معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
مفتی اعظم پاکستان

مکتبۂ معارف القرآن
(Quranic Studies Publishers)

معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه

ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا

من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له

ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له

ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله

صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين

تفسیر معارف القرآن میں قرآن کریم کی سورتوں کی فہرست

معارف القرآن

جلد

۱

سورۃ الفاتحۃ و سورۃ البقرۃ

پارہ اوّل تا پارہ ۳ : رکوع ۸

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

عرضِ ناشر: اگرچہ معارف القرآن کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد بندی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
احاطہ دار العلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰
فون: ۵۰۴۹۷۳۳، ۵۰۳۲۰۲۰

باہتمام : محمد مشتاق سنی
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

- ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
  فون: 5049733 - 5032020
- مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
  فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین
مقدمہ تفسیر "معارف القرآن"

مضمون	صفحہ

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد اوّل

۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدّمہ

علومِ قرآن اور علمِ تفسیر سے متعلق ضروری معلومات

از
محمد تقی عثمانی
اُستاذِ حدیث دار العلوم کراچی ۱۴
(فرزند حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، اور جلد اوّل کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگیا، دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر مکمل طور سے نظرِ ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا، اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اوّل کے شروع میں علوم قرآن اور اصول تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہوسکیں، لیکن متواتر امراض اور ضعف کی بنا پر موصوف کے لئے بذاتِ خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیلِ حکم اور تحصیلِ سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہوگیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پوری کتاب کو معارف القرآن کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایماء پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر معارف القرآن کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتے تھے، یہ تلخیص معارف القرآن جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اُس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو ان شاء اللہ عنقریب مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگی[1]، لہٰذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں وہ اُس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَاِلَیۡہِ اُنِیۡبُ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

دارالعلوم کورنگی
کراچی ۱۴

[1] الحمدللہ یہ کتاب "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی،

وحی اور اُس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو "علم" کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دُنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، مُنہ اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں اُن کا علم نری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم

نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھوکر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جاکر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرماکر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو "وحی" کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحیِ الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے نِری عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کرسکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کرسکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیجدے، اور اُسے نہ چلتے وقت سفر کا

مقصد بتایئے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوند قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمتِ بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جا سکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ "وحی" محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے۔

حضورؐ پر نزولِ وحی کے طریقے

وحی و رسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاریؒ کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے۔ (صحیح بخاریؒ ۲/۱)

اس حدیث میں آپؐ نے "وحی" کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹتی نہیں دوسرے گھنٹی جب مسلسل بجتی ہے تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلامِ الٰہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپؐ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے (فیض الباری ۱/۱۹ و ۲۰)

جب اس طریقے سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپؐ پر وحی نازل ہوتے ہوئے

دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضؓ بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سانس رُکنے لگتا، چہرۂ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے (الاتقان ۱/۴۶)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی (زاد المعاد ۱/۱۸ و ۱۹)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرۂ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سُنائی دیتی تھی (تبویب مسند احمدؒ کتاب السیرۃ النبویۃ ۲۰/۲۱۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں، بہرکیف! جب حضرت جبرئیلؑ انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزولِ وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی (الاتقان ۱/۴۶)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد پر، پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری ۱/۱۸ و ۱۹)

چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (اتقان ۱/۴۶)

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرما دیتے تھے، اسے اصطلاح میں "نفث فی الروع" کہتے ہیں (ایضاً)

تاریخ نزولِ قرآن

قرآن کریم دراصل کلامِ الٰہی ہے، اس لئے ازل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵: ۲۱-۲۲) (بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوحِ محفوظ میں)[1] پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمانِ دنیا کے بیتِ عزّت میں نازل کردیا گیا تھا، بیتِ عزّت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کرکے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزولِ قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے اندازِ بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائیؒ، بیہقیؒ اور حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمانِ دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (اتقان ۱/۴۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمانِ دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابو شامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعتِ شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہلِ زمین کی ہدایت کے لئے اُتاری جانے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ اُتارنے سے یہ بھی جتانا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوحِ محفوظ میں اور دوسرے بیتِ عزّت میں (مناہل العرفان ۱/۳۹) واللہ اعلم۔

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپؐ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوۂ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات، رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترھویں، بعض سے اُنیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے (تفسیر ابن جریرؒ ۱۵/۲)

سب سے پہلے نازل ہونیوالی آیت

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاریؒ میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپؐ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپؐ غارِ حرا میں کئی کئی راتیں گذارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن

---

[1] قارئین کے لئے یہ بات یقیناً سہولت اور خوشی کا باعث ہوگی کہ اس ایڈیشن میں وہ تمام آیاتِ قرآنیہ (جو حوالہ کے طور پر لکھی گئی ہیں) کا سورۃ نمبر اور آیت نمبر دیدیا گیا ہے۔ مثلاً زیرِ نظر سورۃ بروج نمبر شمار ۸۵ آیت نمبر ۲۱-۲۲ - ناشر

اسی غار میں آپؐ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضورؐ نے فرمایا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الخ، (۹۶: ۱-۵)

"پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے" الخ۔

یہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۂ مدثر کی آیات آپؐ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

مکی اور مدنی آیات آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورۃ کے ساتھ مکی اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، مفسرین کی اصطلاح میں "مکی آیت" کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بغرضِ ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، اور "مدنی آیت" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ مکی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اتری، لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات منیٰ، عرفات یا سفرِ معراج کے دوران نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں سفرِ ہجرت کے دوران مدینہ کے راستہ میں نازل ہوئیں ان کو بھی مکی کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتحِ مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (۴: ۵۸) مدنی ہے حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی (البرہان ۱/۱۸۸ و مناہل العرفان ۱/۱۸۸)

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکّی یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۃ مدثر پوری مکّی ہے، اور سورۂ آلِ عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت مکّی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورۂ اعراف مکّی ہے، لیکن اس میں وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ سے لے کر وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ الخ تک کی آیات مدنی ہیں (۷: ۱۶۳)، اسی طرح سورۂ حج مدنی ہے لیکن اس میں چار آیتیں یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى سے لیکر عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ تک مکّی ہیں۔ (۲۲: ۵۲-۵۵)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکّی یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوگئیں اُسے مکّی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔

(مناہل العرفان ۱/۱۹۲)

مکّی و مدنی آیتوں کی خصوصیات

علماء تفسیر نے مکّی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے انکی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکّی ہے یا مدنی؟ ان میں سے بعض خصوصیات قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں:-

(۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ کَلَّا (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکّی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصّہ میں ہیں۔

(۲) ہر وہ سورت جس میں (حنفی مسلک کے مطابق) کوئی سجدے کی آیت آئی ہو، مکّی ہے۔

(۳) سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکّی ہے۔[1]

(۴) ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

(۵) ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجۂ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مکّی سورتوں میں عموماً يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) کے الفاظ سے۔

۲۔ مکّی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی اور مختصر ہیں اور مدنی آیات و سُوَر طویل اور مفصل ہیں

[1] یہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے ماخوذ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رُو سے سورۂ حج مکّی ہے لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہؓ و تابعین سے مروی ہے تو سورۂ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ محمد تقی عثمانی

۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کیے گئے ہیں۔

۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔

۵۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبۃً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق در جوق اسلام کے سایے تلے آرہے تھے، علمی سطح پر بت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔

قرآنِ کریم کا تدریجی نزول

پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تئیس سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزء لے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ (نساء: ۹۵) ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورۂ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے (ابن کثیر ۲/۱۲۲)

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا

جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ (الفرقان: ۳۲ و ۳۳)

"اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے) تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کردیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے"

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہوگیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کردی گئی۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہوجاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہوجاتی، اور یہ اُس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعتِ محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

(۴) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہوجاتی تھی (تفسیر کبیر ۶/۳۳۶)

شانِ نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں "سببِ نزول" یا "شانِ نزول" کہلاتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مؤمن کنیز ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تمہیں پسند ہو"

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانۂ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرثدؓ نے آپؐ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی، (اسباب النزول للواحدیؒ ص ۳۸)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا "شانِ نزول" یا "سببِ نزول" ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں "شانِ نزول" نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اُن کا شانِ نزول معلوم نہ ہو۔

قرآنِ کریم کے سات حروف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امت محمدیہ (علی صاحبہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آگئے، اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، بس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی، (بحوالہ مناہل العرفان ۱/۱۳۳)

سات حروف سے مراد سات نوعیتیں ہیں چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ،

(صحیح بخاری مع القسطلانی ۷/۴۵۳)

"یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں[1]، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلاف کُل سات نوعیتوں پر مشتمل ہے، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

(۱) اسماء کا اختلاف: جس میں افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ ہے اور دوسری قراءت میں تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ۔

(۲) افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ہے اور دوسری میں رَبُّنَا بَاعَدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا۔

(۳) وجوہ اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یا زیر زبر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ کی جگہ لَا يُضَارُّ كَاتِبٌ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ کی جگہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ۔

(۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو، مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور دوسری میں تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ۔

(۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ۔

(۶) بدلیت کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً نُنْشِزُهَا اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوْا اور فَتَثَبَّتُوْا، اور طَلْحٍ اور طَلْعٍ۔

(۷) لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے مثلاً مُوْسٰی کو ایک قراءت میں مُوْسٰے کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہرحال: اختلافِ قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی تھیں

---

[1] ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلہ کی مبسوط تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمایئے "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب ۱۲

اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے اُن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دَور کیا کرتے تھے، جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ دَور فرمایا، اس دَور کو "عرضۂ اخیرہ" کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا، کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر زبر پیش نہیں ڈالے، تاکہ انہی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو قراءتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں اُن کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپؐ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقل علم بن گیا، اور سینکڑوں علماء، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءات" کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمۂ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری امت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

(۱) مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور ائمۂ قرارت میں مشہور ہو۔

جس قرارت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جا سکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسلٍ نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قرارت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ، امام ابو حاتم سجستانیؒ، قاضی اسمٰعیلؒ اور امام ابو جعفر طبریؒ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابو بکر ابن مجاہدؒ (متوفی ۳۲۴ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراء کی قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، اُن کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابلِ قبول ہیں، علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعۃ احرف" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں جنھیں ابن مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، ورنہ ہر وہ قرارت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابلِ قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات قراء بہرحال! علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:۔

(۱) نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیمؒ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہِ راست حضرت اُبی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قرارت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالونؒ (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابو سعید ورشؒ (متوفی ۱۹۷ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۲) عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ابو ایوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قرارت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قرارت کے راویوں میں بزیؒ اور قنبلؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۳) ابو عمرو زبان بن العلاءؒ (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کے

واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُبی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابو عمر الدّوریؒ (متوفی سنہ۲۴۶ھ) اور ابو شعیب سوسیؒ (متوفی سنہ۲۶۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۴) عبداللہ الیحصبیؒ، جو ابن عامرؒ کے نام سے معروف ہیں (متوفی سنہ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۵) حمزۃ بن حبیب الزیّات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمیؒ (متوفی سنہ۱۵۶ھ) آپ سلیمان اعمشؒ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؒ کے، وہ زر بن حبیشؒ کے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی سنہ۱۸۸ھ) اور خلّاد بن خالدؒ (متوفی سنہ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۶) عاصم بن ابی النجود الاسدیؒ (متوفی سنہ۱۲۷ھ) آپ زر بن حبیشؒ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو عبدالرحمٰن سُلَمیؒ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیّاشؒ (متوفی سنہ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی سنہ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عموماً تلاوت انہی حفص بن سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۷) ابوالحسن علی بن حمزۃ الکسائی النحویؒ (متوفی سنہ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں ابوالحارث مروزیؒ (متوفی سنہ۲۴۰ھ) اور ابو عمر الدوریؒ (جو ابو عمروؒ کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخرالذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں۔

دس اور چودہ قراءتیں لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ صحیح قراءتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ) نے سات کے بجائے دس قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ "قراءاتِ عشرہ" کی اصطلاح مشہور ہوگئی، ان دس قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قرّاء کے علاوہ ان تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں۔

(۱) ابو جعفر یزید بن القعقاعؒ (متوفی سنہ۱۳۰ھ) جن کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔

(۲) یعقوب بن اسحٰق حضرمیؒ (متوفی سنہ۲۰۵ھ) آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی۔

(۳) خلف بن ہشامؒ (متوفی سنہ۲۰۵ھ) جو حمزہؒ کی قراءت کے بھی راوی ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراءتیں جمع کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قراء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:-

(۱) حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جن کی قراءت کا مرکز بصرہ تھا۔

(۲) محمد بن عبدالرحمٰن ابن محیصنؒ (متوفی ۱۲۳ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔

(۳) یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۲۰۲ھ) جو بصرہ کے باشندے تھے۔

(۴) ابوالفرج شنبوذیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوذیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں (مناہل العرفان بحوالہ منجد المقرئین لابن الجزریؒ)۔

تاریخ حفاظتِ قرآن

عہدِ رسالتؐ میں حفاظتِ قرآن

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالتؐ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اس کے الفاظ کو اُسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورۂ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظہ پیدا فرما دے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپؐ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سُنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دَور کیا۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

پھر آپؐ صحابۂ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابۂ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ

ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم۔ سوا سے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عُبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجدِ نبویؐ میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے (مناہل العرفان ۱/۲۳۴)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابۂ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفاءِ راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں[1]۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظِ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابلِ اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابلِ اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو حافظے کی ایسی قوت عطا فرما دی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

کتابتِ وحی

قرآنِ کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسم اطہر پر پسینہ

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب۔

کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ لکھواتے رہتے، اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہرحال؛ جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرما دیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے (مجمع الزوائد ۱/۱۵۶ بحوالہ طبرانی)

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں خلفاء راشدینؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ۹/۱۸ اور زاد المعاد ۱/۳۰)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے (فتح الباری ۹/۱۸) اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (ایضاً ۹/۱۱)

اس طرح عہدِ رسالتؐ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیاتِ قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھیں (سیرت ابن ہشام)

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابیؓ کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

اس بناء پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم

کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیجکر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں" میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابتِ وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہٰذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انھیں جمع کرو۔"

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمعِ قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا، جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا (صحیح بخاریؒ، کتاب فضائل القرآن)

جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریق کار

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظِ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یاد داشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، اُن کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں

درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلانِ عام کردیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجۂ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

(۱) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔

(۲) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگادیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے (فتح الباری ۹/۱۱ بحوالہ ابن ابی داؤد)۔

(۳) کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابلِ اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ (اتقان ۱/۶۰)

(۴) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے (البرہان فی علوم القرآن للزرکشیؒ ۱/۲۳۸)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ "سورۂ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ مجھے صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں"۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جزءِ قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزءِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور

کے پاس نہیں (البرہان ۱/۲۳۴ و ۲۳۵)

اُمّ کی خصوصیات

بہرکیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا (اتقان ۱/۶۰) لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "اُمّ" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:۔

(۱) اس نسخہ میں آیاتِ قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (اتقان، حوالۂ بالا)

(۲) اس نسخہ میں قرآن کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے (مناہل العرفان ۱/۲۴۶، وتاریخ القرآن للکردیؒ، ص ۲۸)

(۳) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

(۴) اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام اُمّت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکرؓ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انھیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؒ نے اسے اس خیال سے نذرِ آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر اُمّت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (فتح الباری ۹/۱۶)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدینِ اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جنکی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابۂ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انھوں نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی

پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہونچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ رضؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلّم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلّم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ: "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں

کہ میری قرارت تمہاری قرارت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہونچ سکتی ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا سوچا ہے ؟" حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مُصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے"، صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی، اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ "جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے"۔

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا[1]، ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سُورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا (مستدرک ۲/۲۲۹)

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں

---

[1] یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۹ سے ماخوذ ہیں۔

سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبر پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً ننسرھا لکھا تاکہ اسے نَنْشُزُھَا اور نُنْشِرُھَا دونوں طرح پڑھا جا سکے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں (مناھل العرفان ۱/۲۵۳ و ۲۵۴)

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانی رح کا ارشاد ہے کہ کُل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا (فتح الباری ۹/۱۶)

(۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار کیا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انھیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سرِ نو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت[۲۳] مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ "مصحف لکھتے وقت سورۂ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا" اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ

تمام انفرادی نسخے نذرِ آتش فرما دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسلّمہ قراءتوں کے اجماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بہ نظرِ استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں[۱]، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

"عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا" (فتح الباری ۱۵/۹)

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات

حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمّت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؒ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کر کے قرآنِ کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر زبر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہلِ عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطے

اہلِ عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالمِ اسلام کے مختلف حصّوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا (البرہان ۱/۲۵۰) بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا (صبح الاعشیٰ ۳/۱۵۵) اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے ان سے یہ کام کرایا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ

[۱] اس کی تفصیل کے لئے احقر کی مفصل کتاب "علوم القرآن" ملاحظہ فرمایئے۔

حجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انجام دیا (تفسیر القرطبی ۱/۶۳)

حرکات

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؒ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا (قرطبی ۱/۶۳)

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابو الاسود دؤلیؒ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل رائج ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـٌ) زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ (ـِ) اور پیش کیلئے حرف کے سامنے ایک نقطہ (ـ٠) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ـٌ یا ـٍ یا ـ٠٠) مقرر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں (صبح الاعشیٰ ۳/۱۶۰ و ۱۶۱)۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی موجودہ صورتیں مقرر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

احزاب یا منزلیں

صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے "حزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان ۱/۲۵۰)

اجزاء یا پارے

آجکل قرآن کریم تیس ۳۰ اجزاء پر منقسم ہے، جنھیں تیس ۳۰ پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس ۳۰ مساوی حصّوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس ۳۰ پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انھیں تیس ۳۰ مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہٰذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس ۳۰ پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے (البرہان ۱/۲۵۰ و مناہل العرفان ۱/۴۰۲) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اخماس اور اعشار

قرونِ اُولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ "خمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھدیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا (مناهل العرفان ۱/۴۰۳) علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا (البرہان ۱/۲۵۱) لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں "اعشار" کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہؒ ۲/۴۹۷)

رکوع

"اخماس" اور "اعشار" کی علامتیں تو بعد میں متروک ہوگئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ع) بنا دی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دَور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہونچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵۴۰ عـہ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں قرآن کریم ختم ہوسکتا ہے (فتاویٰ عالمگیریہ فصل التراویح ۱/۹۴)

رموزِ اوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھدیئے گئے جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموزِ اوقاف" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کرسکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبداللہ محمد

عـہ فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے، لیکن جب بندہ نے قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی۔ اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ انکی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم
از ناشر ۱۲/۱۹/ ۲۰۱۳ء

بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے (النشر فی القرآت العشر ۱/۲۲۵) ان رموز کی تفصیل یہ ہے:

ط : یہ "وقفِ مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج : یہ "وقفِ جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز : یہ "وقفِ مجوّز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص : یہ "وقفِ مرخّص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے (المنح الفکریہ، ص ۶۳)۔

م : یہ "وقفِ لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہٰذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقفِ واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقاف میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے (النشر ۱/۲۳۱)

لا : یہ "لَا تَقِفْ" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں (النشر، ص ۲۳۳ ج ۱) [1]

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:

مع : یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہٰذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ الخ اس میں اگر التَّوْرٰىةِ پر وقف کر لیا تو الْإِنْجِيلِ پر وقف درست نہیں، اور اگر الْإِنْجِيلِ پر وقف کرنا ہے تو التَّوْرٰىةِ پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف کریں تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دہی

[1] ○ گول دائرہ یہ علامت آیت ہے۔ ناشر

امام ابوالفضل رازیؒ نے فرمائی ہے (النشر ص ۲۳۷ ج ۱ والاتقان ص ۸۸ ج ۱)

سکتہ: یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملاکر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

وقفہ: اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔

ق: یہ "قِیْلَ عَلَیْہِ الْوَقْفُ" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

قف: یہ لفظ "قِفْ" ہے جس کے معنی ہیں "ٹھہر جاؤ" اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلے: یہ "اَلْوَصْلُ اَوْلیٰ" کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ "ملاکر پڑھنا بہتر ہے"۔

صل: یہ "قَدْ یُوْصَلُ" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملاکر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یہ اُن مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت: جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دَور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکردی ص ۱۸۶ اور علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری ص ۱۴۲)

علمِ تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علمِ تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں "تفسیر" کے لفظی معنی ہیں "کھولنا" اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴)

"اور ہم نے قرآن آپؐ پر اُتارا تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرما دیں جو اُن کی طرف اُتاری گئیں ہیں"

نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳: ۱۶۴)

"بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انھیں پاک صاف کرے، اور انھیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے"

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابۂ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپؐ سے رجوع کرتے اور انھیں تسلی بخش جواب مِل جاتا، لیکن آپؐ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیرِ قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ اُمت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور ملحد و گمراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حُسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیرِ قرآن کے مآخذ علم تفسیر کو اس اُمت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائیں؟ اور یہ جدّوجہد کتنے مراحل سے گذری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں[1]، لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیرِ قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کل چھ ہیں:

۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دُعاء میں یہ جملہ موجود ہے کہ "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" یعنی ہمیں اُن لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا"، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ج۔ (۴: ۶۹)

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ"

چنانچہ مفسرین کرامؒ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپؐ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرما دیں، چنانچہ آپؐ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپؐ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرین کرامؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم

[1] اس کیلئے علوم القرآن پر احقر کی مفصّل کتاب ملاحظہ فرمایئے۔

کی کوئی تفسیر متعین کرلینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہؓ کے اقوال

صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزولِ وحی کے وقت وہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اور انھوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہؓ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصولِ فقہ، اصولِ حدیث اور اصولِ تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعینؒ کے اقوال

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرامؓ سے سیکھی ہے، اس لئے اُن کے اقوال بھی علمِ تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان ۲/۱۷۹) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لُغتِ عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیرِ قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے اُن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لُغتِ عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علمِ لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبّر اور استنباط

تفسیر کا آخری مأخذ "تدبّر اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحر

ناپیدا کنار ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرامؒ اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ ماخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، لغت، صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاءؒ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمت کے محقق علماء نے انھیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی (اتقان ۲/۱۸۴)

اسرائیلیات کا حکم

"اسرائیلیات" اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرینؒ کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انھیں سند کے ساتھ پہنچی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ پہلے اہلِ کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انھیں قرآن کریم میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انھوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے اپنے پُرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں، حافظ ابن کثیرؒ نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (۲:۱۰۲) (اور سلیمانؑ کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا) اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کرلیا، یہ بھی کھُلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن وسنت اور دیگر شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ تورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ اُن کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے قولِ فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انھیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور بلاغت وادب کے علاوہ علمِ حدیث، اصولِ فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہونچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُدھ بُدھ رکھنے والے لوگ جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چُوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحبِ عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینیرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینیر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینیر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیرِ تربیت رہ کر

ن سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینیر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنھیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنّت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کر دے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴: ۱۷)

اور بلا شبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلا شبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انھیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ الذِّکر (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حقہٗ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انھیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:۔

نتعلمنا القرآن والعلم والعمل جمیعًا

"ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے" (اتقان ۲/۱۷۶)

چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہوجاتا تھا (اتقان ۲/۱۷۶ نوع ۷۷)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر و ادب میں مہارت تامّہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہوجایا کرتے تھے، انھیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہوجائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب صحابۂ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود "عالمِ قرآن" بننے کے لئے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُدبُد پیدا کرکے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسرِ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے! ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

من قال فی القراٰن بغیر علم فلیتبوّأ مقعدہ فی النار

"جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"

(ابوداوٗدؒ از اتقان ۲/۱۷۹)

اور:- من تکلّم فی القراٰن برأیہ فأصاب فقد أخطأ

"جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہدے تب بھی اس نے غلطی کی" (ابوداوٗدؒ، نسائیؒ از اتقان ۲/۱۷۹)

مشہور تفسیریں

عہدِ رسالتؐ کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی اتنی خدمت نہیں کی گئی، جتنی قرآن کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم اُن اہم تفسیروں کا

مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مأخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہے، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف اُن تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر

اس تفسیر کا اصل نام "جامع البیان" ہے، اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی سنہ ۳۱۰ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبریؒ اونچے درجے کے مفسر، محدّث اور مؤرخ ہیں، منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھنے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (البدایہ والنہایہ، ص ۱۴۵ ج ۱۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہلِ سنت کے جلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تیس جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول اُن کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات جمع ہوگئی ہیں، اس لئے اُن کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیرِ قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انھیں دستیاب ہوسکیں اُن سب کو جمع کردیا جائے، تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انھوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کرکے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرسکے۔

تفسیر ابن کثیر

یہ حافظ عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی سنہ ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، اُن کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ مصنفؒ روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتبِ تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر القرطبی

اس کا پورا نام "الجامع لاحکام القرآن" ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبیؒ (متوفی سنہ ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرۂ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہوچکی ہے۔

تفسیر کبیر یہ امام فخرالدین رازیؒ (متوفی سنہ ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن "تفسیر کبیرؒ" کے نام سے مشہور ہے، امام رازیؒ متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقلی اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حلِ قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دلنشین انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابلِ قدر ہے، اغلب یہ ہے کہ امام رازیؒ نے سورۂ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کرسکے، چنانچہ سورۂ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقیؒ (متوفی سنہ ۶۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولیؒ (متوفی سنہ ۷۲۷ھ) نے مکمل فرمایا (کشف الظنون ۲/۴۷۷)

امام رازیؒ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہوگئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے اُن کی تفسیر پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ فِيهِ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا التَّفْسِيْرُ (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، کہ حلِّ قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا پایہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انھوں نے جمہور اُمّت کی راہ سے ہٹ کر آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط یہ علامہ ابوحیّان غرناطی اندلسیؒ (متوفی سنہ ۷۵۴ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علمِ نحو و بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں نحو و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للجصّاصؒ یہ امام ابوبکر جصّاص رازیؒ (متوفی سنہ ۳۷۰ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہائے حنفیہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے، اور انھوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف اُن آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدّر المنثور یہ علّامہ جلال الدین سیوطیؒ (متوفی سنہ ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" ہے، اس میں علّامہ سیوطیؒ نے ان تمام روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مثلاً حافظ ابن جریرؒ، امام بغویؒ، ابن مردویہؒ، ابن حبّانؒ اور ابن ماجہؒ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کرچکے تھے،

علامہ سیوطیؒ نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے، البتہ انھوں نے روایات کیساتھ انکی پوری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مراجعت کرکے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو جمع کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہوگئی ہیں، اور سند کی تحقیق کئے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا علامہ سیوطیؒ بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتادیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقیدِ حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہٗ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے اور انھوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام تفسیر مظہریؒ رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انھوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

روح المعانی اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوّف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایاتِ حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

تمہید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ وَرِضٰى نَفْسِهٖ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى صَفْوَةِ رُسُلِهٖ وَخَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَجَمِيْعِ الْاَنْبِيَاۗءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ۝

امّا بعد

دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے

قرآن کریم اس جہان میں وہ نعمت بے بہا ہے کہ سارا جہان آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

انسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی اپنی مقدور بھر قرآن کریم میں اشتغال اور اس کو حاصل کرنا ہے، اور سب سے بڑی شقاوت و بدنصیبی اس سے اعراض اور اُسے چھوڑنا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اس کی فکر تو فرض عین اور ضروری ہے کہ قرآن کریم کو صحتِ لفظی کے ساتھ پڑھنے اور اولاد کو پڑھانے کی کوشش کرے، اور پھر جس قدر ممکن ہو اس کے معانی اور احکام کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی فکر میں لگا رہے، اور اس کو اپنی پوری عمر کا وظیفہ بنائے، اور اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق اس کا جو حصّہ بھی نصیب ہو جائے اُس کو اس جہان کی سب سے بڑی نعمت سمجھے۔

مختصر سرگذشت مصنّف

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع ابن مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرسکتا کہ حق تعالیٰ نے اس کا مولد و وطن مرکز علوم اسلامیہ دیوبند کو بنادیا، اور ایسے والد محترم کی آغوش میں پرورش کا موقع عطا فرمایا جو حافظِ قرآن اور عالمِ دین ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ہمعصر تھے، دارالعلوم دیوبند کے بانیان علمائے ربانی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع اُن کو ہمیشہ میسّر رہے، اُن کا وجود اُن بزرگوں کا زندہ تذکرہ تھا، اور اُن کی زندگی بچپن سے وفات تک دارالعلوم دیوبند ہی میں پوری ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی، وہیں مدرّس ہو کر ساری عمر تعلیم کی خدمت گذاری کی۔

احقر کی ابتدا تعلیمِ قرآن والد محترم کی تجویز سے دارالعلوم کے اساتذۂ قرآن حافظ عبدالعظیم صاحب اور حافظ نامدار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے پاس ہوئی، اور پھر خود والد محترم کی خدمت میں رہ کر اردو، فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم کے درجۂ عربی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ۱۳۳۵ھ تک درسِ نظامی کا نصاب اُن ماہرِ فن اساتذہ کی خدمت میں رہ کر پورا کیا جن کی نظیر آج دنیا کے کسی گوشے میں ملنا مشکل ہے، بچپن سے متوسط تعلیمِ عربی تک شیخ العرب والعجم سیّدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی درسِ بخاری کی غیر رسمی حاضری نصیب رہی، مالٹہ جیل سے واپس تشریف لانے کے بعد انہی کے دستِ حق پرست پر بیعتِ طریقت نصیب ہوئی، اور علومِ عربیہ کی باقاعدہ تعلیم حضرات ذیل سے حاصل کی، حافظ حدیث جامع العلوم حضرت علّامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، عالمِ ربانی حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور ماہرِ علومِ معقول و منقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب و حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب[1]

افسوس ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت آخر الذکر دو بزرگوں کے سوا سب اس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کا سایہ تادیر[1] بعافیت قائم رکھیں، اور اہلِ علم کو ان سے فیض یاب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع عطا فرمائیں۔

---

[1] ۲۳ شعبان ۱۳۹۲ھ کو جبکہ معارف القرآن پر نظرثانی کا کام شروع ہوا تو یہ دونوں بزرگ بھی رخصت ہوچکے ہیں، حق تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور درجات عالیہ نصیب فرمائیں، ۱۲ منہ

اساتذہ اور اکابرِ دارالعلوم کی نظرِ شفقت و عنایت اوّل ہی سے اس ناکارہ پر مبذول تھی، ۱۳۳۵ھ میں احقر نے فنون کی بقیہ چند کتابیں قاضی اور میر زاہد اور امور عامہ وغیرہ پڑھنا شروع کیا تھا کہ اسی سال میں اکابرِ دارالعلوم نے احقر کو کچھ سبق پڑھانے کے لئے دیدیے، اس طرح ۱۳۳۶ھ میری تعلیم و تعلّم کا مشترک سال تھا، ۱۳۳۷ھ سے باقاعدہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر لگادیا گیا، بارہ سال مسلسل مختلف علوم و فنون کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں کے درس کی خدمت انجام دی، ۱۳۴۹ھ میں مجھے صدر مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم کا منصبِ فتویٰ سپرد کیا گیا، اس کے ساتھ کچھ کتابیں حدیث و تفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں، اور بالآخر ۱۳۶۲ھ میں تحریک پاکستان کی جدوجہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگیا۔

دارالعلوم کی چھبیس سالہ خدمتِ درس و فتویٰ کے ساتھ خاص خاص موضوعات پر تصنیف کا بھی سلسلہ جاری رہا، ان تمام مشاغل اور بزرگانِ دارالعلوم کی صحبت سے اپنے حوصلے کے مطابق قرآن و حدیث سے کچھ مناسبت ہوگئی تھی، حضرت مجدد الملۃ حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کا شرف تو طالب علمی کے زمانے میں بھی ہوتا رہتا تھا مگر ۱۳۴۶ھ سے تجدید بیعت کے ساتھ مسلسل حاضر باشی کا شرف حاصل ہوا جو تقریباً بیس سال حضرت اقدس کی وفات رجب ۱۳۶۲ھ تک جاری رہا، حضرت قدس سرہٗ کو حق تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون کی کامل مہارت عطا فرمائی تھی، اور اُن میں سے خصوصاً تفسیر اور تصوّف آپ کے مخصوص فن تھے ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف بیان القرآن، التکشّف اور التشرّف و دیگر رسائل تصوّف اس پر کافی شاہد ہیں، حضرت قدس سرہٗ نے اپنی آخری عمر میں یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ احکام القرآن پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں عصرِ حاضر کے مسائل کو بھی جس قدر قرآن کریم سے ثابت ہوتے ہیں واضح کیا جائے، اس کام کو جلد پورا کرانے کے خیال سے چند اصحاب میں تقسیم فرمایا، اس کا ایک حصّہ احقر کے بھی سپرد ہوا، جس کا کچھ حصّہ تو حضرت قدس سرہٗ کی حیات ہی میں آپ کی زیرِ نگرانی لکھا گیا، باقی حضرت کی وفات کے بعد بعونہٖ تعالیٰ پورا ہوگیا، اور دو جلدوں میں شائع بھی ہوچکا یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔

اس سلسلے نے حضرتؒ کی برکت سے بحمداللہ قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق اور طلب پیدا کردی، اس کے بعد قضاء و قدر سے زندگی میں ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھلا، ۱۳۶۵ھ یعنی ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی تحریک قوی ہوکر پورے ملک میں پھیلی، حضرت قدس سرہٗ کے سابقہ ایماء اور موجودہ اکابر کے ارشاد پر اس تحریک میں حصّہ لیا، اور دو سال کے شب و روز اس جدوجہد میں صرف کئے، مدراس سے پشاور تک اور مغرب میں کراچی تک پورے ملک کے دورے کئے، یہی تحریک پاکستان

اور اس کی جد وجہد بالآخر دار العلوم دیوبند سے استعفاء دینے پر منتہی ہوئی، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ دیرینہ تمنا پوری فرمادی، کہ ہندوستان تقسیم ہوکر مسلمانوں کے لئے خالص اسلام کے نام پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی۔

اسلامی سلطنت، اسلامی نظام، اسلامی قانون کی قدیم تمنائیں اب امید کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں، اور اس کے ساتھ وطنِ مالوف کو ترک کرنے اور پاکستان کو وطن بنانے کی کشمکش دل میں موجزن ہوئی، وطنِ اصلی دیوبند کے علوم اسلامیہ کا مرکز اور منتخب علماء امت کا مرجع ہونے پر نظر جاتی تو سعدی شیرازیؒ کا یہ شعر یاد آتا ہے

تولائے مردانِ ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام وروم

لیکن جب ملک کے سیاسی حالات اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ان کے اداروں کے مستقبل پر نظر جاتی تو کوئی روشن پہلو سامنے نہ آتا، اس کے خلاف پاکستان میں ہر طرح کی صلاح و فلاح کی امید بظاہر اسباب نظر آتی تھی، ادھر یہ کشمکش جاری تھی اور دوسری طرف پورے ملک میں بدامنی اور قتل وغارت گری کے قیامت خیز ہنگامے کھڑے ہوگئے، ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا، لاکھوں انسانوں کو بجبر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، اور پھر جانے والوں کو عافیت کے ساتھ جانے کا موقع بھی نہ دیا گیا، جابجا قتلِ عام، خوں ریزی، لوٹ مار اور اغواء کے روح فرسا نظارے تھے، کسی کا صحیح سالم پاکستان پہنچ جانا ایک اعجوبہ یا کرامت سمجھا جاتا تھا، آٹھ ماہ کے بعد یہ ہنگامے کچھ فرو ہوئے تو میرے استاذ محترم اور پھوپھی زاد بھائی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور چند عمائد کراچی نے یہ ارادہ کیا کہ پاکستان کے لئے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کرکے حکومت کے سامنے رکھا جائے، تاکہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنا ہے وہ جلد سے جلد بروئے کار آسکے، اس تجویز کے لئے منجملہ چند علماء کے احقر کو بھی ہندوستان سے کراچی آنے کی دعوت دی گئی۔

۲۰ رجادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا جس میں وطنِ مالوف مرکزِ علوم دیوبند کو خیرباد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رُخ کیا، والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر اور جس طرف جارہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گذارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن امیدوں کے ملے جلے تصورات میں غلطاں و پیچاں۔

دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے ۲۶ رجادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ

نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا، یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں، اس پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا، اس کی سرگذشت بہت طویل ہے، یہ مقام اُس کے لکھنے کا نہیں جن مقاصد کے لئے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لئے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی ؎

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این ست بہارے

حکومت کے راستے سے کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، تاہم عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور امورِ دین کا احساس بحمد اللہ ابھی تک سرمایۂ زندگی بنا ہوا ہے، ان میں اہل صلاح و تقویٰ کی بحمد اللہ خاصی تعداد موجود ہے، اسی احساس نے یہاں دینی خدمتوں کی راہیں کھولی ہوئی ہیں۔

حکومت کے پیمانے پر اصلاحی کوششوں کے علاوہ عوامی طرز سے اصلاحی جدوجہد اور اس کے لئے کچھ اداروں کا قیام جو شروع سے پیش نظر تھا اُس کی ابتدا ۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۰ء میں اس طرح ہوئی کہ آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں روزانہ بعد صبح درسِ قرآن شروع ہوا اور ہر طرف سے آنے والے سوالات کے جواب میں جو فتاویٰ مسلسل لکھے جاتے اور بغیر نقل کے روانہ کر دیئے جاتے تھے، اب اس کا انتظام اسی مسجد میں ایک دار الافتاء کے قیام کی صورت میں عمل میں آیا، یہ درسِ قرآن اُمید سے زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہوا، سننے والوں کی زندگی میں انقلاب کے آثار دیکھے گئے، احقر ناکارہ کو زندگی کا ایک اچھا مشغلہ مل گیا، بعد نماز فجر روزانہ ایک گھنٹہ کے عمل سے سات سال میں بحمد اللہ یہ درسِ قرآن مکمل ہو گیا۔

یہاں تک کی تمہید ماہ صفر ۱۳۸۳ھ میں اُس وقت لکھی گئی تھی جبکہ تفسیر معارف القرآن کو کتابی صورت میں لانے کا ارادہ ہوا تھا، پھر ۱۳۸۸ھ تک یہ سلسلہ ملتوی رہا، ۸۸ھ سے اس پر کام شروع ہوا جو ۱۳۹۲ھ تک پانچ سال میں بحمد اللہ مکمل ہو گیا، اس تمہید کا آگے آنے والا حصہ تکمیلِ تفسیر کے بعد ۱۳۹۲ھ میں لکھا گیا۔

تفسیر معارف القرآن کی تصنیف قدرتی اسباب سے

احقر ناکارہ گنہگار بے علم و بے عمل کی یہ جرأت کبھی بھی نہ ہوئی کہ قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرتا مگر نیرنگ تقدیر سے اس کے اسباب اس طرح شروع ہوئے کہ ریڈیو پاکستان سے روزانہ

نشر ہونے والے درس قرآن کے متعلق مجھ سے فرمائش کی گئی جس کو چند اعذار کی بناء پر میں قبول نہ کرسکا پھر انھوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ روزانہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام معارف القرآن جاری کیا جائے، جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کے پیش نظر خاص خاص آیات کا انتخاب کرکے اُن کی تفسیر اور متعلقہ احکام بیان ہوا کریں، احقر نے اس کو اس شرط کے ساتھ منظور کرلیا کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درسِ قرآن کے مناسب نہ ہو، یہ شرط منظور کرلی گئی۔

بنام خدا تعالیٰ یہ درس بنام معارف القرآن ۳، شوال ۱۳۷۳ھ ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور تقریباً گیارہ سال پابندی سے جاری رہا یہاں تک کہ جون ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی اپنی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کردیا گیا، یہ درس معارف القرآن تیرہویں پارے اور سورۂ ابراہیم پر ختم ہوگیا جس میں ان تیرہ پاروں کی مکمل تفسیر نہیں بلکہ منتخب آیات کی تفسیر تھی، احقر نے ایسی درمیانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خالص علمی مضامین پر مشتمل تھی اور ریڈیائی تقریر کے ذریعہ عوام کے ذہن نشین کرنا اس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو مکرر سکرر آئی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کر رہا تھا اس کا کوئی دور دور خیال نہ تھا کہ یہ کسی وقت کتابی صورت میں ایک مستقل تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس نشر ہونا شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے زیادہ غیر ممالک افریقہ یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود احقر کو وصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ بہت سے دیندار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس درس سے بہت شغف رکھتے ہیں، افریقہ میں چونکہ یہ درس آخر شب یا بالکل صبح صادق کے وقت پہونچتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کرکے بعد میں سب کو بار بار سنانے کا اہتمام کیا، اور جگہ جگہ سے اس کا تقاضا ہوا کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، عام مسلمانوں کے اس اشتیاق نے اس ناکارہ کی ہمت بڑھادی اور امراض و ضعف کے باوجود گیارہ سال تک یہ سلسلہ بڑی پابندی سے جاری تھا، ۱۳۸۳ھ اور ۱۹۶۴ء میں جب درس کا سلسلہ بند ہوا تو بہت سے حضرات کی طرف سے یہ تقاضا ہوا کہ جتنا ہوچکا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اور درمیان میں جو آیات چھوڑی گئی ہیں ان کی بھی تکمیل کردی جائے، بنامِ خدا یہ ارادہ کرلیا کہ موجودہ پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی ماندہ آیات کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۸۳ھ میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر نظر ثانی مکمل ہوگئی، اور سورۂ بقرہ پر کام شروع کیا، اس میں احکام کی آیات مشکلہ بہت ہیں جو ریڈیو پر نشری تقریر میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، ہجوم

مشاغل اور امراض نے فرصت نہ دی اور تقریباً یہ کام ذہول میں پڑ گیا۔

بزیرنگِ تقدیر ایک شدید و طویل بیماری تکمیلِ تفسیر کا سبب بن گئی

۱۳۸۸ھ کے شعبان میں احقر کے اسفل بدن میں کچھ پھوڑے کی شکل نمودار ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، آخر رمضان میں اس نے کھڑے ہونے سے معذور کر دیا، آخری آٹھ روزے بھی قضا ہوئے، گھر میں بیٹھ کر نماز ہونے لگی، اس کے ساتھ پاؤں میں نقرس کا پرانا درد شروع ہوا، اس کا جو علاج پہلے کارگر ہوجاتا تھا وہ بھی کامیاب نہ ہوا اور دونوں پاؤں سے معذور ہو گیا، تقریباً دس مہینے اسی طرح معذوری و بیماری کے ساتھ موت و حیات کی کشمکش میں گذرے، جب چلنے پھرنے اور ہر کام سے معذور ہو گیا، زندگی کی امید بھی مضمحل ہو گئی تو اب اس پر افسوس ہوا کہ یہ تفسیری اوراق جس قدر ہو چکے تھے اُن پر نظر ثانی اور تکمیل بھی نہ ہو سکی' اب یہ اوراق یونہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے قلب میں ہمت عطا فرمائی' اور شوال ۱۳۸۸ھ کے آخر میں بسترِ علالت پر ہی اللہ تعالیٰ نے اس کام کو شروع کرا دیا، اور ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ کو سورۃ بقرہ کی تکمیل ہو کر کتابت و طباعت کے لئے دیدی، اس کے بعد سے عین بیماری و معذوری کی حالت میں یہ کام تدریجی رفتار سے چلتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے دس ماہ کے بعد معذوری بھی رفع فرما دی تو رجب ۱۳۸۹ھ سے کام کسی قدر تیز ہوا، مگر اسی کے ساتھ ملک میں جدید انتخابات نے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، میں اگرچہ عرصہ دراز سے سیاست سے بالکل یکسو ہو چکا تھا، مگر ان انتخابات نے پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی کر دیئے، اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لئے جدّ و جہد اور جلسے و جلوس عام ہو گئے، اس مسئلے کی نزاکت نے پھر اس پر آمادہ کر دیا کہ کم از کم اسلام اور سوشلزم میں فرق اور سوشلزم کے خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک اس سیاسی میدان میں حصّہ لیا جائے، اس کے لئے تحریری مقالے بھی لکھنے پڑے، اور مشرقی و مغربی پاکستان کے اہم مواقع میں جلسوں میں شرکت بھی کرنا پڑی: مسئلہ کی وضاحت تو مقدور بھر پوری ہو گئی، مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور زر پر کام کرتے ہیں انتخابات کا نتیجہ بالکل خلاف اور برعکس نکلا، اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا وہ آ گیا، وَلِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

انتخابات کے بعد احقر نے پھر سیاست سے مستعفی ہو کر اپنا یہ کام شروع کیا، اور الحمد للہ علی کرمہ کہ رجب ۱۳۹۰ھ تک تیرہ پاروں کی معارف القرآن پر نظر ثانی اور درمیانی متروکہ آیات کی تفسیر بھی مکمل ہو گئی، اور سورۂ ابراہیم سے سورۂ نحل تک دو پاروں کی مزید تفسیر بھی لکھی گئی، اب قرآن مجید نصف کے قریب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی، اور باقی ماندہ قرآن

کی تفسیر لکھنا شروع کیا، اس کا اس وقت کوئی تصور نہیں تھا کہ چھتر سال کی عمر اور سقوطِ قویٰ، اس کے ساتھ مختلف قسم کے امراض کے تسلسل میں یہ تفسیر پوری ہو سکے گی، مگر یہ سمجھ کر کہ قرآن کو ختم کرنا مقصود نہیں قرآن میں اپنی عمر کو ختم کرنا ہے، اللہ کے نام پر یہ سلسلہ شروع کر دیا، شعبان ۱۳۹۰ھ سے سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر شروع ہوئی، اور ۲۳ صفر ۱۳۹۱ھ کو قرآن کی چوتھی منزل سورۂ فرقان پارہ ۱۹ تک مکمل ہوگئی۔

آگے قرآن کی تین منزلیں یعنی تقریباً ایک تہائی قرآن کریم باقی تھا، عمر کے ضعف اور مختلف قسم کے امراض کی بنا پر یہ خیال آیا کہ اس سب کی تکمیل تو شاید مجھ سے نہ ہو سکے، مگر درمیانی پانچویں اور چھٹی منزل کی تفسیر احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی لکھدی ہے جو شائع بھی ہو چکی ہے، اگر میں اس کو نہ لکھ سکا تو میرے بعد بھی کوئی اللہ کا بندہ اسی احکام القرآن کی تفسیر کو اردو میں منتقل کرکے یہ حصہ پورا کر دے گا، اور اس کی وصیت بھی چند حضرات کو کر دی، اور درمیان کی یہ دو منزلیں چھوڑ کر آخری ساتویں منزل سورۂ قٓ سے لکھنا شروع کر دیا، حق تعالیٰ کی مدد نے دستگیری فرمائی اور ۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ سے شروع ہو کر شوال ۱۳۹۱ھ تک یہ آخری منزل پوری ہوگئی، صرف معوذتین یعنی آخری دو سورتیں چھوڑ دی گئیں۔

اب درمیانی دو منزلیں سورۂ شعراء سے سورۂ حجرات تک باقی تھیں اللہ کے نام پر ان کو بھی شروع کر دیا، ان میں سورۂ صٓ، صافات، زخرف تو برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ سے لکھوائی اور خود اس پر نظرثانی کرکے مکمل کیا، باقی سورتیں خود لکھنا شروع کیں، اور قرآن مجید کا تقریباً ڈیڑھ پارہ باقی رہ گیا تھا کہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ ۸ رجون ۱۹۷۲ء کو اچانک مجھے قلب کا ایک شدید مرض پیش آیا، کہ موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، دیکھنے والے تھوڑی دیر کا مہمان سمجھتے تھے، کراچی میں امراضِ قلب کے ہسپتال میں غیر شعوری طور پر پہنچا دیا گیا، تین روز کے بعد ڈاکٹروں نے کچھ اطمینان کا اظہار کیا، جب کچھ ہوش و حواس درست ہوئے تو باقی ماندہ تفسیر کا خیال ایک حسرت بن کر رہ گیا، برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ کو وصیت کر دی کہ بقیہ کی تکمیل وہ کر دیں، اس طرح قلب کا کچھ بوجھ ہلکا کیا، اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر کہ اس نے اس مرض سے صحت بھی عطا فرمائی، اور تین مہینے کے بعد اتنی طاقت تھی کہ کچھ لکھنے پڑھنے کی ہمت ہونے لگی، مگر تھوڑی دیر کام کر لینے سے دماغ، دل و نگاہ سب تھک جاتے تھے، محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہی تھا کہ اس نے اسی حالت میں یہ بقیہ تفسیر ۲۱ شعبان ۱۳۹۲ھ روز شنبہ کو مکمل کرا دی اور حسنِ اتفاق سے یہی روز ۱۳۱۴ھ میں میری ولادت کا دن تھا، اس روز میری عمر کی ستتر منزلیں پوری ہو کر اٹھتر واں سال شروع ہوا۔

اس تفسیر کا آغاز شوال ۱۳۸۸ھ کی شدید بیماری میں ہوا اور خاتمہ پانچ سال کے بعد شعبان ۱۳۹۲ھ کی شدید بیماری کے متصل بعد ہوا، یہ پانچ سال آخر عمر کے طبعی ضعف، مختلف قسم کے امراض کے تسلسل افکار کے ہجوم اور ملک میں انقلابی ہنگاموں کے سال تھے، انہی میں حق تعالیٰ نے اس تفسیر کے تقریباً سات[1] ہزار صفحات اس ناکارہ کے قلم سے لکھوا دیئے، اور یہ بات آنکھوں سے دکھلا دی کہ

ان المقادیر اذا ساعدت　　الحقت العاجز بالقادر

"یعنی جب تقدیر الٰہی مدد کرتی ہے تو عاجز کو قادر کے ساتھ ملا دیتی ہے"

علم و عمل پہلے ہی برائے نام تھا، اس ضعف و پیری اور امراض و مشاغل و ذواہل نے وہ رہا سہا بھی رخصت کر دیا، ان حالات میں کسی تصنیف خصوصاً قرآن کریم کی تفسیر کا ارادہ کرنا بھی ایک بڑی جسارت تھی، اطمینان اس پر تھا کہ اس میں میری اپنی کوئی چیز نہیں، اکابر علماء اور سلف صالحین کی تفسیر کو آسان زبان میں اہل عصر کی طبائع کے قریب بنانا میری ساری محنت کا حاصل تھا، میں نے آخر عمر کے پانچ سال کی یہ محنت شاقہ اس تمنا میں صرف کی کہ عصر جدید کے مسلمان جو عموماً علمی اصطلاحات اور علمی زبان سے بیگانہ ہو چکے ہیں اکابر کی تفسیر کو ان کے لئے اقرب الی الفہم کر دوں تو شاید اس زمانے کے مسلمانوں کو اس سے نفع پہونچے، اور میرے لئے زادِ آخرت بن جائے، علماء محققین اپنی علمی تحقیقات کے کمالات دکھلاتے ہیں اس ناکارہ نے اپنی بے علمی کو اس پردہ میں چھپایا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنی ستاری کا معاملہ فرمادیں، اور اس ناچیز کی خدمت کو قبول فرمادیں، جس میں کسی علمی کمال کا تو کوئی دخل نہیں، البتہ اپنے آپ کو تھکایا ضرور ہے، اور یہ تھکانا بھی اللہ ہی کی توفیق سے تھا، ورنہ ایک قدم چلنے کی بھی کیا مجال تھی، کاش اللہ تعالیٰ میرے اس تھکنے پر نظر فرمائیں اور میری تقصیرات کو جو اس کی کتاب کریم کے حقوق ادا کرنے میں ہوئی ہیں معاف فرما کر اس کو شرف قبولیت عطا فرمادیں ؎

نہ بحرف ساختہ سرخوشم　　نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیادِ تو مے زنم　　چہ عبارت و چہ معانیم

---

[1] یہ بھی اس حال میں کہ دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں اور فتوے کی مستقل خدمات کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر دس مختصر اور مفصل کتابیں اور بھی لکھی گئیں جو شائع ہو چکی ہیں: (۱) احکام الحج، جو مختصر اور سلیس ہونے کے ساتھ تمام ضروری احکام کو جامع بھی ہے (۲) الیواقیت فی احکام المواقیت (مواقیت حج اور جدہ سے احرام کی تحقیق) (۳) منیح الخیر فی الحج عن الغیر (یعنی حج بدل کے احکام) (۴) مقام صحابہؓ (مشاجرات صحابہ اور عدالت صحابہ کی مکمل بحث اور سلف صالحین کا طرز عمل (۵) اسلامی ذبیحہ (ذبیحہ کے شرعی احکام مفصل یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کی بحث، تحریفات کی تردید) (٦) اعضائے انسانی کی پیوندکاری، (۷) بیمہ زندگی (۸) پراویڈنٹ فنڈ (۹) اسلام اور سوشلزم (۱۰) اسلامی نظام میں اقتصادی اصلاحات، فللہ الحمد والمنہ ۱۲ منہ

تصنیفِ کتاب کی یہ لمبی کہانی احقر کے لئے تو ایک یادداشت اور شکر گذاری کے لئے ایک تذکرہ ہے مگر عام لوگوں کے ذوق کی چیز نہیں، اس کے باوجود اس لئے لکھا کہ لوگوں کو میری اس جسارت کا عذر معلوم ہو جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تفسیر قرآن پر مستقل تصنیف کے لئے جرأت کرنے کا میرے لئے دور دور بھی کوئی احتمال نہ تھا، مگر غیر ارادی طور پر اس کے اسباب ہوتے چلے گئے، البتہ زمانہ دراز سے ایک تمنا دل میں تھی کہ حکیم الامت مجدد الملت سیدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تفسیر بیان القرآن جو ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلف صالحین کی تفسیروں کا لبِ لباب ہے، لیکن وہ علمی زبان اور علمی اصطلاحات میں لکھی گئی ہے آجکل کے عوام اس سے استفادہ کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں اس کے مضامین کو سہل زبان میں پیش کر دیا جائے، مگر یہ کام بھی کافی محنت اور فرصت چاہتا تھا، پاکستان میں آنے سے پہلے کچھ شروع بھی کیا پھر رہ گیا تھا، معارف القرآن کی اس تحریر نے بحمد اللہ وہ آرزو بھی پوری کر دی، کیونکہ اس تفسیر کی بنیاد احقر نے بیان القرآن ہی کو بنایا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

معارف القرآن کی خصوصیات والتزامات

(۱) تفسیر قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو اس میں سب سے اہم اور احتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے، کیونکہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے روا نہیں، اس لئے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی، اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ اکابر علماء یہ کام بڑی احتیاط کے ساتھ انجام دے چکے ہیں، اردو زبان میں اس خدمت کو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ کے دو فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدین رحمہ اور حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ نے اپنے اپنے طرز میں انجام دیا، اول الذکر ترجمہ میں بالکل تحت اللفظ ترجمہ کو اختیار کیا گیا ہے، اردو محاورہ کی بھی زیادہ رعایت نہیں رکھی گئی، اور بڑے کمال کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو اردو میں منتقل فرمایا ہے، اور دوسرے ترجمہ میں تحت اللفظ کے ساتھ اردو محاورہ کی رعایت بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ نے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہے، یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا ہے، دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ الہامی ہے، انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کر سکے، شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں

ترمیم کی ضرورت ہو تو انھوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی، جو ترجمہ شیخ الہندؒ کے نام سے معروف و مشہور ہوا احقر نے قرآن کریم کے زیر متن اسی ترجمہ کو بعینہٖ لیا ہے۔

(۲) سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اصل تفسیر بیان القرآن کو اس انداز میں لکھا ہے کہ متنِ قرآن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح قوسین کے درمیان فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اوپر خط دے کر اور تفسیر کو بین القوسین لکھ کر ممتاز کر دیا ہے، اس طرح خط کشیدہ الفاظ میں ترجمہ قرآن ہے، اور بین القوسین اس کی تفسیر ہے، بہت سے لوگوں نے اسی خط کشیدہ ترجمہ کو الگ کر کے قرآن مجید کے زیر متن ترجمہ حکیم الامتؒ کے نام سے خود حضرتؒ کے زمانے میں شائع بھی کر دیا تھا۔

مجھے چونکہ بیان القرآن کی تسہیل کا کام پہلے سے پیش نظر تھا اس وقت احقر نے حضرتؒ کی اس تفسیر کو بنام "خلاصۂ تفسیر" شروع میں بعینہٖ صرف ایک تصرف کے ساتھ نقل کر دیا ہے، وہ یہ کہ اس تفسیر میں جس جگہ خاص اصطلاحی اور مشکل الفاظ آئے تھے وہاں ان کو آسان لفظوں میں منتقل کر دیا، اور اس کا نام خلاصۂ تفسیر رکھنا اس لئے موزوں ہوا کہ خود حضرتؒ نے خطبہ بیان القرآن میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کو تفسیر مختصر یا ترجمہ مطوّل کہا جا سکتا ہے۔

اور اگر کوئی مضمون ہی خالص علمی اور مشکل تھا تو اس کو یہاں سے الگ کر کے معارف و مسائل میں اپنی آسان عبارت میں لکھ دیا، تاکہ مشغول آدمی اگر زیادہ نہ دیکھ سکے تو اس خلاصۂ تفسیر سے ہی کم از کم مفہوم قرآنی کو پورا سمجھ لے، ان دونوں چیزوں کا التزام جلد اوّل کی طبع اوّل میں پارۂ الٓمّٓ کے رُبع اوّل آیت نمبر ۴۴ معارف جلد اوّل صفحہ ۱۵۶ تک نہیں ہو سکا تھا، اب طبع ثانی میں اس حصہ کو بھی مکمل کر کے پوری تفسیر کے مطابق کر دیا گیا ہے، البتہ ایک التزام جو جلد ثانی سے شروع ہوا کہ متنِ قرآن کے نیچے ترجمہ شیخ الہندؒ لکھا جائے یہ پہلی طباعت کی پوری جلد اوّل میں نہیں تھا، طبع ثانی میں اس کو بھی تحت المتن لکھ کر سب کے مطابق کر دیا گیا، یہ دونوں کام تو اکابر علماء کے تھے۔

(۳) تیسرا کام جو احقر کی طرف منسوب ہو وہ "معارف و مسائل" کا عنوان ہو، اس میں بھی غور کیا جائے تو احقر کی صرف اردو عبارت ہی ہے، مضامین سب علماء سلف کی تفسیر سے لئے ہوئے ہیں جن کے حوالے ہر جگہ لکھ دیئے ہیں، اس میں احقر نے چند چیزوں کا التزام کیا ہے:

(۱) علماء کے لئے تفسیر قرآن میں سب سے پہلا اور اہم کام لغات کی تحقیق، نحوی ترکیب، فنِ بلاغت کے نکات اور اختلافِ قرات کی بحثیں ہیں جو بلاشبہ اہلِ علم کے لئے فہم قرآن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اسی کے ذریعہ قرآن کے صحیح مفہوم کو پایا جا سکتا ہے

لیکن عوام تو عوام ہیں آجکل کے بہت سے اہل علم بھی ان تفصیلات میں اُلجھن محسوس کرتے ہیں، بالخصوص عوام کے لئے تو یہ بحثیں ان کی فہم سے بالا اور اصل مقصد میں مخل بنتی ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا مشکل کام ہے، حالانکہ قرآن کریم کا جو اصل مقصد ہے کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قوی ہو اور اس کے نتیجے میں مادّی تعلقات اعتدال پر آجائیں کہ وہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں، دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہو، اور انسان اپنے ہر قول و فعل پر یہ سوچنے کا عادی ہو جائے کہ اس میں کوئی چیز اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اس چیز کو قرآن نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی خود دیکھ کر اور بالکل اَن پڑھ جاہل سن کر بھی یہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کا اعلان فرمایا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴: ۱۷) تفسیر "معارف القرآن" میں عوام کی سہولت کے پیش نظر اُن علمی اور اصطلاحی بحثوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی، بلکہ ائمہ تفسیر کے اقوال میں جس کو جمہور نے راجح قرار دیا ہے اس کے مطابق تفسیر لے لی گئی اور کہیں کہیں بضرورت یہ بحث بھی لی گئی ہے تو وہاں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا کہ خالص علمی اصطلاحات اور غیر معروف اور مشکل الفاظ نہ آئیں، اور اسی لئے ایسی مباحثِ علمیہ کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جو عوام کے لئے غیر ضروری اور ان کی سطح سے بلند ہیں۔

(ب) مستند و معتبر تفاسیر سے ایسے مضامین کو اہمیت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی عظمت و محبت کو بڑھائیں اور قرآن پر عمل اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

(ج) اس پر تو مؤمن کا ایمان ہے کہ قرآن کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے، اور اس میں پورے تدبّر سے کام لیا جائے، اسی لئے ہر زمانہ کے علماءِ تفسیر نے اپنی اپنی تفسیروں میں اُن جدید مسائل اور مباحث پر زیادہ زور دیا ہے جو اُن کے زمانہ میں پیدا ہوئے، یا ملحدین اہلِ باطل کی طرف سے شکوک و شبہات کی صورت میں پیدا کر دیئے گئے، اسی لئے قرونِ متوسطہ کی تفسیریں معتزلہ، جہمیہ، صفواتیہ وغیرہ فرقوں کی تردید اور ان کے شبہات کے ازالہ سے پُر نظر آتی ہیں، احقر ناکارہ نے بھی اسی اصول کے تحت ایسے ہی مسائل اور مباحث کو اہمیت دی ہے جو یا تو اس زمانے کے مشینی دور نے نئے نئے پیدا کر دیئے، اور یا اس زمانہ کے ملحدین اور یہودی اور نصرانی مستشرقین نے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے، جدید مسائل کے حل کے لئے مقدور بھر اس کی کوشش کی ہے

کہ قرآن و سنت یا فقہاء امت کے اقوال میں اس کا کوئی ثبوت ملے یا کم از کم اس کی کوئی نظیر ملے، اور الحمد للہ اس میں کامیابی ہوئی، ایسے مسائل میں دوسرے علمائے عصر سے مشورہ لینے کا بھی التزام کیا گیا ہے اور ملحدانہ شکوک و شبہات کے ازالہ میں بھی مقدور بھر اس کی کوشش رہی ہے کہ جواب اطمینان بخش ہو، اور اس جواب دہی کے لئے اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو گوارا نہیں کیا جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض مصنفین نے اس جواب دہی میں خود اسلامی مسائل میں تاویلیں کر کے ترمیم کر ڈالنے کا طریقہ اختیار کیا ہے، یہ سب کچھ اپنی معلومات اور اپنی کوشش کی حد تک ہو جس میں بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں، اور ان کی اصلاح کا راستہ نکال دیں۔

مذکورالصدر التزامات نے تفسیر معارف القرآن کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع بنادیا ہے:-

(۱) قرآن مجید کے دو مستند ترجمے ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے دوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ترجمہ۔

(۲) خلاصۂ تفسیر، جو درحقیقت بیان القرآن کا خلاصہ مع تسہیل ہے جس کو علیحدہ بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کر لیا جائے تو تھوڑی فرصت والوں کے لئے فہم قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے، اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کر دیا جس کی طرف مجھے اخی فی اللہ مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدینہ منورہ نے علامہ فرید وجدیؒ کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر دکھلا کر توجہ دلائی تھی کہ کاش اردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اس کی طرح مختصر اور آسان ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرمادی، یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

(۳) تیسری چیز معارف و مسائل ہیں جو میری طرف منسوب ہیں، اور میری محنت کا محور ہیں الحمد للہ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں سب اسلاف اُمت ہی سے لیا ہوا ہے، آجکل کے اہل علم و اہل قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ ٭ بے عنایاتِ خدا ہیچیم و ہیچ

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اسأل الصواب والسداد فی المبدء والمعاد و بہ استعین من زلۃ القدم فیما علمت وما لا اعلم وایاہ اسأل ان یجعلہ خالصاً لوجہہ الکریم وان یتقبلہ منّی کما تقبل من صالحی عبادہ وان ینفعنی بہ یوم لا ینفع مال ولا بنون ولہ الحمد اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ وصفوۃ رسلہ خاتم انبیائہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبارک وسلم تسلیماً کثیراً۔

بندۂ ضعیف ناکارہ محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی

۲۵ رشعبان ۱۳۹۲ھ

سُورَةُ الفَاتِحَہ

یہ مکی سورت ہے جس میں سات آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات

سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہے، سورۂ اقرأ، مزمل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضرات صحابہؓ سے سورۂ فاتحہ کا اول ما نزل یعنی نزول میں سب سے پہلی سورۃ ہونا منقول ہے، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی فاتحۃ الکتاب رکھا گیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں، تفسیر روح المعانی اور روح البیان میں اس کا تفصیل بیان ہے، اسی وجہ سے سورۂ فاتحہ کے نام امّ القرآن، امّ الکتاب اور قرآن عظیم بھی احادیث صحیحہ میں آئے ہیں۔ (قرطبی)

یا اس وجہ سے کہ اس سورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت، یا مطالعہ شروع کرے ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر

خاص طلبِ حق اور راہِ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثنا کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواستِ ہدایت پیش کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے، جو الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع ہوتا ہے، گویا انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہِ راست طلب کی تھی اس کے جواب میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۂ فاتحہ کی نظیر نہ توراۃ میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآن کریم میں کوئی دوسری سورت اس کی مثل ہے (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ وقال حسن صحیح والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم، من المظہری)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفاء ہے (رواہ البیہقی فی شعب الایمان بسند صحیح، مظہری)

سورۂ فاتحہ کا ایک نام حدیث میں سورۂ شفاء بھی آیا ہے (قرطبی) اور صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین الحمد للہ رب العالمین ہے۔ (قرطبی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے

اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن میں سورۂ نمل کا جزء ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۂ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا یا تمام سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سورۂ نمل کے اور کسی سورت کا جزء نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے، جو ہر سورۃ کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

تلاوتِ قرآن اور ہر مہم کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم

اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اِس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبرئیل امین لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا، اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن اور امّتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن کی خصوصیت ہے، جیساکہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ کہتے اور لکھتے تھے، جب آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوئی تو انھیں الفاظ کو اختیار فرمالیا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہوگئی (قرطبی، روح المعانی)

قرآن کریم میں جابجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مہم کام جو بِسْمِ اللّٰهِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں (قرطبی)

ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا ہے، کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہوسکتا، جس نے اس کی ہر نقل وحرکت اور تمام معاشی اور دنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنادیا۔

عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیاوی اور بڑا ہے کہ دنیا بھی دین بن گئی، ایک کافر بھی کھاتا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لیکر پک کر تیار ہونے تک آسمان و زمین اور سیاروں اور ہوا و فضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں انسانوں کی محنت صرف ہو کر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گذار کر یہ لقمہ یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے، مومن و کافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مومن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اسی طرح اپنے رابطے کی تجدید کرتا ہے جس سے یہ تمام دنیاوی اور معاشی ضرورتیں ذکر خدا بنکر عبادت میں لکھی جاتی ہیں، مومن سواری پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا پھر اس کو میرے قبضے میں دیدینا انسان کی قدرت سے باہر چیز ہے، رب العزت ہی کے بنائے ہوئے نظام محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے سب کے سب

میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کرنے سے اتنی بڑی خلقِ خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں، اور وہ پیسے بھی ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بِسْمِ اللہ ایک نسخۂ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے، فللہ الحمد علی دین الاسلام وتعلیماتہ۔

مسئلہ قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اول أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور پھر بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے، اور درمیان تلاوت بھی سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تمہید کے بعد آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر دیکھئے:

بسم اللہ الخ کی تفسیر بِسْمِ اللهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرف بآ، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف بآ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے، جن میں سے تین معنی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لئے جا سکتے ہیں:

اوّل: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا، دوسرے: استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا، تیسرے: تبرّک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسْم میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لئے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسمِ اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجودِ حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

اس لئے کلمۂ بسم اللہ کے معنی حرف بآ کے مذکورہ تین معنی کی ترتیب سے یہ ہوئے:

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً "شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ"۔

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف بآ کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان

کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے، اس میں بھی مصحفِ عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف بار رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملاکر لکھنا چاہیے تھا، اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی باسم اللہ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف بار کو سین کے ساتھ ملاکر صورۃً اسم کا جزء بنا دیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں ب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف بار کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، رَحْمٰن کے معنی عام الرحمۃ کے اور رَحِیْم کے معنی تام الرحمۃ کے ہیں، عام الرحمۃ سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ ابتک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی اور شامل ہو، اور تام الرحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رَحْمٰن اللہ جل شانہٗ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے، اسی لئے جس طرح لفظ "اللہ" کا جمع اور تثنیہ نہیں آتا رَحْمٰن کا بھی جمع و تثنیہ نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں، (تفسیر قرطبی) بخلاف لفظ رَحِیْم کے کہ اس کے معنی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں ناممکن ہو، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی شخص سے پوری پوری رحمت کا معاملہ کرے۔

اسی لئے لفظ رَحِیْم انسان کیلئے بھی بولا جا سکتا ہے، قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

مسئلہ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل عبد الرحمٰن، فضل الرحمٰن وغیرہ ناموں میں تخفیف کر کے رحمٰن کہتے ہیں، اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں یہ ناجائز و گناہ ہے۔

حکمت بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے صرف دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں، اور وہ دونوں لفظ رحمت سے مشتق ہیں، اور وسعتِ رحمت اور کمال رحمت پر دلالت کرنے والی ہیں، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تخلیقِ عالم اور آسمان و زمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت ہے، نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنیوالا تھا، صرف اسی کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ⁂ لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

احکام و مسائل

مسئلہ تعوذ تعوذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنا، قرآن کریم میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ "یعنی جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے"

قرات قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا باجماع امت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارج نماز کے، تعوذ پڑھنا تلاوت قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دوسرے کاموں کے شروع میں صرف بسم اللہ پڑھی جائے، تعوذ مسنون نہیں، (عالمگیری باب رابع، من الکراہیۃ)

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ دونوں پڑھی جائیں، درمیان تلاوت میں جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری شروع ہو تو سورۂ برائت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں مکرر بسم اللہ پڑھی جائے، اعوذ باللہ نہیں، اور سورۂ برآءت اگر درمیان تلاوت میں آجائے تو اس پر بسم اللہ نہ پڑھے، اور اگر قرآن کی تلاوت سورۂ برائت ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا چاہیے (عالمگیریہ عن المحیط)

احکام بسم اللہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن مجید میں سورۂ نمل میں آیت کا جزء ہے، اور ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے، اس لئے اس کا احترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے، اس کو بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرخی وصاحب الکافی والہدایہ، شرح منیہ) اور جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں اس کو بطور تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں، جیسے کھانے پینے سے پہلے بطور دعاء پڑھنا ہر حال میں جائز ہے (شرح منیہ کبیر)

مسئلہ پہلی رکعت کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنا مسنون ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی بسم اللہ پڑھنا چاہیے، اس کے مسنون ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے (شرح منیہ)

مسئلہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنا چاہیے، خواہ جہری نماز ہو یا سری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ سے ثابت نہیں ہے، شرح منیہ میں اسی کو امام اعظمؒ اور ابویوسفؒ کا قول لکھا ہے اور شرح منیہ، درمختار، برہان وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی ہے، مگر امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ سری نمازوں میں پڑھنا بہتر ہے، بعض روایات میں یہ قول ابوحنیفہؒ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، اور شامی نے بعض فقہاء سے اس کی ترجیح بھی نقل کی ہے "بہشتی زیور" میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی پڑھ لے تو مکروہ نہیں (شامی)

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ

وَرُكُوْعُهَا وَاحِدٌ	سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ	اٰيَاتُهَا سَبْعٌ
اور ایک رکوع	سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی	اس میں سات آیتیں ہیں
	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
	شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ

سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا، بیحد مہربان نہایت رحم والا، مالک

يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

روزِ جزا کا، تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ

الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ

سیدھی، راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا

	عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝	
	اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔	

ع

خلاصۂ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن) (الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) جو مالک ہیں روز جزا کے (مراد قیامت کا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا) (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) ہم آپ ہی کی عبادت

کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا (مراد دین کا رستہ ہے) صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے (راہِ ہدایت چھوٹنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے، ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مغضوب علیہم سے ایسے لوگ مراد ہیں، کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ فاتحہ کے مضامین سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دعاء و درخواست کا مضمون ہے، جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثناء کا پہلو ہے کچھ دعاء و درخواست کا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز (یعنی سورۂ فاتحہ) میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائیگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری حمد کی ہے"، اور جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے"، اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے"، اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے" کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعاء و درخواست کا، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ: "میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی"۔ پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (آخر تک)، تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ سب میرے بندے کے لئے ہے، اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی" (مظہری)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں

ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دل کش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامن دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں، اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کارفرما نظر آتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش اور مصور کی یا صناع کی ہوتی ہیں، اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں، اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادر مطلق کی ہیں ان کو کسی دوسرے کی تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے ؎

حمد را با تو نسبتے است درست
بر درِ ہر کہ رفت بر در تست

اور یہ ظاہر ہے کہ جب ساری کائنات میں لائقِ حمد درحقیقت ایک ہی ذات ہے تو عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اگرچہ حمد و ثنا کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کر دی گئی، اور دل نشین طریق پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کے اس مختصر سے ابتدائی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہوا، اسی کے ساتھ مخلوقات کی رنگینیوں میں اُلجھے ہوئے دل و دماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کر کے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی، اور معجزانہ انداز سے ایمان کے سب سے پہلے رکن توحید باری کا نقش اس طرح جما دیا گیا کہ جو دعویٰ ہے اسی میں غور کرو تو وہی اس کی دلیل بھی ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ،

ربّ العالمین کی تفسیر اس مختصر ابتدائی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ذکر کی گئی ہے، مختصر الفاظ میں اس کی بھی تشریح دیکھئے:-

لفظ رَبّ کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں، کیونکہ ہر مخلوق خود محتاج تربیت ہے وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کر سکتا ہے۔

اَلْعٰلَمِيْنَ عالم کی جمع ہے، جس میں دنیا کی تمام اجناس: آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضا، برق و باراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان

نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لئے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظام شمسی و قمری اور برق و باراں اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ سارا ایک ہی عالم ہو، اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائل عقلیہ سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اس لامتناہی خلاء میں ہمارے پیشِ نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے منقول ہے کہ "عالم چالیس ہزار ہیں، یہ دنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے، باقی اس کے سوا ہیں"، اسی طرح حضرت مقاتلؒ امام تفسیر سے منقول ہے کہ "عالم اسی ہزار ہیں" (قرطبی) اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلاء میں انسانی مزاج کے مناسب ہوا نہیں ہوتی، اس لئے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، امام رازیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اس عالم سے خارج خلاء میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلاء میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج و طبائع، ان کی غذاء و ہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہوں۔

یہ مضمون تو اب سے سات سو ستر سال پہلے کے اسلامی فلاسفر امام رازیؒ کا لکھا ہوا ہے جبکہ فضاء و خلاء کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات و ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے، آج راکٹوں اور اسپٹنکوں کے زمانے میں خلاء کے مسافروں نے جو کچھ آ کر بتلایا وہ بھی اس سے زیادہ نہیں، کہ اس عالم سے باہر کی خلاء کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس غیر متناہی خلاء میں کیا کچھ موجود ہے، اس دنیا سے قریب ترین ستاروں، چاند اور مریخ کی آبادی کے بارے میں جو قیاسات آج کے جدید ترین ماہرین سائنس پیش کر رہے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ اگر ان سیارات کے اوپر کچھ لوگ آباد ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ انھیں خصوصیات اور اسی مزاج و طبیعت کے ہوں جو اس عالم کے انسان اور حیوانات و نباتات کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ اُن کے مزاج و طبیعت، ان کی غذاء و ضروریات یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام رازیؒ کی تائید اور اس سلسلے کی جدید معلومات کے لئے وہ مقالہ کافی ہے جو امریکی خلائی مسافر جان گلین نے حال میں خلاء کے سفر کر واپس آ کر شائع کرایا ہے، جس میں شعاعی سال کا نام دے کر ایک طویل مدت و مسافت کا پیمانہ قائم کیا، اور اس کے ذریعے اپنی وسعتِ فکر کی حد تک خلاء کا کچھ اندازہ لگایا

اور بھر یہ اقرار کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جا سکتا کہ خلاء کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے۔

قرآن کے اس مختصر جملے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے، اور چشم بصیرت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے تربیت عالم کا کیسا مضبوط اور محکم محیّر العقول نظام بنایا ہے، افلاک سے لے کر عناصر تک سیارات و نجوم سے لے کر ذرات تک ہر چیز اس سلسلۂ نظام میں بندھی ہوئی، اور حکیم مطلق کی خاص حکمت بالغہ کے ماتحت ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، ایک لقمہ جو انسان کے منہ تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پوری حقیقت پر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تیاری میں آسمان اور زمین کی تمام قوتیں اور کروڑوں انسانوں اور جانوروں کی محنتیں شامل ہیں، سارے عالم کی قوتیں مہینوں مصروفِ خدمت رہیں جب یہ لقمہ تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان اس میں غور و تدبر سے کام لے، اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے مخدومِ کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمے بھی کوئی خدمت ہوگی ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند ۔۔۔ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرمانبردار ۔۔۔ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

قرآن حکیم نے انسانی آفرینش اور اس کے مقصدِ حیات کو اس آیت میں واضح فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ	"میں نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے
اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶: ۸۲)	نہیں بنایا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں"

تقریر مذکور سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ایک حیثیت سے پہلے جملے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی دلیل ہے کہ جب تمام کائنات کی تربیت و پرورش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو حمد و ثناء کی حقیقی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس لئے پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں حمد و ثناء کے ساتھ ایمان کے سب سے پہلے رکن توحید باری تعالیٰ کا بیان بھی مؤثر انداز میں آ گیا۔

دوسری آیت میں صفتِ رحمت کا ذکر بلفظ صفت رَحْمٰن و رَحِیْم کیا گیا ہے، یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں جن میں رحمتِ خداوندی کی وسعت و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذکر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ تمام کائنات و مخلوقات کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی ہے وہ کسی اپنی ضرورت یا دباؤ اور مجبوری سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے، اگر پوری کائنات نہ ہو تو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ؎

نہ تنہا بدی چونکہ خلقت نبود، ۔۔۔ نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ لفظ مَالِكٌ مِلْك سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرّف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس) لفظ دِیْن کے معنی جزاء، دینا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا لفظی ترجمہ ہوا "مالک روزِ جزاء کا"۔ یعنی روزِ جزاء میں ملکیت رکھنے والا، وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روزِ جزاء میں تمام کائنات اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی (کشاف)

روزِ جزاء کی حقیقت اور عقلاً اُس کی ضرورت

اب یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں،

اوّل یہ کہ روزِ جزاء کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روزِ جزاء میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روزِ جزاء کی کیا خصوصیت ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روزِ جزاء اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ "روزِ جزاء" سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزاء و سزا کی جگہ نہیں، بلکہ ایک دار العمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہوگیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا پاکر یہ نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب و مبغوض ہے جس طرح دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروفِ محنت دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا، اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتارِ مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرتا ہے، اور کوئی مہربان اُس کو اس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اسکو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے، جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

الغرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور رنج و مصیبت بدعملی کی یقینی علامت نہیں کہ ہاں کبھی کبھی کسی عمل کی جزاء یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں بھی ظاہر کردیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۲۱:۳۲)

"یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ (۶۸:۳۳)

"ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں"

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے، اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ چندروزہ اور محض عارضی ہے، مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور جو اس عالم سے گذرنے کے بعد عالمِ آخرت میں آنے والی ہے، اسی کا نام روزِ جزاء ہے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا، اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، اچھا اور بُرا برابر نہ رہے، بلکہ ہر عمل کی جزاء یا سزا ملنا چاہئے۔

اس لئے ضروری ہوا کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے عمل کا حساب اور اس کی جزاء یا سزا انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روزِ جزاء یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے خود اس مضمون کو سورۂ مؤمن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ۝ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (آیت نمبر ۵۸-۵۹)

"یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور دوسرے، بدکردار باہم برابر نہیں ہوسکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے؟"

مالک کون ہے؟ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر اہلِ عقل کے نزدیک یہ بات بدیہی اور بالکل ظاہر ہے کہ حقیقی مالک تمام کائنات کے ذرّے ذرّے کی وہی ذات پاک ہے، جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر پر بھی باطن پر بھی زندہ پر بھی مُردہ پر بھی، اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہاء، بخلاف انسان کی ملکیت کے کہ وہ ابتداء و انتہاء کے دائرے میں محدود ہے، پہلے نہیں تھی اور پھر نہ رہے گی، نیز اس کی ملکیت

تصرّف اشیار کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں، زندہ پر ہے مُردہ پر نہیں، اس لئے ہر اہل بصیرت کے نزدیک صرف روزِ جزار کی نہیں بلکہ دنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزار کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے؟

سو قرآن کی دوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بھی اگرچہ حقیقی اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگارِ عالم ہی کی ہے، لیکن اسی نے اپنے کرم اور حکمتِ بالغہ سے ایک قسم کی ناقص ملکیت انسان کو بھی عطا فرما رکھی ہے، اور دنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی احترام بھی کیا گیا ہے، آج کی دنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی بنگلہ اور فرنیچر کا مالک ہے، حشم و خدم کا مالک ہے، اور یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آزمائش کے لئے دی گئی تھی، وہ اسی میں مغرور و بدمست ہو گیا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ فرما کر اس مغرور و غافل انسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا، نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی مِلک اور مُلک صرف ایک ذات پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزار کی وضاحت سورۂ مؤمن کی ان آیات میں ہے:

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○ (آیت نمبر ۱۶-۱۷)

اس میں روزِ جزار کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی، جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورۃ کی تین ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنار کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں آچکیں، اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں میں حمد و ثنار کے ضمن میں ایمان کے بنیادی اصول، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آگیا ہے، اس تیسری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب معلوم کر لیا، کہ اس کے صرف دو لفظوں میں حمد و ثنار کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان انقلابی عقیدہ یعنی قیامت و آخرت

کا بیان بھی مع دلیل کے آگیا، اب چوتھی آیت کا بیان آتا ہے:

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ اس آیت میں ایک پہلو حمد و ثنار کا اور دوسرا دعار و درخواست کا ہے، نَعۡبُدُ عبادت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار، نَسۡتَعِيۡنُ استعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" انسان پر تین حالات گذرتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل، پچھلی تین آیتوں میں سے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ اور اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ میں انسان کو اس پر متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، کہ اس کو ماضی میں نابود سے بود کیا، اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل و صورت اور عقل و بصیرت عطا فرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ میں یہ بتادیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا ہی کا محتاج ہے، کہ روزِ جزار میں اس کے سوا کسی کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا، اور جب ان تینوں آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دَور میں خدا ہی کا محتاج ہے تو اس کا طبعی اور عقلی تقاضا یہ ہوا کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو انتہائی تعظیم و محبت کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے، وہ کسی دوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ ایک عاقل انسان پکار اٹھے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مقتضائے طبع کو اِيَّاكَ نَعۡبُدُ میں ظاہر فرمایا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ حاجت روا صرف ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو اقتضائے عقل و طبعی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی اقتضائے عقل و طبع کو وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ (روح البیان)

غرض اس چوتھی آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنار ہے کہ عبادت و اعانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دوسری حیثیت سے انسان کی دعار و درخواست ہے کہ ہماری مدد فرمائے اور تیسری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں انسان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعار مانگنا اس کے منافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ارشاد یہ ہے کہ "ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" کس کام میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذکر نہیں، جمہور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اشارہ ہے، کہ ہم اپنی عبادت اور ہر دینی و دنیوی کام اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔

پھر عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، امام غزالی نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی

دس قسمیں لکھی ہیں : نماز ، زکوٰۃ ، روزہ ، حج ، تلاوتِ قرآن ، ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا ، حلال روزی کے لئے کوشش کرنا ، پڑوسی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا ، لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور بُرے کاموں سے منع کرنا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا اتباع کرنا۔

اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کے معنے یہ ہوگئے کہ نہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اطاعت وخدمت اور کام کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی نذر اور منّت ماننے، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی دوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلّل کا اظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دوسرے کے لئے کرے جو انتہائی تذلّل کی علامات ہیں، جیسے رکوع وسجدہ۔

آخری تین آیتیں جن میں انسان کی دعاء و درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعاء کی تلقین ہے یہ ہیں : اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے۔

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابلِ غور ہیں :

تکمیل الدرایہ فی تفصیل درجات الہدایہ یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لئے دعاء جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عامۂ مؤمنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعاء مانگنے کا کیا مطلب ہے ؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوال مذکور کے علاوہ ان تمام اشکالات کا بھی جواب معلوم ہوجائیگا جو مفہوم ہدایت کے متعلق قرآن کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے ناآشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد واختلاف محسوس کرنے لگتا ہے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں تحریر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصل معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں :

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات ومخلوقات کی تمام اقسام جمادات ، نباتات ،

حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام!

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی، یہ دوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے اُن کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکام آلٰہیہ میں بھی اُن کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا۔ **جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں مگر عقل و شعور نمایاں نہیں، ان کو ذی حیات، جاندار مگر بے عقل و شعور** کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں اُن کو ذوی العقول کہا جاتا ہے، اور اسی اختلاف درجات اور عقل و شعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکام شرعیہ کا مکلف صرف انسان اور جنات کو قرار دیا گیا ہے، کہ ان میں عقل و شعور بھی مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری انواع و اقسام میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ط (سورۂ بنی اسرائیل، ۴۴)

"یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ اُن کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو"۔

اور سورۂ نور میں ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ○ (آیت نمبر ۴۱)

"یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے اُڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی دعاء اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل شعور کے نہیں ہوسکتا اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر روح و حیات بھی ہے، اور ادراک و احساس بھی عقل و شعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جوہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اسی بناء پر اُن کو احکام شرعیہ کا مکلف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ

کوئی فلسفہ مدوّن تھا، بعد میں آنے والے فلاسفروں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اس خیال کے کچھ لوگ گذرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہل سائنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

الغرض ہدایتِ خداوندی کا یہ درجۂ اولیٰ تمام مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان اور جنات کو شامل ہے، اسی ہدایت عامہ کا ذکر قرآن کریم کی آیت اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰:۵۰) میں فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی"، اور یہی مضمون سورۂ اعلیٰ میں ان الفاظ سے ارشاد ہوا:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝	"یعنی آپؐ اپنے پروردگار عالی شان کی تسبیح کیجئے جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی"

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کردی۔

اسی ہدایتِ عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائناتِ عالم کے تمام انواع و اصناف اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ، باحق زندہ اند

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور ادراک کرتے ہیں، دانائے رومؒ نے خوب فرمایا ؎

مر زباں را مشتری جز گوش نیست
واقفِ این راز جز بے ہوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جا سکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام نہیں لیا جا سکتا، سورۂ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ (۱۹:۹۳)	"یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہو کر"

دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف اُن چیزوں کے ساتھ مخصوص

ہی جو عرف میں ذوی العقول کہلاتی ہیں، یعنی انسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مؤمن و مسلم ہو جاتا ہے کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مؤمنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ انسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور اُن کی خلاف ورزی دشوار ہو جائے، اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجۂ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے، مثلاً وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۴۷: ۱۷) وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ "جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں"۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹: ۶۹)	"جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں"

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتِ ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اسی مقامِ ہدایت کے متعلق مولانا رومیؒ نے فرمایا ؎

اے برادر بے نہایت درگہے ست
ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

اور سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ؎

نگویم کہ برآب قادر نیند
کہ برساحل نیل مستسقی اند

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں، اسی لئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا، جو ایک ادنیٰ مؤمن کے لئے بھی مناسب حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسول اور ولیؒ کے لئے بھی اُتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں سورۂ فتح کے اندر فتح مکہ کے فوائد و ثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا، یعنی مکہ مکرمہ اس لئے آپ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو" ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہدایت مجسم تھے، پھر اس موقع پر آپ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہوسکتے کہ ہدایت

کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا۔

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہمِ قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوگئے۔

اوّل یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مؤمن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہو سکتا ہے، ہدایت کے عام و خاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے، اور دوسرا درجہ مخصوص ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دوسری طرف مکرر سکرر یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ہدایتِ عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین و فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

تیسرا فائدہ: یہ ہے کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السّلام کو ہادی قرار دیا ہے وہ اسی دوسرے درجے کے اعتبار سے ہے، اور جہاں یہ ارشاد ہے: اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۸: ۵۶) یعنی "آپ ہدایت نہیں کر سکتے جسکو چاہیں"، تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں۔

الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ایک جامع اور اہم ترین دعاء ہے جو انسان کو سکھلائی گئی ہے، انسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں، دین اور دنیا دونوں میں صراطِ مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی نہیں، دنیا کی اُلجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دعاء نسخۂ اکسیر ہے، مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ "بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا"

صراطِ مستقیم کونسا راستہ ہے؟ سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط اور تفریط نہ ہو، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اُس صراطِ مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے جسکی دعاء اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "یعنی راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا"، اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۔ "یعنی وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، یعنی انبیاءؑ اور صدیقین اور شہداء اور صالحین"، مقبولانِ بارگاہِ الٰہی

کے یہ چار درجات ہیں، جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاءؑ کی امت میں سب سے زیادہ رُتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالاتِ باطنی بھی ہوتے ہیں، عُرف میں اُن کو اولیاء کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنہوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دیندار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراطِ مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراطِ مستقیم ہے، اس کے بعد آخری آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے، ارشاد ہے:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥ "یعنی نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہوگئے" مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا، کہ دنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاءؑ کی توہین کرتے تھے، اور ضَآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑ گئے، اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہوگئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے، کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انھیں کو خدا بنالیا، ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاءؑ کی بات نہ مانیں، اُنھیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں، اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنالیں۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراضِ نفسانی کے تابع بدعمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دین میں غلو (افراط) کرنے والوں کا ہے، بلکہ اُن کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، اور جو شہوات اور اغراضِ نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائدِ فاسدہ سے پاک ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ساتوں آیات کی تفسیر ختم ہوگئی، اس پوری سورت کا خلاصہ اور حاصل مطلب دعاء ہے کہ یا اللہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، اور چونکہ دنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے، اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں، ورنہ خدا طلبی اور اس کے لئے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں، اسی لئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کے مجموعے سے ملتا ہے

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اسمیں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ صراطِ مستقیم کی تعیین کیلئے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ صراط الرسول یا صراط القرآن فرمادیا جاتا

جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیماتِ رسولؐ اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورت میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی تعیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآن کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ محض کتاب انسانی تربیت کے لئے کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسولؐ کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اس دنیا میں دائمی نہیں، اور آپؐ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اُن میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیئے گئے، جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی امتوں کی طرح میری امت بھی تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رجال اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا: "ما انا علیہ واصحابی" یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی، بلکہ رجال ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان کا معلّم اور مربی انسان ہی ہو سکتا ہے، محض کتاب معلّم اور مربی نہیں ہو سکتی، بقول اکبر مرحوم ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے، کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینیری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینیر بنتا ہے، اسی طرح قرآن و حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے، قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوںؑ کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسولؐ کو معلّم بنا کر بھیجا اور

صراط مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام موجود ہیں، دوسرے رجال اللہ یعنی اللہ والے، ان سے استفادے کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے، جو اس معیار پر نہ اُتریں، ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں، تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا بڑا سبب یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قطع نظر کرلی، اُن کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیارِ حق سمجھ لیا، اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کرلی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ ہم اسکے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے، یہ گویا حلف وفاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد پھر ایک اہم دعاء ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے، اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آئے ہیں، ان میں سے چند اہم مسائل کو لکھا جاتا ہے:۔

دعاء کرنے کا طریقہ (۱) اس خاص اسلوب کلام کے ذریعہ انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہٗ سے کوئی دعاء و درخواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثناء کا فرض بجالا کر پھر حلف وفاداری اس بات کا کرو کہ ہم اسکے سوا نہ کسی کو لائق عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دعاء کرو، اس طریقہ سے جو دعاء کی جائے گی اس کے قبول ہونے کی قوی امید ہے (احکام جصاص)

اور دعاء میں بھی ایسی جامع دعاء اختیار کرو جس میں اختصار کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں، جیسے ہدایتِ صراط مستقیم کہ دنیا و دین کے ہر کام میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہو جائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہونچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد و ثناء بیان کرنے کا اصل مقصد انسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء انسان کا فطری فرض ہے (۲) اس سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب ہے، مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بناء پر ہوا کرتی ہے، یہاں کسی نعمت یا صفت

کا ذکر نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اُن کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴: ۳۴) یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے" انسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈال لے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وجود خود ایک عالمِ اصغر ہے جس میں عالمِ اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں، اس کا بدن زمین کی مثال ہے، اُس پر اُگنے والے بال نباتات کی مثال ہیں، اُس کی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدن کی رگیں جس میں خون رواں ہے زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہیں۔

انسان دو جز سے مرکب ہے، ایک بدن دوسرے روح، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے روح اصل، اعلیٰ اور افضل ہے، بدن محض اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ جز کے متعلق بدن انسان کی تحقیق کرنے والے اطباء اور اہلِ تشریح نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں، اس کے بدن میں تین سو سے زیادہ جوڑ ہیں، ہر ایک جوڑ کو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ نے ایسا مستحکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے، نہ اس کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، عادۃً انسان کی عمر ساٹھ ستر سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے یہ نرم و نازک اعضاء اور اُن کے سب جوڑ اکثر اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فولاد بھی ہوتا تو گھس جاتا، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (۷۶: ۲۸) یعنی "ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، اور ہم نے ہی اس کے جوڑ بند مضبوط کئے" اسی قدرتی مضبوطی کا نتیجہ ہے کہ عام عادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑ ستر برس اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، انسانی اعضاء میں صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی حکمت بالغہ کے مظاہر موجود ہیں، انسان کو عمر بھر خرچ کر کے بھی اُن کا پورا ادراک آسان نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر یہ حساب لگائیے کہ اس ایک منٹ کے عمل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں، تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ اُٹھی اور اس نے کسی چیز کو دیکھا، اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی مخلوقات کا اس میں بڑا حصہ ہے، اگر آفتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں دے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضاء کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام میں لانے کے لئے غذاء، ہوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نظر اُٹھ کر جو کچھ دیکھتی ہے اس میں پورے عالم کی طاقتیں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر آنکھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور سال میں کتنی مرتبہ، عمر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اعداد و شمار انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کان، زبان، ہاتھ، پاؤں کے جتنے کام ہیں اُن سب میں پورے عالم کی قوتیں شامل

ہو کر کام پورا ہوتا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جو ہر زندہ انسان کو میسّر ہے، اُس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہٗ کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی وقف عام ہیں کہ ہر فرد انسانی اُن سے نفع اٹھاتا ہے، آسمان، زمین ان دونوں میں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات چاند، سورج، ثوابت اور سیارے، ہوا، فضا، کا نفع ہر جاندار کو پہونچ رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ جل شانہٗ کی نعمائے خاصہ جو انسان کے افراد میں بتقاضائے حکمت کم و بیش کر کے عطاء ہوتی ہیں، مال اور دولت، عزت اور جاہ، راحت اور آرام سب اسی قسم میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ نعمائے عامّہ جو تمام انسانوں میں مساوی طور پر مشترک ہیں جیسے آسمان، زمین اور ان کی تمام مخلوقات یہ نعمتیں بہ نسبت نعمائے خاصّہ مال، دولت وغیرہ کے [illegible] ہم اور اشرف ہیں، مگر بھولا بھالا انسان تمام افرادِ انسان میں عام ہونے کی بنا پر کبھی ان عظیم الشان نعمتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا کہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گرد و پیش کی معمولی چیزیں کھانے، پینے، رہنے سہنے کی خصوصی چیزوں ہی پر اس کی نظر رُک جاتی ہے۔

بہرحال یہ ایک سرسری نمونہ ہے اُن نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت مبذول ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے کہ انسان اپنی معتقد ور بھران احسانات و انعامات کرنے والے کی حمد و ثناء کرے، اور کرتا رہے، اسی کے تقاضائے فطرت کی تلقین کے لئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ اَلْحَمْدُ لایا گیا ہے، اور اللہ کی حمد و ثناء کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز دیدی (قرطبی از ابن ماجہ بروایت انسؓ)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہہ لے تو یہ الحمد للہ اُن ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، قرطبیؒ نے بعض علماءؒ سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ الحمد للہ زبان سے کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، اور حدیث صحیح میں ہے کہ الحمد للہ سے میزانِ عمل کا آدھا پلّہ بھر جاتا ہے، اور حمد کی حقیقت حضرت شقیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اوّل اس کے دینے والے کو پہچانو، پھر جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک تمھارے جسم میں اس کی عطاء کی ہوئی قوت و طاقت موجود ہے اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ (قرطبیؒ)

دوسرا کلمہ لِلّٰہِ ہے، اِس میں لفظ اللہ کے ساتھ شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے، جس کو عربیت کے قاعدے سے لامِ اختصاص کہا جاتا ہے، جو کسی حکم یا وصف کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے، اس جگہ

معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء انسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد وثناء صرف اُسی کی ذاتِ قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سوا عالم میں کوئی مستحق حمد وثناء کا نہیں ہو سکتا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا انعام ہے کہ انسان کو تہذیبِ اخلاق سکھانے کے لئے اس کو یہ بھی حکم دیا کہ میری نعمت واحسان جن واسطوں سے تمہارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر ادا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شکر ادا کرنے کا خوگر نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدح وثنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں

(۳) خود اپنی حمد وثناء کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (۳۲: ۵۳)

"یعنی تم اپنی پاکی اور صفائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون تقویٰ شعار ہے"

مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا تقویٰ کس درجے کا ہے، اور حق تعالیٰ نے جو اپنی حمد وثنا خود بیان فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچارہ انسان اس کی استعداد نہیں رکھتا کہ بارگاہِ عزت وجلال کی حمد وثناء کیسے بیان کرے، اور کسی کی تو کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حمد وثناء کر سکے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ، "یعنی میں آپ کی ثناء کما حقہٗ نہیں کر سکتا" اس لئے اللہ جل شانہٗ نے خود ہی حمد وثناء کا طریقہ انسان کو تعلیم فرما دیا۔

لفظ ربّ اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، غیر اللہ کو ربّ کہنا جائز نہیں

(۴) لفظ ربّ کو ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اس کی تربیت واصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات ومخلوقات کا ایسا ربّ سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ لفظ اپنے اطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ کو ربّ کہنا جائز نہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو ربّ کہے، البتہ کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسان وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے، مثلاً رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الدَّارِ وغیرہ (قرطبی)

استعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلۂ توسّل کی تحقیق

(۵) اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتے" (ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ)

بعض سلفِ صالحین نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا راز (خلاصہ) ہے، اور آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پوری سورۂ فاتحہ کا راز (خلاصہ) ہے، کیونکہ اس کے پہلے جملے میں شرک سے بَری ہونے کا اعلان ہے، اور دوسرے جملے میں اپنی قوت و قدرت سے بَری ہونے کا اظہار ہے کہ بندہ عاجز بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کچھ نہیں کر سکتا جس کا نتیجہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے، جس کی ہدایت قرآن کریم میں جابجا آئی ہے: فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود: ۱۲۳) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا (سورۂ ملک: ۲۹) رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا۔ (مزمل: ۹)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ مؤمن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قابلیت پر کرے نہ کسی دوسرے کی مدد پر بلکہ کلی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے، وہی کارسازِ مطلق ہے۔

اس سے دو مسئلے اصولِ عقائد کے ثابت ہوئے، اوّل یہ کہ:

اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا حرام اور ناقابلِ معافی جرم ہے

عبادت کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت و محبت کی بناء پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلّل کا اظہار ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، تو یہی شرک کہلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھے، بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے یہ بھی شرک جلی میں داخل ہے، قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹: ۳۱)	"یعنی ان لوگوں نے اپنے دینی عالموں کو اپنا رب بنالیا ہے"

حضرت عدی بن حاتمؓ جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر قرآن میں ان کو معبود بنانے کا الزام ہم پر کیسے لگایا گیا، آپؐ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دیدیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تمہارے علماء ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر لیتے ہو، عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ بیشک ایسا تو ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو اُن کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے، جو شخص اس

میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے، اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہِ راست سمجھنے کی اور ان سے احکامِ شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے کسی امام مجتہد، یا عالم و مفتی کے قول پر اعتماد کر کے عمل کرتے ہیں اُن کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور احکامِ خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ؁ (۱۶: ۴۳)	"یعنی اگر تم خود احکامِ الٰہیہ کو نہیں جانتے، تو اہلِ علم سے پوچھ لو"

اور جس طرح احکامِ حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اسی طرح کسی کے نام کی نذر (منت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا مشکل کشا سمجھ کر اُس سے دعاء مانگنا بھی شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دعاء کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح ایسے اعمال و افعال جو علاماتِ شرک کی سمجھے جاتے ہیں ان کا ارتکاب بھی بحکم شرک ہے، جیسے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (مسلمان ہونے کے بعد) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی، آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بُت کو اپنے گلے سے نکال دو۔ اگرچہ اُس وقت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا عقیدہ صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے، مگر ظاہری طور پر بھی علامتِ شرک سے اجتناب کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی، افسوس کہ آجکل ہزاروں مسلمان ریڈ کراس کا صلیبی نشان لگائے ہوئے پھرتے ہیں، اور کوئی پروا نہیں کرتے، کہ بلا وجہ ایک مشرکانہ جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں، اسی طرح کسی کو رکوع، سجدہ کرنا، یا بیت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے گرد طواف کرنا، یہ سب علاماتِ شرک ہیں جن سے اجتناب اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے اقرارِ اطاعت و وفاداری کا جزء ہے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ استعانت اور استغاثہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے کسی دوسرے سے جائز نہیں۔

مسئلہ استعانت و توسل کی تحقیق اور احکام کی تفصیل

یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادّی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اُس استعانت میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادّی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعاء کرنے

کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا روایاتِ حدیث اور اشاراتِ قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اُس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام و شرک ہے۔

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے کونسی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بُت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بُتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دائرے میں وہ خود مختار ہے یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکہ یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے۔ یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو اُن کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبرؑ یا ولیؒ کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، پیغمبرؑ اور ولیؒ کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کا ذکر ہے جس میں آپؐ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی پھینکی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ سارے لشکر کی آنکھوں میں جالگیں، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعم نے پھینکی تھی" جس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبی کے واسطے سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب سے ڈراتے ہیں وہ بُلا لیجئے، تو انھوں نے فرمایا:- اِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ (ہود: ۳۳) "یعنی معجزہ کے طور پر آسمانی عذاب نازل کرنا میرے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ عذاب آجائے گا پھر تم اس سے بھاگ نہ سکوگے۔"

سورۂ ابراہیم میں انبیاء و رسل کی ایک جماعت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۱:۱۴) یعنی کسی معجزہ کا صادر کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا" اسی وجہ سے کوئی پیغمبر یا کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامات دکھادے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری انبیاءؑ سے بہت سے معین معجزات کا مطالبہ مشرکین نے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا ظاہر کردیا جس کو نہ چاہا نہیں ہوا، پورا قرآن اس کی شہادتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک محسوس مثال سے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں بجلی کی روشنی بلب سے اور ہوا برقی پنکھے سے آپ کو پہونچ رہی ہے، مگر یہ بلب اور پنکھا اس روشنی اور ہوا پہنچانے میں قطعاً خود مختار نہیں، بلکہ ہر آن اس جوڑ (کنکشن) کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے پاور ہاؤس کے ساتھ اُن کو حاصل ہے، ایک سیکنڈ کے لئے یہ جوڑ ٹوٹ جائے، تو نہ بلب آپ کو روشنی دے سکتا ہے نہ پنکھا ہوا دے سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت وہ عمل بلب اور پنکھے کا ہے ہی نہیں، بلکہ بجلی کی رَو کا ہے، جو پاور ہاؤس سے یہاں پہنچ رہی ہے، انبیاءؑ و اولیاءؒ اور سب فرشتے ہر عمل میں ہر کام میں ہر آن حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت و مشیت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ ظہور اس کا بلب اور پنکھے کی طرح انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اختیار انبیاءؑ و اولیاءؒ کا نہیں مگر اُن کا وجود یا جوڑ اُن سے بالکل بے دخل بھی نہیں، جیسے بلب اور پنکھے کے بغیر آپ کو روشنی اور ہوا نہیں پہونچ سکتی یہ معجزات وکرامات بھی انبیاءؑ و اولیاءؒ کے بغیر نہیں ملتے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ پوری فٹنگ اور کنکشن درست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر بلب کے روشنی اور بغیر پنکھے کے ہوا کا ملنا عادۃً ناممکن ہے، اور معجزات وکرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے، کہ بغیر واسطہ کسی پیغمبر و ولی کے بھی اس کا ظہور فرمادیں، مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ اُن کا صدور بغیر واسطہ اولیاءؒ و انبیاءؑ کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد ہو وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہو مگر اس کے ساتھ انبیاءؑ و اولیاءؒ کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الٰہی اور طاعتِ احکام خداوندی سے محروم رہیگا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پنکھے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کرنے تو روشنی اور ہوا سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاءؑ و اولیاءؒ کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اسأل الصواب والسداد وبیدہ المبدأ والمعاد

صراطِ مستقیم کی ہدایت دنیا و دین میں کلید کامیابی ہے

(۶) اس تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس دعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اُس صراطِ مستقیم پر موقوف ہو جو انسان کو جنت کی طرف لیجائے اسی طرح دنیا کے سارے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے، جس کام میں وہ آلات و ذرائع اختیار کئے گئے، جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عادۃً لازمی ہو تو کامیابی عادۃً لازمی ہوتی ہے، جہاں کہیں انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ مؤمن کو ہر وقت حرزِ جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ استحضار اور نیت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعین۔

بعونہ تعالیٰ تفسیر سورۂ فاتحہ ختم ہوئی،

وللہ الحمد اوّلہ وآخرہ وظاہرہ وباطنہ

۲

سُورَۃُ البَقَرَہ

نام اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ بقرہ ہی، اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہؓ میں اس کا ذکر موجود ہے، جس روایت میں سورۃ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں (ابن کثیر) تعداد آیات دو سو چھیاسی ہی اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسو ہیں (ابن کثیر)

زمانۂ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۂ بقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ربا یعنی سود کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ (۲:۲۸۱) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سنہ ۱۰ ہجری میں ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، (قرطبی) اور اس کے اسّی نوّے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الٰہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

فضائل سورۂ بقرہ | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "سورۂ بقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بدنصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پا سکتے"

قرطبی نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جادوگر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جادو نہ چلے گا (قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورۂ بقرہ سنام القرآن اور ذروۃ القرآن ہے"، سنام اور ذروہ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسّی فرشتے اس کے جلو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: "سورۂ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کو رات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو افاقہ ہو جائے گا"، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۂ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۂ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۂ بقرہ کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سورۂ بقرہ میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں (قرطبی و ابن کثیر) یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۂ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اوّل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگارِ عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا مستحق عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۂ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنا ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہے قرآن ہی میں ملے گا۔

اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورت سورۂ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اوّل ایمان کے بنیادی اصول: توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبۂ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور اُن کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَة

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ اٰيَاتُهَا ۲۸٦ رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸٦ آیتیں ہیں اور ۴۰ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی نافہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں اُن کے حواس وعقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسول کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط وارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ اُن کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاءؑ پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، رہ گیا عمل سو وہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہوگئیں، اُن پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہِ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی اُن کے لئے ہے)۔

حلِ لغات

ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، رَيْبَ شک وشبہ، هُدًى ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِيْنَ جن میں صفت تقویٰ ہو تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَيْبِ لفظی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی نظر اور دوسرے حواس سامعہ وغیرہ سے باہر ہو، يُقِيْمُوْنَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رَزَقْنٰهُمْ رزق سے بنا ہے، جس کے معنی روزی اور گذارے کا سامان دینا، يُنْفِقُوْنَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اٰخِرَةُ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرۃ کہا جاتا ہے، اس جگہ عالم دنیا کے مقابلے میں عالم آخرت بولا گیا، يُوْقِنُوْنَ ایقان سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، مُفْلِحُوْنَ افلاح سے اور وہ فلاح سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف ومسائل

حروفِ مقطعہ جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں اُن کی تحقیق

الٓمٓ، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، الٓمٓصٓ وغیرہ، ان کو

اصطلاح میں حروف مقطعہ کہا جاتا ہے، انہیں سے ہر حرف جُدا جُدا ساکن پڑھا جاتا ہے، الف ، لام ، میم ،

حروف مقطعہ جو اوائل سُوَر میں آئے ہیں، اُن کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسماء الٰہیہ کے رموز ہیں، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور علماء امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہوسکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

"عامر شعبی، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اوّل تو اُن پر ایمان لانا پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم ہے، دوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہونچتے ہیں۔"

پھر فرمایا :-

"حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جمہور صحابہؓ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہمیں اُن پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔"

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کرکے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے، اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَيْبَ کے معنی شک و شبہ، معنے یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۂ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا سُن لی اور قرآن

بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہے، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضٰی پر عمل کرے۔

اور پھر اس کے متعلق ارشاد ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، کیونکہ کسی کلام میں شک وشبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محلِ شک وشبہ ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام محلِ شک وشبہ نہیں ہوتا، گو کج فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے، جس کا ذکر قرآن کریم میں چند آیتوں کے بعد اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ میں آیا ہے۔

اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات واعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ، ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے، یعنی مخصوص ہدایت جو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنے، وہ متقین ہی کا حصہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوعِ بشر کے لئے بلکہ تمام کائناتِ عالم کے لئے عام ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تمام نوع انسان بلکہ تمام حیوانات وغیرہ کے لئے بھی عام اور شامل ہے، دوسرا درجہ مؤمنین کے لئے خاص اور تیسرا درجہ مقربینِ خاص کے لئے مخصوص ہے، پھر اس کے درجات کی کوئی حد وانتہاء نہیں، قرآن کریم کے مختلف مواقع میں کہیں ہدایتِ عامہ کا ذکر آیا ہے کہیں ہدایت خاصہ کا، اس جگہ ہدایت خاصہ کا ذکر ہے، اس لئے متقین کی تخصیص کی گئی ہے، اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت کی زیادہ ضرورت تو ان لوگوں کو ہے جو متقی نہیں، کیونکہ مذکورہ تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ اس جگہ متقین کی خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن غیر متقی لوگوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

متقین کی خاص صفات اس کے بعد دو آیتوں میں متقین کی مخصوص صفات وعلامات بیان کر کے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ جماعت ہدایت یافتہ ہے، انھیں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جس کو سیدھا راستہ مطلوب ہو، اس جماعت میں شامل ہو جائے اُن کے ساتھ رہے، اُن کے عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کو اپنا نصب العین بنائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ متقین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ، یعنی یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے رب کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔

متقین کی صفات جو ان دو آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان کی اجمالی تعریف اور اس کے بنیادی اصول بھی آ گئے ہیں، اور عملِ صالح کے بنیادی اصول بھی، اس لئے ان صفات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

"یعنی خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ: ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف کو قرآن نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لئے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے، اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسول کو بغیر مشاہدہ کے محض رسولؐ کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے، لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر اُن کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر اُن کو معلوم کیا جا سکے۔

قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنیوالے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقینؑ بھی جس کی تفصیل اسی سورۃ بقرہ کے ختم پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمانِ مفصّل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنے یہ ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں اُن سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے (عقیدۂ طحاوی عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محض جاننے کو ایمان

نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے، کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس لئے وہ مؤمن نہیں۔

دوسرا مسئلہ! اقامتِ صلوٰۃ اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر اُن پر دوام والتزام، یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ فرائض و واجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصۂ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اُن کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ! اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اس میں بھی صحیح اور تحقیقی بات جس کو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کا وہ خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خواہ فرض زکوٰۃ ہو، یا دوسرے صدقاتِ واجبہ یا نفلی صدقات و خیرات، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق استعمال ہوا عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے عموماً لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔

اس مختصر جملہ میں لفظ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ پر غور کیجئے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ شریف انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا اور اسی کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی احسان نہیں ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پر مزید اضافہ لفظ مِمَّا نے کر دیا، جس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں متقین کی صفات کا بیان کرتے ہوئے اوّل ایمان بالغیب کا ذکر فرمایا گیا، پھر اقامتِ نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا، ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے، کہ وہی اصل الاصول اور سارے اعمال کی مقبولیت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جائے تو ان کی فہرست طویل اور فرائض و واجبات کی تعداد کثیر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف دو عمل نماز اور انفاقِ مال کے ذکر پر اکتفاء کرنے میں کیا راز ہے؟

اس میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ جتنے اعمال انسان پر فرض یا واجب ہیں ان کا تعلق

یا انسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب سے اہم نماز ہے. اس کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تنہا دو اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ تمام اعمال و عبادات اُن کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہوگئے کہ متقین وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور عمل بھی، اور ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گویا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کردی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء و جوارح لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی محض دل میں تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اُس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بنا پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (۴: ۱۴۵)	یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے۔

اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی

نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے، ارشاد ہے :۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ (۲: ۱۴۶) یعنی یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں "

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (۲۷: ۱۴) "یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے دلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور اُن کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے"

میرے استاذ محترم حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہی، فرق صرف ابتداء و انتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہونچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہونچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیقِ قلبی ظاہری اقرار و اطاعت تک نہ پہونچے وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہونچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔

امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، اور امام ابن ہمام نے مسایرہ میں اس تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ "یعنی متقین ایسے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اُس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اُتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی باقی صفات کا بیان ہے جس میں ایمان بالغیب کی کچھ تفصیل اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ عہد رسالتؐ میں مومنین متقین دُو طرح کے حضرات تھے، ایک وہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے، پھر مشرف باسلام ہوئے، دوسرے وہ جو پہلے اہل کتاب یہودی یا نصرانی تھے، پھر مسلمان ہوگئے، اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقہ کا ذکر تھا، اور اس آیت میں دوسرے طبقہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس آیت میں قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی تصریح فرمائی گئی کہ وہ حسب تصریح حدیث دوہرے ثواب کے مستحق ہیں، ایک پچھلی کتابوں کے زمانے میں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے

۸

کہ آج ان کتابوں پر ایمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُن کتابوں میں نازل فرمایا تھا وہ سب حق ہے، اور اُس زمانے کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ پچھلی کتابیں اور شریعتیں سب منسوخ ہوگئیں، تو اب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلہ ختم نبوت کی ایک واضح دلیل

آیت کے اس طرز بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپؐ کی وحی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی، کیونکہ تورات وانجیل اور تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلۂ وحی اور نبوت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاءؑ کا ذکر فرمایا، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں، پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ مضمون اوّل سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاءؑ، پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے، کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر ایمان لانا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نحل: ۴۳) (۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ (سورۂ مومن: ۷۸) (۳) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا (سورۂ روم: ۴۷) (۴) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نساء: ۶۰) (۵) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ زمر: ۶۵) (۶) كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ شوریٰ: ۳) (۷) كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۱۸۳) (۸) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (اسرائیل: ۷۷)

ان آیات میں اور ان کی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی وکتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلِ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْۢ بَعْدِ کا اشارہ تک نہیں، اگر ختم نبوت اور انقطاع وحی کا دوسری آیات میں صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلہ ختم نبوت پر قرآنی تصریحات اور احادیث متواترہ کی شہادت اور امت کا اجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ "ختم نبوت" دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفت ایمان بالآخرۃ

اس آیت میں متقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ دارِ آخرت ہے جس کو قرآن میں دار القرار، دار الحیوان اور عقبیٰ کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور پورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے

آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے، مگر اس کو پھر صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ اجزائے ایمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضائے ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔

اور اسلامی عقائد میں یہی وہ انقلابی عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کایا پلٹ کر دی، اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوام عالم کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا، اور جو عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور اسی کی عیش و عشرت ان کا انتہائی مقصود ہے، اسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزاء و سزا کو وہ نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور حلال حرام کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو ان کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی، حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً انسدادِ جرائم اور اصلاحِ اخلاق کے لئے کافی نہیں، عادی مجرم تو ان سزاؤں کے عادی ہو ہی جاتے ہیں، کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دارو گیر کا خطرہ ہو، خلوتوں میں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں، اُسے کون مجبور کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوت و خلوت میں یکساں ہو سکتی ہے، وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے بند دروازوں اور اُن پر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، چال چلن دیکھ کر لوگ دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں بِالْاٰخِرَةِ کے ساتھ لفظ یُؤْمِنُوْنَ

نہیں، بلکہ یُوْقِنُوْنَ استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے، اور ایقان کا مقابل شک و تردد، اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، مُتَّقِین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب، پھر جزاء و سزاء کا نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے، یا دنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلافِ شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرے اور ظاہر شریعت میں اس کو مؤمن کہا بھی جائے، لیکن قرآن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں، اور وہ ہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانیوالی چیز ہے اُسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انعام دیا گیا ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے، اُولٰۤئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰۤئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یعنی "بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب"۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ

لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ ؕ وَعَلٰۤی

ایمان نہ لائیں گے، مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور

اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ ز وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝۷

ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے

ع ۱

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لاویں گے (یہ بات اُن کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کافر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے) بند لگا دیا ہے اللہ نے انکے دِلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

معارف و مسائل

خلاصۂ مضمون مع ربط

سورۂ بقرہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قرآن کریم کا کتاب ہدایت اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد ان خوش نصیب لوگوں کا ذکر تھا، جنھوں نے اس کتاب ہدایت سے پورا فائدہ اُٹھایا، جن کو قرآن کی اصطلاح میں مؤمنین اور متقین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و علامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و عناد سے پیش آئے۔

پھر اُن لوگوں میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنھوں نے کھل کر انکار و مخالفت کا راستہ اختیار کیا جن کو قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ لوگ جو اپنی اخلاقی پستی اور دنیا کی ذلیل اغراض کی بنا پر یہ جرأت بھی نہ کرسکے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور دلی عقیدے کو صاف طور پر ظاہر کر دیتے، بلکہ دھوکہ اور فریب کی راہ اختیار کی، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایات کو مانتے ہیں، تمھارے ساتھ ہیں، اور دلوں میں اُن کے کفر و انکار تھا، کفار کی مجلسوں میں جا کر یہ کہتے کہ ہم تمھارے عقیدے پر اور تمھارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے راز معلوم کرنے کے لئے ہم اُن سے ملتے ہیں۔

اس گروہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کھلے کافروں کا ذکر ہے، اور آگے تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلقہ حالات و علامات اور ان کا انجام مذکور ہے۔

ان تمام آیات کی تفصیل پر یکجائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ایک طرف تو چشمۂ ہدایت کا پتہ دیدیا کہ وہ قرآن ہے، اور دوسری طرف تمام اقوامِ عالم کو اسی ہدایت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک ہدایت یافتہ جن کو مؤمنین و متقین کہا جاتا ہے، دوسرے ہدایت سے انحراف و انکار کرنے والے جن کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں طلب کیا گیا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستہ سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، میں پناہ مانگی گئی ہے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم سے ایک اصولی مسئلہ یہ بھی نکل آیا کہ اقوامِ عالم کے حصوں یا گروہوں میں ایسی تقسیم جو اصول پر اثر انداز ہوسکے وہ صرف اصول و نظریات ہی کے اعتبار سے ہوسکتی ہی،

نسب، وطن، زبان، رنگ اور جغرافیائی حالات ایسی چیزیں نہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے قوموں کے ٹکڑے کئے جاسکیں، قرآن کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورۂ تغابن میں مذکور ہے:

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴: ۲)

"یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر کچھ لوگ تم میں سے مؤمن اور کچھ کافر ہوگئے"

مذکورالصدر دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے اُن کافروں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں ضد اور عناد تک پہنچ گئے تھے، اور اس ضد کی وجہ سے وہ کسی حق بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں سُنّۃ اللہ یہی ہے کہ ان کو ایک سزا اسی جہان میں نقد یہ دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں پر مُہر لگادی جاتی ہے، کانوں، آنکھوں کو حق و صدق کے قبول کرنے سے بند کردیا جاتا ہے، اُن کا حال حق و صدق کے بارے میں ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا نہ اُن کو سمجھنے کی عقل، نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔

آخر آیت میں ایسے لوگوں کا عذابِ عظیم میں مبتلا ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

کفر کی تعریف کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپاتا ہے، اصطلاحِ شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لئے جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہو کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔

اِنْذَار کے معنے لفظ انذار، ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو، جیسا کہ ابشار ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اردو زبان میں اس کا ترجمہ "ڈرانے" سے کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بنا پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے، اسی لئے جو ڈاکو، چور، ظالم کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا، انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت سے نذیر کا لقب دیا جاتا ہے کہ وہ از راہ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح مبلّغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیرخواہی کیساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے، محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے، کہ یہ ضدی اور

معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر و انکار پر جمے ہوئے ہیں، یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں اُن کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا اُن کے حق میں برابر ہے۔

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے وہ سب بند ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا دردسری ہے۔

کسی چیز پر مُہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہوسکے، ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگانے کا بھی مطلب ہے کہ ان میں قبولِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اُن کی اس حالت کو دلوں اور کانوں پر تو مُہر کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے مُہر کے بجائے پردہ پڑنے کا ذکر کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ دلوں میں آنے والا کوئی مضمون یا کوئی فکر و خیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آسکتا ہے، اسی طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور ہر جہت سے آسکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہوسکتی ہے جب اُن پر مُہر کردی جائے بخلاف آنکھوں کے کہ ان کا ادراک صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہوسکتا ہے، اور جب سامنے پردہ پڑجائے تو آنکھوں کا ادراک ختم ہوجاتا ہے۔ (مظہری)

(۱) گناہوں کی دنیوی سزا سلبِ توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملیگی مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاح حال کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، انسان آخرت کے حساب وکتاب سے بے فکر ہوکر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی بُرائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةُ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا" یعنی گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے"۔

اور حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نقطہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے، پہلے نقطۂ گناہ سے بھی انسان پریشان ہوتا ہے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کرلیا تو ایک دوسرا نقطۂ سیاہ لگ جاتا ہے، اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہوجاتی

ہے، اور اب اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ نہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بُری چیز کو بُرا غرض نیکی بدی کا امتیاز اس کے دل سے اُٹھ جاتا ہے، اور پھر فرمایا کہ اسی ظلمت و سیاہی کا نام قرآن کریم میں رَان یا رَین آیا ہے، كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ o (مشکوٰۃ از مسند احمد ترمذی) اور ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو صاف ہو جاتا ہے (قرطبی)

(۲) نصیحت ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے، مخاطب قبول کرے یا نہ کرے

اس آیت میں ازلی کافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ و نصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر قرار دیئے گئے ہیں، مگر اُن کے ساتھ عَلَيْهِمْ کی قید لگا کر بتلادیا کہ یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں، بلکہ اُن کو تو تبلیغ و تعلیم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا، اسی لئے پورے قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوتِ ایمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوتِ دین اور اصلاح کا کام کرتا ہے خواہ مؤثر ہو یا نہ ہو اس کو بہر حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اس آیت کا مضمون وہی ہے جو سورۂ مطففین کی اس آیت کا ہے: كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ o (۸۳: ۱۴) "یعنی ایسا نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے" جس میں حقیقت واضح کردی گئی ہے کہ ان کی بداعمالیاں اور سرکشی ہی ان کے دلوں کا زنگ بن گیا ہے، اسی زنگ کو آیتِ مذکورہ میں مہر یا پردہ کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی اُن کے دلوں پر مہر کردی، اور حواس کو ماؤف کردیا ہے تو یہ اپنی کفر میں معذور ہو گئے، پھر اُن کو عذاب کیسا؟ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت و عناد کرکے باختیار خود اپنی استعداد برباد کرلی ہے، اس لئے اس تباہیِ استعداد کے فاعل اور مسبب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر کرنے کو اپنی طرف نسبت کرکے یہ بتلادیا کہ جب ان لوگوں نے قبولِ حق کی صلاحیت و استعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنتِ الٰہیہ کے مطابق ہم نے وہ بد استعدادی کی کیفیت اُن کے قلوب اور حواس میں پیدا کردی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ﴿۸﴾

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مومن نہیں،

منزل ۱

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو

يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ

اور نہیں سوچتے۔ اُن کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے اُن کی بیماری اور اُن کیلئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا

عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے ، اور جب کہا جاتا ہے اُن کو فساد نہ ڈالو

فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ

ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ، جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ

لیکن نہیں سمجھتے ، اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ

سب لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن

لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا

نہیں جانتے ، اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہا

اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴

ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے)

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ

اللہ ہنسی کرتا ہے اُن سے اور ترقی دیتا ہے اُن کو انکی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں، یہ

الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا

وہی ہیں جنھوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے سو نافع نہ ہوئی انکی سوداگری اور

كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ

نہ ہوئے راہ پانے والے ، اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب

أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا

روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے اُنکی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں

يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ

کہ کچھ نہیں دیکھتے، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے یا انکی مثال ایسی ہے

السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي

جیسے زور کے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے اس میں اندھیری ہیں اور گرج اور بجلی دیتے ہیں انگلیاں اپنے

آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

کانوں میں مارے کڑک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنیوالا ہے کافروں کا،

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ

قریب ہے کہ بجلی اُچک لے اُن کی آنکھیں، جب چمکتی ہے اُن پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں

وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ

اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لیجاوے انکے کان اور آنکھیں

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ع ۲ / ۲

خلاصۂ تفسیر

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ) چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لاچکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چالبازی کا انجام بد خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا) اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض (اس مرض میں اُن کی بداعتقادی اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلنا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و خلجان سب داخل ہیں، مسلمانوں کی ترقی سے اُن کا مرض حسد اور بڑھنا واضح ہے) اور انکے لئے سزا ہے دردناک

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی دورُخی روش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی خیر خواہ نے فہمائش کی کہ ایسی کارروائی موجبِ فساد ہوا کرتی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے مصلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غباوت کا بیان ہے، کہ اپنے عیب ہی کو ہنر سمجھتے ہیں، آگے دوسری جہالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے ہنر کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بیشک یہی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے (یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر غریب مسلمانوں کے سامنے کرلیتے ہوں گے جن سے اُن کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ عام طور پر تو وہ اپنے کفر کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہونچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمہارے ہم مشرب ہیں، آگے اُن کے استہزاء کا جواب ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دی جا رہی ہے جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور جُرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل اُن کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کردیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی اُن کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے (یعنی اُن کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لے لی) اُن کی حالت اُس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کردیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کرلیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں، (تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آجانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

والوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر
ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے،
رکہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہے، یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خوب
دل کھول کر کفر پر جمے ہوتے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین
کے اُس گروہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس
کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراضِ نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ میلان بدل جاتا تھا) یا اُن
منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد
برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں
میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہے کافروں
کو، برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لے لی جہاں ذرا اُن کو بجلی
کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب اُن پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے
کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے
بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفانِ باد و باراں میں کبھی
چلنے سے رہ جاتے ہیں، کبھی موقع پاکر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بیس[۲۰] آیتوں میں اُس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اوّل پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے نہ ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مؤمن نہ تھے، ان لوگوں کا نام قرآن میں منافقین رکھا گیا ہے

مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ "لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے"

اس میں اُن کے دعویِٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے،

یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی چالبازی کو ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی قرار دے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں (قرطبی عن الحسن)

اسی لئے اس کا نتیجہ یہ بتلایا گیا کہ یہ بے وقوف اپنے سوا اور کسی کے ساتھ چالبازی نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ تو ہر دھوکہ و فریب سے بالاتر ہیں ہی، ان کے رسولؐ اور مؤمنین بھی وحیِ الٰہی کی وجہ سے ہر دھوکہ، فریب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، کوئی نقصان اُن کو نہیں پہونچتا، البتہ ان کے دھوکہ، فریب کا وبال دنیا و آخرت میں خود انھیں پر پڑتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ "اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کے مرض کو" مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدالِ مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہو جائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفسِ انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض خواہشاتِ نفسانی کے اتباع سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بدنِ انسان کے امراض اخلاطِ انسان کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں، اس آیت میں اُن کے دلوں میں مخفی کفر کو مرض فرمایا گیا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مرض ہے، رُوحانی مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اوّل تو اپنے پیدا کرنے والے پالنے والے کی ناشکری اور اس کے احکام سے سرکشی جس کا نام کفر ہے، یہ خود روحِ انسانی کے لئے سب سے بڑا مرض اور شرافتِ انسانی کے لئے بدترین داغ ہے، دوسرے دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر اس کو چھپاتے رہنا اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ ہونا، یہ دوسری دنارت ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے، اور نفاق کا جسمانی مرض ہونا اس بنار پر ہے کہ منافق کے دل میں ہمیشہ یہ دغدغہ رہتا ہے کہ کہیں میرا اصلی حال نہ کھل جائے، شب و روز اس کی فکر میں رہنا خود ایک جسمانی مرض ہے، اس کے علاوہ اس مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے، کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھکر منافق کو جلن ہوگی، مگر وہ مسکین اپنے دل کی سوزش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، یہ اسباب اُن کے جسمانی مرض بھی بن جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یہ ترقی دینا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدات

ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اُن کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں آیتوں میں منافقین کا یہ مغالطہ مذکور ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے اور اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے۔ قرآن کریم نے واضح کیا کہ فساد و اصلاح زبانی دعووں پر دائر نہیں ہوتے، ورنہ کوئی چور ڈاکو بھی اپنے آپ کو مفسد کہنے کو تیار نہیں، بلکہ مدار کار اس کام پر ہے جو کیا جارہا ہے، وہ فساد ہو تو کرنے والے کو مفسد ہی کہا جائے گا، خواہ اس کی نیت فساد کی نہ ہو۔

چھٹی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ "یعنی ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ" اس میں لفظ ناس سے مراد باتفاق مفسرین صحابہ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرامؓ کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہو اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مؤمن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں، ان لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو سفہاء یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے، کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلا دیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔

ساتویں آیت میں منافقین کے نفاق اور دورُخی پالیسی کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم مؤمن مسلمان ہوگئے، اور جب اپنی قوم کے کافر لوگوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں، اور تمہاری قوم کے فرد ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ تو محض تمسخر و استہزاء کے لئے، یعنی ان کو بیوقوف بنانے کے لئے ملتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں اُن کی اس احمقانہ گفتگو کا جواب ہے کہ یہ بے شعور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے استہزاء کرتے ہیں، اور ان کو بیوقوف بنارہے ہیں، حالانکہ درحقیقت خود بیوقوف بن رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم و کرم سے اُن کو ڈھیل دے کر خود انہی کے استہزاء کا سامان کر دیا ہے، کہ ظاہر میں کسی عذاب کے نہ آنے سے وہ اور غفلت میں پڑ گئے، اور اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا جرم اور سنگین ہوگیا، پھر دفعۃً پکڑ لئے گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عمل چونکہ اُن کے استہزاء کے جواب میں تھا اس لئے اس عمل کو بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انھوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھا

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مبتلا ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انھوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، اُن کے اس عمل کو قرآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان دے کر ردی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، وہ مثالیں اس بنا پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیرہ آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

(۱) کیا کفر و نفاق عہد نبویؐ کے ساتھ مخصوص تھا، یا اب بھی موجود ہے؟

اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچاننا اور اس کو منافق قرار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلا دیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدۂ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب اُن کے پہچاننے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا اُن پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اصطلاح میں ملحد ہے، اَلَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا (۴۱: ۴۰)، اور حدیث میں اُس کو زندیق کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماءِ امت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مؤمن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالکؒ سے "عمدۃ" شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانۂ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

(۲) ایمان و کفر کی حقیقت | آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان واسلام کی پوری حقیقت واضح ہوجاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف سے ایمان کا دعویٰ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:

اوّل یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلّم ہے، اور جو چیز اُن کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انھوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے؟

بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کرلینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب سے بڑا قادرِ مطلق مانتے ہیں، اور مشرکین ہندوستان تو پرلو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلائی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات واوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہرحال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے، اُن سے آخرت میں کوئی بازپرس ہوگی اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معمولی ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور جھوٹ ہوا۔

(۳) کفر و ایمان کا ضابطہ | قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اوپر سورۂ بقرہ کی تیرہویں آیت میں آچکا ہے: اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابۂ کرامؓ کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص قرآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آجکل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدۂ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابۂ کرامؓ کے ایمان سے بالکل مختلف تحریف کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہؓ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز روزہ میں شریک بھی ہو، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک وہ قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ "اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جا سکتا" اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متعین ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رُو بقبلہ نماز پڑھنا اُن کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہوا کہ ان کا ایمان صحابۂ کرامؓ کی طرح تمام ضروریاتِ دین پر نہیں تھا۔

(۴) جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے یہاں منافقین کے قول اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانست میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعوٰیِ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان بالرسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندی اور گھناؤنی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعوٰی ایمان باللہ و بالیوم الآخر بھی قرآنی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجۃً جھوٹ ثابت ہوا۔

(۵) انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ساتھ برا سلوک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ برائی کرنا ہے آیاتِ مذکورہ میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا ہے يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے اور اس کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں، حالانکہ گروہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شنیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا قرار دے کر یہ بتلا دیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ

کوئی بُرا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپؐ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہٗ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

(۶) جھوٹ بولنے کا وبال | آیاتِ مذکورہ میں منافقین کے عذابِ الیم کی وجہ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ یعنی اُن کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد اُن کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بُری عادت نے اُن کو کفر و نفاق تک پہونچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بُت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (۲۲: ۳۰)	"یعنی بچو بُت پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے۔"

(۷) اصلاح و فساد کی تعریف اور مصلح و مفسد کی پہچان | آیاتِ مذکورہ میں گذر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنے نفاق کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ اس میں لفظ إِنَّمَا جو حصر و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ، یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقۃً زمین میں فتنہ و فساد پھیلنے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ قرآن کی تصریح وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے اُن میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغوار، بدکاری وغیرہ ہر سمجھدار آدمی ان کو شر و فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر اُن کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق برباد ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اخلاقی گراوٹ سارے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفسد ہونے کا انکار اور مصلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر نفاق اور کینہ وحسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آجاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کھو بیٹھا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آجاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جو گت بنے گی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں ہر شخص ہر محکمہ اور ہر ادارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ترقی پذیر ہے، تعلیم و تعلم کے اداروں کا جال گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھلیاں ہے، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سوا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسانیت کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا دیں، تو پھر فساد و جرائم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی رُوح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جرائم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار کی باگ ہے وہ جرائم کے انسداد کے لئے نئے سے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوحِ انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گروں کا علاج سہل ہے، مگر اُن انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ برنگِ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ پُرفریب اصلاحی اسکیم بھی سامنے رکھ لیتے ہیں اور خالص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سُبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲: ۲۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟" جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و صلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہو گا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیتِ اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رُخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو

بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے

لَكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خُلاصۂ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے)، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمھارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر (پردۂ عدم سے) نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہوا (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں اُس دعاء و درخواست کا جواب تھا جو سورۂ فاتحہ میں آئی ہے، یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآن کریم اوّل سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔

اس کے بعد قرآنی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہوں کو بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مؤمنین متقین کا ذکر ہوا، جنھوں نے ہدایاتِ قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیرہ آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں تو قرآنی ہدایات کے مخالف تھے، مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اس طرح سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر کُل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہو، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات کو ماننے والے ایک قوم اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورۂ مجادلہ میں "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کا نام دیا گیا۔

غرض سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں قرآنی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کرکے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے، کہ اس میں دعویٰ کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہوجائے۔

پہلی آیت میں يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب شروع ہوا۔ لفظ اَلنَّاسُ عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا، اور خوف و عظمت کے پیش نظر نافرمانی سے دور رہنا (روح البیان

ص ۴، ج ۱) اور لفظ رَبّ کے معنی "پروردگار" کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گذر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ "عبادت کرو اپنے رب کی"

یہاں پر لفظ "رب" کی جگہ لفظ "اللہ" یا اسماء حسنیٰ میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ "رب" کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع و بصیر، عقل و ادراک والا ماہر انسان بنادے، اور اس کی بقاء و ارتقاء کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کرچکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے میں اُسے ہرگز تامّل نہیں ہوگا، کہ یہ شانِ ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ مربیانہ انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بُت نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقاء میں اُسی "ذاتِ واحد" کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کرسکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کرے بھی تو وہ بھی درحقیقت اُسی ذات کی تربیت ہوگی، جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ "رب" لاکر یہ واضح کردیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا معنی و مطلب جدا ہے، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو گناہگار مسلمانوں کے لئے معنی یہ ہوئے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوئے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان)

اس کے بعد "رب" کی چند صفاتِ خاصہ کا ذکر کرکے اس مضمون کی مزید توضیح فرمادی گئی، ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ "یعنی تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں" اس میں "رَبّ" کی وہ صفت بتلائی گئی ہے جو اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطنِ مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل، پاک و صاف انسان بنادینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُس ذاتِ حق کے کس کا کام ہوسکتا

ہو جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اُس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں خَلَقَكُمْ کے ساتھ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کا اضافہ کرکے ایک تو یہ بتلا دیا کہ تم اور تمہارے آباء و اجداد یعنی تمام بنی نوع انسان کا خالق وہی پروردگار ہے، دوسرے صرف مِنْ قَبْلِكُمْ کا ذکر فرمایا، مِنْ بَعْدِكُمْ، یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا، نہ اس کی کوئی جدید اُمت ہوگی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی دنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذاب سے نجات پانے کی امید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ توحید کو اختیار کرو اور شرک سے باز آؤ۔

کائناتِ زمین و آسمان میں قدرتِ حق کے مظاہر

پھر دوسری آیت میں "رب" کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

"یعنی رب وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعہ پردۂ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے"

پہلی نعمت اس سے پہلی آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزوں سے متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں "انفسی" اور دوسری میں "آفاقی" نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام اقسامِ نعمت کا احاطہ فرمایا گیا۔

ان "آفاقی" نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے، کہ اس کو انسان کے لئے فرش بنا دیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر قرار نہ ہوسکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہو کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کرسکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا بنایا گیا جو عام انسانی ضروریاتِ زندگی میں کام دے سکے۔

فِرَاشًا کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور قرآن کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنا دیا، تیسری نعمت یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسایا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں نہ ہو

بلکہ محاورات میں ہر اوپر سے آنے والی چیز کو آسمان سے آنا بولتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿واقعہ: ۶۹﴾ "کیا بارش کا پانی سفید بادلوں سے تم نے اتارا ہے یا ہم اس کے اُتارنے والے ہیں"

دوسری جگہ ارشاد ہے،

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿نبأ: ۱۴﴾ "ہم نے اُتارا پانی بھرے ہوئے بادلوں سے پانی کا ریلا"

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعہ پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے، پروردگار عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیچارے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے، ان کے متعلق تو کسی بیوقوف جاہل کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہ کے کسی انسان یا بُت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہونگے

ہاں زمین سے پھل اور پھلوں سے انسانی غذا نکالنے میں کسی سادہ لوح اور سطحی نظر رکھنے والے کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جمانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہے۔

لیکن قرآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی اور محنت کو درخت اُگانے یا پھل نکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل "رکاوٹوں کو دور کرنے" سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں ہل چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو دُور کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا گٹھلی کے اندر سے جو نازک کونپل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کونپل نکالنے اور اس میں پھول پتیاں پیدا کرنے میں اس بیچارے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے۔

اسی طرح کاشتکار کا دوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کونپل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کونپلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی درخت

کے نکلنے یا پھلنے پھولنے میں بجز رفع موانع کے اور کیا دخل ہے؛ ہاں پانی سے جمنے والے بیج کی اور اس سے نکلنے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اسی سے وہ پھلتا پھولتا ہے، لیکن پانی کا شتکار کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس میں بھی کاشتکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے پانی کو قدرت ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب وقت میں اور مناسب مقدار میں پہنچا دے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ درخت کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھولنے میں اول سے آخر تک انسان کی محنت اور تدبیر کا اس کے سوا کوئی اثر نہیں کہ نکلنے والے درخت کے راستے سے روڑے ہٹا دے، یا اس کو ضائع ہونے سے بچالے، باقی رہی درخت کی پیدائش، اس کا بڑھنا، اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پیدا کرنا سو اس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ (واقعہ: ۶۳-۶۴)	بتلاؤ جو کچھ تم بوتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو! یا ہم اُگانے والے ہیں؟

قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو اُگانے والے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدائش اور برق و باراں کے منظم سلسلہ کار میں انسانی سعی و محنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح کھیتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول پھل نکلنے، اور ان سے انسان کی غذائیں تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف برائے نام ہے، اور حقیقت میں یہ سب کار و بار صرف حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی چار صفات کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی ہی نہیں جاسکتیں، اور جب ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر اس کی بقاء و ترقی کے سامان زمین اور آسمان، بارش اور پھل پھول کے ذریعے مہیا کرنا سوائے ذاتِ حق جل شانہ کے اور کسی کا کام نہیں، تو ہر ادنیٰ سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور مستحق بھی صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ انسان کے بود و وجود اور اس کے بقاء و ارتقاء کے سارے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور غافل انسان دوسروں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرتا پھرے، دوسری چیزوں کی بندگی میں مشغول ہو جائے، مولانا رومیؒ نے اسی غافل انسان کی زبان پر فرمایا ہے ؎

نعمتت را خوردہ عصیاں میکنم
نعمت از تو من بغیرے می تنم

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سردار اس لئے بنایا تھا کہ ساری کائنات اس کی خدمت کرے، اور یہ صرف ربّ کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ رکھے، اس کا یہ رنگ ہو جائے ؎

بجز راز یاد گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز ذکر حق آباد نیست

لیکن غافل انسان نے اپنی حماقت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بھلا دیا تو اسے ایک خدا کی غلامی کے بجائے ستر کروڑ دیوتاؤں کی غلامی کرنا پڑی ؎

ایک در چھوڑ کے ہم ہو گئے لاکھوں کے غلام
ہم نے آزادیِ عرفی کا نہ سوچا انجام

اسی غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کا مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو، یعنی جب تم نے یہ جان لیا کہ تم کو نیست سے ہست کرنے والا، تمھاری تربیت اور پرورش کے سارے سامان مہیا کر کے ایک قطرہ سے حسین و جمیل، حساس اور عاقل انسان بنانے والا، تمھارے رہن سہن کے لئے زمین اور دوسری ضروریات کے لئے آسمان بنانے والا، آسمان سے پانی برسانیوالا پانی سے پھل اور پھل سے غذا مہیا کرنے والا بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق دوسرا کون ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے، اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو اس جہان میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم اور بیوقوفی و بے عقلی نہیں ہو سکتی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق سے دل لگایا جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے ؎

آنانکہ بجُز روی تو جائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظرانند

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی کتابوں کے اور تمام انبیاء کے بھیجنے کا اصل مقصد ہے، یعنی صرف ایک خدا کی عبادت و بندگی جس کا نام توحید ہے۔

اور یہ وہ انقلابی نظریہ ہے جو انسان کے تمام اعمال و احوال اور اخلاق و معاشرت پر گہرا اثر رکھتا ہے، کیونکہ جو شخص یہ یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام نظام عالم میں متصرف اور تمام چیزوں پر قادر صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور ارادے کے نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس کی پوری توجہ ہر مصیبت و راحت اور ہر تنگی و فراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی

جس کے ذریعہ وہ اسباب ظاہرہ کی حقیقت کو پہچان لے گا کہ یہ سلسلۂ اسباب درحقیقت ایک پردہ ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کارفرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پُوجنے والے دانایانِ یورپ اگر اس حقیقت کو سمجھ لیں تو انھیں معلوم ہوجائے کہ برق اور بھاپ سے آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی پاور اور طاقت نہ برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اسی ذات حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے یہ برق اور بھاپ پیدا کئے، اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت چاہئے، اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا میں کتنا ہی دانشمند و فلاسفر کہلاتا ہو مگر اس کی مثال اس دیہاتی بیوقوف کی سی ہے جو کسی ریلوے اسٹیشن پر پہونچا اور دیکھا کہ گارڈ کے ہاتھ میں دو جھنڈیاں سُرخ اور سبز ہیں، سبز کے دکھلانے سے ریل چلنے لگتی ہے اور سُرخ جھنڈی دکھلانے سے ریل تھم جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ ان جھنڈیوں ہی کو ڈنڈوت کرنے لگے، اور سمجھے کہ یہ جھنڈیاں ہی طاقت کی مالک ہیں کہ اتنی بڑی تیز رفتار پہاڑ کی طرح بوجھل گاڑی کو چلانا اور روکنا ان کا کام ہے، جس طرح دنیا اس دیہاتی پر ہنستی ہے کہ اس جاہل کو یہ خبر نہیں کہ جھنڈیاں محض علامت ہیں اور کام درحقیقت ڈرائیور کا ہے، کہ وہ ریل کو چلاتا ہے اور روکتا ہے، بلکہ اس کا بھی نہیں مشین کے کل پرزوں کا ہے، اور جس نے ذرا نگاہ کو اور گہرا کرلیا تو اُسے یہ نظر آجاتا ہے کہ درحقیقت اُس کا چلانا نہ ڈرائیور کا کام ہے، نہ انجن کے کل پرزوں کا، بلکہ اصل طاقت اس اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر پیدا ہو رہی ہے، اسی طرح ایک موحّد انسان ان سب عقلمندوں پر ہنستا ہے کہ حقیقت کو تم نے بھی نہیں پایا، فکر و نظر کی منزل ابھی اور آگے ہے، ذرا نگاہ کو تیز کرو اور غور سے کام لو، تو معلوم ہوگا کہ اسٹیم اور آگ و پانی بھی کچھ نہیں، طاقت و قوت صرف اسی ذات کی ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے ہیں، اور اسی کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

با من و تو مردہ، باحق زندہ اند

کسی کا عمل اس کی نجات اور جنت کا یقینی سبب نہیں

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، اس جملہ میں لفظ لَعَلَّ استعمال فرمایا ہے جو رجاء یعنی امید کے معنی میں آتا ہے، اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہی جہاں کسی فعل کا وقوع یقینی نہ ہو، حکم ایمان و توحید کے نتیجہ میں نجات اور جنت کا حصول وعدۂ الٰہیہ کے مطابق یقینی ہے، مگر اس یقینی شے کو امید و رجا کے عنوان سے بیان کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں نجات و جنت کی قیمت نہیں بن سکتا، بلکہ فضلِ خداوندی اس کا اصل سبب ہے، ایمان و عمل کی توفیق ہونا اس فضلِ خداوندی کی علامت ہے، علت نہیں۔

عقیدۂ توحید ہی دنیا میں امن دامان اور سکون و اطمینان کا ضامن ہے

عقیدۂ توحید جو اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام مشکلات کا حل، اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ، اور ہر غم و فکر میں اس کا غمگسار ہے، کیونکہ عقیدۂ توحید کا حاصل یہ ہے کہ عناصر کے کون و فساد اور ان کے سارے تغیرات صرف ایک ہستی کی مشیت کے تابع اور اس کی حکمت کے مظاہر ہیں ؎

ہر تغیر ہے غیب کی آواز
ہر تجدد میں ہیں ہزار دں راز

اور ظاہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب و دماغ پر چھا جائے اور اس کا حال بن جائے تو یہ دنیا ہی اس کے لئے جنت بن جائے گی، سارے جھگڑے فساد اور ہر فساد کی بنیادیں ہی منہدم ہو جائیں گی، کیونکہ اس کے سامنے یہ سبق ہوگا ؎

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست
کہ دل ہر دو در تصرفِ اوست

اس عقیدہ کا مالک ساری دنیا سے بے نیاز ہر خوف و خطرے بالاتر زندگی گذارتا ہے، اُس کا حال یہ ہوتا ہے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش ؛ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس ؛ ہمیں است بنیاد توحید و بس

کلمہ لا الٰہ الا اللہ جو کلمۂ توحید کہلاتا ہے اس کا یہی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ توحید کا محض زبانی اقرار اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ سچے دل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ استحضار ضروری ہے، کیونکہ توحیدِ خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

کلمہ لا الٰہ الّا اللہ کے پڑھنے والے تو آج دنیا میں کروڑوں ہیں، اور اتنے ہیں کہ کسی زمانے میں اتنے نہیں ہوئے، لیکن عام طور پر یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے، توحید کا رنگ ان میں رچا نہیں ورنہ اُن کا بھی وہی حال ہوتا جو پہلے بزرگوں کا تھا، کہ نہ کوئی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کو مرعوب کر سکتی تھی، اور نہ کسی قوم کی عددی اکثریت اُن پر اثر انداز ہو سکتی تھی، نہ کوئی بڑی سے بڑی دولت و سلطنت اُن کے قلوب کو خلافِ حق اپنی طرف جھکا سکتی تھی، ایک پیغمبر کھڑا ہو کر ساری دنیا کو للکار کر کہہ دیتا تھا کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کِیۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ، انبیاءؑ کے بعد صحابۂ و تابعینؒ جو تھوڑی سی مدت میں دنیا پر چھا گئے اُن کی طاقت و قوت اسی حقیقی توحید میں مضمر تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالتِ محمدیؐ کا اثبات
بذریعہ اعجازِ قرآن [1]

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت

مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾

اس جیسی اور بلاؤ اس کو جو تمھارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو،

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ

پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور

الْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

پتھر ہیں تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

خُلاصۂ تفسیر

اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندے خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو (کیونکہ تم بھی عربی زبان جانتے ہو اور اس کی نظم و نثر کے مشاق ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی، اور جب اس کے باوجود تم قرآن کے ایک ٹکڑے کی بھی مثل نہ بنا سکو تو بشرطِ انصاف بے تامل ثابت ہو جاوے گا کہ یہ معجزہ منجانب اللہ ہے اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں) اور بلا لو اپنے حمائیتیوں کو (جو) خدا سے الگ (الگ تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کرسکو اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات و خلاصۂ مضمون
یہ سورۂ بقرہ کی تیئیسویں اور چوبیسویں آیتیں ہیں، اس سے پہلی دو آیتوں میں توحید کا ثبوت تھا، ان دونوں آیتوں میں رسالتِ

[1] الحمدللہ یہ مضمون کتابی شکل میں علیحدہ شائع ہو چکا ہے۔ ناشر

محمدیؐ کا اثبات ہے، (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وہ ہدایت جو قرآن لے کر آیا ہے اس کے دو عمود ہیں: توحید اور رسالت، پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کام ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت فرمائی گئی ہے، اور طریق اثبات دونوں کا ایک ہی ہے، کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام مذکور تھے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا، مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا، آسمان سے پانی اُتارنا، پانی سے پھل پھول پیدا کرنا۔

اور خلاصہ استدلال یہ تھا کہ جب یہ کام اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو مستحقِ عبادت بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثال و نظیر لا سکتی ہے، جس طرح زمین و آسمان کی بناوٹ، پانی برسانے اور اس سے پھل پھول نکالنے سے انسانی طاقت کا عاجز ہونا اس کی دلیل تھی کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی طرح کلام الٰہی کا مثل یا نظیر پیش کرنے سے پوری مخلوق کا عاجز رہنا اس کی دلیل ہے، کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کسی مخلوق کا نہیں، اس آیت میں قرآن نے پوری دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے چیلنج دیا ہے کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو، تمھیں بھی ایسا کلام پیش کرنے پر قدرت ہونا چاہئے، پورا کلام تو کیا تم اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نظیر و مثال بنا کر دکھلاؤ، اور اس پر تمہارے لئے یہ مزید آسانی دی جاتی ہے کہ تنہا کوئی آدمی نہ بنا سکے تو تمھیں اختیار ہے سارے جہان سے اپنے حمایتی اور مددگار جمع کر لو، اور ایک بین العالمی کانفرنس کر کے اس قرآن کی چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لاؤ۔

پھر اسی پر بس نہیں کیا دوسری آیت میں اُن کو غیرت دلائی کہ تمھاری مجال نہیں کہ اس جیسی ایک سورت بنا سکو، پھر عذاب سے ڈرایا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا عجز محسوس کرتے ہو، اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے مافوق اور بلند و بالا ہے، جس کی قدرت کاملہ سب پر حاوی ہے، تو پھر اس پر ایمان نہ لانا اپنے ہاتھوں جہنم میں اپنا ٹھکانا کرنا ہے اس سے بچو۔

حاصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ بتلا کر آپ کی رسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو ہزاروں ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن اُن سب میں سے اس جگہ آپؐ کے علمی معجزے یعنی قرآن کے ذکر پر اکتفاء کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اور اس معجزہ کو انبیاء علیہم السلام

کے عام معجزات میں بھی ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ عام دستور یہ ہے کہ ہر نبیؑ و رسولؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کچھ معجزات ظاہر فرماتے ہیں، مگر یہ معجزات ان رسولوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں انھیں کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، مگر قرآن حکیم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ، لفظ رَیب کا ترجمہ اردو میں شک کا کیا جاتا ہے، مگر امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ درحقیقت رَیب ایسے تردّد اور وہم کو کہا جاتا ہے جس کی بنیاد کوئی نہ ہو، ذرا غور و تامل کرنے سے رفع ہو جائے، اسی لئے قرآن کریم میں اہل علم سے رَیب کی نفی کی گئی ہے اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، جیسے ارشاد ہے، وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۳۱:۷۴)، یہی وجہ ہے کہ شروع سورۂ بقرہ میں قرآن کریم کے متعلق فرمایا لَا رَیْبَ فِیْهِ کہ اس میں کسی رَیب کی گنجائش نہیں، اور اس آیت میں فرمایا وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ "یعنی اگر ہو تم کسی تردّد میں" جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم اپنے واضح اور معجزانہ دلائل کی بناء پر کسی شک و تردّد کا محل نہیں ہے، لیکن اپنی ناواقفیت سے پھر بھی تمھیں کوئی تردّد ہی تو سُن لو،

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، لفظ سورہ کے معنی محدود قطعہ کے ہیں، اور سورتِ قرآن اس خاص حصۂ قرآن کو کہا جاتا ہے، جو بذریعہ وحی ممتاز اور علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔

پورے قرآن میں اس طرح ایک سو چودہ سورتیں چھوٹی بڑی ہیں، اور اس جگہ لفظ سورت بغیر الف لام کے لانے سے اس طرف اشارہ پایا گیا کہ چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اس حکم میں شامل ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر تمھیں اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی تردّد ہے، اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے انسان نے خود بنالیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ، اگر تم اس کی مثال بنانے میں کامیاب ہو گئے تو بیشک تمھیں حق ہوگا کہ اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو، اور اگر تم عاجز ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے بالاتر خالص اللہ جل شانہٗ کا کلام ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہمارا عاجز ہو جانا تو اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ سبھی انسان عاجز ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی یا جماعت یہ کام کرلے، اس لئے ارشاد فرمایا، وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، شہداء، شاہد کی جمع ہے جس کے معنی حاضر کے آتے ہیں، گواہ کو بھی شاہد اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا حاضرِ عدالت ہونا ضروری ہے، اس جگہ شہداء سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں کہ سارے جہان میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو لے سکتے ہو، اور یا اس سے مراد اُن کے بُت ہیں جن کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ قیامت کے روز یہ ہمارے لئے گواہی دیں گے۔

دوسری آیت میں ان کو ڈرایا گیا کہ اگر تم یہ کام نہ کر سکو تو پھر جہنم کی ایسی سخت آگ سے بچنے کا سامان کرو جس کے انگارے آدمی اور پتھر ہوں گے، اور وہ تم ہی جیسے انکار کرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، اور اسی جملہ کے بیچ میں جو واقعہ ہونے والا تھا اُس کی خبر بھی دیدی، وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا یعنی خواہ تم کتنا ہی انفرادی اور اجتماعی زور لگاؤ تمہاری مجال نہیں کہ اس کی مثال بنا سکو۔

اس پر غور کیا جائے کہ جو قوم اسلام اور قرآن کی مخالفت اور اس کو گرانے مٹانے کے لئے اپنی جان، مال، آبرو، اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے تُلی ہوئی تھی، اس کو یہ آسان موقع دیا جاتا ہے، کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ تو تم اپنے مطلب میں کامیاب ہو سکتے ہو اور یہ کہکر ان کی غیرت کو جوش میں لایا جاتا ہے، کہ تم ہرگز یہ کام نہ کر سکو گے، مگر پوری قوم میں کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہ بڑھا، اس سے بڑھ کر کونسا اعتراف اپنے عجز کا اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ہو سکتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے، جس نے تمام سرکشوں کی گردنیں جھکا دیں۔

قرآن ایک زندہ اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف اُن کی حیات تک معجزہ ہوتے، لیکن قرآن کا معجزہ بعد وفات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت میں باقی ہے، آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دنیا کے اہلِ علم و دانش کو للکار کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لا سکا نہ آج لا سکتا ہے، اور جس کو ہمت ہو پیش کر کے دکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ مفسر جلالین نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالۂ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں، ایک قرآن کا معجزہ، دوسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں پھر کوئی اُن کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اُٹھاتا بھی نظر نہیں آتا، اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے، اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے، اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا، جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہو جاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں، تو اب اس جگہ صرف اُن کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کا حج قبول نہیں ہوا، اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہو گیا ہوتا، یہ روایت سنن

بیہقی میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں، اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز سات سات کنکریاں پھینکتا ہے، اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں، اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی، نہ اٹھائی جاتی ہیں، اور جیسا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اٹھائی ہی نہیں جاتیں، تو اگلے سال اس کا دُوگنا اور تیسرے سال تگنا ہو جائے گا، پھر کیا شبہ ہے کہ چند سال میں یہ حصۂ زمین مع جمرات کے اُن کنکریوں میں چھپ جائے گا، اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے، اور یہ مشاہدہ ہر زمانے میں رسول کریم صلی اللہ کی تصدیق اور آپ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے، سُنا ہے کہ اب یہاں سے کنکریاں اٹھانے کا کچھ انتظام ہونے لگا ہے، مگر تیرہ سو برس تک کا عمل بھی اس مضمون کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح معجزۂ قرآن ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جا سکی، آج بھی نہیں کی جا سکتی۔

اعجاز قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کریم کو کس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا گیا، اور اس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے، اور کیوں ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہو گئی۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں قرآن کی زبردست تحدّی (چیلنج) کے باوجود کوئی اس کی یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال پیش نہیں کر سکا، یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے، یہ دونوں باتیں طویل الذکر اور تفصیل کی طالب ہیں۔

وجوہ اعجاز قرآنی

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اور وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اس پر قدیم و جدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہر مفسر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں۔

اس جگہ سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب کُل علوم کی جامع کتاب، کس جگہ، کس ماحول میں، اور کس پر نازل ہوئی؟ اور کیا وہاں کچھ ایسے علمی سامان موجود تھے جن کے ذریعہ دائرۂ اسباب

میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہو سکے، جو علوم اولین و آخرین کی جامع، اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین ہدایت پیش کر سکے، جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت کا مکمل نظام ہو، اور تدبیرِ منزل سے لے کر سیاستِ ممالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالات معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ریگستانی خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا جس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی خوشگوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہونچنے کی رغبت کریں، نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں جن سے وہاں تک پہونچنا آسان ہو، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور دور تک کہیں بستی نظر آتی ہے نہ کوئی کھیت نہ درخت۔

اس پورے خطۂ ملک میں کچھ بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گذارنے والے انسان بستے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا، جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے علم و تعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے نہ کوئی بڑی یونیورسٹی یا دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دیدیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر الکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رعد کی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں، ان کی ادنیٰ ادنیٰ چھوکریاں ایسے فصیح و بلیغ شعر کہتی ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ اُن کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسہ میں حاصل نہیں کیا جاتا، غرض نہ وہاں تعلیم و تعلّم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو اُن چیزوں سے کوئی لگاؤ یا دلبستگی ہے، اُن میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اجناسِ مال کی درآمد برآمد ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر مکہ کے ایک شریف گھرانہ میں وہ ذات مقدس پیدا ہوتی ہے جو مہبطِ وحی ہے، جس پر قرآن اُترا ہے، اب اُس ذاتِ مقدس کا حال سنئے:

ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہوگئے، ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آغوشِ مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا، شریف آباء و اجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا، جس سے یتیم کی پرورش اور آئندہ زندگی کا سامان ہو سکے، نہایت عسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالات میں آپ نے پرورش پائی، اور عمر کا ابتدائی حصہ گذارا جو تعلیم و تعلّم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں

کوئی دار العلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا، مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی کسی کو نہ تھی، اسی لئے یہ پوری قوم عرب امیین کہلاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اُن کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم و تعلم سے بے خبر ہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کر سکیں جن کا قرآن حامل ہے، پھر قدرت کو تو ایک خرق العادۃ معجزہ دکھلانا تھا، آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے معمولی نوشت و خواند جو ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں آپ نے وہ بھی نہ سیکھی، بالکل اُمّیِ محض رہے، کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے، عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا، جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے، اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا، آپ کو حق تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ لی، نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

ہاں اُمّیِ محض ہونے کے ساتھ بچپن سے ہی آپ کی شرافتِ نفس، اخلاق فاضلہ، فہم و فراست کے غیر معمولی آثار دیانت و امانت کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی ذاتِ مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مغرور و متکبر سردار آپ کی تعظیم کرتے تھے، اور سارے مکہ میں آپ کو امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

یہ اُمّیِ محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، کسی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہاں جاکر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف ملکِ شام کے دو تجارتی سفر ہوئے، وہ بھی گنے چنے چند دن کے لئے جس میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس اُمّیِ محض ذاتِ مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکہ میں اپنی برادری میں اس طرح گذری کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مکتب میں گئے، نہ کسی مجلس میں کوئی نظم و قصیدہ ہی پڑھا، ٹھیک چالیس سال کے بعد اُن کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام قرآن ہے جو اپنی لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے محیر العقول کلام ہے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ اس نے ساری دنیا کو تحدّی کی، چیلنج دیا کہ کسی کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا مثل بنا لائے۔

اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدّی اور چیلنج اور دوسری طرف ساری دنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی مال جان، اولاد، آبرو سب گنوانے کو تیار ہیں، مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا، کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لائے، فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثال و بے نظیر بھی نہ ہوتی، جب بھی ایک اُمّیِ محض کی زبان سے اس کا ظہور اعجاز

قرآن اور وجوہ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجازِ قرآن کی دوسری وجہ

اب اعجاز قرآن کی دوسری وجہ دیکھئے، یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ساری دنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے بلاواسطہ اور پہلے مخاطب عرب تھے، جن کو اور کوئی علم و فن آتا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہنر اور پیدائشی وصف تھا جس میں وہ اقوامِ دنیا سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، قرآن اُن کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہیں میرے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو تم میری ایک سورت کی مثال بنا کر دکھلا دو، اگر قرآن کی یہ تحدی (چیلنج) صرف اپنے حُسن معنوی یعنی حکیمانہ اصول اور علمی معارف و اسرار ہی کی حد تک ہوتی تو قوم امیین کے لئے اس کی نظیر پیش کرنے سے عذر معقول ہوتا، لیکن قرآن نے صرف حُسن معنوی ہی کے متعلق تحدی نہیں کی، بلکہ لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی پوری دنیا کو چیلنج دیا ہے، اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مستحق عرب ہی تھے، اگر فی الواقع یہ کلام قدرتِ بشر سے باہر کسی مافوق قدرت کا کلام نہیں تھا تو بلغاءِ عرب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک امّی شخص کے کلام کی مثال بلکہ اس سے بہتر کلام فوراً پیش کر دیتے، اور ایک دو آدمی یہ کام نہ کر سکتے تو قرآن نے ان کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ ساری قوم مل کر بنا لائے، مگر قرآن کے اس بلند بانگ دعوے اور پھر طرح طرح سے غیرت دلانے پر بھی عرب کی غیور قوم پوری کی پوری خاموش ہے، چند سطریں بھی مقابلہ پر نہیں پیش کرتی۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گنے چنے رفقاء کو طرح طرح کی ایذائیں دے کر چاہا کہ وہ کلمۂ اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ "یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے" تو خوشامد کا پہلو اختیار کیا عرب کا سردار عتبہ ابن ربیعہ قوم کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت و حکومت اور بہترین حُسن و جمال کی لڑکیوں کی پیشکش اس کام کے لئے کی کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، آپ نے اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سنا دینے پر اکتفاء فرمایا، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ و مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت جو قریشِ عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو، سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرتا، اور چند سطریں مقابلہ پر پیش کر دیتا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت

نہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کے کام یا کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سبؔ نے اس کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا، اور جو ان میں سے منصف مزاج تھے انھوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا، پھر اُن میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے، اور کچھ اپنی آبائی رسوم کی پابندی یا بنی عبد مناف کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے باوجود اعتراف کے محروم رہے، قریش عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل، بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا، اور اس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا، اور حج کا موسم آیا تو قریشِ مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اطراف عرب سے حجاج آئیں گے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام سنیں گے، تو فریفتہ ہو جائیں گے اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے، اس کے انسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا، اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، اُن میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، سبؔ نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطرافِ ملک سے لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلائیے کہ ہم سب وہ ہی بات کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہو جائے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہیے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ مجنون ہیں اُن کا کلام مجنونانہ بڑ ہے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا، کیونکہ یہ لوگ جب اُن کے پاس جائیں گے، اور اُن سے ملاقات و گفتگو کریں گے، اور ان کو ایک فصیح و بلیغ عاقل انسان پائیں گے تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں، ولید نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے وہ تو شعر و شاعری کے ماہر ہیں، انھیں یقین ہو جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب لوگ تمھیں جھوٹا سمجھیں گے، پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں، جو شیاطین و جنات سے سُنکر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں، ولید نے کہا یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب لوگ اُن کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائیگا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمھیں ہی جھوٹا سمجھیں گے، اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے اُن کو ان الفاظ میں بیان کیا:

"خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اشعارِ عرب سے میرے برابر واقف نہیں،
خدا کی قسم! اس کلام میں خاص حلاوت ہے، اور ایک خاص رونق ہے، جو میں کسی شاعر
یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا"

پھر اُن کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے پھر ہم کیا کریں؟ اور اُن کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا، پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم اُن کو ساحر کہو، کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔

قوم اس پر مطمئن اور متفق ہوگئی، اور سب نے یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا! اطرافِ عرب کے لوگ آئے قرآن سُنا اور بہت سے مسلمان ہوگئے، اور اطرافِ عرب میں اسلام پھیل گیا (خصائص کبریٰ)

اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:

"اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب اُن کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں اُن کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے اب جب کہ اُن کے سر میں سفید بال آنے لگے، اور انھوںؐ نے ایک بے مثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، اُن کے کلام سنے ہیں، اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور اُن کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے، اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، اُن کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں، پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سُنی ہے، اُن کے مختلف اور مختلط کلام سُنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم تم انصاف کے ساتھ اُن کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں" (خصائص کبریٰ ص ۱۱۴ ج ۱)

حضرت ابوذر صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی اُنیس ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اس نے واپس آکر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے، میرا بھائی اُنیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے

کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں، اُن کا کلام نہ شعر ہے نہ کہانت ہی، نہ مجنونانہ کلمات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سنکر میں نے مکہ کا سفر کیا، اور مسجد حرام میں آکر پڑ گیا تیس روز میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی نہ کوئی ضعف محسوس کیا (خصائص ص ۱۱۶ ج ۱)

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے روم اور فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام بہت سنے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور حمیر کے مقالات بہت سُنے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سُنی، تم سب میری بات مانو، اور آپ کا اتباع کرو، چنانچہ فتح مکہ کے سال میں اُن کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہونچ کر مسلمان ہوگئے (خصائص ص ۱۱۶ ج ۱)

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل اور اخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھُپ کر قرآن سُنا کرتے، اور اس کے عجیب وغریب، بےمثل وبےنظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے، مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بےنظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے ؟ تو ابوجہل کا جواب یہ تھا کہ تمھیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے، وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں، اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اب وہ یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے اب ہم اس میں کیسے اُن کا مقابلہ کریں، میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا (خصائص)

خلاصہ کلام یہ ہو کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا، بلکہ اس کے بےمثل وبےنظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہوجاتی۔

قرآن اور پیغمبر قرآن کے مقابلہ میں جان ومال، اولاد وآبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہوگئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرکے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کردیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال وافعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے، جب انھوں نے قرآن کو سُنکر یہ سمجھ لیا کہ جب درحقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لاسکتے تو محض دھاندلی اور کٹھ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے

تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کردی تو پورے عرب کے فصحاء و بلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کردیں گے، اور خواہ مخواہ رُسوائی ہوگی، اسی لئے پوری قوم نے سکوت اختیار کیا، اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انھوں نے صاف طور پر اقرار و تسلیم بھی کیا جسکے کچھ وقائع پہلے بیان ہوچکے ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اقرار کیا کہ:

"ہم نے خواہ مخواہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرکے اپنے رشتے ناتے توڑے اور تعلقات خراب کئے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں، ہرگز جھوٹے نہیں اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہوسکتا"

(خصائص، ص ۱۱۶ ج ۱)

قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسمّیٰ قیس بن نسیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ سے قرآن سُنا، اور چند سوالات کئے جن کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تو یہ اُسی وقت مسلمان ہوگئے، اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے، تو لوگوں سے کہا:

"میں نے روم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سُنے ہیں، بہت سے کاہنوں کے کلمات سُننے کا تجربہ ہوا ہے، حِمیَر کے مقالات سنتا رہا ہوں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سُنا، تم سب میری بات مانو اور ان کا اتباع کرو" انھیں کی تحریک و تلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگئے"

(خصائص ۱۱۶ ج ۱)

یہ اقرار و تسلیم صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانبدار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں بحوالہ بیہقی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک علیحدہ علیحدہ نکلا، ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی، اور علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپکر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گذر گئی، جب صبح ہوگئی تو سب

واپس ہوئے، اتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سُنا، تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، کہ تم نے یہ بُری حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے، کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہوگئی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ سُنکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آئی تو پھر اُن میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹیس اٹھی کہ قرآن سُنیں، اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سُنا، یہانتک کہ رات گذر گئی، اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے، تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، اور اس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا، مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذت وحلاوت نے انھیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پہونچے اور رات بھر قرآن سُنکر لوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کرلیں کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، صبح کو اخنس بن شُریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی، اور پہلے ابو سفیان کے پاس پہونچا، کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا، تو اخنس نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے، اس کے بعد وہ ابو جہل کے پاس پہونچا، اور اُس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمدؐ کے کلام کو کیسا پایا؟

ابو جہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنو عبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آتی ہے، قوم کی سیادت وقیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انھوں نے سخاوت وبخشش کے ذریعہ قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے اُن سے بڑھ کر یہ کام کر دکھایا، انھوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں اُن کے خاندان سے یہ آواز اٹھی کہ ہمارے میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس لئے ہم نے تو یہ طے کرلیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے اُن کا مقابلہ کریں گے، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے (خصائص ص ۱۱۵ ج ۱)

یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے، یہ تمام واقعات علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ اعجاز قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں، اور ہو بہو اسی طرح واقعات

پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم و فارس کے مقابلہ میں ابتداءً اہل فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبرؓ سے ہار جیت کی شرط کرلی اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی، اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ایک قسم کا جوا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امورِ غیبیہ کے متعلق قرآن میں دیگئیں اور ان کی سچائی بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی۔

چوتھی وجہ چوتھی وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی اُمتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے بڑے علماء یہود و نصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا نہ کسی عالم کی صحبت اٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداءِ دنیا سے آپؐ کے زمانہ تک تمام اقوامِ عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے، کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس کی متعدد آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی اور پھر اُن کے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ وہ بات صحیح اور سچی تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کرسکتا ہے، کسی بشر سے عادۃً ممکن نہیں، مثلاً ارشاد قرآنی ہے:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (۳: ۱۲۲)	"جب تمہاری دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کیا کہ پسپا ہوجائیں۔"

اور یہ ارشاد کہ:۔

يَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۔ (۵۸: ۸)	"وہ لوگ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا"

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو انھوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا۔

چھٹی وجہ چھٹی وجہ اعجازِ قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشینگوئی کی کہ وہ فلاں کام نہ کرسکیں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کرسکے، جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کے

دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انھیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہئے، وہ ذرا موت کی تمنا کرکے دکھائیں اور پھر ارشاد فرمایا:

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (۲: ۹۵) | "وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرسکیں گے"

موت کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے ارشاد کی وجہ سے اُن کو تمنائے موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اعلان کرتے۔

مگر یہود ہوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے، اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے تو فوراً مرجائیں گے اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کردے۔

ساتویں وجہ وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص و عام اور مؤمن و کافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سُنا، جب آپ آخری آیات پر پہونچے تو جبیرؓ کہتے ہیں کہ میرا دل گویا اُڑنے لگا، اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ (۵۲: ۳۵-۳۷) | "کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ، یا وہی ہیں بنانے والے، یا انھوں نے بنائے ہیں آسمان اور زمین؟ کوئی نہیں، پر یقین نہیں کرتے، کیا اُن کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے، یا وہی داروغہ ہیں"

آٹھویں وجہ یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سُننے سے کوئی اُکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اُس کا شوق اور بڑھتا ہے، دنیا کی کوئی بہتر سے بہتر اور مرغوب کتاب لے لیجئے اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہی نہ سننے کو یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اُتنا ہی اس کو شوق و رغبت بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے،

وہ قیامت تک بغیر کسی ادنی تغیر و ترمیم کے باقی رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں ہر قرن ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر و زبر کی غلطی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیر و زبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا بہت سے مذاہب کی کتابوں میں تو آج یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی، اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانے میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دنیا میں بہ نسبت منکرین اور کافروں کے بہت کم رہی، اور ذرائع نشر و اشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معتد بہ حصہ نصیب نہ تھا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابوں اور صحیفوں پر موقوف نہیں رکھا جن کے جل جانے اور محو ہو جانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے بندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دنیا کے قرآن (معاذ اللہ) نابود کر دیئے جائیں، تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اسی طرح محفوظ رہیگی، چند حافظ مل کر بیٹھ جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری لکھی جا سکتی ہے، یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے، کہ جس طرح اللہ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرف نہیں چل سکتا اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، قرآن کی یہ پیشینگوئی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہے، اور تا قیامت انشاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک و شبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

دسویں وجہ وہ علوم و معارف ہیں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے کہ اتنے مختصر حجم اور محدود کلمات میں اتنے علوم و فنون جمع کئے جا سکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے، شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک اور پھر عمرانیات و اجتماعیات اور سیاستِ ممالک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کر دے۔

پھر صرف نظری اور علمی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظامہائے دنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب عظیم پیدا کرنا جس کی نظیر نہ قرونِ اُولیٰ میں مل سکتی ہے نہ قرونِ مابعد میں، یہ حیرت انگیز انقلاب کیا کسی انسان کی قدرت اور اس کی حکمت عملی کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ انسان بھی اُمّی اور اس کی قوم بھی اُمّی ہو ے

مخدرات سراپردہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

یہ ہیں وہ محیّر العقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کو کلام الٰہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہے جس کی عقل و بصیرت کو تعصب و عناد نے بالکل ہی برباد نہ کر دیا ہو۔

یہاں تک کہ اس دور مادہ پرستی کے مسیحی مصنفین جنھوں نے کچھ بھی قرآن میں غور و فکر سے کام لیا اس اقرار پر مجبور ہو گئے کہ یہ ایک بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔

فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈریس جس کو حکومت فرانس کی وزارت معارف نے قرآن حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مامور کیا تھا اس نے اعتراف کیا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

> "بے شک قرآن کا طرزِ بیان خالق جلّ و علا کا طرز بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق و معارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ ایک کلام الٰہی ہی ہو سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیرِ عظیم کو دیکھتے ہیں تو تسلیم و اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں، پچاس کروڑ مسلمان جو سطح زمین کے ہر حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اُن میں قرآن کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالاجماع اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ جس مسلمان نے اسلام اور قرآن کو سمجھ لیا وہ کبھی مرتد ہوا یا قرآن کا منکر ہو گیا ہو"

مسلمانوں میں تاثیرِ قرآنی کا یہ اعتراف اس مسیحی مستشرق سے ایک ایسے دور میں ہو رہا ہے جبکہ خود مسلمان اسلام اور قرآن سے بیگانہ اس کی تعلیمات سے دور اس کی تلاوت سے غافل ہو چکے ہیں، کاش؛ یہ مصنف اسلام اور قرآن کے اُس دور کو دیکھتا جب کہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کا عمل تھا اور انکی زبانوں پر قرآن کی آیات تھیں۔

اسی طرح دوسرے مسیحی مصنفین نے بھی جو منصف مزاج ہیں اسی قسم کے اعتراف کئے ہیں مسٹر ولیم میور نے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے، اور ڈاکٹر شبلی شمیل نے اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

قرآن کے کلامِ الٰہی اور معجزۂ نبوی ہونے پر دس وجوہ آپ سُن چکے ہیں، آخر میں ایک اجمالی نظر اس پر ڈالئے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی یتیم ہو کر دنیا میں تشریف لائے ہیں، عمر بھر کسی مکتب میں قدم نہیں رکھتے، قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے، اپنا نام بھی خود نہیں لکھ سکتے، اسی میں جوان ہوتے ہیں، آپ کی طبیعت عزلت پسند ہے، کسی کھیل تماشہ، جلسوں، ہنگاموں میں جانے کے بھی عادی نہیں، شعر و سخن سے بھی مناسبت نہیں، کسی قومی اجتماع میں کبھی کوئی خطبہ دینے یا تقریر کرنے کا بھی عمر بھر اتفاق نہیں ہوتا، چالیس سال ہونے کے بعد جب کہ ادھیڑ عمر میں پہونچ جاتے ہیں، اور عادۃً کسی علم کے سیکھنے سکھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے اُس وقت آپ کی زبان مبارک پر ایک ایسا محیر العقول جامع حقائق فصاحت و بلاغت میں اعجاز نما کلام آنے لگتا ہے، جو کسی بڑے سے بڑے عالم، ماہر اور فصیح و بلیغ سے بھی ممکن نہیں جس کے ذریعہ آپ عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہونچ کر خطبے دیتے ہیں، اور پوری دنیا کے لئے عموماً عرب کے لئے خصوصاً یہ چیلنج سناتے ہیں کہ کوئی اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہ کرے تو اس کے کسی چھوٹے سے حصہ کی مثال بنا کر دکھلادے، اس پر پوری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

پوری قوم جو آپ کو پہلے امین کے لقب سے پکارتی اور تعظیم کرتی تھی، آپ کی مخالف ہو جاتی ہے اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت اور ہر انسانی خواہش کی چیزیں پیش کرتی ہے آپ ان میں سے کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، پوری قوم آپ کو اور آپ کے رفقاء کو ستانے، ظلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ یہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں، مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھوڑتے قوم آپ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑتا ہے، آپ کی قوم آپ کو وہاں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

سارا عرب اور اہل کتاب آپ کی مخالفت پر جمع ہو جاتا ہے، آئے دن مدینہ پر حملے ہوتے ہیں آپ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قرآن ان کو غیرت دلاتا ہے اس پر بھی ان کی رگِ حمیت میں حرکت نہیں ہوتی

صرف یہی نہیں کہ پورا عرب قرآن کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا، بلکہ خود وہ ذاتِ اقدس جس پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی حدیث جس طرح کا ہے قرآن کا کلام یقیناً اس سے ممتاز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ

"جو لوگ آخرت میں ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی جیسا ایک اور قرآن بنا دیجئے یا اسی کو بدل دیجئے، تو

اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ (۱۵:۱۰)	آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں ۔

ایک طرف تو قرآن کے یہ کھلے کھلے معجزات ہیں جو اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر شاہد ہیں، دوسری طرف اس کے مضامین و مضمرات اور حقائق و معارف پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے زیادہ محو حیرت بنا دینے والی چیز ہے۔

نزولِ قرآن کے ابتدائی دَور کے چند سال تو اس حالت میں گذرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھلے طور پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر لوگوں کو اصولِ قرآنی کی طرف دعوت دیتے تھے، پھر بے شمار مزاحمتوں اور مخالفتوں کے نرغہ میں کچھ علانیہ دعوت بھی شروع کی جاتی ہے، مگر قرآن کریم کے مجوزہ قانون کی تنفیذ کا کوئی امکان نہ تھا۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے آزادی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، جس میں قرآنی نظام کی مکمل تعلیم اور تنفیذ کی کوشش اور کوئی تعمیری کام کیا جا سکتا تھا۔

لیکن اُن دس سال میں بھی آپ تاریخِ اسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی چھ سال دشمنوں کے نرغہ اور منافقین اور یہود مدینہ کی سازشوں سے کس کو فرصت تھی کہ کوئی تعمیری کام اور ایسا نظام جو ساری دنیا کے نظاموں سے مختلف ہے، عملی طور پر نافذ کرسکے، مسلمانوں کے خلاف سب بڑے بڑے معرکے انھیں چھ سال کے اندر پیش آئے، غزوۂ بدر، اُحد، احزاب وغیرہ سب اسی مدّت کے اندر ہوئے، ہجرت کے چھٹے سال دس سال کے لئے حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا گیا اور صرف ایک سال اس معاہدہ پر قریشِ عرب قائم رہے، اس کے بعد انھوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا، اور پھر جنگ و جہاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ظاہر اسباب میں صرف یہ ایک دو سال ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے ملے، کہ قرآن کی دعوت کو عام کرسکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کرسکیں، اسی عرصہ میں آپ نے بڑے بڑے سلاطینِ دنیا کو خطوط لکھے، قرآن کی دعوت اُن کو پہونچائی، قرآنی نظام کو قائم کرنے پھیلانے کی سعی فرمائی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر مبارک تک اس آزادی کے صرف چار سال ہوتے ہیں جن میں فتحِ مکہ کا جہاد بھی پیش آیا اور مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

اب اس چار سال کی قلیل مدت کو دیکھئے، اور قرآن کے اس نفوذ و اثر پر نظر ڈالئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً پورے جزیرۃ العرب پر قرآن کی حکومت تھی، ایک طرف سرحدِ روم تک اور دوسری طرف عراق تک تیسری طرف عدن تک پہونچ چکی تھی ۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کرلی جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اس کو بھی نظر انداز کیا جائے کہ آپ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی بھول جایئے کہ ساری دنیا آپ کے خلاف تھی، اور مشرکین عرب یہود و نصاریٰ سب کے سب مل کر آپ کو اور قرآن کو دنیا سے مٹانے پر تُلے ہوئے تھے، بالکل سازگار فضا مان لیجئے تو بھی ایک نئے نظام، نئے قانون اور نئے اصول کی پہلے تو تدوین و ترتیب پھر اس کی تعلیم و تفہیم، پھر اس کی عملی تنفیذ اور اس کے ذریعہ ایک پاکباز معاشرہ، اور ملک بھر میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے کتنی مدت، کتنا سرمایہ، کتنے آدمی درکار ہیں، اور کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو حاصل تھے؟ آج کے نظاموں کو سامنے رکھ کر حساب لگایئے تو ایک اندھے کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی کہ یہ نفوذ واثر یہ رُوحانی تاثیر بجز خاص قدرتِ الٰہیہ کے کسی طرح ظاہر نہیں ہوسکتی۔

اعجازِ قرآنی کے پورے وجوہ اور اُن کی تفصیلات کا بیان ایک نہایت طویل بحث ہے، علماءِ اُمت نے اس پر بیسیوں مستقل کتابیں ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں۔

سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے نظم القرآن کے نام سے مستقل کتاب لکھی پھر چوتھی صدی کے اوائل میں ابوعبداللہ واسطی نے بنام اعجاز القرآن ایک کتاب تصنیف کی، پھر اسی صدی میں ابن عیسیٰ ربانی نے ایک مختصر رسالہ بنام اعجاز القرآن لکھا، قاضی ابوبکر باقلانی نے پانچویں صدی کے اوائل میں اعجاز القرآن کے نام سے ایک مفصل و مبسوط کتاب لکھی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان اور خصائص کبریٰ میں امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں، قاضی عیاضؒ نے شفاء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس مضمون کی تفصیل لکھی، آخری دَور میں مصطفےٰ صادق رافعی مرحوم نے اعجاز القرآن کے نام سے اور جناب سید رشید رضا مصری نے الوحی المحمدی کے نام سے مستقل، جامع اور مبسوط کتابیں لکھیں، اردو زبان میں استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک رسالہ بنام اعجاز القرآن تصنیف فرمایا۔

یہ بھی قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے ایک ایک مسئلہ پر مکمل تفسیروں کے علاوہ مستقل رسائل و کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس جگہ بیان نہیں ہوسکتا لیکن جتنا بیان ہوچکا ہے وہ بھی ایک منصف مزاج انسان کو اس پر مجبور کردینے کے لئے کافی ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ تسلیم کرلے۔

چند شبہات اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہو کہ قرآن کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔

لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رہے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو کہ ذرائع نشر و اشاعت جتنے منکرین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر قرون میں اس کا کوئی قابل ذکر حصہ حاصل نہیں رہا، قرآن اتنا بلند بانگ دعویٰ اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، اُن کو چیلنج دیتا ہے، غیرتیں دلاتا ہے، اور مخالفین اسلام اس کے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اگر انھوں نے قرآن کا چیلنج قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوتی، اور ہر زمانہ میں منکرین قرآن مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کو پیش نہ کرتے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و قدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اسلام کے قرن اوّل میں صرف ایک واقعہ مسیلمہ کذاب یمامی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے اُلٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحی آسمانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جانتی ہو کہ اُن کلمات کا کیا حشر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے مُنہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شرمناک غیر مہذب تھے کہ کسی مہذب سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا، اور بہرحال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی، اور منکرین قرآن اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ، جو قرآن کے مقابلہ پر ہر وقت سینہ سپر تھے قرآن کے اس چلینج کے جواب میں انھوں نے طرح طرح کی باتیں کیں جن کو قرآن میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کر کے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو، ایک رومی غلام جو مدینہ میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور کچھ تورات و انجیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا، عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب و عناد سے یہ مشہور کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں قرآن نے اُن کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے، عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ قرآن عربی کی انتہائی بلیغ کتاب ہو سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۰۳ دیکھئے:

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ (ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفین اسلام یہ کہتے ہیں

أَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۝ (۱۶: ۱۰۳)	آپ کو یہ قرآن ایک آدمی سکھا تا ہو حالانکہ وہ جس آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ عجمی ہے ، اور قرآن ایک بلیغ عربی زبان میں ہے ؛

کچھ لوگوں نے قرآن کی تحدی کے جواب میں یہ کہا کہ :

لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا (۸: ۳۱)	" اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہدیتے "

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں ؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا ، جان و مال کی قربانی دی ، اگر تمھیں اس کا مثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس تحدی کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہ لیا ؟

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوی کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کرلیا بلکہ جو کچھ اُن کے مُنہ پر آیا اس کے مقابلہ پر کہتے رہے ، لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہ کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے ، اس لئے قرآن کا یہ دعویٔ یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے ۔

بعض معاندین کو یہ سُوجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قبل از نبوت چند روز کے لئے ملک شام تشریف لے گئے ، اور راستہ میں بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی وہ تورات کا ماہر تھا ، اس سے آپ نے علوم سیکھے ، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ سارے علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز ، اخلاقی تربیت ، نظامِ خانگی ، نظامِ مملکت کیسے سیکھ لئے ۔

آجکل کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ خدا کا کلام یا معجزہ ہے ، ہوسکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر بلاغت کوئی نثر یا نظم ایسی لکھے کہ دوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لاسکیں ۔

سعدی شیرازی کی گلستاں ، فیضی کی تفسیر بے نقط کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں ؟

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامانِ تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا ، کتنے عرصہ تک انھوں نے تعلیم حاصل کی ، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے ، راتوں جاگے ، مدتوں محنتیں کیں ، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے ، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے نتیجہ میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبّی یا کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں یا ہومر یونانی میں یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے ہیں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ اسبابِ متعارفہ کے توسط کے بغیر وجود میں آئے ، کیا ان

لوگوں کی باقاعدہ تحصیلِ علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت وصحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاق ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب و قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی مدرسہ ومکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہوجانے کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم وحکمت حاصل ہو، اس کو بھی آپ ہی کے فیضِ تعلیم کا اثر قرار دیں، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بے مثل وبے نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت وبلاغت اور نظم وترتیب ہی بے مثال نہیں، لوگوں کے دل ودماغ پر اس کی تاثیراتِ عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہوگئی، عرب کے تندخو، گنوار حلم واخلاق اور علم وحکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انقلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہوجائے، اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علیٰ صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، اُن کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

"اس پیغمبر اسلام اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر وزبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُمّی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے"۔

مسٹر ڈوول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

"جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اُسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں مسخر کرلیتی ہے، متحیر بنادیتی ہے، اور آخر میں ہم سے تعظیم کراکر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین واغراض کے،

عفیفۂ عالی شان اور تہدید آمیز ہو اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں، غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اثر دکھاتی رہے گی۔" (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنروی کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تأثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

"عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل اُمّی تھا، تمام مشرق نے اقرار کرلیا ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معنًی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالبؓ نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہوگئے، اور بشپ چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا"

(شہادۃ الاقوام ص ۱۴)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶ ص ۵۹۹ میں ہے:

"قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاءؑ کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔"

انگلستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنتِ روما کا انحطاط و زوال) کی جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھتے ہیں:

"قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی رُوح ہے، قانونِ اساسی ہے، اور صرف اصولِ مذہب ہی کے لئے نہیں بلکہ احکام تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہو جن سے نوعِ انسان کی زندگی وابستہ ہو جن کو حیاتِ انسانی کی ترتیب و تنسیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہو کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"

اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال و اعترافات کا استیعاب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں، نمونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور باعتبار اغراض و مقاصد کے اور باعتبار علوم و معارف کے قرآن کے بے نظیر و بے مثل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں ہر زمانہ کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا اور کوئی نہ لا سکا، آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرین علم و سیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا دو کہ ایک بڑے سے بڑا ماہر حکیم فیلسوف کھڑا ہو اور ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے، اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل گنوار ہو، پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور عملی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط و مستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

"اگر تم اس کی مثال نہ لا سکے اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر اس جہنم کی آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے"

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

اور خوشخبری دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ اُن کے واسطے باغ ہیں کہ

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا ۙ قَالُوا

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں جب ملے گا ان کو وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ

هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا

تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے اُن کو پھل ایک صورت کے اور ان کیلئے وہاں

أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

عورتیں ہوں گی پاکیزہ اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے -

خُلاصۂ تفسِیر

اور خوش خبری سُنا دیجئے آپ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پہلے اور ملے گا بھی اُن کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (ہر بار میں ملتا جلتا پھل ملنا لطف کے واسطے ہوگا کہ دونوں مرتبہ پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی، جس سے وہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے مگر کھانے میں مزہ دوسرا ہوگا جس سے حظ دو سر در بڑھے گا)

رَبطِ آیات اس سے پہلی آیت میں قرآن کریم کو نہ ماننے والوں کے عذاب کا بیان تھا، اس آیت میں ماننے والوں کے لئے بشارت اور خوشخبری مذکور ہے جس میں جنت کے عجیب غریب پھلوں کا اور حوران جنت کا ذکر ہے۔

مَعارف ومَسائل

اہل جنت کو مختلف پھل ایک ہی شکل وصورت میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک تفریح اور لطف کا سامان بنانا ہوگا، اور بعض مفسّرین نے فرمایا کہ پھلوں کے متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جنت کے پھل صورت شکل میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، جب اہل جنت کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو دنیا میں ہمیں ملا کرتے تھے، مگر ذائقہ اور لذت میں دنیا کے پھلوں سے اُن کو کوئی نسبت نہ ہوگی، صرف نام کا اشتراک ہوگا۔

جنت میں اُن لوگوں کو پاک صاف بیبیاں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام ظاہری اور اخلاقی گندگیوں سے پاک ہوں گی، بول وبراز، حیض ونفاس اور ہر ایسی چیز سے پاک ہوں گی جن سے انسان کو نفرت ہوتی ہے، اسی طرح کج خلقی، بیوفائی معنوی عیوب سے بھی پاک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ پھر جنت کی نعمتوں کو دنیا کی آنی فانی نعمتوں کی طرح نہ سمجھو جن کے فنا ہو جانے یا سلب ہو جانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، بلکہ یہ لوگ ان نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے۔

یہاں مومنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی قید لگائی ہے

کہ ایمان بغیر عمل صالح کے انسان کو اس بشارت کا مستحق نہیں بناتا، اگرچہ صرف ایمان بھی جہنم میں خلود اور دوام سے بچانے کا سبب ہے، اور مومن کتنا ہی گناہگار ہو کسی نہ کسی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا، اور جنت میں پہونچے گا، مگر عذاب جہنم سے بالکل نجات کا بغیر عمل صالح کے کوئی مستحق نہیں ہوتا (روح البیان، قرطبی)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

سو جو لوگ مومن ہیں وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی ان کے رب کی طرف سے اور جو کافر

كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ

ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو

وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ

اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو جو توڑتے ہیں خدا

عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ

کے معاہدہ کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے

يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

کو اور فساد کرتے ہیں ملک میں وہی ہیں ٹوٹے والے۔

خُلاصۂ تفسیر

(بعض مخالفین نے قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر تمثیلات میں کیا گیا ہے جیسے مچھر، مکھی وغیرہ، اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس میں نہ ہوتا، اس کا جواب دیا گیا کہ) ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے کہ بیان کردیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں مچھر سے بھی بڑھی ہوئی) سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں (خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال بہت

ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں سو چاہے کچھ ہی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف نافرمانی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد (یعنی عہد ازل جس میں سب کی ارواح نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا) اور قطع کرتے رہتے ہیں اُن تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑنے کا (اس میں تمام تعلقات شرعیہ داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہیں یا وہ جو اس کے اور اقرباء اور رشتہ داروں کے درمیان ہیں اور عام اہل اسلام کے درمیان ہیں اور جو عام انسانوں کے درمیان ہیں) اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں (کفر و شرک خود بھی فساد ہے اور دوسروں پر ظلم اور ناحق شناسی جو کفر کے لوازم میں سے ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے) بس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے (کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے بیٹھے، کیونکہ حاسد کی دنیوی زندگی بھی ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات چند آیات پہلے قرآن کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ قرآن کریم میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں ہو تو وہ اس کی چھوٹی سی سورت کی مثل بنا کر دکھلا دے، ان آیات میں منکرین قرآن کا ایک شبہ ذکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، شبہ یہ تھا کہ قرآن کریم میں مکھی اور مچھر جیسے حقیر جانوروں کا ذکر آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی عظمت کے خلاف ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس میں ایسی حقیر گھناؤنی چیزوں کا ذکر نہ ہوتا، کیونکہ بڑے لوگ ایسی چیزوں کے ذکر سے شرم و حیا محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی حقیر و ذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے مثال دینا مقتضائے عقل و بلاغت ہے، اس غرض کے لئے کسی حقیر گھناؤنی چیز کا ذکر کرنا شرم و حیاء کے قطعاً منافی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرماتے، اور یہ بھی بتلا دیا کہ ایسے احمقانہ شبہات صرف اُن لوگوں کو پیدا ہوا کرتے ہیں جن کے قلوب اور دماغوں سے اُن کے کفر کی وجہ سے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہو، ایمان والوں کو کبھی ایسے شبہات دامنگیر نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلادی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلادیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ مچھر ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہے کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (مظہری)

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعۂ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۔ فاسقین، فسق کے لفظی معنی خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعتِ الٰہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کافروں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مؤمن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی کیلئے استعمال ہوا ہے انکی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (مظہری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو فاجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ، عہد اس صورتِ معاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور میثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجام بد کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دو وجہ ہیں،

اوّل یہ کہ ایسا کرنے والے اُس ازلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونیوالے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟" اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بَلٰی "یعنی آپ رب کیوں نہ ہوتے" جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اقرار ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی اطاعت سے سرِمُو تجاوز نہ کریں، اس لئے یہ عہدِ ازلی انسان اور اللہ جل شانہٗ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاددہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آتے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی پیغمبرؑ یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرکار کے ساتھ ہے اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعتِ اسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ، "یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں،" آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ سے ثابت ہوا کہ کسی مفید مضمون کی توضیح میں کسی حقیر ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہے، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماءِ سلف کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عرفی شرم و حیاء کی پرواہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ سے ثابت ہوا کہ عہد و معاہدہ کی خلاف ورزی شدید گناہ ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے حقوق شرعیہ ادا کرنا واجب ہے، اس کے خلاف کرنا گناہِ عظیم

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ سے معلوم ہوا کہ جن تعلقات کو قائم رکھنے کا شریعتِ اسلام نے حکم دیا ہے ان کا قائم رکھنا ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، غور کیا جائے تو دین و مذہب نام ہی ان حدود و قیود کا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس عالم کا صلاح و فساد انھیں تعلقات کو درست رکھنے یا توڑنے پر موقوف ہے، اسی لئے ان تعلقات کے قطع کرنے کو يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ کے الفاظ میں وجہِ فسادِ عالم بتلایا ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ میں خسارہ الاصرف اسی شخص کو قرار دیا ہے جو مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کرے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خسارہ اور نقصان آخرت ہی کا ہے، دنیا کا خسارہ کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ

کس طرح کافر ہوتے ہو خدا تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو پھر ماریگا تم کو

ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ ھُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي

پھر جلائے گا تم کو پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے، وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو

الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ

کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا اُن کو سات آسمان

وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳

اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

بھلا کیوں کر ناشکری کرتے ہو اللہ کے ساتھ (کہ اس کے احسانات کو بھلا دیتے ہو، اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو) حالانکہ (اس پر دلائلِ واضحہ قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی مستحقِ عبادت ہے

مثلاً یہ کہ) تھے تم بے جان (یعنی نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا پھر تم کو موت دیں گے پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر اُنہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی میدانِ قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب (یہ فائدہ عام ہے کھانے پینے کا ہو یا پہننے اور برتنے کا یا نکاح اور روح کو تازگی بخشنے کا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو فائدہ نہ پہونچتا ہو، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر استعمال حلال ہو جیسے سمیاتِ قاتلہ بھی فائدۂ انسان سے خالی نہیں، مگر اُن کا کھالینا عقلاء کے نزدیک ممنوع ہے) پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق و تکمیل کی طرف) تو درست کرکے بنا دیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں ؀

معارف و مسائل

ربط آیات پچھلی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود، توحید اور رسالت کے دلائل واضحہ اور منکرین و مخالفین کے خیالاتِ باطلہ کا رَد مذکور تھا، مذکورہ دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعامات کا ذکر کرکے اس پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم کفر و انکار میں مبتلا ہیں جس میں اس پر تنبیہ ہو کہ اگر دلائل میں غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تو کم از کم محسن کا احسان ماننا، اس کی تعظیم و اطاعت کرنا تو ہر شریف انسان کا طبعی اور فطری تقاضا ہے، اسی راستے سے تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر آجاؤ۔

پہلی آیت میں اُن مخصوص نعمتوں کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہیں کہ پہلے وہ بے جان ذرات کی صورت میں تھا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی،

دوسری آیت میں اُن عام نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فائدہ اٹھاتی ہیں، اور وہ انسان کی زندگی اور بقاء کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا ذکر کیا گیا جس سے انسان کا قریبی تعلق ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو) ان لوگوں نے اگرچہ بظاہر خدا کا انکار نہیں کیا، مگر رسولِ خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ، اموات، میت کی جمع ہے، مُردہ اور بے جان چیز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہو کہ انسان اپنی اصل حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء وہ بیجان ذرات ہیں، جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں کچھ بہنے والی چیزوں میں کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن بے جان ذرات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا، پھر اُن میں جان ڈالی، ان کو زندہ انسان بنا دیا، یہ اس کی ابتداء پیدائش کا ذکر ہے۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ " یعنی جس نے پہلی مرتبہ تمہارے بے جان ذرات کو جمع کر کے اُن میں جان پیدا کی، وہ اس عالم میں تمہاری عمر کا مقررہ وقت پورا ہونے کے بعد تمہیں موت دے گا، اور پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت میں اسی طرح تمہارے جسم کے بے جان اور منتشر ذرات کو جمع کر کے تمہیں زندہ کرے گا، اس طرح ایک موت یعنی بے جان ہونا تمہاری ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندہ کیا، دوسری موت دنیا کی پوری عمر ہونے کے وقت اور دوسری زندگی قیامت کے روز ہوگی۔

پہلی موت اور زندگی کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا، اس لئے اس میں حرف فاء استعمال کیا گیا، فَاَحْيَاكُمْ، اور چونکہ دنیا کی حیات اور موت کے درمیان اور اسی طرح اُس موت اور قیامت کی زندگی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، اس لئے وہاں لفظ ثُمَّ اختیار کیا گیا، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، کیونکہ لفظ ثُمَّ بُعدِ مدت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ " یعنی پھر تم اُسی ذات پاک کی طرف پھر کر جاؤ گے " اس سے مراد حشر و نشر اور قیامت کا وقت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس انعام و احسان کا ذکر کیا ہے جو ہر انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے، اور جو سارے انعامات و احسانات کا مدار ہے، یعنی زندگی، دنیا و آخرت اور زمین و آسمان کی جتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں وہ سب اسی زندگی پر موقوف ہیں، زندگی نہ ہو تو کسی نعمت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، زندگی کا نعمت ہونا تو ظاہر ہے، مگر اس آیت میں موت کو بھی نعمتوں کی فہرست میں شمار اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دنیا کی موت دروازہ ہے اُس دائمی زندگی کا جس کے بعد موت نہیں، اس لحاظ سے یہ موت بھی ایک نعمت ہے۔

مسئلہ: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ:

جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر ہو، یا قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا منکر ہو وہ اگرچہ بظاہر خدا کے وجود و عظمت کا انکار نہ کرے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ منکرینِ خدا ہی کی فہرست میں شمار ہے۔

حیاتِ برزخی اس آیت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے، جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی جس کے ذریعہ قبر کا سوال وجواب اور قبر میں ثواب وعذاب ہونا قرآن کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے اس کا ذکر نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اُس طرح کی زندگی نہیں ہے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہے، یا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جاسکتا ہے، اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی، اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں، جس کا جداگانہ ذکر کیا جائے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، "اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے، سب کا سب"، یہ اُس نعمتِ عامہ کا ذکر ہے جس میں تمام انسان بلکہ حیوانات وغیرہ بھی شریک ہیں، اور ایک لفظ میں اُن تمام نعمتوں کا اجمال آگیا، جو دنیا میں کسی انسان کو حاصل ہوئیں یا ہوسکتی ہیں، کیونکہ انسان کی غذاؔ، لباسؔ، مکانؔ، اور دواؔ اور راحت کے کُل سامان زمین ہی کی پیداوار ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

استواء کے لفظی معنی سیدھا ہونے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ زمین کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کا قصد راست فرمایا، جس میں کوئی حائل اور مانع نہ ہوسکے، یہاں تک کہ سات آسمانوں کی تخلیق مکمل فرمادی، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے، اس لئے تخلیقِ کائنات اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

دنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے کوئی شے بیکار نہیں اس آیت میں زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا فرمانے کا بیان ہوا ہے:

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو کسی نہ کسی حیثیت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ فائدہ نہ پہونچتا ہو، خواہ یہ فائدہ دنیا میں استعمال کرنے کا ہو، یا آخرت کے لئے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا، بہت سی چیزوں کا فائدہ تو انسان محسوس کرتا ہے، اس کی غذا یا دوا یا استعمال میں براہ راست آتی ہیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو ان سے فائدہ پہونچتا ہے، مگر اس کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں انسان کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں جیسے زہریلی اشیاء، زہریلے جانور وغیرہ، غور کریں تو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کے لئے نفع بخش بھی ہوتی ہیں، جو چیزیں انسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں دوسری کسی طرح اور حیثیت سے ان کا نفع بھی انسان کو پہنچتا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں | کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

عارف باللہ ابن عطاء نے اس آیت کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تمھارے واسطے اس لئے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمھاری ہو اور تم اللہ کے لئے ہو، اس لئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ جو چیز اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اُس ذات سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (بحر محیط)

اشیاء عالم میں اصل اباحت ہے یا حرمت

اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے حلال و مباح ہوں، کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، بجز اُن چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دیدیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن وسنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اشیاء میں حرمت ہے، جب تک قرآن وسنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقف فرمایا۔

تفسیر بحر محیط میں ابن حیانؒ نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوالِ مذکورہ میں سے کسی کے لئے حجت نہیں، کیونکہ خَلَقَ لَكُمْ میں حرف لام سببیت بتلانے کے لئے آیا ہے، کہ تمھارے سبب سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ انسان کے لئے اُن چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال و حرام کے احکام جداگانہ قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں انھیں کا اتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا بلفظ ثُمَّ بیان کیا گیا ہے، اور یہی صحیح ہے، اور سورۃ والنّازعات میں جو یہ ارشاد ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۷۹: ۳۰) "یعنی زمین کو آسمانوں کے پیدا کرنے کے بعد بچھایا" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستی اور اس میں سے پیداوار نکالنے وغیرہ کے تفصیلی کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے، اگرچہ اصل زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی (بحر محیط وغیرہ)

اس آیت سے آسمانوں کی تعداد سات ہونا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم ہیئت والوں کا آسمانوں کی تعداد نو بتلانا غلط، بے دلیل اور محض خیالات پر مبنی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب، کہا فرشتوں نے

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ
اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، فرمایا بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے، اور
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ
سکھلادیئے اللہ نے آدمؑ کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا اُن سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا
اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا
بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو، بولے
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾
پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے ہمکو سکھلایا بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا،
قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ
فرمایا اے آدم بتلادے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام پھر جب بتادیئے اس نے ان کے نام
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ
فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾
جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

خُلاصَۂ تفسیر

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں جس میں حکمت و مصلحت تھی، مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکامِ شرعیہ کے اجراء و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا) کہنے لگے کیا آپ پیدا

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ گذارش نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیازمندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں، ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیقِ بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جبھی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیقِ آدم کی تجویز فرمائی، آگے اسی حکمتِ الٰہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابتِ خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دیدیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدمؑ کو دیدیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں سچے ہو کہ ہم خلافتِ ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا ہم سے پوشیدہ رکھا کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کر کے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا) مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہوگیا کہ وہ اُس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم تم بتلادو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے روبرو بتلادیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہوگئے ہیں) سو جب بتلا دیئے اُن کو آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کردیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

ربط آیات پچھلی آیات میں اللہ جل شانہٗ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کرکے انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر رکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک صوری یعنی محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ پیسہ، مکان جائداد دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھلی آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو دولتِ علم دی، اور مسجودِ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔

خلاصۂ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے جب تخلیق آدمؑ اور دنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، اُن کو زمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گذار ہیں، دنیا کے انتظامات بھی وہ درست کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اوّل ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافتِ ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقامِ علم میں آدمؑ کے تفوّق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافتِ ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور اُن کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔

تخلیقِ آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت حق جلّ وعلا شانہٗ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا اُن سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیشِ نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے اُن کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشار تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہلِ دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو اُن کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز اُن کے علم و بصر کے سامنے برابر ہے، اُن کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب اُن کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ اُن کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ (۲۱: ۲۳)

(اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا)

بات یہی ہے کہ در حقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اُس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنتِ مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرامؓ سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپؐ تو صاحبِ وحی ہیں، تمام معاملات اور اُن کے تمام پہلو آپؐ کو بذریعہ وحی بتلائے جا سکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیمِ مشورہ کا حاصل ہوا (کمافی روح البیان) دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: لَنْ يَّخْلُقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَّا وَلَا اَعْلَمَ (یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرماویں گے) حضرت حق جل شانہٗ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیازمندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفۂ زمین بناتے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادّہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کرسکتا ہے، جبکہ وہ خود خوں ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادّہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبادت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہٗ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کرکے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے؟

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافتِ الٰہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھلائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ملکی متحمل نہیں، فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بچھو کا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدمؑ ہی کو سکھلایا جا سکتا تھا، انہی کو سکھلایا گیا، پھر قرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدمؑ کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدمؑ اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں اُن چیزوں کا علم ابتداءِ آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداءِ ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر اُن کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو اُن کو کیوں نہ سکھایا گیا؟ مگر اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنا دیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور اُن کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر اُن مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان کے زیادہ موزوں ہیں تو اُن چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفۂ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج وطبائع سے اور ان کے خواص وآثار سے پورا واقف ہو، اس کے بغیر وہ اُن پر عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کسی کو بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو، اُن کے استعمال کے طریقوں اور اُن کے ثمرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں، تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر وغرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے فوراً بول اٹھے: سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا اقرار تھا کہ زیادہ اعلم وافضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہے کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انھیں علمِ غیب تھا؟ یا محض اٹکل اور تخمینہ سے انھوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہورِ محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفۂ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی نے اُن کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد وخوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہٗ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی تفوق کا اظہار فرما کر دیدیا گیا، اور فساد وخوں ریزی نے جو شبہ اس کے استحقاقِ نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت وخلافت کے منافی سمجھ رہے ہو درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابتِ زمین کی ضرورت ہی رفعِ فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلا دیا گیا کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیئے جس سے کسی گناہ خطاء کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء خداوندی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذباتِ شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضعِ لغت خود حق تعالیٰ ہیں اس قصۂ آدم علیہ السلام اور تعلیمِ اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضع خود حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے استعمالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کو واضعِ لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر اس واقعہ میں قرآن حکیم کے یہ بلیغ الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ اَنۡۢبِئۡهُمۡ فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرزِ بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلّم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا ہے۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ اُن کو بھی اُن چیزوں کا اجمالی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

خلافتِ ارض کا مسئلہ زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کسی نائب کا مقرر ہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدارِ اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶: ۵۷) اور لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۲: ۱۰۷) اور اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (۷: ۵۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذنِ خداوندی زمین پر سیاست و حکومت اور بندگانِ خدا تعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکامِ الٰہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا تقرر بلاواسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسب عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسبی چیز نہیں، جس کو کوئی اپنی سعی و عمل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کیلئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، قرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۲: ۷۵)

"اللہ تعالیٰ انتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے اپنے رسول کو اور انسانوں میں سے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے"

نیز ارشاد ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ (۶: ۱۲۴)

"اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کس کو عطا فرما دیں"

یہ خلیفۃ اللہ بلا واسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر اُن کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلۂ خلافت و نیابتِ الٰہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل انبیاء خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، اُن کا حلقۂ حکومت و اختیار اُنہی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ ہیں اور آپ کی خصوصیات،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی طرف بھیجا گیا، آپ کا اختیار و اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی فرمایا گیا، قرآن کریم نے آپ کی بعثت و نبوت کے عام ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (۷: ۱۵۸)

"آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں، تم سب کی طرف، اللہ وہ ذات ہے جس کے قبضہ میں ہے ملک آسمانوں اور زمین کا۔"

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت و نیابت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاءؑ بنا دیا، کہ آپ کی خلافت و نیابت قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین و آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوتے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، قرآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے تو الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۵: ۹)	"ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں"

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپؐ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپؐ کے علوم و معارف اور آپؐ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہونچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مٹا نہ سکیگا اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مسخ و محرّف ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپؐ کے بعد نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفۃ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاءؑ کی خلافت و نیابت جو محدود زمانہ کے لئے ہوتی تھی، ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول منجانب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظامِ خلافت

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت و نیابت تا قیامت ہے، اس لئے قیامت تک آپؐ ہی اس زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں، آپؐ کی وفات کے بعد نظامِ عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفۃ الرسول اور آپکا نائب ہوگا، صحیح بخاری مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

كَانَتْ بَنُوْٓا اِسْرَآئِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَّاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَآءُ فَيَكْثُرُوْنَ

"بنی اسرائیل کی سیاست و حکومت اُن کے انبیاء کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی آجاتا تھا، اور خبردار ہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، ہاں میرے خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے"

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیدیا، کہ آپؐ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا مظہر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماعِ امت قرار دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَنْ تَجْتَمِعَ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ

"میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی"

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری اُمت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضمحل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہوگیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفۂ رسولؐ کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابتِ زمین اور نظمِ حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہوگیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کرے وہ خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت سے نظامِ عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے آخری عہد تک یہ سلسلۂ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین	"میری سنت کو لازم پکڑو اور خلفاء راشدین کی سنت کو"

خلافتِ راشدہ کے بعد خلافتِ راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے،

اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہوگیا، اور ہر ملک، ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور اولوالامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ (۴۲: ۳۸) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت میں فرق اسمبلیاں اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں فرق اتنا ہے کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران بالکل آزاد اور خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا برا قانون بناسکتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر اُن کی قانون سازی بھی قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہوسکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کرکے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات کا ثبوت اوّل: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہٗ کا ہے، دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ خلافتِ الٰہیہ کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، تو اب خلافتِ رسولؐ کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب سے قرار پایا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾
اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں کا

خُلاصۂ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدہ میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے، سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہوگیا کافروں میں سے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہوچکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہوگیا کہ صلاحیتِ خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اُن کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہوگیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جاوے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور مصداق ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قویٰ کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور رہا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جاوے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہوجاوے کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں، اور گویا بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یکجا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

کیا سجدہ کا حکم جنات کو بھی تھا اس آیت میں جو بات صراحۃً مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آگے جب استثنار کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدۂ آدمؑ کا حکم اُس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفار کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بدرجۂ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

سجدۂ تعظیمی پہلی اُمتوں میں جائز تھا اسلام میں ممنوع ہے اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (۱۲: ۱۰۰) یہ تو ظاہر ہے کہ سجدۂ عبادت کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاءؑ کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہو گا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاءؑ سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، شریعتِ محمدیہ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اجازت دی گئی، رکوع، سجدہ اور بہیئتِ نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیدیا گیا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر و شرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اصولِ ایمان کے خلاف ہے، وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن کچھ افعال و اعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک و کفر نہیں، مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک و کفر کا بن سکتے ہیں ایسے افعال کو انبیاء سابقینؑ کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو ذریعہ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے:

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (۳۴: ۱۳)	"یعنی جنات اُن کے لئے بڑی محرابیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے"۔

اسی طرح سجدۂ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں، اور اسی راہ سے انبیاء علیہم السلام کے دین و شریعت

میں تحریف ہوگئی، اور پھر دوسرے انبیاءؑ اور دوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا، شریعت محمدیہؐ چونکہ دائمی اور ابدی شریعت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت ختم اور آپؐ کی شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو مسخ و تحریف سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و بت پرستی آسکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دیدی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و بُت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں۔

تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، سجدۂ تعظیمی اسی وجہ سے حرام ہوا ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کر دیا گیا جن میں مشرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں، اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں، حالانکہ لفظی معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنیوالے کے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھولدیں اس لئے ان الفاظ کے استعمال کو روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے، یہ سجدۂ تعظیمی تھا، جو اُن کی شریعت میں سلام، مصافحہ، اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا، اور جائز تھا، شریعتِ محمّدیہ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا رکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز جو اصل عبادت ہے اس میں چار طرح کے افعال ہیں، کھڑا ہونا بیٹھنا، رکوع، سجدہ، ان میں سے پہلے دو یعنی کھڑا ہونا اور بیٹھنا تو ایسے کام ہیں جو عادۃً بھی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے، اور عبادۃً بھی نماز میں کئے جاتے ہیں، مگر رکوع اور سجدہ ایسے فعل ہیں جو انسان عادۃً نہیں کرتا، وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعتِ محمّدیہ میں عبادت ہی کا حکم دے کر غیر اللہ کے لئے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ سجدۂ تعظیمی کا جواز تو قرآن کی مذکورہ آیات سے ثابت ہے شریعتِ محمّدیہ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ مشہورہ سے سجدۂ

تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں سجدۂ تعظیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)

یہ حدیث بیسؔ صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصولِ حدیث کی معروف کتاب تدریب الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دسؔ صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہوجاتی ہے، جو قرآن کی طرح قطعی ہے، یہاں تو بیس صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ بیس صحابہ کی روایتیں حاشیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں، ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں

مسئلہ:۔ ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کردینا اصولِ شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم ربّانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

ابلیس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا

مسئلہ:۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبّر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی دی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کرلی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ حُبِّ جاہ اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کردیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائیدِ حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے، ؎

اِذَا لَمْ یَکُنْ عَوْنٌ مِّنَ اللّٰہِ لِلْفَتٰی
فَاَوَّلُ مَا یَجْنِیْ عَلَیْہِ اِجْتِہَادُہٗ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہے جو آخر عمر اور اوّل منازلِ آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرّہ نہ ہونا چاہئے (روح)

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم،

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا

پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اترو

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بی بی (جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا) بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرما دیا، اور پھر آقا کو اختیار ہے کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے) پس لغزش دیدی آدم و حوّا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کرکے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعادِ معیّن تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا تکملہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب آدمؑ کی فضیلت اور خلافتِ ارضی کیلئے صلاحیت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر نکال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوّا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدمؑ کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھائے ہوئے تھا اُس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر اُن دونوں کو اُس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، اُن کی لغزش کی وجہ سے اُن کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، "اور ہم نے کہا کہ اے آدم! ٹھہرو تم اور تمہاری زوجہ جنت میں" ـــــ یہ واقعہ حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک اُن کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سُنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن و مستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سُنایا گیا۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ـ رَغَدًا کے معنی عربی لغت میں اُس نعمت و رزق کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت و مشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا ختم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم و حوّاء علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل بافراغت استعمال کرتے رہو، نہ اُن کے حاصل کرنے میں تمھیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ فکر کہ یہ غذا ختم یا کم ہو جائے گی۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہو کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کونسا تھا قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعیین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن و حدیث نے مبہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اگر آپ نے اس شجرِ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا ـ زَلَّةٌ کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، اِزْلَالٌ کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم و حوّاء کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم و حوّا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اُس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنْهَا میں لفظ عَنْ بمعنی سبب ہو، یعنی اُس درخت کے سبب و ذریعہ سے شیطان نے آدم و حوّاء کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم وحوا۔ کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر ملاقات کے اُن کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہو کہ اپنی قوتِ جنیہ کے ذریعہ مسمریزم کی صورت سے آدم وحوا، کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۷: ۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا بلکہ آدم وحوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ۔ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم وحوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گذر بسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اُتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم وحوا ہیں، اور شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا رُخ آدم وحوا، اور اُن کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہو کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطفِ زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہو گی۔ (بیان القرآن)

وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ یعنی آدم وحوا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک میعاد معیّن تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آیاتِ مذکورہ سے متعلق مسائل و احکامِ شرعیہ

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے، جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے اُسْكُنَا الْجَنَّةَ۔ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد كُلَا اور لَا تَقْرَبَا میں دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَزَوْجُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرف حضرت آدمؑ کو قرار دیا اور انہی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے:۔

مسئلہ: اوّل یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ: لفظ اُسْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اُسْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیدیا گیا یہ تمہارا مکان ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل صالح کرکے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہے، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی)

غذا و خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا "یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے بافراغت" اس میں بطرز مذکور سابق خطاب حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کرکے كُلَا مِنْهَا فرمایا اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت و خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا لفظ رَغَدًا، ماکولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاٹ اور ممانعت نہیں اور لفظ حَيْثُ شِئْتُمَا میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہے اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَيْثُ شِئْتُمَا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سدِّ ذرائع کا مسئلہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ "یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ" ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصولِ فقہ کا مسئلہ سدِّ ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصولِ فقہ کی اصطلاح میں "سدِّ ذرائع" ہے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاءؑ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہورِ اُمت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاءؑ کے اقوال و افعال سے امن اُٹھ جائے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاءؑ ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاءؑ کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطاء و نسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا، اور یہ سہو و نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

تشریع سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو نسیان ہوسکتا ہے (تفسیر بحر المحیط)
مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیا علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہوجائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں ان میں چند یہ ہیں:

اوّل یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کرکے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہی حکم ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہوسکتا ہے کہ ممانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہے جو اُس وقت آپؐ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہوگیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کرکے منع کیا گیا تھا ممانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی وسوسہ اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کردیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمھیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی ممانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی ممانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی ممانعت صرف آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اوّل عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، ہلکی غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہوجانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہوجاتی ہے تو اب آپ قوی ہوچکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہوجائے گا، اُس وقت اُن کو وہ ممانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰: ۱۱۵) یعنی آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی" یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہوگئی، یا اجتہادی لغزش، جو درحقیقت گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شانِ نبوت اور قربِ خداوندی کے مقامِ عالی کے اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کرکے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی وسوسہ ڈالے، جنات و شیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا، اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ، کہ "شیطان تمہارا دشمن ہے" ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکہ میں کس طرح آگئے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہوگیا اللہ اس پر بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنیوالا

الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ

مہربان ، ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب ، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ،

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾
اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

خُلاصَۂ تفسِیر

بعد ازاں حاصل کر لئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ (یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیئے) تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی اُن پر (یعنی توبہ قبول کرلی) بیشک وہی ہیں بڑی توبہ قبول کرنیوالے بڑے مہربان (اور حضرت حوّا کی توبہ کا بیان سورۂ اعراف میں ہے، قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبولِ توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اُترنے کا حاکمانہ طور پر بطرز سزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا الآیہ یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پیروی کریگا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی اُن پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے اُن کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہَول اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مضرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن وغم دونوں کی نفی فرما دی، کیونکہ اُن پر کوئی آفت وکلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات پچھلی آیات میں شیطانی وسوسہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش اور اسکے نتیجہ میں جنت سے نکلنے اور زمین پر اُترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب و عتاب کہاں سُنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہوگئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلافِ شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی (یعنی اُن کی توبہ قبول کرلی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوعِ انسان کا وجود میں آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکامِ شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا، حدود اور احکامِ شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہونچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اُترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا، کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اُترنا بطور سزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ الٰہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فرائض منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اُترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، (یعنی احکامِ شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی، تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گذشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقّیٰ، تلقی کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو قبول کرنا (روح، کشاف) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

کَلِمٰتٍ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو بغرض توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مفسرینِ صحابہؓ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو قرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ

لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (۷: ۲۳)

تَابَ، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اوّل اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوسرے اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے "اللہ توبہ" کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گذشتہ پر ندامت اور حال میں اُس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تَابَ عَلَيْهِ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، —— بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (۲۸: ۱۶) "یعنی اے میرے پالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمایئے" اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱: ۸۷) "یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں" (مطلب یہ کہ مجھ پر رحم فرمایئے) (قرطبی)

فائدہ: حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی لغزش یا بھول صادر ہوئی ہے، اوّلاً تو قرآن کریم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا۔ اور زمین پر اُترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کرکے لفظ اِهْبِطُوْا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں بہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس لغزش کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کرکے کیا گیا ہے، عَصٰٓى اٰدَمُ وغیرہ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحۃً نہیں فرمایا، اور ایک جگہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت حوا

کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (قرطبی)

توّاب اور تائب میں فرق امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ توّابؒ بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (۲: ۲۲۲) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، جب بندے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تَوَّابٌ کا حکم ہے، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن وسنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

گناہ سے توبہ قبول کرنیکا اختیار خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہود و نصاریٰ اس قاعدے سے غفلت کی بناء پر سخت فتنہ میں مبتلا ہوگئے، کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے، اور اُن کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہوگیا، آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کرسکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کرسکتا ہے۔

آدمؑ کا زمین پر اُترنا سزا کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا جنت سے زمین پر اُترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اُتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اُتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافتِ الٰہیہ کے فرائضِ منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیشِ نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیقِ آدمؑ کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

رنج و غم سے نجات صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خَوفٌ آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حُزن کسی مقصد و مراد کے فوت ہوجانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام انواع و اقسام کا ان دو لفظوں میں ایسا احاطہ کردیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز میں کردی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لَا حُزْنَ عَلَيْهِمْ، بلکہ بصیغۂ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کرکے وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار، کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

دریں دنیا کسے بے غم نباشد
وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے میں فنا کردیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کردیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵: ۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کرلیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہوجائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی تکلیف یا کسی خواہش و مراد پر اُن کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہٗ کی ہیبت و جلال تو اُن پر اور سب سے زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہٗ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی (۲۰: ۶۷) کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتداء حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گمراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے اُن کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کردیں یعنی کفار، اور مؤمنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عملاً کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو ، اور مان لو اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَ

کو جو میں نے اتاری ہے سچ بتانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اور مت ہو سب میں اوّل منکر اس کے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا

نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو ، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصۂ تفسیر

اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

یاد کرو تم لوگ میرے اُن احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر (تاکہ حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارے لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں) اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَاۗءِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (الآیۃ) (۵: ۱۲) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (اپنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جاوے گی) اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، (یعنی تورات کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات وانجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی) اور مت بنو تم پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے اُن سب میں اوّل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک اُن کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامۂ اعمال میں ہی درج ہوتا رہے گا) اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو، (یعنی میرے احکام چھوڑ کر یا اُن کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیائے ذلیل وقلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ اُن کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات سورۂ بقرہ قرآن کے ذکر سے شروع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ قرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مؤمنین اٹھائیں گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے عذابِ شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لائے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، دونوں کا مع ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مؤمنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور قرآن مجید کے اعجاز کا ذکر کر کے سب کو دعوتِ ایمان دی گئی پھر تخلیقِ آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے انسان کی اصلیت اور حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پڑھ اُمّی تھے، جیسے عام اہلِ مکہ، اسی لئے قرآن میں ان لوگوں کو اُمّیین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاءؑ پر ایمان لائے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم اُن کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصارٰی کہلاتے تھے، ان دونوں کو قرآن میں اس بنا پر اہلِ کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہلِ علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں معزز اور قابلِ اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات اُن پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۂ بقرہ چونکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہلِ کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تئیس آیات آخر پارہ الٓمّٓ تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اوّل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونیوالے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اُن کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی سات آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوتِ ایمان اور چار میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیلی خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر بھر اہتمام کے لئے یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فرما کر انھیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی عبداللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے ______ بعض علماء نے فرمایا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، قرآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب

نہیں کیا، بلکہ دوسرا نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عبد اللہ یعنی اللہ کی عبادت گذار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، توریت میں جس کا بیان بقول قتادہؒ و مجاہدؒ اس آیت میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (الیٰ) قَرْضًا حَسَنًا، (پارہ ۶، سورۂ مائدہ، آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم معاہدہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں، نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جس کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپؐ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کر دوں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمۂ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے، آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) اُمتِ محمدیہ کی ایک خاص فضیلت تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر اپنی یاد اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور امتِ محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ، "یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا" اس میں امتِ محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہے، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری اُمتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایفائے عہد واجب اور عہد شکنی حرام ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون آیا ہے، اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا یہ دی جائے گی کہ محشر کے میدان میں جہاں تمام اولین وآخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اتنا ہی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدانِ حشر میں رُسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہو، اس پر بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب لکھا جاتا ہے

اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِهٖ، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد میں بہرحال انتہائی ظلم اور جرم ہے، مگر اس آیت میں یہ فرمایا کہ پہلے کافر نہ بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اوّل کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر پر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر ان سب کے وبالِ کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اسی طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا اُن لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، قرآن مجید کی متعدد آیات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہی ہے جو آیت کے سباق و سیاق سے معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے

رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اجرت لینا کیسا ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ غور و بحث ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہاء امت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ذریعہ کسبِ معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا، کہ قرآن مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیمِ قرآن کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیمِ قرآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحبِ ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے، کہ تعلیمِ قرآن پر اُجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحبِ ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیمِ قرآن کی طرح دین کی بقاء موقوف ہے مثلاً امامت و اذان اور تعلیمِ حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیمِ قرآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (درمختار، شامی)

(۶) ایصالِ ثواب کے لئے ختمِ قرآن پر اجرت لینا باتفاق جائز نہیں

علامہ شامیؒ نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفاء العلیل میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیمِ قرآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متأخرین فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں خلل آنے سے دین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مُردوں کو ایصالِ ثواب کیلئے ختمِ قرآن کرانا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اُس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامیؒ نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعۃ، عینیؔ شرح ہدایہ، حاشیہ خیرالدین بر بحرالرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیرالدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم قرآن کرانا صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلافِ امتؒ سے کہیں منقول نہیں، اس لئے بدعت ہے (شامی، ص ۴۴، ج ۱)

(۷) حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط کرنا حرام ہے

آیت وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الخ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوف یا طمع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہے اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابوحازمؒ تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؒ کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔

حضرت ابوحازمؒ تابعی سلیمان ابن عبدالملکؒ کے دربار میں

مسند دارمی میں سند کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملکؒ مدینہ طیبہ پہنچے اور چند روز قیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کسی صحابیؓ کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازمؒ ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوالیا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمانؒ نے کہا کہ اے ابو حازمؒ یہ کیا بے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازمؒ نے کہا، آپنے میری کیا بے مروتی اور بیوفائی دیکھی ہے؟ سلیمانؒ نے کہا کہ مدینہ کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے ابو حازمؒ نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی؟

سلیمانؒ نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاضرینِ مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح فرمایا، آپ نے غلطی کی۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے رُوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابو حازمؒ! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے ویرانہ میں جانا پسند نہیں۔

سلیمانؒ نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔

سلیمانؒ یہ سُنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائیگا سلیمانؒ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (۸۳: ۱۳-۱۴) "یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنّت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار دوزخ میں"

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷: ۵۶) "یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے"

سلیمانؒ نے پوچھا اے ابو حازمؒ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو مروّت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابلِ قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذاء پہونچائے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمھاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہدینا۔

پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بیچ دیا، سلیمانؒ نے کہا کہ صحیح فرمایا۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؒ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین تمھارے آباء و اجداد نے بزورِ شمشیر لوگوں پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو سنکر کہا کہ ابو حازمؒ تم نے یہ بہت بُری بات کہی ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بُری بات نہیں کہی، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں، لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ (۳: ۱۸۷)

یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؒ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ

تکبر چھوڑ دو، مروّت اختیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کرو۔

سلیمانؒ نے کہا کہ ابوحازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، فرمایا: خدا کی پناہ سلیمانؒ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت وجاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجہ میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کر دو، سلیمانؒ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابوحازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہے تو اس کے بال پکڑ کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؒ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرما دیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت و جلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمان نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سَو گنیاں بطور ہدیہ کے ابوحازم کے پاس بھیجیں، ابوحازم نے ایک خط کے ساتھ اُن کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سَو دینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابوحازم کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلماتِ نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کسی طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا اُن کے نزدیک جائز نہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جھکو نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ

کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو

الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَ

کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے

مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

ہیں اپنے رب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ (علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بناء پر حق تعالیٰ نے فرمایا) کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور (لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو) اور (اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جابجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو (یعنی اگر تم کو حبِّ مال وحبِّ جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو) صبر اور نماز سے (یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حبِّ مال وجاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو سُن لے کہ) اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو اُن پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا، ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہو گی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی رُوح ہیں)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلی تین آیتوں میں ایمان وعقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور حاصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ـــــــــ اور اگر تم کو حبِ مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حُبِ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات وشہوات کے پورا کرنے کا، جب ان لذات وشہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے، تو پھر مال کی فراوانی کی نہ ضرورت رہے گی نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کردے، اور نماز سے حبِ جاہ کم ہوجائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہوجائے گی تو حبِ جاہ ومنصب اور تکبر وغرور گھٹے گا، اصل مادۂ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال وجاہ کی محبت تھی، جب یہ مادۂ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہوجائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت سے افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز ومباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معین اوقات میں تمام ناجائز وجائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان ہمت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہوجاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہو خصوصاً نماز کی پابندیوں کا، تو اس دشواری کا کیا علاج ہوگا؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلادی گئی۔

حاصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کا قلب خوگر ہو میدانِ خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضاء انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضاء بھی آزاد رہیں، اور نماز سراسر اس آزادی کے خلاف

ہے، کہ نہ ہنسو، نہ بولو، نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ چلو، وغیرہ وغیرہ، اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے، اور اس کے تابع اعضائے انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ بسبب اس دشواری اور گرانی کا قلب کی حرکتِ فکریہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکونِ قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکونِ قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب سے مختلف افکار و خیالات کو براہِ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بمحال ہو، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہو کہ نفسِ انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محو و مستغرق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلقین خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور اُن کے دفع ہونے سے حرکتِ فکریہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حبِ جاہ کم ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حائل ہے وہ دور ہو کر ایمان کامل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین و تعیین اس طرح فرمائی: وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت و رہبت یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، اوّل تو ہر خیالِ محمود میں مستغرق ہو جانا قلب کو نیک کام پر جما دیتا ہو خصوصاً امید و بیم کا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، صلوٰۃ کے لفظی معنیٰ دعاء کے ہیں، اصطلاحِ شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادۃً جو عمود یا دیوار یا درخت وغیرہ سیدھا کھڑا ہوتا ہو وہ قائم رہتا ہے، گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہو اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن و سنت کی اصطلاح میں اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کرکے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت

صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ (۲۹: ۴۵)	"یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بُرے کام سے روک دیتی ہے۔"

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، اس لئے بہت سے نمازیوں کو بُرائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

اٰتُوا الزَّكٰوۃَ، لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دو آتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اصطلاحِ شریعت میں مال کے اس حصّہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورۂ مائدہ میں وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ۭ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ (۵: ۱۲) الخ سے ثابت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔ رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اسی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاحِ شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ "رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ" یہاں ایک بات یہ قابلِ غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جزء بول کر کُل نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ فرما کر پوری نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راکعین کے لفظ سے امتِ محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امتِ محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اوّل ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

باجماعت نماز کے احکام نماز کا حکم اور اس کا فرض ہونا تو لفظ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہؓ و تابعینؒ اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرامؓ تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا عذر شرعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوبِ جماعت کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ چند روایاتِ حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَاصَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ (رواہ ابوداؤد)	"یعنی مسجد قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز مراد ہے، تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجایا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل تو ان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہونچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہیے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گنجائش اور رخصت نہیں پاتا (اخرجہ ابوداؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ یُجِبْ فَلَاصَلٰوۃَ لَہٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ (صححہ القرطبی)	"یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہونچتی ہے تو اگر وہ بلا عذر کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہونچ سکے، آلہ مکبر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)،

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء و فقہاء صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکد اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔

اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے :

فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن ہدیٰ میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کرکے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھوگے، اور اگر تم نے اپنے نبیؐ کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤگے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رُخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامۂ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بیّن النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرما دیا کہ وہ سنن ہُدیٰ میں سے ہے، جس کو فقہاء سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذر شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنتِ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنالے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد ویران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب شرعاً مستحق سزا ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲۹۸ ج ۱)

بے عمل واعظ کی مذمت | اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ، اس آیت میں خطاب اگرچہ علمائے یہود سے ہے ، ان کو ملامت کی جارہی ہے ، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو ، اور دینِ اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہے اس بات کی کہ علمائے یہود دینِ اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے ، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اُس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے ، مگر خود عمل نہ کرے ، دوسروں کو خدا سے ڈرائے ، مگر خود نہ ڈرے ، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں ، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شبِ معراج میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جا رہے تھے میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں ! جبرئیل نے بتایا کہ یہ آپؐ کی امت کے دنیادار واعظ ہیں ، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے ، مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکرؒ نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنّتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھکر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے ؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنّت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے ، اہلِ دوزخ کہیں گے : " ہم زبان سے کہتے ضرور تھے ، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے " (ابن کثیر)

کیا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کرسکتا ؟ | لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں ، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے ، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے ، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے ، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے ، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کردے ، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے ، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے ، اور اپنے زیرِ اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے ، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے ۔ (روح المعانی)

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچکر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑدے کہ میں خود گنہگار ہوں ، جب گناہوں سے خود پاک ہوجاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا ، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا ، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو ؟ حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑکر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بُری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں، تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہے، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو واعظ کیلئے جائز ہے نہ غیر واعظ کیلئے پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابلِ ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس یہ عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور اَن پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکابِ گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا اَن پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کریگا۔

دو نفسیاتی بیماریاں اور اُن کا علاج حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں ابتک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حُبِّ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:

۱۔ کنجوسی اور بخل پیدا ہوتا ہے جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، کہ معاشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے اشیاء میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت ستانی، مکر و فریب اور دغابازی کے نت نئے حیلے سُجھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دُھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ کروں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنتا وہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔

۳۔ حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں کرتا، جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پورے معاشرہ کا امن و چین برباد کر ڈالتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال حبِّ جاہ کا نظر آئے گا، کہ اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی حقوق کی پامالی، ہوسِ اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز خرابیاں جنم لیتی ہیں جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ تجویز فرمایا: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (اور مدد لو صبر اور نماز سے) یعنی صبر اختیار کرو، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کر لو، اس سے حبِّ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گذریگا، لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمہاری عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی، نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حبِّ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی کا تصور رہنے لگے گا جس سے تکبر و غرور اور حبِّ جاہ گھٹ جائے گی۔

خشوع کی حقیقت اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ، قرآن و سنت میں جہاں خشوع کی ترغیب دی گئی ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و انکساری ہے، جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ با ادب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ "موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف و رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فارغ کر لو۔"

حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سُنا کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے۔ (قرطبی)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خضوع بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (آوازیں پست ہوگئیں) اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲۶: ۴) | "پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں"

نماز میں خشوع کی فقہی حیثیت نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۲۰: ۱۴) | "اور نماز قائم کر مجھے یاد کرنے کے لئے"

اور ظاہر ہے کہ غفلت یاد کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جل شانہٗ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۷: ۲۰۵) | "اور تو غافلوں میں سے نہ ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، "نماز تو صرف تمسکن اور تواضع ہی ہے" جس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسکن اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روک سکے وہ اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور برائیوں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے[1]۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان کا یہ تقاضا ہے کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اُس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوریؒ، حسن بصریؒ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد ہے لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء نے خشوع کو شرطِ صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے نماز کی روح قرار دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی

[1] یہ سب احادیث امام غزالیؒ کی احیاء العلوم سے ماخوذ ہیں ۱۲ رف

نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رُو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انھوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت محض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کرلے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریعِ احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے، کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف مالایطاق سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتداءِ صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیدیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی بالکل بے فائدہ نہیں

امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں اللہ سے یہی امید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں، کیونکہ بہرحال اُس نے ادائے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فارغ بھی کیا، کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے یہ خوف بھی ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتتا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ معاملہ بیم و رجا کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا چاہیے، وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

تمام عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

طرف سے سفارش اور نہ لیا جاوے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ ان کو مدد پہنچے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اولادِ یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو (خاص خاص برتاؤ میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، (اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "میں نے تم کو ایک بڑے حصۂ مخلوق پر فوقیت دی تھی" مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فائدہ: اس آیت میں خطاب چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکتا ہو اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوسکتی ہے، (جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ ان لوگوں کی طرفداری چل سکے گی۔

فائدہ: آیت میں جس یوم کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیباق کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کرکے بچا لاوے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدون ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرفداری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی زوردار حمایت کرکے زبردستی نکال لاوے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدون ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم کو بڑا عذاب ذبح کرتے تھے

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی

	عَظِيمٌ ﴿۴۹﴾	
	طرف سے بڑی	

خلاصۂ تفسیر اوپر جن خاص برتاؤں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ : اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم (لوگوں کے آباء و اجداد) کو متعلقینِ فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ذکور) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

فائدہ:۔ کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا، کہ اُن عورتوں سے ماماگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور یا رہائی دینا مراد ہو جو کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبو دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنا لیا

الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

بچھڑا موسیٰؑ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریائے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون

کو (مع فرعون کے)، اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہوگئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں سے چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آ پہنچا، حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہوگیا اور بنی اسرائیل کو گذرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو پار ہوگئے، فرعون کے پہنچنے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہوگیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب وہاں ہی غرق ہو کر ختم ہوگئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (توریت دینے کا ایک مدت گذرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر) چالیس رات کا (زمانہ ہوگیا تھا) پھر تم لوگوں نے (پرستش کے لئے) تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے (اس تجویز میں صریح) ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہوگئے تھے)۔

فائدہ:۔ یہ قصہ اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض، مصر میں واپس آکر رہنے لگے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر ٹھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا، کہ اب ہم بالکل مطمئن ہوگئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کوہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور توراۃ آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد افطار فرما لیا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا رائحہ (جو خلوئے معدہ کی تبخیر سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہے، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہوگئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا، اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مٹی جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اس بچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جہلاء بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر

پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگذر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتے

پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ اس توبہ کا بیان آگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ درگذر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکرگذاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنیوالے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ:۔ فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شرعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں، (کیونکہ) شرع سے تمام تر اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے، جھوٹے دعوی کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہدیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

معاف کرنیوالا نہایت مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی (جنھوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی)، بعض آدمیوں کو (جنھوں نے

گوسالہ پرستی کی) قتل کرو، یہ (عملدرآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر (اس عملدرآمد کرنے سے) حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کرلیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ:۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں، جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتلِ عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں موردِ رحمت و عنایت ہوگئے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آلیا

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کڑک بجلی کی آپڑی، اور تم (اس بجلی کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ:۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لاکر پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ ہماری کتاب ہے تو بے شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذنِ الٰہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو، یہ بات بھی ہوجائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کرکے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر اُن پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہوگئے، (ہلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے)

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مرگئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصۂ تفسیر پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کر اٹھایا تمھارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ موت کے لفظ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس بجلی سے مرگئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیجا کر کسی تدبیر سے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، مجھ کو اس تہمت سے محفوظ رکھئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور اُتارا تم پر منّ اور سلویٰ

كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور انھوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصۂ تفسیر اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور (خزانۂ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمھارے پاس ترنجبین اور بٹیریں (اور تم کو اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:۔ دونوں قصے وادیٔ تیہ میں واقع ہوئے، وادیٔ تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملکِ شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملکِ شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہوگیا، فرعون جب غرق ہوگیا اور یہ لوگ مطمئن ہوگئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو، اور اپنی اصل جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑا لو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مصر سے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عمالقہ کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اُترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشاں اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے، تیہ کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کے۔

یہ وادیٔ تیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کردیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من و سلویٰ نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کردی، یہ لوگ اس کو جمع کرلیتے، اسی کو منّ کہا گیا ہے، اور بٹیریں اُن کے پاس جمع ہوجاتیں، اُن سے بھاگتی نہ تھیں، یہ اُن کو پکڑ لیتے، اور ذبح کرکے کھاتے، اسی کو سلویٰ کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانۂ غیب سے قرار دی گئیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاٹھی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلّہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کردی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں، اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کرکے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہوگیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو

رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ

فراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخش دے تو معاف کردینگے ہم تمہارے قصور

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ (اس کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے، اور (یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کردیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (تو سب کی) اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ:۔ بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادی تیہ کا ہے کہ جب من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی (جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آرہا ہے) تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جاکر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخر ہوگیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور ان نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کرکے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کردیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور نہ کوئی اشکال۔

دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول اوّل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کرلینا مناسب ہے جو من وسلویٰ چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی گستاخی، لیکن خیر، اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو معاف کردیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے ان کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اتارا ہم نے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصۂ تفسیر سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ: یہ آیت آیتِ سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمۂ خلاف یہ تھا کہ حِطَّةٌ بمعنی توبہ کی جگہ ازراہِ تمسخر حَبَّةٌ فِیْ شَعِیْرَةٍ (یعنی غلہ درمیان جو کے) کہنا شروع کیا، وہ آفتِ سماوی طاعون تھا، جو حدیث کی رُو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمبرداروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، (بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے)۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل کا حکم شرعی اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں حِطَّةٌ یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدلکر حِنْطَةٌ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل اُلٹ گئے، حِطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی گناہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور حِنْطَةٌ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمۂ مامور بہا سے کوئی تعلق نہیں، الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الٰہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور ادائے عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک اللّٰھم، التحیات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود، جن الفاظ سے منقول ہیں انہی الفاظ میں ادا کرنا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام قرآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوتِ قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف انہی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کرکے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاحِ شریعت میں تلاوتِ قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اُس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو توبہ کے لئے جو الفاظ حِطَّةٌ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماموربہ تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کردی کہ معنی ہی اُلٹ گئے، اس لئے عذابِ آسمانی کے مستحق ہوگئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصود نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، قرطبیؒ نے امام مالکؒ، شافعیؒ، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سُنے ہیں اُسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرینؒ، قاسم بن محمدؒ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اسی غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کردے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعاء پڑھے۔ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ، اس شخص نے نَبِيِّكَ کی جگہ رَسُوْلِكَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ نَبِيِّكَ پڑھا کرے، جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَءًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا۔	یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میرا کوئی کلام سنا اور پھر اُمت کو اسی طرح پہنچا دیا جس طرح سنا تھا ؛

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سنا تھا انہی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے ۔

مگر جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اَولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سُنے ہیں، اپنے قصد سے اُن میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں رہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلغها کما سمعها کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو مضمون سُنا ہو وہی بعینہٖ نقل کردے، اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آوے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبیؒ نے اس کی تائید میں فرمایا کہ خود یہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے ۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسولک کے بجائے نبیک ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لفظ نبی میں صفت مدح بہ نسبت رسول کے زیادہ ہے، کیونکہ رسول کا لفظ تو قاصد کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبی کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے ۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) اسی لئے عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادعیۂ ماثورہ بھی اسی قسم اوّل میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ ۭ

سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۶۰﴾

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دعاء مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا)، بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (و فتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا، مارنے سے قدرتِ خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد مَن و سلویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور نافرمانی اور ترکِ احکام کو فتنہ و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلافِ عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ اجزاءِ زمین سے پانی کو جذب کرلے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا فرمائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے اُبل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعاء ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعاء کرنا ہے، یہ دعاء کبھی خاص نمازِ استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمازِ استسقاء کے لئے عیدگاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعاء کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ خطبۂ جمعہ ہی میں آپ نے دعاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرما دی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعاء کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیرِ دعاء کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمالیں، ان کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعاء مانگ ہمارے واسطے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا

اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ ھُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

ھُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اُترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ

اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ

نہیں مانتے تھے احکامِ خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

یہ اس لئے کہ نافرمان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جاکر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جاکر نقش کی طرح) جم گئی اُن پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اولو العزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادیِ تیہ کا ہے، مَن وسلویٰ سے اُکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخلِ حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جاکر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ جوتو کھاؤ کماؤ۔

اور منجملہ ذلت ومسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قربِ قیامت تک کیلئے چھین لی گئی۔ البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیٹروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا از ورِ شورِ دجال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہوجائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلادی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کروگے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہوگے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۷: ۱۶۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیلی حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر ابدی ذلّت کا مطلب اور اسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب

آیات مذکورہ میں یہود کی سزا دنیا میں دائمی ذلّت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں غضبِ الٰہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلّت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَايَزَالُوْنَ مستذلین من وجدھم استذلھم وضرب علیھم الصغار، یعنی وہ کتنے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے، جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگادے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلّت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ھم اھل القبالات یعنی الجزیۃ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے، خود اُن کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۂ آلِ عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (۳: ۱۱۲)	جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں جائینگے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو؛

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نابالغ بچے، عورتیں، یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدۂ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں مِنَ النَّاسِ فرمایا ہے مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدۂ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ استثناء حبل من اللہ اور حبل من الناس کا اگر بقول کشاف استثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے، عورتیں وغیرہ اس ذلّت و خواری سے نکل جائیں، یا معاہدۂ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں، اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدۂ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے

سہارے ذلت وخواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریر استثناء متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل وخوار ہی رہیں گے، گو قانونِ الٰہی کی وسعت میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہوجائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت وخواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورۂ آلِ عمران کی آیت سے پوری ہوگئی، اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دور ہوگئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں، کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یورپین طاقتوں نے اسلامی بلاک کو کمزور کرنے کے لئے اُن کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد بِحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہے اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لامذہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ برطانیہ کے زیرِ سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہوجائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو اُن کے لئے ہے ان کا ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں اُن پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر عذر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ کا ذکر فرمایا کہ) یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر اور کارگذاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت کے) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

فائدہ:۔ قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اطاعت اطاعتِ محمدیؐ یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحق نجاتِ اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی اِن شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا موردِ عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سُنانا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہماری عنایت کا، سو اگر مخالف بھی اختیار کرلے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہِ طور کو کہ پکڑو جو

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کردیا، (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ:- جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگران لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو اوّل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے، کہ یہ میری کتاب ہے، تب مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گذر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آکر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کردی کہ "اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرما دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہوسکے کرنا جو نہ ہوسکے معاف ہے"، تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر اُن کے سروں پر معلق کردو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کرلینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی مہربانی

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصۂ تفسیر

پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا مقتضا تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ وبالِ اعمال میں مبتلا ہو گے)

فائدہ: حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ دنیا میں مومن کافر سب پر ہے، جس کا اثر عافیت اور دنیوی راحت ہی، رحمت خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہی، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثتِ محمدیہ سے کی ہے۔

اس مضمون کی تائید کے لئے گذشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت اُن لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنے والوں کیواسطے

خلاصۂ تفسیر

اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدِ شرع سے) تجاوز کیا تھا در بارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز

مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکم قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہوگئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنادیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعہ کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے۔

فائدہ:۔ یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مرگئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو نکال فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو مَوعِظَۃ فرمایا۔

معارف ومسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم شرعی باطل ہوجائے حرام ہے

اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذکر کرکے اس کو سببِ عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دُم میں ایک ڈورے کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈورا زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اتوار کے روز اس کو پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے، اس لئے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش نافرمان قرار دے کر اُن پر عذاب آیا۔

مگر اس سے اُن فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید و فروخت کرلو، مثلاً دو سیر خراب کھجوریں دو درہم میں فروخت کردیں، پھر ان دو درہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خریدلی، تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض

ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

واقعہ مسخ صورتِ یہود

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کرکے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی جنھوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے برادرانہ تعلقات قطع کرکے بالکل الگ ہو گئے، اور بستی کے دو حصے کر لئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دوسرے میں علماء و صلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے ادھر بالکل سنّاٹا ہے تو وہاں جاکر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اُن کے جوان بندر بنا دیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آکر روتے تھے۔

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی

اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے، کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی (بلکہ چند روز میں ہلاک ہو کر ختم ہو جاتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے (اور آج بھی ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)

اس موقع پر بعض مفسرین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بندروں میں زنا کی سزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ نہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے نہ روایۃً صحیح ہے، قرطبیؒ نے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے تم کو، ذبح کرو ایک گائے

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

وہ بولے کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو

تو تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں، (کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)

فائدہ:۔ یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہوگیا تھا جس کی وجہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر اس نے انکار کردیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کردیا، قاتل لاپتہ تھا اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معالم نے کلبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزولِ توریت سے قبل کا ہے۔

غرض بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انھوں نے حسب عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں حجتیں نکالنا شروع کیں۔

آیات آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہمکو کہ وہ گائے کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے اب کر ڈالو جو تمکو حکم ملا ہے،

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہمکو کیسا ہے اس کا رنگ، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

گائے ہے زرد خوب گہری ہے اس کی زردی، خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو، بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ

اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کس قسم میں ہے وہ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اگر اللہ نے چاہا

اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ

تو ضرور راہ پالیں گے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنیوالی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا

الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ

پانی دیتی ہو کھیتی کو، بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں، بولے اب لایا تو

جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿۷۱﴾

ٹھیک بات پھر اس کو ذبح کیا وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔

ع ۸

خلاصۂ تفسیر وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں سو اب (زیادہ حجت مت کیجیو، بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے، کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو، کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ (اوّل بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (رہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب و غریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاوینگے، موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب و غریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہیے کہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنوئیں میں جوڑا گیا ہو کہ) اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سنکر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اوصاف) بات فرمائی، (الغرض جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کر دیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

فائدہ: ۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں اُن کے ذمہ نہ ہوتیں جو بھی بقرہ ذبح کر دیا جاتا کافی ہو جاتا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۚ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم

تَكْتُمُونَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ

چھپاتے تھے، پھر ہم نے کہا مارو اس مُردے پر اس گائے کا ایک ٹکڑا اسی طرح زندہ کریگا اللہ مُردوں کو

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے تاکہ تم غور کرو

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی برات کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم و مشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہو گیا) آگے اللہ تعالیٰ بمقابلہ منکرین قیامت کے اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائرِ (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

فائدہ: جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہو گیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا، کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطۂ علمی میں آسکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی

قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ

سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں اور ان میں

مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں
خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝
اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ۔

خلاصہ تفسیر

(گذشتہ واقعات سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تم لوگوں کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے، لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں اُن سے (بھی) زیادہ (ہیں) اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور (انہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر اُن سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، (اور تمہارے قلوب میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (اس قساوت سے جو اعمال بد صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے)۔

فائدہ:۔ اس جگہ پتھر کے تین اثرات بیان کئے گئے ہیں، اوّل ان سے زیادہ پانی نکلنا، دوم کم پانی نکلنا، ان دو میں تو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت یعنی خدا کے خوف سے پتھر کا نیچے آگرنا، اس میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو، کیونکہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں ہے، سو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات لایعقل میں خوف کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ حس حیات پر موقوف ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہم کو ادراک نہ ہوتا ہو، جیسا جوہر دماغ کے احساس کا بہت سے عقلاء کو ادراک نہیں ہوتا، وہ محض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائلِ طبعیہ سے ظاہر نصِ قرآن کی دلالت اور قوت کسی طرح بھی کم نہیں۔

پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوفِ خدا بھی ہو۔

اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود

نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں، جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے، اور ان (یہودیوں) کے دل ایسے بھی نہیں (کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں) اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ پتھر بہ نسبت اوّل کے کم نرم ہوئے، اور ان کے قلوب ان (درجہ دوم کے) پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں، مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے (کہ خوفِ خدا سے نیچے گر آتے ہیں) گو درجے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذبۂ انفعال بھی نہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

اب کیا تم اے مسلمانو: توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا

يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ

کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ

يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

جانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

(مسلمان یہودیوں کو مومن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اٹھاتے تھے تو یہود کے حالات و واقعات بتلا کر مسلمانوں کی امید کا انقطاع کر کے ان کی کلفت اس آیت کے ذریعہ دفع فرماتے ہیں)

(اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی اُن سے ہو چکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم بُرا کر رہے ہیں، محض اغراضِ نفسانیہ اس کارروائی کا باعث ہوتیں)

فائدہ:- مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اغراضِ نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

اور کلام اللہ سے مراد یا تو توریت ہے، اور سماع سے مراد بواسطۂ انبیاء علیہم السلام کے ہے،

اور تحریف سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا کلام سے مراد وہ کلام ہو جو ان ستر آدمیوں نے بطور تصدیقِ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر سُنا تھا، اور سماع سے مراد بلا واسطہ، اور تحریف سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے وہ معاف ہے "۔

امورِ مذکورہ بالا میں سے کسی امر کا صدور گو ان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اُن اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے حکماً یہ بھی ویسے ہی ہوئے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے

بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ

پاس تو کہتے ہیں تم کیوں کہدیتے ہو اُن سے جو ظاہر کیا اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو

بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶

اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے (منافق یہودی) دوسرے بعضے (علانیہ) یہودیوں کے پاس (تو ان سے اُن کی معیت و ہم مشربی کے مدعی ہوتے ہیں اس وقت) وہ (دوسرے یہودی) اُن سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (اُن کے مفید مذہب) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں (مگر ہم بمصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

فائدہ:۔ منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتلانے کے لئے مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہو، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ اُن کو ملامت کرتے تھے۔

اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا

اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے

یَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ق ثُمَّ

پاس کچھ نہیں مگر خیالات، سو خرابی ہے اُن کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہدیتے ہیں

یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ط فَوَیْلٌ

یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مال، سو خرابی ہے اُن کو

لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے۔

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مؤمنین سے اپنا کفر چھپایا تو کیا اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جابجا مطلع فرما دیا ہے)

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا، آگے اُن کے ناخواندہ لوگوں کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں کہ:

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن (بلا سند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں، (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکا لیتے ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور مخلوط ہے، اور پھر اوپر سے اُن میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجُز بے بنیاد خیالات کے حقائق واقعیہ کی تحقیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بقول شخصے "کریلا اور نیم چڑھا" اس میں مٹھاس کہاں۔

اور چونکہ ان کی اس توہم پرستی میں ان کے علماء کی خیانت بڑا سبب ہے، اس لئے جرم میں بھی وہ اپنے عوام سے زیادہ ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں۔

(جب عوام مذکورین قابل زجر و توبیخ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب اُن کے علماء ہی ہیں) تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی) آیا ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کرلیں، سو بڑی خرابی (پیش) آوے گی ان کی اس (تحریف کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کر لیا کرتے تھے۔

فائدہ:۔ عوام کی رضا جوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتلا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے توریت میں لفظی اور معنوی پھیر بچار بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سنائی گئی۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ

اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے کہہ دو کیا تم لے چکے ہو

عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ

اللہ کے یہاں سے قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کریگا اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾

جو تم نہیں جانتے

خلاصۂ تفسیر

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوے گی (بھی تو نہیں، ہاں) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کرلئے جا سکیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

فائدہ:۔ یہود کے اس قول کی مفسرین نے مختلف تقریریں کی ہیں منجملہ اس کے یہ ہے کہ یہ امر محقق ہے کہ مؤمن اگر عاصی ہو تو گو بقدر گناہ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو، لیکن ایمان کی وجہ سے دائمی عذاب جہنم نہ ہوگا، بعد چندے نجات ہو جائے گی۔

پس یہود کے دعوے کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے بزعم دین موسوی منسوخ نہیں ہے، لہذا وہ

مؤمن ہیں، انکارِ نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و جناب حضور مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کافر نہیں ہوئے، پس اگر کسی عصیان کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، کیونکہ دین موسوی کی ابدیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہٰذا انکارِ نبوت مسیحیہ و محمدیہ کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد چندے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے عہد سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلاصۂ تفسیر

خلود فی النار کا ضابطہ: (ہاں) (بجز چند روز کے تم کو آتشِ دوزخ) کیوں نہیں (لگے گی، بلکہ ابدالآباد تک اس میں رہنا ضرور ہی، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصداً بُری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (و قصور اس طرح) احاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسولؐ پر) ایمان لادیں اور نیک کام کریں ایسے لوگ اہلِ بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

فائدہ: خطاؤں کے احاطہ کے جو معنی اوپر ذکر کئے گئے ہیں اس قسم کا احاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہوجاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سر تا پا بدی ہی بدی ہوگی، جس کی جزا ابدی جہنم ہوگی، بخلاف اہلِ ایمان کے کہ اوّل تو ان کا ایمان خود بہت بڑا عمل صالح ہے، دوسرے اعمالِ شرعیہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں، پس احاطۂ مذکور اُن کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رُو سے کافر کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہو گیا، تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں، تو یہود ان کا انکار کر کے کافروں میں شامل ہو گئے، اس لئے اس ضابطہ کی رُو سے وہ بھی خالد فی النار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیل قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ

اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ

کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر

تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں اور تم ہو ہی پھرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گذاری کرنا، اور اہل قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول و قرار کر کے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔

فائدہ:۔ یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہو گئی تو شریعت محمدیہ کے متبع ہو گئے۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت، اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

تعلیم و تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا سے مراد قولاً ذا حسن ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرو تو بات نرم کرے، خوش روئی اور کشادہ دلی کے ساتھ کرو چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو یا بدعتی، ہاں دین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰: ۴۴) تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰؑ سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی بُرا ہو فرعون سے زیادہ بُرا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے امامِ تفسیر و حدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں، حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا (قرطبی)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کروگے خون آپس میں اور نہ نکال دوگے

اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم مانتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر اور جو عہد میثاق لیا گیا تھا اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کرکے) باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کرلیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں، بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

فائدہ:۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی امر کا اقرار مترشح ہوتا ہے گو صاف اقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ سے اس شبہ کو بھی رفع کردیا، اور بتادیا کہ یہ اقرار اتنا صریح اور واضح تھا جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

ترکِ وطن کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ترکِ وطن پر مجبور ہوجائے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ

پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ

مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ

کو ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو اُن پر گناہ اور ظلم سے اور اگر

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

وہی آویں تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دیکر چھڑاتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ

بھی تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو، سو کوئی سزا نہیں اُس کی

يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن

يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے

خلاصۂ تفسیر

تمہ میثاق میں جو حکم ان کو دیا گیا ہے اس کے متعلق عہد شکنی کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے۔

پھر (اس اقرار صریح کے بعد) تم (جیسے ہو، یہ آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل و قتال بھی کرتے ہو، اور (ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ (سو ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو سہل سا سمجھا اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کرا دیتے ہو حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو اُن کا ترکِ وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجہ اولیٰ) نیز ممنوع ہے۔

معارف ومسائل

فائدہ:۔ اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے، اوّل قتل نہ کرنا، دوم اخراج یعنی ترکِ وطن نہ کرانا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید وبند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا، توان لوگوں نے اوّل کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کا اہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہلِ مدینہ میں دو قومیں تھیں: اوس وخزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور مدینہ کے گرد ونواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، اوس وبنی قریظہ کی باہم دوستی تھی، اور خزرج وبنی نضیر میں باہم یارانہ تھا، جب اوس و خزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بنا پر بنو قریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے، اور بنو نضیر خزرج کی طرفداری کرتے، تو جہاں اوس وخزرج مارے جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنو قریظہ کے قتل واخراج میں بنو نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہود کی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو رہا کرا دینا ہم پر واجب ہے، اور اگر کوئی قتل و قتال میں معین ومددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔

اس آیت میں جن مخالف قوموں کی امداد کا ذکر ہے اس سے اوس وخزرج مراد ہیں، کہ اوس بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے، اور خزرج بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے۔

اثم وعدوان (ظلم وگناہ) دو لفظ لانے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں حکمِ الٰہی کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس عہد شکنی پر ملامت وشکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالتصریح بیان فرمایا ہے ارشاد ہے۔

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے تو اور کیا سزا ہو (نا چاہئے) ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے

اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال (زشت) سے۔

فائدہ:۔ ہر چند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذکر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کی بنار پر کافر ہی تھے، مگر یہاں ان کا کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، ہم اپنے محاوراتِ عرفیہ میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنیوالے کو کہدیتے ہیں کہ تُو تو بالکل چمار ہے، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدتِ نفرت اور اُس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے، او یہی معنی ہیں اس حدیث مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ وغیرہ کے۔

اس مقام پر جن دُو سزاؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دنیا میں ذلت و رسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل و قید کیے گئے اور بنی نضیر ملکِ شام کی طرف بہزار ذلت وخواری نکال دیے گئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا

یہ وہی ہیں جنھوں نے مول لی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سو نہ ہلکا

يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

ہوگا اُن پر عذاب اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

ع ۱۰

خلاصۂ تفسیر

(اور وجہ سزا اُن کے لئے یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے (احکام کی مخالفت کرکے) دنیاوی زندگانی (کے مزوں) کو لے لیا ہے، بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سو نہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف دی جائے گی اور نہ کوئی (وکیل مختار یا دوست رشتہ دار) اُن کی طرفداری (پیروی) کرنے پائے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ

اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول

وَاٰتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

اور دیئے ہم نے عیسٰی مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو تو تم تکبر کرنے لگے،

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کردیا

خلاصۂ تفسیر اور ہم نے (اے بنی اسرائیل تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کئے، سب سے اول) موسٰی علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) یکے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے اخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسٰی بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سو الگ جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا، (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کردیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بیدھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

فائدہ: قرآن و حدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے جیسے قرآن کی اس آیت میں، نیز قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶: ۱۰۲) میں اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ؎

وجبریل رسول اللہ فینا و وروح القدس لیس لہ کفاء

اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے عیسٰی علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اوّل، تو ولادت کے وقت میں شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں اُن کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھوالئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتیٰ کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا وحضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (یہودی طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ اس میں مخالف مذہب کا جو اسلام ہے اثر ہی نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ اُن کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)

فائدہ:۔ یہ تھوڑا سا ایمان ان امور کی بابت ہے جو اُن کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں مثلاً خدا کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان امور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوتِ محمدیہ اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے منکر تھے، اس لئے پورا ایمان نہ تھا۔

اور اس تھوڑے ایمان کو باعتبار لغت ایمان کہا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، گو وہ بعض اشیاء کے ساتھ ہی متعلق ہو، شرعاً اس کو ایمان نہیں کہتے، شرعاً وہ ایمان معتبر ہے، جو کل امور وارد فی الشرع کے یقین کے ساتھ ہو۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ

اور جب پہونچی اُن کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو انکے پاس ہے

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ

اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر ، پھر جب پہنچا ان کو جس

مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہوگئے، سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر

خلاصۂ تفسیر

اور جب اُن کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے، (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے، جو (پہلے سے) ان کے

پاس ہے، (یعنی توراۃ) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے (اور) کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں مگر) پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)

فائدہ: قرآن کو جو مصدقِ توراۃ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں بعثتِ محمدیہ اور نزولِ قرآن کی جو پیشنگوئیاں تھیں ان سے ان کا صدق ظاہر ہو گیا، سو توراۃ کا ماننے والا تو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر ہی نہیں سکتا ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آئے گی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا چاہیے کافر کیسے کہا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں شدت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں اُن کے کفر کی وجہ اُن کا عناد بتلایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

بُری چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ

نے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے سو کما لائے

بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

غصہ پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔

خلاصۂ تفسیر | وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعم خود) اپنی جانوں کو (عقوبتِ آخرت سے) چھڑانا چاہتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر (انکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن اور وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو، (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں) نازل فرمائے سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنیوالوں کو ایسی سزا ہو گی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہے۔

فائدہ :- ایک غضب کفر پر دوسرا حسد پر، یوں غضب بالائے غضب فرمایا، عذاب کے ساتھ مہین کی قید سے بتانا یہ مقصود ہو کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مؤمن کو عذاب اس کو پاک کرنے کے لئے ہوگا، ذلت کے لئے نہیں۔

آگے کی آیت میں جو اُن کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی مترشح ہوتا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ

اور جب کہا جاتا ہے ان سے مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہو تو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں جو اُترا ہے

عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ

ہم پر اور نہیں مانتے اس کو جو سوا اس کے ہے حالانکہ وہ کتاب سچی ہے جو تصدیق کرتی ہو اس کتاب کی جو

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

انکے پاس ہے کہہ دو پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ اُن تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم (لوگوں) پر (بواسطہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے ماسوا کتابیں) بھی (فی نفسہٖ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنیوالی بھی ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

فائدہ :- یہود نے جو یہ کہا کہ "ہم صرف توراۃ پر ایمان لاویں گے دوسری کتب پر ایمان نہ لاویں گے" تو ان کا یہ قول صریح کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ (توراۃ) "جو ہم پر نازل کی گئی ہے" اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں، اس لئے اُن پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کو تین طرح رد فرمایا ہے:

اوّل یہ کہ جب اور کتابوں کی حقیت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس انکا کی کیا وجہ ہے ! ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے، انکار محض کی آخر کیا وجہ !

دوسرے اور کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے انکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب و انکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رُو سے کفر ہے، پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا، جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو، تو براہِ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو، اس سے تو تمہارا توراۃ پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل صحیح اور درست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنا لیا تم نے بچھڑا اس کے

بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

گئے پیچھے ، اور تم ظالم ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنا لیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

فائدہ:- بیّنات سے وہ دلائل مراد ہیں جو اس قصہ سے پہلے جبکہ توراۃ نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی برحق ہونے پر قائم ہو چکی تھیں، مثلاً عصا اور ید بیضا، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔

رد کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہتے تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ بھی رَد میں شامل ہیں۔

اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرکے کفر کیا وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہِ طور کو پکڑو جو ہم نے

اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا

تم کو دیا زور سے اور سنو بولے سُنا ہم نے اور نہ مانا اور پلائی گئی ان کے

فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ

دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی بسبب اُن کے کفر کے کہہ دے کہ بُری باتیں سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اگر تم ایمان والے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا، اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) لو جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لیلو اور (ان احکام کو دل سے) سنو (اس وقت) انھوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کرلیا اور) سن لیا، اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبان حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (وجہ اُن کی اس بد دلی کی یہ تھی کہ) ان کے قلوب (رگ و ریشہ) میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اُتر کر انھوں نے ایک بُت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کردیا جائے) آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان مزعوم کے افعال کو سو) یہ افعال تو بہت بُرے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے، اگر تم (بزعم خود اب بھی) اہلِ ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

فائدہ:- اس آیت میں جو اسباب اور مسببات مذکور ہیں، اُن کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہوکر ان سے ایک کلمۂ کفر کا صدور ہوا، ہرچند موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ

سے توبہ کرلی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی ظلمت قلب میں کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ ترقی پاکر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلا قتل معافی ہوگئی ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے، اُن کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے جس قدر نفرت واجب تھی اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس معصیتِ شرکیہ کا ان کے قلب میں باقی تھا، بہرحال ضعف توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے دلوں میں دین سے سستی پیدا کردی جس سے اخذِ میثاق میں کوہِ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

کہدے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ

کے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچ کہتے ہو ، اور ہرگز

يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب اُن گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان لوگوں سے) کہدیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالمِ آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کرکے دکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فردِ قرارداد جرم سنا کر سزا کا حکم کردیا جائیگا)

فائدہ: قرآن کی بعض اور آیات سے بھی اُن کے اس دعویٰ کا مفہوم نکلتا ہے جیسا کہ؛ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (۲: ۸۰) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (۲: ۱۱۱) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ (۵: ۱۸) وغیرہا۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دینِ حق پر ہیں، لہٰذا آخرت میں ہم کو تو ضرور

نجات ملے گی، ہم میں سے جو تائب یا مرحوم ہیں اُن کو تو ابتداء ہی سے جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گنہگار ہیں وہ چند روزہ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں گے، اور جو مطیع ہیں وہ بمثل ابناء و احبار محبوب و مقرب ہیں۔

بعض عنوانات کے قبح سے قطع نظر یہ دعوے دین حق پر قائم ہونے کی صورت میں فی نفسہٖ تو درست و صادق ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کی بناء پر حق پر نہ رہے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا مختلف عنوانات اور طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی، یہاں ایک خاص طریقہ ذکر کیا گیا، کہ اگر عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کرتے تو آؤ مافوق العادۃ طریقہ یعنی معجزے کے ذریعے اس میں نہ زیادہ علم و فہم کی ضرورت، نہ غائر نظر درکار، صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم زبان سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم موت کی تمنا کرتے ہیں"۔

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا۔

چونکہ ان کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کا حق پر ہونا اُن پر خوب واضح و روشن تھا، اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اُٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ تم نے یہ کلمہ مُنہ سے نکالا اور موت نے آدبوچا، اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عداوت و دشمنی تھی اس کے پیش نظر تو ان کو یہ سُنکر جوش آجانا چاہیے تھا، اور یہ کلمات ضرور کہہ دینے چاہیے تھے۔

درحقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے۔

یہاں دو باتیں اور قابلِ ذکر ہیں:

اوّل تو یہ کہ یہ استدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور جنھوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد و عداوت کی بناء پر آپ کا انکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔

دوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ تمنا کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، ممکن ہے انھوں نے دل سے تمنا کی ہو، اوّل تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اس کی صاف تردید کر رہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو اُن کی جیت تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا اچھا موقعہ تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہ کرنا چاہیے کہ انھوں نے تمنا کی ہو، مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو، یہ اس لئے

صحیح نہیں کہ اسلام کے ہمدرد و معاونین کی تعداد کے مقابلہ میں معاندین و مخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اچھالتے کہ دیکھو تم نے جو معیارِ حق و صداقت مقرر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اُترے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ

اور تو دیکھے گا اُن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ

چاہتا ہے ایک ایک اُن میں کا کہ عمر پاوے ہزار برس اور نہیں اس کو بچانیوالا عذاب سے

الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

اس قدر جینا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے، اور (اور وں کا تو کیا ذکر حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا) یہ امر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا، کہ (کسی کی بڑی) عمر ہو جائے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بد جس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)

فائدہ:۔ اس میں حیرت و استبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب تو آخرت کے منکر تھے، انکی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طولِ عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں رہنے کی تمنا کریں، یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی!

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

تو کہہ دے جو کوئی ہووے دشمن جبرئیل کا، سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ

کہ سچا بتانیوالا ہو اس کلام کو جو اس کے پہلے ہو اور راہ دکھاتا ہو اور خوش خبری سناتا ہو ایمان والوں کو، جو

عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

کوئی ہووے دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا تو اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

دشمن ہے ان کافروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنکر کہ جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، ہماری قوم پر واقعات ہائلہ اور احکاماتِ شاقہ انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیل خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے، اس پر حق تعالیٰ رَد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ جو شخص جبرئیلؑ سے عداوت رکھے (رہ جانے لیکن اس امر کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل! کیونکہ اس میں تو وہ سفیر محض ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انھوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے! البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (مصالح ضروریہ کی) اور خوشخبری سُنا رہا ہے ایمان والوں کو (اور کتب سماویہ کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں کتابِ سماوی اور قابلِ اتباع ٹھہرا، پھر جبرئیل علیہ السلام کی عداوت سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے، اب رہا خود مسئلہ عداوتِ جبرئیلؑ کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا یا اس کے دوسرے ملائکہ سے یا اس کے رسولوں سے، یا خود میکائیلؑ سے، جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، ان سب سے عداوت رکھنا اور جبرئیلؑ سے عداوت رکھنا یہ سب ہم پلہ شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ) جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا ہو (تو) اور پیغمبروں کا ہو (تو) اور جبرئیل کا (ہو تو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے اُتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور انکار نہ کریں گے اُن کا مگر وہی جو نافرمان ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور (بعض یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لئے پھرتے ہیں) ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضحہ نازل کئے ہیں، (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سو ان کا انکار نہ جاننے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ انکار عدول حکمی کی عادت کی وجہ سے ہے) اور (قاعدہ کلیہ ہے کہ) کوئی انکار نہیں کیا کرتا (ایسے دلائل کا) مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

کیا جب کبھی باندھیں گے کوئی قرار تو پھینک دیگی اسکو ایک جماعت اُن میں سے بلکہ انمیں اکثر یقین

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

نہیں کرتے۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود کو جو وہ عہد یاد دلایا گیا جو اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں توراۃ میں لیا گیا تھا، تو انھوں نے خود عہد لینے ہی سے صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) کیا (اس عہد لینے سے اُن کو انکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہے کہ انھوں نے اپنے مسلّم عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان لوگوں نے (دین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان (تعمیل عہد نہ کرنے والوں) میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے (تو تعمیل نہ کرنا تو فسق تھا ہی یہ یقین نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)

فائدہ:- اور ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ بعضے اُن میں کے ان عہود کو پورا بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنیوالا اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے تو پھینک

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ

دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے

كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

(اس آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے میں کلام تھا، ارشاد ہوتا ہے) اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (رسول ہونے کے ساتھ) تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراۃ پر عمل تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتے ہیں مگر باوجود اس کے بھی) ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو (اس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا) گویا اصلاً علم ہی نہیں ۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

اور پیچھے ہو لئے اُس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ

نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہو لئے

عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ

جو اُترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اور نہیں سکھاتے تھے وہ

حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا

دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہم تو آزمائش کیلئے ہیں سو تو کافر مت ہو پھر ان سے سیکھتے وہ جادو

يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ

جس سے جُدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے

مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ

کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ

اور خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ،

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ

اور بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو اگر ان کو سمجھ ہوتی، اور اگر وہ ایمان لاتے

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳

اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

خلاصۂ تفسیر

اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انھوں نے (کتاب اللہ کا تو اتباع نہ کیا اور) ایسی چیز کا (یعنی سحر و جادو کا) اتباع (اختیار) کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان علیہ السلام کے (عہد) سلطنت میں اور (بعضے بیوقوف جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر گمانِ سحر رکھتے ہیں بالکل ہی لغو بات ہے، کیونکہ سحر تو اعتقاداً یا عملاً کفر ہے اور) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا مگر (ہاں) شیاطین (یعنی خبیث جن بیشک) کفر (کی باتیں اور کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی اور) آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے (سو وہی سحر متوارث چلا آرہا ہے اس کا اتباع یہ یہودی کرتے ہیں) اور (اسی طرح) اس (سحر) کا بھی (یہ لوگ اتباع کرتے ہیں) جو کہ اُن دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کیواسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کا نام ہاروت و ماروت تھا، اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہ بتلاتے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہدیتے کہ ہمارا وجود بھی (لوگوں کے لئے) ایک امتحان (خداوندی) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاؤ) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے (عمل کر کے) کسی مرد اور (اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے اور (اس سے کوئی وہم اور خوف میں نہ پھنس جاوے کہ جادوگر جو چاہے کر سکتا ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (ساحر) لوگ اس (سحر) کے ذریعے سے کسی کو (ذرہ برابر) بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا سحر حاصل کر کے بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو (بوجہ گناہ کے) ضرر رساں ہیں اور (کسی معتدبہ درجہ میں) اُن کو نافع نہیں ہیں (تو یہودی بھی اتباع سحر سے بڑے ضرر میں ہوں گے) اور (یہ بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں بلکہ) ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس (سحر) کو (کتاب اللہ کے عوض) اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں، اور بیشک بُری ہے وہ چیز (یعنی جادو و کفر) جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) عقل ہوتی، اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کفر و بدعملی کے) ایمان اور تقویٰ (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے یہاں کا معاوضہ (اس کفر و بدعملی سے ہزار درجے) بہتر تھا، کاش!

(اتنی عقل ہوتی)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ کی تفسیر اور شانِ نزول میں نقل کی ہوئی اسرائیلی روایات سے بہت سے لوگوں کو مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، ان شبہات کا حل سیّدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرّہٗ نے نہایت واضح اور سہل انداز میں فرمایا ہے، اس جگہ اس کو بعینہٖ نقل کر دینا کافی ہے، وہ یہ ہے:

۱۔ یہ بیوقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، یہودی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیانِ آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت بھی ظاہر فرما دی۔

۲۔ ان آیتوں سے یہودیوں کی برائی کرنا مقصود ہے، کیونکہ ان میں جادو کا چرچا تھا' ان آیتوں کے متعلق زہرہ کا ایک لمبا چوڑا قصہ بھی مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس قصہ کو قواعد شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے رَد کر دیا ہے، اور جنھوں نے اس میں تاویل کو خلافِ شرع نہیں سمجھا رَد نہیں کیا، ہمیں یہاں فی الوقت اس کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں، جیسے کہ ناظرین کو معارف ومسائل کے اس زیر عنوان مضمون سے اندازہ ہو جائے گا۔

۳۔ اور یہودی سب باتوں کے جاننے کے باوجود چونکہ عمل علم کے خلاف کرتے تھے، اور تدبر سے کام نہ لیتے تھے، اس لئے اوّل تو ان کے جاننے کی خبر دی، اور پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کر دی کہ "کاش ان کو علم وعقل ہوتی"۔ کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبر نہ ہو وہ جہل کی مانند ہے۔

۴۔ ایک زمانے میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں، دنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا، اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیاء کرامؑ کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط واشتباہ ہونے لگا، اور بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے، اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کے رفع کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت وماروت نامی اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے، اور جادو پر عمل کرنے نیز جادوگروں کے اتباع کرنے سے اجتناب کر سکیں، اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات ودلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت وماروت

کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے، تاکہ ان کے احکامات وارشادات کی تعمیل واطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام انبیاء کرامؑ سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اوّل تو انبیاءؑ اور جادوگروں میں امتیاز وفصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیاء کرامؑ ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے حکم فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا۔

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل وحکایت کے عادۃً ہو نہ سکتی تھی، اگرچہ نقلِ کفر کفر نباشد کے عقلی ونقلی مسلمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیاء کرامؑ مظہرِ ہدایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانۂ تکوین میں جو خیر وشر سب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے تو بوجہ مصالح عامہ خیر ہوں، لیکن لزوم مفسدہ کے سبب فی ذاتہٖ شر ہوں، جیسے کسی ظالم وجابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشوونما اور غور وپرداخت، کہ تکوینی اعتبار سے تو درست ومحمود ہے، اور تشریعی لحاظ سے نادرست ومذموم، بخلاف انبیاء کرام علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصاً وعموماً خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور گو کہ یہ نقل وحکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، تو حضرات انبیاءؑ کو اس کا سبب بواسطہ نقل بننا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیاتِ شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی، ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمال فتنہ انبیاء کرامؑ کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیاء کرامؑ نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے، کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحبِ معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے، وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعدِ کلیہ سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دستِ غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آکر اپنا کام شروع کر دیا، کہ سحر کے اصول وفروع ظاہر کر کے

لوگوں کو اس کے عمل بد سے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت و دوری رکھنے کی تنبیہ اور تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جاہل لوگ اکثر نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریراً یا تحریراً ان کلمات کو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی آمد و رفت ان کے پاس شروع ہوئی اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول و فروع سے مطلع کر دیجئے تاکہ ناواقفی سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور احتیاط و تبلیغ اور بنظر اصلاح یہ التزام کیا کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہو کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کہ شر سے آگاہ ہو کر اس سے بچے، اور کون اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر پر مطلع ہو کر وہی شر خود اختیار کر لے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفر عملی ہو یا اعتقادی دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ، اور ایمان برباد کر لو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیر خواہی اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد و پیمان کر لیتا وہ اس کے رد بر جادو کے سب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ و اختیار سے کافر و فاجر بنے وہ جانے۔ چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم نہ رہے، اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیا، جو فسق تو یقیناً ہے، اور بعضے طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں، اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

اس ارشاد اصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول و منقول، عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے، تاکہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے، اور پھر خود ہی خلاف شرع عقائد باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے، اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے، اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جاوے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلاف اسلام نظریات و عقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس اطلاع سحر ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی

گنجائش ہے نہ وسوسہ کی۔

اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلالئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال (بیان القرآن)

سحر کی حقیقت سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات وشیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں یا نجوم وسیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرف عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات وشیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ وکلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ ومشاہدہ سے بھی، اور قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف وکلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثیرات جو کسی انسانی بال یا ناخنوں وغیرہ اعضاء یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرف عام میں ٹونہ ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں سحر ہر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو، یا کواکب ونجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں، جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا، وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال وافعال سے حاصل کی جاتی ہے، جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں مثلاً تقوٰی، طہارت، اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمالِ خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایامِ حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو مؤثر ہوتا ہے، باقی

شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاکی کے کام یا مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہدیا جاتا ہے، (روح المعانی)

سحر کے اقسام امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں،

ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں، جیسے بعض شعبدہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کرلیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں یا قوت خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہوسکتا ہے، کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ پہلی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے:

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (۷: ۱۱۶)	"انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا"

اور ارشاد ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۲۰: ۶۶)	"ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں"

اس میں یخیّل کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ حقیقت سانپ بنی، اور نہ انھوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۲۶: ۲۲۱-۲۲۲)	"میں تمھیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گناہگار پر اترتے ہیں"

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲: ۱۰۲)	"یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے"

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شئے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیں، امام راغب اصفہانی، ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی

ہی تک ہو سکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلاب اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے، یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلاب حقائق ممکن نہیں، اُن کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کہ کوئی محال ممکن بن جائے، یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو اس سے زائد اور کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبارؒ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو موطاء امام مالکؒ میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے:

لولا کلمات اقولھن لجعلتنی الیھود حماراً	اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔

گدھا بنا دینے کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنا دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ سحر کے ذریعے انسان کو گدھا بنا دینے کا امکان ہے، دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبارؒ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:

اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ لَيْسَ شَىْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِىْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَاَ وَذَرَاَ (اخرجه فی الموطاء باب التعوذ عند النوم)	"میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسماء حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں، اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دیا اور پھیلایا ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

سحر اور معجزے میں فرق جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادۃً نہیں ہو سکتے، اسی لئے ان کو خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔ بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس بھی ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور و خفاء کا ہے جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں، وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خط مشرقِ بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقِ عادت کہیں گے، حالانکہ جنات و شیاطین کو ایسے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسباب طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلا واسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرما دیا، کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکمِ الٰہی سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ معجزہ نہیں بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکا خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، ارشاد فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸: ۱۷)	"کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے"

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپ نے ایک مٹھی خاک

اور سنگریزوں کی کفار کے لشکر پر پھینکی (جو سب کی آنکھوں میں پڑ گئی)۔

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلا واسطہ اسباب طبعیہ کے براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اسباب طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کر دیئے ہیں۔

اوّل یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے، جن کا تقویٰ، طہارت، پاکیزگی اخلاق و اعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے ناپاک اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دُور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ عادۃ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے اور نبوّت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوّت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاءؑ پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے، وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی گئی کہ سحر درحقیقت اسباب طبعیہ ہی کا اثر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسباب طبعیہ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں، یہ تأثر شانِ نبوّت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متاثر ہونا، بیماری میں مبتلا ہونا اور شفا پانا ظاہری اسباب سے سب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متاثر ہو سکتے ہیں، اور یہ تأثر شانِ نبوّت کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپؐ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متاثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے، آیات يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ، اور فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ (۲۰: ۶۶-۶۷) موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونا اسی جادو ہی کا تو اثر تھا۔

سحر کے احکام شرعیہ

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، قرآن و حدیث کی اصطلاح میں سحر صرف ایسے عمل کو کہا گیا ہے جس میں کفر و شرک اور فسق و فجور اختیار کر کے جنات و شیاطین کو راضی کیا گیا ہو اور ان سے

مدد لی گئی ہو، ان کی امداد سے کچھ عجیب واقعات ظاہر ہو گئے ہوں، سحر بابل جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ یہی تھا، (جصاص) اور اسی سحر کو قرآن میں کفر قرار دیا ہے، ابو منصورؒ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ مطلقاً سحر کی سب اقسام کفر نہیں، بلکہ صرف وہ سحر کفر ہے جس میں ایمان کیخلاف اقوال و اعمال اختیار کئے گئے ہوں۔ (روح المعانی)

اور یہ ظاہر ہے کہ شیاطین پر لعنت کرنے اور ان سے عداوت و مخالفت کرنے کے احکام قرآن و حدیث میں بار بار آئے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راضی کرنے کی فکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر وہ راضی جب ہی ہوتے ہیں جب انسان کفر و شرک میں مبتلا ہو جس سے ایمان ہی سلب ہو جائے، یا کم از کم فسق و فجور میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مرضیات کے خلاف گندہ اور نجس رہے، یہ مزید گناہ ہے، اور اگر جادو کے ذریعے کسی کو ناحق نقصان پہنچایا تو یہ اور گناہ ہے۔

غرض اصطلاح قرآن و سنت میں جس کو سحر کہا گیا ہے وہ کفر اعتقادی یا کم از کم کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر شیاطین کو راضی کرنے کے لئے کچھ اقوال یا اعمال کفر و شرک کے اختیار کئے تو کفر حقیقی اعتقادی ہوگا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و افعال سے بچ بھی گیا مگر دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا، تو کفرِ عملی سے خالی نہ رہا، قرآن عزیز کی آیات مذکورہ میں جو سحر کو کفر کہا گیا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ یہ سحر کفر حقیقی اعتقادی یا کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس سحر میں کوئی عمل کفر اختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے استغاثہ و استمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے، اور جس میں یہ افعالِ کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

مسئلہ: جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سحر کفر اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفع ضرر کیلئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے (شامی، عالمگیری)

مسئلہ: تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں، اور حرام ہیں، اور اگر الفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں، اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

مسئلہ: قرآن و سنت کے اصطلاحی سحر بابل کے علاوہ باقی قسمیں سحر کی ان میں بھی اگر کفر و شرک کا ارتکاب کیا جائے تو وہ بھی حرام ہیں۔

مسئلہ: اور خالی مباح اور جائز امور سے کام لیا جاتا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ

اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

مسئلہ: اگر قرآن و حدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں، مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے، اگرچہ وظیفہ اسماء الٰہیہ یا آیاتِ قرآنیہ ہی کا ہو وہ بھی حرام ہے (فتاویٰ قاضی خاں، شامی)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ

اے ایمان والو تم نہ کہو رَاعِنَا اور کہو اُنْظُرْنَا اور سنتے رہو،

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴

اور کافروں کو عذاب ہے دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر لفظ راعنا سے آپؐ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بد دعا کے ہیں، اور وہ اسی نیت سے کہتے تھے، مگر عربی زبان میں اسکے معنی "ہماری مصلحت کی رعایت فرمایئے" کے ہیں، اس لئے عربی داں اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے بعضے مسلمان بھی حضورؐ کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے، کہ اب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی برا کہتے تھے، اب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے، حق تعالیٰ نے اس گنجائش کے قطع کرنے کو مسلمانوں کو حکم دیا کہ) اے ایمان والو تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور (اس کی جگہ لفظ) انظرنا کہدیا کرو (کیونکہ اس لفظ کے معنی اور راعنا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، راعنا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کرکے دوسرا لفظ استعمال کرو،) اور (اس حکم کو اچھی طرح) سن لیجیو (اور یاد رکھیو) اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی (جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کے لئے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا، بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں قرآن و سنت میں بہت ہیں، اسی کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد

ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کی تعمیر جو قریش نے زمانہ جاہلیت میں کی تھی، اس میں کئی چیزیں بنا، ابراہیمؑ کے خلاف کردی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو منہدم کر کے از سرنو بنا، ابراہیمی کے مطابق بنا دوں، لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے بالفعل ایسا نہیں کرتا، ایسے احکام کو اصولِ فقہ کی اصطلاح میں سدِّ ذرائع سے تعبیر کیا جاتا ہے جو سبھی فقہار کے نزدیک معتبر ہے، خصوصاً حضرات حنابلہ اس کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں (قرطبی)

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ

دل نہیں چاہتا اُن لوگوں کا جو کافر ہیں اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو

يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ

کہ اُترے تم پر کوئی نیک بات تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ؁۱۰۵

کے ساتھ جسکو چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہود کا جو برتاؤ تھا، وہ اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں یہود کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ (بعضے یہودی بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دل سے تمہارے خیر خواہ ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دینی احکام ہمارے دینی احکام سے بہتر عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس دعوٰیِ خیر خواہی کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ) ان اہلِ کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو (اور ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (و عنایت) کے ساتھ جسکو منظور ہوتا ہے مخصوص فرما لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔

فائدہ:۔ ان یہودیوں کے دو دعوے تھے، اوّل یہودیت کا بہتر ہونا اسلام سے، دوسرا ان کا خیر خواہ ہونا، تو اوّل دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کر سکے، نرے دعوے سے کیا ہوتا ہے، اور پھر یہ دعوٰی ہے بھی فضول سی بات، کیونکہ جب ناسخ آتا ہے تو منسوخ ترک کر دیا جاتا ہے، افضل غیر افضل کے فرق پر موقوف نہیں، لہٰذا بوجہ ظاہر اور کھلی ہوئی بات ہونے کے اس کا جواب

یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

صرف دوسرے دعویٰ خیرخواہی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مضمون کو قوی اور مؤکد کرنے کے لئے کیا گیا، کہ جس طرح مشرکین یقیناً تمہارے خیرخواہ نہیں اسی طرح ان کو بھی سمجھو۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیجدیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر کیا تجھ کو

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ

معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان

وَالۡاَرۡضِؕ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور زمین کی اور نہیں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

خلاصۂ تفسیر

(تبدیل قبلہ کا واقعہ جب ہوا تو یہود نے اس پر طعن کیا، اور مشرکین بھی بعض احکام کی منسوخی پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کے طعن اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم کسی آیت کا جو حکم موقوف کردیتے ہیں (گو آیت قرآن میں یا ذہنوں میں باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کردیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل (بجائے اس کے دوسری چیز) لے آتے ہیں، (اے معترض) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں، (پس ایسے قادر کو مصالح کی رعایت کیا مشکل ہو اور) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص انہی کی سلطنت آسمانوں اور زمین پر ہے، (جب ان کی اس قدرت و سلطنت میں کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کرکے دوسرا حکم دیدینے میں کون مزاحمت کرسکتا ہے، غرض حکمِ ثانی کی تجویز سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس حکم کے جاری کردینے میں بھی کوئی مانع نہیں،) اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں، (پس جب وہ یار ہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے، اور جب مددگار ہیں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت تمہارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے البتہ اگر اس ضرر سے بڑھ کر کوئی نفع اخروی ملنے والا ہو تو ظاہراً مخالف کا مسلط ہوجانا اور بات ہے

معارف ومسائل

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا، اس آیت میں کسی آیتِ قرآن کے منسوخ ہونے کی جتنی صورتیں ہوسکتی ہیں سب کو جمع کر دیا ہے، نسخ کے معنے لغت میں زائل کرنے اور لکھنے کے آتے ہیں، اس پر تمام مفسرین امت کا اتفاق ہے، کہ اس آیت میں نسخ سے مراد کسی حکم کا زائل کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اسی لئے اصطلاحِ کتاب وسنت میں نسخ ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دوسرا حکم یہی ہو کہ سابق حکم بالکل ختم کر دیا جائے، یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دوسرا عمل بتلایا جائے۔

احکامِ الٰہیہ میں نسخ کی حقیقت دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات وحالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکامِ خداوندی میں نہیں ہوسکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اوّل ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اُس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دیدیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرار دادِ سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اسکی مثال ایسی ہے، کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھکر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اُس دن کے مناسب ہے، دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دو روز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہٗ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوّت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی

نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی نبوت و شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر بتقاضائے حکمتِ خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:

لم تکن نبوۃ قط الا تناسخت۔ (مسلم)	"یعنی کبھی کوئی نبوت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور ردّ و بدل نہ کیا ہو (قرطبی)

جاہلانہ شبہات البتہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے احکامِ الٰہیہ کے نسخ کو دنیوی احکام کے نسخ کی پہلی دونوں صورتوں پر قیاس کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں (ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ)

مسلمانوں میں سے فرقہ معتزلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے طعن سے بچنے کی یہ راہ نکالی کہ احکامِ الٰہیہ میں نسخ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی امر اس امکان کے لئے مانع نہیں، لیکن پورے قرآن میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت ناسخ ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابو مسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علماء اُمت نے ہمیشہ ردّ و نکیر فرمایا، تفسیر رُوح المعانی میں ہے:

واتفقت اھل الشرائع علیٰ جواز النسخ ووقوعہ وخالفت الیھود غیر العیسویۃ فی جوازہٖ وقالوا یمتنع عقلاً وابو مسلم الاصفھانی فی وقوعہ فقال انہ و ان جاز عقلا لکنہ لم یقع۔ (روح، ص ۳۵۲ ج ۱)	"تمام اہل شرائع کا نسخ کے جواز اور وقوع دونوں پر اتفاق ہے، صرف یہودیوں نے بجز عیسویہ کے امکان نسخ کا انکار کیا ہے اور ابو مسلم اصفہانی نے وقوع کا انکار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ نسخ احکام الٰہیہ میں ممکن تو ہے مگر کہیں واقع ہوا نہیں"۔

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

معرفۃ ھٰذا الباب اکیدۃ و فائدتہ عظیمۃ لا تستغنی عن معرفتہ العلماء ولا ینکرہٗ الّا الجھلۃ الاغبیاء۔ (قرطبی ص ۶۵ ج ۲)	"باب نسخ کی معرفت بہت ضروری اور فائدہ اس کا بہت بڑا ہے، اس کی معرفت سے علماء مستغنی نہیں ہو سکتے، اور جاہلوں بیوقوفوں کے سوا اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا"۔

قرطبی نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وعظ کہہ رہا تھا، آپ نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ لوگوں

نے کہا کہ وعظ و نصیحت کر رہا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی وعظ و نصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو پہچانو، پھر اس شخص کو بلوا کر پوچھا کہ کیا تم قرآن و حدیث کے ناسخ منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ ہماری مسجد سے نکل جاؤ، آئندہ کبھی یہاں وعظ نہ کہو۔

قرآن و سنت میں نسخ کے وجود و وقوع کے متعلق صحابہؓ و تابعینؒ کے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں جنکو نقل کرنا مشکل ہے، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور وغیرہ میں اسانید قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں، اور روایاتِ ضعیفہ کا تو شمار نہیں۔

اسی لئے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماعی رہا ہے، صرف ابومسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوعِ نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں شرح و بسط کے ساتھ رد کیا ہے۔

نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاحوں میں فرق

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیلِ حکم کے ہیں، اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانسو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے، جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانسو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاءِ حکم ہے، نسخ خلافِ اصل ہے، اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہوا،

جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی، اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کرکے بالکل صفر تک پہنچادے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے اور نہ ایسا کرنے سے صحابہؓ و تابعینؒ اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متاخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے، اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہوسکتی ہے، بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ چودہ سو برس تک تمام علماءِ امت کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہوجائے، معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائے گا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہیں ہوجائیگی۔

عصرِ حاضر میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر سے گذری ہیں، جنھوں نے آیت مذکورہ مَا نَنْسَخْ کو متضمن معنے شرط پر ہونیکی وجہ سے ایک قضیۂ فرضیہ مثل لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ اور لَوْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ قرار دے کر صرف امکانِ نسخ کی دلیل بنایا اور وقوع سے انکار کیا، حالانکہ تضمن معنی شرط اور قضیۂ شرطیہ مُصَرَّح لَوْ میں بڑا فرق ہے، اور یہ وہی استدلال ہے جو ابو مسلم اصفہانی اور معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

لیکن صحابہؓ و تابعینؒ کی تفسیریں اور پوری امت کے تراجم دیکھنے کے بعد اس کو مدلولِ قرآنی کہنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا، صحابہ کرامؓ نے اسی آیت سے وقوع نسخ پر استدلال کیا ہے، اور متعدد واقعات شمار کرائے ہیں۔ (ابن کثیر، ابن جریر وغیرہ)

یہی وجہ ہے کہ امت کے متقدمین و متاخرین میں کسی نے بھی وقوع نسخ کا مطلقاً انکار نہیں کیا، خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تطبیق کرکے تعداد تو کم بتلائی مگر مطلقاً وقوعِ نسخ کا انکار نہیں فرمایا، ان کے بعد بھی اکابر علماءِ دیوبند بلا استثناء سبھی وقوعِ نسخ کے قائل چلے آئے ہیں، جن میں سے متعدد حضرات کی مستقل یا جزوی تفسیریں بھی موجود ہیں، کسی نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً انکار نہیں کیا، واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔

اَوْ نُنْسِهَا، یہ مشہور قراءت کے مطابق اِنْساء اور نسیان سے ماخوذ ہے، معنی یہ ہیں کہ کبھی نسخِ آیت کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ وہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ کے ذہنوں سے بالکل بھلادی جائے، جیسا کہ اس کی تفسیر میں کئی واقعے اس طرح کے حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، اس بھلادینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آئندہ اس پر عمل کرانا مقصود نہیں۔

نسخ کے متعلق بقیہ احکام کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، اس کا اصل محل اصولِ فقہ کی کتابیں ہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہوچکے ہیں موسیٰ سے اس سے

قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

پہلے اور جو کوئی کفر لیوے بدلے ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے ۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عناداً عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہی دفعہ توراۃ نازل ہوئی اسی طرح آپ قرآن مجموعی طور پر لائیے، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ) ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسولؐ (وقت) سے (بیجا بیجا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (تمھارے بزرگوں کی طرف سے حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جاچکی ہیں، (مثلاً خدا تعالیٰ کو علانیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی، اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسولؐ پر اعتراض کرنا اور مصالح الٰہیہ میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہو نری کفر کی باتیں ہیں، اور) جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بلاشک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا،

فائدہ: اس درخواست کو بیجا اس لئے فرمایا کہ ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں (اور مصلحتیں مدّ) ہوتی ہیں بندے کو اس میں تعیینِ طریق کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو یہ اس طرح ہو، اس کا کام تو بس یہ ہونا چاہئے۔

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علت از کارِ تو

ترجمہ شیخ الہندؒ میں یہ خطاب مسلمانوں سے قرار دیا ہے اس کا حاصل مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کرنا ہوگا کہ رسولؐ سے بے جا سوال نہ کیا کریں۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ

دل چاہتا ہے بہت سے اہلِ کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنا دیں

كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ

بسبب اپنے دلی حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہوچکا اُن پر

الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

حق سو تم درگذر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم بیشک اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا

ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

آگے بھیجدو گے اپنے واسطے بھلائی پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس ، بے شک اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور باوجود ناکامی کے اپنی دُھن سے باز نہ آتے تھے، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ) ان اہل کتاب (یعنی یہود) میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں، (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں جیسا کہ وہ اظہار کرتے ہیں، بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ (تمہاری جانب سے کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے، (اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہوئے پیچھے (یہ حالت ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا محل تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو معاف کرو اور درگذر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں (اشارۃً بتلادیا کہ ان کی شرارتوں کا علاج قانونِ انتظامِ امن عام یعنی قتال وجزیہ سے ہم جلد کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھکر اس قانون کے اجراء کے متعلق تعجب ہو سکتا تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو خواہ عجیب ہو) قادر ہیں، اور (سر دست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور (جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ، (اور جب وہ قانون آجائے گا ان اعمالِ صالحہ کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کرلینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آئے صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی رہے گی، نہیں، بلکہ) جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے، حق تعالیٰ کے پاس (پہنچکر) اس کو (پورا پورا مع صلہ کے) پالو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں (ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا)

فائدہ: اُس وقت کی حالت کا یہی مقتضا تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برتا گیا، اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ حسب حیثیت ان کے فساد کے بدلے قتل یا جلا وطنی یا جزیہ پر عملدرآمد کیا گیا۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ
اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی،

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾
یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انھوں نے، کہہ دے لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو،

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ
کیوں نہیں جس نے تابع کر دیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کیلئے ہے ثواب اسکا اسکے رب کے پاس

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ
اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور یہود تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
نصاریٰ نہیں کسی راہ پر اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
پر باوجودیکہ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا
انہی کی سی بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾
جھگڑتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہود نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاویگا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ اُن کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ

اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (سو وہ تو کیا دلیل لاویں گے، کیونکہ کوئی دلیل ہے ہی نہیں، اب ہم اس کے خلاف پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ) ضرور دوسرے لوگ (بھی جنت میں) جاویں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا قانون جو باتفاق سماوی ملتوں کے ماننے والوں کے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے یہ ہے کہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی اعمال و عقائد میں فرمانبرداری اختیار کرے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ فرمانبرداری دلی طور پر اختیار کی ہو محض مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو) تو ایسے شخص کو اس (کی فرمانبرداری) کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچکر اور ایسے لوگوں پر (قیامت میں) نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سُنا کر بے فکر کر دینگے)

حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب یہ قانون مسلّم ہے تو اب صرف یہ دیکھ لو کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ کسی حکم سابق کے منسوخ ہو جانے کے بعد اس پر عمل کرنے والا کسی بھی طور پر فرمانبردار نہیں کہلا سکتا، لہٰذا یہود و نصاریٰ فرمانبردار نہ ہوئے، بلکہ حکم ثانی پر عمل کرنا فرمانبرداری سمجھی جائے گی، اور یہ شان مسلمانوں کی ہے، کہ نبوّت و شریعت محمدیہ کو قبول کر لیا، چنانچہ یہی جنت میں داخل ہونے والے شمار ہوئے۔

اور مخلصین کی قید سے منافقین نکل گئے (کیونکہ وہ بھی شرعاً کفار ہی میں داخل اور مستحق جہنم ہیں)

اور (ایک بار کچھ یہودی اور کچھ نصرانی جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے، تو یہود تو اپنے عقیدہ کیموافق نصاریٰ کے دین کو باطل بتاتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ بھی ضد و تعصب میں آکر دین یہود کو بے اصل و باطل کہنے لگے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور توریت کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل فرما کر بطور تردید فرماتے ہیں کہ) یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے غلط ہی) اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر قائم نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہی) حالانکہ یہ سب (فریقین کے لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور دونوں کتابوں میں دونوں سوالوں اور دونوں کتابوں کی تصدیق موجود ہے، جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہے، گو منسوخ ہو جانے کی بنا پر قابل عمل نہ ہو یہ اور بات ہے)۔

اور اہل کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی جوش آیا اور) اسی طرح سے یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں، ان (ہی اہل کتاب) کا سا قول دُھرانے لگے، (کہ ان یہود و نصاریٰ سب کا دین بے بنیاد ہے، حق پر بس ہم ہی ہیں) سو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے، قیامت کے دن ان تمام مقدمات میں جن میں

وہ باہم اختلاف کر رہے تھے، (اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہلِ حق کو جنت میں اور اہلِ باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قولی اور برہانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ دنیا میں بھی ہو چکا ہے)

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے پر رَد کا ذکر فرما کر ان کی نادانی اور اس اختلاف کے مضر اثرات کا بیان، پھر اصل حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم ہدایات ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں نے دین کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے جنتی اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوامِ عالم کے دوزخی اور گمراہ ہونے کا معتقد تھا۔

اس نامعقول اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ عیسائیت بھی بے بنیاد اور یہودیت بھی بے اصل، حق و صحیح بس ہماری بُت پرستی ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی جہالت و گمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں جنت میں جانے کے اصل سبب سے غافل ہیں، محض مذہب کے نام کی قومیت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مذہب یہود ہو یا نصاریٰ یا اسلام ان سب کی اصل رُوح دو چیزیں ہیں،

ایک یہ کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا عقیدہ و مذہب سمجھے، چاہے یہ کسی مذہب میں حاصل ہو، حقیقت دین و مذہب کو فراموش کر کے یا پس پشت ڈال کر یہودی یا نصرانی قومیت کو اپنا مقصد بنالینا دین و مذہب سے ناواقفیت اور گمراہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے دل سے خدا کی فرمانبرداری کا قصد تو درست کر لے، مگر اطاعت فرمانبرداری اور عبادت کے طریقے اپنے ذہن و خیال کے مطابق خود گھڑ لے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت و اطاعت اور امتثالِ امر کے طریقے بھی وہی اختیار کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے بتائے اور متعین کئے ہوں۔

پہلی بات بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ الخ کے ذریعے اور دوسری وَھُوَ مُحْسِنٌ الخ کے ذریعے واضح کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ نجاتِ اخروی اور دخولِ جنت کے لئے صرف قصدِ اطاعت کافی نہیں، بلکہ حُسنِ عمل بھی ضروری ہے، اور حُسنِ عمل کا مصداق وہی تعلیم و طریقہ ہے جو قرآن اور سنت رسول خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

نسلی مسلمان ہو یا یہودی و نصرانی، اللہ کے یہاں اسکی کوئی قیمت نہیں اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے	جو شخص ان بنیادی اصولوں میں سے کسی بھی اصول کو چھوڑ دے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی یا مسلمان

اور پھر محض نام کی قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنّت کا ٹھیکہ دار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خود فریبی ہے، جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر قریب نہیں ہو سکتا، نہ مقبول بن سکتا ہے، جب تک اس میں ایمان و عمل صالح کی روح موجود نہ ہو۔

پھر اصولِ ایمان تو ہر رسول اور ہر شریعت کے زمانے میں مشترک و یکساں رہے ہیں، البتہ عمل صالح و مقبول کی شکلیں کچھ ادلتی بدلتی رہی ہیں، تورات کے زمانے میں عمل صالح وہ سمجھا گیا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تعلیم کے مُطابق تھا، انجیل کے دور میں عمل صالح یقیناً وہی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تعلیم سے مطابقت رکھتا تھا، اور اب قرآن کے زمانے میں وہی عمل عمل صالح کہے جانے کا مستحق ہوگا جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب "قرآن مجید" کی ہدایت کے مطابق ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں قومیں جہالت کی باتیں کر رہی ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی جنّت کا ٹھیکہ دار نہیں اور نہ ہی دونوں کے مذہب بے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود ہے، غلط فہمی کا سبب اصلی یہ ہے کہ انھوں نے مذہب و ملت کی اصل رُوح یعنی عقائد و اعمال اور نظریات کو چھوڑ کر نسلی یا وطنی بنیاد پر کسی قوم کو یہود ٹھہرا لیا اور کسی کو نصرانی سمجھ لیا۔

جو یہود کی نسل سے ہو، یا یہود کے شہر میں بستا ہو، یا مردم شماری میں اپنے آپ کو یہودی بتاتا ہو اس کو یہود سمجھ لیا گیا، اسی طرح نصرانیوں کی تشخیص و تعیین کی گئی، حالانکہ اصولِ ایمان کو توڑ کر اور اعمالِ صالحہ سے مُنہ موڑ کر نہ کوئی یہودی یہودی رہتا ہے، نہ نصرانی، نصرانی۔

قرآن کریم میں اس اختلاف اور اس فیصلہ کا ذکر مسلمانوں کو سُنانے اور متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، کہ ہم تو پشتی مسلمان ہیں، ہر دفتر و رجسٹر میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں درج ہے، اور ہم زبان سے بھی اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں، اس لئے جنّت کے نیز ان تمام انعامی وعدوں کے ہم ہی مستحق ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں سے کئے گئے۔

اس فیصلہ سے اُن پر واضح ہو جانا چاہئے کہ کوئی شخص نہ محض دعوے سے حقیقی مسلمان بنتا ہے، نہ کہیں مُسلمان نام درج کرانے یا مُسلمان کی صلب سے، یا ان کے شہر میں پیدائش ہونے کی وجہ سے: بلکہ مُسلمان ہونے کے لئے اوّل اسلام ضروری ہے، اور اسلام کے معنی ہی اپنے آپ کو سپرد کرنے

اور سونپ دینے کے ہیں، دوسرے احسانِ عمل یعنی سنت کے مطابق عمل کو درست کرنا۔

لیکن قرآن کریم کی اس تنبیہ کے باوجود بہت سے مسلمان، اسی یہودی اور نصرانی غلطی کا شکار ہوگئے، کہ خدا اور رسولؐ اور آخرت و قیامت سے بالکل غافل رہ کر اپنا نسلی مسلمان ہونا مسلمان ہونے کے لئے کافی سمجھنے لگے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے فلاح دنیا و آخرت کے مسلمانوں سے کئے گئے ہیں اپنے آپ کو ان کا مستحق سمجھ کر ان کے پورے ہونے کا انتظار کرنے لگے، اور جب وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو قرآن و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھتے کہ قرآن نے محض نسلی مسلمانوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام ارادوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ کردیں، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل صالح کے پابند نہ ہوں، یہی خلاصہ ہے آیت مذکورہ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ کا۔

آجکل پوری دنیا کے مسلمان طرح طرح کے مصائب و آفات کا شکار ہیں اس کو دیکھ کر بہت سے ناواقف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان تمام آفات و مصائب کا سبب ہمارا اسلام ہی ہے، لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہوگیا، کہ اس کا اصلی سبب ہمارا اسلام نہیں بلکہ ترک اسلام ہے، کہ ہم نے اسلام کا صرف نام باقی رکھا ہے، نہ اس کے عقائد ہمارے اندر ہیں نہ اخلاق، نہ اعمال، گویا ؏

وضع میں ہم ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کئے ہوئے وعدوں اور انعاموں کا ہم انتظار کریں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہم کچھ بھی سہی نام تو اسلام کا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا تو ہیں، اور جو کفار کھلے طور پر اللہ و رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں اسلام کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے، وہ تو آج دنیا میں ہر طرح کی ترقی کر رہے ہیں، بڑی بڑی حکومتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں، دنیا کی صنعتوں اور تجارتوں کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں، اگر ہماری بدعملی کی ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم ہر جگہ پامال و پریشان ہیں تو کفار و فجار کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئے لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ شبہ خود بخود رفع ہوجائے گا۔

اوّل تو اس لئے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں ہوا کرتا، دوست کو قدم قدم اور بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، اولاد اور شاگرد کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دی جاتی ہے لیکن دشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا، اس کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے۔

مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عظمت و محبت کا دم بھرتا ہے،

وہ دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے بُرے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دیدی جاتی ہے، تاکہ آخرت کا بار ہلکا ہو جائے، بخلاف کافر کے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہلکی ہلکی سزاؤں سے ان کا بارِ عذاب ہلکا نہیں کیا جاتا، اُن کو یک لخت عذاب میں پکڑا جائے گا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا یہی مطلب ہے کہ "دنیا مؤمن کے لئے قیدخانہ اور کافر کے لئے جنت ہے"

دوسری اہم بات مسلمانوں کے تنزّل اور پریشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا جداگانہ خاصہ رکھا ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ ہے مال میں زیادتی، دوا کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں تو دن رات لگا رہے بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو محض تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پا سکتا، اسی طرح دوا دارو کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ یعنی مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی دنیوی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان کا افلاس و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑ دی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت و سیاست کے مفید راستوں کو اختیار کیا، مضر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جاتے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کفر اُن کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھ لیں کہ ہمارا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دیگا! اسلام و ایمان اگر بالکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجاتِ آخرت اور جنت کی دائمی راحت ہے، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا عیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا ضروری نہیں جبتک اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد نہ کی جائے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کے اصولِ صحیحہ کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دنیوی ثمرات و نتائج سے محروم نہیں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ دنیا میں ہمارا افلاس و احتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے مُنہ موڑنے کا نتیجہ ہے، جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہوا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب یورپ والوں کے ساتھ اختلاط کا اتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سیکھے جن کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے پیچھے اَن تھک کوشش، معاملہ کی سچائی، بات کی سچائی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے جو درحقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کی تو یہ قصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے۔

الغرض قرآن کی ان آیات نے واضح کر دیا کہ محض نسلی طور پر اسلام کا نام رکھ لینا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عملِ صالح کو مکمل طور پر اختیار نہ کیا جائے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور

سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ

کوشش کی ان کے اجاڑنے میں، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر ڈرتے ہوئے

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ

ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے ۔ اور اللہ ہی کا ہے

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۤ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بیشک اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

بے انتہا بخشش کرنیوالا سب کچھ جاننے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

یہود تو قبلہ کا حکم بدلنے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کم سمجھ لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے، اگر وہ شبہات عام طور پر قلوب میں اثر کرتے تو اُن کا لازمی نتیجہ انکارِ رسالت اور ترکِ نماز نکلتا، اور ترکِ نماز سے مسجد کی ویرانی لازم ہے، تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترکِ نماز اور ویرانیٔ مساجد خصوصاً مسجد نبویؐ میں بھی کوشاں تھے، اور روم کے بعض سلاطین جو نصاریٰ کے اسلاف تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے تھے، گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہود شام پر چڑھ آئے تھے، قتل و قتال بھی ہوا، اور اس وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور بدامنی کی وجہ سے اس میں

نماز وغیرہ کا اہتمام بھی نہ ہوا، اس طور پر نصاریٰ کے اسلاف ترکِ نماز اور ویرانیِ مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ پر بوجہ عدم انکار اس کا الزام دیا گیا، اس بادشاہ کا نام طیطس تھا، اور نصاریٰ کو یہ قصہ اس لئے ناگوار نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تذلیل ہوئی تھی، اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مسجد الحرام کا طواف اور نماز ادا فرمانی چاہی تو مشرکین مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال واپس تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی مسجدِ حرام کی ویرانی میں کوشاں ہوئے، اس لئے حق تعالیٰ نے صیغۂ عموم سے اس کی قباحت اور برائی ظاہر فرمائی (یعنی) اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں (جنہیں مکہ کی مسجدِ حرام، مدینہ کی مسجد، بیت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگئیں) ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے، اور ان (مساجد) کے ویران (اور معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بیباک) ہو کر ان (مساجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت و حرمت و ادب سے جاتے جب بیباک ہو کر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اس کی ہتکِ حرمت کا حق کب حاصل ہے، اسی کو ظلم فرمایا گیا) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی، اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

(یہود نے تبدیلِ قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یعنی) اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)

پس جب وہ مالک ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کردیں، کیونکہ حکمت تعیینِ قبلہ میں مثلاً عابدین کا اتفاق ہیئت اور اجتماعِ خاطر ہے، اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا حکم دیدیں وہی متعین ہو جائے گی، ہاں البتہ اگر معبود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہت خاص کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلۂ عبادت بننے کا انحصار رہتا تھا، لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے) تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو اُدھر (ہی) اللہ تعالیٰ (کی ذات پاک) کا رُخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہات اور اشیاء کو) محیط ہیں (جس طرح کا احاطہ اُن کی شان کے لائق ہے، لیکن باوجود محیط و غیر محدود ہونے کے پھر بھی جہتِ عبادت کو متعین اس لئے فرمایا کہ وہ) کامل العلم ہیں، (کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں یہ تعیین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دیدیا)

فوائد از بیان القرآن ۱۔ ویرانیِ مساجد میں کوشاں گروہ کی دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ یہ ساری قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گذار ہوئیں، اور عذابِ آخرت تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی، اور ویرانی مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت و شدید ہو جائے گا، اور اوپر کی آیت میں جو ان تینوں فرقوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اسکی تردید کا ایک گونہ مفہوم بھی نکل آیا، کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحبِ حق ہونے کا دعویٰ بڑے شرم کی بات ہے۔

۲۔ تعیینِ قبلہ کی جو ایک حکمت بطور مثال اوپر بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفینِ اسلام کا یہ اعتراض کہ "مسلمان کعبہ پرست ہیں" بالکل اٹھ گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت یکسوئی قلب کی ضرورت ہی، نیز عابدین کی ہیئت اجتماعیہ کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہی چنانچہ یہ دونوں باتیں تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہیں، اس لئے اس یکسوئی اور اجتماع ہیئت حاصل کرنے کے لئے تعیینِ جہت مشروع ہوئی، لہٰذا اس اعتراض و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اسی قصد و غرض سے رکھتے ہیں، تو اوّل تو اپنی برأت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں ٹوٹتا، وہ بدستور مرتفع رہا، جو اس مقام پر مقصود اصلی ہے۔

ثانیاً، عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تفتیش کرنے سے عدم پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راست گو ہونا اور دوسروں کا دروغ گو ہونا ہر وقت ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے، علیٰ سبیل التنزل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان بھی لی جائے پھر بھی اس تعیین اور تعقید کے لئے کسی غیر منسوخ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہلِ اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ و تفسیر کے ضمن میں بیانِ حکمت کے لئے جو لفظ مثلاً اضافہ کیا گیا ہر تو اس کی وجہ یہ ہر کہ احکامِ خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انحصار اور استیعاب کے ساتھ کسی کے ادراک میں نہیں آسکتیں، سو اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دوسروں کی نفی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ "ادھر ہی اللہ کا رخ ہے" اور اسی طرح یہ جو فرمایا ہے کہ "وہ محیط ہر" اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کھود کرید نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پورا ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت بھی فہم سے خارج ہے،

اجمالاً ان سب پر ایمان لے آوے، اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے، پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیطلوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور تورات کے نسخے جلا ڈالے، بیت المقدس میں نجاسات اور خنزیر ڈال دیئے، اس کی عمارت کو خراب و ویران کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال اور ختم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک بیت المقدس اسی طرح ویران و منہدم پڑا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، زمانۂ دراز تک پورا ملک شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصہ کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، اور تقریباً نوّے سال یورپ کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔

رومی نصاریٰ کی اس گستاخانہ حرکت پر کہ تورات کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب و ویران کر کے اس کی بے حرمتی کی، یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے، اور حضرت ابن زیدؓ وغیرہ دوسرے مفسرین نے آیت کا شانِ نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعۂ حدیبیہ کے وقت مسجد حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریرؒ نے پہلی روایت کو اور ابن کثیرؒ نے دوسری کو ترجیح دی ہے۔

لہ بعض مفسرین نے اس مجوسی بادشاہ کا نام بخت نصر بتلایا اس سے معروف بخت نصر تو اس لئے مراد نہیں ہو سکتا کہ اس کا زمانہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی دوسرے بادشاہ کو بخت نصر ثانی کہنے لگے ہوں ۱۲
(محمد شفیع)

بہرحال آیت کا شانِ نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ حکم انہی نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لئے عام رہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے "مساجد اللہ" فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کردیا گیا، اور آیت کا مضمون یہ ہوگیا، کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہوجائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

مَسَاجِدُ اللہ کی عظمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو ہیبت وعظمت اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واحکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:

اوّل یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبویؐ کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے، اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی وعظمت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبویؐ ونیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دور دراز ملکوں سے سفر کرکے پہونچنا موجبِ ثوابِ عظیم اور باعثِ برکات ہے، بخلاف دوسری مساجد کے کہ ان تینوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل جان کر اس کے لئے دور سے سفر کرکے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز وحرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز وتلاوت سے صراحۃً روکا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور وشغب کرکے یا اس کے قرب وجوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز وذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقاتِ نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح وتلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں، مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذکر بالجہر کرنے لگے تو یہ بھی نمازیوں کی نماز وتسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو، اس وقت ذکر یا تلاوت جہر کا مضائقہ نہیں،

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس وقت لوگ نماز و تسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے، اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں، یا کم ہو جائیں، کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل در و دیوار یا ان کے نقش و نگار سے نہیں، بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے، اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ (۹: ۱۸)	"یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں"

اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین و خوب صورت ہوں گی، مگر حقیقتاً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو جائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شرافت و انسانیت کے چھ کام ہیں، تین حضر کے اور تین سفر کے، حضر کے تین یہ ہیں: تلاوتِ قرآن کرنا، مسجدوں کو آباد کرنا، ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا جو اللہ تعالیٰ اور دین کے کاموں میں امداد کریں، اور سفر کے تین کام یہ ہیں: اپنے توشہ سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، حسنِ خلق سے پیش آنا، اور رفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی، تفریح و خوش طبعی کا طرزِ عمل رکھنا، بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں خشوع خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہو کر ذکر و تلاوت میں مشغول رہیں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ ہوگی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہو جائیں، یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع و خضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شانِ نزول واقعۂ حدیبیہ اور مشرکین مکہ کا مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انھیں منہدم کر دیا جائے، بلکہ مساجد جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہو جائے تو مساجد ویران کہلائیں گی۔

تحویلِ قبلہ کی بحث دوسری آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی گئی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے اگرچہ آپ کو مکہ اور بیت اللہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، اور مدینہ پہنچ کر ابتدائی زمانہ میں سولہ سترہ مہینہ تک آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، لیکن اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، نہ آپ کے لئے غمگین ہونے کی کوئی وجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کسی خاص سمت میں نہیں وہ ہر جگہ ہے، اس کے لئے مشرق و مغرب یکساں ہیں، کعبہ کو قبلۂ نماز بنائیں یا بیت المقدس کو، دونوں میں کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ امرِ الٰہی کی تعمیل ہی دونوں جگہ سببِ فضیلت ہے ؎

داد حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد ہست

اس لئے جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا اُس میں فضیلت تھی، اور جب بیت المقدس کا استقبال کرنے کا حکم ہو گیا تو اس میں فضیلت ہے، آپ دلگیر نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی توجہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے، جبکہ بندہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔

چند مہینوں کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کا حکم دے کر عملاً اور آپ نے قولاً اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی خاص مکان یا سمت کو قبلہ قرار دینا اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ اس مکان یا اس سمت میں ہے، دوسری جگہ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہر سمت میں یکساں توجہ کے ساتھ موجود ہے، کسی خاص سمت کو قبلہ عالم قرار دینا، دوسری حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی توجہ کسی خاص سمت یا جگہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب عمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ہر شخص کو اختیار دیدیا جائے کہ جس طرف چاہے رُخ کر کے نماز پڑھے، دوسرے یہ کہ سب کے لئے کوئی خاص سمت و جہت معین کر دی جائے، ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک تشتت و افتراق کا منظر سامنے آئے گا، کہ دس آدمی نماز پڑھ رہے ہیں، اور ہر ایک کا رُخ الگ الگ، اور ہر ایک کا قبلہ جدا جدا ہے، اور دوسری صورت میں تنظیم و اتحاد کا عملی سبق ملتا ہے، ان حکمتوں کی بناء پر سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو بنانا زیادہ مناسب ہے، اب وہ بیت المقدس ہو یا کعبہ، دونوں مقدس اور متبرک مقامات ہیں۔ ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام آتے ہیں، ایک زمانے تک بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی دلی خواہش کے مطابق اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کو قبلہ عالم بنا دیا گیا، ارشاد ہوا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ (۲: ۱۴۴)

ترجمہ:۔ (یعنی کعبہ کو قبلہ بنا دینے کی دلی رغبت کی وجہ سے بار بار آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر دیکھتے ہیں (کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے) ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں، اس لئے اب ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں، اس لئے اب آپ اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کریں، اور یہ حکم کچھ آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت کے لئے یہی حکم دیدیا گیا، کہ تم جہاں کہیں بھی موجود ہو، یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے اندر بھی ہو تو نماز میں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کرو۔

الغرض آیت مذکورہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ نے استقبالِ قبلہ کی پوری حقیقت کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا، بیت اللہ یا بیت المقدس کی معاذ اللہ پرستش نہیں، اور نہ اُن دونوں مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سارے عالم پر محیط اور ہر سمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا جاتا ہے اس میں دوسری حکمتیں ہیں۔

آیت مذکورہ کے اس مضمون کو واضح اور دل نشین کرنے ہی کے لئے شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کو ہجرت کے اوائل میں سولہ سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز ادا کرنے کا حکم دے کر عملی طور پر بتلا دیا گیا کہ ہماری توجہ ہر طرف ہے، اور نوافل میں اس حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا، کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً اونٹ، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھے ہوئے اشارہ سے نفلی نماز پڑھ لے، اور اس کے لئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا بھی ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اسی طرف رُخ کر لینا کافی ہے بعض مفسرینؒ نے آیت فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کو اسی نفلی نماز کا حکم قرار دیا ہے مگر یاد رہے کہ یہ حکم صرف اُن سواریوں کا ہے جن پر سوار ہو کر چلتے ہوئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا دشوار ہو، اور جن سواریوں میں سوار کو قبلہ کی طرف رُخ کر لینا دشوار نہیں، جیسے ریل، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز، ان کا وہی حکم ہے جو حالتِ حضر میں رُخِ قبلہ کا ہے، کہ اگر نفل نماز بھی ان میں پڑھی جائے تو قبلہ رخ ہو کر پڑھی جائے، (البتہ نماز کی حالت میں ریل کا یا جہاز کا رُخ مڑ جائے اور نمازی کے لئے گنجائش نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ رُخ پھر جائے، تو اسی حالت میں نماز پوری کر لے)

اسی طرح جہاں نمازی کو سمتِ قبلہ معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری وغیرہ کی وجہ سے سمتیں متعین کرنا بھی دشوار ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور تخمینہ

لگا کر جس طرف کو بھی متعین کرے گا وہی سمت اس کا قبلہ قرار دی جائے گی، نماز ادا کرنے کے بعد اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں نماز ادا کی ہے، تب بھی نماز صحیح ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جزئیات مذکورہ سے استقبالِ قبلہ کے حکمِ شرعی کی پوری حقیقت واضح ہو گئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد وہ تو سب باتوں سے پاک ہے بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور

الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا

زمین میں سب اسی کے تابعدار ہیں ، نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب

قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

حکم کرتا ہے کسی کام کو تو یہی فرماتا ہے اسکو کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور مشرکینِ عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جیسا مختلف آیات میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قباحت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں، یعنی) اور یہ لوگ (مختلف عنوان سے) کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اولاد غیر جنس ہوگی اور یا ہمجنس ہوگی، اگر غیر جنس ہو تب تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے، اور حق تعالیٰ عیب سے پاک ہیں، عقلاً بھی جیسا مسلّم ہے، اور نقلاً بھی جیسا سبحانہٗ مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہمجنس ہو تو اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہمجنس نہیں، کیونکہ جو صفات کمال لوازم ذات واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص اور غیر اللہ میں معدوم ہیں، اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی کی دلیل ہے، اس لئے غیر اللہ ذات واجب نہ ہوگا، اور وجوب خود عین حقیقت یا لازم حقیقت ہے، پس کوئی غیر اللہ، اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہ ہوا، لہٰذا ہمجنس ہونا بھی باطل ہو گیا، اب صفاتِ کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہونے کی دلیلیں مذکور ہوتی ہیں، اوّل یہ کہ) خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (اور دوسرے یہ کہ مملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (یا بایں معنی کہ ان کے تصرفاتِ قدرت جیسے مارنا، جلانا وغیرہ کوئی نہیں ہٹا سکتا، گو احکامِ شرعیہ کو

کوئی ٹال دے) اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے اور وجہ تھے یہ کہ ایجاد کی بھی قدرت ایسی عظیم و عجیب ہے کہ) جب کسی کام کا (مثلاً پیدا ہی کرنا ہے) پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس (اتنی بات ہے کہ) اس کو (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے، (ان کو آلات و اسباب اور صناعوں اور معینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اور یہ چاروں امر بجز حق تعالیٰ کے کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مدعیانِ اولاد کے بھی مسلمات سے تھا، پس دلیل سے مقدمۂ اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہو گئی)

فوائد

۱۔ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر کرنا، مثلاً بارش، رزق وغیرہ، اور اسی طرح اسباب اور مواد اور قوٰی سے کام لینا، یہ سب کسی حکمتِ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انھیں اسباب و قوات کو حاجت روا مان کر استعانت و مدد کے طلبگار ہوں۔

۲۔ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ پہلی شرائع میں اللہ تعالیٰ کو سببِ اوّل ہونے کی وجہ سے باپ کہا کرتے تھے، جاہلوں نے ولادت کے معنے سمجھ لئے، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا یا ایسا کہنا کفر قرار دیا گیا، دفعِ فساد کی مصلحت سے اب ایسی لفظ کے استعمال کی بالکل اجازت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَآ اٰيَةٌ ط

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ط تَشَابَهَتْ

اسی طرح کہہ چکے ہیں وہ لوگ جو اُن سے پہلے تھے انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل

قُلُوبُهُمْ ط قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوقِنُونَ ﴿۱۱۸﴾

ان کے بے شک ہم نے بیان کر دیں نشانیاں اُن لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور (بعضے) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر، جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتا دیں، کہ دوسرے رسول کی ہم کو ضرورت ہی نہ رہے، یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی ہی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا (کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور

ہی دلیل (ثبوتِ رسالت کی) آجاوے (حق تعالیٰ اولاً اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں، جو اُن سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے، پھر ثانیاً اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب کی بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی، پھر ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا جزو اول حماقت محض تھا، کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پلہ ملائکہ اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے، جو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے، اس لئے اس احمقانہ بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم تو ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالتِ محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہو سکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کد ہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے اُن کو تحقیق ہی منظور نہیں، سوالیسوں کی تسلی و تشفی کا کون ذمہ دار بنے)۔

فائدہ:۔ یہود و نصاریٰ تو اہلِ کتاب تھے، ان میں اہلِ علم بھی تھے، اس کے باوجود جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل فرمایا تو اس لئے کہ باوجودیکہ قطعی اور قوی دلائل کثرت سے قائم کر دیئے گئے تھے پھر بھی جو انکار کئے جا رہے تھے تو جہالت نہیں تو اور کیا تھا، اور یہ جاہلوں ہی کی سی بات کہلائیگی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو جاہل فرمایا۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

بیشک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے سچا دین دے کر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ میں رہنے والوں کی۔

خلاصۂ تفسیر

(چونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین کا تقاضا یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کو اس جہالت اور عناد کی بدولت دل تنگی پیش آتی، اور ان کے ایمان نہ لانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپ ملول و آزردہ خاطر ہو جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کی تسلی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسولؐ) ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر (خلق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سناتے رہئے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے)

ڈراتے رہے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی، (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا، اور کیوں دوزخ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہے، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا،

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

تو کہہ دے جو راہ اللہ بتادے وہی راہ سیدھی ہے اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے انکی خواہشوں کی بعد

الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اس علم کے جو تجھ کو پہنچا، تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار۔

خلاصۂ تفسیر

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہو جائیں (اور یہ محال ہے، پس ان کا راضی ہونا محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے مترشح ہو تو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جس کو خدا نے (ہدایت کا راستہ) بتلایا ہے، (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس راہِ ہدایت وہی رہا) اور (یہ امر کہ آپ نعوذ باللہ ان کے مذہب کے پیرو ہو جائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک محال لازم آتا ہے، کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرنے لگیں (جس کو وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں مگر کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہو جانے سے اب وہ محض چند غلط خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی ثابت بالوحی) آچکنے کے بعد تو (ایسی حالت میں تو) آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے نہ مددگار (بلکہ توبہ توبہ پنجۂ قہر میں گرفتار ہو جانا لازم آوے، اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ دلائل قطعیہ سے دوامِ رضائے حق تعالیٰ آپ سے ثابت ہے، پس غضب محال ہے، اور اتباعِ مذکور سے یہ لازم آیا تھا، اس لئے اتباعِ مذکور بھی محال اور بدون اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو ایسے امر کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اس سے دل کو خالی کر لینا چاہئے)!

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ

وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے اس کے پڑھنے کا وہی اس پر یقین لاتے ہیں

بِہٖ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

اس آیت سے پہلے کی آیت میں معاندین اہل کتاب کا ذکر اور مخالفین کے ایمان سے کلی مایوسی کا بیان تھا، اس کے بعد حسب عادتِ قرآن انصاف پسند اہل کتاب کا بیان ہے، جنھوں نے حق واضح ہو جانے کے بعد جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، اور آپؐ کا اتباع اختیار کر لیا، پس ارشاد ہے، جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے، (کہ قوتِ علمیہ کو فہم مضامین میں صرف کیا، اور قوتِ ارادیہ کو عزم اتباع حق میں استعمال کیا) ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اس (دینِ حق اور علمِ وحی) پر ایمان لے آتے ہیں، اور جو شخص نہ مانے گا (کسی کا نقصان نہ کرے گا) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے (کہ ایمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ہیں ان سے محروم رہیں گے) !

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو احسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے

اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ

تم کو بڑائی دی اہل عالم پر ، اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی

عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا شَفَاعَۃٌ وَّ

کی طرف سے ذرا بھی اور نہ قبول کیا جاوے گا اس کی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور

لَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

نہ اُن کو مدد پہنچے ؛ ؛ ؛

خلاصۂ تفسیر

اوپر کی آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا وہ تو ختم ہوئے، اب ان مضامین کی ابتدائی تمہید جن کے اجمال کے یہ سارے

مضامین تفصیل تھے، اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہید کا مضمون خاص یعنی ترغیب کے لئے انعام عام وخاص کا یاد دلانا، اور ترہیب کیلئے قیامت کو پیش نظر کردینا بوجہ تکرار خوب ذہن نشین ہوجائے، کیونکہ مقصود اعظم کلیات ہوتے ہیں جن کا خود استحضار ان کے اختصار کی وجہ سے سہل اور آسان ہوتا ہے، اور بوجہ جامعیت اور انطباق کے ان کے ذریعے سے ان کے جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور محاورات میں یہ طرز بلیغ بھی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے، کہ مفصل اور مطوّل بات کرنے سے پہلے ایک مجمل عنوان سے اس کی تقریر کردی جائے، جس کا قدر مشترک تمام تفاصیل کے سمجھنے میں معین و مددگار ہو، اور آخر میں بطور خلاصہ اور نتیجہ تفصیل اسی مجمل عنوان کا پھر اعادہ کردیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اس میں ایک ضرر یہ، دوسرا یہ، تیسرا یہ، دس بیس مضرتیں گنوا کر پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ غرض تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اسی طور پر اس آیت یٰبَنِیْٓ اِسْرَاۗءِیْلَ کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔

اے اولاد یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا، اور اس کو (بھی یاد کرو) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی اور تم ڈرو ایسے دن سے (یعنی روز قیامت سے) جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور حق واجب) ادا کرنے پاوے گا، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (بجائے حق واجب کے) قبول کیا جاوے گا اور نہ کسی کی کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (بزور) بچاسکے گا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں، تب فرمایا میں تجھ کو کردوں گا

لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي

سب لوگوں کا پیشوا، بولا اور میری اولاد میں سے بھی فرمایا نہیں پہنچے گا میرا قرار

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ظالموں کو۔

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم کا اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور سے بجالائے، (اس وقت)

حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجئے)، ارشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سُن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا، (سو ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہی، البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)

معارف و مسائل

اس آیت میں حق تعالیٰ کے خاص پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف امتحانات اور ان میں ان کی کامیابی پھر اس کے انعام وصلہ کا بیان ہے، اور پھر جب حضرت خلیل اللہؑ نے از راہِ شفقت اپنی اولاد کے لئے بھی اسی انعام کی درخواست کی، تو انعام پانے کا ایک ضابطہ ارشاد فرما دیا گیا، جس میں حضرت خلیل اللہؑ کی درخواست کی منظوری مشروط صورت میں دی گئی، کہ یہ انعام آپ کی ذریت کو بھی ملے گا، مگر جو لوگ ذریت میں سے نافرمان اور ظالم ہوں گے وہ یہ انعام نہ پاسکیں گے۔

حضرت خلیل اللہؑ کے عظیم امتحانات اور مضامینِ امتحان

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:

اوّل یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہیں، کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال اُن پر مخفی نہیں پھر اس امتحان کا مقصد کیا تھا؟

دوسرے یہ کہ امتحان کس کس عنوان سے لیا گیا۔

تیسرے یہ کہ کامیابی کس صورت اور کس نوعیت کی رہی۔

چوتھے یہ کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس انعام کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس کی کچھ توضیح و تفصیل۔

ان پانچوں سوالات کے جوابات بالتفصیل ملاحظہ فرمائیے:

پہلی بات کہ امتحان کا مقصد کیا تھا؟ قرآن کے ایک لفظ رَبُّہٗ نے اس کو حل کر دیا ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس امتحان کے ممتحن خود اللہ جل شانہٗ ہیں، اور ان کے اسماء حُسنیٰ میں سے اس جگہ لفظ رب لاکر شانِ ربوبیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کسی جرم کی پاداش میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شانِ تربیت و ربوبیت اس کا منشاء ہے، ان

آزمائشوں کے ذریعے اپنے خلیلؑ کی تربیت کر کے ان کے درجات و مقامات تک پہنچانا مقصود ہے، پھر اس جملہ میں مفعول کو مقدم اور فاعل کو مؤخر کر کے یوں ارشاد ہوا وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالتِ شان کو اور نمایاں فرمایا گیا۔

دوسرا سوال کہ امتحان کس عنوان سے لیا گیا؟ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف کلمات کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے مختلف اقوال ہیں، کسی نے احکام الٰہیہ میں سے دس چیزیں شمار کیں، کسی نے تیس بتلائی ہیں، اور کسی نے اور کچھ کم و بیش دوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، وہ چیزیں سب کی سب ہی حضرت خلیل اللہؑ کے مضامینِ امتحان تھے، ائمہ تفسیر ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک علمی موشگافیوں سے زیادہ قابلِ قدر اخلاق و کردار کی عملی ثابت قدمی ہے

یہی مضامینِ امتحان جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی مدارس کے امتحانات کی طرح فنی مسائل اور اُن کی تحقیقات نہیں، بلکہ اخلاقی قدروں اور عملی ثابت قدمی کی جانچ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہِ عزّ و جلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علمی موشگافیاں نہیں، بلکہ عملی اور اخلاقی برتری ہے۔

اب ان مضامینِ امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خُلّت کا خلعتِ خاص عطا فرمایا جائے، اس لئے ان کو سخت امتحانات سے گذارا گیا، پوری قوم کی قوم حتیٰ کہ اپنا خاندان سب کے سب بُت پرستی میں مبتلا تھے سب کے عقائد و رسوم سے مختلف ایک دین حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بارگراں آپ پر ڈالا گیا، آپ نے پیغمبرانہ جرأت و ہمت کے ساتھ بے خوف و خطر قوم کو خدائے وحدہٗ لا شریک لہٗ کی طرف بلایا، بت پرستی کی شرمناک رسم کی خرابیاں مختلف عنوانات سے بیان کیں، عملی طور پر بتوں کے خلاف جہاد کیا، پوری قوم کی قوم آمادۂ جنگ و جدال ہوگئی، بادشاہِ وقت نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا، اللہ کے خلیلؑ نے اپنے مولا کی رضامندی کے لئے ان سب بلاؤں پر راضی ہو کر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پیش کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیلؑ کو امتحان میں کامیاب پایا تو آگ کو حکم دیا:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ (۲۱: ۶۹)	"ہم نے حکم دیدیا کہ اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور ذریعۂ سلامتی بن جا۔"

جس وقت یہ حکمِ خداوندی آتشِ نمرود کے متعلق آیا تو حکم کے الفاظ عام تھے، کسی خاص آگ

کی تعیین کرکے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس حکم خداوندی کے آتے ہی اپنی اپنی جگہ ہر آگ ٹھنڈی ہوگئی، اور نارِ نمرود بھی اس زمرہ کا فرد بن کر ٹھنڈی پڑ گئی،

قرآن میں لفظ بَرْدًا کے ساتھ سَلٰمًا کا اضافہ اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی برف کی طرح تکلیف دہ بلکہ مہلک ہوجاتی ہے، اگر لفظ سلاماً ارشاد نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برف کی طرح ایسی ٹھنڈی ہوجاتی جو بجائے خود ایک عذاب بنجاتی جیسے جہنم میں ایک عذاب زمہریر کا بھی ہے۔

اس امتحان سے فارغ ہوکر دوسرا امتحان یہ لیا گیا کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کرجائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی خیرباد کہہ دیا، اور مع اہل وعیال ہجرت کرکے شام میں چلے آئے؛

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند

فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملکِ شام میں قیام کیا ہی تھا کہ یہ حکم ملا کہ بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے شیرخوار بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کریں (ابن کثیر)

جبرئیل امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلے، راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آتی تو حضرت خلیلؑ فرماتے کہ یہاں ٹھہرا دیا جائے، جبرئیلؑ فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے ہے، جب وہ خشک پہاڑ اور گرم ریگستان آجاتا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر اور شہر مکہ کی بستی بسانا مقدر تھا، اس ریگستان میں آپ کو اتار دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے خلیلؑ اپنے پروردگار کی محبت میں مسرور و مگن اسی چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل میں بی بی کو لے کر ٹھہر جاتے ہیں، لیکن یہ امتحان اسی پر ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ بی بی اور بچے کو یہیں چھوڑ دیں، اور خود ملکِ شام کو واپس ہوجائیں، اللہ کا خلیلؑ حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور شام کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، تعمیلِ حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ بیوی کو یہ اطلاع ہی دیدے کہ مجھے چونکہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جارہا ہوں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو پکارتی ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس لق و دق میدان میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جارہے ہو! اس کا بھی جواب نہیں دیتے، مگر وہ بی بی بھی خلیل اللہؑ کی بی بی تھیں سمجھ گئیں کہ ماجرا کیا ہے، اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بھی جب حکم خداوندی کا علم ہوگیا، تو نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ جائیے جس

مالک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا۔

اب حضرت ہاجرہؑ اپنے شیر خوار بچہ کے ساتھ اس لق و دق جنگل میں وقت گذارنے لگتی ہیں، پیاس کی شدت پانی کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچے کو کھلے میدان میں چھوڑ کر صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر بار بار چڑھتی اترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آئیں یا کوئی انسان نظر آجائے، جس سے کچھ معلومات حاصل کریں، سات مرتبہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مایوس ہو کر بچے کے پاس لوٹ آتی ہیں، صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگار کے طور پر قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے احکامِ حج میں ضروری قرار دیا گیا ہے، حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنی دوڑ دھوپ ختم کرنے اور مایوس ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو رحمتِ خداوندی نازل ہوتی ہے، جبرئیل امین آتے ہیں، اور اس خشک ریگستان کی زمین سے پانی کا ایک چشمہ نکال دیتے ہیں، جس کا نام آج زمزم ہے، پانی کو دیکھ کر اوّل جانور آجاتے ہیں، پھر جانوروں کو دیکھ کر انسان پہنچتے ہیں، اور مکہ کی آبادی کا سامان ہو جاتا ہے، ضروریاتِ زندگی کی کچھ آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں۔

نو مولود بچہ جن کو آج حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کہا جاتا ہے نشو و نما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام باشاراتِ ربانی گاہ گاہ تشریف لاتے ہیں اور بی بی بچہ کو دیکھ جاتے ہیں، اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنے خلیلؑ کا تیسرا امتحان لیتے ہیں، یہ بچہ اس بیکسی اور بے سرو سامانی میں پروان چڑھا، اور بظاہر اسباب باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا، اب والد ماجد کو بظاہر یہ حکم ملتا ہے کہ اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دو، ارشاد قرآنی ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُــؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ؀ (۳۷: ۱۰۲)

جب بچہ اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں کچھ مدد دے سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اے بیٹے میں خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ فرزند سعید نے عرض کیا کہ ابا جان آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے آپ مجھے بھی اس کی تعمیل میں ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادے کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ کے جنگل میں لے گئے، اور اپنی طرف سے حکمِ حق جل و علا شانہٗ کی پوری تعمیل کر دی، مگر وہاں مقصود بچے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ شفیق باپ کا امتحان کرنا تھا، واقعہ خواب کے الفاظ میں غور کیا جائے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کر دیا، بلکہ ذبح کا عمل کرتے دیکھا،

جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر دکھایا اور اس عمل کو بذریعہ وحی منام دکھلانے میں بھی شاید یہی مصلحت ہو کہ بذریعہ کلام حکم ذبح دینا منظور نہ تھا، اسی وجہ سے ارشاد یہ ہوا کہ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا، کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو پورا کر دیا، جب اسمیں وہ پورے اترے، تو اللہ تعالیٰ نے جنت سے اس کا فدیہ نازل فرما کر اس کی قربانی کا حکم دیدیا، اور یہ سنتِ ابراہیمی آنے والی دنیا کے لئے دائمی سنت بن گئی۔

یہ کڑے اور سخت امتحانات تھے جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو گذارا گیا، اس کے ساتھ ہی دوسرے بہت سے اعمال و احکام کی پابندیاں آپ پر عائد کی گئیں، جن میں سے دس خصائلِ فطرت کے نام سے موسوم ہیں، جن کا تعلق بدن کی صفائی، ستھرائی اور پاکی سے ہے، اور یہ خصائلِ فطرت آنے والی تمام امتوں کے لئے بھی مستقل احکام بن گئے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان تمام امور کے لئے تاکیدی احکام دیئے۔

اور ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ پورا اسلام تیس حصوں میں دائر ہے، جس میں سے دس سورۂ برأت میں مذکور ہیں اور دس سورۂ احزاب میں اور دس سورۂ مومنون میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا، اور ان سب امتحانات میں پورے اترے، اور کامیاب رہے۔

سورۂ برأت میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے مسلمان کی دس مخصوص علامات وصفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۹: ۱۱۲)

"وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنیوالے عبادت کرنیوالے حمد کرنیوالے، روزہ رکھنے والے، رکوع سجدہ کرنیوالے، نیک باتوں کی تعلیم کرنیوالے اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے، اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سُنا دیجئے"۔

اور سورۂ مومنون کی دس صفات یہ ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ

"یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرنے والے ہیں، اور جو

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲۳: ۱-۱۱)

لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں اور جو اپنے آپ کو پاک کرنیوالے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلبگار ہو ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اور سورۂ احزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۳۳: ۳۵)

"بیشک اسلام کے کام کرنیوالے مرد اور اسلام کے کام کرنیوالی عورتیں اور ایمان لانیوالے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنیوالے مرد اور فرمانبرداری کرنیوالی عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنیوالے مرد اور صبر کرنیوالی عورتیں، اور خشوع کرنیوالے مرد اور خشوع کرنیوالی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کیلئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے"

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کر دی گئی ہیں، اور یہی صفات وہ کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا امتحان لیا گیا، اور آیت وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ میں انہی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

ان آیات کے متعلق قابلِ غور سوالات میں سے دو سوالوں کا جواب یہاں تک ہو گیا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ اس امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا درجہ اور مقام کیا رہا۔ تو وہ خود قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو سندِ کامیابی عطا فرمائی، ارشاد ہوا:

وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓى (۵۳: ۳۷) (وہ ابراہیم جس نے پورا کر دکھایا)

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر امتحان کی مکمل اور سو فی صدی کامیابی کا اعلان فرما دیا۔

چوتھا سوال کہ اس امتحان پر انعام کیا ملا، اس کا ذکر خود اسی آیت میں آچکا ہے، یعنی:

قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲: ۱۲۴)	"(امتحان کے بعد) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں"

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کامیابی کے صلہ میں امامتِ خلق اور پیشوائی کا انعام دیا گیا، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوا کہ خلقِ خدا کے امام و مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے جو امتحان درکار ہے وہ دنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں جیسا امتحان نہیں جس میں چند مسائل کی فنی تحقیق اور علمی موشگافی کو کامیابی کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے، اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے ان تیس اخلاقی اور عملی صفات میں کامل اور مکمل ہونا شرط ہے، جن کا ذکر ابھی بحوالۂ آیات آچکا ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بھی یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَٮِٕمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ ۝ (۳۲: ۲۴)	"یعنی ہم نے اُن میں کچھ امام اور پیشوا بنائے کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں جب انھوں نے اپنے نفس کو خلافِ شرع سے روکا اور ہماری آیتوں پر یقین کیا"

اس آیت میں امامت و پیشوائی کے لئے ان تیس صفات کا خلاصہ دو لفظوں میں کر دیا گیا ہے، یعنی صبر و یقین، یقین علمی اور اعتقادی کمال اور صبر عملی اور اخلاقی کمال ہے، اور وہ تیس صفات جن کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے سب کی سب انہی دو وصفوں میں سموئی ہوئی ہیں۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منصبِ امامت و پیشوائی دینے کے لئے جو یہ ضابطہ ارشاد ہوا ہے کہ فاسق اور ظالم لوگوں کو یہ منصب نہ ملے گا، اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کی توضیح یہ ہے کہ امامت و پیشوائی ایک حیثیت سے اللہ جل شانہ کی خلافت ہے، یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جو اس کا باغی اور نافرمان ہو اسی لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنا نمائندہ یا امیر کسی ایسے شخص کو مقرر نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کا باغی یا نافرمان ہو۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی، اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا

کی جگہ کو نماز کی جگہ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک رکھو میرے

بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

گھر کو واسطے طواف کرنیوالوں کے اور اعتکاف کرنیوالوں کے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔

حلِّ لغات مَثَابَةً یہ لفظ ثَابَ يَثُوْبُ ثَوْبًا وَمَثَابًا سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس لئے مثابہ کے معنی مرجع کے ہوگئے جہاں آدمی بار بار لوٹ کر جائے۔

خلاصۂ تفسیر (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرر رکھا اور (آخر میں امتِ محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے (بنائے کعبہ کے وقت حضرت) ابراہیم و (حضرت) اسمٰعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو (بیرونی اور مقامی لوگوں کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی ہجرت مکہ اور بنا بیت اللہ کا تفصیلی واقعہ اس آیت میں بیت اللہ کعبہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے اور حضرت خلیل اللہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں اسکی تعمیر جدید نیز بیت اللہ اور مکہ مکرمہ کی چند خصوصیات کا ذکر اور بیت اللہ کے احترام سے متعلقہ احکام مذکور ہیں، یہ مضمون قرآن کی بہت سی آیات میں مختلف سورتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس جگہ مختصر طور پر اس کو بیان کیا جاتا ہے، جس سے مذکورہ آیات کا پورا مضمون واضح ہوجائے گا، یہ مضمون سورۂ حج کی آیت نمبر ۲۶ میں اس طرح مذکور ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝

یعنی وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہو جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانۂ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام درکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے، پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمھارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز کے راستوں سے پہونچی ہوں گی "

تفسیر ابن کثیر میں ائمۂ تفسیر حضرت مجاہدؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملک شام میں مقیم تھے، اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار بچے تھے، جس وقت حق تعالیٰ کا ان کو یہ حکم ملا کہ ہم خانۂ کعبہ کی جگہ آپ کو بتلاتے ہیں آپ اس کو پاک صاف کر کے طواف و نماز سے آباد رکھیں، اس حکم کی تعمیل کے لئے جبریل امین براق لے کر حاضر ہوئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور اسمٰعیل علیہ السلام کو مع ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ لیکر سفر کیا، راستے میں جب کسی بستی پر نظر پڑتی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جبریل امین سے دریافت کرتے کہ کیا ہمیں یہاں اُترنے کا حکم ملا ہے، تو حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے کہ نہیں آپ کی منزل آگے ہے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کی جگہ سامنے آئی، جس میں کانٹے دار جھاڑیاں اور ببول کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس خطۂ زمین کے آس پاس کچھ لوگ بستے تھے جن کو عمالین کہا جاتا تھا، بیت اللہ اس وقت ایک ٹیلہ کی شکل میں تھا، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اس جگہ پہونچ کر جبریل امین سے دریافت کیا کہ کیا ہماری منزل یہ ہے، تو فرمایا کہ ہاں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مع اپنے صاحبزادے اور حضرت ہاجرہ کے یہاں اُتر گئے، اور بیت اللہ کے پاس ایک معمولی چھپر ڈال کر حضرت اسمٰعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو یہاں ٹھہرادیا، ان کے پاس ایک توشہ دان میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا، اور ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت یہاں ٹھہرنے کا حکم نہ تھا وہ اس شیر خوار بچہ اور ان کی والدہ کو حوالہ بخدا کر کے واپس ہونے لگے، جانے کی تیاری دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے عرض کیا کہ ہمیں اس لق و دق میدان میں چھوڑ کر آپ کہاں جاتے ہیں، جس میں نہ کوئی مونس و مددگار ہے نہ زندگی کی ضروریات۔

حضرت خلیل اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ نے کوئی جواب نہ دیا، اور چلنے لگے، حضرت ہاجرہؓ ساتھ اٹھیں، پھر بار بار یہی سوال دُہرایا، حضرت خلیل اللہؑ کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، یہاں تک کہ خود

ان کے دل میں بات پڑی، اور عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔

اس کو سنکر حضرت ہاجرہؓ نے فرمایا کہ پھر آپ شوق سے جائیں، جس نے آپ کو یہ حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا، ابراہیم علیہ السلام حکمِ خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کھڑے ہوئے مگر شیرخوار بچہ اور اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستہ کے موڑ پر پہنچے جہاں سے حضرت ہاجرہؓ نہ دیکھ سکیں تو ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء فرمائی جو سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۳۵ و ۳۷ میں اس طرح مذکور ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ (سورۃ ابراہیم ۱۴: ۳۵)

"اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھئے"

پھر دعاء میں عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۴: ۳۷)

"یعنی اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں، تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے، اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں"

سابقہ حکم جس کی بناء پر شام سے ہجرت کرا کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں لایا گیا تھا اس میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جانتے تھے کہ پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظاہری نجاسات اور گندگی سے بھی پاک رکھا جائے، اور باطنی نجاست کفر و شرک سے پاکی بھی فرمانِ الٰہی میں مقصود ہے، اس لئے یہاں ٹھہر کر جو دعائیں فرمائیں ان میں اوّل تو اس بستی کے محفوظ و مامون رہنے اور جائے امن ہونے کی دعاء فرمائی، پھر یہ دعاء کی کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچائیے، کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو معرفتِ حق تعالیٰ کا وہ مقام حاصل تھا، جس میں انسان کو اپنا وجود ہی نابود نظر آتا ہے، اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادوں کو یہ محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اسی کی مشیت و ارادہ سے سب کام ہوتے ہیں، اس لئے کفر و شرک سے بیت اللہ کو پاک رکھنے کا

جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے امداد طلب کی، اس دعاء کے اندر کفر و شرک سے محفوظ رہنے کی التجاء میں ایک خاص راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا تو یہ احتمال بھی تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ ہی کو معبود نہ بنا لے، اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جائے، اس لئے یہ دعاء فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے۔

اس کے بعد شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیش نظر یہ دعاء فرمائی کہ میں نے ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محترم گھر کے پاس ٹھہرا تو دیا ہے لیکن یہ جگہ زراعت کے قابل بھی نہیں، جہاں کوئی اپنی محنت سے ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکے، اس لئے آپ ہی اپنے فضل سے ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما دیں۔

یہ دعاء کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہو گئے، ادھر حضرت ہاجرہؑ کا کچھ وقت تو اس توشۂ کھجور اور پانی کے ساتھ کٹ گیا، جو حضرت خلیل اللہؑ چھوڑ گئے تھے، پانی ختم ہونے کے بعد خود بھی پیاس سے بے چین اور شیر خوار بچہ بھی، اس وقت پانی کی تلاش میں ان کا نکلنا اور کبھی کوہِ صفا پر کبھی کوہِ مروہ پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر راستہ طے کرنا، تاکہ حضرت اسمٰعیلؑ آنکھوں کے سامنے آجائیں، عام مسلمانوں میں معروف ہے اور حج میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا آجتک اسی کی یادگار ہے۔

اس قصہ کے آخر میں حضرت جبریل امین کا بحکم خداوندی وہاں پہونچنا اور چشمۂ زمزم کا جاری کرنا اور پھر قبیلۂ جرہم کے کچھ لوگوں کا یہاں آکر مقیم ہو جانا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد قبیلۂ جرہم کی ایک بی بی سے شادی ہو جانا، یہ سب صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سورۂ حج کی آیت میں جو بیت اللہ کو آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت خلیل اللہؑ کو ملا تھا اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اسمٰعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کے ذریعہ آباد کر دیا جائے، اس کے مخاطب صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابھی شیر خواری کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر جدید کا حکم نہ ملا تھا، سورۂ بقرہ کی یہ آیت جو اس وقت زیر نظر ہے وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی شریک کر لیا گیا ہے، یہ حکم اس وقت کا ہے جب کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جوان اور متاہل ہو چکے تھے، اُس وقت دونوں کو بناءِ بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام حسب عادت حضرت ہاجرہؑ

اور اسمٰعیلؑ کی ملاقات کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے، تو دیکھا کہ اسمٰعیل علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر بنا رہے ہیں، والد ماجد کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ لائق فرزند نے عرض کیا کہ بسر و چشم کروں گا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں بیت اللہ تھا کہ مجھے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے، بیت اللہ کے حدود اربعہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بتلا دیئے تھے، دونوں بزرگوار اس کام میں لگے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادیں نکل آئیں، انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کر دی، اگلی آیت میں اسی کا بیان ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بانی بیت اللہ اصل میں حضرت خلیل علیہ السلامؑ اور اسمٰعیل علیہ السلام مددگار کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے وہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو بعض روایاتِ حدیث اور تاریخ میں مذکور ہے کہ بیت اللہ پہلے سے دنیا میں موجود تھا، کیونکہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلا دینے کا ذکر ہے، کہیں اس کو پاک صاف رکھنے کا ذکر ہے، یہ کہیں مذکور نہیں کہ آج کوئی نیا گھر تعمیر کرانا ہے اس کی تعمیر کریں، اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا، پھر طوفانِ نوحؑ کے وقت منہدم ہو گیا یا اٹھا لیا گیا تھا، صرف بنیادیں موجود تھیں، حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کے پہلے بانی نہیں، بلکہ بناءِ سابق کی بنیادوں پر جدید تعمیر ان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کس نے اور کس وقت کی؟ اس میں کوئی صحیح اور قوی روایت حدیث کی منقول نہیں، اہلِ کتاب کی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی تعمیر آدم علیہ السلام کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، یہ تعمیر طوفانِ نوح تک باقی رہی، طوفانِ نوحؑ میں منہدم ہو جانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہ ایک ٹیلہ کی صورت میں باقی رہی، حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے از سرِ نو تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس تعمیر میں شکست و ریخت تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر منہدم نہیں ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قریش مکہ نے اس کو منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کیا جس کی تعمیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ مَثَابَۃً سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص فضیلت بخشی ہے کہ وہ ہمیشہ

مرجع خلائق بنا رہیگا، اور لوگ بار بار اس کی طرف جانے اور لوٹنے کے آرزومند رہیں گے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ نے فرمایا لا یقضی احد منھا وطراً (قرطبی) یعنی کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ زیارت و طواف کا شوق لیکر لوٹتا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبول حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پائے، چنانچہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوقِ زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جوں جوں بار بار زیارت کرتا رہتا ہے یہ شوق اور بڑھتا جاتا ہے۔

یہ معجزہ بیت اللہ ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے، ورنہ دنیا کے بہتر سے بہتر مناظر کو انسان ایک دو مرتبہ دیکھ لینے کے بعد سیر ہو جاتا ہے، اور پانچ سات مرتبہ دیکھنے کے بعد تو دیکھنے کا دھیان بھی نہیں آتا، اور یہاں تو نہ کوئی خوش منظر سبزی، نہ وہاں پہنچنا کچھ آسان ہے، نہ وہاں دنیا کے کاروبار ہی کی کوئی اہمیت ہے، اس کے باوجود لوگوں کے دل میں اس کی تڑپ ہمیشہ موجزن رہتی ہے۔ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

۲۔ لفظ اَمْنًا اس جگہ مَاْمَن یعنی جائے امن کے معنی میں ہے، اور لفظ بَیْت سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مراد ہے، قرآن کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ بول کر پورا حرم مراد لینے کے اور بھی شواہد موجود ہیں جیسے ارشاد ہے، هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (۵: ۹۵)، اس میں لفظ کعبہ بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ذکر قربانی کا ہے اور بیتِ کعبہ کے اندر تو قربانی نہیں ہوتی، اور نہ وہاں قربانی کرنا جائز ہے، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوئے کہ ہم نے حرم مکہ کو جائے امن بنا دیا ہے، اور جائے امن بنا دینے سے مراد لوگوں کو یہ حکم دینا ہے کہ حرم محترم کو عام قتل و قتال اور انتقام سے بالاتر رکھیں۔ (ابن عربی)

چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملتِ ابراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہیں لیتے تھے، اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، شریعتِ اسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا، فتح مکہ کے وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ارضِ حرم میں قتال کو جائز کیا گیا تھا، مگر اسی وقت پھر ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرما دیا (صحیح بخاری)

اب رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی رُو سے عائد ہوتا ہے تو حرم اس کو امن نہیں دے گا، بلکہ اس پر باجماع امت

حدود و قصاص جاری کئے جائیں گے (احکام القرآن جصاص و قرطبی) کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فَإِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ. "یعنی اگر تم سے لوگ حرم میں قتال کرنے لگیں تو تم بھی وہیں اُن کو قتل کر دو" (۲: ۱۹۱)

البتہ یہاں ایک مسئلہ ائمہ مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص باہر سے جرم کر کے حرم میں پناہ لیلے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں حدود و قصاص کی سزائیں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو جرائم کر کے سزا سے بچنے کا راستہ کھل جائے گا، اور عالم میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم مجرموں کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے اندر سزا نہ دی جائیگی، بلکہ اس کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ حرم سے باہر نکلے، وہاں سے نکلنے کے بعد سزا جاری کی جائے گی۔

۳۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى، اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہو جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کا بطور معجزہ نشان پڑگیا تھا، اور جس کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ نے استعمال کیا تھا (صحیح بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان ہلکا پڑ گیا ہے (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، ممکن ہو کہ اس سے مراد یہ ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں جن کو مقامِ ابراہیم پر پڑھنے کا حکم اس آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہو جائے گی، اس پر اکثر فقہاء امت متفق ہیں۔

۴۔ آیتِ مذکورہ میں مقامِ ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کا حکم ہے اس کی وضاحت خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے قول وعمل سے اس طرح فرما دی کہ آپ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے تھوڑے فاصلہ سے رکھا ہوا ہے وہاں پہونچ کر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اور پھر مقام ابراہیم کے پیچھے اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقام ابراہیم کو درمیان میں رکھتے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے (صحیح مسلم) اسی لئے فقہاء امت نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقام ابراہیم کے پیچھے متصلاً جگہ نہ ملے، وہ کتنے ہی فاصلہ پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقام ابراہیم بھی اس کے سامنے رہے، اور بیت اللہ بھی تو اس حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں (جصاص ومناسک ملا علی قاری)

البتہ ان دو رکعتوں کا خاص مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا سنت ہے اور حرم میں کسی دوسری جگہ بھی ادا کرے تو کافی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے سے متصل پڑھنا بھی ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس جگہ پڑھنا منقول ہے (جصاص) اور ملا علی قاریؒ نے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور سنت یہ ہے کہ مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کی جائیں، لیکن اگر کسی وجہ سے وہاں ادا نہ کر سکا تو پھر حرم میں یا حرم سے باہر جہاں کہیں ممکن ہو ادا کرنے سے واجب ادا ہو جائے گا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا تو مسجد حرام بلکہ مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد ادا کی، اور بضرورت حرم سے باہر ادا کرنے پر جمہور علماء کے نزدیک کوئی دم بھی واجب نہیں ہوتا، صرف امام مالکؒ وجوب دم کے قائل ہیں (مناسک ملا علی قاری)

۶۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ، اس میں بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری نجاسات اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے، اور باطنی نجاسات کفر و شرک اور اخلاق رذیلہ بغض وحسد، حرص وہوا تکبر و غرور، ریاء ونام ونمود سے پاکی بھی شامل ہے، اور اس حکم طہارت کیلئے لفظ بَيْتِيَ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیوت اللہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے، فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ (۲۴: ۳۶)

حضرت فاروق اعظمؓ نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا، تمہیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی) یعنی مسجد کا ادب واحترام چاہئے، اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے، حاصل یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے، اسی طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام نجاسات اور بدبو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں، اور اپنے دلوں کو شرک ونفاق اور تمام اخلاق رذیلہ، تکبر، حسد، بغض، حرص وریاء وغیرہ کی نجاسات سے پاک کرکے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیاز، لہسن وغیرہ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے، اور چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے، کہ ان سے نجاست کا خطرہ رہتا ہے۔

۷۔ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ، آیت کے ان کلمات سے چند احکام و فوائد حاصل ہوئے، اول یہ کہ بناء بیت اللہ کا مقصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، دوسرے یہ کہ طواف

نماز سے مقدم ہے (کما روی عن ابن عباس) تیسرے یہ کہ اطراف عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل (جصاص)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے رہنے

مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ

والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر فرمایا اور جو

كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ

کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ

الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بری جگہ ہے رہنے کی، اور یاد کر جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں خانۂ کعبہ کی اور

اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا

اسمٰعیل دعا کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے بیشک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا اے پروردگار

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص

ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی ہے توبہ قبول کرنیوالا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس (موقع) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (و امان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) اُن کو (کہتا ہوں) جو اُن میں اللہ تعالیٰ

پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دوں گا مومن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر ہے (البتہ نجات آخرت چونکہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے) سو (اس واسطے) ایسے شخص کو (جوکہ کافر ہو) تھوڑے روز (یعنی دنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا (لیکن) پھر (بعد مرگ) اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچا دوں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بُری ہے (اللہ بچادے، اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسمٰعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں (ہماری دعاء کو سنتے ہیں ہماری نیتوں کو جانتے ہیں) اے ہمارے پروردگار اور (ہم دونوں یہ بھی دعاء کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنالیجئے اور (ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں، مال ومنال اہل وعیال اور خود اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعمیلِ احکامِ ربانی میں مسارعت کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائبِ روزگار میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل وعیال پر شفقت ومحبت ایک طبعی اور فطری امر ہونے کے ساتھ حکم ربانی بھی ہے، مذکور الصدر آیات اس کا مظہر ہیں، انھوں نے اپنے اہل وعیال کیلئے دین و دنیا کی آسائش وراحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں دعاء کو شروع لفظ رب سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں "اے میرے پالنے والے" ان الفاظ میں دعاء مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور لطف وکرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دواعی ہیں، پھر سب سے پہلی دعاء یہ فرمائی کہ اس چٹیل میدان کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل وعیال کو لا ڈالا ہے آپ ایک شہر بنادیں، تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو وحشت نہ ہو، اور ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر آجائیں، یہی دعاء سورۂ ابراہیم میں هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں البلد کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں معرفہ کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دعاء جو آیت

سورۂ بقرہ میں بَلَدًا کے لفظ سے آئی ہے، اس وقت کی گئی ہے جب یہ جگہ جنگل تھی، شہر بنا نہیں تھا اس وقت بلد کو بغیر الف لام کے نکرہ استعمال کیا اور دوسری دعا بظاہر اس وقت کی ہے جب مکہ کی بستی بس گئی اور وہ شہر معروف بن گیا، اس کا قرینہ یہ ہے کہ سورۂ ابراہیم کی آخری آیات میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (۱۴: ۳۹) جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دعا حضرت اسحٰق ؑ کی پیدائش کے بعد کی ہے، اور حضرت اسحٰق حضرت اسمٰعیل ؑ سے تیرہ۱۳ سال بعد میں پیدا ہوئے (ابن کثیر)

دوسری دعا، اس میں یہ ہے کہ اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے، یعنی جو قتل و غارت گری سے کفار کے تسلّط سے اور آفات سے مامون و محفوظ رہے۔

حضرت خلیل اللہ ؑ کی یہ دعا، قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہو گیا، کہ اس کی اپنی آبادی کے علاوہ ساری دنیا کا مرجع بن گیا، اطرافِ عالم سے مسلمان وہاں پہنچنے کو اپنی سب بڑی سعادت سمجھتے ہیں، اور مامون و محفوظ بھی ہو گیا، کہ بیت اللہ کے مخالف کسی قوم اور کسی بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہو سکا، اصحابِ فیل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انھوں نے بیت اللہ پر حملے کا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

یہ شہر قتل و غارت گری سے بھی برابر محفوظ چلا آیا ہے، اسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت والے کتنی ہی خرابیوں اور کفر و شرک کی رسموں میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحول حرم کی تعظیم و تکریم کو ایسا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے کہ کیسا ہی دشمن وہاں کسی کو مل جائے حرم میں اس سے قصاص یا انتقام نہ لیتے تھے، بلکہ سکانِ حرم کی تعظیم و تکریم بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے مکہ والے ملکِ شام اور یمن سے تجارتی درآمد و برآمد کا سلسلہ رکھتے تھے اور کوئی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

حدودِ حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں ایسا ہی جانوروں میں بھی یہ قدرتی احساس پیدا فرما دیا ہے، کہ حدودِ حرم میں آکر جانور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبراتا۔

حرم محترم کے مامون ہونے کے یہ احکام جو دعاء ابراہیمی کا نتیجہ ہیں زمانۂ جاہلیت سے قائم چلے آتے تھے، اسلام اور قرآن نے ان کو اور زیادہ نکھارا، اور تقویت پہنچائی، حجاج ابنِ یوسف اور پھر قرامطہ کے ظلم و ستم اور بدکاریوں سے جو قتل و قتال حرم میں ہوا اول تو وہ خود اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی کافر قوم حملہ آور نہ تھی، اور کوئی شخص خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو وہ امن کے منافی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعات شاذہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہزاروں سال کی مدت میں گنے چنے ہیں، اور قتل و قتال کے بعد ایسا کرنے والوں کا انجام

بھی سب کے سامنے آگیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعاءِ ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک مامون شہر اور تمام دنیا کے لئے امن کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنادی ہے، یہاں تک کہ دجّال کو بھی حرم میں داخل ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ احکام جاری فرما دیئے کہ حرم میں باہمی قتل و قتال تو کیا جانوروں کا شکار بھی حرام کردیا گیا۔

تیسری دعاء یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے، مکہ مکرمہ اور اس کے آس پاس کی زمین نہ کسی باغ و چمن کی متحمل تھی، نہ وہاں دُور دُور تک پانی کا نام و نشان تھا، مگر حق تعالیٰ نے دعاءِ ابراہیمی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طائف کا ایک ایسا خطہ بنادیا جس میں ہر طرح کے بہترین پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ آکر فروخت ہوتے ہیں، بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ طائف دراصل ملک شام کا خطہ تھا، جس کو بحکم خداوندی جبرئیل امینؑ نے یہاں منتقل کردیا۔

حکمتِ ابراہیمی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاء میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو گلزار اور پھلوں کی زمین یا قابلِ کاشت بنادیجئے، بلکہ دعاء یہ فرمائی کہ یہ چیزیں پیدا کہیں اور ہوں مگر مکہ میں پہنچا کریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت خلیلؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشتکاری یا باغبانی کے کاموں میں مشغول ہوجائے، کیونکہ ان کو اس جگہ آباد کرنے کا منشاء تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود یہ فرمادیا رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام اپنی اولاد کا اصل مشغلہ بیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکھنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ خود مکہ مکرمہ کو ایسا گلزار بنادیا جاتا کہ دمشق و بیروت اس پر رشک کرتے۔

رزق ثمرات تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے لفظ ثمرات جو ثمرہ کی جمع ہے اس کے معنی پھل کے ہیں، اور ظاہر اس سے مراد درختوں کے پھل ہیں، لیکن سورہ قصص آیت نمبر ۵۷ میں اس دعاء کی قبولیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے، يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ان الفاظ میں ایک تو اس کی تصریح ہے کہ خود مکہ میں یہ پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں، بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں لائے جایا کریں گے، کیونکہ لفظ یجبیٰ کا یہی مفہوم ہے، دوسرے ثمرات کل شجر نہیں فرمایا، بلکہ ثمرات کل شیء فرمایا، اس تغیر لفظی سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں ثمرات کو عام کرنا مقصود ہے، کیونکہ ثمرہ عرف میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیداوار کو کہا جاتا ہے، درختوں سے پیدا ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اسی طرح مشینوں سے حاصل ہونے والا کل سامان بھی مشینوں کے ثمرات ہیں، اسی طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان اُن دستکاریوں کے

ثمرات ہیں، اس طرح ثمرات کل شیٔ میں تمام ضروریات زندگی داخل ہوجاتی ہیں، اور حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ ارض حرم کو نہ کاشت کی زمین بنایا، نہ صنعتکاری کی، لیکن دنیا بھر میں پیدا ہونے والی اور بننے والی چیزیں یہاں عام طور پر ملجاتی ہیں اور یہ بات شاید آج بھی کسی بڑے سے بڑے تجارتی یا صنعتی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دنیا بھر کی مصنوعات بکثرت وبآسانی وہاں مل جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ کی احتیاط اس آیت میں جبکہ اہل مکہ کے لئے امن اور فراخی عیش کی دعا کی گئی، تو ان میں مومن کافر سب داخل تھے، اور اس سے پہلے حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دعا میں اپنی پوری ذریت کو بغیر امتیاز مومن وکافر جمع کیا تھا، تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دعا مؤمنوں کے حق میں قبول ہے، ظالم مشرکوں کے حق میں قابل قبول نہیں، وہ دعا تھی امامت و اقتدار کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو جو مقام خلت پر فائز اور خشیۃ اللہ سے لبریز تھے اس جگہ بھی وہ بات یاد آئی تو اپنی دعا میں یہ قید لگادی کہ یہ معاشی خوش حالی اور امن وامان کی دعا صرف مؤمنین کے لئے کرتا ہوں، حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیت واحتیاط کی قدر کی گئی اور فرمایا وَمَنْ كَفَرَ یعنی یہ دنیوی خوش حالی اور اقتصادی فراخی ہم سبھی اہل مکہ کو عطا کریں گے، اگرچہ وہ ظالم مشرک کافر ہی ہوں، البتہ مؤمنین کو یہ خوش حالی جس طرح دنیا میں دی جائے گی اسی طرح آخرت میں بھی عطا ہوگی، اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ربانی کی تعمیل میں ملک شام کے ہرے بھرے خوش منظر خطہ کو چھوڑ کر مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان اپنے اہل وعیال کو لا ڈالا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہدے کرنے والے کے دل میں عُجب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو بہت کچھ قابل قدر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، رب العزت کی بارگاہ عزت وجلال کو پہچاننے والے ہیں کہ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے شایان شان عبادت واطاعت ممکن نہیں، ہر شخص اپنی قوت وہمت کی مقدار سے کام کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہوجائے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بناء بیت اللہ کے عمل کے متعلق یہ دعا فرمائی کہ "اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمالیں، کیونکہ آپ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں، ہماری دعا کو سنتے ہیں اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں"

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ، یہ دعا بھی اسی معرفت وخشیت کا نتیجہ ہے، جو حضرت خلیلؑ

کو حاصل تھی، کہ اطاعت و فرمانبرداری کے بے مثال کارنامے بجالانے کے بعد بھی یہ دعا کرتے ہیں کہ "ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے" وجہ یہ ہے کہ جتنی کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے، کہ ہم حقِ وفاداری اور حقِ فرمانبرداری پورا ادا نہیں کر رہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا، اس دعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ان کو اپنی اولاد سے کس قدر محبت ہوتی ہے، مگر اس محبت کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں، عوام تو اولاد کی صرف جسمانی صحت و راحت کو جانتے ہیں، اُن کی ساری شفقت و راحت اُسی کے گرد گھومتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جسمانی سے زیادہ رُوحانی اور دُنیوی سے زیادہ اُخروی راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک جماعت کو پورا فرمانبردار بنا دیجئے، اپنی ذرّیت کے لئے دعا میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہے تو عوام میں اُن کی مقبولیت فطری ہوتی ہے، انکی صلاحیت صلاحِ عوام کا ذریعہ بنتی ہے (بحر محیط)

حضرت خلیل اللہ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی کہ آپ کی ذرّیت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو دینِ حق پر قائم اور اللہ کے فرماں بردار بندے تھے، جاہلیتِ عرب میں جبکہ پوری دنیا کو خصوصاً عرب کو شرک و بت پرستی نے گھیر لیا تھا اس وقت اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ کچھ لوگ عقیدۂ توحید و آخرت کے سچے معتقد اور اطاعت شعار رہے ہیں، جیسے اہلِ جاہلیت میں زید بن عمرو بن نُفَیل اور قُس بن ساعدہؓ تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ امجد عبد المطلب بن ہاشم کے متعلق بھی یہی روایت ہے کہ وہ شرک و بُت پرستی سے بیزار تھے (بحر محیط)

أَرِنَا مَنَاسِكَنَا، مناسک منسک کی جمع ہے، اعمالِ حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقاماتِ حج، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور دعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح سمجھا دیجئے، اسی لئے لفظ أَرِنَا استعمال فرمایا، جس کے معنی ہیں "ہمیں دکھلا دیجئے" وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہو سکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقاماتِ حج کو بذریعہ جبرئیل امینؑ دکھلا کر متعین کر دیا گیا اور احکامِ حج کی واضح تلقین و تعلیم فرما دی گئی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

۱۵ ع ۸ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اے ہمارے پروردگار اور (یہ بھی دعا ہے کہ) اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دعا اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو اُن لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے کی) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام۔

تشریحِ لغات

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ، مصدر تلاوۃ سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، اصطلاح قرآن وحدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلام الٰہی کے پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں، امام راغب اصفہانیؒ نے "مفردات القرآن" میں فرمایا ہے کہ کلام الٰہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جاسکتا۔

وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، اس میں کتاب سے مراد کتابُ اللہ ہے، اور الحکمۃ کا لفظ عربی لغت میں کئی معنے کے لئے آتا ہے، حق بات پر پہونچنا، عدل وانصاف، علم وحلم وغیرہ (قاموس) امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لئے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے لئے جاتے ہیں، ترجمہ شیخ الہندؒ میں اس کا ترجمہ "تہہ کی باتیں" اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے، اور لفظ حکمت عربی زبان میں کئی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، علم صحیح، نیک عمل، عدل وانصاف، قول صادق وغیرہ۔ (قاموس و راغب)

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ حکمت سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہؓ و تابعینؒ جو معانی قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام تفسیر ابن کثیرؒ و ابن جریرؒ نے حضرت قتادہؓ سے یہی تفسیر نقل کی ہے کسی نے تفسیر قرآن اور کسی نے تفقہ فی الدین فرمایا ہے اور کسی نے علم احکام شرعیہ کہا اور کسی نے کہا کہ ایسے احکام الٰہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی

حدیث وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
لفظ یُزَکِّیْہِمْ۔ زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے۔

معارف و مسائل

تشریح مذکورسے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ نسل کی فلاح دنیا وآخرت کے واسطے حق تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری اولاد میں ایک رسول بھیج دیجئے جو ان کو آپکی آیات تلاوت کرکے سنائے اور قرآن وسنت کی تعلیم دے، اور ان کو ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک کرے، اس میں حضرت خلیل اللہؑ نے اس رسول کے لئے اپنی اولاد میں ہونے کی اس لئے دعا فرمائی کہ اول تو یہ اپنی اولاد کے لئے سعادت و شرف ہے، دوسرے ان لوگوں کے لئے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول جب انہی کی قوم اور برادری کے اندر ہوگا، تو اس کے چال، چلن سیرت و حالات سے یہ لوگ بخوبی واقف ہوں گے، کسی دھوکہ فریب میں مبتلا نہ ہوں گے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دعا کا جواب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دعا قبول کرلی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (ابن جریر وابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین اس وقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا، اور میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتداء بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا مظہر ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے، مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ ط (۶۱: ۶)، اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملکِ شام کے محلات جگمگا اُٹھے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ سورۂ آل عمران (آیت نمبر ۱۶۴ اور سورۂ جمعہ آیت نمبر ۲ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسولؐ کے بھیجنے کی دعا فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہوجانے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

بعثتِ رسولؐ کے تین مقاصد

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اور سورۂ آل عمران اور سورۂ جمعہ کی آیات میں آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدۂ نبوت و رسالت کے فرائضِ منصبی تین بیان کئے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔

پہلا مقصد تلاوتِ آیات یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ قرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں، اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے، ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر ان کی تعلیم کیلئے کافی تھا انکو الگ سے ترجمہ تفسیر کی ضرورت نہ تھی تو پھر تلاوتِ آیات کو ایک علیٰحدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جداگانہ دوسرا مقصد رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے، اوّل یہ کہ قرآن کریم دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر معمولی تغیر و تبدل بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنے سمجھے ہوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو و فضول ہے بلکہ قرآن کریم جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظِ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصولِ فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ھو النظم والمعنی جمیعا یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ مضامین بالکل صحیح درست ہی ہوں، ان مضامینِ قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے، تو نماز ادا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام جو قرآن سے متعلق ہیں اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے، وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے امت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے، جس کو عرف میں اردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہا جاتا ہے، کیونکہ درحقیقت جو قرآن اردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیم کتاب

سے علیحدہ تلاوتِ آیات کو جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کردیا کہ قرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کرکے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں تو بیکار نہیں، بلکہ موجبِ ثوابِ عظیم ہیں

لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب تک قرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے، یہ میں اس لئے واضح کررہا ہوں کہ آجکل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثوابِ عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ جو معانیِ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے۔ انھوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کرلینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہوتا، انھوں نے ساری عمر تلاوتِ قرآن کو حرزِ جان بنائے رکھا، بعض صحابہؓ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، بعض دو دن میں اور اکثر حضرات تین دن میں ختمِ قرآن کے عادی تھے، اور ہر ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کا تو پوری امت کا معمول رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجبِ انوار و برکات اور سرمایۂ سعادت و نجات ہے، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانیِ قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بدنصیبی میں مبتلا نہ ہوجائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہوجائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ

قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جنتر منتر کی طرح صرف جھاڑ پھونک میں استعمال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورۂ یٰسین کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں فرائضِ رسول بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب و لہجہ میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقل فرض ہے، اسی طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیم رسول کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم و فنون میں یہ بات معلوم و مشاہد ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں، جب تک کہ اس فن کو کسی ماہر استاذ سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آجکل ڈاکٹری، ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں، معمولی روزمرہ کے کام محض کتابکے مطالعہ بغیر استاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دیگر کام سکھانے کے طریقے بتائے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار، اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ معمولی فنون اور اُن کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیم استاد کی ضرورت ہے تو مضامینِ قرآن جو علوم الٰہیہ سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک تمام گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہے وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارفِ قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر ادیب ہیں وہ سب سے بڑے مفسر قرآن مانے جاتے، اور عہدِ رسالتؐ میں ابوجہل ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسولؐ کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک

مستقل فرض قرار دیا، دوسری طرف تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلا دیا کہ محض تلاوتِ آیات کا سن لینا فہم قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں، بلکہ تعلیم رسولؐ ہی کے ذریعہ قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیماتِ رسولؐ سے جدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اگر مضامینِ قرآنی کو بتلانے سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسولؐ کو بھیجنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب کسی دوسری طرح بھی انسانوں تک پہونچائی جا سکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مضامینِ قرآنی کی تعلیم وتفہیم کے لئے دنیا کے دوسرے علوم وفنون سے زیادہ تعلیم استاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر عام استاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا استاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرفِ ہمکلامی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبیؐ و رسولؐ کہا جاتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کریم کے معانی واحکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، ارشاد ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴) "یعنی ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں" تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی رکھی گئی ہے، اور میں نے اوپر بتلایا ہے کہ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں صحابہؓ وتابعینؒ نے حکمت کی تفسیر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، جس سے واضح ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ جس طرح معانی قرآن کا سمجھانا و بتلانا فرض ہے، اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اصول وآداب جن کا نام سنت ہے، ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ کا مقصد وجود معلم ہونا ہے، تو آپ کی امت کا مقصدِ وجود متعلم اور طالب علم ہونا لازم ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیماتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو، اگر علوم قرآن وسنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت و فرصت نہیں ہے تو کم از کم بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہئے۔

تیسرا مقصد تزکیہ تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تزکیہ ہے جس کے معنی ہیں، ظاہری وباطنی نجاسات سے پاک کرنا، ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقاد فاسد، نیز تکبر وحسد وبغض، حبِ دنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آ گیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا

جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا، کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری وعلمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے، سلوک و تصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے اُنکی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت و اصلاح کے دو سلسلے، کتاب اللہ اور رجال اللہ

اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابلِ نظر ہیں:

اوّل یہ کہ اللہ جل شانہٗ نے ابتداءِ آفرینش سے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں، ایک آسمانی کتابوں کا دوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا، جس طرح محض کتاب نازل فرما دینے کو کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کے بھیجنے پر بھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے، اللہ جل شانہٗ کی اس عادت اور قرآن کریم کی شہادت نے قوموں کی اصلاح و فلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرما کر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے، نہ کوئی مربی انسان، بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات اور الٰہی قانون کی ضرورت ہے جس کا نام کتاب یا قرآن ہے، دوسری طرف ایک معلّم اور مربی انسان کی ضرورت ہے جو اپنی تعلیم و تربیت سے عام انسان کو آسمانی ہدایات سے روشناس کر کے ان کا خوگر بنائے، کیونکہ انسان کا اصلی معلّم انسان ہی ہو سکتا ہے، کتاب معلّم یا مربی نہیں ہو سکتی، ہاں تعلیم و تربیت میں معین و مددگار ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتداء ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دنیا میں پیدا کر دیا، اسی طرح آگے آنیوالی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعت مطہرہ اور دوسری طرف رجال اللہ کا سلسلہ رہا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۹: ۱۱۹)	"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔"

دوسری جگہ صادقین کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲: ۱۷۷)	"اور یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی ہیں پرہیزگار۔"

پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے

یہاں بھی صراط مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراط القرآن یا صراط الرسول یا صراط السنۃ فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ اُن سے صراطِ مستقیم حاصل کی جائے، ارشاد ہوا:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۞	"یعنی صراط مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے نہ کہ اُن لوگوں کا جو گمراہ ہوگئے"

دوسری جگہ ان کی مزید تعیین اور توضیح قرآن میں وارد ہوئی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۴: ۶۹)

اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کرکے دینی معاملات میں آپ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی، ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ (ترمذی)	"اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہنا تو تم گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب اللہ دوسری میری اولاد اور اہلِ بیت"

اور صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ	"یعنی میرے بعد ابو بکرؓ اور عمرؓ کا اتباع کرو"

اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ	"میرے طریقہ کو اختیار کرو، اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قوموں کی اصلاح و تربیت کے لئے ہر قرن ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں، قرآنی ہدایات اور ان کے سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرینِ شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم و تربیت، اور اگر مختلف علوم و فنون اور اُن کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصولِ تعلیم و تربیت کچھ دین اور دینیات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم و فنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دوسری طرف ماہرین کی تعلیم و تربیت، ہر علم و فن کی ترقی و تکمیل کے یہی دو بازو ہیں، لیکن دین اور دینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اٹھانے

میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کی غلط روش میں پڑجاتے ہیں، جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اٹھانے کے نقصان اور بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کرکے صرف علماء و مشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں اور ان کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۱:۹) "یعنی ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنا لیا" ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر کا ہے، اور لاکھوں انسان اس راستہ میں برباد ہوئے، اور ہو رہے ہیں، اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علوم قرآن و حدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلم و مربی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علماء کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت؛ یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دین و ملت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار ہونا ہے، کیوں کہ ماہرین کی امداد و اعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہوجانا انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار رہتا ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملت سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے، اور اطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسولؐ بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہیں، رسولؐ کی اطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے، کہ وہ بعینہ اللہ جل شانہٗ کی اطاعت ہے، ہاں اس کے ساتھ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں اور ان کے احکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول و فعل سے امداد لینے کو سرمایۂ سعادت و نجات سمجھنا ضروری ہے، آیت مذکورہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب کو داخل فرمانے سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیم رسولؐ ضروری ہوا اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہو تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیر و زبر محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیماتِ رسولؐ بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں، ورنہ محض الفاظ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا نہ ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کو سنت یا حدیثِ رسولؐ کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کے لئے موعود ہے۔

ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔	اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝

جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور زیر زبر تک بالکل محفوظ چلے آتے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیتِ مذکورہ کی رُو سے لازمی ہے، اور بحمد اللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں، جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی ماہرینِ سنت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نکھار کر رکھ دیا، اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں قیامت تک ایسی جماعت اہل حق اور اہلِ علم قائم رہے گی، جو قرآن و حدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی، اور اُن میں ڈالے گئے ہر رخنہ کی اصلاح کرتی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیم رسولؐ ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیماتِ رسولؐ بھی باقی اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشینگوئی موجود ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ سے لے کر آج تک علمِ حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعہ محفوظ رکھا ہے، اس سے اس دجل و الحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آجکل بعض لوگوں نے احکامِ اسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرۂ حدیث محفوظ اور قابلِ اطمینان نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ذخیرۂ حدیث سے اعتماد اُٹھ جائے تو قرآن پر بھی اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیت مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی تزکیہ قرار دیا ہے، تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائد فاسدہ سے نیز بُرے اخلاق تکبر، حرص و طمع، بغض و حسد، حُبِّ مال و جاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اصلاحِ انسان کیلئے صرف تعلیم صحیح بھی کافی نہیں اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصدِ رسالت اور رسولؐ کا فرضِ منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اصلاحِ اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیرِ نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلا دینا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور ہمت کا نسخہ بجز اہلِ ہمت کی صحبت

اور اطاعت کے اور کچھ نہیں، ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصدِ رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیماتِ اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے، کیونکہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت میں کسی نہ کسی صورت سے کامل یا ناقص طریق پر ضروری سمجھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لیکر عائلی پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیۂ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے، اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیر تعلیم رہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا، اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپؐ کی زیر تربیت تیار ہوئی، ایک طرف اُن کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہوگئے، تو دوسری طرف ان کے تزکیۂ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (۴۸: ۲۹)	"اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں، تم انہیں کوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھوگے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے فتح و نصرت اُن کے قدم لیتی تھی، تائید ربانی ان کے ساتھ ہوتی تھی، اُن کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں کو مرعوب کئے ہوئے

ہیں وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں، آج دنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیلی ترمیم پر تو سب لوگ غور کرتے ہیں، لیکن تعلیم کی رُوح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی، کہ مدرّس اور معلّم کی اخلاقی حالت اور مصلحانہ تربیت کو دیکھا جائے اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دوسروں پر اثر انداز ہوں، اور دوسروں کی تربیت کر سکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہوں گے ان سے پڑھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ انہی جیسے پیدا ہو سکیں گے، اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے تین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ سردارِ دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تین فرائضِ منصبی سپرد کئے گئے تھے، ان کو آپ نے کس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوتِ آیات کا یہ درجہ ہو گیا تھا، کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن پڑھا جارہا تھا ہزاروں اس کے حافظ تھے، سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے، تعلیمِ کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

دنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توریت و انجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے، قرآنی اصول کو عزت و شرف کا معیار مانا جاتا تھا، تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بد اخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیبِ اخلاق کے معلّم بن گئے، بد اخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحتیاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، غرض بت پرست لوگ ایثار و ہمدردی کے مجسّمے بن گئے، تندخوئی اور جنگ جوئی کی جگہ نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی، چور اور ڈاکو، لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن مقاصد کے لئے دعاء فرمائی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تینوں مقصد آپ کے عہد مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ نے تو ان کو مشرق سے مغرب

اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں عام کر دیا، فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً بعدد من صلیٰ وصام وقعد وقام۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بیشک

اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى

یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکمبرداری کر تو بولا کہ میں حکمبردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا، اور یہی وصیت

بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ

کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بیشک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو

الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔

حلِ لغات

سَفِهَ نَفْسَهٗ۔ سفہ بمعنی جہل، وانتصاب نفسہ علیٰ انہ تمییز علیٰ قول الفراء اوشبہ بالمفعول علیٰ قول بعض الکوفیین او مفعول بہ اما لکون سفہ متعدیاً بنفسہ کسَفَّہ المضعف اولکونہ ضمن معنی ما یتعدی ای جہل وھو قول الزجاج، ترجمہ شیخ الہندؒ اسی پر مبنی ہے اسلئے سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی پہلی توجیہ کے اعتبار سے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے کہ اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور دوسری توجیہ پر معنی یہ ہوں گے کہ ملّتِ ابراہیمی سے رُوگردانی وہی کریگا جو اپنے نفس سے بھی جاہل ہو، یعنی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ میں کیا ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ملّتِ ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور (ایسی ملّت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو (عہدۂ رسالت کے لئے) دنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے اور یہ انتخاب عہدۂ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو، انھوں نے عرض کیا کہ میں نے

اطاعت اختیار کی رب العالمین کی (پس اسی اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے اُن کو شرفِ نبوت دیدیا، خواہ اسی وقت ہو یا بعد چندے) اور اسی (ملتِ موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب علیہ السلام بھی (اپنے بیٹوں کو جس کا یہ مضمون تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام واطاعتِ حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم (دمِ مرگ تک اسی کو مت چھوڑنا اور) بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان سے انحراف کی خرابی کا بیان ہے، جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباعِ ملتِ ابراہیمی کے متعلق دعووں کی تردید اور صرف ملتِ اسلام کا ملتِ ابراہیمی کے مطابق ہونا اور دینِ اسلام کی حقیقت اور یہ کہ وہ تمام انبیاء کا مشترکہ دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام مذکور ہے، پہلی آیت میں ملتِ ابراہیمی کی فضیلت اور اسی کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلا کر ان کی ملت سے انحراف کرنے کو احمقانہ کام بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی "ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو" کیونکہ یہ ملت عین دینِ فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اسی ملت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی، دنیا کی عزت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دنیا نے کر لیا، کہ نمرود جیسا صاحبِ اقتدار بادشاہ اور اس کی قوم اس اکیلے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی، اور اپنے اقتدار کے سارے عوامل ان کے خلاف استعمال کر لئے، آخر میں آگ کے ایک بڑے انبار میں اُن کو ڈال دیا گیا، مگر دنیا کے سارے عناصر اور انکی طاقتیں جبر قدرت والے کے تابع فرمان ہیں اس نے سارے نمرودی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، آگ ہی کو اپنے خلیلؑ کے لئے گلزار بنا دیا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئیں، دنیا کے سارے مومن اور کافر یہاں تک کہ بُت پرست بھی اس بُت شکن کی عزت کرتے چلے آئے، مشرکینِ عرب بہرحال اولادِ ابراہیمؑ تھے، بُت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی عزت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملتِ ابراہیمی کے مٹے مٹے کچھ آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج وعمرہ و قربانی، مہمان نوازی انہی کے باقیات صالحات تھے، اگرچہ جہالت نے اُن کو بھی مسخ کر دیا تھا، اور یہ نتیجہ اس خداوندی انعام کا ہے جس کی رُو سے خلیل اللہؑ کو امام الناس کا خطاب دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔

ابراہیم اور ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اس قہری غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونا بھی دنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل و فہم تھی وہ اس ملت کے سامنے جُھک گیا تھا۔

یہ تو ابراہیم علیہ السلام کے دنیا وی شرف و بزرگی کا ذکر تھا، آخرت کا معاملہ جو ابھی سامنے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عزت و فضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجاتِ عالیہ معتبر رہیں۔

ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اسلام، یعنی اطاعتِ حق ہے وہ صرف اسلام میں منحصر ہے

اس کے بعد دوسری آیت میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول بتلائے گئے، ارشاد ہوا:۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، "یعنی جب فرمایا ابراہیمؑ سے اُن کے رب نے کہ اطاعت اختیار کرو تو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی"، اس طرزِ بیان میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے خطاب اَسْلِمْ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ اَسْلَمْتُ لَكَ، یعنی میں نے آپ کی اطاعت اختیار کرلی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی میں نے پروردگارِ عالم کی اطاعت اختیار کرلی، ایک تو اس میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق جل و علا شانہٗ کی حمد و ثناء شامل ہوگئی جس کا مقام تھا، دوسرے اس کا اظہار ہوگیا کہ میں نے جو طاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا، کیونکہ وہ رب العالمین یعنی سارے جہان کا پروردگار ہے، سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، جس نے اطاعت اختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ اسلام میں مضمر ہے، جس کے معنی ہیں اطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم علیہ السلام کے مذہب و مسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ

خلیل اپنے مقامِ عالی تک پہنچا ہے، اور اسلام یعنی اطاعتِ حق ہی وہ چیز ہے جس کے لئے یہ سارا جہان بنایا گیا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اور نقطۂ وحدت ہے، حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو چلایا، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:

۱- اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳: ۱۹)
"دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"

۲- وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۔ (۳: ۸۵)
"اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین و مذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں"

اور ظاہر ہے کہ جتنے دین و مذہب مختلف انبیاء علیہم السلام لائے ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دینِ اسلام ہی ہوں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دینِ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کہا جائے یا یہودیت و نصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل اطاعتِ حق ہے، البتہ اس میں ایک خصوصیت ملتِ ابراہیمی کو حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام بھی اسلام تجویز کیا اور اپنی امت کو بھی امتِ مسلمہ کا نام دیا، دعا میں عرض کیا:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲: ۱۲۸)
"اے ہمارے پروردگار بنا دیجئے ہم دونوں (ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) کو مسلم (یعنی اپنا فرمانبردار) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا"

اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲: ۱۳۲)
"تم بجز مسلم ہونے کے کسی مذہب پر جان نہ دینا"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امتیاز حضرت ابراہیمؑ ہی کی تجویز کے مطابق امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو حاصل ہوا، کہ اس کا نام امتِ مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملتِ اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (۲۲: ۷۸)
"تم اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی اور اس میں بھی (یعنی قرآن میں)"

کہنے کو تو یہود بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمؑ پر ہیں، نصاریٰ بھی اور مشرکین عرب بھی

لیکن یہ سب غلط فہمی یا جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں ملتِ محمدیہ ہی آخری دور میں ملتِ ابراہیمی اور دینِ فطرت کے مطابق تھی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور جتنی کتابیں اور شرائع نازل ہوئے ان سب کی رُوح اسلام یعنی اطاعتِ حق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں فرمانِ حق کی اطاعت اور اتباعِ ہویٰ کو چھوڑ کر اتباعِ ہدیٰ کی پابندی۔

افسوس ہے کہ آج اسلام کا نام لینے والے لاکھوں مسلمان بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہوگئے اور دین ومذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انھیں قرآن وحدیث کی صرف وہ تفسیر وتعبیر بھلی معلوم ہوتی ہے جو اُن کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جامۂ شریعت کو کھینچ تان کر بلکہ چیر پھاڑ کر اپنی اغراض اور اہواء نفسانی کے بتوں کا لباس بنادیں کہ دیکھنے میں دین ومذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباعِ ہویٰ اور خواہشات کی پیروی ہے ؎

سودہ شد از سجدۂ راہِ بُتاں پیشانیم
چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

غافل انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ حیلے اور تاویلیں مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، مگر خالق کے سامنے جس کا علم ذرہ ذرہ کو محیط ہے، جو دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں بھیدوں کو دیکھتا اور جانتا ہے اس کے آگے بجز خالص اطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں ؎

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر وحیلہ کے رواست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہوکر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ حضرت حق جل شانہٗ کی رضا کس کام میں ہے، اور اس کا فرمان میرے لئے کیا ہے، وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گوش برآواز رہے، کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے، اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک راضی ہو، اسی کا نام عبادتؔ بندگی ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست
ہشدار و گوش را بہ پیامِ سروش دار

اسی جذبۂ اطاعت ومحبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے، جس کو مقامِ عبدیت

کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا خطاب پاتے ہیں، اور سید الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عَبْدَنَا کا خطاب ملتا ہے، اسی عبدیت اور اطاعت کے ذیلی درجات پر امت کے اولیاء، اقطاب و ابدال کے درجات دائر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی توحید ہے جس کے حاصل ہونے پر انسان کے خوف و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہیں ؎

امید و ہراسش نباشد ز کس
ہمین ست بنیادِ توحید و بس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعتِ حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴: ۶۵)

"تیرے رب کی قسم وہ کبھی مومن نہ ہوں گے جبتک وہ آپ کو اپنے تمام اختلافی معاملات میں حکم تسلیم نہ کرلیں اور پھر آپ کے فیصلے کوئی دل تنگی محسوس نہ کریں، اور فیصلہ کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہ کریں"

مسئلہ: آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی، اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی حالت اور کسی ملت پر نہ مرنا، مراد اس کی یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام ہی پر فرمادے، جیساکہ بعض روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پابند رہو گے، اُسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں محشر میں قائم ہوگے، اللہ جل شانہٗ کی عادت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیدیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کردیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے کام اور اہل جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فیصلہ رہ جاتا ہے، مگر پھر اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اہلِ دوزخ کے سے کام کرنے لگتا ہے، اور انجام کار دوزخ میں جاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی ہے اور آخر عمر میں اہلِ جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ فیما یبدو للناس یعنی جس نے عمر بھر جنت کے کام کئے اور آخر میں دوزخ کے کام میں لگا درحقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہل جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، درحقیقت وہ اوّل ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر نظر میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی نیک کام میں مشغول رہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور عادت کی بناً پر یہی امید رکھنا چاہئے کہ اس کا خاتمہ بھی نیکی پر ہوگا۔

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ

کس کی عبادت کروگے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں

إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ

کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے

مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم

فرمانبردار ہیں، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اُن کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمہارے

مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

واسطے ہے جو تم نے کیا اور تم سے پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

خلاصۂ تفسیر

کیا (تم لوگ کسی معتبر صحیح نقل سے دعویٰ مذکورہ کرتے ہو یا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدہ کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کروگے، انھوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذات پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات) ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور ہم (احکام میں) اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے، یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر

چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، رہا اس سے تم کو نفع پہنچنا یہ تو بڑی دور ہی)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملّتِ ابراہیمؑ اور اسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیات مذکورہ میں ایک اور اصولی بات قابلِ نظر ہے کہ ملّتِ ابراہیمؑ کہئے یا اسلام یہ پوری قوم بلکہ ساری دنیا کے لئے ھدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولادِ ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہی کہ آیات مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنی اولاد کو بطور وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقام رسالت و نبوت بلکہ مقام خلّت کے بھی منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رب کا اشارہ پاکر اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے، وہی دوسرے وقت اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی آسائش اور بھلائی کے لئے اپنے رب سے دعائیں بھی کرتا ہے، دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہی یعنی اسلام آیت مذکورہ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ کا یہی مطلب ہے، اور آیت اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ، کا یہی حاصل ہے، فرق اتنا ہی کہ عام انسانوں کی نظروں میں نعمت و دولت دنیا کی فانی اور ذلیل چیزیں ہیں، ان کی نظر اور حوصلہ بلند ہے، ان کے نزدیک اصلی دولت ایمان اور عمل صالح یا اسلام ہے۔

جس طرح عام انسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتے ہیں کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی آجکل یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد ملوں اور فیکٹریوں کی مالک ہو، ان کو امپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے لائسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہو، یا ایک سروس والا انسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو اونچے عہدے اور بڑی تنخواہیں ملیں، یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اسکی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے گُر بتلادے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصلی اور دائمی لازوال دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں، اور کوششیں بھی آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ

آیاتِ مذکورہ سے واضح ہے۔

اولاد کے لئے کوئی دولت دین و اخلاق سکھانے کے برابر نہیں

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ خاص میں عام انسانوں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ جس طرح ان کی دنیوی پرورش اور ان کے دنیوی آرام و راحت کا انتظام کرتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظری، عملی اور اخلاقی تربیت کریں، بُری راستوں اور بُرے اعمال و اخلاق سے ان کو بچانے میں سعی بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور اصلی خیر خواہی یہی ہے، یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے تو ساری توانائی خرچ کرے اور دائمی آگ سے اور عذاب سے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے بدن سے پھانس نکالنے میں تو سارے ذرائع اور وسائل استعمال کرے، اور بندوق کی گولی کا نشانہ بننے سے اس کو نہ بچائے۔

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ عمل سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح و فلاح کی فکر کی جائے ان کے بعد دوسروں کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو حکمتیں ہیں:

اوّل یہ کہ طبعی اور جسمی تعلق کی بناء پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے قبول کرسکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک اور اصلاحی کوشش میں اُن کے دست و بازو بن کر اشاعتِ حق میں اُن کے معین ہوں گے۔

دوسرے اشاعتِ حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا ذمہ دار آدمی اپنے اہل و عیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دل و جان سے لگ جائے کہ اس طرح تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و تربیت کا دائرہ عمل سمٹ کر صرف گھروں کے ذمہ داروں تک آجاتا ہے، ان کو سکھلانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معنی ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے اسی تنظیمی اصول کے پیش نظر ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (۶:۶۶)	"ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو بڑی آگ سے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کے رسول ہیں، اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے آپ کو بھی سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ (۲۶: ۲۱۴)	"اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے"

اور ارشاد ہوا:-

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (۲۰: ۱۳۲)	"یعنی اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہیے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کی تعمیل فرمائی۔

ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک کسی شخص کے اہل وعیال اور قریبی خاندان اس کے نظریات اور عملی پروگرام میں اس کا ساتھی اور ہم رنگ نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم و تبلیغ دوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے جواب میں ابتداء اسلام کے وقت عام لوگوں کا یہ جواب ہوتا تھا کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپ درست کرلیں، پھر ہماری خبر لیں، اور جب خاندان میں اسلام پھیل گیا اور فتح مکہ کے وقت اس کی تکمیل ہوئی تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوا کہ:

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا (۱۱۰: ۲)	"یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج ہو کر داخل ہوں گے"

آجکل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دیندار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دیندار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں اسی کے لئے انتظامات کرتے رہتے ہیں، دولت لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمادیں، کہ آخرت کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے لئے اور اپنی اولاد کیلئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عمل صالح کو سمجھ کر اس کی کوشش کریں۔

بعض مسائل متعلقہ مسئلہ توریث الجد

اس آیت میں حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی طرف سے جو جواب نقل کیا گیا ہے اس میں إِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دادا بھی باپ ہی کہلاتا ہے، اور باپ ہی کے حکم میں ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ میراث میں دادا کا بھی وہی حکم ہے جو باپ کا ہے۔

آباء واجداد کے اعمال کی جزا، سزا اولاد پر نہیں ہوگی

لَهَا مَا كَسَبَتْ الآیۃ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے کافی نہیں ہوں گے، جب تک وہ خود اپنے اعمال کو درست نہ کریں، اسی طرح باپ دادا کے بُرے اعمال کا عذاب بھی اولاد پر نہ پڑے گا جب کہ یہ اعمال صالحہ کے پابند ہوں، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بلوغ سے پہلے مرجائے اُن کو اپنے ماں باپ کے کفر وشرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم

جو چاہیں عمل کرتے رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء و اجداد کے اعمال سے ہو جائے گی، اسی طرح آجکل کے بعض سید خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولادِ رسولؐ ہیں ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہیں ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے؛ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا اور وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶: ۱۶۴) وغیرہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے بنی ہاشم: ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمال صالحہ لیکر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو اور صرف میرے نسب کا بھروسہ لیکر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں تمھیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا"

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔	"یعنی جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے ڈالا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا"

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پالوگے راہ راست کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار

حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا

کی راہ ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنیوالوں میں، تم کہدو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر

وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ

اور جو اترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا

اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے

اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اُن سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں

عـــہ ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہے ۱۲

عـــہ کسی کا بوجھ قیامت کے روز کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکے گا ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا) یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہ (حق) پر پڑ جاؤ گے، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں، (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے، جس میں علاوہ محرّف ہونے کے اس کے منسوخ ہو چکنے کے سبب اب اس میں کجی آگئی) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے، (مسلمانو! یہود و نصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں ان) کی طرف (بواسطہ وحی کے) بھیجا گیا اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انھوں نے ہم کو یہ دین بتلایا) ہم نے اختیار کر لیا (پس یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر ہم قائم ہیں جس میں کسی کو اصلاً انکار و سرتابی کی گنجائش نہیں)۔

معارف و مسائل

اولادِ یعقوب علیہ السلام کو قرآن کریم نے لفظ اسباط سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جمع ہے سبط کی جس کے معنی قبیلہ اور جماعت کے ہیں، ان کو سبط کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے صلبی لڑکے بارہ تھے، پھر ہر لڑکے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد ہزاروں افراد پر مشتمل قبیلے تھے، اور دوسری برکت اولادِ یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دس انبیاء کے علاوہ باقی سب انبیاء و رسل ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نوحؑ، شیثؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اسمٰعیلؑ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

سو اگر وہ بھی ایمان لاویں جس طرح پر تم ایمان لائے تو ہدایت پائی انھوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر

هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

وہی ہیں ضد پر، سو اب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے قبول کرلیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

اللغات والبلاغۃ اَلشِّقَاقُ قال البیضاوی ہو المناواۃ والمخالفۃ فان کل واحد من المخالفین فی شق غیر شق الآخر، اَلصِّبْغَۃُ بالکسر فعلۃ من صبغ وہی الحالۃ اللتی یقع علیہا الصبغ۔

خلاصۂ تفسیر (یعنی جب اوپر طریق اسلام میں دین حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہ (حق) پر لگ جاویں گے، اور اگر وہ (اس سے) روگردانی کریں تو (تم ان کی روگردانی سے کچھ تعجب کرو کیونکہ) وہ لوگ تو ہمیشہ سے) برسر مخالفت ہیں ہی (اور اگر انکی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمھاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمھارے اور ان کے برتاوے) جانتے ہیں، (تمھارے فکر و غم کی کوئی ضرورت نہیں)

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ) ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ و ریشہ میں بھر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب اور کوئی دوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

معارف و مسائل

ایمان کی مختصر اور جامع تفسیر فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ، شروع سورۃ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل کہیں مفصل بیان کیگئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات

پر حاوی ہے، کیونکہ اٰمَنْتُمْ کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ہیں، اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اختیار فرمایا، جو اعتقاد اس سے سرِ مو مختلف ہو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے، اور انبیاء و رسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق جو ایمان و اعتقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے، فرشتوں اور انبیاء و رسل کے لئے جو مقام آپ کے قول و عمل سے واضح ہوا اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہو گیا جو ایمان کے دعویدار ہیں مگر حقیقتِ ایمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعویٰ ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود و نصاریٰ بھی، اور ہر زمانے میں زندیق و ملحد بھی، مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوا۔

فرشتہ اور رسول کی عظمت و محبت میں اعتدال مطلوب ہے، غلو گمراہی ہے

مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا انکار کیا، بعض نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا دیا، دونوں کی تردید بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ سے ہو گئی، یہود و نصاریٰ کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہاں تک کہ بعض کو قتل بھی کر دیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزت و عظمت کو اتنا بڑھایا کہ خدا، یا خدا کا بیٹا یا خدا کا مثل بنا دیا، یہ دونوں قسم کی افراط و تفریط ضلالت و گمراہی قرار دی گئی۔

شریعتِ اسلام میں رسول کی عظمت و محبت فرض ہے، اس کے بغیر ایمان ہی نہیں ہوتا مگر رسول کو کسی صفت علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا گمراہی اور شرک ہے، قرآن کریم نے شرک کی حقیقت بھی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں، اِذْ نُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶: ۹۸) کا یہی مفہوم ہے، آج بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود، حاضر و ناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اور عمر بھر کی

کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں، اس آیت میں اُن کے لئے بھی سبق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے جیسی صحابۂ کرامؓ کے دل میں آپؐ کی تھی، اس سے کمی بھی جرم ہے اور اس میں زیادتی بھی غلو اور گمراہی ہے۔

نبی و رسول کی اختراعی قسمیں: ظلی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہیں

اسی طرح جن فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت کا انکار کر کے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا، اور قرآن کریم کی واضح تصریح خاتم النبیین کو اپنے مقصد میں حائل پایا تو انھوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اختراع کرلیں، جن کا نام نبی ظلی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی، مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے ایمان بالرسل میں کسی ظلی و بروزی کا کہیں نام و نشان نہیں، یہ کھلا ہوا زندقہ اور الحاد ہے۔

ایمان بالآخرۃ کی تاویلات باطلہ مردود ہیں

اسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دماغ صرف مادّے اور مادّیات میں کھوئے ہوئے ہیں، عالمِ غیب اور عالمِ آخرت کی چیزیں جب انھیں مستبعد نظر آتی ہیں تو طرح طرح کی تاویلوں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو اقرب الی الفہم کر دیا، مگر چونکہ وہ تاویلیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے خلاف ہیں، اس لئے سب مردود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ہیں اُن پر بغیر کسی جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے، حشرِ اجساد کے بجائے حشرِ روحانی اور عذاب و ثواب جسمانی کو روحانی، اسی طرح وزنِ اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود، باطل اور گمراہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی

فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ، میں واضح فرما دیا، کہ آپؐ اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ فرمادیں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری ایک آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ۶۷) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمادیا، کہ آپؐ مخالفین کی فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ ان سے آپؐ کی حفاظت خود کریں گے۔

دین و ایمان ایک گہرا رنگ ہے، جو انسان کے چہرہ بشرہ سے نظر آنا چاہئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ، اس سے پہلی آیت میں دینِ اسلام کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا، اس جگہ اس کو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے بتلا دیا کہ دین درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی پیغمبر کی طرف اس کی نسبت مجازی کر دی جاتی ہے، اور اس جگہ ملّت کو صِبْغَۃ کے لفظ سے تعبیر کر کے دو باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا، اوّل تو نصاریٰ کی ایک رسم کی تردید ہو گئی، ان کی عادت یہ

تھی کہ جو بچہ پیدا ہو اس کو ساتویں روز ایک رنگین پانی میں نہلاتے تھے، اور بجائے ختنہ کے اسی نہلانے کو بچے کی طہارت اور دین نصرانیت کا پختہ رنگ سمجھتے تھے، اس آیت نے بتلایا کہ یہ پانی کا رنگ تو دُھل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا، نیز ختنہ نہ کرنے کی وجہ سے جو گندگی اور ناپاکی جسم میں رہتی ہے اس سے بھی یہ رنگ نجات نہیں دیتا، اصل رنگ دین و ایمان کا رنگ ہے جو ظاہری اور باطنی پاکی کی ضمانت بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔

دوسرے دین و ایمان کو رنگ فرما کر اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے محسوس ہوتا ہے مومن کے ایمان کی علامات اس کے چہرہ بشرہ اور تمام حرکات و سکنات، معاملات و عادات میں ظاہر ہونا چاہئیں واللہ اعلم۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

کہہ دے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں، کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی،

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ

کہہ دے کہ تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی

مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ

اس کو اللہ کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی،

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

ان کیواسطے ہے جو انھوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں اُن کے

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

کاموں کی۔

ع ۱۶

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب (اور مالک) ہے (سو ربوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں جیسا تمہارے بعض دعووں سے اختصاص مفہوم ہوتا ہے، مثل نحن ابناء اللّٰہ) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مسلّم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے طریقہ موجودہ کے کہ علاوہ منسوخ ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوط ہے جیسا ان کے اقوال عزیر ابن اللہ اور مسیح ابن اللہ سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی) یا (اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو انبیاء گذرے ہیں یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے، (اور اس سے بواسطہ موافقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایک اتنی مختصر سی بات ان سے) کہدیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاءؑ کا ملتِ اسلام پر ہونا ثابت کر چکے ہیں، جیسا ابھی اوپر گذر چکا ہے) اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس منجانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بےخبر نہیں ہیں، (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم طریق دین میں ان کے موافق کب ہوئے پھر تمہارا حق پر ہونا ثابت نہ ہوا) یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا، اور (تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو در کنار)

معارف ومسائل

اخلاص کی حقیقت وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ، اس میں امتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے مخلص ہے، اخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیرؒ نے یہ بتلائے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو، کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح وشکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے ؁

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو

عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ

ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب،

يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾

چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

خلاصۂ تفسیر

(جب کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہو کر یہود کا قبلہ متروک ہو گیا تو بوجہ ناگواری کے) اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیں، کسی کو منصب علت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام شرعیہ کے باب میں یہی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، خواہ مخواہ علتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض دربارۂ تحویلِ قبلہ نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سُن لیجئے، جس سے سوال و جواب کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

قبلہ کے لفظی معنی ہیں سمتِ توجہ، یعنی جس طرف رُخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رُخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہ لا شریک لہٗ کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا اثر طبعی خاص طور پر یہ ہوتا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رُخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کر لیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کسی

طرف رخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری حکمتِ الٰہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گذاروں کا رُخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور اخفاء کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیشِ نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افرادِ کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت جتنی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سمِ قاتل ہے، پھر نقطۂ وحدت متعین کرنے میں ہر قرن ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطۂ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دینِ الٰہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطۂ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افرادِ انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افرادِ انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دینِ اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو قرار دیا، اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک ذاتِ حق وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افرادِ انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور نظری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افرادِ انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہے وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکزِ وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دینِ اسلام نے ان چیزوں سے جن سے تمدنی

مفاد وابستہ ہیں ان کا پورا احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدتِ انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں اختیاری امور میں اس کی پوری رعایت رکھی کہ فکری وحدت کے ساتھ عملی اور صوری وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکزِ وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت لکھے پڑھے اور ان پڑھ شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار (یونیفارم) کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے، تو یہ اعتدالِ انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعتِ اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار (یونیفارم) مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور اوضاع لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسرافِ بیجا یا فخر وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکزِ وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور سستی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعتِ نماز کی صف بندی، ایک امام کی نقل و حرکت کی مکمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمتِ قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ اللہ جل شانہٗ کی ذات پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے شش جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رُخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت و جہت کونسی ہو جس کی طرف ساری دنیا کا رُخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بناء اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شانہٗ کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولادِ آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانۂ کعبہ بنایا گیا

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۹۶:۳)	سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے برکت والا، ہدایت والا جہان والوں کیلئے۔

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفانِ نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہوگئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہوگئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور اسمٰعیل علیہما السلام نے دوبارہ بحکمِ خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیلؑ کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقینؑ جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القرطبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداءً آپؐ کا قبلہ آپؐ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپؐ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی مسجد نبوی میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپؐ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تو سیدالرسلؐ سراپا اطاعت تھے، اور حکمِ خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپؐ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپؐ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیدیا جائے، اور چونکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں ؎

تو چناں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپؐ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظارِ وحی میں آپؐ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىھَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ (۲: ۱۴۴)	"ہم دیکھ رہے ہیں آپؐ کا بار ہا آسمان کی طرف نظر اٹھانا، سو ہم آپؐ کا قبلہ وہی بدل دیں گے جو آپؐ کو پسند ہے، اس لئے آئندہ آپؐ نماز میں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں"

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار فرما کر اس کو پورا کرنے کا حکم دیدیا گیا ہے، کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رُخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں اس کی سمت کا استقبال بھی بیرونی دنیا کیلئے کافی ہو

یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استعمال فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلادِ بعیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کرلینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے یا کسی قریبی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمتِ بیت اللہ یا سمتِ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرلینا کافی ہے۔

بہرحال، ہجرتِ مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز روز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رہا کہ بیوقوف لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"یعنی آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے"۔

اس میں استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو واضح فرمادیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنادیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جبکہ قبلہ بنادیا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہے اس کی روح حکم حق جل شانہٗ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو بانیٔ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (بقرہ: ۱۷۷)	"اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم مشرق کی طرف رُخ کرو یا مغرب کی طرف لیکن نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے میں ہے"۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (۲: ۱۱۵)

یعنی تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف بھی رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف پاؤ گے۔"

ان آیات نے قبلہ اور استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرما دیا، کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب ہی یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے اختیار فرمالیا، اور اس کی طرف رُخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے، کہ حکمِ ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تغیر و تبدل فرمانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بُت نہیں جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکمِ خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا تو اسی کی طرف رُخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ (۲: ۱۴۳)

"یعنی جس قبلہ پر آپ پہلے رہ چکے ہیں اس کو قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے۔"

اس حقیقتِ قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحویل کو اصولِ اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا: یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ اس میں بتلا دیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ انسان حکمِ حق جل شانہٗ کے لئے کمربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہود نے سنیچر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عنداللہ وہ جمعہ کا روز تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحویل کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آمین کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو میسّر ہوئیں اہلِ کتاب ان سے محروم ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول

الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے متبعانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہو کہ) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پاکر سزایاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)

معارف و مسائل

امتِ محمّدیہ کا خاص اعتدال لفظ وَسَط بفتح السین بمعنی اوسط ہے، اور خیر الامور اور افضل اشیاء کو وَسَط کہا جاتا ہے،

ترمذی میں بروایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف و افضل ہے، اسی طرح ہم نے امتِ اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں جب اپنے انبیاءؑ کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت اُمتِ محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچا ئیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر پوری کوشش کی، مدعی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسولؐ نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا تزکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً اور مفصلاً مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ امتِ معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اعتدالِ امت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل

(۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رُو سے کیا ثبوت ہے، ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:۔

۱۔ اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبِ یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدنِ انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طبِ یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سوداء، صفراء، سے مرکب، اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدنِ انسانی کی صحت و تندرستی

کہلاتی ہے، اور جہاں اُن میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے۔
اس محسوس مثال کے بعد اب رُوحانیت اور اخلاقیات کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ رُوحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔
جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معیّن کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا رُوحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو مخدومِ کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست
آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ؎

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدنِ انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدنِ انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح رُوح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسان کامل کے اولین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدر ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانونِ اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۂ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)

"یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں"

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات لین دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو جس کے ذریعہ اعتدالِ حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور عدل و انصاف قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور اُن پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

امتِ محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا "یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے" یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں امتِ محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلا دیا کہ انسان کا جوہر شرافت و فضیلت ان میں بدرجۂ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۂ اعراف کے آخر میں امتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ (۷: ۱۸۱)	"یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی امت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔"

اس میں امتِ محمدیہ کے اعتدالِ روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۂ آلِ عمران میں امتِ محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (۳: ۱۱۰)	"یعنی تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔"

یعنی جس طرح ان کو رسولؐ سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحتمندانہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا، کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دوسروں کی خیرخواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انھیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کردے، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امّت دوسروں کی خیرخواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب مسلمانوں کی خیرخواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر، شرک،

بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بداخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہو گیا۔ یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے امتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کرکے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹: ۳۰)، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسولؑ کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب اُن کا رسولؑ ان کو کسی جنگ و جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہدیتے ہیں فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ٥ (۵: ۲۴) (یعنی جائیے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف امتِ محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں ؎

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باایں ہمہ کمالات و فضائل عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں، جو قصیدہ بردہ میں فرمایا ؎

دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰى فِيْ نَبِيِّهِمِ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيْهِ وَاحْتَكِمِ

یعنی اس کلمہ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا، (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب حق و صحیح ہے"

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمایئے پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشوتیں لیکر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنھوں نے ترکِ دنیا کر کے رہبانیت اختیار کرلی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امتِ محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکامِ خدا اور رسول پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بیَر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی ؎

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد
ز تدبیرِ عبید اللّٰہی آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو برس جاری رہی، ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مُردہ شوہروں کے ساتھ سَتی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدانِ جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاملہ میں درگذر اور عفو و چشم پوشی کا سبق سکھلایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کرکے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصدِ زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب و عہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیمِ دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیتِ مذکورہ کا مضمون واضح ہوگیا، کہ امتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل و ثقہ ہونا شرط ہے

لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی امتِ محمدیہ کو وسط اور عدل و ثقہ اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہو جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابلِ شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابلِ اعتماد کیا جاتا ہے، اسکی پوری شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اجماعِ امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنا دیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہؓ کا اجماع تابعینؒ پر اور تابعینؒ کا اجماع تبع تابعینؒ پر حجت ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس اُمت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاصؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اوّل یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپؐ کی اُمت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطاء اور غلط پر متفق نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى

رہے گا رسول کا اور کون پھر جائے گا اُلٹے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوئی مگر اُن پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

(اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور جس سمتِ قبلہ پر آپ (چندروز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ (اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا،) اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل (رہا) مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (سیدھے طریق کی) ہدایت فرمائی ہے (جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام الٰہیہ کو بے چون وچرا قبول کر لینا اُن کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے) اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ وسوسہ نہ لائے بس تو جتنی نمازیں ادھر پڑھی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس وسوسہ کو دل میں نہ لانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان (کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کردیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)

معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی ابتدا کب ہوئی

اس میں صحابہؓ و تابعینؒ کا اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اوّل ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینہ تک باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہوگئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیدیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اسی کی طرف نمازیں توجہ کرنے کا حکم آ گیا، تفسیر قرطبی میں بحوالہ ابو عمرو اسی کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذنِ خداوندی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپ کو اپنے اصلی قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپ کو اپنے آباء ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبیؒ نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوگیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صخرۃ بیت المقدس تھا، ابو العالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صخرۃ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کردے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے امتیاز اور اُن سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنادیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے امتیاز اور ان کی مخالفت کا اظہار مقصود ہوا تو اُن کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنادیا گیا، اسی اختلافِ اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوگیا کہ اَلْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ سے کیا مراد ہے، قول اول کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپ کا قبلہ اوّل تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہی آپ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویلِ قبلہ کو آپ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر بھی معلوم ہوجائے کہ کون آپ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کچھ نفاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

کبھی سنت کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے

جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنتِ نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیتِ قرآن نے اس کو منسوخ کرکے

آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حدیثِ رسولؐ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں بامر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ قرآن قرائن اس کے ثبوت پر موجود ہوں اس سے قرآنی حکم منسوخ سمجھا جاسکتا ہے

بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، (اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے) (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہوگیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیانِ نماز ہی اپنا رخ بیت المقدسؔ سے بیت اللہ کی طرف پھیرلیا، نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عورتیں جو پچھلی صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رُخ بیت اللہ کی طرف بدل گیا تو مَردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہوگئیں (ابن کثیر)

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویلِ قبلہ کے حکم پر عمل کرلیا، مگر قُبا میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہونچی، جیساکہ بخاری و مسلم میں بروایت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہلِ قُبا نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کرکے فرمایا:

ھٰذا خبر صحیح مستفیض فی ایدی اہل العلم قد تلقوہ بالقبول فصار فی حیز التواتر الموجب للعلم	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے، مگر قرائن قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تواتر کا حاصل کرلیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے۔

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا اُن پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سلمہ اور اہلِ قُبا کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرتؔ و تواتر حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کیسے عمل کرلیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت یہ ہے کہ آپؐ کا قبلہ بیت اللہ کردیا جائے

اور آپ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں استقبالِ بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقاءِ قبلہ بیت المقدس ظنی ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے یہ خبرِ واحد کافی ہو گئی، ورنہ محض خبرِ واحد سے کوئی قرآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا معقول نہیں۔

آلہ مکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل و حرکت کے مفسدِ نماز نہ ہونے پر استدلال

صحیح بخاری باب ما جاء فی القبلۃ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی حدیث میں جو قباء میں تحویلِ قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالتِ نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:۔

فیہ جواز تعلیم من لیس فی الصلوٰۃ من ھو فیھا (عمدۃ القاری، ص ۱۴۸ ج ۴)	"یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔"

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں: وفیہ استماع المصلی لکلام من لیس فی الصلوٰۃ فلا یضر صلوٰتہ (الیٰ) ھکذا استنبطہ الطحاوی (عمدۃ القاری، ص ۲۴۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو خارجِ صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسدِ نماز کہا ہے جو عام متون و شروحِ حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجبِ فسادِ نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امرِ الٰہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجبِ فساد نہیں۔

فقہاءؒ نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پچھلی صف میں تنہا رہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امرِ غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درمختار باب الامامۃ میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ثم نقل تصحیح عدم الفساد فی مسئلۃ من جذب من الصف فتأخر فھل ثم فرق فلیحرر، اس پر علامہ طحطاویؒ نے تحریر فرمایا: لِاَنَّہٗ اِمْتَثَلَ اَمْرَ اللّٰہِ، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنیوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امرِ الٰہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شرنبلالیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فسادِ نماز کا قول نقل کیا

پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ اِذَا قِیلَ لِمُصَلِّ تَقَدَّمْ فَتَقَدَّمَ (اِلٰی) فَسَدَتْ صَلٰوتُہ لانہ امتثل امر غیر اللّٰہ فی الصلوۃ۔ لان امتثالہ انما ھو لامر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلا یضر اھ

ان تمام روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کیساتھ نماز میں شریک نہیں تو اسکی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ خود اس شخص کی دلداری اور اتباع مقصود ہو یہ تو مفسد نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کرلیا تو وہ درحقیقت امر الٰہی کا اتباع ہے، اس لئے مفسد نماز نہیں ہوگا۔ اسی لئے طحطاوی نے فیصلہ یہی کیا ہے کہ اقول لو قیل بالتفصیل بین کونہ امتثل امر الشارع فلا تفسد بین کونہ امتثل امر الداخل مراعاۃ لخاطرہ من غیر نظر لامر الشارع فتفسد لکان حسنا (طحطاوی علی الدر ص ۲۴۶ ج ۱)

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلہ مکبر الصوت کا فیصلہ کرلینا آسان ہوگیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دُور دور بھی وہم نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اس آلہ سے صرف یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جارہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا ہے نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکم الٰہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ مکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل وحکایت قرار دیا جائے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آوازِ امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جوازِ صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مفصل رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ: یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تحویل قبلہ پر جو بعض بیوقوف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے منحرف ہوگئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہوگیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایات حدیث اور اقوالِ سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازیں سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح ومقبول ہوچکیں، تحویلِ قبلہ کے حکم کا پچھلی نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابن عازبؓ، اور ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصہ میں انتقال کرگئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا اُن کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تحویل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠

بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اُٹھنا تیرے مُنہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

اب پھیر مُنہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو مُنہ اسی کی

وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ

طرف، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امید وحی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے، سو) آپ کے مُنھ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پورا کرنا منظور ہے اس لئے (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جو آپ کو پسند ہے (لو پھر ہم حکم ہی دیئے دیتے ہیں، کہ) اب اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور (یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ مدینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو (اور اس قبلہ کے معتبر رہنے کے متعلق) یہ اہل کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشینگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے (مگر عناداً مانتے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشتیاقِ کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور عطاءِ نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتِ ابراہیمی کے تابع کام کرتے تھے، اور نزولِ وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق قرار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیدیا جائے۔

یہ وجہ بھی تھی کہ قبائلِ عرب بھی چونکہ ملتِ ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلۂ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہلِ کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہودِ مدینہ منورہ کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیدیا جائے، اور چونکہ مقربانِ بارگاہ الٰہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعاء کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعاء کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیتِ مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان فرما کر پہلے تو قبولیتِ دعاء کا وعدہ فرمایا، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ یعنی ہم آپ کا رُخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہو، اس کے فوراً بعد ہی یہ رُخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمادیا، فَوَلِّ وَجْهَكَ، اس طرزِ عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفائے وعدہ کی خوشی قندِ مکرر ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، مظہری سے لیا گیا ہے)

مسئلہ استقبالِ قبلہ یہ تحقیق پہلے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، لیکن مصالح امت کے لئے بتقاضائے حکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عملی مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ فَوَلِّ وَجْهَكَ اِلَى الْكَعْبَةِ اَوْ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے یہ عنوان بدل کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل استقبالِ قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اوّل یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اور بیت اللہ اُن کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رُخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات و حسابات کے ذریعہ بھی صحیح سمت کا تعین دُور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جائے، اور شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رُخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شطر اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا، شطر دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصفِ شے، دوسرے سمتِ شے، باتفاق مفسرین اس جگہ شطر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلا دیا کہ بلادِ بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رُخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمتِ مسجد حرام کافی ہے (بحر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانبِ مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رُخ کر لینے سے استقبالِ قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمتِ مغرب و قبلہ قرار دیا ہے، جو موسم گرما و سرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے، اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغربِ صیف اور مغربِ شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمت قبلہ قرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرح چغمنی باب رابع صفحہ ۶۶ میں دونوں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا ہے۔[1]

---

[1] حضرت والد صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے شرعاً آلات رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ پر مدار نہیں

اس سے اُن لوگوں کی جہالت بھی واضح ہوگئی جنھوں نے ہندوستان و پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمتِ قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ڈگری کا دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں نماز نہیں ہوتی یہ سراسر جہالت ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے ممالک کے لئے ہے، اس لئے احکامِ شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا اصطرلاب وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے، ۹۰ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہلِ مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، ما بین المشرق و المغرب قبلۃ (رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃؓ) یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپؐ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانبِ جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجد حرام کی سمت کافی ہے، البتہ بنا مسجد کے وقت اس کی کوشش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رُخ سے جتنا قریب ہو سکے وہ کر لیا جائے، صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا کہ جس جگہ صحابہ کرامؓ کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوتی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رُخ سیدھا کر لیا، پھر اُن کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رُخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلادِ بعیدہ میں سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں تو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انھیں دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجدِ مسلمین سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و وافی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہات فلسفیہ نکالنا شرعاً محمود نہیں، بلکہ مذموم اور موجبِ تشویش ہی، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہو جاتی ہے، کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہی، آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب حنبلیؒ اسی بناء پر سمتِ قبلہ میں آلات رصدیہ اور تدقیقات ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظہ:

واما علم التسییر فاذا تعلم منه ما یحتاج الیه للاستھداء ومعرفة القبلة والطرق کان جائزا عند الجمھور وما زاد علیه فلا حاجة الیه وھو یشغل عما ھو اھم منه وربما اذی التدقیق فیه الی اساءة الظن بمحاریب المسلمین فی امصارھم کما وقع فی ذلك کثیر من اھل ھذا العلم قدیما وحدیثا وذلك یفضی الی اعتقاد خطاء الصحابة والتابعین فی صلواتھم فی کثیر من الامصار وھو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالجدی وقال انما ورد ما بین المشرق والمغرب قبلة

"لیکن علم تسییر سو اس کو اس قدر حاصل کرنا جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور راستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ سیکھنا) امور ضروریہ سے غافل کردے گا، اور بعض مرتبہ تدقیقات فلکیہ میں پڑنا عامۂ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق بدگمانی پیدا کر دیتا ہے، اس فن میں مشغول ہونیوالوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس سے یہ بھی اعتقاد پیدا ہوگا کہ بہت سے شہروں میں صحابہؓ و تابعینؒ کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمدؒ نے (ستارہ) جدی (جس کو ہمارے بلاد میں قطب کہتے ہیں) سمتِ قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور فرمایا کہ حدیث شریف میں (صرف) ما بین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔"

اور جن جنگلات یا نو آبادیات وغیرہ میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سنت صحابہؓ و تابعینؒ سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمتِ قبلہ متعین کرلی جاوے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی رہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسبِ تصریح صاحبِ بدائع ان بلادِ بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروج ریح کا قرار دے کر اسی پر نقضِ وضو کا حکم کردیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کردیں، حقیقۃً مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلادِ بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو سمتِ قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ بحرالعلوم نے رسائل الارکان میں اسی مضمون کو بالفاظِ ذیل بیان کیا ہے:

والشرط وقوع المسامتة علی حسب

"اور استقبالِ قبلہ میں شرط و ضروری صرف یہ

مایری المصلّی ونحن غیر مأمورین بالمسامتۃ علی ما یحکم بہ الآلات الرصدیۃ ولھذا افتوا ان الانحراف المفسد ان یتجاوز المشارق و المغارب (رسائل الارکان ص ۵۳)

ہو کہ نمازی کی رائے اور اندازہ کے موافق کعبہ کے ساتھ مسامتت (محاذات) واقع ہو جاوے اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ مسامتت ومحاذات کا پیدا کریں جو آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے عام علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ انحراف مفسد (صلوٰۃ) وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جاوے۔

اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمتِ قبلہ" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ

اور اگر تو لائے اہلِ کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ

اور نہ تو مانے اُن کا قبلہ اور نہ اُن میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہوا ان

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

بے انصافوں میں۔

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

اور (باوجود ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ) اگر آپ (ان) اہلِ کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کر کے) پیش کر دیں جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھنی چاہیے کہ آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، (بس کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور (جیسا ان اہلِ کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم بھی موافقت نہیں کیونکہ) ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا، (مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا) اور

(خدانخواستہ آپ تو کسی طرح اُن کے قبلہ منسوخہ غیر مشروعہ کو لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (گو وہ اصل میں حکم آسمانی رہے ہوں لیکن اب بوجہ منسوخ ہونے کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہی، سو اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کرلیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آئے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں (جو کہ تارکین حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کرلیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے قبلہ کو تو کوئی قرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہوگیا، پھر بیت اللہ ہوگیا، اب بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحر محیط)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ، یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فرض محال کے ہے جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سُنانا امت محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلاف ورزی ایسی چیز ہو کہ خود رسولؐ بھی بفرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ

اور بیشک ایک فرقہ اُن میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر ، حق وہی ہے

مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اس سے پہلی آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں انہی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ وانجیل) دی ہے، وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو تورات وانجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بنا پر بحیثیت رسالت (ایسا (بے شک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعضے ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہوچکا) ہے سو (ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ) ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے، کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہ واشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح تورات وانجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات ونشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہے، ماں باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادۃً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداءِ پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوجھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کبھی نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں کیونکہ اس کی نسبت تو انسان پر مشتبہ ہوسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل وصورت وغیرہ کا پہچاننا ہے کہ بیٹا فی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل وصورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت کرو نیکیوں میں جہاں کہیں تم

يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ

ہوگے کر لائے گا تم کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ

تو نکلے سو منہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ

تیرے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ

نکلے منہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو منہ کرو

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي

اُن میں بے انصاف ہیں، سو اُن سے (یعنی انکے اعتراضوں سے) نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

خلاصہ تفسیر

اور (دوسری حکمت تحویلِ قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہو چکی) سو (مسلمانو) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہو گے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اعمالِ بد پر سزا ہو گی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور (اس حکمت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر میں کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھا کیجئے، (غرض حضر و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور) منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بے خبر نہیں۔

تحویلِ قبلہ کی تیسری حکمت اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضر میں بدرجہ اولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھئے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سُن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اُسی (مسجد حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے) تاکہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو (کی مجال) نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تحویل قبلہ کی) ہاں، مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں (وہ اب بھی کٹھ حجتی نکالیں گے، کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ڈرتے رہو (کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضر ہے) اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (واکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخلِ بہشت کرکے) اس کی تکمیل کردوں اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اسلام پر قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر وہ تکمیلِ نعمت مرتب ہوتی ہے)

معارف و مسائل

تحویلِ قبلہ کی حکمتیں مذکورہ آیات میں تحویلِ قبلہ کیلئے الفاظ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ آئے ہیں اور حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ دو مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شغب کا ذریعہ تھا ہی خود مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بتکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحویل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان القرآن کے خلاصہ تفسیر میں جو تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے قرطبی نے بھی اسکی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے جس سے تکرار محض نہ رہے مثلاً فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ یہ حکم حالتِ حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رُخ کیا کریں اور پھر پوری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور حَيْثُ مَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ جو انہی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ کا اضافہ کر کے بتلا دیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس تیسری مرتبہ کے اعادہ کے ساتھ تحویلِ قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو تورات و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا۔ وِجْهَةٌ بکسر الواؤ کے معنی لغوی، جس چیز کی طرف رُخ کیا جائے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہے، اور حضرت ابی بن کعبؓ کی قراءت میں اس جگہ وِجْهَةٌ کی بجائے قِبْلَةٌ بھی منقول ہے، مراد آیت کی جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رُخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ مقرر کر دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں سے اجتناب کی ہدایت

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے۔ اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر درپیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا، أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہار جیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہے، اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوامِ عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

عبادات اور نیک اعمال میں بلاوجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں مسارعت کرنا چاہئے

لفظ فَاسْتَبِقُوا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو چاہئے کہ کسی نیک عمل کا جب موقع مل جائے تو اس کے کرنے میں دیر نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات اس کے ٹلانے اور تاخیر کرنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، پھر آدمی کام کر ہی نہیں سکتا، خواہ وہ نماز روزہ ہو یا حج وصدقہ وغیرہ، قرآن کریم میں یہی مضمون سورۃ انفال کی آیت میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ (۸: ۲۴)

"یعنی اے ایمان والو! تم اللہ و رسولؐ کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسولؐ تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں"

کیا ہر نماز کا اوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے

اس مسابقت فی الخیرات سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر نماز کو اوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے، اور وہ روایات حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہیں جن میں اوّل وقت نماز ادا کرنے کی فضیلت آئی ہے، امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے، مگر امام اعظم ابوحنیفہ ومالک رحمہما اللہ نے دوسری روایاتِ حدیث کی بناء پر اس معاملے میں تفصیل کی ہے کہ جن نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کر کے پڑھنے کی تعلیم اپنے قول و عمل سے دی ہے، ان کا اوّل اور افضل وقت وہی ہے جو اُن احادیث میں بیان ہوا ہے، باقی اپنی اصل پر اوّل وقت میں پڑھی جائیں، مثلاً صحیح بخاری میں بروایت انسؓ عشاء کی نماز کو مؤخر کر کے پڑھنے کی فضیلت مذکور ہے اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی تاخیر پسند تھی (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری و ترمذی میں بروایت ابوذرؓ منقول ہے کہ ایک سفر میں حضرت بلالؓ نے ظہر کی اذان اوّل وقت میں دینا چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، اور فرمایا کہ جب وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے اس وقت اذان کہی جائے کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی آگ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرمایا۔

ان روایات کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ ان نمازوں میں اوّل وقت پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ جب وقت مستحب ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کریں، اور جہاں کوئی تاخیر کا حکم نہیں آیا وہاں بالکل ابتداء وقت ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے جیسے نماز مغرب۔

بہرحال آیت مذکورہ سے یہ بات باتفاق ثابت ہوگئی کہ جب نماز کا وقت آجائے تو بغیر ضرورت شرعیہ یا طبعیہ کے تاخیر کرنا اچھا نہیں، ضرورت شرعیہ تو وہی ہے جو اوپر لکھی گئی، کہ بعض نمازوں کی تاخیر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور ضرورت طبعیہ اپنے ذاتی عوارض بیماری و محتاجی کے سبب تاخیر کرنا، واللہ اعلم۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾

اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے،

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾

سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو

خلاصہ تفسیر

(یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا جو درباب مقبولیت بنائے کعبہ تھی اس طرح قبول کی) جس طرح (ان کی دوسری دعا جو درباب بعثتِ محمدیہ کے تھی قبول کی کہ) تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (و احکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (خیالات و رسوم جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں، اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی، (اور نہ کتب سابقہ یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اس شان کے رسول کے مبعوث ہونے کی ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی، سو اس کا ظہور ہو گیا) ان (مذکورہ) نعمتوں پر مجھ کو (منعم ہونے کی حیثیت سے) یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا، اور میری (نعمت کی) شکر گذاری کرو اور (انکارِ نعمت یا ترک اطاعت سے) میری ناسپاسی مت کرو۔

معارف و مسائل

یہاں تک قبلہ کی بحث چل آرہی تھی، اب اس بحث کو ایسے مضمون پر ختم فرمایا گیا ہے، جو اس بحث کی تمہید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بانیِ کعبہ کی دعا میں ضمناً آیا تھا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولادِ ابراہیمؑ میں ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بانیِ کعبہ کی دعا کو بھی دخل ہے، اس لئے اگر ان کا قبلہ کعبہ کو بنا دیا گیا تو اس میں کوئی تعجب یا انکار کی بات نہیں ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا میں حرف کاف جو تشبیہ کے لئے آتا ہے اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکی ہے، دوسری ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے جس کو قرطبی نے اختیار کیا ہے کہ اس حرف کاف کا تعلق بعد کی آیت فَاذْكُرُوْنِيْٓ سے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جیسا ہم نے تم پر

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہو ایسی ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں قرطبیؒ نے فرمایا کہ كَمَآ اَرْسَلْنَا کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۂ انفال میں كَمَآ اَخْرَجَكَ اور سورۂ حجر کے آخر میں كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ آیا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو، مولانا رومیؒ نے اسی کے متعلق فرمایا ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابوعثمانؒ سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگا لیا (قرطبی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابوعثمان نہدیؒ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، فرمایا اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعتِ احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؒ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم یطعہ لم یذکرہ وان کثر صلوٰتہ وتسبیحہ

"یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو"

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویز منداذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے احکام حلال وحرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث قدسی بروایت ابوہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے ، بیشک اللہ صبر
الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
کرنے والوں کے ساتھ ہے

ربط:۔ تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دو اثر تھے، ایک مذہب اسلام پر کہ اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جایا کرتا ہے، اوپر کی آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طبائع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیتِ آئندہ میں تخفیفِ حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں، (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہے، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ بشارت ہوگی)۔

معارف و مسائل

صبر اور نماز ہر مشکل کا حل اور ہر تکلیف کا علاج ہیں

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب اور تکالیف کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر دو جزء سے مرکب ہے، ایک صبر، دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کردیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا کو عام چھوڑا ہے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے، تفسیر مظہری میں اس عموم کو واضح کردیا ہے، اب اس دو جزئی نسخے کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

صبر کی اصل حقیقت

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادات کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیرؒ عن سعید بن جبیرؓ)

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں عام طور پر اُن کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انھیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ محشر میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گذرے ہیں وہ کھڑے ہوجائیں گے، اور ان کو بلا حساب جنت میں داخلہ کی اجازت دیدی جائے گی، ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹: ۱۰) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جزء اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہوگیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جداگانہ بیان اس لئے کردیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر محبوس بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالتِ نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصۃ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصۃ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو ہاتھ یا منہ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عودِ صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا مؤثر بالخاصۃ ہی، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اسی طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مہم کو پورا فرما دیتے تھے، حدیث میں ہے:

اذا حزبہ امر فزع الی الصلوٰۃ | یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔

صبر اور نماز تمام مشکلات و مصائب سے نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلا دیا گیا ہے کہ صبر حلِ مشکلات اور دفعِ مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کونسا کام رُک سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مُردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن

لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ

مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے اور خوشخبری دے صبر کرنے والوں کو کہ جب

اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ

پہنچے اُن کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں ، ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر -

رَبط اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی، آیاتِ آئندہ میں اور بھی بعض واقعات خلافِ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، دو وجہ سے، اوّل بوجہ اعظم ہونے کے، کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجۂ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصۂ تفسیر اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے جاتے ہیں ان (کی ایسی فضیلت ہے کہ ان) کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم (صفتِ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضا ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجوم مخالفین یا نزولِ حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقر و) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مواشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا، یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آویں اور مستقل رہیں تو) آپ ایسے صابرین کو بشارت سُنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقۃً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں (اور مالکِ حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے مملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جا کر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سُنایا جاوے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہو گئی (کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)۔

معارف و مسائل

شہداءؒ اور انبیاءؑ کی حیات برزخی اور اس کے درجات میں تفاضل

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رُو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاءؑ و صالحینؒ کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنّت ہو اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مرگیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مُردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورو ے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثارِ حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مُردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعۂ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، اُن کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں یہاں تک کہ سلامتِ جسم کے علاوہ اس حیاتِ برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اُن کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مُردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہو کہ بعض اولیاءؒ و صالحینؒ بھی اس فضیلت میں شہدار کے شریک ہیں، سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی معنیً شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہوگئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رتبہ دوسرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہے، اور اگر فرضاً ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائطِ شہادت ہونا دلیل قطعی تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحب رُوح المعانی کو ہوگیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاءؑ و شہداءؒ کے جسم کو زمین نہیں کھاتی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کرسکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام و انواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اخلاط و اجسام بسیطہ مثل آب و آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاءؑ کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں، اور بعض حصّۂ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاءِ غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمتِ اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہو کہ امتیاز اجسادِ شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدّت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جاویں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارقِ عادت ہے، اور خرقِ عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ مؤبّد اور حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے لَا تَشْعُرُوْنَ فرمایا گیا کہ تم اُن کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

مصائب پر صبر کے آسان کرنے کی خاص تدبیر

ف: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دیدینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعۃً کوئی صدمہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا دار المحن ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جاوے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفسِ عمل صبر میں سب مشترک ہیں، اس لئے اس کا صلہ مشترکہ تو عام رحمت ہے، جو نفسِ صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ جدا جدا خاص عنایتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوتِ طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو علی قدر الحیثیت والخدمت دیتے جاتے ہیں۔

مصیبت میں انا للہ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکینِ قلب کا بہترین علاج ہے صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت والوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم و رنج کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

قدردان ہے سب کچھ جاننے والا

ربط آیاتِ متقدمہ میں وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ سے دور تک خانۂ کعبہ کا مفصل ذکر ہوا، جس کے اوّل میں خانۂ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیمی کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکامِ مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہیں، پس بیت اللہ کا معبَدٌ ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصدِ حج و عمرہ بننے کے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفا و مروہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ سعی ہوتی تھی، اور اس وقت صفا و مروہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمانا مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصدِ حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مروہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(صفا و مروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان (سعی کے معروف طریقہ کے مطابق) آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امرِ خیر ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی امرِ خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں، (پس اس ضابطہ کی رُو سے سعی کرنے والے کو بمقدارِ اخلاص ثواب عنایت ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تحقیق

شَعَآئِرِ اللہِ، شعائر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاحِ قرآن و سنت میں خاص خانۂ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعالِ مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف و سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہ سعی امام احمدؒ کے نزدیک سنت مستحبہ ہے، اور مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیتِ مذکورہ کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

۲

ہوا کہ سعی مباحات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لَا جُنَاحَ کا سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مروہ پر بتوں کی مورتیں رکھی تھیں اور اہلِ جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنتِ ابراہیمیؑ ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اُتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں اُن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ

اُن پر لعنت کرنیوالے، مگر جنھوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو تو اُن کو معاف

عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا

کرتا ہوں اور میں ہوں بڑا معاف کرنیوالا نہایت مہربان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہی انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہلکا ہوگا اُن پر سے عذاب اور

لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

نہ اُن کو مہلت ملے گی۔

ربط اوپر بحث قبلہ کے ضمن میں صاحبِ قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ الیٰ قولہ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ آگے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمانِ حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر جو لوگ اخفار کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفار بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الٰہی توراۃ و انجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمتِ خاصہ سے اُن کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی) اُن پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعاء کرتے ہیں ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفار کرنے والوں میں اپنی اس حرکت سے) توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے روبرو گذشتہ سے معذرت) کرلیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہوگئی تھی، آئندہ کے لئے اس کی) اصلاح کردیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفار کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کردیں (تاکہ سب کو اطلاع ہوجاوے اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عندالشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کرلیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوتِ محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہوجاویں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہوجاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کردیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لاویں، اور اسی حالتِ غیر اسلام پر مرجاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دُور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہے، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت) ان (پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت دی جاوے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر اوّل ہی پیشی میں حکمِ سزا ہوجاتا ہے)۔

معارف و مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے:۔

اوّل یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَن سُئِلَ عَن عِلمٍ يَعلَمُهُ فَكَتَمَهُ أَلجَمَهُ اللهُ يَومَ القِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ، (رواہ ابوہریرۃؓ وعمرو بن العاصؓ اخرجہ ابن ماجۃ۔ از قرطبی)

"یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں اللہ تعالیٰ آگ کی لگام ڈالیں گے۔"

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہدے کہ دوسرے علماء سے دریافت کرلو (قرطبی، جصاص)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انھیں علوم و مسائل کے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتمانِ علم کے حکم میں نہیں ہو آیتِ مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ سے اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کردو گے (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہو انھوں نے فرمایا کہ عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کرو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کرسکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد لکھ دیتے ہیں هٰذَا مِمَّا يُعرَفُ وَلَا يُعَرَّفُ

یعنی یہ مسئلہ ایسا ہی کہ اہلِ علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلانا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَمْنَعُوا الْحِكْمَةَ اَهْلَهَا فَتَظْلِمُوْهُمْ وَلَا تَضَعُوْهَا فِيْ غَيْرِ اَهْلِهَا فَتَظْلِمُوْهَا

"یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا"

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو، یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علمِ دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکامِ دین میں رُخصتیں اور حیلوں کی صورتیں بلاضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکامِ دین پر عمل کرنے میں حیلہ جوئی کے عادی بن جائیں (قرطبی)

حدیثِ رسولؐ بھی قرآن کے حکم میں ہے: صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایاتِ حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتمانِ علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیثِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کتمان کی وعید اُن لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحۃً ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیثِ رسولؐ کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اخفاء کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا۔

بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ساری مخلوق لعنت کرتی ہے: وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں قرآن کریم نے لعنت کرنے والوں کو متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امام تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعیین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی اُن پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بداعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہونچتا ہے، حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللّٰعِنُوْنَ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)

کسی معین شخص پر لعنت اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کے کفر پر مرنے کا یقین ہو

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ کے لفظ سے جصاص اور قرطبی وغیرہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مرنے کا یقین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاتمہ کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہوگیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعیین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہے کہ کسی کافر پر بھی اُس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہوجائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کسی مسلمان پر یا کسی جانور پر لعنت کیسے جائز ہوسکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عورتیں کہ بات بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود، راندۂ درگاہ، اللہ مارا وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

ع ۱۹ | ۱۱ | ۳

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جسکو کہ اُتارا

اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے اور

بَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ

پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے

بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے بیشک اُن سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کیلئے

ربط مشرکین عرب نے جو آیت وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سُنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمٰن ہے، رحیم ہے، (اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدون کمالِ صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہے پس بجُز معبودِ حقیقی کے کوئی اور مستحقِ عبادت نہ ہوا) بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہوئے پیچھے (یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دئیے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور توالد و تناسل اسی غذائے نباتی کی بدولت ہے) اور ہواؤں کی (سمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں (کہ کبھی پروا ہے کبھی پچھوا کبھی گرم ہے کبھی سرد) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

توحید کا وسیع مفہوم وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہے استحقاقِ عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک ہے یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا

تجزیہ اور تقسیم ہوسکتی ہے۔

چوتھے یہ کہ وہ ایک ہی یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہے، وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حیثیتیں توحید کی ملحوظ ہیں (جصاص)

اس کے بعد حق تعالیٰ کے واحد حقیقی ہونے پر تکوینی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہر سیال بنادیا کہ رقیق اور سیال ہونے کے باوجود اس کی پیٹھ پر لاکھوں من وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رُخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنیوالا اور چلانے والا کوئی بڑا علیم و خبیر اور حکیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہوسکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافتیں طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اسی مضمون کو فرمایا:

اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ (۴۲: ۳۳)	اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دیں اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہونچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی، جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوٹہ اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہوجانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمائے

ارشاد فرمایا:

فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ (۲۳: ۱۸)

یعنی ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا، اگرچہ ہمیں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا پانی برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا ۔

مگر قدرت نے پانی کو اہلِ زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر اتار دیا اور پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچھادی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برف کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لاد دیا، جو سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پگھل کر زمین کے اندر قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہونچتا ہے، غرض آیتِ مذکورہ میں قدرتِ کاملہ کے چند مظاہر کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے، دیکھئے جصاص، قرطبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۱۶۵)

کا عذاب سخت ہے ۔

ربط اوپر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے)، اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہوجاوے کہ میرے معبود سے مجھ پر کوئی ضرر پڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہوجاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع وضار حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی باقی رہتی ہے، ونیز اکثر مشرکین مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالتِ غالبہ کے بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کرکے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے (اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا) اور (اس مصیبت کی شدت میں غور کرکے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں کہ دار الجزاء ہے اور بھی) سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہوکر توحید و ایمان اختیار کرلیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ

جب کہ بیزار ہوجاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی اُن سے جو کہ اُن کے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا

اور منقطع ہوجاویں گے ان کے سب علاقے ، اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ

لوٹ جانا مل جاتا تو پھر ہم بھی بیزار ہوجاتے ان سے جیسے یہ ہم سے بیزار ہوگئے، اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے ۔

ع ۲۰ / ۴

ربط اوپر عذاب آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سختی کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ (ان مشرکین میں سے) وہ (ذی اثر) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہوجاویں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب (خواص وعوام) عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع تھا دوسرا متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہوجاویں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک ومتفق ہوتے ہیں اور تنقیح مقدمہ کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتی کہ باہم گر شناخت تک کے منکر ہوجاتے ہیں) اور (جب) یہ تابع لوگ (متبوعین کی یہ طوطا چشمی دیکھیں گے تو بڑے جھنجلاویں گے، اور تو کچھ نہ ہوسکے گا مگر جلا کر) یوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لیلیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہوجاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہدیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی اُنکی بد اعمالیوں کو خالی ارمان (کے پیرایہ میں) کرکے ان کو دکھلاویں گے اور ان (تابعین ومتبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار ہے)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو شیطان

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح، وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ بُرے کام اور بےحیائی کرو

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

خلاصۂ تفسیر

(بعض مشرکین بتوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعتقاد ان کی تعظیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الٰہی اور موجب رضائے حق و وسیلۂ تقرب الی اللہ بواسطۂ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال

پاک چیزوں (کی نسبت اجازت ہے کہ اُن) کو کھاؤ (برتو) اور (ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ سمجھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم، شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات وجہالات سے تم کو خسرانِ ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بُری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف ومسائل

حل اللغات حَلٰلًا طَيِّبًا، لفظ حلّ کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کردی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹادی گئی، حضرت سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فرائض ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہو اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُطُوٰتِ، خطوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خطوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خطواتِ شیطان سے مراد شیطانی اعمال وافعال ہیں۔

اَلسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ، سوء وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سوء سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ شیطان کے امر اور حکم کرنے سے مراد دل میں وسوسہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام واثر ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بُرے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور الہامِ فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام وفلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: سانڈ وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور مرغا بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نامزد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا ابھی چار آیتوں کے بعد وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے تحت آنے والا ہے، اس آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقصد اس فعل کی حرمت وممانعت ہے کہ

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کرلینے کا معاہدہ کرلینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بتوں کے نام کرکے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت جہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیت کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کرکے اس حرمت کو ختم کر دو، اس طرح ان جانوروں کو تعظیماً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور نجس کے حکم میں ہوگیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہوگئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے جہالت یا غفلت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کرکے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو تابعداری

عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

کریں گے اسکی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً

اور مثال اُن کافروں کی ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ سنے سوائے پکارنے

وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

اور چلانے کے بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختیار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ اُن کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ (الی قولہ) فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلّا رہا ہے، جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پُرمضمون) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات سے بالکل) بہرے ہیں (گویا سُنا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کیونکہ نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس مختل ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہوگیا جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُوْنَ اور لَا يَهْتَدُوْنَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انہیں نہ عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد نصوص شرعیہ سے استنباط کئے گئے۔

تو وجہ ان کے اتباع و تقلید کے عدم جواز کی یہ ہے کہ نہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہوجائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے، اور اس کو درجۂ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحۃً قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو نصوصِ قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہوسکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہوسکے۔

جاہلانہ تقلید اور ائمہ مجتہدین کی تقلید میں فرق

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمۂ مجتہدین کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آبائی کے ممنوع ہونے

کا جو ذکر ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۂ یوسف میں اس طرح آئی ہے:

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (۱۲ : ۳۷-۳۸)	میں نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑدیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آبا ابراہیمؑ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا۔

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے:

تعلق قوم بھذہ الآیة فی ذم التقلید (الی) وھذا فی الباطل صحیح اما التقلید فی الحق فاصل من اصول الدین وعصمة من عصم المسلمین یلجاء الیھا الجاھل المقصر عن درك النظر (قرطبی، ص ۱۹۴، ج ۲)	"کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے، اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔"

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا

اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

لِلّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو، اس نے تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ

لہو اور گوشت سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر جو کوئی بے اختیار ہوجائے

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصۂ تفسیر

اوپر اکلِ طیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح مقصود تھی، آگے اہلِ ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں، اسی کے ضمن میں اہلِ ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

اے ایمان والو: (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ) جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور (اس اجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکر گذاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت وطاعت بجالا کر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مسلّم اور ظاہر ہے، پس وجوبِ شکر بھی ثابت ہے)۔

ربط اوپر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانوروں کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے پچھلے مضمون کی تائید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی) مردار (جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مرجاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہو جاوے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالبِ لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھا دیا)

معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور حرام کھانے کی نحوست آیاتِ مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گذار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے، دعاء قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعاء قبول ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (۲۳: ۵۱)	"اے ہمارے رسولو! تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعاء میں حلال کھانا معین اور حرام مانعِ قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل السفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعاء کہاں قبول ہوسکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)

اِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ الآیۃ (۶: ۱۴۵) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کردیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت ماسوی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکینِ مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں:

میتۃ (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے ازروئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہے، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۵: ۹۶) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر، از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی)

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (جصاص)

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلہ جارحہ تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

بندوق کی گولی سے شکار **مسئلہ:** بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مر جائے جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں مَوْقُوْذَةٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اسکو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔

مسئلہ: آجکل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارحہ نہیں

بلکہ خارق ہے جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، ورنہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے، کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے، یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز باختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتا بلی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (جصاص، قرطبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ کے الفاظ سے کردی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں، جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۱۶: ۸۰) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔

کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)

مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرامؓ ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا پنیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے جس کو عربی زبان میں انفحہ کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبوح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسفؒ و محمدؒ اور ثوریؒ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قرطبی)

یورپ اور دوسرے غیر اسلامی ملکوں سے جو پنیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبوح جانوروں کا انفحہ استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے، امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پنیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ڈبہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسائل دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دَمٌ بمعنی خون اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۂ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَسْفُوْحٌ یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (۶: ۱۴۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجمد جیسے گردہ تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہؓ و تابعینؒ اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے (جصاص)

مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دَمٌ کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجہ سے حرام ہو اوّل اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اُس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہوگئی جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرے انسان کا جزء بنتا ہے اور شریعتِ اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیشِ نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بچوں کا رزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلوائے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ج (۶۵: ۶)	"اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دودھ پلائے تو اس کو اجرت و معاوضہ دیدو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزءِ انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیساکہ عالمگیری میں ہے:

وَلَا بَأْسَ بِاَنْ يُّسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ الْمَرْاَةِ وَيَشْرَبُهٗ لِلدَّوَاءِ (عالمگیری، ص ۴)	"اس میں مضائقہ نہیں کہ دواء کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔"

اور مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (مغنی کتاب الصید ص ۶۰۲/ ج ۸)

اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزءِ انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزءِ انسانی ہونا تو یہاں وجہِ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج و دواء کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج و دواء کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو، ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نصِ قرآنی کی رُو سے جائز ہے، جس میں مضطر

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحۃً مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوائیں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث تداوی بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ' تعالیٰ اعلم، احقر کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے "اعضاء انسانی کی پیوندکاری" اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحریم خنزیر

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے مقصود لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماعِ امت حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی رہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف چمڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تین صورتیں

چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں۔

اوّل یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماعِ امت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جزء سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاقِ فقہاء حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین و فقہاء نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:

كُلُّ مَا نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَاِنْ ذُبِحَ	"ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا

بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَيْثُ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ اَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَّقَصَدَ بِذَبْحِهٖ التَّقَرُّبَ اِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَّذَبِيْحَتُهٗ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ	نام لیا ہو اس لئے کہ علماء فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا"

نیز درمختار کتاب الذبائح میں ہے:

ذُبِحَ لِقُدُوْمِ الْاَمِيْرِ وَنَحْوِهٖ كَوَاحِدٍ مِّنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِاَنَّهٗ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ وَاَقَرَّهُ الشَّامِيُّ (درمختار)[ع]	"کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اور شامی نے اس کو برقرار رکھا ہے"

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراکِ علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَآ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ نُصُب ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہو معنے یہ ہیں کہ وہ جانور جسکو معبوداتِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَآ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ اُہِلَّ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہو جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ (۵: ۳) اسکے بالمقابل آیا ہے جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہو، اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

ع اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد مہمانی کرنا ہو اور اس مہمانی کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت مہمان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنتِ ضیافت ہے اور جائز ہے، اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں میزبانی کیلئے گوشت کا حصول مقصود ہوتا ہے، اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ درمختار میں آگے یہی وضاحت کی گئی ہے: ولو ذبح للضیف لایحرم لانہ سنۃ الخلیل واکرام الضیف اکرام اللہ تعالیٰ۔ والفارق أنہ إن قدمھا لیأکل منھا کان الذبح للہ والمنفعۃ للضیف أو للولیمۃ أو للربح، وإن لم یقدمھا لیأکل منھا بل یدفعھا لغیرہ کان لتعظیم غیر اللہ فتحرم۔ علامہ شامیؒ نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادی ہے (ردالمحتار ص ۳۰۹ و ۳۱۰ ج ۵) محمد تقی عثمانی ۲۷ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شیخ حکیم الامت)

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُوْدِ بِالذَّبِيْحَةِ وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِيْ اِسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عَبَّرَ بِهٖ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِيْ هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيْمِ (تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

"عرب کی عادت تھی کہ جس کیلئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنیکے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علت تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔"

امام قرطبیؒ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرامؓ نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلمؒ کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا:

اَمَّا مَا ذُبِحَ لِذٰلِكَ الْيَوْمِ فَلَا تَأْكُلُوْا وَلٰكِنْ كُلُوْا مِنْ اَشْجَارِهِمْ (تفسیر قرطبی ص ۲۰۷ ج ۲)

"جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔"

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اوّل تو اشتراک علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے، دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بحیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ

وَلَا سَآئِبَةٍ (۵: ۱۰۳) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدۂ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا مملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔

اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں، مندروں کے پجاریوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں، کہ بکرا، یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ اِن جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان کا خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مسئلہ یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہاء نے اس کو بھی اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم استثنائی مذکور ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قدر ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھا لینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم۔

اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرہ میں ہو معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جا سکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم فائدہ

یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھانے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفاء کر دینے کے بجائے لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہی ہو، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالتِ اضطرار میں دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال

آیتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیتِ مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں:

اوّل یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا یہ حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اُسی وقت ہے جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمہ حرام گوشت کا کھالینا عادۃً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفا یقینی نہیں تو اس دوا حرام کا استعمال آیتِ مذکورہ کے استثنائی حکم میں داخل ہو کر جائز نہیں ہوگا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیتِ قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدرِ ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

آیتِ مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باتفاق فقہاء امت جائز ہے، اُن شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عادۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدرِ ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال

اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائطِ مذکورہ کے ساتھ نصِ قرآن سے ثابت اور اجماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کرکے جائز قرار دیا، وہ واقعہ عُرَنِیِّین کا ہے، جو تمام کتبِ حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفاء ہوگئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہے، اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جبتک شرائطِ اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلاء عام اور عوام کے ضعف پر نظر کرکے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

كما في الدر المختار قبيل فصل البير اختلف في التداوي بالمحرم و ظاهر المذهب المنع كما في

دُرِّ مختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر ولکن نقل المصنف ثَمَّ وههنا عن الحاوی قیل یرخص اذا عُلِمَ فیہ الشفاء ولم یُعْلَمْ دواء اٰخر کما رخص فی الخمر للعطشان وعلیہ الفتوٰی، ومثلہ فی العالمگیریۃ ص ۳۵۵ ج ۵

کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ بحرالرائق کتاب الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے فرمایا دواء و علاج کے لئے حرام چیزوں کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس دواء کے استعمال سے شفاء ہو جانا عادۃً یقینی ہو، اور کوئی حلال دواء اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے اُن تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو یورپ وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مول وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا اُن کو اور اُن کے لئے ہے

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنھوں نے خریدا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ

بدلے بخشش کے، سو کس قدر صبر کرنیوالے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ

کتاب سچی، اور جنھوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ضد میں

بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

دُور جا پڑے

ع ۵ ۲۱

خلاصۂ تفسیر و ربط آیات اس سے پہلی آیات میں اُن حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر اُن کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توریت کی آیات میں تحریف کرکے اُن کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امتِ محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہے، کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فروشی کی سزا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں (دنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے اُن کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (و دراز) کی خلاف (ورزی) میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

معارف و مسائل

مسئلہ: آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکمِ شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مالِ حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے۔ اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالِ حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی ہے،

اگرچہ اس کا آگ ہونا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ

سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور

الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ

محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے

الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ

نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ

اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت یہی لوگ

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار؛

ربط از بیان القرآن

شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۂ بقرہ ہے، زیادہ روئے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب سے اول قرآن کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فرقوں کا ذکر کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولاد ابراہیم علیہ السلام پر انعامات و احسانات کو اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ تک بیان فرمایا، وہاں سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفا و مروہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی

بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہی، اور ضمناً کوئی خطاب مسلمانوں کو ہو جانا اور بات ہے۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۂ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور یہ مضمون ختم سورۃ تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان بِرّ سے، لفظ بِرّ بکسر الباء عربی زبان میں مطلقِ خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اوّل آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایتاء مال و وفاءِ عہد و صبر حین البأس وغیرہ، جس میں قرآنی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیوں کہ شریعت کے کُل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انھیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگے اس بِرّ کی تفصیل چلی ہے جس میں سے بہت سے احکام باقتضاءِ وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یمین و طلاق و نکاح و عدت و مہر و تکرارِ ذکرِ جہاد، و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملاتِ بیع و شراء، و شہادت بقدر ضرورت بیان فرما کر بشارت و وعدۂ رحمت و مغفرت پر ختم فرما دیا، سبحان اللہ، کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل بِرّ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب البِرّ رکھا جاوے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

خلاصۂ تفسیر

ابوابُ البِرّ

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا مُنہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو (کرلو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کُتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کا باپ نابالغ چھوڑ کر مرگیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جا سکتے) ہیں (غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالات مذکورہ میں سے ایک کمال خاص یعنی اقامت صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)

معارف و مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کی فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و شغب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق جہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جہت کو دین کا مقصد بنا لیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہوگئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل بِرّ اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رُخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جاتا ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جہت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعتِ حکم کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہو جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلۂ ربطِ آیات بیان ہو چکا ہے، کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین

کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکامِ اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔

اس کے بعد بقرہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آگیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ میں مفصل آگیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَاٰتَى الزَّكٰوةَ تک آگیا، پھر معاملات کا ذکر وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصّٰبِرِيْنَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو خرچ کرنے میں عَلٰی حُبِّهٖ کی قید لگادی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ حُبِّهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس خرچ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے، جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ اٰتَى میں جو اس کا مصدر ایتاء مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دُکھ رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کردیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کردینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص، قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

فائدہ جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً ذوی القربیٰ، مساکین، مسافر، سوال کرنیوالے فقیر، ان سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَفِي الرِّقَابِ میں، حرف فی بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ مملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد أَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ کا ذکر بھی اسی طرح پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طرز) بدل کر بجائے صیغۂ ماضی استعمال کرنے کے وَالْمُوفُونَ صیغۂ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایفاءِ عہد کی عادت دائمی ہونا چاہئے، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر فاجر بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں۔

اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفائے عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایفاءِ معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمالِ باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنے ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جائے تو تمام اعمالِ باطنہ کی اصل روح صبر ہی ہے، اسی کے ذریعہ اخلاقِ فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاقِ رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیرِ اسلوبِ بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالْمُوفُونَ ذکر کیا تھا یہاں وَالصَّابِرُونَ نہیں بلکہ وَالصَّابِرِينَ فرمایا، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہے اور صابرین اس کا مفعول ہے، یعنی ان سب نیکوکار لوگوں میں خصوصیت سے قابلِ مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمالِ مذکورہ میں مدد لی جاسکتی ہے، اس طرح آیتِ مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہوگیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ

اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں ، آزاد کے بدلے

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ

آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ

کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو خوبی کے ساتھ یہ آسانی ہوئی

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ

تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہے عذاب

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

دردناک ، اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

بچتے رہو۔

ربطِ آیات اور خلاصہ تفسیر

اس سے پہلی آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کرچکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیکی اور خوبی کے اصول بتلا دیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ابواب البر کہا جا سکتا ہے، آگے انہی ابواب البر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

حکم اوّل قصاص

اے ایمان والو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (بقتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جاوے ہر دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گویہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب برابر قصاص لیا جاوے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جاوے گا) ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی

ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو بری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونبہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارث مقتول کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا (کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانونِ دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کردے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہوگا، اور فہیم لوگو (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکابِ قتل سے ڈریں گے، تو کئی جانیں بچیں گی)، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانونِ امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

معارف و مسائل

قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۲: ۱۹۴) اور سورۂ نحل کی آخری آیات میں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (۱۶: ۱۲۶) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اسی لئے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ: قتلِ عمد کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جاوے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد بھی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اُس خاص واقعہ کی بنا پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتمؒ نقل کیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہوگئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہوگئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانۂ اسلام شروع ہوگیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہوگئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

قصاص کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل

ان کے جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی، جس کا حاصل ان کے مطالبہ کو رَد کرنا تھا، کہ غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کردیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلمِ عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کسی مرد کو قتل کردے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، قرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قتلِ عمد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جاوے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دو بیٹے تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کردیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورتِ مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزائے قصاص سے تو قاتل بری ہوگیا، لیکن معاف

نہ کرنے والے کو نصف دیت (خونبہا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خوں بہا شریعت میں سو اونٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے مروجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشے چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۳۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ، جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خوں بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بحساب وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہوا تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابلِ تقسیم ہے، اس لئے کوئی ادنیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیگا تو دوسرے وارثوں کا حقِ قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونبہا) کی رقم حسبِ حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاءِ مقتول کا ہے، مگر باجماعِ امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکمِ سلطانِ مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاءِ مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاقِ علماءِ امت حقِ قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى

وصیت کرنا ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى

پرہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ انہی پر

الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ

ہے جنہوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے، پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

والے سے طرفداری کا یا گناہ کا پھر ان میں باہم صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

ع ۲۲ ۶

ربطِ آیات و خلاصۂ تفسیر

حکم دوم از ابواب البر وصیت

وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

خیر، لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے، وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰: ۸)، اس جگہ باتفاقِ مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حصے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی :-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا) ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہے ان میں سے) جو شخص (بھی) سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاویگا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی

تبدیل کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارے میں) کسی غلطی کی یا (قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقانِ مالِ وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرا دے (گو وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہی) تو اس شخص پر کوئی (بار) گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور (گنہگاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیل اصلاح کے لئے کی ہے، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

معارف و مسائل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہے جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے تین جز ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہیں، اُن کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا، ابن کثیر نے بتصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیتِ میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿۴: ۷﴾

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، اُن کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص، قرطبی)

لیکن باجماع امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، اُن کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیتِ وصیت اُن کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص، قرطبی) یعنی بشرطِ ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماعِ امت منسوخ ہے، اور ناسخ اس کا وہ حدیث متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے سامنے فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ اَعْطٰى لِكُلِّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ، اخرجه الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح	"اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دیدیا ہے، اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں"۔

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ تُجِيْزَهُ الْوَرَثَةُ (جصاص)	"کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دیدیں"۔

اس لئے حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے۔

امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہاء امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیتِ قرآن کا نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقینی طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر، مشہور وغیرہ میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیتِ قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محلِ شبہ نہیں، پھر فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبرِ واحد ہی کے طریق پر پہونچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماعِ صحابہ اور اجماعِ امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث اُن حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے، ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں یہ باتفاقِ امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت جائز اور قابلِ قبول ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے خود مقرر کر دیتے ہیں اُن کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ بدونِ اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے وصیت کرنے کی اجازت ایک تہائی مال تک ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروکہ مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اُس پر اُن تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گذرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ

اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اُن پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی اُن کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرے

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ

نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

حکمِ سوم صوم اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) اُن کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور (گو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہے لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حالت میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رُکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاحِ شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رُکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلوعِ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک مسلسل رُکا رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غروبِ آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ اُن عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عمود اور شعائر قرار دیا گیا ہے، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پچھلی اُمتوں میں روزہ کا حکم روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، پچھلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کی دلجوئی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات ہے کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی)

قرآن کریم کے الفاظ اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ مِنْ قَبْلِکُمْ سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہے، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے اوقات کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا، کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں فرق ہوتا رہا ہے (روح)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقوے کی بنیاد ہے۔

مریض کا روزہ

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا، مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، بعد کی آیت وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، جمہور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ

اَوْ عَلٰی سَفَرٍ یہاں لفظ مسافر کے بجائے عَلٰی سَفَرٍ کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرما دیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصتِ سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ عَلٰی سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو، جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہؓ کے تعامل سے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جسکو پیادہ سفر کرنے والا آسانی تین روز میں طے کرسکے، قرار دی ہے، اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ عَلٰی سَفَرٍ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصتِ سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلۂ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتدبہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتدبہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ عَلٰی سَفَرٍ نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصتِ سفر کا بھی مستحق نہیں۔

مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصتِ سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ عَلٰی سَفَرٍ کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے، اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضاء ان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضاء صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے، جنمیں قضاء کرسکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مرگیا تو اس پر قضاء یا وصیتِ فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھے، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیار ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهٗ، اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کردیں، اسکے ساتھ اتنا فرمادیا وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔

یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کردیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کا یہی قول ہے (جصاص، مظہری)

صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیثؒ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهٗ نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہوگیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزے اور ایک روزہ یوم عاشوراء (یعنی دسویں محرم) کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہوگئی، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے: اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ نازل فرمادی، اس آیت نے تندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کرکے صرف روزہ رکھنا لازم کردیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کردے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سوگیا تو دوسرا روزہ شروع ہوگیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الآیۃ نازل فرما کر یہ آسانی عطا فرمادی کہ اگلے دن کی صبح صادق تک کھانا پینا وغیرہ سب جائز ہیں، سو کر اٹھنے کے بعد سحری کھانے کو سنت قرار دیدیا گیا، صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی احادیث آئی ہیں (ابن کثیر)

فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروجہ سیر اسی تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں، اس کی بازاری قیمت معلوم کر کے کسی غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مسجد مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بحر از قنیہ نقل کیا ہے اور بیان القرآن میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرتؒ نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے

مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کر دوں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے

بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ

تو ضرور روزے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرنی چاہئے اور دنوں سے

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۖ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصۂ تفسیر اور ربطِ آیات

تعیینِ ایامِ صیام اوپر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے:

(وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہ رمضان ہے جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں) قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعۂ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالۃ ہے، (اور ان دونوں وصفوں میں) منجملہ ان کتب (سماویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں اور (وضوحِ دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اوپر قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایامِ رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کرکے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے) اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مقرر کئے جن کو تم آسانی سے بجا لاسکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا) اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کر دیتے) اور (یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر سے رہ جاوے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ (ایامِ ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و ثمراتِ صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمتِ آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پچھلی مجمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی؛ بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ کا لفظ مجمل ہے، جس کی شرح اس آیت نے کردی کہ وہ پورے ماہِ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کردی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تیئیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شب قدر تھی اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۴ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؒ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہوجاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہرحال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور الشہر عربی لغت میں مہینہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہوگئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے منسوخ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو، یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گذر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، تو یہ لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گذشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوتے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، تو انھوں نے ایک حیثیت سے ماہ رمضان بحالتِ صلاحیت پا لیا، اس لئے حکم آیت کا اُن کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اُس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالتِ صلاحیت پا لینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پا لیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اُس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے، گذشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہو گی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گذشتہ ایامِ رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسطِ رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گذشتہ ایام کی قضاء لازم ہو گی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پا لینا شرعاً تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انتیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابر وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہونچے تو اگلا روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے، کہ حقیقتہً چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہود شہر یعنی رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور التباس نہ پیدا ہو جائے (جصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہود شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض ہی نہ ہوں فقہائے حنفیہ میں سے حلوانی اور بقالی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہو جاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں (شامی) اس کا مقتضیٰ یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر کے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کرلیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہو گئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو

اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

خلاصۂ تفسیر مع ربط آیات

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر فرما کر اطاعتِ احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا، کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعاء مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، ـــــــــ اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیانی جملہ ترغیب دعاء کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعاء قبول ہوتی ہے، اس لئے دعاء کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِہٖ دَعْوَۃٌ مُّسْتَجَابَۃٌ، (ابوداؤد طیالسی بروایۃ عبداللہ بن عمرؓ)	"یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ دار کی دعاء مقبول ہے"

اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعاء کیا کرتے تھے، تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور) تو (میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور باستثناء نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو (جس طرح میں اُن کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے حکیم ہونے پر اور رعایت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد (و فلاح) حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں اِنِّیْ قَرِیْبٌ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعاء آہستہ اور خفیہ کرنا چاہئے، دعاء میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شانِ نزول یہی ذکر کیا ہے کہ کسی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہو تو ہم دعاء آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ
حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ
اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ
سو معاف کیا تم کو اور درگذر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے

اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ
اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ
سیاہ سے ، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک ،

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ
اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی،

فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾
سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں۔

خلاصۂ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع

اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے۔ تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ موقوف کی گئی) کیونکہ (بوجہ قرب و اتصال کے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس حکم الٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

(جب اجازت ہوگئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانونِ اجازت) تمہارے لئے تجویز کردیا ہے (بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہے اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہوجاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے) تو پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہوجانے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہوجائے۔

حکم پنجم۵ اعتکاف اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو، (جو کہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) یہ (سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس امید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

معارف و مسائل

اُحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براء بن عازبؓ مذکور ہے کہ ابتداء میں جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو افطار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہوجاتی تھیں، بعض صحابہ کرامؓ کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاریؓ دن بھر مزدوری کر کے افطار کے وقت گھر پہونچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے تکان کی وجہ سے ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہوچکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا، دوپہر کو ضعف سے بیہوش ہوگئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیبیوں کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوعِ صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ سو کر اٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں سحری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایاتِ حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

رَفَثٌ کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرتا یا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن باتفاقِ امت اس جگہ اس سے مراد جماع ہے۔

ثبوتِ احکامِ شرعیہ کے لئے قولِ رسولِ کریمؐ بھی بحکمِ قرآن ہے: اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرامؓ اس حکم پر عمل کرتے تھے (کما رواہ احمد فی مسندہ) اسی کو اس آیت نے حکم الٰہی قرار دیکر منسوخ کیا ہے

اس آیت میں پہلے حکم کو حکمِ الٰہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ، اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلا دیا گیا ہے، کہ نہ تو وہمی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کرو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے باوجود کھاتے پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا تیقن ہے، اس تیقن سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرامؓ کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اسطرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پروائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمھیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اذان سُنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابن امّ مکتومؓ کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوعِ صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری ومسلم)

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جاسے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ اذان ابن ام مکتومؓ جو ٹھیک طلوعِ فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رُک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوعِ صبح کا تیقن ہے، اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نصِ قرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اسلافِ امت سے جو افطار و سحر میں مساہلت کی روایات منقول ہیں ان سب کا محل نص قرآن کے مطابق یہی ہو سکتا ہے کہ تیقن صبح صادق سے پہلے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نصِ قرآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَبُوْهَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو بچشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہِ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقینی نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھا پی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ ر کا چاند ثابت ہوگیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گنہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہو ئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائیگا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اس کے مسائل اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے لفظِ فِي الْمَسَاجِدِ کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دُکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اوپر بیان ہوا ہے، حالتِ اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرتِ نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دوسرے مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد سے نکلنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم آخر آیت میں تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، مُنھ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس وکنار مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ اُن کو حاکموں تک کہ

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

ع ۲۳/۷

ربط آیات و خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مالِ حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہو افطار کے لئے مالِ حلال مہیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مالِ حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گذر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

"یعنی اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"

اور سورۂ نحل آیت ۱۱۴ میں ارشاد فرمایا:-

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝

"یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو"

کسبِ مال کے اچھے بُرے ذرائع اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدارِ زندگی ہونے پر ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے، اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور ممنوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی دنیا بُرا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور پورا عالمِ انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا مختار ہو تو جو لوگ اس کا قانون بنائیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا، اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہے کہ وہ بھی ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ قانونی ناانصافی انجام کار جنگ و جدال اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظامِ معاش ہی دنیا میں امنِ عام قائم کر سکتا ہے

شریعتِ اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بنایا ہے وہ صراحۃً وحیِ الٰہی سے ہے یا اس سے مستفاد، اور وہی ایک ایسا معقول، فطری اور جامع قانون ہے جو ہر قوم و ملت اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امنِ عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانونِ الٰہی میں قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے ہوا، پانی، خود رو گھاس، آگ کی حرارت اور غیر مملوک جنگلات اور غیر آباد پہاڑی جنگلات کی پیداوار وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں، اور جن چیزوں کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت کا قانون جدا ہے، اور پھر انتقالِ ملکیت کا جدا، اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جد و جہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

ورکوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کر دے، انتقالِ ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانونِ الٰہی کے مطابق ہو یا پھر بیع و شراء وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی نوبت آئے۔

نیز اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعتِ اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں اُن سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن میں وجوہِ مذکورہ میں کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہونچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوقِ عامہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ کے لئے مضر ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں أَمْوَٰلَكُمْ آیا ہے، جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال، جس میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا اُس کا اس وقت بھی ایسا ہی احساس کرو، کہ گویا وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیاء ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ

کرکے زائد حاصل کرلئے، دوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کرکے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس ارشادِ خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کرلینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کرکے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھاکر کوئی مال حاصل کرلینا یا ایسی کمائی جس کو شریعتِ اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحۃً کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھاپی کر یا پہن کر یا دوسرے طریقہ کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سب قسم کے استعمالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھاگیا، اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔

شانِ نزول یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں سے دو صاحبوں کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گواہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کرنے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہوگیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت اُن کو یہ آیت سنائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۳: ۷۷) جس میں قسم کھاکر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابیؓ نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کردیا اور زمین مدعی کے حوالہ کردی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلوانے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھاجاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنارہے ہو، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کرکے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ وَّاَنْتُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَہٗ عَلٰی نَحْوِ مَآ اَسْمَعُ مِنْہُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِشَیْءٍ مِّنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَلَا یَاْخُذَنَّہٗ فَاِنَّمَآ اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِّنَ النَّارِ (رواہ البخاری ومسلم عن ام سلمۃؓ)

"یعنی میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زیادہ رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو یاد رکھو کہ حقیقتِ حال تو صاحبِ معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے) اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہے تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کردے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص دھوکہ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور علیم وخبیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کرکے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فسخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فسخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال وحرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوانے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاقِ حمیدہ اور

اعمالِ صالحہ کا صدور مشکل ہو، ارشاد ہے،

يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۳: ۵۱)

"یعنی اے گروہ انبیاء حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے واقف ہوں"

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عملِ صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعاء کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس اُن کا حرام ہے تو اُن کی یہ دعاء کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایکؔ امانت کی حفاظت، دوسرےؔ سچ بولنا، تیسرےؔ حسنِ خلق، چوتھےؔ کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعاء فرما دیجئے کہ میں مقبول الدعاء ہو جاؤں، جو دعاء کیا کروں قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا لو مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کماتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بُری چیز سے بُرے عمل کو نہیں دھوتے، ہاں اچھے عمل سے بُرے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

محشر میں ہر انسان سے پانچ اہم سوالات اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَا تَزَالُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ اَرْبَعٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَعَنْ عِلْمِهٖ مَاذَا عَمِلَ فِيْهِ (البیہقی، ترغیب)

"قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار[1] سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی، دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس شغل میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء واجداد نے سُنے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ اُن پر اجنبی دشمن مسلط فرما دیتے ہیں، جو اُن کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اُن کے دل کو نہ لگیں تو

[1] بعض روایات میں پانچ کا عدد ہے اس میں مال کے دو سوالوں کو الگ الگ شمار کیا۔

اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں ۔ یہ روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے نقل کی ہے ، اور حاکم نے اس کو صحیح علیٰ شرط مسلم فرمایا ہے)

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ

تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا کہدے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ

نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو ،

وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بیشک

اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنیوالوں کو ، اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے ،

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو یہی ہے سزا کافروں کی ۔

ربط آیات آیت لَیْسَ الْبِرَّ کے تحت بیان ہوچکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورۂ بقرہ تک

۳

ابواب البر کا بیان ہوگا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکور الصدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہوگا۔

لغات: اَہِلَّۃ، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، مَوَاقِیْتُ، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منتہائے وقت کے آتے ہیں (قرطبی)

خلاصۂ تفسیر

حکم ہفتم، اعتبار حساب قمری در حج وغیرہ

(بعضے آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے اور بڑھنے کے اعتبار سے لزوماً یا سہولۃً) آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبۂ حقوق کے) لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ) کے لئے۔

حکم ہشتم، اِصلاحِ رسمِ جاہلیت

(بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ، اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو۔

حکم نہم، قتالِ کفار

(ذی قعدہ ۶ھ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائے عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے اُس وقت تک مکہ معظمہ مشرکین کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ

تشریف لاکر عمرہ ادا فرماویں، چنانچہ ذی قعدہ ۷ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں اور آمادۂ مقابلہ و مقاتلہ نہ ہوجاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ منجملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اَشہرِ حُرُم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداءً قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ) اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ جو (نقض عہد کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہدہ) سے مت نکلو، (کہ عہد شکنی کرکے لڑنے لگو،) واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو جہاں سے انھوں نے تم کو (تنگ کرکے اور ایذائیں پہنچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمہارے اس قتل و اخراج کے بعد بھی عقلاً الزام انھیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی) شرارت (ضرر میں) قتل (و اخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و اخراج کی نوبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچی ہے) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداءً قتال کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہے وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرداگرد ایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجدِ حرام کے قرب (و جوار) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو (دھاڑو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ

کی ایک خاص شان ہی کہ انھوں نے بوجہ عظمت و ہیبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلی امتوں کے کہ جنھوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کُل چودہ ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گذرا ہے، اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اَهِلَّة یعنی شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہی، پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہی، تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرامؓ کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمھیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا۔

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت

اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمھیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۂ یونس کی آیت ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے، وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (یونس) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گذارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۲ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے:

فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ	"پھر مٹا یا رات کا نمونہ اور بنا دیا دن کا

مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ (۱۷: ۱۲)	نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب"

اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے (کما ذکرہ فی روح المعانی)

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً اُن عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزۂ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شبِ برأت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویتِ ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں ھِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ فرما کر بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعتِ اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا افق پر دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے، عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کرسکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کردیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلادیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی وملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعتِ اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام و ناجائز قرار دیدیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہوگئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہوگیا۔

حکم نہم جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگذر کی ہی تلقین تھی، ہجرتِ مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتالِ کفار کا حکم آیا، (قالہ الربیع بن انسؓ وغیرہ) اور صدیق اکبرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ قتالِ کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے، اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲: ۳۹) مگر اکثر حضراتِ صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک پہلی آیت سورۂ بقرہ کی آیتِ مذکورہ ہی ہے اور صدیق اکبرؓ نے جسکو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی کہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف اُن کافروں سے قتال کریں جو اُن کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی شغل میں دنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوئے عبادت گذار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ، یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں، یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں داخل ہیں (مظہری، قرطبی، جصاص)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدینِ اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:

نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ	"نبی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے"

اور ابوداؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (مظہری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گذار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں وَلَا تَعْتَدُوْا کا بھی جمہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ۔ خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعۂ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے، جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابۂ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادۂ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیتِ مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دیدی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمھیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو، اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقاتلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگذر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابۂ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا بُرا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بُرا کام ہے، مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و شرک پر جمار ہنا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج وعمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص، قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے اُس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کسی شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اسی آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداءِ جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد ضروری ہے اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے، اور لڑو ان سے یہاں تک کہ

فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى

نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ

ظالموں پر، حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابل) ہے حرمت والے مہینہ کے اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے،

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۖ وَاَحْسِنُوْا ۚ

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصۂ تفسیر

پھر اگر (بعد شروع قتال کے بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز آجاویں

(اور اسلام قبول کرلیں، تو (ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گذشتہ کفر کو بخش دے گا اور (مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرماویں گے اور (اگر وہ لوگ اسلام نہ لاویں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کرلیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہوجاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانونِ جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں اسلام یا قتل اس واسطے) ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ (ان میں) فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجاوے (اور کسی کا دین و مذہب کا خالصاً اللہ کے لئے ہوجانا موقوف ہے، قبولِ اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجاویں (جس کا ذکر ابھی ہوا ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے تم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو بھول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ رہے، لہٰذا ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی، اور مسلمانو! تم کو جو یہ خیال ہے کہ کفارِ مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں اُن سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہوسکتا) ہے بعوض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (وجہ یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرکے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور (ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں حدِ قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاوے) اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت و رحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور مخالف کا قوی ہوجانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہو دل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کیساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کرنے والوں کو۔

معارف و مسائل

سنہ ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے بہ معیت صحابہؓ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں، ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہؓ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی نوبت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہی، اس کا جواب پچھلی آیت میں دیدیا گیا، کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حدود حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو اُن کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہی۔

دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو اُن چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہی، اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کردی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کرسکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالتِ دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی اُن سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداءِ اسلام میں بھی سنہ ہجری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمتِ قتال منسوخ کرکے عام قتال کی اجازت باجماعِ امت دیدی گئی، مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداءً بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں، باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدرِ ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دائمی ہیں اور نہ اُن کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

متعین ہی، بلکہ جب اور جتنی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، جہاد کا خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کے لفظی معنے تو ظاہر ہیں، کہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور امام جصاصؒ رازی نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں سب ہی مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابو ایوب انصاری ؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرما دیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اپنے وطن میں ٹھہر کر اپنے مال و جائداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے یہ بتلا دیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترک جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترک جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں صرف کردی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت ابن عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، ضحاکؒ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراف جائز نہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدام قتال اس آیت کی بناء پر ناجائز ہے۔

اور جصاصؒ کے فرمانے کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، دو طرح کا ہے، ایک عبادت میں دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں، عبادت میں احسان کی تفسیر حدیث جبرئیلؑ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہی

ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

اور معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد میں بروایت حضرت معاذؓ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے بُرا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی بُرا سمجھو۔ (مظہری)

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو

الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ

قربانی سے اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ پہنچ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر پھر جو

كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى

یا قربانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو قربانی سے پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین

اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ

حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوٹو یہ دس روزے ہوئے پورے، یہ حکم

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَھْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور

اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ ع اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے، حج کے چند مہینے ہیں معلوم،

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي

پھر جس شخص نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا

۲۴ ع ۸

الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ

حج کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر

الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فائدہ زادِ راہ کا بچنا ہے سوال سے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب طواف کے لئے لوٹو عرفات سے تو یاد کرو

اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا اور بیشک تم تھے

مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے ناواقف، پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان، پھر جب پورے کر چکو

مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ

اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور

وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ

آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ

اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند

وقفُ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

دنوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رہ گیا

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بیشک تم سب

تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

اسی کے پاس جمع ہوگے۔

خلاصۂ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج وعمرہ

اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (راضی کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ اعمال و آداب بھی سب بجالاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج وعمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور حج وعمرہ کی جو وضع اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈانا ہے، اور بال کٹادینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ فوراً روک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام کھولنا درست ہو جاوے، بلکہ) اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور حدود حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا ہے وہاں اگر خود نہ جاسکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جاوے جب جانور ذبح ہو جاوے اس وقت احرام کھولنا جائز ہوگا) البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑے) تو (اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ تین) روزے سے یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقۂ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات (کے طور پر) دیدینے سے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ تو پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جاتا رہا) تو (اس صورت میں حج وعمرہ

کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص) جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس پر واجب ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج وعمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں (ایام) حج میں (کہ آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہی) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجاوے (یعنی حج کر چکو خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی جو حج وعمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور (ان سب احکام کی بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جاوے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بیباکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال، دوسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کرلے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہیے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کروگے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لیلیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو (ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لیجانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کرکے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی ناواقف تھے، پھر (اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جاکر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے اور مہربانی فرمادیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی تو یہ عادت تھی کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کے مفاخر و فضائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمالِ حج پورے کرچکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بدرجہا) بڑھ کر ہونا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہٰذا تمامتر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعا، مانگنا ہوتا تھا حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر دارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے (وبس، سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے، اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر دارین) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو) اور (منیٰ میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں بارہویں تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) دو دن میں (واپسی مکہ میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آوے، بلکہ تیرہویں کو آوے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

احکام حج وعمرہ ابواب البر جن کے بیان کا سلسلہ نصف سورۂ بقرہ سے چل رہا ہے اُن میں گیارہواں حکم حج کا ہے، حج کا تعلق چونکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ یعنی کعبہ سے ہے اس لئے اس کے متعلق کچھ مسائل تو قبلہ کے بیان میں ضمنی طور پر سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً سے شروع ہوکر وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا تک ذکر میں آگئے ہیں، پھر بحثِ قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہوچکا ہے، اب آیت نمبر ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ سے شروع ہوکر فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ الخ تک آٹھ آیات مسلسل حج وعمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماعِ امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائض اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوۂ احد کے سال میں سورۂ آلِ عمران کی اس آیت ۹۷ سے ہوتی ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (الآیۃ ابن کثیر) اسی آیت میں فرضیتِ حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔

مذکور الصدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ، باتفاقِ مفسرین قصۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی، جو ۶ھ میں واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں وہ پہلے بتلائی جاچکی ہے بلکہ اس جگہ حج وعمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔

عمرہ کا حکم اور چونکہ سورۂ آلِ عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہے اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کردے تو اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے، جیسا عام نفلی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہوجاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کردے تو اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کرلو تو بہتر و افضل ہے، (وقال الترمذی ہذا حدیث حسن صحیح) اس وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ

مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہے، آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ سے فرمادیا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج و عمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں

یہ آیت چونکہ واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا کفار مکہ نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا فدیہ ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک مُحرم کی قربانی اپنے موقع پر پہونچ کر ذبح نہ ہو جائے۔

موقع پر پہونچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حدودِ حرم میں پہونچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کرسکیں تو کسی دوسرے سے کرادیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحۃً مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں باشتراکِ علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی بیان سے یہ امر بھی ثابت ہوگیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے۔

اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ حالتِ احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج وعمرہ کے افعال ادا کرنے سے تو مجبور نہیں، مگر حالتِ احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالتِ احرام میں بال منڈانے پر کوئی مجبور ہو جائے تو وہ کیا کرے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو، یا سر میں جوئیں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدرِ ضرورت جائز ہے، مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدودِ حرم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کرسکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور

نہیں ہے، مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہؓ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے اسی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کردینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو جمع کرنے کے احکام

اسلام سے پہلے عرب اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کردی گئی کہ حدودِ میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اشہر حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہر حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدود میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ معین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے آگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قرب و جوار یعنی حدودِ میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج و عمرہ کو اشہر حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں وہ یہ ہے کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دیدے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کردے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر امام ابو حنیفہؒ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرادے (جصاص)

تمتع و قران

اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھے اس کو اصطلاح حدیث میں قِران کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھے اور مکہ مکرمہ پہونچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لفظی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں فَمَنْ تَمَتَّعَ اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلاف ورزی اور کوتاہی موجب عذاب ہے

آخر آیت میں اوّل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ، یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اوّل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کار معلّموں اور ساتھیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاحِ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

احکام حج کی آٹھ آیتوں میں سے دوسری آیت اور اس کے مسائل

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، اَشْهُرٌ، شَهْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مہینہ، پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرر نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینے اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلا دیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیتِ عرب سے لیکر زمانۂ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوّالؔ ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو امامہؓ و ابن عمرؓ منقول ہے (مظہری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (مظہری)

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالتِ احرام میں

پرہیز کرنا لازم و واجب ہے، وہ تین چیزیں ہیں: رفثؔ، فسوقؔ، جدالؔ۔

رفثؔ ایک لفظ جامع ہے، جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، مُحرِم کو حالتِ احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کنایہ کا مضائقہ نہیں۔

فسوقؔ کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول حکمی اور نافرمانی کو فسوق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسوق کی تفسیر محظوراتِ احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالتِ احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی ممانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں، اوّلؔ عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرےؔ بری جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرےؔ بال یا ناخن کٹوانا، چوتھےؔ خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالتِ احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی سلے ہوئے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالتِ احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک محظوراتِ احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ، اگرچہ فسوق میں داخل ہے لیکن اس کو فسوق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفث سے اس لئے بتلا دیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے محظوراتِ احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مبتلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوفِ عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کرلی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جرمانہ بھی گائے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو فَلَا رَفَثَ کے لفظ سے مستقلاً بیان فرما دیا۔

جدالؔ کے معنی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیتِ عرب کے لوگ مقامِ وقوف میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقفِ ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقاتِ حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کرلیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لَا جِدَالَ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوفِ فرض عرفات میں اور پھر وقوفِ واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف محظوراتِ احرام کا بیان ہوا جو اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز، روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزوں کو منع کر دیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسوق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ قرار دیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح باہم جدال و خلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالتِ احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کرا رہا ہو کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی بیباکی اور اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفث، فسوق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقامِ حج اور زمانۂ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلاء کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالتِ احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و مسعیٰ، عرفات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفث کی حرمت کا بیان فرمایا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لَا فُسُوْقَ کی ہدایت فرما دی، اسی طرح سفرِ حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رفقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بناء پر جھگڑا لڑائی ہو جائے، اس لئے لَا جِدَالَ کا حکم دیا گیا۔

بلاغتِ قرآن اس آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نہی اور ممانعت کرنا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ لا ترفثوا ولا تفسقوا ولا تجادلوا کہا جاتا، مگر یہاں نہی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصوّر ہی نہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ۔ محظورات و ممنوعاتِ احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہی نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غنیمت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، تم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہے اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سرو سامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفرِ حج کے لئے ضروریاتِ سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے مقدور کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترکِ اسباب کا نام توکل رکھنا جہالت ہے۔

سفرِ حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، "یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفرِ حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کما لو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو" واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو مسخ کرکے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعالِ حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم اجتماع میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مٹ جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایامِ حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کرکے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و ممانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

باس آئے، اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لیجاتے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ سے وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، اُس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمھارا حج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دورانِ حج میں کوئی بیع وشرا یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفارِ عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنالیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گذار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصدِ حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور برکاتِ حج جیسی حاصل ہونی چاہئیں وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارفِ حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہے، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کرلی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے، کہ خاص اُن پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گذارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف

اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے، فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ "یعنی پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناواقف تھے"، اس میں بتلایا گیا ہے کہ عرفات

سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظاً جمع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے، جس کے حدود اربعہ معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہونچنا اور زوالِ آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج میں حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہوسکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجوہ بتلائی جاتی ہیں، اُن میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعرِ حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعرِ حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شعار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گذارنا اور مغرب و عشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعرِ حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت سے دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے، آیت کے جملہ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ میں شاید اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دو کیونکہ رائے اور قیاس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اُس روز اُس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، اُن کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، نفلی عبادات اور صدقہ وخیرات وغیرہا میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کرلیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطاوار سمجھتے ہیں

اس آیت نے اُن کی غلطی کو واضح کر دیا، کہ وہ اہلِ جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی رائے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں ارشاد ہے: ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمادیں گے۔"

اس جملے کا شانِ نزول یہ ہے کہ قریشِ عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سارے عرب میں ان کا اقتدار مسلّم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانۂ جاہلیت میں وہ اپنی امتیازی شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدودِ حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدودِ حرم کے اندر ہے، اور عرفات اس سے خارج، یہ بہانہ کر کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آجایا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس حیلہ بہانہ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ کے اس فرمان نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔

اوّل تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک متکبرانہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباسِ احرام اور پھر قیام و مقام کی یکسانیت کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالتِ احرام میں یہ امتیازی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق اور اس کی بہترین عملی صورت اس ارشادِ قرآنی سے اصولِ معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ رہن سہن قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں، بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تفریق مٹتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مدار تقوٰی اور اطاعتِ خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں، کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معاف فرما دیں اور اپنی رحمت فرما دیں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح منیٰ میں فضول اجتماعات کی ممانعت

چوتھی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے تو ان کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور منیٰ میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور خصوصاً ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے ان کو غنیمت جاننا چاہئے۔

علاوہ ازیں حج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں، کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصدِ حج میں کامیاب نہ ہوسکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں کامیاب فرمایا اور فرائض حج پورے ہوگئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضاء یہ ہے کہ اور زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے بھی آخرت کے لئے بھی، آجکل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضول اجتماعات میں فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آبّ یا آبَ ہوتا ہے،

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، عاقل ہو، یَا اَبِ یَا اَبَ کی جگہ یَارَبِّ یَارَبِّ کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے، انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر فخراً بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کردی کہ فخر و عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین و دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال

جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گذاریں، اسی طرح کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں شغل تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر اُن کی تمامتر دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ فریضۂ حج بھی انھوں نے محض رسماً ادا کیا ہے، یا دنیا میں فخر و وجاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ اُن کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انھیں کے لئے صرف کرتے ہیں، اور اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولتمند لوگ یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گذار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت سے حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیا اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا، یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ وظائف و نوافل اور دعاء و درود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصّہ میں کم نصیب محروم القسمۃ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ "یعنی اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں"۔

اس میں لفظ حسنۃ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت و برکت دنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعاء ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون میسّر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء مانگا کرتے تھے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اور حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مسنون ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعاء مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے، انسان اپنے وجود اور بقاء اور عبادت وطاعت سب میں ضروریاتِ دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعاء مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاءؑ سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہے، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ، "یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے" کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر اللہ کی تاکید

آٹھویں آیت جو اس جگہ احکام حج کی آخری آیت ہے اس میں حجاج کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ، "یعنی اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں" ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں، جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔

آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ منیٰ میں قیام اور جمرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیرھویں تاریخ ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام اور جمرات پر رمی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارھویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اسی طرح دوسرے لوگ بارھویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیرھویں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، کہ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، "یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن منیٰ میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں" یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل و اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب سے پہلے منیٰ سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی رمی واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب منیٰ میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی رمی کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی رمی میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوالِ آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

منیٰ سے واپسی کا اور اس میں حجاج کو اختیار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دوسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵ : ۲۷) "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں"، اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوّث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہوگیا، ترکِ حج کا مجرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کرو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو"، وہ تمہارے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزاء و سزا دیں گے، احکامِ حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت اُن سب کی رُوح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ خاص ایامِ حج میں جب کہ اعمالِ حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکامِ حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو، اور بعد میں بھی اپنے حج پر مغرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ وزنِ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادتِ حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہوگیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، دورانِ حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا وسوسہ پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا! یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔

ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مُرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کو گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بجائے بڑھنے کے بالکل سلب ہوگئی، اپنے مرشد مولانا جامیؒ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع وانکسار تھا، اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح وزاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہوگئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمۂ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہوجائے۔ اَللّٰھُمَّ وفقنا لما تحب وترضی من القول والفعل والنیۃ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ

اور بعضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگانی کے کاموں میں اور گواہ کرتا ہے

عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑالو ہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ

اور جب اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر سو کافی ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ

اور وہ بے شک بُرا ٹھکانا ہے، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

میں، اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دعا مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی تھیں، ایک کافر کہ منکر آخرت ہی، اس لئے صرف دنیا مانگتا ہے، دوسرا مؤمن کہ معتقدِ آخرت ہی، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلی آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصۂ تفسیر (کوئی شخص تھا اَخنَسُ بن شَرِیق، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر قسمیں کھا کھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و ایذا رسانی خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں) اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے، (کہ اظہار اسلام سے مسلمانوں کی طرح قرب خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ (اپنا اعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے، اور (جس طرح آپ کا مخالف ہی اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہی چنانچہ) جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس (دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہی کہ شہر میں (کوئی) فساد کرے اور (کسی کی) کھیت اور مواشی کو تلف کرے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے، اور (اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہی کہ) جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو (اور زیادہ) آمادہ کر دیتا ہے اس کو غرور گناہ پر سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ اُن مخلص صحابہ کرامؓ کی شان میں نازل ہوئی ہی جنھوں نے بے مثال قربانیاں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہی کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

۳۱

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت صہیب رومیؓ اپنی سواری سے اُتر کر کھڑے ہوگئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیر تھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلۂ قریش تم سب جانتے ہو کہ میں تیراندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہونچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کرلینا، اور اگر تم نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمھیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا راستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہوگئی، اور حضرت صہیب رومیؓ نے صحیح سالم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچ کر واقعہ سُنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا

رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی	"تمھارا بیوپار نفع بخش رہا، تمھاری بیع نفع بخش رہی"

اسی واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کردی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرامؓ کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا شانِ نزول بتلایا ہے (مظہری)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے ایمان والو داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۰۹ هَلْ

تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ

اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے اُن پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے

وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰ۧ

اور طے ہوجاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

ع ۲۵ / ۹

ربطِ آیات اوپر مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظر غائر حدِ شریعت وسنت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علماء یہود سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعتِ موسویؑ میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعتِ محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں تو شریعتِ موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں کس قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینگے اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت و مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امرِ حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

معارف ومسائل

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ، سِلم بالکسر و بالفتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری اسلام، اس جگہ جمہور صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کافۃ جمیعاً اور عامۃً کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اُدْخُلُوْا کا حال قرار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا حال ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۂ اسلام و اطاعت الٰہیہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلامیہ بجا لا رہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں یا دل دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو بعض میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے، اسلام کا جو مکمل نظام حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کروگے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہوگے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مطمح نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کرو تو وہ تمہیں سارے مذاہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ:۔ اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنھوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے، نہ اُن کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ اُن پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ، کم از کم مختصر رسالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامتؒ کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں اُن کے پاس آجائیں قیامت میں پیش آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا متشابہات میں سے ہے، جس کے متعلق جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مضمون کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد و یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلْ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے انکو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۲۱۱)

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ

فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

دیتا ہے جسکو چاہے بے شمار

وقف لازم

ربطِ آیات

اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضحہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے، پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت پر سزا دی گئی:

خلاصۂ تفسیر

آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے بزرگوں کو) کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گمراہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں، مثلاً توراۃ ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی، اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہئے تھا سر آنکھوں پر رکھتے مگر شبہات نکالے آخر بجلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً دریا میں شگاف کرکے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزا یے قتل دی گئی، اور مثلاً من وسلویٰ نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، نا فرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہوگیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غنیمت سمجھتے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، وعلیٰ ھذا بہت سے معاملات اسی سورۃ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں) اور (ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائلِ واضحہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اُلٹا گمراہ بنتا ہو) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

(دوسری آیت میں مخالفتِ حق کی اصلی علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو، جس کے آثار میں سے اہلِ دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبانِ دین پر ہنستا ہی، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور جہلائے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ باستہزاء پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ) دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے قیامت کے روز (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ) روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں (پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو اور بڑی عزت کی چیز جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے)۔

معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اوّلین و آخرین کے مجمع میں رسوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا عیب اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔
(ذکرہ الحدیث القرطبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ
تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ
ڈرانے والے اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات

فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ
میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑا ڈالا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى
اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾
سیدھا راستہ۔

ربطِ آیات اوپر دینِ حق سے اختلاف کرنے کی علت حبِّ دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم دلائل واضحہ دینِ حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصۂ تفسیر (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے (کیونکہ اول دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دینِ حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت اسی حالت میں گذر گئی، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد اعمال وعقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی) پھر (اس اختلاف کے رفع کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے، اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی

ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان رسل وکتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں (کیونکہ رسل وکتب امر واقعی کا اظہار کردیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہوجانا معلوم ہوجاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہے، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار کار رکھ کر اپنے سب اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع کردیا) اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اوّلاً) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم واہل فہم نے کہ اوّل مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا) بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضحہ پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہوچکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف) باہمی ضدا ضدی کی وجہ سے (اور اصلی وجہ ضدا ضدی کی حُبِّ دنیا ہوتی ہے، حُبِّ مال ہو یا حُبِّ جاہ اپس مدار علت مخالفت حق کا وہی حُبِّ دنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں) پھر (یہ اختلاف کفار کا کبھی اہل ایمان کو مضر نہیں ہوا، بلکہ) اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (مختلفین) اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب وملت اور عقیدہ وخیال پر تھے جو ملّت حق اور دین فطرت تھی، پھر اُنہیں مزاج ومذاق اور رائے وفکر کے اختلاف سے بہت سے مختلف خیالات وعقائد پیدا ہوگئے، جن میں یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو واضح کرنے اور صحیح راہِ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جد وجہد اور تبلیغ واصلاح کے بعد انسان دو گروہوں میں منقسم ہوگئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع ہوگئے، جن کو مؤمن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسمانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "امّۃ" عربی لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ واتحاد اور وحدت

قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو، یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطۂ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ وغیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں :

اوّل یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اوّل کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلاف جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اسی کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدتِ فکر و خیال اور وحدتِ عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افرادِ انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدۂ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفسرین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورۂ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۰: ۱۹)	"یعنی سب آدمی ایک ہی امت تھے، پھر آپس میں اختلاف پڑ گیا، اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی فیصلہ نہ ہوتا کہ اس عالم میں حق و باطل کھرا کھوٹا، سچ اور جھوٹ ملے جلے چلیں گے، تو قدرت الٰہیہ ان سب جھگڑوں کا ایسا فیصلہ کر دیتی کہ حق سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔"

اور سورۂ انبیاءؑ میں فرمایا:

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝ (۲۱: ۹۲)	"یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے رہو"

اسی طرح سورۂ مؤمنون میں فرمایا،

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳: ۵۲)	"یعنی یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے مجھ سے ہی ڈرتے رہو"

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دینِ حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دینِ حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفسرینِ صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؒ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالمِ ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ یعنی "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں" اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بیشک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افرادِ انسانی ایک ہی عقیدہ حقہ پر قائم تھے جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پھیلتی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور انہی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ متبع شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدتِ عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب مسلم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بددعاء سے دنیا میں طوفان آیا، اور بجز اُن لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب مسلمان موحّد اور دینِ حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے انسان ملتِ واحدہ اور امتِ واحدہ بنے ہوئے دینِ حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ "یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشی سناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ میں فیصلہ فرمادیں"

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امتِ واحدہ اور ملتِ واحدہ ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اسی پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاءؑ اور کتابیں بھیجی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاءؑ اور کتابوں کے بھیجنے کی علت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مرادِ آیتِ مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدۂ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اوپر صرف امت واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں، کہ قرآن کریم احوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سارے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جا سکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجدو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے: یُوسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ، اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہونچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافاتِ کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دینِ حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آ رہے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، ہاں یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راہِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دینِ حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی خوش خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنا دیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلادیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء و

رسلؑ اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایاتِ واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اول وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاءؑ اور آیاتِ الٰہیہ بھیجی گئی تھیں، یعنی اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی اشتباہ یا التباس کی گنجائش نہ تھی، کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے بوجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ہدایت پر لگا دیا اور جس نے انبیاء و رسلؑ اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے:

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴: ۲)	"یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ کافر و منکر ہوگئے کچھ مومن و مسلم۔"

خلاصہ مضمون آیت كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا یہ ہے کہ پہلے دنیا کے سب انسان دینِ حق پر قائم تھے، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں التباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہِ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دینِ حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجیں جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایاتِ واضحہ اور آیاتِ بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کرلی۔

مسائل

مسئلہ: اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاءؑ اور کتابیں دنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دینِ حق کی ملّتِ واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر اُن کو اسی ملّتِ واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاءؑ کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا ہا کہ جب لوگ اس راہِ حق سے بچلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بہکے تو دوسرا نبیؑ اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہِ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیجدیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچانے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصولِ علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخۂ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن بھیجے گئے، اور پچھلی کتابوں میں تحریف ہو کر جو پچھلے انبیاءؑ کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ اوپر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نئے نبی اور نئی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی اس کا یہ انتظام فرما دیا گیا کہ قرآن کریم کے تحریف سے محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرما لیا جو ہمیشہ دینِ حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں شائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت، اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازۂ نبوت اور وحی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختمِ نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاءؑ اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دھوکہ میں نہ پڑ جائے کہ انبیاءؑ اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاءؑ اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دینِ حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دینِ حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بناء پر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا دو قومی نظریہ عین منشاء قرآنی کے مطابق ہے آیت فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۲:۶۴) اس پر شاہد ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس دو قومی نظریہ کی اصل بنیاد درحقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداء آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدۂ حق اور دینِ حق کی پیروی پر تھی، ارشادِ قرآنی كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً نے بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقاد صحیح اور دینِ حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدتِ قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاءؑ نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنھوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جداگانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتابِ الٰہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہلِ ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تنگدل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عناد اور انبیاءؑ کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دینِ حق کی طرف بلاتے رہیں، اور شاید اسی مناسبت سے اگلی آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات پر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَ

لوگوں کے جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

زُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ

جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی

نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

اللہ کی مدد، سُن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

ربط آیات

اوپر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مؤمنین کے ساتھ اختلاف اور خلاف کرتے رہنا مذکور تھا جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو استہزاءِ کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مؤمنین کو انواع انواع کی ایذائیں اور شدائد پہنچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصہ تفسیر

(دوسری بات سنو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہوگے، حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اٹھائی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہوگذرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جوان کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے (بے قرار ہوکر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی (جس پر اُن کو جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشاداتِ قرآنی اور ارشاداتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، اُن پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہو کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کرکے یا دینِ حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کرکے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخولِ جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً الاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الاَمْثَلُ فَالاَمْثَلُ	"سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، اُن کے بعد جو اُن کے قریب تر ہیں"

دوسری بات یہاں قابلِ نظر یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو اُن کی شان کے خلاف ہے، بلکہ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس لئے حالتِ اضطرار میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے، اور ایسی دعاء کرنا توکل یا منصبِ نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاح وزاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاءؑ اور صلحاء امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے　اور جو کچھ

تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

کروگے تم بھلائی سو وہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بارہواں حکم، صدقہ کے مصارف لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرما دیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ) ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نسا نیک کام کروگے (خواہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الٰہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی اطاعت و فرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے، جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البر کا جاری ہے اس میں داخل ہیں۔

اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفسار اور سوالات کا جواب براہ راست عرشِ رحمٰن سے بواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ (۴: ۱۲۷) میں صراحۃً حق تعالیٰ نے فتوی دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہرحال اس رکوع میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورۂ بقرہ میں

ہیں ایک سورۂ مائدہ میں ایک سورۂ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابۂ کرامؓ کی طرف سے ہیں، سورۂ اعراف میں دو اور سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰہٰ، سورۂ نازعات میں ایک ایک یہ کل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسّر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ ۱۳ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بلا ضرورت سوال نہ کرتے تھے (قرطبی)

متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کا استفتاء یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر انہی الفاظ کے ساتھ دُہرایا گیا، وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیتِ متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ حکمت اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ عمرو بن جموحؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا نُنْفِقُ مِنْ اَمْوَالِنَا وَاَيْنَ نَضَعُهَا (اخرجہ ابن المنذر، مظہری) "یعنی ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں"۔ اور ابن جریرؒ کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمرو ابن جموحؓ کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو کن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے اس کا شانِ نزول بروایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ کیا مال اور کونسی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہوگئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزء کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظِ قرآنی میں دونوں اجزاء پر نظر فرمائیں، پہلے جز یعنی "کہاں خرچ کریں" کے متعلق ارشاد ہوا ہے مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ "یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں"

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ "یعنی تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے" اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ جو کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصرف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اور بعد والی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا قُلِ الْعَفْوَ، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ ۱: اول یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصابِ مال بھی معتبر ہے اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصابِ مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقاتِ نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مصرف والدین کو بھی قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضۂ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ ۲: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ ماں باپ اور دوسرے اعزاء و اقرباء کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجبِ اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ ۳: تیسری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفلی صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگی میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرضخواہ کو ادا نہ کرے اور نفلی صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دوسرے حضرات نے حکم وجوبی قرار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کرنے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں، ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ دینؒ اس پر ہیں کہ ارشاد قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ

کہ اس میں لڑنا کیسا، کہہ دے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک، اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار تو ہمیشہ تم سے

يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن

لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر قابو پا دیں، اور جو کوئی

ع ۲۶

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مرجاوے حالتِ کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے

اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ

اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیتِ جہاد: جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعًا) گراں (معلوم ہوتا) ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقتِ حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے بُرے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کرو جو کچھ اللہ کا حکم ہو جاوے، اسی کو اجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودہواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام: (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر اُن کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا رجب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جمادی الاخریٰ کی تیس سمجھتے تھے، اور رجب اشہرِ حُرُم میں سے ہے، کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار قریش نے بھی حاضر ہو کر اعتراضاً سوال کیا، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے):-

لوگ آپ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عمداً) قتال کرنا جرم عظیم ہے (مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہوگیا یہ تو تحقیقی جواب ہے) اور (الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح منہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہرِ حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی) اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کرنا (یعنی مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا (کہ وہاں بہت سے بت رکھ چھوڑے تھے، اور بجائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مؤمنین) ان کو (تنگ اور پریشان کرکے) اس (مسجدِ حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کردینا (جس سے نوبت ہجرت یعنی ترکِ وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہرِ حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دینِ حق کے اندر فتنہ پردازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دینِ حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دینِ حق کو ضرر پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رُکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ (وجدال کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجامِ ارتداد اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جاوے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہرِ حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور سنکر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہوگیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۂ ثوابِ اخلاصِ نیت حقیقۃً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں (اور تم لوگوں میں یہ صفات علیٰ سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہوسکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی لہٰذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کردیں گے اور (ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر) رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکامِ جہاد

مسئلہ:۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ، "یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا" ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہو؛ بعض آیاتِ قرآنی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرض عین کے طور پر ہر ہر مسلم پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کردے تو باقی مسلمان سبکدوش سمجھے جائیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترکِ فرض کے گنہگار ہوجائیں گے، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کا یہ مطلب ہے کہ "قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی رہے"، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (۴: ۹۵)	"یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تارکینِ جہاد پر فضیلت دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔"

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں اُن سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض عین ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ حُسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت نہ تھی، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (۹: ۱۲۲)	"اور کیوں نہ نکل کھڑی ہوئی تمہاری ہر بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت اس کام کیلئے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں"

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیمِ عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔

نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکتِ جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟

اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ "پھر جاؤ، ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو" اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضۂ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر نفیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ (۹: ۳۸)	"اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو"

اس آیت میں اسی نفیرِ عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدانخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت پر پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر، یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے جمہور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ: اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہو اولاد کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ، جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت نفیرِ عام کے سبب یا کفار کے نرغہ کے باعث جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ قرضخواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضر یا مضر کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیار عقلمند سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے وقائع پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر پڑیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضر تھی یا کسی چیز کو نہایت مضر سمجھ کر اس سے اجتناب کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے ع

خویش را دیدم در سوائی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا سامان تھا۔

اشہر حرم میں قتال کا حکم

آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہو کہ اشہر حرم یعنی چار مہینے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہو، اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آئی ہے، مثلاً مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منھا اربعۃ حرم ثلاث متوالیات ورجب مضر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباحؒ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت غیر منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اور بقول جصاص عام فقہاء امصار کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کونسی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں بعض نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (۹: ۳۶) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹: ۵) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جگہ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کر دو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں اوطاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عامۃ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا وھو قول فقہاء الامصار۔

روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۃ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمتِ قتال کے منسوخ ہونے پر اجماعِ امت نقل کیا ہے (بیان القرآن) مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے، جس کو آیۃ السیف کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۹: ۳۶) اور یہ آیت آیاتِ قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اسی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات

متذکرہ کو اس کا ناسخ نہیں کہا جا سکتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرۂ طائف ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوا ہے اس لئے اس کو بھی ناسخ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کردی گئی ہے کہ خود کفار ان مہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جا سکتا ہے، جس کی تصریح اس آیت میں ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ۔ (۲: ۱۹۴)

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداءً قتال تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان مہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعانہ قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاصؒ نے بروایت حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجامِ ارتداد آیتِ مذکورہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی "ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے"۔

مسئلہ: دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کی بی بی نکاح سے نکل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالتِ اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدالآباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جاوے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکامِ اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرطِ وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا نہ کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گذشتہ نماز و روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعیؒ دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ: لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب معلّق رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مر گیا تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلمت علیٰ ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ: غرض مرتد کی حالت کافر اصلی سے بد تر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جزیہ قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لاوے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہے تو دوام حبس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوتی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوئے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے

لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا

بھی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے اُن کے فائدے سے۔

خلاصۂ تفسیر

پندرہواں ۱۵ حکم متعلقہ شراب و قمار

لوگ آپؐ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (چیزوں کے استعمال) میں گناہ کی بڑی (بڑی باتیں بھی (پیدا ہو جاتی) ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابل ترک ہیں)

معارف و مسائل

صحابۂ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابۂ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے:۔

حُرمتِ شراب اور اُس کے متعلقہ احکام

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جُوا کھیلنے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر اُن پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت سے مفاسد اور خرابیاں ہیں اُن کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبعی خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا، کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنھوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہونچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑھی ہوئی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بنجائیں، مثلاً شراب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہوجاتا ہے جو تمام کمالات اور شرفِ انسانی کا اصل اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بُرے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بُرے کام کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کردیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے گویا اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ تو اس مشورہ ہی کو قبول کرکے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں بلکہ مفاسدِ دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سببِ گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آگیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انھوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۂ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دوسرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴: ۴۳)	یعنی اے ایمان والو تم نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ"

اس میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی، بعض حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو نہ چھوڑا تھا اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو مطلقاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقاتِ نماز کے شراب کی حرمت قطعی طور پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اَب بھی اوقاتِ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبان بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا دَور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر و شاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح و ثنا تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آگیا، اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم آگیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی، اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَانًا شَافِيًا. یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے۔ اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورۂ مائدہ کی مفصل نازل ہو گئی جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیدیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ	"یعنی اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بُت اور جوئے کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو اس سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کر دے

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ (۵: ۹۱)	اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو کیا اب بھی باز آؤ گے "

حرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الٰہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکم الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر احکام شرعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اتباع میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود قرآن کریم نے فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲: ۲۸۶) "یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو" اسی رحمت وحکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔

شراب کی تدریجی ممانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب سے پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ چھوڑنے کی چیز ہے، مگر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیدیا۔

شریعتِ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور گراں ہوتا، علماء نے فرمایا فِطَامُ الْعَادَةِ اَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرَّضَاعَةِ "یعنی جیسے بچے کو ماں کا دودھ پینے کی عادت چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادتِ مستمرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے" اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اوّل اس کی برائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں ممنوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔

ہاں جس طرح ابتداءً تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی ممانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اوّل سخت وعیدیں عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ ام الخبائث اور ام الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی بُرے سے بُرے

گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہو۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہوسکتے، یہ روایتیں نسائی میں ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، نچوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو ہبہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف زبانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کردے۔

صحابہ میں تعمیلِ حکم کا بیمثال جذبہ فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھروں میں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اس کو تو اسی وقت بہادیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کردی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا جس کے پاس کوئی سبو یا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اس وقت ایک مجلس میں دَورِ جام کے ساقی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، سہیل رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرادو، اس کے جام و سبو توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلانِ حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جامِ شراب لبوں تک پہنچا ہوا تھا اس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رَو کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصۂ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں نکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب ہو وہ فلاں جگہ جمع کردے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مالِ تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے بلا تامل مقررہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کردیا اور باقی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کرکے چاک کرادیا، ایک صحابیؓ جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملکِ شام سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں اپنی ساری رقم جمع کرکے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلانِ حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابیؓ نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی حاصلات کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آرہے تھے اعلانِ حرمت

سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہادو، فرمانبردار محبِ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہادیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز و بے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم الٰہی اور فرمانِ نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور جوئے سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آگیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر، یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشہ کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، اُن کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغوض اور فحش و ناپاک ہوگئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرین صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگادیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستور میں ترمیم کر کے امتناع شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے ارباب سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکنوں کے حالات و معاملات کا یہ عظیم فرق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے، جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعت اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکر آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لاکر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسول کی آواز پر اپنی جان و مال آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں مکی زندگی کے پورے دور میں یہی افراد سازی کا کام ریاضتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جاں نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکر آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ و پے میں فکر آخرت سمائی ہوئی تھی۔

کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں

پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدن انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قویٰ پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ " جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھی کی" وہ جسمانی اور قوت کے اعتبار سے سٹھیائے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب جگر اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، سِل کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں سِل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعضے ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدھی اموات مرض سِل میں ہوتی ہیں اور آدھی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جب سے وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود قوتِ عاقلہ کو بھی ضعیف کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزوِ بدن بنتی ہے اور نہ اس سے خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعۃً ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ فیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب سے شرائین یعنی وہ رگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں رُوح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھاپا جلدی آجاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار سِل تک نوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی بُرا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان طبی حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر تدریجی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصے کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آجاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدّنی یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت دور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعتِ اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۂ مائدہ میں خصوصیت کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا ہے: اِنَّمَا یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّوۡقِعَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِی الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ (۵: ۹۱)

"یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کردے"

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر ڈالتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آسکتا ہے اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ اُمّ الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (۵: ۹۱) "یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے"۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قسمیں بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچہ پوری مملکتِ فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی، جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ "اُمّ الخبائث" یا "اُمّ الفواحش" ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آدھے شراب خانے بند کر دیئے جائیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفاخانے اور آدھے جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب الجواہر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، اُن میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب "خواطر و سوانح فی الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"بہت زیادہ مہلک ہتھیار جس سے اہلِ مشرق کی بیخ کنی کی گئی اور وہ دودھاری

تلوار جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا ۔۔۔ یہ شراب تھی ۔۔۔ ہم نے الجزائر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ اُن کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دور چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اُٹھا سکتے"۔

ایک انگریز قانون داں بنتام لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سرایت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگ گیا اُن کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہٰذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں"۔

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ رجس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس اُم الخبائث سے باز آجاؤ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ (۵: ۹۱)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اوپر آچکا ہے سورۂ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۶: ۶۷)	"اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل رکھتے ہیں"۔

تشریح و تفسیر پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے دُودھ کا ذکر کیا، جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف سُتھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا، کہ ہم نے دُودھ پلایا، اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حَسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ اُن کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں، کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ "سَکَر" کے مقابل "رِزقِ حَسَن" رکھا جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سَکَر کے معنی جمہور مفسرینؒ کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، (روح المعانی، قرطبی، جصاص)

یہ آیات باتفاق امت مکّی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزولِ آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اُس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحةً شراب کو شدّت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (ہذا ملخص ما فی الجصاص والقرطبی)

---

[1] بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص، قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

حرمتِ قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یاسر تقسیم کرنیوالے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جُوے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کرکے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جُوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جُوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعثِ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؒ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جُوئے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؒ اور معاویہ بن صالحؒ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا،

المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز، یعنی ہر قسم کا قمار مَیْسِرْ ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ"۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْمُخَاطَرَۃُ مِنَ الْقِمَارِ "یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے" (جصاص)

ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ مَیْسِرْ میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں (شامی، ص ۳۵۵ جلد ۵ کتاب الحظر والاباحۃ) مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑجائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑجائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب مَیْسِرْ اور قمار اور جُوا کہلائے گا، معمے حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیث صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے جن میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ بھی مَیْسِر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ شطرنج مَیْسِر یعنی جوئے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بُری ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مکہ میں جب سورۂ روم کی آیات غُلِبَتِ الرُّوۡمُ نازل ہوئیں، اور قرآن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسریٰ سے مغلوب ہوگئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط ٹھہرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غالب آگئے تو اتنا مال تمھیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور قمار سے ہمیشہ آپؐ نے اجتناب کیا، اور خاص خاص صحابۂ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع وضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کبھی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کبھی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دنایت اور رذالت کی بات ہے

اس لئے کبھی جہالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا (روح البیان)

قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات قمار یعنی جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جائے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بدحال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اختیار کرلے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب سے عادۃً محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہو کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دَور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دَور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بنکنگ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں، جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہے وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جُوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیمِ دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرما دیا ہے: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹: ۷) یعنی مالِ فئے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار یعنی جُوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ (۵: ۹۱)	"شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے"

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے بُرے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریق ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (۲: ۱۸۸) "آپس کے مال باطل طریقہ پر مت کھاؤ۔"

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعۃً بہت سے گھر برباد ہو جاتے ہیں، لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان مصیبت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملات کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوتِ عمل سُست ہو کر وہمی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ، بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھانا، اُس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جمائے۔

یہ مختصر فہرست ہے قمار کے مفاسد کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے سب متعلقین اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا:

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا "یعنی شراب و قمار کے مفاسد ان کے نفع سے زیادہ ہیں۔"

چند فقہی ضابطے اور فوائد

اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے اُن سے رُکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اُس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اُس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دنیا کی کوئی بُری سے بُری چیز بھی منافع سے خالی نہیں، زہر قاتل میں، سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفاسد ان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغواء، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کونسا جرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان اُن کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ ان کی

مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان اُن کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور جوئے کو اسی اصول کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مفاسد اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہدے جو بچے اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

تمہارے واسطے حکم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم کہدے سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملالو تو وہ

فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ

تم پر مشقت ڈالتا بیشک اللہ زبردست ہے تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تم کو بھلی لگے،

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا

سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

نصیحت قبول کریں۔

ع ۲۷ ۵ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

سولھواں حکم، مقدار انفاق اور لوگ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے اُخروی تکلیف میں پڑ جائیں) اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے) دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں اُن احکام کے موافق عمل کیا کرو)

سترہواں حکم، مخالطتِ یتیم (چونکہ ابتدا میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سُنائی گئی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ اُن کا کھانا بھی الگ پکواتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور سڑتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ اُن لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ یتیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا) اور لوگ آپؐ سے یتیم بچوں (کے خرچ علٰحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں آپؐ فرما دیجئے کہ (اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علٰحدہ خرچ رکھنے سے جو خلافِ مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو (کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ) وہ (بچے) تمہارے (دینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تو مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی

نیک نیتی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس معاملہ میں سخت قانون مقرر کرکے) تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرر فرمایا کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)

اٹھارہواں حکم مناکحتِ کفار

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک وہ مسلمان نہ ہوجاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد بی بی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر عورت بوجہ مال یا جمال کے) تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک وہ مسلمان نہ ہوجاویں اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وجہ ان کافروں کے بُرا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے ممانعتِ نکاح کا ہے یہ ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ظہور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ اُن کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جاوے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور مستحقِ جنت و مغفرت ہو جاویں)

فوائد از بیان القرآن

مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اہلِ کتاب سمجھے جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے اُن کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوتے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کے معتقد نہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سو ایسے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہو اُس سے نکاح درست نہیں لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے جیسے آجکل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیام آنے کے وقت اوّل عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مُسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے

آیاتِ مذکورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانیکے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودّت اور یگانگت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا، اور مشرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقاتِ قریبہ محبت و مودت کا لازمی اثر یہ ہے کہ اُن کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت اُن کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں' اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرما دیتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

اوّل یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہلِ کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ (۵: ۵) اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہلِ کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام اُن غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات قریبہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مساوی ہے، پھر اہلِ کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں' توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدۂ آخرت میں تو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہلِ کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب اہلِ کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہلِ کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے، اور پھر شوہر اس پر حاکم اور نگراں بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متأثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابلِ غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متأثر ہوں اور وہ بھی اسلام قبول کرلے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں حکمت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فارسی کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ "عقلمند تریاق بیقین و زہر بگمان نخورد" اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کرلے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابلِ غور یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کرلیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت النسب ہوگی، لیکن روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے، تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو بھی دیندار ہونے کا موقع میسّر آئے، اور جب غیر متدین مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو کسی غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب خبر پہنچی کہ عراق و شام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے ازدواج

کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ فرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیانۃً بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاسۃً بھی (کتاب الآثار للامام محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا اقرار خود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب "حدیث دفاع" میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دُور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلائے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی قومیت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ حلتِ نکاح کا قرآنی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے، ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے استثناء میں داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا کہہ دے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہو دیں پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝٢٢٢ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے

شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اس سے ملنا ہے اور خوش خبری سُنا ایمان والوں کو

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع کی حرمت اور پاکی کی شرائط

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ (الیٰ قولہ) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اور لوگ آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض گندگی کی چیز ہے، تو حالتِ حیض میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علٰحدہ رہا کرو اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہوجاویں پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہوجاویں (کہ ناپاکی کا شک و شبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالتِ حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہوکر توبہ کرلی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حالتِ حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے منہیات سے بچتے ہیں، اور حالتِ پاکی میں اجازت صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو اس لئے ہے کہ) تمہاری بیبیاں تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت (کے) ہیں (جس میں نطفہ بجائے تخم کے اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے) سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ (اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح بیبیوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کروٹ سے ہو یا پیچھے سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہوجاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ) آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ (اعمالِ صالحہ کرتے رہو) اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے) ایمان داروں کو (جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سُنا دیجئے (کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری سے اور لوگوں

بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲، نیک کام نہ کرنے کی قسم کی ممانعت

اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برے خیالات مت لاؤ)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

جن کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۱، جھوٹی قسمیں کھانیکا حکم

اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں داروگیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا) لیکن داروگیر فرماویں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بیہودہ قسم پر داروگیر نہ فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی مہلت دی)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ

جو لوگ قسم کھالیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے مہلت ہے چار مہینے کی پھر اگر

فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر ٹھہرالیا چھوڑ دینے کو

۴۷

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾

تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۲، ایلاء کا حکم

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ (الیٰ قولہ) سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ یعنی جو لوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے چار مہینے تک کی مہلت ہے سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کرلیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کردیں گے (اور چونکہ اب بی بی کے حقوق ادا کرنے لگا اس پر) رحمت فرمادیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گذرتے ہی قطعی طلاق پڑ جاویں گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ

نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں

اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ع ۲۸ / ۱۲

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۳ و ۲۴، مطلقہ کی عدت اور مدتِ رجعت کا بیان

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ (الیٰ قولہ) اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں (جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو

ان کو حیض آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض (ختم ہونے) تک (اور اس کو عدّت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدّت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعہ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ اُن کو طلاق رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آوے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدّت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لاحاصل ہے، اگرچہ رجعت تو ہو ہی جاوے گی) اور (یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (نفس وجوب میں) مثل انہی کے حقوق کے ہیں جو اُن عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مَردوں کا اُن کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں، (اور) حکیم (بھی) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت از بیان القرآن (۱) اگر غلبۂ شہوت سے حالتِ حیض میں صحبت ہو گئی، تو خوب توبہ کرنا واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

(۳) لغو قسم کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی، یا نکلی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا ہے، اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم نکل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اسی واسطے لغو کہتے ہیں، آخرت میں اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مؤاخذہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو غموس کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنے المذکور میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مؤاخذہ دنیوی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ لفظ لغو غموس کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہے منعقدہ کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اوّل، دوم اور سوم کو شرع میں ایلاء کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ دے اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گذر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کرلیں تو درست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کرلی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و درجات پر ایک جامع آیت

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ الآیۃ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کردی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدلانہ نظام کا مقتضیٰ یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اونچ نیچ یا انحراف انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا میں دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقاء اور تعمیر و ترقی میں عمود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصل مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

قرآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ان دونوں چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ اُن کے فوائد و ثمرات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے، دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جا سکتا ہے، اس کا بیان انشاء اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً یہی مضمون سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح آیا ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۴: ۳۴)	"یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال"

اسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے اولیاء جس کے حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود گھریلو اشیاء کی طرح مالِ وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ متمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، روما کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کردے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہا، اور اگر شوہر مرجائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر ستی کردیا جاتا تھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپؐ کی نبوت سے پہلے ۵۸۶ء میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے لائے ہوئے دینِ حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مَردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مَردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کردیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نامنظور کردے تو باطل ہوجاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کرسکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا لڑکوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادائِ حقوق پر ورنہ طلاق پر مجبور کرسکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کردینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے

عورت کو اس کے حقوقِ مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت تھی جس کو اسلام نے مٹایا ہے، اسی طرح ان کو کھلے مہار چھوڑ دینا اور مَردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کردینا، اس کو اپنے گذارے اور معاش کا خود متکفل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃً اس کے سپرد ہے وہ اس کا متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مَردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطرۂ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ

ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوقِ واجبہ کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور دوسرے لفظوں میں یہ کہ مرد ان کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اُولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہ انحطاط میں جاہلیتِ اُخریٰ کا دَور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جارہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی سعی مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش و بے حیائی عام ہوگئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خوں ریزی کی اتنی کثرت ہوگئی کہ جاہلیتِ اُولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ ہے "اَلْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ" (یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آجاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہوجاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت و نگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا جوا بھی گردن سے اُتارا جارہا ہے، جس کے نتائج بد روزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیامِ امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خوں ریزی اور باہمی جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہوا ہے، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ قدغن کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نورِ ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایۂ سعادت ہے۔

مسئلہ: اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے زوجین کو اُن کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کرلیں تو مطالبہ حقوق کا قضیہ ہی درمیان میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے حقوق ہیں، جب فرائض ادا ہوگئے تو خود بخود حقوق ادا ہوجائیں گے، آجکل دنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے اس کا نتیجہ مطالبہ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آجکل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں، زوجین میں، اور دوسرے اہلِ معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآنِ کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مسامحت اور عفو و درگذر سے کام لے، اگر اس قرآنی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خاندانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہوجائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تفوق دنیوی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دنیا میں نظامِ عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ اُن پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام تر مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و تنزل ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امورِ آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند رہے، یہ بھی ہوسکتا ہے اور حسب تصریح آیات و روایات ایسا ہوگا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہوجائیں گی، اُن کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

قرآن مجید میں احکام شرعیہ اور اعمال کی جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ حسبِ تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغے مذکر کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغے مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے، اس کا ایک سبب تو وہی فرق ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں

پر ایک حیثیت سے تفوّق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمر ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جابجا مَردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے اُن کو خیال پیدا ہوا تو اُمّ المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہوگئی:۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ الآیہ (۳۳: ۳۵) جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجاتِ جنت میں عورتوں کا درجہ مَردوں سے کچھ کم نہیں، (یہ روایت نسائی، مسند احمد، اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے)

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواج مطہراتؓ کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جابجا مردوں کا تو ذکر ہے عورتوں میں سے ازواج مطہراتؓ کا بھی مستقل تذکرہ ہے مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوّق اور حاکمیت انکی مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، ورنہ نیک و بدعمل کی جزاء و سزا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ یہی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ج (۱۶: ۹۷)	"یعنی جو مرد و عورت نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے"

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ "یعنی ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ اُن کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں"، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خداداد تفوّق کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہیے، کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کرسکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مثل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا بر عکس کیونکہ مردو عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جُدا جُدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تقصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان دفترِ حقوق و فرائض کو کیسا سمو دیا ہے، کیونکہ مفہوم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْمَعْرُوْفِ اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرما دیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدّد اور زیادتی نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو اذیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پرُی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچا، جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا، اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رُخی، بے التفاتی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْمَعْرُوْفِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کا مشہور مطلب و مفہوم تو یہی ہے کہ حقوقِ طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مَردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوّق اور حاکمیت عطا فرما دی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخرِ آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ میں اشارہ فرما دیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مَردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے اُن کو زیادہ تحمّل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے اُن کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو اُن کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا

طلاق رجعی ہے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے اور تم کو

یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ

روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس

اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جاوے یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِن طَلَّقَهَا

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا

دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اسکے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اسکے سوا پھر اگر طلاق دیدے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَ

دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اختیار ہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدے کے مطابق رکھ لے، خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیبیوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ لیا ہوا) اسی (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (مہر میں) ان کو دیا تھا مگر (ایک صورت البتہ حلال ہے وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (دربارۂ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے سو اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس مال کے لینے دینے میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے، (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خدائی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقوں کے بعد حلالہ

پھر اگر (دو طلاقوں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گذر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے اور یہ خداوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ انکو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے معاملہ میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور حکیمانہ نظام نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے جیسے بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملات و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماعِ امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء میں نہیں ہوتیں۔

اوّل تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہوجائے، لیکن نکاح ایسا معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کرلیں، اور دونوں میں کوئی فریق کبھی اختلاف و انکار بھی نہ کرے اس وقت بھی شرعًا وہ نکاح باطل کالعدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلانِ عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مسنون ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھئے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعتِ اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرلے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہونچتی ہے، اور پورا معاشرہ بُری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اوّل افہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حَکَم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (۴: ۳۵) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ بُعد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں، کہ اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلقِ نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعتِ اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتۂ ازدواج ہر حال میں ناقابلِ فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخِ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادۃً فکر و تدبر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم سہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کرا سکے یا طلاق حاصل کرسکے، پھر مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار تو دیدیا، مگر اوّل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق	یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔"

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالتِ غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالتِ طہر میں بھی، جس طہر میں صحبت و ہمبستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵:۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوئی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہمبستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حمل رہ گیا ہو تو عدت وضعِ حمل تک طویل ہو جائیگی، طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقتِ طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہے کہ غصہ فرو ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدۂ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرلے، بلکہ معاملۂ نکاح کو قطع کرنے کے لئے اوّل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملۂ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے، عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹتا، بلکہ رشتۂ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دورانِ عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرلے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کرسکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کرکے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے

حکم یہ دیدیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں، بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں اسی نظامِ طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اوّل تو ارشاد فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار رہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیرِ بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا "یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں اُن سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لیلو"

البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرما دی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بُعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلاوجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدتِ طلاق پوری کرکے)

کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوقِ زوجیت ادا کرکے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مرجائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہوسکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ کا یہی مطلب ہے۔

تین طلاق اور اس کے احکام کی تفصیل

یہاں قرآن کریم کے اسلوبِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہونچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہونچانا مناسب نہیں، الفاظ آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے بعد تیسری طلاق کو حرف اِنْ کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اَلطَّلَاقُ ثَلٰثٌ کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہونچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاقِ بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، اِن فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاقِ سنت کے لفظ سے تعبیر کردیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاقِ بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاقِ سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن وسنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ وتابعین سے عدد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالتِ طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاقِ احسن کہا ہے، اور حضراتِ صحابہؓ نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنّف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دیئے جائیں تاکہ عورت آزاد ہوجائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائیں

مگر مَرَّتَانِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، اَلطَّلَاقُ طَلَاقَانِ سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مَرَّتَانِ ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظِ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

اور حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبیدؓ نقل کیا ہے کہ:۔

اخبر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم عن رجل طلق امرأتہ ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبانا ثمّ قال ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم حتی قام رجل وقال یا رسول اللہ الا اقتلہ (نسائی کتاب الطلاق، ص۹۹ ج ۲)	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہوگئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کیساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کر دوں!

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیم نے صحیح علیٰ شرط مسلم قرار دیا ہے، (زاد المعاد) اور جوہر نقی میں علامہ ماردینیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیرؒ نے اسناد جید، ابن حجرؒ نے رُوَاتُہٗ مُوثَّقُونَ فرمایا ہے۔

اسی بناء پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاقِ بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہی کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر بمجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفاء کیا جائے اور عدت گذرنے دیں، تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتۂ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقۂ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہوگا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفاء نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی، اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہرحال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہیں رہی، کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہے، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد بتراضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہونچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہونچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، اس میں فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اوّل یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف امساک یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاحِ حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گذارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزر کر تعلقِ زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادۂ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ فرمایا، تسریح کے معنے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہوجانا ہی تعلقاتِ زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔
امام حدیث ابو داؤدؒ نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقاتِ زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہوجائیگا کہ عدت کے اندر رجعت نہ کرے، اور جس طرح اِمْسَاکٌۢ کے ساتھ بِمَعْرُوْفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ رجعت کرکے بیوی کو روکا جائے تو حسنِ سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَسْرِیْحٌ کے ساتھ بِاِحْسَانٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا فسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسنِ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فسخِ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان وسلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتِّعُوْھُنَّ عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ (۲: ۲۳۶)	"یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ جوڑا کپڑے کا دے کر رخصت کریں مالی حیثیت کے مطابق"

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سارے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرکے بلاوجہ اور بلاضرورت ختم کردیئے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہوسکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہوسکے۔

اگر کسی نے غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتلِ ناحق جرم وگناہ ہے، مگر جسکو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا باتفاق مذاہب جرم وگناہ ہے۔ مگر جو مال اس طرح غائب کردیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے، اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم وگناہ ہونا اُن کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔
اس اصول کا مقتضٰی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ

اپنے سارے اختیاراتِ طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اسی لئے جمہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاحِ جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہارِ غضب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز صاحب کی کتاب "عمدۃ الاثاث" بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اوپر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرما دیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا تھا، اُن کے الفاظ یہ ہیں:

فلم یردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل امضاہ کما فی حدیث عویمر العجلانی فی اللعان حیث امضی طلاقہ الثلاث ولم یردہ (تھذیب سنن ابی داؤد طبع مصر ص ۱۲۹ ج ۳ از عمدۃ الاثاث)	"تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رد نہیں کیا، بلکہ اُسے نافذ فرما دیا، جیسا کہ عویمر عجلانیؓ کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے اُن کی تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا تھا اور رد نہیں کیا تھا"،

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأتہ ثلاثاً	"ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتحل للاول قال لاحتی یذوق عسیلتھا کماذاقھا الاول (صحیح بخاری، ص ۷۹۱، ج ۲، صحیح مسلم ص ۴۶۳)

دی' اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق دیدی' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے ہمبستری کرکے لطف اندوز نہ ہوجائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی"

الفاظِ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں' شروح حدیث فتح الباری' عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی قرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دی تھیں' اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہمبستری اور صحبت نہ ہوجائے، تو اس کے طلاق دینے سے شوہر اوّل کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر عجلانی رضؓ کی ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فلما فرغا قال عویمر کذبت علیھا یارسول اللہ ان امسکتھا فطلقھا ثلاثا قبل ان یامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۳۰۱ ج ۹ صحیح مسلم ص ۴۸۹ ج ۱)

"پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہوگئے تو عویمرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا، اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دیں"

اور ابوداؤدؒ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت سہل بن سعدؓ نقل کرکے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فانفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان ماصنع عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ قال سعد حضرت ھذا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمضت السنۃ بعد فی

"تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے نافذ فرمادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

المتلاعنین ان یفرق بینھما ثم لا یجتمعان ابداً (ابو داؤد ص ۳۰۶، طبع اصح المطابع)

بارے میں یہ طریقہ رائج ہوگیا کہ اُن کے درمیان تفریق کردی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی جمع نہ ہوں"

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابوبکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک طلاق رجعی قرار دے کر بیوی اس کے سپرد کردی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر اُن کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ اور اس پر اشکال وجواب

مذکور الصدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دینا خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباسؓ قال کان الطلاق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وسنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلاث واحدۃ فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم فامضاہ علیھم (صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کردیں، تو آپ نے اُن پر نافذ کردیا۔

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے اس پر انکار یا تردد منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن عبدالبر مالکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، زرقانی شرح موطا میں یہ الفاظ ہیں:

والجمھور علی وقوع الثلاث بل حکی ابن عبد البر الاجماع قائلا ان خلافہ لا یلتفت الیہ (زرقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷، ج ۳)	"اور جمہور امت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شاذ ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا"

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالك وابو حنیفة واحمد وجماھیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث۔ وقال طاؤس وبعض اھل الظاھر لا یقع بذلك الا واحدۃ۔	"امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور سلف و خلف کے جماہیر علماء نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اور طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے"

(شرح مسلم، ص ۴۷۸، ج ۱)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں فرمایا:

فخاطب عمرؓ بذلك الناس جمیعًا وفیھم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ عنھم الذین قد علموا ما تقدم من ذلك فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم ینکر علیہ منھم منکر ولم یدفعہ دافع (شرح معانی الآثار، ص ۲۹ ج ۲)	"پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا، اور ان لوگوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہؓ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہیں کیا، اور کسی رد کرنے والے نے اسے رد نہیں کیا"

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ و تابعین مقرر ہو گئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بغیر دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہو گی۔

لیکن علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جدید کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا، کہ عہدِ رسالتؐ میں اور عہدِ صدیقی میں اور دو سال تک عہدِ فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کرلیا جائے کہ عہدِ رسالت، عہدِ صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا۔ اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہوگئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کرلیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جسکو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے، کہ فاروق اعظمؓ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے مکرر کہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے ہوسکتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی، اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید کے لئے یہ الفاظ مکرر بولے تھے تو آپؐ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتۃ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عرفِ عام میں تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی، انھوں نے اس پر حلف کرلیا، تو آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتۃ سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کردیا ہے

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہؓ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، نہ اُن سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

اس واقعہ نے یہ بات واضح کردی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشینگوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہوگئی کہ تین مرتبہ الفاظِ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظامِ دین میں دور بینی کو سبھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی، اس کی یہ بات نہ سُنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکور الصدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی امرٍ کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضینا علیھم	"لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب ہوگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کردیں"

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایاتِ حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہدِ رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو، بلکہ تین بطورِ تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابۂ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، والحمد للہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شروحِ حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت کو تو رکھ لو اُن کو موافق دستور کے یا

سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ

چھوڑ دو اُن کو بھلی طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیادتی کرو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ

کریگا وہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنسی،

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ

جانتا ہے ۔ اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو

أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ

اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ

اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمھارے واسطے

لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں کو معلّق رکھنے کی ممانعت

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدّت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کرکے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو، اس ارادہ سے کہ اُن پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، اور خصوصاً کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی سے منع کرنے کی ممانعت

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدّت پوری کر چکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح کرلیں، جبکہ باہم سب رضامند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی دو آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکور الصدر دو آیتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاعِ نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات

پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی عورتوں کی عدّت گذرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کرکے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کرکے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاروں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں بِالْمَعْرُوْفِ کا لفظ دونوں جگہ علیحدہ علیحدہ لاکر اس کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ رجعت کے لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، محض وقتی غصّے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے، دونوں صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصّہ تو خود قرآن میں بیان کردیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعۂ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار عواقب کا خیال کرکے رائے یہ ہوجائے کہ رجعت کرکے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پچھلے غصّہ ناراضی کو دل سے نکال کر حُسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گذارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا پیشِ نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر ستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیتِ متذکرہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔ یعنی عورتوں کو اپنے نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ اُن پر ظلم کرو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۂ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (۶۵: ۲) "اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو، پھر اگر گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک اللہ کے واسطے بلا رو رعایت گواہی دو"۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنالو، اس میں کئی فائدے ہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت کا قاعدہ نہ جاری کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص عدّت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدّت گذرنے سے پہلے رجعت کرلی تھی۔ ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا کہ رجعت کرو تو اس پر

دو معتبر گواہ بنالو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عدت کی مہلت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قطع تعلق ہی برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہے کہ دشمنی اور انتقامی جذبے بھڑک اٹھیں جن کا اثر دو شخصوں سے متعدی ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہے اور طرفین کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی چھوڑنا اور قطع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کرو اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود قرآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا، وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا، یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہوا سامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲: ۲۴۱) "سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے اُن پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں"۔ فائدہ پہنچانے کی تفسیر رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کرکے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کردیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاق اور حُسنِ معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فسخ معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حُسنِ سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے کہ طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب حقوق واجبہ ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیزیں عرفاً جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کردیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ یعنی جو شخص ان حدود خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کرکے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بد اس دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ؎

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد
بر گردنِ وے بماند و بر ما بگذشت

قرآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر نہ ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف آخرت کا حساب یاد دلایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰہِ ہُزُوًا، کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیتے ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کرکے مُکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہدیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائیں گے نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح (اخرجہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ)۔

اور حضرت ابوہریرۃؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں:

ثلاث جدّھن جدٌّ وھزلھن جدٌّ النکاح والطلاق والرجعۃ	"یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد وارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے، ایک نکاح دوسرے طلاق تیسری رجعت" (مظہری)

ان تینوں چیزوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ دو مرد و عورت اگر بلا قصد نکاح ہنسی ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کرلیں تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہو جاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہو جاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام باندی آزاد ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کو حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ، یعنی یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر نازل فرمائی اور یاد کرو اس خاص نعمت کو جو کتاب و حکمت کی صورت میں دی گئی اور اللہ سے ڈرو، اور سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں" تمہاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل رسوا کرنے یا تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہے کہ صریح اور رجعی طلاق دی جائے

تیسرا مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت و سنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور ہی ہو جائے تو صاف و صریح لفظوں میں ایک طلاق رجعی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلق زوجیت منقطع ہو جائے جس کو طلاق بائن کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے، جس کے بعد آپس میں نکاح جدید بھی حرام ہو جائے، یہ اشارہ لفظ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاقِ رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاق بائن یا تین طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآن کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل طلاق مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں۔

مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے سے بلا وجہ شرعی روکنا حرام ہے

دوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے، جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے،

کہ اُن کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے روکتے ہیں، اور ان میں بعض اس طمع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم اپنے لئے حاصل کرلیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پھر اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہوجاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء و اقرباء کو طلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہوجاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلاعذر شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کردی تھی، اس نے طلاق دیدی اور عدت بھی گذر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کرلیں، اس کی بیوی یعنی معقل بن یسارؓ کی بہن بھی اس پر آمادہ ہوگئی، لیکن جب اس شخص نے معقلؓ سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا، انھوں نے کہا کہ میں نے تمھارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمھارے نکاح میں دیدی تم نے اسکی یہ قدر کی کہ اسکو طلاق دیدی، اب پھر تم میرے پاس آئے ہو، کہ دوبارہ نکاح کردوں، خدا کی قسم: اب وہ تمھارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبداللہؓ کی چچازاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی جس میں معقلؓ اور جابرؓ کے اس رویہ کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔

صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیتِ کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسارؓ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، اور خود جاکر اس شخص سے بہن کا دوبارہ نکاح کردیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبداللہؓ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنھوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ، "یعنی مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کریں"، خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنھوں نے طلاق دی تھی، یا دوسرے لوگ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگادی گئی اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ "یعنی جب دونوں مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضامند ہوجائیں، تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اشارہ

فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زور زبردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقوں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کرلیں، یا ایامِ عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا اِن مرد وعورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بقدرِ استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے مہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدۂ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا تَرَاضَوْا کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضا یا اجازت کے نہیں ہوسکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں" اس میں اشارہ فرما دیا گیا کہ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکامِ الٰہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ "یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے" اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاقلہ بالغہ جوان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تیسرے اگر خدانخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنھوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلاء خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتال تک نوبت پہنچادے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار

۳۷

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تم نہیں جانتے، اس ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت و غیرت کا تخیل، یا یہ کہ اُن کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تلبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں اُن کی رعایت کرکے احکام دیتے ہیں اور تم چونکہ حقائق امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جس میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو تھامتے پھرتے ہو اگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہوگئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصرفات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کردیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون سازی اور اسکی تنفیذ میں قرآن کریم کا بےنظیر حکیمانہ اصول

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روزِ قیامت کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآنِ کریم کا یہ اسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے اِتَّقُوا اللّٰهَ یا اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ، وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبۂ زندگی پر حاوی قانون

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی ادا ساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انھوں نے ایک قانون بنا دیا، اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوبِ قرآن اور اس کے مخصوص اندازِ بیان سے ایک دُوررس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بناء پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بناء پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہو کہ قرآنی تعلیم نے جو اصولِ معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا تھا۔

قرآنی نظامِ حکومت کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے تو دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جرم و سزا کے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوئی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا سکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلادیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ

کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا

موافق دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جائے ماں کو اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

وجہ سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

چھڑا لیں یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورہ سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ دودھ

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ

پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

موافق دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۰ رضاعت اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہیں پہونچانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ کسی کے باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریق مذکور کے (بچے کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں اور باپ دو سال سے کم ہی) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی کسی مصلحت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں بچے کو مضر ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور انّا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا طے کیا ہے، قاعدے کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کیے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل احکام بیان فرمادیئے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہر دو صورت اس کا ایک ایسا نظام بنا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔

مثلاً آیۃ کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا، وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ، یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے"۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے:۔

دودھ پلانا ماں کے ذمہ واجب ہے

اول یہ کہ دودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی ضد یا ناراضی کے سبب دودھ نہ پلائے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبتک وہ اس کے اپنے نکاح میں ہے کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدتِ رضاعت

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدتِ رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیاتِ قرآن اور احادیث کی بنار پر امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر تیس مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلا دیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کرسکے"۔

اس میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ وَالْوَالِدٰتُ استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالِدٌ چھوڑ کر اَلْمَوْلُوْدُ لَهٗ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ (۳۱: ۳۳) مگر یہاں والد کی جگہ مَوْلُوْدٌ لَهٗ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طرز بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ اور مشفقانہ

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچّہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں باپ کی متاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بجائے وَالِد کے مَوْلُوْدٌ لَّہٗ کا لفظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچّہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچّہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمّہ اور ماں کا نان و نفقہ، ضروریات باپ کے ذمہ ہیں

تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضروریاتِ زندگی باپ کے ذمہ ہے، اور یہ ذمّہ داری جس وقت تک بچّے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک ہے اور طلاق اور عدّت پوری ہونے کے بعد نفقۂ زوجیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچّے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (مظہری)

زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت کے مناسب ہونا چاہئے یا زوجہ کی

چوتھا مسئلہ اس پر تو اتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحبِ ہدایہ نے خصاف کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور مرد مالدار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مالداروں سے کم، اور کرخیؒ کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت سے فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم (فتح القدیر ص ۲۲۲ ج ۳)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ "یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچّے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچّے کی وجہ سے" مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہو گی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوائے گا۔

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا سے **پانچواں مسئلہ** یہ معلوم ہوا کہ ماں اگر بچّہ کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے

تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک نکاح میں ہے تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتی، طلاق وعدت کے بعد کرسکتی ہے

چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچانا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گذر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہوچکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی انّا کا دُودھ پلوائے۔

یتیم بچے کے دودھ پلوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مرجائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ یتیم بچے کو دودھ پلوانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گذارہ ہے، مثلاً اگر یتیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک تہائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یتیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہے کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور یتیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصولِ میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت سمجھے تو یتیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کرجائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے زائد بھی ہوسکتی ہے اسی طرح یتیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کردیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام | اس کے بعد آیت مذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تختہ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت کا دودھ پلوانے کے احکام | آخر میں ارشاد فرمایا گیا وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ یعنی اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی انا کا دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی جو اجرت مقرر کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اگر اس کو مقررہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی انا سے پلوائے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اُجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی کر دے، اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد پھر قرآن نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہے ہیں اور وہ تمہارے دلوں کے مخفی ارادوں اور نیتوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ مستحق سزا ہوگا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ

اور جو لوگ مر جاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپکو

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا

چار مہینے اور دس دن، پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ

فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ

اپنے حق میں قاعدے کے موافق اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے اور کچھ گناہ نہیں

عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ

تم پر اس میں کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح اُن عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن

اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ اُن عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپکر مگر یہی کہ

تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ

کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے عدت مقررہ

الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ

اپنی انتہاء کو اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنیوالا ہے

ع ۳۰ / ۱۴

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۱، شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں عدت کا بیان وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں، اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کر لیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ شرع کے کریں اور تم باوجود روک سکنے کے نہ روکو تو تم بھی شریک گناہ ہوگے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں،

حکم نمبر ۳۲، عدت میں نکاح کا پیغام دینا

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدتِ وفات میں ہیں) پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہدو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو (جب بھی گناہ نہیں اور وجہ اس اجازت کی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذکر مذکور کروگے (سو خیر ذکر مذکور کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو (تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارۃً کہو) اور تم تعلقِ نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہوجائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف و مسائل

عدت کے بعض احکام

(۱) جس کا خاوند مرجائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل بلاضرورتِ دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگوئے نکاحِ ثانی بھی درست نہیں، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست نہیں، ترجمہ میں "نکاح" کے ساتھ جو "وغیرہ" کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے اس عورت کا جس پر طلاق بائن واقع ہوئی، یعنی جس میں رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست نہیں۔

(۲) اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انتیس کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کُل ایک سو تیس دن پورے کریں گے، اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آوے گا، عدت ختم ہوجاوے گی، اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلافِ شرع کرے تو اوروں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرطِ قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شرعاً صحیح اور جائز ہو، تمام شرائط حلت کی وہاں جمع ہوں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ اُن کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو اُن کے

فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا

لئے کچھ مہر اور اُن کو کچھ خرچ دو مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ کہ

بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ

قاعدے کے موافق ہے لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ، اور اگر طلاق دو اُن کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور

أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا

ٹھہرا چکے تھے تم اُن کے لئے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگذر

أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ

کریں عورتیں یا درگذر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند اور تم مرد درگذر کرو تو قریب

لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

ہے پرہیزگاری سے اور نہ بھلا دو احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۳، طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان طلاق قبل الدخول کے معنی یہ ہیں کہ زوجین میں یک جائی اور خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو اس نکاح کے وقت مہر مقرر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار مہر متعین کر دی گئی، پہلی صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ (الیٰ قولہ) حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝

یعنی تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے، (سو اس صورت میں مہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچا دو صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے، خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا کپڑوں کا دینا ہے)۔

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ (الیٰ قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ اُن کو ہاتھ لگاؤ، اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہے (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو) یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی مہر ادا کرنا ہوگا) اور (اے اہل حق) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو، (بلکہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کروگے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو دیں گے) (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (الیٰ قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ طلاق کی، مہر اور صحبت کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نہ مہر مقرر ہو نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت یہ ہے کہ مہر بھی مقرر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آوے، اس میں جو مہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا، یہ حکم قرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ مہر معین نہ کیا، اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں مہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ مہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے، دراصل قرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی، البتہ یہ بتلا دیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحب وسعت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؓ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت وخلوتِ صحیحہ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کردے یا مرد پورا دیدے تو اختیاری بات ہے، جیسا کہ آیت اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مرد کے پورا مہر دینے کو بھی معاف کرنے کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ مہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہوگیا، اب اگر وہ رعایت کرکے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کرنا ہے، اور معاف کرنے کو افضل اور اقرب للتقوٰی قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعلقِ نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسنِ سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصدِ شریعت اور موجب ثوابِ عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ولی عقدۃ النکاح الزوج، یعنی عقدۂ نکاح کا مالک شوہر ہے۔" یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہٖ منقول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی (قرطبی)

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ نکاح مکمل ہوجانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق وہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حٰفِظُوْا عَلَي الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۴، نمازوں کی حفاظت کا بیان: اس سے آگے پیچھے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانا اس طرف اشارہ ہے کہ مقصود حقیقی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصلحتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوقِ عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اتلاف سے درگاہِ الٰہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لوازم میں سے حق وعبد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے، اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (الیٰ قولہ) مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ ہو یا نہ ہو اور گو رکوع وسجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی ادائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھلایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف و مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز سے مراد نمازِ عصر ہے کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور "عاجزی" کی تفسیر حدیث میں "سکوت" کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔

اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مرجاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کردیں اپنی عورتوں کے واسطے

مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

کریں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا،

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے قاعدہ کے موافق لازم ہے پرہیزگاروں پر، اسی طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

۳۱ ع ۱۵

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیبیوں کے واسطے ایک سال تک نان و نفقہ اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں، ہاں اگر (چار مہینے دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد عدت گذار کر) خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ (الیٰ قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں مقرر ہے) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف و مسائل

(۱) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ، زمانۂ جاہلیت میں وفاتِ زوج کی عدت ایک سال تھی، اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن مقرر ہوئے جیسا کہ ماقبل میں آیت يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا، سے معلوم ہو چکا، مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا، اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں مقرر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مُردے کی وصیت پر تھا جیسا کہ آیت كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ (۲: ۱۸۰) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی مراد ہے قاعدہؔ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا، عورت کے لئے بھی، اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ ط مطلقہ عورتوں کو متعہ یعنی فائدہ پہنچانا اس سے پہلی آیات میں بھی آ چکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت یا خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے سو اُن میں جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر مقرر

ؔ اور قاعدہ سے مراد یہی تفصیل ہو جائے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت کیا جائے گا، اور حقًّا کو واجب کے معنی میں نہ لیں گے اور "علیٰ" الزام کے لئے نہ ہو گا، بلکہ محض تاکید کے لئے ہو گا گو درجۂ استحباب ہی سہی (بیان القرآن)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے مہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر ما قبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب ہے، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا تو نے اُن لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا اُن کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر اُن کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے، اور لڑو اللہ کی راہ میں

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ نے اُن کے لئے (حکم) فرما دیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر اُن کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور (اس واقعہ پر غور کر کے) اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنیوالوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے)

معارف ومسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان ومال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت وحیات تقدیر الٰہی کے

تابع ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں، اور بزدلی سے جان چُرانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلفِ صحابہؓ اور تابعینؒ کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت وبا، طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اُٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جاکر مقیم ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آ کھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت مرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا،

آس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنا دیا، اُن کی لاشیں حسب دستور گل سڑ گئیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانۂ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حزقیلؑ بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گذرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو پھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں۔

ایتھا العظام البالیۃ ان اللّٰہ یأمرکِ ان تجتمعی	"یعنی اے پرانی ہڈیوں اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ہر جوڑ کی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے"

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سُنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا بے عقل و بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، قرآن کریم نے آیت اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰: ۵۰) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسبِ حال ہدایت فرمائی، مولانا رومیؒ نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

بہرحال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو:-

ایتھا العظام ان اللّٰہ یأمرکِ	یعنی اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ

ان تکتسی لحما وعصبا وجلدا	اپنا گوشت پہن لو اور پٹھے اور کھال درست کرو"

یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہر ڈھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے :۔

ایتھا الارواح ان اللہ یأمرک	یعنی اے ارواح تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
ان ترجع کل روح الی الجسد	کہ اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر
الذی کانت تعمرہ	وحیات اُن سے وابستہ تھی"

یہ آواز دیتے ہی اُن کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چار طرف دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا سُبْحَانَكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ۔

یہ واقعہ ہائلہ دنیا کے فلاسفروں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر حجت قاطعہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا خواہ جہاد سے ہو یا کسی وبا، وطاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں جس کا یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور نہ ایک سیکنڈ مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو قرآن کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بخوف موت نکل کھڑے ہوئے تھے؟

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں اَلَمْ تَرَ فرمانے کا کیا منشاء ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ اَلَمْ تَرَ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپؐ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویتِ قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی ہیں علم وادراک یعنی اَلَمْ تَرَ ایسے مواقع میں اَلَمْ تَعْلَمْ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ اَلَمْ تَرَ سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ یہ واقعہ ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، اَلَمْ تَرَ کے بعد حرف اِلٰى بڑھانے سے ازروئے زبان اس کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهُمْ اُلُوْفٌ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، لیکن عربی زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا، یعنی کہہ دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے کہ مرجاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہوسکتا ہے اور بواسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں ارشاد ہے: اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (۳۶: ۸۲)

اس کے بعد فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کرکے فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امتِ محمدیہ کو بتلاکر ان کے لئے درسِ عبرت بنایا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود اکثر انسان شکر گذار نہیں ہوتے:

مسائل متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوئے:

تدبیر پر تقدیر غالب ہے

اول یہ کہ تقدیر الٰہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی، اور جہاد سے یا طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہوسکتا، اور نہ اُن میں قائم رہنا موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اُس میں کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی۔

جس بستی میں کوئی وبا، طاعون وغیرہ ہو اس میں جانا یا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانا دونوں ناجائز ہیں

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبائی مرض طاعون وغیرہ پھیل جائے وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان هذا السقم عذب به الامم قبلکم فاذا سمعتم به فی الارض فلا تدخلوها واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارا (بخاری و مسلم، ابن کثیر)

"یعنی اس بیماری (طاعون) کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے، سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر کسی بستی میں یہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو۔"

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملکِ شام کے قصد سے سفر کیا، سرحدِ شام پر تبوک کے قریب ایک مقام سَرْغ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملکِ شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملکِ شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزارہا انسان جن میں بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروقِ اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملکِ شام میں اس وقت جانا چاہئے یا واپس ہونا مناسب ہے، اُس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سُنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ذکر الوجع فقال رجز وعذاب عُذِّبَ بہ الامم ثم بقی منہ بقیۃ فیذھب المرۃ ویأتی الاخرٰی فمن سمع بہ بارض فلا یقدمن علیہ ومن کان بارض وقع بھا فلا یخرج فرارًا منہ، رواہ البخاری عن اسامۃ بن زید واخرجہ الائمۃ بمثلہ۔	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طاعون کی گلٹی کے) درد کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک عذاب ہے جس سے بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا، اب اس کا یہ حال ہے کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آجاتا ہے، تو جو شخص یہ سنے کہ فلاں خطۂ زمین میں یہ عذاب آیا ہوا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس خطۂ زمین میں نہ جائے، اور جو شخص اس خطہ میں پہلے سے موجود ہے تو طاعون کی بھاگنے کے لئے وہاں سے نہ نکلے (بخاری)"

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سُنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملکِ شام کے عامل وامیر (گورنر) بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم سُنکر فرمانے لگے، افرارًا من قدر اللہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہ! کاش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

نعم نفرّ من قدر اللہ الیٰ قدر اللہ	"بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں"

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دربارۂ طاعون ارشادِ نبویؐ کی حکمتیں

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکورسے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اُس جگہ سے بخوفِ موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہوگیا تو مرنے والے کو کبھی یہ گمان ہوگا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہوگا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ مقدور بھر ایسی چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ تقدیرِ الٰہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اُس بستی کے رہنے والوں کو بخوفِ موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعفاء مرد و عورت کا بھی عادۃً ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، اُن کا حشر کیا ہوگا، اوّل تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر اُن میں جو بیمار ہیں اُن کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دفن کفن کا انتظام کیسے ہوگا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اثر کر چکے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

مافرّ احد من الوباء فسلم (قرطبی)	یعنی جو شخص وباء سے بھاگتا ہے وہ کبھی سالم نہیں رہتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کرچکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وبائی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہوجائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے صبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روی البخاری عن یحیی بن یعمر عن عائشۃؓ انھا اخبرتہ انھا سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الطاعون فاخبرھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان عذابًا یبعثہ اللہ علی من یشاء فجعلہ اللہ رحمۃ للمؤمنین فلیس من عبد یقع الطاعون فیمکث فی بلدہٖ صابرًا یعلم انہ لن یصیبہ الا ماکتب اللہ لہ الا کان لہ مثل اجر شھید وھذا تفسیر لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الطاعون شھادۃ والمطعون شھید (قرطبی ص ۲۳۵ ج ۳)	"امام بخاریؒ نے یحیی بن یعمر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو خبر دی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپ نے ان کو بتلایا کہ یہ بیماری اصل میں عذاب کی حیثیت سے نازل ہوئی تھی اور جس قوم کو عذاب دینا منظور ہوتا تھا اس پر بھیجدی جاتی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو مؤمنین کے لئے رحمت بنادیا، تو جو اللہ کا بندہ طاعون پھیلنے کے بعد اپنی بستی میں صبر و سکون کے ساتھ ٹھہرا رہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کو صرف وہی مصیبت پہونچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے، تو ایسے شخص کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ اور یہی تشریح ہے اس حدیث کی جس میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے"

بعض خاص صورتوں کا استثناء حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا فرارًا منہ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وبا پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیّت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ بخوف موت جہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں جہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِہِمۡ وَ قَعَدُوۡا لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِکُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ (۳: ۱۶۸)

"یعنی کچھ لوگ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے، اور جہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانیوالوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سُنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ) آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت سے بچنا تمہارے اختیار میں ہے، تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے بچالو، یعنی جہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی"۔

عجائبِ قدرت سے ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری جہاد ہی میں گذری ہے، وہ کسی جہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے گھر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور جہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عضو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آرام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں جہاد و قتال

کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاد میں جانے کو موت یا بھاگنے کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دوگنا کردے اللہ اس کو کئی

كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

گنا اور اللہ ہی تنگی کر دیتا ہے اور وہی کشائش کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

خلاصۂ تفسیر

جہاد وغیرہ کار خیر میں انفاق کی ترغیب: کون شخص ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا یعنی اخلاص کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دیوے اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو) اللہ (ہی کے قبضہ میں ہے وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصل مدار نہیں) اور تم اُسی کی طرف (بعد مرنے کے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزاء اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)۔

معارف و مسائل

(۱) یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، قرض سے مراد نیک عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس کو قرض مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضرور ہی ملے گا، اور بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خرما اللہ کے راستے میں خرچ کیا جاوے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے

اور اُن کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں قرض دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن مسلم یقرض مسلماً قرضاً مرۃ الا کان کصدقتہ مرتین (مظہری بحوالہ ابن ماجہ)	"جو مسلمان دوسرے مسلمان کو قرض دیدیتا ہے، یہ قرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے"

(۲) ابن عربیؒ فرماتے ہیں اس آیت کو سُنکر لوگوں کے تین فرقے ہوگئے، پہلا فرقہ اُن بدنصیب لوگوں کا ہے جنھوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں، ___ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ (۳: ۱۸۱) سے دیا ___ دوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے جنھوں نے اس آیت کو سُن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کرلیا، مال کی طرف زیادہ رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی ___ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنھوں نے فوراً ہی اس آیت پر عمل کرلیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دیدیا، جیسا کہ ابو الدحداحؓ وغیرہ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابو الدحداحؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپؐ سے پوچھا، اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے تم کو جنت میں داخل کردیں، ابو الدحداحؓ نے یہ سُنکر کہا، اللہ کے رسول ہاتھ بڑھائیں، آپؐ نے اپنا ہاتھ بڑھادیا، ابو الدحداحؓ نے کہنا شروع کیا:

میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری مِلک میں کچھ نہیں، میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپؐ نے اُن سے فرمایا ایک اللہ کے راستے میں وقف کردو اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو ___ ابو الدحداحؓ نے کہا آپؐ گواہ رہئے ان دونوں میں سے بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اللہ تمھیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔

ابو الدحداحؓ اپنے گھر آئے اور بیوی کو اس کی اطلاع دیدی، تو وہ بھی ابو الدحداحؓ کے اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کَمْ مِّنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ	"کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ"

لأبي الدحداح (قرطبی)	محلات کس قدر ابوالدحداح کے لئے تیار ہیں' (یعنی جنت میں)۔"

(۳) قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کردیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ خیارکم احسنکم قضاءً	"تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے۔"

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ

کیا نہ دیکھا تونے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انھوں نے کہا اپنے نبی سے

لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ

مقرر کردو ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں پیغمبر نے کہا کیا تم سے بھی یہ توقع ہے کہ

عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

اگر حکم ہو لڑائی کا تو تم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم

قَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا اُن کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ

مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو، اور فرمایا اُن سے اُن کے نبی نے

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ

بیشک اللہ نے مقرر فرمادیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہے اس کو حکومت

عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ

ہم پر اور ہم زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کشایش مال میں

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ

پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جسکو چاہے اور اللہ ہے فضل کرنیوالا سب کچھ جاننے والا، اور کہا بنی اسرائیل

نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

سے اُن کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ

تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں اُن میں سے جو چھوڑ گئی تھی، موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع

اٹھا لاویں گے اس صندوق کو فرشتے، بیشک اُس میں پوری نشانی ہے تمہارے واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو،

ع ۳۲ / ۱۶

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ

پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا بے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا

سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ

جو کوئی بھرے ایک چلّو اپنے ہاتھ سے، پھر پی لیا سب نے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ

پھر جب پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ

جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے، بارہا

مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جمائے

أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ

رکھ ہمارے پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا

اور مار ڈالا داؤد نے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا اُن کو جو چاہا

يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ

اور اگر نہ ہوتا دفع کرا دینا اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتا ملک ۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

لیکن اللہ بہت مہربان ہے جہان کے لوگوں پر ۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اوپر کا قصہ اسی کی تمہید ہے، انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرا دیا، جس کا ذکر قبل کی آیت وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ میں آیا ہے، کہ فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے اختیار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ (اے مخاطب) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت، کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جس سے پہلے اُن پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہم (اُن کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبالی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیلاً بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی خلاف حکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب سزا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور اُن کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُن کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جسامت بھی بایں معنی ہے کہ موافق و مخالف کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دیدینا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کو شبہ ہو اور) جاننے والے ہیں (کہ کون لیاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لائے ہوئے) آجاوے گا جس میں تسکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی توراۃ اور توراۃ کا منجانب اللہ ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے لے آویں گے اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو، پھر جب (بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے لوگ جمع ہوگئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انھوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کرکے ساتھیوں سے) کہا کہ اب حق تعالیٰ (استقلالی و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے (جو راہ میں آوے گی اور تم شدتِ تشنگی کے وقت اُس پر گذرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط کے ساتھ) پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل حکم یہی ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے (تو اتنی رخصت ہے، غرض وہ نہر راستے میں آئی، پیاس کی تھی شدت) سو سب نے اس سے (بے تحاشا پینا شروع کردیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے (احتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے

چلو سے زیادہ نہ پیا ہوگا) سو جب طالوت اور جو مؤمنین اُن کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے (اور اپنے مجمع کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعضے آدمی آپس میں) کہنے لگے کہ آج تو (ہمارا مجمع اتنا کم ہے کہ اس حالت سے) ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سُنکر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالےٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، (اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب (دیارِ عمالقہ میں پہنچے اور) جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو (دعا میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غیب سے) نازل فرمایئے اور (مقابلہ کیوقت) ہمارے قدم جمائے رکھئے، اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے، پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طالوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جالوت کو قتل کر ڈالا (اور مظفر و منصور واپس آئے) اور (اس کے بعد) ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالےٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطاء فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا (جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا، آگے اس واقعہ کی مصلحتِ عامّہ فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمامتر) فساد سے پُر ہو جاتی، ولیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر (اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

۱۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عمالقہ ان پر مسلّط کر دیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، ـــــ اور جس نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔

۲۔ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی وہ

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وبا، اور بلاء آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے، اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ، اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں، اور اس وقت ایسوں کا اکھڑ جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا علیحدہ کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدّتِ پیاس کے وقت بے منت پانی ملنے پر ضبط کرنا دلیل استقلال کی اور اندھے باؤلوں کی طرح جا گرنا دلیل بے استقلالی کی ہے آگے خرقِ عادت ہے کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور از کار رفتہ ہو گئے، جیسا روح المعانی میں بسندِ ابن ابی حاتمؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے:۔ ناقص الایمان جو امتحان میں پورے نہ اُترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اُترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ آیتیں اللہ کی ہیں، ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

خلاصۂ تفسیر

چونکہ قرآن کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جس جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سُنا نہ دیکھا، ایک معجزہ ہے جو آپؐ کی نبوّت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوّت پر استدلال فرماتے ہیں:

نبوتِ محمدیہ پر استدلال	یہ (آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوتا ہی کہ) آپؐ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں ؎

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ

یہ سب رسولؐ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبرئیلؑ سے اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن اُن میں اختلاف پڑ گیا،

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن

اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

خلاصۂ تفسیر

بعض انبیاءؑ اور امتوں کے کچھ احوال

یہ حضرات مرسلین (جن کا ذکر ابھی اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسےٰ بن مریم (علیہ السلام) کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے فرمائی (ہر وقت یہود سے انکی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (اُمت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کرکے) باہم قتل وقتال نہ کرتے بعد اس کے کہ اُن کے پاس (امرِ حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضا تھا دین حق کے قبول پر متفق رہنا) ولیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں اتفاق

مذہبی نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو اُن میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں نوبت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ الآیہ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی دینا ہے، کیونکہ جب آپؐ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جسکو اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں بھی فرمایا ہے، اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپؐ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سنادی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان عام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں گو ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاءؑ بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تفضلوا بین انبیاء اللہ	"انبیاءؑ کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو"

نیز فرمایا:

لا تخیّرونی علیٰ موسیٰ۔	"مجھے موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو"

اور فرمایا:

لا اقول ان احدًا افضل من یونس بن متّٰی	"میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متّیٰؑ سے افضل ہے"

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دو، اس لئے کہ کسی نبیؑ کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاءؑ کی بعض پر فضیلت معلوم ہوگئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احدا افضل من یونس بن متیٰ اور لا تخیرونی علےٰ موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپؐ تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلادی گئی اور صحابہ کرامؓ سے آپؐ نے اس کا اظہار بھی فرما دیا (مظہری)

(۳) مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گو بلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۃ شوریٰ کی آیت مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ الخ (۴۲: ۵۱) جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ آشنائی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

خلاصۂ تفسیر

انفاق فی سبیل اللہ میں تعجیل کرنا، اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجاوے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز اعمالِ خیر کا بدل نہ ہوسکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اعمالِ خیر کی خرید کرو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو اپنے اعمالِ خیر دیدے) اور نہ (بلا اذنِ الٰہی کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے اعمالِ خیر کی تم کو حاجت نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعاتِ بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیتِ مالیہ و بدنیہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو)۔

معارف و مسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکامِ کثیرہ بیان فرمائے جن میں سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خرچ

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الٰہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور انفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا، وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الخ میں اول کا بیان تھا اور مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ الخ میں دوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طالوت سے اول کی تاکید ہوئی تو اب اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ انفاق مال پر بہت سے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی انفاق مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۥ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا نہیں پکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی

بِاِذْنِہٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا خَلْفَہُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں

مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

کر سکتے کسی چیز کا اس کی معلومات میں سے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُہُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے)

اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے وہ جانتا ہے ان (تمام موجودات) کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیۃ الکرسی کے خاص فضائل

یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات سے افضل فرمایا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمھیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد فی المسند)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہٗ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے باقی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، اس میں لفظ اَللّٰہُ اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں "وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے" لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابلِ عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لفظ حَیّ کے معنے عربی زبان میں ہیں "زندہ" اسمائے الٰہیہ میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ قیّوم، قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنے کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیّوم اور قیّام مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، انکے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیّوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہوسکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود وبقاء میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں! اس لئے کسی انسان کو قیّوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبدالقیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیّوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کے اسماء صفات میں حیّ وقیّوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم اعظم ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ہے، لفظ "سِنَۃٌ" سین کے زیر کے ساتھ، اُونگھ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور "نَوْمٌ" مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اونگھ اور نیند سب سے بری وبالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیّوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہٗ سارے آسمانوں، زمینوں اور ان میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت وفطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم وبصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہٗ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل ومثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں، نہ اُس کے لئے تکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور تکان وتعب اور اونگھ اور نیند سے بالاتر ہے۔

چوتھا جملہ ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ، اس کے شروع میں لفظ لَهٗ کا لام تملیک کے معنی کے لئے آیا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرماوے۔

پانچواں جملہ ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ، یعنی "ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے"، اس میں چند مسائل بیان فرمادیئے ہیں:

اوّل یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کسی کی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت وجلال میں کسی کو مجال دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدی جائیگی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش وشفاعت بھی نہ کرسکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ یعنی "اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات وواقعات سے واقف وباخبر ہے"، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات وواقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات وحالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہٗ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ہے، "یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصّہ کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہوسکتا ہے"، اس میں بتلا دیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہٗ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہوسکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ، یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں" اللہ جل شانہ نشست برخاست اور حیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایاتِ حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بدرجہا بڑے ہیں،

ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہے وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ یعنی "وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے"، پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ ہر عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سزاوار وہی ذات پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ

کرنے والوں کو اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶)

نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے

خلاصۂ تفسیر

دین (اسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اسلام کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کرلے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)

معارف و مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مامون رہتا ہو اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبولِ ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۵: ۶۴)	یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدانِ جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی اُن لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہوگئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا: "اَنَا عَجُوْزٌ کَبِیْرَۃٌ وَّالْمَوْتُ اِلَیَّ قَرِیْبٌ" یعنی میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟ حضرت عمرؓ نے یہ سنکر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے۔"

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہٰذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد و قتال آیت "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے معارض نہیں ہیں۔ (مظہری، قرطبی)

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِیْنَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ

کافر ہوئے اُن کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں اُن کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

ع ۳۴ ۲

خلاصہ تفسیر

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الیٰ قولہ) خٰلِدُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی یا جنی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔"

معارف و مسائل

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیمؑ سے اس کے رب کی بابت اس وجہ سے کہ دی تھی اللہ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ

نے اسکو سلطنت، جب کہا ابراہیمؑ نے میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا

کہا ابراہیمؑ نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾

بے انصافوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمتِ سلطنت پر احسان مانتا اور ایمان لاتا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جسکو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جسکو چاہوں قتل سے معاف کر دوں یہ جلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدی عقل کا ہے کہ اس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو، اور قرائن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھے گا نہیں، اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا اس کا مقتضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جما رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے، تا کہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے، دفع اس شبہ کا یہ ہو کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص پیغمبر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہو لیں، اور اسی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گذرا وہ ایک شہر پر اور وہ گر پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا کیونکر زندہ کرے گا

هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ

اس کو اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس پھر اٹھایا اس کو کہا تو کتنی

كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ

دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس

عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ

اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا، سڑ نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدھے کو

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں

نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

پھر اُن پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک

قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾

اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصۂ تفسیر

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ (الی قولہ) أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گذر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چھتیں گریں پھر اُن پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہوگئی تھی، اور سب آدمی مر مرا گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مُردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مُردوں کو جلادیں گے، مگر اس وقت کے جلانے کا جو خیال غالب ہوا تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہوگئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے ہوگا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلادیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو) سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنایہ ہے مدتِ قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی) چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا) نہیں سڑی گلی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر (کہ گل سڑ کر کیا حال ہوگیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ ہونے پر استدلال کر سکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر اُن پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدے سے) واضح ہوگئی تو (بے اختیار جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ

اور یاد کر جب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مردے، فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دل کو فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اُڑنے والے

فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر اُن کو ہلا لے اپنے ساتھ، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر اُن کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر اُن کو بلا،

يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶۰ۧ

چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصۂ تفسیر

اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مُردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہوسکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ آدمی کو اس کا شبہ ہوسکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان و یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کرکے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے اس سوال کے جواب میں اول) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے، انھوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے قلب کو (معین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہوجاوے (ذہن دوسرے احتمالات سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو،

(تاکہ اُن کی خوب شناخت ہو جاوے) پھر (سب کو ذبح کرکے اور ہڈیوں پروں سمیت ان کا قیمہ سا کرکے اس کے کئی حصے کر دو اور کئی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کرکے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہو کر) دوڑے دوڑے چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہؑ کی درخواست حیات بعد الموت کا مشاہدہ اور شبہات کا ازالہ

یہ تیسرا قصہ ہے جو آیتِ مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکونِ قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاءِ موتیٰ کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرما کر ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و خدشات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کرلیں، پھر اُن کو پاس رکھ کر ہلالیں کہ وہ ایسے ہل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کرکے اور ہڈیوں اور پروں سمیت اُن کا خوب قیمہ سا کرکے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمہ کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر اُن کو بلائیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پَر سے پَر، خون سے خون، گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آگئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیمؑ قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈالدونگا۔

قرآن کے الفاظ میں یَأْتِينَكَ سَعْيًا آیا ہے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اُڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اُڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہؑ کو دکھلا دیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرادیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کو یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعیدہ میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاءِ انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت و اپنی حیثیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابلِ قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔

حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود جہان کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کس کس خطۂ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشۂ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ

اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرما دیئے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جمع فرما دیئے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرما دینا اس کی قدرتِ کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے، جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرما دیا تھا۔

واقعۂ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات

آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک وشبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مُردوں کو زندہ کریں گے، اُن کی قدرتِ کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مُردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہؑ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور اطمینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسولؐ کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جاتے، اور اطمینان سکونِ قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقینِ کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیتِ احیاء کے متعلق تھا۔

دُوسرا سوال یہ ہو کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی اَوَلَمْ تُؤْمِنْ "یعنی کیا آپ کو یقین نہیں" فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا ؟

جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

انہی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بَری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بَلیٰ فرما کر افتراء پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہو کہ اس سوالِ ابراہیمیؑ سے کم ازکم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالمِ غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و اطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجۂ اطمینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیلؑ کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو ؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اطمینان ہو جو اولیاء اللہؒ اور صدیقینؒ کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام اطمینان ہو جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو جو درجۂ اطمینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہؑ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلےٰ درجۂ اطمینان جو مقامِ نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس اطمینان میں حضرت خلیل اللہؑ اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلےٰ مقام اطمینان ہے جو خاص خاص انبیاءؑ کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرورِ کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینانِ کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ، یعنی "اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں"، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرادیں، مگر پھر ایمان بالغیب کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگیں

سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ

سات بالیں ہر بالی میں سَو سَو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی ۙ لَّھُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے

اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمگین ہوں گے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَآ اَذًی ؕ وَاللّٰہُ

جواب دینا نرم اور درگذر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا اور اللہ بے پروا

غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ

ہے نہایت تحمل والا، اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا ہے اللہ

الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ

پر اور قیامت کے دن پر سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسا اس پر

وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ

زور کا مینہ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جو انہوں نے کمایا اور اللہ

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ

نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ ۭ بِرَبْوَةٍ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کر ایسی ہے جو ایک باغ ہے بلند زمین پر

اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

اس پر پڑا زور کا مینہ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر مینہ تو پھوار ہی کافی ہے،

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ

مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے نہریں اس کو اس باغ میں اور بھی سب

الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ

طرح کا میوہ ہو حاصل اور آ گیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد ہیں ضعیف تب آ پڑا اس باغ پر

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا، یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

تاکہ تم غور کرو۔

ع ۳۶ / ۴

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امورِ خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (عند اللہ) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سَو دانے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (بقدر اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ افزونی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی) جاننے والے (بھی) ہیں (اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا اُن کے پروردگار کے پاس (جاکر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و) مناسب بات کہہ دینا اور (اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلادے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگذر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچایا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں،

اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر (مراد اس سے بقرینہ نفی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی) بالکل صاف کر دے (اسی طرح اُس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے

روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے اُن کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچا دیے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمالِ صالحہ سہولت سے پیدا ہوا کریں پس ان لوگوں کے نفقات و صدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ لطافتِ ہوا اور بارش کے سبب اَور باغوں سے یا اَور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور موقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبرگیری کی نہیں ہوگی، بس وجہِ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اوّل صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہوگا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدارِ قبول ہوگا انہی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے احسان جتلانے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہوگئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوگیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطالِ طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۂ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کُل ۲۳ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح عامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے، جس میں آج کی دنیا چارسُو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رَدِّ عمل اشتراکیت اور اشتمالیت کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جسکو صدقہ وخیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔

ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ وخیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلقہ احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سُودی کاروبار کی حرمت و ممانعت، اور قرض اُدھار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اوپر لکھی گئی ہیں ان میں اوّل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا ہے اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ خیرات اللہ کے نزدیک قابلِ قبول اور موجبِ ثواب بنجائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہے جو انسان کے صدقہ وخیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنادیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک اُن نفقات وصدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں، دوسرے اُن نفقات وصدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایتاء الزکوٰۃ، ان الفاظ قرآنی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ خیرات اور رضائے الٰہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر حاوی ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایتاء الزکوٰۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں عام صدقات و مبرات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ایک مثال

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی حج میں یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور بیواؤں اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیز دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کا عمدہ زمین میں بوئے، اس دانہ سے گیہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گیہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہوگئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہوسکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گنے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب سات سو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیتِ صدقات کی مثبت شرائط

لیکن قرآن حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو یا یہ دانہ ضائع ہوجائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمالِ صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو،

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بدنیتی یا نام ونمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہوگئی، اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کرنے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب سے نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مسنون طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذاء پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہے، اور نہ گذشتہ پر کوئی رنج وغم۔

قبولیتِ صدقہ کی منفی شرائط اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل وخوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت وذلت محسوس کرے یا اس کو ایذاء پہنچے۔

تیسری آیت قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ میں بھی صدقات وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت وحقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذاء پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول ومناسب عذر پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلا دے تو اس سے درگذر کرنا ہزار درجے بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذاء پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی وحلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاقِ الٰہیہ کے تابع ہو کر عفو ودرگذر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برباد نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذاء پہنچا کر۔

اس سے واضح ہوگیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کالعدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھاوے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوئے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کردے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیتِ صدقہ و خیرات کی یہ شرط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلاوے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مؤمن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ "ریاء کاری" اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کردیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاقِ مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو دو چند، اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاصِ نیت اور رعایت شرائطِ مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کردی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب ثمرات آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ خیرات میں شرائطِ مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک بگولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جاوے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کرکے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھاپا آگیا، اس کے اولاد بھی ہے اور اولاد بھی چھوٹے بچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گذارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لُٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اُٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیں شدّتِ احتیاج کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کرکے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھاپا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگایا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہوگا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے ریاکاری سے صدقہ خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیالدار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پچھلی کمائی محفوظ ہو تاکہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال و متاع جل جائے تو اس کے دُکھ اور درد کی انتہا نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو ریا و نمود کے لئے کیا گیا تھا عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا رہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجتمند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام ونمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی:

اوّل اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام ونمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضامندی کے بند یا کم کرکے صدقہ وخیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجتمند وارثوں کو محروم کرکے سارے مال کو صدقہ وخیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کرکے مصرف کا انتخاب کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُو سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہے جو شریعت کی رُو سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّآ أَخۡرَجۡنَا

اے ایمان والو خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُم مِّنَ ٱلۡأَرۡضِۖ وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلۡخَبِيثَ مِنۡهُ تُنفِقُونَ وَلَسۡتُم

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

بِاٰخِذِيۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ‌ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ﴿۲۶۷﴾

اس کو کبھی نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ ہے خوبیوں والا،

اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ وَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ‌ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمۡ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بےحیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤۡتِى الۡحِكۡمَةَ مَنۡ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے سمجھ جسکو

يَّشَآءُ ‌ۚ وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ‌ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جسکو سمجھ ملی ہے اُس کو بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں

اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ‏ ﴿۲۶۹﴾ وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ

جو عقل والے ہیں، اور جو خرچ کروگے تم خیرات یا قبول کروگے کوئی منت تو

نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ‌ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنۡ تُبۡدُوا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اگر ظاہر کرکے دو

الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ‌ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيۡرٌ لَّكُمۡ‌ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ

بہتر ہے تمہارے حق میں اور دور کرے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ؕ

خوب خبردار ہے، تیرا ذمہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے جسکو چاہے،

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ

اور جو کچھ خرچ کروگے تم مال سو اپنے ہی واسطے جب تک کہ خرچ کروگے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللّٰهِ‌ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾

میں اور جو خرچ کروگے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا

خیرات اُن فقیروں کیلئے ہے جو رُکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

ملک میں سمجھے ان کو ناواقف مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے اُن کو

بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ

اُن کے چہرے سے، نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو کچھ خرچ کرو گے کام کی چیز وہ

اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہے ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ع ۳۷
۵

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (نیک کام میں) خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو) اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے (کام میں لانے کے) لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ (ویسی ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارے حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے، (کہ اگر خرچ کروگے یا اچھا مال خرچ کروگے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تم کو بُری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سبھی کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں (نیت کے موافق ثمرہ دیتے ہیں اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کا اخفار کرو اور (اخفاء کے ساتھ) فقیروں کو دیدو تب اخفار تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، (چونکہ بہت سے صحابہؓ کفار کو بایں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دور دراز اہتمام کئے جاویں) ولیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آویں، (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور (اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ) تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لوازم سے ہے اور یہ ہر حاجتمند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جاوے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو (آخرت میں) مل جاویگا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے، اور عوض ہر حال میں ملے گا پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے، صدقاتؐ اصل حق اُن حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، (اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃً) امکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف ان کو مالدار خیال کرتا ہے اُن کے

سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو اُن کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر و فاقہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی اُن کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کروگے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے اُن کی خدمت کا نفع زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلاتخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلاتخصیص حالات) سو اُن لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے روز) ان کے رب کے پاس (جاکر) اور نہ (اس روز) اُن پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا ہی) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اس سے قبل کے رکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اسی سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رکوع کی ساٹھ آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا (الیٰ قولہ) غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۔ شانِ نزول سے طیب کے معنے عمدہ کے کئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ طیب کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بناء پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی، اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بری نکمی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ مَا كَسَبْتُمْ اور اخرجنا اس کے موجود ہونے پر اور لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ، عمداً نکمی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو ہی نہیں وہ اس ممانعت سے بری ہے، اور اس کی وہ بری بھی مقبول ہے۔

لفظ مَا كَسَبْتُمْ سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جائز ہے، لقولہ علیہ السلام:

أَوْلَادُكُمْ مِنْ طَيِّبِ أَكْسَابِكُمْ فَكُلُوا مِنْ أَمْوَالِ أَوْلَادِكُمْ هَنِيئًا (قرطبی)	"تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پاکیزہ حصہ ہے پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔"

عشر اراضی کے احکام

مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ میں لفظ أَخْرَجْنَا سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے

عموم سے امام ابوحنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل وکثیر پیداوار پر عشر واجب ہو، سورۃ انعام کی آیت اٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (۶: ۱۴۱) وجوبِ عشر میں بالکل صریح اور واضح ہو، عشر وخراج شریعتِ اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہو کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہو فرق یہ ہے کہ عشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج خالص ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو عشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گذرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اموالِ تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عشر وخراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتبِ فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب "نظام الاراضی" میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان وہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (الیٰ قولہٖ) وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ، جب کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سُن کر بھی اس کی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدۂ الٰہی سے اعراض کر کے وعدۂ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہے کہ "شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا" اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ وخیرات سے گناہ بخشے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں، سب کے ظاہر و باطن نیت وعمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۔ لفظ حکمت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مفسرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تیس ہیں، مگر آخر میں فرمایا

کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، اِحکام بالکسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحر محیط میں آیت بقرہ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ (۲: ۲۵۱) جو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:

وَالْحِكْمَةُ وَضْعُ الْاُمُوْرِ فِيْ مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ وَكَمَالُ ذٰلِكَ اِنَّمَا يَحْصُلُ بِالنُّبُوَّةِ "حکمت کے اصلی معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت سے ہو سکتا ہے، اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت سے کی گئی ہے"۔

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کہیں جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین کہیں اصابتِ رائے اور کہیں خشیۃ اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں راس الحکمۃ خشیۃ اللہ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲: ۱۲۹) میں حکمت کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیر نظر يُؤْتِي الْحِكْمَةَ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط، ص ۳۲۰، ج ۲)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشاد قرآنی وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دیدی گئی اس کو خیر کثیر دیدی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ (الی قولہ) وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ، کسی قسم کے خرچ کرنے میں سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا انفاق میں ریاء شامل ہو یا انفاق کر کے اس پر احسان جتلانا ہو، یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عباداتِ مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں یا عبادتِ بدنیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفاء کیا گیا ہو یا نہ

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزا دیں گے، یہ اس لئے سُنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنا دی۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ۔ بظاہر آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سب میں اخفاء ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ریاء سے ابعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیتِ اخفاء سے آیت میں افضلیت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی عارض سے مثلاً رفع تہمت یا امیدِ اقتداء وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جاوے تو افضلیت فی نفسہٖ کے منافی نہیں، يُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ کفارۂ سیئات کچھ اخفاء کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں تجھے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدۂ عظیمہ ہے۔

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ (الیٰ قولہ) وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۝ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقۂ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ ۱: حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ ۲: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (الیٰ قولہ) فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ۝ یہاں فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا

اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)

تَعْرِفُهُمْ بِسِيمٰهُمْ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنار ہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے لیکن بغیر لپیٹ کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، اِنَّهُمْ مُتَعَفِّفُوْنَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ عِفَّةً تَامَّةً (قرطبی)

آٹھویں آیت اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں ان لوگوں کے اجرِ عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہی بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو۔ خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہی، کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

رُوح المعانی میں بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شانِ نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ

کھو دیئے ہوں جن نے لپٹ کر یہ حالت اُن کی اس واسطے ہوگی کہ انھوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہی سوداگری کو اور حرام کیا ہی سود کو، پھر جسکو پہنچی نصیحت اپنے رب کی

منزل اول

رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ

طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کیواسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے اور جو کوئی

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ

پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، مٹاتا ہے اللہ

الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

سود اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب اُن کا اُن کے رب کے پاس اور نہ اُن کو خوف ہے اور

لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا

نہ وہ غمگین ہوں گے ، اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو مہلت دینی چاہئے کشائش

مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ

اس دن سے جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اُن پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ سُود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنا دیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سُود کے ہے، (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی، اور لیا ہوا مال اسی کی ملک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کرلی ہے، یہ) خدا کے حوالے رہا، (اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سُن کر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف) پھر عود کرے تو (بوجہ اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور بوجہ اس کے کہ اُن کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن مآل کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہے، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن مآل کار اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں، (کبھی تو دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا، جیسا اوپر آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے اور اسی طرح پسند نہیں کرتے) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سُود کے مثل کبائر کا مرتکب ہو)۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا اُن کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے فوت ہونے سے) مغموم ہوں گے،

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جاتے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمھارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمھارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمھارا اصل مال بھی نہ دلایا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل معاف ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے تمھارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگذاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) ؛

معارف و مسائل

ان آیات میں ربا، یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربوٰ پر قرآن و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جزء لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں ربوٰ کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔

دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربوٰ ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل دماغوں کی پیداوار ہے ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصادی امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سب سے بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گمراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اُس پاگل و مجنون کی طرح اٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہلِ تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطبّاء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی، یا جنون مختلف اسباب سے ہوا کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پاگل یا مجنون ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و مجنون تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بکواس اور ہذیان اور دوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا مجنون ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزا میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا یہ سزا اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو "کھانے" کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جا سکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربٰو ہی کی مثل ہے، جس طرح ربٰو کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربٰو بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہے تو ربٰو بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرزِ بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا استہزاء کیا، کہ تم ربٰو کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربٰو کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہوسکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کرکے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک والملکوت اللہ جل شانہٗ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے بُرے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعۂ نظامِ عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم و خبیر کرسکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کرسکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہے۔

اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کرلی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کرلی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اُسی کی ہوگئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کرلی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔

اگر دل سے توبہ کی ہے تو عنداللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے، اور جو شخص نصیحت سُنکر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سودخوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں، یہاں سُود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سُود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجودہ مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کو مٹا دیتے ہیں، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کرنیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامۂ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔

سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربٰو اور سٹہ کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑپتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ کل کروڑپتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے،

اور اہلِ تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آکر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؒ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر محاق (یعنی گھاٹا) آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال ضائع و برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد اور برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد، نہ اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی، نہ گرمی سے بچنے کے لئے اوڑھا بچھایا جا سکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام دے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گذار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔

یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن ورم وغیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہے وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان مہیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے سہنے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، نوکر چاکر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ راحت

اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے، وہ سونے چاندی کے عوض حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی، ایک نیند کی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، ہوا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرنیچر دیدہ زیب دل خوش کن ہو، چارپائی اور گدے اور تکیے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا نیند کا آجانا ان سامانوں کے مہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کبھی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضہ سے نیند نہیں آتی، اب امریکہ جیسے مالدار متمدّن ملک کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دیدیتی ہیں، نیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر نیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لا سکتے، اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ اُن کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت ولذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کو دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آئیں گے، کہ اُن کو اپنے کھانے پہننے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا، کئی کئی مِل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، اُن کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دُور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اُن کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم مایہ لوگوں کی کم مائگی سے فائدہ اٹھائیں، اُن کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی کوئی عزت ووقار ہو، اپنے ملک کے بنیوں اور ملک شام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، اُن کے حالات کو دیکھ لیجئے، اُن کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جواہرات سے بھری ہوں، لیکن دنیا کے کسی گوشہ میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں اُن کی طرف سے بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے، اور آجکل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض ونفرت

کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ نے ہی دنیا میں اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریے پیدا کئے، کمیونزم کی تخریبی سرگرمیاں اسی بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دنیا قتل و قتال اور جنگ و جدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عزت کا ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی کبھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی نحوست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں، لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور اُن کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اوّل تو ان کی خوش حالی کا اجمالی خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردم خور دوسرے انسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جتھہ ایک محلہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقلمند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہے صرف اس محلہ کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا ہے جن کا خون چوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فربہ ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور مجموعی حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ اُن کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامان والوں سے زیادہ اطمینان اور سکونِ قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قلت ہے"	اِنَّ الرِّبٰوا وَاِنْ کَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَہٗ تَصِیْرُ اِلٰی قُلٍّ

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے، وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ، یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو" اس میں اشارہ فرما دیا ہو کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مؤمنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلی آیت میں سود خوروں کے لئے عذاب جہنم اور اُن کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، قرآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربٰو کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقمیں کسی کے ذمہ باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیاتِ مذکرہ سے پہلی آیتوں میں اس کی ممانعت آئی تو حسب عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقموں کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اُسیدؓ تھے، انھوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافتِ حکم لکھ بھیجا،

اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف راس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقمِ سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑتے ہیں تو اب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاهلیة موضوع عنکم کلّه لکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون واول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلّه، (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم) "یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رقم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کر سکے گا، اور سب سے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے عائد ہوتی تھیں"۔ قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے اوّل اِتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ قرآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے عائد شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا، اس کے بعد حکم دیا وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، یعنی اگر تم ایمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ

کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طبائع پر بھاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے اِتَّقُوا اللّٰہَ اور حکم کے بعد اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے ارشادات ملادیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سُن لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ، یعنی اگر تم توبہ کرلو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کرلو تو تمھیں تمھارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کرلو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کرلو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام ہی نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب تو یہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے نکل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بناء پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھ بنا کر حکومتِ اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورتِ شرط فرمایا گیا، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ، یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمھارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مساہلت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

ہوتا ہے، وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی اگر تمہارا مدیون تنگدست ہو، تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کردو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کرسکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کرکے سود در سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں احکم الحاکمین نے یہ قانون بنا دیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک مہلت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کردو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو قرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجبِ ثوابِ عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کردینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہے کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر قرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دو وجہ ہیں، اوّل تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت نکل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مقدار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے۔

اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا، اوّل تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آئی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو قرض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس قرآنی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مساہلت کی تعلیم کے لئے احادیثِ صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طبرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مقروض کے ساتھ نرمی اور مساہلت کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعادِ قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دُوگنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دُور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگدست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ "یعنی ڈرو اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا"۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک ربا کے احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، ربا کی حرمت و ممانعت پر قرآن کریم میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آلِ عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح قرآن حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و ربا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھدی جائے جو سورۂ آلِ عمرآن اور سورۂ نساء اور سورۂ روم میں آئی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر ربا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳: ۱۳۰)	"یعنی اے ایمان والو سود مت کھاؤ حصے سے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔"

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیتِ عرب میں سود خوری کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معیّن کے لئے اُدھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائگی نہ ہوئی تو سُود کی مقدار اور بڑھادی، یہ واقعہ عام کتبِ تفسیر میں بالخصوص لبابُ النقول میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے۔

جاہلیتِ عرب کی اس ملّت کُش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (یعنی کئی حصے زائد) فرماکر ان کے مروجہ طریقہ کی مذمت اور ملّت کُشی و خود غرضی پر تنبیہ فرماکر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعاف و مضاعف نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۂ بقرہ اور نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعاف مضاعف ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جا بجا فرمایا گیا ہے لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا "یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو"۔ اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیاتِ الٰہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر نکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مروجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب سود خوری کی عادت پڑجائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اضعاف مضاعف ہوجاتا ہی، کیونکہ جو رقم سُود سے حاصل ہو کر سود خور کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سُود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہوجائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً

ہوجائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف مضاعفہ بن کر رہے گا۔

اور سورۂ نساء میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۗ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴: ۱۶۱-۱۶۰)

یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو اُن کے لئے حلال تھیں اُن پر حرام کردیں، اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے ان لوگوں کیلئے جو اُن میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان مقرر کر رکھا ہے۔"

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی اُن کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے حرصِ دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کردیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرمادیں۔

اور سورۂ روم کے چوتھے رکوع کی اُنتالیسویں آیت میں ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ (۳۰: ۳۹)

"یعنی جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔"

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ربا اور زیادتی پر نظر کرکے اس آیت کو بھی سود بیاج پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر فرمائی ہے کہ سود بیاج کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر ورم ہوجائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے۔ لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص مادۂ فاسدہ کے اخراج کے لئے مسہل لیتا ہے، یا فصد کھلوا کر خون نکلواتا ہے، تو بظاہر وہ کمزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سود بیاج کی ممانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال اخلاص و نیک نیتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں نوتا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ (۷۴: ۶) "یعنی آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی"۔

اور سورۂ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی راجح معلوم ہوتی ہے، اوّل تو اس لئے کہ سورۂ روم مکی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت مکی ہو، مگر غالب گمان مکی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جا سکتا کہ حرمت سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی دوسری تفسیر ہی کا رجحان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے،

فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ (۳۰: ۳۸) "قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں"۔

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیتِ مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضاجوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہرحال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدر بہت سی آیتیں آئی ہیں، جن میں سے سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت میں اضعاف مضاعف سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضعاف مضاعف اور سود در سود ہو یا اکہرا سود، بہرحال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سُنایا گیا ہے۔

مسئلہ سُود و رِبا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آجکل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور عمود بن گیا ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت سامنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، خلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُلجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟

دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟

تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا سہی، لیکن آجکل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر قرآنی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا ایک مغالطہ کا جواب

اب سنئے کہ لفظ ربوا عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۂ نساء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہ تورات میں بھی معروف تھے، اور تورات میں بھی اس کو حرام

قرار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانۂ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف چلا آتا ہو اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے، اور قرآن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔

یہی وجہ ہو کہ جب ۸ھ ہجری میں سورۂ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابۂ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم دوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابۂ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیر مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۂ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لین دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکم شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے، تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا وہی ربا جسکو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمۂ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جسکو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی کا اختلاف ہوا۔

اب سنئے عرب کا مروجہ ربا کیا تھا ؟ امام تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا اور قرآن نے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل راس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے، اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہؒ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے (تفسیر ابن جریر ص ۶۲ ج ۳)

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابوحیان غرناطی کی تفسیر بحر محیط میں بھی جاہلیت کے رباء کی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اُتنا ہی سُود اس پر بڑھا دینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شراء میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھار دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہئے، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و رباء کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر، اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا: اَلرِّبٰوا فِی اللُّغَۃِ الزِّیَادَۃُ وَالْمُرَادُ بِہٖ فِی الْاٰیَۃِ کُلُّ زِیَادَۃٍ لَّا یُقَابِلُہَا عِوَضٌ (ص ۱۰۱ ج ۲) یعنی رباء کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض اُدھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ رباء کی دو قسمیں ہیں، ایک معاملاتِ بیع و شراء کے اندر رباء، دوسرے ادھار کا رباء، اور جاہلیتِ عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معیّن میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد معیّن پر ادائیگی نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھا دی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھا دیے، یہی جاہلیت کا رباء تھا، جس کو قرآن نے حرام کیا۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں رباء کے معنی یہ بیان فرماتے ہیں:

ھُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوْطُ فِیْہِ الْاَجَلُ وَزِیَادَۃُ مَالٍ عَلَی الْمُسْتَقْرِضِ	"یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا"

حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رباء کی تعریف یہ فرمائی ہے:

کل قرض جر نفعا فھو ربا	"یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے"

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام ربا ہے جو جاہلیتِ عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا جس کو قرآن کریم کی آیتِ مذکورہ نے صراحۃً حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصومات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال، نہ اس میں کسی کو کوئی اشتباہ واشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رِبا کے مفہوم میں بیع وشراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب رِبا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع وشراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی ربا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جو، کھجور اور انگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہؔ اور محاقلہ کے نام سے رائج تھیں آیاتِ ربا نازل ہونے کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں شامل قرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۷ ج ۱)

اس میں یہ بات قابلِ غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے، یا اُن کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخل ربا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا جس کی بناء پر فرمایا:۔

ان اٰیۃ الربٰوا من اٰخر ما نزل من القراٰن وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبض قبل ان یبینہ لنا فدعوا الربٰوا والریبۃ

(احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱، وتفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن ماجہ، ص ۳۲۸ ج ۱)

"یعنی آیتِ ربا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے، ربا کو تو چھوڑنا ہی ہے جس صورت میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے"۔

؎ مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے، اور محاقلہ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چونکہ کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، اس لئے اس کو منع کیا گیا ۱۲ منہ

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شرار کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیتِ عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظمؓ کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظمؓ کو ربا کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظامِ تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انھوں نے فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں رائے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربیؒ نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنھوں نے اس فاروقی ارشاد کی بنار پر آیاتِ ربا کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا:

اِنَّ مَنْ زَعَمَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَقَاطِعَ الشَّرِيْعَةِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ اِلٰى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ بِلُغَتِهِمْ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ كِتَابَهٗ تَيْسِيْرًا مِّنْهُ بِلِسَانِهٖ وَلِسَانِهِمْ وَالرِّبَا فِي اللُّغَةِ الزِّيَادَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِي الْاٰيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عِوَضٌ۔	یعنی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انہی کی زبان میں بھیجا، اُن پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں، اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔"

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک اُدھار کا ربا دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اور اہلِ جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شرار میں کمی زیادتی ربا میں داخل ہے۔

اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شرار کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراء کے اور زمانہ جاہلیت کا ربوا یہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور قرض اُدھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض اُدھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپؐ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراء میں کمی زیادتی یا اُدھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا قرض ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے لا ربا الا فی النسیئۃ (رواہ البخاری) یعنی ربا صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ اُدھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب حکماً ربوا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہوگئیں

اوّل یہ کہ نزولِ قرآن سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، قرض ادھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن میں حرمتِ ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرامؓ نے اس ربا کو ترک کردیا، اس کے معنے سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں برابری شرط ہے، کمی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں اُدھار

کرنا بھی ربا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسامِ بیع مزابنہ، محاقلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو صراحۃً ربا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہو؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرما دیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جہاں ربا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

چوتھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ربٰوا القرآن یا ربٰوا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں متعارف تھا یعنی قرض ادھار پر بحساب میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلافات امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملاتِ ربا میں ہوا، پہلی قسم کا رِبا جو رِبا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت محمدیہ میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو رِبا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلۂ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی ربا ہے، جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن و سنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلۂ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمتِ سود کی حکمت و مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اسکی ہو کہ ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی رُوحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخلوقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بچھو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہرِ قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں ؎

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتبِ فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرات زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے اجتناب لازم ہے۔

ربا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقلمند کے نزدیک قابلِ نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیرپا یا دائمی تو اس کو کوئی عقلمند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالئے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصانِ عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج پا جاتی ہے تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم ورواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے،
بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلتے ہوئے رسم ورواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندیِ رسم ورواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سود ربا اس زمانہ میں ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کرچکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑوے کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں وباء پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مضرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاحِ خلق کے ذمہ دار ہوکر آتے ہیں، وہ کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ماننے والا اُس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ وتعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟

سود ربا کو اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہوجانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہلِ علم وفن بھی کبھی رسم ورواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہوکر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سود ربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلقِ خدا اور تمام ملت فقر وفاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہئے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہو، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ، اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جاکر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محلہ میں لے جاکر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تازے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محلہ میں نہیں دوسرے محلوں میں جاکر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مُردے پڑے ہوئے ہیں، جن کا خون اور گوشت کھاکر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتھے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سود و ربا کی معاشی خرابیاں

سود و ربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابلِ نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں۔

پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہے، سود و ربا کے مہاجنی اور فرسودہ طریقہ میں تو ایسا بھونڈا پن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل والے کو بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس لئے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کرکے چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کرکے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنالیا ہے کہ سطحی نظر والوں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دکانوں کے مشترک کمپنیاں بنالی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلتِ سرمایہ کی بناء پر نہیں کرسکتے ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی سہی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کرکے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملّت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ ابلہ فریبی ہے جو شراب کی گندی بھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت فروشی کے اڈوں کو سنیماؤں اور شبینہ کلبوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلاف پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہوگئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہوگیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے مُنہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جُرم کا شریک کرلیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان فراہم کرلیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو سیونگ بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح اُن کے معاش کی کفالت نہیں کرسکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اوّل تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملّت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت سے دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے، اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں، ایک ہزار کی مالیت والے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھنے والا ہو نو لاکھ بنک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور فرض کر لیجئے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے ضروری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اُدھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو خام سامان جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسّر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آئی اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف اُن چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملّت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملّت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور دوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آجاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملّت کی گرہیں کھلوا لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملّت کا سرمایہ بنکوں کے ذریعہ کھینچ کر ان خود غرض لوگوں کی پرورش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بنتے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹال علیحدہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپیٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیارانہ طریق کار نے پوری قوم کو ایک مہلک بیماری لگا دی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا سمجھی۔

۳۔ بنکوں کے سود سے ملّت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھئے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بنک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو غور کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوّے فی صد نقصان پوری ملّت کا ہوا، جن کا سرمایہ بنک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بنک نے دیوالیہ کے نقصان کو سردست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بنک تو توم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملّت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوّے فی صد نقصان پوری ملّت پر پڑ گیا۔

۴۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سودخور جب گھاٹے میں آجائے تو پھر؛ پنپنے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کرسکے، نقصان کے وقت اس پر دوہری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور اوپر سے بنک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کبھی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقروض تو نہ ہوگا

۱۹۵۴ء میں پاکستان میں روئی کے بیوپار پر قرآنی ارشاد کے مطابق محاق کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی نحوست تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کاروبار میں بیشتر سرمایہ بنکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روئی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آگئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بنکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کردی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوّے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کرکے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بیچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بنکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہوجائے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خویش پروری اور ملت کُشی کی ایک اور چال

سود و ربا کی ملت کُشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیاری اور چالاکی دیکھئے کہ سودخوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیز کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی "سود کے مال میں محاق کی آفتیں آنا لازمی ہیں" جس کے نتیجہ میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سٹہ کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں، ایک کوئی آسمانی آفت کہ جہاز ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے یہ کہ سامان کا نرخ اس کی قیمتِ خرید سے کم ہوگیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سماوی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن انکی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہے کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی فرسودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، سَو میں ایک دو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہوگا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سٹہ کا بازار گرم کیا، اس سٹہ کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متأثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مالدار افراد کے اموال میں بے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بنتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر اُن کے ہاتھ میں آجاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس تو کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھادی یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ اُن کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہونچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فرضی اور جعلی بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفینوں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خُلاصَہ یہ ہے کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی مضرت ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوئی، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہوگئی کہ ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سمٹنے کا اصلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص افراد کی بے جا نفع اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسکو بند نہ کیا جائے اور اس کا رواج نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ تو فائدہ عوام کو بھی ملا، وہ کتنا ہی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر یہ بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو پہلے زمانہ میں تھا، کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزینوں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ اُن کو فائدہ ہو گا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے، اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجمد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہو گا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضۂ زکوٰۃ ایک حیثیت سے تجارت کی ترقی کا ضامن ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مضمر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے ہی

سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ والوں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غرباء فقراء کو فائدہ پہونچے گا۔

سود کی روحانی بیماریاں یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جوہر ایثار و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سودخوار اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچاتا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سودخوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور برے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی تجارت نہیں چل سکتی؟ ربا کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری بحث یہ باقی ہے کہ ربا کی معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہوگئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ ربا ہی تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر وباء کی صورت اختیار کرلے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں، البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ؕ (۲۲: ۷۸)	یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی ؛

اس لئے ضروری ہے کہ رباء سے اجتناب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہو، اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور ربا سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بنکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں، ربا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول از سرِ نو تجویز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں[1]، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر ربا کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیر و حاجتمند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورتِ زکوٰۃ و صدقات واجبہ موجود ہے، لیکن دین اور علمِ دین سے بےخبری اور بے پرواہی کا نتیجہ ہے جس نے آجکل نظامِ زکوٰۃ بھی معطل کر دیا ہے، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کرکے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکمِ الٰہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ رہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

---

[1] احقر نے چند علماء کے مشورہ سے بے سود بنکاری کا مسودہ ۶ عرصہ ہوا تیار کرکے بھی دیا تھا اور بنکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابلِ عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام تاجروں کی توجہ اس طرف نہ ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظوری حاصل نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فالی اللہ المشتکی ۱۲ منہ

اسلامی حکومتِ عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی بیت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس بیت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جا سکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جا سکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی دُکانیں کرا کر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے، کسی یوروپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظامِ زکوٰۃ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات وبا کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھ بیٹھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سُود کا کاروبار چھوڑ دینا معاشی و اقتصادی خودکشی کے مرادف ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتدبہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجّہ کے ساتھ اس کام کا تہیّہ نہ کرے افراد و احاد کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اوّل یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سُود کے منحوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں عملی گناہ میں تو کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علمی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی کیونکہ سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعترافِ جرم کا نتیجہ یہ ضرور رہتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیشِ نظر آخر میں چند روایاتِ حدیث اور ارشاداتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو انہی آیاتِ قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار رہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بناکر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح دیندار مسلمان جو رات کو تہجد اور ذکر اللہ میں گذاریں صبح جب دُکان یا کارخانہ میں پہونچیں تو انھیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سُود کے بارے میں رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایکؔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوؔسرے جادو کرنا، تیسرؔے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوؔتھے سود کھانا، پانچویںؔ یتیم کا مال کھانا، چھٹےؔ جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویںؔ کسی پاک دامن عورت پر تہمت باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی نہر دیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ نہر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ کا آدمی یہی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اُن دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی نہر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا (اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے) یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

③ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد و کاتب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ چکھنے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پینے کا عادی اور سُود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سُود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مالِ حرام سے بنا ہو اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سُود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ پھل کو قابلِ استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سُود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا رعب و غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر رعد و برق کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گذرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھُولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آرہے ہیں، میں نے جبرئیل امین ؑ سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک ؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مالِ غنیمت کی چوری ہے اور دوسرے سود کھانا (طبرانی)

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے یہ ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

ربا کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دنیوی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیثِ نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچنے سمجھنے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا

عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

سکھایا اس کو اللہ نے سو اس کو چاہئے کہ لکھ دے اور بتلاتا جاوے وہ شخص کہ جس پر قرض ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ

اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا

لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ

آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کارگذار اس کا انصاف سے اور گواہ کرو دو شاہد اپنے

مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند

مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا

کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک اُن میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری اور انکار

يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ

نہ کریں گواہ جس وقت بُلائے جاویں اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا

كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى

بڑا اس کی میعاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو

اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ

اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ لیتے دیتے ہو اس کو آپس میں تو تم پر

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ص

کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو،

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر

وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِن كُنتُمْ

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے ، اور اگر تم

عَلَىٰ سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم

سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہیے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا

کا تو چاہیے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رب ہے اسکا اور مت چھپاؤ

الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

۳۹ ع ۲ ۷

گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپاوے تو بے شک گنہگار ہے دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا (خواہ دام اُدھار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے وہ اُدھار ہو جیسے بیع سلم میں) ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس (کی یادداشت و دستاویز) کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کرکے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے) اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو (لکھنا) سکھلایا ہے، اس کو چاہیے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلادے اور) لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور ٹھہرا) اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معتوہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا پیر فرتوت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود (بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو، (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا، یا مثلاً دوسرے ممالک کا رہنے والا ہے اور زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوادے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کرلیا کرو (اور شرعاً اصل مدار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو، اور خالی دستاویز بدون گواہوں کے ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور سن کر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسّر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصّہ کو خواہ ذہن سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے)، بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہوجائے) اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دَین) کے (بار بار) لکھنے سے اُکتا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دَین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مضرّت) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کرلیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو مبیع پوری میرے پاس نہیں پہونچی) اور (جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے) کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کروگے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزاء دیں گے) اور اگر تم (دَین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحبِ حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

(اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کردے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مت کرو اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام

آیاتِ مذکورہ میں قانونِ معاملات جن کو آجکل کے قانون میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے تو اس وقت دنیا کا سب کار و بار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز مہیا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا:

إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ، یعنی "جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو"۔

اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، غیر معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، مہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہوسکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی وہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ، یعنی "یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے

والا انصاف کے ساتھ لکھے"۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ، یعنی لکھوا دے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے"، مثلاً سودا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوا دے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے"، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق عائد ہو وہ خفیف العقل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گونگا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا ولی لکھوا دے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور گونگے یا دوسری زبان بولنے والے کا ولی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنالے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ ولی دونوں معنے پر حاوی ہے۔

ضابطۂ شہادت کے چند اہم اصول

یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں، جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں

اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ مِنْ رِّجَالِكُمْ میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جا سکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بلا عذر شرعی انکار کرنا گناہ ہے اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت ہی احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اُکتائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلمبند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہوا دھار نہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کبھی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے مبیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں عدل و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہونچے آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شاہد بننے سے انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ، یعنی "کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے" یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے اُن کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں، پھر فرمایا وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ، یعنی "اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظامِ عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہوا اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اسی طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

رل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے، آج کی دنیا نے اس قرآنی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظامِ عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصلی اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بُلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بٹھائے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بیچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہے، ورنہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک عذاب سمجھنے اور مقدور بھر اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، قرآن حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصولِ صحیحہ کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے بیس اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور قرآن کریم کی عام عادت ہے کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوفِ خدا اور خوفِ روزِ جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیلِ حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوفِ خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلاف ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعتماد کے لئے کوئی چیز گروی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ "مقبوضۃ" سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شئے مرہونہ سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مرتہن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گنہگار ہے، دل کو اس لئے گنہگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اول ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

۴۴

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کروگے اپنے جی کی بات

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو

يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور (جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجالِ کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (عقائد فاسدہ یا اخلاقِ مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم و ارادہ کی) تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم (زبان و جوارح سے) ظاہر کروگے (مثلاً زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا یا اپنے تکبر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کر ہی ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دوسرے معاصی کے اُن کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد بجز کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اظہار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے اسمیں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جانتے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خبیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، شعبیؒ اور مجاہدؒ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)

اور عموم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں یہی ہے، اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گذرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے پختہ ارادہ کرلیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمرؓ منقول ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے ربّ عزّ وجل وعلیٰ سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مؤمن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمالنامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجمعِ عام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتبِ اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صرف وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمھیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مؤمنین کو معاف کردیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:-

اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ اَنْفُسُھَا مَا لَمْ یَتَکَلَّمُوْا اَوْ یَعْمَلُوْا بِہٖ (قرطبی)	اللہ تعالیٰ نے میری امت کو معاف کردیا ہے وہ جو اُن کے دل میں خیال آیا، جب تک اس کو زبان سے نہ کہا یا عمل نہ کیا ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث احکامِ دنیا کے متعلق ہے، طلاق، عتاق، بیع، ہبہ وغیرہ محض دل میں ارادہ کرلینے سے منعقد نہیں ہوجاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکامِ آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے، کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد اور ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیتِ مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد اور اختیار سے اپنے دل میں جماتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موانع پیش آجانے کی بناء پر اُن پر عمل نہیں کرسکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گذر چکا ہے، اور چونکہ آیتِ مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دونوں قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو سخت فکر و غم لاحق ہوگیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپؐ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہو اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، "یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی" صحابہ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا، لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، "یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا"

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اطمینان ہوگیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب ہی سے ہے، اخلاق صحیحہ تواضع، صبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حُبّ دنیا، حرص وغیرہ یہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قطعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائیگا اسی طرح اعمالِ باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورۃ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ قرآن کریم کی ایسی بڑی اور اہم سورۃ

ہے جس میں احکامِ الٰہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فروعی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمتِ شراب، ربا اور قرض، لین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام "سنام القرآن" بھی آیا ہے، یعنی قرآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے، سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کردی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے تو حیلہ جوئی کے ذریعہ بھی راہِ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ علیم و خبیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیبٌ حفیظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن کریم انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اوّل یا آخر میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا ایسا محافظ ان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ رات کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ

مان لیا رسول نے جو کچھ اُترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے

رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ

اے ہمارے رب نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ

إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس

لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۚ أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی ہمکو طاقت نہیں اور درگذر کر ہم سے اور بخش ہمکو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہے مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

کافروں پر

خلاصۂ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز (کے حق ہونے) کا جو اُنکے پاس اُنکے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسولؐ بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ (کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا اُن کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو نہ سمجھیں) اور اُن سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سُنا اور (اس کو) خوشی سے مانا ہم آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے، (یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس سے مراد امور غیر اختیاری نہیں بلکہ صرف امورِ اختیاریہ ہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی کو (احکام شرعیہ میں) مکلف نہیں بناتا (یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو اُن کے آنے کو حرام اور اُن کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ اُن پر عذاب رکھا) اے ہمارے رب ہم پر دارو گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں، اے ہمارے رب (ہماری یہ بھی درخواست

ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دنیا یا آخرت میں) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگذر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرفدار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

معارف و مسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہوجاتی ہیں، اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورۂ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانۂ خاص سے عطاء فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ، اسی لئے حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جس کو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۂ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا، ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں، لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں اکثر احکامِ شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کردیئے گئے ہیں، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی ہے، جنھوں نے اللہ جل شانہٗ کے تمام احکام پر لبیک کہا، اور تعمیل کے لئے تیار ہوگئے، اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کو پیدا ہوگیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل و رحمت بے حساب کا ذکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ؛ جو کہ تمھارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے اختیار و ارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کروگے اس کا

حساب ہوگا، غیر اختیاری وسوسہ اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظِ قرآن بظاہر عام تھے ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ سُنکر گھبرا اٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ واختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر اختیاری خیالات جو دل میں آجاتے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو عذاب سے نجات پانا سخت دشوار ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیش نظر آپؐ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا انتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تامل کرے تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام سُن کر یہ کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یعنی اے ہمارے پروردگار ہم نے آپ کا حکم سُنا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فرو گذاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمادے کیونکہ ہمارا سب کا آپ ہی کی طرف لَوٹنا ہے، صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا اگرچہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور وساوس سے بچنا تو سخت دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں، جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیکھئے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ "یعنی ایمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو ان کے پاس نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور اس میں بجائے آپؐ کا نام مبارک لینے کے لفظ رسول فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتشریف کو واضح کردیا، اس کے بعد فرمایا، وَالْمُؤْمِنُوْنَ، یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان واعتقاد ہے، اسی طرح عام مومنین کا بھی اعتقاد ہے، اور جو طرزِ بیان اس جملہ میں اختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علٰحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفس ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں لیکن درجاتِ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بنار پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُویت کی بنار پر۔

اس کے بعد اُس ایمان مجمل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیار صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس امت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرامؓ کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دُور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا، کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہوا تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی "اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے" اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات و وسوسے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مؤاخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہاتھ پیر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو اعمالِ ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری، جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا رعشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہونچ گئی، ان میں سب کو معلوم

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا افعال اختیاریہ کے ساتھ مخصوص ہیں افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلّف ہے نہ اُن پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بُرے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور مؤاخذہ صرف اختیاری افعال پر ہے، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کردی صحابہ کرامؓ کو اطمینان ہوگیا کہ غیر اختیاری وساوس و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بالواسطہ ہوجانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہوگیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیکی کی توفیق ہوجائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے والے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اوّل یہ بُرا طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہو رہا ہے۔

اس شبہ کا جواب ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب یا عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہونچا، بلکہ دوسرے کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجاد کیا ہوا اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیاری کا دخل ضرور ہے اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب جبھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطاء کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کیگئی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا "اے ہمارے پروردگار بھول چوک اور خطاء پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرما" پھر فرمایا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، "یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرمایئے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے،"

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کپڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔

سورۂ بقرہ تمام ہوئی و للہ الحمد اولہٗ و آخرہٗ و ظاہرہٗ و باطنہٗ و ھو المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

معارف القرآن

جلد

۲

سورۂ آل عمران و سورۂ نساء

پارہ ۳، رکوع ۹ تا پارہ ۶، رکوع ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی

دیباچۂ طبع اوّل

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ "معارف القرآن" کی جلد اول جس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل شائع ہو چکی ہے، اور بحمد اللہ توقع سے زیادہ مقبولیت کے آثار محسوس کئے گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جا رہی ہے، جس میں سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیات وہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزوں کا التزام کیا گیا ہے جو انشاء اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوگا۔

ایک تو یہ کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ "خلاصۂ تفسیر" میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" میں جو شروع میں خلاصۂ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کو پورا کا پورا لے لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے اُن کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ اس خلاصۂ تفسیر میں حضرتؒ نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمۂ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصۂ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامتؒ کا بھی آ گیا، اور ضروری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین "معارف القرآن" کے لئے دو مستند ترجمے مستقل سامنے آ جائیں گے، ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا، دوسرا خلاصۂ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا، باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

بندہ محمد شفیع
دار العلوم کراچی نمبر ۱۴
شعبان سنہ ۱۳۸۹ھ

۱ے دوسرے ایڈیشن میں جلد اوّل کو بھی ان امور کے مطابق کر دیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب معارف القرآن کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (مصحح)

فہرست مضامین معارف القرآن جلد دوم (سورۂ آلِ عمران و نساء)

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَانَ

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَانَ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَا اٰيَةٍ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۂ آل عمران مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں دو سو ۲۰۰ آیتیں اور بیس ۲۰ رکوع ہیں،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَيْكَ

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا، اتاری تجھ پر

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ

کتاب سچی تصدیق کرتی ہے اگلی کتابوں کی اور اتارا توریت اور

الْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝

انجیل کو اس کتاب سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے واسطے اور اتارے فیصلے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝

بیشک جو منکر ہوئے اللہ کی آیتوں سے ان کے واسطے سخت عذاب ہے،

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ

اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا، اللہ پر چھپی نہیں کوئی چیز

فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ

زمین میں اور نہ آسمان میں، وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے

فِی الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ

ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہے، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا زبردست ہے

الْحَكِيْمُ ۝۶

حکمت والا۔

ربطِ آیات — قرآن کریم کی تیسری سورت آل عمران کا پہلا رکوع ہے، پہلی سورت یعنی فاتحہ جو پورے قرآن کا خلاصہ ہے اس کے آخر میں صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کی گئی تھی، اس کے بعد سورۂ بقرہ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے گویا اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ سورۂ فاتحہ میں جو سیدھے راستہ کی دعا کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے قبول کر کے یہ قرآن بھیج دیا جو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے، پھر سورۂ بقرہ میں اکثر احکامِ شرعیہ کا اجمالی اور تفصیلی بیان آیا، جس کے ضمن میں جا بجا کفار کی مخالفت اور ان سے مقابلہ کا بھی ذکر آیا، آخر میں اس کو وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کے جملۂ دعائیہ پر ختم کیا گیا تھا، جس کا حاصل تھا کفار پر غلبہ پانے کی دعا، اس کی مناسبت سے سورۂ آل عمران میں عموماً کفار کے ساتھ معاملات اور ہاتھ اور زبان سے ان کے مقابلہ میں جہاد کا بیان ہے، جو گویا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کی تشریح و تفصیل ہے۔

خلاصۂ تفسیر

سورۂ آل عمران کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس مقصدِ عظیم کا ذکر ہے، جس کی وجہ سے کفر و اسلام اور کافر و مومن کی تقسیم اور باہمی مقابلہ شروع ہوتا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کی توحید ہے، اس کے ماننے والے مؤمن اور نہ ماننے والے کافر و غیر مسلم کہلاتے ہیں، اس رکوع کی پہلی آیت میں توحید کی عقلی دلیل مذکور ہے، اور دوسری آیت میں نقلی دلیل بیان فرمائی گئی ہے اس کے بعد کی آیت میں کفار کے کچھ شبہات کا جواب ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے، الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، اس میں لفظ الٓمّٓ تو متشابہاتِ قرآنیہ میں سے ہے، جس کے معنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہیں، جس کی تفصیل اس رکوع کی آخری آیتوں میں آتی ہے، اس کے بعد اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں مضمونِ توحید کو ایک دعوے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں۔

اس کے بعد لفظ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ سے توحید کی عقلی دلیل بیان کی گئی جس کی تشریح یہ ہے کہ عبادت نام ہے اپنے آپ کو کسی کے سامنے انتہائی عجز و ذلیل کرکے پیش کرنے کا، اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس کی عبادت کی جائے وہ عزت و جبروت کے انتہائی مقام کا مالک اور ہر اعتبار سے کامل ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے، اپنے وجود اور اس کی بقا میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا عزت و جبروت میں کیا مقام ہو سکتا ہے، اس سے بالکل واضح ہو گیا کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں نہ خود اپنے وجود کی مالک ہیں، ورنہ ہی اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں یا پانی اور درخت ہوں یا فرشتے اور پیغمبر ہوں، ان میں کوئی بھی لائق عبادت نہیں، لائق عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے زندہ موجود رہے اور ہمیشہ زندہ و قائم رہے گی، اور وہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں توحید کی نقلی دلیل بیان فرمائی گئی، ارشاد ہے، نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی توحید کا مضمون جو قرآن نے بیان کیا ہے یہ کچھ قرآن کی یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی تورات و انجیل وغیرہ کتابیں اور انبیاء اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب کا یہی دعویٰ اور یہی کلمہ تھا، قرآن مجید نے تو ان سب کی تصدیق کی ہے کوئی نیا دعویٰ پیش نہیں کیا، جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی الجھن ہو۔

آخری دو آیتوں میں توحید کی دلیل کا تکملہ حق تعالیٰ کی صفت علم و قدرت کے بیان سے کیا گیا ہے، کہ جو ذات علم محیط ازلی کی مالک ہے، اور جس کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے، وہی اس کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، ناقص علم اور محدود قدرت والے کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے :-

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں، اور وہ زندہ (جاوید) ہیں، سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں اور (اسی طرح) بھیجا تھا توریت اور انجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے، اور اسی سے قرآن کا ہدایت ہونا بھی لازم آگیا، کیونکہ ہدایت کا مصدق بھی

ہدایت ہے) اور اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کی تصدیق کے واسطے) بھیجے معجزات، بیشک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے، جو توحید پر دلالت کرتی ہیں ان کے لئے سزا سخت ہے، اور اللہ تعالیٰ صاحب (اور قدرت) والے ہیں، کہ بدلہ لے سکتے ہیں اور بدلہ لینے والے بھی ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے نہ کوئی چیز زمین میں اور نہ کوئی چیز آسمان میں (پس ان کا علم بھی نہایت کامل ہے) وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمہاری صورت (و شکل) بناتا ہے جس طرح چاہتا ہے (کسی کی کیسی صورت اور کسی کی کیسی صورت، پس ان کی قدرت بھی کامل ہے، حیات اور قیومیت اور علم اور قدرت جو کہ مہتمم صفات سے ہیں ان میں کامل طور سے بلا شرکت موجود ہیں جس سے ثابت ہو کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس (ذات پاک) کے (اور) وہ غلبہ والے ہیں (منکر توحید سے انتقام لے سکتے ہیں لیکن) حکمت والے بھی ہیں (کہ بمصلحت دنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے)

معارف و مسائل

توحید کی طرف دعوت
عام مسئلہ کا فیصلہ ہے

دوسری آیت میں جو حقیقت دین توحید کی پیش کی گئی ہے، تشریح اس کی یہ ہے کہ جس بات پر بہت سے انسان متفق ہوں خصوصاً جبکہ وہ مختلف ملکوں کے باشندے اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، اور درمیان میں سینکڑوں ہزاروں برس کا فاصلہ، اور ایک کی بات دوسرے تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس کے باوجود جو اٹھتا ہے وہی ایک بات کہتا ہے جو پہلے لوگوں نے کہی تھی، اور سب کے سب ایک ہی بات اور ایک ہی عقیدہ کے پابند ہوتے ہیں تو فطرت اس کے قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کی توحید کا مضمون انسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام لے کر آئے اور ان کے بعد ان کی اولاد میں تو مسلسل اس بات کا چلنا کچھ بعید نہ تھا، لیکن زمانہ دراز گزر جانے اور اولاد آدمؑ کے وہ تمام طریقے بدل جانے کے بعد پھر حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں، اسی چیز کی دعوت دیتے ہیں جس کی طرف آدم علیہ السلام نے لوگوں کو بلایا تھا، ان کے زمانہ دراز گزرنے کے بعد ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام ملک عراق و شام میں پیدا ہوتے ہیں، اور ٹھیک وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے سلسلہ کے انبیاء آتے ہیں، اور سب کے سب وہی ایک کلمۂ توحید بولتے ہیں، اور وہی دعوت دیتے ہیں، ان پر زمانہ دراز گزر جانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، اور آخر میں سید الانبیاء سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

۲

وہی دعوت لیکر تشریف لاتے ہیں۔

اب اگر ایک خالی الذہن انسان جس کو اسلام اور توحید کی دعوت سے کوئی بغض اور عناد نہ ہو سادگی کے ساتھ ذرا اس مسئلہ پر نظر ڈالے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں میں، مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے اور سب کے سب یہی کہتے اور بتلاتے چلے آئے، اکثر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا، زمانہ تصنیف و تالیف اور کتابت کا بھی نہ تھا، کہ ایک پیغمبر کو دوسرے پیغمبر کی کتابیں اور تحریریں مل جاتی ہوں، ان کو دیکھ کر وہ اس دعوت کو اپنا لیتے ہوں، بلکہ انہی میں ہر ایک دوسرے سے بہت قرنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے، اس کو اسباب دنیا کے تحت پچھلے انبیاء کی کوئی خبر نہیں ہوتی، البتہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پا کر ان سب کے حالات و کیفیات سے مطلع ہوتا ہے، اور خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کو اس دعوت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔

اب کوئی آدمی ذرا سا انصاف کے ساتھ غور کرے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ایک ہی بات کو بیان کریں تو قطع نظر اس سے کہ بیان کرنے والے ثقہ اور معتبر لوگ ہیں یا نہیں، اتنی عظیم الشان جماعت کا ایک ہی بات پر متفق ہونا ایک انسان کے لئے اس بات کی تصدیق کے واسطے کافی ہو جاتا ہے، اور جب انبیاء علیہم السلام کی ذاتی خصوصیات اور ان کے صدق و عدل کے انتہائی بلند معیار پر نظر ڈالی جائے تو ایک انسان یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا کلمہ صحیح اور ان کی دعوت حق اور فلاحِ دنیا و آخرت ہے۔

شروع کی دو آیتوں میں جو مضمون توحید کا ارشاد فرمایا گیا اس کے متعلق حدیث کی روایات میں ہے کہ بعض نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے مذہبی گفتگو جاری ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہ کی توحید کے ثبوت میں یہی دو دلیلیں باذنِ خداوندی بیان فرمائی جن سے نصاریٰ لاجواب ہوئے۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیتوں میں بھی اسی مضمون توحید کی تکمیل ہے، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم محیط کا بیان ہے جس سے کسی جہان کا کوئی ذرہ چھپا ہوا نہیں اور چوتھی آیت میں اس کی قدرت کاملہ اور قادر مطلق ہونے کا بیان ہے، کہ اس نے انسان کو بطنِ مادر کی تین اندھیریوں میں کیسی حکمت بالغہ کے ساتھ بنایا، اور ان کی صورتوں اور رنگوں میں وہ صنعتکاری فرمائی کہ اربوں انسانوں میں ایک کی صورت دوسرے سے

ایسی نہیں جو مستحق عبادت ہو، اس علم محیط اور قدرت کاملہ کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، اس کے سوا سب کے سب علم و قدرت میں یہ مقام نہیں رکھتے، اس لئے وہ لائق عبادت نہیں۔

اس طرح توحید کے اثبات کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی چار اہم صفات ان چار آیتوں میں آگئیں، پہلی اور دوسری آیت میں صفات حیات ازلی و ابدی اور قیومیت کا بیان ہوا، تیسری سے چھٹی آیت تک علم محیط اور قدرت کاملہ مطلقہ کا، اس سے ثابت ہوا کہ جو ذات ان چار صفات کی جامع ہو وہی عبادت کے لائق ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی

اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ

واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں سو جن کے دلوں

زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ

میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم

تَاْوِیْلِهٖ ج وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَالرّٰسِخُوْنَ

کرنے کی وجہ سے اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے اور مضبوط علم والے

وقف لازم

فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا یَذَّكَّرُ

کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں اور سمجھانے سے

اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾

وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے

ربطِ آیات

پچھلی چند آیتوں میں توحید باری تعالیٰ کا اثبات تھا، اس آیت میں توحید کے خلاف بعض شبہات کا جواب ہے، واقعہ اس کا یہ ہے کہ ایک وفد نجران کے کچھ نصاریٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مذہبی گفتگو شروع کی، آپ نے نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث کی تردید بڑی تفصیل سے فرما کر توحید باری تعالیٰ کو ثابت کیا، آپ نے اپنے دعوے پر اللہ تعالیٰ کی صفت حیاتِ دائمہ، قدرت کاملہ،

علم محیط اور قدرت تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے یکتا و منفرد ہونے سے استدلال کیا، اور یہ سب مقدمات نصاریٰ کو تسلیم کرنے پڑتے، جب توحید ثابت ہوگئی تو اسی سے تثلیث کے عقیدہ کا بطلان بھی ثابت ہوگیا۔ ان لوگوں نے قرآن کے ان الفاظ پر اپنے کچھ شبہات پیش کئے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کا روح اللہ یا کلمۃ اللہ ہونا مذکور ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شرکت الٰہیت ثابت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان شبہات کو ختم کردیا، کہ یہ کلمات متشابہات ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہیں جن کی حقیقت پر عوام مطلع نہیں ہوسکتے، عوام کے لئے ان الفاظ کی تحقیق میں پڑنا بھی روا نہیں، ان پر اس طرح ایمان رکھنا ضروری ہے کہ جو بھی ان سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے، مزید تفتیش اور کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں (اس) کتاب (یعنی قرآن) کا (یعنی جن کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو بھی ظاہر المعنی کے موافق بنایا جاتا ہے) اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں (یعنی ان کا مطلب خفی ہے، خواہ مجمل ہونے کی وجہ سے خواہ کسی نص ظاہر المراد کے ساتھ معارض ہونے کی وجہ سے) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے، (دین میں) شورش ڈھونڈھنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد) کے (غلط) مطلب ڈھونڈھنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مطلب حاصل کریں) حالانکہ اس کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا (یا اگر وہ خود قرآن یا حدیث کے ذریعہ سے صراحۃً یا اشارۃً بتلادیں، جیسے لفظ صلوٰۃ کی مراد صراحۃً معلوم ہوگئی، اور استواء علی العرش وغیرہ کی تاویل بعض کی رائے پر قواعد کلیہ سے معلوم ہوگئی، تو بس اسی قدر دوسروں کو بھی خبر ہوسکتی ہے، زیادہ معلوم نہیں ہوسکتا، جیسے مقطعات قرآنیہ کے الف لام میم وغیرہ کے معنی کسی کو معلوم نہیں ہوتے، اور بعض کی رائے پر استواء علی العرش کے معنی بھی معلوم نہیں ہوتے) اور اسی واسطے جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر اجمالاً یقین

رکھتے ہیں سب (آیتیں ظاہر المعنی بھی خفی معنی بھی) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں، (پس ان کے جو کچھ معنی اور مراد واقع میں ہوں وہ حق ہیں، اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہل عقل ہیں (یعنی عقل کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو مضر اور فضول قصہ میں نہ لگے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آیات محکمات اور متشابہات کا ذکر فرما کر ایک عام اصول اور ضابطے کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جس کے سمجھ لینے کے بعد بہت سے شبہات اور نزاعات ختم ہو سکتے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں، ایک قسم کو محکمات کہتے ہیں اور دوسری کو متشابہات۔

محکمات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر اور بین ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو، اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں ان کو متشابہات کہتے ہیں، (مظہری ج ۲)

پہلی قسم کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے اُمّ الکتاب کہا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری تعلیمات کا اصل اصول یہی آیات ہوتی ہیں جن کے معانی اور مفاہیم اشتباہ والتباس سے پاک ہوتے ہیں۔

اور دوسری قسم کی آیات میں چونکہ متکلم کی مراد مبہم اور غیر متعین ہوتی ہے اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہئے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے، اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات "محکمات" کے مخالف نہ ہو، اور کوئی ایسی تاویل اور توجیہ صحیح نہ سمجھی جائے گی، جو اصولِ مسلّمہ اور آیاتِ محکمہ کے خلاف ہو، مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کر دی کہ "اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ" (۴۳: ۵۹) ایسے ہی دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ" (۳: ۵۹)

ان آیات اور انہی کی مثل دوسری بہت سی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کی مخلوق ہیں، لہٰذا نصاریٰ کا ان کے بارے میں الوہیت اور ابنیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔

اب اگر کوئی شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے صرف کلمۃ اللہ

اور "روح منہ" وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنی لینے لگے جو محکمات قرآنیہ اور متواتر بیانات کے منافی ہوں تو یہ اس کی کجروی اور ہٹ دھرمی ہو جائے گی۔

کیونکہ متشابہات کی صحیح مراد صرف اللہ ہی کو معلوم ہے، وہی اپنے کرم و احسان سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے، لہذا ایسے متشابہات سے اپنی رائے کے مطابق کھینچ تان کر کوئی معنی نکالنا صحیح نہیں ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہوتے ہیں، وہ متشابہات کے بارے میں زیادہ تحقیق و تفتیش نہیں کرتے، بلکہ اجمالاً ایسی آیات پر ایمان لے آتے ہیں کہ یہ بھی اللہ کا برحق کلام ہے، اگرچہ اس نے کسی مصلحت کی وجہ سے ہم کو ان کے معانی پر مطلع نہیں فرمایا، درحقیقت یہی طریقہ سلامتی اور احتیاط کا ہے، اس کے برخلاف بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ محکمات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کی کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق معانی نکال کر لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں جو متشابہات کی تفتیش میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ان سے دور بھاگیں، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے۔ (بخاری ج ۲)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے، اول یہ کہ مال بہت مل جائے جس کی وجہ سے باہمی حسد میں مبتلا ہو جائیں اور کشت و خون کرنے لگیں، دوسری یہ کہ کتاب اللہ سامنے کھل جائے (یعنی ترجمہ کے ذریعہ سے عامی اور جاہل بھی اس کے سمجھنے کا مدعی ہو جائے) اور اس میں جو باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں یعنی متشابہات ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں حالانکہ ان کا مطلب اللہ ہی جانتا ہے، تیسری یہ کہ ان کا علم بڑھ جائے تو اسے ضائع کر دیں اور علم کو بڑھانے کی جستجو چھوڑ دیں (ابن کثیر بحوالہ طبرانی)

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ، راسخون فی العلم سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہیں جو قرآن وسنت کی اس تعبیر و تشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ اور اجماع امت سے منقول ہو، اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز محکمات کو مانتے ہیں، اور متشابہات

کے جو معانی ان کے فہم و ادراک سے باہر ہیں ان کو تاہ نظری اور قصور علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خدا کے سپرد کرتے ہیں وہ اپنے کمال علمی اور قوت بیانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل و عنایت کے طلبگار رہتے ہیں ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات ہی کے پیچھے لگی رہیں وہ محکمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں البتہ ایک قسم یعنی محکمات کے معانی ہمارے لئے معلوم کرنے مفید اور ضروری تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پوشیدہ نہیں رکھے، بلکہ کھول کھول کر بیان کردیئے، اور دوسری قسم یعنی متشابہات کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بیان نہیں فرمائے، لہٰذا ان کا معلوم کرنا بھی ہمارے لئے ضروری نہیں، ایسی آیات پر ایمان اجمالی لے آنا ہی کافی ہے، (مظہری ملخصاً)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹

اے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو جب تو ہم کو ہدایت کرچکا اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس سے رحمت تو ہی ہے سب کچھ دینے والا، اے رب ہمارے تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کچھ شبہ نہیں، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ

منزل ۱

ربطِ آیات پچھلی آیت میں حق پرستوں کے ایک کمال کا ذکر تھا کہ وہ باوجود علمی کمال رکھنے کے اس پر مغرور نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کرتے تھے، اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اُن کے دوسرے کمال کو بیان فرما رہے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ آپ ہم کو (حق کی طرف) ہدایت کرچکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے (وہ رحمت یہ ہے کہ راہِ مستقیم پر قائم رہیں)، بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں، اے ہمارے پروردگار (ہم یہ دعا کجی سے بچنے کی اور حق پر قائم رہنے کی کسی دنیاوی غرض سے نہیں مانگتے، بلکہ

محض آخرت کی نجات کے واسطے کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدان حشر میں) جمع کرنے والے ہیں اس دن میں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں (یعنی قیامت کے دن میں اور شک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف نہیں کرتے وعدہ کو (اس سے قیامت کا آنا ضروری ہے اور اس واسطے ہم کو اس کی فکر ہے)

معارف و مسائل

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت اللہ ہی کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے دل کو نیکی کی جانب مائل کر دیتے ہیں، اور جس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کے دل کو سیدھے راستے سے پھیر دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "کوئی دل ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو، وہ جب تک چاہتے ہیں اس کو حق پر قائم رکھتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں اس کو حق سے پھیر دیتے ہیں"

وہ قادر مطلق ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو دین پر قائم رہنے کی فکر ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اپنے اللہ سے استقامت کی دعا مانگتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ استقامت کی دعا مانگا کرتے تھے چنانچہ ایک حدیث میں ہے: یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ "اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ" (مظہری، ج ۲)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ
بیشک جو لوگ کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝ كَدَأْبِ آلِ
اللہ کے سامنے کچھ اور وہی ہیں ایندھن دوزخ کے جیسے دستور

فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ
فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے جھٹلائیں انہوں نے ہماری آیتیں کو پھر پکڑا ان کو

اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ لِلَّذِينَ
اللہ نے ان کے گناہوں پر اور اللہ کا عذاب سخت ہے کہہ دے کافروں کو

كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

کو کہ اب تم مغلوب ہوگے اور ہانکے جاؤگے دوزخ کی طرف اور کیا برا ٹھکانا ہے

خلاصۂ تفسیر

بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں ہرگز ان کے کام نہیں آسکتے ان کے مال (و دولت) اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی اور ایسے لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے (ان لوگوں کا معاملہ ایسا ہے) جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے کافر لوگوں کا (وہ معاملہ یہ تھا) کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو (یعنی خبر و احکام کو) جھوٹا بتلایا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر داروگیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب اور اللہ تعالیٰ کی داروگیر بڑی سخت ہے، کیونکہ ان کی شان یہ ہے کہ وہ سخت سزا دینے والے ہیں (اسی طرح معاملہ ہوگا کہ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی، ان کو بھی ایسی ہی سزا ہوگی اور) ان کفر کرنے والے لوگوں سے (یوں بھی) فرما دیجئے کہ (تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ داروگیر صرف آخرت میں ہوگی، بلکہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہوگی، چنانچہ دنیا میں) عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کئے جاؤ گے، اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کرکے لے جائے جاؤ گے، اور (جہنم) ہے برا ٹھکانا۔

معارف ومسائل

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ، ممکن ہے کوئی اس آیت سے یہ شبہ کرے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مغلوب ہوں گے، حالانکہ سب کفار دنیا سے مغلوب نہیں ہیں لیکن یہ شبہ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ یہاں کفار سے مراد تمام دنیا بھر کے کفار نہیں ہیں، بلکہ اس وقت کے مشرکین اور یہود مراد ہیں، چنانچہ مشرکین کو قتل و قید اور یہود کو قتل و قید کے ساتھ جزیہ اور جلاوطنی کے ذریعہ مغلوب کیا گیا تھا۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ

ابھی گذر چکا ہے تمہارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں میں جن میں مقابلہ ہوا، ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی

اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ۭ

راہ میں اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں یہ ان کو اپنے سے دوچند صریح آنکھوں سے،

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے اسی میں عبرت ہے دیکھنے

لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⓭

والوں کو

ربط آیات پچھلی آیت میں کفار کے مغلوب ہونے کی خبر دی گئی تھی اب اس آیت سے اس کی ایک مثال بطور دلیل کے بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

بیشک تمہارے (استدلال کے) لئے بڑا نمونہ ہے دو گروہوں (کے واقعہ) میں جو کہ باہم (بدر کی لڑائی میں) ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تھے، ایک گروہ تو (یعنی مسلمان) اللہ کی راہ میں لڑتے تھے اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے (اور کافر اس قدر زیادہ تھے کہ) یہ کافر (اپنے گروہ) کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصے (زیادہ) ہیں (اور دیکھنا بھی کچھ وہم و خیال کا نہیں بلکہ) کھلی آنکھوں دیکھنا (جس کے واقعی ہونے میں شبہ نہیں تھا، لیکن کفار کے باوجود اس قدر زیادہ عدد ہونے کے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا) اور (غالب اور مغلوب کرنا محض قبضۂ خداوندی میں ہے) اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیدیتے ہیں، سو بلاشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور [illegible] ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں جنگ بدر کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جس میں کفار تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے، دوسری طرف مسلمان مجاہدین

تین سو سے کچھ اوپر تھے جن کے پاس کل ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں، اور تماشہ یہ تھا کہ ہر ایک فریق کو حریف مقابل اپنے سے دوگنا نظر آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کفار کے دل مسلمانوں کی کثرت کا تصور کر کے مرعوب ہو رہے تھے، اور مسلمان اپنے سے دوگنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور کمال توکل و استقلال سے خدا کے وعدہ "اِن یَّکُن مِّنکُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغلِبُوا مِائَتَینِ" (۸: ۶۶) پر اعتماد کر کے فتح و نصرت کی امید رکھتے تھے، اگر ان کی پوری تعداد جو تین گنی تھی منکشف ہو جاتی تو ممکن تھا خوف طاری ہو جاتا، اور یہ فریقین کو دوگنی تعداد دکھلانا بعض احوال میں تھا ورنہ بعض احوال وہ تھے جب ہر ایک کو دوسرے فریق کی جمعیت کم محسوس ہوئی، جیسا کہ سورۂ انفال میں آئے گا۔

بہرحال ایک قلیل اور بے سروسامان جماعت کو ایسی مضبوط جمعیت کے مقابلے میں ان پیشین گوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں اس طرح کامیاب کرنا آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرتناک واقعہ ہے (فوائد علامہ عثمانی)۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ

فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں اور بیٹے اور

الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ

خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے

الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

نشان لگائے ہوئے اور مویشی اور کھیتی یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ

اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانا تو کہہ کیا بتاؤں میں تم کو اس سے

ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

بہتر پرہیزگاروں کے لئے اپنے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ

ہیں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور عورتیں ہیں ستھری اور رضامندی

مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ

اللہ کی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے

اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ

ہم ایمان لے آئے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے وہ صبر کرنے والے ہیں

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ

اور سچے اور حکم بجا لانے والے اور خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے

بِالْاَسْحَارِ

پچھلی رات میں

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات پچھلی آیتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور ان کے مقابلہ میں جہاد کا ذکر تھا، ان آیات میں مشرکین و یہود کی مخالفت اور تمام بداعمالیوں کی اصل منشاء کو بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ حُبِ دنیا ہے، کوئی جاہ و مال کے لالچ میں حق کی مخالفت اختیار کرتا ہے، کوئی نفسانی خواہشات کی وجہ سے اور کوئی اپنی آبائی رسوم کی محبت کے سبب حق کے مقابلہ پر کھڑا ہوجاتا ہے، اور ان ساری چیزوں کا خلاصہ ہے حُبِ دنیا، مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:۔

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے یا دوسرے مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی کی چیز) تو اللہ ہی کے پاس ہے (جو بعد موت کے کام آوے گی جس کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے، آپ (ان لوگوں سے یہ) فرما دیجئے کیا میں تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان (مذکورہ) چیزوں سے (سو سنو) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک حقیقی کے پاس ایسے باغ ہیں (یعنی بہشت) جن کے پائین میں نہریں جاری ہیں ان (بہشتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، (اور ان کے لئے) ایسی بیبیاں ہیں جو (ہر طرح) صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لئے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے (بھالتے) ہیں بندوں (کے حال) کو (اس لئے ڈرنے والوں کو یہ نعمتیں دیں گے، آگے ان ڈرنے والوں کی بعض

تفصیلی صفات ذکر کی جاتی ہیں (یعنی) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے، اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے (اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور (اللہ تعالیٰ کے سامنے) فروتنی کرنے والے ہیں، اور (نیک کاموں میں مال کے) خرچ کرنے والے ہیں، اور اخیر شب میں (اٹھ اٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

دنیا کی محبت فطری ہے مگر اس میں غلو مہلک ہے

حدیث میں ارشاد ہے: "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ" یعنی دنیا کی محبت ہر برائی کا سرچشمہ ہے، پہلی آیت میں دنیا کی چند اہم مرغوب چیزوں کا نام لے کر بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں، جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر انسانی رغبت و محبت کا مرکز ہیں، جن میں سب سے پہلے عورت کو اور اس کے بعد اولاد کو بیان کیا گیا ہے، کیونکہ دنیا میں انسان جتنی چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے ان سب کا اصلی سبب عورت یا اولاد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد سونے چاندی اور مویشی اور کھیتی کا ذکر ہے، کہ یہ دوسرے نمبر میں انسان کی رغبت و محبت کا مرکز ہوتے ہیں۔

خلاصہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دلوں میں ڈال دی ہے، جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر انسان طبعی طور پر ان چیزوں کی طرف مائل اور ان سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، کسی کو کیا غرض تھی کہ کھیتی کرنے کی مشقت اٹھاتا، یا مزدوری و صنعت کی محنت برداشت کرتا، یا تجارت میں اپنا روپیہ اور محنت صرف کرتا، دنیا کی آبادی اور بقا اس میں مضمر تھی کہ لوگوں کی طبائع میں ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی جائے جس سے وہ خود بخود ان چیزوں کے مہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں پڑ جائیں، صبح اٹھ کر مزدور اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ کچھ پیسے کمائے، مالدار اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ پیسے خرچ کر کے کوئی مزدور لائے جس سے اپنا کام نکالے، تاجر بہتر سے بہتر سامان مہیا کر کے گاہک کے انتظار میں بیٹھتا ہے کہ پیسے حاصل کرے، گاہک سو کوششیں کر کے پیسے لیکر بازار پہنچتا ہے کہ اپنی ضرورت کا سامان خریدے، غور کیا جائے تو سب کو دنیا کی انھیں مرغوبات کی محبت نے اپنے اپنے

گھر سے نکالا، اور دنیا کے تمام نعمتوں کو جنت مقصود تک وصول پر قائم کر دیئے۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر دنیوی نعمتوں سے رغبت و محبت انسان کے دل میں نہ ہو تو اس کو اخروی نعمتوں کا مزہ کہ معلوم ہوگا نہ اُن میں رغبت ہوگی تو پھر اس کو کیا ضرورت کہ وہ نیک اعمال کی کوشش کرکے جنت حاصل کرے اور بُرے اعمال سے پرہیز کرکے دوزخ سے بچے

تیسری حکمت اور وہی اس جگہ زیادہ قابل نظر ہے یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں پیدا کرکے انسان کا امتحان لیا جاوے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہوکر آخرت کو بھلا بیٹھتا ہے، اور کون ہے جو ان چیزوں کی اصل حقیقت اور ان کے آنی فانی ہونے پر مطلع ہوکر ان کی قدر بقدر ضرورت کرے، اور ان کو آخرت کی درستی کے کام میں لگائے، قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام میں خود اس تزیین کی یہی حکمت بتلائی گئی ہے ارشاد ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸: ۷)	"یعنی ہم نے بنایا جو کچھ زمین پر ہے زمین کی زینت، تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے"

اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ دنیا کی ان مرغوب چیزوں کو انسان کے لئے مزین کردینا بھی ایک فعل خداوندی ہے، جو بہت سی حکمتوں پر مبنی ہے، اور بعض آیات جن میں اس قسم کی تزیین کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ (۸: ۴۸) ان میں ایسی چیزوں کی تزیین مراد ہے جو شرعاً اور عقلاً بُری ہیں، یا تزیین کا وہ درجہ مراد ہے جو حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے بُرا ہے، ورنہ مباحات کو مزین کردینا مطلقاً بُرا نہیں، بلکہ اس میں بہت سے فوائد بھی ہیں، اسی لئے بعض آیات میں اس تزیین کو صراحۃً حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے ابھی بیان کیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دنیا کی لذیذ اور مرغوب چیزوں کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و حکمت سے انسان کے لئے مزین فرما کر ان کی محبت اس کے دل میں ڈال دی، جس میں بہت سی حکمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا امتحان لیا جائے کہ ان سرسری اور ظاہری مرغوبات اور اس کی چند روزہ لذت میں مبتلا ہونے کے بعد وہ اپنے اور ان سب چیزوں کے رب اور خالق و مالک کو یاد رکھتا ہے، اور ان چیزوں کو اس کی معرفت اور محبت کا ذریعہ بناتا ہے یا انہی کی محبت میں اُلجھ کر اصل مالک و خالق کو اور آخرت میں اس کے سامنے پیشی اور حساب و کتاب کو بھلا بیٹھتا ہے، پہلا آدمی وہ ہے جس نے دنیا سے بھی فائدہ اٹھایا

اور آخرت میں بھی کامیاب رہا، دنیا کی مرغوبات اس کے لئے سنگِ راہ بننے کے بجائے سنگِ میل بن کر فلاحِ آخرت کا ذریعہ بن گئیں، اور دوسرا شخص وہ ہے جس کے لئے یہی چیزیں حیاتِ آخرت کی بربادی اور دائمی عذاب کا سبب بن گئیں، اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ چیزیں دنیا میں بھی اس کے لئے عذاب ہی بن جاتی ہیں، قرآن کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ۹: ۵۵،

"یعنی آپ ان کافروں کے مال اور اولاد سے متعجب نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو مال و اولاد دینے سے ان کا بھلا نہیں بلکہ ان کو دنیا اور آخرت میں ان کے لئے عذاب ہی بنیں گے

یہی دنیا میں بھی رات دن کی فکروں اور مشاغل کے باعث عذاب ہی بن جاتے ہیں"۔

الغرض دنیا کی جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے مزین اور مرغوب بنا دیا ہے شریعت کے مطابق اعتدال کے ساتھ ان کی طلب اور ضرورت کے موافق ان کو جمع کرنا دنیا و آخرت کی فلاح ہے، اور ناجائز طریقوں پر ان کا استعمال یا جائز طریقوں میں اتنا غلو اور انہماک جس کے سبب آخرت سے غفلت ہو جائے باعثِ ہلاکت ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی کیا اچھی مثال بیان فرمائی ہے

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

یعنی دنیا کا ساز و سامان پانی کے مانند ہے، اور اس میں انسان کا قلب ایک کشتی کی طرح ہے، پانی جب تک کشتی کے نیچے اور اِرد گرد ہے تو کشتی کے لئے مفید اور معین اور اس کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے والا ہے، اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو یہی کشتی کی غرقابی اور ہلاکت کا سامان ہو جاتا ہے، اسی طرح دنیا کے مال و متاع جب تک انسان کے دل میں غلبہ نہ پائیں اس کے لئے دین و دنیا میں معین و مددگار ہیں، اور جس وقت اس کے دل پر چھا جائیں تو دل کی ہلاکت ہیں، اسی لئے آیتِ متذکرہ میں چند خاص مرغوبات دنیا کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ "یعنی یہ سب چیزیں دنیوی زندگی میں صرف کام چلانے کے لئے ہیں، دل لگانے کے لئے نہیں، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا، یعنی وہ ٹھکانا جہاں ہمیشہ رہنا ہے، اور جس کی نعمتیں اور لذتیں نہ فنا ہونے والی ہیں نہ کم یا ضعیف ہونے والی۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کو مزید توضیح کرنے کے لئے فرمایا:

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد ہے کہ آپ ان لوگوں سے جو دنیا کی ناقص و فانی نعمتوں میں مست ہو گئے ہیں فرما دیجئے کہ میں تمہیں اس سے بہت بہتر نعمتوں کا پتہ دیتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں اور اس کے فرمانبرداروں کو ملیں گی، وہ نعمتیں سرسبز جنت ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور ہر قسم کی گندگی سے پاک صاف بیبیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، پچھلی آیت میں دنیا کی چھ بڑی نعمتوں کو شمار کیا گیا تھا کہ لوگ ان کی محبت میں مست ہیں، یعنی عورتیں، اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیر اور عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، ان کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں میں بظاہر تین چیزوں کا بیان آیا، اول جنت کے سرسبز باغات، دوسرے پاک صاف عورتیں، تیسرے رضائے خداوندی، باقی چیزوں میں سے اولاد کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ دنیا میں تو انسان اولاد کی محبت اس لئے کرتا ہے کہ اولاد سے اس کو اپنے کاموں میں مدد ملتی ہے، اور اس کے بعد اس سے اس کا نام زندہ رہتا ہے، آخرت میں نہ اس کو کسی کی مدد کی ضرورت رہے گی، نہ یہ فکر ہوگی کہ اپنے بعد کے لئے کسی ولی و وارث کی تلاش ہو، اس کے علاوہ دنیا میں جس کی اولاد ہے وہ سب اس کو جنت میں مل جائے گی، اور جس کی اولاد دنیا میں نہیں ہے اس کو اول تو آخرت میں اولاد کی خواہش ہی نہیں ہوگی، اور کسی کو خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ بھی دیدیں گے، جامع ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی جنتی کو اولاد کی خواہش ہوگی تو بچہ کا حمل پھر ولادت، پھر اس کا بڑا ہو جانا یہ سب تھوڑی دیر میں ہو جائے گا، اور اس کا مقصد پورا کر دیا جائے گا۔

اسی طرح جنت میں سونے چاندی کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ دنیا میں تو سونا چاندی اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے بدلے میں دنیا کا سامان خریدا جاتا ہے، اور ہر ضرورت کی چیز اسی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، آخرت میں نہ کسی خرید و فروخت کی ضرورت رہے گی، نہ کسی چیز کا معاوضہ دینے کی ضرورت، بلکہ جس چیز کو جنتی کا دل چاہے گا، وہ فوراً مہیا کر دی جائیگی اس کے علاوہ جنت میں خود بھی سونے چاندی کی کمی نہیں، کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ جنت کے بعض محلات ایسے ہوں گے جن کی ایک اینٹ سونے کی اور دوسری چاندی کی ہوگی، بہرحال آخرت کے لحاظ سے وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں سمجھی گئی۔

اسی طرح گھوڑوں کا کام دنیا میں تو یہ ہے کہ ان پر سواری کرکے مسافتِ سفر قطع کی جائے، وہاں نہ سفر کی ضرورت نہ کسی سواری کی، البتہ احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ اہل جنت کو جمعہ کے روز عمدہ گھوڑے سواری کے لئے پیش کئے جائیں گے جن پر سوار ہو کر اہل جنت اپنے اعزہ و احباب سے ملاقات کے لئے جایا کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہاں گھوڑے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، جس کو ذکر کیا جائے، اسی طرح مویشی جو کھیتی کا کام دیتے ہیں یا دودھ کا، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے جنت میں بغیر ان مویشی کے واسطے کے خود عطا فرمادی ہیں۔

یہی حال کھیتی کا ہے کہ دنیا میں تو کھیتی کی مشقت مختلف اجناس کے پیدا کرنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے جنت میں یہ ساری اجناس خود بخود مہیا ہوں گی، وہاں کسی کو کھیتی کی ضرورت ہی کیا ہوگی، اور کسی کو خواہ مخواہ کھیتی ہی سے محبت ہو تو اس کے لئے یہ بھی ہو جائے گا، جیسا کہ طبرانی کی بعض روایات حدیث میں ہے کہ اہل جنت میں سے ایک شخص کھیتی کی تمنا کرے گا تو سارا کھیتی کا سامان جمع کر دیا جائے گا، پھر کھیتی کا بونا، اگنا، پکنا اور کاٹنا یہ سب چند منٹ میں ہو کر سامنے آجائے گا، اس لئے نعمائے آخرت میں صرف جنت اور جنت کی حوروں کا ذکر کر دینا کافی سمجھا گیا، کیونکہ اہل جنت کے لئے قرآن کریم میں یہ وعدہ بھی ہے کہ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ (۴۳: ۷۱)، یعنی ان کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے، اس جامع اعلان کے بعد کسی خاص نعمت کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن ان میں سے چند مخصوص نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا جو ہر جنتی کو بے مانگے ملیں گی، یعنی جنت کے سرسبز باغات اور حسین جمیل عورتیں اور ان جامع نعمتوں کے بعد ایک سب سے بڑی نعمت کا ذکر کیا گیا، جس کا عام طور پر انسان کو تصور بھی نہیں ہوتا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا و خوشنودی ہے جس کے بعد ناراضی کا خطرہ نہیں رہتا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب سب اہل جنت جنت میں پہنچ کر مسرور و مطمئن ہو چکیں گے، اور کوئی تمنا نہ رہے گی جو پوری نہ کر دی گئی ہو تو اس وقت حق تعالیٰ خود اہل جنت کو خطاب فرمائیں گے کہ اب تم راضی اور مطمئن ہو، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟ وہ عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار آپ نے اتنی نعمتیں عطا فرمادی ہیں کہ اس کے بعد اور کسی چیز کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب میں تم کو ان سب نعمتوں سے بالاتر ایک اور نعمت دیتا ہوں، وہ یہ کہ تم سب کو میری رضا اور قرب دائمی طور پر حاصل ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں، اس لئے نعمائے جنت کے سلب ہو جانے کا یا کم ہو جانے کا بھی خطرہ نہیں۔

۳

انہی دو آیتوں کا خلاصہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الدُّنیا ملعونۃ وملعونٌ ما فیھا الّا ما ابتغی بہ وجہ اللہ وفی روایۃ الا ذکر اللہ وما والاہ او عالم او متعلما	"دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے بجز ان چیزوں کے جن کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ بجز ذکر اللہ کے اور اس چیز

کے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور بجز عالم اور طالب علم کے"

یہ حدیث ابن ماجہ اور طبرانی نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل فرمائی ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی

قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ

وہی حاکم انصاف کا ہے کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے زبردست ہے حکمت والا بیشک

الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی مسلمانی حکمبرداری اور نہیں مخالف ہوئے کتاب

الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ

والے مگر جب ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد اور حسد سے

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا تو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سابقہ آیات میں توحید کا بیان ہوا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بھی توحیدِ خداوندی کا مضمون ایک خاص انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ اس پر تین شہادتوں کا ذکر ہے، ایک خود اللہ جل شانہ کی شہادت دوسرے اس کے فرشتوں کی تیسرے اہل علم کی، اللہ جل شانہ کی شہادت تو بطور مجاز ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذات وصفات اور اس کے تمام مظاہر ومصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں

ہر گیاہے کہ از زمیں روید ٭ وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اس کے علاوہ اس کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول اور کتابیں بھی اس کی توحید پر شاہد ہیں اور یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو گویا خود اس کی شہادت اس بات پر ہے کہ اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔

دوسری شہادت فرشتوں کی ذکر کی گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اور اس کے تکوینی امور کے کارکن ہیں، وہ سب کچھ جان کر اور دیکھ کر شہادت دیتے ہیں کہ لائقِ عبادت اللہ تعالیٰ شانہٗ کے سوا کوئی نہیں۔

تیسری شہادت اہل علم کی ہے کہ اہل علم سے مراد انبیاء علیہم السلام اور علماء اسلام ہیں، اسی لئے امام غزالیؒ اور ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس میں علماء کی بڑی فضیلت ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے ان کی شہادت کو اپنی اور اپنے فرشتوں کی شہادت کے ساتھ ذکر فرمایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل علم سے مطلق وہ لوگ مراد ہوں جو علمی اصول پر صحیح نظر کر کے پوری کائنات عالم میں غور و فکر کر کے حق جل وعلا شانہٗ کی وحدانیت کا علم حاصل کر سکیں، اگرچہ وہ اصطلاحی علوم کے عالم نہ ہوں اور دوسری آیت میں اللہ کے نزدیک صرف دین اسلام کا مقبول ہونا اس کے سوا کسی دین و مذہب کا مقبول نہ ہونا بیان کر کے مضمونِ توحید کی تکمیل فرمائی، اور اس سے اختلاف کرنے والوں کی تباہ حالی بیان فرمائی، مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:

گواہی دی ہے اللہ نے (کتب سماویہ میں) اس (مضمون) کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی (اپنے ذکر و تسبیح میں اس کی گواہی دی ہے، کیونکہ ان کے اذکار توحید سے بھرے ہوئے ہیں) اور (دوسرے) اہل علم نے بھی (اپنی تقریرات و تحریرات میں اس کی گواہی دی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے) اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں، (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست ہیں حکمت والے ہیں، بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور (اس کے حق ہونے میں اہل اسلام کے ساتھ) اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (اس طرح سے کہ اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو (اسلام کے حق ہونے کی) دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے، (یعنی اسلام کے حق ہونے میں کوئی وجہ شبہ کی نہیں ہوئی، بلکہ ان میں مادہ دوسروں سے بڑا بننے کا ہے اور اسلام لانے میں یہ سرداری جو ان کو اب عوام پر حاصل ہے فوت ہوتی تھی، اس لئے اسلام کو قبول نہیں کیا، بلکہ الٹا اس کو باطل بتلانے لگے) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا (جیسا ان لوگوں نے کیا) تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد

اس کا حساب لینے والے ہیں (وجہ یہ ہے کہ بے شخص کے حساب کا انجام عذاب ہوگا)۔

معارف و مسائل

آیت شہد اللہ کے فضائل | یہ آیت شہادت ایک خاص شان رکھتی ہے، امام تفسیر بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہود کے دو بڑے عالم ملک شام سے مدینہ طیبہ میں وارد ہوئے، مدینہ کی بستی کو دیکھ کر آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ یہ بستی تو اس طرح کی ہے جس کے لئے تورات میں پیشگوئی آئی ہے کہ اس میں نبی آخر الزمان قیام پذیر ہوں گے، اس کے بعد ان کو اطلاع ملی کہ یہاں کوئی بزرگ ہیں جن کو لوگ نبی کہتے ہیں، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ پر نظر پڑتے ہی وہ تمام صفات سامنے آگئیں جو تورات میں آپ کے لئے بتلائی گئی تھیں، حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، پھر عرض کیا کہ آپ احمد ہیں، آپ نے فرمایا ہاں میں محمد ہوں اور احمد ہوں، پھر عرض کیا کہ ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں، اگر آپ اس کا صحیح جواب دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا دریافت کرو، انھوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے بڑی شہادت کونسی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ آیت شہادت نازل ہوئی، آپ نے ان کو پڑھ کر سنا دی، یہ دونوں اسی وقت مسلمان ہوگئے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو اس کے بعد فرمایا:

وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ يَا رَبِّ (ابن کثیر)	"یعنی اے پروردگار، میں بھی اس پر شاہد ہوں"

اور امام اعمش کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس آیت کی تلاوت کے بعد یہ کہے کہ انا علی ذٰلک من الشّٰھدین۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے فرمائیں گے کہ میرے بندے نے ایک عہد کیا ہے، اور میں عہد پورا کرنے والوں میں سب سے زیادہ ہوں، اس لئے میرے بندے کو جنت میں داخل کردو" (ابن کثیر)

اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر نماز فرض کے بعد سورہ فاتحہ اور آیۃ الکرسی اور آیت شَهِدَ اللّٰهُ (۳: ۱۹) اور قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ سے بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳: ۲۶، ۲۷) تک پڑھا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمائیں گے اور جنت میں جگہ دیں گے اور اس کی ستر حاجتیں پوری فرمائیں گے جن میں سے کم سے کم حاجت

س کی مغفرت ہے" (روح المعانی بحوالہ دیلمی)

دین اور اسلام کے معنی: عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنی ہیں، جن میں ایک معنی ہیں طریقہ اور روش، قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاءؑ میں مشترک ہیں، اور لفظ "شریعت" یا "منہاج" یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ "مذہب" فروعی احکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا (۴۲: ۱۳)	"یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام

کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار، روز قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزاء و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا۔

اور لفظ "اسلام" کے اصلی معنی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا، اور اس کے تابع فرمان ہونا، اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی و رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے، اور ان کا دین دینِ اسلام تھا، اسی معنی کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (سورۂ یونس ۷۲)، اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو امتِ مسلمہ فرمایا: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲: ۱۲۸)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین نے اسی معنی کے اعتبار سے کہا تھا: وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آل عمران: ۵۲)

اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین و شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی

اور امّتِ محمّدیہ کے لئے مخصوص ہوجاتا ہے، جبرئیل علیہ السلام کی ایک حدیث جو تمام کتب حدیث میں مشہور ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی یہی خاص تفسیر بیان فرمائی ہے، آیتِ مذکورہ کے لفظ "الاسلام" میں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے پہلے معنی لے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین صرف دینِ اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان بنانا اور ہر زمانہ میں جو رسول آئے اور وہ جو کچھ احکام لائے اس پر ایمان لانا اور اس کی تعمیل کرنا اس میں دینِ محمدیؐ کی اگرچہ تخصیص نہیں، لیکن عام قاعدہ کے ماتحت حضرت سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان پر اور ان کے لائے ہوئے تمام احکام پر ایمان و عمل بھی اس میں داخل ہوجاتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں دینِ مقبول وہ تھا جو نوح علیہ السلام لائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں وہ جو ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ تھا جو الواحِ تورات اور موسوی تعلیمات کی صورت میں آیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ جو انجیل اور عیسوی ارشادات کے رنگ میں نازل ہوا اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے **زمانہ کا اسلام** وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے نقشہ پر مرتب ہوا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانہ میں ان کا لایا ہوا دین ہی دینِ اسلام اور عنداللہ مقبول تھا جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا، آخر میں خاتم الانبیاءؐ کا دین دینِ اسلام کہلایا، جو قیامت تک باقی رہے گا، اور اگر اسلام کے دوسرے معنی لئے جائیں یعنی وہ شریعت جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوجاتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی اسلام مقبول ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے، پچھلے ادیان کو بھی اگرچہ اُن کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اب وہ منسوخ ہوچکے ہیں اور دونوں صورتوں میں نتیجہ کلام ایک ہی ہے، کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اللہ کے نزدیک مقبول دین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو اس کے سوا دوسرا کوئی دین مقبول نہیں، خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانہ کے لئے وہ اسلام کہلانے کی مستحق نہیں، شریعتِ ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانہ میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس شریعت کے جو احکام منسوخ ہوگئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعتِ موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو وہ اب اسلام نہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیا

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرائع سابقہ کے جو احکام منسوخ ہوگئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اس لئے جوامت قرآن کی مخاطب ہے اس کے لئے اسلام کے معنے عام لئے جائیں یا خاص، دونوں کا حاصل یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف دینِ اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے سوا کوئی دین مقبول اور ذریعہ نجات نہیں، یہ مضمون قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے، ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارد ہے: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳: ۸۵) یعنی جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اس کے تابع جو عمل کیا جائے گا وہ ضائع ہوگا۔"

اس زمانہ میں نجات اسلام میں منحصر ہے، ان آیات نے پوری وضاحت کے ساتھ اس ملحدانہ نظریہ کا خاتمہ کر دیا جس میں اسلام کی رواداری کے نام پر کفر و اسلام کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب خواہ یہودیت و نصرانیت ہو یا بت پرستی ہر ایک ذریعہ نجات بن سکتا ہے، بشرطیکہ عمل صالح اور اخلاق حسنہ کا پابند ہو، اور یہ حقیقت اسلام کے اصول کو منہدم کرنا ہے، جس کا حاصل یہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کی کوئی حقیقت ہی نہیں، محض ایک خیالی چیز ہے، جو کفر کے مرجامہ میں بھی کھپ سکتا ہے، قرآن کریم کی ان آیات اور انہی جیسی بے شمار آیات نے کھول کر بتلا دیا ہے کہ جس طرح اجالا اور اندھیرا ایک نہیں ہو سکتے اسی طرح یہ بات نہایت نامعقول اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی نافرمانی اور بغاوت بھی ایسے ہی پسند ہو جیسے اطاعت و فرمانبرداری، جو شخص اصول اسلام میں سے کسی ایک چیز کا منکر ہے وہ بلاشبہ خدا تعالیٰ کا باغی اور اس کے رسولوں کا دشمن ہے، خواہ فروعی اعمال اور رسمی اخلاق میں وہ کتنا ہی اچھا نظر آئے، نجات آخرت کا مدار سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہے، جو اس سے محروم رہا اس کے کسی عمل کا اعتبار نہیں، قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے عمل کے متعلق ارشاد ہے:

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۸ : ۱۰۵)	"یعنی ہم قیامت کے دن ان کے کسی عمل کا وزن قائم نہ کریں گے"

اس آیت میں اور اس سے پچھلی آیات میں چونکہ روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے اس لئے آخر آیت میں ان کی بیوقوفی اور غلط کاری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ" یعنی اہل کتاب نے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اسلام میں خلاف اور جھگڑا ڈالا تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو کوئی اس معاملہ میں شبہ رہ گیا بلکہ ان کو اپنی کتب تورات و انجیل کے ذریعہ سے پوری طرح اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا علم ہو چکا تھا، لیکن مسلمانوں سے حسد اور حب جاہ و مال نے ان کو اس اختلاف میں مبتلا کیا ہے۔

آخر میں فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلد اس سے حساب لینے والے ہیں، اول تو مرنے کے بعد اس عمل کا امتحان داخلہ قبر کے اس عالم میں ہوگا جس کو برزخ کہا جاتا ہے اور پھر تفصیلی حساب قیامت میں، اس حساب و کتاب کے وقت سب جھگڑوں کی حقیقت کھل جائے گی، باطل پرستوں کو اپنی حقیقت واضح ہو جائے گی، اور پھر اس کی سزا سامنے آجائے گی۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ

پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر اور جنھوں نے بھی کہ جو میرے

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ

اور کہہ دے کتاب والوں کو اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

پھر اگر وہ تابع ہوئے تو انھوں نے راہ سیدھی پائی اور اگر منہ پھیریں تو تیرے ذمہ صرف

الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے

ع ۱۱ ۲ / ۱۰

خلاصۂ تفسیر

رابطِ آیات شروع سورت میں توحید کا اثبات اور تثلیث کا رد کیا گیا تھا، ان آیات میں مشرکین اور منکرین اہل کتاب کی حجتوں کا جواب دیا گیا ہے:

(اسلام کے حق ہونے پر دلیل قائم ہونے کے بعد) پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے

(خواہ مخواہ کی حجتیں نکالیں تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی (اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کر چکے، یہ کنایہ ہے اس سے کہ ہم سب اسلام اختیار کر چکے جس میں اعتقادِ الوہیت کے اعتبار سے قلب کا رخ خاص اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے کیونکہ دوسرے مذاہب میں کچھ کچھ شرک ہو گیا تھا) اور (اس جواب کے بعد دریافت فرمانے کے طور پر) کہئے اہل کتاب سے اور (مشرکین) عرب سے کہ کیا تم بھی (اسلام لاتے ہو سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہ (راست) پر آ جائیں گے اور اگر وہ لوگ (اس سے بدستور) روگردانی رکھیں سو آپ اس کا بھی غم نہ کیجئے، کیونکہ آپ کے ذمہ صرف (احکام خداوندی کا) پہنچا دینا ہے اور (آگے) اللہ تعالیٰ خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے، (اپنے) بندوں کو (آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہے)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ

جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو

بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ

ناحق اور قتل کرتے ہیں ان کو جو حکم کرتے ہیں انصاف کرنے کا لوگوں میں سے،

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ

سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی یہی ہیں جن کی محنت ضائع

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾

ہوئی دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات شروع سورۃ میں کلام کا زیادہ رخ نصاریٰ کی طرف تھا، پھر آیت بالا میں الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ کا عنوان نصاریٰ اور یہود دونوں کو شامل تھا، اب ان آیات میں یہود کے بعض خاص احوال کا بیان ہے، روح المعانی میں بروایت ابن ابی حاتم اس آیت کی تفسیر میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے تینتالیس نبیوں کو ایک وقت میں قتل کیا، ان کی نصیحت کیلئے ایک سو ستر بزرگ کھڑے ہوئے، اسی دن ان کا بھی کام تمام کر دیا (بیان القرآن)

کہتے ہیں اور یہی ان کا اعتقاد ہے، کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی (پھر مغفرت ہو جاوے گی) اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کی تراشی ہوئی باتوں نے (جیسے اسی تراشے ہوئے عقیدہ نے ان کو دھوکہ دیا کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، اس خاندانی بزرگی سے ہماری نجات ضرور ہو جاوے گی اس کے نتیجہ میں وہ کتاب اللہ سے بے اعتنائی کرنے لگے) سو ان (احوال وافعال واقوال کفریہ کے سبب) ان کا کیا (برا) حال ہوگا جب کہ ہم ان کو اس تاریخ میں جمع کرلیں گے جس (کے آنے) میں ذرا شبہ نہیں اور اس تاریخ میں پورا پورا بدلہ مل جاوے گا (کہ بے جرم یا زیادہ از جرم سزا نہ ہوگی)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ
تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت

الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ
چھین لیوے جس سے چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے

بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁ تُوْلِجُ الَّيْلَ
تیرے ہاتھ ہے سب خوبی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے تو داخل کرتا ہے رات کو

فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ
دن میں اور داخل کرے دن کو رات میں اور تو نکالے زندہ مردہ

الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ
سے اور نکالے مردہ زندہ سے اور تو رزق دے جس کو چاہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ؀
بے شمار

خلاصۂ تفسیر

ان آیت میں امت محمدیہ کو ایک دعاء ومناجات کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے ضمن میں امت محمدیہ کے کفار پر غالب ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے، جیسا اس کے شان نزول سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روم وفارس فتح ہوجانے کا وعدہ فرمایا تو منافقین ویہود نے استہزاء کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کما فی روح المعانی

عن الواحدی عن ابن عباسؓ وانسؓ۔

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہئے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک (کا حصہ) جس کو چاہیں دیدیتے ہیں اور جس (کے قبضہ) سے چاہیں ملک (کا حصہ) لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں آپ (بعض موسموں میں) رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے دن بڑا ہونے لگتا ہے) اور (بعض موسموں میں) دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے رات بڑھنے لگتی ہے) اور آپ جاندار (چیز) کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے بیضہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جاندار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندے سے بیضہ) اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت کا شان نزول بدر و احد میں مشرکین مکہ کی مسلسل شکست اور مسلمانوں کے خلاف اور غزوہ خندق کا واقعہ ہے، ہر جگہ و ہر جہاد میں ناکامی کے ساتھ مسلمانوں کی مسلسل ترقی اور اسلام کی روز افزوں اشاعت نے قریش مکہ اور تمام غیر مسلموں میں ایک بوکھلاہٹ پیدا کر دی تھی جس سے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ ایک عام سازش کی صورت میں یہ ظاہر ہوا کہ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سب کا ایک متحدہ محاذ مسلمانوں کے خلاف بن گیا، اور سب نے مل کر مدینہ پر یکبارگی حملہ اور فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی، اور ان کا بے پناہ لشکر اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے مٹا ڈالنے کا عزم لے کر مدینہ پر چڑھ آیا، جس کا نام قرآن میں غزوۂ احزاب اور تاریخ میں غزوۂ خندق ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے یہ طے فرمایا تھا کہ غنیم کے راستہ میں مدینہ سے باہر خندق کھودی جائے۔

بیہقی اور ابونعیم اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ خندق کھودنے کا کام مجاہدین اسلام صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا تو چالیس چالیس ہاتھ لمبی خندق دس دس آدمیوں کے سپرد تھی، یہ خندق کئی میل لمبی اور خاصی گہری اور چوڑی تھی جس کو غنیم عبور نہ کر سکے، اور کھدائی کے لئے تکمیل جلدی سے جلد کرنی تھی اس لئے جاں نثار صحابہ کرامؓ بڑی محنت سے اس میں مشغول تھے

کر قضائے حاجت اور کھانے وغیرہ کی ضروریات کے لئے یہاں سے ہٹنا مشکل ہو رہا تھا، مسلسل بھوکے رہ کر یہ کام انجام دیا جا رہا تھا، اور یقیناً کام ایسا تھا کہ آجکل کی جدید آلات والی مشین بھی ہوتی تو اس تھوڑے وقت میں اس کام کا پورا کرنا آسان نہ ہوتا، مگر یہاں ایمانی طاقت کام کر رہی تھی جس نے بآسانی تکمیل کرادی۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک فرد کی حیثیت سے اس کھدائی کے کام میں شریک تھے، اتفاقاً خندق کے ایک حصہ میں پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی، جن حضرات کے حصہ میں خندق کا یہ ٹکڑا تھا وہ اپنی پوری قوت صرف کرکے عاجز ہوگئے، تو حضرت سلمان فارسی ؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ اب حضور کا کیا حکم ہے؟ آپ اسی وقت موقع پر تشریف لائے اور کدال آپ نے خود دست مبارک میں لے کر ایک ضرب لگائی تو اس چٹان کے ٹکڑے ہوگئے، اور ایک آگ کا شعلہ برآمد ہوا جس سے دور تک اس کی روشنی پھیل گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حیرہ شہر فارس کے محلات وعمارات دکھلائی گئیں، پھر دوسری ضرب لگائی، پھر ایک شعلہ برآمد ہوا تو فرمایا کہ اس کی روشنی میں مجھے رومیوں کے سرخ سرخ محلات وعمارات دکھلائی گئیں، پھر تیسری ضرب لگائی اور روشنی پھیلی تو فرمایا کہ اس میں مجھے صنعاء یمن کے عظیم محلات دکھلائے گئے، اور فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ میری امت ان تمام ممالک پر غالب آئے گی۔

منافقین مدینہ نے یہ سنا تو ان کو استہزاء و تمسخر کا موقع ہاتھ آیا، مسلمانوں کا مذاق اڑایا، کہ دیکھو ان لوگوں کو جو حریف مقابل کے خوف سے خندق کھودنے میں اس طرح مشغول ہیں کہ ان کو اپنی ضروریات کا بھی ہوش نہیں، اپنی جانوں کی حفاظت ان کو مشکل ہو رہی ہے، ملک فارس وروم اور یمن کی فتوحات کے خواب دیکھ رہے ہیں، حق تعالیٰ نے ان بے خبر ظالموں کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

جس میں مناجات ودعا کے پیرایہ میں قوموں کے عروج وزوال اور ملکوں کے انقلاب میں حق جل وعلا شانہ کی قدرت کاملہ کا بیان ایک نہایت بلیغ انداز سے کیا گیا ہے، اور فارس وروم کی فتوحات کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا، جس میں دنیا کے انقلابات سے بے خبر قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے ناواقف

قوم نوح اور عاد و ثمود کے واقعات سے غافل اور جاہل دشمنانِ اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ظاہری شان و شوکت کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی ساری طاقتیں اور حکومتیں سب ایک ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں ہیں، عزت و ذلت اسی کے ہاتھ ہے، وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ غریبوں اور فقیروں کو تخت و تاج کا مالک بنا دے، اور بڑے بڑے بادشاہوں سے حکومت و دولت چھین لے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ آج کے خندق کھودنے والے فقیروں کو کل شام و عراق اور یمن کی حکومت عطا فرما دے ؎

ذرہ ذرہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

جو چیزیں عادۃً بُری سمجھی جاتی ہیں انجام کے اعتبار سے وہ بھی بُری نہیں

آیت کے آخر میں فرمایا بِيَدِكَ الْخَيْرُ، یعنی آپ کے ہاتھ میں ہے ہر بھلائی، شروع آیت میں چونکہ حکومت دینے اور واپس لینے کا نیز عزت اور ذلت دونوں کا ذکر تھا اس لئے بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس جگہ بھی بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَالشَّرُّ کہا جاتا، یعنی ہر بھلائی اور برائی آپ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس آیت میں اس جگہ صرف لفظ "خیر" ذکر کر کے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو کوئی شخص یا کوئی قوم برائی یا مصیبت سمجھتی ہے اور وہ اس شخص یا قوم کے لئے گو تکلیف و مصیبت ہوتی ہے، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے وہ برائی نہیں ہوتی، قوموں کے عروج و زوال اور اس میں مصائب کے بعد فوائد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو عربی کے مشہور شاعر متنبی کا یہ مصرعہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ ؎

مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ
یعنی ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں۔

مجموعۂ عالم کے مصالح و فوائد پر نظر کرنے والا کسی نہ کسی درجہ میں اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ اس میں جتنی چیزیں خراب اور بُری سمجھی جاتی ہیں وہ اپنی ذات میں چاہے بُری سمجھی جائیں مگر پورے عالم کو اگر ایک جسم فرض کر لیا جائے تو وہ اس کے چہرہ کے خال اور بال ہیں، خال اور بال اگر بدن سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں، لیکن ایک حسین چہرہ کا جز ہونے کی حالت میں یہی چیزیں رونقِ حسن ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم بُرا کہتے ہیں اور بُرا سمجھتے ہیں ان کی بُرائی جزوی ہے اور خالقِ کائنات اور رب العالمین کی نسبت اور مجموعۂ عالم کی مصلحت کے اعتبار سے کوئی چیز شر یا خراب نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس لئے اس آیت کے ختم میں صرف لفظ "خیر" پر اکتفاء کر کے فرمایا گیا بِیَدِكَ الْخَيْرُ کیونکہ خالق کائنات کی حکمت اور حکومت اور مجموعۂ عالم کی مصلحت کے لحاظ سے ہر چیز خیر ہی خیر ہے، یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ختم ہوا، جس میں تمام عالم عناصر کی طاقتوں اور دنیا کی سب حکومتوں کا حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہونا بیان فرمایا ہے۔

دوسری آیت میں آسمانی طاقتوں اور فلکیات پر حق جل وعلا شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کا احاطہ اس طرح بیان فرمایا ہے: تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ، یعنی آپ جب چاہتے ہیں رات کے اجزاء دن میں داخل فرما کر دن کو بڑا کر دیتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں دن کے اجزاء رات میں داخل کر کے رات بڑی کر دیتے ہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کے بڑے چھوٹے ہونے کا مدار آفتاب کے طلوع و غروب اور اس کی حرکات پر ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہوا کہ آسمان اور اس کے متعلق سب سے بڑا ستیارہ شمس اور سب سے معروف ستیارہ قمر سب آپ کے احاطۂ قدرت میں ہیں، پھر عالم عناصر اور دنیاوی بادی طاقتوں میں کسی شک وشبہ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد عالم روحانیت پر حق جل وعلا شانہٗ کا احاطۂ قدرت اس طرح بیان فرمایا تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ "یعنی آپ زندہ کو مردہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے بیضہ سے بچہ یا نطفہ سے انسان یا دانہ سے درخت کو نکال لیتے ہیں، اور مردہ کو زندہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے جانور سے بیضہ اور انسان سے نطفہ یا درخت سے پھل اور دانہ خشک۔

اور اگر زندہ اور مردہ کا مفہوم عام لیا جائے، تو عالم اور جاہل اور کامل و ناقص اور مؤمن و کافر سب کو شامل ہو جاتا ہے، جس سے حق جل وعلا شانہٗ کی قدرت کاملہ اور اس کے تصرفات تمام عالم ارواح اور روحانیات پر واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ جب چاہیں تو کافر سے مؤمن یا جاہل سے عالم پیدا کر دیں اور جب چاہیں مؤمن سے کافر یا عالم سے جاہل پیدا کر دیں، آزر کے گھر میں خلیل اللہ پیدا ہو جائے، اور نوح علیہ السلام کے گھر میں ان کا بیٹا کافر رہ جائے، عالم کی اولاد جاہل رہ جائے اور جاہل کی اولاد عالم ہو جائے۔

اس تفصیل سے آپ نے معلوم کیا ہوگا کہ کیسی بلیغ ترتیب کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا تمام کائنات عالم پر محیط ہونا ترتیب وار بیان فرمایا گیا ہے کہ پہلے عالم عناصر اور اس کی قوتوں اور حکومتوں کا ذکر آیا ہے، پھر عالم افلاک اور اس کی قوتوں کا اور ان سب کے بعد

دولت اور روحانیت کا ذکر آیا ہے جو درحقیقت سلطنت و ملک کی ساری قوتوں میں سب سے بڑی قوت ہے،
آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی آپ جس کو چاہیں بے شمار رزق
عطا فرمادیں جس کو کوئی مخلوق نہ معلوم کر سکے، گو خالق کے علم میں ذرہ ذرہ محفوظ ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی
اور آل عمران کی دو آیتیں ایک آیت شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ آخر تک دوسری
آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ سے بِغَيْرِ حِسَابٍ تک پڑھا کرے تو میں اس کا ٹھکانا جنت
میں بنا دوں گا، اور اس کو اپنے حظیرۃ القدس میں جگہ دوں گا، اور ہر روز اس کی طرف ستر مرتبہ
نظر رحمت کروں گا اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا، اور ہر حاسد اور دشمن سے پناہ دوں گا اور
ان پر اس کو غالب رکھوں گا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
نہ بنائیں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر

وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ
اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو ان سے بچاؤ

تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿۲۸﴾
اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ
تو کہہ اگر تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات یا اسے ظاہر کرو گے جانتا ہے اس کو اللہ

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
اور اس کو معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ ہر چیز پر

شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
قادر ہے جس دن موجود پائے گا ہر شخص جو کچھ کی ہے اس نے نیکی اپنے

مُحْضَرًا ۛ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۛ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ
سامنے اور جو کچھ کی ہے برائی آرزو کرے گا کہ مجھ میں اور اس میں پڑ جائے

أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ
فاصلہ دور کا اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ نہایت مہربان ہے

منزل ۱

بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور اس ہدایت کی مخالفت کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ تعالیٰ سے دوستی و محبت کا علاقہ قطع ہو جائے گا، کافروں سے باطنی اور دلی دوستی تو مطلقاً حرام ہے، اور ظاہری دوستی معاشرت کے درجہ میں اگرچہ جائز ہے، مگر بلاضرورت وہ بھی پسند نہیں۔

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:

مسلمانوں کو چاہئے کہ (ظاہراً یا باطناً) کفار کو دوست نہ بناویں مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کرکے (یہ تجاوز دو صورت سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں سے بالکل دوستی نہ رکھیں، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی دوستی ہو اور کفار کے ساتھ بھی دونوں صورتیں ممانعت میں داخل ہیں) اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا سو وہ اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں (کیونکہ جن دو شخصوں میں باہم عداوت ہو ایک سے دوستی کرکے دوسرے سے دوستی کا دعویٰ قابل اعتماد نہیں ہو سکتا) مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو (اور اس دفع ضرر کی ضرورت ہے) اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتا ہے (کہ اس کی ذات سے ڈر کر احکام کی مخالفت مت کرو) اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس وقت کی سزا کا خوف کرنا ضرور ہے، آپ ان سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھو گے اپنا مافی الضمیر یا اس کو (زبان و جوارح سے) ظاہر کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال میں) جانتے ہیں اور (اسی کی کیا تخصیص ہے وہ تو سب کچھ جانتے ہیں) جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے (کوئی چیز ان سے مخفی نہیں) اور (علم کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں (سو اگر تم کسی امر قبیح کا ارتکاب کرو گے خواہ ظاہراً یا باطناً تو وہ تم کو سزا دے سکتے ہیں) جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا، اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو (بھی پائے گا اس روز) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی (تاکہ اپنے اعمال بد کا معائنہ نہ کرنا پڑتا) اور (تم سے پھر مکرر کہا جاتا ہے کہ) خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان)

سے ڈراتے ہیں (اور یہ ڈرانا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں اپنے بندوں کے حال پر، اس مہربانی سے یوں چاہتے ہیں کہ یہ سزائے آخرت سے بچے رہیں، اور بچنے کا طریقہ ہے اعمالِ بد کا ترک کرنا، اور ترک کرنا عادۃً بدون ڈرانے کے ہوتا نہیں، اس لئے ڈراتے ہیں، پس یہ ڈرانا عین شفقت و رحمت ہے)

معارف و مسائل

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں جا بجا مختلف عنوانات کے ساتھ بکثرت آئی ہیں،

سورۂ ممتحنہ میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ

"یعنی اے ایمان والو میرے دشمن اور اپنے دشمن یعنی کافروں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو پیغام بھیجو دوستی کے۔"

پھر اس کے آخر میں فرمایا:

وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ

"جس شخص نے ان سے دوستی کی تو وہ سیدھے رستے سے گمراہ ہوگیا۔"

اور دوسری جگہ میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ (۵: ۵۱)

"یعنی اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں (مسلمانوں سے ان کو کوئی دوستی و ہمدردی نہیں) تو جو ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔"

اور سورۂ مجادلہ میں ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ (۵۸: ۲۲)

"یعنی آپ نہ پائیں گے کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ دوستی کریں ایسے لوگوں سے جو مخالف ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ ان کے باپ دادا ہی ہوں یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی، یا اپنے خاندان والے۔"

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں؟

یہ مضمون بہت سی آیاتِ قرآنیہ میں مجمل اور مفصّل مذکور ہے جس میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے، ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقتِ حال سے ناواقف غیر مسلموں کو تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق کی بلکہ حسنِ اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اور دوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کی بہت سی آیات سے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عمل سے خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وسلوک اور ہمدردی و غمخواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہیں؛ تو ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن و سنت کے احکام و ارشادات میں باہم تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے، مگر یہ دونوں خیال قرآن کی حقیقی تعلیمات پر طائرانہ نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر مختلف مقامات سے قرآن کی آیات کو جو اس معاملے سے متعلق ہیں جمع کر کے غور کیا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لئے وجہ شکایت باقی رہتی ہے، نہ آیات و روایات میں کسی قسم کا تعارض باقی رہتا ہے، اس لئے اس مقام کی پوری تشریح کر دی جاتی ہے جس سے موالات اور احسان وسلوک یا ہمدردی و غمخواری میں باہمی فرق اور ہر ایک کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی، اور یہ بھی کہ ان میں کونسا درجہ جائز ہے کونسا ناجائز، اور جو ناجائز ہے اس کی وجہ کیا ہیں۔

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی مودّت و محبت ہے، یہ صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے غیر مؤمن کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے جس کے معنی ہیں ہمدردی و خیرخواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفار اہلِ حرب کے جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی جس میں ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	"یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ	جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں
وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ٦٠: ٨	اور انصاف کا سلوک کرو۔"

تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ

بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورۂ آل عمران کی آیت مذکورہ میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جب کہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو، اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دیدیا گیا (بیان القرآن)

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود اُن کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور احسان و ہمدردی و نفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس کا مقصد مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہو کر اس دنیا میں تشریف لائے، آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کئے، اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے، مکہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپؐ کو اپنے وطن سے نکالا تھا، ان کی خود امداد فرمائی، پھر مکہ مکرمہ فتح ہو کر یہ سب دشمن آپؐ کے قابو میں آگئے تو سب کو یہ فرما کر آزاد کردیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، یعنی آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے، غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو بہت سے لوگ اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا، کفار نے آپؐ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں مگر کبھی آپؐ کا ہاتھ انتقام کے لئے نہیں اٹھا، زبان مبارک سے بددعا بھی نہیں فرمائی، بنو ثقیف جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ عزت کا مقام تھا۔

فاروق اعظمؓ نے غیر مسلم محتاج ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفے دیئے

خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، یہ سب مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں تھیں، جس موالات سے منع کیا گیا وہ نہ تھی۔

اس تفصیل اور تشریح سے ایک طرف تو یہ معلوم ہو گیا کہ غیر مسلموں کے لئے اسلام میں کتنی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم ہے، دوسری طرف جو ظاہری تعارض ترکِ موالات کی آیات سے محسوس ہوتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

اب ایک بات یہ باقی رہ گئی کہ قرآن نے کفار کی موالات اور قلبی دوستی و محبت کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں روکا کہ وہ کسی حال میں کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں رکھی، اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں اس دنیا کے اندر انسان کا وجود عام جانوروں یا جنگل کے درختوں اور گھاس پھوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھولے پھلے پھر مر کر ختم ہو گئے بلکہ انسان کی زندگی اس جہان میں ایک مقصدِ زندگی ہے، اس کی زندگی کے تمام ادوار، اس کا کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ جینا، مرنا سب ایک مقصد کے گرد گھومتے ہیں، جب تک وہ اس مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سب کام صحیح و درست ہیں اس کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں، دانائے روم نے خوب فرمایا ہے

زندگی از بہرِ ذکر و بندگی ست
بے عبادت زندگی شرمندگی ست

جو انسان اس مقصد سے ہٹ جائے وہ دانائے روم اور اہلِ حقیقت کے نزدیک انسان نہیں ہے

آنچہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند

قرآن حکیم نے اسی مقصد کا اقرار انسان سے ان الفاظ میں لیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ (۶: ۱۶۲)	"آپ کہئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العلمین کے لئے ہے"

اور جب انسان کی زندگی کا مقصد اللہ رب العالمین کی اطاعت و عبادت ٹھہرا تو دنیا کے کاروبار ریاست و سیاست اور عائلی اور منزلی تعلقات سب اس کے تابع ٹھہرے، تو جو انسان اس مقصد کے مخالف ہیں وہ انسان کے سب سے زیادہ دشمن ہیں، اور اس دشمنی میں چونکہ شیطان سب سے آگے ہے اس لئے قرآن حکیم نے فرمایا:

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ	"یعنی شیطان تمہارا دشمن ہے اس کی دشمنی کو

عَدُوًّا (۶:۳۵) ہمیشہ یاد رکھو۔

اسی طرح جو لوگ شیطانی وساوس کے پیرو اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آئے ہوئے احکامِ خداوندی کے مخالف ہیں ان کے ساتھ دلی ہمدردی و قلبی دوستی اس شخص کی ہو ہی نہیں سکتی جس کی زندگی ایک مقصدِ زندگی ہے، اور دوستی و دشمنی اور موافقت و مخالفت سب اس مقصد کے تابع ہیں۔

اسی مضمون کو صحیح کی ایک حدیث میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ (بخاری و مسلم)

"یعنی جس شخص نے اپنی دوستی اور دشمنی کو صرف اللہ کے لئے وقف کر دیا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔"

معلوم ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ انسان اپنی محبت و دوستی اور دشمنی و نفرت کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا دے، اس لئے مؤمن کی قلبی مودت اور مودت صرف اسی کے لئے ہو سکتی ہے جو اس مقصد کا ساتھی اور اللہ جل شانہٗ کا تابع فرمان ہے، اس لئے قرآن حکیم کی مذکورہ آیتوں میں کافروں کے ساتھ دلی و قلبی موالات اور دوستی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ انہی میں سے ہیں۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے، ایسا نہ ہو کہ چند روزہ اغراض و مقاصد کے خاطر موالاتِ کفار میں مبتلا ہو کر اللہ جل شانہٗ کو ناراض کر بیٹھو، اور چونکہ موالات کا تعلق دل سے ہے، اور دل کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص واقع میں تو کفار کی موالات و محبت میں مبتلا ہو مگر زبانی انکار کرے، اس لئے دوسری آیت میں فرمایا کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف و خبردار ہیں، یہ انکار و حیلہ ان کے سامنے نہیں چل سکتا ؎

کارہا با خلق آری جملہ راست
با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے

لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا

گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تو کہہ حکم مانو

اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿۳۲﴾

اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں کافروں سے

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات پچھلی آیات میں توحید کا وجوب اور کفر کی مذمت مذکور تھی، آگے، عقیدۂ رسالت اور اتباعِ رسول کا وجوب بیان فرماتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح انکارِ توحید کفر ہے اسی طرح انکارِ رسالت بھی کفر ہے، ارشاد ہوتا ہے:

آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعمِ خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو (کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لئے مبعوث ہوا ہوں جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسبِ وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا، یا معاف کرا لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایت فرمانے والے ہیں (اور) آپ یہ (بھی) فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی (کہ اصل مقصود تو وہی ہے) اور (اطاعت کیا کرو) رسول کی (یعنی میری اطاعت اس حیثیت سے کرنا ضروری ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں میری معرفت اپنی اطاعت کے طریقے بتلاتے ہیں) پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ (آپ کی اطاعت سے کہ ادنیٰ اس کا اعتقادِ رسالت ہے) اعراض کریں سو (وہ لوگ سن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے (اور اس صورت میں یہ لوگ کافر ہوں گے سو ان کو اللہ سے دعوائے محبت کرنا یا ہوسِ محبوبیت رکھنا محض بے حقیقت ہے)۔

معارف و مسائل

محبت ایک مخفی چیز ہے، کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں، اور کم ہے یا زیادہ ہے، اس کا کوئی پیمانہ بجز اس کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے۔ محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار اور محبوبیت کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج

کسی شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس کو اتباعِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص اپنے دعوے میں جتنا سچا ہوگا اتنا ہی حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بنائے گا، اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہوگا اسی قدر آپ کی اطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔

ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا "جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا اس نے درحقیقت اللہ کا اتباع کیا، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی"۔ (تفسیر مظہری، ج ۲)

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ

بے شک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو

عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ

سارے جہان سے جو اولاد تھے ایک دوسرے کی اور اللہ سننے والا

عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

جاننے والا ہے۔

انبیاءِ سابقین کا تذکرہ بڑے تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ ان کو آپ کی نبوت و رسالت ہی میں شبہ تھا، ان کی ہدایت کے لئے ان آیات میں کچھ انبیاءِ سابقین کے بیان فرماتے ہیں، جن سے یہ شبہات رفع ہو جائیں، ان انبیاءِ سابقین کے تذکرہ میں حضرت آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ آلِ عمرانؑ کا ذکر تو اجمال و اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے، اس کے بعد اصل ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کرنا ہے، جس سے پہلے ان کی نانی اور والدہ کا بھی تفصیلی تذکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نہایت مفصل ذکر کیا گیا ہے جس کی حکمت و مصلحت کا بیان مسئلہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کے تحت آئے گا، خلاصہ یہ کہ امتِ محمدیہ کو آخر زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کیساتھ کام کرنا ہے، اس لئے ان کی پہچان اور علامات کے بیان کرنے کا اہتمام قرآن میں سب انبیاء سے زیادہ کیا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لئے) منتخب فرمایا ہے (حضرت) آدم (علیہ السلام)

اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) کو اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، اور تمام انبیاء بنی اسرائیل کہ اولادِ یعقوب علیہ السلام کی ہیں، اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام سے ہیں) اور عمران کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (اگر یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہیں، اور اگر یہ عمران حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، غرض ان حضرات کو نبوت کے لئے) تمام جہان (کی مخلوقات) پر (منتخب فرمایا ہے، بعضے ان میں بعضوں کی اولاد ہیں (جیسے آدم علیہ السلام کی اولاد سب ہیں، اسی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد سب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولادِ عمران بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں خوب جاننے والے ہیں (کہ سب کے قول سنتے ہیں سب کے احوال کو جانتے ہیں، بس جس کے اقوال و احوال مناسب شانِ نبوت کے دیکھے ان کو نبی بنا دیا)۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ

جب کہا عمران کی عورت نے اے رب میں نے نذر کیا تیرے جو کچھ میرے پیٹ میں ہے

مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا

سب سے آزاد رکھ کر سو تو مجھ سے قبول کر بیشک تو ہی ہے اصل سننے والا جاننے والا پھر جب اس

وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

کو جنا بولی اے رب میں نے تو اس کو لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ

وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ

اس نے جنا اور بیٹا نہ ہو جیسی وہ بیٹی اور میں نے اس کا نام رکھا مریم

وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے

خلاصۂ تفسیر

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ عمران (پدر مریم) کی بی بی نے (حالتِ حمل

میں حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر (یعنی منت) مانی ہے آپ (کی عبادت) کے لئے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ (خاص خدا کی خدمت کے واسطے) آزاد (فارغ) رکھا جائے گا (اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی) سو آپ اس کو مجھ سے قبول کر لیجئے، بیشک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں، (کہ میری عرض کو سن رہے ہیں، اور میری نیت کو جان رہے ہیں)، پھر جب ان بی بی نے لڑکی جنی (تو ان کو رنج ہوا کہ یہ تو خدمت بیت المقدس کے لائق نہیں، یہ کام تو مردوں کا ہے، اس لئے حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو حمل لڑکی جنی (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں، حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس لڑکی کی شان کو جو انہوں نے جنی اور کسی طرح بھی) وہ لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں (ہو سکتا تھا، بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات و برکات عجیب و غریب ہوں گے، یہ ارشاد خداوندی بطور جملہ معترضہ کے تھا، آگے ان بی بی کا قول ہے) اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ (اور حفاظت) میں دیتی ہوں شیطان مردود سے

معارف و مسائل

انبیاء سابقین کی شریعت میں ایک طریقہ عبادت کا یہ بھی تھا کہ اپنی اولاد میں سے کسی بچے کو اللہ کے لئے مخصوص کر دیں کہ اس سے دنیا کی کوئی خدمت نہ لیں، حضرت مریمؑ کی والدہ نے اسی قاعدہ کے مطابق اپنے حمل کے متعلق یہ منت مان لی کہ اس کو خاص بیت مقدس کی خدمت کے لئے رکھوں گی، دنیا کے کام میں نہ لگاؤں گی، مگر جب حمل سے لڑکی پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے افسوس کیا کہ لڑکی تو یہ کام نہیں کر سکتی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی برکت سے اُس لڑکی ہی کو قبول فرمایا، اور اس کی شان ساری دنیا کی لڑکیوں سے ممتاز کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کو اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک گونہ ولایت حاصل ہے، کیونکہ اگر ماں کو بچے پر ولایت حاصل نہ ہوتی تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نذر نہ مانتیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ ماں کو بھی حق ہے کہ اپنے بچے کا نام خود تجویز کرے (جصاص)

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا

پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سپرد کی

زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا

زکریا کو، جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس

رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ

کچھ کھانا، کہا اے مریم کہاں سے آیا تیرے پاس یہ، کہنے لگی یہ اللہ کے پاس سے

اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

آتا ہے، اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس۔

خلاصۂ تفسیر

حاصل یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس میں پہنچیں اور وہاں کے مجاورین و عابدین سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے، جا کر کہا کہ اس لڑکی کو میں نے خاص خدا کے لئے مانا ہے، اس لئے میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی، سو اس کو لائی ہوں، آپ لوگ رکھئے۔

حضرت عمرانؒ اس مسجد کے امام تھے اور حالت حمل میں ان کی وفات ہو چکی تھی، ورنہ سب سے زیادہ مستحق ان کے لینے کے وہ تھے، لڑکی کے باپ بھی تھے اور مسجد بیت المقدس کے امام بھی، اس لئے بیت المقدس کے مجاورین و عابدین میں سے ہر شخص ان کو لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ترجیح کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں اُن کی خالہ ہیں، اور وہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے، اس لئے بعد ماں کے وہی رکھنے کی مستحق ہے، مگر اور لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے، آخر قرعہ اندازی پر اتفاق قرار پایا، اور صورت قرعہ کی بھی عجیب و غریب خلاف عادت ٹھہری، جس کا بیان آگے آئے گا، اس میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کامیاب ہوئے۔

چنانچہ حضرت مریمؑ ان کو مل گئیں، اور انھوں نے بعض روایات کے مطابق ایک انا کو نوکر رکھ کر دودھ پلوایا، اور بعض روایات میں ہے کہ دودھ پینے کی اُن کو حاجت ہی نہیں ہوئی، غرض وہ خود اٹھنے بیٹھنے لگیں، ان کو مسجد کے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا، جب کہیں جاتے اس کو قفل لگا کر جاتے، پھر آ کر کھول لیتے، اسی قصہ کا ذکر مختصر آگے آتا ہے، (یعنی) پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بطریق احسن قبول فرمایا اور عمدہ طور پر ان کو نشو و نما دیا، اور (حضرت) زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا

جب کبھی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس اس عمدہ مکان میں (جس میں اُن کو رکھا تھا، تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں (جب کہ مکان مقفل ہے، باہر سے کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں) وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (خزانہ غیب ہے اس میں) سے آئیں، بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں (جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا)۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ

وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے کہا اے رب میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾

اولاد پاکیزہ بیشک تو سننے والا ہے دعا کو

خلاصہ تفسیر

(حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریمؑ کی تربیت میں غیر معمولی نشانات قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دعا فرمائی جن کا بیان یہ ہے):

اس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

معارف و مسائل

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا، حضرت زکریا علیہ السلام کے اس وقت تک اولاد نہ تھی، اور زمانہ بڑھاپے کا آگیا تھا جس میں عادۃً اولاد نہیں ہوسکتی، اگرچہ خرق عادت کے طور پر قدرت خداوندی کا ان کو پورا اعتقاد تھا کہ وہ ذات اس بڑھاپے کے موقع میں بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی ایسی عادت آپ نے مشاہدہ نہیں کی تھی کہ وہ بے موقع اور بے موسم چیزیں عطا کرتا ہے اس لئے آپ کو اولاد کے لئے دعا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن اس وقت جب آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بے موسم میوے عطا فرمائے ہیں تو اب آپ کو بھی سوال کرنے کی جرأت ہوئی کہ جو قادر مطلق بے موقع پھل عطا کر سکتا ہے وہ بے موقع اولاد

بھی عطا کرے گا۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دعا کرنا انبیاءؑ اور صالحین کی سنت ہے۔

ایک دوسری آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (۱۳ : ۳۸) یعنی جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیویاں اور اولاد عطا کی گئیں اسی طرح یہ نعمت انبیاء سابقینؑ کو بھی دی گئی تھی، اب اگر کوئی شخص کسی ذریعہ سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف فطرت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گا بلکہ انبیاء علیہم السلام کی ایک مشترک و متفق علیہ سنت سے بھی محروم ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح اور اولاد کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ آپؐ نے اس شخص کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جو بیاہ شادی اور اولاد سے باوجود قدرت کے اعراض کرتا ہو، چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں :

۱- اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ	نکاح میری سنت ہے۔
۲- فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ	جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔
۳- تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ	تم خاوند سے دوستی رکھنے والی اور بہت جننے والی سے نکاح کرو کیونکہ تمہاری کثرت کی وجہ سے میں دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو اولاد اور بیوی کے حصول اور ان کے نیک صالح ہونے کے لئے اپنے اللہ سے دعائیں کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے :

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (۲۵ : ۷۴)	"یعنی اللہ کے فرمانبردار لوگ وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بیوی بچے ایسے عطا فرما جنھیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور قلب مسرور ہو"

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ یہاں آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد یہ ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول دیکھے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمّ سُلیم نے درخواست کی کہ آپؐ اپنے خادم انسؓ کے لئے کوئی دعا فرمائیں تو آپؐ نے ان کے لئے یہ دعا کی :

اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ ، یعنی اے اللہ اس (انس) کے مال اور

وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ ۔	اور اولاد کو زیادہ کر اور اس چیز میں برکت عطا کر جو کچھ آپ نے اس کو عطا کی ہے۔

اسی دعا کا اثر تھا کہ حضرت انسؓ کی اولاد سو کے قریب ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت بھی عطا فرمائی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ

پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ

کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو گواہی دے گا اللہ کے حکم کی اور

سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۳۹

سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائے گا اور نبی ہوگا صالحین سے

خلاصۂ تفسیر

پس پکار کر کہا ان سے فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ (نام بیٹا عطا ہونے) کی جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور (دوسرے) مقتدائے (دین) ہوں گے اور (تیسرے) اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے ہوں گے اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے اور (پانچویں) اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

معارف و مسائل

كَلِمَةُ اللهِ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت بلا واسطہ باپ کے پیدا کئے گئے۔

حَصُوْرًا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے تھے، اور لذات سے رکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا بھی داخل ہے، مثلاً اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا، اس صفت کو موقع مدح میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے، حالانکہ احادیث سے نکاح کی فضیلت ثابت ہے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سی ہو

یا اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو، ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے، اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور زوجیت کے حقوق ادا کرسکتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں (بیان القرآن)

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ
بولا اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اور

امْرَأَتِي عَاقِرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴿٤٠﴾
عورت میری بانجھ ہے فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
بولا اے رب مقرر کر میرے لئے کچھ نشانی فرمایا نشانی تیرے لئے یہ ہے کہ نہ بات کرے گا تو لوگوں

ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۗ وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ
سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور تسبیح کر

بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٤١﴾
شام اور صبح

ع ۴ ۱۱ ۱۲

خلاصۂ تفسیر

(حضرت زکریا علیہ السلام نے (جناب باری میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آپہنچا، اور میری بی بی بھی (بڑھاپے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہو جاوے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہوگیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کرسکو گے بجز ہاتھ، سر وغیرہ کے اشارہ کے، (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے) اور اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذکر اللہ پر قادر ہوگے سو) اپنے رب کو

(دل سے بھی) بکثرت یاد کیجیو (اور زبان سے بھی) تسبیح (و تقدیس) کیجیو دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی، (کیونکہ ذکر اللہ کی قدرت اس وقت بھی باقی رہے گی)۔

معارف و مسائل

حضرت زکریا علیہ السلام اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ، حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرت خداوندی اور اس کی حکمت کے معتقد بھی تھے اور نمونہ کا مشاہدہ بھی کرچکے تھے اور خود ہی دعا کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہوگیا تھا، پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ کس طرح لڑکا ہوگا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ مقصود سوال سے کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی کی جو حالت موجودہ ہے کہ دونوں خوب بوڑھے ہیں، یہی حالت رہے گی، یا کچھ اس میں تبدیلی کی جاوے گی، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے، اور اسی حالت میں تم سے اولاد ہوگی، اب اس میں کوئی اشکال نہ رہا (بیان القرآن)۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا، حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی معلوم کرنے سے مقصود یہ تھا کہ مجھے جلدی خوشی ہو اور بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی شکر میں مشغول ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نشانی عطا کی کہ آپ تین دن تک لوگوں سے سوائے اشارے کے کوئی کلام نہیں کرسکیں گے۔

اس نشانی میں لطافت یہ ہے کہ نشانی کی درخواست سے جو ان کا مقصود تھا کہ شکر ادا کریں نشانی ایسی تجویز کی گئی کہ بجز اس مقصود کے دوسرے کام ہی کے نہ رہیں گے، غرض نشانیوں کی ایک نشانی ہوگئی، اور مقصود کا مقصود بدرجہ اتم حاصل ہوگیا، (بیان القرآن)

اِلَّا رَمْزًا اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کلام کرنا متعذر ہو تو اشارہ قائم مقام کلام کے سمجھا جائے گا، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بندی سے سوال کیا کہ "اَیْنَ اللّٰہُ" اللہ کہاں ہے تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ بندی مسلمان ہے۔ (قرطبی)

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ

اور جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا

وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر اے مریم بندگی کر اپنے رب کی

۵

خلاصۂ تفسیر

یہ قصے (جو اوپر مذکور ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے بوجہ اس کے کہ آپؐ کے پاس کوئی ذریعہ ظاہری ان کے معلوم کرنے کا نہ تھا) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں جن کی وحی بھیجتے ہیں ہم آپ کے پاس (اس کے ذریعہ سے آپ یہ خبریں معلوم کرکے اوروں کو بتلاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت مریم علیہا السلام کے رکھنے میں اختلاف کر رہے تھے جس کا فیصلہ انہی میں قرعہ پر قرار پایا تھا) آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے (اور صورت قرعہ نکلنے کی یہ قرار پائی تھی کہ جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہہ جاوے وہ مستحق سمجھا جاوے، سو قرعہ سے غرض اس امر کا طے کرنا تھا) کہ ان سب میں کون شخص حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت (پرورش) کرے، (پس آپ نہ تو اس وقت موجود تھے) اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ وہ لوگ (قبل قرعہ اس مقدمہ میں) باہم اختلاف کر رہے تھے (جس کے رفع کی ضرورت کے لئے یہ قرعہ قرار دیا، اور ان خبروں کے دریافت ہونے کے لئے دوسرا واسطہ کا نہ ہونا بھی یقیناً معلوم ہے، پس ایسی حالت میں یہ غیبی خبریں آپؐ کی نبوت کی دلیل ہیں)۔

معارف و مسائل

مسئلہ: شریعت محمدیہ میں حنفیہ کے مسلک پر قرعہ کا یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب شرع میں معلوم و متعین ہیں ان میں قرعہ ناجائز و داخل قمار ہے، مثلاً شئ مشترک میں جس کا نام نکل آئے وہ سب لے لے، یا جس بچے کے نسب میں اختلاف ہو اس میں جس کا نام نکل آئے وہی باپ سمجھا جائے، اور جن حقوق کے اسباب رائے کے سپرد ہوں ان میں قرعہ جائز ہے، مثلاً مشترک مکان کی تقسیم میں قرعہ سے زید کو شرقی حصہ دیدینا اور عمرو کو غربی حصہ دیدینا، یہ اس لئے جائز ہے کہ بلا قرعہ بھی ایسا کرنا اتفاقِ شریکین سے یا قضائے قاضی سے جائز تھا (بیان القرآن)

یا یوں کہئے کہ جہاں سب شریکوں کے حقوق مساوی نہ ہوں وہاں کوئی ایک جہت ایک شخص کے لئے متعین کرنے کے واسطے قرعہ اندازی جائز ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ
جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی

اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَ
جس کا نام مسیح ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا مرتبہ والا دنیا میں اور

الْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ
آخرت میں اور اللہ کے مقربوں میں اور باتیں کرے گا لوگوں سے جب کہ ماں کی

وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾
گود میں ہوگا اور جبکہ پوری عمر کا ہوگا اور نیک بختوں میں ہے

خلاصۂ تفسیر

(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی) کہا کہ اے مریم بیشک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی جو بلا واسطہ باپ کے پیدا ہونے کے سبب کلمۃ اللہ کہلاوے گا، اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ) باآبرو ہوں گے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں (بھی کہ ان کو نبوت عطا ہوگی) اور آخرت میں (بھی کہ اپنی امت کے مومنین کے باب میں مقبول الشفاعت ہوں گے) اور (جیسے ان میں نبوت وشفاعت کی صفت ہوگی جس کا تعلق دوسروں سے بھی ہے، اسی طرح ذاتی کمال کے ساتھ بھی موصوف ہوں گے) منجملہ مقربین (عند اللہ) ہوں گے اور (صاحب معجزہ بھی ہوں گے) آدمیوں سے (دونوں حالت میں یکساں) کلام کریں گے، گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں بھی) اور بڑی عمر میں (بھی دونوں کلاموں میں تفاوت نہ ہوگا) اور (اعلیٰ درجہ کے) شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

معارف ومسائل

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دلیل، بڑی عمر میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام معجزہ ہی ہے: اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی بتلائی ہے کہ وہ بچپن کے گہوارے میں جب کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس حالت میں بھی کلام کریں گے، جیسا دوسری آیت میں مذکور ہے کہ جب لوگوں نے ابتداء ولادت کے بعد حضرت مریمؑ پر تہمت

حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے (صحبت کے طور پر) ہاتھ نہیں لگایا (اور کوئی بچہ جائز طریق سے عادۃً بدون مرد کے پیدا نہیں ہوتا، تو معلوم نہیں کہ ویسے ہی محض قدرتِ خداوندی سے بچہ ہوگا یا مجھ کو نکاح کا حکم کیا جائے گا) اللہ تعالیٰ نے (جواب میں فرشتے کے واسطے سے) فرمایا ایسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے صرف ان کا چاہنا کافی ہے، کسی واسطہ یا سبب خاص کی ان کو حاجت نہیں اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ موجود ہوجا، بس وہ چیز موجود ہو جاتی ہے (پس جس چیز کو بلا اسباب و وسائط موجود ہونے کو کہدیا وہ اسی طرح ہوجاتی ہے)۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

اور سکھلاوے گا اس کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور توریت اور انجیل

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ

اور کرے گا اس کو پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف بیشک میں آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لے کر

رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ

تمہارے رب کی طرف سے کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو گارے سے پرندے کی شکل

فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ

پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو ہو جاتا ہے وہ اڑتا جانور اللہ کے حکم سے اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو

وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا

اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتا دیتا ہوں تم کو جو

تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں اس میں نشانی

لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا

پوری ہے تم کو اگر تم یقین رکھتے ہو اور سچا بتاتا ہوں اپنے

بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ

سے پہلی کتاب کو جو توریت ہے اور اس واسطے کہ حلال کردوں تم کو بعضی وہ چیزیں

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

جو حرام تھیں تم پر اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لے کر تمہارے رب کی سو ڈرو اللہ سے

وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هٰذَا

اور میرا کہا مانو بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو یہی

صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝٥١

راہ سیدھی ہے

خلاصۂ تفسیر

اور اے مریم اس مولود مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ان کو تعلیم فرما دیں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل (ان کو تمام) اور بنی اسرائیل کی طرف ان کو پیغمبر بنا کر (یہ مضمون دے کر) بھیجیں گے کہ اِنّی قد جئتکم (تا) مستقیم یعنی میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مُردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دوسرا تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کر آ)تے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا) بلاشبہ ان (معجزات مذکورہ) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی توراۃ کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعضی ایسی چیزیں حلال کر دوں جو (شریعت موسیٰ علیہ السلام میں) تم پر حرام کر دی گئی تھیں (اور ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہوگی) اور (میرا یہ دعویٰ نسخ بلا دلیل نہیں ہے بلکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحب نبوت کا قول دعویٰ نسخ میں حجت ہے، حاصل یہ کہ جب میرا نبی ہونا دلیل سے ثابت ہو چکا تو میری تعلیم کے موافق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کی مخالفت حکم) سے ڈرو اور (دین کے باب میں) میرا کہنا مانو (اور خلاصہ میری دینی تعلیم کا یہ ہے کہ) بےشک اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے (یہ تو حاصل ہے تکمیل عقیدہ کا) سو تم لوگ اس (رب)

کی عبادت کرو (یہ حاصل ہو تکمیلِ عمل کا، بس) یہی ہے راہ راست (دین کی جس میں عقائد و اعمال دونوں کی تکمیل ہو، اسی سے نجات و وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے)

معارف ومسائل

مسئلہ: پرندہ کی شکل بنانا تصویر تھا جو اس شریعت میں جائز تھا، ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہوگیا۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر بولا کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی

اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ

راہ میں کہا حواریوں نے ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے ہم یقین لائے اللہ پر

وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ

اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا اے رب ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اتاری اور

اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۳)

ہم تابع ہوئے رسول کے سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں

خلاصۂ تفسیر

(غرض بشارت مذکورہ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شان سے پیدا ہوئے، اور بنی اسرائیل سے مضمون مذکورہ کی گفتگو ہوئی اور معجزات ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپ کی نبوت کے منکر رہے) سو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے انکار دیکھا (اور انکار کے ساتھ درپے ایذا بھی، اور اتفاقاً کچھ لوگ ان کو ایسے ملے جو حواریین کہلاتے تھے) تو (ان حواریین سے) آپ نے فرمایا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (دینِ حق میں بمقابلہ مخالفین و منکرین کے) میرے مددگار ہو جاویں، اللہ کے واسطے (جس سے دعوتِ دین میں مجھ کو کوئی ایذا نہ پہونچائے، حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے (دین کے) ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب دعوت آپ کے) ایمان لائے اور آپ (اس بات) کے گواہ رہیے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرمانبردار ہیں (پھر زیادتِ اہتمام و توثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے

ہمارے رب ہم ایمان لائے ان چیزوں (یعنی ان احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے (ان) رسول کی سو (ہمارا ایمان قبول فرما کر) ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو (مضامین مذکورہ کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی مومنین کاملین کے زمرہ میں ہم کو بھی شمار فرمائیے)۔

معارف ومسائل

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ لفظ حواری، حور سے ماخوذ ہے جس کے معنی لغت میں سفیدی کے ہیں، اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کو ان کے خلوص وصفائی قلب کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے حواری کا لقب دیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو صحابی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے حواریین کی تعداد بارہ بتلائی ہے، اور کبھی لفظ حواری مطلقاً مددگار کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے، اسی معنی سے ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ہر نبی کا کوئی حواری یعنی مخلص ساتھی ہوتا ہے، میرے حواری زبیر ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

فائدہ مہمہ: اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جب لوگوں کا کفر اور مخالفت محسوس ہوئی اس وقت مددگاروں کی تلاش ہوئی تو فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْٓ ابتداء میں نبوت کا منصبی کام اور دعوت شروع کرتے وقت تنہا ہی تعمیل حکم کے لئے کھڑے ہوگئے تھے، پہلے سے کسی پارٹی یا جماعت بنانے کی فکر میں نہیں پڑے، جب ضرورت پیش آئی تو جماعت بھی بن گئی، غور کیا جائے تو ہر کام ایسے ہی عزم وہمت کو چاہتا ہے۔

ع ۱۳ ۵ ۱۲

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے جس وقت کہا

اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ

اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھا لوں گا اپنی طرف اور پاک کر دوں گا تجھ کو

مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ

کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں

كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ

سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک پھر میری طرف ہے تم سب کو پھر آنا پھر فیصلہ کر دوں گا

بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اسرائیل میں سے آپ کے منکرِ نبوت تھے آپ کو ہلاک کرنے اور ایذا پہونچانے کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر و حیلہ سے آپ کو گرفتار کرکے سولی دینے پر آمادہ ہوئے) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی (جس کی حقیقت کا ان لوگوں کو بھی پتہ نہ لگا، کیونکہ انہیں مخالفین میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل پر بنا دیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا جس سے وہ محفوظ رہے، اور وہ ہمشکل سولی دیدیا گیا، ان لوگوں کو اس تدبیر کا علم تک بھی نہ ہوسکا اور دفع پر تو کیا قدرت ہوتی) اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں، (کیونکہ اوروں کی تدبیریں ضعیف ہوتی ہیں، اور کبھی قبیح اور بے موقع بھی ہوتی ہیں، اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خیر محض اور موافق حکمت کے ہوتی ہیں، اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت متردد اور پریشان ہوئے) فرمایا کہ اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو (اپنے وقت موعود پر طبعی موت سے) وفات دینے والا ہوں (پس جب تمہارے لئے موت طبعی مقدر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں دار پر جان دینے سے محفوظ رہو گے) اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالم بالا کی) طرف اٹھائے لیتا ہوں، اور تم کو ان لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں جو (تمہارے) منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روزِ قیامت تک (گو اس وقت منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں) پھر (جب قیامت آجائے گی اس وقت) میری طرف ہوگی سب کی واپسی (دنیا و برزخ سے) سو میں (اس وقت تمہارے سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے (کہ منجملہ ان امور کے مقدمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا)۔

آیت کے اہم الفاظ کی تشریح

اس آیت کے الفاظ و معانی میں بعض فرقوں نے تحریفات کا دروازہ کھولا ہے جو

تمام امت کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور آخر زمانہ میں نزول کے منکر ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان الفاظ کی تشریح وضاحت کے ساتھ کردی جائے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ، لفظ "مکر" عربی زبان میں لطیف وخفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور برائی کے لئے ہو تو برا ہے، اسی لئے وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ (۳۵:۴۳) میں مکر کے ساتھ "سیئ" کی قید لگائی، اردو زبان کے محاورت میں مکر صرف سازش اور بری تدبیر اور حیلہ کے لئے بولا جاتا ہے اس سے عربی محاورت پر شبہ نہ کیا جائے، اسی لئے یہاں خدا کو "خیر الماکرین" کہا گیا مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کردیں حتی کہ بادشاہ کے کان بھردیے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے، تورات کو بدلنا چاہتا ہے، سب کو بددین بناکر چھوڑے گا، اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دیدیا، ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر حق تعالیٰ کی لطیف وخفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ، لفظ متوفی کا مصدر "توفی" اور مادہ وفی ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وفاء، ایفاء، استیفاء اسی معنی کے لئے بولے جاتے ہیں توفی کے بھی اصل معنی پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل مقدرہ پوری کرلیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے، اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۳۹:۴۲) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی ان کی نیند کے وقت"۔

حافظ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح ص ۸۳ ج ۲ میں فرمایا: اَلتَّوَفِّيْ فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ مَعْنَاهَا الْقَبْضُ وَالْاِسْتِيْفَاءُ وَذٰلِكَ ثَلَاثَةُ اَنْوَاعٍ، اَحَدُهَا التَّوَفِّيْ فِي النَّوْمِ وَالثَّانِيْ تَوَفِّي الْمَوْتِ وَالثَّالِثُ تَوَفِّي الرُّوْحِ وَالْبَدَنِ جَمِيْعًا۔

اور کلیات ابو البقاء میں ہے: التوفی الاماتۃ وقبض الروح وعلیہ استعمال العامۃ او الاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لفظ متوفیک کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ الہند میں مذکور ہے، اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو

یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے، بلکہ خود آپ کو لے لیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھالیں گے۔

اور بعض حضرات نے اس کا ترجمہ موت دینے سے کیا ہے، جیسا کہ بیان القرآن کے خلاصہ میں اوپر مذکور ہے، اور یہی ترجمہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اسانید صحیحہ کے ساتھ منقول ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس وقت جب کہ یہودی آپ کے قتل کے درپے تھے آپ کی تسلی کے لئے دو لفظ ارشاد فرمائے، ایک یہ کہ آپ کی موت اُن کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت میں ہوگی، دوسرا یہ کہ اس وقت اُن لوگوں کے نرغہ سے نجات دینے کی ہم یہ صورت کریں گے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لیں گے، یہی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت اس طرح منقول ہے:

اَخْرَجَ اِسْحٰقُ بْنُ بِشْرٍ وَابْنُ عَسَاکِرَ مِنْ طَرِیْقِ جُوَیْبِرٍ عَنِ الضَّحَّاکِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ یَعْنِیْ رَافِعُکَ ثُمَّ مُتَوَفِّیْکَ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ (درمنثور ص ۳۶ ج ۲)

”اسحٰق بن بشر اور ابن عساکر نے روایت جوہر عن الضحاک حضرت ابن عباسؓ سے آیت انی متوفیک ورافعک الیّ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا۔“

اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ توفّی کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے، رَافِعُکَ کا پہلے اور مُتَوَفِّیْکَ کا وقوع بعد میں ہوگا، اور اس موقع پر مُتَوَفِّیْکَ کو مقدم ذکر کرنے کی حکمت و مصلحت اس پورے معاملے کی طرف اشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے، یعنی یہ اپنی طرف بلا لینا ہمیشہ کے لئے نہیں، چند روزہ ہوگا اور پھر آپ اس دنیا میں آئیں گے اور دشمنوں پر فتح پائیں گے، اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہوگی، اس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کی تکمیل بھی، نیز اس میں عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت کا ابطال بھی تھا، ورنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے ان کا یہ عقیدہ باطل اور پختہ ہوجاتا کہ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرح حیّ و قیوم ہے، اس لئے پہلے مُتَوَفِّیْکَ کا لفظ ارشاد

فرما کر ان تمام خیالات کا ابطال کر دیا، پھر اپنی طرف اٹھانے کا ذکر فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی مخالفت و عداوت تو انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ ہی ہوتی چلی آئی ہے، اور عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم نے انکار اور ضد پر کمر باندھ لی اور پیغمبر کی بات نہ مانی، ان کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائی، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کی گئی ہے، یا تو اس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کر دیا گیا، جیسے عاد و ثمود اور قوم لوط علیہ السلام، و قوم صالح علیہ السلام کے ساتھ معاملہ کیا گیا، یا پھر یہ صورت ہوئی کہ اپنے پیغمبر کو اس دار الکفر سے ہجرت کرا کے کسی دوسری جگہ منتقل کیا گیا اور وہاں ان کو وہ قوت و شوکت دی گئی کہ پھر اپنی قوم پر فتح پائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کر کے شام میں پناہ لی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام ہجرت کر کے مصر سے مدین تشریف لے گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ کو وطن بنایا، پھر وہاں سے حملہ آور ہو کر مکہ فتح کیا، یہود کے نرغے سے بچانے کے لئے یہ آسمان پر بلا لینا بھی درحقیقت ایک قسم کی ہجرت تھی، جس کے بعد وہ پھر دنیا میں واپس آ کر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی یہ ہجرت سب سے الگ آسمان کی طرف کیوں ہے؟ تو حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں خود فرما دیا ہے کہ ان کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش عام مخلوقات کے طریق پیدائش سے مختلف بغیر ماں باپ کے ہے اسی طرح ان کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش سے مختلف صورت سے ہوئی اور وفات بھی عجیب و غریب طریقہ سے صدہا سال کے بعد دنیا میں آ کر عجیب ہوگی تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی ہجرت بھی کسی ایسے عجیب طریقے سے ہو۔

یہی عجائب قدرت تو جاہل نصاریٰ کے لئے اس عقیدہ میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے کہ ان کو خدا کہنے لگے، حالانکہ انہی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعہ میں ان کی عبدیت و بندگی اور تابع فرمان الٰہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں، اور اسی لئے ہر ایسے موقع پر قرآن حکیم نے عقیدۂ الوہیت کے ابطال کی طرف اشارہ کر دیا ہے، آسمان پر اٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا، اس لئے مُتَوَفِّيكَ کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا، اس تقدیم و تاخیر الفاظ کے ذریعہ اسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے

بری ہوں، ایک وقت آئے گا جب ان کو بھی موت آئے گی۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر اسی طرح کے مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونیوالے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر، ص ۴۸۱، ج ۲)

وَرَافِعُكَ اِلَیَّ، اس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف روح کا نہیں بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہوا جسمانی نہیں اٹھایا گیا بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ رفع کبھی بلندی مرتبہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶: ۱۶۶)، اور یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۵۸: ۱۱) وغیرہ آیات میں مذکور ہے۔

تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ رفع کو رفع درجہ کے معنی میں استعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرائن کی بنا پر مذکورہ آیات میں ہوا ہے، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ رفع کے ساتھ لفظ اِلٰی استعمال فرما کر اس مجازی معنی کا احتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں رَافِعُكَ اِلَیَّ فرمایا، اور سورۂ نساء کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا، وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴: ۱۵۸) یعنی یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا، اپنی طرف اٹھا لینا روح مع جسد کے زندہ اٹھا لینے ہی کے لئے بولا جاتا ہے،

یہاں تک الفاظ آیت کی تشریح ہوئی۔

آیت مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے — اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے:

سب سے پہلا وعدہ یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی، اور وہ وقت موعود قرب قیامت میں آئے گا جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ متواترہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، اور اس کا کچھ حصہ آگے آئے گا۔

دوسرا وعدہ فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھا لینے کا تھا، یہ اسی وقت پورا کر دیا گیا جس کے پورا کرنے کی خبر سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح دیدی گئی، وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴: ۱۵۸) "یقیناً ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا"

تیسرا وعدہ ان کو دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا میں وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور یہود کے سب غلط الزامات کو صاف کر دیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، قرآن کریم نے اس الزام کو یہ فرما کر صاف کر دیا کہ وہ محض اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے بلا باپ کے پیدا ہوئے، اور یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں، حضرت آدمؑ کی پیدائش اس سے زیادہ تعجب کی چیز ہے، کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

یہود کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعوے کا الزام لگاتے تھے، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس کے خلاف اپنی عبدیت اور بندگی اور بشریت کا اقرار نقل فرمایا۔

چوتھا وعدہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ میں ہے کہ آپ کے متبعین کو آپ کے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں اتباع سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور اقرار ہے، ان کے سب احکام پر ایمان و اعتقاد کی شرط نہیں تو اس طرح نصاریٰ اور اہلِ اسلام دونوں اس میں داخل ہوگئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد نجاتِ آخرت کے لئے کافی نہیں بلکہ نجاتِ آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر اعتقاد و ایمان اختیار نہ کیا، اس لئے نجاتِ آخرت سے محروم رہے مسلمانوں نے اس پر بھی عمل کیا، اس لئے نجاتِ آخرت کے مستحق ہوگئے، لیکن دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر موقوف تھا، وہ دنیا کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو بمقابلہ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقیناً قیامت تک رہے گا۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بمقابلہ یہود ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انھیں کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اور رہیں۔

اسرائیل کی موجودہ حکومت سے اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا	کیونکہ اول تو اس حکومت کی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ وہ روس اور یورپ کے نصاریٰ کی مشترک چھاؤنی ہے جو محض مسلمانوں

کے خلاف قائم کر رکھی ہے، ایک دن کے لئے بھی اگر حکومت روس و امریکہ و دیگر ممالک یورپ اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹا لیں تو دنیا کے نقشے سے اس کا وجود مٹ جائے، ساری دنیا مشاہدہ کرلے۔ اس لئے یہود یا اسرائیل کی یہ حکومت حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ایک مجاز تو ہو سکتی ہے اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، اور بالفرض اس کو انکی اپنی ہی حکومت تسلیم کرلیا جائے تو بھی نصاریٰ در اصل اسلام کے ثبوت کے مقابلہ میں ان کے مغلوب و مقہور ہونے سے کونسا صحیح العقل انسان انکار کر سکتا ہے، اس سے بھی قطع نظر کرو تو قرب قیامت میں چند روزہ یہود کے غلبہ کی خبر تو خود اسلام کی متواتر روایات میں موجود ہے، اگر اس دنیا کو اب زیادہ باقی رہنا نہیں ہے اور قیامت قریب ہی آچکی ہے تو اس کا ہونا بھی اسلامی روایات کے منافی نہیں، اور ایسی چند روزہ شورش کو سلطنت یا حکومت نہیں کہہ سکتے۔

پانچواں وعدہ: قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، جیسا کہ آیت میں ارشاد ہے ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ

مسئلہ حیات و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

دنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو کر دفن ہوگئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۂ نساء کی آیت میں واضح کردی ہے، اور اس آیت میں بھی وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ میں اس کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کر کے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا، آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۝ (۴، ۱۵۷)

"(نہ انھوں نے عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہولئے)"

اس کی مزید تفصیل سورۂ نساء میں آئے گی۔

نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہوگئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھائے گئے، مذکورہ آیت نے ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کردی، اور بتلا دیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکہ

عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اس لئے شُبِّهَ لَهُمْ کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہو گئے۔

ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے آسمان پر زندہ اٹھا لیا، نہ ان کو قتل کیا جا سکا نہ سولی پر چڑھایا جا سکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے، اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔

اسی عقیدہ پر تمام امتِ مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الحبیر ص ۳۱۹ میں یہ اجماع نقل کیا ہے، قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اجماعِ امت سے ثابت ہے، یہاں اس کی پوری تفصیل کا موقع بھی نہیں، اور ضرورت بھی نہیں، کیونکہ علماء امت نے اس مسئلہ کو مستقل کتابوں اور رسالوں میں پورا پورا واضح فرما دیا ہے، اور منکرین کے جوابات تفصیل سے دیئے ہیں ان کا مطالعہ کافی ہے، مثلاً حضرت حجۃ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کی تصنیف بزبان عربی عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنی کی تصنیف بزبان اردو حیات عیسیٰ علیہ السلام، مولانا سید محمد ادریس صاحب کی تصنیف حیات مسیح علیہ السلام، اور بھی سینکڑوں چھوٹے بڑے رسائل اس مسئلہ پر طبع و مشتہر ہو چکے ہیں، احقر نے بھی استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ سو سے زائد احادیث جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ اٹھایا جانا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہونا بتواتر ثابت ہوتا ہے ایک مستقل کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں جمع کر دیا ہے، جس کو حال میں حواشی و شرح کے ساتھ حلب شام کے ایک بزرگ علامہ عبدالفتاح ابو غدہ نے بیروت میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

اور حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ زخرف کی آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳: ۶۱) کی تفسیر میں لکھا ہے:

وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَخْبَرَ بِنُزُوْلِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِمَامًا عَادِلًا الخ	"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل قیامت نازل ہونے کی خبر دی ہے"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور زندہ رہنے پھر قرب قیامت

میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے جن کو علماءِ امت نے مستقل کتابوں رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے جن میں سے بعض کے نام اوپر درج ہیں مسئلہ کی مکمل تحقیق کے لئے تو انھی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس پر نظر کرنے سے ذرا بھی عقل و انصاف ہو تو اس مسئلہ میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کے چوتھے رکوع میں حق تعالیٰ نے انبیاءِ سابقین کا ذکر فرمایا تو حضرت آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ، آلِ عمرانؑ، سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمال کرنے پر کفایت فرمایا، اس کے بعد تقریباً تین رکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کا ذکر اس بسط و تفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کا تفصیلی ذکر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطنِ مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن و تشنیع، اور ولادت میں ان کو بطورِ معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، اُن کی مخالفت، حواریین کی امداد، یہودیوں کا نرغہ، ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا جانا وغیرہ، پھر احادیث متواترہ میں ان کی مزید صفت شکل و صورت ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن و حدیث میں کسی نبی و رسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے، یہ بات ہر انسان کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی و رسول ہیں کوئی دوسرا نبی آپ کے بعد آنے والا نہیں، اس لئے آپ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل امت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دیدیں، اس لئے آپؐ نے ایک طرف تو اس کا اہتمام فرمایا کہ آپ کے بعد قابلِ اتباع کون لوگ ہوں گے، ان کا تذکرہ اصولی طور پر عام اوصاف کے ساتھ بھی بیان فرمایا بہت سے حضرات کے نام متعین کر کے بھی امت کو ان کے اتباع کی تاکید فرمائی، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے امت کے دین کو خطرہ تھا۔

بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح دجال تھا، جس کا فتنہ سخت گمراہ کن تھا اس کے اتنے حالات وصفات بیان فرما دیئے کہ اس کے آنے کے وقت امت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابلِ اقتداء

٦

بزرگوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کو حق تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے نوازا اور فتنۂ دجال میں امتِ مسلمہ کی امداد کے لئے ان کو آسمان میں زندہ رکھا، اور قربِ قیامت میں ان کو قتلِ دجال کے لئے مامور فرمایا، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وصفات بھی امت کو ایسے واشگاف بتلادئیے جائیں جن کے بعد نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔

اس میں بہت سی حکم ومصالح ہیں، اوّل یہ کہ اگر امت کو ان کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آیا تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، امتِ مسلمہ ان کے ساتھ نہ لگے گی تو وہ امت کی امداد ونصرت کس طرح فرمائیں گے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ اس وقت فرائضِ نبوت و رسالت پر مامور ہوکر دنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ امتِ محمدیہ کی قیادت وامامت کے لئے بحیثیت خلیفۂ رسول ﷺ تشریف لائیں گے، مگر ذاتی طور پر جو ان کو منصبِ نبوت ورسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، بلکہ اس وقت ان کی مثال اس گورنر کی سی ہوگی جو اپنے صوبہ کا گورنر ہے، مگر کسی ضرورت سے دوسرے صوبہ میں چلا گیا ہے، تو وہ اگرچہ صوبہ میں گورنر کی حیثیت پر نہیں مگر اپنے عہدۂ گورنری سے معزول بھی نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی صفتِ نبوت و رسالت سے الگ نہیں ہوں گے، اور جس طرح ان کی نبوت سے انکار پہلے کفر تھا اس وقت بھی کفر ہوگا، تو امتِ مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر قرآنی ارشادات کی بنا پر ایمان لائے ہوئے ہے اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو انکار میں مبتلا ہوجائے گی، اس لئے انکی علامات وصفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو دنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگرانکی علامات وحالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی دعویٰ کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوں، ان علامات کے ذریعہ اس کی تردید کی جاسکے گی، جیسا کہ ہندوستان میں مرزا قادیانی نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں، اور علماء امت نے انہی علامات کی بنا پر اس کے قول کو رد کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ اور دوسرے مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وصفات کا اتنی تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود ان کے قربِ قیامت میں نازل ہونے اور دوبارہ دنیا میں تشریف لانے ہی کی خبر دے رہا ہے۔ احقر نے اس مضمون کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے رسالہ مسیح موعود کی پہچان میں بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا
سو وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب دنیا میں

وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
کام نیک کئے سو ان کو پورا دے گا ان کا حق اور اللہ کو خوش نہیں آتے

الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾
بے انصاف یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں اور بیان تحقیقی

ربطِ آیات | اوپر آیت میں مذکور تھا کہ "میں ان اختلاف کرنیوالوں کے درمیان قیامت کے روز عملی فیصلہ کر دوں گا" اس آیت میں اس فیصلہ کا بیان ہے:

خلاصۂ تفسیر

تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ (ان اختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے سو ان کو (ان کے کفر پر) سخت سزا دوں گا (مجموعہ دونوں جہان میں) دنیا میں بھی (کہ وہ تو ہو چکی) اور آخرت میں بھی (کہ وہ باقی رہی) اور ان لوگوں کا کوئی حامی (طرفدار) نہ ہوگا اور (جو لوگ مومن تھے اور انھوں نے نیک کام کئے تھے سو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کام کے) ثواب دیں گے اور (کفار کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے (ایسے) ظلم کرنے والوں سے (جو خدا تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں یعنی چونکہ یہ ظلم عظیم ہے، معافی کے قابل نہیں، اس لئے مبغوض شدید ہو کر سزا یاب ہو جاتا ہے) یہ (قصہ مذکورہ) ہم تم کو (بذریعہ وحی کے) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ (آپ کے) منجملہ دلائل (نبوت) کے ہے اور منجملہ حکمت آمیز مضامین کے ہے

معارف ومسائل

مصائبِ دنیا کفار کے لئے کفارہ نہیں ہوتے | فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
مومن کے لئے کفارہ ہو کر مفید ہوتے ہیں | اس آیت کے مضمون پر ایک خفیف سا اشکال ہوتا ہے،
کہ قیامت کے فیصلہ کے بیان میں اس کہنے کے کیا معنی کہ میں دنیا و آخرت میں سزا دوں گا کیونکہ

اس وقت تو سزائے دنیوی نہیں ہوگی۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو یہ کہے کہ اس وقت تو ایک سال کی قید کرتا ہوں، مگر جیل خانہ میں کوئی شرارت کی تو دو سال کی سزا کر دوں گا، فقط اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ دو سال آج کی تاریخ سے ہوں گے، پس اس بنا پر یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم موجود ہے گا، حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعہ کی تکمیل بطور انضمام ایک سال زائد کے مرتب ہو جاوے گی۔

اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں تو سزا ہو چکی اس کے ساتھ سزائے آخرت منضم ہو کر مجموعہ قیامت کے روز تکمیل کر دیا جائے گا، یعنی سزائے دنیا کفارہ نہ ہوگا سزائے آخرت کے لئے بخلاف اہل ایمان کے کہ اگر ان پر دنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور عاقبت کی عقوبت خفیف یا رفع ہو جاتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کی طرف وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ میں اشارہ فرمایا گیا، یعنی اہل ایمان بسبب ایمان کے محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں، اور اہل کفر بسبب کفر کے مبغوض ہیں، مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ (بیان القرآن)

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ

بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے پھر

قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ

کہا اس کو کہ ہو جا وہ ہو گیا، حق وہ ہے جو تیرا رب کہے پھر تو مت رہ شک

الْمُمْتَرِيْنَ ۝۶۰ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ

لانے والوں میں سے، پھر جو کوئی جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آ چکی تیرے پاس

مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا

خبر سچی تو تو کہہ دے آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں

وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ

اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان پھر التجا کریں ہم سب اور لعنت کریں

اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱ اِنَّ ھٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ

اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں، بے شک یہی ہے بیان سچا،

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

پھر اگر قبول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے

ع ۶ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

بیشک حالت عجیبہ (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک (یعنی ان کی تجویز ازلی میں) مشابہ حالت عجیبہ (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے ہے کہ ان (آدم علیہ السلام) کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہوجا، بس وہ (جاندار) ہوگئے، یہ امر واقعی (جو اوپر مذکور ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوجائیے، بس جو آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے، تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آجاؤ ہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں، بیشک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) وہی ہے سچی بات، اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے (یہ توحید ذاتی ہوئی) اور بلاشک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں (یہ توحید صفاتی ہوئی) پھر (ان سب حجتوں کے بعد بھی) اگر (حق قبول کرنے سے سرتابی کریں، تو (آپ ان کا معاملہ حوالہ بخدا کیجئے، کیونکہ) بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد کرنے والوں کو

معارف و مسائل

قیاس کی حجیت

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس بھی حجت شرعیہ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی، یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ (اور ماں) کے پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر قیاس کرنے کی طرف اشارہ فرمادیا (مظہری)۔

مُباہلہ کی تعریف

نَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا الخ اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مباہلہ کرنے کا حکم دیا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی امر کے حق و باطل میں فریقین میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں باطل پر ہو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت پڑے، کیونکہ لعنت کے معنی رحمت حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا، اس وقت سچے کی تعیین صادق و کاذب کی منکرین کے نزدیک بھی واضح ہو جائے گی، اس طور پر دعا کرنے کو مباہلہ کہتے ہیں، اور اس میں اصل تو خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دعا کرنا ہے، اپنے اعزہ و اقارب کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر جمع کیا جائے تو اس سے اور اہتمام بڑھ جاتا ہے۔

واقعۂ مُباہلہ اور رَدِّ روافض

اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کی جانب ایک فرمان بھیجا جس میں تین چیزیں ترتیب وار ذکر کی گئی تھیں، (۱) اسلام قبول کرو (۲) یا جزیہ ادا کرو (۳) یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، نصاریٰ نے آپس میں مشورہ کر کے شرحبیل، عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن قیس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، ان لوگوں نے آکر مذہبی امور پر بات چیت شروع کی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے میں ان لوگوں نے انتہائی بحث و تکرار سے کام لیا، اتنے میں یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی، اس پر آپ نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی، اور خود بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تیار ہو کر تشریف لائے، شرحبیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا نبی ہے، نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت اور بربادی یقینی ہے، اس لئے نجات کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو، ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کی جائے، چنانچہ اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جزیہ مقرر کر کے صلح کر دی جس کو انھوں نے بھی

منظور کرلیا (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اس آیت میں اَبْنَآءَنَا سے مراد صرف اولاد صلبی نہیں ہے، بلکہ عام مراد ہے، خواہ اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو، کیونکہ عرفاً ان سب پر اولاد کا صدق ہوتا ہے، لہٰذا اَبْنَآءَنَا میں آپ کے نواسے حضرات حسنینؓ اور آپ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اَبْنَآءَنَا میں داخل کرنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ آپؓ نے تو پرورش بھی حضورؐ کی آغوش میں پائی تھی، آپ نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، اور آپؓ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا صدق کیا جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاد میں داخل ہیں، لہٰذا روافض کا آپ کو اَبْنَآءَنَا سے خارج کرکے اور اَنْفُسَنَا میں داخل کرکے آپؓ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

تو کہہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا

کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی

بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا

کسی کو رب سوائے اللہ کے پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ

بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

ہم تو حکم کے تابع ہیں

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلّم ہونے میں) برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر (اس کے بعد بھی) وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم (مسلمان لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار)

کے گواہ رہو کہ ہم تو اس بات کے ماننے والے ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)۔

معارف و مسائل

تبلیغ و دعوت کے اہم اصول

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ، اس آیت سے تبلیغ و دعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، وہ دعوت نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْاَرِيْسِيِّيْنَ، يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بخاری)

"میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے یہ خط محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے، روم کے بادشاہ ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہو اس شخص کے لئے جو راہ ہدایت کی پیروی کرے بعد اس کے میں تجھے اسلام کے بلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دوہرا اجر دیگا، اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب کسانوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں، اے اہل کتاب، ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شریک کریں، اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں کو رب بنائیں۔"

تَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ، اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ تم گواہ رہو، اس سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہئے، مزید بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ

اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور توریت اور انجیل تو اتریں

وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاۗءِ

اس کے بعد کیا تم کو عقل نہیں سنتے ہو تم لوگ

حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ

جھگڑ چکے جس بات میں تم کو کچھ خبر تھی، اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں تم کو

لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ

کچھ خبر نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے نہ تھا

اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَ

ابراہیم یہودی اور نہ تھا نصرانی لیکن تھا حنیف یعنی سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور حکم بردار

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ

اور نہ تھا مشرک لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی جو ساتھ

اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اس کے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا

خلاصۂ تفسیر

اے اہل کتاب کیوں حجت کرتے ہو (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں (کہ وہ طریق یہودیت پر تھے یا نصرانیت پر تھے) حالانکہ نہیں نازل کی گئی توراۃ اور انجیل مگر ان کے (زمانہ کے بہت) بعد (اور یہ دونوں طریق ان دونوں کتابوں کے نزول کے بعد سے ظاہر ہوئے پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا، پھر حضرت ابراہیمؑ ان طریقوں پر کس طرح ہو سکتے ہیں) کیا (ایسی خلاف عقل بات منہ سے نکالتے ہو اور) پھر سمجھتے نہیں ہو، ہاں تم ایسے ہو

گمراہ نہیں کر سکتے مگر خود اپنے آپ کو (وبالِ ضلال میں گرفتار کر رہے ہیں) اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے، اے اہلِ کتاب کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں کے ساتھ (جو تورات اور انجیل میں نبوت محمدیہ پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ان آیات کی تکذیب کرنا ہے جو کفر ہے) حالانکہ تم (اپنی زبان سے) اقرار کرتے ہو کہ وہ آیات حق ہیں، یہ تو مذمت ہوئی ان کے ضلال پر آگے اضلال پر ملامت فرماتے ہیں کہ) اے اہل کتاب کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوتِ محمدیہ) کو غیر واقعی (یعنی عبارت تحریف شدہ یا تفسیر فاسد) سے، اور کیوں چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو (کہ حق بات چھپا رہے ہو)

معارف و مسائل

اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اور اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کے الفاظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر وہ اقرارِ حق نہ کریں یا ان کو علم نہ ہو تو ان کے لئے کفر جائز ہوگا، وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر اپنی ذات کے اعتبار سے ایک قبیح فعل ہے، یہ ہر حالت میں ناجائز ہے، البتہ علم و اقرار کے بعد کفر اختیار کرنے میں ملامت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ
اور کہا بعض اہلِ کتاب نے مان لو جو کچھ اترا
عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ
مسلمانوں پر دن چڑھے اور منکر ہو جاؤ آخر دن میں شاید وہ
یَرْجِعُوْنَ ۚۖ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
پھر جاویں، اور نہ مانیو مگر اسی کی جو چلے تمہارے دین پر کہہ دے کہ بیشک
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ اَوْ
ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا جیسا کچھ تم کو ملا تھا
یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ
وہ غالب کیوں آگئے تم پر تمہارے رب کے آگے تو کہہ بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جس کو
یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۚۙ (۷۳) یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ
چاہے اور اللہ بہت گنجائش والا ہے خبردار خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اور اللہ کا فضل بڑا ہے

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے لوگ اہل کتاب میں سے (بطور مشورہ) باہم کہتے ہیں کہ (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ ظاہراً) ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی گئی ہے (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) مسلمانوں پر (مراد یہ کہ قرآن پر ایمان لے آؤ) شروع دن میں (یعنی صبح کے وقت) اور (پھر) انکار کر بیٹھو آخر دن (یعنی شام کو) عجب نہیں (اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی قرآن اور اسلام کے حق ہونے میں شبہ پڑ جانے اور) وہ (اپنے دین سے) پھر جاویں، اور یہ خیال کریں کہ یہ لوگ علم والے ہیں اور بے تعصب بھی ہیں کہ اسلام قبول کر لیا اس پر بھی جو پھر گئے تو ضرور اسلام کا غیر حق ہونا ان کو دلائل علمیہ سے ثابت ہو گیا ہوگا، اور ضرور انھوں نے اسلام میں کوئی خرابی دیکھی ہوگی جب ہی اس سے پھر گئے اور اہل کتاب نے یہ بھی باہم کہا کہ مسلمانوں کے دکھلانے کو صرف ظاہری ایمان لانا اور (صدق دل سے) کسی کے روبرو (دین کا) اقرار مت کرنا مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو (اس کے روبرو تم کو اپنے قدیم دین کا اقرار خلوص سے کرنا چاہئے باقی غیر مذاہب والوں کے یعنی مسلمانوں کے روبرو ویسے ہی بہ مصلحت مذکورہ زبانی اسلام کا اقرار کر لینا حق تعالیٰ ان کی تدبیر کے چل نہ ہونے کا بیان فرماتے ہیں کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ (ان چالاکیوں سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ) یقیناً ہدایت (جو بندوں کو ہوتی ہے وہ) ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے (پس جب ہدایت قبضہ خداوندی میں ہے تو وہ جس کو ہدایت پر قائم رکھنا چاہیں اس کو کوئی دوسرا کسی تدبیر سے نہیں بچلا سکتا ہے، آگے ان کے اس مشورہ و تدبیر کی علت بتلاتے ہیں کہ اے اہل کتاب تم) ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی (یعنی کتاب اور دین آسمانی) یا وہ اور لوگ تم پر غالب آجاویں (اس دین حق کی تعیین میں جو) تمہارے رب کے نزدیک (ہے، حاصل علت کا یہ ہوا کہ تم کو مسلمانوں پر حسد ہے کہ ان کو آسمانی کتاب کیوں مل گئی، یا یہ لوگ ہم پر مذہبی مناظرہ میں کیوں غالب آجاتے ہیں، اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام کے تنزل کی کوشش کر رہے ہیں، آگے اس حسد کا رد ہے کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ بے شک فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے وہ اس کو جسے چاہیں عطا فرما دیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں فضل کی کمی نہیں) اور خوب جاننے والے ہیں

(کہ کس وقت کس کو دینا مناسب ہے) اس لئے خاص کر دیتے ہیں اپنی رحمت (وفضل) کے ساتھ، جس کو چاہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں (پس اس وقت برعایت حکمت مسلمانوں پر فضل ورحمت فرما دیا اس میں حسد کرنا فضول اور جہل ہے)۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ

اور بعضے اہل کتاب میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا تو ادا کردیں تجھ کو

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ

اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ایک اشرفی تو ادا نہ کریں تجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے

عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ

اس کے سر پر کھڑا یہ اس واسطے کہ انھوں نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھ لوگوں کے حق لینے

سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ؀

میں کچھ گناہ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر اور وہ جانتے ہیں ؏

ربطِ آیات اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب کی خیانت فی الدین کا ذکر تھا یعنی ان کا کفر کرنا آیات اللہ کے ساتھ اور خلط کرنا حق و باطل کا، اور حق کے چھپانے کا، اور تدبیر کرنا مومنین کی گمراہی کی، اگلی آیت میں ان کی اموال میں خیانت کرنے کا ذکر ہے، اور ان میں سے چونکہ بعض امانت دار بھی تھے، اس لئے دونوں قسموں کو ذکر فرمایا۔

خلاصۂ تفسیر

اور اہل کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے (بلکہ امانت رکھانے کا بھی اقرار نہ کرے) مگر جب تک کہ تم (امانت رکھ کر) اس کے سر پر (برابر) کھڑے رہو (اس وقت تک تو انکار نہ کرے اور جہاں الگ ہوئے پھر ادا کرنے کا تو کیا ذکر ہے، سرے سے امانت ہی سے مکر جاوے) یہ (امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے (مال کے) بارے میں (اگر چوری چھپے لیا جاوے مذہبًا) کسی طرح کا الزام نہیں، یعنی غیر اہل کتاب مثلاً قریش کا مال چرا لینا یا چھین لینا سب جائز ہے

اللہ تعالیٰ آگے ان کے اس دعوی کی تکذیب فرماتے ہیں) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں، (کہ اس فعل کو حلال سمجھتے ہیں، اور دل میں وہ بھی جانتے ہیں (کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال نہیں کیا محض تراشیدہ دعویٰ ہے)

معارف و مسائل

کسی غیر مسلم کے اچھے اعمال کی مدح کرنا درست ہے: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ، اس آیت میں بعض لوگوں کی امانت دار ہونے پر مدح کی گئی ہے، مگر اس بعض سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو ایمان لا چکے تھے تو ان کی تعریف کرنے میں کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر خاص مومن مراد نہ ہوں بلکہ مطلقاً اہل کتاب ہوں جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں تو اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر کا کوئی عمل معتبر نہیں ہوتا تو پھر ان کی مدح سے کیا فائدہ؟

جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا مقبول ہونا اور چیز ہے اور اس کی مدح کرنا اور چیز ہے، مدح کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اللہ کے ہاں مقبول بھی ہے اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اچھی بات گو کافر کی ہو وہ بھی کسی درجہ میں اچھی ہی ہے جس کا فائدہ اس کو دنیا میں "نیک نامی" ہے، اور آخرت میں عذاب کی کمی۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام تعصب و تنگ نظری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ کھلے دل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی اس کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے۔

اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا، اس آیت سے امام ابوحنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ دائن کو یہ حق ہے کہ وہ مدیون سے اپنا حق وصول کرنے تک اس کا پیچھا کرتا رہے (قرطبی، ج ۴،

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

کیوں نہیں جو کوئی پورا کرے اپنا اقرار اور پرہیزگار رہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیزگاروں سے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا

جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے اقرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول

اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ

ان کا کچھ حصہ نہیں آخرت میں اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور

لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

نہ نگاہ کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے واسطے عذاب ہے دردناک

ربطِ آیات اوپر یَقُوْلُوْنَ سے اہلِ کتاب کے دعوٰی کی تکذیب مذکور تھی، آگے ان آیات سے اسی تکذیب کی تاکید اور ایفاءِ عہد کی فضیلت اور نقضِ عہد کی مذمت کی تصریح ہے:

خلاصۂ تفسیر

(خائن پر الزام کیوں نہ ہوگا ضرور ہوگا کیونکہ اس کے متعلق ہمارے یہ دو قانون ہیں، ایک یہ کہ) جو شخص اپنے عہد کو (خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ سے ہوا ہو یا بشرط جواز کسی مخلوق سے) پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں (ایسے) متقیوں کو (اور دوسرا قانون یہ ہے کہ) یقیناً جو لوگ معاوضہ (یعنی نفع دنیوی) لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو (انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے (مثلاً انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا) اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے (مثلاً حقوق العباد و معاملات کے باب میں قسم کھا لینا) ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ اُن سے (لطف کا) کلام فرماویں گے اور نہ اُن کی طرف (نظرِ محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ اُن کو (گناہوں سے) پاک کریں گے، اور ان کے لئے دردناک عذاب (تجویز) ہوگا

معارف و مسائل

عہد کی تعریف اور اس کے خلاف: عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت کرنے والے پر چند وعیدیں سے طے ہوتا ہے، جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے، بخلاف وعدہ کے کہ وہ صرف جانبِ واحد سے ہوتا ہے، یعنی عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے۔

ایفاءِ عہد کی قرآن و سنت میں بہت تاکید آئی ہے، چنانچہ اوپر کی آیت نمبر ۷۷ میں بھی عہد کی خلاف ورزی کرنے والے پر پانچ وعیدیں مذکور ہیں:-

① ان کے لئے جنت کی نعمتوں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق دبایا تو اس نے اپنے لئے آگ کو واجب کر دیا، راوی نے عرض کیا کہ اگر وہ چیز معمولی سی ہو تب بھی اس کے لئے آگ واجب ہوگی؟ آپ نے جواب میں فرمایا اگرچہ وہ درخت کی سبز ٹہنی ہی کیوں نہ ہو (رواہ مسلم بحوالہ مظہری)

② اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن بات نہیں کریں گے۔

③ اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔

۴ اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کو معاف نہیں کریں گے کیونکہ عہد کے خلاف کرنے کی وجہ سے عہد کا حق تلف ہوا ہے اور حق العبد کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔

۵ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ
اور ان میں ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تاکہ تم جانو

مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
کہ وہ کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے

وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
اور وہ نہیں اللہ کا کہا اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں

يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ
جان کر۔ کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت

وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ
اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر

لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا
لیکن یوں کہے کہ تم اللہ والے ہو جاؤ جیسے کہ تم سکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ

كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے۔ اور نہ یہ کہے تم کو کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو

وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۗ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾
اور نبیوں کو رب کیا تم کو کفر سکھلائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

٨ ع ٩ ١٦

خلاصۂ تفسیر

اور بے شک ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں (یعنی ان میں کوئی لفظ یا کوئی تفسیر غلط ملا دیتے ہیں اور غلط پڑھنا کج زبانی کہلاتا ہے) تاکہ تم لوگ (جو اس کو سنو تو) اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا جزو

نہیں اور (صرف دھوکہ دینے کے لئے اسی عملی طریق پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ (لفظ یا مطلب) خدا تعالیٰ کے پاس سے (جو لفظاً یا معناً نازل ہوئے ہیں ان سے ثابت) ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں (بلکہ ان کا جھوٹا ہونا لازم آگیا، آگے تاکید کے لئے اس کی کچھ تصریح ہے) اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور (اپنا جھوٹا ہونا دل میں خود بھی) وہ جانتے ہیں، کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرماویں (جن میں ہر ایک کا مقتضا ہے کفر و شرک سے ممانعت اور) پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ خدا تعالیٰ (کی توحید) کو چھوڑ کر (یعنی نبوت اور امر بالشرک جمع نہیں ہو سکتے) ولیکن (وہ نبی یہ تو کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) بوجہ اس کے کہ تم کتاب (الٰہی) دوسروں کو بھی سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو، اور اس کتاب میں تعلیم ہے توحید کی، اور نہ (وہ بشر موصوف بالنبوۃ) یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور (دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے لو کیا (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتلائے گا بعد اس کے کہ تم (اس عقیدہ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعم خود) مسلمان ہو،

معارف و مسائل

عصمتِ انبیاء کی ایک دلیل

مَا كَانَ لِبَشَرٍ، وفد نجران کی موجودگی میں بعض یہود و نصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمدؐ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریمؑ کو پوجتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، معاذ اللہ! کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں، یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔" یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب و حکمت اور قوتِ فیصلہ دیتا اور پیغمبری کے منصبِ جلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغام الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اس کی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے، اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے، اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا، دنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے:

(۱) یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں؟

۷

حکومت کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے، کوئی بادشاہ یا پریزیڈنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکامات سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو، بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبۂ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں اگر کسی مرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے، ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ، یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک و خدا سے بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

اس میں نصاریٰ کے اس دعوے کا بھی رد ہو گیا جو کہتے تھے کہ ابنیت و الوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا تھا، اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کے بجائے آپ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے، اور اہل کتاب پر بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا (العیاذ باللہ)۔ (فوائد عثمانی)

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور

حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ

علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان

بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۚ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ

لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول

اِصْرِيْ ۖ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ

کیا بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

گواہ ہوں پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد تو وہی لوگ ہیں

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ

نافرمان اب کیا اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا دین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے اور اسی کی طرف سب پھر جاویں گے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى

اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو

وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ

اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) سے کہ جو کچھ تم کو کتاب اور علم (شریعت) دوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آوے جو مصدق (اور موافق) ہو اس (علامت) کا جو تمہارے پاس (کی کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی دلائل معتبرۂ عند الشرع سے اس کی رسالت ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رسالت) پر (دل سے) اعتقاد بھی لانا اور (ہاتھ پاؤں سے) اس کی مدد بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کرکے ارشاد) فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا)، وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو اپنے اس اقرار پر گواہ بھی رہنا (کیونکہ گواہی سے پھرنے کو ہر شخص بہت ہی برا سمجھتا ہے بخلاف اقرار کرنے والے کے کہ بوجہ صاحب غرض ہونے کے اس کا پھر جانا زیادہ مستبعد نہیں ہوتا، اسی طرح تم صرف اقراری نہیں بلکہ گواہ کی طرح اس پر قائم رہنا) اور میں (بھی اس (مضمون) پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں، سو جو شخص (امتوں میں سے) روگردانی کرے گا (اس عہد سے) بعد اس کے (کہ انبیاء تک سے عہد لیا گیا اور امتیں تو کس شمار میں ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں، کیا (دین اسلام سے جس کا عہد لیا گیا ہے روگردانی کرکے) پھر (اس) دینِ خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ (کی یہ شان

ہے کہ ان (کے حکم کے) سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں میں (ہیں) اور (جتنے) زمین میں ہیں (بعضے) خوشی (اور رضا) سے، اور (بعضے) مجبوری سے اور (اول تو اس عظمت ہی کا مقتضیٰ یہ تھا کہ کوئی ان کے عہد کی مخالفت نہ کرے خاص کر جب کہ آئندہ سزا کا بھی ڈر ہو چنانچہ) سب خدا ہی کی طرف (قیامت کے روز) لوٹائے (بھی) جاویں گے (اور اس وقت مخالفین کو سزا ہوگی) (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (دین اسلام کے اظہار کے لئے خلاصہ کے طور پر یہ) فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس (حکم) پر جو (حضرت) ابراہیم و اسمٰعیل و یعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں) ان کی طرف بھیجا گیا اور اس (حکم و معجزہ) پر بھی جو (حضرت) موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (ایمان لانے کے معاملہ میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں (اس نے جو دین ہم کو بتلایا ہم نے اختیار کرلیا)۔

معارف و مسائل

اللہ تعالیٰ کے تین عہد

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں، ایک کا ذکر سورۂ اعراف میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (۷: ۱۷۲) کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی، اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

دوسرے کا ذکر وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (۳: ۱۸۷) سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔

تیسرے عہد کا بیان وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ سے کیا گیا ہے اس کی تفصیل آگے آتی ہے (تفسیر احمدی)

میثاق سے کیا مراد ہے اور یہ کہاں ہوا؟

میثاق کہاں ہوا؟ یہ تو عالم ارواح میں ہوا یا دنیا میں بذریعہ وحی ہوا، دونوں احتمال ہیں، (بیان القرآن)

میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو قرآن نے کردی ہے لیکن یہ میثاق کس چیز کے

بارہ میں لیا گیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی علیہ السلام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ عہد تمام انبیاء سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید و نصرت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کر جائیں۔

حضرت طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء سے اس لئے لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی تائید و نصرت کریں (تفسیر ابن کثیر)

اس دوسرے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول "وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا" (۳۳: ۷، احزاب) سے بھی کی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ عہد ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کے لئے لیا گیا تھا (تفسیر محمدی)

درحقیقت مذکورہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے دونوں ہی مراد لی جا سکتی ہیں (تفسیر ابن کثیر)

تمام انبیاء سے ایمان کے عہد پر یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے تو پھر انبیاء کے ایمان لانے کا کیا فائدہ؟

ذرا غور کیا جائے تو فائدہ بالکل ظاہر معلوم ہوگا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات پر ایمان قبول کرنے کا پختہ ارادہ کریں گے تو اسی وقت سے ثواب پائیں گے (صاوی بحوالہ جلالین)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ، اس آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا، تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائے اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرے، قرآن کے اس قاعدۂ کلیہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء سے لیا ہوگا جیسا کہ علامہ سبکیؒ اپنے رسالہ "التعظیم والمنۃ فی لتؤمنن بہ ولتنصرنہ" میں فرماتے ہیں کہ "آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید و نصرت اور آپ پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو، اور کوئی بھی ایسا

نبی نہیں گزرا جس نے اپنی امت کو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی تائید و نصرت کی وصیت نہ کی ہو، اور اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ کی امت میں شمار ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں ہے بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی کے احکام پر عمل کریں گے (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی نبوت عامہ و شاملہ ہے، اور آپ کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں، اس بیان سے آپ کے ارشاد "بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً" کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے، کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ کی نبوت آپ کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے صحیح نہیں، بلکہ آپ کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ "كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ"۔ محشر میں شفاعت کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵

اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خراب ہے

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول (و منظور) نہ ہوگا، اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا (یعنی نجات نہ پاوے گا)۔

معارف و مسائل

اسلام کی تعریف اور اس کا مدار نجات ہونا

"اسلام" کے لفظی معنی اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں، اور اصطلاح میں خاص اس دین کی اطاعت کا نام "اسلام" ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ اصولِ دین تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

پھر لفظ "اسلام" کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں، انبیاء سابقین کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی امت کو امتِ مسلمہ کہنا بھی نصوصِ قرآن سے ثابت ہے، اور اس نام کا خاتم الانبیاء کی امت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲: ۷۸) خلاصہ یہ کہ ہر دین الٰہی جو کسی نبی و رسول کے ذریعہ دنیا میں آیا اس کو بھی "اسلام" کہا جاتا ہے، اور امتِ محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس جگہ "اسلام" کے لفظ سے کونسا مفہوم مراد ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ انبیاء سابقین کے دین کو جو اسلام کا نام دیا گیا ہے وہ ایک محدود طبقہ اور مخصوص زمانے کے لئے تھا، اس وقت کا اسلام وہی تھا، اس طبقہ اور امت کے علاوہ دوسروں کے لئے اس وقت بھی وہ اسلام معتبر نہ تھا اور جب اس نبی کے بعد اور کوئی نبی بھیج دیا گیا تو اب وہ اسلام نہیں رہا، اس وقت کا اسلام وہ ہوگا جو جدید نبی پیش کرے، جس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی اصولی اختلاف نہیں ہوگا مگر فروعی احکام مختلف ہوسکتے ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اسلام دیا گیا وہ ناقابلِ نسخ دائمی تا قیامت رہے گا، اور حسب قاعدہ مذکورہ آپؐ کی بعثت کے بعد پچھلے تمام ادیان منسوخ ہو گئے، اب وہ اسلام نہیں بلکہ اسلام صرف وہ دین ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہونچا، اسی لئے احادیث صحیحہ معتبرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اس وقت ان پر بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا، اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، تو باوجود اپنے وصفِ نبوّت اور عہدۂ نبوّت پر قائم رہنے کے

اس وقت وہ بھی آپ ہی کی شریعت کا اتباع کریں گے۔

اس لئے اس جگہ خواہ اسلام کا مفہوم عام مراد لیں یا مخصوص امت محمدیہ کا دین مراد لیں، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف وہی دین اسلام کہلائے گا جو آپ کے ذریعہ دنیا کو پہنچا ہے، وہی تمام انسانوں کے لئے مدار نجات ہے، آیت مذکورہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین جو شخص اختیار کرے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورۃ کی آیت اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے تحت صفحہ ۳۳ جلد دوم میں گذر گئی۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا
کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہوگئے ایمان لا کر اور گواہی دے کر

اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
کہ بیشک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس نشانیاں اور اللہ راہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ
ظالم لوگوں کو ایسے لوگوں کی سزا ہے کہ ان پر لعنت ہے

اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا
اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ

يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۸۸ اِلَّا الَّذِيْنَ
ہلکا ہوگا ان سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے مگر جنہوں نے

تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۸۹
توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے تو بیشک اللہ غفور رحیم ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ
جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں ہرگز

تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الضَّاۗلُّوْنَ ۝۹۰ اِنَّ
قبول نہ ہوگی ان کی توبہ اور وہی ہیں گمراہ جو

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ
لوگ کافر ہوئے اور مرگئے کافر ہی تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے سے

مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ

زمین بھر کر سونا اگرچہ بدلہ دیوے اس قدر سونا ان کو عذاب

اَلِيْمٌ وَّمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۹

دردناک ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار

ع ۹ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

(اوّل اُن مرتدین کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہ کر اس کو ہدایت سمجھتے رہے، چونکہ ان کا اعتقاد یا دعوٰی یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اب ہدایت فرمائی، لہٰذا ان کی مذمت میں اس کی نفی بھی فرماتے ہیں کہ بھلا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہوگئے بعد ایمان لانے کے (دل سے) اور بعد اپنے اس اقرار کے (زبان سے) کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم دعوٰی رسالت میں) سچے ہیں، اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل (حقانیتِ اسلام کے) پہنچ چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے، (یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی توفیق اسلام کی نہیں دیتے بلکہ مقصود ان کے اسی دعوٰی مذکورۂ بالا کی نفی کرنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے جو اسلام چھوڑ کر یہ طریق اختیار کیا ہے ہم کو خدا نے ہدایت دی ہے، خلاصہ نفی کا یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا بے ڈھنگا راستہ اختیار کرے وہ ہدایتِ خداوندی پر نہیں، اس لئے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو خدا نے ہدایت دی ہے، کیونکہ ہدایت کا یہ اثر نہیں بلکہ ایسے لوگ یقیناً گمراہ ہیں اور) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور (بہتیرے) آدمیوں کی بھی (غرض) سب کی (اور پھر وہ لعنت بھی ایسے طور پر رہے گی کہ) وہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (اور چونکہ اس لعنت کا اثر جہنم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور) ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے سے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت ہی دی جاوے گی (آگے ان کا بیان ہے جو پھر مسلمان ہوگئے ان کو اس حکم سے مستثنیٰ فرماتے ہیں یعنی) ہاں مگر جو لوگ توبہ کرلیں اس (کفر) کے بعد (یعنی مسلمان ہوجاویں) اور اپنے (دل) کو (بھی) سنوار لیں (یعنی منافقانہ طور پر صرف زبان سے توبہ کافی نہیں) سو بے شک (ایسوں کے لئے) خدا تعالیٰ بخش دینے والے رحمت کرنے والے ہیں، بیشک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں (یعنی کفر پر دوام رکھا ایمان نہیں لائے) اُن کی توبہ (جو کہ اور گناہوں سے کرتے ہیں) ہرگز مقبول نہ ہوگی (کیونکہ توبہ عن المعاصی

ایک طاعت فرعیہ ہے اور طاعت فرعیہ کے مقبول ہونے کی شرط ایمان ہے) اور ایسے لوگ (اس توبہ کے بعد بھی بدستور) پکے گمراہ ہیں

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالت کفر ہی میں سو ان میں سے کسی کا (بطور کفارہ) زمین بھر سونا بھی نہ لیا جاوے گا اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے (اور بے دیئے تو کون پوچھتا ہے) ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے حامی (مددگار) بھی نہ ہوں گے۔

معارف و مسائل

ایک شبہ کا ازالہ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ الخ اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کسی کو مرتد ہونے کے بعد ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ بہت سے لوگ مرتد ہونے کے بعد ایمان قبول کر کے ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں جو ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس کی مثال ہمارے محاورات میں ایسی ہے جیسے کسی بدمعاش کو کوئی حاکم اپنے ہاتھ سے سزا دے اور وہ کہے کہ مجھ کو حاکم نے اپنے ہاتھ سے خصوصیت عنایت فرمائی ہے، اور اس کے جواب میں کہا جاوے کہ ایسے بدمعاش کو ہم خصوصیت کیوں دینے لگے، یعنی یہ امر خصوصیت ہی نہیں، اور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایسا شخص کسی طرح قابل خصوصیت نہیں ہو سکتا اگرچہ شائستہ بن جاوے۔ (بیان القرآن)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا

ہرگز نہ حاصل کر سکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ　اور جو چیز خرچ

مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

کروگے　سو اللہ کو　معلوم　ہے۔

ربطِ آیات مع تشریح

اس سے پہلی آیت میں کفار و منکرین کے صدقات و خیرات کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر مقبول ہونا بیان کیا گیا تھا، اس آیت میں مؤمنین کو صدقۂ مقبولہ اور اس کے آداب بتلائے گئے ہیں، اس آیت کے الفاظ میں سب سے پہلے لفظ بِرّ کے معنی اور اس کی حقیقت کو سمجھئے، تاکہ آیت کا پورا مفہوم صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکے۔

لفظ بِرّ کے لفظی اور حقیقی معنی ہیں کسی شخص کے حق کی پوری ادائیگی، اور اس سے کامل سبکدوشی اور احسان اور حسنِ سلوک کے معنی میں بھی آتا ہے، بَرّ بالفتح اور بارّ اس شخص کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے ذمہ عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کرے، قرآن کریم میں بَرًّا بِوَالِدَتِيْ (۱۹: ۳۲) اور بَرًّا بِوَالِدَيْهِ (۱۹: ۱۴) اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ان حضرات کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اپنے والدین کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے والے تھے۔

اسی لفظ بَرّ بالفتح کی جمع ابرار ہے، جو قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوئی ہے، ارشاد ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (۷۶: ۵) اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ (۸۳: ۲۲، ۲۳) اور ایک جگہ ارشاد ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚ (۸۲: ۱۳، ۱۴) اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "بِرّ" کا مقابل اور ضد فجور ہے۔

امام بخاری کے ادب مفرد میں اور ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچ بولنے کو لازم پکڑو، کیونکہ "صدق" "بِرّ" کا ساتھی ہے اور وہ دونوں جنت میں ہیں، اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور کا ساتھی ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں ہیں۔

اور سورہ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۲: ۱۷۷)، اس آیت میں نیک اعمال کی ایک فہرست دے کر ان سب کو "بِرّ" فرمایا گیا ہے، مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ اعمالِ بِرّ میں افضل ترین بِرّ یہ ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے، آیت مذکورہ میں ارشاد

ہے کہ تم ہرگز بر کو حاصل نہیں کرسکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں میں سے کچھ خرچ نہ کرو، تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کی مکمل ادائیگی اور اس سے پوری سبکدوشی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اپنی محبوب اور پیاری چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کریں، اسی مکمل ادائیگی کو خیر کامل یا نیکی میں کمال یا ثواب عظیم سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ ابرار کی صف میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں قربان کی جائیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو) تم خیر کامل (یعنی عظیم ثواب) کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی بہت پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کروگے اور (یوں) جو کچھ بھی خرچ کروگے (گو غیر محبوب چیز ہو) اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (مطلق ثواب اس پر بھی دیدیں گے۔ لیکن کمال ثواب حاصل کرنے کا وہی طریقہ ہے)

معارف و مسائل

آیت مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کا جذبۂ عمل

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو قرآنی احکام کے اولین مخاطب اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ شاگرد اور احکام قرآنی کی تعمیل کے عاشق تھے، اس آیت کے نازل ہونے پر ہر ایک نے اپنی محبوب چیزوں پر نظر ڈالی، اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخواستیں ہونے لگیں، انصار مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار حضرت ابوطلحہؓ تھے، مسجد نبوی کے بالکل مقابل اور متصل ان کا باغ تھا، جس میں ایک کنواں بیرحاء کے نام سے موسوم تھا، اب اس باغ کی جگہ تو باب مجیدی کے سامنے اصطفا منزل کے نام سے ایک عمارت بنی ہوئی ہے جس میں زائرین مدینہ قیام کرتے ہیں، مگر اس کے شمال مشرق کے گوشے میں یہ بیرحاء اسی نام سے اب تک موجود ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس باغ میں تشریف لے جاتے اور بیرحاء کا پانی پیتے تھے، آپ کو اس کنویں کا پانی پسند تھا، حضرت طلحہؓ کا یہ باغ بڑا قیمتی اور زرخیز اور ان کو اپنی جائداد میں سب سے زیادہ محبوب تھا، اس آیت کے نازل ہونے پر وہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ میرے تمام اموال میں بیرحاء مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو صرف فرمادیں، آپ نے فرمایا کہ وہ تو عظیم الشان منافع کا باغ ہے میں مناسب یہ

سمجھتا ہوں کہ اس کو آپ اپنے اقربا میں تقسیم کر دیں، حضرت ابو طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کو قبول فرما کر اپنے اقربا اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم فرما دیا، (یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیرات صرف وہ نہیں جو عام فقراء اور مساکین پر صرف کی جائے، اپنے اہل و عیال اور عزیز و رشتہ داروں کو دینا بھی بڑی خیرات اور موجب ثواب ہے۔

حضرت زید بن حارثہؓ اپنا ایک گھوڑا لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے، اور عرض کیا کہ مجھے اپنی املاک میں یہ سب سے زیادہ محبوب ہے میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ نے اس کو قبول فرما لیا، لیکن ان سے لے کر انہی کے صاحبزادے اسامہؓ کو دے دیا، زید بن حارثہؓ اس پر کچھ دلگیر ہوئے کہ میرا صدقہ میرے ہی گھر میں واپس آگیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے (تفسیر مظہری، بحوالہ ابن جریر و طبرانی وغیرہ)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کنیز سب سے زیادہ محبوب تھی، آپ نے اس کو لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس ایک کنیز تھی جس سے وہ محبت کرتے تھے، اس کو اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔

الغرض آیت متذکرہ کا حاصل یہ ہے کہ حق اللہ کی مکمل ادائیگی اور خیر کامل اور نیکی کا کمال جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ آدمی اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، آیت مذکورہ میں چند مسائل قابل نظر اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اس آیت میں لفظ بر تمام صدقات واجبہ اور نفلیہ کو شامل ہے

اول یہ کہ اس آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے اس سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک صدقات واجبہ زکوٰۃ وغیرہ ہیں، اور بعض کے نزدیک صدقات نافلہ ہیں، لیکن جمہور محققین نے اس مفہوم کو صدقات واجبہ اور نفلیہ دونوں میں عام قرار دیا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے واقعات متذکرہ بالا اس پر شاہد ہیں کہ ان کے یہ صدقات نفلیہ تھے۔

اس لئے مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جو صدقہ بھی ادا کرو خواہ زکوٰۃ فرض ہو یا کوئی نفلی صدقہ و خیرات، ان سب میں مکمل فضیلت اور ثواب جب ہے کہ اپنی محبوب اور پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، یہ نہیں کہ صدقہ کو تاوان کی طرح سر سے ٹالنے کے لئے فالتو، بیکار یا خراب چیزوں کا انتخاب کرو، قرآن کریم کی دوسری ایک آیت میں اس مضمون کو اور زیادہ

واضح اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ (۲: ۲۶۸)

"یعنی اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ چیزوں کو چھانٹ کر اس میں خرچ کرو، اور ردی چیز کی طرف نیت مت لیجایا کرو کہ اس میں سے خرچ کردو حالانکہ وہ چیز اگر تم کو تمہارے حق کے بدلے میں ملنے لگے تو تم ہرگز قبول نہ کروگے بجز اسکے کہ کسی وجہ سے چشم پوشی کر جاؤ"

اس کا حاصل یہ ہوا کہ خراب اور بیکار چیزوں کا انتخاب کرکے صدقہ کرنا مقبول نہیں بلکہ صدقہ مقبولہ جس پر مکمل ثواب ملتا ہے وہی ہے جو محبوب اور پیاری چیزوں میں سے خرچ کیا جائے۔

صدقہ کرنے میں اعتدال چاہئے

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ مِمَّا سے اشارہ کردیا گیا ہے کہ یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنی چیزیں اپنے نزدیک محبوب اور پیاری ہیں ان سبھی کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جتنا بھی خرچ کرنا ہے اس میں اچھی اور پیاری چیز دیکھکر خرچ کریں تو مکمل ثواب کے مستحق ہوں گے۔

تیسرا مسئلہ یہ کہ محبوب چیز خرچ کرنا صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی بڑی قیمت کی چیز خرچ کی جائے، بلکہ جو چیز کسی کے نزدیک عزیز اور محبوب ہے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل اور قیمت کے اعتبار سے کم ہو اس کے خرچ کرنے سے بھی اس "بر" کا مستحق ہو جائے گا، حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ جو چیز آدمی اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرے وہ اگرچہ کھجور کا ایک دانہ ہی ہو اس سے بھی انسان اس ثواب عظیم اور بر کامل کا مستحق ہو جاتا ہے جس کا آیت میں وعدہ کیا گیا ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس خیر عظیم اور بر کا ذکر ہے اس سے وہ غریب لوگ محروم رہیں گے جن کے پاس خرچ کرنے کے لئے مال نہیں، کیونکہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ خیر عظیم بغیر محبوب مال خرچ کئے حاصل نہیں کی جا سکتی، اور فقراء و مساکین کے پاس مال ہی نہیں جس کے ذریعہ ان کی یہاں تک رسائی ہو، لیکن غور کیا جائے تو آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ خیر عظیم اور ثواب عظیم حاصل کرنا چاہیں تو بجز مال محبوب کے خرچ کرنے کے ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا، بلکہ بات یہ ہے کہ یہ خیر عظیم کسی دوسرے ذریعہ سے مثلاً عبادت، ذکر اللہ، تلاوت قرآن، کثرت نوافل سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے، اسلئے

فقراء و غرباء کو بھی یہ خیر عظیم دوسرے ذرائع سے حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں صراحةً بھی یہ مضمون آیا ہے۔

مال محبوب سے کیا مراد ہے

پانچواں مسئلہ: یہ ہے کہ مال کے محبوب ہونے سے کیا مراد ہے؟ قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے کام میں آرہی ہو اور اس کو اس چیز کی حاجت ہو، فالتو اور بیکار نہ ہو، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا (۷۶ : ۸)	"یعنی اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو حاجت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں باوجود اس کے کہ اس کھانے کی خود ان کو بھی ضرورت ہے"

اسی طرح دوسری آیت میں اسی مضمون کی اور زیادہ وضاحت اس طرح فرمائی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹ : ۹)	"یعنی اللہ کے مقبول بندے اپنے اوپر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود بھی حاجتمند ہوں"

فالتو اور زائد از ضرورت چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی ثواب سے خالی نہیں

چھٹا مسئلہ: یہ ہے کہ آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خیر کامل اور ثواب عظیم اور صفتِ ابرار میں داخلہ اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کریں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرورت سے زائد فالتو مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب ہی نہ ملے، بلکہ آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ، یعنی تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے، اس آیت کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ خیر کامل اور صفتِ ابرار میں داخلہ خاص محبوب چیز خرچ کرنے پر موقوف ہے لیکن مطلق ثواب سے کوئی صدقہ خالی نہیں، خواہ محبوب چیز خرچ کریں یا زائد اور فالتو اشیاء، ہاں مکروہ اور ممنوع یہ ہے کہ کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کرلے کہ جب خرچ کرے فالتو اور خراب چیز کا ہی انتخاب کرکے خرچ کیا کرے، لیکن جو شخص صدقہ خیرات میں اپنی محبوب اور عمدہ چیزیں بھی خرچ کرتا ہے، اور اپنی ضرورت سے زائد چیزیں، بچا ہوا کھانا یا پرانے کپڑے، عیب دار برتن یا استعمالی چیزیں بھی خیرات میں دیدیتا ہے، وہ ان چیزوں کا صدقہ کرنے سے کسی گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ اس کو ان پر بھی ضرور ثواب ملے گا، اور محبوب چیزوں کے خرچ کرنے پر اس کو خیر عظیم بھی حاصل ہوگی، اور صفتِ ابرار میں اس کا داخلہ بھی ہوگا۔

آیت کے اس آخری جملہ میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کی اصل حقیقت اللہ پر روشن ہے کہ وہ اس کے نزدیک محبوب ہے یا نہیں، اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہے یا ریاء و شہرت کے لئے، محض کسی کا زبانی دعوے

اس کے لئے کافی نہیں کہ میں اپنی محبوب چیز کو اللہ کے لئے خرچ کر رہا ہوں، بلکہ علیم وخبیر جو دلوں کے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے، دیکھ رہا ہے کہ واقع میں اس کے لئے خرچ کا کیا درجہ ہے

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ

سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کو مگر وہ جو حرام کر لی تھیں اسرائیل نے

عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَىٰةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَىٰةِ

اپنے اوپر توریت نازل ہونے سے پہلے تو کہہ لاؤ توریت اور

فَاتْلُوهَآ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿٩٣﴾ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ

پڑھو اس کو اگر تم سچے ہو پھر جو کوئی جوڑے اللہ پر

الْكَذِبَ مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَـٰٓئِكَ هُمُ الظَّـٰلِمُونَ ﴿٩٤﴾ قُلْ

جھوٹ اس کے بعد تو وہی ہیں بڑے بے انصاف تو کہہ

صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ

سچ فرمایا اللہ نے اب تابع ہو جاؤ دین ابراہیم کے جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور نہ تھا

مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

شرک کرنے والا

خلاصۂ تفسیر

(جن کھانے کی چیزوں میں گفتگو ہے یہ) سب کھانے کی چیزیں (حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے ہرگز حرام نہیں چلی آرہی ہیں بلکہ یہ چیزیں نزولِ توراۃ کے قبل بجز ان کے (یعنی گوشتِ شتر کے) جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے (ایک خاص وجہ سے) اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا، (اور پھر وہ ان کی اولاد میں بھی حرام چلا آیا) باقی سب چیزیں خود بنی اسرائیل (تک) پر بھی حلال تھیں (تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ان کی تحریم کا دعویٰ کب صحیح ہو سکتا ہے، اور نزولِ توراۃ کے قبل اس واسطے فرمایا کہ نزولِ توراۃ کے بعد ان مذکورہ حلال چیزوں میں سے بھی بہت سی چیزیں حرام ہوگئی تھیں، جس کی کچھ تفصیل سورۂ انعام کی اس آیت میں ہے وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ الخ) اور اگر اب بھی یہود کو تحریم کی قدامت مذکورہ کا دعویٰ ہے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے

کہ اگر مجھ کو، پھر توراۃ لاؤ پھر اس کو (لا کر) پڑھو اگر تم (دعویٰ مذکور میں) سچے ہو (تو اس میں کوئی آیت وغیرہ اس مضمون کی نکال دو کیونکہ امور منقولہ میں نص کی ضرورت ہے، اور دوسری نصوص یقینیہ منتفی ہیں، صرف توراۃ باقی ہے، سو اس میں دکھلا دو، چنانچہ اس میں نہ دکھلا سکے تو کذب ان کا اس دعوے میں ثابت ہوگیا، آگے اس پر مرتب کرکے فرماتے ہیں) سو جو شخص اس (ظہور کذب) کے بعد (بھی) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے (جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے گوشت شتر وغیرہ کو حرام فرمایا) تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا سو (اب) تم (کو چاہیے کہ بعد ثبوت حقیت قرآن کے) ملت ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع (اختیار) کرو جس میں ذرا بھی کجی نہیں اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرک نہ تھے۔

معارف و مسائل

اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب سے بحث چلی آتی ہے، کہیں یہود سے کہیں نصاریٰ سے کہیں دونوں سے، ایک بحث کا آگے بیان آتا ہے، جس کا قصہ روح المعانی میں بروایت واحدی کلبی سے منقول ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت ابراہیمی پر ہونا باعتبار تمام اصول شرعیہ و اکثر فروع کے بیان فرمایا، تو یہود نے اعتراض کیا کہ آپ اونٹ کا گوشت اور دودھ کھاتے ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام تھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ نہیں ان پر حلال تھا، یہود نے کہا جتنی چیزیں ہم حرام سمجھتے ہیں یہ سب حضرت نوح و حضرت ابراہیم علیہما السلام کے وقت سے حرام چلی آتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک وہ تحریم پہنچی، تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الخ تکذیب یہود کے لئے نازل فرمائی جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نزول توراۃ کے قبل باستثناء اس کے اسی گوشت شتر کے جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک خاص وجہ سے خود اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا اور پھر وہ ان کی اولاد میں حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں۔

دراصل اس میں قصہ یہ ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا مرض تھا، آپ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سے شفاء دیں تو سب سے زیادہ جو کھانا مجھ کو محبوب ہے اس کو چھوڑ دوں گا، ان کو شفاء ہوگئی، اور سب سے زیادہ محبوب آپ کو اونٹ کا گوشت تھا

اس کو ترک فرما دیا (اخرجہ الحاکم وغیرہ بسند صحیح عن ابن عباس کذا فی روح المعانی واخرجہ الترمذی فی سورۃ مرفوعاً نحوہ) پھر یہی تحریم جو نذر سے ہوئی تھی بنی اسرائیل میں بحکم وحی باقی رہ گئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں نذر سے تحریم بھی ہو جاتی ہوگی جس طرح ہماری شریعت میں مباح کا ایجاب ہو جاتا ہے، مگر تحریم کی نذر جو درحقیقت یمین ہے ہماری شریعت میں جائز نہیں بلکہ ایسی قسم توڑنا پھر اس کا کفارہ دینا واجب ہے، کما قال اللہ تعالیٰ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ... الآیۃ، اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

بیشک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

یقیناً وہ مکان جو سب (مکانات عبادت) سے پہلے لوگوں (کی عبادت گاہ بننے) کیلئے (منجانب اللہ) مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ (شہر) مکہ میں ہے (یعنی خانۂ کعبہ) جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے (کیونکہ اس میں دینی نفع یعنی ثواب ہے) اور (عبادت خاص مثلاً نماز کا رخ بتلانے میں) جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے (مطلب یہ ہے کہ حج وہاں ہوتا ہے اور مثلاً نماز کا ثواب بروئے تصریح حدیث وہاں بہت زیادہ ہوتا ہے، دینی برکت تو یہ ہوئی، اور جو وہاں نہیں ہیں ان کو اس مکان کے ذریعے سے نماز کا رخ معلوم ہوتا ہے یہ رہنمائی ہوئی)

معارف و مسائل

مذکورہ آیت میں ساری دنیا کے مکانات یہاں تک کہ تمام مساجد کے مقابلہ میں بیت اللہ یعنی کعبہ کا شرف اور افضلیت کا بیان ہے، اور یہ شرف و فضیلت کئی وجہ سے ہے۔

فضائل بیت اللہ مع تاریخ تعمیر

اول اس لئے کہ وہ دنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔
دوسرے یہ کہ وہ برکت والا ہے۔
تیسرے یہ کہ وہ پورے جہان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

آیت کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو نہ دولت خانہ، حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کی شان سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مجاہد، قتادہ، سدی وغیرہ صحابہ و تابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں مگر عبادت کے لئے یہ پہلا گھر بنا ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔

بیہقیؒ نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں، ان حضرات نے حکم کی تعمیل کر لی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں، اور ان سے کہا گیا کہ آپ اول الناس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں، اور یہ گھر اول بیت وضع للناس ہے، یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے (ابن کثیر) ضعفہ ابن کثیر بان ابن لہیعۃ ومعنی انہ لیس بذلک الحدیث مطلق ولسیما فی ہذا المقام فی الروایۃ قد تایدت باشارات الکتاب۔

بعض روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی، طوفان نوحؑ میں منہدم ہوئی، اور اس کے نشانات مٹ گئے، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا، پھر ایک مرتبہ کسی حادثہ میں اس کی تعمیر منہدم ہوئی تو قبیلہ جرہم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی، پھر ایک مرتبہ منہدم ہوئی تو عمالقہ نے تعمیر کی، اور پھر منہدم ہوئی تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں تعمیر کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور حجر اسود کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا، لیکن قریش نے اس تعمیر میں بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی کہ ایک حصہ بیت اللہ کا بیت اللہ سے الگ کر دیا جس کو حطیم کہا جاتا ہے، اور خلیل اللہ علیہ السلام کی بناء میں کعبہ کے دو دروازے تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا پشت کی جانب باہر نکلنے کے لئے، قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا، تیسرا تغیر یہ کیا کہ دروازہ بیت اللہ کا سطح زمین سے کافی بلند کر دیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جا سکے، بلکہ جس کو وہ اجازت دیں وہی جا سکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ

موجودہ تعمیر کو منہدم کرکے اس کو بالکل بناء ابراہیمی کے مطابق بنادوں، قریش نے جو تصرفات بناء ابراہیمی کے خلاف کئے ہیں ان کی اصلاح کردوں، لیکن ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اسی لئے سردست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں، اس ارشاد کے بعد اس دنیا میں آپ کی حیات زیادہ نہیں رہی۔

لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنے ہوئے تھے، خلفاء راشدین کے بعد جس وقت مکہ مکرمہ پر ان کی حکومت ہوئی تو انہوں نے بیت اللہ منہدم کرکے ارشادِ نبوی اور بناء ابراہیمی کے مطابق بنادیا، مگر عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت مکہ معظمہ پر چند روزہ تھی، ظالم الامۃ حجاج بن یوسف نے مکہ پر فوج کشی کرکے ان کو شہید کیا، اور حکومت پر قبضہ کرکے اس کو گوارا نہ کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک ان کی مدح و ثناء کا ذریعہ بنا رہے، اس لئے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ فعل غلط تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جس حالت پر چھوڑا تھا ہمیں اسی حالت پر اس کو رکھنا چاہئے، اس بہانے سے بیت اللہ کو پھر منہدم کرکے اسی طرح کی تعمیر بنادی جو زمانہ جاہلیت میں قریش نے بنائی تھی، حجاج بن یوسف کے بعد آنے والے بعض مسلم بادشاہوں نے پھر حدیث مذکور کی بناء پر یہ ارادہ کیا کہ بیت اللہ کو از سر نو حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بنادیں، لیکن اس زمانہ کے امام حضرت امام مالک بن انسؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب بار بار بیت اللہ کو منہدم کرنا اور بنانا آگے آنے والے بادشاہوں کے لئے بیت اللہ کو ایک کھلونا بنادے گا، ہر آنے والا بادشاہ اپنی نام آوری کے لئے یہی کام کرے گا، اس لئے اب جس حالت میں بھی ہے اسی حالت میں چھوڑ دینا مناسب ہے، تمام امت نے اس کو قبول کیا، اسی وجہ سے آج تک وہی حجاج بن یوسف ہی کی تعمیر باقی ہے، البتہ شکست و ریخت اور مرمت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

ان روایات سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، یا کم از کم سب سے پہلا عبادت خانہ ہے، قرآن کریم میں جہاں یہ ذکر ہے کہ کعبہ کی تعمیر بامرِ خداوندی حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی، وہیں اس کے اشارات بھی موجود ہیں کہ ان بزرگوں نے اس کی ابتدائی تعمیر نہیں فرمائی، بلکہ سابق بنیادوں پر اسی کے مطابق تعمیر فرمائی، اور کعبہ کی اصل بنیاد پہلے ہی سے تھی، قرآن کریم کے ارشاد وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (۲: ۱۲۷) سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ قواعد بیت یعنی اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں سورۂ حج کی آیت میں ہے:

یعنی جب ٹھیک کر دیا ہم نے ابراہیم کیلئے ٹھکانا اس گھر کا۔	وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (۲۲: ۲۶)

اس سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی جگہ پہلے سے متعین چلی آتی تھی، اور پہلی آیت سے اس کی بنیادوں کا ہونا بھی مفہوم ہوتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو تعمیر بیت اللہ کا حکم دیا گیا تو فرشتہ کے ذریعہ ان کو بیت اللہ کی جگہ سابق بنیادوں کی نشاندہی کی گئی جو ریت کے تودوں میں دبی ہوئی تھی۔

بہرحال آیت مذکورہ سے کعبہ کی ایک فضیلت یہ ثابت ہوئی کہ وہ دنیا کا سب سے پہلا گھر یا پہلا عبادت خانہ ہے، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام، انھوں نے عرض کیا اس کے بعد کونسی مسجد ہے؟ آپ نے فرمایا مسجد بیت المقدس ہے، پھر دریافت کیا کہ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا چالیس سال کا۔

اس حدیث میں بیت اللہ کی بنا جدید جو ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اس کے اعتبار سے بیت المقدس کی تعمیر کا فاصلہ بیان کیا گیا ہے، کیونکہ روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ بیت المقدس کی ابتدائی تعمیر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ بیت اللہ کی تعمیر سے چالیس سال بعد میں ہوئی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو بیت المقدس کی تعمیر کی یہ بھی بیت اللہ کی طرح بالکل نئی اور ابتدائی تعمیر نہ تھی، بلکہ سلیمان علیہ السلام نے بناء ابراہیمی پر اس کی تجدید کی ہے، اس طرح روایات میں باہم کوئی تعارض نہیں رہتا۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیشہ سے دنیا میں اس کی تعظیم و تکریم ہوتی چلی آئی ہے اس میں لفظ وُضِعَ لِلنَّاسِ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس گھر کی تعظیم و تکریم کسی خاص قوم یا جماعت ہی کا حصہ نہیں، بلکہ عامۂ خلائق اور سب انسان اس کی تعظیم کریں گے، اس کی سرشت میں حق تعالیٰ نے ایک عظمت اور ہیبت کا داعیہ رکھا ہے کہ لوگوں کے قلوب اس کی طرف خود بخود مائل ہوتے ہیں،

اس میں لفظ بَکَّہ سے مراد مکہ معظمہ ہے، خواہ یہ کہا جائے کہ میم کو با سے بدل دیا گیا ہے، عرب کے کلام میں اس کی نظائر بکثرت ہیں کہ میم کو با سے بدل دیا کرتے ہیں، اور یا یہ کہا جائے کہ مکہ کا دوسرا نام بکہ بھی ہے۔

بیت اللہ کی برکات اس آیت میں بیت اللہ کی دوسری فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ

وہ مبارک ہے، لفظ مبارک، برکت سے مشتق ہے، برکت کے معنی ہیں بڑھنا اور ثابت رہنا، پھر کسی چیز کا بڑھنا اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا وجود کھلے طور پر مقدار میں بڑھ جائے، اور اس طرح بھی کہ اگرچہ اس کی مقدار میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو لیکن اس سے کام اتنے نکلیں جتنے عادۃً اس سے زائد سے نکلا کرتے ہیں، اس کو بھی معنوی طور پر زیادتی کہا جاسکتا ہے۔

بیت اللہ کا بابرکت ہونا ظاہری طور پر بھی ہے معنوی طور پر بھی، اس کے ظاہری برکات میں یہ مشاہدہ ہے کہ مکہ اور اسکے آس پاس ایک خشک ریگستان اور بنجر زمین ہونے کے باوجود اس میں ہمیشہ ہر موسم میں ہر طرح کے پھل اور ترکاریاں اور تمام ضروریات مہیا رہتی ہیں کہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں بلکہ اطراف عالم سے آنے والوں کے لئے بھی کافی ہوجاتی ہیں، اور آنے والوں کا حال دنیا کو معلوم ہے کہ خاص موسم حج میں تو لاکھوں انسان اطراف عالم سے جمع ہوتے ہیں جنکی مردم شماری اہل مکہ سے چوگنی پانچ گنی ہوتی ہے، یہ ہجوم عظیم وہاں صرف دو چار روز نہیں بلکہ مہینوں رہتا ہے، موسم حج کے علاوہ بھی کوئی وقت ایسا نہیں آتا جس میں باہر سے ہزاروں انسانوں کی آمد و رفت نہ رہتی ہو، پھر خاص موسم حج میں جب کہ وہاں لاکھوں انسانوں کا زائد مجمع ہوتا ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ بازار میں کسی وقت بھی تیار ضروریات ختم ہوگئیں ملتی نہیں، یہاں تک کہ قربانی کے بکرے جو وہاں پہنچ کر ایک ایک انسان سو سو بھی کرتا ہے اور اوسط فی کس ایک کا تو یقینی ہے، یہ لاکھوں بکرے وہاں ہمیشہ ملتے ہیں، یہ بھی نہیں کہ دوسرے ملک سے منگانے کا اہتمام کیا جاتا ہو، قرآن کریم میں یُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (۲۸، ۵۷) "یعنی اس میں باہر سے لائے جاتے ہیں ثمرات ہر چیز کے" ان الفاظ میں اسی کی طرف واضح اشارہ بھی موجود ہے۔

یہ تو ظاہری برکات کا حال ہے جو مقصود کی حیثیت نہیں رکھتیں، اور معنوی و باطنی برکات تو اتنی ہیں کہ اس کا شمار نہیں ہوسکتا، بعض اہم عبادات تو بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں جو اجر عظیم اور برکات روحانی ہیں ان سب کا مدار بیت اللہ پر ہے، مثلاً حج و عمرہ، اور بعض دوسری عبادات کا بھی مسجد حرام میں ثواب بدرجہا بڑھ جاتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی انسان گھر میں نماز پڑھتا ہے تو ایک نماز کا ثواب ملے گا، اور اگر اپنے محلہ کی مسجد میں ادا کرے اس کو پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور جو جامع مسجد میں ادا کرے تو پانچ سو نمازوں کا ثواب پائے گا، اور اگر مسجد اقصٰی میں نماز ادا کی تو ایک ہزار نمازوں کا، اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا، (یہ روایت ابن ماجہ، طحاوی وغیرہ نے نقل کی ہے) حج کے فضائل میں یہ حدیث عام مسلمان جانتے ہیں کہ حج کو صحیح طور پر ادا کرنے والا مسلمان پچھلے گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے

پاک وصاف پیدا ہوا ہے ظاہر ہے کہ یہ سب بیت اللہ کی معنوی اور روحانی برکات ہیں، انہی برکات کو آیت کے آخر میں لفظ ھُدًی سے تعبیر فرمایا گیا ہے مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ

اس میں نشانیاں ظاہر ہیں جیسے مقام ابراہیم، اور جو اس کے اندر آیا اس کو امن ملا،

وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَ

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور

مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۹۷)

جو نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

خلاصۂ تفسیر

اس میں کچھ تشریعی اور کچھ تکوینی کھلی نشانیاں (اس کی افضلیت کی) موجود ہیں (چنانچہ تشریعی نشانیوں میں اس کا مبارک اور ہدیٰ ہونا مذکور ہو کر بیان ہو چکا اور یہ مقام ابراہیم کے بعد مذکور ہیں یعنی اس میں داخل ہونے والے کا مستحق امن ہو جانا اور اس کا حج بشرط قدرت فرض ہونا جو کہ مطلق مشروعیۃ مذکورہ سابق پر زائد مفہوم ہے، یہ چند نشانیاں تو تشریعی اس جگہ مذکور ہیں اب درمیان میں تکوینی کا ذکر فرماتے ہیں کہ) منجملہ ان نشانیوں کے ایک مقام ابراہیم (نشانی) ہے، اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) جو شخص اس (کے حدود محترمہ) میں داخل ہو جاوے وہ (شرعاً) امن والا ہو جاتا ہے اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے، مگر سب کے ذمہ نہیں بلکہ خاص خاص کے، یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کی سبیل کی اور جو شخص (احکام خداوندی کا) منکر ہو تو (خدا تعالیٰ کا کیا ضرر) کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہیں (کسی کے نہ ماننے پر ان کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا بلکہ خود اس منکر ہی کا ضرر ہے)

معارف ومسائل

بیت اللہ کی تین خصوصیات

اس آیت میں بیت اللہ شریف کی خصوصیات اور فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں، منجملہ ان کے مقام ابراہیم ہے دوسرے یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا

اور محفوظ ہو جاتا ہے، کوئی اس کو قتل نہیں کر سکتا، تیسرے یہ کہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر اس بیت اللہ کا حج فرض ہے، بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو، اور قدرت رکھتا ہو۔

پہلی بات کہ اس میں اللہ جل شانہ کی قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ جب سے بیت اللہ قائم ہوا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو مخالفین کے حملوں سے محفوظ فرما دیا، ابرہہ نے ہاتھیوں کا لشکر لے کر چڑھائی کی تو اللہ جل شانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو پرندوں کے ذریعہ تباہ و ہلاک کر دیا، حرم مکہ میں داخل ہونے والا انسان بلکہ جانور تک محفوظ ہے، جانوروں میں بھی اس کا احساس ہے، حدودِ حرم کے اندر جانور بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں، وہاں وحشی شکاری جانور انسان سے نہیں بھاگتے، عام طور پر یہ بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بیت اللہ کی جس جانب بارش ہوتی ہے اس جانب کے ممالک زیادہ بارش سے سیراب ہوتے ہیں، ایک عجیب نشانی یہ ہے کہ جمرات جن پر ہر ایک حج کرنے والا سات سات کنکریاں روزانہ تین روز تک پھینکتا ہے، اور ہر سال لاکھوں حجاج وہاں جمع ہوتے ہیں، یہ ساری کنکریاں اگر وہاں جمع ہو کر باقی رہیں تو ایک ہی سال میں وہ جمرات کنکریوں کے ڈھیر میں دب جائیں اور چند سال میں تو وہاں ایک پہاڑ بن جائے، حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ حج کے تینوں دن گذرنے کے بعد وہاں کنکریوں کا کوئی بہت بڑا انبار جمع نہیں ہوتا، کچھ کنکریں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں جس کی وجہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ یہ کنکریاں فرشتے اٹھا لیتے ہیں اور صرف ایسے لوگوں کی کنکریں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج کسی وجہ سے قبول نہیں ہوا، وہی وجہ ہے کہ جمرات کے پاس سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ وہ غیر مقبول ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق ہر دیکھنے والا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے کہ جمرات کے آس پاس بہت تھوڑی سی کنکریں نظر آتی ہیں، حالانکہ وہاں سے اٹھانے یا صاف کرنے کا کوئی اہتمام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے نہ عوام کی طرف سے۔[1]

اسی وجہ سے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات ایسے بھی ہیں جو آپ کی وفات کے بعد بھی موجود و قائم ہیں، اور قیامت تک باقی رہیں گے اور ہر شخص ان کا مشاہدہ کر سکے گا، ان میں سے ایک تو قرآن کا بے نظیر ہونا ہے کہ ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہے، یہ معجزہ جیسے عہد نبوی میں تھا ایسے ہی آج بھی موجود ہے، اور قیامت تک رہے گا، ہر زمانہ کا مسلمان پوری دنیا کو چیلنج کر سکتا ہے کہ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، اسی طرح جمرات کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان پر پھینکی ہوئی کنکریں نامعلوم طور پر فرشتے اٹھا لیتے ہیں، صرف ان بدنصیب

[1] معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے انھیں ہٹانے کا انتظام کیا ہے　　محمد تقی عثمانی

لوگوں کی کنکریاں رہ جاتی ہیں جن کے حج قبول نہیں ہوتے، آپ کے اس ارشاد کی تصدیق ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی، یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ اور بیت اللہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے۔

مقامِ ابراہیم

ان نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی مقام ابراہیم ہے، اسی لئے قرآن کریم نے اس کو مستقل طور پر علیحدہ بیان فرمایا، مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر فرماتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہو جاتا تھا، اور نیچے اترنے کے وقت نیچا ہو جاتا تھا، اس پتھر کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے، ظاہر ہے کہ ایک بے حس و بے شعور پتھر میں یہ ادراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہو جائے اور یہ تاثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قدمین کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے، یہ سب آیات قدرت ہیں جو بیت اللہ کی علے فضیلت ہی سے متعلق ہیں، یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى، اُس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر مطاف سے باہر زمزم کے قریب رکھ دیا گیا، اور آجکل اس کو اسی جگہ ایک محفوظ مکان میں مقفل کیا ہوا ہے، طواف کے بعد کی دو رکعتیں اسی مکان کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں، حال میں یہ ترمیم ہوئی کہ وہ مکان توڑ دیا گیا اور مقام ابراہیم کو ایک بلوری خول کے اندر محفوظ کر دیا گیا، مقام ابراہیم اصل میں اسی خاص پتھر کا نام ہے، اور طواف کے بعد کی رکعتیں اس کے اوپر یا اس کے پاس پڑھنا افضل ہے، لیکن مقام ابراہیم کے لفظی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ تمام مسجد حرام کو حاوی ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

داخلِ بیت اللہ کا مامون ہونا

آیت مذکورہ میں بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا یعنی مامون و محفوظ ہو جاتا ہے، اس میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا ایک تو تشریعی اعتبار سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ حکم ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے اس کو نہ ستاؤ نہ قتل کرو، اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے، اس کو بھی اس جگہ سزا نہ دی جائے، بلکہ اس کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکلے، حرم سے باہر آنے پر سزا جاری کی جائے گی۔ اس طرح حرم میں داخل ہونے والا

شرعی طور پر مامون و محفوظ ہو گیا۔

دوسرے حرم میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا یوں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر ہر قوم و ملت کے دلوں میں بیت اللہ کی تعظیم و تکریم ڈال دی ہے، اور وہ سب عموماً ہزاروں اختلافات کے باوجود اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا اگرچہ مجرم یا ہمارا دشمن ہو تو حرم کا احترام اس کا مقتضی ہے کہ وہاں اس کو کچھ نہ کہیں، حرم کو عام جھگڑوں لڑائیوں سے محفوظ رکھا جائے، زمانہ جاہلیت کے عرب اور ان کے مختلف قبائل خواہ کتنی ہی عملی خرابیوں میں مبتلا تھے مگر بیت اللہ اور حرم محترم کی عظمت پر سب جان دیتے تھے، ان کی جنگ جوئی اور تشنہ خونی ساری دنیا میں مشہور ہے، لیکن حرم کے احترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اپنی آنکھیں نیچی کر کے گذر جاتا تھا اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

فتح مکہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دین کی اہم مصلحت اور بیت اللہ کی تطہیر کی خاطر چند گھنٹوں کے لئے حرم میں قتال کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اور فتح کے بعد آپ نے بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اعلان و اظہار فرمایا کہ یہ اجازت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تطہیر بیت اللہ کی غرض سے تھی، اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے تھی، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے پھر اس کی وہی حرمت ثابت ہے جو پہلے سے تھی، اور فرمایا کہ حرم کے اندر قتل و قتال نہ مجھ سے پہلے حلال تھا نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے، اور میرے لئے بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے حلال ہوا تھا پھر حرام کر دیا گیا۔

رہا یہ معاملہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے خلاف مکہ میں فوج کشی کی اور قتل و غارت کیا یہ اس امن عام کے تشریعی طور پر اس لئے خلاف نہیں کہ باجماع امت اس کا یہ فعل حرام اور سخت گناہ تھا، تمام امت نے اس پر نفرین کی، اور تکوینی طور پر بھی اس کو احترام بیت اللہ کے منافی اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ حجاج خود بھی اپنے اس عمل کے حلال ہونے کا معتقد نہ تھا، وہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک سنگین جرم کر رہا ہوں، لیکن سیاست و حکومت کی مصالح نے اس کو اندھا کیا ہوا تھا۔

بہرحال یہ بات پھر بھی محفوظ تھی کہ امت مرحومہ بیت اللہ اور حرم کو اس درجہ واجب الاحترام سمجھتے رہے ہیں کہ اس میں قتل و قتال اور لڑائی جھگڑے کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں، اور یہ ساری دنیا میں صرف بیت اللہ اور حرم محترم ہی کی خصوصیت ہے۔

حج بیت اللہ کا فرض ہونا

آیت میں بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم و واجب قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت واستطاعت رکھتے ہوں، اس مقدرت واستطاعت کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پاس ضروریاتِ اصلیہ سے فاضل اتنا مال ہو جس سے وہ بیت اللہ تک آنے جانے اور وہاں کے قیام کا خرچ برداشت کرسکے، اور اپنی واپسی تک ان اہل وعیال کا بھی انتظام کرسکے جن کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے نیز ہاتھ پاؤں اور آنکھوں سے معذور نہ ہو، کیونکہ ایسے معذور کو تو اپنے وطن میں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے، وہاں جانے اور ارکانِ حج ادا کرنے پر کیسے قدرت ہوگی۔

اسی طرح عورت کے لئے چونکہ بغیر محرم کے سفر کرنا شرعاً جائز نہیں، اس لئے وہ حج پر قادر اس وقت سمجھی جائے گی جب کہ اس کے ساتھ کوئی محرم حج کرنے والا ہو، خواہ محرم اپنے خرچ سے حج کر رہا ہو یا عورت اس کا خرچ بھی برداشت کرے، اسی طرح وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ کا مامون ہونا بھی استطاعت کا ایک جزء ہے، اگر راستہ میں بدامنی ہو، جان مال کا قوی خطرہ ہو تو حج کی استطاعت نہیں سمجھی جائے گی۔

لفظ حج کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں اور شرعی معنی کی ضروری تفصیل تو خود قرآن کریم نے بیان فرمادی، طواف کعبہ اور وقوف عرفہ ومزدلفہ وغیرہ ہیں، اور باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زبانی ارشادات اور عملی بیانات کے ذریعہ واضح فرمادی ہیں، اس آیت میں حج بیت اللہ کے فرض ہونے کا اعلان فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے۔

اس میں وہ شخص تو داخل ہے ہی جو صراحۃً فریضۂ حج کا منکر ہو، حج کو فرض نہ سمجھے، اس کا دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے وَمَنْ كَفَرَ کا لفظ اس پر صراحۃً صادق ہے، اور جو شخص عقیدہ کے طور پر فرض سمجھتا ہے، لیکن باوجود استطاعت وقدرت کے حج نہیں کرتا، وہ بھی ایک حیثیت سے منکر ہی ہے، اس پر لفظ وَمَنْ كَفَرَ کا اطلاق تہدید اور تاکید کے لئے ہے، کہ یہ شخص کافروں جیسے عمل میں مبتلا ہے، جیسے کافر منکر حج نہیں کرتے یہ بھی ایسا ہی ہے، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ آیت کے اس جملہ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو باوجود قدرت واستطاعت کے حج نہیں کرتے، کہ وہ اپنے اس عمل سے کافروں کی طرح ہوگئے۔ العیاذ باللہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

تو کہہ اے اہل کتاب کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے اور اللہ کے روبرو ہے جو تم کرتے ہو، تو کہہ اے اہل کتاب کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اس کو جو ایمان لاوے، ڈھونڈتے ہو اس میں عیب اور تم خود جانتے ہو اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے، اے ایمان والو اگر تم کہا مانو گے بعض اہل کتاب کا تو پھیر دیں گے تم کو ایمان لائے پیچھے کافر، اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو اور تم پر پڑھی جاتی ہیں آیتیں اللہ کی اور تم میں اس کا رسول ہے، اور جو کوئی مضبوط پکڑے اللہ کو تو اس کو ہدایت ہوئی سیدھے رستے کی۔

ع ۱۰

ربط آیات | اوپر سے اہل کتاب کے عقائد فاسدہ اور ان کے شبہات پر کلام چل رہا تھا، درمیان میں بعض اہل ایمان کا تذکرہ آیا، آگے پھر اہل کتاب ہی سے خطاب ہے جس کا تعلق ایک خاص واقعہ سے ہے، وہ یہ کہ ایک یہودی شاس بن قیس مسلمانوں سے بہت کینہ رکھتا تھا، اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو ایک جگہ مجتمع و متفق دیکھا تو حسد سے بے چین ہوگیا، اور ان میں تفرقہ ڈالنے کی فکر میں لگ گیا، آخر یہ تجویز کی کہ ایک شخص سے کہا کہ ان دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک بڑی جنگ عرصہ دراز تک رہ چکی ہے، اور اس کے متعلق فریقین کے فخریہ اشعار ہیں وہ اشعار اس مجلس میں پڑھ دیئے جائیں، چنانچہ شعر اس کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی، اور آپس میں جدال جنگ ہونے لگی یہاں تک

کہ موقع اور وقت لڑائی کا بھی مقرر ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان کے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کیا غضب ہے، میرے ہوتے ہوئے یہ مسلمان ہونے اور باہم متفق و مانوس ہونے کے بعد یہ جہالت ہے، کیا تم اسی حالت میں کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟ سب متنبہ ہوئے اور سمجھ کہ یہ شیطانی حرکت تھی، اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی، اس واقعہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اس واقعہ کو روح المعانی میں بروایت ابن اسحٰق اور ایک جماعت نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے، یہ مضمون کئی آیتوں تک چلا گیا ہے، جس میں اول مذمت ہے ان اہل کتاب کی جنھوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر مذمت سے پہلے ان کے کفر پر بھی ملامت کی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ خود بھی مسلمان ہو جاتے نہ یہ کہ دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ جائے، پھر خطاب و نصائح مسلمانوں کو ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) کہتے (کہ) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب تم (بعد ظہور حجت غائیت اسلام کے) کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا (اصول و فروع آئیں سب آگئے)، حالانکہ اللہ تعالیٰ تمھارے سب کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں (تم کو اس سے بھی ڈر نہیں لگتا، اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب کیوں ہٹانے کی کوشش کرتے ہو اللہ کی راہ (یعنی اس کے دین حق) سے ایسے شخص کو جو (اس دین حق کے ثبوت پر) ایمان لا چکا اس طور پر کہ کجی (کی باتیں) ڈھونڈتے ہو اس راہ کے (اندر) تیر کرنے کے (لئے) (جیسے کہ قصۂ مذکورہ میں کوشش کی تھی کہ اس کارروائی سے ان کے دین کے اندر بوجہ نااتفاقی کے گناہ بھی ہے اور اجتماعی قوت کی بربادی بھی، اور یہ کہ ان بکھیڑوں میں پڑ کر دین حق سے ان کو بعد ہو جاوے گا، حالانکہ تم خود بھی (اس حرکت کے قبیح ہونے کی) اطلاع رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمھارے کاموں سے بے خبر نہیں (وقت معین پر اس کی سزا دیں گے)، اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے (یعنی اہل کتاب میں سے)، تو وہ لوگ تمھارے ایمان لائے پیچھے (اعتقاداً یا عملاً) کافر بنا دیں گے اور (بھلا) تم کفر کیسے کر سکتے ہو (یعنی تمھارے لئے کب روا ہو سکتا ہے) حالانکہ (اسباب مانع کفر کے پورے جمع ہیں کیونکہ) تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام (قرآن میں) پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں، اور دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے

پس تم کو چاہئے کہ ان دونوں امور کی تعلیمات کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور یاد رکھو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے (یعنی ایمان پر پورا قائم رہتا ہے کیونکہ اللہ کو مضبوط پکڑنا یہی ہے کہ اس کی ذات و صفات کی تصدیق کرے، اس کے احکام کو مضبوط پکڑے، کسی دوسرے مخالف کی موافقت نہ کرے) تو ایسا شخص ضرور راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے (یعنی وہ راہ راست پر رہتا ہے، اور راہ راست پر ہونا سبب ہے رحمت و قرب کا، پس اس میں ایسے شخص کے لئے رحمت و قرب کی بشارت و وعدہ ہے)۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہئے اس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر

وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَٱعْتَصِمُوا۟ بِحَبْلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۟

مسلمان اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو

وَٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ

اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت دی

بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَٰنًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ

تمہارے دلوں میں اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی اور تم تھے کنارے

شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ

پر ایک آگ کے گڑھے کے پھر تم کو اس سے نجات دی اسی طرح کھولتا ہے اللہ

ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

تم پر آیتیں تاکہ تم راہ پاؤ۔

ربط آیات سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہل کتاب اور دوسرے لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اہتمام کریں، مذکورہ دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط و ناقابل تسخیر بنانے کے دو اہم اصول بتلائے گئے ہیں۔

اوّل تقوٰی، دوسرے باہمی اتفاق و اتحاد، اور تفرق و اختلاف سے بچنا۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے (کامل ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شرک وکفر سے بچے ہو اسی طرح تمام گناہوں سے بھی بچو، کیونکہ بلا وجہ شرعی لڑنا معصیت ہے تو اس سے بھی بچنا فرض ہے) اور بجز اسلام (کامل) کے (جس کا حاصل وہی ہے جو کامل ڈرنے کا حق تھا) اور کسی حالت پر جان مت دینا (یعنی اسی کامل تقویٰ اور کامل اسلام پر تمام عمر قائم رہنا) اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کو جس میں اصول و فروع سب آگئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو (جس کی اسی دین میں تعلیم بھی ہے) اور باہم نا اتفاقی مت کرو (جس کی اسی دین میں ممانعت بھی ہے) اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم (باہم) دشمن تھے (یعنی قبل اسلام کے، چنانچہ اوس وخزرج کے دو قبیلوں میں طویل مدت سے جنگ چلی آتی تھی اور عام طور پر اکثر عرب کے لوگوں کی یہی حالت تھی) پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی، سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام (تالیف قلوب) سے (آپس میں) بھائی بھائی (کی طرح) ہو گئے اور (ایک انعام جو کہ انعام مذکورہ کی بھی اصل ہے یہ فرمایا کہ) تم لوگ (بالکل) دوزخ کے گڑھے کے کنارے (پر) پہنچ رہے تھے (یعنی بوجہ کافر ہونے کے دوزخ سے اتنی قریب تھے کہ بس دوزخ میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی) سو اس (گڑھے) سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی (یعنی اسلام نصیب کیا جس نے جہنم سے نجات دلائی، تو اب تم ان انعاموں کی قدر پہچانو اور آپس کے جدال و قتال سے جو کہ معصیت ہے اللہ کی ان نعمتوں کو زائل نہ کرو، کیونکہ باہمی جنگ وجدال سے پہلا انعام یعنی سب کے قلوب کا باہم مربوط اور مانوس ہونا تو خود ہی زائل ہو جائے گا، اور دوسرا انعام یعنی دین اسلام بھی اس سے مختل اور کمزور ہو جائے گا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام واضح طور پر بیان فرماتے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے (اور) احکام (بھی) بیان کر کے بتلاتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ (راست) پر قائم رہو۔

معارف و مسائل

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول تقویٰ اور باہمی اتفاق: مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں پہلا اصول اور دوسری میں دوسرا بتلایا گیا ہے، پہلا اصول جو مذکورہ آیت نے بتلایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے

مطابق ہو۔

لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں، یا کہ ان سے عذاب الٰہی کا خطرہ ہے، وہ ڈرنے کی چیز، تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے، اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لئے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے، دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے، کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضاجوئی سے معمور رکھنا، مذکورہ آیت میں اِتَّقُوا اللّٰہَ کے بعد حَقَّ تُقٰتِہٖ کا کلمہ بڑھا دیا گیا ہے کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔

حق تقویٰ کیا ہے؟ اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے:

حَقَّ تُقٰتِہٖ ھُوَ اَنْ یُّطَاعَ فَلَا یُعْصٰی وَیُذْکَرَ فَلَا یُنْسٰی وَیُشْکَرَ فَلَا یُکْفَرَ (بحر محیط)

"حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے، کوئی کام اطاعت کے خلاف نہ ہو، اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔"

اسی مفہوم کو ائمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے، مثلاً بعض نے فرمایا کہ حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور برائی کی پروا نہ کرے، اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے، اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو، اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔

اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں جو اِتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ہے یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت میں ہے تو حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؒ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حَقَّ تُقٰتِہٖ

کی یہ تفسیر و تشریح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کردے تو حق تقویٰ ادا ہوگیا، اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے بعد کسی ناجائز میں مبتلا ہوگیا تو وہ حق تقویٰ کے خلاف نہیں۔

اگلے جملے میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ، اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درحقیقت پورا اسلام ہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت اور اس کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کا ہی نام تقویٰ ہے، اور اسی کو اسلام کہا جاتا ہے۔

اور یہ معلوم کہ آیت میں حکم یہ ہے کہ تمہاری موت اسلام ہی پر آنی چاہئے اسلام کے سوا **کسی حال پر موت نہ آنی چاہئے۔**

تو یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ موت تو آدمی کے اختیار میں نہیں کسی وقت کسی حال میں آسکتی ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کَمَا تَعِيشُونَ تَمُوتُونَ وَكَمَا تَمُوتُونَ تُحْشَرُونَ، یعنی جس حالت پر تم اپنی زندگی گذاروگے اسی پر موت آئے گی، اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کئے جاؤگے، تو جو شخص اپنی پوری زندگی اسلام پر گذارنے کا پختہ عزم رکھتا ہے، اور مقدور بھر اس پر عمل کرتا ہے اس کی موت انشاء اللہ اسلام ہی پر آئے گی، بعض روایات حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر عمل صالح کرتے ہوئے گذرگئی، آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال حبط و برباد ہوگئے، یہ ایسے ہی لوگوں کو پیش آسکتا ہے جن کے عمل میں اول اخلاص و پختگی نہیں تھی۔ واللہ اعلم

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا دوسرا اصول، باہمی اتفاق دوسری آیت وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا، میں اس کو نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے، کہ سب سے پہلے وہ اصول اور گر بتلایا جو انسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخہ اکسیر ہے، اس کے بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا، اس کے بعد آپس کے افتراق و انتشار سے منع فرمایا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ اتفاق و اتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مذہب و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے، اس میں دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں، دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہ مفید اور بہتر جانتا ہو، اس لئے دنیا کی ہر جماعت ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں، لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں، گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹی

کا لاعلاج روگ ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام عقل مند آدمیوں کا نعرۂ اتحاد و اتفاق بھی ایک فسانہ بن کر رہ گیا ہے،
وقتی غرض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں، غرض پوری ہو جاتی ہے یا ان میں
ناکام ہو جاتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہو جاتا ہے بلکہ افتراق و عداوتوں کی نوبت آتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ، و ہر شخص لوگوں کو اپنے
خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے، اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام
رکھتے ہوں تو وہ اس سے متفق ہونے کی بجائے اُن کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے
ہیں، اس سے لازمی طور پر دعوت اتحاد کا نتیجہ ایک ہی جماعتوں اور فرقوں کا افتراق و انتشار
نکلتا ہے، اور اختلافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس لئے قرآن حکیم نے صرف اتحاد و اتفاق اور تنظیم و اجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا
بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ و عادلانہ اصول بھی بتلا دیا جس کے
ماننے سے کسی گروہ کو نفرت نہیں ہونا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں
کے بنائے ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ امید رکھنا کہ
وہ سب اس پر متفق ہو جائیں گے عقل و انصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں
البتہ رب العالمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق
ہو جانا ہی چاہئے، کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کر سکتا، اب اگر اختلاف کی
کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہو سکتی ہے کہ حکم الٰہی یعنی
رب العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کونسا ہے، یہودی نظام تورات کو، نصاریٰ نظام انجیل
کو خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا واجب التعمیل بتلاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں
بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔

لیکن اوّل تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہو کر اپنی عقل
خداداد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے کہ خاتم الانبیاء
صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرآن کی صورت میں لائے ہیں، آج اس کے
سوا کوئی نظام خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اس وقت
مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر ایمان ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا نظام حق ہے جو بلا شبہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے
اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف و تغییر کا بھی امکان نہیں، اس لئے سردست

میں غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتا ہوں کہ ان کے لئے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے، اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تدبر قرآن میں رہ سکتا ہے، اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر بلکہ ایسا اختلاف رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے، سو اس پر قابو پانا اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں، بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہو کر ہماری پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلاف و جدال کا کوئی علاج نہیں رہتا، اور اسی اختلاف و انتشار کو قرآن کریم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری پوری ملت انتشار و افتراق میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکسیر اس طرح بتلایا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا	یعنی اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھامو۔

اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے، عبد اللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ، یعنی کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے، (ابن کثیر) زید بن ارقمؓ کی روایت میں حبل اللہ ہو القرآن کے الفاظ آئے ہیں (ابن کثیر)

محاورۂ عربی میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے، قرآن کو یا دین کو رسی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے اس ایک جملہ میں حکیمانہ اصول بتلائے گئے، ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات یعنی قرآن پر مضبوطی سے عامل ہو، دوسری یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں، جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظم ہو جائیں، جیسے کوئی جماعت ایک رسی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جسم واحد بن جاتی ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح اس طرح

بیان فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹:۹۶)	"یعنی جو لوگ ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں دوستی و محبت پیدا فرما دیتے ہیں"

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جو کسی بلندی پر چڑھتے وقت، ایک مضبوط رسی کو پکڑ لیں اور ہلاکت سے محفوظ رہیں، بند شدہ فرمایا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے، کوئی شیطان شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل تسخیر ہو جائے گی، قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کر لیتی ہے، اور اس سے ہٹ کر ان کی قومی و اجتماعی زندگی تو تباہ ہو ہی جائے گی اور اس کے بعد انفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف اسلام ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہو سکتا

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وحدت و اتفاق کے لئے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو، پھر مرکز وحدت کے بارے میں اقوام عالم کی رائیں مختلف ہیں، کہیں نسلی اور نسبی رشتوں کو مرکز وحدت سمجھا گیا، جیسے قبل عرب کی وحدت تھی کہ قریش ایک قوم اور بنو تمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی، اور کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے، کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکز اتحاد بنایا ہوا تھا، کہ ہندی ایک قوم اور عربی دوسری قوم، کہیں آبائی رسوم و رواج کو مرکز وحدت بنایا گیا تھا، کہ جو ان رسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جو ان کے پابند نہیں وہ دوسری قوم، جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج وغیرہ۔

قرآن کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکز وحدت حبل اللہ قرآن کریم کو یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام محکم کو قرار دیا، اور دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ مومن ایک قوم ہے جو حبل اللہ سے وابستہ ہے، اور کافر دوسری قوم جو اس حبل متین سے وابستہ نہیں، خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۲:۶۴) کا یہی مطلب ہے، جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکز وحدت بنایا جائے، کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری امور ہیں، جن کو کوئی انسان اپنے سعی و عمل سے حاصل نہیں کر سکتا، جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا،

جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا، جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا، اس لئے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہو سکتی ہیں، ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وحدت میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا، اس لئے قرآن کریم نے مرکزِ وحدت حبل اللہ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو بنایا جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے، کوئی مشرق کا بسنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا ہندی و انگریزی، کسی قبیلہ کسی خاندان کا ہو ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکزِ وحدت کو اختیار کر سکتا ہے، اور دنیا بھر کے بسنے والے انسان اس مرکزِ وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں، اور اگر وہ آبائی رسم و رواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی، کہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں، اور اس کا اتباع کر کے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں، جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت میں مربوط ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کرے گا، یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دنیا کی اقوام کو دعوت دے سکتا ہے، کہ یہی صحیح راستہ ہے اس طرف آؤ، اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے صدیوں چلی ہے وہ خود اسلام کے دعویداروں میں کامیاب ہو گئی اب امتِ اسلامیہ کی وحدت عربی، مصری، ہندی، سندھی میں تقسیم ہو کر پارہ پارہ ہو گئی، قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو بآوازِ بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے، اس لئے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سربلند بنایا اور اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستہ سے مل سکتی ہے۔

الغرض اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کے پابند ہو جائیں، دوسرے یہ کہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ اس کو تھام لیں، تاکہ ملتِ اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظم ہو جائے، جیسا کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔

مسلمانوں میں اتفاق کے ایجابی پہلو کی وضاحت کے بعد فرمایا وَلَا تَفَرَّقُوا باہم

نااتفاقی نہ کرو۔ قرآن حکیم کا یہ حکیمانہ انداز ہے کہ وہ جہاں کہیں بہبود صحیح کرتا ہے وہیں منفی پہلو سے مخالف چیزوں سے منع فرماتا ہے، چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (۶: ۱۵۳)

اس آیت میں بھی صراط مستقیم پر قائم رہنے کی تلقین ہے اور اپنی خواہشات کے زیر اثر خود ساختہ راستوں پر چلنے کی ممانعت، نااتفاقی کیونکہ قوم کی ہلاکت کا سب سے پہلا اور آخری سبب ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے بار بار مختلف اسالیب میں اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶: ۱۶۰)

بیشک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقے ڈالے اور مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے آپ کا ان سے کوئی تعلق اور کوئی واسطہ نہیں

علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے واقعات کو نقل فرمایا کہ کس طرح وہ امتیں باہمی اختلاف و شقاق کے باعث مقصد حیات سے ہٹ کر دنیا و آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا ہوچکی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند، پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

اوّل یہ کہ تم عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو اور نااتفاقی سے بچو، سوم یہ کہ اپنے حکام اور اولو الامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔

اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں یہ ہیں: (۱) بے ضرورت قیل وقال اور بحث ومباحثہ (۲) بلا ضرورت کسی سے سوال کرنا (۳) اضاعتِ مال (ابن کثیر عن ابی ہریرۃ رض)

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہر اختلاف مذموم ہے، یا کوئی اختلاف غیر مذموم بھی ہے، جواب یہ ہے کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے، بلکہ مذموم وہ اختلاف ہے کہ جس میں اپنی ہوا اور خواہشات کی بنا پر قرآن سے دور رہ کر سوچا جائے، لیکن اگر قرآن پر مجتمع رہتے ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بنا پر فروع میں اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری ہے، اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف

اسی قسم کا اختلاف تھا، اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا، ہاں اگر انہی فروعی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدال اور سبّ و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے، باہمی اتحاد کے ان دونوں پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد اس حالت کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں اسلام سے پہلے اہل عرب مبتلا تھے، قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پران کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی، اس آگ میں جلنے مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی، چنانچہ فرمایا گیا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	"اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ	قلوب میں الفت ڈال دی، سو تم اس کے انعام
اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ	سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اور تم دوزخ
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ	کے گڑھے کے کنارے پر تھے، سو اس نے تم کو
	اس سے بچا لیا"

یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر خدا تعالیٰ نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بھائی بھائی بنا دیا، جس سے تمہارے دین و دنیا درست ہو گئے، اور ایسی دوستی قائم ہو گئی جسے دیکھ کر تمہارے دشمن مرعوب ہوتے، اور یہ برادرانہ اتحاد خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے بھی میسر نہ آسکتی تھی۔

واقعہ شانِ نزول میں شریر لوگوں نے جو اوس و خزرج کے قبیلوں کو پچھلی جنگ یاد دلا کر فساد برپا کرنا چاہا تھا آیت مذکورہ میں اس کا مکمل علاج ہو گیا، نتیجہ اور بذریعہ اسلام ان سے رہائی کا بیان فرما دیا۔

مسلمانوں کا باہمی اتحاد و اتفاق قرآن حکیم کے اس ارشاد سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا، کہ اطاعت پر موقوف ہے وہ یہ کہ دلوں کا مالک درحقیقت اللہ جل شانہ ہے، دلوں کے اندر محبت یا نفرت پیدا کرنا اسی کا کام ہے کسی جماعت کے قلوب میں باہمی محبت اور مودت پیدا کرنا خاص انعام خداوندی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام صرف اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، معصیت و نافرمانی کے ساتھ یہ انعام نہیں مل سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اگر مسلمان مستحکم تنظیم و اتحاد چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ فقط یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنائیں، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے کہ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے حقائق واضح کرکے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم لوگ صحیح راہ پر رہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ

اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا

اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہوگئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ

جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۱۰۵

پہنچ چکے ان کو حکم صاف اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

ربطِ آیات

پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت و صلاحیت کے دو اصول بتلائے گئے تھے، جن میں ہر فرد کو ایک خاص انداز سے اپنی اصلاح کرنے کی ہدایت تھی کہ ہر شخص تقویٰ اختیار کرے، اور اللہ تعالیٰ کے سلسلۂ اسلام سے مربوط ہو جائے، اس طرح انفرادی صلاح کے ساتھ ساتھ خود بخود ایک اجتماعی قوت بھی مسلمانوں کو حاصل ہو جائے گی، مذکورہ دو آیتوں میں اسی نظامِ وحدت و قوت کا تکملہ اس طرح کیا گیا ہے کہ مسلمان صرف اپنے اعمال و افعال کی اصلاح پر بس نہ کریں، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کی فکر بھی ساتھ ساتھ رکھیں، اسی صورت سے پوری قوم کی اصلاح بھی ہوگی، اور ربط و اتحاد کو بقاء و قیام بھی ہوگا۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے، اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے (دین میں) باہم تفریق کرلی، اور (نفسانیت سے) باہم اختلاف کرلیا،

ان کے پاس واضح احکام پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (یعنی قیامت کے روز)۔

معارف و مسائل

مسلمانوں کی قومی و اجتماعی فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے پہلے تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعہ اپنی اصلاح، دوسرے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح۔

آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ میں اسی دوسری ہدایت کا بیان ہے، گویا ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ خود بھی اپنے اعمال و اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق درست کرو، اور اپنے دوسرے بھائیوں کے اعمال کو درست کرنے کی بھی فکر رکھو، یہی مضمون ہے جو سورۂ والعصر میں ارشاد فرمایا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

"یعنی آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عمل صالح کے پابند ہیں اور دوسروں کو بھی حق کی تعلیم اور اعمالِ صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔"

قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی مضبوط و مستحکم رشتۂ وحدت ہو جس کو پہلی آیت میں اعتصام بحبل اللہ کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے، اسی طرح رشتہ کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے یہ دوسرا عمل بھی ضروری ہے جو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے، یعنی دوسرے بھائیوں کو احکام قرآن و سنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فرض سمجھے، تاکہ یہ حبل اللہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، کیونکہ بقول حضرت مرحوم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ "اللہ تعالیٰ کی یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے اس رسی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیش نظر یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور برے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حبل متین کو تھامے رہیں گے، اور اس کے نتیجہ میں فلاحِ دنیا و آخرت ان کے ساتھ ہوگی، اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لئے قرآن کریم میں بہت سے واضح ارشادات وارد ہیں،

سورۃ العصر کا مضمون ابھی آپ دیکھ چکے ہیں، اور اسی سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳: ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، کیونکہ تم نیک کاموں کا لوگوں کو حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔"

اس میں بھی پوری امت پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اور دوسری امتوں پر اس کی فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا ہے، اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں بے شمار ہیں، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لتأمرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقابا من عندہ ثم لتدعنہ فلا یستجیب لکم

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا عذاب بھیج دے اس وقت تم خدا تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔"

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان

"یعنی تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ اور قوت سے اس کو روک دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو زبان سے روکے اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دل میں اس فعل کو برا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجہ کا ایمان ہے۔"

ان تمام آیات اور روایات سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت و استطاعت پر احکام دائر ہوں گے جس کو جتنی قدرت ہو اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا ابھی جو حدیث آپ نے دیکھی ہے اس میں استطاعت ہی پر مدار رکھا گیا ہے۔

پھر استطاعت و قدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے، امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف و منکر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو جس کو خود ہی

معروف و منکر کی تمیز نہ ہو یا اس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا منکر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف و منکر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت پیدا کرے اور احکام شرعیہ کے معروف و منکر کا علم حاصل کرے اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے۔

لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں اس کو اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں جیسے اس زمانہ میں بہت سے جاہل وعظ کہنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ انہیں قرآن کا علم ہے نہ حدیث کا، یا بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو، یہ طریق کار بجائے معاشرہ کے درست کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ و جدل کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح امر بالمعروف کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی ناقابل برداشت ضرر پہنچنے کا قوی خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دل ہی سے برا سمجھے ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کر سکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ قوی ہے کہ اس نے حق بات کی تلقین کی تو اس کی جان جاتی رہے گی، یا کوئی دوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پرواہ نہ کرے، اور نقصان برداشت کر کے بھی امر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، جیسے بہت سے صحابہ و تابعین اور ائمہ اسلام کے واقعات منقول ہیں، یہ ان کی اولو العزمی اور بڑی فضیلت ہے، جس سے ان کا مقام دنیا و آخرت میں بلند ہوا، مگر ان کے ذمہ ایسا کرنا فرض و واجب نہ تھا۔

سورۂ والعصر کی آیت اور کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ (۳: ۱۱۰) وغیرہ آیات سے، نیز احادیث مذکورہ سے امت کے ہر فرد پر اس کی قدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے وجوب میں یہ تفصیل ہے کہ امور واجبہ میں معروف کا امر اور منکرات سے نہی کرنا واجب اور امور مستحبہ میں مستحب ہے، مثلاً نماز پنجگانہ فرض ہے تو ہر شخص پر

واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے، ورنہ نفل مستحب میں اس کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی سے اظہار کرے، اور واجبات میں اول نرمی ورنہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، آجکل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں، لیکن امور واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

نیز ہر شخص پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہوگا جب کہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے، مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا کسی غیر عورت سے مجرمانہ اختلاط کر رہا ہے، تو اس کے ذمہ واجب ہوگا کہ اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش و تحقیق کرکے اس کو سزا دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد من رأی منکم میں اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم میں سے کسی منکر کو دیکھے۔

امر بالمعروف کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت وارشاد ہی کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ ہی یہی ہو کہ اپنے قول وعمل سے لوگوں کو قرآن وسنت کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے، اور چونکہ اس اہم فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کو مسائل کا پورا علم بھی ہو اور امر بالمعروف کو انجام دینے کے آداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اس کو معلوم ہوں، اس لئے مکمل طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا، جو ہر طرح دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو، چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو بتلاتے ہوئے فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، یعنی تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں، وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ

اُمَّۃٌ میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں کیونکہ ان کی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے۔ پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ یعنی اس جماعت کا پہلا امتیازی خصوصی یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصد اعلیٰ ہوگا، خیر سے مراد کیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اَلْخَیْرُ ھُوَ اتِّبَاعُ الْقُرْاٰنِ وَسُنَّتِیْ، یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے۔ (ابن کثیر)

خیر کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دین شریعت اس میں آگیا، پھر یدعون کو صیغہ مضارع سے ذکر کرکے بتلا دیا کہ اس جماعت کا وظیفہ ہی دعوت الی الخیر ہوگا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص موقع پر ہوگی جب وہ منکرات دیکھے جائیں لیکن یدعون الی الخیر کہہ کر بتلا دیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس وقت منکرات موجود نہ ہوں یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی، کہ وقت نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے، روزہ کا وقت نہیں آیا، ابھی رمضان کا مہینہ دور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا، ہر مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا ان سچے مومنین کی اس طرح تعریف کی:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین و قدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظام

اجتماعات قائم کرتے ہیں جن کا ایک مظاہرہ ہے، وہ اپنی اس قوت مذکورہ کے اصولوں پر قائم
کرتے ہیں، بخلاف امر بمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں، اگر آج امت
مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہو جائیں گی
جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پیدا ہو گئی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت
الی الخیر) پر مجتمع ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں ہی دینی حیثیت سے تمام عالم پر غالب آنا ہے
اور اقوام کی تربیت و تہذیب ہمارے ذمہ ہے، تو ان کی تمام نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہو جائیں گی
اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے ایک جان ہو جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر تھا۔ حدیث میں ہے کہ
حضرت ضحاکؒ نے یہ آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا: هُمْ خَاصَّةً
اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابن جریر) یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرامؓ
کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے، کہ تمام مسلمان عمومًا
اور جماعت خاصۃً مخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے، اور فریضہ دعوت الی الخیر
انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو فرائض
احکام و اسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی، یعنی
امت مسلمہ میں علوم قرآن و سنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دوسری آیت
میں رہنمائی کی گئی ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا
قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۹: ۱۲۲) آگے اس جماعت کا ایک دوسرا
وصف اور امتیاز خصوصی یہ بتلایا: يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
یعنی وہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے،
اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی، اور چونکہ یہ معروف جانے پہچانے
ہوئے ہیں اس لئے معروف کہلاتے ہیں۔

اسی طرح منکر میں تمام وہ برائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم و معروف ہے، اس مقام پر واجبات
اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو

کر روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو امت میں مشہور و معروف ہیں اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اصولِ شرعیہ کے ماتحت رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے، اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔

آیت کے اختتام پر اس جماعت کے انجام اور عاقبت محمودہ کو ان لفظوں میں فرمایا: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، یعنی درحقیقت یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح وسعادت دارین انہی کا حصہ ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا مصداق جماعت صحابہؓ ہے، جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عظیم مقصد کو لے کر اٹھی اور قلیل عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئی، روم وایران کی عظیم سلطنتیں روند ڈالیں، اور دنیا کو اخلاق و پاکیزگی کا درس دیا، نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔

حق تعالیٰ نے امت داعیہ الی الخیر کی ضرورت اور اس کے اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مذکورۃ الصدر دوسری آیت میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف اور تفرق وانتشار سے بچانے کی ہدایت فرمائی ہے، ارشاد ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ،

"یعنی ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد اختلاف کیا۔"

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو، جنھوں نے خدا تعالیٰ کے صاف احکام پہونچنے کے بعد محض اوہام و اہواء کی پیروی کرکے اصولِ شرع میں متفرق ہوگئے، اور باہمی جنگ وجدال کے عذاب الٰہی میں مبتلا ہوگئے، یہ آیت درحقیقت آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا تتمہ ہے، اسی آیت میں مرکز وحدت اعتصام بحبل اللہ کی طرف دعوت دی گئی، اور اشارۃً بتلایا گیا کہ اجتماع اور اتحاد تمام امت اور قوم کو ایک شخص واحد میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اسی وحدت واجتماع کو غذا پہونچائی جاتی ہے، اور نشو ونما کیا جاتا ہے، پھر وَلَا تَفَرَّقُوْا اور آیت وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا سے اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ تفرق اور اختلاف نے پچھلی قوموں کو تباہ کر دیا، ان سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے میں یہ مرض پیدا ہونے نہ دو

آیت میں جس تفرق و اختلاف کی مذمت ہے اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصولِ دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید کہ "احکامِ واضحہ آنے کے بعد" اس امر پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اصولِ دین سب واضح ہوتے ہیں، اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی، لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے و اجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں، اور وہ حدیث صحیح اس کی اجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری ومسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاص سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ اجتہادی اختلاف جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں ہوا ہے، اس کو اس آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں بقول حضرت قاسم بن محمدؒ و حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ صحابہؓ کا اختلاف لوگوں کے لئے موجب رحمت و رخصت ہے (کذا فی روح المعانی نقلاً عن البیہقی والمدخل)

اجتہادی اختلافات میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی جس پر نکیر جائز نہیں

یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہو گئی کہ جو اجتہادی اختلاف شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے، اس میں اپنے اپنے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کر لی اگرچہ عند اللہ ان میں سے صواب اور صحیح صرف ایک ہے دوسرا خطا ہے، لیکن یہ صواب و خطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد صواب پر پہنچنے والے عالم کو دوہرا ثواب عطا فرمادیں گے، اور جس کے اجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے، ہاں اپنی فہم و بصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنۃ سمجھے اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر احتمال خطا کا بھی ہے، اور دوسری جانب خطا ہے، مگر احتمال صواب کا بھی ہے، اور یہ وہ بات ہے جو تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے، اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود امر منکر ہے، جس سے پرہیز لازم ہے، یہ وہ بات ہے جس میں آجکل بہت سے اہلِ علم بھی

غفلت میں مبتلا ہیں، اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرّا اور سبّ وشتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ وجدل اور انتشار و اختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آرہا ہے۔

اجتہادی اختلاف بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ تو ہرگز آیت مذکورہ وَلَا تَفَرَّقُوْا سے خارج اور مذموم نہیں، البتہ اس اجتہادی اختلاف کے ساتھ جو معاملہ آجکل کیا جا رہا ہے کہ اسی کی بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنا لی گئی، اور اسی پر باہمی جنگ و جدل اور سب وشتم تک نوبت پہونچا دی گئی، یہ طرز عمل بلاشبہ وَلَا تَفَرَّقُوْا کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنت سلف، صحابہؓ و تابعین کے بالکل خلاف ہے، اسلاف امت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلاف کی بناء پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو، مثلاً امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوگی، اس کے بالمقابل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اسی لئے حنفیہ نہیں پڑھتے، لیکن پوری امت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارک نماز کہتے ہوں، کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں، اس لئے تم بے نمازی ہو یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکرات شرعیہ پر کی جاتی ہے۔

امام ابن عبد البر اپنی کتاب جامع العلم میں اس معاملہ کے متعلق سنت سلف کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں:

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ مَا بَرِحَ أَهْلُ الْفَتْوٰى يُفْتُوْنَ فَيُحِلُّ هٰذَا وَيُحَرِّمُ هٰذَا فَلَا يَرَى الْمُحَرِّمُ أَنَّ الْمُحِلَّ هَلَكَ لِتَحْلِيْلِهِ وَلَا يَرَى الْمُحِلُّ أَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِيْمِهِ

(جامع بیان العلم، ص)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتویٰ دیتے رہے ہیں ایک شخص ایک صورت حکم میں ایک چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال قرار دیتا ہے، دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہوگیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک اور گمراہ ہوگیا۔

۱۰

تنبیہ ضروری یہ تمام گفتگو اس اجتہاد میں ہے جو شریعت کے اصول اجتہاد کے تحت ہو جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں، یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں، یا چند آیات و روایات سے ظاہراً متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ایسے مواقع میں صرف اُن لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں، مثلاً قرآن و حدیث کے متعلق تمام علوم و فنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہؓ و تابعین کے اقوال و آثار کی مکمل واقفیت وغیرہ، تو جو شخص کسی منصوص مسئلہ میں اپنی رائے چلائے وہ اجتہادی اختلاف نہیں۔

اسی طرح شرائط اجتہاد جس شخص میں موجود نہیں اس کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف نہیں کہا جا سکتا، اس کے قول کا کوئی اثر مسئلہ پر نہیں پڑتا، جیسے آجکل بہت سے لکھے پڑھے لوگوں نے یہ سن لیا ہے کہ اسلام میں اجتہاد بھی ایک اصول ہے، اور ان منصوصات شرعیہ میں رائے زنی کرنے لگے جس میں کسی امام مجتہد کو بھی بولنے کا حق نہیں، اور یہاں تو شرائط اجتہاد کیا نفس علم دین سے بھی واقفیت نہیں ہوتی، العیاذ باللہ۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ

جس دن کہ سفید ہوں گے بعضے منہ اور سیاہ ہوں گے بعضے منہ سو وہ لوگ کہ سیاہ ہوئے

وُجُوْھُھُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ

منہ ان کے، ان سے کہا جائے گا کیا تم کافر ہوگئے ایمان لا کر اب چکھو عذاب

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ

بدلا اس کفر کرنے کا اور وہ لوگ کہ سفید ہوئے منہ اُن کے

فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ

سو رحمت میں ہیں اللہ کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ حکم ہیں اللہ کے

نَتْلُوْھَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۸

ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک اور اللہ ظلم کرنا نہیں چاہتا خلقت پر

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۱۰۹

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہے ہر کام کا

ع ۲

خلاصۂ تفسیر

اس روز (یعنی قیامت کے روز) کہ بعضے چہرے سفید (روشن) ہو جاویں گے، اور بعضے چہرے سیاہ (تاریک) ہوں گے، سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے ان سے کہا جاویگا کیا تم (ہی) لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد، تو (اب) سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (یعنی جنت) میں (داخل) ہوں گے، (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ (جو اوپر مذکور ہوئیں) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں (اس سے تو مضمون بالا کا صحیح ہونا معلوم ہوا) اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے (پس جو کچھ کسی کے لئے جزا و سزا تجویز کی ہے وہ بالکل مناسب ہے اس سے تجویز مذکور کا مناسب ہونا معلوم ہوا) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے (پس جب سب ان کی ملک ہے تو ان سب کے ذمہ اطاعت واجب تھی ان سے ان کا مملوک ہونا اور وجوب طاعت ثابت ہوا) اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا)۔

معارف و مسائل

چہرے کی سفیدی اور سیاہی سے کیا مراد ہے؟

چہرے کی سفیدی اور سیاہی کا ذکر قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں آیا ہے، مثلاً وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ۔ (زمر ۳۹: ۶۰)، وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۸۰: ۳۸ تا ۴۱) عبس، وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (قیامہ ۷۵: ۲۲، ۲۳)

ان آیات میں ایک ہی مفہوم سے متعلق متعدد الفاظ ذکر کئے گئے ہیں، یعنی "بیاض" اور "سواد" "غبرۃ"، "قترۃ" اور "نضرۃ"، جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نورِ ایمان کی سفیدی ہے، یعنی مؤمنین کے چہرے نورِ ایمان سے روشن اور غایت مسرت سے خنداں اور فرحاں ہوں گے، اور سیاہی سے مراد کفر کی سیاہی ہے، یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی، اور پھر اس پر فسق و فجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ و تاریک کردے گی۔

سیاہ چہرے والے اور سفید چہرے والے کون لوگ ہیں

ان لوگوں کی تعیین میں مفسرین کے متعدد اقوال مذکور ہیں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہلِ بدعت کے سیاہ ہوں گے، حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کے چہرے

سفید ہوں گے اور بنی قریظہ اور بنی نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے (قرطبی)

امام ترمذی نے حضرت ابو امامہؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اس سے مراد خوارج ہیں، یعنی سیاہ چہرے خوارج کے ہوں گے اور سفید چہرے اُن لوگوں کے ہوں گے جن کو وہ قتل کریں گے۔ فقال ابو امامۃ کلاب النار شرّ قتلی تحت ادیم السماء وخیر قتلی من قتلوہ، ثم قرأ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ۔ ابو امامہؓ سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ نے یہ حدیث حضور ﷺ سے سنی ہے تو آپ نے جواب میں شمار کرتے ہوئے بتلایا کہ اگر حضور ﷺ سے میں نے سات مرتبہ یہ حدیث سنی ہوئی نہ ہوتی تو میں بیان نہ کرتا (ترمذی)

حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ سیاہ چہرے اہل کتاب کے ان لوگوں کے ہوں گے جو آپ کی بعثت سے قبل تو آپ کی تصدیق کرتے تھے، لیکن جب آپ مبعوث ہوئے تو بجائے آپ کی تائید و نصرت کرنے کے آپ کی تکذیب کرنی شروع کردی (تفسیر قرطبی)

مذکورہ اقوال کے علاوہ اور بھی بہت سے اقوال ہیں، لیکن ان سب میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا حاصل ایک ہی ہے، امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں آیت "یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" کے متعلق فرمایا کہ مومنین مخلصین کے چہرے سفید ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ ان تمام لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جنھوں نے دین میں تغیر و تبدل کیا ہو، خواہ وہ مرتد اور کافر ہوگئے ہوں، خواہ اپنے دلوں میں نفاق کو چھپائے ہوئے ہوں ان سب کے ساتھ یہی معاملہ کیا جائے گا (تفسیر قرطبی)

چند اہم فوائد

اللہ تعالیٰ نے "یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" میں بیاض کو سواد پر مقدم کیا، لیکن فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ میں سواد کو بیاض پر مقدم کیا، حالانکہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ بیاض کو یہاں بھی مقدم رکھا جاتا، اس ترتیب کو برعکس کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصدِ تخلیق کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ مقصد اپنی مخلوق پر رحمت کرنا ہے، نہ کہ عذاب، اس لئے سب سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل بیاض کو بیان کیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ثواب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اہل سواد کو ذکر کیا گیا جو عذاب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت کے خاتمہ پر "فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ" سے اپنی رحمتِ عظمیٰ کا بھی اظہار فرمایا، تو آیت کے شروع اور اس کے آخر دونوں جگہ اہل رحمت کو بیان کیا، درمیان میں اہل سواد کا، جس میں اپنی رحمتِ بیکراں کی طرف اشارہ کردیا کہ بنی نوع انسان کو اس نے پیدا نہیں کیا تاکہ ان کو عذاب کا مظہر بنائے بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری رحمت سے فائدہ اٹھائیں۔

دوسرا فائدہ یہ کہ اہل بیاض کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں

رہیں گے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت سے مراد اس جگہ جنت ہے، یہاں بھی بظاہر جنت کو رحمت سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی عابد اور زاہد کیوں نہ ہو وہ جنت میں محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی جائے گا، کیونکہ عبادت کرنا بھی انسان کا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اس کی قدرت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لئے عبادت کرنے سے دخولِ جنت ضروری نہیں ہوجاتا، بلکہ جنت کا داخلہ تو اللہ کی رحمت ہی سے ہوگا (تفسیر کبیر)

تیسرا فائدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے "فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ" کے بعد "هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ" فرماکر بتادیا کہ مؤمنین اللہ کی جس رحمت میں ہوں گے وہ اُن کے لئے عارضی نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوگی، ان سے یہ نعمت کبھی سلب یا کم نہ کی جائے گی، اس کے بالمقابل اہل سواد کے لئے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ اس حال میں ہمیشہ رہیں گے۔

آدمی سزا اپنے ہی گناہوں کی پاتا ہے: فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ میں اشارہ فرمادیا کہ آج کا عذاب ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی کمائی ہے جو دنیا میں کرتے رہے ہو کیونکہ درحقیقت جنت و دوزخ کی نعمتیں اور مصائب درحقیقت ہمارے اعمال ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، اسی بات پر متنبہ کرنے کے لئے آخر میں یہ بھی فرمادیا: وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے عذاب ثواب جو کچھ ہے عین انصاف و مقتضائے حکمت و رحمت ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ
اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے

الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ
اہل کتاب تو ان کے لئے بہتر تھا کچھ تو ان میں سے ہیں ایمان پر اور اکثر ان میں

الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾
نافرمان ہیں

ربطِ آیات سابقہ آیات میں مسلمانوں کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کا خاص اہتمام کرنے کی ہدایت تھی، اس آیت میں اس کی مزید تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جو حق تعالیٰ نے تمام امتوں سے افضل و اعلیٰ اور خیر الامم قرار دیا ہے اس کی بڑی وجہ ان کی یہی صفت ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے امتِ محمدیہ) تم لوگ (سب اہل مذاہب سے) اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے (نفع ہدایت پہنچانے کے لئے) ظاہر کی گئی ہے، (اور نفع پہنچانا جو اس امت کے خیر اور افضل ہونے کی وجہ ہے اس کی صورت یہ ہے کہ) تم لوگ (بمقتضائے شریعت زیادہ اہتمام کے ساتھ) نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو (یعنی ایمان پر قائم رہتے ہو، یہاں اللہ پر ایمان میں وہ تمام عقائد و اعمال داخل ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں) اور اگر اہل کتاب (بھی جو تم سے مخالفت کر رہے ہیں، تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ بھی اہل حق کی اس بہتر جماعت میں داخل ہو جاتے، مگر افسوس کہ وہ سب مسلمان نہ ہوئے بلکہ) ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر داخل اسلام ہو گئے، اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں (کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اور ان کی بہتر امت میں شامل نہیں ہوئے)

معارف و مسائل

امتِ محمدیہ کا خیر الامم ہونا اور اس کی چند وجوہ: قرآن کریم نے امتِ محمدیہ کو خیر الامم قرار دینے کی وجوہ متعدد آیتوں میں بیان فرمائی ہیں اس سلسلہ کی سب سے اہم آیت سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۲: ۱۴۳) وہاں اس آیت کی تفسیر اور امتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی بڑی وجہ اس کا اعتدال مزاج ہونا اور پھر ہر شعبۂ زندگی میں امتِ محمدیہ کے اعتدال کی تفصیل بیان ہوئی ہے (معارف القرآن جلد اول ص ۳۰۹ تا ص ۳۰۶)

اس آیت میں امتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خلق اللہ کو نفع پہونچانے ہی کے لئے وجود میں آئی ہے، اور اس کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ خلق اللہ کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی فکر اس کا منصبی فریضہ ہے، اور پچھلی سب امتوں سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکمیل اس امت کے ذریعہ ہوئی، اگرچہ امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کا فریضہ پچھلی امتوں پر عائد تھا، جس کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، مگر اول تو پچھلی بہت سی امتوں میں جہاد کا حکم نہیں تھا، اس لئے ان کا امر بالمعروف صرف دل اور زبان سے ہو سکتا تھا، امت محمدیہ میں اس کا تیسرا درجہ ہاتھ کی قوت سے امر بالمعروف کا بھی ہے جس میں جہاد کی تمام اقسام بھی داخل ہیں، اور بزور حکومت اسلامی قوانین کی تنفیذ بھی اس کا جزء ہے، اس کے علاوہ امم سابقہ میں جس طرح دین کے دوسرے شعائر غفلت عام ہو کر محو ہو گئے تھے، اسی طرح فریضۂ امر بالمعروف بھی بالکل متروک ہو گیا تھا، اور اس امت محمدیہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی ہے کہ: "اس امت میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو فریضۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم رہے گی"۔

دوسری امتیازی صفت اس امت کی تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ بیان فرمائی ہے، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ایمان باللہ تو تمام انبیاء سابقینؑ اور ان کی امتوں کا مشترک وصف ہے، پھر اس کو وجہ امتیازی کس بناء پر قرار دیا۔

جواب واضح ہے کہ اصل ایمان تو سب میں مشترک ہے، مگر کمال ایمان کے درجات مختلف ہیں ان میں امت محمدیہ کو جو درجہ حاصل ہے وہ سابقہ امتوں کے مقابلہ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔

اور آخر آیت میں جو اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے کچھ مسلمان ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

وہ کچھ نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا مگر ستانا زبان سے اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ دیں گے پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔

ربطِ آیات پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کی مسلمانوں سے دشمنی اور ان کو دینی ضرر پہنچانے کی تدبیریں کرنا مذکور تھا اس آیت میں مسلمانوں کے لئے دنیوی ضرر کی تدبیریں کرنے کا ذکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ (اہل کتاب، تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، مگر ذرا ہی سی اذیت (یعنی زبانی برا بھلا کہہ کر دل دکھانا)

اور اگر وہ (اس سے زیادہ کی ہمت کریں اور) تم سے مقاتلہ کریں تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ) کسی طرف سے ان کی مدد بھی نہ ہوگی۔

معارف و مسائل

یہ قرآن کی پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اہل کتاب زمانۂ نبوت میں کسی موقع پر بھی صحابہ کرامؓ پر جو کہ بقرینۂ مقام اس مضمون کے خاص مخاطب ہیں غالب نہ آسکے، خصوصاً یہود جن کے قبائل خصوصیت سے اس جگہ مذکور ہیں جس میں وہ حصہ صحابہ کرامؓ کے آپس میں تفرقہ ڈالنے کی کارروائی کا بھی ہے، انجام یہ ہوا کہ یہ لوگ ذلیل و خوار ہوئے، بعض پر جزیہ لگایا گیا، بعض مقتول ہوئے، بعض جلا وطن کئے گئے، آیت آئندہ میں اسی مضمون کا تتمہ ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ

ماری گئی ان پر ذلت جہاں دیکھے جائیں سوائے دستاویز

اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ

اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے اور کمایا انھوں نے غصہ اللہ کا اور لازم کردی گئی

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ

ان کے اوپر حاجت مندی یہ اس واسطے کہ وہ انکار کرتے رہے ہیں اللہ کی

اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا

آیتوں سے اور قتل کرتے رہے ہیں پیغمبروں کو ناحق یہ اس واسطے کہ نافرمانی کی

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

انھوں نے اور حد سے نکل گئے۔

خلاصۂ تفسیر

چسپاں کردی گئی ہے ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں (دو ذریعوں سے وہ اس ذلت سے نجات پا سکتے ہیں) ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے، اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے (اللہ کی طرف کا ذریعہ تو یہ ہے کہ کوئی کتابی غیر مسلم [illegible] عبادت میں اپنے طریق پر ایسا مشغول و مصروف

ہو کر مسلمانوں سے لڑتا پھرتا نہ ہو، اس کو جہاد میں قتل نہیں کیا جاتا، اگرچہ اس کی کافرانہ عبادت آخرت میں اس کے کام نہ آئے گی، اسی طرح مشرکی عرف کے ذریعہ میں یہ بھی آگیا کہ وہ کتابی، بالغ یا عورت ہو کہ شریعت اسلام کی رُو سے ان کو بھی جہاد میں قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور آدمیوں کی طرف کے ذریعہ سے مراد معاہدہ اور صلح ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ ہو جائے کیونکہ شریعت اسلام میں جس شخص سے کوئی معاہدہ صلح کا ہو جاتا ہے وہ بھی مامون ہے اس کا قتل جائز نہیں) اور مستحق ہو گئے یہ لوگ غضب الٰہی کے، اور جمادی گئی ان پر پستی (کہ ان کے طبائع میں بھی اولوالعزمی نہیں نیز جزیہ دخراج مسلمانوں کو ادا کر کے رہنا بھی مسکنت اور پستی میں داخل ہے یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے، اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (اس طرح سے کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی ناحق ہوتا تھا) اور یہ ذلت و غضب اس وجہ سے بھی ہوا کہ انہوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

معارف و مسائل

یہود پر ذلت و غضب کا مطلب موجودہ اسرائیل حکومت سے شبہ کا جواب

یہ بحث سورۂ بقرہ کی آیت (۶۱) میں تفصیل سے گذر چکی ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے، آیت آل عمران میں اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے استثناء کی تحقیق وہاں گذر چکی ہے، اس کو معارف القرآن جلد اول صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۱ میں دیکھ لیا جائے، اتنی بات یہاں مکرر قابل ذکر ہے کہ کشاف کی تفسیر کے مطابق استثناء کو متصل قرار دے کر معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہود پر ذلت و خواری تو ہمیشہ رہے گی، مگر صرف دو صورتوں میں وہ اس ذلت سے بچ سکتے ہیں ایک اللہ کا عہد مثلاً نابالغ بچہ یا عورت ہونے کی بناء پر بحکم خداوندی وہ قتل وغیرہ سے مامون ہیں، دوسرے بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ یعنی لوگوں سے معاہدہ صلح کی بناء پر ان کی ذلت و خواری کا ظہور نہ ہو، اس جگہ الفاظِ قرآن بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ میں، جو مومن و کافر سب کو شامل ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بے فکر ہو جائیں اور یہ بھی محتمل ہے کہ دوسری غیر مسلم طاقتوں سے معاہدہ صلح کر کے محفوظ ہو جائیں، جیسا کہ حکومت اسرائیل کی موجودہ صورت ہے، کہ کسی صاحب بصیرت پر مخفی نہیں کہ اسرائیل کی حکومت درحقیقت اہلِ یورپ کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ نہیں، اس کی جو کچھ قوت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتہ پر ہے

[illegible] رکھ سکتا، واللہ اعلم۔

لَيْسُوا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ

وہ سب برابر نہیں اہل کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر پڑھتے ہیں

اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

آیتیں اللہ کی راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں ایمان لاتے ہیں اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بُری بات سے

وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ

اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر اور وہی لوگ نیک بخت ہیں

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ

اور جو کچھ کریں گے وہ نیکی کا کام سو اس کی ناقدری نہ ہوگی اور اللہ کو خوب معلوم ہیں پرہیزگار

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ

وہ لوگ جو کافر ہیں ہرگز کام نہ آئیں گے ان کو ان کے مال اور نہ اولاد

مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ

اللہ کے آگے کچھ اور وہی لوگ رہنے والے ہیں آگ میں وہ اس آگ میں ہمیشہ رہیں گے

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْھَا

جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں اس کی مثال جیسے ایک ہوا کہ اس میں ہو

صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَكَتْهُ ۭ

پالا جا لگی کھیتی کو اس قوم کی کہ انہوں نے اپنے حق میں برا کیا تھا پھر اس کو نابود کر گئی

وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ

اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

ربطِ آیات اوپر اہل کتاب کے متعلق بیان ہوا تھا کہ ان میں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں، اور زیادہ کافر ہیں، اسی مضمون کی مزید تفصیل ان آیات میں ہے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ (اہل کتاب) سب برابر نہیں (بلکہ) ان (ہی) اہل کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے جو (دین حق پر) قائم ہیں (اور) اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں (اور) اللہ پر اور قیامت والے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور (دوسروں کو) نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) شائستہ لوگوں میں (شمار کئے جاتے ہیں) اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس (کے ثواب) سے محروم نہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو خوب جانتے ہیں، (اور یہ لوگ چونکہ اہل تقویٰ ہیں تو حسب وعدہ جزاء کے مستحق ہیں) بیشک جو لوگ کافر رہے ہرگز ان کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ اولاد اللہ تعالیٰ کے (عذاب کے) مقابلہ میں ذرا بھی اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (اور کبھی نجات نہ ہوگی) وہ (کفار) جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگانی میں اس کی حالت (برباد و ضائع ہونے میں) اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی (یعنی پالا) ہو (اور) وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنھوں نے (بددینی سے) اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کر ڈالے (اسی طرح ان لوگوں کا خرچ کرنا آخرت میں سب ضائع ہے) اور (اس ضائع کرنے میں) اللہ تعالیٰ نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود (کفر کے ارتکاب سے جو کہ مانع قبول ہے) اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے (نہ وہ کفر کرتے نہ ان کے سب نفقات ضائع ہوتے)۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا

اے ایمان والو نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی

يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ

نہیں کرتے تمہاری خرابی میں ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف میں رہو نکلی پڑتی ہے دشمنی

مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا

ان کی زبان سے اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے ہم نے بتادیئے

لَكُمُ الْآيَاتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۱۸﴾ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ

تم کو پتے اگر تم کو عقل ہے سن لو تم لوگ ان کے دوست ہو

وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا

اور وہ تمہارے دوست نہیں اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں

اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ

ہم مسلمان ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے تو کہہ

مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۱۹

مرو تم اپنے غصہ میں اللہ کو خوب معلوم ہیں دلوں کی باتیں

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ

اگر تم کو ملے کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے ان کو اور اگر تم پر پہنچے کوئی برائی تو

يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ

خوش ہوں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو تو کچھ نہ بگڑے گا تمہارا ان کے

شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۱۲۰

فریب سے بیشک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے

ع ۱۲ ۳

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت کے برتاؤ میں) صاحب خصوصیت مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے (اور دل سے بھی) تمہاری مضرت (دنیوی دینی) کی تمنا رکھتے ہیں (اور دلوں میں تمہاری طرف سے اس قدر بغض بھرا ہے کہ) واقعی (وہ) بغض (بعض اوقات) ان کے منہ سے (بے اختیار بات چیت میں) ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر اُن کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے (چنانچہ) ہم (ان کی عداوت کے) علامات (اور قرائن) تمہارے سامنے ظاہر کرچکے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان یقینی علامات سے دیکھ لو) ہاں (سمجھو) تم ایسے ہو ان لوگوں سے محبت (کا برتاؤ) رکھتے ہو اور یہ لوگ تم سے اصلاً محبت نہیں رکھتے (نہ دل سے نہ برتاؤ سے) حالانکہ تم تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (اس میں ان کی کتابیں بھی شامل ہیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن پر ایمان نہیں رکھتے مگر وہ تو باوجود اس تمہارے ایمان کے بھی تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم باوجود ان کے

اس عدم ایمان کے بھی ان سے محبت رکھتے ہو) اور (تم ان کے ظاہری دعوٰی ایمان سے شبہ مت کرنا کہ وہ بھی تو ہماری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں (صرف تمہارے دکھانے کو منافقانہ طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب (تم سے) الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ (وغضب کے (یہ کنایہ ہے شدت غضب سے) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں (مراد یہ کہ اگر تم مر بھی جاؤ گے تب بھی تمہاری مراد پوری نہ ہوگی) بیشک خدا تعالٰی خوب جانتے ہیں دلوں کی باتوں کو (اسی لئے ان لوگوں کے دلوں میں جو رنج وغبار اور عداوت تمہاری طرف سے بھری ہیں سب بتلادی اور ان کا یہ حال ہے کہ) اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (مثلاً تم میں باہم اتفاق ہو، غیروں پر غلبہ ہو جائے) تو ان کے لئے موجب رنج ہوتی ہے، (جس کا سبب اشد درجہ کا حسد ہے) اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس (پڑے) خوش ہوتے ہیں (جس سے ان کی شماتت ثابت ہے، سو ان کے جب یہ حالات ہیں تو وہ اس قابل کب ہیں کہ ان سے دوستی یا دوستی کا برتاؤ کیا جاوے، ان کے مذکورہ حالات سننے کے بعد دلوں میں یہ خیال پیدا ہونا بعید نہیں تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو ضرر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں رکھیں گے، اس لئے اگلی آیت میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا) اور اگر تم مستقل اور تقوٰی کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی (تم اس سے بے فکر رہو تو دنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے دوزخ ہوگی کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالٰی ان کے اعمال پر (علمی) احاطہ رکھتے ہیں کوئی عمل ان سے مخفی نہیں اس لئے وہاں سزا سے بچنے کے لئے کسی حیلہ حوالے کی گنجائش نہیں)

معارف و مسائل

شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس اور خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی، انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور یہود ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے، جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ پرانے تعلقات نبھاتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے

لیکن یہودیوں کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے لائے ہوئے دین سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لئے تیار نہ تھے جو اس دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہوگیا ہو، انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آرہے تھے، مگر دل میں اب وہ ان کے دشمن ہوچکے تھے، اور اسی ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں، اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اس منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرماتے ہیں، اور ایک نہایت اہم ضابطہ بیان فرماتے ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ، یعنی اے ایمان والو اپنے (یعنی مسلمانوں کے) علاوہ کسی کو گہرا اور رازدار دوست نہ بناؤ، بِطَانَة کے معنی میں ولی، دوست، رازدار اور بھیدی، کپڑے کا باطنی استر جو جسم سے ملا رہے وہ بھی بطانہ کہلاتا ہے، یہ بطن سے مشتق ہے، بطن کا استعمال ہر شے میں ظہر کے خلاف ہوتا ہے، اوپر کی جانب کو ظہر اور اندر کی جانب کو بطن بولتے ہیں، اور کپڑے کے اوپر کے حصہ کو ظہارہ اور اندرونی اور نیچے کے حصہ کو جو جسم سے ملا رہے جیسے استر وغیرہ کو بطانہ کہتے ہیں، جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہے، یعنی وہ اس کو نہایت مرغوب و محبوب ہے، اسی طرح بطانۃ الثوب سے بطور استعارہ ولی، دوست اور معتمد جو باطنی امور کا رازدار ہو اس کے لئے بطانۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، عربی لغت کی مشہور معتبر کتاب لسان العرب میں بطانۃ کے معنی اس طرح کئے بطانۃ الرجل صاحب سرہ وداخلۃ امرہ الذی یشاورہ فی احوالہ، یعنی بطانۃ الرجل کسی شخص کے ولی اور رازدار دوست اور اس کے معاملات میں دخیل کو کہا جاتا ہے جس سے وہ اپنے معاملات میں مشورہ لے، اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی یہی معنی بیان کئے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوا کہ بطانہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو رازدار، ولی اور دوست سمجھا جائے، اور اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور مشیر بنایا جائے۔

تو اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت والوں کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی ملت و حکومت کے راز کھول دو،

اسلام نے اپنی عالمگیر رحمت کے سایہ میں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی، خیرخواہی، نفع رسانی اور مروت و رواداری کی غیر معمولی ہدایت فرمائی اور نہ صرف زبانی ہدایات بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام معاملات میں اس کو عملی طور پر رواج دیا ہے وہیں عین حکمت کے مطابق مسلمانوں کی اپنی تنظیم اور ان کے مخصوص شعائر کی حفاظت کے لئے یہ احکام بھی صادر فرمائے کہ قانونِ اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت مسلمان کو نہیں دی جا سکتی کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کے لئے ضرر اور خطرے کھلے ہوئے ہیں اور یہ ایک صحیح معقول، مناسب اور ضروری انتظام ہے جس سے فرد اور ملت دونوں کی حفاظت ہوتی ہے، جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے باشندے ہیں، یا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ کئے ہوئے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور انکی حفاظت کے لئے انتہائی تاکیدات اسلامی قانون کا جزء ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ اٰذٰی ذِمِّیًّا فَاَنَا خَصْمُهٗ وَمَنْ كُنْتُ خَصْمَهٗ خَصَمْتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (عن ابن مسعودؓ)

"جس شخص نے کسی ذمی کو ستایا تو قیامت کے روز اس کی طرف سے میں مدعی ہوں گا اور جس مقدمہ میں میں مدعی ہوں تو میں ہی غالب ہوں گا"

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

مَنَعَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَّلَا غَيْرَهٗ (عن علیؓ)

"مجھے میرے پروردگار نے منع فرمایا ہے کہ میں کسی معاہد یا کسی دوسرے پر ظلم کروں"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِ انْتَقَصَهٗ اَوْ كَلَّفَهٗ فَوْقَ طَاقَتِهٖ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔

"خبردار جو کسی غیر مسلم معاہد پر ظلم کرے، یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے، یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو قیامت کے روز میں اس کا وکیل ہوں گا"

لیکن ان تمام مراعات کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی جماعت اور ملت کی حفاظت کے لئے یہ ہدایات بھی دی گئیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا گہرا دوست اور رازدار معتمد نہ بنایا جائے۔

ابن ابی حاتمؒ نے نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے، اگر اس کو آپ اپنا میر منشی بنالیں تو بہتر ہو، اس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

قَدِ اتَّخَذْتُ اِذًا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ.

"یعنی اس کو میں ایسا کروں تو مسلمانوں کو چھوڑ کر دوسرے ملت والے کو رازدار بنا لوں گا جو نص قرآن کے خلاف ہے"

امام قرطبیؒ جو پانچویں صدی کے مشہور عالم اور مفسر ہیں بڑی حسرت اور درد کے ساتھ مسلمانوں میں اس تعلیم کی خلاف ورزی اور اس کے نتائج بد کا بیان اس طرح فرماتے ہیں:

وَقَدِ انْقَلَبَتِ الْاَحْوَالُ فِیْ هٰذِهِ الْاَزْمَانِ بِاتِّخَاذِ اَهْلِ الْکِتٰبِ کَتَبَةً وَّاُمَنَاءَ وَتَسَوَّدُوْا بِذٰلِکَ عِنْدَ الْجَهَلَةِ الْاَغْنِيَاءِ مِنَ الْوُلَاةِ وَالْاُمَرَاءِ.

"یعنی اس زمانہ میں حالات میں ایسا انقلاب آیا کہ یہود و نصاریٰ کو رازدار و امین بنا لیا گیا اور اس ذریعہ سے وہ جاہل اغنیاء و امراء پر مسلط ہو گئے"

آج بھی کسی ایسی مملکت میں جس کا قیام کسی خاص نظریہ پر ہو وہاں اس ترقی و روشنی کے زمانے میں بھی کسی ایسے شخص کو جو اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا مشیر اور معتمد نہیں بنایا جا سکتا، روس اور چین میں کسی ایسے شخص کو جو کمیونزم پر ایمان نہیں رکھتا ہو، کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز نہیں کیا جاتا، اور اس کو مملکت کا رازدار و مشیر نہیں بنایا جاتا، اسلامی مملکتوں کے زوال کی داستانیں پڑھیے تو زوال کے دوسرے سبب کے ساتھ بکثرت یہ بھی ملیگا کہ مسلمانوں نے اپنے امور کا رازدار و معتمد غیر مسلموں کو بنا لیا تھا، سلطنت عثمانی کے زوال میں بھی اس کو کافی دخل تھا۔

آیتِ مذکورہ میں اس حکم کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا الآیۃ یعنی وہ لوگ تمھیں وبال و فساد میں مبتلا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، اور تمھارے دکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بغض تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اور بھی بڑھ کر ہے، ہم تو تمھارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر چکے ہیں، اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور مشیر نہ بنائیں کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ، منافقین ہوں یا مشرکین،

کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیر خواہ نہیں ہو سکتی، یہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ تمہیں بیوقوف بنا کر نقصان پہنچائیں، اور دینی و دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں، ان کی آرزو یہ ہے کہ تم تکلیف میں رہو، اور کسی نہ کسی طرح سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچے، جو دشمنی یا ضرر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے، لیکن بسا اوقات عداوت و غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا بھی ایسی باتیں کر گذرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں، مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی، پس عقلمند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے دشمنوں کو راز دار بنائے، خدائے تعالیٰ نے دوست دشمن کے پتے اور موالات کے احکام بتلا دیئے ہیں، جس میں عقل ہوگی اس سے کام لے گا۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ، یہ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے، اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی آگئی کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلمانوں کا حقیقی دوست اور خیر خواہ **نہیں ہو سکتا۔**

اس کے بعد فرمایا گیا ھٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ الآیۃ یعنی تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور یہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے، اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو، اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے، کہہ دیجئے کہ تم غیظ میں مر رہو، بیشک اللہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے، یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے رہو اور وہ تمہارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانے میں کسی پیغمبر پر اتری ہوں اس کے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے، بلکہ اپنی کتابوں پر بھی خود ان کا ایمان صحیح نہیں، اس لحاظ سے چاہئے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور اور بیزار رہتے، مگر یہاں **معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔**

اس کافرانہ ذہنیت کی مزید توضیح یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ، یعنی ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آجائے تو یہ ان لوگوں کو دکھ پہنچاتی ہے، اور اگر تم پر کوئی بری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

پھر منافقوں کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد اور مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا آسان اور سہل الحصول نسخہ یہ بیان کیا گیا کہ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ، اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو

تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

مسلمانوں کی فتح و کامیابی اور تمام مشکلات میں آسانی کا راز صبر اور تقویٰ کی دو صفتوں میں مضمر ہے

قرآن کریم نے مسلمانوں کو ہر قسم کے مصائب اور پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے صبر و تقویٰ کو صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی ایک مؤثر علاج کی حیثیت سے بیان فرمایا، اسی رکوع کے بعد دوسرے رکوع میں ہے: بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (۳: ۱۲۵) اس میں امداد غیبی کا وعدہ انہی دو شرطوں یعنی صبر و تقویٰ پر موقوف رکھا گیا ہے۔

سورۂ یوسف میں فرمایا: اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ (۱۲: ۹۰) اس میں بھی فتح و کامیابی صبر و تقویٰ کے ساتھ وابستہ بتلائی گئی ہے۔ اسی سورۃ کے ختم پر صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جا رہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳: ۲۰۰) اس میں بھی فلاح و کامیابی کو صبر و تقویٰ پر معلق کیا گیا ہے۔

صبر و تقویٰ کے مختصر عنوان کے اندر انفرادی اور جماعتی زندگی کے ہر شعبہ، عوامی اور فوجی نظم و نسق کا ایک کامیاب ضابطہ بڑی جامعیت کے ساتھ آ گیا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

عن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لاعلم آیۃ لو اخذ الناس بہا لکفتہم ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا الآیۃ (رواہ احمد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل اختیار کر لیں تو ان کے دین و دنیا کے لئے وہی کافی ہے، وہ آیت یہ ہے: ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں"

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۲۱) اِذْ ھَمَّتْ طَّاۗىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

اور جب صبح کو نکلا تو اپنے گھر سے بٹھلانے لگا مسلمانوں کو لڑائی کے ٹھکانوں پر، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ جب قصد کیا دو فرقوں نے تم میں سے کہ نامردی کریں اور اللہ مددگار تھا ان کا، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ

الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ

کریں مسلمان اور تمہاری مدد کر چکا ہے اللہ بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور تھے

فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۲۳﴾

سو ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم احسان مانو۔

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ اگر مسلمان صبر و تقویٰ پر قائم رہیں تو کوئی طاقت ان کو ضرر نہیں پہونچا سکتی، اور یہ کہ غزوۂ احد کے موقع پر جو عارضی شکست اور تکلیف مسلمانوں کو پہونچی وہ بھی دو چیزوں میں بعض حضرات کی طرف سے کوتاہی کی بناء پر تھی، مذکورہ آیات میں اسی غزوۂ احد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور غزوۂ بدر میں فتح کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ آپ صبح کے وقت (تاریخ قتال سے پہلے) اپنے گھر سے (اس غرض سے) نکلے (کہ) مسلمانوں کو (کفار سے) مقاتلہ کرنے کے لئے (مناسب مقامات پر جمانے کے لئے آمادہ کر رہے تھے (پھر اسی تجویز کے مطابق سب کو ان مقامات پر جما دیا) اور اللہ تعالیٰ (اس وقت کی باتیں) سب سن رہے تھے (اور اس وقت کے حالات سب جان رہے تھے (اسی کے ساتھ یہ قصہ بھی ہوا کہ) تم (مسلمانوں) میں سے دو جماعتوں نے (کہ وہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ ہیں) دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں (اور ہم بھی عبداللہ ابن ابی منافق کی طرح اپنے گھر جا بیٹھیں، اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا، (بھلا ان کو کب ہمت ہارنے دیتا، چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان کو اس خیال پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا) اور (ہم آئندہ کے لئے ان جماعتوں اور سب کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب تم مسلمان ہو) پس مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہئے (اور ایسی کم ہمتی کبھی نہ کرنا چاہئے) اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو (غزوہ) بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم (محض) بے سر و سامان تھے، (کیونکہ مجمع بھی کفار کے مقابلہ میں کم تھا، وہ ایک ہزار تھے، اور مسلمان تین سو تیرہ تھے اور ہتھیار وغیرہ بھی بہت کم تھے) سو (چونکہ یہ منصور ہونا بدولت تقویٰ کے تھا، جس میں استقلال و صبر بھی داخل ہے تو تم پر لازم ہے کہ آئندہ بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) تاکہ تم (اس نعمت نصرت کے) شکرگذار رہو،

(کیونکہ شکر گذاری صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورا شکر یہ ہے کہ زبان اور قلب بھی مشغول ہو، اور طاعت کی بھی پابندی ہو بالخصوص جبکہ اس طاعت کا اس نعمت میں دخیل ہونا بھی ثابت ہو جائے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ اُحد کا پس منظر آیت مذکورہ کی تفسیر سے قبل ضروری ہے کہ غزوہ احد کے واقعات اور پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔

رمضان المبارک سنہ ۲ ھ میں بدر کے مقام پر قریشی فوج اور مسلمان مجاہدین میں جنگ ہوئی، جس میں کفار مکہ کے ستر نامور اشخاص مارے گئے، اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اس تباہ کن اور ذلت آمیز شکست سے جو حقیقتاً عذاب الہٰی کی پہلی قسط تھی قریش کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا، جو سردار مارے گئے تھے ان کے اقرب نے تمام عرب کو غیرت دلائی، اور یہ معاہدہ کیا کہ جب تک ہم اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے، اور اہل مکہ سے اپیل کی کہ ان کا تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے وہ سب اسی مہم پر خرچ کیا جائے، تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں، سب نے منظور کیا، اور سنہ ۳ ھ میں قریش کے ساتھ بہت سے دوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے نکل پڑے حتی کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں تاکہ موقع آنے پر مردوں کو غیرت دلا کر پسپائی سے روک سکیں جس وقت یہ تین ہزار کا لشکر اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل جبل اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ لیا۔ آپ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھا، اس سے بھی رائے لی گئی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی مگر بعض پرجوش مسلمان جنہیں بدر کی شرکت نصیب نہ ہوئی تھی اور شوقِ شہادت بے چین کر رہا تھا مُصر ہوئے کہ ہم کو باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے، تاکہ دشمن ہمارے بارے میں بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ کرے، کثرتِ رائے اسی طرف ہو گئی۔

اس عرصہ میں آپ مکان کے اندر تشریف لے گئے، اور زرہ پہن کر باہر آئے، تو اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہم نے آپ کو آپ کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر جنگ کرنے پر مجبور کیا، یہ غلط ہوا، اس لئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر آپ کا منشا نہ ہو تو

ہیں تشریف رکھئے، فرمایا: "ایک پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے اور ہتھیار لگالے پھر بدون قتال کئے ہوئے بدن سے اُتارے"۔ اس جملہ میں نبی اور غیر نبی کا فرق واضح ہورہا ہے کہ نبی کی ذات سے کبھی کمزوری کا اظہار نہیں ہوسکتا، اور اس میں امت کے لئے بھی ایک بڑا سبق ہے۔

جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، تقریباً ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ تھے، مگر منافق عبداللہ بن ابی تقریباً تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر راستہ سے یہ کہتا ہوا واپس ہوگیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا اور دوسروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں، کیوں ہم خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں، اس کے ساتھیوں میں زیادہ تو منافقین ہی تھے، مگر بعض مسلمان بھی ان کے فریب میں آکر ساتھ لگ گئے تھے۔

آخر آپ کُل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر میدان جنگ میں پہنچ گئے، آپؐ نے بنفس نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں، صف آرائی اس طرح کی کہ اُحد کو پشت کی جانب رکھا، اور دوسرے انتظامات اس طرح کئے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علَم (جھنڈا) عنایت کیا، حضرت زبیر بن عوامؓ کو رسالہ کا افسر مقرر کیا، حضرت حمزہؓ کو اس حصّہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئے، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا، اور حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب ٹیلہ پر حفاظت کا کام انجام دیں، لڑنے والوں کی فتح و شکست سے تعلق نہ رکھیں اور اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے، قریش کو بدر میں تجربہ ہوچکا تھا اس لئے انھوں نے بھی ترتیب سے صف آرائی کی۔

نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صف آرائی اور فوجی قواعد کے لحاظ سے نظم و ضبط کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے رہبر کامل، مقدس نبی ہونے کے ساتھ سپہ سالار اعظم کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہیں، آپ نے جس انداز میں مورچے قائم کئے اور لڑائی کا نظم قائم کیا، اس وقت کی دنیا اس سے ناآشنا تھی، اور آج جبکہ فن حرب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کرگیا ہے، وہ بھی آپ کے فوجی قواعد اور نظم و ضبط کو سراہتا ہے، اسی حقیقت کو دیکھ کر ایک مسیحی مورخ بول اٹھا،

"برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہنا چاہئے کہ فن حرب کی بھی نئی راہ نکالی، مکہ والوں کی بے دھڑک اور اندھا دھند

لڑائی کے مقابلہ میں خوب دور اندیشی اور سخت قسم کے نظم وضبط سے کام لیا۔"

یہ الفاظ بیسویں صدی کے ایک مورخ ٹام انڈرے کے ہیں جو اس نے "لائف آف محمدؐ" میں بیان کئے

جنگ کا آغاز

اس کے بعد جنگ شروع ہوئی، ابتداءً مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی، مسلمان سمجھے کہ فتح ہوگئی، مال غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے، اُدھر جن تیر اندازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پشت کی جانب حفاظت کے لئے بٹھایا تھا انھوں نے جب دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا، تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن کی طرف آنے لگے، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا دوسروں نے کہا کہ حضورؐ کے حکم کی تعمیل تو موقت تھی اب ہمیں سب کے ساتھ مل جانا چاہئے، اس موقع سے خالد بن ولیدؓ جو ابھی تک مسلمان نہ تھے اور اس وقت لشکر کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درّہ سے حملہ کردیا، عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے قلیل ساتھیوں نے اس حملہ کو ہمت وشجاعت سے روکنا چاہا، مگر مدافعت نہ کرسکے، اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہوگئے اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا، اور مسلمان اس غیر متوقع صورت حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہوکر میدان سے چلا گیا، تاہم کچھ صحابہؓ ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے، اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے، اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش وحواس بھی گم کردیئے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے، اور آپؐ خود بھی زخمی ہوگئے تھے، شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی، کہ عین وقت پر صحابہ کو معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسلامت تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہوگئے، اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے، اس شکست کے بعد مسلمان حد درجہ پریشان رہے، اور یہ عارضی شکست چند اسباب کا نتیجہ تھی، قرآن مجید نے ان اسباب پر جچے تلے الفاظ میں تبصرہ کیا اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔

اس واقعہ کی تفصیل میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر عظیم سبق لئے ہوئے ہیں، اور اس میں تمام مسلمانوں کے لئے موعظت ونصیحت کے جواہر پارے مخفی ہیں۔

اُحد کے واقعہ سے چند سبق

(۱) پہلی بات جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ کفار قریش

اس جنگ میں عورتوں کو بھی لائے تھے تاکہ وہ مردوں کو پسپائی سے روک سکیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ عورتیں ہندہ زوجۂ ابی سفیان کی سربراہی میں اشعار گا کر مردوں کو جوش دلا رہی ہیں ؎

إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقْ　وَنَفْرِشِ النَّمَارِقْ
أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقْ　فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقْ

"مطلب یہ تھا کہ اگر مقابلہ پر ڈٹے رہے اور پیش قدمی کی تو ہم تم کو گلے لگائیں گے، اور تمہارے لئے نرم بستر بچھائیں گے، لیکن اگر تم نے پیٹھ موڑی تو ہم تم کو بالکل چھوڑ دیں گے"۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ دعائیہ جاری تھے:

اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ	"اے اللہ میں تجھ ہی سے قوت حاصل کرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی دین کے لئے قتال کرتا ہوں، اللہ ہی کافی ہے اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے"۔

اس دعاء کا ایک ایک لفظ تعلق مع اللہ کی تاکید اور مسلمانوں کے تمام افعال و اعمال حتیٰ کہ جنگ و قتال کو بھی دیگر اقوام کے جنگ و قتال سے ممتاز کر رہا ہے۔

(۲) دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ اس غزوہ میں بعض صحابہؓ نے بہادری و شجاعت، و جاں نثاری اور فدائیت کے وہ نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، حضرت ابو دجانہؓ نے اپنے جسم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنا لیا تھا، کہ جو آنے والا تیر اپنے سینہ پر کھاتے تھے، حضرت طلحہؓ نے بھی اسی طرح اپنے بدن کو چھلنی کرا لیا تھا، لیکن حضور کی رفاقت کو نہیں چھوڑا، حضرت انس بن مالکؓ کے چچا حضرت انس بن النضرؓ جنگ بدر سے غیر حاضر رہے تھے اس لئے ان کو اس کا افسوس تھا، آرزو کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں اگر کوئی موقع ہاتھ آیا تو اپنے دل کی حسرت پوری کروں گا۔

جب کچھ دن کے بعد جنگ اُحد کا واقعہ پیش آیا تو انس بن النضرؓ شریک ہوئے، مسلمان جب منتشر ہو گئے تھے اور کفار قریش کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا تو یہ اپنی تلوار لے کر آگے بڑھے، اتفاقاً حضرت سعدؓ سے ملاقات ہوئی، سعدؓ بھی منتشر ہونے والوں میں جا رہے تھے، پکار کر کہا: "سعد! کہاں چلے جا رہے ہو؟ میں تو اُحد کے اس دامن میں جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں"، یہ کہہ کر آگے بڑھے اور شدید قتال کے بعد اپنی جان جہاں آفریں کے سپرد کر دی (ابن کثیر)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان منتشر ہو گئے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ صرف گیارہ حضرات رہ گئے تھے جن میں حضرت طلحہؓ بھی تھے، کفارِ قریش کا سیلاب اُمڈ رہا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون اِن کی خبر لے گا؟ حضرت طلحہؓ بول اٹھے "میں یا رسول اللہ" ایک دوسرے انصاری صحابی نے کہا: "میں حاضر ہوں" انصاری کو آپؐ نے جانے کا حکم دیا، وہ قتال کے بعد شہید ہوگئے، پھر ایک ریلہ آیا، آپؐ نے پھر وہی سوال کیا، حضرت طلحہؓ نے وہی جواب دیا، وہ بے تاب ہو رہے تھے کہ حضورؐ حکم دیں تو میں آگے بڑھوں، حضورؐ نے پھر کسی دوسرے انصاری صحابی کو بھیجدیا، اور حضرت طلحہؓ کی تمنا پوری نہیں ہوئی، اسی طرح سات بار حضورؐ نے کہا، اور ہر مرتبہ حضرت طلحہؓ کو اجازت نہیں دی گئی، اور دوسرے صحابہ کو اجازت دی جاتی تھی وہ شہید ہوجاتے تھے۔

جنگِ بدر میں باوجود قلتِ تعداد کے مسلمانوں کو فتح ہوئی، غزوۂ اُحد میں بدر کی بہ نسبت کثرت تھی، پھر بھی شکست ہوئی، اس میں بھی مسلمانوں کے لئے عبرت ہے، کہ مسلمان کو کبھی کثرت ساز و سامان پر نہیں جانا چاہئے، بلکہ فتح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھے، اور اسی سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھے۔

جنگِ یرموک کے موقع پر جب مجاہدین جنگ سے حضرت عمرؓ کو مزید فوجی کمک بھیجنے کے لئے لکھا گیا اور قلتِ تعداد کی شکایت کی گئی تو تحریر فرمایا:

قد جاءنی کتابکم تستمدوننی وانی ادلکم علی من ھو اعز نصرا واحصن جندا اللہ عزوجل فاستنصروہ فان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم قد نصر فی یوم بدر فی اقل من عدتکم فاذا جاءکم کتابی ھذا فقاتلوھم ولا ترجعونی (بحوالہ مسند احمد) (ابن کثیر)

"میرے پاس تمہارا خط آیا جس میں تم نے زیادہ فوجی مدد طلب کی ہے لیکن میں تم کو ایک ایسی ذات کا پتہ دیتا ہوں جو نصرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ غالب، فوج کے لحاظ سے سب سے زیادہ محفوظ ہے وہ اللہ رب العالمین کی ذات ہے لہذا تم اسی سے مدد طلب کرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں باوجود قلتِ عدد کے مدد دی گئی، جب میرا یہ خط تم کو پہنچے تو ان پر ٹوٹ پڑو اور مجھ سے اس سلسلہ میں کوئی مراجعت نہ کرو۔"

اس واقعہ کے راوی بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کو یہ خط ملا ہم نے اللہ کا نام لے کر کفار کے لشکرِ کثیر پر یکبارگی حملہ کیا جس میں ان کو شکستِ فاش ہوئی، حضرت فاروق اعظمؓ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کی فتح و شکست، قلت و کثرت پر دائر نہیں ہوتی، بلکہ

اللہ پر توکل اور اس کی مدد پر موقوف ہے جیسا کہ قرآن کریم نے غزوۂ حُنین کے بارے میں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا، ارشاد ہے:

يَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا۔ (۹: ۲۵)	"یعنی غزوۂ حُنین کو یاد کرو جب کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا، تو یہ کثرت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی"

اب آیات کی تفسیر پر غور فرمائیے:

إِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ الخ، یعنی جب کہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے، جنگ کے لئے مختلف مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے۔

قرآن مجید کا نقل واقعات میں ایک خاص معجزانہ اسلوب ہے کہ وہ عام طور پر کوئی واقعہ پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان نہیں کیا کرتا، مگر جن واقعات اور جزئیات میں خاص ہدایات مضمر ہوتی ہیں وہ بیان کی جاتی ہیں، مذکورہ آیت میں جو خاص جزوی امور کی تصریح ہے، مثلاً گھر سے نکلنے کا وقت کیا تھا، اس کو لفظ غَدَوْتَ سے بیان فرما دیا، اور روایات حدیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ صبح ساتویں تاریخ شوال کی سنہ ۳ھ کی تھی۔

اس کے بعد یہ بھی بتلایا کہ اس سفر کی ابتداء کس جگہ سے ہوئی، مِنْ أَهْلِكَ کے لفظ سے اشارہ ہوا کہ آپ اس وقت اپنے اہل و عیال میں تھے، ان کو وہیں چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے حالانکہ یہ حملہ مدینہ ہی پر ہونے والا تھا، ان جزوی حالات میں یہ ہدایت مضمر ہے کہ جب اللہ کا حکم آجائے تو اس کی تعمیل میں اہل و عیال کی محبت سنگِ راہ نہیں ہونی چاہئے، اس کے بعد گھر سے نکل کر محاذِ جنگ تک پہونچنے کے جزئی واقعات کو چھوڑ کر محاذِ جنگ کا پہلا کام یہ بیان کیا گیا کہ:

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ، یعنی آپ مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات پر جا رہے تھے۔

پھر اس آیت کو اس طرح ختم کیا گیا کہ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے، سمیع علیم کی صفات کو یاد دلا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین دونوں جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ سن رہے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آچکا، اور اس موقعہ پر مخالفین و موافقین کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شے اس سے مخفی نہیں رہی، اور اسی طرح اس جنگ کا انجام بھی اس سے مخفی نہیں

اس کے بعد دوسری آیت ہے إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا الخ، یعنی جب

تم میں سے دو جماعتیں اس کا خیال کر بیٹھیں کہ ہمت ہار دیں، درحقیقت اللہ دونوں کا مددگار تھا، ان دونوں جماعتوں سے مراد قبیلۂ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلۂ خزرج کے بنی سلمہ ہیں، ان دونوں جماعتوں نے عبداللہ بن اُبی کی مثال دیکھ کر اپنے میں کمزوری اور کم ہمتی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور اس وسوسہ کو وسوسہ کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیا اور یہ خیال بھی جو انھیں پیدا ہوا، اپنی قلتِ تعداد، قلتِ سامان اور مادی کمزوری کی بنا پر تھا، نہ کہ ضعفِ ایمان کی بنا پر، مغازی کے مشہور امام مورخ ابن ہشام نے اس کو واضح فرما دیا ہے، اور وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کا جملہ خود ان کے ایمان کامل کی شہادت دے رہا ہے اس لئے ان دونوں قبیلوں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ: "اگرچہ اس آیت میں ہم پر کچھ عتاب بھی ہے، لیکن وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کی بشارت بھی ہمارے لئے آئی ہے"۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ "مسلمانوں کو اللہ پر اعتماد رکھنا چاہئے" اس میں واضح کر دیا کہ کثرتِ عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ بقدرِ استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ہونا چاہئے بنو حارثہ اور بنو سلمہ کو کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ اسی مادی ضعف کی بنا پر تھا اس لئے ان کے وسوسہ کا علاج توکل سے بتلایا گیا کہ توکل و اعتماد ان وساوس کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفت میں سے ہے، محققین صوفیا نے اس کی حقیقت پر مفصل بحثیں کی ہیں، یہاں اس قدر سمجھئے کہ توکل کے معنی یہ نہیں کہ تمام اسباب ظاہری سے بالکل قطع تعلق کر کے اللہ پر اعتماد کیا جائے، بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام اسباب ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور اختیار کرے، اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے، اور ان ظاہری اسباب پر فخر و ناز نہ کرے، بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے، خود اسی جہاد میں مسلمانوں کے لشکر کو جنگ کے لئے منظم کرنا، اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامانِ حرب فراہم کرنا، محاذِ جنگ پر پہنچ کر مناسب حال و مقام نقشۂ جنگ تیار کرنا، مختلف مورچے بنا کر صحابۂ کرامؓ کو ان پر بٹھانا وغیرہ یہ سب مادی انتظامات ہی تو تھے جن کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بدست مبارک استعمال فرما کر بتلا دیا کہ مادی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں، یہاں مؤمن اور غیر مؤمن میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مومن سب سامان اور مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ و توکل صرف

اللہ پر کرتا ہے، غیر مومن کو یہ روحانیت نصیب نہیں، اس کو صرف اپنی مادی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے، اور اسی فرق کا ظہور تمام اسلامی غزوات میں ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔

اب اس کے بعد اس غزوہ کی طرف ذہن کو منتقل کیا جا رہا ہے، جس میں مسلمانوں نے کامل توکل کا مظاہرہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی و نصرت سے سرفراز کیا تھا، ارشاد ہے وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ الخ یعنی اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری امداد فرمائی جبکہ تم تعداد میں بھی صرف تین سو تیرہ تھے، اور وہ بھی سب بے سروسامان۔

بدر کی اہمیت اور اس کا محل وقوع

بدر مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی اسّی میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے۔

اس وقت اس کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان یہیں سب سے پہلا معرکہ بروز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۱۷ مارچ ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا، یہ غزوہ بظاہر تو ایک مقامی جنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا، اسی لئے قرآن کی زبان میں اس کو یوم الفرقان کہا گیا ہے، فرنگی مورخوں نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے۔

امریکی پروفیسر ہٹی اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربین میں کہتا ہے:

"یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی"

وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ۔ یعنی تم اس وقت تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر تھے مسلمان تعداد میں قوی روایات کے مطابق ۳۱۳ تھے، اس فوج کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے، اور اونٹ ستر کی تعداد میں تھے، انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔

آخر کی آیت میں فرمایا گیا فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو **تاکہ تم شکر گذار رہو۔**

قرآن نے جگہ جگہ منافقین کے کید اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کے لئے تقویٰ اور صبر کو علاج بتلایا ہے، انہی دو چیزوں کے اندر ساری تنظیمی جدوجہد اور فتح مبین کا راز مضمر ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اور یہاں صبر و تقویٰ کے بجائے صرف تقویٰ پر اکتفار کیا گیا ہے، کیونکہ درحقیقت تقویٰ ایسی صفت جامع ہے کہ صبر بھی اس میں شامل ہے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ

جب تو کہنے لگا مسلمانوں کو کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہاری مدد کو بھیجے رب تمہارا تین

آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا

ہزار فرشتے آسمان سے اترنے والے البتہ اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو

وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ

اور وہ آئیں تم پر اسی دم تو مدد بھیجے تمہارا رب پانچ

آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا

ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر اور یہ تو اللہ نے تمہارے دل کی

بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا

خوشی کی اور تاکہ تسکین ہو تمہارے دلوں کو اس سے اور مدد ہے صرف

مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١٢٦﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ

اللہ ہی کی طرف سے جو کہ زبردست ہے حکمت والا تاکہ ہلاک کرے بعضے

كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ ﴿١٢٧﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ

کافروں کو یا ان کو ذلیل کرے تو پھر جاویں محروم ہو کر تیرا اختیار کچھ نہیں

الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ

یا ان کو توبہ دیوے خدائے تعالیٰ یا ان کو عذاب کرے کہ وہ

ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ

ناحق پر ہیں اور اللہ ہی کا مال ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے بخش دے

لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٩﴾

جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ع ۱۳ / ۴

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں بضمن قصۂ اُحد غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد غیبی ہونے کا ذکر تھا، آگے اس امداد کی کچھ تفصیل اور فرشتوں کے بھیجے کی حکمت کا بیان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ... فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ (غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی یہ امداد اس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں سے یوں فرمارہے تھے کہ کیا تم کو (تقویت قلب کیلئے) یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ (جو اسی کام کے لئے آسمان سے) اتارے جاویں گے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجے کے فرشتے ہوں گے، ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا (روح) پھر اوپر کے استفہام کا خود جواب اس طرح ارشاد فرمایا) ہاں! کیوں نہیں، (کافی ہوگا، اس کے بعد اس امداد میں مزید زیادتی کا وعدہ اس طرح فرمایا کہ مقابلہ کے وقت) اگر مستقل رہوگے اور تقوے پر قائم رہوگے (یعنی کوئی امر خلاف اطاعت نہ کروگے) اور وہ لوگ تم پر یکبارگی حملہ کردیں گے (جس میں عادۃً کسی مخلوق سے مدد پہنچنا مشکل ہوتا ہے) تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع کے بنائے ہوں گے (جیسے عام جنگوں میں اپنی اپنی فوج کی پہچان کے لئے کوئی خاص وردی ہوتی ہے، آگے اس امداد و نصرت کی حکمت کا بیان ہے کہ) اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد (مذکور جو فرشتوں سے ہوئی) محض اس لئے کی کہ تمہارے لئے (غلبہ اور فتح کی) بشارت ہو، اور تمہارے دلوں کو اس سے قرار آئے اور نصرت (و غلبہ) تو صرف اللہ کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں (کہ ویسے بھی غالب کرسکتے ہیں لیکن) حکیم (بھی) ہیں (تو جب مقتضیٰ حکمت یہ ہوتا ہے کہ اسباب کے ذریعہ غلبہ دیا جائے تو ویسے ہی اسباب پیدا فرما دیتے ہیں، یہ تو امداد بالملائکہ کی حکمت تھی آگے اس کی حکمت کا بیان ہے کہ یہ فتح و غلبہ تمہیں کیوں عطا کیا گیا، اس کے لئے ارشاد فرمایا گیا) تاکہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کردے (چنانچہ کافروں کے ستر سردار رئیس مارے گئے) یا ان (میں سے بعض) کو ذلیل و خوار کردے پھر وہ ناکام لوٹ جاویں (یعنی ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوجائے اور اگر دونوں ہوجاویں تو اور بھی بہتر ہے، چنانچہ دونوں باتیں ہوئیں کہ ستر سردار مارے گئے، ستر قید ہوکر ذلیل ہوئے، باقی ذلیل و خوار ہوکر بھاگ گئے)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (الیٰ قولہ) غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو (کسی کے مسلمان ہونے یا کافر رہنے کے متعلق خود) کوئی دخل نہیں (خواہ علم کا دخل ہو یا قدرت کا بلکہ یہ سب خدا تعالیٰ کے علم اور قبضہ میں ہے آپ کو صبر کرنا چاہئے)

یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو (رحمت سے) متوجہ ہو جاویں (یعنی ان کو اسلام کی توفیق دیدیں، تو اس وقت صبر فرح اور سرور سے بدل جائے گا) اور یا ان کو (دنیا ہی میں کوئی سزا دیں (تو اس وقت صبر تسکینِ قلبی میں بدل جائے گا، اور سزا دینا کچھ بیجا بھی نہیں) کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں (مراد اس سے کفر و شرک ہے، جیسا کہ فرمایا اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ آگے اس مضمون کی تاکید ہے) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے وہ جس کو چاہیں بخش دیں (یعنی اسلام نصیب کر دیں جس سے مغفرت ہوتی ہے، اور جس کو چاہیں عذاب دیں (یعنی اسلام نصیب نہ ہو اور اس وجہ سے عذاب دائمی ہو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے (اور) بڑے رحمت کرنے والے ہیں (تو بخشنے کا تو ذرا بھی تعجب نہیں، کیونکہ رحمت تو ان کی سابق ہی ہے، اس لئے عذاب دینے کی وجہ اوپر بیان فرمائی، فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ)۔

معارف و مسائل

فرشتوں کی امداد بھیجنے کی حکمت اور اصل مقصد اور تعداد ملائکہ میں مختلف عدد بیان کرنے کی حکمت

یہاں طبعی طور پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو وہ طاقت بخشی ہے کہ ایک ہی فرشتہ پوری بستی کا تختہ الٹ سکتا ہے، جیسے کہ قومِ لوط کی زمین تنہا جبرئیل امین نے الٹ دی تھی، تو پھر فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

نیز یہ کہ جب فرشتے میدان میں آئے ہی تھے تو ایک کافر بھی بچنا نہیں چاہئے تھا اس کا جواب خود قرآن کریم نے آیت وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی میں دیدیا ہے، کہ فرشتوں کے بھیجنے میں درحقیقت ان سے کوئی میدانِ جنگ فتح کرانا مقصود نہ تھا، بلکہ مجاہدین مسلمین کی تسلی اور تقویت قلب اور بشارت فتح دینا مقصود تھا، جیسا کہ اس آیت کے الفاظ اِلَّا بُشْرٰی اور لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ سے واضح ہے، اور اس سے زیادہ صریح سورۂ انفال میں اسی واقعہ کے متعلق آئے ہوئے الفاظ میں فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۲ ۸ جس میں فرشتوں کو خطاب کرکے ان کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو جمائے رکھیں، پریشان نہ ہونے دیں، اس تثبیت قلوب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اپنے تصرف کے ذریعہ ان کے قلوب کو مضبوط کر دیں جیسے کہ مشائخ صوفیہ اہل تصرف کا معمول ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے یہ واضح کر دیں کہ اللہ کے

فرشتے ان کی مدد پر کھڑے ہیں، کبھی سامنے ظاہر ہو کر، کبھی آواز سے، کبھی کسی اور طریق سے، جیسا کہ میدانِ بدر میں یہ سب طریقے استعمال کئے گئے، آیت فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸ : ۱۲) کی ایک تفسیر میں یہ خطاب فرشتوں کو ہے، اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ مسلمان نے کسی مشرک پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کا سر خود ہی بدن سے جدا ہو گیا، (کما روی عن سہل بن حنیف بروایۃ الحاکم وتصحیح البیہقی) اور بعض صحابہ کرامؓ نے جبرئیل امین کی آواز بھی سنی کہ (اقدم حیزوم فرما رہے ہیں، اور بعض نے خود بھی بعض ملائکہ کو دیکھا بھی (رواہ مسلم) یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ ملائکۃ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دلانے کے لئے کچھ کچھ کام ایسے بھی کئے ہیں کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں اور در اصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویت قلب تھا، فرشتوں کے ذریعہ میدانِ جنگ فتح کرانا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں جنگ وجہاد کے فرائض انسانوں پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کرائے جائیں تو دنیا میں کفر و کافر کا نام ہی نہ رہتا، حکومت وسلطنت کی تو کیا گنجائش تھی،

مگر اس کارخانۂ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں، یہاں تو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت ملے جلے ہی چلتے رہیں گے، ان کے نکھارنے کے لئے حشر کا دن ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ غزوۂ بدر میں ملائکۃ اللہ کو مدد کے لئے بھیجنے میں جو وعدے آئے ہیں ان میں سورۂ انفال کی آیت میں تو ایک ہزار کا وعدہ ہے، اور آل عمران کی مذکورہ آیت میں پہلے تین ہزار کا پھر پانچ ہزار کا وعدہ ہے، اس میں کیا حکمت ہے، بات یہ ہے کہ سورۂ انفال میں مذکور یہ ہے کہ جب میدانِ بدر میں مسلمانوں نے مخالف کی تعداد ایک ہزار دیکھیں، اور ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی تو بارگاہِ رب العزت میں استغاثہ کیا، اس پر یہ وعدہ ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا کیا گیا، کہ جو عدد مقابلہ دشمن کا ہے اتنا ہی عدد فرشتوں کا بھیج دیا جائے گا آیت کے الفاظ یہ ہیں اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۸ : ۹) اور اس آیت کے بعد بھی فرشتوں کی مدد بھیجنے کا یہی مقصد ظاہر فرما دیا کہ مسلمانوں کے قلوب مطمئن رہیں اور ان کو فتح کی بشارت ملے، چنانچہ اس کے بعد کی آیت کے الفاظ یہ ہیں وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔

اور سورۂ آل عمران کی آیت زیرِ نظر میں تین ہزار فرشتوں کا وعدہ شاید اس بنا پر کیا گیا کہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر محاربی اپنے قبیلہ کا لشکر لے کر

مشرکین مکہ کی امداد کو آ رہا ہے (کذا فی الروح) یہاں دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ پہلے ہی سے تھی، مسلمان اس خبر سے کچھ پریشان ہوئے تو تین ہزار فرشتوں کا وعدہ کیا گیا تاکہ معاملہ برعکس ہو کر مسلمانوں کی تعداد دشمن سے تین گنی ہو جائے گی۔

پھر اسی آیت کے آخر میں اس تعداد کو چند شرطوں کے ساتھ بڑھا کر پانچ ہزار کر دیا وہ شرطیں دو تھیں، ایک یہ کہ مسلمان صبر و تقویٰ کے مقام اعلیٰ پر قائم رہیں، دوسرے یہ کہ دشمن ان پر یکبارگی حملہ کرے، مگران دو شرطوں میں سے دوسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی اس لئے پانچ ہزار کی تعداد کا وعدہ نہ رہا، پھر اس میں ائمہ تفسیر و تاریخ کے اقوال مختلف ہیں، کہ اگرچہ وعدہ کی یہ شرط متحقق نہیں ہوئی پھر بھی یہ وعدہ پانچ ہزار کی صورت میں پورا ہوا یا صرف تین ہزار کی صورت میں، یہ اقوال مختلفہ روح المعانی میں مذکور ہیں۔

آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ یہاں سے پھر اصل قصۂ اُحد کی طرف عود ہے درمیان میں مجملاً قصۂ بدر کا ذکر آ گیا تھا، اور سبب نزول اس آیت کا یہ ہے کہ اس غزوۂ اُحد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک جو کہ سامنے کے دو اوپر کے دو نیچے کے دانتوں کی کروٹوں میں چار دانت ہوتے ہیں دو اوپر داہنے بائیں، دو نیچے داہنے بائیں، ان چاروں میں نیچے داہنی طرف کا دانت شہید ہو گیا، اور چہرۂ مبارک مجروح ہو گیا تو آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات آ گئے، کہ ایسی قوم کو کیسے فلاح ہو گی جنھوں نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالانکہ وہ نبی اُن کو خدا کی طرف بلا رہا ہے، اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاری سے ایک قصہ اور بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے بعض کفار کے لئے بددعاء بھی فرمائی تھی، اس پر یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی تعلیم دی گئی ہے (از بیان القرآن ملخصاً)

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰٓا أَضْعَافًا مُّضَٰعَفَةً

اے ایمان والو مت کھاؤ سود دونے پر دونا

وَّاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيٓ

اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو　اور بچو اس آگ سے

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝١٣١

جو تیار ہوئی کافروں کے واسطے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو سود مت کھاؤ (یعنی مت لو اصل سے) کئی حصے زائد کر کے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو (یعنی جنت نصیب ہو اور دوزخ سے نجات ہو) اور اس آگ سے بچو جو (دراصل کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (اور آگ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ سود وغیرہ حرام کاموں سے بچو)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں سود کھانے کی حرمت و ممانعت کے ساتھ أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا ذکر حرمت کی قید نہیں بلکہ سود کی قباحت کو واضح کرنے کے لئے ہے، کیونکہ دوسری آیات میں مطلقاً ربوٰ کی حرمت کا بیان انتہائی شدید و تاکید کے ساتھ آیا ہے جس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آچکی ہے، اور أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کے ذکر میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس کو سود کھانے کی عادت ہو جائے تو خواہ وہ اصطلاحی سود مرکب یعنی سود در سود کے معاملے سے پرہیز بھی کرے تو سود سے حاصل شدہ کمائی کو جب دوبارہ سود پر چلائے گا تو وہ لامحالہ اضعاف مضاعفہ ہوتا چلا جائے گا، اگرچہ سود خوروں کی اصطلاح میں اس کو سود مرکب یعنی سود در سود نہ کہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر ایک سود انجام کار اضعاف مضاعفہ ہی ہوتا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝١٣٢ وَ

اور حکم مانو اللہ کا اور رسول کا تاکہ تم پر رحم ہو اور

سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

دوڑو بخشش کی طرف اپنے رب کی اور جنت کی طرف جس کا عرض ہے

السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝١٣٣

آسمان اور زمین تیار ہوئی واسطے پرہیزگاروں کے۔

خلاصۂ تفسیر

اور خوشی سے کہا مانو اللہ کا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے (یعنی قیامت میں) اور دوڑو طرف مغفرت کے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے (نصیب) ہو اور (دوڑو) طرف جنت کے (مطلب یہ ہے کہ ایسے نیک کام اختیار کرو جس سے پروردگار تمہاری مغفرت کردیں اور تم کو جنت عنایت ہو اور وہ جنت ایسی ہے) جس کی وسعت ایسی (تو) ہے (ہی) جیسے سب آسمان اور زمین (اور زیادہ کی نفی نہیں چنانچہ واقع میں زائد ہونا ثابت ہے اور) وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔

معارف ومسائل

آیت مذکورہ میں دو مسئلے زیادہ اہم ہیں، اوّل پہلی آیت کا مضمون جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر رسول کی اطاعت بعینہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب "قرآن" کی اطاعت کا نام ہے تو پھر اس کے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اور اگر ان دونوں میں کچھ فرق ہے تو کیا ہے؟

دوسری بات جو ہمیشہ یاد رکھنے اور اپنی عملی زندگی کا قبلہ بنانے کے قابل ہے وہ وہ صفات اور علامات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول اور پرہیزگار بندوں کے لئے ان آیات میں بتلا کر یہ واضح فرما دیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتی بلکہ اطاعت گزاروں کے کچھ صفات اور حالات ہوتے ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔

رسولؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ سے الگ کرکے بیان کرنے کی حکمت

پہلا مسئلہ: پہلی مختصر آیت میں اس طرح بیان فرمایا: وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ یعنی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اس میں رحمتِ خداوندی کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بھی اسی طرح لازم اور ضروری قرار دیا ہے، اور یہ پھر صرف اسی آیت میں نہیں پورے قرآن میں بار بار اس کا تکرار اسی طرح ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہوتا ہے وہیں اطاعتِ رسولؐ کا بھی ذکر مستقلاً ہے۔ قرآن حکیم کے یہ متواتر اور مسلسل ارشادات ایک

انسان کو اسلام اور ایمان کے بنیادی اصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ ایمان کا پہلا جزء خدائے تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے، تو دوسرا جزء "رسول" کی تصدیق اور اس کی اطاعت ہے۔

اب یہاں غور طلب یہ ہے کہ قرآن کریم ہی کے ارشادات سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب باذن خداوندی ہوتا ہے، اپنی طرف سے کچھ نہیں ہوتا، قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (۵۳: ۳، ۴) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بولتے ہیں وہ کسی اپنی خواہش سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے "وحی" ہوتی ہے، اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ "رسول" کی اطاعت بعینہٖ خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے، اس سے الگ کوئی چیز نہیں، سورۂ نسآء آیت ۸۰ میں خود قرآن نے بھی ان الفاظ میں اس کو واضح فرما دیا:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ	"یعنی جس نے اطاعت کی رسول کی، اس نے اطاعت کی اللہ کی"

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان دونوں اطاعتوں کو الگ الگ بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ خصوصاً اس التزام اور اہتمام کے ساتھ کہ پورے قرآن کریم میں یہی عادت مستمرہ ہے کہ دونوں اطاعتوں کا ساتھ ساتھ حکم دیا جاتا ہے۔

راز اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے ایک کتاب بھیجی، اور ایک رسول، رسول کے ذمہ یہ کام لگائے گئے، اوّل یہ کہ وہ قرآن کریم کی آیات ٹھیک اسی صورت اور لب ولہجہ کے ساتھ لوگوں کو پہنچا دیں جس صورت سے وہ نازل ہوئیں۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو ظاہری، و باطنی گندگیوں سے پاک کریں۔

تیسرے یہ کہ وہ اس کتاب کے مضامین کی امت کو تعلیم دیں، اور اس کے مقاصد کو بیان فرمائیں، نیز یہ کہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیں، یہ مضمون قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں تقریباً ایک ہی عنوان سے آیا ہے، يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۝ (۶۲: ۲)

معلوم ہوا کہ رسول کے فرائض منصبی میں صرف اتنا ہی داخل نہیں کہ وہ قرآن لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اس کی تعلیم اور تبیین بھی رسول کے ذمہ ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عرب کے فصحاء و بلغاء تھے، ان کے لئے قرآن کریم کی تعلیم کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ محض الفاظ قرآنی کے لغوی معنی اُن کو سمجھائے جائیں، کیونکہ وہ سب

خود بخود ان کو بخوبی سمجھتے تھے، بلکہ اس تعلیم و تبیین کا مقصد صرف یہی تھا اور یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ایک حکم مجمل یا مبہم الفاظ میں بیان فرمایا، اس کی تشریح اور تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وحی کے ذریعہ سے لوگوں تک پہونچائی جو قرآن کے الفاظ میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک میں ڈالی جس کی طرف آیتِ قرآن اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً قرآن نے بے شمار مواقع میں صرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمانے پر اکتفار کیا ہے، کہیں نماز کے معاملہ میں قیام، رکوع اور سجدہ کا ذکر بھی آیا تو وہ بھی بالکل مبہم ہے ان کی کیفیات کا ذکر نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرئیل امینؑ نے خود آکر اللہ کے حکم سے ان تمام اعمال اور ارکان کی تفصیل صورت عمل کر کے بتلائی، اور آپ نے اسی طرح قول و عمل کے ذریعہ اُمت کو پہنچادیا۔

زکوٰۃ کے مختلف نصاب اور ہر نصاب پر زکوٰۃ کی مقدار کا تعین، پھر یہ بات کہ کس مال پر زکوٰۃ ہے اور کس مال پر نہیں، اور مقدارِ نصاب میں کتنا حصہ معاف ہے، یہ سب تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں، اور ان کے فرامین لکھوا کر متعدد صحابہ کرامؓ کے سپرد فرمائے۔

یا مثلاً قرآن حکیم نے حکم دیا کہ:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲: ۱۸۸)	"یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ پر ناحق نہ کھاؤ"۔

اب اس کی یہ تفصیل کہ رائج الوقت معاملات، بیع و شرار اور اجارہ میں کیا کیا صورتیں ناحق اور بے انصافی یا ضرر عوام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے باطل ہیں، یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باذنِ خداوندی امت کو تبلائی، اسی طرح تمام شرعی احکام کا بھی یہی حال ہے۔

تو یہ تمام تفصیلات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے بہ وحیِ الٰہی اُمت کو پہنچائیں، چونکہ یہ تفصیلات قرآن کریم میں مذکور نہیں، اس لئے یہ احتمال تھا کہ کسی وقت کبھی ناواقف کو یہ دھوکا ہو کہ یہ تفصیلی احکام خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام نہیں اس لئے خدا تعالیٰ کی اطاعت میں اُن کی تعمیل ضروری نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے سارے قرآن میں بار بار اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے، جو حقیقت میں تو خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، مگر ظاہری صورت اور تفصیل بیان کے اعتبار سے اس سے کچھ مختلف بھی ہے، اس لئے بار بار تاکیدات کے ساتھ بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں جو کچھ حکم دیں اس کو بھی خدا تعالیٰ ہی کی طاعت سمجھ کر مانو، خواہ وہ قرآن

میں صراحۃً موجود ہو یا نہ ہو، یہ مسئلہ چونکہ اہم تھا اور کسی ناواقف کو دھوکہ لگ جانے کے علاوہ دشمنانِ اسلام کے لئے اسلامی اصول میں گڑبڑ پھیلانے اور مسلمانوں کو اسلام کے صحیح راستہ سے بہکانے کا بھی ایک موقع تھا، اس لئے قرآن کریم نے اس مضمون کو صرف لفظ اطاعتِ رسول کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ مختلف عنوانات سے امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بتلایا ہے، مثلاً آپ کے فرائض میں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کا اضافہ کرکے اس طرف اشارہ کر دیا، کہ علاوہ کتاب کے کچھ اور بھی آپ کی تعلیمات میں داخل ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے جس کو لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کہیں ارشاد فرمایا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶: ۴۴) "یعنی رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے آپ پر نازل شدہ آیات کے مطالب و مقاصد اور تشریحات کو بیان فرمائیں"۔

اور کہیں یہ ارشاد ہے کہ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹: ۷) یعنی رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لو، اور جس سے روکیں اس سے باز آجاؤ، یہ سب انتظام اس کا کیا گیا کہ کل کو کوئی شخص یہ نہ کہنے لگے کہ ہم تو صرف ان احکام کے مکلف ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، جو احکام ہمیں قرآن میں نہ ملیں اُن کے ہم مکلف نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو رسول ص کی تعلیمات اور تشریحات سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے یہی دعویٰ کریں گے کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے اس لئے ایک حدیث میں صراحۃً بھی اس کا ذکر فرمایا جس کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی اپنی کتابوں میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاْتِيْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِيْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِيْ مَا وَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ

"یعنی ایسا نہ ہو کہ میں تم سے کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے ہوئے بے فکری سے بیٹھے ہوئے میرے امر و نہی کے متعلق یہ کہہ دے کہ ہم اس کو نہیں جانتے ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے، جو کچھ اس میں ملتے ہیں اس کا اتباع کر لیتے ہیں"۔

خُلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ جگہ جگہ رسول کی اطاعت کا بار بار ارشاد اور پھر مختلف عنوانات سے رسول کے دیئے ہوئے احکام کو ماننے کی ہدایات یہ سب اسی خطرہ کے پیشِ نظر ہیں کہ کوئی شخص ذخیرۂ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفصیلاتِ احکام کو قرآن سے الگ اور اطاعتِ خدا تعالیٰ سے جدا سمجھ کر انکار نہ کر بیٹھے۔

کہ وہ درحقیقت الگ نہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

دوسری آیت میں مغفرت اور جنّت کی طرف مسابقت اور مسارعت کا حکم دیا گیا ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے بعد یہ دوسرا حکم دیا گیا، یہاں مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں، یعنی وہ اعمال صالحہ جو باعث مغفرت الٰہی ہیں، صحابہؓ و تابعین سے اس کی تفسیر میں مختلف عنوانات سے منقول ہیں، مگر مضمون اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تفسیر "ادائے فرض" سے فرمائی، حضرت ابن عباسؓ نے "اسلام" سے، ابو العالیہؒ نے "ہجرت" سے، انس بن مالکؓ نے "تکبیر اولیٰ" سے، سعید بن جبیرؒ نے "ادائے طاعت" سے، ضحاکؒ نے "جہاد" سے، عکرمہؒ نے "توبہ" سے کی ہے، ان تمام اقوال کا حاصل یہی ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمال صالحہ ہیں جو مغفرت الٰہی کا باعث اور سبب ہوتے ہیں۔

اس مقام پر دو باتیں قابل غور ہیں، پہلی بات تو یہ ہے اس آیت میں مغفرت اور جنّت کی طرف مسابقت اور مسارعت کا حکم دیا جا رہا ہے، حالانکہ دوسری آیت میں لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴ : ۳۲) فرما کر دوسرے کی فضیلت حاصل کرنے کی تمنا کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں، ایک فضائل تو وہ ہیں جن کا حاصل کرنا انسان کے اختیار اور بس سے باہر ہو جن کو فضائل غیر اختیاریہ کہتے ہیں، جیسے کسی کا سفید رنگ یا حسین ہونا یا کسی بزرگ خاندان سے ہونا وغیرہ، دوسرے وہ فضائل جن کو انسان اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کر سکتا ہے، ان کو فضائل اختیاریہ کہتے ہیں، فضائل غیر اختیاریہ میں دوسرے کی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش بلکہ اس کی تمنا کرنے سے بھی اس لئے روکا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق مخلوق میں تقسیم کئے ہیں، کسی کی کوشش کا اس میں دخل نہیں، اس لئے وہ فضائل جو کوشش اور تمنا سے حاصل تو ہونگے نہیں، اب سوائے اس کے کہ اس کے دل میں حسد اور بغض کی آگ بھڑکتی رہے اور کوئی فائدہ نہیں، مثلاً ایک شخص کالا ہے وہ گورا ہونے کی تمنا کرتا رہے تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا، البتہ جو فضائل اختیاریہ ہیں ان میں مسابقت اور مقابلہ کا حکم دیا گیا، صرف ایک آیت میں نہیں، بلکہ متعدد آیتوں میں آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۲ : ۱۴۸) دوسری جگہ ارشاد ہے: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳ : ۲۶)

ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر کسی انسان میں کوئی فطری اور طبعی کوتاہی ہو جس کا دور کرنا اس کے بس سے باہر ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنی اس کوتاہی پر قانع رہ کر دوسروں کے کمال کو دیکھے بغیر اپنا کام کرتا رہے، کیونکہ اگر وہ اپنی کوتاہی پر تاسف اور دوسروں کے کمال پر حسد کرتا رہا تو جتنا کام کر سکتا ہے اس قدر بھی نہیں کر سکے گا، اور بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری چیز جو اس جگہ قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مغفرت کو جنت سے مقدم کیا، اس میں ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جنت حاصل کر لینا مغفرتِ الٰہی کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ انسان اگر تمام عمر بھی نیکیاں کرتا رہے، اور معصیت سے کنارہ کش رہے تب بھی اس کے تمام اعمال جنت کی قیمت نہیں ہو سکتے، جنت میں لے جانے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ مغفرت باری تعالیٰ ہے اور اس کا فضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا فَاِنَّهٗ لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا الْجَنَّةَ عَمَلُهٗ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ
(ترغیب ترہیب بحوالہ بخاری ومسلم)

"راستی اور حق کو اختیار کرو، درمیانی راہ اختیار کرو اور (اللہ کے فضل) کی بشارت حاصل کرو، کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچائے گا لوگوں نے کہا، نہ آپ کا یارسول اللہ، آپ نے فرمایا، نہ میرا عمل جنت میں پہنچائے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔"

حاصل یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں، لیکن عادت اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو عملِ صالحہ کرتا ہے، بلکہ جس کو اعمالِ صالحہ کی توفیق ہوگی، وہی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہیں، لہٰذا اعمال کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرنا چاہئے، معلوم ہوا کہ دخولِ جنت کا اصلی باعث اور سبب مغفرتِ الٰہی ہے، اسی لئے مغفرت کی اہمیت کے پیشِ نظر مطلق مغفرت نہیں فرمایا گیا، بلکہ مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فرمایا گیا صفتِ ربوبیت کے بیان کرنے میں مزید لطف اور امتنان کا اظہار مقصود ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف دوڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ جنت ہے، اور جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی وسعت اس قدر ہے جتنا سارا آسمان و زمین ہے، انسان کے دماغ میں آسمان و زمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت آہی نہیں سکتی، اس لئے سمجھانے کے لئے جنت کے عرض کو اس سے تشبیہ دی، گویا بتلا دیا کہ جنت بہت وسیع ہے

اس کے عرض میں سارے زمین و آسمان سما سکتے ہیں، پھر جب اس کے عرض کا یہ حال ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا ہوگا، یہ معنی تو اس وقت ہیں جب عرض کو طول کے مقابل لیا جائے، لیکن اگر عرض کو ثمن یعنی قیمت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنت کوئی معمولی شے نہیں ہے، اس کی قیمت سارا آسمان و زمین ہیں، لہٰذا ایسی قیمتی اور عظیم الشان چیز کے لئے مسابقت اور مسارعت کرو۔

تفسیر کبیر میں ہے:

قَالَ اَبُوْمُسْلِم اِنَّ الْعَرْضَ ھٰھُنَا مَا یُعْرَضُ مِنَ الثَّمَنِ فِیْ مُقَابَلَۃِ الْمَبِیْعِ ای ثمنھا لو بیعت کَثَمَنِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الْمُرَادُ بِذٰلِکَ عَظْمَ مِقْدَارِھَا وجلالۃ خطرھا وانہ لایساویھا شیٔ وان عظم

"ابو مسلم کہتے ہیں کہ عرض سے مراد آیت میں وہ چیز ہے جو مبیع کے مقابلہ میں بطور قیمت پیش کی جائے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض جنت کی قیمت لگائی جائے تو سارا آسمان و زمین اور ان کی کائنات اس کی قیمت ہوگی، مقصود اس سے جنت کی عظمت اور جلالتِ قدر کا بیان کرنا ہے۔"

جنت کا دوسرا وصف بتلایا، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ، یعنی جنت پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت پیدا کی جاچکی ہے، قرآن و حدیث کے واضح اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے، اس طرح کہ ساتواں آسمان اس کی زمین ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ
جو خرچ کئے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں اور دبا لیتے ہیں

الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾
غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا
اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا برا کام کریں اپنے حق میں تو یاد کریں

اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ص وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ
اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے گناہ بخشنے والا

اِلَّا اللّٰهُ ۟ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ

سوا اللہ کے اور اڑتے نہیں اپنے کیے پر اور وہ جانتے ہیں انہی کی

جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

جزا ہے بخشش اُن کے رب کی اور باغ جن کے نیچے نہریں بہتی

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ

ہیں ہمیشہ رہیں گے وہ لوگ ان باغوں میں اور کیا خوب مزدوری ہے کام کرنے والوں کی ہو چکے ہیں تم

مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ

سے پہلے واقعات سو پھرو زمین میں اور دیکھو کہ کیا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ

انجام جھٹلانے والوں کا یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور

مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

نصیحت ہے ڈرنے والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

ایسے لوگ ہیں) جو کہ (نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں (ہر حال میں) فراغت میں (بھی) اور تنگی میں (بھی) اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگذر کرنیوالے اور اللہ تعالیٰ ایسے نکوکاروں کو (جن میں یہ خصال ہوں بوجہ اکمل) محبوب رکھتا ہے اور (ایک ان مذکورین کے اعتبار سے دوسرے درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں (دوسروں پر) زیادتی ہو یا (کوئی گناہ کر کے خاص) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ (کی عظمت اور عذاب) کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں (یعنی اس طریقہ سے جو معافی کے لئے مقرر ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے میں ان اہلِ حقوق سے بھی معاف کرائے اور خاص اپنی ذات کے متعلق گناہ میں اس کی حاجت نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرانا دونوں میں مشترک ہے) اور (واقعی) اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو (رہا اہلِ حقوق کا معاف کرنا سو وہ لوگ اس کا اختیار تو نہیں رکھتے کہ عذاب سے بھی بچا لیں اور حقیقی بخشش اسی کا نام ہے) اور وہ لوگ اپنے فعل (بد) پر اصرار

اصرار نہیں کرتے اور وہ اس بات کو جانتے بھی ہیں (کہ فلاں کام ہم نے گناہ کا کیا اور یہ کہ توبہ ضروری ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ غفار ہے، مطلب یہ کہ اعمال کی بھی درستی کر لیتے ہیں، اور عقائد بھی درست رکھتے ہیں) ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور (بہشت کے) ایسے باغ ہیں کہ ان کے (درختوں اور مکانوں کے) نیچے سے نہریں چلتی ہونگی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (اور اسی مغفرت و جنت کی تحصیل کا شروع آیتوں میں حکم تھا، بیچ میں اس کا طریقہ بتلایا، ختم پر اس کا وعدہ فرمایا) اور (یہ) اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا (وہ کام مستغفر اور حسن اعتقاد ہے، اور استغفار کا نتیجہ آئندہ اطاعت کی پابندی ہے، جس پر عدم اصرار دلالت کرتا ہے) بالتحقیق تم سے قبل (زمانوں میں) مختلف طریق (کے لوگ) گذر چکے ہیں (انہیں مسلمان بھی تھے اور کفار بھی، اور ان میں اختلاف و مقابلہ و مقاتلہ بھی ہوا، لیکن انجام کار کفار ہی ہلاک ہوئے، چنانچہ اگر تم آثار کا مشاہدہ کرنا چاہو) تو تم روئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھ لو کہ اخیر انجام تکذیب کرنے والوں کا (یعنی کفار کا) کیسا ہوا، (یعنی ہلاک و برباد ہوئے چنانچہ ان کی ہلاکت کے آثار اس وقت تک بھی باقی تھے جس کو دوسری آیت میں فرمایا ہے فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً (۲۷: ۵۲)، فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ (۲۸: ۵۸) وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵: ۷۹)) یہ (مضمون مذکور) بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے (کہ اگر اس میں غور کریں تو عبرت حاصل کر سکتے ہیں) اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لئے (یعنی ہدایت اور نصیحت بھی یہی لوگ حاصل کرتے ہیں، ہدایت یہ کہ اس کے موافق عمل کریں)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حق تعالیٰ نے مؤمنین متقین کی خاص صفات اور علامات بتلائی ہیں، جن سے بہت سے فوائد متعلق ہیں، مثلاً یہ کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ نیک بندوں کی صحبت اور ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی تاکید فرمائی ہے، کہیں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فرما کر دین کی سیدھی اور صحیح راہ انہی مقبول بندوں سے سیکھنے کی طرف اشارہ فرمایا کہیں كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ فرما کر ان کی صحبت اور معیت کی خاص افادیت کی تلقین فرمائی، اور دنیا میں ہر گروہ کے اندر اچھے برے لوگ ہوا کرتے ہیں، اچھوں کے لباس میں برے بھی ان کی جگہ لے لیتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ مقبول بندوں کی خاص علامات و صفات بتلا کر یہ سمجھا دیا جائے کہ لوگ غلط رہنماؤں اور مقتداؤں سے پرہیز کریں، اور

صادقین کی علامتیں پہچان کران کا اتباع کریں، مومنین متقین کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد اُنکی دائمی کامیابی و جنّت کے اعلیٰ مقامات بتلاکر نیک بندوں کو خوشخبری اور بُری راہوں پر چلنے والوں کے لئے نصیحت و ترغیب کا راستہ کھولا گیا ہے ان آیات کے اخیر میں هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ، میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مقبولین کی جو صفات وعلامات یہاں ذکر کی گئی ہیں، اس میں ابتدائی آیات میں ان صفات کا بیان ہے جن کا تعلق انسانی حقوق اور باہمی معاشرت سے ہے، اور بعد کی آیات میں وہ صفات ہیں جن کا تعلق حق تعالیٰ کی عبادت وطاعت سے ہے، جن کو دوسرے لفظوں میں حقوق العباد اور حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا آیات میں حقوقِ انسانی سے متعلقہ صفات کو پہلے اور حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کو بعد میں بیان فرماکر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حقوق اللہ سارے حقوق پر مقدم ہیں، لیکن دونوں میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے حقوق بندوں پر لازم کئے ہیں اُن سے نہ خدا تعالیٰ کا اپنا کوئی فائدہ متعلق ہے، نہ خدا تعالیٰ کو ان کی حاجت ہے، ورنہ اُن کے ادا نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہے، اُس کی ذات سب سے بے نیاز ہے، اس کی عبادت سے فائدہ خود عبادت کرنیوالے کا ہے، پھر وہ ارحم الراحمین اور کریم بخشنے والا ہے، اس کے حقوق میں بڑی سے بڑی کوتاہی اور غلطی کرنیوالا انسان جس وقت بھی اپنے کئے ہوئے پر نادم ہوکر اس کی طرف متوجہ ہوجائے اور توبہ کرلے تو بارگاہ رحم وکرم سے اس کے سارے گناہ ایک دم میں معاف ہوسکتے ہیں، بخلاف حقوق العباد کے کہ انسان ان کا محتاج ہے، اور جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ لازم ہیں اگر وہ ادا نہ کرے تو اس کا نقصان بھی ہے، اور اپنے نقصان کو معاف کرنا بھی انسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے حقوق العباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ نظم عالم کی درستی اور انسانی معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا دار ومدار باہمی حقوق کی ادائیگی پر ہے، اس میں ذرا سی کوتاہی جنگ وجدال اور فساد کی راہیں کھول دیتی ہے، اور اخلاقی فضائل اگر پیدا کرلئے جائیں تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں، صدیوں کی لڑائیاں صلح وآشتی میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اس لئے بھی ان صفات وعلامات کو مقدم کیا گیا جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے، ان صفات میں سب سے پہلی صفت یہ بتلائی گئی ہے:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ، یعنی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنا

مال خرچ کرنے کے ایسے عادی اور خوگر ہیں کہ ان پر فراخی ہو یا تنگی ہر حال میں مقدور بھر خرچ کرتے رہتے ہیں، زیادہ میں سے زیادہ اور کم میں سے کم، اس میں ایک طرف تو یہ ہدایت ہے کہ غریب فقیر آدمی بھی اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بالکل فارغ نہ سمجھیں اور اس کی راہ میں خرچ کرنے کی سعادت سے محروم نہ ہوں، کیونکہ ہزار روپے میں سے ایک روپیہ خرچ کرنے کا جو درجہ ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہزار پیسے میں سے ایک پیسہ خرچ کرنے کا بھی ہے، اور عملی طور پر جس طرح ہزار روپے کے مالک کو ایک روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا کچھ مشکل نہیں اسی طرح ہزار پیسوں کے مالک کو ایک پیسہ خرچ کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔

دوسری طرف یہ ہدایت بھی ہے کہ تنگی کی حالت میں بھی بقدر حیثیت خرچ کرتے رہنے سے خرچ کرنے کی مبارک خصلت و عادت فنا نہیں ہوگی، اور شاید اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے فراغت اور فراخی بھی عطا فرما دیں۔

تیسری اہم چیز اس میں یہ ہے، کہ جو شخص اس کا خوگر ہو کہ دوسرے انسانوں پر اپنا مال خرچ کر کے ان کو فائدہ پہنچائے، غریبوں فقیروں کی امداد کرے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی دوسروں کے حقوق غصب کرنے اور ان کی مرضی کے خلاف ہضم کرنے کے پاس بھی نہ جائے گا، اس لئے اس پہلی صفت کا حاصل یہ ہوا کہ مؤمنین متقین اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں، خواہ ان پر فراخی ہو یا تنگی، حضرت عائشہؓ نے ایک وقت صرف ایک انگور کا دانہ خیرات میں دیا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا، بعض سلف سے منقول ہے کہ کسی وقت انھوں نے صرف ایک پیاز کا صدقہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَرُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفِ شَاةٍ	"یعنی تم جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا صدقہ میں دے کر ہی ہو، اور سائل کو خالی واپس نہ کرو اور کچھ نہ ہو تو بکری کے پاؤں کی کھری ہی دیدو"

تفسیر کبیر میں امام رازی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی، تو جن کے پاس سونا چاندی تھا انھوں نے وہ صدقہ میں دیدیا، ایک شخص کھجور کے چھلکے لایا، کہ میرے پاس اور کچھ نہیں، وہ بھی صدقہ کر دیئے گئے، ایک اور شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس کوئی چیز صدقہ

کرنے کے لئے نہیں ہے، البتہ میں اپنی قوم میں عزت دار سمجھا جاتا ہوں میں اپنی عزت کی خیرات کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی آدمی مجھے کتنا ہی بُرا بھلا کہے میں اس سے ناراض نہیں ہونگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انفاق فی سبیل اللہ صرف مالداروں اور اغنیاء ہی کا حصہ نہیں ہے، غریب، فقیر بھی اس صفت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ اپنی اپنی مقدرت کے موافق اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے اس عظیم صفت کو حاصل کرلیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ضروری نہیں کہ مال ہی خرچ کیا جائے

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ يُنفِقُونَ کا تو ذکر فرمایا کہ وہ لوگ تنگی اور فراخی ہر حال میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں، یہ متعین نہیں فرمایا کہ کیا خرچ کرتے ہیں، اس کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف مال و دولت ہی نہیں بلکہ ہر خرچ کرنے کی چیز داخل ہے، مثلاً جو شخص اپنا وقت، اپنی محنت اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ بھی اس انفاق کی صفت سے موصوف کیا جائے گا، جو حدیث بحوالہ تفسیر کبیر اوپر گزری ہے وہ اس پر شاہد ہے

تنگی اور فراخی کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ یہی وہ حالتیں ہیں جن میں عادۃً انسان خدا کو بھولتا ہے، یعنی تنگ اور زحمت۔ جب مال و دولت کی فراوانی ہو تو عیش میں خدا کو بھول جاتا ہے، اور جب تنگی اور مصیبت ہو تو بسا اوقات اسی کی فکر میں رہ کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے، اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو نہ عیش میں خدا کو بھولتے ہیں نہ مصیبت و تکلیف میں، ظفر شاہ دہلوی کا کلام اس معنی میں خوب ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا خواہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اس کے بعد ان کی ایک خاص صفت اور علامت یہ بتلائی گئی کہ اگر ان کو کسی ایسے شخص سے سابقہ پڑے جو ان کو اذیت اور تکلیف پہونچائے، تو وہ غصہ میں مشتعل اور مغلوب نہیں ہو جاتے، اور غصہ کے مقتضیٰ پر عمل کر کے انتقام نہیں لیتے، پھر صرف یہی نہیں کہ انتقام نہ لیں بلکہ دل سے بھی معاف کر دیتے ہیں، اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ تکلیف دینے والے کے ساتھ احسان کا معاملہ فرماتے ہیں، اس ایک صفت میں گویا تین صفتیں شامل ہیں، اپنے غصہ پر قابو پانا، تکلیف دینے والے کو معاف کرنا، پھر اس کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا، ان تینوں چیزوں کو اس آیت میں بیان فرمایا:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ

یعنی وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں اور لوگوں کا قصور معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

امام بیہقی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت سیدنا علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کا ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ آپ کی ایک کنیز آپ کو وضو کرا رہی تھی کہ اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کے اوپر گرا، تمام کپڑے بھیگ گئے، غصہ آنا طبعی امر تھا، کنیز کو خطرہ ہوا، تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی، وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ۔ یہ سنتے ہی خاندان نبوت کے اس بزرگ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، بالکل خاموش ہو گئے، اس کے بعد کنیز نے آیت کا دوسرا جملہ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ پڑھ دیا، تو فرمایا کہ میں نے تجھے دل سے بھی معاف کر دیا، کنیز بھی ہوشیار تھی اس کے بعد اس نے تیسرا جملہ بھی سنا دیا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، جس میں احسان اور حسن سلوک کی ہدایت ہے، حضرت علی بن حسینؓ نے یہ سنکر فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کر دیا (روح المعانی بحوالہ بیہقی)

لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کر دینا انسانی اخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے، اور اس کا ثواب آخرت نہایت اعلیٰ ہے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے روز حق تعالیٰ کی طرف سے منادی ہوگی کہ جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق ہے وہ کھڑا ہو جائے، تو اس وقت وہ لوگ کھڑے ہوں گے، جنھوں نے لوگوں کے ظلم و جور کو دنیا میں معاف کیا ہوگا"

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّشْرَفَ لَهُ الْبُنْيَانُ وَتُرْفَعَ لَهُ الدَّرَجٰتُ فَلْيَعْفُ عَنْ مَّنْ ظَلَمَهٗ وَيُعْطِ مَنْ حَرَمَهٗ وَيَصِلْ مَنْ قَطَعَهٗ

"جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اونچے ہوں اور اس کے درجات بلند ہوں اس کو چاہئے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس کو معاف کر دے اور جس نے اس کو کبھی کچھ نہ دیا ہو اس کو بخشش و ہدیہ دیا کرے، اور جس نے اس سے ترک تعلقات کیا ہو یہ اس سے ملنے میں پرہیز نہ کرے"

قرآن کریم نے دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت سے برائی کرنے والوں کے ساتھ احسان کرنے کا خلق عظیم سکھلایا، اور یہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں ارشاد فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (۴۱: ۳۴)

"یعنی بدی کی مدافعت بھلائی اور احسان کے ساتھ کرو، تو جس کے ساتھ دشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن جائے گا"۔

حق تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تربیت بھی اسی اعلیٰ پیمانہ پر فرمائی ہے کہ آپ نے اپنی امت کو بھی یہ ہدایت دی کہ:

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ اِلَیْكَ

"یعنی جو شخص آپ سے قطع تعلق کرے آپ اُن سے ملیں اور جو آپ پر ظلم کرے آپ اُس کو معاف کریں، اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے آپ اُس پر احسان کریں"۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے، آپ کی تعلیمات کی برکت سے یہی اخلاق و اوصاف آپ کے خدام میں بھی حق تعالیٰ نے پیدا فرما دیئے تھے، جو اسلامی معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اور اسلافِ امت کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھرے بازار میں امام اعظمؒ کی شان میں گستاخی کی اور گالیاں دیں، حضرت امام اعظمؒ نے غصہ کو ضبط فرمایا، اور اس کو کچھ نہیں کہا، اور گھر پر واپس آنے کے بعد ایک خوان میں کافی درہم و دینار رکھ کر اس شخص کے گھر تشریف لے گئے، دروازے پر دستک دی، یہ شخص باہر آیا تو اشرفیوں کا یہ خوان اس کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش فرمایا کہ آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا، اپنی نیکیاں مجھے دیدیں، میں اس احسان کا بدلہ کرنے کے لئے یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں، امامؒ کے اس معاملہ کا اس کے قلب پر اثر ہونا ہی تھا، آئندہ کو اس بُری خصلت سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوگیا، حضرت امامؒ سے معافی مانگی، اور آپ کی خدمت اور صحبت میں علم حاصل کرنے لگا یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں میں ایک بڑے عالم کی حیثیت اختیار کرلی۔

یہاں تک ان اوصاف کا بیان تھا جو انسانی حقوق سے متعلق ہیں، اس کے بعد حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کا بیان اس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور کبھی بمقتضائے بشریت ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر استغفار کرتے ہیں اور آئندہ اس گناہ سے باز آنے کا ارادہ پختہ کرلیتے ہیں، ارشاد ہے:

رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

دیکھ لیا تم نے اس کو آنکھوں کے سامنے۔

ربطِ آیات

ان آیات میں پھر قصۂ اُحد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دینے کا مضمون ہے، کہ ہمیشہ سے یہی طریق اللہ جل شانہ کا رہا ہے کہ انجام کار کفار ہی خائب و خاسر ہوتے ہیں اگرچہ تم اس وقت اپنی بے عنوانی سے مغلوب ہوگئے، لیکن اگر اپنے مقتضیات ایمان یعنی ثبات و تقویٰ پر قائم رہے تو اخیر میں کفار ہی مغلوب ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم (اگر اس وقت مغلوب ہوگئے تو کیا ہوا) ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور آخر تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے مومن رہے (یعنی اس کے مقتضیات پر ثابت رہے) اگر تم کو زخم (صدمہ) پہنچ جاوے، (جیسے اُحد میں ہوا) تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ اس میں چند حکمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس قوم کو بھی (جو کہ تمہارے مقابل تھی یعنی کفار) ایسے ہی زخم (صدمہ) پہنچ چکا ہے، (چنانچہ گذشتہ بدر میں وہ صدمہ اٹھا چکے ہیں) اور (ہمارا معمول ہے کہ) ان ایام کو (یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانہ کو) لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں، (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب اور دوسری کو مغلوب کر دیا کبھی اس کا عکس کر دیا، سو اسی معمول کے مطابق پارسال وہ مغلوب ہوئے تھے، اب کے تم ہوگئے، ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (دوسری حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر) جان لیویں (کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور نیک کا امتحان ہو جاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ ہے کہ) کہ تم میں سے بعضوں کو شہید بنانا تھا، (بقیہ حکمتیں آگے آتی ہیں درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ظلم (کفر و شرک) کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (پس اس کا احتمال نہ کیا جاوے کہ شاید ان کو محبوب ہونے کی وجہ سے غالب فرما دیا ہو ہرگز نہیں) اور (چوتھی حکمت یہ ہے) تاکہ (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو (کیونکہ مصیبت سے اخلاق و اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (پانچویں حکمت یہ ہے کہ) مٹا دیوے کافروں کو (یہ اس لئے کہ غالب آجانے سے ان کی ہمت بڑھے گی، پھر مقابلہ میں آئیں گے اور ہلاک ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے قہرِ خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے) ہاں اور سنو! کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں (خصوصیت کے ساتھ) جا داخل ہو گے حالانکہ ہنوز

۱۴

اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے (خوب) جہاد کیا ہو اور جو جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہوں، اور تم تو (شہید ہو کر) مرنے کی (بڑی) تمنا کیا کرتے تھے، موت کے سامنے آنے سے پہلے سو، (تمنا کے مطابق) اس (کے سامان) کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا (پھر اس کو دیکھ کر کیوں بھاگنے لگے اور وہ تمنا کہاں بھول گئے)

معارف و مسائل

غزوۂ احد کا واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ اسی سورت میں بیان کیا جا چکا ہے جس میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس جہاد میں مسلمانوں کی بعض کوتاہیوں کے سبب ابتدائی فتح کے بعد کچھ مسلمانوں کو شکست ہوئی، ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم آئے، مگر ان سب امور کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے جنگ کا پانسہ پلٹ، اور دشمن پسپا ہو گئے۔

اس عارضی شکست کے تین سبب تھے، پہلا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیر اندازوں کو دیا تھا وہ بعض اسباب کی بنا پر قائم نہ رہے، کیونکہ اس بات میں اختلاف رائے ہو گیا، کوئی کہتا تھا کہ ہم کو یہیں جمے رہنا چاہئے، کسی نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، چل کر سب کے ساتھ غنیمت حاصل کرنے میں لگنا چاہئے، تو پہلا سبب آپس کا جھگڑا تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب حضورؐ کے قتل کی خبر مشہور ہو گئی، تو مسلمانوں کے قلوب میں کمزوری پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ بزدلی اور کم ہمتی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تیسرا سبب جو ان دونوں سببوں سے زیادہ اہم تھا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اختلاف پیش آیا، یہ تینوں لغزشیں مسلمانوں سے ہو گئی تھیں، جن کی بنا پر ان کو عارضی شکست ہوئی، یہ عارضی شکست اگرچہ بالآخر فتح میں تبدیل ہو چکی تھی، لیکن مسلمان مجاہدین زخموں سے چور چور تھے، ان کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے پڑی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اشقیاء نے مجروح کر دیا تھا، شدائد و یاس کا ہجوم تھا، اور اپنی ان لغزشوں کا بھی شدید صدمہ تھا، اب یہاں دو چیزیں پیدا ہو چکی تھیں، ایک تو گذشتہ باتوں کا رنج و غم، دوسری چیز جس کا خطرہ تھا وہ یہ کہ مسلمان آئندہ کے لئے کہیں کمزور نہ ہو جائیں، اور اقوام عالم کی امامت کا جو فریضہ ان پر عائد ہے، اس میں ضعف نہ پیدا ہو جائے، اس لئے ان دونوں رخنوں کو بند کرنے کے لئے قرآن کریم کا یہ ارشاد آیا:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ یعنی تم آئندہ کے لئے کمزوری اور سُستی اپنے پاس نہ آنے دو، اور گذشتہ پر رنج و ملال نہ کرو، اور انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے، بشرطیکہ ایمان و ایقان کے راستہ پر مستقیم رہو، اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر کامل وثوق رکھتے ہوئے طاعتِ رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔

مطلب یہ تھا کہ گذشتہ غلطیوں اور لغزشیں جو ہو چکی ہیں اُن پر رنج و غم میں اپنا وقت اور توانائی صرف کرنے کے بجائے مستقبل میں اپنے کام کی درستی کی فکر کرو، اور اسے کامیاب بناؤ، ایمان و ایقان، طاعتِ رسولؐ درخشاں مستقبل کا ضامن ہے، ان کو ہاتھ سے نہ جانے دو، انجام کار تم ہی غالب رہو گے۔

اس وقت قرآنی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، اور پژمردہ جسموں میں تازہ روح پھونک دی، غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی کس طرح تربیت و اصلاح فرمائی اور ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ایک ضابطہ اور اصول دیدیا، کہ گذشتہ فوت شدہ امور پر رنج و ملال میں وقت صرف کرنے کے بجائے آئندہ کے لئے قوت و شوکت کے اسباب بہم پہنچانے چاہئے، پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ غلبہ اور بلندی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی چیز اصل ہے یعنی ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا، ایمان کے تقاضہ میں وہ تیاریاں بھی داخل ہیں جو جنگ کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں، یعنی اپنی فوجی قوت کا استحکام، سامانِ جنگ کی بہم رسانی اور ظاہری اسباب سے بقدر وسعت آراستہ و مسلح ہونا، غزوۂ اُحد کے واقعات اول سے آخر تک ان تمام امور کے شاہد ہیں۔

اس آیت کے بعد ایک دوسرے انداز میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے ارشاد ہے کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اٹھانی پڑی، تو اسی طرح کے حوادث فریق مقابل کو بھی تو پیش آچکے ہیں، اگر اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے ان کے ستر آدمی جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں، اور خود اس لڑائی میں بھی ابتداء ان کے بہت سے آدمی مقتول و مجروح ہوئے، لہٰذا فرمایا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ یعنی اگر تم کو زخم پہنچا تو ان کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے، اور ہم ان ایام کو باری باری بدلتے رہتے ہیں، جس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اس آیت میں ایک اہم ضابطہ اور اصول کی طرف رہنمائی فرمائی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اس عالم میں یہی ہے کہ وہ سختی، نرمی، دکھ، سکھ، تکلیف و راحت کے دنوں کو

لوگوں میں داخل ہو جاتے ہیں، اگر کسی وجہ سے کسی باطل قوت کو عارضی فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو جماعت حقہ کو اس سے بددل نہیں ہونا چاہئے، ورنہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم کو اب ہمیشہ شکست ہی ہوا کرے گی، بلکہ اس شکست کے سبب کو پتہ لگا کر ان اسباب کا تدارک کرنا چاہئے، انجام کار فتح و نصرت جماعت حقہ ہی کو نصیب ہوگی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ

اور محمد تو ایک رسول ہے ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر

مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي

وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں اور جو کوئی پھر جائے گا الٹے

عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

پاؤں تو ہرگز نہ بگاڑے گا اللہ کا کچھ اور اللہ ثواب دے گا شکر گزاروں کو

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ

اور کوئی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا ہے ایک وقت مقرر

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

اور جو کوئی چاہے گا بدلہ دنیا کا دیویں گے ہم اس کو دنیا ہی سے اور جو کوئی چاہے گا بدلہ

الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۵)

آخرت میں اس میں سے دیویں گے ہم اس کو اور ہم ثواب دیں گے احسان ماننے والوں کو

خلاصہ تفسیر

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں جس پر قتل یا موت ممکن نہ ہو) آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں (اسی طرح آپ بھی ایک روز گذر ہی جائیں گے) سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ شہید ہو جاویں تو کیا تم لوگ (جہاد یا اسلام سے) الٹے پھر جاؤ گے (جیسا کہ اس واقعہ میں بعضے مسلمان میدان جنگ سے بھاگ پڑے تھے اور منافقین ترغیب ارتداد کی دے رہے تھے) اور جو شخص (جہاد یا اسلام سے) الٹا پھر جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا (بلکہ اپنا ہی کچھ کھو دے گا) اور خدا تعالیٰ جلد ہی (نیک) عوض دے گا حق شناس لوگوں کو (جو ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو

یاد رکھ کر اس کی اطاعت پر قائم و مستقیم رہتے ہیں، اور قیامت کو ملنا جلد ہی ملتا ہے، کیونکہ قیامت روزانہ قریب ہی ہو رہی ہے، اور نیز کسی کے مرنے سے اتنا گھبرانا بھی فضول ہے، کیونکہ اوّل تو کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں (خواہ طبعاً خواہ عقلاً) بدون حکم خدا کے (پھر جب خدا کے حکم سے ہے تو اس پر راضی رہنا ضرور ہے، دوسرے یہ کہ جس کی موت آتی بھی ہے تو) اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے (جس میں تقدیم تاخیر نہیں ہو سکتی، تو پھر ارمان اور حسرت محض بیکار ہے، تو وہ وقت پر ضرور ہوگی، اور وقت سے پہلے ہرگز نہ ہوگی) اور دیکھو یہ کہ اس تدبیر پر بھاگنے کا آخر نتیجہ کیا بجز اس کے کہ دنیا میں اور چند روز زندہ رہیں، سو ایسی تدبیر کا اثر سن لو کہ) جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) دنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ (بشرط اپنی مشیت کے) دیدیتے ہیں (اور آخرت میں اس کے لئے کچھ حصہ نہیں) اور جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) اخروی نتیجہ چاہتا ہے (مثلاً جہاد میں اس لئے ثابت قدم رہا کہ یہ تدبیر ہے ثواب آخرت کی) تو ہم اس کو آخرت کا (حصہ اداء) ضرور کر کے دیں گے، اور بہت جلد (نیک) عوض دیں گے (ایسے) حق شناسوں کو (جو اپنے اعمال میں آخرت کی نعمت چاہیں)

معارف و مسائل

یہ آیات بھی غزوۂ اُحد کے واقعات سے متعلق ہیں، کیونکہ ان واقعات کو کئی وجوہ سے خاص اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سورۂ آلِ عمران کے چار پانچ رکوع تک غزوۂ اُحد میں پیش آنے والی فتح و شکست اور ان دونوں میں جو قدرتی ہدایات **پوشیدہ تھیں ان کا بیان مسلسل فرمایا ہے۔**

مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بعض صحابۂ کرامؓ کی ایک لغزش پر تہدید آمیز تنبیہ کر کے ایک ایسے اصولی مسئلہ کی طرف ہدایت کی گئی ہے کہ سوچنے والوں کو اس سے یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس عارضی شکست اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے اور حضورؐ کی وفات کی خبر پھیل جانے کی اور اس پر بعض صحابہؓ کی ہمت پست ہو جانے میں یہ راز بھی تھا کہ مسلمان اس اصولی مسئلہ پر عملی طور پر پختہ ہو جائیں، وہ مسئلہ یہ تھا کہ جہاں اصولِ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا گیا ہے، اس میں ادنیٰ کمزوری کو کفر کے مرادف بتلایا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی اتنی ہی اہم تھی کہ کہیں مسلمان اُس مرض کا شکار نہ ہو جائیں جس میں نصاریٰ اور

وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکرگذاروں کو۔

اس میں تنبیہ فرمادی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں، آپ کے بعد بھی مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رہنا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس عارضی شکست کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجروح ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز تھا کہ آپ کے بعد جو حالات صحابہ کرامؓ پر پیش آسکتے تھے وہ آپ کی دنیوی حیات ہی میں ظاہر کردیئے گئے، تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اصلاح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہوجائے، اور آئندہ جب یہ واقعہ وفات سچ مچ پیش آئے تو یہ عشاق رسول از خود رفتہ نہ ہوجائیں، چنانچہ یہی ہوا آپ کی وفات کے وقت جب بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے ہوش و حواس بجا نہ تھے، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی آیات قرآنیہ کی سند سے ان کو سمجھایا، اور وہ سب سنبھل گئے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں بھی حوادث اور مصائب کے وقت ثابت قدم رہنے کی تعلیم دینے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کی موت اللہ تعالیٰ کے نزدیک لکھی ہوئی ہے، اس کی تاریخ، دن اور وقت معین ہے، نہ اس سے پہلے کسی کو موت آسکتی ہے نہ اس کے بعد وہ زندہ رہ سکتا ہے، پھر کسی کی موت سے بدحواس پراگندہ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

آخر میں اس پر تنبیہ فرمائی کہ اس حادثہ کے ظاہری اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جن حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی جانب پہاڑی پر نگراں بنا کر بٹھایا تھا ابتدائی فتح کے وقت عام مسلمانوں کو مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول دیکھ کر ان میں بھی چند حضرات کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اب تو فتح ہوگئی، اس جگہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ رہی، پھر ہم بھی مال غنیمت جمع کرنے میں کیوں حصہ نہ لیں؟ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے فرمایا:

وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ ۝ یعنی جو شخص اپنے عمل سے دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا میں کچھ حصہ دیدیتے ہیں، اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو آخرت کا ثواب ملتا ہے، **اور ہم عنقریب شکرگذاروں کو بدلہ دیں گے۔**

اس میں اشارہ فرمایا کہ مال غنیمت جمع کرنے کی فکر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ کام کو چھوڑ بیٹھنے میں ان سے غلطی ہوئی، یاد رہے کہ حقیقت کے اعتبار سے مال

غنیمت جمع کرنا کوئی نری دنیا طلبی نہیں جو شرعاً مذموم ہے، بلکہ مال غنیمت جمع کرکے محفوظ کرنا اور پھر اس کو اس کے مصرف میں صرف کرنا یہ بھی ایک جزو جہاد ہے، اور عبادت ہی ہے، ان حضرات صحابہؓ کا اس میں شریک ہونا صرف طمع دنیوی کی وجہ سے نہ تھا، کیونکہ شرعی ضابطہ سے اگر وہ اس مال کے جمع کرنے میں شریک ہوتے جب بھی ان کو مال غنیمت میں وہ حصہ ملتا جو اب ملا، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حضرات نے طمع دنیا کے لئے اپنے مقام کو چھوڑا، لیکن جیسا کہ پہلی آیت کی تفسیر میں بتلایا گیا ہے کہ بڑوں کی تھوڑی لغزش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے، ان کے معمولی جرم کو بڑا سخت جرم قرار دے کر عتاب و خطاب کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی ہے کہ مال غنیمت جمع کرنے میں کچھ نہ کچھ دنیوی منفعت کا تعلق تو تھا، اور اس تعلق کا طبعی اثر قلوب میں ہونا بھی مستبعد نہ تھا، صحابہ کرامؓ کے معیار اخلاق کو بلند سے بلند کرنے کے لئے ان کے اس عمل کو بھی ارادہ دنیا سے تعبیر کر دیا کہ طمع دنیا کا ادنیٰ غبار بھی اُن کے قلوب تک نہ جا سکے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ
اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خدا کے طالب پھر نہ ہارے ہیں کچھ

اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ
تکلیف پہنچنے سے اللہ کی راہ میں اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں اور اللہ کو

يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
محبت ہے ثابت قدم رہنے والوں سے اور کچھ نہیں بولے مگر یہی کہا کہ اے رب ہمارے

اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
بخش ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمارے کام میں اور ثابت رکھ قدم ہمارے

وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ
اور مدد دے ہم کو قوم کفار پر پھر دیا اللہ نے ان کو ثواب

الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع
دنیا کا اور خوب ثواب آخرت کا اور اللہ محبت رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں سے

۱۵ ع ۲

ربطِ آیات سابقہ آیات میں غزوۂ احد میں پیش آنے والی بعض کوتاہیوں پر مسلمانوں کو تنبیہ اور مذمت تھی، ان آیات میں بھی اس کا تکملہ پچھلی امتوں کے بعض حالا

واقعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ کس طرح میدانِ جنگ میں ثابت قدم و استقلال کے ساتھ رہے، تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

بعض لغات کی تشریح

رِبِّیُّوْنَ بکسر راء و تشدید باء مکسورہ و ضمہ یاء، رَبّ کی طرف منسوب ہے جیسے رَبَّانِیّ معنی ہیں رب والے، اس میں حرف راء مفتوح کی بجائے مکسور خلاف قیاس استعمال ہوا ہے، (روح) بعض حضرات نے رِبِّیُّوْنَ کے معنی بہت سی جماعتوں کے کئے ہیں، اُن کے نزدیک یہ رِبَّۃ بکسر راء بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے۔ رِبِّیُّوْنَ (اللہ والے) سے مراد یہاں کون لوگ ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اس سے مراد علماء و فقہاء ہیں۔ (روح المعانی)

اِسْتَکَانُوْا، اِسْتِکَانَۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی دب جانے اور عاجز ہو کر رک جانے کے ہیں (بیضاوی)

وَهَنُوْا، وَهْن سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ضعف و کمزوری۔

خلاصۂ تفسیر

اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت بہت اللہ والے (کفار کے ساتھ) لڑے ہیں، سو انھوں نے ہمت نہیں ہاری ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کے (قلب یا بدن کا) زور گھٹا اور نہ وہ (دشمن کے سامنے) دبے (کہ ان سے عاجزی اور خوشامد کی باتیں کرنے لگیں) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے (اور افعال میں تو ان سے کیا لغزش ہوتی) اُن کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انھوں نے (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں کو حد سے آگے نکل جانے کو بخش دیجئے، اور ہم کو کفار کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھئے اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے تو (اس استقلال اور دعاء کی برکت سے) ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بدلہ بھی دیا (یعنی فتح و ظفر) اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ دیا (یعنی رضا اور جنت) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکوکاروں سے محبت ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سابق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جہاد میں شریک اللہ والوں کی جنگ میں ثابت قدمی، و مصائب و شدائد سے نہ گھبرانا نہ کمزور ہونا بیان فرمانے کے

بعد ان کی ایک اور مخصوص صفت کا بیان بھی اس طرح فرمایا ہے کہ وہ اپنی اس بے مثال قربانی کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چند دعائیں کرتے رہتے تھے:

اوّل یہ کہ ہمارے پچھلے گناہ معاف فرمادے۔

دوسرے یہ کہ حالیہ عمل جہاد میں ہم سے جو کوتاہی ہوگئی ہو اس کو معاف فرمادے۔

تیسرے یہ کہ ہمیں ثابت قدمی پر قائم رکھے۔

چوتھے یہ کہ ہمیں دشمنوں پر غالب کرے۔

ان دعاؤں کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اہم ہدایات ہیں:

ہے کسی نیک عمل پر ناز نہیں کرتا ہے اول یہ کہ حقیقت شناس مومن کا کام یہ ہے کہ وہ بلکہ ہر حال میں اللہ سے مغفرت و رحمت پر کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جدوجہد اللہ کی راہ دعا مغفرت کی دعا کرتے رہنا چاہئے میں کر رہا ہو، اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر ناز و فخر کرے، کیونکہ درحقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس کے بغیر کوئی نیک عمل ہو ہی نہیں سکتا، حدیث میں مذکور ہے:

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

"یعنی اگر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو ہمیں نہ ہدایت کا راستہ ملتا اور نہ ہم سے زکوٰۃ و نماز ادا ہوسکتی۔"

اس کے علاوہ جو نیک عمل کوئی انسان کرتا ہے وہ کتنا ہی درست کرکے کرے لیکن مالک الملک والملکوت کی شانِ جلال کے مطابق کر لینا اس کے بس میں نہیں، اس لئے اس کے ادائے حق میں کوتاہی ناگزیر ہے، اس لئے حالتِ عمل میں بھی استغفار کی ضرورت ہے، نیز یہ بھی کسی کو اطمینان نہیں ہوسکتا کہ جو نیک عمل وہ اس وقت کر رہا ہے آگے بھی اس کی توفیق ہوگی، اس لئے موجودہ عمل میں کوتاہی پر ندامت اور آئندہ کے لئے اس پر قائم رہنے کی دعا، مومن کا وظیفہ ہونا چاہئے۔

مذکورہ دعاؤں میں سب سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو رنج و غم یا کوئی تکلیف یا دشمن کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے وہ اکثر اس کے سابقہ گناہوں کا ثمرہ ہوتا ہے، جس کا علاج استغفار و توبہ ہے، مولانا رومیؒ نے فرمایا ؎

غم چو بینی زود استغفار کن
غم بامرِ خالق آمد کار کن

آخری آیت میں اللہ والوں کو دنیا و آخرت دونوں میں اچھا بدلہ دینے کا ذکر ہے، کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انجام کار دشمنوں پر غالب اور اپنے مقصد میں کامیاب فرماتے ہیں، پھر آخرت کا بدلہ تو اصل بدلہ دائمی راحت ہے جس کو کبھی فنا نہیں، اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ثواب آخرت کے ساتھ لفظ حسن بڑھا دیا گیا، وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ
اے ایمان والو اگر تم کہا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو پھیر دیں گے

عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ
الٹے پاؤں پھر جا پڑو گے تم نقصان میں بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے

وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾
اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی عارضی شکست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی افواہ گرم ہونے پر منافقین نے جب جنگ کا پانسہ پلٹتے ہوئے دیکھا تو شرارت کا موقع مل گیا، مسلمانوں سے کہنے لگے کہ جب آپ ہی نہ رہے تو ہم اپنا ہی دین کیوں نہ اختیار کرلیں، جس سے سارے جھگڑے مٹ جائیں، اس سے منافقین کی خباثت و مسلمانوں کا بدخواہ دشمن ہونا ظاہر ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان دشمنوں کی بات پر کان نہ لگائیں، ان کو اپنے کسی مشورہ میں شریک نہ کریں، نہ ان کے کسی مشورہ کا اتباع کریں، تو جیسے پچھلی آیت میں اللہ والوں کا اتباع کرنے کی ہدایت تھی اس میں منافقین اور مخالفین اسلام کے مشورہ پر عمل نہ کرنے اور ان سے بچتے رہنے کی ہدایت ہے، خلاصۂ تفسیر یہ ہے:

اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو (کفر کی طرف) الٹا پھیر دیں گے (مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانا اور بدگمان کرنا ہے جس کو کبھی صراحۃً بھی کہہ دیتے ہیں، اور کبھی صاف نہیں کہتے مگر انداز ایسا ڈالتے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان کے دل سے اسلام کی عظمت و محبت کم ہوتی چلی جائے) پھر تم (ہر طرح) ناکام ہو جاؤ گے (خلاصہ یہ کہ وہ تمہارے دوست ہرگز نہیں اگرچہ اظہار دوستی کا کریں)

بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے، اس سے مسلمانوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں، اسی کی مدد پر بھروسہ کریں، منافقین اگرچہ تمہاری نصرت و امداد کی کچھ تدبیریں بھی بتلائیں تو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ان پر عمل نہ کرو۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۵۱﴾

اب ڈالیں گے ہم کافروں کے دل میں ہیبت اس واسطے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ظالموں کا

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۲﴾

اور اللہ تو سچ کر چکا تم سے اپنا وعدہ جب تم قتل کرنے لگے ان کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز، کوئی تم میں سے چاہتا تھا دنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت پھر تم کو الٹ دیا ان پر سے تاکہ تم کو آزمائے اور وہ تو تم کو معاف کر چکا اور اللہ کا فضل ہے ایمان والوں پر۔

رَبطِ آیات سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کا نصرت و مددگار ہونا مذکور تھا، ان آیات میں نصرتِ الٰہی کے کچھ واقعات کا ذکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں رعب (ہیبت) کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس کے قابلِ شرکت ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (نہ لفظاً صراحۃً اور نہ معنًی یعنی ایسی دلیل جس کا شرع میں

کہ ان کا تصرف ہی کیوں نہ ہو، اس لئے ان حضرات کو سبب سے تعبیر کرکے ناپسندیدگی کا اظہار فرمادیا، واللہ اعلم۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِيٓ أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنۢ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَآئِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُۥ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِيٓ أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے پھر پہنچا تم کو غم عوض میں غم کے تاکہ تم غم نہ کیا کرو اس پر جو ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر کہ جو کچھ پیش آجائے اور اللہ کو خبر ہے تمہارے کام کی۔ پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو جو اونگھ تھی کہ ڈھانک رہی تھی بعضوں کو تم میں سے اور بعضوں کو فکر پڑ رہا تھا اپنی جان کا خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں جیسے کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں تو کہہ سب کام ہے اللہ کے ہاتھ وہ اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ تو کہہ اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا اپنے پڑاؤ پر اور اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور صاف کرنا تھا اس کو جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى

دلوں کے بھید — جو لوگ تم میں سے ہٹ گئے جس دن بھڑیں دو

الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ

فوجیں سو ان کو بہکا دیا شیطان نے ان کے گناہ کی شامت سے اور ان کو

عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

بخش چکا اللہ، اللہ بخشنے والا ہے تحمل کرنے والا

ربطِ آیات یہ آیات بھی غزوۂ اُحد کے واقعہ مذکورہ سے متعلق ہیں، پہلی آیت میں اس واقعہ پر صحابہ کرامؓ کے حزن و غم کا ذکر ہے، اور دوسری طویل آیت میں اس غم کے ازالہ کا بیان ہے، تیسری آیت میں مکرر اس کا اظہار ہے کہ اس میں جو صورت شکست پیش آئی وہ بھی کوئی سزا نہیں، بلکہ مؤمنین مخلصین اور منافقین میں تفرقہ کرنے کے لئے ایک آزمائش تھی، اور پھر صحابہ کرامؓ کی لغزش کی معافی کا اعلان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ وقت یاد کرو جب تم (بھاگے) منہ اٹھائے جنگل کو چڑھے چلے جارہے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے (کہ ادھر آؤ ادھر آؤ مگر تم نے سنا ہی نہیں) سو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، تاکہ (اس پاداش اور مصیبت سے تم میں پختگی پیدا ہو جائے جس سے پھر) تم مغموم نہ ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جاوے، اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے، اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی (اس لئے تم جیسا کام کرتے ہو اس کے مناسب پاداش تجویز فرماتے ہیں آگے ازالہ غم کا بیان ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین (اور راحت) بھیجی یعنی اونگھ (جب کہ کفار میدان سے واپس ہوگئے اس وقت غیب سے مسلمانوں پر اونگھ غالب ہوئی جس سے سب غم غلط ہوگیا) کہ تم میں سے ایک جماعت (یعنی مسلمانوں) پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی (یعنی منافقین کی) کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی (کہ دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جاتے ہیں) وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلاف واقع گمان کر رہے تھے جو محض حماقت کا خیال تھا (وہ خیال آگے ان کے قول سے

اور اس کا اتفاق و ہزیمت ہونا اس کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، ان کا قول یہ سمجھ کر، وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا اختیار کچھ چلتا ہے، مطلب یہ تھا کہ ہماری رائے کسی نے نہ سنی جو جنگ سے پہلے ہم نے دی تھی خود نکلو ورنہ سب کو مصیبت میں پھنسا دیا، آپ فرما دیجئے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا (چلتا) ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر عمل بھی ہوتا تب بھی قضاء الٰہی نہ ٹلتی اور جو افتاد آنے والی تھی آکر رہتی، چنانچہ ان کے قول اور اس کے جواب کا مطلب آگے نص میں آتا ہے) وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے (صراحۃً) ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ ظاہر میں ان کے اس قول کا کہ ہمارا کیا اختیار ہے یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ تقدیر الٰہی کے سامنے بندہ کی تدبیر نہیں چلتی جو کہ عین ایمان کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جو لطیف جواب دیا گیا اس میں اس معنی کی تصدیق بھی ہے کہ واقعی اختیار اللہ ہی کا غالب ہے مگر درحقیقت ان کا مطلب اس قول سے یہ نہیں تھا، بلکہ وہ یہ بات اس معنے سے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا (یعنی ہماری رائے پر عمل ہوتا) تو ہم میں جو لوگ یہاں قتل ہوئے وہ، یہاں مقتول نہ ہوتے (جس کا حاصل یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اسی لئے آگے ان کے اس قول کی تکذیب اس طرح کی گئی کہ) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف (آنے کے لئے) نکل پڑتے جہاں وہ (قتل ہو ہوکر) گرے ہیں (غرض یہ ہے کہ یہ ظاہری ہزیمت جس قدر ہوئی وہ تو ٹلنے والی نہ تھی اور اس کے فوائد و منافع بہت عظیم تھے کیونکہ یہ جو کچھ ہوا اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات (یعنی ایمان) کی آزمائش کرے (کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور مؤمنین کا ایمان اور زیادہ متوکل اور محقق ہوگیا) اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات (یعنی اسی ایمان) کو (شوائب اور وساوس سے) صاف کردے (کیونکہ مصیبت سے مؤمن کی توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاتی ہے جس سے ایمان کو جلاء اور قوت پہونچتی ہے) اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (ان کو آزمائش کی حاجت نہیں، مگر اس لئے کہ عدالتی طریقہ سے مجرم کا جرم کھل کر سامنے آجائے ایسے امور واقع کئے جاتے ہیں) یقیناً تم میں جن لوگوں نے (میدان جنگ سے) پشت پھیر دی تھی جس روز کہ دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور کفار کی) باہم مقابل ہوئیں (یعنی احد کے روز) اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دیدی ان کے بعض اعمال (گذشتہ) کے سبب سے (یعنی ان سے کچھ خطائیں قصور ایسے ہوگئے تھے جس سے شیطان کو ان سے اور بھی معصیت کرا دینے کی طمع ہوگئی اور اتفاق

۱۴

سے وہ طمع پوری بھی ہوگئی، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف فرما دیا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے حلم والے ہیں (کہ صدورِ خطا کے وقت بھی کوئی سزا نہیں دی)

معارف و مسائل

مذکورالصدر پہلی آیت میں کچھ صحابہ کرامؓ کا میدانِ جنگ چھوڑ کر چلا جانا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آواز دینے پر بھی ان کا نہ آنا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم ہونا اور اس غم کے بدلے میں انجام کار صحابہ کو غم ہونا مذکور ہے، اور روایات حدیث میں ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا تو مسلمان جمع ہوگئے۔

اس کی توجیہ وتطبیق صاحب روح المعانی نے اس طرح کی ہے کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا جو صحابہ کرامؓ نے سُنا نہیں، اور دُور نکلے چلے گئے، اُس وقت حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا وہ سب نے سُن لیا تو جمع ہوگئے۔

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اصل وجہ گھبراہٹ کی یہ خبر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے، آپ کے پکارنے میں اس خبر کی کوئی تردید تو تھی نہیں اور آواز اگر پہونچی بھی ہو تو پہچانی نہیں گئی، پھر جب حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا تو اس میں اس خبر کی تردید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حیات ہونا مذکور تھا، یہ سن کر سب کی تسلی ہوئی اور سب جمع ہوگئے، باقی رہا یہ کہ پھر اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اگر مستقل مزاج رہتے تو آواز کو پہچان سکتے تھے۔

أحد کے مصائب سزا نہیں بلکہ آزمائش تھے اور جو لغزش بعض صحابہ کرام سے ہوئی وہ معاف کردی گئی

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ الآیۃ سے معلوم ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جو مصائب اور تکالیف صحابہ کرامؓ کو پیش آئیں وہ بطور سزا نہیں بلکہ بطور آزمائش تھیں اس امتحان کے ذریعہ مؤمنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اظہار کرنا تھا، اور فَاَثَابَكُمْ غَمًّا کے الفاظ سے جو اس کا سزا ہونا معلوم ہوتا ہے اس کی تطبیق یہ ہے کہ صورت تو سزا ہی کی تھی مگر یہ سزا مربیانہ اصلاح کے لئے تھی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو، استاذ اپنے شاگرد کو کچھ سزا دیتا ہے تو عرف میں اس کو سزا بھی کہہ سکتے ہیں، مگر درحقیقت یہ تربیت اور اصلاح کی ایک صورت ہوتی ہے، حاکمانہ سزا اس سے مختلف ہے۔

واقعۂ اُحد میں مسلمانوں پر مصائب کے اسباب کیا تھے؟

جملہ مذکورہ لِیَبْتَلِیَ سے آخر آیت تک جو ارشاد ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقوعِ مصائب کا سبب یہ ربانی حکمتیں تھیں، لیکن اگلی آیت میں اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کوئی سابقہ لغزش اس شیطانی اثر کا سبب ہوئی۔

جواب یہ ہے کہ ظاہری سبب تو وہ لغزش ہی ہوئی کہ اس کی وجہ سے شیطان کو ان سے اور معصیت کرا دینے کی بھی طمع ہوگئی، اور اتفاق سے اس کی وہ طمع پوری بھی ہوگئی، مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں بہت تکوینی حکمتیں مستور تھیں، جن کو لِيَبْتَلِيَكُمْ میں بیان فرمایا ہے، روح المعانی میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو اپنے وہ گناہ یاد دلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، اس لئے جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کرکے پھر پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور شہید ہو کر اللہ سے ملیں۔

ایک گناہ دوسرے گناہ کا بھی سبب ہو جاتا ہے

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، جیسے ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچتی ہے، یعنی اعمالِ حسنہ اور سیئہ میں تجاذب ہے، جب انسان کوئی ایک نیک کام کر لیتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کے لئے دوسری نیکیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں، اس کے دل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی طرح انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے دوسرے گناہوں کا راستہ ہموار کر دیتا ہے، دل میں گناہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةَ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ بَعْدَهَا۔	"یعنی نیک کام کی ایک نقد جزاء وہ دوسری نیکی ہے جس کی توفیق اس کو ہو جاتی ہے اور بُرے عمل کی ایک سزا وہ دوسرا گناہ ہے جس کیلئے پہلے گناہ نے راستہ ہموار کر دیا ہے۔"

حضرت حکیم الامت نے مسائل السلوک میں فرمایا کہ حدیث کی تصریح کے مطابق گناہ سے قلب میں ایک ظلمت اور تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور جب قلب میں ظلمت آ جاتی ہے تو شیطان قابو پا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرامؓ کا مقام بلند اور ان کی خطاؤں پر عفو و درگذر کا مشفقانہ معاملہ

واقعۂ اُحد میں جو لغزشیں اور خطائیں بعض اصحاب کرامؓ سے صادر ہوئیں وہ اپنی ذات میں بڑی شدید اور سخت تھیں، جس مورچہ پر پچاس صحابہؓ کو یہ حکم دے کر بٹھایا تھا کہ ہم پر کچھ بھی حال گذرے تم یہاں سے نہ ہٹنا، ان کی بڑی تعداد یہاں سے ہٹ گئی، اگرچہ ہٹنے کا

سبب ان کی یہ اجتہادی غلطی تھی کہ اب فتح ہو چکی ہے جس حکم کی تعمیل پوری ہو چکی ہے، یہاں سے نیچے آکر سب مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہئے، مگر درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایات کے خلاف تھا، اسی خطا و قصور کے نتیجہ میں میدان جنگ سے بھاگنے کی غلطی سرزد ہوئی جبکہ اس میں بھی کسی تاویل ہی کا سہارا لیا گیا ہو، جیسا کہ روایات سے اوپر نقل کیا جا چکا ہے، پھر یہ میدان جنگ سے بھاگنا ایسی حالت میں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہیں، اور پیچھے سے ان کو آواز دے رہے ہیں، یہ چیزیں اگر شخصیت اور گرد و پیش کے حالات سے الگ کر کے دیکھی جائیں تو بلاشبہ سخت ترین اور ایسے سنگین جرم تھے کہ مشاجرات صحابہؓ کے سلسلہ میں مختلف صحابہ پر جتنے الزامات مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے ہیں یہ ان سب سے زیادہ شدید جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر غور کیجئے کہ حق تعالیٰ نے ان تمام خطاؤں اور لغزشوں کے بعد بھی ان حضرات کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، وہ مذکورہ آیات میں بڑی وضاحت سے آ گیا، کہ اول ظاہری نعمت اونگھ کا بھیج کر ان کی تعب اور تکان و پریشانی دور کی گئی، پھر یہ بتلایا گیا کہ جو مصائب اور غم مسلمانوں کو اس وقت پہنچے ہیں وہ بڑی سزا و عقوبت نہیں بلکہ اس میں کچھ مزید حکمتیں مستور ہیں، پھر صاف لفظوں میں معافی کا اعلان فرمایا، یہ سب چیزیں ایک مرتبہ اس سے پہلے آ چکی ہیں اس جگہ پھر ان کا اعادہ فرمایا، اس تکرار کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ تو خود صحابہ کرامؓ کی تسلی کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا، اور اس جگہ منافقین کے اس قول کا رد بھی مقصود ہے جو وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم نے ہماری رائے پر عمل نہ کیا اس لئے مصائب و تکالیف کا سامنا ہوا۔

بہرحال ان تمام آیات میں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آ گئی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہے کہ اتنی بڑی عظیم خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ صرف عفو و درگذر کا ہی نہیں بلکہ لطف و کرم کا فرمایا گیا، یہ معاملہ تو خود حق تعالیٰ کا ہے جو نصوص قرآنی کا بیان کیا ہوا ہے، اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا حضورؐ کے سامنے پیش ہوا، انھوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے حالات کے متعلق ایک خط لکھ دیا تھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی اس کی حقیقت کھلی اور خط پکڑا گیا تو صحابہ کرامؓ میں حاطب بن ابی بلتعہؓ کے خلاف سخت غیظ و غضب تھا، فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن مار دوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ وہ منافق

نہیں مومن مخلص ہیں مگر یہ غلطی ان سے سرزد ہو گئی، اس لئے اس کو معاف فرمایا، اور فرمایا کہ یہ اہل بدر میں سے ہیں، اور شاید اللہ تعالیٰ نے تمام حاضرین بدر کے متعلق مغفرت اور معافی کا حکم نافذ کر دیا ہے (یہ روایت حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے)

صحابہ کرامؓ کے متعلق عام مسلمانوں کے لئے ایک سبق

یہیں سے اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ اور عمل کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں، ان سے بڑے گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود امت کے لئے یہ جائز نہیں کہ ان کی طرف کسی برائی اور عیب کو منسوب کرے، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کرکے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایا اور ان کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا مقام عطا فرمایا، تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے حضرت عثمان غنیؓ اور بعض صحابہ کرامؓ پر غزوۂ اُحد کے اسی واقعہ کا ذکر کرکے طعن کیا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز کی معافی کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے (صحیح بخاری)

اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ کی تعظیم اور ان پر طعن و اعتراض سے پرہیز واجب ہے، عقائد نسفیہ میں ہے:

وَيَكُفُّ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ اِلَّا بِخَيْرٍ	"یعنی واجب ہے کہ صحابہؓ کا ذکر بغیر خیر کے اور بھلائی کے نہ کرے۔"

اور شرح مسامرہ ابن ہمام میں ہے

اِعْتِقَادُ اَهْلِ السُّنَّةِ تَزْكِيَةُ جَمِيْعِ الصَّحَابَةِ وَالثَّنَاءُ عَلَيْهِمْ	"یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ کو عدول و ثقات سمجھیں ان کا ذکر مدح و ثناء کے ساتھ کریں۔"

شرح مواقف میں ہے:

يَجِبُ تَعْظِيْمُ الصَّحَابَةِ كُلِّهِمْ وَالْكَفُّ عَنِ الْقَدْحِ فِيْهِمْ	"یعنی تمام صحابہؓ کی تعظیم واجب ہے، اور ان پر طعن و اعتراض سے باز رہنا واجب ہے۔"

حافظ ابن تیمیہؒ نے عقیدۂ واسطیہ میں فرمایا ہے کہ:-

اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو اختلافات اور قتل و قتال ہوئے ہیں ان میں کسی پر الزام و اعتراض کرنے سے باز رہیں، وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں جو روایات اُن کے عیوب کے متعلق آئی ہیں ان میں بکثرت تو جھوٹی اور غلط ہیں جو دشمنوں نے اُڑائی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن میں کمی بیشی کر کے اپنی اصلیت کے خلاف کر دی گئی ہیں، اور جو بات صحیح بھی ہے تو صحابہ کرامؓ اس میں اجتہادی رائے کی بناء پر معذور ہیں، اور بالفرض جہاں وہ معذور بھی نہ ہوں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی اعمال صالحہ بُرے اعمال کا بھی کفارہ ہوجاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اعمالِ صالحہ کے برابر کسی دوسرے کے اعمال نہیں ہوسکتے، اور اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کے جتنے وہ مستحق ہیں کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے اعمال پر مؤاخذہ کرے، اور ان میں سے کسی پر طعن و اعتراض کی زبان کھولے۔

(عقیدۂ واسطیہ ملخصاً)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا

اے ایمان والو تم نہ ہو اُن کی طرح جو کافر ہوئے اور کہتے ہیں

لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا

اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کو نکلیں ملک میں یا ہوں جہاد میں اگر رہتے

عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ

ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ اللہ ڈالے اس گمان سے افسوس

قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

ان کے دلوں میں اور اللہ ہی جِلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تمہارے سب کام

بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ

دیکھتا ہے اور اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا مرگئے تو بخشش

مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ

اللہ کی اور مہربانی اس کی بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں اور اگر تم مرگئے

اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

یا مارے گئے تو البتہ اللہ ہی کے آگے اکٹھے ہوگے تم سب

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ
اور ان سے مشورہ لے کام میں پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر اللہ

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾
کو محبت ہے توکل والوں سے۔

ربطِ آیات غزوۂ احد میں بعض مسلمانوں کی لغزش اور میدان چھوڑنے سے جو صدمہ اور غم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تھا، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طبعی اخلاق اور عادت عفو و کرم کی بناء پر ان کو اس پر کوئی ملامت نہیں کی، اور کوئی معاملہ سختی کا بھی نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولؐ کے ساتھیوں کی دلجوئی اور ان کے دلوں میں اس غلطی پر جو صدمہ اور اپنے قصور پر جو ندامت تھی اُن سب کو دھو دینا منظور تھا تو اس آیت میں آپؐ کو مزید لطف و کرم کی ہدایت اور صحابہ کرامؓ سے معاملات میں مشورہ لینے کا حکم دیا۔

خلاصۂ تفسیر

بعد اس کے کہ صحابہ کرامؓ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپؐ کو ملامت اور مواخذہ کرنے کا حق تھا، خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپؐ پر ہے) آپؐ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپؐ (خدانخواستہ) تُند خو سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپؐ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیض و برکات کہاں نصیب ہوتے) سو (جب آپؐ نے برتاؤ میں ایسی نرمی فرمائی تو ان سے جو غلطی آپؐ کی تعمیل حکم میں ہو گئی ہے اس کو دل سے بھی) ان کو معاف کر دیجئے اور (ان سے جو غلطی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی سے ہوئی اس کیلئے) آپؐ ان کے لئے استغفار کیجئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی معافی اور مغفرت کا اعلان پہلے ہی فرما دیا تھا مگر آپؐ کا ان کے لئے دعاء مغفرت کرنا ان کے لئے مفید اور موجب تسلی ہوگا) اور ان سے خاص خاص باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے (تاکہ اس خصوصی لطف سے ان کے دلوں سے غم زائل ہو جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپؐ (کسی ایک جانب) رائے پختہ کر لیں (خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف) تو خدا تعالیٰ پر اعتماد (کر کے اس کام کو کر ڈالا) کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

مرشد و مربی کی خاص صفات

صحابۂ کرامؓ جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اپنی جان و مال سے زیادہ آپؐ کو عزیز رکھنے والے تھے، ان سے جب آپؐ کے حکم کے خلاف ایک لغزش صادر ہو گئی تو یہاں ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ ان حضرات کو جب اپنی لغزش اور خلاف ورزیٔ حکم پر تنبہ ہو تو ان کا صدمہ حد سے بڑھ جائے، جو اُن کے قلب و دماغ کو معطل کر دے، یا رحمت سے مایوس بنا دے، اس کا علاج تو پچھلی آیت میں بتلا دیا گیا کہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ اس لغزش کی سزا دنیا میں دی جا چکی ہے، آخرت کا کھاتہ بیباق ہو گیا۔

دوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غلطی اور لغزش کے نتیجہ میں زخمی ہوئے، جس سے جسمانی تکلیف بھی پہونچی، اور روحانی تکلیف تو پہلے ہی سے تھی، تو اس جسمانی و روحانی تکلیف سے یہ احتمال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں صحابۂ کرامؓ کی طرف سے تکدر پیدا ہو جائے، جو اُن کی ہدایت و تلقین میں مخل ہو جائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینی تھی کہ آپؐ ان کی خطاء سے درگذر فرمائیں، ان کی لغزش دل سے معاف کر دیں، اور آئندہ کے لئے بھی لطف و مہربانی کا معاملہ جاری رکھیں۔

اس مضمون کو حق تعالیٰ نے ایک عجیب غریب اسلوب بیان کے ساتھ ارشاد فرمایا، جس میں ضمنی طور پر چند اہم فوائد بھی آ گئے:

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا حکم ایسے انداز سے دیا گیا ہے جس میں آپؐ کی ثناء و تعریف اور عظمتِ شان کا اظہار بھی ہے کہ یہ صفات آپؐ کے اندر پہلے سے موجود ہیں، اور دوسرے سب سے پہلے فَبِمَا رَحْمَةٍ کا لفظ بڑھا کر یہ بھی بتلا دیا کہ ان صفاتِ کمال کا آپؐ کے اندر ہونا یہ ہماری رحمت سے ہے، کسی کا ذاتی کمال نہیں پھر لفظ رحمت کو بصورتِ نکرہ لا کر رحمت کے عظیم اور وسیع ہونے کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ رحمت صرف صحابۂ کرام پر ہی نہیں، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے کہ آپؐ کو ان صفاتِ کمال کے ساتھ متصف فرما دیا۔

اس کے بعد ایک تیسرا اہم فائدہ بعد کے جملوں سے ظاہر فرما دیا، کہ یہ نرم خوئی، خوش اخلاقی، عفو و درگذر اور لطف و مہربانی کی صفات اگر آپؐ کے اندر نہ ہوتیں تو اصلاحِ خلائق کا جو کام آپؐ کے سپرد ہے وہ حسبِ منشاء انجام نہ پاتا، لوگ آپؐ کے ذریعہ اپنی اصلاح اور تزکیۂ اخلاق کا فائدہ حاصل کرنے کے بجائے آپؐ سے بھاگ جاتے۔

اور اس سب مجموعہ سے ایک اور اہم فائدہ یہ حاصل ہو کہ ارشاد و اصلاح اور تبلیغ کے آداب اس سے معلوم ہوگئے، کہ جو شخص رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کے کام کا ارادہ کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسولؐ کی سختی برداشت نہیں ہو سکتی تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدد اور کج خلقی کے ساتھ خلق اللہ کو اپنے گرد جمع کر سکے، اور ان کی اصلاح کا فرض انجام دے سکے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپؐ تندخو، سخت طبیعت ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لئے تندخوئی سخت کلامی، زہر اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ، یعنی ان سے جو خطا ہوگئی ہے اس کو آپؐ معاف فرما دیں اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے، بلکہ عفو و درگذر سے کام لے، بُرا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو، ایذاء دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ، یعنی آپؐ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں جس میں یہ ہدایت ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں، بلکہ دل سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑیں اور چونکہ سب سے بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی درستی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کے لئے بخشش کی دعا مانگیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، یعنی حسبِ سابق اپنے فیصلوں اور کاموں میں ان حضرات سے مشورہ بھی لیا کریں تاکہ ان کی پوری تسلی ہو جائے، اس میں اس کی طرف ہدایت فرمائی کہ جو خیر خواہی کا داعیہ ان کے لئے قلب میں ہے عمل سے بھی اس کا اظہار کریں کہ اپنی مشاورت سے ان کو مشرف فرما دیں۔

اس پوری آیت میں مصلح و مبلغ کے لئے چند صفت کا ہونا ضروری قرار دیا گیا، اوّل سخت کلامی اور کج خلقی سے بچنا۔ دوسرے ان لوگوں سے کوئی غلطی یا ان کے متعلق ایذاء کی کوئی چیز سادر ہو جائے تو انتقام کے درپے نہ ہونا بلکہ عفو و درگذر کا معاملہ کرنا، تیسرے یہ کہ انکی خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑنا، ان کے لئے دعاء و استغفار بھی کرتے رہنا اور ظاہری معاملات میں انکے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ چھوڑنا، مذکورہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا حکم اور پھر مشورہ کے بعد طریق عمل کی ہدایت کی گئی ہے، مشورہ کے بارے میں قرآن کریم نے دو جگہ صریح حکم [illegible] ہی آیت مذکورہ اور دوسرے سورہ شوریٰ کی آیت جس میں

سچے مسلمانوں کی صفت بیان کرتے ہوئے یک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸)، "یعنی اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے"۔ اور بعض جگہ ضمنی طور پر مشورہ کی ہدایت فرمائی ہے جیسے رضاعت کے احکام میں ارشاد فرمایا: عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (۲: ۲۳۳) یعنی بچے کا دودھ چھڑانا ماں اور باپ دونوں کی رضامندی اور مشورہ سے ہونا چاہئے، مشورہ سے متعلق چند اہم مسائل قابلِ غور ہیں:۔

پہلا مسئلہ لفظ امر اور مشورہ کے معنی، دوسرا مسئلہ مشورہ کی شرعی حیثیت، تیسرا مسئلہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ، چوتھا مسئلہ، حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ، پانچواں مسئلہ مشورہ میں اختلافِ رائے ہو تو فیصلہ کی صورت، چھٹا مسئلہ، ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل۔

پہلا مسئلہ لفظ امر اور شوریٰ کی تحقیق لفظ امر کا اطلاق عربی زبان میں کئی معنی کیلئے ہوتا ہے، ایک عام معنی میں آتا ہے، جو ہر مہتم بالشان قول وفعل کو شامل ہے، دوسرا اطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے، جس پر قرآن کریم میں لفظ اولی الامر محمول ہے، تیسرا اطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لئے ہے، جس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے مثلاً اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷: ۵۴) اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (۱۱: ۱۲۳)، اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (۳: ۱۵۴) اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ (۲: ۲۷۵)، اور محققین کے نزدیک قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (۱۷: ۸۵) میں بھی یہی امر مراد ہے، اب قرآن کے ارشاد وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳: ۱۵۹) اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸)، میں دونوں معنی کا احتمال ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں اور دوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ حکومت سے متعلق ہو خواہ دوسرے معاملات سے، اور لفظ شوریٰ، مشورہ، مشاورت کے معنی ہیں کسی قابلِ غور معاملہ میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا، اس لئے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے معنی یہ ہوئے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپؐ قابلِ غور معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں، صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کریں، یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قابلِ غور معاملہ میں جس میں کوئی اہمیت ہو، خواہ حکم وحکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے، ان میں سچے مسلمانوں کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ مشورہ کی شرعی حیثیت اس بارہ میں قرآن کریم کے ارشادات مذکورہ اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسے معاملہ میں جس میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں خواہ وہ حکومت سے متعلق ہو یا کسی دوسرے معاملہ سے باہمی مشورہ لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت اور دنیا و آخرت میں باعثِ برکات ہے، قرآن و حدیث میں اس کی تاکید آئی ہے، اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے جیسے معاملاتِ حکومت ان میں مشورہ لینا واجب ہے۔ (ابن کثیر)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں، تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے، اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم پر خواہش پرستی غالب آ جائے کہ بھلے برے اور نافع و مضر سے قطع نظر کر کے محض عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دو تو اس وقت کی زندگی سے تمہارے لئے موت بہتر ہے، ورنہ مشورہ میں کسی عورت کی بھی رائے لینا کوئی ممنوع نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے ثابت ہے اور قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کی آیت جو ابھی بیان کی گئی ہے، اس میں ارشاد ہے عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ، یعنی بچہ کا دودھ چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے، اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے، اس لئے خاص طور سے عورت کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ اِذَا اسْتُشِيْرَ فَيُشِيْرُهٗ بِمَا هُوَ صَانِعٌ لِنَفْسِهٖ	"یعنی جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے اس پر لازم ہے کہ اس معاملہ میں جو بات وہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے وہی رائے دوسرے کو دے اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔"

یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں بسند حسن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (مظہری)

البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں مسنون ہے جن کے بارہ میں قرآن و حدیث کا کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو، ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہو اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں بلکہ جائز بھی نہیں، مثلاً کوئی شخص اس میں مشورہ کرے کہ نماز پڑھے یا نہیں، زکوٰۃ دے یا نہیں، حج کرے یا نہیں، یہ مشورہ کی چیزیں نہیں، شرعی طور پر فرض قطعی ہیں، البتہ اس میں مشورہ کیا جا سکتا ہے کہ حج کو اس سال جائے یا آئندہ، اور پانی کے جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے، یا خشکی کے راستہ سے جائے یا دوسرے طریق سے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ مشورہ لیا جا سکتا ہے کہ اس کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کیا جائے، کیونکہ یہ سب امور شرعاً اختیاری ہیں۔

ایک حدیث میں خود اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحۃً قرآن میں نازل نہیں ہوا، اور آپ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو، تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گذار فقہاء کو جمع کرو، اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس حدیث شریف سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مشورہ صرف دنیوی معاملات میں نہیں بلکہ جن احکام شرعیہ میں قرآن و حدیث کی صریح نصوص نہ ہوں ان احکام میں بھی باہمی مشورہ مسنون ہے، اور دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ ایسے لوگوں سے لینا چاہئے جو موجودہ لوگوں میں تفقہ اور عبادت گذاری میں معروف ہوں (اخرجہ الخطیب کذا فی الروح)

نیز خطیب بغدادیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے:

اِسْتَرْشِدُوا الْعَاقِلَ وَلَا تَعْصُوْهُ فَتَنْدَمُوْا! "یعنی عقلمند آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو، ورنہ ندامت اٹھانی ہوگی"

ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ کے ارکان میں دو وصف ضروری ہیں، ایک صاحب عقل و رائے ہونا، دوسرے عبادت گذار ہونا، جس کا حاصل ہے ذی رائے اور متقی ہونا، اور اگر مسئلہ شرعی ہے تو فقیہ ہونا بھی لازم ہے۔

تیسرا مسئلہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ

آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیں، اس میں یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور صاحبِ وحی ہیں، آپ کو کسی سے مشورہ کی کیا حاجت ہے، آپ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی ہے، اس لئے بعض علماء نے اس حکم مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی، نہ اس مشورہ پر آپؐ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرامؓ کے اعزاز اور دل جوئی کے لئے مشورہ کا حکم آپؐ کو دیا گیا ہے، لیکن امام ابوبکر جصاصؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا، اور نہ مشورہ کا کسی کام پر کوئی اثر ہے تو پھر اس مشورہ پر کوئی دل جوئی اور اعزاز بھی نہیں رہتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام امور میں تو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے، مگر بمقتضائے حکمت و رحمت بعض امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ایسے ہی اُمور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی قسم کے اُمور میں مشورہ لینے کا آپؐ کو حکم دیا گیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اگر آپؐ ہمیں دریا میں کود پڑنے کا حکم دیں تو ہم اس میں کود پڑیں گے، اور اگر آپؐ ہمیں برک الغماد جیسے دور دراز مقام کی طرف چلنے کا ارشاد فرمائیں گے تو ہم آپؐ کے ساتھ ہوں گے، ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب کفار سے مقابلہ کریں، بلکہ ہم یہ عرض کریں گے کہ آپؐ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ آپؐ سے آگے اور پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

اسی طرح غزوۂ اُحد میں اس بارہ میں مشورہ کیا کہ کیا مدینہ شہر کے اندر رہ کر مدافعت کریں یا شہر سے باہر نکل کر، عام طور سے صحابہ کرامؓ کی رائے باہر نکلنے کی ہوئی، تو آپؐ نے اسی کو قبول فرمایا، غزوۂ خندق میں ایک خاص معاہدہ پر صلح کرنے کا معاملہ درپیش آیا، تو سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ نے اس معاہدہ کو مناسب نہ سمجھ کر اختلاف کیا، آپؐ نے انہی دونوں کی رائیں قبول فرمائیں، حدیبیہ کے ایک معاملہ میں مشورہ لیا تو صدیق اکبرؓ کی رائے پر فیصلہ فرما دیا ۔ قصۂ افک میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا، یہ سب معاملات وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص جانب متعین نہیں کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت اور صاحب وحی ہونا کچھ مشورہ کے منافی نہیں، اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشورہ محض تسلّی دل جوئی کے لئے ہو، اس کا اثر معاملات پر نہ ہو بلکہ بہت مرتبہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو آپؐ نے اپنی رائے کے خلاف بھی قبول فرما لیا، بلکہ بعض امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص صورت متعین نہ فرمانے اور مشورہ سے کر کام کرنے میں حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ آئندہ امت کے لئے ایک سنّت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جاری ہو جائے کہ جب آپؐ کو بھی مشورہ سے استغنا نہیں تو پھر ایسا کون ہے جو استغناء کا دعویٰ کر سکے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ میں ایسے مسائل میں مشورت کا طریق ہمیشہ جاری رہا، جن میں کوئی نص شرعی نہ تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی یہی معمول رہا، بلکہ ابتداء میں تو ایسے احکام شرعیہ کی دریافت کے لئے بھی مشورہ کا معمول رہا جن میں قرآن و حدیث کا کوئی صریح فیصلہ نہ تھا، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریق کار بتلایا تھا۔

چوتھا مسئلہ: حکومتِ اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے دو جگہ مشورہ کا صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیت مذکورہ اور دوسرے سورۂ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے، ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸) یعنی اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے ان دونوں جگہ پر مشورہ کے ساتھ لفظ امر مذکور ہے، اور لفظ امر کی مفصل تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ہر مہتم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے، اور حکم اور حکومت کے لئے بھی بولا جاتا ہے، امر کے خواہ معنی اول مراد لیں یا دوسرے معنی، حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا بہر صورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے، حکم یا حکومت مراد لینے کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے، اور اگر معنی عام لئے جائیں جب بھی حکم و حکومت کے معاملات مہتم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابل مشورہ ٹھہریں گے، اس لئے امیر اسلام کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت کے اہم معاملات میں اہل حل وعقد سے مشورہ لیا کرے، قرآن کی آیت مذکورہ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا مسلسل تعامل اس کی روشن سند ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جس طرح معاملاتِ حکومت میں مشورہ کی ضرورت واضح ہوئی، اسی طرح ان سے اسلام کے طرز حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اصول بھی سامنے

آگئے کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں، آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے، شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً وکرہاً اسی طرف آرہی ہیں، لیکن اب سے چودہ سو برس پہلے زمانہ کی طرف نظر کر دیکھئے جبکہ پوری دنیا پر آج کے تین بڑوں کی جگہ دو بڑوں کی حکومت تھی ایک کسریٰ، دوسرے قیصر، اور ان دونوں کے آئین حکومت شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں مشترک تھے جس میں ایک شخص واحد لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی قابلیت و صلاحیت سے نہیں، بلکہ وراثت کے ظالمانہ اصولوں کی بنا پر حکومت کرتا تھا، اور انسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی بادشاہی انعام سمجھا جاتا تھا، یہی نظریۂ حکومت دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلط تھا، صرف یونان میں جمہوریت کے چند دھندلے اور نامکمل نقوش پائے جاتے تھے لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مبہم تھے کہ ان پر کسی مملکت کی بنیاد رکھنا مشکل تھا، اسی وجہ سے جمہوریت کے ان یونانی اصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہیں بن سکی، بلکہ وہ اصول ارسطو کے فلسفہ کی ایک شاخ بن کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کر کے امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں دیدیا، جس کو وہ اپنے نمائندوں اہل حل وعقد کے ذریعہ استعمال کر سکیں، بادشاہ پرستی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ اور منصفانہ نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی روح ہے اس طرز حکومت کی جس کو آج **جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔**

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم وستم کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق العنان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنا دیا کہ ان کے قلب و دماغ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصل مالکیت وحکومت کے تصور سے بھی بیگانہ ہو گئے، اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے عوامی اختیار پر خدا تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں **کو بھی بارِ خاطر خلافِ انصاف تصور کرنے لگیں۔**

اسلامی آئین نے جس طرح خلقِ خدا کو کسریٰ و قیصر اور دوسری شخصی بادشاہتوں کے جبر واستبداد کے پنجہ سے نجات دلائی، اسی طرح ناخدا آشنا مغربی جمہوریتوں کو بھی خداشناسی اور خداپرستی کا راستہ دکھلایا، اور بتلایا کہ ملک کے حکام ہوں یا عوام، خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں، ان کے عوام اور عوامی اسمبلی کے اختیارات، قانون سازی، عزل و نصب خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں، ان پر لازم ہے کہ امیر کے انتخاب میں اور

پھر عہدوں اور منصبوں کی تقسیم میں ایک طرف قابلیت اور صلاحیت کی پوری رعایت کریں تو دوسری طرف اُن کی دیانت و امانت کو پرکھیں، اپنا امیر ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم، تقویٰ، دیانت، امانت، صلاحیت، اور سیاسی تجربہ میں سب سے بہتر ہو، پھر یہ امیر منتخب بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں، بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا تعامل اس پر شاہد عدل ہیں، حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:

لَا خِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ　　　"یعنی شورائیت کے بغیر خلافت نہیں ہے"

(کنز العمال بحوالۂ ابن ابی شیبۃ)

شورائیت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کے لئے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے حتیٰ کہ اگر امیرِ مملکت مشورہ سے آزاد ہو جائے، یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطۂ نظر سے مشورہ کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا ضروری ہے۔

ذَکَرَ ابْنُ عَطِیَّۃَ اَنَّ الشُّوْرٰی مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِیْعَۃِ وَعَزَائِمِ الْاَحْکَامِ وَمَنْ لَّا یَسْتَشِیْرُ اَھْلَ الْعِلْمِ وَالدِّیْنِ فَعَزْلُہٗ وَاجِبٌ، ھٰذَا مَا لَا خِلَافَ فِیْہِ (البحر المحیط لابی حیان)

"ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے، جو امیر کہ اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے، اس کا عزل کرنا واجب ہے، اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں"

مشورہ کے ضروری ہونے سے اسلامی حکومت اور اس کے باشندوں پر جو ثمرات اور برکات حاصل ہوں گے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا، ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کو اس مشورہ کی حاجت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے (بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اپنے رسول کو ہر کام بذریعہ وحی بتلا دیتا، کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا، لیکن امت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپؐ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے، اس لئے بہت سے امور ایسے چھوڑ دیئے جن میں صراحۃً کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، ان میں آپؐ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔

پانچواں مسئلہ۔ مشورہ میں اگر اختلاف رائے ہو جائے تو کیا آجکل کے پارلیمانی اصول
اختلاف رائے ہو جائے، تو کثرت رائے کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا، یا اس کو اختیار ہوگا
جمہوری کی اصطلاح ہوگی؟ کہ اکثریت ہو یا قلیت جس طرف دلائل کی قوت اور حکمت
کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے، قرآن و حدیث اور رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف رائے کی صورت میں
امیر اکثریت رائے کے فیصلہ کا پابند مجبور ہے، بلکہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث
اور تعامل صحابہؓ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی
صواب دید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے، خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا
اقلیت کے، البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر
کرے گا اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض وقت اس کے لئے سبب
اطمینان بن سکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں غور فرمایئے، اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم
دینے کے بعد فرمایا گیا ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ یعنی مشورہ کے بعد آپ جب کسی
جانب کو طے کر کے عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے، اس میں عَزَمْتَ کے لفظ میں
عزم یعنی نفاذِ حکم کا پختہ ارادہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا، عَزَمْتُمْ
نہیں فرمایا جس سے عزم و تنفیذ میں صحابہؓ کی شرکت معلوم ہوتی، اس کے اشارہ سے ثابت ہوتا
ہے کہ مشورہ لینے کے بعد تنفیذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے، حضرت عمر بن الخطابؓ بعض
وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ بن عباسؓ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان
کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے، حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہؓ موجود ہوتے تھے، جو
ابن عباسؓ سے عمر اور علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے، حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو جمہور صحابہؓ کے مقابلہ میں
ترجیح دی ہے، حتی کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیت مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ
لینے کے لئے نازل ہوئی۔ حاکمؒ نے مستدرک میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے
روایت کیا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) قَالَ أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ۔ (ابن کثیر)	"ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شاورھم کی ضمیر سے مراد حضرات شیخینؓ ہیں"۔

کلبی کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَزَلَتْ فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ وَکَانَا حَوَارِیَّیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَوَزِیْرَیْہِ وَاَبَوَیِ الْمُسْلِمِیْنَ (ابن کثیر)

"ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے مشورہ لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ دونوں حضرات جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی اور وزیر تھے، اور مسلمانوں کے مربی تھے"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات شیخینؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِیْ مَشُوْرَةٍ مَّا خَالَفْتُکُمَا (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

"جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا"

ایک اشکال اور اس کا جواب یہاں یہ اشکال کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی ہے، اور شخصی حکومت کا طرز ہے، اور اس سے جمہور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلے کرلی ہے، کیونکہ عوام کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں امیر بنادیں بلکہ ان پر لازم قرار دیا ہے کہ علم و عمل اور صلاحیت کار اور خدا ترسی اور دیانت کی رُو سے جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں صرف اس کو امیر منتخب کریں، تو جس شخص کو ان اعلیٰ اوصاف و اعلیٰ صفات کے تحت منتخب کیا گیا ہو، اس پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو بددیانت اور فساق فجار پر عائد کی جاتی ہیں، عقل و انصاف کا خون کرنا، اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور ملک و ملت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے مرادف ہوگا۔

چھٹا مسئلہ: ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا اس جگہ یہ بات بہت ہی قابل غور ہے کہ نظم حکومت اور دوسرے اہم امور میں تدبیر و مشورہ کے احکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرو، کیونکہ یہ سب تدبیریں مدبر الامور کے قبضہ قدرت میں ہیں، انسان کیا اور اس کی رائے و تدبیر کیا، ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش

اس جملہ میں فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ توکل ترک اسباب اور ترک تدبیر کا نام نہیں بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء اور تعلیم قرآن کے خلاف ہے، ہاں اسباب بعیدہ اور دور دراز کی فکروں میں پڑے رہنا یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو مؤثر سمجھ کر مسبب الاسباب اور مدبر الامور سے غافل ہو جانا بے شک خلاف توکل ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہو سکے گا اور اگر مدد نہ کرے تمہاری تو پھر ایسا کون ہے

الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو مدد کرے تمہاری اس کے بعد اور اللہ ہی پر بھروسہ چاہئے مسلمانوں کو

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۚ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

اور نبی کا کام نہیں کہ کچھ چھپا رکھے اور جو کوئی چھپاوے گا وہ لاوے گا اپنی چھپائی چیز دن قیامت کے

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ

پھر پورا پاوے گا ہر کوئی جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا کیا ایک شخص

اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ

جو تابع ہے اللہ کی مرضی کا برابر ہو سکتا ہے اس کے جس نے کمایا غصہ اللہ کا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

اور کیا ہی بری جگہ پہنچا لوگوں کے مختلف درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ

بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ

کرتے ہیں اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں

فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

رسول انہی میں کا پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ

اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں

مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ

تھے کیا جس وقت پہنچی تم کو ایک تکلیف کہ تم پہنچا چکے ہو اس سے دو چند

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ

تو کہتے ہو یہ کہاں سے آئی تو کہہ دے یہ تکلیف تم کو پہنچی تمہاری ہی طرف سے بیشک اللہ ہر چیز

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ

پر قادر ہے اور جو کچھ تم کو پیش آیا اس دن کہ ملیں دو فوجیں سو اللہ کے حکم

اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ

سے اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور تاکہ معلوم کرے ان کو جو منافق تھے

وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا

اور کہا گیا ان کو کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا دفع کرو دشمن کو بولے

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ

اگر ہم کو معلوم ہو لڑائی تو البتہ تمہارے ساتھ رہیں وہ لوگ اس دن کفر کے قریب ہیں

مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ

بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے جو نہیں ان کے دل میں

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ

اور اللہ خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو

وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ

اور آپ بیٹھ رہے ہیں اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے، تو کہہ دے اب ہٹا دیجیو اپنے اوپر سے

الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

موت کو اگر تم سچے ہو اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو

قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ

جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس

يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ

کھاتے پیتے خوشی کرتے ہیں اس پر جو دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے اور

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ

خوش وقت ہوتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے ان کے پاس ان کے پیچھے سے

أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ

اس واسطے کہ نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ اُن کو غم خوش وقت ہوتے ہیں اللہ کی

مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾

نعمت اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ ضائع نہیں کرتا مزدوری ایمان والوں کی

ربطِ آیات

واقعۂ اُحد میں عارضی شکست اور مسلمانوں کی پریشانی پر حضرات صحابہ کرامؓ کی تسلی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چند امور کا حکم ہوا تھا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا خطرہ تو زائل ہوگیا، لیکن ان حضرات کو اس واقعۂ مغلوبیت سے حسرت باقی تھی اس لئے متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں ان کی حسرت مغلوبیت کو دل سے نکالتے ہیں، نیز بدر کے روز مالِ غنیمت میں ایک چادر گم ہوگئی، بعض کم سمجھ یا منافق لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، اور یہ امر حقیقۃً یا صورۃً خیانت ہے، نبی کی شان اس سے منزہ ہے، لہٰذا دوسری، تیسری اور چوتھی آیات کے اندر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان صفت امانت اور اس خیال کی غلطی کو بیان کرکے پانچویں آیت کے اندر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کا نعمتِ عظمیٰ ہونا اور آپؐ کی بعثت کا انسانیت کے لئے احسان عظیم ہونا واضح فرمایا گیا ہے۔

چونکہ مؤمنین کو اس شکست کی سخت کلفت تھی کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ مصیبت کیوں اور کدھر سے آگئی، اس پر صحابہ کرامؓ کو تعجب اور افسوس تھا، نیز منافقین کہا کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تو ہلاک نہ ہوتے اور ان شہداء کی موت کو بدنصیبی اور محرومی قرار دیتے تھے، اس لئے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں آیت کے اندر دوسرے عنوان سے اس عارضی مصیبت و تکلیف کی علت و حکمت واضح فرمائی گئی، اور اس کے ضمن میں منافقین کی تردید بھی۔

اور نویں آیت میں ان کے غلط عقیدہ گھروں میں بیٹھے رہنا ہلاکت سے نجات کا سبب ہے تردید کی گئی، اور دسویں، گیارہویں اور بارہویں آیات میں حضرات شہداء کرام کی اعلیٰ درجہ کی کامیابی اور حیاتِ حقیقیہ اور دائمی نعمتوں کا اثبات فرمادیا گیا ہے:

خلاصۂ تفسیر

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا، اور اگر تمہارا ساتھ

نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہاری مدد کرے اور تم کو غالب کر دے) اور صرف اللہ تعالیٰ
پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہئے۔ اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) خیانت کرے
حالانکہ خائن کی تو قیامت میں رسوائی اور فضیحت ہوگی کیونکہ) جو شخص خیانت کرے گا
وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن (میدانِ حشر میں) حاضر کرے گا
(تاکہ سب خلائق مطلع ہوں اور سب کے روبرو فضیحت اور رسوائی ہو) پھر (میدانِ قیامت
کے بعد) ہر شخص کو (ان خائنوں میں سے) اس کے کئے کا (دوزخ میں) پورا عوض ملے گا،
اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا (کہ جرم سے زائد سزا ہونے لگے، غرض خائن تو مغضوب اور مستحق
جہنم ہوا اور انبیاء علیہم السلام بوجہ رضاجوئی حق کے قیامت میں سربلند ہوں گے پس دونوں
امر جمع نہیں ہو سکتے، جیسا آگے ارشاد ہے) سو ایسا شخص جو رضائے حق کا تابع ہو جیسے نبی
کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جاوے گا جو کہ غضب الٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو،
(جیسے خائن) اور وہ جانے کی بری جگہ ہے (ہرگز دونوں برابر نہیں ہوں گے بلکہ) یہ مذکورین
(یعنی متبعانِ رضائے حق اور مغضوبین) درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک
(کہ متبع محبوب جنتی ہے اور مغضوب دوزخی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں ان کے
اعمال کو (اس لئے ہر ایک کے مناسب معاملہ فرماویں گے) حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے
مسلمانوں پر (بڑا) احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے (عظیم الشان) پیغمبر
کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں (اور احکام) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (ظاہری
اور باطنی گندگیوں سے) ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب (الٰہی) اور سمجھ کی
باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) قبل سے صریح غلطی (یعنی
شرک و کفر) میں (مبتلا) تھے اور جب (اُحد میں) تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دوگنا تم
(بدر میں) جیت چکے تھے (کیونکہ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہوئے اور بدر میں ستر کافروں کو
قید اور ستر کو قتل کیا تھا) تو کیا ایسے وقت میں تم (بطور اعتراض نہ سہی بطور تعجب کے)
یوں کہتے ہو کہ (باوجود ہمارے مسلمان ہونے کے) یہ (ہار) کدھر سے ہوئی (یعنی کیوں ہوئی)
آپ فرما دیجئے کہ یہ (ہار) تمہاری طرف سے ہوئی (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے
خلاف نہ کرتے تو نہ ہارتے، کیونکہ اس قید کے ساتھ وعدۂ نصرت ہو چکا تھا) بیشک
اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (جب تم نے اطاعت کی اپنی قدرت سے تم کو
غالب کر دیا اور جب خلاف کیا اپنی قدرت سے تم کو مغلوب کر دیا) اور جو مصیبت تم پر
پڑی جس روز کہ دونوں گروہ (مسلمانوں اور کفار کے) باہم (مقاتلہ کے لئے) مقابل ہوئے،

(یعنی اُحد کے دن) سو (وہ مصیبت) خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوئی (کیونکہ چند در چند حکمتیں تھیں جن کا بیان اوپر بھی آچکا ہے) اور (ان میں سے ایک حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی دیکھ لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت اخلاص وغیرہ خلاص ظاہر ہوجاتا ہے جیسا کہ ابھی بیان کیا ہے) اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے (شروع جنگ کے وقت جبکہ تین سو آدمیوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جیسا کہ پہلے آچکا ہے) یوں کہا گیا کہ (میدانِ جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر) دشمنوں کی مدافعت کرنا (کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو اُن پر رعب ہوگا اور اس سے شاید ہٹ جاویں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنے زیادہ بھی اُن کے پاس سامان بھی زیادہ ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا ہے، لڑائی اس کو نہیں کہتے، حق تعالیٰ اس پر ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ منافقین اس روز (جبکہ ایسا خشک جواب دیا تھا) کفر سے (ظاہراً بھی) نزدیک تر ہو گئے، بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ (پہلے سے ظاہراً) ایمان سے (کسی قدر) نزدیک تھے (کیونکہ پہلے سے گو وہ دل سے مومن نہ تھے مگر مسلمانوں کے سامنے موافقت کی باتیں بناتے رہتے تھے، اس روز ایسی خوطہ جستی غالب ہوئی کہ کھلا کھلا مخالفت کی باتیں منہ سے نکلنے لگیں، اس لئے پہلے سے جو ظاہری قرب ایمان کے ساتھ تھا وہ کفر کے قرب میں تبدیل ہو گیا، اور یہ قرب اس قرب سے زیادہ اس لئے ہے کہ موافقت کی باتیں دل سے نہ تھیں اس لئے زوردار نہ تھیں، اور یہ مخالفت کی باتیں دل سے تھیں اس لئے عبارت بھی زوردار تھی، یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں (یعنی دل میں تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیں گو لڑائی ڈھنگ ہی کی کیوں نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں (اس لئے ان کے اس قول کا غلط ہونا اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے) یہ ایسے لوگ ہیں کہ (خود تو جہاد میں شریک نہ ہوئے اور) اپنے (ہم نسب) بھائیوں کی نسبت (جو کہ مقتول ہو گئے، گھروں میں بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے (یعنی ہمارے منع کرنے پر نہ جاتے) تو (بے فائدہ) قتل نہ کئے جاتے، آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم (اس خیال میں) سچے ہو (کہ میدان میں جانے سے ہی ہلاکت ہوتی ہے، کیونکہ قتل سے بچنا تو موت ہی سے بچنے کے لئے مقصود ہے جب وقت مقرر پر موت گھر بیٹھے بھی آجاتی ہے تو قتل بھی وقت مقرر پر نہیں ٹل سکتا) اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے گئے ان کو (اور مُردوں کی طرح) مُردہ مت

خیال کرو بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی (مثلاً درجاتِ قرب وغیرہ یعنی رزق ظاہری بھی ملتا ہے اور رزقِ معنوی یعنی مسرت بھی) اور (جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں اسی طرح) جو لوگ (ابھی دنیا میں زندہ ہیں اور) ان کے پاس نہیں پہنچے (بلکہ) ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ (شہداء) خوش ہوتے ہیں کہ اگر وہ بھی شہید ہو جاویں تو ہماری طرح، ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ کسی طرح مغموم ہوں گے (غرض ان کو دو خوشیاں حاصل ہوں گی، ایک اپنے متعلق، دوسرے اپنے متعلقین کے متعلق، آگے ان دونوں خوشیوں کا سبب یہ بتلایا کہ، وہ (اپنی حالت پر تو) خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت وفضل خداوندی کے (جس کا انھوں نے مشاہدہ کر لیا) اور (دوسروں کی حالت پر خوش ہوتے ہیں، اس وجہ سے کہ وہاں جا کر مشاہدہ کر لیا کہ) اللہ تعالیٰ اہل ایمان (کے اعمال) کا اجر ضائع نہیں کرتے (تو جو لوگ ان کے متعلقین پیچھے رہ گئے ہیں وہ نیک اعمال جہاد وغیرہ میں لگے ہیں ان کو بھی ایسے ہی انعامات ملیں گے)۔

معارف ومسائل

مال غنیمت میں چوری گناہ عظیم ہے کسی نبی سے ایسے گناہ کا امکان نہیں

آیۃ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ، ایک خاص واقعہ کے متعلق آئی ہے، اس کے ضمن میں غلول، یعنی مالِ غنیمت کی چوری کا مسئلہ بھی آگیا۔

واقعہ حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں مالِ غنیمت میں ایک چادر گم ہو گئی، بعض لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، یہ کہنے والے اگر منافق تھے تو کوئی بعید بات نہیں، اور ممکن ہے کہ کوئی ناسمجھ مسلمان ہی ہو تو اس نے یہ سمجھا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا اختیار ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں غلول کا گناہ عظیم ہونا اور قیامت کے روز اس کی سزائے شدید کا ذکر ہے اور یہ کہ کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہوگا بہت بیہودہ جسارت ہے کیونکہ انبیاء ؑ ہر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔

لفظ غلول مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور خاص کر مالِ غنیمت کی خیانت کے لئے بھی، اور مالِ غنیمت میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور

خیانتوں سے زیادہ اشد ہے، کیونکہ مالِ غنیمت میں پورے لشکرِ اسلام کا حق ہوتا ہے تو جس نے اس میں چوری کی اس نے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی چوری کی، اگر کسی وقت اس کو تلافی کا خیال بھی آوے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے یا معاف کرائے، بخلاف دوسری چوریوں کے کہ مال کا مالک معلوم و متعین ہے، کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کر بری ہو سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا، مال غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا، آپ نے باوجود رحمۃ للعالمین ہونے اور رحمت بر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب میں اس کو کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں، اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہوگے۔

اسی لئے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادہ اشد ہے، کہ میدانِ حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لدا ہوا ہوگا، صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مذکور ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو (اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مالِ غنیمت کا اونٹ چرایا تھا) وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔

اللہ بچائے یہ میدانِ حشر کی رسوائی ایسی ہوگی کہ بعض روایت میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رسوائی سے بچ جائیں۔

اموالِ اوقاف اور سرکاری خزانہ میں چوری بحکم غلول ہے

یہی حال مساجد، مدارس، خانقاہوں اور اوقاف کے اموال کا ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے، اگر معاف بھی کرائے تو کس کس سے معاف کرائے، اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے، کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی، مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اس لئے آجکل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے، اور لوگ اس کے انجامِ بد اور وبالِ عظیم سے غافل ہیں، کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذابِ جہنم کے میدانِ حشر کی رسوائی بھی ہے، اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محرومی بھی (نعوذ باللہ منہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ کا وجود باجود پوری انسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے

آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الآیۃ اسی مضمون کی ایک آیت ۱۲۹ تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ بقرہ میں گذر چکی ہے جس کی تفسیر و تشریح تفصیل کے ساتھ معارف القرآن جلد اول صفحہ ۳۲۹ میں آچکی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے، یہاں آیت میں ایک لفظ زائد ہے، لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرما کر حق تعالیٰ نے مومنین پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

اس کے متعلق پہلی بات تو یہ قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، اور پورے عالم کے لئے آپ کا وجود نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہے، اس جگہ اس کو صرف مومنین کے لئے فرمانا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمانا کہ قرآن کا سارے عالم کے لئے ہدایت ہونا دوسری آیت سے ثابت ہے مگر بعض جگہ اس کو متقین کے ساتھ مخصوص کرکے بیان فرمایا، اس کی وجہ دونوں جگہ مشترک طور پر ایک ہی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود سارے عالم اور ہر مومن و کافر کے لئے نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہے اسی طرح قرآن کریم سارے عالم انسانیت کے لئے صحیفۂ ہدایت ہے، مگر چونکہ اس نعمت و ہدایت کا نفع صرف مومنین اور متقین نے حاصل کیا اس لئے کسی جگہ اس کو ان کے ساتھ مخصوص کرکے بھی بیان کر دیا گیا۔

دوسری بات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کے لئے یا پورے عالم کے لئے نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہونے کی تشریح و توضیح ہے۔

یہ بات ایسی ہے کہ اگر آجکل کا انسان روحانیت فراموش اور مادیت کا پرستار نہ ہوتا تو یہ مضمون کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں تھا، عقل سے کام لینے والا انسان اس احسان عظیم کی حقیقت سے خود واقف ہوتا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج کا انسان دنیا کے جانوروں میں ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا، اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے، اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی رُوح ہے اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر غافل ہوگیا ہے، اس لئے اس تشریح کی ضرورت ہوئی کہ انسان کو پہلے تو یہ بتلایا جائے کہ اس کی حقیقت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقیقتِ انسان وہ رُوح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے، جب تک یہ رُوح اس کے بدن میں ہے اس وقت تک انسان انسان ہے، اس کے حقوق

انسانیت قائم ہیں خواہ وہ کیسا ہی ضعیف و کمزور لب دم کیوں نہ ہو، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی جائداد اور اموال پر قبضہ کر سکے، یا اس کے حقوق سلب کر سکے، لیکن جس وقت یہ روح اس کے بدن سے الگ ہوگئی، تو خواہ وہ کیسا ہی قوی اور پہلوان ہو، اور اس کے اعضاء سب اپنی اصلی ہیئت میں ہوں وہ انسان نہیں رہا، اس کا کوئی حق خود اپنی جائداد و اموال میں باقی نہیں رہتا۔

انبیاء علیہم السلام دنیا میں آتے ہیں اس لئے کہ وہ انسانی روح کی صحیح تربیت کر کے انسان کو حقیقی انسان بنائیں، تاکہ اس کے بدن سے جو اعمال و افعال صادر ہوں وہ انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں، وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دوسرے انسانوں کو ایذاء اور تکلیف دیتا نہ پھرے، اور خود اپنے بھی انجام کو سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے، اور آنحضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے زمرۂ انبیاء میں امامت و سیادت کا منصب حاصل ہے، انسان کو صحیح انسان بنانے میں بھی آپ کی شان تمام انبیاء علیہم السلام سے بہت ممتاز ہے، آپ نے اپنی مکی زندگی میں صرف یہی کام افراد سازی کا انجام دیا، اور انسانوں کا ایسا معاشرہ تیار کر دیا جس کا مقام فرشتوں کی صفوف سے آگے ہے، اور زمین و آسمان نے اس سے پہلے ایسے انسان نہیں دیکھے، ان میں سے ایک ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ نظر آتا ہے، ان کے بعد کے لئے بھی آپ نے جو تعلیمات اور ان کے رواج دینے کے طریقے چھوڑے ہیں اس پر پورا عمل کرنے والے اسی مقام کو پا سکتے ہیں جو صحابہ کرام نے پایا ہے، یہ تعلیمات سارے عالم کے لئے ہیں، اس لئے آپ کا وجود باجود پورے عالم انسان کے لئے احسان عظیم ہے، گو اس سے پورا نفع مؤمنین ہی نے اٹھایا ہے۔

واقعۂ احد میں مسلمانوں کو عارضی شکست اور زخم و قتل کے مصائب پیش آنے کے بعض اسباب اور حکمتیں

آیت اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ الآیۃ، سابقہ آیات میں کئی جگہ اس مضمون کا ذکر آچکا ہے، یہاں پھر اس کی تاکید مزید توضیح کے ساتھ بیان کی گئی ہے، کیونکہ مسلمانوں کو اس واقعہ سے سخت کلفت تھی یہاں تک کہ بعض حضرات کی زبان پر یہ بھی آیا اَنّٰی هٰذَا کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آپڑی، جب کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد ہیں۔

آیت مذکورہ میں اول تو یہ بات یاد دلائی کہ جتنی مصیبت تم پر آج پڑی ہے تم اس سے دوگنی اپنے مخالف پر اس سے پہلے غزوۂ بدر میں ڈال چکے ہو، کیونکہ غزوۂ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے، اور غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر سردار مارے گئے تھے اور ستر گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے، اس بات کے یاد دلانے سے ایک تو یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ تکلیف و پریشانی کا احساس گھٹ جائے کہ جس شخص کی دوگنی جیت ہو چکی ہو اگر ایک دفعہ

آدھی ہار و شکست بھی ہو جائے تو زیادہ غم و تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرا اصل مقصد آیت کے آخری جملہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ میں بتلایا کہ یہ تکلیف و مصیبت درحقیقت دشمن کی قوت و کثرت کے سبب سے نہیں، بلکہ تمہاری اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب سے ہے، کہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں تم سے کوتاہی ہو گئی۔

اس کے بعد کی آیت فَبِإِذْنِ اللّٰهِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کے اذن و مشیت سے ہوا، جس میں بہت سی حکمتیں مستور ہیں، جن میں سے بعض کا بیان پہلے آچکا ہے، اور ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین مخلصین کو بھی دیکھ لیں اور منافقین کو بھی، یعنی مؤمنین کا اخلاص اور منافقین کی منافقت سب پر واضح ہو جائے کہ ہر دیکھنے والا دیکھ لے، یہاں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے مراد یہی ہے کہ دنیا میں جو دیکھنے کی صورت متعارف ہے اس صورت میں دیکھ لیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں، چنانچہ یہ حکمت اس طرح واضح ہو گئی کہ اس شدت کے وقت منافقین الگ ہو کر کھڑے ہو گئے اور مخلص مومن معرکہ میں ڈٹے رہے۔

اور ایک وجہ تسلی یہ بھی ہے کہ جو مسلمان اس معرکہ میں شہید ہو گئے ہیں ان کو حق تعالیٰ نے وہ انعامات دیئے ہیں کہ دوسرے دل کو ان پر رشک آنا چاہئے، اس مناسبت سے اس کے بعد کی آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا میں شہداء کے خاص **فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔**

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خاص فضائل اور درجات

اس آیت میں شہداء کے خاص فضائل کا بیان ہے، اور احادیث صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیل وارد ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ شہداء کے بھی درجات اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے روایات حدیث میں جو مختلف صورتیں آئی ہیں، وہ مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔

یہاں شہداء کی پہلی فضیلت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مرے نہیں، بلکہ دائمی زندگی کے مالک ہو گئے ہیں، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بظاہر ان کا مرنا اور قبر میں دفن ہونا تو مشاہد اور محسوس ہے، پھر قرآن کی متعدد آیات میں ان کو مردہ نہ کہنے اور نہ سمجھنے کی جو ہدایت آئی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کہا جائے کہ حیات برزخی مراد ہے، تو وہ ہر شخص مؤمن و کافر کو حاصل ہے، کہ مرنے کے بعد اس کی روح زندہ رہتی ہے، اور قبر کے سوال و جواب کے بعد مؤمنین صالحین کے لئے سامان راحت اور کفار فجار کے لئے قبر کا عذاب قرآن و سنت سے ثابت ہے تو یہ حیات برزخی جب سب کے لئے عام ہے تو شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی؟

جواب یہ ہے، کہ قرآن کریم کی اسی آیت نے یہ بتلایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے

جنت کا رزق ملتا ہے، وہ رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے منتقل ہوتے ہی شہید کے لئے رزق جنت جاری ہو جاتا ہے، اور ایک خاص قسم کی زندگی اسی وقت سے اس کو مل جاتی ہے، جو عام مُردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے (قرطبی)

اب رہا کہ وہ حیات کیا ہے؟ اور وہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی حقیقت سوائے خالق کائنات کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ جاننے کی ضرورت ہے، البتہ بسا اوقات ان کی حیاتِ خاص کا اثر اس دنیا میں بھی ان کے ابدان پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی وہ صحیح سالم باقی رہتے ہیں (قرطبی) جس کے بہت سے واقعات مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

شہداء کی پہلی فضیلت اس آیت میں ان کی ممتاز حیات ہے، دوسری یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے، تیسری فضیلت فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ میں یہ بیان کی گئی کہ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہیں گے، ان نعمتوں میں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں، چوتھی فضیلت یہ ہے وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ، یعنی وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے ان کے متعلق بھی ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک عمل اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آکر یہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے۔

اور سدی نے بیان فرمایا کہ شہید کا جو کوئی عزیز دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے، کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آرہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے جیسے دنیا میں کسی دور افتادہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے

اس آیت کی شانِ نزول جو ابوداؤد نے بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ جب واقعہ اُحد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا وہ جنت کی نہروں اور باغات کے پھلوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور پھر ان قندیلوں میں آجاتے ہیں جو ان کے لئے عرش رحمٰن کے نیچے معلق ہیں، جب ان لوگوں نے یہ راحت و عیش کی زندگی دیکھی تو کہنے لگے کہ ہمارے متعلقین دنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں، کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر ان کو پہنچا سکتا ہے تاکہ وہ ہم پر غم نہ کریں، اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری یہ خبر ان کو پہنچائے دیتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔ (قرطبی)

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ

جن لوگوں نے حکم مانا اللہ کا اور رسول کا بعد اس کے کہ پہنچ چکے تھے ان کو زخم

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ

جو ان میں نیک ہیں اور پرہیزگار ان کو ثواب بڑا ہے جن کو کہا

لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

لوگوں نے کہ مکہ والے آدمیوں نے جمع کیا ہے سامان تمہارے مقابلہ کو سو تم ان سے ڈرو تو

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

اور زیادہ ہوا ان کا ایمان اور بولے کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے،

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ

پھر چلے آئے مسلمان اللہ کے احسان اور فضل کے ساتھ کچھ نہ پہونچی ان کو برائی

وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا

اور تابع ہوئے اللہ کی مرضی کے اور اللہ کا فضل بڑا ہے یہ جو ہے

ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ

سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے سو تم ان سے مت ڈرو اور

خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں نے اللہ و رسول کے کہنے کو (جبکہ ان کو تعاقب کفار کے لئے بلایا گیا) قبول کرلیا بعد اس کے کہ ان کو (بھی تازہ) زخم (لڑائی میں) لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں (اور واقع میں سب ہی ایسے ہیں) ان کے لئے (آخرت میں) ثواب عظیم ہے، یہ ایسے (مخلص) لوگ ہیں کہ (بعض) لوگوں نے (یعنی عبدالقیس والوں نے جو) ان سے (آکر) کہا کہ ان لوگوں (یعنی اہل مکہ نے) تمہارے (مقابلہ کے) لئے (بڑا) سامان جمع کیا ہے، سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس (خبر) نے ان کے (جوشِ) ایمان کو اور زیادہ کردیا اور (نہایت استقلال سے یہ) کہہ

(کر بات کو ختم کر) دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ (مشکلات کے لئے) کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے (اسی سپرد کرنے کو توکل کہتے ہیں) پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے (یعنی ثواب اور نفع تجارت سے) بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگواری پیش نہیں آئی، اور وہ لوگ (اس واقعہ میں) رضائے حق کے تابع رہے (اس کی بدولت دینی دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے (مسلمانو، اس سے زیادہ کوئی قابل اندیشہ) بات نہیں کہ یہ مخبر (فعلاً) شیطان ہے کہ اپنے (ہم مذہب) دوستوں سے (تم کو) ڈرانا چاہتا ہے، سو تم ان سے کبھی مت ڈرنا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات اور شانِ نزول اوپر غزوہ اُحد کے قصہ کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اسی غزوہ سے متعلق ایک دوسرے غزوہ کا ذکر ہے، جو غزوہ حمراء الاسد کے نام سے مشہور ہے، حمراء الاسد مدینہ طیبہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔

واقعہ اس غزوہ کا یہ ہے کہ جب کفارِ مکہ اُحد کے میدان سے واپس ہوگئے، تو راستے میں جاکر اس پر افسوس ہوا کہ ہم غالب آجانے کے باوجود خواہ مخواہ واپس لوٹ آئے، ہمیں چاہئے تھا کہ ایک حملہ کر کے سب مسلمانوں کو ختم کر دیتے، اور اس خیال نے کچھ ایسا اثر کیا کہ پھر واپس مدینہ کی طرف لوٹنے کا ارادہ ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر رعب ڈال دیا، اور سیدھے مکہ مکرمہ کو ہولئے، لیکن بعض مسافروں سے جو مدینہ کی طرف جارہے تھے یہ کہہ گئے کہ تم جاکر کسی طرح مسلمانوں کے دل میں ہمارا رعب جمادو کہ وہ پھر لوٹ کر آرہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بات معلوم ہوگئی، اس لئے آپ ان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہنچے **(ابن جریر کذا فی الروح)**

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اُحد کے دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مجاہدین میں اعلان فرمایا کہ ہمیں مشرکین کا تعاقب کرنا ہے، مگر اس میں صرف وہی لوگ جاسکیں گے جو کل کے معرکہ میں ہمارے ساتھ تھے، اس اعلان پر دو سو مجاہدین کھڑے ہوگئے۔

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ کون ہے جو مشرکین کے تعاقب میں جائے تو ستر حضرات کھڑے ہوگئے جن میں ایسے لوگ بھی تھے جو گذشتہ کل کے معرکہ میں شدید زخمی ہوچکے تھے، دوسروں کے سہارے چلتے تھے، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین کے تعاقب میں روانہ ہوئے، مقام حمراء الاسد پر

پہونچے تو وہاں نُعیم بن مسعود ملے ، اس نے خبر دی کہ ابوسفیان نے اپنے ساتھ مزید لشکر جمع کرکے پھر یہ طے کیا ہے کہ پھر مدینہ پر چڑھائی کریں اور اہلِ مدینہ کا استیصال کریں ، زخم خوردہ ضعیف صحابہؓ اس خبر وحشت اثر کو سُن کر یک زبان ہو کر بولے کہ ہم اس کو نہیں جانتے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے ، اور وہی بہتر مددگار ہے ۔

اس طرف تو مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے یہ خبر دی گئی ، اور مسلمان اس سے متاثر نہیں ہوئے ، دوسری طرف مَعْبد خُزاعی بنی خُزاعہ کا ایک آدمی مدینہ سے مکہ کی طرف جارہا تھا یہ اگرچہ مسلمان نہ تھا مگر مسلمانوں کا خیر خواہ تھا ، اس کا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف تھا ، اس لئے جب راستہ میں مدینہ سے لوٹتے ہوئے ابوسفیان کو دیکھا کہ وہ اپنے لوٹنے پر پچھتا رہا ہے اور پھر واپسی کی فکر میں ہے تو اس نے ابوسفیان کو بتایا کہ تم دھوکے میں ہو کہ مسلمان کمزور ہو گئے ، میں ان کے بڑے لشکر کو حمراء الاسد میں چھوڑ کر آیا ہوں جو پورے ساز و سامان سے تمہارے تعاقب میں نکلا ہے ، ابوسفیان پر اس کی خبر نے رُعب ڈال دیا ۔

اس واقعہ کا بیان مذکورہ تین آیتوں میں فرمایا گیا ہے ، پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ غزوۂ اُحد میں زخم خوردہ ہونے اور مشقتیں برداشت کرنے کے باوجود جب اُن کو دوسرے جہاد کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو وہ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے ، اس مقام پر ایک امر قابل غور ہے وہ یہ کہ یہاں جن مسلمانوں کی تعریف بیان کی جارہی ہے ان کے دو وصف بیان کئے گئے ، ایک تو مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ، یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر تیار ہونے والے وہ لوگ ہیں جن کو اُحد میں زخم پہونچ چکے تھے ، اور اُن کے ستر نامور بہادر شہید ہو چکے تھے ، اور ان کے جسم بھی زخموں سے چُور تھے ، لیکن جب اُن کو دوسری دفعہ بلایا گیا تو وہ فوراً جہاد کے لئے تیار ہو گئے ۔

دوسرا وصف لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا میں بیان کیا گیا ہے ، کہ یہ لوگ عملی جذبۂ جہاد اور جاں نثاری کے عظیم کارناموں کے ساتھ یہ حضرات احسان و تقویٰ کی صفاتِ کمال سے بھی آراستہ تھے ، اور یہ مجموعہ ہی ان کے اجرِ عظیم کا سبب ہے ۔

اس آیت میں لفظ مِنْهُمْ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سب لوگ احسان و تقویٰ کے حامل نہیں ، بلکہ ان میں سے بعض تھے ، اس لئے کہ یہاں حرف "مِنْ" تبعیض کے لئے نہیں بلکہ بیانیہ ہے ، جس پر خود اسی آیت کے ابتدائی الفاظ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا شاہد ہیں کیونکہ یہ استجابت اور طاعت بغیر احسان و تقویٰ کے ہو ہی نہیں سکتی ، اس لئے اکثر مفسرین نے اس جگہ "مِنْ" کو بیانیہ قرار دیا ہے ، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب لوگ جو احسان

وتقویٰ کی صفات سے آراستہ تھے ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

کسی کام کے لئے صرف جدوجہد اور جان نثاری کافی نہیں جبتک اخلاص نہ ہو | البتہ اس خاص عنوان سے ایک اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کوئی کام کتنا ہی نیک ہو اور اس کے لئے کوئی شخص کتنی ہی جان نثاری دکھلائے اللہ کے نزدیک وہ موجب اجر اُسی وقت ہوگی جب کہ اس کے ساتھ احسان وتقویٰ بھی ہو، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو، ورنہ محض جان نثاری اور بہادری کے واقعات تو کفار میں بھی کچھ کم نہیں۔

حکم رسول درحقیقت حکم خدا ہے | اس واقعہ میں مشرکین کے تعاقب میں جانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، قرآن کی کسی آیت میں مذکور نہیں، مگر اس آیت میں جب ان لوگوں کی اطاعت شعاری کی مدح فرمائی تو اس حکم کو اللہ اور رسول دونوں کی طرف منسوب کرکے اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ فرمایا گیا، جس نے واضح طور پر ثابت کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیتے ہیں وہ اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے، اگرچہ اللہ کی کتاب میں مذکور نہ ہو۔

جو بے دین حدیث کا انکار کرتے ہیں، اور رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد کی بتلاتے ہیں (معاذ اللہ) ان کے سمجھنے کے لئے یہ جملہ بھی کافی ہے، کہ رسول کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہی حکم قرار دیا، جس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ رسول خود بھی اپنی صواب دید پر مصلحت کے مطابق کچھ احکام دے سکتے ہیں، اور ان کا وہی درجہ ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے دیئے ہوئے احکام کا ہے۔

احسان کی تعریف | احسان کی تعریف حدیث جبرئیل کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ — "یعنی تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہو تو کم از کم یہ حالت تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے"

تقویٰ کی تعریف | تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی، حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین، کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گذر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا، کئی بار ہوا ہے، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لئے اور نہایت احتیاط سے چلا، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے، یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں

بھری پڑی ہے، اس نے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گذارنا چاہئے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے الجھنے نہ پائے، اسی کا نام تقویٰ ہے، جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے:

یَقُوْلُ الْمَرْءُ فَائِدَتِیْ وَمَالِیْ
وَتَقْوَی اللّٰہِ اَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

"یعنی لوگ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ تقویٰ سب سے بہتر سرمایہ ہے"

دوسری آیت میں اس جہاد کے لئے بڑھنے والے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مزید توصیف و تعریف اس طرح کی گئی:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا، یعنی یہ وہ حضرات ہیں کہ جب ان لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف دشمنوں نے بڑا سامان اکٹھا کیا ہے، ان سے ڈرو، جنگ کا ارادہ نہ کرو، تو اس خبر نے ان کا جوش ایمان اور بڑھا دیا، وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت جب ان حضرات نے قبول کی تھی تو پہلے ہی دن سے محسوس کر لیا تھا کہ ہم نے جس راستہ پر سفر شروع کیا ہے وہ خطرات سے پُر ہے، قدم قدم پر مشکلات در پیش آئیں گے، ہمارا راستہ روکا جائے گا، اور ہماری انقلابی تحریک کو مٹانے کے لئے مسلسل کوششیں کی جائیں گی، اس لئے جب یہ حضرات اس قسم کی مشکلات کو دیکھتے تھے تو ایمان کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی تھی، اور پہلے سے زیادہ جانفشانی اور فداکاری کے ساتھ کام کرنے لگتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان حضرات کا ایمان تو مسلمان ہونے کے اول روز ہی سے کامل تھا، لہٰذا ان دونوں آیتوں میں ایمان کی زیادتی سے ایمان کی صفت اور ایمان کے ثمرات کی زیادتی مراد ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر تیار ہو جانے والے صحابہؓ کی اس حالت کو بھی اس جگہ خصوصیت کے ساتھ بیان کیا، کہ اس جہاد کے سفر میں تمام راستہ یہ بس ان کے ورد زبان رہا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ، اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

یہاں یہ بات خصوصیت سے قابل غور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے زیادہ تو دنیا میں کسی کا توکل و اعتماد اللہ تعالیٰ پر نہیں ہو سکتا، لیکن آپ کی صورت توکل یہ نہ تھی، کہ اسباب ظاہرہ کو چھوڑ کر بیٹھے رہتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے

وہ بیٹھے بٹھائے ہمیں غنیمت فراہم کردے گا، نہیں، بلکہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا، زخم خوردہ لوگوں کے دلوں میں نئی روح پیدا فرمائی، جہاد کے لئے تیار کیا اور نکل کھڑے ہوئے، جتنے اسباب و ذرائع اپنے اختیار میں تھے وہ سب مہیا و استعمال کرنے کے بعد فرمایا کہ ہمیں اللہ کافی ہے، یہی وہ صحیح توکل ہے جس کی تعلیم قرآن میں دی گئی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا اور کرایا، اسباب ظاہرہ دنیویہ بھی خدا تعالیٰ کا انعام ہیں، ان کو ترک کردینا اس کی ناشکری ہے، ترک اسباب کرکے توکل کرنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، کوئی مغلوب الحال ہو تو وہ معذور سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ صحیح بات یہی ہے کہ

برتوکل زانوئے **اشتر بہ بند**

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک واقعہ میں اسی آیت حسبنا اللہ ونعم الوکیل **کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:**

عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخصوں کا مقدمہ آیا، آپؐ نے ان کے درمیان فیصلہ فرمادیا، یہ فیصلہ جس شخص کے خلاف تھا اس نے فیصلہ نہایت سکون سے سنا، اور یہ کہتے ہوئے چلنے لگا کہ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس لاؤ، اور فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَ	"یعنی اللہ تعالیٰ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے
لٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَإِذَا	کو پسند نہیں کرتا، تم کو چاہئے کہ تمام
غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَ	ذرائع اختیار کرو پھر بھی عاجز ہو جاؤ اس
نِعْمَ الْوَكِيْلُ،	وقت کہو حسبی اللہ ونعم الوکیل۔"

تیسری آیت میں ان حضرات صحابہؓ کے قدم بقدم اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہنے کے فوائد و ثمرات اور برکات کا بیان ہے فرمایا ہے:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ

یعنی یہ لوگ اللہ کے نعمت و فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری ذرا پیش نہ آئی اور یہ لوگ رضائے الٰہی کے تابع رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو تین نعمتیں عطا کیں، پہلی نعمت تو یہ کہ کافروں کے قلوب میں رعب و ہیبت ڈال دی، اور وہ لوگ بھاگ گئے جس کی وجہ سے یہ حضرات قتل و قتال سے محفوظ رہے، اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نے نعمت ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ ان حضرات کو حمراء الاسد کے بازار میں تجارت کا موقع

ملا اور راس المال سے منافع حاصل ہوئے جس کو لفظ فضل سے تعبیر فرمایا ہے۔

تیسری نعمت جو ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے وہ رضائے الٰہی کا حصول ہے، جو اس جہاد میں ان حضرات کو خاص انداز میں حاصل ہوئی۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کے جو فوائد و برکات قرآن کریم نے بیان فرمائے وہ کچھ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ جو شخص بھی جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس کا ورد کرے وہ یہ برکات حاصل کرے گا۔

مشائخ و علماء نے حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھنے کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس آیت کو ایک ہزار مرتبہ جذبۂ ایمان والقین کے ساتھ پڑھا جائے اور دعاء مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ رد نہیں فرماتا، ہجوم افکار و مصائب کے وقت حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا پڑھنا مجرب ہے۔

چوتھی آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے مشرکین کے دوبارہ لوٹنے کی خبر دینے والا اصل میں شیطان ہے، جو تم کو اپنے اولیاء یعنی ہم مذہب کفار سے ڈرانا چاہتا ہے، تو گویا اصل عبارت میں يُخَوِّفُ کا ایک مفعول محذوف ہے، یعنی يُخَوِّفُكُمْ اور دوسرا مفعول أَوْلِيَاءَهُ مذکور ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو ایسی خبروں سے ہرگز ڈرنا نہیں چاہئے، البتہ مجھ سے ڈرتے رہنا ضروری ہے، یعنی میری طاعت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہر مؤمن کو ڈرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ ہو تو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

خوف خدا سے مراد کیا ہے | اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور دوسری آیت میں ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ (۱۶ : ۵۰) مگر بعض اکابر نے فرمایا کہ خوف خدا رونے اور آنسو پونچھنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ سے ڈرنے والا وہ ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس پر اللہ کی طرف سے عذاب کا خطرہ ہو۔

ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابو بکر بن فورک بیمار تھے، میں اُن کی عیادت کو گیا، مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے کہا کہ گھبرایئے نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو شفاء و عافیت دیں گے، وہ فرمانے لگے کہ کیا تم یہ سمجھے کہ میں موت کے خوف سے روتا ہوں، بات یہ نہیں، مجھے مابعد الموت کا خوف ہے کہ وہاں کوئی عذاب نہ ہو (قرطبی)

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ

اور غم میں نہ ڈالیں تجھ کو وہ لوگ جو دوڑتے ہیں کفر کی طرف وہ نہ

يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِي

بگاڑیں گے اللہ کا کچھ　اللہ چاہتا ہے کہ ان کو نہ دے　آخرت

الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا

میں　اور ان کے لئے عذاب ہے بڑا　جنھوں نے مول لیا

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ

کفر کو ایمان کے بدلے وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ　اور ان کے لئے عذاب

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ

ہے دردناک　اور یہ نہ سمجھیں کافر کہ ہم جو مہلت دیتے ہیں ان

لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ

کو کچھ بھلا ہے ان کے حق میں　ہم تو مہلت دیتے ہیں ان کو تاکہ ترقی کریں وہ گناہ میں

وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

اور ان کے لئے عذاب ہے رسوا کرنیوالا

ربطِ آیات　سابقہ آیات میں منافقین کی بے وفائی، بدخوئی کا ذکر تھا، مذکورہ آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے، کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور شکستہ خاطر نہ ہوں وہ کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے، آخری آیت میں اس خیال کا جواب ہے کہ بظاہر تو دنیا میں یہ کفار پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں تو ان کو مقہور و مغضوب کیسے سمجھا جائے؟

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کے لئے وہ لوگ موجب غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر (کی باتوں) میں جا پڑتے ہیں، (جیسے منافقین کہ ذرا مسلمانوں کا پلہ ہلکا دیکھیں تو کھلم کھلا کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ واقعات مذکورہ میں معلوم ہو چکا ہے) یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے (اس لئے آپ کو یہ غم تو ہونا نہیں چاہئے کہ ان کی حرکتوں سے اللہ کے دین کو ضرر پہونچ جائے گا، اور اگر آپ کو خود ان کافروں کا غم ہو کہ یہ بدنصیب کیوں جہنم کی طرف جا رہے ہیں تو بھی آپ غم نہ کریں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو (تکوینی طور پر) یہ منظور ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہ دے (اس لئے ان سے موافقت کی امید رکھنا صحیح نہیں،

اور رنج دینی ہوتا ہے جیسی امید ہو) اور ان کے لئے صرف آخرت کی نعمتوں سے محرومی ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو سزائے عظیم بھی ہوگی (اور جس طرح یہ لوگ دین اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح) یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان کو چھوڑ کر اس کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے (خواہ منافق ہوں یا کھلے کافر اور خواہ پاس کے ہوں یا دور کے) یہ لوگ (بھی) اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور ان کو (بھی پہلے لوگوں کی طرح) دردناک سزا ہوگی، اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو (عذاب سے) مہلت دینا (کچھ) ان کے لئے بہتر (اور مفید) ہے (ہرگز نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دے رہے ہیں (جس میں زیادتِ عمر کی وجہ سے) ان کو جرم میں اور ترقی ہو جاوے (تاکہ یکبارگی پوری سزا ملے) اور (دنیا میں اگر سزا نہ ہوئی تو کیا ہے آخرت میں تو) ان کو توہین آمیز سزا ہوگی۔

معارف ومسائل

کفار کی دنیوی عیش و عشرت بھی درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے

یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مہلت اور عمر دراز اور عافیت و راحت کے سامان اس لئے دیئے ہیں کہ وہ اپنے جرم میں اور بڑھتے جائیں تو پھر کفار بے قصور ہوئے، کیونکہ مقصود آیت کا یہ ہے کہ کفار کی اس چند روزہ مہلت اور عیش و عشرت سے مسلمان پریشان نہ ہوں، کیونکہ باوجود کفر و عصیان کے ان کو دنیوی قوت، طاقت، سامانِ دنیا بھی اُن کے عذاب ہی کی ایک صورت ہے، جس کا احساس آج نہیں اس دنیا سے جانے کے بعد ہوگا کہ یہ دنیا کا سامانِ راحت جو انھوں نے گناہوں میں خرچ کیا، درحقیقت جہنم کے انگارے تھے، جیسا کئی آیتوں میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا (۹: ۵۵)، یعنی کفار کے اموال اور عیش و عشرت ان کے لیے کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے عذاب ہی کی ایک قسط ہے جو ان کے عذابِ آخرت بڑھانے کا سبب ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو جب تک

يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ

کہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے

عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا

غیب کی لیکن اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے، سو تم یقین لاؤ

بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے

ربطِ آیات پچھلی آیت میں اس شبہ کا جواب تھا کہ جب کفار اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض اور مردود ہیں تو دنیا میں ان کو مال و دولت اور عیش و عشرت کے سامان کیوں حاصل ہیں، مذکورہ آیت میں اس کے بالمقابل اس شبہ کا رد ہے کہ مومن مسلمان جو اللہ کے مقبول بندے ہیں ان پر تکالیف و مصائب کیوں آتے ہیں، مقبولیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ راحتیں اور سامانِ راحت ان کو ملتا۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتے جس پر تم اب ہو (کہ کفر و ایمان اور حق و باطل اور مومن و منافق میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے انعامات دنیوی کے اعتبار سے کوئی امتیاز اور فرق نہیں، بلکہ مسلمانوں پر شدائد و مصائب کا نازل ہوتے رہنا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مومن مخلص) سے ممتاز نہ کردیا جائے (اور یہ تمیز و تبیین مصائب و مشکلات ہی کے پیش آنے پر پوری طرح ہو سکتی ہے اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مومن و کافر اور حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ حوادث و مصائب ڈال کر ہی یہ امتیاز حاصل کیا جائے اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس کا اعلان فرما سکتے ہیں کہ فلاں مومن مخلص ہے اور فلاں منافق اور فلاں چیز حلال ہے فلاں حرام، تو اس کا جواب یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (بمقتضائے حکمت) ایسے امور غیبیہ پر تم کو (بلا واسطہ ابتلاء و امتحان کے) مطلع نہیں کرنا چاہتے، لیکن ہاں جس کو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں اور (ایسے حضرات) وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (بلا واسطہ حوادث بھی غیبی خبروں پر مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرما لیتے ہیں، (اور تم پیغمبر ہو نہیں، اس لئے ایسے امور کی تمہیں اطلاع نہیں دی جا سکتی، البتہ ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے مخلص و منافق کا فرق خود بخود واضح ہو جائے، اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا میں کافروں پر عذاب نازل نہ ہونا بلکہ عیش و عشرت ملنا اور مسلمانوں پر بعض مصائب و شدائد نازل ہونا عین تقاضائے حکمت ہے، یہ باتیں کسی کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتیں پس اب تم ایمان کے پسندیدہ

اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ کرو بلکہ) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تم کو اجرِ عظیم ملے۔

معارف و مسائل

مؤمن و منافق میں امتیاز وحی کے بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت
اس آیت میں ارشاد ہے کہ مؤمن مخلص اور منافق میں امتیاز کے لئے حق تعالیٰ ایسے حالات حوادث و مشکلات کے پیدا فرماتے ہیں جن سے عملی طور پر منافقین کا نفاق کھل جائے، اور یہ امتیاز اگرچہ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ بذریعہ وحی منافقین کے نام متعین کر کے بتلا دیا جائے، مگر بمقتضائے حکمت ایسا نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کے افعال کی پوری حکمتیں تو اسی کو معلوم ہیں، یہاں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں احتیاط کے لئے کوئی ایسی واضح حجت نہ ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کریں، وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو ہم تو پکے سچے مسلمان ہیں۔

بخلاف اس عملی امتیاز کے جو مصائب کے ابتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق بھاگ کھڑے ہوئے عملی طور پر ان کا نفاق کھل گیا، اب ان کا یہ منہ نہیں رہا کہ مؤمن مخلص ہونے کا دعویٰ کریں اور اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری اختلاط بھی قطع ہو ورنہ دل میں اختلاف کے باوجود ظاہری اختلاط رہتا تو وہ بھی مضر ہی ہوتا۔

امورِ غیب پر کسی کو مطلع کر دیا جائے تو وہ علمِ غیب نہیں
اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امورِ غیب پر بذریعہ وحی اطلاع ہر شخص کو نہیں دیتے، البتہ اپنے انبیاءؑ کا انتخاب کر کے ان کو دیتے ہیں اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو انبیاءؑ بھی علمِ غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے کیونکہ وہ علمِ غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو، دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو جس سے کسی ذرے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاءؑ کو جو امورِ غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقتہً علمِ غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاءؑ کو دی گئی ہیں جن کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ انباء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ (۱۱: ۴۹)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ

اور نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ نے ان کو دی ہے اپنے فضل سے کہ یہ بخل

خَيْرًا لَهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ

بہتر ہے ان کے حق میں بلکہ یہ بہت برا ہے ان کے حق میں طوق بنا کر ڈالا جائے گا ان کے گلوں میں وہ مال جس میں بخل کیا تھا

الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

قیامت کے دن اور اللہ وارث ہے آسمان اور زمین کا اور اللہ جو کرتے ہو

خَبِيرٌ ﴿١٨٠﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ

سو جانتا ہے بیشک اللہ نے سنی ان کی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم

أَغْنِيَاءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَ

مالدار اب لکھ رکھیں گے ہم ان کی بات اور جو خون کئے ہیں انہوں نے نبیوں کے ناحق اور

نَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿١٨١﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ

کہیں گے کہ چکھو عذاب جلتی آگ کا یہ بدلہ اس کا ہے جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں

وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿١٨٢﴾ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ

اور اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو

عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ

کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک نہ لاوے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے

النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي

اس کو آگ تو کہہ تم میں آچکے بہت رسول مجھ سے پہلے نشانیاں لے کر اور یہ بھی

قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٨٣﴾ فَإِنْ كَذَّبُوكَ

جو تم نے کہا پھر ان کو کیوں قتل کیا تم نے اگر تم سچے ہو پھر اگر یہ تجھ کو جھٹلا دیں

فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ

تو پہلے تجھ سے جھٹلائے گئے بہت رسول جو لائے نشانیاں اور صحیفے

وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿١٨٤﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا

اور کتاب روشن ہر جی کو چکھنی ہے موت اور تم کو

ع ۹

تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ

پورے پورے ملیں گے قیامت کے دن، پھر جو کوئی دور کیا گیا دوزخ سے اور

أُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿١٨٥﴾

داخل کیا گیا جنت میں اس کا کام تو بن گیا اور نہیں زندگانی دنیا کی مگر پونجی دھوکہ کی

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا

البتہ تمہاری آزمائش ہوگی مالوں میں اور جانوں میں اور البتہ سنوگے تم اگلی کتاب

الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ

والوں سے اور مشرکوں سے بدگوئی بہت اور اگر

تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾

تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ ہمت کے کام ہیں

رابطِ آیات سورۂ آل عمران کے شروع میں یہودیوں کی بُری خصلتوں اور شرارتوں کا ذکر تھا یہاں سے پھر اسی کی طرف عود کیا گیا، آیات مذکورہ سب اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور مسلمانوں کے لئے نصیحت کا ذکر ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ہرگز نہ خیال کریں ایسے لوگ جو ضروری مواقع میں ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی، (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بُری ہے (کیونکہ انجام اس کا یہ ہوگا کہ) وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنائے جائیں گے اس (مال) کا (سانپ بناکر) جس میں انھوں نے بخل کیا تھا اور (بخل کرنے والوں کی بھی حماقت ہے کہ) آخر میں (جب سب مرجاویں گے) سب آسمان و زمین (اور جو کائنات ان کے اندر ہیں سب) اللہ ہی کا رہ جاوے گا (لیکن اس وقت یہ مال اللہ کے لئے ہوجانے سے تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا، کیونکہ تم نے اپنے اختیار سے نہیں دیئے، اور جب انجام کار سب اللہ ہی کا ہوجانا ہے تو عقل کی بات یہ ہے کہ ابھی اپنے اختیار سے دیدو تاکہ ثواب کے مستحق ہو) اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کچھ خرچ کرو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کرو)۔

بیشک اللہ نے سن لیا ہے ان لوگوں کا قول جنہوں نے (استہزاءً) یوں کہا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں (اور صرف اس سننے پر اکتفاء نہیں کیا جاوے گا) بلکہ ہم ان کے کہے ہوئے کو ان کے نامۂ اعمال میں لکھ رہے ہیں اور اسی طرح ان کا انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنا بھی (ان کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے) اور ہم (ان پر سزا جاری کرنے کے وقت جتلانے کے لئے) کہیں گے کہ (لو) چکھو آگ کا عذاب (اور ان کو رنج دینے کے لئے اس وقت یہ بھی کہا جاوے گا کہ) یہ (عذاب) ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔

وہ (یہود) ایسے لوگ ہیں کہ (بالکل جھوٹ تراش کر) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو (بواسطۂ انبیاء سابقین) حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر (کے دعویٰ) پر (تصدیق کے لئے) ایمان نہ لاویں جب تک ہمارے سامنے معجزہ (خاص نذر و نیاز اللہ کی خاطر) ظاہر نہ کرے کہ اس کو (آسمانی) آگ کھا جاوے (پہلے بعض انبیاء علیہم السلام کا معجزہ ہوا ہے کہ کوئی چیز جاندار یا بے جان اللہ کے نام کی نکال کر کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دی، غیب سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اس چیز کو جلا دیا، یہ علامت قبول صدقہ کی ہوتی تھی، مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ خاص معجزہ ظاہر نہیں فرمایا، اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، حق تعالیٰ اس کا جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ فرما دیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل (معجزات وغیرہ) لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو، سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا اگر تم (اس امر میں) سچے ہو، سو اگر یہ (کفار) لوگ آپ کی تکذیب کریں تو (غم نہ کیجئے کیونکہ) بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گذرے ہیں تکذیب کی جا چکی ہے، جو معجزات لے کر آئے تھے اور (چھوٹے چھوٹے) صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر (جب کفار کی یہ عادت ہی ہے کہ انبیاء کی تکذیب کیا کرتے ہیں تو پھر آپ کو کیا غم ہے)۔

(تم میں) ہر جان (دار) کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور (مرنے کے بعد) تم کو پوری پاداش تمہاری (بھلائی برائی کی) قیامت ہی کے روز ملے گی (اگر دنیا میں کافروں پر کسی سزا کا ظہور نہ ہو تو اس سے تکذیب کرنے والوں کو خوشی کا اور تصدیق کرنے والوں کو غم کا کوئی موقع نہیں، آگے اس پاداش کی تفصیل ہے) تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا (اسی طرح جو جنت سے جدا رہا اور دوزخ میں بھیجا گیا پورا ناکام وہ ہوا) اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف ایک چیز ہے جیسے دھوکہ کا سودا ہوتا ہے (جس کی ظاہری آب و تاب کو دیکھ کر خریدار پھنس جاتا ہے، بعد میں اس کی قلعی

کھل جاتی ہے تو افسوس کرتا ہے اسی طرح دنیا کی ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا کر آخرت سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

(ابھی کیا ہے) البتہ آگے (آگے) اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں (کے نقصان) میں اور اپنی جانوں (کے نقصان) میں اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی ان لوگوں سے (بھی) جو تم سے پہلے (آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی اہل کتاب سے) اور ان لوگوں سے (بھی) جو کہ مشرک ہیں اور اگر (ان مواقع پر) صبر کرو گے اور (خلاف شرع امور سے) پرہیز رکھو گے تو (تمہارے لئے اچھا ہوگا، کیونکہ) یہ (صبر و تقویٰ) تاکیدی احکام میں سے ہے۔

معارف و مسائل

مذکورہ سات آیتوں میں سے پہلی آیت میں بخل کی مذمت اور اس پر وعید مذکور ہے۔

بخل کی تعریف اور اس پر سزا کی تفصیل

بخل کے معنی شرعی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے، اسی لئے بخل حرام ہے، اور اس پر جہنم کی وعید شدید ہے، اور جن مواقع میں خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، وہ اس بخل حرام میں داخل نہیں، البتہ معنی عام کے اعتبار سے اس کو بھی بخل کہہ دیا جاتا ہے، اس قسم کا بخل حرام نہیں، مگر خلاف اولیٰ ہے۔

بخل ہی کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے، یعنی شُحّ، اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے، اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا ہے، تو وہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَجْتَمِعُ شُحٌّ وَّ اِیْمَانٌ فِیْ قَلْبِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ اَبَدًا (رواہ النسائی عن ابی ھریرۃ رض)	"یعنی شح اور ایمان کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے" (قرطبی)

بخل کی جو سزا اس آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ قیامت کے روز جس چیز کے دینے میں بخل کیا اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا، اس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی مال عطا

فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا، اور کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔ (نسائی از تفسیر قرطبی)

دوسری آیت میں یہود کی ایک سخت گستاخی پر تنبیہ اور سزا کا ذکر ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ و صدقات کے احکام قرآن سے بتلائے تو گستاخ یہودی یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ فقیر و محتاج ہوگیا اور ہم مالدار ہیں جب ہی تو ہم سے مانگتا ہے (نعوذ باللہ منہ) ظاہر یہ ہے کہ اس بیہودہ قول کے موافق ان کا اعتقاد تو نہ ہوگا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے کہا ہوگا کہ اگر قرآن کی یہ آیات صحیح ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ فقیر و محتاج ہو، ان کا یہ لغو استدلال تو بداہۃً باطل ہونے کی وجہ سے قابل جواب نہ تھا، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم صدقات کا اپنے نفع کے لئے نہیں خود اصحاب مال کے نفع دینی اور دنیوی کے لئے ہے، مگر اس کو کہیں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا عنوان اس لئے دیدیا گیا کہ جس طرح قرض کی ادائیگی ہر شریف آدمی کے لئے ضروری اور یقینی ہوتی ہے، اسی طرح جو صدقہ انسان دیتا ہے اس کی جزاء اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ ایسی قرار دیتے ہیں جیسے کسی کا قرض دینا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق اور مالک جانتا ہے، اس کو ان الفاظ سے کبھی وہ شبہ نہیں ہو سکتا جو گستاخ یہودیوں کے اس قول میں ہے، اس لئے قرآن کریم نے اس شبہ کا جواب تو دیا نہیں، صرف اُن کی اس گستاخی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ کا استہزاء کرنے کے متعدد و شدید جرائم کی سزا میں یہ فرمایا کہ ہم ان کے گستاخانہ کلمات کو لکھ کر رکھیں گے تاکہ قیامت کے روز ان پر ثبت تمام کر کے عذاب دیا جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پھر یہود کی اس گستاخی کے ذکر کے ساتھ ان کا ایک دوسرا جرم یہ بھی ذکر کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کی صرف تکذیب و استہزاء ہی نہیں کیا، بلکہ قتل کر ڈالنے سے بھی باز نہیں رہے، تو ایسے لوگوں سے کسی نبی و رسول کی تکذیب و استہزاء پر کیا تعجب ہو سکتا ہے

کفر و معصیت پر دل سے راضی ہونا بھی ایسا ہی عظیم گناہ ہے

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے مخاطب یہود مدینہ ہیں، اور قتل انبیاء کا واقعہ ان سے بہت پہلے حضرت یحییٰ اور زکریا علیہما السلام کے زمانے کا ہے، تو اس آیت میں قتل انبیاء کا جرم ان مخاطبین کی طرف کیسے منسوب کیا گیا، وجہ یہ ہے کہ یہود مدینہ اپنے سابق یہودیوں

کے اس فعل پر راضی اور خوش تھے، اس لئے یہ خود بھی قاتلین کے حکم میں شمار کئے گئے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس تفسیر میں کہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر اور معصیت میں داخل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اس کی مزید توضیح کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جب زمین پر کوئی گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص وہاں موجود ہو مگر اس گناہ کی مخالفت کرے اور اس کو بُرا سمجھے تو وہ ایسا ہے گویا یہاں موجود نہیں، یعنی وہ ان کے گناہ کا شریک نہیں، اور جو شخص اگرچہ اس مجلس میں موجود نہیں مگر ان کے اس فعل سے راضی ہے وہ باوجود غائب ہونے کے ان کا شریک گناہ سمجھا جائے گا۔ انتہی

اس آیت کے اخیر اور تیسری آیت میں ان گستاخوں کی سزا یہ بتلائی ہے کہ ان کو دوزخ میں ڈال کر کہا جائے گا کہ اب آگ میں جلنے کا مزہ چکھو جو تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں۔

چوتھی آیت میں انہی یہود کا ایک افتراء و بہتان کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے یہ حیلہ پیش کیا کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ صدقات کے مال کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دیئے جاتے تھے اور آسمانی آگ ان کو آکر جلا دیتی تھی یہی علامت صدقات کی قبولیت کی ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو حق تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمایا تھا کہ اموال صدقات آسمانی آگ کی نذر کرنے کے بجائے مسلمان فقیروں و محتاجوں کو دیئے جاتے ہیں، چونکہ پچھلے انبیاء کے طرز کے یہ طرز خلاف تھا اس لئے اس کو مشرکین نے بہانہ بنایا کہ اگر آپ نبی ہوتے تو آپ کو بھی یہ معجزہ عطا ہوتا کہ آسمانی آگ اموال صدقات کو کھا جاتی، اس پر مزید یہ جرأت کی کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بہتان باندھا کہ اس نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ ہم اس شخص پر ایمان نہ لائیں جس سے یہ معجزہ آسمانی آگ کے آنے اور مال صدقہ کو جلانے کا صادر نہ ہو۔

چونکہ یہود کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل اور باطل تھا کہ اللہ نے ان سے یہ عہد لیا ہے، اس کا جواب دینے کی تو ضرورت نہ تھی، ان کو انہی کے مسلمات سے مغلوب کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایسا عہد لیا ہے تو پھر جن انبیاء سابقین نے تمہارے کہنے کے مطابق یہ معجزہ بھی دکھلا دیا تھا کہ آسمانی آگ مال صدقہ کو کھا گئی، تو تم ان پر تو ایمان لاتے، مگر ہوا یہ کہ تم نے ان کی بھی تکذیب ہی کی بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگرچہ یہود کا یہ دعویٰ اور مطالبہ قطعاً غلط تھا، لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ہو جاتا تو شاید ایمان لے آتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ

قَرْضًا حَسَنًا (۲: ۲۴۵) نازل ہوئی جس میں ایک بلیغ عنوان میں صدقہ و خیرات اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا ہے، اور اس بلیغ عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ یہاں دو گے اس کا بدلہ آخرت میں ایسا یقینی ہو کر ملے گا جیسے کسی کا قرض ادا کیا جاتا ہے۔

ایک جاہل یا معاند یہودی نے اس کو سن کر یہ الفاظ کہے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ حضرت صدیق اکبرؓ کو اس کی گستاخی پر غصہ آیا اور یہودی کے ایک طمانچہ رسید کیا، یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ الآیۃ، جس میں بتلا دیا کہ جان و مال کی قربانیوں سے اور کفار و مشرکین اور اہل کتاب کی بدزبانی کی ایذاؤں سے گھبرانا نہیں چاہئے، یہ سب ان کی آزمائش ہے، اور اس میں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر سے کام لیں اور اپنے اصل مقصد تقویٰ کی تکمیل میں مصروف رہیں ان کی جواب دہی کی فکر میں نہ پڑیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ

اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں سے

وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ

اور نہ چھپاؤ گے پھر پھینک دیا انہوں نے وہ عہد اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید کیا اس کے

ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

بدلے تھوڑا مول سو کیا برا ہے جو خریدتے ہیں، تو نہ سمجھ کہ جو لوگ خوش

يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا

ہوتے ہیں اپنے کیے پر اور تعریف چاہتے ہیں بن کیے پر سو

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

مت سمجھ ان کو کہ چھوٹ گئے عذاب سے اور ان کے لئے عذاب ہے دردناک

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹ / ۱۰

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان کی اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں یہودیوں کے افعال بد اور بُری خصلتوں کا بیان تھا، مذکورہ پہلی آیت میں ان کے ایک ایسے ہی بُرے عمل کا ذکر ہے، اور وہ ہے عہد و پیمان کی خلاف ورزی، کیونکہ اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام جو تورات

آگے جو اُن میں دلائل (توحید کے موجود) ہیں اہل عقل سلیم (کے استدلال کے) لئے جن
کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور یہی حالت ان کے عاقل ہونے کی علامت بھی ہے
کیونکہ عقل کا اقتضا دفع مضرت و تحصیل منفعت ہے اور اس پر اس حالت کا مجموعہ دال ہے)
وہ حالت یہ ہے کہ وہ لوگ ہر حال میں دل سے بھی اور اس زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد
کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی، اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوت
عقلیہ سے) غور کرتے ہیں (اور غور کا جو نتیجہ ہوتا ہے یعنی حدوث ایمان یا تجدید و تقویت ایمان
اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی
پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں جن میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس مخلوق سے
خالق تعالیٰ کے وجود پر استدلال کیا جاوے) ہم آپ کو (لایعنی پیدا کرنے سے) منزہ
سمجھتے ہیں (اس لئے ہم نے استدلال کیا اور توحید کے قائل ہوئے) سو ہم کو (موحد و مؤمن
ہونے کی وجہ سے) عذاب دوزخ سے بچا لیجئے (جیسا کہ شرعاً اس کا مقتضیٰ ہے گو کسی عارض
سے یہ اقتضا ضعیف ہو جاوے اور چندے عذاب ہونے لگے، ایک عرض تو ان لوگوں کی یہ
تھی اور وہ اس مضمون کے مناسب اور معروضات بھی کرتے ہیں جو آگے آتے ہیں،)
اے ہمارے پروردگار (ہم اس لئے عذاب دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں کہ) بیشک آپ جس کو
(بطور اصل سزا کے) دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کردیا (اور اس سے
کافر ہیں، اور ایسے بے انصافوں کا (جن کی اصل سزا دوزخ تجویز کی جاوے) کوئی بھی
ساتھ دینے والا نہیں (اور آپ کا وعدہ ہے اہل ایمان کے لئے رسوا نہ کرنے کا بھی اور
نصرت کرنے کا بھی، پس ایمان لا کر ہماری درخواست ہے کہ کفر کی اصلی سزا
سے بچئے، ایمان کا اصل مقتضا یعنی دوزخ سے نجات مرتب فرمائیے)۔
اے ہمارے پروردگار ہم نے (جیسے مصنوعات کی دلالت سے عقلی استدلال کیا
اسی طرح ہم نے) ایک (حق کی طرف) پکارنے والے کو (مراد اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ہیں بواسطہ یا بلا واسطہ) سنا کہ وہ ایمان لانے کے لئے اعلان کر رہے ہیں کہ (اے لوگو) تم اپنے
پروردگار (کی ذات و صفات) پر ایمان لاؤ سو ہم (اس دلیل نقلی سے استدلال کر کے بھی)
ایمان لے آئے (اس درخواست میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول بھی ضمناً آگیا،
پس ایمان کے دونوں جزو یعنی اعتقاد توحید و اعتقاد رسالت کامل ہوگئے)۔
اے ہمارے پروردگار پھر (اس کے بعد ہماری یہ درخواست ہے کہ) ہمارے (بڑے)
گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے اور ہماری (چھوٹی) بدیوں کو ہم سے (معاف کر کے) زائل

کر دیجئے اور (ہمارا انجام بھی جب یہ مرنے لگیں درست کیجئے اس طرح کہ) ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ (شامل رکھ کر) موت دیجئے (یعنی نیکی پر خاتمہ ہو)۔

اے پروردگار (اور جس طرح ہم نے اپنی مضرتوں سے محفوظ رہنے کے لئے درخواست کی ہے جیسے دوزخ و رسوائی اور ذنوب و سیئات، اسی طرح ہم اپنے منافع کی دعا کرتے ہیں کہ) ہم کو وہ چیز (یعنی ثواب و جنت بھی) دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے (کہ مؤمنین و ابرار کو جنت و نعیم ملے گا، اور یہ ثواب و جنت ہم کو اس طرح دیجئے کہ ثواب ملنے سے پہلے بھی) ہم کو قیامت کے روز رسوا نہ کیجئے (جیسا کہ بعض کو اول سزا ہوگی پھر جنت میں جاویں گے، مطلب یہ کہ اول ہی سے جنت میں داخل کر دیجئے اور) یقیناً آپ (تو) وعدہ خلافی نہیں کرتے (لیکن ہم کو یہ خوف ہے کہ جن کے لئے وعدہ ہے یعنی مؤمنین و ابرار کہیں ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ ہم ان صفات سے موصوف نہ رہیں جن پر وعدہ ہے، اس لئے ہم آپ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہم کو یہ وعدہ کی چیزیں دیجئے، یعنی ہم کو ایسا کر دیجئے اور ایسا ہی رکھئے جس سے ہم وعدہ کے مخاطب و محل ہو جاویں)۔

معارف و مسائل

آیت کا شانِ نزول اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ عطاء بن ابی رباح حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی ہو وہ مجھے بتلائیے، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: آپ کی کس شان کو پوچھتے ہو؟ ان کی تو ہر شان عجیب ہی تھی، ہاں ایک واقعہ عجیب سناتی ہوں، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میرے پاس تشریف لائے، اور لحاف میں میرے ساتھ داخل ہوگئے، پھر فرمایا کہ اجازت دو کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں، بستر سے اٹھے، وضو فرمایا، پھر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، اور قیام میں اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک پر بہہ گئے، پھر رکوع فرمایا اور اس میں بھی روئے، پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بھی اسی قدر روئے پھر سر اٹھایا، اور مسلسل روتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، حضرت بلالؓ آئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضورؐ اس قدر کیوں گریہ فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں، آپ نے فرمایا: تو کیا میں شکر گذار بندہ

مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقلمندی کا معیار سمجھ لیا ہے، وہ محض ایک دھوکا ہے، کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیدیا، کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اصل پاور سمجھ لینے کا نام عقلمندی رکھ دیا لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو ہمیشہ سے انبیاء و رسل لے کر آئے کہ علم و حکمت کے ذریعہ سلسلۂ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تمہیں جس نے پہونچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی کا یا لوہے تانبے کا ہے، نہ مشین کا، نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا، بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کی جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ تمہارے ہاتھ آئی ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

اس کو ایک معمولی محسوس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہونچے اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے، اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے، تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو روک دیتی اور چلا دیتی ہے، تو عقل والے اس کو احمق کہیں گے، اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں، بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے، لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کہے گا کہ انجن ڈرائیور کو پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا، لیکن ایک فلسفی اور سائنس داں اس کو بھی یہ کہہ کر بیوقوف بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے، جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے، لیکن حکمت و فلسفہ یہاں آکر تھک جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم، جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت و پاور کا مالک سمجھنا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا

کو خوفِ خدا سے رونے کا اور جسم کو صبر کا اور قلب کو تفکر کا عادی بنا دے، اور کل کے رزق کی فکر نہ کرے۔

آیتِ مذکورہ میں اسی فکر و تدبر کو عقلمند انسان کا اعلیٰ وصف کرکے بیان فرمایا ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرکے حق تعالیٰ کی معرفت اور دنیا کی ناپائیداری کا علم حضوری حاصل کرلینا افضل عبادت اور نورِ ایمان ہے، اسی طرح آیاتِ الٰہیہ کو دیکھنے اور برتنے کے باوجود ان مخلوقات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اُلجھ کر رہ جانا اور ان کے ذریعہ مالکِ حقیقی کی معرفت حاصل نہ کرنا سخت نادانی اور ناسمجھ بچوں کی سی حرکت ہے، مولانا جامیؒ نے اسی کو فرمایا ہے ؎

همه اندر زمن ترا زین است
که تو طفلی و خانه رنگین است

اور اسی بے بصیرتی کو حضرت مجذوبؒ نے اس طرح بیان فرمایا ؎

کچھ بھی مجنوں جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے
تو نے لیلیٰ جسے سمجھا ہے وہ محمل ہو جائے

بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائناتِ عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے، آج کی سائنٹفک اور حیرت انگیز ایجادات اور ان میں اُلجھ کر رہ جانے والے موجدین کی خدا تعالیٰ اور اپنے انجام کار سے غفلت حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہے کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں خدا تعالیٰ کی کمالِ صنعت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں اتنے ہی وہ خدا شناسی اور حقیقت آگاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں، بقول اکبر مرحوم ؎

بھول کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

قرآن کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ یعنی آسمان اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گذر جاتے ہیں اُن کی حقیقت وصنعت اور ان کے صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات میں غور و فکر کرکے اس کی عظمت و قدرت کا استحضار ایک اعلیٰ عبادت ہے، اُن سے کوئی عبرت حاصل نہ کرنا سخت نادانی ہے

آیت مذکورہ کے آخری جملے نے آیات قدرت میں غور و فکر کا نتیجہ بتلا دیا ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، یعنی حق تعالیٰ کی عظیم اور غیر محصور مخلوقات میں غور و تدبر کرنے والا اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے فضول و بیکار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خلقت میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں، ان سب کو انسان کا خادم اور انسان کو مخدوم کائنات بنا کر انسان کو اس غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ساری کائنات تو اس کے فائدہ کے لئے بنی ہے، اور انسان خدا تعالیٰ کی طاعت و عبادت کے لئے پیدا ہوا ہے، یہی اس کا مقصد زندگی ہے۔ اس کے بعد غور و فکر اور تفکر و تدبر کے نتیجہ میں وہ لوگ اس حقیقت پر پہنچے کہ کائنات عالم فضول و بیکار پیدا نہیں کی گئی، بلکہ یہ سب خالق کائنات کی عظیم قدرت و حکمت کے روشن دلائل ہیں۔

آگے ان لوگوں کی چند درخواستوں اور دعاؤں کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنے رب کو پہچان کر اس کی بارگاہ میں پیش کیں۔

پہلی درخواست یہ ہے کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، یعنی ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائیے۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ ہمیں آخرت کی رسوائی سے بچائیے، کیونکہ جن کو آپ نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو سارے جہان کے سامنے رسوا کر دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ میدان حشر کے اندر رسوائی ایک ایسا عذاب ہوگا کہ آدمی یہ خواہش کرے گا کہ کاش اسے جہنم میں ڈال دیا جائے اور اس کی بدکاریوں کا چرچا اہل محشر کے سامنے نہ ہو۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف سے آنے والے منادی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا، اور اس پر ایمان لائے تو آپ ہمارے بڑے گناہوں کو معاف فرما دیں، اور ہمارے عیوب اور برائیوں کا کفارہ فرما دیں اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دیں، یعنی ان کے زمرہ میں شامل فرمالیں۔

یہ تین درخواستیں تو عذاب اور تکلیف و مشقت سے بچنے کے لئے تھیں، آگے چوتھی درخواست فوائد اور منافع حاصل کرنے کے متعلق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو وعدہ آپ نے جنت کی نعمتوں کا فرمایا ہے وہ ہمیں اس طرح عطا فرمائیے کہ قیامت میں رسوائی بھی نہ ہو، یعنی اوّل مؤاخذہ اور بدنامی، بعد میں معافی کی صورت کے بجائے اول ہی سے معافی فرما دیجئے، آپ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے، مگر اس عرض و معروض کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اس قابل بنا دیجئے کہ ہم یہ وعدہ حاصل کرنے کے مستحق ہو جائیں، اور پھر اس پر قائم رہیں، یعنی خاتمہ ایمان اور عمل صالح پر ہو۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم

پھر قبول کی ان کی دعا ان کے رب نے کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی

مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَ

تم میں سے مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک ہو پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور

أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا

نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے

لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

البتہ دور کروں گا میں ان سے برائیاں ان کی اور داخل کروں گا ان کو باغوں میں کہ بہتی ہیں ان کے

مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ

نیچے نہریں یہ بدلہ ہے اللہ کے ہاں سے اور اللہ کے ہاں ہے

حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي

اچھا بدلہ تجھ کو دھوکا نہ دے چلنا پھرنا کافروں کا

الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ

شہروں میں یہ فائدہ ہے تھوڑا سا پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت برا

الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي

ٹھکانا ہے لیکن جو لوگ ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہیں جن کے

مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَ

نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں مہمانی ہے اللہ کے ہاں سے اور

مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

جو اللہ کے ہاں ہے سو بہتر ہے نیک بختوں کے واسطے اور اہل کتاب میں بعضے وہ بھی ہیں

لَمَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ

جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور جو اترا تمہاری طرف اور جو اترا ان کی طرف

خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ

عاجزی کرتے ہیں اللہ کے آگے نہیں خریدتے اللہ کی آیتوں پر مول تھوڑا وہی ہیں

معارف و مسائل

ہجرت اور شہادت سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں مگر قرض وغیرہ حقوق العباد کی معافی کا وعدہ نہیں

لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ کے تحت خلاصۂ تفسیر میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ اللہ کے حقوق میں جو کوتاہیاں اور گناہ ہوئے وہ معاف ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں قرض اور دین کا مستثنیٰ ہونا بیان فرمایا ہے، اس کی معافی کا ضابطہ یہی ہے کہ خود یا اس کے وارث ان حقوق کو ادا کردیں یا معاف کرادیں، اور کسی شخص پر حق تعالیٰ خاص فضل فرمادیں اور صاحب حق کو اس سے راضی کر کے معاف کرادیں یہ اور بات ہے، اور بعض کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا وَاتَّقُوا

اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾

اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہونچو

ع ۲۰ / ۱۱

ربطِ آیات یہ سورۂ آل عمران کی آخری آیت ہے مسلمانوں کے لئے چند اہم وصیتوں پر مشتمل ہے، گویا پوری سورت کا خلاصہ ہے،

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تکالیف پر) خود صبر کرو اور جب کفر سے مقاتلہ ہو تو) مقاتلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقاتلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ حدود شرعیہ سے نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں لازمی اور ضروری اور بعض اوقات دنیا میں بھی)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں تین چیزوں کی وصیت مسلمانوں کو کی گئی ہے، صبر، مصابرہ، مرابطہ، اور چوتھی چیز تقویٰ کی ہے جو ان تینوں کے ساتھ لازم ہے۔

صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں نفس کو خلافِ طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے، جس کی تین قسمیں ہیں:

اوّل، صبر علی الطاعات، یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

دوسرے، صبر عن المعاصی، یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ نفس کیلئے کتنی ہی مرغوب و لذیذ ہوں نفس کو اس سے روکنا۔

تیسرے صبر علی المصائب، یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف و راحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

مصابرت اسی لفظ صبر سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا، مرابطہ، یہ لفظ ربط سے بنا ہے جس کے اصل معنی باندھنے کے ہیں، اور اسی وجہ سے رباط اور مرابطہ کے معنے گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لئے جاتے ہیں، قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے آیا ہے، وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ، اصطلاح قرآن و حدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے:

اوّل اسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لئے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے، تاکہ دشمن اسلامی سرحد کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

دوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی سے دوسری نماز کے منتظر رہیں، یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے فضائل بے شمار ہیں، ان میں سے چند یہاں لکھے جاتے ہیں:

رباط یعنی اسلامی سرحد کی حفاظت کا انتظام

اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں قیام کرنے کو رباط اور مرابطہ کہا جاتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کبھی جنگ کا خطرہ سامنے نہیں، سرحد مامون و محفوظ ہے، محض حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی نگرانی کرنا ہے، ایسی حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ آدمی وہاں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہنے بسنے لگے، اور زمین کی کاشت وغیرہ سے اپنا معاش پیدا کرتا رہے، اس حالت میں اگر اس کی اصل نیت حفاظت سرحد کی ہے، رہنا بسنا اور کسب معاش اس کے تابع ہے تو اس شخص کو بھی رباط فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا، خواہ کبھی جنگ نہ کرنا پڑے، لیکن جس کی اصل نیت حفاظتِ سرحد نہ ہو بلکہ اپنا گذارہ ہی مقصد ہو خواہ اتفاقی طور پر سرحد کی حفاظت کی بھی نوبت آجائے یہ شخص مرابط فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سرحد پر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہے، ایسی حالت میں عورتوں بچوں کو وہاں رکھنا درست نہیں، صرف وہ لوگ رہیں جو دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں (قرطبی)۔

ان دونوں صورتوں میں رباط کے فضائل بے شمار ہیں، صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "اللہ کے راستہ میں ایک دن کا رباط تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" اور صحیح مسلم میں بروایت سلمانؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "ایک دن رات کا رباط ایک مہینہ کے مسلسل روزے اور تمام شب عبادت میں گذارنے سے بہتر ہے، اور اگر وہ اسی حال میں مرگیا تو اس کے عمل رباط کا روزانہ ثواب ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا اور وہ شیطان سے مامون و محفوظ رہے گا۔

اور ابوداؤد نے بروایت فضالہ بن عبید نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، بجز مرابط کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے اور قبر میں حساب و کتاب لینے والوں سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عمل رباط ہر صدقہ جاریہ سے بھی زیادہ افضل ہے، کیونکہ صدقہ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان، زمین یا تصانیف کتب یا وقف کی ہوئی کتابوں وغیرہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہو جائے تو ثواب بھی بند ہو جاتا ہے، مگر مرابط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک منقطع ہونے والا نہیں، وجہ یہ ہے کہ سب مسلمانوں کا اعمال صالحہ پر قائم رہنا جب ہی ممکن ہے جبکہ وہ دشمن کے حملوں سے محفوظ ہوں تو ایک مرابط کا عمل تمام مسلمانوں کے اعمال صالحہ کا سبب بنتا ہے، اسی لئے قیامت تک اس کے عمل رباط کا ثواب بھی جاری رہے گا، اور اس کے علاوہ وہ جتنے نیک کام دنیا میں کیا کرتا تھا، ان کا ثواب بھی بغیر عمل کئے ہمیشہ جاری رہے گا جیسا کہ ابن ماجہ میں باسناد صحیح حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مَنْ مَاتَ مُرَابِطًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَجْرٰی عَلَیْہِ اَجْرَ عَمَلِہِ الصَّالِحِ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُہٗ وَاَجْرٰی عَلَیْہِ رِزْقَہٗ وَاَمِنَ مِنَ الْفَتَّانِ وَبَعَثَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اٰمِنًا مِّنَ الْفَزَعِ (از تفسیر قرطبی)	"جو شخص حالت رباط میں مر جائے تو وہ جو کچھ عمل صالح دنیا میں کیا کرتا تھا ان سب اعمال کا ثواب برابر جاری رہے گا اور اس کا رزق بھی جاری رہے گا اور شیطان سے مامون رہے گا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسا مطمئن اٹھائیں گے کہ محشر کا کوئی خوف اس کو نہ ہوگا"

اس روایت میں جو فضائل مذکور ہیں ان میں شرط یہ ہے کہ حالتِ رباط ہی میں اس کی موت آجائے، مگر بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ بھی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ گیا تو یہ ثواب پھر بھی جاری رہے گا۔

حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی کمزور سرحد کی حفاظت اخلاص کے ساتھ ایک دن رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں کرنے کا ثواب سو سال کے مسلسل روزوں اور شب بیداری سے افضل ہے، اور رمضان میں ایک دن کا رباط افضل واعلیٰ ہے ایک ہزار سال کے صیام وقیام سے (اس لفظ میں راوی نے کچھ تردد کا اظہار کیا ہے) پھر فرمایا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح سالم اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹا دیا تو ایک ہزار سال تک اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا، اور نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور اس کے عملِ رباط کا اجر قیامت تک جاری رہے گا۔ (قرطبی)

نماز جماعت کی پابندی ایک نماز کے بعد دوسری کے انتظار میں رہنا بھی رباط فی سبیل اللہ ہے

ابو سلمہ بن عبدالرحمنؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چیز بتاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیں اور تمہارے درجات بلند کریں، وہ چیزیں یہ ہیں، وضو کو مکمل طور پر کرنا باوجودیکہ سردی یا کسی زخم درد وغیرہ کے سبب اعضاء وضو کا دھونا مشکل نظر آرہا ہو، اور مسجد کی طرف کثرت سے جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار، پھر فرمایا: ذٰلکم الرباط (یعنی یہی رباط فی سبیل اللہ ہے)

امام قرطبیؒ نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حدیث کی رُو سے امید ہے کہ جو شخص ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کی پابندی کرے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وہ ثواب عظیم عطا فرما دیں گے جو رباط فی سبیل اللہ کے لئے احادیث میں مذکور ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اوّل تو مسلمانوں کو صبر کا حکم دیا گیا ہے جو ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ ہو سکتا ہے، اور اس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے، دوسرا حکم مصابرہ کا جو کفار سے مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت ہوتا ہے، تیسرا حکم مرابطہ کا جو کفار سے مقابلہ کا احتمال اور خطرہ لاحق ہونے کے وقت ہوتا ہے، اور سب سے آخر میں تقویٰ کا حکم ہے جو ان سب کاموں کی رُوح اور قبولیتِ اعمال کا مدار ہے، یہ مجموعہ تقریباً تمام احکام شرعیہ پر حاوی ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں۔ وللہ الحمد اولہ وآخرہ ؛

سُورۂ آلِ عمران تمام شد

سُورَةُ النِّسَآءِ

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّسِتٌّ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعَةٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا،

سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ایک سو چھہتر آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا

اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور

اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے بیشک اللہ

عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ① وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا

تم پر نگہبان ہے، اور دے ڈالو یتیموں کو ان کا مال اور بدل نہ لو

الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ

برے مال کو اچھے مال سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ

اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ②

یہ ہے بڑا وبال

ربطِ آیات وسورت سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت تقویٰ پر ختم ہوئی ہے، اور یہ سورت بھی

حکم تقویٰ سے شروع ہو رہی ہے، پچھلی سورت میں بعض غزوات اور مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے اور غزوات کے سلسلہ میں مالِ غنیمت حاصل ہونے پر خیانت کی مذمت، اور بعض دیگر امور کا ذکر تھا، اس سورت کے شروع میں بندوں سے میل جول یعنی حقوق العباد سے متعلق احکام ہیں مثلاً یتیموں کے حقوق، رشتہ داروں اور بیویوں کے حقوق وغیرہ، لیکن حقوق کچھ تو ایسے ہیں جو قانون انضباط میں آسکتے ہیں، اور ان کی ادائیگی بزورِ قانون کرائی جا سکتی ہے، جیسے عام معاملات بیع و شراء، اجارہ و مزدوری کے ذریعہ پیدا ہونے والے حقوق جو باہمی معاہدات اور صلح کے ذریعہ ہو سکتے ہیں، اگر کوئی فریق مقررہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو بزور حکومت بھی دلوائے جا سکتے ہیں، لیکن اولاد، والدین، شوہر اور بیوی و یتیم بچے جو اپنی تحویل میں ہوں، اور دوسرے رشتہ داران کے باہمی حقوق جو ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی کا مدار، ادب، احترام، دلداری، ہمدردی اور قلبی خیرخواہی پر ہے، اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کانٹے میں تولی نہیں جا سکتیں، اور معاہدات کے ذریعہ بھی ان کی پوری تعیین مشکل ہے، لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے بجز خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، جس کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ تقویٰ کی طاقت حکومت اور قانون کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس سورت کو امر بالتقویٰ سے شروع فرمایا، اور ارشاد ہوا:

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ، یعنی اے لوگو! اپنے رب کی مخالفت سے ڈرو، اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو خطبۂ نکاح میں پڑھا کرتے تھے، اور خطبۂ نکاح میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ خطاب یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ کے ذریعہ شروع کیا گیا ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں، مرد ہوں یا عورتیں، اور نزولِ قرآن کے وقت موجود ہوں یا آئندہ قیامت تک پیدا ہوں پھر حکم اِتَّقُوْا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے لفظ رب کو اختیار کیا گیا جس میں امر تقویٰ کی علت اور حکمت کی طرف اشارہ فرما دیا کہ جو ذات تمہاری پرورش کی کفیل ہے اور جس کی شانِ ربوبیت کے مظاہر انسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس کی مخالفت اور سرکشی کس قدر خطرناک ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی رب تعالیٰ کی ایک خاص شان کا ذکر فرمایا کہ اس نے اپنی حکمت و رحمت سے تم سب کو پیدا کیا، پھر پیدا کرنے اور موجود کرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی تھیں ان میں سے ایک خاص صورت کو اختیار فرمایا کہ سب انسانوں کو ایک ہی انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کر کے سب کو اخوۃ و برادری کے ایک مضبوط رشتہ میں

باندھ دیا، علاوہ خوف خدا و آخرت کے اس رشتہ اخوۃ کا بھی یہی تقاضی ہے کہ باہمی ہمدردی و خیر خواہی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں، اور انسان انسان میں ذات پات کی اونچ نیچ، نسلی اور وطنی یا لسانی امتیازات کو شرافت و رذالت کا معیار نہ بنایا جائے، اس لئے فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً، یعنی اپنے اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے، آدمؑ سے اس طرح پیدا فرمایا کہ پہلے ان کی بیوی حضرت حوا کو پیدا کیا، پھر اس جوڑے کے ذریعہ بہت سے مرد اور عورتیں پیدا فرمائیں"۔

غرض یہ پوری آیت ان احکام کی تمہید ہے جو آگے اس سورت میں آنے والے ہیں، اس تمہید میں ایک طرف تو پروردگار عالم کے حقوق سامنے رکھ کر اس کی مخالفت سے روکا گیا، دوسری طرف تمام افراد انسانی کو ایک باپ کی اولاد بتلا کر ان میں اخوت اور باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو بیدار کیا گیا تاکہ باہمی قرابت داروں، یتیموں، اور زوجین کے درمیان باہمی حقوق کی ادائیگی دل سے ہو سکے۔

اس کے بعد پھر اِتَّقُوا اللّٰهَ کا دوبارہ اعلان کیا ایک خاص عنوان سے فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ یعنی "اللہ تعالیٰ سے ڈرو، جس کے نام پر تم دوسروں سے اپنے حقوق طلب کرتے ہو، اور جس کی قسمیں دے کر دوسروں سے اپنا مطلب نکالتے ہو"۔ آخر میں فرمایا: وَالْاَرْحَامَ، یعنی قرابت کے تعلقات خواہ باپ کی طرف سے ہوں خواہ ماں کی طرف سے، ان کی نگہداشت اور ادائیگی میں کوتاہی کرنے سے بچو۔

دوسری آیت میں یتیم بچوں کے حقوق کی تاکید اور ان کے اموال کی حفاظت کے احکام ہیں، مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:

خُلاصۂ تفسِیر

اے لوگو! اپنے پروردگار کی مخالفت سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا، (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی زوجہ حوا کو) پیدا کیا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلائیں اور پھر تم سے مکرر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو (جس مطالبہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ خدا سے ڈر کر میرا حق دیدے، سو جب دوسروں کو خدا کی مخالفت سے ڈرنے کو

ڈرتے ہو، تو معلوم ہوا کہ تم اس ڈرنے کو ضروری سمجھتے ہو تو تم بھی ڈرو) اور (اول تو تمام احکام الٰہیہ میں مخالفت سے بچنا اور ڈرنا ضروری ہے، لیکن اس مقام پر ایک حکم خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے،) قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب (کے حالات) کی اطلاع رکھتے ہیں (اگر مخالفت کروگے مستحق سزا ہوگے) اور جن بچوں کا باپ مرجائے ان کے (مملوک) مال انہی کو پہنچاتے رہو (یعنی انہی کے خرچ میں لگاتے رہو) اور (جب تک تمہارے قبضہ میں ہو) تم (ان کے مال میں شامل کرنے کے لئے ان کی) اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو (یعنی ایسا مت کرو کہ ان کی اچھی چیز تو نکال لی جائے اور بری چیز ان کے مال میں ملادی جاوے) اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں (کے رہنے) تک (البتہ جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے تو بقدر حق الخدمت اپنے گذارہ کے لئے ان کے مال سے لینا درست ہے جیسا آگے آوے گا، (وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا) ایسی کارروائی کرنا کہ بری چیز انکے مال میں شامل کردی یا بلا ضرورت انکے مال سے منتفع ہو) بڑا گناہ ہے (جس کی وعید آگے آیتی اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى میں ہے)۔

معارف و مسائل

یہ پہلا حکم ہے جو تمہید کے بعد ارشاد فرمایا گیا وہ تمام تعلقات قرابت کی نگہداشت پر حاوی اور شامل ہے۔

صلہ رحمی کے معنی اور اس کے فضائل: لفظ ارحام، رحم کی جمع ہے، رحم بچہ دانی کو کہتے ہیں جس میں ولادت سے پہلے ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، چونکہ ذریعہ قرابت یہ رحم ہی ہے، اس لئے اس سلسلے کے تعلقات وابستہ رکھنے کو صلہ رحمی اور رشتہ داری کی بنیاد پر جو فطری حقوق تعلقات پیدا ہوگئے، ان کی طرف سے بے توجہی و بے التفاتی برتنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

احادیث شریفہ میں صلہ رحمی پر بہت زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَأَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ (مشکوٰۃ، ص ۴۱۹)	"یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی پیدا ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔"

اس حدیث سے صلہ رحمی کے دو بڑے اہم فائدے معلوم ہوگئے، کہ آخرت کا ثواب تو ہے ہی، دنیا میں بھی صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق کی تنگی دور ہوتی ہے اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور میں حاضر ہوا تو آپ کے وہ مبارک کلمات جو سب سے پہلے میرے کانوں میں

پڑے ہوئے تھے، آپؐ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْأَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (مشکوٰۃ)

"لوگو ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کیا کرو، اللہ کی رضاجوئی کے لئے لوگوں کو کھانا کھلایا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، اور ایسے وقت میں نماز کی طرف سبقت کیا کرو جبکہ عام لوگ نیند کے مزے میں ہوں، یاد رکھو ان امور پر عمل کرکے تم حفاظت اور سلامتی کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے جنت میں پہنچ جاؤ گے"

ایک اور حدیث میں ذکر ہے کہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک باندی کو آزاد کر دیا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا:

لَوْ أَعْطَيْتِهَا أَخْوَالَكِ كَانَ أَعْظَمَ لِأَجْرِكِ (مشکوٰۃ ص ۱۷۱)

"اگر تم اپنے ماموں کو دیدیتیں تو زیادہ ثواب ہوتا"

اسلام میں غلام باندی کو آزاد کرنے کی بہت ترغیب ہے، اور اسے بہترین کار ثواب قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود صلہ رحمی کا مرتبہ اس سے بہر حال اعلیٰ ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت ہے، آپؐ نے فرمایا:

الصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۷۱)

"یعنی کسی محتاج کی مدد کرنا صرف صدقہ ہی ہے، اور اپنے کسی عزیز قریب کی مدد کرنا دو امروں پر مشتمل ہے، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی"

صرف مصرف کے تبدیل کرنے سے دو طرح کا ثواب مل جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں قطع رحمی کے حق میں جو شدید ترین وعیدیں روایاتِ حدیث میں مذکور ہیں اس کا اندازہ دو حدیثوں سے بخوبی ہو سکتا ہے، آپؐ کا ارشاد ہے:

(۱) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ (مشکوٰۃ، ص ۴۱۹)

"جو آدمی حقوقِ قرابت کی رعایت نہیں کرتا وہ جنت میں نہیں جائے گا"

(۲) لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلَى قَوْمٍ فِيهِ قَاطِعُ رَحِمٍ (مشکوٰۃ ص ۴۲۰)

"اس قوم پر اللہ کی رحمت نہیں اترتی جس میں کوئی قطع رحمی کرنے والا موجود ہو"

آخر میں پھر دلوں میں ادائے حقوق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے جو تمہارے دلوں اور

ارادوں سے باخبر ہے، اگر رسمی طور پر شرما شرمی بے دلی سے کوئی کام بھی کر دیا مگر دل میں جذبہ ایثار و خدمت نہ ہوا تو قابل قبول نہیں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی، کہ وہ سب پر ہمیشہ نگراں ہے، قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ قانون کو محض دنیا کی حکومتوں کے قانون کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ تربیت و شفقت کے انداز میں بیان کرتا ہے، قانون کے بیان کے ساتھ ساتھ ذہنوں اور دلوں کی تربیت بھی کرتا ہے۔

یتیموں کے حقوق اور ان کے اموال کی حفاظت

پہلی آیت میں مطلقاً قرابت کی حفاظت اور اس کے حقوق ادا کرنے کی تاکید عام انداز میں بیان فرمانے کے بعد دوسری آیت میں یتیموں کے اموال کی حفاظت کا حکم، اور ان میں کسی قسم کی خورد برد کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ یتیم بچے کا نگراں اور ولی عموماً اس کا کوئی رشتہ دار رہتا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی حق قرابت کی ادائیگی سے ہے۔

پہلے جملہ میں ارشاد ہے: وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یتیموں کے مال انہی کو پہنچاؤ، یتیم کے لفظی معنی اکیلے اور منفرد کے ہیں، اسی لئے جو موتی سیپ میں تنہا ایک ہو، اس کو دُرِّ یتیم کہا جاتا ہے، اصطلاح شرع میں اس بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے جس کا باپ مرگیا ہو، اور جانوروں میں اس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں مرگئی ہو، (قاموس) بالغ ہونے کے بعد شرعی اصطلاح میں اس کو یتیم نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں تصریح ہے لا یُتم بعد احتلام، یعنی بلوغ کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی (مشکوٰۃ شریف، ص ۲۱۴)

یتیم بچوں کی ملکیت میں اگر کچھ مال ہے جو اُن کو کسی نے ہبہ کیا ہو، یا کسی کی میراث میں ان کو پہنچ گیا ہو تو یتیم کے ساتھ اس کے مال کی حفاظت بھی اس شخص کے ذمہ ہے جو یتیم کا ولی ہے، خواہ اس ولی کا تقرر اس کے مرنے والے باپ نے خود کر دیا ہو، یا حکومت کی جانب سے کوئی ولی مقرر کیا گیا ہو، ساتھ ہی ولی میں یہ بھی لازم ہے کہ یتیم کے ضروری اخراجات تو اس کے مال سے پورے کرے، لیکن اس کا مال بالغ ہونے سے پہلے اس کے قبضہ میں نہ دے، کیونکہ وہ ناسمجھ بچہ ہے، کہیں ضائع کر دے گا، تو آیت کے اس جملے میں جو ارشاد فرمایا گیا کہ یتیموں کے مال ان کو پہنچا دو اس کی توضیح آگے پانچویں آیت میں آتی ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ان کے مال ان کو اس وقت پہنچاؤ جب دیکھ لو کہ وہ بالغ ہوگئے، اور ان کو اپنے نفع و نقصان اور بھلے بُرے کی تمیز پیدا ہوگئی۔

اس لئے اس آیت میں یتیموں کے اموال ان کو پہنچانے کا مطلب یہ ہوا کہ ان اموال کی حفاظت کرو، تاکہ اپنے وقت پر یہ مال اُن کو پہنچائے جاسکیں، اس کے علاوہ اس جملے میں

اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ولی یتیم کی ذمہ داری صرف اتنی سی نہیں ہے کہ یتیم کے مال کو خود نہ کھائے یا خود ضائع نہ کرے، بلکہ اس کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی حفاظت کرکے اس قابل بنائے کہ بالغ ہونے کے بعد اس کو مل سکے۔

دوسرے جملہ میں ارشاد ہے: وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ، یعنی اچھی چیز کا بُری چیز سے تبادلہ مت کرو، بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ یتیم کے مال کی تعداد تو محفوظ رکھتے تھے مگر اس میں جو اچھی چیز نظر آتی وہ خود لے لی اور اس کی جگہ اپنی خراب چیز رکھ دی، عمدہ بکری کے بدلہ میں لاغر بیمار بکری اس کے مال میں لگا دی، یا کھرے نقد کے بدلے میں کھوٹا رکھ دیا، یہ بھی چونکہ مال یتیم میں خیانت ہے اور ممکن تھا کہ کسی شخص کا نفس یہ حیلہ تراشے کہ ہم نے تو یتیم کا مال لیا نہیں بلکہ بدلا ہے، اس لئے قرآن کریم نے صراحۃً اس کی ممانعت فرما دی، اس ممانعت میں جس طرح یہ داخل ہے کہ خود اپنی خراب چیز دے کر اچھی چیز لے لیں، اسی طرح یہ بھی داخل ہے کہ کسی دوسرے شخص سے تبادلہ کا ایسا معاملہ کرلیں جس میں یتیم بچے کا نقصان ہو۔

تیسرے جملہ میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ، یعنی "یتیموں کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھا جاؤ" ظاہر ہے کہ اس کا مقصد تو یتیم کے مال کو ناجائز طور پر کھا جانے کی ممانعت ہے، خواہ اپنے مال میں ملا کر کھا جائے یا علیحدہ رکھ کر کھائے، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ یتیموں کا مال اپنے مال میں شامل رکھ، اس میں سے خود بھی کھایا یتیم کو بھی کھلا دیا، اس صورت میں جداگانہ حساب نہ ہونے کی وجہ سے ایک دیندار متبع شریعت کو بھی یہ دھوکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، اس لئے خاص طور سے اپنے اموال کے ساتھ ملا کر کھانے کی حرمت کا ذکر اور اس پر تنبیہ فرما دی کہ یا تو یتیم کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو اور علیحدہ خرچ کرو جس میں کسی زیادتی کا خطرہ ہی نہ رہے، یا پھر ملا کر رکھو تو ایسا حساب رکھو جس میں یہ یقین ہو کہ یتیم کا مال تمہارے ذاتی خرچ میں نہیں آیا، اس کی تشریح سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۷ میں گذر چکی ہے، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ

اس طرز بیان میں اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ یتیموں کے مال میں خورد برد کرنے والے عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس اپنے مال بھی موجود ہوتے ہیں، تو اس عنوان سے ان کو عار دلائی گئی کہ اپنا حلال مال موجود ہوتے ہوئے یتیموں کا مال حرام طور پر کھا جانا بڑی شرم کی بات ہے۔

آیت میں مال یتیم کے کھانے کی ممانعت کا ذکر ہے، اس لئے کہ مال کا سب سے بڑا اہم

وانہ کھانا ہے، لیکن محاورہ میں مال کے ہر تصرف کو کھانا بولا جاتا ہے، خواہ استعمال کر کے ہو یا کھا کر، قرآن کریم نے بھی اسی محاورے پر لَا تَاْکُلُوْٓا فرمایا ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف داخل ہے، لہٰذا یتیم کے مال کو کسی بھی طریقے سے ناجائز طور پر خرچ کرنا حرام ہوا۔

آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا لفظ حوب، بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما حبشی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں بڑا گناہ، عربی زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، معنی یہ ہوئے کہ مال یتیم میں کسی قسم کا ناجائز تصرف خواہ حفاظت کی کمی سے ہو یا خراب چیز کے بدلہ میں اچھی چیز لے کر ہو، یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کا مال کھانے سے ہو، بہرحال یہ بہت بڑا گناہ ہے، اور یتیم کے مال کو کھانے کی سخت وعید اس رکوع کے ختم پر آرہی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ
اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو عورتیں تم کو

مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا
خوش آویں دو دو تین تین چار چار پھر اگر ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے

فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳
تو ایک ہی نکاح کرو یا لونڈی جو اپنا مال ہے اس میں امید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو گے

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیت: ما قبل کی آیت میں یتامیٰ کی حق تلفی کی ممانعت تھی کہ اولیاء کو ان کے اموال خرد برد کرنا حرام ہے، اس آیت میں بھی ایک دوسرے عنوان سے اس حکم کا اعادہ ہے کہ جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہیں ان سے اس خیال سے نکاح نہ کریں کہ اپنے اختیار کی لڑکی ہے، جتنا چاہیں گے مہر مقرر کر دیں گے، اور جو اموال ان کی ملک میں ہیں وہ بھی اپنے قبضہ میں آجائیں گے۔

غرض قرآن کریم کی اس آیت نے صراحۃً بتلا دیا کہ مالِ یتیم پر قبضہ کرنے کا ہر حیلہ اور بہانہ ناجائز ہے، اور اولیاء کا فرض ہے کہ وہ دیانتداری سے اُن کے حقوق کی نگہداشت کریں، چنانچہ فرمایا:

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال (غالب) ہو، (اور یقین ہو تو بدرجہ اولیٰ) کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں (بابت ان کے مہر کے) انصاف (کی رعایت) نہ کر سکو گے تو (ان سے نکاح مت کرو بلکہ) اور (دوسری) عورتوں سے جو تم کو (اپنی کسی مصلحت کے اعتبار سے) پسند ہوں نکاح کر لو (کیونکہ وہ مجبور نہیں آزادی سے اپنی رضامندی ظاہر کر سکتی ہیں، اور یہ نکاح اس قید کے ساتھ ہو کہ جو ایک عورت سے زیادہ کرنا چاہے تو ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو، ایک صورت یہ کہ ایک ایک مرد) دو دو عورتوں سے (نکاح کر لے، اور (دوسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) تین تین عورتوں سے (نکاح کر لے) اور (تیسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) چار چار عورتوں سے (نکاح کر لے) پس اگر تم کو (غالب) احتمال اس کا ہو کہ (کئی بیبیاں کر کے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بی بی کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو (یا اگر دیکھو کہ ایک کے حقوق بھی ادا نہ ہوں گے تو) جو لونڈی (حسب قاعدۂ شرعیہ) تمہاری ملک میں ہو وہی سہی اس امر مذکور میں (یعنی ایک بی بی کے رکھنے یا صرف لونڈی پر بس کرنے میں) زیادتی (و بے انصافی) نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے (کیونکہ ایک صورت میں تو کوئی تعداد نہیں جس میں برابری کرنا پڑے، دوسری صورت میں بی بی کے حقوق سے بھی کم حقوق ہیں، مثلاً مہر نہیں، صحبت کا حق نہیں تو اندیشہ اور کم ہے)

معارف و مسائل

یتیم لڑکیوں کی حق تلفی کا انسداد زمانۂ جاہلیت میں جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جو شکل و صورت سے بھی اچھی ہوتیں یا ان کی ملکیت میں کوئی مال جائیداد ہوتی تو ان کے اولیاء ایسا کرتے تھے کہ خود ان سے نکاح کرتے یا اپنی اولاد سے ان کا نکاح کر دیتے تھے، جو چاہا کم سے کم مہر مقرر کر دیا، اور جس طرح چاہا ان کو رکھا، کیونکہ وہی ان کے ولی اور نگراں ہوتے تھے، ان کا باپ موجود نہ ہوتا تھا جو ان کے حقوق کی پوری نگرانی کر سکتا، اور ان کی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر نظر اور فلاح و بہبود کا مکمل انتظام کر کے ان کا نکاح کر دیتا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص کی ولایت میں ایک یتیم لڑکی تھی، اور اس کا ایک باغ تھا جس میں یہ لڑکی بھی شریک تھی، اس شخص نے اس یتیم لڑکی سے خود اپنا نکاح کر لیا، اور بجائے اس کے کہ اپنے پاس سے مہر وغیرہ دیتا اس کے باغ کا حصہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا

مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ، یعنی اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے خود اپنا نکاح کرنے میں تم انصاف پر قائم نہ رہو گے، بلکہ ان کی حق تلفی ہو جائے گی، تو تمہارے لئے دوسری عورتیں بہت ہیں، ان میں جو تمہارے لئے حلال اور پسند ہیں، ان سے نکاح کر لو۔

نکاح نابالغ کا مسئلہ

اس آیت میں یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، اور اصطلاحِ شرع میں یتیم اسی لڑکی یا لڑکے کو کہا جاتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو، اس لئے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یتیم لڑکی کے ولی کو یہ بھی اختیار ہے کہ بحالتِ صغرسنی بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کر دے، البتہ لڑکی کی مصلحت اور آئندہ فلاح و بہبود پیش نظر رہے، ایسا نہ ہو جیسے بہت سی برادریوں میں رائج ہے، کہ بڑی لڑکی کا نکاح چھوٹے بچے سے کر دیا عمروں کا تناسب نہ دیکھا، یا لڑکے کے حالات و عادات کا جائزہ نہ لیا ویسے ہی نکاح کر دیا۔

اور وہ بالغ لڑکیاں جن کے باپ مر چکے ہیں، اگرچہ بالغ ہو جانے کی بنار پر خود مختار ہیں لیکن لڑکیاں شرم و حیا کی بنار پر عادۃً بالغ ہونے کے بعد بھی اپنے نکاح کے معاملہ میں خود کچھ نہیں بولتیں، اولیار اور وارث جو کچھ کر دیں اسی کو قبول کر لیتی ہیں، اس لئے ان کے اولیار پر بھی لازم ہے کہ ان کی حق تلفی سے پرہیز کریں۔

بہر حال اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے ازدواجی حقوق کی پوری نگہداشت کا حکم مذکور ہے، مگر عام حکومتوں کے قانون کی طرح اس کے نافذ کرنے کی ذمہ داری براہِ راست حکومت پر ڈالنے کے بجائے خود عوام کو خدا تعالیٰ کے خوف کا حوالہ دے کر حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں اس میں بے انصافی کا خطرہ ہو تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی کے خیال کو چھوڑ دو، دوسری عورتیں تمہارے لئے بہت ہیں، اُن سے نکاح کر لو۔

ساتھ ہی ذمہ دارانِ حکومت کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس کی نگرانی کریں، کسی جگہ حق تلفی ہوتی نظر آئے تو بزورِ قانون حقوق ادا کرائیں۔

قرآن میں تعددِ ازدواج اور اسلام سے پہلے اقوامِ عالم میں اس کا رواج

ایک مرد کے لئے متعدد بیبیاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان، ایران، مصر، بابل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرتِ ازدواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعددِ ازدواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی، تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اب وہاں کے اہلِ بصیرت حکمار خود اس کو رواج دینے کے حق میں ہیں، مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعددِ ازدواج کی حمایت

میں انجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے :

"ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں، بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے"

اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور ایزک ٹیلر نے پُرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے، اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدد ازدواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

کرشن جو ہندؤوں میں واجب التعظیم اوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیبیاں تھیں؛ جو مذہب اور قانون عفت و عصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زناکاری کا انسداد ضروری جانتا ہو اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازدواج کی اجازت دے، اس میں زناکاری کا بھی انسداد ہے، اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے، اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی افراط ہوگی یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ان میں زنا کی کثرت ہے یورپین اقوام کو دیکھ لیجئے ان کے یہاں تعدد ازدواج پر تو پابندی ہے، مگر بطور دوستانہ جتنی بھی عورتوں سے مرد زنا کرتا ہے اس کی پوری اجازت ہے، کیا تماشہ ہے کہ نکاح ممنوع اور زنا جائز۔

غرض اسلام سے پہلے کثرتِ ازدواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود و نصاریٰ نے، نہ ہندؤوں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی، لیکن اس غیر محدود کثرتِ ازدواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اول اول تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے، مگر پھر ان کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، اور یہ عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں، پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان میں عدل و مساوات کا کہیں نام و نشان نہ تھا جس سے دلبستگی ہوئی اس کو نوازا گیا جس سے رخ پھر گیا اس کے کسی حق کی پرواہ نہیں۔

اسلام نے تعدد ازدواج پر ضروری پابندی لگائی اور عدل و مساوات کا قانون جاری کیا

قرآن نے عام معاشرہ کے اس ظلم عظیم کو روکا، تعدد ازدواج پر پابندی لگائی، اور چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا، اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر رہیں ان میں مساوات حقوق کا نہایت مؤکد حکم اور اس کی خلاف ورزی پر وعید شدید سنائی، آیتِ مذکورہ میں ارشاد ہوا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ،

یعنی "جو حلال عورتیں تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کر سکتے ہو، دو دو تین تین، چار چار"۔
آیت میں مَا طَابَ کا لفظ آیا ہے، حسن بصریؒ، ابن جبیرؒ اور ابن مالکؒ نے مَا طَابَ کی تفسیر مَا حَلَّ سے فرمائی ہے، یعنی جو عورتیں تمھارے لئے حلال ہیں۔
اور بعض حضرات نے مَا طَابَ کے لفظی معنی کے اعتبار سے "پسندیدہ" کا ترجمہ کیا ہے، مگر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، یہ مراد ہو سکتی ہے کہ جو عورتیں طبعی طور پر تمھیں پسند ہوں اور تمھارے لئے شرعاً حلال بھی ہوں۔
اس آیت میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی گئی کہ ایک سے زائد دو، تین، چار، عورتیں نکاح میں جمع کر سکتے ہیں، دوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کی جا سکتیں۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان نے اس قرآنی تخصیص اور پابندی کو اور زیادہ واضح کر دیا، اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص غیلان بن اسلمہ ثقفیؓ مسلمان ہوئے، اس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ بھی مسلمان ہوگئی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قرآنی کے مطابق ان کو حکم دیا کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کر لیں، باقی کو طلاق دے کر آزاد کر دیں، غیلان بن اسلمہ ثقفیؓ نے حکم کے مطابق چار عورتیں رکھ کر باقی سے علیحدگی اختیار کر لی (مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۴ بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ) مسند احمد میں اسی روایت کے تکملہ میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے، اس کا ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس کا تعلق بھی نسوانی حقوق سے ہے، وہ یہ کہ:
غیلان بن اسلمہ نے حکم شرعی کے مطابق چار عورتیں رکھ لی تھیں، مگر فاروق اعظمؓ کے زمانۂ خلافت میں انھوں نے ان کو بھی طلاق دیدی، اور اپنا کل مال و سامان اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کو حاضر کر کے فرمایا کہ تم نے ان عورتوں کو اپنی میراث سے محروم کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے جو سراسر ظلم ہے، اس لئے فوراً ان کی طلاق سے رجعت کرو اور اپنا مال بیٹوں سے واپس لو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔
قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں، میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو باقی کو طلاق دیدو۔ (ابو داؤد، ص ۳۰۴)
اور مسند امام شافعیؒ میں نوفل بن معاویہؓ دیلمی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ جب مسلمان

ہوئے تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی ایک عورت کو طلاق دینے کا حکم دیا، یہ واقعہ مشکوٰۃ شریف (ص ۲۷۴) میں بھی شرح السنۃ سے نقل کیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے اس تعامل سے آیتِ قرآنی کی مراد بالکل واضح ہوگئی کہ چار سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعددِ ازدواج

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سراپا رحمت و برکت ہے، تبلیغ احکام اور تزکیۂ نفوس اور ابلاغ قرآن آپؐ کا سب سے بڑا مقصدِ بعثت تھا، آپؐ نے اسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دنیا میں پھیلا دیا، یعنی آپؐ بتاتے بھی تھے اور کرتے بھی تھے، پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبیؐ کی رہبری کی ضرورت نہ ہو، نماز باجماعت سے لے کر بیویوں کے تعلقات، آل و اولاد کی پرورش اور پاخانہ پیشاب اور طہارت تک کے بارے میں آپؐ کی قولی اور فعلی ہدایات سے کتب حدیث بھرپور ہیں، اندرون خانہ کیا کیا کام کیا، بیویوں سے کیسے میل جول رکھا، اور گھر میں آکر مسائل پوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا، اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ازواجِ مطہراتؓ کے ذریعہ ہی امت کو رہنمائی ملی ہے، تعلیم و تبلیغ کی دینی ضرورت کے پیشِ نظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کثرتِ ازدواج ایک ضروری امر تھا، صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے احکام و مسائل، اخلاق و آداب اور سیرت نبوی سے متعلق دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں جو کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں، حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد تین سو اٹھتر تک پہنچی ہوئی ہے، حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین (ص ۹ ج ۱) میں لکھا ہے کہ اگر حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کئے جائیں جو انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیئے ہیں، تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا روایت و درایت اور فقہ و فتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلسل اڑتالیسؒ سال تک علمِ دین پھیلایا۔

بطور مثال دو مقدس بیویوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے، دیگر ازواج مطہراتؓ کی روایات بھی مجموعی حیثیت سے کافی تعداد میں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تبلیغ کا نفع صرف ازواجِ مطہراتؓ سے پہنچا۔

انبیاءِ اسلام کے مقاصد بلند، اور پورے عالم کی انفرادی و اجتماعی، خانگی اور ملکی اصلاحات کی فکروں کو دنیا کے شہوت پرست انسان کیا جانیں، وہ تو سب کو اپنے اوپر قیاس کرسکتے ہیں

اسی کے نتیجے میں کئی صدی سے یورپ کے ملحدین اور مستشرقین نے اپنی ہٹ دھرمی سے فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کو ایک خاص جنسی اور نفسانی خواہش کی پیداوار قرار دیا ہے اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ہوشمند منصف مزاج کبھی بھی آپ کی کثرت ازدواج کو اس پر محمول نہیں کر سکتا۔

آپ کی معصوم زندگی قریش مکہ کے سامنے اس طرح گذری کہ پچیس سال کی عمر میں ایک سن رسیدہ صاحب اولاد بیوہ (جس کے دو شوہر فوت ہو چکے تھے) سے عقد کر کے عمر کے پچیس سال تک انہی کے ساتھ گذارہ کیا، وہ بھی اس طرح کہ مہینہ مہینہ گھر چھوڑ کر غار حرا میں مشغول عبادت رہتے تھے، دوسرے نکاح جتنے ہوئے پچاس سالہ عمر شریف کے بعد ہوئے، یہ پچاس سالہ زندگی اور عنفوان شباب کا سارا وقت اہل مکہ کی نظروں کے سامنے تھا، کبھی کسی دشمن کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں ملا جو تقویٰ وطہارت کو مشکوک کر سکے، آپ کے دشمنوں نے آپ پر ساحر، شاعر، مجنون، کذاب، مفتری جیسے الزامات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن آپ کی معصوم زندگی پر کوئی ایسا حرف کہنے کی جرأت نہیں ہوئی جس کا تعلق جنسی اور نفسانی جذبات کی بے راہ روی سے ہو۔

ان حالات میں کیا یہ بات غور طلب نہیں ہے کہ جوانی کے پچاس سال اس زہد وتقویٰ اور لذائذ دنیا سے یکسوئی میں گذارنے کے بعد وہ کیا داعیہ تھا جس نے آخر عمر میں آپ کو متعدد نکاحوں پر مجبور کیا، اگر دل میں ذرا سا بھی انصاف ہو تو ان متعدد نکاحوں کی وجہ اس کے سوا نہیں بتلائی جا سکتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اب اس کثرت ازدواج کی حقیقت کو بھی سن لیجئے، کہ کس طرح وجود میں آئی۔

پچیس سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر شریف ہونے تک تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ رہیں، ان کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا، مگر حضرت سودہؓ تو آپ کے گھر تشریف لے آئیں اور حضرت عائشہؓ صغر سنی کی وجہ سے اپنے والد کے گھر ہی رہیں، پھر چند سال کے بعد ۲ھ میں مدینہ منورہ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی، اس وقت آپ کی عمر چوّن سال ہو چکی ہے، اور دو بیویاں اس عمر میں آ کر جمع ہوئی ہیں، یہاں سے تعدد ازدواج کا معاملہ شروع ہوا، اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، پھر کچھ ماہ بعد حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اور صرف اٹھارہ ماہ آپ کے نکاح میں رہ کر وفات پائی، ایک قول کے مطابق تین ماہ آپ کے نکاح میں زندہ رہیں، پھر ۴ھ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

سے نکاح ہوا، پھر ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون سال ہو چکی تھی، اور اتنی بڑی عمر میں آکر چار بیویاں جمع ہوئیں حالانکہ امت کو جس وقت چار بیویوں کی اجازت ملی تھی اس وقت ہی آپ کم از کم چار نکاح کر سکتے تھے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، ان کے بعد ۶ھ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے، اور ۷ھ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے، اور پھر ۷ھ میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

خُلاصہ: یہ کہ پچپن سال کی عمر تک آپ نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گذارا کیا، یعنی پچیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گذارے، پھر اٹھاون سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں، اور باقی ازواج مطہرات دو تین سال کے عرصہ میں حرم نبوت میں آئیں۔

اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان سب بیویوں میں صرف ایک ہی عورت ایسی تھیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا، یعنی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان کے علاوہ باقی سب ازواج مطہرات بیوہ تھیں جن میں بعض کے دو دو شوہر پہلے گذر چکے تھے، اور یہ تعداد بھی آخر عمر میں آکر جمع ہوئی ہے۔

حضرات صحابہؓ مرد اور عورت سب آپ پر جاں نثار تھے، اگر آپ چاہتے تو سب بیویاں کنواری جمع کر لیتے، بلکہ ہر ایک کو دو دو مہینہ کے بعد بدلنے کا بھی موقع تھا، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

نیز یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق نبی تھے، نبی صاحب ہوا وہوس نہیں ہوتا، جو کچھ کرتا ہے اذن الٰہی سے کرتا ہے، نبی ماننے کے بعد ہر اعتراض ختم ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص آپ کو نبی ہی نہ مانے اور یہ الزام لگائے کہ آپ نے محض شہوت پرستی کی وجہ سے اپنے لئے کثرت ازدواج کو جائز رکھا تھا تو اس شخص سے کہا جائے گا کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنے حق میں کثرت ازدواج کے معاملہ میں اس پابندی کا اعلان کیوں فرماتے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ میں موجود ہے، اپنے حق میں اس پابندی کا اعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا اپنے رب کے اذن سے کیا۔

تعدد ازدواج کی وجہ سے تعلیمی و تبلیغی فوائد جو امت کو حاصل ہوئے، اور جو احکام امت تک پہنچے اس کی جزئیات اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا احصاء دشوار ہے، کتب احادیث اس پر شاہد ہیں، البتہ بعض دیگر فوائد کی طرف یہاں ہم اشارہ کرتے ہیں۔

ل: عمر مبارک اٹھاون سال۔ [illegible] ۲/ ۲۲۶ھ [illegible] ۲۹ [illegible] عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں ۳ھ میں چار ازواج مطہرات آ گئی تھیں حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینب بنت خزیمہؓ، اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پچپن سال تھی۔ [illegible] ۲/ ۲/ ۲۲۶ھ

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر حضرت ابو سلمہؓ کی وفات کے بعد آپؐ نے اُن سے نکاح کر لیا تھا، وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپؐ کے گھر تشریف لائیں، اُن کے بچوں کی آپؐ نے پرورش کی، اور اپنے عمل سے بتا دیا کہ کس پیار و محبت سے سوتیلی اولاد کی پرورش کرنی چاہئے، آپؐ کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں، اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پرورش کا خانہ خالی رہ جاتا، ورنہ امت کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہ ملتی، ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پاتا تھا، ایک بار آپؐ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا، آپؐ نے فرمایا، سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ ۔ (اللہ کا نام لے کر کھا، داہنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا) (بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۶۳)

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہو کر آئی تھیں، دوسرے قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم میں آ گئیں، اور ثابت بن قیسؓ یا ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں ان کو لگا دیا گیا، لیکن انھوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کر لیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دیدوں گی مجھے آزاد کر دو، یہ معاملہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور مالی امداد چاہی، آپؐ نے فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتا دوں؟ وہ یہ کہ میں تمھاری طرف سے مال ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں، انھوں نے بخوشی منظور کر لیا، تب آپؐ نے اُن کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرما لیا، ان کی قوم کے سینکڑوں افراد حضرات صحابہؓ کی ملکیت میں آ چکے تھے، کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہو کر آئے تھے، جب صحابہؓ کو پتہ چلا کہ جویریہؓ آپؐ کے نکاح میں آ گئی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے پیش نظر سبؓ نے اپنے اپنے غلام باندی آزاد کر دیئے، سبحان اللہ! حضرات صحابہ کرامؓ کے ادب کی کیا شان تھی، اس جذبے کے پیش نظر کہ یہ لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال والے ہو گئے، ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں، سب کو آزاد کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے متعلق فرماتی ہیں۔

فَلَقَدْ اُعْتِقَ بِتَزْوِيْجِهٖ اِيَّاهَا
مِائَةُ اَهْلِ بَيْتٍ مِّنْ بَنِي الْمُصْطَلِقِ
فَمَا اَعْلَمُ امْرَأَةً اَعْظَمَ بَرَكَةً
عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہؓ سے نکاح کر لینے سے بنو المصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہوئی ہو۔"

حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتداءِ اسلام ہی میں کہ میں

اسلام قبول کیا تھا، اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کرکے قافلہ کے دوسرے افراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے، وہاں ان کا شوہر نصرانی ہوگیا، اور چند دن کے بعد مرگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے واسطہ سے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، جسے انھوں نے قبول کرلیا، اور وہیں حبشہ میں نجاشی ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کردیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت امّ حبیبہؓ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، اور حضرت ابوسفیان اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے، جس نے اسلام دشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا، اور وہ مسلمانوں کو اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے اور انھیں فنا کے گھاٹ اتار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جب ان کو اس نکاح کی اطلاع ہوئی تو بلا اختیار ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے. هُوَ الْفَحْلُ لَا يُجْدَعُ أَنْفُهٗ، (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوانمرد ہیں ان کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی) مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز ہیں ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں، ادھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور اُدھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی۔

غرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا، اور اسلام کے مقابلہ میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہوگئے، اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ، اسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کے مدبّر اور حکیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فائدہ کو ضرور پیشِ نظر رکھا ہوگا۔

یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں، ان کے علاوہ سیرت پر عبور رکھنے والے حضرات کو بہت کچھ حکمتیں آپؐ کے تعددِ ازدواج میں مل سکتی ہیں، اس سلسلے میں سیّدی حکیم الامت قدس سرہٗ کے رسالے "کثرتِ ازواج لصاحب المعراج" کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلائے ہوئے پُر فریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے، کیونکہ ان کے اس دامِ تزویر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام سے بے خبر ہیں اور اسلامیات کا علم مستشرقین ہی کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اگر متعدد بیویوں میں مساوات اور عدل پر قدرت نہ ہو تو صرف ایک بیوی پر اکتفاء کیا جائے

چار بیویوں تک کی اجازت دے کر فرمایا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ "یعنی اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا جو کنیز شرعی اصول کے مطابق تمہاری ملک ہو اس سے گذارہ کرلو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے جبکہ

شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کرسکے اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھی جائے، زمانۂ جاہلیت میں یہ ظلم عام تھا کہ ایک ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا تھا جس کا ذکر چند احادیث کے حوالے سے اس آیت کے ضمن میں پہلے گزرا ہے۔ اور بیویوں کے حقوق میں مساوات اور عدل کا مطلق خیال نہ تھا، جس کی طرف زیادہ میلان ہو گیا اس کو ہر حیثیت سے نوازنے اور خوش رکھنے کی فکر میں لگ گئے اور دوسری بیویوں کے حقوق نظر انداز کرڈالتے، قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا کہ اگر عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بیوی رکھو، یا کنیز سے گذارہ کرو، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مملوکہ کنیز جس کا ذکر آیت میں ہے اس کی خاص شرائط ہیں، جو عموماً آجکل مفقود ہیں، اس لئے اس زمانے میں کسی کو مملوکہ شرعی کنیز کہہ کر بے نکاح رکھ لینا حرام ہے، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے چار عورتیں تک نکاح میں رکھنے کی اجازت دیدی، اور اس حد کے اندر جو نکاح کئے جائیں گے وہ صحیح اور جائز ہوں گے، لیکن متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں ان میں عدل و مساوات قائم رکھنا واجب ہے، اور اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم ہے، اس لئے جب ایک سے زائد نکاح کا ارادہ کرو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو کہ سب کے حقوق عدل و مساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں، اگر یہ احتمال غالب ہو کہ عدل و مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو ایک سے زائد نکاح پر اقدام کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اقدام ہے اس سے باز رہنا چاہئے، اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چار سے زائد عورتوں سے کسی نے بیک وقت یعنی ایک ہی ایجاب و قبول میں نکاح کرلیا تو وہ نکاح سرے سے باطل ہے، کیونکہ چار سے زائد نکاح کا کسی کو حق نہیں، اور چار کے اندر جو نکاح کئے جائیں وہ نکاح تو بہرحال ہو جائیں گے، لیکن بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھی تو سخت گناہ ہوگا، اور جس کی حق تلفی ہو رہی ہو وہ قاضی کی عدالت میں دعویٰ کرکے اپنا حق وصول کرسکے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب بیویوں کے درمیان پوری مساوات و عدل کی سخت تاکید فرمائی ہے، اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں، اور خود اپنے عمل کے ذریعے بھی اس کو واضح فرمایا ہے، بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان معاملات میں بھی مساوات فرماتے تھے جن میں مساوات لازم نہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور انصاف نہ کرسکے تو وہ قیامت میں اس طرح

اٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۹)

البتہ یہ مساوات ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ میں برابری، شب باشی میں برابری، رہا وہ امر جو انسان کے اختیار میں نہیں مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہو جائے، تو اس غیر اختیاری معاملہ میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَآ اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَآ اَمْلِکُ	"یا اللہ یہ میری برابر والی تقسیم ہے اُن چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔"

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دوسرا کیسے قادر ہو سکتا ہے، اس لئے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ (۴: ۱۲۹)	"عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کر سکو گے۔"

جس میں بتلا دیا کہ میلان قلب اور محبت ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، اس میں برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیر اختیاری معاملہ کی اصلاح کے لئے بھی ارشاد فرمایا: فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ، یعنی "اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دوسری بیوی سے کلی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں"۔ اس آیت کے جملے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً میں جس عدل و مساوات کا بیان ہے یہ وہی امور اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں بے اعتدالی گناہ عظیم ہے، اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب مذکورہ بالا تفصیل و تشریح کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض لوگ سورۂ نساء کی آیت مذکورہ اور اس آیت (۴: ۱۲۹) کو ملانے سے ایک عجیب مغالطہ میں مبتلا ہو گئے، وہ یہ کہ آیت سورۂ نساء میں تو یہ حکم دیا گیا کہ اگر عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی نکاح پر بس کرو، اور اس دوسری آیت میں قطعی طور پر یہ واضح کر دیا کہ عدل و مساوات ہو ہی نہیں سکتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سے زائد نکاح مطلقاً جا

نذر ہے، لیکن ان کو سوچنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ جل شانہ کا مقصود ان تمام آیات میں ایک سے زائد نکاح کو روکنا ہی ہوتا تو بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، "یعنی نکاح کرو جو پسند آئیں تم کو عورتیں دو دو، تین تین، چار چار" اور پھر اس ارشاد کے کیا معنی کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا "یعنی اگر تمہیں بے انصافی کا خطرہ ہو" کیونکہ اس صورت میں تو بے انصافی یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔

اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی اور قولی بیان اور مسلسل تعامل بھی اس پر شاہد ہے کہ ایک سے زائد نکاح کو کسی وقت اسلام میں نہیں روکا گیا، بات وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ سورۂ نساء کی پہلی آیت میں امور اختیاریہ کے عدل و مساوات کا ذکر ہے، اور دوسری آیت میں محبت اور قلبی میلان میں عدم مساوات پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے، اس لئے دونوں آیتوں میں نہ کوئی تعارض ہے، اور نہ ان آیات میں مطلقاً تعدد ازدواج کی ممانعت کی کوئی دلیل ہے۔

آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا، اس آیت میں دو کلمے ہیں، ایک کلمہ "اَدْنٰى" یہ لفظ دُنُوٌّ سے مشتق ہے، جو قرب کے معنی میں ہے، اور دوسرا لفظ لَا تَعُوْلُوْا ہے، عَالَ يَعُوْلُ، مَالَ يَمِيْلُ کے معنی میں ہے جس کے معنی میلان کے ہیں، اور یہاں ناجائز میلان اور ظلم و جور کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ تم کو بتلایا گیا ہے (یعنی عدل نہ کر سکنے کی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرنا یا باندی کے ساتھ گذارہ کر لینا) یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تم ظلم کرنے سے بچ سکو گے، اور زیادتی و تعدی کے مواقع ختم ہو سکیں گے۔

یہاں ایک شبہ یہ ہے کہ جب ایک بیوی ہوگی تو ظلم کا بالکل کوئی موقع نہ ہوگا، پھر لفظ "اَدْنٰى" بڑھا کر یہ کیوں فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، بلکہ یہ فرمانا چاہئے کہ تم بالکل اس ظلم سے بچ جاؤ گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ "اَدْنٰى" بڑھا کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ ایک بیوی کو بھی ظلم و ستم کا تختہ بنائے رکھتے ہیں، اس لئے ظلم کا راستہ بند کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ظلم کا خطرہ کم ہو جائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ جاؤ گے، اور ظلم و جور سے مکمل رہائی اس وقت ہوگی جبکہ ایک بیوی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ رہے، اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کجی پر صبر کیا جائے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ

دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو

نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗـــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔـا ④

اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا

ربطِ آیات گذشتہ آیت میں کثرت ازدواج کی وجہ سے جو عورتوں پر ظلم ہوتا تھا اس کا ازالہ تھا اس آیت میں عورتوں کے ایک خاص حق کا ذکر ہے، اور اس میں جو ظلم واقع ہوتا تھا اس کا ازالہ ہے، اور یہ حق مہر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو (اور یہی حکم کل کا بھی ہے) تو (اس حالت میں) تم اس کو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔

معارف و مسائل

مہر کے متعلق عرب میں کئی قسم کے ظلم ہوتے تھے:

ایک یہ کہ مہر جو لڑکی کا حق ہے اس کو نہ دیا جاتا تھا، بلکہ لڑکی کے اولیاء شوہر سے وصول کرلیتے تھے، جو سراسر ظلم تھا، اس کو دفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ، یعنی "دو عورتوں کو ان کے مہر" اس کے مخاطب شوہر بھی ہیں کہ وہ اپنی بی بی کا مہر خود بی بی کو دیں اور دوسروں کو نہ دیں، اور لڑکیوں کے اولیاء بھی مخاطب ہیں کہ اگر لڑکیوں کے مہر اُن کو وصول ہوجائیں تو یہ لڑکیوں ہی کو دیدیں، ان کی اجازت کے بغیر اپنے تصرف میں نہ لائیں۔

دوسرا ظلم یہ بھی تھا کہ اگر کبھی کسی کو مہر دینا بھی پڑ گیا تو بہت تلخی کے ساتھ، بادلِ ناخواستہ تاوان سمجھ کر دیتے تھے، اس ظلم کا ازالہ آیتِ مذکورہ کے اس لفظ نحلہ سے فرمایا گیا، کیونکہ نحلہ لغت میں اس دینے کو کہتے ہیں جو خوش دلی کے ساتھ دیا جائے۔

غرض اس آیت میں یہ تعلیم فرمائی گئی کہ عورتوں کا مہر ایک حق واجب ہے، اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور جس طرح تمام حقوقِ واجبہ کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح مہر کو بھی سمجھنا چاہئے۔

تیسرا ظلم مہر کے بارے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ بہت سے شوہر یہ سمجھ کر کہ بیوی ان سے مجبور ہے مخالفت کر نہیں سکتی، دباؤ ڈال کر اس سے مہر معاف کرا لیتے تھے، جس سے درحقیقت معافی نہ ہوتی تھی، مگر وہ یہ سمجھ کر بیفکر ہو جاتے تھے کہ مہر معاف ہو گیا۔

اس ظلم کے انسداد کے لئے آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا: فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا، یعنی اگر وہ عورتیں خوش دلی کے ساتھ اپنے مہر کا کوئی حصہ تمہیں دیدیں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، تمہارے لئے مبارک ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جبر و اکراہ اور دباؤ کے ذریعہ معافی حاصل کرنا تو کوئی چیز نہیں، اس سے کچھ معاف نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ بالکل اپنے اختیار اور رضامندی سے کوئی حصہ مہر کا معاف کر دیں یا لینے کے بعد تمہیں واپس کر دیں تو وہ تمہارے لئے جائز ہے، اور درست ہے۔

یہ مظالم مذکورہ زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ تھے جن کا انسداد قرآن حکیم نے اس آیت میں فرمایا، افسوس ہے کہ جاہلیت کے زمانہ کی یہ باتیں مسلمانوں میں اب بھی موجود ہیں، مختلف قبیلوں اور علاقوں میں ان مظالم میں سے کوئی نہ کوئی ظلم ضرور پایا جاتا ہے، ان سب مظالم سے بچنا لازم ہے۔

آیت شریفہ میں جو یہ قید لگائی طیب نفس کی کہ خوشی سے تمہاری بیویاں اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دیدیں یا تم سے وصول ہی نہ کریں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اس میں ایک بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طیب نفس سے اجازت نہ ہو، بطور قاعدہ کلیہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَلَا لَا تَظْلِمُوا أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۵۵)	"خبردار ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سے سمجھو کہ کسی شخص کا مال دوسرے شخص کیلئے حلال نہیں جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو"

یہ ایک عظیم اصول ہے، اور اس کے تحت بہت سے جزئیات آجاتے ہیں۔

[illegible] چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنے والا نہیں ہے، اگر سوال کروں یا معاف نہ کروں تو بددلی یا بدمزگی پیدا ہوگی، اس لئے بادل ناخواستہ معاف کر دیتی ہیں، اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں، سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ صحیح معنی میں طیب نفس سے معاف کرنے کا پتہ اُس صورت میں چل سکتا ہے کہ مہر کی رقم بیوی کے حوالہ کر دی جائے اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے دیدے، یہی طیب نفس بہنوں اور بیٹیوں کی

میراث میں بھی حصہ لینا چاہتے، اگر یہ ہوتا ہے کہ ماں یا باپ کے فوت ہوجانے پر لڑکے ہی پورے مال پر قبضہ جما لیتے ہیں، لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے، اگر کسی کو بہت دینداری کا خیال ہوا تو بہنوں سے معافی مانگ لیتا ہے، وہ چونکہ یہ سمجھتی ہیں کہ حصہ تو ملنے والا نہیں اس لئے اپنی مرضی کے خلاف معاف کرنے کو کہہ دیتی ہیں، پھر باپ کی وفات پر اس کی بیوی کا حصہ بھی نہیں دیا جاتا، خصوصاً سوتیلی ماں کو تو دیتے ہی نہیں، یہ سب حقوق دبا لینا ہے، اگر کوئی طیب نفس سے معاف کرے تو معاف ہوسکتا ہے جس کی علامت اوپر گذر چکی۔

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلہ میں طیب نفس کا ذکر ہے طیب قلب نہیں فرمایا، اس لئے کہ کسی کا مال حلال ہونے کے لئے اس کے دل کی خوشی کافی نہیں، جو لوگ رشوت یا سود دیتے ہیں بہت سے دنیاوی منافع سوچ کر اور وقتی طور پر آمدنی کا حساب لگا کر خرچ کر دیتے ہیں مگر یہ خوشی معتبر نہیں، اگر نفس سے پوچھا جائے تو وہ اس خرچہ پر قطعاً راضی نہ ہوگا، اسی وجہ سے طیب نفس کو شرط قرار دیا گیا۔

مساجد و مدارس یا اور کسی ضرورت کے لئے اگر چندہ کیا جائے اس میں بھی دینے والے کے طیب نفس کا خیال رکھنا لازم ہے، زبردستی یا چودھری، سرداری وغیرہ کے دباؤ سے اگر کوئی شخص چندہ دے اور طیب نفس نہ ہو تو اس چندہ کو کام میں لگانا حلال نہیں، بلکہ اس کو واپس کیا جائے گا۔

آیت میں جو لفظ صَدُقٰت آیا ہے صدقۃ (بالفتح الصاد وضم الدال) کی جمع ہے، صَدُقَۃ اور صَداق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے، ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: وَسُمِّیَ بِہٖ لِاَنَّہٗ یَظْهَرُ بِہٖ صِدْقُ مَیْلِ الرَّجُلِ اِلَی الْمَرْاَۃِ، یعنی مہر کو صَداق اور صَدُقہ اس لئے کہتے ہیں کہ صدق کے معنی سچ کے ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس مناسبت سے مہر کو صَداق کہنے لگے۔

هَنِیْٓـًٔا اور مَرِیْٓـًٔا دونوں فعیل کے وزن پر صفت کے لفظ ہیں، هَنِیْٓـًٔا (من هَنَأَ وَهَنُؤَ هَنَاءَۃً) لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت و تکلیف کے بغیر حاصل ہوجائے، جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی خوشگوار طعام کے ہوتے ہیں، یعنی ایسا طعام جو کسی مشقت کے بغیر حلق سے اتر جائے، اور آسانی سے ہضم ہو کر جزو بدن بن جائے۔

مَرِیْٓـًٔا (من مرأ الطعام فهو مرئ ای هنیٔ) کا لفظ بھی مذکورہ معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، (قاموس) غرض دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، اسی وجہ سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ "خوشگوار" کے لفظ سے کیا ہے اور حضرت شاہ عبدالقادر نے "رچتا پچتا" کے الفاظ استعمال کئے ہیں

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۤءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ
اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گذران کا سبب اور ان کو

فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى
اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو اور کہو ان سے بات معقول ۔ اور سدھاتے رہو یتیموں کو

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا
جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کردو

اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ
ان کے مال ان کا اور کھا نہ جاؤ یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور حاجت سے پہلے کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں

وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ
اور جس کو حاجت نہ ہو تو مال یتیم سے بچتا رہے اور جو کوئی محتاج ہو تو کھاوے موافق

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا
دستور کے پھر جب ان کو حوالہ کرو ان کے مال تو گواہ کرلو

عَلَیْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝۶
اس پر اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو۔

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں یتیموں کے مال ان کو سپرد کر دینے اور عورتوں کے مہر ان کو ادا کرنے کا حکم گذر چکا ہے، جس سے بظاہر یہ مستفاد ہو سکتا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا مال بہر حال ان کے حوالہ کر دینا چاہئے، خواہ ان کو معاملات کا سلیقہ بھی نہ ہو، اور وہ اموال کی حفاظت پر بھی قادر نہ ہوں، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ان آیات میں فرمایا ہے کہ کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کرو اور ان کی جانچ کرتے رہو، جب اموال کی حفاظت اور ان کے مصارف کی سوجھ بوجھ ان کے اندر محسوس ہونے لگے تو اموال ان کے سپرد کردو۔

خُلاصۂ تفسیر

(اور اگر یتیم بالغ ہو جائیں جس کا مقتضیٰ مال کا سپرد کر دینا ہے جیسا آگے آتا ہے لیکن کم عقل ہوں تو) تم (ان) کم عقلوں کو اپنے (یعنی ان کے) وہ مال مت دو جن کو خدا تعالیٰ نے

(ایسے کام کا بہید کیا ہے کہ ان کو تمہارے (رہنے کے) لئے مایۂ زندگی بنایا ہے (مطلب یہ کہ مال قدر کی چیز ہے، ان کو ابھی مت دو کہ بے قدری کرکے اڑا دیں گے)، اور ان مالوں میں (سے) ان کو کھلاتے رہو پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہتے رہو (یعنی ان کو تسلی کرتے رہو کہ مال تمہارا ہے، تمہاری خیرخواہی کی وجہ سے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا، ذرا سمجھدار ہو جاؤ گے تو تم ہی کو دیدیا جائے گا) اور (جب مال سپرد کرنے کے لئے ہوشیاری دیکھنا ضروری ہے تو) تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری و تمیزداری کی باتوں میں) آزما لیا کرو (کیونکہ بالغ ہونے کا وقت تو سپردگی مال کا وقت ہے، تو آزمائش پہلے سے چاہئے، مثلاً کچھ کچھ سودا سلف اس سے منگا لیا، اور دیکھا کہ کیسے سلیقہ سے خرید کر لائے، یا کوئی چیز فروخت کی دیدی، اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا) یہاں تک کہ (ان کو آزمایا جائے، کہ) جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جاویں (یعنی بالغ ہو جاویں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر (بعد بلوغ و آزمائش)، اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت و رعایت مصالح مال کا سلیقہ اور انتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو، (اور اگر ہنوز سلیقہ یا انتظام نہ معلوم ہو تو چندے اور حوالہ نہ کیا جائے) اور ان اموال (یتامیٰ) کو ضرورت سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جاویں گے (پھر ان کو حوالہ کرنا پڑے گا) جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو اور (اگر اس طرح نہ اڑا دیں، بلکہ تھوڑا کھانا چاہیں تو اس کا یہ حکم ہے کہ) جو شخص (اس مال سے) مستغنی ہو (یعنی اس کے پاس بھی بقدر کفایت موجود ہے گو صاحب نصاب نہ ہو) سو وہ تو اپنے کو بالکل (تھوڑا کھانے سے بھی) بچائے، اور جو شخص حاجتمند ہو تو وہ مناسب مقدار سے (یعنی جس میں حاجات ضروریہ رفع ہو جاویں) کھالے (برت لے) پھر جب (بعد وجود شرائط یعنی بلوغ و رشد مذکور کے) ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے اموال ان کو دیدینے) پر گواہ بھی کر لیا کرو، (شاید کسی وقت کچھ اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آویں) اور (یوں تو) اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والا کافی ہے (اگر خیانت نہ کی ہو تو گواہوں کا نہ ہونا بھی مضر نہیں، کیونکہ اصل حساب جن کے متعلق ہے وہ تو اس کی صفائی جانتے ہیں اور اگر خیانت کی ہے تو گواہوں کا ہونا کوئی نافع نہیں، کیونکہ جن سے حساب کا سابقہ ہے وہ اس کا ملوث ہونا جانتے ہیں، صرف ظاہری انتظام کے لئے گواہوں کا ہونا مصلحت ہے)

معارف و مسائل

مال سرمایۂ زندگی ہے اور اس کی حفاظت لازمی ہے

اس آیت میں ایک طرف تو مال کی اہمیت اور انسانی معاش میں اس کا بڑا دخل ہونا بیان فرمایا، اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا، دوسری طرف حفاظتِ اموال کے متعلق ایک عام کوتاہی کی اصلاح فرمائی گئی، وہ یہ کہ بہت سے آدمی طبعی محبت سے مغلوب ہو کر ناتجربہ کار نابالغ بچوں اور ناواقف عورتوں کو اپنے اموال حوالہ کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ مال کی بربادی اور بہت جلد افلاس و تنگدستی ہوتی ہے۔

عورتوں بچوں اور کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کئے جائیں

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ اپنا پورا مال کم عقل بچوں اور عورتوں کے سپرد کر کے خود ان کے محتاج نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوام اور منتظم بنایا ہے، تم مال کو خود اپنی حفاظت میں رکھ کر بقدر ضرورت ان کے کھانے پہننے پر خرچ کرتے رہو اور اگر وہ مال کو اپنے قبضہ میں لینے کا مطالبہ بھی کریں تو ان کو معقول بات کہہ کر سمجھا دو جس میں دل شکنی بھی نہ ہو اور مال بھی ضائع نہ ہونے پائے، مثلاً یہ کہہ دو کہ یہ سب تمہارے ہی لئے رکھا ہے، ذرا تم ہوشیار ہو جاؤ گے تو تمہیں دیدیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی اس تفسیر پر آیت کا مفہوم ان سب عورتوں، بچوں اور کم عقل ناتجربہ کار لوگوں کو شامل ہے جن کو مال سپرد کر دینے پر مال میں نقصان کا خطرہ ہے، خواہ وہ اپنے بچے ہوں یا یتیم بچے، اور خواہ وہ مال ان بچوں اور یتیموں کا اپنا ہو یا ولی کا ہو — یہی تفسیر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بھی منقول ہے، اور امام تفسیر ابن جریر طبریؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

پچھلی اور اگلی آیتوں کا سیاق اگرچہ اس حکم کو بھی یتیم بچوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا رجحان پیدا کر سکتا ہے، لیکن الفاظ کا عموم اپنی جگہ ہے، جس میں یتیم اور غیر یتیم سب بچے داخل ہیں اور شاید اسی جگہ اَمْوَالَكُمْ بصیغۂ خطاب فرمانے میں یہی حکمت ہو کہ وہ اپنے اموال کو بھی شامل ہے اور یتیموں کے اموال کو بھی، جب تک ان میں ہوشیاری نہ آئے ان کی ذمہ داری میں ہونے کی رعایت سے گویا انہی کے اموال ہیں، اور اس سے پہلی آیت میں وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ فرما کر اصل حقیقت کو واضح بھی کر دیا گیا ہے کہ یتیموں کے مال انہی کو دینا ہے جس کے بعد کوئی مغالطہ باقی نہیں رہ سکتا۔

مال کی حفاظت ضروری امر ہے اور اس کو ضائع کرنا گناہ ہے، اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شخص مقتول ہو جائے تو شہید ہے، جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے

مقتول ہونے پر شہادت کا اجر موعود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ (بخاری صفحہ ۳۳۷، جلد ۱، مسلم صفحہ ۸۱ جلد ۱)

"اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص مقتول ہو گا وہ شہید ہے (دینی ثواب کے اعتبار سے شہیدوں میں شمار ہے)"

نیز ارشاد فرمایا:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ (مشکوٰۃ ص ۳۲۶)

"نیک آدمی کے لئے اس کا اچھا اور پاکیزہ مال بہترین متاع حیات ہے"

نیز ارشاد فرمایا:

لَا بَأْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ (مشکوٰۃ ص ۴۴۵)

"جو شخص اللہ عز وجل سے ڈرتا ہو اس کی مالداری میں دین کا کوئی حرج نہیں"

آخر کی ان دونوں حدیثوں میں یہ بات بتائی ہے کہ صالح اور متقی آدمی کا مال پاس رکھنا اس کے حق میں مضر نہیں ہے، کیونکہ ایسا شخص اللہ سے خوف رکھتے ہوئے اپنے مال کو گناہوں میں خرچ کرنے سے بچے گا، بہت سے اولیاء اللہ اور صوفیاء و زاہدین سے جو مال کی برائی منقول ہے، وہ انہی لوگوں کے حق میں ہے جو گناہوں میں خرچ کرکے اپنے کمائے ہوئے مال کو آخرت کے عذاب کا ذریعہ بناتے ہیں، اور چونکہ انسان طبعی طور پر مالدار ہونے کے بعد اسراف اور دیگر معاصی سے محفوظ رہنے کی فکر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے مال سے دور رہنے کو محبوب سمجھا گیا ہے، بقدر ضرورت تھوڑا بہت کمایا اور اللہ کا نام لیا، اور مال کے حساب سے اپنی جان بچائی، یہ پرانے بزرگوں کا طرز تھا، دور حاضر میں لوگوں میں دین و ایمان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، دنیوی ساز و سامان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اور معمولی سی تکلیف ہی نہیں بلکہ ظاہری فیشن کے خلاف درزی ہو جانے پر دین چھوڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے مال حلال کسب کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کی زیادہ اہمیت ہے، اسی طرح کے لوگوں کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا (مشکوٰۃ، ص ۴۳۹)

"یعنی تنگدستی انسان کو بعض اوقات کافر بنا سکتی ہے"

حضرت سفیان ثوری نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: كان المال فيما مضى يكره، فاما اليوم فهو ترس المؤمن. یعنی "زمانہ سابق میں مال کو پاس رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ مال مؤمن کی ڈھال ہے"

نیز انھوں نے فرمایا: مَنْ كَانَ فِي يَدِهٖ مِنْ هٰذِهٖ شَيْئًا فَلْيُصْلِحْهُ فَإِنَّهٗ زَمَانٌ إِنِ احْتَاجَ كَانَ أَوَّلَ مَنْ يَبْذُلُ دِيْنَهٗ، "یعنی جس کے پاس دراہم و دنانیر میں سے کچھ موجود ہو اسے چاہئے کہ اس مال کو مناسب طریقہ پر کام میں لائے، کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر کچھ حاجت پیش آگئی تو انسان سب سے پہلے حاجت پوری کرنے کے لئے اپنے دین ہی کو خرچ کرے گا" مطلب یہ ہے کہ حاجت پورے کرنے کی اہمیت دین پر چلنے سے زیادہ ہوگئی (مشکوٰۃ ص۲۴۹)

نابالغوں کی سمجھ اور صلاحیت جانچنے کا حکم

پہلی آیت میں جب یہ معلوم ہوگیا کہ جب تک معاملات میں نابالغوں کی ہوشیاری ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ان کو اموال سپرد نہ کئے جائیں، اس لئے دوسری آیت میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اور پھر امتحان کر کے ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے احکام دیئے گئے، ارشاد ہوا:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ، "یعنی بالغ ہونے سے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے معمولی معاملات خرید و فروخت ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان لیتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل یعنی بالغ ہو جائیں"، تو اب خاص طور سے اس کا اندازہ لگاؤ کہ وہ اپنے معاملات میں ہوشیار ہو گئے یا نہیں، جب ہوشیاری محسوس کرلو تب ان کے اموال ان کے سپرد کردو۔

خلاصہ یہ کہ بچوں کی مخصوص طبیعت اور ان میں عقل و ہوش کے نشو و نما کے اعتبار سے ان کے تین درجے کر دیئے گئے، ایک بلوغ سے پہلے، دوسرا بلوغ کے بعد، تیسرا ہوشیاری کے بعد، بلوغ سے پہلے بچوں کے اولیاء کو یہ حکم ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کی کوشش کریں معاملات میں ان کو ہوشیار کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے معاملات خرید و فروخت کے ان کے ہاتھ سے کرائیں، آیت میں وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى کا یہی مطلب ہے ـــــ اس سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نابالغ بچے جو معاملاتِ خرید و فروخت اپنے ولی کی اجازت سے کریں وہ صحیح اور نافذ ہیں۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ جب وہ بالغ اور نکاح کے قابل ہو جائیں تو اب معاملات اور تجربہ کے اعتبار سے ان کے احوال کی جانچ کرو، اگر دیکھو کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے لگے ہیں، اور معاملات سلیقہ سے کرتے ہیں تو ان کے مال ان کے حوالے کردو۔

بلوغ کی عمر

اس آیت میں جہاں بلوغ کا حکم بیان فرمایا گیا وہاں قرآن کریم نے اس بارے میں کہ بچے کا بالغ ہونا کس عمر میں سمجھا جائے گا، إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ اصل بلوغ کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ اس کا مدار اُن آثار پر ہے جو بالغوں

کو حیض آنے میں ان آثار کے اعتبار سے جس وقت بھی وہ نکاح کے قابل ہو جائیں بالغ سمجھے جائیں گے خواہ عمر تیرہ چودہ سال ہی کی ہو، البتہ اگر کسی بچے میں آثار بلوغ موجود ہی نہ ہوں تو عمر کے اعتبار سے اس کو بالغ قرار دیا جائے گا جس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض نے لڑکے کے لئے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لئے سترہ سال عمر مقرر کئے ہیں، اور بعض نے دونوں کے لئے پندرہ سال قرار دیئے، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مذہب میں فتویٰ اس قول پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں پندرہ سال کی عمر پوری ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے، خواہ آثار بلوغ پائے جائیں یا نہیں۔

ہوشیاری کیونکر معلوم ہوگی؟ اس سلسلے میں حکم قرآنی یہ ہے کہ جب تم ان میں ہوشیاری محسوس (آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا کی تشریح ہے) کرو اس وقت ان کے مال ان کو سپرد کردو، اس ہوشیاری کی کیا میعاد ہے؟ قرآن مجید نے اس آخری میعاد کی کوئی صراحت نہیں فرمائی، اس لئے بعض فقہاء اس طرف گئے کہ جب تک پوری ہوشیاری محسوس نہ کی جائے اس وقت تک ان کے اموال ان کے سپرد نہ کئے جائیں گے، بلکہ بدستور سابق ولی کی حفاظت و امانت میں رہیں گے، خواہ ساری عمر اسی حالت میں گزر جائے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس جگہ عدم ہوشیاری سے وہ مراد ہے جو بچپن کے اثرات ہوں، اور بالغ ہونے کے دس سال بعد تک بچپن کا اثر ختم ہوجاتا ہے، اس لئے پندرہ سال عمر بلوغ اور دس سال مدت رشد و ہوشیاری یعنی کل پچیس سال کی عمر ہوجانے پر وہ رشد و ہوشیاری ضرور حاصل ہوگی جس کے حاصل ہونے میں بچپن اور کم عمری حائل تھی اور قرآن کریم نے لفظ رشد نکرہ لاکر اس کی طرف اشارہ بھی کردیا ہے کہ مکمل ہوشیاری اور دانشمندی شرط نہیں، کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لئے کافی ہے کہ ان کے اموال ان کو دیدیئے جائیں، اس لئے پچیس سال تک انتظار کرکے اگر مکمل ہوشیاری نہ بھی آئے تب بھی ان کے اموال ان کو دیدیئے جائیں گے، رہی مکمل ہوشیاری اور دانشمندی سو یہ بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی، وہ ہمیشہ سیدھے بھولے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو اپنے اموال سے محروم نہ کیا جائے گا، ہاں اگر کوئی بالکل پاگل اور مجنون ہی ہو تو اس کا حکم علیحدہ ہے کہ وہ ہمیشہ نابالغ بچوں کے حکم میں رہتا ہے، اور اس کے اموال کبھی اس کے حوالے نہ کئے جائیں گے، جب تک اس کا جنون زائل نہ ہوجائے، اگرچہ ساری عمر اس جنون میں گزر جائے۔

یتیموں کے مال بے جا خرچ کرنے کی ممانعت جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے اس آیت میں اس بات کی ہدایت دی گئی ہے کہ یتیموں کے مال ان کو اس وقت تک حوالہ نہ کرو جب تک ان میں کسی قدر ہوشیاری اور تجربہ نہ آجائے، اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ مزید کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا۔

اس حالت میں یہ امکان تھا کہ اولیاء یتیم کی طرف سے کوئی ایسی زیادتی ہو جس سے یتیم کا نقصان ہو، اس لئے آگے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا یعنی ان اموال کو ضرورت سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جائیں گے تو ان کو دینا پڑے گا، جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو، اس میں اولیاء یتیم کو دو چیزوں سے روکا گیا، ایک ان کے مال میں اسراف یعنی ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے، دوسرے اس بات سے کہ ان کا مال ضرورت پیش آنے سے پہلے جلد جلد خرچ کرنے لگیں، اس خیال سے کہ عنقریب یہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کا مال ان کو دینا پڑے گا، ہمارا اختیار ختم ہو جائے گا۔

یتیم کا ولی اس کے مال میں سے حسب ضرورت کچھ لے سکتا ہے

آخر آیت میں اس کا ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی یتیم بچے کی تربیت اور اس کے مال کی حفاظت میں اپنا وقت اور محنت خرچ کرتا ہے کیا اس کو یہ حق ہے کہ یتیم کے مال میں سے اپنا حق الخدمت کچھ لے لے، چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ یعنی جو شخص صاحب مقدرت ہو اپنی ضرورت کا تکفل کسی دوسرے ذریعہ سے کر سکتا ہو اس کو چاہئے کہ یتیم کے مال میں سے حق الخدمت نہ لیا کرے، کیونکہ یہ خدمت اس کے ذمہ فرض ہے، اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، پھر فرمایا:

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جو ولی یتیم فقیر محتاج ہو اور دوسرا کوئی ذریعہ معاش نہ رکھتا ہو وہ یتیم کے مال میں سے ایک مناسب مقدار کھا سکتا ہے جس سے حاجات ضروریہ پوری ہو جائیں۔

مال سپرد کرتے وقت گواہ بنا لو

آخر میں ارشاد فرمایا: فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا یعنی جب آزمائش کے بعد یتیموں کے اموال ان کے سپرد کرنے لگو تو چند ثقہ اور نیک لوگوں کو گواہ بنا لیا کرو، تاکہ آئندہ کسی نزاع اور جھگڑے کی صورت پیدا نہ ہو، اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حساب میں ہر چیز ہے۔

اوقاف اور دوسری ملی خدمات کا معاوضہ

اس آیت کے سیاق سے ایک فقہی ضابطہ اور اصول معلوم ہو گیا، کہ جو لوگ اوقاف کے نگران ہیں یا مساجد و مدارس کے منتظم ہیں یا مسلم حکومت کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، یا ایسی ہی دوسری ملکی اور ملی خدمات جن کا انجام دینا فرض کفایہ ہے ان پر مامور ہیں، ان حضرات کے لئے بھی اعلیٰ اور افضل یہ ہے کہ اگر اپنے پاس اتنا اثاثہ ہو، اور وہ اپنے بچوں کے ضروری اخراجات پورے کر سکتے ہوں تو ان اداروں سے اور حکومت کے بیت المال سے کچھ بھی نہ لیں، لیکن اگر اپنے پاس گزارہ کے لئے مال موجود نہ ہو اور کسب کے اوقات

ان کے امور میں مشغول ہوتے ہوں تو بقدر ضرورت ان کے مال سے لینے کا اختیار ہے مگر قدر ضرورت کا لفظ پیش نظر رہے، بہت سے لوگ ضابطے کے طور پر کاغذی خانہ پری کے لئے ماہانہ کچھ حصہ مقرر کر لیتے ہیں لیکن مختلف طریقوں سے اس سے کہیں زیادہ بے احتیاطی کے ساتھ اپنی ذات پر اور بال بچوں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں، اس بے احتیاطی کا مداوا بجز خوف خدا کے کچھ نہیں جس کی طرف آیت کے آخری ٹکڑے میں وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيبًا فرما کر ہر عوام و خواص کو توجہ دلا دی گئی ہے کہ جسے اللہ کے محاسبہ کا دھیان ہو وہی ناجائز مال سے بچ سکتا ہے، وباللہ التوفیق۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ وَ
مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے اور

لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ
عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا

مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
بہت ہو حصہ مقرر کیا ہوا ہے اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت

أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَ
رشتہ دار اور یتیم اور محتاج تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا
کہہ دو ان کو بات معقول اور چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑیں

مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ
اپنے پیچھے اولاد ضعیف تو ان پر اندیشہ کریں یعنی مرنے کے پیچھے ایسی ہی ان کا ہوگا تو چاہئے کہ ڈریں اللہ سے

وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ
اور کہیں بات سیدھی جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال

الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَ
یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور

سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝
عنقریب داخل ہوں گے آگ میں

ربطِ آیات سورۂ نساء میں، اول ہی سے انسانی حقوق، بخصوص عائلی زندگی سے متعلق حقوق کا بیان چل رہا ہے، اس سے پہلی آیت میں یتیموں کے حقوق کا بیان تھا، مذکورہ چار آیتوں میں بھی عورتوں اور یتیموں کے خاص حقوق متعلقہ وراثت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں جاہلیت کی اس رسم کو باطل کیا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کو میراث کا مستحق ہی نہیں مانا جاتا تھا، اس آیت نے ان کو اپنے شرعی حصہ کا مستحق قرار دے کر ان کے حق میں کمی کرنے اور نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت کی، پھر چونکہ مستحقین میراث کا ذکر آیا تھا اور ایسے موقع پر تقسیم کے وقت غیر مستحقین فقراء اور یتیم بچے بھی حاضر ہو جایا کرتے ہیں تو دوسری آیت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور مراعات کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن یہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیت میں بھی احکامِ یتامیٰ کے سلسلہ میں اسی مضمون کی تاکید ہے۔

خلاصۂ تفسیر

مردوں کے لئے بھی (خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں اور (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان عورتوں کے) ماں باپ اور (دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں خواہ وہ (چھوڑی ہوئی) چیز قلیل ہو یا کثیر ہو (سب میں سے ملے گا اور) حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مقرر ہے، اور جب (وارثوں میں ترکہ کے تقسیم ہونے کے وقت (یہ لوگ) موجود ہوں (یعنی دور کے) رشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ (اس توقع سے کہ شاید ہم کو بھی کچھ مل جاوے، رشتہ دار تو ممکن ہے کہ گمان استحقاق سے اور دوسرے لوگ بامیدِ خیرات کے) تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دیدو اور ان کے ساتھ خوبی (اور نرمی) سے بات کرو، وہ بات رشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ سمجھا دو کہ تمہارا حصہ شرع سے اس میں نہیں ہے، ہم معذور رہیں، اور دوسروں سے یہ کہ دے کر احسان نہ جتلاؤ) اور (یتامیٰ کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جاویں تو ان (بچوں) کی ان (لوگوں) کو فکر ہو (کہ دیکھئے ان کو کوئی آزار نہ دے، تو ایسا ہی دوسرے کے بچوں کے لئے بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ہم ان کو آزار نہ دیں) سو (اس بات کو سوچ کر) ان لوگوں کو چاہئے کہ (یتامیٰ کے معاملہ میں) خدا تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں (یعنی فعلاً آزار و ضرر

نہ کیجئے) اور (قولاً بھی ان سے) موقع کی بات کہیں (جس میں تسلی اور دل جوئی کی بات بھی آگئی
اور تعلیم و تادیب کی بات بھی آگئی، غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اصلاح کریں) بلاشبہ جو
لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں (دوزخ کی) آگ
(کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی انجام اس کھانے کا یہ ہونے والا ہے) اور (اس انجام کے
مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کیونکہ) عنقریب (یہی دوزخ کی) جلتی (آگ) میں داخل
ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)۔

معارف و مسائل

والدین اور دیگر قرابت کے اموال میں حقِ میراث: اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنفِ ضعیف، یتیم بچے اور صنفِ نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں، اوّل تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق دلائے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا، قانونِ وراثت میں بھی عام اقوامِ دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔

عرب نے تو اصول ہی بنا لیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو، اور دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان کا مالِ غنیمت جمع کرے (روح المعانی ص ۲۱۰ ج ۴)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنفِ ضعیف بچے اور عورتیں اس اصول پر نہیں آسکتیں، اس لئے ان کے اصولِ وراثت کی رُو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہو تو وہ بھی مستحقِ وراثت نہ تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اوس بن ثابت کا انتقال ہوا اور دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کرلیا اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقاً مستحقِ وراثت نہ سمجھی جاتی تھی خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہوگئیں، اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کردیا گیا، لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچا زاد بھائی ہوگئے۔

اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچا زاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ

کر لیتے تب تو ان دونوں لڑکیوں سے شادی کر لیتے تاکہ ان کی دولت ہاتھ آ جائے، مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا، تب اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض حال کیا، اور اپنی اور اپنے بچوں کی بیکسی و محرومی کی شکایت کی، اس وقت تک چونکہ قرآن حکیم میں آیتِ میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے میں توقف فرمایا، آپ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا، چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

اور اس کے بعد دوسری آیتِ وراثت نازل ہوئی جس میں حصوں کی تفصیلات ہیں، اور اس سورت کا دوسرا رکوع ان تفصیلات پر مشتمل ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ قرآن کے مطابق کل ترکہ کا آٹھواں حصہ بیوی کو دے کر باقی سب مال مرحوم کے لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ اس کا آدھا لڑکے کو اور آدھے میں دونوں لڑکیاں برابر کی شریک رہیں، اور چچازاد بھائی بمقابلہ اولاد کے چونکہ اقرب نہ تھے اس لئے ان کو محروم کیا گیا۔ (روح المعانی)

استحقاقِ میراث کا ضابطہ

اس آیت نے وراثت کے چند احکام کے ضمن میں قانونِ وراثت کا ضابطہ بیان فرما دیا ہے:

مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ، ان دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اصول بتلا دیئے، ایک رشتۂ ولادت، جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے، اور جس کو لفظ وَالِدَانِ سے بیان کیا گیا ہے، دوسرے عام رشتہ داری جو لفظ اَقْرَبُوْنَ کا مفہوم ہے، اور صحیح یہ ہے کہ لفظ "اقربون" ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ میں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوتے ہیں، لفظ "اقربون" سب پر حاوی ہے، لیکن والدین کو ان کی اہمیت کی وجہ سے بطور خاص جدا کر دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مطلق رشتہ داری وراثت کے لئے کافی نہیں، بلکہ رشتہ میں اقرب ہونا شرط ہے، کیونکہ اگر قرابت کو معیاری شرط نہ بنایا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت پوری دنیا کی تمام انسانی آبادی پر تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا، کیونکہ سب ایک ماں باپ آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، دور قریب کا کچھ نہ کچھ رشتہ سب میں موجود ہے، اور یہ اول تو امکان سے باہر

ہے، دوسرے اگر کسی طرح کوشش کرکے اس کا انتظام کر بھی لیا جائے تو متروکہ مال جزء لایتجزّٰی بن کر ہی تقسیم ہوسکے گا جو کسی کے کام نہ آئے گا، اس لئے ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں، گرچہ وجوہ قربت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے، جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ، کہ یہ سب اقرب ہیں گرچہ قربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔

نیز ایک اور بات اس لفظ "اقربون" نے یہ بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ رشتہ اولاد کا یا ماں باپ کا ہو یا دوسری قسم کے رشتے ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے، جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوئی ہے جب حق وراثت کا مدار رشتہ پر ہو تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

پھر قرآن کریم کے اسلوب کو دیکھئے کہ لِلرِّجَالِ اور وَلِلنِّسَاءِ کو جمع کرکے مختصر لفظوں میں ان کے حق کا بیان ہوسکتا تھا اس کو اختیار نہیں کیا، بلکہ مردوں کے حق کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے اسی تفصیل و تشریح کے ساتھ عورتوں کا حق جداگانہ بیان فرمایا، تاکہ دونوں کے حقوق کا مستقل اور اہم ہونا واضح ہوجائے۔

نیز اسی لفظ "اقربون" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مالِ وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہوگا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہوگا، گرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنالیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کرسکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی جذباتی ہوگا، کیونکہ فقر و حاجت کوئی دائمی چیز نہیں اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں درجات بھی، ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعویدار نکل آیا کریں گے اور فیصلہ کرنے والوں کو ان کا فیصلہ مشکل ہوگا۔

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

اگر اس قرآنی اصول کو سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ جو آجکل بلاوجہ ایک نزاعی مسئلہ بنادیا گیا ہے، وہ خود بخود ایک قطعی فیصلہ

کے ساتھ حل ہوجاتا ہے کہ اگرچہ یتیم پوتا بہ نسبت بیٹے کے ضرورتمند زیادہ ہو، لیکن اَقربون کے قانون کی رُو سے وہ مستحقِ وراثت نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بیٹے کی موجودگی میں اقرب نہیں، البتہ اُس کی ضرورت رفع کرنے کے لئے دوسرے انتظامات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک ایسا ہی انتظام اگلی آیت میں آرہا ہے۔

اس مسئلہ میں موجودہ دور کے مغرب زدہ متجددین کے علاوہ کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا، ساری امت آج تک قرآن و حدیث کی تصریحات سے یہی سمجھتی آئی ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہ ملے گی، خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مرگیا ہو۔

متوفی کی ملکیت میں جو کچھ ہو سب میں وراثت کا حق ہے

اس آیت میں مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ فرما کر ایک دوسری جاہلانہ رسم کی اصلاح فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ بعض قوموں میں بعض اقسام مال کو بعض خاص وارثوں کے لئے مخصوص کر لیا جاتا تھا، مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ اسلحہ، یہ سب صرف نوجوان مردوں کا حق تھا، دوسرے وارثوں کو ان سے محروم کر دیا جاتا تھا، قرآن کریم کی اس ہدایت نے بتلا دیا کہ میت کی ملکیت میں جو چیز بھی تھی، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہر چیز میں ہر وارث کا حق ہے، کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا جائز نہیں۔

میراث کے مقررہ حصے اللہ کی طرف سے ہیں

آخر آیت میں جو ارشاد فرمایا نَصِيبًا مَّفْرُوضًا، اس سے یہ بھی بتلا دیا کہ مختلف وارثوں کے جو مختلف حصے قرآن نے مقرر فرمائے ہیں، یہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔

وراثت ایک جبری ملک ہے اس میں مالک ہونے والے کی رضامندی شرط نہیں

اور اسی لفظ مَفْرُوضًا سے ایک اور مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت کے ذریعہ جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے وہ ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے، نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے، بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کر دے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کر دے۔

محروم الارث رشتہ داروں کی دلداری ضروری ہے

میت کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو ضابطۂ شرعی کے ماتحت اس کی میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ فرائض کی تفصیلات کا علم ہر شخص کو نہیں ہوتا، عام طور پر ہر رشتہ دار خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کو بھی میراث میں سے حصہ ملے، اس لئے وہ رشتہ دار جو شرعی ضابطۂ میراث کے

تحت محروم قرار دیئے گئے ہیں، تقسیم میراث کے وقت ان کا دل افسردہ و رنجیدہ ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ تقسیم میراث کے وقت وہ موجود بھی ہوں، اور بالخصوص جبکہ ان میں کچھ یتیم اور مسکین حاجتمند بھی ہوں ایسی حالت میں جب کہ دوسرے رشتہ دار اپنا اپنا حصہ لے جا رہے ہوں، اور یہ کھڑے دیکھ رہے ہوں، ان کی حسرت و یاس، اور دل شکنی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر کبھی یہ کیفیت گزری ہو۔

اب قرآنی نظام کی خوبی و خوش اسلوبی کو دیکھئے کہ ایک طرف تو خود قرآن ہی کا بتایا ہوا وہ ضابطہ یہ ہے کہ اقرب کے مقابلہ میں اَبعَد کو محروم کیا جاتا ہے، دوسری طرف محروم ہونے والے ابعد کی حسرت اور دل شکنی بھی گوارا نہیں کی جاتی، اس کے لئے ایک مستقل آیت میں یہ ہدایت کی گئی:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا "یعنی جو دور کے رشتہ دار اور یتیم مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہو رہے ہوں، اگر وہ تقسیم میراث کے وقت آموجود ہوں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے، کہ اس مال میں سے باختیار خود کچھ حصہ ان کو بھی دیدیں جو ان کے لئے ایک قسم کا صدقہ اور موجبِ ثواب ہے، اور ایسے وقت میں جب کہ ایک مال بغیر کسی سعی و عمل کے محض خدا تعالیٰ کے دینے سے، ان کو مل رہا ہو تو صدقہ خیرات فی سبیل اللہ کا خود بھی داعیہ دل میں ہونا چاہئے"؛ جیسا کہ اس کی ایک نظیر دوسری آیت میں مذکور ہے، كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ "یعنی اپنے باغ کا پھل کھاؤ جب کہ وہ پھل دینے لگے، اور جس روز پھل کاٹو تو اس کا حق نکال کر فقراء و مساکین کو دیدو"۔ (یہ آیت سورۂ انعام ۶: ۱۴۲ میں آرہی ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دور کے رشتہ دار، یتیم، مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا کوئی حصہ ضابطۂ شرعی سے اس میراث میں نہیں ہے تو ان کے جمع ہو جانے سے تم تنگدل نہ ہو، بلکہ جو مال خدا تعالیٰ نے تمہیں بلا محنت عطا فرمایا ہے اس میں سے بطور شکرانہ کچھ عطا کر دو، اور غنیمت جانو کہ خرچ کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے، اس موقع پر ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دیدینے سے ان دور کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہو جائے گا، اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آ گیا، اس کے چچاؤں، اور پھوپھیوں کو چاہئے کہ اس کو اپنے اپنے حصہ سے بخوشی کچھ دیدیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا سا دینے پر بھی راضی نہ ہوں بلکہ دوسروں کے برابر حصہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو چونکہ ان کا یہ مطالبہ قانون

شرع کے خلاف اور بغیر استحقاق ہے، اس لئے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی تو گنجائش نہیں، لیکن اس پر بھی ان کو کوئی ایسی بات نہیں کہی جائے جس سے اُن کی دل شکنی ہو، بلکہ معقول طور پر ان کو سمجھا دیا جائے کہ شرعی قاعدہ سے میراث میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ محض تبرعاً دیا ہے، اور ایک بات یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو دیا جائے گا مجموعی مال میں سے نہیں بلکہ بالغ ورثہ میں سے جو حاضر ہوں وہ اپنے حصہ میں سے دیں، نابالغ اور غائب کے حصہ میں سے دینا درست نہیں۔

اللہ سے ڈرتے ہوئے میراث تقسیم کریں

تیسری آیت میں عام مسلمانوں کو خطاب عام ہے، کہ اس کا پورا اہتمام کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جائے، اور ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کریں جس میں اولاد کے حصہ پر کوئی ناگوار اثر پڑتا ہو، اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت یا تصرف کرتے ہوئے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دوسرے وارثوں کو نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے تو آپ پر لازم ہے کہ اس کو ایسی وصیت یا ایسے تصرف سے روکیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو اپنا پورا مال یا آدھا مال صدقہ کرنے سے روک دیا، اور صرف ایک تہائی مال کو صدقہ کرنے کی اجازت دیدی، (مشکوٰۃ باب الوصایا، ص ۲۶۵) کیونکہ پورا مال یا آدھا مال صدقہ کر دیا جاتا تو وارثوں کا حصہ ختم یا کم ہو جاتا۔

نیز اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا دینے کا بڑا اہتمام کریں، اس میں ادنیٰ کوتاہی کو راہ نہ دیں، اور دوسروں کے یتیم بچوں کے حالات کو اپنے بچوں اور اپنی محبت کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیں اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ لوگ اچھا معاملہ کریں، اور وہ پریشان نہ ہوں، کوئی ان پر ظلم نہ کرے تو ان کو چاہئے کہ دوسرے کی اولاد یتامیٰ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کریں۔

یتیم کا مال کھانا پیٹ میں انگارے بھرنا ہے

چوتھی آیت میں یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنے والوں کے لئے وعید شدید کا بیان ہے، کہ جو شخص ناجائز طور پر یتیم کا مال کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔

اس آیت نے یتیم کے مال کو جہنم کی آگ قرار دیا ہے، بہت سے مفسرین نے اس کو تشبیہ اور کنایہ پر محمول کیا ہے، یعنی یتیموں کا مال ناحق کھانا ایسا ہے جیسے کوئی پیٹ میں آگ بھرے، کیونکہ اس کا انجام بالآخر قیامت میں ایسا ہی ہونے والا ہے، مگر اہلِ تحقیق کا قول

یہ ہے کہ آیت میں کوئی مجاز اور کنایہ نہیں ہے، بلکہ جو مال یتیم کا ناجائز طریقہ سے کھایا جائے وہ حقیقت میں آگ ہی ہے، اگرچہ اس وقت اس کی صورت آگ کی معلوم نہ ہوتی ہو، جیسے کوئی شخص دیا سلائی کو کہے کہ یہ آگ ہے، یا سنکھیا کو کہے کہ قاتل ہے، تو ظاہر ہے کہ دیا سلائی کو ہاتھ میں لینے سے ہاتھ نہیں جلتا، اور سنکھیے کو ہاتھ میں لینے سے بلکہ منہ میں رکھنے سے بھی کوئی آدمی نہیں مرتا، البتہ ذرا ان کو رگڑ کھانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا سلائی کو آگ کہا تھا وہ صحیح کہا تھا، اسی طرح حلق کے نیچے اترنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سنکھیا کو قاتل کہنے والا سچا تھا۔ قرآن کریم کے عام ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انسان جو عمل نیک یا بد کر رہا ہے یہی عمل جنت کے درخت اور پھل پھول ہیں یا جہنم کے انگارے ہیں، گرچہ ان کی صورت یہاں اور ہے، مگر قیامت کے روز اپنی شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آئیں گی، قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا، یعنی قیامت کے روز وہ اپنے کئے ہوئے کو موجود پائیں گے، یعنی جو عذاب و ثواب ان کو نظر آئے گا وہ حقیقت میں ان کا اپنا عمل ہوگا۔

بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک، اور کانوں، آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے روز اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھڑک رہے ہوں گے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہوں گے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں دیکھا اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا (ابن کثیر ص ۴۵۶ ج ۱)

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں شدید احتیاط کے لئے واضح ہدایات دی ہیں، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اُحَرِّجُ مَالَ الضَّعِیْفَیْنِ الْمَرْاَۃِ وَالْیَتِیْمِ (ابن کثیر، ص ۴۵۶ ج ۱)

"میں تم کو خاص طور پر دو ضعیفوں کے مال سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہوں، ایک عورت، اور دوسرے یتیم۔"

سورۂ نساء کے اول رکوع میں شروع سے آخر تک عموماً یتامی ہی کے احکام ہیں۔ یتامی کے اموال کی نگہداشت رکھنے، ان کے مال کو اپنا مال نہ بنا لینے، ان کے وراثت میں

ملے ہوئے اموال سے ان کو حصہ دینے کا حکم فرمایا، اور بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کا مال اڑا دینے میں جلدی کرنا، یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے مہر کم کر دینا یا ان کے مال پر قبضہ کر لینا وغیرہ، ان سب امور کی ممانعت فرمائی۔

آخر میں فرمایا کہ ناحق یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ کے انگارے بھرنا ہے، کیونکہ اس کی پاداش میں موت کے بعد اس طرح کے لوگوں کے پیٹوں میں آگ بھری جائے گی۔ لفظ یَاْکُلُوْنَ استعمال فرمایا ہے اور یتیم کا مال کھانے پر وعید سنائی گئی ہے، لیکن یتیم کے مال کا ہر استعمال کھانے پینے میں ہو یا برتنے میں سب حرام اور باعث عتاب و عذاب ہے، کیونکہ محاورے میں کسی کا مال ناحق کھا لینا ہر استعمال کو شامل ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر حصہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس کے نابالغ بچے یتیم ہوتے ہیں، ان بچوں کے ساتھ عموماً ہر گھر میں ظلم و زیادتی کا برتاؤ ہوتا ہے، اور یہ وہ شخص جو ان بچوں کے باپ کی وفات کے بعد مال پر قابض ہوتا ہے خواہ ان بچوں کا چچا ہو یا بڑا بھائی ہو یا والدہ ہو یا اور کوئی ولی یا وصی ہو، اکثر ان امور کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کی ممانعت اس رکوع میں کی گئی ہے، اول تو سالہا سال مال کو تقسیم کرتے ہی نہیں، ان بچوں کی روٹی کپڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں، پھر بدعات، رسومات اور نفسانیات میں اسی مالِ مشترک سے خرچ کئے چلے جاتے ہیں، اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہیں، اور سرکاری کاغذات میں نام بدل کر اپنے بچوں کا نام لکھواتے ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی ہی گھر خالی رہتا ہوگا۔

مدرسوں اور یتیم خانوں میں جو چندہ یتیموں کے لئے آتا ہے اس کو یتیموں پر خرچ نہ کرنا بھی ایک صورت یتیم کا مال ہضم کرنے کی ہے۔

مسئلہ: میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں، ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں، بعض علاقوں میں تانبے پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دیدیتے ہیں، حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے، پہلے مال بانٹ لیں جس میں سے مرنے والے کی اولاد، بیوی، والدین، بہنیں، جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہو اس کو دیدیں، اس کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کریں، یا مل کر کریں تو صرف بالغین کریں، نابالغ کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں، اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف درست نہیں۔

مسئلہ: میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازہ کے اوپر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے، اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں، کیونکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کردے تو جائز ہے، بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھنے والے امام کے لئے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلیٰ تیار کیا جاتا ہے، اور پھر یہ مصلیٰ امام کو دیدیا جاتا ہے یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے فاضل ہے، ورثہ کے مشترک مال میں سے اس کا خریدنا جائز نہیں۔

مسئلہ: بعض جگہ میت کے غسل کے لئے نئے برتن خریدے جاتے ہیں، پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے، اول تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں سے غسل دیا جاسکتا ہے، اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ جائے تو توڑنا جائز نہیں، اول تو اس میں مال ضائع کرنا ہے، اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔

مسئلہ: ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ و خیرات کچھ جائز نہیں، اس طرح کے صدقہ و خیرات کرنے سے مُردے کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا، بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے، اس لئے کہ مورث کے مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے، اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں، اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چُرا کر میت کے حق میں صدقہ کردیا جائے۔ پہلے مال تقسیم کردیا جائے، اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ خیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں، اس لئے کہ جو ان میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں، اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں، ہوسکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں، اور لوگوں کے طعنوں کے خوف سے کہ اپنے مُردہ کے حق میں دو پیسے تک خرچ نہ کئے اس عار سے بچنے کے لئے بادل ناخواستہ ہامی بھرلے ۔۔۔ حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جب کہ دینے والا طیب خاطر سے دے رہا ہو، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہوجائیگا یہ بزرگ ایک مسلمان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی رُوح پرواز کرگئی، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انھوں نے فوراً اسے

بجھا دیا، اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا، اور روشنی کی، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت تھی، اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا، اب یہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہوگیا، لہٰذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کرسکتے ہیں، اور وہ سب یہاں موجود نہیں ہیں لہٰذا اپنے پیسوں سے تیل منگا کر روشنی کی۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ

حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے

فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ

پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کیلئے ہے دو تہائی اس مال سے جو چھوڑ مرا اور اگر

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

ایک ہی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ

مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ

اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں

أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ

اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ

مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ

بعد وصیت کے جو کر مرا یا بعد ادائے قرض کے تمہارے باپ اور بیٹے تم کو

لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ

معلوم نہیں کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے،

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

بیشک اللہ خبردار ہے حکمت والا

ربطِ آیات | پچھلے رکوع میں لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ الخ میں میراث کا استحقاق رکھنے والے لوگوں کا جملہ ذکر تھا، اس رکوع میں انہی مستحقین میراث کی بعض اقسام کی تفصیل مذکور ہے، اور ان کے مختلف حالات کے اعتبار سے ان کے حصص بیان کئے گئے ہیں، اس

سلسلہ کی کچھ تفصیل سورت کے آخر میں آرہی ہے، اور باقی ماندہ حصوں کو احادیث کے اندر بیان کیا گیا ہے، فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس کی تمام تفصیلات اخذ کرکے مستقل فن "فرائض" کی شکل میں مدوّن کر دیتے ہیں۔

مندرجہ آیت میں اولاد اور والدین کے حصے بیان کئے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ میراث کے کچھ اور مسائل بھی مذکور ہیں،

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے میراث پانے کے باب میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر (یعنی لڑکا لڑکی ایک ایک یا کئی کئی ملی جلی ہوں تو ان کے حصوں میں باہم یہ نسبت ہوگی کہ ہر لڑکے کو دوہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا) اور اگر (اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے (اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے، کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا، تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے نہ گھٹتا پس جب دوسری بھی لڑکی ہے، تب تو تہائی سے کسی طرح گھٹ نہیں سکتا اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں، پس اس کا بھی ایک تہائی ہوگا، دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین لڑکیوں میں شبہ تھا کہ شاید ان کو تین تہائی کا حق ہو جاوے، اس لئے فرمایا کہ گو لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں مگر دو تہائی سے نہ بڑھے گا) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو (کل ترکہ کا) نصف ملے گا (اور پہلی صورت میں ایک ثلث بچا ہوا اور دوسری صورت کا ایک نصف بچا ہوا دوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے، یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر اسی کو دیدیا جاوے گا، جیسا کہ کتب فرائض میں مذکور ہے) اور ماں باپ (کو میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے) کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ (مقرر) ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہو (خواہ مذکر یا مؤنث، خواہ ایک یا زیادہ اور بقیہ میراث اولاد اور دوسرے خاص خاص ورثہ کو ملے گی اور پھر بھی بچ جاوے تو پھر سب کو دی جاوے گی) اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور (صرف) اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں (یہ دوسری صورت ہوئی اور "صرف" اس سے کہا کہ بھائی بہن بھی نہ ہوں، جیسا آگے آتا ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور باقی دو تہائی باپ کا، اور چونکہ صورت مفہومہ میں یہ ظاہر تھا، اس لئے تصریح کی حاجت

نہیں ہوتی) اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن (کسی قسم کے) ہوں (خواہ ماں باپ دونوں میں شریک جس کو عینی کہتے ہیں، خواہ صرف باپ ایک، ماں الگ الگ جس کو علاتی کہتے ہیں خواہ صرف ماں ایک باپ الگ الگ جس کو اخیافی کہتے ہیں، غرضیکہ کسی طرح کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور یہ تیسری صورت ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کو (ترکہ کا) چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا — یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا دین (اگر ہو تو اس کو بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے) تمہارے اصول و فروع جو ہیں تم (ان کے متعلق) پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کا کونسا شخص تم کو (دنیوی یا اخروی) نفع پہنچانے میں (باعتبار توقع کے) نزدیک تر ہے (یعنی اگر تمہاری رائے پر یہ قصہ رکھا جاتا تو بغالب احوال تم لوگ تقسیم میں مدار ترجیح و تفضیل کا اس شخص کے نفع رسانی پر رکھتے، اور اس مدار کے تیقن کا خود کوئی طریقہ کسی کے پاس نہیں ہے تو اس کا مدار تجویز ٹھہرانا ہی صحیح نہ تھا پس جب نفع میں مدار بننے کی قابلیت نہ تھی اس لئے دوسرے مصالح و اسرار کو گو وہ تمہارے ذہن میں نہ آویں اس حکم کا مبنیٰ اور مدار ٹھہرا کر) یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا (اور یہ امر) بالیقین (مسلّم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی حکمت والے ہیں (پس جو حکمتیں انھوں نے اپنے علم سے اس میں مرعی رکھی ہیں وہی قابلِ اعتبار رہیں، اس لئے تمہاری رائے پر نہیں رکھا)۔

معارف و مسائل

حقوق متقدمہ علی المیراث | شریعت کا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے مال سے پہلے شریعت کے مطابق اس کے کفن دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں، جن میں نہ فضول خرچی ہو نہ کنجوسی ہو، اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں، اگر قرضے اتنے ہی ہوں جتنا اس کا مال ہے یا اس سے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی نہ کوئی وصیت نافذ ہوگی، اور اگر قرضوں کے بعد مال بچ جائے یا قرضے بالکل ہی نہ ہوں تو اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو اور وہ کسی گناہ کی وصیت نہ ہو، تو اب جو مال موجود ہے اس کے ایک تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی، اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر دے تب بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہوگی تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا مناسب بھی نہیں ہے، اور وارثوں کو محروم کرنے کی نیت سے وصیت کرنا گناہ بھی ہے۔

ادائے دین کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے

جس کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، اگر وصیت نہ کی ہو تو ادائے دین کے بعد پورا مال میراث میں تقسیم ہوگا۔

اولاد کا حصہ: جیسا کہ گذشتہ رکوع میں گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم الاقرب فالاقرب کے اصول پر ہوگی، مرنے والے کی اولاد اور اس کے والدین چونکہ قریب ترین ہیں اس لئے ان کو ہر حال میں میراث ملتی ہے، یہ دونوں رشتے انسان کے قریب ترین اور بلاواسطہ رشتے ہیں، دوسرے رشتے بالواسطہ ہوتے ہیں، قرآن شریف میں پہلے انہی کے حصے بیان فرمائے اور اولاد کے حصے سے شروع فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ، یہ ایک اساسی قاعدہ کلیہ ہے، جس نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا مستحق بھی بنا دیا اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا اور یہ اصول معلوم ہو گیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصہ میں مال اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا مل جائے، مثلاً کسی نے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں چھوڑیں تو مال کے چار حصے کرکے ۲/۴ لڑکے کو اور ۱/۴ ہر لڑکی کو دیدیا جائے گا۔

لڑکیوں کو میراث دینے کی اہمیت: قرآن مجید نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصہ کو اصل قرار دے کر اس کے اعتبار سے لڑکوں کا حصہ بتلایا، اور بجائے لِلْأُنْثَيَيْنِ مِثْلُ حَظِّ الذَّكَرِ (دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے بقدر) فرمانے کے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (لڑکے کو دو لڑکیوں کے حصہ کے بقدر) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔

جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھ کر بادل ناخواستہ شرما شرمی معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو کیوں بھائیوں سے برائی لیں، ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت گنہگار ہیں، ان میں بعض بچیاں نابالغ بھی ہوتی ہیں، ان کو حصہ نہ دینا دوہرا گناہ ہے، ایک گناہ وارث شرعی کے حصہ کو دبانے کا اور دوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔

اس کے بعد مزید تشریح فرماتے ہوئے لڑکیوں کا حصہ یوں بیان فرمایا:

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ، یعنی اگر نرینہ اولاد نہ ہوں اور صرف لڑکیاں ہوں اور ایک سے زائد ہوں تو ان کو مال موروث سے دو تہائی دیا جائے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی، اور باقی ایک تہائی دوسرے ورثاء مثلاً میت کے والدین، بیوی یا شوہر وغیرہ میراث کے حقداروں کو ملے گا، دو لڑکیاں اور دو سے زائد سب

دو تہائی میں شریک ہوں گی۔

دو لڑکیوں سے زائد کا حکم تو قرآن کریم کی آیت میں صراحۃً مذکور ہے، جیسا کہ فَوْقَ اثْنَتَيْنِ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں، اور لڑکیاں دو ہوں تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو دو سے زیادہ کا حکم ہے، اس کا ثبوت حدیث شریف میں مذکور ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى جِئْنَا امْرَأَةً مِّنَ الْاَنْصَارِ فِي الْاَسْوَاقِ فَجَاءَتِ الْمَرْأَةُ بِابْنَتَيْنِ لَهَا فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ بِنْتَا ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ قُتِلَ مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ وَقَدِ اسْتَفَاءَ عَمُّهُمَا مَالَهُمَا وَمِيْرَاثَهُمَا كُلَّهُ وَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا اِلَّا اَخَذَهُ فَمَا تَرٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ لَا تُنْكَحَانِ اَبَدًا اِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْضِي اللّٰهُ فِي ذٰلِكَ وَقَالَ نَزَلَتْ سُوْرَةُ النِّسَاءِ "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ" الاٰية. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُدْعُوْا لِيَ الْمَرْأَةَ وَصَاحِبَهَا. فَقَالَ لِعَمِّهِمَا اَعْطِهِمَا الثُّلُثَيْنِ وَاَعْطِ اُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِيَ فَلَكَ. (ابو داؤد كتاب الفرائض ومعناه في الترمذي ابواب الفرائض)

ترجمہ

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، راستے میں ہمارا گذر اسواق میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہوگیا ہے، اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرما دے گا، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۂ نساء کی یہ آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے

أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ "یعنی اولاد اور ماں باپ کے یہ حصے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے مقرر کر دیئے ہیں، اور اللہ کو سب کچھ معلوم ہے، اور وہ حکیم ہے جو حصے مقرر کئے گئے ہیں ان میں بڑی حکمتیں ہیں، اگر تمہاری رائے پر تقسیم میراث کا معاملہ رکھا جاتا تو مدار تقسیم تم لوگ نفع رساں ہونے کو بناتے لیکن نفع رساں کون ہوگا؟ اور سب سے زیادہ نفع کس سے پہنچ سکتا ہے؟ اس کا یقینی علم حاصل کرنا تمہارے لئے مشکل تھا، اس لئے بجائے نافع ہونے کے قرابت کو مدار حکم بنایا۔"

قرآن کریم کی اس آیت نے جو دیگر میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے، اس میں کسی کو اپنی رائے زنی کی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں اور تمہیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے، تمہارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے، اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمہیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہو سکتی، اگر تقسیم میراث کا مسئلہ خود تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا، تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کر پاتے، اور میراث کی تقسیم میں بے اعتدالی ہو جاتی، اللہ جل شانہ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو، اور میت کا سرمایہ منصفانہ طریقے سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ

اور تمہارا ہے آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد،

فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ

اور اگر ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد وصیت کے

يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن

جو کر گئیں یا بعد قرض کے اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہارے

لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم

اولاد، اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو کچھ کہ تم نے چھوڑا

مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ

بعد وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے۔

خلاصۂ تفسیر

رابطِ آیات یہاں تک ان مستحقینِ میراث کے حصص کا بیان تھا جن کو میت کے ساتھ نسب اور ولادت کا رشتہ تھا، مذکورہ آیت میں بعض دوسرے مستحقین کا ذکر ہے، اور میت سے ان کا رشتہ نسب کا نہیں، بلکہ زوجیت کا ہے، جس کا بیان یہ ہے:

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جاویں، اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ اس حد سے نیچے) اور اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو اس صورت میں تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا (یہ کل دو صورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے ورثاء کو ملے گا لیکن ہر صورت میں یہ میراث) وصیت کے قدر مال نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جاویں یا دین (اگر ہو تو اس کے نکالنے کے بعد ملے گی) اور ان بیبیوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ (خواہ وہ ایک ہو یا کئی ہوں تو وہ چوتھائی سب میں برابر بانٹ دیا جاوے گا) اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ واحد نہ کثیر) اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو (خواہ ان بیبیوں سے یا دوسری عورت سے) تو اس صورت میں، ان کو (خواہ وہ ایک ہو یا کئی) تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا (یہ بھی دو صورتیں ہیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے ورثاء کو ملے گا، لیکن یہ میراث) وصیت کے قدر مال نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین (اگر ہو تو اس کے بھی نکالنے کے بعد ملے گی)۔

معارف و مسائل

شوہر اور بیوی کا حصہ مندرجہ بالا سطور میں شوہر اور بیوی کے حصوں کی تعیین کی گئی ہے، اور پہلے شوہر کا حصہ بتایا، اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اس کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے، کیونکہ عورت کی وفات کے بعد شوہر دوسرے گھر کا آدمی ہو جاتا ہے، اگر بچے میکہ میں عورت کا انتقال ہو جائے اور اس کا مال وہیں ہو تو شوہر کا حصہ دینے سے گریز کیا جاتا ہے، گویا اس زیادتی کا سدباب کرنے کے لئے شوہر کا حصہ پہلے بیان فرمایا، اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فوت ہونے والی عورت نے اگر کوئی بھی اولاد نہ چھوڑی ہو تو شوہر کو بعد ادائے دین و نفاذ وصیت کے مرحومہ کے کُل کا نصف ملے گا، اور باقی نصف میں دوسرے ورثاء مثلاً مرحومہ کے والدین، بھائی بہن، حسب قاعدہ حصہ پائیں گے۔

اور اگر مرنے والی نے اولاد چھوڑی ہو، ایک ہو یا دو ہوں یا اس سے زائد ہوں لڑکا

اس وارث پر بھی اطلاق کیا گیا جو مرنے والے کا ولد اور والد نہ ہو، لغت کے اعتبار سے جو اشتقاق بتلایا اس کا تقاضا ہے کہ لفظ "ذو" مقدر ہو اور کلالہ بمعنی "ذو کلالہ" ہو گا یعنی ضعیف رشتہ والا، پھر اس مال موروث پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا جو ایسے میت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی ولد اور والد نہ ہو۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کوئی شخص مرد یا عورت وفات پا جائے، اور اس کے نہ باپ ہو نہ دادا، اور نہ اولاد ہو، اور اس نے ایک بھائی یا بہن ماں شریک چھوڑے ہوں، تو ان میں سے اگر بھائی ہے تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بہن ہے تو بہن کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر ایک سے زیادہ ہوں، مثلاً ایک بھائی ایک بہن ہو، یا دو بھائی یا دو بہنیں ہوں تو یہ سب مرنے والے کے کل مال کے تہائی حصے میں شریک ہوں گے، اور اس میں مذکر کو مؤنث سے دوہرا نہیں ملے گا، علامہ قرطبی فرماتے ہیں، وَلَيْسَ فِي الْفَرَائِضِ مَوْضِعٌ يَكُونُ فِيهِ الذَّكَرُ وَالْأُنْثَى سَوَاءً إِلَّا فِي مِيرَاثِ الْإِخْوَةِ لِلْأُمِّ۔

بہن بھائی کا حصہ

واضح رہے کہ اس آیت میں اخیافی یعنی ماں شریک بہن بھائی کا حصہ بتلایا گیا ہے، اگرچہ قرآن کریم کی اس آیت میں یہ قید مذکور نہیں ہے لیکن یہ قید بالاجماع معتبر ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اس آیت میں اس طرح ہے: وله اخ او اخت من امه، جیسا کہ علامہ قرطبی، صاحب روح المعانی اور ابوبکر جصاص اور دیگر حضرات نے نقل کیا ہے، گو یہ قراءت متواتر نہیں ہے، لیکن اجماع امت ہونے کی وجہ سے معمول بہا ہے اور اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۂ نساء کے ختم پر بھی کلالہ کی میراث کا ذکر کیا ہے، وہاں بتایا ہے کہ اگر ایک بہن ہو تو اس کو آدھا ملے گا، اور اگر ایک بھائی ہو تو اپنی بہن کے پورے مال کا وارث بنے گا، اور اگر دو بہنیں ہوں تو دو تہائی مال پائیں گی، اور اگر متعدد بھائی بہن ہوں تو مذکر کو مؤنث سے دوہرا دیا جائے گا، سورت کے ختم پر جو یہ حکم ارشاد فرمایا ہے، عینی یعنی حقیقی بہن بھائی، اور علاتی یعنی باپ شریک بہن بھائی کا ذکر ہے، اگر یہاں علاتی اور عینی بھائی بہن کو شامل کر لیا جائے تو احکام میں تعارض لازم آجائے گا۔

وصیت کے مسائل

اس رکوع میں تین مرتبہ میراث کے حصے بیان کر کے یہ فرمایا کہ حصول کی یہ تقسیم وصیت اور دَین کے بعد ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کہ میت کی تجہیز و تکفین کے بعد کل مال سے قرضہ ادا کرنے کے بعد جو بچے اس میں سے تہائی مال میں وصیت نافذ ہو گی اگر اس سے زیادہ وصیت ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں،

ضابطہ میں اداءِ دین نفاذِ وصیت سے مقدم ہے، اگر تمام مال اداءِ دیون میں لگ جائے تو نہ وصیت نافذ ہوگی نہ میراث چلے گی۔ اس رکوع میں تینوں جگہ جہاں جہاں وصیت کا ذکر آیا ہے وہاں وصیت کا ذکر دین سے پہلے کیا گیا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا حق دین سے مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہوئے فرمایا

اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

یعنی آپ حضرات یہ آیت تلاوت کرتے ہیں من بعد وصیۃ توصون بہا او دین، جس میں اگرچہ وصیت مقدم ہے، لیکن تم دیکھو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کو دین کے بعد رکھا ہے۔

تاہم یہ نکتہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اگر عملاً وصیت مؤخر ہے، تو لفظاً اس کو دین سے پہلے کیوں بیان کیا گیا، صاحب روح المعانی اس بارہ میں لکھتے ہیں:

وتقديم الوصية على الدين ذكرًا مع أن الدين مقدم عليها حكمًا لإظهار كمال العناية بتنفيذها لكونها مظنة للتفريط في أدائها. الخ

یعنی آیت میں دین پر وصیت کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وصیت میراث کی طرح بغیر کسی عوض کے ملتی ہے، اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں، اس لئے وارثین کی جانب سے اس کو نافذ کرنے میں کوتاہی ہو جانے یا دیر ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، اپنے موروث کا مال کسی کے پاس جاتا ہوا دیکھنا ان کو ناگوار ہو سکتا تھا، اس لئے تنفیذِ وصیت کا اہتمام فرماتے ہوئے دین پر اس کو مقدم کر دیا گیا، پھر یہ بھی بات ہے کہ قرض کا ہر میت پر ہونا ضروری نہیں، اور اگر زندگی میں ہو تو موت تک اس کا باقی رہنا بھی ضروری نہیں، اور اگر موت کے وقت موجود بھی ہو تب بھی چونکہ اس کا مطالبہ حقدار کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے ورثاء بھی انکار نہیں کر سکتے اس وجہ سے اس میں کوتاہی کا احتمال بہت کم ہے، بخلاف وصیت کے کہ جب میت مال چھوڑتا ہے تو اس کا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ صدقہ جاریہ کے طور پر اپنے مال کا حصہ کسی کارِ خیر میں صرف کر جائے، یہاں چونکہ اس وصیت کی طرف سے مطالبہ نہیں ہوتا، اس لئے وارثوں کی طرف سے کوتاہی کا امکان تھا، جس کا سد باب کرنے کے لئے بطور خاص ہر جگہ وصیت کو مقدم کیا گیا۔

مسئلہ: اگر دین اور وصیت نہ ہو تو تجہیز و تکفین کے بعد بچا ہوا کل مال وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

مسئلہ: وارث کے حق میں وصیت کرنا باطل ہے، اگر کسی نے اپنے لڑکے، لڑکی، شوہر یا بیوی کے لئے یا اور کسی ایسے شخص کے لئے وصیت کی جس کو میراث میں حصہ ملنے والا ہے تو اس وصیت کا کچھ اعتبار نہیں، وارثوں کو صرف میراث کا حصہ ملے گا، اس سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ	"اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے اس لئے کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت معتبر نہیں"
(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، ص ۲۶۵)	

ہاں اگر دیگر ورثہ اجازت دیدیں تو جس وارث کے لئے وصیت کی ہے، اس کے حق میں وصیت نافذ کر کے باقی مال شرعی طریقہ پر تقسیم کیا جائے، جس میں اس وارث کو بھی اپنے حصہ کی میراث ملے گی، بعض روایت حدیث میں إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَرَثَةُ کا استثناء بھی مذکور ہے۔ (کما ذکر صاحب الہدایۃ)

غَيْرَ مُضَارٍّ کی تفسیر

مقدار میراث کے حصے بتانے کے بعد کہ یہ میراث وصیت اور دین کے بعد نافذ ہوگی، لفظ غَيْرَ مُضَارٍّ فرمایا، یہ قید اگرچہ صرف اسی جگہ مذکور ہے، لیکن اس سے پہلے جو دو جگہ وصیت اور دین کا ذکر ہے وہاں پر بھی معتبر اور معمول بہ ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ مرنے والے کے لئے وصیت یا دین کے ذریعہ وارثوں کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، وصیت کرنے یا اپنے اوپر قرض کا فرضی اقرار کرنے میں وارثوں کو محروم کرنے کا ارادہ ہونا اور اس ارادہ پر عمل کرنا سخت ممنوع ہے، اور گناہ کبیرہ ہے۔

دین یا وصیت کے ذریعہ ضرر پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں، مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کر لے کسی دوست وغیرہ کو دلانے کے لئے، یا اپنے مخصوص مال کو جو اس کا اپنا ذاتی ہے یہ ظاہر کرے کہ فلاں شخص کی امانت ہے، تاکہ اس میں میراث نہ چلے، یا ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت کرے، یا کسی شخص پر اپنا قرض ہو اور وہ وصول نہ ہوا ہو، لیکن جھوٹ یہ کہہ دے کہ اس سے قرض وصول ہوگیا، تاکہ وارثوں کو نہ مل سکے، یا مرض الوفات میں ایک تہائی سے زیادہ کسی کو ہبہ کر دے۔

یہ صورتیں ضرر پہنچانے کی ہیں، ہر مورث جو دنیا سے جا رہا ہے اُسے زندگی کے آخری لمحات میں اس طرح کے اضرار سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کرنے کی تاکید

میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ پاک نے ارشاد فرمایا وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ، یعنی جو کچھ حصے مقرر کئے گئے، اور دین اور

وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی اس سب پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے، اللہ پاک کی طرف سے ایک عظیم وصیت اور نہایت باشان حکم ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا، پھر مزید تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے ہوئے حصے مقرر فرمائے، جو احکام مذکورہ پر عمل کرے گا اللہ کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہ ہوگی، اور جو خلاف ورزی کرے گا اس کی یہ بدکرداری بھی اللہ کے علم میں آئے گی جس کی پاداش میں اس سے مواخذہ کیا جائے گا۔

نیز جو کوئی مرنے والا دین یا وصیت کے ذریعہ سے ضرر پہنچائے گا اللہ کو اس کا بھی علم ہے، اس کے مواخذہ سے بے خوف نہ رہو، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلاف ورزی کرنے پر اس دنیا میں سزا نہ دے، اس لئے کہ وہ حلیم ہے، خلاف ورزی کرنے والے کو یہ دھوکا نہ لگنا چاہئے کہ میں بچ گیا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ

یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اس کو داخل کرے گا

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ

جنتوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ

بڑی مراد ملنی اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جاوے

حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

اس کی حدوں سے ڈالے گا اس کو آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

ع ۲ ۱۳

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات میراث کے مذکورہ احکام بیان کرنے کے بعد ان دو آیتوں میں ان احکام کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کی فضیلت اور نافرمانی کرنے کی برائی و قباحت کا بیان ہے، جس سے احکام مذکورہ کی اہمیت مقصود ہے۔

یہ سب احکام مذکورہ (متعلقہ میراث وغیرہ احکام یتامیٰ کے) خداوندی ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ و رسول کی پوری اطاعت کرے گا (یعنی ان ضابطوں کی پابندی کرے گا)

اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں (فوراً) داخل کر دیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا (یعنی پابندی کو ضروری بھی نہ سمجھے گا اور یہ حالت کفر کی ہے) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے، اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔"

معارف و مسائل

قرآن کریم کا یہ اسلوب ہے کہ احکام و عقائد کے بیان کے بعد تتمہ کے طور پر ماننے والوں کے لئے ترغیب اور ان کی فضیلت کا ذکر ہوتا ہے، اور نہ ماننے والوں کے لئے ترہیب و سزا، اور ان کی مذمت مذکور ہوتی ہے۔

یہاں بھی چونکہ احکام کا ذکر تھا اس لئے آخر کی ان دو آیتوں میں اطاعت کرنیوالوں، اور نافرمانوں کے نتائج کا ذکر کر دیا گیا۔

تکملہ احکامِ میراث

مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا

اگرچہ میراث کی تقسیم نسبی قرابت پر رکھی گئی ہے، لیکن اس میں سے بعض چیزیں مستثنیٰ ہیں، اوّل یہ کہ مورث اور وارث دو مختلف دین والے نہ ہوں لہٰذا مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوگا، خواہ ان میں آپس میں کوئی بھی نسبی رشتہ ہو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (مشکوٰۃ ص ۲۶۳) "یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔"

یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب کہ پیدائش کے بعد ہی سے کوئی شخص مسلم یا کافر ہو، لیکن اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا، پھر (معاذ باللہ) اسلام سے پھر گیا اور مرتد ہو گیا، اگر ایسا شخص مر جائے یا مقتول ہو جائے، تو اس کا وہ مال جو اسلام کے زمانہ میں کسب کیا تھا، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، اور جو ارتداد کے بعد کمایا ہو وہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔

لیکن اگر عورت مرتد ہو گئی تو اس کا کل مال خواہ زمانۂ اسلام میں حاصل ہوا ہو یا زمانۂ ارتداد میں، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، لیکن خود مرتد مرد ہو یا عورت اس کو نہ کسی

مسلمان سے میراث ملے گی نہ کسی مرتد سے۔

قاتل کی میراث | اگر کوئی شخص ایسے آدمی کو قتل کردے جس کے مال میں اس کو میراث پہنچتی ہو تو یہ قاتل اس شخص کی میراث سے محروم ہوگا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "القاتل لا یرث" (مشکوٰۃ، ص ۲۶۳) "یعنی قاتل وارث نہیں ہوگا" البتہ قتل خطا کی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے)

پیٹ میں بچہ ہے | اگر کسی شخص نے اپنی کچھ اولاد چھوڑی اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے، **اس کی میراث** | تو یہ بچہ بھی وارثوں کی فہرست میں آئے گا، لیکن چونکہ یہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی یا ایک سے زیادہ بچے ہیں، اس لئے بچہ پیدا ہونے تک تقسیم میراث ملتوی رکھنا مناسب ہوگا، اور اگر تقسیم کرنا ضروری ہی ہو تو سر دست ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کر کے دونوں کے اعتبار سے دو صورتیں فرض کی جائیں، ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں ورثاء کو کم ملتا ہو وہ ان میں تقسیم کردیا جائے، اور باقی اس حمل کے لئے رکھا جائے۔

معتدہ کی میراث | جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور طلاق رجعی ہے، یعنی طلاق سے رجوع اور عدت ختم ہونے سے پہلے وفات پاگیا، تو یہ عورت میراث میں حصہ پاوے گی، اس لئے کہ نکاح باقی ہے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات میں بیوی کو طلاق دی، اگرچہ طلاق بائن یا مغلظہ ہی ہو، اور عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے مرگیا، تب بھی وہ عورت اس کی وارث ہوگی، اور عورت کو وارث بنانے کی وجہ سے دو عدتوں میں سے جو سب سے زیادہ دراز ہو اس کو اختیار کیا جائے گا، جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ:

عدتِ طلاق تین حیض ہے، اور عدتِ وفات چار مہینہ دس دن ہے، ان دونوں میں جو عدت زیادہ دنوں کی ہو اس کو عدت قرار دیا جائے گا، تاکہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو حصہ مل سکے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات سے پہلے بائن یا مغلظ طلاق دی اور اس کے چند دن بعد عورت کی عدت میں وہ فوت ہوگیا، تو اس صورت میں اس کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، البتہ اگر طلاق رجعی دی ہے تو وہ وارث ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی عورت نے شوہر کے مرض وفات میں خود سے خلع کرلیا تو وارث نہیں ہوگی، اگرچہ اس کا شوہر اس کی عدت کے دوران مرجائے۔

عصبات کی میراث فرائض کے مقررہ حصے بارہ وارثوں کے لئے طے شدہ ہیں، ان وارثوں کو اصحاب الفروض کہا جاتا ہے جن کی تفصیل کسی قدر اوپر گذر چکی، اگر اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو، یا اصحاب الفروض کے حصے دیدینے کے بعد کچھ مال بچ جائے تو وہ عصبہ کو دیدیا جاتا ہے، اور بعض مرتبہ ایک ہی شخص کو دونوں حیثیتوں سے مال مل جاتا ہے، بعض صورتوں میں میت کی اولاد اور میت کا والد بھی عصبہ ہوجاتے ہیں، دادا کی اولاد یعنی چچا اور باپ کی اولاد یعنی بھائی بھی عصبہ ہوجاتے ہیں۔

عصبات کی کئی قسمیں ہیں جن کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں یہاں ایک مثال لکھی جاتی ہے۔ مثلاً زید فوت ہوگیا اور اس نے اپنے پیچھے جو وارث چھوڑے، بیوی، لڑکی، ماں اور چچا، تو مسئلہ کے کل چوبیس حصے کئے جائیں گے، جن میں سے آدھا یعنی بارہ حصے لڑکی کو، ⅛ کے حساب سے تین حصے بیوی کو، ⅙ کے حساب سے چار حصے ماں کو، اور بقیہ پانچ حصے جو بچے وہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے چچا کو ملیں گے۔

مسئلہ: عصبات اگر نہ ہوں تو اصحاب فرائض سے جو مال بچے وہ ان کے حصوں کے مطابق انہی کو دیدیا جاتا ہے، اور اس کو علم فرائض کی اصطلاح میں رد کہتے ہیں، البتہ شوہر اور بیوی پر رد نہیں ہوتا، کسی حال میں ان کو مقررہ حصے سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔

مسئلہ: اگر اصحاب فروض میں سے کوئی نہ ہو، اور عصبات میں بھی کوئی نہ ہو تو ذوی الارحام کو میراث پہنچ جاتی ہے، ذوی الارحام کی فہرست طویل ہے، نواسے، نواسیاں، بہنوں کی اولاد، پھوپھیاں، ماموں، خالہ، یہ لوگ ذوی الارحام کی فہرست میں آتے ہیں، اور اس مسئلہ میں تفصیل ہے جس کا یہ محل نہیں یہاں اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر

اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی

چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیدیں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک

یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ

کہ اٹھا لیوے ان کو موت یا مقرر کردے اللہ ان کے لئے کوئی راہ اور جو

یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا

دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو ان کا

یعنی زنا کی حد مذکور ہے، پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کے ثبوت کے لئے چار گواہ مرد طلب کئے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوتِ زنا کے لئے وہ چار گواہ طلب کریں جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں، اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے، اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

زنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے جس سے عزت و عفت مجروح ہوتی ہے، اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اوّلاً تو یہ شرط لگائی کہ مرد ہی گواہ ہوں عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا، ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے جس کا وجود میں آنا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے، یہ سختی اس لئے اختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی بہن ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگائیں، یا دوسرے بدخواہ لوگ دشمنی کی وجہ سے الزام اور تہمت لگانے کی جرأت نہ کر سکیں، کیونکہ اگر چار افراد سے کم لوگ زنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیئے جاتے ہیں، اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے ان پر حدِ قذف جاری کر دی جاتی ہے۔

سورۂ نور میں واضح طور پر ارشاد فرمایا: لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۲۴: ۱۳) جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ چار گواہ نہ لا سکیں وہ جھوٹے ہیں۔

بعض اکابر نے چار گواہوں کی ضرورت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس معاملہ میں چونکہ دو افراد ملوث ہوتے ہیں، مرد اور عورت، تو گویا کہ یہ ایک ہی معاملہ تقدیراً دو معاملوں کے حکم میں ہے، اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا اس کے لئے چار گواہ ضروری ہوں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے تعرض مت کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دینے کے بعد اگر انھوں نے توبہ کرلی تو پھر انھیں ملامت مت کرو، اور مزید سزا مت دو، یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہوگئی، اس لئے کہ یہ توبہ سزا کے بعد مذکور ہے، جیساکہ فاء کی تفریع سے ظاہر ہے، ہاں اگر توبہ نہ کی ہو تو سزا کے بعد بھی ملامت کرسکتے ہیں۔

قرآن کریم کی ان دو آیتوں میں زنا کے لئے کوئی متعین حد بیان نہیں کی گئی، بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ان کو تکلیف پہنچاؤ، اور زناکار عورتوں کو گھروں میں بند کر دو۔

تکلیف پہنچانے کا بھی کوئی خاص طریقہ نہیں بتلایا گیا اور حکام کے صواب دید پر اس کو چھوڑ دیا گیا، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں ایذا دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو زبان سے عار دلائی جائے اور شرمندہ کیا جائے اور ہاتھ سے بھی جوتے وغیرہ کے ذریعہ ان کی مرمت کی جائے، حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی بطور تمثیل کے معلوم ہوتا ہے، اصل بات وہی ہے کہ یہ معاملہ حکام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی ان دو آیتوں کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں تو ان کو ایذا دینے کا حکم نازل ہوا اور اس کے بعد خاص طور سے عورتوں کے لئے یہ حکم بیان کیا گیا کہ ان کو گھروں میں محبوس رکھا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مرجائے، اس کی زندگی ہی میں آنے والا حکم آجائے گا تو بطور حد کے اسی کو نافذ کردیا جائے گا۔

چنانچہ بعد میں وہ "سبیل" بیان کردی گئی جس کا اللہ جل شانہ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ "سبیل" کی تفسیر فرماتے ہیں "یَعْنِی الرَّجْمُ لِلثَّیِّبِ وَالْجَلْدُ لِلْبِکْرِ" کہ شادی شدہ کے حق میں زنا کی حد اس کو سنگسار کردینا ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے اس کو کوڑے مارنا (بخاری کتاب التفسیر، ص ۶۵۷)

مرفوع احادیث میں بھی اس سبیل کا بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے، اور شادی شدہ، غیر شادی شدہ ہر ایک کے لئے الگ الگ حکم بیان کیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ قبیلۂ ازد کی ایک عورت پر زنا کی حد جاری فرمائی تھی، اور یہ دونوں چونکہ شادی شدہ تھے، اس لئے ان کو سنگسار کردیا گیا تھا، نیز ایک یہودی کو بھی زنا کی وجہ سے رجم کیا گیا تھا، اور اس کے حق میں یہ فیصلہ تورات کے حکم پر کیا گیا تھا۔

غیر شادی شدہ کا حکم خود قرآن کریم کی سورۂ نور میں مذکور ہے۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ	"زناکار عورت اور زناکار مرد دونوں میں ہر ایک کو سو کوڑے مارو" (۲۴: ۲)

شروع میں رجم کے حکم کے لئے قرآن کریم کی آیت بھی نازل کی گئی تھی، لیکن بعد میں اس کی تلاوت منسوخ کردی گئی، البتہ حکم باقی رکھا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَیْهِ الْكِتٰبَ فَكَانَ	"اللہ تعالیٰ نے محمد علیہ السلام کو نبی برحق بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب بھی نازل کردی

مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی اٰیَةَ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰی مَنْ زَنٰی اِذَا اُحْصِنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ الخ

(بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۰۹)

جو کچھ وحی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی، اس میں رجم کی آیت بھی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد رجم کیا، رجم کا حکم اس شخص کے لئے ثابت ہے جو زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔"

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں جو حبس فی البیوت اور ایذاء کا حکم ہے وہ شرعی حد نازل ہونے پر منسوخ ہوگیا، اور اب حدِ زنا سو کوڑے یا رجم پر عمل کرنا لازم ہوگا، مزید تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ نور کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

غیر فطری طریقہ سے قضاءِ شہوت کا حکم

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ "میرے نزدیک "اَلَّذَانِ یَاْتِیٰنِهَا" کا مصداق وہ لوگ ہیں جو غیر فطری طریقہ پر قضاءِ شہوت کرتے ہیں، یعنی مرد استلذاذ بالمثل کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

قاضی صاحبؒ کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اسی قول کو لیا ہے، الفاظ قرآن مجید میں چونکہ لفظ اَلَّذَانِ یَاْتِیٰنِهَا موصول اور صلہ دونوں مذکر کے الفاظ ہیں، اس لئے ان حضرات کا یہ قول بعید نہیں ہے، اگرچہ جن حضرات نے زانی اور زانیہ مراد لیا ہے، انھوں نے بطور تغلیب مذکر کا یہ صیغہ زانیہ کے لئے بھی شامل رکھا ہے، تاہم موقع کی مناسبت سے استلذاذ بالمثل کی حرمت و شدت اور اس کی جزاء و تعزیر کا ذکر اس جگہ بے جا نہ ہوگا۔

احادیث و آثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ سَبْعَةً مِنْ خَلْقِهٖ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوٰتِهٖ وَرَدَّدَ اللَّعْنَةَ عَلٰی وَاحِدٍ مِّنْهُمْ ثَلٰثًا وَلَعَنَ کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ لَعْنَةً تَکْفِیْهِ قَالَ مَلْعُوْنٌ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے، اور ان سات میں سے ایک پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے اور باقی پر ایک دفعہ، فرمایا

مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مَلْعُوْنٌ
مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مَلْعُوْنٌ
مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ الحدیث
(الترغیب والترهیب)

ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے
ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے
ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل
کرتا ہے"

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعَةٌ یُصْبِحُوْنَ فِیْ غَضَبِ اللّٰهِ وَیُمْسُوْنَ فِیْ سَخَطِ اللّٰهِ قُلْتُ مَنْ هُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْمُتَشَبِّهُوْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتُ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ وَالَّذِیْ یَاْتِی الْبَهِیْمَةَ وَالَّذِیْ یَاْتِی الرِّجَالَ (الترغیب والترهیب)

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہ کے غضب میں ہوتے ہیں، اور شام کو بھی اللہ جل شانہ ان سے ناراض ہوتے ہیں، میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مرد جو عورتوں کی طرح بنتے ہیں اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے اور وہ مرد جو مرد سے قضاء شہوت کرتا ہے"

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدْتُّمُوْهُ یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ
(الترغیب والترهیب)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو تم قوم لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو"

حافظ زکی الدین نے ترغیب وترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور ہشام بن عبدالملک نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے محمد بن منکدر کی روایت سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں عرب کے ایک علاقہ میں ایک مرد ہے جس کے ساتھ عورت والا کام کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کو جمع کیا، اور ان میں حضرت علیؓ

بھی تشریف لاتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ارتکاب سوائے ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا، اور اللہ جل شانہٗ نے اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے، میری رائے ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے، دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اس پر اتفاق کرلیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے آگ میں جلا دینے کا حکم دیدیا۔

مذکورہ روایت میں قوم لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم کفر و شرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی، اور جب حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہٗ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اٹھا لیا، اور اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا، جس کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا، انشاء اللہ۔

مندرجہ بالا روایات استلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں، روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی رَجُلٍ اَتٰی رَجُلًا اَوِ امْرَاَۃً فِیْ دُبُرِھَا (الترغیب والترہیب)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ جل شانہٗ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے۔"

عَنْ خُزَیْمَۃَ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ لَا تَاْتُوا النِّسَاءَ فِیْ اَدْبَارِھِنَّ (الترغیب والترہیب)

"خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، یہ الفاظ آپؐ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے (پھر فرمایا) عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو۔"

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتَی امْرَاَۃً فِیْ دُبُرِھَا (الترغیب والترہیب)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے۔"

وَعَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

"حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ

قَالَ مَنْ أَتَى حَائِضًا أَوِ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے یا غیر فطری طریقہ سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب کے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے، تو ایسے لوگ اس دین سے منکر ہوگئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

اس قبیح فعل کے لئے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، تاہم اس کے لئے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو ان کی ہے جو کرتے ہیں برا کام جہالت سے پھر

يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ

توبہ کرتے ہیں جلدی سے تو ان کو اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب

اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ

کچھ جاننے والا ہے حکمت والا اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں برے

السَّيِّئَاتِ حَتّٰىٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ

کام یہاں تک کہ جب سامنے آجاوے ان میں سے کسی کے موت تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں

الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا

اب اور نہ ایسوں کی توبہ جو کہ مرتے ہیں حالت کفر میں ان کے لئے تو ہم نے تیار کیا

لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۸﴾

ہے عذاب دردناک۔

ربطِ آیات: قبل کی آیت میں توبہ کا ذکر آیا تھا، اب ان دو آیتوں میں قبولِ توبہ کی شرائط اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کی صورتیں بتلاتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

توبہ جس کا قبول کرنا (حسب وعدہ) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو انہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ (صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو) کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں (یعنی قبل حضور موت جس کے معنی آگے آتے ہیں) توبہ کر لیتے ہیں، سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ (قبول توبہ کے ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول کر لیتے ہیں)، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں (کہ کس نے دل سے توبہ کی)، حکمت والے ہیں (کہ دل سے توبہ نہ کرنے والے کو فضیحت نہیں کرتے)، اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو برابر گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی (حضور موت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں)، تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں (پس نہ تو ایسوں کی توبہ قبول) اور نہ ان لوگوں کی (توبہ یعنی ایمان لانا ایسے وقت کا مقبول ہے) جن کو حالت کفر پر موت آجاتی ہے، ان (کافر) لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا (یعنی عقوبت دوزخ) تیار کر رکھی ہے۔

معارف و مسائل

کیا قصد و اختیار سے کیے ہوئے گناہ معاف نہیں ہوتا

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں لفظ بِجَهَالَةٍ کا وارد ہوا ہے اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ انجانی اور نادانی سے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی، جان بوجھ کر کرے تو توبہ قبول نہیں ہوگی، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے جو تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ "جہالۃ" سے اس جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ اس کو گناہ کے گناہ ہونے کی خبر نہ ہو، یا گناہ کا قصد و ارادہ نہ ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کو گناہ کے انجام بد اور اخروی عذاب سے غفلت اس گناہ پر اقدام کا سبب ہوگئی، اگرچہ گناہ کو گناہ جانتا ہو اور اس کا قصد و ارادہ بھی کیا ہو۔

دوسرے الفاظ میں جہالت کا لفظ اس جگہ حماقت و بیوقوفی کے معنی میں ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں مذکور ہوا ہے، اس کی نظیر سورۂ یوسف میں ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جٰهِلُونَ (۸۹:۱۲)، اس میں بھائیوں کو جاہل کہا گیا ہے، حالانکہ انہوں نے جو کام کیا وہ کسی خطا یا نسیان سے نہیں بلکہ قصد و ارادہ سے جان بوجھ کر کیا تھا، مگر اس فعل کے انجام سے غفلت کے سبب ان کو جاہل کہا گیا ہے۔

ابو العالیہ اور قتادہ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر متفق تھے کہ کُلُّ

ذَنْبٍ اَصَابَهٗ عَبْدٌ فَهُوَ جَهَالَةٌ عَمْدًا كَانَ اَوْ غَيْرَهٗ "یعنی بندہ جو گناہ کرتا ہے خواہ بلا قصد ہو یا بالقصد بہرحال جہالت ہے"۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا: كُلُّ عَامِلٍ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَهُوَ جَاهِلٌ حِيْنَ عَمَلِهَا "یعنی جو شخص کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ یہ کام کرتے ہوئے جاہل ہی ہے" اگرچہ صورت میں بڑا عالم اور باخبر ہو (ابن کثیر)

اور ابوحیانؒ نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث میں ارشاد ہے: لَا يَزْنِي الزَّانِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ "یعنی زنا کرنے والا مومن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا" مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ اس فعل بد میں مبتلا ہوا ہے اس وقت وہ ایمانی تقاضے سے دور جا پڑا۔

اسی لئے حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ: اُمُوْرُ الدُّنْيَا كُلُّهَا جَهَالَةٌ "یعنی دنیا کے وہ سارے کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت سے خارج ہوں سب کے سب جہالت ہیں" اور وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا تھوڑی دیر کی لذت کو ہمیشہ باقی رہنے والی لذت پر ترجیح دے رہا ہے، اور جو شخص تھوڑی دیر کی لذت کے بدلے میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب شدید خریدے وہ عاقل نہیں کہا جا سکتا، اس کو ہر شخص جاہل ہی کہے گا، اگرچہ وہ اپنے فعل بد کو جانتا ہو، اور اس کا قصد و ارادہ بھی کر رہا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ قصداً کرے یا خطاءً دونوں حالت میں گناہ جہالت ہی سے ہوتا ہے، اسی لئے صحابہؓ و تابعینؒ اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہوا اس کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے (بحر محیط)

آیت مذکورہ میں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ اس میں قبول توبہ کے لئے یہ شرط بتلائی ہے کہ قریب زمانہ میں ہی توبہ کرلے، توبہ کرنے میں دیر نہ کرے، اس میں قریب کا کیا مطلب ہے، اور کتنا زمانہ قریب میں داخل ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر ایک حدیث میں خود اس طرح بیان فرمائی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس پر موت اور نزع روح کا غرغرہ طاری نہ ہو جائے"۔

اور محدث ابن مردویہؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندۂ مومن موت سے ایک مہینہ پہلے اپنے گناہ سے توبہ کرے، یا ایک دن یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ

قبول فرمائیں گے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ سچی توبہ کی گئی ہو (ابن کثیر)

خلاصہ یہ کہ مِنْ قَرِیْبٍ کی تفسیر جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری عمر کا زمانہ قریب ہی میں داخل ہے، موت سے پہلے پہلے جو توبہ کرلی جائے قبول ہوگی، البتہ غرغرۂ موت کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔

اس کی توضیح جو حضرت حکیم الامت تھانوی نے تفسیر بیان القرآن میں بیان فرمائی ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں، ایک تو یاس و ناامیدی کی جب کہ انسان ہر دوا تدبیر سے عاجز ہوکر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالت یاس یا بأس سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزع روح شروع ہو جائے اور غرغرہ کا وقت آجائے، اس حالت کو یأس بھی کہا جاتا ہے، پہلی حالت یعنی حالت یأس تک تو مِنْ قَرِیْبٍ کے مفہوم میں داخل ہے، اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے، مگر دوسری حالت یعنی حالتِ بأس کی توبہ مقبول نہیں، جب کہ فرشتے اور عالمِ آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے آجائیں کیونکہ وہ مِنْ قَرِیْبٍ کے مفہوم میں داخل نہیں۔

اس آیت میں مِنْ قَرِیْبٍ کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی ساری عمر ہی ایک قلیل زمانہ ہے، اور موت جس کو وہ بعید سمجھ رہا ہے اس کے بالکل قریب ہے۔

قریب کی یہ تفسیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی ہے، دوسری آیت میں خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے، جس میں یہ بتلایا ہے کہ موت کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔

خلاصۂ مضمون آیت کا یہ ہوگیا کہ جو شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے خواہ جان بوجھ کر قصد و ارادہ سے کرے یا خطاءً و ناواقفیت کی بناء پر کرے، وہ بہرحال جہالت ہی ہوتا ہے، ہر ایسے گناہ سے انسان کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے بشرطیکہ موت سے پہلے پہلے سچی توبہ کرلے۔

اپنے ذمہ لے لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرما لیا ہے جس کا پورا ہونا یقینی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی فرض و واجب یا کسی کا حق لازم نہیں ہوتا، پہلی آیت میں تو اس توبہ کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول ہے، دوسری آیت میں اس توبہ کا بیان ہے جو قابلِ قبول نہیں۔

اس میں بیان فرمایا ہے کہ اُن لوگوں کی توبہ قابلِ قبول نہیں جو عمر بھر جرأت کے ساتھ گناہ کرتے رہے اور جب موت سر پر آپہنچی اور نزعِ روح شروع ہوگیا، موت کے

فرشتے سامنے آگئے، اُس وقت کہنے لگے کہ ہم اب توبہ کرتے ہیں، انھوں نے فرصتِ عمر گنوا کر توبہ کا وقت کھو دیا، اس لئے ان کی توبہ مقبول نہیں ہوگی، جیسے فرعون اور آلِ فرعون نے غرق ہونے کے وقت پکارا کہ ہم ربِ موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے ہیں، تو ان کو جواب ملا کہ کیا اب ایمان لاتے ہو جب ایمان لانے کا وقت گزر چکا؟

اور یہی مضمون آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا کہ اُن لوگوں کی توبہ بھی قابلِ قبول نہیں جن کو حالتِ کفر پر موت آگئی، اور عین نزعِ روح کے وقت ایمان کا اقرار کیا، یہ اقرار و ایمان بے وقت اور بے سود ہے ان کے لئے عذاب تیار کر لیا گیا ہے۔

توبہ کی تعریف و حقیقت

دونوں آیتوں کی لفظی تفسیر کے بعد ضروری بات یہ باقی رہتی ہے کہ توبہ کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کی کیا حقیقت اور کیا درجہ ہے؟

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں:

ایک یہ کہ کبھی گناہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو، یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیاء علیہم السلام کی، دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے، اور پھر ان پر اصرار جاری رہے، کبھی اُن پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے، یہ درجہ شیاطین کا ہے، تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو، اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا یہ خاص شیاطین کا کام ہے اس لئے باجماعِ امت توبہ فرض ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	"یعنی ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو سچی توبہ، تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہوں کا کفارہ کر دیں اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کر دیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں"

کریم الکرماء اور رحیم الرحماء کی بارگاہِ رحمت کی شان دیکھئے کہ انسان ساری عمر اس کی نافرمانی میں مبتلا رہے، مگر موت سے پہلے سچے دل سے توبہ کر لے تو صرف یہی نہیں کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے بلکہ اس کو اپنے محبوب بندوں میں داخل کر کے جنت کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلتَّائِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ وَالتَّائِبُ　　"یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب

مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ (ابن ماجہ)	ہے، وہ جس نے گناہ سے توبہ کرلی وہ ایسا ہوگیا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔"

بعض روایات میں ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کرے، اور وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہو جائے، تو صرف یہی نہیں کہ اس پر مواخذہ نہ ہو، بلکہ اس کو فرشتوں کے لکھے ہوئے نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، تاکہ اس کی رسوائی بھی نہ ہو۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ توبہ سچی اور توبۃ النصوح ہو جس کے تین رکن ہیں، اول اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں ارشاد ہے: اِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ، یعنی توبہ نام ہی ندامت کا ہے" دوسرا رکن توبہ کا یہ ہے کہ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے۔

تیسرا رکن یہ ہے کہ تلافی مافات کی فکر کرے، یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتنا تدارک اس کے قبضہ میں ہے اس کو پورا کرے مثلاً نماز روزہ فوت ہوا ہے تو اس کو قضا کرے، فوت شدہ نمازوں اور روزوں کی صحیح تعداد یاد نہ ہو، تو غور و فکر سے کام لے کر تخمینہ متعین کرے پھر ان کی قضاء کرنے کا پورا اہتمام کرے، بیک وقت نہیں کر سکتا تو ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز قضاءِ عمری کی پڑھ لیا کرے، ایسے ہی متفرق اوقات میں روزوں کی قضاء کا اہتمام کرے، فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گذشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی یک مشت یا تدریجاً ادا کرے، کسی انسان کا حق لے لیا ہے تو اس کو واپس کرے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے، لیکن اگر اپنے کئے پر ندامت نہ ہو یا ندامت تو ہو مگر آئندہ کے لئے اس گناہ کو ترک نہ کرے، تو یہ توبہ نہیں ہے، گو ہزار مرتبہ زبان سے توبہ توبہ کہا کرے ؂

توبہ برلب سبحہ برکف دل پُر از ذوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ما

جب کسی انسان نے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق توبہ کرلی تو وہ ہر طرح کا گناہ کرچکنے کے باوجود اللہ کا محبوب بندہ بن گیا۔

اور اگر پھر بتقاضائے بشریت کبھی اس سے گناہ کا ارتکاب ہوگیا، تو پھر فوراً توبہ کی تجدید کرے، بارگاہِ غفور کریم سے ہر دفعہ توبہ قبول کرنے کی امید رکھے، ؂

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ
اے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ
اور نہ روکے رکھو ان کو اس واسطے کہ لے لو ان سے کچھ اپنا دیا ہوا مگر یہ کہ وہ کریں

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ
بے حیائی صریح اور گذران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾
شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ
اور اگر بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور دے چکے ہو

اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ
ان میں ایک کو بہت سا مال تو مت پھیر لو اس میں سے کچھ کیا لیتے ہو اس کو

بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى
ناحق اور صریح گناہ سے اور کیونکر اس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے

بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾
تم میں کا ایک دوسرے تک اور لے چکیں وہ عورتیں تم سے عہد پختہ۔

ربطِ آیات مندرجہ بالا آیات میں توبہ کا ذکر ایک مناسبت سے آیا تھا، اس سے پہلے عورتوں سے متعلق احکام کا ذکر چل رہا تھا، ان آیات میں بھی عورتوں کے متعلق احکام ہیں، جاہلیت میں عورتوں پر ان کے شوہروں کی طرف سے بھی ظلم ہوتا تھا، اور ان کے وارثوں کی طرف سے بھی۔

جب عورت کا شوہر مرجاتا تو شوہر کے ورثاء اپنی من مانی کرتے تھے، دل چاہتا تو اسی عورت کے ساتھ خود نکاح کرلیتے یا دوسرے کے ساتھ کر دیتے، اور اگر رغبت نہ ہوتی تو نہ خود نکاح کرتے اور نہ دوسرے سے نکاح کرنے دیں بلکہ ان کو قیدی بنا کر رکھیں، تاکہ اس کو ذریعہ آمدنی بناویں، اس لئے کہ اس صورت میں اب وہ یا تو اپنا مال متاع ان کو دے کر اپنے آپکو چھڑا لیتی اور یا یوں ہی ان کے گھر میں قید رہتی، اور اسی حالت میں اس کو موت آجاتی تھی۔

شوہر بھی اپنی بیویوں پر ظلم و ستم کیا کرتے تھے، اگر رغبت نہ ہوتی تو نہ حقوق زوجیت ادا کرتے اور نہ اس کو طلاق دیتے تاکہ وہ اپنا مال دے کر طلاق حاصل کرلے۔

ان آیات میں انہی مفاسد کا سد باب ہے، اور وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ سے خاص شوہروں کو خطاب کیا گیا ہے، وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ سے مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا تک کی یہ دو آیتیں بھی اسی مضمون کا تتمہ ہیں:

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو، تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے (مال یا جان کے) جبراً مالک ہو جاؤ (مال کا مالک ہونا تین طرح ہے، ایک یہ کہ اس عورت کا جو حق شرعی میراث میں ہے اس کو خود لے لیا جاوے اس کو نہ دیا جاوے، اور دوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے یہاں تک کہ وہ یہیں ہی مر جائے پھر اس کا مال لے لیں، یا اپنے ہاتھ سے کچھ دے، تیسرے یہ کہ خاوند اس کو بے وجہ مجبور کرے کہ وہ اس کو کچھ مال دے تب یہ اس کو چھوڑے۔

اول اور تیسری صورت میں جبر کی قید سے یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ امور بالکل عورت کی خوشی سے ہوں تو جائز اور حلال ہیں، اور دوسری صورت میں یہ جبر واقع میں نکاح سے روکنے میں ہے جس سے غرض مال لینا تھا، اس لئے لفظوں میں اس سے متعلق کر دیا، اس سے بھی یہی فائدہ ہوا، یعنی اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح نہ کرے تو ان لوگوں کو گناہ نہیں۔

اور جان کا مالک ہونا یہ تھا کہ مردہ کی عورت کو میت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، اس صورت میں جبر کی قید واقعی یعنی بیان واقعہ کے لئے ہے، کہ وہ ایسا کرتے تھے، مگر اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر عورت اپنی رضامندی سے اپنے کو مال میت کی طرح ترکہ موروثہ بنانے پر راضی ہو جائے، تو وہ سچ مچ میراث اور ملک ہو جاوے گی، اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے (یعنی خود تم نے یا تمہارے عزیزوں نے) ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ (بھی ان سے) وصول کر لو (اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں۔

ایک یہ کہ میت کا وارث اس میت کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دے، تاکہ ہم کو یہ کچھ دے، دوسرے یہ کہ خاوند اس کو مجبور کرے کہ مجھ کو کچھ دے تب چھوڑوں، تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی بدون کچھ لئے اس کو نکاح نہ کرنے دے، یہاں کی پہلی صورت اوپر کی دوسری صورت کا ایک جزو ہے، اور یہاں کی دوسری صورت اوپر کی تیسری صورت ہے، اور وہاں کی پہلی صورت اور یہاں کی تیسری صورت الگ الگ ہے مگر بعض صورتوں میں ان سے مال لینا

یا ان کو مقید کرنا جائز ہے وہ یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں (اس میں بھی تین صورتیں آگئیں، ایک یہ کہ ناشائستہ حرکت نافرمانی شوہر کی اور بدخلقی ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ اس کو بدون مال لئے ہوئے جو مہر سے زیادہ نہ ہو اس کو نہ چھوڑے، دوسرے یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو ابتدائے اسلام میں قبل نزول حدود خاوند کو جائز تھا کہ اس جرمانہ میں اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس کرے اور اس کو نکال دے، اب یہ حکم منسوخ ہے زنا سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوتا، ان دو صورتوں میں مال لیا جائے گا، اور تیسری صورت یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو خاوند کو اور نیز دوسرے ورثاء کو جیسا کہ شروع رکوع میں مذکور ہے بطور سزا کے بحکم حاکم عورتوں کو گھروں کے اندر مقید رکھنا جائز تھا، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا پس یہ مقید رکھنا بطور سزا کے ہوگا، بغرض وصول مال کے نہ ہوگا، پس یہ استثناء مطلق عضل سے ہوگا، نہ عضل مقید بغرض ذہاب مال سے ـــــ آگے خاص شوہروں کو حکم ہے) اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو، (یعنی خوش اخلاقی اور نان ونفقہ کی خبرگیری) اور اگر (بمقتضائے طبیعت) وہ تم کو ناپسند ہوں (مگر ان کی طرف سے کوئی امر ناپسندیدگی کا موجب واقع نہ ہو) تو (تم بمقتضائے عقل یہ سمجھ کر برداشت کرو کہ) ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت (دنیوی یا دینی) رکھ دے (مثلاً وہ تمہاری خدمت گذار اور آرام رساں اور ہمدرد ہو، یہ دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہو کر بچپن میں مر جائے یا زندہ رہے اور صالح ہو، جو ذخیرۂ آخرت ہو جائے یا اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنے کا ثواب وفضیلت تو ضرور ہی ملے گی) اور اگر تم (خود اپنی رغبت کی وجہ سے) بجائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دوسری بیوی کرنا چاہو اور پہلی بیوی کا کوئی قصور نہ ہو) اور تم اس ایک کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ وعطیہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو (خواہ ہاتھ میں سونپ دیا، یا فقط مہر کے سے صرف معاہدہ میں دینا کیا ہو) تو تم اس (دیئے ہوئے یا معاہدہ کئے ہوئے) میں سے (عورت کو تنگ کر کے) کچھ بھی (واپس مت لو (اور معاف کرانا بھی حکماً واپس لینا ہے) کیا تم اس کو (واپس) لیتے ہو اس کی ذات پر نافرمانی یا بدکاری کا بہتان رکھ کر اور اس کے مال میں صریح گناہ (یعنی ظلم) کے مرتکب ہو کر (خواہ بہتان صراحۃً ہو یا کہ اس طور پر دلالۃً ہو کہ اوپر صرف نافرمانی وبدکرداری کی صورت میں اس سے مال لینے کی اجازت تھی پس جب اس سے مال لیا تو گویا اس کو نافرمان وبدکردار دوسروں کے ذہن میں تصور کرایا اور ظلم مال کی وجہ ظاہر ہے کہ بغیر خوش دلی کے عورت نے دیا، اور ہبہ کی صورت میں یہ ظلم اس لئے کہ زوجین کے آپس میں کوئی کسی کو ہدیہ دیدے تو اب

اس سے واپس لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں اور واپس لے گا تو وہ ایک قسم کا غصب ہوگا، اور بہتان بھی اسی سے لازم آتا ہے، کیونکہ واپس لینا گویا یہ کہنا ہے کہ یہ میری زوجہ نہ تھی، اس کا بہتان ہونا ظاہر ہے، کہ اس کو دعوت زوجیت میں کاذبہ اور معاشرت میں فاسقہ ٹھہراتا ہے) اور تم اس (دیئے ہوئے) کو (حقیقۃً یا حکماً) کیسے لیتے ہو حالانکہ (علاوہ بہتان وظلم کے اس کے لینے سے دو امر اور بھی مانع ہیں، ایک یہ کہ) تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو (یعنی صحبت ہو چکی ہے، یا خلوت صحیحہ کہ وہ بھی بحکم صحبت میں ہے، بہرحال انھوں نے اپنی ذات تمہارے تمتع و تلذذ کے لئے تمہارے سپرد کر دی ہے، اور مہر اسی سپردگی کا معاوضہ ہے، پس مبدل منہ کو حاصل کر کے بدل کو واپس لینا یا نہ دینا عقل سلیم کے بالکل خلاف ہے اور اگر وہ مال مہر نہیں بلکہ عطیہ تھا تو یہ بے حجابانہ ملاقات اثر زوجیت کی وجہ سے مانع ہے، اور اصل مانع زوجیت ہے اور دوسرا مانع یہ کہ) وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا قرار (یعنی عہد مستحکم) لے چکی ہیں (وہ عہد وہ ہے کہ نکاح کے وقت تم نے مہر اپنے ذمہ رکھا تھا اور عہد کر کے خلاف کرنا یہ بھی عقل کے نزدیک مذموم ہے، اور اگر وہ ہبہ اور عطیہ ہے تو قبل بے حجابانہ ملاقات کے یہ عہد بھی اثر زوجیت ہونے کی وجہ سے واپسی ہبہ سے مانع ہے، غرض چار موانع کے ہوتے ہوئے واپسی نہایت ہی مذموم ہے)

معارف و مسائل

اسلام سے پہلے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا انسداد

ان تین آیتوں میں اُن مظالم کی روک تھام ہے جو اسلام سے پہلے صنف نازک پر روا رکھے جاتے تھے، ان میں ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورتوں کی جان و مال کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے، عورت جس کے نکاح میں آگئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملک سمجھتا تھا، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے، اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے، چاہیں تو وہ خود اس سے نکاح کرلیں، یا دوسرے کسی سے مال لے کر اس کا نکاح کر دیں، شوہر کا لڑکا جو دوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو اپنے نکاح میں لا سکتا تھا اور جب عورت کی جان ہی اپنی ملک سمجھ لی گئی تو مال کا معاملہ ظاہر ہے اور اس ایک بنیادی غلطی کے نتیجہ میں عورتوں پر طرح طرح کے صدہا مظالم ہوا کرتے تھے، مثلاً:

ایک ظلم تھا کہ جو مال عورت کو کہیں سے وراثت میں ملا یا اس کے میکہ والوں کی طرف سے بطور ہدیہ تحفہ ملا، بیچاری عورت اس سب سے محروم و بے تعلق رہتی، اور یہ سب مال

سسرال کے مرد ہضم کر لیتے تھے۔

دوسرا ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر عورت نے اپنے حصہ مال پر کہیں قبضہ کر ہی لیا تو مرد اس کو نکاح کرنے سے اس لئے روکتے تھے کہ یہ اپنا مال باہر نہ لے جاسکے بلکہ یہیں مرجائے، اور مال چھوڑ جائے تو ہمارے قبضہ میں آجائے۔

تیسرا ظلم کہیں کہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود محض طبعی طور پر وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی تو شوہر اس کے حقوق زوجیت ادا نہ کرتا، مگر طلاق دے کر اس کی گلو خلاصی بھی اس لئے نہیں کرتا کہ یہ تنگ آکر زیور اور مہر جو وہ اسے دے چکا ہے واپس کردے، یا اگر ابھی نہیں دیا تو معاف کردے تب اسے آزادی ملے گی ــــــ اور بعض اوقات شوہر طلاق بھی دیدیتا لیکن پھر بھی اپنی اس مطلقہ کو کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرنے دیتا تاکہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مہر واپس کردے، یا واجب الادا مہر کو معاف کردے۔

چوتھا ظلم بعض اوقات یوں ہوتا تھا کہ شوہر مرگیا، اس کے وارث اس کی بیوہ کو نکاح نہیں کرنے دیتے، یا جاہلانہ عار کی وجہ سے یا اس طمع میں کہ اس کے ذریعہ کچھ مال وصول کریں۔

یہ سب مظالم اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کا بھی اپنے آپ کو مالک سمجھا جاتا تھا، قرآن کریم نے اس فساد کی اس جڑ کو اکھاڑ ڈالا، اور اس کے تحت ہونے والے تمام مفاسد کے انسداد کے لئے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا	"اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مالک بن بیٹھو"

جبراً کی قید اس جگہ بطور شرط کے نہیں کہ عورتوں کی رضامندی سے ان کا مالک بنجانا صحیح قرار دیا جائے، بلکہ بیان واقعہ کے طور پر ہے کہ عورتوں کی جان و مال کا بلا وجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھنا ظاہر ہے کہ جبراً ہی ہوسکتا ہے، اس پر کوئی ہوش و عقل والی عورت راضی کب ہوسکتی ہے (بحر محیط) اسی لئے شریعت نے اس معاملہ میں اس کی رضا کو مؤثر نہیں قرار دیا، کوئی عورت بیوقوفی سے کسی کی مملوک بننے پر راضی بھی ہوجائے تو اسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد انسان کسی کا مملوک ہوجائے۔

ظلم و فساد کی ممانعت کا عام طریقہ یہ ہے کہ بصیغۂ نہی اس سے منع کردیا جائے، لیکن اس جگہ قرآن کریم نے اس عام طریقہ کو چھوڑ کر لفظ لَا يَحِلُّ سے اس کو بیان فرمایا ہے، اس میں اس معاملہ کے شدید گناہ ہونے کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اگر کسی نے کسی بالغ عورت سے بغیر اس کی رضا و اجازت کے نکاح کر بھی لیا تو وہ نکاح شرعاً

حلال نہیں، بلکہ کالعدم ہے، ایسے نکاح سے نہ اُن دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے، ورنہ وراثت یا نسب کے احکام اس سے متعلق ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کرکے اس سے اپنا دیا ہوا مہر واپس لے لیا، یا واجب الادا مہر کو جبراً معاف کرالیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً معتبر نہیں، نہ اس سے لیا ہوا مال مرد کے لئے حلال ہوتا ہے، نہ کوئی حق واجب معاف ہوتا ہے، اور اسی مضمون کی مزید توضیح کے لئے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ "یعنی عورتوں کو اپنی مرضی کا نکاح کرنے سے نہ روکو، اس خیال پر کہ جو مال تم نے یا تمہارے عزیز نے ان کو بطور مہر کے یا بطور ہدیہ تحفہ کے دیدیا ہے وہ اس سے واپس لے لو" مہر دینے اور واپس لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ جو مہر دینا مقرر کرچکے ہیں اس کو معاف کرایا جائے، غرض دیا ہوا مہر جبراً واپس لیں یا واجب الادا کو جبراً معاف کرائیں، یہ سب ناجائز اور حرام ہیں، اسی طرح جو مال بطور ہدیہ تحفہ کے مالکانہ طور پر بیوی کو دیا جاچکا ہے، اس کا واپس لینا نہ خود شوہر کے لئے حلال ہے نہ اس کے وارثوں کے لئے، مالکانہ طور پر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر شوہر نے کوئی زیور یا اور کوئی استعمالی جہیز بیوی کو محض عاریۃً استعمال کے لئے دی ہے مالک بنا کر نہ دی ہو تو وہ بیوی کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوتی اس لئے اس کی واپسی بھی ممنوع نہیں۔

اس کے بعد اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فرما کر بعض ایسی صورتوں کو مستثنیٰ فرمادیا گیا ہے، جن میں شوہر کے لئے اپنا دیا ہوا مال مہر وغیرہ واپس لینا جائز ہوجاتا ہے۔

معنی یہ ہیں کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی ناشائستہ حرکت ایسی صادر ہوجائے جس کی وجہ سے طلاق دینے کے لئے آدمی طبعاً مجبور ہوجائے، تو ایسی صورت میں مضائقہ نہیں کہ شوہر اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک یہ اس کا دیا ہوا مہر واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔

اور اس جگہ لفظ فاحشہ یعنی ناشائستہ حرکت سے مراد حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ضحاکؒ وغیرہ کے نزدیک تو شوہر کی نافرمانی اور بدزبانی ہے۔

اور ابو قلابہؒ، حسن بصریؒ نے فاحشہ سے مراد اس جگہ بے حیائی اور زنا لیا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر ان عورتوں سے کوئی بے حیائی کا کام سرزد ہوگیا، یا وہ نافرمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں، جس سے مجبور ہوکر مرد طلاق پر آمادہ ہورہا ہے، تو چونکہ قصور عورت کا ہے، اس لئے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس وقت تک اپنے نکاح میں روکے رکھے جبتک

اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس وصول نہ کرے یا مقرر کردہ مہر معاف نہ کرالے۔

اگلی دو آیتوں میں بھی اسی مضمون کی تفصیل بیان ہے، ارشاد ہے کہ جب عورت کی طرف سے کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لئے موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال بھی اس کو دے چکا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس سے دیئے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق کے معاوضہ میں واپس لے، یا واجب الادا مہر کو معاف کرائے، کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں، اور جس سبب سے مہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے، یعنی عقد نکاح بھی ہو گیا اور دونوں آپس میں بے حجابانہ مل بھی چکے ہیں، تو اب دیا ہوا مال واپس لینے یا واجب الادا مہر کے معاف کرانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس رقم کی واپسی کے ظلم و گناہ ہونے کو تین مرحلوں میں بیان فرمایا گیا، اول فرمایا: اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا "یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بیوی پر زنا وغیرہ کے بہتان لگانے کا کھلا گناہ کر کے اپنا مال واپس لینے کا راستہ نکالو" یعنی جب یہ معلوم ہو چکا کہ دیا ہوا مال واپس لینا صرف اس وقت جائز ہے جبکہ بیوی کسی ناشائستہ حرکت کی مرتکب ہو، تو اب اس سے مال واپس لینا درحقیقت اس کا اعلان کرنا ہے کہ اس نے کوئی ناشائستہ حرکت بے حیائی وغیرہ کی ہے، خواہ زبان سے اس پر تہمت زنا کی لگائے یا نہ لگائے، بہر حال یہ ایک صورت تہمت اور بہتان کی ہے جس کا اثم مبین یعنی کھلا گناہ عظیم ہونا ظاہر ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا گیا: وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ "یعنی اب تم اپنا مال ان سے کیسے واپس لے سکتے ہو، جبکہ صرف عقد نکاح ہی نہیں بلکہ خلوت صحیحہ اور ایک دوسرے سے بے حجابانہ ملنا بھی ہو چکا ہے، کیونکہ اس صورت میں دیا ہوا مال اگر مہر کا ہے تو عورت اس کی پوری مستحق اور مالک ہو چکی ہے، کیونکہ اس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کر دیا، اب اس کی واپسی کے کوئی معنی نہیں، اور اگر دیا ہوا مال ہدیہ تحفہ کا ہے تو بھی اب اس کی واپسی ممکن نہیں، کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کریں اس کی واپسی نہ شرعاً جائز ہے نہ قانوناً نافذ کی جاتی ہے، غرض ازدواجی تعلق ہبہ کی واپسی سے مانع ہے۔

اور اسی مضمون کو تیسرے جملہ میں ارشاد فرمایا: وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا "یعنی ان عورتوں نے تم سے پختہ اور مضبوط عہد لے لیا ہے" اس سے مراد عقد نکاح کا عہد ہے۔

جو اللہ کے نام اور خطبہ کے ساتھ مجمع کے سامنے کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس ازدواجی عہد و میثاق اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کے لئے عورت کو مجبور کرنا کھلا ہوا ظلم و جور ہے، مسلمانوں کو اس سے اجتناب لازم ہے

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ

اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لا چکے تمہارے باپ مگر جو پہلے ہو چکا،

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ

یہ بے حیائی ہے اور کام ہے غضب کا اور برا چلن ہے، حرام ہوئی ہیں تم پر

اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ

تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں

الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ

بھائی کی اور بہن کی اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ

اور دودھ کی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ

اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جن کو جنا ہے تمہاری ان عورتوں نے جن سے

دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا

تم نے صحبت کی، اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ

کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے

اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ

ہیں، اور یہ کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے

سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ

اور خاوند والی عورتیں مگر جن کے مالک ہو جائیں

اَیْمَانُکُمْ ۚ کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ

تمہارے ہاتھ حکم ہوا اللہ کا تم پر اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ

بشرطیکہ طلب کرو ان کو اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ

پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق جو مقرر ہوئے،

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِہٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ

اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں کہ ٹھہرا لو تم دونوں آپس کی رضا سے مقرر کئے پیچھے

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۲۴﴾

بے شک اللہ ہے خبردار حکمت والا۔

ربطِ آیات اوپر سے جاہلیت کی رسومِ قبیحہ کا ذکر چلا آرہا ہے، ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ بعض محرم عورتوں سے نکاح کر لیا کرتے تھے، مثلاً اپنی سوتیلی ماں سے، ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے اسی کی مناسبت سے دوسری محرمات کا بھی ذکر آگیا، نیز وہ لوگ لے پالک بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے کو حرام سمجھتے تھے، اس کا بھی ابطال فرما دیا، اس سلسلہ میں بعض ان عورتوں کی حلت کو بھی بیان کیا گیا جن میں مسلمانوں کو شبہ ہوا تھا، مثلاً باندی جو مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی ہو اور اس کا پہلا شوہر دارالحرب میں ہو، اسی کے ساتھ نکاح کے شرائط اور اس کے متعلقات مہر وغیرہ کا بھی ذکر آگیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (یا دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو، مگر (خیر) جو بات گذر گئی گذر گئی، (آئندہ کبھی ایسا نہ ہو) بیشک یہ (بات عقلاً بھی) بڑی بے حیائی ہے اور (اہل طبائع سلیمہ کے عرف میں بھی نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً بھی) بہت برا طریقہ ہے، تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں (یعنی ان سے نکاح کرنا

حرام اور باطل ہے اور ان کی کئی قسمیں ہیں:

اول محرمات نسبیہ وہ یہ ہیں) تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں (اور ان میں سب اصول و فروع بواسطہ و بلا واسطہ سب داخل ہیں) اور تمھاری بہنیں (خواہ عینی ہوں یا علاتی یا اخیافی) اور تمھاری پھوپھیاں (اس میں باپ کی اور سب مذکر اصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آگئیں) اور تمھاری خالائیں (اس میں ماں کی اور سب مؤنث اصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آگئیں) اور بھتیجیاں (اس میں تینوں قسموں کے بھائیوں کی اولاد بواسطہ و بلا واسطہ سب آگئیں) اور بھانجیاں (اس میں تینوں قسموں کی بہنوں کی اولاد بواسطہ و بلا واسطہ سب آگئیں) اور

قسم دوم محرمات رضاعیہ، وہ یہ ہیں) تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے (یعنی انّا) اور تمھاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے بہن ہیں (یعنی تم نے ان کی حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے، یا اس نے تمھاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے، گو مختلف وقت میں پیا ہو) اور

قسم سوم محرمات بالمصاہرۃ، وہ یہ ہیں) تمھاری بیبیوں کی مائیں (اس میں زوجہ کے سب مؤنث اصول آگئے) اور تمھاری بیبیوں کی بیٹیاں (اس میں زوجہ کے سب مؤنث فروع آگئے) جو کہ (عادۃً) تمھاری پرورش میں رہتی ہیں (مگر اس میں ایک قید بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لڑکیاں) ان بیبیوں سے (ہوں) کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو (یعنی کسی عورت کے ساتھ صرف نکاح کرنے سے اس کی لڑکی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب اس عورت سے صحبت بھی ہو جائے تب لڑکی حرام ہوتی ہے) اور اگر (ہنوز) تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو (گو نکاح ہو چکا ہو) تو (ایسی بی بی کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے میں) تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمھاری ان بیٹوں کی بیبیاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمھاری نسل سے ہوں (اس میں سب مذکر فروع کی بیبیاں آگئیں، اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے یعنی لے پالک جس کو متبنّٰی کہتے ہیں اس کی بی بی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو لیکن جو (اس حکم سے) پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں (کہ رحمت سے گناہ معاف کر دیتے ہیں) اور

(قسم چہارم) وہ عورتیں ہیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر (اس قسم میں وہ مستثنیٰ ہیں) جو کہ (شرعاً) تمھاری مملوک ہو جائیں (اور ان کے حربی شوہر دار الحرب میں موجود ہوں اور بعد ایک حیض آجانے یا وضع حمل کے حلال ہیں، کذا فی الہدایہ) اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو

تم پر فرض کردیا ہے اور ان عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو (یعنی مہر مقرر کر کے نکاح میں ضرور ہے اور) اس طرح کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (جس کی شرطیں شرع میں مشہور ہیں، مثلاً گواہ بھی ہوں وہ نکاح موقت بھی نہ ہو، وغیرہ) صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو (اس کے عموم میں زنا اور متعہ سب داخل ہوگئے، گو اس میں بھی مال خرچ کیا جاتا ہے) پھر (نکاح ہوجانے کے بعد) جس طریق سے (منجملہ طرقِ شرعیہ معتبرہ کے) تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو سو ان کو (ان کے عوض) انکے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں اور (یہ نہ سمجھو کہ اس مقررہ میں کسی طرح مثل نماز روزہ کے کمی بیشی ممکن نہ ہو بلکہ) مقرر ہوئے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بیوی) باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں (مثلاً خاوند نے مہر بڑھادیا یا عورت نے کم کردیا، یا معاف ہی کردیا، ہر طرح درست ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں (تمھاری مصلحتوں کو خوب جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (ان مصلحتوں کی رعایت سے احکام مقرر فرماتے ہیں، اگو کہیں تمھاری سمجھ میں نہ آوے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں محرمات یعنی ان عورتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے پھر بعض محرمات تو وہ ہیں جو کسی حال میں حلال نہیں ہوتیں جنھیں محرمات ابدیہ کہا جاتا ہے اور بعض محرمات ابدیہ نہیں ہیں وہ بعض حالتوں میں حلال بھی ہوجاتی ہیں۔

شروع کی تین قسمیں محرمات نسبیہ، محرمات رضاعیہ اور محرمات بالمصاہرۃ، محرمات ابدیہ ہیں، اور آخر کی ایک قسم منکوحہ عورتیں اس وقت تک کے لئے حرام ہیں جب تک وہ غیر کے نکاح میں ہیں:

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ، جاہلیت کے زمانہ میں اس میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیتے تھے، اس آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منع فرمایا اور اس کو موجب مقت یعنی خدائے پاک کی ناراضگی کا باعث بتایا، ظاہر ہے کہ یہ کیسی خلاق کی موت اور کردار کی خرابی ہے کہ جس کو ایک عرصہ تک ماں کہتے رہے، اس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ لیا۔

مسئلہ: آیت شریفہ میں باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے،

اس میں اس بات کی قید نہیں لگائی ہے کہ باپ نے ان سے وطی بھی کی ہو، لہٰذا کسی بھی عورت سے اگر باپ کا عقد بھی ہو جائے تو اس عورت سے بیٹے کے لئے نکاح کبھی بھی حلال نہیں۔

اسی طرح سے بیٹے کی بیوی سے باپ کو نکاح کرنا درست نہیں، اگرچہ بیٹے کا صرف نکاح ہی ہوا ہے، قَالَ الشَّامِيُّ وَتَحْرُمُ زَوْجَةُ الْاَصْلِ وَالْفَرْعِ بِمُجَرَّدِ الْعَقْدِ دَخَلَ بِهَا اَوْلَا۔

مسئلہ: اگر باپ نے کسی عورت سے زنا کر لیا ہو تو بھی بیٹے کو اس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ، یعنی اپنی والدہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لفظ اُمَّهٰتُكُمْ کے عموم میں دادیاں اور نانیاں سب داخل ہیں۔

وَبَنٰتُكُمْ، اپنی صلبی لڑکی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لڑکی کی لڑکی سے بھی، اور بیٹے کی لڑکی سے بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، پوتی، پرپوتی، نواسی، پڑنواسی ان سب سے نکاح کرنا حرام ہے، اور سوتیلی لڑکی جو دوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس سے نکاح کرنے نہ کرنے میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے، اور جو لڑکا لڑکی صلبی نہ ہو بلکہ گود لے کر پال لیا ہو ان سے اور ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کسی دوسرے طریقہ سے حرمت نہ آئی ہو، اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو اس نطفہ سے جو لڑکی پیدا ہو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے اس سے بھی نکاح درست نہیں۔

وَاَخَوٰتُكُمْ، اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، اور اس بہن سے بھی جو علاتی (باپ شریک) اور اس بہن سے بھی جو اخیافی (ماں شریک) ہو۔

وَعَمّٰتُكُمْ، اپنے باپ کی حقیقی بہن، علاتی، اخیافی بہن، ان تینوں سے نکاح حرام ہے، غرض کہ تینوں طرح کی پھوپھیوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔

وَخٰلٰتُكُمْ، اپنی والدہ کی بہن حقیقی ہو یا علاتی ہو یا اخیافی، ہر ایک سے نکاح حرام ہے۔

وَبَنٰتُ الْاَخِ، بھائی کی لڑکیوں یعنی بھتیجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، حقیقی ہو، علاتی ہو یا اخیافی ہو، تینوں طرح کے بھائیوں کی لڑکیوں سے نکاح حلال نہیں ہے۔

وَبَنٰتُ الْاُخْتِ، بہن کی لڑکیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، اور یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ بہنیں خواہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ان کی لڑکیاں شرعاً

نکاح میں نہیں آسکتیں۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىْٓ اَرْضَعْنَكُمْ جن عورتوں کا دودھ پیا ہے گرچہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حرمتِ نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں، ان سے بھی نکاح حرام ہے، تھوڑا دودھ پیا ہو یا زیادہ، ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدد دفعہ پیا ہو، ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہوجاتی ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو حرمتِ رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمتِ رضاعت اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے إِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ، یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی، وہ اسی زمانہ کے دودھ پینے سے ہوگی جس زمانہ میں دودھ پینے ہی سے بچے کا نشو و نما ہوتا ہے (بخاری و مسلم)

اور یہ مدت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لیکر ڈھائی سال تک ہے اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں امام ابوحنیفہؒ کے مخصوص شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں، صرف دو سال کی مدت تک رضاعت ثابت ہوسکتی ہے اور اسی پر امام محمدؒ کا فتویٰ بھی ہے اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ، یعنی رضاعت کے رشتے سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایام رضاع میں کسی عورت کا دودھ پی لیا وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی، اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا، اور اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے، اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں، اور اس عورت کا جیٹھ دیور ان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے، اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں، اور باہم ان سب میں حرمتِ رضاعت ثابت ہوگئی، نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے رضاع کے رشتہ سے بھی حرام ہوجاتا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ (بخاری) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے، إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ (بحوالۂ مشکوٰۃ، ص ۲۷۳)

مسئلہ: اگر ایک لڑکے ایک لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کی لڑکی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے، اور نسبی بہن

کی رضاعی ماں سے بھی حلال ہے، اور رضاعی بہن کی نسبی بہن سے بھی اور نسبی بہن کی رضاعی بہن سے بھی نکاح جائز ہے۔

مسئلہ: منہ یا ناک کے ذریعہ یا مرضاع میں دودھ اندر جانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، اور اگر اور کسی راستہ سے دودھ اندر پہنچایا جائے، یا دودھ کا انجکشن دے دیا جائے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ: عورت کے دودھ کے علاوہ کسی اور دودھ مثلاً چوپائے کا دودھ یا کسی مرد کا، سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ: دودھ اگر دوا میں یا بکری، گائے، بھینس کے دودھ میں ملا ہوا ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت اس وقت ثابت ہوگی جب کہ عورت کا دودھ غالب ہو، اور اگر دونوں برابر ہوں تب بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے، لیکن اگر عورت کا دودھ کم ہے تو یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ: اگر مرد کے دودھ نکل آئے تو اس سے حرمتِ رضاع ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ: اگر دودھ پینے کا شک ہو تو اس سے حرمت رضاع ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کسی عورت نے کسی بچے کے منہ میں پستان دیا، لیکن دودھ جانے کا یقین نہ ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی اور نکاح کی حلت پر اس کا اثر نہ پڑے گا۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کرلیا، اور کسی اور عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اگر دونوں اس کی تصدیق کریں تو نکاح کے فاسد ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے گا، اور اگر یہ دونوں اس کی تکذیب کریں اور عورت دیندار خدا ترس ہو تو فسادِ نکاح کا فیصلہ نہ ہوگا، لیکن طلاق دے کر مفارقت کرلیں پھر بھی افضل ہے۔

مسئلہ: حرمت رضاع کے ثبوت کے لئے دو دیندار مردوں کی گواہی ضروری ہے، ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، لیکن چونکہ معاملہ حرام و حلال سے متعلق ہے، اس لئے احتیاط کرنا افضل ہے، حتی کہ بعض فقہاء نے یہ تفصیل لکھی کہ اگر کسی عورت سے نکاح کرنا ہو اور ایک دیندار مرد گواہی دے کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں تو نکاح کرنا جائز نہیں، اور اگر نکاح کے بعد ہو تو احتیاط جدا ہونے میں ہے، بلکہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے تب بھی احتیاط اسی میں ہے کہ مفارقت اختیار کرلیں۔

مسئلہ: جس طرح دو دیندار مردوں کی گواہی سے حرمتِ رضاع ثابت ہوجاتی ہے، اسی طرح ایک دیندار مرد اور دو دیندار عورتوں کی گواہی سے بھی اس کا ثبوت ہوجاتا ہے۔

البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ اگر نصاب شہادت پورا نہ ہو تب بھی شک سے بچنے کے لئے حرمت کو ترجیح دی جائے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ: بیویوں کی مائیں بھی شوہروں پر حرام ہیں، یہاں بھی امہات میں تفصیل ہے۔

اس میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں نسبی ہوں یا رضاعی سب داخل ہیں۔

مسئلہ: جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے، اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو یا جس کے ساتھ زنا کیا ہو یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہے۔

مسئلہ: نفس نکاح ہی سے بیوی کی ماں حرام ہو جاتی ہے، حرمت کے لئے دخول وغیرہ ضروری نہیں۔

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ: جس عورت کے ساتھ نکاح کیا اور نکاح کے بعد ہمبستری بھی کی تو اس عورت کی لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہے اسی طرح اس کی پوتی، نواسی حرام ہوگئیں، ان سے نکاح کرنا جائز نہیں، لیکن اگر ہمبستری نہیں کی، صرف نکاح ہوا تو صرف نکاح سے مذکورہ قسمیں حرام نہیں ہو جاتیں، لیکن نکاح کے بعد اگر اس کو شہوت کے ساتھ چھوا، یا اس کے اندرونی حصہ کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا تو یہ بھی ہمبستری کے حکم میں ہے، اس سے بھی اس عورت کی لڑکی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: یہاں بھی نسب کے حکم میں تعمیم ہے، لہٰذا اس عورت کی لڑکی پوتی اور نواسی بھی حرام ہوگئیں جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو یا اس کے ساتھ زنا کیا ہو۔

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ: بیٹے کی بیوی حرام ہے، اور بیٹے کے عموم میں پوتا، نواسا بھی داخل ہیں، لہٰذا ان کی بیویوں سے نکاح جائز نہ ہوگا۔

مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید سے متبنّیٰ (لے پالک) کو نکالنا مقصود ہے، اس کی بیوی سے نکاح حلال ہے، اور رضاعی بیٹا بھی نسبی بیٹے کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ، دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، حقیقی بہنیں ہوں یا علاتی ہوں یا اخیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں، یہ حکم سب کو شامل ہے، البتہ طلاق ہو جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے لیکن یہ جواز عدت گزرنے کے بعد ہے عدت کے دوران نکاح جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: جس طرح ایک ساتھ دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اسی طرح پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔
قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْءَةِ وَعَمَّتِهَا وَلَا بَيْنَ الْمَرْءَةِ وَخَالَتِهَا (بخاری ومسلم)

مسئلہ: فقہائے کرام نے بطور قاعدۂ کلیہ یہ لکھا ہے کہ ہر ایسی دو عورتیں جن میں سے اگر کسی ایک کو مذکر فرض کیا جائے تو شرعاً ان دونوں کا آپس میں نکاح درست نہ ہو، اس طرح کی دو عورتیں ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، یعنی جاہلیت میں جو کچھ ہوتا رہا اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہ الفاظ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ کی آیت میں بھی ذکر ہوئے ہیں، اور وہاں پر بھی یہی معنی ہیں کہ جاہلیت میں جو کچھ تم سے صادر ہوا سو ہوا، اب اسلام لانے کے بعد اس کا مواخذہ نہیں ہوگا اور آئندہ کے لئے اجتناب لازم ہے۔

اسی طرح اگر نزولِ تحریم کے اس وقت میں باپ کی منکوحہ یا دو بہنیں نکاح میں ہوں تو تفریق ضروری ہے، اور دو بہنوں کی صورت میں ایک بہن کو الگ کر دینا لازم ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبردہ بن نیارؓ کو ایک آدمی کے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا، اس لئے کہ اس شخص نے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا تھا (مشکوٰۃ، ص ۲۷۴)

ابن فیروز دیلمیؒ کی روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں اسلام لے آیا تو دو بہنیں میرے نکاح میں تھیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا ان میں سے ایک کو طلاق دے کر جدا کر دو، اور ایک کو باقی رکھ لو (حوالہ بالا)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ جس طرح حالتِ اسلام میں ابتداءً منکوحۃ الاب اور جمع بین الاختین جائز نہیں، اسی طرح اگر حالتِ کفر میں نکاح کی یہ صورت واقع ہوئی ہو تو اسلام لانے کے بعد اس کو باقی رکھنا جائز نہ ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، اسلام سے پہلے جو کچھ انھوں نے حماقت میں کیا، اب اسلام لانے کے بعد اللہ جل شانہ ان سے درگذر کرے گا، اور ان کی طرف اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، یعنی شوہر والی عورتیں بھی حرام کی گئیں جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، دوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا، اس سے واضح

طور پر معلوم ہوا کہ ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد شوہر والی نہیں ہو سکتی ہے، اس دور کے بعض جاہل ملحد کہنے لگے ہیں کہ مردوں کو جب ایک سے زائد بیویوں کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ایک سے زائد شوہروں سے متمتع ہونے کی اجازت ملنی چاہیے، یہ مطالبہ اس آیت شریفہ کے بالکل خلاف ہے، ایسی جاہلانہ باتیں کرنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مرد کے لئے کثرتِ ازدواج ایک نعمت ہے، جسے ہر مذہب و ملت میں جائز قرار دیا گیا ہے، جس پر انسان کی تاریخ شاہد ہے، لیکن عورت کے لئے ایک وقت میں ایک سے زائد شوہر ہونا اس عورت کے لئے بھی باعثِ مصیبت ہے، اور جو دو مرد ایک عورت کے شوہر بن جائیں ان کے لئے بھی باعث ننگ و عار ہے، اور سراسر بے شرمی ہے، نیز اس میں کسی بچہ کے ثبوت النسب ہونے کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، جب کئی مرد کسی عورت سے استمتاع کریں گے تو پیدا ہونے والی اولاد کو ان میں سے کسی ایک کا بیٹا تجویز کرنے کا کوئی طریق باقی نہ رہے گا، اس طرح کا بدترین مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو انسانیت کے سراپا دشمن ہوں، اور جن کی غیرت و حیا کا جنازہ نکل چکا ہو، ایسے لوگ اولاد اور والدین کے حقوق کی لائن سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے پوری انسانیت کو محروم کرنے کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں، جب نسب ثابت نہیں ہوگا تو باہمی حقوق و فرائض کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟

خالص طبعی اور عقلی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو ایک عورت کے لئے متعدد شوہر ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا:

۱۔ ازدواج کا بنیادی مقصد تناسل ہے، اس اعتبار سے متعدد عورتیں تو ایک مرد سے حاملہ ہو سکتی ہیں، لیکن ایک عورت متعدد مردوں سے حاملہ نہیں ہو سکتی وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی، اس لئے متعدد شوہروں کی صورت میں ایک کے علاوہ باقی شوہروں کی قوت ضائع گئی، شہوت رانی کے سوا ان کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔

۲۔ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں صنفِ نازک ہے وہ سال کے اکثر حصہ میں استمتاع کے بھی قابل نہیں رہتی، بعض حالات میں اس کے لئے ایک ہی شوہر کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شوہر ہوں۔

۳۔ چونکہ مرد جسمانی قوت کے اعتبار سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند ہے، اس لئے اگر کسی مرد کی جنسی قوت معمول سے زیادہ ہو، اور ایک عورت سے اس کی تشفی نہ ہو سکتی ہو تو اسے جائز طریقہ سے دوسرے اور تیسرے نکاح کا موقع ملنا چاہیے، ورنہ وہ دوسرے ناجائز طریقے اختیار کرے گا، اور پورے معاشرے کو بگاڑ دے گا، لیکن عورت سے ایسے بگاڑ کا اندیشہ نہیں ہے۔

شریعت اسلامیہ میں اس مسئلہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت کے دوسرے نکاح کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی عورت کا کوئی شوہر طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدت گذرنے تک بھی کسی دوسرے شخص سے اس عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یہ جملہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ سے استثناء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی بیوی سے کسی دوسرے شخص کو نکاح کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی عورت مملوکہ باندی ہو کر آجائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دارالحرب کے کافروں سے جہاد کیا، اور وہاں سے کچھ عورتیں قید کر کے لے آئے، ان عورتوں میں جو عورت دارالاسلام میں لائی گئی اور اس کا شوہر دارالحرب میں رہ گیا، تو اس عورت کا نکاح دارالاسلام میں آنے سے اپنے سابق شوہر سے ختم ہو گیا، اب یہ عورت اگر کتابیہ یا مسلمہ ہو تو اس سے دارالاسلام کا کوئی بھی مسلمان نکاح کر سکتا ہے، اور اگر امیر المؤمنین اس کو باندی بنا کر کسی فوجی سپاہی کو مال غنیمت کی تقسیم میں دیدے تب بھی اس سے استمتاع جائز ہے ــــــ لیکن یہ نکاح و استمتاع ایک حیض آنے کے بعد ہی جائز ہے، اور اگر حمل ہے تو وضع حمل ضروری ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کافر عورت دارالحرب میں مسلمان ہو جائے، اور اس کا شوہر کافر ہے تو تین حیض گذرنے کے بعد وہ اس کے نکاح سے جدا ہو جائے گی۔

مسئلہ: اور اگر دارالاسلام میں کوئی کافر عورت مسلمان ہو جائے، اور اس کا شوہر کافر ہو، تو حاکم شرع اس کے شوہر پر اسلام پیش کرے، اگر وہ مسلمان ہونے سے انکار کرے تو قاضی ان دونوں میں تفریق کر دے، اور یہ تفریق طلاق شمار ہوگی، اس کے بعد عدت گذار کر وہ عورت کسی مسلمان سے نکاح کر سکتی ہے۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، یعنی جن محرمات کا ذکر ہوا ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے، قال القرطبی ای حرمت هذه النسآء کتاباً من الله علیکم۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ، یعنی جو محرمات اب تک مذکور ہوئیں، ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں مثلاً چچا کی لڑکی، خالہ کی لڑکی، ماموں زاد بہن، ماموں چچا کی بیوی ان کی وفات یا طلاق دینے کے بعد، بشرطیکہ یہ مذکورہ اقسام اور کسی رشتہ سے محرم نہ ہوں، اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی، جب وہ طلاق دیدے یا وفات پا جائے، بیوی مر جائے تو اس کی بہن کے ساتھ ـــ وغیرہ ـــ بے شمار صورتیں بنتی ہیں، ان سب کو مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے عموم میں داخل فرما دیا۔

مسئلہ: بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، اس کا

تفصیلی بیان سورۂ نساء کے شروع میں گذر چکا ہے، قریب کی آیات میں اس کا ذکر نہ دیکھ کر کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے عموم میں بغیر کسی پابندی کے عورتوں سے نکاح جائز ہے، نیز بہت سی محرمات وہ ہیں جن کا ذکر احادیث شریفہ میں ہے، اور ان کی طرف آیات میں اشارات بھی ہیں، جن کو ہم تفسیر کے ذیل میں ذکر کرتے چلے آئے ہیں۔

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ یعنی محرمات کا یہ بیان تمہارے لئے اس لئے کیا گیا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اور ان کو اپنے نکاح میں لاؤ۔

ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نکاح مہر سے خالی نہیں ہو سکتا، حتی کہ اگر زوجین آپس میں یہ طے کرلیں کہ نکاح بغیر مہر کے ہوگا تب بھی مہر لازم ہوگا، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، دوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ مہر وہ چیز ہونی چاہئے جس کو مال کہا جا سکے۔

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہونا چاہئے، ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے۔

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ یعنی اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں طلب کرو اور یہ بھی کہ عورتوں کی تلاش عفت و عصمت کے لئے ہے جو نکاح کا اہم مقصد ہے، اور نکاح کے ذریعہ اس چیز کو حاصل کرو، مال خرچ کرکے زنا کے لئے عورتیں تلاش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زناکار بھی مال خرچ کرتے ہیں، لیکن وہ مال خرچ کرنا بھی حرام ہے، اور اس مال کے ذریعہ جو عورت حاصل کی جائے اس سے استمتاع حلال نہیں ہوتا لفظ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ بڑھا کر زنا کی ممانعت فرماتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ زنا میں صرف شہوت رانی، سفح ماء، پانی بہانا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طلب اولاد اور ابقاء النسل کا ارادہ نہیں ہوتا، مسلمانوں کو پاک دامن رہنے اور تکثیر نسل انسانی کے لئے اپنی قوت کو برمحل خرچ کرنا چاہئے، جس کا طریقہ صرف نکاح اور ملک یمین ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً، یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے استمتاع کرو تو ان کے مہر دیدو، یہ دینا تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

اس آیت میں استمتاع سے بیویوں سے ہمبستری و دوطی کرنا مراد ہے، اگر محض نکاح ہو جائے اور خصتی نہ ہو اور شوہر کو استمتاع کا موقع نہ ملے، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی طلاق دیدے تو آدھا مہر واجب ہوتا ہے، اور اگر استمتاع کا موقع مل جائے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے، اس آیت میں خصوصی توجہ دلائی ہے کہ جب کسی عورت سے استمتاع کرلیا تو اس کا مہر دینا

ہر طرح سے واجب ہو گیا، اس میں کوتاہی کرنا شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے، اور انسانی غیرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جب نکاح کا مقصد حاصل ہو گیا تو بیوی کے حق میں کوتاہی اور ٹال مٹول نہ ہو۔۔۔ البتہ شریعت عورت کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ مہر اگر معجل ہے تو مہر کی وصولی تک وہ شوہر کے پاس جانے سے انکار کر سکتی ہے۔

حُرمتِ متعہ لفظ استمتاع کا مادہ م، ت، ع ہے، جس کے معنی کسی فائدہ کے حاصل ہونے کے ہیں، کسی شخص سے یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا تو اس کو استمتاع کہتے ہیں، عربی قواعد کی رُو سے کسی کلمہ کے مادہ میں س اور ت کا اضافہ کر دینے سے طلب و حصول کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں، اس لغوی تحقیق کی بنیاد پر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کا سیدھا مطلب پوری امت کے نزدیک خلف عن سلف وہی ہے، جو ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے، لیکن ایک فرقہ کا کہنا ہے کہ اس سے اصطلاحی متعہ مراد ہے، اور ان لوگوں کے نزدیک یہ آیت متعہ حلال ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ متعہ جس کو کہتے ہیں اس کی صاف تردید قرآن کریم کی آیت بالا میں لفظ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ سے ہو رہی ہے، جس کی تشریح آگے آ رہی ہے

متعہ اصطلاحی جس کے جواز کا یک فرقہ مدعی ہے یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کے لئے اتنے پیسے یا فلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں متعہ اصطلاحی کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، محض مادۂ اشتقاق کو دیکھ کر یہ فرقہ مدعی ہے کہ آیت سے حلتِ متعہ کا ثبوت ہو رہا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب دوسرے معنی بھی کم از کم محتمل ہے (گو ہمارے نزدیک متعین ہے) تو ثبوت کا کیا راستہ ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے محرمات کا ذکر فرما کر یوں فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ اپنے اموال کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اس حال میں کہ پانی بہانے والے نہ ہوں یعنی محض شہوت رانی مقصود نہ ہو، اور ساتھ ہی ساتھ محصنین کی بھی قید لگائی ہے، یعنی یہ کہ عفت کا دھیان رکھنے والے ہوں۔۔۔ متعہ چونکہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں نہ حصولِ اولاد مقصود ہوتا ہے، نہ گھر بار بسانا، اور نہ عفت و عصمت، اور اسی لئے جس عورت سے متعہ کیا جائے اس کو فریق مخالف زوجۂ وارثہ بھی قرار نہیں دیتا، اور اس کو ازواج معروفہ کی گنتی میں بھی شمار نہیں کرتا۔ اور چونکہ مقصد محض قضاء شہوت ہے، اس لئے مرد و عورت عارضی طور پر نئے نئے جوڑے تلاش کرتے رہتے ہیں، جب یہ صورت ہے تو متعہ عفت و عصمت کا ضامن نہیں بلکہ دشمن ہے۔

صاحب ہدایہ نے حضرت امام مالکؒ کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک متعہ جائز ہے، لیکن یہ نسبت بالکل غلط ہے، جیسا کہ شراح ہدایہ اور دیگر اکابر نے تصریح کی ہے کہ صاحب ہدایہ سے تسامح ہوا ہے۔

البتہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اخیر تک حلتِ متعہ کے قائل تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، امام ترمذیؒ نے باب ما جاء فی نکاح المتعۃ کا باب قائم کرکے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث یہ ہے:

عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ مُتْعَۃِ النِّسَاءِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَھْلِیَّۃِ زَمَنَ خَیْبَرَ

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔

دوسری حدیث جو امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّمَا کَانَتِ الْمُتْعَۃُ فِیْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ حَتّٰی اِذَا نَزَلَتِ الْاٰیَۃُ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَکُلُّ فَرْجٍ سِوَاھُمَا فَھُوَ حَرَامٌ

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں متعہ اسلام کے عہد اول میں مشروع تھا، یہاں تک کہ آیت کریمہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ نازل ہوئی تو وہ منسوخ ہوگیا، اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زوجہ شرعیہ اور مملوکہ شرعیہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے تمتع حرام ہے۔"

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کچھ عرصہ تک متعہ کو جائز سمجھتے تھے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے (جیسا کہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۲ پر ہے) اور آیت شریفہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ سے متنبہ ہوکر رجوع فرمالیا، جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو فرقہ حلتِ متعہ کا قائل ہے باوجودیکہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محب اور فرمانبردار ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس مسئلہ میں وہ ان کا بھی مخالف ہے۔
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۔ (۲۶: ۲۲۷)

صاحب روح المعانی قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر سے پہلے متعہ

حلال تھا، پھر غزوۂ خیبر میں حرام کر دیا گیا، اس کے بعد فتح مکہ کے دن حلال کر دیا گیا لیکن پھر تین دن کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا۔

نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فرمان باری تعالیٰ شانہٗ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، یہ ایسا واضح ارشاد ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، اس سے حرمتِ متعہ صاف ظاہر ہے، اس کے مقابلہ میں بعض شاذ قراءتوں کا سہارا لینا قطعاً غلط ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اِسْتَمْتَعْتُمْ سے متعہ اصطلاحی مراد ہونے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، محض ایک احتمال ہے، یہ احتمال اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُھُمْ کے قطعی الدلالۃ مضمون کے ہرگز معارض نہیں ہو سکتا، اور بالفرض اگر دونوں دلیلیں قوت میں برابر ہوں تو کہا جائے گا کہ دونوں دلیلیں حلّت و حرمت میں متعارض ہیں، بالفرض اگر تعارض مان لیا جائے تب بھی عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ محرّم کو مبیح پر ترجیح ہونی چاہئے۔

مسئلہ: نکاح متعہ کی طرح نکاح موقت بھی حرام اور باطل ہے، نکاح موقت یہ ہے کہ ایک مقررہ مدت کے لئے نکاح کیا جائے ــــ اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ متعہ میں لفظ متعہ بولا جاتا ہے، اور نکاح موقت لفظ نکاح سے ہوتا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ، آیت کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ باہمی مہر مقرر کرنے کے بعد مہر مقررہ کوئی حتمی چیز نہیں ہو جاتی کہ اس میں کمی بیشی درست نہ ہو، بلکہ شوہر مقررہ مہر پر اپنی طرف سے اضافہ بھی کر سکتا ہے اور بیوی اگر چاہے تو اپنی خوش دلی سے تھوڑا یا پورا مہر معاف کر سکتی ہے، الفاظ کے عموم سے معلوم ہوا کہ عورت اگر مہر معجل لے کر کے تاجیل کر لے، یعنی بعد میں لینے کو منظور کر لے تو یہ بھی درست ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا، آیت کے ختم پر یہ جملہ بڑھا کر ایک تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے، احکام مذکورہ کی اگر کوئی شخص خلاف ورزی کرے تو اگرچہ اس کی خبر قاضی، حاکم اور کسی انسان کو نہ ہو، لیکن اللہ جل شانہٗ کو تو سب خبر ہے، اس سے ہر حال میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

اور یہ بھی بتلایا کہ جو احکام ارشاد فرمائے ہیں یہ سب کچھ حکمت پر مبنی ہیں، حکمت اس دقیق بات کو کہتے ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتی، حرمت و حلّت کے احکام جو آیات میں مذکور ہیں ان کی علّت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ان کو ہر حال میں ماننا لازم ہے، کیونکہ

اگر تمہیں علت معلوم نہیں تو علت سبب حکم کی حق تعالیٰ شانہٗ کو معلوم ہے جو علیم و حکیم ہے۔

اس دور کے بہت سے پڑھے لکھے جاہل احکامِ حدود شرعیہ کی علتیں تلاش کرتے ہیں، اگر کوئی علت معلوم نہیں ہوتی تو معاذ اللہ حکم ربانی کو نامناسب یا دورِ حاضر کے تقاضوں کے خلاف کہہ کر ٹال دیتے ہیں، ان الفاظ سے ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا گیا ہے، اور بتلا دیا گیا ہے کہ تم نادان ہو، اللہ جل شانہٗ دانا ہے، تم ناسمجھ ہو اللہ حکیم ہے، اپنی سمجھ کو معیارِ حقیقت نہ بناؤ، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ
اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ نکاح میں لائے بیبیاں

الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ
مسلمان تو نکاح کرلے ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں جو کہ تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان،

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِكُمْ ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ
اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمہاری مسلمانی تم آپس میں ایک ہو سو ان سے نکاح کرو

بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دو ان کے مہر موافق دستور کے قید میں آنے والیاں ہوں

غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ
نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں پھر جب وہ قیدِ نکاح میں آچکیں تو اگر

أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
کریں بے حیائی کا کام تو ان پر آدھی سزا ہے بیبیوں کی سزا

مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَأَنْ
سے یہ اس کے واسطے ہے جو کوئی تم میں ڈرے تکلیف میں پڑنے سے اور صبر

تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾
کرو تو بہتر ہے تمہارے حق میں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

ع ۴

ربطِ آیات اوپر سے چونکہ نکاح کے احکام چلے آرہے ہیں، اس لئے اسی کے ذیل میں اب

شرعی لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کا ذکر شروع ہوا، اس کے بعد اسی سے متعلق حد کا حکم بھی بیان کردیا گیا کہ باندی اور غلام کی حد آزاد عورت و مرد سے مختلف ہوتی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص تم میں پوری مقدرت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس والوں کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی شرعاً مملوکہ ہیں نکاح کرلے، کیونکہ اکثر لونڈیوں کا مہر وغیرہ کم ہوتا ہے اور ان کو غریب کے ساتھ بیاہ دینے میں عار بھی نہیں کرتے اور لونڈی سے نکاح کرنے میں عار نہ کرے کیونکہ دین کی رو سے تو ممکن ہے کہ وہ تم سے بھی افضل ہو، وجہ یہ کہ مدار فضیلت دین کا ایمان ہے اور تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس میں کس کا اعلیٰ ہے کون ادنیٰ ہے، کیونکہ وہ متعلق قلب کے ہے جس کی پوری اطلاع اللہ ہی کو ہے، اور دنیا کی رو سے زیادہ وجہ عار کی تفاوت نسب ہے، اس میں جو انساب کا اصل مبدأ ہے یعنی حضرت آدم و حوا علیہما السلام اس میں مشارکت کے اعتبار سے، تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، پھر عار کی کیا بات، سو جب عدم عار کی وجہ معلوم ہوگئی تو ضرورت مذکورہ کے وقت ان سے نکاح کرلیا کرو (مگر شرط یہ بھی ہے کہ) ان کے مالکوں کی اجازت سے (ہو) اور ان (کے ان مالکوں) کو ان کے مہر قاعدہ (شرعیہ) کے موافق دیدیا کرو (اور یہ مہر دینا) اس طور پر (ہو) کہ وہ منکوحہ بنائی جاویں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں (یعنی وہ مہر بمقابلہ نکاح ہو بطور اجرت زنا کے دینے سے وہ حلال نہ ہوگی) پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنائی جاویں، پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تو (بعد ثبوت بشرطیکہ مسلمان ہوں) ان پر اس سزا سے نصف سزا (جاری) ہوگی جو کہ (غیر منکوحہ) آزاد عورتوں پر ہوتی ہے، (جیسا کہ نکاح کے قبل بھی لونڈیوں کی یہی سزا تھی، اور اسی طرح غلاموں کی بھی) یہ (لونڈیوں سے نکاح کرنا) اس شخص کے لئے مناسب ہے جو تم میں (بوجہ غلبۂ شہوت اور آزاد منکوحہ میسر نہ ہونے کے) زنا (میں مبتلا) ہوجانے کا اندیشہ رکھتا ہو، (اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے مناسب نہیں، اور اگر اس اندیشہ کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قادر ہو تو) تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (بہ نسبت نکاح کنیز کے، اور یوں) اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں، (اگر صورت کراہت میں بھی نکاح کرلیا، ہم مواخذہ نہیں کریں گے) اور بڑی رحمت والے ہیں (کہ حرمت کا حکم نہیں فرمایا)۔

معارف و مسائل

طَوْل قدرت و وسعت کو کہتے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ مسلمان کنیزوں میں سے مومن باندیوں سے نکاح کر سکتا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو آزاد عورت ہی سے نکاح کرنا چاہئے، باندی سے نکاح نہ کرے اور اگر باندی سے نکاح کرنا پڑ ہی جائے تو مومن باندی تلاش کرے۔

حضرت امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے کہ آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کر لینا یا کتابیہ باندی سے نکاح کر لینا مکروہ ہے۔

اور حضرت امام شافعی اور دیگر ائمہ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور کتابیہ باندی سے نکاح کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔

بہر حال باندی کے نکاح سے بچنا آزاد کے لئے مستحب ہے، اور اگر مجبوراً کرنا ہو تو مومن باندی سے نکاح کریں، وجہ اس کی یہ ہے کہ باندی سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ اس شخص کی غلام ہوتی ہے جو باندی کا مالک ہے، اور غیر مومن باندی سے جو اولاد ہوگی اندیشہ ہے کہ وہ ماں کے ڈھنگ پر غیر دین اختیار کریں، اولاد کو غلامی سے بچانے اور مومن بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کی ماں آزاد ہو، اور اگر باندی ہو تو کم از کم مومنہ ضرور ہو، تاکہ بچے کا ایمان محفوظ رہے، اسی لئے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ کتابی عورت جو آزاد یہود و نصاریٰ میں سے ہو اگرچہ نکاح کرنا درست ہے لیکن بچنا بہتر ہے، اور اس دور میں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کی عورتیں عموماً مسلمانوں سے اسی لئے نکاح کرتی ہیں کہ خود شوہر کو اور شوہر کی اولاد کو اپنے دین پر لا سکیں۔

پھر فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا خوب علم ہے، ایمان وجہ فضیلت ہے، بعض مرتبہ غلام و باندی ایمانی مرتبہ میں آزاد مرد و عورت سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے مومن باندی سے نکاح کرنے کو قابل نفرت نہ جانیں، بلکہ اس کے ایمان کی قدر کریں۔

آخر میں فرمایا بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یعنی آزاد و غلام سب ایک ہی جنس بنی آدم سے تعلق رکھتے ہیں، اور سب ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں، فضیلت کا مدار ایمان اور تقویٰ پر ہے، قال فی المظہری فهذان الجملتان لتأنيس الناس بنكاح الاماء ومنعهم عن الاستنكاف منهن" یعنی ان دونوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باندیوں کے نکاح

سے مانوس ہوں اور اس نکاح کو قبول نفرت نہ سمجھیں"

وَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، یعنی باندیوں سے نکاح ان کے مالکوں کی اجازت سے کرو، اگر وہ اجازت نہ دیں تو باندیوں کا نکاح صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ باندی کو خود اپنے نفس پر ولایت حاصل نہیں ہوتی، یہی حکم غلام کا بھی ہے، کہ وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ باندیوں سے نکاح کرو تو ان کے مہر خوبی کے ساتھ ادا کر دو، یعنی ٹال مٹول نہ کرو اور پورا ادا کر دو، باندی سمجھ کر اس بارے میں تکلیف نہ دو۔

اس مسئلہ میں امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ مہر باندی کا حق ہے، اور دوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ باندی کے مہر میں جو مال ملے اس کا مالک بھی باندی کا آقا ہے۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ، یعنی مومن باندیوں سے نکاح کرو اس حال میں کہ وہ پاک دامن ہوں، نہ وہ مسافحات ہوں (یعنی علانیہ زنا کرنے والی) اور نہ خفیہ طریقہ پر آشنا رکھنے والی ہو، گو اس جگہ پر باندیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ نکاح کے لئے پاک دامن باندیوں کو تلاش کرو، لیکن آزاد عورت بدکار ہو اس سے نکاح سے بچنا بھی افضل اور بہتر ہے۔

جیسا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرہ کے ساتھ نکاح کی قدرت نہ ہو تو باندی کے ساتھ نکاح کرو، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ متعہ جائز نہیں، اس لئے کہ اگر متعہ جائز ہوتا تو حرہ کے ساتھ نکاح کے عدم استطاعت کی صورت میں کسی شخص کے لئے آسان ترین صورت متعہ کرنے کی تھی کہ اس میں جنسی خواہش بھی پوری ہو جاتی، اور مالی بوجھ بھی نکاح کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا۔

نیز آیت میں مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ کے ساتھ باندیوں کی صفت بیان کی گئی ہے، اور متعہ کی صورت میں سفاح ہی سفاح ہوتا ہے، کہ ایک عورت قلیل مدت میں متعدد اشخاص کے استعمال میں آتی ہے، اور چونکہ بچہ کسی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، اس لئے تناسل کا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور سب کی قوت صرف شہوت رانی میں ضائع چلی جاتی ہے۔

پھر فرمایا فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ، یعنی جب باندیاں نکاح میں آگئیں، اور ان کے پاک دامن رہنے کا انتظام ہو گیا تو اب اگر زنا کر بیٹھیں تو ان کو اس سزا سے آدھی سزا ملے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے، اس سے غیر شادی شدہ آزاد عورتیں مراد ہیں، غیر شادی شدہ آزاد مرد و عورت سے اگر زنا کا صدور ہو جائے تو اس کو سو کوڑے لگائے جائیں گے، جس کا ذکر سورۂ نور کی

دوسری آیت میں ہے، اور جو کوئی شادی شدہ مرد و عورت زنا کرلے تو اس کی سزا رجم ہے یعنی پتھروں سے مار مار کر قتل کر دیا جائے گا، چونکہ اس میں تنصیف نہیں ہوسکتی، اس لئے چاروں اماموں کا مذہب یہی ہے کہ غلام یا باندی خواہ شادی شدہ ہوں خواہ کنوارے ہوں اگر ان سے زنا سرزد ہوجائے تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہیں، باندیوں کا حکم تو آیت شریفہ میں مذکور ہے، اور بطور دلالۃ النص غلام کا مسئلہ بھی اسی سے سمجھ میں آرہا ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ، یعنی باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت اس شخص کے لئے ہے جس کو زنا میں پڑجانے کا اندیشہ ہو۔

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی باوجود اندیشۂ زنا کے بھی اگر صبر کرو اور اپنے نفسوں کو پاک دامن رکھ سکو تو یہ تمہارے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ باندیوں سے نکاح کرو۔

آیت کے ختم پر فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی باندیوں سے نکاح کرنا مکروہ ہے، اگر اس کراہت پر عمل کرلو گے تب بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے، اور وہ رحم والا بھی ہے کیونکہ اس نے باندیوں سے نکاح کی اجازت دیدی اور اس کو ممنوع قرار نہیں دیا۔

فائدہ: آیت بالا کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذکر آیا ہے ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں جو کافر مرد و عورت جہاد کے موقع پر قید کرلئے جاتے تھے، امیر المؤمنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ قیدی غلام باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی بااستثناء بعض صورتوں کے، جن کا تفصیلی ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے جب سے مسلمانوں نے شرعی طور پر جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اپنے جہاد اور صلح و جنگ کا مدار دشمنانِ دین کے مشورہ پر رکھ دیا ہے اور غیر شرعی اصولوں کے پابند ہوگئے ہیں اس وقت سے غلام اور باندی سے بھی محروم ہوگئے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ آزاد ہیں۔

بعض علاقوں میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے، اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ

اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے واسطے اور چلاوے تم کو پہلوں

قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ

کی راہ اور معاف کرے تم کو اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا اور اللہ چاہتا ہے

عدل ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

پھر فرمایا: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا ؕ یعنی انسان خلقی طور پر ضعیف ہے، اور اس کے اندر شہوانی مادہ رکھ گیا ہے، اگر بالکل ہی عورتوں سے دور رہنے کا حکم دیدیا جاتا تو اطاعت اور فرمانبرداری کرنے سے عاجز رہ جاتا، اس کے عجز و ضعف کے پیش نظر عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب دی، اور نکاح کے بعد آپس میں جو ایک دوسرے کو نفس و نظر کی پاکیزگی کا نفع اور دوسرے فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے طرفین کو تقویت پہنچتی ہے، پس نکاح ضعف کے دور کرنے کا باہمی معاہدہ اور ایک بے مثال طریقہ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا

مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے اور نہ خون کرو

اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

آپس میں بیشک اللہ تم پر مہربان ہے اور جو کوئی یہ کام کرے

عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي

تعدی سے اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے آگ میں اور یہ اللہ

اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

پر آسان ہے۔

ربطِ آیات شروع سورۂ نساء میں تمام انسانوں کا ایک ماں باپ سے پیدا ہونا اور سب کا ایک رشتۂ اخوت میں جکڑے رہنا بیان فرما کر عام انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ادائیگی کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا، پھر یتیموں اور عورتوں کا تفصیلی بیان آیا، پھر میراث کے احکام کا بیان ہوا، جس میں یتیموں، عورتوں کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تاکید تھی، اس کے بعد نکاح کے احکام آئے کہ کس عورت سے نکاح حلال ہے کس سے حرام، کیونکہ نکاح ایک ایسا معاملہ اور معاہدہ ہے جس سے عورت کی جان اور مال میں تصرف کرنے کا کسی کو حق ملتا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں عام انسانوں کے جان و مال کی حفاظت اور ان میں ہر ناجائز تصرف

کرنے کی ممانعت کا بیان ہے، خواہ وہ انسان مرد ہوں یا عورتیں، وہ عزیز رشتہ دار ہوں یا غیر، یہاں تک کہ مسلم ہوں یا وہ غیر مسلم جن سے ترک جنگ کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو (کما صرح بہ المظہری)

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے واقع ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں (یہ تو مالی تصرف تھا، آگے تصرف نفسی کو فرماتے ہیں) اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلا شبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں (اس لئے ضرر رسانی کی صورتوں کو منع فرمادیا، بالخصوص جبکہ اس میں یہ اثر ہو کر دوسرا شخص بھی تم کو ضرر پہنچادے گا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تم کو بھی ضرر سے بچالیا) اور (چونکہ قتل ان دونوں امور میں اشد ہے اس لئے اس پر بالخصوص وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص ایسا فعل (یعنی قتل) کرے گا اس طور پر کہ حد (شرع) سے گذر جاوے اور (وہ گذرنا بھی خطاء فعل یا خطاء رائے سے نہ ہو بلکہ اس طور پر کہ (قصداً) ظلم کرے تو ہم عنقریب (یعنی بعد الموت) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے اور یہ امر (یعنی ایسی سزا دینا) خدا تعالیٰ کو بالکل آسان ہے (کچھ اہتمام کی حاجت نہیں جس میں اس احتمال کی گنجائش ہو کہ شاید کسی وقت اہتمام وسامان جمع نہ ہو تو سزا ٹل جاوے گی)۔

معارف و مسائل

جس طرح کسی غیر کا مال ناجائز طریقے سے کھانا جائز نہیں، خود اپنا مال بھی غلط طریق سے خرچ کرنا جائز نہیں

آیت کے الفاظ میں اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "اپنے مال آپس میں" اس میں یہ بات تو باتفاق مفسرین داخل ہے ہی کہ کوئی شخص دوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھائے، ابوحیان ؒ نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی اپنا ہی مال ناجائز طور پر کھائے، مثلاً ایسے کاموں میں خرچ کرے جو شرعاً گناہ یا اسراف بے جا ہیں، وہ بھی آیت کی رو سے ممنوع و ناجائز ہے۔

آیت میں لَا تَاْكُلُوْٓا کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "مت کھاؤ" مگر عام محاورہ کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مال میں ناحق طور پر کسی قسم کا تصرف نہ کرو، خواہ کھانے پینے کا ہو یا استعمال کرنے کا، عرف عام میں کسی کے مال میں تصرف کرنے کو اس کا

کھانا ہی بولا جاتا ہے، اگرچہ وہ چیز کھانے کی نہ ہو۔ لفظ "باطل" جس کا ترجمہ "ناحق" سے کیا گیا ہے عبداللہ بن مسعودؓ اور جمہور صحابہؓ کے نزدیک تمام ان صورتوں پر حاوی ہے جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں، جس میں چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت، سود، قمار اور تمام معاملات فاسدہ داخل ہیں۔ (بحر محیط)

تکمیلِ تشریح و تفسیر

اس طرح سے گویا قرآن کریم نے ایک لفظ بالباطل فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کئے ہوئے مال کو حرام قرار دیدیا، پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمائی، آپ نے ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید و فروخت یا ناجائز اجارہ وغیرہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہے، اس لئے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں، احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوتے ہیں، سب کا مطلب یہی حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی قرآنی ارشاد کی تشریح ہوتی ہے خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے۔

آیت کے پہلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، دوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا، اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ یعنی دوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔

جائز طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث، لیکن عام طور پر ایک شخص کا مال دوسرے کے تصرف میں آنے کی معروف و جاری صورت تجارت ہی ہے۔

پھر تجارت کے معنی عام طور پر صرف بیع و شراء کے لئے جاتے ہیں، مگر تفسیر مظہری میں اجارہ یعنی ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل قرار دیا گیا ہے، کیونکہ بیع میں تو مال کے بدلہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے، اور اجارہ میں محنت و خدمت کے بدلہ میں مال حاصل ہوتا ہے، لفظ تجارت ان دونوں کو حاوی ہے۔

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے، لیکن اگر رضامندی کے ساتھ یعنی بیع و شراء یا ملازمت و مزدوری کا معاملہ ہو جائے تو اس طرح دوسرے کا مال حاصل کرنا اور اس میں مالکانہ تصرفات کرنا جائز ہے۔

کسب معاش کے ذرائع میں تجارت و محنت سب سے افضل ہے

دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال وطیب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَّبْرُوْرٍ، رواہ احمد والحاکم (مظہری وترغیب)	"آدمی کا اپنے ہاتھ کی مزدوری، اور ہر وہ بیع وشراء جس میں جھوٹ فریب نہ ہو۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ (ترمذی)	"سچا امانتدار تاجر انبیاء، اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"

اور حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، رواہ الاصبہانی (ترغیب)	"سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہوگا۔"

پاکیزہ کمائی کے حاصل کرنے کی شرائط

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں، اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان (کسی سے) خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں، اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹلائیں نہیں، اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔"

(اخرجہ الاصبہانی، از حاشیہ مظہری)

اسی لئے ایک حدیث میں ارشاد ہے:

إِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُونَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ (اخرجه الحاكم عن رفاعة بن رافع)

"قیامت کے روز تاجر لوگ فاجر یعنی گنہگاروں کی صف میں ہوں گے بجز اس شخص کے جو اللہ سے ڈرے اور نیکی کا معاملہ کرے، اور سچ بولے۔"

دوسرے کا مال حلال ہونے کے لئے تجارت اور تراضی کی دو شرطیں

آیت کے اس جملہ میں تجارت کے ساتھ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ فرما کر یہ بتلا دیا کہ جہاں تجارت ہی نہ ہو بلکہ تجارت کے نام پر جوا، سٹہ، یا ربوٰ اور سود کا معاملہ ہو یا مال بھی موجود نہیں، محض ذہنی قرارداد پر اس کا سودا کیا گیا ہو وہ بیع باطل اور حرام ہے۔

اسی طرح اگر تجارت یعنی مبادلۂ اموال تو ہو لیکن اس میں فریقین کی رضامندی نہ ہو وہ بھی بیع فاسد اور ناجائز ہے، اور یہ دونوں صورتیں اکل اموال بالباطل میں داخل ہیں، پہلی صورت کو فقہاء بیع باطل کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور دوسری صورت کو بیع فاسد کے نام سے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ ایک مال کا دوسرے مال سے تبادلہ کرنے کا نام تجارت ہے، اگر ان میں کسی ایک جانب مال ہو اور اس کے بالمقابل مال ہی نہ ہو تو وہ تجارت نہیں، بلکہ فریب ہے، سود کے معاملات کا یہی حال ہے کہ سود کی رقم ادھار کی میعاد کا معاوضہ ہوتا ہے اور یہ میعاد کوئی مال نہیں، اسی طرح سٹہ، جوا کہ اس میں ایک طرف تو مال متعین موجود ہے، دوسری طرف مال کا ہونا یا نہ ہونا مشکوک ہے، اسی طرح وہ وعدے کے سودے جن میں مال ابھی تک وجود میں نہیں آیا، اور اس کا سودا کر دیا گیا تو ایک طرف مال اور دوسری طرف موہوم وعدہ ہے، اس لئے حقیقت کے اعتبار سے یہ تجارت ہی نہیں، بلکہ ایک قسم کا دھوکہ فریب ہے اسی لئے فقہاء نے اس کو بیع باطل قرار دیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے مال اور تبادلۂ مال تو ہو، لیکن کسی ایک جانب سے رضامندی نہ ہو، یہ تجارت تو ہوئی مگر فاسد اور غلط قسم کی تجارت ہے، اس لئے اس کو بیع فاسد کہا جاتا ہے اور ناجائز ہے۔

اس تشریح سے بیع و شراء اور تجارت کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں سب نکل جاتی ہیں۔

شرط تراضی کی حقیقت

البتہ ایک تیسری قسم اور ہے جس میں طرفین سے تبادلۂ مال بھی ہے اور بظاہر فریقین کی رضامندی بھی، مگر وہ رضامندی درحقیقت مجبوری کی رضامندی ہوتی ہے

حقیقی رضامندی نہیں ہوتی اس لئے شرعاً اس تیسری قسم کو بھی دوسری ہی قسم میں داخل قرار دیا گیا ہے، مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کرے اور پھر اس کی قیمت میں خود بخود اضافہ کر کے فروخت کرنے لگے، چونکہ بازار میں دوسری جگہ ملتی نہیں، گاہک مجبور ہے کہ مہنگی سستی جیسی بھی یہ فروخت کرے وہ اس کو خریدے، اس صورت میں اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے، لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری کے تحت ہے، اس لئے کالعدم ہے۔

اسی طرح کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ معاشرت کی ایسی صورتیں پیدا کردے کہ وہ اپنا مہر معاف کرنے پر مجبور ہو جائے، تو گو معافی کے وقت وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے لیکن درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی۔

یا کوئی آدمی جب یہ دیکھے کہ میرا جائز کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہوگا وہ رضامندی کے ساتھ رشوت دینے کے لئے آمادہ ہو تو چونکہ یہ رضامندی بھی درحقیقت رضامندی نہیں اس لئے شرعاً کالعدم ہے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ سے بیع و شراء اور تجارت کی صرف انہی صورتوں کا جواز ثابت ہوا جن کا جواز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو منضبط کردیا ہے اور جتنی صورتیں بیع و شراء اور تجارت کی شرعاً ممنوع و ناجائز ہیں وہ سب اس سے خارج ہیں، قرآن کریم کے اس ایک لفظ نے فقہ کی پوری کتاب البیوع اور کتاب الاجارہ کا مکمل بیان کردیا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اس میں باتفاق مفسرین خودکشی بھی داخل ہے، اور یہ بھی کہ ایک دوسرے کو ناحق قتل کرے۔

آیت کے پہلے جملہ میں عام انسانوں کے مالی حقوق اور ان کی حفاظت کا بیان تھا، اس جملہ میں ان کے جانی حقوق کی حفاظت کا بیان آگیا ——— اور اس جگہ مال کو مقدم اور جان کو مؤخر شاید اس لئے بیان فرمایا گیا کہ مالی حقوق میں ظلم و جور اور کوتاہی و غفلت بہت عام ہے، ناحق قتل و خوں ریزی اگرچہ اس سے زیادہ شدید ہے مگر عادۃً اس میں ابتلاء کم ہے، اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا، یعنی جو احکام اس آیت میں دیئے گئے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق نہ کھاؤ یا کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یہ سب احکام تمہارے حق

میں رحمتِ خداوندی ہیں، تاکہ تم ان کاموں کے اُخروی وبال سے بھی محفوظ رہو اور دنیوی سزاؤں سے بھی۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا، یعنی قرآنی ہدایت کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے اور جان بوجھ کر تعدی اور ظلم کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے یا کسی کو ناحق قتل کر دے تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔ تعدی و ظلم کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر سہو و نسیان یا خطاء سے ایسا ہوگیا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ

اگر تم بچتے رہو گے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں تو ہم معاف کر دیں گے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے

وَنُدْخِلْکُمْ مُّدْخَلًا کَرِیْمًا (۳۱)

اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں

ربطِ آیات اس آیت سے پہلی آیات میں چند بڑے بڑے گناہوں کا ذکر اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان ہے، قرآن کریم کا مخصوص اندازِ بیان یہ ہے کہ جب کسی جرم پر سزا سے ڈرایا جاتا ہے جسے ترہیب کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس جرم سے باز آئے گا اس کے لئے یہ انعامات و درجات ہیں۔

اس آیت میں بھی ایک خاص انعامِ خداوندی ذکر کر کے ترغیب دی گئی ہے، وہ یہ کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچ گئے تو تمہارے چھوٹے گناہوں کو ہم خود معاف کر دیں گے، اور اس طرح تم ہر طرح کے بڑے چھوٹے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک وصاف ہو کر عزت و راحت کے اس مقام میں داخل ہو سکو گے جس کا نام جنت ہے۔

خلاصۂ تفسیر

جن کاموں سے تم کو (شرع میں) منع کیا جاتا ہے (یعنی گناہ کے کام) ان میں سے جو بھاری بھاری کام ہیں (یعنی بڑے بڑے گناہ ہیں) اگر تم ان سے بچتے رہو تو (اس بچنے پر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اعمالِ حسنہ کے کرنے سے جب کہ وہ مقبول ہو جائیں) ہم تمہاری خفیف برائیاں (یعنی چھوٹے گناہ جو کہ دوزخ میں لے جا سکتے ہیں) تم سے دور (یعنی

معاف فرمادیں گے، پس دوزخ سے محفوظ رہو گے) اور ہم تم کو ایک معزز جگہ (یعنی بہشت) میں داخل کردیں گے۔

معارف و مسائل

گناہوں کی دو قسمیں آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ کبیرہ، یعنی بڑے گناہ، اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کرکے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرمادیں گے۔

کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض و واجبات کو ادا کرے، کیونکہ فرض و واجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص اس کا اہتمام پورا کرے کہ تمام فرائض و واجبات ادا کرے، اور تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچالے، تو حق تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کردیں گے۔

اعمال صالحہ سے صغیرہ گناہ کفارہ ہوجاتے ہیں کفارہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اعمال صالحہ کو صغیرہ گناہوں کا کفارہ بناکر اس کا حساب بیباق کردیں گے، اور بجائے عذاب کے ثواب اور بہشت کی راحت نصیب ہوگی ____ جیسے احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا، چہرہ دھویا تو آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا، کلی کرلی تو زبان کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا، پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دُھل گئے، پھر جب وہ مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔

کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں آیت سے معلوم ہوا کہ وضو، نماز وغیرہ اعمال صالحہ کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہونا جو روایاتِ حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اور کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اور صغیرہ کی یہ شرط ہے کہ آدمی ہمت اور کوشش کرکے کبیرہ گناہوں سے بچ گیا ہو ____ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں میں مبتلا رہتے ہوئے وضو اور نماز ادا کرتا ہے تو محض وضو نماز یا دوسرے اعمالِ صالحہ سے اس کے صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ نہیں ہوگا، اور کبیرہ تو اپنی جگہ ہیں ہی ____ اس لئے کبیرہ گناہوں کا ایک بہت بڑا ضرر خود ان گناہوں کا وجود ہے جس پر قرآن و حدیث کی شدید وعیدیں آئی ہیں، اور وہ بغیر سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اس کے علاوہ دوسری محرومی یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے

چھوٹے گناہ بھی معاف نہیں ہوں گے اور یہ شخص محشر میں کبائر و صغائر کے بوجھ میں لدا حاضر ہوگا اور کوئی اس وقت اس کا بوجھ ہلکا نہ کرسکے گا۔

گناہ اور اس کی دو قسمیں صغائر کبائر

آیت میں کبائر کا لفظ آیا ہے، اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں اور وہ کُل کتنے ہیں، اور صغیرہ گناہ کی کیا تعریف ہے اور اس کی تعداد کیا ہے؟

علماء امت نے اس مسئلہ پر مختلف انداز میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم اور ان کی تعریفات سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ مطلق گناہ نام ہے ہر ایسے کام کا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو، اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اصطلاح میں جس گناہ کو صغیرہ یعنی چھوٹا کہا جاتا ہے، درحقیقت وہ بھی چھوٹا نہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت ہر حالت میں نہایت سخت و شدید جرم ہے، اسی حیثیت سے امام الحرمین اور بہت سے علماء امت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت کبیرہ ہی ہے — کبیرہ و صغیرہ کا فرق صرف گناہوں کے باہمی مقابلہ اور موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ کُلُّ مَا نُهِيَ عَنْهُ فَهُوَ كَبِيرَةٌ، یعنی جس کام سے شریعت اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس گناہ کو اصطلاح میں صغیرہ یا چھوٹا کہا جاتا ہے، اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں ہیں کہ ایسے گناہوں کے ارتکاب میں غفلت یا سستی برتی جائے اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا جائے، بلکہ صغیرہ گناہ کو بیباکی اور بے پرواہی کے ساتھ کیا جائے، تو وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے چھوٹا بچھو اور بڑا بچھو، یا آگ کے بڑے انگارے اور چھوٹی چنگاری کہ انسان ان دونوں میں سے کسی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کرسکتا، اسی لئے محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ گناہوں کو ترک کیا جائے، جو لوگ نماز، تسبیح کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادت مقبول نہیں، اور حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا، اور سلف صالحین نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو انسان کو کافرانہ اعمال و اخلاق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مداح بھی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں، گناہوں سے بے پرواہی انسان کے لئے دائمی تباہی کا سبب ہے ــــ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ اور استغفار کر لیا تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے" اور اس کا نام قرآن میں رَین ہے کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ یعنی ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا ان کے اعمال بد نے" (۸۳: ۱۴) البتہ گناہوں کے مفاسد اور نتائج بد اور مضرات کے اعتبار سے ان کے آپس میں فرق ضروری ہے، اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

گناہِ کبیرہ گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن و حدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ابن عباسؓ کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپ نے فرمایا سات نہیں سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

امام ابن حجر مکیؒ نے اپنی کتاب الزواجر میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے، جو مذکورہ تعریف کی رو سے کبائر میں داخل ہیں، ان کی اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو سڑسٹھ تک پہنچی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اکتفا کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع و اقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہو گئی، اس لئے یہ کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا، اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات، کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اسی سے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں منحصر کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا اتنا بیان کر دیا گیا۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ

گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں میں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں، وہ تین ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک سمجھنا ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی، اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔

اسی طرح بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے، فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا، تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے، اور پڑوسی کے اہل و عیال کی حفاظت بھی چونکہ اپنے اہل و عیال کی طرح انسان کے ذمہ لازم ہے اس سے یہ جرم دوگنا ہوگیا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے، فرمایا کہ ہاں! جو شخص کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں، کیونکہ یہی ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتل ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدان جہاد سے بھاگنے اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے، اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔

بعض روایات حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارالکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارالہجرۃ کو چھوڑ کر دارالکفر میں دوبارہ چلا جائے۔

دوسری روایات حدیث میں ان صورتوں کو بھی گناہ کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے مثلاً جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا اور دوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادو سیکھنا، جادو کا عمل کرنا، اور فرمایا کہ شراب پینا اکبر الکبائر ہے، اور فرمایا کہ شراب پینا ام الفواحش ہے کیونکہ شراب میں مست ہو کر آدمی ہر برے سے برا کام کرسکتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسا عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔

ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذر شرعی کے دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر دیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا، مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا، بلکہ قضاء کرکے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔

بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب و سزا سے بے فکر و بے خوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصہ میراث کم کرنے کے لئے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب و خاسر ہوئے اور تباہ ہوگئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ نامراد و تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا ایک وہ شخص جو تکبر سے کپڑا پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور جبہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرکے احسان جتلاتا ہے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا فرماں روا ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیالدار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغل خور آدمی جنت میں نہ جائے گا۔

اور نسائی و مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلا وجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا، جنات و شیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتلانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل و عیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اُس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لئے قربان کرے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر مردوں کو

نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ

حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِـيْمًا (۳۲)

اور مانگو اللہ سے اس کا فضل بے شک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ

اور ہر کسی کے لئے ہم نے مقرر کر دیئے ہیں وارث اس مال کے کہ چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے،

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِيْبَھُمْ ۭ اِنَّ

اور جن سے معاہدہ ہوا تمہارا ان کو دیدو ان کا حصہ بے شک

اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۳۳)

اللہ کے روبرو ہے ہر چیز۔

ربطِ آیات ماقبل کی آیتوں میں میراث کے احکام گذرے ہیں، ان میں یہ بھی بتلایا جا چکا ہے کہ میت کے وارثوں میں اگر مرد اور عورت ہوں اور میت کی طرف رشتہ کی نسبت ایک ہی طرح کی ہو تو مرد کو عورت کی نسبت دوگنا حصہ ملے گا، اسی طرح کے اور فضائل بھی مردوں کے ثابت ہیں، حضرت ام سلمہؓ نے اس پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے، اور بھی فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہیں۔

مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی تمنا تھی کہ اگر ہم لوگ بھی مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل ہمیں بھی حاصل ہو جاتے، بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد میں حصہ لیتے اور جہاد کی فضیلت ہمیں حاصل ہو جاتی۔

ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مرد کو میراث میں دوگنا حصہ ملتا ہے اور عورت کی شہادت بھی مرد سے نصف ہے تو کیا عبادت و اعمال میں بھی ہم کو نصف ہی ثواب ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں دونوں قولوں کا جواب دیا گیا ہے، حضرت ام سلمہؓ کے قول کا جواب وَلَا تَتَمَنَّوْا سے دیا گیا، اور اس عورت کے قول کا جواب لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ سے دیا گیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم سب مردوں عورتوں کو حکم ہوتا ہے کہ نفسانی [illegible] میں سے ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (مثلاً مردوں کو) بعضوں پر (مثلاً عورتوں پر

بلا دخل اس کے کسی عمل کے، فوقیت بخشی ہے (جیسے مرد ہونا یا مردوں کا دو حصہ ہونا یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیرہ ذلک کیونکہ) مردوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے، (اور مدار نجات کا قانوناً یہی اعمال ہیں اور ان میں کسی کی تخصیص نہیں، تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال ہیں جو کہ فضائل کسبیہ ہیں کوشش کرکے دوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کرلو، باوجود اس پر قادر ہونے کے فضائل خاصہ مذکورہ کی تمنا محض ہوس اور فضول ہے) اور (اگر فضائل وہبیہ میں ایسے فضائل کی رغبت ہے جن میں اعمال کو بھی دخل ہے مثلاً احوال و کمالات باطنیہ و اشباہہا تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ خالی تمنا ہی کیا کرو، بلکہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (خاص) کی درخواست (یعنی دعا) کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس میں سب چیزیں آگئیں، یعنی فضائل وہبیہ قسم اول کی وجہ تخصیص بھی اور فضائل کسبیہ پر ثواب دینا بھی، اور فضائل وہبیہ قسم دوم کی درخواست بھی، پس یہ جملہ سب کے متعلق ہے)، اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور (دوسرے) رشتہ دار لوگ (اپنے مرنے کے بعد) چھوڑ جاویں ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں، اور جن لوگوں سے تمہارے عہد (اپنے ہاتھ سے) بندھے ہوئے ہیں (جس کو مولی الموالات کہتے ہیں) ان کو (اب جبکہ شرع سے رشتہ دار لوگ وارث مقرر ہو گئے ساری میراث مت دو، بلکہ صرف) ان کا حصہ (یعنی ایک ششم) دیدو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں (پس ان کو ساری میراث نہ دینے کی حکمت اور ششم مقرر کر دینے کی مصلحت اور یہ کہ یہ ششم ان کو کون دیتا ہے کون نہیں دیتا، ان سب کی ان کو خبر ہے)۔

معارف و مسائل

امور غیر اختیاریہ کی تمنا کرنا

اس آیت میں ان غیر اختیاری فضائل کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے جو دوسروں کو حاصل ہوں ـــــ وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو دوسروں سے مال و دولت، آرام و عیش، حسن و خوبی، علم و فضل وغیرہ میں کم پاتا ہے تو عادۃً اس کے دل میں ایک مادہ حسد کا ابھرتا ہے، جس کا تقاضا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ میں بھی اس کے برابر یا زیادہ ہو جاؤں، اور بسا اوقات اس پر قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جن میں انسان کے سعی و عمل کو کوئی دخل نہیں، وہ محض قدرت کے انعامات ہوتے ہیں، جیسے کسی شخص کا مرد ہونا، یا کسی اعلیٰ خاندان نبوت میں یا خاندان حکومت میں

پیدا ہونا، یا حسین وخوب صورت پیدا ہونا وغیرہ کہ جس شخص کو یہ انعامات حاصل نہیں، وہ اگر عمر بھر اس کی کوشش کرے کہ [illegible] مرد ہوجائے یا خاندانی سید بن جائے، اس کا ناک نقشہ، قد و قامت حسین ہوجائے، تو یہ اس کی قدرت میں نہیں، نہ کسی دوا، درمان یا تدبیر سے وہ ان چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے، اور جب دوسرے کی برابری پر قدرت نہیں ہوتی تو اب اس کے نفس میں یہ خواہش جگہ پکڑتی ہے کہ دوسروں سے بھی یہ نعمت چھن جائے تاکہ وہ بھی اس کے برابر یا کم ہوجائیں، اسی کا نام حسد ہے، جو انسانی اخلاق میں انتہائی شرمناک اور مضر خصلت ہے، اور دنیا کے بہت سے جھگڑوں اور فسادات، قتل وغارتگری کا سبب ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت نے اس فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ارشاد فرمایا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکمت ومصلحت جو کمالات وفضائل لوگوں میں تقسیم فرمائے ہیں، کسی کو کوئی وصف دیدیا کسی کو کوئی، کسی کو کم کسی کو زیادہ، اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت پر راضی اور خوش رہنا چاہئے، دوسرے کے فضائل وکمالات کی تمنا میں نہ پڑنا چاہئے، کہ اس کا نتیجہ اپنے لئے رنج وغم اور حسد کے گناہ عظیم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جس کو حق تعالیٰ نے مرد بنایا وہ اس پر شکر ادا کرے، جس کو عورت بنادیا وہ اس پر راضی رہے اور سمجھے کہ اگر وہ مرد ہوتی تو شاید مردوں کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرسکتی اور گنہگار ہوجاتی، جس کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت پیدا کیا ہے وہ اس پر شکرگذار ہو کہ اس کو یہ نعمت ملی، اور جو بدصورت ہے وہ بھی رنجیدہ نہ ہو اور سمجھے کہ میرے لئے اسی میں کوئی خیر مقدر ہوگی، اگر مجھے حسن وجمال ملتا تو شاید کسی فتنہ وخرابی میں مبتلا ہوجاتا، جو شخص نسب کے اعتبار سے سید ہاشمی ہے وہ اس پر شکر کرے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، اور جس کو یہ نسبت حاصل نہیں وہ اس فکر میں نہ پڑے اور اس کی تمنا بھی نہ کرے، کیونکہ یہ چیز کسی کوشش سے حاصل ہونے والی نہیں، اس کی تمنا اس کو گناہ میں مبتلا کردے گی، اور بجز رنج وغم کے کچھ حاصل نہ ہوگا، بجائے نسب پر افسوس کرنے کے اعمال صالحہ کی فکر میں زیادہ پڑے، ایسا کرنے سے وہ بڑے نسب والوں سے بڑھ سکتا ہے۔

بعض آیات قرآنی اور ارشادات نبوی میں مسابقت فی الخیرات، یعنی نیک کاموں میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کا حکم یا دوسروں کے فضائل وکمالات کو دیکھ کر ان کی تحصیل کے لئے سعی وعمل اور جدوجہد کی ترغیب آئی ہے تو وہ اُن اعمال وافعال سے متعلق ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، اور کسب واکتساب سے حاصل ہوسکتے ہیں، مثلاً

علمی فضائل و عملی اخلاق و کمالات کسی کے دیکھ کر ان کے حاصل کرنے کی جد و جہد مستحسن اور پسندیدہ عمل ہے، یہ آیت اس کے منافی نہیں بلکہ آیت کا آخری حصہ اس کی تائید کر رہا ہے، جس میں بشارت ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ یعنی جو کوئی چیز مردوں نے کسب و عمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا اور جو عورتوں نے **سعی و عمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا۔**

اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ فضائل و کمالات کی جن قسموں میں کسب و اکتساب اور جد و جہد بیکار نہیں، بلکہ مرد و عورت کو اس کی سعی و عمل کا حصہ ضرور ملے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کے علمی، عملی، اخلاقی فضائل کو دیکھ کر ان کی تمنا، اور پھر تمنا پوری کرنے کے لئے سعی و عمل اور جد و جہد کرنا مطلوب و مستحسن ہے۔

یہاں ایک مغالطہ بھی رفع ہو گیا جس میں بہت سے ناواقف مبتلا ہوا کرتے ہیں بعض تو غیر اختیاری فضائل کی تمنا میں لگ کر اپنے عیش و آرام اور سکون و اطمینان کو دنیا ہی میں برباد کر لیتے ہیں، اور اگر نوبت حسد تک پہنچ گئی یعنی دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا ہونے لگی تو آخرت بھی برباد ہوئی، کیونکہ حسد کے گناہِ عظیم کا ارتکاب ہوا۔

اور بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی سستی، کم ہمتی، بلکہ بے غیرتی سے اختیاری فضائل حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے اور کوئی کہے تو اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے **لئے قسمت و تقدیر کے حوالے دینے لگتے ہیں۔**

اس آیت نے ایک حکیمانہ دستور و ضابطہ بتلا دیا، کہ جو کمالات و فضائل غیر اختیاری ہیں اور ان میں انسان کا کسب و عمل مؤثر نہیں جیسے کسی کا عالی نسب یا حسین و خوب صورت پیدا ہونا، وغیرہ، ایسے فضائل کو تو حوالۂ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور نتیجہ رنج و غم ہے

اور جو فضائل و کمالات اختیاری ہیں جو کسب و عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب و عمل اور جد و جہد بھی ہو اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی و عمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی، بلکہ ہر ایک کو بقدر محنت **حصہ ملے گا مرد ہو یا عورت۔**

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس آیت سے پہلے لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ اور وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ کے احکام آئے تھے جن میں کسی کا مال ناحق استعمال کرنے اور کسی کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت ہے، اس آیت میں ان دونوں جرموں کے نتیجہ

کو بند کرنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ دوسرے لوگوں کو جو مال و دولت یا عیش و عشرت یا عزت و جاہ وغیرہ میں تم پر تفوق خداداد حاصل ہے، تم اس کی تمنا بھی نہ کرو ــــ اس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چوری، ڈاکہ، اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کسی کا مال لینا، یا قتل و غارت گری کرنا، ان سب جرائم کا اصل منشاء یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان جب دوسرے انسان کو مال و دولت وغیرہ میں اپنے سے فائق اور بڑھا ہوا پاتا ہے تو اول اس کے دل میں اس کی برابری یا اس سے برتری کی خواہش و تمنا پیدا ہوتی ہے، پھر یہ تمنا ہی ان سب جرائم تک پہنچا دیتی ہے، قرآنی ہدایت نے ان تمام جرائم کے سرچشمہ کو بند کر دیا کہ دوسروں کے فضائل و کمالات کی تمنا ہی کو روک دیا۔

آیت میں اس کے بعد ارشاد ہے وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ، اس میں یہ ہدایت ہے کہ جب تم کسی کو کسی کمال میں اپنے سے زائد دیکھو تو بجائے اس کے کہ اُس خاص کمال میں اس کے برابر ہونے کی تمنا کرو، تمہیں کرنا یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کی درخواست کرو، کیونکہ فضل خداوندی ہر شخص کے لئے جدا جدا صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، کسی کے لئے مال و دولت فضلِ الٰہی ہوتا ہے، اگر وہ فقیر ہو جائے تو گناہ و کفر میں مبتلا ہو جائے، اور کسی کے لئے تنگی اور تنگدستی ہی میں فضل ہوتا ہے، اگر وہ غنی اور مالدار ہو جائے تو ہزاروں گناہوں کا شکار ہو جائے، اسی طرح کسی کی عزت و جاہ کی صورت میں فضل خداوندی ہوتا ہے، کسی کے لئے گمنامی اور کس مپرسی ہی میں اس کے فضل کا ظہور ہوتا ہے، اور حقیقت حال پر نظر کرے تو معلوم ہو جائے کہ اگر اس کو عزت و جاہ ملتی تو بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا۔

اس لئے اس آیت نے یہ ہدایت دی کہ جب اللہ سے مانگو تو کسی خاص وصفِ معین کو مانگنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا فضل مانگو، تاکہ وہ اپنی حکمت کے مطابق تم پر اپنے فضل کا دروازہ کھول دے۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا، یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے اس میں اشارہ فرما دیا کہ حق تعالیٰ کی تقسیم عین حکمت اور عین عدل و انصاف ہے، جس کو جس حال میں پیدا کیا اور رکھا ہے، وہی مقتضائے حکمت و عدل تھا، مگر چونکہ انسان کو اپنے اعمال کے عواقب کا پورا پتہ نہیں ہوتا، اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کس کو کس حال میں رکھنا اس کے لئے مفید ہے۔

آیت مذکورہ کی شانِ نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب میراث میں مردوں کا دوہرا

حصہ مقرر ہوا تو بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ ہم مرد ہوتے تو ہمیں بھی دوہرا حصہ ملتا، اس کے مناسب دوسری آیت میں میراث کے قانون کا عدہ اس انداز سے کر دیا گیا کہ اس میں جو کچھ حصے مقرر کئے گئے ہیں وہ عین حکمت اور مطابق عدل ہیں، انسانی عقل چونکہ تمام عالم کے مصالح و مفاسد کا احاطہ نہیں کر سکتی اس لئے وہ ان حکمتوں کو بھی نہیں پہنچ سکتی، جو خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون میں ملحوظ ہیں، اس لئے جو حصہ کسی کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اس کو اسی پر راضی رہنا اور شکر گذار ہونا چاہئے۔

حقِ موالات سے میراث نہیں ملتی

اس آیت کے آخر میں جو باہمی معاہدہ کی بنا پر حصہ دینا مذکور ہے، یہ ابتداء اسلام میں تھا، بعد میں آیت وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ سے یہ منسوخ ہو گیا، اب اگر دوسرے ورثاء موجود ہوں تو دو شخصوں کے باہمی معاہدہ کا میراث پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى
مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو

بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ
نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو

نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ
تم کو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو ان کو

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بیشک اللہ ہے سب سے

عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا
اوپر بڑا اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف

مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ
مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرا دیں تو اللہ

اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾
موافقت کر دیگا ان دونوں میں بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

ع ۵

ربطِ آیات عورتوں کے متعلق جو احکام گذر چکے ہیں اس میں ان کی حق تلفی کی ممانعت بھی مذکور ہوئی، اب آگے مردوں کے حقوق کا ذکر ہے، اور ان کے مطالبہ اور ان کو فوت کرنے کی صورت میں تادیب کی اجازت بھی دی گئی ہے، حقوق میں اختلاف واقع ہونے کی صورت میں اس کے تصفیہ کا طریق اور حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت بھی مذکور ہے، اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اس سے یہ جواب بھی نکل آیا کہ جب مرد، عورت کے مقابلہ میں افضل ہیں تو یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ میراث میں ان کا حصہ عورتوں کی نسبت زیادہ کیوں ہے؟

خلاصۂ تفسیر

مرد حاکم ہیں عورتوں پر دو وجہ سے، ایک تو اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو یعنی مردوں کو بعضوں پر یعنی عورتوں پر قدرتی فضیلت دی ہے (یہ تو وہبی امر ہے) اور (دوسرے) اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں اور نان نفقہ میں) خرچ کئے ہیں، (اور خرچ کرنے والوں کا ہاتھ اونچا اور رتبہ ہوتا ہے، اس سے کہ جس پر خرچ کیا جاوے اور یہ امر مکتسب ہے) سو جو عورتیں نیک ہیں (وہ مرد کے ان فضائل و حقوق کی وجہ سے) اطاعت کرتی ہیں (اور) مرد کی عدم موجودگی میں (بھی) بحفاظت (و توفیق الٰہی) (اس کی آبرو و مال کی) نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں (اس صفت کی نہ ہوں، بلکہ) ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بددماغی کا احتمال (قوی) ہو تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو) ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال کے ساتھ) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت اور عظمت والے ہیں (ان کے حقوق اور قدرت اور علم سب بڑے ہیں، اگر تم ایسا کرو گے پھر وہ بھی تم پر اپنے حقوق کے متعلق ہزاروں الزام قائم کرسکتے ہیں) اور اگر (قرائن سے) تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (تجویز کرکے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو (کہ وہ جاکر تحقیق حال کریں، اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو سمجھاویں) اگر ان دونوں آدمیوں

اس آیت میں قوام کا ترجمہ عموماً حاکم کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہوتا ہے کہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے، جس طرح ملک و سلطنت اور ریاست کے لئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی، اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار و حاکم مانا گیا ہے، اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلہ میں اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں، اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھدار عورت یا مرد **اس کا انکار نہیں کرسکتا۔**

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت میں وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲: ۲۲۸) فرما کر اور سورۂ نساء کی آیت متذکرہ میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ اگرچہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم و واجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو امتیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہیں۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ بھی واضح کردیا گیا کہ یہ حکومت جو مردوں کی عورتوں پر ہے محض آمریت اور استبداد کی حکومت نہیں، بلکہ حاکم یعنی مرد بھی قانون شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو حکم دیا گیا ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴: ۱۹) یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا **سلوک کرو۔**

اسی طرح دوسری آیت میں عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (۲: ۲۳۳) کی تعلیم ہے جس میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ امور خانہ داری میں بیوی کے مشورہ سے کام کریں، اس تفصیل کے بعد مرد کی حاکمیت عورت کے لئے کسی رنج کا سبب نہیں ہوسکتی، تاہم چونکہ یہ احتمال تھا کہ مردوں کی اس فضیلت اور اپنی محکومیت سے عورتوں پر کوئی ناگوار اثر ہو، اس لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ صرف حکم بتلانے اور جاری کرنے پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی اس کی حکمت اور وجہ بھی بتلا دی، ایک وہبی جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں، دوسرے کسبی جو عمل کا اثر ہے۔

پہلی وجہ یہ ارشاد فرمائی بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خاص حکمت و مصلحت کے تحت ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، کسی کو فضل کسی کو مفضول بنایا ہے، جیسے ایک خاص گھر کو اللہ نے اپنا بیت اللہ اور قبلہ قرار دیدیا،

بیت المقدس کو خاص فضیلت دیدی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خدا داد فضیلت ہے جس میں مردوں کی سعی و عمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں۔

دوسری وجہ کسبی و اختیاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر ادا کرتے ہیں، اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں ــــــ ان دو وجہ سے مردوں کو **عورتوں پر حاکم بنایا گیا۔**

فائدہ:- یہاں ایک بات اور قابل غور ہے، ابن حیانؒ بحر محیط میں لکھتے ہیں، کہ آیت میں حاکمیت رجال کی دو وجہوں کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کسی کو ولایت و حکومت کا استحقاق محض زور و تغلب سے قائم نہیں ہوتا، بلکہ کام کی صلاحیت و اہلیت ہی اس کو حکومت **کا مستحق بناسکتی ہے۔**

> مردوں کی افضلیت کے بیان کے لئے قرآن حکیم کا عجیب اسلوب

پہلی وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نساء کی طرف ضمیریں عائد کرکے فَضَّلَهُمْ عَلَيْهِنَّ فرما دیا جاتا، مگر قرآن کریم نے عنوان بدل کر بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے الفاظ اختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزء قرار دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور فضیلت ثابت بھی ہو جائے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل، یا انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے، تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا، ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مثل اعضاء و اجزاء کے ہیں، **مرد سر ہے تو عورت بدن۔**

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالات علمی و عملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے **اور صفتِ حاکمیت میں بھی مرد سے فائق ہوجائے۔**

> مرد اور عورت کے مختلف اعمال تقسیم کار کے اصول پر مبنی ہیں

دوسری وجہ اختیاری جو یہ بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیاتِ میراث میں مردوں کا حصہ دوہرا اور عورتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلادی کہ مالی ذمہ داریاں تمامتر مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے

ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر، اس لئے اگر غور کیا جائے، تو لڑکی کو دوہرا حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورتوں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا اشارہ ایک اہم اصول زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے ـــــ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی پوری ذمہ داری مرد پر ڈال دی، شادی سے پہلے باپ اس کا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر ـــــ اس کے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مرد ان امور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس لئے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اس کا رتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر ذمہ داریاں تقسیم کر دی گئی ہیں، ہاں ذمہ داریوں کے دینے میں باہمی تفاضل ہوا کرتا ہے وہ یہاں بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجوہ کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت نہ عورتوں کو کوئی بے وقعت کرتی ہے، اور نہ ان کا اس میں کوئی نقصان ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔

صالح بیوی

اس آیت کے شروع میں بطور ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ مرد عورت پر حاکم ہے، اس کے بعد نیک و بد عورتوں کا بیان اس طرح فرمایا: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ، یعنی نیک عورتیں وہ ہیں جو مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کی اطاعت کرتی ہیں، اور مردوں کے پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، یعنی اپنی عصمت اور گھر کے مال کی حفاظت جو امور خانہ داری میں سب سے اہم ہیں، ان کے بجا لانے میں ان کے لئے مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہیں، یہ نہیں کہ ان کے سامنے تو اس کا اہتمام کریں اور ان کی نظروں سے غائب ہوں تو اس میں لاپرواہی برتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر ارشاد فرمایا کہ:

خَیْرُ النِّسَآءِ امْرَاَۃٌ اِذَا نَظَرْتَ اِلَیْھَا سَرَّتْکَ وَاِذَا اَمَرْتَھَا اَطَاعَتْکَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْھَا	"یعنی بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اس کو دیکھو تو خوش ہو اور جب اس کو کوئی حکم دو تو اطاعت کرے اور جب تم

حَفِظَتْ فِیْ مَالِهٖ وَنَفْسِهَا	غائب ہو تو اپنے نفس و مال کی حفاظت کرے

اور چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داری یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت دونوں آسان کام نہیں، اس لئے آگے فرما دیا بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ یعنی اس حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں، انہی کی امداد اور توفیق سے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں، ورنہ نفس و شیطان کے مکائد ہر وقت ہر انسان مرد و عورت کو گھیرے ہوئے ہیں، اور عورتیں خصوصاً اپنی علمی اور عملی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں، اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط نظر آتی ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد ہے، یہی وجہ ہے کہ بے حیائی کے گناہوں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔

اطاعت شعار نیک عورتوں کی فضیلت جہاں اس آیت سے مفہوم ہوتی ہے وہاں اس سلسلہ میں احادیث بھی وارد ہیں۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار و مطیع ہو اس کے لئے استغفار کرتے ہیں پرندے ہوا میں، اور مچھلیاں دریا میں، اور فرشتے آسمانوں میں اور درندے جنگلوں میں۔ (بحر محیط)

نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ

اس کے بعد ان عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار نہیں یا جن سے اس کام میں کوتاہی ہوتی ہے، قرآن کریم نے ان کی اصلاح کے لئے مردوں کو علی الترتیب تین طریقے بتلائے، وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ یعنی عورتوں کی طرف سے اگر نافرمانی کا صدور یا اندیشہ ہو، تو پہلا درجہ ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ نرمی سے ان کو سمجھاؤ، اور اگر وہ محض سمجھانے بجھانے سے باز نہ آئیں تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کا بستر اپنے سے علیحدہ کردو، تاکہ وہ اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضی کا احساس کرکے اپنے فعل پر نادم ہوجائیں، قرآن کریم کے الفاظ میں فِی الْمَضَاجِعِ کا لفظ ہے، اس سے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ مطلب نکالا کہ جدائی صرف بستر میں ہو، مکان کی جدائی نہ کرے، کہ عورت کو مکان میں تنہا چھوڑ دے اس میں ان کو رنج بھی زیادہ ہوگا، اور فساد بڑھنے کا اندیشہ بھی اس میں زیادہ ہے۔

ایک صحابیؓ سے روایت ہے:

قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ زَوْجَةِ	"میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
اَحَدِنَا عَلَیْهِ قَالَ اَنْ تُطْعِمَهَا	عرض کیا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے
اِذَا طَعِمْتَ وَتَکْسُوْهَا اِذَا	آپ نے فرمایا جب تم کھاؤ تو انھیں بھی

اَلْکَتَسَیْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِی الْبَیْتِ (مشکوٰۃ، ص ۲۸۱)

بھی کھلاؤ اور تم پہنو تو انھیں بھی پہناؤ، اور چہرے پر مت مارو، اگر اس سے علیحدگی کرنا ہی ہو تو صرف اتنی کرو کہ بستر الگ کر دو، مکان نہیں۔

اور جو اس شریفانہ سزا و تنبیہ سے بھی متاثر نہ ہو تو پھر اس کو معمولی مار مارنے کی بھی اجازت ہے، جس سے اس کے بدن پر اثر نہ پڑے، اور ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے تک نوبت نہ آئے، اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع فرما دیا گیا ہے۔

ابتدائی دو سزائیں تو شریفانہ سزائیں ہیں، اس لئے انبیاءؑ و صلحاءؒ سے قولاً بھی ان کی اجازت منقول ہے، اور اس پر عمل بھی ثابت ہے، مگر تیسری سزا یعنی مار پیٹ کی اگرچہ بدرجۂ مجبوری ایک خاص انداز میں مرد کو اجازت دی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے وَلَنْ یَضْرِبَ خِیَارُکُمْ، یعنی "اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے" چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے کہیں ایسا عمل منقول نہیں۔

ابن سعد اور بیہقی نے حضرت صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ پہلے مردوں کو مطلقاً عورتوں کو مارنے سے منع کر دیا گیا تھا، مگر پھر عورتیں شیر ہو گئیں، تو یہ اجازت مکرر دی گئی۔

آیت مذکورہ کا تعلق بھی اسی قسم کے ایک واقعہ سے ہے، اس کا شان نزول ہے کہ زید بن ابی زہیرؓ نے اپنی لڑکی حبیبہؓ کا نکاح حضرت سعد بن ربیعؓ سے کر دیا تھا، ان کے آپس میں کچھ اختلاف پیش آیا، شوہر نے ایک طمانچہ مار دیا، حبیبہؓ نے اپنے والد سے شکایت کی، والد ان کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے حکم دیدیا کہ حبیبہؓ کو حق حاصل ہے کہ جس زور سے سعد بن ربیعؓ نے ان کے طمانچہ مارا ہے وہ بھی اتنی ہی زور سے ان کے طمانچہ ماریں۔

یہ دونوں حکم نبوی سُن کر چلے کہ اس کے مطابق سعد بن ربیعؓ سے اپنا انتقام لیں، مگر اسی وقت آیت مذکورہ نازل ہوگئی جس میں آخری درجہ میں مرد کے لئے عورت کی مار پیٹ کو بھی جائز قرار دیدیا ہے اور اس پر دوسرے قصاص یا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی، آیت نازل ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلوا کر حق تعالیٰ کا حکم سُنا دیا، اور انتقام لینے کا پہلا حکم منسوخ فرما دیا۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ ان تدابیر سہ گانہ کے ذریعہ اگر وہ تابعدار ہو جائیں تو پھر تم بھی چشم پوشی سے کام لو، معمولی باتوں پر الزام کی راہ نہ تلاش کرو، اور سمجھ لو کہ

اللہ کی قدرت سب پر حاوی ہے۔

خلاصۂ مضمون آیت سے بنیادی اصول کی حیثیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلی آیات کے ارشادات کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حقوق باہم متماثل ہیں، بلکہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا اس وجہ سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ بہ نسبت مرد کے ضعیف ہیں، اپنے حقوق اپنی قوتِ بازو کے ذریعہ مرد سے حاصل نہیں کر سکتیں، لیکن اس مساوات کے یہ معنی نہیں کہ عورت و مرد میں کوئی تفاضل یا درجہ کا کوئی فرق ہی نہ ہو، بلکہ باقتضائے حکمت و انصاف دو سبب سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے:

اوّل تو جنس مرد کو اپنے علمی اور عملی کمالات کے اعتبار سے عورت کی جنس پر ایک خداداد فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، جس کا حصول جنس عورت کے لئے ممکن نہیں — افراد و احاد اور اتفاقی واقعات کا معاملہ الگ ہے۔

دوسرے یہ کہ عورتوں کی تمام ضروریات کا تکفل مرد اپنی کمائی اور اپنے مال سے کرتے ہیں — پہلا سبب وہبی غیر اختیاری اور دوسرا کسبی اور اختیاری ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں سے بعض کو حاکم بعض کو محکوم بنانے کے لئے عقل و انصاف کی رو سے دو چیزیں ضروری تھیں، ایک جنس کو حاکم بنایا جائے اس میں علم و عمل کے اعتبار سے حاکمیت کی صلاحیت، دوسرے اس کی حاکمیت پر محکوم کی رضامندی، پہلا سبب مرد کی صلاحیت حاکمیت کو واضح کر رہا ہے، اور دوسرا سبب محکوم کی رضامندی کو، کیونکہ بوقت نکاح جب عورت اپنے مہر اور نان نفقہ کے تکفل کی شرط پر نکاح کی اجازت دیتی ہے تو اس کی اس حاکمیت کو تسلیم اور منظور کرتی ہے۔

الغرض اس آیت کے پہلے جملہ میں خانگی اور عائلی نظام کا ایک بنیادی اصول بتلایا گیا ہے، کہ اکثر چیزوں میں مساوات حقوق کے باوجود مرد کو عورت پر ایک فضیلت حاکمیت کی حاصل ہے اور عورت محکوم و تابع ہے۔

اس بنیادی اصول کے ماتحت عملی دنیا میں عورتوں کے دو طبقے ہو گئے، ایک وہ جنھوں نے اس بنیادی اصول اور اپنے معاہدہ کی پابندی کی اور مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی — دوسرے وہ جو اس اصول پر پوری طرح قائم نہ رہا، پہلا طبقہ تو خانگی امن و اطمینان کا خود ہی کفیل ہے، اس کو کسی اصلاح کی حاجت نہیں۔ دوسرے طبقہ کی اصلاح کے لئے آیت کے دوسرے جملہ میں ایک ایسا مرتب نظام

بتلا یا گیا جس کے ذریعہ گھر کی اصلاح گھر کے اندر ہی ہو جائے اور میاں بیوی کا جھگڑا انہیں دونوں کے درمیان نمٹ جائے، کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہ ہو، اس میں مردوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا کہ اگر عورتوں سے نافرمانی یا اطاعت میں کچھ کمی محسوس کرو تو سب سے پہلا کام یہ کرو کہ سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اصلاح کرو، اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہو گیا، عورت ہمیشہ کے لئے گناہ سے اور مرد قلبی اذیت سے اور دونوں رنج و غم سے بچ گئے، اور اگر فہمائش سے کام نہ چلا تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کو تنبیہ کرنے اور اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لئے خود علیحدہ بستر پر سوؤ، یہ ایک معمولی سزا اور بہترین تنبیہ ہے، اس سے عورت متنبہ ہو گئی تو جھگڑا یہیں ختم ہو گیا، اور اگر وہ اس شریفانہ سزا پر بھی اپنی نافرمانی اور کج روی سے باز نہ آئی تو تیسرے درجہ میں معمولی مار مارنے کی بھی اجازت دیدی گئی جس کی حد یہ ہے کہ بدن پر اس مار کا اثر و زخم نہ ہو ــــــ مگر اس تیسرے درجہ کی سزا کے استعمال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد فرمایا کہ شریف **اور بھلے لوگ ایسا نہیں کریں گے۔**

بہرحال اس معمولی مار پیٹ سے بھی اگر معاملہ درست ہو گیا تب بھی مقصد حاصل ہو گیا، اس میں مردوں کو عورتوں کی اصلاح کے لئے جہاں یہ تین اختیارات دیئے گئے وہیں آیت کے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا یعنی اگر ان تینوں تدبیروں سے وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو اب تم بھی زیادہ بال کی کھال نہ نکالو اور الزام تراشی میں مت لگو، بلکہ کچھ چشم پوشی سے کام لو اور خوب سمجھ لو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر تمہیں کچھ بڑائی دی ہے تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی تمہارے اوپر بھی مسلط ہے، تم زیادتی **کروگے تو اس کی سزا تم بھگتوگے۔**

جھگڑا اگر طول پکڑ جائے تو دونوں طرف کی برادری کے حکم سے صلح کرائی جائے

یہ نظام تو وہ تھا کہ جس کے ذریعہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جائے، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا ہے، خواہ اس وجہ سے کہ عورت کی طبیعت میں تمرد و سرکشی ہو، یا اس بنا پر کہ مرد کا قصور اور اس کی طرف سے بے جا تشدد ہو، بہرحال اس صورت میں گھر کی بات کا باہر نکلنا تو لازمی ہے، لیکن عام عادت کے مطابق تو یہ ہوتا ہے کہ طرفین کے حامی ایک دوسرے کو بُرا کہتے ہیں اور الزام لگاتے پھرتے ہیں، جس کا نتیجہ جانبین سے اشتعال اور پھر دو شخصوں کی لڑائی خاندانی جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس دوسری آیت میں قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے

حکام وقت، فریقین کے اولیاء اور عام مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرکے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اشتعال بھی ختم ہوجائے اور الزام تراشی کے راستے بھی بند ہوجائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ نکل آئے، اور گھر کا جھگڑا اگر گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں ختم ہوجائے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے۔

وہ یہ کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لئے دو حَکَم مقرر کریں، ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے، اور ان دونوں جگہ لفظ حَکَم سے تعبیر کرکے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کردیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہوسکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور دیانتدار بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک حَکَم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا، مقرر کرکے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں ــــ اب وہاں جاکر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اختیارات کیا ہیں ــــ قرآن کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا، البتہ آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا، یعنی اگر یہ دونوں حَکَم اصلاحِ حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں امداد فرمادیں گے، اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کردیں گے۔

اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں:

اوّل تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حَکَم اگر نیک نیت ہوں اور دل سے چاہیں کہ باہم صلح ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی امداد ہوگی، کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے، اور ان کے ذریعہ دونوں میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق و محبت پیدا فرمادیں گے، اس کے نتیجہ سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جہاں باہمی مصالحت نہیں ہو پاتی تو دونوں حَکَمین میں سے کسی جانب اخلاص کے ساتھ صلح جوئی میں کمی ہوتی ہے۔

دوسری بات اس جملہ سے یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ان دونوں حَکَمین کے بھیجنے کا مقصد میاں بیوی میں صلح کرانا ہے، اس سے زیادہ کوئی کام حَکَمین کے بھیجنے کے مقصد میں شامل نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ فریقین رضامند ہوکر انہیں دونوں حَکَموں کو اپنا وکیل، مختار یا ثالث بنادیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دوگے

نہیں منظور ہوگا، اس صورت میں یہ دونوں حَکَم کلی طور پر ان کے معاملہ کے فیصلہ میں مختار ہوجائیں گے، دونوں طلاق پر متفق ہوجائیں تو طلاق ہوجائے گی، دونوں مل کر خلع وغیرہ کی کوئی صورت طے کردیں تو وہی فریقین (اور مرد کی جانب سے دیئے ہوئے اختیار کی بنا پر عورت کو طلاق دیدیں تو فریقین کو ماننا پڑے گی، سلف میں حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی یہی تحقیق ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، اس میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ ان دونوں حکموں کو زخود کوئی اختیار بجز صلح کرانے کے نہیں ہے، جب تک فریقین ان کو کلی اختیار نہ دیدیں ____ یہ واقعہ سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانیؒ اس طرح مذکور ہے:

ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حَکَم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں، جب یہ حَکَم تجویز کردیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمھاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمھیں کیا کرنا ہے؟ ___ سُن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہوجاؤ تو ایسا ہی کرلو، اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہوسکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہوجائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو، یہ سُنکر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حَکَم قانونِ الٰہی کے موافق جو فیصلہ کردیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے۔

لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حَکَم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمھیں بھی ان حَکَمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہئے جیسا عورت نے دیدیا۔

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حَکَمین کا بااختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو بااختیار بنوایا، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حَکَمین کا بااختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس

کی دلیل ہے کہ اصل سے حکمین با اختیار نہیں ہوتے، ہاں میاں بیوی ان کو مختار بنا دیں تو با اختیار ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہو جس کے ذریعہ عدالت و حکومت تک پہونچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ برادریوں کی پنچایت میں ہو سکتا ہے۔

دوسرے نزاعات میں بھی حکم کے ذریعہ مصالحت کرائی جائے

حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ باہم صلح کرانے کے لئے دو حکموں کے بھیجنے کی یہ تجویز صرف میاں بیوی کے جھگڑوں میں محدود نہیں، بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے اور لینا چاہئے، خصوصاً جب کہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز و رشتہ دار ہوں، کیونکہ عدالتی فیصلوں سے وقتی جھگڑا تو ختم ہو جاتا ہے، مگر وہ فیصلے دلوں میں کدورت و عداوت کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرمادیا تھا کہ:

رُدُّوا الْقَضَاءَ بَيْنَ ذَوِي الْأَرْحَامِ حَتّٰى يَصْطَلِحُوْا فَإِنَّ فَصْلَ الْقَضَاءِ يُوْرِثُ الضَّغَائِنَ

(معین الحکام، ص ۲۰۴)

"رشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں واپس کر دو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ و عداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔"

فقہائے حنفیہ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن شحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو ایسے پنچایتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکل جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت و حکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کر دیا کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے، کیونکہ باہمی کدورت و عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ہے، اس لئے حکام اور قضاۃ کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کر لیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔

غرض ان دو آیتوں میں انسان کی خانگی اور عائلی زندگی کا ایک ایسا جامع اور مکمل

نظام ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر اس پر پورا عمل ہو جائے تو دنیا کے اکثر جھگڑے اور جنگ و جدال مٹ جائیں، مرد اور عورتیں سب مطمئن ہو کر اپنی خانگی زندگی کو ایک جنت کی زندگی محسوس کرنے لگیں اور خانگی جھگڑوں سے جو قبائلی اور پھر جماعتی اور ملکی جھگڑے اور جنگیں کھڑی ہو جاتی ہیں ان سب سے امن ہو جائے۔

آخر میں پھر اس عجیب و غریب قرآنی نظام محکم پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے جو اس نے گھریلو جھگڑوں کے ختم کرنے کے لئے دنیا کو دیا ہے:

۱۔ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں تدریجی تدبیروں کے ساتھ چکا دیا جائے۔

۲۔ یہ صورت ممکن نہ رہے تو کنبہ برادری کے لوگ دو حکموں کے ذریعہ ان میں مصالحت کرا دیں تاکہ گھر میں نہیں تو خاندان ہی کے اندر محدود رہ کر جھگڑا ختم ہو سکے۔

۳۔ جب یہ بھی ممکن نہ رہے تو آخر میں معاملہ عدالت تک پہونچے، وہ دونوں کے حالات واقعات کی تحقیق کر کے عادلانہ فیصلہ کرے۔

آخر آیت میں اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ فرما کر دونوں حکموں کو بھی متنبہ فرما دیا کہ تم کوئی بے انصافی یا کج روی کرو گے تو تم کو بھی ایک علیم و خبیر سے سابقہ پڑتا ہے اس کو سامنے رکھو۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی

اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ

کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ

ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ

قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر

السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ

کے ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ بیشک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے

مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

والا بڑائی کرنے والا جو کہ بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا

بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ
کافروں کے لئے عذاب ذلت کا اور وہ لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
لوگوں کے دکھانے کو اور ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر

وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا (۳۸)
اور جس کا ساتھی ہو شیطان تو وہ بہت برا ساتھی ہے

ربطِ آیات سورۂ نساء کی تفسیر میں آپ دیکھتے آئے ہیں کہ اس سورت میں حقوق العباد کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، شروع سورت سے یہاں تک عام انسانی حقوق کی اہمیت کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا اہتمام اور ان میں کوتاہی پر سزا اور وعید اور اس دنیا میں جو ان کی دو صنف ضعیف یعنی بچوں اور عورتوں کے ساتھ ظلم روا رکھا گیا اور ظالمانہ رسمیں اختیار کی گئیں ان کی اصلاح کا اور پھر وراثت کے حقوق کا بیان آیا ہے، اس کے بعد والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور تعلق داروں اور پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حقوق کا کچھ تفصیلی بیان آرہا ہے، اور چونکہ ان حقوق کو صحیح سمجھ کر وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اور قیامت کے ساتھ عقیدہ درست رکھتا ہو، نیز بخل، کبر اور ریاء سے بھی بچتا ہو، اس لئے کہ یہ امور بھی ادائے حقوق میں مانع ہوتے ہیں، اس لئے ان آیت میں توحید اور ترغیب و ترہیب کے کچھ مضامین ارشاد فرمائے، اور شرک، انکارِ قیامت، عصیانِ رسول اور بخل وغیرہ اخلاقِ ذمیمہ کی مذمت بھی ذکر فرمائی:

خلاصۂ تفسیر

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو (اس میں توحید بھی آگئی) اور اس کے ساتھ کسی چیز کو خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان عبادت میں یا ان کی خاص صفات میں، اعتقاد میں) شریک مت کرو اور اپنے والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور (دوسرے) اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی، (خواہ وہ مجلس دائمی ہو جیسے سفرطویل کی رفاقت اور کسی مباح کام میں شرکت یا عارضی ہو جیسے سفر قصیر یا اتفاقی جلسہ میں شرکت) اور راہ گیر کے ساتھ بھی (خواہ وہ تمہارا خاص مہمان ہو یا نہ ہو)

اور ان (غلام لونڈیوں) کے ساتھ بھی جو (شرعاً) تمہارے (مالکانہ) قبضہ میں ہیں (غرض ان سب سے خوش معاملگی کرو جس کی تفصیل شریعت نے دوسرے موقع پر بتلادی ہے، اور جو لوگ ان حقوق کو ادا نہیں کرتے اکثر اس کے کئی سبب ہیں، یا تو ان کے مزاج میں تکبر ہے، کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اور کسی کی طرف التفات ہی نہیں کرتے، اور یا ان کی طبیعت میں بخل غالب ہے کہ کسی کو دیتے دلاتے جان نکلتی ہے، اور یا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتقاد نہیں کہ آپ کے احکام کو واجب الادا اور حقوق کے ثواب کے وعدوں کو اور اتلافِ حقوق کے عذاب کی وعیدوں کو صحیح نہیں سمجھتے، اور یہ کفر ہے، اور یا ان کی عادت نمائش اور نام و نمود کی ہے، اس لئے جہاں نمود ہو وہاں دیتے دلاتے ہیں گو حق نہ ہو، اور جہاں نمود نہ ہو وہاں ہمت نہیں ہوتی گو حق ہو، اور یا ان کو سرے سے خدا تعالیٰ ہی کے ساتھ عقیدہ نہیں، یا وہ قیامت کے قائل نہیں اور یہ بھی کفر ہے، اس لئے اسی ترتیب سے جو ان امور کا انفراداً یا اجتماعاً ارتکاب کرتے ہیں ان کا حال بھی سن لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو (دل میں) اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے) شیخی کی باتیں کرتے ہوں، جو کہ بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں (خواہ زبان سے یا اس طرح سے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے بھی تعلیم پاتے ہیں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے، (اس سے مراد یا مال و دولت ہے جب کہ بلا مصلحت حفاظت کے محض بخل کی وجہ سے چھپاوے کہ اہلِ حقوق ان سے توقع ہی نہ کریں، یا مراد علم دین ہے کہ یہود اخبار رسالت کو چھپایا کرتے تھے، پس بخل بھی عام ہو جاوے گا، پس اس میں بخلاء و منکرین رسالت دونوں آ گئے) اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے (جو نعمت مال یا نعمت بعثت رسولؐ کی حق شناسی نہ کریں) اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت کے دن) پر اعتقاد نہیں رکھتے (ان کا بھی یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت نہیں) اور (بات یہ ہے کہ) شیطان جس کا مصاحب ہو (جیسا ان مذکور لوگوں کا ہوا ہے) تو وہ اس کا برا مصاحب ہے (کہ ایسا مشورہ دیتا ہے جس میں انجام کار سخت ضرر ہو)۔

معارف ومسائل

حقوق کے بیان سے پہلے توحید کا ذکر کیوں

حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت اور توحید کا مضمون اس طرح ارشاد فرمایا گیا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا، یعنی "اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ ٹھہراؤ"۔

بیانِ حقوق سے پہلے مضمون عبادت اور توحید کو ذکر کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ کا خوف اور اس کے حقوق کا اہتمام ہو تو اس سے دنیا میں اور کسی کے حقوق کے اہتمام کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے، برادری، سوسائٹی کی شرم یا حکومت کے قانون سے بچنے کے لئے ہزاروں راہیں ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ چیز جو انسان کو انسانی حقوق کے احترام پر حاضر و غائب مجبور کرنے والی ہے وہ صرف خوفِ خدا اور تقویٰ ہے اور یہ خوف وتقویٰ صرف توحید ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے مختلف تعلقات اور رشتہ والوں کے حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید وعبادت کی یاددہانی مناسب سمجھی۔

توحید کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر

اس کے بعد تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا بیان فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنے حقوق کے متصل والدین کے حقوق کو بیان فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ حقیقت اور اصل کے اعتبار سے تو سارے احسانات وانعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، لیکن ظاہری اسباب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ احسانات انسان پر اس کے والدین کے ہیں، کیونکہ عام اسباب میں وہی اس کے وجود کا سبب ہیں، اور آفرینش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک جتنے کٹھن مراحل ہیں ان سب میں بظاہر اسباب ماں باپ ہی اس کے وجود اور پھر اس کے بقاء وارتقاء کے ضامن ہیں، اسی لئے قرآن کریم میں دوسرے مواقع میں بھی ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کے متصل بیان فرمایا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔	اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۲: ۸۳) ان دونوں آیتوں میں والدین کے معاملہ میں یہ نہیں فرمایا کہ

ان کے حقوق ادا کرو یا ان کی خدمت کرو، بلکہ لفظ احسان لایا گیا جس کے عام مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسب ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کریں، اور یہ بھی داخل ہے کہ جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق جسمانی خدمات انجام دیں، یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو میں سخت آواز سے یا بہت زور سے نہ بولیں جس سے ان کی بے ادبی ہو، کوئی ایسا کلمہ نہ کہیں جس سے ان کی دل شکنی ہو اُن کے دوستوں اور تعلق داروں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے والدین کی دل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہونچانے اور خوش رکھنے کیلئے جو صورتیں اختیار کرنی پڑیں وہ سب کریں، یہاں تک کہ اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو جب بھی اولاد کے لئے بدسلوکی کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس وصیتیں فرمائی تھیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ تمھیں قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے، دوسرے یہ کہ اپنے والدین کی نافرمانی یا دل آزاری نہ کرو اگرچہ وہ یہ حکم دیں کہ تم اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دو۔ (مسند احمد)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جس طرح والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکیدات وارد ہیں، اسی طرح اس کے بے انتہا فضائل اور درجات ثواب بھی مذکور ہیں۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا اپنے والدین کا مطیع وفرمانبردار ہو جب وہ اپنے والدین کو عزت ومحبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو ہر نظر میں اس کو حج مقبول کا ثواب ملتا ہے۔

بیہقی ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید

آیت میں والدین کے بعد ذوی القربیٰ یعنی تمام رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، قرآن کریم کی ایک جامع اور مشہور آیت میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤئِ ذِي الْقُرْبٰى یعنی اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں سب کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا" جس میں رشتہ داروں کی حسب استطاعت مالی امداد خدمت بھی داخل ہے، اور ان سے ملاقات وخبر گیری بھی۔

حضرت سلمان ابن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں فقیروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور اگر اپنے ذی رحم رشتہ دار کو دیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں، ایک صدقہ کا دوسرا صلۂ رحمی کا، یعنی رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے کا۔ (مسند احمد، نسائی، ترمذی)

آیت مذکورہ میں اول والدین کے حقوق کی تاکید فرمائی پھر عام رشتہ داروں کی۔

یتیم اور مسکین کا حق تیسرے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ، یتیموں اور مسکین کے حقوق کا مفصل بیان اگرچہ شروع سورت میں آچکا ہے مگر اس کی یاد دہانی رشتہ داروں کے ضمن میں فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ لاوارث بچوں اور بیکس لوگوں کی امداد و اعانت کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھیں جیسے اپنے رشتہ داروں کے لئے کرتے ہیں۔

پڑوسی کا حق چوتھے نمبر میں ارشاد فرمایا وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى، اور پانچویں نمبر میں وَالْجَارِ الْجُنُبِ، جار کے معنی پڑوسی کے ہیں، اس آیت میں اس کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک جار ذی القربیٰ دوسرے جار جنب، ان دو قسموں کی تفسیر وتشریح میں صحابہ کرام کے مختلف اقوال ہیں:

عام مفسرین نے فرمایا کہ جَارِ ذِي الْقُرْبٰى سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمہارے مکان کے متصل رہتا ہے اور جَارِ جُنُبٍ سے وہ پڑوسی مراد ہے جو تمہارے مکان سے کچھ فاصلہ پر رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جَارِ ذِي الْقُرْبٰى سے وہ شخص مراد ہے جو پڑوسی بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس طرح اس میں دو حق جمع ہوگئے اور جَارِ جُنُبٍ سے مراد وہ ہے جو صرف پڑوسی ہے رشتہ دار نہیں، اس لئے اس کا

درجہ پہلے سے مؤخر رکھا گیا۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جَارِ ذِی الْقُرْبٰی وہ پڑوسی ہے جو اسلامی برادری میں داخل اور مسلمان ہے، اور جَارِ جُنُب سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔

الفاظ قرآن ان سب معانی کو محتمل ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجہ میں فرق ہو جانا امر معقول ہے، اور معتبر ہے، اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی ——— اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا غیر، مسلم ہو یا غیر مسلم، بہرحال اس کا حق ہے بقدر استطاعت کے امداد و اعانت اور خبرگیری لازم ہے۔

البتہ جس کا حق علاوہ پڑوسی کے دوسرا بھی ہے وہ دوسرے پڑوسیوں سے درجہ میں مقدم ہے، ایک حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واضح فرما دیا ارشاد فرمایا کہ بعض پڑوسی وہ ہیں جن کا صرف ایک حق ہے، بعض وہ ہیں جن کے دو حق ہیں اور بعض وہ جن کے تین ہیں، ایک حق والا پڑوسی وہ غیر مسلم ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہیں، دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلمان بھی ہے، تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہے مسلمان بھی اور رشتہ دار بھی " (ابن کثیر)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبرئیل امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کی رعایت و امداد کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کر دیا جائے گا (بخاری و مسلم)

ترمذی اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی محلہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں، جب کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

ہمنشین کا حق چھٹے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ، اس کے لفظی معنی "ہم پہلو ساتھی" کے ہیں، جس میں رفیق سفر بھی داخل ہے جو ریل میں، جہاز میں، بس میں، گاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔

شریعت اسلام نے جس طرح نزدیک و دور کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق

واجب فرمائے، اسی طرح اس شخص کا بھی حق صحبت لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو جس میں مسلم و غیر مسلم اور رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب برابر ہیں، اس کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذاء نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو، کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے مُنہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ تھوکیں، اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے، اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں، دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ صاحب بالجنب میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک ہے، صنعت مزدوری میں، دفتر کی ملازمت میں، سفر میں، حضر میں۔ (روح المعانی)

راہ گیر کا حق ساتویں نمبر میں ارشاد فرمایا: وَابْنِ السَّبِيلِ، یعنی راہ گیر، اس سے مراد وہ شخص ہے جو دورانِ سفر آپ کے پاس آ جائے، یا آپ کا مہمان ہو جائے، چونکہ اس اجنبی شخص کا کوئی تعلق والا یہاں نہیں ہے، تو قرآن نے اس کے اسلامی، بلکہ انسانی تعلق کی رعایت کر کے اس کا حق بھی آپ پر لازم کر دیا، کہ بقدر وسعت و استطاعت اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

غلام باندی اور ملازموں کا حق آٹھویں نمبر میں ارشاد فرمایا: وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ، جس سے مراد مملوک، غلام اور باندیاں ہیں، ان کا بھی یہ حق لازم کر دیا گیا کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کریں، استطاعت کے موافق کھانے پلانے، پہنانے میں کوتاہی نہ کریں، اور نہ ان کی طاقت سے زیادہ کام اُن پر ڈالیں۔

اگرچہ الفاظ آیت کا صریح مدلول مملوک اور غلام اور باندیاں ہیں، لیکن اشتراکِ علّت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی بناء پر یہ احکام نوکروں اور ملازموں پر بھی حاوی ہیں کہ ان کا بھی یہی حق ہے، کہ مقررہ تنخواہ اور کھانا وغیرہ دینے میں بخل اور دیر نہ کریں، اور ان کی طاقت سے زیادہ اُن پر کام نہ ڈالیں۔

حقوق میں کوتاہی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں تکبر ہو

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا، یعنی "اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو متکبر اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے والا ہو"۔

آیت کا یہ آخری جملہ پچھلے تمام ارشادات کا تتمہ ہے، کہ پچھلے آٹھ نمبروں میں جن لوگوں کے حقوق کی تاکید آئی ہے اس میں کوتاہی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں تکبر اور فخر و غرور ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

تکبر اور جاہلی تفاخر کی وعید میں بہت سی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ وَّلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ (مشکوٰۃ ص ۴۳۳ بحوالہ مسلم)

"حضرت عبداللہ مسعودؓ سے روایت ہے وہ شخص جہنم میں (ہمیشہ کے لئے) نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو، اور جنت میں ایسا کوئی شخص نہیں جاسکے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے مقدار تکبر ہو"۔

ایک اور حدیث جس میں کبر کی تعریف بھی مذکور ہے:-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَّنَعْلُهٗ حَسَنًا، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ (مشکوٰۃ، ص ۴۳۳ بحوالہ مسلم)

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوسکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو، حاضرین میں سے ایک آدمی نے سوال کیا، لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں ان کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں اور جمال کو پسند بھی فرماتے ہیں، تکبر نام ہے حق رد کرنے کا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا"۔

اس کے بعد اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ میں بیان ہے کہ جو لوگ متکبرین ہوتے ہیں وہ حقوق واجبہ میں بھی بخل کرتے ہیں، اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے اور دوسروں کو بھی اپنے قول وعمل سے اس بری صفت کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

آیت میں بخل کا لفظ آیا ہے، جس کا اطلاق عرف عام میں حقوق مالیہ کے اندر کوتاہی کرنے پر ہوتا ہے، لیکن آیت کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بخل کا لفظ عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو بخل بالمال اور بخل بالعلم دونوں کو شامل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یہود مدینہ کے حق میں نازل ہوئی تھی، یہ لوگ بہت زیادہ مغرور تھے، انتہا درجہ کے کنجوس تھے، مال خرچ کرنے میں بھی بخل کرتے تھے، اور اس علم کو بھی چھپاتے تھے جو انھیں اپنی الہامی کتابوں سے حاصل ہوا تھا، ان کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت تھی، اور آپ کی علامات کا بھی ذکر تھا، لیکن یہود نے ان سب کا یقین کر لینے کے بعد بھی بخل سے کام لیا، نہ خود اس علم کے تقاضے پر عمل کیا، اور نہ دوسروں کو بتلایا کہ وہ عمل کرتے۔

آگے فرمایا کہ ایسے لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے مال ودولت میں بھی بخل کرتے ہیں اور علم وایمان کے معاملہ میں بھی بخیل ہیں ایسے لوگ نعمت خداوندی کے ناسپاس ہیں اور ان کے لئے اہانت آمیز عذاب تیار کر لیا گیا ہے۔

انفاق کی فضیلت اور بخل کی مذمت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مَلَكَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (بخاری ومسلم)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! بخیل کو مال ودولت کی تباہی سے ہمکنار کر۔
عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْفِقِیْ وَ	حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا تُحْصِيْ فَيُحْصِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَارْضَخِيْ مَا اسْتَطَعْتِ (بخاری)

اے اسماء! خیر کے راستہ میں خرچ کیا کر اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کرے گا، اور انفاق سے بچنے کے لئے بہت زیادہ حفاظت نہ بر تو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا شروع کر دے گا، اور کم از کم جو تجھ سے ہو سکے اس کے دینے سے دریغ نہ کر۔"

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلسَّخِیُّ قَرِيْبٌ مِّنَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ قَرِيْبٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِيْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِّنَ اللّٰهِ بَعِيْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِيْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيْبٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْجَاهِلُ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيْلٍ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سخی اللہ سے بھی قریب ہے جنت سے بھی قریب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے، اور جہنم کی آگ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے بھی دور ہے جنت سے بھی دور ہے لوگوں سے بھی دور ہے اور آگ سے قریب ہے، اور جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہو) اس کنجوس سے بہتر ہے جو عبادت گذار ہو۔"

وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ، اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ (ترمذی)

"حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو عادتیں کسی مؤمن میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد اخلاقی۔"

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ، سے متکبرین کی ایک دوسری صفت بتلا دی کہ یہ لوگ اللہ کے راستہ میں خود بھی خرچ نہیں کرتے، اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، البتہ لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ یہ لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اس لئے اللہ کی رضاء اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو شیطان کے ساتھی ہیں، لہٰذا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کے ساتھی شیطان کا ہوگا۔

۲

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوقِ واجبہ میں کوتاہی کرنا، بخل کرنا معیوب ہے اسی طرح لوگوں کو دکھانے کے لئے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے، وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوتا، اور حدیث میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِیْهِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُهٗ وَشِرْکَهٗ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ

(احمد بحوالۂ مشکوٰۃ)

"شداد بن اوس سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے نماز پڑھی دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا۔"

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ، قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ، قَالَ الرِّیَاءُ۔

"محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرکِ اصغر کا ہے، صحابہؓ نے پوچھا شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ریاء"

(احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

اور بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ قیامت کے دن جب اعمالِ صالحہ کا ثواب

تقسیم ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ریاکرنے والوں سے فرمائیں گے:
"ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم دنیا میں نیک عمل کرتے تھے اور دیکھو کیا ان کے پاس تمہارے اعمال کا ثواب اور اس کی جزاء ہے؟"

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا
اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور خرچ کرتے اللہ کے
رَزَقَهُمُ اللَّهُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿٣٩﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا
دیئے ہوئے میں سے اور اللہ کو ان کی خوب خبر ہے بیشک اللہ حق
يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ
نہیں رکھتا کسی کا ایک ذرہ برابر اور اگر نیکی ہو تو اس کو دونا کر دیتا ہے اور دیتا ہے
مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ
اپنے پاس سے بڑا ثواب پھر کیا حال ہوگا جب بلاویں گے ہم ہر امت
أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ
میں سے احوال کہنے والا اور بلاویں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا اس دن
يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ
آرزو کریں گے وہ لوگ جو کافر ہوئے تھے اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ برابر ہو جاویں
الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾
زمین کے اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات

ربط آیات ماقبل کی آیات میں انکار خدا، انکار آخرت اور بخل وغیرہ کی مذمت مذکور تھی اور ان آیات میں خدا اور آخرت پر ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب مذکور ہے، اور آخر میں مواقف حشر کا بیان کر کے ان لوگوں کو نتیجہ سے ڈرایا گیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور نہ نیک عمل کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جاوے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن

(یعنی قیامت) پر ایمان لے آتے اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (اخلاص کیساتھ)
خرچ کرتے رہا کرتے (یعنی کچھ بھی ضرر نہیں ہوتا بلکہ نفع ہی نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ ان (کے
نیک و بد) کو خوب جانتے ہیں (جیسے ایمان و انفاق پر ثواب دیں گے ویسے کفر وغیرہ پر عذاب)
بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے (کہ کسی کا ثواب مار لیں یا بے وجہ عذاب
دینے لگیں جو کہ ظاہراً ظلم ہے) اور (بلکہ وہ تو ایسے رحیم ہیں کہ) اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا
(کر کے ثواب) دیں گے (جیسا کہ دوسری آیت میں وعدہ مذکور ہے) اور (اس ثواب موعود کے
علاوہ) اپنے پاس سے (بلا معاوضۂ عمل بطور انعام اور) اجر عظیم (اور) دیں گے، سو اس وقت
بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں
پر (جن کا آپ سے سابقہ ہوا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر لاویں گے (یعنی جن لوگوں نے خدائی
احکام دنیا میں نہ مانے ہوں گے، ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام
کے اظہارات لئے جاویں گے، جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے سب ظاہر
کر دیں گے، ان شہادات کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہو کر سزا دی جاوے گی، آگے فرماتے ہیں
کہ اس وقت کیا حال ہوگا، آگے اس حال کو خود بیان فرماتے ہیں کہ) اس روز یہ حال ہوگا کہ
جن لوگوں نے (دنیا میں) کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے
کہ کاش (اس وقت) ہم زمین کے پیوند ہو جاویں (تاکہ اس ہولناک آفت سے محفوظ رہیں اور
(گواہی کے علاوہ خود وہ قرائن مجرم بھی ہوں گے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفاء جو ان سے
دنیا میں صادر ہوئی تھیں) نہ کر سکیں گے (پس دونوں طور پر فرد قرار داد جرم ان پر
لگا دی جاوے گی)

معارف ومسائل

پہلی آیت میں فرمایا وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ، یعنی ان کو کیا نقصان پہنچ جاتا اور کیا مصیبت پیش آجاتی اگر یہ لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان لاتے اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے، یہ سب آسان کام ہیں ان کے اختیار کرنے میں کچھ بھی تکلیف نہیں، پھر کیوں نافرمان بن کر آخرت کی تباہی اپنے سر لے رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اعمالِ حسنہ کا ثواب اور جزاء خیر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں فرماتے بلکہ اپنی طرف سے

اس میں اور اضافہ فرما دیتے ہیں، اور آخرت میں چند در چند ثواب بڑھا کر نوازیں گے، اور اپنی طرف سے ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک نیکی کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور اس کے علاوہ مختلف بہانوں سے اضافہ در اضافہ ہوتا رہتا ہے، بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب بیس لاکھ گنا تک زیادہ ہو جاتا ہے، اور اللہ کی ذات تو کریم ذات ہے، وہ اپنی بے پایاں رحمت سے تو بڑھا کر دیدیتے ہیں کہ حساب و شمار میں بھی نہیں آتا، وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ، اس اجر عظیم کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے جو بارگاہِ ربّ العزت سے ملتا ہے، وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

آیت میں جو لفظ ذَرَّةٍ آیا ہے اس کا ایک ترجمہ تو معروف ہی ہے، جو ما قبل میں گذر گیا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ ذرۃ لال رنگ کی سب سے چھوٹی چیونٹی کو کہا جاتا ہے، اہلِ عرب کم وزن اور حقیر ہونے میں اس کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ سے میدان آخرت کے استحضار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اور کفارِ قریش کی توبیخ بھی مقصود ہے۔

ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب میدانِ حشر میں ہر ہر امت کا نبی اپنی امت کے نیک و بد اعمال پر بطور گواہ پیش ہوگا، اور آپ بھی اپنی امت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے، اور بطور خاص ان کفار و مشرکین کے متعلق خدائی عدالت میں گواہی دیں گے کہ انھوں نے کھلے کھلے معجزات دیکھ کر بھی تکذیب کی، اور آپ کی وحدانیت و میری رسالت پر ایمان نہ لائے۔

بخاری شریف میں روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ، حضرت عبد اللہؓ نے عرض کیا آپؐ مجھ سے سننا چاہتے ہیں؟ حالانکہ قرآن آپؐ ہی پر نازل ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا ہاں پڑھو، میں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کر دی، اور جب فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ پر پہنچا تو آپؐ نے فرمایا کہ اب بس کرو، اور جب میں نے آپؐ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

علامہ قسطلانی لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا، اور اپنی امت کے کوتاہ عمل و بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا اس لئے آنسو مبارک جاری ہو گئے۔

فائدہ: بعض حضرات نے فرمایا کہ هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ زمانۂ رسالت میں موجود

کفار و منافقین کی طرف ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ قیامت تک کی پوری امت کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی امت کے اعمال آپؐ پر پیش ہوتے رہتے ہیں۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ گذشتہ امتوں کے نبیؑ اپنی اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہوں گے، اور آپؐ بھی اپنی امت کے اعمال کی گواہی دیں گے ـــــــ قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی امت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآن کریم میں اس کا، اور اس کی شہادت کا بھی ذکر ہوتا، اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔

یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا میں میدان آخرت میں کافروں کی بدحالی کا ذکر ہے، کہ یہ لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین کا پیوند بن گئے ہوتے، کاش زمین پھٹ جاتی اور ہم اس میں دھنس کر مٹی بن جاتے، اور اس وقت کی پوچھ گچھ اور عذاب و حساب سے نجات پا جاتے۔

میدان حشر میں جب کفار دیکھیں گے کہ تمام جانور ایک دوسرے کے مظالم کا بدلہ لینے دینے کے بعد مٹی بنا دیئے گئے تو ان کو حسرت ہوگی اور تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی مٹی ہو جاتے، جیسے کہ سورۂ نبأ میں فرمایا: وَیَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا۔

آخر میں فرمایا وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا، یعنی یہ کفار اپنے عقائد و اعمال سے متعلق کچھ بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے، ان کے اپنے ہاتھ پیر اقرار کریں گے، انبیاء گواہی دیں گے، اور نامۂ اعمال میں بھی سب کچھ موجود ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ کفار کچھ بھی نہ چھپا سکیں گے، اور دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے: وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ (۶: ۲۳)، کہ ہم نے شرک نہیں کیا۔ بظاہر ان دو آیتوں میں تعارض ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ: ہوگا یوں کہ جب شروع میں کفار یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے سوا جنت میں کوئی جاتا ہی نہیں تو وہ یہ طے کریں گے کہ ہمیں اپنے شرک اور اعمال بد کا انکار ہی کر دینا چاہئے، ہو سکتا ہے اس طرح ہم نجات پا جائیں، لیکن اس انکار کے بعد خود ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے، اور چھپانے کا جو مقصود انہوں نے بنایا تھا، اس میں بالکل ناکام ہو جائیں گے، اس وقت سب اقرار کرلیں گے، اس لئے فرمایا: وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا، کچھ بھی نہیں چھپا سکیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى

اے ایمان والو نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو،

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى

یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک

تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ

کہ غسل کر لو اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں یا آ یا ہے کوئی شخص

مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً

تم میں جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ ملا تم کو پانی

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ

تو ارادہ کرو زمین پاک کا پھر ملو اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو،

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

بیشک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا۔

شانِ نزول ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ شراب کی حرمت سے پہلے ایک بار حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بعض صحابہ کرامؓ کی دعوت کر رکھی تھی جس میں مے نوشی کا بھی انتظام تھا، جب یہ سب حضرات کھا پی چکے تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام بنا دیا گیا، ان سے نماز میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی تلاوت میں بوجہ نشہ کے سخت غلطی ہو گئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں تنبیہ کر دی گئی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ (یعنی ایسی حالت میں نماز مت پڑھو) کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو (اس وقت تک نماز مت پڑھو، مطلب یہ ہے کہ جب کہ نماز تو اپنے اوقات میں فرض ہے اور یہ حالت ادائے نماز کے منافی ہے، پس اوقاتِ صلوۃ میں نشہ کا استعمال مت کرو، کبھی تمہارے منہ سے نماز میں کوئی کلمہ خلاف نہ نکل جائے) اور حالتِ جنابت میں بھی (یعنی جبکہ غسل فرض

ہو، بحالت استثناء تمہارے مسافر ہونے کی حالت کے کہ اس کا حکم عنقریب آتا ہے، نماز کے پاس مت جاؤ) یہاں تک کہ غسل کر لو (یعنی غسل جنابت شرائط صحت نماز سے ہے، اور یہ حکم یعنی جنابت کے بعد بدون غسل نماز نہ پڑھنا حالت عدم عذر میں ہے، اور اگر تم (کچھ عذر رکھتے ہو مثلاً) بیمار ہو، اور پانی کا استعمال مضر ہو جیسا آگے آتا ہے) یا حالت سفر میں ہو (جو کہ مستثنیٰ ہے کہ اس کا حکم بھی آوے گا، یعنی اور پانی نہیں ملتا، جیسا آگے آتا ہے تو ان دونوں عذروں سے تیمم کی اجازت آتی ہے، اور جواز تیمم کچھ انہی مذکورہ عذروں یعنی سفر و مرض کے ساتھ خاص نہیں بلکہ خواہ تم کو خاص یہ عذر ہوں یا یہ کہ عذر خاص نہ ہوں یعنی نہ تم مریض ہو نہ مسافر بلکہ ویسے ہی کسی کا وضو یا غسل ٹوٹ جائے اس طرح سے کہ مثلاً تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو اور، پھر ان ساری صورتوں میں خواہ مرض و سفر کے عذر کی صورت ہو یا نہ مرض ہو نہ سفر ویسے وضو یا غسل کی ضرورت ہو) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ تو اس وجہ سے کہ مرض میں اس سے ضرر ہوتا ہو خواہ اس لئے کہ وہاں پانی ہی موجود نہیں خواہ سفر ہو یا نہ ہو، تو ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو (یعنی اس زمین پر دو بار ہاتھ مار کر) اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ہاتھ پھیر لیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں (اور جس کی ایسی عادت ہوتی ہے وہ آسان حکم دیا کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آسان حکم دیدیے کہ تم کو تکلیف و تنگی نہ ہو)۔

معارف و مسائل

تدریجی احکام

شراب کی حرمت کے شریعت اسلامیہ کو حق تعالیٰ نے یہ خاص امتیاز دیا ہے کہ اس کے احکام کو سہل اور آسان کر دیا ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ شراب نوشی عرب کی پرانی عادت تھی، اور پوری قوم اس عادت میں مبتلا تھی، بجز معدودے چند حضرات کے جن کی طبیعت ہی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا سلیم بنا دیا تھا کہ وہ اس خبیث چیز کے پاس کبھی نہیں گئے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ نبوت سے پہلے آپ نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ عادت کسی چیز کی بھی ہو اس کا چھوڑنا انسان پر بڑا شاق ہوتا ہے، خصوصاً شراب اور نشہ کی عادت تو انسان کی طبیعت پر ایسا قبضہ کر لیتی ہے کہ اس سے نکلنا آدمی اپنے لئے موت سمجھنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شراب نوشی اور نشہ کرنا حرام تھا، اور اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو اس سے بچانا مقصود و مطلوب تھا۔ مگر یکایک اس کو حرام کر دیا جاتا تو لوگوں پر اس حکم کی تعمیل سخت مشکل ہو جاتی، اس لئے ابتداء اس پر جزوی پابندی عائد کی گئی، اور اس کے خراب اثرات پر تنبیہ کر کے ذہنوں کو اس کے چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا، چنانچہ ابتداءً اس آیت میں صرف یہ حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، جس کا حاصل یہ تھا کہ نماز کے وقت نماز کا ادا کرنا تو فرض ہے، اوقات نماز میں شراب مستعمل نہ کی جائے، جس سے مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ ایسی خراب چیز ہے جو انسان کے لئے نماز سے مانع ہے، بہت سے حضرات نے تو اسی وقت سے اس کے چھوڑنے کا اہتمام کر لیا اور دوسرے حضرات بھی اس کی خرابی اور برائی کو سوچنے لگے، آخر کار سورۂ مائدہ کی آیت (۹۰) میں شراب کے ناپاک اور حرام ہونے کا قطعی حکم آگیا اور ہر حال میں شراب پینا حرام ہو گیا۔

مسئلہ: جس طرح نشہ کی حالت میں نماز حرام ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب نیند کا غلبہ ایسا ہو کہ آدمی اپنی زبان پر قابو نہ رکھے تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنا درست نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے،

اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ فِي الصَّلٰوةِ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبَّ نَفْسَهٗ (قرطبی)	"اگر تم میں سے کسی کو نماز میں اونگھ آنے لگے تو اسے کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے تاکہ نیند کا اثر چلا جائے ورنہ نیند کی حالت میں وہ سمجھ نہیں سکے گا اور

بجائے دعاء و استغفار کے اپنے آپ کو گالیاں دینے لگ جائے گا"

تیمم کا حکم ایک انعام ہے جو اس امت کی خصوصیت ہے: اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وضو و طہارت کے لئے ایسی چیز کو پانی کے قائم مقام کر دیا جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین اور مٹی ہر جگہ موجود ہے، حدیث میں ہے کہ یہ سہولت صرف امت محمدیہ کو عطا کی گئی ہے، تیمم کے ضروری مسائل فقہ کی کتابوں اور اردو کے رسالوں میں بکثرت چھپے ہوئے ہیں ان کو دیکھ لیا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب سے خرید کرتے ہیں

الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

گمراہی اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بہک جاؤ راہ سے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ

تمہارے دشمنوں کو اور اللہ کافی ہے حمایتی اور اللہ کافی ہے مددگار بعضے

الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ

لوگ یہودی کے پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے اور کہتے ہیں

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ

ہم نے سنا اور نہ مانا اور کہتے ہیں کہ سن نہ سنایا جائیو اور کہتے ہیں راعنا موڑ کر اپنی زبان کو

وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ

اور عیب لگانے کو دین میں اور اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن

وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ

اور ہم پر نظر کر تو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست لیکن لعنت کی ان پر اللہ نے

بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی دیکھنے کے قابل ہیں دیکھو تو تعجب کرو) جن کو کتاب (اللہ یعنی توریت کے علم) کا ایک بڑا حصہ ملا ہے (یعنی توریت کا علم رکھتے ہیں باوجود اس کے) کہ وہ لوگ گمراہی (یعنی کفر) کو اختیار کر رہے ہیں اور (خود تو گمراہ ہوئے ہی تھے مگر وہ) یوں چاہتے ہیں کہ تم (بھی) راہ (راست) سے (علیحدہ ہو کر) بے راہ ہو جاؤ (یعنی طرح طرح کی تدبیریں اس کی کرتے ہیں جیسا کہ تیسرے پارہ کے آخر اور چوتھے کے شروع میں کچھ ذکر ہو چکا ہے، اور تم کو اگر ان لوگوں کی اب تک خبر نہ ہو تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) تمہارے (ان) دشمنوں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے تم کو بتلا دیا سو تم ان سے بچتے رہو) اور (ان کی حالت مخالفت کا تصور کر کے) زیادہ فکر میں بھی نہ پڑ جانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تمہارا) کافی رفیق ہے (کہ تمہاری مصلحتوں کی رعایت رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ (تمہارا) کافی حامی ہے (کہ ان کی مضرتوں سے تمہاری حفاظت کرے گا اور) یہ لوگ (جن کا ذکر ہو چکا ہے) یہودیوں میں سے ہیں (اور ان کا گمراہی کو اختیار کرنا جو اوپر آچکا ہے یہ ہے کہ) کلام (الٰہی یعنی توریت) کو اس کے مواقع

(اور محل) سے (لفظاً یا معنًی) دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور (ایک گمراہی ان کی جس میں دھوکہ سے دوسرے سادہ ذہن شخص کو پھنسا دینا بھی ممکن ہے یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتے وقت) یہ کلمات کہتے ہیں (جو آگے مذکور ہوتے ہیں، ان کلمات کے دو دو معنی ہیں ایک اچھے دوسرے برے، وہ لوگ برا مطلب لیتے تھے اور دوسروں پر ظاہر کرتے تھے کہ ہم اچھے مطلب کہتے ہیں، اور اس سے کسی مسلمان کا دھوکہ میں آکر بعضے ایسے ہی کلمات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرنا بعید نہ تھا، چنانچہ سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۳ (آیت ۱۰۴) میں مؤمنین کو لفظ راعنا کہنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے، پس اس اعتبار سے یہود کا ان کلمات کو کہنا ایک گونہ دوسروں کو گمراہ کرنا بھی ہے، گو لفظاً نہ ہو، پس اس میں یُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا کا لفظ جو کہ اوپر آیا ہے بیان بھی ہوگیا جیسا کہ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا میں بیان تھا اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا کا اور یُحَرِّفُوْنَ میں بیان تھا یَشْتَرُوْنَ کا، ان کلمات میں سے ایک یہ ہے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا، اس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ ہم نے سن لیا اور مانا نہیں، اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کا ارشاد ہم نے سن لیا اور کسی آپ کے مخالف کا قول ہو کہ ہم کو بہکاتا تھا نہیں مانا، اور برا مطلب ظاہر ہے کہ ہم نے آپ کی بات کو سن تو لیا مگر ہم عمل نہ کریں گے) اور (دوسرا کلمہ یہ ہے) اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ (اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ تم ہماری بات سنو اور خدا کرے تم کو کوئی بات سنائی نہ جائے، اس کا اچھا مطلب تو یہ کہ تم کو کوئی مخالف اور رنج دہ بات نہ سنائی جائے بلکہ آپ کا یہ اقبال ہے کہ جو بات فرمائیں سب اس کے جواب میں موافق ہی بات آپ کو سنائیں، اور برا مطلب یہ ہے کہ تم کو کوئی موافق اور مسرت بخش بات نہ سنائی جائے بلکہ آپ جو بات کہیں اس کا جواب مخالف ہی آپ کے کان میں پڑے) اور (تیسرا کلمہ یہ ہے) رَاعِنَا (اس کے دونوں اچھے اور برے مطلب سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں کہ اچھے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری رعایت کیجئے اور برے معنی لغت یہود میں دشنام ہے، غرض ان کلمات کو اس طور پر کہتے ہیں کہ اپنی زبانوں کو (جانب توقیر سے جانب تحقیر کی طرف) پھیر کر اور (دل سے) دین میں طعنہ زنی اور تحقیر ہی کی نیت سے (وجہ یہ ہے کہ نبی کے ساتھ طعن و استہزاء بعینہ دین کے ساتھ طعن و تمسخر ہے) اور اگر یہ لوگ (بجائے دو معنی دینے والے الفاظ کے یہ کلمات کہتے (بجائے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کے، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا) اور (بجائے اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ کے صرف) اِسْمَعْ (جس کے معنی خالی یہ ہیں کہ آپ سن لیجئے) اور (بجائے رَاعِنَا کے، اُنْظُرْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمائیے، اور یہ کلمات معنی شرارت سے پاک ہیں تو اگر یہ کلمات کہتے) تو یہ بات اُن کے لئے بہتر (ہوتی) اور نافع بھی

ہوتی اور درحقیقت یہ بھی موقع کی بات تھی مگر انھوں نے تو ایسے نفع اور موقع کی بات کبھی کی ہی نہیں، بلکہ وہی بیہودہ بات بکتے رہے، سو اس سے ان کو یہ تکلیف پہنچی کہ ان کو خدا تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب جس میں یہ کلمات بھی آگئے اور بھی ان کے سب اقوال و افعال کفریہ داخل ہوگئے، پس ان سب کفریات کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور پھینک دیا اب وہ ایمان نہ لاویں گے ہاں مگر تھوڑے سے آدمی (بوجہ اس کے کہ وہ ایسی حرکتوں سے دور رہے وہ دوری رحمتِ خاصہ سے مستثنیٰ ہیں اور وہ ایمان بھی لے آئے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ)

معارف ومسائل

ربطِ آیات پچھلی آیات میں موانعِ تقویٰ کا بیان تھا جس میں زیادہ تر ذکر باہمی معاملات کا تھا، درمیان میں کچھ احکام عبادت نماز وغیرہ متعلقات کے ذکر کر دیے گئے، جو انسان میں خدا کا خوف اور فکرِ آخرت پیدا کرتے اور معاملات کی درستی کو آسان کر دیتے ہیں، مذکورہ آیات سے مخالفین کے ساتھ معاملات کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہود کی شرارت کا علاج اور مسلمانوں کو الفاظ و عنوان میں بھی ادب کی رعایت کی تلقین کی گئی ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا

اے کتاب والو ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا تصدیق کرتا ہے

لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓي

اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے پہلے اس سے کہ ہم مٹا ڈالیں بہت سے چہروں کو پھر الٹ دیں ان کو

اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَ

پیٹھ کی طرف یا لعنت کریں ان پر جیسے ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر اور

كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اللہ کا حکم تو ہو کر ہی رہتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو جو کتاب (توریت) دیے گئے ہو تم اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے، (اور تم کو اس پر ایمان لانے سے وحشت نہ ہونا چاہیے) کیونکہ

معارف و مسائل

شرک کی تعریف اور اسکی چند صورتیں

قولہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھنا یہ شرک ہے، اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں:

علم میں شریک ٹھہرانا: یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے، نجومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا یا کسی بزرگ کے کلام میں فال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہو گئی، یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اشراک فی التصرف: یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا: کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا، کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سمجھنا اور کسی مہینہ کو منحوس سمجھنا وغیرہ۔

اپنی مدح سرائی اور دعوئے پاکی کا دعویٰ جائز نہیں

قولہ تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ، یہود اپنے آپ کو مقدس بتلاتے تھے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو اپنی پاکی بیان کرتے ہیں، ان پر تعجب کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنی یا دوسروں کی پاکی بیان کرنا جائز نہیں ہے، یہ ممانعت تین وجہ سے ہے:

(۱) اپنی مدح کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، تو حقیقت میں ممانعت کبر سے ہوئی۔

(۲) یہ کہ خاتمہ کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ تقویٰ و طہارت پر ہوگا یا نہیں، اس لئے اپنے آپ کو مقدس بتلانا خلافِ خوف بھی ہے چنانچہ ایک روایت میں حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس وقت چونکہ میرا نام بَرَّہ تھا جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک میں نے وہی بتلایا، تو آپ نے فرمایا: لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ، سَمُّوْهَا زَيْنَبَ (رواہ مسلم)

نہ پاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ اس پر ان کو آخرت میں اور دنیا میں بھی سخت سزا ہوگی، چنانچہ دنیا میں بعضے قتل، بعضے قید، بعضے ذلیل رعیت ہوئے، اور آخرت میں جو ہونے والا ہے وہ ظاہر ہی ہوگا)

ربطِ آیات پیچھے آیت أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلٰلَةَ سے یہود کی قبائح اور بری خصلتوں کا ذکر چل رہا ہے، ان آیات کا تعلق بھی انہی کے ذکر قبائح سے ہے۔

معارف و مسائل

جبت اور طاغوت سے کیا مراد ہے؟ اوپر کی آیت نمبر ۵۱ میں دو لفظ "جبت" اور "طاغوت" کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، حضرت ابن عباس، ابن جبیر اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ "جبت" حبشی لغت میں ساحر کو کہتے ہیں، اور "طاغوت" سے مراد کاہن ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جبت" سے مراد سحر ہے اور "طاغوت" سے مراد شیطان ہے، مالک بن انسؒ سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طاغوت کہا جاتا ہے۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ مالک بن انسؒ کا قول زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے، ارشاد ہے: أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ، لیکن ان متعدد اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں، اس طرح کہ اصل میں جبت تو بت ہی کا نام تھا، لیکن بعد میں اس کا استعمال اللہ کے سوا دوسری عبادت کی جانے والی چیزوں پر بھی ہونے لگا (روح المعانی)۔

مذکورہ آیات کا شانِ نزول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے سردار حُیی بن اخطب اور کعب بن اشرف اپنی ایک جماعت کو جنگِ اُحد کے بعد لے کر مکہ میں قریش کے ساتھ ملنے آئے، یہود کا سردار کعب بن اشرف ابوسفیان کے پاس آیا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا، اہل مکہ نے کعب بن اشرف سے کہا تم ایک دھوکہ دینے والی قوم ہو، اگر تم واقعی اپنے قول میں سچے ہو تو ہمارے ان دو بتوں (جبت اور طاغوت) کے سامنے سجدہ کرو۔

چنانچہ اس نے قریش کو مطمئن کرنے کے لئے ایسا ہی کیا، اس کے بعد کعب نے قریش سے کہا کہ تیس آدمی تم میں سے اور تیس ہم میں سے سامنے آئیں، تاکہ رب کعبہ کے ساتھ اس چیز کا عہد

کریں کہ ہم سب مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں گے۔
کعب کی اس تجویز کو قریش نے پسند کیا، اور اس طرح سے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر دیا، اس کے بعد ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تم اہل علم ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے، لیکن ہم بالکل جاہل ہیں، اس لئے آپ ہمارے متعلق بتائیں کہ ہم حق پر چلنے والے ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کعب نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ ابوسفیان نے کہا ہم حج کے لئے اپنے اونٹوں کو ذبح کرتے ہیں اور ان کا دودھ پلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، اپنے خویش واقرباء کے تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، اور بیت اللہ کا طواف اور عمرہ کرتے ہیں، اس کے برخلاف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا ہے، وہ اپنوں سے علیحدہ ہو چکا ہے، اور اس نے ہمارے قدیم دین کے خلاف اپنا ایک نیا دین پیش کیا ہے۔
ان باتوں کو سن کر کعب بن اشرف نے کہا کہ تم لوگ حق پر ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (معاذ اللہ) گمراہ ہو چکا ہے۔
اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرما کر ان کے دجل و فریب کی مذمت کی۔ (مظہری)

نفسانی خواہشات بعض اوقات آدمی کو دین وایمان سے محروم کر دیتی ہیں

کعب بن اشرف یہودیوں کا ایک ممتاز عالم تھا جو خدا پر بھی عقیدہ رکھتا تھا، اور اسی کی عبادت کرتا تھا، لیکن جب اس کے دل و دماغ پر نفسانی خواہشات کا بھوت سوار ہوا تو اس نے مسلمانوں کے خلاف قریش سے الحاق کرنا چاہا، قریش مکہ نے اس کے ساتھ ملنے کی یہ شرط لگائی کہ وہ ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ کرے، اس نے اس کو بھی گوارا کر لیا جس کی تفصیل گزر چکی ہے، اس نے اپنے مذہب کے خلاف قریش کی شرط کو تو پورا کیا لیکن اپنے مذہبی عقائد کو قائم رکھنے کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کرنا گوارا نہ کیا، قرآن عزیز نے ایک دوسرے مقام پر اسی قسم کا واقعہ بلعم باعوراء کے بارے میں بیان کیا ہے، ارشاد ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝
مفسرین نے لکھا ہے کہ بلعم بن باعوراء ایک جلیل القدر عالم اور صاحب تصرف درویش تھا، لیکن جب اس نے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ناپاک تدبیریں کرنی شروع کیں تو ان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن خود مردود اور گمراہ ہو گیا۔
اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا محض علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا جب تک کہ صحیح معنی

ہیں، اس کا تابع نہ ہو اور محض دنیوی طمع اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے مکمل اجتناب نہ ہو، ورنہ آدمی اپنے مذہب جیسی عزیز چیز کو بھی اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں بچتا آجکل بھی بعض لوگ اس قسم کے ہیں جو مادی و سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے اپنے حق مسلک کو آسانی سے چھوڑ دیتے ہیں، اور لادینی عقائد و نظریات کو اسلام کا لباس پہنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، نہ ان کو خدا کے عہد و میثاق کی کچھ پروا ہوتی ہے، اور نہ آخرت کا خوف، یہ سب کچھ صحیح اور حق مسلک کو چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر چلنے سے ہوتا ہے۔

اللہ کی لعنت دنیا و آخرت میں رسوائی کا سبب ہے

لعنت نام ہے اللہ کی رحمت سے دوری کا، اور انتہائی رسوائی اور ذلت کا، جس پر اللہ کی لعنت ہو وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا، ان کے بارے میں اتنی سخت وعید آئی ہے کہ فرمایا: مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا "جن پر اللہ کی لعنت ہے وہ جہاں کہیں بھی ملیں ان کی گردن اڑا دی جائے" یہ تو ان کی دنیاوی رسوائی ہے، اور آخرت کی رسوائی تو اس سے بھی سخت ہوگی۔

اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، اب غور طلب یہ بات ہے کہ اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، سود کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت کی ہے، اور وہ سب گناہ میں برابر ہیں (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ (رواہ رزین بحوالہ مشکوٰۃ) "یعنی جو آدمی لوط علیہ السلام کی قوم کے جیسا عمل کرے وہ لعنتی ہے" (یعنی مرد سے بدفعلی کرنے والا) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سارق (چور) پر لعنت بھیجتا ہے، جو انڈے اور رسی جیسی حقیر چیز کی چوری تک سے گریز نہیں کرتا، جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: لَعَنَ اللّٰهُ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَمُوْكِلَهٗ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

"اللہ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر، ان عورتوں پر جو اپنے جسم کو گودنے والی (یعنی سوئی کے ذریعے جسم میں سوراخ کرکے سرمہ ڈالتی ہیں تاکہ زینت ہو) یا گدوانے والی ہیں اور ایسے ہی تصویر کھینچنے والوں پر لعنت کی ہے"

مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

شکل وصورت بناکر ہیجڑے بنیں، اور لعنت کی ان عورتوں پر جو شکل وصورت میں مردانہ پن اختیار کریں، اور ارشاد فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔"

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ

"یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے والیوں پر اور گدوانے والیوں پر اور جو ابرو یعنی بھووں کے بال چنتی ہیں (تاکہ بھویں باریک ہوجائیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو حسن کے لئے دانتوں کے درمیان کشادگی کرتی ہیں جو اللہ کی خلقت کو بدلنے والی ہیں۔"

لعنت کے احکام لعنت جس قدر بُری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں، کسی مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے، اور کافر پر بھی صرف اُس صورت میں کی جاسکتی ہے جبکہ اس کا کفر پر مرنا یقینی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس کے متعلق یہ ہیں، حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْبَذِیْ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

"حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مؤمن وہ نہیں ہے جو طعنہ باز اور لعنتی ہو، اور نہ ہی بدگو۔"

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا لَعَنَ شَيْئًا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ اِلَى السَّمَاءِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ دُوْنَهَا ثُمَّ تَهْبِطُ اِلَى الْاَرْضِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَاْخُذُ يَمِيْنًا وَشِمَالًا فَاِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ اِلَى الَّذِیْ لُعِنَ فَاِنْ

"حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جب بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، جس پر آسمان کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، پھر وہ زمین کی طرف اُترتی ہے تو زمین کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں (یعنی زمین اس لعنت کو قبول نہیں

كَانَ لِذٰلِكَ اَهْلًا وَاِلَّا رَجَعَتْ اِلٰى قَآئِلِهَا (رواہ ابوداؤد بحوالہ المشکوٰۃ)

کرتی) پھر وہ دائیں بائیں گھومتی ہے جب کہیں اس کو راستہ نہیں ملتا تو جس پر لعنت کی گئی ہے اس کے پاس پہونچتی ہے، اگر وہ واقعی لعنت کا مستحق ہے تو اس پر پڑتی ہے، ورنہ پھر اپنے کہنے والے پر پڑ جاتی ہے"

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ الرِّيْحُ رِدَاءَهٗ فَلَعَنَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنْهَا فَاِنَّهَا مَاْمُوْرَةٌ وَاِنَّهٗ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

"حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ہوا نے ایک آدمی کی چادر اڑالی تو اس نے ہوا پر لعنت کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس پر لعنت نہ کر اس لئے کہ وہ اللہ کی جانب سے مامور ہے اور یاد رکھئے کہ جو آدمی ایسی چیز پر لعنت کرے جس کی وہ مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت اس کے کہنے والے ہی پر لوٹتی ہے"

مسئلہ: کسی معین شخص کے بارے میں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی ہے اس پر لعنت جائز نہیں، اگرچہ وہ فاسق ہی ہو، اسی اصول کی بناء پر یزید پر لعنت کرنے سے علامہ شامی نے منع کیا ہے لیکن معین کافر جس کی موت کفر پر ہونے کا یقین ہو، مثلاً ابوجہل، ابولہب پر جائز ہے (شامی، ج ۲ ص ۸۳۶)

مسئلہ: کسی کا نام لئے بغیر اس طرح لعنت کرنا جائز ہے کہ ظالموں پر یا جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

مسئلہ: لغۃً لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے کے ہوتے ہیں، شرعاً کفار کے حق میں اس کے معنی اللہ کی رحمت سے بعید ہونے کے ہیں، اور مؤمنین کے حق میں ابرار (صلحاء) کے درجہ سے نیچے گرنے کے ہیں (نقلہ الشامی عن القہستانی، ج ۲ ص ۸۳۶) اس لئے کسی مسلمان کے لئے اس کے نیک عمل کم ہو جانے کی دعاء بھی جائز نہیں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ

کیا ان کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک

نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ

تل برابر، یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر جو دیا ہے ان کو اللہ نے

مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اپنے فضل سے سو ہم نے تو دی ہے ابراہیم کے خاندان کو کتاب اور علم،

وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ

اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت پھر ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی

مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

اس سے ہٹا رہا اور کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ۔

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کے پاس کوئی حصہ ہے سلطنت کا سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے یا دوسرے آدمیوں سے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں سو (آپ کو ایسی چیز مل جانا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ) ہم نے (پہلے سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان (والوں) کو کتاب (آسمانی) بھی دی ہے اور علم (کی دولت) بھی دی ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (چنانچہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء گذرے ہیں، بعض انبیاء سلطنت والے بھی ہوئے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام و حضرت داؤد علیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ سلطنت والے بھی گو نہ تھے مگر یہ سب اولاد ابراہیمؑ ہیں، سو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اولاد ابراہیمؑ سے ہیں، تو آپ کو اگر یہ نعمتیں و عطیات مل گئے تو تعجب کی کیا بات ہے، سو ان انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی جو کہ خاندان ابراہیم علیہ السلام سے گذرے ہیں جو لوگ موجود تھے) ان میں سے بعضے تو اس (کتاب و حکمت) پر ایمان لائے، اور بعضے ایسے تھے کہ اس سے روگرداں ہی رہے (پس اگر آپ کی رسالت و قرآن پر بھی آپ کے زمانہ کے بعضے لوگ ایمان نہ لائیں تو کوئی نئی بات نہیں) اور (ان کفار و معرضین کو اگر دنیا میں سزا کامل بھی نہ ہو تو کیا ہوا ان کے لئے آخرت میں) دوزخ کی آتشِ سوزاں (سزا) کافی ہے،

معارف ومسائل

یہودیوں کے حسد کرنے پر شدید مذمت

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم و فضل اور جاہ و جلال عطا کیا تھا، اس پر یہودی جلتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۵۳ و ۵۴ میں ان کے اسی حسد و بغض کی شدید مذمت کی ہے، اور ان کے حسد کو نامعقول قرار دیتے ہوئے دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک وجہ آیت نمبر ۵۳ میں بیان کی، اور دوسری آیت نمبر ۵۴ میں، لیکن دونوں کا حاصل ایک ہے، یعنی تمہارا حسد اس بات پر ہے، اگر اس پر ہے کہ اصل صاحب سلطنت تم ہو، تمہاری ہی سلطنت ان کو مل گئی، اس کا غلط ہونا تو کھلا ہوا ہے، کہ تم سلطنت سے خود محروم ہو، اور تمہیں کچھ حصہ سلطنت کا مل جاتا تو تم ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دیتے، اور اگر تمہارا حسد اس پر ہے کہ گو سلطنت ہمارے پاس سے ان کے پاس نہیں گئی پھر بھی ان کو کیوں ملی، ان کو سلطنت سے کیا علاقہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ بھی انبیاء کے خاندان سے ہیں جن میں سلطنت پہلے سے ہوتی آئی ہے، اس لئے کسی اجنبی جگہ سلطنت نہیں آئی، لہٰذا تمہارا حسد کرنا نامعقول ہے۔

حسد کی تعریف، حکم اور اس کی نامعقولیت کا بیان

علامہ نووی شارح مسلم حسد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: اَلْحَسَدُ تَمَنِّیْ زَوَالِ النِّعْمَةِ (مسلم ج ۲) یعنی دوسرے آدمی کی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا حسد کہلاتا ہے، اور یہ حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثٍ (مسلم، ج ۲)

"تم آپس میں بغض اور حسد نہ کرو اور نہ ہی ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو، بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بن جاؤ اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے"

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ (رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)

"تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے"

عَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

"حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، بحوالۂ مشکوٰۃ)

کہ تمہاری طرف بھی پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد ہے، اور بغض ایسی خصلت ہے جو مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔"

حسد خواہ دنیوی کمال پر ہو یا دینی کمال پر دونوں حرام ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول "اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ" سے امر اول کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، اور "الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" سے امر ثانی کی طرف۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا

بیشک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے آگ میں جس وقت

نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا

جل جائے گی کھال ان کی تو ہم بدل دیں گے ان کو اور کھال تاکہ چکھتے رہیں

الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَالَّذِيْنَ

عذاب بیشک اللہ ہے زبردست حکمت والا اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

ایمان لائے اور کام کئے نیک البتہ ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ

نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ ان کے لئے وہاں

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝

عورتیں ہیں ستھری اور ان کو ہم داخل کریں گے گھنی چھاؤں میں

خلاصۂ تفسیر

بلاشک جو لوگ ہماری آیات (واحکام) کے منکر ہوئے (ہم ان کو) عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے (اور وہاں ان کی برابر یہ حالت رہے گی کہ) جب ایک دفعہ ان کی کھال

(آگ سے) جل چکیں گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری (تازی) کھال پیدا کر دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب ہی بھگتتے رہیں (کیونکہ پہلی کھال میں جلنے کے بعد شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس میں درد کا احساس نہ رہے اس شبہ قطع کرنے کیلئے یہ سنا دیا) بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں کہ وہ ایسی سزا دیسکتے ہیں اور حکمت والے ہیں (سزا دینے) باوجود قدرت کے جلی ہوئی کھال کو تکلیف پہنچ سکتے ہیں پھر بھی کسی حکمت سے بدلدیا جیسے کہ ایک حکمت کا بیان بھی ہوا ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم انکو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کرینگے کہ انکے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہونگی ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہینگے انکے واسطے ان باغوں میں پاک صاف بیبیاں ہونگی اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ (کی جگہ) میں داخل کریں گے۔

معارف ومسائل

حضرت معاذؓ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ان کی کھال جل چکے گی تو اس کو تبدیل کیا جائے گا، اور یہ کام اتنی سرعت سے ہوگا **کہ ایک ساعت میں سو مرتبہ کھال تبدیل کی جائے گی۔**

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

تَأْكُلُ النَّارُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ اَلْفَ مَرَّةٍ كُلَّمَا اَكَلَتْهُمْ قِيْلَ لَهُمْ عُوْدُوْا فَيَعُوْدُوْنَ كَمَا كَانُوْا (اَخْرَجَ الْبَيْهَقِيْ عَنِ الْحَسَنِ بحوالہ مظہری ۲۷)

"آگ ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی، جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت پر لوٹ جاؤ، پس وہ لوٹ جائیں گے"۔

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا رَجُلٌ فِيْ اَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَتَانِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ بِالْقُمْقُمِ

"نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اہل جہنم میں سب سے کم عذاب کے اعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چنگاریاں ہونگی جن کی وجہ سے اس کا دماغ ہنڈیا کی طرح کھولتا ہوگا"۔

(رواہ البخاری ومسلم، بحوالۂ الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۳۹)

ازواجٌ مُطَهَّرَةٌ کی تفسیر: حاکم نے ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی عورتیں پاک ہوں گی، یعنی وہ حیض، بول وبراز اور ناک سے بہنے والی کدورت سے پاک ہوں گی۔

حضرت مجاہدؒ نے مذکورہ چیزوں پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بچے پیدا کرنے اور ناپاک نطفہ سے بھی پاک ہوں گی (مظہری)

معارف ومسائل

آیات کا شان نزول مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ کعبہ کی خدمت اسلام سے پہلے بھی بڑی عزت سمجھی جاتی تھی، اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزز وممتاز مانے جاتے تھے، اسی لئے بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، زمانۂ جاہلیت سے ایام حج میں حجاج کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ کے سپرد تھی، جس کو سقایہ کہا جاتا تھا، اسی طرح اور بعض خدمتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے چچا ابوطالب کے سپرد تھی، اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقررہ ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہؓ سے متعلق تھا۔

عثمان بن طلحہ کا اپنا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے، اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے تشریف لائے، (اس وقت تک عثمان بن طلحہؓ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے) انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر جانے سے روکا، اور انتہائی ترشی دکھائی، آپؐ نے بڑی بردباری کے ساتھ ان کے سخت کلمات کو برداشت کیا، پھر فرمایا، اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، جبکہ مجھے اختیار ہوگا کہ جس کو چاہوں سپرد کر دوں، عثمان بن طلحہؓ نے کہا کہ اگر ایسا ہوگیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہو جائیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ نہیں! اس وقت قریش آباد اور عزت والے ہو جائیں گے، آپؐ یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اس کے بعد جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے یقین سا ہوگیا کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا، میں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا ارادہ کر لیا، لیکن میں نے اپنی قوم کے تیور بدلے ہوئے پائے، وہ سب کے سب مجھے سخت ملامت کرنے لگے، اس لئے میں اپنے ارادہ کو پورا نہ کر سکا، جب کہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی، میں نے پیش کر دی۔

بعض روایات میں ہے کہ عثمان بن طلحہ کنجی لے کر بیت اللہ کے اوپر چڑھ گئے تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کے لئے زبردستی کنجی ان کے ہاتھ سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی تھی، بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز ادا کرنے کے بعد

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو پھر کنجی مجھ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ لو اب یہ کنجی ہمیشہ تمھارے ہی خاندان کے پاس قیامت تک رہے گی، جو شخص تم سے یہ کنجی لے گا وہ ظالم ہوگا، مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ کنجی لے لے، اسی کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلہ میں تمھیں جو مال مل جائے **اس کو شرعی قاعدہ کے موافق استعمال کرو۔**

عثمان بن طلحہؓ کہتے ہیں کہ جب میں کنجی لے کر خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا: کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں، اب مجھے وہ بات یاد آگئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے فرمائی تھی کہ ایک روز تم یہ کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، میں نے عرض کیا کہ بیشک آپ کا ارشاد پورا ہوا، اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا (مظہری بروایت ابن سعد)

حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا "اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی، ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اس وقت جوفِ کعبہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر کنجی ان کو سپرد کی، کیونکہ عثمان بن طلحہؓ نے جب یہ کنجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی تو یہ کہہ کر دی تھی کہ میں یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں، اگرچہ ضابطہ سے اُن کا یہ کہنا صحیح نہ تھا، بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہر طرح کا اختیار تھا کہ جو چاہیں کریں، لیکن قرآن کریم نے صورتِ امانت کی بھی رعایت فرمائی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہدایت کی کہ کنجی عثمانؓ ہی کو واپس فرما دیں، حالانکہ اس وقت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے یہ کنجی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرما دیجئے، مگر آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست رد کر کے کنجی عثمان بن طلحہؓ کو واپس فرمائی (تفسیر مظہری)

یہاں تک آیت کے شانِ نزول پر کلام تھا، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آیت کا شانِ نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ ہوا کرتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری امت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اب اس کے معنی اور مطلب ملاحظہ کیجئے:

ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، "یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہونچایا کرو"، اس حکم کا مخاطب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمان ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ خاص امراء و حکام مخاطب ہوں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو کسی امانت کا امین ہے، اس میں عوام بھی داخل ہیں اور حکام بھی۔

ادائے امانت کی تاکید حاصل اس ارشاد کا یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں کوئی امانت ہے اس پر لازم ہے کہ یہ امانت اس کے اہل و مستحق کو پہونچا دے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے امانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو:

لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ	"یعنی جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں"۔

(یہ روایت بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہے)

خیانت نفاق کی علامت ہے بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتلاتے ہوئے ایک علامت یہ بتلائی کہ جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔

امانت کی قسمیں اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ "امانات" بصیغہ جمع استعمال فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں، جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔

حکومت کے منصب اللہ کی امانتیں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل و نصب کے اختیارات ہیں، ان کے لئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے، بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لئے اپنے دائرہ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔

کسی منصب پر غیر اہل کو بٹھانے والا ملعون ہے پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے

تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کئے ہوئے دیدیا اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض قبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے (جمع الفوائد، ص ۳۲۵)

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول کی اور سب مسلمانوں کی، آج جہاں نظام حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے، کہ تعلقات اور سفارشوں اور رشوتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل اور ناقابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلق خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظام حکومت برباد ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ، "یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو" یہ حدیث صحیح بخاری کتاب العلم میں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے لفظ امٰنٰت بصیغہ جمع لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو، بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ "یعنی مجلسیں امانتداری کے ساتھ ہونی چاہئیں"

مطلب یہ ہے کہ مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے، ان کی اجازت کے بغیر اس کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر جانتے ہوئے خلاف مشورہ دیدیا تو امانت میں

خیانت کا مرتکب ہوگیا، اسی طرح کسی نے آپ سے اپنا راز کہا تو وہ اس کی امانت ہے بغیر اس کی اجازت کے کسی سے کہہ دینا خیانت ہے، آیت مذکورہ میں ان سب امانتوں کا حق ادا کرنے کی تاکید ہے۔

یہاں تک پہلی آیت کے ابتدائی جملہ کی تفسیر تھی، آگے پہلی آیت کے دوسرے جملہ کی تفسیر ہے وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ "یعنی جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو عدل و انصاف کے ساتھ کیا کرو" ظاہر یہ ہے کہ اس کا خطاب حکام و امراء کو ہے جو خصومات و مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے ہیں، اور اسی کے قرینہ سے بعض حضرات نے پہلے جملہ کا مخاطب بھی حکام و امراء کو قرار دیا ہے، اگرچہ پہلے جملہ کی طرح اس میں بھی گنجائش اس کی موجود ہے، کہ حکام و عوام دونوں اس خطاب میں شامل ہوں، کیونکہ عوام میں اکثر فریقین کسی کو ثالث بنا کر فیصلہ کر دیا کرتے ہیں، اسی طرح جھگڑوں کا فیصلہ کرنا عوام میں بھی پایا جاسکتا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اول نظر میں ان دونوں جملوں کے مخاطب حکام و امراء ہی معلوم ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مخاطبِ اول حکام و امراء ہیں، اور ثانیاً یہ خطاب ہر اس شخص کے لئے بھی ہے جس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں اور جس کو کسی مقدمہ کا ثالث بنا دیا جائے۔

اس جملہ میں حق تعالیٰ نے بین الناس فرمایا بین المسلمین یا بین المؤمنین نہیں فرمایا، اس میں اشارہ فرما دیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اور دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہم وطن، ہم رنگ، ہم زبان ہوں یا غیر، فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہو کر جو بھی حق و انصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں۔

عدل و انصاف امنِ عالم کا ضامن ہے

غرض آیت کے پہلے جملہ میں ادائے امانات کا حکم ہے، اور دوسرے میں عدل و انصاف کا، ان میں ادائے امانات کو مقدم کیا گیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پورے ملک میں عدل و انصاف کا قیام اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، کہ جن کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار ہے وہ پہلے ادائے امانات کا فریضہ صحیح طور پر ادا کریں، یعنی حکومت کے عہدوں پر صرف انہی لوگوں کو مقرر کریں جو صلاحیتِ کار اور امانت و دیانت کی رُو سے اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ بہتر نظر آئیں، دوستی اور تعلقات یا محض سفارش یا رشوت کو اس میں راہ نہ دیں، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ نا اہل نا قابل یا خائن اور ظالم لوگ عہدوں پر قابض ہو جائیں گے، پھر اگر اربابِ اقتدار دل سے بھی یہ چاہیں کہ ملک میں عدل و انصاف کا رواج ہو تو ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا، کیونکہ یہ عہدہ دارانِ حکومت ہی حکومت کے ہاتھ اور پیر ہیں، جب یہ خائن یا نا قابل ہوئے تو عدل و انصاف قائم کرنے کی کیا راہ ہے؟

اس آیت میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں حق جل شانہ نے حکومت کے عہدوں کو بھی امانت قرار دے کر اول تو یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنا چاہئے جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر مسکین پر رحم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں یا کسی رشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لئے کسی شخص کی امانت اس کو دیدینا درست نہیں، اسی طرح حکومت کے عہدے جن کے ساتھ عام خلق خدا تعالیٰ کا کام متعلق ہوتا ہے یہ بھی امانتیں ہیں، اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اپنی صلاحیت کار اور قابلیت و استعداد کے اعتبار سے بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں، اور دیانت اور امانت کے اعتبار سے بھی سب میں بہتر ہوں، ان کے سوا کسی دوسرے کو یہ عہدہ **سپرد کر دیا تو یہ امانت ادا نہ ہوئی۔**

علاقائی اور صوبائی بنیادوں پر حکومت کے منصب سپرد کرنا اصولی غلطی ہے

اس کے ساتھ قرآن حکیم کے اس جملہ نے اس عام غلطی کو بھی دور کر دیا جو اکثر ممالک کے دستوروں میں چل رہی ہے کہ حکومت کے عہدوں کو باشندگان ملک کے حقوق قرار دیدیا ہے۔

اور اس اصولی غلطی کی بناء پر یہ قانون بنانا پڑا کہ حکومت کے عہدے تناسب آبادی کے اصول پر تقسیم کئے جائیں، ہر صوبہ ملک کے لئے کوٹے مقرر ہیں، ایک صوبہ کے کوٹہ میں دوسرے صوبہ کا آدمی نہیں رکھا جا سکتا، خواہ وہ کتنا ہی قابل اور امین کیوں نہ ہو، اور اس صوبہ کا آدمی کتنا ہی غلط کار نااہل ہو، قرآن حکیم نے صاف اعلان فرما دیا کہ یہ عہدے کسی کا حق نہیں بلکہ امانتیں ہیں جو صرف اہل امانت ہی کو دی جا سکتی ہیں، خواہ وہ کسی صوبہ اور کسی خطہ کے رہنے والے ہوں، البتہ کسی خاص علاقہ اور صوبہ پر حکومت کے لئے اسی علاقہ کے آدمی کو ترجیح دی جا سکتی ہے کہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کام کی صلاحیت اور امانت **میں اس پر پورا اطمینان ہو۔**

دستورِ مملکت کے چند زریں اصول

اس طرح اس مختصر آیت میں دستور مملکت کے چند بنیادی اصول آ گئے جو **مندرجہ ذیل ہیں:-**

۱۔ اول یہ کہ آیت کے پہلے جملہ کو اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ سے شروع فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل امر اور حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، سلاطین دنیا سب اس کے مامور ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ ملک میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ حکومت کے عہدے باشندگان ملک کے حقوق نہیں جن کو تناسب آبادی کے اصول پر تقسیم کیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی امانتیں ہیں جو صرف

انکے اہل اور لائق لوگوں کو دیئے جاسکتے ہیں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ زمین پر انسان کی حکمرانی صرف ایک نائب و امین کی حیثیت سے ہوسکتی ہے وہ ملک کی قانون سازی میں ان اصول کا پابند ہے گا جو حاکم مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلا دیئے گئے ہیں۔

۴۔ چوتھے یہ کہ حکام و امراء کا فرض ہے کہ جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آئے تو نسل و وطن اور رنگ و زبان یہاں تک کہ مذہب و مسلک کا امتیاز کئے بغیر عدل و انصاف کا فیصلہ کریں۔

اس آیت میں دستورِ مملکت کے زرین اصول بتلا کر آخر میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو نصیحت کی ہے وہ بہت ہی اچھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی سنتا ہے، اور جو بولنے اور فریاد کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے حالات کو خود دیکھتا ہے، اس لئے اس کے بتلائے اور بنائے ہوئے اصول ہی ایسے ہیں جو ہمیشہ ہر ملک میں اور ہر دور میں قابل عمل ہو سکتے ہیں، انسانی دماغوں کے بنائے اصول و دستور صرف اپنے ماحول کے اندر محدود ہوا کرتے ہیں، اور تغیر حالات کے بعد ان کا بدلنا ناگزیر ہوتا ہے، جس طرح پہلی آیت کے مخاطب حکام و امراء تھے دوسری آیت میں عوام کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو! تم اللہ کی اور رسولؐ کی اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولی الامر کون لوگ ہیں؟ اولی الامر لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام و انتظام ہو، اسی لئے حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ رضی اللہ عنہم، مفسرین قرآن نے اولی الامر کے مصداق علماء و فقہاء کو قرار دیا ہے، کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، اور نظامِ دین ان کے ہاتھ میں ہے۔

اور ایک جماعت مفسرین نے جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ اولی الامر سے مراد حکام اور امراء ہیں جن کے ہاتھ میں نظامِ حکومت ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ لفظ دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء کو بھی اور حکام و امراء کو بھی، کیونکہ نظامِ امر انہی دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس آیت میں ظاہراً تین کی اطاعتوں کا حکم ہے، اللہ، رسولؐ، اولی الامر، لیکن قرآن کی دوسری آیت نے واضح فرما دیا کہ حکم و اطاعت دراصل صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، مگر اس کے حکم اور اس کی اطاعت کی عملی صورت چار حصوں میں منقسم ہے۔

حکم اور اطاعت کی تین عملی صورتیں ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل

فرما دیا، اور اس میں کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں، جیسے شرک و کفر کا انتہائی جرم ہونا، ایک اللہ وحدہٗ کی عبادت کرنا، اور آخرت و قیامت پر یقین رکھنا، اور محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری اور سچا رسول ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو فرض سمجھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو براہِ راست احکامِ ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلاواسطہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

دوسرا حصہ احکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات و تشریحات کی ضرورت ہے، ان میں قرآن کریم اکثر ایک مجمل یا مبہم حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل و تشریح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کے ذریعہ فرماتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے، اگر اس تفصیل و تشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح فرما دی جاتی ہے، اور بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکمِ الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے۔

اس قسم کے احکام کی اطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے لیکن ظاہری اعتبار سے چونکہ یہ احکام صراحۃً قرآن نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو پہنچے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت ظاہری اعتبار سے اطاعتِ رسول ہی کہلاتی ہے جو حقیقت میں اطاعت حق کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینے کے **ساتھ اطاعتِ رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔**

تیسرا درجہ احکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث میں، یا ذخیرۂ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے احکام میں علماء مجتہدین قرآن و سنت کے منصوصات اور زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور و فکر کر کے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں، ان احکام کی اطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے قرآن و سنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اطاعتِ خداوندی ہی کی ایک فرد ہیں، مگر ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ فقہی فتاویٰ **کہلاتے ہیں، اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔**

اسی تیسری قسم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں کتاب و سنت کی رو سے کوئی پابندی عائد نہیں بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں کریں، جن کو اصطلاح میں مباحات کہا جاتا ہے، ایسے احکام میں عملی انتظام حکام اور اولی الامر کے سپرد ہے، کہ وہ حالات اور مصالح کے پیش نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں، مثلاً شہر کراچی میں ڈاک خانے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں، ریلوے کا نظام کس طرح ہو، آبادکاری کا انتظام

کن قواعد پر کیا جائے، یہ سب مباحات ہیں ان کی کوئی جانب نہ واجب ہے نہ حرام بلکہ اختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دیدیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا، اس لئے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

آیت مذکورہ میں اولوالامر کی اطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے، اس لئے اس آیت کی رُو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی امور میں حکام وامراء کی اطاعت واجب ہوگئی۔

یہ اطاعت بھی درحقیقت اللہ جل شانہ کے احکام ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ احکام نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں، بلکہ ان کا بیان یا علماء کی طرف سے ہو یا حکامؒ کی طرف سے، اس لئے اس اطاعت کو تیسرا نمبر جداگانہ قرار دے کر اولوالامر کی اطاعت نام رکھ دیا گیا، اور جس طرح منصوصات قرآن میں قرآن کا اتباع اور منصوصات رسولؐ میں رسولؐ کا اتباع لازم و واجب ہے، اسی طرح غیر منصوص فقہی چیزوں میں فقہاء کا، اور انتظامی امور میں حکام وامراء کا اتباع واجب ہے، یہی مفہوم ہے اطاعت اولی الامر کا۔

خلاف شرع کاموں میں امیر کی اطاعت جائز نہیں

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس کام کو ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ کرو، اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اولی الامر کی اطاعت کی تعلیم دی، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ امیر اگر عدل پر قائم رہے تو اس کی اطاعت واجب ہے، اور اگر وہ عدل وانصاف کو چھوڑ کر خلاف شرع احکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" یعنی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس سے خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ

ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی عدل وانصاف کو قائم رکھنے کی طاقت اور صلاحیت نہ رکھتا ہو اس کو قاضی بھی نہیں بننا چاہئے، کیونکہ حکم بالعدل بھی ایک امانت ہے جس کی حفاظت کمزور اور نااہل آدمی نہیں کرسکتا، چنانچہ جب حضرت ابوذرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپؐ مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمائیں تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا	اے ابوذرؓ آپ ضعیف آدمی ہیں، اور

أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ إِلَّا مَنْ أَخَذَ بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا (رواہ مسلم بحوالہ مظہری)	منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ قیامت کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کردیا ہو (یعنی وہ ذلت سے بچ جائے گا)

عادل آدمی اللہ کا محبوب ترین بندہ ہے

ایک حدیث میں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عادل اللہ کا محبوب اور قریب ترین انسان ہے، اور ظالم اللہ کی رحمت اور نظر کرم سے دور ہوتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ سب سے پہلے اللہ کے سایہ کے نیچے کون جائے گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس بات کا زیادہ علم ہے، تو پھر آپ نے ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے جب حق آجائے تو فوراً قبول کرلیتے ہیں، اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو مال کو خرچ کرتے ہیں اور جب وہ فیصلہ کرتے ہیں تو ایسا عدل کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے لئے کرتے۔

اجتہاد اور قیاس کا ثبوت

قولہ تعالیٰ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اگر تمہارا کسی امر کے بارے میں اختلاف ہوجائے تو تم اللہ اور رسول کی جانب رجوع کرو۔

کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کتاب وسنت کے احکام منصوصہ کی جانب رجوع کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ اگر احکام منصوصہ موجود نہیں ہیں تو ان کے نظائر پر قیاس کرکے رجوع کیا جائے گا، فَرُدُّوهُ کے الفاظ عام ہیں جو دونوں صورتوں کو شامل ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ

کیا تونے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اُترا

إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا

تیری طرف اور جو اترا تجھ سے پہلے چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں

إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ

شیطان کی طرف اور حکم ہوچکا ہے ان کو کہ اس کو نہ مانیں اور چاہتا ہے شیطان

أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا

کہ ان کو بہکاکر دور جا ڈالے اور جب ان کو کہے کہ آؤ اللہ کے حکم

أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ

کی طرف جو اس نے اتارا اور رسول کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ ہٹتے ہیں تجھ سے

صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ

رک کر پھر کیا ہو جبکہ ان کو پہنچے مصیبت بدلے اپنے ہاتھوں کے

أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا

کیے ہوئے کے پھر آویں تیرے پاس قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر

إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي

بھلائی اور ملاپ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ان کے دل

قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ

میں ہے، سو تو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے حق میں

قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ

بات کام کی اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم

اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا

مانیں اللہ کے فرمانے سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی

اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾

چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو زبان سے تو دعوے کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (یعنی توریت کیونکہ اس میں منافقین کا بیان ہے، اور اکثر منافقین یہودیوں سے تھے، مطلب یہ کہ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح ہم توریت کو مانتے ہیں اسی طرح قرآن کو بھی مانتے ہیں یعنی مسلمان ہونے کے مدعی ہیں) پھر اس پر حالت یہ ہے کہ اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شرع کی طرف مقدمہ لے جانے کے لئے شیطان سکھلاتا ہے پس اس پر عمل کرنا ایسا ہے جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمہ لے گئے)

حالانکہ اس سے دو امر مانع موجود ہیں ایک یہ کہ ان کو شریعت کی جانب سے یہ حکم ہوا کہ اس شیطان
کو نہ مانیں یعنی اعتقاداً و عملاً اس کی مخالفت کریں، اور دوسرا مانع یہ کہ شیطان ان کا ایسا دشمن
اور بدخواہ ہے کہ ان کو (راہِ حق سے) بھٹکا کر بہت دور لیجانا چاہتا ہے (پس باوجود ان دونوں
امروں کے جن کا مقتضیٰ یہ ہے کہ شیطان کے کہنے پر عمل نہ کریں پھر بھی اس کی موافقت کرتے ہیں)
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور (آؤ) رسول
(صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (کہ آپ اس حکم کے موافق فیصلہ فرما دیں) تو آپ (اس وقت)
منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ (کے پاس آنے) سے پہلو تہی کرتے ہیں پھر کیسی جان کو
بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو (اس مصیبت سے)
پہلے کر چکے تھے، (مراد اس حرکت سے شرع کو چھوڑ کر دوسری جگہ مقدمہ لے جانا ہے، اور
مصیبت سے مراد جیسے قتل یا خیانت و نفاق کا کھل جانا، وغیرہ پس ہونا یعنی اس وقت دقت
پڑتی ہے کہ اس حرکت کی کیا تاویل کریں جس میں پھر سرخرو رہیں) پھر (تاویلیں سوچ کر) آپ
کے پاس آتے ہیں (اور) خدا کی قسمیں کھاتے ہوتے کہ ہم جو دوسری جگہ چلے گئے تھے، ہمارا اور کچھ مقصود
نہ تھا سوا اس کے کہ معاملے دونوں فریق کی کوئی بھلائی کی صورت نکل آئے اور (ان میں)
باہم موافقت (مصالحت) ہو جائے (مطلب یہ کہ قانون تو شرع ہی کا حق ہے ہم دوسری جگہ
شرع کو ناحق سمجھ کر نہیں گئے تھے لیکن بات یہ ہے کہ قانونی فیصلہ میں تو صاحب حق کو حاکم
رعایت کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا اور باہمی فیصلہ میں کچھ رعایت کر دی جاتی ہے، یہ وجہ
تھی دوسرے دوسری جگہ جانے کی، اور قصہ قتل میں تاویل اس مقتول کے فعل کی ہوگی کہ
مقصود اپنی براءت یا حضرت عمرؓ پر دعویٰ قتل بھی ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کی اس تاویل کی تکذیب
فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ نفاق و کفر ان کے دلوں میں ہے
(کہ اس کفر و نفاق و عدم رضا بحکم شرعی ہی کی وجہ سے یہ لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں اور وقت
معین پر اس کی سزا بھی پالیں گے) سو (مصلحت یہی ہے کہ آپ علم خداوندی و مواخذہ
خداوندی پر اکتفاء فرما کر) ان سے تغافل کر جایا کیجئے (ان پر مواخذہ نہ فرمایئے) اور (اپنے
اپنے منصب رسالت کے مقتضا سے) ان کو نصیحت فرماتے رہئے (کہ ان حرکتوں کو چھوڑ دو)
اور ان سے خاص ان کی ذات (کی اصلاح) کے متعلق کوئی مضمون کہہ دیجئے تاکہ ان پر حجت قائم
اور تمام ہو جائے پھر نہ مانیں تو وہ جانیں، اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے
مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی (جو کہ اطاعتِ رسل کے باب میں فرمایا ہے) ان کی اطاعت
کی جائے (پس اول تو ان لوگوں کو شرع ہی سے اطاعت کرنا واجب تھی) اور اگر (خیر شامت

نفس پر حماقت ہی ہوگئی تھی تو جس وقت (یہ گناہ کر کے) اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت (ندامت کے ساتھ) آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے پھر (حاضر ہو کر) اللہ تعالیٰ سے (اپنے اس گناہ کی) معافی چاہتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی) ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توبہ قبول فرما لیتے)

معارف و مسائل

ربطِ آیات پہلی آیات میں تمام معاملات میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کی طرف رجوع کرنے کا حکم تھا، اگلی ان آیات سے خلافِ شرع قوانین کی طرف رجوع کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

آیات کا شانِ نزول ان آیات کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا، یہودی نے کہا کہ چلیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان سے فیصلہ کرائیں، مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی، کعب بن اشرف یہود کا ایک سردار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپؐ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے، مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے اس میں کسی کی رُو رعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لئے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، سو یہ جانتا تھا کہ آپؐ کا فیصلہ میرے خلاف ہوگا، اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ انجام ہوا کہ دونوں اسی پر راضی ہوگئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر آپؐ ہی سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں، مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپؐ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اسی کے حق میں فیصلہ دیدیا، اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا ناکام کر دیا، اس لئے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا، اور ایک نئی راہ نکالی، کہ کسی طرح یہودی کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ ہم

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ کرانے جیں، یہودی نے اس کو قبول کر لیا، راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہرکیف یہ دونوں اب حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا، کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں، مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں، اور آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اقرار کیا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا اچھا ذرا ٹھہرو: میں آتا ہوں، گھر میں تشریف لے گئے، اور ایک تلوار لے کر آئے، اور اس منافق کا کام تمام کر دیا، اور فرمایا "جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا یہی فیصلہ ہے" (یہ واقعہ روح المعانی میں بروایت ثعلبی و ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے)۔

اور عامہ مفسرین نے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد منافق مقتول کے وارثوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف یہ دعویٰ بھی دائر کر دیا کہ انھوں نے ایک مسلمان کو بغیر دلیل شرعی کے مار ڈالا ہے، اور اس کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے اس کے کفر قولی و عملی کی تاویلیں پیش کیں، آیت متذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی اصل حقیقت اور اس شخص مقتول کا منافق ہونا ظاہر فرما کر حضرت عمرؓ کو بری کر دیا۔

اس سلسلہ میں اور بھی چند وقائع منقول ہیں جن میں کچھ لوگوں نے شرعی فیصلہ چھوڑ کر کسی کاہن یا نجومی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا، ہو سکتا ہے کہ آیتِ متذکرہ ان سب کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

اب آیت کی تفسیر دیکھئے، پہلی آیت میں ارشاد ہوا کہ اس شخص کو دیکھو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں پچھلی کتابوں تورات اور انجیل پر بھی ایمان لایا تھا اور جو کتاب (قرآن) آپ پر نازل ہوئی اس پر بھی ایمان لاتا ہوں، یعنی پہلے اہل کتاب میں داخل تھا، پھر مسلمانوں میں داخل ہو گیا، لیکن یہ مسلمانوں میں داخل ہونا محض زبانی ہے، دل میں وہی کفر بھرا ہوا ہے، جس کا ظہور جھگڑے کے وقت اس طرح ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر یہودی سردار کعب ابن اشرف کی طرف رجوع کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واضح اور حق فیصلہ دیدیا تو اس پر راضی نہ ہوا۔

لفظ طاغوت کے لغوی معنی سرکشی کرنے والے کے ہیں اور عرف میں شیطان کو طاغوت

کہا جاتا ہے، اس آیت میں کعب بن اشرف کی طرف مقدمہ لے جانے کو شیطان کی طرف لیجانا قرار دیا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ کعب بن اشرف خود یک شیطان تھا، اور یا اس وجہ سے کہ شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر خلاف شرع فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شیطان ہی کی تعلیم ہو سکتی ہے، اس کا اتباع کرنے والا گویا شیطان ہی کے پاس اپنا مقدمہ لے گیا ہے، اسی لئے آخر آیت میں ہدایت فرمادی کہ جو شخص شیطان کی پیروی کرے گا تو شیطان اس کو دور دراز کی گمراہی میں مبتلا کر دیگا۔

دوسری آیت میں بتلا دیا کہ باہمی خصومت اور جھگڑے کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شرعی فیصلہ سے اعراض کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا، ایسا کام کرنے والا منافق ہی ہو سکتا ہے، اور جب اس منافق کا کفر عملاً اس طرح کھل گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا تو فاروق اعظم کا اس کو قتل کرنا صحیح ہو گیا، کیونکہ اب وہ منافق نہ رہا بلکہ کھلا کافر ہو گیا، اس لئے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے، اور اس کے رسولؐ کی طرف، تو یہ منافقین آپؐ کی طرف آنے سے رُک جاتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان تاویلات باطلہ کا غلط ہونا واضح کیا ہے جو شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر غیر شرعی فیصلہ کی طرف رجوع ہونے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناحق سمجھ کر نہیں چھوڑا، اور دوسروں کے فیصلوں کو اس کے بالمقابل حق سمجھ کر اختیار نہیں کیا، بلکہ بعض مصالح کی بنا پر ایسا کیا، مثلاً یہ مصلحت تھی کہ آپؐ کے پاس تو قانونی فیصلہ ہوتا، جس میں باہمی مصالحت اور رو رعایت کا کوئی سوال نہیں تھا، ہم مقدمہ کو دوسری جگہ اس لئے لے گئے کہ ان دونوں فریق کے لیے کوئی بھلائی کی صورت نکل آئے، اور دونوں میں مصالحت کرادی جائے۔

یہ تاویلیں ان لوگوں نے اس وقت پیش کیں جب کہ ان کا راز کھل گیا، اور خباثت اور نفاق ظاہر ہو گیا ان کا آدمی حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا، غرض جب ان کے اعمالِ بد کے نتیجہ میں ان پر رسوائی یا قتل کی مصیبت پڑ گئی، تو قسمیں کھا کر تاویلیں کرنے لگے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرمادیا کہ یہ اپنی قسموں اور تاویلوں میں جھوٹے ہیں، انھوں نے جو کچھ کیا اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے کیا ہے، ارشاد فرمایا کہ جب ان پر اپنے اعمالِ بد کے نتیجہ میں کوئی مصیبت پڑ جاتی ہے، مثلاً خیانت و نفاق ظاہر ہو کر رسوائی ہو گئی، یا اس کے نتیجہ میں قتل کا واقعہ پیش آیا، تو اس وقت یہ لوگ آپؐ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کے پاس مقدمہ لے جانے کا سبب کفر یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ

کو ناحق سمجھنا نہیں تھا، بلکہ ہمارا مقصد حسن و توفیق تھا، یعنی فریقین کے لئے کوئی بھلائی اور مصالحت کی راہ تلاش کرنا مقصود تھا۔

چوتھی آیت میں اس کا جواب آیا کہ ان کے دلوں میں جو کفر و نفاق ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف اور باخبر ہیں، ان کی تاویلیں غلط اور قسمیں جھوٹی ہیں، اس لئے آپ ان کے عذر کو قبول نہ فرمائیں، اور حضرت عمرؓ کے خلاف دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ رد فرما دیں، کیونکہ اس منافق کا کفر واضح ہو چکا تھا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان منافقین کو بھی آپ خیر خواہانہ نصیحت فرمائیں جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، یعنی آخرت کا خوف دلا کر ان کو مخلصانہ اسلام کی طرف دعوت دیں یا دنیوی سزا کا ذکر کر دیں کہ اگر تم نفاق سے باز نہ آئے تو کسی وقت نفاق کھل جائے گا، تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا جو بشر منافق کا ہوا۔

پانچویں آیت میں اول تو ایک عام ضابطہ بتلایا کہ ہم نے جو رسول بھیجا وہ اسی لئے بھیجا کہ سب لوگ فرمانِ خداوندی کے موافق اس کے احکام کی اطاعت کریں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص رسولؐ کے احکام کی مخالفت کرے اس کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کیا جائے گا اس لئے حضرت عمرؓ نے جو عمل کیا وہ صحیح ہوا، اس کے بعد ان کو خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا ہے کہ یہ لوگ تاویلات باطلہ اور جھوٹی قسموں کی بجائے اپنے قصور کا اعتراف کر لیتے اور آپ کے پاس حاضر ہو کر خود بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی مغفرت کی دعا کرتے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی توبہ قبول فرما لیتے۔

اس جگہ قبول توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعاء مغفرت کرنے کی شرط غالباً اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت پر حملہ کیا، اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کر کے آپ کو ایذا پہونچائی، اس لئے ان کے جرم کی توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کو شرط کر دیا گیا۔

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا، کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لئے دعاء مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی اسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا، اور قبر شریف کے پاس آ کر گر گیا، اور زار زار روتے ہوئے آیتِ مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسولؐ اس کے لئے دعائے مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اس لئے میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپؐ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں، اس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے آواز آئی قَدْ غُفِرَ لَکَ، یعنی مغفرت کر دی گئی (بحر محیط)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں

لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

خلاصۂ تفسیر

پھر قسم ہے آپؐ کے رب کی یہ لوگ (جو صرف زبانی ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں عند اللہ) ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپؐ سے (اور آپؐ نہ ہوں تو آپؐ کی شریعت سے) فیصلہ کرا دیں پھر (جب آپؐ تصفیہ کر دیں تو) اس آپؐ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں (انکار کی) تنگی نہ پاویں اور (اس فیصلہ کو) پورا پورا (ظاہر سے باطن سے) تسلیم کر لیں۔

معارف و مسائل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا کفر ہے

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپؐ کی اطاعت جو بے شمار آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہے اس کی واضح تشریح بیان فرمائی ہے، اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دل میں بھی اس فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائی جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رسول خود امت کے حاکم اور ہر پیش آنے والے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے ذمہ دار ہیں، آپ کی حکومت اور آپ کا فیصلہ کسی کے حکم بنانے پر موقوف نہیں، پھر اس آیت میں مسلمانوں کو حکم بنانے کی تلقین اس لئے فرمائی گئی ہے کہ حکومت کے مقرر کردہ حاکم اور اس کے فیصلہ پر تو بہت سے لوگوں کو اطمینان نہیں ہوا کرتا، جیسا اپنے مقرر کردہ ثالث یا حکم پر ہوتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف حاکم نہیں، بلکہ رسولِ معصوم بھی ہیں، رحمۃ للعالمین بھی ہیں، اُمت کے شفیق و مہربان باپ بھی ہیں، اس لئے تعلیم یہ دی گئی کہ جب بھی کسی معاملہ میں یا کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو فریقین کا فرض ہے، کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ کرائیں اور پھر آپ کے فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کر کے عمل کریں۔

اختلافات میں آپ کو حکم بنانا آپ کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ارشادِ قرآنی پر عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کے بعد آپ کی شریعت مطہرہ کا فیصلہ خود آپ ہی کا فیصلہ ہے، اس لئے یہ حکم قیامت تک اس طرح جاری ہے کہ آپ کے زمانہ مبارک میں خود بلا واسطہ آپ سے رجوع کیا جائے، اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رجوع کیا جائے جو درحقیقت آپ ہی کی طرف رجوع ہے۔

چند اہم مسائل

اوّل یہ کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنے ہر جھگڑے اور ہر مقدمہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر مطمئن نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس شخص کو قتل کر ڈالا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور پھر معاملہ کو حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا، اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حضرت عمرؓ پر دعویٰ کر دیا کہ انھوں نے ایک مسلمان کو بلا وجہ قتل کر دیا، جب یہ استغاثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوا تو بیساختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا: "مَا كُنْتُ اَظُنُّ اَنَّ عُمَرَ يَجْتَرِءُ عَلٰى قَتْلِ رَجُلٍ مُؤْمِنٍ" (یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ عمر کسی مردِ مومن کے قتل کی جرأت کریں گے) اس سے ثابت ہوا کہ حاکمِ اعلیٰ کے پاس اگر کسی ماتحت حاکم کے فیصلہ کی اپیل کی جائے تو اس کو اپنے حاکمِ ماتحت کی جانب داری کے بجائے انصاف کا فیصلہ کرنا چاہئے، جیسا اس واقعہ میں آیت نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اظہارِ ناراضی فرمایا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حقیقت کھل گئی کہ اس آیت کی رو سے وہ شخص مومن ہی نہیں تھا۔

دوسرا مسئلہ اس آیت سے یہ نکلا کہ لفظ فِيمَا شَجَرَ صرف معاملات اور حقوق کے ساتھ متعلق نہیں، عقائد اور نظریات، اور دوسرے نظری مسائل کو بھی حاوی ہے۔ (بحر محیط)
اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب بھی کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو باہم جھگڑتے رہنے کے بجائے دونوں فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آپؐ کے بعد آپؐ کی شریعت کی طرف رجوع کر کے مسئلہ کا حل تلاش کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہو، اس کے کرنے سے دل میں تنگی محسوس کرنا بھی ضعفِ ایمان کی علامت ہے، مثلاً جہاں شریعت نے تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی وہاں تیمم کرنے پر جس شخص کا دل راضی نہ ہو، اس کو تقویٰ نہ سمجھے بلکہ اپنے دل کا روگ سمجھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی متقی نہیں ہو سکتا، جس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی اور خود بیٹھ کر ادا فرمائی، اگر کسی شخص کا دل اس پر راضی نہ ہو اور ناقابل برداشت محنت و مشقت اٹھا کر کھڑے ہی ہو کر نماز ادا کرے، تو وہ سمجھ لے کہ اس کے دل میں روگ ہے ہاں معمولی ضرورت یا تکلیف کے وقت اگر رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کے مطابق درست ہے، مگر مطلقاً شرعی رخصتوں سے تنگدلی محسوس کرنا کوئی تقویٰ نہیں اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهٗ كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى عَزَائِمُهٗ۔	"یعنی اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمتوں پر عمل کرنے سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح رخصتوں پر عمل کرنے کو بھی پسند فرماتے ہیں۔"

عام عبادات و اذکار، اوراد، درود و تسبیح میں سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا معمول رہا، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا جس پر عمل رہا، مسلمانوں کا فرض ہے کہ حدیث کی مستند روایات سے اس کو معلوم کر کے اسی کو اپنا لائحہ عمل بنائیں۔

ایک اہم فائدہ گذشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے صرف مصلح اور اخلاقی رہبر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عادل حاکم بھی تھے، پھر حاکم بھی اس شان کے کہ آپؐ کے فیصلہ کو ایمان و کفر کا معیار قرار دیا گیا، جیسا کہ بشر منافق کے واقعہ سے ظاہر ہے، اس چیز کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں متعدد مقامات پر اپنی اطاعت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ

کی اطاعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی تم اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔"

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا، مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، یعنی جو رسول کی اطاعت کرے اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔"

ان آیات میں غور کرنے سے آپ کی شانِ حاکمیت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے جس کی عملی صورت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس اپنا قانون بھیجا، تاکہ آپ مقدمات کے فیصلے اس کے مطابق کر سکیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ، یعنی ہم نے آپ پر کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان میں اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھلائے اور سمجھائے۔"

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ

اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان یا چھوڑ نکلو اپنے

دِیَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا

گھر تو ایسا نہ کرتے مگر تھوڑے ان میں سے اور اگر یہ لوگ کریں وہ جو

مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا

ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ ان کے حق میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت رکھنے والا ہو دین میں اور اس

لَّاٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَیْنٰهُمْ

وقت البتہ دیں ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب اور چلاویں ان کو

صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۶۸﴾

سیدھی راہ

خلاصۂ تفسیر

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات (بطور احکام مقصودہ کے) فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے (جو مومن کامل ہوتے) اس حکم کو کوئی بھی نہ بجا لاتا (اس سے ثابت ہوا کہ کامل اطاعت کرنے والے کم ہوتے ہیں)

اور اگر یہ (منافق) لوگ جو کچھ ان کو اطاعتِ رسولؐ بجان و دل کی) نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے (دنیا میں تو بوجہ استحقاقِ ثواب کے) بہتر ہوتا اور (نیز باعتبار تکمیل دین کے ان کے) ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا (کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوا کہ دین کا کام کرنے سے خود باطنی کیفیت اعتقاد و یقین کو ترقی ہوتی ہے) اور اس حالت میں (جب کہ عمل سے خیریت اور تثبیتِ دین حاصل ہوجاتی تو آخرت میں) ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اجرِ عظیم عنایت فرماتے، اور ہم ان کو (جنت کا) سیدھا راستہ بتلا دیتے (کہ بے روک ٹوک جنت میں داخل ہوں جو کہ اجرِ عظیم ملنے کا مقام ہے)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول جس واقعہ کی بناء پر یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئیں، وہ بشر منافق کا معاملہ تھا جس نے اپنے جھگڑے کے فیصلہ کے لئے پہلے کعب بن اشرف یہودی کو تجویز کیا، پھر مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، اور آپ کا فیصلہ چونکہ اس کے خلاف تھا اس پر راضی نہ ہوا، دوبارہ فیصلہ کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا، اس واقعہ کی جب مدینہ میں شہرت ہوئی تو یہود نے مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم کیسے لوگ ہو کہ جس کو رسول مانتے ہو اور اس کے اتباع کے دعوے دار ہو، مگر اس کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے، دیکھو یہودیوں کو ان کے گناہ کی توبہ کے سلسلہ میں یہ حکم ملا تھا کہ تم اس میں ایک دوسرے کو قتل کرو ہم نے تو اس شدید حکم کی تعمیل بھی کی، یہاں تک کہ ہمارے ستر ہزار آدمی مارے گئے، اگر تمہیں کوئی ایسا حکم دیدیا جاتا تو تم کیا کرتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ، یعنی ان منافقین کا یا عام لوگوں کا جن میں کا فر و مومن سب داخل ہیں یہی حال ہے کہ اگر ان کو بنی اسرائیل کی طرح کوئی سخت حکم خودکشی یا ترکِ وطن کا دیدیا جاتا تو ان میں سے بہت کم آدمی اس حکم کی تعمیل کرتے۔

اس میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ ہے جو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ رسول اللہؐ یا شریعتِ رسولؐ کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف لے جاتے ہیں، اور یہودی کے طعن کا جواب بھی ہے کہ یہ حال منافقین کا ہے سچے مسلمانوں کا نہیں، اور شاہد اس کا یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک صاحبؓ نے کہا کہ اللہ نے ہمیں اس آزمائش میں نہیں ڈالا، صحابیؓ کا یہ کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچا تو آپؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے زیادہ جما ہوا ہے، ابن وہبؒ کا

بیان ہے کہ یہ کلمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر یہ حکم نازل ہوتا تو خدا کی قسم میں سب سے پہلے اپنے آپ اور اپنے اہل بیت کو اس پر قربان کر دیتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ حکم خودکشی یا ترک وطن کا اللہ کی طرف سے آجاتا تو ابن ام عبد یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر عمل کرتے، اور رہا دوسرا معاملہ ترک وطن کا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر تو عمل کر کے دکھلا دیا، کہ اپنے وطن مکہ اور اپنی تمام جائدادوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت اختیار کر لی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ یہ کام اگرچہ مشکل ہے، لیکن اگر وہ ہمارے فرمان کے مطابق اس کو مان لیں تو یہ کام کرنا ان کے لئے بہتر ہوگا اور یہ عمل ان کے ایمان کو اور مضبوط کر دیگا اور ہم اس پر ان کو ثواب عظیم عطا کریں گے، اور ان کو سیدھی راہ پر چلائیں گے۔

اس کے بعد آخری آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والوں کے درجات عظیمہ کا بیان ہے جس میں ان کو یہ بشارت دیدی گئی ہے کہ یہ لوگ جنت میں انبیاء اور صدیقین اور شہداء وصلحاء کے ساتھ ہوں گے۔

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے اور اس کی تفصیل، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے چار درجات جن کا اس آیت میں ذکر ہے ان کی تشریح اور جنت میں ان کے ساتھ ہونے کی تفسیر ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ

اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر

اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَ

اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور

الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝۶۹ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ

نیک بخت ہیں اور خوب ہے ان کی رفاقت یہ فضل ہے اللہ کی طرف

اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِــيْمًا ۝۷۰

سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص (ضروری احکام میں بھی) اللہ و رسول کا کہنا مان لے گا (گو بکثرت طاعات سے کمالِ خاص نہ کر سکے) تو ایسے اشخاص بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) انعام (دین و قرب و قبول کا) فرمایا ہے، یعنی انبیاء (علیہم السلام) اور صدیقین (جو کہ انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبہ کے ہوتے ہیں، جن میں کمال باطنی بھی ہوتا ہے جن کو عرف میں اولیاء کہا جاتا ہے) اور شہداء (جنھوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی) اور صلحاء (جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی جن کو نیک بخت دیندار کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جن کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور مطیع کی ان کے ساتھ رفاقت ثابت ہے، پس حاصل یہ ہو کہ اطاعت کا یہ ثمرہ ہوا کہ اس کو ایسے رفیق ملے) یہ (معیت اور رفاقت ان حضرات کے ساتھ محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے (یعنی عمل کا صلہ نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ جو درجہ اُس عمل کا مقتضا تھا اس سے آگے نہ جا سکتا، پس یہ بطور انعام کے ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک عمل کو اور اس کے مقتضا کو اور اس مقتضا سے زائد مناسب انعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس انعام میں بھی تفاوت ہوگا، کسی کو ان حضرات سے بار بار قرب ہوگا، کسی کو گاہ بگاہ وعلیٰ ہذا واللہ اعلم)

ربطِ آیات اوپر اللہ و رسول کی طاعت پر خاص مخاطبین سے اجرِ عظیم کا وعدہ تھا، اب ان آیات میں بطور قاعدہ کلیہ کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر عام وعدہ کا ذکر ہے۔

معارف و مسائل

جنت کے درجات اعمال کے اعتبار سے ہوں گے جو لوگ ان تمام چیزوں پر عمل کریں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، ان تمام چیزوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے تو عمل کے اعتبار سے ان کے مختلف درجات ہوں گے، اول درجہ کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت کے مقامات عالیہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، اور دوسرے درجہ کے لوگوں کو اُن لوگوں کے ساتھ جگہ عطا فرمائیں گے جو انبیاء کے بعد ہیں،

جن کو صدیقین کہا جاتا ہے، یعنی وہ جلیل القدر صحابہ جنہوں نے بغیر کسی جھجک اور مخالفت کے اول ہی ایمان قبول کر لیا، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی، پھر تیسرے درجہ کے حضرات شہداء کے ساتھ ہوں گے، شہداء وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال قربان کر دیا، پھر چوتھے درجہ کے حضرات صلحاء کے ساتھ ہوں گے، اور صلحاء وہ لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں اعمالِ صالحہ کے پابند ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور مقبول ہیں جن کے چار درجے بتلائے گئے ہیں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

شانِ نزول یہ آیت ایک خاص واقعہ کی بنا پر نازل ہوئی ہے جس کو امام تفسیر حافظ ابن کثیر نے متعدد اسانید سے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے دل میں آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اپنی بیوی سے بھی، اپنی اولاد سے بھی، بعض اوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی زیارت کر لوں تب سکون ہوتا ہے، اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دنیا سے آپ کی وفات ہو جائے اور مجھے بھی موت آ جائے گی تو میں جانتا ہوں کہ آپ جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ درجاتِ عالیہ میں ہوں گے، اور مجھے اول تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں، اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ سے بہت نیچے ہوگا، میں وہاں آپ کی زیارت نہ کر سکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہو گئی، وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بشارت سنادی کہ اطاعت گذاروں کو جنت میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا، یعنی درجاتِ جنت میں تفاضل اور اعلیٰ ادنیٰ ہونے کے باوجود باہم ملاقات و مجالست کے مواقع ملیں گے۔

جنت میں ملاقات کی چند صورتیں جس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے جیسا کہ موطا امام مالک میں بروایت ابو سعید خدری منقول ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت اپنی کھڑکیوں میں سے نیچے سے اوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں گے جیسے دنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو۔

اور یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کے لئے آیا کریں گے، جیساکہ ابن جریرؒ نے بروایت ربیعؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اونچے درجات والے نیچے درجات کی طرف اُتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور مجالست ہوا کرے گی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کے لئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اجازت ہو، اس آیت کی بناء پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن اسلمیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گذارتے تھے، ایک رات تہجد کے وقت کعب اسلمیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لاکر رکھیں، تو آپ نے خوش ہوکر فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو، کعب اسلمیؓ نے عرض کیا، میں جنت میں آپ کی صحبت چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا اور کچھ؟ تو انھوں نے عرض کیا اور کچھ نہیں، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو "أَعِنِّي عَلَىٰ نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ" یعنی تمھارا مقصد حاصل ہو جائے گا لیکن اس میں تم بھی میری مدد اس طرح کرو کہ کثرت سے سجدے کیا کرو، یعنی نوافل کی کثرت کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اور میں پانچ وقت کی نماز کا بھی پابند ہوں، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں، یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرجائے وہ انبیاءؑ، صدیقین، اور شہداء کے ساتھ ہوگا، بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَاءِ	"یعنی وہ بیوپاری جو سچا اور امانتدار ہو وہ انبیاءؑ اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا"

قرب کی شرط محبت ہے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور رفاقت آپ کے ساتھ محبت کرنے سے حاصل ہوگی، چنانچہ صحیح بخاری میں طرق متواترہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں پہنچا، آپ نے فرمایا: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ "یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے"

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو دنیا میں کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس حدیث سے، کیونکہ اس حدیث نے ان کو یہ بشارت دیدی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے والے محشر اور جنت میں بھی حضورؐ کے ساتھ ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کسی رنگ و نسل پر موقوف نہیں۔

طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حبشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہم سے حسن صورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوت و رسالت میں بھی، اب اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ ایمان رکھتے ہیں، اور وہی عمل کروں جو آپ کرتے ہیں، تو کیا میں بھی جنت میں آپ کے ساتھ ہو سکتا ہوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ضرور (تم اپنی حبشیانہ بدصورتی سے نہ گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جنت میں کالے رنگ کے حبشی سفید اور حسین ہو جائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چمکیں گے، اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس کی فلاح و نجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتی ہے، اور جو شخص سبحان اللہ وبحمدہ پڑھتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

یہ سنکر مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حسنات کی اتنی سخاوت ہے تو ہم پھر کیسے ہلاک ہو سکتے یا عذاب میں کیسے گرفتار ہو سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا (یہ بات نہیں) حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں بعض آدمی اتنا عمل اور حسنات لے کر آئیں گے کہ اگر ان کو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ بھی ان کے بوجھ کا تحمل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلہ میں جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں، اور ان سے موازنہ کیا جاتا ہے تو انسان کا عمل ان کے مقابلہ میں ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ

ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازیں۔

اس حبشی کے سوال و جواب ہی پر سورۂ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی، هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ حبشی نے حیرت سے سوال کیا یا رسول اللہ میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جن کو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟

آپ نے فرمایا: ہاں ضرور، یہ سن کر حبشی نومسلم نے رونا شروع کیا، یہاں تک کہ روتے روتے وہیں جان دیدی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

درجات کی تفصیل

آیت کی تفسیر مع شان نزول اور متعلقہ تشریحات کے بیان ہو چکی، اب ایک بات قابل غور باقی رہ گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا جن لوگوں پر انعام ہے ان کے چار درجے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ درجے کس اعتبار سے ہیں، اور ان چار درجوں میں باہمی نسبت اور فرق کیا ہے، اور کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص میں جمع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات مفسرین نے اس بارے میں مختلف اقوال اور وجوہ تفصیل لکھی ہے، بعض نے فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتے ہیں اور یہ سب صفات متداخلہ کی طرح ہیں کیونکہ قرآن کریم میں جن کو نبی فرمایا گیا ہے اس کو صدیق وغیرہ کے القاب بھی دیئے گئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے، اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا، اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ آیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ چار صفات اور درجات الگ الگ ہیں، لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ اور متکلم مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو مفسر بھی ہوں محدث بھی، فقیہ بھی اور مورخ و متکلم بھی، یا جس طرح ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ مختلف صفات ہیں، مگر یہ سب کسی ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں۔

البتہ عرف عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہو جاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے عامۂ مفسرین نے فرمایا کہ "صدیقین" سے مراد اجلہ صحابہ اور "شہداء" سے شہداء احد اور "صالحین" سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔

اور امام راغب اصفہانی نے ان چاروں درجات کو مختلف درجات قرار دیا ہے، تفسیر بحر محیط روح المعانی، اور مظہری میں بھی یہی مذکور ہے، یعنی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ وادنیٰ مقرر فرماتے ہیں، اور عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کے درجے سے پیچھے نہ رہیں، عمل اور علمی جد وجہد کے ذریعہ ان درجات تک پہونچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوت ایک ایسا مقام ہے جو جد وجہد سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن نبیوں کی معیت پھر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ امام راغب نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جنکو قوتِ الٰہیہ کی امداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا " اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى "

صدیقین کی تعریف دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دور سے دیکھ رہا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کر سکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائق ایمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے۔ اس دیکھنے سے حضرت علیؓ کی مراد اسی قسم کی رؤیت ہے کہ ان کی معرفت علمی مثل دیکھنے کے ہے۔

شہداء کی تعریف تیسرا درجہ شہداء کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے رب کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔

اور حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ میں بھی اسی قسم کی رؤیت مراد ہوسکتی ہے۔

صالحین کی تعریف چوتھا درجہ صالحین کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید و اتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دور سے دیکھے، اور حدیث میں فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ وارد ہوا ہے اس میں بھی رؤیت کا یہی درجہ مراد ہوسکتا ہے امام راغب اصفہانی کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ درجات معرفت رب کے درجات ہیں، اور معرفت کے مختلف درجات کی بناء پر مختلف مدارج ہیں ــــــــ بہر حال آیت کا مضمون صاف ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے درجات عالیہ کے رہنے والوں کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ یہ محبت ہم سب کو نصیب کرے، آمین۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ
اے ایمان والو لے لو اپنے ہتھیار پھر نکلو جدی جدی فوج ہو کر یا

انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ
سب اکٹھے اور تم میں بعض ایسا ہے کہ البتہ دیر لگا دے گا پھر اگر

اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ
تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو کہے اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں نہ ہوا

مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ
ان کے ساتھ اور اگر تم کو پہنچے فضل اللہ کی طرف سے

لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ
تو اس طرح کہنے لگے گا کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی اے کاش کہ

كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ
میں ہوتا ان کے ساتھ تو پاتا بڑی مراد سو چاہئے کہ لڑیں اللہ کی راہ

اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ
میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے اور جو کوئی

يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ
لڑے اللہ کی راہ میں پھر مارا جاوے یا غالب ہووے تو ہم دیویں گے اس کو

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾
بڑا ثواب

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (کافروں کے مقابلہ میں) اپنی تو احتیاط رکھو (یعنی ان کے داؤ گھات سے بھی ہوشیار رہو اور مقاتلہ کے وقت سامان ہتھیار، ڈھال اور تلوار سے بھی درست رہو) پھر (ان سے مقاتلہ کے لئے) متفرق طور پر یا مجتمع طور پر (جیسا موقع ہو) نکلو اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعضے منافقین بھی شامل ہو رہے ہیں) بعضا بعضا شخص ایسا ہے (مراد

اس سے منافق ہے جو (جہاد سے) سست ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا جیسے شکست وغیرہ، تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہو کر) کہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا، (نہیں تو مجھ پر بھی مصیبت آتی) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح و غنیمت، تو ایسے طور پر (خود غرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں (مال کے فوت ہونے پر تاسف کر کے) کہتا ہے، ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی ان لوگوں کا شریک حال ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی (کہ مال و دولت لاتا، اور خود غرضی اور بے تعلقی اس کہنے سے ظاہر ہے ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی کامیابی پر بھی تو خوش ہوتے ہیں یہ نہیں کہ اپنا افسوس کرنے بیٹھ جائے اور اس کی خوشی کا نام بھی نہ لے، اللہ تعالیٰ اس شخص کے حق میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی مفت نہیں ملتی اگر اس کا طالب ہے، تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے جو کہ موقوف ہے ایمان و اخلاص پر یعنی مسلمان و مخلص بن کر) ان کافر لوگوں سے لڑے جو آخرت (چھوڑ کر اس) کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی اس شخص کو اگر فوز عظیم کا شوق ہے تو دل درست کرلے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، تیغ دشمن کے سامنے سینہ سپر بنے دیکھو فوز عظیم ہاتھ آتا ہے یا نہیں، اور یوں ہی کوئی دل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی مصیبت جھیلے سچی کامیابی اس کی ہے، کیونکہ دنیا کی کامیابی اول تو حقیر، پھر کبھی ہے کبھی نہیں، کیونکہ اگر غالب آگئے تو ہے ورنہ نہیں) اور آخرت کی کامیابی جو کہ ایسے شخص کے لئے موعود ہے ایسی ہے کہ عظیم بھی اور پھر ہر حالت میں ہے کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ (مغلوب ہو جائے حتیٰ کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آجائے ہم (ہر حالت میں، اس کو آخرت کا) اجر عظیم دیں گے (جو کہ فوز عظیم کہنے کے لائق ہے)۔

رَبطِ آیات اس سے قبل اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا ذکر تھا، آگے ان آیات میں فرمانبرداروں کو احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے (قرطبی)

مَعارف ومَسائل

فوائدِ مہمّہ (۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ الخ اس آیت کے پہلے حصہ میں جہاد کرنے کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا گیا، اور دوسرے حصہ میں اقدام جہاد کا، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی جس کو متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ

ظاہری اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں اسلحہ کی فراہمی کا حکم تو دیدیا گیا، لیکن یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اس کی وجہ سے تم یقیناً ضرور محفوظ ہی رہو گے، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا گیا کہ اسباب کا اختیار کرنا صرف اطمینان قلبی کے لئے ہوتا ہے، ورنہ ان میں فی نفسہ نفع و نقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے، جیسے ارشاد ہے:

قُل لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا	"یعنی اے نبی آپ کہدیجئے کہ ہم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔"

(۱) اس آیت میں پہلے تو جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا گیا، اس کے بعد اس کے لئے نکلنے کا نظم بتلایا گیا، جس کے لئے دو وجہیں ذکر کئے گئے، یعنی فَانفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوا جَمِيعًا، ثبات "ثُبَۃ" کی جمع ہے، جس کے معنے چھوٹی سی جماعت کے ہیں، جس کو فوجی دستہ (سریہ) کہتے ہیں یعنی اگر تم جہاد کے لئے نکلو تو کیلے اور تنہا نہ نکلو، بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں نکلو یا ایک کثیر (جمیعًا) لشکر کی صورت میں جاؤ، کیونکہ اکیلے لڑنے کے لئے جانے میں نقصان کا قوی احتمال ہوتا ہے، اور دشمن ایسے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

یہ تعلیم تو جہاد کے موقع کے لئے مسلمانوں کو دی گئی ہے، لیکن عام حالات میں بھی شریعت کی یہی تعلیم ہے، کہ اکیلے سفر نہ کیا جائے، چنانچہ ایک حدیث میں تنہا مسافر کو ایک شیطان کہا گیا اور دو مسافروں کو دو شیطان اور تین کو جماعت فرمایا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

خَيْرُ الصَّحَابَةِ أَرْبَعَةٌ وَخَيْرُ السَّرَايَا أَرْبَعُ مِائَةٍ وَخَيْرُ الْجُيُوشِ أَرْبَعَةُ آلَافٍ (رواہ الطبرانی بحوالہ مشکوٰۃ)	"یعنی بہترین ساتھی چار ہیں اور بہترین فوجی دستہ چار سو کا ہے، اور بہترین لشکر چار ہزار کا ہے"،

(۲) وَإِنَّ مِنكُمْ، اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مؤمنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ مؤمنین کی نہیں ہو سکتیں، اس لئے علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے خطاب میں ان کو مؤمنین کی ایک جماعت کہا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ

مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں اے رب ہمارے

اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا

نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کر دے ہمارے لئے

مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾

اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ

لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں سو لڑو تم شیطان کے حمایتیوں سے

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

بیشک فریب شیطان کا سست ہے۔

ع

خلاصۂ تفسیر

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو (باوجودیکہ اس کا قوی داعی موجود ہے، کیونکہ یہ جہاد) اللہ کی راہ میں (ہوتا ہے، یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے جس کا اہتمام ضروری ہے) اور (اس اعلاء دین کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ) کمزور (ایمان دار) وں کی خاطر سے (بھی لڑنا ضرور ہے تاکہ کفار کے پنجہ ستم سے رہائی پائیں)، جن (بیچاروں) میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو (کفار سے تنگ و پریشان ہو ہو کر) دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو کسی طرح اس بستی سے (یعنی مکہ سے جو ہمارے لئے جیل خانہ بنا ہوا ہے) باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں (کہ ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے)، اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے (کہ ہماری حمایت کر کے ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑا دے)، جو لوگ پکے ایمان دار ہیں (وہ تو ان احکام کو سن کر) اللہ کی راہ میں (یعنی

غلبۂ اسلام کے قصد سے) جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں (یعنی غلبۂ کفر کے قصد سے) لڑتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں نصرت اللہ کی طرف سے ایمان داروں کو ہوگی، جب ایمان داروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے) تو (اے ایماندارو) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جو کہ اللہ کی مدد سے محروم ہیں) جہاد کرو، (اور گو وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں لیکن) واقع میں (وہ شیطانی تدبیریں ہیں کہ شیطان ان کفری تدبیروں کا حکم کرتا ہے) شیطانی تدبیر (خود) لچر ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں غیبی امداد نہیں ہوتی، اور کبھی چند روزہ غلبہ ہوجانا تو ان کو چند روزہ مہلت اور ڈھیل دینا ہے، تو غیبی امداد جو مؤمنین کے ساتھ ہے وہ تدبیر اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔

خلاصہ یہ کہ داعی بھی ہے اور وعدۂ نصرت بھی ہے، پھر کیا عذر ہے؟ اس لئے مکرر تاکید کی گئی۔

معارف ومسائل

مظلوم کی فریاد رسی اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی ضعف اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کرسکے تھے، اور بعد میں کافروں نے بھی ان کو جانے سے روک دیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کردیں، تاکہ یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں، ان حضرات میں سے بعضوں کے نام بھی تفاسیر میں مذکور ہیں، مثلاً ابن عباسؓ اور ان کی والدہؓ، سلمہ بن ہشامؓ، ولید بن ولیدؓ، اور ابو جندل بن سہلؓ (قرطبی) یہ حضرات اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے ان کے ظلم وستم کو جھیلتے اور سہتے رہے، اور اسلام پر بڑی مضبوطی سے جمے رہے، البتہ اللہ تعالیٰ سے ان مصائب سے نجات کی دعائیں انھوں نے برابر جاری رکھیں، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء قبول فرمائی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاد کر کے ان کو کفار کے جبر وتشدد سے چھٹکارا دلوائیں۔

اس آیت میں مؤمنین نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی تھی، ایک یہ کہ ہم کو اس قریہ سے نکالیں (یہاں قریہ سے مراد مکہ ہے) دوسری یہ کہ ہمارے لئے کوئی ناصر اور مددگار بھیجدیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دونوں باتیں قبول فرمائی ہیں، اس طرح کہ بعض کو وہاں سے نکلنے کے مواقع میسر کئے، جس سے ان کی پہلی بات پوری ہوئی اور بعض اسی جگہ رہے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسیدؓ کو ان کا متولی مقرر کیا، جنھوں نے مظلومین کو ان کے ظالمین سے نجات دلائی، اس طرح

سے اُن کی دوسری بات بھی پوری ہوگئی، اس آیت میں صرف لفظوں میں حکم قتال دینے کے بجائے قرآن نے یہ الفاظ اختیار کئے، مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ، جن میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال وجہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ ہے، جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا تمام مصائب کا بہترین علاج ہے آیت يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا سے یہ بتلایا گیا کہ حکم قتال کا ایک سبب ان کمزور مسلمان مردوں، اور عورتوں کی دعا تھی جس کی قبولیت مسلمان کو حکم جہاد دے کر کی گئی، اور ان کی مصائب کا فوری خاتمہ ہوگیا۔

جنگ تو سب کرتے ہیں مگر اس سے مومن اور کافر کے مقاصد الگ الگ ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ اس آیت میں بتلایا گیا کہ مومنین اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی جد وجہد کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج ہو، اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے، اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے، اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا، دنیا کے امن کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے، لہٰذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے یہی مقصد ہوتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں کفر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو، اور طاغوتی قوتیں برسرِ اقتدار آئیں تاکہ دنیا میں کفر و شرک خوب پھیلے، اور چونکہ کفر و شرک شیطان کی راہیں ہیں، اس لئے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

شیطان کی تدبیر ضعیف ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا، اس آیت میں بتلایا گیا کہ شیطانی تدابیر لچر اور کمزور ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مومنین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لہٰذا مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں سے لڑنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ان کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے، اور کافروں کو شیطان کی تدبیر کوئی فائدہ نہ دے گی۔

چنانچہ جنگِ بدر میں ایسا ہی ہوا کہ پہلے شیطان کافروں کے سامنے لمبی ڈینگیں مارتا رہا، اور اس نے کافروں کو یہ یقین دلایا کہ "لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ" "آج کے دن تم لوگوں کو کوئی مغلوب نہیں کرسکتا اس لئے کہ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (میں تمہارا مددگار ہوں) میں اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ تمہاری مدد کو آؤں گا، جب جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اگرچہ آگے بڑھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حمایت میں فرشتے آپہنچے ہیں تو اس نے اپنی تدبیر کو ناکام پاکر اُلٹے پاؤں بھاگنا شروع کردیا، اور اپنے دوستوں یعنی

کافروں سے کہا: "اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ، وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ" "میں تم لوگوں سے بری ہوں، اس لئے کہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی فرشتوں کا لشکر) میں اللہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے" (مظہری)

اس آیت میں شیطان کی تدبیر کو جو ضعیف کہا گیا ہے اس کے لئے اسی آیت سے دو شرطیں بھی مفہوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ آدمی جس کے مقابلہ میں شیطان تدبیر کر رہا ہے مسلمان ہو، اور دوسری یہ کہ اس کا کام محض اللہ ہی کے لئے ہو، کوئی دنیوی نفسانی غرض نہ ہو، پہلی شرط اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اور دوسری یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ سے معلوم ہوتی ہے، اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی فوت ہو جائے تو پھر ضروری نہیں کہ شیطان کی تدبیر اس کے مقابلہ میں کمزور رہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب تم شیطان کو دیکھو تو بغیر کسی خوف وخدشہ کے اس پر حملہ کر دو۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا (احکام القرآن للسیوطی)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا
کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور قائم رکھو

الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ
نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا

اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ
اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی

خَشْیَۃً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ
زیادہ ڈر اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ

اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ
چھوڑ رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک کہہ دے کہ فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے

وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۪ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾
اور آخرت بہتر ہے پرہیزگار کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک تاگے برابر

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ

جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو آ پکڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں

مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ

میں اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں یہ اللہ کی طرف سے

اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ

ہے اور اگر ان کو پہنچے کچھ برائی تو کہیں یہ تیری طرف سے ہے

قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَكَادُوۡنَ

کہہ دے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے سو کیا حال ہے ان لوگوں کا ہرگز نہیں

یَفۡقَهُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫

لگتے کہ سمجھیں کوئی بات جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے،

وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَیِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ وَاَرۡسَلۡنٰكَ

اور جو تجھ کو برائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھ کو بھیجا پیغام

لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ﴿۷۹﴾

پہنچانے والا لوگوں کو اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

(اے نبی ﷺ) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (قبل نزول حکم جہاد تو جنگ کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ ان کو منع کرنے کے تھے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رہو اور (جو جو حکم تم کو ہو چکے ہیں اس میں لگے رہو مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا) تو یہ حالت تھی اور یا) پھر جب ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو کیا حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (مخالف) لوگوں سے (طبعاً) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کر دیں گے) جیسا (کوئی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دشمن کا ڈر طبعی ہے، اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقلی حالت سے شدید ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی امید رحمت بھی تو ہے اور کافر دشمن سے تو ضرر کا خوف ہی خوف ہے، اور چونکہ یہ خوف

طبعی تھا (اس لئے گناہ نہیں ہوا) اور (یا حکم قتال کو ملتوی کرنے کی تمنا میں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور خدا تعالیٰ کے علم میں قول نفسی قول لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے (ابھی سے) ہم پر جہاد کیوں فرض کردیا ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدت مہلت دیدی ہوتی (ذرا بے فکری سے اپنی ضروریات پوری کرلیتے اور چونکہ یہ عرض کرنا بطور اعتراض یا انکار کے نہ تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ دنیا سے فائدہ اٹھانا (جس کے لئے تم مہلت کی تمنا کرتے ہو) محض چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے لئے سامان آخرت کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے اُن کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو اور اگر جہاد بھی نہ کیا تو وقت معین پر موت سے بچ جاؤ گے ہرگز نہیں، کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ) تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں موت تم کو آ دبائے گی اگرچہ تم پختہ مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو (غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مر کر دنیا کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ بلکہ عقل کی بات یہ ہے کہ ع "چند روزے جہد کن باقی بخند")، اور اگر ان (منافقین) کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح و کامیابی) تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ (اتفاقاً) ہوگئی (ورنہ مسلمانوں کی بے تدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت و قتل) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ (کی اور مسلمانوں کی بے تدبیری) کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرما دیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں بلکہ) سب کچھ (نعمت و نقمت) اللہ ہی کی طرف سے ہے (گو ایک بلاواسطہ اور ایک بواسطہ جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے بلاواسطہ اعمال ہے اور نقمت یعنی مصیبت اللہ کے عدل سے بواسطہ اعمال سیئہ عباد کے ہے پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو واقع میں عمل سیئہ کا اس میں دخل ہے، جیسا اُحد میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے، اگر آدمی ذرا بھی غور کرے تو خوشحالی کے قبل کوئی نیک عمل اس درجہ کا نہ پاوے گا محض فضل ہی

ثابت ہوگا، اور بدحالی کے قبیل سے جو کوئی عمل بد ہے گا جس کی سزا اس سے زیادہ ہوتی، جب یہ ایسی ظاہر بات ہے، تو ان (منافق) لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے اور سمجھیں گے تو کیا، اور وہ تفصیل اس جمالی جواب مذکور کی یہ ہے کہ) اے انسان تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے (فضل) ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی اعمال بد کے سبب سے ہے (پس اس بدحالی کو شریعت کے احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ کہنا یا شارع کی طرف اس کی نسبت کرنا پوری جہالت ہے، جیسا منافقین جہاد اور امام الجہاد کی طرف اس کی نسبت کرتے تھے، اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اگر کوئی منافق کافر انکار کرے تو اس کے انکار سے نفی نبوت کی کب ہو سکتی ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کے) گواہ کافی ہیں (جنھوں نے قولی اور فعلی شہادت دی ہے، قولی تو مشتہر یہی کلمہ وَاَرْسَلْنٰكَ اور فعلی یہ کہ معجزات جو دلیل اثبات نبوت ہیں آپ کو عطا فرمائے)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ الخ، مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستایا کرتے تھے، مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور اجازت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں، آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے تھے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں، بلکہ صبر اور درگذر کرنے کا حکم ہے، اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ، کیونکہ جب تک آدمی اطاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان دینا بہت دشوار ہوتا ہے، اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا، پھر ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو جہاد کا حکم ہوا تو ان کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی، مگر بعض کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، یا اس سے بھی زیادہ، اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

حکم جہاد نازل ہونے پر مسلمانوں کی طرف سے التوائے حکم کی تمنا کس وجہ سے ہوئی حکم جہاد پر مسلمانوں کی طرف سے مہلت کی تمنا درحقیقت کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ ایک لطف آمیز شکایت تھی،

جس کی وجہ یہ تھی کہ عادۃً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کو انتہائی تنگی و تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اس لئے ایسے وقت میں انتقام لینا زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن آرام و راحت کے وقت اس کی طبیعت لڑائی کی طرف آمادہ نہیں ہوتی، یہ ایک بشری تقاضا ہے، چنانچہ یہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو اس وقت کفار کی ایذاؤں سے تنگ آکر جہاد کے حکم کی تمنا کر رہے تھے، لیکن مدینہ میں آکر جب ان کو سکون و آرام نصیب ہوا تو ایسی صورت میں جب قتال کا حکم ہوا تو اس وقت ان کا پرانا جذبہ کم ہو چکا تھا اور ان کے دلوں میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا اس لئے انہوں نے محض ایک تمنا کی کہ اگر اس وقت جہاد کا حکم نہ ہوتا تو بہتر تھا، اس تمنا کو اعتراض پر محمول کرکے ان مسلمانوں کی طرف معصیت کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، یہ تقریر اس صورت میں ہے جب کہ انہوں نے شکایت کا اظہار زبان سے بھی کیا ہو، لیکن اگر زبان سے نہیں کیا محض ان کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو ہو تو وساوس قلبی کو شریعت نے معصیت ہی شمار نہیں کیا، یہاں یہ دونوں احتمال ہیں، اور آیت کے لفظ قَالُوْا سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انہوں نے زبان سے اظہار کر دیا تھا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دل میں کہا ہو (بیان القرآن ملخصاً) بعض مفسرین کے نزدیک آیات کا تعلق مؤمنین سے نہیں ہے بلکہ منافقین سے ہے، اس صورت میں کسی قسم کا اشکال نہیں (تفسیر کبیر)

اصلاح ملک سے اصلاح نفس مقدم ہے

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، اللہ تعالیٰ نے پہلے نماز اور زکوٰۃ کے احکام کو بیان فرمایا، جو اصلاح نفس کا سبب ہیں، اور اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اصلاح ملک کا سبب ہے یعنی اس کے ذریعہ سے ظلم و ستم کا استیصال کیا جاتا ہے اور ملک میں امن و امان قائم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے، چنانچہ درجہ کے اعتبار سے بھی قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور ثانی کا فرض کفایہ ہے، جس سے اصلاح نفس کی اہمیت اور اس کا مقدم ہونا ظاہر ہے (مظہری)

دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں فرق

آیت میں دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو افضل او بہتر کہا گیا ہے، اس کی مندرجہ ذیل چند وجوہ ہیں۔

۱۔ دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔

۲۔ دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہیں، اور آخرت کی باقی رہنے والی ہیں۔

۳۔ دنیا کی نعمتوں کے ساتھ طرح طرح کی پریشانیاں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں ان کدورتوں سے پاک ہیں۔

۴۔ دنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں ہے اور آخرت کی نعمتیں ہر متقی کو یقیناً ملیں گی (تفسیر کبیر)

وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ ۔ مِنَ اللّٰهِ فِي دَارِ الْمُقَامِ نَصِيْبُ

فَإِنْ تُعْجِبِ الدُّنْيَا رِجَالًا فَإِنَّهَا ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَالزَّوَالُ قَرِيْبُ

"یعنی اس دنیا اور دنیا میں اس شخص کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ رکھا یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ ہو، پھر اگر دنیا کچھ لوگوں کو فریفتہ کرے تو آگاہ رہیں کہ یہ دنیا تو متاع قلیل ہے اور اس کا زوال پذیر ہونا بہت قریب ہے یعنی ادھر آنکھ بند ہوئی ادھر آخرت سامنے آئی۔"

ایک عبرتناک واقعہ

أَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ، اللہ تعالیٰ نے اس آیت جہاد سے رکنے والوں کے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ شاید جہاد سے جان بچا کر موت سے کہیں بچ سکتے ہیں اس لئے فرمایا کہ موت ایک دن آکر رہے گی خواہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں موت آئے گی جب یہ بات ہے تو تمہارا جہاد سے منہ پھیرنا بیکار ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرتناک واقعہ بروایت ابن جریرؒ و ابن ابی حاتم عن مجاہدؒ لکھا ہے، کہ پہلی امتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضع حمل کا وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لئے بھیجا، وہ دروازہ سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے پوچھا کہ یہ عورت کیا جنی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ آپ یاد رکھئے! یہ لڑکی سو مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر میں ایک مکڑی سے مرے گی، ملازم یہ سنکر واپس ہوا، اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، اور سوچا کہ اب یہ مرگئی ہے تو بھاگ گیا، مگر پیچھے لڑکی کی ماں نے ٹانکے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ لڑکی جوان ہوگئی اور خوبصورت اتنی تھی کہ اس شہر میں وہ بے مثل تھی، ادھر اس ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی، اور کافی عرصہ تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑھیا ملی، تو اس سے ذکر کیا، کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ خوبصورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس عورت نے کہا کہ فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوبصورت نہیں ہے، آپ اسی سے شادی کرلیں، آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کرلی، تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک لڑکی کا میں پیٹ چاک کرکے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا، یہ سنکر وہ

بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اس نے پیٹ دکھایا، جس پر نشان موجود تھا، یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں، ایک یہ کہ تو سو مردوں سے زنا کرے گی، اس پر عورت نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں، مرد نے کہا تعداد سو ہے، دوسری بات یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کر دیا، جس میں مکڑی کے جالے کا نام تک نہ تھا، ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکڑی نظر آئی، عورت بولی کیا مکڑی یہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا ہاں! اس پر وہ فوراً اٹھی اور کہا کہ اس کو تو میں فوراً مار دوں گی، یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پیروں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔

مکڑی تو ہلاک ہوگئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں، جو اس کی موت کا پیغام بن گئیں۔ (ابن کثیر)

یہ عورت صاف ستھرے شاندار محل میں اچانک ایک مکڑی کے ذریعہ ہلاک ہوگئی، اس کے بالمقابل کتنے ایسے آدمی ہیں کہ عمر بھر جنگوں اور معرکوں میں گذار دی وہاں موت نہ آئی، حضرت خالد بن ولیدؓ جو اسلام کے سپاہی اور جرنیل معروف و مشہور ہیں، اور سیف اللہ ان کا لقب ہے پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے اور ہزاروں کافروں کو تہ تیغ کیا، ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا، اور ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ میری موت عورتوں کی طرح چارپائی پر نہ ہو بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدانِ جہاد میں ہو، لیکن آخر کار ان کی موت بستر پر ہی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کا نظام قادرِ مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے، جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر ایک مکڑی کے ذریعہ مار دے اور بچانا چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بچالے۔

پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے خلاف نہیں وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ، اس آیت میں کہا گیا کہ موت تم کو بہر کیف پہنچ کر رہے گی، گرچہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رہنے سہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لئے مضبوط و عمدہ گھر تعمیر کرنا نہ خلافِ توکل ہے، اور نہ خلافِ شرع ہے۔ (قرطبی)

انسان کو نعمت محض اللہ کے فضل سے ملتی ہے مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ، یہاں حسنہ سے مراد نعمت ہے۔ (مظہری)

اس آیت سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ انسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنی ہی عبادت

کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے پھر اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، ان کو محدود عبادات اور طاعات سے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہماری عبادت بھی رب العالمین کی بادشاہت کے شایانِ شان نہ ہو۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَا اَحَدٌ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا بِرَحْمَۃِ اللّٰہِ قِیْلَ وَلَا اَنْتَ قَالَ وَلَا اَنَا (متفق علیہ)

(بحوالہ مظہری)

"یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا، راوی نے عرض کیا آپ بھی نہیں جائینگے فرمایا ہاں میں بھی نہیں"

مصیبت انسان کے شامت اعمال کا نتیجہ ہے

وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ، یہاں سَیِّئَۃٌ سے مراد مصیبت ہے (مظہری)

مصیبت کی تخلیق اگرچہ اللہ ہی کرتا ہے، لیکن اس کا سبب خود انسان کے اعمالِ بد ہوتے ہیں، اب اگر یہ انسان کافر ہے تو اس کے لئے دنیا میں جو مصیبت پیش آتی ہے یہ اس کے لئے اس عذاب کا ایک معمولی سا نمونہ ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر وہ مؤمن ہے تو اس کے لئے مصائب و تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ ہوکر نجاتِ آخرت کا سبب ہوجاتی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

مَا مِنْ مُّصِیْبَۃٍ تُصِیْبُ الْمُسْلِمَ اِلَّا کَفَّرَ اللّٰہُ بِھَا عَنْہُ حَتّٰی الشَّوْکَۃَ یُشَاکُھَا

(ترمذی بحوالہ مظہری)

"یعنی کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو کسی مسلمان کو پہنچے، مگر وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اس کے پاؤں میں چبھتا ہے"

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُصِیْبُ عَبْدًا نَکْبَۃٌ فَمَا فَوْقَھَا وَمَا دُوْنَھَا اِلَّا بِذَنْبٍ وَمَا یَعْفُوْ اَکْثَرُ

"حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کو جو کوئی بھی یا سخت مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے، اور بہت گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں"

(ترمذی بحوالہ مظہری)

آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے عام ہے

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا، اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رسالت پورے عالم کے انسانوں کے لئے عام ہے، خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تا قیامت پیدا ہوں (مظہری)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ
جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا اور جو الٹا پھرا تو ہم نے

اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾
تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان

خلاصۂ تفسیر

جس شخص نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی، (اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عقلاً بھی واجب ہے، پس آپ کی اطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص (آپ کی اطاعت سے) روگردانی کرے سو آپ کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے) آپ کو (بطور ذمہ داری کے) ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا (کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں، بلکہ آپ کا فرض پیغام پہنچا دینے سے پورا ہو جاتا ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ کفر کریں تو آپ پر کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں آپ بے فکر رہیں)

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ
اور کہتے ہیں قبول ہے پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے

مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ
ان میں سے رات کو اس کے خلاف جو تجھ سے کہہ چکے تھے اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾
سو تو تغافل کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ
کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے

لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝۸۲

تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت ۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے احکام سنکر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے پھر جب آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے اور چونکہ وہ سردار ہیں اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں، (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سب انتظام اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے، اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا) کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں، اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تاکہ اس کا کلام الٰہی ہونا واضح ہوجاوے) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس کے مضامین میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے واقعیات سے اور حد اعجاز سے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف و تفاوت ہوتا تو مضامین کثیرہ میں اختلافات کثیرہ ہوتے، حالانکہ ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، پس لامحالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا)

معارف و مسائل

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ، اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دورخی پالیسی رکھتے ہیں زبان سے کچھ کہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

پیشوا کے لئے ایک اہم ہدایت فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭوَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا

جب منافقین آپ کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لئے مشورے کرتے، اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی کہ ان کی پرواہ نہ کیجئے، آپ اپنا کام اللہ کے بھروسہ پر کرتے رہیں، کیونکہ وہ آپ کے لئے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کی باتے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

تدبرِ قرآن اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ قرآن میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس میں چند چیزیں قابلِ غور ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ فرمایا اَفَلَا يَقْرَءُوْنَ نہیں فرمایا، اس سے بظاہر ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ وہ اگر گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں تو ان کو اس کے معانی و مضامین میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا، اور یہ مفہوم تدبر کے عنوان سے ہی ادا ہو سکتا ہے، صرف تلاوت اور قراءت جس میں تدبر اور غور و فکر نہ ہو اس سے بہت سے اختلافات نظر آنے لگتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے ہے صحیح نہیں ہے، البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالیگا عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلیدِ کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہو سکے تو کوئی مستند و معتبر تفسیر کا مطالعہ کریں، اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں، اور ماہر علماء سے رجوع کریں۔

قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہے، لیکن اس کے لیے شرائط ہیں

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ تدبر کے درجات متفاوت ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے، تاکہ وہ نتائج کا استخراج صحیح کر سکے، اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا، جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکالے گا، اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر صرف سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔

یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینیروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانونِ ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی؟ میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کر سکتا ہوں، اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ، پھر بلاشبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو، لیکن یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جاتی ہے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں؟ کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح و تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

قیاس کا ثبوت اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن و

سنت میں نہ ملے تو انہی میں غور و فکر کرکے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے، اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبی)

اختلافِ کثیر کی تشریح لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، اختلافِ کثیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مضمون میں اختلاف ہوتا تو مضامین کثیرہ کا اختلاف بھی کثیر ہوتا (بیان القرآن)، لیکن یہاں کسی ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بشر کے کلام میں یہ یکسانیت کہاں، نہ کہیں جگہ فصاحت و بلاغت میں کمی، نہ توحید و کفر اور حلال و حرام کے بیان میں تناقض اور تفاوت، پھر غیب کی اطلاعات میں بھی نہ کوئی خبر ایسی ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو، نہ نظمِ قرآن میں کہیں یہ فرق کہ بعض فصیح ہو اور بعض رکیک، ہر بشر کی تقریر و تحریر پر ماحول کا اثر ہوتا ہے، اطمینان کے وقت کلام اور طرح کا ہوتا ہے پریشانی کے وقت دوسری طرح کا ہے، مسرت کے وقت اور رنگ ہوتا ہے، اور رنج کے وقت دوسرا، لیکن قرآن ہر قسم کے تفاوت اور تناقض سے پاک ہے اور بالاتر ہے، اور یہی کلامِ الٰہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا

اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے

بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ

ہیں، اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کی، اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان کو کسی امر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ امر موجب) امن ہو یا (موجب) خوف (مثلاً کوئی لشکر مسلمانوں کا کسی جگہ جہاد کے لئے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی، یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی یہ خوف کی خبر ہے) تو اس

خبر کو فوراً مشہور کردیتے ہیں (حالانکہ بعض وقت وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا مصلحت انتظامیہ کے خلاف ہوتا ہے) اور اگر (بجائے خود مشہور کرنے کے یہ لوگ اس خبر کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو حضرات اکابر صحابہؓ ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کی رائے کے اوپر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت وغلط اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں (جیسا ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں پھر جیسا یہ حضرات عملدرآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا؟ آگے احکام مذکورہ سنانے کے بعد جو سراسر متضمن مصالح دنیویہ و اخرویہ ہیں بطور منت کے مسلمانوں کو ارشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا اپنا پیغمبر بھیجا یہ اگر) نہ ہوتا تو تم سب کے سب (صلاح دنیوی و اخروی ختم کرکے) شیطان کے پیرو ہوجاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو بدولت عقل سلیم خداداد کے کہ وہ بھی ایک خاص فضل و رحمت ہے اس سے محفوظ رہتے ورنہ زیادہ تر اسی میں پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جس کی معرفت ایسے مصالح تک کام آتے ہیں برخلاف مذکورہ منافقین کے بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اور پوری طاعت کرنا چاہئے)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ، ابن عباس، ضحاک اور ابو معاذ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور حضرت حسنؒ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی)

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شان نزول میں حضرت عمر بن خطابؓ کی حدیث کو ذکر کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپؓ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپؓ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، چنانچہ آپؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ نہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویو کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:
وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ الخ (تفسیر ابن کثیر)

بے تحقیق باتوں کا اڑانا گناہ اور بڑا فتنہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ، یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: مَنْ حَدَّثَ بِحَدِيْثٍ وَهُوَ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ "یعنی جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے" (تفسیر ابن کثیر)

اولوالامر کون لوگ ہیں؟

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ الخ استنباط، اصل میں کنوئیں کی تہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں، کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماءِ مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد ہے کسی بات کی تہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا (قرطبی)

اولوالامر کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں، حضرت حسن، قتادہؓ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امراء اور حکام مراد ہیں، ابوبکر جصاص ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ اولی الامر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اولی الامر اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو، اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک جبر و تشدد سے، وہ تو صرف اہل حکومت ہی کر سکتے ہیں، دوسری صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، اور وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے، جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے، کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، اور از روئے شرع ان پر ان کے احکام کی اطاعت واجب بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اولوالامر کا اطلاق صحیح ہے (احکام القرآن للجصاص)

اس بحث کی مزید تفصیل آیت اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے تحت بھی گذر چکی ہے۔

مسائل جدیدہ میں قیاس، اجتہاد و عوام کے لئے تقلید ائمہ کا ثبوت ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے احکام مجتہدو قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تامہ رکھتے ہیں

اس بیان سے چند امور مستفاد ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں، بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔

(احکام القرآن للجصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی استنباط واستدلال کے مکلف تھے لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلف تھے، اس لئے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا، ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، اور دوسرے اولوا الامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ اور یہ حکم عام ہے جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذات بھی مستنبط احکام کی مکلف تھی (احکام القرآن للجصاص)

فوائد مہمہ ○ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کر کے جو بات بتائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے، اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اختیار کرے، دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا احتمال رہتا ہے، تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔

(احکام القرآن للجصاص ملخصاً)

اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم یقینی کا نہیں (۲) استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطا ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے، جو عمل کے لئے کافی ہے۔ (احکام القرآن جصاص و تفسیر کبیر)

فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ
سو تو لڑ اللہ کی راہ میں تو ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کا اور تاکید کر

الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ
مسلمانوں کو قریب ہے کہ اللہ بند کرے لڑائی کافروں کی اور اللہ

اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِیْلًا (۸۴)
بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے والا

خلاصۂ تفسیر

(جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوئی) پس آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے (اور اگر فرضاً کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے، کیونکہ) آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دیدیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ ہیں، نہ تو بازپرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ مذکور ہو چکی ورنہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے جس کی وجہ یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے زور جنگ کو

روک دیں گے اور ان کو مغلوب کر دیں گے، اور (گو یہ بڑے زور در نظر آتے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ زورِ جنگ میں (ان سے بدرجہا بے شمار) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

شانِ نزول جب غزوۂ احد ختم ہو چکا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدہ کے موافق بدر میں مقابلہ کے لئے جانا چاہا (جس کو مؤرخین بدرِ صغریٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہی خبروں کی وجہ سے جانے (میں) کچھ تامل کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کچھ مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اے رسول تم تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کرو اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے، اس ہدایت کو پاتے ہی آپ ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوۂ احد کے بعد ہوا تھا، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا، وہ کوئی مقابلہ میں نہ آیا، اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ (قرطبی، مظہری)

قرآنی احکام کا حسن اسلوب فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الخ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ تن تنہا جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جائیے کوئی دوسرا آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دوسرے جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ سے باز پرس نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ تن تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہو سکتا تھا اس کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے، اور ان کو مرعوب و مغلوب کر دے، اور آپ کو تنہا ہی کامیاب کر دے، پھر اس کے بعد اس کامیاب ہونے پر دلیل بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے جس کی قوت جنگ اور زورِ جنگ ان کافروں سے بدرجہا زیادہ ہے تو پھر کامیابی بھی یقیناً آپ ہی کی ہے، پھر اسی

شدت بأس کے ساتھ اپنی سزا کی شدت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے یا دنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہرحال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوت و طاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ

جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے ایک حصہ اور جو کوئی

يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى

سفارش کرے بری بات میں اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر

كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ

قدرت رکھنے والا، اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے

مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

بہتر یا وہی کہو الٹ کر، بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، بیشک تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن اس میں

فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

کچھ شبہ نہیں، اور اللہ سے سچی بات کس کی۔

خلاصۂ تفسیر

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و مقصود دونوں مشروع ہوں) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بری سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و غرض غیر مشروع ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں) اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے لفظوں میں سلام کرو (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ویسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر)

حساب میں لگے (یعنی ان کا قانون یہی ہے کہ وہ اپنے فضل سے معاف کردیں وہ اور بات ہے) اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی جب وہ خبر دیتے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے۔

معارف و مسائل

سفارش کی حقیقت اور اس کے احکام اور اقسام

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کردیا، اور یہ بھی بتلا دیا کہ نہ ہر سفارش بری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور بری سفارش کرنے والے کو عذاب کا، آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ نَصِيْبٌ کا لفظ آیا ہے اور بری سفارش کے ساتھ كِفْلٌ کا، اور لغت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کسی چیز کا ایک حصہ، لیکن عرف عام میں لفظ نصیب اچھے حصہ کے لئے بولا جاتا ہے، اور لفظ کفل اکثر برے حصہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اچھے حصہ کے لئے بھی لفظ کفل استعمال ہوا ہے، جیسے قرآن کریم میں كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ارشاد ہے۔

شفاعت کے لفظی معنے ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ شَفْع عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے، اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنے طاق استعمال کیا جاتا ہے اس سے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کردیا جائے، یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت و سفارش کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا، آپ پہنچا دیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعت سیئہ یعنی بری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اس لئے وہ بھی شفاعت سیئہ میں داخل ہے۔

اب خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہوگیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور اسی طرح جو کسی

ناجائز کام کے لئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا محروم کا کام کردے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا، اسی طرح سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش مؤثر اور کامیاب بھی ہو بلکہ اس کو بہرحال اپنا حصہ ملے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ (رواہ البزار عن ابن مسعودؓ والطبرانی عنہ وعن سہل بن سعدؓ بحوالۂ مظہری) یعنی جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کردے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو"

اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ کَلِمَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ اٰئِسٌ مِّنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (مظہری)

"یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے"

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا ابھار دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا، لفظ "مُقیت" کے معنی لغت کے اعتبار سے قادر و مقتدر کے بھی ہیں، اور حاضر و نگراں کے بھی، اور روزی تقسیم کرنے والے کے بھی، اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، عمل کرنے والے اور سفارش کرنیوالے کی جزاء یا سزاء اس کے لئے دشوار نہیں۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں و حاضر ہے اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کررہا ہے، محض لوجہ اللہ کسی صاحب کی امداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رشوت کے اس سے حاصل کرنا ہے۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے، جتنا کسی کے لئے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا، کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا، بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا، البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے، کہ وہ ایک کمزور کی اعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كَانَ اللّٰهُ فِيْ عَوْنِ عَبْدِهٖ مَا دَامَ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ

"یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے"۔

اسی بنا پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَا شَاۗءَ

"یعنی تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب ملے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو"۔

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجب ثواب ہونا بیان فرمایا ہے وہیں یہ بھی بتلایا کہ سفارش کی حد اتنی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک نہیں پہنچا سکے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو، آگے وہ سفارش مان جائے یا نہ مانی جائے، اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہئے، حدیث کے آخری جملہ میں ولیقضی اللہ علی لسان نبیہ ماشاء کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کامیاب ہو، بلکہ اس ثواب و عذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے، آپ نے شفاعت حسنہ کر دی تو ثواب کے مستحق ہو گئے، اور شفاعت سیئہ کر دی تو عذاب کے مستوجب بن گئے، خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر بحر محیط اور بیان القرآن وغیرہ میں مَنْ يَّشْفَعْ میں لفظ مِنْهَا کو سببیہ قرار دے کر اس کی طرف اشارہ تبلایا ہے، اور تفسیر مظہری میں امام تفسیر مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ملے گا، اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو، اور یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی دوسرے انسان کے پاس جو سفارش کی جائے، اس کا بھی یہی اصول ہونا چاہئے، کہ سفارش کرکے آدمی فارغ

ہو جائے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جیسا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ اس نے جو اپنے شوہر مغیث سے طلاق حاصل کرلی ہے اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کرلے؛ بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ آپؐ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے، بریرہؓ جانتی تھیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خلاف اصول کوئی ناگواری نہ ہوگی، اس لئے صاف عرض کردیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی، آپؐ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعث اجر و ثواب تھی، آجکل لوگوں نے جو اس کا حلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی، بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو ناراض ہوتے ہیں، بلکہ دشمنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہو جائے، اکراہ و اجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے، اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کسی کے حق پر زبردستی قبضہ کرے، وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد و خود مختار تھا، آپ نے اس کو مجبور کرکے اس کی آزادی سلب کرلی، اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کے لئے کسی دوسرے کا مال چرا کر اس کو دیدیا جائے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت اور حرام ہے

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس کو سحت و حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشا کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہونچانا یا مضرت اور نقصان سے بچانا ہو، اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کے سبب نہ ہو، بلکہ محض اللہ کے لئے کمزور کی رعایت مقصود ہو، اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے، اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جس کی سزا قرآن میں معیّن و مقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے، اور دعاء کرنے والے کو بھی اجر

ملتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے کوئی دعاء خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے "ولک بمثل" یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

سلام اور اسلام

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ ۔۔۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور اس کے جواب کے آداب بتلاتے ہیں:

لفظ تحیہ کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو

تحیہ کے لفظی معنے ہیں کسی کو "حَيَّاكَ اللّٰهُ" کہنا، یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے، قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو "حَيَّاكَ اللّٰهُ" یا "اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا" یا "اَنْعِمْ صَبَاحًا" وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہنے کا طریقہ جاری کیا، جس کے معنی ہیں "تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو"۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اور "السلام علیکم" کے معنی یہ ہیں کہ "اَللّٰهُ رَقِيْبٌ عَلَيْكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔

اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے

دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لئے کہیں، لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دعاء بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں، بلکہ حیات طیبہ کی دعاء ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہونچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے، اور اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے ضمن میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو

کا میں محافظ ہوں۔

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں امام بن عیینہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

اَتَدْرِیْ مَا السَّلَامُ؟ یَقُوْلُ اَنْتَ اٰمِنٌ مِّنِّیْ	"یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون رہو"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیۃ ایک عظیم جامعیت رکھتا ہے: (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہارِ تعلق و محبت بھی، (۴) اس کے لئے بہترین دعا بھی (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہونچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وارد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ (الحدیث)	"یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچے"

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کریں، بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کریں، تو شاید پوری قوم کی اصلاح کے لئے یہی کافی ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی، اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرلو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائیگی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں

کو کھانا کھلا دو، اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو (صحیحین)

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابو امامہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتداء کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے (طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرۃؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا صحابہ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا، یہ روایت مؤطا امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمھیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہدو، اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السلام علیک یا رسول اللہ" آپؐ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" پھر ایک صاحب آئے اور انھوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے "السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ" آپؐ نے جواب میں ایک کلمہ اور بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پھر ایک صاحب آئے، انھوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپؐ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد فرمایا، ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ

آپ پر قربان پہلے جو حضرات آئے آپ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے، اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے "وعلیک" پر اکتفاء فرمایا، آپ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے، اس لئے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفاء کر لیا۔ اس روایت کو ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے **مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔**

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا "السلام علیکم" تو آپ جواب دیں "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ"، اور اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" تو آپ جواب میں کہیں "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں، اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے، اسی لئے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ اِنَّ السَّلَامَ قَدِ انْتَهٰى اِلَى الْبَرَكَةِ (رواہ البغوی) یعنی سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے۔ (مظہری عن ابن کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی ادا بالمثل کے حکم میں حکم قرآنی اَوْ رُدُّوْهَا کی تعمیل کے لئے کافی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کلمہ پر اکتفاء فرمایا ہے (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہگار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے

بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ بعینہٖ انہی الفاظ سے جواب دیدیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم و واجب صراحۃً بتلا دیا گیا ہے، لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے، اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے، مگر اِذَا حُيِّيْتُمْ میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کیونکہ اس لفظ کو بصیغہ مجہول بغیر تعیین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتداء کرے۔

اسلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنت مؤکدہ سے کم نہیں تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اَلسَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَّالرَّدُّ فَرِیْضَةٌ، یعنی ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ بھی مختصر طور پر ملاحظہ کر لیجئے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیدل چلنے والے کو خود سلام کرے، اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گذریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کے لئے بھی برکت ہوگی، اور اس کے گھر والوں کیلئے بھی۔

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے، اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے، ترمذی، ابوداؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں، جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسدِ نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے

یا انسانی ضروریات استنجاء وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

آخر مضمون پر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿٨٦﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں، جن میں انسانی اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جواب سلام کے سب امور داخل ہیں، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لیں گے۔

پھر فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کسی کو معبود جانو اور جو کام کرو اس کی عبادت کی نیت سے کرو، وہ تم کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس روز سب کے بدلے عنایت فرمائیں گے۔ قیامت کا وعدہ اور جزاء و سزا کی خبر سب حق ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴿٨٧﴾ کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے!

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فریق ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو الٹ دیا بسبب

كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ

ان کے اعمال کے، کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا اللہ نے اور جس کو گمراہ

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ

کرے اللہ ہرگز نہ پاوے گا تو اس کے لئے کوئی راہ، چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ

كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ

جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ

حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ

یہاں تک کہ وطن چھوڑ آویں اللہ کی راہ میں، پھر اگر اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ

اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ

دوست اور نہ مددگار، مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں

ع ۵

وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن

اور ان میں عہد ہے یا آئے ہوں تمہارے پاس کہ تنگ ہو گئے ہیں دل ان کے تمہاری

يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ

لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور

عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا

دے دیتا تو ضرور لڑتے تم سے سو اگر یکسو رہیں وہ تم سے پھر نہ لڑیں تم سے اور پیش کریں

إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا

اب تم دیکھو گے ایک اور قوم کو جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی

قَوْمَهُمْ كُلَّ مَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَإِن

قوم سے بھی جب کبھی بلائے جاتے ہیں فساد کی طرف تو اس کی طرف الٹ جاتے ہیں پھر اگر

لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ

وہ تم سے یکسو نہ رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور اپنے ہاتھ نہ روکیں

فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ

تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور ان پر

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿٩١﴾

ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند۔

ع ۱۲ / ۹

خلاصۂ تفسیر

تین مختلف گروہوں کا بیان اور اُن کے احکام

پہلے فرقہ کا بیان (جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم (اختلاف رائے کرکے) دو گروہ ہوگئے (کہ ایک گروہ ان کو اب بھی مسلمان

کہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) الٹ پھیر دیا ان کے (بد) عمل کے سبب (وہ بد عمل ترک ہجرت دار الاسلام کو باوجود قدرت کے چھوڑ دینا ہے، جو کہ اس وقت مثل ترک اقرار باسلام کے علامت کفر کی تھی اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہ ہوئے تھے، اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ جن کو اس ترکِ دار الاسلام کا علامتِ کفر ہونا معلوم نہیں) اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جب کہ ان لوگوں نے گمراہی اختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مؤمن گروہ کو جو ہدایت یافتہ مؤمن کہتے ہو یہ تمہارے لئے جائز نہیں) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (اس کے مؤمن ہونے کے) لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے (پس ان لوگوں کو مؤمن نہ کہنا چاہئے، اور بھلا وہ خود کیا مؤمن ہوں گے ان کے غلو فی الکفر کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدا نہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ سو ان کی جب یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی کے جواز کے لئے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیل اسلام کے لئے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو اب اقرار بالشہادتین کا ہے، اور تکمیل اسلام کی قید اس لئے ہے کہ خالی دار الاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہلِ تجارت بھی آ جاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آویں یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ جامع اقرار و ہجرت کے ہو جاویں، اور رہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لئے ہے یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں استعانت بلکہ الگ تھلگ رہو)۔

دوسرے فرقہ کا بیان | مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمہارے ساتھ مصالحت سے رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ بواسطہ صلح ہو یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہو جاتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے، (جیسے بنو مدلج، کہ ان سے صلح ہوئی تو ان کے ہم عہد بھی اس استثناء میں آگئے تو بنو مدلج

بدرجہ اولیٰ مستثنیٰ ہونے چاہئیں) دوسرا فریق یہ ہے کہ بلا واسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ خود تمہارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منقبض ہو، اس لئے کہ نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، ایسے دونوں فریقوں میں جس طرح سے کوئی مصالحت رکھے وہ حکم مذکور یعنی پکڑنے اور قتل سے مستثنیٰ ہیں، اور (تم ان لوگوں کی درخواست صلح میں منظوری کا احسان مت سمجھو کیونکہ ان کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی ورنہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر خدا تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچا لیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کئی لفظ تاکید کے لئے فرما دیئے) تو (اس حالت صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اجازت نہیں دی)۔

تیسرے فرقہ کا بیان بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہوگی) کہ (براہ دھوکہ) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (اور ساتھ ہی اس کے) جب کبھی ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے) شرارت (و فساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب مثل سابق کے ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے ان کا قتل کرنا ظاہر ہے اور وہ حجت ان کا نقض عہد ہے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے جن کے متعلق دو حکم مذکور ہیں، واقعات ان فرقوں کے مندرجہ روایات سے واضح ہوں گے۔

پہلی روایت: عبد بن حمید نے مجاہد سے روایت کیا کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے اور

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسباب تجارت لانے کا بہانہ کرکے پھر مکہ چل دیئے اور پھر نہ آئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے کہا یہ مومن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ میں بیان کردیا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کو منافق کہنا باین معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے دل سے ایمان نہ لائے تھے، اور منافقین کو قتل نہ کئے جاتے تھے لیکن جب ہی تک کہ اپنا کفر چھپاتے تھے، اور ان لوگوں کا ارتداد ظاہر ہوگیا تھا اور جنھوں نے مسلمان کہا شاید حسنِ ظن کی وجہ سے کہا ہو، اور ان کے دلائل ارتداد میں کچھ تاویل کرلی ہوگی، اور اس تاویل کی بنیاد رائے محض ہوگی جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہوگی اس لئے معتبر نہیں رکھی گئی۔

دوسری روایت: ابن ابی شیبہؒ نے حسنؒ سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجیؓ نے بعد واقعہ بدر واحد کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کرلیجئے، آپؐ نے حضرت خالدؓ کو تکمیل صلح کے لئے وہاں بھیج دیا، مضمونِ صلح یہ تھا:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے، اور قریش مسلمان ہوجائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہوجائیں گے، اور جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں"

اس پر یہ آیت وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ سے قولہ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ نازل ہوئی۔

تیسری روایت: حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا گیا کہ آیۃ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں جن کا ذکر ہے مراد ان سے قبیلہ اسد و غطفان ہیں، کہ مدینہ میں آئے اور ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندر و عقرب (بچھو) پر ایمان لائے ہیں، اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دین پر ہیں۔

اور ضحاکؒ نے ابن عباسؓ سے یہی حالت بنی عبدالدار کی نقل کی ہے، پہلی اور دوسری روایت روح المعانی اور تیسری معالم میں ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت مثل پہلی روایت والوں کے ہوئی، کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہوگیا، اسی لئے ان کا حکم مثل عام کفار کے ہے، یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے قتال نہ کیا جائے

اور مصالحت نہ ہونے کی صورت میں قتال کیا جاوے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے باب میں دوسری آیت یعنی فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ میں گرفتار کرنے اور قتل کا حکم اور تیسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ میں مصالحت میں ان کا استثناء موجود ہے جن کی مصالحت کا ذکر دوسری روایت میں ہے اور تاکید استثناء کے لئے پھر فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ کی تصریح کردی۔

اور تیسری روایت والوں کے باب میں چوتھی آیت یعنی سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں بیان فرمادیا کہ اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ قتال کرتے ہیں تو تم ان سے جہاد کرو، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کریں تو ان سے قتال نہ کیا جاوے۔

(بیان القرآن)

خلاصہ یہ کہ یہاں تین فرقوں کا ذکر فرمایا گیا:

۱۔ جو ہجرت کہ ابتداء اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، یا کرنے کے بعد دارالاسلام سے نکل کر دارالحرب میں چلے جائیں۔

۲۔ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کریں یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کریں۔

۳۔ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کریں، اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہوجائیں، اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فرقہ کا حکم عام کفار کی مانند ہے، دوسرا فریق قتل اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہے تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان آیتوں کے کُل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدم صلح کے وقت قتال، اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

ہجرت کی مختلف صورتیں اور احکام

قولہ تعالیٰ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ ابتداء اسلام میں ہجرت دار کفر سے تمام مسلمانوں پر فرض تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنے سے منع کیا ہے جو اس فرض کے تارک ہوں، پھر جب مکہ فتح ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (رواہ البخاری) "یعنی جب مکہ فتح ہوکر دارالاسلام بن گیا تو اب وہاں سے ہجرت فرض نہ رہی"، یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت شرط ایمان تھی اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود

لہ ہجرت سے متعلق بحث کے لئے تفسیر آیت نمبر... سورۂ نساء دیکھئے۔

قدرت کے ہجرت نہ کرے لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔

ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ "یعنی ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی ہے" (صحیح بخاری)

علامہ عینی شارح بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے اَنَّ الْمُرَادَ بِالْهِجْرَةِ الْبَاقِيَةِ هِيَ هَجْرُ السَّيِّئَاتِ "یعنی اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے" جیسا کہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ "یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے" (بحوالہ مرقاۃ جلد اول)

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے (۱) دین کے لئے ترک وطن کرنا جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا وطن مکہ ترک کرکے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔ (۲) گناہوں کا چھوڑنا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے طلب نصرت حرام ہے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپ سے چاہی تو آپ نے فرمایا: اَلْخَبِيْثُ لَا حَاجَةَ لَنَا بِهِمْ "یعنی یہ خبیث قوم ہے اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں" (مظہری جلد ۲)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرے

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

گردن ایک مسلمان کی اور خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں،

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن

مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

ایک مسلمان کی اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے،

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

تو خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ

پھر جسکو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو مہینے کے برابر گناہ بخشوانے کو

اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۹۲ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا

اللہ سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر

فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝۹۳

کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب

خلاصۂ تفسیر

اور کسی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو (ابتداءً) قتل کرے لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے)، اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو اس پر (شرعاً) ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا (واجب) ہے اور خون بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں بقدر حصص میراث) حوالہ کردی جائے (اور جس کے کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال قائم مقام ورثہ کے ہے) مگر یہ کہ وہ لوگ (اس خون بہا کو) معاف کردیں (خواہ کل یا بعض اتنی ہی معاف ہو جاوے گی) اور اگر وہ (مقتول خطاءً) ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں (یعنی حربی ہیں اور انہی میں کسی وجہ سے رہتا تھا) اور وہ شخص خود مومن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا پڑے گا، اور دیت اس لئے نہیں کہ اگر ورثہ اس مقتول کے مسلمان ہیں تب تو وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہ ہونے کے باعث مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی، اور دار الحرب کے دار الاسلام کے بیت المال میں ترکہ لایا نہیں جاتا) اور اگر وہ (مقتول خطاءً) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ (صلح یا ذمہ کا) ہو (یعنی ذمی یا مصالح و مستامن ہو) تو خون بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کردی جاوے، (کیونکہ کافر کا کافر وارث ہوتا ہے) اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا)

پھر جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنے دام ہوں کہ خرید سکے) تو (اس کے ذمہ بجائے اس آزاد کرنے کے) متواتر (یعنی لگاتار) دو ماہ کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا، وروزہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ مشروع ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (اپنے علم وحکمت سے مصلحت کے مناسب احکام مقرر فرماتے ہیں، گو ہر جگہ حکمت بندہ کو معلوم نہ ہو) اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا تو جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے، اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزائے دوزخ) کا سامان کریں گے۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات اوپر سے قتل وقتال کا ذکر چلا آرہا ہے، اور کُل صورتیں ابتداءً قتل کی آٹھ ہیں، کیونکہ مقتول چار حال سے خالی نہیں ہے، یا مومن ہے یا ذمی، یا مصالح ومستامن ہے یا حربی ہے، اور قتل دو طرح کا ہے یا عمداً یا خطاءً، پس اس اعتبار سے کُل صورتیں قتل کی آٹھ ہوئیں، اول مومن کا قتلِ عمد، دوم مومن کا قتلِ خطاء، سوم ذمی کا قتلِ عمد، چہارم ذمی کا قتلِ خطاء، پنجم مصالح کا قتل عمد، ششم مصالح کا قتلِ خطاء، ہفتم حربی کا قتلِ عمد، ہشتم حربی کا قتلِ خطاء۔

ان صورتوں میں بعض کا حکم تو اوپر معلوم ہو چکا، بعض کا آگے مذکور ہے، اور بعض کا حدیث میں موجود ہے، چنانچہ صورتِ اولیٰ کا حکم دنیوی یعنی وجوب قصاص سورۂ بقرہ میں مذکور ہے اور حکم اخروی آگے آیت وَمَنْ يَقْتُلْ میں آتا ہے، اور صورتِ دوم کا بیان قول اللہ تعالیٰ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ الی قولہ، وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ میں آتا ہے، اور صورتِ سوم کا حکم حدیث دار قطنی میں ہے کہ ذمی کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے قصاص لیا (اخرجہ الزیلعی فی تخریج ہدایہ) صورتِ چہارم کا ذکر قول اللہ تعالیٰ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ میں آتا ہے، صورتِ پنجم کا ذکر اوپر کے رکوع قول اللہ تعالیٰ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا میں آچکا ہے،

صورت ششم کا حکم صورت چہارم کے ساتھ ہی مذکور ہے کیونکہ میثاق عام ہے جو وقتی اور دائمی دونوں کو شامل ہے، پس ذمی و مستامن دونوں آگئے، درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں مستامن کی دیت کے وجوب کی تصریح کی ہے، صورت ہفتم و ہشتم کا حکم خود جہاد کی مشروعیت سے واضح معلوم ہوچکا، کیونکہ جہاد میں اہل حرب قصداً مقتول ہوتے ہیں، اور خطاء کا جواز بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگا۔ (بیان القرآن)

قتل کی تین قسمیں اور ان کا شرعی حکم
پہلی قسم: عمد:- جو ظاہراً قصد سے ایسے آلہ کے ذریعہ سے واقع ہو جو آہنی یا تفریق اجزاء میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا بانس یا دھار والا پتھر وغیرہ۔

دوسری قسم: شبہ عمد:- جو قصداً تو ہو مگر ایسے آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاء میں تفریق ہو سکتی ہو۔

تیسری قسم: خطاء:- یا تو قصد و ظن میں کہ دور سے آدمی کو شکاری جانور یا کافر حربی سمجھ کر نشانہ لگا دیا، یا فعل میں کہ نشانہ تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جا لگا، اس میں خطاء سے مراد غیر عمد ہے، پس دوسری، تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں، دونوں میں دیت بھی ہے، اور گناہ بھی ہے، مگر ان دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔

دیت دوسری قسم کی سو اونٹ ہیں، چار قسم کے، یعنی یک ایک قسم کے پچیس پچیس، اور دیت تیسری قسم کی سو اونٹ ہیں، پانچ قسم کے یعنی یک ایک قسم کے بیس بیس، البتہ اگر دیت میں نقد دیا جاوے تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی یا یک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ دوسری قسم میں زیادہ ہے بوجہ قصد کے، اور تیسری قسم میں کم صرف بے احتیاطی کا (کذا فی الہدایۃ) چنانچہ تحریر رقبہ کا وجوب و نیز لفظ توبہ بھی اس پر دال ہے، اور یہ حقیقت ان تینوں کی دنیا میں جاری ہونے والے احکام شرعیہ کے اعتبار سے ہے، اور گناہ کے اعتبار سے عمد و غیر عمد ہونا، اس کا مدار قلبی قصد و ارادہ پر ہے، جس پر وعید آخرت کا مدار ہے، وہ خدا کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ اس اعتبار سے قسم اول غیر عمد ہو جاوے اور قسم ثانی عمد ہو جاوے۔

مسئلہ: یہ مقدار مذکور دیت کی جب ہے کہ مقتول مرد ہو اور اگر عورت ہو تو اس کی نصف ہے (کذا فی الہدایۃ)

مسئلہ: دیت مسلم اور ذمی کی برابر ہے، قول رسول علیہ السلام دِیَۃُ کُلِّ ذِی عَھْدٍ فِی عَھْدِہٖ اَلْفُ دِیْنَارٍ (کذا فی الہدایۃ اخرجہ ابوداؤد فی مراسیلہ)۔

مسئلہ: کفارہ یعنی تحریر رقبہ یا روزے رکھنا خود قاتل کو ادا کرنا پڑتا ہے، اور دیت قاتل کے اہل نصرت پر ہے جن کو شرع کی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں (بیان القرآن)

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور انصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ اس میں قاتل کے اولیاء بھی قصور وار ہوتے ہیں، کہ انھوں نے اس کو اس قسم کی بے احتیاطی کرنے سے روکا نہیں، اور دیت کے خوف سے آئندہ وہ لوگ اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے۔

مسئلہ: کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہیں، لفظ رقبہ عام ہے، البتہ ان کے اعضاء سالم ہونے چاہئیں۔

مسئلہ: دیت مقتول کی شرعی ورثہ میں تقسیم ہوگی، اور جو اپنا حصہ معاف کرے گا اس قدر معاف ہو جائے گی، اور اگر سب نے معاف کر دی سب معاف ہو جائے گی۔

مسئلہ: جس مقتول کا کوئی وارث شرعی نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دیت ترکہ ہے اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔ (بیان القرآن)

مسئلہ: اہل میثاق (ذمی یا مستأمن) کے باب میں جو دیت واجب ہے ظاہر یہ ہے کہ اس وقت ہے جب اس ذمی یا مستامن کے اہل موجود ہوں، اور اگر اس کے اہل نہ ہوں یا وہ اہل مسلمان ہوں اور مسلمان کافر کا وارث ہو نہیں سکتا، اس لئے وہ بجائے نہ ہونے کے ہے، تو اگر وہ ذمی ہے تو اس کی دیت بیت المال میں داخل کی جائیگی، کیونکہ ذمی لاوارث کا ترکہ جس میں دیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے، (کما فی الدر المختار) ورنہ واجب نہ ہوگی (بیان القرآن)

مسئلہ: روزے میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہا ہو تو از سر نو رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض کی وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی عذر سے روزہ پر قدرت نہ ہو تو قدرت تک توبہ کیا کرے۔

مسئلہ: قتل عمد میں یہ کفارہ نہیں توبہ کرنا چاہئے۔

(بیان القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

اور مت کہو اس شخص کو کہ جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ

تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں

كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

ہیں تم بھی تو ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا

فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾ لَا

سو اب تحقیق کر لو بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے برابر

يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ

نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں،

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ

اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے،

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے

عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ

بیٹھ رہنے والوں پر درجہ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا اور زیادہ کیا

اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ

اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں جو کہ درجے ہیں

مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے اور مہربانی ہے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

١٣ ع ٥ ١٠

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو ہر کام کو (قتل ہو یا اور کچھ ہو) تحقیق کرکے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے (علامات) اطاعت (کی) ظاہر کرے (جیسا کلمہ پڑھنا یا مسلمانوں کے طرز پر سلام کرنا) یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو (دل سے) مسلمان نہیں (محض اپنی جان بچانے کو جھوٹ موٹ اظہار اسلام کرتا ہے) اس طور پر کہ تم دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو، کیونکہ خدا کے پاس (یعنی انکے علم و قدرت میں تمہارے لئے) بہت غنیمت کے مال ہیں (جو تم کو جائز طریقوں سے ملیں گے اور یاد تو کرو کہ) پہلے (ایک زمانہ میں) تم بھی ایسے ہی تھے (کہ تمہارے اسلام کے قبول کا مدار صرف تمہارا دعویٰ و اظہار تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا (کہ اس ظاہری اسلام پر اکتفا کیا گیا اور دلی جستجو پر موقوف نہ رکھا) سو (ذرا) غور (تو) کرو بیشک اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (کہ بعد اس حکم کے کون اس پر عمل کرتا ہے کون نہیں کرتا تو اب میں) برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں (یعنی جہاد میں نہ جاویں) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے (یعنی مالوں کو خرچ کرکے اور جانوں کو حاضر کرکے) جہاد کریں (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے اور (یوں بوجہ فرض عین نہ ہونے کے گناہ ان بیٹھنے والوں پر بھی نہیں بلکہ بوجہ ایمان اور دوسرے فرائض عین کے بجالانے کے) سب سے (یعنی مجاہدین سے بھی قاعدین سے بھی) اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا (یعنی جنت کا جو آخرت میں ہے) وعدہ کر رکھا ہے اور (اوپر جو اجمالاً کہا گیا ہے کہ مجاہدین کا بڑا درجہ ہے اس کی تعیین یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مجاہدین (مذکورین) کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجر عظیم دیا ہے، (وہ درجہ یہی اجر عظیم ہے اس اجمال کی تفصیل فرماتے ہیں) یعنی (بوجہ اعمال کثیرہ کے جو مجاہد سے صادر ہوتے ہیں ثواب کے) بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور (گناہوں کی) مغفرت اور رحمت (یہ سب اجر عظیم کی تفصیل ہوئی) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں

معارف ومسائل

ربطِ آیات: پچھلی آیت میں قتل مومن پر سخت وعید فرمائی ہے، آگے یہ فرماتے ہیں کہ احکامِ شرعیہ کے جاری ہونے میں مومن کے مومن ہونے کے لئے صرف ظاہری اسلام کافی ہے، جو شخص اسلام کا اظہار کرے اس کے قتل سے ہاتھ روکنا واجب ہے، اور محض شک وشبہ کی وجہ سے باطن کی تفتیش کرنا اور احکامِ اسلامیہ کے جاری کرنے میں اس کے یقینی ایمان کے ثبوت کا منتظر رہنا جائز نہیں، جیسا بعض صحابہؓ سے بعض غزوات میں اس قسم کی لغزش واقع ہوئی کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، لیکن بعض حضرات صحابہؓ نے ان کی علاماتِ اسلام کو کذب پر محمول کرکے قتل کر ڈالا اور مقتول کا مال غنیمت میں لے لیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا انسداد فرمایا، اور چونکہ اس وقت تک صحابہؓ کو یہ مسئلہ واضح طور پر معلوم نہ تھا، اس لئے صرف فہمائش پر اکتفاء کیا اور اس فعل پر اُن کے لئے کوئی وعید نازل نہیں فرمائی (بیان القرآن)

مسلمان سمجھنے کے لئے علاماتِ اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش کرنا جائز نہیں۔ مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ بغیر تحقیق کے اس کے قول کو نفاق پر محمول کرے، اس آیت کے نزول کا سبب کچھ ایسے واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کرامؓ سے اس بارہ میں لغزش ہوگئی تھی۔

چنانچہ ترمذی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک آدمی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ملا، جب کہ یہ حضرات جہاد کے لئے جا رہے تھے، یہ آدمی اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس نے حضراتِ صحابہؓ کو سلام کیا، جو عملاً اس چیز کا اظہار تھا کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرامؓ نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان ومال بچانے کے لئے یہ فریب کیا ہے، کہ مسلمانوں کی طرح سلام کرکے ہم سے بچ نکلے چنانچہ انھوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اس کی بکریوں کو مالِ غنیمت قرار دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اسلامی طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے، اور اس کے مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر حاصل نہ کرو (ابن کثیر)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک دوسری روایت ہے جسکو بخاری نے مختصر اور بزار نے مفصلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ مجاہدین کا بھیجا جس میں حضرت مقداد بن اسودؓ بھی تھے، جب وہ موقع پر پہنچے تو سب لوگ بھاگ گئے، صرف ایک شخص رہ گیا جس کے پاس بہت مال تھا، اس نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کہا: أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، مگر حضرت مقدادؓ نے یہ سمجھ کر کہ دل سے نہیں کہا، بلکہ محض جان و مال بچانے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ رہا ہے اس کو قتل کر دیا، حاضرین میں سے ایک صحابیؓ نے کہا کہ آپ نے برا کیا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دی تھی، میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو اس واقعہ کا ضرور ذکر کروں گا، جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا، آپ نے حضرت مقدادؓ کو بلا کر سخت تنبیہ فرمائی، اور فرمایا کہ بروز قیامت تمہارا کیا جواب ہوگا، جب کلمہ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تمہارے مقابلہ میں دعویدار ہوگا، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقٰى إِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔

مذکورہ آیت کے بارہ میں ان دو واقعات کے علاوہ دوسرے واقعات بھی منقول ہیں، لیکن محققین اہل تفسیر نے فرمایا کہ ان روایات میں تعارض نہیں ہو سکتا، کہ یہ چند واقعات مجموعی حیثیت سے نزول کا سبب ہوئے ہوں۔

آیت کے الفاظ میں أَلْقٰى إِلَيْكُمُ السَّلٰمَ ارشاد ہے، اس میں لفظ "سلام" سے اگر اصطلاحی سلام مراد لیا جائے تب تو پہلا واقعہ اس کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، اور اگر سلام کے لفظی معنی سلامت و اطاعت کے لئے جائیں تو یہ سب واقعات اس میں برابر ہیں، اسی لئے اکثر حضرات نے "سلام" کا ترجمہ اس جگہ اطاعت کا کیا ہے۔

واقعہ کی تحقیق کے بغیر فیصلہ کرنا جائز نہیں

اس آیت کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام بے تحقیق محض گمان پر نہ کریں، ارشاد ہے إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوا، یعنی جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو، محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے، اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذکر کی گئی کہ یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے، یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے، ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "سوچ سمجھ کر

کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے" (بحر محیط)

دوسرے جملہ یعنی تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں اسی روگ کی اصلاح ہے، جو اس غلطی پر اقدام کرنے کا باعث ہوا، یعنی دنیا کی دولت اور غنیمت حاصل ہونے کا خیال، آگے یہ بھی بتلا دیا کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے اموالِ غنیمت بہت سے مقرر اور مقدر کر رکھے ہیں، تم ان کی فکر میں نہ پڑو، اس کے بعد ایک اور تنبیہ فرمائی کہ ذرا اس پر بھی تو نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اسلام و ایمان کا اعلان نہیں کر سکتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ کفار کے نرغہ سے نجات دیدی تو اسلام کا اظہار کیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکر اسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقۃً پہلے سے اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اسلامی لشکر کو دیکھ کر اظہار کیا، یہ کہ شروع میں جب تم نے کلمۂ اسلام کو پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہا تو اس وقت تمہیں مسلمان قرار دینے کے لئے شریعت نے یہ قید نہیں لگائی تھی کہ تمہارے دلوں کو ٹٹولیں اور دلوں میں اسلام کا ثبوت ملے تب تمہیں مسلمان قرار دیں، بلکہ صرف کلمۂ اسلام پڑھ لینے کو تمہارے مسلمان قرار دینے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا، اسی طرح اب جو تمہارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے اس کو بھی مسلمان سمجھو۔

اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب

اس آیت کریمہ سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہو وہ کلمہ پڑھتا ہو یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہوگا، فرض کرلو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا لَا نُكَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ، "یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے، بعض روایات حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو، خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بدعمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن وحدیث

سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے اس وقت تک اس کے اقرار اسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اخلاص یا نفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔

لیکن جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلماتِ کفر بھی بکتا ہے، یا کسی بُت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے، یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا وغیرہ، وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائیگا، آیت مذکورہ میں لفظ فَتَبَيَّنُوْا سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ یہود و نصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مومن مسلمان کہتے تھے، اور مسیلمہ کذاب جس کو باجماع صحابہؓ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمۂ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحب وحی کہتا تھا، جو نصوص قرآن و سنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بناء پر اس کو مرتد قرار دیا گیا، اور اس کے خلاف باجماع صحابہؓ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہو گیا کہ ہر کلمہ گو اہل قبلہ کو مسلمان سمجھو اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے؟ اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلافِ ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو بشرطیکہ اس کا خلافِ ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو، اور اس میں کوئی دوسرے احتمال یا تاویل کی راہ نہ ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ "کلمہ گو" یا "اہل قبلہ" یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعیِ اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول و فعل کا مرتکب نہ ہو۔

جہاد سے متعلق چند احکام دوسری آیت یعنی لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں چند احکام جہاد کو بیان کیا گیا ہے، اول یہ کہ جو لوگ بغیر کسی معذوری کے شریکِ جہاد نہیں ہوتے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو غیر مجاہدین پر درجہ میں فضیلت و برتری

دی ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق یعنی مجاہدین و غیر مجاہدین سے اچھی جزاء کا وعدہ کیا ہوا ہے، جنّت و مغفرت دونوں کو حاصل ہوں گی، فرق درجات کا رہے گا۔

علماءِ تفسیر نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے کہ بعض لوگ اس کو ادا کریں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ جو لوگ جہاد میں مشغول ہیں وہ اُس جہاد کے لئے کافی ہوں، اور اگر وہ کافی نہیں تو ان کے قرب و جوار کے مسلمانوں پر فرضِ عین ہو جائے گا کہ مجاہدین کی مدد کریں۔

فرضِ کفایہ کی تعریف فرضِ کفایہ شریعت میں ایسے ہی فریضہ کو کہا جاتا ہے جن کی ادائیگی ہر فردِ مسلم پر ضروری نہیں بلکہ بعض کا کر لینا کافی ہے، در عموماً قومی اور اجتماعی کام اسی درجہ میں ہیں، علومِ دینیہ کی تعلیم و تبلیغ بھی ایسا ہی فرض ہے کچھ لوگ اس میں مشغول ہوں اور وہ کافی بھی ہوں تو دوسرے مسلمان اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، لیکن جہاں کوئی بھی مشغول نہ ہو تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین بھی ایک قومی چیز ہے، کہ ایک بھائی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا حق ادا کرتا ہے، اور اس کا حکم بھی یہی ہے، مساجد اور مدارس بنانا اور دوسرے رفاہِ عامہ کے کام سرانجام دینا اسی حکم میں داخل ہیں، یعنی بعض مسلمان کر لیں تو باقی سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر وہ احکام جو اجتماعی اور قومی ضرورتوں سے متعلق ہیں، ان کو شریعتِ اسلام نے فرضِ کفایہ ہی قرار دیا ہے تاکہ تقسیمِ عمل کے اصول پر تمام فرائض کی ادائیگی ہو سکے، کچھ لوگ جہاد کا کام انجام دیں، کچھ تعلیم و تبلیغ کا، کچھ دوسری اسلامی یا انسانی ضروریات مہیا کرنے کا۔

اس آیت میں وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى فرما کر ان لوگوں کو بھی مطمئن فرما دیا ہے جو جہاد کے علاوہ دوسری دینی ضرورتوں میں مشغول ہیں، لیکن یہ حکم عام حالات میں ہے، جبکہ کچھ لوگوں کا جہاد اسلام کے دشمنوں کی مدافعت کے لئے کافی ہو، اور اگر ان کا جہاد کافی نہ رہے ان کو مزید کمک کی ضرورت ہو تو اول قرب و جوار کے مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے آس پاس کے لوگوں پر فرضِ عین ہو جاتا ہے اور وہ بھی کافی نہ رہیں تو دوسرے مسلمانوں پر یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس میں شریک ہو۔

تیسری آیت میں بھی انہی درجاتِ فضیلت کا بیان ہے، جو مجاہدین کو دوسروں پر حاصل ہیں۔

مسئلہ: لنگڑے لولے، اندھے، بیمار اور دیگر معذورِ شرعی لوگوں پر جہاد فرض نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ

وہ لوگ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ وہ برا کر رہے ہیں اپنا، کہتے ہیں ان سے

كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ

تم کس حال میں تھے، وہ کہتے ہیں ہم تھے بے بس اس ملک میں، کہتے ہیں فرشتے کیا نہ

تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ

تھی زمین اللہ کی کشادہ جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں، سو ایسوں کا

مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ

ٹھکانا ہے دوزخ اور وہ بہت بری جگہ پہنچے، مگر جو ہیں بے بس

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً

مردوں اور عورتوں اور بچوں میں سے جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر

وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ

اور نہ جانتے ہیں کہیں کا رستہ، سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ معاف

عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾ وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ

کرے اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا، اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی

اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن

راہ میں پاوے گا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش، اور جو کوئی

يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ

نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ اور رسول کی طرف پھر آپکڑے اس کو

الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٠﴾ ع

موت تو مقرر ہو چکا اس کا ثواب اللہ کے ہاں، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔

ع ۱۴/۱۱

خلاصۂ تفسیر

بیشک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنھوں نے باوجود قدرت ہجرت کے پھر ہجرت کے ترک ہونے سے اپنے کو گنہگار کر رکھا تھا تو اس وقت (وہ فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دین کے) کس کام میں تھے یعنی دین کے کیا کیا ضروری کام کیا کرتے تھے وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنی بود و باش کی) سرزمین میں محض مغلوب تھے (اس سے بہت سی ضروریات دین پر عمل نہ کر سکتے تھے یعنی ان فرائض کے ترک میں معذور رہے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہ کر سکتے تھے تو) کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کر کے اس (زمین) کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جانا چاہئے تھا (اور وہاں جا کر فرائض کو ادا کر سکتے تھے، اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور جرم ان کا ثابت ہو جاوے گا) سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کے لئے وہ بُری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے (واقع میں ہجرت پر بھی) قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ راستہ سے واقف ہیں سو ان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے مغفرت کرنے والے ہیں اور (جن لوگوں کے لئے ہجرت مشروع ہے ان میں سے) جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے لئے) ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور (اظہار دین کی) بہت گنجائش ملے گی، پس اگر ایسی جگہ پہنچ گیا تو دنیا میں بھی اس سفر اور اظہار سے کامیابی ظاہر ہے، اور اگر اتفاق سے یہ مذکورہ کامیابی نہ ہوئی تب بھی آخرت کی کامیابی میں تو کوئی تردد نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ و رسول کے دین کے ظاہر کر سکنے کے موقع کی طرف ہجرت کروں گا پھر (مقصد کے حاصل کرنے سے پہلے) اس کو موت آپکڑے، تب بھی اس کا ثواب (جس کا وعدہ ہجرت کرنے پر ہے) ثابت ہو گیا (اور وعدہ کی وجہ سے ایسا ہے جیسے) اللہ کے ذمہ (گو ابھی اس سفر کو ہجرت نہیں کہہ سکتے، لیکن صرف اچھی نیت سے اس کے شروع کر دینے پر پورا صلہ عطا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (اس ہجرت کی برکت سے گو وہ ناتمام رہے بہت سے گناہ معاف فرما دیں گے جیسا حدیث میں ہجرت کی فضیلت آئی ہے کہ ہجرت سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں) اور بڑے رحمت والے ہیں (کہ عمل کو اچھی نیت سے شروع کرنے ہی سے عمل کے پورا ہونے کے برابر ثواب عنایت فرماتے ہیں)

معارف ومسائل

ہجرت کی تعریف ان چند آیتوں میں ہجرت کے فضائل، برکات اور احکام کا بیان ہے لغت میں ہجرت، ہجران اور ہجر کے معنی ہیں کسی چیز سے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ دینا، اور محاوراتِ عامہ میں ہجرت کا لفظ ترکِ وطن کرنے کیلئے بولا جاتا ہے، اصطلاحِ شرع میں دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں (روح المعانی)

اور ملّا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا کہ کسی وطن کو دینی وجوہ کی بناء پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے (مرقاۃ، صفحہ ۳۹ جلد ۱)

سورۂ حشر کی آیت اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ، جو مہاجرین صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہونے والے مسلمان جو دارالکفر سے بیزاری کے سبب باختیار خود اس طرف آئے ہیں یا جن کو غیرمسلموں نے محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیا ہے، یہ سب لوگ شرعی معنی کے اعتبار سے مہاجر ہیں، البتہ جو تجارتی ترقی یا ملازمت کی سہولتوں کی نیت سے منتقل ہوئے وہ شرعاً مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں۔

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ وَرَسُوْلُهٗ	یعنی مہاجر وہ ہے جو اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔

سو اس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ	یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں۔

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذاء نہ پہونچائے، اسی طرح سچا اور کامیاب مہاجر وہی ہے جو صرف ترکِ وطن کر کے فارغ نہ ہو جائے، بلکہ جتنی چیزیں شریعت نے حرام و ناجائز قرار دی ہیں ان سب کو بھی چھوڑ دے ؎
اپنے دل کو بھی بدل جامۂ احرام کے ساتھ

ہجرت کے فضائل قرآن کریم میں جس طرح جہاد کے متعلق آیات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح ہجرت کا ذکر بھی قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں متعدد مرتبہ آیا ہے، سب آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات ہجرت میں تین قسم کے مضامین ہیں، اول ہجرت کے فضائل، دوسرے اس کی دنیوی اور اخروی برکات، تیسرے **باوجود قدرت کے دارالکفر سے ہجرت نہ کرنے پر وعیدیں۔**

پہلے مضمون یعنی ہجرت کے فضائل کی ایک آیت سورۂ بقرہ میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

"بیشک وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔"

دوسری آیت سورۂ توبہ میں ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑے درجہ میں ہیں، اور یہی لوگ کامیاب بامراد ہیں۔"

اور تیسری آیت یہی سورۂ نساء کی ہے:

وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ

"یعنی جو شخص اللہ اور رسول کے لئے اپنے گھر سے بہ نیت ہجرت نکل کھڑا ہوا پھر اس کو راستہ ہی میں موت آگئی تو اس **کا ثواب اللہ کے ذمہ ہوگیا۔**"

یہ آیت بعض روایات کے مطابق حضرت خالد بن حزامؓ کے بارے میں ہجرت حبشہ کے زمانہ میں نازل ہوئی، یہ حضرت حبشہ کی طرف ہجرت کی نیت پر نکلے تھے، راستہ میں ان کو سانپ نے کاٹ لیا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی، بہرحال ان تینوں آیتوں میں دارالکفر سے ہجرت کی ترغیب اور اس کے بڑے فضائل کا بیان واضح طور پر آگیا۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا "یعنی ہجرت ان سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔"

ہجرت کی برکات برکات کے متعلق سورۂ نحل کی ایک آیت میں ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

"یعنی جن لوگوں نے اللہ کے لئے ہجرت کی بعد اس کے کہ اُن پر ظلم کیا گیا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش یہ لوگ سمجھ لیتے۔"

سورۂ نساء کی چار آیتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں ان میں سے چوتھی آیت کا بھی تقریباً یہی مضمون ہے جس میں ارشاد ہے:

وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ

"یعنی جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ پائے گا زمین میں جگہ بہت اور کشائش۔"

آیت کا لفظ مُرَاغَم مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونا، اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مراغم کہہ دیا جاتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں ہجرت کی برکات ظاہرہ و باطنہ کا بیان ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسولؐ کے لئے ہجرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا میں راہیں کھول دیتے ہیں اور اس کو دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیتے ہیں اور آخرت کے ثواب و درجات تو وہم و گمان سے بالاتر ہیں۔

اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاہدؒ نے رزقِ حلال سے اور حسن بصریؒ نے عمدہ مکان سے اور بعض دوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزت و شرف سے کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان، وطن کی عزت و شرف سے زیادہ عزت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عراقی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لئے اپنے وطن مصر کو چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر وطن ملک شام کا عطا فرمایا، اور پھر مصر بھی ان کو مل گیا، ہمارے آقا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اللہ و رسولؐ کے لئے مکہ کو چھوڑا تو مہاجرین

کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہو، ہر طرح کی عزت و غلبہ اور راحت و ثروت عطا ہوئی، ہجرت کے ابتدائی دور میں چند روزہ تکلیف و مشقت کا اعتبار نہیں، اس عبوری دور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں اور ان کی کئی نسلوں میں جاری رہیں اسی کا اعتبار ہوگا۔

صحابۂ کرامؓ کے فقر و فاقہ کے جو واقعات تاریخ میں مشہور ہیں وہ عموماً ہجرت کے ابتدائی دور کے ہیں، یا وہ فقر اختیاری کے ہیں کہ انھوں نے دنیا و مال و دولت کو پسند ہی نہیں کیا، اور جو حاصل ہوا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حال یہی تھا، کہ آپؐ کا فقر و فاقہ محض اختیاری تھا، آپؐ نے غنا و مالداری کو اختیار نہیں فرمایا، اور اس کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال میں فتح خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اہل و عیال کے گذارہ کا کافی انتظام ہوگیا تھا، اسی طرح خلفائے راشدینؓ میں سب کا یہی حال تھا، کہ مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا تھا لیکن اسلامی ضرورت پیش آنے پر حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے گھر کا پورا مال لاکر پیش کر دیا، اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ کو جو کچھ وظیفہ ملتا وہ سب فقراء و مساکین میں تقسیم کرکے خود فقیرانہ زندگی گذارتی تھیں، اسی وجہ سے ان کا لقب اُمّ المساکین ہوگیا تھا، اور اس کے باوجود غنی صحابہؓ جنھوں نے بڑی مقدار میں مال و جائداد چھوڑی ان کی مقدار بھی صحابۂ کرامؓ میں کم نہیں، بہت سے حضرات صحابہؓ ایسے بھی تھے جو اپنے وطن مکہ مکرمہ میں مفلس و نادار تھے، ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت اور ہر طرح کی رفاہیت عطا فرمائی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایک صوبہ کے والی بنا دیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ تازہ کرتے تھے، اور اپنے نفس کو خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ ابوہریرہ، تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا، اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی، اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو تو پیدل ان کے ساتھ چلے، اور جب وہ کسی منزل پر اتریں تو تو ان کے لئے جلانے کی لکڑیاں جمع کر لائے، آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا، تجھ کو امام اور امیر المؤمنین کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ مہاجرین کے لئے قرآن میں فرمایا ہے اس کو دنیا نے پورا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، البتہ اس آیت میں شرط یہ ہے کہ ھَاجَرَ فِی اللّٰہِ کے مصداق ہوں، دنیا کے مال و دولت یا حکومت و سلطنت

یا عزت وجاہ کی طلب میں ہجرت نہ کی ہو، ورنہ صحیح بخاری کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو ان کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لئے ہے، یعنی یہ صحیح ہجرت ہے، جس کے فضائل و برکات قرآن میں مذکور ہیں، اور جس شخص نے کسی مال کی طلب یا کسی عورت کے نکاح کے خیال سے ہجرت کی ہو تو اس کی ہجرت کا معاوضہ وہی چیز ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

آج جو بعض مہاجرین پریشان حال ہیں یا تو ابھی وہ اس عبوری دور میں ہیں جس میں ابتدائی ہجرت کے وقت پریشانی پیش آیا کرتی ہے، یا پھر وہ صحیح معنی میں مہاجر نہیں ان کو اپنی نیت اور حال کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہئے، نیت اور عمل کی اصلاح کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی سچائی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا

اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں کہ کچھ کم کرو

مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ

نماز میں سے اگر تم کو ڈر ہو کہ ستاویں گے تم کو کافر البتہ

الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ

کافر تمہارے صریح دشمن ہیں اور جب تو ان میں موجود ہو

فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ

پھر نماز میں کھڑا کرے تو چاہئے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ

وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ

اور ساتھ لیویں اپنے ہتھیار پھر جب یہ سجدہ کریں تو ہٹ جاویں تیرے

وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا

پاس سے اور آوے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ نماز پڑھیں

مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ

تیرے ساتھ اور ساتھ لیویں اپنا بچاؤ اور ہتھیار کافر چاہتے ہیں

كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ

کسی طرح تم بے خبر ہو اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ

عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ

تم پر حملہ کریں یکبارگی ، اور تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم کو

اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ

تکلیف ہو مینھ سے یا تم بیمار ہو کہ اتار رکھو اپنے ہتھیار

وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

اور ساتھ لے لو اپنا بچاؤ بیشک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے عذاب ذلت کا

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا

پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے

وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ

اور لیٹے پھر جب خوف جاتا رہے تو درست کرو نماز کو بیشک

الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا

نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں اور ہمت نہ ہارو

فِي ابْتِغَاۗءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ

ان کا پیچھا کرنے سے ، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں

كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ

جس طرح تم ہوتے ہو اور تم کو اللہ سے امید ہے جو ان کو نہیں اور اللہ

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب تم زمین میں سفر کرو (جس کی مقدار تین منزل ہو)، سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا (بلکہ ضروری ہے) کہ تم (ظہر اور عصر اور عشاء کے فرض) نماز (کی رکعات) کو کم کردو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو) اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے (اور اس اندیشہ کی وجہ سے ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا جاوے، کیونکہ) بلا شبہ

کافر لوگ تمہارے صریح دشمن ہیں، اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں (اور اسی طرح
آپ کے بعد اور جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز
میں لگ جائیں گے تو کوئی دشمن موقع پاکر حملہ کر بیٹھے گا) تو (ایسی حالت میں یوں چاہئے کہ
جماعت کے دو گروہ ہو جائیں پھر) ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں)
کھڑے ہو جائیں (اور دوسرا گروہ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑا رہے تاکہ دشمن کو
دیکھتا رہے) اور وہ لوگ (جو آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہیں وہ بھی مختصر مختصر) ہتھیار
لے لیں (یعنی نماز سے پہلے لے کر ہمراہ رکھیں شاید مقابلہ کی ضرورت پڑ جاوے تو ہتھیار
لینے میں دیر نہ لگے۔ فوراً قتال کرنے لگیں، گو نماز قتال سے ٹوٹ جاوے گی، لیکن گناہ نہیں)
پھر جب یہ لوگ (آپ کے ساتھ) سجدہ کر چکیں (یعنی ایک رکعت پوری کر لیں) تو یہ لوگ
(نگہبانی کے لئے) تمہارے پیچھے ہو جاویں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور دوسرے
گروہ کے جو کہ اب نماز میں شامل ہوں گے جن کا بیان آگے آتا ہے، یہ پہلا گروہ ان سب کے
پیچھے ہو جاوے) اور دوسرا گروہ جنھوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی (یعنی شروع بھی نہیں کی
وہ اس پہلے گروہ کی جگہ امام کے قریب) آجاوے اور آپ کے ساتھ نماز (کی ایک رکعت
جو باقی رہی ہے اس کو) پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لیں
(اور سامان اور ہتھیار ہمراہ لینے کا اس لئے سب کو حکم کیا ہے کہ) کافر لوگ یوں چاہتے ہیں
کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو تم پر ایک بارگی حملہ کر بیٹھیں،
(سو ایسی حالت میں احتیاط ضروری ہے) اور اگر تم کو بارش (وغیرہ) کی وجہ سے (ہتھیار
لے کر چلنے میں) تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اور اس وجہ سے ہتھیار باندھ نہیں سکتے) تو تم کو
اس میں (بھی) کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور (پھر بھی) اپنا بچاؤ (ضرور) لے لو،
(اور یہ خیال نہ کرو کہ کفار کی دشمنی کا صرف دنیا ہی میں علاج کیا گیا ہے بلکہ آخرت
میں اس سے بڑھ کر ان کا علاج ہوگا کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزائے
اہانت آمیز مہیا کر رکھی ہے، پھر جب تم نماز (خوف) کو ادا کر چکو تو (بدستور) اللہ
تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی (یعنی ہر حالت میں حتیٰ کہ
عین لڑائی کے وقت بھی اللہ کا ذکر جاری رکھو دل سے بھی اور احکام شرعیہ کے اتباع سے
بھی کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے، لڑائی میں خلاف شرع کوئی کارروائی کرنے سے پرہیز
کرو، غرض نماز تو ختم ہوئی ذکر ختم نہیں ہوتا، سفر یا خوف کی وجہ سے نماز میں تو تخفیف
ہو گئی تھی، لیکن ذکر اپنی حالت پر ہی ہے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ (یعنی سفر ختم کر کے

مقیم ہو جاؤ، اور اسی طرح خوف کے ختم ہونے کے بعد بے خوف ہو جاؤ، تو نماز کو اصلی قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو (یعنی قصر اور نماز میں مشی وغیرہ چھوڑ دو، کیونکہ وہ بوجہ عارض کے جائز رکھا گیا تھا) یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے (پس فرض ہونے کی وجہ سے ادا کرنا ضروری اور وقت کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے وقت ہی میں ادا کرنا ضروری ہوا، اس لئے کچھ کچھ اس کی شکل و صورت میں تبدیلی کر دی گئی، ورنہ نماز کی صورت مقصودہ وہی اصلی صورت ہے، پس سبب ختم ہونے کے بعد نماز کی اصلی صورت کی حفاظت لازم ہو گئی) اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں (جبکہ اس کی ضرورت ہے) اگر تم (زخموں سے) تکلیف میں مبتلا ہو تو (کیا ہوا) وہ بھی تو (ایسی تکلیف میں) مبتلا ہیں جیسے تم (زخموں میں) مبتلا ہو، تو وہ تم سے زیادہ قوت نہیں رکھتے پھر کاہے کو ڈرتے ہو) اور (تم میں ایک زیادتی ان سے یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ ان کی امید نہیں رکھتے (یعنی ثواب، تو دل کی قوت میں تم زیادہ ہوئے، اور ضعف بدن میں ایک جیسے تو تم کو زیادہ پست ہونا چاہئے) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (ان کو کفار کا کمزور دل اور کمزور بدن معلوم ہے) بڑے حکمت والے ہیں (تمہاری قوت برداشت زائد حکم نہیں فرمایا)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات اوپر جہاد اور ہجرت کا ذکر تھا، چونکہ غالب احوال میں جہاد و ہجرت کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے، اور ایسے سفر میں مخالف کی طرف سے اندیشہ بھی اکثر ہوتا ہے، اس لئے سفر اور خوف کی رعایت سے جو نماز میں بعض خاص سہولتیں اور تخفیفیں کی گئی ہیں، آگے ان کا ذکر فرماتے ہیں۔

سفر اور قصر کے احکام **مسئلہ:** جو سفر تین منزل سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے۔

مسئلہ: اور جب سفر ختم کر کے منزل پر جا پہنچے تو اگر وہاں پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تب تو وہ بحکم سفر میں ہے، فرض نماز چار رکعت والی آدھی پڑھی جائے گی، اور اسکو قصر کہتے ہیں، اور اگر پندرہ روز یا زیادہ کا رہنے کا ایک ہی بستی میں ارادہ ہو، تو وہ وطنِ اقامت ہو جائے گا وہاں بھی وطنِ اصلی کی طرح قصر نہیں ہو گا، بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔

مسئلہ: قصر صرف تین وقت کے فرائض میں ہے، اور مغرب اور فجر میں اور سنن و وتر میں نہیں ہے۔

مسئلہ: سفر میں خوف نہ ہو تو بھی قصر نماز پڑھی جائے گی۔

مسئلہ: بعض لوگوں کو پوری نماز کی جگہ قصر پڑھنے میں دل میں گناہ کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ قصر بھی شریعت کا حکم ہے جس کی تعمیل پر گناہ نہیں ہوتا، بلکہ ثواب ملتا ہے۔

مسئلہ: آیت میں جو وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ، یعنی جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں، اس سے یہ نہ سمجھ جائے کہ اب صلوٰۃ خوف کا حکم باقی نہیں رہا کیونکہ آپ کی ذات بابرکات اب ہم میں موجود نہیں، اس لئے کہ یہ شرط اس وقت کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے، کیونکہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا آدمی بلا عذر کے امام نہیں بن سکتا، آپ کے بعد اب جو امام ہو وہی آپ کے قائم مقام ہے، وہی صلوٰۃِ خوف پڑھائے گا، تمام ائمہ کے نزدیک صلوٰۃ خوف کا حکم آپ کے بعد بھی جاری ہے منسوخ نہیں ہوا۔

مسئلہ: جیسے آدمی کے خوف کے وقت صلوٰۃِ خوف پڑھنا جائز ہے، ایسے ہی اگر کسی شیر یا اژدہا وغیرہ کا خوف ہو اور نماز کا وقت تنگ ہو اس وقت بھی جائز ہے۔

مسئلہ: آیت میں دونوں گروہ کے ایک ایک رکعت پڑھنے کا تو ذکر فرمایا دوسری رکعت کا طریقہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو دونوں گروہ نے اپنی ایک ایک رکعت بطور خود پڑھ لی، مزید تفصیل احادیث میں ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

بیشک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾

جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا

اور بخشش مانگ اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے　　اور مت

تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا

مت جھگڑ ان کی طرف سے جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں اللہ کو پسند نہیں

يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿۱۰۷﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ

جو کوئی ہو دغاباز گنہگار، شرماتے ہیں لوگوں سے

وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ

اور نہیں شرماتے اللہ سے اور وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ مشورہ کرتے ہیں

مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿۱۰۸﴾

رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے،

هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا قف

سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں،

فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ

پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے دن یا کون

يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ

ہوگا ان کا کارساز، اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا برا

نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۱۰﴾

کرے پھر اللہ سے بخشوا دے تو پاوے اللہ کو بخشنے والا مہربان،

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ

اور جو کوئی کرے گناہ سو کرتا ہے اپنے ہی حق میں اور اللہ

اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور جو کوئی کرے خطا یا گناہ

ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿۱۱۲﴾ ع

پھر تہمت لگادے کسی بے گناہ پر اس نے سر دھرا طوفان اور گناہ صریح،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ

اور اگر نہ ہوتا تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر ہی چکی تھی ان میں ایک جماعت

۱۶ ع ۸ ۱۲

فرمایئے (کہ آپ کی شان عظیم ہے اتنا امر بھی آپ کے لئے قابل استغفار ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے
مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جوابدہی
کی بات نہ کیجئے (جیسا وہ لوگ آپ سے چاہتے تھے) جو کہ (دوسروں کی خیانت اور نقصان کرکے
باعتبار وبال و ضرر کے درحقیقت) اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے
شخص کو نہیں چاہتے (بلکہ اس کو مبغوض رکھتے ہیں) جو بڑا خیانت کرنیوالا بڑا گناہ کرنیوالا ہو (جیسا کہ
تھوڑے خیانت کرنے والے کو بھی محبوب نہیں رکھتے، لیکن چونکہ بشیر کا بڑا خائن ہونا بتلانا
مقصود ہے اس لئے یہ صیغہ مبالغہ کا لایا گیا) جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ (اپنی خیانت کو) آدمیوں
سے تو شرما کر (چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ (مثل ہر وقت کے)
اس وقت (بھی) ان کے پاس ہے جب کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو کے متعلق
تدبیریں کیا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے (علمی) احاطہ میں لئے ہوئے
ہیں ہاں جو بشیر وغیرہ کی حمایت میں بعض اہل محلہ جمع ہو کر آئے تھے وہ سن لیں کہ) تم ایسے ہو
کہ تم نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جوابدہی کی باتیں کرلیں سو (یہ بتلاؤ کہ) خدا تعالیٰ
کے روبرو قیامت کے دن ان کی طرف سے کون جوابدہی کرے گا یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا
کام بنانے والا ہوگا یعنی نہ کوئی زبانی جوابدہی کر سکے گا نہ کوئی عملی درستی مقدمہ کی کر سکے گا،
اور یہ خائنین اگر اب بھی توبہ موافق قاعدہ شرعیہ کے کرلیتے تو معافی ہو جاتی کیونکہ ہمارا
قانون یہ ہے کہ) جو شخص کوئی (متعدی) برائی کرے یا (غیر متعدی) اپنی جان کا ضرر کرے (یعنی
ایسا گناہ کرے جس کا اثر دوسروں تک نہ پہنچتا ہو اور) پھر اللہ تعالیٰ سے (حسب قاعدہ
شرعیہ) معافی چاہے (جس میں بندوں کے حقوق کو ادا کرنا یا ان سے معاف کرانا بھی داخل ہے)
تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا اور (ضرور گنہگاروں کو اس کی کوشش کرنا چاہئے
کیونکہ) جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات ہی کے لئے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ
بڑے علم والے ہیں (سب کے گناہوں کی ان کو خبر ہے) بڑے حکمت والے ہیں (مناسب
سزا تجویز فرماتے ہیں) اور یہ تو خود گناہ کرنے کا نتیجہ ہوا اور جو کہ دوسروں پر
تہمت لگادے اس کا حال سنو کہ) جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ پھر (بجائے اس
کے کہ خود ہی توبہ کرلینا چاہئے تھی اس نے یہ کام کیا کہ) اس (گناہ) کی تہمت کسی بے گناہ
پر لگادی سو اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ اپنے (سر کے) اوپر لادلیا (جیسا
بشیر نے کیا کہ خود تو چوری کی اور ایک نیک بخت بزرگ آدمی لبید کے ذمہ چوری کی
تہمت رکھ دی) اور اگر (اس مقدمہ میں) آپ پر (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا فضل
اور رحمت نہ ہو (جو کہ ہمیشہ آپ پر رہتی ہے) تو ان (چور کے) لوگوں میں سے ایک گروہ نے

تو آپؐ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا کے فضل سے ان کی رنگ آمیز باتوں کا آپؐ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آئندہ بھی نہ ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں) اور وہ لوگ بھی آپؐ کو، غلطی میں نہیں ڈال سکتے، لیکن (اس ارادہ سے) اپنی جانوں کو (مبتلائے گناہ اور عذاب کئے) بنا رہے ہیں، اور آپؐ کو ذرہ برابر (اس قسم کا) ضرر نہیں پہنچا سکتے اور (آپؐ کو غلطی سے ضرر پہنچانا کب ممکن ہے جب کہ) اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں (جس کے ایک حصہ میں اس قصہ کی اطلاع بھی دیدی) اور آپؐ کو وہ وہ (غیبیہ اور علمی) باتیں بتلائی ہیں جو آپؐ (پہلے سے) نہ جانتے تھے اور آپؐ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات اوپر ظاہری کفار کے معاملات کے ضمن میں چند جگہ منافقین کا ذکر آیا ہے کہ کفر دونوں میں یکساں ہے، آگے بھی بعض منافقین کے ایک خاص قصہ کے متعلق مضمون مذکور ہوتا ہے (بیان القرآن)

آیات کا شانِ نزول مذکورہ سات آیات ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، لیکن عام قرآنی اسلوب کے مطابق جو ہدایات اس سلسلہ میں دی گئیں وہ مخصوص اس واقعہ کے ساتھ نہیں بلکہ تمام موجودہ اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لئے عام اور بہت اصولی اور فروعی مسائل پر مشتمل ہیں۔

پہلے واقعہ معلوم کیجئے، پھر اس سے متعلقہ ہدایات اور ان سے نکلنے والے مسائل پر غور کیجئے، واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ میں ایک خاندان بنو اُبیرق کے نام سے معروف تھا ان میں سے ایک شخص جس کا نام ترمذی اور حاکم کی روایت میں بشیر ذکر کیا گیا ہے اور بغویؒ اور ابن جریرؒ کی روایت میں طعمہ نام بتلایا گیا ہے، اس نے حضرت قتادہ بن نعمانؓ کے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں نقب لگا کر چوری کرلی۔

ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ شخص درحقیقت منافق تھا، مدینہ میں رہتے ہوئے بھی صحابہ کرامؓ کی توہین میں اشعار لکھ کر دوسروں کے ناموں سے ان کی اشاعت کیا کرتا تھا۔

اور چوری کی صورت یہ ہوئی کہ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان فقر و فاقہ کے ساتھ تنگی سے بسر اوقات کرتے تھے، اور ان کی عام خوراک جَو کا آٹا تھا یا کھجوریں

یا گیہوں کا آٹا جو بہت کم میسر تھا اور مدینہ میں ملتا بھی نہ تھا، ملک شام سے جب آتا تو کچھ لوگ مہمانوں کے لئے یا کسی خاص ضرورت کے لئے خرید لیا کرتے تھے، حضرت رفاعہؓ نے اسی طرح کچھ گیہوں کا آٹا خرید کر ایک بوری میں اپنے لئے رکھ لیا، اسی میں کچھ اسلحہ وغیرہ بھی رکھ کر ایک چھوٹی کوٹھڑی میں محفوظ کر دیا، ابن اُبیرق بشیر یا طعمہ نے اس کو بھانپ لیا، تو نقب لگا کر یہ بوری نکال لی۔ حضرت رفاعہؓ نے جب صبح کو یہ ماجرا دیکھا تو اپنے بھتیجے قتادہؓ کے پاس آئے اور واقعہ چوری کا ذکر کیا، سب نے مل کر محلہ میں تفتیش شروع کی بعض لوگوں نے بتایا کہ آج رات ہم نے دیکھا کہ بنو ابیرق کے گھر میں آگ روشن تھی ہمارا خیال ہے کہ وہی کھانا پکایا گیا ہے، بنو اُبیرق کو جب راز فاش ہونے کی خبر ملی تو خود آئے اور کہا کہ یہ کام لبید بن سہل کا ہے، حضرت لبیدؓ کو سب جانتے تھے کہ مخلص مسلمان اور نیک بزرگ ہیں ان کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ تلوار کھینچ کر آئے اور کہا کہ چوری میرے سر لگاتے ہو اب میں تلوار اس وقت تک میان میں نہ رکھوں گا جب تک چوری کی حقیقت واضح نہ ہو جائے۔

بنو اُبیرق نے آہستہ سے کہا کہ آپ بے فکر رہیں، آپ کا نام کوئی نہیں لیتا، نہ آپ کا یہ کام ہو سکتا ہے، بغویؒ اور ابن جریرؒ کی روایت میں اس جگہ یہ ہے کہ بنو اُبیرق نے چوری ایک یہودی کے نام لگائی اور ہوشیاری یہ کی کہ آٹے کی بوری کو تھوڑا سا پھاڑ دیا تھا جس سے آٹا گرتا رہا اور رفاعہ کے مکان سے یہودی مذکور کے مکان تک اس آٹے کے آثار پائے گئے شہرت ہونے کے بعد چوری کیا ہوا اسلحہ و زرہیں بھی اسی یہودی کے پاس رکھوا دیں، اور تحقیق کے وقت اسی کے گھر سے برآمد ہوئیں، یہودی نے قسم کھائی کہ زرہیں مجھے ابن اُبیرق نے دی ہیں۔

ترمذی کی روایت اور بغوی کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ بنو اُبیرق نے اولاً چوری کو لبید بن سہل کے نام لگایا ہو، پھر جب بات بنتی نظر نہ آئی تو اس یہودی کے سر ڈالا ہو، بہرحال اب معاملہ یہودی اور بنو اُبیرق کا بن گیا۔

ادھر حضرت قتادہؓ اور رفاعہؓ کو مختلف صورتوں سے یہ گمان غالب ہو گیا تھا کہ یہ کارروائی بنو اُبیرق کی ہے، حضرت قتادہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا واقعہ اور بسلسلۂ تفتیش بنو اُبیرق پر گمان غالب کا ذکر کر دیا۔

بنو اُبیرق کو خبر ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت رفاعہؓ اور قتادہؓ کی شکایت کی، کہ بلا ثبوت شرعی چوری ہمارے نام لگاتے ہیں، حالانکہ مسروقہ مال یہودی کے گھر سے برآمد ہوا ہے، آپ ان کو روک دیجئے کہ ہمارے نام نہ لگائیں یہودی پر دعویٰ کریں

ظاہری حالات و آثار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اسی طرف رجحان ہوگیا کہ یہ کام یہودی کا ہے، بنو اُبَیرق پر الزام صحیح نہیں، یہاں تک کہ بغوی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ہوگیا کہ یہودی پر چوری کی سزا جاری کردی جائے اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔

ادھر جب حضرت قتادہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ آپ بغیر دلیل اور ثبوت کے ایک مسلمان گھرانے پر چوری کا الزام لگاتے ہیں، حضرت قتادہؓ اس معاملہ سے بہت رنجیدہ ہوئے، اور افسوس کیا کہ کاش میں اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات نہ کرتا، اگرچہ میرا مال بھی جاتا رہتا اسی طرح حضرت رفاعہؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ارشاد فرمایا! تو انھوں نے بھی صبر کیا اور کہا وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔

اس معاملہ پر کچھ وقت نہ گزرا تھا کہ قرآن کریم کا ایک پورا رکوع اس بارے میں نازل ہوگیا جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعہ کی حقیقت منکشف کردی گئی اور ایسے معاملات کے متعلق عام ہدایات دی گئیں۔

قرآن کریم نے بنو اُبَیرق کی چوری کھول دی، اور یہودی کو بَری کردیا، تو بنو اُبَیرق مجبور ہوئے اور مال مسروقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا، آپؐ نے رفاعہ رضی اللہ عنہ کو واپس دلایا، اور انھوں نے یہ سب اسلحہ کو جہاد کے لئے وقف کردیا، ادھر جب بنو اُبَیرق کی چوری کھل گئی تو بشیر بن ابیرق مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا، اگر وہ پہلے سے منافق تھا تو اب کھلا کافر ہوگیا، اور اگر پہلے مسلمان تھا تو اب مرتد ہوگیا۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کے وبال نے بشیر بن ابیرق کو مکہ میں بھی چین سے نہ رہنے دیا، جس عورت کے مکان پر جاکر ٹھہرا تھا، اس کو واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے نکال باہر کیا، اسی طرح پھرتے پھرتے آخر اس نے ایک اور شخص کے مکان میں نقب لگائی، تو دیوار اس کے اوپر گر گئی، اور وہیں دب کر مر گیا۔

یہاں تک تو واقعہ کی پوری تفصیل تھی، اب اس کے متعلق قرآنی ارشادات پر غور کیجئے:

پہلی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چوری کے واقعہ کی اصل حقیقت بتلا کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپؐ پر قرآن اور وحی اسی لئے نازل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

جو علم و معرفت آپ کو عطا فرمایا ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں اور خائنوں کی یعنی بنو ابیرق کی طرف داری نہ کریں، اور اگرچہ ظاہری حالات اور قرائن کی بنا پر چوری کے معاملہ میں یہودی کی طرف آپ کا رجحان کوئی گناہ نہ تھا، مگر تھا تو واقعہ کے خلاف، اس لئے دوسری آیت میں آپ کو استغفار کا حکم دیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت بلند ہے ان سے اتنی بات بھی پسند نہیں۔

تیسری آیت (یعنی آیت ۱۰۷) میں پھر اس کی تاکید فرمائی کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے آپ کوئی جواب دہی نہ کریں، کیونکہ وہ اللہ کو پسند نہیں۔

چوتھی آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۸) میں ان خیانت کرنے والوں کے بُرے حال اور بیوقوفی کا بیان ہے، کہ یہ لوگ اپنے ہی جیسے آدمیوں سے تو شرماتے اور چوری کو چھپاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے، اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، خصوصاً اس واقعہ کو جب انھوں نے باہم مشورہ کرکے یہ رائے قائم کی کہ الزام یہودی پر لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفاعہؓ اور قتادہؓ کی شکایت کرو کہ بلا وجہ ہم پر الزام لگاتے ہیں، اور آپ سے اس کی درخواست کرو کہ آپ یہودی کے مقابلہ میں ہماری حمایت فرمائیں۔

پانچویں آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۹) میں بنو اُبیرق کی مدد کرنے والے حمایتیوں کو تنبیہ فرمائی گئی کہ دنیا میں تو تم نے ان کی حمایت کرلی، مگر معاملہ یہیں تو ختم نہیں ہو جاتا، قیامت میں جب حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی عدالت میں معاملہ پیش ہوگا وہاں کون حمایت کریگا، اس آیت میں ان کو ملامت بھی ہے اور آخرت کا خوف دلا کر اپنے فعل سے توبہ اور رجوع کی ترغیب بھی۔

چھٹی آیت (یعنی نمبر ۱۱۰) میں قرآن کریم کے عام اسلوب حکیمانہ کے مطابق مجرموں گنہگاروں کو ناامیدی سے بچانے کے لئے فرمایا گیا، کہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، جب گنہگار اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پاتا ہے، اس میں ان لوگوں کو جن سے یہ گناہ سرزد ہوا تھا اس کی ترغیب ہے کہ اب بھی باز آجائیں، اور دل سے توبہ کرلیں تو کچھ نہیں بگڑا، اللہ تعالیٰ سب معاف فرمائیں گے۔

ساتویں آیت (یعنی ۱۱۱) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اگر یہ لوگ اب بھی تائب نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ یا اس کے رسولؐ یا مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اس کا وبال خود اسی شخص پر ہے۔

آٹھویں آیت (یعنی ۱۱۲) میں ایک عام ضابطہ کی صورت ارشاد فرمایا کہ جو شخص

خود کوئی جرم کرے، اور پھر یہ جرم کسی بے قصور انسان کے ذمہ لگائے، (جیسا کہ اس واقعہ میں بنو اُبیرق نے چوری خود کی اور الزام حضرت لبیدؓ یا یہودی پر لگا دیا) تو اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لاد لیا۔

نویں آیت (یعنی نمبر ۱۱۳) میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت آپ کے ساتھ نہ ہوتی جس نے بذریعہ وحی آپ کو واقعہ کی حقیقت بتلا دی تو یہ لوگ آپ کو غلطی میں مبتلا کر دیتے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت آپ کے ساتھ ہے، اس لئے وہ ہرگز آپ کو غلطی میں نہیں ڈال سکتے، بلکہ خود ہی گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں، اور آپ کو یہ ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور دانشمندی کی باتیں نازل فرمائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ الخ اس آیت سے پانچ مسائل ثابت ہوئے، ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح وارد نہ ہو اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا، اور مہمات کے فیصلوں میں آپ بہت سے فیصلے اپنے اجتہاد سے بھی فرماتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجتہاد رائے وہی معتبر ہے جو قرآنی اصول اور نصوص سے ماخوذ ہو، خالص رائے، و خیال معتبر نہیں، اور نہ اس کو شریعت میں اجتہاد کہا جا سکتا ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح نہ تھا، جس میں غلطی اور خطاء کا احتمال ہمیشہ باقی رہتا ہے، بلکہ جب آپ کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے فرماتے تو اگر اس میں کوئی غلطی ہو جاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ کو متنبہ فرما کر آپ کے فیصلہ کو صحیح اور حق کے مطابق کرا دیتے تھے، اور جب آپ نے کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی چیز نہ آئی تو یہ علامت اس کی تھی کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو پسند اور اس کے نزدیک صحیح ہے۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ قرآن سے سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا سمجھایا ہوا ہوتا تھا، اس میں غلط فہمی کا امکان نہ تھا، بخلاف دوسرے علماء و مجتہدین کے کہ ان کا سمجھا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا ہے، جیسا کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ دیا ہے، اسی وجہ سے جب ایک شخص نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ کہا فَاحْكُمْ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ تو آپ نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جھوٹے مقدمہ اور جھوٹے دعوی کی پیروی یا وکالت کرنا یا اس کی تائید و حمایت کرنا سب حرام ہے۔

توبہ کی حقیقت

اور آیت نمبر ۱۱۰ یعنی وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ الخ سے یہ معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے، ہر قسم کا گناہ توبہ و استغفار سے معاف ہوسکتا ہے، البتہ توبہ و استغفار کی حقیقت جاننا ضروری ہے، محض زبان سے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ کہنے کا نام توبہ و استغفار نہیں ہے، اسی لئے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہے اس پر اس کو ندامت بھی نہیں، اور اس کو چھوڑا بھی نہیں یا آئندہ کے لئے چھوڑنے کا عزم نہیں کیا، اور اس حالت میں زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے تو یہ توبہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کے لئے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں: ایک گذشتہ گناہوں پر ندامت ہونا، دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے ان کو انہی سے معاف کرانا، یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔

اپنے گناہ کا الزام دوسرے پر لگانا دوگنے عذاب کا سبب ہے

اور آیت نمبر ۱۱۲ یعنی وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۤـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ الخ سے معلوم ہوا کہ جو شخص گناہ خود کرے اور اس کا الزام دوسرے بے گناہ آدمی پر لگادے، تو اس نے اپنے گناہ کو دوگنا اور نہایت سخت کردیا، اور عذاب شدید کا مستحق ہوگیا، ایک تو خود اصل گناہ کا عذاب، دوسرے افتراء اور بہتان کا شدید عذاب۔

قرآن و سنت کی حقیقت

آیت نمبر ۱۱۳ یعنی وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ الخ میں کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی داخل فرما کر اس طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ حکمت جو نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیمات کا، یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کی ہوئی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں اسی لئے داخل قرآن نہیں، اور معانی اس کے اور قرآن کے دونوں اللہ ہی کی جانب سے ہیں

اس لئے دونوں پر عمل کرنا واجب ہے۔

اس سے اُس کلام کی حقیقت معلوم ہوگئی جو بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں متلو (جو تلاوت کی جاتی ہے) اور غیر متلو (جو تلاوت نہیں کی جاتی) وحی متلو قرآن کا نام ہے جس کے معنی اور الفاظ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، اور غیر متلو حدیث رسول کا نام ہے جن کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ساری مخلوقات سے زائد ہے

دوسرا مسئلہ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ سے یہ ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے برابر تمام کائنات کا علم محیط نہ تھا، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں، بلکہ جتنا علم حق تعالیٰ عطاء فرماتے وہ مل جاتا تھا ہاں اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم عطا ہوا وہ ساری مخلوقات کے علم سے زائد ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ
کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہ کہے صدقہ کرنے کو یا

مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ
نیک کام کو یا صلح کرانے کو لوگوں میں اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾
کی خوشی کے لئے تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَ
اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور

يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ
چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے

جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾
ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا

ع ۱۷
۱۴

خلاصۂ تفسیر

عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب و برکت) نہیں ہوتی، ہاں مگر جو لوگ

ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں (اور اس تعلیم و ترغیب کی تکمیل و انتظام کے لئے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں، یا خود ہی صدقہ وغیرہ کی دوسروں کو خفیہ ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بعض اوقات خفیہ ہی کہنا مصلحت ہوتا ہے، ان کے مشوروں میں البتہ خیر یعنی ثواب اور برکت ہے) اور جو شخص یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے (نہ کہ جاہ و شہرت کی غرض سے) سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمادیں گے اور جو شخص رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق کا امر ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہو لیا (جیسا بشیر مرتد ہو گیا حالانکہ اسلام کا حق ہونا اور نیز اس خاص واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا خود اس کی نظر میں حق ہونا معلوم تھا، پھر بھی اسے بدبختی نے گھیرا) تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔

معارف و مسائل

باہمی مشوروں اور مجلسوں کے آداب

ارشاد ہے لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ یعنی لوگوں کے باہمی مشورے اور تدبیریں جو آخرت کی فکر اور انجام پر غور سے آزاد ہو کر محض چند روزہ دنیوی اور وقتی منافع کے لئے ہوا کرتے ہیں ان میں کوئی خیر نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یعنی ان مشوروں اور سرگوشیوں میں اگر خیر کی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کو صدقہ خیرات کی ترغیب دے، یا نیکی کا حکم کرے، یا لوگوں کے آپس میں صلح کرانے کا مشورہ دے، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ انسان کا ہر کلام اس کے لئے مضر ہی ہے، بجز اس کے کہ کلام میں اللہ کا ذکر ہو یا امر بالمعروف یا نہی عن منکر ہو۔

معروف کے معنی ہیں ہر وہ کام جو شریعت میں اچھا سمجھا جاتا ہے، اور جس کو اہل شرع پہچانتے ہوں، اور اس کے مقابل منکر ہے، یعنی ہر وہ کام جو شریعت میں ناپسندیدہ اور اہل شرع میں اوپرا اور اجنبی ہو۔

امر بالمعروف، ہر نیکی کے حکم اور ترغیب کو شامل ہے، جس میں مظلوم کی امداد کرنا، حاجتمندوں کو قرض دینا، گمشدہ کو راستہ بتا دینا وغیرہ سب نیک کام داخل ہیں، اور صدقہ اور اصلاح بین الناس بھی اگرچہ اس میں داخل ہے، لیکن ان کو تخصیص

کے ساتھ علیحدہ اس لئے بیان کیا گیا کہ ان دونوں چیزوں کا نفع متعدی ہے، اور ان سے ملت کی اجتماعی زندگی سدھرتی ہے۔

نیز یہ دونوں کام خدمتِ خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں، ایک جلبِ منفعت یعنی خلق اللہ کو نفع پہنچانا، دوسرے دفعِ مضرت یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا، صدقہ نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اور اصلاح بین الناس خلق اللہ کو مضرت اور نقصان سے بچانے کا اہم عنوان ہے، اس لئے جمہور علماء تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوٰۃ صدقاتِ واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے۔

صُلح کرانے کی فضیلت لوگوں کی باہمی رنجشیں دور کرنے اور ان کے آپس میں مصالحت و موافقت پیدا کرنے کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہایت اہم ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"کیا میں تم کو ایسا کام نہ بتلاؤں جس کا درجہ روزے، نماز اور صدقہ میں سب سے افضل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ضرور بتلائیے، آپؐ نے فرمایا کہ وہ کام اصلاح ذات البین ہے یعنی دو شخصوں کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اس کو دور کر کے آپس میں صلح کرا دینا فساد کو ختم کرنا۔"

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ "یعنی لوگوں کے آپس میں جھگڑا فساد مونڈ دینے والی چیز ہے"، پھر اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ یہ جھگڑا سر کو نہیں مونڈتا، بلکہ انسان کے دین کو مونڈ ڈالتا ہے۔"

آیت کے آخر میں ایک اور اہم مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ یہ نیکیاں صدقہ اور امر بالمعروف اور اصلاح بین الناس اسی وقت معتبر اور مقبول ہو سکتی ہیں جبکہ ان کو اخلاص کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے، اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

اجماعِ امت حجت ہے وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ (آیت نمبر ۱۱۵) اس آیت میں دو چیزوں کا جرمِ عظیم اور دخولِ جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے، ایک مخالفتِ رسولؐ اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفتِ رسولؐ کفر اور وبالِ عظیم ہے، دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اُس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ اجماعِ امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن و سنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہے، اسی طرح

امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے، اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے، جیسا کہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ”یعنی جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے، اور جو شخص جماعت مسلمین سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ کرکے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔“

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اجماع امت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن میں کیا ہے؟ آپ نے قرآن سے دلیل معلوم کرنے کے لئے تین روز تک مسلسل تلاوت قرآن کو معمول بنایا، ہر روز دن میں تین مرتبہ اور رات میں تین مرتبہ پورا قرآن ختم کرتے تھے، بالآخر یہی مذکورہ آیت ذہن میں آئی، اور اس کو علماء کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجیت پر یہ دلیل کافی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ

بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو کہ اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا

لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۱۶﴾

جس کو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ بہک کر دور جا پڑا

إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا

اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر عورتوں کو اور نہیں پکارتے مگر

شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿۱۱۷﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ

شیطان سرکش کو جس پر لعنت کی اللہ نے اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لوں گا

عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ

تیرے بندوں سے حصہ مقررہ اور ان کو بہکاؤں گا اور ان کو امیدیں دلاؤں گا

وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ

اور ان کو سکھلاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے کان اور ان کو سکھلاؤں گا کہ

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ

بدلیں صورتیں بنائی ہوئی اللہ کی اور جو کوئی بنا دے شیطان کو دوست اللہ کو

دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَ

چھوڑ کر تو وہ پڑا صریح نقصان میں ان کو وعدہ دیتا ہے اور

وقف لازم

يُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾

ان کو امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان سو سب فریب ہے۔

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾

ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور نہ پاویں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کی جگہ

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ سزائے ابدی میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا اب وہ سزائے دائمی بھی نہ رہیگی) اور (وجہ اس شرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ (امر حق سے) بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا (وہ امر حق توحید ہے جو عقلاً بھی واجب ہے اور کارساز کی تعظیم اس کے حقوق میں سے ہے، پس مشرک نے حضرت صانع کارساز کی اہانت کی، اس لئے ایسی سزا کا مستحق ہوگا، بخلاف دوسرے گناہوں کے کہ وہ گمراہی تو ہے مگر توحید کے خلاف اور اس سے بعید نہیں، اس لئے قابل مغفرت قرار دیا۔ اور شرک کی طرح دوسری قسم کے کفر بھی ناقابل معافی ہونے میں شریک ہیں، کیونکہ اس میں بھی انکار ہوتا ہے، صانع کی کسی بتلائی ہوئی بات کا، پس وہ اس کی صفت صدق کا انکار کرتا ہے، اور بعض کافر خود ذات باری تعالیٰ ہی کے منکر ہیں، بعض کسی صفت کے منکر ہیں، اور بعض صفت اور ذات دونوں کے منکر ہیں، اور ان میں سے جس کا بھی انکار ہو وہ توحید کا انکار اور اس سے بُعد ہے، پس کفر و شرک دونوں قابل معافی نہیں ہیں، آگے مشرکین کی بیوقوفی ان کے مذہبی طریقے میں بیان کرتے ہیں کہ) یہ (مشرک) لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (ایک تو) صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور (ایک) صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ (خدا تعالیٰ کے حکم سے باہر ہے (اور جس کو (اس بے حکمی کی وجہ سے) خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت (خاصہ) سے دور ڈال رکھا ہے، اور جس نے (جس وقت کہ رحمت خاصہ سے دور اور ملعون ہونے لگا) یوں کہا تھا (جس سے اس کی عداوت صاف ظاہر معلوم ہو رہی تھی) کہ میں (پوری کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ) ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقرر حصہ اطاعت کا

لوں گا اور اس حصہ کی تفصیل یہ ہے کہ میں ان کو عقائد میں گمراہ کردوں گا اور میں ان کو خیالات میں، ہوسیں دلاؤں گا جس سے گناہ کی طرف میلان ہو اور ان کی مضرت نظر میں نہ رہے، اور میں انکو بُرے عمل کرنے کی تعلیم دوں گا جس سے وہ (بتوں کے نام پر) چوپاؤں کے کانوں کو تراشا کریں گے (اور یہ اعمال کفریہ میں سے ہے) اور میں ان کو (اور بھی) تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے (اور یہ اعمالِ فسقیہ میں سے ہے جیسے ڈاڑھی منڈانا، بدن گدوانا وغیرہ) اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بناویگا (یعنی خدا تعالیٰ کی اطاعت نہ کرے اور شیطان کی طاعت کرے) وہ شخص صریح نقصان وزیان میں واقع ہوگا (یہ زیان جہنم میں جانا ہے)، شیطان ان لوگوں سے (عقائد کے متعلق جھوٹے) وعدے کیا کرتا ہے (کہ تم بے فکر رہو نہ کہیں حساب ہے نہ کتاب ہے) اور (خیالات میں، ان کو ہوسیں دلاتا ہے (کہ اس گناہ میں ایسی لذت ہے، اس حرام ذریعہ میں ایسی آمدنی ہے اور اعمالِ شیطانیہ کا وجود اور لغویت اور مضرت خود ظاہر ہے)، اور شیطان اُن سے صرف جھوٹے فریب آمیز وعدے کرتا ہے (کیونکہ واقع میں حساب وکتاب حق ہے اور اس کی ہوسوں کا فریب ہونا تو بہت جلدی کھل جاتا ہے) ایسے لوگوں کا (جو کہ شیطان کی راہ پر چلتے ہیں) ٹھکانا جہنم ہے (اور وہ خسران مبین یہی ہے) اور اس (جہنم) سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے (کہ وہاں جاکر پناہ لیں)

معارف ومسائل

ربطِ آیات اوپر ذکر تھا ہیں گو سب مخالفینِ اسلام داخل ہیں، لیکن بیان احوال میں اب تک یہود اور منافقین کے احوال کا بیان ہوا تھا، اور مخالفین میں ایک جماعت بلکہ اوروں سے بڑی مشرکین کی تھی آگے کچھ ان کے عقائد کی حالت اور طریقۂ مذمت اور اس کی سزا کا مذکور ہے، اور اس مقام پر یہ اس سے اور زیادہ مناسب ہوگیا کہ اوپر جس سارق کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ وہ سارق مرتد تھا، پس اس سے اس کی دائمی سزا کا حال معلوم ہوگیا (بیان القرآن)

پہلی آیت یعنی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ، شروع میں سورۂ نساء آیت ۴۸ میں انہی الفاظ کے ساتھ آچکی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں خاتمۂ آیت پر وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا آیا ہے، اور یہاں وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا، وجہ فرق کی ائمہ تفسیر کی تصریحات کے

مطابق یہ ہے کہ پہلی آیت کے مخاطب براہ راست یہود اہل کتاب تھے، جن کو بذریعہ تورات توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی برحق ہونا سب کچھ معلوم تھا، اس کے باوجود وہ شرک میں مبتلا ہوگئے تو گویا اپنے عمل سے انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ تورات کی یہی تعلیم ہے جو سراسر افترا اور بہتان ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ارشاد ہوا، اور دوسری آیت کے مخاطب براہ راست مشرکین مکہ تھے جن کے پاس اس سے پہلے نہ کوئی کتاب تھی نہ پیغمبر، مگر توحید کے عقلی دلائل بالکل واضح تھے، اور اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے پتھروں کو اپنا معبود بنا لینا ادنیٰ عقل والے کے لئے بھی لغو و باطل اور گمراہی تھا، اس لئے یہاں ارشاد ہوا فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۔

شرک اور کفر کی سزا کا دائمی ہونا یہاں بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدر عمل ہونی چاہئے، مشرک و کافر نے جو جرم کفر و شرک کا کیا ہے، وہ محدود مدت عمر کے اندر کیا ہے تو اس کی سزا غیر محدود اور دائمی کیوں ہوئی؟ جواب یہ ہے کفر و شرک کرنے والا چونکہ اس کو جرم ہی نہیں سمجھتا بلکہ نیکی سمجھتا ہے، اس لئے اس کا عزم و قصد یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے گا، اور جب مرتے دم تک وہ اسی پر قائم رہا، تو اپنے اختیار کی حد تک اس نے جرم دائمی کرلیا اس لئے سزا بھی دائمی ہوئی۔

ظلم کی تین قسمیں

ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے، دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہوسکے گی، اور تیسری قسم وہ ہے کہ **جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔**

پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے، اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے (ابن کثیر بحوالہ مسند بزار)

شرک کی حقیقت

شرک کی حقیقت، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے، قرآن کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے نقل کیا ہے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	"یعنی قسم خدا کی ہم کھلی گمراہی میں تھے جب کہ ہم نے تم کو اللہ رب العلمین کے برابر قرار دیدیا تھا"

ظاہر ہے کہ مشرکین کا بھی یہ عقیدہ تو نہ تھا کہ ہمارے گھڑے ہوئے پتھر اس جہان کے

خالق و مالک ہیں، مگر انہوں نے دوسری غلط فہمیوں کی بنا پر ان کو عبادت میں یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رکھا تھا، یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا (فتح الملہم) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت خالق، رازق، قادر مطلق، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ میں کسی مخلوق کو اللہ کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے اچھے ان کو ہم داخل کریں گے باغوں

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ

میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی ہمیشہ وعدہ ہے

اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾ لَيْسَ

اللہ کا سچا، اور اللہ سے زیادہ سچا کون نہ تمہاری

بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ

امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی برا کام کرے گا اس

بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٢٣﴾ وَ

کی سزا پاویگا اور نہ پاوے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار اور

مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ

جو کوئی کام کرے اچھے مرد ہو یا عورت اور وہ

مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ

ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا

نَقِيرًا ﴿١٢٤﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ

تل بھر، اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم

لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ

پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر جو ایک ہی طرف کا تھا اور اللہ

اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿١٢٥﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي

نے بنا لیا ابراہیم کو خالص دوست اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور

الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع

زمین میں اور سب چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں

ع ۱۸ / ۱۱ / ۱۵

خُلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور (انھوں نے) اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، خدا تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا، نہ تمھاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں بلکہ مدار کار اطاعت پر ہے، پس) جو شخص (اطاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی برا کام کرے گا (خواہ عقائد سے ہو یا اعمال سے) وہ اس کے عوض میں سزا دیا جاوے گا (اگر وہ برائی عقیدۂ کفریہ تک ہے تو سزا دائمی اور یقینی اور اگر اس سے کم ہے تو سزا ہمیشہ کی نہیں) اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مددگار ملے گا، (کہ خدا کے عذاب سے اسے چھڑا لے)، اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ ان کی کوئی نیکی ضائع کردی جاوے) اور (اوپر جو مؤمن کی قید لگائی گئی ہے اس کا مصداق ہر فرقہ نہیں بلکہ صرف وہ فرقہ جس کا دین خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے میں سب سے اچھا ہو، اور ایسا فرقہ صرف اہل اسلام ہی ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں یہ صفات ہیں: مکمل اطاعت، اخلاص، ملت ابراہیمؑ کی پیروی اور) ایسے شخص (کے دین) سے زیادہ بہتر کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو کہ دل سے فرمانبرداری اختیار کی ہو خالی مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو، اور وہ ملت ابراہیمؑ (یعنی اسلام) کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں اور ملت ابراہیمی ضرور قابل اتباع ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا تھا (تو ظاہر ہے کہ دوست کے طریقہ پر چلنے والا بھی محبوب و مقبول ہوگا، پس طریقہ اسلام مقبول ہوا، پس اہل اسلام ہی مؤمن کے لقب کے مصداق ٹھہرے، اور دوسرے فرقوں نے ابراہیمؑ کی پیروی کو چھوڑ دیا، کہ اسلام نہ لائے، اس لئے صرف مسلمان ہی ایسے ثابت ہوئے کہ محض امانی یعنی تمناؤں پر ان کا سہارا نہیں بلکہ اطاعت گذار ہیں، پس کام انہی کا بنے گا)، اور (اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری

کرنا تو ضروری ہے، کیونکہ ان کی سلطنت وقدرت اور ان کا علم محیط، دونوں تام اور مکمل ہیں اور یہی امور مدار ہیں وجوب اطاعت کے چنانچہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یہ تو کمال سلطنت ہوا) اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو (اپنے علم میں) احاطہ فرماتے ہوئے ہیں (یہ کمال علمی ہوا)

معارف و مسائل

مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ایک مفاخرانہ گفتگو

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ان آیات میں پہلے ایک مکالمہ اور گفتگو کا ذکر ہے، جو مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ہوئی تھی اور پھر اس مکالمہ پر محاکمہ کیا گیا ہے، فریقین کو صحیح راہ ہدایت بتلائی گئی، آخر میں اللہ کے نزدیک مقبول اور افضل و اعلیٰ ہونے کا ایک معیار بتلا دیا گیا جس کو سامنے رکھا جائے تو کبھی انسان غلطی اور گمراہی کا شکار نہ ہو۔

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان مفاخرت کی گفتگو ہونے لگی، اہل کتاب نے کہا کہ ہم تم سے افضل و اشرف ہیں، کیونکہ ہمارے نبیؑ تمہارے نبی سے پہلے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تم سب سے افضل ہیں، اس لئے کہ ہمارے نبیؐ خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب آخری کتاب ہے جس نے پہلی سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ الخ یعنی یہ تفاخر اور تعلّی کسی کے لئے زیبا نہیں، اور محض خیالات اور تمناؤں اور دعووں سے کوئی کسی پر افضل نہیں ہوتا، بلکہ مدار اعمال پر ہے، کسی کا نبی اور کتاب کتنی ہی افضل و اشرف ہو اگر وہ عمل غلط کرے گا تو اس کی ایسی سزا پائے گا کہ اس سے بچانے والا اس کو کوئی نہ ملے گا۔

یہ آیت جب نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر بہت شاق ہوئی، امام مسلم، ترمذی، نسائی اور امام احمد رحمہم اللہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ یعنی جو کوئی کچھ برائی کریگا اس کی سزا دی جائے گی، تو ہم سخت رنج و غم اور فکر میں پڑ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس آیت نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، ذرا سی برائی بھی ہوگی تو اس کی جزاء ملے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فکر میں نہ پڑو، اپنی طاقت و قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو، کیونکہ (جس سزا کا یہاں ذکر ہے ضروری نہیں کہ

وہ جہنم ہی کی سزا ہو بلکہ تمھیں دنیا میں جو بھی کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے یہ تمھارے گناہوں کا کفارہ اور برائی کی جزاء ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بھی کفارۂ گناہ ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کو دنیا میں جو بھی کوئی غم یا تکلیف یا بیماری یا فکر لاحق ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

جامع ترمذی اور تفسیر ابن جریر وغیرہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۤءًا يُّجْزَ بِهٖ ان کو سنائی تو ان پر یہ اثر ہوا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا، کیا بات ہے؟ تو صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی برائی نہیں کی، اور جب ہر برائی کی جزاء ملنی ہے تو ہم میں سے کون بچے گا؟ آپ نے فرمایا، اے ابو بکر! آپ اور آپ کے مؤمن بھائی کوئی فکر نہ کریں، کیونکہ دنیا کی تکلیف کے ذریعہ آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہونچتا؟ صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، بے شک سب چیزیں پہنچتی ہیں، آپ نے فرمایا، بس یہی جزاء ہے تمھارے سیئات کی۔

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث میں ہے جسکو ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ بندہ کو جو بخار یا تکلیف پہونچتی ہے یا کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے مگر دوسری جیب میں ملے، اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت دی ہے، کہ محض دعووں اور تمناؤں میں نہ لگیں، بلکہ عمل کی فکر کریں، کیونکہ کامیابی صرف اس سے نہیں کہ تم فلاں نبی یا فلاں کتاب کے نام لینے والے ہو بلکہ اصل فلاح اس میں ہے کہ اس پر صحیح ایمان اور اس کے مطابق اعمال صالحہ کے پابند رہو، ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۝ یعنی جو مرد یا عورت نیک عمل کرے بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ ایمان بھی ہو تو ضرور جنت میں جائے گا اور ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا ملے گا جس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی، اس میں اشارہ فرمایا کہ اہل کتاب یا دوسرے غیر مسلم اگر ان کے

اعمال نیک بھی ہوں تو چونکہ ان کا ایمان صحیح نہیں، اس لئے وہ عمل مقبول نہیں، اور مسلمانوں کا چونکہ ایمان بھی صحیح ہے اور عمل بھی نیک ہے، اس لئے وہ کامیاب اور دوسروں سے افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا ایک معیار

چوتھی آیت میں افضلیت اور مقبولیت عند اللہ کا ایک معیار بتلایا گیا ہے، جس سے اس کا صحیح فیصلہ ہوسکتا ہے کہ کون مقبول ہے اور کون مردود، اس معیار کے دو جز ہیں، ان میں سے ایک میں بھی خلل آئے تو ساری کوششیں اکارت اور ضائع ہوجاتی ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جہاں کہیں کوئی گمراہی یا غلط کاری ہے وہ انہی دو جزوں میں کسی ایک جز کے خلل سے پیدا ہوتی ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں موازنہ کریں یا خود مسلمانوں کے فرقوں، جماعتوں، اور پارٹیوں میں مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہی دو نقطے ہیں جن میں سے کسی ایک سے ہٹ جانا انسان کو ذلت و ضلالت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

ارشاد فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ یعنی اس شخص سے بہتر کس کا طریقہ نہیں ہوسکتا جس میں دو باتیں پائی جائیں، ایک اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کردے، ریاکاری یا دنیا سازی کے لئے نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے عمل کرے۔ دوسرے وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی وہ عمل بھی درست طریقہ پر کرے، امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ درست طریقہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل محض خود ساختہ طریقہ پر نہ ہو، بلکہ شریعت مطہرہ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایک اخلاص اور دوسرے عمل کا درست یعنی مطابق شریعت و سنت ہونا، ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط اخلاص کا تعلق انسان کے باطن یعنی قلب سے ہے، اور دوسری شرط یعنی موافقت شرع کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے، جب یہ دونوں شرطیں کسی شخص نے پوری کرلیں تو اس کا ظاہر و باطن درست ہوگیا، اور جب ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوئی تو عمل فاسد ہوگیا، اخلاص نہ رہا تو عمل منافق ہوگیا، اور اتباع شریعت فوت ہوگیا، تو گمراہ ہوگیا۔

قوموں کی گمراہی کا سبب اخلاص یا صحت عمل کا فقدان ہے

قوموں اور مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ جتنے بے راہ فرقے اور قومیں دنیا میں ہیں کسی میں اخلاص نہیں، اور کسی میں عمل صحیح نہیں، یہی دو گروہ ہیں جن کا ذکر سورۂ فاتحہ میں صراط مستقیم

سے ہٹ جانے والوں کے سلسلہ میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْنَ کے لفظوں سے بیان کیا گیا ہے، مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وہ لوگ ہیں جن میں اخلاص نہیں، اور ضَآلِّيْنَ وہ جن کا عمل درست نہیں، پہلا گروہ شہوت کا شکار ہے اور دوسرا شبہات کا۔

پہلی شرط یعنی اخلاص کی ضرورت، اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عمل کا بے کار ہونا تو عام طور پر سب سمجھتے ہیں، لیکن حُسنِ عمل یعنی اتباعِ شریعت کی شرط پر بہت سے مسلمان بھی نہیں دھیان دیتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ نیک عمل کو جس طرح چاہو کرلو، حالانکہ قرآن وسنت نے پوری طرح واضح کردیا ہے کہ حسنِ عمل صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اتباعِ سنت پر موقوف ہے، اس سے کم کرنا بھی جرم ہے اور اس سے بڑھانا بھی جرم ہے، جس طرح ظہر کی چار کے بجائے تین رکعت پڑھنا جرم ہے، اسی طرح پانچ پڑھنا بھی ویسا ہی جرم و گناہ ہے، کسی عبادت میں جو شرط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی ہو، اس میں اپنی طرف سے شرطوں کا اضافہ یا آپ کی بتلائی ہوئی ہیئت سے مختلف صورت اختیار کرنا یہ سب ناجائز اور حُسنِ عمل کے خلاف ہے، خواہ دیکھنے میں وہ کتنے ہی خوب صورت عمل نظر آئیں، بدعات اور محدثات جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گمراہی قرار دیا، اور ان سے بچنے کی تاکیدی ہدایتیں فرمائیں، وہ سب اسی قسم سے ہیں، جن کو آدمی اس کو بڑے اخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور عبادت و ثواب جان کر کرتے ہیں، مگر شرعِ محمدی میں اس کا یہ عمل ضائع بلکہ موجب گناہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم نے بار بار حسن عمل یعنی اتباعِ سنت کی تاکید فرمائی، سورۂ ملک میں ہے: لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، یہاں پر أَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا أَكْثَرُ عَمَلًا نہیں فرمایا، یعنی کثرتِ عمل کا ذکر نہیں، بلکہ اچھے عمل کرنے کا ذکر ہے، اور اچھا عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اسی حُسنِ عمل اور اتباعِ سنّتِ مصطفوی کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے: وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا، یعنی سعی و عمل ان لوگوں کا مقبول ہے جنھوں نے نیت بھی خالص آخرت کی رکھی ہو اور اس کے لئے سعی بھی کر رہے ہوں، اور جو سعی کر رہے ہیں وہ سعی مناسب بھی ہو، اور سعی مناسب وہی ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اُمت کو بتلائی، اس سے ہٹ کر خواہ سعی میں کمی کی جائے یا زیادتی، دونوں چیزیں سعی مناسب نہیں ہیں، اور

سے مناسب دی ہے جس کا دوسرا نام حسن عمل ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں: اخلاص اور حسن عمل، اور حسن عمل نام ہے اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اخلاص کے ساتھ حسن عمل کرنے والے کا یہ بھی فرض ہے کہ عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح کیا ہے، اور اس کے متعلق کیا ہدایتیں دی ہیں، ہمارا جو عمل سنت کے طریقہ سے ہٹے گا نامقبول ہوگا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات وخیرات اور ذکر اللہ اور درود وسلام سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح انجام دیا اور کس طرح کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے، آخر آیت میں اخلاص اور حسن عمل کی ایک مثال حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش کر کے ان کے اتباع کا حکم دیا گیا اور وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ حضرت خلیل اللہ کے اس مقام بلند کا سبب یہی ہے کہ وہ مخلص بھی اعلیٰ درجے کے تھے اور ان کا عمل بھی بشارت خداوندی صحیح اور درست تھا۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى

اور تجھ سے رخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی، کہہ دے اللہ تم کو اجازت دیتا ہے ان کی اور وہ جو تم کو

عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ

سنایا جاتا ہے قرآن میں سو حکم ہے ان یتیم عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو ان کے لئے

مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

مقرر کیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ اور حکم ہے ناتوان

مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا

لڑکوں کا اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر اور جو کرو گے

مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ

بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے اور اگر کوئی عورت ڈرے

مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ

اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی پھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کر لیں

يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ

آپس میں کسی طرح صلح اور صلح خوب چیز ہے اور دلوں کے سامنے

الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ
موجود ہے حرص اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ کو تمہارے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ
سب کاموں کی خبر ہے اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں

النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْھَا
کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو

كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ
جیسے ادھر میں لٹکتی اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ
بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر دونوں جدا ہو جاویں تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دے گا

سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾
اپنی کشائش سے اور اللہ کشائش والا تدبیر والا ہے۔

ربطِ آیات

شروع سورت میں یتیموں اور عورتوں کے خاص احکام اور ان کے حقوق ادا کرنے کا وجوب مذکور تھا، کیونکہ جاہلیت میں بعضے ان کو میراث ہی نہ دیتے تھے، بعضے جو مال میراث میں یا اور کسی طور سے ان کو ملتا اس کو ناجائز طور پر کھا جاتے بعضے ان سے نکاح کر کے ان کو مہر پورا نہ دیتے، اور ان سب کی ممانعت کی گئی تھی، اس پر مختلف واقعات پیش آئے، بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ عورتیں اور بچے فی نفسہٖ قابل میراث کے نہیں، کسی وقتی مصلحت سے یہ حکم چند لوگوں کے لئے ہو گیا ہے، امید ہے کہ منسوخ ہو جائے گا، اور بعض اس کے منتظر رہے جب نسخ نہ ہوا تو یہ مشورہ ٹھہرا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہئے، اور حاضر ہو کر پوچھا، ابن جریرؒ اور ابن المنذرؒ نے آیت کا سبب نزول اسی سوال کو نقل کیا ہے، اور اس کے بعد کی آیتوں میں عورتوں سے متعلق چند اور مسائل بیان فرما دیئے گئے (بیان القرآن)

خُلاصۂ تفسیر

اور لوگ آپؐ سے عورتوں (کی میراث اور مہر) کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں

پس جانبین کی خاص خاص حرص نے اس صلح کی تکمیل کردی، اور (اے مردو) اگر تم (خود عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ رکھو (اور ان سے حقوق معاف کرانے کے خواہاں نہ ہو) اور ان کے ساتھ (کج ادائی اور بے رخی کرنے سے) احتیاط رکھو تو (تم کو بڑا ثواب ملے کیونکہ) بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اور اعمال نیک پر ثواب دیا کرتے ہیں) اور (عادۃً) تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتیٰ کہ رغبت قلب میں بھی) گو (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے (اور تم کتنی ہی اس میں کوشش کرو، لیکن چونکہ قلب کا میلان غیر اختیاری ہے، اس لئے اس پر قدرت نہیں، گو اتفاقاً بلااختیار کہیں برابری ہو ہی جائے تو اس کی نفی آیت میں مقصود نہیں، غرض جب اختیار میں نہیں تو تم اس کے مکلف نہیں، لیکن اس کے غیر اختیاری ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ظاہری حقوق بھی اختیاری نہ رہیں، بلکہ وہ تو اختیاری ہیں، جب وہ اختیاری ہیں) تو (تم پر واجب ہے کہ) تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ (بالکل کا مطلب یہ کہ باطن سے بھی جس میں معذور سمجھے اور ظاہر سے بھی جس میں مختار ہو، یعنی حقوق شرعیہ میں ان سے نشوز و اعراض نہ کرو) جس سے اس (مظلومہ) کو ایسا کر دو جیسے کوئی ادھر نہ ادھر (یعنی بیچ میں) لٹکی ہو (یعنی نہ تو اس کے حقوق ادا کئے جائیں کہ خاوند والی سمجھی جائے ورنہ اس کو طلاق دی جائے کہ بے خاوند والی کہی جاوے، بلکہ رکھو تو اچھی طرح رکھو) اور (رکھنے کی صورت میں جو زمانہ ماضی میں کچھ ناگوار معاملات ان سے کئے گئے) اگر (ان معاملات کی فی الحال) اصلاح کر لو اور (آئندہ زمانہ میں ایسے معاملات سے) احتیاط رکھو تو (وہ امور گزشتہ معاف کر دیئے جائیں گے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (چونکہ اصلاح ذنوب متعلقہ بحقوق العباد کی ان عباد کے معاف کرنے سے ہوتی ہے پس صلاح میں یہ معافی بھی آگئی، تو اس کے وقوع کے بعد توبہ شرعاً صحیح ہوگئی اس لئے مقبول ہوگئی) اور اگر دونوں میاں بیوی (میں کسی طرح بھی موافقت نہ ہوئی اور دونوں) جدا ہو جائیں (یعنی خلع یا طلاق ہو جائے) تو (کوئی ان میں سے خواہ مرد اگر اس کی زیادتی ہے یا عورت اگر اس کی کوتاہی ہے یوں نہ سمجھے کہ بدون میرے اس دوسرے کا کام ہی نہ چلے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (قدرت) سے (دونوں میں سے) ہر ایک کو (دوسرے سے) بے احتیاج کر دے گا (یعنی ہر ایک کا مقدر کا مہیا دوسرے کے چل جائے گا) اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں (ہر ایک کے لئے مناسب سبیل نکال دیتے ہیں)۔

حاجت خواہ اپنی اولاد کے مفاد کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کا کوئی دوسرا سہارا نہیں، تو یہاں ایک ہی راستہ ہے کہ شوہر کو کسی چیز پر راضی کیا جائے، مثلاً عورت اپنے تمام یا بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑ دے، اور شوہر یہ خیال کرے کہ بہت سے حقوق کے بارے تو سبکدوشی ہوتی ہے، بیوی مفت میں ملتی ہے اس پر صلح ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس آیت میں ایک تو اس طرح کی مصالحت کے متوقع ہونے کی طرف رہنمائی اس طرح فرمائی، وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ، یعنی حرص تمام نفوس کے سامنے دھری رہتی ہے ایسی صورت میں عورت کو تو یہ حرص ہے کہ مجھے آزاد کر دیا تو اولاد برباد ہو جائے گی، یا میری زندگی دوسری جگہ تلخ ہوگی اور شوہر کو یہ لالچ ہے کہ جب عورت نے اپنا کل مہر یا بعض معاف کر دیا اور دوسرے حقوق کا بھی مطالبہ چھوڑ دیا، تو اب اس کو رکھنے میں میرے لئے کیا مشکل ہے، اس لئے مصالحت باہمی آسان ہو جائے گی، اس کے ساتھ ارشاد فرمایا،

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا، یعنی اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑائی جھگڑے یا بے رخی کا خطرہ محسوس کرے تو دونوں میں سے کسی کو گناہ نہیں ہوگا، اگر آپس میں خاص شرائط پر صلح کر لیں، اور گناہ نہ ہونے کے عنوان سے اس سے تعبیر فرمایا کہ اس معاملہ کی صورت بظاہر رشوت کی سی ہے کہ شوہر کو مہر وغیرہ کی معافی کا لالچ دے کر ازدواجی زندگی کا تعلق باقی رکھا گیا ہے، لیکن قرآن کے اس ارشاد نے واضح کر دیا کہ یہ رشوت میں داخل نہیں بلکہ مصلحت میں داخل ہے، جس میں فریقین اپنے کچھ کچھ کا مطالبہ چھوڑ کر کسی درمیانی صورت پر رضامند ہو جایا کرتے ہیں، اور یہ جائز ہے۔

زوجین کے جھگڑے میں دوسروں کا دخل بلا ضرورت مناسب نہیں تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا، فرمایا، یعنی "میاں بیوی دونوں آپس میں کسی صورت پر مصالحت کر لیں" اس میں لفظ بَيْنَهُمَا سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ میاں بیوی کے معاملات میں بہتر یہ ہے کہ کوئی تیسرا دخیل نہ ہو، یہ دونوں خود ہی آپس میں کوئی بات طے کر لیں، کیونکہ تیسرے کے دخل سے بعض اوقات تو مصالحت ہی ناممکن ہو جاتی ہے اور ہو بھی جائے تو طرفین کے عیوب تیسرے آدمی کے سامنے بلا وجہ آتے ہیں جس سے بچنا دونوں کے لئے مصلحت ہے۔

مذکورہ آیت کے آخر میں فرمایا: وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا

فریقین کو تو خود ہی حق قرآن کریم نے دیا، اور دوسری طرف دونوں کو بلند اخلاق اور اپنے حقوق سے ترک کرنے پر صبر کی تلقین فرما کر یہ ہدایت فرمادی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تعلق کو قطع کرنے سے بچنا چاہئے اور بہتر ہے کہ جانبین سے کچھ کچھ حقوق ترک کرکے کسی خاص صورت پر صلح کرلیں۔

اس آیت کے نزول کا موقع اگرچہ میاں بیوی کے باہمی اختلافات کے وقت صلح کا صرف جائز ہونا تو ثابت ہے، اور آخر آیت میں صلح نہ ہونے کی صورت میں بھی صبر و تحمل کے ساتھ تعلق نبھانے کی تلقین فرمائی گئی ہے، درمیان میں ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا ہے جس سے مصالحت کا پسندیدہ اور افضل و بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے، ارشاد ہے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یعنی باہم مصالحت کرنا بہتر ہے، اور یہ جملہ ایسے عنوان سے بیان فرمایا جس میں زیر بحث میاں بیوی کے جھگڑے بھی داخل ہیں، اور دوسری قسم کے گھریلو اختلافات بھی اور تمام دنیا کے معاملات کے باہمی جھگڑے اور منازعات و مقدمات بھی، کیونکہ الفاظ قرآن عام ہیں کہ صلح بہتر ہے۔

خلاصۂ مضمون یہ کہ فریقین کا اپنے اپنے پورے مطالبہ پر اڑے رہنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ فریقین اپنے کچھ مطالبات سے دستبردار ہو کر کسی درمیانی صورت پر رضامندی کے ساتھ مصالحت کرلیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلَّا صُلْحًا أَحَلَّ حَرَامًا أَوْ حَرَّمَ حَلَالًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا

(رواه الترمذی عن کثیر بن عبداللہ، تفسیر مظہری)

یعنی مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی مصالحت جائز ہے بجز اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو، اور مسلمان اپنی مانی ہوئی شرطوں پر قائم رہتے ہیں بجز اس شرط کے جس کے ذریعہ کسی حلال کو حرام قرار دیا گیا ہو۔

مثلاً کسی عورت سے اس بات پر صلح کر لینا جائز نہیں کہ اس کے ساتھ اس کی بہن کو بھی نکاح میں رکھا جائے، کیونکہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا شرعاً حرام ہے یا اس پر صلح کرے کہ دوسری بیوی کے حقوق ادا نہ کرے گا، کیونکہ اس میں ایک حلال کو حرام ٹھہرانا ہے۔

اور روایت میں چونکہ عموم کے ساتھ ہر صلح کو جائز قرار دیا ہے اس عموم سے

کے یہاں بڑی وسعت ہے، اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے، ممکن ہے کہ اس علیحدگی ہی میں حکمت و مصلحت ہو، جدائی کے بعد دونوں کو ایسے جوڑے مل جائیں کہ دونوں کی زندگی سدھر جائے۔

امورِ غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ نہیں

ازدواجی زندگی کو خوشگوار و پائیدار بنانے کے لئے قرآن عظیم نے مذکورہ آیت میں جو ہدایتیں فریقین کو دی ہیں ان آیات میں ایک آیت یہ ہے: وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ جس میں فریقین کو ایک خاص ہدایت فرمائی، وہ یہ کہ ایک مرد کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں تو قرآن کریم نے سورۂ نساء کے شروع میں اس کو یہ ہدایت دی کہ سب بیویوں میں عدل و مساوات قائم رکھنا اس کے ذمہ فرض ہے، اور جو خیال کرے کہ اس فرض کو میں ادا نہ کرسکوں گا تو اس کو چاہئے کہ ایک سے زائد بیبیاں نہ کرے، ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً "یعنی اگر تم کو یہ خطرہ ہو کہ دو بیویوں میں مساوات نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو"

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیویوں میں عدل اور برابری کو نہایت تاکیدی حکم قرار دیا ہے، اور اس کی خلاف ورزی پر سخت وعید سنائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہراتؓ میں برابری اور عدل کا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور ساتھ ہی بارگاہِ جل شانہ میں عرض کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ

"یعنی یا اللہ! یہ میری منصفانہ تقسیم و مساوات اس چیز میں ہے جو میرے اختیار میں ہے، اس چیز میں جو آپ کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں، یعنی قلبی میلان اور رجحان اس میں مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمائیے۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مگر قلبی میلان کو آپؐ نے بھی اپنے اختیار سے باہر قرار دیا، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا۔

سورۂ نساء کی شروع کی آیت کے ظاہری الفاظ سے بیویوں میں مطلقاً مساوات و برابری کا فرض ہونا معلوم ہوتا تھا، جس میں قلبی میلان میں بھی مساوات کرنا داخل ہے، اور یہ معاملہ انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے سورۂ نساء کی اس آیت میں حقیقتِ حال کی وضاحت فرما دی کہ جن چیزوں پر تمہیں قدرت نہیں ہے ان میں مساوات

چاہتا ہو تو (وہ بڑی غلطی میں ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی ان کی قدرت میں) تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ (موجود) ہے (جب اللہ تعالیٰ دونوں پر ان کی قدرت ہے تو طالب حقیر کیوں نہ مانگی جاوے) اور اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں سب کے اقوال اور درخواستوں کو دنیا کی ہوں یا دین کی سنتے ہیں، اور سب کی نیتوں کو دیکھتے ہیں، پس طالبانِ آخرت کو ثواب دیں گے، اور طالبانِ دنیا کو آخرت میں محروم رکھیں گے پس آخرت ہی کی نیت اور درخواست کرنا چاہیے، البتہ دنیا کی حاجت مستقل طور پر مانگنا مضائقہ نہیں، لیکن عبادت میں یہ قصد نہ کرے)۔

معارف و مسائل

فوائدِ مہمہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، یعنی اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات، اس جگہ ان الفاظ کو تین مرتبہ دُہرایا گیا، اول سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، دوسرے سے بے نیازی اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پرواہ نہیں اگر تم منکر ہو، تیسری دفعہ میں حمایت اور کارسازی کا اظہار ہے کہ اگر تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو تو وہ تمہارے سب کام بنائے گا۔

تیسری آیت میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھا لے، اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار پیدا کر دے، اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغناء اور بے نیازی خوب ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری طرح تہدید اور تخویف بھی ہو گئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ
اے ایمان والو قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ

لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ
کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا اگر

يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ
کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف

تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
کرنے میں اور اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے سب کاموں

بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجتے رہنے کا، اور ان کے ساتھ بہت سی کتابیں اور صحیفے نازل فرمانے کا اہم مقصد یہی تھا، کہ دنیا میں انصاف اور اس کے ذریعہ امن و امان قائم ہو، ہر فرد انسانی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے، اور جو سرکش لوگ وعظ و پند اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ عدل و انصاف پر نہ آئیں، اپنی سرکشی پر اَڑے رہیں ان کو قانونی سیاست اور تعزیر و سزا کے ذریعہ انصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

سورۂ حدید کی پچیسویں آیت میں اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔	"یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر، اور ہم نے اتارا لوہا اس میں بڑ رعب ہے اور اس سے لوگوں کے کام چلتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ بعثتِ انبیاء اور تنزیل کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے، رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لئے عمل میں آیا ہے، اور آخر میں لوہا اتارنے کا ذکر کرکے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ سب لوگوں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کافی نہ ہوگی، بلکہ کچھ شریر لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو لوہے کی زنجیروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مرعوب کرکے انصاف پر قائم کیا جاسکے گا۔

عدل و انصاف پر قائم رہنا صرف حکومت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلف ہے

سورۂ حدید کی آیت مذکورہ اور سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (آیت ۸) سے واضح طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلف و مخاطب ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو انصاف پر قائم رکھنے کی کوشش کرے، ہاں انصاف کا صرف ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اَڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم

میں زور آوروں کو عدل و انصاف کرنے دیں، تو حکومۃ تعزیر اور سزا کی ضرورت ہے، یہ اقامت عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔

آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیئے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت و عدالت کا فریضہ ہے، عوام اس کے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک ہر سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے، راعی اور رعیت کے درمیان خلاف و اختلاف کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے، ہر ملک کے عوام اپنی حکومت سے عدل و انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن خود کسی انصاف پر قائم رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اسی کا نتیجہ ہے جو دنیا آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، کہ قانون معطل ہے، جرائم کی روز افزوں ترقی ہے، آج ہر ملک میں قانون سازی کے لئے اسمبلیاں قائم ہیں، ان پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے، ان کے نمائندے منتخب کرنے کے لئے الیکشن میں خدا کی پوری زمین ہل جاتی ہے، اور پھر یہ پورے ملک کا دل و دماغ ملک کی ضروریات، اور لوگوں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ قانون بناتے ہیں، اور پھر اس کو عوام کے لئے شائع کرتے ہیں، اسے عام معلوم کرنے کے بعد یہ قانون قابل تنفیذ سمجھا جاتا ہے، پھر اس کے نفاذ کے لئے حکومت کی لاتعداد مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ہزاروں بلکہ لاکھوں شعبے ہوتے ہیں، اور ہر شعبہ میں ملک کے بڑے بڑے آزمودہ کار لوگوں کی خدمات بروئے کار آتی ہیں، لیکن چلی ہوئی رسوم کی دنیا سے ذرا نظر کو اونچا کر کے دیکھا جائے، اور جن لوگوں کو خواہ مخواہ تہذیب اور شائستگی کا ٹھیکیدار مان لیا گیا ہے تھوڑی دیر کے لئے ان کی کورانہ تقلید سے نکل کر حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو ہر شخص بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ؎

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
مری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

اب سے سو سال پہلے ۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کا ہی موازنہ کریں، اعداد و شمار محفوظ ہیں وہ گواہی دیں گے کہ جوں جوں قانون سازی بڑھی، اور قانون میں عوام کی مرضی کی نمائش بڑھی اور تنفیذ قانون کے لئے مشینری بڑھی، ایک پولیس کے بجائے مختلف اقسام کی پولیس بروئے کار آئی، تو نئے نئے روز بروز جرائم بڑھے، اور لوگ انصاف سے دور ہوتے چلے گئے، اور اسی رفتار سے دنیا کی بدامنی بڑھتی چلی گئی۔

اِن عام کی ضمانت صرف عقیدہ کوئی مرد رشید نہیں جو آنکھ کھول کر دیکھے، اور چلتی ہوئی ہمول آخرت اور خوفِ خدا دے سکتا ہے کی جگہ بندی کو توڑ کر ذرا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے رٹے ہوئے پیغام کو سوچے سمجھے، اور اس حقیقت پر غور کرے کہ دنیا کا امن وسکون نرے تعزیرات سے نہ کبھی حاصل ہوا نہ آئندہ ہوگا، عوام کے امن وامان کی ضمانت صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا دے سکتا ہے جس کے ذریعہ سے کلکم راعی اور رعیت اور عوام اور حکومت میں مشترک ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگتا ہے، قانون کے احترام و حفاظت کے لئے عوام یہ کہہ کر آزاد نہیں ہو جاتے کہ یہ کام حکام کا کا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ آیتیں بسلسلۂ قیام عدل وانصاف اسی انقلابی عقیدہ کی تلقین پر ختم کی گئی ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت کے ختم پر إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا، کا ارشاد ہوا، اور سورۂ مائدہ کی آیت کے آخر میں اول تقویٰ کی ہدایت فرمائی، اور پھر فرمایا إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ، اور سورۂ حدید کی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا: إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ،

ان تینوں آیتوں میں حکام اور عوام دونوں کو عدل وانصاف پر قائم رہنے اور قائم رکھنے کی ہدایات دینے کے بعد ختم آیت میں سب کی نظریں اس حقیقت کی طرف پھیر دی گئی ہیں جو انسان کی زندگی اور اس کے خیالات اور جذبات میں انقلاب عظیم پیدا کرنے والی ہے، یعنی خدا تعالیٰ کی قوت وسلطنت اس کے سامنے حاضری اور حساب وکتاب اور جزاء وسزا کا تصور، یہی وہ چیز تھی جس نے اب سے سو برس پہلے کی دنیا کو آج کی نسبت بہت زیادہ امن وسکون بخش رکھا تھا، اور یہی وہ چیز ہے جس کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے آج کی ترقی یافتہ آسمانوں سے باتیں کرنے والی، سیارے اڑانے والی دنیا امن وچین سے محروم ہے۔

روشن خیال دنیا سن لے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وہ آسمان کی طرف چڑھ سکتے ہیں، ستاروں پر جا سکتے ہیں، سمندر میں جا سکتے ہیں، لیکن امن وامان اور سکون واطمینان جو ان سارے سامانوں اور سارے کارخانوں کا اصل مقصد ہے وہ نہ ان کو کسی سیارے میں ہاتھ آئے گا، نہ کسی نئی سے نئی ایجاد میں، وہ ملے گا تو پیغمبر عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور ان کی تعلیمات میں، خدا تعالیٰ کو ماننے اور آخرت کے حساب پر عقیدہ رکھنے میں، أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ، سائنس کے حیرت انگیز انکشافات روز بروز خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی بے مثال صنعت کاری کو اور زیادہ روشن کرتے جاتے ہیں،

جن کے سامنے ہر انسانی ترقی اپنے عجز و درماندگی کا، اعتراف کرکے رہ جاتی ہے، مگر ؎

"چہ سود چوں دلِ دانا و چشمِ بینا نیست"

قرآن حکیم نے ایک طرف تو دنیا کے سامنے نظام کا منشاء یعنی قیام عدل و انصاف بتلایا، دوسری طرف اس کا ایک بے مثال نظام ایسا عجیب و غریب فرمایا کہ اگر اس کے پورے نظام کو اپنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہی خونخوار و بدکار دنیا ایک ایسے صالح معاشرے میں تبدیل ہو جائے جو آخرت کی جنت سے پہلے نقد جنت ہو، اور ارشاد قرآنی وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ، جس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کو دو جنتیں ملیں گی، ایک آخرت میں، دوسری نقد دنیا ہی میں، اس کا ظہور مشاہدہ میں آجائے، اور یہ کوئی صرف ذہنی خیال یا خیالی اسکیم نہیں، اس پیغام کے لانے والے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی صورت میں دکھا کر چھوڑا ہے، اور ان کے بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے متبع سنت سلاطین نے جب بھی اس پر عمل کیا تو شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے کی فرضی مثال ایک حقیقت بن کر لوگوں کے مشاہدہ میں آگئی، غریب امیر، مزدور و سرمایہ دار کا تفرقہ یک سر مٹ گیا، قانون کا احترام ہر فرد اپنے گھروں کے بند کمروں میں، رات کی تاریکیوں میں کرنے لگے، یہ کوئی افسانہ نہیں، تاریخی حقائق ہیں، جن کا اعتراف غیروں نے بھی کیا، اور ہر صاف دل غیر مسلم بھی اس کے ماننے پر مجبور ہوا۔

مضمونِ آیت کے بعد آیت کی تفسیر تفصیلاً دیکھئے:

مذکورہ آیت میں كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ فرمایا گیا، قسط بکسر القاف کے معنی ہیں عدل و انصاف اور عدل و انصاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحب حق کا حق پورا ادا کیا جائے، اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی داخل ہیں، اور سب قسم کے انسانی حقوق بھی، اس لئے قیام بالقسط کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے، مظلوم کی حمایت کی جائے، اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کا حق دلوانے کے لئے شہادت کی ضرورت پیش آئے تو شہادت سے گریز نہ کیا جائے، اور یہ بھی داخل ہے کہ شہادت میں حق اور حقیقت کا اظہار کیا جائے خواہ وہ کسی کے موافق پڑے یا مخالف، یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور انتظام ہے، جب دو فریق کا کوئی مقدمہ ان کے سامنے پیش ہو تو فریقین کے ساتھ برابری کا معاملہ کریں، کسی ایک طرف کسی طرح کا

قیدان نہ ہونے دیں، گواہوں کے بیانات غور سے سنیں، معاملہ کی تحقیق میں اپنی پوری کوشش خرچ کریں، **پھر فیصلہ میں پورے پورے عدل و انصاف کا معاملہ رکھیں۔**

عدل و انصاف کے قیام میں سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی دونوں آیتیں اگرچہ متحد ہیں مگر ان دونوں آیتوں کی پیش نظر رکاوٹ بننے والے اسباب، مضمون دونوں کا تقریباً ایک ہے، فرق اتنا ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والی عادۃً دو چیزیں ہوا کرتی ہیں، ایک اپنوں کی محبت و قرابت یا دوستی و تعلق جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شاہد کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ شہادت ان کے موافق دی جائے تاکہ یہ نقصان سے محفوظ رہیں یا ان کو نفع پہنچے، اور فیصلہ کرنے والے قاضی یا جج کے دل میں اس تعلق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ ان کے حق میں دے، دوسری چیز کسی کی عداوت و دشمنی ہے جو شاہد کو اس کے خلاف شہادت پر آمادہ کرسکتی ہے، اور قاضی اور جج کو اس کے خلاف فیصلہ دینے کی باعث ہوسکتی ہے، غرض محبت و عداوت دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو عدل و انصاف کی راہ سے ہٹا کر ظلم و جور میں مبتلا کرسکتی ہیں، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی دونوں آیتوں میں ان دونوں رکاوٹوں کو دور کیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں قرابت و تعلق کی رکاوٹ دور کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے: اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، یعنی اگر تمہاری شہادت اپنے ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں ہی کے خلاف پڑے تو بھی حق بات کہو اور سچی شہادت دینے میں اس تعلق کا لحاظ نہ کرو۔

اور سورۂ مائدہ کی آیت میں عداوت اور دشمنی کی رکاوٹ کو دور کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى، **یعنی کسی قوم کا بغض و عداوت بھی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہونا چاہئے کہ راہِ عدل کو چھوڑ کر ان کے خلاف گواہی یا فیصلہ دینے لگو۔**

دونوں آیتوں کے عنوان و تعبیر میں بھی تھوڑا فرق ہے، سورۂ نساء کی آیت میں قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ فرمایا گیا، اور سورۂ مائدہ کی آیت میں قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ارشاد ہوا، یعنی پہلی آیت میں دو چیزوں کی ہدایت ہے، ایک قیام بالقسط اور دوسری شہادت للہ، اور دوسری آیت میں بھی دو ہی چیزیں مامور بہ ہیں، **مگر عنوان بدل کر قیام للہ اور شہادت بالقسط۔**

اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس تغیر عنوان سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، کہیں قیام بالقسط اور شہادت للہ سے تعبیر کر دیا گیا، کہیں قیام للہ اور شہادت بالقسط کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا، ان دونوں

آیتوں کے طرزِ بیان میں یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ یا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ کا طویل جملہ اختیار فرمایا گیا حالانکہ عدل و انصاف کا حکم صرف ایک لفظ اَقْسِطُوْا کے ذریعہ بھی دیا جا سکتا تھا۔ اس طویل جملہ کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ اتفاقی طور پر کسی معاملہ میں عدل و انصاف کر لینے سے ذمہ داری پوری نہیں ہوتی کیونکہ کسی نہ کسی معاملہ میں انصاف ہو جانا تو ایک طبعی امر ہے کہ ہر بڑے سے بڑے اور ظالم سے ظالم حاکم پر بھی صادق ہے، کہ اس سے بھی کسی معاملہ میں تو انصاف ہو ہی جاتا ہے، اس جملہ میں لفظ قَوّٰمِیْنَ استعمال فرما کر یہ بتلایا کہ عدل و انصاف پر ہمیشہ ہر وقت ہر حال اور ہر دوست دشمن کے لئے قائم رہنا ضروری ہے۔

پھر ان دونوں آیتوں میں پوری دنیا کو عدل و انصاف پر قائم کرنے اور قائم کرانے کے لئے جو ذرائع سہل اختیار کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن حکیم ہی کی خصوصیت میں سے ہیں۔

ان میں سے ایک اہم چیز تو یہ ہے کہ حکام اور عوام سب کو خدا تعالیٰ کی قدرت قاہرہ اور روز جزاء کے حساب سے ڈرا کر اس کے لئے تیار کیا گیا ہے کہ عوام خود بھی قانون کا احترام کریں، اور حکام جو تنفیذ قانون کے ذمہ دار ہیں وہ بھی تنفیذ قانون میں خدا و آخرت کو سامنے رکھ کر خلق خدا کے خادم بنیں، قانون کو خدمت خلق اور اصلاحِ عالم کا ذریعہ بنائیں، لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ اور مظلوم کو دفتر گردی کے چکر میں پھنسا کر مزید ظلم پر ظلم کا سبب نہ بنائیں، قانون کو اپنی ذاتی خواہشات یا چند ٹکوں میں فروخت نہ کریں، قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ، شُھَدَآءَ لِلّٰہِ فرما کر حکام و عوام دونوں کو للّٰہیت اور اخلاصِ عمل کی دعوت دی گئی ہے۔

دوسری بنیادی چیز یہ کہ عدل انصاف کے قیام کی ذمہ داری پوری فرد انسانی پر ڈال دی گئی ہے، سورۂ نساء اور مائدہ میں تو اس کا مخاطب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرما کر پوری امتِ مسلمہ کو بنا دیا گیا ہے، اور سورۂ حدید میں لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ فرما کر اس فریضہ کو تمام افراد انسانی پر عائد کر دیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ فرما کر اس طرف ہدایت فرما دی کہ انصاف کا مطالبہ صرف دوسروں ہی سے نہ ہو، بلکہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہئے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا شہادت دینا پڑے تو بھی حق و انصاف کے خلاف کچھ نہ بولے، اگرچہ اس کا نقصان اس کی ذات ہی پر پڑتا ہو، کیونکہ یہ نقصان حقیر و قلیل و عارضی ہے، اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچ گئی تو قیامت کا شدید عذاب اپنی جان کے لئے خرید لیا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى

اے ایمان والو یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو

نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن

نازل کی ہے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے اور جو کوئی

يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ

یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ثُمَّ كَفَرُوا۟

وہ بہک کر دور جا پڑا، جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے،

ثُمَّ ءَامَنُوا۟ ثُمَّ كَفَرُوا۟ ثُمَّ ٱزْدَادُوا۟ كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ ٱللَّهُ

پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر بڑھتے رہے کفر میں تو اللہ ان کو ہرگز

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًۢا ﴿١٣٧﴾

بخشنے والا نہیں اور نہ دکھلاوے ان کو راہ۔

ربط آیات | اوپر زیادہ حصہ احکام فرعیہ کا مذکور ہوا اور ایمان و کفر کے مباحث کہیں کہیں معاملات مع المخالفین کے ضمن میں آگئے ہیں، آگے یہ مباحث قدرے تفصیل سے مذکور ہوتے ہیں اور ختم سورت کے بالکل قریب تک چلے گئے ہیں، ترتیب بیان میں اول اس کا بیان ہے کہ شریعت میں ایمان معتبر کیا ہے، پھر کفار کے مختلف فرقوں کی مذمت عقائد میں بھی اور بعض اعمال میں بھی

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (یعنی جو محض ایمان لاکر مومنین کے زمرہ میں داخل ہو چکے ہیں، تم (عقائد ضروریہ کی تفصیل سن لو کہ، اعتقاد رکھو اللہ کی ذات و صفت کے ساتھ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت) کے ساتھ اور اس کتاب کے (حق ہونے) کے ساتھ جو اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) اپنے رسول (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی اور ان کتابوں (کے حق ہونے) کے ساتھ بھی جو کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) پہلے (اور نبیوں پر) نازل ہو چکی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سابقہ پر ایمان لانے میں ملائکہ اور باقی انبیاء علیہم السلام اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا بھی داخل ہو گیا) اور جو شخص اللہ (کی ذات

یا صفت کا انکار کرے اور اسی طرح جو اس کے فرشتوں کا انکار کرے اور اسی طرح جو اس کی کتابوں کا (جس میں قرآن بھی آ گیا) انکار کرے اور اسی طرح جو اس کے رسولوں کا (جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں) انکار کرے، اور اسی طرح جو روز قیامت کا انکار کرے، تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا، بیشک جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے پھر مسلمان ہوئے اور اس پر بھی اسلام پر قائم نہ رہے ورنہ پہلا ارتداد معاف ہوجاتا بلکہ پھر کافر ہوگئے، (پھر اسلام ہی نہ لائے ورنہ پھر بھی ایمان قبول ہوجاتا بلکہ کفر میں بڑھتے چلے گئے (یعنی کفر پر دم مرگ تک قائم رہے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو منزل مقصود (یعنی بہشت کا) راستہ دکھائیں گے (کیونکہ مغفرت اور جنت کے لئے موت تک مومن رہنا شرط ہے)

معارف و مسائل

فوائد مہمہ

قولہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا، اس سے مراد منافقین ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اول ایمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کرکے کافر ہوگئے، پھر توبہ کرکے مومن ہوئے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہوکر کافر ہوئے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرکے کفر میں ترقی کرگئے (روح المعانی)

قولہ تعالیٰ لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا، مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ان کے بار بار کفر کی طرف لوٹنے سے ان کی توفیق حق سلب ہوجائے گی اور آئندہ توبہ کرنے اور ایمان لانے کا موقع ہی نصیب نہ ہوگا، ورنہ جو قاعدہ قرآن وسنت کی نصوص قطعیہ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ کیسا ہی کافر یا مرتد ہو اگر سچی توبہ کرے تو پچھلا گناہ معاف ہوجاتا ہے، یہ لوگ بھی توبہ کرلیں تو معافی کا قانون کھلا ہوا ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ الَّذِیْنَ
خوش خبری سنادے منافقوں کو کہ ان کے واسطے ہے عذاب دردناک، وہ جو

یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ
بناتے ہیں کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ ﴿۱۳۹﴾
کیا ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس عزت سو عزت تو اللہ ہی کے واسطے ہے ساری،

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
اور حکم اتار چکا تم پر قرآن میں کہ جب سنو اللہ کی آیتوں پر

يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا
انکار ہوتے اور ہنسی ہوتے تو نہ بیٹھو اُن کے ساتھ یہاں تک کہ مشغول ہوں

فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ
کسی دوسری بات میں نہیں تو تم بھی انہی جیسے ہو گئے اللہ اکٹھا کرے گا

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۱۴۰ الَّذِيْنَ
منافقوں کو اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ وہ منافق جو

يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ
تمہاری تاک میں ہیں پھر اگر تم کو فتح ملے اللہ کی طرف سے تو کہیں کیا ہم نہ تھے

نَكُنْ مَّعَكُمْ ښ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ
تمہارے ساتھ اور اگر نصیب ہو کافروں کو تو کہیں کیا ہم نے

نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ
گھیر نہ لیا تھا تم کو اور بچا دیا تم کو مسلمانوں سے سو اللہ

يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ
فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۱۴۱ ع
مسلمانوں پر غلبہ

۲۰ ع ۱۷

خلاصۂ تفسیر

منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے (آخرت میں) بڑی دردناک سزا تجویز کی گئی جن کی یہ حالت ہے کہ عقائد تو ایمان کے نہ رکھتے تھے مگر وضع بھی اہل ایمان کی نہ رکھ سکے جیسے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس (جاکر) عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ عزت تو ساری خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے (وہ جس کو

چاہتے ہیں پس اگر خدا تعالیٰ ان کو یعنی جن سے جا کر دوستی کرتے ہیں ان کو عزت نہ دیں تو کہاں سے عزت دلوا دیں گے، اور اے مسلمانو دیکھو تم منافقین کی طرح کفار کے ساتھ خصوصیت مت رکھنا، اس لئے کہ جس وقت وہ کفریات کا تذکرہ کرتے ہوں، چنانچہ اس سورۃ مدنیہ سے قبل بھی) اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان (سورۂ انعام کی آیت میں جو مکیہ ہے) بھیج چکا ہے (جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کسی مجمع میں، احکامِ الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہو سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں، اور یہی مضمون اس آیت کا حاصل ہے وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ الخ سو یہ استہزاء کرنے والے مکہ میں مشرکین تھے اور مدینہ میں یہود تو علانیہ اور منافقین صاف غیر، اور ضعفاء مسلمین کے روبرو، پس جس طرح وہاں مشرکین کی مجالست ایسے وقت میں ممنوع تھی یہاں یہود اور منافقین کی مجالست سے نہی ہے اور یہ ممانعت بوجہ اس کے کرتے ہیں کہ اس حالت میں تم بھی (گناہ میں) انہی جیسے ہو جاؤ گے، گو دونوں کی نوعیت میں فرق ہو کہ ایک گناہ کفر کا ہے دوسرا فسق کا، اور اس ممانعت مجالست میں کفار اور منافقین سب برابر ہیں، کیونکہ مشترک علت اس کی خوض فی الکفر یعنی کفر کی باتوں کا تذکرہ اور اس خوض کا منشاء کفر ہے اور اس میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ سزائے کفر یعنی دوزخ کا ایندھن ہونے میں بھی دونوں برابر ہوں گے کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے اور وہ منافقین ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر (اور آرزو مند) رہتے ہیں پھر (ان کے اس انتظار کے بعد) اگر تمہاری فتح منجانب اللہ ہو گئی تو (تم سے آکر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ (جہاد میں شریک) نہ تھے (کیونکہ نام و نمود کو تو مسلمانوں میں گھسے ہی رہتے تھے، مطلب یہ کہ ہم کو بھی غنیمت کا حصہ دو) اور اور اگر کافروں کو (فتح میں) کچھ حصہ مل گیا (یعنی وہ اتفاق سے غالب آگئے) تو ان سے جا کر باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے، مگر ہم نے قصداً تمہارے غالب کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد نہ کی اور ایسی تدبیر کی کہ بنی بات بگڑ گئی، اور کیا ہم نے (جب تم مغلوب ہونے لگے تھے) تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا اس طرح کہ ان کی مدد نہ کی، اور تدبیر سے لڑائی بگاڑ دی مطلب یہ کہ بعوض اس امداد کے جو تمہارے ہاتھ آیا ہے ہم کو بھی کچھ حصہ دو، غرض دونوں طرف سے بناتے رہتے ہیں، سو دنیا میں گو اظہارِ اسلام کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں عملی فیصلہ فرما دیں گے اور اس فیصلہ میں، ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرماویں گے، بلکہ کفار مجرم قرار پا کر دوزخ میں جاویں گے، اور

مسلمان (اہل حق ثابت ہو کر جنت میں جائیں گے، اور فیصلہ عملی یہی ہے)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں منافقین کے لئے دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے، اور اس رنج دہ خبر کو لفظ بشارت سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ فرما دیا گیا کہ ہر انسان اپنے مستقبل کے لئے خوشخبری سننے کا منتظر رہا کرتا ہے، مگر منافقین کے لئے اس کے سوا کوئی خبر نہیں، ان کے لئے بشارت کے عوض میں یہی خبر ہے۔

عزت اللہ ہی سے طلب کرنی چاہیئے

دوسری آیت میں کفار و مشرکین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے اور گھل مل کر رہنے کی مذمت اور ایسا کرنے والوں کے لئے وعید مذکور ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس مرض میں مبتلا ہونے کی اصل منشاء اور سبب کو بیان کر کے اس کا غلط اور بیہودہ ہونا بھی بتلا دیا ہے، ارشاد فرمایا أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا، یعنی کفار و مشرکین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ ملنے کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ان کی ظاہری عزت و قوت و جتھے سے متاثر ہو کر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے دوستی رکھی جائے، تو ہمیں بھی ان سے عزت و قوت حاصل ہو جائے گی، حق تعالیٰ نے اس لغو خیال کی حقیقت اس طرح واضح فرمائی کہ تم ان کے ذریعہ عزت حاصل کرنا چاہتے ہو جن کے پاس خود عزت نہیں، عزت جس کے معنی ہیں قوت و غلبہ کے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، اور مخلوق میں سے جس کسی کو بھی کوئی قوت و غلبہ ملتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، تو کس قدر بے عقلی ہوگی کہ عزت حاصل کرنے کے لئے اصل عزت کے مالک اور عزت دینے والے کو تو ناراض کیا جائے، اور اس کے دشمنوں کے ذریعہ عزت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن مجید کی سورۂ منافقون میں بھی یہی مضمون ایک اضافہ کے ساتھ اس طرح آیا ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۸﴾

"یعنی عزت تو صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے لئے، **لیکن منافقین اس کو نہیں جانتے**"

اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اور مومنین کا اضافہ کر کے یہ بھی بتلا دیا کہ جس

عزت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے کچھ حصہ عزت عطا فرما دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور ان پر ایمان لانے والے چونکہ اس کے نزدیک محبوب اور مقبول ہیں، اس لئے ان کو عزت و غلبہ دیا جاتا ہے، کفار و مشرکین کو خود ہی عزت نصیب نہیں، ان کے تعلق سے کسی دوسرے کو کیا عزت مل سکتی ہے، اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا

مَنِ اعْتَزَّ بِالْعَبِيْدِ اَذَلَّهُ اللّٰهُ (جصاصؒ)	"جو شخص مخلوقات اور بندوں کے ذریعہ عزت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر دیتے ہیں۔"

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ملک شام کے عامل (گورنر) سے فرمایا: كُنْتُمْ اَقَلَّ النَّاسِ وَاَذَلَّ النَّاسِ فَاَعَزَّكُمُ اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ مَهْمَا تَطْلُبُوا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهٖ يُذِلَّكُمُ اللّٰهُ (مستدرک ص ۸۲ ج ۳) یعنی (اے ابو عبیدہ) تم تعداد میں سب سے کم اور سب سے زیادہ کمزور تھے، تم کو محض اسلام کی وجہ سے عزت و شوکت ملی ہے، تو خوب سمجھ لو اگر تم اسلام کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے عزت حاصل کرنا چاہو گے تو خدا تعالیٰ تم کو ذلیل کر دے گا۔"

ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ مراد آیت مذکورہ سے یہ ہے کہ کفار و فجار سے دوستی کر کے عزت طلب نہ کرو، ہاں مسلمانوں کے ذریعہ عزت و قوت طلب کی جائے تو اس کی ممانعت نہیں، کیونکہ سورہ منافقون کی آیت نے اس کو واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور مؤمنین کو عزت بخشی ہے۔ (جصاص ص ۳۵۲، ج ۲)

یہاں عزت سے مراد اگر ہمیشہ قائم و باقی رہنے والی آخرت کی عزت ہے تب تو دنیا میں اس کا مخصوص ہونا اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور مؤمنین کے ساتھ واضح ہے، کیونکہ آخرت کی عزت کسی کافر و مشرک کو قطعاً حاصل نہیں ہو سکتی، اور اگر مراد دنیا کی عزت لی جائے تو عارضی دور اور تھوڑی مدت کو چھوڑ کر انجام کے اعتبار سے یہ عزت و غلبہ بالآخر اسلام اور مسلمانوں ہی کا حق ہے، جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان رہے، دنیا نے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، اور پھر آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امامت و قیادت میں مسلمان صحیح اسلام پر قائم ہو جائیں گے تو پھر غلبہ انہی کا ہوگا، درمیانی اور عارضی دور میں مسلمانوں کے ضعف ایمان اور بتدریج معاصی کی وجہ سے ان کا مغلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

آیت وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ میں قرآن مجید کی ایک اور آیت کا جو سورۂ انعام میں قبل از ہجرت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی حوالہ دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم نے تو اطلاع

نسائی کے لئے پہلے ہی یہ حکم بھیجا تھا کہ کفار و فجار کی مجلس میں بھی مت بیٹھو، اور تعجب ہے کہ یہ منافق لوگ اس سے بھی آگے بڑھ گئے، کہ ان سے دوستی کرنے لگے، اور ان کو عزت و قوت کا مالک سمجھنے لگے۔

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت اور سورۂ انعام کی وہ آیت جس کا حوالہ سورۂ نساء میں دیا گیا ہے دونوں کا مفہوم مشترک یہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار یا اُن پر استہزاء کر رہے ہوں تو جب تک وہ اس بیہودہ شغل میں لگے رہیں ان کی مجلس میں بیٹھنا اور شرکت کرنا بھی حرام ہے، مگر سورۂ انعام کی آیت کے الفاظ میں کچھ تعمیم اور مزید تفصیل ہے، کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝	"یعنی جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر دیں یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی اور بات میں اور اگر بھلا دے تم کو شیطان تو مت بیٹھو یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے ساتھ۔"

اس میں آیات الٰہیہ میں جھگڑا کرنا مذکور ہے جس میں کفر و استہزاء بھی داخل ہے، اور آیات کی تحریف معنوی یعنی آیات قرآنی کے ایسے معانی بیان کرنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی تفسیر کے خلاف یا اجماع امت کے خلاف ہوں یہ بھی اسی میں داخل ہیں، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بروایت ضحاک منقول ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن کی تفسیر غلط یا اس میں تحریف کرنے والے یا بدعات نکالنے والے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں: دَخَلَ فِي هٰذِهِ الْآيَةِ كُلُّ مُحْدِثٍ فِي الدِّيْنِ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (مظہری ص ۲۲۳ ج ۲)

تفسیر بالرائے کرنے والے کی مجلس میں شرکت جائز نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن کریم کے درس یا تفسیر میں تفسیر سلف صالحین کا پابند نہیں، بلکہ ان کے خلاف معانی بیان کرتا ہے اس کے درس و تفسیر میں شرکت بنص قرآن ناجائز اور بجائے ثواب کے گناہ ہے، تفسیر بحر محیط میں ابو حیانؒ نے فرمایا کہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس بات کا زبان سے کہنا گناہ ہے اس کا کانوں سے باختیار خود سننا بھی گناہ ہے۔

اور اس پر یہ شعر نقل کیا ہے ؎

وَسَمْعَكَ صُنْ عَنْ سِمَاعِ الْقَبِيْحِ
كَصَوْنِ اللِّسَانِ عَنِ النُّطْقِ بِهٖ

"یعنی اپنے کانوں کو بُری بات سننے سے بچاؤ جس طرح زبان کو بُری بات
کہنے سے بچاتے ہو"

دوسری بات سورۂ انعام کی آیت میں یہ زیادہ ہے کہ اگر کسی وقت بھولے یا بے خبری سے کوئی آدمی ایسی مجلس میں شریک ہوگیا، پھر خیال آیا تو اسی وقت اس مجلس سے علیحدہ ہوجانا چاہئے، یاد آجانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

سورۂ نساء اور سورۂ انعام کی دونوں آیتوں میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تک وہ لوگ اس بیہودہ گفتگو میں مشغول رہیں اس وقت تک ان کی مجلس میں بیٹھنا حرام ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب وہ اس گفتگو کو ختم کرکے کوئی دوسری بات شروع کردیں تو اس وقت ان کے ساتھ مجالست و شرکت جائز ہے یا نہیں؟ قرآن کریم نے اس کی صراحت سے بیان نہیں فرمایا، اسی لئے علماء کا اس میں اختلاف ہے، بعض نے فرمایا کہ ممانعت کی علت آیات الٰہیہ کی توہین اور تحریف تھی، جب وہ ختم ہوگئی تو ممانعت بھی ختم ہوگئی، اسی لئے دوسری باتیں شروع ہوجانے کے بعد ان کی مجلس میں بیٹھنا گناہ نہیں، اور بعض نے فرمایا کہ ایسے کفار و فجار اور ظالم لوگوں کی صحبت و مجالست بعد میں بھی درست نہیں، حضرت حسن بصری کا یہی ارشاد ہے، انھوں نے سورۂ انعام کے اس جملے سے استدلال فرمایا ہے: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھیں، اور ظاہر ہے کہ ظالم اس گفتگو کو ختم کردینے کے بعد بھی ظالم ہی ہے اسی لئے اس کی صحبت و مجالست سے بعد میں بھی احتراز لازم ہے۔ (جصاص)

اور تفسیر مظہری میں قاضی صاحب رحمۃ اللہ نے دونوں میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ جب کفر و استہزاء اور تحریف قرآن کی گفتگو بند ہوکر کوئی دوسری بات شروع ہوجائے تو اس وقت بھی ایسے لوگوں کی مجلس میں شرکت بلاضرورت تو حرام ہے، اور اگر کوئی ضرورت شرعی یا طبعی داعی ہو تو جائز ہے۔

بروں کی صحبت سے تنہائی بھلی

امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس مجلس میں کوئی گناہ ہو رہا ہو تو مسلمان پر نہی عن المنکر کے ضابطہ سے یہ لازم ہے کہ اگر اس کو روکنے کی قدرت ہو تو قوت کے ساتھ روک دے، اور یہ قدرت نہیں ہے تو کم از کم اس گناہ سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس

تو تم بھی ان کے گناہ کے شریک ہو کر انہی جیسے ہوگئے، مراد یہ ہے کہ خدانخواستہ تمہارے جذبات وخیالات بھی ایسے ہیں کہ تم ان کے کفریات کو پسند کرتے اور اس پر راضی ہوتے تو حقیقۃً تم بھی کافر ہو کیونکہ کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہے، اور اگر یہ بات نہیں تو ان کی مثل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دین کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں تم بھی اس شرکت کے ذریعہ ان کی امداد کر کے معاذ اللہ ان کی مثل ہوگئے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا
البتہ منافق دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا اور جب کھڑے ہوں

إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ
نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کے دکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو

اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ
مگر تھوڑا سا، ادھر میں لٹکتے ہیں دونوں کے بیچ نہ اُن کی طرف

وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾
اور نہ اِن کی طرف اور جس کو گمراہ کرے اللہ تو ہرگز نہ دے گا تو اس کے واسطے کہیں راہ

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ
اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو

دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ
چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾
الزام صریح

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ منافق لوگ (اظہار ایمان میں) چالبازی کرتے ہیں اللہ سے، (گو ان کی چال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور گو ان کا اعتقاد اللہ کے ساتھ چالبازی کرنے کا نہ ہو، مگر ان کی یہ کارروائی مشابہ اسی کے ہے کہ جیسے یہی اعتقاد ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا

ان کو دینے والے ہیں، اور چونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں، اور اس لئے نماز کو فرض نہ سمجھیں
نہ اس میں ثواب کا اعتقاد رکھیں اس لئے) جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے
ساتھ کھڑے ہوتے ہیں (کیونکہ نشاط اعتقاد و امید سے پیدا ہوتا ہے) صرف آدمیوں کو (اپنا
نمازی ہونا) دکھلاتے ہیں (تاکہ مسلمان سمجھیں) اور (چونکہ محض نماز کا نام ہی کرنا ہے اس لئے
اس نماز میں) اللہ تعالیٰ کا ذکر (زبانی بھی) نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر (یعنی محض صورت نماز
کی بنا لیتے ہیں جس میں نماز کا نام موجود ہو، اور عجب نہیں کہ اٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو، کیونکہ جہر
کی قراءت تو بعض نمازوں میں امام کو ہوتی ہے، امامت تو ان کو کہاں نصیب ہوتی مقتدی
ہونے کی حالت میں اگر سری نماز بالکل نہ پڑھے فقط سب حرکات کرے تو کسی کو کیا خبر ہو تو ایسے بداعتقاد
سے کیا بعید ہے کہ زبان بھی نہ ہلتی ہو) معلق ہو رہے ہیں دونوں کے (یعنی کفار و مومنین کے)
درمیان میں نہ ادھر کے نہ ادھر کے (کیونکہ ظاہر میں تو مومن ہیں تو کفار سے الگ اور باطن
میں کافر تو مومنین سے الگ) اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (جیسا کہ ان کی عادت
ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں) ایسے شخص کے (مومن ہونے کے) لئے
کوئی سبیل (یعنی راہ) نہ پاؤ گے (سو اے پیغمبر ان منافقین کے راہ پر آنے کی امید مت رکھو، اس میں
منافقین کی تشنیع ہے اور مومنین کی تسلی کہ ان کی شرارتوں سے رنج نہ کریں) اے ایمان والو! تم
مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو (خواہ منافق ہوں خواہ مجاہر ہوں) دوست مت بناؤ (جیسا منافقین
کا شیوہ ہے کیونکہ تم کو ان کی حالت کفر و عداوت کی معلوم ہو چکی) کیا تم (ان سے دوستی کر کے)
یوں چاہتے ہو کہ اپنے اوپر (اپنے مجرم و مستحق عذاب ہونے پر) اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم
کر لو (حجت صریحہ یہی ہے کہ ہم نے جب منع کر دیا تھا پھر کیوں کیا)

معارف ومسائل

مسئلہ: (قولہ تعالیٰ قاموا کسالیٰ) جس کسل کی یہاں مذمت ہے وہ اعتقادی کسل
ہے، اور باوجود اعتقاد کے کسل ہو وہ اس سے خارج ہے، پھر اگر کسی عذر سے ہو جیسے مرض
وتعب وغیرہ تو وہ قابل ملامت بھی نہیں، اور اگر بلا عذر ہو تو قابل ملامت ہے۔
(بیان القرآن)

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ

بیشک منافق ہیں سب سے نیچے درجے میں دوزخ کے اور ہرگز

تو بھر رحمت ہی رحمت ہے) اور اللہ تعالیٰ (تو خدمت کی بڑی قدر کرنے والے (اور خدمتگذری کے خلوص وغیرہ کو) خوب جاننے والے ہیں (پس جو شخص اطاعت واخلاص سے لپٹے اس کو بہت کچھ دیتے ہیں)

معارف و مسائل

(قولہ تعالیٰ) اَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل مقبول ہے جو ریا سے پاک ہو، اور محض اسی کی ذات کے لئے ہو، کیونکہ مخلص کے معنی فقہاء نے یہ بیان کئے ہیں:

اَلَّذِیْ یَعْمَلُ لِلّٰہِ لَا یُحِبُّ اَنْ یَّحْمَدَہُ النَّاسُ عَلَیْہِ (بحوالہ مظہری)

"یعنی مخلص وہ آدمی ہے جو عمل محض اللہ ہی کے لئے کرے، اور اس بات کو وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کے عمل کی تعریف کریں"

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ

اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا

اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا

مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ ہے سننے والا جاننے والا۔ اگر تم کھول کر کرو کوئی بھلائی

اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْۗءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

یا اس کو چھپاؤ یا معاف کرو برائی کو تو اللہ بھی معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ

جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ

يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ

فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور

نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ

نہیں مانتے بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں ایک

سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا

راہ، ایسے لوگ وہی ہیں اصل کافر اور ہم نے تیار کر رکھا ہے

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر

وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰۗىِٕكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ

اور جدا نہ کیا ان میں سے کسی کو ان کو جلد دے گا ان کے

اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

ثواب اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

ع ۲۱ / ۱۱

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو (کسی کے لئے) پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے (کہ وہ اپنے ظالم کی نسبت کچھ حکایت شکایت کرنے لگے تو وہ گناہ نہیں) اور اللہ تعالیٰ (مظلوم

کی بات، خوب سنتے ہیں اور خصم کے ظلم کی حالت خوب جانتے ہیں (اس میں اشارہ ہے کہ مظلوم کو بھی خلافِ واقعہ کہنے کی اجازت نہیں، اور ہرچند کہ ایسی شکایت جائز تو ہے لیکن) اگر نیک کام علانیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو (جس میں معاف کرنا بھی آگیا) یا (بالخصوص) کسی کی برائی کو معاف کردو تو (زیادہ فضل ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں، (باوجودیکہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح انتقام لے سکتے ہیں، مگر پھر بھی اکثر معاف ہی کردیتے ہیں، پس اگر تم ایسا کرو تو اوّل تو تخلق باخلاق اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا اتباع ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرنے کی امید ہوگی) جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ (جیسا ان کے عقیدہ اور قول سے جو آگے آتا ہے صاف طور پر لازم آتا ہے) اور (کفر کرتے ہیں) اس کے رسولوں کے ساتھ (یعنی بعض کے ساتھ تو صراحۃً، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے، اور کل کے ساتھ لزوماً جیسا آگے آتا ہے) اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں (باعتبار ایمان لانے کے) فرق رکھیں اور (اپنے اس عقیدہ کو زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں (اس قول اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کفر لازم آگیا، اور سب رسولوں کے ساتھ بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور ہر رسول نے سب رسولوں کو رسول کہا ہے، جب بعض کا انکار ہوا تو اللہ تعالیٰ کی اور بقیہ رسولوں کی تکذیب ہوگئی، جو کہ ضد ہے تصدیق اور ایمان کی) اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں (کہ نہ سب پر ایمان رہے جیسے مسلمان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ سب کا انکار رہے جیسا کہ مشرکین کرتے تھے سو) ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں (کیونکہ کفر بالبعض بھی کفر ہے، اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جب ایمان بالجمیع نہ ہوا تو کفر ہی ہوا) اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے (وہی ان کے لئے بھی ہوگی) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی اور ان میں سے کسی میں (ایمان لانے کے اعتبار سے) فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کا ثواب دیں گے اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں (اس لئے ایمان لانے سے پہلے جتنے گناہ ہوچکے ہیں سب بخش دیں گے اور چونکہ وہ) بڑے رحمت والے ہیں (اس لئے ایمان کی برکت سے ان کے حسنات کو مضاعف کرکے خوب ثواب دیں گے)۔

۳۸

معارف ومسائل

ان آیات میں سے پہلی آیت اور دوسری آیت دنیا سے ظلم وجور کے مٹانے کا ایک قانون ہے، مگر عام دنیا کے قوانین کی طرح نہیں جس کی حیثیت صرف آمرانہ ہوتی ہے، بلکہ ترغیب وترہیب کے انداز کا ایک قانون ہے جس میں ایک طرف تو اس کی اجازت دیدی گئی ہے کہ جس شخص پر کوئی ظلم کرے تو مظلوم اس کے ظلم کی شکایت یا کسی عدالت میں چارہ جوئی کرسکتا ہے جو عین عدل وانصاف کا تقاضا اور انسداد جرائم کا ایک ذریعہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک قید بھی سورۂ نحل کی آیت میں مذکور ہے۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (آیت ۱۲۶) یعنی اگر کوئی شخص تم پر ظلم کرے تو تم بھی اس سے ظلم کا بدلہ لے سکتے ہو، مگر شرط یہ ہے کہ جتنا ظلم وتعدی اس نے کیا ہے بدلہ میں اس سے زیادتی نہ ہونے پائے، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے جس کا حاصل یہ ہے کہ ظلم کے جواب میں ظلم کی اجازت نہیں بلکہ ظلم کا بدلہ انصاف سے ہی لیا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت ہے کہ بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے مگر صبر کرنا اور معاف کردینا بہتر ہے۔

اور آیت مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس پر کسی نے ظلم کیا ہو اگر وہ ظلم کی شکایت، حکایت لوگوں سے کرے تو یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، کیونکہ اس نے خود اس کو شکایت کرنے کا موقع دیا ہے، غرض قرآن حکیم نے ایک طرف تو مظلوم کو ظلم کا مساوی بدلہ لینے کی اجازت دیدی، اور دوسری طرف اعلیٰ اخلاق کی تعلیم، عفو ودرگذر اور اس کے بالمقابل آخرت کا عظیم فائدہ پیش نظر کرکے مظلوم کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے اس جائز حق میں ایثار سے کام لے ظلم کا انتقام نہ لے، ارشاد فرمایا:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا "یعنی اگر تم کوئی نیکی ظاہر کرکے کرو، یا خفیہ طور پر کرو، یا کسی کے ظلم اور برائی کو معاف کردو تو یہ بہتر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والے اور بڑی قدرت والے ہیں"

اس آیت میں اصل مقصد تو ظلم کے معاف کرنے سے متعلق ہے، مگر اس کے ساتھ علانیہ اور خفیہ نیکی کا بھی ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ یہ عفو ودرگذر ایک بڑی نیکی ہے جو اس کو اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کے عفو ورحمت کا مستحق ہو جائے گا۔

آخر آیت میں فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا فرما کر یہ بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ

قادر مطلق ہیں جسکو جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں، اس کے باوجود بہت معاف کرنے والے ہیں، تو انسان جسکو قدرت واختیار بھی کچھ نہیں وہ اگر انتقام لینا بھی چاہے تو بہت ممکن ہے کہ اس پر قدرت ہی نہ ہو، اس لئے اس کو تو عفو ودرگذر اور بھی زیادہ مناسب ہے۔

یہ ہے رفع ظلم اور اصلاح معاشرہ کا قرآنی اصول اور مربیانہ انداز کہ ایک طرف برابر کے انتقام کا حق دے کر عدل وانصاف کا بہترین قانون بنادیا، دوسری طرف مظلوم کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر عفو ودرگذر پر آمادہ کیا، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہے جس کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۴۱: ۳۴) یعنی جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی اس طرز عمل سے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔"

عدالتی فیصلہ اور ظلم کا انتقام لے لینے سے ظلم کی روک تھام ضرور ہوجاتی ہے، لیکن فریقین کے دلوں میں وہ ایک دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں جو آئندہ پھر باہمی جھگڑوں کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور یہ اخلاقی درس جو قرآن کریم نے دیا اس کے نتیجہ میں گہری اور پرانی عداوتیں دوستیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

تیسری اور چوتھی اور پانچویں آیت میں قرآن حکیم نے یہ کھلا ہوا فیصلہ دیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو مانے مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ لائے، یا بعض رسولوں کو مانے اور بعض کو نہ مانے وہ اللہ کے نزدیک مؤمن نہیں، بلکہ کھلا کافر ہے جس کی نجات آخرت کی کوئی راہ نہیں۔

اسلام کے سوا کسی مخالف مذہب میں نجات نہیں ہوسکتی

قرآن حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور کجروی کو پوری طرح کھول دیا ہے، جو دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقائد کو بطور تحفہ اور ہبہ کے پیش کرنا چاہتے ہیں اور قرآن وسنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پا سکتا ہے، حالانکہ یہ لوگ سب رسولوںؑ کے یا کم از کم بعض رسولوںؑ کے منکر ہیں، جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اعلان کردیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف اور ہمدردی و خیرخواہی اور احسان و رواداری کے معاملہ میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن احسان و

سلوک یا حقوق دنیاوی حیثیت میں جو کرتے ہیں مذہبی اصول دعقائد ہماری حیثیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کر سکیں، اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنی سرحدات کی حفاظت میں نہایت محتاط اور سخت بھی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رسوم کفر سے پوری طرح اعلان برأت بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے، اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح حفاظت بھی کرتا ہے وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں قرآن و سنت میں موجود ہیں۔

اگر اسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب وملت میں نجات ہو سکتی ہے تو اس کو مذہب اسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا اصولاً غلط اور خلاف عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کریم کا نزول معاذ اللہ بیکار اور فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے۔

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ "بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"

اس آیت میں چونکہ ایمانیات کی پوری تفصیل دینے کے بجائے صرف ایمان باللہ والیوم الآخر پر اکتفاء کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھورے مطالعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھنا نجات کے لئے کافی ہے رسولوں پر ایمان شرط نجات نہیں، اور یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسل کے ساتھ ہو، ورنہ محض خدا کے اقرار و توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے، قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ

شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۲: ۱۳۷) "یعنی ان کا ایمان اس وقت معتبر ہوگا جبکہ وہ عام مسلمانوں کی طرح ایمان حبیب کریں جس میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول لازم ہے، ورنہ پھر سمجھ لو کہ وہی لوگ تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان کے لئے کافی ہے، اور وہ بہت سننے والا جاننے والا ہے"

اور پیش نظر آیات میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بتلادیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی ایک رسول کا بھی منکر ہو وہ کھلا کافر ہے، اور اس کے لئے عذابِ جہنم ہے، ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بر رسول کے ساتھ ہو، اس کے بغیر اس کو ایمان باللہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

آخری آیت میں پھر اسی طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ نجاتِ آخرت انہی لوگوں کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے سب رسولوں پر بھی ایمان رکھیں، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِنَّ الْقُرْاٰنَ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا "یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر و تشریح کرتا ہے"

خود قرآنی تفسیر کے خلاف کوئی تفسیر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ

تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہل کتاب کہ تو ان پر اتار لائے لکھی ہوئی کتاب آسمان سے

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً

سو مانگ چکے ہیں موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز اور کہا ہم کو دکھلادے اللہ کو بالکل سامنے

فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ

سو آپڑی ان پر بجلی ان کے گناہ کے باعث پھر بنالیا بچھڑے کو بہت کچھ نشانیاں

بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى

پہنچ چکنے کے بعد پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا اور دیا ہم نے موسیٰ کو

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۵۳ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ

غلبہ صریح، اور ہم نے اٹھایا ان پر پہاڑ قول لینے کے واسطے اور

قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا

اور ہم نے کہا داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے کہا کہ زیادتی مت کرو

فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيظًا ﴿۱۵۴﴾

ہفتہ کے دن میں اور ہم نے ان سے لیا قول مضبوط۔

ربطِ آیات ماقبل کی آیات میں یہود کی بداعتقادیوں کا ذکر کر کے ان کی مذمت مذکور تھی، ان آیات میں بھی ان کی کچھ دوسری خراب حرکتوں کی ایک طویل فہرست اور ان قباحتوں کی بنا پر ان کے عذاب و سزا کا ذکر ہے، اور یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے اہلِ کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوا دیں سو (آپ ان لوگوں سے اس کو عجیب نہ سمجھئے کیونکہ یہ فرقہ ایسا معاند ہے کہ) انھوں نے (یعنی اس فرقہ کے جو لوگ موسیٰ علیہ السلام کے وقت موجود تھے انھوں نے) موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی، اور یوں کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا (بلا حجاب) دکھلا دو، جس پر ان کی گستاخی کے سبب ان پر کڑک بجلی کی آ پڑی، پھر (اس سے بڑھ کر ان کی یہ حرکت ہو چکی ہے کہ) انھوں نے گوسالہ کو (پرستش) کے لئے تجویز کیا تھا بعد اس کے کہ بہت سے دلائل (تعیینِ حق و باطل کے) ان کو پہنچ چکے تھے (مراد ان دلائل سے معجزات ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے جن میں سے غرقِ فرعون تک بہتوں کا مشاہدہ ہو چکا تھا) پھر ہم نے ان سے درگذر کر دیا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بڑا رعب دیا تھا (اس رعب پر اور ہماری درگذر اور عنایت پر ان لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ نہ عنایت سے متاثر ہوتے تھے نہ رعب سے) اور ہم نے ان لوگوں سے (تورات پر عمل کرنے کے) قول و قرار لینے کے واسطے کوہِ طور کو اٹھا کر ان کے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی سے داخل ہونا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم ہفتہ کے بارے میں (جو حکم تم کو ملا ہے کہ اس میں شکار نہ کریں اس میں حدِ شرع سے) تجاوز مت کرنا اور (اس کے علاوہ اور بھی) ہم نے ان سے قول و قرار نہایت شدید لئے (جس کا بیان وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَاۗءِیْلَ میں مذکور ہے لیکن ان لوگوں نے باوجود اس قدر اہتمام کے پھر اپنے عہدوں کو توڑ ڈالا)۔

معارف و مسائل

یہودیوں کے کچھ سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر لکھی ہوئی کتاب آسمان سے نازل ہوئی تھی طرح کی ایک کتاب آپ بھی آسمان سے لائیں، تو ہم ایمان لے آئیں گے، ان کا مطالبہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ دل سے ایمان لانا چاہتے تھے، اور یہ ان کی ایک شرط تھی، بلکہ وہ ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے کوئی نہ کوئی عذر کرتے ہی رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقتِ حال سے آگاہ فرمایا، اور ان کی تسلی کر دی کہ درحقیقت

یہ قوم تو ایسی ہے کہ شیطان کے دھوکوں کو سستا تری سمجھتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے بڑی سے بڑی حرکت بھی کر گذرتی ہے، ان کے آباؤ اجداد نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی زیادہ بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دکھلایا جائے، ان کی اس گستاخی پر آسمان سے بجلی آئی اور ان کو ہلاک کر دیا، پھر توحید و خدائے واحد لاشریک کے براہین و بینات کو اچھی طرح سمجھنے برتنے کے بعد بھی خالق حقیقی کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہم نے عفو و درگذر سے کام لیا، ورنہ تو موقع اس کا تھا کہ ان کا قلع قمع کیا جاتا اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے غلبہ عطا کیا

ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ ان لوگوں نے تورات کی شریعت کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا تو ہم نے پہاڑ طور کو ان پر معلق کر دیا کہ شریعت کو ماننا ہی ہوگا، ورنہ پہاڑ کے نیچے دب جاؤ گے۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ جب شہر انبیا کے دروازہ میں داخل ہو تو نہایت عاجزی سے اطاعت خداوندی کے جذبہ سے سرشار سر جھکائے ہوئے داخل ہو، یہ بھی ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ سنیچر کے روز مچھلیوں کا شکار نہ کھیلو، یہ ہمارا حکم ہے اس سے روگردانی نہ کرو اور اس طرح ہم نے ان سے مضبوط عہد لے لیا تھا، لیکن ہوا یوں کہ انھوں نے ایک ایک کرکے احکام کی خلاف ورزی کی، اور ہمارے عہد کو توڑ ڈالا تو ہم نے دنیا میں بھی اُن کو ذلیل کر دیا، اور آخرت میں بھی اُن کو بدترین سزا بھگتنی ہوگی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ
اُن کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر

الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ
پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ ہمارے دل پر غلاف ہے سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے

عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّبِكُفْرِهِمْ
مہر کر دی ان کے دل پر کفر کے سبب سو ایمان نہیں لاتے مگر کم، اور ان کے کفر پر

وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا
اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر اور ان کے کہنے پر

قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ
کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا اور انھوں نے نہ اس کو مارا

وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا

اور نہ سولی پر چڑھایا اس کو لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے

فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ

ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف اٹکل پر چل رہے ہیں،

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا

اور اس کو قتل نہیں کیا بیشک بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست

حَكِيمًا ﴿١٥٨﴾ وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ

حکمت والا اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی

مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿١٥٩﴾

موت سے اور قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ۔

ربطِ آیات ماقبل کی آیات میں بھی یہود کی شرارتوں کا ذکر تھا، اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان پر لعن طعن و سزا کا بیان ہوا تھا، ان آیات میں بھی یہود کے بعض جرائم کی تفصیل مذکور ہے، اس کے ضمن میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان کے باطل خیال کی تردید کی گئی ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم و ستم سے بچا کر زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے، یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے اور ان کو سولی دی ہے، یہ ان کا محض جھوٹا دعویٰ ہے، جس شخص کو انھوں نے قتل کیا تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے، بلکہ ان کے ہمشکل ایک دوسرا شخص تھا، جس کو قتل کر کے یہ لوگ یوں سمجھنے لگے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا۔

خلاصۂ تفسیر

سو ہم نے (ان کی شرارتوں کی وجہ سے) سزائے لعنت و غضب و ذلت و مسخ وغیرہ میں مبتلا کیا یعنی) ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر (و انکار) کی وجہ سے احکام الٰہیہ کے ساتھ اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء (علیہم السلام) کو (جو ان کے نزدیک بھی) ناحق تھا، اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب یعنی اسلام کا اثر نہیں ہوتا تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ اس پر

رد فرماتے ہیں کہ یہ مضبوطی اور پختگی نہیں) بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے
بند لگا دیا ہے (کہ حق بات کی ان میں تاثیر نہیں ہوتی) سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل،
اور قدرے قلیل ایمان مقبول نہیں پس کافر ہی ٹھہرے) اور (ہم نے ان کو سزائے لعنت
وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مبتلا کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے اور (تفصیل
اس کی یہ ہے کہ) حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے
(جس سے تکذیب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی لازم آتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ
سے ان کی برأت ظاہر فرما چکے ہیں) اور (نیز بطور تفاخر) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ
ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا (یہ کہنا خود دلیل ہے
عداوت کی، اور عداوت انبیاء کے ساتھ کفر ہے، نیز اس میں دعویٰ ہے قتل کا، اور قتل نبی بھی
کفر ہے، اور دعویٰ کفر کا بھی کفر ہے) حالانکہ (علاوہ کفر ہونے کے خود ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے
کیونکہ) انہوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو یعنی (عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو
سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے
(یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے
پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انھوں
نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا
وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھا لیا (اور ایک
اور شخص کو ان کا ہمشکل بنا دیا اور وہ مصلوب و مقتول ہوا، اور یہی سبب ہوا یہود کے اشتباہ
کا اور اسی اشتباہ نے اہل کتاب میں اختلاف پیدا کیا) اور (اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی
قدرت والے) حکمت والے ہیں (اپنی قدرت و حکمت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
بچا لیا اور اٹھا لیا، اور یہود کو بوجہ تشبیہ کے پتہ بھی نہ لگا، اور یہود کو اپنا کذب و بطلان
انکار نبوت عیسویہ میں بہت جلد دنیا ہی میں ظاہر ہو جائے گا کیونکہ وقت نزول آیت سے
لے کر کسی زمانہ میں، کوئی شخص اہل کتاب (یعنی یہود میں) سے (باقی) نہ رہے گا، مگر وہ
عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) کی اپنے مرنے سے (ذرا) پہلے (جب کہ عالم برزخ نظر آنے لگتا
ہے) تصدیق کرے گا گو اس وقت کی تصدیق نافع نہیں، مگر ظہور بطلان کے لئے تو
کافی ہے، کاش اب ہی ایمان لے آویں تو نافع ہو جائے) اور (جب عالم دنیا اور
عالم برزخ دونوں ختم ہو چکیں گے یعنی قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان
(منکرین کے انکار) پر گواہی دیں گے۔

معارف و مسائل

سورۂ آلِ عمران کی آیت یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ الآیہ (۵۵:۳) میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن یہود کے عزائم کو ناکام بنانے اور عیسیٰ علیہ السلام کو انکی دستبرد سے بچانے کے سلسلہ میں پانچ وعدے فرمائے تھے جن کی تفصیل اور مکمل تشریح و تفسیر سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے، ان وعدوں میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ یہود کو آپؑ کے قتل پر قدرت نہیں دی جائے گی، بلکہ آپؑ کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف اٹھالیں گے، اس آیت میں یہود کی شرارتوں اور جھوٹے دعووں کے بیان میں اُس وعدۂ الٰہیہ کی تکمیل اور یہود کے مغالطہ کا مفصل بیان، اور یہود کے اس قول کی مکمل تردید ہے کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔

ان آیات میں واضح کیا گیا کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ، یعنی ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کو نہ قتل کیا اور نہ سُولی پر چڑھایا، بلکہ صورتِ حال یہ پیش آئی کہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔

یہود کو اشتباہ کس طرح پیش آیا؟ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو آپؑ کے حواری ایک جگہ جمع ہو گئے، حضرت مسیح علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لے آئے، ابلیس نے یہود کے اس دستہ کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کیلئے تیار کھڑا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دیدیا، اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کر دیا جائے، اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو، ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا، آپؑ نے اس کو اپنا کرتہ، عمامہ عطا کیا، پھر اس پر آپؑ کی مشابہت ڈال دی گئی، اور جب وہ باہر نکل آیا تو یہود اُسے پکڑ کر لے گئے، اور سُولی پر چڑھا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا گیا (قرطبی)

بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے ایک شخص طیطلانوس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے بھیجا تھا، حضرت عیسیٰؑ تو مکان میں نہ ملے، اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیا تھا، اور یہ شخص جب گھر سے نکلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمشکل بنا دیا گیا تھا، یہود یہ سمجھے کہ یہی عیسیٰؑ ہے، اور اس نے اپنے ہی آدمی کو لیکر قتل کر دیا (مظہری)

ان میں سے جو بھی صورت حال پیش آئی ہو سب کی گنجائش ہے، قرآن کریم نے کسی خاص صورت کو متعین نہیں فرمایا، اس لئے حقیقت حال کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے، البتہ قرآن کریم نے اس جملے اور دوسری تفسیری روایات سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو زبردست مغالطہ ہوگیا تھا، حقیقی واقعہ ان سے پوشیدہ رہا، اور اپنے اپنے گمان و قیاس کے مطابق انھوں نے طرح طرح کے دعوے کئے، اور ان کے آپس ہی میں اختلافات پیدا ہوگئے، اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کہ ان کے پاس صحیح علم کی بنیاد پر کوئی یقینی بات نہیں ہے، جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرکے طرح طرح کے دعوے کئے ہیں یہ سب شک اور اٹکل کی باتیں ہیں، صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو تنبہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے ہی آدمی کو قتل کردیا ہے، اس لئے کہ یہ مقتول چہرے میں تو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مشابہ ہے، لیکن باقی جسم میں ان کی طرح نہیں، اور یہ کہ اگر یہ مقتول مسیح (علیہ السلام) ہیں تو ہمارا آدمی کہاں ہے اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح (علیہ السلام) کہاں ہیں؟

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا، اللہ جل شانہٗ زبردست قدرت و غلبہ والا ہے، یہود لاکھ دفعہ قتل کے منصوبے بناتے لیکن جب اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کی حفاظت کا ذمہ لیا تو اس کی قدرت و غلبہ کے سامنے ان کے منصوبوں کی حیثیت کیا ہے، وہ قدرت والا ہے، صرف مادہ کے پرستار انسان اگر رفع عیسیٰ (علیہ السلام) کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے تو یہ ان کی اپنی کمزوری ہے، وہ حکمت والا ہے، اس کا ہر فعل حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

آخر میں اسی مضمون کے تتمہ کے لئے فرمایا کہ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، یہ لوگ اس وقت اگرچہ بغض و حسد کی وجہ سے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باطل خیالات رکھتے ہیں نیز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی انکار کررہے ہیں، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اس وقت انھیں یقین ہوجائیگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہمارا خیال تھا وہ سب جاہل تھا۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں گذری ہے کہ موتہ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع کی جائے، اور آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ یہ یہود اپنی موت سے ذرا پہلے پیشتر جب عالم برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے گرچہ اس وقت کا ایمان ان کے حق میں نافع نہیں ہوگا، جس طرح کہ فرعون کو اس کے اس ایمان نے فائدہ نہیں دیا تھا جو وہ غرق ہونے کے وقت لایا تھا۔

دوسری تفسیر جس کو صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے، اور حدیث صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، یہ ہے کہ موتہ کی ضمیر حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگرچہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے، یہود تو انھیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انھیں العیاذ باللہ مفتری اور کاذب قرار دیتے ہیں، اور نصاریٰ اگرچہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بعض تو ان میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہونچ گئے کہ یہودیوں کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہوگئے، اور بعض اعتقاد کے غلو میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انھیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا، قرآن کریم کی اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اس زمین پر پھر نازل ہونگے تو یہ سب اہل کتاب ان پر صحیح ایمان لے آئیں گے، نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے قتل کر دیئے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے، اس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا، اور اس زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لینزلن ابن مریم حکما عدلا فلیقتلن الدجال ولیقتلن الخنزیر ولیکسرن الصلیب وتکون السجدۃ واحدۃ للہ رب العالمین ثم قال ابوھریرۃ واقرأوا

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بنکر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور اس وقت عبادت صرف پروردگار عالم کی ہوگی۔

اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ

اِنْ شِئْتُمْ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ قَبْلَ مَوْتِ عِيْسٰى. يُعِيْدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (قرطبی)

آیت بھی پڑھ لو جس میں اسی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ ان پر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا، آپؓ نے فرمایا عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت سے پہلے، اور تین باران الفاظ کو دُہرایا ۔

آیتِ مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہؓ سے بروایت صحیحہ ثابت ہے، جس میں قبل موتہ سے مراد قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قرار دیا ہے، جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے متعلق ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کے نزول سے اللہ جل شانہ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اس زمین پر ہی ان کی وفات ہوگی۔

اس کی تائید سورۂ زخرف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ (۴۳: ۶۱) "یعنی عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں پس تم قیامت کے آنے میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو" مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے یہاں پر لکھا ہے کہ اِنَّهٗ کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک علامت ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے، کہ وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے، اور اُن کا آنا قیامت کی علامات میں سے ہوگا۔

اس آیت میں ایک دوسری قراءت لَعَلَمٌ بھی منقول ہے، اس سے یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں، کیونکہ عَلَمٌ بفتح اللام کے معنی علامت کے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تفسیر بھی اسی کی مؤید ہے، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ، قَالَ خُرُوْجُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ــــ حضرت ابن عباسؓ سے وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کے بارے میں منقول ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔ (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ قبل موتہ کے ساتھ جب حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث

صحیح کے ساتھ تفسیر کو شامل کیا جائے تو اس سے واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ ہونا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہو کر یہود پر مکمل غلبہ پانا ثابت ہو جاتا ہے، اسی طرح آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ سے بھی حسب تفسیر ابن عباس یہ مضمون یقینی ہو جاتا ہے۔

امام تفسیر ابن کثیرؒ نے آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کی تفسیر میں لکھا ہے:

وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَخْبَرَ بِنُزُوْلِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِمَامًا عَادِلًا (ابن کثیر)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں، کہ آپ نے قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں نازل ہونے کی خبر دی ہے۔"

ان روایات متواترہ کو ہمارے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جمع فرمایا، جن کی تعداد ستّر سے زیادہ ہے، حضرت استاذ کے حکم سے احقر نے اس مجموعے کو بزبانِ عربی مرتب کیا، حضرتؒ نے اس کا نام التصریح بما تواتر فی نزول المسیح تجویز فرمایا، جو اسی زمانے میں شائع ہو چکا تھا، حال میں حلب شام کے ایک بڑے عالم علامہ عبدالفتاح ابو غدہ نے مزید شرح و حواشی کا اضافہ کر کے بیروت میں اعلیٰ کتابت کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ قطعی اور اجماعی ہے جس کا منکر کافر ہے

یہ مضمون آیات مذکورہ سے بھی واضح ہو چکا ہے، اور اس کی پوری تفصیل سورۂ آل عمران میں گذر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے، اس میں ان شبہات کا بھی جواب مذکور ہے جو اس زمانے کے بعض ملحدین کی طرف سے اس عقیدہ کو مشکوک بنانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، واللہ ولی الہدایۃ۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ

سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال

لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ

تھیں اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت اور اس وجہ سے کہ سود

الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ

لیتے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے واسطے جو ان میں ہیں عذاب دردناک

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں یہود کی شرارتوں کا اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان کی سزا کا ذکر تھا، ان آیات میں بھی ان کی کچھ اور قباحتوں کا بیان ہے، اور سزا کی ایک نوعیت کا بھی ذکر ہے، وہ یہ کہ قیامت میں تو انھیں عذاب ہوگا ہی، اس دنیا میں بھی ان کی گمراہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سی پاکیزہ چیزیں جو پہلے سے حلال تھیں بطور سزا کے ان پر حرام کر دی گئیں۔

خُلاصَۂ تفسِیر

سو یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب (جن میں بہت سے امور سورۂ مائدہ میں ذکر کئے) ہم نے بہت سی پاکیزہ (یعنی حلال ونافع اور لذیذ) چیزیں جو (پہلے سے) ان کے لئے (بھی) حلال تھیں (جیسا آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (۳: ۹۳) میں ہے) ان پر (شریعت موسویہ میں) حرام کر دیں (جن کا بیان سورۂ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (۶: ۱۴۶) میں ہے اور وہاں بھی یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ان حلال پاک چیزوں کو ان پر حرام کرنا ان کے گناہوں اور نافرمانیوں کی بنا پر ہوا تھا ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ اور شریعت موسویہ میں بھی وہ سب حرام ہی رہیں کوئی حلال نہ ہوئی) بسبب اس کے کہ وہ آئندہ بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے، مثلاً یہی کہ) وہ (احکام میں تحریف کر کے یا حکم خداوندی کو چھپا کر) بہت آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی دین حق کے قبول کرنے) سے مانع بن جاتے تھے (کیونکہ ان کی اس کارروائی سے عوام کو خواہ مخواہ التباس ہو جاتا تھا، گو طلبِ صادق سے وہ التباس دور ہو جانا ممکن تھا) اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو (توریت میں) اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ (یعنی غیر مشروع ذریعہ) سے کھا جاتے تھے (پس اس طریق حق میں رکاوٹ بننے، سود لینے اور ناجائز طریقوں سے دوسروں کا مال کھا جانے کی وجہ سے اس شریعت کی بقا تک تخفیف نہ ہوئی، البتہ شریعتِ جدیدۂ عیسویہ میں کچھ احکام بدلے تھے، جیسا آیت وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (۳: ۵۰) سے معلوم ہوتا ہے، اور شریعتِ محمدیہ میں بہت تخفیف ہوگئی جیسا يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ (۷: ۱۵۷) سے ثابت ہے، یہ تو دنیوی سزا تھی) اور (آخرت میں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے (البتہ جو موافق قاعدۂ شرعیہ کے ایمان لے آئے اس کی پچھلی جنایتیں سب معاف ہو جائیں گی)۔

معارف و مسائل

شریعت محمدیہ میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، لیکن وہ کسی جسمانی یا روحانی ضرر کی وجہ سے حرام کردی گئیں، بخلاف یہود کے کہ ان پر جو طیبات حرام کردی گئی تھیں ان میں کوئی جسمانی یا روحانی ضرر نہیں تھا، بلکہ ان کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر حرام کردی گئی تھیں۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ
لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں اور ایمان والے سو مانتے ہیں اس کو

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ
جو نازل ہوا تجھ پر اور جو نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آفرین ہے نماز پر قائم

الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
رہنے والوں کو اور جو دینے والے ہیں زکوٰۃ کے اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت

الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾
کے دن پر سو ایسوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب۔

۲۲ ع ۲

ربطِ آیات اوپر کی آیت میں اُن یہود کا ذکر تھا جو اپنے کفر پر قائم تھے، اور مذکورہ بالا منکرات میں مبتلا تھے آگے ان حضرات کا بیان ہے جو اہلِ کتاب تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور وہ صفات جو اُن کی کتابوں میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں آپ میں پوری پوری دیکھیں تو ایمان لے آئے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام و اُسید و ثعلبہ رضی اللہ عنہم، اس آیت میں انہی حضرات کی تعریف و توصیف مذکور ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

لیکن ان (یہود) میں جو لوگ علم (دین) میں پختہ (یعنی اس کے موافق عمل کرنے پر مضبوط) ہیں اور اسی آمادگی نے ان پر حق کو واضح اور قبولِ حق کو سہل کردیا جو آگے اصلاً و فرعاً مذکور ہے) اور جو ان میں، ایمان لے آنے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے (نبیوں

کے پاس بھیجی گئی (جیسے توریت و انجیل) اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں، اور جو (ان میں) زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں (سو) ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثواب عظیم عطا فرما دیں گے۔

معارف ومسائل

آیت میں جن حضرات کے لئے اجر کامل کا وعدہ ہے وہ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے ہے، اور جہاں تک نفسِ نجات کا تعلق ہے وہ عقائد ضروریہ کی تصحیح پر موقوف ہے، بشرطیکہ خاتمہ بالایمان کی سعادت نصیب ہو۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوحؑ پر اور ان نبیوں پر جو

بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ

ان کے بعد ہوئے اور وحی بھیجی ابراہیمؑ پر اور اسمٰعیلؑ پر اور اسحٰقؑ پر اور یعقوبؑ پر

وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ

اور اس کی اولاد پر اور عیسٰیؑ پر اور ایوبؑ پر اور یونسؑ پر اور ہارونؑ پر اور سلیمانؑ پر

وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ

اور ہم نے دی داؤدؑ کو زبور اور بھیجے ایسے رسول کہ جن کا احوال ہم نے سنایا تجھ کو

مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ

اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سنایا تجھ کو اور باتیں کیں اللہ نے

مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ

موسٰیؑ سے بول کر بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تاکہ باقی نہ رہے

لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا

لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد اور اللہ زبردست ہے

حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾ لَّٰكِنِ ٱللَّهُ يَشْهَدُ بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ

حکمت والا لیکن اللہ شاہد ہے اس پر جو تجھ پر نازل کیا کہ یہ نازل کیا ہے

بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۭ﴿۱۶۶﴾

اپنے علم کے ساتھ اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کافی ہے حق ظاہر کرنے والا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا

جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے وہ بہک کر دور

ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ

جا پڑے جو لوگ کافر ہوئے اور حق دبا رکھا ہرگز اللہ بخشنے والا

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ

نہیں ان کو اور نہ دکھلاوے گا ان کو سیدھی راہ مگر راہ دوزخ کی

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

رہا کریں اس میں ہمیشہ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

ربط آیات | یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے یہودیوں کا ایک متعنتانہ سوال نقل کر کے تفصیل سے اس کا الزامی جواب دیا گیا، یہاں ایک دوسرے عنوان سے اسی سوال کو باطل کیا جا رہا ہے، کہ تم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے یہ شرط لگاتے ہو کہ آپ آسمان سے لکھی ہوئی کتاب لا کر دکھلائیں، تو بتلاؤ کہ یہ جلیل القدر انبیاء جن کا ذکر ان آیات میں ہے ان کو تم بھی تسلیم کرتے ہو، اور ان کے حق میں تم اس طرح کے مطالبات نہیں کرتے، تو جس دلیل سے تم نے ان حضرات کو نبی تسلیم کیا ہے، یعنی معجزات سے، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی معجزات ہیں، لہٰذا ان پر بھی ایمان لے آؤ، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارا یہ مطالبہ طلب حق کے لئے نہیں بلکہ عناد پر مبنی ہے۔

آگے بعثت نبی کی حکمت بھی بیان کر دی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتلا دیا گیا کہ یہ لوگ اگر آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تو اپنا انجام خراب کرتے ہیں، آپ کی نبوت پر تو خدا بھی گواہ ہے، اور خدا کے فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(ہم نے دیکھیے آپ کو کچھ رسول نہیں بنایا جو کیسی وحی نئی ہی فرمائش کرتے ہیں بلکہ)

آپ کے پاس (بھی) ایسی ہی وحی بھیجی ہے جیسی (حضرت) نوح (علیہ السلام) کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس (بھیجی تھی، اور (ان میں سے بعضوں کے نام بھی بتلا دیتے ہیں کہ) ہم نے (حضرت) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں) اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے پاس وحی بھیجی تھی اور (اسی طرح) ہم نے داؤد (علیہ السلام کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، چنانچہ ان کو (کتاب) زبور دی تھی اور (ان کے علاوہ، اور (بعضے) ایسے پیغمبروں کو (بھی) صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل (سورۂ انعام وغیرہ مکی سورتوں میں) ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور (بعضے) ایسے پیغمبروں کو (صاحب وحی بنایا) جن کا حال (ابھی تک) ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام کو بھی صاحب وحی بنایا، چنانچہ ان سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا (اور) ان سب کو (ایمان پر) خوش خبری (نجات کی) دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے (آنے کے) بعد کوئی عذر (ظاہراً بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی اشیاء کا حسن وقبح عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا، پھر ہماری کیا خطا، اور) یوں اللہ تعالیٰ بڑے زور (اور اختیار) والے ہیں (کہ بلا ارسال رسل بھی سزا دیتے تو بوجہ اس کے کہ مالک حقیقی ہونے میں منفرد ہیں ظلم نہ ہوتا اور درحقیقت عذر کا حق کسی کو نہ تھا لیکن چونکہ) بڑے حکمت والے (بھی) ہیں (اس لئے حکمت ہی ارسال کو مقتضی ہوئی، تاکہ ظاہری عذر بھی نہ رہے، یہ بیانِ حکمت درمیان میں تبعاً آگیا تھا، آگے اثبات نبوتِ محمدیہ کرکے جواب کی تکمیل فرماتے ہیں، کہ گو وہ اپنے اس شبہ کے رفع ہونے پر بھی نبوت کو تسلیم نہ کریں) لیکن (واقع میں تو ثابت ہے اور اس کے ثبوت پر دلیل صحیح قائم ہے چنانچہ) اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجی بھی (کس طرح) اپنے علمی کمال کے ساتھ (جس سے وہ کتاب معجزۂ عظیمہ ہوگئی جو کہ نبوت کی دلیل قاطع ہے، ایسی کتاب معجز کے ذریعہ سے آپ کی نبوت کی) شہادت دے رہے ہیں (یعنی دلیل قائم کر رہے ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ کتاب معجز نازل فرمائی اور اعجاز دلیلِ نبوت ہے، پس دلیل سے تو واقع میں نبوت ثابت ہے، رہا کسی کا ماننا نہ ماننا تو اول تو اس کا خیال ہی کیا، اور اگر طبعاً اس کو جی ہی چاہتا ہو تو ان سے افضل مخلوق یعنی) فرشتے (آپ کی نبوت کی) تصدیق کر رہے ہیں، (اور مومنین کی تصدیق مشاہد ہی تھی، پس اگر چند حمقاء نے نہ مانا نہ سہی اور اصل بات

تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت یعنی قدرت دلیل فی الواقع کافی ہے (کسی کی
تصدیق و تسلیم کی آپ کو حاجت ہی نہیں) جو لوگ (ان حجج قاطعہ کے بعد بھی) منکر ہیں
اور علاوہ یہ کہ اوروں کو بھی خدائی دین سے مانع ہوتے ہیں (حق سے) بڑی دور کی گمراہی
میں جا پڑے ہیں (یہ تو دنیا میں ان کے مذہب کا حاصل ہے، اور اس کا ثمرہ آخرت میں
آگے سنو کہ) بلاشبہ جو لوگ (حق کے) منکر ہیں اور (حق سے مانع بن کر) دوسروں کا
بھی نقصان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوائے جہنم کی راہ
کے اور کوئی راہ (یعنی جنت کی راہ) دکھلائیں گے، اس طرح پر کہ اس (جہنم) میں ہمیشہ
ہمیشہ کو رہا کریں گے، اور اللہ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے (کچھ سامان نہیں کرنا پڑتا)

معارف و مسائل

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ، اس سے
معلوم ہوگیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے، اور انبیاءؑ
سابقین پر جیسے وحی الٰہی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی، تو جس نے ان کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہئے، اور جس نے
اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہوگیا، اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں
کے ساتھ تشبیہ کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو
اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی،
گویا اول حالت محض ابتدا تعلیم کی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں
وہ حالت پوری ہوکر اس قابل ہوگئی کہ ان کا امتحان لیا جائے، اور فرمانبرداروں کو انعام
اور نافرمانوں کو سزا دی جائے، چنانچہ انبیاءؑ اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح
علیہ السلام ہی سے شروع ہوا، اور وحی الٰہی سے روگردانی کرنے والوں پر بھی اول عذاب
حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔

خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام سے پہلے حکم الٰہی اور انبیاءؑ کی مخالفت پر عذاب
نازل نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی، اور سمجھانے ہی کی
کوشش کی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب
ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا، تو اب
نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا، اول حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان

آیا، اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ انبیاء کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے، تو آپ کی وحی کو حضرت نوحؑ اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دینے میں اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔ (فوائد علامہ عثمانی)

حضرت نوح علیہ السلام کی ذات خود ایک معجزہ تھی، ساڑھے نو سو سال کی عمر آپ کو عطا کی گئی تھی، آپ کا کوئی دانت نہیں گرا تھا، نہ آپ کا کوئی بال سفید ہوا، آپ کی جسمانی طاقت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اور پوری عمر قوم کی ایذا رسانی کو صبر کے ساتھ سہتے رہے۔ (مظہری)

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاءؑ ہوئے ہیں انھیں بالاجمال ذکر کر کے ان میں سے جو اولوالعزم اور جلیل القدر انبیاءؑ ہیں ان کا بطور خاص بھی ذکر کر دیا گیا جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سب انبیاءؑ ہیں اور انبیاءؑ کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی ہے، کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ براہ راست اپنے رسول سے بات کرتے ہیں غرض جس طریقہ سے بھی وحی آجائے اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، لہٰذا یہود کا یہ کہنا کہ توراۃ کی طرح لکھی ہوئی کتاب نازل ہو تب مانیں گے ورنہ نہیں خالص حماقت اور کفر ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ بھیجے ہیں جن میں سے تین سو تیرہ اصحاب شریعت رسول تھے (قرطبی)

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ، اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوش خبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر کی مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے، سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور پیغمبروں نے راہ حق بتلائی، تو اب دین حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جا سکتا، وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے روبرو کوئی حجت نہیں چل سکتی، بلکہ سب حجتیں قطع ہو جاتی ہیں، اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت آپؐ کے

پاس آگئی، آپ نے ان سے فرمایا: بخدا تم یقیناً جانتے ہو کہ میں خدا کا برحق رسول ہوں ــــ انھوں نے اس کا انکار کردیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوگئی: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ ــــ جس میں بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب معجز کے ذریعہ سے جو اس کے علمی کمال کا مظہر ہے آپ کی نبوت پر گواہ ہے، اس نے یہ جان کر کتاب نازل کردی ہے کہ آپ اس کے اہل ہیں، اور فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں، اور علیم و خبیر ذات کی شہادت کے بعد پھر کس دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ منکر ہیں، اور تورات میں جو آپ کے اوصاف اور علامات موجود تھے ان کو چھپاتے ہیں اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کرکے ان کو بھی دین حق سے باز رکھتے ہیں، سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہوگی نہ ہدایت، جس سے خوب معلوم ہوگیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے، اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے ــــ اس سے یہودیوں کے سب خیالات کی تغلیط کردی گئی

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ

اے لوگو! تمہارے پاس رسول آچکا ٹھیک بات لے کر تمہارے رب کی

فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

سو مان لو تاکہ بھلا ہو تمہارا اور اگر نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

اور زمین میں اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا

ربطِ آیات یہودیوں کے اعتراضات کا جواب اور نبوت محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے اثبات کے بعد اب تمام جہان کے انسانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آؤ۔

خُلاصۂ تفسیر

اے تمام (جہان کے) لوگو تمہارے پاس یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سچی بات (یعنی سچا دعویٰ، سچی دلیل) لے کر تمہارے پروردگار (جل شانہٗ) کی طرف سے تشریف لائے ہیں سو (مقتضیٰ اثبات دعویٰ باادلہ صحیح کا یہ ہے کہ) تم (ان پر اور جو جو یہ فرماویں سب پر)

یقین رکھو (جو پہلے سے یقین لائے ہوئے ہیں وہ اس پر قائم رہیں اور جو نہیں لائے اب اختیار کرلیں) یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (کیونکہ نجات ہوگی) اور اگر تم منکر ہوگئے تو (تمہارا ہی نقصان ہے، خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) خدا تعالیٰ کی (تو) ملک ہے یہ سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں (موجود) ہے (تو ایسے بڑے عظیم الشان مالک و قادر کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہو، مگر اپنی خیر مناؤ) اور اللہ تعالیٰ (سب کے ایمان و کفر کی) پوری اطلاع رکھتے ہیں (اور دنیا میں جو پوری سزا نہیں دیتے تو اس لئے کہ) کامل حکمت والے (بھی) ہیں (وہ حکمت اس کو مقتضی ہے)۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا

اے کتاب والو مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو اللہ تعالیٰ کی شان میں

ٱلۡحَقَّۚ إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ

مگر پکی بات بیشک مسیح جو ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلام

أَلۡقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرۡيَمَ وَرُوحٞ مِّنۡهُۖ فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦۖ وَلَا

ہے جس کو ڈالا مریم کی طرف اور روح ہے اس کے ہاں کی سو مانو اللہ کو اور اس کے رسولوں کو اور نہ

تَقُولُواْ ثَلَٰثَةٌۚ ٱنتَهُواْ خَيۡرٗا لَّكُمۡۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ

کہو کہ خدا تین ہیں اس بات کو چھوڑو بہتر ہوگا تمہارے واسطے بیشک اللہ معبود ہے اکیلا

سُبۡحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٞۘ لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي

اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

ٱلۡأَرۡضِۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلٗا ﴿۱۷۱﴾

زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ کارساز۔

ع ۲۳

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں یہود کو خطاب تھا اور انہی کی گمراہیوں کی تفصیل ذکر کی گئی اس آیت میں نصاریٰ کو خطاب ہے، اور ان کی بداعتقادی اور خدا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے باطل خیالات کی تردید کی گئی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اہل کتاب (یعنی نصاریٰ) تم اپنے دین (کے بارہ) میں (عقیدۂ حقہ کی) حد سے مت نکلو اور خدا تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو (کہ نعوذ باللہ وہ صاحب اولاد ہے جیسے بعض کہتے تھے اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ یا وہ مجموعہ ثلاثہ کا ایک ہے جیسا بعض کہتے تھے اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ اور بقیہ دو جزء ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے اور ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جیسا آیت آئندہ میں وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ کے بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے، اور بعضے حضرت مریم علیہا السلام کو جیسا اِتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ سے معلوم ہوتا ہے، یا وہ عین مسیح ہے جیسا بعض کہتے تھے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ، غرض یہ سب عقیدے باطل ہیں) مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ (پیدائش) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) مریم تک (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) پہنچایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں (کہ اس جان کو حضرت مریم کے جسم میں بواسطہ نفخ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پہنچا دیا تھا، باقی نہ وہ ابن اللہ ہیں، نہ تین میں کے ایک ہیں، جیسا عقائد مذکورہ میں مذکور آتا ہے) سو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (اور وہ موقوف ہے توحید پر پس توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ خدا تین ہیں، (مقصود منع کرنا ہے شرک سے اور وہ سب اقوال مذکورہ میں مشترک ہے، اس شرک سے) باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا، (اور توحید کے قائل ہو جاؤ کیونکہ) معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے (اور) وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں سب اسی کی ملک ہیں (اور ان کا منزہ اور مالک علی الاطلاق ہونا دلیل ہے توحید کی) اور (ایک دلیل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں، اور ان کے سوا سب کارسازی میں ناکافی و محتاج الی الغیر اور ایک حد پر جاکر عاجز ہو جاتے ہیں، اور یہ کفایت صفت کمال سے ہے، اور صفت کا کمال لوازم الوہیت سے ہے، جب وہ غیر اللہ میں منتفی ہے پس الوہیت میں بھی منفی ہے، لہٰذا توحید ثابت ہے۔

معارف و مسائل

وَكَلِمَتُهٗ، اس لفظ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ ہیں، مفسرین نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔

(۱) امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کارفرما ہوتے ہیں، ایک عامل نطفہ ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمہ "کن" فرمانا جس کے بعد وہ بچہ وجود میں آجاتا ہے ــــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں چونکہ پہلا عامل منتفی ہے، اس لئے دوسرے عامل کی طرف نسبت کرکے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مادی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف کلمہ "کن" سے پیدا ہوئے ہیں اس صورت میں اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچا دیا جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آگئی۔

(۲) بعض نے فرمایا کہ كَلِمَةُ اللّٰهِ، بشارۃ اللہ کے معنی میں ہے، اور مراد اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اللہ جل شانہٗ نے فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰؑ کی جو بشارت دی تھی اس میں "کلمہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ

(۳) بعض نے فرمایا کلمۃ آیت اور نشانی کے معنی میں ہے، جیسا کہ دوسری جگہ یہ لفظ آیۃ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا

وَرُوْحٌ مِّنْهُ۔ اس لفظ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے اس نسبت کا کیا مطلب ہے؟

اس سلسلہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں:-

(۱) بعض نے فرمایا: عرف کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شے کی طہارت اور پاکیزگی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو مبالغہ کے لئے اس پر روح کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں چونکہ کسی باپ کے نطفہ کا دخل نہیں تھا، اور وہ صرف اللہ جل شانہٗ کے ارادہ اور کلمہ "کن" کا نتیجہ تھے، اس لئے اپنی طہارت و نظافت میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو روح کہا گیا، اور اللہ کی طرف نسبت اُن کی تعظیم و تشریف کے لئے ہے، جس طرح مساجد کی تعظیم کے لئے اُن کی نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے "مساجد اللہ"، یا کعبہ کی نسبت اللہ کی طرف کرکے بیت اللہ کہا جاتا ہے، یا کسی اطاعت شعار بندہ کی نسبت اللہ کی طرف کرکے عبد اللہ کہا جاتا ہے، چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ۔

(۲) بعض حضرات نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مُردہ دلوں میں روحانی حیات ڈال کر پھر زندہ کردیں، چونکہ وہ روحانی حیات کا سبب تھے جس طرح روح جسمانی حیات کا سبب ہوا کرتی ہے، اس لئے ان کو اس اعتبار سے روح کہا گیا، جیسا کہ خود قرآن کریم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، کیونکہ قرآن کریم بھی روحانی حیات بخشتا ہے۔

(۳) بعض نے فرمایا کہ روح کا استعمال راز کے معنی میں ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی عجیب وغریب پیدائش کی وجہ سے چونکہ اللہ جل شانہ کی ایک نشانی اور راز تھے، اس لئے انہیں روح اللہ کہا گیا۔

(۴) بعض نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل عبارت یوں تھی ذُوْ رُوْحٍ مِّنْهُ اور چونکہ ذی روح ہونے میں سب حیوان برابر ہیں، اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کا امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ان کی نسبت اللہ جل شانہ نے اپنی طرف کردی۔

(۵) ایک قول یہ بھی ہے کہ روح، نفخ پھونک کے معنی میں ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریمؑ کے گریبان میں اللہ کے حکم سے پھونک دیا تھا، اور اسی سے حمل قرار پا گیا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور معجزہ کے صرف نفخ سے پیدا ہوگئے تھے اس لئے آپ کو روح اللہ کہہ دیا گیا، قرآن کریم کی دوسری آیت فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد احتمالات بیان کئے گئے ہیں، بہرحال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا ایک جزء ہیں، اور یہی روح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی شکل میں ظاہر ہوگئی ہے۔

لطیفہ علامہ آلوسیؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک نصرانی طبیب نے حضرت علی بن حسین واقدی سے مناظرہ کیا، اور ان سے کہا کہ تمہاری کتاب میں ایسا لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جزء ہیں، اور دلیل میں یہ آیت پڑھ دی جس میں ”رُوْحٌ مِّنْهُ“ کے الفاظ ہیں۔ علامہ واقدی نے ان کے جواب میں ایک دوسری آیت پڑھ دی وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی اللہ سے ہے، اور مِنْهُ کے ذریعہ سب چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کردی گئی ہے) اور فرمایا کہ رُوْحٌ مِّنْهُ کا اگر مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ

اللہ کا جزو ہیں، تو اس آیت کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ کا جزو ہے؟ یہ جواب سُنکر نصرانی طبیب لاجواب ہوا اور مسلمان ہوگیا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ - نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ جن بڑے بڑے فرقوں میں تقسیم تھے، تثلیث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جداجدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عین خدا ہیں، اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اُتر آیا ہے، دوسرے فرقہ کا کہنا یہ تھا کہ مسیح ابن اللہ ہے اور تیسرا فرقہ یہ دعوٰی کرتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے، باپ، بیٹا، مریم، اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے، دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ روح القدس کو اقنوم ثالث کہتا تھا، غرض یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ تسلیم کرتے تھے اس لئے قرآن کریم میں تینوں کو جُدا جُدا بھی خطاب کیا ہے اور یکجا بھی، اور نصاریٰ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مسیح (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کے سچے رسول ہیں، اس سے زیادہ کچھ کہا جاتا ہے سب باطل اور لغو ہے، خواہ اس میں تفریط ہو جیسے کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اعیاذ باللہ وہ شعبدہ باز و مفتری تھے، یا افراط ہو جیسے کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، کہ وہ خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں، یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں ایک طرف تو نصاریٰ اور یہود کی گمراہی کو واضح کیا، اور دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان رفیع اور عنداللہ ان کے مقام اعلیٰ کو واضح فرمایا ہے، تاکہ افراط و تفریط کے کج راہوں میں سے حق کا معتدل راستہ نمایاں ہوجائے عیسائی معتقدات کے مختلف پہلوؤں پر اور اس کے بالمقابل اسلام کی حقانیت پر اگر تفصیلی معلومات حاصل کرنا ہوں تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی مشہور عالم کتاب "اظہار الحق" کا مطالعہ کریں جس کا عربی سے ترجمہ مع شرح و تحقیق حال میں دارالعلوم کراچی نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔[1]

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا، یعنی آسمان اور زمین میں اوپر سے نیچے تک جو کچھ ہے سب اسی کی مخلوق اور اسی کی مملوک اور اسی کے بندے ہیں، پھر کیسے اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہو سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کارسازی کے لئے وہی کافی اور بس ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلایئے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو سکتی ہے؟

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور

[1] بائبل سے قرآن تک (ناشر)

اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش نہ اس کی حاجت جس سے معلوم ہوگیا کہ مخلوقات میں کسی کو خدا کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان و عقل دونوں سے محروم ہو۔

دین میں غلو حرام ہے | دقولہ تعالیٰ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ، اس آیت میں اہل کتاب کو غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا، غلو کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، اور امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا:

الغلوّ فی الدین ھو مجاوزۃ حدّ الحق فیہ

"غلو فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ دین میں جس چیز کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس سے آگے نکل جائے"

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں کو اس حکم کا مخاطب اس لئے بنایا گیا کہ غلو فی الدین ان دونوں میں مشترک ہے، اور یہ دونوں فرقے غلو فی الدین ہی کے شکار ہیں، کیونکہ نصاریٰ نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے اور ان کی تعظیم میں غلو کیا، ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا بنادیا، اور یہود نے ان کے نہ ماننے اور رد کرنے میں غلو کیا کہ ان کو رسول بھی نہ مانا، بلکہ معاذ اللہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم پر تہمت لگائی اور ان کے نسب پر عیب لگایا۔

چونکہ غلو فی الدین کے سبب یہود و نصاریٰ کی گمراہی اور تباہی مشاہدہ میں آچکی تھی، اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس معاملہ میں پوری احتیاط کی تاکید فرمائی، مسند احمد میں حضرت فاروق اعظمؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ ابن مریم فانما انا عبد فقولوا عبد اللہ ورسولہ

"میری مدح و ثنا میں ایسا مبالغہ نہ کرو جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریمؑ کے معاملہ میں کیا ہے، خوب سمجھ لو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس لئے تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہا کرو"

(اس روایت کو بخاری اور ابن مدینی نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح السند قرار دیا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہوں، میرا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس سے آگے بڑھنا کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں مجھے شریک قرار دیدو یہ غلو ہے، تم نصاریٰ کی طرح کہیں اس غلو میں مبتلا نہ ہوجاؤ، اور یہود و نصاریٰ کا یہ غلو فی الدین صرف انبیاء ہی کی حد تک نہیں رہا، بلکہ انھوں نے جب یہ عادت ڈال لی تو انبیاء علیہم السلام کے حواریین اور متبعین اور ان کے نائبین کے مقابلہ میں بھی یہی

برتاؤ اختیار کرلیا، رسول کو تو خدا بنا دیا تھا، رسول کے متبعین کو معصوم کا درجہ دیدیا، پھر یہ بھی تنقید وتحقیق نہ کی کہ یہ لوگ حقیقۃً انبیاء کے متبع اور ان کی تعلیم پر صحیح طور سے قائم بھی ہیں یا محض وراثۃً عالم یا شیخ سمجھے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ان کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو خود بھی گمراہ تھے اوران کی گمراہی کو اور بڑھاتے تھے، دین اور تدین ہی کی راہ سے ان کا دین برباد ہوگیا، قرآن حکیم نے ان لوگوں کی اس حالت کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، یعنی ان لوگوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی معبود کا درجہ دیدیا، جس طرح رسول کو تو خدا بنایا ہی تھا، اتباعِ رسول کے نام پر پچھلے مذہبی پیشواؤں کی بھی پرستش شروع کردی۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے، اسی لئے ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس وباءِ عظیم سے بچانے کے لئے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

حدیث میں ہے کہ حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمرات کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کرلائیں، انھوں نے متوسط قسم کی کنکریں پیش کردیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: بِمِثْلِهِنَّ بِمِثْلِهِنَّ، یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہئے، پھر فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ	"یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ
فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَکُمْ	تم سے پہلی امتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ
بِالْغُلُوِّ فِیْ دِیْنِهِمْ	سے ہلاک و برباد ہوئیں"

اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوئے:

فوائدِ مہمہ اول یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں، ان کی حد مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی، بڑے بڑے پتھر اٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حدِ شرعی وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے متعین فرمادی، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

تیسرے یہ واضح ہوگیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حدِ مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

حُبِّ دنیا کی حُدُود

ضرورت سے زیادہ دنیا کے مال و دولت اور عیش و عشرت کی طمع اسلام میں مذموم ہے، اور اس کے ترک کرنے کی ہدایتیں بھی قرآن میں بکثرت وارد ہیں، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں طمع دنیا اور حُبّ دنیا سے منع فرمایا وہیں اپنے قول و عمل سے اس کی حدود بھی متعین فرما دی ہیں کہ نکاح کرنے کو اپنی سنّت قرار دیا، اور اس کی ترغیب دی، اولاد پیدا کرنے کے فوائد اور درجات بتلائے، اہل و عیال کے ساتھ حُسنِ معاشرت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو فرض قرار دیا، اپنی اور ان کی ضروریات کے لئے کسبِ معاش کو فریضۃٌ بعد الفرائض فرمایا، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور مزدوری کی لوگوں کو تاکید فرمائی، اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی نظام کی ترویج کو فریضۂ نبوت قرار دے کر اپنے عمل سے پورے جزیرۃ العرب میں ایک نظامِ مملکت قائم فرمایا، اور خلفائے راشدینؓ نے اس کو دنیا کے مشرق و مغرب میں پھیلا دیا جس سے معلوم ہوا کہ بقدرِ ضرورت ان چیزوں کا اشتغال نہ حُبّ دنیا میں شمار ہے نہ حرص و طمع میں۔

یہود و نصاریٰ نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، اور رہبانیت میں مبتلا ہوگئے، قرآن حکیم نے ان کی اس کجروی کو ان الفاظ میں رد فرمایا: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا، یعنی ان لوگوں نے اپنی طرف سے رہبانیت کے یعنی ترکِ دنیا کے طریقے اختیار کر لئے جو ہم نے ان کے ذمہ نہ لگائے تھے، پھر جو چیزیں یہ خود اپنے ذمہ کر لی تھیں ان کو پورا بھی نہ کر سکے۔

سُنّت اور بدعت کی حُدُود

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات اور معاشرت سب ہی چیزوں میں اپنے قول و عمل سے اعتدال کی حدود مقرر فرما دی ہیں اور ان سے پیچھے رہنا کوتاہی اور آگے بڑھنا گمراہی ہے، اسی لئے آپ نے بدعات اور محدثات کو بڑی شدّت کے ساتھ رد کیا ہے اور ارشاد فرمایا:

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ	"یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے"۔

بدعت اسی چیز کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں صراحۃً یا اشارۃً موجود نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے لکھا ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لئے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دین کا راستہ ہے، پچھلی امتوں میں یہی ہوا کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کر لئے اور بعد آنے والی نسل ان میں

اضافے کرتی رہی یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا، اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے اندر یہ بیان فرمایا ہے کہ تحریفِ دین کے دنیا میں کیا کیا اسباب پیش آئے ہیں، اور شریعتِ اسلام نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا ہے، کہ کسی سوراخ سے یہ وبا، اس اُمت میں نہ پھیلے۔

علماء و مشائخ کی تعظیم و اتباع میں راہِ اعتدال

ان اسباب میں سے دین کے بارے میں تعمق و تشدد یعنی غلو فی الدین کو بڑا سبب قرار دیا، مگر افسوس ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر اہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود آج اُمتِ مسلمہ اسی غلو کی بُری طرح شکار ہے، دین کے سارے ہی شعبوں میں اس کے آثار نمایاں ہیں، ان میں سے بالخصوص جو چیز ملّت کے لئے مہلک اور انتہائی مضرت ثابت ہو رہی ہے وہ دینی مقتداء و پیشواؤں کا معاملہ ہے، مسلمانوں کی ایک جماعت تو اس پر آگئی ہے کہ مقتداء و پیشواء، علماء و عرفاء کوئی چیز نہیں، کتابُ اللہ ہمارے لئے کافی ہے، جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں، هُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ، یعنی وہ بھی آدمی ہیں ہم بھی آدمی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے واقف ہے نہ قرآن کے حقائق و معارف سے، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تفسیر سے محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگا، قرآن کریم کی جو تفسیر و تشریح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلا واسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرامؓ سے منقول ہے اس سب سے قطع نظر جو بات ذہن میں آگئی اس کو قرآن کے سر تھوپ دیا، حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلّم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں کو پہنچا دیتے، رسولؐ کو معلّم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف کتاب اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی بھی علم و فن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا، ڈاکٹری، یا طبِ یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا، انجینیری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینیر نہیں بنا، کپڑا سینے یا کھانا پکانے کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا باورچی نہیں بنا، بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم و تعلّم اور معلّم کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے، مگر افسوس کہ قرآن و سنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لئے کسی معلّم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کے مطالعہ کو کافی سمجھ بیٹھے، علماءِ سلف کی تفسیروں اور تعبیروں کو اور ان کے اقتداء و اتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف ایک بھاری جماعت مسلمانوں کی اس غلو میں مبتلا ہوگئی کہ اندھا دھند

جس کو چاہا اپنا مقتدا اور پیشوا بنا لیا پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی، نہ یہ معلوم کیا کہ جس کو ہم نے مقتدا اور پیشوا بنایا ہے یہ علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اترتا ہے یا نہیں؟ اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے مخالف تو نہیں۔ شریعت اسلام نے غلو سے بچ کر ان دونوں کے درمیان طریقہ کار یہ بتلایا کہ کتاب اللہ کو رجال اللہ سے سیکھو اور رجال اللہ کو کتاب اللہ سے پہچانو، یعنی قرآن و سنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعہ پہلے ان لوگوں کو پہچانو جو کتاب و سنت کے علوم میں مشغول ہیں اور ان کی زندگی کتاب و سنت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، پھر کتاب و سنت کے ہر الجھے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر و تشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو اور ان کا اتباع کرو۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ

مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ فرشتوں کو

الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ

جو مقرب ہیں اور جس کو عار آوے اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے

فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس اکٹھے، پھر جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے

الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ

اچھے تو ان کو پورا دے گا ان کا ثواب اور زیادہ دے گا اپنے فضل سے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

اور جنہوں نے عار کی اور تکبر کیا سو ان کو عذاب دے گا عذاب

اَلِيْمًا ڏ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۱۷۳

دردناک اور نہ پاویں گے اپنے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار

خلاصۂ تفسیر

(نصاریٰ خود دیکھو حضرت مسیح علیہ السلام کو آپ خدا و ابن خدا کہتے ہیں اور حضرت مسیح کی یہ کیفیت ہے کہ [illegible] حالت میں تو ان کا قرار عبدیت جو کہ [illegible] الوہیت

ہے مشہور اور سب کو معلوم ہی ہے، لیکن اب بھی سکونت سماء کی حالت میں کہ سکونتِ ارض سے ارفع اور مظنۂ تعلی کا ہے یا قیامت تک وہ جس حالت میں ہوں ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے اس حالت میں بھی) ہرگز خدا کا بندہ بننے سے عار (اور انکار) نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے (کبھی عار کریں گے جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں، جن کو اللہ کا ایک جزو مانتے ہیں خود ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے) اور (وہ عار کریں کیسے اس عار کرنے کا ایسا برا انجام ہے کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو (اس کا انجام سن لو) خدا تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس (یعنی حساب کے موقع پر) جمع کریں گے پھر جو لوگ (دنیا میں) ایمان لائے ہوں گے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہوں گے (یعنی عبد بنے رہے ہوں گے، کیونکہ حاصل عبدیت کا یہی ایمان اور اعمال ہیں) تو ان کو تو ان کا پورا ثواب (بھی) دیں گے (جو کہ ایمان اور اعمال پر منصوص ہے) اور (اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں گے، (جس کی تفصیل منصوص نہیں) اور جن لوگوں نے (عبد بننے سے) عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پاویں گے

معارف ومسائل

اللہ کا بندہ ہونا اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ الخ یعنی مسیح کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں اور نہ ہی اللہ کے مقرب فرشتوں کو عار ہے، اس لئے کہ اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے، حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر و قیمت پوچھئے ان کو اس سے کیسے ننگ اور عار آسکتا ہے، البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے، جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا، اور مشرکین فرشتوں کو بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے، سو ان کے لئے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے (فوائد عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ

اے لوگو تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور اتاری ہم نے

اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا

تم پر روشنی واضح ۔ سو جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط

۴۰

بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ

پکڑا تو ان کو داخل کرے گا اپنی رحمت میں اور فضل میں اور پہنچادے گا ان کو

اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

اپنی طرف سیدھے راستہ پر

خلاصۂ تفسیر

اے (تمام) لوگو یقیناً تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک (کافی) دلیل آچکی ہے (وہ ذات مبارک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) اور ہم نے تمھارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے وہ قرآن مجید ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ تم کو بتلایا جاوے وہ سب حق ہے جن میں مضامین مذکورہ بھی داخل ہیں) سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے (جس کے لئے توحید و تنزیہ کا اعتقاد لازم ہے) اور انھوں نے اللہ کے دین کو (یعنی اسلام کو) مضبوط پکڑا (جس کے لئے رسول اور قرآن کی تصدیق لازم ہے) سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں (یعنی جنت میں) داخل کریں گے اور اپنے فضل میں (یعنی دخول جنت کے علاوہ اور بھی نعمتیں عطا دیں گے جن میں دیدار حق بھی داخل ہے) اور اپنے تک (پہنچنے کا) ان کو سیدھا راستہ بتلا دیں گے (یعنی دنیا میں ان کو طریق رضا پر قائم و ثابت رکھیں گے، اور اسی سے تارک ایمان و اعمال صالحہ کی حالت معلوم ہوگئی کہ ان کو یہ ثمرات نہ ملیں گے)۔

معارف و مسائل

برہان سے کیا مراد ہے؟ قولہ تعالیٰ، قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ. برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے (روح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو لفظ برہان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ آپ کی ذات مبارک اور آپ کے اخلاق کریمانہ، آپؐ کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپؐ کی نبوت اور آپؐ کی رسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی حاجت باقی نہیں رہتی، تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپؐ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔

اور نور سے مراد قرآن مجید ہے (روح) جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۵:۵) یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے (بیان القرآن) اس آیت میں اس کو نور کہا گیا ہے آگے اسی کو کتاب مبین کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغایر کو چاہتا ہے لہذا نور اور کتاب ایک چیز نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ تغایر عنوان کا کافی ہے، اگرچہ مصداق اور معنون ایک ہی ہے (روح)

اور اگر نور سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہو، اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو یہ بھی صحیح ہے (روح)، لیکن اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نور محض ہونا ثابت نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے سو کہدے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا اگر کوئی مرد مر گیا اور

لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ

اس کے بیٹا نہیں اور اس کے ایک بہن ہے تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑ مرا اور وہ بھائی وارث

اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ

ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کے بیٹا پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو پہنچے دو تہائی

مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ

اس مال کا جو چھوڑ مرا اور اگر کئی شخص ہوں اس رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو ایک مرد کا حصہ ہے

حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ

برابر دو عورتوں کے بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (۱۷۶) ع

ہر چیز سے واقف ہے

ع ۲۴ ۵ ۴

ربطِ آیات شروع سورت کے ذرا بعد میراث کے احکام مذکور تھے، پھر وہاں سے تقریباً ایک پارہ کے بعد دوسرے احکام کے ساتھ حکم میراث کی طرف پھر عود ہوا تھا، اب ختم سورت پر کچھ عود ہے اسی کی طرف شاید تین جگہ اس کے متفرق کر دینے میں حکمت یہ ہو کہ اسلام سے پہلے میراث کے باب میں بہت ظلم تھا، پس سورت کے اول میں، وسط میں، آخر میں اس کے ذکر

فرمانے سے مخاطبین کو اہتمام بلیغ اس باب میں مفہوم ہوگا جس سے وہ بھی زیادہ اہتمام کریں۔

خُلاصۂ تفسیر

لوگ آپ سے (میراثِ کلالہ کے باب میں یعنی جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت کرتے ہیں آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے (وہ یہ ہے کہ) اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو (یعنی نہ مذکر نہ مؤنث اور نہ ماں[1] باپ ہوں) اور اس کے ایک (عینی یا علاتی) بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی بعد حقوقِ متقدمہ اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو اس کو دیا جائے گا ورنہ پھر اسی پر رد ہو جائے گا) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہوگا اگر (وہ بہن مر جائے اور) اس کے اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر (ایسی) بہنیں دو (یا زیادہ) ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے (اور ایک تہائی عصبہ کو ورنہ بطور رد کے انہی کو مل جائے گا) اور اگر (ایسی میت کے جس کے نہ اولاد ہے نہ والدین خواہ وہ میت مذکر ہو یا مؤنث) وارث چند (یعنی ایک سے زیادہ) ایسے ہی بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو (ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دوہرا بہن کو اکہرا لیکن عینی بھائی سے علاتی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں اور عینی بہن سے کبھی وہ ساقط ہو جاتے ہیں کبھی حصہ گھٹ جاتا ہے جس کی تفصیل کتب فرائض میں ہے) اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم (ناواقفی سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو تذکیر احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (پس احکام کی مصلحتوں سے بھی مطلع ہیں اور احکام میں ان کی رعایت کی جاتی ہے یہ حکمت کا بیان ہے)۔

معارف ومسائل

فوائدِ مہمہ (۱) قولہ تعالیٰ يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اس جگہ کلالہ کے حکم اور اس کے سببِ نزول بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم

[1] خلاصۂ تفسیر بیان القرآن سے ماخوذ ہے، اور وہاں یہ عبارت اسی طرح ہے، مگر راجح قول کی بنا پر کلالہ ہونے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ میت کی ماں اسکی وفات کے وقت زندہ نہ ہو بلکہ اگر ماں زندہ ہو تو بھی میت کلالہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں جو صفحہ ۳۲۷ پر اسی جلد میں گذری ہے، "ماں" کا لفظ موجود نہیں ہے، لہٰذا راجح قول کی بنا پر لفظ یہاں بھی نہ ہونا چاہئے یہاں یہ لفظ لکھنے میں بظاہر بیان القرآن میں تسامح ہوا ہے۔ لہٰذا اعتماد اس تفسیر پر کیا جائے جو سورۂ نساء کی آیت ۱۲ کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے۔ محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۱۴۲۲/۳/۲۹ھ

ہوئیں، اوّل یہ کہ جیسا پہلے وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا حال ذکر فرمایا تھا، ایسے ہی ارشاد فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ الخ کے بعد صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم　　تمثیل ذکر فرمایا، تاکہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور بُرائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت اور بھلائی خوب سمجھ میں آجائے۔

(۲) اسی کے ذیل میں دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوگئی کہ اہل کتاب نے تو یہ غضب کیا کہ ذات اقدس سبحانہ وتعالیٰ کے لئے شریک اور اولاد جیسے شنیع امر کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الٰہی کا خم ٹھونک کر خلاف کیا، اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے کہ اصول ایمان اور عبادات تو درکنار معاملات جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متجسس اور منتظر رہتے ہیں، اور ہر امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتے ہیں، اپنی عقل اور خواہش کو دخل نہیں سمجھتے اگر ایک دفعہ میں تشفی نہ ہوئی تو مکرر حاضر خدمت ہوکر دریافت کرتے ہیں سہ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت سید المرسلین بھی بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے اگر کسی امر میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے، جب وحی آتی تب حکم فرماتے، نیز اشارہ ہے اس طرف کہ یک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں تھی جو بوقت حاجت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے، کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اس صورت میں سوال کرسکتا ہے، اور بذریعہ وحی متلو اس کو جواب مل سکتا ہے، جیسا کہ اس موقع میں اور قرآن مجید کے بہت سے مواقع میں موجود ہے، اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافت ذکر خداوندی وعزت خطاب حق عز وجل ایسے فخر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی اُمت کو نصیب نہیں ہوا، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، جس صحابی کی بحدث میں یا اس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے، اور اختلاف کے موقع میں جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق وحی نازل ہوگئی قیامت تک ان کی خوبی و نیک نام باقی رہے گا، سو کلالہ کے متعلق سوال وجواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ فرمادیا (فوائد عثمانی)

تَمَّتْ سُوْرَةُ النِّسَاءِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهٗ وَاٰخِرُهٗ

جلد دوم تمام شد

ا

معارف القرآن

جلد

۳

مائدہ ، انعام ، اعراف

پارہ ٦ ، رکوع ۵ تا پارہ ۹ ، رکوع ۱

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

فہرست مضامین معارف القرآن جلد سوم

سورۃ الانعام

سورۃ الاعراف

سُورَةُ المَائِدَة

(یہ سورت مدنی ہے اس میں ایک سو بیس آیات اور سولہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ

اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو حلال ہوئے تمہارے لئے

بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي

چوپائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے

الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝ ①

مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے

سورت کا شانِ نزول اور خلاصۂ مضامین یہ سورۂ مائدہ کی ابتدائی آیت ہے، سورۂ مائدہ بالاتفاق مدنی سورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخری سورت ہے یہاں تک کہ بعض حضرات نے اس کو قرآن کی آخری سورت بھی کہا ہے۔ مسند احمد میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ و اسماء بنت یزید منقول ہے کہ سورۂ مائدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ سفر میں عضباء نامی اونٹنی پر سوار تھے، نزولِ وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسبِ دستور اس وقت بھی ہوا، یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہوگئی، تو آپ اس سے نیچے اتر آئے۔ یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع

جو حکم ہے وہ مبین کر ان کا تقاضا ہے جس کے بعد حکم فرمایا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ۔ لفظ عقود عقد کی جمع ہے جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔ اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بمعنی عہود ہوگیا۔

امام تفسیر ابن جریر نے مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو۔ اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہوگئے ہوں۔ ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے اسی لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوگیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں۔ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں، کسی نے کہا ہے اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و طاعت کے متعلق لئے ہیں۔ یا وہ معاہدات جو اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کی ہوئے احکام حلال و حرام سے متعلق اپنے بندوں سے لئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ جیسے معاہدۂ نکاح معاہدۂ بیع وشراء وغیرہ مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اسی طرف گئے ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے وہ حلف و معاہدے مراد ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں ایک دوسرے سے باہمی امداد کے لئے لیا کرتے تھے۔ مجاہد، ربیع، قتادہ وغیرہ مفسرین نے بھی یہی فرمایا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ بلکہ سب قسم کے معاہدات لفظ عقود کے تحت میں داخل ہیں اور سبھی کو پورا کرنے کے لئے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے، مثلاً ایمان و طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد۔ دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کرکے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کرلے۔ تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور اسی تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات، یا باہمی سمجھوتے، جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق

اور دو جماعتوں کے درمیان جو باہمی معاملات نکاح، تجارت، شرکت، اجارہ، ہبہ وغیرہ ان تمام معاہدات میں جو جائز شرائط طے ہوجائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے۔ اور جائز کی قید اس لئے لگائی کہ خلاف شرع شرط لگانا یا اس کا قبول کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جملہ میں اس عام ضابطہ کی بعض جزئیات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ۔ لفظ بَهِيمَة ان جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے جن کو عادۃً غیر ذوی العقول سمجھا جاتا ہے کیونکہ لوگ ان کی بولی کو عادۃً نہیں سمجھتے تو ان کی مراد مبہم رہتی ہے۔ اور امام شعرانی رح نے فرمایا کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کو عقل نہیں وہ عقل کی باتیں اس پر مبہم رہتی ہیں، جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل و ادراک سے کوئی جانور بلکہ کوئی شجر و حجر بھی خالی نہیں۔ ہاں درجات کا فرق ضرور ہے۔ ان چیزوں میں اتنی عقل نہیں ہے جتنی انسان میں اسی لئے انسان کو احکام کا مکلف بنایا گیا ہے۔ جانوروں کو مکلف نہیں بنایا گیا۔ ورنہ اپنی ضروریات زندگی کی حد تک جانور بلکہ شجر و حجر کو حق تعالیٰ نے عقل و ادراک بخشا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ۔ عقل نہ ہوتی تو اپنے خالق و مالک کو کس طرح پہچانتی اور کس طرح تسبیح کرتی

امام شعرانی کے فرمانے کا منشاء یہ ہے کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کی بے عقلی کے سبب معلومات اس پر مبہم رہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی بولی لوگ نہیں سمجھتے، اس کا کلام لوگوں پر مبہم رہتا ہے۔ بہرحال لفظ بہیمہ چوپایوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چوپایہ جانداروں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور لفظ انعام نَعَم کی جمع ہے۔ پالتو جانور جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورۂ انعام میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان کو نَعَم کہا جاتا ہے۔ بہیمہ کا لفظ عام تھا، انعام کے لفظ نے اس کو خاص کردیا۔ مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ گھریلو جانوروں کی آٹھ قسمیں تمہارے لئے حلال کردی گئیں۔ لفظ عقود کے تحت میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ تمام معاہدات داخل ہیں۔ ان میں سے ایک معاہدہ وہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے حلال و حرام کی پابندی کے متعلق لیا ہے۔ اس جملہ میں اس خاص معاہدہ کا بیان آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اونٹ، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کو حلال کردیا ہے۔ ان کو شرعی قاعدہ کے موافق ذبح کرکے کھا سکتے ہیں۔

آمیز خط لکھے تھے بہر حال کے تذبذب میں حضرت عمر کی طرف سے انتہائی عزت و انعام کا یقین ہو رہا تھا۔
دوسرا واقعہ جس کا ذکر ہے یہ ہے کہ مشرکین مکہ میں سے حطیم بن ہند اپنا مال تجارت لے کر مدینہ طیبہ آیا اور مال فروخت کرنے کے بعد اپنا سامان اور آدمی مدینہ سے باہر چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور منافقانہ طور پر اپنے اسلام لانے کا اظہار کیا تاکہ مسلمان اس سے مطمئن ہو جائیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آنے سے پہلے ہی بذریعہ وحی خبر پاکر صحابہ کرام کو بتا دیا تھا کہ ہمارے پاس ایک شخص آنے والا ہے جو شیطان کی زبان سے کلام کرے گا۔ اور جب یہ واپس گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کفر کے ساتھ آیا اور دھوکہ غداری کے ساتھ لوٹا ہے۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے نکل کر سیدھا مدینہ سے باہر پہنچا۔ جہاں اہل مدینہ کے جانور چر رہے تھے ان کو ہنکا کر ساتھ لے گیا۔ صحابہ کرام کو اس کی اطلاع کچھ دیر میں ہوئی، تعاقب کے لئے نکلے تو وہ ان کی زد سے باہر ہو چکا تھا۔ پھر جب ہجرت کے ساتویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرۂ حدیبیہ کی قضا کے لئے جا رہے تھے تو دور سے تلبیہ کی آواز سنی اور دیکھا کہ یہی حطیم بن ہند اہل مدینہ کے ان جانوروں کو جو مدینہ سے لایا تھا بطور قربانی کے اپنے ساتھ لئے ہوئے عمرہ کرنے جا رہا ہے۔ اس وقت صحابہ کرام کا قصد ہوا کہ اس پر حملہ کر کے اپنے جانور چھین لیں اور اس کو یہیں ختم کر دیں۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ہجرت کے آٹھویں سال رمضان المبارک میں مکہ مکرمہ فتح ہوا اور تقریباً پورے عرب پر اسلامی قبضہ ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی انتقام کے آزاد فرما دیا، وہ آزادی کے ساتھ اپنے سب کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے جاہلانہ طرز پر حج و عمرہ کی رسوم بھی ادا کرتے رہتے۔ اس وقت بعض صحابہ کرام کے دل میں واقعہ حدیبیہ کا انتقام لینے کا خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں جائز اور حق طریق پر عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، ہم ان کے ناجائز اور غلط طریق کے عمرہ و حج کو کیوں آزاد چھوڑیں، ان پر حملہ کریں، ان کے جانور چھین لیں اور ان کو ختم کر دیں۔

یہ واقعات ابن جریر نے بروایت عکرمہ و سدی نقل کئے ہیں۔ یہ چند واقعات تھے کہ جن کی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ شعائر اللہ کی تعظیم تمہارا اپنا فرض ہے۔ کسی دشمن کے بغض و عداوت کی وجہ سے اس میں خلل ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اشہر حُرُم میں قتل و قتال بھی جائز نہیں۔ قربانی کے جانوروں کو حرم تک جانے سے روکنا یا ان کا چھین لینا بھی جائز نہیں۔ اور جو مشرکین احرام باندھ کر اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کے فضل و رضا حاصل کرنے کے قصد سے چلے ہیں، اگرچہ بوجہ کفر ان کا یہ خیال خام ہے

سزا دینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ یعنی اے ایمان والو اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس میں لفظ شعائر جس کا ترجمہ نشانیوں سے کیا گیا ہے، شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، اسی لئے شعائر اور شعیرہ اس محسوس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو۔ شعائر اسلام ان اعمال و افعال کو کہا جائے گا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق ڈاڑھی وغیرہ۔ شعائر اللہ کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ سے منقول ہے مگر جامع بات وہ ہے جو تفسیر بحر محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصری اور عطاءؒ سے منقول ہے اور امام جصاص نے اس کو تمام اقوال کے لئے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد تمام شرائع اور دین کے مقرر کردہ واجبات و فرائض اور ان کی حدود ہیں۔ اس آیت میں لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور شعائر اللہ کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دوسرے یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں مگر ادھورا کریں، پورا نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرکے آگے بڑھنے لگیں۔ لَا تُحِلُّوْا شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے عنوان سے اس طرح ارشاد فرمائی ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْبِ۔ یعنی جو شخص اللہ کی حرمات کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا اثر ہے۔ آیت کے دوسرے جملہ میں شعائر اللہ کی ایک خاص قسم یعنی شعائر حج کی چند تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

ارشاد ہے وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاۗىِٕدَ وَلَآ اٰۗمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ یعنی شہر حرام میں قتل و قتال کرکے اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ اشہر حرم وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا۔ ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔ بعد میں یہ حکم جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہو گیا، نیز حرم مکہ میں قربان ہونے والے جانور اور خصوصاً وہ جن کے گلے میں قربانی کی علامت کے طور پر قلادہ ڈالا گیا ہے، ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے

روک دیا جائے یا چھین لیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے وغیرہ کا لیا جائے، آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دے دیا۔

پھر فرمایا: وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا یعنی ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرو جو حج کے لئے بیت الحرام کا قصد کرکے گھر سے چلے ہیں، اور اس سفر سے ان کا مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا فضل اور رضا حاصل کریں، ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سفر میں ان سے مزاحمت نہ کی جائے، نہ کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا، یعنی پہلی آیت میں حالت احرام میں شکار کی جو ممانعت کی گئی ہے، اس کی حد بتلا دی گئی کہ جب تم احرام سے فارغ ہو جاؤ تو شکار کرنے کی ممانعت ختم ہو گئی، اب شکار کر سکتے ہو۔

آیت مذکورہ میں اس معاہدہ کے اہم جزء کا بیان ہو رہا ہے جو انسان اور رب العالمین کے درمیان ہے۔ اس کے چند اجزاء کا بیان اب تک ہو چکا ہے، جن میں اول متعلق شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت ہے اور پھر خاص طور پر ان شعائر اللہ کی کچھ تفصیلات ہیں جو حج سے متعلق ہیں، ان میں بالقصد حج آنے والے مسافروں اور ان کے ساتھ آنے والے قربانی کے جانوروں سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنے اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

اس کے بعد معاہدہ کا دوسرا جزء اس طرح ارشاد فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا، یعنی جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس آ گئے تھے، اب جبکہ تم کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہئے کہ پچھلے واقعہ کے غم و غصہ کا بدلہ اس طرح لینے لگو کہ ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکنے لگو، کیونکہ یہ ظلم ہے اور اسلام ظلم کا انتقام ظلم سے لینا نہیں چاہتا، بلکہ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنے اور انصاف پر قائم رہنا سکھلاتا ہے۔ انھوں نے اپنی قوت و اقتدار کے وقت مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے ظلماً روک دیا تھا، تو اس کا جواب یہ نہ ہونا چاہئے کہ اب مسلمان اپنے اقتدار کے وقت ان کو افعال حج سے روک دیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عدل و انصاف میں دوست و دشمن سب برابر ہونے چاہئیں

تمہارا دشمن کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ہی ایذا پہنچائی ہو، اس کے معاملہ میں بھی انصاف ہی کرنا تمہارا فرض ہے۔

یہ اسلام ہی کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ دشمنوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور ان کے ظلم کا جواب ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دینا سکھاتا ہے۔

باہمی تعاون وتناصر کا قرآنی اصول

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

— یہ سورۂ مائدہ کی دوسری آیت کا آخری جملہ ہے۔ اس میں قرآن حکیم نے ایک ایسے اصولی اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے جو پورے نظام عالم کی روح ہے۔ اور جس پر انسان کی ہر صلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے۔ وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون وتناصر کا۔ ہر ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریاتِ زندگی کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لئے غلہ اُگانے سے لیکر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل کو طے کرسکتا ہے، نہ لباس وغیرہ کے لئے روئی کی کاشت سے لیکر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بیشمار مسائل کا حل کرسکتا ہے اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرسکتا ہے۔ غرض ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کا محتاج ہے۔ اُن کے باہمی تعاون وتناصر سے ہی سارا دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ تعاون دنیوی زندگی ہی میں ... ضروری نہیں، مرنے سے لیکر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعاء مغفرت اور ایصالِ ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

حق جل شانہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے اس جہان کا ایسا محکم نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو دوسرے کا محتاج بنادیا۔ غریب آدمی پیسوں کے لئے مالدار کا محتاج ہے تو بڑے سے بڑا مالدار بھی محنت و مشقت کے لئے غریب مزدور کا محتاج ہے۔ سوداگر گاہکوں کا محتاج ہے اور گاہک سوداگر کا۔ مکان بنانے والا معمار، لوہار، بڑھئی کا محتاج ہے اور یہ سب اس کے محتاج ہیں۔ اگر یہ ہمہ گیر احتیاج نہ ہوتی اور تعاون محض اخلاقی برتری پر رہ جاتا تو کون کسی کا کام کرتا۔ اس کا وہی حشر ہوتا جو عام اخلاقی قدروں کا

اس دنیا میں ہو رہا ہے اور اگر یہ تقسیم کار کسی حکومت یا بین الاقوامی ادارہ کی طرف سے بصورت
قانون کر بھی دی جاتی تو اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو آج پوری دنیا میں دنیا کے قانون کا ہو رہا ہے کہ
کہ قانون ایکٹوں میں محفوظ ہے۔ اور بازار اور دفتروں میں رشوت، بے جا رعایت،
فرض ناشناسی اور بے عملی کا قانون چل رہا ہے۔ یہ صرف حکیم الحکماء رب العزت جل شانہٗ ہی کا نظام
ہے کہ مختلف لوگوں کے دلوں میں مختلف کاروبار کی رغبت اور صلاحیت پیدا کردی۔
انھوں نے اپنی اپنی زندگی کا محور اسی کام کو بنا لیا ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل او را در دلش انداختند!

ورنہ اگر کوئی بین الاقوامی ادارہ یا کوئی حکومت لوگوں میں تقسیم کار کرتی اور کسی
جماعت کو بڑھئی کے کام سپرد کرتی، کسی کو لوہار کے کام سپرد کرتی، کسی کو نائی دھوبی کے کام کرنے، کسی کو
پانی کے لئے، کسی کو خوراک کے لئے مقرر کرتی تو دنیا میں کس کی مجال تھی کہ ایسی اطاعت کرکے دن
کا چین اور رات کی نیند خراب کرکے اس کام میں لگ جاتا۔
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ہر انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کام کی رغبت اس کے
دل میں ڈال دی۔ وہ بغیر کسی قانونی مجبوری کے اس خدمت ہی کو اپنی زندگی کا کام سمجھتا ہے
اس کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اس نظام محکم کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری
ضروریات چند ٹکے خرچ کرنے سے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ پکا پکایا کھانا، سلا سلایا کپڑا، بنا
بنایا فرنیچر، تیار شدہ مکان سب کچھ انسان کچھ پیسے خرچ کرکے حاصل کرلیتا ہے۔ اگر
یہ نظام نہ ہوتا تو ایک کروڑ پتی انسان اپنی پوری دولت خرچ کرکے بھی گندم کا ایک دانہ حاصل
نہ کرسکتا۔ اسی قدرتی انتظام کا نتیجہ ہے کہ آپ ہوٹل میں قیام پذیر ہو کر جس جس چیز سے فائدہ
اٹھاتے ہیں اگر ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آٹا امریکہ کا، گھی پنجاب کا، گوشت سندھ کا،
مسالے مختلف ملکوں کے، برتن اور فرنیچر مختلف ملکوں کا، کام کرنے والے بیرے
باورچی مختلف شہروں کے آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک لقمہ جو آپ کے
منہ تک پہنچا ہے اس میں لاکھوں مشینوں، جانوروں اور انسانوں نے کام کیا ہے۔ تب
یہ آپ کے ذائقہ کو سنوار رہا ہے۔ آپ صبح گھر سے نکلتے ہیں چار میل جانا ہے جس کی طاقت یا
فرصت آپ کو نہیں۔ آپ کو سینکڑوں قریب سڑک میں ٹیکسی اور رکشہ یا بس کھڑی ہوئی
ملے گی۔ جس کا لوہا آسٹریلیا کا، لکڑی برما کی، مشینری امریکہ کی، ڈرائیور سرحد کا، کنڈکٹر
یوپی کا، یہ کہاں کہاں کے سامان اور کہاں کہاں کی مخلوق آپ کی خدمت کے لئے کھڑی ہے

کہ صرف چند پیسے دے کر آپ ان سب سے خدمت لے لیں۔ ان کو کس حکومت نے مجبور کیا ہے یا کس نے پابند کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں آپ کے لئے مہیا کر دیں، سوائے اس قانون قدرت کے جو قلوب کے مالک نے تکوینی طور پر ہر ایک کے دل پر جاری فرما دیا ہے۔

آج کل سوشلسٹ ممالک نے اس قدرتی نظام کو بدل کر ان چیزوں کو حکومت کی ذمہ داری بنا لیا، کہ کون انسان کیا کام کرے۔ اس کے لئے ان کو سب سے پہلے جبر و ظلم کے ذریعہ انسانی آزادی سلب کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ہزاروں انسانوں کو قتل کیا گیا، ہزاروں کو قید کیا گیا۔ باقی ماندہ انسانوں کو شدید جبر و ظلم کے ذریعہ مشین کے پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں کہ کسی جگہ کچھ اشیاء کی پیداوار بڑھ بھی گئی تو انسانوں کی انسانیت ختم کر کے بڑھی۔ تو یہ سودا سستا نہیں پڑا۔ قدرتی نظام میں ہر انسان آزاد بھی ہے اور قدرتی تقسیم طبائع کی بنا پر خاص خاص کاموں کے لئے مجبور بھی اور وہ مجبوری بھی چونکہ اپنی طبیعت سے ہے۔ اس لئے اس کو کوئی بھی جبر محسوس نہیں کرتا۔ سخت سے سخت محنت اور ذلیل سے ذلیل کام کے لئے خود آگے بڑھنے والے اور کوشش کر کے حاصل کرنے والے ہر جگہ ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ اور اگر کوئی حکومت ان کو اس کام کے لئے مجبور کرنے لگے تو یہ سب اس سے بھاگنے لگیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے کہ اگر جرائم، چوری، ڈاکہ، قتل و غارتگری وغیرہ کے لئے یہ باہمی تعاون ہونے لگے، چوروں اور ڈاکوؤں کی بڑی بڑی اور منظم قوی جماعتیں بن جائیں تو یہی تعاون و تناصر اس عالم کے سارے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہمی تعاون ایک دو دھاری تلوار ہے جو اپنے اوپر بھی چل سکتی ہے۔ اور نظام عالم کو برباد بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ عالم چونکہ خیر و شر اور اچھے برے، نیک و بد کا ایک مرکب معجون ہے۔ اس لئے اس میں ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہ تھا کہ جرائم اور قتل و غارت یا نقصان رسانی کے لئے باہمی تعاون کی قوت استعمال کرنے لگیں۔ اور یہ صرف احتمال نہیں بلکہ واقعہ بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ تو اس کے رد عمل کے طور پر عقلاء دنیا نے اپنے تحفظ کے لئے مختلف نظریوں پر خاص خاص جماعتوں یا قوموں کی بنیاد ڈالی۔ کہ ایک جماعت یا ایک قوم کے خلاف جب کوئی دوسری جماعت یا قوم حملہ آور ہو تو یہ سب ان کے مقابلہ میں باہمی تعاون کی قوت کو استعمال کر کے مدافعت کر سکیں۔

قومیتوں کی تقسیم | عبد الکریم شہرستانی کی ملل و نحل میں ہے کہ شروع میں جب تک انسانی

آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کے چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئیں، مشرقی، مغربی، جنوبی، شمالی۔ ان میں سے ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسروں کو دوسری قوم سمجھنے لگے۔ اور اسی بنیاد پر تعاون و تناصر قائم کرلیا۔ اس کے بعد جب آبادی زیادہ پھیلی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی و خاندانی بنیادوں پر قومیت و اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا۔ عرب کا سارا نظام اسی نسبی و قبائلی بنیاد پر تھا۔ اسی پر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ بنو ہاشم ایک قوم، بنو تمیم دوسری قوم، بنو خزاعہ تیسری قوم۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں تو آج تک اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق اسی طرح چل رہی ہے۔

یورپین اقوام کے دور جدید نے نہ کوئی نسب باقی رکھا، نہ دنیا کے انساب کو کچھ سمجھا، جب دنیا میں ان کا عروج ہوا تو نسبی و قبائلی قومیتیں اور تقسیمیں ختم کرکے جغرافیائی اور صوبائی، وطنی اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے الگ الگ قومیں کھڑی کردی گئیں۔ اور آج یہی سلسلہ تقریباً ساری دنیا میں چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ جادو مسلمانوں پر بھی چل گیا۔ عربی، ترکی، عراقی، سندھی کی تقسیمیں ہی نہیں بلکہ ان میں بھی مزید تقسیم ہوکر مصری، شامی، حجازی، نجدی اور پنجابی، بنگالی، سندھی، ہندی وغیرہ کی الگ الگ قومیں بن گئیں۔ حکومت کے سب کاروبار انہیں بنیادوں پر چلائے گئے۔ یہاں تک کہ یہ صوبائی عصبیت ان کے رگ و پے میں سرایت کرگئی۔ اور ہر صوبے کے لوگوں کا تعاون و تناصر اسی بنیاد پر ہونے لگا۔

قومیت اور اجتماعیت کے لئے قرآنی تعلیم

قرآن کریم نے انسان کو پھر بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سورۂ نساء کی شروع آیت میں یہ واضح کردیا کہ تم سب ایک انسان یعنی ماں باپ کی اولاد ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کردیا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار صرف تقویٰ اور اطاعت خدائے تعالیٰ پر ہے۔ اس قرآنی تعلیم نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کا اعلان کرکے حبشہ کے کالے بھجنگ کو سرخ ترکی و رومی کا، عجم کی نیچی ذات کے انسانوں کو عرب کے قریشی اور ہاشمی کا بھائی بنادیا۔ قومیت و برادری اس بنیاد پر قائم کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ماننے والے ایک قوم، اور نہ ماننے والے دوسری قوم ہیں۔ یہی وہ بنیاد تھی جس نے ابوجہل اور ابولہب کے خاندانی رشتوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑ دیا۔ اور بلال حبشی اور صہیب رومی کا رشتہ جوڑ دیا۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

حتی کہ قرآن کریم نے اعلان کر دیا خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر تم دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ کافر ہو گئے، کچھ مؤمن۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں اسی قرآنی تقسیم کا عملی مظاہرہ ہوا تھا کہ نسبی بھائی جب خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے باہر ہو تو مسلمان بھائی کا رشتہ اخوت و تعاون اس سے کٹ گیا، اور وہ اس کی تلوار کی زد میں آ گیا۔ نسبی بھائی تلوار لے کر مقابلہ پر آیا تو اسلامی بھائی امداد کے لئے پہونچا۔ غزوہ بدر و احد اور خندق کے واقعات اس پر شاہد ہیں

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بیگانہ کہ آشنا باشد

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے تعاون و تناصر کا یہی معقول و صحیح اصول بتلایا ہے۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ یعنی نیکی اور خدا ترسی پر تعاون کرو۔ بدی اور ظلم پر تعاون نہ کرو۔

غور کیجئے کہ اس میں قرآن کریم نے یہ عنوان بھی اختیار نہیں فرمایا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی جو اصل بنیاد ہے، یعنی نیکی اور خدا ترسی اسی کو تعاون کرنے کی بنیاد قرار دیدیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم و جور کی طرف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد نہ کرو۔ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو۔ کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح مدد ہے، تاکہ ظلم و جور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ کرام رضہ جو قرآنی تعلیم میں رنگے جا چکے تھے، انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ مظلوم بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے۔ مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو۔ یہی اس کی امداد ہے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم نے بِر و تقویٰ یعنی نیکی اور خدا ترسی کو اصل معیار بنایا۔ اسی پر مسلم قومیت کی تعمیر کھڑی کی۔ اس پر تعاون و تناصر کی دعوت دی۔ اس کے بالمقابل اِثم و

عُدْوَان کو سخت جُرم قرار دیا۔ جس پر تعاون کرنے سے روکا۔ بِرّ و تَقْوٰی کے دو لفظ اختیار فرمائے۔ جمہور مفسرین نے بِرّ کے معنی اس جگہ فعل الخیرات یعنی نیک عمل قرار دیئے ہیں اور تقویٰ کے معنی ترک المنکرات یعنی برائیوں کا ترک بتلائے ہیں۔ اور لفظ اثم مطلق گناہ اور معصیت کے معنی میں ہے۔ خواہ وہ حقوق سے متعلق ہو یا عبادات سے اور عُدْوَان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے ظلم و جور ہے۔

بِرّ و تقویٰ پر تعاون اور امداد کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ الدال علی الخیر کفاعلہ۔ یعنی جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتادے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس نے خود کیا ہو۔ یہ حدیث ابن کثیر نے بحوالہ بزار نقل فرمائی ہے۔ اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سب کی برابر اس کو بھی ثواب ملے گا۔ بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا۔ تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کی برابر اس کو بھی گناہ ہوگا۔ بغیر اس کے کہ ان گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

اور ابن کثیر نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ اسی پر سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے۔ کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے۔ تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات قلم کو درست کیا ہے۔ وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کرکے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن و سنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی۔ انصاف۔ ہمدردی۔ اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بناکر کھڑا کردیا تھا۔ اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو ایک ایسا سپاہی بنا دیا تھا جو خفیہ اور علانیہ اپنی ڈیوٹی بجالانے پر خوف خدا تعالیٰ کی وجہ سے مجبور تھا۔ اسی حکیمانہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جو دنیا نے صحابہ و تابعین کے قرن میں دیکھا۔ آج بھی جب کسی ملک میں

جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری دفاع کے محکمے قائم کرکے ہر فرد قوم کو کچھ فنون کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے مگر جرائم کے انسداد کے لئے اس کا کہیں اہتمام نہیں ہے کہ لوگوں کو خیر کا داعی اور شر کو روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اسکی مشق نہ فوجی پریڈ سے ہوتی ہے نہ شہری دفاع کے طریقوں سے۔ یہ ہنر تو تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آجکل بدقسمتی سے ان چیزوں کے نام سے ناآشنا ہے۔ برّ و تقویٰ اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آجکل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے۔ اور اِثم وعدوان کا ہر راستہ کھلا ہوا ہے۔ پھر یہ بیچاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے۔ جب ساری قوم حلال وحرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت چوری، ڈاکہ، فوحش، قتل و غارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جاتی ہے اور قانونی مشینری ان کے انسداد سے عاجز ہے۔

اس کے یہی دو سبب ہیں کہ ایک طرف تو حکومتیں اس قرآنی نظام سے دور ہیں، اُن کے ارباب اقتدار اپنی زندگی کو برّ و تقویٰ کے اصول پر ڈالتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اگرچہ اسکے نتیجہ میں ہزاروں تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ کاش وہ اس تلخ گھونٹ کو ایک دفعہ تجربہ کے لئے بھی پی جائیں، اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ کس طرح ان کو اور عوام کو امن وسکون اور چین و راحت کی حیاتِ طیبہ عطا ہوتی ہے۔

دوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسدادِ جرائم صرف حکومت کا کام ہے۔ وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محض احقاقِ حق اور انسدادِ جرائم کے لئے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو از روئے قرآن کریم حرام اور سخت گناہ ہے۔ اور وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے حکم سے بغاوت ہے۔

⁂

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ
حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سور کا اور جس

اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ
جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر

وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ
یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور حرام ہے جو ذبح

عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ

جو کسی تھان پر اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے

فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا

آج ناامید ہوگئے کافر تمہارے دین سے سو ان سے

تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ

مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں پورا کرچکا تمہارے لئے دین تمہارا اور

اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ

پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

تم پر (یہ جانور وغیرہ) حرام کئے گئے ہیں مردار (جانور جو کہ باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون (جو بہتا ہو) اور خنزیر کا گوشت (اسی طرح اس کے سب اجزاء) اور جو جانور کہ (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جاوے اور جو کسی ضرب سے مر جاوے اور جو اونچے سے گر کر مر جاوے (مثلاً پہاڑ سے یا کنوئیں میں) اور جو کسی کی ٹکر سے مر جاوے اور جس کو کوئی درندہ (پکڑ کر) کھانے لگے (اور اس کے صدمہ سے مر جاوے) لیکن (منخنقہ سے ما اکل السبع تک جن کا ذکر ہے ان میں سے) جس کو تم (دم نکلنے سے پہلے قاعدہ شرعیہ کے مطابق) ذبح کر ڈالو (وہ اس حرمت سے مستثنیٰ ہے) اور نیز جو جانور (غیر اللہ کی) پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے (وہ حرام ہے گو زبان سے غیر اللہ کے نامزد نہ کرے، کیونکہ مدار حرمت کا نیت تعظیم پر ہے۔ اس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے کہ نامزد کرے کبھی فعل سے ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر ذبح کرے) اور یہ (بھی حرام ہے) کہ (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں۔ آج کے دن (یعنی اب) ناامید ہوگئے کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب و گم ہو جانے) سے (کیونکہ ماشاء اللہ اسلام کا خوب شیوع ہوگیا) سو ان (کفار) سے مت ڈرنا (کہ تمہارے دین کو گم کرسکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت مت کرنا) آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو

مایوسی ہوئی اور احکام و قواعد میں بھی، (دراس آمیں سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی اور اکمال دین میں دونوں آگئے) اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے ہمیشہ کو پسند کرلیا (یعنی قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا۔ اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین تجویز نہ کیا جاوے گا۔ پس تم کو چاہیے کہ میری نعمت کا شکر کرتے اس دین پر پورے پورے قائم رہو، پھر اشیاء مذکورہ بالا کی حرمت دریافت کرلینے کے بعد یہ بھی معلوم کرلو کہ) جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہوجاوے اور اس وجہ سے اشیائے بالا کو کھالے، بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھاوے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورۂ بقرہ میں غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے تعبیر فرمایا ہے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہوا، اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا اور) رحمت والے ہیں (کہ ایسی حالت میں اجازت دے دی)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت ہے۔ جس میں بہت سے اصول و فروعی احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے۔ جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ انکو قرآن نے خبائث قرار دیا اور حرام کردیا، اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں ہے، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کئے گئے تم پر مُردار جانور۔ مُردار سے مراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مرجائیں۔ ایسے مُردار جانور کا گوشت "طبی" طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے، اور روحانی طور پر بھی۔

البتہ حدیث شریف میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ایک "مچھلی" دوسرے "ٹڈی" یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

دوسری چیز جس کو اس آیت نے حرام قرار دیا ہے وہ خون ہے، اور قرآن کریم کی دوسری آیت میں اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے۔

اس سے جمے ہوئے اجزاء جو خون ہونے کے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیث مذکور میں جہاں "میتہ" سے مچھلی اور ٹڈی کو مستثنیٰ فرمایا ہے، اسی میں جگر اور طحال کو خون سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

تیسری چیز "لحم خنزیر" ہے۔ جس کو حرام فرمایا ہے۔ لحم سے مراد اس کا پورا بدن ہے۔ جس میں چربی، پٹھے وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

چوتھے وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھلا شرک ہے۔ اور یہ جانور باتفاق مردار کے حکم میں ہے۔

جیسا مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر۔ اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ تعالیٰ کا لیا، مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہوا اور اس کی رضامندی کے لئے قربان کیا ہے تو جمہور فقہاء نے اس کو بھی مَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

پانچویں۔ مُنْخَنِقَة یعنی وہ جانور حرام ہے جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو یا خود ہی کسی جال وغیرہ میں پھنس کر دم گھٹ گیا ہو۔ یہ منخنقہ اور موقوذۃ بھی میتہ کے اندر داخل ہیں، مگر اہل جاہلیت ان کو جائز سمجھتے تھے۔ اس لئے خصوصی ذکر کیا گیا۔

چھٹے۔ موقوذۃ۔ یعنی وہ جانور جو ضرب شدید کے ذریعہ ہلاک ہو ہو۔ جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو۔ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کر دے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذۃ میں داخل ہو کر حرام ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات معراض تیر سے شکار کرتا ہوں۔ اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور عرض تیر کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذۃ میں داخل ہے اس کو مت کھاؤ اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت جصاص نے "احکام القرآن" میں اپنی سند سے نقل کی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکنے کے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا گیا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اس کو بھی فقہاء نے موقوذہ میں داخل اور حرام قرار دیا ہے۔ امام جصاص رح نے حضرت عبداللہ بن عمر رضہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے۔ المقتولۃ بالبندقۃ تلک الموقوذۃ۔ یعنی بندوق کے ذریعہ جو جانور قتل کیا گیا ہے وہ ہی موقوذہ ہے اس لئے حرام ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحہ، شافعی، مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی) ساتویں مُتَرَدِّیَة۔ یعنی وہ جانور جو کسی پہاڑ، ٹیلہ یا اونچی

عمارت یا کنوئیں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ بھی حرام ہے۔ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص پہاڑ پر کھڑا ہے، اور تم نے تیر بسم اللہ پڑھ کر اس پر پھینکا اور وہ تیر کی زد سے نیچے گر کر مر گیا تو اس کو نہ کھاؤ۔

کیونکہ اس میں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہو گرنے کے صدمہ سے ہو تو وہ مُتَرَدِّیَہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا، وہ پانی میں گر گیا تو اس کے کھانے کو بھی اسی بنا پر منع فرمایا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی ہو۔ (جصاص)۔

اور حضرت عدی بن حاتم رضؓ نے یہی مضمون رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت فرمایا ہے۔ (جصاص)۔

آٹھویں۔ نطیحہ۔ یعنی وہ جانور جو کسی ٹکر اور تصادم سے ہلاک ہو گیا ہو۔ جیسے ریل، موٹر وغیرہ کی زد میں آکر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکر سے مر جائے۔

نویں۔ وہ جانور جس کو کسی درندہ جانور نے پھاڑ دیا ہو اس سے مر گیا ہو۔

ان نو اقسام کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا۔ فرمایا۔۔ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ۔ یعنی اگر ان جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کر لیا تو وہ حلال ہو گیا۔ اس کا کھانا جائز ہے۔

یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مَیْتَہ اور دَم میں تو اس کا امکان ہی نہیں۔ اور خنزیر اور مَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللہِ۔ یعنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے۔ اسی لئے حضرت علی رضؓ۔ ابن عباس رضؓ۔ حسن بصری۔ قتادہ۔ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی مُنْخَنِقَہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ اس لئے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔ خواہ وہ مُنْخَنِقَہ ہو، یا مَوْقُوذَہ یا مُتَرَدِّیَہ اور نطیحہ یا جسکو درندہ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ ان میں سے جس کو بھی آثار زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا۔

دسویں۔ وہ جانور حرام ہے جو نُصُب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نُصُب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لئے کرتے تھے۔ اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔

اہل جاہلیت ان سب قسم کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے جو خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا۔

گیارھویں چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ وہ استقسام بالازلام ہے ازلام، زلم کی جمع ہے۔ زلم اس تیر کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لئے مقرر تھا کہ اس کے ذریعہ قسمت آزمائی کی جاتی تھی اور یہ سات تیر تھے۔ جن میں سے ایک پر نعم ایک پر لا۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ اور یہ تیر بیت اللہ کے خادم کے پاس رہتے تھے۔

جب کسی شخص کو اپنی قسمت یا آئندہ کسی کام کا مفید ہونا یا مضر ہونا معلوم کرنا ہوتا، تو خادم کعبہ کے پاس جاتے اور سو روپے اس کو نذر نذ دیتے وہ ان تیروں کو ترکش سے ایک ایک کرکے نکالتا۔ اگر اس پر لفظ نعم نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام مفید ہے، اور اگر لا نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہ کرنا چاہیے۔ حرام جانوروں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم ہر ایک کے حصہ شرکت کے مطابق کرنے کے بجائے ان جوئے کے تیروں سے کرتے تھے جس میں کوئی بالکل محروم رہتا، کسی کو بہت زیادہ، کسی کو حق سے کم ملتا تھا۔ اس لئے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کا بیان کر دیا گیا۔

علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر، سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔

اور استقسام بالازلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے۔ یہ بھی بنص قرآن حرام ہے۔ جس کو قرآن کریم نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، اور شعبی نے فرمایا کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ازلام کے حکم میں ہیں۔ (مظہری)

استقسام بالازلام کی حرمت کے ساتھ ارشاد فرمایا:-

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ، یعنی یہ طریقہ قسمت معلوم کرنے یا حصہ مقرر کرنے کا فسق اور

گمراہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

آج کے دن کفار تمہارے دین پر غالب آنے سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب تم ان سے کوئی خوف نہ رکھو البتہ مجھ سے ڈرتے رہو۔

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری تھا۔ اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو کفار یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہمارے مقابلہ میں کم بھی ہے اور کمزور بھی ان کو ختم کر دیا جائے۔ اب نہ اُن میں یہ حوصلہ باقی رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی۔ اس لیے مسلمان اُن سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت وعبادت میں لگ جائیں۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام میدان عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا یہ عظیم اجتماع ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریک ہیں۔ رحمۃ للعالمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے اپنی ناقہ "عضباء" پر سوار ہیں۔ اور حج کے سب سے بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت

قوموں کے لئے مکمل نہ ہو تو پھر اس کو منسوخ کرکے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی۔ بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے۔ نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور نہ کسی خاص خطہ، ملک یا قوم کے ساتھ، بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔

تیسرا انعام جو اس امت مرحومہ کے لئے اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے لئے اللہ جل شانہ نے اپنے تکوینی انتخاب کے ذریعہ دین اسلام کو منتخب فرمایا جو ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔ اور جس پر نجات کا انحصار ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ امت محمدیہ کے لئے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے۔ اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور ہر جہت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے مگر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسال رسول کی ضرورت بھی پوری ہو چکی ــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر و بحر محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتلا دیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آخر آیت میں فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ کا تعلق ان جانوروں سے ہے، جن کی حرمت کا بیان شروع آیت میں آیا ہے۔ اور اس جملہ کا مطلب ایک خاص حالت کو عام قاعدہ سے مستثنٰی کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاوے اور خطرہ موت کا لاحق ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ مذکورہ بالا حرام جانوروں میں سے کچھ کھالے تو اس کے لئے گناہ نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پیٹ بھرنا اور لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اتنا کھالے جس سے اضطرار کی کیفیت رفع ہو جاوے۔

آیت میں غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ کا یہی مطلب ہے کہ اس کھانے میں اس کا میلان گناہ کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اضطرار کا رفع کرنا ہو ــــ آخر میں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ محرمات اس وقت بھی اپنی جگہ حرام

بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۵﴾

ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اس کی اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے

خلاصۂ تفسیر

آج (اور یہ جیسے دینی ابدی انعام ہوا کہ کمال دین سے مشرف کیے گئے۔ اسی طرح ایک معتدبہ دنیوی ابدی انعام بھی ہوا کہ) تمہارے لئے حلال چیزیں (کہ اس سے پہلے حلال کردی گئی تھیں ہمیشہ کے لئے) حلال رکھی گئیں (کہ کبھی منسوخ نہ ہوں گی) اور جو لوگ (تم سے پہلے آسمانی) کتاب دیے گئے ہیں (یعنی یہود و نصاریٰ) ان کا ذبیحہ (بھی) تم کو حلال ہے اور (اس کا حلال ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسا تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں، اور جیسا مسلمان عورتوں کا حلال ہونا یقینی ہے اسی طرح) پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) دیے گئے ہیں تم کو حلال ہیں، جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو (یعنی مہر دینا گو شرط نہیں مگر واجب ہے اور عورتیں مذکورہ جو حلال کی گئی ہیں تو) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (یعنی نکاح میں لاؤ جن کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں)، نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو (یہ سب احکام شرعیہ ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے) اور جو شخص ایمان (لانے کی چیزوں) کے ساتھ کفر کرے گا (مثلاً حلال قطعی کی حلت کا یا حرام قطعی کی حرمت کا انکار کرے گا) تو اس شخص کا (ہر نیک) عمل غارت (اور اکارت) جاوے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔ (بس حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو)۔

معارف و مسائل

سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بہیمۃ الانعام یعنی پالتو جانور، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کا حلال ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور تیسری آیت میں نو قسم کے حرام جانوروں کی تفصیل ہے مگر اس تفصیل سے پہلے اس کے ابتدائی جملہ میں اس پورے باب کا خلاصہ اس طرح بیان فرمادیا ہے کہ اس میں جانوروں کی حلت و حرمت کا ضابطہ بھی معلوم ہوگیا۔ اور اس کا ایک معیار و اصول بھی۔

ارشاد ہے، اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ یعنی آج تمہارے لئے حلال ہوئیں

سب صاف ستھری چیزیں۔ آج سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئی ہیں یعنی حجۃ الوداع کا یوم عرفہ۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے لئے دین کامل مکمل کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تم پر مکمل ہوگئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ چیزیں جو پہلے بھی تمہارے لئے حلال تھیں، دائمی طور پر حلال کر دی گئیں۔ اور ان کے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوا۔ کیونکہ سلسلہ وحی ختم ہونے والا ہے۔

اس جملہ میں طیبات حلال ہونے کا بیان ہے اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ یعنی حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث۔ اس میں طیبات کے بالمقابل خبائث ذکر کر کے ان دونوں لفظوں کی حقیقت واضح کر دی گئی۔

لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت نے اس کلمے سے بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے۔ جس کا مقصد زندگی دنیا میں کھانے پینے، سوتے جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو۔ اس کو قدرت نے مخدوم کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے بداخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔

اسی لئے قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یعنی وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اور جب انسان کی انسانیت کا مدار صلاح اخلاق پر ہو تو ضروری ہے کہ جتنی چیزیں انسانی اخلاق کو گندہ اور خراب کرنے والی ہیں اُن سے اس کو مکمل پرہیز کرایا جائے۔ انسان کے اخلاق پر اس کے گرد و پیش کی چیزوں اور اس کی سوسائٹی کا اثر پڑنا بدیہی طور پر ہر شخص جانتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب گرد و پیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں اُن سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے۔ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوئی۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، سود، قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی، وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دُور اور شیطنت سے قریب کرے گی۔ اسی لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا، عمل صالح کے ساتھ اکل حلال کا ذکر دیا گیا ہے، کیونکہ اکل حلال کے بغیر عمل صالح متصور نہیں۔ بالخصوص گوشت جو انسان کے بدن کا جزو اہم بنتا ہے اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں داخل نہ ہو جو اس کے اخلاق کو خراب کرے اسی طرح وہ گوشت جو جسمانی طور پر انسان کے لئے مضر ہے کہ بیماری اور ہلاکت کے جراثیم اس میں ہیں، اس سے انسان کے پرہیز ضروری ہو، تو سبھی جانتے ہیں جتنی چیزیں شریعت نے خبائث قرار دی ہیں، وہ یقینی طور پر انسان کے جسم یا روح یا دونوں کو خراب کرنے والی اور انسانی جان یا اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں، اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ اس کے بالمقابل طیبات سے انسان کے جسم و روح کی تربیت اور اخلاق فاضلہ کا نشو و نما ہوتا ہے ان کو حلال قرار دے دیا۔ غرض قرآن پاک کے جملہ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ نے حلت و حرمت کا فلسفہ بھی بتلا دیا اور اصول بھی۔

اب یہ بات کہ کونسی چیزیں طیبات یعنی صاف ستھری مفید اور مرغوب ہیں اور کونسی خبائث یعنی گندی، ضرر رساں قابل نفرت ہیں، اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت و نفرت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، ہر زمانہ کے سلیم الطبع انسان ان کو گندہ اور قابل نفرت سمجھتے رہے ہیں، جیسے مردار جانور، خون۔ البتہ بعض اوقات جاہلانہ رسوم طبیعت پر غالب آ جاتی ہیں تو اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جاتی ہے یا بعض چیزوں کا خبث مخفی ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا فیصلہ سب کے لئے حجت ہے کیونکہ افراد انسانی میں سب سے زیادہ سلیم الطبع انسان انبیاء علیہم السلام ہیں جنکو حق تعالیٰ نے مخصوص طور پر فطرت سلیمہ سے نوازا اور ان کی تربیت کا خود تکفل فرمایا۔ ان کے گرد و پیش اپنے فرشتوں کا پہرہ لگایا جس سے ان کے قلب و دماغ اور اخلاق کسی غلط ماحول سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے جن چیزوں کو خبائث قرار دیا وہ حقیقۃً خبائث ہیں اور جن کو طیبات سمجھا وہ حقیقۃً طیبات ہیں۔

چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے کے سلیم الطبع حضرات نے ان کو گندی اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمایا ہے کہ جتنے جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دئیے ہیں، ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب

دو اصولوں کے تحت آتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبیحہ کے بجائے مَیتَة یعنی مُردار قرار دیا جائے گا۔

سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں نو چیزوں کو حرام بتلایا ہے۔ ان میں خنزیر قسم اوّل میں داخل ہے۔ باقی آٹھ قسم دوم میں۔ قرآن کریم نے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا۔ اور اس کی تفصیل میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحۃً بیان فرما دیں۔ جیسے لَحْمُ خِنْزِیر اور دَمٌ مَّسْفُوْح وغیرہ۔ باقی چیزوں کا بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتلائی کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے جس جانور کی شکل میں مسخ و تبدیل کیا گیا ہو تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ جانور طبعاً خبیث ہے کہ جن لوگوں پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ان کو اس جانور کی شکل دی گئی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ یعنی بعض قوموں کو خنزیر اور بندر کی شکل میں بطور عذاب کے مسخ کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی یہ دونوں قسمیں بالطبع خباثت میں داخل ہیں۔ ان کو باقاعدہ ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حلال نہیں ہو سکتے۔ دوسرے بہت سے جانور ایسے بھی ہیں کہ افعال و آثار سے ان کا خبیث ہونا عام طبائع خود بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ مثلاً درندے جانور، جن کا کام ہی دوسرے جانوروں کو زخمی کرنا، پھاڑنا، کھانا ہے اور سخت دلی ہے۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیئے کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے جانور ہیں جن کی خصلت ایذا رسانی، چیزوں کا اچک لینا ہے۔ جیسے سانپ۔ بچھو۔ چھپکلی۔ مکھی۔ یا چیل اور باز وغیرہ۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضابطہ کے طور پر بیان فرمایا کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کھاتا ہے، جیسے شیر، چیتا یا وغیرہ۔ اور پرندوں میں وہ جانور جو اپنے پنجے سے شکار کرتے ہیں۔ جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ یا ایسے جانور جن کی طبیعت میں خست اور دناءت یا نجاست کے ساتھ ملوث ہونا ہے، جیسے چوہا یا مردار خور جانور یا گدھا وغیرہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان جانوروں کے طبعی خواص اور ان کا مضر ہونا ہر انسان جو معمولی سلامت طبع رکھتا ہو محسوس کرتا ہے۔

حِلٌّ لَّهُمْ ، یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال۔

اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک کھانے سے مراد ذبیحہ جانور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابوالدرداء، ابراہیم، قتادہ، سدی، ضحاک، مجاہد رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی منقول ہے (روح المعانی و جصاص)، کیونکہ دوسری قسم کے کھانوں میں اہل کتاب اور بت پرست مشرکین سب برابر ہیں۔ روٹی، آٹا، دال، چاول، پھل وغیرہ جن میں ذبح کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی جائز طریقہ پر حاصل ہو تو مسلمان کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اور مسلمانوں سے اُن کو ملے تو اُن کے لئے حلال ہے۔ اس لئے خلاصہ مضمون اس آیت کا یہ ہوا کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمان کے لئے اور مسلمان کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے حلال ہے —

اب اس جگہ چند مسائل قابل غور ہیں: اول یہ کہ اہل کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں۔ کتاب سے کیا مراد ہے؟ دوسرے کیا اہل کتاب ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان و عمل رکھتے ہوں۔ اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا۔ وہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس لئے باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو۔ جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس سے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں۔ وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی۔ جیسے مشرکین مکہ، مجوس، بُت پرست ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ باصطلاحِ قرآن اہل کتاب میں داخل ہیں۔ تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں، یہ نجوم پرست قوم ہیں۔ وہ ان کو بُت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یقینی صورت جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں

کو دخل ہے۔ اس میں چونکہ غیر مسلم برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت پر کوئی بھروسہ نہیں اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ ان سے اجتناب کیا جائے، بلا ضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں، مگر اس میں جو عمل مشرکین، بت پرستوں کا ہے، وہی اہل کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذبیحہ کے گوشت میں ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں باتفاق امت طعام اہل کتاب سے مراد ان کے ذبائح ہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے لکھا ہے:-

والطعام اسم لما يؤكل والذبائح منه وهو ههنا خاص بالذبائح عند كثير من اهل العلم بالتأويل واما ما حرم من طعامهم فليس بداخل فى عموم الخطاب۔ (قرطبی ص۷۷، ج ۶)

لفظ طعام عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی داخل ہیں۔ اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا ہے اکثر علماء تفسیر کے نزدیک اور اہل کتاب کے طعام میں سے جو چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔ وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔

اس کے بعد امام قرطبی نے مزید تفصیل اس مسئلہ کی بیان فرمائی ہے:-

لاخلاف بين العلماء ان مالا يحتاج الى ذكٰوة كالطعام الذى لامحاولة فيه كالفاكهة والبر۔ جائز اكله اذ لا يضر فيه تملك احد والطعام الذى تقع فيه المحاولة على ضربين احدهما ما فيه محاولة صنعة لاتعلق لها بالدين كخبزة الدقيق وعصر الزيت ونحوه۔ فهذا ان تجنب من الذمى فعلى وجه التقذر۔ والضرب الثانى التذكية التى ذكرنا انها هى التى تحتاج الى الدين والنية۔ فلما كان القياس ان لا تجوز ذبائحهم كما

علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ چیزیں جن میں ذبح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کھانا جس میں تصرف نہیں کرنا پڑتا جیسے میوہ اور گندم وغیرہ اس کا کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بننا چنداں مضر نہیں ہے۔ البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو کچھ عمل کرنا پڑتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً آٹے سے روٹی بنانا، زیتون سے تیل نکالنا وغیرہ تو کافر ذمی کی ایسی چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ محض طبعی کراہت کی بناء پر ہوگا۔ اور دوسری

یعنی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور یا وہ جانور جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام ہے۔ موجودہ زمانے میں یہود و نصاریٰ کے جو فرقے اب بھی موجود ہیں ان میں بھی ذبیحہ و نکاح کے احکام تقریباً وہی ہیں جو قرآن کریم اور اسلام میں ہیں۔ جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف بھی عمل کرتے ہوں، جیسا کہ خود مسلمانوں میں سے جاہل عوام میں بہت سی جاہلانہ رسمیں شامل ہو گئی ہیں مگر ان کو مذہب اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ شاید کسی کے جاہل عوام کے طرز عمل کو دیکھ کر ہی بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبح کے وقت کیا کہتے ہیں کوئی اللہ کا نام لیتا ہے یا غیر اللہ کا نام لیتا ہے، کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ آیت مائدہ جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے، اس آیت نے اہل کتاب کے ذبح کے حق میں سورۂ بقرہ اور اور سورۂ انعام کی ان آیتوں میں تخصیص یا ایک قسم کا نسخ قرار دیا ہے جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض ائمہ مجتہدین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات تابعین نے اہل کتاب کے متروک التسمیہ ذبیحہ اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک بھی اہل کتاب کا اصل مذہب تو اسلامی احکام سے مختلف نہیں ہے، مگر ان کے جاہل عوام یہ غلطیاں کرتے ہیں، اس کے باوجود ان حضرات نے جاہل اہل کتاب کو بھی عام اہل کتاب کے حکم سے الگ نہیں کیا، اور ذبیحہ و نکاح کے معاملہ میں ان کا بھی وہی حکم رکھا جو ان کے آباء و اجداد اور اصل مذہب کے پیروؤں کا ہے کہ ان کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد ابو الفتح مقدسی سے سوال کیا کہ موجودہ نصاریٰ کی تو یہ حالت ہے کہ وہ ذبح کرتے ہیں، مثلاً مسیح یا عزیر کا نام بوقت ذبح لیتے ہیں تو ان کا ذبیحہ کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ اس پر ابو الفتح مقدسی نے فرمایا:۔

هم من آبائهم وقد جعلهم الله تعالیٰ تبعاً لمن كان قبلهم علمه بحالهم۔	ان کا حکم اپنے آباء و اجداد کا سا ہے۔ آج کے اہل کتاب کا حال اللہ کو معلوم تھا، لیکن اللہ نے ان کو ان کے آباء کے تابع بنا دیا ہے۔

(احکام ابن عربی ص ۲۲۹، جلد اول)

تم نے اس کو پاک کر لیا ہو۔ اور وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت نے میتہ یعنی خود مرا ہوا جانور اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور وہ گھونٹ ہوا جانور اور چوٹ سے مارا یا اونچی جگہ سے گر کر مرا ہوا۔ یا سینگوں کی چوٹ سے مارا ہوا اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو سب حرام قرار دیئے ہیں۔ توراۃ و انجیل کی مذکورہ تصریحات میں بھی "لحم خنزیر" کے علاوہ تقریباً سبھی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف چوٹ سے یا اونچی جگہ سے گر کر سینگوں سے مرنے والے جانور کی تفصیل اگرچہ مذکور نہیں ہے۔ مگر وہ سب تقریباً خود مرے یا گلا گھونٹ کر مارے ہوئے کے حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کی تاکید فرمائی ہے فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ۔ اور جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو حرام کیا ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ۔ بائبل میں کتاب استثنا کی عبارت مذکورہ[1] سے بھی اس کی تاکید معلوم ہوتی ہے کہ جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔ اسی طرح نکاح کے معاملات میں بھی اہل کتاب کا مذہب کئی چیزوں میں شریعت اسلام کے مطابق ہے۔

ملاحظہ ہو۔ احبار ۔ ۱۸ ۔ ۶ تا ۔ ۹ جس میں ایک طویل فہرست محرمات کی دی گئی ہے اور جن میں بیشتر وہی ہیں جن کو قرآن نے حرام کیا ہے، یہاں تک کہ جمع بین الاختین ۔ یعنی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنے کی حرمت اور حالت حیض میں صحبت کا حرام ہونا بھی اس میں مصرح ہے۔ نیز بائبل میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بُت پرست اور مشرک اقوام سے نکاح جائز نہیں۔ موجودہ توراۃ کے الفاظ یہ ہیں۔

"تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا۔ نہ اُن کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا۔ اور نہ اپنے بیٹوں کے لئے اُن کی بیٹیاں لینا۔ کیونکہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے۔ تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں۔" (استثنا ۷ ۔ ۳ ۔ ۴)

خُلاصۂ کلام

یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبیح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال اور دوسرے کفار کے ذبیح اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کے اغلاط ہیں۔ اُن کا مذہب نہیں ہے۔ اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورۂ مائدہ

انعام اور مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد، یا نسخ یا تخصیص نہیں ہے۔ اور جن علماء و تابعین نے نصاریٰ عرب کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا اور آیات مائدہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے، اس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، یعنی اللہ تو عیسیٰ بن مریم ہی ہیں۔ یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اس سے مراد عیسیٰ بن مریم ہی لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہو گیا۔ اسی بناء پر حضرات تابعین نے ذبح اہل کتاب میں اس کی اجازت دیدی ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں اسی بنیاد کی وضاحت فرمائی ہے۔

(احکام ابن عربی ص۲۲۹، جلد۱)

مگر جمہور امت نے اس کو قبول نہیں کیا، جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر و تفسیر بحر محیط ابھی گذر چکا ہے۔ اور تفسیر مظہری میں قول مختلف نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:-

وَالصحيح المختار عندنا هو القول الأول. يعني ذبائح أهل الكتاب إن ترك التسمية عامدًا أو على غير اسم الله تعالى لا يؤكل إن علم ذلك يقينًا أو كان غالب حالهم ذلك وهو محمل النهي عن أكل ذبائح نصارى العرب ومحمل قول علي رض لا تأكلوا من ذبائح نصارى بني تغلب فإنهم لم يتمسكوا من النصرانية بشيء إلا بشرب الخمر فلعل عليًا علم من حالهم أنهم لا يسمون الله عند الذبح أو يذبحون على غير اسم الله وهذا حكم نصارى العجم إن كان عادتهم الذبح على غير اسم الله تعالى غالبًا لا يؤكل ذبيحتهم ولا اشتباه أن النصارى في هذا الزمان لا يذبحون بل يقتلون بالوقذ غالبًا فلا يحل طعامهم۔

(تفسیر مظہری ص۲۹ ،جلد۳)

اور صحیح اور مختار ہمارے نزدیک وہ پہلا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہو، یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے ہوں۔ وہ حلال نہیں، اگر یقینی طور پر اس کا علم ہو جائے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا یا غیر اللہ کا لیا ہے، یا اہل کتاب کی عام عادت یہ ہو جائے، جن بزرگوں نے عرب کے نصاریٰ کے ذبائح کو منع کیا ہے ان کے قول کا مقصد بھی یہی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضؓ نے جو یہ فرمایا کہ نصاریٰ بنی تغلب کے ذبائح کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ انھوں نے مذہب نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کچھ نہیں لیا۔ اس کا محل بھی یہی ہے حضرت علی رضؓ کو یہ ثابت ہو گیا ہو گا کہ بنی تغلب اپنے ذبائح پر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یا پھر غیر اللہ کا نام لیتے ہیں۔

پس یہی حکم عجمی نصاریٰ کا بھی ہے کہ اگر ان کی عادت یہی ہو جائے کہ عام طور پر غیر اللہ

کے نام پر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں اور اس میں شک نہیں کہ آجکل کے نصاریٰ تو ذبح ہی نہیں کرتے بلکہ عام طور پر چوٹ مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔

تفصیلی بحث یہاں اس لئے نقل کی گئی کہ اس مقام پر مصر کے مشہور عالم مفتی عبدہ سے ایک سخت لغزش ہوگئی ہے جس کے غلط اور کتاب و سنت اور جمہور امت کے خلاف ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ موصوف سے تفسیر المنار میں اس جگہ دوہری غلطی ہوئی ہے۔

اوّل تو اہل کتاب کے مفہوم میں دنیا کے کفار مجوس، ہندو، سکھ وغیرہ سب کو داخل کرکے اتنا عام کردیا کہ پورے قرآن میں جو کفار اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تقسیم و تفریق کی گئی ہے وہ بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

اور دوسری غلطی اس سے بڑی یہ ہوئی کہ طعام اہل کتاب کے مفہوم میں اہل کتاب کے ہر کھانے کو بلا کسی شرط کے حلال کردیا، خواہ وہ جانور کو ذبح کریں یا نہ کریں۔ اور اس پر اللہ کا نام لیں یا نہ لیں۔ ہر حال میں وہ جانور کو جس طرح کھاتے ہیں اس کو مسلمانوں کے لئے حلال کردیا۔

جس وقت ان کا یہ فتویٰ مصر میں شائع ہوا اُس وقت خود مصر کے اور دنیا کے تمام اکابر علماء نے اس کو غلط قرار دیا۔ اس پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے گئے۔ مفتی عبدہ کو عہدہ فتوے سے معزول کرنے کے مطالبات ہر طرف سے ہوئے۔ ادھر مفتی صاحب موصوف کے شاگردوں اور کچھ مغرب زدہ یورپین معاشرے کے دلدادہ لوگوں نے بحثیں چلائیں۔ کیونکہ یہ فتویٰ اُن کی راہ کی تمام مشکلات کا حل تھا کہ یورپ کے یہود و نصاریٰ بلکہ دہریوں کا ہر کھانا ان کے لئے حلال ہوگیا۔

لیکن اسلام کا یہ بھی معجزہ ہے کہ خلاف شریعت کام خواہ کتنے ہی بڑے عالم سے کیوں نہ ہو جائے۔ عام مسلمانوں کے قلوب اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو گمراہی قرار دیا۔ اور اس وقت یہ معاملہ دب کر رہ گیا۔ مگر زمانہ حال کے ملحدین جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کیا جائے کہ جس میں یورپ کی ہر لغویت کھپ جائے۔ اور نئے جوانوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرے انھوں نے پھر اس بحث کو اس انداز سے نکالا کہ گویا وہ خود کوئی اپنی تحقیق پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سب نقل مفتی عبدہ کے مذکورہ مقالہ کی ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس

بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے۔

اب الحمد للہ بقدر ضرورت اس کا بیان ہو گیا۔ اور اس کی پوری تفصیل میرے رسالہ "اسلامی ذبیحہ" میں ہے۔ وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا مسئلہ۔ اس جگہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس ارشاد میں ایک حکم تو مسلمانوں کے لئے بیان فرمایا کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے، یہ تو ظاہر ہے مگر اس کا دوسرا جزء یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے جائز ہے، اس کا کیا مقصد ہے۔ کیونکہ اہل کتاب جو قرآنی ارشادات کے قائل ہی نہیں ان کے لئے کیا حلال ہے کیا حرام۔ اس کے بیان سے کیا فائدہ۔

تفسیر بحر محیط وغیرہ میں ہے کہ اس سے متعلق فرمایا کہ دراصل اس جگہ بھی مسلمانوں ہی کو بتلانا منظور ہے کہ تمہارا ذبیحہ ان کے لئے جائز ہے۔ اس واسطے تم اپنے ذبیحہ میں سے کسی غیر مسلم اہل کتاب کو کھلا دو تو کوئی گناہ نہیں۔ یعنی ہدیہ قربانی میں سے کسی کتابی شخص کو دے سکتے ہو۔ اور اگر ہمارا ذبیحہ ان کے لئے حرام ہوتا تو ہمارے لئے جائز نہ ہوتا کہ ہم ان کو اس میں سے کھلائیں۔ اس لئے گو یہ حکم ابتداءً اہل کتاب کا ہے مگر درحقیقت اس کے مخاطب مسلمان ہی ہیں۔

اور تفسیر روح المعانی میں بحوالہ سدی اس جملہ کا ایک اور مقصد ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بعض حلال جانور یا ان کے کچھ حصے ان کے لئے بطور سزا حرام کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے وہ جانور یا جانور کا حصہ طعام اہل کتاب میں بظاہر داخل نہیں، لیکن آیت کے اس جملہ نے بتلا دیا کہ جو تمہارے لئے حلال ہے گو اہل کتاب اس کو حلال نہ جانتے ہوں، اگر اہل کتاب کے ذبح کردہ ملیں تو وہ بھی مسلمانوں کے لئے حلال ہی سمجھے جائیں گے۔ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تقریر پر بھی نتیجہ اس جملہ کا تعلق خود مسلمانوں کے ساتھ ہو گیا۔

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ اس جملہ کا فرق بیان کرنا ہے۔ ذبائح کے معاملہ میں اور نکاح کے معاملہ میں وہ فرق یہ ہے کہ ذبائح تو دونوں طرف سے حلال ہیں۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے۔ مگر عورتوں کے نکاح کا یہ معاملہ نہیں۔ اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمانوں کی عورتیں اہل کتاب کے لئے حلال نہیں۔

تیسرا مسئلہ۔ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی ہو جائے تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں۔ بلکہ وہ مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ باجماع امت حرام ہے۔

اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہو وہ بھی مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ یہ شخص قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہل کتاب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں کسی دوسرے مذہب و ملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی و نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں شمار ہو گا۔ اور اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے:۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ط یعنی تمہارے لئے مسلمان عفیف و پاکدامن عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عفیف و پاکدامن عورتوں سے بھی نکاح حلال ہے۔

اس میں دونوں جگہ محصنٰت کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عربی لغت و محاورہ کے اعتبار سے دو ہو سکتے ہیں۔ ایک آزاد جس کا مقابل کنیزیں ہیں۔ دوسرے عفیف و پاکدامن عورتیں ہیں لغت کے اعتبار سے اس جگہ بھی دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

اسی لئے علماء تفسیر میں سے مجاہد نے اس جگہ محصنٰت کی تفسیر حرائر سے کی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اہل کتاب کی آزاد عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کنیزیں حلال نہیں۔ (مظہری)

لیکن جمہور علماء صحابہ و تابعین کے نزدیک اس جگہ محصنٰت کے معنی عفیف و پاکدامن عورتوں کے ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جس طرح عفیف و پاکدامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح اہل کتاب کی عفیف و پاکدامن عورتوں سے بھی جائز ہے۔ (احکام القرآن جصاص و مظہری)

لیکن باتفاق جمہور اس جگہ عفیف و پاکدامن عورتوں کی قید کے یہ معنی نہیں کہ غیر عفیف عورتوں سے نکاح ہی حرام ہے۔ بلکہ اس قید کا فائدہ بہتر اور مناسب صورت کی ترغیب ہے کہ خواہ مسلمان عورت سے نکاح کرو یا اہل کتاب سے۔ بہرحال یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ پاکدامن عفیف عورت سے نکاح ہو۔ بدکار فاسق عورتوں سے نکاح کا رشتہ جوڑنا کسی شریف مسلمان کا کام نہیں۔ (مظہری وغیرہ)

اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے حلال ہے کہ کسی مسلمان

عورت سے نکاح کرے یا اہل کتاب کی عورت سے۔ البتہ دونوں صورتوں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ عفیف و پاکدامن عورت سے نکاح کرے۔ بدکار، ناقابل اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جوڑنا دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہیئے۔ اس آیت میں اہل کتاب کی قید سے بہ اجماعِ اُمت یہ ثابت ہو گیا کہ جو غیر مسلم اہل کتاب میں داخل نہیں، اُن کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

سابقہ بیان میں یہ واضح ہو چکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں۔ ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہل کتاب میں شمار ہو سکتی ہیں۔ باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہل کتاب میں داخل نہیں۔ آتش پرست۔ یا بُت پرست ہندو یا سکھ آریہ۔ بدھ وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعویدار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحی الٰہی ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو تورات و انجیل ہی ہیں جن کی ماننے والی دو قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ باقی زبور اور صحف ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعویدار ہے اور "وید" اور "گرنتھ" یا زردشت وغیرہ ... کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحی الٰہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے۔ اور محض یہ امکان کہ شاید زبور اور صحف ابراہیم ہی کی مسخ شدہ وہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا "وید" یا "گرنتھ" وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امکان محض اور احتمال محض ہے جو ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ اس سے باجماعِ اُمت ثابت ہو گیا کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے نکاح حرام ہے۔

آیت قرآن کریم، لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ اسی مضمون کے لئے آئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ اور اہل کتاب کے سوا دوسری قومیں سب مشرکات میں داخل ہیں۔

غرض قرآن مجید کی دو آیتیں اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک میں یہ ہے کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح حلال نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ دوسری یہ آیت سورہ مائدہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

اس لئے جمہور علماء صحابہ و تابعین نے دونوں آیتوں کا مدلول و مفہوم یہ قرار دیا کہ

کہ اصولی طور پر غیر مسلم عورت سے مسلمان کا نکاح نہ ہونا چاہیے۔ لیکن سورۂ مائدہ کی اس آیت نے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اس عموم سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے سوا کسی دوسری قوم کی عورت سے بغیر مسلمان ہوئے مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

باقی رہا مسئلہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتوں کا تو بعض صحابہ کرام کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہی مذہب ہے۔ ان سے جب کوئی پوچھتا تو وہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن کریم میں واضح ہے: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ یعنی مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا کونسا شرک ہوگا کہ وہ عیسیٰ بن مریم یا کسی دوسرے بندۂ خدا کو اپنا رب اور خدا قرار دے۔ (احکام القرآن - جصاص)

ایک مرتبہ میمون بن مہرانؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں آباد ہیں جہاں اہل کتاب زیادہ رہتے ہیں، تو کیا ہم ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور ان کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو جواب میں یہ دونوں آیتیں پڑھ کر سنا دیں۔ ایک وہ جس میں مشرکات کے نکاح کو حرام فرمایا ہے۔ دوسرے یہ آیت مائدہ جس میں اہل کتاب کی عورتوں کی حلّت بیان کی ہے۔

میمون بن مہران نے کہا یہ دونوں آیتیں تو میں بھی قرآن میں پڑھتا ہوں اور جانتا ہوں، میرا سوال تو یہ ہے کہ ان دونوں کے پیش نظر مجموعہ سے حکم شرعی کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پھر یہی دونوں آیتیں پڑھ کر سنا دیں، اور اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا جس کا مطلب علماء امت نے یہ قرار دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہونے پر بھی اطمینان نہیں تھا۔

اور جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ ازروئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے فی نفسہٖ نکاح حلال ہے لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے از روئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی ان کی بنا پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

جصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہؓ

نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے، تو پھر امیر المؤمنین فاروق اعظم رضؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانوں میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہوجائے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابو حنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظم رضؓ نے جب حضرت حذیفہ رضؓ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے:۔

اعزم علیك ان لا تضع کتابی حتی تخلی سبیلها فانی اخاف ان یقتدیك المسلمون فیختاروا النساء اهل الذمة لجمالهن وکفی بذلك فتنة لنساء المسلمین۔

(کتاب الآثار ص۱۵۶)

یعنی آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دیکر آزاد کردو، کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔

اس واقعہ کو نقل کرکے حضرت محمد بن حسن رہ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حذیفہ رضؓ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انھوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرلیا تو جب فاروق اعظم رضؓ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔ (مظہری)

فاروق اعظم رضؓ کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے، جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کرسکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں اُن میں بدکاری ہو تو اُن کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہوجائیں۔ یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑجائیں۔ مگر فاروقی نظر دور رس انہی مفاسد کو سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ اُن کا

اس کے متعلق کیا عمل ہو۔ اوّل تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے رجسٹروں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رُو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ نہ ان کا تورات و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر۔ وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لامذہب اور دہریئے ہیں۔ محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان گھرانے میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اسلام و مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جن کے عبرتنامے روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت ... کو تباہ کردیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اسکے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔

الغرض قرآن وسنت اور اسوۂ صحابہ کی رُو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آجکل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے کلی پرہیز کریں۔ آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کردی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو گھر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کرکے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، اُن کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو داشتہ کے طور پر رکھنا اور کھلے طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغۡسِلُواْ
اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو تو دھو لو

وُجُوهَكُمۡ وَأَيۡدِيَكُمۡ إِلَى ٱلۡمَرَافِقِ وَٱمۡسَحُواْ بِرُءُوسِكُمۡ
اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو

وَأَرۡجُلَكُمۡ إِلَى ٱلۡكَعۡبَيۡنِۚ وَإِن كُنتُمۡ جُنُبٗا فَٱطَّهَّرُواْۚ
اور پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو

وَإِن كُنتُم مَّرۡضَىٰٓ أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوۡ جَآءَ أَحَدٞ مِّنكُم
اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم میں آیا ہے جائے ضرور سے

مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٦﴾ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٧﴾

دلوں کی بات

ربطِ آیات پچھلی آیات میں کچھ احکام شرعیہ وہ ذکر کئے گئے جن کا تعلق انسان کی دنیوی زندگی اور کھانے پینے سے ہے، اس آیت میں چند احکام شرعیہ متعلق عبادات کے ذکر کئے گئے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو (یعنی نماز پڑھنے کا ارادہ کرو) اور تم کو اس وقت وضو نہ ہو، تو (وضو کرو یعنی) اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت (دھوؤ) اور اپنے سروں پر (بھیگا) ہاتھ پھیرو اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت (دھوؤ) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نماز سے پہلے) سارا بدن پاک کرلو اور اگر تم بیمار ہو اور پانی کا استعمال مضر ہو یا حالت سفر میں ہو اور پانی نہیں ملتا جیسا آگے آتا ہے، یا تو عذر کی حالت ہو یا نہ ہو، اگر مرض و سفر کا عذر بھی نہ ہو بلکہ ویسے ہی وضو یا غسل ٹوٹ جاوے اس طرح سے کہ مثلاً تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو

تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ

چھوڑ دو عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو

اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ

سے اور جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے واسطے بخشش اور ثواب

عَظِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ

ہے بڑا اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں

اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

دوزخ والے

خلاصۂ تفسیر

(از بیان القرآن)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے احکام کی پوری پابندی کرنے والے اور (شہادت کی نوبت آوے تو) انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو، اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم (ان کے معاملات میں) عدل نہ کرو (ضرور ان کے معاملہ میں) عدل کیا کرو (یعنی عدل کرنا) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (یعنی اس سے تقویٰ کے ساتھ موصوف کہلاتا ہے، اور تقویٰ اختیار کرنا تم پر فرض ہے، چنانچہ حکم ہوا ہے کہ) اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو (یہی حقیقت ہے تقویٰ کی پس عدل جو کہ اس فرض تقویٰ کا موقوف علیہ ہے نیز فرض ہوگا)، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے (پس مخالفین احکام کو سزا ہو جاوے تو بعید نہیں)، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور انھوں نے اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور ثواب عظیم ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھوٹا بتلایا ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت کا مضمون تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ

نساء میں بھی یہ ترتیب ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ارشاد
ہوا تھا اور یہاں كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں
میں الفاظ کے تقدم اور تاخر کی ایک لطیف وجہ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں ذکر کی ہے،
جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

انسان کو عدل و انصاف سے روکنے اور ظلم و جور میں مبتلا کرنے کے عادتاً دو سبب
ہوا کرتے ہیں، ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں، عزیزوں کی طرفداری، دوسرے کسی شخص
کی دشمنی و عداوت، سورۂ نساء کی آیت کا روئے سخن پہلے مضمون کی طرف ہے، اور سورۂ
مائدہ کی اس آیت کا روئے سخن دوسرے مضمون کی طرف۔

اسی لئے سورۂ نساء میں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ
الْاَقْرَبِيْنَ، یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو، چاہے وہ عدل و انصاف کا حکم خود تمہارے
نفس یا تمہارے والدین اور عزیزوں و دوستوں کے خلاف پڑے، اور سورۂ مائدہ کی
اس آیت میں جملہ مذکورہ کے بعد یہ ارشاد ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا
تَعْدِلُوْا، یعنی کسی قوم کی عداوت و دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف
کے خلاف کرنے لگو۔

اس لئے سورۂ نساء کی آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے نفس
اور والدین اور عزیزوں کی بھی پرواہ نہ کرو، اگر انصاف کا حکم ان کے خلاف ہے تو
خلاف ہی پر قائم رہو، اور سورۂ مائدہ کی آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے
معاملہ میں کسی دشمن کی دشمنی کی وجہ سے لغزش نہ ہونی چاہیے کہ اس کو نقصان پہنچانے
کے لئے خلافِ انصاف کام کرنے لگو۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ نساء کی آیت میں قسط یعنی انصاف کو مقدم کرکے ارشاد فرمایا،
كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ، اور سورۂ مائدہ کی آیت میں للہ کو مقدم کرکے
ارشاد فرمایا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ، اگرچہ انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے
یہ دونوں عنوان ایک ہی مقصد کو ادا کرتے ہیں، کیونکہ جو شخص انصاف پر کھڑا ہوگا،
وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوگا، اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ ضرور انصاف
ہی کرے گا، لیکن اپنے نفس اور دوستوں عزیزوں کی رعایت کے مقام میں یہ خیال گزر
سکتا ہے کہ ان تعلقات کی رعایت بھی تو اللہ ہی کے لئے ہے، اس لئے وہاں لفظ قسط
کو مقدم لا کر اس کی طرف ہدایت کردی کہ وہ رعایت اللہ کے لئے نہیں ہو سکتی جو عدل و انصاف

کے خلاف ہو۔ اور سورۂ مائدہ میں دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کا حکم دینا تھا تو وہاں لفظ اللہ کو مقدم لاکر نفسانی نفرت و عداوت میں مغلوب ہونے سے نکال دیا کہ تم لوگ اللہ کے لئے کھڑے ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے۔ ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل و انصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہئے اور نہ کسی دشمنی و عداوت سے۔ دوسری ہدایت ان دونوں آیتوں میں اس کی دی ہے کہ سچی شہادت ادا کرنے کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے، تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

قرآن کریم نے اس مضمون پر کئی آیتوں میں مختلف عنوانات سے زور دیا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے کہ لوگ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ برتیں۔ ایک آیت میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ حکم دیا

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۔

یعنی گواہی کو چھپاؤ نہیں اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ جس سے سچی گواہی دینا واجب اور اس کا چھپانا سخت گناہ ثابت ہوا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم نے اس پر بھی نظر رکھی ہے کہ لوگوں کو سچی گواہی دینے سے روکنے والی چیز درحقیقت یہ ہے کہ گواہ کو بار بار عدالتوں کی حاضری اور فضول قسم کی کڑی جرح سے سابقے پڑتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا نام کسی گواہی میں آگیا وہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے کاروبار سے گیا، اور مفت کی زحمت میں مبتلا ہوا۔

اس لئے قرآن کریم نے جہاں سچی گواہی دینے کو لازم و واجب قرار دیا، وہیں یہ بھی ارشاد فرما دیا۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۔ یعنی معاملہ کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

آج کل عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدمات کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موقع پر کے اور سچے گواہ شاذ و نادر کہیں ملتے ہیں۔ سمجھدار شریف آدمی جہاں کوئی ایسا واقعہ دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آجائے۔ پولیس ادھر ادھر کے گواہوں سے خانہ پری کرتی ہے۔ اور نتیجہ اس کا وہی ہو سکتا ہے جو رات دن مشاہدہ میں آرہا ہے کہ فیصد دس پانچ مقدمات میں بھی حق و انصاف پر فیصلہ نہیں ہو سکتا اور

عدالتیں بھی مجبور ہیں جیسی شہادتیں اُن کے پاس پہنچتی ہیں وہ انہی کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکال سکتی ہیں اور انہیں کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتی ہیں۔

مگر اس بنیادی غلطی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ اگر گواہوں کے ساتھ شریفانہ معاملہ کیا جائے اور ان کو بار بار پریشان نہ کیا جائے تو اچھے سے اچھے نیک اور سچے آدمی قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے باز نہ رہیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہ ہی بار بار بلا کر گواہ کو اتنا پریشان کر دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ جاتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا پھر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں۔ ہر تاریخ پر اس ناکردہ گناہ کو دکھ غمی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طولانی ضابطہ کارروائی نے جو انگریز اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے، ہماری ساری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے۔ قدیم سادہ طرز پر جو آج بھی حجاز اور بعض دوسرے ممالک میں رائج ہے نہ مقدمات کی اتنی کثرت ہو سکتی ہے ورنہ ان میں اتنا طول ہو سکتا ہے نہ گواہوں کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضابطۂ شہادت اور ضابطۂ کارروائی اگر قرآنی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کی برکات آج بھی آنکھوں سے مشاہدہ ہونے لگیں۔ قرآن نے ایک طرف واقعہ سے باخبر لوگوں پر سچی شہادت ادا کرنے کو لازم و واجب قرار دے دیا ہے۔ تو دوسری طرف لوگوں کو ایسی ہدایتیں دی ہیں کہ گواہوں کو بلاوجہ پریشان نہ کیا جائے۔ کم سے کم وقت میں ان کا بیان لیکر فارغ کر دیا جائے۔

امتحانات کے نمبر، سند و سارٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں۔

آخر میں ایک اور اہم بات بھی یہاں جاننا ضروری ہے، وہ یہ کہ لفظ شہادت اور گواہی کا جو مفہوم آج کل عرف میں مشہور ہو گیا ہے وہ تو صرف مقدمات و خصومات میں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینے کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹری سارٹیفکٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بھی ایک شہادت ہے۔ اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہو گیا۔

اسی طرح امتحانات میں طلباء کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان

بوجہ کہ یہ بے پروائی سے نمبروں میں کمی بیشی کر دی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے۔ اور حرام اور سخت گناہ ہے۔

کامیاب ہونے والے طلبہ کو سند یا سرٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سرٹیفکیٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اسمبلیوں و کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے نمائندوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ گواہی سچی اور صحیح ثابت ہو سکے، مگر ہمارے عوام ہیں کہ انہوں نے اس کو محض ہار جیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ناپائیدار دوستوں اور ذلیل وعدوں کے بھروسہ پر اسکو استعمال کیا جاتا ہے۔

اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نااہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر مستحق لعنت و عذاب بن رہے ہیں۔

نمائندوں کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کی از روئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو شفاعت یا سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ اس کا حکم قرآن کریم کے الفاظ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، ارشاد ہے:-

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا۔

یعنی جو شخص اچھی اور سچی سفارش کرے گا، تو جس کے حق میں سفارش کی ہے اس کے نیک عمل کا حصہ اس کو بھی ملے گا۔ اور جو شخص بری سفارش کرتا ہے، یعنی کسی نااہل اور برے شخص کو کامیاب بنانے کی سعی کرتا ہے، اس کو اس کے برے اعمال کا حصہ ملے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ امیدوار اپنی کارکردگی کے پنج سالہ دور میں غلط اور ناجائز

کام کرے گا اُن سب کا وبال ووٹ دینے والے کو بھی پہونچے گا۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس اُمیدوار کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بناتا ہے۔ لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہونچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں، کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خُلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسرے شفاعت اور تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت۔ تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بُری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

اس لئے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ جس کو ووٹ دے رہا ہے وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور دیانت دار ہے یا نہیں، محض غفلت و بے پروائی سے بلاوجہ اس گناہ عظیم کا مرتکب نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

اے ایمان والو یاد رکھو احسان اللہ کا اپنے اوپر

إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ

جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلاویں پھر روک دیئے تم سے

أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

اُن کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ ہی پر چاہئے بھروسہ

الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ

ایمان والوں کو اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ۖ وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي

اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار اور کہا اللہ نے میں تمہارے

ع ٢

مدد کرتے رہو گے اور (علاوہ زکوٰۃ کے اور مصارف خیر میں بھی صرف کرکے) اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ) قرض دیتے رہو گے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور ضرور تم کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے کو نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اس (عہد و پیمان لینے) کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بے شک راہ راست سے دور جا پڑا۔

معارف و مسائل

سورۂ مائدہ کی ساتویں آیت جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد و میثاق لینے اور ان کے ماننے اور تسلیم کرلینے کا ذکر فرمایا ہے۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ، یہ میثاق خدا و رسول کی اطاعت اور احکام شرعیہ کے اتباع کا میثاق ہے، جس کا اصطلاحی عنوان کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔ اور ہر کلمہ گو مسلمان اس میثاق کا پابند ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں میثاق کی بعض اہم دفعات یعنی خاص خاص احکام شرعیہ کا بیان فرمایا ہے۔ جس میں دوست دشمن سب کے لئے عدل و انصاف کے قیام کی اور اقتدار پانے کے بعد دشمنوں سے بجائے انتقام کے بجائے انصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ میثاق خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی لئے اس کو اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کیا گیا ہے۔

آیت مذکورہ کو بھی اسی جملہ اُذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے شروع کرکے یہ بتلانا منظور ہے کہ مسلمانوں نے جب اس عہد و میثاق کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا و آخرت میں قوت و بلندی اور درجات عالیہ عطا فرمائے اور دشمنوں کے ہر مقابلہ میں انکی امداد فرمائی، دشمنوں کا قابو ان پر نہ چلنے دیا۔

اس آیت میں خاص طور پر اس کا ذکر ہے کہ دشمنوں نے بار بار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مٹا دینے اور قتل و غارت کر دینے کے منصوبے بنائے، اور تیاریاں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو خائب و خاسر کر دیا۔ ارشاد ہے کہ "ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُن کے ہاتھ تم سے روک دیئے"۔

مجموعی حیثیت سے تو ایسے واقعات تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں کہ کفار کے منصوبے بفضل خداوندی سے خاک میں مل گئے۔ لیکن بعض خاص خاص اہم واقعات بھی ہیں جن کو حضرات مفسرین نے اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ مثلاً مسند عبدالرزاق میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

کسی جہاد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے صحابہ کرام مختلف حصوں میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے لگے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تن تنہا ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ اور اپنے ہتھیار ایک درخت پر لٹکا دیئے۔ دشمنوں میں سے ایک گاؤں والے نے موقع غنیمت جان کر جھپٹا اور آتے ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر قبضہ کر لیا۔ اور آپ پر وہ تلوار کھینچ کر بولا مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي اب بتلایئے کہ آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بے دھڑک فرمایا کہ "اللہ عزّ وجل" گاؤں والے نے پھر وہی کلمہ دہرایا۔ من یمنعک منی آپ نے پھر اسی بے فکری کے ساتھ فرمایا "اللہ عزّ وجل" دو تین مرتبہ اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ غیبی قدرت کے رعب نے اس کو مجبور کر کے تلوار کو میان میں داخل کر کے رکھدیا۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بلایا اور یہ واقعہ سنایا، یہ گاؤں والا ابھی تک آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ (ابن کثیر)

اسی طرح بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نے ایک مرتبہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں بلا کر قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ اللہ تعالٰے نے آپ کو اس کی اطلاع کردی اور ان کی ساری سازش خاک میں مل گئی (ابن کثیر) اور حضرت مجاہد، عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ کے لئے یہود بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں مشغول کیا اور دوسری طرف عمرو بن جحش کو اس کام پر مقرر کر دیا کہ دیوار کے پیچھے سے اوپر چڑھ کر پتھر کی ایک چٹان آپ کے اوپر ڈالدے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادہ پر مطلع فرمایا اور آپ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ (ابن کثیر)

ان واقعات میں کوئی تضاد نہیں، سب کے سب آیت مذکورہ کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں رسول کریم صلّے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی غیبی حفاظت کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔

اس میں یہ ارشاد فرمادیا کہ یہ انعام خداوندی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نصرت و امداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے۔ جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو صفتوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی ایسی ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت و حمایت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کو آیات سابقہ کے مجموعہ کے ساتھ لگایا جائے۔ جن میں بدترین دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کے احکام دیئے گئے ہیں تو پھر اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کی تعلیم بظاہر ایک سیاسی غلطی اور دشمنوں کو جرأت دلانے کے مرادف ہے، اس لئے اس جملہ میں مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا گیا۔ اگر تم تقویٰ شعار اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے رہو تو یہ رواداری اور حسن سلوک تمہارے لئے قطعاً مضر نہیں ہوگا، اور دشمنوں کو مخالفت کی جرأت کے بجائے تمہارے زیر اثر لانے اور اسلام سے قریب کرنے کا سبب بنے گا۔ نیز تقویٰ اور خوف خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کرسکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوف خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آجکل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے وہاں بھی آخر آیت میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا گیا تھا۔ اور یہاں پھر اس کا اعادہ کیا گیا، نیز اس پوری آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی فتح و نصرت صرف ظاہری ساز و سامان کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ ان کی اصل طاقت کا راز تقویٰ اور توکل میں مضمر ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں سے عہد و میثاق لینے اور ان کے ایفاء عہد پر دنیا و آخرت میں اس کے بہترین نتائج کا ذکر کرنے کے بعد معاملہ کا دوسرا رخ سامنے لانے کے لئے دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عہد و میثاق لینا صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اُن سے پہلے دوسری امتوں سے بھی اسی قسم کے میثاق لئے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے عہد و میثاق میں پورے نہ اترے۔ اس لئے ان پر طرح طرح کے عذاب مسلط کئے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایک عہد لیا تھا۔ اور ان سے عہد لینے کی یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ پوری قوم بنی اسرائیل جو بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی انھیں میں سے ہر خاندان سے

ایک سردار چنا گیا، اور ہر خاندان کی طرف سے ہر سردار نے ذمہ داری سنبھالی کہ میں اور میرا پورا خاندان اس میثاق خداوندی کی پابندی کرے گا۔ اس طرح ان بارہ سرداروں نے پوری قوم بنی اسرائیل کی ذمہ داری لے لی۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ خود بھی اس میثاق کی پابندی کریں اور اپنے خاندان سے بھی کرائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عزت و فضیلت کے معاملہ میں اسلام کا اصل اصول تو یہ ہے کہ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا ہے کہ اسلام میں عرب و عجم، کالے، گورے اور اونچی نیچی ذات پات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ سارے مسلمانوں کا بھائی ہو گیا۔ حسب نسب، رنگ، وطن، زبان کے امتیازات جو جاہلیت کے بت تھے ان سب کو اسلام نے توڑ ڈالا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انتظامی معاملات میں نظم قائم رکھنے کے لئے بھی خاندانی خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک خاندان کے لوگ اپنے خاندان کے جانے پہچانے آدمی پر بنسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں، اور یہ شخص ان کی پوری نفسیات سے واقف ہونے کی بنا پر ان کے جذبات و خیالات کی زیادہ رعایت کر سکتا ہے۔ اسی حکمت عملی پر مبنی تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں سے جب عہد لیا گیا تو ہر خاندان کے ایک ایک سردار کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

اور اسی انتظامی مصلحت اور مکمل اطمینان و سکون کی رعایت اس وقت بھی کی گئی، جبکہ قوم بنی اسرائیل پانی نہ ہونے کی وجہ سے سخت اضطراب میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بحکم خداوندی انھوں نے پانی کے لئے ایک پتھر پر مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے بارہ چشمے بارہ خاندانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جاری کر دئیے۔

سورۂ اعراف میں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:-

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا۔ اور فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط

(ہم نے بانٹ دیئے ان کے بارہ خاندان بارہ جماعتوں میں۔ پھر بہہ نکلے پتھر سے بارہ چشمے ہر ایک خاندان کے لئے جدا جدا)۔

اور یہ بارہ کا عدد بھی کچھ عجیب خصوصیت اور مقبولیت رکھتا ہے۔

جس وقت انصار مدینہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے لئے دعوت دینے حاضر ہوئے اور آپؐ نے ان سے بذریعہ بیعت معاہدہ لیا تو اس معاہدہ میں بھی انصار کے بارہ سرداروں نے ذمہ داری لے کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اُن میں تین سردار قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے تھے۔ (ابن کثیر)۔

اور صحیحین میں حضرت جابر بن سمرۃ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کا کام اور نظام اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک کہ بارہ خلیفہ ان کی قیادت کریں گے۔ امام ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ اس حدیث نے کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بارہ امام یکے بعد دیگرے مسلسل ہوں گے۔ بلکہ ان کے درمیان فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چار خلفاء صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہم مسلسل ہوئے اور درمیان کی کچھ مدت کے بعد بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ باجماع امت پانچویں خلیفہ برحق مانے گئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے معاہدہ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ خاندانوں کے بارہ سرداروں کو ذمہ دار ٹھہرایا، اور اُن سے ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ مَعَكُمْ یعنی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میثاق کی پابندی کی اور دوسروں سے پابندی کرانے کا عہد کیا تو میری امداد و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس میثاق کی چند اہم دفعات اور بنی اسرائیل کی عہدشکنی اور ان پر عذاب الٰہی کا ذکر ہے۔

میثاق کی دفعات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ اِنِّیْ مَعَكُمْ، جس میں دو باتیں بتلادی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم میثاق پر قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے، تمہارا کوئی عزم و ارادہ، اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں کی نیتوں اور رازوں سے بھی واقف ہے۔ میثاق کی خلاف ورزی کرکے تم کسی طرح بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے بعد میثاق کی دفعات میں سب سے پہلے اقامت صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور پھر ادائے زکوٰۃ کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ کے فرائض اسلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر بھی عائد تھے۔ اور دوسرے قرآنی اشارات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرائض صرف بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

بلکہ ہر پیغمبر اور ہر شریعت میں ہمیشہ عائد رہے ہیں۔ تیسرا نمبر میثاق میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان لائیں اور اُن کے مقصد رشد و ہدایت میں ان کی امداد کریں ـــــ

بنی اسرائیل میں چونکہ بہت سے رسول آنے والے تھے، اس سے ان کو خصوصیت سے اس کی تاکید فرمائی گئی۔ اور اگرچہ ایمانیات کا درجہ عملیات، نماز، زکوٰۃ سے رتبۃً مقدم ہے، مگر میثاق میں مقدم اس کو رکھا گیا جس پر بالفعل عمل کرنا تھا۔ آنے والے رسول تو بعد میں آئیں گے، اُن پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا وقوع بھی بعد میں ہونے والا تھا اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا گیا۔

چوتھا نمبر میثاق میں یہ ہے:۔ وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کو قرض دو اچھی طرح کا قرض۔ اچھی طرح کے قرض کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو، اور اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرے۔ ردی اور بیکار چیزیں دست کرنا نہ ہو۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض دینے سے اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ قرض کا بدلہ دینا عرف اور اخلاق دونوں میں واجب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ یقین کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں خرچ کریں کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔

اور زکوٰۃ فرض کا ذکر مستقل کرنے کے بعد اس جگہ قرض حسن کا ذکر یہ بتلا رہا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات و خیرات ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان صرف زکوٰۃ ادا کر کے ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا، زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اور مالی حقوق مسلمان کے ذمہ لازم ہیں۔ کسی جگہ مسجد نہیں تو تعمیر مسجد اور دینی تعلیم کے لئے حکومت متکفل نہیں ہے تو دینی تعلیم کا انتظام مسلمانوں ہی پر لازم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ **زکوٰۃ فرضِ عین اور یہ فرضِ کفایہ ہیں۔**

فرضِ کفایہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ قوم کے چند افراد یا کسی جماعت نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تو دوسرے مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں، اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ آج کل دینی تعلیم اور اس کے مدارس جس کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں ہیں اُن کو وہی لوگ جانتے ہیں، جنھوں نے اس کو دین کی اہم خدمت سمجھ کر قائم کیا ہوا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی حد تک مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے ذمہ فرض ہے، اور یہ جاننے کے باوجود بہت کم افراد ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور ادا کرنے والوں میں بھی بہت کم افراد ہیں جو پورا حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو خال خال پوری زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی ہیں تو وہ بالکل یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اب ہمارے ذمہ اور کچھ نہیں۔ ان کے سامنے کسی کی ضرورت آئے تو زکوٰۃ

معارف و مسائل

آیت میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی بدبختی سے ان واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور میثاق کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیا۔

بنی اسرائیل پر ان کی بدعملی اور سرکشی کی سزا میں دو طرح کے عذاب آئے، ایک ظاہری اور محسوس جیسے پتھر برسنا^عہ^، زمین کا تختہ الٹ دینا وغیرہ جس کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔

دوسری قسم عذاب کی معنوی اور روحانی ہے کہ سرکشی کی سزا میں ان کے دل و دماغ مسخ ہوگئے، ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی، وہ اپنے گناہوں کے وبال میں مزید گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

ارشاد ہے: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً، یعنی ہم نے ان کی بدعہدی اور میثاق کی خلاف ورزی کی سزا میں ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ اب ان میں کسی چیز کی گنجائش نہ رہی۔ اسی رحمت سے دوری اور دلوں کی سختی کو قرآن کریم نے سورۂ مطففین میں ران کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، یعنی حق کی آیات بینات اور کھلی ہوئی نشانیوں سے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ

انسان جب اول کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، جس کی برائی کو وہ اس وقت ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی صاف سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ لگ جائے وہ ہر وقت نظر کو تکلیف دیتا ہے، لیکن اگر اس نے متنبہ ہو کر توبہ کر لی اور آئندہ گناہ سے باز آگیا تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے، اور اگر اس نے پروا نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک نقطہ سیاہ کا اضافہ ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کا صفحۂ قلب ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہو جائے گا، اس وقت اس کے قلب کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کوئی برتن اوندھا رکھا ہو کہ اس میں کوئی چیز ڈالی جائے تو فوراً باہر آجاتی ہے، اسی لئے کوئی خیر اور نیکی کی بات اس کے دل میں نہیں جمتی، اس وقت اس کے دل کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ لا یعرف معروفاً ولا ینکر منکراً، یعنی اب نہ وہ کسی نیکی کو نیکی سمجھتا ہے نہ بری کو برائی

عہ پہلے ایڈیشنوں میں یہاں عبارت یوں تھی: "جیسے ان پر خون اور مینڈکوں وغیرہ کی بارش یا پتھراؤ الخ" بعض اہل علم نے توجہ دلائی کہ خون اور مینڈکوں کا عذاب بنی اسرائیل پر نہیں آیا تھا، اس لئے یہاں سے خون اور مینڈکوں کا ذکر حذف کر دیا گیا۔ حضرت مصنف کی طرف سے احقر کو ایسے تصرفات کی جرأت تھی ۱۲ احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۸-۷-۱۴۰۹ھ

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ

تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ

مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ

اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ

الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ

مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ

وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ

بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ

بَيْنَهُمَا ؕ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

خلاصۂ تفسیر

اے اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) تمہارے پاس ہمارے یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
آئے ہیں (جن کے کمال علمی کا تو یہ حال ہے کہ کتاب (کے مضامین) میں سے جن چیزوں کو تم چھپا لیتے ہو،
ان میں سے بہت سی باتوں کو (جن کے اظہار میں کوئی شرعی مصلحت تھی) تحصیل علوم نہ فرمانے کے
باوجود خاص وحی کے ذریعہ واقف ہو کر، تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں اور (کمال
علمی و اخلاقی کا یہ عالم ہے کہ جن چیزوں کو تم نے چھپایا تھا ان میں سے) بہت سے امور کو (جاننے
اور باخبر ہونے کے باوجود خود ہی ان کے ظاہر کرنے سے) درگذر فرماتے ہیں (جبکہ ان کے اظہار میں
دینی شرعی مصلحت نہ ہو صرف تمہاری رسوائی ہی ہوتی ہو۔ اور یہ کمال علمی دلیل نبوت ہے اور
کمال اخلاقی اس کا مؤید و مؤکد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے
معجزات کے علاوہ خود تمہارے مقابلہ پر آپ کا یہ بیان آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور
اسی رسول کے ذریعہ، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے۔ اور (وہ)
ایک کتاب واضح (ہے)، کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب
ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں (یعنی جنت میں جانے کے طریقے جو خاص عقائد و اعمال ہیں
تعلیم فرماتے ہیں کیونکہ درحقیقت مکمل سلامتی تو جنت ہی میں ہو سکتی ہے کہ نہ اس میں کوئی کمی ہوتی
ہے اور نہ زوال کا خطرہ) اور ان کو اپنی توفیق سے کفر و معصیت کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان
و طاعت کے) نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو ہمیشہ راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔ بلاشبہ
وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح ابن مریم ہے۔ آپ (ان سے یوں پوچھئے کہ
اگر ایسا ہے تو بتلاؤ) اگر اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم (جن کو تم اللہ کا عین سمجھتے ہو) اور ان کی والدہ
(حضرت مریم) کو اور جتنے زمین میں آباد ہیں ان سب کو (موت سے) ہلاک کرنا چاہیں تو (کیا)
کوئی شخص ایسا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے (یعنی اتنی بات تو تم بھی مانتے
ہو کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ کی قدرت میں ہے، تو جس ذات کا ہلاک کرنا دوسرے کے قبضہ میں ہو
وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے عقیدہ الوہیت مسیح کا باطل ہو گیا۔ اور (جو حقیقۃً خدا اور سب کا
معبود ہے یعنی) اللہ تعالیٰ (اس کی یہ شان ہے کہ اسی کے لئے خاص ہے حکومت آسمانوں
پر اور زمین پر اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں ان پر اور وہ جس چیز کو (جس طرح)
چاہیں پیدا کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اور یہود و نصاریٰ (دونوں فریق) دعویٰ

کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔ (مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد
ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری یہ ایک خصوصیت ہے کہ ہم گناہ بھی کریں تو اس پر
اتنی ناراضی نہیں ہوتی جتنی دوسروں پر ہوتی ہے جیسے باپ کو اپنے بیٹے کی نافرمانی پر اتنا
اثر نہیں ہوتا، جتنا کسی غیر آدمی کے ایسے ہی فعل پر ہوتا ہے۔ ان کے اس خیال باطل کے
ابطال کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان سے یوں پوچھئے کہ اچھا پھر تم کو
تمہارے گناہوں کے عوض آخرت میں عذاب کیوں دیں گے۔ جس کے تم بھی قائل ہو جیسے
کہ یہود کا قول ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ یعنی اگر ہمیں عذاب جہنم ہوا بھی تو چند
روز ہی ہوگا۔ اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا قول قرآن میں مذکور ہے۔ .... اِنَّهٗ
مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ۔ یعنی جس شخص نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک
ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتے ہیں۔ جو بجز اثبات دوام کے مثل اقرار تعذیب کی
کے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کے عذاب کا جب تمہیں خود بھی اقرار ہے تو یہ بتلاؤ کہ کیا کوئی باپ
اپنے بیٹے یا محبوب کو عذاب بھی دیا کرتا ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو خدا کی اولاد کہنا باطل ہے
یہاں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ بعض وقت باپ بھی اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت
کے لئے تادیباً سزا دیتا ہے تو سزا ہونا بیٹا ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ باپ کی سزا تادیب
کے لئے ہوتی ہے تاکہ وہ آئندہ ایسا کام نہ کرے۔ اور آخرت میں تادیب کا کوئی مقام نہیں
کیونکہ وہ دار العمل نہیں دار الجزاء ہے۔ وہاں آگے کوئی کام کرنے یا کسی کام سے روکنے کا
کوئی احتمال نہیں۔ جس کو تادیب کہا جائے، اس لئے وہاں جو سزا ہوگی وہ خالص سزا
و تعذیب ہی ہو سکتی ہے۔ جو اولاد یا محبوب ہونے کے قطعاً منافی ہے، اس لئے معلوم ہوا
کہ تمہاری کوئی خصوصیت اللہ کے یہاں نہیں) بلکہ تم بھی منجملہ دوسری مخلوقات کے ایک
معمولی آدمی ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے جس کو چاہیں گے سزا دیں گے اور
اللہ ہی کی ہے سب حکومت آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور جو کچھ ان کے درمیان
ان میں بھی اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ (اس کے سوا کوئی پناہ نہیں)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں نصاریٰ کے ایک ہی قول کی تردید کی گئی ہے جو ان کے ایک

فرقہ کا عقیدہ ہے یعنی یہ کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) عین اللہ تعالیٰ ہیں۔ مگر تردید جس دلیل سے کی گئی ہے وہ تمام فرقوں کے عقائد باطلہ پر حاوی ہے جو توحید کے خلاف ہیں خواہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ ہو، یا تین خداؤں میں سے ایک خدا ہونے کا عقیدہ فاسدہ ہو۔ اس سے سب کا رد اور ابطال ہوگیا۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کا ذکر فرمانے میں دو حکمتیں ہوسکتی ہیں اول تو یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام حق تعالیٰ کے سامنے بے بس ہیں کہ وہ نہ اپنے آپ کو اللہ سے بچا سکتے ہیں نہ اپنی ماں کو جن کی خدمت وحفاظت کو شریف بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس فرقہ کے خیال کی بھی تردید ہوگئی جو حضرت مریم کو تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے ہیں۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور مریم علیہما السلام کی موت کو بصورت فرض کے ذکر فرمایا ہے، حالانکہ نزول قرآن کے وقت حضرت مریم کی موت محض فرضی نہیں تھی بلکہ واقع ہوچکی تھی۔ اس کی وجہ یا تو تغلیب ہے، یعنی اصل میں موت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور فرض کے بیان کرنا تھا، ماں کا ذکر بھی اسی عنوان کے ضمن میں کردیا گیا، ورنہ ان کی موت واقع ہوچکی تھی۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت مریم پر ہم موت مسلط کرچکے ہیں حضرت مسیح اور دوسری سب مخلوق پر بھی اسی طرح مسلط کردینا ہمارے قبضہ میں ہے۔ اور یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ میں عیسائیوں کے اسی عقیدہ باطلہ کے منشا کو باطل کرنا ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا ماننے کا اصل منشاء ان کے یہاں یہ ہے کہ ان کی پیدائش ساری دنیا کے قاعدوں کے خلاف بغیر باپ کے صرف ماں سے ہوئی ہے۔ اگر وہ بھی انسان ہوتے تو قاعدہ کے مطابق ماں اور باپ دونوں کے ذریعہ پیدائش ہوتی۔

اس جملہ میں اس کا جواب دیدیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب طرح قدرت کاملہ حاصل ہے، کہ جو چاہے، جس طرح چاہے پیدا کردے۔ جیسا کہ آیت:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۔

میں اسی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تخلیق عام قانون قدرت سے الگ ہونا اُن کی خدائی کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

دیکھو حضرت آدم علیہ السلام کو تو حق تعالیٰ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمادیا تھا۔ ان کو سب قدرت ہے، وہی خالق و مالک اور لائق عبادت ہیں۔ دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں ہوسکتا۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ

اے کتاب والو آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا کھولتا ہے تم پر

عَلَىٰ فَتۡرَةٖ مِّنَ ٱلرُّسُلِ أَن تَقُولُواْ مَا جَآءَنَا مِنۢ

رسولوں کے انقطاع کے بعد کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ آیا کوئی

بَشِيرٖ وَلَا نَذِيرٖۖ فَقَدۡ جَآءَكُم بَشِيرٞ وَنَذِيرٞۗ

خوشی یا ڈر سنانے والا سو آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا

وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿١٩﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

اے اہل کتاب تمہارے پاس یہ ہمارے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپہونچے جو تم کو شریعت کی باتیں صاف صاف بتلاتے ہیں۔ ایسے وقت میں کہ رسولوں کے آنے کا سلسلہ مدت سے موقوف تھا (اور شرائع سابقہ مفقود و محرف ہو چکی تھیں اور انبیاء کا سلسلہ عرصہ دراز تک بند رہنے سے اُن گم شدہ شرائع کے دوبارہ دریافت ہونے کا سامان بھی نہ رہا تھا اس لئے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت شدید تھی تو ایسے وقت آپ کا تشریف لانا بڑی نعمت اور غنیمت سمجھنا چاہئے) تاکہ تم (قیامت میں) یوں نہ کہنے لگو کہ (دین کے معاملہ میں غلطی اور کوتاہی میں ہم اس لئے معذور ہیں کہ) ہمارے پاس کوئی رسول بشیر و نذیر (ایسا جس سے ہم کو دین کا صحیح علم اور عمل پر ابھارا ہوتا) نہیں آیا سو (اب اس عذر کی گنجائش نہیں رہی کیونکہ) تمہارے پاس بشیر و نذیر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آچکے ہیں (اب اپنا نفع و نقصان خود سمجھ لو) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں کہ جب چاہیں حکمت سے اپنے انبیاء بھیج دیں جب چاہیں حکمت سے ان کو روک دیں اس لئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جب مدت دراز سے انبیاء کا سلسلہ بند ہے تو اب کوئی رسول نہیں آسکتا کیونکہ یہ سلسلہ ایک مدت تک موقوف رکھنا حق تعالیٰ کی حکمت سے تھا، اس نے سلسلۂ نبوت بند اور ختم کر دینے کا کوئی اعلان اس وقت تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ خبر بھی دیدی تھی کہ آخر زمانے میں ایک خاص رسول خاص شان اور خاص صفات کے ساتھ آنے والے ہیں جن پر نبوت کا اختتام ہوگا۔ اس اعلان کے مطابق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ——

معارف و مسائل

عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ ۔ فترت کے لفظی معنی سُست ہونے، ساکن ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کر دینے کے آتے ہیں۔ اس آیت میں ائمہ تفسیر نے فترت کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ اور مراد اس سے کچھ عرصہ کے لئے سلسلۂ نبوت و انبیاء بند رہنا ہے جو حضرت عیسیٰ کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ ہے۔

زمانۂ فترت کی تحقیق حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے۔ اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں کبھی فترت نہیں ہوئی۔ صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصہ میں مبعوث ہوئے۔ اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچسو سال کا عرصہ ہے۔ اس میں سلسلۂ انبیاء بند رہا، اسی لئے اس زمانہ کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنا زمانہ انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع ایضاح)

حضرت موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کی مدت، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کی مدت میں اور بھی مختلف روایات ہیں جن میں اس سے کم و بیش مدتیں بیان ہوئی ہیں، مگر اصل مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امام بخاری رح نے حضرت سلمان فارسی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا۔ اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسٰی ۔ یعنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا، لَیْسَ بَیْنَنَا نَبِیٌّ یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

اور سورۂ یٰسٓ میں جو تین رسولوں کا ذکر ہے وہ درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد تھے۔ جن کو لغوی معنے کے اعتبار سے رسول کہا گیا ہے۔

اور خالد بن سنان عبسی کا بھی جن بعض نے اسی زمانہ فترت میں ہونا بیان کیا ہے اس کے متعلق تفسیر روح المعانی میں بحوالہ شہاب بیان کیا ہے کہ ان کا نبی ہونا تو صحیح ہے مگر زمانہ اُن کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے بعد میں نہیں۔

زمانۂ فترت کے احکام

آیت مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ اُن کے پاس نہ کوئی رسول اور نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ اُن کے نائبین پہونچے، اور نہ پچھلے انبیاء کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے علاوہ کسی غلط کاری اور گمراہی میں مبتلا ہو جاویں تو وہ معذور سمجھے جاویں گے۔ وہ مستحق عذاب نہیں ہوں گے۔ اسی لئے حضرات فقہاء کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جاویں گے یا نہیں۔

جمہور کا رجحان یہ ہے کہ امید یہی کی ہے کہ وہ بخشدیئے جاویں گے جبکہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط اُن کے پاس حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہو کر موجود تھا۔ بشرطیکہ وہ توحید کے مخالف اور شرک میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ مسئلہ توحید کسی نقل کا محتاج نہیں۔ وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔

ایک سوال اور جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جن اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں خطاب ہے، اُن کے لئے اگرچہ زمانہ فترت میں کوئی رسول نہیں پہونچے مگر اُن کے پاس تورات و انجیل تو موجود تھی۔ ان کے علماء بھی تھے تو پھر قیامت میں ان کے لئے یہ عذر کرنے کا کیا موقع تھا کہ ہمارے پاس کوئی ہدایت نہیں پہنچی تھی۔ جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک تورات و انجیل اصلی باقی نہیں رہی تھی۔ بتحریفات ہو کر ان میں جھوٹے قصے کہانیاں داخل ہو گئی تھیں۔ اس لئے اُن کا وجود عدم برابر تھا۔ اور اتفاق سے کہیں کوئی اصلی نسخہ کسی کے پاس گمنام جگہ میں محفوظ رہا بھی تو وہ اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ بعض علماء ابن تیمیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ تورات و انجیل کے اصلی نسخے کہیں کہیں موجود تھے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کمالات کی طرف اشارہ

اس آیت میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل فترت کے بعد آئے ہیں۔ اس میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تم لوگوں کو چاہیئے کہ آپ کے وجود کو غنیمت کبریٰ اور بڑی نعمت سمجھیں کیونکہ مدت دراز سے یہ سلسلہ بند

تھا، اب تمھارے لئے پھر کھولا گیا ہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کا تشریف لانا ایسے زمانے اور ایسے مقام میں ہوا ہے، جہاں علم اور دین کی کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ مخلوقِ خدا، خدا سے نا آشنا ہو کر بت پرستی میں لگ گئی تھی، ایسے زمانے میں کسی قوم کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے جاہلیت کے زمانے میں ایسی بگڑی ہوئی قوم آپ کے حوالہ ہوئی۔ آپ کے فیضِ صحبت اور نورِ نبوت سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ قوم ساری دنیا کے لئے علم و عمل، اخلاق، معاملات، معاشرت اور تمام زندگی کے شعبوں میں استاد اور قابلِ تقلید قرار دی گئی۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی پیغمبرانہ تعلیم کا تمام انبیاء سابقین میں افضل و اعلیٰ ہونا مشاہدہ سے ثابت ہو گیا۔ جو ڈاکٹر کسی مایوس العلاج مریض کا علاج کرے اور ایسی جگہ میں کرے جہاں طبی آلات اور دوائیں بھی مفقود ہوں۔ اور پھر وہ اس کے علاج میں اتنا کامیاب ہو کہ یہ بے دم مریض نہ صرف یہ کہ تندرست ہو گیا بلکہ ایک حاذق اور ماہر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ تو اس ڈاکٹر کے کمال میں کسی کو کیا شبہ رہ سکتا ہے۔

اسی طرح طویل زمانہ فترت کے بعد جبکہ ہر طرف کفر و معصیت کی ظلمت ہی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ آپ کی تعلیمات اور تربیت نے ایسا اُجالا کر دیا کہ اس کی نظیر کسی پچھلے دور میں نظر نہیں آتی تو سارے معجزات ایک طرف، تنہا یہ معجزہ انسان کو آپ پر ایمان لانے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
جب پیدا کئے تم میں نبی اور کر دیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں

يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ
دیا تھا کسی کو جہان میں اے قوم داخل ہو زمین

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى
پاک میں جو مقرر کر دی ہے اللہ نے تمھارے واسطے اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف

اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ
پھر جا پڑو گے نقصان میں بولے اے موسیٰ وہاں

فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا

ایک قوم ہے زبردست اور ہم ہرگز وہاں نہ جاویں گے یہاں تک کہ وہ نکل جاویں

مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلَانِ

مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ

الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ

فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٣﴾ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن

نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا ۖ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ

فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا

أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي ۖ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ

الْفَاسِقِينَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ ۛ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ

يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی ذکر کے قابل ہے جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم (یعنی بنی اسرائیل) سے (ان کو ترغیب جہاد کی تمہید میں یہ) فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے (جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام و حضرت یوسف علیہ السلام اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام وغیرہم

ہو وہ ان ایک کے بعد حسب وعدہ مانگتے تھے ارشاد ہوا اچھا، تو ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ ملک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا اور نہ ہی جانا بھی نصیب نہ ہوگا راستہ ہی نہ ملے گا، یوں ہی چالیس برس تک زمین میں سرمارتے پھریں گے (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فیصلہ سنا جس کا گمان نہ تھا خیال یہ تھا کہ کوئی معمولی تنبیہ ہو جاوے گی تو طبعاً مغموم ہونے لگے۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ جب ان سرکشوں کے لئے ہم نے یہ تجویز کیا تو یہی مناسب ہے، سو آپ اس بے حکم قوم (کی اس حالتِ زار) پر (ذرا) غم نہ کیجئے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں اس میثاق کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کے بارے میں بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ان کی عام عہد شکنی، اور میثاق کی خلاف ورزی اور اس پر سزاؤں کا بیان تھا۔ ان آیات مذکورہ میں ان کی عہد شکنی کا ایک خاص واقعہ مذکور ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر غرق دریا ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات پاکر حکومت مصر کے مالک بن گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مزید انعام اور ان کے آبائی وطن ملک شام کو بھی ان کے قبضہ میں دینے کے لئے بذریعہ موسیٰ علیہ السلام ان کو یہ حکم دیا کہ وہ جہاد کی نیت سے ارضِ مقدسہ یعنی ملک شام میں داخل ہوں۔ اور ساتھ ہی ان کو یہ خوشخبری بھی سنادی کہ اس جہاد میں فتح ان کی ہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس زمین کو ان کے حصہ میں لکھ دیا ہے وہ ضرور ان کو مل کر رہے گی۔ مگر بنی اسرائیل ... اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعامات، غرق فرعون اور فتح مصر وغیرہ کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلینے کے باوجود یہاں بھی عہد میثاق پر پورے نہ اترے۔ اور جہاد سے انکار کر کے اس حکم الٰہی کے خلاف ضد کر کے بیٹھ گئے۔ جس کی سزا ان کو قدرت کی طرف سے اس طرح ملی کہ چالیس سال تک ایک محدود علاقہ میں محصور و مقید ہو کر رہ گئے کہ بظاہر نہ ان کے گرد کوئی حصار تھا، نہ ان کے ہاتھ پاؤں کسی قید میں جکڑے ہوئے تھے۔ بلکہ کھلے میدان میں تھے۔ اور اپنے وطن مصر کی طرف واپس چلے جانے کے لئے ہر روز صبح سے شام تک سفر کرتے تھے۔ مگر شام کو جہاں سے صبح چلے تھے وہیں نظر آتے تھے۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی

اُمَّةً وَّسَطًا۔ اس پر شاہد ہے اور حدیث نبوی کی بے شمار روایات اس کی تائید میں ہیں۔ جواب یہ کہ اس آیت میں دنیا کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کے موسوی عہد میں موجود تھے، کہ اس وقت پورے عالم میں کسی کو وہ نعمتیں نہیں دی گئی تھیں جو بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آئندہ زمانہ میں کسی امت کو ان سے بھی زیادہ نعمتیں مل جائیں یہ اس کے منافی نہیں۔

اس پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو قول نقل فرمایا گیا ہے یہ تمہید تھی اس حکم کے بیان کرنے کی جو دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی اے میری قوم تم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ **جو اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ رکھی ہے۔**

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے اقوال بظاہر متعارض ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ بیت المقدس مراد ہے۔ بعض نے شہر قدس اور ایلیا کو ارض مقدسہ کا مصداق بتلایا ہے۔ بعض نے شہر اریحا کو جو دریائے اردن اور بیت المقدس کے درمیان دنیا کا قدیم ترین شہر تھا اور آج تک موجود ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی عظمت و وسعت **کے عجیب و غریب حالات نقل کئے جاتے ہیں۔**

بعض روایات میں ہے کہ اس شہر کے ایک ہزار حصے اور ہر حصہ میں ایک ایک ہزار باغ تھے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ارض مقدسہ سے مراد دمشق، فلسطین اور بعض کے نزدیک اردن ہے۔ اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ کعب احبار نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی کتاب یعنی تورات میں دیکھا ہے کہ ملک شام پوری زمین میں اللہ کا خاص خزانہ ہے اور اس میں اللہ کے مخصوص مقبول بندے ہیں۔ اس زمین کو مقدس اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی نظر پہونچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔ یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔ اور صاف بات یہ ہے کہ ان اقوال میں تعارض کچھ نہیں۔ پورا ملک شام آخری روایات کے مطابق ارض مقدس ہے۔ بیان کرنے میں بعض حضرات نے ملک شام **کے کسی حصہ کو بیان کر دیا کسی نے پورے کو۔**

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى۔ اس سے پہلے آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بذریعہ موسیٰ علیہ السلام

قوم عمالقہ سے جہاد کرکے ملک شام فتح کرنے کا حکم دیا تھا، اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی دیدی تھی کہ ملک
شام کی زمین اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے لکھ دی ہے، اس لئے ان کی فتح یقینی ہے۔

مگر آیت مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ اس کے باوجود بنی اسرائیل نے اپنی معروف
طبیعت اور کج طبعی کی وجہ سے اس حکم کی تعمیل نہ کی، بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ
اس ملک پر تو بڑے زبردست قوم والوں کا قبضہ ہے، ہم تو اس زمین میں اس وقت تک
داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں قابض ہیں، ہاں وہ کہیں اور چلے جاویں تو بیشک
ہم وہاں جاسکتے ہیں۔

واقعہ اس کا جو امام تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ وغیرہ
سے منقول ہے یہ ہے کہ اس وقت ملک شام اور بیت المقدس پر قوم عمالقہ کا قبضہ تھا جو
قوم عاد کی ایک شاخ اور بڑے ڈیل ڈول اور ہیبت ناک قد و قامت کے لوگ تھے، جن سے
جہاد کرکے بیت المقدس فتح کرنے کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ملا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر
ملک شام کی طرف روانہ ہوئے، جہاں بیت المقدس پڑتا تھا، جب نہر اُردن سے پار ہو کر دنیا کے
قدیم ترین شہر اریحا پر پہنچے، تو وہاں قیام فرمایا، اور بنی اسرائیل کے انتظام کیلئے بارہ سرداروں کا
انتخاب کیا جن کا قرآن کریم کی پچھلی آیات میں بیان ہوچکا ہے۔ ان سرداروں کو آگے بھیجا تاکہ
وہ ان لوگوں کے حالات اور میدان جنگ کی کیفیات معلوم کریں جو بیت المقدس پر
قابض ہیں اور جن سے جہاد کرنے کا حکم ملا ہے۔ یہ حضرات بیت المقدس پہنچے تو شہر سے
باہر ہی قوم عمالقہ کا کوئی آدمی مل گیا، اور وہ اکیلا ان سب کو گرفتار کرکے لے گیا، اور اپنے
بادشاہ کے سامنے پیش کیا، کہ یہ لوگ ہم سے جنگ کرنے کے قصد سے آئے ہیں۔ شاہی دربار میں
مشورہ ہوا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے یا کوئی دوسری سزا دی جائے، بالآخر رائے اس پر
ٹھہری کہ ان کو آزاد کر دیں تاکہ یہ اپنی قوم میں جاکر عمالقہ کی قوت و شوکت کے ایسے عینی
گواہ ثابت ہوں کہ کبھی ان کی طرف رُخ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

اس موقع پر اکثر کتب تفسیر میں اسرائیلی روایات کی لمبی چوڑی کہانیاں درج ہیں
جن میں ایک شخص کا نام عوج بن عنق بتلایا ہے، اور اس کی بے پناہ قد و قامت
اور قوت و طاقت کو ایسی مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کسی سمجھدار آدمی کو اس کا
نقل کرنا بھی بھاری ہے۔

امام تفسیر ابن کثیر نے فرمایا کہ عوج بن عنق کے جو قصے ان اسرائیلی روایات میں

مذکور ہیں نہ عقل ان کو قبول کر سکتی ہے اور نہ شرع میں ان کا کوئی جواز ہے۔ بلکہ یہ سب کذب و افترا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قوم عمالقہ کے لوگ چونکہ قوم عاد کے بقایا ہیں جن کے ہیبتناک قد و قامت کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے۔ اس قوم کا ڈیل ڈول اور قوت و طاقت ضرب المثل تھی۔ ان میں کا ایک آدمی قوم بنی اسرائیل کے بارہ آدمیوں کے گرفتار کر کے لے جانے پر قادر ہو گیا۔

بہرحال بنی اسرائیل کے بارہ سردار عمالقہ کی قید سے رہا ہو کر اپنی قوم کے پاس مقام اریحا پر پہونچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عجیب و غریب قوم اور اس کی ناقابلِ قیاس قوت و شوکت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر تو ان سب باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فتح و کامیابی کی بشارت سُنادی تھی۔ بقول اکبر ؎

مجھ کو بے دل کردے ایسا کون ہے
یاد مجھ کو اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی قوت و شوکت کا حال سن کر اپنی جگہ کوہ استقامت بنے ہوئے اقدام جہاد کی فکر میں لگے رہے۔ مگر خطرہ یہ ہو گیا کہ بنی اسرائیل کو اگر حریف مقابل کی اس بے پناہ طاقت کا علم ہو گیا تو یہ لوگ پھسل جائیں گے۔ اس لئے ان بارہ سرداروں کو ہدایت فرمائی کہ قوم عمالقہ کے یہ حالات بنی اسرائیل کو ہرگز نہ بتائیں، بلکہ راز رکھیں۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دوستوں سے خفیہ طور پر اس کا تذکرہ کر دیا۔ صرف دو آدمی جن میں سے ایک کا نام یوشع بن نون اور دوسرے کا کالب بن یوقنا تھا۔ انھوں نے موسوی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

اور ظاہر ہے کہ بارہ میں سے جب دس نے راز فاش کر دیا تو اس کا پھیل جانا قدرتی امر تھا۔ بنی اسرائیل میں جب ان حالات کی خبریں شائع ہونے لگیں تو لگے رونے پیٹنے اور کہنے لگے کہ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ قوم فرعون کی طرح ہم بھی غرق دریا ہو جاتے۔ وہاں سے بچا لا کر ہمیں یہاں مروایا جا رہا ہے۔ انھیں حالات میں بنی اسرائیل نے یہ الفاظ کہے:۔ يٰمُوۡسٰۤى اِنَّ فِيۡهَا قَوۡمًا جَبَّارِيۡنَ وَاِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَهَا حَتّٰى يَخۡرُجُوۡا مِنۡهَا۔ یعنی اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑی زبردست قوم آباد ہے جن کا مقابلہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اس سے جب تک وہ لوگ آباد ہیں موجود ہیں ہم وہاں جانے کا نام نہ لیں گے۔ اگلی آیت میں ہے کہ دو

شخص جو ڈرنے والے تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا تھا انھوں نے بنی اسرائیل کی یہ گفتگو سن کر ان کو نصیحت کی اور کہا کہ تم پہلے ہی کیوں ڈرے مرتے ہو۔ ذرا قدم اٹھا کر شہر بیت المقدس کے دروازے تک تو چلو۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہارا اتنا ہی عمل تمہاری فتح کا سبب بن جائے گا۔ اور دروازۂ بیت المقدس میں داخل ہوتے ہی تم غالب ہو جاؤ گے۔ اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ یہ دو شخص جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک وہ بھی بارہ میں سے دو سردار ہیں جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر مخالف کا پورا حال بنی اسرائیل کو نہ بتایا تھا، یعنی یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا۔

قرآن کریم نے اس جگہ ان دونوں بزرگوں کی دو صفتیں خاص طور پر ذکر فرمائی ہیں۔ ایک الَّذِينَ يَخَافُونَ۔ یعنی یہ دو شخص جو ڈرتے ہیں۔ مگر یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس سے ڈرتے ہیں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ڈرنے کے لائق سارے عالم میں صرف ایک ہی ذات ہے یعنی اللہ جل شانہ کیونکہ ساری کائنات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کی مشیت و اذن کے بغیر کوئی نہ کسی کو ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ادنیٰ نقصان اور جب ڈرنے کے لائق ایک ہی ذات ہے اور وہ متعین ہے تو پھر اس کے تعین کی ضرورت نہ رہی۔

دوسری صفت ان بزرگوں کی قرآن کریم نے یہ بتلائی کہ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص میں جو بھی کوئی خوبی اور بھلائی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا انعام مخصوص ہے۔ ورنہ ان بارہ سرداروں میں قوائے ظاہرہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان اور قوائے ظاہرہ و باطنہ اور عقل و ہوش اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت و معیت یہ ساری ہی چیزیں سبھی کو حاصل تھیں۔ اس کے باوجود اور سب پھسل گئے اور یہی دو اپنی جگہ جمے رہے تو معلوم ہوا کہ اصل ہدایت انسان کے قوائے ظاہرہ و باطنہ اس کی سعی و عمل کے تابع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ البتہ اس انعام کے لئے سعی و عمل شرط ضرور ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عقل و ہوش اور دانائی و ہوشیاری عطا فرمائی ہو وہ اپنی ان نعمتوں پر ناز نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے رشد و ہدایت طلب کرے عارف رومی نے خوب فرمایا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنی برادری کو یہ نصیحت فرمائی کہ عمالقہ کی ظاہری قوت و شوکت سے نہ گھبرائیں۔ اللہ پر توکل کر کے بیت المقدس کے دروازہ تک چلے چلیں تو فتح اور غلبہ ان کا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ فیصلہ کہ دروازہ تک پہنچنے کے بعد ان کو غلبہ ضرور حاصل ہو جائے گا اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عمالقہ کے جائزہ لینے کی بنا پر ہو کہ وہ لوگ بڑے ڈیل ڈول اور طاقت و قوت کے باوجود دل کے کچے ہیں۔ جب حملہ کی خبر پائیں گے تو ٹھہر نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرمان الٰہی جو بطور بشارت فتح موسیٰ علیہ السلام سے سن چکے تھے۔ اس پر یقین کامل ہونے کی وجہ سے یہ فرمایا ہو۔

مگر بنی اسرائیل نے جب اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی بات نہ سنی تو ان دونوں بزرگوں کی کیا سنتے۔ پھر وہی جواب اور زیادہ بھونڈے انداز سے دیا کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں ہی جا کر ان سے مقابلہ کریں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ اگر استہزاء کے طور پر ہوتا تو صریح کفر تھا۔ اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے ساتھ رہنا۔ ان کے لئے میدان تیہ میں دعائیں کرنا۔ جس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ اس کا امکان نہ تھا۔

اس لئے ائمہ تفسیر نے اس کلمہ کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ آپ جائیے اور ان سے مقابلہ کیجئے۔ آپ کا رب آپ کی مدد کرے گا۔ ہم تو مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ کفر کی حد سے نکل گیا۔ مگر یہ جواب نہایت بھونڈا اور دل آزار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا۔

غزوۂ بدر میں جب نہتے اور بھوکے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک ہزار مسلح نوجوانوں کا لشکر آکھڑا ہوا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر اپنے رب سے دعائیں فرمانے لگے۔ تو حضرت مقداد بن اسود صحابی آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ہے ہم ہرگز وہ بات نہ کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ بلکہ ہم آپ کے داہنے اور بائیں سے اور سامنے سے اور پیچھے سے مدافعت کریں گے۔ آپ بے فکر ہو کر مقابلہ کی طیاری فرمائیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بے حد مسرور ہوئے۔ اور صحابہ کرام میں بھی جوش جہاد کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مقداد

بن اسود کے اس کارنامہ پر مجھے بڑا رشک ہے کاش یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایسے نازک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب دے کر پچھلے سب عہد و میثاق توڑ ڈالے۔

قوم کی انتہائی بے وفائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عزم و استقلال

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ ۔ قوم بنی اسرائیل کے سابقہ حالات و واقعات اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملات کا بار بار دیکھنے والا اگر سرسری طور پر بھی اس کو سامنے رکھے کہ یہ قوم بنی اسرائیل صدیوں سے فرعون کی غلامی میں طرح طرح کی ذلتیں اور عذاب برداشت کر رہی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی برکت سے ان کو اللہ نے اس ذلیل سے کہاں سے کہاں پہنچایا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے کیسے کیسے مظاہر آئے۔ فرعون اور قوم فرعون کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ہاتھوں اپنے قوم کے ہوتے دریا میں شکست فاش ہوئی۔ جن ساحروں پر ان کا بھروسہ تھا۔ وہی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا دم بھرنے لگے۔ پھر اس خدائی کا دعویٰ کرنے والا فرعون اور شاہی محلات میں بسنے والے آل فرعون سے خدائے عز و جل کی قدرت قاہرہ نے کس طرح تمام محلات و مکانات اور ان کے ساز و سامان کو بیک وقت خالی کرالیا۔ اور کس طرح بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے ان کو غرق دریا کر دیا اور کس طرح معجزانہ طور پر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔ اور کس طرح وہ دولت جس پر فرعون یہ کہہ کر فخر کیا کرتا تھا۔ اَلَيْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۔ اللہ تعالیٰ نے پورا ملک اور اس کی پوری دولت بغیر کسی قتل و قتال کے بنی اسرائیل کو عطا فرما دی۔

ان تمام واقعات میں اللہ جل شانہ کی قدرت قاہرہ کے مظاہر اس قوم کے سامنے آئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قوم کو ان غفلت و جہالت سے کیا، فرعون کی غلامی سے .... نجات دلانے میں کیا کیا ذلت و مصائب برداشت کیں، ان سب چیزوں کے بعد جب اسی قوم کو خدائی امداد و انعامات کے وعدوں کے ساتھ ملک شام پر جہاد کرنے کا حکم ملا تو ان لوگوں اپنی اس دناءت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھے کہ ان حالات اور اس کے بعد قوم کی ان حرکات کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ مگر یہاں تو اللہ تعالیٰ کے اولو العزم رسول ہیں، کہ کوہ استقامت بنے ہوئے اپنی دھن میں لگے ہیں۔

قوم کی مسلسل عہد شکنی اور بیہودہ نافرمانی سے عاجز آکر اپنے رب کے سامنے صرف اتنا عرض کرتے ہیں۔ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ۔ یعنی مجھے تو اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔ قوم عمالقہ پر جہاد کی مہم کو کس طرح سر کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے قوم بنی اسرائیل میں سے کم از کم دو سردار یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا جنہوں نے پوری طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا ثبوت دیا تھا اور قوم کو سمجھانے اور صحیح راستہ پر لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسلسل کوشش کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا بھی ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف اپنا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا۔ اس کا سبب وہی قوم بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی تھی کہ صرف حضرت ہارون علیہ السلام بوجہ نبی و پیغمبر ہونے کے معصوم تھے۔ اور ان کا طریق حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ باقی یہ دونوں سردار معصوم نبی نہ تھے۔ اس انتہائی غم و غصہ کے عالم میں صرف اس کا ذکر کیا جس کا حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ اس اظہار کے ساتھ کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی **کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔**

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ یعنی ہم دونوں اور ہماری قوم کے درمیان آپ ہی فیصلہ فرما دیجئے۔ اس دعا کا حاصل حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ تھا کہ یہ لوگ جس سزا کے مستحق ہیں ان کو وہ سزا دی جائے اور ہم دونوں جس صورت حال کے مستحق ہیں ہم کو وہ عطا فرمایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ۔ یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام قرار دیدی گئی۔ اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جا سکیں گے۔ اور پھر یہی نہیں کہ ملک شام نہ جا سکیں گے، بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جا سکیں گے بلکہ اس میدان ہی میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدا تعالیٰ عز و جل کی سزا کے لئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے۔ بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و **مکان اس کے لئے جیل بن جاتے ہیں** ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ٭ با من و تو مردہ با حق زندہ اند

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان تھا جس کی پیمائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوّے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہو جاتا ہے، اور بعض روایات کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل کے بیان کے موافق چھ لاکھ نفوس تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کر دیا کہ چالیس سال مسلسل اس تنگ دودو میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں، یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پر پہونچ جائیں، مگر ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پہونچ گئے ہیں جہاں سے صبح چلے تھے۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ کسی قوم کو جو سزا دیتے ہیں وہ ان کے اعمال بد کی مناسبت سے ہوتی ہے، اس نافرمان قوم نے چونکہ یہ کلمہ بولا تھا کہ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ یعنی ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انکو اسی سزا میں چالیس سال تک کے لئے وہیں قید کر دیا، تاریخی روایات اس میں مختلف ہیں کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی موجودہ نسل جس نے نافرمانی کی تھی سبھی فنا ہو گئے، اور ان کی اگلی نسل باقی رہ گئی، جو اس چالیس سالہ قید سے نجات پانے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئی، یا ان میں سے بھی کچھ لوگ باقی تھے، بہرحال قرآن کریم نے ایک تو یہ وعدہ کیا تھا کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی ملک شام بنی اسرائیل کے حصہ میں لکھ دیا ہے، وہ وعدہ پورا ہونا ضرور تھا، کہ قوم بنی اسرائیل اس ملک پر قابض و مسلط ہو، مگر بنی اسرائیل کے موجودہ افراد نے نافرمانی کر کے اس انعام خداوندی سے اعراض کیا تو ان کو یہ سزا مل گئی کہ مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً "یعنی چالیس سال تک وہ ارض مقدسہ فتح کرنے سے محروم کر دیئے گئے، پھر اُن کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے ان کے ہاتھوں یہ ملک فتح ہوا، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔

اس وادیٔ تیہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے مگر یہ وادی اُن کے لئے قید اور سزا تھی، اور ان دونوں حضرات کے لئے نعمائے الٰہیہ کا مظہر۔ یہی وجہ ہے کہ چالیس سالہ دَور جو بنی اسرائیل پر معتوب ہونے کا گذرا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، کھلے میدان کی دھوپ سے عاجز آئے تو موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بادلوں کی چھتری لگا دی، جس طرف یہ لوگ چلتے تھے بادل ان کے ساتھ سایہ فگن

ہو کر چلتے تھے، پیاس اور پانی کی قلت کی شکایت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ایک ایسا پتھر عطا فرما دیا کہ وہ ہر جگہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، اور جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی، تو موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا اُس پر مارتے تھے تو بارہ چشمے اس میں سے جاری ہو جاتے تھے، بھوک کی تکلیف پیش آئی تو آسمانی غذا من وسلویٰ اُن پر نازل کر دی گئی، رات کو اندھیری کی شکایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے روشنی کا ایک مینار ان کے لئے کھڑا کر دیا جس کی روشنی میں یہ سب کام کاج کرتے تھے۔

غرض اس میدان تیہ میں صرف معتوب لوگ ہی نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دو محبوب پیغمبر اور ان کے ساتھ دو مقبول بزرگ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا بھی تھے، ان کے طفیل میں اس قید و سزا کے زمانے میں بھی یہ انعامات اُن پر ہوتے رہے، اور اللہ تعالیٰ رحیم الرحمار ہیں، ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ان افراد نے بھی ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کرلی ہو اس کے بدلہ میں یہ نعمت ان کو مل رہے ہوں۔

صحیح روایات کے مطابق اسی چالیس سالہ دور میں اوّل حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی، اور اس کے ایک سال یا چھ مہینہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام اُن کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی ناقابلِ قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔

آخر آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ، یعنی اس نافرمان قوم پر آپ ترس نہ کھائیں، یہ اس بنا پر کہ انبیاء علیہم السلام اپنی طبیعت اور فطرت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی امت کی تکلیف و پریشانی کو برداشت نہیں کر سکتے، اگر ان کو سزا ملے تو یہ بھی اس سے مغموم و متأثر ہو کرتے ہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی کہ آپ ان کی سزا سے دل گیر نہ ہوں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا

اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نیاز کی دونوں نے پھر

فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ

نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی کہا

وقف لازم

لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ

میں تجھ کو مار ڈالوں گا وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے ۔ اگر تو

بَسَطْتَّ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِیَ اِلَيْكَ

ہاتھ چلاوے گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر

لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِيْدُ

مارنے کو میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا ۔ میں چاہتا ہوں کہ

اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ

تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور

ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ

یہی ہے سزا ظالموں کی پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے

فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ

پھر اس کو مار ڈالا سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں، پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا

فِی الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤی

زمین کو تاکہ اس کو دکھلائے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی بولا اے افسوس

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ

مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہوں برابر اس کوے کی کہ میں چھپاؤں لاش اپنے

اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ

بھائی کی پھر لگا پچھتانے ، اسی سبب سے ،

كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ

لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے

اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ

یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے

اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ

زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو اور لا چکے ہیں ان کے پاس

رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ
رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں
لَمُسْرِفُوْنَ ﴿٣٢﴾
دست درازی کرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان اہل کتاب کو (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا (یعنی ہابیل وقابیل کا) قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنایئے (تاکہ ان کو انتساب بالصلحین کا گھمنڈ جاتا ہے جس کا نحن ابناء اللہ میں اظہار ہو رہا ہے، اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ دونوں نے (اللہ تعالیٰ کے نام کی) ایک ایک نیاز پیش کی اور ان میں سے ایک کی (یعنی ہابیل کی) تو مقبول ہوگئی اور دوسرے کی (یعنی قابیل کی) مقبول نہ ہوئی، (کیونکہ جس معاملہ کے فیصلہ کے لئے یہ نیاز چڑھائی گئی تھی اس میں ہابیل حق پر تھا اس لئے اس کی نیاز قبول ہوگئی اور قابیل حق پر نہ تھا اس کی قبول نہ ہوئی، ورنہ پھر فیصلہ نہ ہوتا، بلکہ اور خلط و اشتباہ ہو جاتا جب) وہ دوسرا (یعنی قابیل اس میں بھی ہار کر جھلا کر) کہنے لگا کہ میں تجھ کو ضرور قتل کردوں گا، اس ایک نے (یعنی ہابیل نے) جواب دیا (کہ تیرا ہارنا تو تیری ہی ناحق پرستی کی وجہ سے ہے میری کیا خطا، کیونکہ) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں (میں نے تو تقویٰ اختیار کیا اور خدا کے حکم پر رہا، خدا تعالیٰ نے میری نیاز قبول کی، تو نے تقویٰ چھوڑ دیا اور خدا کے حکم سے منہ موڑا تیری نیاز قبول نہیں کی، سو اس میں تیری خطا ہے یا میری، انصاف کر، لیکن اگر پھر بھی تیرا یہی ارادہ ہے تو تو جان، میں نے تو تجھے قصد کرلیا ہے) اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں (کیونکہ) میں تو خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں (کہ باوجودیکہ تیرے جواز قتل کا بظاہر ایک سبب موجود ہے یعنی یہ کہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے، مگر اس وجہ سے کہ یہ جواز اب تک کسی نص جزئی سے مجھ کو محقق نہیں ہوا، اس لئے اس کے ارتکاب کو احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس شبہ کی وجہ سے خدا سے ڈرتا ہوں اور یہ ہمت تجھی کو ہے کہ باوجود کہ میرے جواز قتل [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] ہے لیکن پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا، میں [illegible]

ظلم کیوں نہ کرے جس سے کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے، پھر تو دوزخیوں میں
شامل ہو جاوے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی سو ان باتوں تو پہلے ہی سے قتل کا ارادہ
کر چکا تھا یہ جو سُنا کہ مدافعت بھی نہ کرے گا، چاہیے تو تھا کہ گداختہ ہو جاتا مگر بے قدر ہو کر
اور بھی، اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا، پھر آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا
جس سے (کمبخت، بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا (دنیا میں تو یہ نقصان کہ
اپنا قوت بازو اور راحتِ روح گم کر بیٹھا، اور آخرت میں یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا
ہو گا، اب جب قتل سے فارغ ہوا تو اب حیران ہے کہ لاش کو کیا کروں جس سے یہ راز پوشیدہ
رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو) پھر (آخر) اللہ تعالیٰ نے ایک کوا (وہاں) بھیجا کہ وہ (اپنی چونچ اور پنجوں
سے) زمین کو کھودتا تھا (اور کھود کر ایک دوسرے کوے کو کہ وہ مرا ہوا تھا اس گڑھے
میں دھکیل کر اس پر مٹی ڈالتا تھا) تاکہ وہ (کوا) اس (قابیل) کو تعلیم دے کہ اپنے بھائی
(ہابیل) کی لاش کو کس طریقہ سے چھپاوے (قابیل یہ واقعہ دیکھ کر اپنے جی میں بڑا ذلیل
ہوا کہ مجھ کو کوے کے برابر بھی فہم نہیں، اور غایت حسرت سے) کہنے لگا کہ افسوس میری
حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گذرا کہ اس کوے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش
کو چھپا دیتا (سو اس بدحالی پر) بڑا شرمندہ ہوا، (اسی واقعہ کی وجہ سے (جس سے قتل
ناحق کے مفاسد ثابت ہوتے ہیں) ہم نے (تمام مکلفین پر عموماً اور) بنی اسرائیل پر
(خصوصاً) یہ (حکم) لکھ دیا (یعنی مقرر کر دیا) کہ (قتلِ ناحق ایسا بڑا گناہ ہے کہ) جو شخص
کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے (جو ناحق مقتول ہوا ہو) یا بدون کسی (شرعی)
فساد کے جو زمین میں اس سے پھیلا ہو (خواہ مخواہ) قتل کر ڈالے تو (اس کو بعض اعتبار
سے ایسا گناہ ہو گا کہ) گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا (اور وہ بعض اعتبار یہ ہے کہ
اس گناہ پر جرأت کی، خدائے تعالیٰ کی نافرمانی کی، خدائے تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے
دنیا میں مستحقِ قصاص ہوا، آخرت میں مستحقِ دوزخ ہوا، یہ امور ایک کے اور ہزار کے
قتل کرنے میں مشترک ہیں، گو شدت و اشدیت کا تفاوت ہو اور یہ دو قیدیں
اس لئے لگائیں کہ قصاص میں قتل کرنا جائز ہے، اسی طرح دوسرے اسباب جواز قتل
سے بھی جس میں قطع طریق جو آگے مذکور ہے، اور کفر حربی جس کا ذکر احکام جہاد میں آچکا
ہے سب داخل ہیں، قتل کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے) اور (یہ بھی لکھ دیا
تھا کہ جیسا ناحق قتل کرنا گناہ عظیم ہے اسی طرح کسی کو قتل غیر واجب سے بچا لینا اس میں
ثواب بھی ایسا ہی عظیم ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بچا لیوے تو (اس کو ایسا ثواب ملیگا کہ

گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا، (غیر واجب کی قید اس لئے لگائی کہ جس شخص کا قتل شرعاً واجب ہو اس کی امداد یا سفارش حرام ہے، اور اس مضمونِ احیاء کے لکھنے سے بھی تشدید قتل کی ظاہر ہوگئی کہ جب احیاء ایسا محمود ہے تو ضد، قتل مذموم ہوگا، اس لئے اس کا ترتب و تسبب بھی بواسطہ عطف کے مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ پر صحیح ہوگیا) اور بنی اسرائیل کے پاس (اس مضمون کے لکھ دینے کے بعد) ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائل واضحہ (نبوت کے) لیکر آئے، اور وقتاً فوقتاً اس مضمون کی تاکید کرتے رہے) مگر پھر اس (تاکید و اہتمام) کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنے والے ہی رہے (اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا حتی کہ بعض نے خود ان انبیاء ہی کو قتل کر دیا)۔

معارف و مسائل

قصہ ہابیل و قابیل ان آیات میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ اہلِ کتاب کو یا پوری امت کو حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح سنا دیجئے۔

قرآن مجید پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کریم کوئی قصہ کہانی یا تاریخ کی کتاب نہیں جس کا مقصد کسی واقعہ کو اول سے آخر تک بیان کرنا ہو، لیکن واقعاتِ ماضیہ اور گذشتہ اقوام کی سرگذشت اپنے دامن میں بہت سی عبرتیں اور نصیحتیں رکھتی ہے، وہی تاریخ کی اصلی روح ہے، اور ان میں بہت سے حالات و واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر مختلف احکام شرعیہ کی بنیاد ہوتی ہے، انہی فوائد کے پیش نظر قرآن کریم کا اسلوب ہر جگہ یہ ہے کہ موقع بموقع کوئی واقعہ بیان کرتا ہے، اور اکثر پورا واقعہ بھی ایک جگہ بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے جتنے حصہ سے اس جگہ کوئی مقصد متعلق ہوتا ہے اس کا وہی ٹکڑا یہاں بیان کر دیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا یہ قصہ بھی اسی اسلوب حکیم پر نقل کیا جا رہا ہے، اس میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سی عبرتیں اور مواعظ ہیں، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکامِ شرعیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب پہلے الفاظِ قرآن کی تشریح اور اس کے تحت میں اصل قصہ دیکھئے، اس کے بعد اس کے متعلقہ احکام و مسائل کا بیان ہوگا۔

اس سے پہلی آیات میں بنی اسرائیل کو حکم جہاد اور اس میں ان کی کم ہمتی اور بزدلی

کا ذکر تھا، اس قصہ میں اس کے بالمقابل قتل ناحق کی برائی اور اس کی تباہ کاری کا بیان کر کے قوم کو اس اعتدال پر لانا مقصود ہے کہ جس طرح حق کی حمایت اور باطل کو مٹانے میں قتل و قتال سے ذم چرانا غلطی ہے، اسی طرح ناحق قتل و قتال پر اقدام دین و دنیا کی تباہی ہے۔

پہلی آیت میں اِبْنَیْ اٰدَمَ کا لفظ مذکور ہے، یوں تو ہر انسان آدمی اور آدم کی اولاد ہے، ہر ایک کو ابن آدم کہا جا سکتا ہے، لیکن جمہور علماءِ تفسیر کے نزدیک اس جگہ اِبْنَیْ اٰدَمَ سے حضرت آدم علیہ السلام کے دو صلبی اور حقیقی بیٹے مراد ہیں، یعنی ہابیل و قابیل، ان دونوں کا قصہ بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا:

تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور سچائی واجب ہے

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ، "یعنی ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح واقعہ کے مطابق سنا دیجئے"، اس میں بِالْحَقِّ کے لفظ سے تاریخی روایات کی نقل میں ایک اہم اصول کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تاریخی روایات کی نقل میں بڑی احتیاط لازم ہے، جس میں نہ کوئی جھوٹ ہو نہ کوئی تلبیس اور دھوکہ اور نہ اصل واقعہ میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی زیادتی (ابن کثیر)

قرآن کریم نے صرف اسی جگہ نہیں بلکہ دوسرے مواقع میں بھی اس اصول پر قائم رہنے کی ہدایات دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ، دوسری جگہ ارشاد ہے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ، تیسری جگہ ارشاد ہے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ، ان تمام مواقع میں تاریخی واقعات کے ساتھ لفظ حق لاکر اس بات کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ نقلِ واقعات میں حق و صدق کی رعایت لازمی ہے، روایات و حکایات کی بناء پر جس قدر مفاسد دنیا میں ہوتے ہیں ان سب کی بنیاد عام طور پر نقلِ واقعات میں بے احتیاطی ہوتی ہے، ذرا سا لفظ اور عنوان بدل دینے سے واقعہ کی حقیقت مسخ ہو جاتی ہے، پچھلی اقوام کے مذاہب و شرائع اسی بے احتیاطی کی راہ سے ضائع ہو گئے، اور ان کی مذہبی کتابیں چند بے سند بے تحقیق کہانیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئیں، اس جگہ ایک لفظ بِالْحَقِّ کا اضافہ کر کے اس اہم مقصد کی طرف اشارہ فرما دیا گیا۔

اس کے علاوہ اسی لفظ میں قرآن کریم کے مخاطبین کو اس طرف بھی رہنمائی کرنا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو اُمّیِ محض ہیں اور ہزاروں سال پہلے کے واقعات بالکل سچے اور صحیح بیان فرما رہے ہیں تو اس کا سبب بجز وحی آسمانی اور نبوت کے کیا ہو سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ان دونوں بیٹوں کا واقعہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا: اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ، یعنی ان دونوں نے اللہ تعالیٰ

کے لئے اپنی اپنی قربانی پیش کی، مگر ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی،

لفظ قربان، عربی لغت کے اعتبار سے اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کسی کے قرب کا ذریعہ بنایا جائے، اور اصطلاح شرع میں اس ذبیحہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔

اس قربانی کے پیش کرنے کا واقعہ جو صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ منقول ہو اور ابن کثیر نے اس کو علماء سلف و خلف کا متفقہ قول قرار دیا ہے یہ ہے کہ جب حضرت آدم اور حواء علیہما السلام دنیا میں آئے اور توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ایک حمل سے ان کے دو بچے توام پیدا ہوتے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی، اس وقت جبکہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں بجز بہن بھائیوں کے کوئی اور نہ تھا، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا تو اللہ جل شانہٗ نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے شریعت آدم علیہ السلام میں یہ خصوصی حکم جاری فرما دیا تھا کہ ایک حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہو وہ تو آپس میں حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے، لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی، بلکہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج ومناکحت جائز ہوگا

لیکن ہوا یہ کہ پہلے لڑکے قابیل کی ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ حسین وجمیل تھی اور دوسرے لڑکے ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بدشکل تھی، جب نکاح کا وقت آیا تو حسب ضابطہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بدشکل لڑکی قابیل کے حصہ میں آئی، اس پر قابیل ناراض ہو کر ہابیل کا دشمن ہوگیا، اور اس پر اصرار کرنے لگا کہ میرے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہی میرے نکاح میں دی جائے، حضرت آدم علیہ السلام نے شرعی قاعدہ کے موافق اس کو قبول نہ فرمایا، اور ہابیل وقابیل کے درمیان رفع اختلاف کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے لئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہو جائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ قربانی اسی کی قبول ہوگی جس کا حق ہے، یعنی ہابیل کی۔

اس زمانہ میں قربانی قبول ہونے کی ایک واضح اور کھلی ہوئی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور قربانی کو کھا جاتی تھی، اور جس قربانی کو آگ نہ کھائے تو یہ علامت اس کے نامقبول ہونے کی ہوتی تھی۔

اب صورت یہ پیش آئی کہ ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں، اس نے ایک

میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہو گئی تو میرے لئے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

"میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور اہلِ تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا، اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا، اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں"

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے، اور جو عمل مقبول ہو جائے وہ چھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

جرم و سزا کے چند قرآنی ضابطے

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ

یہی سزا ہے اُن کی جو لڑتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں

فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ

ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا جاوے یا سولی چڑھائے جاویں یا کاٹے جاویں ان کے ہاتھ

وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ

اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کر دیے جاویں اس جگہ سے یہ

لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۳۳﴾

ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے

إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟

مگر جنھوں نے توبہ کی تمھارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ

أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۳۴﴾

اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

ع ۵

خلاصۂ تفسیر | جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑتے ہیں اور (اس لڑنے کا مطلب یہ کہ) ملک میں فساد (یعنی بدامنی) پھیلاتے

یہ اسلوب نہایت لطیف طریقہ پر ذہنی انقلاب پیدا کرنے والا ہے، کہ وہ دنیا کی تعزیرات کی کتابوں کی طرح محض جرم و سزا کے بیان پر کفایت نہیں کرتا، بلکہ ہر جرم و سزا کے ساتھ خوف خدا و آخرت مستحضر کرکے انسان کا رخ ایک ایسے عالم کی طرف موڑ دیتا ہے، جس کا تصور اس کو ہر عیب و گناہ سے پاک کر دیتا ہے، اور اگر حالات و واقعات پر غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ خوف خدا و آخرت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون، پولیس، فوج دنیا میں انسداد جرائم کی ضمانت نہیں لے سکتی، قرآن کریم کا یہی اسلوب تھا، جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا، اور ایسے انسانوں کا ایک معاشرہ پیدا کیا جو اپنے تقدس میں فرشتوں سے بھی اونچا مقام رکھتے ہیں۔

شرعی سزاؤں کی تین قسمیں

ڈاکہ اور چوری کی شرعی سزائیں جن کا ذکر آیات مذکورہ میں ہے، ان کی تفصیل اور متعلقہ آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ان سزاؤں سے متعلق شرعی اصطلاحات کی کچھ وضاحت کر دی جائے، جن سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سے لکھے پڑھے لوگوں کو بھی اشکالات پیش آتے ہیں، دنیا کے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہوں، تعزیرات ہند، تعزیرات پاکستان وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، وہ ہر قسم کے جرائم اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں، لیکن شریعت اسلام میں یہ معاملہ ایسا نہیں، بلکہ جرائم کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئیں۔

حدود[1]، قصاص[2]، تعزیرات[3]۔ ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے، اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لئے ہر ایسے جرم میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے۔

لیکن بعض جرائم میں حق العبد کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور بعض میں حق اللہ کی حیثیت زیادہ غالب ہے، اور احکام میں مدار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے۔

دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے خاص خاص جرائم کے علاوہ باقی جرائم کی سزاؤں کے لئے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مکان اور ہر ماحول کے تقاضے جیسی اور جتنی سزا انسداد جرم کے لئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی

ایک استثناء ہے کہ ڈاکو اگر گرفتاری سے قبل توبہ کرے اور معاملات سے اس کی توبہ کا اطمینان ہو جائے تو بھی یہ حد ساقط ہو جاتی ہے، گرفتاری کے بعد کی توبہ معتبر نہیں، اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے قبل ہو یا بعد میں، اسی طرح تعزیری جرائم میں حالات کے موافق سفارشیں سنی جا سکتی ہیں، حدود اللہ میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کا سننا بھی جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں اور ان کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے کہ ان میں کسی کو کسی کی رعایت کی کمی بیشی میں اجازت نہیں، نہ کوئی ان کو معاف کر سکتا ہے، جہاں سزا اور قانون کی یہ سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو معتدل کرنے کے لئے ثبوت جرم اور تکمیل ثبوت جرم کے لئے شرائط بھی نہایت کڑی رکھی گئی ہیں، ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے، بلکہ ادنیٰ سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے، اسلام کا مسلمہ قانون اس میں یہ ہے کہ اَلْحُدُوْدُ تَنْدَرِءُ بِالشُّبُہَاتِ

یعنی حدود کو ادنیٰ شبہ سے ساقط کر دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جن صورتوں میں حد شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرأت پیدا ہو، بلکہ حاکم اس کے مناسب حال اس کو تعزیری سزا دے گا، اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسداد جرائم کا مکمل انتظام ہے۔ فرض کیجئے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے، اور گواہ عادل ثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہو سکتا، مگر از روئے قانون شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دیدی جائے، بلکہ حاکم وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہوگی، یا چوری کے ثبوت کے لئے جو شرائط مقرر ہیں ان میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہو سکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہو گیا، بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسب حال دی جائیں گی۔

قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن میں متعین ہے، کہ جان کے بدلے میں جان لی جائے زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دی جائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت حق اللہ نافذ کیا گیا ہے، اگر صاحب حق انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہوگا، اور حد

ساقط نہ ہوگی، مثلاً جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کردے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی، بخلاف قصاص کے، کہ اس میں حق عبد کی حیثیت کو قرآن و سنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہو جانے کے بعد اس کو ولی مقتول کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، وہ چاہے تو قصاص لے لے اور اس کو قتل کرادے اور چاہے معاف کردے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاء مقتول نے معاف کرکے چھڑا دیا ہے تو قاتلوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور قتل کی وارداتیں عام ہو جائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کر دیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لئے اس کو عمر قید یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر **اس خطرہ کا انسداد کر سکتی ہے۔**

یہاں تک شرعی سزاؤں حدود، قصاص، اور تعزیرات کی اصطلاحات شرعیہ اور ان کے متعلق ضروری معلومات کا بیان ہوا، اب ان کے متعلق آیات کی تفسیر اور حدود کی تفصیل دیکھئے، پہلی آیت میں ان لوگوں کی سزا کا بیان ہے جو اللہ اور رسول کے ساتھ **مقابلہ اور محاربہ کرتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔**

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اللہ و رسول کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے، اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں، لفظ محاربہ حرب سے ماخوذ ہے، اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ سلم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اکا دکا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جب ہی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہو جائے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے، جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جا سکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنے والے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں (تفسیر مظہری)

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ اس آیت میں محاربہ کو اللہ اور رسول کی طرف

منسوب کیا ہے جو ڈاکو یا بغاوت کرنے والے جو مقابلہ یا محاربہ کرتے ہیں وہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ کوئی طاقت ور جماعت جب طاقت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو توڑنا چاہے تو گرچہ ظاہر میں اس کا مقابلہ عام انسانوں سے ساتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کی جنگ حکومت کے ساتھ ہے، اور اسلامی حکومت میں جب قانون اللہ اور رسول کا نافذ ہو تو یہ محاربہ بھی اللہ اور رسول ہی کے مقابلہ میں کہا جائیگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس سزا کا ذکر ہے یہ ان لوگوں اور جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو اجتماعی قوت کے ساتھ حملہ کرکے امن عامہ کو برباد کریں اور قانون حکومت کو علانیہ توڑنے کی کوشش کریں، اور ظاہر ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، مال لوٹنے، آبرو پر حملہ کرنے سے لیکر قتل و خونریزی تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں، اسی سے مقاتلہ اور محاربہ میں فرق معلوم ہو گیا کہ لفظ مقاتلہ خونریزی لڑائی کے لئے بولا جاتا ہے گو کوئی قتل ہو یا نہ ہو، اور گو صرف مال ہی لوٹا جائے، اور لفظ محاربہ طاقت کے ساتھ بدامنی پھیلانے اور سلامتی کو سلب کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لئے یہ لفظ اجتماعی طاقت کے ساتھ عوام کی جان و مال و آبرو میں سے کسی چیز پر دست درازی کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو رہزنی، ڈاکہ اور بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس جرم کی سزا قرآن کریم نے خود متعین فرمادی اور بطور حق اللہ یعنی سرکاری جرم کے نافذ کیا جس کو اصطلاح شرع میں حد کہا جاتا ہے، اب سنئے کہ ڈاکہ اور رہزنی کی شرعی سزا کیا ہے

آیت مذکورہ میں رہزنی کی چار سزائیں مذکور ہیں:

اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ، یعنی ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے، ان میں سے پہلی تین سزاؤں میں مبالغہ کا لفظ باب تفعیل سے استعمال فرمایا جو تکرار فعل اور شدت پر دلالت کرتا ہے، اس میں صیغہ جمع استعمال فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ ان کا قتل یا سولی چڑھانا یا ہاتھ پاؤں کاٹنا عام سزاؤں کی طرح نہیں کہ جس فرد پر جرم ثابت ہو صرف اسی فرد پر سزا جاری کی جائے بلکہ یہ جرم جماعت میں سے ایک فرد سے بھی صادر ہو گیا تو پوری جماعت کو قتل یا سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

نیز اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ قتل و صلب وغیرہ قصاص کے طور پر نہیں کہ اولیاء مقتول کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائے، بلکہ یہ حد شرعی بحیثیت حق اللہ کے نافذ کی گئی ہے جن لوگوں کو نقصان پہونچا ہے وہ معاف بھی کردیں تو شرعاً سزا معاف نہ ہوگی،

یہ دونوں حکم بصیغۂ تفصیل ذکر کرنے سے مستفاد ہوتے ہیں (تفسیر مظہری وغیرہ)

رہزنی کی یہ چار سزائیں حرف اَوْ کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں جو چند چیزوں میں اختیار دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور تقسیم کار کے لئے بھی، اسی لئے فقہاء امت صحابہ و تابعین کی ایک جماعت حرف اَوْ کو تخییر کے لئے قرار دے کر یہ صورت گئی ہے کہ ان چاروں سزاؤں میں امام و امیر کو شرعاً اختیار دیا گیا ہے کہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرم کی شدت و خفت پر نظر کرکے ان کے مناسب حال یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔

سعید بن مسیبؒ، عطاءؒ، داؤدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، نخعیؒ، مجاہدؒ اور ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے، اور امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ایک جماعت صحابہؓ و تابعین نے حرف اَوْ کو اس جگہ تقسیم کار کے لئے لیکر آیت کا مفہوم یہ قرار دیا کہ رہزنوں اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بردہ اسلمی سے معاہدۂ صلح کا فرمایا تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی، اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے مدینہ طیبہ آرہے تھے، ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں جبرئیل امین یہ حکم سزا لیکر نازل ہوئے کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھا دیا جائے، اور جس نے صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے، اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں، اور جو ان میں سے مسلمان ہوجائے اس کا جرم معاف کر دیا جائے، اور جس نے قتل و غارتگری کچھ نہیں کیا صرف لوگوں کو ڈرایا جس سے امن عامہ مختل ہوگیا، اس کو جلاوطن کیا جائے، اگر ان لوگوں نے دارالاسلام کے کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا تو ان کی سزا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے اگرچہ فعل قتل بلاواسطہ صرف بعض افراد سے صادر ہوا ہو، اور اگر کسی کو قتل بھی کیا مال بھی لوٹا تو ان کی سزا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا ہے، یعنی ان کو سولی چڑھایا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے، پھر نیزہ وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے، اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے کسی کو قتل نہیں کیا تو ان کی سزا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ہے، یعنی ان کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنوں پر سے کاٹ دیئے جائیں، اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا عمل بلاواسطہ اگرچہ بعض سے صادر ہوا ہو، مگر سزا سب کے لئے یہی ہوگی، کیونکہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ساتھیوں کے تعاون و امداد کے بھروسہ پر کیا ہے، اس لئے

سب شریک جرم ہیں، اور اگر ابھی تک قتل و غارت گری کا کوئی جرم اُن سے صادر نہیں ہوا تھا کہ پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی سزا اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ہے، یعنی ان کو زمین سے نکال دیا جائے۔

زمین سے نکالنے کا مفہوم ایک جماعت فقہا کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے، اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے نکال دیا جائے، حضرت فاروق اعظمؓ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے مسلح حملوں میں آجکل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل و خوں ریزی ہی پر اکتفا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت دری اور اغوا وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا، اس قسم کے تمام جرائم کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے، اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام و امیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو اُن کے مناسب حال دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہونچے تو حدِ زنا جاری کرے۔

اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا، مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا، تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا (تفسیر مظہری)

آخر آیت میں فرمایا ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي .... الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ یعنی یہ سزائے شرعی جو دنیا میں اُن پر جاری کی گئی ہے، یہ تو دنیا کی رسوائی ہے اور سزا کا ایک نمونہ ہے، اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور دیرپا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود و قصاص یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی، ہاں سزا یافتہ شخص دل سے توبہ کرلے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی۔

دوسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ج میں ایک استثناء ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکو اور باغی اگر حکومت کے گھیرے میں آنے اور اُن پر قابو پانے سے پہلے پہلے جب کہ ان کی قوت و طاقت بحال ہے، اس حالت میں اگر توبہ کرکے رہزنی سے خود ہی باز آجائیں تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی اُن سے ساقط ہو جائے گی، یہ استثناء عام قانونِ حدود سے مختلف ہے، کیونکہ دوسرے جرائم چوری زنا وغیرہ میں جرم کرنے اور قاضی کی عدالت

میں جرم ثابت ہو جانے کے بعد اگر مجرم سچے دل سے توبہ بھی کرے تو گو اس توبہ سے آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی، مگر دنیا میں حد شرعی معاف نہ ہوگی، جیسا کہ چند آیتوں کے بعد چوری کی سزا کے تحت میں اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

حکمت اس استثناء کی یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکوؤں کی سزا میں یہ شدت اختیار کی گئی ہے کہ پوری جماعت میں کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہے اس لئے دوسری طرف اس استثناء کے ذریعہ معاملہ کو ہلکا کر دیا گیا، کہ توبہ کر لیں تو سزائے دنیا بھی معاف ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے . . . . کہ ایک طاقتور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا، اس لئے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا، کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔

نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو، ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہے اس لئے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی، اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھہ جمع کر کے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی، يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، قاری کے پاس پہنچے، اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی، دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی، اور رہزنی سے توبہ کر کے مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابوہریرہؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر امیر مدینہ کے پاس لے گئے، اور قرآن کی آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔

حکومت بھی ان کے فساد و رہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کو خوشی ہوئی۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کر کے نکل گیا، اور قتل و غارت گری کو پیشہ بنا لیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کر کے واپس آیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

یہاں یہ بات قابل یاد داشت ہے کہ حد شرعی کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہو جائیں، بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد ہے تو اولیاء مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے

سے معاف ہو جائے گا، اور جو کوئی مالی نقصان کسی کو پہونچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف کرانا لازم ہے، امام اعظم ابو حنیفہ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا خود توبہ کا ایک جزء ہے، بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی، اس لئے کسی ڈاکو کو تائب اسی وقت مانا جائے گا جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرالے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور

جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ

جہاد کرو اس کی راہ میں تاکہ تمہارا بھلا ہو جو لوگ کافر ہیں اگر

اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ

ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ بدلا میں دیں

عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

اپنے قیامت کے دن عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب

اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ

دردناک ہے چاہیں گے کہ نکل جاویں آگ سے اور وہ اس سے

بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾ وَالسَّارِقُ وَ

نکلنے والے نہیں اور ان کے لئے عذاب دائمی ہے اور چوری کرنیوالا مرد اور

السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا

چوری کرنیوالی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ سزا میں ان کی کمائی کی، تنبیہ ہے

مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ

اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب ہے حکمت والا پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے

ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

پیچھے اور اصلاح کی تو اللہ قبول کرتا ہے اس کی توبہ بے شک اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

مہربان ہے تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

عذاب کرے جس کو چاہے اور بخشے جس کو چاہے اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ (کے احکام کی مخالفت) سے ڈرو (یعنی معاصی چھوڑ دو) اور (طاعات کے ذریعہ) خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو (یعنی طاعاتِ ضروریہ کے پابند رہو) اور (طاعات میں سے) بالخصوص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو، امید ہے کہ (اس طریق سے) تم (پورے) کامیاب ہو جاؤ گے (اور کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حاصل ہونا اور دوزخ سے نجات ہے) یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر (بالفرض) ان (میں سے ہر ایک) کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں (جس میں تمام دفائن و خزائن بھی آگئے) اور (انہی چیزوں پر کیا منحصر ہے بلکہ) ان چیزوں کے ساتھ اتنی ہی چیزیں اور بھی ہوں تاکہ وہ اس کو دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے چھوٹ جاویں تب بھی وہ چیزیں ہرگز ان سے قبول نہ کی جاویں گی (اور عذاب سے نہ بچیں گے بلکہ) ان کو دردناک عذاب ہوگا (پھر بعد عذاب میں داخل ہو جانے کے) اس بات کی خواہش (و تمنا) کریں گے کہ دوزخ سے (کسی طرح) نکل آویں اور (یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی اور) وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے اور ان کو عذاب دائمی ہوگا (یعنی کسی تدبیر سے نہ سزا ٹلے گی نہ دوام سزا ٹلے گا)

اور جو مرد چوری کرے اور (اسی طرح) جو عورت چوری کرے سو (ان کا حکم یہ ہے کہ اے حکام) ان دونوں کے داہنے ہاتھ (گٹے پر سے) کاٹ ڈالو ان کے (اس) کردار کے عوض میں (اور یہ عوض) بطور سزا کے (ہے) اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے ہیں (جو سزا چاہیں مقرر فرما دیں اور) بڑی حکمت والے ہیں (کہ مناسب ہی سزا مقرر فرماتے ہیں) پھر جو شخص (موافق قاعدۂ شرعیہ کے) توبہ کرلے اپنی اس زیادتی (یعنی چوری) کرنے کے بعد اور (آئندہ کے لئے) اعمال کی درستی رکھے (یعنی چوری وغیرہ نہ کرے) اپنی توبہ پر قائم رہے تو بے شک اللہ تعالیٰ (اس کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرما دیں گے (کہ توبہ سے پچھلا گناہ معاف فرما دیں گے، اور استقامت علی التوبہ سے مزید عنایت

فرما دیں گے، بیشک خدا تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (کہ اس کا گناہ معاف کر دیں) بڑی رحمت والے ہیں (کہ آئندہ بھی مزید عنایت کریں) اے مخاطب کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے ثابت ہے حکومت سب آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جس کو چاہیں سزا دیں اور جس کو چاہیں معاف کر دیں، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے پہلی آیت میں ڈاکہ زنی کی شرعی سزا اور اس کے احکام کی تفصیل مذکور تھی، اور آگے تین آیتوں کے بعد چوری کی شرعی سزا کا بیان آنے والا ہے، اس کے درمیان تین آیتوں میں تقویٰ، اطاعت و عبادت، جہاد کی ترغیب اور کفر و عناد اور معصیت کی تباہ کاری کا بیان فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کے اس طرز خاص میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ محض حاکمانہ طور پر تعزیر و سزا کا قانون بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ مربیانہ انداز میں ذہنوں کو جرم سے باز رہنے کے لئے ہموار بھی کرتا ہے، خدا تعالیٰ اور آخرت کے خوف اور جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو مستحضر کر کے ان کے قلوب کو جرم سے متنفر بناتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر قوانین جرم و سزا کے پیچھے اِتَّقُوا اللّٰهَ وغیرہ کا اعادہ کیا جاتا ہے، یہاں بھی پہلی آیت میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے:

اول اِتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ خوف خدا ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حقیقی طور پر خفیہ و علانیہ جرائم سے روک سکتی ہے۔

دوسرا ارشاد ہے: وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ یعنی اللہ کا قرب تلاش کرو، لفظ وسیلہ وَسْلٌ مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی ملنے اور جڑنے کے ہیں، یہ لفظ سین اور صاد دونوں سے تقریباً ایک ہی معنی میں آتا ہے، فرق اتنا ہے کہ وصل بالصاد مطلقاً ملنے اور جڑنے کے معنی میں ہے، اور وسل بالسین رغبت و محبت کے ساتھ ملنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ صحاح جوہری اور مفردات القرآن راغب اصفہانی میں اس کی تصریح ہے، اس لئے صاد کے ساتھ وُصْلَہ اور وصیلہ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان میل اور جوڑ پیدا کر دے، خواہ وہ میل اور جوڑ رغبت و محبت سے ہو یا کسی دوسری صورت سے، اور سین کے ساتھ لفظ وسیلہ کے معنی اس چیز کے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے سے محبت و رغبت کے ساتھ ملا دے۔ (لسان العرب، مفردات راغب)

اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ہر وہ چیز ہے جو بندہ کو رغبت و محبت کے ساتھ اپنے معبود

کے قریب کرنے، اس لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اس آیت میں وسیلہ کی تفسیر طاعت و قربت اور ایمان و عمل صالح سے کی ہے، بروایت حاکم حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ وسیلہ سے مراد قربت و اطاعت ہے، اور ابن جریرؒ نے حضرت عطاءؒ، مجاہدؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

اور ابن جریرؒ وغیرہ نے حضرت قتادہؒ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے: تَقَرَّبُوْٓا اِلَيْهِ بِطَاعَتِهٖ وَالْعَمَلِ بِمَا يُرْضِيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرو، اس کی فرمانبرداری اور رضامندی کے کام کرکے، اس لئے آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، بذریعہ ایمان اور عمل صالح کے۔

اور مسند احمد کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وسیلہ ایک اعلیٰ درجہ ہے جنت کا جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے، تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ درجہ مجھے عطا فرمادے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤذن اذان کہے تو تم بھی وہی کلمات کہتے رہو جو مؤذن کہتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو اور میرے لئے وسیلہ کی دعا کرو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وسیلہ ایک خاص درجہ ہے جنت کا، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اور آیت مذکورہ میں ہر مومن کو وسیلہ طلب کرنے اور ڈھونڈنے کا حکم بظاہر اس خصوصیت کے منافی ہے، مگر جواب واضح ہے کہ جس طرح ہدایت کا اعلیٰ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور آپ ہمیشہ اس کے لئے دعا کیا کرتے تھے، مگر اس کے ابتدائی اور متوسط درجات تمام مومنین کے لئے عام ہیں، اسی طرح وسیلہ کا اعلیٰ درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اور اس کے نیچے کے درجات سب مومنین کے لئے، آپ ہی کے واسطہ اور ذریعہ سے عام ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ لفظ وسیلہ میں محبت و رغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہو کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے، اور محبت پیدا ہوتی ہے اتباع سنت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، اس لئے جتنا کوئی اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کو حاصل ہوگی، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک

محبوب ہوجائے گا، اور جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔

لفظ وسیلہ کی لغوی تشریح اور صحابہ و تابعین کی تفسیر سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء وصالحین کی صحبت ومحبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہے، اور اسی لئے اُن کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

اور ایک روایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ (منار)

آیت مذکورہ میں اول تقویٰ کی ہدایت فرمائی گئی، پھر اللہ تعالیٰ سے ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعہ تقرب حاصل کرنے کی، آخر میں ارشاد فرمایا: وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ، یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں، اگرچہ اعمال صالحہ میں جہاد بھی داخل تھا، لیکن اعمال صالحہ میں جہاد کا اعلیٰ مقام بتلانے کے لئے اس کو علیحدہ کرکے بیان فرما دیا گیا، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ، یعنی اسلام کا اعلیٰ مقام جہاد ہے دوسرے اس جگہ جہاد کو اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ حکمت بھی ہے کہ پچھلی آیتوں میں فساد فی الارض کا حرام و ناجائز ہونا اور اس کی دنیوی اخروی سزاؤں کا بیان آیا تھا، جہاد بھی ظاہر کے اعتبار سے فساد فی الارض کی صورت معلوم ہوتی ہے، اس لئے ممکن تھا کہ کوئی ناواقف جہاد اور فساد میں فرق نہ سمجھے، اس لئے فساد فی الارض کی ممانعت کے بعد جہاد کا حکم اہمیت کے ساتھ ذکر کرکے دونوں کے فرق کی طرف لفظ فِیْ سَبِیْلِهٖ سے اشارہ فرمادیا کیونکہ ڈاکہ، بغاوت وغیرہ میں جو قتل وقتال اور مال لوٹا جاتا ہے وہ محض اپنی ذاتی اغراض وخواہشات اور ذلیل مقاصد کے لئے ہوتا ہے، اور جہاد میں اگر اس کی نوبت آئے بھی تو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور ظلم وجور کو مٹانے کے لئے ہے جن میں زمین آسمان کا فرق ہے، دوسری اور تیسری آیت میں کفر و شرک ومعصیت کا وبال عظیم ایسے انداز میں بتلایا گیا ہے کہ اس پر ذرا بھی غور کیا جائے تو وہ انسان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردے، اور کفر و شرک اور معصیت سب کو چھوڑنے پر مجبور کردے

وہ یہ ہے کہ عام طور پر انسان جن گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات و

نہ پائیں گے۔

ان کے کردار کے بدلہ میں، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے"

نہیں فرمایا، بلکہ دونوں صنفوں کو الگ الگ کر کے حکم دیا۔

فرمایا۔

قانون میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے، اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی سرقہ کی شرعی تعریف ہے، اور اس تعریف کی رُو سے سرقہ ثابت ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہوئیں:

اوّل یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو، اور نہ ایسی چیزیں ہوں جن میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہِ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہے، یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حدِ سرقہ اُس پر جاری نہ کی جائے گی، حکام اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کر سکتے ہیں۔

دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال محفوظ ہونا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگراں چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہونا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حدِ سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا، اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہو جائے تو بھی حد ساقط ہو جائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حدِ سرقہ عائد نہیں ہوگی، اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے، کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہو چکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حدِ سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حدِ سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حدِ شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ جن صورتوں میں چوری کی حدِ شرعی ساقط ہو جاتی ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکمِ وقت اپنی صوابدید کے مطابق اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے جو جسمانی کوڑوں کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ جن صورتوں میں سرقہ کی کوئی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے حدِ شرعی جاری نہ ہو تو وہ شرعاً جائز و حلال ہے، کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ یہاں گناہ

اس رائے کے مشورے سے مقرر کرکے قاضی یا جج کو ان کا پابند کر دیا جائے، جیسا کہ آجکل حکومت کی اسمبلیوں کے ذریعہ تعزیری قوانین متعین کئے جاتے ہیں، اور قاضی یا جج مقررہ حدود کے اندر سزا جاری کرتے ہیں، بہرحال پانچ جرائم میں جن کی سزائیں قرآن یا اجماع سے متعین کردی گئی ہیں، اور ان میں کسی فرد یا جماعت یا حکومت کو تغیر و تبدل کا کوئی اختیار نہیں، ہاں مگر ان میں بھی اگر جرم کا ثبوت شریعت کے مقرر کردہ ضابطہ شہادت سے نہ ہو سکے، یا جرم کا ثبوت تو مت مگر اس جرم پر جن شرائط کے ساتھ یہ سزا جاری کی جاتی ہے وہ شرائط مکمل نہ ہوں، اور نفس جرم قاضی یا جج کے نزدیک ثابت ہو تو اس صورت میں بھی حد شرعی جاری نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی، اسی کے ساتھ یہ شرعی ضابطہ بھی مشترک اور مسلم ہے کہ شبہ کا فائدہ مجرم کو پہونچتا ہے، اگر ثبوتِ جرم یا جرم کی شرائط میں سے کسی چیز میں شبہ پڑ جائے تو حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، مگر نفس جرم کا ثبوت ہو جانے تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ جرائم میں بہت سی صورتیں ایسی نکلیں گی کہ ان میں حدود شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوگا، بلکہ تعزیری سزائیں صواب دید حاکم کے مطابق دی جائیں گی، تعزیری سزائیں چونکہ شریعت اسلام نے متعین نہیں کیں بلکہ ہر زمانہ اور ہر ماحول کے مطابق عام قوانین مملکت کی طرح ان میں تغیر و تبدل اور کمی بیشی کی جا سکتی ہے، اس لئے ان پر تو کسی کو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، اب بحث صرف پانچ جرائم کی سزاؤں میں اور ان کی بھی مخصوص صورتوں میں رہ گئی، مثال کے طور پر چوری کو لے لیجئے، اور دیکھئے کہ شریعت اسلام میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مطلقاً ہر چوری پر مقرر نہیں کہ جس کو عرف عام میں چوری کہا جاتا ہے، بلکہ سرقہ جس پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس کی ایک مخصوص تعریف ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، کہ کسی کا مال محفوظ جگہ سے سامانِ حفاظت توڑ کر ناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے اس تعریف کی رو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتا ہے، حد سرقہ کی تعریف سے نکل جاتی ہیں، مثلاً محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام پبلک مقامات مثلاً مسجد، عیدگاہ، پارک، کلب، اسٹیشن، ویٹنگ روم، ریل، جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی کوئی چوری کرے، یا درختوں پر لگے ہوئے پھل توڑ لے، یا شہد کی چوری کرے تو اس پر حد سرقہ جاری نہیں ہوگی، بلکہ عام ممالک کے قوانین کی طرح تعزیری سزا دی جائیگی اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور و معمار ہو، یا کوئی دوست عزیز ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگرچہ عرفی چوری میں داخل اور تعزیری سزا کا مستحق ہے، مگر ہاتھ کاٹنے کی

یہیں سے ان تمام شبہات کا یہ جواب ہوگیا کہ حد شرعی صرف اس صورت میں جاری ہوگی جبکہ شریعت مقدسہ کے مقرر کردہ ضابطہ کے مطابق جرم بھی مکمل ہو اور اس کا ثبوت بھی مکمل اور مکمل بھی ایسا کہ اس کا کوئی پہلو مشتبہ نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے جہاں ان جرائم کی سزائیں مقتضائے حکمت سخت مقرر کی ہیں، وہیں حدود شرعیہ کے نفاذ میں انتہائی احتیاط کو بھی ملحوظ رکھا ہے، حدود کا ضابطہ شہادت بھی عام معاملات کے ضابطہ شہادت سے مختلف اور انتہائی احتیاط پر مبنی ہے، اس میں ذرا سی کمی رہ جائے تو حد شرعی تعزیری سزا میں منتقل ہوجاتی ہے، اسی طرح تکمیل جرم کے سلسلہ میں کوئی کمی پائی جائے جب بھی حد شرعی ساقط ہوکر تعزیری سزا رہ جاتی ہے جس کا عمل دخل ہوتا ہے۔ حدود شرعیہ کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر ہی کبھی پیش آتی ہے، عام حالات میں حدود والے جرائم میں بھی تعزیری سزائیں جاری کی جاتی ہیں، لیکن جب کہیں تکمیل جرم تکمیل ثبوت کے ساتھ جاری ہوجائے گو وہ ایک ہی صدی میں ہو تو سزا نہایت سخت عبرتناک دی جاتی ہے جس کی ہیبت لوگوں کے قلب و دماغ پر مسلط ہوجائے، اور اس جرم کے پاس جاتے ہوئے بھی بدن پر لرزہ پڑنے لگے جو ہمیشہ کے لئے انسداد جرائم اور امن عامہ کا ذریعہ بنتی ہے، بخلاف مروجہ تعزیری قوانین کے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نظر میں ایک کھیل ہیں جس کو وہ بڑی خوشی سے کھیلتے ہیں، جیل خانہ میں بیٹھے ہوئے بھی آئندہ اس سے بڑے جرم کو خوبصورتی سے کرنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں، جن ممالک میں حدود شرعیہ نافذ کی جاتی ہیں ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہاں نہ آپ کو بہت سے لوگ ہاتھ کٹے ہوئے نظر آئیں گے، نہ سالہا سال میں آپ کو کوئی سنگساری کا واقعہ نظر پڑتا ہے، مگر ان شرعی سزاؤں کی دھاک قلوب پر ایسی ہے کہ وہاں چوری، ڈاکہ اور بے حیائی کا نام نظر نہیں آتا سعودی عربیہ کے حالات سے عام مسلمان براہ راست واقف ہیں، کیونکہ حج و عمرہ کے سلسلہ میں ہر طبقہ و ہر ملک کے لوگوں کی وہاں حاضری رہتی ہے، دن میں پانچ مرتبہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں، لاکھوں کا سامان ان میں پڑا ہوا ہے، اور ان کا مالک بغیر دکان بند کئے ہوئے نماز کے وقت حرم شریف میں پہنچ جاتا ہے، اور نہایت اطمینان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد آتا ہے، اس کو کبھی یہ وسوسہ بھی پیش نہیں آتا کہ اس کی دکان سے کوئی چیز غائب ہوگئی ہوگی، پھر یہ ایک دن کی بات نہیں، عمر یوں ہی گذرتی ہے، دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک میں ایسا کرکے دیکھئے تو ایک دن میں سینکڑوں چوریاں اور ڈاکے پڑجائیں گے، تہذیب انسانی اور حقوق انسانی کے دعویدار عجیب ہیں

اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ

جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئی بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ

کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ

اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اللہ کے ہاں یہ وہی

الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا

لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے ان کو دنیا میں

خِزْىٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ

ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑا عذاب ہے جاسوسی کرنے والے

لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

جھوٹ بولنے کے لئے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آویں وہ تیرے پاس تو فیصلہ کر دے ان میں

اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ

یا منہ پھیر لے ان سے اور اگر تو منہ پھیر لے گا ان سے تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ

شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

سکیں گے اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر ان میں انصاف سے بے شک اللہ

يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ

دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بناویں گے اور ان کے پاس

التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ

تو توریت ہے جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے پیچھے پھرے جاتے ہیں

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں

ع ۹ / ۱۰

ربطِ آیات

سورۂ مائدہ کے تیسرے رکوع سے اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا تھا، درمیان میں قدر قلیل اور بعض مضامین خاص خاص مناسبات سے آگئے تھے، اب

آگے پھر اہل کتاب ہی کا ذکر دور تک چلا گیا ہے، اہل کتاب میں یہود و نصاریٰ کے دو فرقے تو تھے
ہی، ایک تیسرا فرقہ اور شامل ہوگیا تھا جو حقیقت میں یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر مسلمان ہوگئے
تھے، مسلمانوں کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں میں بیٹھتے تو
اسلام اور مسلمانوں کا استہزاء کرتے تھے، مذکورہ تین آیتیں انہی تینوں فرقوں کے ایسے اعمال سے
اور حالات سے متعلق ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے
مقابلہ میں اپنی خواہشات اور رایوں کو مقدم رکھتے ہیں، اور احکام و ہدایات الٰہیہ کو
اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی فکر میں رہتے ہیں، آیات مذکورہ میں ایسے لوگوں کی دنیا و
آخرت میں رسوائی اور انجام بد کا بیان ہے، اس کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اصولی ہدایات
اور احکام شرعیہ کا بیان ہے۔

شانِ نزول آیاتِ مذکورہ کے نزول کا سبب دو واقعات ہیں، جو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی
قبائل میں پیش آئے، ایک واقعہ قتل و قصاص کا اور دوسرا واقعہ زنا اور اس کی سزا کا ہے۔

یہ بات تو کسی تاریخ عالم کے جاننے والے پر مخفی نہیں کہ اسلام سے پہلے ہر جگہ، ہر خطہ،
اور ہر طبقہ میں ظلم و جور کی حکومت تھی، قوی ضعیف کو، عزت والا بے عزت کو غلام بنائے
رکھتا تھا، قوی اور باعزت آدمی کے لئے قانون اور تھا، اور کمزور و بے عزت کے لئے قانون
دوسرا تھا، جیسے آج بھی اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہنے والے بہت سے ممالک میں کالے
اور گورے کا قانون الگ الگ ہے، محسن انسانیت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے
ہی آکر ان امتیازات کو مٹایا اور اولادِ آدم کے حقوق کی مساوات کا اعلان کیا، اور انسان
کو انسانیت اور آدمیت کا سبق دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف
لانے سے پہلے حوالی مدینہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، ان میں
سے بنو نضیر قوت و شوکت اور دولت و عزت میں بنو قریظہ سے زیادہ تھے، یہ لوگ
آئے دن بنو قریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور وہ چار و ناچار اس کو سہتے تھے، یہاں تک کہ بنو نضیر
نے بنو قریظہ کو اس ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا کہ اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی
شخص کو قتل کردے تو اس کا قصاص یعنی جان کے بدلے میں جان لینے کا ان کو حق نہ ہوگا،
بلکہ صرف ستر وسق کھجوریں اس کے خون بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی، (وسق عربی اوزان کا
ایک پیمانہ ہے، جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً پانچ من دس سیر کا ہوتا ہے) اور اگر
معاملہ برعکس ہو کہ بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی شخص کو قتل کردے تو قانون یہ

ہوگا کہ اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے گا، اور اس سے خون بہا بھی لیا جائے گا، اور وہ بھی بنو نضیر کے خون بہا سے دوگنا یعنی ایک سو چالیس وسق کھجوریں، اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کا مقتول اگر عورت ہوگی تو اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے ایک مرد کو قتل کیا جائیگا، اور اگر مقتول مرد ہے تو اس کے معاوضہ میں بنو قریظہ کے دو مردوں کو قتل کیا جائے گا اور اگر بنو نضیر کے غلام کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے آزاد کو قتل کیا جائے گا، اور اگر بنو نضیر کے آدمی کا کسی نے ایک ہاتھ کاٹا ہے تو بنو قریظہ کے آدمی کے دو ہاتھ کاٹے جائیں گے، ایک کان کاٹا ہے تو اُن کے دو کان کاٹے جائیں گے، یہ قانون تھا جو اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کے درمیان رائج تھا اور بنو قریظہ اپنی کمزوری کی بنا پر اس کے ماننے پر مجبور تھے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور مدینہ ایک دار الاسلام بن گیا، یہ دونوں قبائل ہنوز نہ اسلام میں داخل ہوئے تھے نہ کسی معاہدہ کی رو سے اسلامی احکام کے پابند تھے، مگر اسلامی قانون کی عدل گستری اور عام سہولتوں کو دور سے دیکھ رہے تھے، اس عرصہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی نے بنو نضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالا، تو بنو نضیر نے معاہدہ مذکور کے مطابق بنو قریظہ سے دوگنی دیت یعنی خون بہا کا مطالبہ کیا۔ بنو قریظہ اگرچہ نہ اسلام میں داخل تھے، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کا کوئی معاہدہ تھا، لیکن یہ لوگ یہودی تھے، ان میں بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی تھے، جو تورات کی پیشینگوئیوں کے مطابق جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی آخر الزماں ہیں، جن کے آنے کی خوشخبری تورات نے دی ہے، مگر تعصب مذہبی یا دنیوی لالچ کی وجہ سے ایمان نہ لائے تھے، اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آپ کا مذہب مساواتِ انسانی اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے، اس لئے بنو نضیر کے ظلم سے بچنے کے لئے ان کو ایک سہارا ملا اور انھوں نے دوگنی دیت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم تم ایک ہی خاندان سے ہیں، ایک ہی وطن کے باشندے ہیں، اور ہم دونوں کا مذہب بھی ایک یعنی یہودیت ہے، یہ غیر منصفانہ معاملہ جو آج تک تمہاری زبردستی اور ہماری کمزوری کے سبب ہوتا رہا، اب ہم اس کو گوارا نہ کریں گے۔

اس جواب پر بنو نضیر میں اشتعال پیدا ہوا، اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، مگر کچھ بڑے بوڑھوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے، بنو قریظہ کی تو یہ عین مراد تھی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے ظلم کو برقرار نہ رکھیں گے، بنو نضیر بھی باہمی گفت و شنید اور صلح کی

یہ کہیں کہ میرے اس فیصلہ کو ماننے یا نہ ماننے کے لئے ابن صوریا کو حکم بنا دو، اور ابن صوریا کے
حالات و صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیئے، آپ نے آنے والے وفد سے کہا کہ
کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو جو سفید رنگ مگر ایک آنکھ سے معذور ہے، فدک میں رہتا ہے
جس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے، سب نے اقرار کیا، آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ اس کو
کیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ علماءِ یہود میں روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی عالم نہیں
آپ نے فرمایا، اس کو بلاؤ۔

چنانچہ وہ آ گیا، آپ نے اس کو قسم دے کر پوچھا کہ اس صورت میں تورات کا حکم کیا ہے؟
وہ بولا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم آپ نے مجھ کو دی ہے، اگر آپ قسم نہ دیتے اور
مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ غلط بات کہنے کی صورت میں تورات مجھے جلا ڈالے گی، تو میں یہ حقیقت
ظاہر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ حکم اسلام کی طرح تورات میں بھی یہی حکم ہے کہ ان دونوں
کو سنگسار کر کے قتل کرایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم پر کیا آفت آئی کہ تم تورات کے
حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو، ابن صوریا نے بتلایا کہ اصل بات یہ ہے کہ زنا کی سزا
شرعی تو ہمارے مذہب میں یہی ہے، مگر ہمارا ایک شہزادہ اس جرم میں مبتلا ہو گیا،
ہم نے اس کی رعایت کر کے چھوڑ دیا، سنگسار نہیں کیا، پھر یہی جرم ایک معمولی آدمی سے
سرزد ہوا، اور ذمہ داروں نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو مجرم کے جتھے کے لوگوں نے احتجاج
کیا کہ اگر شرعی سزا اس کو دینی ہے تو اس سے پہلے شہزادے کو دو، ورنہ ہم اس پر یہ
سزا جاری نہ ہونے دیں گے، یہ بات بڑھی تو سب نے مل کر صلح کر لی کہ سب کے لئے
ایک ہی ہلکی سزا تجویز کر دی جائے، اور تورات کا حکم چھوڑ دیا جائے، چنانچہ ہم نے کچھ
مار پیٹ اور منہ کالا کر کے جلوس نکالنے کی سزا تجویز کر دی، اور اب یہی سب میں رائج ہو گئی۔

خلاصۂ تفسیر

اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ کفر (کی باتوں) میں دوڑ دوڑ گرتے ہیں (یعنی
بے تکلف رغبت سے ان باتوں کو کرتے ہیں) آپ کو وہ مغموم نہ کریں (یعنی آپ اُن کے
کفریات سے مغموم و متاسف نہ ہوں) خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے منہ سے تو
(جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل یقین (یعنی ایمان) لائے نہیں
(مراد منافقین ہیں جو کہ ایک واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے)

اور خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو کہ یہودی ہیں (جیسا دوسرے واقعہ میں یہ لوگ حاضر ہوئے تھے) یہ دونوں قسم کے لوگ آپ سے دین کے باب میں اپنے علمائے محرفین سے غلط باتیں سننے کے عادی ہیں، اور انہی غلط باتوں کی تائید کی جستجو میں یہاں آکر آپ کی باتیں دوسری قوم کی خاطر سے کان دھر دھر کر سنتے ہیں جس قوم کے یہ حالات ہیں کہ (ایک تو) وہ آپ کے پاس (فرط تکبر و عداوت سے خود) نہیں آئے (بلکہ دوسروں کو بھیجا، اور دوسروں کو بھیجا بھی تو طلب حق کے لئے نہیں بلکہ شاید اپنے احکام محرفہ کے موافق کوئی بات مل جائے، کیونکہ پیٹتے ہیں) کلام الٰہی کو بعد اس کے کہ وہ کلام اپنے صحیح موقع پر (قائم) ہوتا ہے لفظاً یا معنیً دونوں طرح بدلتے رہتے ہیں (چنانچہ اسی عادت کے موافق خون بہا اور رجم کے حکم کو بھی اپنی رسم مخترع سے بدل دیا، پھر اس احتمال سے کہ شاید شریعت محمدیہ سے اس رسم کو سہارا لگ جائے یہاں اپنے جاسوسوں کو بھیجا، تیسرے صرف یہی نہیں کہ اپنی رسم محرف کے موافق بات کی تلاش ہی تک رہتے بلکہ ارادہ یہ ہے کہ جانے والوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو (وہاں جاکر) یہ حکم (محرف) ملے تب تو اس کو قبول کر لینا (یعنی اس کے موافق عملدرآمد کرنے کا اقرار کر لینا) اور اگر تم کو یہ حکم (محرف) نہ ملے تو اس کے قبول کرنے سے احتیاط رکھنا، پس اس کیفیت والی قوم میں جن کی جاسوسی کرنے یہ لوگ آئے ہیں چند خرابیاں ہوئیں، اول تکبر و عداوت جو سبب ہے خود حاضر نہ ہونے کا، دوسرے طلب حق نہ ہونا بلکہ حق کو محرف کرکے اس کی تائید کی فکر ہونا، تیسرے دوسروں کو بھی قبول حق سے روکنا، یہاں تک آنے والوں اور بھیجنے والوں کی الگ الگ مذمت تھی، آگے ان سب کی مذمت ہے) اور (اصل) یہ ہے کہ جس کا خراب (اور گمراہ) ہونا خدا ہی کو منظور ہو (گو یہ تخلیق منظور ہی اس گمراہ کے سوء اختیار کے بعد ہوتی ہے) تو اس کے لئے تم سے (اے عام مخاطب) تیرا کچھ زور نہیں چل سکتا کہ اس گمراہی کو نہ پیدا ہونے دے، یہ تو ایک عام قاعدہ ہوا اب یہ سمجھو کہ یہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ان کے دلوں کا (کفریات سے) پاک کرنا منظور نہیں ہوا (کیونکہ یہ عزم ہی نہیں کرتے اس لئے اللہ تعالیٰ تطہیر تحقیقی نہیں فرماتے بلکہ ان کے عزم گمراہی کی وجہ سے تخلیقاً ان کا خراب ہی ہونا منظور ہے، پس قاعدہ مذکور کے موافق کوئی شخص ان کو ہدایت نہیں کر سکتا، مطلب یہ ہوا کہ جب یہ خود خراب رہنے کا عزم رکھتے ہیں اور عزم کے بعد اس فعل کی تخلیق عادت الٰہیہ ہے اور تخلیق الٰہی کو کوئی روک نہیں سکتا، پھر ان کے ادھر آنے کی توقع کیا کی جائے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تسلی ہو سکتی ہے جس سے کلام شروع بھی ہوا تھا، پس آغاز و انجام کلام کا مضمون

کی بعثت کے بعد تمام پہلی شریعتیں اور ان کے قوانین منسوخ ہو چکے ہیں، بجز ان کے جن کو قرآن کریم اور شریعت مصطفوی میں باقی رکھا گیا ہے، اسی لئے بعد کی آیت میں قانون الٰہی کے خلاف کسی دوسرے قانون یا رسم و رواج پر فیصلہ صادر کرنے کو ظلم اور فسق وکفر قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے معاملات کا فیصلہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ یہودی جنھوں نے اپنے مقدمات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں بھیجا نہ ان کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان تھا، نہ یہ کہ مسلمانوں کے زیر حکم ذمی تھے، البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا معاہدہ ترک جنگ کا ہو گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں ٹال دیں اور چاہیں فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرما دیں کیونکہ ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری اسلامی حکومت پر نہیں ہے، اور اگر یہ ذمی ہوتے اور اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرتے تو حاکم مسلم پر فیصلہ کرنا فرض ہوتا، ٹال دینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ان کے حقوق کی نگرانی اور ان کو ظلم سے بچانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، جیسے مسلمانوں کے حقوق اور ان سے ظلم کا دفع کرنا حکومت اسلامیہ کا فرض ہے، اسی لئے آئندہ آنے والی ایک آیت میں یہ بھی ارشاد ہے: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ، یعنی اگر یہ لوگ اپنا معاملہ آپ کے پاس لائیں تو آپ اس کا فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرما دیں۔

اس آیت میں اختیار دینے کے بجائے ایک متعین فیصلہ کرنے کا ارشاد ہے، امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں ان دونوں کی تطبیق اسی طرح کی ہے کہ پہلی آیت جس میں اختیار دیا گیا ہے وہ ان غیر مسلموں سے متعلق ہے جو ہماری حکومت کے باشندے یا ذمی نہیں بلکہ آزاد جمہوریت ہوتے ہوئے ان سے کوئی معاہدہ ہو گیا ہے، جیسے بنو قریظہ و بنو نضیر کا حال تھا، کہ اسلامی حکومت سے ان کا اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا، کہ ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ جنگ نہ کرنے کے پابند ہو گئے تھے۔

اور دوسری آیت ان غیر مسلموں کے متعلق ہے جو مسلمانوں کے ذمی اسلامی مملکت کے شہری اور زیر حکومت رہتے ہیں۔

اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پہلی آیت اختیار اور دوسری آیت دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت یہ ہے کہ جب ان غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم یعنی اپنی شریعت کے مطابق کریں، ان غیر مسلموں کی خواہشات

یا اُن کے مذہب کے مطابق فیصلہ نہ دیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ یہ حکم ان معاملات کے متعلق ہے جن کا ذکر ان آیات کے شانِ نزول میں آپ سن چکے ہیں کہ ایک معاملہ تو یہ قتل و خون بہا کا تھا، دوسرا زنا اور اس کی سزا کا، ان جیسے معاملات یعنی جرائم کی سزاؤں میں ساری دنیا کا یہی دستور ہے کہ پورے ملک کا ایک ہی قانون ہوتا ہے جس کو جنرل قانون کہتے ہیں، اس جنرل قانون میں طبقات یا مذاہب کی وجہ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مثلاً چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، تو یہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ہر باشندۂ ملک کے لئے یہی سزا ہوگی، اسی طرح قتل و زنا کی سزائیں بھی سب کے لئے عام ہوں گی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر مسلموں کے شخصی اور خالص مذہبی معاملات کا فیصلہ بھی شریعتِ اسلام کے مطابق کرنا ضروری ہو۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب اور خنزیر کو مسلمانوں کے لئے تو حرام قرار دیا، اور اس پر سزا مقرر فرمائی، مگر غیر مسلموں کو اس میں آزاد رکھا، غیر مسلموں کے نکاح، شادی وغیرہ شخصی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں فرمائی، ان کے مذہب کے مطابق جو نکاح صحیح ہیں ان کو قائم رکھا۔

مقامِ ہجر کے مجوسی اور نجران اور وادی القریٰ کے یہودی و نصاریٰ اسلامی حکومت کے ذمی بنے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ مجوسیوں کے نزدیک اپنی ماں بہن سے بھی نکاح حلال ہے، اسی طرح یہود و نصاریٰ میں بغیر عدت گذارے یا بغیر گواہوں کے نکاح معتبر ہے، مگر آپ نے ان کے شخصی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرمائی اور ان کے نکاحوں کو برقرار تسلیم کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے باشندے ہیں ان کے شخصی اور ذاتی اور مذہبی معاملات کا فیصلہ انہی کے مذہب و خیال پر چھوڑا جائے گا، اور اگر ایسے مقدمات کی ضرورت پیش آئے گی تو انہی کے مذہب کا حاکم مقرر کرکے فیصلہ کرایا جائیگا۔

البتہ اگر یہ حاکمِ مسلم کے پاس رجوع ہوں اور اس کے فیصلہ پر فریقین رضامند ہوں تو پھر مسلم حاکم فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق ہی کرے گا، کیونکہ اب وہ فریقین کی طرف سے بنائے ہوئے ثالث کا حکم رکھتا ہے، آیت کریمہ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ جو آگے آنے والی ہے، اس میں شریعتِ اسلام کے مطابق فیصلہ دینے کا حکم جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے یا تو اس بنا پر کہ معاملہ قانونِ عام یعنی جنرل قانون کا ہے جس میں کسی فرقہ کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، اور یا اس بنا پر کہ یہ لوگ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو حکم تسلیم کر کے آپ ہی سے فیصلہ کرنے کے لئے آنے تو ظاہر ہے کہ آپ کا فیصلہ وہی ہونا چاہئے جس پر آپ کا ایمان ہے اور آپ کی شریعت کا حکم ہے۔

بہرحال آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، اس کے بعد یہودیوں کی سازش سے آپ کو باخبر کیا گیا، يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ سے آخر تک اسی کا بیان ہے، جس سے یہ منکشف کر دیا گیا کہ آپ کی خدمت میں آنے والا وفد منافقین کا ہے، جن کا خفیہ گٹھ جوڑ یہودیوں کے ساتھ اور انہی کا بھیجا ہوا آرہا ہے، اس کے بعد آنے والے وفد کی چند بری خصلتوں کا بیان فرما کر مسلمانوں کو اس کی برائی پر متنبہ فرمایا اور ضمنی طور پر یہ ہدایت فرما دی کہ یہ خصلتیں کافرانہ ہیں، ان سے بچنے اور دور رہنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہود کی ایک بری خصلت

پہلی خصلت یہ بتلائی سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ یعنی یہ لوگ جھوٹی اور غلط باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے کو مذہب کہلانے والے غدار یہودیوں کے ایسے اندھے متبع ہیں کہ احکام تورات کی کھلی خلاف ورزی دیکھنے کے باوجود ان کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور ان کی غلط سلط بیان کی ہوئی کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔

عوام کے لئے علماء کے اتباع کا ضابطہ

اس میں جس طرح تحریف کرنے والوں اور احکام خدا و رسول میں غلط چیزیں شامل کرنے والوں کے لئے وعید ہیں، اسی طرح ان لوگوں کو بھی سخت مجرم قرار دیا ہے جو ایسے لوگوں کو امام بنا کر غلط اور غلط روایات سننے کے عادی ہو گئے ہیں، اس میں مسلمانوں کے لئے ایک اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگرچہ جاہل عوام کے لئے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کریں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے، کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لئے کونسا ڈاکٹر ماہر ہے، کونسا حکیم اچھا ہے، اس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں، اس کے مطب میں جانے والے زیر علاج لوگوں پر کیا گذرتی ہے، یہی ممکنی تحقیق کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہوتا، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا، اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خودکشی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لئے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انھوں نے اپنی بستی کے

اہل علم و فن و تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدیٰ بنایا اور اس کے فتوے پر عمل کیا تو وہ عند اللہ بھی معذور سمجھا جائے گا۔ اور عند اللہ بھی ایسے ہی معاملہ کے متعلق حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، فَإِنَّ إِثْمَهُ عَلَى مَنْ أَفْتَى، یعنی ایسی صورت میں اگر عالم اور مفتی نے غلطی کرلی اور کسی مسلمان نے اس کے غلط فتوے پر عمل کرلیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اس عالم و مفتی پر ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو یا ممکن غور و خوض میں کمی کی ہو یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا اور لوگوں کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم و مقتدیٰ قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے، اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی اور عالم پر نہیں بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے جس نے تحقیق کے بغیر اپنے دین کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالہ کردی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد قرآنی آیا ہے سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ، یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم عمل و امانت و دیانت کی تحقیق کئے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوتے ہیں اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ حال یہودیوں کا بیان کیا ہے، اور مسلمانوں کو سنایا ہے کہ وہ اس سے محفوظ رہیں لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بہت بڑی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار، چست و چالاک ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو بہتر سے بہتر ڈاکٹر حکیم کو تلاش کرتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل بیرسٹر ڈھونڈھتے ہیں، کوئی مکان بناتا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکیٹکٹ اور انجینیر کا سراغ لگا لیتے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور کرتہ دیکھا اور کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن لیا، اس کو مقتدا، عالم، مفتی، رہبر بنا لیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس نے باقاعدہ کسی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے یا نہیں؟ علماء ماہرین کی خدمت میں رہ کر علمِ دین کا کچھ ذوق پیدا کیا ہے یا نہیں؟ کچھ علمی خدمت کی ہیں یا نہیں، اچھے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر تقویٰ و طہارت پیدا کی ہے یا نہیں؟

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل واعظوں اور ڈھونگ رچانے والے پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جا پڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ رسمیں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر

زندہ ہیں، وہ خوش ہیں کہ ہم دین پر چل رہے ہیں، وہ بڑی عبادت کر رہے ہیں، مگر حقیقت وہ ہوتی ہے جس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا، یعنی وہ لوگ ہیں جنکی سعی و عمل دنیا ہی میں برباد ہو چکی ہے، اور وہ اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا عمل کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان منافق یہودیوں کا حال سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ کے لفظوں میں بیان کر کے ایک تو ان کی برائی اور بدحالی بتلا دی، کہ جاہل عوام کو علماء کی پیروی تو ناگزیر ہے مگر ان پر لازم ہے کہ بعد تحقیق کسی کو عالم و مستند قرار دیں اور ناواقف لوگوں سے غلط سلط باتیں سننے کے عادی نہ ہو جائیں۔

یہود کی ایک دوسری بری خصلت ان منافقین کی دوسری بری خصلت یہ بتلائی کہ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ، یعنی یہ لوگ بظاہر تو آپ سے ایک دینی معاملہ کا حکم پوچھنے آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا مقصد نہ دین ہے، نہ دینی معاملہ کا حکم معلوم کرنا ہے، بلکہ یہ ایک ایسی یہودی قوم کے جاسوس ہیں جو اپنے تکبر کی وجہ سے آپ تک خود نہیں آئے، ان کی خواہش کے مطابق صرف یہ چاہتے ہیں کہ سزائے زنا کے بارے میں آپ کا نظریہ معلوم کر کے ان کو بتلا دیں، پھر ماننے نہ ماننے کا فیصلہ خود کریں گے، اس میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ کسی عالم دین سے فتویٰ دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دریافت کرنے والے کی نیت حکم خدا و رسول کو معلوم کر کے اس کا اتباع کرنا ہو، محض مفتیوں کی رائے معلوم کر کے اپنی خواہش کے موافق حکم تلاش کرنا کھلا ہوا اتباعِ نفس شیطان ہے اس سے بچنا چاہئے۔

تیسری بری خصلت، کتاب اللہ کی تحریف تیسری بری خصلت ان لوگوں کی یہ بیان فرمائی کہ یہ لوگ اللہ کے کلام کو اس کے موقع سے ہٹا کر غلط معنی پہناتے اور احکامِ خداتعالیٰ کی تحریف کرتے ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ تورات کے الفاظ میں کچھ رد و بدل کر دیں، اور یہ بھی کہ الفاظ تو وہی رہیں اُن کے معنی میں لغو قسم کی تاویل و تحریف کریں، یہودی ان دونوں قسموں کی تحریف کے عادی ہیں۔

مسلمانوں کے لئے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے، اس میں لفظی تحریف کی تو کوئی جرأت نہیں کر سکتا، کہ لکھے ہوئے صحیفوں کے علاوہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ کلام میں ایک زیر و زبر کی غلطی کوئی کرتا ہے

تو فوراً پکڑا جاتا ہے، معنوی تحریف بظاہر کی جا سکتی ہے اور کرنے والوں نے کی بھی ہے، مگر اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا ہے کہ اس امت میں قیامت تک ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو قرآن و سنت کے صحیح مفہوم کی حامل ہوگی، اور تحریف کرنے والوں کی قلعی کھول دے گی۔

چوتھی بری خصلت رشوت خوری

دوسری آیت میں ان کی ایک اور بری خصلت یہ بیان فرمائی ہے: اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ، یعنی یہ لوگ سحت کھانے کے عادی ہیں، سحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں، اسی معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ یعنی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تمہارا استیصال کر دے گا، یعنی تمہاری جڑ بنیاد ختم کر دی جائے گی، قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سحت سے مراد رشوت ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ابراہیم نخعی، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس کی تفسیر رشوت سے کی ہے۔

رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے بلکہ پورے ملک و ملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور قانونِ ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک و ملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لئے شریعت اسلام میں اس کو سحت فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے امراء و حکام کو جو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دیکر حرام کر دیا گیا ہے (جصاص)

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں، اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے (جصاص)

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہو اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رُو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے، یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے، یا صوم و صلوٰۃ

اور حج اور تلاوتِ قرآن عبادات ہیں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، اُن پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے، تعلیمِ قرآن اور امامت اس سے مستثنیٰ ہیں کما فی فتوی المتاخرین۔

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت لینے کا گناہگار ہی، اور یہ مال اس کے لئے سُحت اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوسرا شدید جرم حق تلفی اور حکمِ خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ

ہم نے نازل کی توریت کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر

الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا

جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم اس واسطے

اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا

کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے سو تم نہ

تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ

ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا،

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۴۴﴾

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں کافر،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ

اور لکھ دیا ہم نے اُن پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ،

وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن

اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر، پھر

تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ

جس نے معاف کر دیا تو وہ گناہ سے پاک ہو گیا اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے

اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم

اتارا سو وہی لوگ ہیں ظالم اور پیچھے بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر

بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَ

عیسیٰ مریم کے بیٹے کو تصدیق کرنے والا توریت کی جو آگے سے تھی اور

اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

اس کو دی ہم نے انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے

يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ط

اگلی کتاب توریت کی اور راہ بتلانے والی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۗ وَمَنْ لَّمْ

اور چاہئے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اس میں اور جو کوئی حکم

يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ

نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان ۔ اور

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ

مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ

کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا

اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۗ لِكُلٍّ

اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا رستہ جو تیرے پاس آیا ہر ایک کو

جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا

دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے اپنے دیئے ہوئے حکموں میں سو تم دوڑ کر

الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

لو خوبیاں اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے پھر جتا دے گا جس بات میں

فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

تم کو اختلاف تھا اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ

اور مت چل اُن کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں کسی ایسے حکم سے جو

اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ

اللہ نے اُتارا تجھ پر پھر اگر نہ مانیں تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے کہ پہنچائے

يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

ان کو کچھ سزا اُن کے گناہوں کی اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان ۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنیوالا

لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

یقین کرنیوالوں کے واسطے

ع ۷
۱۱

خلاصۂ تفسیر

ربط یہ سورۂ مائدہ کا ساتواں رکوع ہے اس میں حق تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کو یکجائی طور پر ایک اہم اور خاص حکمِ شرعی پر متنبہ فرمایا ہے، جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں متفرق طور پر .... اوپر سے چلا آیا ہے، اور وہ معاملہ ہے اللہ جل شانہٗ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کا اور اس کے بھیجے ہوئے احکام میں تغیر و تبدل اور تحریف و تاویل کا جو یہود و نصاریٰ کی دائمی خصلت و عادت بن گیا تھا۔

اس رکوع میں حق تعالیٰ نے اوّل اہلِ تورات یہود کو مخاطب فرما کر ان کو اس کج روی اور اس کے انجامِ بد پر ابتدائی دو آیتوں میں متنبہ فرمایا، اور اس کے ضمن میں قصاص کے متعلق بعض احکام بھی اس مناسبت سے ذکر فرما دیئے کہ پچھلی آیتوں میں جو واقعہ یہود کی سازش کا ذکر کیا گیا ہے وہ قصاص کے متعلق تھا کہ بنو نضیر دیت اور قصاص میں مساوات کے قائل نہ تھے بلکہ بنو قریظہ کو اپنے سے کم دیت لینے پر مجبور کر رکھا تھا، ان دونوں آیتوں میں یہود کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا کرنے والوں کو کافر اور ظالم قرار دیا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں اہلِ انجیل نصاریٰ کو اسی مضمون کا خطاب فرما کر اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے خلاف کوئی قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا

کرنے والوں کو سرکش و نافرمان قرار دیا۔

اس کے بعد چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر مسلمانوں کو اسی مضمون کے متعلق ہدایات دی گئیں کہ وہ اہل کتاب کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہوجائیں کہ جاہ و مال کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدلنے لگیں، یا اس کے قانون کے خلاف کوئی قانون اپنی طرف سے جاری کرنے لگیں۔

اس کے ضمن میں ایک اور اہم اصولی مسئلہ یہ بھی بیان فرمادیا کہ اگرچہ اصول عقائد اور اطاعت حق جل شانہ کے معاملے میں تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی طریقہ کے پابند ہیں، لیکن بمقتضائے حکمت ہر پیغمبر کو اس کے زمانہ کی مناسب شریعت دی گئی جن میں بہت سے فروعی اور جزوی احکام مختلف ہیں، اور یہ بتلایا کہ ہر پیغمبر کو جو شریعت دی گئی اس کے زمانہ میں وہی مقتضائے حکمت اور واجب الاتباع تھی، اور جب اس کو منسوخ کرکے دوسری شریعت لائی گئی تو اس وقت وہی عین حکمت و مصلحت اور واجب الاتباع ہوگئی، اس میں شریعتوں کے مختلف ہوتے رہنے اور بدلتے رہنے کی ایک خاص حکمت **کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔**

ہم نے (موسیٰ علیہ السلام پر) توریت نازل فرمائی تھی جس میں (عقائد صحیحہ کی بھی) ہدایت تھی اور (احکام عملیہ کا بھی) وضوح تھا، انبیاء (بنی اسرائیل) جو کہ (باوجود لاکھوں آدمیوں کے مقتدا و مطاع ہونے کے، اللہ تعالیٰ کے) مطیع تھے اس (توراۃ) کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور (اسی طرح ان میں کے) اہل اللہ اور علماء بھی (اسی کے موافق کہ وہی اس وقت کی شریعت تھی حکم دیتے تھے) بوجہ اس کے کہ ان (اہل اللہ و علماء) کو اس کتاب اللہ (پر عمل کرنے اور کرانے) کی نگہداشت کا حکم (حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے) دیا گیا تھا، اور وہ اس کے (یعنی اس پر عمل کرنے کرانے کے) اقراری ہوگئے تھے (یعنی چونکہ ان کو اس کا حکم ہوا تھا اور انہوں نے اس حکم کو قبول کرلیا تھا، اس لئے ہمیشہ اس کے پابند رہے) سو (اے اس زمانہ کے رؤساء علماء یہود جب ہمیشہ سے تمہارے سب مقتدا توراۃ کو مانتے آئے ہیں تو) تم بھی (تصدیق رسالت محمدیہ کے باب میں جس کا حکم توریت میں ہے) لوگوں سے (یہ) اندیشہ مت کرو (کہ ہم تصدیق کرلیں گے تو عام لوگوں کی نظر میں ہماری جاہ میں فرق آئے گا) اور (صرف) مجھ سے ڈرو (کہ تصدیق نہ کرنے پر سزا دوں گا) اور میرے احکام کے بدلہ میں (دنیا کی) متاع قلیل (جو کہ تم کو اپنے عوام سے وصول ہوتی ہے) مت لو (کہ یہی حبِ جاہ و حبِ مال تم کو باعث

ہوتی ہیں تصدیق نہ کرنے پر ... (اور یاد رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (بلکہ غیر حکم شرعی کو قصداً حکمِ شرعی بتلا کر اس کے موافق حکم کرے) سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں (جیسا اے یہود تم کر رہے ہو کہ عقائد میں بھی مثل عقیدۂ رسالتِ محمدیہ اور اعمال میں بھی جیسے حکم رجم وغیرہ اپنے مخترعات کو حکمِ الٰہی بتلا کر ضلال و اضلال میں مبتلا ہو رہے ہو) اور ہم نے ان (یہود) پر اس (توراۃ) میں یہ بات فرض کی تھی کہ (اگر کوئی کسی کو ناحق عمداً قتل یا زخمی کرے اور صاحب حق دعویٰ کرے تو) جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور (اسی طرح دوسرے) خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے پھر جو شخص (اس قصاص یعنی بدلہ لینے کا مستحق ہو کر بھی) اس (قصاص) کو معاف کر دے وہ (معاف کرنا) اس (معاف کرنے والے) کے لئے (اس کے گناہوں کا) کفارہ (یعنی گناہوں کے دور ہونے کا سبب) ہو جائیگا (یعنی معاف کرنا موجب ثواب ہے) اور (چونکہ یہود نے ان احکام کو چھوڑ رکھا تھا اس لئے مکرر وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (جس کے معنے اوپر گذرے) سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھا رہے ہیں (یعنی بہت برا کام کر رہے ہیں) اور ہم نے ان (نبیوں) کے پیچھے (جن کا ذکر يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ میں آیا ہے) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو اس حالت میں (پیغمبر بنا کر) بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے (جو کہ لوازمِ رسالت سے ہے کہ تمام کتبِ الٰہیہ کی تصدیق کرے) اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں (توریت ہی کی طرح عقائد صحیحہ کی بھی) ہدایت تھی اور (احکامِ عملیہ کا بھی) وضوح تھا اور وہ (انجیل) اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق (بھی) کرتی تھی (کہ یہ بھی لوازمِ کتاب الٰہی سے ہے) اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اور ہم نے انجیل دے کر حکم کیا تھا کہ) انجیل والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں اور (اے اس زمانہ کے نصاریٰ سُن رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (اور اس کے معنی اوپر گذر چکے ہیں) تو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں (اور انجیل رسالتِ محمدیہ کی خبر دے رہی ہے، تو تم اس کے خلاف کیوں چل رہے ہو) اور (توراۃ و انجیل کے بعد) ہم نے یہ کتاب (مسمّی بقرآن) آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق (و راستی) کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو (آسمانی) کتابیں (آچکی) ہیں (جیسے توراۃ و انجیل و زبور) ان کی بھی تصدیق کرتی ہے'

(کہ وہ منزل من اللہ ہیں) اور (چونکہ وہ کتاب مسمیٰ بالقرآن قیامت تک محفوظ و معمول بہ ہے اور اس میں ان کتب سماویہ کی تصدیق موجود ہے اس لئے وہ کتاب) ان کتابوں (کے صادق ہونے کے مضمون) کی (ہمیشہ کے لئے) محافظ ہے (کیونکہ قرآن میں ہمیشہ یہ محفوظ رہے گا کہ وہ کتب منزل من اللہ ہیں جب قرآن ایسی کتاب ہے) تو ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات میں (جب کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی (خلافِ شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عمدرآمد نہ کیجئے (جیسا اب تک باوجود ان کی درخواست و التماس کے آپ نے صاف انکار فرمایا، یعنی یہ آپ کی رائے نہایت ہی درست ہے، اسی پر ہمیشہ قائم رہئے، اور اے اہلِ کتاب تم کو اس قرآن کے حق جاننے سے اور اس کے فیصلہ کو ماننے سے کیوں انکار ہے؟ کیا دین جدید کا آنا کچھ تعجب کی بات ہے؟ آخر) تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے (اس کے قبل) ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی (مثلاً یہود کی شریعت و طریقت تورات تھی، اور نصاریٰ کی شریعت اور طریقت انجیل تھی، پھر اگر امت محمدیہ کے لئے شریعت و طریقت قرآن مقرر کیا گیا، جس کا حق ہونا بھی دلائل سے ثابت ہے تو وجہ انکار کیا) اور اگر اللہ تعالیٰ کو (سب کا ایک ہی طریقہ رکھنا) منظور ہوتا تو (وہ اس پر بھی قدرت رکھتے تھے کہ) تم سب (یہود و نصاریٰ و اہلِ اسلام) کو (ایک ہی شریعت دے کر) ایک ہی امت میں کر دیتے (اور شرع جدید نہ آتی جس سے تم کو توحش ہوتا ہے) لیکن (بنی حکمت کے) ایسا نہیں کیا (بلکہ ہر امت کو جدا جدا طریقہ دیا) تاکہ جو دین تم کو (ہر زمانہ میں نیا نیا) دیا ہے اس میں تم سب کا (تمہارے انہار اطاعت کے لئے) امتحان فرما دیں (کیونکہ اکثر طبعی امر ہے کہ نئے طریقہ سے وحشت اور مخالفت کی طرف حرکت ہوتی ہے، لیکن جو شخص عقل صحیح و انصاف سے کام لیتا ہے، وہ اس ظہورِ حقیقت کے بعد اپنی طبیعت کو موافقت پر مجبور کر دیتا ہے اور یہ ایک امتحان عظیم ہے، پس اگر سب کی ایک ہی شریعت ہوتی تو اس شریعت کی ابتداء کے وقت جو لوگ ہوتے ان کا امتحان تو ہو جاتا، لیکن دوسرے جو ان کے مقلد و اس طریق سے مالوف ہوتے ان کا امتحان نہ ہوتا، اور اب ہر امت کا امتحان ہو گیا، اور امتحان کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو جس چیز سے روکا جائے خواہ معمول ہو یا متروک اس پر حرص ہوتی ہے، اور یہ امتحان شرائع کے تعدد میں اقویٰ ہے کہ منسوخ سے روکا جاتا ہے، اور شریعت کے اتحاد میں گو معاصی سے

روک دے لیکن ان میں حقیقت کا تو شبہ نہیں ہوتا، اس لئے امتحان اس درجہ کا نہیں، ان
دونوں امتحانوں کا مجموعہ ہر امت کے سلف اور خلف سب کو عام ہوگیا، جیسا کہ صورت
اول کو صرف سلف سے خصوصیت ہے، پس جب شرع جدید میں یہ حکمت ہے)، تو
(تعصب کو چھوڑ کر) مفید باتوں کی طرف (یعنی ان عقائد و اعمال و احکام کی طرف جن پر
قرآن مشتمل ہے) دوڑو (یعنی قرآن پر ایمان لا کر اس پر چلو ایک روز) تم سب
کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم (باوجود وضوح حق
کے دنیا میں خواہ مخواہ) اختلاف کیا کرتے تھے (اس لئے اس اختلاف بے جا کو چھوڑ کر
حق کو جو کہ اب منحصر ہے قرآن میں قبول کرلو)، اور (چونکہ ان اہل کتاب نے ایسی بلند پروازی
کی کہ آپ سے درخواست اپنے موافق مقدمہ طے کردینے کی کرتے ہیں، جہل کہ اس کا
احتمال ہی نہیں، اس لئے ان کے حوصلے پست کرنے کو اور اس کو سنا کر ہمیشہ ہمیشہ ان
کے ناامید کرنے کو ہم (مکرر) حکم دیتے ہیں کہ آپ ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات
میں (جب کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ
فرمایا کیجئے اور ان کی (خلاف شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عملدرآمد
نہ کیجئے (جیسا اب تک کبھی نہیں کیا)، اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے (آئندہ بھی مثل
سابق) احتیاط رکھئے کہ وہ آپ کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی بچلا دیں
(یعنی گو اس کا احتمال نہیں لیکن اس کا قصد بھی رہے تو موجب ثواب بھی ہے) پھر
(باوجود وضوح قرآن اور اس کے فیصلہ کے حق ہونے کے بھی)، اگر یہ لوگ (قرآن سے
اور آپ کے فیصلہ سے جو موافق قرآن کے ہوگا) اعراض کریں تو یقین کرلیجئے کہ بس خدا
ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعضے جرموں پر ان کو دنیا ہی میں سزا دیدیں (اور وہ بعض
جرم فیصلہ نہ ماننا ہے اور جرم نفس قرآن کے نہ ماننے کی سزا پوری آخرت میں ملے گی،
کیونکہ پہلا جرم ذمی ہونے کے خلاف ہے، اور دوسرا جرم ایمان کے خلاف، ذمیت کی سزا دنیا میں
ہوتی ہے اور کفر کی سزا آخرت میں، چنانچہ یہودیوں کی عہد شکنی ثابت ہوگئی تو ان کو سزا قتل اور قید اور اخراج
وطن کی دی گئی)، اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہ حالات سن کر آپ کو رنج ضرور
ہوگا، لیکن آپ زیادہ غم نہ کیجئے کیونکہ) زیادہ آدمی تو (دنیا میں ہمیشہ سے) بے حکم ہی
ہوتے (آئے) ہیں، یہ لوگ (فیصلہ قرآنی سے جو کہ عین عدل ہے اعراض کرکے) پھر کیا
زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (جس کو انھوں نے برخلاف شرائع سماویہ کے خود تجویز
کرلیا تھا، جس کا ذکر دو واقعوں کے ضمن میں اس رکوع سے پہلے رکوع یا ایہا الرسول

کی تمہید میں گذر چکا ہے، حالانکہ وہ سراسر عدل و دلیل کے خلاف ہے، یعنی اہل علم ہو کر علم سے اعراض کرنا اور جہل کا طالب ہونا عجب در عجب ہے) اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا فیصلہ کرنے والا ہوگا (بلکہ کوئی مساوی بھی نہیں، پس خدائی فیصلہ کو چھوڑ کر دوسرے کے فیصلہ کا طالب ہونا عین جہل نہیں تو کیا ہے، لیکن یہ بات بھی یقین (وایمان) رکھنے والوں (ہی) کے نزدیک (کیونکہ اس کا سمجھنا موقوف ہے قوت عقلیہ کی صحت پر اور وہ کفار اس سے بے نصیب ہیں)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ، "یعنی ہم نے اپنی کتاب تورات بھیجی جس میں حق کی طرف رہنمائی اور ایک خاص نور تھا" اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ آج جو شریعت تورات کو منسوخ کیا جا رہا ہے تو اس میں تورات کی کوئی تنقیص نہیں، بلکہ تغیر زمانہ کے سبب تغیر احکام کی ضرورت کے ماتحت ایسا کیا گیا، ورنہ تورات بھی ہماری نازل کردہ کتاب ہے، اس میں بنی اسرائیل کے لئے اصول ہدایت بھی مذکور ہیں، اور ایک خاص نور بھی ہے، جو روحانی طور پر ان کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ، "یعنی تورات کو ہم نے اس لئے نازل کیا تھا کہ جب تک اس کی شریعت کو منسوخ نہ کیا جائے اس وقت تک آنے والے انبیاء اور ان کے نائب اللہ والے اور علماء سب اسی تورات کے مطابق فیصلے کیا کریں، اسی قانون کو دنیا میں چلایا کریں، اس میں انبیاء علیہم السلام کے نائبین کو دو قسموں میں ذکر فرمایا ہے، پہلے ربّٰنیّون دوسرے احبار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ والا اور احبار، حبر کی جمع ہے، یہود کے محاورہ میں عالم کو حبر کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو اللہ والا ہو گا ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہو سکتا، اور بغیر احکام الٰہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ والا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، ورنہ وہ عالم جو احکام الٰہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض وواجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ و رسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے

مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرما کر اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ اگرچہ اللہ والے کے لئے علم ضروری ہے اور عالم کے لئے عمل ضروری ہے، لیکن جس پر جس رنگ کا غلبہ ہو اس کے اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات و عمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہے، اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کر لیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص علمی مہارت پیدا کر کے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض و واجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت و طریقت اور علماء و مشائخ کی اصلی وحدت کو بھی بتلا دیا، اور طریقۂ کار اور غالب مشغلہ کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کر دیا جس سے معلوم ہوگیا کہ علماء اور صوفیہ کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لئے اُن کے طریق کار صورۃً متغایر نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ، یعنی یہ انبیاء اور ان کے دونوں قسم کے نائبین علماء و مشائخ تورات کے احکام جاری کرنے کے پابند اس لئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی حفاظت ان کے ذمہ لگا دی تھی اور انہوں نے اس کی حفاظت کا عہد و پیمان کر لیا تھا۔

یہاں تک تورات کے کتاب الٰہی ہونے اور ہدایت و نور ہونے کا اور اس کا ذکر تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیچھے نائبین مشائخ اور علماء نے اس کی حفاظت فرمائی، اس کے بعد موجودہ زمانے کے یہودیوں کو ان کی کجروی پر اور اس کجروی کے اصلی سبب پر متنبہ فرمایا گیا کہ تم نے بجائے اس کے کہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر تورات کی حفاظت کرتے، اس کے احکام میں تحریف و تغییر و تبدیل کر دیا، تورات میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر اور یہود کو ان پر ایمان لانے کی ہدایت مذکور تھی، ان لوگوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بجائے آپ کی مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی ان کی اس مسلک غلطی کا سبب بھی بیان فرما دیا، کہ وہ محرک حب جاہ اور حب مال ہے، تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق جاننے کے باوجود آپ سے

اتباع سے اس لئے گھبراتے ہو کہ اب تو تم اپنی قوم کے مقتدا مانے جاتے ہو، یہودی عوام تمہارے پیچھے چلتے ہیں، اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو تم ایک فرد مسلم کی حیثیت میں آجاؤ گے، یہ چودھراہٹ ختم ہو جائے گی، دوسرے ان لوگوں نے یہ پیشہ بنا لیا تھا کہ بڑے لوگوں سے رشوت لے کر ان کے لئے احکام تورات میں تحریف کر کے آسانیاں پیدا کر دی تھیں، اس پر متنبہ فرمانے کے لئے موجودہ زمانہ کے یہود کو فرمایا:

وَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ یعنی تم لوگوں سے نہ ڈرو کہ وہ تمہارا اتباع چھوڑ دیں گے یا مخالف ہو جائیں گے، اور تم دنیا کی متاع قلیل کے لئے حکم الٰہی میں گڑبڑ نہ کرو کہ یہ تمہارے لئے دین و دنیا کی بربادی ہے کیونکہ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ، یعنی جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو واجب نہیں سمجھتے اور ان پر فیصلہ نہیں دیتے بلکہ ان کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں، وہ کافر منکر ہیں جن کی سزا دائمی عذاب جہنم ہے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں احکام قصاص اسی حوالے سے بیان کئے گئے ہیں کہ ہم نے یہ احکام تورات میں نازل کئے ہیں، ارشاد ہے: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ، یعنی ہم نے یہود کے لئے تورات میں یہ حکم قصاص نازل کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بدلہ ہے۔

بنو قریظہ، بنو نضیر کا جو مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا کہ بنو نضیر نے اپنی قوت و شوکت کے دباؤ سے بنو قریظہ کو اس پر مجبور کر رکھا تھا کہ بنو نضیر کے کسی آدمی کو ان کا آدمی قتل کر دے تو اس کا قصاص بھی جان کے بدلے جان سے لیا جائے اور اس کے علاوہ خون بہا یعنی دیت بھی لی جائے، اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ بنو نضیر کا آدمی بنو قریظہ کے آدمی کو مار ڈالے تو کوئی قصاص نہیں، صرف دیت یعنی خون بہا دیا جائے وہ بھی بنو نضیر سے آدھا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی اس چوری کا پردہ چاک کر دیا کہ خود تورات میں بھی قصاص اور دیت کی مساوات کے احکام موجود ہیں یہ لوگ جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتے ہیں، اور محض حیلہ جوئی کے لئے اپنا مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس لاتے ہیں۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ یعنی جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر حکم نہ دیں وہ ظالم ہیں، کیونکہ احکام خداوندی کے منکر اور باغی ہیں۔ تیسری آیت میں اول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ذکر ہے کہ وہ پچھلی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، پھر انجیل کا ذکر ہے کہ وہ بھی تورات کی طرح ہدایت اور نور ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا کہ اہل انجیل کو چاہئے کہ جو قانون اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے اس کے مطابق احکام نافذ کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم جاری کریں وہ نافرمان اور سرکش ہیں۔

قرآن تورات و انجیل کا بھی محافظ ہے

پانچویں اور چھٹی آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جو اپنے سے پہلی کتابوں تورات و انجیل کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان کا محافظ بھی ہے، کیونکہ جب اہل تورات نے تورات میں اور اہل انجیل نے انجیل میں تحریف اور تغیر و تبدل کیا تو قرآن ہی وہ محافظ و نگراں ثابت ہوا جس نے ان کی تحریفات کا پردہ چاک کرکے حق اور حقیقت کو روشن کر دیا اور تورات و انجیل کی اصل تعلیمات آج بھی قرآن ہی کے ذریعہ دنیا میں باقی ہیں جبکہ ان کتابوں کے وارثوں اور ان کی پیروی کے مدعیوں نے اُن کا حلیہ ایسا بگاڑ دیا ہے، کہ حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہوگیا، آخر آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی حکم دیا گیا جو اہل تورات و اہل انجیل کو دیا گیا تھا، کہ آپ کے احکام اور فیصلے سب اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق ہونے چاہئیں، اور یہ لوگ جو آپ سے اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے ہیں ان کے مکر سے باخبر رہیں، اس ارشاد کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یہود کے چند علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء اور پیشوا ہیں، اگر ہم مسلمان ہوگئے تو وہ بھی سب مسلمان ہوجائیں گے لیکن ہماری ایک شرط یہ ہے کہ ہمارا ایک مقدمہ آپ کی قوم کے لوگوں کے ساتھ ہے ہم یہ مقدمہ آپ کے پاس لائیں گے، آپ اس میں فیصلہ ہمارے موافق فرما دیں، تو ہم مسلمان ہوجائیں گے، حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے مسلمان ہوجانے کے پیش نظر عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف فیصلہ ہرگز نہ دیں، اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مسلمان ہوں گے یا نہیں۔

شرائع انبیاء میں جزوی اختلاف: اس آیت میں دوسری ہدایت کے ساتھ ایک اہم اصولی سوال کا اور اس کی حکمت کا جواب بھی بیان فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ جب تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، اور ان پر نازل ہونے والی کتابیں اور صحیفے اور ان کی شریعتیں سب اللہ جل شانہ کی ہی طرف سے ہیں، تو پھر ان کی کتابوں اور شریعتوں میں اختلاف کیوں ہے، اور آنے والی شریعت و کتاب پچھلی شریعت و کتاب کو منسوخ کیوں کرتی ہے، اس کا جواب مع حکمت خداوندی کے اس آیت میں بیان کیا گیا، یعنی جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ، یعنی ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص طریق عمل بنایا ہے، جس میں اصول مشترک اور متفق علیہ ہونے کے باوجود فروعی احکام میں کچھ اختلافات بمصلحت ہوتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت یک رنگ ملت بنا دیتا، سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی، کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش برآواز رہتے ہیں کہ جو حکم ملے اس کی تعمیل کریں، جو نئی کتاب یا شریعت آئے اس کا اتباع کریں، اور پچھلی شریعت و کتاب ان کو کتنی محبوب ہو، اور آبائی مذہب ہو جانے کے سبب اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو، مگر وہ ہر وقت گوش برآواز اطاعت کے لئے تیار رہتے ہیں، اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنا بیٹھے اور اس کو ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے لئے ہوئے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے۔

اختلاف شرائع میں یہ ایک بڑی حکمت ہے جس کے ذریعہ ہر زمانہ ہر طبقہ کے لوگوں کو صحیح عبادت و عبودیت کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے، کہ درحقیقت عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کا، جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا ذکر و تلاوت میں منحصر نہیں، اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقصد ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک حکم الٰہی کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کار ثواب نہیں بلکہ الٹا گناہ کا موجب ہے، ایام عیدین وغیرہ جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں میدان عرفات میں جمع ہو کر دعاء و عبادت کرنا کار ثواب نہیں جبکہ

نویں ذی الحجہ میں سب سے بڑی عبادت یہی ہو، اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال ہو، جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں، اور جب اور جس حد پر ان کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، جاہل عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، جو عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں بلکہ جن قومی رسوم کو وہ عبادات سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، صریح احکامِ خدا و رسول کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز کر دیتے ہیں یہیں سے بدعات و محدثات دین کا جزو بن جاتی ہیں جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب ہوئی ہیں، اللہ جل شانہ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہو کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصود نہ بنالیں، بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جس عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔

اس کے علاوہ اختلافِ شرائع کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر دور اور ہر طبقہ کے انسانوں کے مزاج و طبائع مختلف ہوتی ہیں، زمانہ کا تصرف طبیعتِ انسانی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اگر سب کے لئے فروعی احکام ایک ہی کر دیئے جائیں تو انسان بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائے، اس لئے حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ ہر زمانہ اور ہر مزاج کے جذبات کی رعایت رکھ کر فروعی احکام میں مناسب تبدیلی کی جائے، یہاں ناسخ و منسوخ کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ حکم دینے والے کو پہلے حالات معلوم نہ تھے تو ایک حکم دیدیا، پھر نئے حالات سامنے آئے تو اس کو منسوخ کر دیا، یا پہلے غفلت و غلطی سے کوئی حکم صادر کر دیا تھا، پھر تنبہ ہوا تو بدل دیا، بلکہ شرع میں ناسخ و منسوخ کی مثال بالکل ایک حکیم یا ڈاکٹر کے نسخہ کی مثال ہے، جس میں دوائیں تدریجاً بدل جاتی ہیں کہ حکیم ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کا استعمال کرنے کے بعد مریض پر یہ کیفیات طاری ہو جائیں گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی، جب وہ پہلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پچھلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہو کہ پچھلے ایام میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا، اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں آئے ہوئے صریح و ضمنی احکام کا خلاصہ

اوّل ابتدائی آیات سے معلوم ہوا کہ یہود کا مقدمہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا، اور آپ نے اس کا فیصلہ فرمایا تو یہ فیصلہ شریعت تورات کے مطابق تھا، اس سے ثابت ہوا کہ پچھلی شریعتوں

میں جو احکام انبیاء نافذ تھے جب تک قرآن یا وحی الٰہی نے ان کو منسوخ نہ کیا ہو، وہ بدستور باقی رہتے ہیں۔ جیسا کہ یہود کے مقدمات میں قصاص کی مساوات اور سزائے زنا میں سنگساری کا حکم تورات میں بھی تھا، پھر قرآن نے بھی اس کو بعینہٖ باقی رکھا۔

اسی طرح دوسری آیت میں زخموں کے قصاص کا حکم جو بحوالہ تورات بیان کیا گیا ہے اسلام میں بھی یہی حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا، اسی بنا پر جمہور علماء اسلام کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے وہ احکام جن کو قرآن نے منسوخ نہ کیا ہو وہ ہماری شریعت میں بھی نافذ اور واجب الاتباع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات مذکورہ میں اہل تورات کو تورات کے مطابق اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق حکم دینے اور عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں کتابیں اور ان کی شریعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، مطلب یہ ہے کہ تورات و انجیل کے جو احکام قرآن نے منسوخ نہیں کئے وہ آج بھی واجب الاتباع ہیں۔

تیسرا حکم ان آیات میں یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف حکم دینا بعض صورتوں میں کفر ہے جبکہ اعتقاد میں بھی اس کو حق نہ جانتا ہو، اور بعض صورتوں میں ظلم و فسق ہے، جبکہ عقیدہ کی رو سے تو ان احکام کو حق مانتا ہے، مگر عملاً اس کے خلاف کرتا ہے۔

چوتھا حکم ان آیات میں یہ آیا ہے کہ رشوت لینا مطلقاً حرام ہے، اور خصوصاً عدالتی فیصلہ پر رشوت لینا اور بھی زیادہ اشد ہے۔

پانچواں حکم ان آیات سے یہ واضح ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور انکی شریعتیں اصول میں تو بالکل متفق اور متحد ہیں، مگر جزوی اور فروعی احکام ان میں مختلف ہیں اور یہ اختلاف بڑی حکمتوں پر مبنی ہے۔

وقف لازم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ

وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے،

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى الَّذِينَ فِي

اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو، اب تو دیکھے گا اُن کو

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا

جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں اُن میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجاوے ہم پر

دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا

گردش زمانہ کی سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرماوے فتح یا کوئی حکم اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی

عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ

کی چھپی بات پر پچھتانے اور کہتے ہیں مسلمان

اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ

کیا یہ وہی لوگ ہیں جو قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے

اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں برباد گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں ،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب

يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں نرم دل ہیں مسلمانوں پر

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا

زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں ، اور ڈرتے

يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

نہیں کسی کے الزام سے یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے ،

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

اور اللہ کشائش والا ہے خبردار ، تمہارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں

الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

زکوٰۃ اور عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی دوست رکھے اللہ اور اس کے رسول کو

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾ يٰۤاَيُّهَا

اور ایمان والوں کو تو اللہ کی جماعت وہی سب پر غالب ہیں اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا

ایمان والو مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں تمہارے دین کو ہنسی اور

وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ

کھیل وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے تم سے پہلے اور نہ کافروں کو اپنا دوست،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لئے

اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿٥٨﴾

تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل یہ اس واسطے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

خلاصۂ تفسیر

آیاتِ مذکورہ میں تین اہم اصولی مضامین کا بیان ہے، جو مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی وحدت وشیرازہ بندی کے بنیادی اصول ہیں:

اوّل یہ کہ مسلمان غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی، خیر خواہی، عدل وانصاف، اور احسان وسلوک سب کچھ کرسکتے ہیں، اور ایسا کرنا چاہئے کہ ان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن ان سے ایسی گہری دوستی اور خلط ملط جس سے اسلام کے امتیازی نشانات گڈمڈ ہوجائیں اس کی اجازت نہیں، یہی وہ مسئلہ ہے جو "ترکِ موالات" کے نام سے معروف ہے۔

دوسرا مضمون یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی جگہ مسلمان اسی بنیادی اصول سے ہٹ کر غیر مسلموں سے ایسا خلط ملط کرلیں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے اسلام کو کوئی گزند اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ اسلام کی حفاظت اور بقاء کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے، اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا، اگر کوئی قوم برگشتہ ہوجائے اور حدود شرعیہ کو توڑ کر فرض کرلو کہ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو کھڑا کردیں گے جو اسلام کے اصول وقانون کو قائم کرے گی،

تیسرا مضمون یہ ہے کہ جب ایک طرف منفی پہلو معلوم ہوگیا تو مسلمان کی گہری دوستی

تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور ان پر ایمان لانے والوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔
یہ اجمال ہے ان مضامین کا جو مذکورہ بالا پانچ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اب ان آیتوں کی مختصر

تفسیر دیکھئے:

اے ایمان والو تم (منافقوں کی طرح) یہود و نصاریٰ کو (اپنا) دوست مت بنانا وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، (یعنی یہودی یہودی باہم اور نصرانی نصرانی باہم، مطلب یہ ہے کہ دوستی ہوتی ہے مناسبت سے، سو ان میں باہم تو مناسبت ہے، مگر تم میں اور ان میں کیا مناسبت) اور (جب مقدمہ مذکورہ سے معلوم ہو کہ دوستی ہوتی ہے تناسب سے تو) جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ (کسی خاص مناسبت کے اعتبار سے) ان ہی میں سے ہوگا (اور گو یہ امر ظاہر ہے لیکن) یقیناً اللہ تعالیٰ (اس امر کی) سمجھ ہی نہیں دیتے ان لوگوں کو جو (کفار سے دوستی کر کرکے) اپنا نقصان کر رہے ہیں (یعنی دوستی میں منہمک ہونے کی وجہ سے یہ بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی اور چونکہ ایسے لوگ اس امر کو نہیں سمجھتے، اسی لئے اے دیکھنے والے) تم ایسے لوگوں کو کہ جن کے دل میں (نفاق کا) مرض ہے دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان (کفار) میں گھستے ہیں (اور کوئی مذمت کرے تو حیلہ بازی اور سخن سازی کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ (ہمارا ملنا ان کے ساتھ دل سے نہیں، بلکہ دل سے تو تمہارے ساتھ ہیں صرف ایک مصلحت سے ان کے ساتھ ملتے ہیں وہ یہ کہ) ہم کو اندیشہ ہے کہ (اتفاقات انقلاب زمانہ سے) ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے (جیسے قحط یا تنگی ہے، اور یہ یہودی مالدار ساہوکار ہیں ان سے قرض ادھار مل جاتا ہے، اگر ظاہری میل جول قطع کر دیں گے تو وقت پر ہم کو تکلیف ہوگی، ظاہر اَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ کا یہ مطلب لیتے تھے، لیکن دل میں اور مطلب لیتے کہ شاید آخر میں مسلمانوں پر کفار کے غالب آجانے سے ہم کو ان کی احتیاج پڑے اس لئے ان سے دوستی رکھنا چاہئے) سو قریب امید (یعنی وعدہ) ہے کہ اللہ تعالیٰ (مسلمانوں کی کامل) فتح (ان کفار کے مقابلہ میں جن سے یہ دوستی کر رہے ہیں) فرما دے (جس میں مسلمانوں کی کوشش کا بھی دخل ہوگا) یا کسی اور بات کا خاص اپنی طرف سے ظہور فرما دے (یعنی ان کے نفاق کا علی التعیین بذریعہ وحی کے علم اظہار فرما دیں جس میں مسلمانوں کی تدبیر کا اصلاً دخل نہیں، مطلب یہ کہ مسلمانوں کی فتح اور ان کی پردہ دری دونوں امر قریب ہونے والے ہیں) پھر (اس وقت) اپنے (سابق) پوشیدہ دلی خیالات پر نادم ہوں گے (کہ ہم کیا سمجھتے تھے کہ کفار غالب آویں گے اور یہ کیا برعکس ہوگیا، ایک ندامت تو اپنے خیال کی غلطی پر کہ امر طبعی ہے، دوسری ندامت اپنے

نفاق پر جس کی بدولت آج رسوا ہوئے، مَآ اَسَرُّوْا میں یہ دونوں داخل ہیں، اور یہ تیسری ندامت کہ
کفار کے ساتھ دوستی کرنے پر الگ ہوئی کہ مسلمانوں سے بھی برے بنے، چونکہ دوستی مَآ اَسَرُّوْا
پر مبنی تھی، لہٰذا ان دونوں ندامتوں کے ذکر سے یہ تیسری بدون ذکر صریح خود مفہوم ہو گئی، اور جب اس
زمانۂ فتح میں ان لوگوں کا نفاق کھل جائے گا تو آپس میں مسلمان لوگ (تعجب سے) کہیں گے
ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ بڑے مبالغہ سے (بڑھا چڑھا کر) قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم (دل
سے) تمہارے ساتھ ہیں (یہ تو کچھ اور ہی ثابت ہوا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) ان لوگوں کی ساری
کارروائیاں (کہ دونوں فریق سے بھلا رہنا چاہتے تھے سب) غارت گئیں جس سے (دونوں
طرف سے) ناکام رہے (کیونکہ کفار تو مغلوب ہو گئے، ان کا ساتھ دینا محض بیکار ہے اور
مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل گئی، ان سے اب بھلا بننا دشوار ہو کیا مشکل ہو گیا "از یں سو
رانده و زاں سو مانده") اے ایمان والو (یعنی جو لوگ وقت نزول اس آیت کے ایمان والے ہیں)
جو شخص تم میں سے اپنے اس دین سے پھر جائے تو (اسلام کا کوئی نقصان نہیں
کیونکہ اسلامی خدمات انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ بہت جلد (ان کی جگہ) ایسی قوم
کو پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان
ہوں گے وہ مسلمانوں پر تیز ہوں گے کافروں پر (کہ ان سے) جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی
راہ میں اور (دین اور جہاد کے معاملہ میں) وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت
کا اندیشہ نہ کریں گے (جیسے منافقین کا حال ہے کہ دبے دبائے جہاد کے لئے جاتے بھی،
مگر اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کفار جن سے دل میں دوستی ہے ملامت کریں گے، یا اتفاق سے
جن کے مقابلہ میں جہاد ہے وہی اپنے دوست یا عزیز ہوں تو سب دیکھنے سننے والے طعن
کریں گے کہ ایسوں کو مارنے گئے تھے) یہ (صفات مذکورہ) اللہ تعالیٰ کا فضل ہے،
جس کو چاہیں عطا فرما دیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (کہ اگر چاہیں تو سب
کو یہ صفات دے سکتے ہیں لیکن) بڑے علم والے (بھی) ہیں (ان کے علم میں جس کو دینا
مصلحت ہوتا ہے اس کو دیتے ہیں) تمہارے دوست تو (جن سے تم کو دوستی رکھنا چاہئے)
اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت
سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان (کے دلوں) میں خشوع ہوتا ہے،
(یعنی عقائد، اخلاق و اعمال بدنی و مالی سب کے جامع ہیں) اور جو شخص (موافق مضمون
مذکور) اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایماندار لوگوں سے سو (وہ اللہ
کے گروہ میں داخل ہو گیا اور) اللہ کا گروہ بیشک غالب ہے (اور کفار مغلوب ہیں، غالب

مغلوب کی سازگاری اور دوستی کی فکر کرنا محض نازیبا ہی) اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی توریت وانجیل) مل چکی ہے (مراد یہود و نصاریٰ) جو ایسے ہیں کہ انھوں نے تمھارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہو (جو علامت ہی تکذیب کی) ان کو اور (اسی طرح دوسرے کفار کو (بھی جیسے مشرکین وغیرہ) دوست مت بناؤ (کیونکہ اصل علت کفر و تکذیب تو مشترک ہی) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (یعنی ایمان دار تو ہو ہی پس جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اس کو مت کرو) اور (جیسے اصولِ دین کے ساتھ استہزار کرتے ہیں، اسی طرح فروع کے ساتھ بھی چنانچہ) جب تم نماز کے لئے (اذان کے ذریعہ سے) اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ (تمھاری) اس (عبادت) کے ساتھ (جس میں اذان اور نماز دونوں آگئیں) ہنسی اور کھیل کرتے ہیں (اور) یہ (حرکت) اس سبب سے ہی کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے (ورنہ امرِ حق کو سمجھتے اور اس کے ساتھ ہنسی نہ کرتے)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے موالات (یعنی گہری دوستی) نہ کریں جیسا کہ عام غیر مسلموں کا اور یہود و نصاریٰ کا خود یہی دستور ہی کہ وہ گہری دوستی کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص رکھتے ہیں مسلمانوں سے یہ معاملہ نہیں کرتے پھر اگر کسی مسلمان نے اس کی خلاف ورزی کر کے کسی یہودی یا نصرانی سے گہری دوستی کر لی تو وہ اسلام کی نظر میں بجائے مسلمان کے اسی قوم کا فرد شمار ہونے کے قابل ہی۔

شانِ نزول امام تفسیر ابن جریر نے بروایت عکرمہؓ بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، وہ یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد اطراف کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ اس پر کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے، نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی امداد کریں گے، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی طرح مسلمانؓ ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ اُن کے خلاف کسی قوم کی امداد کریں گے بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے، کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ جانبین سے قائم رہا، لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکینِ مکہ سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لئے خط لکھ دیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپؐ نے

ان کے مقابلہ کے لئے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیا بنو قریظہ کے یہ یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کرتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے، اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے اس لئے یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی گہری دوستی سے روک دیا، تاکہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کرسکیں، اس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہ بن صامت وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور ترک موالات کا اعلان کردیا، اور بعض لوگ جو منافق طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا بھی ایمان ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے قطع تعلق کر دینے میں یہ خطرات محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکین و یہود کی سازش کامیاب ہو جائے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں تو ہمیں اُن لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہئے کہ اُس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہو جائے، عبداللہ بن اُبی بن سلول نے اسی بناء پر کہا کہ ان لوگوں سے قطع تعلق میں تو مجھے خطرہ ہے، اس لئے ایسا نہیں کرسکتا اس پر دوسری آیت نازل ہوئی:

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ، یعنی ترک موالات کا حکم شرعی سُن کر وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے اپنے کافر دوستوں کی طرف دوڑنے لگے، اور کہنے لگے کہ ان سے قطع تعلق کرنے میں تو ہمارے لئے خطرات ہیں۔

اللہ جل شانہ نے ان کے جواب میں فرمایا: فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ، یعنی یہ لوگ تو اس خیال میں ہیں کہ مشرکین اور یہود مسلمانوں پر غالب آجائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما چکے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ قریب ہے کہ مکہ فتح ہو جائے، یا فتح مکہ سے پہلے اللہ تعالیٰ ان منافقین کے نفاق کا پردہ چاک کرکے ان کو رُسوا کردے، تو اس وقت یہ لوگ اپنے مخفی خیالات پر نادم ہوں گے۔

تیسری آیت میں اس کی مزید تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ جب منافقین کے نفاق کا پردہ چاک ہوگا اور ان کی دوستی کے دعووں اور قسموں کی حقیقت کھلے گی تو مسلمان حیرت میں رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو ہم سے اللہ تعالیٰ کی مغلظ قسمیں کھا کر دوستی کا دعویٰ کرتے تھے اور آج ان کا یہ حشر ہوا کہ ان کے سب اسلامی

اعمال جو محض دکھلاوے کے لئے کیا کرتے تھے ضائع ہو گئے، اور اللہ جل شانہ نے ان آیات میں جو فتح مکہ اور منافقین کی رسوائی کا ذکر فرمایا ہے وہ چند روز کے بعد سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

چوتھی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ گہری دوستی اور خلط ملط کی جو ممانعت کی گئی ہے یہ خود مسلمانوں ہی کے مفاد کی خاطر ہے، ورنہ اسلام وہ دین حق ہے جس کی حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے، کسی فرد یا جماعت کی کجروی یا نافرمانی تو بجائے خود ہے، اگر مسلمانوں کا کوئی فرد یا جماعت سچ مچ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے اور بالکل ہی مرتد ہو کر غیر مسلموں میں مل جائے اس سے بھی اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قادر مطلق جو اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے فوراً کوئی دوسری قوم میدان عمل میں لے آئے گا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اشاعت کے فرائض انجام دے گی، اس کے کام نہ کسی ذات پر موقوف ہیں نہ کسی بڑی سے بڑی جماعت یا ادارہ پر وہ جب چاہتے ہیں تو تنکوں سے شہتیر کا کام لے لیتے ہیں، ورنہ شہتیر پڑے کھاد ہوتے رہتے ہیں، کسی نے خوب کہا ہے

اِنَّ الْمَقَادِيْرَ اِذَا سَاعَدَتْ
اَلْحَقَتِ الْعَاجِزَ بِالْقَادِرِ

"یعنی تقدیر الٰہی جب کسی کی مددگار ہو جاتی ہے تو ایک عاجز و بیکار سے قادر و توانا کا کام لے لیتی ہے"

اس آیت میں جہاں یہ ذکر فرمایا کہ مسلمان، اگر مرتد ہو جائیں تو پروا نہیں، اللہ تم ایک دوسری جماعت کھڑی کر دے گا، وہاں اس پاکباز جماعت کے کچھ اوصاف بھی بیان فرماتے ہیں کہ یہ جماعت ایسے اوصاف کی حامل ہو گی، دین کی خدمت کرنے والوں کو ان اوصاف کا خیال رکھنا چاہئے، کیونکہ آیت سے معلوم ہوا کہ ان اوصاف و عادات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و محبوب ہیں۔

ان کی پہلی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے محبت رکھے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھیں گے، اس صفت کے دو جزء ہیں، ایک ان لوگوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ، یہ تو کسی نہ کسی درجہ میں انسان کے اختیار میں سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک انسان کو کسی کے ساتھ اگر طبعی محبت نہ ہو تو کم از کم عقلی محبت اپنے عزم و ارادہ کے تابع رکھ سکتا ہے، اور طبعی محبت بھی اگرچہ اختیار میں نہیں، مگر اس کے بھی اسباب اختیاری ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قدرت کاملہ اور انسان پر اس کے انعامات و

تعلیمات کا مراقبہ اور تصور لازمی طور پر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت طبعی بھی پیدا کردیتا ہے۔
لیکن دوسرا جز یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت ان لوگوں کے ساتھ ہوگی، اس میں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اختیار و عمل کا کوئی دخل ہی نہیں، اور جو چیز ہماری قدرت و اختیار سے باہر ہے اسے سنانے اور بتلانے کا بھی بظاہر کوئی حاصل نہیں نکلتا۔
لیکن قرآن کریم کی دوسری آیات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ محبت کے اس جز کے اسباب بھی انسان کے اختیار میں ہیں، اگر وہ ان اسباب کا استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اُن کے ساتھ لازمی ہوگی، اور وہ اسباب آیتِ قرآن قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میں مذکور ہیں، یعنی اے رسول آپ لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمانے لگیں گے۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائیں اس کو چاہئے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کا محور بنالے، اور زندگی کے ہر شعبے اور ہر کام میں سنت کے اتباع کا التزام کرے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس سے محبت فرمائیں گے، اور اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کفر و ارتداد کا مقابلہ وہی جماعت کرسکے گی جو متبعِ سنت ہو، نہ احکامِ شرعیہ کی تعمیل میں کوتاہی کرے، اور نہ اپنی طرف سے خلافِ سنت اعمال کو اور بدعت کو جاری کرے۔
دوسری صفت اس جماعت کی یہ بتلائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ، اس میں لفظ اذلّہ حسب تصریح قاموس ذلیل یا ذلول دونوں کی جمع ہوسکتی ہے، ذلیل کے معنی عربی زبان میں وہی ہیں جو اردو وغیرہ میں معروف ہیں، اور ذلول کے معنی ہیں نرم اور سہل الانقیاد، یعنی جو آسانی سے قابو میں آجائے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے، اگر کسی معاملہ میں اختلاف بھی ہو تو آسانی سے قابو میں آجائیں گے، جھگڑا چھوڑ دیں گے، اگرچہ وہ اپنے جھگڑے میں حق بجانب بھی ہوں، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انا زعيم ببيت فی ربض الجنة لمن ترك المراء وهو محق، "یعنی میں اس شخص کو وسطِ جنت میں گھر دلوانے کی ذمہ داری لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے"۔
تو حاصل اس لفظ کا یہ ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اپنے حقوق اور معاملات میں کوئی

جھگڑا نہ رکھیں گے، دوسرا لفظ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ آیا، اس میں بھی اَعِزَّة، عزیز کی جمع ہے جس کے معنی غالب، قوی اور سخت کے آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں سخت اور قوی ہیں، اور وہ ان پر قابو نہ پاسکیں گے۔

اور دونوں جملوں کو ملانے کا حاصل یہ نکل آیا کہ یہ ایک ایسی قوم ہوگی جس کی محبت و عداوت اور دوستی، دشمنی اپنی ذات اور ذاتی حقوق و معاملات کے بجائے صرف اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر ہوگی، اسی لئے ان کی لڑائی کا رخ اللہ و رسول کے فرماں برداروں کی طرف نہیں بلکہ اس کے دشمنوں اور نافرمانوں کی طرف ہوگا، یہی مضمون ہے سورۂ فتح کی اس آیت کا، اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

پہلی صفت کا حاصل حقوق کی تکمیل تھا، اور دوسری صفت کا حاصل حقوق العباد اور معاملات کا اعتدال ہے، تیسری صفت اس جماعت کی یہ بیان فرمائی: يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، یعنی یہ لوگ دین حق کی اشاعت اور برتری کے لئے جہاد کرتے رہیں گے اس کا حاصل یہ ہے کہ کفر و الحاد کے مقابلہ کے لئے صرف معروف قسم کی عبادت گذاری اور نرم و سخت ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اقامت دین کا جذبہ بھی ہو، اس جذبہ کی تکمیل کے لئے چوتھی صفت یہ بتلائی گئی وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ، یعنی اقامت دین اور کلمۂ حق کے سربلند کرنے کی کوشش میں یہ لوگ کسی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی تحریک کو چلانے والے کی راہ میں دو قسم کی چیزیں حائل ہوا کرتی ہیں، ایک مخالف قوت کا زور، دوسرے اپنوں کے لعن طعن اور ملامت، اور تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ تحریک چلانے کے لئے عزم لے کر کھڑے ہوتے ہیں، اور اکثر حالات میں مخالف قوت سے مغلوب نہیں ہوتے، قید و بند اور زخم و خون سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، لیکن اپنوں کے طعنوں اور تشنیع و تضحیک سے بڑے بڑے عزم والوں کے قدم میں لغزش آجاتی ہے، شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ اس کی اہمیت جتلانے کے لئے اس پر اکتفا فرمایا، کہ یہ لوگ کسی کی ملامت کی پروا کئے بغیر اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں۔

آخر آیت میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ صفات و خصائل حسنہ اللہ تعالیٰ ہی کے انعام ہیں، وہی جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، انسان محض اپنے سعی و عمل سے بغیر فضل **خداوندی کے ان کو حاصل نہیں کرسکتا۔**

آیت کے الفاظ کی تشریح سے یہ واضح ہوچکا کہ اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ مرتد بھی ہوجائیں تو دین اسلام کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، بلکہ اس کی حفاظت و حمایت کیلئے

اللہ جل شانہٗ ایک اعلیٰ اخلاق و اعمال کی جماعت کو کھڑا کر دیں گے۔

جمہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت درحقیقت آنے والے فتنہ کی پیشگوئی اور اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے کامیاب ہونے والی جماعت کے لئے بشارت ہو آنے والا وہ فتنہ ارتداد ہے جس کے کچھ جراثیم تو عہد نبوت کے بالکل آخری ایام میں پھیلنے لگے تھے، اور پھر بعد وفات آنحضرتؐ کے عام ہو کر پورے جزیرۃ العرب میں اس کا طوفان کھڑا ہو گیا اور بشارت پانے والی وہ جماعت صحابہ کرامؓ کی ہے جس نے خلیفہ اول صدیق اکبرؓ کے ساتھ مل کر اس فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا۔

واقعات یہ تھے کہ سب سے پہلے تو مسیلمہ کذاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نبوت ہونے کا دعویٰ کیا، اور یہاں تک جرأت کی کہ آپ کے قاصدوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر مصلحت تبلیغ و اصلاح یہ دستور عام نہ ہوتا کہ قاصدوں اور سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا، مسیلمہ اپنے دعوے میں کذاب تھا، پھر آپ کو اس کے خلاف جہاد کا موقع نہیں ملا، یہاں تک کہ وفات ہو گئی۔

اسی طرح یمن میں قبیلہ مذحج کے سردار اسود عنسی نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم یمن کو اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیدیا، مگر جس رات میں اس کو قتل کیا گیا اس کے اگلے دن ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، صحابہ کرام تک اس کی خبر ربیع الاول کے آخر میں پہنچی، اسی طرح کا واقعہ قبیلۂ بنو اسد میں پیش آیا کہ ان کا سردار طلیحہ بن خویلد خود اپنی نبوت کا مدعی بن گیا۔

یہ تین قبیلوں کی جماعتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وفات ہی میں مرتد ہو چکی تھیں، آپ کی وفات کی خبر نے اس فتنہ ارتداد کو ایک طوفانی شکل میں منتقل کر دیا، عرب کے سات قبیلے مختلف مقامات پر اسلام اور اس کی حکومت سے منحرف ہو گئے، اور خلیفۂ وقت ابو بکر صدیقؓ کو اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا

وفات سرورِ کائنات کے بعد ملک و ملت کی ذمہ داری خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ پر عائد ہوئی، ایک طرف ان حضرات پر اس حادثۂ عظیم کا صدمہ جانگداز اور دوسری طرف یہ فتنوں اور بغاوتوں کے سیلاب، صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو صدمہ میرے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ پر پڑا اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑ جاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و استقامت

کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا کہ تمام آفات و مصائب کا پورے عزم و ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔

بغاوتوں کا مقابلہ ظاہر ہے کہ طاقت استعمال کر کے ہی کیا جا سکتا تھا، مگر حالات کی نزاکت اس حد کو پہونچ گئی تھی کہ صدیق اکبرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو کسی کی رائے نہ ہوئی کہ اس وقت بغاوتوں کے مقابلہ میں کوئی سخت قدم اٹھایا جائے، خطرہ یہ تھا کہ حضرات صحابہؓ اگر اندرونی جنگ میں مشغول ہو جائیں تو بیرونی طاقتیں اس جدید اسلامی ملک پر دوڑ پڑیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے قلب کو اس جہاد کے لئے مضبوط فرما دیا، اور آپؓ نے ایک ایسا بلیغ خطبہ صحابہ کرام کے سامنے دیا کہ اس جہاد کے لئے ان کا بھی شرح صدر ہو گیا، اس خطبہ میں اپنے پورے عزم و استقلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

"جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکام اور قانون اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرے مقابلہ پر تمام جن و انس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں، اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو، تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا!"

اور یہ فرما کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلنے لگے، اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبرؓ کو اپنی جگہ بٹھلا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا، اسی لئے حضرت علی مرتضیٰؓ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، قتادہ وغیرہ جمہور ائمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیقؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آئی ہے وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے جن کے من جانب اللہ میدان عمل میں لائے جانے کا آیت مذکورہ میں ارشاد ہے۔

مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ کوئی دوسری جماعت بھی اس آیت کی مصداق ہو، اس لئے جن حضرات نے اس آیت کا مصداق حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ یا دوسرے صحابہ کرام کو قرار دیا ہے، وہ بھی اس کا مخالف نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ یہ سب حضرات بلکہ قیامت تک آنے والے وہ مسلمان جو قرآنی ہدایات کے مطابق کفر و ارتداد کا مقابلہ کریں گے، سبھی آیت کے مصداق میں داخل ہوں گے، بہرحال صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت صدیق اکبرؓ کے زیر ہدایت اس فتنۂ ارتداد کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی، حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک بڑا لشکر دے کر مسیلمہ کذاب کے مقابلہ پر یمامہ کی طرف روانہ کیا،

وہاں مسیلمہ کذاب کی جماعت نے اچھی خاصی طاقت پکڑ لی تھی، سخت معرکے ہوئے، بالآخر مسیلمہ کذاب حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا، اور اس کی جماعت تائب ہو کر پھر مسلمانوں میں مل گئی، اسی طرح طلیحہ بن خویلد کے مقابلہ پر بھی حضرت خالدؓ ہی تشریف لے گئے، وہ فرار ہو کر کہیں باہر چلا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خود بخود ہی اسلام کی دوبارہ توفیق بخشی، اور مسلمان ہو کر لوٹ آئے۔

خلافتِ صدیقی کے پہلے مہینہ ربیع الاول کے آخر میں اسود عنسی کے قتل اور اس کی قوم کے مطیع و فرمانبردار ہو جانے کی خبر پہنچ گئی، اور یہی خبر سب سے پہلی فتح کی خبر تھی، جو حضرت صدیق اکبرؓ کو ان حالات میں پہنچی تھی، اسی طرح دوسرے قبائل مانعینِ زکوٰۃ کے مقابلہ میں بھی ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو فتحِ مبین نصیب فرمائی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو تیسری آیت کے آخر میں مذکور ہے، فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ یعنی اللہ والوں کی جماعت ہی غالب آکر رہے گی، اس کی عملی تفسیر دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لی، و بالجملہ تاریخی اور واقعاتی رنگ میں یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبائلِ عرب میں فتنۂ ارتداد پھیلا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قوم کھڑی فرمائی وہ صدیق اکبرؓ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام ہی تھے، تو اس آیت ہی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو اوصاف اس جماعت کے قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں وہ سب صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقائے کار صحابہ کرام میں موجود تھے، یعنی:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب حضرات مسلمانوں کے معاملات میں نہایت نرم ہیں اور کفار کے معاملہ میں تیز۔

چوتھے یہ کہ ان کا جہاد ٹھیک اللہ کی راہ میں تھا جس میں انھوں نے کسی کی ملامت وغیرہ کی پرواہ نہیں کی۔

آخر آیت میں اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ یہ سب صفاتِ کمال پھر ان کا ہر وقت استعمال، پھر ان کے ذریعہ اسلامی مہم میں کامیابی یہ سب چیزیں نری تدبیر یا طاقت یا جماعت کے بل بوتہ پر حاصل نہیں ہوا کرتیں، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہی جس کو چاہتے ہیں یہ نعمت عطاء فرماتے ہیں۔

سابقہ چار آیات میں مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ گہری دوستی رکھنے سے منع فرمایا گیا پانچویں آیت میں مثبت طور پر یہ بتلایا گیا کہ مسلمانوں کو گہری دوستی اور رفاقت خاص کا تعلق جن سے ہو سکتا ہے وہ کون ہیں، ان میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے کہ درحقیقت مؤمن کا ولی اور رفیق ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور وہی ہو سکتا ہے، اور اس کے تعلق کے سوا ہر تعلق اور ہر دوستی فانی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا تعلق ہی ہے اس سے الگ نہیں، تیسرے نمبر میں مسلمانوں کے رفیق اور مخلص دوست ان مسلمانوں کو قرار دیا ہے جو صرف نام کے مسلمان نہیں، بلکہ سچے مسلمان ہیں، جن کی تین صفات اور علامات یہ بتلائی ہیں:

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ

اوّل یہ کہ وہ نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرتے ہیں، دوسری یہ کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، تیسرے یہ کہ وہ لوگ متواضع اور فروتنی کرنے والے ہیں اپنے اعمالِ خیر پر ناز اور تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت کا تیسرا جملہ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ میں لفظ رکوع کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اس لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ رکوع سے مراد اس جگہ اصطلاحی رکوع ہی، جو نماز کا ایک رکن ہے، اور یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے بعد وَھُمْ رٰکِعُوْنَ کا جملہ اس مقصد سے لایا گیا کہ مسلمانوں کی نماز کو دوسرے فرقوں کی نماز سے ممتاز کر دینا مقصود ہے، کیونکہ نماز تو یہود و نصاریٰ بھی پڑھتے ہیں، مگر اس میں رکوع نہیں ہوتا، رکوع صرف اسلامی نماز کا امتیازی وصف ہے۔ (مظہری)

مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ لفظ رکوع سے اس جگہ اصطلاحی رکوع مراد نہیں، بلکہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی جھکنا، تواضع اور عاجزی و انکساری کرنا، تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اور تفسیر کشاف میں زمخشری نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور تفسیر مظہری و بیان القرآن وغیرہ میں بھی اسی کو لیا گیا ہے، تو معنی اس جملہ کے یہ ہو گئے کہ ان لوگوں کو اپنے اعمال صالحہ پر ناز نہیں، بلکہ تواضع اور انکساری ان کی خصلت ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک روز حضرت علی مرتضیٰؓ نماز میں مشغول تھے، جب آپ رکوع میں گئے تو کسی سائل نے آکر سوال کیا، آپؓ نے اسی حالتِ رکوع میں اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی، غریب فقیر کی حاجت روائی

میں تاخیر کرنا بھی پسند نہیں فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر اس کی ضرورت پوری کریں یہ مسابقت فی الخیرات اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند آئی، اور اس جملہ کے ذریعہ اس کی قدر افزائی فرمائی گئی۔

اس روایت کی سند میں علماء محدثین کو کلام ہے، لیکن روایت کو صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز و زکوٰۃ کے پابند عام مسلمان ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ، (رواہ احمد، از مظہری) یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی بھی اس کے دوست ہیں۔

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ، یعنی یا اللہ آپ محبوب بنائیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہو علی مرتضیٰ سے، اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضیٰ سے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لئے نوازا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہوگیا تھا، کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت و دشمنی رکھیں گے، اور ان کے مقابلہ پر علم بغاوت اٹھائیں گے، جیسا کہ خوارج کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔

بہرحال آیت مذکورہ کا نزول خواہ اسی واقعہ کے متعلق ہوا ہو مگر الفاظ آیت کے عام ہیں، جو تمام صحابہ کرام اور سب مسلمانوں کو شامل ہیں، اور روئے حکم کسی فرد کی خصوصیت نہیں، اسی لئے جب کسی نے حضرت امام باقرؒ سے پوچھا کہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی مومنین میں داخل ہونے کی حیثیت سے اس آیت کا مصداق ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کو فتح و نصرت اور دنیا پر غالب آنے کی بشارت دی گئی ہے، جو مذکورہ آیت قرآنی کے احکام کی تعمیل کرکے غیروں کی گہری دوستی سے باز آجائیں اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو اپنا دوست بنائیں، ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ، اس میں ارشاد فرمایا کہ ان احکام الٰہیہ کی تعمیل کرنے والے مسلمان اللہ کا گروہ ہیں، اور پھر یہ خوشخبری سنا دی کہ اللہ کا گروہ ہی انجام کار سب پر غالب آکر رہے گا۔ آنے والے واقعات نے اس کی ایسی تصدیق کردی کہ ہر آنکھوں والے نے دیکھ لیا کہ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب پر غالب آگئے جو طاقت ان سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی
خلیفہ اول صدیق اکبرؓ کے مقابلہ پر اندرونی فتنے اور بغاوتیں کھڑی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو
سب پر غالب فرمایا، حضرت فاروق اعظمؓ کے مقابلہ پر دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں قیصر و کسریٰ
آگئیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام و نشان مٹا دیا، اور پھر ان کے بعد کے خلفاء اور مسلمانوں میں
جب تک ان احکام کی پابندی رہی کہ مسلمانوں نے غیروں کے ساتھ خلط ملط اور گہری دوستی
کے تعلقات قائم نہیں کئے وہ ہمیشہ مظفر و منصور نظر آئے۔

چھٹی آیت میں پھر اسی تاکید کے اس حکم کا اعادہ فرمایا گیا ہے جو شروع رکوع میں بیان
ہوا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو، تم ان لوگوں کو اپنا رفیق یا گہرا دوست نہ بناؤ
جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل قرار دیتے ہیں، اور یہ دو گروہ ہیں، ایک اہل کتاب دوسرے
عام کفار و مشرکین۔

امام ابوحیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ لفظ کفار میں تو اہل کتاب بھی داخل تھے
پھر خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب کا مستقل ذکر اس جگہ غالباً اس لئے فرمایا گیا کہ اہل کتاب
اگرچہ ظاہر میں بہ نسبت دوسرے کفار کے اسلام کے ساتھ قریب تھے، مگر تجربہ نے یہ
بتلایا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں نے اسلام کو قبول کیا یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت اور
مابعد کے ایمان لانے والے لوگوں کے اعداد و شمار دیکھے جائیں، تو ان میں کثرت عام کفار
کی نکلے گی، اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔

اور وجہ اس کی یہ ہو کہ اہل کتاب کو اس پر ناز ہے کہ ہم دینِ الٰہی اور کتاب آسمانی کے
پابند ہیں، اس فخر و ناز نے ان کو حق قبول کرنے سے باز رکھا، اور مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزاء
کا معاملہ بھی زیادہ تر انھوں نے کیا، اسی ظرافت پسندی کا ایک واقعہ وہ ہے جو ساتویں
آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا
هُزُوًا وَّلَعِبًا، یعنی جب مسلمان نماز کے لئے اذان دیتے ہیں تو یہ لوگ اُن کا مذاق اڑاتے
ہیں، اس کا واقعہ بحوالہ ابن ابی حاتم تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک نصرانی
تھا، وہ جب اذان میں أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا لفظ سنتا تو یہ کہا کرتا تھا
احرق اللّٰہ الکاذب یعنی جھوٹے کو اللہ تعالیٰ جلا دے۔

آخر کار اس کا یہی کلمہ اس کے پورے خاندان کے جل کر خاک ہو جانے کا سبب
بن گیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ رات کو جب یہ سو رہا تھا اس کا نوکر کسی ضرورت سے آگ
لے کر گھر میں آیا اس کی چنگاری اڑ کر کسی کپڑے پر پڑ گئی اور سب کے سو جانے کے بعد وہ

بھڑک اٹھی اور سب کے سب جل کر خاک ہو گئے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ، یعنی دین حق کے ساتھ اس تمسخر و استہزاء کی وجہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے عقل فرمایا، حالانکہ امور دنیا میں ان کی عقل و دانش مشہور و معروف ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان ایک قسم کے کاموں میں بڑا دانشمند عقلمند ہو مگر دوسری قسم میں بالکل عقل سے کام نہیں لیتا، اس کی عقل اس طرف چلتی نہیں، اس لئے اس میں بیوقوف لایعقل ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم نے اسی مضمون کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ

یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے سطحی امور کو تو خوب جانتے ہیں، مگر انجام اور آخرت سے غافل ہیں۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ

تو کہہ اے کتاب والو کیا ضد ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو

اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ

نازل ہوا ہم پر اور جو نازل ہو چکا پہلے اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں

بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ

کس کی بری جزا ہے اللہ کے یہاں وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب

عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ

نازل کیا اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعضوں کو سور اور جنہوں نے بندگی کی شیطان کی

اُولٰۤئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَاِذَا

وہی لوگ بدتر ہیں درجہ میں اور بہت بہکے ہوئے ہیں سیدھی راہ سے اور جب

جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ

تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور حالت یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور

خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾

کافر ہی چلے گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

آپ کہدیجئے کہ اے اہل کتاب تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر (بھی) جو (ہم سے) پہلے بھیجی جا چکی ہے (یعنی تمہاری کتاب توریت و انجیل) باوجود اس کے کہ تم میں اکثر لوگ ایمان سے خارج ہیں (کہ نہ قرآن پر ان کا ایمان ہو جس کا خود ان کو بھی اقرار ہو اور نہ توراۃ و انجیل پر ایمان ہے، کیونکہ ان پر ایمان ہوتا تو ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت موجود ہے اس پر بھی ضرور ایمان ہوتا، قرآن کا انکار اس پر شاہد ہے کہ توراۃ و انجیل پر بھی ان کا ایمان نہیں ہے، یہ حال تو تم لوگوں کا ہوا اور ہم اس کے برعکس سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، تو عیب ہم میں نہیں خود تم میں ہے غور کرو) اور آپ ان سے کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم ہمارے طریقہ کو برا سمجھتے ہو تو آؤ) کیا میں (اچھے برے میں موازنہ کرنے کے لئے) تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو (ہمارے) اس (طریقہ) سے بھی (جس کو تم برا سمجھ رہے ہو) خدا کے یہاں سزا ملنے میں زیادہ برا ہو، وہ ان اشخاص کا طریقہ ہے جن کو (اس طریقہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو اور ان کو بندر اور سور بنا دیا ہو اور انھوں نے شیطان کی پرستش کی ہو (اب دیکھ لو کہ ان میں کونسا طریقہ برا ہے، آیا وہ طریقہ جس میں غیر اللہ کی عبادت اور اس پر یہ وبال ہوں، یا وہ طریقہ جو سراسر توحید اور نبوتِ انبیاء کی تصدیق ہو یقیناً موازنہ کا نتیجہ یہی ہے کہ) ایسے اشخاص (جن کا طریقہ ابھی ذکر کیا گیا ہے آخرت میں) مکان کے اعتبار سے بھی (جو ان کو سزا کے طور پر ملے گا) بہت برے ہیں (کیونکہ یہ مکان دوزخ ہے) اور (دنیا میں) راہ راست سے بھی بہت دور ہیں، (اشارہ یہ ہے کہ تم لوگ ہم پر ہنستے ہو، حالانکہ استہزاء کے قابل تمہارا طریقہ ہے، کیونکہ یہ سب خصلتیں تم میں پائی جاتی ہیں، کہ یہود نے گوسالہ پرستی کی اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا بنا لیا، پھر اپنے علماء و مشائخ کو خدائی کے اختیارات سپرد کر دیئے، اسی لئے یہودیوں نے جب یوم سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تو اللہ کا عذاب آیا، وہ بندر بنا دیئے گئے اور نصاریٰ کی درخواست پر آسمانی مائدہ نازل ہونے لگا، انھوں نے پھر بھی ناشکری کی تو ان کو بندر اور سور بنا دیا گیا، آگے ان کی ایک خاص جماعت کا ذکر ہے، جو منافق تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر یہودی ہی تھے)

اور جب یہ (منافق لوگ) تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ کفر ہی کو لے کر (مسلمانوں کی مجلس میں) آئے تھے اور کفر ہی کو لے کر چلے گئے اور اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں جس کو یہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں اس لئے ان کا نفاق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کام نہیں دے گا اور کفر کی بدترین سزا سے سابقہ پڑے گا۔

معارف و مسائل

اَکْثَرَکُمْ فٰسِقُوْنَ میں حق تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے خطاب میں سب کے بجائے اکثر کو فاسق فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہر حال میں مومن ہی رہے، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی تھی وہ احکام تورات وانجیل کے تابع اور ان پر ایمان رکھتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآن نازل ہوا تو آپ پر بھی ایمان لائے اور عمل قرآن کے تابع کرنے لگے۔

تبلیغ و دعوت میں مخاطب کی رعایت

یہاں قُلْ هَلْ اُنَبِّئُکُمْ میں جو حال ایک مثال کے انداز میں ایسے لوگوں کا بیان کیا ہے جن پر اللہ کی لعنت و غضب ہے اس کے مصداق درحقیقت خود یہی مخاطب تھے، مقتضیٰ اس کا تھا کہ اُن پر ہی یہ الزام عائد کیا جاتا کہ تم ایسے ہو، مگر قرآن کریم نے طرز بیان بدل کر اس کو ایک مثال کی صورت دیدی، جس میں پیغمبرانہ دعوت کا ایک خاص اسلوب بتلا دیا گیا کہ عنوان بیان ایسا اختیار کرنا چاہئے جس سے مخاطب کو اشتعال پیدا نہ ہو۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ

اور تو دیکھے گا بہتوں کو ان میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم اور

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۲) لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ

حرام کھانے پر بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں کیوں نہیں منع کرتے

الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ

ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے

السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۶۳)

سے، بہت ہی برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (یہودیوں) میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ (یعنی جھوٹ) اور ظلم اور حرام (مال) کھانے پر گرتے ہیں (واقعی ان کے یہ کام بُرے ہیں (یہ تو عوام کا حال تھا آگے خواص کا حال ہے کہ) ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے (باوجود علم مسئلہ و اطلاع واقعہ کے) کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بُری ہے

معارف ومسائل

یہود کی اخلاقی تباہ حالی آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں کثر یہود کی اخلاقی گراوٹ اور عملی بربادی کا ذکر ہے، تاکہ سننے والوں کو نصیحت ہو کہ ان افعال اور ان کے اسباب سے بچتے رہیں۔

اگرچہ عام طور پر یہودیوں کا یہی حال تھا، لیکن ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے، قرآن کریم نے ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے لفظ كَثِيْرًا استعمال فرمایا، اور ظلم و تعدی اور حرام خوری دونوں اگرچہ لفظ اِثْمٌ یعنی گناہ کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ان دونوں قسم کے گناہوں کی تباہ کاری اور اُن کی وجہ سے پورے امن و اطمینان کی بربادی واضح کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر علیحدہ کر دیا (بحر محیط)

اور تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ ان لوگوں کے متعلق دوڑ دوڑ کر گناہوں پر گرنے کا عنوان اختیار کر کے قرآن کریم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا، کہ یہ لوگ ان بُری خصلتوں کے عادی مجرم ہیں، اور یہ بُرے اعمال ان کے ملکاتِ راسخہ بن کر ان کی رگ پے میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ بلا ارادہ بھی یہ لوگ اسی طرف چلتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک عمل ہو یا بد جب کوئی انسان اس کو بکثرت کرتا ہے، تو رفتہ رفتہ وہ ایک ملکۂ راسخہ اور عادت بن جاتی ہے، پھر اس کے کرنے میں اس کو کوئی مشقت اور تکلف باقی نہیں رہتا، بُری خصلتوں میں یہود اسی حد پر پہنچے ہوئے تھے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ، اور اسی طرح اچھی خصلتوں میں انبیاء و اولیاء کا حال ہے، اُن کے بارے میں بھی قرآن کریم نے يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کے الفاظ استعمال فرمائے۔

اصلاحِ عمل کا طریقہ اصلاحِ اعمال کا سب سے زیادہ اہتمام کرنے والے حضرات صوفیائے کرام

اور اولیاء اللہ میں ان حضرات نے انہی ارشادات قرآنیہ سے یہ اہم اصول اخذ کیا ہے کہ جتنے بُرے یا بھلے اعمال انسان کرتا ہے اصل میں ان کا اصل سرچشمہ وہ مخفی ملکات اور اخلاق ہوتے ہیں جو انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، اس لئے بُرے اعمال اور جرائم کی روک تھام کے لئے ان کی نظر انہی مخفی ملکات پر ہوتی ہے اور ان کی اصلاح کر دیتے ہیں، تو تمام اعمال خود بخود درست ہونے لگتے ہیں، مثلاً کسی کے دل میں مال دنیا کی حرص کا غلبہ ہے، وہ اس کے نتیجہ میں رشوت بھی لیتا ہے، سود بھی کھاتا ہے، اور موقع ملے تو چوری اور ڈاکہ تک بھی نوبت پہونچ جاتی ہے، حضرات صوفیائے کرام ان جرائم کا الگ الگ علاج کرنے کے بجائے وہ نسخہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان سب جرائم کی بنیاد منہدم ہو جائے اور وہ ہے دنیا کی ناپائیداری اور اس کی عیش و عشرت کے زہر آلود ہونے کا استحضار۔

اسی طرح کسی کے دل میں تکبر و غرور ہے، وہ غصہ میں مغلوب ہو، اور دوسروں کی تحقیر و توہین کرتا ہے، دوستوں اور پڑوسیوں سے لڑتا ہے، یہ حضرات فکر آخرت اور خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کو مستحضر کرنے والا نسخہ استعمال کرتے ہیں جن سے یہ عمل بد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قرآنی اشارہ سے معلوم ہوا کہ انسان میں کچھ ملکات ہوتے ہیں جو طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، یہ ملکات خیر اور بھلائی کے ہیں تو نیک عمل خود بخود ہونے لگتے ہیں، اسی طرح ملکات بُرے ہیں تو بُرے اعمال کی طرف انسان خود بخود دوڑنے لگتا ہے، مکمل اصلاح کے لئے ان ملکات کی اصلاح ضروری ہے۔

علماء پر عوام کے اعمال کی ذمہ داری دوسری آیت میں یہود کے مشائخ اور علماء کو اس پر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ ان لوگوں کو بُرے اعمال سے کیوں نہیں روکتے، قرآن میں اس جگہ دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں، ایک رَبّٰنِیُّوْنَ، جس کا ترجمہ ہے اللہ والے، یعنی عابد، زاہد جن کو ہمارے عرف میں درویش، پیر یا مشائخ کہا جاتا ہے، اور دوسرا لفظ اَحْبَارُ استعمال فرمایا، یہود کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ، دوسرے علماء، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ربانیون سے مراد وہ علماء ہیں جو حکومت کی طرف سے مامور و با اقتدار ہوں، اور احبار سے مراد عام علماء ہیں، اس صورت میں جرائم سے روکنے کی ذمہ داری حکام اور علماء دونوں پر عائد ہو جاتی ہے، اور بعض دوسری آیات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

علماء و مشائخ کیلئے تنبیہ آخر آیت میں فرمایا لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ، یعنی ان مشائخ و

علماء کی یہ سخت بُری عادت ہے کہ یہ فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور ان کو نہیں روکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ارشاد فرمایا گیا، اور دوسری آیت جس میں مشائخ و علماء کی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے آخر میں لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ کا لفظ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ فعل تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ بقصد ہو یا بلا قصد اور لفظ عمل صرف اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو قصد و ارادہ سے کیا جائے، اور لفظ صنع اور صنعت کا ایسے کام کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے جس میں قصد و اختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور مقصد کے درست کر کے کیا جائے، اس لئے عوام کی بدعملی کے نتیجہ میں تو صرف لفظ عمل اختیار فرمایا، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور خواص مشائخ و علماء کی غلط کاری کے نتیجہ میں لفظ صنع اختیار فرمایا لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ، اس میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان کے علماء و مشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہماری کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بد اعتقاد ہو جانے کے خوف سے ان کے دلوں میں حمایتِ حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ ان بدکاروں کے اعمالِ بد سے بھی زیادہ اشد ہے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ و علماء کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مشائخ و علماء کے لئے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں، اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ علماء کے لئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے (ابن جریر و ابن کثیر)

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رُو سے ان کا جرم تمام چوروں ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے (العیاذ باللہ) مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہے جبکہ مشائخ و علماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائیگی اور جس جگہ قرائن یا تجربہ سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سُنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے،

لیکن فضل و اعلیٰ یہی رہتا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں، اور اس میں کسی کی ملامت یا ایذاء کی فکر نہ کریں جیسا کہ چند آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ کے مقبول مجاہدین کی صفات میں گذر چکا ہے، وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، یعنی یہ لوگ اللہ کے راستہ میں اور حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ و علماء بلکہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم و گناہ ہونا معلوم ہو فرض ہے کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں مقدور بھر کوشش کرے خود ہاتھ سے یا زبان سے یا کم از کم اپنے دل کی نفرت اور اعراض سے، اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ مانی جائے گی، یا یہ کہ اس کے خلاف دشمنی بھڑک اٹھے گی، تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر فضل و اعلیٰ پھر بھی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں، خود نیک عمل اختیار کرنے اور برے اعمال سے بچنے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور برائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دنیا میں امن و اطمینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زریں اصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام برائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔

اصلاح امت کا طریقہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اور قرون مابعد میں بھی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا مسلمانوں کی پوری قوم علم و عمل اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سربلند و ممتاز رہی، اور جب سے مسلمانوں نے اس فریضہ کو نظر انداز کر دیا، اور جرائم کی روک تھام کو صرف حکومت اور اس کی پولیس کا فرض سمجھ کر خود اس سے علیحدہ ہو بیٹھے تو اس کا نتیجہ وہ ہوا جو آج ہر جگہ سامنے ہے، کہ ماں باپ اور پورا خاندان دیندار اور پابند شریعت ہے، مگر اولاد اور متعلقین اس کے برعکس ہیں، ان کا نظری اور فکری رخ بھی اور ہے، اور عملی طریقے بھی جداگانہ ہیں، اسی لئے ملت کی اجتماعی اصلاح کے لئے قرآن و حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے، قرآن نے اس کام کو امت محمدیہ کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے کو سخت گناہ اور موجب عذاب قرار دیا ہے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم میں گناہ کے کام کئے جائیں اور کوئی آدمی اس قوم میں رہتا ہے اور ان کو منع نہیں کرتا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں پر عذاب بھیج دے۔ (بحر محیط)

گناہوں پر اظہارِ نفرت نہ کرنے پر وعید

مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو تباہ کردو، فرشتوں نے عرض کیا کہ اس بستی میں تو آپ کا فلاں عبادت گذار بندہ بھی ہے، حکم ہوا کہ اس کو بھی عذاب چکھاؤ، کیونکہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اس کو کبھی غصہ نہیں آیا، اور اس کا چہرہ غصہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کئے جائیں گے، جن میں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بدعمل، حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا کہ رب العالمین بدکرداروں کی ہلاکت کی وجہ تو ظاہر ہے، نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، ان کے ساتھ کھانے پینے، اور ہنسی دل لگی کے شریک رہتے تھے، میری نافرمانیوں اور گناہ دیکھ کر کبھی ان کے چہرہ پر کوئی ناگواری کا اثر تک نہ آیا (یہ سب روایات بحر محیط سے منقول ہیں)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا

اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا، انہی کے ہاتھ بند ہو جاویں اور لعنت ہے ان کو

بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ

اس کہنے پر، بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے، اور ان میں بہتوں کو

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَ

بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور انکار، اور

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ

ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی اور بیر قیامت کے دن تک، جب کبھی

اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ

آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور دوڑتے ہیں ملک میں

فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۴ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ

فساد کرتے ہوئے، اور اللہ پسند نہیں کرتا فساد کرنے والوں کو۔ اور اگر اہل کتاب ایمان

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ

لاتے اور ڈرتے تو ہم دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ان کو داخل کرتے

وقف لازم

اس کی علت یا حکمت نہ کہ ان کے کفر کو بیان کرنا ہی مقصود ہے نہ یہ کہ یہی اس کی علت ہو) اور یہود کے کفر اور سرکشی کی یہ حالت ہے کہ ان کو یہ توفیق نہ ہوگی کہ مثلاً اپنے قول کا بطلان ہی سن لیا تو اس سے توبہ کرلیں، نہیں بلکہ جو مضمون آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہوجاتا ہے (اس طرح سے کہ وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں، تو کچھ تو پہلا طغیان اور کفر تھا پھر اور بڑھ گیا) اور (ان کے کفر سے جو ان پر لعنت یعنی رحمت سے دوری واقع کی گئی ہے اس کے آثار (دنیویہ میں سے ایک یہ ہے کہ) ہم نے ان میں باہم (دین کے باب میں) قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا (چنانچہ ان میں مختلف فرقے ہیں، اور ہر فرقہ دوسرے کا دشمن، اور نتیجہ باہمی عداوت و بغض کی وجہ سے) جب کبھی (مسلمانوں کے ساتھ) لڑائی کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں (یعنی لڑنے کا ارادہ کرتے ہیں) حق تعالیٰ اس کو فرو کر دیتے ہیں (اور بکھیر دیتے ہیں یعنی مرعوب ہوجاتے ہیں یا لڑکر مغلوب ہوجاتے ہیں یا آپس کے تفرق کی وجہ سے اتفاق کی نوبت نہیں آتی) اور (جب لڑائی سے رہ جاتے ہیں تو اپنی عداوت دوسری طرح نکالتے ہیں کہ) ملک میں (خفیہ) فساد کرتے پھرتے ہیں (جیسے مسلمانوں کو بہکانا، لگائی بجھائی کرنا، عوام کو توریت کے محرف مضامین سنا کر اسلام سے روکنا) اور اللہ تعالیٰ (چونکہ) فساد کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں، اس لئے اس فساد کی ان کو خوب سزا ہوگی خواہ دنیا میں بھی اور آخرت میں تو ضرور) اور اگر یہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ جن امور حقہ کے منکر ہیں جیسے رسالت محمدیہ و حقیقت قرآن ان سب پر) ایمان لے آتے اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے جن امور کا کفر و معصیت ہونا بتلا دیا گیا ہے ان سب سے) تقویٰ (یعنی پرہیز) اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی تمام گذشتہ برائیاں (کفر اور شرک و معاصی جن میں سب اقوال و احوال آگئے) معاف کر دیتے اور (معاف کر کے) ضرور ان کو چین اور آرام کے باغوں میں (یعنی بہشت میں) داخل کرتے (تو یہ برکات اخرویہ ہوئیں) اور اگر یہ لوگ (ایمان اور تقویٰ مذکور اختیار کرتے جس کو بعنوان دیگر یوں کہا جاتا ہے کہ) توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) ان کے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے (یعنی ان میں جس جس بات پر عمل کرنے کو کہا ہے سب پر پورا عمل کرتے، اس میں تصدیق رسالت بھی آگئی، اور اس سے احکام محرفہ و منسوخہ نکل گئے کیونکہ ان کتب کا مجموعہ ان پر عمل کرنے کو نہیں بتلاتا بلکہ منع کرتا ہے) تو یہ لوگ (بوجہ اس کے کہ) اوپر سے (یعنی آسمان سے پانی برستا،

اور نیچے سے (یعنی زمین سے پیدا ہوتی) خوب فراغت سے کھاتے (برتتے، یہ ایمان کی برکاتِ دنیویہ کا ذکر ہوا، لیکن کفر پر مصر رہے، اس سے تنگی میں پڑ گئے، جس پر بعض نے حق تعالیٰ کی شان میں بخل کی نسبت کرکے گستاخی کی، مگر پھر بھی سب یہود و نصاریٰ برابر نہیں، چنانچہ) ان ہی میں ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی بھی ہے (جیسے یہود میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، اور نصاریٰ میں حضرت نجاشی اور ان کے ساتھی لیکن ایسے قلیل ہیں) اور (زیادہ) ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں (کیونکہ کفر و عناد سے بدتر کیا کردار ہوگا) اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (لوگوں کو) سب پہنچا دیجئے اور اگر (بالفرض محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (یوں سمجھا جاوے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض ہے، تو جیسے کل کے اخفاء سے یہ فرض فوت ہوتا تو اسی طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے، اور تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ کے مقابل ہوکر قتل و ہلاک کر ڈالیں) محفوظ رکھے گا (اور) یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (اس طرح قتل و ہلاک کر ڈالنے کے واسطے آپ تک) راہ نہ دیں گے۔

معارف و مسائل

یہود کی ایک گستاخی کا جواب | وَقَالَتِ الْيَهُودُ، اس آیت میں یہود کا ایک سنگین جرم اور ایک بدترین کلمہ یہ ذکر کیا گیا کہ وہ کم بخت یہ کہنے لگے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ **تنگ دست ہوگیا۔**

واقعہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودیوں کو مال دار صاحبِ وسعت بنایا تھا، مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، اور آپ کی دعوت ان کو پہنچی تو ان ظالموں نے اپنی قومی چودھراہٹ اور اپنی جاہلی رسوم سے حاصل ہونے والے نذرانوں کی خاطر اس دعوتِ حق سے روگردانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا بھی تنگ کردی یہ تنگ دست ہوگئے، اس پر ان نالائقوں کی زبان سے ایسے کلمات نکلنے لگے کہ (معاذ اللہ) خدائی خزانہ میں کمی آگئی یا اللہ نے بخل اختیار کرلیا، اس کے جواب میں اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہاتھ تو انہی کہنے والوں کے بندھیں گے، اور ان پر لعنت ہوگی جس کا اثر آخرت میں عذاب اور دنیا میں

مسلسل رزق عطا ہوگی (تفسیر کبیر)

اوپر کی آیت میں تو صرف آخرت کی نعمتوں کا وعدہ تھا اس آیت میں دنیاوی آرام و راحت کا وعدہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا گیا، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہود کی بدعملی اور احکام تورات و انجیل میں تحریف و تبدیل اور توڑ مروڑ کی بڑی وجہ ان کی دنیا پرستی اور حرصِ مال تھی، اور یہ وہ آفت تھی جس نے ان کو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات بینات دیکھنے کے باوجود ان کی اطاعت سے روکا ہوا تھا، ان کو خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم مسلمان ہو جائیں گے تو ہماری یہ چودھراہٹ ختم ہو جائے گی، اور دینی پیشوا ہونے کی حیثیت سے جو نذرانے اور ہدیہ ملتے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وسوسہ کو دور کرنے کے لئے یہ بھی وعدہ فرما لیا کہ اگر وہ سیدھی طرح ایمان اور عمل صالح اختیار کرلیں تو ان کی دنیوی دولت و راحت میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی بلکہ زیادتی ہو جائے گی۔

ایک شبہ کا جواب اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ خاص وعدہ ان یہودیوں کے متعلق کیا گیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود اور آپ کے مخاطب تھے، وہ اگر ان احکام کو مان لیتے تو دنیا میں بھی ان کو ہر طرح کی نعمت و راحت دیدی جاتی، چنانچہ اس وقت جن حضرات نے ایمان اور عمل صالح اختیار کرلیا ان کو یہ نعمتیں پوری ملیں جیسے نجاشی سلطان حبشہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب کوئی ایمان و عمل صالح کا پابند ہو جائے تو دنیا میں اس کے لئے رزق کی وسعت ضروری ہو اور جو نہ ہو تو اس کے لئے رزق کی تنگی ضرور ہو، کیونکہ یہاں کوئی عام قاعدہ ضابطہ بیان فرمانا مقصود نہیں، ایک خاص جماعت سے خاص حالات میں وعدہ کیا گیا ہے۔

البتہ ایمان اور عمل صالح پر عام قاعدہ ضابطہ کی صورت سے حیات طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی عطا ہونے کا وعدہ عام ہے، مگر وہ وسعت رزق کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اور ظاہری تنگدستی کی صورت میں بھی جیسا کہ انبیاء و اولیاء علیہم السلام کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ سب کو ہمیشہ وسعتِ رزق تو نہیں ملی لیکن پاکیزہ زندگی سب کو عطا ہوئی۔

آخر آیت میں حق تعالیٰ نے عدل و انصاف یہ بھی فرما دیا کہ جو کچھ روگردانی اور بدعملی یہود کی بیان کی گئی ہے یہ سب یہود کا حال نہیں، بلکہ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، ان میں ایک تھوڑی سی جماعت راہِ راست پر بھی ہے، لیکن ان کی اکثریت بدکار بدعمل ہے، راہِ راست پر ہونے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے یہودی یا نصرانی تھے، پھر قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، ان دونوں آیتوں میں اور ان سے پہلے مسلسل

دو رکوع میں یہود و نصاریٰ کی کجروی و بے راہی اور ضد و ہٹ دھرمی اور مخالف اسلام سازشوں کا ذکر چلا آرہا تھا۔

تبلیغ کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اس کا ایک اثر طبعی طور پر بتقاضائے بشریت یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، مایوس ہو کر یا مجبور ہو کر تبلیغ رسالت میں کچھ کمی ہو جائے، اور دوسرا اثر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ مخالفت اور دشمنی اور ایذا رسانی کی پرواہ کئے بغیر تبلیغ رسالت میں لگے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں آپ کو دشمنوں کے ہاتھ سے تکالیف و مصائب کا سامنا ہو، اس لئے تیسری آیت میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکیدی حکم دیدیا گیا کہ جو کچھ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچا دیں، کوئی بُرا مانے یا بھلا، اور مخالفت کرے یا قبول کرے، اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کر دیا گیا کہ تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں یہ کفار آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ خود آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس آیت میں ایک جملہ تو یہ قابل غور ہے کہ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ، مراد اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حکم خداوندی بھی آپ نے اُمت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنے فرض پیغمبری سے سبکدوش نہیں ہوں گے، یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت و قوت صرف فرمائی، اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جو ایک حیثیت سے اسلام کا آئین اور دستور تھا اور دوسری حیثیت سے ایک رؤف و رحیم اور ماں باپ سے زیادہ شفیق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نصیحت اس خطبہ میں آپ نے صحابہ کرام کے ایک عظیم مجمع کے سامنے اہم ہدایات فرمانے کے بعد مجمع سے سوال فرمایا:

أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ، دیکھو، کیا میں نے آپ کو دین پہنچا دیا؟ صحابہ کرام نے اقرار فرمایا کہ ضرور پہنچایا، اس پر ارشاد فرمایا کہ آپ اس پر گواہ رہو، اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، یعنی جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہیں وہ غائبوں تک میری بات پہنچا دیں، یہ غائبین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود تھے، مگر مجمع میں حاضر نہ تھے، اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہونچانے کا طریقہ علم دین کی نشر و اشاعت تھی جس کو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے پوری کوشش سے انجام دیا۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ عام حالات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و کلمات کو اللہ کی ایک بھاری امانت کی طرح محسوس فرمایا اور مقدور بھر اس کی کوشش کی کہ آپ کی زبان مبارک سے سنا ہوا کوئی جملہ ایسا نہ رہ جائے جو امت کو نہ پہونچے، اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی نے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کیا تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنا دیا، تاکہ وہ اس امانت سے سبکدوش ہوجائیں، صحیح بخاری میں حضرت معاذؓ کی ایک حدیث کے متعلق ایسا ہی واقعہ مذکور ہے کہ اخبر بہا معاذ عند موتہ تأثماً، یعنی حضرت معاذؓ نے یہ حدیث اپنی موت کے وقت بیان فرمادی تاکہ امانت نہ پہنچانے کی وجہ سے گنہگار نہ ہوجائیں۔

آیت کے دوسرے جملہ واللہ یعصمک من الناس میں، یہ بشارت دی گئی ہے کہ ہزاروں مخالفوں کے باوجود دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے عام طور پر ساتھ لگے رہتے تھے، اور سفر و حضر میں آپ کی حفاظت کرتے تھے اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے ان سب کو رخصت کردیا، کہ اب کسی پہرہ اور حفاظت کی ضرورت نہیں رہی، اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھے تبلیغ رسالت کے احکام ملے تو میرے دل میں اس کی بڑی ہیبت تھی، کہ ہر طرف سے لوگ میری تکذیب اور مخالفت کریں گے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوگیا۔ (تفسیر کبیر)

چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ تبلیغ رسالت کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند پہنچا سکے، جنگ و جہاد میں عارضی طور سے کوئی تکلیف پہنچ جانا اس کے منافی نہیں۔

قُلْ يَآهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ

کہدے اے کتاب والو تم کسی راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو توریت اور

الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ

انجیل کو اور جو تم پر اترا تمھارے رب کی طرف سے اور ان میں بہتوں کو

كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ

بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ

سو تو افسوس نہ کر اس قوم کفار پر بے شک جو مسلمان ہیں اور جو

هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

یہودی ہیں اور فرقہ صابی اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور روز

الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

قیامت پر اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ،

ربطِ آیات اوپر اہل کتاب کو اسلام کی ترغیب تھی آگے ان کے موجودہ طریقہ کا جس کے حق ہونے کے وہ مدعی تھے عند اللہ ناکارہ اور نجات میں ناکافی ہونا اور نجات کا اسلام پر موقوف ہونا مذکور ہے، اور اس کے بعد پھر ان کے اصرار علی الکفر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرمایا ہے اور درمیان میں ایک خاص مناسبت اور ضرورت سے تبلیغ کا مضمون آ گیا تھا۔

خلاصۂ تفسیر

آپ ان یہود و نصاریٰ سے کہئے کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر بھی نہیں (کیونکہ غیر مقبول راہ پر ہونا مثل بے راہی کے ہے) جب تک کہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) تمہارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) تمہارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اس کی بھی پوری پابندی نہ کرو گے (جس کے معنی اور ترغیب اور برکات اوپر مذکور ہوئے ہیں، اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان میں اکثر لوگ تعصب مذموم میں مبتلا ہیں اس لئے یہ) ضرور (ہے کہ) جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے، (اور اس میں ممکن ہے کہ آپ کو رنج و غم ہو، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ متعصب ہیں) تو آپ ان کافر لوگوں (کی اس حالت) پر غم نہ کیا کیجئے، یہ تحقیقی بات ہے کہ اور یہودی اور فرقہ صابئین اور نصاریٰ (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ (کی ذات و صفات) پر

(اور قیامت پر) اور کارگذاری اچھی کرے (یعنی موافق قانون شریعت کے) ایسوں پر (آخرت میں) نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اہل کتاب کو شریعتِ الٰہیہ کے اتباع کی ہدایت

پہلی آیت میں اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کو شریعت الٰہیہ کے اتباع کی ہدایت اس عنوان سے فرمائی گئی تھی کہ اگر تم نے احکامِ شرعیہ کی پابندی نہ کی تو تم کچھ نہیں، مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلام کی پابندی کے بغیر تمہارے سارے کمالات اور اعمال سب اکارت ہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ایک کمال فطری یہ عطا فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہو، دوسرے تورات و انجیل کے علمی کمالات بھی تمہیں حاصل ہیں، تم میں سے بہت سے آدمی درویش منش بھی ہیں، مجاہدات و ریاضیات کرتے ہیں، مگر ان سب چیزوں کی قیمت اور وزن اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس پر موقوف ہے کہ تم شریعتِ الٰہیہ کا اتباع کرو، اس کے بغیر نہ کوئی نسبی فضیلت کام آوے گی نہ علمی تحقیقات تمہاری نجات کا سامان بنیں گی نہ تمہارے مجاہدات و ریاضیات۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت مل گئی کہ کوئی درویشی و سلوک و طریقت، مجاہدات و ریاضات اور کشف و الہام اس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ ہو۔

اس آیت میں شریعت الٰہیہ کی پیروی کے لئے تین چیزوں کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے، اوّل تورات، دوسرے انجیل، جو یہود و نصاریٰ کے لئے پہلے نازل ہو چکی تھیں، تیسرے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا۔

جمہور مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے، جو تمام امت دعوت کے لیے بشمول یہود و نصاریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے بھیجا گیا، اس لئے معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ جب تک تم تورات، انجیل اور قرآن کے لائے ہوئے احکام پر صحیح صحیح اور پورا پورا عمل نہ کرو گے تمہارا کوئی نسبی یا علمی کمال اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں ہوگا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں تورات و انجیل کی طرح قرآن کا مختصر نام ذکر کر دینے کے بجائے ایک طویل جملہ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ استعمال فرمایا گیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُن احادیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہو جن میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا، اسی طرح دوسرے علوم و معارف بھی عطا کئے گئے ہیں جن کو ایک حیثیت سے قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جا سکتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشك رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله (صلی الله علیه وسلم) کما حرم الله (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی بغیرہ)

"یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے، آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم صرف قرآن کافی ہے جو اس میں حلال ہے صرف اس کو حلال سمجھو، اور جو اس میں حرام ہے صرف اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہو وہ بھی ایسی ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں"

احکام کی تین اقسام | اور خود قرآن بھی اسی مضمون کا شاہد ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اور جن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنے اجتہاد اور قیاس کے ذریعہ فرماتے ہیں، اور بذریعہ وحی پھر اس کے خلاف آپ کو کوئی ہدایت نہیں ملتی تو بالآخر وہ قیاس اور اجتہاد بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک تو وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صراحۃً قرآن میں مذکور نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جداگانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے، تیسرے وہ جو آپ نے اپنے اجتہاد و قیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا، وہ بھی بحکم وحی ہو گیا، یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں اور وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ میں داخل ہیں۔

شاید آیت مذکورہ میں قرآن کا مختصر نام چھوڑ کر یہ طویل جملہ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے لایا گیا ہو کہ ان تمام احکام کا اتباع لازم و واجب ہے جو صراحۃً قرآن میں مذکور ہوں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ احکام دیئے ہوں۔

دوسری بات اس آیت میں یہ قابل غور ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ کو تورات، انجیل، قرآن تینوں کے احکام پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی، حالانکہ ان میں سے بعض بعض کے لئے ناسخ ہیں، انجیل نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ ٹھہرایا اور قرآن نے تورات اور انجیل کے بہت سے احکام کو منسوخ قرار دیا، تو پھر تینوں کے مجموعہ پر عمل کیسے ہو؟

جواب واضح ہے کہ جب آنے والی کتاب نے پچھلی کتاب کے جن احکام کو بدل دیا، تو بدلے ہوئے طریقہ پر عمل کرنا ہی ان دونوں کتابوں پر عمل کرنا ہے منسوخ شدہ احکام پر **عمل کرنا دونوں کتابوں کے مقتضاء کے خلاف ہے۔**

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی: آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کے ساتھ آپ کی اس رعایت و عنایت کے باوجود ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے کہ اس عنایت ربانی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں گے، بلکہ ان کا کفر و عناد اور بڑھ جائے گا، آپ اس سے غمگین نہ ہوں اور ایسے لوگوں پر ترس نہ کھائیں۔

چار قوموں کو ایمان اور عمل صالح کی ترغیب اور آخرت میں نجات کا وعدہ: دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے چار قوموں کو مخاطب کرکے ایمان اور عمل صالح کی ترغیب اور اس پر فلاح آخرت کا وعدہ فرمایا، ان میں سے پہلے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی مسلمان ہیں، دوسرے اَلَّذِيْنَ هَادُوْا یعنی یہود، تیسرے صٰبِـُٔوْنَ اور چوتھے نصاریٰ، ان میں تین قومیں مسلمان، یہود، نصاریٰ معروف مشہور اور دنیا کے اکثر خطوں میں موجود ہیں، صابئون یا صابیہ کے نام سے آجکل کوئی قوم معروف نہیں، اسی لئے اس کی تعیین میں علماء و ائمہ کے اقوال مختلف ہیں، امام تفسیر ابن کثیر نے بحوالہ قتادہ ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ صابئون وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں اور آسمانی کتاب زبور کی تلاوت کرتے ہیں (جو حضرت **داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی)۔**

قرآن کریم کے اس سیاق سے بظاہر اسی کی تائید ہوتی ہے کہ چار آسمانی کتابیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تورات، زبور، انجیل، اور قرآن، اس میں ان چار کتابوں کے **ماننے والوں کا ذکر آگیا۔**

اسی مضمون کی ایک آیت تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ بقرہ کے ساتویں رکوع میں گزر چکی ہے، اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اس میں بتقاضائے مقام بعض الفاظ کی تقدیم

تاخیر کے سوا کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اختیار کا مدار عمل صالح پر ہے

خلاصۂ مضمون ان دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی نسبی، وطنی اور قومی خصوصیت کچھ نہیں، جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور عمل صالح اختیار کرے گا، خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے یہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے، کیونکہ کتب سابقہ تورات و انجیل میں بھی اس کی ہدایات موجود ہیں، اور قرآن کریم تو سراسر اسی کے لئے نازل ہوا، اسی لئے نزول قرآن اور بعثت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر نہ تورات وانجیل کا اتباع صحیح ہوسکتا ہے نہ زبور کا، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ان تمام اقوام میں سے جو مسلمان ہوجائے گا آخرت میں نجات و ثواب کا مستحق ہوگا، اس میں اُس خیال کا جواب ہوگیا کہ یہ کفر و معصیت اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرارتیں جو اب تک کرتے رہے ہیں، مسلمان ہوجانے کے بعد ان کا کیا انجام ہوگا، معلوم ہوا کہ پچھلے سب گناہ اور خطائیں معاف کردی جائیں گی، اور آخرت میں نہ اُن لوگوں کو اندیشہ رہے گا نہ کوئی غم و رنج پیش آئے گا۔

مضمون پر نظر کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ تو ایمان واطاعت کے اُس مقام پر ہیں جو اس آیت میں مطلوب ہے، یہاں ذکر صرف اُن لوگوں کا کرنا چاہیے جن کو اس مقام کی طرف بلانا ہے، مگر اس طرز خاص میں کہ مسلمانوں کا ذکر بھی ان کے ساتھ ملا دیا گیا ایک خاص بلاغت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ مورد عنایت وانعام ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سُنانا تو اصل میں اس کو ہے جو مخالفت کر رہا ہے، لیکن اس جگہ موافق کو بھی ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم کو جو موافقین کے ساتھ عنایت ہے وہ کسی نسبی یا قومی خصوصیت کی بناء پر نہیں بلکہ ان کی صفت اطاعت پر تمام عنایت وانعام کا مدار ہے، اگر مخالف بھی اطاعت اختیار کرے گا وہ بھی اسی لطف و عنایت کا مستحق ہوگا۔

متذکرہ چار قوموں کو خطاب کرکے جس امر کی ہدایت دی گئی اس کے تین جزء ہیں: **ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، اور عمل صالح۔**

ایمان بالرسالۃ کے بغیر نجات نہیں

ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے، اسلام کے چند بنیادی عقائد

ذکر کر کے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور ان کی طرف دعوت دینا مقصود ہے، اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول یا ایمان بالنبوۃ کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم و عقل اور انصاف و دانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی، خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں، جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول اور ارشاداتِ رسول پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان و عمل بغیر اس کے مقبول و معتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکروہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے، اور انھوں نے اس آیت میں صراحۃً ذکرِ رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کر لیا، جو قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے قطعی خلاف ہے، وہ یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب یہودی، نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجاتِ آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے، نجاتِ اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں (نعوذ باللہ منہ)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوتِ قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے، ان کے لئے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کر دینا کسی بڑے علم و نظر کا محتاج نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو باآسانی سمجھ سکتے ہیں، **چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں:**

قرآن کریم نے جس جگہ ایمانِ مفصل کا بیان فرمایا اس کے الفاظ سورۂ بقرہ کے **آخر میں یہ ہیں:**

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

"سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے"

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں، بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہے، اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے **نزدیک معتبر اور مقبول نہیں۔**

دوسری جگہ ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کردیں (کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر رسولوں پر ایمان نہ ہو) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر و اسلام کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں"

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَلَوْ كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي

"یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسٰی علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے سوا چارہ نہ ہوتا"

تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاحِ آخرت پا سکتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہر مذہب و ملت ایسی چیز ہو کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات اور فلاح کے لئے کافی ہے، تو پھر خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن ہی بے معنی ہو جاتا ہے، اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہو جاتا ہے، سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی، دوسرے رسولوں کتابوں شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے، اور اس صورت میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے، کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود و نصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل و قتال اور سیف و سنان کی جنگیں بھی لڑیں، اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عند اللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو بیچارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہو گیا، اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روزِ آخرت اور قیامت

خلاصۂ تفسیر

ہم نے بنی اسرائیل سے (انزل توریت میں تمام پیغمبروں کی تصدیق واطاعت کا) عہد لیا اور (اس عہد کے یاد دلانے کو) ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے (لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ) جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا (تب ہی ان کے ساتھ مخالفت سے پیش آئے) سو بعضوں کو (تو) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے اور (ہمیشہ ہر شرارت پر جب چندے دنیا سے مہلت دی گئی) یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی اس (گمان) سے اور بھی اندھے اور بہرے (کی طرح) بن گئے (کہ نہ دلائل صدقِ انبیاء کو دیکھا نہ ان کے کلام کو سنا) پھر (ایک مدت کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ان پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائی (کہ اور کسی پیغمبر کو بھیجا کہ اب بھی راہ پر آویں مگر) پھر بھی (اسی طرح) اندھے اور بہرے بنے رہے یعنی (سب تو نہیں مگر) ان میں کے بہتیرے، اور اللہ تعالیٰ ان کے (ان) اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں (یعنی ان کا گمان غلط تھا، چنانچہ ان کو وقتاً فوقتاً سزا بھی ہوتی رہی، مگر ان کا یہی شیوہ رہا، حتیٰ کہ اب آپؐ کے ساتھ اسی طرح تکذیب و خلاف کا برتاؤ کیا)

معارف ومسائل

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ، یعنی جب بنی اسرائیل کے پاس ان کا رسول کوئی حکم لاتا جو ان کے مذاق کے مطابق نہ ہوتا تو عہد وپیمان توڑ کر خدا سے غداری کرتے پھرتے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کیا، یہ تو ان کے "ایمان باللہ اور عمل صالح" کا حال تھا، "ایمان بالیوم الآخر" کا اندازہ اس سے کرلو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کرکے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا، اور ظلم وبغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے، یہ خیال کرکے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل ہی اندھے اور بہرے ہوگئے، اور جو نا کردنی کام تھے وہ کئے، حتیٰ کہ بعض انبیاء کو قتل اور بعض کو قید کیا، آخر خدا تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا، پھر ایک مدتِ دراز کے بعد بعض ملوکِ فارس نے بخت نصر کی قید ذلت ورسوائی سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا، اس وقت لوگوں نے توبہ کی، اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے

توبہ قبول کی، لیکن کچھ زمانہ کے بعد پھر وہی شرارتیں سوجھیں، اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرأت کی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گئے۔ (فوائد عثمانی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا،

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ط

اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا،

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ

بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو حرام کی اللہ نے اس پر جنت اور

مَأْوَاهُ النَّارُ ط وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ

اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی نہیں گنہگاروں کی مدد کرنے والا، بیشک کافر ہوئے

الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ م وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّآ إِلَٰهٌ

جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک، حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک

وَاحِدٌ ط وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ

معبود کے، اور اگر نہ باز آویں گے اس بات سے کہ کہتے ہیں تو بیشک پہنچے گا ان میں سے کفر پر

كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۷۳) أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَ

قائم رہنے والوں کو عذاب دردناک، کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ کے آگے اور

يَسْتَغْفِرُونَهُ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۷۴) مَا الْمَسِيحُ ابْنُ

گناہ بخشواتے اس سے، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان، نہیں ہے مسیح مریم کا

مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَأُمُّهُ

بیٹا مگر رسول، گزر چکے اس سے پہلے بہت رسول، اور اس کی ماں

صِدِّيقَةٌ ط كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ط انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ

ولی ہے، دونوں کھاتے تھے کھانا، دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں ان کو

الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (۷۵) قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ

دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جا رہے ہیں، تو کہہ دے کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو

وقف لازم

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ

اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی اور اللہ وہی ہے

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

سننے والا جاننے والا

خلاصۂ تفسیر

بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح بن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد ذاتی ہے) حالانکہ (حضرت) مسیح نے خود فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے (اور اس قول میں اپنے مربوب اور بندہ ہونے کی تصریح ہے، پھر ان کو خدا کہنا ایسی بات ہے کہ مدعی سست گواہ چست) بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (کہ دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا دے، اور جیسے عقیدہ اتحاد کفر ہے اسی طرح عقیدہ تثلیث بھی کفر ہے لیں) بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک معبود (برحق) کے اور کوئی معبود (برحق) نہیں (نہ دو نہ تین، جب یہ عقیدہ بھی کفر و شرک ہے تو اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ الخ میں جو سزا مذکور ہے وہ اس پر بھی مرتب ہوگی) اور اگر یہ (دونوں عقیدہ کے) لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (سمجھ رکھیں کہ) جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر (آخرت میں) دردناک عذاب واقع ہوگا، کیا (ان مضامین توحید و وعید کو سن کر) پھر بھی (اپنے ان عقائد و اقوال سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ (جب کوئی توبہ کرتا ہے تو) بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرمانیوالے ہیں، (حضرت) مسیح ابن مریم (میں نعوذ باللہ خدائی کا ذرا بھی جزو نہیں وہ) کچھ بھی نہیں صرف ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر (اہل معجزات) گذر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبری یا خرق عادت دلیل اُلوہیت ہے تو سب کو الٰہ (خدا) ماننا چاہئے، اور اگر دلیل اُلوہیت نہیں ہے تو حضرت مسیح کو کیوں الٰہ کہا جاتا ہے غرض جب اوروں کو الٰہ نہیں کہتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی الٰہ یا جزو الٰہ نہیں بلکہ وہ) ایک ولی بی بی

ہیں، جیسی اور بہتیری بھی دلیلیں ہو چکی ہیں۔ اور دونوں حضرت کے الٰہ نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک سہل دلیل یہ ہے کہ دونوں (حضرات) کھانا کھایا کرتے تھے (اور جو شخص کھانا کھاتا ہو وہ اس کا محتاج ہوتا ہے، اور کھانا خواص مادیت سے ہے، اور احتیاج اور مادیت خاصہ ممکن الوجود کا ہے، جس کا وجود ضروری نہ ہو، اور ممکن یعنی جس کا وجود بھی ضروری نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا) (دیکھئے تو سہی) ہم کیونکر صاف صاف دلائل ان سے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھئے وہ اُلٹے کدھر جا رہے ہیں، آپ ان سے فرمائیے کیا خدا کے سوا ایسی (مخلوق) کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو کوئی ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتی ہو اور نہ نفع پہنچانے کا (اختیار رکھتی ہو اور عاجز ہونا خود خدائی کے منافی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سنتے ہیں جانتے ہیں، (پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتے اور اپنے کفر و شرک سے باز نہیں آتے)۔

معارف و مسائل

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ، یعنی حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ یا مسیح، مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں (نعوذ باللہ) ان میں کا ایک حصہ اللہ ہو، پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں، عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے، اور اس خلافِ عقل و بداہت عقیدہ کو گول مول اور پیچیدہ عبارتوں سے ادا کرتے ہیں، اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں (فوائد عثمانی)

مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید

قولہ تعالیٰ: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، یعنی جس طرح اور انبیاء دنیا میں آئے اور کچھ دن رہ کر چل بسے، ان کو دوام اور بقاء حاصل نہ تھا جو الوہیت کی شان ہے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام (جو انہی کی طرح ایک انسان ہیں) کو دوام اور بقاء حاصل نہیں، لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہو سکتے۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج اور حیوانات سے اسے استغناء نہیں ہو سکتا، غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو، بالواسطہ یا بلا واسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل و ذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیتِ مسیح و مریم کے ابطال کو بشکلِ استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے، جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی

مدینہ اور مشرکین مکہ میں مسلمانوں کی عداوت کے علاقہ سے جس کا منشاء تحد فی الکفر تھا باہم خوب سازگاری تھی جو کام، نفوسانے آگے (بھیجنے) کے لئے کیا ہے یعنی کفر جو سبب تھا دوستی کفار اور عداوت مومنین کا) وہ بے شک برا ہے کہ (اس کے سبب) اللہ تعالیٰ ان پر (ہمیشہ کے لئے) ناخوش ہوا اور (اس ناخوشی کا ثمرہ یہ ہوگا کہ) یہ لوگ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، اور اگر یہ (یہودی) لوگ اللہ پر ایمان رکھتے اور پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) پر (ایمان رکھتے جس کا ان کو دعویٰ ہے) اور اس کتاب پر (ایمان رکھتے) جو ان (پیغمبر) کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی توریت) تو ان (مشرکین) کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں زیادہ لوگ (دائرہ ایمان سے خارج) ہیں (اس لئے کافروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور دوستی ہوگئی)

معارف ومسائل

بنی اسرائیل کی کجروی کا ایک دوسرا پہلو

(قولہ تعالیٰ) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ، پچھلی آیات میں بنی اسرائیل کی سرکشی اور ان کے ظلم وستم کو بیان کیا گیا تھا، کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول جو ان کے لئے حیات جاودانی کا پیغام اور ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کا دستور العمل لے کر آئے تھے ان کی قدر ومنزلت پہچاننے اور تعظیم وتکریم کرنے کے بجائے انھوں نے ان کے ساتھ یہ برا سلوک کیا، کہ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ، یعنی بعض انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کر ڈالا۔

مذکورہ آیت سے بنی اسرائیل کی کجروی کا دوسرا رخ بتلایا گیا ہے، کہ یہ جاہل یا تو سرکشی اور نافرمانی کے اس کنارے پر تھے کہ اللہ کے رسولوں کو جھوٹا کہا، اور بعض کو قتل کر ڈالا، اور یا گمراہی اور کجروی کے اس کنارے پر پہونچ گئے کہ رسولوں کی تعظیم میں غلو کرکے ان کو خدا ہی بنادیا، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، یعنی وہ بنی اسرائیل کافر ہوگئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو عیسیٰ ابن مریم ہی کا نام ہے۔

یہاں تو یہ قول صرف نصاریٰ کا مذکور ہے، دوسری جگہ یہی غلو اور گمراہی یہود کی بھی بیان فرمائی گئی ہے، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ، یعنی یہود نے تو یہ کہہ دیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ نے یہ کہہ دیا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔

غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد وعمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھ جائیں مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلق خدا میں

سب سے افضل جانتے، اس حد سے آگے بڑھ کر نبی کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دینا اعتقادی غلو ہے۔

بنی اسرائیل کی افراط و تفریط انبیاء اور رسل کے معاملہ میں بنی اسرائیل کے یہ دو متضاد عمل کہ یا تو ان کو جھٹلائیں اور قتل تک سے دریغ نہ کریں، اور یا یہ زیادتی کہ ان کو خود ہی خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیدیں یہ وہی افراط و تفریط ہے جو جہالت کے لوازمات سے ہے، عرب کا مشہور مقولہ ہے الجاھل اما مفرِط او مفرِّط یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال و میانہ روی پر نہیں رہتا ہمیشہ یا افراط میں مبتلا ہوتا ہے یا تفریط میں افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنے کے ہیں اور تفریط کے معنی ہیں فرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور کمی کرنے کے، اور یہ افراط و تفریط یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی دو مختلف جماعتوں کی طرف سے عمل میں آئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جماعت سے یہ دو مختلف عمل مختلف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتے ہوں کہ بعض کی تکذیب و قتل تک نوبت پہونچ جاتی، اور بعض کو خدا کے برابر بنا دیا جائے۔

ان آیات میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو ہدایت ان کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو دی گئی ہیں وہ دین و مذہب اور اس کی پیروی میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اس سے ذرا ادھر ادھر ہونا انسان کو گمراہیوں کے غاروں میں دھکیل دیتا ہے، اس لئے اس کی تشریح سمجھ لیجئے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ سارے جہان اور اس کی موجودات کا خالق و مالک صرف ایک ذات اللہ جل شانہٗ ہے، اسی کا ملک اور اسی کا حکم ہے، اسی کی اطاعت ہر انسان پر لازم ہے، لیکن چونکہ خاک کا پتلا انسان اپنی مادی ظلمتوں اور پستیوں میں گھرا ہوا ہے، اس کی ساری رسائی اس ذات قدوس تک یا اس کے احکام و ہدایات معلوم کرنے تک کس طرح ہو، اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل سے اس کے لئے دو واسطے مقرر کر دیئے، جن کے ذریعے انسان کو حق تعالیٰ کی پسند و ناپسند اور مامورات و منہیات کا علم ہو سکے، ایک اپنی کتابیں جو انسان کے لئے قانون و ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہیں، دوسرے اپنے ایسے مخصوص مقبول بندے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے چُن لیا ہے، اور ان کو اپنی پسند و ناپسند کا عملی نمونہ اور اپنی کتاب کی عملی شرح بنا کر بھیجا ہے، جن کو دینی اصطلاح میں رسول یا نبی کہا جاتا ہے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ کوئی کتاب خواہ کتنی ہی جامع اور مفصل کیوں ہو کسی انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے کافی نہیں ہوتی بلکہ فطری طور پر انسان کا مربی و معلم صرف انسان ہی ہو سکتا ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے دو سلسلے رکھے، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ جن میں انبیاء علیہم السلام اور پھر ان کے نائبین علماء و مشائخ سب

تفریط کے درمیان اعتدال کی تھی، اسی طرح اس آیت میں غلو اور افراط و تفریط کی ممانعت غلطی کا بیان بھی آگیا، اور درمیانی راہ صراط مستقیم پر قائم رہنے کا بھی۔

تیسری آیت کا مضمون۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل کا انجام بد ذکر کیا گیا ہے، جو اس افراط و تفریط کی گمراہی میں مبتلا تھے، کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی، اوّل داؤد علیہ السلام کی زبان سے جس کے نتیجہ میں ان کی صورتیں مسخ ہو کر خنزیر بن گئے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ لعنت اُن پر مسلط ہوئی جس کا اثر دنیا میں یہ ہوا کہ مسخ ہو کر بندر بن گئے، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ بتقاضائے مقام ان دو پیغمبروں کی زبانی ان پر لعنت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پر لعنت کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی، اور انتہا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی، اس طرح مسلسل چار پیغمبروں کی زبانی ان لوگوں پر لعنت مسلط ہوئی جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی یا جنہوں نے ان کو حد سے آگے بڑھا کر خدا تعالیٰ کی صفات کا شریک بنا دیا۔

آخری دونوں آیتوں میں کفار کے ساتھ گہری دوستی اور موالات کی ممانعت اور اس کے تباہ کن نتائج کا بیان فرمایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ ساری کج روی اور گمراہی نتیجہ تھی ان کے غلط قسم کے ماحول اور کفار کے ساتھ دلی دوستی کرنے کا، جس نے ان کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ

تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو

وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ

اور مشرکوں کو اور تو پاوے گا سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں

اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ

کے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس واسطے کہ نصاریٰ میں

قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

عالم ہیں اور درویش ہیں اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے،

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى

اور جب سنتے ہیں اس کو جو اُترا رسول پر تو دیکھے تو

أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ

ان کی آنکھوں کو دیکھے کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا حق بات کو

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا

کہتے ہیں اے رب ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کے ساتھ اور ہم کو کیا ہوا

نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا

کہ یقین نہ لاویں اللہ پر اور اس چیز پر جو پہنچی ہم کو حق سے اور توقع رکھیں اس کی کہ داخل کرے ہم کو

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿۸۴﴾ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا

رب ہمارا ساتھ نیک بختوں کے پھر ان کو بدلے میں دیئے اللہ نے اس کہنے پر ایسے

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ

باغ کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی اور یہ ہے

جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

بدلہ نیکی کرنے والوں کا اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلانے لگے ہماری آیتوں

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿۸۶﴾

کو وہ ہیں دوزخ کے رہنے والے

ربطِ آیات

اوپر یہود کا مشرکین سے دوستی رکھنا مذکور تھا، آگے ان کا مع مشرکین کے مسلمانوں سے عداوت رکھنا مذکور ہے، جو اس دوستی کا اصلی سبب تھا، اور چونکہ ہر معاملہ میں قرآن مجید عدل و انصاف کا سب سے بڑا داعی ہے، اس لئے یہود و نصاریٰ میں بھی سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا، جس میں کوئی خوبی تھی اس کا بھی اظہار کیا گیا، مثلاً نصاریٰ کی ایک خاص جماعت میں بہ نسبت ان یہود کے تعصب کا کم ہونا، اور ان نصاریٰ میں جنھوں نے حق قبول کرلیا تھا ان کا مستحق حسنِ ثناء و حسنِ جزاء ہونا مذکور ہے، اور یہ خاص جماعت حبشہ کے نصاریٰ کی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو جبکہ ہجرت مدینہ کے قبل وہ اپنا وطن مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے تھے، کچھ تکلیف نہیں دی، اور جو دوسرا نصرانی ایسا ہی ہو وہ بھی حکماً انہی میں داخل ہے، اور ان میں سے جنھوں نے حق قبول کرلیا تھا وہ نجاشی بادشاہ اور ان کے مصاحب ہیں کہ حبشہ میں بھی قرآن سن کر روئے اور مسلمان ہوگئے، پھر تیس آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن سنکر روئے اور اسلام قبول کیا، یہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(غیر مومنین میں) تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پاویں گے اور ان (غیر مومن آدمیوں) میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر (بہ نسبت اوروں کے) ان لوگوں کو پاویں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (قریب تر کا یہ مطلب ہے کہ دوست تو وہ بھی نہیں، مگر دوسرے کفار مذکورین سے غنیمت ہیں، یہ (دوستی سے قریب تر ہونا اور عداوت میں کم ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان (نصاریٰ) میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارکِ دنیا درویش ہیں اور جب کسی قوم میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں تو عوام میں بھی حق کے ساتھ زیادہ عناد نہیں رہتا، اگرچہ خواص و عوام حق کو قبول بھی نہ کریں، اور اس سبب سے ہے کہ یہ (نصاریٰ) لوگ متکبر نہیں ہیں، (قسیسین و رہبان سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں اور نیز تواضع کا خاصہ ہے امر حق کے سامنے نرم ہو جانا اس لئے ان کو عداوت زیادہ نہیں، پس قسیسین و رہبان یعنی علماء و مشائخ کا وجود اشارہ ہے علتِ فی العلم کی طرف اور عدم استکبار قابلیت کی طرف، بخلاف یہود و مشرکین کے کہ محبِ دنیا اور متکبر ہیں، اور گو یہود میں بھی بعض علماء حقانی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے، لیکن بوجہ ان کی قلت کے عوام میں اثر نہیں پہنچا تھا، اس لئے ان میں عناد رہا، جو سبب ہو جاتا ہے شدتِ عداوت کا، اسی لئے یہود تو مومن بہت ہی کم ہوئے اور مشرکین میں سے جب عناد نکل گیا تب مومن ہونا شروع ہوئے) اور (بعضے ان میں ... جو کہ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے ایسے ہیں کہ) جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، اس سبب سے کہ انھوں نے (دین) حق (یعنی اسلام) کو پہچان لیا (مطلب یہ کہ حق کو سن کر متاثر ہوتے ہیں اور) یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم مسلمان ہو گئے تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لیجئے (یعنی ان میں شمار کر لیجئے) جو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے حق ہونے کی) تصدیق کرتے ہیں ... اور ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب تعلیم شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو (دین) حق ہم کو (اب) پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لاویں اور (پھر) اس بات کی امید (بھی) رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک (مقبول) لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا، (بلکہ یہ امید موقوف اسلام پر ہے، اس لئے مسلمان ہونا ضروری ہے) سو ان (لوگوں) کو اللہ تعالیٰ ان کے (اس) قول (مع الاعتقاد) کی پاداش میں ایسے باغ (بہشت کے) دیں گے جن کے (محلات کے)

نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، اور نیکوکاروں کی یہی جزا ہے اور برخلاف ان کے جو لوگ کافر رہے اور ہماری آیات (احکام) کو جھٹلاتے رہے وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہیں۔

معارف و مسائل

بعض اہل کتاب کی ان آیات میں مسلمانوں کے ساتھ مودت یا عداوت کے معیار سے اُن اہل کتاب حق پرستی ، کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اپنی حق پرستی اور خدا ترسی کی وجہ سے مسلمانوں سے بغض و عداوت نہیں رکھتے تھے، مگر ان اوصاف کے لوگ یہود میں بہت کم کالعدم تھے جیسے حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ، نصاریٰ میں نسبتاً ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ملک حبشہ کا بادشاہ نجاشی اور وہاں کے حکام و عوام میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی، اور اسی سبب جب مکہ مکرمہ کے مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آگئے، تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کرجانے کا مشورہ دیا، اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ حبشہ کا بادشاہ نہ خود ظلم کرتا ہے، نہ کسی کو کسی پر ظلم کرنے دیتا ہے، اس لئے مسلمان کچھ عرصہ کے لئے وہاں چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے پہلی مرتبہ گیارہ حضرات حبشہ کی طرف نکلے، جن میں حضرت عثمان غنیؓ اور ان کی زوجہ محترمہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں، اس کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک بڑا قافلہ جو عورتوں کے علاوہ بیاسی مردوں پر مشتمل تھا، حبشہ پہنچ گیا، شاہ حبشہ اور وہاں کے باشندوں نے ان کا شریفانہ استقبال کیا اور یہ لوگ امن و عافیت سے وہاں رہنے لگے۔

قریشِ مکہ کے غیظ و غضب نے ان کو اس پر بھی نہ رہنے دیا، کہ یہ لوگ کسی دوسرے ملک میں اپنی زندگی عافیت سے گذار لیں، انھوں نے اپنا ایک وفد بہت سے تحفے دے کر شاہِ حبشہ کے پاس روانہ کیا، اور یہ درخواست کی کہ ان مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دیں، مگر شاہ حبشہ نے حالات کی تحقیق کی، اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور ان کے رفقاء سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے حالات معلوم کئے، ان حالات اور اسلام کی تعلیمات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی پیشینگوئی کے عین مطابق پایا، جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر اور ان کی تعلیمات کا مختصر خاکہ اور ان کا اور ان کے صحابہ کا حلیہ وغیرہ مذکور تھا، اس سے متاثر ہو کر شاہِ حبشہ نے قریشی وفد کے ہدیئے، تحفے واپس

کر دیئے اور ان کو صاف جواب دیدیا کہ میں ایسے لوگوں کو اپنے ملک سے نکلنے کا کبھی حکم نہیں دے سکتا

حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر کا شاہ حبشہ پر اثر

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے نجاشی کے دربار میں اسلام اور اس کی تعلیمات کا ایک مختصر مگر جامع نقشہ کھینچ دیا تھا، اور پھر ان حضرات کے قیام نے نجاشی کے دل میں بلکہ وہاں کے حکام و عوام سب کے دل میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت و عظمت پیدا کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور وہاں آپؐ کا اور صحابہ کرامؓ کا مطمئن ہوجانا معلوم ہوا اور مہاجرین حبشہ نے مدینہ طیبہ جانے کا عزم کیا تو نجاشی شاہ حبشہ نے ان کے ساتھ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء و مشائخ کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھا، جن میں باسٹھ حضرات حبشہ کے اور آٹھ شام کے تھے۔

شاہ حبشہ کے وفد کی دربار رسالت میں حاضری

یہ وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک درویشانہ اور راہبانہ لباس میں ملبوس حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی، یہ لوگ سنتے جاتے تھے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، سب نے کہا کہ یہ کلام اس کلام کے کتنا مشابہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا، اور یہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔

ان کی واپسی کے بعد شاہ حبشہ نجاشی نے بھی اسلام کا اعلان کر دیا، اور اپنا ایک خط دے کر اپنے صاحبزادہ کو ایک دوسرے وفد کا قائد بنا کر بھیجا، مگر سوء اتفاق سے یہ کشتی دریا میں غرق ہوگئی، الغرض حبشہ کے بادشاہ اور حکام و عوام نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شریفانہ اور عادلانہ سلوک کیا بلکہ بالآخر خود بھی مسلمان ہوگئے۔

جمہور مفسرین نے فرمایا کہ آیات مذکورہ انہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى، اور بعد کی آیات میں ان کا خوف حق تعالیٰ سے رونا اور حق کو قبول کرنا بیان فرمایا گیا ہے، اس پر بھی جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ اگرچہ یہ آیات نجاشی اور اس کے بھیجے ہوئے وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن الفاظ میں عموم ہے اس لئے اس کا حکم ان تمام نصاریٰ کے لئے عام اور شامل ہے جو اہل حبشہ کی طرح حق پرست و انصاف پسند ہوں، یعنی اسلام سے پہلے انجیل کے متبع تھے، اور اسلام آنے کے بعد اسلام کے پیرو ہوگئے۔

یہود میں بھی اگرچہ چند حضرات اسی شان کے موجود تھے جو عہد موسوی میں تورات پر

مسلمان تھے، کچھ اسلام آنے کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے، لیکن یہ اتنی کم تعداد تھی کہ امتوں اور قوموں کے ذکر کے وقت اس کو ذکر نہیں کیا جاسکتا ہے، باقی یہود کا حال کھلا ہوا تھا، کہ وہ مسلمانوں کی عداوت اور بغض میں سب سے آگے تھے اسی لئے صدر آیت میں یہود کا یہ حال ذکر فرمایا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ، یعنی مسلمانوں کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس آیت میں نصاریٰ کی ایک خاص جماعت کی مدح فرمائی گئی ہے، جو خداترسی اور حق پرستی کی حامل تھی، جس میں نجاشی اور اس کے اعوان و انصار بھی داخل ہیں، اور دوسرے نصاریٰ بھی جو ان صفات کے حامل تھے یا آئندہ زمانہ میں داخل ہوں، لیکن اس کے ... یہ معنی ان آیات سے نکلتے ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں کہ نصاریٰ خواہ کیسے ہی گمراہ ہوجائیں اور اسلام دشمنی میں کتنے ہی سخت اقدام کریں ان کو بہرحال مسلمانوں کا دوست سمجھا جائے، اور مسلمان ان کی دوستی کی طرف ہاتھ بڑھائیں، کیونکہ یہ بداہۃً غلط اور واقعات کے قطعاً خلاف ہے، اسی لئے امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ بعض جاہل جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان آیات میں مطلقاً نصاریٰ کی مدح ہے اور وہ علی الاطلاق یہود سے بہتر ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، کیونکہ اگر عام طور پر دونوں جماعتوں کے مذہبی عقائد کا موازنہ کیا جائے تو نصاریٰ کا مشرک ہونا زیادہ واضح ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ معاملات کو دیکھا جائے تو آجکل کے عام نصاریٰ نے بھی اسلام دشمنی میں یہودیوں سے کم حصہ نہیں لیا، ہاں یہ صحیح ہے کہ نصاریٰ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوئی ہے، جو خداترس اور حق پرست تھے، اسی کے نتیجہ میں انکو قبول اسلام کی توفیق ہوئی، اور یہ آیت ان دونوں جماعتوں کے مابین اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں، خود اسی آیت کے آخر میں قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے: ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، یعنی جن نصاریٰ کی مدح ان آیات میں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور خداترس تارک الدنیا حضرات ہیں، اور ان میں تکبر نہیں کہ دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، مقابلہ سے معلوم ہوا کہ یہود کے یہ حالات نہ تھے، ان میں خداترسی اور حق پرستی نہ تھی، ان کے علماء نے بھی بجائے ترکِ دنیا کے اپنے علم کو صرف ذریعہ معاش بنا لیا تھا، اور طلبِ دنیا میں ایسے مست ہوگئے تھے کہ حق و ناحق اور حلال و حرام کی بھی پرواہ نہ رہی تھی۔

قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست علماء و مشائخ ہیں

آیت مذکورہ کے بیان سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست، خداترس علماء و مشائخ ہیں، ان کا وجود پوری قوم

کی حیثیت ہے جب تک کسی قوم میں ایسے علماء و مشائخ موجود ہوں جو دنیوی خواہشات کے پیچھے نہ ہوں اور خدا ترسی ان کا مقام ہو تو وہ قوم خیر و برکت سے محروم نہیں ہوتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ

اے ایمان والو مت حرام ٹھہراؤ وہ مزیدار چیزیں جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیں

وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا

اور حد سے نہ بڑھو بیشک اللہ پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو اور کھاؤ اللہ کے

رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو

ربطِ آیات یہاں تک اہل کتاب کے متعلق گفتگو تھی آگے پھر عود ہے احکامِ فرعیہ کی طرف جن کا ذکر کچھ شروع سورت میں اور کچھ درمیان میں بھی ہوا ہے، اور بہ علاقہ خصوصیت مقام کے ایک ربط خاص بھی منقول ہے، وہ یہ کہ اوپر مقام مدح میں رہبانیت کا ذکر آیا ہے، گو وہ باعتبار اس کے ایک جزو خاص یعنی ترک لذات دنیا کے ہے، لیکن احتمال تھا کہ کوئی رہبانیت کی اس ادنیٰ خصوصیت کو قابل مدح سمجھ جاتا، اس لئے اس مقام پر اس تحریم حلال کی ممانعت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔ (بیان القرآن ملخصاً)

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں (خواہ وہ کھانے پینے اور پہننے کی قسم سے ہوں یا منکوحات کی قسم سے ہوں) ان میں لذیذ اور مرغوب چیزوں کو (قسم و عہد کر کے) اپنے نفسوں پر حرام مت کرو اور حدود (شرعیہ) سے (جو کہ تحلیل و تحریم کے باب میں مقرر ہیں) آگے مت نکلو بیشک اللہ تعالیٰ حد (شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ (برتو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو (یعنی تحریم حلال خلاف رضائے حق ہے، ڈرو اور اس کا ارتکاب مت کرو)۔

معارف و مسائل

ترکِ دنیا اگر حدودِ شرعیہ کے اندر ہو تو جائز، ورنہ حرام ہے

مذکورہ آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ ترکِ دنیا اور ترکِ شہوات و لذات ایک درجہ میں محبوب و پسندیدہ ہے، مگر اس میں بھی حدودِ شرعیہ سے تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجات

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں، ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرے، مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا، یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا، تیسرے یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظِ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گی، قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحتہً کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارۂ قسم ادا کرے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن و سنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس کے لئے ان چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لئے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں،

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ، یعنی اللہ کی حدود سے آگے نہ بڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

حد سے بڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ کسی حلال چیز کو بلا کسی عذر کے ثواب سمجھ کر چھوڑ دے، جس کو ناواقف آدمی تقویٰ سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تعدی اور ناجائز ہے، اس لئے دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ یعنی جو رزق حلال پاک اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے اس کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے جس پر تمہارا ایمان ہے ڈرتے رہو۔

اس آیت میں واضح فرما دیا کہ حلال پاک چیزوں کا ثواب سمجھ کر چھوڑ دینا تقویٰ نہیں، بلکہ تقویٰ اس میں ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر استعمال کرے، اور شکر ادا کرے، ہاں کسی جسمانی یا روحانی مرض کی وجہ سے بطور علاج کسی چیز کو چھوڑے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر لیکن پکڑتا ہے

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ

اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہے دس محتاجوں کو

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ

اوسط درجہ کا کھانا جو دیتے ہو اپنے گھر والوں کو یا کپڑا پہنا دینا دس محتاجوں کو یا ایک گردن آزاد

رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ

کرنی، پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھنے ہیں تین دن کے یہ کفارہ ہے تمہاری

اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ

قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی اسی طرح بیان کرتا ہے

اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۸۹

اللہ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم احسان مانو

ربطِ آیات

اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا، چونکہ وہ بعض دفعہ بذریعہ قسم کے ہوتی ہے، اس لئے آگے قسم کھانے کا حکم مذکور ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ تم سے (دنیوی) مواخذہ نہیں فرماتے (یعنی کفارہ واجب نہیں کرتے) تمہاری قسموں میں لغو قسم (توڑنے) پر، لیکن (اس) مواخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو (آئندہ بات پر) مستحکم کر دو (اور پھر اس کو توڑ دو) سو اس (قسم کے توڑنے) کا کفارہ (یہ ہے کہ) دس محتاجوں کو کھانا دینا اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو (معمولی طور پر) کھانے کو دیا کرتے ہو یا ان (دس محتاجوں) کو کپڑا دینا (اوسط درجہ کا) یا ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا (یعنی تینوں میں جس کو چاہے اختیار کرے) اور جس کو (ان تینوں میں سے ایک کا بھی) مقدور نہ ہو تو اس کا کفارہ تین دن کے (متواتر) روزے ہیں یہ (جو مذکور ہوا) کفارہ ہے تمہاری (ایسی) قسموں کا جبکہ تم قسم کھا لو (اور پھر اس کو توڑ دو) اور (چونکہ یہ کفارہ واجب ہوتا ہے اس لئے) اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو (کبھی ایسا نہ ہو کہ قسم کو توڑ دو اور کفارہ نہ دو) اور (جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بہ رعایت تمہارے دنیوی و دینی مصالح کے بیان فرمایا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے (دوسرے) احکام (بھی) بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (اس نعمت یعنی مصالح خلق کی رعایت کا) شکر کرو۔

معارف و مسائل

قسم کھانے کی چند صورتیں اور ان کے متعلق احکام

اس آیت میں قسم کھانے کی چند صورتوں کا بیان ہے، بعض کا بیان سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے، خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر کسی گذشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے، اس کو اصطلاح فقہ میں یمین غموس کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کر لیا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے، اور پھر جان بوجھ کر قسم کھائے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم سخت گناہ کبیرہ اور موجب وبال دنیا و آخرت ہے، مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ و استغفار لازم ہے، اسی لئے اس کو اصطلاح فقہ میں یمین غموس کہا جاتا ہے، کیونکہ غموس کے معنی ڈبو دینے والے کے ہیں، یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کر دینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ پر اپنے نزدیک سچ سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں وہ غلط ہو، مثلاً کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص آگیا ہے، اس پر اعتماد کر کے اس نے قسم کھا لی کہ وہ آگیا ہے، پھر معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس کو یمین لغو کہتے ہیں، اسی طرح بلا قصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی یمین لغو کہا جاتا ہے

اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس پر کفارہ ہے نہ گناہ۔

تیسری صورت قسم کی یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اس کو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ بھی ہوتا ہے، بعض میں نہیں ہوتا۔

اس جگہ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں لفظ یمین لغو سے وہی قسم مراد ہے جس پر کفارہ نہیں خواہ گناہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس کے مقابل عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ مذکور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مواخذہ سے مراد صرف دنیا کا مواخذہ ہے جو کفارہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

اور سورۂ بقرہ کی آیت میں ارشاد ہے لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اس میں لغو سے مراد وہ قسم ہے جو بلا قصد زبان سے نکل جائے یا اپنے نزدیک سچی بات سمجھ کر قسم کھالے مگر وہ واقع میں غلط ہو، اس کے بالمقابل وہ قسم مذکور ہے جس میں قصداً جھوٹ بولا گیا ہو جس کو یمین غموس کہتے ہیں، اس لئے اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ یمین لغو پر تو کوئی گناہ نہیں بلکہ گناہ یمین غموس پر ہے جس میں قصد کرکے جھوٹ بولا گیا ہو تو سورۂ بقرہ میں حکم آخرت کے گناہ کا بیان ہے اور سورۂ مائدہ کی آیت متذکرہ میں دنیوی حکم یعنی کفارہ کا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ یمین لغو پر اللہ تعالیٰ تم سے مواخذہ نہیں کرتا یعنی کفارہ واجب نہیں کرتا، بلکہ کفارہ صرف اس قسم پر لازم کرتا ہے جو آئندہ زمانہ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں منعقد کی ہو، اور پھر اس کو توڑ دیا ہو، اس کے **بعد کفارہ کی تفصیل اس طرح ارشاد فرمائی ہے:**

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ، یعنی تین کاموں میں سے کوئی ایک کام اختیار کرلے، اول یہ کہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا صبح و شام دو وقت کھلا دیا جائے، یا یہ کہ دس مسکینوں کو بقدر ستر پوشی کپڑا دیدیا جائے، مثلاً ایک پاجامہ یا تہبند یا ایک کرتا، یا کوئی مملوک غلام آزاد کر دیا جائے۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ یعنی اگر کسی قسم توڑنے والے کو اس مالی کفارہ کے ادا کرنے پر قدرت نہ ہو کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے یا غلام آزاد کرسکے تو پھر اس کا کفارہ یہ ہے کہ تین دن روزے رکھے، بعض روایات میں اس جگہ تین روزے پے در پے مسلسل رکھنے کا حکم آیا ہے، اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک کفارہ قسم کے تین روزے مسلسل ہونا ضروری ہیں۔

آیت مذکورہ میں کفارہ قسم کے متعلق اول لفظ اطعام آیا ہے، اور اطعام کے معنی عربی لغت

کے اعتبار سے کھانا کھلانے کے بھی آتے ہیں، اور کسی کو کھانا دیدینے کے بھی، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہے کہ دس مسکینوں کی دعوت کرکے کھانا کھلادے یا کھانا ان کی ملکیت میں دیدے، مگر پہلی صورت میں یہ ضروری ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا جو وہ عموماً اپنے گھر کھاتا ہے دس مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھلادے، اور دوسری صورت میں ایک مسکین کو بقدر ایک فطرہ کے دیدے، مثلاً پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت تینوں میں جو چاہے اختیار کرے، لیکن روزہ رکھنا صرف اُس صورت میں کافی ہوسکتا ہے جبکہ ان تینوں میں سے کسی پر قدرت نہ ہو۔

قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی معتبر نہیں

آخر آیت میں تنبیہ کے لئے دو ارشاد فرمائے گئے ہیں، اول ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ یعنی یہ ہے کفارہ تمہاری قسم کا جب تم نے قسم کھالی، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی آئندہ کام کرنے یا نہ کرنے پر حلف کرو اور پھر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفارہ کی ادائیگی قسم ٹوٹنے کے بعد ہونی چاہئے، قسم توڑنے سے پہلے اگر کفارہ دیدیا جائے تو وہ معتبر نہ ہوگا، وجہ یہ ہے کہ کفارہ لازم ہونے کا سبب قسم توڑنا ہے جب تک قسم نہیں ٹوٹی تو کفارہ واجب ہی نہیں ہوا، تو جیسے وقت سے پہلے نماز نہیں ہوتی رمضان سے پہلے رمضان کا روزہ نہیں ہوتا، اسی طرح قسم ٹوٹنے سے پہلے قسم کا کفارہ بھی ادا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ یعنی اپنی قسموں کی حفاظت کرو، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی قسم کھالی ہے تو بلا ضرورت شرعی یا طبعی قسم کو نہ توڑو، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قسم کھانے میں جلد بازی سے کام نہ لو، اپنی قسم کو محفوظ رکھو جب تک شدید مجبوری نہ ہو قسم نہ کھاؤ (مظہری)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ

اے ایمان والو یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت

وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ

اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے سو ان سے بچتے رہو تاکہ

تُفْلِحُونَ ﴿۹۰﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ

تم نجات پاؤ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں

معارف ومسائل

کائنات کی تخلیق انسان کے نفع کے لئے ہے ان آیات میں بتلانا یہ منظور ہے کہ رب کائنات نے ساری کائنات کو انسان کی خدمت کے لئے پیدا فرمایا، اور ہر ایک چیز کو انسان کی خاص خاص خدمت پر لگا دیا ہے، اور انسان کو مخدوم کائنات بنایا ہے، انسان پر صرف ایک پابندی لگا دی کہ ساری مخلوقات سے نفع اٹھانے کی جو حدود ہم نے مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، جن چیزوں کو تمہارے لئے حلال طیب بنا دیا ہے ان سے احتراز کرنا بے ادبی اور ناشکری ہے، اور جن چیزوں کے کسی خاص استعمال کو حرام قرار دیدیا ہے، اس میں خلاف ورزی کرنا نافرمانی اور بغاوت ہے، بندہ کا کام یہ ہے کہ مالک کی ہدایت کے مطابق اس کی مخلوق کا استعمال کرے، **اسی کا نام عبدیت ہے۔**

پہلی آیت میں شراب، جوا، بت اور جوئے کے تیر چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔ اسی مضمون کی ایک آیت تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بھی آ چکی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ اس میں ان چاروں چیزوں کو رجس فرمایا، رجس عربی زبان میں ایسی گندی چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت کو گھن اور نفرت پیدا ہو، یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ذرا بھی عقل سلیم اور طبع سلیم رکھتا ہو تو خود بخود ہی ان چیزوں سے اس کو گھن **اور نفرت ہوگی۔**

ازلام کی تشریح ان چار چیزوں میں سے ایک ازلام ہے، جو زلم کی جمع ہے، ازلام ان تیروں کو کہا جاتا ہے جن پر قرعہ اندازی کر کے عرب میں جوا کھیلنے کی رسم جاری تھی، جس کی صورت یہ تھی کہ دس آدمی شرکت میں ایک اونٹ ذبح کرتے تھے، پھر اس کا گوشت تقسیم کرنے کے لئے بجائے اس کے کہ دس حصے برابر کر کے تقسیم کرتے اس میں اس طرح جوا کھیلتے کہ دس عدد تیروں میں سے سات تیروں پر کچھ مقررہ حصوں کے نشانات بنا رکھتے تھے کسی پر ایک کسی پر دو یا تین، اور تین تیروں کو سادہ رکھا ہوا تھا، ان تیروں کو ترکش میں ڈال کر ہلاتے تھے، پھر ایک ایک شریک کے لئے ایک ایک تیر ترکش میں سے نکالتے، اور جتنے حصوں کا تیر کسی کے نام پر نکل آئے وہ اتنے حصوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اور جس کے نام پر سادہ تیر نکل آئے وہ حصہ سے محروم رہتا تھا جیسے آجکل بہت سی قسمیں لاٹری کے طریقہ پر بازاروں میں جاری ہیں، اس طرح کی قرعہ اندازی، قمار یعنی جوا ہے جو ازروئے قرآن کریم حرام ہے۔

قرعہ اندازی کی جائز صورت: ہاں ایک دوسری قسم قرعہ اندازی کی جائز اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ یہ کہ جب حقوق سب کے مساوی ہوں اور حصے بھی مساوی تقسیم کر دیئے گئے ہوں پھر ان میں سے حصوں کی تعیین بذریعہ قرعہ اندازی کرلی جائے، مثلاً ایک مکان چار شریکوں میں تقسیم کرنا ہے تو قیمت کے لحاظ سے چار حصے برابر لگا لئے گئے، اب یہ تعیین کرنا کہ کونسا حصہ کس شریک کے پاس رہے، اس کی تعیین اگر آپس میں مصالحت و رضامندی سے نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے کہ قرعہ اندازی کرکے جس کے نام پر جس طرف کا حصہ نکل آئے اس کو دیدیا جائے، یا کسی چیز کے خواہشمند ایک ہزار ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں، مگر جو چیز تقسیم کرنی ہے وہ کل سو ہیں، تو اس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

ازلام کی قرعہ اندازی کے ذریعہ گوشت تقسیم کرنے کی جاہلانہ رسم کی حرمت سورۂ مائدہ ہی کی ایک آیت میں پہلے آچکی ہے وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں جن چار چیزوں کو حرام ہونا ذکر کیا ان میں سے دو یعنی میسر اور ازلام تو تقریباً ایک ہی ہیں، باقی دو میں ایک انصاب ہے، جو نُصُبٌ کی جمع ہے، ایسی چیز کو نصب کہا جاتا ہے جو عبادت کے لئے کھڑی کی گئی ہو خواہ بت ہو یا کوئی درخت، پتھر وغیرہ۔

شراب وجوئے کے جسمانی و روحانی مفاسد

آیت کے شان نزول اور اس کے بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اصل مقصود دو چیزوں کی حرمت اور مفاسد کا بیان کرنا ہے، یعنی شراب اور جوا، انصاب یعنی بتوں کا ذکر اس کے ساتھ اس لئے ملا دیا گیا ہے کہ سننے والے سمجھ لیں کہ شراب اور جوئے کا معاملہ ایسا سخت جرم ہے جیسے بت پرستی۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ یعنی شراب پینے والا ایسا مجرم ہے جیسے بت کو پوجنے والا، اور بعض روایات میں ہے: شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی "یعنی شراب پینے والا ایسا ہے جیسے لات و عزیٰ کی پرستش کرنے والا"۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہاں شراب اور جوئے کی شدید حرمت اور ان کی روحانی اور جسمانی خرابیوں کا بیان ہے، اول روحانی و معنوی خرابیاں رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ کے الفاظ میں بیان کیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ یہ چیزیں فطرت سلیمہ کے نزدیک گندی قابل نفرت چیزیں اور شیطانی جال ہیں جن میں پھنس جانے کے بعد انسان بیشمار مفاسد اور مہلک خرابیوں کے گڑھے میں جا گرتا ہے، یہ روحانی مفاسد بیان فرمانے کے بعد حکم دیا گیا

وَ اجْتَنِبُوْهُ کہ جب یہ چیزیں ایسی ہیں تو ان سے اجتناب کرو اور پرہیز کرو۔

آخر میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ جس میں بتلایا گیا کہ تمھاری فلاح دنیا و آخرت اسی پر موقوف ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرتے رہو۔

اس کے بعد دوسری آیت میں شراب اور جوئے کے دنیوی اور ظاہری مفاسد کا بیان اس طرح فرمایا گیا اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ، "یعنی شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں مبتلا کرکے تمھارے درمیان بغض وعداوت کی بنیادیں ڈال دے"۔

ان آیات کا نزول بھی کچھ ایسے ہی واقعات کے بارہ میں ہوا ہے کہ شراب کے نشہ میں ایسی حرکات صادر ہوئیں جو باہمی غیظ وغضب اور پھر جنگ وجدل کا سبب بن گئیں، اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ شراب کے نشہ میں جب آدمی عقل کھو بیٹھتا ہے تو اس سے ایسی حرکات کا صدور لازمی جیسا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جوئے کا معاملہ ہے کہ ہارنے والا اگرچہ اپنی ہار مان کر اس وقت نقصان اٹھا لیتا ہے، مگر اپنے حریف پر غیظ وغضب اور بغض وعداوت اس کے لازمی اثرات میں سے ہے، حضرت قتادہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بعض عرب کی عادت تھی کہ جوئے میں اپنے اہل وعیال اور مال وسامان سب کو ہار کر انتہائی رنج وغم کی زندگی گذارتے تھے۔

آخر آیت میں پھر ان چیزوں کی ایک اور خرابی ان الفاظ میں ارشاد فرمائی. وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ "یعنی یہ چیزیں تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کر دیتی ہیں"۔

یہ خرابی بلحاظ روحانی اور اخروی خرابی ہے جس کو دنیوی خرابی کے بعد مکرر ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ اصل قابلِ نظر اور قابلِ فکر وہ زندگی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے، عقلمند کے نزدیک اسی کی خوبی مطلوب ومرغوب ہونی چاہیئے، اور اسی کی خرابی سے ڈرنا چاہیئے، دنیا کی چند روزہ زندگی کی خوبی نہ کوئی قابلِ فخر چیز ہے، نہ خرابی زیادہ قابلِ رنج وغم ہے، کہ اس کی دونوں حالتیں چند روز میں ختم ہو جانے والی ہیں ؎

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت
تلخی وخوشی وزشت وزیبا بگذشت

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت یہ دنیا و آخرت اور جسم و روح دونوں کے لئے مضر ہے، آخرت اور روح کے لئے مضر ہونا تو ظاہر ہے کہ اللہ

سے غافل، بے نماز کی آخرت تباہ اور روح مُردہ ہے، اور ذرا غور سے دیکھا جائے تو اللہ سے غافل کی دنیا بھی وبالِ جان ہوتی ہے کہ جب اللہ سے غافل ہو کر سب کا انتہائی مقصود مال و دولت اور عزت و جاہ ہو جائے تو وہ اتنے بکھیڑے اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ وہ خود ایک مستقل غم ہوتے ہیں جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنے مقصود، مقاصد یعنی راحت و آرام اور اطمینان و سکون سے محروم ہو جاتا ہے، اور ان اسبابِ راحت میں یہ مست ہوتا ہے کہ خود راحت کو بھی بھول جاتا ہے، اور اگر کسی وقت یہ مال و دولت یا عزت و جاہ جاتے رہیں یا ان میں کمی آجائے تو ان کے غم و رنج کی انتہا نہیں رہتی، غرض یہ خالص دنیادار انسان دونوں حالتوں میں رنج و فکر اور غم و اندوہ میں گھر رہتا ہے، ؎

اگر دنیا نباشد دردمندیم
وگر باشد بمہرش پائے بندیم

بخلاف اس شخص کے جس کا دل اللہ کی یاد سے روشن اور نورِ نماز سے منور ہے، دنیا کے مال و منال اور جاہ و منصب اس کے قدموں پر گرتے ہیں، اور ان کو صحیح راحت و آرام پہنچاتے ہیں، اور اگر یہ چیزیں جاتی رہیں تو ان کے قلوب اس سے متاثر نہیں ہوتے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیشِ ہمتِ ما ہر چہ آمد بود مہمانے

خلاصہ یہ ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت اگر غور سے دیکھا جائے تو اخروی اور دنیوی دونوں طرح کی خرابی ہے، اس لئے ممکن ہو کہ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ سے خالص اخروی اور روحانی مضرت بیان کرنا مقصود ہو، اور يُوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ سے خالص دنیوی اور جسمانی خرابی بتلانا ہو، اور يَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ سے دین و دنیا کی مشترک تباہی و بربادی کا ذکر کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ذکر اللہ میں تو نماز بھی داخل ہے، پھر نماز کو علیحدہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں نماز کی اہمیت اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں افضل و اشرف ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے نماز کو مستقل طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

اور تمام دینی اور دنیوی، جسمانی اور روحانی خرابیوں کی تفصیل بتلانے کے بعد ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ایک عجیب دل نواز انداز سے فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ یعنی جب یہ ساری خرابیاں تمہارے علم میں آگئیں تو اب بھی ان سے باز آؤ گے۔

ان دونوں آیتوں میں شراب اور جوئے وغیرہ کی حرمت اور شدید ممانعت کا بیان تھا، جو قانونِ الٰہی کی ایک دفعہ ہے، تیسری آیت میں اس حکم کو آسان کرنے اور اس پر عمل کو سہل بنانے کے لئے قرآن کریم نے اپنے خاص اسلوب بیان کے تحت ارشاد فرمایا:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طاعت کا حکم تمہارے فائدہ کے لئے ہے، اگر تم نہ مانو تو نہ اللہ جل شانہ کا کوئی نقصان ہے نہ اس کے رسول کا، اللہ تعالیٰ کا اس نفع و نقصان سے بالاتر ہونا تو ظاہر تھا، رسول کے متعلق کسی کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب انکی بات نہ مانی گئی تو ان کے اجر و ثواب یا قدر و منزلت میں شاید کچھ فرق آجائے، اس شبہ کے ازالہ کے لئے ارشاد فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ، یعنی اگر تم میں سے کوئی بھی ہمارے رسول کی بات نہ مانے جب بھی اس کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیونکہ جتنا کام ان کے سپرد تھا وہ کر چکے، یعنی صاف صاف طور پر واضح کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا، اس کے بعد جو شخص نہیں مانتا وہ اپنا نقصان کرتا ہے ہمارے رسول کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو کچھ پہلے

طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا

کھا چکے جب کہ آئندہ کو ڈر گئے اور ایمان لائے اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے

وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۳)

اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

ع ۱۲ / ۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

اے ایمان والو البتہ تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات سے اس شکار میں کہ جس پر

تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ

پہنچتے ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے تاکہ معلوم کرے اللہ کون اس سے ڈرتا ہے

بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

بن دیکھے، پھر جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ

اے ایمان والو نہ مارو شکار جس وقت کہ تم ہو احرام میں، اور جو کوئی

قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ

تم میں سے اس کو مارے جان کر تو اس پر بدلہ ہے اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے

يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ

جو تجویز کریں دو آدمی معتبر تم میں سے اس طرح سے کہ وہ جانور بدلے کا بطور نیاز پہنچایا جاوے

طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ

کعبہ تک یا اس پر کفارہ ہے چند محتاجوں کو کھلانا یا اس کے برابر روزے تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ

اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہو چکا اور جو کوئی پھر کرے گا اس سے بدلہ لے گا اللہ اور اللہ

عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ

زبردست ہے بدلہ لینے والا۔ حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا

تمہارے فائدہ کے واسطے اور سب مسافروں کے اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار جب تک

دُمْتُمْ حُرُمًا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

تم احرام میں رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم جمع ہو گے

ربطِ آیات اس باب میں مسند احمد سے بروایت ابی ہریرہؓ منقول ہے کہ جب اوپر کی آیت میں تحریم خمر و میسر نازل ہو چکی تو بعض لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ بہت سے آدمی جو کہ شراب پیتے تھے اور قمار کا مال کھاتے تھے تحریم سے پہلے مر گئے، اور اب معلوم ہوا کہ وہ حرام ہے ان کا کیا حال ہوگا، اس پر آیت لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔

اور پیچھے آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ میں تحریم طیبات کی ممانعت کا ذکر تھا، اب آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ الخ سے بیان فرماتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ خاص حالت میں خاص خاص چیزوں کو حرام قرار دیدیں (بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جسکو وہ کھاتے پیتے ہوں، اور اس وقت وہ حلال ہو گو بعد میں حرام ہو جائے (ورنہ گناہ کیوں نہیں ہوتا، جبکہ گناہ کا کوئی امر مقتضی نہ ہو بلکہ ایک امر مانع موجود ہو وہ یہ کہ) وہ لوگ (خدا کے خوف سے اس وقت کی ناجائز چیزوں سے) پرہیز رکھتے ہوں اور (دلیل اس خوف کی یہ ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں (جو کہ خدا سے ڈرنے کا سبب ہے) اور نیک کام کرتے ہوں (جو کہ خوفِ خدا کی علامت ہے، اور اسی حالت پر وہ عمر بھر رہیں، چنانچہ اگر وہ حلال چیز جس کو پہلے کھاتے پیتے تھے آگے کبھی چل کر حرام ہو جاوے تو پھر (اس سے بھی اسی خوفِ خدا کے سبب) پرہیز کرنے لگتے ہوں اور (اس خوف کی بھی دلیل مثل سابق یہی ہو کہ وہ لوگ، ایمان رکھتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں (جو کہ موقوف ہیں ایمان پر، پس یہاں بھی سبب اور علامت خوف خدا کے مجتمع ہیں، مطلب یہ کہ ہر بار کی مکرر سہ کرر تحریم میں ان کا یہی عمل در آمد ہو کچھ دو تین بار کی خصوصیت نہیں، پس باوجود مانع اور استمرار مانع کے سارے فضل سے بعید ہے کہ وہ گناہ گار ہوں) اور (ان کی یہ خاص طریقہ مذکور کی نیکوکاری صرف لزوم گناہ سے مانع ہی نہیں بلکہ وجود ثواب و محبوبیت کو مقتضی بھی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں (پس ان میں مبغوض ہونے کا احتمال تو کب ہو سکتا ہے، یہ تو غیر مبغوض ہونے سے گذر کر محبوب ہونے کا درجہ رکھتے ہیں)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک (بوجہ تم سے دور دور نہ بھاگنے کے، تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے (مطلب امتحان کا یہ کہ حالتِ احرام میں وحوش کے شکار کرنے کو تم پر حرام کر کے جیسا آگے تصریحاً آتا ہے، ان وحوش کو تمہارے آس پاس پھراتے رہیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہر طور پر بھی) معلوم کرے کہ کون شخص اس سے (یعنی اس کے عذاب سے، بن دیکھے ڈرتا ہے (اور ارتکاب حرام سے جو کہ موجب عذاب ہے بچتا ہے اسی سے التزاماً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شکار حرام ہے) سو جو شخص اس (حرمت) کے بعد (جس پر ابتلاء بھی دلالت کر رہا ہے، حد (شرعی) سے نکلے گا (یعنی شکار ممنوع کا مرتکب ہوگا) اس کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے، (چنانچہ شکاری

جانور اسی طرح آس پاس لگے پھرتے تھے، چونکہ صحابہ میں بہت سے شکار کے عادی تھے اس میں ان کی اطاعت کا امتحان ہو رہا تھا، جس میں وہ پورے اترے، آگے ممانعت کی زیادہ تصریح ہے کہ) اے ایمان والو وحشی شکار کو (باستثناء ان کے کہ جن کو شرع نے مستثنیٰ کر دیا) قتل مت کرو، جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو (اسی طرح جبکہ وہ شکار حرم میں ہو گو شکاری احرام میں نہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے) اور جو شخص تم میں اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر اس کے فعل کی پاداش واجب ہوگی جو کہ (باعتبار قیمت کے) مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہو جس (کے تخمینہ) کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں (کہ دینداری میں بھی قابل اعتبار ہوں اور تجربہ و بصیرت میں بھی، پھر اس قاتل کو تخمینۂ قیمت کے بعد اختیار ہے) خواہ (اس قیمت کا کوئی ایسا جانور خرید کر) وہ پاداش (کا جانور خاص چوپاؤں میں سے ہو یعنی اونٹ، گائے بھینس بھیڑ بکری نر ہو یا مادہ، بشرطیکہ نیاز کے طور پر کعبہ (کے پاس) تک (یعنی حرم کے اندر) پہنچائی جائے اور خواہ (اس قیمت کے برابر غلہ بطور) کفارہ (کے) مساکین کو دیدیا جائے (یعنی ایک مسکین کو بقدر ایک صدقۃ الفطر کے دیا جائے) اور خواہ اس (غلہ) کے برابر روزے رکھ لئے جائیں (برابری کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کے حصہ یعنی فطرہ کے بدلے ایک روزہ اور یہ پاداش اس لئے مقرر کی ہے) تاکہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے (بخلاف اس شخص کے جس نے قصداً شکار نہ کیا ہو کہ گو اس پر بھی جزاء تو بھی واجب ہے مگر وہ فعل کی سزا نہیں، بلکہ محل محترم یعنی شکارِ حرم جو کہ حرم کی وجہ سے محترم یا احرام کی وجہ سے کالمحترم ہو گیا ہے اس کا ضمان اور جزاء ہے اور اس جزاء کے ادا کر دینے سے) اللہ تعالیٰ نے گذشتہ کو معاف فرمایا اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا (چونکہ اکثر عود میں ایک گونہ پہلی بار سے زیادہ جرأت ہوتی ہے) تو (اس وجہ سے علاوہ جزاء مذکور کے جو کہ اصل فعل یا محل کا عوض ہے آخرت میں) اللہ تعالیٰ اس سے (اس جرأت کا) انتقام لیں گے (البتہ اگر توبہ کرلے تو انتقام کا سبب ختم ہو جاوے گا) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں انتقام لے سکتے ہیں تمہارے لئے (حالتِ احرام میں) دریا (یعنی پانی) کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا (سب) حلال کیا گیا ہے تمہارے انتفاع کے واسطے (اور تمہارے) مسافروں کے (انتفاع کے) واسطے (کہ سفر میں اسی کو توشہ بنا دیں) اور خشکی کا شکار (گو بعض صورتوں میں کھانا حلال ہو مگر) پکڑنا (یا اس میں معین ہونا) تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے، جبتک تم حالت احرام میں رہو اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو، جس کے پاس جمع (کر کے حاضر) کئے جاؤ گے۔

معارف و مسائل

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضارِ دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں۔ اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں تجربہ اور نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر و فکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان و یقین مضبوط و مستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ و ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام "احسان" اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرمادی۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: صید جو کہ محرم اور حرم میں حرام ہے عام ہے خواہ ماکول یعنی حلال جانور ہو یا غیر ماکول یعنی حرام (لاطلاق الآیۃ)

مسئلہ: صید یعنی شکار، ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقۃً اہلی ہوں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ: البتہ جو اس سے مستثنیٰ ہو گئے ہیں ان کو پکڑنا یا قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، لقولہ تعالیٰ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ، اور بعضے خشکی کے جانور، جیسے کوا، اور چیل اور بھیڑیا اور سانپ اور بچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے، حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلصَّیْدُ میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ: جو حلال شکار غیر محرم اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں معین یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے، اور آیت کے الفاظ لَا تَقْتُلُوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لَا تَقْتُلُوا فرمایا ہے لَا تَأْكُلُوا نہیں فرمایا۔

مسئلہ: شکار حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے، اسی طرح خطاء و نسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخرجہ الروح)

مسئلہ: جیسا پہلی بار میں جزاء واجب ہے اسی طرح دوسری تیسری بار قتل کرنے میں بھی واجب ہے۔

مسئلہ: حاصل جزاء کا یہ ہے کہ جس زمان و جس مکان میں یہ جانور قتل ہوا ہے بہتر تو یہ ہے کہ دو عادل شخص سے اور جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی عادل شخص سے اس جانور کی قیمت کا تخمینہ کرائے، پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہے تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہوگی، اور اگر وہ جانور ماکول تھا تو جس قدر تخمینہ ہوگا وہ سب واجب ہوگا، اور دونوں حال میں آگے اس کو تین صورتوں میں اختیار ہے، خواہ تو اس قیمت کا کوئی جانور حسب شرائط قربانی کے خرید لے، اور حدودِ حرم کے اندر ذبح کر کے فقراء کو بانٹ دے، اور یا اس قیمت کے برابر غلہ حسب شرائط صدقہ فطر

کے فی مسکین نصف صاع فقراء کو دیدے، اور یا بحساب فی مسکین نصف صاع جتنے مساکین کو وہ غلہ پہنچ سکتا ہو اتنے شمار سے روزے رکھ لے اور تقسیم غلہ اور روزوں میں حرم کی قید نہیں، اور اگر قیمت نصف صاع سے بھی کم واجب ہوئی ہے تو اختیار ہے خواہ ایک مسکین کو دیدے، یا ایک روزہ رکھ لے اسی طرح اگر فی مسکین نصف صاع دے کر نصف صاع سے کم بچ گیا، تو بھی یہی اختیار ہے کہ خواہ وہ بقیہ ایک مسکین کو دیدے یا ایک روزہ رکھ لے، نصف صاع کا وزن ہمارے وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر ہوتا ہے۔

مسئلہ: تخمینہ مذکور میں جتنے مساکین کا حصہ قرار پادے اگر ان کو دو وقت کھانا شکم سیر کر کے کھلادے تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ: اگر اس قیمت کے برابر ذبح کے لئے جانور تجویز کیا، مگر کچھ قیمت بچ گئی تو اس بقیہ میں اختیار ہے خواہ دوسرا جانور خریدے، یا اس کا غلہ دیدے، یا غلہ کے حساب سے روزے رکھ لے، جس طرح قتل میں جزاء واجب ہے اسی طرح ایسے جانور کو زخمی کرنے میں بھی تخمینہ کرایا جائے گا کہ اس سے جانور کی کس قدر قیمت کم ہوگئی اس مقدار قیمت میں پھر وہی تین مذکورہ صورتیں جائز ہوں گی۔

مسئلہ: محرم کو جس جانور کا شکار کرنا حرام ہے اس کا ذبح کرنا بھی حرام ہے، اگر اس کو ذبح کرے گا تو اس کا حکم مردار کا سا ہوگا (فی لاتقتلوا اشارة الی ان ذبحه کالقتل)۔

مسئلہ: اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ: اشارہ و دلالت و اعانت شکار میں مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ

اللہ نے کردیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث لوگوں کیلئے اور بزرگی والے

الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

مہینوں کو اور قربانی کو جو کہ نیاز کعبہ کی ہو اور جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر لیجاویں کعبہ کو یہ اس لئے کہ تم جان لو بیشک اللہ کو

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾

معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا

رسول کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو

تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ

چھپا کر کرتے ہو تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے

كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ناپاک کی کثرت سو ڈرتے رہو اللہ سے اے عقلمندو تاکہ تمہاری نجات ہو

ع ۱۳ / ۳

خلاصۂ تفسیر

خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے، لوگوں (کی مصلحتوں) کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے اور (اسی طرح) عزت والے مہینہ کو بھی اور (اسی طرح) حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور (اسی طرح) ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں حرم میں ذبح ہوں گے) یہ (قرار دینا علاوہ اور دنیوی مصلحتوں کے اس (دینی) مصلحت کے لئے (بھی) ہے تاکہ (تمہارا اعتقاد درست اور پختہ ہو اس طرح سے کہ تم ان مصالح سے استدلال کر کے اس بات کا یقین (ابتداءً یا تاکیداً) کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم (کامل) رکھتے ہیں (کیونکہ ایسا حکم مقرر کرنا جس میں آئندہ کے ایسے مصالح مرعی ہوں کہ عقول بشریہ انکو نہ سوچ سکیں دلیل ہے کمال صفت علمیہ کی) اور (ان معلومات مذکورہ کے ساتھ تعلق علم کامل سے استدلال کر کے یقین کر لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں (کیونکہ ان معلومات کے علم پر کسی چیز نے مطلع نہیں کیا، معلوم ہو کہ علم ذاتی کی نسبت جمیع معلوم کے ساتھ یکساں ہوتی ہے) تم یقین سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے بھی ہیں (تو ان کے احکام کی خلاف مت کیا کرو اور جو احیاناً ہو گیا ہو، موافق قواعد شرعیہ کے توبہ کر لو) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے، (سو وہ خوب پہنچا چکے اب تمہارے پاس کوئی عذر و حیلہ نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں جو کچھ تم (زبان یا جوارح سے) ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو (سو تم کو چاہئے کہ اطاعت ظاہر و باطن دونوں سے کرو) آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک (یعنی گناہ اور اطاعت یا گناہ کرنے والا اور اطاعت کرنے والا) برابر نہیں، (بلکہ خبیث مبغوض ہے اور طیب مقبول ہے، پس اطاعت کر کے مقبول بننا چاہئے،

معصیت کرکے مبغوض نہ ہونا چاہئے، گرچہ اے دیکھنے والے، تجھ کو ناپاک کی کثرت (جیسا اکثر دنیا میں یہی واقع ہوتا ہے) تعجب میں ڈالتی ہو، کہ باوجود ناپسندیدہ ہونے کے یہ کثیر کیوں ہے، مگر یہ سمجھ لو کہ کثرت جو کسی حکمت سے ہے دلیل محمود ہونے کی نہیں، جب کثرت پر مدار نہیں پایا کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم و عقاب پر بھی مطلع ہوگئے، تو اس کو مت دیکھو بلکہ، خدا تعالیٰ (کے خلاف حکم کرنے) سے ڈرتے رہو تاکہ تم (پورے طور سے، کامیاب ہو (کہ وہ جنت اور رضائے حق ہے)

معارف و مسائل

امن و اطمینان کے چار ذرائع | پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کو لوگوں کے قیام و بقاء اور امن و اطمینان کا سبب بتلایا ہے۔

اول کعبہ، لفظ کعبہ عربی زبان میں ایسے مکان کو کہتے ہیں جو مربع یعنی چوکور ہو، عرب میں قبیلہ خثعم کا بنایا ہوا ایک اور مکان بھی اسی نام سے موسوم تھا جس کو کعبہ یمانیہ کہا جاتا تھا، اسی لئے بیت اللہ کو اس کعبہ سے ممتاز کرنے کے لئے لفظ کعبہ کے ساتھ البیت الحرام کا لفظ بڑھایا گیا۔

لفظ قیام اور قوام اسم مصدر ہے، اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر کسی چیز کا قیام و بقاء موقوف ہو، اس لئے قِیٰمًا لِّلنَّاسِ کے معنے یہ ہوئے کہ کعبہ اور اس کے متعلقات لوگوں کے قیام و بقاء کا سبب اور ذریعہ ہیں۔

اور لفظ نَاس لغت میں عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ قرینۂ مقام کی وجہ سے خاص مکہ والے یا اہل عرب بھی مراد ہوسکتے ہیں اور عام دنیا کے انسان بھی، اور ظاہر یہی ہے کہ پورے عالم کے انسان اس میں داخل ہیں، البتہ مکہ اور عرب والے ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں، اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ بیت اللہ اور جن چیزوں کا ذکر آگے آتا ہے، اُن کو پورے عالم انسانیت کے لئے قیام و بقاء اور امن و سکون کا ذریعہ بنا دیا ہے، جب تک دنیا کا ہر ملک ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوکر نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا رہے یعنی جن پر حج فرض ہو وہ حج ادا کرتے رہیں، اس وقت تک یہ پوری دنیا قائم اور محفوظ رہے گی۔ اور اگر ایک سال بھی ایسا ہوجائے کہ کوئی حج نہ کرے یا کوئی شخص بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوکر نماز ادا نہ کرے تو پوری دنیا پر عذاب عام آجائے گا۔

بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے | اسی مضمون کو امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے ان الفاظ میں

بیان فرمایا ہے: لو ترکوہ عامًا واحدًا لم ینظروا ولم یؤخروا (بحر محیط)، اس سے معلوم ہوا کہ معنوی طور پر بیت اللہ اس پورے عالم کا عمود ہے، جب تک اس کا استقبال اور حج ہوتا رہے گا دنیا قائم رہے گی، اور اگر کسی وقت بیت اللہ کا یہ احترام ختم ہوا تو دنیا بھی ختم کر دی جائے گی،

رہا یہ معاملہ کہ نظامِ عالم اور بیت اللہ میں جوڑ اور ربط کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، جس طرح مقناطیس اور لوہے اور کہربا اور تنکے کے ربطِ باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، بیت اللہ اور نظامِ عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے قبضہ میں نہیں، وہ خالقِ کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، بیت اللہ کا پورے عالم کی بقاء کے لئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، ظاہری نظریں اس کو نہیں پا سکتیں، لیکن عرب اور اہلِ مکہ کے لئے اس کا موجبِ امن و سلامتی ہونا طویل تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے۔

بیت اللہ کا وجود امنِ عامہ کا سبب ہے عام دنیا میں قیامِ امن کی صورت حکومتوں کے قوانین اور ان کی گرفت ہوتی ہے، اس کی وجہ سے ڈاکو، چور، قتل و غارت گری کرنے والے کی جرأت نہیں ہوتی، لیکن جاہلیتِ عرب میں نہ کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی، اور نہ امنِ عامہ کے لئے کوئی قانون عام تھا، سیاسی نظام محض قبائلی بنیادوں پر قائم تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی جان و مال عزت و آبرو سب ہی چیزوں پر جب چاہے حملہ کر سکتا تھا، اس لئے کسی قبیلہ کے لئے کسی وقت امن و اطمینان کا موقع نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کو حکومت کے قائم مقام ذریعۂ امن بنادیا، جس طرح حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کوئی سمجھدار انسان نہیں کرسکتا، اسی طرح بیت اللہ شریف کی حرمت و تعظیم حق تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی عام لوگوں کے دلوں میں اس طرح پیوست کر دی تھی کہ اس کے احترام کے لئے اپنے سارے جذبات و خواہشات کو پیچھے ڈال دیتے تھے۔

عرب جاہلیت جو اپنی جنگ جوئی اور قبائلی تعصب میں پوری دنیا میں ضرب المثل تھی، اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ اور اس کے متعلقات کی اتنی حرمت و تعظیم اُن کے دلوں میں پیوست کر دی تھی کہ ان کا کیسا ہی جانی دشمن یا سخت سے سخت مجرم ہو اگر وہ حرم شریف میں داخل ہو جائے تو انتہائی غم و غصہ کے باوجود اس کو کچھ نہ کہتے، باپ کا قاتل حرم میں بیٹے کو ملتا تو بیٹا نیچی نظریں کر کے گذر جاتا تھا۔

اسی طرح جو شخص حج و عمرہ کے لئے نکلا ہو یا جو جانور حرم شریف میں قربانی کے لئے لایا گیا ہو اس کا بھی اتنا ہی احترام عرب میں عام تھا کہ کوئی بُرے سے بُرا شخص بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچاتا تھا، اور اگر وہ جانی دشمن بھی ہے تو ایسی حالت میں جبکہ اس نے حج و عمرہ کی کوئی علامت احرام یا قلادہ باندھا ہوا ہو اس کو قطعاً کچھ نہ کہتے تھے۔

سنہ ۶ ہجری یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک خاص جماعت کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر بقصد بیت اللہ روانہ ہوئے اور حدودِ حرم کے قریب مقام حدیبیہ پر قیام فرمایا کر حضرت عثمان غنیؓ کو چند رفیقوں کے ساتھ مکہ بھیجا کہ مکہ کے سرداروں سے کہہ دیں کہ مسلمان اس وقت کسی جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ عمرہ ادا کرنے کے لئے آئے ہیں اس لئے ان کی راہ میں کوئی مزاحمت نہ ہونی چاہئے۔

قریشی سرداروں نے بہت سے بحث و مباحثہ کے بعد اپنا ایک نمائندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص حرماتِ بیت اللہ کا خاص لحاظ رکھنے والا ہے، اس لئے اپنے قربانی کے جانور جن پر قربانی کا نشان کیا ہوا ہے اس کے سامنے کر دو، اس نے جب ہدایا (قربانی کے جانور) دیکھے تو اقرار کیا کہ بیشک ان لوگوں کو بیت اللہ سے ہرگز نہیں روکنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حرم محترم کا احترام زمانۂ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایسا رکھ دیا تھا کہ اس کی وجہ سے امن و امان قائم رہتا تھا، اس احترام کے نتیجہ میں صرف حرم شریف کے اندر آنے جانے والے اور وہ لوگ مامون ہو جاتے تھے جو حج وعمرہ کے لئے نکلے ہیں، اور حج کی کوئی علامت ان پر موجود ہے، اطرافِ عالم کے لوگوں کو اس سے کوئی نفع امن و اطمینان کا حاصل نہ ہوتا تھا، لیکن عرب میں جس طرح بیت اللہ کے مکان اور اس کے گرد و پیش کے حرم محترم کا احترام عام تھا اسی طرح حج کے مہینوں کا بھی خاص احترام تھا کہ ان مہینوں کو شہرِ حرام کہتے تھے، ان کے ساتھ رجب کو بھی بعض نے شامل کر لیا تھا، ان مہینوں میں حرم سے باہر بھی قتل و قتال کو تمام عرب حرام سمجھتا اور پرہیز کرتا تھا۔

اسی لئے قرآن کریم نے قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ہونے میں کعبہ کے ساتھ تین اور چیزوں کو شامل فرمایا ہے، اوّل اَلشَّھْرَ الْحَرَامَ یعنی عزت و عظمت کا مہینہ، یہاں چونکہ لفظ شَھْرَ مفرد لایا گیا ہے، اس لئے عام مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس جگہ "شہر حرام" سے مراد ماہ ذی الحجہ ہے جس میں حج کے ارکان و اعمال ادا کئے جاتے ہیں، اور بعض نے فرمایا

کہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر مراد اس سے جنس ہے، اس لئے سب ہی اشہر حرم (عزت کے مہینے) اس میں داخل ہیں۔

دوسری چیز ھدی ہے، ھدی اس جانور کو کہا جاتا ہے جس کی قربانی حرم شریف میں کی جائے، ایسے جانور جس شخص کے ساتھ ہوں عام عرب کا معمول تھا کہ اس کو کچھ نہ کہتے تھے، وہ امن و اطمینان کے ساتھ سفر کرتا اور اپنا مقصد پورا کر سکتا تھا، اس لئے ھدی بھی قیام امن کا ایک سبب ہوئی۔

تیسری چیز قلائد ہیں، قلائد قلادہ کی جمع ہے، گلے کے ہار کو کہا جاتا ہے۔ جاہلیت عرب کی رسم یہ تھی کہ جو شخص حج کے لئے نکلتا تو اپنے گلے میں ایک ہار بطور علامت کے ڈال لیتا تھا، تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ سمجھ لیں کہ یہ حج کے لئے جا رہا ہے کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، اسی طرح قربانی کے جانوروں کے گلے میں بھی اس طرح کے ہار ڈالے جاتے تھے ان کو بھی قلائد کہتے ہیں، اس لئے قلائد بھی قیام امن و سکون کا ایک ذریعہ بن گئے۔

اور اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں چیزیں شہر حرام، ھدی اور قلائد سب کے سب بیت اللہ کے متعلقات میں سے ہیں ان کا احترام بھی بیت اللہ ہی کے احترام کا ایک شعبہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بیت اللہ اور اس کے متعلقات کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم انسانیت کے لئے عموماً اور عرب اور اہل مکہ کے لئے خصوصاً ان کے تمام امور دین و دنیا دونوں کے لئے قیام و قوام بنا دیا ہے۔

قِيٰمًا لِّلنَّاسِ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ بیت اللہ اور حرم محترم سب کے لئے جائے امن بنایا گیا ہے، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد اہل مکہ کے لئے وسعت رزق ہے، کہ باوجود اس کے کہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ دنیا بھر کی چیزیں وہاں پہنچتے رہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ اہل مکہ جو کہ بیت اللہ کے خادم اور محافظ کہلاتے تھے اُن کو لوگ اللہ والے سمجھ کر ہمیشہ ان کی تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، قِيٰمًا لِّلنَّاسِ سے اُن کا یہ خاص اعزاز مراد ہے۔

امام عبداللہ رازی نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی اختلاف نہیں لفظ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو سب لوگوں کے بقاء و قیام اور معاش و معاد کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بنایا ہے، اور اہل عرب اور اہل مکہ کو خصوصیت کے ساتھ اس کی برکات ظاہرہ اور باطنہ سے نوازا ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یعنی ہم نے بیت اللہ کو اور اس کے متعلقات کو لوگوں کے لئے ذریعہ امن وامان اور قیام وبقاء بنا دیا ہے جس کا مشاہدہ اہل عرب خصوصیت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، یہ اس لئے کیا گیا کہ سب لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی ہر چیز کو پورا پورا جانتے ہیں اور وہی اس کا انتظام کرسکتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والے رحم فرمانے والے ہیں، اس میں بتلا دیا کہ جو احکام حلال وحرام کے دیئے گئے ہیں وہ عین حکمت ومصلحت ہیں ان کی تعمیل ہی میں تمہارے لئے خیر ہے، اُن کی خلاف ورزی سخت وبال وعذاب ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ انسانی بھول اور غفلت سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اللہ تعالیٰ فوراً عذاب نہیں دیتے، بلکہ توبہ کرنیوالو اور شرمندہ ہونے والوں کے لئے مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ، یعنی ہمارے رسول کے ذمہ تو اتنا ہی کام ہے کہ ہمارے احکام مخلوق کو پہنچا دیں، پھر وہ مانیں نہ مانیں اس کا نفع وضرر انہی کو پہنچتا ہے، ان کی نافرمانی سے ہمارے رسول کا کچھ نقصان نہیں، اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دیا جا سکتا، وہ تمہارے ظاہر و باطن اور کھلے اور چھپے ہر کام سے واقف ہیں۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ، عربی زبان میں طیّب اور خبیث دو متقابل لفظ ہیں، طیّب ہر چیز کے عمدہ اور جید کو اور خبیث ہر چیز کے ردی اور خراب کو کہا جاتا ہے، اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک خبیث سے مراد حرام یا ناپاک ہے، اور طیّب سے مراد حلال اور پاک، معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر عقلِ سلیم کے نزدیک پاک وناپاک یا حلال وحرام برابر نہیں ہوسکتے۔

اس جگہ لفظ خبیث اور طیّب اپنے عموم کے اعتبار سے حرام وحلال مال ودولت کو بھی شامل ہے، اور اچھے بُرے انسانوں کو بھی اور بھلے بُرے اعمال واخلاق کو بھی مطلب آیت کا واضح ہے کہ کسی عقلِ سلیم کے نزدیک نیک وبد اور بھلا بُرا برابر نہیں ہوتے اسی فطری قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال وحرام پاک وناپاک چیزیں

برابر نہیں اسی طرح اچھے اور بُرے اعمال و اخلاق برابر نہیں اسی طرح نیک و بد انسان برابر نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ، یعنی اگرچہ دیکھنے والوں کو بعض اوقات خراب اور خبیث چیزوں کی کثرت مرعوب کردیتی ہے، اور گرد و پیش میں خبیث و خراب چیزوں کے پھیل جانے اور غلبہ آجانے کے سبب انہی کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہ انسانی علم و شعور کی بیماری اور احساس کا قصور ہوتا ہے۔

آیت کا شان نزول، آیت کے شان نزول کے متعلق بعض روایات میں ہے کہ جب اسلام میں شراب کو حرام اور اس کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دیدیا گیا تو ایک شخص نے جس کا کاروبار شراب فروشی کا تھا، اور اس ذریعہ سے اس نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ مال جو شراب کی تجارت سے میرے پاس جمع ہوا ہے اگر میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کردوں تو کیا وہ میرے لئے مفید ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو حج یا جہاد وغیرہ میں خرچ کروگے تو وہ اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی قیمت نہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ پاک اور حلال چیز کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

حرام مال کی یہ بے توقیری تو آخرت کے اعتبار سے ہوئی، اور اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے اور سب کاموں کے آخری انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال و حرام مال برابر نہیں ہوتے، حلال سے جتنے فوائد اور اچھے نتائج اور حقیقی آرام و راحت نصیب ہوتی ہے وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہوگیا اور آمدنی بہت محدود ہوگئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی، لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ، اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم و جور کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل و انصاف قائم کرکے اپنے خزانہ کو کم کرلو، اور کوئی پروا نہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم

مقدار سے پورے ہوں گے۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے کہ عدد و شمار کی کمی زیادتی کوئی چیز نہیں کثرت و قلت سے کسی چیز کی بھلائی یا برائی کو نہیں جانچا جا سکتا، انسانوں کے سر پر ہاتھ شمار کر کے یا ووٹوں کی گنتی کو کثرت کے مقابلہ میں حق و صداقت کا معیار نہیں کہا جا سکتا۔

بلکہ اگر دنیا کے ہر طبقے کے حالات پر ذرا بھی نظر ڈالی جائے تو سب سے عام میں بھلائی کی مقدار اور تعداد کم اور برائی کی تعداد میں کثرت نظر آئے گی، ایمان کے مقابلہ میں کفر، تقویٰ طہارت اور دیانت و امانت کے مقابلہ میں فسق و فجور، عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم و جور، علم کے مقابلہ میں جہل، عقل کے مقابلہ میں بے عقلی کی کثرت کا مشاہدہ ہوگا، جس سے اس کا یقین لازمی ہو جاتا ہے کہ کسی چیز یا کسی جماعت کی تعداد کی کثرت اس کے اچھا یا حق پر ہونے کی قطعاً دلیل نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی چیز کی بھلائی اور برائی اس چیز یا اس جماعت کے ذاتی حالات و کیفیت پر دائر ہوتی ہے، حالات و کیفیات اچھی ہیں تو وہ اچھی اور بری ہیں تو بری ہیں، قرآن کریم نے اسی حقیقت کو وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ کے الفاظ سے واضح فرما دیا ہے۔

ہاں عددی کثرت کو اسلام نے بھی بعض مواقع میں فیصلہ کن قرار دیا ہے وہ اس جگہ جہاں قوت دلیل اور ذاتی خوبیوں کے موازنہ کا فیصلہ کرنے والا کوئی صاحب اقتدار حاکم نہ ہو، ایسے موقع پر عوام کا جھگڑا نکالنے کے لئے عددی کثرت کو ترجیح دیدی جاتی ہے جیسے نصب امام کا مسئلہ ہے، وہاں کوئی امام و امیر فیصلہ کرنے والا موجود نہیں، اس لئے کثرت رائے کو بعض دفعہ قطع نزاع کے لئے ترجیح دیدی گئی، یہ ہرگز نہیں کہ جس چیز کو زیادہ تعداد کے لوگوں نے اختیار کر لیا وہی چیز عدل اور جائز و حق ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ، یعنی اے عقل والو اللہ سے ڈرو، جس میں اشارہ فرما دیا کہ کسی چیز کی عددی کثرت کا مرعوب ہونا یا کثرت کو بمقابلہ قلت کے حق و حقیقت کا معیار قرار دینا عقلمندوں کا کام نہیں، اسی لئے عقلاء کو خطاب کر کے ان کو اس غلط روش سے روکنے کے لئے فَاتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم دیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔـلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ

اے ایمان والو مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھول دی جاویں تو

تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔـلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ

تم کو بری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے

تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۰۱ قَدْ سَاَلَهَا

تو تم کو بری لگیں جو پہلے ہو چکا اللہ نے اس سے درگذر کی ہے اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے ایسی باتیں پوچھ چکی ہے

قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝۱۰۲ مَا جَعَلَ اللّٰهُ

ایک جماعت تم سے پہلے پھر ہو گئے ان باتوں سے منکر ، نہیں مقرر کیا اللہ نے

مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَاۗىِٕبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ

بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی ، لیکن

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ

کافر باندھتے ہیں اللہ پر بہتان ، اور ان میں اکثروں کو

لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۳

عقل نہیں ،

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو ایسی (فضول) باتیں مت پوچھو (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم سے ظاہر کردی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو (یعنی یہ احتمال ہو کہ جواب تمہاری منشاء کے خلاف آیا تو تمہیں ناگوار ہوگا) اور (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم زمانہ نزول قرآن (اور وحی) میں ان باتوں کو پوچھو تو تم سے ظاہر کردی جاویں (یعنی سوال کرنے میں تو یہ دوسرا احتمال ہو کہ جواب مل جائے اور جواب ملنے میں وہ پہلا احتمال ہو کہ ناگوار گذرے، اور یہ دونوں احتمال جو مجموعی طور پر علت نہی سوال کی ہیں واقعی ہیں پس ایسا سوال ممنوع ہے جیسے) سوالات گذشتہ جو اس وقت تک کرچکے ہو وہ تو اللہ تعالیٰ نے معاف کردیئے، مگر آئندہ مت کرنا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے گذشتہ سوالات معاف کردیئے) اور بڑے حلم والے ہیں (اس لئے اگر آئندہ کے خلاف ورزی پر دنیا میں سزا نہ دے تو دھوکہ میں مت پڑجانا کہ آگے بھی کوئی عذاب و سزا نہ ہوگی) ایسی باتیں تم سے پہلے (زمانہ میں) اور امتوں کے لوگوں نے بھی (اپنے پیغمبروں سے) پوچھی تھیں پھر (ان کو جواب ملا تو) ان باتوں کا حق نہ بجا لائے (یعنی ان جوابوں میں جو متعلق احکام کے تھے ان کے موافق عمل نہ کیا اور جو متعلق واقعات کے تھے ان سے متاثر نہ ہوئے، پس کہیں تم کو بھی ایسی ہی نوبت نہ پیش آئے، اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ ایسے

سوالات چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو، لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ ان رسوم کے باب میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ خدا تعالیٰ ان اعمال سے خوش ہیں، اور اکثر کافر دین کی عقل نہیں رکھتے اور اس سے کام نہیں لیتے بلکہ محض اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی یہی جہالتیں کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت | ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکام آلہیہ میں بلا ضرورت تدقیق و بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے، اور جو احکام نہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیۂ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑ جائے یا ان کو خفیہ رازوں کے کھلنے سے رسوائی ہو۔

شانِ نزول | ان آیات کا شانِ نزول مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو اقرع بن حابسؓ نے سوال کیا کہ کیا ہر سال ہمارے ذمہ حج فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سوال کا جواب نہ دیا، تو مکرر سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی سکوت فرمایا، انھوں نے تیسری مرتبہ پھر سوال کیا، تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کے ساتھ تنبیہ فرمائی کہ اگر میں تمہارے جواب میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج فرض ہے تو ایسا ہی ہو جاتا اور پھر تم اس کو پورا نہ کر سکتے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کے متعلق میں تمہیں کوئی حکم نہ دوں اُن کو اسی طرح رہنے دو، ان میں کھود کرید کر کے سوالات نہ کرو، تم سے پہلے بعض امتیں اسی کثرت سوال کے ذریعہ ہلاک ہو چکی ہیں، کہ جو چیزیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے فرض نہیں کی تھیں سوال کر کر کے ان کو فرض کرا لیا اور پھر اس کی خلاف ورزی میں مبتلا ہوگئے، تمہارا وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ جس کام کا میں حکم دوں اس کو مقدور بھر پورا کرو اور جس چیز سے منع کر دوں اس کو چھوڑ دو (مراد یہ ہے کہ جن چیزوں سے سکوت کیا جائے ان کے متعلق کھود کرید نہ کرو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت اور سلسلۂ وحی ختم ہے | اس آیت میں ایک ضمنی جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ، یعنی نزولِ قرآن کے زمانہ میں اگر تم ایسے سوالات کروگے تو بذریعہ وحی ان کا جواب آجائے گا، اس میں نزولِ قرآن کے زمانہ کے ساتھ مقید کر کے اس کی طرف اشارہ فرما دیا کہ نزولِ قرآن

کی تکمیل کے بعد نبوت و وحی کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔

ختم نبوت اور سلسلۂ وحی کے انقطاع کے بعد بے سوالات کا اگرچہ یہ اثر نہ ہوگا کہ نئے احکام آجائیں جو چیزیں فرض نہیں ہیں وہ فرض ہو جائیں یا بذریعہ وحی کسی کا خفیہ راز آشکارا ہو جائے لیکن بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بے ضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا بعد انقطاع نبوت کے بھی مذموم اور ممنوع ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ، یعنی مسلمان ہونے کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے، اس سے معلوم ہو کہ بہت سے مسلمان بالکل فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کیا نام تھا، اور نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول و عرض کیا تھا جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں، ایسے سوالات کرنا مذموم ہے خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ ایسے سوالات کرنے والے حضرات اکثر ضروری اور اہم مسائل دین سے بے خبر ہوتے ہیں، فضول کاموں میں پڑنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی ضروری کاموں سے محروم ہو جاتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرات فقہاء نے خود ہی بہت سی مفروضہ صورتیں مسائل کی نکال کر اور سوالات قائم کر کے ان کے احکام بیان کر دیئے ہیں سو یہ بے ضرورت چیز نہ تھی، آنے والے واقعات نے بتلا دیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی ضرورت تھی، اس لئے وہ فضول اور لایعنی سوالات نہ تھے۔

اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ایک تعلیم ہے کہ علم ہو یا عمل کوئی کام ہو یا کلام جب تک اس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو اس میں لگ کر وقت ضائع نہ کریں۔

بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تعریف بحیرہ، سائبہ وصیلہ، حامی، یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں، مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے، ممکن ہو ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو، ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔

بحیرہ: جس جانور کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔

سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔

حامی: نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو، اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے

نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ وغیرہ

علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں جن پر بتوں کے گوشت یا دودھ وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا گویا منصب تشریع تجویز کرنا تھا، اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں، ان کے بڑوں نے خدا پر یہ بہتان باندھا، اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کرلیا، الغرض یہاں یہ تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول و بیکار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی رائے و ہوا سے حلال و حرام تجویز کرلے جائیں، (فوائد عثمانی)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ

اور جب کہا جاتا ہے ان کو آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ

تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو بھلا اگر ان کے باپ دادے

لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے، اے ایمان والو

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ

تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا تمہارا کچھ نہیں بگڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو، پھر وہ جتلا دے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔

ربطِ آیات

اوپر رسم پرست کفار کی ایک جہالت کا ذکر تھا، اور ایسی ایسی جہالتیں انکی بہ کثرت تھیں جن کو سن کر مومنین کو رنج اور افسوس ہوتا تھا، اس لئے آگے مومنین کو اس کے متعلق ارشاد ہے کہ تم کیوں اس غم میں پڑے ہو، تم کو اپنی اصلاح کا اور دوسرے کی اصلاح میں بقدر وسعت و قدرت کوشش کرنے کا حکم ہے، باقی کوشش پر ثمرہ مرتب ہونا تمہارے اختیار سے خارج ہے، اس لئے "کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن" پر عمل کرو۔

خلاصۂ تفسیر

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی طرف اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (جن پر وہ احکام نازل ہوتے ہیں) رجوع کرو (جو امر اس سے حق ثابت ہو حق سمجھو اور جو باطل ہو باطل سمجھو) تو کہتے ہیں کہ ہم کو (ان احکام اور رسول کی ضرورت نہیں ہم کو) وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا ہے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) کیا وہ طریقہ ان کے لئے ہر حال میں کافی ہے، گو ان کے بڑے (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔ اے ایمان والو اپنی (اصلاح کی) فکر کرو (اصل کام تمہارے ذمہ یہ ہے، باقی دوسروں کی اصلاح کے متعلق یہ ہے کہ جب تم اپنی طرف سے اپنی قدرت کے مطابق اصلاح کی سعی کر رہے ہو مگر دوسرے پر اثر نہیں ہوتا تو تم اثر مرتب نہ ہونے کی فکر میں نہ پڑو کیونکہ) جب تم (دین کی) راہ پر چل رہے ہو (اور واجباتِ دین کو ادا کر رہے ہو اس طرح کہ اپنی بھی اصلاح کر رہے ہو اور دوسروں کی اصلاح میں بھی کوشش کر رہے ہو) تو جو شخص باوجود تمہاری سعی اصلاح کے بھی، گمراہ رہے تو اس (کے گمراہ رہنے) سے تمہارا کوئی نقصان نہیں اور جیسا اصلاح وغیرہ میں حد سے زیادہ فکر و غم سے منع کیا جاتا ہے ایسے ہی ہدایت سے ناامید ہونے کی صورت میں غصہ میں آکر دنیا ہی میں ان پر سزا نازل ہونے کی تمنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ حق و باطل کا مکمل فیصلہ تو آخرت میں ہوگا، چنانچہ) اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دیں گے جو کچھ تم سب کیا کرتے تھے (اور جتلا کر حق پر ثواب اور باطل پر عذاب کا حکم نافذ فرما دیں گے)۔

معارف و مسائل

آیات کا شان نزول: جاہلیت کی رسموں میں ایک تقلید آباء بھی تھی، جس نے ان کو ہر برائی میں مبتلا اور ہر بھلائی سے محروم رکھا تھا، تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ ان میں سے کوئی خوش نصیب اگر حق بات کو مان کر مسلمان ہو جاتا تو اس کو یوں عار دلائی جاتی تھی کہ تو نے اپنے باپ دادوں کو بیوقوف ٹھہرایا، کہ ان کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کر لیا،

ان کی اس گمراہی درگمراہی پر یہ آیت نازل ہوئی، وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا، یعنی جب ان کو کہا جاتا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حقائق اور احکام اور رسول کی طرف رجوع کرو جو ہر حیثیت سے حکمت و

مصلحت اور تمہارے لئے صلاح و فلاح کے ضامن ہیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ ہم کو تو وہی طریقہ کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔

یہ وہ شیطانی استدلال ہے جس نے لاکھوں انسانوں کو معمولی سمجھ بوجھ اور علم وہنر رکھنے کے باوجود گمراہ کیا۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، غور کرنے والوں کے لئے قرآن کے اس ایک جملے نے کسی شخص یا جماعت کی اقتداء کرنے کا ایک صحیح اصول بیان کرکے اندھوں کے لئے بینائی کا اور جہل و غفلت کے لئے انکشافِ حقیقت کا مکمل سامان فراہم کر دیا ہے، وہ یہ کہ یہ بات تو معقول ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں کی، ناواقف لوگ واقف کاروں کی پیروی کریں، جاہل آدمی عالم کی اقتداء کریں، لیکن یہ کوئی معقول بات نہیں کہ علم و عقل اور ہدایت کے معیار سے ہٹ کر اپنے باپ دادا یا کسی بھائی بند کی اقتداء کو اپنا طریقہ کار بنا لیا جائے، در آنحالیکہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مقتدا خود کہاں جا رہا ہے، اور ہمیں کہاں پہنچائے گا اس کے پیچھے لگ لیا جائے۔

اسی طرح بعض لوگ کسی کے اتباع و اقتداء کا معیار لوگوں کی بھیڑ کو بنا لیتے ہیں جس طرف یہ بھیڑ دیکھی اسی طرف چل پڑے، یہ بھی ایک نامعقول حرکت ہی، کیونکہ اکثریت تو ہمیشہ دنیا میں بیوقوفوں یا کم عقلوں کی، اور عمل کے لحاظ سے بدعملوں کی رہتی ہے، اس لئے لوگوں کی بھیڑ حق و ناحق یا بھلے بُرے کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔

نااہل کو مقتدا بنانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے

قرآن کریم کے اس جملہ نے سب کو ایک واضح حکمت کا سبق دیا کہ ان میں سے کوئی چیز مقتدا و پیشوا بنانے کے لئے ہرگز کافی نہیں، بلکہ ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے سفر کا رُخ متعین کرے، پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ دیکھے کہ کون ایسا انسان ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو، اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا انسان مل جائے تو بے شک اس کے پیچھے لگ لینا اس کو منزلِ مقصود پر پہنچا سکتا ہے، یہی حقیقت ہر ائمہ مجتہدین کی تقلید کی کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لئے نہ جاننے والے ان کا اتباع کرکے دین کے مقصد یعنی اتباعِ خدا اور رسول کو حاصل کر سکتے ہیں، اور جو گم کردہ راہ ہو، منزلِ مقصود کو خود ہی نہ جانتا ہو یا جان بوجھ کر منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقلمند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا، بلکہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، اس علم و حکمت اور روشن خیالی کے زمانہ میں بھی افسوس ہے کہ لکھے پڑھے ہوش و عقل والے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں، اور آج کی بربادی

اور تباہی کا سب سے بڑا سبب نااہل اور غلط مقتداؤں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔

اقتدار کا معیار قرآن کریم کے اس جملہ نے اقتدار کا نہایت معقول اور واضح معیار دو چیزوں کو بنایا ہے، علم اور اہتداء، علم سے مراد منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کا جاننا ہے اور اہتداء سے مراد اس مقصد کی راہ پر چلنا، یعنی صحیح علم پر عمل مستقیم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس شخص کو مقتدا بناؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ جس مقصد کے لئے اس کو مقتدا بنایا ہے وہ اس مقصد اور اس کے طریق سے پوری طرح واقف بھی ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھو کہ وہ اس کی راہ پر چل بھی رہا ہے؟ اور اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے یا نہیں؟

غرض کسی کو مقتدا بنانے کے لئے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری ہے، محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا، یا صاحب مال و دولت ہونا یا صاحب حکومت و سلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیار اقتدار سمجھا جائے۔

کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ قرآن کریم نے اس جگہ تقلید آبائی کے خوگر لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا، اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلا دیا جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو اشتعال نہ ہو، کیونکہ دین آبائی کی تقلید کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمھارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں، بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا، نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔

اصلاح خلق کی فکر کرنیوالوں کو ایک تسلی دوسری آیت میں اصلاح خلق کی فکر میں سب کچھ قربان کرنیوالے مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جب تم نے حق کی تبلیغ و تعلیم میں مقدور بھر کوشش کر لی، اور نصیحت و خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، تو پھر بھی اگر کوئی گمراہی پر جما رہے تو تم اس کی فکر میں نہ پڑو، اس حالت میں دوسروں کی گمراہی یا غلط کاری سے تمھارا کوئی نقصان نہ ہوگا، ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

یعنی اے مسلمانوں تم اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے تو اس سے تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے چونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر انسان کو صرف اپنے عمل اور اپنی اصلاح کی فکر کافی ہے، دوسرے کچھ بھی کرتے رہیں اُس پر دھیان دینے کی ضرورت

نہیں اور یہ بات قرآن کریم کی بے شمار تصریحات کے خلاف ہے، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کا اہم فریضہ اور اس امت کی امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے، اسی لئے اس آیت کے نازل ہونے پر کچھ لوگوں کو شبہات پیش آئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے گئے، آپ نے توضیح فرمائی، کہ یہ آیت احکام امر بالمعروف کے منافی نہیں، امر بالمعروف کو چھوڑ دو گے تو مجرموں کے ساتھ تم بھی ماخوذ ہوگے، اسی لئے تفسیر بحر محیط میں حضرت سعید ابن جبیرؓ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ تم اپنے واجبات شرعیہ کو ادا کرتے رہو جن میں جہاد اور امر بالمعروف بھی داخل ہے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو لوگ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی نقصان نہیں، قرآن کریم کے الفاظ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ میں غور کریں، تو یہ تفسیر خود واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم راہ پر چل رہے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہارے لئے مضر نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص امر بالمعروف کے فریضہ کو ترک کرتا ہے وہ راہ پر نہیں چل رہا ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ سوال کیا کہ فلاں فلاں حضرات میں باہمی سخت جھگڑا ہے، ایک دوسرے کو مشرک کہتے ہیں، تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہیں کہہ دوں گا کہ جاؤ ان لوگوں سے قتال کرو، ہرگز نہیں، جاؤ اُن کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ، قبول کریں تو بہتر اور نہ کریں تو ان کی فکر چھوڑ کر اپنی فکر میں لگ جاؤ، پھر یہی آیت آپ نے جواب کی شہادت میں تلاوت فرمائی۔

گناہوں کی روک تھام کے بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک خطبہ

آیت کے ظاہری الفاظ سے سرسری نظر میں جو شبہ ہو سکتا تھا اس کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے موقع استعمال کرتے ہو، کہ امر بالمعروف کی ضرورت نہیں، خوب سمجھ لو کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو لوگ کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور بمقدور پھر اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے ساتھ ان دوسرے لوگوں کو بھی عذاب میں پکڑ لے۔

یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ میں موجود ہے اور ابو داؤد کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جو لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کو ظلم سے (اپنی قدرت کے موافق) نہ روکیں **تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں پکڑ لیں گے۔**

معروف اور منکر کے معنی

گزشتہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہو چکی کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ منکر یعنی ناجائز امور کی روک تھام کرے یا کم از کم ان سے اظہار نفرت کرے، اب یہ

معلوم کیجئے کہ معروف اور منکر کس کو کہتے ہیں۔

لفظ معروف، معرفہ سے اور منکر انکار سے ماخوذ ہے، معرفہ کہتے ہیں کسی چیز کو غور و فکر کرکے سمجھنے یا پہچاننے کو، اس کے بالمقابل انکار کہتے ہیں نہ سمجھنے یا نہ پہچاننے کو، یہ دونوں لفظ متقابل سمجھے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا، یعنی اللہ کی قدرت کاملہ کے مظاہر دیکھ کر اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں مگر پھر از روئے عناد انکار کرتے ہیں گویا ان نعمتوں کو جانتے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لغوی معنی کے اعتبار سے معروف کے معنی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، اور منکر کے معنی ناپہچانی ہوئی چیز کے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اسی کی مناسبت سے اصطلاح شرع میں معروف و منکر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ معروف ہر اس فعل کو کہا جاتا ہے جس کا مستحسن یعنی اچھا ہونا عقل یا شرع سے پہچانا ہوا ہو، اور منکر ہر اس فعل کا نام ہے جو از روئے عقل و شرع اوپرا اور نہ پہچانا ہوا ہو، یعنی بُرا سمجھا جاتا ہو اس لئے امر بالمعروف کے معنی اچھے کام کی طرف بلانے کے اور نہی عن المنکر کے معنی بُرے کام سے روکنے کے ہوگئے۔

ائمہ مجتہدین کے مختلف قول میں کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا

لیکن اس جگہ گناہ و ثواب یا طاعت و معصیت کے بجائے معروف و منکر کا لفظ استعمال کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ وہ دقیق اور اجتہادی مسائل جن میں قرآن و سنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دو رائیں ہو سکتی ہیں، اور اسی بنا پر ان میں فقہاء امت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ سے خارج ہیں، ائمہ مجتہدین جن کی شان اجتہاد علماء امت میں مسلّم ہے، اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں، ایسے مسائل میں ایک رائے کو راجح سمجھنے والے کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث و تمحیص اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجوہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس جانب کو راجح سمجھے اسے اختیار کرے، لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ و جدل

یا منافرت پھیلانے والے مقالات و مضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں ان مسائل کو محاذِ جنگ بنانا صرف ناواقفیت یا جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

اے ایمان والو گواہ درمیان تمہارے جب کہ پہنچے کسی کو تم میں موت،

حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ

وصیت کے وقت دو شخص معتبر ہونے چاہئیں تم میں سے یا دو شاہد اور ہوں تمہارے سوا،

اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ

اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر پہنچے تم کو مصیبت موت کی

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ

تو کھڑا کرو ان دونوں کو بعد نماز کے وہ دونوں قسم کھاویں اللہ کی اگر تم کو شبہ پڑے کہیں

لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَـمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ

کہ ہم نہیں لیتے قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی

اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓي اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا

نہیں تو ہم بے شک گنہگار ہیں، پھر اگر خبر ہو جاوے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ

تو دو گواہ اور کھڑے ہوں ان کی جگہ ان میں سے کہ جن کا حق دبا ہے جو سب سے زیادہ

الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا

قریب ہوں میت کے پھر قسم کھاویں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہے پہلوں کی گواہی سے

وَمَا اعْتَدَيْنَآ ڮ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰٓي اَنْ

اور ہم نے زیادتی نہیں کی، نہیں تو ہم بیشک ظالم ہیں، اس میں امید ہے کہ

يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰي وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ

ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح پر اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی

بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

قسم کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو اور اللہ نہیں چلاتا سیدھی

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٨﴾
راہ پر نافرمانوں کو

ربطِ آیات اوپر مصالحِ دینیہ کے متعلق احکام تھے، آگے مصالحِ دنیویہ کے متعلق بعض احکام کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ کر دیا کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے مثل اصلاحِ معاد کے اپنے بندوں کی معاش کی اصلاح بھی فرماتے ہیں (بیان القرآن)۔

شانِ نزول آیاتِ مذکورہ کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص "بُدَیل" نامی جو مسلمان تھا دو شخصوں تمیم و عدی کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے بغرضِ تجارت ملکِ شام کی طرف گیا، شام پہنچکر بُدیل بیمار ہو گیا، اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی، اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی، مرض جب زیادہ بڑھا، تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کُل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انھوں نے سب سامان لاکر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھا اس میں سے نکال لیا، وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی، انھوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میّت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں خرچ ہوا ہو، ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میّت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی، نہ کوئی چیز اس کی چھپائی، آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا، کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے، جب سوال ہو تو کہنے لگے کہ ہم نے میّت سے خرید لیا تھا، چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔

میّت کے وارثوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا، اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے، شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میّت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میّت کی ملک تھا، اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں، چنانچہ جس قیمت پر انھوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم پر) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تمہارے آپس (کے معاملات) میں (مثلاً ورثہ کو مال سپرد کرنے کے لئے) دو شخص وصی ہونا مناسب ہے (گو بالکل وصی نہ بنانا بھی جائز ہے) جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے (یعنی جب وصیت کرنے کا وقت ہو اور) وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں اور تم میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) ہوں یا غیر قوم کے دو شخص ہوں اگر (مسلمان نہ ملیں مثلاً) تم کہیں سفر میں گئے ہو پھر تم پر واقعہ موت کا پڑ جائے (اور یہ سب امور واجب نہیں، مگر مناسب اور بہتر ہیں ورنہ جس طرح بالکل وصی نہ بنانا جائز ہے اسی طرح اگر ایک وصی ہو یا عادل نہ ہو یا حضر میں غیر مسلم کو بنا دے سب جائز ہے، لیکن ان وصیاء کا یہ حکم ہے کہ اگر (کسی وجہ سے اُن پر تم کو اے ورثاء شبہ ہو تو اے حکام مقدمہ اس طرح فیصل کرو کہ اول ورثاء سے چونکہ وہ مدعی ہیں اس امر پر گواہ طلب کرو کہ انھوں نے فلاں چیز مثلاً جام لے لیا ہے، اور اگر وہ گواہ نہ لا سکیں تو ان اوصیاء سے چونکہ وہ مدعا علیہ ہیں اس طرح قسم لو کہ) ان دونوں (وصیوں) کو بعد نماز (عصر مثلاً) روک لو (کیونکہ اکثر اس وقت مجمع زیادہ ہوتا ہے، تو جھوٹی قسم کھانے والا کچھ نہ کچھ شرماتا ہے، نیز وقت بھی معظم ہے کچھ اس کا بھی خیال ہو جاتا ہے اور مقصود اس سے تغلیظ یمین کی ہے زمان متبرک و مکان اجتماع خلق کے ساتھ) پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھاویں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ بھی کہیں کہ) ہم اس قسم کے عوض کوئی (دنیا) کا نفع نہیں لینا چاہتے (کہ دنیا کا نفع حاصل کرنے کے لئے قسم میں سچ بولنے کو چھوڑ دیں) اگرچہ (اس واقعہ میں ہمارا) کوئی قرابتدار بھی (کیوں نہ ہوتا (جس کی مصلحت کو اپنی مصلحت سمجھ کر ہم جھوٹی قسم کھاتے اور اب تو کوئی ایسا بھی نہیں، جب دوسری مصلحتوں کی وجہ سے بھی ہم جھوٹ نہ بولتے تو ایک مصلحت کے لئے تو ہم کیوں ہی جھوٹ بولیں گے) اور اللہ کی (طرف سے جس بات رکھنے کا حکم ہے اس) کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے، ورنہ ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت گنہگار ہوں گے (یہ تغلیظ قولی ہے جس سے مقصود تنبیہ ہے وجوب صدق و حرمت کذب و عظمت الٰہیہ کا جو مانع ہو دروغ حلفی سے) (اب ان دونوں تغلیظ کے بعد اگر حاکم کی رائے ہو تو بتعیین اصل مضمون کی قسم کھلا دیں، مثلاً ہم کو میت نے پیالہ نہیں دیا، اور اس پر مقدمہ فیصل کر دینا چاہئے، چنانچہ اس آیت کے واقعہ میں ایسا ہی ہوا، پھر (اس کے بعد) اگر (کسی طریق سے ظاہراً) اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں وصی کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

(مثلاً واقعہ آیت میں جس کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، جب پیالہ مکہ میں ملا اور دونوں وصیین نے دریافت کرنے پر میت سے خریدنے کا دعویٰ کیا جس سے میت سے لے لینے کا اقرار لازم آتا ہے، اور وہ ان کے پہلے قول کا مخالف ہے جس میں مطلقاً لینے ہی سے انکار کیا تھا، چونکہ اقرار بالمضر حجت ہے، اس لئے ظاہراً ان کا خائن اور کاذب ہونا معلوم ہوا) تو ایسی صورت میں مقدمہ کا رُخ بدل جائے گا وصی جو کہ پہلے مدعا علیہ تھے اب خریدنے کے مدعی ہوگئے اور ورثاء جو کہ پہلے مدعی خیانت کے تھے اب مدعا علیہ ہوگئے، اس لئے اب فیصلہ کی یہ صورت ہوگئی کہ اول وصیوں سے گواہ خریدنے کے طلب کئے جائیں، اور جب وہ گواہ پیش نہ کر سکیں تو) ان لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں (ان اوصیاء کی جانب سے) گناہ (مذکور) کا ارتکاب ہوا تھا اور (جو کہ شرعاً مستحق میراث ہوں مثلاً صورت واقعہ آیت میں، دو شخص (تھے)، جو سب (ورثہ) میں باعتبار (استحقاق میراث) قریب تر ہیں جہاں (حلف کے لئے) وہ دونوں وصی کھڑے ہوئے تھے (اب) یہ دونوں (حلف کے لئے) کھڑے ہوں پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھاویں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ بھی کہ) بالیقین ہماری یہ قسم (بوجہ اس کے کہ بالکل اشتباہ سے ظاہراً و حقیقۃً پاک ہے) ان دونوں (اوصیاء) کی اس قسم سے زیادہ راست ہے (کیونکہ اس کی حقیقت کا گو ہم کو علم نہیں لیکن ظاہراً تو وہ مشتبہ ہوگئی) اور ہم نے (حق سے) ذرا تجاوز نہیں کیا (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے (کیونکہ پرایا مال جان بوجھ کر بلا اجازت لے لینا ظلم ہے، یہ بھی تغلیظ ہے جو حاکم کی رائے پر ہے، پھر اصل مضمون پر قسم لی جائے، جس کا صیغہ بوجہ اس کے کہ فعل غیر پر ہے یہ ہوگا کہ خدا کی قسم ہمارے علم میں میت نے ان مدعیان کے ہاتھ جام فروخت نہیں کیا، اور چونکہ علم کی واقعیت و عدم واقعیت کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی واقعیت پر زیادہ موکد قسم لی گئی، جیسا لفظ اَحَقُّ دال ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس کا مدار چونکہ میرے ہی اوپر ہے اس لئے قسم کھاتا ہوں کہ جیسا اس میں کذب ظاہری کا ثبوت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حقیقت میں کذب بھی نہیں ہے، اور یہ قرینہ مفید ہے کہ یہاں حلف علم پر ہے، اور چونکہ اس کا کذب بلا اقرار کبھی ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے اس میں جو حق تلفی ہوگی وہ اشد درجہ کا ظلم ہوگا، عجب نہیں کہ یہاں ظالمین اسی لئے کہا گیا ہو) یہ (قانون جو مجموعہ آیتین میں مذکور ہوا) بہت قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (اوصیاء) لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں (اگر سپردگی مال زندگی نہیں ہوئی قسم کھا لیں، اور اگر ہوئی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کر دیں، یہ حکمت تو تحلیف اوصیاء

ہیں ہے یا اس بات سے ڈر کر قسم کھانے سے رک جائیں کہ ان سے قسم لینے کے بعد ورثاء پر قسمیں متوجہ کی جائیں گی، پھر ہم کو خفیف ہونا پڑے گا، یہ حکمت تحلیف ورثاء میں ہے، اور ان سب شقوق میں حق دار کو اس کا حق پہونچ جاتا ہے جو مشروع و مطلوب ہے، کیونکہ اگر تحلیف اوصیاء مشروع نہ ہوتا اور اوصیاء اس کے سپرد کرنے میں سچے ہوتے تو ان کی تہمت دفع کرنے کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اگر وہ جھوٹے ہوتے تو ورثاء کے اثبات حق کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اب سچے ہونے کے وقت براءۃ ہو جاتی، اور جھوٹے ہونے کے وقت شاید جھوٹی قسم سے ڈر کر انکار کر جاویں تو ورثاء کا حق ثابت ہو جاتا ہے، اور اگر تحلیف ورثاء مشروع نہ ہوتا اور ورثاء کا حق ہوتا تو اثبات حق کی کوئی صورت نہ تھی اور اگر ثمّ اً ان کا حق نہ ہوتا تو اوصیاء کے اثبات حق کا کوئی طریقہ نہ تھا، اور اب ورثاء کا حق ہونے کے وقت ان کا اثبات حق ہو سکتا ہے اور حق نہ ہونے کے وقت قسم کے انکار سے وصیاء کا حق ثابت ہو جائیگا پس دو شقیں تحلیف اوصیاء کی حکمت میں ہیں اور یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ دونوں کو شامل ہے اور دو شقیں تحلیف ورثاء کی حکمت میں ہیں جن میں کی دوسری شق تو تحلیف اوصیاء کی پہلی شق میں متداخل ہے اور پہلی شق اَوْ يَخَافُوْا کا مدلول ہے، پس مجموعہ ہر دو تحلیف میں سب شقوق کی رعایت ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور معاملات و حقوق میں جھوٹ مت بولو، اور ان کے احکام کو سنو (یعنی مانو، ورنہ اگر خلاف کروگے تو فاسق ہو جاؤگے) اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو قیامت کے روز فرمانبرداروں کے درجات کی طرف راہنمائی نہ کریں گے بلکہ نجات پانے کے وقت بھی ان سے محروم رہیں گے تو ایسا خسارہ کیوں گوارا کرتے ہو)

معارف و مسائل

مسئلہ ۱: میت جس شخص کو مال سپرد کرکے اس سے متعلق کسی کو دینے دلانے کیلئے کہہ جاوے وہ وصی ہے، اور وصی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، اور زیادہ بھی۔

مسئلہ ۲: وصی کو مسلمان و عادل ہونا خواہ حالت سفر ہو یا حضر افضل ہے لازم نہیں

مسئلہ ۳: نزاع میں جو امر زائد کا مثبت ہو وہ مدعی اور دوسرا مدعا علیہ کہلاتا ہے

مسئلہ ۴: اوّل مدعی سے گواہ لئے جاتے ہیں، اگر موافق ضابطہ شرعی کے پیش کردے مقدمہ وہ پاتا ہے، اور اگر پیش نہ کرسکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے اور مقدمہ وہ پاتا ہے، البتہ اگر قسم سے انکار کر جاوے تو پھر مدعی مقدمہ پاتا ہے۔

مسئلہ ۵: قسم کی تغلیظ زمان یا مکان کے ساتھ جیسا کہ آیت مذکورہ میں کی گئی ہے، حاکم کی رائے پر ہے لازم نہیں، اس آیت سے بھی لزوم ثابت نہیں ہوتا اور دوسری

آیات و روایات سے اطلاق ثابت ہے۔

مسئلہ : اگر مدعا علیہ کسی غیر کے فعل کے متعلق قسم کھائے تو الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ مجھ کو اس فعل کی اطلاع نہیں۔

مسئلہ : اگر میراث کے مقدمہ میں وارث مدعا علیہ ہوں تو جن کو شرعاً میراث پہنچتی ہے ان پر قسم آوے گی خواہ وہ واحد ہو یا متعدد اور جو وارث نہیں اُن پر قسم نہ ہوگی (بیان القرآن)۔

ایک کافر کی شہادت دوسرے کافر کے معاملہ میں قبول ہے

قولہ تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَۃُ بَیْنِکُمْ (الیٰ قولہ) اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِکُمْ، اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو دو ایسے آدمیوں کو وصی بناؤ جو تم میں سے ہوں اور نیک ہوں، اور اگر اپنی قوم کے آدمی نہیں ہیں تو غیر قوم (یعنی کافر) سے بناؤ۔

اس سے امام ابو حنیفہؒ نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ کفار کی شہادت بعض کی بعض پر جائز ہے، کیونکہ اس آیت میں کفار کی شہادت مسلمانوں پر جائز قرار دی ہے، جیسا کہ اٰوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِکُمْ سے ظاہر ہے تو کفار کی شہادت بعض کی بعض پر بطریق اولیٰ جائز ہے، لیکن بعد میں آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ (الیٰ قولہ) وَاسْتَشْھِدُوْا شَھِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِکُمْ، سے کفار کی شہادت مسلمانوں پر منسوخ ہوگئی، لیکن کفار کی بعض کی بعض پر اسی طرح باقی ہے (قرطبی، احکام القرآن للجصاص)۔

امام صاحب کے مسلک کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ایک یہودی نے زنا کرلیا تو اس کے لوگوں نے اس کو منہ پر سیاہی مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کیا، آپ نے اس کی حالت دیکھ کر وجہ دریافت فرمائی تو انہوں نے کہا کہ اس نے زنا کیا ہے تو آپ نے گواہوں کی شہادت کے بعد اس کو رجم کرنے کا حکم دیا (جصاص)۔

جس شخص پر کسی کا حق ہو وہ اس کو قید کر سکتا ہے

قولہ تعالیٰ تَحْبِسُوْنَھُمَا، اس آیت سے ایک اصول معلوم ہوا کہ جب آدمی پر کسی کا کوئی حق واجب ہو اس کو اس حق کی خاطر ضرورت کے وقت قید کیا جا سکتا ہے (قرطبی)۔

قولہ تعالیٰ مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوۃِ، صلوٰۃ سے عصر کی نماز مراد ہے، اس وقت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی تعظیم اہل کتاب بہت کرتے تھے، جھوٹ بولنا ایسے وقت میں خصوصاً ان کے یہاں ممنوع تھا، اس سے معلوم ہوا کہ قسم میں کسی خاص وقت یا خاص مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے (قرطبی)

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا تم کو کیا جواب ملا تھا وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں تو ہی ہے چھپی باتوں کو جاننے والا۔ جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر جب مدد کی میں نے تیری روح پاک سے تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود میں اور بڑی عمر میں اور جب سکھائی میں نے تجھ کو کتاب اور تہ کی باتیں اور توریت اور انجیل اور جب تو بناتا تھا گارے سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو ہو جاتا اڑنے والا میرے حکم سے اور اچھا کرتا تھا مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا کرتا تھا مردوں کو میرے حکم سے اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے جب تو لے کر آیا ان کے پاس نشانیاں تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں اور کچھ نہیں یہ تو جادو ہے صریح

ربط آیات یہاں تک کہ مضامین مذکورہ میں زیادہ تر احکام بیان ہوئے ہیں ان پر عمل کی ترغیب اور ان کی مخالفت پر ترہیب فرمائی گئی، اس کی تاکید کے لئے اگلی آیت میں قیامت کے ہولناک واقعات یاد دلاتے ہیں، تاکہ اطاعت کا زیادہ باعث اور مخالفت سے زیادہ مانع ہو، اور یہ طرز قرآن مجید کا یہی ہے، خصوصاً اس سورت میں اہل کتاب کے ساتھ مکالمہ ذکر فرمایا ہے، جو ماقبل متعدد آیات میں

مذکور ہو چکا جس سے مقصود اہل کتاب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعض مضامین سنانا ہے جن سے ان کی عبدیت کا ثبوت اور اُلوہیت کی نفی ہے اگرچہ اس مخاطبت کا وقوع قیامت میں ہوگا)

خلاصۂ تفسیر

وہ دن بھی کیسا ہولناک ہوگا جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو مع ان کی امتوں کے جمع کریں گے پھر ان امتوں میں بعض سی ہوں گے بغرض توبیخ ان کے سنانے کو ان پیغمبروں سے ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو ان امتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ (ظاہری جواب تو تم کو معلوم ہے اور اس کو بیان بھی کردیں گے، لیکن ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کی) ہم کو کچھ خبر نہیں (اس کو آپ ہی جانتے ہیں کیونکہ) آپ بیشک پوشیدہ باتوں کے پورے جاننے والے ہیں (مطلب یہ کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ اعمال والوں کی تفتیش ہوگی، اس لئے تم کو مخالفت و معصیت سے ڈرتے رہنا چاہئے) اور اسی روز عیسیٰ علیہ السلام سے ایک خاص گفتگو ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم میرا انعام یاد کرو (تاکہ لذت تازہ ہو) جو تم پر اور تمہاری والدہ پر مختلف وقت میں مختلف صورتوں سے ہوا ہے مثلاً جبکہ میں نے تم کو روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے امداد و تائید دی اور تم آدمیوں سے دونوں حالتوں میں یکساں کلام کرتے تھے (ماں کی گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی دونوں کلاموں میں کچھ تفاوت نہ تھا) اور جبکہ میں نے تم کو (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور بالخصوص توریت و انجیل تعلیم کیں اور جبکہ تم گارے سے ایک شکل بناتے تھے جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے میرے حکم سے پھر تم اس (مصنوعی ہیئت) کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے اور تم اچھا کر دیتے تھے مادرزاد اندھے کو اور برص (جذام) کے بیمار کو میرے حکم سے اور جبکہ تم مُردوں کو (قبروں سے) نکال (وجلد کر) کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل (میں سے جو آپ کے مخالف تھے ان) کو تم سے (یعنی تمہارے قتل و ہلاک سے) باز رکھا جب (انھوں نے تم کو ضرر پہنچانا چاہا جبکہ) تم ان کے پاس (اپنی نبوت کی) دلیلیں (معجزات) لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انھوں نے کہا تھا کہ یہ (معجزات) بجز کھلے جادو کے اور کچھ بھی نہیں

معارف و مسائل

قیامت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے سب سے پہلے سوال ہوگا قولہ تعالیٰ، يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ، قیامت میں اگرچہ اوّل سے آخر تک پیدا ہونے والے تمام انسان ایک کھلے میدان میں کھڑے ہوں گے، اور کسی خطہ، کسی ملک اور کسی زمانہ کا انسان موجودہ اس میدان میں حاضر ہوگا اور سب سے ان کے عمر بھر کے اعمال کا حساب لیا جائے گا لیکن بیان میں خصوصیت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا، يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ، یعنی اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ سب رسولوں کو حساب کے لئے جمع فرمائیں گے، مراد یہ ہے کہ جمع تو سارے عالم کو کیا جائے گا، مگر سب سے پہلے سوال انبیاء علیہم السلام سے ہوگا، تاکہ پوری مخلوق دیکھ لے، کہ آج کے دن کوئی حساب اور سوال و جواب سے مستثنیٰ نہیں، پھر رسولوں سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہے کہ مَاذَآ اُجِبْتُمْ، یعنی جب آپ لوگوں نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دینِ حق کی طرف بلایا تو ان لوگوں نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟ اور کیا انھوں نے آپ کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کیا؟ یا انکار و مخالفت؟

اس سوال کے مخاطب اگرچہ انبیاء علیہم السلام ہوں گے، لیکن درحقیقت سنانا ان کی امتوں کو مقصود ہوگا کہ امتوں نے جو اعمال نیک یا بد کئے ہیں ان کی شہادت سب سے پہلے ان کے رسولوں سے لی جائے گی، امتوں کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوگا، کہ وہ تو اس ہوش ربا ہنگامہ میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کے متوقع ہوں گے، ادھر انبیاء علیہم السلام ہی سے اُن کے متعلق یہ سوال ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کوئی غلط یا خلاف واقع بات تو کہہ نہیں سکتے، اس لئے مجرموں اور گنہگاروں کو اندیشہ یہ ہوگا کہ جب خود انبیاء علیہم السلام ہی ہمارے جرائم کے شاہد بنیں گے تو اب کون ہے جو کوئی شفاعت یا مدد کر سکے۔

انبیاء علیہم السلام اس سوال کا جواب یہ دیں گے: قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، یعنی ہمیں اُن کے ایمان و عمل کا کوئی علم نہیں، آپ خود ہی تمام غیب کی چیزوں سے پورے باخبر ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں سوال یہ ہے کہ ہر رسول کی امت کے وہ لوگ جو اُن کی وفات کے بعد پیدا ہوئے اُن کے بارے میں تو انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب صحیح اور صاف ہے، کہ ان کے ایمان و عمل سے وہ باخبر نہیں، کیونکہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، لیکن ایک بہت بڑی تعداد امت میں ان لوگوں کی بھی تو ہے جو خود انبیاء علیہم السلام کی انتھک

کوششوں سے انہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور پھر ان کے احکام کی پیروی ان کے سامنے کرتے رہے، اسی طرح وہ کافر جنہوں نے انبیاء کی بات نہ مانی اور مخالفت و دشمنی سے پیش آئے، ان کے بارے میں یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ ہمیں ان کے ایمان و عمل کا علم نہیں۔ تفسیر بحر محیط میں ہے کہ امام ابوعبداللہ رازی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک علم جس کے معنی یقین کامل کے ہیں، اور دوسرے ظن یعنی غالب گمان، اور ظاہر ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے ہونے کے باوجود اس کے ایمان و عمل کی گواہی اگر دے سکتا ہے، تو محض ظن یعنی غالب گمان کے اعتبار سے دے سکتا ہے، ورنہ دلوں کا راز اور حقیقی ایمان جس کا تعلق دل سے ہے وہ تو کسی کو یقینی طور پر بغیر وحی الٰہی کے معلوم نہیں ہوسکتا، ہر امت میں منافقین کے گروہ رہے ہیں، جو ظاہر میں ایمان بھی لاتے تھے اور احکام کی پیروی بھی کرتے تھے، مگر ان کے دلوں میں ایمان نہ تھا، اور نہ پیروی کا کوئی جذبہ، وہاں جو کچھ تھا سب ریاکاری تھی، اہل دنیا کے تمام احکام ظاہر افعال پر دائر ہوتے تھے جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور احکام خداوندی کا اتباع کرے، اور خلاف اسلام و ایمان اس سے کوئی قول و فعل ثابت نہ ہو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں اس کو مومن صالح کہنے پر مجبور تھے، خواہ وہ دل میں مومن مخلص ہو یا منافق، اسی لئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ وَاللّٰهُ مُتَوَلِّي السَّرَائِرِ	"یعنی ہم تو ظاہر اعمال پر حکم جاری کرتے ہیں، دلوں کے مخفی رازوں کا متولی خود **اللہ جل شانہ ہے**"

اسی ضابطہ کے تحت دنیا میں تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب خلفاء و علماء ظاہری اعمال پر حسن ظن کے مطابق کسی کے مومن صالح ہونے کی شہادت دے سکتے تھے لیکن آج وہ عالم دنیا جس کا سارا مدار ظن و گمان پر تھا ختم ہوچکا، یہ محشر کا میدان ہے جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی، حقائق کو آشکارا کیا جائے گا، مجرموں کے مقابلہ میں پہلے دوسرے لوگوں سے شہادتیں لی جائیں گی، ان سے اگر مجرم مطمئن نہ ہوا اور اپنے جرم کا اعتراف نہ کیا تو خاص قسم کے سرکاری گواہ بروئے کار لائے جائیں گے، ان کے منہ اور زبان پر تو مہر سکوت لگا دی جائے گی، اور مجرم کے ہاتھوں، پاؤں اور کھال سے گواہی لی جائے گی، وہ ہر فعل کی پوری حقیقت بیان کر دیں گے، اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اس وقت انسانوں کو معلوم ہوگا کہ میرے تمام

اعضاء رب العالمین کی خفیہ پولیس تھے، ان کے بیان کے بعد انکار کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔

خلاصہ یہ کہ اس عدالت کا کوئی حکم محض ظن وتخمین پر نہیں چلے گا، بلکہ علم ویقین پر ہر چیز کا مدار ہوگا اور یہ ابھی معلوم ہو چکا کہ کسی شخص کے ایمان وعمل کا حقیقی اور یقینی علم بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس لئے انبیاء علیہم السلام سے جب محشر میں یہ سوال ہوگا کہ مَاذَآ اُجِبْتُمْ، تو وہ اس سوال کی حقیقت کو پہچان لیں گے کہ یہ سوال عالم دنیا میں نہیں ہو رہا جس کا جواب ظن کی بنیاد پر دیا جاسکے، بلکہ یہ سوال محشر میں ہو رہا ہے، جہاں یقین کے سوا کوئی بات چلنے والی نہیں، اس لئے ان کا یہ جواب کہ ہمیں ان کے متعلق کوئی علم نہیں، یعنی علم یقینی نہیں بالکل بجا اور درست ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب انبیاء کی انتہائی شفقت کا ظہور

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتوں کے قبول وعدم قبول، اطاعت ونافرمانی کے جو واقعات ان کے سامنے پیش آئے ان سے جس طرح کا علم بظن غالب ان کو حاصل ہوا، اس سوال کے جواب میں وہ تو بیان کر دینا چاہئے تھا، صرف اس علم کے درجہ یقین کا حوالہ اللہ تعالیٰ پر کیا جاسکتا ہے، مگر یہاں انبیاء علیہم السلام نے اپنی معلومات اور پیش آمدہ واقعات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، علم الٰہی کے حوالے کرکے خاموش ہوگئے۔

حکمت اس میں یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں اور عام خلق اللہ پر بے انتہا شفیق ہوتے ہیں، ان کے متعلق ایسی کوئی بات اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہیں گے جس سے یہ لوگ گرفت میں آجائیں، ہاں کوئی مجبوری ہی ہوتی تو کہنا پڑتا، یہاں علم یقین نہ ہونے کا عذر موجود تھا، اس عذر سے کام لے کر اپنی زبانوں سے اپنی امتوں کے خلاف کچھ کہنے سے بچ سکتے تھے اس طرح اس سے بچ گئے۔

محشر میں پانچ چیزوں کا سوال

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں قیامت کے ہولناک منظر کی ایک جھلک سامنے کردی گئی، کہ موقفِ حساب میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ ومقبول رسول کھڑے ہیں، اور لرز رہے ہیں تو دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس لئے اس روز کی فکر آج سے چاہئے، اور فرصتِ عمر کو اس حساب کی تیاری کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ
عَنْ عُمْرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَآ اَبْلَاہُ وَعَنْ مَالِہٖ مِنْ اَیْنَ
اِکْتَسَبَہٗ وَاَیْنَ اَنْفَقَہٗ وَمَاذَا عَمِلَ بِمَا عَلِمَ

"یعنی کسی آدمی کے قدم محشر میں اس وقت تک آگے نہ سرک سکیں گے جبتک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لے لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کے طویل و کثیر سال و نہار کس کام میں خرچ کئے، دوسرے یہ کہ خصوصیت سے جوانی کا زمانہ جو قوت عمل کا زمانہ تھا، اس کو کن کاموں میں خرچ کیا، تیسرے یہ کہ ساری عمر میں جو مال اس کو حاصل ہوا وہ کہاں اور کن حلال یا حرام طریقوں سے کمایا، چوتھے یہ کہ مال کو کن جائز یا ناجائز کاموں میں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟"

اللہ تعالیٰ نے غایت رحمت و شفقت سے اس امتحان کا پرچۂ سوالات بھی پہلے ہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت کو بتلا دیا، اب ان کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ ان سوالات کا حل سیکھے، اور محفوظ رکھے، امتحان سے پہلے ہی سوالات بتلا دینے کے بعد بھی کوئی ان میں فیل ہو جائے تو اس سے زیادہ کون محروم ہو سکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصی سوال وجواب

پہلی آیت میں تو تمام انبیاء علیہم السلام کا حال اور ان سے سوال و جواب کا تذکرہ تھا، دوسری آیت میں اور اس کے بعد ختم سورت تک کی نو آیات میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور ان پر اللہ تعالیٰ کے مخصوص انعامات کی کچھ تفصیل کا بیان ہے، اور محشر میں ان سے ایک خصوصی سوال اور اس کے جواب کا ذکر ہے، جو اگلی آیتوں میں آرہا ہے۔

حاصل اس سوال و جواب کا بھی بنی اسرائیل اور تمام مخلوق کو یہ ہولناک منظر دکھلانا ہے کہ اس میدان میں جب روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے سوال ہوتا ہے کہ آپ کی امت نے جو آپ کو خدا کا شریک بنایا، تو وہ ساری عزت و عظمت اور عصمت و نبوت کے باوجود کس قدر گھبرا کر اپنی برات بارگاہِ عزّ وجل میں پیش فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نہیں بار بار مختلف عنوانات سے اس کی نفی کرتے ہیں کہ میں نے ان کو یہ تعلیم نہ دی تھی، اوّل عرض کیا: سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ، "یعنی پاک ہیں آپ میری کیا مجال تھی کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے حق نہ تھا"۔

اپنی برات کا دوسرا پہلو اس طرح اختیار فرماتے ہیں کہ خود حق تعالیٰ کو اپنا گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر میں ایسا کہتا تو آپ کو ضرور اس کا علم ہوتا، کیونکہ آپ تو میرے دل کے بھید سے بھی واقف ہیں، قول و فعل کا تو کیا کہنا، آپ تو علام الغیوب ہیں۔

اس ساری تمہید کے بعد اصل سوال کا جواب دیتے ہیں:-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب بارگاہِ ایزدی میں

یعنی یہ کہ میں نے اُن کو وہی تعلیم دی تھی جس کا آپ نے مجھے حکم فرمایا تھا، اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، پھر اس تعلیم کے بعد جب تک میں ان لوگوں کے اندر رہا تو میں ان کے اقوال و افعال کا گواہ تھا (اُس وقت تک اُن میں کوئی ایسے نہ کہتا تھا)، پھر جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو پھر یہ لوگ آپ ہی کی نگرانی میں تھے، آپ ہی ان کے اقوال و افعال سے پورے واقف ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند مخصوص انعامات کا ذکر

ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جس سوال و جواب کا ذکر کیا گیا ہے اس سے پہلے اُن مخصوص انعامات کا بھی ذکر ہے جو خصوصی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مبذول ہوئے، اور بشکل معجزات ان کو عطا فرمائے گئے، اس مجموعہ میں ایک طرف انعامات خاصہ کا اور دوسری طرف جواب طلبی کا منظر دکھلا کر بنی اسرائیل کی ان دونوں قوموں کو تنبیہ کی گئی ہے، جن میں سے ایک نے تو ان کی توہین کی اور طرح طرح کی تہمتیں لگائیں اور ستایا، اور دوسری قوم نے ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا، انعامات کا ذکر کر کے پہلی قوم کو اور سوال و جواب کا ذکر کر کے دوسری قوم کو تنبیہ کی گئی، یہاں جن انعامات کا تفصیلی ذکر کئی آیتوں میں کیا گیا ان میں سے ایک جملہ زیادہ قابلِ غور ہے جس میں ارشاد ہوا ہے: تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا، یعنی ایک خصوصی معجزہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بچہ ہونے کی حالت میں بھی کلام کرتے ہیں، اور ادھیڑ عمر ہونے کی حالت میں بھی۔

اس میں پہلی بات کا معجزہ اور خصوصی انعام ہونا تو ظاہر ہے، ابتداءِ ولادت میں بچے کلام کرنے کے قابل نہیں ہوا کرتے، کوئی بچہ ماں کی گود یا گہوارہ میں بولنے لگے تو یہ اس کا خصوصی امتیاز ہوگا، ادھیڑ عمر میں بولنا یا کلام کرنا جو مذکور ہے وہ تو کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں، ہر انسان اس عمر میں بولا ہی کرتا ہے، اور کلام کرتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصوصی حال پر غور کریں تو اس کا بھی معجزہ ہونا واضح ہو جائے گا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لئے گئے، اب یہاں کے انسانوں سے ان کا کلام کرنا ادھیڑ عمر کو پہونچنے کے بعد جب ہی ہو سکتا ہے جب وہ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں، جیسا کہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے، اور قرآن و سنت کی تصریحات سے ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر میں کلام کرنا بھی بوجہ اس دنیا میں دوبارہ آنے کے معجزہ ہی ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْٓا

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے

اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى

ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں، جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً

مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا

مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

آسمان سے بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے،

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ

بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھاویں اس میں سے اور مطمئن ہو جاویں ہمارے دل اور ہم جان لیں

قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى

کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اس پر گواہ کہا عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ

مریم کے بیٹے نے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے

تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا

کہ وہ دن عید رہے ہمارے لئے پہلوں اور پچھلوں کے واسطے اور نشانی ہو تیری طرف سے اور روزی دے ہم کو

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا

اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان

عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا

تم پر پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا

لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع

جو کسی کو نہ دوں گا جہان میں

ع ۱۵ / ۷ / ۵

خلاصۂ تفسیر

اور جبکہ میں نے حواریین کو انجیل میں تمہاری زبانی حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لاؤ انھوں نے (جواب میں تم سے) کہا کہ ہم (خدا اور رسول یعنی آپ پر) ایمان لائے اور آپ شاہد رہئے کہ ہم (خدا کے اور آپ کے) پورے فرمانبردار ہیں۔ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ حواریین نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیک السلام) کیا آپ کے رب ایسا کرسکتے ہیں (یعنی کوئی امر مثل خلاف حکمت ہونے وغیرہ کے اس سے مانع تو نہیں) کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا (پکا پکایا) نازل فرمادیں آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (مطلب یہ کہ تم تو ایمان دار ہو اس لئے خدا سے ڈرو اور معجزات کی فرمائش سے کہ بے ضرورت ہونے کی وجہ سے خلافِ ادب ہے بچو) وہ بولے کہ (ہمارا مقصود بے ضرورت فرمائش کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک مصلحت سے اس کی درخواست کرتے ہیں وہ یہ کہ) ہم (ایک تو) یہ چاہتے ہیں کہ (برکت حاصل کرنے کو) اس میں سے کھائیں اور (دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہمارے دلوں کو (ایمان پر) پورا اطمینان ہوجاوے اور (مطلب اطمینان کا یہ ہے کہ) ہمارا یہ یقین اور بڑھ جاوے کہ آپ نے (دعویٰ رسالت میں) ہم سے سچ بولا ہے (کیونکہ جس قدر دلائل بڑھتے جاتے ہیں دعوے کا یقین بڑھتا جاتا ہے)، اور (تیسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہم (ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے یہ معجزہ نہیں دیکھا) گواہی دینے والوں میں سے ہوجاویں (کہ ہم نے ایسا معجزہ دیکھا ہے تاکہ ان کے سامنے اثباتِ رسالت کرسکیں، اور ان کی ہدایت کا یہ ذریعہ بن جاوے) عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے (جب دیکھا کہ اس درخواست میں ان کی غرض صحیح ہے تو حق تعالیٰ سے) دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ (مائدہ) ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اوّل (یعنی موجودہ زمانہ میں) ہیں اور جو بعد (کے زمانہ میں آنیوالے) ہیں، سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہوجاوے (حاضرین کی خوشی تو کھانے سے اور درخواست قبول ہونے سے اور بعد والوں کی خوشی اپنے سلف پر انعام ہونے سے، اور یہ غایت تو خاص ہے مؤمنین کے ساتھ) اور (میری پیغمبری پر) آپ کی طرف سے ایک نشان ہوجاوے، (کہ مؤمنین کا یقین بڑھ جاوے اور منکرین حاضرین یا غائبین پر حجت ہوجاوے اور یہ مقصد مؤمنین وغیرہ سب کے لئے عام ہے) اور آپ ہم کو (وہ مائدہ) عطا فرمائیے، اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ سب کا دینا اپنے نفع کے لئے اور آپ کا

دنیا مخلوق کے نفع کے لئے ہے، اس لئے ہم اپنے منافع کو پیش کر کے آپ سے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں) حق تعالیٰ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) میں وہ کھانا (آسمان سے) تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد (اس کی) ناحق شناسی کرے گا (یعنی اس کے حقوق واجبہ عقلاً و نقلاً ادا نہ کرے گا) تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا (اس وقت کے) جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا

معارف و مسائل

مؤمن کو معجزات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے

(قولہ تعالیٰ) قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، جب حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمان سے مائدہ کے اترنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دار بندہ کو لائق نہیں کہ وہ اس قسم کی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے، اور اس سے خرقِ عادت کی چیزوں کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ روزی وغیرہ کو انہی ذرائع سے طلب کرے جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔

جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا وبال بھی بڑا ہوتا ہے

(قولہ تعالیٰ) فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گذاری کی تاکید بھی معمولی سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔

مائدہ آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین حضرات کا اختلاف ہے، جمہور نزول کے قائل ہیں، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی، اور اگلے دن کے لئے اٹھا کر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ)

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے کھاتے بھی تھے، جیسا تاکلُ میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لئے رکھ لینا ممنوع تھا۔

(بیان القرآن)

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي

اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو

وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ

اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ

أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ

کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا تو جانتا ہے

مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿۱۱۶﴾

جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بیشک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي

میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا

وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۚ فَلَمَّا

اور تمہارا اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا پھر جب

تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا اُن کی اور تو ہر چیز سے

شَهِيدٌ ﴿۱۱۷﴾ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ

خبردار ہے اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف

فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱۸﴾

کر دے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا

خُلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفار نصاریٰ کے سنانے کے لئے) فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم (ان لوگوں میں جن کا عقیدہ تثلیث کا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو شریکِ الوہیت مانتے تھے تو) کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام

کو) اور میری ماں (حضرت مریمؑ) کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دیدو تو عیسیٰ علیہ السلام)
عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ، میں تو خود اپنے عقیدہ میں) آپ کو (شریک سے) منزہ سمجھتا ہوں
(جیسا کہ آپ واقع میں بھی منزہ (پاک) ہیں تو ایسی حالت میں) مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ
میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں (نہ باعتبار اپنے عقیدے کے کہ میں
موحد یعنی ایک خدا کا قائل ہوں اور نہ باعتبار پیغام الٰہی پہنچانے کے کہ مجھ کو ایسا کوئی پیغام
نہیں دیا گیا تھا اور دلیل میری اس نہ کہنے کی یہ ہے کہ) اگر میں نے (واقع میں) کہا ہوگا تو
آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہوگا (مگر جب آپ کے علم میں بھی میں نے نہیں کہا تو واقع میں بھی
نہیں کہا اور کہنے کی صورت میں آپ کو اس کا علم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ) آپ تو میرے
دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں (تو جو زبان سے کہتا اس کا علم تو کیوں نہ ہوتا) اور میں
(تو مثل دیگر مخلوقات کے اتنا عاجز ہوں کہ) آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو (بدون آپ کے
بتلائے ہوئے) نہیں جانتا (جیسے دیگر مخلوقات کا بھی یہی حال ہے پس) تمام غیبوں کے
جاننے والے آپ ہی ہیں (سو جب اپنا اس قدر عجز اور آپ کا کمال مجھ کو معلوم ہے تو الوہیت
میں شرکت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، یہاں تک تو اس بات کے کہنے کی نفی ہوئی، آگے اس
کی نقیض کے کہنے کا اثبات ہے کہ) میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا، صرف وہی (بات)
جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی
رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، (اور یہاں تک تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت
کے متعلق عرض کیا، آگے ان لوگوں کی حالت کے متعلق عرض کرتے ہیں کیونکہ ءَاَنْتَ
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ میں گو تصریحاً تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے
یا نہیں، لیکن اشارۃً اس کا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا
پس عیسیٰ علیہ السلام اس باب میں یوں عرض کریں گے کہ) میں ان (کی حالت) پر مطلع
رہا جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے
اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں)، پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی اول بار میں تو
زندہ آسمان کی طرف اور دوسری بار میں وفات کے طور پر) تو (اس وقت صرف)
آپ اُن (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب
کیا ہوا اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں (یہاں تک تو اپنا اور ان کا
معاملہ عرض کیا آگے ان کے اور حق تعالیٰ کے معاملات کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ) اگر
آپ ان کو (اس عقیدہ پر) سزا دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) یہ آپ کے بندے ہیں

(اور آپ ان کے مالک، اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرم پر سزا دے، اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ آپ زبردست (قدرت والے) ہیں (تو معافی پر بھی قادر ہیں اور) حکمت والے بھی ہیں (تو آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی اس لئے اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہوسکتی، مطلب یہ ہے کہ دونوں حال میں آپ مختار ہیں میں کچھ دخل نہیں دیتا)

(غرض عیسیٰ علیہ السلام نے معروض اول سُبْحٰنَكَ الخ میں اپنی تبری ان اہلِ تثلیث کے عقیدے سے، اور اس کی تعلیم سے، دوسری عرض وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ الخ میں اپنی تبری ان کے اس عقیدہ کے مفصل جاننے تک سے، اور عرض سوم اِنْ تُعَذِّبْهُمْ الخ میں اپنی تبری ان کے باب میں کوئی تحریک کرنے تک سے ظاہر کردی، اور یہی مقصود تھا حق تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان مخاطبات سے، پس ان میں ان کفار کو پوری زجر اپنی نادانی پر اور حسرت اپنی ناکامی پر ہوگی)۔

معارف و مسائل

فوائد مہمہ قولہ تعالیٰ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى الخ، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام سے سوال اس لئے نہیں فرمایا ہے کہ ان کو معلوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود ان کی قوم نصاریٰ کی ملامت اور سرزنش ہے کہ جس کو تم الٰہ مان رہے ہو وہ خود تمہارے عقیدے کے خلاف اپنی عبدیت کا اقرار کر رہا ہے، اور تمہارے بہتان سے وہ بری ہے (ابن کثیر)

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء وغیرہ کی بحث سورۂ آل عمران میں آیت اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ کے تحت گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور رفع الی السماء کے انکار پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ گفتگو قیامت کے روز ہوگی، اور اس وقت آسمان سے نزول کے بعد آپ کو موت حقیقی حاصل ہو چکی ہوگی چنانچہ ابن کثیر نے بروایت ابو موسیٰ اشعری ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں بلائی جائیں گی، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اور ان کو ایک ایک کرکے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بیٹے مریم کے اُذْكُرْ نِعْمَتِيْ

عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ، یہاں تک کہ فرمائے گا يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، عیسیٰ علیہ السلام انکار کریں گے کہ پروردگار میں نے نہیں کہا ہے، پھر نصاریٰ سے سوال ہوگا تو یہ لوگ کہیں گے کہ ہاں اس نے ہم کو یہی حکم دیا تھا، اس کے بعد ان کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔

قولہ تعالیٰ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بیجا سختی نہیں کر سکتے، اس لئے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہوگی، اور فرض کیجئے معاف کر دیں تو یہ معافی بھی ازراہ عجز نہ ہوگی، کیونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں، اس لئے کوئی مجرم آپ کے قبضۂ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا، کہ اس پر آپ قابو نہ پا سکیں، اور چونکہ حکیم (حکمت والے) ہیں، اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع چھوڑ دیں، بہرحال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی، اس لئے حضرت مسیح نے "عزیز حکیم" کی جگہ "غفور رحیم" وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا، برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان میں سے میرے تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے، یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو تائب اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے (فوائد عثمانی)

ابن کثیرؒ نے بروایت ابوذرؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک تہجد میں پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے، اور وہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، ہے، پھر جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ یہی آیت پڑھتے رہے، رکوع اسی سے اور سجدے اسی سے کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تو فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے اپنے واسطے شفاعت کی درخواست کی تو مجھے عطا فرمائی، اور وہ انشاء اللہ تعالیٰ ملنے والی ہے، ایسے شخص کے واسطے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے مذکورہ آیت پڑھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ یعنی میرے پاک پروردگار میری امت کی طرف نظر رحمت فرما، اور آپ رونے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبرئیل امین رونے کی وجہ دریافت

فرمائی تو آپ نے جبرئیل امین کو آپ کے مذکورہ قول سے آگاہ کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دو کہ ہم عنقریب تیری امت کے بارے میں تم کو خوشنود کر دیں گے اور تم کو ناخوش نہ کریں گے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ
فرمایا اللہ نے یہ دن ہے کہ کام آوے گا سچوں کے ان کا سچ ان کے واسطے ہیں

جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ
باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں گے انہی میں ہمیشہ اللہ

اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۹ لِلّٰهِ
راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے یہ ہے بڑی کامیابی اللہ ہی کے لئے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۲۰
سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

ع ۱۶ / ۵

ربط آیات اوپر دونوں رکوع میں قیامت کے دن اعمال و احوال کا حساب و کتاب اور سوال و جواب کا ذکر ہے اب آگے اس تفتیش و محاسبہ کا نتیجہ ذکر کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

ان تمام مکالمات مذکورہ کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ یہ (قیامت کا دن) وہ دن ہے کہ جو لوگ (دنیا میں باعتبار عقائد و اعمال و اقوال کے) سچے تھے (اور وہ سچا ہونا اب ظاہر ہو رہا ہے جن میں انبیاء جن سے خطاب ہو رہا ہے اور مؤمنین جن کے ایمان کی انبیاء و ملائکہ سب شہادت دیں گے سب داخل ہیں اور اس میں اشارہ تصدیق رسل و تصدیق عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی ان خطابات میں ہو گیا، غرض یہ سب حضرات جو دنیا میں سچے تھے) ان کا سچا ہونا آج ان کے کام آوے گا (اور وہ کام آنا یہ ہے کہ) ان کو (جنت کے) باغ (رہنے کو) ملیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (اور یہ نعمتیں ان کو کبھی نہ ملیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں (اور جب مخلوق راضی اور خالق راضی ہو تو ان کو ایسی ہی نعمتیں ملتی ہیں) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) بڑی بھاری کامیابی ہے (کہ اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی) ۔

ربطِ آیات اب سورت ختم ہونے کو ہے۔ پوری سورت میں کچھ اصولی اور فروعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے آخر میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مالک ہے، اس لئے اُسے یہ احکام دینے کا حق ہے۔ اور بندوں کو یہ احکام پوری طرح ماننے چاہئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں، وہ نافرمانی کی صورت میں سزا اور فرماں برداری کی صورت میں انعام دینے پر قادر ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں موجود ہیں، اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

فائدہ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ، عام طور پر واقع کے مطابق قول کو صدق اور خلاف واقع کو کذب سمجھا جاتا ہے، لیکن قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق و کذب عام ہے یعنی قول اور عمل دونوں کو شامل ہے، چنانچہ اس حدیث میں خلافِ واقع عمل کو کذب کہا گیا ہے، مَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ (مشکوٰۃ) "یعنی اگر کوئی اپنے آپ کو ایسے زیور سے آراستہ کرے جو اس کو نہیں دیا گیا، یعنی کسی ایسی صفت یا عمل کا دعویٰ کرے جو اس میں نہیں ہے تو گویا اس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہنے"۔

ایک دوسری حدیث میں علانیہ اور تنہائی میں اچھی طرح نماز پڑھنے والے کو سچا بندہ کہا گیا ہے، ارشاد ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلّٰى فِي الْعَلَانِيَةِ فَحَسَنَ وَصَلّٰى فِي السِّرِّ فَحَسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِيْ حَقًّا (مشکوٰۃ)	"یعنی جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہو اور وہ تنہائی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہو تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچا بندہ ہے"

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بڑی نعمت یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہوا اب کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، یعنی یہی بڑی کامیابی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ مالک و خالق جل جلالہٗ راضی ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهٗ وَاٰخِرُهٗ

سُورۂ مائدہ تمام شد

سُورَۃُ الْاَنْعَام

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّخَمْسٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۂ انعام مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینسٹھ آیتیں ہیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ⃝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور بنایا

الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۥ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ①

اندھیرا اور اُجالا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر کئے دیتے ہیں

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کر دیا ایک وقت اور ایک مدت مقرر ہے

عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ② وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي

اللہ کے نزدیک پھر بھی تم شک کرتے ہو اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور

الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③

زمین میں جانتا ہے تمہارا چھپا اور کھلا اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا

اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے مگر کرتے ہیں اس

مُعْرِضِيْنَ ④ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ

سے تغافل سو بیشک جھٹلایا انھوں نے حق کو جب اُن تک پہنچا سو اب

يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٥﴾
آئی جاتی ہے ان کے آگے حقیقت اس بات کی جس پر ہنستے تھے

خلاصۂ تفسیر

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا پھر بھی کافر لوگ (عبادت میں) دوسروں کو اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (بواسطہ آدم علیہ السلام کے) مٹی سے بنایا پھر (تمہارے مرنے کا) ایک وقت معین کیا اور دوسرا وقت معین (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا) خاص اللہ ہی کے نزدیک (معلوم) ہے، پھر بھی تم (میں سے بعض) شک رکھتے ہو (کہ قیامت کو محال سمجھتے ہو حالانکہ جس نے اول حیات بخشی دوبارہ دینا اس کو کیا مشکل ہے) اور وہی ہے معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی (یعنی اور سب معبود باطل ہیں) وہ تمہارے پوشیدہ حالات کو بھی اور تمہارے ظاہر حالات کو بھی (یکساں) جانتے ہیں اور (بالخصوص) تم جو کچھ (ظاہراً یا باطناً) عمل کرتے ہو (جس پر جزاء و سزا کا مدار ہے) اس کو جانتے ہیں، اور ان (کفار) کے پاس کوئی نشانی بھی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آتی، مگر وہ اس سے اعراض ہی کیا کرتے ہیں، سو (چونکہ یہ ان کی عادت بنی ہوئی ہے، انھوں نے اس سچی کتاب (قرآن) کو بھی جھوٹا بتلایا جبکہ وہ ان کے پاس پہونچی سو (ان کی یہ تکذیب خالی نہ جائے گی بلکہ) جلد ہی ان کو خبر مل جاوے گی اس چیز کی جس کے ساتھ یہ لوگ استہزاء کیا کرتے تھے (مراد اس سے عذاب ہے جس کی خبر قرآن میں سُنکر ہنستے تھے، اور اس کی خبر ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جب عذاب نازل ہوگا تو اس خبر کی تصدیق آنکھوں سے دیکھ لیں گے)

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورۂ انعام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری سورت بجز چند آیات کے بیک وقت مکہ میں اس طرح نازل ہوئی ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے تھے، ائمۂ تفسیر میں سے مجاہدؒ، کلبیؒ، قتادہؒ وغیرہ کا بھی تقریباً یہی قول ہے۔

ابو اسحاق اسفرائنی نے فرمایا کہ یہ سورت توحید کے تمام اصول و قواعد پر مشتمل ہے

اس سورۃ کو کلمۂ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کیا گیا، جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور مراد اس خبر سے لوگوں کو حمد کی تعلیم دینا ہے، اور تعلیم کے اس طرز خاص میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی کی حمد و تعریف کا محتاج نہیں، کوئی حمد کرے یا نہ کرے وہ اپنے ذاتی کمال کے اعتبار سے خود بخود محمود ہے، اس جملہ کے بعد آسمان و زمین اور اندھیرے، اجالے کے پیدا کرنے کا ذکر فرما کر اس کے محمود ہونے کی دلیل بھی بتلادی کہ جو ذات اس عظیم قدرت و حکمت کی حامل ہے وہی حمد و تعریف کی مستحق ہو سکتی ہے۔

اس آیت میں سَمٰوٰت کو جمع اور اَرْض کو مفرد ذکر فرمایا ہے، اگرچہ دوسری آیت میں آسمان کی طرح زمین کے بھی سات ہونے کا ذکر موجود ہے، شاید اس میں اس طرف اشارہ ہو کہ سات آسمان اپنی ہیئت و صورت اور دوسری صفات کے اعتبار سے باہم بہت امتیاز رکھتے ہیں، اور ساتوں زمینیں ایک دوسرے کی ہمشکل اور مثل ہیں، اس لئے ان کو مثل ایک عدد کے قرار دیا گیا (مظہری)

اسی طرح ظُلُمٰت کو جمع اور نُوْر کو مفرد ذکر فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نور تعبیر ہے صحیح راہ اور صراط مستقیم سے اور وہ ایک ہی ہے، اور ظلمات تعبیر ہے غلط راستہ کی، اور وہ ہزاروں ہیں (مظہری و بحر محیط)

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسمانوں اور زمین کے بنانے کو لفظ خلق سے تعبیر کیا گیا، اور اندھیرے اُجالے کے بنانے کو لفظ جَعَلَ سے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اندھیرا اور اجالا آسمان و زمین کی طرح مستقل قائم بالذات چیزیں نہیں، بلکہ عوارض اور صفات میں سے ہیں، اور ظلمات کو نور پر مقدم شاید اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ اس جہان میں اصل ظلمات ہے، اور نور خاص خاص چیزوں سے وابستہ ہے، جب وہ سامنے ہوتی ہیں روشنی پیدا ہوتی ہے، جب نہیں ہوتیں تو اندھیرا رہتا ہے۔

مقصود اس آیت کا توحید کی حقیقت اور اس کی واضح دلیل کو بیان فرما کر دنیا کی ان تمام قوموں کو تنبیہ کرنا ہے جو یا تو سرے سے توحید کی قائل نہیں، یا قائل ہونے کے باوجود توحید کی حقیقت کو چھوڑ بیٹھی ہیں۔

مجوس دنیا کے دو خالق مانتے ہیں یزدان اور اہرمن، یزدان کو خالق خیر اور اہرمن کو خالق شر قرار دیتے ہیں، اور انہی دونوں کو نور و ظلمت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدا کا شریک بتاتے ہیں، آریہ سماج توحید کے قائل ہونے کے باوجود روح و مادّہ کو قدیم اور خدا تعالیٰ کو قدرت و خلقت سے

آزاد قرار دے کر توحید کی حقیقت سے ہٹ گئے، اسی طرح نصاریٰ توحید کے قائل ہونے کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو خدا تعالیٰ کا شریک و سہیم بنانے لگے، اور پھر عقیدۂ توحید کو نباہنے کے لئے ان کو ایک تین اور تین ایک کا غیر معقول نظریہ اختیار کرنا پڑا، اور عرب کے مشرکین نے تو خدائی کی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ ہر پہاڑ کا ہر پتھر ان کے نزدیک نوعِ انسانی کا معبود بن سکتا تھا، غرض انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدومِ کائنات اور اشرف المخلوقات بنایا تھا، جب راہ سے بھٹکا تو اس نے صرف چاند، سورج، اور ستاروں کو بلکہ آگ، پانی اور درخت، پتھر یہاں تک کہ کیڑوں مکوڑوں کو اپنا مسجود و معبود اور حاجت روا مشکل کشا بنا لیا۔

قرآن کریم نے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کا خالق اور اندھیرے اُجالے کا بنانے والا بتلا کر ان سب غلط خیالات کی تردید کردی، کہ نور و ظلمت اور آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہیں، تو پھر ان کو کیسے خدا تعالیٰ کا شریک و سہیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلی آیت میں عالمِ کبیر یعنی پوری دنیا کی عظیم ترین چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق و محتاج بتلا کر انسان کو صحیح عقیدۂ توحید کا سبق دیا گیا ہے، اس کے بعد دوسری آیات میں انسان کو بتلایا ہے کہ تیرا وجود خود ایک عالمِ صغیر ہے، اگر اسی کی ابتداء و انتہاء اور بود و باش پر نظر کرے تو عقیدۂ توحید ایک واضح حقیقت بن کر سامنے آجائے، اس میں ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَى أَجَلًا، یعنی اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، کہ آدم علیہ السلام کو مٹی کے خمیر سے پیدا فرما کر ان میں جان ڈال دی، اور عام انسانوں کی غذا مٹی سے نکلتی ہے، غذا سے نطفہ، اور نطفہ سے انسان کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری ...... فرماتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک خاص مقدار سے پیدا فرمایا جس میں پوری زمین کے اجزاء شامل کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم، رنگ و روپ اور اخلاق و عادات میں مختلف ہیں، کوئی کالا کوئی گورا، کوئی سُرخ، کوئی سخت کوئی نرم، کوئی پاکیزہ خصلت کوئی خبیث الطبع ہوتا ہے، (مظہری بروایت ابن عدی بسند حسن)

یہ تو انسان کی ابتداء آفرینش کا ذکر تھا اس کے بعد انتہا کی دو منزلوں کا ذکر ہے، ایک انسان کی شخصی انتہا جس کو موت کہا جاتا ہے، دوسری پوری نوع انسانی اور اس کے کائناتی خوادم سب کے مجموعہ کی انتہا، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، انسان کی شخصی انتہا

کے لئے فرمایا، ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا، یعنی انسان کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء وحیات کے لئے ایک میعاد معین مقرر کردی، اس میعاد پر پہنچنے کا نام موت ہے، جس کو اگرچہ انسان نہیں جانتا مگر اللہ کے فرشتے جانتے ہیں، بلکہ خود انسان بھی اس حیثیت سے اپنی موت کو جانتا ہے کہ ہر وقت ہر جگہ اپنے گرد و پیش میں اولادِ آدم کو مرتے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد پورے عالم کی انتہاء یعنی قیامت کا ذکر اس طرح فرمایا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ، یعنی ایک اور میعاد مقرر ہے، جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی میعاد کا پورا علم نہ کسی فرشتہ کو ہے نہ کسی انسان کو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ پہلی آیت میں عالم اکبر یعنی پوری دنیا کا حال یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہے، اور دوسری آیت میں اسی طرح عالم اصغر یعنی انسان کا مخلوقِ خداوندی ہونا بیان فرمایا، پھر انسان کو غفلت سے چونکانے کے لئے یہ بتلایا کہ ہر انسان کی ایک خاص عمر ہے جس کے بعد اس کی موت یقینی ہے، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر انسان کو اپنے گرد و پیش میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے، وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ انسان کی شخصی موت سے پورے عالم کی عمومی موت یعنی قیامت پر استدلال ایک فطری و طبعی امر ہے، اس لئے قیامت کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس لئے آخر آیت میں بطور استبعاد کے فرمایا، ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ یعنی ایسے واضح دلائل کے باوجود تم قیامت کے بارے میں شبہات و شکوک نکالتے ہو۔

تیسری آیت میں پہلی دو آیتوں کے مضمون کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جو آسمانوں اور زمین میں لائق عبادت و اطاعت ہے، اور وہی تمہارے ظاہر و باطن کے ہر حال اور ہر قول و فعل سے پورا واقف ہے۔

چوتھی آیت میں غفلت شعار انسان کی ہٹ دھرمی اور عدم حق شناسی کی شکایت اس طرح فرمائی گئی ہے کہ: وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کے باوجود منکر انسانوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نشانی ان کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، اس میں ذرا غور نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں اسی غفلت شعاری کی مزید تفصیل بعض واقعات کی طرف اشارہ کرکے بیان فرمائی ہے کہ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ، یعنی جب حق اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے حق کو جھٹلا دیا، حق سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذاتِ اقدس بھی۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءِ عمر سے آخر تک انہی قبائل عرب کے درمیان رہے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا انہی کی آنکھوں کے سامنے آیا، ان کو یہ بھی پوری طرح واضح تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان سے مطلقاً کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، یہاں تک کہ اپنا نام بھی خود نہ لکھتے تھے، پورے عرب میں آپ کا لقب اُمّی مشہور تھا، چالیس سال کی عمر اسی حال میں ان کے درمیان گذری، کہ نہ کبھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہوئی نہ کبھی کوئی علم و تعلیم سے مناسبت ہوئی، پھر چالیس سال پورے ہوتے ہی دفعۃً آپ کی زبانِ مبارک سے وہ حقائق و معارف اور علوم و فنون جاری ہوگئے کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہر فلاسفر بھی اُن کے سامنے عاجز نظر آئے، عرب کے تمام فصحاء و بلغاء کو بڑے بڑے ہوئے کلام کا مقابلہ کرنے کے لئے چیلنج دیا، یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لئے اپنی جان، مال، عزت و آبرو، اولاد و خاندان سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہر وقت تُلے رہتے تھے، ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس چیلنج کو قبول کرکے قرآن کی ایک آیت کی مثال ہی پیش کردیتے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اپنا وجود خود حقانیت کی بہت بڑی نشانی تھی اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہزاروں معجزات اور کھلی کھلی نشانیاں ایسی ظاہر ہوئیں جن کا انکار کوئی صحیح الحواس انسان نہیں کرسکتا، مگر ان لوگوں نے ان ساری نشانیوں کو یکسر جھٹلا دیا، اسی لئے اس آیت میں ارشاد فرمایا: فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ۔

آخر آیت میں اُن کے کفر و انکار اور تکذیب کے انجام بد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ، یعنی آج تو یہ انجام سے غافل لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کی لائی ہوئی ہدایات اور قیامت و آخرت سب کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب یہ سارے حقائق ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، قیامت قائم ہوگی، ایمان و عمل کا حساب دینا ہوگا، اور ہر شخص اپنے کئے کی جزاء و سزا پائے گا، مگر اس وقت کا یقین و اقرار ان کے کام نہ آئے گا، کیونکہ وہ روزِ عمل نہیں بلکہ روزِ جزاء ہوگا، ابھی غور و فکر کی فرصت خدا تعالیٰ نے دے رکھی ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر آیاتِ الٰہیہ پر ایمان لانے ہی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي

کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے اُمتیں جنکو جما دیا تھا ہم نے

الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا

ملک میں اتنا کہ جتنا تم کو نہیں جمایا اور چھوڑ دیا ہم نے اُن پر آسمان کو لگاتار برستا ہوا،

وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

اور بنا دیں ہم نے نہریں بہتی ہوئی اُن کے نیچے پھر ہلاک کیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر

وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۶﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ

اور پیدا کیں ہم نے ان کے بعد اور امتوں کو ، اور اگر اتاریں ہم تجھ پر

كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

لکھا ہوا کاغذ میں پھر چھو لیویں وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ

یہ نہیں ہے مگر صریح جادو ، اور کہتے ہیں کیوں نہیں اترا اُس پر کوئی

مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿۸﴾

فرشتہ ، اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جاوے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے ،

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا

اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں

يَلْبِسُوْنَ ﴿۹﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ

اب پڑ رہے ہیں ، اور بے شبہ ہنسی کرتے رہے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر گھیر لیا

بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ

ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز نے کہ جس پر ہنسا کرتے تھے ، تو کہہ دے

ع ۱

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

کہ سیر کرو ملک میں پھر دیکھو کیا انجام ہوا

الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

جھٹلانے والوں کا

خلاصۂ تفسیر

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو (عذاب سے) ہلاک کرچکے ہیں جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت (جسمانی اور مالی) دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں اور ہم نے ان کے (کھیت اور باغوں کے) نیچے سے نہریں جاری کیں (جس سے زراعت اور پھلوں کی خوب ترقی ہوئی اور وہ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے) پھر (اس قوت و قدرت و سامان و اسباب کے ہوتے ہوئے) ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (انواع عذاب سے) ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کر دیا (تو اگر ہم ان پر بھی عذاب نازل کر دیں تو تعجب کیا ہے) اور ان لوگوں کے عناد کی یہ حالت ہے کہ اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ پر نازل فرماتے، پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے (جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا کہ لکھی ہوئی کتاب آسمان سے آجائے اور ہاتھوں سے چھو لینے کا ذکر کر کے نظر بندی کے شبہ کو بھی دُور کر دیا) تب بھی یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے (کیونکہ جب بات ماننے کا ارادہ ہی نہیں تو ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نئی بات نکال لینا کیا مشکل ہے) اور یہ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے پاس کوئی فرشتہ (جس کو ہم دیکھیں اور باتیں سنیں) کیوں نہیں بھیجا گیا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں، اور اگر ہم کوئی فرشتہ (اسی طرح) بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا پھر (نزولِ فرشتہ کے بعد) ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی (کیونکہ عادتِ الٰہیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا مُنہ مانگا معجزہ دکھلا دیا گیا اگر پھر بھی انھوں نے ایمان سے انکار کیا تو فوراً بلا مہلت کے عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا ہے اور جب تک ایسا مطلوبہ معجزہ نہ دیکھیں دنیا میں مہلت ملتی رہتی ہے) اور اگر ہم اُس (پیغام پہنچانے والے) کو فرشتہ ہی قرار دیتے تو (اس کو بشکل فرشتہ بھیجیں تو اسکی ہیبت انسانوں سے برداشت نہ ہو، اس لئے) ہم اس (فرشتہ) کو آدمی ہی (کی شکل) بناتے تو اس پر بھی وہی شبہ کرتے جو اب کر رہے ہیں (یعنی اس فرشتہ کو بشر سمجھ کر پھر بھی اعتراض کرتے، غرض نزول فرشتہ جس کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اگر اس کو پورا کر دیا جائے تو ان کو اس سے کوئی فائدہ تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ فرشتہ بشکلِ فرشتہ دیکھنے پر ان کو قدرت نہیں، اور بشکل انسان بھیجنے سے ان کا شبہ رفع نہیں ہوگا، اور دوسری طرف ان کو نقصان یہ پہونچے گا کہ نہ ماننے پر خود ہی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے) اور (آپ ان کے بیہودہ مطالبات سے غم نہ کریں کیونکہ) واقعی آپ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں

ان کے ساتھ بھی (مخالفین کی طرف سے) استہزاء کیا گیا ہے، پھر جن لوگوں نے ان سے تمسخر کیا تھا انکو اس عذاب نے آگھیرا جس کا تمسخر اڑاتے تھے (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس طرز عمل سے انبیاء کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، بلکہ یہ خود انہی کے لئے عذاب اور مصیبت ہوا، اگر یہ لوگ امم سابقہ کے عذاب کا انکار کرنے لگیں) تو آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں احکام الٰہیہ اور تعلیمات رسل سے اعراض کرنے یا مخالفت کرنیوالوں پر وعید شدید کا ذکر تھا، ان آیات میں انہی منکرین کا رُخ اپنے گردوپیش کے حالات اور اگلے زمانہ کے تاریخی واقعات کی طرف پھیر کر ان کو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے، بلاشبہ تاریخ عالم عبرتوں کی ایک کتاب ہے، جس کو اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے، تو وہ ہزاروں وعظوں سے زیادہ موثر وعظ ہے، ایک حکیم کا یہ جملہ بہت ہی پسندیدہ ہے کہ: "دنیا ایک بہترین کتاب ہے، اور زمانہ بہترین معلم" یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا عنصر قصص اور تاریخ ہے، لیکن عام طور پر غفلت شعار انسان نے دنیا کی تاریخ کو بھی ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ اس وعظ و حکمت کی بہترین کتاب کو بھی اپنی غفلت و معصیت کا ایک ذریعہ بنالیا، پچھلے قصوں اور کہانیوں کا یا تو صرف یہ کام رہ گیا کہ نیند سے پہلے ان کو خواب آور دوا کے قائم مقام استعمال کیا جائے، اور یا پھر خالی اوقات میں دل بہلانے اور وقت گذارنے کا مشغلہ بنایا جائے۔

شاید اسی لئے قرآن کریم نے تاریخ عالم کی روح کو عبرت و نصیحت کے لئے لیا ہے، مگر عام دنیا کی تاریخی اور افسانوی کتابوں کی طرح نہیں، جن میں قصہ گوئی یا تاریخ نگاری خود ہی ایک مقصد ہوتا ہے، اسی لئے تاریخی واقعات کو مسلسل قصہ کی صورت سے بیان نہیں فرمایا، بلکہ قصہ کا جتنا ٹکڑا جس معاملہ اور جس حال سے متعلق تھا وہاں اتنا ہی ٹکڑا ذکر کردیا، پھر کسی دوسری جگہ اس قصہ کا دوسرا ٹکڑا وہاں کی مناسبت سے بیان فرمادیا، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ کوئی خبر یا قصہ کبھی خود مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ہر خبر سے کوئی انشاء اور ہر واقعہ کے اظہار سے کوئی عملی نتیجہ نکالنا مقصد ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا جتنا حصہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے اس کو پڑھو، ...... اور آگے بڑھو اور اپنے حالات کا جائزہ لو، اور واقعات ماضیہ سے سبق حاصل کرکے اپنی اصلاح کرو،

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ مخاطب یعنی اہلِ مکہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے اپنے سے پہلے گذرنے والی قوموں کا حال نہیں دیکھا جس سے ان کو عبرت و نصیحت ہوتی، دیکھنے سے مراد ان کے حال پر غور و فکر کرنا ہے کیونکہ وہ قومیں اس وقت تو ان کے سامنے نہیں تھیں جن کو وہ دیکھ سکتے، اس کے بعد اگلی قوموں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر فرمایا: كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ، یعنی ہم نے ان سے پہلے کتنے قرنوں کو ہلاک کر دیا۔

لفظ قرن اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانہ میں مجتمع موجود ہو، اور زمانہ کے ایک طویل حصّہ کو بھی جس کے بارے میں دس سال سے لے کر سو سال تک کے مختلف اقوال ہیں، مگر بعض واقعات و روایاتِ حدیث سے تائید اس کی ہوتی ہے کہ لفظ قرن سو سال کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن بُسر مازنی کو فرمایا تھا کہ تم ایک قرن زندہ رہو گے، اور وہ پورے ایک سو سال زندہ رہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچّہ کو دعا دی کہ قرن بھر زندہ رہو تو وہ پورے سو سال زندہ رہا، آخر حضرات علماء نے حدیث خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، کا یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ ہر قرن کو سو سال مانا گیا۔

اس آیت میں گذشتہ اقوامِ عالم کے بارے میں پہلے یہ بتلایا گیا کہ ان کو حق تعالیٰ نے زمین میں وہ وسعت و قوت اور سامانِ معیشت عطا فرمایا تھا، جو بعد کے لوگوں کو نصیب بھی نہیں ہوا، لیکن جب انہی نے رسولوں کی تکذیب اور احکامِ خداوندی کی مخالفت اختیار کی تو یہ سارا جاہ و جلال اور مال و منال اللہ کے عذاب کے سامنے بیکار ثابت ہوا اور سب کے سب نیست و نابود ہو کر رہ گئے، تو آج کے مخاطب اہلِ مکہ جن کو نہ عاد و ثمود جیسی قوت و طاقت حاصل ہے، نہ اہلِ شام و یمن جیسی خوش حالی ان کو اقوامِ ماضیہ کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا اور اپنے افعال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ مخالفت کر کے ان کا کیا انجام ہوگا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ، یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہیں تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور ڈیل ڈول و قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک و برباد کر دیا، بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی ان کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر کے ایسی طرح بسا دیا کہ دیکھنے والوں کو یہ بھی محسوس نہ ہو سکا کہ یہاں سے کوئی انسان کم بھی ہوا ہے۔

اور حق جل و علا شانہ کی اس قدرت و حکمت کا مشاہدہ تو ویسے بھی ہر زمانہ ہر وقت میں

ہوتا رہتا ہے کہ روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر کہیں خلا نظر نہیں آتا کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں کے آدمی ہلاک ہوگئے تو اس میں بسنے والے نہ رہے ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی؟
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدان عرفات میں جہاں تقریباً دس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا اس طرف نظر گئی کہ آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے اس سارے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے جن کا آج نام و نشان نہیں ہے، اس طرح انسانوں کے ہر جتھے اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو جب اس کے ماضی و مستقبل کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک بہت ہی مؤثر واعظ نظر آتا ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

دوسری آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی کہ عبداللہ بن ابی اُمیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ میں تو آپ پر اُس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں، اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک کتاب لے کر آئیں جس میں میرا نام لے کر یہ ہو کہ میں آپ کی تصدیق کروں، اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں میں تو جب بھی مسلمان ہوتا نظر نہیں آتا۔

اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ پھر یہی صاحب مسلمان ہوئے اور ایسے ہوئے کہ اسلام کے غازی بنکر غزوہ طائف میں شہید ہوئے۔

قوم کے ایسے بیہودہ معاندانہ مطالبات اور استہزاء کے رنگ میں مکالمات نے ماں باپ سے زیادہ شفیق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر کیا اثر کیا ہوگا، اس کا صحیح اندازہ ہم نہیں کر سکتے، صرف وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کو قوم کی صلاح و فلاح کی فکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لگی ہو۔

اسی لئے اس آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ ان کے یہ مطالبات کسی غرض و مقصد کے لئے نہیں، نہ اُن کو عمل کرنا مقصود ہے، اُن کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ یہ طلب کر رہے ہیں اگر اس سے بھی زیادہ واضح صورتیں آپ کی سچائی کی ان کے سامنے آجائیں، جب بھی قبول نہ کریں، مثلاً ہم اُن کی فرمائش کے مطابق آسمان سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اُتار دیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ آنکھوں سے دیکھ لیں جس میں نظر بندی یا جادو وغیرہ کا احتمال ہے، بلکہ وہ اس کتاب کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیں کہ محض خیال نہیں،

حقیقت ہے، مگر چونکہ ان کی ساری باتیں محض عناد کی وجہ سے ہیں تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ، "یعنی یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔

تیسری آیت کے نزول کا بھی ایک واقعہ ہے کہ یہی عبداللہ بن ابی امیہ اور نضر بن حارث اور نوفل بن خالد ایک مرتبہ جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہم تو آپ پر جب ایمان لائیں گے جب کہ آپ آسمان سے ایک کتاب لے کر آئیں، اور اس کے ساتھ چار فرشتے آئیں جو اس کی گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہے اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کا جواب حق تعالیٰ نے ایک تو یہ دیا کہ یہ غفلت شعار ایسے مطالبات کر کے اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی پیغمبر سے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیا جائے، تو اگر وہ پھر بھی ماننے اور اسلام لانے میں ذرا تاخیر کریں تو پھر ان کو عذاب عام کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے، یہ قوم جن کا بھی یہ مطالبہ کسی نیک نیتی سے تو کر نہ رہی تھی جس سے مان لینے کی توقع کی جاتی، اس لئے فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ، یعنی اگر ہم ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیں کہ فرشتہ بھیج دیں اور یہ قوم مانے والی تو ہے نہیں تو اس معجزہ کے دیکھنے کے بعد بھی جب انحراف و نافرمانی کرے گی تو اللہ کا حکم ان کے ہلاک کرنے کے لئے جاری ہو جائے گا، اور اس کے بعد ان کو ذرا بھی مہلت نہ دی جائے گی، اس لئے ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی مانگی ہوئی کوئی نشانی اگر ظاہر نہیں کی گئی تو اس میں ان کی خیر ہے۔

اسی بات کا ایک دوسرا جواب چوتھی آیت میں دوسرے انداز سے یہ دیا گیا کہ یہ سوال کرنے والے عجیب بیوقوف ہیں کہ فرشتوں کے نازل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ فرشتوں کے نازل ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی ہیئت و صورت میں سامنے آجائے تو اس کی ہیبت کو تو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ ہول کھا کر فوراً مر جانے کا خطرہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ بشکل انسانی آئے، جیسے جبریل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مرتبہ بشکل انسانی آئے ہیں، تو اس صورت میں اس سوال کرنے والے کو جو اعتراض آپ پر ہے وہی اس فرشتہ پر بھی ہوگا، کہ یہ اس کو ایک انسان ہی سمجھے گا۔

ان تمام معاندانہ سوالات کے جواب دینے کے بعد پانچویں آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ استہزاء و تمسخر اور ایذاء رسانی کا معاملہ جو آپ کی قوم آپ کے ساتھ کر رہی ہے کچھ آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ سے پہلے بھی سب رسولوں کو ایسے دلدوز اور ہمت شکن واقعات سے سابقہ پڑا ہے، مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری، اور انجام یہ ہوا کہ استہزاء و تمسخر کرنے والی قوم کو اس عذاب نے آپکڑا جس کا تمسخر کیا کرتے تھے خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ احکام ہے، وہ کر کے آپ اپنے قلب کو فارغ فرمالیں اس کا اثر کسی نے کچھ لیا یا نہیں، اس کی نگہداشت آپ کے ذمہ نہیں، اس لئے اس میں مشغول ہو کر آپ قلب کو مغموم نہ کریں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ
پوچھ کہ کس کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے کہدے اللہ کا ہے، اس نے لکھی ہے اپنے

الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ
ذمہ مہربانی البتہ تم کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن تک کہ اس میں کچھ شک نہیں جو لوگ

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي
نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو وہی ایمان نہیں لاتے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آرام پکڑتا ہے

الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ
رات میں اور دن میں اور وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا تو کہہ دے کیا اور کسی کو بناؤں مددگار

وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ
مددگار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا

قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ
کہہ دے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں اور تو ہرگز نہ ہو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾
مشرک والا

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان مخالفین سے بطور الزام حجت کے) کہئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود

(یہ سب اسی کی ملک قرار دیں تو وہ بھی یہی جواب دیں گے جس سے توحید ثابت ہوگی، اور اگر کسی وجہ سے مثل خوف مغلوبیت کے جواب نہ دیں تو آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ ہی کی ملک ہے) اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے توبہ کرنے والوں کے ساتھ مہربانی فرمانا اپنے ذمہ لازم فرما لیا ہے، اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر تم نے توحید کو قبول نہ کیا تو پھر سزا بھی بھگتنا پڑے گی کیونکہ، تم کو خدا تعالیٰ قیامت کے روز قبروں سے زندہ کرکے میدانِ حشر میں جمع کریں گے (اور قیامت کی حالت یہ ہے کہ) اس کے آنے میں کوئی شک نہیں (مگر) جن لوگوں نے اپنے کو اپنی ہی عقل ونظر کو ضائع (یعنی معطل) کرلیا ہے سو وہ ایمان نہ لاویں گے (اور ان سے بطور اتمام حجت یہ بھی کہئے کہ) اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ رات میں اور دن میں رہتے ہیں (اس کے ذکر سے بھی آیت قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ جتنی چیزیں کسی مکان میں ہیں یا کسی زمان میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں) اور وہی سب سے بڑا سننے والا جاننے والا ہے (یہاں تک ثبوت توحید کے بعد ان سے کہئے کہ) کیا اللہ کے سوا جو کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے ہیں اور جو سب کو کھانے کو دیتے ہیں اور ان کو کوئی نہیں کھلاتا (کیونکہ وہ کھانے پینے کی احتیاج سے بالاتر ہیں) تو کیا ایسے اللہ کے سوا، کسی کو اپنا معبود قرار دوں (آپ اس استفہام انکاری کی تشریح میں خود، فرما دیجئے (کہ میں غیر اللہ کو معبود کیسے قرار دے سکتا ہوں جو عقل ونقل کے خلاف ہے) مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں اسلام قبول کرلوں، (جس میں عقیدۂ توحید بھی آگیا) اور (مجھ کو یہ کہا گیا ہے کہ) تم مشرکین میں سے ہرگز نہ ہونا۔

معارف ومسائل

آیت قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ میں کفار سے سوال کیا گیا ہے کہ آسمان وزمین اور ان کی تمام کائنات کا مالک کون ہے؟ پھر خود ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ سب کا مالک اللہ ہے، کفار کے جواب کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی جواب دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جواب کفار مکہ کے نزدیک بھی مسلّم ہے وہ اگرچہ شرک بت پرستی میں مبتلا تھے مگر زمین وآسمان اور کل کائنات کا مالک اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ میں لفظ الیٰ یا تو فی کے معنی میں ہے، اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب اولین وآخرین کو قیامت کے دن میں جمع فرما دیں گے، اور یا جمع فی القبور مراد ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت تک سب انسانوں کو قبروں میں

بندوں پر غالب اور برتر ہیں اور علم کے اعتبار سے) وہی بڑی حکمت والے اور پوری خبر رکھنے والے ہیں (پس وہ علم سے سب کا حال جانتے ہیں اور قدرت سے سب کو جمع کرلیں گے اور حکمت سے مناسب جزا دے دیں گے، آپ ان منکرین توحید و رسالت سے کہیے کہ اچھا یہ تو بتلاؤ کہ سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے (جس کی گواہی دینے پر سب کا اختلاف رفع ہو جاوے، اس کا جواب ظاہر ہے یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر ہیں، پس) آپ کہیے کہ میرے اور تمہارے درمیان (جس مسئلہ میں اختلاف ہے اس میں وہی) اللہ تعالیٰ گواہ ہے (جن کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے، اور ان کی گواہی یہ ہے کہ) میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے (منجانب اللہ) بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو (ان وعیدوں سے) ڈراؤں (جو توحید و رسالت کے انکار پر اس میں مذکور ہیں کیونکہ قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی مثل بنانے سے ساری دنیا کا عاجز ہونا اللہ تعالیٰ کی تکوینی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ہوگئی، اور مضامین قرآن سے اس کی تشریعی شہادت ہوگئی) کیا تم (اس شہادت کبریٰ کے بعد بھی جو کہ توحید کو شامل ہے توحید کے خلاف) سچ مچ یہی گواہی دوگے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (استحقاق عبادت میں) کچھ اور معبود بھی شریک ہیں (اور اگر وہ ہٹ دھرمی سے اس پر بھی کہہ دیں کہ ہاں ہم تو یہی گواہی دیں گے تو اس وقت ان سے بحث کرنا فضول ہے، بلکہ صرف آپ اپنے عقیدہ کو ظاہر کرنے کے لئے) کہہ دیجئے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا اور بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں (اور آپ کی رسالت کے بارے میں جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے پوچھ کر دیکھ لیا تو اس معاملہ کی تحقیق یہ ہے کہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات و انجیل) دی ہے وہ سب لوگ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (ایسا) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (لیکن جب شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے اہل کتاب کی شہادت پر مدار ہی نہیں تو اس کے نہ ہونے سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا، اور ایسی شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے بھی) جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کرلیا ہے وہ ایمان نہ لاویں گے (عقل کو ضائع کرنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کو معطل کردیا عقل سے کام نہیں لیا، اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتلاوے، ایسے بے انصافوں کا حال یہ ہوگا کہ) ان کو (قیامت کے دن) خلاصی نہ ہوگی (بلکہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کو ذکر کرکے اس پر ایمان لانے اور شرک سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا، آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا عذاب ایک خاص انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ لوگوں سے کہدیجئے کہ اگر بالفرض میں بھی اپنے رب کے حکم کی مخالفت کروں تو مجھ کو بھی قیامت کے عذاب کا خوف ہے، یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر گناہ سے معصوم ہیں، آپ سے نافرمانی کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، لیکن آپ کی طرف منسوب کرکے امت کو یہ بتلانا ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی پر جب انبیاء کو معاف نہیں کیا جا سکتا تو اور کسی کی کیا مجال ہے۔

اس کے بعد فرمایا مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ، یعنی روز محشر کا عذاب انتہائی ہولناک اور سخت ہے، جس شخص سے یہ عذاب ٹل گیا تو سمجھئے کہ اس پر اللہ کی بڑی رحمت ہوگئی، وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ یعنی یہی بڑی اور کھلی کامیابی ہے، یہاں کامیابی سے مراد دخولِ جنت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عذاب سے نجات اور جنت کا داخلہ لازم و ملزوم ہیں۔

دوسری آیت میں اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نفع اور نقصان کا مالک درحقیقت صرف اللہ جل شانہ ہے، کوئی شخص کسی کو حقیقت کے اعتبار سے نہ ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ادنیٰ نقصان، اور ظاہر میں جو کسی کو کسی کے ہاتھ سے نفع یا نقصان پہنچتا نظر آتا ہے وہ صرف ایک ظاہری صورت اور حقیقت کے سامنے ایک نقاب سے زائد کوئی حقیقت نہیں رکھتا ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

یہ عقیدہ بھی اسلام کے ان انقلابی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمانوں کو ساری مخلوق سے بے نیاز اور صرف خالق کا نیازمند بنا کر ان کی ایک ایسی بے مثال لبیلی جماعت تیار کردی جو فقر و فاقہ اور تنگدستی میں بھی سارے جہان پر بھاری ہے، کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتی ؎

فقر میں بھی میں سر بسر فخر و غرور و ناز ہوں ✻ کس کا نیازمند ہوں سب سے جو بے نیاز ہوں

قرآن مجید میں جا بجا یہ مضمون مختلف عنوانات کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، ایک آیت میں ارشاد ہے:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

"جو اللہ تعالیٰ نے جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دی اس کو کوئی روکنے والا نہیں، اور جس کو روک دے اس کو کوئی کھولنے والا نہیں"

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں اکثر یہ کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

"یا اللہ جو آپ نے دیا اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جو آپ نے روک دیا اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی کوشش والے کی کوشش آپ کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی"

امام بغوی نے اس آیت کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار ہوئے، اور مجھے اپنے پیچھے ردیف بنا لیا، کچھ دور چلنے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے لڑکے: میں نے عرض کیا حاضر ہوں، کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تم کو یاد رکھے گا، تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے، تم امن و عافیت اور خوش عیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو پہچانو تو تمہاری مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ تم کو پہچانے گا، جب تم کو سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے سوال کرو، اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو، جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے قلم تقدیر اس کو لکھ چکا ہے، اگر ساری مخلوقات مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نفع پہنچا دیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں نہیں رکھا تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکیں گے، اور اگر وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نقصان پہنچا دیں جو تمہاری قسمت میں نہیں ہے تو ہرگز اس پر قدرت نہ پائیں گے، اگر تم کر سکتے ہو کہ یقین کے ساتھ صبر پر عمل کرو تو ایسا ضرور کر لو، اگر اس پر قدرت نہیں تو صبر کرو، کیونکہ اپنی خلاف طبع چیزوں پر صبر کرنے میں بڑی خیر و برکت ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کے ساتھ ہے، اور مصیبت کے ساتھ راحت اور تنگی کے ساتھ فراخی ہے" (یہ حدیث ترمذی اور مسند احمد میں بھی بسند صحیح مذکور ہے)۔

افسوس ہے کہ قرآن کے اس واضح اعلان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بھر کی تعلیمات کے باوجود یہ اُمت پھر اس معاملہ میں بھٹکنے لگی، سارے خدائی اختیارات مخلوقات کو

بانٹ دیئے، آج اپنے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو مصیبت کے وقت بجائے خدا تعالیٰ
کے پکارنے کے اور اس سے دعا مانگنے کے مختلف ناموں کی دہائی دیتے اور انہی سے مدد مانگتے
ہیں، خدا تعالیٰ کی طرف ان کا دھیان تک نہیں ہوتا، انبیاء و اولیاء کے توسل سے دعا مانگنا دوسری
بات ہے وہ جائز ہے، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس کے شواہد موجود ہیں
لیکن براہ راست کسی مخلوق کو حاجت روائی کے لئے پکارنا اس سے اپنی حاجتیں مانگنا،
اس قرآنی حکم کے خلاف کھلی بغاوت ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ یعنی اللہ تعالیٰ
اپنے سب بندوں پر غالب و قادر ہے، اور سب اس کے تحت قدرت و محتاج ہیں،
یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان خواہ وقت کا رسول مقرب ہو یا دنیا کا بڑے سے
بڑا بادشاہ ہو اپنے ہر ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اس کی ہر مراد پوری نہیں ہوتی۔

وہ حکیم بھی ہے کہ اس کے تمام افعال عین حکمت ہیں، اور ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے
اس میں لفظ قاہر سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اور لفظ حکیم سے اس کے علم محیط کا بیان
کر کے بتلا دیا کہ تمام صفات کمال علم و قدرت میں منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ ان دونوں میں یکتا ہیں

پانچویں آیت کا ایک خاص واقعہ نزول علماء مفسرین نے نقل کیا ہے، کہ ایک مرتبہ
اہل مکہ کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ جو رسول اللہ
ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا گواہ کون ہے؟ کیونکہ ہمیں کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو
آپ کی تصدیق کرتا ہو حالانکہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے اس کی تحقیق میں پوری کوشش کی

اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ
سے بڑھ کر کس کی شہادت ہوگی جس کے قبضہ میں کل جہان اور سب کا نفع و ضرر ہے، پھر
آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی گواہی سے مراد
وہ معجزات اور آیات بینات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول
برحق ہونے کے متعلق ظاہر فرمائی، اسی لئے اس کے بعد اہل مکہ کو خطاب کر کے یہ ارشاد
فرمایا اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى یعنی کیا اللہ تعالیٰ کی اس گواہی کے
بعد بھی تم اس کے خلاف اس کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود بھی
ہیں، اگر ایسا ہے تو آپ انہیں کہہ دیجئے کہ میں تو ایسی گواہی نہیں دے سکتا، قُلْ اِنَّمَا هُوَ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ایک معبود ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

اور ارشاد فرمایا وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ،

یعنی مجھ پر بطور وحی قرآن بھیجا گیا، تاکہ اس کے ذریعہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں، اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن کو قیامت تک یہ قرآن پہونچے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہیں، اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، قیامت تک اس کی تعلیم و تلاوت باقی رہے گی، اور لوگوں پر اس کا اتباع لازم رہے گا۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا وہ ایسا ہے گویا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرلی، اور ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تاکید فرمائی بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً یعنی میرے احکام و تعلیمات لوگوں تک پہنچا دو اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ اور صحت مند رکھے جس نے میرا کوئی مقالہ سنا پھر اس کو یاد رکھا پھر اس کو امت تک پہونچا دیا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خود کسی کلام کے مفہوم کو اتنا نہیں سمجھتا جتنا بعد میں آنے والا سمجھتا ہے جس کو یہ کلام اس نے پہونچایا ہے۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے اس قول کی تردید ہے کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے سب تحقیق کرلی، کوئی بھی آپ کی سچائی اور نبوت کی گواہی نہیں دیتا، اس کے متعلق ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ، یعنی یہود و نصاریٰ تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ تورات و انجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ شریف آپ کے وطن اصلی پھر وطن ہجرت کا، اور آپ کے عادات و اخلاق اور آپ کے کارناموں کا ایسا تفصیلی ذکر ہے کہ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر نہیں آپ کے صحابہ کرامؓ کے حالات کا مفصل تذکرہ تک تورات و انجیل میں موجود ہے، اس لئے اس کا کوئی امکان نہیں کہ جو شخص تورات و انجیل کو پڑھتا اور اُن پر ایمان رکھتا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہچانے۔

اس جگہ حق تعالیٰ نے تشبیہ کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ جیسے لوگ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی پہچان اپنے بچوں کے لئے سب سے زیادہ تفصیلی اور یقینی ہوتی ہے، بچوں کے بدن کا ہر حصہ ماں باپ

کے سامنے آتا اور رہتا ہے، وہ بچپن سے لے کر جوانی تک اُن کے ہاتھوں اور گود میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ جتنا اپنی اولاد کو پہچان سکتے ہیں تو دلادن کو نہیں پہچان سکتی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہود میں داخل تھے، پھر مسلمان ہوگئے، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے کہ تم لوگ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہو جیسے اپنی اولاد کو، اس کی کیا وجہ ہے؟ عبداللہ ابن سلام نے فرمایا کہ ہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نازل فرمائے، اس لئے اس کا علم ہمیں یقینی اور قطعی طور پر ہے، بخلاف اپنی اولاد کے کہ اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری اولاد ہے بھی یا نہیں۔

حضرت زید بن سعنہ جو اہل کتاب میں سے ہیں انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات و انجیل کے بیان کردہ اوصاف ہی کے ذریعہ پہچانا تھا، صرف ایک وصف ایسا تھا جس کی ان کو پہلے تصدیق نہیں ہو سکی تھی، امتحان کے بعد تصدیق ہوئی، وہ یہ کہ آپ کا حلم آپ کے غصہ پر غالب ہوگا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچ کر تجربہ کیا تو یہ صفت بھی پوری طرح آپ میں پائی اسی وقت مسلمان ہوگئے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ یہ اہل کتاب جو پوری طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے، یہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں، اور خسارہ میں پڑ رہے ہیں، اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ

اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان لوگوں کو جنھوں نے شرک کیا تھا

شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ

کہاں ہیں شریک تمہارے جن کا تم کو دعویٰ تھا، پھر نہ رہے گا اُن کے

فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

پاس کوئی فریب مگر یہی کہ کہیں گے قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم نہ تھے شرک کرنے والے

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

دیکھو تو کیسا جھوٹ بولے اپنے اوپر اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو

يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

بنایا کرتے تھے، اور بعضے ان میں کان لگائے رہتے ہیں تیری طرف، اور ہم نے ان کے دلوں پر ڈال رکھے

اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ

ہیں پردے تاکہ اس کو نہ سمجھیں اور رکھ دیا ان کے کانوں میں بوجھ، اور اگر دیکھ لیں تمام

اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ

نشانیاں تو بھی ایمان نہ لاویں ان پر، یہاں تک کہ جب آتے ہیں تیرے پاس تجھ سے جھگڑنے کو تو کہتے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ

ہیں وہ کافر، نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی، اور یہ لوگ

يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــــَٔــوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

روکتے ہیں اس سے اور بھاگتے ہیں اس سے، اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو،

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور نہیں سمجھتے

خلاصۂ تفسیر

کیفیت عدم فلاح مشرکین

اور وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جس روز ہم ان تمام خلائق کو میدان حشر میں جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے (بواسطہ یا بلاواسطہ بطور زجر و توبیخ کے) کہیں گے کہ (بتلاؤ) تمہارے وہ شرکاء جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے کہاں گئے (کہ تمہاری سفارش نہیں کرتے جس پر تم کو بھروسہ تھا) پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی (ظاہر) نہ ہوگا کہ وہ (اس شرک سے خود بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے اور بدحواسی کے عالم میں) یوں کہیں گے قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہیں تھے (حق تعالیٰ نے فرمایا تعجب کی نظر سے) ذرا دیکھو تو کس طرح (صریح) جھوٹ بولا اپنی جانوں پر اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تراشا کرتے تھے (یعنی ان کے بت اور جن کو وہ خدا کا شریک ٹھہراتے تھے) وہ سب غائب ہوگئے (تشنیع بر انکار قرآن، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ) اور ان (مشرکین) میں بعضے ایسے ہیں کہ (آپ کے قرآن پڑھنے کے وقت اس کے سننے کے لئے) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور

(چونکہ یہ سننا طلب حق کیلئے نہیں محض تماشے یا تمسخر کی نیت سے ہوتا ہے اس لئے اس سے ان کو کچھ نفع نہیں ہوتا، چنانچہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اس سے کہ وہ اس (قرآن کے مقصود) کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے کہ وہ اس کو ہدایت کے لئے نہیں سنتے، یہ تو ان کے دلوں اور کانوں کی حالت تھی اب ان کی بصارت اور نگاہ کو دیکھو اگر وہ لوگ (آپ کی صدق نبوت کے) تمام دلائل کو دیکھ لیں تب بھی ان پر بھی ایمان نہ لاویں ان کے عناد کی نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں (اس طرح پر کہ) یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلے لوگوں سے منقول چلی آرہی ہیں (یعنی مذہب والے پہلے سے ایسی باتیں کرتے چلے آئے ہیں کہ معبود ایک ہی ہے اور یہ کہ انسان خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے، قیامت میں پھر زندہ ہونا ہے جس کا تعقل نہیں) اور تکذیب ہی پر نہیں اس سے ترقی کرکے جدال اور دوسروں کو بھی ہدایت سے روکنے کا کام شروع کیا، اور یہ لوگ اس (قرآن) سے اوروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی اس سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے دور دور رہتے ہیں اور ان حرکتوں سے یہ لوگ اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں اور از راہ حماقت اور غایت جہل سے کچھ خبر نہیں رکھتے کہ ہم کس کا نقصان کر رہے ہیں، ہمارے اس فعل سے رسول اور قرآن کا تو اس سے کچھ بگڑتا نہیں)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں یہ مذکور تھا کہ ظالموں، کافروں کو فلاح نصیب نہ ہوگی، مذکورہ آیات میں اس کی تفصیل و تشریح ہے، پہلی اور دوسری آیت میں سب سے بڑے امتحان کا ذکر ہے جو محشر میں رب الارباب کے سامنے ہونے والا ہے، ارشاد فرمایا وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا، یعنی وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے جس میں ہم ان سب کو یعنی ان مشرکین کو اور ان کے بنائے ہوئے معبودوں کو جمع کریں گے، ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ یعنی پھر ہم ان سے یہ سوال کریں گے کہ تم جن معبودوں کو ہمارا ساجھی و شریک اور اپنا حاجت روا مشکل کشا سمجھا کرتے تھے آج وہ کہاں ہیں؟ تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے؟

اس میں لفظ ثُمَّ اختیار فرمایا گیا ہے جو تراخی اور دیر کے لئے مستعمل ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ محشر میں جمع ہونے کے بعد فوراً ہی سوال جواب نہیں ہوگا، بلکہ

عرصہ دراز تک حیرت و تذبذب کے عالم میں کھڑے رہیں گے، مدت کے بعد حساب کتاب اور سوالات شروع ہوں گے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ تم کو میدانِ حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہوگے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیری میں رہیں گے، آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے یہ روایت حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے ذکر کی ہے۔

اس روایت میں جو پچاس ہزار اور ایک ہزار کا فرق ہے یہی فرق قرآن کی دو آیتوں میں بھی مذکور ہے، ایک جگہ ارشاد ہے کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ، "یعنی ایک دن تمہارے رب کے پاس ایک ہزار سال کا ہوگا" اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ یہ روز شدت تکلیف و مشقت کے اعتبار سے دراز ہوگا، اور درجات محنت و مشقت کے مختلف ہوں گے اس لئے بعضوں کے لئے یہ دن پچاس ہزار سال کا اور بعض کے لئے ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سب سے بڑی امتحان گاہ میں اول تو ایک عرصہ دراز ایسا گذرے گا کہ امتحان شروع ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ یہ لوگ تمنا کرنے لگیں گے کہ کسی طرح امتحان اور حساب جلد ہو جائے، انجام کچھ بھی ہو، یہ تردد اور تذبذب کی تکلیف تو جائے، اسی طولِ قیام اور عرصہ دراز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لفظ ثُمَّ کے ساتھ فرمایا ثُمَّ نَقُوْلُ، اسی طرح دوسری آیت میں مشرکین کی طرف سے جو جواب مذکور ہے وہ بھی لفظ ثُمَّ کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی بڑے وقفہ کے بعد بہت غور و فکر اور سوچ بچار کر کے یہ جواب دیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، یعنی اللہ رب العالمین کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم تو مشرک نہ تھے، اس آیت میں ان کے جواب کو لفظ فتنۃ سے تعبیر فرمایا ہے، اور یہ لفظ امتحان و آزمائش کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور کسی پر فریفتہ و مفتون ہو جانے کے لئے بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلی صورت میں ان کے جواب امتحان کو امتحان سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اور دوسری صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ لوگ دنیا میں ان بتوں اور خود ساختہ معبودوں پر مفتون تھے، اپنے جان و مال اُن پر قربان کرتے تھے، مگر آج وہ ساری محبت و فریفتگی ختم ہوگئی، اور ان کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ ان سے

برأت اور علیحدگی کا دعویٰ کریں۔

ان کے جواب میں ایک عجیب چیز یہ ہے کہ میدانِ قیامت کے ہولناک مناظر اور رب الارباب کی قدرت کاملہ کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے کے بعد ان کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ بولیں اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ اسی کی ذات کی قسم بھی کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے۔

عامہ مفسرین نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کا یہ جواب کچھ عقل و ہوش اور انجام بینی پر مبنی نہیں، بلکہ فرطِ ہیبت سے بوکھلاہٹ کی بنا پر ہے، اور ایسی حالت میں آدمی جو کچھ منہ میں آئے بولا کرتا ہے، لیکن میدانِ حشر کے عام واقعات و حالات میں غور کرنے کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کی پوری کیفیت اور حالت کو سامنے لانے کے لئے ان کو یہ قدرت بھی دیدی کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہیں جس طرح دنیا میں کہا کرتے تھے، تاکہ کفر و شرک کے گناہِ عظیم کے ساتھ ان کا یہ عیب بھی اہلِ حشر کے سامنے آجائے کہ یہ جھوٹ بولنے میں بھی یکتا ہیں کہ اس ہولناک موقع پر بھی جھوٹ بولنے سے نہیں جھجکتے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ سے اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جس طرح مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا جاتے ہیں اسی طرح خود رب العالمین کے سامنے بھی دروغ حلفی سے نہ چوکیں گے۔

محشر میں جب یہ قسمیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے انکاری ہو جائیں گے تو اس وقت حق تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہرِ سکوت لگا دیں گے، اور ان کے اعضاء و جوارح، ہاتھ پاؤں کو حکم دیں گے کہ تم شہادت دو کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے تھے، اس وقت ثابت ہوگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں آنکھ کان یہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی خفیہ پولیس تھی، وہ تمام اعمال و افعال کو ایک ایک کر کے سامنے رکھ دیں گے، اسی کے متعلق سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہے:-

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، اس مشاہدہ قدرت کے بعد کسی کو یہ جرأت نہ رہے گی کہ پھر کوئی بات چھپائے یا جھوٹ بولے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا، یعنی اس روز وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے، اس کا مطلب حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہی بتلایا کہ پہلے پہلے تو خوب جھوٹ بولیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت کوئی غلط بات کہنے کی جرأت نہ ہوگی۔

کہ مشرکین کو حشر کے ہولناک میدان میں جو یہ اختیار دیا کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہہ سکیں، یہاں تک کہ جھوٹی قسم کھا کر انھوں نے شرک سے انکار کر دیا، اس میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ایک ایسی خبیث عادت ہے جو چھوٹتی نہیں یہاں تک کہ یہ لوگ جو دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھایا کرتے تھے یہاں بھی باز نہ آئے اور پوری خلقِ خدا کے سامنے ان کی رسوائی ہوئی اسی لئے قرآن وحدیث میں جھوٹ بولنے پر شدید وعید اور مذمت فرمائی گئی ہے، قرآن میں جا بجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فجور کا ساتھی ہے، اور جھوٹ اور فجور دونوں جہنم میں جائیں گے (ابن حبان فی صحیحہ)

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جائے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل جھوٹ ہے (مسند احمد) اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی دونوں باچھیں چیر دی جاتی ہیں وہ پھر درست ہو جاتی ہیں، پھر چیر دی جاتی ہیں، اسی طرح یہ عمل اس کے ساتھ قیامت تک ہوتا رہے گا آپ نے جبرئیل امین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی پورا مؤمن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مزاح و مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

نیز بیہقی وغیرہ میں بسند صحیح وارد ہے کہ مسلمان کی طبیعت میں اور بری خصلتیں تو ہو سکتی ہیں مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ، عامۂ مفسرین ضحاکؒ، قتادہؒ، محمد بن حنفیہؒ کے نزدیک یہ آیت عام کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو لوگوں کو قرآن سننے اور اس کا اتباع کرنے سے منع کرتے تھے، اور خود بھی اس سے دور رہتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور دوسرے ان چچاؤں کے متعلق ہے جو لوگوں کو آپ کی ایذا رسانی سے روکتے اور آپ کی حمایت کرتے تھے، مگر نہ قرآن پر ایمان لاتے نہ اس پر عمل کرتے، اس صورت میں يَنْهَوْنَ عَنْهُ کی ضمیر بجائے قرآن کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہو گی (مظہری بروایت ابن ابی حاتم عن سعید بن ابی ہلال)

۲۰

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ

اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ کھڑے کئے جاویں گے وہ دوزخ پر پس کہیں گے اے کاش ہم پھر بھیج دیئے جاویں اور ہم

بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا

نہ جھٹلاویں اپنے رب کی آیتوں کو اور ہو جاویں ہم ایمان والوں میں، کوئی نہیں بلکہ ظاہر ہو گیا جو

يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ

چھپاتے تھے پہلے، اور اگر پھر بھیجے جاویں تو پھر بھی وہی کام کریں جس سے منع کئے گئے تھے اور وہ

لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ

بیشک جھوٹے ہیں، اور کہتے ہیں ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر نہیں

بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ

زندہ ہونا، اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت وہ کھڑے کئے جاویں گے اپنے رب کے سامنے، فرمایا کیا

هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا

یہ سچ نہیں، کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے ہمارے رب کی، فرمایا تو چکھو عذاب بدلے میں اپنے

كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ

کفر کے، تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا

حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي

یہاں تک کہ جب آپہنچے گی ان پر قیامت اچانک تو کہیں گے اے افسوس کیسی

مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ

کوتاہی ہم نے اس میں کی اور وہ اٹھاویں گے اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر،

اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ

خبردار ہو جاؤ کہ برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھاویں گے، اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور

وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

جی بہلانا، اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیزگاروں کے لئے کیا تم نہیں سمجھتے

ع ۱۰ / ۹

خلاصۂ تفسیر

اور اگر آپ ان کو اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک واقعہ نظر آئے) جبکہ یہ (منکرین) دوزخ کے پاس کھڑے کئے جاویں گے اور قریب ہوگا کہ جہنم میں ڈال دیئے جاویں تو (ہزاروں تمناؤں کے ساتھ) کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم (دنیا میں) پھر واپس بھیجدیئے جاویں اور اگر ایسا ہو جاوے تو ہم (پھر) اپنے رب کی آیات (مثل قرآن وغیرہ) کو کبھی جھوٹا نہ بتلاویں اور ہم (ضرور) ایمان والوں میں سے ہوجاویں (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ تمنا اور وعدہ بھی رغبت اور قصد اطاعت سے نہیں، بلکہ (اس وقت ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے (دنیا میں) دبایا (اور مٹایا) کرتے تھے، وہ آج ان کے سامنے آگئی ہے (وہ اس چیز سے آخرت کا عذاب ہے جس کی وعید کفر و معصیت پر دنیا میں ان کو کی جاتی تھی اور وہ ماننے سے انکار کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس وقت جان کو بن رہی ہے اس لئے جان بچانے کو یہ سارے وعدے کر رہے ہیں اور دل سے ہرگز وعدہ پورا کرنے کا ارادہ نہیں یہاں تک کہ اگر (بالفرض) یہ لوگ پھر واپس بھی بھیجدیئے جاویں تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا یعنی کفر و نافرمانی اور یقیناً یہ (ان وعدوں میں) بالکل جھوٹے ہیں (یعنی نہ اس وقت ایفاء وعدہ کا قصد، نہ دنیا میں جاکر ایفاء وعدہ کا ان سے احتمال ہے) اور یہ (منکرین) کہتے ہیں کہ زندگی اور کہیں نہیں بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم (اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد پھر) زندہ نہ کئے جاوینگے، (جیساکہ انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں) اور اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو عجیب واقعہ نظر آوے) جب کہ یہ اپنے رب کے سامنے (حساب کے لئے) کھڑے کئے جاویں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے فرماوے گا کہ (کہو) کیا یہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا) امر واقعی نہیں وہ کہیں گے بیشک (واقعی ہے) قسم اپنے رب کی اللہ تعالیٰ فرماوے گا تو اب اپنے کفر کا مزہ چکھو (اس کے بعد دوزخ میں بھیجدیئے جاویں گے) بے شک (سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے ملنے کی (یعنی قیامت کے روز زندہ ہوکر خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی کی) تکذیب کی اور یہ تکذیب تھوڑے دنوں رہیگی، یہاں تک کہ جب وہ معین وقت (یعنی قیامت کا دن مع مقدمات) ان پر دفعۃً (بلا اطلاع) آپہونچے گا (اس وقت سارے دعوے اور تکذیب ختم ہوجاویں گے اور) کہنے لگیں گے ہائے افسوس ہماری کوتاہی (اور غفلت) پر جو اس (قیامت) کے بارے میں

رحم ہے) ہوئی اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے (کفر و نافرمانی کا) بار اپنی کمر پر لادے ہوئے ہوں گے خوب سُن لو کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو اپنے اوپر لادیں گے، اور دنیوی زندگانی تو کچھ بھی نہیں بجز لعب و لہو کے (بوجہ غیر نافع اور غیر باقی ہونے کے)، اور پچھلا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سوچتے نہیں۔

معارف و مسائل

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: توحید، رسالت، عقیدۂ آخرت، باقی سب عقائد انہی تین کے تحت میں داخل ہیں، اور یہ وہ اصول ہیں جو انسان کو اس کی اپنی حقیقت اور مقصد زندگی سے روشناس کر کے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک سیدھی اور صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، ان میں بھی عملی طور پر عقیدۂ آخرت اور اس میں حساب جزاء و سزا کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رُخ ایک خاص طرف پھیر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام مضامین انہی تین میں دائر رہتے ہیں .... مذکورہ آیات میں خصوصیت کے ساتھ آخرت کے سوال و جواب، وہاں کے شدید و مدید ثواب و عذاب کا اور دنیا کے ناپائیداری کی حقیقت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں مجرمین منکرین کا یہ حال بیان فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں جب ان کو دوزخ کے کنارے کھڑا کیا جائے گا اور وہ وہم و خیال سے بھی زیادہ ہولناک عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ یہ تمنا ظاہر کریں گے کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم اپنے رب کی بھیجی ہوئی آیات اور احکام کی تکذیب نہ کرتے بلکہ ان پر ایمان لاتے اور مؤمنین میں داخل ہو جاتے۔

دوسری آیت میں علیم و خبیر احکم الحاکمین نے ان کی اس گھبرائی ہوئی تمنا کا پول اس طرح کھولا کہ ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ جیسے ہمیشہ سے جھوٹ کے عادی تھے وہ اپنے اس قول و تمنا میں بھی جھوٹے ہیں، اور بات اس کے سوا نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو حقائق ان کے سامنے رکھے گئے تھے اور یہ لوگ ان کو جاننے پہچاننے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے یا دنیوی طمع خام کی وجہ سے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیا کرتے تھے آج وہ سب یک یک کر کے ان کے سامنے آگئے، اللہ جل شانہ کی یکتائی اور قدرت کاملہ کے مظاہر آنکھوں سے دیکھے، انبیاء علیہم السلام کی سچائی کا

مشاہدہ کیا، آخرت میں دوبارہ زندہ ہونے کا مسئلہ جس کا ہمیشہ انکار کرتے تھے بے نقاب حقیقت بن کر سامنے آگیا، جزاء و سزا کا منظر دیکھا، دوزخ کا مشاہدہ کیا تو اب ان کے پاس کوئی حجت و مخلصی کی باقی نہ رہی، اس لئے یہاں یہ کہنے لگے کہ کاش ہم پھر دنیا میں واپس ہو جاتے، تو مومن ہو کر لوٹتے۔

لیکن ان کے پیدا کرنے والے علیم و خبیر مالک نے بتلا دیا کہ اب تو یہ ایسا کہہ رہے ہیں لیکن بالفرض اگر ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو وہ پھر اپنے اس قول و قرار کو بھول جائیں گے اور پھر سب کچھ وہی کریں گے جو پہلے کیا تھا، اور جن حرام چیزوں سے ان کو روکا گیا تھا یہ پھر ان میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لئے ان کا یہ کہنا بھی ایک جھوٹ اور فریب ہے۔

ان کے اس قول کو جھوٹ فرمانا اس کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جواب وعدہ کر رہے ہیں کہ اگر دوبارہ دنیا میں لوٹا دیئے جائیں تو تکذیب نہ کریں گے، مگر ایسا ہوگا نہیں، یہ وہاں جا کر پھر بھی تکذیب ہی کریں گے، اور اس کذب کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں سچے ارادہ سے نہیں بلکہ محض دفع الوقتی کے طور پر عذاب سے بچنے کے لئے کہہ رہے ہیں، دل میں اب بھی ان کا ارادہ نہیں۔

تیسری آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا وَقَالُوٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا، اس کا عطف لَعَادُوا پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان کو دوبارہ بھی دنیا میں لوٹا دیا جائے تو یہ دنیا میں پہنچ کر یہی کہیں گے کہ ہم تو اس دنیوی زندگی کے سوا کسی دوسری زندگی کو نہیں مانتے، بس یہی زندگی زندگی ہے، دوبارہ ہم کو زندہ نہیں کیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کو اور پھر حساب کتاب اور جزاء وسزا کو آنکھوں سے دیکھ چکیں گے، تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ پھر یہاں آکر اس کا انکار کردیں۔

جواب یہ ہے کہ انکار کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ واقع میں ان کو ان واقعات و حقائق کا یقین نہ رہے، بلکہ جس طرح آج بہت سے کفار و مجرمین اسلامی حقائق کا پورا یقین رکھتے ہوئے محض عناد سے انکار و تکذیب پر جمے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ دنیا میں واپس آنے کے بعد قیامت اور دوبارہ زندگی اور آخرت کے تمام حالات کا پورا یقین رکھنے کے باوجود محض شرارت اور عناد سے پھر تکذیب پر اتر آئیں گے، جیسا کہ قرآن کریم نے اسی موجودہ زندگی میں بعض کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

یعنی یہ لوگ ہماری آیت کا انکار تو کر رہے ہیں مگر ان کے دلوں میں اس کے حق ہونے کا یقین

جیسے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات اپنے علم ازلی سے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو مؤمن صالح ہو جائیں گے بالکل جھوٹ اور فریب ہے، اگر ان کے کہنے کے مطابق دوبارہ دنیا کو پیدا کرکے ان کو اس میں چھوڑ دیا جائے تو یہ [illegible] کریں گے جو پہلی زندگی میں کیا تھا۔

تفسیر مظہری میں بحوالہ طبرانی یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے کہ حساب کتاب کے وقت حق تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو میزان عدل کے پاس کھڑا کرکے فرماویں گے کہ اپنی اولاد کے اعمال کا خود معائنہ کریں اور جس شخص کے اعمال صالحہ اس کے گناہوں سے ایک ذرہ بھی بڑھ جائیں تو اس کو آپ جنت میں پہنچا سکتے ہیں، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ میں جہنم کے عذاب میں صرف اسی شخص کو داخل کروں گا جس کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ وہ اگر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو پھر بھی وہی حرکتیں کرے گا جو پہلے کر گیا ہے۔

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ، روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز نیک لوگوں کے اعمال ان کی سواری بن جائیں گی، اور بدکاروں کے اعمالِ بد بھاری بوجھ کی شکل میں ان کے سروں پر لادے جائیں گے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ کفار وفجار میدانِ حشر میں اپنی جان بچانے کے لئے بوکھلاہٹ میں مختلف باتیں کریں گے، کہیں جھوٹی قسمیں کھا جائیں گے کہیں یہ تمنا کریں گے کہ دوبارہ دنیا میں لوٹا دیئے جائیں، مگر یہ کوئی نہ کہے گا کہ ہم اب ایمان لاتے اور اب نیک عمل کیا کریں گے کیونکہ حقیقت بداہت کے ساتھ ان کے سامنے آجائے گی کہ عالمِ آخرت دارالعمل نہیں، اور یہ کہ ایمان کی قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ایمان بالغیب ہو، مشاہدہ کے بعد کی تصدیق تو اپنے مشاہدہ پر عمل ہے، خدا اور رسول کی تصدیق نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے ثمرات یعنی دائمی عیش وراحت دنیا میں امن واطمینان کی حیاتِ طیبہ اور آخرت میں نعمائے جنت حاصل کرنا صرف دنیا کی زندگی کے ذریعہ ہو سکتا ہے نہ اس سے پہلے عالمِ ارواح میں اس کا حصول ممکن ہے اور نہ اس سے گذرنے کے بعد عالمِ آخرت میں اس کی تحصیل ممکن ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ دنیا کی زندگی بہت بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے جس میں یہ عظیم الشان سودا خریدا جا سکتا ہے، اسی لئے اسلام میں

خودکشی حرام اور موت کی دعا یا تمنا کرنا ممنوع ہے، اس میں خدا تعالیٰ کی ایک بھاری نعمت کی ناشکری ہے، بعض بزرگوں کے حالات میں ہے کہ وفات کے قریب مولانا جامیؒ کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا ؎

با دو روزِ زندگی جامی نشد سیر غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمرِ جاودانی داشتیم

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں اور متعدد آیاتِ قرآنیہ میں جو حیاتِ دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے یا احادیثِ کثیرہ میں دنیا کی جو مذمت آئی ہے اس سے مراد حیاتِ دنیا کے وہ لمحات و ساعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے غفلت میں گذریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی طاعت و ذکر میں گذرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت و دولت نہیں ؎

دن وہی دن ہے شب وہی شب ہے
جو تری یاد میں گذر جائے

ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنٌ وَّمَلْعُوْنٌ مَّا فِیْهَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰهِ اَوْ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ،	"یعنی دنیا بھی ملعون ہے، اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہیں، مگر اللہ کی یاد اور عالم یا طالب علم"

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو عالم اور طالب علم بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہو جاتے ہیں، کیونکہ علم سے وہی علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنے، تو ایسے علم کا سیکھنا اور سکھانا دونوں ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، بلکہ امام جزریؒ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی احکامِ شریعت کی مطابقت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ ہی میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام، کسبِ معاش کے تمام جائز طریقے اور دوسری ضروریات جو حدودِ شریعت سے باہر نہ ہوں وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں، اہل و عیال، اقربا، واحباب، پڑوسی، او رمہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو احادیثِ صحیحہ میں صدقہ و عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور ذکر اللہ کے سوا کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، استاذِ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہ نے خوب فرمایا ہے ؎

بگذر از یادِ گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز ذکرِ حق آباد نیست

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک چیز جو انسان کو حاصل ہے اور سب سے زیادہ قیمتی اور محبوب ہے، وہ اس کی زندگی ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا ایک محدود وقت ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی زندگی کی صحیح حد کسی کو معلوم نہیں کہ ستر سال ہوگی یا ستر گھنٹے، یا ایک سانس کی بھی مہلت نہ ملے گی۔

دوسری طرف یہ معلوم ہوگیا کہ رضائے الٰہی کی تجارت گر سرمایہ جو دنیا و آخرت کی راحت و عیش اور ابدی آرام کی ضمانت ہے وہ صرف اسی محدود حیات دنیا میں حاصل کی جا سکتی ہے، اب ہر انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل و ہوش دیا ہے خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ زندگی کے ان محدود لمحات و ساعات کو کس کام میں خرچ کرنا چاہئے، بلاشبہ عقل کا تقاضا یہی ہوگا کہ ان قیمتی اوقات کو زیادہ سے زیادہ اس کام میں خرچ کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو، باقی کام جو اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں ان کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَرَضِيَ بِالْكَفَافِ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

"یعنی عقلمند ہوشیار وہ آدمی ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے . . . اور بقدر کفایت معاش پر راضی ہو جائے اور مابعد الموت کیلئے سارا عمل وقف کردے"

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ

ہم کو معلوم ہے کہ تجھ کو غمگین کرتی ہیں ان کی باتیں سو وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے

وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ

لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور جھٹلائے گئے ہیں

رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ

بہت سے رسول تجھ سے پہلے پس صبر کرتے رہے جھٹلانے پر اور ایذا پر یہاں تک کہ پہنچی ان کو

نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ

مدد ہماری اور کوئی نہیں بدل سکتا اللہ کی باتیں اور تجھ کو پہنچ چکے ہیں کچھ

نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ

حالات رسولوں کے اور اگر تجھ پر گراں ہے ان کا منہ پھیرنا تو اگر

اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ

تجھ سے ہو سکے کہ ڈھونڈ نکالے کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں

فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ

پھر لادے ان کو ایک معجزہ اور اگر اللہ چاہتا تو جمع کر دیتا سب کو سیدھی راہ پر

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۵﴾ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ

سو تو مت ہو نادانوں میں ماننے وہی ہیں جو

يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۳۶﴾

سنتے ہیں اور مُردوں کو زندہ کرے گا اللہ پھر اس کی طرف لائے جاویں گے

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کہدے کہ اللہ کو قدرت ہے اس پر

يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ

کہ اتارے نشانی لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے اور نہیں ہے

دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ

کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے اپنے دو بازوؤں سے مگر ہر ایک امت ہے

أَمْثَالُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ

تمہاری طرح ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی چیز پھر سب اپنے رب کے سامنے

يُحْشَرُونَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي

جمع ہوں گے اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو وہ بہرے اور گونگے ہیں

الظُّلُمَاتِ ۗ مَنْ يَشَإِ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ

اندھیروں میں جس کو چاہے اللہ گمراہ کرے اور جس کو چاہے ڈال دے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ

سیدھی راہ پر تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا

أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ

یا آوے تم پر قیامت کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے بتاؤ اگر تم

صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاۗءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝۴۱

سچے ہو، بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لئے اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور تم بھول جاتے ہو جن کو شریک کرتے تھے

ع ۱۱ ۱۰

خلاصہ تفسیر

کفار کے بیہودہ کلمات پر ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کفار کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو آپ بحال تسلی فکر میں نہ پڑیئے بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ (براہ راست) آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا (قصداً) انکار کرتے ہیں، اگرچہ اس سے آپ کی تکذیب بھی لازم آتی ہے مگر ان کا اصل مقصود آیات اللہ کی تکذیب ہے، جیسا کہ ان میں بعض مشرک ابوجہل اس کے اقراری بھی ہیں، اور جب ان کا اصل مقصد آیات اللہ کی تکذیب ہے تو ان کا یہ معاملہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا، وہ خود ہی ان کو سمجھ لیں گے، آپ کیوں غم میں مبتلا ہوں، اور آپ کی یہ تکذیب کوئی نئی بات نہیں بلکہ بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے جس پر انھوں نے صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچ گئی، جس سے غالب و منصور ہوگئے، اس وقت تک وہ صبر ہی کرتے رہے، اور آپ کی ان صبر کرنے کے بعد آپ کو بھی امداد پہنچے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی باتوں (یعنی وعدوں) کو کوئی بدلنے والا نہیں اور امداد کا وعدہ آپ سے ہوچکا ہے، جیسے فرمایا لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصص (قرآن میں) پہنچ چکے ہیں جن سے اللہ کی امداد اور مخالفین کا بالآخر مغلوب ہونا ثابت ہوجاتا ہے، اور حاصل اس تسلی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ابتدائی چند روزہ صبر کے بعد وہ اپنے رسولوں کو امداد بھیج دیتے ہیں، جس سے دنیا میں بھی حق کا غلبہ ہوتا ہے اور باطل مغلوب ہوجاتا ہے، اور آخرت میں بھی ان کو عزت و فلاح ملتی ہے، آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونے والا ہے، آپ مغموم نہ ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ تمام انسانوں کے ساتھ شفقت و محبت انتہا کی تھی، آپ باوجود اس تسلی کے یہ چاہتے تھے کہ یہ مشرکین اگر موجودہ معجزات اور نبوت کے دلائل پر مطمئن ہوکر ایمان نہیں لاتے تو جس قسم کے معجزات کا یہ مطالبہ کرتے ہیں وہی معجزات واقع ہوجائیں، شاید ایمان لے آویں، اور اس اعتبار سے ان کا کفر دیکھ کر صبر نہ آتا تھا، اس لئے اگلی آیات میں

اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ بمقتضائے حکمت الٰہیہ ان کے فرمائشی معجزات واقع نہ کئے جاویں گے، آپ تا چندے صبر کریں، ان کے وقوع کی فکر میں نہ پڑیں، چنانچہ فرمایا وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ) اور اگر آپ کو (منکرین) کا اعراض (وانکار) گراں گذرتا ہے (اور اس لئے جی چاہتا ہے کہ انکے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جاویں) تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں (جانے کو) کوئی سرنگ یا آسمان میں (جانے کو) کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لو پھر (اس کے ذریعہ زمین یا آسمان میں جاکر وہاں سے) معجزہ (فرمائشی معجزوں میں سے) لے آؤ تو (بہتر ہے آپ ایسا) کرلو (لیکن ہم تو ان کی یہ فرمائشیں بوجہ عدم ضرورت اور بمقتضائے حکمت کے پوری نہیں کرتے، اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ مسلمان ہی ہو جاویں تو آپ خود اس کا انتظام کیجئے) اور اللہ کو (تکوینًا) منظور ہوتا تو ان سب کو راہ (راست) پر جمع کر دیتا (لیکن چونکہ یہ خود ہی اپنا بھلا نہیں چاہتے اس لئے تکوینًا اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہوا پھر آپ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) سو آپ (اس فکر کو چھوڑ دیجئے اور) نادانوں میں سے نہ ہو جئے (امر حق وہدایت کو تو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو (حق بات کو طلب حق کے ارادہ سے) سنتے ہیں اور (اگر اس انکار واعراض کی پوری سزا ان کو دنیا میں نہ ملی تو کیا ہوا آخر ایک دن) مُردوں کو اللہ تعالیٰ قبروں سے زندہ کرکے اٹھادیں گے، پھر وہ سب اللہ ہی کی طرف (حساب کے لئے) لائے جاویں گے اور یہ (منکر) لوگ (براہِ عناد) کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان پر (ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ (ایسا ہی) معجزہ نازل فرمادیں، لیکن ان میں اکثر (اس کے انجام سے) بے خبر ہیں (اس لئے ایسی درخواست کرتے ہیں، اور وہ انجام یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لاویں گے تو سب فوراً ہلاک کر دیئے جاویں گے لقولہ تعالیٰ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ، حاصل یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو اس لئے نہیں کہ پہلے معجزات کافی ہیں، لقولہ تعالیٰ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ ؕ اور ہم جانتے ہیں کہ فرمائشی معجزہ پر بھی ایمان نہ لاویں گے جس سے فوری عذاب کے مستحق ہو جاویں گے اس لئے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر نہ کیا جائے، اور آیت کے آخر میں وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ فرمانا محبت وشفقت کے طور پر ہے، لفظ جہالت عربی زبان میں اس معنی عام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، بخلاف اردو زبان کے، اس لئے اس کا ترجمہ لفظ جہل یا جہالت سے کرنا ادب کے خلاف ہے، اگلی آیات میں تنبیہ کے لئے قیامت اور تمام خلائق کے حشر کا ذکر ہے) اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر (خواہ خشکی میں یا پانی میں) چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی

تم ایسی نہیں جو کہ (قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنے میں) تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں اور گو یہ سب اپنی کثرت کی وجہ سے معلوم ہوتے ہیں بے انتہا ہوں لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ ہم نے اپنے دفتر (لوح محفوظ) میں کوئی چیز (جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے) نہیں چھوڑی (اگرچہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ان کا علم ازلی و محیط ہی کافی ہے لیکن لکھنے کے ذریعے منضبط کر لینا انتظام معمولہ کے قریب تر ہے) پھر (اس کے بعد اپنے وقت معین پر) سب (انسان اور جانور) اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جاویں گے، آگے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا مضمون ہے، اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو (حق سننے سے) بہرے (جیسے) اور (حق کہنے سے) گونگے (جیسے) ہو رہے ہیں (اور اس کی وجہ سے) طرح طرح کی ظلمتوں میں (گرفتار) ہیں (کیونکہ یہ کفر ایک ظلمت ہے اور ان میں مختلف قسم کے کفر جمع ہیں پھر ان اقسام کفر کا بار بار تکرار الگ الگ ظلمتیں ہیں) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں (بوجہ اعراض عن الحق کے) بے راہ کر دیں اور وہ جس کو چاہیں (اپنے فضل سے) سیدھی راہ پر لگا دیں۔ آپ (ان مشرکین سے) کہیے کہ (اچھا) یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آ پڑے یا تم پر قیامت ہی آ پہونچے تو کیا (اس عذاب اور ہول قیامت کو ہٹانے کے واسطے) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم (شرک کے دعوے میں) سچے ہو (تو چاہئے اس وقت بھی غیر اللہ ہی کو پکارو لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا) بلکہ (اس وقت تو) خاص اسی کو پکارنے لگو پھر جس (آفت) کے (ہٹانے) کے لئے تم اس کو پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے اور نہ چاہے تو نہ بھی ہٹاوے) اور جن کو تم (اب اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو (اس وقت) ان سب کو بھول بھال جاؤ۔

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں جو یہ فرمایا ہے فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ، یعنی یہ کفار درحقیقت آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں، اس کا واقعہ تفسیر مظہری میں بروایت سُدّی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دو سردار اخنس بن شریق اور ابوجہل کی ملاقات ہوئی، تو اخنس نے ابوجہل سے پوچھا کہ اے ابوالحکم (عرب میں ابوجہل ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابوجہل کا لقب دیا گیا) یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی تیسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال صحیح صحیح بتلاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔

ابوجہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمد سچے ہیں، انھوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ

نہیں بولا، لیکن بات یہ ہے کہ قبیلۂ قریش کی ایک شاخ بنو قصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں، باقی قریش خالی رہ جائیں اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہے، حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے، بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے، اب اگر نبوت بھی ہم انہی کے اندر تسلیم کرلیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

ایک دوسری روایت ناجیہ بن کعب سے منقول ہے کہ ابوجہل نے ایک مرتبہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں آپ پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں، اور نہ ہم آپ کی تکذیب کرتے ہیں ہاں ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جس کو آپ لائے ہیں (مظہری)

ان روایات کی بناء پر آیت کو اپنے حقیقی مفہوم میں بھی لیا جاسکتا ہے کہ یہ کفار آپ کی نہیں بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں اور اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کفار اگرچہ ظاہر میں آپ ہی کی تکذیب کرتے ہیں، مگر درحقیقت آپ کی تکذیب کا انجام خود اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کی تکذیب ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص مجھے ایذا پہنچاتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانے کے حکم میں ہے۔"

اور چھٹی آیت وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز انسانوں کے ساتھ تمام جانور بھی زندہ کئے جاویں گے، اور ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے بے سینگ کے جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اُس کا انتقام اس سے لیا جائے گا، (اسی طرح دوسرے جانوروں کے باہمی مظالم کا انتقام لیا جاوے گا) اور جب اُن کے آپس کے حقوق و مظالم کے بدلے اور انتقام ہو چکیں گے، تو ان کو حکم ہوگا کہ سب مٹی ہو جاؤ، اور تمام جانور اسی وقت پھر مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے، یہی وقت ہوگا جبکہ کافر کہے گا: يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا، یعنی کاش میرا بھی یہی معاملہ ہو جاتا کہ مجھے مٹی بنا دیا جاتا، اور عذاب جہنم سے بچ جاتا۔

اور امام بغویؒ نے ایک دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب اہل حقوق کے حق ادا کئے جائیں گے یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کا انتقام سینگ والی بکری سے بھی لیا جاوے گا۔

حقوقِ خلق کی انتہائی اہمیت یہ سب کو معلوم ہے کہ جانور کسی شریعت اور احکام کے مکلف

نہیں ان کے مکلف صرف انسان اور جن ہیں، اور ظاہر ہے کہ غیر مکلف سے جزاء و سزا کا معاملہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رب العالمین کے غایت عدل و انصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا باقی ان کے کسی اور عمل پر جزاء و سزا نہ ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ بندگان خدا کے باہمی حقوق و مظالم کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے آزاد نہیں کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ بہت سے دیندار و عبادت گذار آدمی بھی اس میں غفلت برتتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ
اور ہم نے رسول بھیجے تھے بہت سی امتوں پر تجھ سے پہلے پھر ان کو پکڑا ہم نے سختی میں اور تکلیف
لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن
میں تاکہ وہ گڑگڑائیں پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب آیا ان پر عذاب ہمارا لیکن
قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾
سخت ہوگئے دل ان کے اور اچھے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے
فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ
پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک
إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾
کہ جب خوش ہوئے ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک پس اس وقت وہ رہ گئے ناامید
فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٥﴾
پھر کٹ گئی جڑ ان ظالموں کی اور سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے آپ سے پہلے اور امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے تھے (مگر انھوں نے ان کو نہ مانا) تو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جاویں (اور اپنے کفر و معصیت سے توبہ کر لیں) سو جب اُن کو ہماری سزا پہونچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے (کہ ان کا جرم معاف ہو جاتا) لیکن ان کے قلوب تو ویسے ہی سخت (کے سخت) رہے، اور شیطان ان کے اعمال بد کو ان کے خیال میں (بدستور) آراستہ (و مستحسن) کرکے دکھاتا رہا، پھر جب وہ لوگ (بدستور) اُن چیزوں

کو بھولے (اور چھوڑے) رہے جن کی ان کو (پیغمبروں کی طرف سے) نصیحت کی جاتی تھی (یعنی ایمان و اطاعت) تو ہم نے اُن پر (عیش و عشرت کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اترا گئے (اور غفلت و سستی میں ان کا کفر اور بڑھ گیا) اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً (بے گمان عذاب میں) پکڑ لیا (اور عذاب شدید نازل کیا جس کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے) پھر (اس عذاب سے) ظالم لوگوں کی جڑ (تک) کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے (کہ ایسے ظالموں کا بیڑا کٹا جن کی وجہ سے دنیا میں نحوست پھیلی تھی)

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں شرک و کفر کا ابطال اور توحید کا اثبات ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے کہ پہلے مشرکین مکہ سے سوال کیا گیا کہ اگر تم پر آج کوئی مصیبت آپڑے، مثلاً خدا تعالیٰ کا عذاب اسی دنیا میں تم پر آجائے، یا موت یا قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہو جائے، تو اپنے دلوں میں غور کر کے بتلاؤ کہ تم اُس وقت اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لئے کس کو پکارو گے اور کس سے امید رکھو گے کہ وہ تمہیں عذاب اور مصیبت سے نجات دلائے، کیا یہ پتھر کے خود تراشیدہ بُت یا مخلوق میں سے دوسرے لوگ جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے، اُس وقت تمہارے کام آئیں گے؟ اور تم اُن سے فریاد کرو گے یا صرف ایک اللہ جل شانہ کو ہی اس وقت پکارو گے۔

اس کا جواب کسی ذی ہوش انسان کی طرف سے بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتا جو خود حق تعالیٰ نے ان کی طرف سے ذکر فرما دیا کہ اس وقت مصیبت کے وقت بڑے سے بڑا مشرک بھی سب بتوں اور خود تراشیدہ معبودوں کو بھول جائے گا، اور صرف خدا تعالیٰ کو پکارے گا، تو اب نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تمہارے بُت اور وہ معبود جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو ہی اپنا مشکل کشا اور حاجت روا جانتے اور کہتے ہو جب اس بڑی مصیبت کے وقت تمہارے کام نہ آئے اور تمہیں یہ جرأت وہمت بھی نہ ہو سکی کہ ان کو اپنی امداد کے لئے بلاؤ، تو پھر اُن کی عبادت اور ان کی مشکل کشائی کس دن کام آئے گی۔

یہ مضمون سابقہ آیات کا خلاصہ ہے، ان میں بطور ذیل کے یہ بتلایا گیا کہ تمہارے کفر و شرک اور نافرمانی کی سزا میں تم پر اسی دنیا کی زندگی میں بھی عذاب آسکتا ہے، اور بالفرض زندگی میں عذاب نہ آیا تو قیامت کا آنا تو یقینی ہے جہاں انسان کے سب اعمال و افعال کا جائزہ لیا جائے گا، اور جزا و سزا کے احکام نافذ ہوں گے۔

یہاں قیامت سے مراد متعارف معنی قیامت کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ لفظ ساعت سے اس جگہ قیامت صغریٰ مراد ہو جو ہر انسان کی موت پر قائم ہو جاتی ہے جیسا کہ معروف ہے کہ: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ ۔ "یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو آج ہی قائم ہو گئی" کیونکہ قیامت کے حساب و کتاب کا ابتدائی نمونہ بھی قبر و برزخ میں سامنے آجائے گا اور وہاں کی جزاء و سزا کے نمونے بھی یہیں سے شروع ہو جائیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والوں کو ان آیات میں متنبہ کیا گیا ہے، کہ اپنی اس نافرمانی کے ساتھ بے فکر ہو کر مت بیٹھو، ہو سکتا ہے کہ اسی دنیا کی زندگی میں تم پر اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب آجائے جیسا پچھلی امتوں پر آیا ہے، اور یہ بھی نہ ہو تو بعد موت یا قیامت کے بعد کا حساب تو یقینی ہے۔

لیکن اپنی زندگی کے محدود واقعات اور اس میں پیش آنے والے نہایت محدود تجربات پر پوری دنیا اور پورے عالم کو قیاس کرنے والے انسان کی طبیعت ایسی چیزوں میں حیلہ جُو ہوتی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کے انذار و تنبیہات کو موہوم خیالات کہہ کر ٹال جاتے ہیں، خصوصاً جبکہ ایسے حالات بھی ہر زمانہ میں سامنے آتے ہیں کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی کھلی نافرمانیوں کے باوجود پھل پھول رہے ہیں، دنیا میں مال و دولت، عزت و شوکت سب کچھ ان کو حاصل ہے۔ ایک طرف یہ مشاہدہ اور دوسری طرف اللہ کے پیغمبر کی یہ تخویف کہ نافرمانی کرنے والوں پر عذاب آیا کرتے ہیں جب ان دونوں کو ملا کر دیکھتے ہیں تو ان کی حیلہ جُو طبیعت اور شیطان ان کو یہی سکھاتا ہے کہ پیغمبر کا قول ایک فریب یا موہوم خیال ہے۔

اس کے جواب کے لئے مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ نے پچھلی امتوں کے واقعات اور ان پر جاری ہونے والے قانونِ قدرت بیان فرمایا ہے، ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ "یعنی ہم نے آپؐ سے پہلے بھی بہت رسول دوسری امتوں کی طرف بھیجے، اور دو طرح سے ان کا امتحان لیا گیا۔ اول کچھ سختی اور تکلیف ان پر ڈال کر یہ دیکھا گیا کہ تکلیف و مصیبت سے گھبرا کر بھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا نہیں، جب وہ اس میں فیل ہوئے اور بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے اور سرکشی سے باز آنے کے وہ اور زیادہ اس میں منہمک ہو گئے، تو اب ان کا دوسری قسم کا امتحان لیا گیا کہ ان پر دنیوی عیش و راحت کے دروازے کھول دیئے گئے اور حیاتِ دنیا سے متعلق ان کو سب کچھ دیدیا گیا کہ شاید یہ لوگ نعمتوں کو دیکھ کر اپنے منعم اور محسن کو پہچانیں، اور اس طرح ان کو خدا یاد آئے، لیکن وہ اس امتحان میں بھی ناکام ثابت ہوئے، اپنے محسن و منعم کو پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے وہ عیش و عشرت کی بھول بھلیاں میں ایسے کھوئے گئے کہ اللہ اور رسولؐ کے پیغامات و تعلیمات کو یکسر بھلا بیٹھے، اور چند روزہ

عیش میں بدمست ہوگئے تو دونوں طرح کے امتحان و آزمائش میں ناکام رہنے کے بعد ان پر ہر طرح کی حجت تمام ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں دفعۃً پکڑ لئے گئے، اور ایسے نیست و نابود کردیئے گئے کہ ان کا سلسلۂ نسل بھی باقی نہ رہا، یہ عذاب پچھلی امتوں پر کبھی اس طرح آیا کہ کبھی آسمان سے کبھی زمین سے کبھی کسی دوسری صورت سے ایک عذاب عام آیا اور پوری کی پوری قوم اس میں بھسم ہوکر رہ گئی، نوح علیہ السلام کی پوری قوم کو پانی کے ایسے طوفان عام نے گھیر لیا جس سے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، قوم عاد پر ہوا کا شدید طوفان آٹھ دن تک مسلسل رہا جس سے ان کا کوئی فرد باقی نہ بچا، قوم ثمود کو ایک خوفناک آواز کے ذریعہ تباہ کردیا گیا، قوم لوط علیہ السلام کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا، جو آج تک اردن کے علاقہ میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحر میت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور بحر لوط کے نام سے بھی۔

غرض پچھلی امتوں کی نافرمانیوں کی سزا اکثر تو ان مختلف قسم کے عذاب کی شکل میں آئی جس میں بیک وقت پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ بظاہر طبعی موت سے مرگئے اور آگے کوئی ان کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہا۔

آیت مذکورہ میں یہ بھی بتلادیا کہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی قوم پر عذاب عام دفعۃً نہیں بھیجتے بلکہ بطور تنبیہ کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں، جن کے ذریعہ سعید و نیک بخت لوگ اپنی غفلت سے باز آکر صحیح راستہ پر لگ سکیں، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو تکلیف اور مصیبت دنیا میں بطور سزا کے دی جاتی ہے اس کی صورت اگرچہ سزا کی ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کی بھی سزا نہیں ہوتی، بلکہ غفلت سے چونکانے اور بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہے، جو عین مقتضیٰ رحمت ہے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ یعنی ہم ان کو عذاب اکبر چکھانے سے پہلے ایک عذاب ادنیٰ چکھاتے ہیں تاکہ وہ اب بھی حقیقت کو سمجھ کر اپنے غلط راستہ سے باز آجائیں۔

اسی آیت سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا کہ یہ دنیا تو دار الجزاء نہیں بلکہ دار العمل ہے، یہاں تو نیک و بد دونوں شریک ہی رہتے ہیں، بلکہ بد نیکوں سے اچھے رہتے ہیں، پھر اس دنیا میں سزا جاری ہونے کا کیا مطلب ہے؟ جواب واضح ہے کہ اصل جزاء و سزا تو اسی روز قیامت میں ہوگی جس کا نام ہی یوم الدین یعنی روز جزاء ہے، لیکن کچھ تکلیفیں بطور نمونۂ عذاب کے اور کچھ راحتیں بطور نمونۂ ثواب کے اس دنیا میں بمقتضائے رحمت بھیج دی جاتی ہیں اور بعض

نے فرمایا کہ:

"جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا اور بڑھانا چاہتے ہیں تو دو وصف ان میں پیدا کر دیتے ہیں، ایک ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی، دوسرے عفت اور عصمت یعنی حرام چیزوں کے استعمال سے پرہیز، اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں تو ان پر خیانت کے دروازے کھول دیتے ہیں یعنی وہ اپنی خیانتوں اور بدعملیوں کے باوجود دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں۔"

آخری آیت میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آگیا تو ظالموں کی نسل تک قطع کر دی گئی، اور اس کے آخر میں فرمایا: وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، جس میں اشارہ کیا گیا کہ ظالموں اور مجرموں پر جب کوئی عذاب و مصیبت آئے تو پورے عالم کے لئے ایک نعمت ہے جس پر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى

تو کہہ دیکھو تو اگر چھین لے اللہ تمہارے کان اور آنکھیں اور مہر کر دے

قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ

تمہارے دلوں پر تو کون ایسا رب ہے اللہ کے سوا جو تم کو یہ چیزیں لا دیوے دیکھ ہم کیونکر طرح طرح سے

الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ

بیان کرتے ہیں باتیں پھر بھی وہ کنارہ کرتے ہیں تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر

عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

عذاب اللہ کا اچانک یا ظاہر ہو کر تو کون ہلاک ہوگا مگر ظالم لوگ ہی

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ

اور ہم رسول نہیں بھیجتے مگر خوشی اور ڈر سنانے کو پھر جو کوئی ایمان لایا

وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

اور سنور گیا تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں اور جنہوں نے جھٹلایا

بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

ہماری آیتوں کو ان کو پہنچے گا عذاب اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

اَلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ

قرآن سے ان لوگوں کو جن کو ڈر ہے اس کا کہ وہ جمع ہوں گے اپنے رب کے سامنے اس طرح پر کہ اللہ کے سوا

دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾

نہ کوئی ان کا حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنیوالا، تاکہ وہ بچتے رہیں

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان معاند لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے تمام خزانے ہیں (کہ جو کچھ مجھ سے مانگا جاوے وہ اپنی قدرت سے دیدوں) اور نہ میں تمام غیب کی چیزوں کو جانتا ہوں (جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے) اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے (جس میں مقتضائے وحی پر خود عمل کرنا بھی داخل ہے اور دوسروں کو دعوت دینا بھی، جیسا کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی حال تھا، پھر) آپ ان سے کہئے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہو سکتا ہے (اور جب یہ بات سب کو مسلم ہے) تو کیا تم آنکھوں والا بننا نہیں چاہتے اور اس تقریر مذکور میں) غور کامل بقصد طلب حق نہیں کرتے (کہ حق واضح ہو جائے اور تم بیناؤں میں داخل ہو جاؤ) اور اگر اس پر بھی وہ عناد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث مباحثہ بند کر دیجئے اور آپ کا جو اصلی کام ہے تبلیغ رسالت کا اس میں مشغول ہو جائیے اور) ایسے لوگوں کو (کفر و معصیت پر عذاب کی خاص طور پر) ڈرائیے جو (اعتقاداً یا کم از کم احتمالاً) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں (کہ قیامت میں) اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جاویں گے کہ اللہ کے سوا جس جس کو مددگار یا سفارش کرنے والا کفار نے سمجھا تھا (اس وقت ان میں سے) نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی مستقل شفاعت کرنے والا، شاید یہ لوگ (عذاب سے) ڈر جاویں (اور کفر و معصیت سے باز آجائیں)۔

معارف و مسائل

کفار عرب کی طرف سے فرمائشی معجزات کا معاندانہ مطالبہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات اور اللہ تعالیٰ کی آیات بینات کا ظہور ہو چکا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحالت امّی دنیا میں تشریف لانا لکھنے پڑھنے سے بالکل

الگ ایک اُمّی محض ہو کر رہنا، یہ ذہن میں پیدا ہوا جس کے آس پاس کبھی نہ کوئی علم تھا نہ علمی مذاکرہ، عمر شریف کے چالیس سال اسی کیفیت محضہ کے عالم میں سب اہل مکہ کے سامنے رہنا، پھر چالیس سال کے بعد دفعۃً آپ کی زبان مبارک سے ایسا معجز العقول حکیمانہ کلام جاری ہونا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام بلغاء عرب کو چیلنج دے کر ہمیشہ کے لئے ان کے مونھوں پر مہر لگادی، اور جس کی حکمت پرور معانی نے قیامت تک کی ضروریات انسانی کی رعایت کے ساتھ انسان کامل کی زندگی کا ایسا نظام عمل جس کو انسانی عقل و دماغ ہرگز مرتب نہیں کرسکتا، نہ صرف نظری اور فکری حیثیت سے جمع کر کے پیش کیا، بلکہ عملی طور پر بھی دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ رائج کر کے دکھلا دیا، اور وہ انسان جو اپنی انسانیت کو بھلا کر بیل، بکری، گھوڑے، گدھے کی طرح اپنی زندگی کا مقصد صرف کھانے، پینے، سونے جاگنے کو قرار دے چکا تھا، اس کو صحیح انسانیت کا سبق دیا، اس کا رخ اس بلند مقصد کی طرف پھیر دیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر دور، اس میں پیش آنے والے عظیم القدر واقعات ہر ایک ایک مستقل معجزہ اور آیت الٰہیہ تھی جس کے بعد کسی انصاف پسند عقلمند کے لئے مزید کسی آیت و معجزہ کے طلب کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔

لیکن کفار قریش نے اس کے باوجود دوسری قسم کے معجزات اپنی خواہش کے مطابق طلب کئے، ان کے مطلوبہ معجزات میں سے بھی بعض کو حق تعالیٰ نے واضح طور پر عمل میں لاکر دکھلا دیا، چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا تھا، شق قمر کا معجزہ نہ صرف قریش نے بلکہ اس وقت کی دنیا میں بہت سے لوگوں کی بڑی تعداد نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

لیکن اُن کے مطالبہ کے موافق ایسا عظیم الشان معجزہ ظاہر ہونے کے باوجود وہ اپنے اسی کفر و ضلالت اور ضد و عناد پر جمے رہے اور اللہ تعالیٰ کی اس آیت بیّنہ کو اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ کہہ کر نظر انداز کر دیا، اور ان سب چیزوں کو دیکھنے اور سمجھ بوجھنے کے باوجود ان کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روز نئے نئے معجزات کا مطالبہ رہتا تھا، اور جیسا کہ پچھلی آیتوں میں گذرا ہے: وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

"یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ان کا کوئی معجزہ کیوں ظاہر نہیں ہوتا، قرآن نے ان کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم

دیا کہ آپ ان لوگوں کو بتلا دیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، اس نے جس طرح تمھارے مانگے بغیر خود ہی بے شمار آیات بینات اور معجزات نازل فرما دیئے، اسی طرح وہ تمھارے مطلوبہ معجزات بھی نازل فرما سکتا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عادۃ اللہ اس بارے میں یہ ہے کہ جب کسی قوم کا مطلوبہ معجزہ دکھلا دیا جائے اور پھر وہ اس پر بھی ایمان نہ لائیں تو ان کو فوری عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے، اس لئے قوم کی مصلحت اس میں تھی اور ہے کہ ان کے مطلوبہ معجزات ظاہر نہ کئے جائیں، مگر بہت سے لوگ جو اس دقیق حکمت سے جاہل و بے خبر ہیں، ان کا اصرار یہی رہتا ہے کہ ہمارا مطلوبہ معجزہ دکھلایا جائے۔

مذکور الصدر آیتوں میں ان لوگوں کے ایسے ہی سوالات و مطالبات کا جواب ایک خاص انداز سے دیا گیا ہے۔

کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں تین مطالبے پیش کئے تھے، اوّل یہ کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو بذریعہ معجزہ ہمارے لئے تمام دنیا کے خزائن جمع کرا دیجئے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ واقعی سچے رسول ہیں تو ہمارے مستقبل میں پیش آنے والے تمام مفید یا مضر حادث و واقعات بتلا دیجئے، تاکہ ہم مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر صورتوں سے بچنے کا انتظام پہلے ہی کرلیا کریں، تیسرے یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری ہی قوم کا ایک انسان جو ہماری ہی طرح ماں باپ سے پیدا ہوا، اور تمام بشری صفات کھانے پینے، بازاروں میں پھرنے وغیرہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے وہ اللہ کا رسول بن جائے، کوئی فرشتہ ہوتا جس کی تخلیق اور اوصاف ہم سب سے ممتاز ہوتے، تو ہم اس کو خدا تعالیٰ کا رسول اور اپنا پیشوا مان لیتے۔

ان تینوں سوالات کے جواب میں ارشاد ہوا: قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ ان لوگوں کے (لغو) سوالات کے جواب میں آپ اُن سے صاف کہہ دیجئے کہ تم جو مجھ سے خزائن دنیا کا مطالبہ کرتے ہو تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اور تم جو یہ مطالبہ کرتے ہو کہ مستقبل میں پیش آنے والے ہر مفید یا مضر معاملہ اور واقعہ کو میں تمھیں بتلا دوں تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں ہر غیب کی چیز کو جانتا ہوں، اور تم جو مجھ میں فرشتوں کی مخصوص صفات دیکھنا چاہتے ہو تو میں نے کب کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجھ سے دلیل اس چیز کی مانگی جا سکتی ہے جس کا میں نے دعویٰ کیا ہو،

لائق یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اس کی بھیجی ہوئی ہدایت انسانوں کو پہونچاتا ہوں اور خود بھی ان کا اتباع کرتا ہوں دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں، جس پر اس کے لئے ایک دو نہیں بے شمار واضح دلائل پیش کئے جا چکے ہیں۔

اس دعوی رسالت کے لئے نہ یہ ضروری ہے کہ مدعی رسالت اللہ کے سب خزانوں کا مالک ہو جائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرح غیب کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے واقف ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ انسانی و بشری صفات سے جدا کوئی فرشتہ ہو بلکہ رسول کا منصب صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کا اتباع کرے، جس میں خود اس پر عمل کرنا بھی داخل ہے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دینا بھی۔

اس ہدایت نامہ سے منصب رسالت کی حقیقت کو بھی واضح فرما دیا گیا، اور رسول کے بارے میں جو غلط تصورات ان لوگوں نے قائم کر رکھے تھے ان کا ازالہ بھی کر دیا گیا، اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ عیسائیوں کی طرح اپنے رسول کو خدا نہ بنائیں اور خدائی کا مالک نہ قرار دیں، ان کی عظمت و محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کے متعلق یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط میں اور غلو میں نہ پڑ جائیں، کہ یہود نے تو انبیاء کے قتل تک سے گریز نہ کیا، اور نصاریٰ نے اپنے رسول کو خدا بنا دیا۔

اس کے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے ہاتھ میں نہیں ان خزانوں سے کیا مراد ہے؟ علماء تفسیر نے بہت سی چیزوں کے نام لئے ہیں، مگر خود قرآن کریم نے جہاں اللہ کے خزانوں کا ذکر کیا ہے تو اس میں فرمایا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ، یعنی کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ خزائن اللہ کا مفہوم دنیا کی تمام چیزوں پر حاوی ہے کچھ خاص چیزوں کو متعین نہیں کیا جا سکتا، اور جن حضرات مفسرین نے مخصوص چیزوں کے نام لئے ہیں وہ بھی بطور مثال کے ہیں، اس لئے اختلاف کچھ نہیں، اور جب اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ خدائی کے سارے خزانے سید الرسل امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں بھی نہیں ہیں تو پھر امت کے کسی بزرگ یا ولی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں کھلی ہوئی جہالت ہے۔

آخری جملہ میں فرمایا وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ "یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں جس کی وجہ سے تم بشری صفت کو دیکھ کر رسالت کا انکار کرتے ہو"

درمیانی جملہ میں طرز کلام بدل کر بجائے اس کے کہ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

فرمایا جاتا یعنی یہ کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں غیب کو جانتا ہوں، ارشاد یوں فرمایا گیا کہ **وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ یعنی میں غیب کو نہیں جانتا۔**

ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں اس طرز کلام کے بدلنے کی ایک لطیف توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تمام خزائن کا مالک نہ ہونا، اسی طرح کسی شخص کا فرشتہ ہونا یا نہ ہونا یہ چیزیں تو مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، مخاطب لوگ بھی سب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے خزائن سب آپ کے ہاتھ میں نہیں، اور آپ فرشتہ بھی نہیں، محض عناد سے اس کا مطالبہ کرتے تھے، اُن کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میں **خزائن اللہ کا مالک ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں۔**

لیکن علم غیب کا مسئلہ ایسا نہ تھا، کیونکہ وہ لوگ اپنے نجومیوں، کاہنوں کے بارے میں بھی اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ غیب کو جانتے ہیں، تو اللہ کے رسولؐ کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا کچھ مستبعد نہ تھا، خصوصاً جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے انھوں نے بہت سی غیب کی خبریں بھی سنی تھیں، اور ان کے مطابق واقعہ ہونے کا مشاہدہ بھی کیا تھا، اس لئے یہاں صرف دعویٰ اور قول کی نفی کرنے کو کافی نہ سمجھا، بلکہ اصل فعل کی نفی کی گئی اور یہ فرمایا وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ، یعنی میں غیب کو نہیں جانتا، اس میں ان کی اس غلط فہمی کو بھی رفع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی یا الہام جن غیب کی چیزوں کا علم کسی فرشتہ یا رسول یا ولی کو دیا جائے اصطلاح قرآنی میں اس کو علم غیب یا اس کے جاننے والے کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس معنی میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا تھا، بلکہ تمام فرشتوں اور اولین و آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے ان سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا فرمایا گیا ہے، یہی پوری امت کا عقیدہ ہے، ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف و خلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی مخصوص صفت ہے، جس طرح اس کے خالق و رازق، قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہوسکتا، اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو غیب کی لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرورِ کائنات سید الرسل امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کی کمالات کے بارہ میں بہت سی باتیں ثابت کرنے کے بعد زندہ بزرگ تر کی قصہ مختصر
کمالات علمی میں کبھی کمی نہیں ہے، خدا تعالیٰ نے جو درجہ تمام فرشتوں اور انبیاء و رسل سے آپ کا
عطا فرمایا ہے، مگر خدا تعالیٰ کے برابر نہیں، برابری کا دعویٰ کرنا عیسائیت کے غلو کا نتیجہ ہے۔
آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، مطلب یہ ہے کہ نفسانی
جذبات اور ضد و عناد کو چھوڑ کر حقیقت کو دیکھو تو تم اس شمار اندھوں میں نہ رہو گے، تم بصیر
اور بینا ہو جاؤ اور یہ بینائی تمہیں ذرا سے غور و فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان واضح
بیانات کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث و مباحثہ کو موقوف
کر دیجئے اور جو اصلی کام ہے رسالت کا یعنی تبلیغ اس میں مشغول ہو جائیے، اور تبلیغ و انذار
کا رُخ ان لوگوں کی طرف پھیر دیجئے جو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب
کا عقیدہ رکھتے ہیں، جیسے مسلمان یا وہ جو کم از کم اس کے منکر نہیں، بطور احتمال کے ہی سہی کم از کم ان کو
خطرہ تو ہے کہ شاید ہمارے اعمال کا ہم سے حساب لیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے متعلق تین طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ جو یقینی طور پر اس
کے معتقد ہیں، دوسرے وہ جو متردد ہیں، تیسرے وہ جو بالکل منکر ہیں، اور تبلیغ و انذار کا حکم
انبیاء علیہم السلام کو اگرچہ ان تینوں طبقوں کے لئے عام ہے، جیسا کہ بہت سے ارشادات
قرآنی سے واضح ہے لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے، اس لئے
اس آیت میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی، وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ
يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ

اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اس کی

وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ

رضا تجھ پر نہیں ہے ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر

عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ

ہے کچھ کہ تو ان کو دور کرنے لگے پس ہو جاوے گا تو بے انصافوں میں اور اسی طرح

فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ

ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا

بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ

ہم سب میں کیا نہیں ہے اللہ خوب جاننے والا شکر گذاروں کو، اور جب آویں تیرے پاس

يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ

ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ دے تو سلام ہے تم پر لکھ لیا ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر

الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ

رحمت کو کہ جو کوئی کرے تم میں سے برائی نادانی سے پھر اس کے بعد توبہ کر لے

بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

اور نیک ہو جاوے تو بات یہ ہے کہ وہ ہے بخشنے والا مہربان اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان

وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جاوے طریقہ گنہگاروں کا

ع ۵ / ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام بدوام مناسب) اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے صرف اللہ کی رضا ہی کا قصد رکھتے ہیں (اور کوئی غرض جاہ و مال کی نہیں، یعنی ان کی عبادت میں مداومت بھی ہے اور اخلاص بھی، اور اخلاص اگرچہ امر باطنی ہے مگر آثار و علامات سے پہچانا بھی جا سکتا ہے، اور جب تک عدم اخلاص کی کوئی دلیل نہیں، اخلاص ہی کا گمان رکھنا چاہیے)۔ اور ان (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور (یہ اُن کے باطن کی تفتیش کا آپ سے متعلق نہ ہونا ایسا یقینی ہے جیسا کہ) آپ (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں، (یعنی اگر ان کے باطنی اخلاص کی تفتیش آپ کے ذمہ ہوتی تو اس کی گنجائش تھی کہ جن کے اخلاص ..... کی تحقیق نہ ہو جائے ان کو تنگ کر دیں، مگر وہ آپ کے ذمہ نہیں، اور دوسری کوئی وجہ اُن کو نکالنے کے جواز کی موجود نہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مربی ہیں، اور مربی کے لئے اپنے ماتحتوں کے احوال کی تفتیش کرنے کا احتمال ہو سکتا تھا، مگر اس کا عکس کہ وہ لوگ اپنے پیغمبر کے باطنی احوال کی تفتیش کریں، اس کا کوئی احتمال ہی نہیں اس لئے وہ قطعاً منفی ہے، اس جگہ محتمل کو متیقن کے ساتھ برابر قرار دے کر اس کی نفی کی گئی تاکہ اس کا منفی ہونا بھی یقینی ہو جاوے) ورنہ (ان کے نکالنے سے) آپ نامناسب

کام کرنے والوں میں ہو جاویں گے اور (جو ہم نے مومنوں کو غریب اور کافروں کو رئیس بنا رکھا ہے جو بنائے مقتضائے قیاس کے بعید ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) اسی طور پر ہم نے (ان میں سے) ایک (یعنی کفار) کو دوسرے (یعنی مومنوں) کے ذریعہ آزمائش میں ڈال رکھا ہے (یعنی اس طرز عمل میں امتحان ہے کفار کا) تاکہ یہ لوگ (مومنوں کے متعلق) کہا کریں کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے (انتخاب کرکے) ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا ہے (یعنی اپنے دین اسلام کے لئے ان کو منتخب کیا ہے) کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے (ان غریب لوگوں نے اپنے منعم حقیقی کا حق پہچانا، طلب حق میں لگ گئے، دین حق اور قبول عند اللہ سے مشرف کئے گئے، اور ان رؤساء نے ناشکری اور کفر کیا وہ اس نعمت سے محروم رہے) اور جب یہ لوگ آپ کے پاس آویں جو ہماری آیتوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں تو آپ (ان کو بشارت سنانے کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہے (یعنی کفار پر جو ہر طرح کی آفات آخرت میں پڑیں گی ان سے تم مامون ہو، اور دوسرے یہ بھی کہہ دو کہ) تمہارے رب نے (اپنے فضل و کرم سے) رحمت کرنا (اور تم کو نعمتیں دینا) اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے (یہاں تک) کہ جو شخص تم میں سے کوئی برا کام کر بیٹھے (جو کہ جہالت سے ہو جاتا ہے، کیونکہ خلاف حکم کرنا عملی جہالت ہے مگر) پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے (اور آئندہ کو اپنے اعمال کی) اصلاح رکھے (اس میں یہ بھی آگیا کہ اگر وہ توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کر لے)، تو اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ (اس کے لئے بھی) بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (کہ گناہ کی سزا بھی معاف کر دیں گے) اور بڑی رحمت کرنے والے ہیں (کہ طرح طرح کی نعمتیں بھی دیں گے) اور (جس طرح ہم نے اس مقام پر مومنین اور کفار کے حال و مآل کی تفصیل کر دی) اسی طرح ہم آیات کی (جو کہ دونوں فریق کے حال و مآل پر مشتمل ہوں) تفصیل کرتے رہتے ہیں (تاکہ مومنین کا طریقہ بھی ظاہر ہو جاوے) اور تاکہ مجرمین کا طریقہ (بھی) ظاہر کر دیا جائے (اور حق و باطل کے واضح ہونے سے طالب حق کو معرفت حق آسان ہو جائے)۔

معارف و مسائل

عزت و جاہت کا ازالہ اور عزت و ذلت کا اسلامی معیار اسلام میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں

جن لوگوں نے انسان ہونے کے باوجود انسانیت کو نہیں پہچانا بلکہ انسان کو دنیا کے مختلف جانوروں میں سے ایک ہوشیار جانور قرار دیا، جس نے دوسرے جانوروں کو اپنا تابع و محکوم بنا کر سب سے خدمت لی، ان کے نزدیک انسان کی تخلیق کا منشاء اس کے

سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ ایک جانور کی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حیوانی جذبات کو استعمال کرنے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھیں، اور جب مقصدِ زندگی صرف یہی ہو تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اچھے برے، بڑے چھوٹے، باعزت و بے عزت، شریف و رذیل کے پہچاننے کا معیار یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے، پہننے برتنے کا سامان زیادہ ہو وہ کامیاب اور باعزت اور شریف ہے، اور جس کے پاس یہ چیزیں کم ہوں وہ بے عزت، ذلیل اور نامراد و ناکام ہے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ و نظریہ پر خلق و اعمالِ صالحہ کی کوئی بحث ہی انسان کے شریف اور معزز ہونے میں نہیں آتی، بلکہ وہی عمل عملِ صالح اور خلق خلقِ حسن ہوگا، جس کے ذریعہ یہ حیوانی مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں۔

اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین و مذہب کا پہلا اور آخری سبق یہی رہا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو دائمی اور غیر منقطع ہوگی، وہاں کی راحت بھی مکمل اور دائمی ہوگی اور تکلیف و عذاب بھی مکمل اور دائمی، دنیا کی زندگی خود مقصد نہیں، بلکہ دوسری زندگی میں جو سامان کام آنے والا ہے اس کی فراہمی اس چند روزہ زندگی کا اصل مقصد ہے ؎

رہا مرنے کی تیاری میں مصروف
مرا کام اور اس دنیا میں تھا کیا

اور انسان و حیوان میں یہی ممتاز فرق ہے کہ حیوانات کو اگلی زندگی کا کوئی فکر نہیں، بخلاف انسان کے کہ اس کی سب سے بڑی فکر اہلِ عقل و ہوش کے نزدیک دوسری زندگی کی درستی ہے، اسی عقیدہ و نظریہ پر شرافت و رذالت اور عزت و ذلت کا معیار ظاہر ہے کہ زیادہ کھانا پینا یا زیادہ مال و دولت جمع کر لینا نہیں ہوگا، بلکہ اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ ہوں گے، جن پر آخرت کی عزت کا مدار ہے۔

دنیا جس وقت بھی انبیاء علیہم السلام کی ہدایات اور تعلیمات اور عقیدۂ آخرت سے غافل ہوئی تو اس کا طبعی نتیجہ سامنے آگیا، کہ عزت و دولت اور شرافت و رذالت کا معیار صرف روٹی اور پیٹ رہ گیا، جو اس میں کامیاب ہو وہ شریف و معزز کہلاتا ہے، جو اس میں ناکام یا ادھورا ہے وہ غریب، بے عزت، رذیل و ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

اسی لئے ہر زمانہ میں صرف حیاتِ دنیا کی بھول بھلیاں میں پھنسے ہوئے انسانوں نے مالدار کو معزز و شریف اور غریب و فقیر کو بے عزت و رذیل قرار دیا، حضرت نوح علیہ السلام

کی قوم نے ایمان لانے والے غریب لوگوں کو کمتر سمجھتے ہوئے رذیل کہہ کر یہ اعتراض کیا کہ ہم ان رذیل لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کوئی پیغام سنیں تو ان غریب غرباء کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ، یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ پر ایسی حالت میں ایمان لے آئیں جبکہ آپ کے متبعین رذیل قسم کے لوگ ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے اس دل خراش کلام کا جواب مخصوص پیغمبرانہ انداز میں یہ دیا کہ: وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ، "یعنی میں ان کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں کہ یہ فیصلہ کر سکوں کہ وہ رذیل ہیں یا شریف معزز، بلکہ ہر شخص کے عمل کی حقیقت اور اس کا حساب میرے رب ہی کو معلوم ہے، جو دلوں کے بھید سے باخبر ہے"

نوح علیہ السلام نے ان جاہل اور متکبر انسانی شرافت و رذالت کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں کا رخ ایک واضح حقیقت کی طرف پھیر کر یہ بتلا دیا کہ شریف و رذیل کے الفاظ تم لوگ استعمال کرتے ہو اور ان کی حقیقت سے واقف نہیں، پیسے والے کو شریف اور غریب کو رذیل کہنے لگے، حالانکہ شرافت و رذالت کا معیار پیسہ نہیں بلکہ اعمال و اخلاق ہیں، اس موقع پر حضرت نوح علیہ السلام یہ فرما سکتے تھے کہ اعمال و اخلاق کے معیار پر یہ لوگ تم سے زیادہ شریف و معزز ہیں، لیکن پیغمبرانہ طرز تبلیغ و اصلاح نے اس کی اجازت نہ دی، کہ ایسا کلمہ کہیں جس سے مخاطب کو اشتعال ہو، اس لئے صرف اتنا فرما دیا کہ رذالت کا مدار تو افعال و اعمال پر ہے اور میں ان کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں، اس لئے ان کے شریف یا رذیل ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

نوح علیہ السلام کے بعد بھی ہر زمانہ میں قوم کے غریب لوگ خواہ وہ اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے کتنے ہی شریف اور باعزت ہوں مگر دنیا پرست، نخوت شعار لوگ ان کو حقیر و ذلیل کہتے آئے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی بصیرت اور اخلاقِ صالحہ کی بناء پر ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں پہل کی، یہاں تک کہ مذاہب و ملل کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے نزدیک کسی پیغمبر کی صدق و حقانیت کی ایک دلیل یہ بن گئی کہ ان کے ابتدائی متبعین قوم کے غریب لوگ ہوں، یہی وجہ تھی کہ جب ہرقل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ دعوتِ اسلام کے لئے پہونچا اور اس نے آپ کی حقانیت و صدق کی تحقیق کرنا چاہی تو واقف کار لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو سوالات کئے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کے اکثر متبعین غریب عوام

میں یا قوم کے بڑے لوگ؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ غریب لوگ ہیں تو اس نے کہا ہُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ یعنی رسولوں کے ابتدائی متبعین یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی یہی سوال کھڑا ہوا، مذکورہ آیات میں **اسی کا جواب خاص ہدایات کے ساتھ مذکور ہے۔**

ابن کثیرؒ نے امام ابن جریرؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ کفار قریش کے چند سردار عتبہ، شیبہ بن ربیعہ اور مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل وغیرہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور کہا آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سننے اور ماننے سے ہمارے لئے ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ان کے ارد گرد ہر وقت وہ لوگ رہتے ہیں جو یا تو ہمارے غلام تھے ہم نے ان کو آزاد کر دیا، اور یا وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہی رحم و کرم پر زندگی گزارتے تھے، ان حقیر و ذلیل لوگوں کے ہوتے ہوتے ہم ان کی مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے، آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر ہمارے آنے کے وقت وہ ان لوگوں کو مجلس سے ہٹا دیا کریں، تو ہم **ان کی بات سنیں اور غور کریں۔**

ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بات نقل کی تو فاروق اعظمؓ نے یہ رائے دی کہ اس میں کیا حرج ہے کچھ دنوں کے لئے آپ یہ بھی کر دیکھیں، یہ لوگ تو اپنے بے تکلف محبین ہیں، ان لوگوں کے آنے کے وقت مجلس سے ہٹ جایا کریں گے۔

اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرما دیا گیا، نزول آیت کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو معذرت کرنا پڑی **کہ میری رائے غلط تھی۔**

اور یہ غریب لوگ جن کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی اس وقت حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، عمار بن یاسرؓ، سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، صبیح مولی اُسیدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مقداد ابن عمروؓ، مسعود بن القاریؓ، ذوالشمالینؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ تھے، جن کی عزت و شرافت کا پروانہ آسمان سے نازل ہوا اور قرآن میں ان کے متعلق دوسری جگہ اس کی تاکید ان الفاظ میں آئی، وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ اپنے نفس کو ان لوگوں میں باندھ رکھیں جو صبح و شام یعنی ہر وقت اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اخلاص کے ساتھ، آپ اپنی نظریں ان کے سوا کسی پر نہ ڈالیں

جس کی غرض یہی ہوسکتی ہے کہ حیاتِ دنیا کی زینت مقصود ہو، اور ایسے لوگوں کی بات نہ مانئے جن کے دلوں کو ہم نے اپنے ذکر سے غفلت میں ڈال دیا اور جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیرو ہوگئے، اور جن کا کام ہی حدود سے نکل جانا ہے"۔

آیت مذکورہ میں ان غریب لوگوں کی صفت یہ بتلائی کہ وہ صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس میں صبح و شام سے مراد محاورہ کے مطابق روز و شب کے تمام اوقات ہیں، اور پکارنے سے مراد عبادت کرنا ہے، اور روز و شب کی اس عبادت کے ساتھ یہ قید بھی لگا دی کہ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ جس نے بتلا دیا کہ عبادت میں جب تک اخلاص نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان کا حساب آپ کے ذمہ نہیں، اور آپ کا حساب ان کے ذمہ نہیں، ابن عطیہ اور زمخشری وغیرہ کی تحقیق کے مطابق اس میں حسابھم اور علیہم کی ضمیریں ان رؤساء مشرکین کی طرف راجع ہیں جو غریب مسلمانوں کو مجلس سے ہٹا دینے کی فرمائش کیا کرتے تھے، تو حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا کہ یہ لوگ خواہ ایمان لائیں یا نہ لائیں آپ بمقتضائے اخلاص ان کی پروا نہ کریں، کیونکہ ان کے حساب کی ذمہ داری آپ پر نہیں جیسا کہ آپ کے حساب کی ذمہ داری ان پر نہیں، اگر یہ ذمہ داری آپ پر ہوتی یعنی ان کے مسلمان نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ ہوتا، تو اس صورت میں آپ رؤساء مشرکین کی خاطر غریب مسلمین کو مجلس سے ہٹا سکتے تھے، اور جب ایسا نہیں تو ان کو مجلس سے ہٹانا محض بے انصافی ہے، اگر آپ ایسا کریں تو آپ کا شمار بے انصاف لوگوں میں ہوجائے گا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے اسی طرح ایک کو دوسروں کے ذریعہ آزمائش میں ڈال رکھا ہے، تاکہ رؤساء قریش خدا تعالیٰ کی اس قدرت قاہرہ کا تماشا دیکھیں کہ غریب مسلمان جن کو وہ حقیر و ذلیل سمجھتے تھے اللہ کے رسول کا اتباع کرنے سے کس مقام پر پہنچے، اور دنیا و آخرت میں ان کو کیسی عزت حاصل ہوئی، اور وہ یہ کہتے پھریں کہ کیا یہی غریب لوگ اللہ کے انعام و اکرام کے مستحق تھے کہ ہم سب اشراف کو چھوڑ کر ان کو نوازا گیا

ہر دمش برمنِ دل سوختہ لطفِ دگر است
ایں گدا بیں کہ چہ شائستہ انعام افتاد

کشاف وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ان کا یہ قول اسی ابتلاء و امتحان کا نتیجہ ہے جو ان کا ضعفاء مسلمین کے ذریعہ لیا گیا تھا، وہ اس امتحان میں ناکام ہوئے، بجائے اس کے کہ قدرت کے اس منظر پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچتے کہ شرافت و رذالت، مال و دولت وغیرہ پر موقوف نہیں بلکہ اس کا مدار اخلاق و اعمال پر ہے، وہ الٹا اللہ تعالیٰ پر یہ الزام لگانے لگے

تو اپنے مخلص دوست ہیں اُن سے یہ بات چیت کر لیں گے تو کچھ دیر کے لئے وہ مجلس سے جلد چلے جایا کریں گے ممکن ہے کہ اس طرح یہ رؤسائے قریش اللہ کا کلام سنیں اور مسلمان ہو جائیں۔

لیکن آیت سابقہ میں اس مشورہ کے خلاف یہ حکم نازل ہوا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے ایسا کرنا ظلم اور بے انصافی ہے، اس حکم کے نازل ہونے پر حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنی رائے اور مشورہ کی غلطی واضح ہوئی، اور ڈرے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف رائے دے کر گنہگار ہوگیا، **اس کی معذرت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔**

اس پر آیات مذکورہ ان کی تسلّی کے لئے نازل ہوئیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو گذشتہ غلطی پر مواخذہ نہ ہونے سے مطمئن فرمادیں بلکہ صرف یہی نہیں کہ اس غلطی پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا وعدہ بھی سنادیں، اور بارگاہ ارحم الراحمین کا یہ قانون ان کو بتلا دیں کہ جب کوئی مسلمان جہالت سے کوئی برا کام کر بیٹھے، اور پھر اپنی غلطی پر متنبہ ہوکر اس سے توبہ کرلے اور آئندہ کے لئے اپنے عمل درست کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہوں کو معاف فرمادیں گے اور آئندہ اپنی دنیوی اور اخروی نعمتوں سے بھی اس کو **محروم نہ فرمادیں گے۔**

اس تشریح کے مطابق یہ آیات اس خاص واقعہ میں نازل ہوئیں جن کا بیان پچھلی آیتوں میں ہوچکا ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے ان آیات کے مضمون کو ایک مستقل ہدایت نامہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے جو ان لوگوں سے متعلق ہے جن سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا، پھر **ندامت ہوئی، اور توبہ کرکے اپنے عمل کو درست کرلیا۔**

اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حکم جو کسی خاص واقعہ میں نازل ہوا ہو اگر اس کے الفاظ اور مضمون عام ہے تو وہ صرف اسی واقعہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتا، بلکہ ایک عام حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اگر بالفرض آیت مذکورہ کا نزول اسی واقعہ مذکورہ میں ہوا ہو تب بھی یہ حکم ایک عام ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہر اس گنہگار کو شامل ہے جس کو گناہ کے بعد بھی اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور نادم ہوکر اس نے اپنے آئندہ عمل کو درست کرلیا۔

اب ان آیات کی پوری تشریح دیکھئے، پہلی آیت میں ارشاد ہے، وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، یعنی جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، آیات سے مراد اس جگہ آیات قرآنی بھی ہوسکتی ہیں، اور اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کی علامات و نشانیاں بھی، تو آپ ان لوگوں

کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ اُن کو سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ سے خطاب فرمائیں یہاں سلام علیکم کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اللہ جل شانہٗ کا سلام پہنچا دیجئے، جس میں ان لوگوں کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے، اس صورت میں ان غریب مسلمانوں کی دلشکنی کا بہترین تدارک ہوگیا جن کے بارہ میں رؤسائے قریش نے مجلس سے ہٹا دینے کی تجویز پیش کی تھی، اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آپ ان لوگوں کو سلامتی کی خوش خبری سنا دیجئے کہ اگر ان لوگوں سے عمل میں کوتاہی یا غلطی بھی ہوئی ہے تو وہ معاف کر دی جائے گی، اور یہ ہر قسم کی آفات سے سلامت رہیں گے۔

دوسرے جملہ میں کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ میں اس احسان پر اور مزید احسان وانعام کا وعدہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ آپ ان مسلمانوں سے فرما دیں کہ تمہارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اس لئے بہت ڈریں اور گھبرائیں نہیں، اس جملہ میں اول تو رب استعمال فرما کر مضمون آیت کو مدلل کر دیا، کہ اللہ تعالیٰ تمہارا پالنے والا ہے، اور ظاہر ہے کہ کوئی پالنے والا اپنے پالے ہوئے کو ضائع نہیں کیا کرتا، پھر لفظ رب نے جس رحمت کی طرف اشارہ کیا تھا اس کو صراحۃً بھی ذکر فرما دیا، اور وہ بھی اس عنوان سے کہ تمہارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی شریف بھلے انسان سے بھی وعدہ خلافی سرزد نہیں ہوتی تو رب العالمین سے کیسے ہو سکتی ہے، خصوصاً جبکہ اس وعدہ کو بصورت معاہدہ لکھ لیا گیا ہو۔

صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد میں بروایت ابوہریرہؓ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا، تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ اِنَّ رَحۡمَتِیۡ غَلَبَتۡ غَضَبِیۡ، "یعنی میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے"

اور حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے تورات میں یہ لکھا دیکھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور ان کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، تو صفتِ رحمت کے سو حصے کر کے ان میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کر دیا، اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی اثر رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے، ماں باپ اور اولاد میں، بھائی بہنوں میں، شوہر بیوی میں، اور رشتہ داروں میں، پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو باہمی ہمدردی و محبت و رحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایک حصہ رحمت کے نتائج ہیں، باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے رکھے ہیں،

نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، خواہ غفلت و جہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارتِ نفس اور اتباعِ ہویٰ کی وجہ سے۔

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں گنہگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ، دوسرے اصلاحِ عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے: اِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ، یعنی توبہ نام ہے ندامت کا۔

دوسرے آئندہ کے لئے اصلاحِ عمل اس اصلاحِ عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا حدِ اختیار ان کو ادا کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے، اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ و تصرف کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذاء پہونچانا ہے۔

اس لئے تکمیلِ توبہ کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ گزشتہ گناہ پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، اور آئندہ کے لئے اپنے عمل کو درست رکھے، اس گناہ کے پاس نہ جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے ترک ہوگئے ہیں ان کی قضاء کرے، جو زکوٰۃ نہیں دی گئی وہ سب ادا کرے، قربانی، صدقۃ الفطر کے واجبات میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے اور خود نہ کر سکے تو حجِ بدل کرائے، اور اگر اپنے سامنے حجِ بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے کہ اس کے وارث اس کے ذمہ عائد شدہ واجبات کا فدیہ یا حجِ بدل کا انتظام کریں، خلاصہ یہ ہے کہ اصلاحِ عمل کے لئے صرف آئندہ کا عمل درست کر لینا کافی نہیں، پچھلے فرائض و واجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے، یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہونچائی ہے تو اس سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو مثلاً وہ مر جائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحبِ حق راضی ہو جائے گا، اور یہ شخص سبکدوش ہو جائے گا۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

تو کہہ دے مجھ کو روکا گیا ہے اس سے کہ بندگی کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا

قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (۵۶)

تو کہہ میں نہیں چلتا تمہاری خوشی پر بیشک میں تو بہک جاؤں گا اور نہ رہوں گا ہدایت پانے والوں میں

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ

تو کہہ دے مجھ کو شہادت پہنچی میرے رب کی اور تم نے اس کو جھٹلایا میرے پاس نہیں جس چیز کی تم جلدی

بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ (۵۷)

کر رہے ہو حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کے بیان کرتا ہے حق بات اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ

تو کہہ اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو طے ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے اور

بَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ (۵۸)

درمیان تمہارے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان معاندین سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ ان (معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (اور ان کے طریقہ کی گمراہی ظاہر کرنے کے لئے) آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے (باطل) خیالات کا اتباع نہ کروں گا، کیونکہ (اگر نعوذ باللہ میں ایسا کروں تو) اس حالت میں بے راہ ہو جاؤں گا اور (راہ راست) پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا، آپ (ان سے) یہ بھی کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو (اس دینِ اسلام کے حق ہونے پر) ایک دلیل (کافی موجود) ہے جو میرے رب کی طرف سے (مجھ کو ملی) ہے، یعنی قرآن مجید جو کہ میرا معجزہ ہے، جس سے میری تصدیق ہوتی ہے اور تم (بلا وجہ) اس کی تکذیب کرتے ہو (اور تم جو یہ کہتے ہو کہ اگر دینِ اسلام حق ہے تو ہمارے انکار پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب سخت آئے، جیسا کہ دوسری جگہ ان الفاظ سے مذکور ہے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ تو اس کا جواب یہ ہے کہ) جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی عذاب

ہیں، وہ میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) نہیں، حکم کسی کا نہیں (چلتا) بجز اللہ کے (اور اللہ کو حکم نزول عذاب کا ہوا نہیں تو میں کیسے عذاب دکھلا دوں) اللہ تعالیٰ حق بات کو دلیل سے بتلا دیتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا وہی ہے (چنانچہ اس نے میری رسالت کی واضح اور قوی دلیل قرآن کریم بھیج دیا اور دوسرے واضح معجزات ظاہر فرما دیئے، اور دلیل صحیح ایک بھی کافی ہوتی ہے تو تمہاری فرمائشی دلیلیں ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے اس وقت نزول عذاب کے ذریعہ فیصلہ نہیں فرمایا) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) وہ چیز ہوتی جس کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی عذاب) تو (اب تک) میرا اور تمہارا باہمی قضیہ (کبھی کا) فیصل ہو چکا ہوتا اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے (کہ کس کے ساتھ کیا معاملہ کس وقت کیا جاوے)

ربطِ آیات — آیات مذکورہ میں کفار کی طرف سے نزول عذاب کی عجلانہ فرمائش اور اس کا جواب خیر الفاصلین میں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر اعلم بالظالمین میں مذکور تھا، آگے تمام معلومات و مقدورات پر اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کا احاطہ بیان کیا جاتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ

اور اسی کے پاس ہیں خزانے غیب کی چیزوں کے، ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ جنگل

وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ

اور دریا میں ہے اور نہیں جھڑتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں گرتا کوئی دانہ

ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز، مگر وہ سب کتاب مبین

مُّبِيْنٍ ۞ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ

میں ہے، اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر چکے

بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ

ہو دن میں پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تاکہ پورا ہو وعدہ جو مقرر ہو چکا ہے پھر اسی کی طرف

مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ وَهُوَ الْقَاهِرُ

تم کو لوٹ جانا ہے پھر خبر دے گا تم کو اس کی جو کچھ تم کرتے تھے، اور وہی غالب ہے

ع ۷ ۱۲

فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ

اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان یہاں تک کہ جب آپہنچے کسی کو تم میں سے

الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْٓا

موت قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اور وہ کوتاہی نہیں کرتے، پھر پہنچائے جاویں گے

اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ

اللہ کی طرف جو مالک ان کا سچا ہے سن رکھو حکم اسی کا ہے اور وہ بہت جلد

الْحٰسِبِيْنَ ۝۶۲

حساب لینے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں (یعنی اسی کی قدرت میں ہیں) خزانے تمام مخفی اشیاء (ممکنہ) کے (ان میں سے جس چیز کو جس وقت چاہیں قدرت سے ظہور میں لاتے ہیں، ان اشیاء میں عذاب کی قسمیں بھی آگئیں، مقصد یہ ہے کہ کسی کو ان چیزوں پر قدرت نہیں، اور جس طرح قدرت کا میدان ان کے ساتھ خاص ہے، اسی طرح ان کا علم تام اور کامل بھی، چنانچہ) ان خزائن مخفیہ کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے، اور وہ ان تمام چیزوں کو بھی جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریا میں ہیں اور کوئی پتہ (تک درخت سے) نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ (تک) زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز (مثل پھل وغیرہ کے) گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہیں، اور وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے کہ (اکثر) رات میں (سونے کے وقت) تمہاری روح (نفسانی) کو (جس سے احساس و ادراک متعلق ہے) ایک گونہ قبض کرلیتا ہے (یعنی معطل کردیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو (دوام) جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ (اسی سونے جاگنے کے دوروں سے) میعاد معین (دنیوی زندگی کی) تمام کردی جاوے پھر اسی (اللہ) کی طرف (مر کر) تم کو جانا ہے، پھر تم کو بتلادے گا جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے، (اور اس کے مناسب جزاء اور سزا جاری کرے گا) اور وہی (اللہ تعالیٰ قدرت سے) اپنے بندوں کے اوپر غالب ہیں برتر ہیں اور (اے بندو) تم پر (تمہارے اعمال اور جان کی) نگرانی کرنے والے (فرشتے) بھیجتے ہیں (جو زندگی بھر تمہارے اعمال کو بھی

دیکھتے ہیں اور تمہاری جان کی بھی حفاظت کرتے ہیں، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو اس وقت اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کرلیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے، بلکہ جس وقت حفاظت کا حکم تھا حفاظت کرتے رہے جب موت کا حکم ہوگیا تو یہی محافظ روح قبض کرنے والے فرشتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں) پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جاویں گے، خوب سن لو اس وقت، فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا (اور کوئی دخل نہ دے سکے گا) اور وہ بہت جلد حساب لے لے گا۔

معارف ومسائل

گناہوں سے بچنے کا نسخہ اکسیر

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکن اعظم عقیدۂ توحید ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک اور اکیلا جاننے کا نام توحید نہیں، بلکہ اس کو تمام صفات کمال میں یکتا و بے مثل ماننے اور اس کے سوا کسی مخلوق کو ان صفتِ کمال میں اس کا سہیم و شریک نہ سمجھنے کو توحید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال: حیٰوۃ، علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ، مشیت، خلق، رزق وغیرہ وہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں: ایک علم، دوسرے قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود و غیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی و محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری پوری محیط ہے، مذکورہ دو آیتوں میں انہی دو صفتوں کا بیان ہے، اور یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں پر مکمل یقین اور اس کے استحضار کی کیفیت پیدا کرلے تو اس سے کوئی جرم و گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، ظاہر ہے کہ اگر ایک انسان کو اپنے ہر قول و عمل اور نشست و برخاست میں ہر قدم پر یہ مستحضر رہے کہ ایک علیم و خبیر قادر مطلق مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے، اور میرے ظاہر و باطن اور دل کے ارادہ اور خیال تک سے واقف ہے تو یہ استحضار کبھی اس کا قدم اس قادرِ مطلق کی نافرمانی کی طرف نہ اٹھنے دے گا، اس لئے یہ دونوں آیتیں انسان کو انسان کامل بنانے اور اس کے اعمال و اخلاق کو درست کرنے اور درست رکھنے میں نسخۂ اکسیر ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ

لفظ مفاتح جمع ہے، اس کا مفرد مَفْتَح بفتح میم بھی ہوسکتا ہے، جو خزانہ کے لئے بولا جاتا ہے،

اور مفتح بکسرِ میم بھی ہو سکتا ہے، جس کے معنی ہیں کنجی، لفظ مفاتح میں دونوں معنی کی گنجائش ہے، اسی لئے بعض مفسرین اور مترجمین نے اس کا ترجمہ خزانوں سے کیا ہے، اور بعض نے کنجیوں سے، در اصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ کنجیوں کا مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا مراد ہوتا ہے۔

قرآنی صراحت میں علم غیب اور قدرت عامہ مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں

اور لفظ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں، یا وجود میں تو آچکی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا، پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات و واقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، یا کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ کون کب اور کہاں پیدا ہوگا کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کتنے سانس لے گا کتنے قدم اٹھائے گا کہاں مرے گا کہاں دفن ہوگا، رزق کس کو کتنا اور کس وقت ملے گا، بارش کس وقت، کہاں اور کتنی ہوگی۔

اور دوسری قسم کی مثال وہ حمل ہے جو عورت کے رحم میں وجود تو اختیار کر چکا ہے، مگر کسی کو معلوم نہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی خوب صورت ہے یا بد صورت، نیک طبیعت ہے یا بد خصلت، اسی طرح اور ایسی چیزیں جو وجود میں آجانے کے باوجود مخلوق کے علم و نظر سے غائب ہیں۔

عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے پاس ہیں خزانے غیب کے، اس کے پاس ہونے سے مراد اس کی ملک اور قبضہ میں ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ غیب کے خزانوں کا علم بھی اس کے قبضہ میں ہے، اور ان کو وجود و ظہور میں لانا بھی اسی کی قدرت میں ہے کہ کب کب اور کتنا کتنا وجود میں آئے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں مذکور ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ، یعنی ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک خاص اندازے سے نازل کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جملہ سے حق تعالیٰ کا بے مثل کمال علمی بھی ثابت ہوگیا اور کمال قدرت بھی، اور یہ بھی کہ یہ علم محیط اور قدرت مطلقہ صرف اللہ جل شانہ کی صفت ہے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی، آیت میں لفظ عِنْدَهٗ کو مقدم کرکے قواعد عربیت کے مطابق اسی حصر و اختصاص کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، آگے اس اشارہ کو صراحت میں تبدیل کرکے پوری طرح دلنشین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، یعنی ان خزائن غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس لئے اس جملہ سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اول حق تعالیٰ کا تمام غیب کی چیزوں پر علم محیط کے ساتھ مطلع اور ان سب پر قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہونا، دوسرے ذاتِ حق

جل شانہ کے سوا کسی مخلوق یا کسی چیز کو یہ علم و قدرت حاصل نہ ہونا۔

قرآن کی اصطلاح میں لفظ غیب کے جو معنی (بحوالہ تفسیر مظہری) اوپر بیان کئے گئے ہیں کہ وہ چیزیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا آچکی ہیں مگر ابھی تک کسی مخلوق پر ان کا ظہور نہیں ہوا، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو مسئلۂ غیب پر سطحی نظر میں جو جو شبہات عوام کو پیش آیا کرتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں۔

لیکن عام طور پر لوگ لفظ غیب کے لغوی معنی لیتے ہیں کہ جو چیز ہمارے علم و نظر سے غائب ہو، خواہ دوسروں کے نزدیک اس کا علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں اس کو بھی غیب کہنے لگتے ہیں، اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں، مثلاً علم نجوم، جفر، رمل، یا ہتھیلی کی لکیروں وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، یا کشف و الہام کے ذریعہ کسی شخص کو واقعات آئندہ کا علم ہو جاتا ہے، یا مانسون کا رُخ اور اس کی قوت رفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے بادوباراں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور ان میں بہت سی باتیں صحیح بھی ہو جاتی ہیں، یہ سب چیزیں عوام کی نظر میں علم غیب ہوتی ہیں، اس لئے آیت مذکورہ پر یہ شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن حکیم نے تو علم غیب کو ذاتِ حق جل شانہ کی خصوصیت بتلایا ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

جواب واضح ہے کہ کشف والہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دیدی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علم غیب نہ رہا، اسی طرح اسباب و آلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جا سکے وہ بھی اصطلاحِ قرآنی کے لحاظ سے علم غیب نہیں، جیسے محکمۂ موسمیات کی خبریں یا نبض دیکھ کر مریض کے مخفی حالات بتلا دینا، وجہ یہ ہے کہ محکمۂ موسمیات کو یا کسی حکیم، ڈاکٹر کو ایسی خبریں دینے کا موقع جب ہی ہاتھ آیا جب ان واقعات کا مادّہ پیدا ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے، فرق اتنا ہے کہ ابھی اس کا ظہور عام نہیں ہوتا آلات کے ذریعہ اہل فن کو ظاہر ہوتا ہے، عوام بے خبر رہتے ہیں، اور جب یہ مادّہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محکمۂ موسمیات مہینہ دو مہینہ بعد ہونیوالی بارش کی خبر آج نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی اس بارش کا مادّہ سامنے نہیں آیا، اسی طرح کوئی حکیم ڈاکٹر سال دو سال پہلے کی کھائی ہوئی، یا دو سال بعد کھائی جانے والی دوا یا غذا وغیرہ کا پتہ آج نبض دیکھ کر نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کا کوئی اثر عادۃً نبض میں نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ کسی چیز کے آثار و نشانات دیکھ کر اس کے

وجود کی خبر دیدی جاتی ہے، مگر جب اس کے آثار و نشانات اور وہ ظاہر ہوچکا تو اب وہ غیب میں شامل نہ رہا بلکہ مشاہدہ میں آگیا، البتہ لطیف یا ضعیف ہونے کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آیا، جب قوت پکڑے گا تو عام مشاہدہ میں بھی آجائے گا۔

اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ و اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے، علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں سے کسی چیز سے کسی کو حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان خبروں کے غلط ہونے کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

اور علم نجوم وغیرہ سو اس میں جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں اُن کا علم تو علم ہے، مگر وہ غیب نہیں، جیسے حساب لگا کر کوئی یہ کہے کہ آج دن کے کر آٹھ بیس منٹ پر آفتاب طلوع ہوگا یا فلاں مہینہ فلاں تاریخ کو چاند گرہن یا سورج گرہن ہوگا ظاہر ہے کہ یہ ایک محسوس چیز کی رفتار کا حساب لگا کر وقت کی تعیین کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ہوائی جہازوں اور ریلوں کے کسی پورٹ یا اسٹیشن پر پہونچنے کی خبر دیدیتے ہیں، اس کے علاوہ نجوم وغیرہ سے جو خبریں معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ دھوکہ کے سوا کچھ نہیں، سو جھوٹ میں ایک سچ نکل آنا کوئی علم نہیں۔

حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کے بارے میں بھی بہت سے اہلِ فن کچھ کہا کرتے ہیں، مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کا درجہ بھی وہی تخمینہ و اندازہ کا ہے یقینی نہیں، اور سو میں دو چار کا صحیح ہو جانا ایک طبعی امر ہے، وہ کسی علم و آگہی سے تعلق نہیں رکھتا۔

اور جب ایکسرے کے آلات ایجاد ہوئے تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اس کے ذریعہ حمل کا نر یا مادہ ہونا معلوم ہو جایا کرے گا، مگر تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ایکسرے کے آلات بھی یہ متعین نہیں کر سکتے کہ حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز قرآنی اصطلاح میں غیب ہے، اس کا سوائے خدائے قدوس کے کسی کو علم نہیں، اور جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب و آلات کے ذریعہ عادۃً حاصل ہو جاتا ہے وہ درحقیقت غیب نہیں، گو ظہورِ عام نہ ہونے کی وجہ سے اس کو غیب کہتے ہوں۔

اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف و الہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دیدیا گیا تو وہ غیب کی حدود سے نکل گیا، اس کو قرآن میں غیب کی بجائے انباء الغیب کہا گیا ہے، جیسا کہ متعدد آیات میں مذکور ہے: تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ، اس لئے آیت مذکورہ میں لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، یعنی غیب کے

خزانوں کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اس میں کسی شبہ یا استثناء کی گنجائش نہیں۔

اس جملہ میں تو حق جل شانہ کی یہ مخصوص صفت بتلائی گئی ہے کہ وہ عالم الغیب ہے، ہر غیب کو جانتا ہے، بعد کے جملوں میں غیب کے بالمقابل علم شہادت یعنی حاضر و موجود چیزوں کے علم کا بیان ہے کہ ان کے علم میں بھی اللہ جل شانہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا علم محیط ہے کوئی ذرہ اس سے باہر نہیں، ارشاد فرمایا کہ وہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور اس چیز کو جو دریا میں ہے، اور کوئی پتہ کسی درخت کا نہیں گرتا جس کا علم اس کو نہ ہو، اسی طرح کوئی دانہ جو زمین کے تاریک حصہ میں مستور ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، اور ہر تر و خشک میں کل کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے علم میں ہے اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کے متعلق دو چیزیں حق تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہیں، جن میں کوئی فرشتہ یا رسول یا کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں، ایک علم غیب، دوسرے موجودات کا علم محیط جس سے کوئی ذرہ مخفی نہیں، اسی آیت میں انہی دونوں مخصوص صفات کا بیان..... اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کے پہلے جملہ میں پہلی خصوصیت کا بیان ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، اور بعد کے جملوں میں تمام کائنات و موجودات کے علم محیط کا ذکر اس طرح فرمایا کہ پہلے ارشاد ہوا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور جو دریا میں ہے، مراد اس سے کل کائنات و موجودات ہے، جیسے صبح و شام کا لفظ بول کر پورا زمانہ اور مشرق و مغرب کا لفظ بول کر پوری زمین مراد لی جاتی ہے، اسی طرح بر و بحر یعنی خشکی اور دریا بول کر مراد اس سے پورے عالم کی کائنات و موجودات ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔

آگے اس کی مزید تشریح و تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر احاطہ علمی صرف یہی نہیں کہ بڑی بڑی چیزوں کا اس کو علم ہو، بلکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مخفی سے مخفی چیز بھی اس کے علم میں ہے، فرمایا وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا یعنی سارے جہان میں کسی درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا جو اس کے علم میں نہ ہو، مراد یہ ہے کہ ہر درخت کا ہر پتہ گرنے سے پہلے اور گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے وہ جانتا ہے کہ ہر پتہ درخت پر لگا ہوا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، اور کب اور کہاں گرے گا، اور پھر وہ کس کس حال سے گذرے گا، گرنے کا ذکر شاید اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتہ کا درخت سے گرنا اس کے نشو و نما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہے، آخری حال کا ذکر کر کے تمام حالات کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ، یعنی ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، پہلے درخت کے پتہ کا ذکر کیا جو عام نظروں کے سامنے گرتا ہے، اس کے بعد دانہ کا ذکر کیا جو کاشتکار زمین میں ڈالتا ہے، یا خودبخود کہیں زمین کی گہرائی اور اندھیری میں مستور ہوجاتا ہے، اس کے بعد پھر تمام کائنات پر علم باری تعالیٰ کا حاوی ہونا تر اور خشک کے عنوان سے ذکر فرمایا، اور فرمایا کہ یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں لکھی ہوئی ہیں، کتاب مبین سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک لوح محفوظ ہے، اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد علم الٰہی ہے، اور اس کو کتاب مبین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے لکھی ہوئی چیز محفوظ ہوجاتی ہے، اس میں سہو ونسیان کی راہ نہیں رہتی اسی طرح اللہ جل شانہ کا یہ علم محیط تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا صرف تخمینی نہیں بلکہ یقینی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ اس طرح کا علم محیط جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال خارج نہ ہو یہ صرف ذات حق جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہے، سورۂ لقمان میں ہے:

اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ

"یعنی اگر کوئی دانہ رائی کے برابر ہو پھر وہ پتھر کے جگر میں پیوست ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں کہیں ہو، اللہ تعالیٰ اس سب کو جمع کرلیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ لطیف اور ہر چیز سے خبردار ہے"

آیۃ الکرسی میں ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ

"یعنی اللہ تعالیٰ سب انسانوں کے اگلے اور پچھلے سب حالات سے واقف ہیں اور سارے انسان مل کر اس کے علم میں سے کسی ایک چیز کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، بجز اتنے علم کے جو اللہ تعالیٰ کسی کو دینا چاہیں"

سورۂ یونس میں ہے:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ

"یعنی ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز زمین و آسمان میں آپ کے رب کے علم سے جدا نہیں ہے"

اور سورۂ طلاق میں ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝

"یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"

اسی طرح بے شمار آیات میں یہ مضمون مختلف عنوانات سے آیا ہوا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ یہ بیان فرما دیا گیا ہے کہ غیب کا علم (جس کو قرآن میں غیب کہا گیا ہے اور اس کی تفسیر اوپر گذر چکی ہے) یا تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے...... کسی فرشتہ یا رسول کے علم کو اسی طرح ہر ذرہ کائنات پر محیط سمجھنا وہ عیسائیوں کی طرح رسول کو خدا کا درجہ دیدینا ہے اور خدا تعالیٰ کے برابر قرار دیدینا ہے جو بتصریح قرآن کریم شرک ہے، سورۂ شعراء میں شرک کی یہی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّیْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

"یعنی قیامت کے روز مشرکین کہیں گے کہ بخدا ہم سخت گمراہی میں تھے کہ تم کو یعنی بتوں کو رب العالمین کے برابر کرتے تھے۔"

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے اور سب فرشتوں اور انبیاء سے زیادہ عطا فرمایا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم نہیں، نہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر یہ رسول کی تعظیم کا وہ غلو ہوگا جو عیسائیوں نے اختیار کیا، کہ رسول کو خدا کے برابر ٹھہرا دیا، اسی کا نام شرک ہے، نعوذ باللہ منہ۔

یہاں تک پہلی آیت کا بیان تھا جس میں اللہ جل شانہ کی صفتِ علم کی خصوصیات کا بیان ہے، کہ وہ ہر غیب و شہادت اور ہر ذرہ ذرہ کائنات پر حاوی ہے، دوسری آیت میں اسی طرح حق تعالیٰ کی صفتِ قدرت اور اس کے قادرِ مطلق ہونے کا بیان ہے جو اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر رات میں تمہاری روح کو ایک گونہ قبض کر لیتا ہے، اور پھر صبح کو جگا کر اٹھا دیتا ہے، تاکہ تمہاری مقررہ عمر پوری کردے، اور پھر دن بھر میں تم جو کچھ کرتے رہتے ہو وہ سب اس کے علم میں ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ ہے کہ انسان کے جینے، مرنے، اور مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا ایک نمونہ ہر روز اس کے

سامنے آ جاتا ہے۔ حدیث میں نیند کو موت کا بھائی فرمایا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ نیند انسان کے تمام قویٰ کو ایسا ہی معطل کر دیتی ہے جیسے موت۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے نیند اور پھر اس کے بعد بیداری کی مثال پیش فرما کر انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس طرح ہر رات اور ہر صبح میں ہر شخص شخصی موت اور مر کر جینے کی ایک مثال کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح پورے عالم کی اجتماعی موت اور پھر اجتماعی زندگی کو سمجھ لو، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، جو ذات اس پر قادر ہے اس کی قدرت کاملہ سے وہ بھی مستبعد نہیں، اسی لئے آخر آیت میں فرمایا ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ یعنی پھر تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو جتلا دے گا جو تم عمل کیا کرتے تھے، اور یہ ہے کہ اعمال کا حساب ہوگا، پھر اس پر جزاء و سزا ہوگی۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں پر ایک قوت قاہرہ رکھتا ہے، جب تک اس کو ان کا زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو حفاظت کرنے والے فرشتے ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیتا ہے، کسی کی مجال نہیں جو اس کو نقصان پہنچا سکے، اور جب کسی بندہ کا مقررہ وقت عمر کا پورا ہو جاتا ہے تو یہی حفاظت کرنے والے فرشتے اس کی موت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور اب اس کی موت کے اسباب فراہم کرنے میں ذرا کمی نہیں کرتے، اور پھر مر کر بھی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ یعنی دوبارہ زندہ ہو کر پھر اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر کئے جائیں گے، اس جگہ احکم الحاکمین کے سامنے پیشی اور عمر بھر کے حساب کا جب خیال کیا جائے تو کس کی مجال ہے جو پورا اتر سکے، اور عذاب سے بچ نکلے، اس لئے اس کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ، یعنی اللہ تعالیٰ صرف حاکم اور احکم الحاکمین ہی نہیں وہ اپنے بندوں کے مولیٰ بھی ہیں جو ہر موقع پر ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا اَلَا لَهُ الْحُكْمُ، بیشک فیصلہ اور حکم صرف اسی کا ہے، یہاں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایک ذات اربوں انسانوں کی پوری پوری عمروں کا حساب نمٹے گا کس طرح؟ اس لئے اس کے بعد فرمایا وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے، وہ بہت جلد سب حساب پورا فرما لیں گے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ

تو کہہ کون تم کو بچا لاتا ہے جنگل کے اندھیروں سے اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو

خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

تم اس کو گڑگڑا کر اور چپکے سے کہ اگر ہم کو بچا لیوے اس بلا سے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

تو کہہ دے اللہ تم کو بچاتا ہے اس سے اور ہر سختی سے پھر بھی تم شرک کرتے ہو

خُلاصۂ تفسیر

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات (یعنی شدائد) سے اس حالت میں نجات دے دیتا ہے کہ تم اس کو (نجات دینے کے لئے) پکارتے ہو (کبھی) تذلل ظاہر کر کے اور (کبھی) چپکے چپکے (اور یوں کہتے ہو) کہ (اے اللہ) اگر آپ ہم کو ان (ظلمات) سے (اب کی) نجات دیدیں تو (پھر) ہم ضرور حق شناسی (پر قائم رہنے) والوں سے ہو جاویں (یعنی آپ کی توحید کے بڑی حق شناسی ہے قائل رہیں، اور اس سوال کا جواب چونکہ متعین ہے اور وہ لوگ بھی کوئی دوسرا جواب نہ دیں گے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے (جب کبھی نجات ملتی ہے) اور (ان ظلمات مذکورہ کی کیا تخصیص ہے بلکہ) ہر غم سے (وہی نجات دیتا ہے مگر) تم (ایسے ہو کہ) پھر بھی (بعد نجات پانے کے بدستور) شرک کرنے لگتے ہو (جو کہ اعلیٰ درجہ کی ناحق شناسی ہے، اور وعدہ کیا تھا حق شناسی کا۔ غرض یہ کہ شدائد میں تمہارے اقرار سے توحید کا حق ہونا ثابت ہو جاتا ہے، پھر انکار کب قابلِ التفات ہے)

معارف ومسائل

علم الٰہی اور قدرت مطلقہ کے کچھ مظاہر

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہٗ کے علم و قدرت کا کمال اور اُن کی بے مثال وسعت بیان کی گئی تھی، مذکورہ آیات میں اسی علم و قدرت کے کچھ آثار اور مظاہر کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں لفظ ظلمات، ظلمۃ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں اندھیری، ظلمات البر والبحر کے معنی خشکی اور دریا کی اندھیریاں ہے، چونکہ اندھیری کی مختلف قسمیں ہیں، رات کی اندھیری،

گھٹا بادل کی اندھیری، گرد و غبار کی اندھیری اور دریا میں موجوں کی اندھیری، ان تمام قسموں کو شامل کرنے کے لئے لفظ ظلمات جمع استعمال فرمایا گیا ہے۔

اگرچہ انسان کے سونے اور آرام کرنے کے لئے اندھیری بھی ایک نعمت ہے، لیکن عام حالات میں انسان کا کام روشنی ہی سے چلتا ہے، اور اندھیری سب کاموں سے معطل کرنے کے علاوہ بہت سے مصائب اور آفات کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے عرب کے محاورہ میں لفظ ظلمات مصائب اور حوادث و آفات کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں بھی جمہور مفسرین نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اللہ جل شانہ نے مشرکین مکہ کو تنبیہ اور ان کی غلط کاری پر آگاہ کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں سے یہ سوال کریں کہ بری اور بحری سفروں میں جب کبھی وہ کسی مصیبت میں گھر جاتے ہیں، تو اس وقت تمام بتوں کو بھول کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، کبھی علانیہ اپنی ذلت و عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں اور کبھی دل دل میں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اس مصیبت سے تو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں بچا سکتا، اور اس ذہن کے ساتھ یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دیدی تو ہم شکر و حق شناسی کو اپنا شیوہ بنائیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں گے، اسی کو اپنا کارساز سمجھیں گے، اس کے سوا کسی کو اس کا شریک نہ سمجھیں گے کیونکہ جب ہماری مصیبت میں کوئی کام نہ آیا تو ہم ان کی پوجا پاٹ کیوں کریں، تو اب آپ ان سے پوچھئے کہ ان حالات میں کون ان کو مصائب اور ہلاکت سے نجات دیتا ہے؟ چونکہ ان کا جواب متعین اور معلوم تھا کہ وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بت یا دیوتا اس وقت میں ان کے کام نہیں آیا، اس لئے دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے خود ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ ہی بتلائیے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہیں اس مصیبت سے نجات دیں گے، بلکہ تمہاری ہر تکلیف و پریشانی اور بے چینی کو وہی دور فرمائیں گے، مگر ان سب کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود کہ جب تم کو نجات و آرام مل جاتا ہے تو تم پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہو اور بتوں کی پوجا پاٹ میں لگ جاتے ہو، یہ کیسی غداری اور مہلک قسم کی جہالت ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان بھی ہے کہ ہر انسان کو ہر مصیبت اور تکلیف سے نجات دینے پر اس کو پوری قدرت ہے، اور یہ بھی کہ ہر قسم کی مصیبتوں اور تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور

بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت اور بدیہی ہے کہ ساری عمر بتوں اور دیوتاؤں کو پوجنے اور پکارنے والے بھی جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں اس وقت وہ بھی صرف خدا تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اسی کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔

عبرت | مشرکین کا یہ طرز عمل ان کی زندگی کے اعتبار سے کتنی ہی برا ہو، مگر مصیبت پڑنے کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور حقیقت کا اعتراف ہم مسلمانوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے باوجود مصیبتوں کے وقت بھی خدا تعالیٰ کو یاد نہیں کرتے بلکہ ہمارا سارا دھیان مادی سامانوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، ہم اگرچہ مورتوں اور تصویری بتوں کو اپنا کارساز نہیں سمجھتے، مگر یہ مادی سامان اور اسباب و آلات بھی ہمارے لئے بتوں سے کم نہیں جن کی فکروں میں ہم ایسے گم ہیں کہ خدا تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی طرف کبھی دھیان نہیں ہوتا۔

حوادث و مصائب آئیں تو ہر بیماری میں صرف ڈاکٹروں اور دواؤں کا اور ہر طوفان اور سیلاب کے کا مقابلہ اس وقت صرف مادی سامانوں کو اپنا کارساز سمجھ کر اسی کی فکر میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ مالک کائنات کی طرف دھیان تک نہیں جاتا، حالانکہ قرآن کریم نے بار بار واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے مصائب اور حوادث عموماً انسانوں کے اعمال بد کے نتائج اور آخرت کی سزا کا ہلکا سا نمونہ ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ مصائب مسلمانوں کے لئے ایک طرح کی رحمت ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ غافل انسانوں کو چونکایا جاتا ہے تاکہ وہ اب بھی اپنے اعمال بد کا جائزہ لے کر ان سے باز آنے کی فکر میں لگ جائیں اور آخرت کی بڑی اور سخت سزا سے محفوظ رہیں، اسی مضمون کے لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

"اور ہم ان لوگوں کو تھوڑا سا عذاب قریب دنیا میں چکھا دیتے ہیں آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے تاکہ وہ اپنی غفلت اور برائیوں سے باز آجائیں"

قرآن کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے:

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ (شوریٰ)

"یعنی جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال بد کا نتیجہ ہے اور بہت سے برے اعمال کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں"

اس آیت کے بیان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ہوجانا غفلت و بے حسی کے ساتھ بھی ممکن ہے لیکن جب مجموعی حیثیت سے پوری خلق خدا کے
حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب چیزیں ناکام نظر آتی ہیں، موجودہ زمانہ میں انسان کو راحت
پہنچانے اور اس کی ہر تکلیف کو دور کرنے کے لئے کیسے کیسے آلات اور سامان ایجاد کئے گئے ہیں
اور کئے جا رہے ہیں کہ اب سے تیس چالیس سال پہلے کے انسان کو ان کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا
امراض کے علاج کے لئے نئی نئی دوائیں اور طرح طرح کے انجکشن اور بڑے بڑے ماہر
ڈاکٹر اور ان کے لئے جا بجا شفاخانوں کی بہتات کون نہیں جانتا کہ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے
کا انسان ان سب سے محروم تھا، لیکن مجموعی حالت کا جائزہ لیا جائے تو ان آلات و سامان
سے محروم انسان اتنا بیمار نہ تھا جتنا آج کا انسان بیماریوں کا شکار ہے، اسی طرح
آج عام وباؤں کے لئے طرح طرح کے ٹیکے موجود ہیں، حوادث سے انسان کو بچانے کے لئے
آگ بجھانے والے انجن اور مصیبت کے وقت فوری اطلاع اور فوری امداد کے ذرائع اور
سامان کی فراوانی ہے، لیکن جتنا جتنا یہ مادی سامان بڑھتا جاتا ہے، انسان حوادث اور آفات
کا شکار پہلے سے زیادہ ہوتا جاتا ہے، وجہ اس کے سوا نہیں کہ پچھلے دور میں خالق کائنات سے
غفلت اور کھلی نافرمانی اتنی نہ تھی جتنی اب ہے، وہ سامان راحت کو خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر
شکر گذاری کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اور آج کا انسان بغاوت کے ساتھ استعمال
کرنا چاہتا ہے، اس لئے آلات و سامان کی بہتات اس کو مصیبت سے نہیں بچاتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشرکین کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ
مصیبت کے وقت وہ بھی خدا ہی کو یاد کرتے تھے، مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے تمام مصائب
و تکلیفوں کے دور کرنے کے لئے مادی سامان اور تدبیروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف
رجوع کرے، ورنہ انجام وہی ہوگا جو روز مشاہدہ میں آ رہا ہے، کہ ہر تدبیر مجموعی حیثیت سے
اُلٹی پڑتی ہے، سیلابوں کو روکنے اور ان کے نقصانات سے بچنے کی ہزار تدبیریں کی جاتی ہیں
مگر وہ آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں، امراض کے علاج کی نئی نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، مگر
امراض روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، اشیاء کی گرانی رفع کرنے کے لئے ہزاروں تدبیریں
کی جاتی ہیں اور وہ سطحی طور پر مؤثر بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے نتیجہ یہ ہے کہ
گرانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، چوری، ڈکیتی، اغوا، رشوت ستانی، چور بازاری کو روکنے
کے لئے کتنی مادی تدبیریں آج ہر حکومت استعمال کر رہی ہے، مگر حساب لگائیے تو ہر روز
ان جرائم میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے، کاش آج کا انسان صرف شخصی اور سطحی اور سرسری نفع
نقصان کی سطح سے ذرا بلند ہو کر حالات کا جائزہ لے تو اس کو ثابت ہوگا کہ مجموعی حیثیت

سے ہماری مادی تدبیریں سب ناکام ہیں بلکہ مصائب میں اضافہ کر رہی ہیں، پھر اس قرآنی عدالت پر نظر کیجئے کہ مصائب سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت کی طرف رجوع کیا جائے، مادی تدبیروں کو بھی اسی کی عطا کی ہوئی نعمت کے طور پر استعمال کیا جائے، اس کے سوا سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ

تو کہہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب اوپر سے یا تمہارے

أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم

پاؤں کے نیچے سے یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی

بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

ایک کی، دیکھ کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ سمجھ جاویں،

وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿٦٦﴾

اور اس کو جھوٹ بتلایا تیری قوم نے حالانکہ وہ حق ہے تو کہہ دے کہ میں نہیں تم پر داروغہ

لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٦٧﴾

ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ اس کو جان لو گے

خلاصۂ تفسیر

آپ (یہ بھی) کہئے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہے) اسی طرح اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر و شرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے سے (جو زمین ہے اس) سے نمودار کردے (جیسے زلزلہ یا غرق ہو جانا اور ان عذابوں کے اسباب قریبہ تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کبھی نہ کبھی ایسے ہوگئے خواہ دنیا میں یا آخرت میں) یا کہ تم کو (اغراض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو آپس میں بھڑا دے (یعنی لڑا دے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعہ مزہ) چکھا دے (اور اس کا سبب قریب فعل اختیاری ہے) اور یا سب آفتیں جمع کردے، غرض نجات دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا دونوں اسی کی قدرت میں ہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھئے تو سہی ہم کس کس طرح دلائل توحید کو مختلف پہلوؤں سے

بیان کرتے ہیں شاید وہ لوگ سمجھ جاویں اور (اللہ تعالیٰ کے عذاب دینے پر قادر ہونے اور کفر و شرک کے سبب عذاب ہونے کو جاننے کے باوجود) آپ کی قوم کے لوگ (قریش و عرب بھی) اس (عذاب) کی تکذیب کرتے ہیں (اور اس کے واقع نہ ہونے کے معتقد ہیں) حالانکہ وہ یقینی واقع ہونے والا ہے (اور اس کو سن کر وہ یوں کہتے ہیں کہ کب ہوگا تو) آپ یوں کہہ دیجئے کہ میں تم پر (عذاب واقع کرنے کے لئے) تعینات نہیں کیا گیا ہوں (کہ مجھ کو تفصیل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ) ہر خبر کے (وقوع کا) ایک وقت (اللہ کے علم میں متعین) ہے اور جلدی ہی تم کو معلوم ہو جاوے گا (کہ یہ عذاب آیا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کے وسیع علم اور بے مثل قدرت کا یہ اثر مذکور تھا کہ ہر انسان کی ہر مصیبت کو وہی دور کر سکتا ہے اور مصیبت کے وقت جو اس کو پکارتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد وہ آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ اس کی تمام کائنات پر قدرت بھی کامل ہے اور تمام مخلوق پر رحمت بھی کامل، اس کے سوا کسی کو قدرت کاملہ حاصل ہے اور نہ تمام مخلوق پر رحمت و شفقت۔

مذکور الصدر آیات میں قدرت کاملہ کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ہے کہ کوئی عذاب کوئی مصیبت اور کیسی ہی بڑی سے بڑی آفت ہو اس کو ٹال سکتا ہے، اسی طرح اس کو اس پر بھی قدرت حاصل ہے کہ جب کسی فرد یا جماعت کو اس کی سرکشی کی سزا اور عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو ہر قسم کا عذاب اس کے لئے آسان ہے، کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے دنیا کے حکام کی طرح اس کو نہ کسی پولیس اور فوج کی حاجت ہے اور نہ کسی مددگار کی ضرورت، اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا: هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا، یعنی اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ بھیج دے تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا تمہیں مختلف پارٹیوں میں بانٹ کر آپس میں بھڑا دے اور ایک کو دوسرے کے ہاتھ سے عذاب میں ہلاک کر دے۔

عذاب الٰہی کی تین قسمیں یہاں عذاب الٰہی کی تین قسموں کا ذکر ہے، ایک جو اوپر سے آئے، دوسرے جو نیچے سے آئے، تیسرے جو اپنے اندر سے پھوٹ پڑے، پھر لفظ عَذَابًا کو اس جگہ تنوین کے ساتھ نکرہ لا کر عربی قواعد کے اعتبار سے اس پر بھی متنبہ کر دیا کہ ان تینوں

میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کر دیتا ہوں وہ ان کو ہر طرح کا برا عذاب چکھاتے ہیں اس لئے تم حکام کو برا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دے۔"

اسی طرح ابوداؤد و نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جب اللہ تعالیٰ کسی امیر و حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیدیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لئے کوئی برائی مقدر ہوتی ہے تو برے آدمیوں کو اس کے وزراء و ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔ (الحدیث)

ان روایات اور آیت مذکورہ کی مذکورہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکلیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہونچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہونچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے بلکہ ایک قانون الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، حضرت سفیان ثوری نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر ...... اور اپنی سواری کے گھوڑے اور بار برداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

خلق را با تو چنیں بدخو کنند

تا ترا ناچار رو آں سو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے زبردست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلاف مزاج اور تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلط کر کے درحقیقت تمہارا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کر کے آخرت کے عذاب اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم وجور اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، کام چوری، غداری، نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا

جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی امید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے ؎

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ لفظ عَذَابًا جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے، آسمان سے برسنے والے پتھر، خون، آگ اور پانی کا سیلاب اور بالادست حکام کا ظلم وجور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی زمین سے اُبل کر غرق ہو جانا، یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں اور باہم ایک دوسرے کے لئے عذاب بن جائیں۔ اس میں لفظ يَلْبِسَكُمْ، لبس کے مادہ سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں، اسی معنی سے لباس اُن کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لے، اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ و اشتباہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔

اور لفظ شِيَعًا، شِيْعَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع، قرآن مجید میں ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ "یعنی نوح علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام"، اسی لئے عرف و محاورہ میں لفظ شیعہ ایسی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی خاص غرض کے لئے جمع ہوں، اور اس غرض میں ایک دوسرے کے معاون ہوں جس کا بامحاورہ ترجمہ آجکل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔

اس لئے آیت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے، اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

"یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن

[illegible] | (اخرجہ ابن ابی حاتم عن زید بن اسلم، مظہری)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے، ہمارا گذر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی، اس کے بعد آپ دعا میں مشغول ہو گئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا، ایک یہ کہ میری امت کو غرق کرکے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمالی، دوسرے یہ کہ میری اُمت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمالی، تیسری دعا یہ کی کہ میری امت آپس کے جنگ و جدال سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعا سے روک دیا گیا۔ (مظہری بحوالہ البغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرما دے جو سب کو تباہ و برباد کر دے، یہ دعا قبول ہوئی اور آپس میں نہ بھڑیں اس دعا کو منع کر دیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے اُن کی پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا رہے گا، وہ عذاب آپس کی جنگ و جدال اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہو کر باہمی آویزش اور جنگ و جدال سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ و جدال کے ذریعہ آئے گا۔

سورۂ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ (ہود)	"یعنی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی"

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں (بلا وجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں وہ رحمت خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی نحوست اور مذموم چیز ہے، آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو بیشتر مصائب کا سبب باہمی کا اختلاف اور تشتت نظر آئے گا، ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہو گیا کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا، اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطے میں ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل و نسب سے متعلق ہو سب بھائی بھائی تھے، کوہ و دریا کی دشوار گذار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں، نسب و خاندان، رنگ و زبان کا تفاوت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا، انکی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی، عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی، کی تقسیمیں صرف شناخت و تعارف کے لئے تھیں اور کچھ نہیں، بقول اقبال مرحوم ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی و لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا، اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر بھی تشتت اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی، وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگذر اور ایثار تھا، اور جھگڑے سے بچنے کے لئے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی، آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں، یہی وہ اغراض و اہواء کا اختلاف ہے جو قوم و ملت کے لئے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔

ہاں اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الٰہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو، یا نفسانی اغراض و اہواء کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصول اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے، جن میں فریقین کی حجت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے، مگر قرآن و سنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی، فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے، ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالہ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اِخْتِلَافُ اُمَّتِيْ رَحْمَةٌ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ امتِ محمدیہ کی خصوصیت اس لئے نقل فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء متقین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہوگا، اور صدق نیت و للّٰہیت سے ہوگا، کوئی نفسانی غرض جاہ و مال وغیرہ ان کے اختلاف کی محرک نہ ہوگی، اس لئے وہ کسی جنگ و جدال کا سبب بھی نہ بنے گا، بلکہ علامہ عبدالرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسالک اصولِ قرآن و سنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکامِ خدا اور رسول ہی کہلائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال خصوصیات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام، اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے، یہ روڈ کی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے، مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزلِ مقصود پر پہنچے گا، اس لئے راستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کے لئے وسعت و رحمت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں، اور جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں، ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک راجح ہے، مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے مسلک کو بھی وہ باطل نہیں کہتے، بلکہ ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے ہیں، فقہاء صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کے بے شمار حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے، جنگ و جدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مذاہبِ فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک صحیح علم و دیانت رہی ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

یہ اختلاف ہے جو رحمت ہی رحمت اور لوگوں کے لئے وسعت و سہولت کا ذریعہ

اور بہت سے مفید نتائج کا حامل ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ فروعی مسائل میں رائے کا
اختلاف جہاں تک اپنی حد کے اندر رہے وہ کوئی مضر چیز نہیں، بلکہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں
کو کھولنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں معین ہے، اور جہاں دیانت دار عقلاء جمع ہوں گے
تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف نہ ہو، ایسا اتفاق تو یا بے حسوں میں
ہو سکتا ہے جن کو کوئی سمجھ بوجھ نہ ہو، یا بے دینوں میں ہو سکتا ہے جو کسی پارٹی وغیرہ کی
رعایت سے خلاف ضمیر رائے میں اتفاق کا اظہار کریں۔

اختلاف رائے جو اپنی حدود کے اندر ہو، یعنی قرآن و سنت کے قطعی اور اعتقادی
مسائل اور قطعی احکام میں نہ ہو، صرف فروعی مسائل اجتہادیہ میں ہو جن میں قرآن و سنت
کی نصوص ساکت یا مبہم ہیں، اور وہ بھی جنگ و جدال اور طعن و تشنیع کی حد تک نہ پہنچے تو وہ
بجائے مذموم ہونے کے مفید اور ایک نعمت و رحمت ہے، جیسے کائنات عالم کی تمام چیزوں
کا شکل و صورت، رنگ و بو اور خاصیت و منفعت میں اختلاف ہے، یا دنیا میں لاکھوں
مختلف قسمیں بنی نوع انسان کی مزاجوں اور پیشوں، صنعتوں اور رہن سہن کے طریقوں
میں اختلاف یہ سب اس عالم کی رونق بڑھانے والے اور ہزاروں منافع کے اسباب ہیں۔

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء
کے فتووں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے
کہ علماء میں اختلاف ہے تو ہم کدھر جائیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے، کہ جس طرح
کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم
کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر و تجربہ کار کون ہے،
بس اس کا علاج کرتے ہیں، دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں
میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے
کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا
چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے
کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ برتر و افضل سمجھیں اس کا اتباع
کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ مفتی کا انتخاب اور
درصورت اختلاف ان میں سے کسی شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ
میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام

یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے لیکن یہ اس کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے، مگر دوسرے علماء و مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے، اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے،

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب، اگر چوروں ڈاکوؤں باغیوں کی ایک جماعت آپس میں متفق ہوجائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کے لئے مہلک ہے، اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی جانب سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے،

معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں، بلکہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں جو بعد کی خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دیانت کی کمی اور غرض نفسانی و انتہار کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لئے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کی یہ جماعتیں ہر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل اور بعض اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی خدمت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ مذہب کا اس غلو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی گمراہی کا سبب قرار دیا ہے (ترمذی، ابن ماجہ)

دوسری آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ (وسلم) کی برادری یعنی قریش مکہ کی مخالفت حق کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ یہ لوگ جو آپ سے وقوع عذاب کا معین وقت پوچھتے ہیں، آپ ان سے فرمادیں کہ میں اس کام کے لئے مسلط نہیں کیا گیا، بلکہ ہر بات کا ایک وقت اللہ کے علم میں مقرر ہے، وہ اپنے وقت پر ہو رہے گی، اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو کہ جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر

حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ

یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی اور بات میں اور اگر بھلا دے تجھ کو شیطان

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى

تو مت بیٹھ یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ ۔ اور پرہیزگاروں پر

الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ

نہیں ہے جھگڑنے والوں کے حساب میں سے کوئی چیز لیکن ان کے ذمہ نصیحت کرنی ہے تاکہ وہ

يَتَّقُوْنَ ۝ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ

ڈریں ۔ اور چھوڑ دے ان کو جنہوں نے بنا رکھا ہے اپنے دین کو کھیل اور تماشا اور دھوکہ دیا ان کو

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ

دنیا کی زندگی نے اور نصیحت کر ان کو قرآن سے تاکہ گرفتار نہ ہو جاوے کوئی اپنے کئے میں

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ

کہ نہ ہو اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے والا اور اگر بدلے میں دے سارے

عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ

بدلے تو قبول نہ ہو اس سے وہی لوگ ہیں جو گرفتار ہوئے اپنے کئے میں ان کو

لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

پینا ہے گرم پانی اور عذاب ہے دردناک بدلے میں کفر کے

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ

تو کہہ دے کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا اس کو جو نفع پہنچا نہ سکے ہم کو اور نہ نقصان اور

نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ

کیا پھر جاویں ہم الٹے پاؤں اس کے بعد کہ اللہ سیدھی راہ دکھلا چکا ہم کو مثل اس شخص کے کہ

الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ

رستہ بھلا دیا اس کو جنوں نے جنگل میں جبکہ وہ حیران ہو اس کے رفیق بلاتے ہیں اس کو

اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَ

رستہ کی طرف کہ چلا آ ہمارے پاس تو کہہ دے کہ اللہ نے جو راہ بتلائی وہی سیدھی راہ ہے اور

اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ

ہم کو حکم ہوا ہے کہ تابع رہیں پروردگار عالم کے اور یہ کہ قائم رکھو نماز کو اور

اتَّقُوهُ ۚ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٧٢﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ

ڈرتے رہو اس سے اور وہی ہے جس کے سامنے تم سب اکٹھے ہو گے اور وہی ہے جس نے بنایا

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُن فَيَكُونُ ۚ

آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر اور جس دن کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گا

قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ

اسی کی بات سچی ہے اور اسی کی سلطنت ہے جس دن پھونکا جاوے گا صور جاننے والا چھپی

وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٧٣﴾

اور کھلی باتوں کا اور وہی ہے حکمت والا جاننے والا

خلاصۂ تفسیر

اور اے مخاطب! جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات (اور احکام) میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں (کے پاس) سے کنارہ کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاویں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے (یعنی اس مجلس میں بیٹھنے کی ممانعت یاد نہ رہے) تو جب یاد آوے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالموں کے پاس مت بیٹھ (بلکہ فوراً اٹھ کھڑا ہو) اور (اگر کوئی واقعی دنیوی یا دینی ضرورت ایسی مجلس میں جانے کی ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ) جو لوگ (ممنوعات شرعیہ سے جن میں بلا ضرورت ایسی مجلس میں جانا بھی داخل ہے) احتیاط رکھتے ہیں، ان پر ان (طعن کرنے والوں) مکذبین کی باز پرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی بضرورت وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے) ولیکن ان کے ذمہ (حسب قدرت) نصیحت کر دینا ہے، شاید وہ (طعن دینے والے) بھی (ان خرافات سے) احتیاط کرنے لگیں (خواہ قبول اسلام کر کے خواہ ان کے لحاظ سے) اور (کچھ مجلس تکذیب کی تخصیص نہیں، بلکہ) ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہ جنہوں نے اپنے (اس) دین کو (جس کا ماننا ان کے ذمہ فرض تھا یعنی اسلام کو) لہو و لعب بنا رکھا ہے (کہ اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں) اور دنیوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے (کہ اس کی لذات میں مشغول ہیں اور آخرت کے منکر ہیں، اس لئے اس تمسخر کا نتیجہ نظر نہیں آتا) اور (کنارہ کشی و ترک تعلق کے ساتھ ایسے لوگوں کو) اس قرآن کے ذریعہ سے (جس سے یہ تمسخر کر رہے ہیں) نصیحت بھی کرتا رہ تاکہ کوئی شخص اپنے کردار (بد) کے سبب (عذاب میں) اس طرح نہ پھنس جاوے

توحید پر ایمان کی ظاہری علامت ہے) اور یہ حکم ہوا ہے کہ اس سے (یعنی اللہ سے) ڈرو (یعنی مخالفت نہ کرو جس میں سب سے بڑھ کر شرک ہے) اور وہی (اللہ) ہے جس کے پاس تم سب (قیامت کے دن قبروں سے نکل کر حساب کے لئے) جمع کئے جاؤ گے (وہاں مشرکین کو اپنے شرک کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا) اور وہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو با فائدہ پیدا کیا (جس میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خالق کے وجود اور توحید پر استدلال کیا جائے پس یہ بھی توحید کی ایک دلیل ہے۔ اور اوپر جو تُحْشَرُوْنَ میں حشر یعنی قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دی ہے اس کو بھی کچھ مستبعد مت سمجھو کیونکہ وہ قدرتِ الٰہیہ کے سامنے اس قدر آسان ہے کہ) جس وقت اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا کہ (حشر) تو ہو جا بس وہ (حشر فوراً) ہو پڑے گا (اس کا یہ کہنا) بااثر ہے (خالی نہیں جاتا) اور (حشر کے روز) جبکہ صور میں (بحکم الٰہی دوسری بار فرشتہ کی) پھونک ماری جائے گی ساری حکومت (حقیقتاً بھی ظاہراً بھی) خاص اسی (اللہ) کی ہوگی (اور وہ اپنی حکومت سے موحدین و مشرکین کا فیصلہ کرے گا) وہ (اللہ) جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا (پس مشرکین کے اعمال و احوال کا بھی اس کو علم ہے) اور وہی ہے بڑی حکمت والا (اس لئے مناسب جزاء ہر ایک کو دے گا) اور وہی ہے پوری خبر رکھنے والا (اس لئے کسی امر کا اخفاء اس سے ممکن نہیں)۔

معارف و مسائل

اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز کا حکم

آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو ایک اہم اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہئے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

پہلی آیت میں لفظ یَخُوْضُوْنَ، خوض سے بنا ہے جس کے اصلی معنی پانی میں اترنے اور اس میں گذرنے کے ہیں، اور لغو و فضول کاموں میں داخل ہونے کو بھی خوض کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں یہ لفظ عموماً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ اور فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ، وغیرہ آیات اس کی شاہد ہیں۔

اسی لئے خوض فی الآیات کا ترجمہ اس جگہ عیب جوئی یا جھگڑنے کا کیا گیا ہے، یعنی جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں محض لہو و لعب اور استہزاء و تمسخر کے لئے دخل دیتے ہیں اور عیب جوئی کرتے ہیں تو آپ ان سے رخ پھیر لیں۔

اس آیت کا خطاب عام مخاطب کو ہے، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں اور امت کے افراد بھی، اور درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب بھی عام مسلمانوں کو سنانے کے لئے ہے ورنہ آپ تو بچپن میں بھی کبھی ایسی مجلس میں شریک نہیں ہوئے، اس لئے کسی ممانعت کی آپ کو ضرورت نہ تھی۔

پھر اہل باطل کی مجلس سے رخ پھیرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اس مجلس سے اٹھ جائیں، دوسرے یہ کہ وہیں رہتے ہوئے کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، انکی طرف التفات نہ کریں، لیکن آخر آیت میں بتلا دیا گیا کہ مراد پہلی ہی صورت ہے، کہ ان کی مجلس میں بیٹھے نہ رہیں، وہاں سے اٹھ جائیں۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اگر تم کو شیطان بھلا دے یعنی بھول کر ان کی مجلس میں شریک ہو گئے خواہ اس طرح کہ ایسی مجلس میں شریک ہونے کی ممانعت یاد نہ رہی، یا اس طرح کہ یہ یاد نہ رہا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تذکرے اپنی مجلس میں کیا کرتے ہیں، تو اس صورت میں جس وقت بھی یاد آجائے اسی وقت اس مجلس سے اٹھ جانا چاہئے، یاد آجانے کے بعد وہاں بیٹھا رہنا گناہ ہے، دوسری ایک آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد ہوا ہے، اور اس کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ اگر تم وہاں بیٹھے رہے تو تم بھی انہی جیسے ہو۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت کا اصل منشاء گناہ کی مجلس و مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی ہے جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے لیکن اگر وہاں سے اٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عوام کے لئے یہ بھی جائز ہو کہ کنارہ کشی کی کوئی دوسری صورت اختیار کریں مثلاً کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، اور ان لوگوں کی طرف التفات نہ کریں، مگر خواص جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہرحال اٹھ جانا ہی مناسب ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ، یعنی اگر تجھ کو شیطان بھلا دے۔ اس کا خطاب عام مسلمانوں کو ہے تو بات صاف ہے کہ بھول اور نسیان ہر انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اور اگر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول و نبی پر بھی بھول اور نسیان کا اثر ہو جایا کرے تو ان کی تعلیمات پر کیسے اعتماد و اطمینان رہ سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی کسی خاص حکمت و مصلحت کے تحت بھول تو

ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً ان کو تنبیہ بذریعہ وحی ہو جاتی ہے جس سے وہ بھول پر قائم نہیں رہتے، اس لئے بالآخر ان کی تعلیمات بھول اور نسیان کے شبہ سے پاک ہو جاتی ہیں۔

بہر حال آیت کے اس جملے سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص سہو و نسیان سے کسی غلطی میں مبتلا ہو جائے تو وہ معاف ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ارشاد ہے،

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ	"یعنی میری امت سے خطاء اور بھول کا
وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ	اور اس کام کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے جو
	کسی نے زبردستی اس سے کرا دیا ہو"

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ "اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں، اور اس کو بند کرنا یا کرانا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ و اختیار میں نہ ہو، ہاں اگر ایسی مجلس میں بہ نیت اصلاح شریک ہو اور ان لوگوں کو حق بات کی تلقین کرے تو مضائقہ نہیں" اور آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آ جانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاص نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے ظالم بے دین اور دریدہ دہن لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا مطلق گناہ ہے، خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو ایسی بیہودہ گفتگو شروع کرتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے، وجہ استدلال کی یہ ہے کہ اس میں مطلقاً ظالموں کے ساتھ بیٹھنے کو منع فرمایا گیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ اس وقت بھی ظلم کرنے میں مشغول ہوں۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی یہی مضمون واضح طور پر بیان ہوا ہے فرمایا کہ وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ "یعنی ظالم لوگوں کے ساتھ میل جول اور میلان نہ رکھو، ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ سے پالا پڑے گا"

جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر ان کی مجالس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر دوسری آیت اس کے بعد نازل ہوئی، وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِہِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰکِنْ ذِکْرٰی لَعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ ۝ یعنی جو لوگ احتیاط رکھنے والے

ہیں وہ اگر اپنے کام سے بچ جاتے ہیں تو ان شریر لوگوں کے اعمال بد کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچا دیں، شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آجائیں۔

تیسری آیت میں بھی تقریباً اسی مضمون کی مزید تاکید اس طرح ارشاد فرمائی گئی ہے: وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا اس میں لفظ ذَرْ، وَذْر سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز سے نفرت ہو کر اس کو چھوڑ دینا، معنی آیت کے یہ ہیں کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو لہو و لعب بنا رکھا ہے، اس کا استہزاء و تمسخر کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہو و لعب کو بنا لیا ہے۔ دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، یعنی ان کو دنیا کی چند روزہ زندگی نے غرور اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، یہ ان کے مرض کا اصل سبب بیان فرمایا کہ ان کی اس ساری سرکشی و نافرمانی کا اصلی سبب یہ ہے کہ دنیا ہی کی چند روزہ زندگی پر مفتون ہیں، اور آخرت کو بھلائے بیٹھے ہیں، اگر آخرت اور قیامت کا اعتقاد ہوتا تو ہرگز وہ یہ حرکتیں نہ کرتے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کو دو حکم دیئے گئے ہیں، اوّل یہ کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں جس کا بیان مذکورہ جملہ میں آچکا ہے، دوسرے یہ کہ صرف ان لوگوں سے کنارہ کشی اور اعراض ہی کافی نہیں، بلکہ تبلیغی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت بھی کرتے رہیں اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں۔

آخر آیت میں اس عذاب کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی، کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو یہ اپنے کردار بد کے جال میں خود پھنس جائیں گے، آیت میں اس جگہ اَنْ تُبْسَلَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی قید ہو جانے اور پھنس جانے کے ہیں۔

چونکہ دنیا میں انسان اس کا خوگر ہے کہ اگر کبھی کوئی غلطی یا ظلم کسی پر کر بیٹھتا ہے اور اس کی سزا اس کے سامنے آگئی تو سزا سے بچنے کے لئے تین قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے اپنے ظلم کی پاداش سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر اس سے عاجز ہو گیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے، اور یہ بھی نہ چلی تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے کچھ مال خرچ کر کے

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ خدا کے مجرم کے لئے سزا سے بچنے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے نہ کسی کی سفارش بغیر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے چل سکتی ہے اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ اس سب مال کو سزا سے بچنے کا فدیہ بنانا چاہے تب بھی یہ فدیہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

آخر آیت میں فرمایا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال بد کی سزا میں پکڑے گئے ہیں، ان کو پینے کے لئے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا جس کے متعلق دوسری آیت میں ہے کہ وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا، اور اس پانی کے علاوہ دوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے ان کے کفر و انکار کے بدلے میں۔

اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ آخرت سے غافل صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہیں، ان کی صحبت و مجالست بھی ... انسان کے لئے مہلک ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والا بھی اس عذاب کا شکار ہوگا جس میں وہ مبتلا ہیں۔

ان تینوں آیتوں کا حاصل مسلمان کو بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچانا ہے جو انسان کے لئے سم قاتل ہے قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام بُرائیوں اور جرائم میں مبتلا کرنے والی چیز اس کی بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد انسان اوّل تو خلافِ ضمیر اور خلافِ طبع برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو یہ برائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص اوّل گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ نقطہ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس کو بھی گناہ سے دل میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور پچھلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو یکے بعد دیگرے سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دل کی نورانی لوح بالکل سیاہ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی، قرآن مجید میں اسی کو لفظ ران سے تعبیر فرمایا ہے، كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ یعنی ان کے دلوں میں ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے زنگ لگ گیا کہ صلاحیت ہی مفقود ہو گئی۔

اور جہاں تک غور کیا جائے انسان کو اس حالت پر پہونچانے والی چیز اکثر اس کا غلط

ماحول اور بری صحبت میں ہوتے ہیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، اس لئے بچوں کے مربیوں کا فرض ہے کہ بچوں کو ایسے ماحول اور سوسائٹی سے بچانے میں پوری کوشش کریں۔

اگلی تین آیتوں میں بھی شرک کے ابطال اور توحید اور آخرت کے اثبات کا مضمون ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۚ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو کیا تو مانتا ہے بتوں کو خدا،

إِنِّيٓ أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ

میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہ ہیں۔ اور اسی طرح ہم دکھانے لگے

إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ

ابراہیم کو عجائبات آسمانوں اور زمین کے اور تاکہ اس کو

الْمُوقِنِينَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ

یقین آجاوے۔ پھر جب اندھیری کر لی اس پر رات نے دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا

هٰذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْاٰفِلِينَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا

یہ ہے رب میرا، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہوجانے والوں کو۔ پھر جب

رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ

دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت

يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّينَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ

کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک میں ہوں گا گمراہ لوگوں میں۔ پھر جب دیکھا

الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّي هٰذَآ أَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ

سورج جھلکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا

يٰقَوْمِ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۷۸﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

اے میری قوم میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو۔ میں نے متوجہ کر لیا اپنے منہ کو اسی کی طرف

لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۷۹﴾ ۚ

جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے یکسو ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ

اور اس سے جھگڑا اس کی قوم نے، بولا کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو اللہ کے ایک ہونے میں اور وہ مجھ کو سمجھا

مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ

چکا اور میں ڈرتا نہیں ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کے مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچانی چاہے، احاطہ

رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَیْفَ اَخَافُ

کر لیا ہے میرے رب کے علم نے سب چیزوں کا، کیا تم نہیں سوچتے، اور میں کیونکر ڈروں

مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ

تمہارے شریکوں سے اور تم نہیں ڈرتے اس بات سے کہ شریک کرتے ہو اللہ کا جس کی نہیں اتاری

عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

اس نے تم پر کوئی دلیل، اب دونوں فرقوں میں کون مستحق ہے دل جمعی کا، بولو اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

سمجھ رکھتے ہو

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر (نامی) سے فرمایا کہ کیا تو بتوں کو معبود قرار دیتا ہے، بیشک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو (جو اس اعتقاد میں تیرے شریک ہیں) صریح غلطی میں دیکھتا ہوں (اور ستاروں کے متعلق جو آگے گفتگو آنے کی، درمیان میں ابراہیم علیہ السلام کا صحت نظر کے ساتھ موصوف ہونا کہ ماقبل و مابعد دونوں سے اس کا تعلق ہے فرماتے ہیں) اور ہم نے ایسی ہی (کامل) طور پر ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات (بچشم معرفت) دکھلائیں، تاکہ وہ (خالق کی ذات و صفات کے) عارف ہو جاویں اور تاکہ (ازدیاد معرفت سے) کامل یقین کرنے والوں سے ہو جاویں (آگے ستاروں کے متعلق گفتگو کہ تتمہ مناظرہ کا ہے مذکور ہے کہ اوپر کی گفتگو تو بتوں کے متعلق ہو چکی، پھر اسی دن یا کسی اور دن) جب رات کی تاریکی ان پر (اسی طرح اور سب پر) چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا (کہ چمک رہا ہے) آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا)

تو استقلالِ قدرت مفقود ہے، ہاں اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے (تو وہ دوسری بات ہے وہ ہو جاوے گی لیکن اس سے آلہہ اور اربابِ باطلہ کی قدرت کا ثبوت یا اُن سے خوف کی ضرورت کب لازم آئی اور) میرا پروردگار (جس طرح قادرِ مطلق ہے جیسا ان اشیاء سے معلوم ہوا اسی طرح وہ) ہر چیز کو اپنے احاطۂ علم میں (بھی) گھیرے ہوئے ہے (غرض قدرت و علم دونوں اُسی کے ساتھ مختص ہیں، اور تمھارے آلہہ کو نہ قدرت ہے نہ علم ہے) کیا تم (سنتے ہو اور) پھر (بھی) خیال نہیں کرتے اور (جس طرح میرے نہ ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمھارے معبود علم و قدرت سے محض عاری ہیں، اسی طرح یہ بات بھی تو ہے کہ میں نے کوئی کام ڈر کا کیا بھی تو نہیں تو پھر) میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے (اللہ تعالیٰ کے ساتھ استحقاقِ عبادت اور اعتقادِ ربوبیت میں) شریک بنایا ہے، حالانکہ (تم کو ڈرنا چاہئے دو وجہ سے اوّل تم نے ڈر کا کام یعنی شرک کیا ہے جس پر غضب مرتب ہوتا ہے، دوسرے خدا کا عالم اور قادر ہونا معلوم ہو چکا ہے، مگر) تم اس بات (کے وبال) سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن (کے معبود ہونے) پر اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل (نقلی یا عقلی نازل) نہیں فرمائی (مطلب یہ کہ ڈرنا چاہئے تم کو، پھر اُلٹا مجھ کو ڈراتے ہو) سو بعد اس تقریر کے انصاف سے سوچ کر بتلاؤ کہ) ان دو (مذکورہ) جماعتوں میں سے (یعنی مشرکین و موحدین میں سے) امن کا (یعنی اس کا کہ اس پر خوف واقع نہ ہو) زیادہ مستحق کون ہے، اور خوف بھی وہ جو واقع میں قابلِ اعتبار ہے، یعنی آخرت کا) اگر تم (کچھ) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکینِ عرب کو خطاب اور بُت پرستی چھوڑ کر صرف خدا پرستی کی دعوت کا بیان تھا۔

ان آیات میں اسی دعوتِ حق کی تائید ایک خاص انداز میں فرمائی گئی ہے، جو طبعی طور پر اہلِ عرب کے لئے دلنشین ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جدِ امجد ہیں اور اسی لئے سارا عرب ان کی تعظیم پر ہمیشہ سے متفق چلا آیا ہے، ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے بُت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، اور پھر سب کو توحیدِ حق کا سبق دیا تھا۔

پہلی آیت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم نے

اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود بنایا ہے، میں تم کو اور تمہاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

مشہور یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ہے، اور اکثر مورخین نے ان کا نام تارخ بتلایا ہے اور یہ کہ آزر ان کا لقب ہے۔ اور امام رازی اور علماء سلف میں سے ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر ہے، ان کا چچا آزر نمرود کی وزارت کے بعد شرک میں مبتلا ہوگیا تھا، اور چچا کو باپ کہنا عربی محاورات میں عام ہے، اسی محاورہ کے تحت آیت میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ فرمایا گیا ہے، زرقانی نے شرح مواہب میں اس کے کئی شواہد بھی نقل کئے ہیں۔

اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت اپنے گھر اور اپنے خاندان سے شروع کرنی چاہئے

آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں یا چچا بہر حال نسبی طور پر ان کے قابل احترام بزرگ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے دعوت حق اپنے گھر سے شروع فرمائی، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم ہوا ہے وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈرایئے، اور آپ نے اس کے ماتحت سب سے پہلے اپنے خاندان ہی کو کوہ صفا پر چڑھ کر دعوت حق کے لئے جمع فرمایا۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر خاندان کے کوئی واجب الاحترام بزرگ دین کے صحیح راستہ پر نہ ہوں تو ان کو صحیح راستہ کی طرف دعوت دینا احترام کے خلاف نہیں بلکہ ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دعوت حق اور اصلاح کا کام اپنے قریبی لوگوں سے شروع کرنا سنتِ انبیاء ہے۔

دو قومی نظریہ، مسلمان ایک قوم اور کافر دوسری قوم ہے

نیز اس آیت میں حضرت ابراہیم نے اپنے خاندان اور قوم کی نسبت اپنی طرف کرنے کے بجائے باپ سے یہ کہا کہ تمہاری قوم گمراہی میں ہے، اس میں اس عظیم قربانی کی طرف اشارہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی راہ میں اپنی مشرک برادری سے قطع تعلق کرکے دی اور اپنے عمل سے بتلا دیا کہ مسلم قومیت رشتہ اسلام سے قائم ہوتی ہے، نسبی اور وطنی قومیتیں اگر اس سے متصادم ہوں تو وہ سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد

فدائے یک تنِ بیگانہ کآشنا باشد

قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو ذکر کرکے آئندہ آنے والی

امتوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں، ارشاد ہے: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهٗٓ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ، یعنی امت محمدیہ کے لئے اسوۂ حسنہ اور قابل اقتداء ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عمل کہ انھوں نے اپنی نسبی اور وطنی برادری سے صاف کہدیا کہ ہم تم سے اور تمھارے غلط معبودوں سے بیزار ہیں، اور ہمارے تمھارے درمیان بغض و عداوت کی دیوار اس وقت تک حائل ہے جب تک تم ایک اللہ کی عبادت اختیار نہ کرلو۔

معلوم ہوا کہ یہ دو قومی نظریہ جس نے پاکستان بنوایا ہے، اس کا اعلان سب سے پہلے حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہے، امت محمدیہ اور دوسری تمام امتوں نے حسب ہدایت یہی طریقہ اختیار کیا، اور عام طور پر مسلمانوں میں قومیت اسلام معروف ہوگئی، حجۃ الوداع کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قافلہ ملا، آپ نے پوچھا کہ تم کس قوم سے ہو، تو جواب دیا نَحْنُ قَوْمٌ مُّسْلِمُوْنَ، یعنی عرب میں عرب کے سابقہ دستور کے مطابق کسی قبیلہ یا خاندان کا نام لینے کے بجائے مُسْلِمُوْنَ کہہ کر حقیقی قومیت کو بتلادیا جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلنے والی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ اپنے باپ سے خطاب کے وقت تو برادری کی نسبت ان کی طرف کرکے اپنی بیزاری کا اعلان فرمایا اور جس جگہ قوم سے اپنی بیزاری اور قطع تعلق کا اعلان کرنا تھا وہاں اپنی طرف منسوب کرکے خطاب کیا، جیسے اگلی آیت میں ہے، يٰقَوْمِ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ، یعنی اے میری قوم! میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں، اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ نسب اور وطن کے لحاظ سے تم میری قوم ہو، لیکن تمھارے مشرکانہ افعال نے مجھے تمھاری برادری سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برادری اور ان کے باپ دوہرے شرک میں مبتلا تھے کہ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے، اور ستاروں کی بھی، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی دونوں مسئلوں پر اپنے باپ اور اپنی قوم سے مناظرہ کیا۔

پہلے بت پرستی کا ضلالت و گمراہی ہونا ذکر فرمایا، اگلی آیت میں ستاروں کا قابل عبادت نہ ہونا بیان فرمایا، اور اس سے پہلے ایک آیت میں بطور تمہید کے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی ایک خاص شان اور علم و بصیرت میں اعلیٰ مقام کا ذکر اس طرح فرمایا: وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو اس طرح دکھلا دیا کہ ان کو سب چیزوں کی حقیقت واشگاف طور پر معلوم ہوجائے، اور ان کا یقین مکمل ہوجائے اسی کا نتیجہ تھا جو

بعد کی آیات میں ایک عجیب طرح کے مناظرہ کی شکل میں اس طرح مذکور ہے :

تبلیغ و دعوت میں حکمت و تدبیر سے کام لینا سنت انبیاء ہے

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ، یعنی ایک رات میں جب تاریکی چھا گئی اور ایک کوکب یعنی ستارہ پر نظر پڑی تو اپنی قوم کو سنا کر کہا کہ یہ تو میرا رب ہے، مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالات و عقائد کی رُو سے یہی میرا اور تمہارا رب یعنی پالنے والا ہے، اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا، چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہوگیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر حجت تمام کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا، اور فرمایا لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ، آفلین کا یہ لفظ اُفول سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غروب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ میں غروب ہوجانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا، اور جس کو خدا یا معبود بنایا جائے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت و عظمت کا مستحق ہونا چاہیے، مولانا رُومی نے ایک شعر میں اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے، ؎

خلیل آسا در ملک یقین زن

نوائے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ زن

اس کے بعد پھر کسی دوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ اختیار فرمایا اور کہا کہ (تمہارے عقائد کے مطابق) یہ میرا رب ہے، مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آجائے گی، چنانچہ جب چاند غروب ہوگیا تو فرمایا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا رہتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہوجاتا، اور چاند ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھ بیٹھتا، لیکن اس کے طلوع و غروب کے بدلنے والے حالات نے مجھے متنبہ کردیا کہ یہ ستارہ بھی قابلِ عبادت نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ میرا رب کوئی دوسری شے ہے جس کی طرف سے مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز آفتاب کو نکلتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اسی طریقہ پر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا رب ہے، اور یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر اس بڑے کی حقیقت و حیثیت بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی، چنانچہ آفتاب بھی اپنے وقت پر غروب ہوگیا، تو قوم پر آخری حجت تمام کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرمادیا کہ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ یعنی اے میری قوم: میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بیزار ہوں کہ تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدائی کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالنے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہو سکتا جو خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہیں اور ہر وقت ہر آن عروج و نزول اور طلوع و غروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں، بلکہ ہمارا سب کا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اس لئے میں نے اپنا رخ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات و تاثرات میں گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف کر لیا ہے، اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس واقعۂ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت و موعظت سے کام لے کر یکبارگی ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسا انداز قائم کیا، جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب و دماغ خود متأثر ہو کر حقیقت کو پہچان لے، ہاں بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اول ہی شدت اختیار فرمائی، اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کر دیا، وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نامعقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا، بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو استدلال بیان فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو اور اس کے حالات ادل بدل ہوتے رہتے ہوں، اور وہ اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا رب قرار دیں، اس استدلال میں ستاروں کے طلوع غروب اور درمیانی تمام حالات سے استدلال کیا جا سکتا تھا، کہ وہ اپنی حرکات میں خود مختار نہیں کسی کے حکم کے تابع ایک خاص روش پر چلتے رہتے ہیں، لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات و کیفیات میں سے استدلال کے لئے ان ستاروں کے غروب کو پیش کیا، کیونکہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرز استدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو، وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے، بلکہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں، اس لئے ان ستاروں کی بے بسی اور بے اثری ثابت کرنے کے لئے ان کے غروب کو پیش کیا، ورنہ ان کے بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی استدلال ہو سکتا تھا، اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جا سکتی ہے۔

مبلغین اسلام کے لئے چند ہدایات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرز مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لئے چند اہم ہدایات حاصل ہوئیں: اول یہ کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں

نرم جگہ سختی مناسب ہے نہ ہر جگہ نرمی، بلکہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے، جیسے یہاں بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرما دیا، کیونکہ سیاروں و ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام لفظوں میں واضح نہ ہو تو علماء و مبلغین کو چاہئے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنے کی تدبیر کریں۔

دوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ اظہار حق و حقیقت کے لئے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یوں خطاب نہیں کیا کہ تم ایسا کرو، بلکہ اپنا حال بتلا دیا کہ میں تو ان طلوع وغروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا، اس لئے میں نے اپنا رُخ ایک ایسی ہستی کی طرف کرلیا ہے جو ان سب چیزوں کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے۔ مقصود تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے، مگر حکیمانہ انداز میں صریح خطاب سے پرہیز فرمایا، تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور مبلغ کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لئے مؤثر ہو۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ

جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انہوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان انہی کے واسطے ہے

الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿۸۲﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ

دلجمعی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر ۔ اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس

عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۸۳﴾

کی قوم کے مقابلہ میں درجے بلند کرتے ہیں ہم جس کے چاہیں تیرا رب حکمت والا ہے جاننے والا۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن

اور بخشا ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب سب کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت کی ہم نے

قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَ

اس سب سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو اور ایوب اور یوسف کو اور

ع ۹ / ۱۲ / ۱۵

۲۵

(دی ہوئی) حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی (جب ہماری دی ہوئی تھی تو یقیناً اعلیٰ درجہ کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے) ہم (تو) جس کو چاہتے ہیں (علمی وعملی) مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں (چنانچہ سب انبیاء کو یہ رفعت درجات عطا فرمائی) بیشک آپ کا رب بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے (کہ ہر ایک کا حال اور استعداد جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب اس کو کمال عطا فرماتا ہے) اور (ہم نے جیسا ابراہیم علیہ السلام کو کمال ذاتی علم وعمل دیا اسی طرح کمال اضافی بھی دیا کہ ان کے اصول اور فروع سے بہتوں کو کمال دیا چنانچہ ہم نے ان کو (ایک بیٹا) اسحاق دیا اور (ایک پوتا) یعقوب (دیا اور اس سے دوسری اولاد کی نفی نہیں ہوتی اور دونوں صاحبوں میں سے ہر ایک کو (طریق حق کی) ہم نے ہدایت کی، اور (ابراہیم سے) پہلے زمانہ میں ہم نے نوح علیہ السلام کو جن کا ابراہیم علیہ السلام کے اجداد میں ہونا مشہور ہے اور اس کی فضیلت فرع میں بھی موثر ہوتی ہے طریق حق کی ہدایت کی اور ان (ابراہیم علیہ السلام) کی اولاد (خواہ نسبی ہو خواہ عرفی یا شرعی) میں سے (آخیر تک جتنے مذکور ہیں سب کو طریق حق کی ہدایت کی یعنی) داؤد (علیہ السلام) کو اور (ان کے صاحبزادہ) سلیمان (علیہ السلام) کو اور ایوب (علیہ السلام) کو اور یوسف (علیہ السلام) کو اور موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ہارون (علیہ السلام) کو (طریق حق کی ہدایت کی) اور (جب یہ ہدایت پر چلے تو ہم نے ان کو جزائے خیر بھی دی یعنی ثواب و زیادہ قرب کے) اور جس طرح نیک کام پر ان کو جزاء دی اسی طرح (ہماری عادت ہے کہ) ہم نیک کام کرنے والوں کو (مناسب جزاء) دیا کرتے ہیں اور نیز (ہم نے طریق حق کی ہدایت کی) زکریا (علیہ السلام) کو اور (ان کے صاحبزادہ) یحییٰ (علیہ السلام) کو اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور الیاس (علیہ السلام) کو (اور یہ) سب (حضرات) پورے شائستہ لوگوں میں تھے اور نیز (ہم نے طریق حق کی ہدایت کی) اسمٰعیل (علیہ السلام) کو اور یسع (علیہ السلام) کو اور یونس (علیہ السلام) کو اور لوط (علیہ السلام) کو اور (ان میں سے) ہر ایک کو (ان کے زمانوں کے) تمام جہان والوں پر (نبوت سے) ہم نے فضیلت دی اور نیز ان (حضرات مذکورین) کے کچھ باپ دادوں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو (طریق حق کی) ہم نے ہدایت کی اور ہم نے ان (سب) کو راہ راست (یعنی دین حق) کی ہدایت کی اور وہ (دین جس کی ان سب کو ہدایت ہوئی تھی) اللہ کی (جانب سے جو) ہدایت (ہوتی ہے) وہ یہی (دین) ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت (یعنی منزل پر پہنچانے کی صورت میں) کرتا ہے (چنانچہ اب جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی اسی کی ہدایت اس معنی سے ہوئی کہ ان کو صحیح راستہ دکھلا دیا، باقی منزل پر پہنچانا یہ پہنچانا ان کا کام ہے، مگر ان میں سے

بعض نے اس کو چھوڑ کر شرک اختیار کر لیا اور شرک اس قدر ناپسند چیز ہے کہ غیر نبی، تو کس شمار میں ہیں اگر فرضاً یہ حضرات (انبیاء مذکورین) بھی نعوذ باللہ شرک کرتے تو جو کچھ یہ (نیک) اعمال کیا کرتے تھے ان سے سب اکارت ہو جاتے (آگے مسئلہ نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ) یہ حضرات ایسے تھے کہ ہم نے ان کے مجموعہ کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (کے علوم) اور نبوت عطا کی تھی (تو نبوت امر عجیب نہیں جو یہ کفار لوگ آپ کے منکر ہو رہے ہیں، کیونکہ نظائر موجود ہیں) سو اگر (نظائر موجود ہونے پر بھی) یہ لوگ (آپ کی) نبوت کا انکار کریں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے اس کے ماننے کے لئے ایسے بہت لوگ مقرر کر دیئے ہیں (یعنی مہاجرین و انصار) جو اس کے منکر نہیں ہیں۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اپنے باپ آزر اور پوری قوم نمرود کے ساتھ مذکور تھا جس میں ان کی بت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف یقینی شہادتیں پیش کرنے کے بعد آیت مذکورہ میں اپنی قوم کو خطاب فرمایا کہ تم مجھے اپنے بتوں سے ڈراتے ہو کہ میں ان کا انکار کروں گا تو یہ مجھے برباد کر دیں گے، حالانکہ نہ بتوں میں اس کی قدرت ہے اور نہ میں نے کوئی کام ایسا کیا ہے جس کے نتیجہ میں مجھے کوئی مصیبت پہنچے بلکہ ڈرنا تمہیں چاہئے کہ تم نے جرم بھی ایسا سخت کیا ہے کہ اللہ کی مخلوق بلکہ مخلوق کی مصنوعات کو خدا کا شریک اور برابر کر دیا، اور پھر خدا تعالیٰ کا علیم و خبیر اور قادر مطلق ہونا بھی کسی عقل والے سے مخفی نہیں تو اب تم خود سوچ کر بتلاؤ کہ امن و اطمینان کا مستحق کون ہے؟ اور ڈرنا کس کو چاہئے؟

ان آیات میں سے پہلی آیت میں یہ مضمون ارشاد فرمایا کہ عذاب سے مامون و مطمئن صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں، اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی ملاوٹ نہ کریں، حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام سہم گئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی ظلم اپنی جان پر بذریعہ گناہ کے نہیں کیا، اور اس آیت میں عذاب سے مامون ہونے کی یہ شرط ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی ظلم نہ کیا ہو تو پھر ہماری نجات کی کیا سبیل ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے، آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات

وصفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے وہ عذاب سے مامون اور ہدایت یافتہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، دریاؤں کو پوجنے والی مخلوق اپنی بیوقوفی سے ان چیزوں کو با اختیار سمجھتی ہے، اور ان کی عبادت چھوڑنے سے اس لئے ڈرتی ہے کہ کہیں یہ چیزیں ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی بات ان کو بتلائی کہ خدائے قدوس جو تمہارے ہر کام سے باخبر بھی ہے اور تمہارے ہر بھلے برے پر پوری طرح قادر بھی ہے اس سے تو تم ڈرتے نہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کوئی مصیبت آجائے گی اور جن چیزوں میں نہ علم ہے نہ قدرت ان سے ایسے ڈرتے ہو؟ یہ سوائے بے عقلی کے اور کیا ہے، ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ سے چاہئے، اور جس کا یہ ایمان ہو وہ کسی خطرہ میں نہیں۔

اس آیت میں وَلَمْ يَلْبِسُوٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ فرمایا ہے، اس میں ظلم سے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے موافق شرک مراد ہے، عام گناہ مراد نہیں، لیکن لفظ بِظُلْمٍ کو نکرہ لاکر عربی زبان کے قواعد کے مطابق عام کردیا جو ہر قسم کے شرک کو شامل ہے، اور لفظ لَمْ يَلْبِسُوٓا لبس سے بنا ہے جس کے ایک معنی ہیں اوڑھنا یا خلط ملط کردینا، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جو آدمی اپنے ایمان میں کسی قسم کا شرک ملالے یعنی خدا تعالیٰ کو تمام صفاتِ کمال کے ساتھ ماننے کے باوجود غیر اللہ کو بھی ان میں سے بعض صفات کا حامل سمجھے وہ اس امن و ایمان سے خارج ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ کھلے طور پر مشرک و بت پرست ہوجائے، بلکہ وہ آدمی بھی مشرک ہے جو اگرچہ کسی بت کی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور کلمۂ اسلام پڑھتا ہے، مگر کسی فرشتہ یا رسول یا کسی ولی اللہ کو اللہ کی بعض صفاتِ خاصہ کا شریک ٹھہرائے اس میں ان عوام کے لئے سخت تنبیہ ہے جو اولیاء اللہ اور ان کے مزارات کو حاجت روا سمجھتے ہیں اور عملاً ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا خدائی کے اختیارات ان کے حوالے کردیئے گئے ہیں، نعوذ باللہ منہ۔

دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنی قوم کے مناظرہ میں کھلی فتح پائی، اور ان کو لاجواب کردیا یہ ہمارا ہی انعام تھا کہ ان کو صحیح نظریہ عطا کیا پھر اس کے واضح دلائل بتلا دیئے، کسی کو اپنی عقل و فہم یا تقریر اور زورِ خطابت پر ناز نہ ہونا چاہئے کہ بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے کسی کا بیڑا پار نہیں ہوتا، نری عقل انسانی ادراکِ حقائق کیلئے کافی نہیں جس کا مشاہدہ ہر دور میں ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے علامہ فہامہ فلسفی گمراہی کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں اور بہت سے ان پڑھ جاہل صحیح عقیدہ و نظریہ کے پابند ہوجاتے ہیں، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

آخر آیت میں فرمایا نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ، یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو پورے عالم میں اور قیامت تک آنے والی نسلوں میں خاص عزت و مقام عطا ہو کہ یہودی، نصرانی، مسلمان، بُدھ مت وغیرہ سب کے سب ان کے تقدس کے قائل اور ان کی تعظیم کرتے چلے آتے ہیں، یہ بھی ہمارا ہی فضل و انعام ہے کسی کے کسب و اکتساب کا اس میں دخل نہیں۔

اس کے بعد کی چھ آیتوں میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی ہے جن میں سے بعض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء و اجداد ہیں، اور کثر ان کی اولاد ہیں، اور بعض اُن کے بھائی بھتیجے ہیں، ان آیتوں میں ایک طرف تو ان حضرات کا ہدایت پر ہونا، صالحین ہونا، صراط مستقیم پر ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب اور قبول فرمایا ہے، اور دوسری طرف یہ بتلایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں اپنے باپ اور برادری اور وطن کو چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے درجات عالیہ اور دائمی اور بے مثال راحتوں سے پہلے دنیا میں بھی ان کو اپنی برادری سے بہتر برادری اور وطن سے بہتر وطن عطا فرمایا، اور یہ شرف عظیم عطا فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد قیامت تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے گئے وہ سب ان کی اولاد میں ہیں، ایک شاخ جو حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اس میں تمام انبیاء بنی اسرائیل آئے اور دوسری شاخ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چلی اس میں سید الاولین والآخرین نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اور یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ عزت و ذلت اور نجات و عذاب کا اصل مدار انسان کے اپنے ذاتی اعمال پر ہے، لیکن آباء و اجداد میں کسی نبی، ولی کا ہونا یا اولاد میں علماء، صلحاء کا ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس سے بھی انسان کو فائدہ پہونچتا ہے۔

ان سترہ انبیاء علیہم السلام میں جن کی فہرست آیت مذکورہ میں دی گئی ہے ایک حضرت نوح علیہ السلام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جدِّ امجد ہیں، باقی سب کو ان کی ذریت فرمایا ہے، وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ آیۃ، اس میں ایک اشکال تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دختری اولاد میں سے ہیں، یعنی پوتے نہیں نواسے ہیں، تو ان کو ذریت کہنا کیسے صحیح

ہوگا؟ اس کا جواب علمائے اُمت نے یہ دیا ہے کہ لفظ ذریت پوتوں اور نواسوں دونوں کو شامل ہے، اور اسی سے استدلال کیا گیا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔

دوسرا اشکال حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ذریت میں نہیں بلکہ بھتیجے ہیں، لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ عرف میں چچا کو باپ اور بھتیجے کو بیٹا کہنا بہت ہی متعارف ہے۔

آیات مذکورہ میں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انعامات الٰہیہ بیان فرما کر ایک طرف تو یہ قانون قدرت بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرتا ہو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی اس سے بہتر چیزیں عطا فرما دیتے ہیں، دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ حالات سنا کر اس طرف ہدایت کرنا مقصود ہے کہ تم لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے تو دیکھو جن کو تم بھی سب بڑا مانتے ہو یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا پورا خاندان وہ سب یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قابل عبادت صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک کرنا یا اس کی مخصوص صفات کا ساجھی بتلانا کفر و گمراہی ہے، **تم لوگ خود اپنے مسلّمات کی رُو سے بھی ملزم ہو۔**

آٹھویں آیت میں یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا اور اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ: فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ، یعنی اگر آپ کے کچھ مخاطب آپ کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین کی ہدایات پیش کر دینے کے باوجود وہ انکار ہی پر جمے ہوئے ہیں، تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ ہم نے آپ کی دعوت و ہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بڑی قوم کو مقرر کر رکھا ہے، وہ کفر و انکار کے پاس نہ جائیں گے، اس میں عہد مبارک کے موجودین مہاجرین و انصار بھی داخل ہیں، اور قیامت تک آنے والے مسلمان بھی، اور یہ آیت ان سب لوگوں کے لئے مایۂ فخر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاحْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهِمْ

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سو تو چل ان کے طریقہ پر تو کہہ دے کہ میں نہیں مانگتا تم سے

عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (۹۰) وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ

اس پر کچھ مزدوری، یہ تو محض نصیحت ہے جہان کے لوگوں کو اور نہیں پہچانا انھوں نے اللہ کو

حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ

پورا پہچاننا جب کہنے لگے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز پوچھ تو

ع ۸ ۱۰ ۱۶

مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى

کس نے اتاری وہ کتاب جو موسیٰ لے کر آیا تھا روشن تھی اور ہدایت تھی

لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ

لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ

اور تم کو سکھلا دیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ دادے تو کہہ دے کہ اللہ نے اتارا پھر

ذَرْهُمْ فِىْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

چھوڑ دے ان کو کہ اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں اور یہ قرآن کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی

مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ

تصدیق کرنے والی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے ہیں اور تاکہ تو ڈراوے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ

کو اور جن کو یقین ہے آخرت کا وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ہیں اپنی نماز سے

يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ

خبردار اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا

قَالَ اُوْحِىَ اِلَىَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَىْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ

کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں مثل

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ

اس کے جو اللہ نے اتارا اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور

الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ

فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ

بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب اس سبب سے کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹی

الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا

باتیں اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے اور البتہ تم ہمارے پاس آگئے

فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ

ایک ایک ہو کر جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تم کو پہلی بار اور چھوڑ آئے تم جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا

ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ

پیٹھ کے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ سفارش کرنے والوں کو جن کو تم بتلایا کرتے تھے کہ

فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ

ان کا تم میں ساجھا ہے، البتہ منقطع ہوگیا تمہارا علاقہ اور جاتے رہے جو دعوے کہ تم

تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

کیا کرتے تھے

ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

(اور ہم جو تم کو صبر کرنے کو کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ سب انبیاء نے ایسا ہی کیا ہے چنانچہ) یہ حضرات (مذکورین) ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (اس صبر کی) ہدایت کی تھی سو (اس باب میں) آپ بھی انہی کے طریق (صبر) پر چلئے (کیونکہ آپ کو بھی اس کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ ان سے آپ کو نفع نہ کوئی ضرر جس کی وجہ سے غم اور بے صبری ہو) اور اس مضمون کے اظہار کے واسطے ان سے تبلیغ کے وقت آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے (اس تبلیغ قرآن) پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا (جس کے نہ ملنے سے نفع اور نہ ملنے سے عذر ہو، بے غرض نصیحت کرتا ہوں) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے واسطے ایک نصیحت ہے (جس کو ماننے سے تمہارا ہی نفع اور نہ ماننے سے تمہارا ہی نقصان ہے)، اور ان (منکر) لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ (منہ بھر کر) یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز (یعنی کوئی کتاب) بھی نازل نہیں کی (یہ کہنا ناقدر شناسی اس لئے ہے کہ اس سے مسئلہ نبوت کا انکار لازم آتا ہے، اور نبوت کا منکر اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے، اور تصدیق حق واجب ہے، پس اس میں قدر شناسی واجب میں اخلال ہوا، یہ تو تحقیقی جواب تھا، اور الزامی مسکت جواب دینے کے لئے) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ (علیہ السلام) لائے تھے (یعنی توریت جس کو تم بھی مانتے ہو) جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (خود مثل) نور (کے واضح) ہے اور (جن کی ہدایت کے لئے وہ آئی تھی ان) لوگوں کے لئے وہ (بوجہ بیان شرائع کے ذریعہ) ہدایت ہے جس کو تم نے (اپنی غرض نفسانیہ کے لئے) متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن

(میں جتنے اوراق کو چاہو ان کو ظاہر کر دیتے ہو (جس میں تمہارے مطلب کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی)
اور بہت سی باتوں کو (جو اپنے مطلب کے خلاف ہیں، ان اوراق میں وہ لکھی ہوئی ہیں ان کو) چھپاتے
ہو اور (اس کتاب کی بدولت) تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو (قبل کتاب ملنے کے)
نہ تم (اپنی قوم بنی اسرائیل جو کہ وقت نزول آیت موجود تھی) جانتے تھے اور نہ تمہارے (قریب سلسلہ کے)
بڑے (جانتے تھے مطلب یہ کہ جس توریت کی یہ حالت ہے کہ اس کو تو تم مانتے ہو، دوسرے بوجہ
نور و ہدیٰ ہونے کے ماننے کے قابل بھی ہے، تیسرے ہر وقت تمہارے استعمال میں ہے، گو وہ
استعمال شرمناک اور لعین ہے لیکن اس کی وجہ سے گو بعض بحث ہیں لیکن تھے تمہارے حق میں وہ بڑی نعمت
اور منت کی چیز ہے، کہ اسی کی بدولت علم بنے بیٹھے ہو اس حیثیت سے بھی اس میں گنجائش انکار
نہیں، یہ بتلاؤ کہ اس کو کس نے نازل کیا ہے، اور چونکہ اس سوال کا جواب ایسا متعین ہے کہ وہ
لوگ بھی اس کے سوا کوئی جواب نہ دیتے، اس لئے خود ہی جواب دینے کے لئے حضور ﷺ کو حکم ہے کہ
آپ (وہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے (کتاب مذکور کو نازل فرمایا ہے (اور اس سے ان کا
دعویٰ عدم باطل ہو گیا) پھر (یہ جواب سنا کر) ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے
دیجئے (یعنی آپ کا منصبی کام ختم ہو گیا، نہ مانیں تو آپ فکر میں نہ پڑیں ہم آپ ہی سمجھ لیں گے)
اور (جس طرح توریت ہماری نازل کی ہوئی کتاب تھی اسی طرح) یہ (قرآن) بھی (جس کی تکذیب
یہود کے قول مذکور سے اصل مقصود ہے، ایسی ہی) کتاب ہے جس کو ہم نے (آپ پر) نازل کیا ہے
جو بڑی خیر و برکت والی ہے (چنانچہ اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا موجب فلاح و نفع دارین
ہے اور) اپنے سے پہلے (نازل شدہ) کتابوں (کے منزل من اللہ ہونے) کی تصدیق کرنے والی ہے
اور ہم نے اس قرآن کو نفع خلائق و تصدیق کتب الٰہیہ کے لئے نازل فرمایا) اور (اس لئے
نازل فرمایا کہ) تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) مکہ والوں کو اور آس پاس والوں کو (خصوصیت
کے ساتھ عذاب الٰہی سے جو کہ مخالفت پر ہوگا) ڈراویں (اور یوں انذار عام بھی کریں لِیَکُوْنَ
لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا) اور (آپ کے ڈرانے کے بعد گو سب ایمان نہ لاویں لیکن) جو لوگ آخرت
کا (پورا) یقین رکھتے ہیں (جس سے عذاب کا اندیشہ ہو جائے اور اس سے بچنے کی فکر پڑ جائے
اور ہمیشہ طلب طریق نجات اور تعیین حق کی دھن لگ جائے خواہ کسی دلیل نقلی سے یا تجربۂ عقلی سے)
ایسے لوگ (تو) اس (قرآن) پر ایمان لے آتے ہیں اور (ایمان و اعتقاد کے ساتھ اس کے
اعمال کے بھی پابند ہوتے ہیں کیونکہ عذاب سے نجات ان ہی پر موعود ہے، چنانچہ) وہ اپنی
نماز پر مداومت رکھتے ہیں (اور جب اس عبادت پر جو کہ ہر روز پانچ بار مکرر اور شاق ہے مداومت
کرتے ہیں تو دوسری عبادات کے جو کہ گاہ گاہ اور سہل ہیں بدرجہ اولیٰ پابند ہوں گے، حاصل

یہ لوگ ان کے ماننے نہ ماننے کی فکر نہ کیجئے جو اپنے بصیرت ہیں گے مان لیں گے، جو نہ چاہیں گے نہ نہیں گے آپ اپنا کام کیجئے، اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے، اور مطلق نبوت یا اس نبوت کا منکر ہو، جیسا اوپر بعض کا قول آیا ہے، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ اور بعض کا قول تھا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا، یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی (جیسے مسیلمہ وغیرہ)، اور اسی طرح اس سے بھی زیادہ ظالم کون ہوگا، جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے حسب دعویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نازل کیا ہے، اسی طرح کا میں بھی لا کر دکھلاتا ہوں (جیسا نضر یا عبداللہ کو کہتا تھا، غرض یہ سب لوگ بڑے ظالم ہیں)، اور ظالموں کا حال یہ ہے کہ اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک منظر دکھلائی دے) جبکہ یہ ظالم لوگ (جن کا ذکر ہوا) موت کی (روحانی) سختیوں میں (گرفتار) ہوں گے اور (موت کے) فرشتے (جو ملک الموت کے اعوان ہیں ان کی روح نکالنے کے وقت ان کی طرف) اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور شدت کے ظاہر کرنے کو یوں کہتے جاتے ہوں گے کہ، ہاں (جلدی) اپنی جانیں نکالو (کہاں بچتے پھرتے تھے دیکھو، آج معاملے کے ساتھ ہی) تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (یعنی جس میں تکلیف جسمانی بھی ہو اور ذلت روحانی بھی ہو) اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی (جھوٹی) باتیں بکتے تھے (جیسے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور اُوْحِيَ اِلَيَّ اور سَاُنْزِلُ وغیرہا) اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات (کے قبول کرنے) سے (جو کہ ذریعہ ہدایت تھیں) تکبر کرتے تھے۔

(یہ کیفیت تو موت کے وقت ہوگی، اور (جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرما دیں گے) تم ہمارے پاس (بے یار و مددگار) تنہا تنہا (ہو کر) آگئے (اور اس حالت سے آئے) جس طرح ہم نے اول بار (دنیا میں) تم کو پیدا کیا تھا (کہ نہ بدن پر کپڑا نہ پاؤں میں جوتا)، اور جو کچھ ہم نے تم کو (دنیا میں ساز و سامان) دیا تھا (جس پر تم بھولے بیٹھے تھے) اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے (ساتھ کچھ نہ لائے، مطلب یہ کہ مال و دولت کے بھروسہ پر نہ رہنا، یہ سب یہاں ہی رہ جاوے گا) اور (تم میں جو بعض کو اپنے باطل معبودوں کی شفاعت کا بھروسہ تھا سو) ہم تو تمہارے ہمراہ (اس وقت) تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے (جس سے ثابت ہوا کہ واقع میں بھی تمہارے ساتھ نہیں ہیں) جن کی نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں (کہ تمہارا جو معاملہ عبادت ہمارے ساتھ ہوتا تھا وہی ان کے ساتھ ہوتا تھا) واقعی تمہارے (اور ان کے) آپس میں تو قطع تعلق ہوگیا کہ آج تم ان سے بیزار اور وہ تم سے بیزار، شفاعت کیا کریں گے) اور وہ تمہارا دعویٰ (جو مذکور ہوا) سب تم سے گیا گذرا ہوا (کچھ کام کا نہ نکلا تو اب پوری پوری مصیبت پڑے گی)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کے عظیم الشان انعامات اور ان کے بلند درجات کا ذکر تھا جن میں پوری نسل آدم علیہ السلام کو عموماً اور اہل مکہ و عرب کو خصوصاً عملی صورت میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرا لے اور اس کے لئے ہر محبوب چیزوں کی قربانی پیش کرے جیسے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کی کہ ماں باپ اور قوم و وطن سب کو اللہ کے لئے چھوڑ دیا، پھر بنا بیت اللہ کی عظیم خدمت کے لئے ملک شام کے سبزہ زاروں کو چھوڑ کر مکہ کا ریگستان اختیار کیا، بیوی اور بچہ کو جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم ہوا تو فوری تعمیل کی، اکلوتے محبوب بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تو اپنے مذ خفیہ رنگ اس کی مکمل تعمیل کر دکھائی، ایسے اطاعت گذاروں کا اصل بدلہ تو قیامت کے بعد جنت ہی میں ملے گا، لیکن دنیا میں بھی حق تعالیٰ ان کو وہ مرتبہ اور دولت عطا فرماتے ہیں جس کے سامنے ساری دنیا کی دولتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ نے اپنی قوم و برادری کو اللہ کے لئے چھوڑا تو اس کے بدلہ میں ان کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت ملی جو ہمیشہ ان کی اولاد ہی میں ہیں، عراق اور شامی وطن کو چھوڑا، تو اللہ کا گھر اور بلد امین اور ام القریٰ یعنی مکہ نصیب ہوا، ان کی قوم نے ان کو ذلیل کرنا چاہا تو اس کے بدلہ میں ان کو ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کا امام اور پیشوا بنا دیا کہ دنیا کی مختلف اقوام و مذاہب آپس کے بڑے بڑے اختلاف کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم پر متفق چلے آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی تھی جن میں سے بیشتر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد و ذریت میں داخل ہیں، اور یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ سب وہ بزرگترین ہستیاں ہیں جن کو حق تعالیٰ نے سارے عالم کے انسانوں میں سے اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب فرمایا اور ان کو سیدھا راستہ دکھلایا ہے۔

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر اہل مکہ کو سنایا گیا ہے کہ کسی قوم کے آباء و اجداد محض باپ دادا ہونے کی حیثیت سے قابل تقلید نہیں ہو سکتے کہ ان کے ہر قول و فعل کو قابل اتباع سمجھا جائے، جیسا کہ عموماً عرب اور اہل مکہ کا خیال تھا، بلکہ تقلید و اتباع کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جس کی پیروی کرتے ہیں وہ خود بھی ہدایت کے صحیح راستہ پر ہے یا نہیں، اس لئے

انبیاء علیہم السلام کی ایک مختصر فہرست شمار کر کے فرمایا گیا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ، یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ پھر فرمایا فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۔ یعنی آپ بھی ان کی ہدایت اور طریق کار کو اختیار فرماویں۔

اس میں ایک ہدایت تو اہل عرب اور تمام امت کو یہ ہے کہ تقلید آبائی کی وہم پرستی کو چھوڑیں، اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ بزرگوں کا اتباع کریں۔

دوسری ہدایت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ آپ بھی انہی انبیاء سابقین کا طریق اختیار فرمائیں۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فروعی اور جزوی اختلافات پہلے بھی ہوتے رہے ہیں، اور ملتِ اسلام میں بھی ان سے مختلف بہت سے احکام نازل ہوئے ہیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کے طریق پر چلنے اور عمل کرنے کا کیا مطلب ہوا؟ دوسری آیات اور روایاتِ حدیث کے پیش نظر اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام فروعی اور جزوی احکام میں انبیاء سابقین کا طریق کار اختیار کرنے کا حکم نہیں بلکہ اصول دین: توحید، رسالت، آخرت میں ان کا طریق اختیار کرنا مقصود ہے جو کسی پیغمبر کی شریعت میں ردّ و بدل نہیں ہوئے، آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی ایک عقیدہ اور طریقہ رہا ہے، باقی فروعی احکام جن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ان میں بھی طریقہ کار مشترک رہا اور جن میں حالات کے بدلنے کی وجہ سے بتقاضائے وقت و حکمت کوئی دوسرا حکم دیا گیا اس کی تعمیل کی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب تک آپ کو بذریعہ وحی کوئی خاص ہدایت نہ آتی تھی تو آپ فروعی معاملات میں بھی پچھلے انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ کار پر چلتے تھے (مظہری وغیرہ)

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے اعلان کا حکم دیا گیا جس کا اعلان تمام انبیاء سابقین بھی کرتے چلے آئے ہیں، وہ یہ کہ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ، یعنی میں تمہاری زندگی سنوارنے کے لئے جو ہدایات تمہیں دے رہا ہوں اس پر تم سے کوئی فیس اور معاوضہ نہیں لیتا، تم اس کو مان لو تو میرا کوئی نفع نہیں اور نہ مانو تو کوئی نقصان نہیں، یہ تو تمام دنیا جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت و خیر خواہی کا پیغام ہے، تعلیم و تبلیغ پر کوئی معاوضہ نہ لینا تمام انبیاء علیہم السلام میں ہمیشہ مشترک چلا آیا ہے اور تبلیغ کے مؤثر ہونے میں اس کا بڑا دخل ہے۔

دوسری آیت اُن لوگوں کے جواب میں آئی ہے جنھوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی بشر پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں فرمائی، یہ کتابوں اور رسولوں کا قصہ سرے سے غلط ہے۔

اس کے کہنے والے اگر مکہ کے بُت پرست ہیں جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے فرمایا تو معاملہ ظاہر ہے کہ وہ کسی کتاب اور نبی کے قائل نہ تھے، اور اگر یہود ہیں جیسا کہ دوسرے مفسرین نے اختیار فرمایا اور آیت کا سلسلۂ کلام بظاہر اس کی تائید میں ہے تو پھر ان کا ایسا کہنا محض غصہ اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا، جو خود ان کے بھی مذہب کے خلاف تھا، امام بغوی کی ایک روایت میں ہے کہ اسی لئے یہود بھی اس شخص سے ناراض ہوگئے جس نے یہ بات کہی تھی اور اسی غلطی کی وجہ سے اس کو مذہبی پیشوائی کے عہدہ سے ہٹا دیا تھا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ بیہودہ کلمہ کہا انھوں نے حق تعالیٰ کو پہچاننے کی طرح نہیں پہچانا، ورنہ یہ گستاخانہ کلمہ ان کے منہ سے نہ نکلتا، آپ ان لوگوں سے جو مطلق آسمانی کتابوں کا انکار کرتے ہیں یہ کہہ دیجئے کہ اگر بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نہیں بھیجی تو یہ بتلاؤ کہ یہ تورات جس کو تم بھی مانتے ہو اور اسی کی وجہ سے قوم کے چودھری بنے بیٹھے ہو یہ کس نے نازل کی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ تم وہ ٹیڑھے چلنے والے ہو کہ جس کتاب تورات کو تم آسمانی کتاب کہتے اور مانتے ہو اس کے ساتھ بھی تمہارا یہ معاملہ ہے کہ تم نے اس کو بندھی ہوئی کتاب کے بجائے متفرق اوراق میں لکھ چھوڑا ہے، تاکہ جب تمہارا جی چاہے کسی ورق کو درمیان سے نکال دو، اور اس کے مضمون سے انکار کر دو، جیسے تورات کی وہ آیات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات اور صفات کے متعلق تھیں ان کو تم نے نکال دیا ہے، آیت کے آخری جملہ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ کا یہی مطلب ہے، قراطیس، قرطاس کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ورق کا۔

اس کے بعد انہی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ، یعنی قرآن کے ذریعہ تمہیں تورات و انجیل سے زائد بھی وہ علم دیا گیا ہے جس کی نہ تمہیں اس سے پہلے خبر تھی، نہ تمہارے باپ دادوں کو۔

آخر آیت میں فرمایا: قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔ یعنی اس سوال کا جواب کہ جب اللہ نے کوئی کتاب ہی نہیں بھیجی تو تورات کس نے نازل کی وہ تو کیا دیں گے، آپ ہی فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمائی ہے، اور جب اُن پر حجت تمام ہوگئی تو آپ کا کام ختم ہوگیا، اب وہ جس لہو و لعب میں کھوئے ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔

ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف نازل ہونے والی کتابوں کے بارے میں اُن پر حجت تمام

کرنے کے بعد تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَھٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی جس طرح تورات کا خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا تمھیں بھی مسلّم ہے اسی طرح یہ قرآن بھی ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے حق و صادق ہونے کے واسطے ان کے لئے یہ شہادت کافی ہے کہ قرآن ان سب چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جو تورات وانجیل میں نازل ہوئی ہیں، اور تورات وانجیل کے بعد اس کے نازل کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں تو بنی اسرائیل کے لئے بھیجی گئی تھیں ان کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل جو عرب کہلاتے ہیں اور ام القریٰ یعنی مکہ اور اس کے گرد و پیش رہتے ہیں ان کی ہدایت کے لئے کوئی خاص پیغمبر اور کتاب اب تک نہ آئی تھی، اب یہ قرآن ان کے لئے خصوصاً اور پورے عالم کے لئے عموماً نازل کیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ کو قرآن کریم نے ام القریٰ فرمایا، یعنی تمام شہروں اور بستیوں کی جڑ اور بنیاد، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی روایات کے مطابق ابتداءِ آفرینش میں پیدائش زمین کی ابتداء یہیں سے ہوئی ہے، نیز یہ کہ سارے عالم کا قبلہ عبادت بھی مکہ ہی ہے (مظہری)

اُمّ القُریٰ کے ساتھ وَمَنْ حَوْلَهَا فرمایا، یعنی مکہ کے تمام اطراف جس میں پورا عالم مشرق و مغرب اور جنوب و شمال داخل ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَھُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، اس میں یہود و مشرکین کی ایک مشترک بیماری پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ بے فکری کہ جس کو چاہا مانا جس کو چاہا رد کر دیا، اور اس کے خلاف محاذ بنا لیا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جس شخص کو آخرت اور یوم الحساب پر ایمان ہوگا اس کو خوفِ خدا ضرور اس طرف متوجہ کرے گا، کہ دلائل میں غور کرے، اور حق بات کو قبول کرنے میں آبائی رسوم جاہلیت کی پروا نہ کرے۔

اور اگر غور کیا جائے تو آخرت سے بے فکری ہی اُمّ الامراض ہے، کفر و شرک بھی اسی کا نتیجہ ہوتا ہے اور سارے گناہ و معاصی بھی، آخرت پر یقین رکھنے والے سے اگر کبھی کوئی غلطی اور گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اور بالآخر توبہ کر کے آگے کے لئے گناہ سے بچنے کا عزم کرتا ہے، اور درحقیقت خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی اور جرائم سے باز رکھتی ہے، اسی لئے قرآن کریم کی کوئی سورت بلکہ کوئی رکوع بھی شاید ہی خالی نہیں کہ جس میں فکرِ آخرت کی طرف متوجہ نہ کیا گیا ہو، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ جَمِيْعَ ھُمُوْمِنَا ھَمًّا وَّاحِدًا ھَمَّ الْاٰخِرَةِ

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ

اللہ ہے کہ پھوڑ نکالتا ہے دانہ اور گٹھلی، نکالتا ہے مردہ سے زندہ اور نکالنے والا ہے

الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ ۖ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ۚ

مردہ کو زندہ سے، وہ اللہ ہے پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو، پھاڑ نکالنے والا صبح کی روشنی کا

وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ

اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند حساب کے لئے، یہ اندازہ رکھا ہوا ہے

الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا

زبردست خبردار کا، اور اسی نے بنا دیئے تمہارے واسطے ستارے کہ ان کے وسیلہ سے رستے

بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

معلوم کرو اندھیروں میں جنگل اور دریا کے، البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے پتے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں

وَهُوَ الَّذِيْٓ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۗ

اور وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت کی جگہ

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

البتہ ہم نے کھول کر سنا دیئے پتے ان لوگوں کو جو سوچتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو (یعنی زمین میں دبانے کے بعد جو دانہ یا گٹھلی پھوٹتی ہے یہ اللہ ہی کا کام ہے) وہ جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکال لاتا ہے (جیسے نطفہ سے آدمی پیدا ہوتا ہے) اور وہ بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالنے والا ہے (جیسے آدمی کے بدن سے نطفہ باہر ہوتا ہے)، اللہ یہ ہے (جس کی ایسی قدرت ہے) سو تم (اس کی عبادت چھوڑ کر) کہاں (غیر اللہ کی عبادت کی طرف) الٹے چلے جا رہے ہو، وہ (اللہ تعالیٰ) صبح (صادق) کا (رات میں سے) نکالنے والا ہے (یعنی رات ختم ہو جاتی ہے اور صبح صادق ظاہر ہوتی ہے)، اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنائی ہے (کہ سب تھکے تھکائے سو کر آرام پاتے ہیں) اور سورج اور چاند (کی رفتار) کو حساب سے رکھا ہے (یعنی ان کی رفتار منضبط ہے جس سے اوقات کے انضباط میں سہولت ہو) یہ (کہ حساب سے ان کی

پ

رفتار ہو) ٹھہرائی ہوئی بات ہے ایسی ذات کی جو کہ قادر (مطلق) ہے (کہ جس طرح حرکت پیدا کرنے پر اس کو قدرت ہے اور) بڑے علم والا ہے (کہ اس رفتار کی مصلحتیں اور حکمتیں جانتا تھا اس لئے اس خاص طرح پر ٹھہرا دیا) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے ستاروں کو پیدا کیا اور وہ فائدہ یہ ہے تاکہ تم ان کے ذریعہ سے رات کے اندھیروں میں خشکی میں بھی اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو، بیشک ہم نے (یہ) دلائل (توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (اور گو پہنچیں گے سب کو مگر نفع) ان (ہی) لوگوں کیلئے (ہوں گے) جو (بھلے برے کی کچھ) خبر رکھتے ہیں (کیونکہ غور ایسے ہی لوگ کیا کرتے ہیں)، اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (اصل میں) ایک شخص سے (کہ آدم علیہ السلام ہیں) پیدا کیا پھر (آگے توالد و تناسل کا اس طرح سلسلہ جاری چلا آرہا ہے کہ تم میں سے ہر شخص کے لئے مرتبہ مادہ میں) ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے (یعنی ماں کا رحم) اور ایک جگہ چندے رہنے کی (یعنی باپ کی پشت بقولہ تعالیٰ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ) بیشک ہم نے (یہ) دلائل (بھی توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (عام طور پر مگر ان کا نفع بھی مثل سابق) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوگا) جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، (یہ تفصیل ہوگئی يُخْرِجُ الْحَيَّ الخ کی)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کی ہٹ دھرمی اور حقائق و نتائج سے غفلت کا تذکرہ تھا، اور ان سب خرابیوں کی اصل بنیاد خدا تعالیٰ اور اس کے بے مثال علم و قدرت سے بے خبری ہے، اس لئے مذکورہ چار آیات میں حق تعالیٰ نے غافل انسان کے اس روگ کا علاج اس طرح فرمایا ہے کہ اپنے وسیع علم اور عظیم قدرت کے چند نمونے اور انسان پر اپنے انعامات و احسانات کا ایک سلسلہ ذکر فرمایا، جن میں ادنیٰ غور کرنے سے ہر سلیم الفطرت انسان خالقِ کائنات کی عظمت اور بے مثال قدرت کا اور اس بات کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ عظیم الشان کارنامے ساری کائنات میں سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی قدرت میں نہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، یعنی اللہ تعالےٰ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو، اس میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بتلایا گیا ہے کہ خشک دانہ اور خشک گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے ہرا بھرا درخت نکال دینا صرف

اسی ذاتِ پاک کا فعل ہے جو خالقِ کائنات ہے، انسان کے سعی و عمل کو اس میں کوئی دخل نہیں، کاشتکار کی ساری کوششوں کا حاصل اس سے زائد نہیں ہوتا کہ دانہ اور گٹھلی کے اندر سے جو نازک کونپل قدرتِ خداوندی نے نکالی ہے اس کی راہ سے موانع اور مضر چیزوں کو دور کردے، زمین کو ہل وغیرہ کے ذریعہ نرم کرنا، کچھ کھاد ڈالنا، پانی دینا ان سب اعمال کا اثر زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نکلنے والی نازک کونپل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، باقی اصل کام کہ دانہ اور گٹھلی پھٹ کر اس میں سے درخت کی کونپل نکلے اور پھر اس میں رنگ برنگ کے عجیب و غریب پتے اور پھر ایسے پھل پھول لگیں کہ انسان کی عقل و دماغ اس کا ایک پتہ یا ایک پنکھڑی بنانے سے عاجز ہے، اس میں ظاہر ہے کہ کسی انسانی عمل کو دخل نہیں، اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا: أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ، یعنی کیا تم ان دانوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم مٹی میں ڈال دیتے ہو کہ ان کو تم نے بویا اور بنایا ہے یا ہم نے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا: يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی بے جان چیزوں میں سے جاندار چیزوں کو پیدا کرتا ہے، بے جان سے مراد نطفہ یا انڈا ہے جن سے انسان اور حیوانات کی تخلیق ہوتی ہے، اسی طرح جانداروں سے بے جان چیزیں نکال دیتا ہے، یہاں بے جان چیزوں سے مراد یہی نطفہ و انڈا ہے کہ وہ جاندار چیزوں سے نکلتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ، یعنی یہ سب کام صرف ایک اللہ تعالیٰ کے کئے اور بنائے ہوئے ہیں، پھر یہ جانتے بوجھتے ہوئے تم کس طرف بہکے چلے جا رہے ہو کہ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا معبود کہنے لگے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: فَالِقُ الْإِصْبَاحِ، فالق کے معنی پھاڑنے والا اور اصباح کے معنی یہاں وقتِ صبح کے ہیں، فالق الاصباح کے معنی ہیں پھاڑنے والا صبح کا، یعنی گہری اندھیری کی چادر کو پھاڑ کر صبح کا نکالنے والا، یہ بھی اُن افعال و اعمال میں سے ہے جس میں جن و بشر اور ساری کائنات کی قوتیں ہیچ ہیں، اور ہر آنکھوں والا دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ رات کی اندھیری کے بعد صبح کو اجالا پیدا کرنے والا نہ کوئی انسان ہو سکتا ہے نہ فرشتہ، نہ کوئی دوسری مخلوق، بلکہ یہ صرف اُس مافوق الادراک ہستی کا کام ہے جو سارے جہان کی پیدا کرنے والی ہے۔

مخلوقات کے آرام کے لئے رات کی قدرتی و جبری تعیین ایک عظیم نعمت ہے

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا، لفظ سکن، سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سکن

سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو وقت میں کس قدر اختلاف ہوتا، اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو چوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا، اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا! یہ اللہ جل شانہٗ ہی کی قدرت قاہرہ ہے جس نے جبری طور پر ہر انسان اور ہر جاندار پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

شمسی اور قمری حساب | ارشاد فرمایا: وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا، حُسبان بالضم مصدر ہے، حساب کرنے اور شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب اور ان کی رفتار کو ایک خاص حساب سے رکھا ہے جس کے ذریعہ انسان سالوں مہینوں دنوں اور گھنٹوں کا بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب آسانی سے لگا سکتا ہے۔

یہ اللہ جل شانہٗ ہی کی قدرت قاہرہ کا عمل ہے کہ ان عظیم الشان نورانی کُروں اور ان کی حرکات کو ایسے مستحکم اور مضبوط انداز سے رکھا ہے کہ ہزاروں سال گذر جانے پر بھی ان میں کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان کی مشینری کو نہ کسی ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے نہ پرزے گھسنے اور بدلنے سے کوئی سابقہ پڑتا ہے، یہ دونوں نور کے کُرے اپنے اپنے دائرہ میں ایک معین رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں، لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، ہزاروں سال میں بھی ان کی رفتار میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، افسوس کہ قدرت کے اس مستحکم اور غیر متبدل نظام ہی سے انسان دھوکہ کھا گیا کہ انہی چیزوں کو مستقل بالذات بلکہ معبود و مسجود بنا بیٹھا، اگر ان کا یہ نظام کبھی کبھی ٹوٹا کرتا، ان کی مشینری درست کرنے کے لئے کچھ دنوں یا گھنٹوں کے وقفے ہوا کرتے تو انسان سمجھ لیتا کہ یہ مشینیں خود بخود نہیں چل رہی ہیں بلکہ ان کا کوئی چلانے والا ہے اور بنانے والا ہے، مگر اسے روشنی صبح تو ہر شب بلا ستری، ان کُروں کے غیر متبدل اور مستحکم نظام نے انسان کی نظروں کو خیرہ کر دیا اور اسی طرف لگا دیا، یہاں تک کہ وہ اس کو بھول بیٹھا کہ ؎

کوئی محبوب ہے اس پردۂ زنگاری میں

آسمانی کتابیں اور انبیاء و رسل اس کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے ہی کے لئے نازل ہوئے۔

قرآن کریم کے اس ارشاد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سالوں اور مہینوں کا حساب شمسی بھی ہو سکتا ہے، اور قمری بھی، دونوں ہی اللہ جل شانہٗ کے انعامات ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عام ان پڑھ دنیا کی سہولت اور ان کو حساب کتاب کی اُلجھن سے بچانے کے لئے

اسلامی احکام میں قمری سن و سال استعمال کئے گئے، اور چونکہ اسلامی تاریخ اور اسلامی احکام کا مبنیٰ
مدار قمری حساب پر ہے اس لئے امت پر فرض ہے کہ وہ اس حساب کو قائم اور باقی رکھے، دوسرے
حسابات شمسی وغیرہ دوسری ضرورت سے اختیار کئے جائیں تو کوئی گناہ نہیں، لیکن قمری حساب کو
بالکل نظر انداز اور محو کر دینا گناہ عظیم ہے جس سے انسان کو یہ بھی خبر نہ رہے کہ رمضان کب
آئے گا اور ذی الحجہ اور محرم کب۔

آخر آیت میں فرمایا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ یعنی یہ حیرت انگیز مستحکم نظام
حرکات جس میں کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا یہ اسی ذات پاک کی قدرت کا
کرشمہ ہو سکتا ہے جو عزیز یعنی ہر چیز پر غالب اور قوی بھی ہے، اور علیم یعنی ہر چیز اور ہر کام کی
جاننے والی بھی۔

تیسری آیت میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي
ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی آفتاب و ماہتاب کے علاوہ دوسرے ستارے بھی اللہ جل شانہ
کی قدرت کاملہ کے مظاہر ہیں اور ان کے پیدا کرنے میں ہزاروں حکمتیں ہیں تو ایک
حکمت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے بحری اور بری سفروں میں جہاں رات کی تاریکی کے وقت منزل
کا پتہ لگانا بھی آسان نہیں رہتا، ان ستاروں کے ذریعہ اپنا راستہ متعین کر سکتا ہے، تجربہ
شاہد ہے کہ آج اس مشینری کے زمانہ میں بھی انسان ستاروں کی ہدایت سے بے نیاز نہیں ہوا۔

اس آیت میں بھی انسان کو اس غفلت اور کوتاہ نظری پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ ستارے
بھی کسی بنانے والے اور چلانے والے کے تابع فرمان چل رہے ہیں، نہ اپنے وجود میں مستقل
ہیں نہ اپنی بقاء و عمل میں، جو لوگ صرف انہی پر اپنی نظریں جما کر بیٹھ رہے، اور ان کے بنانے
والے کی طرف نظر نہ کی وہ سخت کوتاہ نظر اور فریب خوردہ ہیں ؎

آناں کہ بجز روئے تو جائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظرانند

اس کے بعد ارشاد فرمایا قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ یعنی ہم نے
دلائل قدرت خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ان لوگوں کے لئے جو خبر رکھتے ہیں۔ اس میں
اشارہ فرمایا کہ جو لوگ ان کھلی کھلی نشانیوں سے بھی حق تعالیٰ کو نہیں پہچانتے وہ بے خبر اور
بے ہوش ہیں۔

چوتھی آیت میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ
وَمُسْتَوْدَعٌ۔ مستقر، قرار سے بنا ہے، اس جگہ کو مستقر کہتے ہیں جو کسی چیز کے لئے جائے قرار ہو

اور مستودع ودیعت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی کے پاس عارضی طور سے چند روز رکھ دینے کے، تو مستودع اس جگہ کو کہا جائے گا جہاں کوئی چیز عارضی طور پر چند روز رکھی جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات پاک ہے جس نے انسان کو ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا، پھر اس کے لئے ایک مستقر یعنی مدت تک رہنے کی جگہ بنادی، اور ایک مستودع یعنی چند روز رہنے کی جگہ۔

قرآن کریم کے الفاظ تو یہی ہیں، ان کی تعبیر و تفسیر میں بہت سے احتمال ہیں، اسی لئے علماء تفسیر کے اقوال اس میں مختلف ہیں، کسی نے فرمایا کہ مستودع ماں کا پیٹ اور مستقر یہ دنیا ہے، کسی نے فرمایا کہ مستودع قبر ہے اور مستقر دار آخرت، اور بھی متعدد اقوال ہیں، اور الفاظ قرآنی میں سب کی گنجائش ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس کو ترجیح دی ہے کہ مستقر دار آخرت کا مقام جنت یا دوزخ ہے، اور انسان کی ابتداء آفرینش سے آخرت تک جتنے مراحل اور درجات ہیں وہ سب مستودع یعنی چند روزہ قیام کی جگہیں ہیں، خواہ شکم مادر ہو یا زمین پر رہنے سہنے کی جگہ یا قبر و برزخ، قرآن کریم کی ایک آیت سے بھی اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے جس میں فرمایا: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ، یعنی تم ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی طرف ہمیشہ چڑھتے رہو گے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دار آخرت سے پہلے پہلے انسان اپنی پوری زندگی میں ایک مسافر کی حیثیت رکھتا ہے، جو ظاہری سکون و قرار کے وقت بھی درحقیقت سفر عمر کے منازل طے کر رہا ہے، ؎

مسافر ہوں کہاں جانا ہے، نا واقف ہوں منزل سے
زمانے سے پھرتے پھرتے گور تک پہنچا ہوں مشکل سے

اس آخری آیت میں ظاہری اسباب اور مخلوقات کی نیرنگیوں میں مشغول ہو کر اپنے اصلی مستقر اور خدا و آخرت سے غافل ہو جانے والے کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں، تاکہ وہ حقیقت کو پہچانے اور دنیا کے دھوکہ و فریب سے نجات پائے، مولانا جامیؒ نے خوب فرمایا کہ ؎

ہمہ اندر زمن ترا این است ؛ کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ

اور اسی نے اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگنے والی

كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ

ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا،

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے

وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى

اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک

ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۹۹

درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو ان چیزوں میں نشانیاں ہیں واسطے ایمان والوں کے

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ

اور ٹھہراتے ہیں شریک اللہ کے جنوں کو حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا اور تراشتے ہیں اس کے واسطے بیٹے اور

بَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۱۰۰ بَدِيْعُ

بیٹیاں جہالت سے وہ پاک ہے اور بہت دور ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں نئی طرح پر

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ

بنانے والا آسمان اور زمین کا کیونکر ہو سکتا ہے اس کے بیٹا حالانکہ اس کے کوئی

صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۱۰۱ ذٰلِكُمُ

عورت نہیں اور اس نے بنائی ہر چیز اور وہ ہر چیز سے واقف ہے یہی اللہ

اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ

تمہارا رب ہے نہیں کوئی معبود سوا اس کے پیدا کرنے والا ہر چیز کا سو تم اسی کی عبادت کرو

وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۱۰۲

اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس (ایک ہی پانی) کے ذریعہ سے ہر قسم کے (رنگ برنگ) نباتات کو (زمین سے) نکالا (ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے کتنی مختلف قسم کی نباتات جن کے رنگ و بو، ذائقہ و فوائد مختلف ہیں کس قدر عجیب کرشمۂ قدرت ہے) پھر ہم نے اس (کونپل) سے (جو اول زمین سے نکلتی ہے، جس کو بعض لغات میں سوئی یا کھونٹی کہتے ہیں وہ رنگ میں زرد ہوتی ہے)

سبز شاخ نکالی کہ اس شاخ سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں، یہ تو غلوں کی کیفیت ہوئی جس کا ذکر بطور الف و نشر کے آئندہ آیت میں آئیگا اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھے میں سے خوشے نکلتے ہیں جو (مارے) بوجھ کے نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور اسی پانی سے ہم نے انگوروں کے باغ پیدا کئے، اور زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے جو کہ بعضے تو اور بعضے زیتون پھل کی صورت شکل و مقدار و رنگ وغیرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور بعضے ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے، ذرا ہر ایک کے پھل کو تو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس وقت بالکل کچا بدمزہ قابل نہ کھانے کے ہوتا ہے، اور اس کے پکنے کو دیکھو کہ اس وقت سب اوصاف میں کیسا کامل ہو گیا، یہ بھی خدا کی قدرت کا ظہور ہے، ان (امور) میں (بھی) دلائل (توحید کے) موجود ہیں، اگرچہ باعتبار تبلیغ کے سب کے لئے ہیں مگر نفع کے اعتبار سے) ان ہی لوگوں کے لئے ہیں جو ایمان رکھنے کی فکر رکھتے ہیں (ان میووں اور پھلوں کا بیان ہوا جن کا ذکر اجمالاً اوپر کی آیت میں آچکا ہے)

اور (مشرک) لوگوں نے (اپنے عقیدہ میں) شیاطین کو (ایسے) اللہ کا (جس کے صفات وافعال اوپر مذکور ہوئے) شریک قرار دے رکھا ہے (کہ ان کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں اور خدا کے مقابلہ میں ان کے کہنے پر چلتے ہیں) حالانکہ ان لوگوں کو (خود ان کے اقرار کے موافق بھی) خدا ہی نے پیدا کیا ہے (جب خالق کوئی اور نہیں تو معبود بھی کوئی اور نہ ہونا چاہئے) اور ان (مشرکین) میں سے بعض لوگوں نے اللہ کے حق میں بیٹے اور بیٹیاں (اپنے اعتقاد میں) محض بلا سند تراش رکھی ہیں، (جیسے نصاریٰ حضرت مسیح کو اور بعض یہود حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا، اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے) وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ (خدا تعالیٰ کی شان میں) بیان کرتے ہیں (یعنی یہ کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس کے کوئی اولاد ہو) وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد (یعنی نیست سے ہست کرنے والا) ہے (اور دوسرا کوئی موجد نہیں، پس معبود بھی کوئی اور نہ ہوگا، اس سے تو شریک کی نفی ہوئی اور اولاد کی نفی کی دلیل یہ ہے کہ اولاد کی حقیقت یہ ہے کہ میاں بیوی ہوں اور ان دونوں کی مقارنت سے تیسری جاندار چیز پیدا ہو تو اللہ کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے حالانکہ اس کے کوئی بی بی تو ہے نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے (جیسا ان لوگوں کو پیدا کیا وَخَلَقَهُمْ اور زمین و آسمان کو پیدا کیا بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ الخ اسی طرح اس نے) ہر چیز کو پیدا کیا، اور (جس طرح وہ خالقیت میں یکتا ہے اسی طرح اس صفت میں بھی یکتا ہے کہ) وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (ازلاً بھی ابداً بھی اور اس وصف میں بھی اس کا کوئی شریک

نہیں اور تخلیق بدون علم کے ہو نہیں سکتی اس سے بھی ثابت ہو گیا کہ کوئی خالق نہیں بجز ذات
جس کے صفات کمال بیان کئے گئے یہ ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں
ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اور جب یہ بیان ہو چکا جب یہ صفات اللہ ہی کی ہیں تو تم لوگ اس
ہی کی عبادت کرو اور دیکھو کہ وہ ہی ہر چیز کا کارساز حقیقی ہے اور دوسرا کوئی کارساز
بھی نہیں پس اس کی عبادت کرو گے تو وہ تم کو نفع حقیقی پہنچائے گا اور دوسرا کوئی نہ دے گا،
غرض خالق بھی وہی علیم بھی وہی کارساز بھی وہی اور یہ سب امور مقتضی ہیں کہ معبود بھی وہی ہو۔

معارف و مسائل

ان مضامین میں ایک عجیب ترتیب کی رعایت ہے، وہ یہ کہ یہاں تین قسم کی کائنات مذکور ہے، سفلیات، علویات، کائناتِ جو، یعنی فضا کے اندر کی پیدا ہونے والی اشیاء، اور بیان شروع کیا سفلیات سے کہ وہ ہم سے اقرب ہیں، اور پھر اس کے دو حصے کئے، ایک بیان زمین سے اُگنے والی نباتات اور درختوں باغوں کا، دوسرے حیوانات انسان اور جانوروں کا، اوّل کو مقدم کیا کہ بہ نسبت دوسرے کے نسبتاً ظاہر ہے، اور دوسرے کا معاملہ کہ روح پر موقوف ہو دقیق ہے، چنانچہ نطفہ سے متصف ہونا اور حیات کا ادراک حیوانات کے ساتھ مخصوص ہے بخلاف نباتات کے بڑھنے، پھلنے پھولنے وغیرہ کے کہ عام طور سے مشاہد ہے، پھر فضائی سماوی کی کائنات کو ذکر کیا، صبح و شام پھر علویات کو ذکر کیا، شمس و قمر و نجوم، پھر چونکہ سفلیات کا زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے، اس کو مکرر ذکر کر کے اس پر ختم فرمایا، مگر پہلے وہ اجمالاً مذکور تھا اب تفصیل سے ذکر کیا گیا، لیکن تفصیل کی ترتیب میں اجمال کی ترتیب کا عکس کر دیا گیا، کہ بیان نفس کو مقدم کیا، اور بیان نباتات کو مؤخر، ممکن ہے کہ اس کا مبنی یہ ہو کہ اس فصل بیان میں اظہار نعمت کا عنوان اختیار کیا گیا ہے تو اس حیثیت سے منعم علیہ بوجہ مقصود و متبوع ہونے کے قابل تقدیم کے ہوا اور نباتات میں ترتیب سابق باقی ہے کہ حبوب یعنی غلات کی کیفیت دانہ و گٹھلی پر مقدم رہی، اور بارش کا درمیان میں ذکر آنا نباتات کے تابع ہے، اور اس میں ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ بارش کی مختلف حیثیات ہیں، مبدأ کے اعتبار سے تو علوی اور منتہی کے اعتبار سے سفلی اور مسافت کے اعتبار سے فضائی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ

نہیں پا سکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پا سکتا ہے آنکھوں کو اور وہ نہایت لطیف

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بینی کے ذرائع (یعنی توحید و رسالت کے حق ہونے کے دلائل عقلیہ و نقلیہ) پہنچ چکے ہیں سو جو شخص ان کے ذریعہ سے حق کو دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا (یعنی تمہارے اعمال کا) نگران نہیں ہوں (یعنی جیسے نگرانی کرنے والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ناشائستہ حرکت نہ کرنے دے، یہ میرے ذمہ نہیں، میرا کام صرف تبلیغ ہے اور دیکھئے ہم اسی (عمدہ) طور پر دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ سب کو پہنچا دیں، اور تاکہ یہ (منکرین حقوب سے) یوں کہیں کہ آپ نے کسی سے (ان مضامین کو) پڑھ لیا ہے (مطلب یہ کہ تاکہ ان پر اور زیادہ الزام ہو کہ ہم تو اس طرح واضح کرکے حق کو ثابت کرتے تھے اور تم پھر لغو بہانے تراشتے تھے) اور تاکہ ہم اس (قرآن کے مضامین) کو دانشمندوں کے لئے خوب ظاہر کردیں (یعنی قرآن کے نازل کرنے کے تین فائدے ہیں، ایک یہ کہ آپ کو اجر تبلیغ ملے، دوسرے یہ کہ منکرین پر زیادہ حجت قائم ہو، تیسرے یہ کہ دانشمند طالبان حق کو حق ظاہر ہوجاوے پس آپ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، خود اس طریق پر چلتے رہئے جس کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے (اور اس طریق میں بڑی چیز یہ اعتقاد ہے کہ) اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں (اور طریق میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے) اور (اس پر قائم رہ کر) مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے (کہ افسوس، انھوں نے قبول کیوں نہ کیا، اور وجہ خیال نہ کرنے کی یہ ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ کرتے (لیکن ان لوگوں کی بدعنوانیوں سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کو سزا دیں، اس لئے ایسا ہی سامان جمع کردیا، پھر ان کو آپ کیا مسلمان بنا سکتے ہیں، اور آپ اس فکر میں پڑیں ہی کیوں) ہم نے آپ کو ان (کے اعمال) کا نگران نہیں بنایا اور نہ آپ (ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے) مختار ہیں (پس جب آپ کے متعلق ان کے جرائم کی تفتیش ہے اور نہ ان کی سزا کا حکم ہے، پھر آپ کو کیوں تشویش ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کی ان پانچ آیات میں سے پہلی آیت میں ابصار بصر کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نگاہ اور دیکھنے کی قوت، اور ادراک کے معنی پالینا، پکڑ لینا، احاطہ کرلینا ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ ادراک کی تفسیر احاطہ کرلینا بیان فرمائی ہے (بحر محیط)۔

معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ساری مخلوقات جن و انس و ملائکہ اور تمام حیوانات کی نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ یہ نگاہیں اس کی ذات کا احاطہ

کرلیں، اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی نگاہوں کو پوری طرح دیکھتے ہیں اور ان کا دیکھنا ان سب پر محیط ہے، اس مختصر آیت میں حق تعالیٰ کی دو مخصوص صفتوں کا ذکر ہے، اوّل یہ کہ ساری کائنات میں کسی کی نگاہ بلکہ سب کی نگاہیں مل کر بھی اس کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان اور جنّات اور فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کرسکتے۔ (مظہری بحوالہ ابن ابی حاتم)

اور یہ خاص صفت حق جل وعلا شانہٗ کی ہی ہوسکتی ہے ورنہ نگاہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت بخشی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی چھوٹی سے چھوٹی آنکھ دنیا کے بڑے سے بڑے کرّے کو دیکھ سکتی اور نگاہ سے اس کا احاطہ کرسکتی ہے، آفتاب و ماہتاب کتنے بڑے بڑے کرّے ہیں کہ زمین اور ساری دنیا کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر ہر انسان بلکہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی آنکھ ان کرّوں کو اسی طرح دیکھتی ہے کہ نگاہ میں ان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسّہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم حاصل ہوسکتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے، اس کا علم اس حاسّہ بصر سے کیسے حاصل ہو ؎

تو دل میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

حق تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں، اور انسانی حواس اور عقل وخیال سب محدود چیزیں ہیں، ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود کسی محدود چیز میں نہیں سما سکتا، اسی لئے دنیا کے عقلاء و فلاسفر جنھوں نے عقلی دلائل سے خالق کائنات کا پتہ لگانے اور اس کی ذات و صفات کے ادراک کے لئے اپنی عمریں بحث و تحقیق میں صرف کیں، اور صوفیائے کرام جنھوں نے کشف و شہود کے راستہ سے اس میدان کی سیاحت کی، سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا نہ پاسکتا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

دُور بینانِ بارگاہِ الست ⁂ غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

اور حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

روئیت باری تعالیٰ کا مسئلہ | انسان کو حق تعالیٰ کی رؤیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تمام علماء اہلسنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اور زیارت نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی کہ رَبِّ اَرِنِیْ "اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے" تو جواب میں ارشاد ہوا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ "آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے"۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مومنین کو حق تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح و قوی احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور خود قرآن کریم میں موجود ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ | "قیامت کے روز بہت سے چہرے تر و تازہ ہشاش بشاش ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"

البتہ کفار و منکرین اس روز بھی سزا کے طور پر حق تعالیٰ کی رؤیت سے مشرف نہ ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ | "یعنی کفار اس روز اپنے رب کی زیارت سے محجوب و محروم ہوں گے"

اور آخرت میں حق تعالیٰ کی زیارت مختلف مقامات پر ہوگی، عرصۂ محشر میں بھی، اور جنت میں پہونچنے کے بعد بھی، اور اہل جنت کے لئے ساری نعمتوں سے بڑی نعمت حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں اُن سے زائد اور کچھ چاہیے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اُس وقت حجاب درمیان سے اُٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی، یہ حدیث صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا، آپ نے چاند کی طرف نظر فرمائی

اور پھر فرمایا کہ آخرت میں، تم اپنے رب کو اسی طرح عیاناً دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔

ترمذی و مسند احمد کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے، اُن کو روزانہ صبح و شام حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو حق تعالیٰ کی زیارت نہیں ہوسکتی، اور آخرت میں سب اہلِ جنت کو ہوگی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شبِ معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی درحقیقت عالمِ آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہان کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، آسمانوں سے اوپر آخرت کا مقام ہے، وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ جب آیتِ قرآن لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رُویت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر قیامت میں کیسے ہوگی؟ اس کا جواب کھلا ہوا یہ ہے کہ آیتِ قرآن کے یہ معنی نہیں کہ انسان کے لئے حق تعالیٰ کی رُویت و زیارت ناممکن ہے، بلکہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسانی نگاہ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتی، کیونکہ اس کی ذات غیر محدود اور انسان کی نظر محدود ہے۔

قیامت میں بھی جو زیارت ہوگی وہ اس طرح ہوگی کہ نظر احاطہ نہیں کرسکے گی، اور دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں جو اس طرح کی رویت کو بھی برداشت کرسکے، اس لئے دنیا میں رویت مطلقاً نہیں ہوسکتی، اور آخرت میں قوت پیدا ہوجائے گی، تو رویت و زیارت ہوسکے گی، مگر نظر میں ذاتِ حق کا احاطہ اُس وقت بھی نہ ہوسکے گا۔

دوسری صفت حق تعالیٰ شانہٗ کی اس آیت میں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی نظر ساری کائنات پر محیط ہے، دنیا کا کوئی ذرہ اس کی نظر سے چھپا ہوا نہیں، یہ علم مطلق اور احاطہ علمی بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی ہی خصوصیت ہے، اس کے سوا کسی مخلوق کو تمام اشیاء کائنات اور ذرہ ذرہ کا علم نہ کبھی ..... حاصل ہوا نہ ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ مخصوص صفت ہے رب العزت جل شانہٗ کی۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ، لطیف عربی لغت کے اعتبار سے دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک معنی مہربان، دوسرے بمقابل کثیف، یعنی وہ چیز جو حواس کے ذریعہ محسوس و معلوم نہیں کی جاسکتی۔

اور خبیر کے معنی ہیں باخبر، معنی اس جملہ کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ لطیف ہیں اس لئے حواس کے ذریعہ ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، اور خبیر ہیں، اس لئے ساری کائنات کا کوئی ذرہ ان کے علم و خبر سے باہر نہیں، اور اگر لطیف کے معنی اس جگہ مہربان کے لئے جاویں تو اشارہ اس طرف

ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہمارے ہر قول و فعل بلکہ ارادہ اور خیال سے بھی باخبر ہیں جس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم ہر گناہ پر پکڑے جایا کرتے، مگر چونکہ وہ لطیف و مہربان بھی ہیں، اس لئے ہر گناہ پر مواخذہ نہیں فرماتے۔

دوسری آیت میں لفظ بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عقل و دانش یعنی وہ قوت جس کے ذریعہ انسان غیر محسوس چیزوں کا علم حاصل کرسکتا ہے، بصائر سے مراد آیت میں وہ دلائل اور ذرائع ہیں جن سے انسان حق اور حقیقت کو معلوم کرسکے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس حق بینی کے ذرائع اور وسائل پہونچ چکے ہیں، یعنی قرآن آیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ کے معجزات آئے، آپ کے اخلاق و معاملات و تعلیمات مشاہدہ میں آئیں یہ سب حق بینی کے ذرائع ہیں۔

تو جو شخص ان ذرائع سے کام لے کر صاحب بصیرت بن گیا، اس نے اپنا نفع حاصل کرلیا اور جو ان ذرائع کو چھوڑ کر حق سے اندھا رہا تو اپنا ہی نقصان کیا۔

آخر آیت میں فرمایا کہ "میں تمہارا نگراں نہیں"، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار نہیں کہ لوگوں کو زبردستی کرکے ناشائستہ کاموں سے روک ہی دیں، جیسے نگراں اور محافظ کا کام ہوتا ہے، بلکہ رسول کا منصبی فریضہ صرف احکام کا پہونچا دینا اور سمجھا دینا ہے، پھر کوئی اپنے اختیار سے ان کا اتباع کرے یا نہ کرے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

توحید و رسالت پر جو واضح دلائل پچھلی آیات میں بیان ہوچکے ہیں، تیسری آیت میں ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا: كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ، یعنی ہم اسی طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا: وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ جس کا حاصل یہ ہے کہ سارا ہدایت کا سامان معجزات اور دلائل، بے مثل کتاب قرآن اور ایک اُمّی محض کی زبان مبارک سے ایسے علوم و حقائق کا اظہار جن سے ساری دنیا کے فلاسفر اور حکماء عاجز ہیں، ایسا بلیغ کلام جس میں قیامت تک آنے والے جن و بشر کو چیلنج کیا گیا کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورت جیسا کلام کوئی بنا سکے تو لائے اور ساری دنیا اس سے عاجز رہی، یہ سب حق بینی کا سامان ایسا تھا کہ ہر ہٹ دھرم منکر کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر جانا چاہئے تھا، لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں زیغ اور کجی تھی، وہ یہ کہنے لگے کہ درست یعنی یہ علوم تو آپ نے کسی سے پڑھ لئے ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا: وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ، جس کا حاصل یہ ہے کہ دانشمند

جن کی سمجھ درست اور فہم سلیم ہے ان کے لئے یہ بیان نافع و مفید ثابت ہوا، خلاصہ یہ ہے کہ سامانِ ہدایت تو سب کے سامنے رکھا گیا مگر کج فہموں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، سلیم الفہم لوگ اس کے ذریعہ دنیا کے رہبر بن گئے۔

چوتھی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کون مانتا ہوا، یہ کون نہیں مانتا، آپ خود اس طریق پر چلتے رہئے جس طریق پر چلنے کے لئے آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے، جس میں بڑی چیز یہ اعتقاد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، نیز اس وحی میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے، اس پر قائم رہئے، مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے کہ افسوس انھوں نے کیوں قبول نہ کیا۔

پانچویں آیت میں اس کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تکوینی طور پر یہ منظور ہوتا کہ سب انسان مسلمان ہو جائیں تو یہ شرک نہ کر سکتے، لیکن ان کی بد عنوانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ ان کو سزا ملے تو ایسا ہی سامان جمع کر دیا، پھر آپ ان کو کیسے مسلمان بنا سکتے ہیں، اور آپ اس فکر میں پڑیں کیوں، ہم نے آپ کو ان کے اعمال کا نگران نہیں بنایا، اور نہ آپ ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے مختار ہیں، اس لئے آپ کو ان کے اعمال سے تشویش نہ ہونی چاہئے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ

اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا، پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو

عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى

بے ادبی سے بدون سمجھے، اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو، پھر ان سب

رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾ وَاَقْسَمُوْا

کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے اور وہ قسمیں کھاتے ہیں

بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَاۗءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ

اللہ کی تاکید سے کہ اگر آوے ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور اس پر ایمان لاویں گے

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ

تو کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اے مسلمانو کیا خبر ہے کہ جب نشانیاں آویں گی تو

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا

یہ لوگ ایمان لے ہی آویں گے اور ہم الٹ دیں گے ان کے دل اور ان کی آنکھیں جیسے کہ

لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

یقین نہیں لائے ان نشانیوں پر پہلی بار اور ہم چھوڑے رکھیں گے ان کو ان کی سرکشی میں بہکتے ہوئے

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ

اور اگر ہم اتاریں ان پر فرشتے اور باتیں کریں ان سے

الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ

مردے اور زندہ کردیں ہم ہر چیز کو ان کے سامنے تو بھی یہ لوگ ہرگز ایمان لانیوالے نہیں

اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ

مگر یہ کہ چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر جاہل ہیں، اور اسی طرح

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ

کردیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو، جو کہ سکھلاتے ہیں

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ

ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کے لئے، اور اگر تیرا رب چاہتا

مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ

تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے، سو تو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ، اور اس لئے کہ مائل ہوں ان ملمع

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا

کی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل جن کو یقین نہیں آخرت کا، اور وہ اس کو بھی پسند کرلیں اور کئے جاویں

هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

جو کچھ برے کام کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور (دشنام دہی) مت دو ان (معبودان باطلہ) کو جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہ جہل حد سے گذر کر (یعنی غصہ میں آکر) اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے (اور اس کا تعجب نہ کیا جانے کہ ایسی گستاخی کرنیوالوں کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی کیونکہ) ہم نے (دنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل (خواہ برا ہو) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے سبب جمع ہو جاتے ہیں

آیت کا شانِ نزول ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم ابوطالب مرض موت میں تھے تو قریش کے مشرک سردار جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور ایذا رسانی میں لگے ہوتے تھے اور قتل کی سازشیں کرتے رہتے تھے، ان کو یہ فکر ہوئی کہ ابوطالب کی وفات ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن جائے گی کیونکہ ان کے بعد اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کریں تو یہ ہماری عزت و شرافت کے خلاف ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ ابوطالب کے سامنے تو ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے، ان کی موت کے بعد اکیلا پاکر قتل کردیا، اس لئے اب وقت ہے کہ ہم مل کر خود ابوطالب ہی سے کوئی فیصلہ کن بات کریں۔

یہ بات تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان جانتا ہے کہ ابوطالب اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و محبت بلکہ عظمت و جلالت بھی ان کے دل میں پیوست تھی، اور آپ کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہتے تھے۔

چند قریشی سرداروں نے یہ مشورہ کرکے ابوطالب کے پاس جانے کے لئے ایک وفد مرتب کیا جس میں ابوسفیان، ابوجہل، عمرو بن عاص وغیرہ قریشی سردار شامل تھے، ابوطالب سے اس وفد کی ملاقات کے لئے وقت لینے کا کام ایک شخص مطلب نامی کے سپرد ہوا، اس نے ابوطالب سے اجازت لے کر اس وفد کو وہاں پہونچایا۔

وفد نے ابوطالب سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو سخت تکلیف اور ایذاء پہونچا رکھی ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں تو ہم اس پر صلح کرلیں گے کہ وہ اپنے دین پر جس طرح چاہیں عمل کریں، جس کو چاہیں معبود بنائیں، ہم ان کو کچھ نہ کہیں گے۔

ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ آپ کی برادری کے سردار آئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیں، برا بھلا نہ کہیں، ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو چھوڑ دیں گے، اس طرح باہمی مخالفت ختم ہوجائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر میں تمھاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کے لئے تیار ہوجاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک ہوجاؤ گے، اور عجم کے لوگ بھی تمھارے تابع اور باج گذار بن جائیں گے۔

ابوجہل بولا کہ ایک کلمہ کیا، ہم دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، بتلائیے وہ کیا ہیں، آپ نے فرمایا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، یہ سنتے ہی سب برہم ہوگئے، ابو طالب نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے بھتیجے اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو کیونکہ آپ کی قوم اس کلمہ سے گھبرا گئی ہے۔ آپ نے فرمایا چچا جان میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا، اگر وہ آسمان سے آفتاب کو اتار کر بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیں جب بھی میں اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا ہرگز نہ کہوں گا، مقصود یہ تھا کہ ان کو مایوس کر دیں۔

اس پر یہ لوگ ناراض ہو کر کہنے لگے کہ یا تو آپ ہمارے معبودوں (بتوں) کو برا کہنے سے باز آجائیے، ورنہ ہم آپ کو بھی گالیاں دیں گے اور اس ذات کو بھی جس کا رسول آپ اپنے آپ کو بتلاتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ، یعنی آپ ان بتوں کو برا نہ کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو برا کہنے لگیں، اپنی بے راہ روی اور بے علمی سے۔

اس میں لَا تَسُبُّوْا لفظ سبّ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں گالی دینا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے فطرتی اخلاق کی بناء پر پہلے ہی اس کے پابند تھے، کبھی بچپن میں بھی کسی انسان بلکہ کسی جانور کے لئے بھی گالی کا لفظ آپ کی زبان مبارک پر جاری نہیں ہوا، ممکن ہے بعض صحابہ کرام کی زبان سے کبھی کوئی سخت کلمہ نکل بھی گیا ہو جس کو مشرکین مکہ نے گالی سے تعبیر کیا اور قریشی سرداروں کے اس وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس معاملہ کو ذکر کر کے یہ اعلان کر دیا کہ آپ ہمارے بتوں کو سب وشتم کرنے سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کے **خدا کو سب وشتم کریں گے۔**

اس پر قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہوا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو روک دیا گیا کہ وہ مشرکین کے معبوداتِ باطلہ کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کریں، اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابل نظر ہے کہ اس سے پہلی آیت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا تھا، مثلاً ارشاد ہے، اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اور اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ اور مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اور مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ، ان تمام صیغوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب تھے کہ آپ ایسا کریں یا ایسا نہ کریں، اس کے بعد اس آیت میں طرز خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پھیر کر عام مسلمانوں کی طرف کر دیا گیا، فرمایا لَا تَسُبُّوْا اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی کسی کو گالی دی ہی نہیں تھی، ان کو براہ راست اس کلمہ کا مخاطب بنانا ان کی دل شکنی کا سبب

... ہو سکتا ہے، اس لئے خطاب عام کر دیا گیا، ورنہ تمام صحابہ کرام بھی اس میں احتیاط فرمانے لگے (کذا فی البحر المحیط)

رہا یہ معاملہ کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں، وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں، توہین کرنے کی دل آزاری نہ پیش نظر ہے، ورنہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا مقصود ہے، اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ بآسانی سمجھ لیتے ہیں کہ کبھی کسی شخص کا کوئی عیب یا برائی کسی مسئلہ کی تنقیح کے لئے ذکر کی جاتی ہے، جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز پیش آتا رہتا ہے، لیکن عدالت کے سامنے ہونے والے بیان کو دنیا میں کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے فلاں کو گالی دی ہے، اسی طرح ڈاکٹروں اور حکیموں کے سامنے انسان کے بہت سے ایسے عیب بیان کئے جاتے ہیں کہ ان کو دوسری جگہ اور دوسری طرح کوئی بیان کرے گا تو گالی سمجھی جائے، لیکن بغرض علاج ان کے بیان کرنے کو کوئی گالی دینا نہیں کہتا۔

اسی طرح قرآن کریم نے جا بجا بتوں کے بے حس و بے شعور اور بے علم و قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں، اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا گمراہی واضح ہو جائے، جس کے نتیجہ میں ارشاد ہوا ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ، یعنی یہ بت بھی کمزور ہیں اور ان کے پوجنے والے بھی کمزور، یا یہ ارشاد ہوا کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ”یعنی تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں“ یہاں بھی کسی کو برا کہنا مقصود نہیں، گمراہی اور غلطی کا انجام بد بیان کرنا مقصود ہے، اور فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو کسی مشرکین کو چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبّ ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے، جیسے مواضع مکروہہ میں تلاوتِ قرآن کا ناجائز ہونا سب کو معلوم ہے۔ (روح المعانی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور قرآن کریم میں تو نہ پہلے کبھی ایسا کلام آیا تھا جس کو لوگ گالی سمجھیں، اور نہ آئندہ آنے کا کوئی خطرہ تھا، ہاں مسلمانوں سے اس کا امکان تھا ان کو اس آیت نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

اس وقت اور اس پر قرآنی ہدایت نے ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا، دو چند اصولی مسائل اس سے نکل آئے۔

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے — مسئلہ یہ نکلا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے، کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضے سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس بے ادبی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ ہاں انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجہ میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے، تو اس گالی دلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود گالی دی۔

اسی معاملہ کی ایک دوسری مثال عہد رسالت میں یہ پیش آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بیت اللہ شریف زمانہ جاہلیت کے کسی حادثہ میں منہدم ہو گیا تھا تو قریش مکہ نے بعثت و نبوت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بنا ابراہیمی کے خلاف ہو گئیں، ایک تو یہ کہ جس حصہ کو حطیم کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا جزء ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا، دوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا باہر نکلنے کے لئے، اہل جاہلیت نے غربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا، اور وہ بھی سطح زمین سے بلند کر دیا تاکہ بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی و اجازت سے ہو سکے۔ ہر شخص بے محابانہ جا سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنا دوں، مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عام عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس لئے

میں نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا۔

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا ایک طاعت اور کار ثواب تھا، مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتب دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا، اس واقعہ سے بھی یہی اصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس پر ایک قوی اشکال ہے جس کو روح المعانی میں ابو منصور سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد و قتال لازم فرمایا ہے، حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے، اور مسلمان کا قتل حرام ہے، تو اس اصول کی بناء پر جہاد بھی ممنوع ہونا چاہئے، ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوت قرآن پر نیز اذان و نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور تمسخر بناتے ہیں تو کیا ہم ان کے اس غلط رویّہ کی بناء پر اپنی عبادات سے دستبردار ہو جائیں گے۔

اس کا جواب خود ابو منصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزوم مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو، جیسے معبودات باطلہ کو برا کہنا، اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں، اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں، اس لئے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا، اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں، یا کوئی مقصد اسلامی ان پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ و خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں، اور پیش آنے والے مفاسد جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں،

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کے لئے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے، اس کو دیکھ کر ابن سیرینؒ واپس ہو گئے، مگر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں، نماز جنازہ فرض ہے اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کی کوشش بقدر قدرت کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔

یہ واقعہ بھی روح المعانی میں نقل کیا گیا ہے۔

اس سے خاص مسئلہ کا جو آیت مذکورہ سے نکلتا ہے یہ ہوگیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کردینا واجب ہوجاتا ہے، بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔

اس اصول سے فقہاء امت نے ہزاروں مسائل کے احکام نکالے ہیں، فقہاء نے فرمایا کہ کسی شخص کا بیٹا نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے کہوں گا تو انکار کرے گا اور اس کے خلاف کرے گا جس سے اس کا سخت گناہگار ہونا لازم آئے گا تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں اس کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کرلیا جائے تو بہت اچھا ہو، تاکہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہوجائے (خلاصۃ الفتاویٰ)

اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرائن سے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اختیار کرے گا جس کے نتیجہ میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہوجائے گا تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کردینا بہتر ہے، امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے باب من ترک بعض الاختیار مخافۃ ان یقصر فھم بعض الناس فیقعوا فی اشد منہ، یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم لوگوں کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض و واجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتداء اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز و تلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا، ....

.... مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، بلکہ خود آیت مذکورہ کے شان نزول میں جو واقعہ ابوجہل وغیرہ رؤساء قریش کا ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں یہ کام کسی حال میں نہیں کرسکتا اگرچہ وہ آفتاب لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

اس لئے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہوگئی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، اور جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں، اور ان کے ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائیگا

پچھلی آیات میں اس کا ذکر تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے ہوئے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں کے باوجود بدنصیب لوگوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا، اپنے انکار اور ضد پر جمے رہے، اگلی آیات میں اس کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا ایک نیا روپ یہ بدلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص خاص قسم کے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قریشی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ اگر آپ ہمیں یہ معجزہ دکھلادیں کہ کوہ صفا پورا سونے کا ہو جائے تو ہم آپ کی نبوت و رسالت کو مان لیں گے، اور مسلمان ہوجائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پختہ معاہدہ کرو کہ اگر یہ معجزہ ظاہر ہوگیا تو تم سب مسلمان ہوجاؤ گے، انھوں نے قسمیں کھالیں، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے کہ اس پہاڑ کو سونا بنا دیجئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے کہ اگر آپ چاہیں تو ہم ابھی اس پورے پہاڑ کو سونا بنا دیں، لیکن قانون الٰہی کے مطابق اس کا نتیجہ ہوگا کہ اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب پر عذاب عام نازل کرکے ہلاک کر دیا جائے گا، جیسے پہلی قوموں میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے، کہ انھوں نے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کیا، وہ دکھلا دیا گیا، اور وہ پھر بھی منکر رہ گئے، تو ان پر اللہ تعالیٰ کا قہر و عذاب نازل ہوگیا، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان لوگوں کی عادات و ہٹ دھرمی سے واقف تھے، بمقتضائے شفقت آپ نے فرمایا کہ اب میں اس معجزہ کی دعا نہیں کرتا، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، جس میں کفار کے قول کو نقل کیا ہے، کہ انھوں نے مطلوبہ معجزہ ظاہر ہونے پر مسلمان ہوجانے کی قسمیں کھائیں، اس کے بعد کی آیت اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ میں ان کے قول کا جواب ہے کہ معجزات اور نشانیاں سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، اور جو معجزات ظاہر ہوچکے ہیں وہ بھی اسی کی طرف سے تھے، اور جس کا مطالبہ کیا جارہا ہے اس پر بھی وہ پوری طرح قادر ہے، لیکن از روئے عقل و انصاف ان کو ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں، اور اس دعوے پر بہت سے دلائل و شہادتیں معجزات کی صورت میں پیش فرما چکے ہیں، اب

دوسرے فریق کو اس کا تو حق ہے کہ ان دلائل اور شہادتوں پر جرح کرے، ان کو غلط ثابت کرے، لیکن ان پیش کردہ شہادتوں میں کوئی جرح نہ کریں اور یہ مطالبہ کریں کہ ہم تو دوسری شہادتیں چاہتے ہیں، یہ ایسا ہوگا جیسے عدالت میں کوئی مدعا علیہ مدعی کے پیش کردہ گواہوں پر تو کوئی جرح نہ کرے، مگر یہ کہے کہ میں ان گواہوں کی شہادت نہیں مانتا، بلکہ فلاں معین شخص کی گواہی پر بات مانوں گا، اس کو کوئی عدالت قابل سماعت نہ سمجھے گی۔

اسی طرح نبوت و رسالت پر جب شواہد آیات بینات اور معجزات ظاہر ہو جانے کے بعد جب تک ان معجزات کو غلط ثابت نہ کریں ان کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ہم تو فلاں قسم کا معجزہ دیکھیں گے جب ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد آخر آیات تک مسلمانوں کو فہمائش اور خطاب ہے کہ تمھارا کام دین حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو صحیح طریقہ سے پہونچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کرنے لگیں تو ان کی فکر میں پڑنا نہیں چاہئے، کیونکہ زبردستی کسی کو مسلمان بنانا نہیں، اگر زبردستی بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ زبردست کون ہے، وہ خود ہی سب کو مسلمان بنا دیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو بھی بالکل ان کے ارادہ کے صحیح طور پر ظاہر کر دیں یہ جب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضد و عناد اور ہٹ دھرمی سے ہے جس کا علاج کوئی معجزہ سے نہیں ہو سکتا، آخری آیت وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ میں اسی مضمون کا بیان ہے کہ اگر ہم ان لوگوں کے فرمائشی معجزات سب دکھلا دیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ فرشتوں سے ان کی ملاقات اور مردوں سے گفتگو کرا دیں جب بھی وہ ماننے والے نہیں، بعد کی دو آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر آپ سے عداوت کرتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں، پچھلے تمام انبیاء کے بھی دشمن ہوتے چلے آئے ہیں، آپ اس سے دلگیر نہ ہوں۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ

سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے اتاری تم پر کتاب

مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ

واضح اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے

مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ

تیرے رب کی طرف سے ٹھیک سو تو مت ہو شک کرنے والوں میں سے اور تیرے رب کی

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان مقدمہ رسالت و نبوت میں اختلاف ہے، میں اس کا مدعی ہوں اور تم منکر، اور یہ مقدمہ حکم الحاکمین کے اجلاس سے میرے حق میں اس طرح طے و فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل خود قرآن کا معجزہ ہے جس نے تمام قوم عرب کو چیلنج کیا کہ اگر اس کے کلام الٰہی ہونے میں کسی کو شبہ ہو تو اس کلام کی ایک چھوٹی سی سورت یا آیت کا مقابلہ کرکے دکھلاؤ جس کے جواب میں تمام عرب عاجز رہے، اور وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو پست کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، آبرو سب کچھ قربان کر رہے تھے ان میں سے ایک کبھی ایسا نہ نکلا کہ قرآن کے مقابلہ کے لئے ایک دو آیت بنا کر پیش کر دیتا، یہ کھلا ہوا معجزہ کیا قبول حق کے لئے کافی نہ تھا کہ ایک امی جس نے کہیں کسی سے تعلیم نہیں پائی اس کے پیش کئے ہوئے کلام کے مقابلہ سے پورا عرب بلکہ پورا جہان عاجز ہو جائے، یہ درحقیقت احکم الحاکمین کی عدالت سے اس مقدمہ کا فیصلہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول برحق اور قرآن اللہ جل شانہ کا کلام ہے۔

پہلی آیت میں اسی کے متعلق فرمایا: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا، یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے بعد میں کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد قرآن کریم کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو خود قرآن کریم کے حق اور کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہیں، ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا، جس میں قرآن کریم کے چار خصوصی کمالات کا بیان ہے، اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ وہ ایک کتاب کامل و معجز ہے کہ سارا جہان اس کے مقابلہ سے عاجز ہے، تیسرے یہ کہ تمام اہم اور اصولی مضامین اس میں بہت مفصل واضح بیان کئے گئے ہیں، چوتھے یہ کہ قرآن کریم سے پہلے اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام حق ہے، پھر جن میں کوئی سچائی اور حق گوئی کی صفت تھی، انھوں نے اس کو ظاہر بھی کر دیا، اور جو لوگ معاند تھے وہ باوجود یقین کے اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔

قرآن کریم کی ان چار صفات کو بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ، یعنی ان واضح دلائل کے بعد آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی وقت بھی شبہ کرنے والوں میں نہ تھے نہ ہو سکتے تھے، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ نہ میں نے کبھی شک کیا اور نہ کبھی سوال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظوں میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن درحقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے، اور آپؐ کی طرف اسناد کرنے سے مبالغہ اور تاکید زیادہ منظور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہا گیا تو دوسروں کی کیا مجال ہے جو کوئی شک کر سکیں۔

دوسری آیت میں قرآن حکیم کی دو امتیازی صفات کا بیان ہے جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہیں۔ ارشاد ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ، یعنی کامل ہے کلام آپؐ کے رب کا سچائی اور انصاف اور اعتدال کے اعتبار سے

اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

لفظ تَمَّتْ میں کامل ہونے کا بیان ہے، اور كَلِمَتُ رَبِّكَ سے مراد قرآن ہے (بحر محیط عن قتادہؓ) قرآن کے کل مضامین دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں تاریخ عالم کے عبرت آموز واقعات، حالات اور نیک عمل پر وعدہ اور بُرے عمل پر سزا کی وعید بیان کی گئی ہے، دوسرے وہ جن میں انسان کی صلاح و فلاح کے لئے احکام بیان کئے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے متعلق قرآن مجید کی یہ دو صفتیں بیان فرمائیں، صِدْقًا وَّعَدْلًا، صدق کا تعلق پہلی قسم سے ہے، یعنی جتنے واقعات و حالات یا وعدہ وعید قرآن میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں، ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں، اور عدل کا تعلق دوسری قسم یعنی احکام سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں، اور لفظ عدل کا مفہوم دو معنی کو شامل ہے، ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم و حق تلفی نہ ہو، دوسرے اعتدال کہ نہ بالکل انسان کی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں، اور نہ ایسے جن کو انسانی جذبات اور اس کے فطری ملکات برداشت نہ کر سکیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام احکام الٰہیہ انصاف اور اعتدال پر مبنی ہیں نہ ان میں کسی پر ظلم ہے اور نہ ان میں ایسی شدت اور تکلیف ہے جس کو انسان برداشت نہ کر سکے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ کسی عمل کی تکلیف نہیں دیتے، اس کے ساتھ ہی اس آیت میں لفظ تَمَّتْ لا کر یہ بھی بتلا دیا کہ صرف یہی نہیں کہ قرآن کریم میں ...... صدق و عدل کی صفات موجود ہیں، بلکہ وہ ان صفات میں ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔

اور یہ بات کہ تمام قرآنی احکام تمام اقوام دنیا کے لئے اور قیامت تک آنے والی نسلوں اور بدلنے والے حالات کے لئے انصاف پر بھی مبنی ہوں اور اعتدال پر بھی، یہ اگر

ذرا بھی غور کیا جائے تو صرف احکم الحاکمین ہی کا ہو سکتا ہے، دنیا کا کوئی قانون ساز اسمبلی تمام موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کا نہ پورا اندازہ لگا سکتی ہے، نہ ان سب حالات کی رعایت کرکے کوئی قانون بنا سکتی ہے، ہر ملک و قوم اپنے ملک اور اپنی قوم کے بھی صرف موجودہ حالات کے پیش نظر قانون بناتی ہے، اور ان قوانین میں بھی تجربہ کرنے کے بعد بہت سی چیزیں عدل و اعتدال کے خلاف محسوس ہوتی ہیں، تو ان کو بدلنا پڑتا ہے، دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں یا آئندہ حالات کی پوری رعایت کرکے ایسا قانون وضع کرنا جو ہر قوم ہر ملک ہر حال میں عدل و اعتدال کی صفت لئے ہوئے ہو، یہ انسانی فکر و نظر سے بالاتر ہے، صرف حق جل وعلا شانہ ہی کا کام ہو سکتا ہے، اس لئے یہ پانچویں صفت قرآن کریم کی کہ اس میں بیان کئے ہوئے گذشتہ و آئندہ کے تمام واقعات اور وعدہ وعید سب سچے ہیں، ان میں خلاف واقع ہونے کا کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے بیان کئے ہوئے تمام احکام پوری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عدل و اعتدال لئے ہوئے ہیں، ان میں کسی پر ظلم ہے، نہ اعتدال و میانہ روی سے کم و بیش ہے، یہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے، اس لئے بدلا جائے، یا یہ کہ کوئی دشمن زبردستی اس کو بدل ڈالے، اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب چیزوں سے بالاتر اور برتر، اس نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، پھر کس کی مجال ہے کہ ان کی حفاظت کو توڑ کر اس میں کوئی تغیر تبدل کر سکے، چنانچہ چودہ سو برس اس پر گذر چکے ہیں، اور ہر قرن ہر زمانہ میں قرآن کے مخالف اس کے ماننے والوں کی نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے ہیں، قوت میں بھی، مگر کسی کی مجال نہیں ہو سکی کہ قرآن کے ایک زیر زبر میں فرق پیدا کر سکے، اور بدلنے کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کرکے بدل دیا جائے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب ہے، اس کے بعد نسخ کا کوئی احتمال نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یعنی اللہ جل شانہ اس تمام گفتگو کو

باطنی گناہ ہے جیسا کہ اس کا عکس بھی) بیشک جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب (قیامت میں) سزا ملے گی اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر (بطریق مذکور) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو (جیسا کہ مشرکین ایسے جانوروں کو کھاتے ہیں) اور یہ امر (یعنی ما لم یذکر اسم اللہ علیہ کا کھانا) بے حکمی ہے (غرض نہ ترک میں ان کا اتباع کرو اور نہ فعل میں) اور (ان لوگوں کے شبہات اس لئے قابل التفات نہیں کہ) یقیناً شیاطین (جن) اپنے (انسان) دوستوں (اور پیرووں) کو (یہ شبہات) تعلیم کر رہے ہیں تاکہ یہ تم سے (بیکار) جدال کریں (یعنی اول تو یہ شبہات نص کے خلاف دوسرے غرض محض جدال اس لئے قابل التفات نہیں) اور اگر تم (خدانخواستہ) ان لوگوں کی اطاعت (عقائد یا فعل میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ (کیونکہ اللہ کی تعلیم پر دوسرے کی تعلیم کو ترجیح دینا یا برابر سمجھنا بھی شرک ہے، یعنی ان کی اطاعت ایسی بری چیز ہے اس لئے اس کے مقدمات یعنی التفات سے بھی بچنا چاہئے)

معارف و مسائل

ما ذکر اسم اللہ علیہ میں ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری یعنی تیر و باز اور کتے کا شکار جبکہ اس کے چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھی جاوے، اور ذکر حقیقی و ذکر حکمی سب داخل ہے، پس امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس پر بسم اللہ سہواً ترک کر دی جاوے وہ حکماً ما ذکر اسم اللہ علیہ میں داخل ہے البتہ عمداً ترک کرنے سے امام صاحب کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي
بھلا ایک شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو دی روشنی کہ لئے پھرتا ہے
النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ۚ
اس کو لوگوں میں برابر ہو سکتا ہے اس کے کہ جس کا حال یہ کہ پڑا ہے اندھیروں میں وہاں سے نکل نہیں سکتا،
كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾
اسی طرح مزین کر دیئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام

خلاصہ تفسیر

ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ (یعنی گمراہ) تھا پھر ہم نے اس کو زندہ (یعنی مسلمان) بنا دیا

اسی طرح دوسروں کے لئے نفع رسانی کے معاملہ میں تو تمام حیوانات اور نباتات کا قدم بظاہر انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے، کہ ان کے گوشت، کھال، ہڈی، پٹھے اور درختوں کے پتے پیکر شاخیں، . . اور جڑیں تک ہر چیز مخلوق کے لئے کارآمد اور ان کی ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ انسان کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال، نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بناء پر مخدومِ کائنات اور افضل المخلوقات ٹھہرتے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آپہونچی . . ذرا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل و شعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہے، اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لئے فائدہ بخش نظر آتی ہے، اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا آنے والا ہے، اس میدان میں جمادات نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل و شعور بھی کام نہیں دیتی، اور نہ اس میدان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کیلئے کارآمد یا مفید ہوسکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جس میں مخدومِ کائنات اور افضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے، اور اسی سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہوسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصدِ زندگی پوری عمر کی ابتداء و انتہاء کو سامنے رکھ کر اس کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لئے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بُری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت و سکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہوسکے، اور جب انسان کا مقصدِ زندگی اور کمالِ انسانی کا یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہونچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بنکر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء و انتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع و نقصان کو وحی الٰہی کی روشنی میں پہچانے کیونکہ نری عقلِ انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سَر کیا ہے نہ کرسکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء و حکماء، اور فیلسوفانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

زیرکانِ موشگافانِ دہی
کردہ ہر خشر طوم خطِ الٰہی

اور جب مقصدِ زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو پہچانے اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہوگیا کہ جو ایسا نہیں وہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

زندگی از بہر طاعت و بندگی ست ۔۔ بے عبادت زندگی شرمندگی ست

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست ۔۔ آدمیت جز رضائے دوست نیست

یہ قرآنی مثال تھی مومن و کافر کی کہ مومن زندہ اور کافر مردہ ہے۔ دوسری مثال ایمان و کفر کی نور و ظلمت کے ساتھ دی گئی ہے۔

ایمان نور اور کفر ظلمت: ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت اور اندھیری قرار دیا گیا ہے، ذرا غور کیا جائے تو یہ مثال بھی کوئی خیالی مثال نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے، یہاں بھی روشنی اور اندھیری کے اصل مقصد پر غور کیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نزدیک و دور کی اشیاء کو دیکھ سکیں جس کے نتیجہ میں مضر چیزوں سے بچنے اور مفید کو اختیار کرنے کا موقع ملے۔

اب ایمان کو دیکھو کہ وہ ایک نور ہے جس کی روشنی تمام آسمانوں اور زمین اور ان سب سے باہر کی تمام چیزوں پر حاوی ہے، صرف یہی روشنی پورے عالم کے انجام اور تمام امور کے صحیح نتائج کو دکھا سکتی ہے، جس کے ساتھ یہ نور ہو تو وہ خود بھی تمام نقصان دہ اور مضر چیزوں سے بچ سکتا ہے، اور دوسروں کو بھی بچا سکتا ہے، اور جس کو یہ روشنی حاصل نہیں وہ خود اندھیرے میں ہے مجموعۂ عالم اور پوری زندگی کے اعتبار سے کیا چیز نافع ہے کیا مضر اس کا وہ کوئی امتیاز نہیں کرسکتا، صرف پاس پاس کی چیزوں کو ٹٹول کر کچھ پہچان سکتا ہے، موجودہ دنیا کی زندگی یہی آس پاس کا ماحول ہے، کافر اس زندگی اور اس کے نفع نقصان کو تو پہچان لیتا ہے، مگر بعد میں آنے والی دائمی زندگی کی اس کو کچھ خبر نہیں، نہ اس کے نفع و ضرر کا اسے کچھ ادراک ہے، قرآن کریم نے اسی مضمون کے لئے ارشاد فرمایا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ ظاہری دنیوی زندگی اور اس کے کھرے کھوٹے کو تو کچھ پہچانتے ہیں، مگر عالمِ آخرت سے قطعاً غافل ہیں۔

دوسری ایک آیت میں پچھلی منکر اقوام کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے فرمایا ہے: وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ، یعنی آخرت کے معاملہ میں ایسی شدید غفلت اور بے عقلی برتنے والے اس دنیا میں بیوقوف نادان نہ تھے، بلکہ مستبصرین یعنی روشن خیال لوگ تھے، مگر یہ ظاہری سطحی روشن خیالی صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کے سنوارنے ہی میں کام دے سکی

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا

اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر بستی میں گنہگاروں کے سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں

وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا جَاۗءَتْهُمْ

اور جو حیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے اور جب آتی ہے ان کے

اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ

پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ نہ دیا جاوے ہم کو جیسا کچھ کہ دیا گیا

اللّٰهِ ؁ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ

اللہ کے رسولوں کو، اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو جہاں بھیجے اپنے پیغام، عنقریب پہنچے گی

اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا

گنہگاروں کو ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ

يَمْكُرُوْنَ ۝ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ

مکر کرتے تھے، سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کے سینہ کو

لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا

واسطے قبول کرنے اسلام کے، اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ

حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاۗءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ

بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر، اسی طرح ڈالے گا اللہ

الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۵

عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر

خلاصہ تفسیر

اور یہ کوئی نئی بات نہیں، جس طرح مکہ کے رؤساء ان جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان کے اثر سے دوسرے لوگ شامل ہو جاتے ہیں اسی طرح ہم نے پہلی امتوں میں بھی، ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو (اول) جرائم کا مرتکب بنایا۔ (پھر ان کے اثر سے اور عوام بھی ان سے مل گئے) تاکہ وہ لوگ وہاں (انبیاء کو ضرر پہنچانے کے لئے) شرارتیں کیا کریں، (جن سے ان کا مستحق سزا ہونا خوب ثابت ہو جاوے) اور وہ لوگ (گو اپنے خیال میں

دوسروں کو شریر بناتے ہیں، پھر وہ توقع رکھتے ہیں کہ اپنے ان ساتھ شرارت کرتے ہیں، کیونکہ اس کا
وبال تو انہی کو بھگتنا پڑے گا، وہ اپنی غایت جہالت سے اس امر کی ذرا خبر نہیں رکھتے اور ان کفر و
مکر کا جرم یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ
اپنے اعجاز کی وجہ سے دلالت علی النبوۃ میں کافی ہوتی، مگر یہ لوگ پھر بھی یوں کہتے ہیں کہ ہم
ان آیات پر ہرگز ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جاوے جو اللہ
کے رسولوں کو دی جاتی ہے (یعنی وحی و خطاب بصحیفہ و کتاب جس میں ہم کو آپ پر ایمان
لانے کا حکم ہو، وہ اس قول کا جرم عظیم ہونا ظاہر ہے کہ تکذیب اور عناد، واستکبار اور گستاخی
سب اس کا جامع ہے) آگے اللہ تعالیٰ اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ اس موقع کو تو خدا ہی
خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام (ان کے ذریعہ سے) بھیجتا ہے (کیا ہر کس و ناکس اس شرف کے
قابل ہو گیا "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ") آگے اس جرم کی سزا کا بیان ہے کہ) عنقریب ان لوگوں
کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے خدا کے پاس پہنچ کر (یعنی آخرت میں) ذلت پہنچے گی (جیسا انہوں نے
اپنے کو نبی کے مقابلہ میں عزت و نبوت کا مستحق سمجھا تھا) اور سزائے سخت (ملے گی) ان کی
شرارتوں کے مقابلہ میں۔ (اوپر چونکہ مومن و کافر کا حال مذکور ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ)
جس شخص کو اللہ تعالیٰ (نجات کے) رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب)
کو اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں (کہ اس کے قبول کرنے میں پس و
پیش نہیں کرتا اور وہ نور مذکور یہی ہے) اور جس کو (تکوینًا و تقدیرًا) بے راہ رکھنا چاہتے
ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب) کو (اسلام کے قبول کرنے سے) تنگ (اور) بہت تنگ
کر دیتے ہیں (اور اس کو اسلام لانا ایسا مصیبت نظر آتا ہے) جیسے کوئی (فرض کرو) آسمان
میں چڑھنا چاہتا ہو (اور چڑھا نہیں جاتا اور جی تنگ ہوتا ہے اور مصیبت کا سامنا ہوتا
ہے پس جیسا اس شخص سے چڑھا نہیں جاتا) اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر
(چونکہ ان کے کفر اور شرارت کے سبب) پھٹکار ڈالتا ہے (اس لئے ان سے ایمان نہیں
لایا جاتا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت کے آخر میں یہ ذکر تھا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں جس طرح اچھے
اور نیک اعمال کے ساتھ کچھ محنت و مشقت لگی ہوئی ہے اُن کی راہ میں یہاں رکاوٹیں پیش
آتی ہیں اسی طرح بُرے اعمال کے ساتھ چند روزہ نفسانی لذت اور خواہشات کا ایک فریب

ہوتا ہے جو حقیقت اور انجام سے غافل انسان کی نظر میں اُن بُرے اعمال ہی کو مزین کر دیتا ہے، اور دنیا کے بڑے بڑے ہوشیار اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ اس امتحان اور آزمائش کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ابتداء عالم سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر بستی کے رئیس و مالدار اور بڑے لوگ جو حقیقت اور انجام سے غافل چند روزہ کی فانی لذتوں میں مست ہو کر جرائم کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، اور عوام کی عادت یہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں کے پیچھے چلنے اور ان کی نقل اتارنے ہی کو اپنی سعادت اور کامیابی سمجھتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ جو اُن کو ان کے بُرے اعمال سے روکنا اور ان کے انجام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں یہ بڑے لوگ ان کے خلاف طرح طرح کی شرارتیں کیا کرتے ہیں، جو ظاہر میں تو ان بزرگوں کے خلاف شرارتیں اور سازشیں اور ان کی دل آزاری کا سامان ہوتا ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے ان سب کا وبال خود انہی کی طرف لوٹتا ہے، اور آخر دنیا میں بھی اس کا ظہور ہو جاتا ہے۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑوں اور رئیسوں مالداروں کی ریس نہ کریں، ان کے پیچھے چلنے کی عادت چھوڑیں، انجام بینی کو شعار بنائیں اور بھلے بُرے کو خود پہچانیں۔

نیز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دینا مقصود ہے کہ رؤسائے قریش جو آپ کی مخالفت پر لگے ہوئے ہیں اس سے آپ دل گیر نہ ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے انبیاء علیہم السلام کو بھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے، اور انجام کار وہ رُسوا اور ذلیل ہوئے اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔

دوسری آیت میں انہی قریشی سرداروں کی ایک ایسی گفتگو کا ذکر ہے جو حق کے مقابلہ میں محض ہٹ دھرمی اور استہزاء و تمسخر کے انداز میں تھی، پھر اس کا جواب دیا گیا۔

امام بغویؒ نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش کے سب سے بڑے سردار ابوجہل نے ایک مرتبہ کہا کہ بنو عبد مناف (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) سے ہم نے ہر محاذ پر مقابلہ کیا، جس میں کبھی ہم ان سے پیچھے نہیں رہے، لیکن اب وہ یوں کہتے ہیں کہ تم شرافت و بزرگی میں ہمارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہمارے خاندان میں ایک نبی آئے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، پھر کہا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم کبھی ان کا اتباع نہ کریں گے، جب تک خود ہمارے پاس ایسی ہی وحی نہ آنے لگے، جیسی اُن کے پاس آتی ہے، آیت مذکورہ میں وَاِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى

مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ کا یہی مطلب ہے۔

نبوت و رسالت کسبی اور اختیاری نہیں بلکہ ایک عہدہ ہے قرآن کریم نے یہ قول نقل کرنے کے بعد جواب دیا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ وہ عطا کرنے کا منصب صرف اللہ تعالیٰ ... یعنی رسالت و نبوت کس کو عطا فرمائے، مطلب یہ ہے کہ اس [illegible] بیوقوف نے اپنی جہالت سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نبوت اور پیغمبری خاندانی شرافت یا قوم کی سرداری اور مالداری کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، حالانکہ نبوت اللہ تعالیٰ کی خلافت کا عہدہ ہے جس کا حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں، کتنے ہی کمالات حاصل کرلینے کے بعد بھی کوئی اپنے اختیار سے یا کسی کے زور سے نبوت و رسالت حاصل نہیں کرسکتا وہ خالص عطائے حق جل شانہ ہے، وہ جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہو کہ رسالت و نبوت کوئی کسبی اور اختیاری چیز نہیں جس کو علمی، عملی کمالات یا مجاہدہ و ریاضت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکے، کوئی شخص مقاماتِ ولایت میں کتنی ہی اونچی پرواز کرکے بھی نبوت حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ محض فضلِ خداوندی ہے جو خداوندی علم و حکمت کے ماتحت خاص بندوں کو دیا جاتا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ کے علم میں یہ مقام اور عہدہ دینا منظور ہوتا ہے اس کو شروع ہی سے اس کے قابل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے اس کے اخلاق و عمل کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۝ اس میں لفظ صغار، حاصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ذلت و رسوائی، معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ یہ حق کے مخالف جو آج اپنی قوم میں بڑے اور رئیس کہلاتے ہیں عنقریب ان کی بڑائی اور عزت خاک میں ملنے والی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے پاس سخت ذلت و رسوائی پہونچنے والی ہے، اور سخت عذاب ہونے والا ہے۔

اللہ کے پاس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کے روز جب یہ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تو ذلیل و خوار ہو کر حاضر ہوں گے، اور پھر ان کو سخت عذاب دیا جائے گا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ گرچہ اس وقت ظاہر میں یہ بڑے عزت دار اور رئیس ہیں لیکن اللہ کی طرف سے ان کو سخت ذلت و رسوائی پہونچنے والی ہے، وہ دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور آخرت میں بھی، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کے متعلق دنیا کی تاریخ میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے، کہ انجام کار ان کے مخالفین دنیا میں بھی ذلیل ہوئے، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے مخالفین جو بڑی عزت کی ڈینگ مارا کرتے تھے، ایک ایک کرکے یا تو دائرۂ

اسلام میں داخل ہوگئے، اور جو نہ ہوئے تو ذلیل و خوار ہوکر ہلاک ہوئے، ابوجہل، ابولہب وغیرہ قریشی سرداروں کا مال دنیا کے سامنے آگیا، اور فتح مکہ نے ان سب کی کمریں توڑ دیں۔

دین میں شرح صدر اور اس کی علامات

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پانے والوں اور گمراہی پر جمے رہنے والوں کے کچھ حالات اور علامات بتلائی گئی ہیں، ارشاد فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کے لئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے، حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلاف حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے جس کو شرح صدر حاصل ہوگیا ہے؟ فرمایا ہاں! علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہوجاتی ہے، دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے، پھر فرمایا وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت تنگ کردیتے ہیں، اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان میں چڑھنا۔

امام تفسیر کلبی نے فرمایا کہ "اس کا دل تنگ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حق اور بھلائی کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا، یہ مضمون حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی منقول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو دین میں شرح صدر حاصل تھا، اس لئے شکوک و شبہات بہت کم پیش آئے

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور بلاواسطہ شاگردی کے لئے منتخب فرمایا تھا ان کو اسلامی احکام میں شبہات اور وساوس کم سے کم پیش آئے، ساری عمر میں صحابہ کرام نے جو سوالات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے پیش کیے گئے وہ گنے چنے تھے، وجہ یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا گہرا نقش ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا جس کے سبب ان کو شرح صدر کا مقام حاصل تھا ان کے قلوب خود بخود حق و باطل کا معیار بن گئے تھے، حق کو آسانی کے ساتھ فوراً قبول کرتے اور باطل ان کے دلوں میں راہ نہ پاتا تھا، پھر جب جوں جوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دوری ہوتی چلی گئی شکوک و شبہات اور دینی مسائل کی تحقیق کے اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

شکوک و شبہات کے دور کرنے کا اصل طریقہ بحث و مباحثہ نہیں بلکہ شرح صدر کی تحصیل ہے

اور آج پوری دنیا ان شکوک و شبہات کے گھیرے میں پھنسی ہوئی ہے اور بحث و مباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہتی ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

راستہ وہی ہے جو ہمارے اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے انعامات کا استحضار کرکے اس کی عظمت و محبت دل میں پیدا کی جائے، تو شبہات خود بخود کافور ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ، یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے۔

آخر آیت میں فرمایا کَذٰلِكَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈال دیتا ہے، اور حق بات ان کے دل میں نہیں اترتی، اور ہر برائی اور بیہودگی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِیْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ

اور یہ راستہ ہے تیرے رب کا سیدھا، ہم نے واضح کر دیں نشانیاں غور کرنے والوں کے

یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِیُّهُمْ

واسطے، ان کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے

بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ۚ یٰمَعْشَرَ

بسبب ان کے عملوں کے، اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو، فرمائے گا اے جماعت

الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ

جنات کی تم نے بہت کچھ تابع کر لئے اپنے آدمیوں میں سے اور کہیں گے ان کے دوستدار آدمیوں میں

رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ

سے اے رب ہمارے کام نکالا ہم میں ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

[illegible]

حکمت والا خبردار ہے

خلاصۂ تفسیر

[illegible]

ہاں، اگر خدا ہی کو ڈالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے (لیکن یہ یقینی ہے کہ خدا کبھی نہیں چاہے گا اس لئے ہمیشہ رہا کرو) بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا بڑا علم والا ہے (علم سے سب کے جرائم معلوم کرتا ہے اور حکمت سے مناسب سزا دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا، یعنی "راستہ تیرے رب کا ہے سیدھا"؛ اس میں لفظ ھٰذا سے بقول ابن مسعودؓ قرآن کی طرف اور بقول ابن عباسؓ اسلام کی طرف اشارہ ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن یا شریعت اسلام جو آپ کو دی گئی ہے یہ راستہ آپ کے رب کا ہے، یعنی ایسا راستہ ہے جس کو آپ کے پروردگار نے اپنی حکمت بالغہ سے تجویز فرمایا اور اس کو پسند کیا ہے، اس میں راستہ کی اضافت و نسبت پروردگار کی طرف کرکے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ قرآن اور اسلام کا جو دستور العمل آپ کو دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا کچھ اللہ تعالیٰ کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنے والوں کے فائدہ کے لئے شانِ پروردگاری کے تقاضے کی بنا پر ہے اس کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت کرنا مقصود ہے جو اس کی دائمی فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔

پھر اس میں لفظ رب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے آپ پر ایک خاص لطف و عنایت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پروردگار نے یہ راستہ تجویز فرمایا ہے، اس نسبت کا لطف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک بندہ کو اپنے رب اور معبود کی طرف کوئی ادنیٰ نسبت حاصل ہو جانا بھی اس کے لئے انتہائی فخر کی چیز ہے، اور اگر رب الارباب اور معبود کائنات اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرے کہ میں تیرا ہوں تو اس کی قسمت کا کیا کہنا، حضرت حسن نظامیؒ اسی مقام سے فرماتے ہیں ؎

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ توام ✧ تو بزبانِ خود بگو کہ بندہ نواز کیستی

اس کے بعد اس قرآنی راستہ کا یہ حال لفظ مُسْتَقِيمًا سے بیان کیا گیا کہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے، اس میں بھی مستقیم کو صراط کی صفت کے طور پر لانے کے بجائے حال کے طریقہ سے ذکر کرکے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو راستہ پروردگار عالم کا تجویز کیا ہوا ہے اس میں بجز مستقیم اور سیدھا ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا (روح و بحر)

اس کے بعد فرمایا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ، یعنی ہم نے نصیحت قبول کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا ہے۔

آہیہ سے بوجہ رسولوں کے نہ آنے کے، بےخبر ہوں (یعنی عذاب آخرت کہ شرعی بدیہی دلیل نہ ہوتی، اس لئے رسولوں کو بھیجتے ہیں تاکہ ان کو جرم کی اطلاع ہوجاوے پھر جس کو عذاب ہو استحقاق کی وجہ سے ہو، چنانچہ آگے فرماتے ہیں) اور (جب رسول آگئے اور اطلاع ہوگئی پھر جیسا جیسا کوئی کرے گا) ہر ایک کیلئے (جن وانس صالح و طالح میں سے جزا و سزا کے ویسے ہی) درجے ملیں گے ان کے عمل کے سبب اور آپ کا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں لفظ نُوَلِّيْ کے عربی لغت کے اعتبار سے دو ترجمے ہوسکتے ہیں، ایک ملا دینے اور قریب کر دینے کے، اور دوسرے مسلط کردینے کے، ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے بھی دونوں طرح کی روایات میں اس کی تفسیر منقول ہے۔

محشر میں لوگوں کی جماعتیں عمل و اخلاق کی بنیاد پر ہونگی نسبی تعلقات کی بنیاد پر نہیں

حضرت سعید بن جبیر اور قتادہ وغیرہ نے پہلا ترجمہ اختیار کرکے آیت کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں اجتماع و تعلقات لوگوں کی جماعتیں اور پارٹیاں نسلی یا وطنی یا رنگ و زبان کی بنا پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ہوں گی، اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار مسلمان جہاں کہیں ہوگا وہ مسلمانوں کا ساتھی ہوگا، اور نافرمان کافر جہاں کہیں ہوگا وہ کافروں کا ساتھی ہوگا، خواہ ان کی نسل اور نسب میں، وطن اور زبان میں، رنگ اور معاشرت میں کتنا ہی بُعد اور اختلاف ہو۔

پھر مسلمانوں میں بھی نیک دیندار دینداروں کے ساتھ ہوگا، اور گنہگار بدکردار بدکرداروں کے ساتھ لگا دیا جائے گا، سورۂ تکویر میں جو ارشاد ہے وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ یعنی لوگوں کے جوڑے اور جماعتیں بنا دی جائیں گی اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ عمل و اخلاق کے اعتبار سے اہل محشر مختلف جماعتوں میں تقسیم ہوجائیں گے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایک قسم کے اعمال نیک یا بد کرنے والے ایک ساتھ کردیئے جائیں گے، نیک آدمی نیکوں کے ساتھ جنت میں اور بدکردار دوسرے بدکرداروں کے ساتھ جہنم میں پہنچا دیا جائے گا، اور اس مضمون کی توثیق کے لئے فاروق اعظمؓ نے قرآن کریم کی آیت اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ سے استدلال فرمایا، جس کا مضمون یہی ہے کہ قیامت کے دن حکم ہوگا کہ ظالموں کو اور ان کے مناسب عمل کرنے والوں کو جہنم میں لے جاؤ۔

خلاصۂ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں کا ساتھی بنا کر ایک جماعت کردیں گے، اگرچہ نسلی اور وطنی اعتبار سے ان میں کتنی بھی دوری ہو۔

اور ایک دوسری آیت میں یہ بات بھی واضح طور پر بیان فرمادی ہے کہ محشر میں یہ دنیوی اور رسمی اتحاد جو آج لوگوں میں نسل، وطن، رنگ، زبان وغیرہ کی بنیادوں پر قائم ہیں یہ سب یکسر ٹوٹ جائیں گے، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو جو لوگ آپس میں متحد و متفق ہیں وہ متفرق ہوجائیں گے۔

دنیا میں بھی اعمال و اخلاق اور یہ موجودہ رشتوں ناطوں اور رسمی تنظیموں کا کٹ جانا، اور قیامت میں کا اجتماعی معاملات میں اثر تو وہاں اور مکمل طور پر سب کے سامنے آجائے گا، مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہوجاتا ہے، یہ ہوتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکیوں سے مناسبت ہوتی ہے، انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لئے راستے کھلتے اور نظر آتے اور ہموار وہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بدکردار کو بھی جیسے بدکرداروں سے تعلق اور انس ہوتا ہے وہ انہیں میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کی صحبت سے اس کی بداخلاقی میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے برے عمل کی نقد سزا اس دنیا میں ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نیک و بد عمل کی مکمل جزاء و سزا تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء و سزا نقد اس دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو رفقاء کار بھی نیک اور دیانتدار نصیب ہوجاتے ہیں جو اس کے کام کو چار چاند لگا دیتے ہیں اور برے اور بدنیت آدمی کو اعضاء و جوارح اور رفقاء کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو اس کو اور بھی زیادہ گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ اور حاکم سے راضی ہوتے ہیں تو اس کو اچھے وزیر اور اچھا عملہ دیدیتے ہیں جس سے اس کی حکومت کے سب کاروبار درست اور ترقی پذیر ہوجاتے ہیں اور جب کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو اس کو عملہ اور رفقاء کار برے ملتے ہیں، برے افسروں سے پالا پڑتا ہے، وہ اگر کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس پر قابو نہیں پاتا۔

ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے

آیت مذکورہ کا یہ مفہوم ترجمہ کے اعتبار سے ہے، اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، ابن زیدؓ، مالک بن دینار وغیرہ سے اس آیت کی تفسیر دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں پر مسلط کردیتا ہے، اور اس طرح ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا دلوا دیتے ہیں، یہ مضمون بھی اپنی جگہ صحیح و درست، اور قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کے مطابق ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ یعنی

جیسے تم ہوگے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے، تم ظالم و بدکار ہوگے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے، اور تم نیک عمل و نیک کردار ہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے حکام نیک اور رحم دل منصف مزاج لوگوں کو بنادیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا بھلا چاہتے ہیں تو ان پر بہترین حکام و امراء کو مسلط فرماتے ہیں، اور جب کسی قوم کا برا چاہتے ہیں تو ان پر بدترین حکام و سلاطین کو مسلط کردیتے ہیں۔ (تفسیر بحر محیط)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب رعیت اور عوام اللہ تعالیٰ سے منحرف ہوکر ظلم و جور میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ظالم حکام مسلط کرکے ان کے ہاتھوں ان کو سزا دلواتے ہیں۔

اور ابن کثیرؒ نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ "مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا سَلَّطَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ" یعنی جو شخص کسی ظالم کے ظلم میں اس کی مدد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس کے ستانے کے لئے اس پر مسلط کردیتے ہیں اور اسی کے ہاتھ سے اس کو سزا دلواتے ہیں۔"

دوسری آیت میں ایک سوال و جواب کا ذکر ہے جو محشر میں جنات اور انسانوں کو مخاطب کرکے کیا جائے گا، کہ تم جو کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے اس کا کیا سبب ہے؟ کیا تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں پہنچے جو تمہاری قوم میں سے تھے، جو میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور آج کے دن کی حاضری اور حساب سے ڈراتے تھے؟ اس کے جواب میں ان سب کی طرف سے رسولوں کے آنے اور پیغام حق سنانے کا اور اس کے باوجود کفر و نافرمانی میں مبتلا ہونے کا اقرار ذکر کیا گیا ہے، اور ان کی طرف سے کوئی وجہ اور سبب اس غلط کاری کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے ہی اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، یعنی ان لوگوں کو دنیا کی زندگی اور لذتوں نے دھوکہ میں ڈال دیا، کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے جو درحقیقت کچھ نہ تھا، اور انجام و عاقبت سے غافل ہوگئے، بقول اکبر مرحوم ؎

تھی فقط غفلت ہی غفلت، عیش کا دن کچھ نہ تھا
ہم اسے سب کچھ سمجھتے تھے وہ لیکن کچھ نہ تھا

اس آیت میں ایک بات تو یہ قابل غور ہے کہ بعض دوسری آیات میں تو یہ مذکور ہے کہ مشرکین سے جب محشر میں ان کے کفر و شرک کے متعلق سوال ہوگا تو وہ اپنے جرم سے مُکر جائیں گے، اور رب الارباب کے دربار میں قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، یعنی قسم

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا

جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور آنی ہے اور تم عاجز نہیں کرسکتے تو کہدے اے قوم تم کام کرتے رہو

عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ

اپنی جگہ پر میں بھی کام کرتا ہوں سو عنقریب جان لوگے تم کہ کس کو ملتا ہے عاقبت

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿١٣٥﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا

کا گھر بیشک بھلا نہ ہوگا ظالموں کا اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اس کی

ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ

پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں ایک حصہ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال میں

وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ

اور یہ ہمارے شریکوں کا سو جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ تو نہیں پہنچتا اللہ کی طرف اور جو اللہ کا

لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾

ہے وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کی طرف کیا برا انصاف کرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رب رسولوں کو بھیجنے کے لئے نہیں بھیجتا کہ نعوذ باللہ وہ محتاج ہو عبادت کا، وہ تو بالکل غنی ہے (بلکہ اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ) رحمت والا (بھی) ہے (اپنی رحمت سے رسولوں کو بھیجتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو منافع و مضار (نفع و نقصان دینے والی چیزیں) معلوم ہوجائیں پھر منافع سے منتفع اور مضار سے محفوظ رہیں سو اس میں بندوں ہی کا فائدہ ہے، اور حق تعالیٰ کا غنا تو ایسا ہے) اگر وہ چاہے تو تم سب کو (دنیا سے دفعۃً) اٹھالیوے اور تمہارے بعد جس (مخلوق) کو چاہے تمہاری جگہ (دنیا میں) آباد کردے جیسا (اس کی نظیر پہلے سے موجود ہے کہ) تم کو (جو کہ اب موجود ہو) ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے (کہ ان کا کہیں پتہ نہیں اور تم ان کی جگہ موجود ہو، اور اسی طرح یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، لیکن یہ سلسلہ تدریجاً تم نے دیکھا ہے، اگر ہم چاہیں دفعۃً بھی ایسا کردیں، کیونکہ کسی کے ہونے نہ ہونے سے ہمارا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا، پس ارسالِ رسل ہمارے احتیاج کی وجہ سے نہیں تمہاری احتیاج کی وجہ سے ہے، تم کو چاہئے کہ ان کی تصدیق اور ان کا اتباع کرکے سعادت حاصل کرو اور کفر و انکار کے ضرر سے بچو کیونکہ) جس چیز کا (رسولوں کی معرفت) تم سے

مقصد کچھ اس لئے نہیں تھا کہ رب العالمین کو ہماری عبادت و اطاعت کی حاجت تھی، یا اس کا کوئی کام ہماری اطاعت پر موقوف تھا نہیں وہ بالکل بے نیاز اور غنی ہے، مگر اس کے کامل استغناء اور بے نیازی کے ساتھ اس میں صفت رحمت بھی تھی، تو سارے عالم کے وجود میں لانے پھر باقی رکھنے اور ان کی ظاہری اور باطنی موجودہ اور آئندہ تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا سبب یہی صفت رحمت ہے، ورنہ دنیا اور انسان اپنی ضروریات کو خود پیدا کرنے کی قوت تو کیا ہوتا اس کو تو اپنی تمام ضروریات کے مانگنے کا بھی سلیقہ نہیں، خصوصاً نعمت وجود جو عطا کی گئی ہے اس کا تو بے مانگے ملنا بالکل ہی واضح ہے کہ کسی انسان نے کہیں اپنے پیدا ہونے کی دعا نہیں مانگی، اور نہ وجود سے پہلے دعا مانگنے کا کوئی تصور ہو سکتا ہے، اسی طرح انسان کی تخلیق جن عطایات کی گئی ہے آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ، کیا یہ چیزیں کسی انسان نے مانگی تھیں یا کہیں اس کو مانگنے کا شعور و سلیقہ تھا؟ کچھ نہیں، بلکہ

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ٭ لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے تخلیق کائنات صرف اس کی رحمت کا نتیجہ ہے

بہرحال اس آیت میں وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ کے الفاظ سے رب العالمین کی بے نیازی بیان کرنے کے ساتھ ذُو الرَّحْمَةِ کا اضافہ کر کے یہ بتلا دیا کہ وہ اگرچہ تمام سب سے بلکہ ساری کائنات سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہیں، لیکن بے نیازی کے ساتھ وہ ذو الرحمۃ یعنی رحمت والا بھی ہے۔

کسی انسان کو اللہ نے بے نیاز نہیں بنایا، اس میں بڑی حکمت ہے، انسان بے نیاز ہو جائے تو ظلم کرتا ہے

اور یہ اسی ذات پاک کا کمال ہے ورنہ انسان کی عادت یہ ہے کہ اگر وہ دوسروں سے بے نیاز و مستغنی ہو جائے تو اس کو دوسروں کے نفع نقصان اور رنج و راحت کی کوئی پروا نہیں رہتی، بلکہ اس حالت میں وہ دوسروں پر ظلم و جور کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، قرآن کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى، یعنی انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز و مستغنی پاتا ہے تو وہ سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسی لئے حق جل شانہ نے انسان کو ضروریات میں جکڑ دیا ہے، جو دوسروں کی مدد کے بغیر پوری ہی نہیں ہو سکتیں، بڑے سے بڑا بادشاہ اور حاکم نوکروں چاکروں اور سپاہیوں کا محتاج ہے، بڑے سے بڑا مالدار اور مل اونر مزدوروں کا محتاج ہے، صبح کو جس طرح ایک مزدور اور رکشہ چلانے والا کچھ پیسے حاصل کر کے محتاجی دور کرنے کے لئے تلاش روزگار میں نکلتا ہے ٹھیک اسی طرح بڑے مالدار جن کو اغنیاء کہا جاتا ہے وہ مزدور اور رکشا اور گاڑی سواری کی تلاش میں نکلتے ہیں، قدرت نے سب کو محتاجی کی ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے، کسی کا کسی پر احسان نہیں اور یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی مالدار کسی کو ایک پیسہ دیتا اور نہ کوئی مزدور کسی کا ذرا سا بوجھ اٹھاتا، یہ تو

صرف حق جل شانہ کی صفت کمال ہے کہ کامل استغنا اور بے نیازی کے باوجود وہ ذوالرحمۃ یعنی رحمت والا ہے، اس جگہ ذوالرحمۃ کے بجائے اگر رحمٰن یا رحیم کا لفظ لایا جاتا تب بھی مقصودِ کلام ادا ہو جاتا، لیکن غنی ہونے کے ساتھ صفتِ رحمت کے جوڑ کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عنوان ذوالرحمۃ کا اختیار فرمایا گیا کہ وہ غنی اور مکمل بے نیاز ہونے کے باوجود صفتِ رحمت بھی مکمل رکھتا ہے اور یہی صفت رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا اصل سبب ہے۔

اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح اس کی رحمت عام و تام ہے اسی طرح اس کی قدرت ہر چیز و ہر کام پر حاوی ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ایک آن میں فنا کر سکتا ہے اور ساری مخلوق کے فنا کر دینے سے بھی اس کے کارخانۂ قدرت میں ادنیٰ سا فرق نہیں آتا، پھر اگر وہ چاہے تو موجودہ ساری کائنات کو فنا کر کے ان کی جگہ دوسری مخلوق اسی طرح اسی آن میں پیدا کر کے کھڑی کر دے، جس کی ایک نظیر انسان کے ہر دور میں اس کے سامنے رہتی ہے، کہ آج جو کروڑوں انسان زمین کے چپہ چپہ پر آباد اور زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف کاروبار کو چلا رہے ہیں، اگر اب سے ایک سو سال پیچھے کی طرف غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی یہ دنیا اسی طرح آباد تھی، اور سب کام چل رہے تھے، مگر موجودہ آباد کرنے والوں اور کام چلانے والوں میں سے کوئی نہ تھا، ایک دوسری قوم تھی جو آج زیر زمین ہے، اور جس کا آج نام و نشان بھی نہیں ملتا، اور موجودہ دنیا ایک پہلی قوم کی نسل سے پیدا کی گئی ہے، ارشاد ہے:

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تم سب کو لے جائیں، لے جانے سے مراد یہ فنا کر دینا ہے کہ نام و نشان تک گم ہو جائے، اور اسی لئے یہاں ہلاک کرنے یا مار دینے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ یجانا ارشاد فرمایا جس میں فنائے محض اور بے نام و نشان کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کے غنی و بے نیاز ہونے کا، پھر صاحبِ رحمت ہونے کا، اور پھر قدرتِ کاملہ کے مالک ہونے کا بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں نافرمانوں اور حکم نہ ماننے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ:

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جس عذاب سے ڈرایا ہے وہ ضرور آنے والا ہے، اور تم سب مل کر بھی خدائی عذاب کو نہیں ٹال سکتے۔

تیسری آیت میں پھر ان کو غفلت سے چونکانے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کر کے ارشاد فرمایا:

قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۔ جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان

کی تعیین وغیرہ ہجرت کے بعد ہوا، اور اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیداوار پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حق عائد کیا گیا ہے، مگر اس کی مقدار کی تعیین اس میں مذکور نہیں، اس لئے حق کی مقدار یہ آیت مجمل ہے، اور مکہ معظمہ میں اس تعیین کی ضرورت بھی اس لئے نہ تھی کہ وہاں مسلمانوں کو یہ زمینیں حاصل ہی نہ تھیں اور باغات کی پیداوار مسلمانوں کے ساتھ خاص کی گئی تھیں، اس لئے اس زمانہ میں دستور وہی رہا جو پہلے سے نیک لوگوں میں جاری تھا، کہ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑنے کے وقت جو غریب غرباء وہاں جمع ہو جاتے ان کو کچھ دیدیتے تھے، کوئی خاص مقدار معین نہ تھی، اسلام سے پہلے دوسری ملتوں میں بھی کھیتی اور پھلوں میں اس طرح کا صدقہ دینے کا رواج قرآن کریم کی آیت إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ میں مذکور ہے، ہجرت کے دو سال بعد جس طرح دوسرے اموال کے نصاب اور مقدار زکوٰۃ کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحیِ الٰہی بیان فرمائی، اسی طرح زمین کی زکوٰۃ کا بیان فرمایا جو حضرت معاذ بن جبل اور ابن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے تمام کتب حدیث میں منقول ہے مَا سَقَتِ السَّمَآءُ فَفِيْهِ الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ فَنِصْفُ الْعُشْرِ، یعنی بارانی زمینوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی سامان نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا واجب ہے، اور جو زمینیں کنوؤں سے سیراب کی جاتی ہیں ان کی پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔

قانون زکوٰۃ میں شریعت اسلام نے ہر قسم کی زکوٰۃ میں اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ اور جتنی محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جائے یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد بارانی زمین کا نمبر ہے جس میں محنت، خرچ کم ہو کر اس کی زکوٰۃ پانچویں حصہ سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا، اس کے بعد وہ زمین ہے جس کو کنوئیں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوٰۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی، یعنی بیسواں حصہ، اس کے بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مال تجارت ہے جس کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔

قرآن کی آیت مذکورہ میں اور حدیث کی روایت مذکورہ میں زمین کی پیداوار کے لئے کوئی

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ

اور پیدا کئے اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو پوچھ تو دونوں نر حرام کئے

حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ

ہیں یا دونوں مادہ یا وہ کہ جس کو لپٹ رہے ہیں پیٹ دونوں مادہ کے

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ

کیا تم حاضر تھے جس وقت تم کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا پھر اس سے زیادہ ظالم کون

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ

جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر تحقیق بیشک

اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۴

اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو

ع ۱۷

خلاصۂ تفسیر

(یہ مویشی جن میں تحلیل و تحریم کر رہے ہو) آٹھ نر و مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (ایک نر ایک مادہ) اور بکری میں دو قسم (ایک نر ایک مادہ) آپ (ان سے) کہیے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں جانوروں کے دونوں نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو حرام کہا ہے یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ یعنی تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا تحریم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے) تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو (یہ تو چھوٹے قد والے کے متعلق بیان ہوا آگے بڑے قد والوں کا بیان ہے کہ جیسے بکری میں کئی نر و مادہ پیدا کیا، جیسا بیان ہوا) اور (اسی طرح) اونٹ میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) اور گائے (و بھینس) میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ پیدا کئے) آپ (ان سے اس باب میں بھی) کہیے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (جانوروں کے) نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ، اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا تحریم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے؟ اس پر کوئی دلیل قائم کرنا چاہئے جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی رسول و فرشتہ کے واسطے سے ہو، سو مسئلہ نبوت و وحی سے تو تم کو انکار ہی ہے، اس شق کو تو اختیار کر نہیں سکتے، بس دوسرا

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ جن حیوانات میں کلام ہو رہا ہے ان کے متعلق جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھاوے (خواہ مرد ہو یا عورت)، مگر ان چیزوں کو البتہ حرام پاتا ہوں (وہ) یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو، (یعنی جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے)، یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ (خنزیر) بالکل ناپاک ہے (یہاں تک کہ اس کے سب اجزاء نجس اور حرام ہیں ایسا نجس، نجس العین ہوتا ہے) یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو اس طرح کہ (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (سو یہ سب حرام ہیں) پھر (بھی اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو اور نہ (قدر ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان حرام چیزوں سے کھانے میں بھی اس شخص کو کچھ گناہ نہیں ہوتا) واقعی آپ کا رب (اس شخص کے لئے) غفور رحیم ہے (کہ ایسے وقت میں رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں گناہ اٹھا دیا) اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی چربیاں ان (یہود) پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ (چربی مستثنیٰ تھی) جو ان (دونوں) کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو (چربی) ہڈی سے ملی ہوئی ہو (باقی سب چربی حرام تھی، سو ان چیزوں کی تحریم فی نفسہٖ مقصود نہ تھی بلکہ) ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی تھی اور ہم یقیناً سچے ہیں، پھر (اس تحقیق مذکور کے بعد بھی) اگر یہ (مشرکین) آپ کو (نعوذ باللہ اس مضمون میں صرف اس وجہ سے) کاذب کہیں (کہ ان پر عذاب نہیں آتا) تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے (بعض حکمتوں سے جلدی مواخذہ نہیں فرماتا) اور (اس سے یوں نہ سمجھو کہ ہمیشہ یوں ہی بچے رہو گے جب وہ وقت معین آ جاوے گا پھر اس وقت) اس کا عذاب مجرم لوگوں سے (کسی طرح) نہ ٹلے گا۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا

اب کہیں گے مشرک اگر اللہ چاہتا تو شرک نہ کرتے ہم اور نہ ہمارے باپ دادے

وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

اور نہ ہم حرام کر لیتے کوئی چیز اسی طرح جھٹلا گئے ان سے اگلے

حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ
یہاں تک کہ انہوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس کہ اس کو ہمارے آگے ظاہر کرو
اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ
تم تو نری اٹکل پر چلتے ہو اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو، تو کہہ دے
فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلْ
پس اللہ کا الزام پورا ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا تم سب کو، تو کہہ
هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ
لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو،
فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ
پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو تو اعتبار نہ کر ان کا اور مت چل ان کی خواہش پر جنہوں نے
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ
جھٹلایا ہماری باتوں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ اپنے
بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾
رب کے برابر کرتے ہیں اوروں کو

ع ۵ / ۱۸

خلاصۂ تفسیر

یہ مشرکین یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہوتا کہ ہم شرک و تحریم نہ کریں، یعنی اللہ تعالیٰ عدم شرک و عدم تحریم کو پسند کرتے نہ شرک و تحریم کو پسند کرتے، تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے، اور نہ ہم (اور نہ ہمارے بزرگ) کسی چیز کو (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس شرک و تحریم سے ناراض نہیں، اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ استدلال اس لئے باطل ہے کہ مستلزم تکذیب رسل کو ہے، پس یہ لوگ رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جس طرح یہ کر رہے ہیں) اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا (خواہ دنیا میں، جیسے اکثر کفار سابقین پر نزول عذاب ہوا، اور یا مرنے کے بعد تو ظاہر ہی ہے، اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ان لوگوں کے کفریات کے مقابلہ

إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ

مفلسی سے، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو، اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ

کے جو ظاہر ہو اس میں سے اور جو پوشیدہ ہو، اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا ہے اللہ نے

إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا

مگر حق پر، تم کو یہ حکم کیا ہے تاکہ تم سمجھو، اور پاس نہ

تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ

جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ بہتر ہو یہاں تک کہ پہنچ جاوے اپنی جوانی کو،

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا

اور پورا کرو ناپ اور تول کو انصاف سے، ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں

وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ

جس کی اس کو طاقت ہو، اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قرابتی ہو، اور اللہ کا عہد

اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۵۲﴾ وَأَنَّ

پورا کرو، تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو، اور حکم کیا

هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

کہ یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو اور مت چلو اور رستوں پر

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ

کہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے رستے سے، یہ حکم کر دیا ہے تم کو تاکہ

تَتَّقُونَ ﴿۱۵۳﴾

تم بچتے رہو

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں) یہ ہیں کہ (ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (یعنی شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (یعنی ان کے

بُری طرح رہنا حرام ہو) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب (جیسا کہ جاہلیت میں غالب عادت تھی) قتل مت کیا کرو (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو (دونوں کو) رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں، پھر کیوں قتل کرتے ہو، پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہوں اور خواہ پوشیدہ ہوں (وہ طریقے یہی ہیں) اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر (قتل جائز ہے مثل قصاص میں یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم ان کو سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا، اس کی حفاظت کرنا، اور بعض اولیاء اور اوصیاء کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (اس وقت تک ان تصرفات مذکورہ کی بھی اجازت ہے اور بعد اس کا مال اس کو دیدیا جاوے گا بشرط سفیہ نہ ہونے کے، پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ دے، پس اس میں دغا کرنا حرام ہوا، اور یہ احکام کچھ دشوار نہیں کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف (بھی) نہیں دیتے (پھر ان کاموں میں کوتاہی کیوں کی جاوے) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق کوئی) بات کیا کرو تو اس میں انصاف رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو تمہارا) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر بشرطیکہ اس کے مشروع ہونے سے) اس کو پورا کیا کرو (پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) ان (سب) کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ (بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ) یہ دین (اسلام اور اس کے تمام احکام) میرا رستہ ہے (جس کی طرف میں باذن الٰہی دعوت دیتا ہوں) جو کہ بالکل مستقیم (اور راست) ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے (جس کی طرف میں دعوت کرتا ہوں) جدا اور دور کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم اس راہ کے خلاف کرنے سے احتیاط رکھو۔

معارف و مسائل

ان آیات سے پہلے تقریباً دو تین رکوع میں مسلسل یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ غافل و جاہل انسان نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے حکیم کا نازل کیا ہوا قانون چھوڑ کر آبائی اور من گھڑت رسموں کو اپنا دین بنا لیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا ان کو جائز سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا تھا ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا، اور بعض چیزوں کو مردوں کے لئے جائز عورتوں کے لئے حرام اور بعض کو **عورتوں کے لئے حلال مردوں کے لئے حرام قرار دیدیا۔**

ان تین آیتوں میں ان چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، تفصیلی بیان میں نو چیزوں کا ذکر ہے، اس کے بعد دسواں حکم اس طرح بیان فرمایا گیا کہ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ، یعنی یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے، اس پر چلو، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اور بتلائے ہوئے دین و شریعت کی طرف اشارہ کر کے تمام حلال و حرام اور جائز و ناجائز، مکروہ و مستحب چیزوں کی تفصیلات کو اس کے حوالہ کر دیا کہ شریعت محمدیہ نے جس چیز کو حلال بتلایا، اس کو حلال اور جس کو حرام قرار دیا اس کو حرام سمجھو، اپنی طرف سے **حلال و حرام کے فیصلے نہ کرتے پھرو۔**

پھر جن دس چیزوں کا تفصیلی بیان ان آیات میں آیا ہے ان میں اصل مقصد تو حرام چیزوں کا بیان کرنا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ان سب کو بصیغۂ نہی ممانعت کرنے کے عنوان سے بیان کیا جاتا، لیکن قرآن کریم نے اپنے خاص حکیمانہ اسلوب کے ماتحت ان میں سے چند چیزوں کو ایجابی طور پر بصیغۂ امر بیان فرمایا ہے، اور مراد یہ ہے کہ اس کے خلاف کرنا حرام ہے (کشاف)، اس کی حکمت آگے معلوم ہو جائے گی، وہ دس حرام چیزیں جن کی حرمت کا بیان ان آیات میں آیا ہے یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت و اطاعت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا، فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا، بے حیائی کے کام کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا، ناپ تول میں کمی کرنا، شہادت یا فیصلہ یا دوسرے کلام میں بے انصافی کرنا، اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستہ کو **چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا۔**

آیات مذکورہ کی اہم خصوصیت: کعب احبار جو تورات کے ماہر عالم ہیں پہلے یہودی تھے، پھر

متعلق قرآن کا فیصلہ ہے کہ اس کی معافی نہیں، اس کے سوا دوسرے گناہوں کی معافی مختلف اسباب سے ہوسکتی ہے، اسی لئے حدیث میں بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ و حضرت ابوالدرداءؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ قرار دو، اگرچہ تمہارے ٹکڑے کردیئے جائیں، یا تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا تمہیں زندہ جلا دیا جائے۔

دوسرا گناہ والدین سے بدسلوکی ہے

اس کے بعد دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی، وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا، یعنی والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ اور اچھا برتاؤ کرو، مقصود تو اس جگہ یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو، ان کو ایذاء نہ پہنچاؤ، مگر حکیمانہ انداز سے بیان اس طرح کیا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، اس میں اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کرو اور ایذاء نہ پہنچاؤ، بلکہ حسن سلوک اور نیازمند برتاؤ کے ذریعہ ان کو راضی رکھنا اور خوش کرنا فرض ہے، جس کا بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ، یعنی ان کے سامنے اپنے بازو نیازمندانہ طور پر پست کرو۔

اس آیت میں والدین کو ایذاء پہنچانے اور تکلیف دینے کو شرک کے بعد دوسرے نمبر کا جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کی اطاعت اور راحت رسانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا ہے:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

یعنی آپ کے رب نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ

"یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا، پھر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے"

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل اور بہتر عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا "نماز کو اس کے وقت مستحب میں پڑھنا"، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک"، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا عمل ہے؟ فرمایا: "اللہ کے راستہ میں جہاد"۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں ترجمہ بے حیائی سے کیا جاتا ہے۔ اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے بُرے کام کے لئے بولا جاتا ہے جس کی بُرائی اور مفاسد بہت زیادہ ہوں اور دور تک پہنچیں۔ امام راغب نے... مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ قرآن کریم میں جابجا فحش اور فحشاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے ایک آیت میں ارشاد ہے یَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، ایک جگہ ارشاد ہے حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ وغیرہ۔

فحش و فحشاء کے اس مفہوم میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ وہ اقوال سے متعلق ہوں یا افعال سے اور ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن اور قلب سے۔ بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ بھی سب اس میں داخل ہیں اور اسی لئے عرف عام میں یہ لفظ بدکاری کے معنی میں بولا جاتا ہے، قرآن کی اس آیت میں فواحش کے قریب جانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کو اگر مفہوم عام میں لیا جائے تو تمام بُری خصلتیں اور گناہ خواہ زبان سے ہوں خواہ ہاتھ پاؤں وغیرہ سے، اور خواہ دل سے متعلق ہوں، سبھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور اگر مشہور مفہوم بے حیائی کے لئے جاویں تو اس کے معنی بدکاری اور اس کے مقدمات اور اسباب مراد ہوں گے۔

پھر اس آیت میں فواحش کی تفسیر میں یہ بھی فرمایا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، پہلی تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے تمام گناہ مراد ہوں گے، اور باطنی فواحش سے وہ گناہ مراد ہوں گے جو دل سے متعلق ہیں، جیسے حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے مراد وہ بے حیائی کے کام ہوں گے جن کو علانیہ کیا جاتا ہے، اور باطنی وہ جو چھپ کر کئے جاویں، اصل بدکاری میں اس کے مقدمات و لوازمات سب داخل ہیں، بدنیتی سے کسی عورت کی طرف دیکھنا، ہاتھ وغیرہ سے چھونا، اس سے اس طرح کی باتیں کرنا سب اس میں داخل ہیں، اور باطنی بے حیائی میں وہ خیالات اور ارادے اور ان کو پورا کرنے کی خفیہ تدبیریں داخل ہیں جو کسی بے حیائی اور بدکاری کے سلسلہ میں عمل میں لائی جائیں۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فواحش سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا بُرا ہونا عام طور پر مشہور و معلوم ہے اور سب جانتے ہیں، اور باطنی فواحش سے مراد وہ افعال ہیں جو اللہ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں اگرچہ عام طور پر اُن کو لوگ بُرا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، جیسے بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑنا یا کسی ایسی عورت سے نکاح کر لینا جو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار سے تمام ظاہری اور

باطنی گناہ ہوں گے اور مشہور عام مفہوم کے اعتبار سے بدکاری و بے حیائی کے جتنے طریقے کھلے یا چھپے ہوئے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ دوسرے اس میں یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ، پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور ایسے مقامات سے بھی بچو جہاں جانے سے اس کا خطرہ ہو کہ ہم گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ایسے کاموں سے بھی بچو جن سے ان گناہوں کا راستہ کھلتا ہو، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمَىٰ يُوشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ،	"یعنی جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہو جائے"

اس لئے احتیاط کا مقتضی یہی ہے کہ جس جگہ کا داخلہ ممنوع ہے اس جگہ کے ارد گرد بھی نہ پھرے۔

پانچواں حرام قتل ناحق ہے | محرمات میں سے پانچویں چیز قتل ناحق ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ "یعنی جس شخص کا خون اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر"۔ اور اس حق کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمائی ہے جو بروایت عبداللہ بن مسعودؓ بخاری و مسلم نے نقل کی ہے وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر تین چیزوں سے، ایک یہ کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو جائے، دوسرے یہ کہ اس نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو، اس کے قصاص میں مارا جائے، **تیسرے یہ کہ اپنا دینِ حق چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہو۔**

حضرت عثمان غنیؓ جس وقت باغیوں کے نرغہ میں محصور تھے، اور لوگ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے اس وقت بھی حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو یہ حدیث سنا کر کہا کہ بحمد اللہ میں ان تینوں چیزوں سے .... بری ہوں، میں نے زمانۂ اسلام میں تو کیا زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی بدکاری نہیں کی، اور نہ میں نے کسی کو قتل کیا، اور نہ کبھی میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ میں اپنے دینِ اسلام کو چھوڑ دوں، پھر تم مجھے **کس بناء پر قتل کرتے ہو!**

اور بے وجہ قتل کرنا جیسے مسلمان کا حرام ہے اسی طرح اس غیر مسلم کا قتل بھی ایسا ہی حرام ہے جو کسی اسلامی ملک میں ملک کے قانون کا پابند ہو کر رہتا ہے، یا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں بروایت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو کسی ذمی غیر مسلم کو قتل کر دے اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا، اور جو شخص اللہ کے عہد کو توڑے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔

اس ایک آیت میں دس میں سے پانچ حرام و ناجائز چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ "یعنی ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے

"تاکہ تم سمجھو"۔

چھٹا حرام: یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانا

دوسری آیت میں چھٹا حکم یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانے کی حرمت کے متعلق ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، "یعنی یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے" اس میں یتیم نابالغ بچوں کے ولی اور وصی لوگوں کو خطاب ہے کہ وہ ان کے مال کو ایک آگ سمجھیں اور ناجائز طور پر اس کے کھانے اور لینے کے پاس بھی نہ جائیں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں سخت الفاظ کے ساتھ آیا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔

البتہ یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اور کسی ایسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر بڑھانا جس میں نقصان کا خطرہ عادۃً نہ ہو، یہ طریقہ مستحسن اور ضروری ہے، یتیموں کے ولی کو ایسا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد مال یتیم کی حفاظت کی ذمہ داری کی حد بتلادی حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہونچ جائے تو ولی کی ذمہ داری ختم ہوگئی، اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔

لفظ اشد کے اصلی معنی قوت کے ہیں، اور اس کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہوجانے سے ہوجاتی ہے، جس وقت بچے میں آثار بلوغ پائے جائیں یا اس کی عمر پندرہ سال کی پوری ہوجائے، **اس وقت اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائے گا۔**

البتہ بالغ ہوجانے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں اپنے مال کی حفاظت اور صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں، اگر صلاحیت دیکھی جائے تو بالغ ہوتے ہی اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر یہ صلاحیت ابھی اس میں موجود نہیں تو پچیس سال کی عمر تک مال کی حفاظت ولی کے ذمہ ہے، اس درمیان میں جس وقت بھی اس کو مال کی حفاظت اور کاروبار کی لیاقت پیدا ہوجائے تو مال اس کو دیا جاسکتا ہے، اور اگر پچیس سال تک بھی اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو تو پھر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا مال بہرحال اس کو دیدیا جائے، بشرطیکہ اس کی یہ عدم صلاحیت دیوانگی اور جنون کی حد تک نہ پہونچی ہو، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس وقت بھی مال اس کو سپرد نہ کیا جائے، بلکہ قاضی شرعی اس کے مال کی حفاظت کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد کردے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہے، جس میں فرمایا ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ، یعنی یتیم بچوں میں بالغ ہونے کے بعد اگر تم یہ صلاحیت دیکھو کہ وہ اپنے مال کی خود حفاظت کرسکتے ہیں اور کسی کاروبار میں لگا سکتے ہیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو۔ اس آیت نے بتلایا کہ صرف بالغ ہونا مال سپرد کرنے کے لئے کافی

نہیں، بلکہ مال کی حفاظت اور کاروبار کی قابلیت شرط ہے۔

ساتواں حرام: ناپ تول میں کمی ساتواں حکم اس آیت میں ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرنے کا ہے، انصاف کا مطلب یہ ہے کہ دینے والا دوسرے فریق کے حق میں کوئی کمی نہ کرے اور لینے والا اپنے حق سے زیادہ نہ لے (روح المعانی)

چیزوں کے لین دین میں ناپ تول میں کمی زیادتی کو قرآن نے شدید حرام قرار دیا ہے، اور اس کے خلاف کرنے والوں کے لئے سورۂ مطففین میں سخت وعید آئی ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو تجارت میں ناپ تول کا کام کرتے ہیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ناپ اور تول یہ دو کام ہیں جن میں بے انصافی کرنے کی وجہ سے تم سے پہلے کی امتیں عذاب الٰہی کے ذریعہ تباہ ہو چکی ہیں، تم اس میں پوری احتیاط سے کام لو (تفسیر ابن کثیر)

فرائض ملازمت، مزدوروں کی مقررہ ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنے کے حکم میں ہے

یاد رہے کہ ناپ تول کی کمی جس کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ کسی کے ذمہ دوسرے کا جو حق ہے اس میں کمی کرنا بھی تطفیف میں داخل ہے جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تو نے تطفیف کر دی، یعنی جو حق واجب تھا وہ ادا نہیں کیا، اس کو نقل کر کے امام مالکؒ فرماتے ہیں لِکُلِّ شَیْءٍ وَّفَاءٌ وَّتَطْفِیْفٌ، یعنی حق کا پورا دینا یا کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے، صرف ناپ تول میں ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو ملازم اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کرتا، وقت چراتا ہے، یا کام میں کوتاہی کرتا ہے، وہ کوئی وزیر و امیر ہو یا معمولی ملازم، اور وہ کوئی دفتری کام کرنے والا ہو یا علمی اور دینی خدمت، جو حق اس کے ذمہ ہے، اس میں کوتاہی کرے تو وہ بھی مطففین میں داخل ہے، اسی طرح مزدور جو اپنی مقررہ خدمت میں کوتاہی کرے وہ بھی اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد فرمایا لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے، بعض روایات حدیث میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے امکان و اختیار تک ناپ تول کا پورا پورا حق ادا کرے تو اگر اس سے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جائے تو وہ معاف ہے کیونکہ وہ اس کی قدرت و اختیار سے خارج ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جملہ کا اضافہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ ادائے حق کے وقت احتیاط اس میں ہے کہ کچھ زیادہ دیدیا جائے، تاکہ کمی کا شبہ نہ رہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک ایسے ہی موقع پر وزن کرنے والے کو حکم دیا کہ وزن کرو اور جھکتا ہوا تولو (احمد، ابوداؤد، ترمذی، بروایت سوید بن قیسؓ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت بھی تھی کہ جس کسی کا کوئی حق آپ کے ذمہ ہوتا، تو اس کے ادا کرنے کے وقت ...... اس کے حق سے زائد ادا فرمانے کو پسند فرماتے تھے، اور بخاری کی ایک حدیث میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بیچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے، بلکہ کچھ معمولی کمی بھی ہو تو راضی ہو جائے"

مگر یہ حکم اخلاق ہے کہ دینے میں زیادہ دے اور لینے میں کم بھی ہو تو جھگڑا نہ کرے، قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر مجبور ہو، اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے، یعنی دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی جبری حکم نہیں، کیونکہ عام لوگوں کو ایسا کرنا آسان نہیں۔

ساتواں حکم عدل و انصاف کا ہے، ارشاد فرمایا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى، یعنی جب تم کوئی بات کہو تو حق کی کہو، اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو" اس جگہ کسی خاص بات کا ذکر نہیں، اسی لئے جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے، خواہ وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ یا آپس میں مختلف قسم کی گفتگو ان سب میں ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال بات کرتے ہوئے حق و انصاف کا خیال رہنا چاہئے، کسی مقدمہ کی گواہی یا فیصلہ میں حق و انصاف قائم رکھنے کے معنی ظاہر ہیں، کہ گواہ کو جو بات یقینی طور پر معلوم ہو وہ اپنی طرف سے کسی لفظ کی کمی بیشی کئے بغیر جتنا معلوم ہے صاف صاف کہہ دے، اپنی تخیل اور گمان کو دخل نہ دے، اور اس کی فکر نہ کرے کہ اس سے کس کو فائدہ پہونچے گا، اور کس کو نقصان، اسی طرح کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے تو گواہوں کو شرعی اصول پر جانچنے کے بعد جو کچھ ان کی شہادت سے نیز دوسری قسم کے قرائن سے ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گواہی اور فیصلہ دونوں میں نہ کسی کی دوستی اور محبت حق بات کہنے سے مانع ہو، اور نہ کسی کی دشمنی اور مخالفت، اسی لئے اس جگہ یہ جملہ بڑھایا گیا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى، یعنی اگرچہ وہ آدمی جس کے مقدمہ کی شہادت دینا یا فیصلہ کرنا ہے وہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو تب بھی حق و انصاف کو نہ گواہی میں ہاتھ سے جانے دو اور نہ فیصلہ میں۔

مقصود اس آیت میں جھوٹی گواہی اور حق کے خلاف فیصلہ سے روکنا ہے، جھوٹی گواہی کے

متعلق ابوداؤد اور ابن ماجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

"جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے، تین مرتبہ فرمایا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ یعنی بت پرستی کے گندہ عقیدہ سے بچو اور جھوٹ بولنے سے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتے ہوئے۔"

اسی طرح حق کے خلاف فیصلہ کرنے کے بارے میں ابوداؤد نے بروایت حضرت بریدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"قاضی یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک جنت میں جائے گا اور دو جہنم میں، جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کرکے حق کو پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کرکے حق بات کو جان تو لیا مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے، اور اسی طرح وہ قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور وفکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دیدیا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔"

قرآن مجید کی دوسری آیات میں اسی مضمون کو اور بھی زیادہ وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا گیا ہے کہ شہادت یا فیصلہ میں کسی کی دوستی، قرابت اور تعلق کا یا دشمنی اور مخالفت کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے، جیسے ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ، "یعنی حق بات اگرچہ خود تمہارے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو اس کے کہنے میں رکاوٹ نہ ہونی چاہئے"۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حکم ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا، "یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کے خلاف گواہی دینے یا فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ کردے" اور گواہی اور فیصلہ کے علاوہ آپس کی گفتگوؤں میں حق و انصاف قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جھوٹ نہ بولے، کسی کی غیبت نہ کرے، ایسی بات نہ بولے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے یا کسی کو جانی یا مالی نقصان پہنچے۔

نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا، یعنی عہد شکنی کا حرام ہونا

نواں حکم اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے اور عہد شکنی سے بچنے کا ہے، ارشاد فرمایا: وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا، "یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو"۔ اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہوسکتا ہے جو ازل میں ہر انسان سے لیا گیا جس میں سب انسانوں سے کہا گیا تھا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟"

سب نے جواب دیا تھا، یعنی بیشک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس عہد کا مقتضی یہی ہے کہ پروردگار کے کسی حکم کی مخالفت نہ کریں، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو سب کاموں سے مقدم اور اہم جانیں، اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کے پاس بھی نہ جائیں، اور ان کے شبہات سے بھی بچتے رہیں، خلاصہ اس عہد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کریں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص خاص عہد جن کا ذکر قرآن کے مختلف مواقع میں فرمایا گیا ہے مراد ہوں، اور انہی میں سے یہ تین آیتیں بھی ہیں جن کی تفسیر آپ دیکھ رہے ہیں (جن میں دس احکام تاکید کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں)۔

علماء نے فرمایا کہ اس عہد میں نذر اور منت کا پورا کرنا بھی داخل ہے جو ایک انسان اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا، (قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں اس کو صراحۃً بھی ذکر فرمایا ہے یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ، یعنی اللہ کے نیک بندے اپنی منتوں کو پورا کیا کرتے ہیں۔

(خلاصہ یہ ہے کہ یہ نواں حکم شمار میں تو نواں حکم ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے تمام احکام شرعیہ واجبات اور ممنوعات سب پر حاوی ہے)۔

اس دوسری آیت کے آخر میں فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، "یعنی ان کاموں کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو"۔

تیسری آیت میں دسواں حکم مذکور ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، "یعنی یہ دین محمدی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اس راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی"۔

اس میں لفظ ہٰذا کا اشارہ دین اسلام یا قرآن کی طرف ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۃ انعام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس میں بھی پورے اصول اسلام، توحید، رسالت اور اصول احکام شرعیہ مذکور ہیں (اور مستقیم، دین کے اس راستہ کی صفت ہے جس کو نحوی ترکیب میں بصورت حال ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دین اسلام کے لئے مستقیم ہونا لازمی وصف ہے، اس کے بعد فرمایا فَاتَّبِعُوْهُ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ دین اسلام میرا راستہ ہے اور وہی مستقیم اور سیدھا راستہ ہے تو جب منزل مقصود کی سیدھا راستہ ہاتھ آ گیا، اس پر صرف اسی راستہ پر چلو)۔

پھر فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، سُبُل، سبیل کی جمع ہے، اس کے معنی بھی راستہ کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے، لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، تم ان

راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہونچنے کے نہیں ہیں، اس لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستے سے دُور جا پڑے گا۔

تفسیر مظہری میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کا منشار تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور تجویزوں کو قرآن و سنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچے میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجویزات کے سانچے میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے منشار کے خلاف نظر آئی اس کو تاویلیں کرکے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں، جو بدعات اور شبہات کی راہیں ہیں، انھی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

مسند دارمی میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ سُبُل ہیں، (یعنی وہ راستے جن پر چلنے سے اس آیت میں منع فرمایا ہے) اور فرمایا کہ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے، جو لوگوں کو سیدھے راستہ سے ہٹا کر اس طرف بلاتا ہے اور اس کے بعد آپؐ نے استدلال کے طور پر اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

تینوں آیتوں کی تفسیر اور ان میں بیان کئے ہوئے دس اصول محرمات کا بیان پورا ہوگیا، آخر میں قرآن کریم کے اس اسلوب بیان پر بھی ایک نظر ڈالئے، کہ اس جگہ دس احکام بیان کئے تھے، ان کو آجکل کی کتب قانون کی طرح دس دفعات میں نہیں لکھ دیا، بلکہ پہلے پانچ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ، اور پھر اور چار حکم بیان فرمانے کے بعد پھر اسی جملہ کو دوبارہ اس فرق کے ساتھ ذکر کیا کہ تَعْقِلُوْنَ کے بجائے تَذَکَّرُوْنَ فرمایا اور پھر آخری حکم ایک مستقل آیت میں بیان فرماکر پھر اُسی جملہ کا اعادہ اس فرق کے ساتھ کیا کہ تَذَکَّرُوْنَ کے بجائے تَتَّقُوْنَ فرمایا۔

قرآن کریم کے اس حکیمانہ اسلوب بیان میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ قرآن کریم عام دنیا کے قوانین کی طرح محض حاکمانہ قانون نہیں، بلکہ مربیانہ قانون ہے، اسی لئے ہر قانون کے ساتھ اس کو آسان کرنے کی تدبیر بھی بتلائی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو قانون کی پابندی پر خلوت و جلوت

میں مجبور کرنے والی ہے، اسی لئے تینوں آیتوں کے آخر میں ایسے کلمات لائے گئے جن سے انسان کا رُخ مادی دنیا سے پھر کر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف ہو جائے۔

پہلی آیت میں جو پانچ احکام بیان کئے گئے ہیں شرک سے بچنا، والدین کی نافرمانی سے بچنا، قتلِ اولاد سے بچنا، بے حیائی کے کاموں سے بچنا، کسی کا ناحق خون کرنے سے بچنا، ان کے آخر میں تو لفظ تَعْقِلُوْنَ استعمال فرمایا، کیونکہ زمانہ جاہلیت والے ان چیزوں کو کوئی عیب ہی نہ جانتے تھے، اس لئے اشارہ کیا گیا کہ آبائی رسموں اور جذبوں کو چھوڑ کر عقل سے کام لو۔

دوسری آیت میں چار احکام بیان ہوئے، یعنی مالِ یتیم کو ناحق نہ کھانا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، بات کہنے میں حق و صدق کا لحاظ رکھنا اور اللہ کے عہد کو پورا کرنا۔

یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ضروری ہونے کو تو جاہل بھی جانتے تھے، اور ان میں کچھ لوگ عمل بھی کرتے تھے، مگر اکثر ان میں غفلت برتی جاتی تھی، اور غفلت کا علاج ہے تذکرہ، یعنی خدا و آخرت کی یاد، اس لئے اس آیت کے آخر میں لفظ تَذَكَّرُوْنَ فرمایا۔

تیسری آیت میں صراطِ مستقیم کو اختیار کرنے اور اس کے خلاف دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے، اور صرف خوفِ خدا ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے خیالات و خواہشات سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ ہو سکتی ہے، اس لئے اس کے آخر میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ارشاد فرمایا۔

اور تینوں جگہ لفظ وصیت کا دیا گیا جو تاکیدی حکم کو کہا جاتا ہے، اسی لئے بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مُہر کیا ہوا وصیت نامہ دیکھنا چاہے وہ یہ تین آیتیں پڑھ لے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے نیک کام والوں پر اور واسطے

لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور رحمت کے لئے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں،

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ

رحمت ہو اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو انہی دو فرقوں پر

۱۹ ع ۲

ب

کمال حاصل کرکے ثواب کے مستحق ہوتے سو اب دیکھو، اب تمہارے پاس کوئی عذر نہیں، تمہارے پاس ابھی تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب (جس کے احکام واضح ہیں) اور وہ رہنمائی کا ذریعہ ہے اور خدا کی رحمت ہے، آچکی ہے سو اب بھی کوئی شافی کتاب آنے کے بعد اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلاوے اور دوسروں کو بھی اس سے روکے، ہم ابھی آخرت میں ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کو اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے (یہ سختی اس روکنے سے بڑھی ورنہ صرف تکذیب بھی موجب سزا ہے)۔

معارف ومسائل

وجہ غفلت یہ نہیں کہ تورات و انجیل لغت عرب میں نہ تھی، کیونکہ ترجمہ کے ذریعہ سے مضامین کی اطلاع ممکن اور بکثرت واقع ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے اہل عرب کی تعلیم توحید کا کبھی اہتمام نہیں کیا، اور اتفاقی کانوں میں کوئی مضمون پڑ جانا دفعۃً تنبیہ میں کم مؤثر ہے، گو اس قدر تنبیہ پر طلب دین کامل واجب ہو جاتی ہے، اور اسی بناء پر ترک توحید پر عذاب ممکن تھا، اور اس سے عموم بعثت موسویہ و عیسویہ کا شبہ لازم نہیں آتا، کیونکہ اختصاص اس عموم کا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باعتبار مجموعہ اصول و فروع کے ہے، ورنہ اصول میں سب انبیاء کا اتباع سب خلائق پر واجب ہے، پس اس بناء پر عذاب صحیح ہوتا، لیکن یہ عذر بادی النظر میں پیش کیا جا سکتا تھا، اب اس کی بھی گنجائش نہ رہی اور حجت تامہ ہوگئی۔

اور دوسرا قول لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ کے متعلق ایک سوال وجواب باعتبار جمیع اہل فترت کے سورۂ مائدہ کے رکوع سوم کے آخر میں گذر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ

کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب

اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا

یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی جس دن آئے گی نشانی تیرے رب کی، کام نہ

يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ

آئے گا کسی کے اس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان

فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو کہہ دے تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ (جو کہ بعد نزول کتاب و بینات و وضوح حق کے بھی ایمان نہیں لاتے اپنے ایمان لانے کے لئے) صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں (یعنی ایسا توقف کر رہے ہیں جیسے کوئی انتظار کر رہا ہو) کہ ان کے پاس فرشتے آویں یا ان کے پاس آپ کا رب آوے (جیسا قیامت میں حساب کے وقت واقع ہوگا) یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی (منجملہ قیامت کی نشانیوں کے) آوے (مراد اس بڑی نشانی سے آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کیا ایمان لانے میں قیامت کے وقوع یا قرب کا انتظار ہے، سو اس کے متعلق سن رکھیں کہ) جس روز آپ کے رب کی یہ بڑی نشانی (مذکور) آپہنچے گی (اس روز) کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آوے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہو (بلکہ اسی روز ایمان لایا ہو) یا (ایمان تو پہلے بھی رکھتا ہو لیکن) اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو (بلکہ اعمالِ بد اور گناہوں میں مبتلا ہو، اور اس روز ان سے توبہ کر کے اعمالِ نیک شروع کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی، اور اس سے قبل اگر معاصی سے توبہ کرتا تو مؤمن ہونے کی برکت سے توبہ قبول ہو جاتی، تو قبول توبہ منجملہ منافع ایمان کے ہے، اس وقت ایمان نے یہ خاص نفع نہ دیا، اور جب علامت قیامت مانع ہوگئی قبول ایمان و توبہ سے تو خاص وقوع قیامت تو بدرجہ اولیٰ مانع ہوگا، پھر انتظار کاہے کا، اور اگر اس توضیح پر بھی ایمان نہ لاویں تو) آپ (تہدید مزید کے طور پر) فرما دیجئے کہ (خیر بہتر) تم (ان امور کے) منتظر رہو (اور مسلمان نہیں ہوتے تو مت ہو) ہم بھی (ان امور کے) منتظر ہیں (اس وقت تم پر مصیبت پڑے گی، اور ہم مؤمن ان شاء اللہ تعالیٰ ناجی ہوں گے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کا اکثر حصہ اہل مکہ اور مشرکین عرب کے عقائد اور اعمال کی اصلاح اور ان کے شبہات اور سوالات کے جواب میں نازل ہوا ہے۔

اس تمام سورۃ اور خصوصاً پچھلی آیات میں اہل مکہ اور عرب کے باشندوں پر واضح کر دیا گیا کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بینات دیکھ چکے، پچھلی کتابوں اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں آپ کے متعلق سن چکے، پھر ایک اُمّی محض کی زبان سے قرآن کی آیات بینات سن چکے جو ایک مستقل معجزہ بن کر آیا، سب حق و صدق کی راہیں تمہارے سامنے کھل چکیں، اور خدا تعالیٰ کی حجت تم پر تمام ہو چکی اب ایمان لانے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مذکور ہے کہ اہل دوزخ دوزخ میں پہونچ کر فریاد کریں گے، اور بڑے بڑے وعدے کریں گے کہ اگر ہمیں اب دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان اور عمل صالح کے سوا کچھ نہ کریں گے، مگر سب کا جواب یہی ہوگا کہ ایمان و عمل کا وقت ختم ہو چکا، اور اب جو **کچھ کہہ رہے ہو مجبور ہو کر کہہ رہے ہو اس کا اعتبار نہیں۔**

اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، اور اس کو دیکھتے ہی سارے جہان کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمان بردار بن جائیں گے، لیکن اس وقت کا ایمان اور توبہ قابل قبول نہ ہوگا (بغوی بسندہ عن ابی ہریرۃؓ)

اس آیت میں اتنی بات تو قرآنی تصریح سے معلوم ہوگئی کہ بعض نشانیاں ایسی واقع ہوں گی جن کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، کسی کافر یا فاسق کی توبہ قبول نہ ہوگی، لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ وہ کونسی نشانی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ **صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:**

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آجائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو، جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، یہی وہ وقت ہوگا جس کے لئے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت **کسی نفس کو ایمان لانا نفع نہیں دے گا**"

اسی تفسیر میں صحیح مسلم میں بروایت حذیفہ ابن اسیدؓ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ علامات قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، آفتاب کا جانب مغرب سے نکلنا، اور ایک خاص قسم کا دھواں، اور دابۃ الارض اور یاجوج ماجوج کا نکلنا، عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا، دجال کا نکلنا، اور تین جگہوں پر زمین کا دھنس جانا، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں، ایک جزیرۃ العرب میں، اور ایک آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کر لے چلے گی۔

اور مسند احمد میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان آیات میں سب سے پہلے مغرب کی طرف سے طلوع آفتاب اور دابۃ الارض کا نکلنا واقع ہوگا۔

الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ	اُن میں سے کسی کی موت آجائے تو کہتا ہو کہ میں اب توبہ کرتا ہوں"

اور اسی کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ تَوْبَةَ الْعَبْدِ تُقْبَلُ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ۔	"یعنی بندہ کی توبہ اُس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک اس کی رُوح حلق میں آکر غرغرہ موت کی صورت پیدا نہ ہوجائے"

اس سے معلوم ہوا کہ نزعِ رُوح کے وقت جب سانس آخری ہو اُس وقت بھی چونکہ فرشتۂ موت کے سامنے آجاتے ہیں اُس وقت بھی توبہ قبول نہیں ہوتی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال بھی اللہ کی طرف سے ایک اہم نشانی ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ میں یہ موت کا وقت بھی داخل ہے، جیسا کہ تفسیر بحر محیط میں بعض علماء کا یہ قول نقل بھی کیا ہے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ " یعنی جو شخص مرگیا اس کی قیامت تو اسی وقت قائم ہوگئی، کیونکہ دارِ عمل ختم ہوا اور جزاءِ اعمال کا کچھ نمونہ قبر ہی سے شروع ہوگیا، صائب نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے ؎

توبہ با انفس باز پسیں دست زدمت ❊ بحجہ دیر رسیدی درِ محمل بستند

یہاں عربی زبان کے اعتبار سے یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں پہلے فرمایا اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ اور پھر اسی جملہ کا اعادہ کرکے فرمایا یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا، اس میں ضمیر سے کام لے کر کلام کو مختصر نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کلمہ میں جو بَعْضُ آیاتِ مذکور ہیں وہ اور ہیں اور دوسرے کلمہ کی بَعْضُ اٰیٰت اس سے مختلف ہیں، اس سے اس تفصیل کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جو ابھی آپ نے بروایت حذیفہ ابن اُسید پڑھی ہے کہ قیامت کی دس نشانیاں بہت اہم ہیں، ان میں سے آخری نشانی مغرب سے طلوعِ آفتاب ہے جو انقطاعِ توبہ کی علامت ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ کی ساری حجتیں پوری ہوجانے کے بعد بھی اگر تمہیں موت یا قیامت کا انتظار ہے تو یہ انتظار کرتے رہو، ہم بھی اسی کا انتظار کریں گے کہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کا کیا معاملہ ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي

جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہوگئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ

شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾

سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی جتلاوے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے

مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ

جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے ہے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے

بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾

ایک برائی سو سزا پاوے گا اسی کے برابر اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو (جس کے وہ مکلف ہیں) جدا جدا کردیا (یعنی دین حق کو تمامہ قبول نہ کیا خواہ سب کو چھوڑ دیا یا بعض کو اور طریقے شرک و کفر و بدعت کے اختیار کرلئے) اور (مختلف) گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (یعنی آپ ان سے بری ہیں، آپ پر کوئی الزام نہیں) بس (وہ خود اپنے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں، اور) ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے (وہ دیکھ بھال رہے ہیں) پھر (قیامت میں) ان کو ان کا کیا ہوا جتلادیں گے (اور حجت تمام کرکے مستحق عذاب ظاہر کردیں گے) جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے (یعنی ایسا سمجھا جاوے گا کہ گویا وہ نیکی دس بار کی اور ہر ایک نیکی پر جس قدر ثواب ملتا اب دس حصے ویسے ثواب کے ملیں گے) اور جو شخص برا کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی (زیادہ نہ ملے گی) اور ان لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیکی درج نہ ہو یا کوئی بدی زیادہ کرکے لکھ لی جاوے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کا بیشتر حصہ مشرکین مکہ کے خطاب اور ان کے سوال و جواب کے متعلق آیا ہے جس میں ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ صرف قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے، جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کے زمانہ میں ان کا اور ان کی کتاب و شریعت کا اتباع مدار نجات تھا، اب صرف آپ کی اور آپ کی شریعت

کی پیروی مدارِ نجات ہے عقل سے کام لو اور اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں کے غلط راستوں کو اختیار نہ کرو، ورنہ وہ راستے تمھیں خدا تعالیٰ سے دُور کردیں گے۔

مذکورہ آیت سے پہلی آیت میں ایک عام خطاب تھا جس میں مشرکینِ عرب اور یہود ونصاریٰ اور مسلمان سب داخل ہیں، ان سب کو مخاطب کرکے اللہ کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا انجام بد بیان کیا گیا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کا ان غلط راستوں پر چلنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے، پھر ان میں غلط راستے وہ بھی ہیں جو صراطِ مستقیم سے بالکل مخالف جانب لے جانے والے ہیں، جیسے مشرکین اور اہل کتاب کے راستے، اور وہ راستے بھی ہیں جو مخالف جانب میں تو نہیں مگر سیدھے رستے سے ہٹ کر دائیں بائیں لے جانے والے ہیں، وہ شبہات اور بدعات کے راستے ہیں، وہ بھی انسان کو گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ، "یعنی وہ لوگ جنھوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہوگئے بہت سے فرقے تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہی جتلادے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے"۔

اس آیت میں غلط راستوں پر پڑنے والوں کے متعلق اوّل تو یہ بتلادیا کہ اللہ کا رسول ان سے بری ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، پھر ان کو یہ وعید شدید سنائی کہ ان کا معاملہ بس خدا تعالیٰ کے حوالے ہے وہی ان کو قیامت کے روز سزا دیں گے۔

دین میں تفریق ڈالنا اور فرقے بن جانا جو اس آیت میں مذکور ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اصولِ دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر وتلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھادے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے۔

دین میں بدعت پیدا کرنے پر وعید شدید

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں جنھوں نے اپنے اصولِ دین کو ترک کرکے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملادی تھیں اور اس امت کے اہلِ بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:-

"میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس طرح کی بداعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری اُمت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے، بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری اُمت کے تہتّر فرقے ہو جاویں گے جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے، صحابۂ کرام نے

عرض کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ،

یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائیگی

(اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے)۔

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر ہے وہ اہل بدعت اور اپنی خواہشات وخیالات کے تابع نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں، یہی مضمون حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے بروایت عرباض بن ساریہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلافات دیکھیں گے، اس لئے (میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ) تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہو اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو، نئے نئے طریقوں سے بچتے رہو، کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی ہر چیز بدعت ہے اور ہر **بدعت گمراہی ہے**“

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہوگیا اس نے اسلام **کا قلادہ اپنی گردن سے نکال دیا (رواہ ابوداؤد واحمد)**

تفسیر مظہری میں ہے کہ جماعت سے مراد اس حدیث میں جماعت صحابہ ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو قرآن عطا فرمایا، اور قرآن کے علاوہ دوسری وحی عطا فرمائی جس کو حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، پھر قرآن میں بہت سی آیات مشکل یا مجمل یا مبہم ہیں، ان کی تفسیر و بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ بیان کرنے کا وعدہ فرمایا، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ کا یہی مطلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنّت کی تفصیلات ... اپنے بلاواسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو اپنے قول وعمل کے ذریعہ سکھلائیں اس لئے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعت الٰہیہ کا بیان و تفسیر ہے۔

اس لئے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے، اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو

اختیار کرے جس کو جمہور صحابہ کرام نے اختیار فرمایا ہو۔

اسی مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے کہ تعامل صحابہ اور تفسیراتِ صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن و سنت کا مفہوم قرار دیدیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا، اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی اُن پر لعنت کرے، ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا (یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھا دیئے یا معنی میں ایسی زیادتی کردی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے) دوسرے وہ شخص جو تقدیر الٰہی کا منکر ہو گیا، تیسرے وہ شخص جو اُمت پر زبردستی مسلط ہو جائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور ذلت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے، چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا، یعنی حرم مکہ میں قتل و قتال کیا، یا شکار کھیلا، پانچویں وہ شخص جس نے میری عترت و اولاد کی بے حرمتی کی، چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

پچھلی آیت میں اس کا بیان تھا کہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے والوں کو روزِ قیامت میں اللہ تعالیٰ ہی ان کے اعمال کی سزا دیں گے۔

اس آیت میں آخرت کی جزاء و سزاء کا کریمانہ ضابطہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیک کام کرے گا اس کو دس گنہ بدلہ دیا جائے گا، اور جو ایک گناہ کرے گا اس کا بدلہ صرف ایک گناہ کی برابر دیا جائے گا۔

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب عزّ وجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لئے ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے، خواہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کرلے، تو دس نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو و کرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دربار میں وہی شخص ہلاک ہو سکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے (ابن کثیر)

ایک حدیث قدسی میں بروایت ابوذرؓ ارشاد ہے:

"جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ اور جو شخص ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا صرف ایک ہی گناہ کی برابر ملے گی یا میں اس کو بھی معاف کر دونگا اور جو شخص اتنے گناہ کر کے میرے پاس آئے جن سے ساری زمین بھر جائے اور مغفرت کا طالب ہو تو میں اتنی ہی مغفرت سے اس کے ساتھ معاملہ کروں گا، اور جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جو شخص ایک ہاتھ میری طرف آتا ہو میں اس کی طرف بقدر ایک باع کے آتا ہوں (باع کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کو) اور جو شخص میری طرف جھپٹ کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"

ان روایات حدیث سے معلوم ہوا کہ نیکی کی جزاء میں دس تک کی زیادتی جو اس آیت میں مذکور ہے ادنیٰ حد کا بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں اور دیں گے، جیسا کہ دوسری روایات سے ستر گنا یا سات سو گنا تک ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں لفظ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فرمایا ہے عَمِلَ بِالْحَسَنَةِ نہیں فرمایا، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ محض کسی نیک یا بدکام کر لینے پر یہ جزاء وسزاء نہیں دی جائے گی، بلکہ جزاء وسزاء کے لئے موت کے وقت تک اس عمل نیک یا بدعمل کا قائم رہنا شرط ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نیک عمل کیا، لیکن پھر اس کے کسی گناہ کی شامت سے وہ عمل حبط اور ضائع ہو گیا تو وہ اس عمل پر جزاء کا مستحق نہیں رہا، جیسے معاذ اللہ کفر و شرک تو سارے ہی اعمالِ صالحہ کو برباد کر دیتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہ ایسے ہیں جو بعض اعمالِ صالحہ کو باطل اور بے اثر کر دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، یعنی تم اپنے صدقے کو احسان جتلا کر یا ایذا پہونچا کر باطل اور ضائع نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذاء پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمالِ صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے کئے ہیں وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح برے اعمال سے اگر توبہ کر لی تو وہ گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، موت کے وقت تک باقی نہیں رہتا، اس لئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ کوئی عمل کرے نیک یا بد تو اس کو جزاء یا سزا ملے گی" بلکہ یوں فرمایا کہ "جو شخص ہمارے پاس لائے گا نیک عمل تو دس گنا

تو بڑھ جائیگا اور جو برے پاس لائے گا برا عمل تو ایک ہی عمل کی سزا پائے گا، اللہ تعالیٰ کے پاس لانا کی وقت ہوگا جب یہ عمل آخر تک قائم اور باقی رہے، نیک عمل کو ضائع کرنے والی کوئی چیز پیش نہ آئے اور برے عمل سے توبہ و استغفار نہ کرے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ یعنی اس عدالت عالیہ میں اس کا امکان نہیں کہ کسی پر ظلم ہو سکے، نہ کسی کے نیک عمل کے بدلے میں کمی کا امکان ہے، نہ کسی کے برے عمل میں اس سے زائد سزا کا احتمال ہے۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ

تو کہہ دے مجھ کو سجھادی میرے رب نے راہ سیدھی دین صحیح ملت ابراہیم

إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦١﴾ قُلْ إِنَّ

کی جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں۔ تو کہہ میری

صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾

نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے،

لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾

کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں،

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ

تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہے رب ہر چیز کا اور جو کوئی گناہ کرتا ہے

كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ

سو وہ اس کے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا پھر

إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾

تمہارے رب کے پاس ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے سو وہ جتلا دیگا جس بات میں تم جھگڑتے تھے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ

اور اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک

بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ

کے ایک پر تاکہ آزمائے تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں، تیرا رب جلد

الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾

عذاب کرنے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا رستہ (وحی کے ذریعہ سے) بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے مستحکم (بوجہ ثبوت بدلائل کے مستحکم ہے) جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ (ابراہیمؑ) شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (اور) آپ (اس دین مذکور کی قدرے تفصیل کے لئے) فرما دیجئے کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا، اس کا (استحقاق عبادت یا تصرفات ربوبیت میں) کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی (دین مذکور پر رہنے) کا حکم ہوا ہے اور (حکم کے موافق) میں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا (ماننے والا) ہوں، آپ (ان باطل کی طرف بلانے والوں سے) فرما دیجئے کہ کیا (بعد وضوح حقیقت توحید و اسلام کے تمہارے کہنے سے) میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں (یعنی نعوذ باللہ شرک اختیار کرلوں) حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا (اور سب چیزیں اس کی مملوک ہیں اور مملوک شریک مالک نہیں ہو سکتا) اور (تم جو کہتے ہو کہ تمہارا گناہ ہمارے سر سو یہ محض لغو بات ہے کہ کرنے والا پاک صاف رہے اور صرف دوسرا گنہگار ہو جاوے، بلکہ بات یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے، اور کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا، (بلکہ سب اپنی اپنی بھگتیں گے) پھر (سب کے عمل کر چکنے کے بعد) تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے (کہ کوئی کسی دین کو حق بتلاتا تھا اور کوئی کسی کو، وہاں علی الاطلاع سے فیصلہ کر دیا جاوے گا، کہ اہل حق کو نجات اور اہل باطل کو سزا ہوگی) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا (اس نعمت میں تو تماثل ہے) اور ایک کا دوسرے پر (مختلف چیزوں میں) رتبہ بڑھایا، (اس نعمت میں تفاضل ہے) تاکہ (ان نعمتوں سے) تم کو (ظاہراً) آزماوے ان چیزوں میں جو کہ (نعم مذکورہ سے) تم کو دی ہیں (آزمانا یہ کہ کون ان نعمتوں کی قدر کرکے منعم کی اطاعت کرتا ہے اور کون بے قدری کرکے اطاعت نہیں کرتا، پس بعضے مطیع ہوتے، بعضے نافرمان ہوکر اور دونوں کے ساتھ مناسب معاملہ کیا جاوے گا، کیونکہ) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے، اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے،

رہیں نافرمانوں کے لئے عقاب ہو اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہو اور نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے، پس مکلفین پر ضرور ہوا کہ دین حق کے موافق اطاعت اختیار کریں، اور باطل اور مخالفت حق سے باز آویں)۔

معارف ومسائل

یہ سورۂ انعام کی آخری چھ آیتیں ہیں جن لوگوں نے دین حق میں افراط و تفریط اور کمی بیشی کر کے مختلف دین بنا لئے تھے، اور خود مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے، ان کے مقابلہ پر ان میں سے پہلی تین آیتوں میں دین حق کی صحیح تصویر اس کے بنیادی اصول اور بعض اہم فروع و جزئیات بیان کئے گئے ہیں، پہلی دو آیتوں میں اصول کا بیان ہے اور تیسری آیت میں ان کے اہم فروع کا ذکر ہے، اور دونوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ **ان لوگوں کو یہ بات پہونچا دیں۔**

پہلی آیت میں ارشاد ہے، قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ "یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے"، اس میں اشارہ فرما دیا کہ میں نے تمہاری طرح اپنے خیالات یا آبائی رسوم کے تابع یہ راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ میرے رب نے مجھے یہ راستہ بتایا ہے، اور لفظ رب سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس کی شان ربوبیت کا تقاضا ہو کہ وہ صحیح راستہ بتائے، تم بھی اگر چاہو تو اس کی طرف ہدایت کے سامان تمہارے لئے بھی موجود ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اس میں لفظ "قیم" مصدر ہے قیام کے معنی میں، اور مراد اس سے قائم رہنے والا مستحکم ہے، یعنی یہ دین مستحکم ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، کسی کے شخصی خیالات نہیں، اور کوئی نیا دین و مذہب بھی نہیں جس میں کسی کو شبہ ہو سکے، بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی دین ہے، خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اس لئے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر مذہب والے ان کی عظمت و امامت کے قائل ہیں، موجودہ فرقوں میں سے یہود، نصاریٰ، مشرکین عرب آپس میں کتنے ہی مختلف ہوں مگر ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی و امامت پر سب ہی متفق ہیں، یہی وہ مقام امامت ہی جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو دیا ہے اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط

پھر ان میں سے ہر فرقہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں، اور ہمارا مذہب ہی ملتِ ابراہیم ہے، ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام تو غیر اللہ کی عبادت سے پرہیز کرنے والے اور شرک سے نفرت کرنے والے

تھے، اور یہی ان کا سب سے بڑا شرف رہا ہے، تم لوگ جب کہ شرک میں مبتلا ہوگئے تو یہود نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور مشرکین عرب نے ہزاروں بتوں کو خدائی کا شریک مان لیا، تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں، ہاں کہ وہ ملتِ ابراہیمی کا پابند ہے، اور یہ حق صرف مسلمان کو پہونچتا ہے جو شرک و کفر سے بیزار ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس میں لفظ "نُسُک" کے معنی قربانی کے بھی آتے ہیں، اور حج کے ہر فعل کو بھی نُسُک کہتے ہیں، اعمالِ حج کو مناسک کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ مطلق عبادت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، اسی لئے ناسک بمعنی عابد بولا جاتا ہے، اس جگہ ان میں سے ہر ایک معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، اور مفسرین صحابہ و تابعین سے یہ سب تفسیریں منقول بھی ہیں، مگر مطلق عبادت کے معنی اس جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ میری نماز اور میری تمام عبادات اور میری پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اس میں فروعِ اعمال میں سے اوّل نماز کا ذکر کیا، کیونکہ وہ تمام اعمالِ صالحہ کی رُوح اور دین کا عمود ہے، اس کے بعد تمام اعمال و عبادات کا اجمالی ذکر فرمایا، اور پھر اس سے ترقی کرکے پوری زندگی کے اعمال و احوال کا ذکر کیا، اور آخر میں موت کا، ان سب کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہماری یہ سب چیزیں صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی ایمان کامل اور اخلاص کامل کا نتیجہ ہے، کہ انسان اپنی زندگی کے ہر حال میں اور ہر کام میں اس چیز پر نظر رکھے کہ میرا اور تمام جہان کا ایک رب ہے، میں اس کا بندہ اور ہر وقت اس کی نظر میں ہوں، میرا قلب، دماغ، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پیر، قلم اور قدم اس کی مرضی کے خلاف نہ اٹھنا چاہئے، یہ وہ مراقبہ ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دل و دماغ میں مستحضر کرلے تو صحیح معنی میں انسان اور کامل انسان ہوجائے، اور گناہ و معصیت اور جرائم کا اس کے آس پاس بھی گذر نہ ہو۔

تفسیر درمنثور میں اسی آیت کے تحت میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفۂ زندگی بنالے۔

اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرکت یا ریا یا کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہونا لازم ہے، اور زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری موت و حیات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، تو پھر زندگی کے اعمال و عبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے

وابستہ ہیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں، جیسے نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق و فرائض وغیرہ اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں، یعنی وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چاہتا اور سوچتا ہے، وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے۔

پھر فرمایا وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ، یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قول و قرار اور اخلاصِ کامل کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار مسلمان ہوں" مراد یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں کیونکہ ہر امت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحیِ شریعت نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان و زمین اور مخلوقات وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے، اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى نُوْرِيْ (روح المعانی)

کسی کے گناہ کا بار دوسرا نہیں اٹھا سکتا

چوتھی آیت میں مشرکین مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، تو تمہارے سارے گناہوں کا بار ہم اٹھائیں گے، اس پر فرمایا قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمہارا یہ کہنا کہ ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھا لیں گے یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامۂ عمل میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہوگا، تمہارے اس کہنے سے وہ گناہ تمہاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے، اور اگر یہ خیال ہو کہ حساب اور نامۂ اعمال میں تو اسی کے رہے گا لیکن میدانِ حشر میں اس پر جو سزا مرتب ہوگی وہ سزا ہم بھگت لیں گے، تو اس خیال کو بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، فرمایا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى، یعنی قیامت کے روز کوئی شخص دوسرے کا بارِ گناہ نہیں اٹھائے گا۔

اس آیت نے مشرکین کے بیہودہ قول کا جواب تو دیا ہی ہے، عام مسلمانوں کو یہ ضابطہ بھی بتلا دیا کہ قیامت کے معاملہ کو دنیا پر قیاس نہ کرو کہ یہاں کوئی شخص جرم کر کے کسی دوسرے کے سر ڈال سکتا ہے، خصوصاً جبکہ دوسرا خود رضامند بھی ہو، مگر عدالتِ الٰہیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، وہاں ایک کے گناہ میں دوسرا ہرگز نہیں پکڑا جا سکتا، اسی آیت سے استدلال فرما کر

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولد الزنا پر والدین کے جرم کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ حدیث حاکم نے بسندِ صحیح حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔

اور ایک میّت کے جنازہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مُردہ کو عذاب ہوتا ہے۔ ابن ابی مُلیکہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول حضرت عائشہؓ کے سامنے نقل کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص کا یہ قول نقل کر رہے ہو جو نہ کبھی جھوٹ بولتا ہے اور نہ اُن کی ثقاہت میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے، مگر کبھی سننے میں بھی غلطی ہوجاتی ہے، اس معاملہ میں تو قرآن کا ناطق فیصلہ تمہارے لئے کافی ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، "یعنی ایک گناہ دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، تو کسی زندہ آدمی کے رونے سے مُردہ بے قصور کس طرح عذاب میں ہوسکتا ہے (درِ منثور)

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ "پھر تم سب کو بالآخر اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے، جہاں تمہارے سارے اختلافات کا فیصلہ سُنا دیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ زبان آوری اور کج بحثی سے باز آؤ، اپنے انجام کی فکر کرو۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ایک جامع نصیحت پر سورۂ انعام کو ختم کیا گیا ہے، اور وہ عہدِ ماضی کی تاریخ اور پچھلی قوموں کی سرگذشت کو ان کے سامنے لاکر اپنے مستقبل کی طرف توجہ دلایا گیا ہے: وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

اس میں لفظ خلائف، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام اور گدی نشین۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جس کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو اور سمجھتے ہو ایسا نہیں جو کل تمہیں جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی ہر وقت قابلِ غور ہے کہ تم میں بھی سب آدمی یکساں نہیں کوئی مفلس ہے کوئی مالدار، کوئی ذلیل ہے کوئی عزت دار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مالداری اور عزت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کونسا انسان مفلسی اور ذلت کو اختیار کرتا، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے مفلس کردے جسکو چاہے مالدار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت۔

آخر آیت میں فرمایا لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ، یعنی تمہیں دوسرے لوگوں کی جگہ بٹھانے اور ان کے مال جائداد کا مالک بن جانے اور پھر عزت و دولت کے اعتبار سے مختلف درجات میں رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ تمہاری آنکھیں کھلیں اور اس کا امتحان ہو کہ جو نعمتیں پچھلے لوگوں کو ہٹا کر

تمہارے سپرد کی گئی ہیں، ان میں تمہارا عمل کیا ہوتا ہے، شکر گذاری اور فرمانبرداری کا یا ناشکری اور نافرمانی کا؟

چھٹی آیت میں ان دونوں حالتوں کا انجام اس طرح بتلا دیا: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی آپ کا رب نافرمانوں پر جلد عذاب بھیجنے والا ہے، اور فرمانبرداروں کے لئے غفور و رحیم ہے۔

سورۃ انعام کا شروع حمد سے ہوا اور ختم مغفرت پر، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حمد کی توفیق اور مغفرت سے سرفراز فرما دیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ انعام مکمل ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور اس شان کے ساتھ نازل ہوئی کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ سورۃ انعام قرآن کریم کی افضل و اعلیٰ سورتوں میں سے ہے۔

بعض روایات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کو شفاء دیتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سورۃ الاعراف

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

سُورَةُ الْأَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَّسِتُّ آيَاتٍ وَّأَرْبَعٌ وَّعِشْرُونَ رُكُوعًا

سورۂ اعراف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ

یہ کتاب اتری ہے تیری طرف سو چاہیے کہ تیرے جی میں تنگی نہ ہو اس کے پہنچانے سے

مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ

تاکہ تو ڈرائے اس سے اور نصیحت ہو ایمان والوں کو، چلو اسی پر جو اترا تم پر

اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا

تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے تم بہت

مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا

کم دھیان کرتے ہو، اور کتنی بستیاں ہم نے غارت کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب

بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ

راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے، پھر یہی تھی ان کی پکار جس وقت کہ پہنچا ان پر

بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ

ہمارا عذاب کہ کہنے لگے کہ بیشک ہم ہی تھے گنہگار، سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے

اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ

جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے، پھر ہم ان کو احوال

عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾

سنا دیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے

خلاصۂ مضامینِ سُورۃ

تمام سورۃ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین معاد (آخرت) اور رسالت سے متعلق ہیں، اور یہیں دو آیت کِتٰبٌ اُنْزِلَ میں نبوت کا اور آیت نمبر ۲ میں فَلَنَسْئَلَنَّ میں معاد و آخرت کی تحقیق کا مضمون ہے، اور رکوع چہارم کے نصف سے رکوع ششم کے ختم تک بالکل آخرت کی بحث ہے، پھر رکوع ہشتم سے اکیسویں رکوع تک وہ معاملات مذکور ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے ہوئے ہیں، یہ سب مسئلۂ رسالت سے متعلق ہیں، اور ان قصص میں ساتھ ساتھ منکرین رسالت کی سزاؤں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، تاکہ منکرین موجودین کو عبرت حاصل ہو، اور رکوع بائیس کے نصف سے تیئیس کے ختم تک پھر معاد کی بحث ہے، صرف ساتویں اور بائیسویں رکوع کے شروع میں اور آخری رکوع چوبیس کے آخر حصہ میں توحید پر خاص بحث ہے، باقی بہت کم حصہ سورۃ کا ایسا ہے جس میں جزوی فروعی احکام بمناسبت مقام مذکور ہیں (کذا فی البیان)

خلاصۂ تفسیر

الۗمۗصۗ (اس کے معنی تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے، جس پر امت کو اطلاع نہیں دی گئی بلکہ اس کی جستجو کو بھی منع کیا گیا، کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو (اللہ کی جانب سے) آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ (لوگوں کو عذاب الٰہی سے نافرمانی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں (کسی کے نہ ماننے سے) بالکل تنگی نہ ہونی چاہئے (کیونکہ کسی کے نہ ماننے سے آپ کے اصل مقصد بعثت میں جو کہ حق بات پہونچانے کا ہے کوئی خلل نہیں آتا، پھر آپ کیوں دل تنگ ہوں) اور یہ (قرآن خصوصیت کے ساتھ) نصیحت ہے ایمان والوں کے لئے (آگے عام امت کو خطاب ہے کہ جب قرآن کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہوگیا تو) تم لوگ اس (کتاب) کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (اتباع کتاب یہی کہ اس کی دل سے تصدیق بھی کرو، اور اس پر عمل بھی) اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (جس نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا) دوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو، (جو تم کو گمراہ کرتے ہیں جیسے شیاطین الجن والانس مگر باوجود اس مشفقانہ فہمائش کے) تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو، اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ان کو (یعنی ان کے رہنے والوں کو ان کے کفر و تکذیب کی بناء پر) ہم نے تباہ و برباد کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب (یا تو) رات کے وقت پہونچا (جو سونے اور آرام کرنے کا

وقت ہی یا ایسی حالت میں پہنچا کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے (یعنی کسی کو کسی وقت کسی کو کسی وقت سوتے) جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم اور خطاوار تھے (یعنی ایسے وقت اقرار کیا جب کہ اقرار کا وقت گذر چکا تھا، یہ تو دنیوی عذاب ہوا) پھر اس کے بعد آخرت کے عذاب کا سامان ہوگا کہ قیامت میں ہم ان لوگوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے (کہ تم نے پیغمبروں کا کہنا مانا یا نہیں) اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے (کہ تمہاری امتوں نے تمہارا کہنا مانا یا نہیں؟ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ، اور دونوں سوالوں سے مقصود کفار کو زجر و تنبیہ ہوگی) پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے ہیں خود ہی (سب کے روبرو ان کے اعمال کو) بیان کردیں گے، اور ہم (عمل کے وقت اور جگہ سے) غائب تو نہ تھے۔

معارف و مسائل

پوری سورۃ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین زیادہ تر معاد یعنی آخرت اور نبوت و رسالت کے متعلق ہیں، چنانچہ ابتداء سورۃ سے چھٹے رکوع تک تقریباً مضمون معاد و آخرت کا بیان ہوا ہے، پھر آٹھویں رکوع سے اکیسویں رکوع تک انبیاء سابقین کے حالات اور ان کی امتوں کے واقعات ان کی جزاء و سزا اور ان پر آنے والے عذابوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ، پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی گئی ہے، آپ کو اس کی وجہ سے دل تنگی نہ ہونی چاہئے، دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اور اس کے احکام کی تبلیغ میں آپ کو کسی کا خوف مانع نہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس کو جھٹلا دیں گے اور آپ کو ایذاء دیں گے، (کذا روی عن ابی العالیۃ، مظہری)

اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے اُس نے آپ کی امداد و حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے، اس لئے آپ کیوں دل تنگ ہوں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور احکام اسلام سُن کر بھی جو لوگ مسلمان نہ ہوتے تھے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بوجہ شفقت کے شاق ہوتا تھا، اسی کو دل تنگی سے تعبیر کیا گیا، اور یہ بتلا دیا گیا ہے کہ آپ کا فرض منصبی صرف تبلیغ و دعوت کا ہے، جب آپ نے یہ کام کر لیا تو اب یہ ذمہ داری آپ کی نہیں کہ کون مسلمان ہوا کون

نہیں ہوا، پھر آپ کیوں بلاوجہ دل تنگ ہوں۔

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ، یعنی قیامت کے روز عام امتوں سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنے رسول اور کتابیں بھیجی تھیں، تم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو پیغام اور رسالت دے کر ہم نے آپ کو بھیجا تھا وہ آپ حضرات نے اپنی اپنی امتوں کو پہنچا دیئے یا نہیں، (اخرجہ البیہقی عن ابن عباس، مظہری)

اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں لوگوں سے سوال کیا کہ قیامت کے ....

روز تم لوگوں سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچایا یا نہیں؟ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ، یعنی اس وقت تم اس کے جواب میں کیا کہو گے؟ سب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم یہ کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا، اور امانت خداوندی کا حق ادا کر دیا، اور امت کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، "یعنی یا اللہ آپ گواہ رہیں"۔

اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے دریافت فرمائیں گے کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں کو پہنچا دیا، اور میں جواب میں عرض کروں گا کہ میں نے پہنچا دیا ہے، اس لئے اب تم سب اس کا اہتمام کرو کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبین تک میرا پیغام پہنچا دیں، (مظہری)

غائبین سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے مگر اس مجلس میں حاضر نہ تھے، اور وہ نسلیں بھی جو بعد میں پیدا ہوں گی، ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ آنے والی نسل کو اس پیغام کے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھیں، تاکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام بنی آدم کو یہ پیغام پہنچ جائے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٍالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۤئِكَ

اور تول اس دن ٹھیک ہوگی پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں سو وہی ہیں

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۤئِكَ

نجات پانے والے اور جس کی تولیں ہلکی ہوئیں سو وہی ہیں

الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹

جنھوں نے اپنا نقصان کیا اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط
اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں اور مقرر کر دیں اس میں تمہارے لئے روزیاں
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۚ
تم بہت کم شکر کرتے ہو

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

اور اس روز (یعنی قیامت کے دن اعمال) وحقوق کا وزن واقع ہونے والا ہے (تاکہ عام طور پر ہر ایک کی حالت ظاہر ہو جاوے) پھر (وزن کے بعد) جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مؤمن ہوگا) سو ایسے لوگ (تو) کامیاب ہوں گے (یعنی نجات پائیں گے) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) تو یہ لوگ وہ ہوں گے جنھوں نے اپنا نقصان کرلیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کی حق تلفی کیا کرتے تھے، اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس (زمین) میں سامانِ زندگی پیدا کیا (جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ تم اس کے شکریہ میں فرمانبردار و طاعت شعار ہوتے، لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (مراد اس سے طاعت ہے اور کم اس سے فرمایا کہ تھوڑا بہت نیک کام تو اکثر لوگ کر ہی لیتے ہیں، لیکن بوجہ ایمان نہ ہونے کے وہ قابلِ اعتبار نہیں)

معارف ومسائل

پہلی آیت میں ارشاد ہے وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ، یعنی بھلے بُرے اعمال کا وزن ہونا اس دن حق و صحیح ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکا نہ کھائیں کہ وزن اور تول تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جن میں کوئی بوجھ اور ثقل ہو، انسان کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے ان کا کوئی جسم اور جرم ہی نہیں جس کا تول ہو سکے، پھر اعمال کا وزن کیسے ہوگا، کیونکہ اول تو مالک الملک قادر مطلق ہر چیز پر قادر ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں حق تعالیٰ بھی نہ تول سکیں، اس کے علاوہ آج کل تو دنیا میں وزن تولنے کے لئے نئے نئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن میں نہ ترازو کی ضرورت ہے نہ اس کے پلوں کی اور نہ ڈنڈی کی اور کانٹے کی، آج تو ان نئے آلات کے ذریعہ وہ چیزیں بھی تولی جاتی ہیں جن کے تولنے کا آج سے پہلے کسی کو تصور بھی نہ تھا، ہوا تولی جاتی ہے، برقی رو تولی جاتی

اور سردی گرمی تولی جاتی ہے تھرمامیٹر کی تیزی، مو تو اگر حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے انسانی اعمال کا وزن کرلیں تو
اس میں کیا استبعاد ہے، اس کے علاوہ خالق کائنات کو اس پر بھی قدرت ہے کہ ہمارے اعمال کو کسی
وقت جوہری وجود اور کوئی شکل و صورت عطا فرما دیں۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی
روایات اس پر شاہد ہیں کہ برزخ اور محشر میں انسانی اعمال خاص خاص شکلوں، صورتوں میں آئیں گے
قبر میں انسان کے اعمال صالحہ ایک حسین صورت میں اس کے مونس بنیں گے اور برے اعمال سانپ
بچھو بن کر بیٹھیں گے۔ حدیث میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کی وہ مال ایک زہریلے
سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا، اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں تیرا خزانہ
اسی طرح معتبر احادیث میں ہے کہ میدان حشر میں انسان کے اعمال صالحہ اس کی سواری
بن جائیں گے، اور برے اعمال بوجھ بن کر اس کے سر پر لاد دیے جائیں گے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میدان حشر میں
دو گہرے بادلوں کی شکل میں آکر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے۔

اسی طرح کی بے شمار روایات حدیث مستند اور معتبر طریقوں سے منقول ہیں جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس جہان سے گذر جانے کے بعد ہمارے یہ سارے اعمال نیک و بد خاص خاص شکلیں اور
صورتیں اختیار کرلیں گے، اور ایک جوہری وجود کے ساتھ میدان حشر میں موجود ہوں گے۔

قرآن مجید کے بھی بہت سے ارشادات سے اس کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے: وَوَجَدُوْا
مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا، یعنی ان لوگوں نے دنیا میں جو کچھ عمل کیا تھا اس کو وہاں حاضر و موجود پائیں گے،
ایک آیت میں فرمایا مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔
یعنی جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی نیکی کرے گا تو قیامت میں اس کو دیکھے گا اور ایک ذرہ
کی برابر بھی برائی کرے گا تو قیامت میں اس کو بھی دیکھے گا، ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ انسان
کا عمل جوہری وجود کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا، ان میں بھی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں کہ
اعمال کی جزاء کو موجود پائے گا اور دیکھے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ انسانی اعمال کا تولا جانا کوئی بعید یا مشکل امر نہیں رہتا، مگر چونکہ
تھوڑی سی عقل و فہم کا مالک انسان اس کا عادی ہے کہ سارے امور کو اپنی موجودہ حالت اور
کیفیت ظاہری پر قیاس کرتا ہے، اور سب چیزوں کو اسی کے پیمانہ سے جانچتا ہے، قرآن کریم
نے اس کے اسی حال کو اس طرح بیان فرمایا ہے، يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ
وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ایک ظاہری پہلو
کو جانتے ہیں وہ بھی پورا نہیں، اور آخرت سے بالکل غافل ہیں، ظاہر حیات دنیا میں تو زمین

آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، مگر حقیقی اشیاء سے جن کا صحیح انکشاف آخرت میں ہونے والا ہے یہ لوگ بالکل بے خبر ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں اسی لئے اہتمام کرکے یہ فرمایا گیا وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ، تاکہ یہ ظاہر ہیں انسان آخرت میں وزنِ اعمال سے انکار نہ کر بیٹھے، جو قرآن کریم سے ثابت اور پوری امتِ مسلمہ کا عقیدہ ہے۔

قرآن مجید میں بروزِ قیامت وزنِ اعمال ہونے کا مسئلہ بہت سی آیات میں مختلف عنوانوں سے آیا ہے اور روایاتِ حدیث اس کی تفصیلات میں بے شمار ہیں۔

وزنِ اعمال کے متعلق ایک شبہ و جواب

وزنِ اعمال کے متعلق جو تفصیلی بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں آیا ہے اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ متعدد روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ محشر کی میزانِ عدل میں سب سے بڑا وزن کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ہوگا، جس پلڑے میں یہ کلمہ ہوگا وہ سب پر بھاری رہے گا۔

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے ۹۹ نامۂ اعمال لائے جاویں گے، اور ان میں سے ہر نامۂ اعمال اتنا طویل ہوگا کہ جہاں تک اس کی نظر پہونچتی ہے، اور یہ سب نامۂ اعمال برائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے، اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامہائے اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے یا نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کچھ ظلم کیا ہے اور خلافِ واقعہ کوئی بات لکھ دی ہے؟ وہ اقرار کرے گا کہ اے میرے پروردگار جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے، اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا، ان تمام گناہوں کے مقابلہ میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں تمہارا کلمہ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ لکھا ہوا ہے، وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اتنے بڑے سیاہ نامۂ اعمال کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا، اس وقت ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا، اور ایک پلہ میں وہ سب گناہوں سے بھرے ہوئے نامہائے اعمال رکھے جائیں گے، دوسرے میں یہ کلمۂ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا تو اس کلمہ کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا، اس واقعہ کو بیان کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔ (مظہری)

اور مسند بزار و مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کرکے فرمایا کہ میں تمہیں کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور زمین ایک پلہ میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ دوسرے پلہ میں رکھ دیا جائے تو کلمہ کا پلہ ہی بھاری رہے گا، اسی مضمون کی روایات حضرت سعید ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے معتبر سندوں کے ساتھ کتب حدیث میں منقول ہیں۔ (مظہری)

ان روایات کا مقتضا تو یہ ہے کہ مؤمن کا پلہ ہمیشہ بھاری ہی رہے گا، خواہ وہ کتنے بھی گناہ کرے، لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات اور بہت سی روایاتِ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی حسنات اور سیئات کو تولا جائے گا کسی کی حسنات کا پلہ بھاری ہوگا، کسی کے گناہوں کا، جس کی حسنات کا پلہ بھاری رہے گا وہ نجات پائے گا، جس کی سیئات اور گناہوں کا پلہ بھاری ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔

مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے:۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝

"یعنی ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے جس سے کسی شخص پر ادنیٰ ظلم نہیں ہوگا جو بھی ذرا برابر ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی نے کی ہو وہ سب میزانِ عمل میں رکھی جائے گی، اور ہم حساب کے لئے کافی ہیں۔"

اور سورۂ قارعہ میں ہے:۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔

"یعنی جس کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ عمدہ عیش میں رہے گا، اور جس کا پلہ نیکی کا ہلکا ہوگا اس کا مقام دوزخ ہوگا۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مؤمن کا پلہ حسنات کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مظہری)

اور ابوداؤد میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ اگر کسی بندہ کے فرائض میں

کوئی کمی پائی جائے گی تو رب العالمین کا ارشاد ہوگا کہ دیکھو اس بندہ کے کچھ نوافل بھی ہیں یا نہیں، اگر نوافل موجود ہیں تو فرضوں کی کمی کو نفلوں سے پورا کر دیا جائے گا۔ (مظہری)

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن مسلمان کا پلہ بھی بھاری کبھی ہلکا ہوگا، اس لئے بعض علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا، اول کفر و ایمان کا وزن ہوگا جس کے ذریعہ مؤمن و کافر کا امتیاز کیا جائے گا، اس وزن میں جس کے نامۂ اعمال میں صرف کلمۂ ایمان بھی ہے اس کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کر دیا جائے گا، پھر دوسرا وزن نیک و بد اعمال کا ہوگا، اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی برائیاں بھاری ہوں گی، اور اسی کے مطابق اس کو جزاء و سزاء ملے گی، اس طرح تمام آیات اور روایات کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہو جاتا ہے (بیان القرآن)۔

وزنِ اعمال کس طرح ہوگا بخاری و مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا، اور اس کی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی، فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا، یعنی قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں دیکھنے میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزانِ عدل میں ان کا وزن اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزانِ عمل میں بہت بھاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں، اور وہ کلمے یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ کہنے سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے۔

اور ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حُسنِ خلق کی برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا۔

اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کے لئے کچھ بھاری نہیں، اور میزانِ عمل میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہوں گے، ایک حُسنِ خلق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا، یعنی بلاضرورت کلام نہ کرنا۔

اور امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوفِ خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا، تو جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا تو وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا، بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے گا (مظہری)

ایک حدیث میں ہے کہ میدانِ حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا، جب اُس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پاکر گھبرائے گا کہ، اچانک ایک چیز بادل کی طرح اُٹھ کر آئیگی اور اس کے نیک اعمال کے پلے میں گر جائے گی، اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام و مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا، اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا اُن سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگا دیا گیا (مظہری عن ابن المبارک)

طبرانی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے، اس کی میزانِ عمل میں دو قیراط رکھدی جائیں گی، اور دوسری روایت میں ہے کہ اس قیراط کا وزن اُحد پہاڑ کے برابر ہوگا۔

طبرانی نے بروایت جابرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی میزانِ عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے اور انکی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

اور امام ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انھوں نے علم دین اور احکامِ دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

اس طرح کی روایاتِ حدیث قیامت کے وزنِ اعمال کے سلسلہ میں بہت ہیں، یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص اعمال کی فضیلت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تمام روایاتِ حدیث سے وزنِ اعمال کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے انسان تولے جائیں گے، وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال تولے جائیں گے، اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اعمال مجسّم ہو جائیں گے وہ تولے جائیں گے، امام تفسیر ابن کثیرؒ نے یہ سب روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملات کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، ہم عمل کرنے کے لئے

اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں، صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے اعمال کا وزن ہوگا، نیک اعمال کا پلہ ہلکا رہا تو عذاب کے مستحق ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل و کرم سے یا کسی نبی یا ولی کی شفاعت سے معاف فرمادیں اور عذاب سے نجات ہوجائے۔

جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ بعض لوگوں کو صرف کلمۂ ایمان کی بدولت نجات ہوجائے گی اور سب گناہ اس کے مقابلہ میں معاف ہوجائیں گے، یہ بھی استثنائی صورت سے متعلق ہیں جو عام ضابطہ سے الگ مخصوص فضل وکرم کا مظہر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جن کی تفسیر ابھی بیان ہوئی، گناہگاروں کو میدانِ حشر کی رسوائی اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا تھا، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر فرماکر حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب اس طرح دی گئی ہے کہ ہم نے تم کو زمین پر پوری قدرت اور تصرف مالکانہ عطا کیا، اور پھر اس میں تمہارے سامانِ عیش حاصل کرنے کے ہزاروں راستے کھول دیئے، گویا رب العالمین نے زمین کو انسان کی تمام ضروریات سے لے کر تفریحی سامان تک کا عظیم الشان گودام بنادیا ہے، اور تمام انسانی ضروریات کو اس کے اندر پیدا فرمادیا ہے، اب انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ اس گودام سے اپنی ضروریات کو نکالنے اور ان کے استعمال کرنے کے طریقوں کو سیکھے، انسان کے ہر علم و فن اور سائنس کی ترقی سے نئی ایجادوں کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ خالقِ کائنات کی پیدا کی ہوئی چیزیں جو زمین کے گودام میں محفوظ ہیں، ان کو سلیقہ کے ساتھ نکالے اور صحیح طریقہ سے استعمال کرے، بیوقوف اور بدسلیقہ آدمی جو اس گودام سے نکالنے کا طریقہ نہیں جانتا، یا چیز نکال کر اس کے استعمال کا طریقہ نہیں سمجھتا وہ ان کے منافع سے محروم رہتا ہے، سمجھدار انسان دونوں چیزوں کو سمجھ کر ان سے نفع اٹھاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری ضروریاتِ انسانی حق تعالیٰ نے زمین میں ودیعت رکھ دی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکرگذار رہے مگر وہ غفلت میں پڑکر اپنے خالق و مالک کے احسانات کو بھول جاتا ہے، اور انہی اشیاء میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اسی لئے آخرِ آیت میں بطور شکایت کے ارشاد فرمایا: قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ، یعنی تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو"

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری پھر حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو

لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ ﴿١١﴾

آدم کو پس سجدہ کیا سب نے مگر ابلیس نہ تھا سجدہ والوں میں۔

سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کونسا امر مانع ہے، جب کہ میں (خود) تجھ کو سجدہ کا حکم دے چکا، کہنے لگا وہ امر مانع یہ ہے کہ، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا، اور اس (آدم) کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے (یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے، اور دوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے، تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہے چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا سجدہ کرنا غیر افضل کو نامناسب ہے، ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں اس لئے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا، مگر پہلے مقدمہ کے سوا سارے ہی مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں جزو غالب مٹی کا ہے، باقی مقدماتِ دلیل کا غلط ہونا کھلا ہوا ہے، کیونکہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہوسکتی ہے، کلی طور پر اس کو افضل کہنا دعویٰ بے دلیل ہے، اسی طرح افضل کی فرع اور اولاد کا افضل ہونا بھی مشکوک ہے، ہزاروں واقعات اس کے خلاف سامنے آتے ہیں، کہ نیک کی اولاد بد اور بد کی اولاد نیک ہوجاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے، کہ افضل کو مفضول کے لئے سجدہ نامناسب ہے، بعض اوقات مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہونا مشاہد ہے)

حق تعالیٰ نے فرمایا (جب تو ایسا نافرمان ہے) تو آسمان سے نیچے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے، (خصوصاً آسمان میں رہ کر جہاں سب فرمانبرداروں ہی کا مقام ہے) تو (یہاں سے) نکل (دور ہو) بے شک تو (اس تکبر کی وجہ سے) ذلیلوں میں شمار ہونے لگا، وہ کہنے لگا مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی، وہ کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوینی) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان (کے لیعنی آدم اور اولادِ آدم کی رہزنی کرنے) کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر (جو کہ دین حق ہے جاکر) بیٹھ جاؤں گا پھر ان پر (ہر چہار طرف سے) حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی (یعنی ان کے بہکانے میں کوشش کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑوں گا تاکہ وہ آپ کی عبادت نہ کرنے پاویں) اور (میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، چنانچہ) آپ ان میں سے اکثروں کو (آپ کی نعمتوں کا) احسان ماننے والا نہ پاویں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں (آسمان) سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا (اور تو جو اولادِ آدم کو بہکانے کو کہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے کرے میں سب سے بے نیاز ہوں نہ کسی کے راہ راست پر آنے سے میرا کوئی فائدہ ہے نہ گمراہ ہونے سے کوئی نقصان) جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سے (یعنی ابلیس

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ کا ظہور ہوگا، اس دعاء کی بنا پر ابلیس اس وقت بھی زندہ رہتا، اس لئے اس کی ایک دعاء کو یوم بعث تک کی مہلت کے بجائے یَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ تک کی مہلت سے تبدیل کرکے قبول کیا گیا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ جس وقت سارے عالم پر موت طاری ہوگی، اس وقت ابلیس کو بھی موت آئے گی، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو وہ بھی زندہ ہو جائے گا۔

اس تحقیق سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سے اس دعاء کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر دونوں میں تعارض ہوگیا۔

لیکن حاصل اس تحقیق کا یہ ہے کہ یوم البعث اور یوم الوقت المعلوم دو الگ الگ دن ہیں ابلیس نے یوم البعث تک کی مہلت مانگی تھی وہ پوری قبول نہ ہوئی، اس کو بدل کر یوم الوقت المعلوم تک کی مہلت دی گئی، سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ نے بیان القرآن میں ترجیح اس کو دی ہے کہ درحقیقت یہ دونوں ایک ہی دن ہیں یعنی نفخہ اولیٰ کے وقت سے دخول جنت و نار تک ایک طویل دن ہوگا، اس کے مختلف حصوں میں مختلف واقعات ہوں گے، انہی واقعات مختلفہ کی بنا پر اس دن کی ہر واقعہ کی طرف نسبت کر سکتے ہیں مثلاً اس کو یوم نفخ صور و یوم فنا بھی کہہ سکتے ہیں، اور یوم بعث اور یوم جزاء بھی، اس سے سب اشکالات رفع ہوگئے، فللہ الحمد

کیا کافر کی دعاء بھی قبول ہو سکتی ہے

یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ آیت قرآن وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ، سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کافر کی دعاء قبول نہیں ہوتی مگر اس واقعہ ابلیس اور آیت مذکورہ سے قبولیت دعاء کا اشکال ظاہر ہے، جواب یہ ہے کہ دنیا میں تو کافر کی دعاء بھی قبول ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ ابلیس جیسے اکفر کی دعاء بھی قبول ہوگئی، مگر آخرت میں کافر کی دعاء قبول نہ ہوگی، اور آیت مذکورہ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ آخرت کے متعلق ہے دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

واقعہ آدمؑ و ابلیس کے مختلف الفاظ

قرآن مجید میں یہ قصہ کئی جگہ آیا ہے، اور ہر جگہ اس سوال و جواب کے الفاظ مختلف ہیں، حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے، وجہ یہ ہے کہ اصل واقعہ میں تو سب جگہ ایک ہی مضمون ہے اور نقل الفاظ ہر جگہ بعینہٖ ضروری نہیں، روایت بالمعنیٰ بھی ہو سکتی ہے، اتحادِ مضمون و مفہوم کے بعد اختلافِ الفاظ قابلِ نظر نہیں۔

ابلیس کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ بارگاہِ عزت و جلال میں ایسی بیباکانہ گفتگو کی

رب العزت جل شانہٗ کی بارگاہِ قدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ہیبت و جلال کی بنا پر مجالِ دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہوگئی، علماء نے فرمایا کہ یہ قہرِ الٰہی کا انتہائی سخت مظہر،

۳۴

ذکر ابلیس کے مردود ہونے کے باعث ایک ایک حجاب حائل ہوگیا جس نے اس پر حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کو مستور کردیا اور بے حیائی اس پر مسلط کردی (بیان القرآن ملخصاً وموضحاً)

شیطان کا حملہ انسان پر چار طرف میں محدود نہیں ہے

قرآن عزیز کی مذکورہ آیت میں یہ مذکور ہے کہ ابلیس نے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے لئے چار جانب کو بیان کیا ہے آگے پیچھے، داہنے بائیں، لیکن یہاں درحقیقت کوئی تحدید مقصود نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر سمت سے اور ہر پہلو سے، اس لئے اوپر کی جانب یا نیچے تلے سے گمراہ کرنے کا احتمال اس کے منافی نہیں، اسی طرح حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ شیطان انسان کے بدن میں داخل ہوکر خون کی رگوں کے ذریعہ پورے بدن انسان پر تصرف کرتا ہے، یہ بھی اس کے منافی نہیں۔

آیت مذکورہ میں شیطان کو آسمان سے نکل جانے کا حکم دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، پہلے فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ میں دوسرے قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا میں، غالب یہ ہے کہ پہلا کلام حکم کی تجویز ہے اور دوسرے میں اس کی تنفیذ (بیان القرآن ملخصاً)

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ

اور اے آدم رہ تو اور تیری عورت جنت میں پھر کھاؤ جہاں سے

شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

چاہو اور پاس نہ جاؤ اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے گنہگار۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا

پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھی

مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ

ان کی شرمگاہوں سے اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس درخت سے

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ

مگر اسی لئے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے، اور

قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ

ان کے آگے قسم کھائی کہ میں البتہ تمہارا دوست ہوں، پھر مائل کر لیا ان کو فریب سے

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ

پھر جب چکھا ان دونوں نے درخت کو تو کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی اور لگے جوڑنے

عَلَيْهِمَا مِن وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن

اپنے اوپر بہشت کے پتے اور پکارا ان کو ان کے رب نے کیا میں نے منع نہ کیا تھا

تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٢﴾

تم کو اس درخت سے اور نہ کہہ دیا تھا تم کو کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

بولے وہ دونوں اے رب ہمارے ظلم کیا ہم نے اپنی جان پر اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور

مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ

ہو جاویں گے تباہ فرمایا تم اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمہارے واسطے

فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ

زمین میں ٹھکانا اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک۔ فرمایا اسی میں تم زندہ رہو گے اور

فِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾

اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے

ع ۲ ۱۵ ۹

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے آدم (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بی بی (حوا) جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو دونوں آدمی کھاؤ اور اس درخت کے پاس (بھی) مت جاؤ (یعنی اس کو بھی مت کھاؤ) کبھی ان لوگوں کے شمار میں آجاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ (ان کو وہ ممنوع درخت کھلا کر) ان کا مستور بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے (کیونکہ اس درخت کے کھانے کی یہی تاثیر تھی خواہ بذات یا بوجہ مخالفت کے) اور (وہ وسوسہ یہ تھا کہ دونوں سے) کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں (اس کو کھا کر) کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ (حاصل وسوسہ کا یہ تھا کہ اس درخت کے کھانے سے قوت ملکیت اور دائمی زندگی پیدا ہو جاتی ہے مگر شروع میں آپ کا وجود اس طاقتور غذا کا متحمل نہ تھا، اس لئے منع کر دیا گیا تھا اب آپ کی حالت اور قوت میں ترقی ہو گئی اور آپ کے قویٰ میں اس کا تحمل ہو گیا

تو اب وہ ممانعت باقی نہ رہی اور ان دونوں کے روبرو (اس بات پر) قسم کھا لی کہ یقین جانیے میں آپ دونوں کا دل سے خیرخواہ ہوں تو (ایسی باتیں بنا کر) ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا، (نیچے لانا باعتبار حالت اور رائے کے بھی تھا کہ اپنی رائے عالی کو چھوڑ کر اس دشمن کی رائے پر مائل ہوگئے، اور مقام کے اعتبار سے بھی کہ جنت سے سفل کی طرف آ اترے گئے) پس ان دونوں نے جو درخت کو چکھا (فوراً) دونوں کا مستور بدن ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا، (یعنی جنت کا لباس اتر پڑا اور دونوں شرما گئے، اور بدن چھپانے کے لئے) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور (اس وقت) ان کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، (اس کے بہکانے سے بچتے رہنا) دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ ایسی جستجو و تامل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جاویں گے، حق تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام سے فرمایا کہ (جنت سے نیچے زمین پر) ایسی حالت میں جاؤ کہ تم (اور تمہاری اولاد) باہم بعضے بعض کے دشمن رہوگے، اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ (تجویز کی گئی) ہے اور (اسباب معیشت سے) نفع حاصل کرنا (تجویز ہوا) ہے، ایک وقت خاص تک (یعنی موت کے وقت تک) اور یہ بھی فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے (قیامت کے روز) پھر زندہ ہو کر نکلنا ہے۔

معارف و مسائل

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ آیات مذکورہ میں آیا ہے بعینہ یہی سب واقعہ سورۃ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پوری تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اور اس کے متعلق جس قدر سوالات وشبہات ہوسکتے ہیں ان سب کا تفصیلی جواب اور پوری تشریح مع دیگر فوائد کے سورۃ بقرہ کی تفسیر میں صفحہ ۱۰۸ سے صفحہ ۱۴۴ تک لکھ دیا گیا ہے ضرورت ہو تو وہاں دیکھ لیا جائے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

اے اولاد آدم کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے

وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

آرائش کے کپڑے اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی

لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۲۶﴾ يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا

تاکہ وہ لوگ غور کریں ۔ اے اولاد آدم کی نہ بہکاوے تم کو شیطان جیسا کہ

أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا

اس نے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو جنت سے، اتروائے ان سے ان کے کپڑے تاکہ دکھلائے

سَوْآتِهِمَا ۗ إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ

ان کو شرمگاہیں ان کی وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کی قوم جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے ۔

إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۲۷﴾

ہم نے کر دیا شیطانوں کو رفیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے

خلاصۂ تفسیر

اے اولاد آدم! ایک یہ بات انعام کی ہے کہ ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے ستر (یعنی پردہ والے بدن) کو بھی چھپاتا ہے اور (تمہارے بدن کے لئے) موجب زینت بھی (ہوتا) ہے، اور (اس ظاہری لباس کے علاوہ ایک معنوی لباس بھی تمہارے لئے تجویز کیا ہے جو) تقویٰ (یعنی دینداری) کا لباس (ہے) یہ اس (لباس ظاہری) سے بڑھ کر (ضروری) ہے (کیونکہ اس ظاہری لباس کا مطلوب شرعی ہونا بھی تقویٰ یعنی دینداری کی ایک فرع ہے، اصل مقصود ہر حالت میں لباسِ تقویٰ ہی ہے) یہ (لباس پیدا کرنا) اللہ تعالیٰ کی (فضل و کرم کی) نشانیوں میں سے ہے، تاکہ یہ لوگ (اس نعمت کو) یاد رکھیں (اور یاد رکھ کر اپنے منعم اور محسن کا حقِ اطاعت ادا کریں اور وہ حق اطاعت وہی ہے جس کو ہم نے تقویٰ فرمایا ہے) اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے (کہ خلافِ دین و تقویٰ تم سے کوئی کام کرا دے) جیسا اس نے تمہارے دادا دادی (یعنی آدم و حوا علیہما السلام) کو جنت سے باہر کرا دیا (یعنی ان سے ایسا کام کرا دیا کہ اس کے نتیجہ میں وہ جنت سے باہر ہوگئے، اور باہر بھی) ایسی حالت سے (کرایا) کہ ان کا لباس بھی ان (کے بدن) سے اُتروا دیا تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کے پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے (جو شریعت انسان کیلئے بڑی شرم و رسوائی ہے، غرض شیطان تمہارا قدیم دشمن ہے اس سے بہت ہوشیار رہو اور زیادہ احتیاط اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ) وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو (عادۃً) نہیں دیکھتے ہو (ظاہر ہے کہ ایسا دشمن بہت خطرناک ہے، اس سے بچنے کا پورا اہتمام چاہئے اور یہ اہتمام ایمان کامل اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے وہ اختیار کرلو تو بچاؤ کا

سامان ہو جائے گا، کیونکہ ہم شیطانوں کو اُن کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے (اگر بالکل ایمان نہیں تو پوری طرح شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور اگر ایمان تو ہے مگر کامل نہیں تو اس سے کم درجہ کا تسلط ہوتا ہے، بخلاف مومن کامل کے کہ اس پر شیطان کا بالکل قابو نہیں چلتا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے: إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام و شیطان رجیم کا واقعہ بیان فرمایا گیا تھا جس میں شیطانی اغواء کا پہلا اثر یہ ہوا تھا کہ آدم و حوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور وہ ننگے رہ گئے، اور پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تمہارا لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی قدر کرو، یہاں خطاب صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ پوری اولاد آدم کو ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور ضرورت ہے، جو بلا تمیز کسی مذہب و ملت کے سب ہی اس کے پابند ہیں، پھر اس کی تفصیل **میں تین قسم کے لباسوں کا ذکر فرمایا:**

اوّل: لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ اس میں یواری، مواراۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں چھپانے کے، اور سوآت، سوءۃ کی جمع ہے، ان اعضاءِ انسانی کو سوءۃ کہا جاتا ہے جن کے کھلنے کو انسان فطرۃً برا اور قابلِ شرم سمجھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری صلاح و فلاح کے لئے ایک ایسا لباس اتارا ہے جس سے تم اپنے قابلِ شرم اعضاء کو چھپا سکو۔

اس کے بعد فرمایا وَرِيشًا، ریش اس لباس کو کہا جاتا ہے جو آدمی زینت و جمال کے لئے استعمال کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ صرف ستر چھپانے کے لئے تو مختصر سا لباس کافی ہوتا ہے، مگر ہم نے تمہیں اس سے زیادہ لباس اس لئے عطا کیا کہ تم اس کے ذریعہ زینت و جمال حاصل کر سکو، اور اپنی **ہیئت کو شائستہ بنا سکو۔**

اس جگہ قرآن کریم نے أَنْزَلْنَا یعنی اتارنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے، مراد اس سے عطا کرنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آسمان سے بنا بنایا اترا ہو، جیسے دوسری جگہ أَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ کا لفظ آیا ہے، یعنی ہم نے لوہا اتارا، جو سب کے سامنے زمین سے نکلتا ہے، البتہ دونوں جگہ لفظ أَنْزَلْنَا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس طرح آسمان سے اترنے والی چیزوں میں کسی انسانی تدبیر اور صنعت کو دخل نہیں ہوتا، اسی طرح لباس کا اصل مادہ جو روئی یا اون وغیرہ ہے اس میں کسی انسانی

تدبیر کو ذرہ برابر دخل نہیں، وہ محض قدرتِ حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں، البتہ ان چیزوں سے اپنی راحت و آرام اور مزاج کے مناسب سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس بنالینے میں انسانی صنعت گری کام کرتی ہے، اور وہ صنعت بھی حق تعالیٰ ہی کی بتلائی اور سکھائی ہوئی ہے، اس لئے حقیقت شناس نگاہ میں یہ سب حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے جیسے آسمان سے اُتارا گیا ہو۔

لباس کے دو فائدے

اس میں لباس کے دو فائدے بتلائے گئے، ایک ستر پوشی، دوسرے سردی گرمی سے حفاظت اور آرائشِ بدن، اور پہلے فائدہ کو مقدم کرکے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے، اور یہی اس کا عام جانوروں سے امتیاز ہے کہ جانوروں کا لباس جو قدرتی طور پر اُن کے بدن کا جزء بنا دیا گیا ہے اس کا کام صرف سردی گرمی سے حفاظت یا زینت ہے، ستر پوشی کا اس میں اتنا اہتمام نہیں، البتہ اعضاءِ مخصوصہ کی وضع ان کے بدن میں اس طرح رکھ دی ہے کہ بالکل کھلے نہ رہیں، کہیں اُن پر دُم کا پردہ کہیں دوسری طرح کا۔

اور حضرت آدم و حوّا اور اغواءِ شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لئے ننگا اور قابلِ شرم اعضاء کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر و فساد کا مقدمہ ہے۔

انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اس کو ننگا کرنے کی صورت میں ہوا

اور یہی وجہ ہے کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ انسان کے خلاف اسی راہ سے ہوا کہ اس کا لباس اُتر گیا، اور آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے جب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو تہذیب و شائستگی کا نام لے کر سب سے

آج بھی نئی شیطانی تہذیب انسان کو برہنہ یا نیم برہنہ کرنے میں لگی ہوئی ہے

پہلے اس کو برہنہ یا نیم برہنہ کرکے عام سڑکوں اور گلیوں میں کھڑا کر دیتا ہے، اور شیطان نے جس کا نام ترقی رکھ دیا ہے وہ تو عورت کو شرم و حیاء سے محروم کرکے منظرِ عام پر نیم برہنہ حالت میں لے آنے کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔

ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے

شیطان نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپ کر پہلا حملہ انسان کی ستر پوشی پر کیا تو شریعتِ اسلام جو انسان کی ہر صلاح و فلاح کی کفیل ہے، اس نے ستر پوشی کا اہتمام اتنا کیا کہ ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی کو قرار دیا، نماز، روزہ وغیرہ سب اس کے بعد ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نیا لباس پہنے تو اس کو چاہئے کہ لباس پہننے کے وقت یہ دعاء پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ	تعریف شکر اس ذات کا جس نے مجھے لباس دیا

مَا أُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَأَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ	جس کے ذریعہ میں اپنے ستر کا پردہ کروں اور زینت حاصل کروں"

نیا لباس پہننے کے وقت پڑھے اور فرمایا کہ جو شخص نیا لباس پہننے کے بعد پرانے لباس کو غرباء و مساکین کو صدقہ کر دینے کا ثواب عظیم ... مساکین پر صدقہ کرے تو وہ اپنی موت و حیات کے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور پناہ میں آگیا۔ (ابن کثیر عن مسند احمد)

اس حدیث میں بھی انسان کو لباس پہننے کے وقت انہی دونوں مصلحتوں کو یاد دلایا گیا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی لباس پیدا فرمایا ہے۔

ستر پوشی ابتداءِ آفرینش سے انسان کا فطری عمل ہے، ارتقاء کا جدید فلسفہ باطل ہے: آدم علیہ السلام کے واقعہ اور قرآن کریم کے اس ارشاد سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور پیدائشی ضرورت ہے جو اول انسان کے ساتھ ہے، اور آجکل کے بعض فلاسفروں کا یہ قول سراسر غلط اور بے اصل ہے کہ انسان اول ننگا پھرا کرتا تھا، پھر ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد اس نے لباس ایجاد کیا۔

لباس کی ایک تیسری قسم: ستر پوشی اور راحت و زینت کے لئے دو قسم کے لباسوں کا ذکر فرمانے کے بعد قرآن کریم نے ایک تیسرے لباس کا ذکر اس طرح فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ بعض قراءتوں میں فتحہ یعنی زبر کے ساتھ لِبَاسَ التَّقْوٰى پڑھا گیا ہے، تو اَنْزَلْنَا کے تحت میں داخل ہو کر معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے ایک تیسرا لباس تقویٰ کا اتارا ہے، اور مشہور قراءت کی رو سے معنی یہ ہیں کہ یہ دو لباس تو سب جانتے ہیں، ایک تیسرا لباس تقویٰ کا ہے، اور وہ سب لباسوں سے زیادہ بہتر ہے، لباس تقویٰ سے مراد حضرت ابن عباس اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق عمل صالح اور خوفِ خدا ہے۔ (روح)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ظاہری لباس انسان کے قابل شرم اعضاء کے لئے پردہ اور سردی گرمی سے بچنے اور زینت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح ایک معنوی لباس عمل صالح و خوفِ خدا تعالیٰ کا ہے جو انسان کے اخلاقی عیوب اور کمزوریوں کا پردہ ہے، اور دائمی تکالیف اور مصیبتوں سے نجات کا ذریعہ ہے اسی لئے وہ سب سے بہتر لباس ہے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک بدکار آدمی جس میں خوفِ خدا نہ ہو اور وہ عمل صالح کا پابند نہ ہو وہ کتنے ہی پردوں میں چھپے مگر انجام کار رسوا و ذلیل ہو کر رہتا ہے، جیسا کہ ابن جریر نے بروایت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے جو شخص کوئی بھی عمل لوگوں کی نظروں

سے چھپا کر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کی چادر اوڑھا کر اعلان کر دیتے ہیں، نیک عمل ہو تو نیکی کا اور بُرا عمل ہو تو بُرائی کا، چادر اُڑھانے سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدن پر اوڑھی ہوئی چادر سب کے سامنے ہوتی ہے، انسان کا عمل کتنا ہی پوشیدہ ہو اس کے ثمرات و آثار اس کے چہرے اور بدن پر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتے ہیں، اور اس ارشاد کی سند میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، وَرِيْشًا، وَلِبَاسُ التَّقْوٰى، ذٰلِكَ خَيْرٌ، ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ظاہری لباس کا بھی اصل لباس التقویٰ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہو ظاہری لباس کے ذریعہ ستر پوشی و زینت، ان سب کا اصل مقصد تقویٰ اور خوفِ خدا تعالیٰ ہے، جس کا ظہور اس کے لباس میں بھی اس طرح ہونا چاہئے کہ اس میں پوری ستر پوشی ہو، کہ قابلِ شرم اعضاء کا پورا پردہ ہو، وہ ننگے بھی نہ رہیں اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس میں یہ اعضاء مثل ننگے کے نظر آئیں، نیز اس لباس میں فخر و غرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع کے آثار ہوں اسرافِ بیجا بھی نہ ہو، ضرورت کے موافق کپڑا استعمال کیا جائے، عورتوں کے لئے مردانہ اور مردوں کے لئے زنانہ لباس بھی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہے، لباس میں کسی دوسری قوم کی نقالی بھی نہ ہو جو اپنی قوم و ملت سے غداری اور اعراض کی علامت ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاق و اعمال کی درستی بھی ہو جو لباس کا اصل مقصد ہے آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ، یعنی انسان کو لباس کی یہ تینوں قسمیں عطا فرمانا اللہ جل شانہٗ کی آیاتِ قدرت میں سے ہے، تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

دوسری آیت میں پھر تمام اولادِ آدم کو خطاب کر کے تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنے ہر حال اور ہر کام میں مکرِ شیطانی سے بچتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پھر کسی فتنہ میں مبتلا کر دے، جیسا تمہارے ماں باپ حضرت آدم و حوا کو اس نے جنت سے نکلوایا اور ان کا لباس اُتار کر ان سے ستر کھونے کا سبب بنا، وہ تمہارا قدیم دشمن ہے، اس کی دشمنی کا ہمیشہ ہر وقت خیال رکھو۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ، اس میں لفظ قبیل کے معنی جماعت اور جتھے کے ہیں، جو جماعت ایک خاندان کی شریک ہو اس کو قبیلہ کہتے ہیں، اور عام جماعتوں کو قبیل کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ شیطان تمہارا ایسا دشمن ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو تم کو دیکھتے ہیں، تم ان کو نہیں دیکھتے، اس لئے اس کا مکر و فریب تم پر چل جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔

لیکن دوسری آیات میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے اور مکرِ شیطانی سے ہوشیار رہنے والے ہیں، ان کے لئے شیطان کا جال نہایت کمزور ہے۔

اس آیت کے آخر میں بھی جو یہ فرمایا کہ ہم نے شیطانوں کو ان کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان والوں کے لئے اس کے جال سے بچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

بعض حضرات سلف نے فرمایا کہ یہ دشمن جو ہمیں دیکھتا ہے اور ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے اس کا علاج ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیں جو ان شیطانوں کو اور ان کی ہر نقل و حرکت کو دیکھتا ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اور یہ ارشاد کہ انسان شیاطین کو نہیں دیکھ سکتے یہ عادت اور عام عادت کے اعتبار سے ہے خرق عادت کے طور پر کوئی انسان کبھی ان کو دیکھ لے یہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کا آنا اور سوالات کرنا اور اسلام قبول کرنا وغیرہ صحیح روایات حدیث میں مذکور ہے (روح)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا

اور جب کرتے ہیں کوئی برا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اسی طرح کرتے اپنے باپ دادوں کو اور اللہ نے

بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا

بھی ہم کو یہی حکم کیا ہے تو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا برے کام کا کیوں لگاتے ہو اللہ کے ذمہ وہ باتیں

لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ

جو تم کو معلوم نہیں، تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا، اور سیدھے کرو اپنے منہ

عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ

ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو خالص اس کے فرمانبردار ہو کر، جیسا تم کو پہلے پیدا کیا

تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ

دوسری بار بھی پیدا ہوگے، ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی

إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ

انہوں نے بنایا شیطانوں کو رفیق اللہ کو چھوڑ کر اور سمجھتے ہیں کہ

أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾ يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ

وہ ہدایت پر ہیں، اے اولاد آدم کی لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے

مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾

وقت اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بے جا خرچ کرنے والے

ع ٣ / ١٠

خلاصۂ تفسیر

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں (یعنی ایسا کام جس کی برائی کھلی ہوئی ہو اور انسانی فطرت اس کو برا سمجھتی ہو جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا) تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی بتلایا ہے (آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جاہلانہ استدلال کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش کام کی کبھی تعلیم نہیں دیتا، کیا (تم یہ دعویٰ کر کے) خدا کے ذمہ ایسی باتیں لگاتے ہو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم نے جن فحش و غلط کاموں کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے وہ تو غلط ہے، اب وہ بات سنو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے واقعی طور پر دیا ہے وہ یہ ہے کہ) میرے رب نے تو حکم دیا ہے انصاف کرنے کا، اور یہ کہ تم ہر سجدہ (یعنی عبادت) کے وقت اپنا رُخ سیدھا (اللہ کی طرف) رکھا کرو (یعنی کسی مخلوق کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو) اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو (اس مختصر جملہ میں تمام امورات شرعیہ اجمالاً آ گئے، قسط میں حقوق العباد، قیموا میں اعمال و طاعات، مخلصین میں عقائد) تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم (ایک وقت) پھر دوبارہ پیدا ہو گے بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا میں) ہدایت کی ہے (ان کو اس وقت جزا ملے گی) اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے (ان کو سزا ملے گی) ان لوگوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور باوجود اس کے پھر اپنی نسبت) خیال رکھتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر ہیں، اے اولادِ آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت (نماز کے لئے ہو یا طواف کے لئے) اپنا لباس پہن لیا کرو اور (جس طرح ترکِ لباس گناہ تھا، ایسے ہی حلال چیزوں کے کھانے پینے کو ناجائز سمجھنا بھی بڑا گناہ ہے، اس لئے حلال چیزوں کو) خوب کھاؤ اور پیو اور حدِ شرعی سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو۔

معارف و مسائل

اسلام سے پہلے جاہلیتِ عرب کے زمانہ میں شیطان نے لوگوں کو جن شرمناک اور بیہودہ رسموں میں مبتلا کر رکھا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قریش کے سوا کوئی شخص بیت اللہ کا طواف اپنے کپڑوں میں نہیں کر سکتا تھا، بلکہ یا وہ کسی قریشی سے اس کا لباس عاریت کے طور پر مانگے یا پھر ننگا طواف کرے۔

اور ظاہر ہے کہ سارے عرب کے لوگوں کو قریش کے لوگ کہاں تک کپڑے دے سکتے تھے، اس لئے ہوتا یہی تھا کہ یہ لوگ اکثر ننگے ہی طواف کرتے تھے، مرد بھی عورتیں بھی، اور عورتیں عموماً رات کے اندھیر میں طواف کرتی تھیں، اور اپنے اس فعل کی شیطانی حکمت یہ بیان کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں انہی کپڑوں میں بیت اللہ کے گرد طواف کرنا خلاف ادب ہے، اور یہ عقل کے اندھے یہ نہ سمجھتے تھے کہ ننگے طواف کرنا اس سے زیادہ خلاف ادب اور خلافِ انسانیت ہے) صرف قریش کا قبیلہ بوجہ خدامِ حرم ہونے کے اس عُریانی کے قانون سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

آیت مذکورہ میں پہلی آیت اسی بیہودہ رسم کو مٹانے اور اس کی خرابی کو بتلانے کے لئے نازل ہوئی ہے، اس آیت میں فرمایا کہ جب یہ لوگ کوئی فحش کام کرتے تھے تو جو لوگ ان کو اس فحش کام سے منع کرتے تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہمارے باپ دادا اور بڑے بوڑھے یونہی کرتے آئے ہیں، ان کے طریقہ کو چھوڑنا عار اور شرم کی بات ہے، اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ (ابن کثیر)

اس آیت میں فحش کام سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک یہی ننگا طواف ہے، اور اصل میں فحش، فحشاء اور فاحشہ ایسے بُرے کام کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی انتہا کو پہونچی ہوئی ہو، اور عقل و فہم اور فطرت سلیمہ کے نزدیک بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہو (مظہری) اور اس درجہ میں حُسن و قبح کا عقلی ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے (روح)

جاہل لوگوں نے اس بیہودہ رسم کے جواز کے لئے دو دلیلیں پیش کیں، ایک تقلیدِ آبائی کہ باپ دادوں کے طریقہ کو قائم رکھنا ہی خیر اور بھلائی ہے، اس کا جواب تو بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا کہ جاہل باپ دادوں کا اتباع کوئی معقول چیز نہیں، ذرا سی عقل و ہوش رکھنے والا انسان بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، کہ کسی طریقہ کے جواز کی یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ باپ دادا ایسا کرتے تھے، کیونکہ اگر کسی طریقہ اور کسی عمل کی صحت اور جواز کے لئے باپ دادوں کا طریقہ ہونا کافی سمجھا جاوے تو دنیا میں مختلف لوگوں کے باپ دادا مختلف اور متضاد طریقوں پر عمل کیا کرتے تھے اس دلیل سے تو دنیا بھر کے سارے گمراہ کن طریقے جائز اور صحیح قرار پاتے ہیں، غرض ان جاہلوں کی یہ دلیل کچھ قابلِ توجہ نہ تھی، اس لئے یہاں قرآن کریم نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور دوسری روایت میں اس کا بھی جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر باپ دادا کوئی جہالت کا کام کریں تو وہ کس طرح قابلِ تقلید و اتباع ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل ان لوگوں نے اپنے ننگے طواف کے جواز پر یہ پیش کی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہی ایسا حکم دیا ہے، یہ سرسر بہتان اور حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف اس کی طرف ایک غلط

حکم کو منسوب کرتا ہے، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا:
قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ، یعنی آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی فحش کام کا حکم نہیں دیا کرتے، کیونکہ ایسا حکم دینا حکمت اور شان قدوسی کے خلاف ہے، پھر ان لوگوں کے اس بہتان وافتراء علی اللہ اور باطل خیال کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ان لوگوں کو اس طرح تنبیہ کی گئی، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی چیزوں کو منسوب کرتے ہو جن کا تم کو علم نہیں، یعنی جس کے یقین کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی حجت نہیں، اور ظاہر ہے کہ بلا تحقیق کسی شخص کی طرف بھی کسی کام کو منسوب کرنا انتہائی دلیری اور ظلم ہے تو اللہ جل شانہ کی طرف کسی نقل کی ایسی غلط نسبت کرنا کتنا بڑا جرم اور ظلم ہوگا، حضرات مجتہدین آیاتِ قرآنی سے بذریعہ اجتہاد جو احکام نکالتے اور بیان کرتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ ان کا استخراج قرآن کے الفاظ و ارشادات سے ایک حجت کے ماتحت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ننگے طواف کے جائز کرنے کی غلط نسبت کرنے والے جاہلوں سے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ قسط کا حکم دیا کرتے ہیں، قسط کے اصلی معنی انصاف واعتدال کے ہیں، اور اس جگہ قسط سے مراد وہ عمل ہے جو افراط وتفریط سے خالی ہو یعنی نہ اس میں کوتاہی ہو اور نہ مقررہ حد سے تجاوز ہو، جیسا کہ تمام احکام شرعیہ کا یہی حال ہے، اس لئے لفظ قسط کے مفہوم میں تمام عبادات اور طاعات اور عام احکام شرعیہ داخل ہیں (روح المعانی)

اس آیت میں قسط یعنی انصاف واعتدال کا حکم بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی گمراہی اور بے راہی کے مناسب احکام شرعیہ سے دو حکم خصوصیت کے ساتھ بیان فرمائے گئے، ایک اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ، اور دوسرا وَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ، پہلا حکم انسان کے ظاہری افعال سے متعلق ہے، اور دوسرا اس کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتا ہے، پہلے حکم میں لفظ مسجد اکثر مفسرین کے نزدیک بمعنی سجدہ وعبادت آیا ہے، اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت ونماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھا کرو، اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا ٹھیک قبلہ کی طرف کرنے کا اہتمام کرو، اور رُخ سیدھا کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے ہر قول وفعل اور ہر عمل میں اپنا رُخ اپنے رب کے حکم کے تابع رکھو، اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پاوے، اس معنی کے لحاظ سے یہ حکم صرف نماز کے لئے خاص نہیں، بلکہ تمام عبادات ومعاملات پر حاوی ہے۔

اور دوسرے حکم کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح پکارو کہ عبادت خالص اسی کی ہو،

اس میں کسی دوسرے کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو، یہاں تک کہ شرک خفی یعنی ریاء و نمود سے بھی پاک ہو۔

ان دونوں حکموں کو ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو احکام شریعت کے مطابق درست کرے، نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کے کافی ہے، اور نہ محض خلوص باطنی بغیر ظاہری اتباع شریعت کے کافی ہو سکتا ہے، بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق درست کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص رکھے، اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوتی ہے جو شریعت و طریقت کو مختلف طریقے سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے گو شریعت کے خلاف کرتے رہیں یہ کھلی گمراہی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں اول پیدا فرمایا تھا اسی طرح قیامت کے روز دوبارہ تمہیں زندہ کر کے کھڑا کر دیں گے، اس کی قدرت کاملہ کے آگے یہ کوئی مشکل چیز نہیں، اور شاید اسی آسانی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے يُعِيْدُكُمْ کے بجائے تَعُوْدُوْنَ فرمایا کہ دوبارہ پیدا ہونے کے لئے کسی خاص عمل و سعی کی ضرورت نہیں (روح)

اس جملہ کو اس جگہ لانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ احکام شرعیہ پر پوری طرح قائم رہنا انسان کے لئے آسان ہو جائے، کیونکہ عالم آخرت اور قیامت اور اس میں اچھے برے اعمال کی جزاء و سزا کا تصور ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے ہر مشکل کو آسان اور ہر تکلیف کو راحت بنا سکتی ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ جب تک انسان پر یہ خوف مسلط نہ ہو نہ کوئی وعظ و پند اس کو سیدھا کر سکتا ہے، اور نہ کسی قانون کی پابندی اس کو جرائم سے روک سکتی ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق اور دوست بنا لیا، اور یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ راہ پر ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ اللہ جل شانہ کی ہدایت عام تھی مگر ان لوگوں نے اس ہدایت سے منہ موڑا اور شیطانوں کا اتباع کرنے لگے، اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ اپنی بیماری ہی کو صحت اور گمراہی کو ہدایت خیال کرنے لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ سے جہل اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں، ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کرے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش و حواس اور عقل و دانش اسی لئے دی ہے کہ وہ اس سے

کام لے کر کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کو پہچاننے، پھر اس کو صرف اس کی عقل و دانش پر نہیں چھوڑا اپنے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعے صحیح و غلط اور حق و باطل کو خوب کھول کر واضح کر دیا۔

اگر کسی شخص کو اس پر شبہ ہو کہ ایک شخص جو واقع میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہو گو غلطی پر ہو پھر اس پر کیا الزام ہے، وہ معذور ہونا چاہئے، کیونکہ اس کو اپنی غلطی کی اطلاع ہی نہیں، جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و ہوش پھر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم عطا فرما دی ہیں جن کے ذریعے کم از کم اس کو اپنے اختیار کئے ہوئے طریقہ کے خلاف کا احتمال اور تردد ضرور ہو جانا چاہئے، اب اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، اور جس غلط طریقہ کو اختیار کر لیا تھا اس پر جما رہا۔

البتہ جو شخص طلب حق میں اپنی پوری کوشش خرچ کر چکا، اور پھر بھی اس کی نظر صحیح راستہ اور حق بات کی طرف نہ پہنچی وہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور ہو، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں فرمایا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: "اے اولاد آدم، تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے، زمانۂ جاہلیت کے عرب جیسا کہ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرنے کو صحیح عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے اسی طرح ان میں یہ رسم بھی تھی کہ ایام حج میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، صرف اتنا کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے خصوصاً گھی، دودھ اور پاکیزہ غذاؤں سے بالکل اجتناب کرتے تھے (ابن جریر)

ان کے اس بیہودہ طریقۂ کار کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلایا کہ ننگے ہو کر طواف کرنا بے حیائی اور بیت اللہ کی بے ادبی ہے اس سے اجتناب کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی پاکیزہ غذاؤں سے بلا وجہ اجتناب کرنا بھی کوئی دین کی بات نہیں بلکہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا گستاخی اور عبادت میں حد سے تجاوز کرنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، اس لئے ایام حج میں خوب کھاؤ پیو، ہاں اسراف نہ کرو، حلال غذاؤں سے بالکل اجتناب کرنا بھی اسراف میں داخل ہے، اور حج کے اصل مقاصد اور ذکر اللہ سے غافل ہو کر کھانے پینے ہی میں مشغول رہنا بھی اسراف میں داخل ہے۔

یہ آیت اگرچہ جاہلیت عرب کی ایک خاص رسم عریانی کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی ہے جس کو وہ طواف کے وقت بیت اللہ کی تعظیم کے نام پر کیا کرتے تھے، لیکن ائمہ تفسیر اور

فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی حکم کے کسی خاص واقعہ میں نازل ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے، جو جو چیزیں ان الفاظ کے عموم میں شامل ہوتی ہیں سب پر یہی حکم عائد ہوتا ہے۔

نماز میں ستر پوشی فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی

اسی لئے اس آیت سے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے کئی احکام نکالے ہیں، اول یہ کہ اس میں جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے، اسی طرح ننگے نماز پڑھنا بھی حرام اور باطل ہے، کیونکہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلطَّوَافُ بِالْبَيْتِ صَلٰوةٌ، اس کے علاوہ خود اسی آیت میں جبکہ لفظ مسجد سے جمہور مفسرین کے نزدیک مراد سجدہ ہے، تو بحالت سجدہ عریانی کی ممانعت خود آیت میں صراحت سے آجاتی ہے اور جب سجدہ میں ممنوع ہوئی تو رکوع اور قیام و قعود اور نماز کے تمام افعال میں اس کا لازم ہونا ظاہر ہے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نے اس کو اور بھی واضح کر دیا، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں (ترمذی)۔

اور نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں بھی ستر پوشی کا فرض ہونا دوسری آیات و روایات سے ثابت ہے جن میں سے ایک آیت اسی سورت میں گذر چکی ہے، يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ

خلاصہ یہ ہے کہ ستر پوشی انسان کے لئے پہلا انسانی اور اسلامی فرض ہے جو ہر حالت میں اس پر لازم ہے نماز اور طواف میں بدرجۂ اولیٰ فرض ہے۔

نماز کے لئے اچھا لباس

دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ہے کہ لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ نماز میں افضل و اولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق لباس زینت اختیار کیا جائے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

معلوم ہوا کہ اس آیت سے جیسے کہ نماز میں ستر پوشی کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح بقدر استطاعت صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت و استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔

نماز میں لباس کے متعلق چند مسائل

تیسرا مسئلہ اس جگہ یہ ہے کہ ستر جس کا چھپانا انسان پر ہر حال میں اور خصوصاً نماز و طواف میں فرض ہے، اس کی حد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اجمالاً ستر پوشی کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کیا، آپ نے تفصیل کے

کیونکہ وہ جسم کو خراب کرتا ہے، بیماریاں پیدا کرتا ہے، عمل میں سستی پیدا کرتا ہے، بلکہ کھانے پینے میں میانہ روی اختیار کرو کیونکہ وہ جسم کی صحت کے لئے بھی مفید ہے، اور اسراف سے دور ہے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فربہ جسم عالم کو پسند نہیں فرماتے، مراد یہ ہے کہ جو زیادہ کھانے سے اختیاری طور پر فربہ ہوگیا ہو، اور فرمایا کہ آدمی اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو دین پر ترجیح نہ دینے لگے۔ (روح عن ابی نعیم)

سلف صالحین نے اس بات کو اسراف میں داخل قرار دیا ہے کہ آدمی ہر وقت کھانے پینے ہی کے دھندے میں مشغول رہے یا اس کو دوسرے اہم کاموں میں مقدم جانے، جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا مقصد زندگی یہی کھانا پینا ہے، انہی حضرات کا مشہور مقولہ ہے کہ "خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن"، یعنی کھانا اس لئے ہے کہ زندگی قائم رہے یہ نہیں کہ زندگی کھانے پینے ہی کے لئے ہو۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی اسراف میں داخل فرمایا ہے کہ جب کسی چیز کو جی چاہے اس کو ضرور ہی پورا کرے، اِنَّ مِنَ الْاِسْرَافِ اَنْ تَاْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ (ابن ماجہ عن انس)

اور بیہقی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کو ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ دن میں دو مرتبہ کھانا تناول فرمایا تو ارشاد فرمایا اے عائشہ کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ تمھارا شغل صرف کھانا ہی رہ جائے۔

اور میانہ روی کا یہ حکم جو کھانے پینے کے متعلق اس آیت میں مذکور ہے صرف کھانے پینے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پہننے اور رہنے سہنے کے ہر کام میں درمیانی کیفیت پسند و محبوب ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ پیو اور جو چاہو پہنو، صرف دو باتوں سے بچو، ایک یہ کہ اس میں اسراف یعنی قدر ضرورت سے زیادتی نہ ہو، دوسرے فخر و غرور نہ ہو۔

ایک آیت سے آٹھ مسائل خلاصہ یہ ہے کہ وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کے کلمات سے آٹھ مسائل شرعیہ نکلے، اول یہ کہ کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے، دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کی حرمت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز حلال ہے، تیسرے یہ کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع کر دیا ان کا استعمال اسراف اور ناجائز ہے، چوتھے یہ کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں ان کو حرام سمجھنا بھی اسراف اور سخت گناہ ہے، پانچویں یہ کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اور کھانا ناجائز ہے، چھٹے یہ کہ اتنا کم کھانا جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے درست نہیں ہے، ساتویں یہ کہ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بھی اسراف ہے، آٹھویں یہ بھی اسراف

جس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ چار سو گنی کی قیمت کی چادر استعمال فرمائی۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ ہمیشہ نفیس اور عمدہ لباس استعمال فرماتے تھے، ان کے لئے تو کسی صاحب نے سال بھر کے لئے تین سو ساٹھ جوڑوں کا سالانہ انتظام اپنے ذمہ لیا ہوا تھا، اور جو جوڑا امامؒ کے بدن پر ایک مرتبہ پہونچ گیا تھا دوبارہ استعمال نہ ہوتا تھا، کیونکہ صرف ایک روز استعمال کر کے کسی غریب طالب علم کو دیدیتے تھے۔

وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنی نعمت اور وسعت عطا فرما دیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے لباس وغیرہ میں دیکھا جائے، اس لئے کہ اظہار نعمت بھی ایک قسم کا شکر ہے، اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پھٹے پرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے۔

ہاں ضروری بات یہ ہے کہ دو چیزوں سے بچے، ایک ریاء و نمود، دوسرے فخر و غرور، یعنی محض لوگوں کو دکھلانے اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے لباس فاخرہ استعمال نہ کرے، اور ظاہر ہے کہ سلف صالحین ان دونوں چیزوں سے بری تھے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین میں حضرت فاروق اعظمؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے جو عام حالات میں معمولی قسم کا لباس یا پیوند زدہ کپڑے استعمال کرنا منقول ہے اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ اکثر جو کچھ مال آتا وہ فقراء مساکین اور دینی کاموں میں خرچ کر ڈالتے تھے، اپنے لئے باقی ہی نہ رہتا تھا جس سے عمدہ لباس آسکے، دوسرے یہ کہ آپ مقتدائے خلائق تھے اس سادہ و سستی پوشاک کے رکھنے سے دوسرے امراء کو اس کی تلقین کرنا تھا، تاکہ عام غرباء و فقراء پر ان کی مالی حیثیت کا رعب نہ پڑے۔

اسی طرح صوفیائے کرام جو مبتدیوں کو لباس زینت اور عمدہ لذیذ کھانوں سے روکتے ہیں، اس کا منشاء بھی یہ نہیں کہ ان چیزوں کو دائمی طور پر ترک کرنا کوئی کار ثواب ہے، بلکہ نفس کی خواہشات پر قابو پانے کے لئے ابتداء سلوک میں ایسے مجاہدے بطور علاج و دوا کے کر دیئے جاتے ہیں، اور جب وہ اس درجہ پر پہونچ جائے کہ خواہشات نفسانی پر قابو ہو لے کہ اس کا نفس اس کو حرام و ناجائز کی طرف نہ کھینچ سکے تو اس وقت تمام صوفیائے کرام عام سلف صالحین کی طرح عمدہ لباس اور لذیذ کھانوں کو استعمال کرتے ہیں، اور اس وقت یہ طیبات رزق ان کے لئے معرفت خداوندی اور درجات قرب میں رکاوٹ کے بجائے اضافہ اور تقرب کا ذریعہ بنتے ہیں۔

خوراک و پوشاک میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خوراک و پوشاک کے بارے میں خلاصہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کا یہ ہے کہ ان چیزوں میں تکلف نہ کرے، جیسی پوشاک و خوراک

جو کوئی رنج و مصیبت، تینوں مفہوم آیت کے اس جملہ میں کھپ سکتے ہیں، اور اسی لئے مفسرین صحابہ و تابعین نے ان کو اختیار کیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ یعنی ہم اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح تفصیل و وضاحت سے بیان کیا کرتے ہیں، جس سے ہر اہل وجدان سمجھ سکے، اس آیت میں لوگوں کے غلو اور اس جاہلانہ خیال کی تردید بھی ہے کہ اچھا لباس اور اچھا کھانا ترک کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں کچھ ان چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے ترک کرنے ہی سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ دوہری جہالت میں مبتلا ہیں، ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی عمدہ اور نفیس چیزوں کو بلا وجہ حرام کرکے ان نعمتوں سے محروم ہوگئے، اور دوسری طرف جو چیزیں حقیقۃً حرام تھیں، اور جن کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور آخرت کا عذاب ان پر آنے والا ہے، ان کے استعمال میں مبتلا ہو کر آخرت کا وبال خرید لیا، اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں جگہ نعمتوں سے محروم ہو کر خسرانِ دنیا و آخرت کا مورد بن گئے، ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

یعنی جن چیزوں کو تم نے خود بخود حرام ٹھہرا لیا وہ تو حرام نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے تمام بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوئے ہوں یا چھپے ہوئے، اور ہر گناہ کے کام کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدون دلیل کسی کو شریک ٹھہرانے کو اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

اس تفسیر میں لفظ اثم کے تحت وہ تمام گناہ آگئے ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، اور بغی میں وہ گناہ جن کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو، اور شرک اور افتراء علی اللہ یہ عقیدہ کا گناہِ عظیم ظاہر ہی ہے۔

اس خاص تفصیل کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا کہ اس میں تقریباً ہر طرح کے محرمات اور گناہ پورے آگئے، خواہ عقیدہ کے گناہ ہوں یا عمل کے، اور پھر ذاتی عمل کے گناہ ہوں یا لوگوں کے حقوق، اور اس لئے بھی کہ اہل جاہلیت ان سب جرائم اور محرمات میں مبتلا تھے، اس طرح ان کی دوسری جہالت کو کھول دیا گیا، کہ حلال چیزوں سے پرہیز کرتے اور حرام کے استعمال سے نہیں جھجکتے۔

اور دین میں غلو اور نو ایجاد بدعات کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ جو شخص ان چیزوں میں مبتلا ہوتے ہیں

وہ دین کی اصل اور اہم ضروریات سے عادۃً غافل ہوجاتے ہیں، اس لئے غلو فی الدین اور بدعت کا نقصان دوہرا ہوتا ہے، ایک خود غلو و بدعت میں مبتلا ہو کر گناہگار، دوسرے اس کے مقابل صحیح دین اور سنت کے طریقوں سے محروم ہونا، نعوذ باللہ منہ۔

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں مشرکین و مجرمین کے دو غلط کاموں کا ذکر تھا، ایک حلال کو حرام ٹھیرانا، دوسرے حرام کو حلال قرار دینا، تیسری آیت میں ان کے انجام بد اور آخرت کی سزا و عذاب کا بیان کرکے ارشاد فرمایا: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ، یعنی یہ مجرمین جو اپنی سرکشی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہے ہیں اور دنیا میں بظاہر ان پر کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا، اس عادۃ اللہ سے غافل نہ رہیں کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو اپنی رحمت سے ڈھیل دیتے رہتے ہیں کہ کسی وقت بھی یہ اپنی سرکشیوں سے باز آجائیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اس ڈھیل اور مہلت کی ایک میعاد معین ہوتی ہے جب وہ میعاد آپہنچتی ہے تو ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی، اور یہ عذاب میں پکڑ لئے جاتے ہیں، کبھی دنیا ہی میں کوئی عذاب آجاتا ہے، اور اگر دنیا میں عذاب نہ آیا تو مرتے ہی عذاب میں داخل ہوجاتے ہیں۔

اس آیت میں میعاد معین سے آگے پیچھے نہ ہونے کا جو ذکر ہے یہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہمارے عرف میں خریدار دکاندار سے کہتا ہے کہ قیمت میں کچھ کمی زیادتی ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ قیمت کی زیادتی اس کو مطلوب نہیں صرف کمی کو پوچھنا ہے مگر تبعاً اس کے ساتھ زیادتی کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں اصل مقصد تو یہ ہے کہ میعاد معین کے بعد تاخیر نہیں ہوگی، اور تقدیم کا ذکر تاخیر کے ساتھ بطور محاورہ عوام کے کردیا گیا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ

اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں کے کہ سنادیں تم کو آیتیں میری تو جو کوئی

اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ

ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جنھوں نے جھٹلایا

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے، وہی ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ

ہمیشہ رہیں گے، پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا، یا

كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى

جھٹلاوے اس کے حکموں کو، وہ لوگ ہیں کہ ملے گا ان کو جو ان کا حصہ لکھا ہوا ہے کتاب میں، یہاں تک

اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ

کہ جب پہنچیں ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کو تو کہیں کہاں ہیں وہ جن کو تم پکارا کرتے تھے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا

سوائے اللہ کے، بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کریں گے اپنے اوپر کہ بے شک وہ

كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ

کافر تھے۔ فرمائے گا داخل ہو جاؤ ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں جنّ اور

وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا

آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر، جب داخل ہوگی ایک امت تو لعنت کرے گی دوسری امت کو یہاں تک کہ

فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا

جب گر چکیں گے اس میں سارے، تو کہیں گے ان کے پچھلے پہلوں کو اے رب ہمارے ہم کو انہی نے گمراہ کیا،

فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا

سو تو ان کو دے دونا عذاب آگ کا، فرمائے گا کہ دونوں کو دُگنا ہے لیکن تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا

نہیں جانتے، اور کہیں گے ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو ہم پر

مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

بڑائی، اب چکھو عذاب بسبب اپنی کمائی کے

ع ۴ ۸ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

(ہم نے عالم ارواح ہی میں کہہ دیا تھا) اے اولادِ آدم کی، اگر تمہارے پاس پیغمبر آویں جو تم ہی میں سے ہوں گے جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے سو (ان کے آنے پر) جو شخص (تم میں ان آیات کی تکذیب سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں) نہ کچھ اندیشہ (کی بات واقع ہونے والی) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ (نہ صرف یہ کہ) ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتا دیں گے اور ان (کے قبول کرنے) سے

تکبر کریں گے وہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (جب تکذیب کرنے والوں کا مستحق وعید شدید ہونا جملۃً معلوم ہوگیا سواب تفصیل سنو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی نہ ہو اس کو خدا کی کہی ہوئی کہے) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلاوے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی ہو اس کو بے کہی بتلاوے) ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ (رزق و عمر) ہے وہ تو ان کو (دنیا میں) مل جاوے گا، (لیکن آخرت میں مصیبت ہی مصیبت ہے) یہاں تک کہ (دوزخ میں مرنے کے وقت تو ان کی یہ حالت ہوگی کہ) جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آویں گے تو (ان سے) کہیں گے کہ (کہو) وہ کہاں گئے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (اب اس مصیبت میں کیوں نہیں کام آتے) وہ کافر کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہوگئے (واقعی کوئی کام نہ آیا) اور (اس وقت) اپنے کافر ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے (لیکن اس وقت کا اقرار محض بیکار ہوگا اور بعض آیات میں ایسے ہی سوال وجواب کا وقوع قیامت میں بھی مذکور ہے سو دونوں موقعوں پر ہونا ممکن ہے اور قیامت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ فرماوے گا کہ جو فرقے (کفار کے) تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ (چنانچہ آگے پیچھے سب کفار اس میں داخل ہوں گے، اور یہ کیفیت واقع ہوگی کہ) جس وقت بھی کوئی جماعت (کفار کی) داخل (دوزخ) ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو بھی (جو انہیں جیسے کافر ہوں گے اور ان سے پہلے دوزخ میں جا چکے ہوں گے) لعنت کرے گی (یعنی باہم ہمدردی نہ ہوگی بلکہ بوجہ انکشاف حقائق کے ہر شخص دوسرے کو بری نظر سے دیکھے گا اور برا کہے گا) یہاں تک کہ جب اس (دوزخ) میں سب جمع ہوجاویں گے تو (اس وقت) پچھلے لوگ (جو بعد میں داخل ہوئے ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کفر میں دوسروں کے تابع تھے) پہلے (داخل ہونے والے) لوگوں کی نسبت (یعنی ان لوگوں کی نسبت جو بوجہ رئیس و پیشوائے کفر ہونے کے دوزخ میں پہلے داخل ہوں گے یہ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، سو ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دوگنا دیجئے۔ (اللہ تعالیٰ) ارشاد فرماویں گے کہ (ان کو دوگنا ہونے سے تم کو کونسی تسلی و راحت ہو جاوے گی بلکہ چونکہ تمہارا عذاب بھی ہمیشہ آناً فاناً بڑھتا جاوے گا، اس لئے تمہارا عذاب بھی ان کے دوگنے عذاب ہی جیسا ہوگیا پس اس حساب سے) سب ہی کا (عذاب) دوگنا ہے لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں (کیونکہ ابھی تو عذاب کی ابتداء ہی ہے، اس تزاید کو دیکھا نہیں، اس لئے ایسی باتیں بنا رہے ہو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے تضاعف عذاب کو اپنے لئے موجب شفاء غیظ و باعث تسلی سمجھتے ہو) اور پہلے (داخل ہونے) والے پچھلے (داخل ہونے والے) لوگوں سے (خدا تعالیٰ کے اس جواب سے مطلع ہو کر) کہیں گے (کہ جب سب کی سزا کی یہ حالت ہے تو) پھر تم کو ہم پر (تخفیف عذاب کے بارے میں) کوئی فوقیت نہیں (کیونکہ

تخفیف نہ ہم کو نہ تم کو، سو تم بھی اپنے کردار کے مقابلہ میں عذاب زیادہ کا مزہ چکھتے رہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا نہ کھولے جائیں گے ان کے لئے

أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي

دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی

سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ

کے ناکے میں اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں گنہگاروں کو ان کے واسطے دوزخ کا بچھونا

مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

ہے اور اوپر سے اوڑھنا اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

اور جو ایمان لائے اور کیں نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اس کی طاقت کے موافق

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي

وہی ہیں جنت میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور نکال لیں گے ہم جو کچھ

صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ

ان کے دلوں میں خفگی تھی بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں، اور وہ کہیں گے شکر

لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا

اللہ کا جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانے والے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو

اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ

اللہ، بے شک لائے تھے رسول ہمارے رب کی سچی بات اور آواز آئے گی کہ یہ جنت

الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

ہے، وارث ہوئے تم اس کے بدلے میں اپنے اعمال کے

خلاصۂ تفسیر

(یہ حالت تو کفار کے دخول نار کی ہوئی، اب حسن جنت کی کیفیت سنو کہ) جو لوگ ہماری

سے سرکشی کرے اس کے لئے جہنم کا دائمی عذاب مقرر ہے، مذکور الصدر آیات میں اسی صورت واقعہ کا اظہار ہے جو اس دنیا میں آنے کے بعد انسانوں کے مختلف گروہوں نے اختیار کی کہ بعض نے عہد میثاق کو بھلا دیا، اور اس کی خلاف ورزی کی اور بعض اس پر قائم رہے، اور اس کے مطابق اعمال صالحہ انجام دیئے، ان دونوں فریقوں کے انجام اور عذاب و ثواب کا بیان ان چار آیات میں ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں عہد شکنی کرنے والے منکرین و مجرمین کا ذکر ہے، اور آخری دو آیتوں میں عہد پورا کرنے والے مؤمنین و متقین کا۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور ہماری ہدایات اور آیات کے مقابلہ میں تکبر کے ساتھ پیش آئے ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔

تفسیر بحر محیط میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی ایک تفسیر یہ نقل فرمائی ہے کہ نہ ان لوگوں کے اعمال کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے نہ ان کی دعاؤں کیلئے مطلب یہ ہے کہ ان کی دعاء قبول نہ کی جائے گی، اور ان کے اعمال اس مقام پر جانے سے روک دیئے جائیں گے جہاں اللہ کے نیک بندوں کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں جس کا نام قرآن کریم نے سورۂ مطففین میں علیین بتلایا ہے، اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے، جس میں ارشاد ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ یعنی انسان کے کلمات طیبات اللہ تعالیٰ کے پاس لیجائے جاتے ہیں، اور ان کا نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے، یعنی انسان کے اعمال صالحہ اس کا سبب بنتے ہیں کہ اس کے کلمات طیبات حق تعالیٰ کی بارگاہ خاص میں پہونچائے جاتے ہیں۔

اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ منکرین و کفار کی ارواح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، یہ روحیں نیچے پھینک دی جائیں گی، اور اس مضمون کی تائید حضرت براء بن عازبؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمدؒ نے مفصل نقل کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے، ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے، اور صحابہ کرام آپ کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مؤمن بندہ کے لئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے، اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں، اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لئے نکل، اس وقت اس کی روح اس طرح

بدن سے آسانی سے نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے، اس کی روح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کردیتا ہے، یہ فرشتے اس کو لیکر چلتے ہیں جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے، یہ حضرات اس کا نام و لقب لیتے ہیں جو عزت و احترام کے لئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہونچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، دروازہ کھولا جاتا ہے یہاں سے اور فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہونچتے ہیں، اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھو، اور اس کو واپس کردو، یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے، اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لئے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لئے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی خبیث روح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہونچ کر دروازہ کھولنے کے لئے کہتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں رکھو جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مؤمن بندہ سے کئے تھے یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ، یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لئے ...... جہنم کا فرش، جہنم کا لباس دیدیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ و گرمی پہونچتی رہتی ہے، اور اس کی قبر اس پر تنگ کردی جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منکرین و کفار کی ارواح آسمان تک لیجائی جاتی ہیں، آسمان کا دروازہ ان کے لئے نہیں کھلتا تو وہیں سے پھینک دی جاتی ہیں، آیت مذکورہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بوقت موت ان کی ارواح کے لئے آسمان **کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔**

آخر آیت میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ، اس میں لفظ یلج ولوج سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تنگ جگہ میں گھسنا اور جمل اونٹ کو کہا جاتا ہے اور سَمّ سوئی کے روزن کو، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک اونٹ جیسا عظیم الجثہ جانور سوئی کے روزن میں داخل نہ ہو جائے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سوئی کے روزن میں اونٹ کا داخل ہونا عادۃً محال ہے اسی طرح ان کا جنت میں جانا محال ہے، اس سے ان لوگوں کا دائمی عذاب جہنم بیان کرنا مقصود ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے عذاب جہنم کی مزید شدت کا بیان ان الفاظ سے کیا گیا ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ، مہاد کے معنی فرش، اور غواش غاشیہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپ لینے والی چیز، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا سب جہنم کا ہوگا، اور پہلی آیت جس میں جنت سے **محرومی کا ذکر تھا اس کے ختم پر** وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ فرمایا اور دوسری آیت جس میں عذاب جہنم کا ذکر ہے اس کے ختم پر وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ارشاد فرمایا، کیونکہ یہ اس سے زیادہ شدید

تیسری آیت میں احکام خداوندی کی پیروی اور پابندی کرنے والوں کا ذکر ہے، کہ یہ لوگ **جنت والے ہیں اور جنت ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔**

احکام شریعت میں سہولت کی رعایت

لیکن ان کے لئے جہاں یہ شرط ذکر کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، اس کے ساتھ ہی جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی فرمایا لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر کوئی ایسا بوجھ یا کام نہیں ڈالتے جو اس کی طاقت سے باہر ہو، مقصود یہ ہے کہ اعمال صالحہ جن کو دخول جنت کے لئے شرط کہا گیا ہے وہ کوئی بہت مشکل کام نہیں جو انسان نہ کر سکے بلکہ اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت کو ہر شعبہ میں نرم اور آسان کر دیا ہے، بیماری، کمزوری، سفر اور دوسری انسانی ضروریات کا ہر حکم میں لحاظ رکھ کر آسانیاں دی گئی ہیں۔

اور تفسیر بحر محیط میں ہے کہ جب انسان کو اعمال صالحہ کا حکم دیا گیا تو یہ احتمال تھا کہ کسی کو یہ حکم اس لئے بھاری معلوم ہو کہ تمام اعمال صالحہ ہر جگہ ہر حال میں بجا لانا تو انسان کے بس میں نہیں، اس لئے اس کے اس شبہ کو ان الفاظ سے دور کر دیا گیا کہ ہم... تمام انسانی زندگی کے مختلف ادوار اور حالات کا جائزہ لے کر ہر حال میں اور ہر وقت اور ہر جگہ کے لئے مناسب احکام دیتے ہیں

تفسیر مظہری میں یہی نقل کیا ہے کہ جنت کے اس پانی سے سب کے دلوں کی بندشیں اور کدورتیں دُھل جائیں گی
حضرت علی مرتضیٰ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم اور عثمان اور طلحہ اور زبیر
بھی ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے سینے دخولِ جنت سے پہلے کدورتوں سے صاف کر دیئے جائیں گے (ابن کثیر)
یہ وہ حضرات ہیں جن کے آپس میں دنیا میں اختلافات پیش آئے اور نوبت جنگ تک پہنچ گئی تھی۔

دوسرا حال اہلِ جنت کا اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جنت میں پہونچ کر یہ لوگ اس پر
اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ان کے لئے جنت کی طرف ہدایت کی اور اس کا راستہ
آسان کر دیا، اور کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہماری مجال نہ تھی کہ ہم یہاں پہونچ سکتے

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی انسان محض اپنی کوشش سے جنت میں نہیں جا سکتا جب تک
اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر نہ ہو، کیونکہ کوشش خود اس کے قبضہ میں نہیں وہ بھی محض اللہ تعالیٰ
کی رحمت و فضل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

ہدایت کے مختلف درجات ہیں جن کا آخری درجہ دخولِ جنت ہے

امام راغب اصفہانی نے لفظ ہدایت کی تحقیق میں بڑی مفید اور اہم بات فرمائی ہے کہ ہدایت کا لفظ بہت عام ہے، اس کے درجات مختلف ہیں اور
حقیقت یہ ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ملنے کا نام ہے، اس لئے تقرب الی اللہ
کے درجات بھی جتنے مختلف اور غیر متناہی ہیں، اسی طرح ہدایت کے درجات بھی بے حد متفاوت
ہیں، ادنیٰ درجہ ہدایت کا کفر و شرک سے نجات اور ایمان ہے جس سے انسان کا رُخ غلط راستہ
سے پھر کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے، پھر بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جس قدر فاصلہ ہے
اس کو طے کرنے کے ہر درجہ کا نام ہدایت ہے، اس لئے ہدایت کی طلب سے کسی وقت کوئی انسان
یہاں تک کہ انبیاء اور رسل بھی مستغنی نہیں ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر
تک اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تعلیم جس طرح امت کو دی خود بھی اس دعاء کا اہتمام
جاری رکھا، کیونکہ تقرب الی اللہ کے درجات کی کوئی انتہا نہیں، یہاں تک کہ جنت کے داخلہ
کو بھی اس آیت میں لفظ ہدایت سے تعبیر کیا گیا کہ یہ ہدایت کا آخری مقام ہے۔

وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا
اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے پایا جو ہم سے وعدہ کیا تھا
رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا نَعَمْ ۚ فَأَذَّنَ
ہمارے رب نے سچا سو تم نے بھی پایا اپنے رب کے وعدے کو سچا، وہ کہیں گے کہ ہاں پھر پکارے گا

رحمت ہوئی کہ اُن کو یہ حکم ہوگیا کہ جاؤ جنت میں رہو، اگر یہ شبہ ہو کہ یہ تو ورنہ محروم ہوتے اور اس کلام میں جو جواب کی تخصیص کی گئی ہے، تو اس کی یہ وجہ ہوئی کہ ہنوز عصاۃ مؤمنین بھی دوزخ میں پڑے ہوں گے تو قرینہ اس کا یہ ہے کہ سب اہل اعراف اہل جنت میں ہیں مگر داخل جنت نہیں ہوئے ہوں گے تو ان کو کہا گیا، اگرچہ بحیثیت اہل اعراف کے حیثیت سے زیادہ میں ظاہر مرتبہ ادنیٰ دوزخ سے ابھی نکلے ہوں گے، مگر یہ لوگ اس کلام کے مخاطب ہوں گے۔ واللہ اعلم

معارف و مسائل

جب اہل جنت جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں اپنے اپنے مستقر پر پہنچ جائیں گے، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں ہر حیثیت سے بُعد بعید حائل ہوگا، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ ان دونوں مقامات کے درمیان کچھ ایسے راستے ہوں گے جن سے ایک دوسرے کو دیکھ سکے گا اور ان کے آپس میں مکالمات اور سوال و جواب ہوں گے۔

سورۂ صافات میں دو شخصوں کا ذکر مفصل آیا ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے لیکن ایک مؤمن دوسرا کافر تھا، آخرت میں جب مؤمن جنت میں اور کافر جہنم میں چلا جائے گا تو یہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور باتیں کریں گے ارشاد ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۝ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ جس کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جنتی ساتھی جب جھانک کر دوزخی ساتھی کو دیکھے گا تو اس کو وسطِ جہنم میں پڑا ہوا دیکھے گا، اور کہے گا کہ کمبخت تو نے تو یہ چاہا تھا کہ میں بھی تیری طرح برباد ہو جاؤں، اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو آج میں بھی تیرے ساتھ جہنم میں پڑا ہوتا، اور تو جو مجھ سے یہ کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کی موت کے بعد کوئی زندگی اور کوئی حساب کتاب یا ثواب عذاب ہونے والا نہیں، اب دیکھ لیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

آیت مذکورہ اور ان کے بعد بھی تقریباً ایک رکوع تک اسی قسم کے مکالمات اور سوال و جواب کا تذکرہ ہے جو اہل جنت اور اہل جہنم کے آپس میں ہوں گے۔

اور یہ جنت و دوزخ کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے راستے بھی درحقیقت اہل جہنم کے لئے ایک اور طرح کا عذاب ہوگا کہ ہر طرف سے ان پر ملامت ہوتی ہوگی، اور وہ اہل جنت کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھ کر جہنم کی آگ کے ساتھ حسرت کی آگ میں بھی جلیں گے، اور اہل جنت کے لئے نعمت و راحت میں ایک نئی طرح کا اضافہ ہوگا کہ دوسر

فریق کی مصیبت دیکھ کر اپنی راحت و نعمت کی قدر زیادہ ہوگی، اور جو لوگ دنیا میں دینداروں پر ہنسا کرتے تھے اور ان کا مسخرہ بنایا کرتے تھے اور یہ کوئی انتقام نہ لیتے تھے آج ان لوگوں کو ذلت و خواری کے ساتھ عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو یہ ہنسیں گے کہ ان کے عمل کی ان کو سزا مل گئی، قرآن کریم میں یہی مضمون سورۂ مطففین میں اس طرح ارشاد ہوا ہے فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

اہل جہنم کو ان کی گمراہی پر تنبیہ اور ان کے احمقانہ کلمات پر ملامت فرشتوں کی طرف سے بھی ہوگی، وہ ان کو مخاطب کر کے کہیں گے هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝ أَفَسِحْرٌ هٰذَا أَمْ أَنتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۝ "یعنی یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، اب دیکھو کہ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں نظر نہیں آتا؟"

اسی طرح آیات مذکورہ میں پہلی آیت میں ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے سوال کریں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جن نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ کیا تھا ہم نے تو ان کو بالکل سچا اور پورا پایا، تم بتلاؤ کہ تمہیں جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا وہ بھی تمہارے سامنے آگیا یا نہیں، وہ اقرار کریں گے کہ بیشک ہم نے بھی اس کا مشاہدہ کرلیا۔

ان کے اس سوال و جواب کی تائید میں اللہ جل شانہ کی طرف سے کوئی فرشتہ یہ منادی کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہے ظالموں پر جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ اس کا راستہ بھی سیدھا نہ رہے، اور وہ آخرت کا انکار کیا کرتے تھے۔

اہل اعراف کون لوگ ہیں جنت و دوزخ والوں کے باہمی مکالمات کے ضمن میں ایک اور بات تیسری آیت میں یہ بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پاگئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہوجائیں، ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اعراف کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح سورۂ حدید کی آیات سے ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے، ایک کھلے کافر و مشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے، دوسرے مومنین ان کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی، تیسرے منافقین، یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے، اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے، اس وقت ایک سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی، مومنین اپنے نور ایمان کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں، اس پر

شدت میں ان کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ پیچھے لوٹ جاؤ، وہاں روشنی تلاش کرو، مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور عمل صالح کی ہے، جس کے حاصل کرنے کا مقام پیچھے گذر گیا، جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی، ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں پہنچے گا، اسی حالت میں منافقین اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار کا حصار حائل کردیا جائے گا، جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس دروازہ کے باہر تو سارا عذاب ہی عذاب نظر آئے گا اور دروازہ کے اندر جہاں مؤمنین ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی، یہی مضمون اس آیت کا ہے یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَکُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۔

اس آیت میں وہ حصار جو اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان حائل کیا جائے گا اس کو لفظ سُور سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ لفظ دراصل شہر پناہ کے لئے بولا جاتا ہے، جو بڑے شہروں کے گرد غنیم سے حفاظت کے لئے بڑی مضبوط مستحکم چوڑی دیوار سے بنائی جاتی ہے، ایسی دیواروں میں فوج کے محافظ دستوں کی کمین گاہیں بھی بنی ہوتی ہیں جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔

سورۂ اعراف کی آیت مذکورہ میں ہے: وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَی الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ کُلًّا بِسِیْمٰهُمْ، ابن جریر اور دوسرے ائمۂ تفسیر کی تحریر کے مطابق اس آیت میں لفظ حجاب سے وہی حصار مراد ہے جس کو سورۂ حدید کی آیت میں لفظ سُور سے تعبیر کیا گیا ہے، اس حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، کیونکہ اعراف عرف کی جمع ہے، اور عُرف ہر چیز کے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ دور سے معروف و ممتاز ہوتا ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جنت و دوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، اور آیت اعراف میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محشر میں اس مقام پر کچھ لوگ ہوں گے جو جنت و دوزخ دونوں طرف کے حالات کو دیکھ رہے ہوں گے، اور دونوں طرف رہنے والوں سے مکالمات اور سوال و جواب کریں گے۔

اب یہ بحث کہ یہ کون لوگ ہوں گے اور اس درمیانی مقام میں ان کو کیوں روکا جائے گا اس میں مفسرین کے اقوال مختلف اور روایات حدیث متعدد ہیں، لیکن صحیح اور راجح جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات اور سیئات کے دونوں پلّے میزان عمل میں برابر ہو جائیں گے، اپنے حسنات کے سبب جہنم سے تو نجات پالیں گے، لیکن سیئات اور گناہوں کے سبب ابھی جنت میں ان کا داخلہ نہ ہوا ہوگا، اور بالآخر رحمت خداوندی سے یہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے

صحابہ کرام میں سے حضرت حذیفہ، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم کا، اور دوسرے صحابہ و تابعین کا بھی قول ہے، اور اس میں تمام روایات حدیث بھی جمع ہو جاتی ہیں جو مختلف عنوانات سے منقول ہیں، امام ابن جریرؒ نے بروایت حذیفہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، اس لئے جہنم سے تو نجات ہو گئی مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے، ان کو اس مقام اعراف پر روک لیا گیا، یہاں تک کہ تمام اہل جنت اور اہل دوزخ کا حساب اور فیصلہ ہو جانے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا، اور بالآخر ان کی مغفرت ہو جائے گی اور جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ (ابن کثیر)

اور ابن مردویہ نے بروایت حضرت جابر بن عبداللہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے اور اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے، تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلہ سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔

اس حدیث اور پہلی حدیث میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہ حدیث ایک مثال ہے ان لوگوں کی جن کی نیکیاں اور گناہ برابر درجہ کے ہوں، کہ ایک طرف شہادت فی سبیل اللہ اور دوسری طرف ماں باپ کی نافرمانی، دونوں پلے برابر ہو گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سلام کا مسنون لفظ

اہل اعراف کی تشریح اور تعریف معلوم ہونے کے بعد اب اس آیت کا مضمون دیکھئے جس میں ارشاد ہے کہ اہل اعراف اہل جنت کو آواز دے کر کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، یہ لفظ دنیا میں بھی باہمی ملاقات کے وقت بطور تحفہ و اکرام کے بولا جاتا ہے، اور مسنون ہے، اور بعد موت کے قبروں کی زیارت کے وقت بھی، اور پھر محشر اور جنت میں بھی، لیکن آیات اور روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تو اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنا مسنون ہے، اور اس دنیا سے گذرنے کے بعد بغیر الف لام کے سلام علیکم کا لفظ مسنون ہے، زیارت قبور کے لئے جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے وہ بھی سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ آیا ہے، اور فرشتے جب اہل جنت کا استقبال کریں گے اس وقت بھی یہ لفظ اسی عنوان سے آیا ہے، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔ اور یہاں بھی اہل اعراف اہل جنت کو اسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔

آگے اہل اعراف کا یہ حال بتلایا ہے کہ وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، مگر اس کے امیدوار ہیں، اس کے بعد ارشاد ہے: وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَاۗءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی جب اہل اعراف کی نظر اہل جہنم پر پڑے گی اور

بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ

سچی بات، سو اب کوئی ہماری سفارش والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم لوٹا دیئے جائیں تو ہم عمل کریں خلاف

الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۳﴾ ع ۱۳

اس کے جو کر رہے تھے، بیشک تباہ کیا انھوں نے اپنے آپ کو اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا کیا کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور جس طرح اہلِ جنت والوں نے (دوزخ والوں سے گفتگو کی اسی طرح) دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ (ہم مصیبت بھوک اور پیاس اور گرمی کے بے دم ہوئے جاتے ہیں خدا کے واسطے) ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو (شاید کچھ تسکین موجب ہو) یا اور ہی کچھ دیدو جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دے رکھا ہے (اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امید کرکے مانگیں گے، کیونکہ غایت اضطراب میں بعید از توقع چیزیں بھی منہ سے نکلا کرتی ہیں) جنت والے (جواب میں) کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی (یعنی جنت کے کھانے اور پینے کی) کافروں کے لئے بندش کر رکھی ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے دین کو (جس کا قبول کرنا اُن کے ذمہ واجب تھا) لہو ولعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیوی زندگانی نے دھوکہ (و غفلت) میں ڈال رکھا تھا (اس لئے دین کی کچھ پرواہ نہ کی اور یہ دار الجزاء ہے جب دین نہیں اس کا ثمرہ کہاں، آگے حق تعالیٰ اہل جنت کے اس جواب کی تصدیق و تائید میں فرماتے ہیں) سو (جب ان کی دنیا میں یہ حالت تھی تو) ہم بھی آج (قیامت) کے روز ان کا نام نہ لیں گے (اور کھانا پینا خاک نہ دیں گے) جیسا انھوں نے اس (عظیم الشان) دن کا نام تک نہ لیا، اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے، اور ہم نے ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے (یعنی قرآن) جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے بہت ہی واضح کرکے بیان کر دیا ہے (اور یہ بیان سب کے سُنانے کو کیا ہے لیکن) ذریعہ ہدایت اور رحمت ان ہی لوگوں کے لئے (ہوا) ہے جو (اس کو سن کر) ایمان لے آتے ہیں (اور جو باوجود تمام حجت کے ایمان نہیں لاتے، ان کی حالت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ) ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس (قرآن) کے بتلائے ہوئے اخیر نتیجہ (یعنی وعدہ سزا) کا انتظار ہے (یعنی قبل از عذاب وعید سے نہیں ڈرتے تو خود عذاب کا وقوع چاہتے ہوں گے سو) جس روز اس کا (بتلایا ہوا) اخیر نتیجہ پیش آئے گا (جس کی تفصیل دوزخ وغیرہ کی اوپر مذکور ہوئی) اس روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے تھے (مضطر ہوکر) یوں کہنے لگیں گے واقعی ہمارے

رب کے پیغمبر دنیا میں سچی سچی باتیں لائے تھے، مگر ہم سے حماقت ہوئی، سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے کہ وہ ہماری سفارش کر دے یا کیا ہم پھر دنیا میں واپس بھیجے جا سکتے ہیں، تاکہ ہم لوگ پھر دنیا میں جا کر ان اعمال بد کے جن کو ہم کیا کرتے تھے برخلاف دوسرے اعمال (نیک) کریں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب کوئی صورت نجات کی نہیں، بے شک ان لوگوں نے اپنے کو (کفر کرکے) خسارے میں ڈال دیا اور یہ جو جو باتیں تراشتے تھے (اس وقت) سب گم ہو گیا، اب بجز سزا کے اور کچھ نہ ہوگا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین چھ دن میں

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا وَّ

پھر قرار پکڑا عرش پر اوڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ

پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے تابعدار اپنے حکم کے سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور

الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۴﴾

حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز (کے برابر وقت) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا جو کہ اس کی شان کے لائق ہے، چھپا دیتا ہے شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ و زائل ہو جاتی ہے) ایسے طور پر کہ وہ شب دن کو جلدی سے آ لیتی ہے (یعنی دن آناً فاناً گزرتا معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ دفعۃً رات آ جاتی ہے) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم (تکوینی) کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑے کمالات والے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں آسمان و زمین اور سیارات و نجوم کے پیدا کرنے اور ایک خاص نظام محکم کے تابع اپنے اپنے کام میں لگے رہنے کا ذکر اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ

کا بیان کرکے سوال عقل انسان کو اس کی دعوت فکر دی گئی ہے کہ جو ذات پاک اس عظیم الشان عالم کو عدم سے وجود میں لانے اور حکیمانہ نظام کے ساتھ چلانے پر قادر ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ ان چیزوں کو معدوم کرکے قیامت کے روز دوبارہ پیدا فرمادے، اس لئے قیامت کا انکار چھوڑ کر صرف اسی ذات کو اپنا رب سمجھیں، اسی سے اپنی حاجات طلب کریں، اسی کی عبادت کریں، مخلوق پرستی کی دلدل سے نکلیں، اور حقیقت کو پہچانیں، اس میں ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا۔

آسمان وزمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں ہوئی

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ تو اس پر قادر ہیں کہ یہ سارا جہان ایک آن میں پیدا فرمادیں، خود قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے یہ بات بار بار ذکر کی گئی ہے کہیں ارشاد ہے وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ یعنی آنکھ جھپکنے کی مقدار میں ہمارا حکم نافذ ہوجاتا ہے، کہیں فرمایا ہے اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کہ ہوجا وہ پیدا ہوجاتی ہے" پھر پیدائش عالم کے لئے چھ روز صرف ہونے کی کیا وجہ ہے؟

مفسر القرآن حضرت سعید بن جبیرؓ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ قدرت حق تعالیٰ تو بیشک اس پر حاوی ہے کہ یہ سب کچھ ایک آن میں پیدا کردیں، لیکن بتقاضائے حکمت اس عالم کی تخلیق میں چھ دن لگائے گئے، تاکہ انسان کو نظام عالم کے چلانے میں تدریج اور پختہ کاری کی تعلیم دی جائے جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غور و فکر اور وقار و تدریج کے ساتھ کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے (مظہری بحوالہ شعب البیہقی)

مطلب یہ ہے کہ جلد بازی میں انسان مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر نہیں کرسکتا، اس لئے اکثر کام خراب ہوجاتا ہے، اور پشیمانی ہوتی ہے، غور و تدبر اور سہولت کے ساتھ جو کام کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے۔

تخلیق زمین و آسمان اور سیارات سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے

دوسرا سوال یہ ہے کہ دن اور رات کا وجود تو آفتاب کی حرکت سے پہچانا جاتا ہے، آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے جب نہ آفتاب تھا نہ ماہتاب، چھ دنوں کی تعداد کس حساب سے ہوئی۔

اس لئے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد چھ دن سے اتنا وقت اور زمانہ ہے جس میں چھ دن رات اس دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن صاف اور بے غبار بات یہ ہے کہ دن اور رات کی یہ اصطلاح کہ طلوع آفتاب سے غروب تک دن اور غروب سے طلوع تک رات، یہ تو اس دنیا کی اصطلاح ہے، پیدائش عالم سے پہلے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کی دوسری

علامت مقرر فرما دی ہوں جیسے جنت میں ہوگا کہ وہاں کا دن اور رات حرکتِ آفتاب کے تابع نہیں ہوگا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چھ دن جن میں زمین و آسمان بنائے گئے وہ ہمارے چھ دن کے برابر ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے بڑے ہوں، جیسے آخرت کے دن کے بارے میں ارشادِ قرآنی ہے کہ ایک ہزار سال کے برابر ایک دن ہوگا۔

ابو عبد اللہ رازیؒ نے فرمایا کہ فلکِ اعظم کی حرکت اس دنیا کی حرکات کے مقابلہ میں اتنی تیز ہے کہ ایک دوڑنے والا انسان ایک قدم اٹھا کر زمین پر رکھنے نہیں پاتا کہ فلکِ اعظم تین ہزار میل کی مسافت طے کر لیتا ہے (بحر محیط)

امام احمد بن حنبلؒ اور مجاہدؒ کا قول یہی ہے کہ یہاں چھ دن سے آخرت کے چھ دن مراد ہیں اور بروایت ضحاک حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

اور یہ چھ دن جن میں پیدائشِ عالم وجود میں آئی ہے صحیح روایات کے مطابق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوتے ہیں یوم سبت یعنی ہفتہ کے اندر تخلیقِ عالم کا کام نہیں ہوا، بعض علماء نے فرمایا کہ سبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں اس روز کا یوم السبت اسی لئے نام رکھا گیا کہ اس پر کام ختم ہوگیا (تفسیر ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں زمین و آسمان کی تخلیق چھ روز میں مکمل ہونے کا ذکر ہے، اس کی تفصیل سورۂ حم سجدہ کی نویں اور دسویں آیات میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، پھر دو دن میں زمین کے اوپر پہاڑ، دریا، معادن، درخت، نباتات، اور انسان و حیوان کے کھانے پینے کی چیزیں بنائی گئیں، کل چار دن ہوگئے، ارشاد فرمایا، خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ اور پھر فرمایا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ

پہلے دو دن جن میں زمین بنائی گئی اتوار اور پیر ہیں، اور دوسرے دو دن جن میں زمین کی آبادی کا سامان پہاڑ دریا بنائے گئے وہ منگل اور بدھ ہیں، اس کے بعد ارشاد فرمایا فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ یعنی پھر سات آسمان بنائے دو دن میں، ظاہر ہے کہ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہوں گے، اس طرح جمعہ تک چھ دن ہوگئے۔

آسمان و زمین کی تخلیق کا بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی پھر عرش پر قائم ہوا، استوی کے لفظی معنی قائم ہونے اور عرش شاہی تخت کو کہا جاتا ہے اب یہ عرش رحمٰن کیسا اور کیا ہے، اور اس پر قائم ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے متعلق بے غبار و صاف و صحیح وہ مسلک ہے جو سلفِ صالحین، صحابہ و تابعین سے اور بعد میں اکثر حضرات صوفیائے کرام سے منقول ہے کہ انسانی عقل اللہ جل شانہٗ کی ذات

وصفات کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے، اس کی کھوج میں پڑنا بیکار بلکہ مُضر ہے، ان پر اجمالاً یہ ایمان لانا چاہئے کہ ان الفاظ سے جو کچھ حق تعالیٰ کی مراد ہے وہ صحیح اور حق ہے، اور خود کوئی معنی متعین کرنے کی فکر نہ کرے۔

حضرت امام مالکؒ سے کسی شخص نے یہی سوال کیا کہ استوا علی العرش کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے کچھ دیر تامل فرمانے کے بعد فرمایا کہ لفظ استواء کے معنی تو معلوم ہیں اور اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک عقلِ انسانی نہیں کر سکتی، اور ایمان لانا اس پر واجب ہے، اور اس کے متعلق کیفیت و حقیقت کا سوال کرنا بدعت ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات نہیں کئے، سفیان ثوری، امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ جو آیات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق آئی ہیں ان کو جس طرح وہ آئی ہیں اسی طرح بغیر کسی تشریح و تاویل کے رکھ کر ان پر ایمان لانا چاہئے (مظہری)۔

اس کے بعد آیت مذکورہ میں فرمایا يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا، یعنی اللہ تعالیٰ ڈھانپ دیتے ہیں رات کو دن پر اس طرح کہ رات جلدی کے ساتھ دن کو آلیتی ہے، مراد یہ ہے کہ رات اور دن کا یہ انقلاب عظیم کہ پورے عالم کو نور سے اندھیرے میں یا اندھیرے سے نور میں لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کے تابع اتنی جلدی اور آسانی سے ہو جاتا ہے کہ ذرا دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ، یعنی پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آفتاب اور چاند اور تمام ستاروں کو اس حالت پر کہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے امر و حکم کے تابع چل رہے ہیں۔

اس میں ایک ذی عقل انسان کے لئے دعوتِ فکر ہے جو مخلوق کی بنائی ہوئی مصنوعات کا ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں میں اول تو کچھ نقائص رہتے ہیں، اور نقائص بھی نہ رہیں تو کیسی فولادی مشینیں اور کل پرزے ہوں چلتے چلتے گھستے ہیں ڈھیلے ہوتے ہیں، مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، گریسنگ کی حاجت پیش آتی ہے، اور اس کیلئے کئی کئی دن بلکہ ہفتوں اور مہینوں مشین معطل رہتی ہے، لیکن ان خدائی مشینوں کو دیکھو کہ جس طرح اور جس شان سے پہلے دن ان کو چلایا تھا اسی طرح چل رہی ہیں، نہ کبھی ان کی رفتار میں ایک منٹ سیکنڈ کا فرق آتا ہے، نہ کبھی ان کا کوئی پرزہ گھستا ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ چل رہی ہیں، یعنی ان کے چلنے چلانے کے لئے نہ کوئی بجلی کا پاور درکار ہے نہ کسی انجن کی مدد ضروری ہے، وہ صرف حق تعالیٰ کے امر سے چل رہی ہیں، اسی کے تابع ہیں

اس میں کوئی فرق آنا ممکن نہیں، ہاں جب خود قادرِ مطلق ہی ان کے فنا کرنے کا ارادہ ایک معین وقت پر کریں گے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کا نام قیامت ہے۔

ان چند مثالوں کے ذکر کے بعد حق تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ مطلقہ کا بیان ایک کلی قاعدے کی صورت میں اس طرح کیا گیا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ، خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا ہیں، معنی یہ ہیں کہ اسی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، اس کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی ادنیٰ چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو کسی پر حکم کرنے کا حق ہے، (بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حکم کا کوئی خاص شعبہ کسی کے سپرد کردیا جائے تو وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کا حکم ہے) اس لئے مراد آیت کی یہ ہوئی کہ یہ سب چیزیں پیدا کرنا بھی اسی کا کام تھا، اور پیدا ہونے کے بعد ان سے کام لینا بھی کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے۔

صوفیائے کرام نے فرمایا کہ خلق اور امر دو عالم ہیں، خلق کا تعلق مادہ اور مادیات سے ہے، اور امر کا تعلق مجردات لطیفہ کے ساتھ ہے، آیت قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ میں اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ روح کو امر رب سے فرمایا، خلق اور امر دونوں کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونے کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں وہ تو سب مادی ہیں، ان کی پیدائش کو خلق کہا گیا، اور ما فوق السموات جو مادہ اور مادیت سے بری ہیں ان کی پیدائش کو لفظ امر سے تعبیر کیا گیا (مظہری)

آخر آیت میں ارشاد فرمایا تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، اس میں لفظ تبارک برکت سے بنا ہے اور لفظ برکت بڑھنے، زیادہ ہونے ثابت رہنے وغیرہ کے کئی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے، اس جگہ لفظ تبارک کے معنی بلند و بالا ہونے کے ہیں، جو بڑھنے کے معنی سے بھی لیا جا سکتا ہے اور ثابت رہنے کے معنی سے بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ قائم اور ثابت بھی ہیں، اور بلند و بالا بھی، بلند ہونے کے معنی کی طرف حدیث کے ایک جملہ میں بھی اشارہ دیا گیا ہے تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ، جس میں تبارکت کی تفسیر تعالیت کے لفظ سے کر دی گئی۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭاِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۵۵

پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ

اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور

طَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶

توقع سے، بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے

خلاصۂ تفسیر

تم لوگ (ہر حالت میں) اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات واقعی ہے کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو (دعا میں) حد (ادب) سے نکل جاویں (مثلاً امور محالہ عقلیہ یا محرمات شرعیہ کی دعا مانگنے لگیں) اور دنیا میں بعد اس کے کہ (تعلیم توحید اور بعثت انبیاء کے ذریعہ) اس کی اصلاح (درستی) کر دی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ (یعنی امور حقہ توحید وغیرہ کے ماننے اور نہ ماننے سے جن کی وجہ سے عالم میں امن قائم ہوتا ہے تم تعلیم مذکور کو چھوڑ کر نقض امن مت کرو) اور جیسے تم کو خاص دعا کرنے کا حکم ہوا ہے اسی طرح بقیہ عبادات کا حکم کیا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت (کرتے رہو جیسا کہ تم کو بتلایا ہے) اور عبادت کرو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے (یعنی عبادت کرے ... آگے عبادت کی ترغیب ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے خاص خاص مظاہر اور اہم انعامات کا ذکر تھا، ان آیات میں اس کا بیان ہے کہ جب قدرت مطلقہ کا مالک اور تمام احسانات و انعامات کا کرنے والا صرف رب العالمین ہے تو مصیبت اور حاجت کے وقت اسی کو پکارنا اور اسی سے ذکر کرنا چاہئے، اس کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہونا جہالت اور محرومی ہے، اس کے ساتھ ان آیات میں دعاء کے بعض آداب بھی بتلا دیئے گئے جن کی رعایت کرنے سے قبولیتِ دعاء کی امید زیادہ ہو جاتی ہے۔

لفظ دعاء عربی زبان میں کسی ..... حاجت روائی کے لئے پکارنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور مطلق ذکر کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، آیت میں ارشاد ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یعنی پکارو اپنے رب کو اپنی حاجات کے لئے، یا یاد کرو اور عبادت کرو اپنے رب کی۔

پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اپنی حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دوسری صورت میں یہ کہ ذکر و عبادت اسی کی کرو، یہ دونوں تفسیریں سلف صالحین ائمہ تفسیر سے منقول ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، تضرع کے معنی عجز و انکسار اور اظہار تذلل کے ہیں، اور خفیہ کے معنی پوشیدہ چھپے ہو، جیسا کہ اردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔

ان دونوں لفظوں میں دعاء و ذکر کے لئے دو اہم آداب کا بیان ہے، اول یہ کہ قبولیتِ دعاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و انکسار اور تذلل کا اظہار

کر کے دعا کرے، اس کے الفاظ بھی عجز و انکسار کے مناسب ہوں لب و لہجہ بھی تواضع و انکسار کا ہو، ہیئت دعا مانگنے کی بھی ایسی ہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آجکل عوام جس انداز سے دعا مانگتے ہیں اول تو اس کو دعا مانگنا ہی نہیں کہہ سکتے، بلکہ پڑھنا کہنا چاہئے، کیونکہ اکثر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کلمات زبان سے بول رہے ہیں ان کا مطلب کیا ہے، جیسا کہ آجکل عام مساجد میں ائمہ کا معمول ہوگیا ہے کہ کچھ عربی زبان کے کلمات دعائیہ انھیں یاد ہوتے ہیں ختم نماز پر انھیں پڑھ دیتے ہیں اکثر تو خود ان اماموں کو بھی ان کلمات کا مطلب مفہوم معلوم نہیں ہوتا اور اگر ان کو معلوم ہو تو کم از کم جاہل مقتدی تو اس سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، وہ بے سمجھے بوجھے امام کے پڑھے ہوئے کلمات کے پیچھے آمین آمین کہتے ہیں اس سارے تماشہ کا حاصل چند کلمات کا پڑھنا ہوتا ہے، دعا مانگنے کی جو حقیقت ہے یہاں پائی ہی نہیں جاتی، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے ان بے جان کلمات ہی کو قبول فرما کر قبولیت دعا کے آثار پیدا فرما دیں، مگر اپنی طرف سے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دعا پڑھی نہیں جاتی بلکہ مانگی جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مانگنے کے ڈھنگ سے مانگا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے کلمات کے معنی بھی معلوم ہوں اور سمجھ کر ہی کہہ رہا ہو تو اگر اس کے ساتھ ڈھنگ، لب و لہجہ اور ہیئت ظاہری تواضع و انکسار کی نہ ہو تو یہ دعا ذرا ایک مطالبہ رہ جاتا ہے جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں۔

خلاصہ یہ کہ پہلے لفظ میں آداب دعا بتلائے گئے کہ وہ عاجزی و انکساری اور اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگنا ہے، دوسرے لفظ میں ایک دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ دعا کا خفیہ اور آہستہ مانگنا افضل اور اقرب الی القبول ہے، کیونکہ آواز بلند دعا مانگنے میں اول تو تواضع و انکسار باقی رہنا مشکل ہے، ثانیاً اس میں ریاء و شہرت کا بھی خطرہ ہے، ثالثاً اس کی صورت عمل ایسی ہے کہ گویا یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سمیع و علیم ہیں، ہمارے ظاہر و باطن کو یکساں جانتے ہیں، ہر بات خفیہ ہو یا جہر سب کو سنتے ہیں، اسی لئے غزوۂ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام کی آواز دعا میں بلند ہونے لگی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے کو یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو جو اتنی بلند آواز سے کہتے ہو، بلکہ ایک سمیع و قریب کو مخاطب کر رہے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ، اس لئے آواز بلند کرنا فضول ہے، خود اللہ جل شانہ نے ایک نیک بندے صالح کی دعا کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا یعنی جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا آہستہ آواز سے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعا کی یہی کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دعا مانگی جائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہر کے ساتھ دعا کرنے میں اور آہستہ پست آواز سے

کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علم دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں (ابن کثیر، مظہری)

ابن جریج نے فرمایا کہ دعا میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے، امام ابوبکر جصاص حنفی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعاء کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے، حضرت حسن بصری اور ابن عباسؓ سے ایسا ہی منقول ہے، اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے **کیونکہ آمین بھی ایک دعاء ہے۔**

ہمارے زمانہ کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرماویں کہ قرآن و سنت کی تلقین اور بزرگان سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آداب دعاء کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں، غلبۂ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، کسی خاص موقع پر خاص دعاء پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو تو ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعاء کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں اس کا مضائقہ نہیں، بشرطیکہ دوسروں کی نماز و عبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں، اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعاء کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آجکل عام طور سے ہو رہا ہے۔

یہ بیان اپنی حاجات کے لئے دعاء مانگنے کا تھا، اگر دعاء کے معنی اس جگہ ذکر و عبادت کے لئے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکر سر ذکر جہر سے افضل ہے، اور صوفیائے کرام میں مشائخ چشتیہ جو مبتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے، تاکہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جائے اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے، ورنہ فی نفسہٖ ذکر میں جہر کرنا ان کے

یہاں بھی مطلوب نہیں گو جائز ہے، اور جواز اس کا بھی حدیث سے ثابت ہے، بشرطیکہ اس میں ریاء و نمود نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل، ابن حبان، بیہقی وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِيْ	یعنی بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو انسان کے لئے کافی ہو جائے۔"

ہاں خاص خاص حالات اور اوقات میں جہر ہی مطلوب اور افضل ہے، ان اوقات و حالات کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے واضح فرما دی ہے، مثلاً اذان و اقامت کا بلند آواز سے کہنا، جہری نمازوں میں بلند آواز سے تلاوت قرآن کرنا، تکبیرات نماز، تکبیرات تشریق، حج میں تلبیہ بلند آواز سے کہنا وغیرہ، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فیصلہ اس باب میں یہ فرمایا کہ جن خاص حالات اور مقامات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا عملاً جہر کرنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں تو جہر ہی کرنا چاہئے، اس کے علاوہ دوسرے حالات و مقامات میں ذکر خفی اولیٰ وانفع ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ، معتدین، اعتداء سے مشتق ہے، اعتداء کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، حد سے آگے بڑھنا خواہ دعاء میں ہو یا کسی دوسرے عمل میں سب کا یہی حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دین اسلام نام ہی حدود و قیود کی پابندی اور فرماں برداری کا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام معاملات میں حدود شرعیہ سے تجاوز کیا جائے تو وہ بجائے عبادت کے گناہ بن جاتے ہیں۔

دعاء میں حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دعاء میں لفظی تکلفات قافیہ وغیرہ کے اختیار کئے جائیں جس سے خشوع خضوع میں فرق پڑے، دوسرے یہ کہ دعاء میں غیر ضروری قیدیں شرطیں لگائی جائیں، جیسے حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے دیکھا کہ ان کے صاحبزادے اس طرح دعاء مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ میں آپ سے جنت میں سفید رنگ کا داہنی جانب والا محل طلب کرتا ہوں تو موصوف نے اُن کو روکا، اور فرمایا کہ دعاء میں ایسی قیدیں شرطیں لگانا حد سے تجاوز ہے جس کو قرآن و حدیث میں ممنوع قرار دیا گیا ہے (مظہری بروایت ابن ماجہ وغیرہ)۔

تیسری صورت حد سے تجاوز کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے بددعاء کرے یا کوئی

ایسی چیزیں مانگے جو عام لوگوں کے لئے متعذر ہوں۔ اسی طرح ایک صورت حد سے تجاوز کی یہ بھی ہے جو اس جگہ مذکور ہے کہ دعا میں بلا ضرورت آواز بلند کی جائے (تفسیر مظہری، احکام القرآن)

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا، اس میں دو لفظ متضاد اور متقابل آئے ہیں، صلاح اور فساد، صلاح کے معنی درستی اور فساد کے معنی خرابی کے آتے ہیں، امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ فساد کہتے ہیں کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو خواہ یہ نکلنا تھوڑا سا ہو یا زیادہ، اور ہر فساد میں کمی بیشی کا مدار اسی اعتدال سے خروج پر ہے، جس قدر خروج بڑھے گا فساد بڑھے گا۔ فساد کے معنی خرابی پیدا کرنا اور صلاح کے معنی درستی کرنا ہوا اس لئے لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کے معنی یہ ہوئے کہ زمین میں خرابی نہ پیدا کرو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی درستی فرمادی ہے۔

امام راغب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی اصلاح کرنا اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو اول ہی ٹھیک اور درست پیدا فرمایا، جیسے وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ، دوسرے یہ کہ اس میں جو فساد آ گیا تھا اس کو دور کر دیا، جیسے يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ تیسری یہ کہ اس کو صلاح کا حکم دیا جائے، اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین کی اصلاح و درستی فرمادی تو اس کے بعد تم اس میں فساد اور خرابی نہ ڈالو، اس میں زمین کی درستی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری درستی کہ زمین کو کھیتی اور درخت اگانے کے قابل بنایا، اس پر بادلوں سے پانی برسا کر زمین سے پھل پھول نکالے، انسان اور دوسرے جانداروں کے لئے زمین سے ہر قسم کی ضروریات زندگی اور آسائش کے سامان پیدا فرمائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی باطنی اور معنوی اصلاح فرمائی، اس طرح کہ زمین پر اپنے رسول اپنی کتابیں اور ہدایات بھیج کر اس کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مفہوم یعنی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی اصلاح اس آیت میں مراد ہو، تو اب معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ظاہری اور باطنی طور پر درست فرما دیا ہے، اب تم اس میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے فساد نہ مچاؤ، اور خرابی پیدا نہ کرو۔

زمین کی درستی و خرابی میں لوگوں کے گناہوں کا اس میں دخل

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اسی طرح فساد کی بھی دو قسمیں ہیں، زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ پتھر لوہے کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جا سکے، ایک درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے، تاکہ انسان اس کو نرم کر کے اس میں کھیتی اور درخت اور پھل پھول اگا سکے، اور کھود کر اس میں کنویں اور خندقیں

ہوا میں بن سکیں، مکانات کی بنیادیں مستحکم کر سکیں، پھر اس زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا فرما دیئے جن سے زمین کی آبادی ہو، اس میں سبزی اور درخت اور پھول پھل اُگ سکیں باہر سے ہوا، روشنی، گرمی، سردی پیدا کی اور بادلوں کے ذریعے اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہو سکیں مختلف ستاروں اور سیاروں کی شعاعیں اس پر ڈالی گئیں جن سے پھلوں پھولوں میں رنگ اور رس بھرے گئے، انسان کو فہم و عقل عطا کی گئی جس کے ذریعہ اس نے زمین سے نکلنے والے خام مواد لکڑی، لوہا، تانبہ، پیتل، ایلومنیم وغیرہ کے جوڑ توڑ لگا کر مصنوعات کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی یہ سب زمین کی اصلاح ظاہری ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی اور روحانی کا مدار ذکر اللہ تعالیٰ مع اللہ اور اس کی اطاعت پر ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اوّل تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا رکھ دیا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، اور انسان کے گرد و پیش کے ہر ذرے ذرے میں اپنی قدرت کاملہ و صنعت عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر معمولی فہم و ادراک رکھنے والا بھی بول اُٹھے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ، اس کے علاوہ اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔

اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہو گئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس **زمین کو درست کر دیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔**

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے بالمقابل فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں، اور اس ارشاد ربانی کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اگرچہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی اصلاح باطنی ہے، اور اس کے بالمقابل فساد باطنی سے روکنا ہے لیکن اس دنیا میں ظاہر و باطن کے صلاح و فساد میں ایک ایسا ربط ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا موجب بن جاتا ہے، اس لئے شریعت قرآن نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی منع فرمایا، چوری، ڈاکہ، قتل، اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پیدا کرتے ہیں، اس لئے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر فرمائیں، اور عام گناہوں اور جرائم کو بھی ممنوع قرار دیا، کیونکہ ہر جرم و گناہ کہیں ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب بنتا ہے، اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے۔

ظاہری فساد کو باطنی کے لئے مستلزم ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اطاعتِ احکامِ آلٰہیہ کی خلاف ورزی ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی ہی کا دوسرا نام فسادِ باطنی ہے، البتہ فسادِ باطنی کس طرح فسادِ ظاہری کا سبب بنتا ہے، اس کو سمجھنا کسی قدر غور و فکر کا محتاج ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ سارا جہان اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز سب مالک الملک ملکوت کی بنائی ہوئی اور اس کے تابع فرمان ہے، جب تک انسان اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان رہتا ہے تو یہ سب چیزیں انسان کی صحیح صحیح خدمتگار ہوتی ہیں اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے تو دنیا کی ساری چیزیں درپردہ انسان کی نافرمان ہوجاتی ہیں جس کو بظاہر انسان اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا، لیکن ان چیزوں کے آثار و خواص اور نتائج و فوائد میں غور کرنے سے بدیہی طور پر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے سامنے موجود رہتی ہیں، پانی اس کے حلق میں اتر کر تو پیاس بجھانے سے انکار نہیں کرتا، کھانا اس کی بھوک رفع کرنے سے نہیں رکتا، لباس اور مکان اس کی سردی گرمی کی آسائشوں کو مہیا کرنے سے انکار نہیں کرتا۔

لیکن عواقب و نتائج کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اپنا کام پورا نہیں کررہی، کیونکہ اصل مقصد ان تمام چیزوں اور ان کے استعمال کا یہ ہے کہ انسان کو آرام و راحت میسر آئے اس کی پریشانی اور تکلیف دور ہو، اور بیماریوں کو شفاء ہو۔

اب دنیا کے حالات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ آجکل سامان راحت اور سامان شفاء کی زائد از قیاس فراوانی کے باوجود انسانوں کی اکثریت انتہائی پریشانیوں اور بیماریوں کا شکار ہے، نئے نئے امراض نئی نئی مصیبتیں برس رہی ہیں، کوئی بڑے سے بڑا انسان اپنی جگہ مطمئن اور آسودہ نہیں ہے، بلکہ جوں جوں یہ سامان بڑھتے جاتے ہیں اسی انداز سے مصائب و آفات اور امراض و پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں ع "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

آج کا انسان جس کو برق و بھاپ اور دوسری مادی رنگینیوں نے مخمور بنا رکھا ہے، ذرا ان چیزوں سے بلند ہو کر سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ہماری ساری کوششیں اور ساری مصنوعات و ایجادات ہمارے اصل مقصد یعنی اطمینان و راحت کے حاصل کرنے میں فیل اور ناکام ہیں، اس کی وجہ بجز اس معنوی اور باطنی سبب کے نہیں کہ ہم نے اپنے رب اور مالک کی نافرمانی اختیار کی تو اس کی مخلوقات نے معنوی طور پر ہم سے نافرمانی شروع کردی ؎

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

کہ ہمارے لئے حقیقی آرام و راحت مہیا نہیں کرتی، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ⁂ بامن و تو مردہ با حق زندہ اند

اس آیت میں دعاء کے لئے دو آداب باطنی اور بتلائے گئے، جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے وہ یہ کہ دعاء کرنے والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہئے کہ شاید میری دعاء قبول نہ ہو، اور امید بھی ہونی چاہئے کہ میری دعاء قبول ہو سکتی ہے، کیونکہ اپنی خطاؤں اور گناہوں سے بے فکر ہو جانا بھی ایمان کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے، قبولیت دعاء کی جب ہی توقع کی جاسکتی ہے **جبکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان رہے۔**

پھر آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعاء خوف اور امید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں، لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی کی جانب راجح ہے، کیونکہ رب العالمین اور رحیم الراحمین کے جود واحسان میں کوئی کمی ہے نہ بخل، وہ برے سے برے انسان بلکہ شیطان کی بھی دعاء قبول کر سکتا ہے، ہاں اگر عدم قبولیت کا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ اپنی بداعمالی اور گناہوں کی نحوست سے ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لئے محسن یعنی **نیک عمل ہونا درکار ہے۔**

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، اور اپنی ہیئت فقیرانہ بناتے ہیں، اور اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، مگر ان کا کھانا... بھی حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے اور لباس بھی حرام کا ہے، سو ایسے آدمی کی دعاء کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ **(مسلم، ترمذی، عن ابی ہریرہ)**

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کی دعاء اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعاء نہ کرے، اور جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرام نے دریافت کیا جلد بازی کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصہ سے دعاء مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی، یہاں تک کہ مایوس ہو کر دعاء چھوڑ دے **(مسلم، ترمذی)**

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعاء مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

مراد یہ ہے کہ رحمت خداوندی کی وسعت کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جماؤ کہ میری دعاء ضرور قبول ہوگی، یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کے شامت کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعاء کی قبولیت میں آڑے آجائیں، وصلی اللہ تعالیٰ علی نبینا وسلم۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ

اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے یہاں تک کہ

إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ

جب وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بھاری بادلوں کو ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم

فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ

اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل اسی طرح ہم نکالیں گے مُردوں کو تاکہ

تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ

تم غور کرو ۔ اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے،

وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ

اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں

لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

حق ماننے والے لوگوں کو

خلاصہ تفسیر

اور وہ اللہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ مردوں کو زندہ کرنے کی ثابت ہوتی ہے اس لئے فرمایا) یوں ہی (قیامت کے روز) ہم مردوں کو (زمین سے) نکال کھڑا کریں گے (یہ سب اس لئے سنایا) تاکہ تم سمجھو (اور قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اگرچہ سب کے لئے عام ہے مگر اس سے زندہ اٹھنے والے کم لوگ ہوتے ہیں اس کی مثال ایسی بارش سے سمجھو کہ بارش تو ہر زمین پر برستی ہے مگر کھیتی اور درخت ہر جگہ نہیں پیدا ہوتے صرف ان زمینوں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہو، اسی سے فرمایا کہ) جو زمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار تو خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی تو) بہت کم نکلتی ہے اسی طرح ہم (ہمیشہ) دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں (مگر وہ سب) انہی لوگوں کے لئے نافع ہوتے ہیں جو (ان کی) قدر کرتے ہیں

معارف و مسائل

سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی خاص خاص اور بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جس میں آسمان زمین، رات دن چاند سورج اور عام ستاروں کی پیدائش اور ان کا انسان کی تربیت میں کام کرنے اور اس کی خدمت میں لگے رہنے کا تذکرہ کر کے اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جب ہماری ساری ضروریات اور ساری راحتوں کا سامان کرنے والی ایک ذات پاک ہے، تو ہر حاجت و ضرورت میں ہمیں دعاء و درخواست بھی اسی سے کرنا چاہئے، اور اسی کی طرف رجوع کرنے کو اپنے لئے کلید کامیابی سمجھنا چاہئے۔

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں بھی اسی قسم کی اہم اور بڑی نعمتوں کا ذکر ہے، جن پر انسان اور زمین کی کل مخلوقات کی حیات و بقاء کا مدار ہے، مثلاً بارش اور اس سے پیدا ہونے والے درخت اور کھیتیاں، ترکاریاں وغیرہ، فرق یہ ہے کہ پچھلی آیت میں نعمتوں کا ذکر تھا جو عالم علوی سے متعلق ہیں اور اس میں ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جو عالم سفلی سے متعلق ہیں (بحر محیط)

اور دوسری آیت میں ایک خاص بات یہ بتلائی گئی ہے کہ ہماری یہ عظیم الشان نعمتیں اگرچہ زمین کے ہر حصہ پر عام ہیں، بارش جب برستی ہے تو دریا پر بھی برستی ہے پہاڑ پر بھی، بنجر اور خراب زمین اور عمدہ اور بہتر زمین سب پر یکساں برستی ہے، لیکن کھیتی، درخت، سبزی صرف اسی زمین میں پیدا ہوتی ہے جس میں اگنے کی صلاحیت ہو، پتھریلی اور ریتلی زمینیں اس بارش کے فیض سے مستفید نہیں ہوتیں۔

پہلی آیت سے یہ نتیجہ نکال کر بتلایا گیا کہ جو ذات پاک مردہ زمین میں نشوونما کی زندگی عطا فرما دیتی ہے، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ جو انسان پہلے سے زندہ تھے پھر مر گئے، ان میں دوبارہ زندگی پیدا فرما دے، اسی نتیجہ کو اس آیت میں واضح طور پر بتلا دیا گیا، اور دوسری آیت سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت، آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام پھر ان کے نائب علماء و مشائخ کی تعلیم و تربیت بھی بارش کی طرح ہر انسان کے لئے عام ہے، مگر جس طرح باران رحمت سے ہر زمین فائدہ نہیں اٹھاتی، اسی طرح اس روحانی بارش کا فائدہ بھی صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے، اور جن لوگوں کے قلوب پتھریلی یا ریتلی زمین کی طرح نشوونما کی قابلیت نہیں رکھتے وہ تمام واضح ہدایات اور آیات بینات کے باوجود اپنی گمراہی پر جمے رہتے ہیں۔

اس نتیجہ کی طرف دوسری آیت کے آخری جملہ سے اشارہ فرمایا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ

لِّقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ یعنی ہم اسی طرح پھیر پھیر کر طرح طرح سے بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو قدر کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگرچہ قدرتی دلائل کا یہ بیان تو سب ہی کے لئے تھا مگر نتیجہ کے طور پر مفید ہونا انہی لوگوں کے لئے ثابت ہوا جن میں اس کی صلاحیت ہے، اور وہ اس کی قدر و منزلت پہچانتے ہیں،

اس طرح مذکورہ دو آیتیں مبدأ و معاد کے اہم مسائل پر مشتمل ہوگئیں، اب ان دونوں آیتوں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لئے سنئے، پہلی آیت میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ اس میں ریاح ریح کی جمع ہے جس کے معنی ہوا کے، اور بشر کے معنی بشارت و خوشخبری، اور رحمت سے مراد بارانِ رحمت، یعنی اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے بارانِ رحمت سے پہلے ہوائیں خوشخبری دینے کے لئے۔

مطلب یہ ہے کہ عام عادۃ اللہ یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت و نشاط ہوتی ہے، اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر بھی پہلے دیدیتی ہیں، اس لئے یہ ہوائیں دو نعمتوں کا مجموعہ ہے، خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لئے نافع و مفید ہیں، اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خبر بھی دیدیتی ہیں، کیونکہ انسان ایک لطیف اور نازک مخلوق ہے کہ اس کی بہت سی ضروریات بارش کی وجہ سے بند ہوجاتی ہیں، جب بارش کی اطلاع کچھ پہلے مل جاتی تو وہ اپنا انتظام کرلیتا ہے، اس کے علاوہ خود اس کا وجود اور اس کا سامان بارش کا متحمل نہیں، وہ بارش کے آثار دیکھ کر اپنے سامان اور اپنی جان کی حفاظت کا سامان کرلیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا، سحاب کے معنی بادل اور ثقال ثقیل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بھاری، یعنی جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں بھاری بادلوں سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں جو ہوا کے کاندھوں پر سوار ہوکر اوپر جاتے ہیں، اور اس طرح یہ ہزاروں من کا وزنی پانی ہوا پر سوار ہوکر اوپر پہنچ جاتا ہے، اور حیرت انگیز یہ بات ہے کہ نہ اس میں کوئی مشین کام کرتی ہے نہ کوئی انسان اس میں محنت کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوجاتا ہے تو خود بخود دریا سے بخارات (مان سون) اُٹھنا شروع ہوجاتے ہیں، اور اوپر جاکر بادل بنتا ہے، اور یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں گیلن پانی سے بھرا ہوا جہاز خود بخود ہوا کے دوش پر سوار ہوکر آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ، سَوق کے معنی کسی جانور کو ہانکنے اور چلانے کے ہیں، اور بلد کے معنی شہر اور بستی کے ہیں، میّت کے معنی مردہ۔

معنی یہ ہیں کہ جب ہواؤں نے بھاری بادلوں کو اٹھا لیا تو ہم نے ان بادلوں کو ہانک دیا ایک مرے ہوئے شہر کی طرف، مرے ہوئے شہر سے مراد وہ بستی ہے جو پانی نہ ہونے کے سبب ویران ہو رہی ہے، اور اس جگہ بجائے عام زمین کے خصوصیت سے شہر اور بستی کا

ذکر کرنا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد برق و باراں اور ان سے زمین کی سیرابی کا انسان کی ضروریات مہیا کرنا ہے جس کا مسکن شہر ہی ہو، ورنہ جنگل کی سرسبزی خود کوئی مقصد نہیں۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے مضمون سے چند چیزیں ثابت ہوئیں: اوّل یہ کہ بارش بادلوں سے برستی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیات میں آسمان سے بارش برسانا مذکور ہے وہاں بھی لفظ سماء سے بادل مراد ہے، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت دریائی مان سون کی بجائے براہ راست آسمان سے بادل پیدا ہو جائیں اور ان سے بارش ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ بادلوں کا کسی خاص سمت اور خاص زمین کی طرف جانا یہ براہ راست حکم خداوندی سے متعلق ہے وہ جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں جس قدر چاہتے ہیں بارش برسانے کا حکم دیدیتے ہیں، بادل فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں۔

اس کا مشاہدہ ہر جگہ اس طرح ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات کسی شہر یا بستی پر بادل چھایا رہتا ہے، اور وہاں بارش کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن وہ بادل یہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں دیتا، بلکہ جس شہر یا بستی کا کوٹہ بحکمِ الٰہی مقرر ہو چکا ہے وہیں جاکر برستا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس شہر کے علاوہ کسی اور جگہ اس بادل کا پانی حاصل کرلے۔

قدیم و جدید فلاسفہ نے مان سون اور ہواؤں کی حرکت کے لئے کچھ ضابطے اور اصول نکال رکھے ہیں، جن کے ذریعہ وہ بتلا دیتے ہیں کہ فلاں مان سون جو فلاں سمندر سے اٹھا ہے کس طرف جائے گا کہاں جاکر برسے گا، کتنا پانی برسائے گا، عام ممالک میں موسمیات کے محکمے اسی قسم کی معلومات مہیا کرنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ محکمہ موسمیات کی بہت سی خبریں بکثرت غلط ہو جاتی ہیں، اور جب امرِ الٰہی ان کے خلاف ہوتا ہے تو ان کے سارے ضابطے قاعدے دھرے رہ جاتے ہیں، ہوائیں اور مان سون اپنا رخ ان کی دی ہوئی خبروں کے خلاف کسی دوسرے سمت کو پھیر لیتی ہیں، اور موسمیات کے محکمے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو ضابطے قاعدے ہواؤں کی حرکت کے لئے فلاسفہ نے تجویز کئے ہیں وہ بھی کچھ اس کے منافی نہیں ہیں کہ بادلوں کا حمل و نقل فرمانِ الٰہی کے تابع ہے، کیونکہ عادت اللہ تعالیٰ کی اس عالم کے تمام کاروبار میں یہی ہے کہ حکمِ خداوندی اسبابِ طبعیہ کے پردوں میں ظاہر ہوتا ہے، ان اسبابِ طبعیہ سے انسان کوئی ضابطہ قاعدہ بنالیتا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو حافظ شیرازیؒ نے بتلائی ہے کہ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں ❊ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اس کے بعد ارشاد فرمایا: فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ، یعنی

ہم نے اس مُردہ شہر میں پانی برسایا پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پھول نکالے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، یعنی ہم اسی طرح نکالیں گے مُردوں کو قیامت کے روز، شاید تم سمجھو، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے مُردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں سے درخت اور پھل پھول نکالے اسی طرح بروز قیامت مُردوں کو دوبارہ زندہ کرکے نکال کھڑا کریں گے، اور یہ مثالیں ہم نے اس لئے بیان کی ہیں کہ تمہیں سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملے۔

بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا، پہلے صور پر تمام عالم فنا ہو جائے گا کوئی چیز زندہ باقی نہ رہے گی، اور دوسرے صور پر پھر از سر نو نیا عالم پیدا ہوگا، اور سب مُردے زندہ ہو جائیں گے، حدیث مذکور میں ہے کہ ان دونوں مرتبہ کے صور کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اور ان چالیس سال میں مسلسل بارش جاری رہے گی، اسی عرصہ میں ہر مُردہ انسان اور جانور کے اجزاء بدن اس کے ساتھ جمع کرکے ہر ایک کا مکمل ڈھانچہ بن جائے گا، اور پھر دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ان لاشوں کے اندر روح آجائے گی اور زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے، اس روایت کا اکثر حصہ بخاری و مسلم میں موجود ہے بعض اجزاء ابن ابی داؤد کی کتاب البعث سے لئے گئے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۔ نَکِد کہتے ہیں اس چیز کو جو بے فائدہ بھی ہو اور کچھ مقدار میں بھی قلیل ہو، معنی یہ ہیں کہ اگرچہ باران رحمت کا فیض ہر شہر ہر زمین پر یکساں ہوتا ہے لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک عمدہ اور اچھی زمین جس میں نشوونما کی صلاحیت ہے، اس میں تو ہر طرح کے پھول پھل نکلتے ہیں اور فوائد حاصل ہوتے ہیں، دوسری وہ سخت یا کھاری زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں، اس میں اول تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا، پھر اگر کچھ ہو بھی تو وہ بہت کم مقدار میں ہوتا ہے، اور جتنا پیدا ہوتا ہے وہ بھی بیکار اور خراب ہوتا ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ، یعنی ہم اپنے دلائل قدرت طرح طرح سے بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو قدر کرنے والے ہیں۔

اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ باران رحمت کے فیضان عام کی طرح ہدایت ربانی اور آیات بینات کا فیض بھی سب ہی انسانوں کے لئے عام ہے، مگر جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی اسی طرح ہر انسان ہدایت ربانی سے نفع حاصل نہیں کرتا، بلکہ نفع صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو شکرگزار اور قدرشناس ہیں۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ

بیشک بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی

مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ

کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا میں خوف کرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے

عَظِيۡمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰٮكَ فِىۡ ضَلٰلٍ

عذاب سے۔ بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح

مُّبِيۡنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ ضَلٰلَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ

بہکا ہوا۔ بولا اے میری قوم میں ہرگز بہکا نہیں و لیکن میں بھیجا ہوا ہوں

رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنۡصَحُ لَـكُمۡ وَاَعۡلَمُ

جہان کے پروردگار کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ

اللہ کی طرف سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے

رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۶۳﴾

رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم ہو۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ فِى الۡـفُلۡكِ وَاَغۡرَقۡنَا

پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور ان کو کہ جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور غرق کر دیا

الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا عَمِيۡنَ ﴿۶۴﴾ ع

ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو، بیشک وہ لوگ تھے اندھے۔

ع ۸ / ۱۵

خلاصۂ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) ان کی قوم کی طرف بھیجا سو انہوں نے (اس قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بتوں کی پرستش چھوڑ دو جن کا نام سورۂ نوح میں ہے وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) مجھ کو تمہارے لئے (درصورت میرا کہنا نہ ماننے کے) ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (کہ وہ یوم قیامت ہے

یا یوم طوفان) ان کی قوم کے آبرودار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب کا ڈراوا دکھا رہے ہو) انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں انہوں نے مجھ کو توحید پہنچانے کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام اور احکام پہنچاتا ہوں (اور اس پہنچانے میں میری کوئی دنیوی غرض نہیں بلکہ محض) تمہاری خیرخواہی کرتا ہوں (کیونکہ توحید میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (عذاب یوم عظیم سے جو تم کو تعجب ہوتا ہے تو تمہاری غلطی ہے کیونکہ میں خدا کی طرف سے ان اُمور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں (تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ایمان نہ لانے سے عذاب یوم عظیم واقع ہوگا) اور (تم کو جو میرے رسول ہونے پر بوجہ میرے بشر ہونے کے انکار ہے جیسا سورۂ مؤمنون میں تصریح ہے مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ، تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات یہی ہے جو مذکور ہوئی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الی قولہ اِنِّیْٓ اَخَافُ) تاکہ وہ شخص تم کو (بحکم خداوندی عذاب سے) ڈراوے اور تاکہ تم (اس کے ڈرانے سے) ڈر جاؤ اور تاکہ (ڈرنے کی وجہ سے مخالفت چھوڑ دو جس سے) تم پر رحم کیا جائے سو (باوجود اس تمام تر فہمائش کے) وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (طوفان کے عذاب سے) بچالیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے (طوفان میں) غرق کردیا بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے (حق و باطل، نفع نقصان کچھ نہ سوجھتا تھا)۔

معارف و مسائل

سورہ اعراف کے شروع سے یہاں تک اصولِ اسلام توحید، رسالت، آخرت کا مختلف عنوانات اور دلائل سے ثبوت اور لوگوں کو اتباع کی ترغیب اور اُس کی مخالفت پر وعید اور ترہیب اور اُس کے ضمن میں شیطان کے گمراہ کن مکر و فریب وغیرہ کا بیان تھا اب آٹھویں رکوع سے تقریباً آخر سورت تک چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر ہے جس میں تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طور پر اصول مذکورہ توحید، رسالت، آخرت کی طرف اپنی اپنی امتوں کو دعوت دینا اور ماننے والوں کے اجر و ثواب اور نہ ماننے والوں پر طرح طرح کے

عذاب اور ان کے انجام بد کا مفصل بیان تقریباً چودہ رکوع میں آیا ہے جس کے ضمن میں سیکڑوں اصولی اور فروعی مسائل بھی آگئے ہیں۔ اور موجودہ اقوام کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا سامان ہو گیا کہ پہلے سب رسولوں کے ساتھ ایسے ہی معاملات ہوتے رہے ہیں۔

آیات مذکورہ سورۂ اعراف کا آٹھواں رکوع پورا ہے۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور انکی اُمّت کے حالات و مقالات کا بیان ہے۔

سلسلۂ انبیاء میں سب سے پہلے نبی اگرچہ آدم علیہ السلام ہیں لیکن اُن کے زمانہ میں کفر و ضلالت کا مقابلہ نہ تھا اُن کی شریعت میں زیادہ تر احکام بھی زمین کی آبادکاری اور انسانی ضروریات کے متعلق تھے کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے۔ کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا۔ اور رسالت و شریعت کی حیثیت سے دنیا میں وہ سب سے پہلے رسول ہیں۔ اس کے علاوہ طوفان میں پوری دنیا غرق ہو جانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے رفقاء سفینہ تھے اُنھیں سے نئی دنیا آباد ہوئی اسی لئے اُن کو آدم اصغر کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصص انبیاء کا آغاز بھی انہیں سے کیا گیا ہے جس میں ساڑھے نو سو برس کی طویل عمر میں اُن کی پیغمبرانہ جدوجہد اور اس پر اکثر اُمت کی کجروی اور اس کے نتیجہ میں بجز تھوڑے سے مؤمنین کے باقی سب کا غرق ہونا بیان ہوا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ

نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی آٹھویں پُشت میں ہیں۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے (تفسیر مظہری) قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہو گیا۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی ہے اور بتصریح قرآن ان کی عمر نو سو پچاس سال ہوئی۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپّن سال ہو جاتے ہیں ؎ (مظہری) نوح علیہ السلام کا اصلی نام شاکر

؎ یہ مدت مظہری (ص ۳۶۰ ج ۳) سے لیگئی ہے، لیکن بظاہر اس کے حساب میں غلطی ہوئی ہے خود مظہری کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق حضرت نوحؑ کی کل عمر ۱۰۵۰ سال ہوئی، کیونکہ ۹۵۰ سال جو قرآن میں مذکور ہیں وہ تبلیغ نبوت کے بعد طوفان سے پہلے کی مدت پر مشتمل ہیں نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی، اور طوفان کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ رہے۔ اس طرح کل مدت ۲۸۵۶ کے بجائے ۲۹۳۶ سال بنتی ہے، اور اگر حضرت نوحؑ کی کل عمر ۱۰۵۰ کے بجائے ۹۵۰ قرار دی جائے جیسا کہ مصنف نے ذکر کیا ہے تو کل مدت ۲۸۳۶ قرار پاتی ہے۔ محمد تقی عثمانی ۔ ۲ ۔ ۴۲۵ھ

اور بعض روایات میں شکن اور بعض میں عبدالغفار آیا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے ہے یا بعد میں۔ اکثر صحابہ کا قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام سے پہلے ہیں (بحر محیط)۔

مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔

آیت قرآن لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت ونبوت صرف اپنی قوم کے لئے تھی ساری دنیا کے لئے عام نہ تھی اور ان کی قوم عراق میں آباد بظاہر مہذب مگر شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ یہ تھی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ اس کے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت ہے جو اصل اصول ہے۔ دوسرے جملہ میں شرک وکفر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے جو اس قوم میں وباء کی طرح پھیل گیا تھا۔ تیسرے جملہ میں اس عذاب عظیم کے خطرہ سے آگاہ کرنا ہے جو خلاف ورزی کی صورت میں ان کو پیش آنے والا ہے۔ اس عذاب عظیم سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں طوفان کا عذاب بھی۔ (کبیر)

ان کی قوم نے اس کے جواب میں کہا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ لفظ ملاء قوم کے سرداروں اور برادریوں کے چودھریوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں **قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں** کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزاء وسزا پانے کے خیالات یہ سب اوہام ہیں۔

اس دل آزار ودلخراش گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجہ میں جو جواب دیا وہ مبلغین اور مصلحین کے لئے ایک اہم تعلیم وہدایت ہے کہ اشتعال کی بات پر مشتعل اور غضبناک ہونے کے بجائے سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا ازالہ فرما رہے ہیں۔ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

یعنی اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں مگر بات یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آبائی رسوم جہالت کا پابند نہیں بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں جو کچھ کہتا ہوں ہدایت ربی سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچاتا ہوں جس میں تمہارا ہی بھلا ہے نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ اور نہ میری کوئی غرض۔ اس میں رب العالمین کا لفظ عقیدہ شرک پر ضرب کاری ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد نہ کوئی دیوی اور دیوتا ٹھہر سکتا ہے نہ کوئی یزدان و اہرمن۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم کو جو قیامت کے عذاب میں شبہات ہیں اُس کی وجہ تمہاری بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کا علم یقین دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے شبہ کا جواب ہے جو سورۂ مؤمنون میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً الخ یعنی ان کی قوم نے نوح علیہ السلام کی دعوت پر ایک شبہ یہ بھی کیا کہ یہ تو ہماری ہی طرح ایک بشر اور انسان ہیں ہماری ہی طرح کھاتے پیتے سوتے جاگتے ہیں ان کو ہم کیسے اپنا مقتدا مان لیں اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغام بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ یعنی کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے رب کا پیغام تمہاری طرف ایک ایسے شخص کی معرفت آیا جو تمہاری ہی جنس کا ہے تاکہ وہ تمہیں ڈراوے اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اُس کے ڈرانے سے تم متنبہ ہو کر مخالفت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تم پر رحمت نازل ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بشر کو رسول بنایا جائے۔ اول تو حق تعالیٰ مختار مطلق ہیں جس کو چاہیں اپنی نبوت و رسالت عطا فرمائیں اس میں کسی کو چون چرا کی مجال نہیں۔ اس کے علاوہ اصل معاملہ پر غور کرو تو واضح ہو جائے کہ عام انسانوں کی طرف رسالت و نبوت کا مقصد بشر ہی کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اصل مقصد رسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کردیا جائے اور اس کے احکام کی مخالفت سے بچایا جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کی جنس بشر کا کوئی شخص نمونۂ عمل بن کر ان کو دکھلائے کہ بشری تقاضوں اور خواہشوں

کے ساتھ بھی احکام الٰہیہ کی اطاعت اور اس کی عبادت بجا ہو سکتی ہے۔ اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی مثال لوگوں کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر ظاہر تھا کہ فرشتے تو بشری خواہشات سے پاک ہیں نہ ان کو بھوک پیاس لگتی ہے نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے اُن کی طرح ہم کیسے بن جائیں۔ لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس بشر تمام بشری خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود ان احکام الٰہیہ کی مکمل اطاعت کر کے دکھلائے تو اُن کے لئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے ڈرانے سے متاثر ہو کر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہم جنس اور ان کی طرح بشری خصوصیات کا جامع ہو۔ یہ شبہ اکثر امتوں کے کفار نے پیش کیا کہ کوئی بشر نبی اور رسول نہیں ہونا چاہئے اور قرآن نے سب کا یہی جواب دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن کی اتنی تصریحات کے باوجود آج بھی کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ مگر جاہل انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ کسی اپنے ہم جنس کی برتری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ہمعصر اولیاء اور علماء سے ان کی معاصرت کی بنا پر نفرت و حقارت کا برتاؤ جاہلوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

قوم نوح علیہ السلام کے دل خراش کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ بھی جب ان کی بد حس قوم پر اثر انداز نہ ہوا بلکہ الٹے ان کو جھٹلانے ہی میں لگے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا۔ ارشاد فرمایا،

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ۔ یعنی نوح علیہ السلام کی تمام قوم نے ان کی نصیحت و خیرخواہی کی کوئی پرواہ نہ کی اور برابر اپنی تکذیب پر جمے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا۔ بے شک یہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور اُن کی قوم کی غرقابی اور کشتی والوں کی نجات کی پوری تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود میں آئے گی۔ اس جگہ بتقاضائے مقام اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب اُس وقت آیا جب کہ وہ اپنی کثرت و قوت کے اعتبار سے بھرپور تھے۔ عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ اُن کی کثرت کے سبب تنگ ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو

ڈھیل دیتے رہتے ہیں، عذاب اُس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت، قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں اور اس میں بدمست ہو جائیں۔ (ابن کثیر)

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے اس میں روایات مختلف ہیں۔ ابن کثیرؒ نے بروایت ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اسّی آدمی تھے جن میں ایک کا نام جُرہم تھا یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ اسّی کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اُس بستی کا نام ثمانون مشہور ہو گیا۔

غرض اس جگہ نوح علیہ السلام کا مختصر قصہ بیان فرما کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ تمام انبیاء قدیم کی دعوت اور اصول عقائد ایک ہی تھے۔ دوسرے یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی تائید و حمایت کس طرح حیرت انگیز طریقہ پر کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے طوفان میں بھی ان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے جس طرح پچھلی امتیں تکذیب انبیاء کے سبب عذاب میں گرفتار ہو گئیں آج کے لوگوں کو بھی اُس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ

اور قوم عاد کی طرف بھیجا اُن کے بھائی ہود کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن

معبود اس کے سوا، سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ بولے سردار جو کافر تھے اُس

قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾

کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ

بولا اے میری قوم میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار

الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾

عالم کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیرخواہ ہوں اطمینان کے لائق۔

أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ

کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ تم کو ڈرائے،

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي

اور یاد کرو جبکہ تم کو سردار کر دیا پیچھے قوم نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے

الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا

بدن کا پھیلاؤ، سو یاد کرو احسان اللہ کے تاکہ تمہارا بھلا ہو، بولے

أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۖ

کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے،

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ

پس لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ کہا تم پر واقع

عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ

ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ، کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ

سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ

رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند،

فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٧١﴾ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ

سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جو

مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ

اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور جڑ کاٹی ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو

وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٧٢﴾ ع

اور نہیں مانتے تھے۔

۹ ع ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم صرف اللہ کی

عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں، اور بت پرستی چھوڑ دو جیسا آگے وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا سے معلوم ہوتا ہے) سو کیا تم ایسے بڑے جرم عظیم یعنی شرک کے مرتکب ہو کر عذاب الٰہی سے، نہیں ڈرتے ان کی قوم میں جو آبرو دار لوگ کافر تھے انہوں نے (جواب میں) کہا کہ ہم تم کو کم عقلی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب سے ڈرا رہے ہو) اور ہم بیشک تم کو جھوٹے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں (یعنی نعوذ باللہ نہ تو توحید صحیح مسئلہ ہے اور نہ عذاب کا آنا صحیح ہے) انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں لیکن چونکہ میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں (انہوں نے مجھ کو تعلیم توحید اور انذار عذاب کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام اور احکام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ امانت دار ہوں کیونکہ توحید و ایمان میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (تم جو میرے بشر ہونے سے میری نبوت کا انکار کرتے ہو جیسا سورۂ ابراہیم میں بعد ذکر قوم نوح و عاد و ثمود کے ہے قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور سورۂ فصلت میں بعد ذکر عاد و ثمود کے ہے قَالُوْا لَوْ شَاۗءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات وہی ہے جو مذکور ہوئی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الیٰ قولہ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ تاکہ وہ شخص تم کو (عذاب الٰہی سے) ڈرا دے، یعنی یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیا بشریت و نبوت میں منافاۃ ہے اور اَفَلَا تَتَّقُوْنَ میں ترہیب تھی آگے ترغیب ہے) اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ (بھی) زیادہ دیا سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) تاکہ تم کو (ہر طرح کی) فلاح ہو وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا (خوب) آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کیا کریں اور جن (بتوں) کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ہم ان (کی عبادت) کو چھوڑ دیں (یعنی ہم ایسا نہ کریں گے) اور (ہم کو نہ ماننے پر) جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو (جیسا اَفَلَا تَتَّقُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے) اس (عذاب) کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو انہوں نے فرمایا کہ (تمہاری سرکشی کی جب یہ حالت ہے تو) بس اب تم پر خدا کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے (پس عذاب کے شبہ کا جواب تو اس وقت معلوم ہو جائے گا اور باقی توحید پر جو شبہ ہے کہ ان بتوں کو معبود کہتے ہو جن کا نام تو تم نے معبود

رکھ لیا ہے، لیکن واقع میں ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل ہی نہیں تو کیا تم مجھ سے ایسے (بے حقیقت) ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو یعنی وہ مسمیات بمنزلہ محض اسماء کے ہیں، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے آپ ہی ٹھہرا لیا ہے (لیکن ان کے معبود ہونے کی خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل (نقلی یا عقلی) نہیں بھیجی (یعنی جدال میں مدعی کے ذمہ دلیل ہے اور مقابل کی دلیل کا جواب بھی، سو تم نہ دلیل قائم کر سکتے ہو نہ میری دلیل کا جواب دے سکتے ہو پھر جدال کا کیا معنی) سو تم (اب جدال ختم کرو اور عذاب الٰہی کے) منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر کر رہا ہوں غرض (عذاب آیا اور) ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (یعنی مؤمنین کو) اپنی رحمت (و کرم) سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ تک کاٹ دی (یعنی بالکل ہلاک کر دیا) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ (بوجہ غایت قساوت کے) ایمان لانے والے نہ تھے (یعنی اگر ہلاک بھی نہ ہوتے جب بھی ایمان نہ لاتے اس لئے ہم نے بمقتضائے اس وقت کی حکمت کے خاتمہ ہی کر دیا)۔

معارف و مسائل

عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ | عاد اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور ان کے بیٹے سام کی اولاد میں ہے۔ پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم عاد کے نام سے مشہور ہوگئی۔ قرآن کریم میں عاد کے ساتھ کہیں لفظ عاد اولیٰ اور کہیں ارم ذات العماد بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کو ارم بھی کہا جاتا ہے۔ اور عاد اولیٰ کے مقابلہ میں کوئی عاد ثانیہ بھی ہے، اس کی تحقیق میں مفسرین اور مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ عاد کے دادا کا نام ارم ہے اس کے ایک بیٹے یعنی عوص کی اولاد میں عاد ہے یہ عاد اولیٰ کہلاتا ہے اور دوسرے بیٹے جثر کا بیٹا ثمود ہے یہ عاد ثانی کہلاتا ہے۔ اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عاد اور ثمود دونوں ارم کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کو عاد اولیٰ اور دوسری کو ثمود یا عاد ثانیہ بھی کہا جاتا ہے اور لفظ ارم عاد و ثمود دونوں کے لئے مشترک ہے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قوم عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اس کو عاد اُخریٰ کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

اور ہود علیہ السلام ایک نبی کا نام ہے یہ بھی نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور سام کی اولاد میں ہیں قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ چوتھی پشت میں سام پر

جمع ہو جاتا ہے اسی لئے ہود علیہ السلام عاد کے نسبی بھائی ہیں اسی لئے اَخَاهُمْ هُوْدًا فرمایا گیا۔

قوم عاد کے تیرہ خاندان تھے۔ عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں۔ ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں ہر قسم کے باغات تھے۔ رہنے کے لئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے۔ بڑے قد آور قوی ہیکل آدمی تھے آیتِ مذکورہ میں زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری ہی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے۔ مگر ان کی کج فہمی نے انھیں نعمتوں کو ان کے لئے وبال جان بنا دیا۔ اپنی قوت و شوکت کے نشہ میں بدمست ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کی ڈینگ مارنے لگے۔

اور رب العالمین جس کی نعمتوں کی بارش ان پر ہو رہی تھی اس کو چھوڑ کر بُت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ جو خود انھیں کے خاندان سے تھے۔ اور ابوالبرکات جونی جو انساب عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں اُنھوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں جو یمن میں جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انھیں کی نسل ہیں۔ اور عربی زبان کی ابتداء انھیں سے ہوئی اور یعرب کی مناسبت سے ہی زبان کا نام عربی اور اس کے بولنے والوں کو عرب کہا گیا۔ (بحر محیط)

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہدِ نوح علیہ السلام سے جاری تھی کشتی نوح علیہ السلام کے ایک رفیق جرہم تھے جو عربی زبان بولتے تھے (بحر محیط)۔ اور یہی جرہم ہیں جن سے مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتدا یعرب بن قحطان سے ہوئی اور ابوالبرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو بت پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور ظلم و جور چھوڑ کر عدل و انصاف اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ مگر یہ لوگ اپنی دولت و قوت کے نشہ میں سرشار تھے۔ بات نہ مانی جس کے نتیجہ میں اُن پر پہلا عذاب تو یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہو گئی۔ ان کی زمینیں خشک ریگستانی صحرا بن گئیں باغات جل گئے۔ مگر اس پر بھی یہ لوگ شرک و بت پرستی سے باز نہ آئے تو آٹھ دن اور سات راتوں تک ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلّط ہوا جس نے ان کے رہے سہے باغات اور محلات کو زمین پر بچھا دیا ان کے آدمی اور جانور ہوا میں اُڑتے اور پھر سر کے بل آ کر گرتے تھے۔ اس طرح یہ قوم عاد پوری کی پوری ہلاک کر دی گئی۔ آیاتِ مذکورہ میں جو ارشاد ہے وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

یعنی ہم نے جھٹلانے والوں کی نسل قطع کردی اس کا مطلب بعض حضرات نے یہی قرار دیا ہے کہ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب فنا کر دیئے گئے۔ اور بعض حضرات نے اس لفظ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ آئندہ کے لئے بھی قوم عاد کی نسل اللہ تعالیٰ نے منقطع کردی۔

حضرت ہود علیہ السلام کی بات نہ ماننے اور کفر و شرک میں مبتلا رہنے پر جب ان کی قوم پر عذاب آیا تو ہود علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے ایک حظیرہ (گھیر) میں پناہ لی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوا سے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہو رہے تھے مگر اس گھیر میں ہوا نہایت معتدل ہو کر داخل ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام کے سب رفقاء عین نزول عذاب کے وقت بھی اسی جگہ مطمئن بیٹھے رہے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ قوم کے ہلاک ہوجانے کے بعد مکہ معظمہ میں منتقل ہو گئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ (بحر محیط)

قوم عاد کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں تو قرآن مجید میں صراحۃً مذکور اور منصوص ہے اور سورۂ مومنون میں قصہ نوح علیہ السلام ذکر کرنے کے بعد جو ارشاد ہوا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ یعنی پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور جماعت پیدا کی، ظاہر یہ ہے کہ اس جماعت سے مراد قوم عاد ہے۔ پھر اس جماعت کے اعمال و اقوال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ یعنی پکڑ لیا ان کو ایک سخت آواز نے۔ اس ارشادِ قرآنی کی بنا پر بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ قوم عاد پر سخت قسم کی ہیبتناک آواز کا عذاب مُسلط ہوا تھا مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سخت آواز بھی ہوئی ہو اور ہوا کا طوفان بھی۔

یہ مختصر واقعہ ہے قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا اس کی تفصیل قرآنی الفاظ کے ساتھ یہ ہے۔

پہلی آیت میں وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا تو انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں۔

قوم عاد سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کا عذاب عظیم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے غائب نہ ہوا تھا اس لئے حضرت ہود علیہ السلام کو عذاب کی شدت و عظمت بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی صرف اتنا فرمانا کافی سمجھا کہ کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

دوسری آیت میں ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ - یعنی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تقریباً ایسا ہی معارضہ ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا صرف بعض الفاظ کا فرق ہے۔ تیسری اور چوتھی آیت میں اس کا جواب بھی تقریباً اُسی انداز کا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ مجھ میں بے وقوفی کچھ نہیں بات صرف اتنی ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کر آیا ہوں اُس کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر تمہارا خیرخواہ ہوں۔ اس لئے تمہاری آبائی جہالتوں اور غلطیوں میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے میں تمہارے طبائع کے خلاف حق بات تمہیں پہنچاتا ہوں جس سے تم بُرا مانتے ہو۔

پانچویں آیت میں قوم عاد کا وہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے جو ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام نے پیش کیا تھا کہ ہم کسی اپنے ہی جیسے بشر اور انسان کو کیسے اپنا بڑا اور پیشوا مان لیں کوئی فرشتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم مان لیتے۔ اس کا جواب بھی قرآن کریم نے وہی ذکر کیا جو نوح علیہ السلام نے دیا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی انسان اللہ کا نبی و رسول ہو کر لوگوں کو ڈرانے کے لئے آجائے۔ کیونکہ درحقیقت انسان کے سمجھانے بجھانے کے لئے انسان ہی کا **پیغمبر ہونا مؤثر ہوسکتا ہے۔**

اس کے بعد ان کو وہ انعامات یاد دلائے جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر مبذول فرمائے ہیں ارشاد فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ یعنی اس بات کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد زمین کا مالک و متصرف بنا دیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ اُس کی **ان نعمتوں کو یاد کرو تو تمہارا بھلا ہوگا۔**

مگر اس سرکش بدمست قوم نے ایک نہ سنی اور وہی جواب دیا جو عام طور پر گمراہ لوگ دیا کرتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے ہمارے باپ دادا کا مذہب چھڑا دو اور سارے دیوتاؤں کو چھوڑ کر ہم صرف ایک خدا کو ماننے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ آپ جس عذاب کی دھمکی ہمیں دے رہے ہیں اس عذاب کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

چھٹی آیت میں ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب تمہاری سرکشی اور بے ہوشی کی یہ حالت ہے تو اب تم پر خدا تعالیٰ کا غضب اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی اب اُسی کا انتظار کرتے ہیں۔ قوم کے اس اشتعال آمیز جواب پر عذاب آنے کی خبر تو دے دی لیکن پیغمبرانہ شفقت و نصیحت نے پھر مجبور کیا کہ اس کلام کے دوران میں یہ بھی

فرمایا کہ افسوس ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بے عقل بے جان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیا جن کے معبود ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی اور پھر تم ان کی عبادت میں ایسے پختہ ہوگئے کہ ان کی حمایت میں مجھ سے جھگڑا کر رہے ہو۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہود علیہ السلام کی ساری جدوجہد اور عاد قوم کی سرکشی کا آخری انجام یہ ہوا کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے عذاب سے محفوظ رکھا اور جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

اس قصہ میں غافل انسانوں کے لئے خدا کی یاد اور طاعت میں لگ جانے کی ہدایت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سامان عبرت اور مبلغین و مصلحین کے لئے پیغمبرانہ طریقہ تبلیغ و اصلاح کی تعلیم ہے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
اور ثمود کی طرف بھیجا اُن کے بھائی صالح کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ
معبود اس کے سوا، تم کو پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ اونٹنی

اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ

بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ
بری طرح، پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک۔ اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار

خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ
کردیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ بناتے ہو

مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا
نرم زمین میں محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سو یاد کرو

اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ
احسان اللہ کے اور مت پھرو زمین میں فساد مچاتے۔ کہنے لگے سردار

الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ
جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان

مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا

لا چکے تھے کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اُس کے رب نے ، بولے ہم کو

بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ

تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے ۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو

اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے ۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (انہوں نے ایک خاص معجزہ کی درخواست کی کہ اس پتھر میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں چنانچہ آپ کی دُعا سے ایسا ہی ہوا کہ وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اونٹنی نکلی۔ رواہ محمد بن اسحٰق۔ آپ نے فرمایا کہ) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل (میرے رسول ہونے کی) آچکی ہے (آگے اس کا بیان ہے) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بن کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل ہے) سو (علاوہ اس کے کہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آپکڑے اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کرکے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (قوم) عاد کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو (دلخواہ) ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر (بھی بڑے بڑے) محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (بھی) گھر بناتے ہو سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو اور دوسری نعمتوں کو بھی) یاد کرو (اور کفر و شرک کے ذریعہ) زمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی ایمان لے آؤ مگر باوجود اس قدر فہمائش کے کچھ غرباء ایمان لائے اور ان میں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی یعنی) ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے

ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے (پیغمبر بنا کر) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں انہوں نے (جواب میں) کہا کہ بیشک ہم تو اس (حکم) پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کے حالات کا تذکرہ ہے جیسے اس سے پہلے قوم نوح اور قوم ہود علیہما السلام کا ذکر آچکا ہے اور سورۂ اعراف کے آخر تک بھی انبیاء سابقین اور ان کی قوموں کے احوال انبیاء کی دعوتِ حق پر ان کے کفر و انکار کے انجام بد کا بیان ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا اس سے پہلے قوم عاد کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں ایک قوم عاد دوسری قوم ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے تھے اور ان کے بڑے شہر کا نام حجر تھا جس کو اب عموماً مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی دولتمند، قوی اور بہادر قوم اور سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں ماہر تھی کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر ان میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر ارمی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔

دنیا کی دولت و ثروت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو کر غلط رستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ قوم ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔

حالانکہ ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کے عذاب کے واقعات کا تذکرہ ابھی تک دنیا میں موجود تھا اور پھر ان کے بھائی قوم عاد کی ہلاکت کے واقعات تو تازہ ہی تھے۔ مگر دولت و قوت کے نشہ کا خاصہ ہی یہ ہے کہ ابھی ایک شخص کی بنیاد منہدم ہوتی ہے دوسرا اس کی خاک کے ڈھیر پر اپنی تعمیر کھڑی کر لیتا ہے اور پہلے کے واقعات کو بھول جاتا ہے۔ قوم عاد کی تباہی اور ہلاکت کے بعد قوم ثمود ان کے مکانات اور زمینوں کی وارث بنی اور انہیں مقامات پر اپنے عشرت کدے تیار کئے جن میں ان کے بھائی ہلاک ہو چکے تھے اور ٹھیک وہی اعمال و افعال شروع کر دیئے جو قوم عاد نے کئے تھے کہ خدا و آخرت سے غافل ہو کر شرک و بت پرستی میں لگ گئے

اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ صالح علیہ السلام نسب و وطن کے اعتبار سے قوم ثمود ہی کے ایک فرد تھے۔ کیونکہ یہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے اسی لئے قرآن کریم میں ان کو قوم ثمود کا بھائی فرمایا ہے اَخَاهُمْ صٰلِحًا۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ وہی دعوت ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک سب انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور بت پرستی سے بچو۔ عام انبیاء سابقین کی طرح صالح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور خالق و مالک سمجھو اس کے سوا کوئی معبود بنانے کے لائق نہیں۔ فرمایا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ یعنی اب تو ایک کھلا ہوا نشان بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آپہنچا ہے۔ اس نشان سے مراد ایک عجیب و غریب ناقہ ہے جس کا اجمالی ذکر اس آیت میں بھی ہے اور قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں اُس کی مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ واقعہ اس ناقہ کا یہ تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی کے زمانہ سے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دینا شروع کی اور برابر اس میں لگے رہے یہاں تک کہ بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے۔ صالح علیہ السلام کے بار بار اصرار سے تنگ ہو کر ان کی قوم نے یہ قرار دیا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کرو جس کو یہ پورا نہ کر سکیں اور ہم ان کی مخالفت میں سرخرو ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام کاتبہ تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال دیجئے جو دس مہینہ کی گابھن ہو اور قوی و تندرست ہو۔

صالح علیہ السلام نے اول ان سے عہد لیا کہ اگر میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کرا دوں تو تم سب مجھ پر اور میری دعوت پر ایمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کر لیا۔ تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کے لئے تو کوئی کام دشوار نہیں ان کا مطالبہ پورا فرما دیں۔ دعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اُسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔

صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر اُن میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے۔ اور باقی تمام قوم نے بھی ارادہ کر لیا کہ ایمان لے آئیں۔ مگر قوم کے چند سردار جو

بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے امام تھے انھوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آجائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بناء پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آجائے گا یہی مضمون آیت مذکورہ کے ان جملوں میں ارشاد ہوا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یعنی یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے۔ اور اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگاؤ، ورنہ تم کو عذاب الیم آپکڑے گا اس ناقہ کو ناقۃ اللہ اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ کی دلیل اور صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر حیرت انگیز طریق سے پیدا ہوئی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ فرمایا گیا کہ ان کی پیدائش بھی معجزانہ انداز سے ہوئی تھی۔ تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمھاری ملک اور تمھارے گھر سے کچھ نہیں جاتا زمین اللہ کی ہے اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے اس کی اونٹنی کو اس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگاہوں میں کھاتی رہے۔

قوم ثمود جس کنوئیں سے پانی پیتے پلاتے تھے اسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ عجیب الخلقۃ اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنوئیں کا پانی ختم کر دیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے باذن ربانی یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے اور جس روز یہ اونٹنی پانی پیئے گی تو دوسروں کو پانی کے بجائے اونٹنی کا دودھ اتنی مقدار میں مل جاتا تھا کہ وہ اپنے سارے برتن اس سے بھر لیتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس تقسیم کا ذکر اس طرح آیا ہے وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ۔ یعنی صالح علیہ السلام آپ اپنی قوم کو بتلا دیں کہ کنوئیں کا پانی ان کے اور ناقۃ اللہ کے درمیان تقسیم ہوگا ایک دن اونٹنی کا اور دوسرے دن پوری قوم کا اور اس تقسیم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی نگرانی مسلط ہوگی کہ کوئی اس کے خلاف نہ کر سکے۔ اور ایک دوسری آیت میں ہے هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ۔ یعنی یہ اللہ کی اونٹنی ہے ایک دن پانی کا حق اس کا اور دوسرے دن کا پانی تمھارے لئے معین ومقرر ہے۔

دوسری آیت میں اس وعدہ فراموش سرکش قوم کی خیر خواہی اور ان کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے پھر ان کو اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات یاد دلائے کہ اب بھی یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز آجائیں فرمایا۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا۔ اس میں خلفاء خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں قائم مقام اور نائب اور قصور قصر کی جمع اونچی عالیشان عمارت اور محل کو کہا جاتا ہے تَنْحِتُوْنَ، نَحْت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سنگ تراشی۔ جبال جبل کی جمع ہے بمعنی پہاڑ بیوتا بیت کی جمع ہے جو گھر کے کمرے کے لئے بولا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے قوم عاد کو ہلاک کرکے اُن کی جگہ تم کو بسایا، اُن کی زمین اور مکانات تمہارے قبضہ میں دے دیئے اور تم کو یہ صنعت سکھلادی کہ کھلی زمین میں بڑے بڑے محلات بنا لیتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں کمرے اور مکانات بنا لیتے ہو۔ آخر آیت میں فرمایا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ یعنی اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ان کا احسان مانو اُس کی اطاعت اختیار کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

احکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے چند اصولی اور فروعی مسائل معلوم ہوئے۔

اوّل یہ کہ اصولِ عقائد میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور اُن کی شریعتیں متحد ہیں سب کی دعوت توحید کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اُس کی خلاف ورزی پر عذابِ دنیا و آخرت سے ڈرانا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام پچھلی امتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولتمند آبرو دار لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اُس کے نتیجہ میں دنیا میں بھی ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی مستحقِ عذاب ہوئے۔

تیسرے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں کافروں پر بھی مبذول ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قوم عاد و ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دولت و قوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

چوتھے تفسیر قرطبی ہی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلات اور عالیشان مکانات کی تعمیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اُن کا بنانا جائز ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ انبیاء و اولیاء اللہ نے اس کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اونچی تعمیرات کے بارہ میں ارشادات منقول ہیں وہ اسی انداز کے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں وہ مکالمہ اور مباحثہ ذکر کیا گیا ہے جو قوم ثمود کے دو گروہوں کے درمیان ہوا۔ ایک وہ گروہ جو صالح علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا، دوسرا منکرین و کفار کا گروہ۔ ارشاد فرمایا قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ

مِنْهُمْ یعنی کہ قوم صالح علیہ السلام میں سے اُن لوگوں نے جنھوں نے تکبر کیا اُن لوگوں سے جن کو حقیر وضعیف سمجھا جاتا تھا یعنی جو ایمان لائے تھے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ اس جگہ ان دونوں گروہوں کے دو وصف قرآن کریم نے بتلائے مگر کفار کا وصف بصیغہ معروف بتلایا اِسْتَكْبَرُوْا اور مؤمنین کا وصف بصیغہ مجہول بتلایا اسْتُضْعِفُوْا اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ کفار کا یہ حال کہ وہ تکبر کرتے تھے خود اُن کا اپنا فعل تھا جو قابل مواخذہ و مذمت اور انجام کار موجب عذاب ہوا اور مؤمنین کا جو وصف یہ لوگ بیان کرتے تھے کہ وہ ذلیل و حقیر اور ضعیف ہیں یہ کفار کا کہنا ہے خود مؤمنین کا واقعی حال اور وصف نہیں جس پر کوئی مذمت ہوسکے بلکہ ملامت ان لوگوں پر ہے جو بلاوجہ ان کو حقیر وضعیف کہتے اور سمجھتے ہیں۔ آگے وہ مکالمہ جو دونوں گروہوں میں ہوا یہ ہے کہ کفار نے مؤمنین سے کہا کہ کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

مؤمنین نے جواب دیا کہ جو ہدایت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے کر بھیجے گئے ہیں ہم ان سب پر یقین و ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر کشاف میں ہے کہ قوم ثمود کے مؤمنین نے کیسا بلیغ جواب دیا ہے کہ تم جس بحث میں پڑے ہوئے ہو کہ یہ رسول ہیں یا نہیں یہ بات قابل بحث ہی نہیں بلکہ بدیہی اور یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا پیغام ہے۔ بات پوچھ ہوسکتی ہے تو یہ کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے کون نہیں، سو ہم تو بحمد اللہ اُن کی لائی ہوئی سب ہدایات پر ایمان رکھتے ہیں۔

مگر ان کے بلیغ جواب پر بھی قوم نے وہی سرکشی کی بات کی کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اُس کے منکر ہیں۔ دنیا کی محبت اور دولت و قوت کے نشہ سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے کہ وہ انسان کی آنکھوں کا پردہ بن جاتے ہیں اور وہ بدیہی چیزوں کا انکار کرنے لگتا ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يٰصٰلِحُ

پھر انھوں نے کاٹ ڈالا اونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رب کے حکم سے اور بولے اے صالح

ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ فَاَخَذَتْهُمُ

لے آ ہم پر جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا اگر تو ہے رسول پس آ پکڑا ان کو

الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۞ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ

زلزلے نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں اوندھے پڑے پھر صالح الٹا پھرا ان سے

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ

اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور خیر خواہی کی تمہاری

وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

غرض (نہ صالح علیہ السلام پر ایمان لائے ورنہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو (بھی) مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم (ماننے) سے (بھی) سرکشی کی (وہ حکم اعتقاد توحید و رسالت تھا، اور اس پر یہ بیباکی کہ) کہنے لگے کہ اے صالح جس (عذاب) کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوا لیجئے اگر آپ پیغمبر ہیں کیونکہ پیغمبر کا صادق ہونا لازم ہے) پس پکڑا ان کو زلزلہ نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے اس وقت صالح (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا (جس پر عمل کرنا موجب فلاح تھا) اور میں نے تمہاری (بہت) خیر خواہی کی کہ کس طرح شفقت سے سمجھایا لیکن (افسوس تو یہ ہے کہ) تم لوگ (اپنے) خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے (اس لئے یہ دن دیکھا اور آخر روزِ بد دیکھا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے پہاڑ کی ایک بڑی چٹان شق ہو کر اس سے ایک عجیب و غریب اونٹنی پیدا ہوگئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو بھی اس قوم کے لئے آخری امتحان اس طرح بنا دیا تھا کہ جس کنویں سے ساری بستی کے لوگ اور ان کے مویشی پانی حاصل کرتے تھے یہ اس کا سارا پانی پی جاتی تھی اس لئے صالح علیہ السلام نے ان کے لئے باری مقرر کردی تھی کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے دوسرے دن بستی والے۔

قوم ثمود اس اونٹنی کی وجہ سے ایک تکلیف میں مبتلا تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ہلاک ہو جائے مگر خود ایسی حرکت کرنے سے ڈرتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب آجائے گا۔

شیطان کا سب سے بڑا وہ فریب جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنی ہوش و عقل کھو بیٹھتا ہے

وہ عورت کا فتنہ ہے۔ قوم کی دو حسین و جمیل عورتوں نے یہ بازی لگا دی کہ جو شخص اس ناقہ کو قتل کر دے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جس کو چاہے وہ اس کی ہے۔

قوم کے دو نوجوان، مِصْدَع اور قُدَار اس نشہ میں مدہوش ہو کر اس ناقہ کو قتل کرنے کے لئے نکلے اور ناقہ کے راستہ میں ایک پتھر کی چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب ناقہ سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قدار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر قتل کر دیا۔

قرآن کریم نے اسی کو قوم ثمود کا سب سے بڑا شقی اور بدبخت قرار دیا ہے۔ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا۔ کیونکہ اس کے سبب پوری قوم عذاب میں گرفتار ہوگی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتلا دیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ۔ یعنی تین دن اور اپنے گھروں میں آرام کر لو (اس کے بعد عذاب آنے والا ہے) اور یہ وعدہ سچا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں۔ مگر جس قوم کا وقت خراب آجاتا ہے اس کے لئے کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہیں ہوتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے اس ارشاد پر بھی ان بدبخت لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا اور اس کی علامت کیا ہوگی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ لو عذاب کی علامت بھی سن لو۔ کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے سخت زرد ہو جائیں گے مرد و عورت، بچہ بوڑھا کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا، پھر پرسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے سخت سرخ ہو جائیں گے اور ترسوں ہفتہ کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہو جائیں گے۔ اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بدنصیب قوم نے یہ سن کر بھی بجائے اس کے کہ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہو جاتے یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کر دیں اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔ قوم کے اس ارادہ کا تذکرہ قرآن میں دوسری جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ قوم کے اس متفقہ فیصلہ کے تحت کچھ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل کے ارادہ سے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی میں ان پر پتھر برسا کر ہلاک کر دیا۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی انہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایسی تدبیر کی کہ ان کو اس کی خبر نہ ہوئی۔

اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہوگئے جیسے گہرا زرد رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ عذاب کی پہلی علامت کے سچ ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے۔ اور اپنی غلط کاریوں سے باز آجاتے بلکہ ان کا غیظ وغضب حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم اُن کے قتل کی فکروں میں پھرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر سے بچائے اس کی بھی علامات ہوتی ہیں کہ قلوب ودماغ اوندھے ہوجاتے ہیں نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔

بالآخر دوسرا دن آیا تو پیشن گوئی کے مطابق سب کے چہرے سُرخ ہوگئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہوگئے۔ اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہوکر انتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرف سے کس طرح آتا ہے۔

اسی حال میں زمین سے ایک شدید زلزلہ آیا اور اوپر سے سخت ہیبتناک چیخ اور شدید آواز ہوئی جس سے سب کے سب بیک وقت بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مرگئے۔ زلزلہ کا ذکر تو ان آیات میں موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ۔ رجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔

اور دوسری آیت میں فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بھی آیا ہے صیحہ کے معنی ہیں چیخ اور شدید آواز۔ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح کے عذاب ان پر جمع ہوگئے تھے۔ زمین سے زلزلہ اور اوپر سے صیحہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔ جٰثمین مصدر جثوم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حس وحرکت ہوکر ایک جگہ پڑجانا یا بیٹھے رہنا (قاموس)۔ معنی یہ ہیں کہ جو جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَهْرِهٖ وَعَذَابِهٖ۔

قوم ثمود کے اس قصہ کے اہم اجزاء تو خود قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں اور کچھ اجزاء روایاتِ حدیث میں مذکور ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے لئے ہیں مگر اُن پر کسی واقعہ اور حقیقت کے ثبوت کا مدار نہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا گزر اس مقام حِجر پر ہوا جہاں قوم ثمود پر عذاب آیا تھا۔ تو آپ نے صحابہ کرام کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اُس کے کنوئیں کا پانی استعمال کرے۔ (مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابو رغال کے کوئی نہیں بچا۔ یہ شخص اس وقت حرم مکہ میں پہنچا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حرم مکہ کے احترام کے سبب اس وقت اس کو عذاب سے بچا لیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آگیا اور یہیں ہلاک ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابو رغال کی قبر کا نشان بھی دکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہوگئی تھی۔ صحابہ کرام نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے بنو ثقیف اسی ابو رغال کی اولاد ہیں۔ (مظہری)

ان معذب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کدے بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآن کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفر شام کے راستہ پر یہ مقامات آج بھی داستانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا۔

قوم صالح علیہ السلام کے واقعۂ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۔ یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مؤمنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مؤمنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضر موت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے ان کا مکہ معظمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کرکے فرمایا کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر افسوس تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہوچکی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کرکے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزولِ عذاب اور ہلاکت قوم سے پہلے ہوا ہو گرچہ بیان میں اس کو مؤخر ذکر کیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ
اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
اس کو کسی نے جہان میں۔ تم تو دوڑتے ہو مردوں پر

شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾
شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ
اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے

قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
شہر سے، یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں۔ پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو

اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ
مگر اس کی عورت، کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں۔ اور برسایا ہم نے ان پر مینہ یعنی پتھروں کا۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع ۱۰
پھر دیکھ کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر) بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم (یعنی اپنی امت) سے فرمایا کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا (یعنی تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر اور اس کام کے ارتکاب میں یہ نہیں کہ تم کو کوئی دھوکہ ہوگیا ہو) بلکہ (اس باب میں) تم حد (انسانیت ہی) سے گزر گئے ہو اور (ان مضامین کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ (آخر میں بیہودگی کی راہ سے) آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو (یعنی لوط علیہ السلام کو اور ان کے ساتھی مؤمنین کو) تم اپنی اس بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (اور ہم کو گندہ بتلاتے ہیں پھر گندوں میں پاکوں کا کیا کام، یہ بات انہوں نے براہ تمسخر کہی تھی) سو جب یہاں تک نوبت پہنچی تو ہم نے (اس قوم پر

عذاب نازل کیا اور (لوط علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو یعنی ان کے گھر والوں کو اور دوسرے ایمان والوں کو بھی اس عذاب سے) بچا لیا، (اس طرح کہ وہاں سے نکل جانے کا پہلے ہی حکم ہو گیا)، بجز ان کی بیوی کے کہ وہ (بوجہ ایمان نہ لانے کے) ان ہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی، سو اے دیکھنے والے) دیکھ تو سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا (اگر تو غور سے دیکھے گا تو تعجب کرے گا اور سمجھے گا کہ نافرمانی کا کیا انجام ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کے قصص کا جو سلسلہ اوپر سے چل رہا ہے اُس کا **چوتھا قصہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے۔**

لوط علیہ السلام حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ دونوں کا اصل وطن مغربی عراق میں بصرہ کے قریب ارض بابل کے نام سے معروف تھا اس میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ خلیل اللہ علیہ السلام کا گھرانہ خود بت پرستی میں مبتلا تھا۔ حق تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ابراہیم علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ قوم نے مخالفت کی جس کی نوبت آتش نمرود تک پہنچی، خود والد نے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔

اپنے گھرانہ میں سے صرف زوجہ محترمہ حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام مسلمان ہوئے۔ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ۔ بالآخر انہیں دونوں کو ساتھ لے کر وطن سے ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ نہر اردن پر پہنچنے کے بعد بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ کنعان میں جا کر مقیم ہوئے جو بیت المقدس کے قریب ہے۔

اور لوط علیہ السلام کو بھی حق تعالیٰ نے نبوت عطا فرما کر اردن اور بیت المقدس کے درمیان مقام سدوم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ یہ علاقہ پانچ اچھے بڑے شہروں پر مشتمل تھا۔ جن کے نام سدوم، عمورہ، ادمہ، صبوبیم اور بالع یا صوغر تھے ان کے مجموعہ کو قرآن کریم نے مؤتفکہ اور مؤتفکات کے الفاظ میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔

سدوم ان شہروں کا دار الحکومت اور مرکز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہیں قیام فرمایا۔ زمین سرسبز و شاداب تھی ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ (یہ تاریخی تفصیلات بحر محیط، مظہری، ابن کثیر، المنار وغیرہ میں مذکور ہیں)۔

انسان کی عام عادت قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى، یعنی انسان سرکشی کرنے لگتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں رہا۔ ان لوگوں پر بھی حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عام انسانی عادت کے تحت دولت و ثروت کے نشہ میں مبتلا ہو کر عیش و عشرت اور ہوا و ہوس کے اُس کنارے پر پہنچ گئے کہ انسانی غیرت و حیاء اور اچھے بُرے کی فطری تمیز بھی کھو بیٹھے۔ ایسے خلافِ فطرت فواحش میں مبتلا ہوگئے جو حرام اور گندہ ہونے کے علاوہ فطرت سلیمہ کے لئے نفرت اور ایسے گھن کے کام ہیں کہ عام جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا۔ انھوں نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا۔ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی بطور تنبیہ کے فرمایا، کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا۔

زنا کے بارہ میں تو قرآن کریم نے اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے اور یہاں الف لام کے ساتھ الفاحشہ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ خلاف فطرت بدکاری گویا تمام فواحش کا مجموعہ اور زنا سے زیادہ شدید جرم ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ یہ بدکاری تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کی۔ عمرو بن دینار نے فرمایا کہ اس قوم سے پہلے دنیا میں کبھی ایسی حرکت نہ دیکھی گئی تھی (مظہری) اور نہ اہل سدوم سے پہلے کسی بُرے سے بُرے انسان کا ذہن اس طرف گیا تھا۔ اُموی خلیفہ عبدالملک نے کہا کہ اگر قرآن میں قوم لوط علیہ السلام کا واقعہ مذکور نہ ہوتا تو میں کبھی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی انسان ایسا کام کر سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

اس میں ان کی بے حیائی پر دو حیثیت سے تنبیہ کی گئی اول تو یہ کہ بہت سے گناہوں میں انسان اپنے ماحول یا اپنے اسلاف کی تقلید کی وجہ سے مبتلا ہو جاتا ہے گو وہ بھی کوئی شرعی عذر نہیں۔ مگر عرفاً اُس کو کسی نہ کسی درجہ میں معذور کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا گناہ جو پہلے کسی نے نہیں کیا نہ اُس کے لئے خاص مقتضیات ہیں یہ اور بھی زیادہ وبال ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے کہ کسی بُرے کام یا بُری رسم کو جو شخص ایجاد کرتا ہے اُس پر اپنے فعل کا گناہ اور عذاب تو ہوتا ہی ہے اُس کے ساتھ اُن تمام لوگوں کا عذاب و وبال بھی اسی کی گردن پر ہوتا ہے جو قیامت تک اس کے فعل سے متأثر ہو کر مبتلائے گناہ ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی اس بے حیائی کو زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ انسان کی طبعی اور فطری خواہش کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حلال اور جائز طریقہ عورتوں سے نکاح کرنے کا مقرر فرما دیا ہے اُس کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کو اختیار کرنا نری خباثت نفس اور گندہ ذہنی کا ثبوت ہے۔

اسی لئے صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس جرم کو عام بدکاری سے زیادہ شدید جرم و گناہ قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا ایسا فعل کرنے والے کو ایسی ہی سزا دینا چاہئے جیسے قوم لوط کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی کہ آسمان سے پتھر برسے، زمین کا تختہ اُلٹ گیا اس لئے اس شخص کو کسی اونچے پہاڑ سے گرا کر اوپر سے پتھراؤ کر دیا جائے۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ میں بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والوں کے بارہ میں فرمایا فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ۔ یعنی اس کام کے فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ (ابن کثیر)

آخر آیت میں فرمایا بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ یعنی تم ایسی قوم ہو جو حدِ انسانیت سے گزر گئی ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم ہر کام میں اُس کی حد سے نکل جاتے ہو۔ جنسی خواہش کے بارہ میں بھی ایسا ہی ہوا کہ خدا تعالےٰ کی مقرر کردہ حد سے نکل کر خلاف وضع فطری میں مبتلا ہو گئے۔

تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں ان کی قوم کا جواب اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کوئی معقول جواب تو بن نہیں سکا ضد میں آکر آپس میں یہ کہنے لگے کہ یہ لوگ بڑی پاکی اور صفائی کے مدعی ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں قوم سدوم کی اس کجروی اور بے حیائی کی سزاءِ آسمانی کا ذکر ہے اور یہ کہ اس پوری قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا صرف لوط علیہ السلام اور ان کے چند ساتھی عذاب سے محفوظ رہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ آیا ہے یعنی ہم نے لوط اور اُن کے اہل کو عذاب سے نجات دی۔ یہ اہل کون لوگ تھے۔ بعض حضرات مفسرین کا قول ہے کہ اہل میں دو لڑکیاں تھیں جو مسلمان ہوئی تھیں۔ بیوی بھی مسلمان نہ ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ مذکور ہے کہ اُن تمام بستیوں میں ایک گھر کے سوا کوئی مسلمان نہ تھا۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کے صرف گھر کے آدمی مسلمان تھے جن کو عذاب سے نجات ملی اُن میں

بھی بیوی داخل نہ تھی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچنے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے اہل و متعلقین کو لے کر آخر رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آجائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل کی اپنے اہل و متعلقین کو لے کر آخر شب میں سدوم سے نکل گئے۔ بیوی کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ساتھ چلی ہی نہیں دوسری یہ کہ کچھ دور تک ساتھ چلی مگر حکم خداوندی کے خلاف پیچھے مڑ کر بستی والوں کا حال دیکھنا چاہتی تھی تو اس کو عذاب نے پکڑ لیا۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں اس واقعہ کو مجمل اور مفصل بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں تیسری آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم نے لوط علیہ السلام اور اُن کے اہل و متعلقین کو عذاب سے نجات دے دی مگر ان کی بیوی عذاب میں رہ گئی۔ نجات دینے کی یہ صورت کہ یہ لوگ آخر رات میں بستی سے نکل جائیں اور مڑ کر نہ دیکھیں دوسری آیات میں مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں اس قوم پر نازل ہونے والے عذاب کو مختصر لفظوں میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر ایک عجیب قسم کی بارش بھیجی گئی۔ اور سورۂ ہود میں اس عذاب کی مفصل کیفیت یہ بیان فرمائی ہے۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ یعنی جب ہمارا عذاب آپہنچا تو کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے اُن پر پتھر کنکر کے تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور۔

اس سے معلوم ہوا کہ اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کے پورے طبقہ کو جبرئیل امین نے اُٹھا کر اوندھا پلٹ دیا۔ اور جن پتھروں کی بارش برسی وہ تہ بہ تہ تھے یعنی ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بہ تہ جمع ہو گئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر ایک پتھر پر اُس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کی ہلاکت کے لئے پھینکا گیا تھا۔ اور سورۂ حجر کی آیت میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی مذکور ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ۔ یعنی آپکڑا اُن کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمان سے کوئی سخت آواز چنگھاڑ کی صورت میں آئی پھر اس کے

بعد دوسرے عذاب آئے۔ ظاہر الفاظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چنگھاڑ کے بعد پہلے زمین کا تختہ الٹ دیا گیا پھر اس پر ان کی مزید تذلیل و تحقیر کے لئے پتھراؤ کیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پتھراؤ کیا گیا ہو بعد میں زمین کا تختہ الٹ دیا گیا ہو، کیونکہ قرآنی اسلوب بیان میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا ذکر پہلے ہوا ہو وہ وقوع کے اعتبار سے بھی پہلے ہو۔

قوم لوط علیہ السلام کے ہولناک عذابوں میں سے زمین کا تختہ الٹ دینے کی سزا ان کے فحش و بے حیائی عمل کے ساتھ خاص مناسبت بھی رکھتی ہے کہ انھوں نے قلب موضوع کا ارتکاب کیا ہے۔

سورۂ ہود کی آیت کے آخر میں قرآن کریم نے اہل عرب کی مزید تنبیہ کے لئے یہ بھی فرمایا کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ، یعنی یہ الٹی ہوئی بستیاں ان ظالموں سے کچھ دور نہیں، سفر شام کے راستہ پر ہر وقت ان کے سامنے آتی ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ یہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اور یہ منظر صرف نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں آج بھی موجود ہے بیت المقدس اور نہر اردن کے درمیان آج بھی یہ قطعہ زمین بحر لوط یا بحر میت کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی زمین سطح سمندر سے بہت زیادہ گہرائی میں ہے اور اس کے ایک خاص حصہ پر ایک دریا کی صورت میں ایک عجیب قسم کا پانی موجود ہے جس میں کوئی جاندار مچھلی، مینڈک وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اس کو بحر میت بولتے ہیں۔ یہی مقام سدوم کا بتلایا جاتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِهٖ وَغَضَبِهٖ۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں

لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا
تمہارا معبود اس کے سوا، تمہارے پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے سو پوری کرو

الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا
ناپ اور تول، اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت خرابی ڈالو

فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستہ سے اس کو جو کہ یقین لائے اس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب، اور یاد کرو جب کہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم کو بڑھا دیا، اور دیکھو کیسا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل (کہ کوئی معجزہ ہے) آچکی ہے (جب میری نبوت ثابت ہے) تو (احکامِ شرعیہ میں میرا کہنا مانو چنانچہ میں کہتا ہوں کہ) تم ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے)، اور روئے زمین میں بعد اس کے کہ (تعلیم و توحید و بعثتِ انبیاء و ایجاب عدل و ادائے حقوق کیل و میزان سے) اس کی درستی تجویز) کردی گئی فساد مت پھیلاؤ (یعنی ان احکام کی مخالفت اور کفر مت کرو کہ موجب فساد ہے) یہ (جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنا) تمہارے لئے (دنیا و آخرت دونوں میں) نافع ہے اگر تم (میری) تصدیق کرو (جس پر دلیل قائم ہے اور تصدیق کرکے عمل کرو تو امورِ مذکورہ دارین میں نافع ہیں آخرت میں تو ظاہر ہے کہ نجات ہوگی اور دنیا میں عمل بالشرع سے امن و انتظام قائم رہتا ہے خاص کر پورا ناپنے تولنے میں بوجہ اعتبار بڑھنے کے تجارت کو ترقی ہوتی ہے) اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو (ایمان

لانے پر) دھمکیاں دو اور (ان کو) اللہ کی راہ (یعنی ایمان) سے روکو اور اس (راہ) میں کجی (اور شبہات) کی تلاش میں لگے رہو کہ بے جا اعتراض سوچ سوچ کر لوگوں کو بہکاؤ یہ لوگ ضلال مذکور سابق کے ساتھ اس اضلال میں بھی مبتلا تھے کہ سڑکوں پر بیٹھ کر آنے والوں کو بہکاتے کہ شعیب علیہ السلام پر ایمان نہ لانا نہیں تو ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ آگے تذکیر نعمت سے ترغیب اور تذکیر نقمت سے ترہیب ہے یعنی) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم (شمار میں یا مال میں، کم تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو (شمار یا مال میں) زیادہ کر دیا (یہ تو ترغیب تھی ایمان لانے پر) اور دیکھو تو کیسا برا انجام ہوا فساد (یعنی کفر و تکذیب و ظلم) کرنے والوں کا (جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود گزر چکے ہیں اسی طرح تم پر عذاب آنے کا اندیشہ ہے یہ ترہیب ہے کفر پر) اور اگر (تم کو عذاب نہ آنے کا اس بات سے شبہ ہو کر) تم میں سے بعضے (تو) اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے ایمان لاتے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لائے (اور پھر بھی دونوں فریق ایک ہی حالت میں ہیں یہ نہیں کہ ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آگیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عذاب سے ڈرانا بے اصل ہے) تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فوراً عذاب نہ آنے سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ عذاب نہ آئے گا، ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے (یعنی دونوں فریق کے) درمیان میں اللہ تعالیٰ عملی فیصلہ کئے دیتے ہیں (یعنی عذاب نازل کر کے مؤمنین کو نجات دیں گے اور کفار کو ہلاک کریں گے، اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں (کہ ان کا فیصلہ بالکل مناسب ہی ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام کے قصص جن کا سلسلہ گزشتہ آیات سے چل رہا ہے اُن میں پانچواں قصہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے جو آیات متذکرہ میں بیان ہوا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادہ مدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔ مدین حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل و اولاد بھی مدین کے نام سے معروف ہوگئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اُردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہے وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ۔ اس میں یہی بستی مراد ہے۔ (ابن کثیر)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کے

حسن بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔ (ابن کثیر۔ بحر محیط)

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں قرآن کریم نے کہیں اُن کا اہل مدین اور اصحاب مدین کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہیں اصحاب ایکہ کے نام سے۔ ایکہ کے معنی جنگل اور بن کے ہیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں قومیں الگ الگ تھیں دونوں کی بستیاں بھی الگ تھیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام ان میں سے پہلے ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ان کی ہلاکت کے بعد دوسری قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ دونوں قوموں پر جو عذاب آیا اُس کے الفاظ بھی مختلف ہیں اصحاب مدین پر کہیں صیحہ اور کہیں رجفہ مذکور ہے اور اصحاب ایکہ پر عذاب ظلہ ذکر کیا گیا ہے۔ صیحہ کے معنی چنگھاڑ اور سخت آواز کے اور رجفہ کے معنی زلزلہ ہیں اور ظلہ سائبان کو کہا جاتا ہے۔ اصحاب ایکہ پر عذاب کی یہ صورت ہوئی کہ اوّل چند روز ان کی پوری بستی میں سخت گرمی پڑی جس سے ساری قوم بلبلا اُٹھی۔ پھر اُن کے قریب جنگل پر ایک گہرا بادل آیا جس سے اس جنگل میں سایہ ہوگیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر سارے بستی کے آدمی اس بادل کے سایہ میں جمع ہوگئے۔ اس طرح یہ خدائی مجرم بغیر کسی وارنٹ اور سپاہی کے اپنے پاؤں چل کر اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گئے۔ جب سب جمع ہوگئے تو بادل سے آگ برسی اور زمین میں بھی زلزلہ آیا جس سے یہ سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم کا نام ہے اور عذاب کی جو تین قسمیں ابھی ذکر کی گئی ہیں۔ تینوں اس قوم پر جمع ہوگئیں۔ پہلے بادل سے آگ برسی پھر اُس کے ساتھ سخت آواز چنگھاڑ کی شکل میں آئی پھر زمین میں زلزلہ آیا۔ ابن کثیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بہرحال یہ دونوں قومیں الگ الگ ہوں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جو پیغامِ حق ان کو دیا وہ پہلی اور دوسری آیت میں مذکور ہے۔ اس پیغام کی تفسیر سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک دعوت ہے۔ اس کا خلاصہ ادائے حقوق ہے۔ پھر حقوق دو قسم کے ہیں ایک براہ راست اللہ تعالیٰ کا حق جس کے کرنے یا چھوڑنے سے انسانوں کا کوئی معتدبہ نفع نقصان متعلق نہیں جیسے عبادات نماز روزہ وغیرہ۔ دوسرے حقوق العباد جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اور یہ قوم ان دونوں حقوق سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں پر ایمان نہ لا کر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے

تھے اور اس کے ساتھ خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق کو ضائع کر رہے تھے اور اس پر مزید یہ کہ راستوں اور سڑکوں کے دہانوں پر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر لوٹتے اور شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ اس طرح روئے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔ یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے تین باتیں فرمائیں، اول یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں۔ یہ وہی دعوت توحید ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی روح ہے چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق سے غافل تھی اس لئے ان کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا۔ اور فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے یہاں واضح دلیل سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ تفسیر بحر محیط میں مختلف صورتیں ان کے معجزات کی ذکر کی ہیں۔

دوسری بات یہ فرمائی فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اس میں کیل کے معنی ناپ اور میزان بمعنی وزن تولنے کے معنی میں ہے اور بخس کے معنی کسی کے حق میں کمی کرکے نقصان پہنچانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کرکے ان کو نقصان نہ پہنچایا کرو۔

اس میں پہلے تو ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عام کر دیا۔ خواہ وہ مال سے متعلق ہو یا عزت و آبرو سے یا کسی دوسری چیز سے۔ (بحر محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے اسی طرح دوسرے حقوق انسانی میں کمی کرنا بھی حرام ہے۔ کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ یا کسی کے درجہ اور رتبہ کے موافق اس کا احترام نہ کرنا۔ جس جس کی اطاعت واجب ہے ان کی اطاعت میں کوتاہی کرنا۔ یا جس شخص کی تعظیم و تکریم واجب ہے اس میں کوتاہی برتنا۔ یہ سب امور اسی جرم میں داخل ہیں جو شعیب علیہ السلام کی قوم کیا کرتی تھی۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

لوگوں کی آبرو کو اُن کے خون کے برابر واجب الاحترام اور قابل حفاظت قرار دیا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں مُطَفِّفِيْنَ اور تطفیف کا ذکر آیا ہے اُس میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک شخص کو جلدی جلدی رکوع سجدے کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا قد طففت یعنی تو نے ناپ تول میں کمی کردی (مؤطا امام مالک)۔ مراد یہ ہے کہ نماز کا جو حق تھا وہ تو نے پورا نہ کیا۔ اس میں حق نماز پورا ادا نہ کرنے کو تطفیف کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ یعنی زمین کی درستی کے بعد اُس میں فساد مت پھیلاؤ۔ یہ جملہ اسی سورۂ اعراف میں پہلے بھی آچکا ہے وہاں اس کے معنی کی تفصیل بیان ہوچکی ہے کہ زمین کی ظاہری اصلاح ہر چیز کو اُس کے مصرف پر خرچ کرنے اور حدود کی رعایت کرنے اور عدل و انصاف قائم رکھنے پر موقوف ہے اور باطنی اصلاح، تعلق مع اللہ اور اطاعت احکام الٰہیہ پر، اسی طرح زمین کا ظاہری و باطنی فساد ان اصول کو چھوڑ دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام نے ان تمام اصول کو نظر انداز کر رکھا تھا جس کی وجہ سے زمین پر ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد برپا تھا۔ اس لئے اُن کو یہ نصیحت کی گئی کہ تمہارے یہ اعمال ساری زمین کو خراب کرنے والے ہیں ان سے بچو۔

پھر فرمایا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ یعنی یہی بات تمہارے لئے نافع ہے اگر تم میری بات مانو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی ان ناجائز حرکتوں سے باز آجاؤ تو اسی میں تمہارے دین و دنیا کی فلاح اور بہبود ہے۔ دین و آخرت کی فلاح تو ظاہر ہے کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت سے وابستہ ہے اور دنیا کی فلاح اس لئے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ فلاں شخص ناپ تول میں اور دوسرے حقوق میں دیانت داری سے کام کرتا ہے تو بازار میں اس کی ساکھ قائم ہوکر اس کی تجارت کو فروغ ہوگا۔

تیسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے راستوں سڑکوں پر نہ بیٹھا کرو۔ اس کا مطلب بعض مفسرین نے یہ قرار دیا کہ یہ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں کہ یہ لوگ راستوں پر بیٹھ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے والوں کو روکتے اور ڈراتے دھمکاتے تھے اس سے منع کیا گیا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ان کے یہ دو جرم الگ الگ تھے۔ راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ بھی کرتے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے بھی تھے۔ پہلے جملہ میں پہلا مضمون اور دوسرے جملہ میں دوسرا مضمون بیان فرمایا ہے۔ تفسیر بحر محیط وغیرہ میں

اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ کرنے میں اس کو بھی داخل قرار دیا ہے جو خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرنے کے لئے راستوں پر چوکیاں بنائی جاتی ہیں۔

علامہ قرطبی نے فرمایا کہ جو لوگ راستوں پر بیٹھ کر خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں وہ بھی قوم شعیب علیہ السلام کی طرح مجرم ہیں، بلکہ اُن سے زیادہ ظالم و جابر ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم لوگ اللہ کے راستہ میں کجی کی تلاش میں لگے رہتے ہو کہ کہیں انگلی رکھنے کی جگہ ملے تو اعتراضات و شبہات کے دفتر کھول دیں اور لوگوں کو **دینِ حق سے بیزار کرنے کی کوشش کریں۔**

اس کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ اس میں ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے ترغیب و ترہیب کے دونوں پہلو استعمال کئے گئے۔ اول تو ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت یاد دلائی کہ تم پہلے اعداد و شمار کے لحاظ سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری نسلیں بڑھا کر ایک بڑی وسیع قوم بنا دیا۔ یا مال و سامان کے اعتبار سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرما کر مستغنی کر دیا۔ پھر ترہیب کے لئے فرمایا کہ اپنے سے پہلے فساد کرنے والی قوموں کے انجام پر نظر ڈالو کہ قوم نوح قوم عاد و ثمود قوم لوط پر کیا کیا عذاب آچکے ہیں تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔

پانچویں آیت میں اس قوم کے ایک شبہ کا جواب ہے کہ شعیب علیہ السلام کی دعوتِ ایمان کے بعد ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی کچھ ایمان لائے کچھ منکر رہے۔ مگر ظاہری اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جماعتیں یکساں آرام و عیش میں ہیں اگر منکر ہونا کوئی جرم ہوتا تو مجرم کو سزا ملتی۔ اس کے جواب میں فرمایا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا یعنی جلد بازی نہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے علم و کرم سے مجرموں کو مہلت دیتے ہیں جب وہ بالکل ہی سرکش ہو جاتے ہیں تو پھر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ تمہارا بھی یہی حال ہے اگر تم اپنے انکار سے باز نہ آئے تو عنقریب منکروں پر فیصلہ کن عذاب نازل ہو جائے گا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
بولے سردار جو بڑے تھے اس کی قوم میں ہم ضرور نکال دیں گے

يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ
اے شعیب تجھ کو اور اُن کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ

فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ
ہمارے دین میں، بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی۔ بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر

الجزء التاسع ۹

كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّىٰنَا اللَّهُ مِنْهَا ۚ وَمَا يَكُونُ

جھوٹ اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے، اور ہمارا کام نہیں

لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ۚ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ

کہ لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب

شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا

چیزوں کو اپنے علم میں، اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا، اے ہمارے رب فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں

بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿٨٩﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا

انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور بولے سردار جو کافر تھے

مِنْ قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ ﴿٩٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ

اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بیشک خراب ہو گے۔ پھر آپکڑا اُن کو

الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩١﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا

زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیبؑ کو

كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٢﴾

گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں، جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ

پھر اُلٹا پھرا اُن لوگوں سے اور بولا، اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا

لَكُمْ ۖ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿٩٣﴾

تمہاری، اب کیا افسوس کروں کافروں پر۔

مع عند المتقدمین ۱۲ ع ۱۱

خلاصہ تفسیر

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب (یاد رکھیے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے۔ یہ بات مومنین کے لئے اس لئے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریق کفر پر تھے لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لئے کہی کہ ان کے سکوت قبل بعثت سے

وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آجائیں گے گو ہم (بدلیل دبصیرت) اس کو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کریں ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہوجائیں اگر خدا نہ کرے ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو (کیونکہ اول تو مطلق کفر کو دین حق سمجھنا ہی اللہ پر تہمت لگانا ہے کہ یہ دین معاذ اللہ اللہ کو پسند ہے خصوصاً مومن کا کافر ہونا چونکہ بعد علم وقبول دلیل حق کے ہے اور زیادہ تہمت ہے ایک تو وہی تہمت دوسری وہ تہمت کہ اللہ نے جو مجھ کو دلیل کا علم دیا تھا جس کو میں حق سمجھتا تھا وہ علم غلط دیا تھا اور شعیب علیہ السلام نے لفظ عود یا تو تغلیباً دوسروں کے اعتبار سے یا ان کے گمان کو فرض کرکے یا مشاکلۃً برتا) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے مقدر میں) کیا ہو (جس کی مصلحت انہی کے علم میں ہے تو خیر اور بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے (اس علم سے سب مقدرات کے مصالح کو جانتے ہیں مگر) ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں (اور بھروسہ کرکے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو دین حق پر ثابت رکھے اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین نہ تھا انبیاء کو یہ یقین دیا جاتا ہے بلکہ مقصود اظہار عجز اور تفویض الی المالک ہے جو کہ لوازم کمال نبوت سے ہے اور دوسرے مؤمنین کے اعتبار سے لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں یہ جواب دے کر جب دیکھا کہ ان سے خطاب کرنا بالکل مؤثر نہیں اور ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہیں ان سے خطاب ترک کرکے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری (اس) قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے کیونکہ خدائی فیصلہ کا حق ہونا لازم ہے یعنی اب عملی طور پر حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیجئے) اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اور ان کی قوم کے (انہی مذکور) کافر سرداروں نے (شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر بلیغ سن کر اندیشہ کیا کہ کہیں سامعین پر اس کا اثر نہ ہوجائے اس لئے انہوں نے بقیہ کفار سے) کہا کہ اگر تم شعیب (علیہ السلام) کی راہ چلنے لگو گے تو بیشک بڑا نقصان اٹھاؤ گے (دین کا بھی کیونکہ ہمارا مذہب حق ہے حق کو چھوڑنا خسارہ ہے اور دنیا کا بھی اس لئے کہ پورا ناپنے تولنے میں بچت کم ہوگی غرض وہ سب اپنے کفر وظلم پر جمے رہے اب عذاب کی آمد ہوئی) پس ان کو زلزلے نے پکڑا سو اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی۔ اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کو آمادہ تھے

خود) ان کی یہ حالت ہوگئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے جنہوں نے شعیب (علیہ سلام) کی تکذیب کی تھی (اور ان کے اتباع کرنے والے کو خسارہ بتلاتے تھے خود) وہی خسارہ میں پڑ گئے اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کرکے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے (جن پر عمل کرنا ہر طرح کی فلاح کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بڑی) خیرخواہی کی کہ کس کس طرح سمجھایا گیا مگر افسوس تم نے نہ مانا اور یہ روز بد دیکھا پھر ان کے عناد و کفر وغیرہ کو یاد کرکے فرمانے لگے کہ جب انہوں نے اپنے ہاتھوں یہ مصیبت خریدی تو) پھر میں ان کافر لوگوں (کے ہلاک ہونے) پر کیوں رنج کروں۔

معارف ومسائل

شعیب علیہ السلام سے جب اُن کی قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کے ماننے والے پھلتے پھولتے اور نہ ماننے والوں پر عذاب آجاتا مگر ہو یہ رہا ہے کہ دونوں فریق برابر درجہ میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں تو ہم آپ کو کیسے سچا مان لیں۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ جلدبازی نہ کرو عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ فرمادیں گے۔ اس پر قوم کے متکبر سرداروں نے وہی بات کہی جو ہمیشہ ظالم متکبر کہا کرتے ہیں کہ اے شعیب یا تو تم اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں وہ سب ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ۔ ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔

ان کے مذہب میں واپس آنا قوم شعیب علیہ السلام کے مؤمنین کے متعلق تو اس لئے صادق ہے کہ وہ سب پہلے انہیں کے مذہب اور طریقہ پر تھے۔ پھر شعیب علیہ السلام کی دعوت پر مسلمان ہوگئے۔ مگر حضرت شعیب علیہ السلام تو ایک دن بھی اُن کے باطل مذہب وطریقہ پر نہ رہے تھے اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کبھی کسی مشرکانہ باطل مذہب کی پیروی کرسکتا ہے تو پھر اُن کے لئے یہ کہنا کہ ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ غالباً اس وجہ سے تھا کہ نبوت عطا ہونے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان لوگوں کے باطل اقوال و اعمال پر سکوت فرماتے تھے اور قوم کے اندر رلے ملے رہتے تھے اس کے سبب اُن کا خیال حضرت شعیب علیہ السلام کے بارہ میں بھی یہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم خیال اور ہمارے مذہب کے پیرو ہیں۔ دعوت ایمان کے بعد اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور خیال کیا کہ یہ ہمارے مذہب سے پھر گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۔ یعنی کیا

تمھارا یہ مطلب ہے کہ تمھارے مذہب کو ناپسند اور باطل سمجھنے کے باوجود ہم تمھارے مذہب میں داخل ہو جائیں. اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ہے۔

دوسری آیت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تمھارے باطل مذہب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی۔ اس کے بعد اگر ہم تمھارے مذہب میں واپس ہو جائیں تو یہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ پر سخت جھوٹ بہتان ہوگا۔

کیونکہ اوّل تو خود کفر و شرک کو مذہب بنانا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس پر افترا اور بہتان ہے۔ اس کے علاوہ ایمان لانے اور علم و بصیرت حاصل ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا گویا یہ کہنا ہے کہ پہلا طریقہ باطل اور غلط تھا حق اور صحیح وہ طریق ہے جس کو اب اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دوہرا جھوٹ اور بہتان ہے کہ حق کو باطل کہا اور باطل کو حق۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمھارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہو سکتے۔ اور ایسا دعویٰ کرنا شانِ عبدیت کے خلاف ہے جو مقربانِ بارگاہِ الٰہی اور اہلِ معرفت کی شایانِ شان نہیں اس لئے فرمایا مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ یعنی ہم تمھارے مذہب میں ہرگز واپس نہیں ہو سکتے بجز اس کے کہ (خدا نخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کی مشیت و ارادہ ہماری گمراہی کا ہو جائے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم نے اُسی اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔

اس میں اپنے عجز و ضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل و تفویض ہے جو کمالاتِ نبوت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اُس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں۔ کسی نیکی کا کرنا یا بُرائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے۔ جیسا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لولا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستہ کی ہدایت نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ خیرات کر پاتے نہ نماز پڑھ سکتے۔

یہاں تک قوم کے متکبر سرداروں سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اب ان کو خطاب چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لفظ فتح کے معنی اس جگہ

فیصلہ کرنے کے ہیں اسی معنی سے فتح بمعنی قاضی آتا ہے (بحر محیط)۔
اور درحقیقت ان الفاظ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے کفار کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان لوگوں کو زلزلہ کے ذریعہ ہلاک کر دیا۔ دوسری آیت کا مضمون ختم ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کے متکبر سرداروں کا ایک گمراہ کن قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ آپس میں کہنے لگے یا اپنے پیرووں سے کہنے لگے کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم بڑے بے وقوف جاہل ٹھہرو گے۔ (بحر محیط عن عطاء)

چوتھی آیت میں اس سرکش قوم کے عذاب کا واقعہ اس طرح ذکر فرمایا۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔ یعنی اُن کو سخت اور عظیم زلزلہ نے آپکڑا جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

قوم شعیب علیہ السلام کا عذاب اس آیت میں زلزلہ کو بتلایا ہے اور دوسری آیات میں فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کو یَوْمِ الظُّلَّةِ کے عذاب نے پکڑ لیا۔ یَوْمِ الظُّلَّةِ کے معنی ہیں سایہ کا دن۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اُن پر گہرے بادل کا سایہ آیا، جب سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تو اسی بادل سے اُن پر پتھر یا آگ برسائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم پر اوّل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو جس سے ان کا دم گھٹنے لگا نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی۔ پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا۔ اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذاب ظلہ دونوں جمع ہو گئے (بحر محیط)۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم شعیب علیہ السلام کے مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذاب ظلہ سے ہلاک کئے گئے ہوں۔

پانچویں آیت میں قوم شعیب کے واقعہ سے دوسروں کو عبرت کا سبق دیا گیا ہے جو اس واقعہ کے بیان کا اصل مقصود ہے۔ فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا۔ لفظ غَنی کے ایک معنی کسی مقام میں خوش عیشی کے ساتھ بسر کرنے کے بھی آتے ہیں اس جگہ

یہی معنی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن مکانات میں آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے، اس عذاب کے بعد ایسے ہوگئے کہ گویا کبھی یہاں آرام و عیش کا نام ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۔ یعنی جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی لوگ خسارہ میں پڑے۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے مؤمن ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ انجام کار خسارہ انھیں پر پڑا۔

چھٹی آیت میں فرمایا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ یعنی قوم پر عذاب آتا ہوا دیکھ کر شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھی یہاں سے چل دیئے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات یہاں سے مکہ معظمہ آگئے۔ اور پھر آخر تک یہیں قیام رہا۔

قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے مایوس ہو کر شعیب علیہ السلام نے بد دعا تو کر دی۔ مگر جب اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت و رحمت کے سبب دل دکھا تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کر کے فرمایا۔ کہ میں نے تو تم کو تمھارے رب کے احکام پہنچا دیئے تھے اور تمھاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا مگر میں کافر قوم کا کہاں تک غم کروں۔

تمت

بحمد اللہ جلد سوم تمام ہوئی

باقی سورۂ اعراف چوتھی جلد میں آئے گی۔

فہرست مضامین معارف القرآن جلد چہارم

معارف القرآن جلد چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بقیہ سورۃ اعراف

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِى قَرْيَةٍ مِّن نَّبِىٍّ إِلَّآ أَخَذْنَآ أَهْلَهَا بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَأَخَذْنَٰهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰٓ ءَامَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَٰهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَٰتًا وَهُمْ نَآئِمُونَ ﴿۹۷﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَٰسِرُونَ ﴿۹۹﴾

رکوع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے ان مذکورہ اور ان کے علاوہ اور بھی دوسری بستیوں میں سے کسی بستی میں

کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو اس نبی کے نہ ماننے پر اول اول تنبیہ نہ کی ہو اور تنبیہ کی غرض سے ان کو، ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہو تاکہ وہ ڈھیلے پڑجائیں اور اپنے کفر و تکذیب سے توبہ کریں، پھر (جب اس سے متنبہ نہ ہوئے تو استدراجاً یا اس غرض سے کہ مصیبت کے بعد جو نعمت ہوتی ہے اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے اور نعمت دینے والے کی آدمی بالطبع اطاعت کرنے لگتا ہے) ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ ان کو فراغی اور صحت کے ساتھ مال واولاد میں خوب ترقی ہوئی اور اس وقت براہ کج فہمی، کہنے لگے کہ وہ پہلی مصیبت ہم پر کفر و تکذیب کے سبب نہ تھی ورنہ پھر خوش حالی کیوں ہوتی بلکہ اتفاقات زمانہ سے ہے چنانچہ، ہمارے آباؤ اجداد کو بھی یہ دو حالتیں کبھی تنگی اور کبھی راحت پیش آئی تھیں اسی طرح ہم پر یہ حالتیں گزرگئیں جب وہ اس بھول میں پڑگئے تو اس وقت ہم نے ان کو دفعۃً (عذاب مہلک میں) پکڑلیا اور ان کو اس عذاب کے آنے کی خبر بھی نہ تھی (یعنی گو ان کو انبیاء نے خبر دی تھی مگر چونکہ وہ اس خبر کو غلط سمجھتے تھے اور عیش و آرام میں بھولے ہوئے تھے اس لئے ان کو گمان بھی نہ تھا، اور ہم نے جو ان کو عذاب مہلک میں پکڑا تو اس کا سبب صرف ان کا کفر اور مخالفت تھی ورنہ اگر ان بستیوں کے رہنے والے پیغمبروں پر ایمان لے آتے اور ان کی مخالفت سے پرہیز رکھتے تو ہم (بجائے ارضی و سماوی آفات کے ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے یعنی آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار ان کو برکت کے ساتھ عطا فرماتے اور گو اس ہلاکت سے پہلے ان کو خوش حالی ایک حکمت کے لئے دی گئی لیکن اس خوش حالی میں اس لئے برکت نہ تھی کہ آخر وہ وبال جان تھی بخلاف ان نعمتوں کے جو ایمان و اطاعت کے ساتھ ملتی ہیں کہ ان میں برکت ہوتی ہے اور وہ وبال کبھی نہیں ہوتیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں، حاصل یہ کہ اگر وہ ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ان کو بھی یہ برکتیں دیتے، لیکن انہوں نے تو پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے بھی ان کے اعمال بد کی وجہ سے ان کو عذاب مہلک میں پکڑ لیا (یہاں تک قصص گذشتہ سے جو خبر فرمایا ہے آگے کفار موجودین کو عبرت دلاتے ہیں کہ ان قصص کو سن کر) پھر بھی ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت میں موجود ہیں) اس بات سے بے فکر ہوگئے ہیں کہ ان پر بھی ہمارا عذاب شب کے وقت آپڑے جس وقت وہ پڑے سوتے ہوں اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے باوجود کفر و تکذیب کے جو کہ کفار سابقین کے ہلاک کا سبب تھا اس بات سے بے فکر ہوگئے ہیں کہ مثل سابقین کی طرح ان پر ہمارا عذاب دن دوپہر آپڑے جس وقت کہ وہ اپنے لایعنی قصوں میں مشغول ہوں (مراد اس سے دنیوی کاروبار ہیں) ہاں تو کیا اللہ تعالیٰ کی اس ناگہانی پکڑ سے جس کا اوپر بیان ہوا ہے بے فکر ہوگئے سو (سمجھ رکھو کہ) خدا تعالیٰ

کی پکڑ سے بے خوف ہوجائیں تو ان کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔

معارف و مسائل

پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ اور ان کے عبرتناک حالات و واقعات سے قرآن کا سلسلہ کئی رکوع پہلے سے چل رہا ہے یہاں تک پانچ حضرات انبیاء کے قصص کا بیان ہوا ہے، چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کا ہے جو تفصیل کے ساتھ ان آیات کے بعد آنے والا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہوچکی ہے کہ قرآن کریم تاریخ عالم اور اقوام عالم کے حالات بیان کرتا ہے مگر اسلوب بیان یہ رہتا ہے کہ عام تاریخی کتابوں اور قصے کہانیوں کی کتابوں کی طرح کسی قصہ کو ترتیب اور تفصیل کے ساتھ لانے کے بجائے ہر قدم کے مناسب کسی قصہ کا ایک حصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس سے حاصل ہونے والے عبرت آموز نتائج ذکر کئے جاتے ہیں، اسی طرح پر یہاں ان پانچ قصوں کے بیان کے بعد ان آیات میں جو اوپر لکھی گئی ہیں کچھ تنبیہات مذکور ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ قوم نوح علیہ السلام اور عاد و ثمود کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ کچھ ان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی دائمی عادت یہی ہے کہ قوموں کی ہدایت اور ان کی اصلاح و فلاح کے لئے نبی علیہم السلام کو بھیجتے ہیں، جو لوگ ان کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے تو اول ان کو دنیوی مصائب و تکالیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تاکہ تکلیف و مصیبت ان کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیں کیونکہ انسان کو فطرۃً مصیبت کے وقت خدا ہی یاد آتا ہے، اور یہ ظاہری تکلیف و مصیبت درحقیقت رحمٰن و رحیم کی رحمت و عنایت ہوتی ہے جیسا مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

خلق را با تو چنین بدخو کنند
تا ترا ناچار رو آنسو کنند

آیت مذکورہ میں اَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ کا یہی مطلب ہے، بَاْس اور بَاْسَاء کے معنی فقر و فاقہ اور ضرّ و ضرّاء کے معنی بیماری و مرض کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جا بجا اسی معنی میں آیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ بَاْس اور بَاْسَاء مالی نقصان کے لئے بولا جاتا ہے اور ضرّ و ضرّاء جانی نقصان کے لئے، اس کا حاصل بھی یہی ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی قوم کی طرف اپنے رسول بھیجتے ہیں اور وہ ان کی بات نہیں مانتے تو ہماری عادت یہ ہے کہ اول ان کو دنیا ہی میں مالی اور جانی تنگی و بیماری وغیرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ وہ بچھلے ہوجائیں اور انجام پر نظر کر کے اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ اس کے بعد دوسری

ہے، ہر چیز میں برکت یعنی زیادتی ہوتی۔

پھر برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا، یا تھوڑے سے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہوجانا روایات صحیحہ میں مذکور ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی مقدار اتنی ہی رہی جتنی تھی لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دوگنی چوگنی چیز سے نکلتے، اور اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن، کپڑا، مکان یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر آدمی راحت اٹھاتا ہے اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے، اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی رہیں مگر ان سے نفع اٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اٹھایا لیکن پورا نفع نہ اٹھا سکے۔

اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی، کام میں بھی اور وقت میں بھی، بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت و صحت کا سبب بن جاتا ہے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی طاقتور غذا اور دوا کام نہیں دیتی، اسی طرح بعض وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہوجاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا۔ ان سب صورتوں میں اگرچہ مقدار کے اعتبار سے نہ مال بڑھا ہے نہ وقت مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے۔

اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ آسمان اور زمین کی کل مخلوقات و موجودات کی برکات ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہیں ان کو اختیار کیا جائے تو آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیا کی فلاح و برکات بھی حاصل ہوتے ہیں اور ایمان و تقویٰ کو چھوڑنے کے بعد ان کی برکات سے محرومی ہوجاتی ہے، آج کی دنیا کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ آج کل ظاہری طور پر زمین کی پیداوار بہ نسبت پہلے کے بہت زائد ہے اور استعمالی اشیاء کی بہتات اور نئی نئی ایجادات تو اس قدر ہیں کہ پچھلی نسلوں کو ان کا تصور بھی نہ ہوسکتا تھا، مگر اس تمام ساز و سامان کی بہتات اور فراوانی کے باوجود آج کا انسان سخت پریشان، بیمار، تنگدست نظر آتا ہے، آرام و راحت اور امن و اطمینان کا کہیں وجود نہیں، اس کا سبب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ سامان سارے موجود اور بکثرت موجود ہیں مگر ان کی برکت مٹ گئی ہے۔

یہاں ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ سورۂ انعام کی ایک آیت کے اندر کفار و فجار کے بارے میں آیا ہے فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ، یعنی جب ان لوگوں نے احکام خداوندی کو بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، اور پھر اچانک ان کو عذاب میں پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے دروازے کسی پر کھل جانا کوئی حقیقی انعام نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا قہر الٰہی بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکات کھول

لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

[illegible]

خلاصۂ تفسیر

(آگے اس کی علت بتلاتے ہیں کہ ان کو عذاب سے کیوں ڈرنا چاہئے، اور وہ علت ان کا امم سابقہ کے ساتھ جرم کفر میں شریک ہونا ہے یعنی) اور ان گذشتہ زمین پر رہنے والوں کے بعد جو لوگ (اب) زمین پر بجائے ان کے رہتے ہیں کیا ان واقعات مذکورہ نے ان کو یہ بات (ہنوز) نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو بھی مثل امم سابقہ کے ان کے جرائم کفر و تکذیب کے سبب ہلاک کر ڈالتے، کیونکہ امم سابقہ ان ہی جرائم کے سبب ہلاک کی گئیں، اور واقعی یہ واقعات تو ایسے ہی ہیں کہ ان سے سبق لینا چاہئے تھا لیکن اصل یہ ہے کہ ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اس سے وہ (حق بات کو دل سے) سنتے بھی نہیں (ورنہ ماننا تو در کنار رہا، پس اس بند لگانے سے ان کی قساوت بڑھ گئی کہ ایسے عبرت خیز واقعات سے بھی عبرت نہیں ہوتی اور اس بند لگانے کا سبب انہی کا ابتداء میں کفر کرنا ہے، لقولہ تعالیٰ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ آگے تشدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لئے سارے مضمون مذکور کا خلاصہ ہے کہ) ان مذکورہ بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب (بستیوں میں رہنے والوں) کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے مگر پھر (بھی ان کی ضد و ہٹ دھرمی کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اول (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ دل کے سخت تھے) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں اور (ان میں سے بعضے لوگ مصیبتوں میں ایمان لانے کا عہد بھی کر لیتے تھے لیکن) اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا (یعنی زوال مصیبت کے بعد پھر ویسے کے ویسے ہی ہو جاتے تھے) اور ہم نے اکثر لوگوں کو (باوجود ارسال رسل و اظہار معجزات و نزول بینات و توثیق معاہدات) بے حکم ہی پایا (پس کفار ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتے رہے ہیں، آپ بھی غم نہ کیجئے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں بھی پچھلی قوموں کے واقعات و حالات سنا کر موجودہ اقوام عرب و عجم کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان واقعات میں تمہارے لئے بڑا درس عبرت ہے کہ جن کاموں کی وجہ سے پچھلے لوگوں پر اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوا ان کے پاس نہ جاؤ اور جن کاموں کی وجہ سے انبیاء

علیہم السلام اور ان کے متبعین کو کامیابی حاصل ہوئی ان کو اختیار کریں، چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہے اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ،

هدٰی یَهْدِیْ کے معنی نشان دہی کرنے اور بتلانے کے آتے ہیں، اس جگہ اس کا فاعل وہ واقعات ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ موجودہ زمانہ کے لوگ جو پچھلی قوموں کے ہلاک ہونے کے بعد ان کی زمینوں مکانوں کے وارث بنے یا آئندہ بنیں گے کیا ان کو پچھلے عبرتناک واقعات نے یہ نہیں بتلایا کہ کفر و انکار اور احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں جس طرح ان کے مورث، علی یعنی پچھلی قومیں، ہلاک و برباد ہو چکی ہیں اسی طرح اگر یہ بھی انہیں جرائم کے مرتکب رہے تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا قہر و عذاب آسکتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَنَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ، طبع کے معنی چھاپنے اور مہر لگانے کے ہیں، اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ واقعات مذکورہ سے بھی کوئی عبرت اور ہدایت حاصل نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غضب الٰہی سے ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ کچھ نہیں سنتے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں بڑھتا گیا تو بے نکی توبہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر لیتے ہیں اور انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے جو فطری مادہ بھلے برے کی پہچان اور برائی سے بچنے کا رکھا ہے وہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو برا اور بری کو اچھا، مفید کو مضر اور مضر کو مفید خیال کرنے لگتا ہے، اسی حالت کو قرآن میں ران یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی حالت کا آخری نتیجہ وہ ہے جس کو طبع یعنی مہر لگانے سے اس آیت میں اور بہت سی دوسری آیات میں تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دل پر مہر لگ جانے کا نتیجہ تو عقل و فہم کا معدوم ہو جانا ہے، کانوں کی سماعت پر تو اس کا کوئی اثر عادۃً نہیں ہوا کرتا، تو اس آیت میں موقع اس کا تھا کہ اس جگہ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ فرمایا جاتا یعنی وہ سمجھتے نہیں، مگر قرآن کریم میں یہاں فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ آیا ہے یعنی وہ سنتے نہیں، سبب یہ ہے کہ سننے سے مراد اس جگہ ماننا اور اطاعت کرنا ہے جو نتیجہ ہوتا ہے سمجھنے کا، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء و جوارح کا مرکز ہے جب قلب کے افعال میں خلل آتا ہے تو سارے اعضاء کے افعال مختل ہو جاتے ہیں جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا برائی سما جاتی ہے تو پھر ہر چیز میں اس کو آنکھوں سے بھی وہی نظر آتا ہے کانوں سے بھی وہی سنائی دیتا ہے۔

چشم بداندیش کہ برکندہ باد　　عیب نماید ہنرش در نظر

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا، انباء، نبأ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کوئی عظیم الشان خبر، معنی یہ ہیں کہ ہلاک شدہ بستیوں کے بعض واقعات ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں حرف مِنْ سے اشارہ کر دیا گیا کہ پچھلی اقوام کے حالات و واقعات جو ذکر کئے گئے ہیں وہ سب واقعات کا استیعاب نہیں بلکہ ہزاروں واقعات میں سے چند اہم واقعات کا بیان ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ، یعنی ان سب لوگوں کے انبیاء و رسل ان کے پاس معجزات لے کر پہنچے جن کے ذریعہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے، مگر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ عالم تھا کہ جس چیز کے متعلق ایک مرتبہ ان کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ یہ غلط و جھوٹ ہے پھر اس کے حق و صدق ہونے پر کتنے ہی معجزات، دلائل و حجتیں سامنے آ گئیں مگر وہ اس کی تصدیق و اقرار کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اس آیت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ معجزات تمام انبیاء و رسل کو عطا فرمائے گئے ہیں جن میں سے بعض انبیاء کے معجزات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، بہت سوں کا نہیں آیا، اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ جن کے معجزات کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ان سے کوئی معجزہ ثابت ہی نہیں، اور سورۂ ہود میں جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ قول مذکور ہے کہ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ یعنی آپ کوئی معجزہ نہیں لائے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کا یہ قول محض عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا یا یہ کہ ان کے معجزات کو معمولی سمجھ کر ایسا کہا۔

دوسری بات یہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا جو حال بتلایا گیا ہے کہ غلط بات زبان سے نکل گئی تو اس کی سخن پروری کرتے رہے، اس کے خلاف کتنے ہی واضح دلائل آ جائیں، اپنی بات کی پچ کرتے رہے، یہ خدا کی منکر اور کافر قوموں کا حال ہے جس میں بکثرت مسلمان بلکہ بعض علماء و خواص بھی مبتلا پائے جاتے ہیں کہ کسی چیز کو اول وہلہ میں غلط یا جھوٹ کہہ دیا تو اب اس کی سچائی کے ہزاروں دلائل بھی سامنے آ جائیں تو اپنی غلط بات کی پیروی کرتے رہیں۔ یہ حالت قہر خداوندی اور غضب الٰہی کا موجب ہے، (از مسائل السلوک)۔ اس کے بعد فرمایا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ، یعنی جس طرح ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اسی طرح عام کافر و منکر لوگوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتے ہیں کہ پھر نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ یعنی ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے ایفائے عہد کرنے والا نہ پایا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد الست ہے جو ازل میں تمام مخلوقات

کے پیدا کرنے سے پہلے ان سب کی روحوں کو پیدا فرما لیا گیا تھا جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا پروردگار نہیں، اس وقت تمام ارواح انسانی نے اقرار اور عہد کے طور پر جواب دیا بَلٰی یعنی ضرور آپ ہمارے رب ہیں، دنیا میں آکر اکثر لوگ اس عہد ازل کو بھول گئے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوگئے اس لئے اس آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد نہ پایا، یعنی عہد کی پابندی اور ایفاء نہ پایا۔ (کبیر)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد ایمان ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا، اس میں عہد سے عہد ایمان و طاعت مراد ہے، تو آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر نے ایمان و طاعت کا عہد جو ہم سے باندھا تھا پھر اس کی خلاف ورزی کی، عہد باندھنے سے مراد یہ ہے کہ عموماً انسان جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت کتنا ہی فاسق فاجر ہو اس کو بھی خدا ہی یاد آتا ہے اور اکثر دل یا زبان سے عہد کرتا ہے کہ اگر مصیبت سے نجات مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں لگ جاؤں گا نافرمانی سے بچوں گا جیسا کہ قرآن کریم میں بہت سے لوگوں کا یہ حال ذکر کیا گیا ہے، لیکن جب ان کو نجات ہوجاتی ہے اور آرام و راحت ملتی ہے تو پھر ہوئی و ہوس میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اس عہد کو بھول جاتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں لفظ اَكْثَر سے اس کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ تو ایسے شقی ہوتے ہیں کہ مصیبت کے وقت بھی انہیں خدا یاد نہیں آتا اور اس وقت بھی وہ ایمان و طاعت کا عہد نہیں کرتے تو ان سے بدعہدی کی شکایت کے کوئی معنی نہیں، اور بہت سے لوگ وہ بھی ہیں جو عہد کو پورا کرتے ہیں، ایمان و طاعت کے حقوق ادا کرتے ہیں اس لئے فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِم مِّنْ عَهْدٍ یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں ایفائے عہد نہ پایا

اس کے بعد فرمایا وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ یعنی ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو اطاعت و فرماں برداری سے خارج پایا۔

یہاں تک پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے پانچ واقعات کا بیان کرکے موجودہ لوگوں کو ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے تنبیہات فرمائی گئی ہیں۔

اس کے بعد چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، جس میں واقعات کے ضمن میں سینکڑوں احکام و مسائل اور عبرت و نصیحت کے بے شمار مواقع ہیں، اور اسی لئے قرآن کریم میں اس واقعہ کے اجزاء بار بار دہرائے گئے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى

پس کفر کیا انھوں نے ان کے مقابلہ میں، سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا، اور کہا موسیٰؑ نے

يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ

اے فرعون میں رسول ہوں پروردگار عالم کا، قائم ہوں اس بات پر کہ نہ کہوں

اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ

اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے، لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی سو بھیج دے

مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ

میرے ساتھ بنی اسرائیل کو، بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اس کو

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ

اگر تو سچا ہے، تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہوگیا اژدھا

مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ

صریح، اور نکالا اپنا ہاتھ تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو، بولے سردار

مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ

فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی بڑا واقف جادوگر ہے، نکالنا چاہتا ہے تم کو تمہارے

اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

ملک سے، اب تمہاری کیا صلاح ہے۔

ع ۱۳ ۴

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکور پیغمبروں) کے بعد ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس (ان کی ہدایت و تبلیغ کے لئے) بھیجا، سو (جب موسیٰ علیہ السلام نے وہ دلائل ظاہر کئے تو) ان لوگوں نے (ان معجزات) کا بالکل حق ادا نہ کیا (کیونکہ ان کا حق اور مقتضا یہ تھا کہ ایمان لے آتے) سو دیکھئے ان مفسدوں کا کیا (برا) انجام ہوا (جیسا دوسری جگہ ان کا غرق اور ہلاک ہونا مذکور ہے۔ یہ تو تمام قصہ کا اجمال

تھا آگے تفصیل ہے یعنی اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (فرعون کے پاس بحکم الٰہی جا کر) فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے (تمام لوگوں کی ہدایت کے واسطے) پیغمبر (مقرر ہوا) ہوں (جو مجھ کو کاذب بتلائے اس کی غلطی ہے کیونکہ میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز حق کے خدا کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں (اور میں رسالت کا خالی دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل (یعنی معجزہ) بھی لایا ہوں (جو طلب کے وقت دکھلا سکتا ہوں، سو جب میں رسول مع الدلیل ہوں تو میں جو کہوں اس کی اطاعت کر چنانچہ منجملہ ان امور کے ایک یہ کہتا ہوں کہ) تو بنی اسرائیل کو (اپنی بیگار سے خلاصی دے کر) میرے ساتھ (ملک شام کو جو ان کا اصلی وطن ہے) بھیج دے فرعون نے کہا کہ اگر آپ (من جانب اللہ) کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس کو اب پیش کیجئے اگر آپ (اس دعویٰ میں) سچے ہیں، بس آپ نے (فوراً) اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا سو دفعۃً وہ صاف ایک اژدھا بن گیا (جس کے اژدھا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا تھا، اور دوسرا معجزہ یہ ظاہر کیا کہ) اپنا ہاتھ (گریبان کے اندر بغل میں دبا کر) باہر نکال لیا سو وہ یکایک سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے دیکھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات عظیمہ ظاہر ہوئے تو فرعون نے اہل دربار سے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو سے تم لوگوں پر غالب آ کر یہاں کا رئیس ہو جائے اور تم کو یہاں آباد نہ رہنے دے سو اس بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے چنانچہ سورۂ شعراء میں یہ قول فرعون کا منقول ہے اس کو سن کر جیسا کہ مصاحبین سلاطین کی عادت ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی ہوتی ہے فرعون کے قول کی تصدیق و موافقت کے لئے) قوم فرعون میں جو سردار (اور اہل دربار) لوگ تھے انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ واقعی (جیسا ہمارے بادشاہ کہتے ہیں کہ) یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے (ضرور) یہ (یہی) چاہتا ہے کہ (اپنے جادو کے زور سے خود مع بنی اسرائیل کے رئیس ہو جائے اور) تم کو (بوجہ اس کے کہ بنی اسرائیل کی نظر میں خار ہو، تمہاری) اس سرزمین سے باہر کر دے سو تم لوگ (جیسا کہ بادشاہ دریافت کر رہے ہیں) کیا مشورہ دیتے ہو۔

معارف و مسائل

اس سورت میں جتنے قصص و واقعات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے ذکر کئے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے، اس کو زیادہ تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا

سبب یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بہ نسبت دوسرے انبیاء سابقین کے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور قوت ظہور میں بھی۔ اسی طرح اس کے بالمقابل ان کی قوم بنی اسرائیل کی جہالت اور ہٹ دھرمی بھی پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ اشد ہے اور یہ بھی ہے کہ اس قصہ کے ضمن میں بہت سے معارف و مسائل اور احکام بھی آئے ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ ان کے بعد یعنی نوح اور ہود اور صالح اور لوط اور شعیب علیہم السلام کے یا ان کی قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ آیات سے مراد تورات کی آیات بھی ہو سکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔ اور فرعون اس زمانہ میں ہر بادشاہ مصر کا لقب ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا نام قابوس بیان کیا جاتا ہے (قرطبی)

فَظَلَمُوا بِهَا کی ضمیر بھی آیات کی طرف راجع ہے، معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا۔ اور آیاتِ الٰہیہ پر ظلم کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے آیاتِ الٰہیہ کی قدر نہ پہچانی، ان پر شکر کے بجائے ناشکری، اقرار کے بجائے انکار، ایمان کے بجائے کفر اختیار کیا۔ کیونکہ ظلم کے اصلی معنی ہی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے محل اور موقع کے خلاف استعمال کرنا۔

پھر فرمایا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ، یعنی دیکھو تو سہی کہ پھر ان فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ مراد یہ ہے کہ ان کے حالات اور انجام بد پر غور کرو اور عبرت حاصل کرو۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں رب العٰلمین کا رسول ہوں، میرے حال اور منصب نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات بجز سچ کے منسوب نہ کروں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو جو پیغام حق تعالیٰ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ ان کے پاس خدائی امانت ہوتے ہیں، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرنا خیانت ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام خیانت اور ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگوں کو میری بات پر اس لئے یقین کرنا چاہیئے کہ میری سچائی تم سب کے سامنے ہے، میں نے کبھی نہ جھوٹ بولا ہے اور نہ بول سکتا ہوں، اس کے علاوہ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ، یعنی صرف یہی بات نہیں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بلکہ میرے دعوے پر دلیل میرے معجزات بھی ہیں۔ اس لئے ان سب چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میری بات سنیں اور مانیں، بنی

اسرائیل کو مصنوعی غلامی سے نجات دے کر میرے ساتھ کر دیں۔ فرعون نے اور کسی بات پر توکان نہ دھرا، معجزہ دیکھنے کا مطالبہ کرنے لگا، اور کہا اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَأْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ، یعنی اگر تم واقعی کوئی معجزہ لائے ہو تو پیش کرو اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطالبہ کو مانتے ہوئے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی وہ اژدھا بن گئی فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ۔ ثعبان بڑے اژدھا کو کہا جاتا ہے اور اس کی صفت مُبِیْنٌ ذکر کر کے بتلا دیا کہ اس لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے یا گوشہ پردہ میں واقع ہوا ہو جس کو کوئی دیکھے کوئی نہ دیکھے، جیسے عموماً شعبدہ بازوں یا جادوگروں کا طرز ہوتا ہے، بلکہ یہ واقعہ سب کے دربار میں سب کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس اژدھا نے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر تخت شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی اس کی دہشت سے مر گئے (تفسیر کبیر)۔

لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عادتِ عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابلِ تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشأ ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کرسکیں وہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابلِ تعجب و انکار نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد فرمایا وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ۔ نزع کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں سے کسی قدر سختی کے ساتھ نکالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو کھینچ کر نکالا، یہاں یہ مذکور نہیں کہ کس چیز میں سے نکالا۔ دوسری آیات میں دو چیزیں مذکور ہیں، ایک جگہ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دوسری جگہ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ مذکور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے دبا لو۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہاتھ کا نکالنا گریبان کے اندر سے یا بازو کے نیچے سے ہوتا تھا۔ یعنی کبھی گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنے سے اور کبھی بازو کے نیچے دبا کر نکالنے سے یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا کہ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ، یعنی وہ ہاتھ

چمکنے والا ہو جاتا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

بَیۡضَآءُ کے لفظی معنی سفید کے ہیں اور ہاتھ کا سفید ہو جانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایک دوسری آیت میں اس جگہ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفیدی بھی معمولی سفیدی نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ روشنی ہوتی تھی جس سے ساری فضاء روشن ہو جاتی تھی۔ (قرطبی)

اس جگہ لفظ لِلنّٰظِرِیۡنَ بڑھا کر اس روشنی کے عجیب و غریب ہونے کی طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ یہ ایسی عجیب روشنی تھی کہ اس کے دیکھنے کے لئے ناظرین جمع ہو جاتے تھے۔

اس وقت فرعون کے مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو معجزے دکھلائے، ایک لاٹھی کا اژدھا بن جانا دوسرے ہاتھ کو گریبان یا بغل میں ڈال کر نکالنے سے اس میں روشنی پیدا ہو جانا۔ پہلا معجزہ مخالفین کی ترہیب اور ڈرانے کے لئے، اور دوسرا معجزہ ان کی ترغیب اور قریب کرنے کے لئے ہے۔ جس میں اشارہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ایک نور ہدایت رکھتی ہے، اس کا اتباع باعثِ فلاح ہے۔

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیۡمٌ، لفظ مَلَاُ کسی قوم کے بااثر سرداروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ قوم فرعون کے سردار یہ معجزات دیکھ کر اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے وجہ یہ تھی کہ ؎

قدر ہر کس بقدر ہمت اوست

ان بیچاروں کو خدائے تعالیٰ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی کیا خبر تھی جنہوں نے ساری عمر فرعون کو اپنا خدا اور جادوگروں کو اپنا رہبر سمجھا اور جادوگروں کے شعبدوں ہی کو دیکھا تھا، وہ اس حیرت انگیز واقعہ کو دیکھ کر اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ یہ بھی کوئی بڑا جادو ہے لیکن ان لوگوں نے بھی یہاں سٰحِرٌ کے ساتھ عَلِیۡمٌ کا لفظ بڑھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے متعلق یہ احساس ان کو بھی ہو گیا تھا کہ یہ کام عام جادوگروں کے کام سے ممتاز اور مختلف ہے اسی لئے اتنا اقرار کیا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف

انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت و نظافت ان کی طبیعت ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق من جانب اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہل بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہوگیا، بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہِ راست قدرتِ حق کا فعل ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔

اس سے معلوم ہوا کہ معجزہ اور سحر کی حقیقتیں بالکل مختلف اور متباین ہیں، حقیقت شناس کے لئے تو کوئی التباس کی وجہ ہی نہیں، عوام کو التباس ہوسکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس التباس کو دور کرنے کے لئے بھی ایسے امتیازات رکھ دیئے ہیں کہ جس کی وجہ سے لوگ دھوکہ سے بچ جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قوم فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو اپنے جادوگروں کے افعال سے کچھ ممتاز و مختلف پایا، اس لئے اس پر مجبور ہوئے کہ یہ کہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے کہ عام جادوگر اس جیسے کاموں کا مظاہرہ نہیں کرسکتے۔

يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ، یعنی یہ ماہر جادوگر یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے، تو اب بتلاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا مشورہ دیتے ہو؟

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴿١١١﴾

بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج پرگنوں میں جمع کرنے والوں کو،

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿١١٢﴾ وَجَاۗءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا

کہ جمع کر لائیں تیرے پاس جو ہو کامل جادوگر، اور آئے جادوگر فرعون کے پاس، بولے

اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٣﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ

ہمارے لئے کچھ مزدوری ہے اگر ہم غالب ہوئے، بولا ہاں اور بیشک تم

لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿١١٤﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ

مقرب ہو جاؤ گے، بولے اے موسیٰ یا تو تو ڈال اور یا ہم

نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا
ڈالتے ہیں، کہا ڈالو، پھر جب انہوں نے ڈالا، باندھ دیا لوگوں کی
اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَ
آنکھوں کو اور ان کو ڈرا دیا اور لائے بڑا جادو۔ اور ہم نے
اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا
حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا سو وہ جبھی لگا نگلنے جو سانگ
يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا
انہوں نے بنایا تھا، پس ظاہر ہوگیا حق اور غلط ہوگیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا، پس ہار گئے
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾
اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہو کر۔ اور گر پڑے جادوگر سجدہ میں،
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
بولے ہم ایمان لائے پروردگار عالم پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔

خلاصۂ تفسیر

(غرض مشورہ طے کر کرا کر) انہوں نے (فرعون سے) کہا کہ آپ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو اور ان کے بھائی کو مہلت دیجئے اور (اپنی حدود قلمرو کے) شہروں میں (گرد آوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکم نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں (چنانچہ یہی انتظام کیا گیا) اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے (اور) کہنے لگے کہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آئے تو (کیا) ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں (انعام بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ ہوگا کہ) تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی جانب سے اس کی اطلاع دی گئی اور مقابلہ کے لئے تاریخ معین ہوئی اور تاریخ پر سب ایک میدان میں جمع ہوئے اس وقت) ان ساحروں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے موسیٰ (ہم آپ کو اختیار دیتے ہیں) خواہ آپ (اول اپنا عصا میدان میں) ڈالئے (جس کو آپ اپنا معجزہ بتلاتے ہیں) اور یا (آپ کہیں تو) ہم ہی (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں) ڈالیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ہی (پہلے) ڈالو جب انہوں نے

(اپنی رسیوں اور لاٹھیوں کو) ڈالا تو (جادو سے دیکھنے والے) لوگوں کی نظر بندی کر دی (جس سے وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں لہراتی نظر آنے لگیں) اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا اور (اس وقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی کے ذریعے سے حکم دیا کہ آپ اپنا عصا ڈال دیجئے (جیسا ڈالا کرتے ہیں) سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدہا بن کر) ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کیا پس (اس وقت) حق (کا حق ہونا) ظاہر ہو گیا اور انہوں نے (یعنی ساحروں نے) جو کچھ بنایا و بنایا تھا سب آتا جاتا رہا پس وہ لوگ (یعنی فرعون اور اس کی قوم) اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے (اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے) اور وہ جو ساحر تھے وہ سجدہ میں گر گئے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بقیہ قصہ مذکور ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کھلا معجزہ دیکھا کہ لاٹھی کا سانپ بن گیا اور پھر جب اس کو ہاتھ میں پکڑا تو پھر لاٹھی بن گئی اور ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر نکالا تو چمکنے لگا۔ اس وقت قدرت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا مگر جیسا اہل باطل کا عام طرز ہے کہ حق پر پردہ ڈالنے اور مکر کرنے کے لئے صحیح چیز کو غلط عنوان دیا کرتے ہیں، فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے بھی لوگوں سے یہی کہا کہ یہ بڑے ماہر جادوگر ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے ملک پر قبضہ کر کے تمہیں نکال دیں تو اب تم بتلاؤ کیا کرنا چاہئے؟

قوم فرعون نے یہ سن کر جواب دیا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ، اس میں لفظ اَرْجِهْ اِرْجَاءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ڈھیل دینے اور امید دلانے کے آتے ہیں اور مَدَاۗىِٕنِ، مَدِيْنَةٌ کی جمع ہے جو ہر بڑے شہر کے لئے بولا جاتا ہے، حٰشِرِيْنَ، حَاشِرٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اٹھانے والا جمع کرنے والا، مراد اس سے سپاہی ہیں جو اطراف ملک سے جادوگروں کو جمع کر کے لائیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ قوم کے لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ جادوگر ہے اور جادو کے ذریعہ ہمارا ملک فتح کرنا چاہتا ہے تو اس کا مقابلہ ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں، ہمارے ملک میں بڑے بڑے ماہر جادوگر ہیں اس کو اپنے جادو سے شکست دے دیں گے، کچھ سپاہی ملک کے

اطراف میں بھیج دیجئے جو ہر شہر کے جادوگروں کو بلا لائیں۔

وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں جادو سحر کا رواج عام تھا اور عام لوگوں پر جادوگروں کا اقتدار تھا اور شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ اسی لئے عطا فرمایا کہ جادوگروں سے مقابلہ ہو اور معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی سب لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم عادت بھی یہی ہے کہ ہر زمانہ کے پیغمبر کو اس زمانہ کے مناسب معجزات عطا فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت یونانی اور طب یونانی اپنے عروج پر تھی تو ان کو معجزہ یہ دیا گیا کہ مادرزاد اندھوں کو بینا بنادیں اور جذامی کوڑھیوں کو تندرست کردیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کا سب سے بڑا کمال فصاحت و بلاغت تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن بنایا گیا جس کے مقابلہ سے سارا عرب و عجم عاجز ہوگیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ، قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ، یعنی لوگوں کے مشورہ کے مطابق ملک بھر سے جادوگروں کے جمع کرنے کا انتظام کیا گیا، اور یہ جادوگر فرعون کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آگئے تو ہمیں اس کی کچھ اجرت اور انعام بھی ملے گا؟ فرعون نے کہا ہاں اجرت بھی ملے گی اور اس پر مزید یہ انعام ہوگا کہ تم سب ہمارے مقربین میں داخل ہوجاؤ گے۔

یہ جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ملک بھر سے جمع کئے گئے تھے، ان کی تعداد میں تاریخی روایات مختلف ہیں، نو سو سے لیکر تین لاکھ تک کی روایات ہیں۔ ان کے ساتھ لاٹھیوں اور رسیوں کا ایک انبار تھا جو تین سو اونٹوں پر لاد کر لایا گیا تھا۔ (قرطبی)

فرعونی جادوگروں نے آتے ہی پہلی بات سودے بازی کی شروع کی کہ ہم مقابلہ کریں اور غالب آجائیں تو ہمیں کیا ملے گا۔ وجہ یہ تھی کہ اہل باطل کے سامنے صرف دنیا کے فوائد ہوتے ہیں اس لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے معاوضہ اور اجرت کا سوال سامنے آتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائبین کے کہ وہ ہر قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، یعنی ہم جو پیغام حق تمہارے فائدہ کے لئے تمہیں پہنچاتے ہیں اس پر تم سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، بلکہ ہمارا معاوضہ صرف رب العالمین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرعون نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ اجرت چاہتے ہو، ہم اجرت بھی دیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ تمہیں شاہی دربار کا مقرب بنالیں گے۔

فرعون سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کی

جگہ اور وقت کا تعین کر دیا۔ چنانچہ ایک کھلا میدان اور عید کے دن آفتاب بلند ہونے کے بعد کا وقت اس کام کے لئے تجویز ہوا جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے۔ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَنْ يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى۔

بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آگیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اُس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر بالفرض تم غالب آگئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری و قرطبی)

قَالُوا يٰمُوسٰى إِمَّآ أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّآ أَنْ نَّكُونَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ۔ اِلقاء کے معنی ڈالنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب میدان مقابلہ میں پہنچے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یا تو آپ پہلے ڈالیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔ جادوگروں کا یہ کہنا اپنی بے فکری اور بڑائی جتانے کے لئے تھا کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ابتداء ہماری طرف سے ہو، کیونکہ ہم ہر حالت میں اپنے فن پر اطمینان رکھتے ہیں۔ ان کے انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ چاہتے تو یہی تھے کہ پہلا وار ان کا ہو مگر اظہار قوت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہل آپ کرنا چاہتے ہو یا ہم کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے منشاء کو محسوس کر کے اپنے معجزہ پر مکمل اطمینان ہونے کے سبب پہلا موقع ان کو دے دیا اور فرمایا اَلْقُوْا یعنی تم ہی پہلے ڈالو۔

اور ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کیا کہ پہلا موقعہ ان کو دینے کی پیشکش کی، اسی کا یہ اثر تھا کہ ان کو ایمان کی توفیق ہوئی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے، پھر جب کہ وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو بلا شبہ کفر ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیسے ان لوگوں کو اس کی اجازت دینے کے لئے فرمایا اَلْقُوْا یعنی تم ڈالو۔ لیکن حقیقت حال پر غور کرنے سے یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں تو یقینی تھا کہ یہ لوگ اپنا سحر مقابلہ پر ضرور پیش کریں گے، گفتگو صرف پہلے اور پیچھے کی تھی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت دینے کے لئے ان کو ہی موقعہ عطا فرمایا، اس کے علاوہ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ پہلے جادوگر اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنالیں تو پھر عصاء

موسیٰ کا معجزہ، صرف یہی نہیں کہ وہ بھی سانپ بن جائے بلکہ اس طرح ظاہر ہو کہ وہ جادو کے سارے سانپوں کو نگل بھی جائے تاکہ جادوگری کی کھلی شکست پہلے ہی قدم پر سامنے آجائے (بیان القرآن)

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان کو جادوگری کرنے کی اجازت کے لئے نہیں بلکہ ان کی رسوائی کو واضح کرنے کے لئے تھا کہ اچھا تم ڈال کر دیکھو کہ تمہارے جادو کا کیا انجام ہوتا ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ، یعنی جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو دکھلایا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور تخییل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں، سانپ نہیں بنے تھے۔ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر صرف اسی قسم میں منحصر ہے سحر کے ذریعہ انقلاب ماہیت نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر کی مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں۔ کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخییل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے۔ اور اگر کہیں قلب ماہیت بھی ہو جاتا ہو کہ انسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ، یعنی ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال دو، وہ زمین پر گرتے ہی سب سے بڑا سانپ بن کر ان تمام سانپوں کو نگلنے لگا جو جادوگروں نے جادو سے ظاہر کئے تھے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ ہزاروں جادوگروں کی ہزاروں لاٹھیاں اور رسیاں جب سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو سارا میدان سانپوں سے بھر گیا اور ایک عجیب ہیبت سارے مجمع پر مسلط ہو گئی تھی، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ایک بڑے اژدھا کی صورت میں سامنے آئی تو ان سب سانپوں کو نگل کر ختم کر دیا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ ساحروں نے

بنایا تھا وہ سب باطل اور ہَوا ہو گیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ، یعنی اس موقع پر وہ سب ہار گئے اور خوب رُسوا ہوئے۔

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ، قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ، یعنی جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے اور کہنے لگے کہ ہم رب العالمین یعنی ربّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئے۔

سجدے میں ڈال دیئے گئے فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر یہ لوگ کچھ ایسے مبہوت اور مجبور ہو گئے کہ بے اختیار سجدہ میں گر گئے۔ اور اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرما کر ان کو سجدہ میں ڈال دیا۔ اور "ربّ العالمین" کے ساتھ "ربّ موسیٰ و ہارون" بڑھا کر اپنی بات کو فرعون کے مقابلہ میں واضح کر دیا کیونکہ وہ بے وقوف تو اپنے آپ ہی کو رب العالمین کہتا تھا، اس لئے ربّ موسیٰ و ہارون کہہ کر اس کو بتلا دیا کہ ہم تیری خدائی کے قائل نہیں رہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ

بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری اجازت سے پہلے،

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا

یہ تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے اس شہر میں تاکہ نکال دو اس شہر سے

مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ

اس کے رہنے والوں کو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ

وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور دوسری طرف کے پاؤں، پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو،

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ

وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے، اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ

اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

مان لیا ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں، اے ہمارے رب! دہانے کھول دے

صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ

ہم پر صبر کے اور ہم کو مار مسلمان ، اور بولے سردار قوم فرعون کے ، کیوں

فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ

چھوڑتا ہے تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائیں ملک میں ،

وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ

اور موقوف کر دے تجھ کو اور تیرے بتوں کو ، بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور

نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

زندہ رکھیں گے ان کی عورتوں کو ، اور ہم ان پر زور آور ہیں

خلاصۂ تفسیر

فرعون (بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھڑ کر ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے ہو بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں بیشک (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جو کچھ جنگ زرگری کے طور پر ہوا ہے) ایک کارروائی تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں (خفیہ سازش ہوگئی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے اور یہ کارروائی ملی بھگت اس لئے کی ہے) تاکہ تم سب (مصر) اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو (پھر بفراغ خاطر سب مل کر یہاں ریاست کرو، سو بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) انہوں نے جواب دیا کہ (کچھ پرواہ نہیں، ہم مر کر کسی برے ٹھکانے تو نہ جائیں گے بلکہ) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے سو ہمارا نقصان ہی کیا ہے) اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے (جس پر اس قدر شور و غل ہے) بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے (سو یہ کوئی عیب کی بات نہیں پھر اس سے اعراض کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما (کہ اگر سختی کریں تو مستقل رہیں) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکالئے (کہ اس کی سختی سے پریشان ہو کر کوئی بات ایمان کے خلاف نہ ہو جائے) اور جب موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ عظیمہ منظر عام پر ظاہر

ہوا اور ساحرین ایمان لے آئے اور بعضے اور لوگ بھی آپ کے تابع ہو گئے اس وقت (قوم فرعون کے سرداروں نے (جو کہ ارکان سلطنت تھے یہ دیکھ کر کہ بعضے آدمی مسلمان ہو چلے فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) کو اور ان کی قوم (تابعین) کو یوں ہی رفع مخلی بالطبع و مطلق العنان آزاد رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں (فساد یہ کہ اپنا مجمع بڑھائیں جس کے اخیر میں اندیشہ بغاوت ہے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آپ کو اور آپ کے (تجویز کئے ہوئے) معبودوں کو ترک کئے رہیں (یعنی ان کے معبود ہونے کے منکر رہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم بھی ایسا ہی کرے یعنی آپ اس کا انتظام کیجئے) فرعون نے کہا کہ (بندوبست یہ انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے کہ) ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں تاکہ ان کا زور نہ بڑھنے پائے) اور (چونکہ عورتوں کے بڑھنے سے کوئی اندیشہ نہیں نیز ہم کو اپنے کاروخدمت کے لئے بھی ضرورت ہے اس لئے) عورتوں کو زندہ رہنے دیں اور ہم کو ہر طرح کا ان پر زور ہے (اس انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی)۔

مَعَارِف و مَسائِل

ان سے پہلی آیت میں مذکور تھا کہ فرعون نے اپنی قوم کے سرداروں کے مشورہ سے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے جن ساحروں کو پورے ملک سے جمع کیا تھا وہ میدان مقابلہ میں ہار گئے۔ اور صرف ہار ہی نہیں کہ اپنی ہار مان لی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

تاریخی روایات میں ہے کہ جب دو گروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر قوم فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کا اعلان کر دیا۔

اس مقابلہ اور مناظرہ سے پہلے تو صرف دو حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے مخالف تھے اس وقت سب سے بڑے جادوگر جو قوم میں اقتدار کے مالک تھے اور ان کے ساتھ چھ لاکھ قوم مسلمان ہو کر ایک بہت بڑی طاقت مقابلہ پر آگئی۔

اس وقت فرعون کی پریشانی اور سراسیمگی بیجا نہ تھی مگر اس نے اس کو چھپا کر ایک چالاک ہوشیار سیاست دان کے انداز میں پہلے تو جادوگروں پر یہ باغیانہ الزام لگایا کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ سازش کر کے یہ کام اپنے ملک و ملت کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا ہے اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ یعنی یہ ایک سازش ہے جو تم نے میدانِ مقابلہ میں آنے سے پہلے شہر کے اندر آپس میں کر رکھی تھی۔ اور پھر جادوگروں کو خطاب کر کے کہا اٰمَنْتُمْ بِهٖ

قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ یعنی کیا تم نے میری اجازت سے پہلے ہی ایمان قبول کرلیا۔ یہ استفہام انکاری بطور زجر و تنبیہ کے تھا۔ اور اپنی اجازت سے پہلے ایمان لانے کا ذکر کرکے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا حق پر ہونا واضح ہوجائے تو ہم بھی ان کو مانیں اور لوگوں کو بھی اجازت دیں کہ وہ مسلمان ہوجائیں لیکن تم لوگوں نے جلد بازی کی اور حقیقت کو سوچے سمجھے بغیر ایک سازش کے شکار ہوگئے۔

اس چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کی تسلیم کو ایک سازش قرار دے کر ان کو تو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالاکی یہ کی کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کے لئے تھا، قوم اور عوام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اُس کو ایک ملکی و سیاسی مسئلہ بنانے کے لئے کہا۔ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا یعنی تم لوگوں نے یہ سازش اس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ ملک مصر پر تم غالب آجاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو۔ ان چالاکیوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب و خوف جمانے کے لئے جادوگروں کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اول تو مبہم انداز میں کہا، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم ابھی دیکھ لوگے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے، اس کے بعد اُس کو واضح کرکے بتادیا، لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ، یعنی میں تم سب کے ہاتھ پیر مختلف جانبوں کے کاٹ کر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پیر جس سے دونوں جانبیں زخمی اور بدہیئت اور بیکار ہوجائیں۔

فرعون نے اس بدحواسی پر قابو پانے اور اپنے درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کر لی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو ہراساں کردینے کے لئے کافی تھیں۔

لیکن اسلام و ایمان ایک ایسی زبردست قوت ہے کہ جب وہ کسی دل میں گھر کرلیتی ہے تو پھر انسان ساری دنیا اور اس کے وسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔

یہ جادوگر جو اب سے چند گھنٹے پہلے فرعون کو اپنا خدا مانتے اور اسی گمراہی کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے، چند منٹ میں کلمہ اسلام پڑھتے ہی ان میں کیا چیز پیدا ہوگئی تھی کہ وہ فرعون کی ساری دھمکیوں کے جواب میں کہتے ہیں:۔

اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ، یعنی اگر تو ہمیں قتل کردے گا تو مضائقہ نہیں، ہم اپنے رب کے پاس

چلے جائیں گے، جہاں ہم کو ہر طرح کی راحت ملے گی۔ جادوگر چونکہ فرعون کی سطوت وجبروت سے ناواقف نہ تھے اس لئے یہ نہیں کہا کہ ہم تیرے قابو میں نہیں آئیں گے یا مقابلہ کریں گے بلکہ اس کی دھمکی کو صحیح مان کر یہ جواب دیا کہ یہ مانا کہ تو ہمیں ہر قسم کی سزا دینے پر دنیا میں قادر ہے مگر ہم دنیا کی زندگی ہی کو ایمان لانے کے بعد کوئی چیز نہیں سمجھتے، دنیا سے گزر جائیں گے تو اس زندگی سے بہتر زندگی ملے گی اور اپنے رب کی ملاقات نصیب ہوگی۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس زندگی میں جو تیرا دل چاہے کر لے، آخر کار ہم اور تم سب رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے اور وہ ظالم سے مظلوم کا انتقام لیں گے اس وقت اپنے اس عمل کا نتیجہ تیرے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس موقع پر ان جادوگروں کے یہ الفاظ منقول ہیں، فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ، یعنی جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں حکم دے دے، بس اتنا ہی تو ہے کہ تیرا حکم ہماری اس دنیوی زندگی پر چل سکتا ہے اور تیرے غصہ کے نتیجہ میں وہ زندگی ختم ہو سکتی ہے مگر ایمان لانے کے بعد ہماری نظر میں اس دنیوی زندگی کی وہ اہمیت ہی باقی نہیں رہی جو ایمان لانے سے پہلے تھی کیونکہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ زندگی راحت یا کلفت کے ساتھ گزر ہی جانے کی، فکر اس زندگی کی کرنا چاہئے جس کے بعد موت نہیں اور جس کی راحت بھی دائمی ہے اور کلفت بھی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو کل تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، خدا تعالیٰ کی شان وعظمت سے بالکل ناآشنا تھے، ان میں یکبارگی ایسا انقلاب کیسے آگیا کہ اب پچھلے سب عقائد و اعمال سے یکسر تائب ہو کر دین حق پر اتنے پختہ ہو گئے کہ اس کے لئے جان تک دینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس چلے جائیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہو گئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تحقیقی علم ومعرفت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرعون کے مقابلہ میں اس جرأت مندانہ بیان کے ساتھ یہ دعا بھی کرنے لگے۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ۔

یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہمیں وفات دے۔

اس میں اشارہ اس معرفت کی طرف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو انسان کا عزم وہمت کچھ کام نہیں آتا اس لئے اسی سے ثابت قدمی کی دعا کی گئی۔ اور یہ دعا جیسے معرفت حق کا

ثمرہ اور نتیجہ ہے اسی طرح اس مشکل کے حل کا بہترین ذریعہ بھی ہے جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے، کیونکہ صبر و ثبات قدمی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب و نتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدانِ جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت و مشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تاکید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوف آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر المنار)

ساحروں میں ایمانی انقلاب موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا و یدِ بیضاء سے بھی بڑا تھا۔

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لئے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گر کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔ فرعونی جادوگروں نے بھی اول مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا ناشناس منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کامل اور مجاہد و غازی بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا و یدِ بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔

فرعون پر حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی ہیبت کا اثر۔

فرعون کی چالاکی اور سیاسی جھوٹ نے اس کی جاہل قوم کو اس کے ساتھ قدیم گمراہی میں مبتلا رہنے کا کچھ سامان تو کر دیا مگر یہ اعجوبہ ان کے لئے بھی ناقابل فہم تھا کہ فرعون کے غصہ کا سارا زور جادوگروں پر ختم ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام جو اصل مخالف تھے ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا، اس پر ان کو کہنا پڑا۔

اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ، یعنی کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں۔

اس پر مجبور ہو کر فرعون نے کہا، سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ، یعنی ان کا معاملہ ہمارے لئے کچھ قابل فکر نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ ان میں جو لڑکا پیدا ہوگا اس کو قتل کر دیں گے صرف لڑکیوں کو رہنے دیں گے، جس کا نتیجہ کچھ عرصہ میں یہ ہو جائے گا کہ ان کی قوم مردوں سے خالی ہو کر صرف عورتیں رہ جائیں

گی جو ہماری قسمت کا دروازہ بند کر دیں گی۔ اور ہم تو ان سب پر پوری قدرت رکھتے ہیں جو چاہیں کریں یہ ہمارا کچھ نہیں بنا سکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ قوم کے اس طرح جھنجوڑنے پر بھی فرعون نے یہ تو کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے، لیکن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی بات نہ آئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس معجزہ اور واقعہ نے فرعون کے قلب و دماغ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت ہیبت بٹھلادی تھی۔

حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو پیشاب خطا ہوجاتا تھا، اور یہ بالکل صحیح ہے، ہیبت حق کا یہی حال ہوتا ہے ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست

اور مولانا رومیؒ نے فرمایا ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید　　ترسد ازوے جن و انس و ہر کہ دید

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ساری مخلوق اس سے ڈرنے لگتی ہے۔

اس جگہ قوم فرعون نے جو یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر فساد کرتے پھریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون اگرچہ اپنی قوم کے سامنے خود خدائی کا دعویدار تھا اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی کہتا تھا، لیکن خود بتوں کی پوجا پاٹ بھی کیا کرتا تھا۔

اور بنی اسرائیل کو ذلیل رکھنے کے لئے یہ ظالمانہ قانون کہ جو لڑکا پیدا ہو اسے قتل کردیا جائے یہ اب دوسری مرتبہ نافذ کیا گیا، اس کا پہلا دور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہوچکا تھا، جس کے ناکام ہونے کا مشاہدہ یہ اس وقت تک کر رہا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو رسوا کرنا چاہتے ہیں اس کی تدبیریں ایسی ہی ہوجایا کرتی ہیں جو انجام کار ان کے لئے تباہی کا سامان کردیتی ہیں، چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ فرعون کا یہ ظلم و جور آخر کار اس کو اور اس کی قوم کو لے ڈوبا۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ

[موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو، بیشک]

الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۗ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَ

زمین ہے اللہ کی، اس کا وارث کردے جس کو وہ چاہے اپنے بندوں میں، اور

الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوٓا أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا

آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کی۔ وہ کہنے لگے ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے

وَمِنۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ

اور تیرے آنے کے بعد، کہا نزدیک ہے کہ تمہارا رب ہلاک کردے

عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ

تمہارے دشمن کو اور خلیفہ کردے تم کو ملک میں، پھر دیکھے تم کیسے

تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۹﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَآ ءَالَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَ

کام کرتے ہو، اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور

نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۳۰﴾ فَإِذَا

میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں، پھر جب

جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِۦ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ

پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر پہنچتی برائی

يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُۥٓ ۗ أَلَآ إِنَّمَا طَٰٓئِرُهُمْ عِندَ

تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی، سن لو ان کی شومی تو اللہ

اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِۦ

کے پاس ہے پر اکثر لوگ نہیں جانتے، اور کہنے لگے جو کچھ تو لاوے گا

مِنْ ءَايَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾

ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے، سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لاویں گے۔

خلاصۂ تفسیر

(اس مجلس کی گفتگو کی خبر جو بنی اسرائیل کو پہنچی تو بڑے گھبرائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چارہ جوئی کی تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو (گھبراؤ مت) یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک (اور حاکم) بنادیں اپنے بندوں میں سے، سو چند روز کے لئے فرعون کو

دے دی ہے اور نیک کامیابی انہی کی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، سو تم ایمان و تقویٰ پر قائم رہو، انشاء اللہ تعالیٰ یہ سلطنت تم ہی کو مل جائے گی، تھوڑے دنوں انتظار کی ضرورت ہے۔ قوم کے لوگ (غایت حسرت و حزن سے جس کا طبعی مقتضا تکرار شکوہ ہے) کہنے لگے کہ حضرت، ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (کہ فرعون بیگار لیتا تھا اور مدتوں ہمارے لڑکوں کو قتل کرتا رہا) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی (کہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اب پھر قتل اولاد کی تجویز ٹھہری ہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (گھبراؤ مت) بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس زمین کا حاکم بنا دیں گے پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے (کہ شکر و قدر و طاعت کرتے ہو یا بے قدری اور غفلت و معصیت، اس میں ترغیب ہے طاعت کی اور تحذیر ہے معصیت سے) اور (جب فرعون اور اس کے متبعین نے انکار و مخالفت پر کمر باندھی تو) ہم نے فرعون والوں کو (فرعون کی حسب عادت مذکورہ رکوع اول پارہ ہذا، ان بلیات میں) مبتلا کیا (۱) قحط سالی میں اور (۲) پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ (حق بات کو) سمجھ جائیں (اور سمجھ کر قبول کرلیں، سو وہ پھر بھی نہ سمجھے بلکہ یہ کیفیت تھی کہ) جب ان پر خوشحالی (یعنی ارزانی و پیداواری) آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے (یعنی ہم مبارک طالع ہیں یہ ہماری خوش بختی کا اثر ہے، یہ نہ تھا کہ اس کو خدا کی نعمت سمجھ کر شکر بجا لاتے اور اطاعت اختیار کرتے) اور اگر ان کو کوئی بدحالی (جیسے قحط و کم پیداواری مذکور) پیش آتی تو موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے (کہ یہ ان کی نحوست سے ہوا، یہ نہ ہوا کہ اس کو اپنے اعمال بد کفر و تکذیب کی شامت و سزا سمجھ کر تائب ہو جاتے حالانکہ یہ سب ان کی شامت اعمال تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں کہ) یاد رکھو کہ ان کی (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی ان کے اعمال کفریہ جو اللہ کو معلوم ہیں یہ نحوست انہی اعمال کی سزا ہے) لیکن (انکی بے تمیزی سے) ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے تھے اور (بلکہ اور پرے) یوں کہتے (کہ خواہ) کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے۔

معارف و مسائل

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد بنی اسرائیل پر اس طرح غصہ اتارا کہ ان کے لڑکوں کو قتل کرکے صرف عورتوں کو باقی رکھنے کا قانون بنا دیا تو بنی اسرائیل

گھبرائے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے جو عذاب فرعون نے ان پر ڈال رکھا تھا وہ پھر آ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کو محسوس فرمایا تو پیغمبرانہ شفقت اور حکمت کے مطابق اس بلاء سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کو دو چیزوں کی تلقین فرمائی، ایک دشمن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا۔ دوسرے کشود کار تک صبر وہمت سے کام لینا۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ اس نسخہ کا استعمال کرو گے تو یہ ملک تمہارا ہے تمہیں غالب آؤ گے۔ یہی مضمون ہے پہلی آیت کا جس میں فرمایا ہے، اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا یعنی اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ اور پھر فرمایا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، یعنی ساری زمین اللہ کی ہے وہ جس کو چاہے اس کو اس زمین کا وارث و مالک بنائے گا۔ اور یہ بات متعین ہے کہ انجام کار کامیابی متقی پرہیزگاروں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا جس کا طریقہ ابھی مذکور ہوا ہے کہ استعانت باللہ اور صبر کا التزام کیا جائے تو انجام کار تم ہی ملک مصر کے مالک و قابض ہو گے۔

مشکلات و مصائب سے نجات کا نسخہ اکسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جو حکیمانہ نسخہ دشمن پر غالب آنے کے لئے تلقین فرمایا تھا، غور کیا جائے تو یہی وہ نسخہ اکسیر ہے جو کبھی خطا نہیں ہوتا، جس کے بعد کامیابی یقینی ہوتی ہے، اس نسخہ کا پہلا جزء استعانت باللہ ہے، جو اصل روح ہے اس نسخہ کی۔ وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی مدد پر ہو تو ساری کائنات کا رخ اس کی مدد کی طرف پھر جاتا ہے، کیونکہ ساری کائنات اس کے تابع فرمان ہے ؂

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند		با من و تو مردہ با حق زندہ اند

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے دشمن کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی قوت انسان کے لئے اتنی کارآمد نہیں ہو سکتی جتنی اللہ تعالیٰ سے امداد کی طلب، بشرطیکہ طلب صادق ہو، محض زبان سے کچھ کلمات بولنا نہ ہو۔

دوسرا جزء اس نسخہ کا صبر ہے۔ صبر کے معنی اصل لغت کے اعتبار سے خلاف طبع چیزوں پر ثابت قدم رہنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے ہیں۔ کسی مصیبت پر صبر کرنے کو بھی اسی لئے صبر کہا جاتا ہے کہ اس میں رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کے طبعی جذبہ کو دبایا جاتا ہے۔ ہر تجربہ کار عقلمند جانتا ہے کہ دنیا میں ہر بڑے مقصد کے لئے بہت سی خلاف طبع محنت و مشقت برداشت کرنا لازمی ہے، جس شخص کو محنت و مشقت کی عادت اور خلاف طبع

چیزوں کی برداشت حاصل ہوجائے وہ اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر ایسی نعمت ہے کہ اس سے زیادہ وسیع تر نعمت کسی کو نہیں ملی (ابوداؤد)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس حکیمانہ نصیحت اور اس پر مرتب ہونے والی فتح و نصرت کا اجمالی وعدہ کجروی کی خوگر بنی اسرائیل کی سمجھ میں کیا آتا، یہ سب کچھ سن کر بول اٹھے اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا، یعنی آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں ایذائیں دی گئیں اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے تو اس امید پر وقت گذر سکتا تھا کہ کوئی پیغمبر ہماری خلاصی کے لئے آنے والا ہے، اب آپ کے آنے کے بعد بھی یہی ایذاؤں کا سلسلہ رہا تو ہم کیا کریں گے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حقیقت معاملہ منکشف کرنے کے لئے فرمایا، عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ بات دور نہیں کہ اگر تم نے میری نصیحت پر عمل کیا تو بہت جلد تمہارا دشمن ہلاک و برباد ہوجائے اور ملک پر تمہارا قبضہ و قدرت ہوجائے، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا، فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ، جس میں بتلادیا کہ اس دنیا میں کسی زمین کی حکومت و سلطنت خود کوئی مقصد نہیں بلکہ زمین میں عدل و انصاف قائم کرنے اور اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کے لئے کسی انسان کو کسی ملک کی حکومت دی جاتی ہے، اس لئے جب تم کو ملک مصر پر اقتدار حاصل ہو تو ہوشیار رہو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی حکومت و اقتدار کے نشہ میں اپنے سے پہلے لوگوں کے انجام کو بھول بیٹھو۔

حکومت و سلطنت حصول طاقت کا امتحان ہے۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ خاص بنی اسرائیل کو ہے لیکن اللہ جل شانہ نے ہر حکمران طبقہ کو اس میں یہ تنبیہ فرمادی ہے کہ درحقیقت حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، انسان کو بحیثیت خلیفہ کے وہ ہی حکومت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھین لیتا ہے، تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ، کا یہی مطلب ہے، نیز یہ کہ جس کو کسی زمین پر حکومت عطا کی جاتی ہے وہ درحقیقت حکمران فرد یا حکمران جماعت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ مقصد حکومت یعنی قیام عدل و انصاف اور اقامۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

تفسیر بحر محیط میں اس جگہ نقل کیا ہے کہ بنی عباس کے دوسرے خلیفہ منصور کے پاس خلافت ملنے سے پہلے ایک روز عمرو بن عبید پہنچے تو یہ آیت پڑھی، عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ

عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ، جس میں ان کے لئے خلافت ملنے کی بشارت تھی، اتفاقاً اس کے بعد منصور خلیفہ بن گئے اور پھر عمرو بن عبید ان کے یہاں پہنچے تو منصور نے اُن کی پیشین گوئی جو آیت مذکورہ کے تحت اس سے پہلے فرمائی تھی یاد دلائی تو عمرو بن عبید نے خوب جواب دیا کہ ہاں خلیفہ ہونے کی پیشین گوئی تو پوری ہوگئی مگر ایک چیز باقی ہے یعنی فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، مطلب یہ تھا کہ ملک کا خلیفہ و امیر بن جانا کوئی فخر و مسرت کی چیز نہیں کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خلافت و حکومت میں اس کا رویہ کیا اور کیسا رہا، اب اس کے دیکھنے کا وقت ہے۔

اس کے بعد آیت مذکورہ کے وعدہ کا ایفاء اور قوم فرعون کا طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار ہونا اور بالآخر غرق دریا ہو کر ختم ہو جانا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس میں سب سے پہلا عذاب قحط اور اشیاء کی کمیابی اور گرانی کا تھا جو قوم فرعون پر مسلط ہوا۔

تفسیری روایات میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال مسلسل رہا، اور آیت میں جو اس قحط کے بیان میں دو لفظ آئے ہیں، ایک سِنِیْن، دوسرے نقص ثمرات۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور قتادہؒ وغیرہ نے فرمایا کہ قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کے لئے تھا اور پھلوں کی کمی شہر والوں کے لئے، کیونکہ عموماً دیہات میں غلہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور شہروں میں پھلوں کے باغات ہوتے ہیں تو اشارہ اس طرف ہوا کہ نہ غلہ کے کھیت باقی رہے نہ پھلوں کے باغات۔

لیکن جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، قوم فرعون بھی اسی قہر میں مبتلا تھی، عذاب کے اس ابتدائی جھٹکے سے بھی ان کو کوئی تنبیہ نہ ہوئی بلکہ اس کو اوپر آنے والی مصیبت کو یہ کہنے لگے کہ یہ نحوست حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی ہے، فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ، یعنی جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی اور راحت و آرام ملتا تو یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے ہمیں ملنا ہی چاہئے، اور جب کوئی مصیبت اور برائی پیش آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے اثر سے ہے، حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

لفظ طائر کے لغوی معنی پرندے جانور کے ہیں۔ عرب پرندہ جانوروں کے داہنے بائیں جانب اڑنے سے اچھی بری فالیں لیا کرتے تھے، اس لئے مطلق فال کو بھی "طائر" کہنے لگے، اس آیت میں طائر کے یہی معنی ہیں۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان کی فال اچھی یا بری جو کچھ بھی ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے جو کچھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی قدرت

ومشیت سے ہوتی ہیں، اس میں نہ کسی کی نحوست کا دخل ہے نہ برکت کا، یہ سب ان کی خام خیالی اور جہالت ہے جو پرندوں کے داہنے یا بائیں اڑ جانے سے اچھی بری فالیں لے کر اپنے مقاصد اور عمل کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔

اور بالآخر قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کو سحر کہہ کر نظر انداز کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا۔ مَهْمَا تَأْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ، یعنی آپ کتنی ہی علامتیں اپنی نبوت کی پیش کر کے ہم پر اپنا جادو چلانا چاہیں تو سن لیجئے ہم کبھی آپ پر ایمان لانے والے نہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ

پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک

وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور خون بہت سی نشانیاں جدی جدی، پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گنہگار

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا

اور جب پڑتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے جیسا کہ

عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ

اس نے بتلا رکھا ہے تجھ کو اگر تو نے دور کر دیا ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئیں گے تجھ پر

وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ

اور جانے دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو پھر جب ہم نے اٹھا لیا ان سے

الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

عذاب ایک مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا اسی وقت عہد توڑ ڈالتے

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا

پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو دریا میں اس وجہ سے کہ انہوں نے جھٹلایا

بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

ہماری آیتوں کو اور ان سے تغافل کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

(جب ایسی سرکشی اختیار کی تو) پھر ہم نے ان دو بلاؤں کے علاوہ یہ بلائیں مسلط کیں کہ (۳) ان پر (کثرتِ بارش کا) طوفان بھیجا (جس سے مال وجان تلف ہونے کا اندیشہ ہوگیا، اور اس سے گھبرائے تو موسیٰ علیہ السلام سے عہد وپیمان کیا کہ ہم سے یہ بلا دور کرا دیجئے تو ہم ایمان لائیں اور جو آپ کہیں اطاعت کریں پھر جب وہ بلا دور ہوئی اور خوب غلہ وغیرہ نکلا پھر بے فکر ہوگئے کہ اب تو جان بھی بچ گئی مال بھی خوب ہوگا اور بدستور اپنے کفر وطغیان پر اڑے رہے تو ہم نے ان کے کھیتوں پر (۴) ٹڈیاں (مسلط کیں) اور (جب پھر کھیتوں کو تباہ ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پھر ویسے ہی عہد وپیمان کئے اور پھر جب آپ کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی اور غلہ تیار کرکے اپنے گھر لے آئے پھر بے فکر ہوگئے کہ اب تو غلہ قبضہ میں آگیا اور بدستور اپنے کفر ومخالفت پر جمے رہے تو ہم نے اس غلہ میں (۵) گھن کا کیڑا (پیدا کردیا، اور جب پھر اسی طرح عہد وپیمان کرکے دعا کرائی اور وہ بلا بھی دور ہوئی اور اس سے مطمئن ہوگئے کہ اب پیٹ بھر کر کھائیں پئیں گے، پھر وہی کفر اور وہی مخالفت، تو اس وقت ہم نے ان کے کھانے کو یوں بے لطف کردیا کہ ان پر (۶) مینڈک (بہجوم کثرت ان کے کھانے کے برتنوں میں ہنڈیوں میں آ آکر گرنے شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہوا اور ویسے بھی گھر میں بیٹھنا مشکل کردیا اور پینے کو یوں بے لطف کردیا کہ (۷) ان کا پانی) خون (ہو جاتا، منہ میں لیا اور خون بنا، غرض ان پر یہ بلائیں مسلط ہوئیں)، کہ یہ سب (موسیٰ علیہ السلام کے) کھلے کھلے معجزے تھے (کہ ان کی تکذیب ومخالفت پر ان کا ظہور ہوا اور یہ ساتوں عصا اور ید بیضاء ملا کر آیاتِ تسعہ کہلاتے ہیں) سو چاہیے تھا کہ ان معجزات وآیاتِ قہر کو دیکھ کر ڈر جاتے مگر) وہ (پھر بھی) تکبر (ہی) کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرم پیشہ (کہ ایسی سختی پر بھی باز نہ آتے تھے) اور جب ان پر کوئی عذاب (مذکورہ بلاؤں میں سے) واقع ہوتا تو یوں کہتے، اے موسیٰ، ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کردیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے، وہ بات قہر کا دور کردینا ہے ہمارے باز آجانے پر، سو ہم اب وعدہ کرتے ہیں کہ، اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹا دیں (یعنی دعا کرکے ہٹوا دیں) تو ہم ضرور بضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی رہا کرکے آپ کے ہمراہ کردیں گے پھر جب (ببرکت دعائے موسیٰ علیہ السلام) ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے (جیسا اوپر بیان ہوا) پھر (جب بار بار یہ دیکھا کہ وہ اپنی شرارت سے باز ہی نہیں آتے تب اس وقت) ہم نے ان سے (پورا) بدلہ لیا یعنی ان کو

دریا میں غرق کردیا جیسا دوسری جگہ ہے) اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور
ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے (اور تکذیب و غفلت بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ اصرار و عناد
کے ساتھ کہ اطاعت کا وعدہ کرلیں اور توڑ دیں)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں قوم فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا باقی قصہ مذکور ہے کہ فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ہار گئے اور ایمان لے آئے، مگر قوم فرعون اسی طرح اپنی سرکشی اور کفر پر جمی رہی۔

اس واقعہ کے بعد تاریخی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام بیس۲۰ سال مصر میں مقیم رہ کر ان لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور حق کی طرف دعوت دیتے رہے، اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نو۹ معجزات عطا فرمائے، جن کے ذریعہ قوم فرعون کو متنبہ کرکے راستہ پر لانا مقصود تھا، قرآن کریم میں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ میں انہی نو معجزات کا بیان ہے۔

ان معجزات میں سے سب سے پہلے دو معجزے، عصا اور ید بیضاء کا ظہور فرعون کے دربار میں ہوا، اور انہی دو معجزوں کے ذریعہ جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فتح حاصل کی، اسی سلسلہ کا ایک معجزہ وہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے کہ قوم فرعون پر ان کی بدعملی کے سبب قحط مسلط کردیا، ان کی زمینوں اور باغوں میں پیداوار بہت گھٹ گئی جس سے یہ سخت پریشان ہوئے، اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قحط رفع ہونے کے لئے دعا کرائی، مگر جب قحط رفع ہوگیا تو پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہوگئے اور کہنے لگے یہ قحط تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہوا تھا، اب جو قحط رفع ہوا یہ ہمارے حال کا تقاضا ہے،

باقی معجزات کا بیان مذکورہ آیتوں میں ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ،

یعنی پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیڑا اور مینڈک اور خون۔

اس میں قوم فرعون پر مسلط ہونے والے پانچ قسم کے عذابوں کا ذکر ہے اور ان کو اس آیت میں اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فرمایا ہے جس کے معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ ان میں سے ہر عذاب ایک معین وقت تک رہا پھر موقوف ہوگیا، اور کچھ مہلت دی گئی اس کے بعد دوسرا اور تیسرا عذاب اسی طرح الگ الگ ہو کر آئے، یہی ترجمہ شیخ الہند میں اختیار کیا گیا ہے۔

ابن منذر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب قوم فرعون پر سات روز تک مسلط رہتا تھا، ہفتہ کے دن شروع ہو کر دوسرے ہفتہ کے دن رفع ہو جاتا اور پھر تین ہفتے کی مہلت ان کو دی جاتی تھی۔

امام بغوی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ جب پہلی مرتبہ قوم فرعون پر قحط کا عذاب مسلط ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے رفع ہو گیا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار۔ یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذاب قحط سے بھی متاثر نہ ہوئے اور معاہدہ کر کے پھر گئے، اب ان پر کوئی ایسا عذاب مسلط فرما دیجئے جو ان کے لئے دردناک ہو، اور ہماری قوم کے لئے ایک وعظ کا کام دے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت بنے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا، مشہور مفسرین کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے۔ قوم فرعون کے سب گھروں اور زمینوں کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی نہ زمین میں کچھ کاشت وغیرہ کرنے کی، اور عجیب بات یہ تھی کہ قوم فرعون کے مکانات اور زمینوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں تھیں، بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں سب بدستور خشک تھیں کہیں طوفان کا پانی نہ تھا اور قوم فرعون کے سارے گھر اور زمین اس طوفان سے لبریز تھے۔

اس طوفان سے گھبرا کر قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے دور فرما دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا۔ اور اس کے بعد ان کی کھیتیاں پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں، تو اب یہ کہنے لگے کہ درحقیقت یہ طوفان کوئی عذاب نہیں تھا بلکہ ہمارے فائدے کے لئے آیا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہماری زمینوں کی پیداوار بڑھ گئی، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ دخل نہیں اور یہ کہہ کر سب عہد و پیمان نظر انداز کر دیئے۔

اس طرح یہ لوگ ایک مہینہ امن و عافیت سے رہتے رہے، اللہ نے ان کو غور و فکر کی مہلت دی مگر یہ ہوش میں نہ آئے تو اب دوسرا عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، ٹڈی دل نے ان کی ساری کھیتیوں اور باغوں کو کھا لیا، بعض روایات میں ہے کہ لکڑی کے دروازوں اور چھتوں کو اور گھر کے سب سامان کو ٹڈیاں کھا گئیں اور اس عذاب کے وقت بھی موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ سامنے تھا کہ یہ سارا ٹڈی دل صرف قبطی یعنی قوم فرعون کے باغوں، کھیتیوں، گھروں پر چھایا ہوا تھا، پاس ملے ہوئے اسرائیلیوں کے مکانات، زمینیں، باغ سب اس سے محفوظ تھے اس وقت پھر قوم فرعون چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اس

اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیں یہ عذاب ہٹ جائے تو ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی اور یہ عذاب ہٹ گیا، مگر عذاب سے بچنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس اب بھی اتنا ذخیرہ غلہ کا موجود ہے کہ ہم سال بھر کھا سکتے ہیں، تو پھر سرکشی اور عہد شکنی پر آمادہ ہو گئے، نہ ایمان لائے نہ بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

ایک مہینہ پھر اللہ تعالیٰ نے مہلت دی، اس مہلت کے بعد تیسرا عذاب قُمَّل کا مسلط ہوا، لفظ قمل اس جُوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان کے بالوں اور کپڑوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو غلہ میں لگ جاتا ہے جس کو گھُن بھی کہا جاتا ہے۔ قمل کا یہ عذاب ممکن ہے کہ دونوں قسم کے کیڑوں پر مشتمل ہو کہ غلوں میں گھُن لگ گیا اور انسانوں کے بدن اور کپڑوں میں جُوؤں کا طوفان امڈ آیا۔

غلوں کا اس گھُن نے ایسا کر دیا کہ دس سیر گیہوں پیسنے کے لئے نکالیں تو اُس میں تین سیر آٹا بھی نہ نکلے، اور جوؤں نے ان کے بال اور پلکیں اور بھویں تک کھالیں

آخر پھر قوم فرعون بلبلا اٹھی اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اب کی مرتبہ ہم ہرگز وعدہ سے نہ پھریں گے آپ دعا کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی ٹل گیا، مگر جن بدنصیبوں کو ہلاک ہی ہونا تھا وہ کہاں عہد کو پورا کرتے، پھر عافیت ملتے ہی سب کچھ بھول گئے اور منکر ہو گئے۔

پھر ایک ماہ کی مہلت امن آرام و راحت کے ساتھ ان کو دی گئی مگر اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، اور اس کثرت سے مینڈک ان کے گھروں میں پیدا ہو گئے کہ جہاں بیٹھتے تو ان کے گلے تک مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکتی ہوئی ہنڈیا میں، رکھے ہوئے کھانے میں آٹے میں اور ہر چیز میں مینڈک بھر جاتے، اس عذاب سے عاجز آ کر سب رونے لگے اور پہلے سے پختہ وعدوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی رفع ہو گیا۔

مگر جس قوم پر قہر الٰہی مسلط ہو اس کی عقل اور ہوش و حواس کام نہیں دیتے، اس واقعہ کے بعد بھی عذاب سے نجات پا کر یہ پھر اپنی ہٹ دھرمی پر جم گئے اور کہنے لگے کہ اب تو ہمیں اور بھی یقین ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر ہیں یہ سب ان کے جادو کے کرشمے ہیں رسول نبی کچھ نہیں۔

پھر ایک ماہ کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی [illegible] اس مہلت سے بھی کوئی کام نہ لیا تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کردیا گیا کہ ان [illegible] پینے [illegible] خون بن گئی، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالیں خون بن جائے [illegible] پکانے کے لئے رکھیں خون بن جائے اور ان سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام [illegible] عذاب سے اسرائیلی حضرات بالکل مامون و محفوظ تھے، خون کے عذاب [illegible] قوم فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا جب وہ ان کے ہاتھ میں [illegible] ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر قبطی اور اسرائیلی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اٹھاتے [illegible] ہوتا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ قبطی کے منہ میں جاتا خون بن جاتا، یہ عذاب [illegible] سابق سات روز رہا بالآخر پھر یہ بدکار بدعہد قوم چلّا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام [illegible] یاد کی اور پہلے سے زیادہ موثق وعدے کئے، دعا کی گئی عذاب ہٹ گیا مگر یہ لوگ [illegible] ہٹ دھرمی پر جمے رہے، اس طرح یہ پانچ عذاب مسلسل ان پر آتے رہے مگر یہ لوگ اپنی گمراہی پر [illegible] جس کو قرآن کریم نے فرمایا:

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ، یعنی ان لوگوں نے [illegible] سے کام لیا اور یہ لوگ بڑے عادی مجرم تھے۔

اس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذکر بعد کی آیت میں رجز کے نام سے آیا ہے، یہ لفظ الشرطاعون کے لئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وبا مسلط کردی گئی جس میں ان کے ستّر ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ اس وقت پھر ان لوگوں نے فریاد کی اور پھر دعا کرنے پر یہ عذاب ہٹا اور پھر بدستور ان لوگوں نے عہد شکنی کی، اتنی مسلسل آزمائشوں اور مہلتوں کے بعد جب ان میں کوئی احساس پیدا ہی نہ ہوا تو اب آخری عذاب آیا کہ سب کے سب اپنے مکان زمینیں سامان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلے [illegible] دریائے قلزم کا لقمہ بن گئے، فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ

اور وارث کردیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے [illegible] اس زمین کے

الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ

مشرق [illegible] اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے اور پورا ہوگیا نیکی کا

ان کو کمزور سمجھیں مگر انجام کار پر سب کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کمزور و ذلیل نہ تھے، کیونکہ درحقیقت قوت و عزت حق تعالیٰ شانہ کے قبضہ میں ہے، تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔

اور زمین کا مالک بنا دینے کے لئے لفظ اَوْرَثْنَا ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو وارث بنا دیا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ جس طرح وارث ہی اپنے مورث کے مال کا مستحق ہوتا ہے، باپ کی حیات ہی میں ہر شخص یہ جان لیتا ہے کہ اس کے مال و جائداد کی مالک آخرکار اس کی اولاد ہے اسی طرح علم الٰہی میں بنی اسرائیل پہلے ہی سے قوم فرعون کے ملک و مال کے مستحق تھے۔

مَشَارِقَ مَشْرِق کی جمع ہے اور مَغَارِبَ مَغْرِب کی، سردی گرمی کے مختلف موسموں میں مغرب و مشرق کے بدلنے کی وجہ سے جمع کا لفظ لایا گیا، اور زمین سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے قول کے مطابق ملک شام اور مصر کی سرزمین ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو قوم فرعون اور قوم عمالقہ کے ہلاک ہونے کے بعد قبضہ اور حکومت عطا فرمائی۔

اور الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا سے یہ بتلا دیا کہ ان زمینوں میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اپنی برکات نازل فرمائی ہیں، ملک شام کے بارے میں تو قرآن کریم کی متعدد آیات میں محل برکات ہونے کا ذکر ہے، الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ میں اسی کا بیان ہے، اسی طرح ارض مصر کے بارے میں بھی محل برکات و ثمرات ہونا متعدد روایات سے نیز مشاہدات سے ثابت ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ مصر کا دریائے نیل سَیِّدُ الْاَنْهَار یعنی دریاؤں کا سردار ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ برکات کے دس حصوں میں سے نو حصے مصر میں ہیں اور باقی ایک پوری زمین میں (بحر محیط)

خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کو غرور و پندار کے نشہ والوں نے اپنی کوتاہ نظری سے ذلیل و کمزور سمجھ رکھا تھا، ہم نے اسی کو ان متکبرین کی دولت و سلطنت اور ملک و مال کا مالک بنا کر دکھلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا وعدہ سچا ہوتا ہے، ارشاد فرمایا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ یعنی آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوگیا۔

اس اچھے وعدے سے مراد یا تو وہ وعدہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیا تھا، عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ یعنی قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ان کی زمین کا تمہیں مالک بنا دے۔ اور یا وہ وعدہ ہے جو قرآن کریم میں دوسری جگہ خود حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَي الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ، یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قوم پر احسان کریں جن کو اس ملک میں کمزور و ذلیل سمجھا گیا ہے، اور

ان کو ہی سردار اور حکام بنا دیں اور ان کو ہی اس زمین کا وارث قرار دیں اور اس زمین پر تصرفات کرنے کا حق دیں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز واقع کر کے دکھلا دیں جس کے ڈر سے وہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں وعدے ایک ہی ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدے ہی کی بناء پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا، اس آیت میں اس وعدہ کا پورا ہونا لفظ تَمَّتْ سے بیان کیا گیا، کیونکہ وعدہ کا اتمام وتکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ پورا ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر اس انعام واحسان کی وجہ بھی بیان فرما دی بِمَا صَبَرُوْا یعنی اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اللہ کے راستہ میں تکلیفیں برداشت کیں اور ان پر ثابت قدم رہے اس میں اشارہ کر دیا کہ ہمارا یہ احسان وانعام کچھ بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان کے عمل صبر وثابت قدمی کا نتیجہ تھا جو شخص یا جو قوم اس عمل کو اختیار کرے ہمارا انعام ہر جگہ ہر وقت اس کے لئے موجود ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو　　اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب نصرتِ الٰہی کا وعدہ اپنی قوم سے کیا تھا اس وقت بھی انہوں نے قوم کو یہی بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا اور مصائب وآفات کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہی کلید کامیابی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب انسان کا مقابلہ کسی ایسے شخص یا جماعت سے ہو جس کا دفاع کرنا اس کی قدرت میں نہ ہو تو ایسے وقت کامیابی اور فلاح کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مقابلہ نہ کرے بلکہ صبر کرے، انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی کی ایذاء کا مقابلہ اس کی ایذاء سے کرتا ہے یعنی اپنا انتقام خود لینے کی فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں کامیاب ہو یا ناکام، اور جب کوئی شخص لوگوں کی ایذاء کا مقابلہ صبر اور نصرتِ الٰہی کے انتظار سے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے راستے کھول دیتے ہیں۔

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے صبر وثابت قدمی پر یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کو دشمن پر فتح اور زمین پر حکومت عطا کریں گے اسی طرح امتِ محمدیہ سے بھی وعدہ فرمایا ہے جو سورۂ نور میں مذکور ہے، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، اور جس طرح بنی اسرائیل نے وعدۂ خداوندی کا مشاہدہ کر لیا تھا، امتِ محمدیہ نے ان سے زیادہ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا مشاہدہ کیا کہ پوری زمین پر ان کی حکومت وسلطنت عام ہو گئی (روح البیان)۔

میں جتنی جہالت ہے، یہ لوگ جس طریقہ کو تم نے پسند کیا ان کے اعمال سب ضائع و برباد ہیں یہ باطل کے پیرو ہیں، ان کی حرص نہ کرنی چاہئے، کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کسی کو معبود بنا دوں، حالانکہ اس نے تم کو تمام جہان والوں پر فضیلت بخشی ہے، مراد اُس وقت کے اہل عالم ہیں کہ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہی دوسرے سب لوگوں سے افضل و اعلیٰ تھے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو ان کی پچھلی حالت یاد دلائی گئی کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں ایسے مجبور و مقہور تھے کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا تھا صرف لڑکیاں اپنی خدمت کے لئے رکھی جاتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برکت و دعا سے اس عذاب سے نجات دی، کیا اس احسان کا شکریہ ہونا چاہیے کہ تم اسی رب العالمین کے ساتھ دنیا کے ذلیل ترین پتھروں کو شریک ٹھہراؤ، یہ ایک ظلم عظیم ہے اس سے توبہ کرو۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے پس پوری ہوگئی مدت

رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ

تیرے رب کی چالیس راتیں اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے

اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۴۲)

کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چل مفسدوں کی راہ۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہوگئے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہم کو کوئی شریعت ملے تو اس پر اطمینان کے ساتھ عمل کریں، موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی، حق تعالیٰ اس کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ کوہِ طور پر آکر اعتکاف کریں تو آپ کو شریعت اور کتاب تورات دی جائے گی) اور دس راتیں مزید ان تیس راتوں کا تتمہ بنا دیا (یعنی توریت دے کر اُن میں دس راتیں عبادت کے لئے اور بڑھا دیں جس کی وجہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہو چکی ہے) اس طرح اُن کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب مل کر) پوری چالیس راتیں ہوگیا اور موسیٰ (علیہ السلام کوہِ طور آنے لگے

کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی اس لئے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا کیونکہ ان دس راتوں کے اضافہ کا جو واقعہ مفسرین نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس راتوں کے اعتکاف میں موسیٰ علیہ السلام نے حسب قاعدہ تیس روزے بھی مسلسل رکھے بیچ میں افطار نہیں کیا، تیسواں روزہ پورا کرنے کے بعد افطار کرکے مقررہ مقام طور پر حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ روزہ دار کے منہ سے جو ایک خاص قسم کی رائحہ معدہ کی تبخیر سے پیدا ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، آپ نے افطار کے بعد مسواک کرکے اس رائحہ کو زائل کر دیا، اس لئے مزید دس روزے اور رکھئے تاکہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے۔

اور بعض روایات تفسیر میں جو اس جگہ یہ منقول ہے کہ تیسویں روزہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کرلی تھی جس کے ذریعہ وہ رائحہ صوم زائل ہو گیا تھا، اس سے اس بات پر استدلال نہیں ہو سکتا کہ روزہ دار کے لئے مسواک کرنا مکروہ یا ممنوع ہے کیونکہ اول تو اس روایت کی کوئی سند مذکور نہیں، دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے متعلق ہو عام لوگوں کے لئے نہ ہو یا شریعت موسوی میں ایسا ہی حکم سب کے لئے ہو کہ روزہ کی حالت میں مسواک نہ کی جائے، لیکن شریعت محمدیہ میں تو بحالت روزہ مسواک کرنے کا معمول حدیث سے ثابت ہے جس کو بیہقی نے بروایت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خَيْرُ خِصَالِ الصَّائِمِ السِّوَاكُ یعنی روزہ دار کا بہترین عمل مسواک ہے۔ اس روایت کو جامع صغیر میں نقل کرکے حسن فرمایا ہے۔

فائدہ اس روایت پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تلاش خضرؑ میں سفر کر رہے تھے تو آدھے دن بھوک پر صبر نہ ہو سکا اور اپنے ساتھی سے فرمانے لگے اٰتِنَا غَدَاۗءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا یعنی ہمارا ناشتہ لاؤ کیونکہ اس سفر نے ہم کو تکان میں ڈال دیا، اور کوہ طور پر مسلسل تیس روزے اس طرح رکھے کہ رات کو بھی افطار نہیں، یہ عجیب بات ہے؟

تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ فرق ان دونوں سفروں کی نوعیت کے سبب سے تھا، پہلا سفر مخلوق کے ساتھ مخلوق کی تلاش میں تھا، اور کوہ طور کا سفر مخلوق سے علیحدہ ہو کر ایک ذات حق سبحانہ کی جستجو میں، اس کا یہی اثر ہونا تھا کہ بشری تقاضے نہایت مضمحل ہو گئے، کھانے پینے کی حاجت اتنی گھٹ گئی کہ تیس روز تک کوئی تکلیف محسوس نہیں فرمائی۔

عبادات میں قمری حساب معتبر ہے، دنیوی معاملات میں شمسی حساب کی گنجائش ہے۔

ایک اور مسئلہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا ہے، کیونکہ اس آیت میں بھی تیس دن کے بجائے تیس راتوں کا ذکر فرمایا ہے، وجہ یہ ہے کہ شرائع انبیاء میں مہینے قمری

پیچھے اپنے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو ان سے مواخذہ فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو بدنظمی اور بے فکری ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ
اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے بولا اے میرے رب تو مجھ کو

اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ
دکھلا کہ میں تجھ کو دیکھوں فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف اگر وہ

اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ لے گا پھر جب تجلی کی اس کے رب نے پہاڑ کی طرف

جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ
کر دیا اس کو ڈھا کر برابر اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری ذات پاک ہے

تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوسٰٓى اِنِّي
میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں سب سے پہلے یقین لایا فرمایا اے موسیٰ میں نے

اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ڮ فَخُذْ مَآ
تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا سو لے جو

اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ
میں نے تجھ کو دیا اور رہ شکر گزاروں میں اور لکھ دی ہم نے اس کو تختیوں پر

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ
ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی سو پکڑ لے ان کو زور سے

وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾
اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی بہتر باتیں عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھر نافرمانوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے وقت (موعود) پر آئے (جس کا قصہ بیان ہو رہا ہے) اور ان کے رب نے ان سے بہت سی لطف و عنایت کی باتیں کیں تو (شدتِ

انبساط سے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے، (کیونکہ یہ آنکھیں تاب جمال نہیں لا سکتیں، کما فی المشکوۃ عن مسلم لاحرقت سبحات وجھہ) لیکن (تمہاری تشفی کے لئے یہ تجویز کرتے ہیں کہ) تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو (ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں) سو اگر یہ اپنی جگہ پر قرار رہا تو (خیر) تم بھی دیکھ سکو گے (غرض موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے لگے) پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس (پہاڑ) کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بیہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افاقہ میں آئے تو عرض کیا بیشک آپ کی ذات (ان آنکھوں کی برداشت سے) منزہ (اور بلند) ہے میں آپ کی جناب میں (اس مشتاقانہ درخواست سے) معذرت کرتا ہوں اور (جو کچھ حضور کا ارشاد ہے کہ لَنْ تَرٰىنِيْ) سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ! (یہی بہت ہے کہ) میں نے (تم کو) اپنی (طرف سے) پیغمبری (کا عہدہ دے کر) اور اپنے (ساتھ) ہم کلامی (کا شرف بخش کر) اس (زمانے) کے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو (اب) جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے (رسالت و ہم کلامی و توراۃ) اس کو لو اور شکر کرو اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکام ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی (یہی تختیاں توراۃ ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب یہ تختیاں ہم نے دی ہیں) تو ان کو کوشش کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو (بھی) حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر (یعنی سب پر کہ سب ہی اچھے ہیں) عمل کریں میں اب بہت جلد تم لوگوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) ان بے حکموں کا (یعنی فرعونیوں کا یا عمالقہ کا) مقام دکھلاتا ہوں (اس میں بشارت اور وعدہ ہے کہ مصر یا شام پر عنقریب تسلط ہوا چاہتا ہے، مقصود اس سے ترغیب دینا ہے اطاعت کی کہ اطاعتِ احکام الٰہیہ کے یہ برکات ہیں)

معارف و مسائل

لَنْ تَرٰىنِيْ، (یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالتِ موجودہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لَنْ تَرٰىنِيْ کے بجائے لَنْ اُرٰى کہا جاتا کہ میری رؤیت نہیں ہو سکتی (مظہری)

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہو گیا اور یہی مذہب ہے جمہور اہلِ سنت کا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ

تھا، ان دونوں میں سے اس جگہ کونسا ملک مراد ہے، اس میں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ غرقِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل مصر میں واپس چلے گئے تھے یا نہیں، اگر اس وقت مصر میں واپس گئے اور مملکتِ مصر پر قابض ہوئے جیسا کہ آیت وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ سے اس کی تائید ہوتی ہے تو مصر پر قبضہ و غلبہ اس واقعہ تجلی طور سے پہلے ہو چکا ہے جس میں سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ کا مفہوم ملکِ شام متعین ہو جاتا ہے، اور اگر اس وقت واپس نہیں گئے تو دونوں ملک مراد ہو سکتے ہیں۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی تختیاں لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھیں، انہی تختیوں کے مجموعہ کا نام تورات ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ
میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق

الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا
اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر دیکھیں

سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ
رستہ ہدایت کا تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں رستہ

الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ
گمراہی کا تو اس کو ٹھہرا لیں راہ یہ اس لئے کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور

كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ
رہے ان سے بے خبر اور جنہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی

الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا
ملاقات کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں وہی بدلہ پائیں گے جو کچھ

يَعْمَلُوْنَ ۝ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ
عمل کرتے تھے اور بنا لیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا
بچھڑا ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور

يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿١٤٨﴾ وَلَمَّا

نہیں بتلاتی رستہ معبود بنا لیا اس کو اور وہ تھے ظالم اور جب

سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا

پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بیشک گمراہ ہو گئے تو کہنے لگے

لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا رب اور نہ بخشے ہم کو تو بیشک ہم تباہ ہوں گے

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا

اور جب لوٹ کر آیا موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرا ہوا افسوسناک بولا کیا بری

خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى

نیابت کی تم نے میری میرے بعد کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے اور ڈال دیں

الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ

وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف وہ بولا اے میری ماں کے جنے

إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ

لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھ کو مار ڈالیں سو مت ہنسا

بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٥٠﴾ قَالَ

مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھ کو گنہگار لوگوں میں بولا

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ

اے میرے رب معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو

أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾

سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

وقف لازم

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

(اب ترغیب اطاعت کے بعد ترہیب مخالفت کے لئے ارشاد ہے کہ) میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں (احکام ماننے سے) تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں (کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا حق اس کا ہے جو واقع میں بڑا ہو، اور وہ ایک

خدا کی ذات ہے) اور (برگشتگی کا ان پر یہ اثر ہوگا کہ) اگر تمام (دنیا بھر کی) نشانیاں (بھی) دیکھ لیں تب بھی (غایتِ قساوت سے) ان پر ایمان نہ لاویں، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں (یعنی حق کے قبول نہ کرنے سے پھر دل سخت ہوجاتا ہے اور برگشتگی اس حد تک پہنچ جاتی ہے) یہ (اس درجہ کی برگشتگی) اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو (تکبر کی وجہ سے) جھوٹا بتلایا اور ان (کی حقیقت میں غور کرنے) سے غافل رہے (یہ سزا تو دنیا میں ہوئی کہ ہدایت سے محروم رہے) اور (آخرت میں یہ سزا ہوگی کہ) یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام (جن سے ان کو توقع نفع کی تھی) غارت گئے (اور انجام اس حبط کا جہنم ہے، ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے اور (جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لینے تشریف لے گئے تو) موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے ان کے (جانے کے) بعد اپنے (مقبوضہ) زیوروں کا (جو کہ قبطیوں سے مصر سے نکلتے وقت بہ بہانۂ شادی کے مانگ لیا تھا) ایک بچھڑا (بنا کر جس کا قصہ سورۂ طٰہٰ میں ہے، اس کو معبود) ٹھہرایا جو کہ (صرف اتنی حقیقت رکھتا تھا کہ) ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی (اور اس میں کوئی کمال نہ تھا، جس سے کسی عاقل کو اس کی معبودیت کا شبہ ہوسکے) کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ (اس میں آدمی کے برابر بھی تو قدرت نہ تھی چنانچہ) وہ ان سے بات تک نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو (دنیا یا دین کی) کوئی راہ بتلاتا تھا (اور خدا کی سی صفت تو اس میں کیا ہوتیں، غرض یہ کہ) اس (بچھڑے) کو انہوں نے معبود قرار دیا اور (چونکہ اس میں اصلاً کوئی شبہ کی وجہ نہ تھی اس لئے انہوں نے) بڑے بے ڈھنگا کام کیا اور (بعد رجوع موسیٰ علیہ السلام کے جس کا قصہ آگے آتا ہے ان کے تنبیہ فرمانے سے) جب (متنبہ ہوئے اور اپنی اس حرکت پر) نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑگئے تو (ندامت سے بطور معذرت) کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا (یہ) گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے چنانچہ خاص طریقہ سے ان کو تکمیلِ توبہ کا حکم ہوا جس کا قصہ سورۂ بقرہ آیت فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں گزرا ہے، اور (موسیٰ علیہ السلام کو متنبہ فرمانے کا قصہ یہ ہوا کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف (طور سے) واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے کیونکہ ان کو وحی سے یہ معلوم ہوگیا تھا، طٰہٰ میں ہے قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا الخ) تو (اول قوم کی طرف متوجہ ہوئے) فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی، کیا اپنے رب کے حکم (آنے) سے پہلے ہی تم نے (ایسی) جلد بازی کرلی (میں تو احکام ہی لینے گیا تھا اس کا انتظار تو کیا ہوتا) اور (پھر حضرت ہارون علیہ السلام

کی طرف متوجہ ہوئے اور دینی حمیت کے جوش میں) جلدی سے (توریت کی) تختیاں (تو) ایک طرف رکھیں (اور جلدی میں ایسے زور سے رکھی گئیں کہ دیکھنے والے کو اگر غور نہ کرے تو شبہ ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں) اور (ہاتھ خالی کرکے) اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) کا سر (یعنی بال) پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے (کہ تم نے کیوں پورا انتظام نہ کیا اور چونکہ غلبہ غضب میں ایک گونہ بے اختیاری ہوگئی تھی اور غضب بھی دین کے لئے تھا اس لئے اس بے اختیاری کو معتبر قرار دیا جائے گا اور اس اجتہادی لغزش پر اعتراض نہ کیا جائے گا) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی میں نے اپنی کوشش بھر بہت روکا لیکن) ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور (بلکہ نصیحت کرنے پر) قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں تو تم مجھ پر (سختی کرکے) دشمنوں کو مت ہنسواؤ اور مجھ کو (برتاؤ سے) ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کرو (کہ ان کی سی ناخوشی مجھ سے بھی برتنے لگو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور) کہا کہ اے میرے رب میری خطا (کو وہ اجتہادی ہو) معاف فرما دے اور میرے بھائی کی بھی (کوتاہی جو ان مشرکین کے ساتھ معاملہ متارکت میں شاید ہوگئی ہو جیسا اس قول سے معلوم ہوتا ہے، مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا أَلَّا تَتَّبِعَنِ الآية) اور ہم دونوں کو اپنی رحمت (خاص) میں داخل فرمائیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں (اس لئے ہم کو قبول دعا کی امید ہے)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ "میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو جو بڑے بنتے ہیں زمین میں بغیر حق کے"

اس میں بغیر حق سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تکبر کرنے والوں کے مقابلہ میں تکبر کرنا حق ہے وہ برا اور گناہ نہیں، کیونکہ وہ صرف صورت کے اعتبار سے تکبر ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیساکہ مشہور ہے اَلتَّكَبُّرُ مَعَ الْمُتَكَبِّرِيْنَ تَوَاضُعٌ، (مسائل السلوک) تکبر انسان کو فہم سلیم اور علوم　　اور تکبر کرنے والوں یعنی بڑے بننے والوں کو اپنی آیتوں سے پھیر دینے الٰہیہ سے محروم کردیتا ہے　　کا مطلب یہ ہے کہ ان سے آیات الٰہیہ کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، اور آیات الٰہیہ بھی اس جگہ عام مراد ہوسکتی ہیں، جن میں آیات منزلہ تورات و انجیل کی یا قرآن کریم کی بھی داخل ہیں اور آیات تکوینیہ جو تمام زمین و آسمان اور ان کی مخلوقات میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ تکبر یعنی اپنے آپ

کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھنا ایسی مذموم اور منحوس خصلت ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے اس کی عقل و فہم سلیم نہیں رہتی، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے سمجھنے سے محروم ہو جاتا ہے نہ اس کو قرآنی آیات صحیح سمجھنے کی توفیق باقی رہتی ہے اور نہ آیاتِ قدرت میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے میں اس کا ذہن چلتا ہے۔

روح البیان میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اور نخوت ایک ایسی بُری خصلت ہے جو علوم ربانیہ کے لئے حجاب بن جاتی ہے کیونکہ علوم ربانیہ صرف اس کی رحمت سے حاصل ہوتے ہیں اور رحمتِ خداوندی تواضع سے متوجہ ہوتی ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

پہلی دو آیتوں میں یہ مضمون ارشاد فرمانے کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا باقی قصہ اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ:

جب موسیٰ علیہ السلام تورات حاصل کرنے کے لئے کوہ طور پر معتکف ہوئے اور شروع میں تیس دن رات کے اعتکاف کا حکم تھا اور اس کے مطابق اپنی قوم سے کہہ گئے تھے کہ تیس دن بعد لوٹیں گے، وہاں حق تعالیٰ نے اس پر دس روز کی میعاد اور بڑھا دی تو اسرائیلی قوم جس کی جلد بازی اور کجروی پہلے سے معروف تھی، اس وقت بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے، ان کی قوم میں ایک شخص سامری نام کا تھا، جو اپنی قوم میں بڑا اور چودھری مانا جاتا تھا مگر کچے عقیدہ کا آدمی تھا اس نے موقع پاکر یہ حرکت کی کہ بنی اسرائیل کے پاس کچھ زیورات قوم فرعون کے لوگوں کے رہ گئے تھے ان سے کہا کہ یہ زیورات تم نے قبطی لوگوں سے مستعار طور پر لیے تھے اب وہ سب غرق ہو گئے اور زیورات تمہارے پاس رہ گئے، یہ تمہارے لئے حلال نہیں، کیونکہ کفار سے جنگ کے وقت حاصل شدہ مالِ غنیمت بھی اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے حلال نہیں تھا، بنی اسرائیل نے اس کے کہنے کے مطابق سب زیورات لاکر اس کے پاس جمع کر دیئے، اس نے اس سونے چاندی سے ایک بچھڑے یا گائے کا مجسمہ بنایا، اور جبریل امین کے گھوڑے کے سم کے نیچے کی مٹی جو اس نے کہیں پہلے سے جمع کر رکھی تھی اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے حیات و زندگی کا خاصہ رکھا تھا، اس نے سونا چاندی آگ پر پگھلانے کے وقت یہ مٹی اس میں شامل کر دی اس کا یہ اثر ہوا کہ اس گائے کے مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کے اندر سے گائے کی سی آواز نکلنے لگی، اس جگہ آیت میں عِجْلًا کی تفسیر جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

سامری کی یہ حیرت انگیز شیطانی ایجاد سامنے آئی تو اس نے بنی اسرائیل کو اس کفر کی

دعوت دینا شروع کردی کہ یہی خدا ہے، موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کے لئے کوہِ طور پر گئے ہیں اور اللہ میاں (معاذ اللہ) خود یہیں آگئے موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہوگئی بنی اسرائیل میں اس کی بات پہلے سے مانی جاتی تھی وہ اس وقت تو یہ شعبدہ بھی اس نے دکھلا دیا تو اور بھی معتقد ہوگئے اور اسی گائے کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت میں لگ گئے۔

مذکورہ تیسری آیت میں اس مضمون کا بیان اختصار کے ساتھ آیا ہے، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد بنی اسرائیل کے نادم ہوکر توبہ کرنے کا ذکر ہے، اس میں سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ کے معنی عربی محاورہ کے موافق نادم و شرمندہ ہونے کے ہیں۔

پانچویں آیت میں اس واقعہ کی تفصیل ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے تورات لے کر واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو گرچہ قوم کی اس گمراہی کی خبر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور ہی پر کردی تھی، لیکن سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے جب ان لوگوں کو دیکھا کہ گائے کی پوجا پاٹ کر رہے ہیں تو غصہ کی انتہا نہ رہی۔

پہلے اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ یعنی تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی ہے اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ کیا تم نے اپنے رب کا حکم آنے سے جلد بازی کی، یعنی اللہ کی کتاب تورات کے آنے کا انتظار تو کر لیتے، تم نے اس سے جلد بازی کرکے یہ گمراہی اختیار کرلی، اور بعض مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کیا تم نے جلد بازی کرکے یہ قرار دے لیا تھا کہ میری موت آگئی۔

اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کو اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے انہوں نے اس گمراہی سے ان لوگوں کو کیوں نہ روکا، اُن کی طرف ہاتھ بڑھانے کے لئے ہاتھ کو خالی کرنے کی فکر ہوئی تو تورات کی تختیاں جو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے جلدی سے رکھ دیں اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ ، اِلقاء کے لغوی معنی ڈال دینے کے ہیں، اور اَلْوَاح، لَوْح کی جمع ہے جس کے معنی ہیں تختی، یہاں لفظ اِلقاء سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کی حالت میں تورات کی تختیوں کی بے ادبی کی کہ ان کو ڈال دیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ لوحِ تورات کو بے ادبی کے ساتھ ڈال دینا گناہِ عظیم ہے اور انبیاء علیہم السلام سب گناہوں سے معصوم ہیں، اس لئے مراد آیت کی یہی ہے کہ اصل مقصود حضرت

ہارون علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ خالی کرنا تھا اور غصہ کی حالت میں جلدی سے ان کو رکھا، جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ ڈال دیا، اس کو قرآن کریم نے بطور تنبیہ کے ڈالنے کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (بیان القرآن)

اس کے بعد اس خیال پر کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے فرائض قائم مقامی میں کوتاہی کی ہے ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگے تو حضرت ہارونؑ نے عرض کیا کہ میرا قصور نہیں قوم نے میرا کوئی اثر نہ لیا اور میری بات نہ سنی بلکہ قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے اس لئے آپ میرے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے میرے دشمن خوش ہوں اور آپ مجھے ان گمراہوں کے ساتھ نہ سمجھیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِکَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ، یعنی اے میرے پروردگار مجھے بھی معاف فرما دیجئے اور میرے بھائی کو بھی اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما دیجئے اور آپ تو سب رحمت کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

اس میں اپنے بھائی ہارون کے لئے تو اس بنا پر دعائے مغفرت کی کہ شاید ان سے کوئی کوتاہی قوم کو گمراہی سے روکنے میں ہوئی ہو اور اپنے لئے دعائے مغفرت یا تو اس بنا پر کی کہ جلدی کے ساتھ الواح تورات کو رکھ دینا جس کو قرآن کریم نے ڈال دینے سے تعبیر کر کے ایک غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس سے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا۔ اور یا یہ کہ دعا کا ادب ہی یہ ہے کہ دوسرے کے لئے دعا کرے تو اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کرے تاکہ اس کا استغنار محسوس نہ ہو یعنی یہ کہ یہ اپنے آپ کو دعا کا محتاج نہیں سمجھتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا ان کو پہنچے گا غضب ان کے رب کا

وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ
اور ذلت دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو اور

الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ
جنہوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے تو بیشک

رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ
تیرا رب توبہ کے پیچھے البتہ بخشنے والا مہربان ہے اور جب تھم گیا موسیٰ کا

مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ
غصہ تو اس نے اٹھا لیں تختیاں کو اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور

رَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ

رحمت تھی ان کے واسطے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور چن لئے موسیٰ نے اپنی قوم

سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ

میں سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو، پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو بولا

رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

اے رب میرے اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کر دیتا ان کو اور مجھ کو کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر

السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ وَ

جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے یہ سب تیری آزمائش ہے بچلا دے اس میں جس کو تو چاہے اور

تَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۖ وَأَنتَ

سیدھا رکھے جس کو چاہے تو ہی ہے ہمارا تھامنے والا سو بخش دے ہم کو اور رحمت کر ہم پر اور تو

خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ

سب سے بہتر بخشنے والا ہے اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور

فِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ

آخرت میں ہم نے رجوع کیا تیری طرف فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں میں اس کو جس پر

أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ

چاہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لئے

يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۵۶﴾

جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(پھر حق تعالیٰ نے ان گوسالہ پرستوں کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ) جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے (اگر اب بھی توبہ نہ کریں گے تو) ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی (اور کچھ ان ہی کی تخصیص نہیں) ہم (تو) افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (کہ دنیا ہی میں مغضوب اور ذلیل ہو جاتے ہیں گو کسی عارض سے اس ذلت کا گاہے ظہور نہ ہو یا دیر میں ہو، چنانچہ سامری نے جو توبہ نہ کی، اس پر غضب اور ذلت کا نزول ہوا جس کا قصہ سورۂ طٰہٰ میں ہے، قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ الآیۃ) اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے (مثلاً گوسالہ پرستی ان

سے سرزد ہوگئی مگر) پھر وہ ان (گناہوں) کے (کرنے کے) بعد توبہ کرلیں اور (اس کفر کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، تمہارا رب اس توبہ کے بعد (ان کے) گناہ کا معاف کردینے والا اور (ان کے حال پر) رحمت کرنے والا ہے (گو تکمیل توبہ کے لئے اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کا بھی حکم ہوا ہو کیونکہ اصل رحمت آخرت کی ہے چنانچہ تائبین کی خطا اسی طرح معاف ہوئی) اور جب (ہارون علیہ السلام کی یہ معذرت سن کر) موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھا لیا اور ان (تختیوں) کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی (مراد احکام ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے موصوف بہدایت اور موعود برحمت ہوتا ہے) اور (جب گوسالہ کا قصہ تمام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے تورات کے احکام سنائے اُن لوگوں کی عادت تھی ہی شبہات نکالنے کی، چنانچہ اس میں بھی شبہ نکالا کہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں تو یقین کیا جائے، آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ ان میں کے کچھ آدمی جن کو یہ لوگ معتبر سمجھتے ہوں منتخب کر کے ان کو کوہ طور پر لے آؤ ہم خود ان سے کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے احکام ہیں اور اس لانے کے لئے ایک وقت معین کیا گیا چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقتِ معین (پر لانے) کے لئے منتخب کئے (چنانچہ وہاں پہنچ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سُنا تو اس میں ایک شاخ نکالی اور کہنے لگے کہ خدا جانے کون بول رہا ہوگا ہم تو جب یقین لائیں کہ خدا تعالیٰ کو کھلم کھلا اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، لقولہ تعالیٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ خدا تعالیٰ نے اس گستاخی کی سزا دی نیچے سے زلزلہ شدید شروع ہوا اوپر سے ایسی کڑک بجلی ہوئی کہ سب وہاں ہی رہ گئے) سو جب ان کو زلزلہ (وغیرہ) نے آپکڑا، تو موسیٰ (علیہ السلام) ڈرے کہ بنی اسرائیل جاہل اور بدگمان تو ہیں ہی، یوں سمجھیں گے کہ کہیں لے جا کر کسی طریق سے ان سب کا کام تمام کر دیا ہے گھبرا کر) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار (یہ تو مجھ کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو محض سزا دینا منظور ہے خاص ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ) اگر آپ کو یہ منظور ہوتا تو آپ اس کے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتے (کیونکہ ان کا اس وقت ہلاک ہونا بنی اسرائیل کے ہاتھوں میرا ہلاک ہونا ہے سو اگر آپ کو یہ مقصود ہوتا تو آپ پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے مگر جب ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوگیا کہ ان کو بھی ہلاک کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے میری ہلاکت بھی ہے اور بدنامی کے ساتھ، آپ سے امید ہے کہ مجھ کو بدنام نہ کریں گے اور بھلا) کہیں آپ ہم میں کے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دیں گے (کہ بے وقوفی تو کریں یہ لوگ کہ ایسی گستاخی کریں اور ساتھ میں بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ہلاک ہوں میں بھی، آپ سے امید ہے کہ آپ ایسا نہ کریں گے

پس ثابت ہوا کہ یہ واقعہ (رجفہ و صاعقہ کا) محض آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں (کہ حق تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگے) اور جس کو آپ چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں (کہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے سو میں آپ کے فضل وکرم سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور) آپ ہی تو ہمارے خبرگیراں ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ ہیں (سو ان کی گستاخی بھی معاف کر دیجئے چنانچہ وہ لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے، سورۂ بقرہ میں تفصیل ملاحظہ ہو) اور (اس دعا کے ساتھ آپ نے تفصیل رحمت کے لئے یہ بھی دعا کی کہ) ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور (اسی طرح) آخرت میں بھی (کیونکہ) ہم آپ کی طرف (خلوص و اطاعت کے ساتھ) رجوع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور) فرمایا کہ (اے موسیٰ اول تو مصداق میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ) میں اپنا عذاب (اور غضب) تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں (گو مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر واقع نہیں کرتا بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر واقع کرتا ہوں جو غایت درجہ سرکش اور متمرد ہوتے ہیں) اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے (باوجودیکہ ان میں بہت سی مخلوق مثلاً سرکش و معاند لوگ اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو کامل طور پر ضرور ہی لکھوں گا جو کہ (اس کے حسب وعدہ مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (جو منجملہ اعمال قلب سے ہے) اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ اعمال جوارح سے ہے) اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (جو کہ عقائد میں سے ہے، تو ایسے لوگ تو پہلے سے مستحق رحمت ہیں گو آپ درخواست بھی نہ کرتے اور اب تو آپ درخواست بھی کر رہے ہیں رَحْمَةً وَّاكْتُبْ لَنَا، پس ہم بشارت قبول دیتے ہیں کیونکہ آپ تو ایسے ہیں ہی اور آپ کی قوم میں بھی جو مورد رحمت بننا چاہے وہ ایسے ہی اوصاف اختیار کرے کہ مستحق ہو جائے)

معارف و مسائل

یہ سورۂ اعراف کا انیسواں رکوع ہے، اس کی پہلی آیت میں گوسالہ پرستی کرنے والے اور اس پر قائم رہنے والے بنی اسرائیل کے انجام بد کا ذکر ہے کہ آخرت میں ان کو رب العالمین کے غضب سے سابقہ پڑے گا جس کے بعد کہیں پناہ کی جگہ نہیں اور دنیا میں اس کو ذلت و خواری

نصیب ہوگی۔

بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی ملتی ہے جیسے سامری اور اس کے ساتھیوں کا حال ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں ہی خوار و ذلیل کر دیا کہ اس کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ رہے نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے نہ کوئی اس کو ہاتھ لگائے، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا کوئی انسان اس کے پاس نہ آتا تھا۔

تفسیر قرطبی میں بروایت قتادہؓ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا (قرطبی)

اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ خصوصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے، اور آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ یعنی جو لوگ اللہ پر افترا کرتے ہیں ان کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے، سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا کہ جو لوگ دین میں بدعت اختیار کرتے ہیں وہ بھی اس افترا علی اللہ کے مجرم ہو کر اس سزا کے مستحق ہوتے ہیں (مظہری)

امام مالکؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ دین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے والوں کی یہی سزا ہے کہ آخرت میں غضب الٰہی کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت کے (قرطبی)

دوسری آیت میں ان لوگوں کا حال مذکور ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد اپنے اس جرم سے توبہ کر لی اور توبہ کے لئے جو کڑی شرط اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگائی گئی تھی کہ یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں تب ان کی توبہ قبول ہوگی، یہ لوگ حکم بجا لائے تو موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خداوندی ان کو بتلایا کہ تم سب کی توبہ قبول ہوگئی، اس قتل عام میں جو لوگ مارے گئے وہ شہید ہوئے جو باقی رہے ان کی مغفرت ہوگئی، اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ جو لوگ برے اعمال کے مرتکب ہوں، خواہ کیسے ہی بڑے گناہ کفر و معصیت کے ہوں اگر وہ اس کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان کو درست کر لیں یعنی مقتضائے ایمان کے مطابق اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت سے معاف فرما دیں گے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کی طرف رجوع کرے۔

تیسری آیت میں اس کا بیان ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہو تو تورات کی تختیاں جو جلدی سے رکھ دی تھیں پھر اٹھا لیں، اور اس کے نسخہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت تھی۔

لفظ نُسْخَةٌ اس تحریر کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی کتاب وغیرہ سے نقل کی جائے، بعض

روایات میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی تختیاں جلدی سے رکھیں تو وہ ٹوٹ گئی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی دوسری چیز میں لکھ ہوا عطا فرمایا، اس کو نسخہ کہا گیا ہے

ستر بنی اسرائیل کا انتخاب اور ان کی ہلاکت کا واقعہ | چوتھی آیت میں ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات لاکر بنی اسرائیل کو دی تو اپنی کج روی اور حیلہ جوئی کی وجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، ممکن ہے آپ اپنی طرف سے لکھ لائے ہوں، ان کو اطمینان دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ اس قوم کے منتخب آدمیوں کو آپ کوہ طور پر لے آئیں تو ہم ان کو بھی خود اپنا کلام سنا دیں گے جس سے ان کو یقین آجائے، موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور کوہ طور پر لے گئے، حسب وعدہ انہوں نے اپنے کانوں اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا، مگر جب یہ حجت بھی پوری ہوگئی تو کہنے لگے ہمیں کیا معلوم یہ آواز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یا کسی اور کی، ہم تو جب یقین کریں جب کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں، ان کا یہ سوال چونکہ ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی تھا، اس پر غضب الٰہی متوجہ ہوا، اُن کے نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک آئی جس سے یہ بیہوش ہوکر گر گئے اور بظاہر مردہ ہوگئے، سورۂ بقرہ میں اس جگہ صاعقہ کا لفظ آیا ہے اور یہاں رجفہ کا، صاعقہ کے معنی بجلی کی کڑک اور رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں، اس میں کوئی بعد نہیں کہ دونوں چیزیں جمع ہوگئی ہوں۔

بہرحال یہ لوگ ایسے ہوکر گر گئے جیسے مُردے ہوتے ہیں خواہ حقیقۃً مر ہی گئے ہوں یا ظاہر میں مردہ نظر آتے ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اول تو اس لئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے منتخب لوگ تھے، دوسرے اس لئے کہ اب اپنی قوم میں جاکر کیا جواب دیں گے وہ یہ تہمت لگائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سب کو کہیں لے جاکر قتل کرادیا ہے اور اس تہمت کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے، اس لئے اللہ جل شانہ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں جانتا ہوں کہ اس واقعہ سے آپ کا مقصود ان کو ہلاک کرنا نہیں کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اس سے پہلے بہت سے واقعات تھے جن میں یہ ہلاک کئے جاسکتے تھے، فرعون کے ساتھ غرق کردیئے جاتے یا گوسالہ پرستی کے وقت سب کے سامنے ہلاک کردیئے جاتے اور آپ چاہتے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کردیتے مگر آپ نے یہ نہیں چاہا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ان کا ہلاک کرنا مقصود نہیں بلکہ سزا دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ہم سب کو چند بے وقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کردیں۔ اس جگہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا اس لئے ذکر کیا کہ ان ستر آدمیوں کی اس طرح غائبانہ ہلاکت کا نتیجہ یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام

اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کئے جائیں۔

پھر عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض آپ کا امتحان ہے جس کے ذریعہ آپ بعض لوگوں کو گمراہ کردیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت وناشکری کرنے لگیں، اور بعض کو ہدایت پر قائم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ کر مطمئن ہوجاتے ہیں، میں بھی آپ کے فضل سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمت فرمایئے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ معافی دینے والے ہیں اس لئے ان کی اس گستاخی کو بھی معاف کردیجئے، چنانچہ وہ سب لوگ صحیح سالم اُٹھ کھڑے ہوئے

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ستر آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے وہ نہیں جنہوں نے اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کی درخواست کی تھی، اور اس پر صاعقہ کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو گوسالہ پرستی میں شریک نہ تھے مگر قوم کو اس حرکت سے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا اور بیہوش ہوگئے، واللہ اعلم۔ بہرحال یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوکر کھڑے ہوگئے۔

پانچویں آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا تکملہ یہ بھی مذکور ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ، یعنی اے ہمارے پروردگار آپ ہمارے لئے اس دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور آخرت میں بھی، کیونکہ ہم آپ کی طرف خلوص واطاعت سے رجوع کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اے موسیٰ اول تو میری رحمت مطلقہ میرے غضب پر سابق ہے چنانچہ میں اپنا عذاب اور غضب تو صرف اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اگرچہ مستحق عذاب ہر نافرمان ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب پر عذاب واقع نہیں کرتا، بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر عذاب واقع کرتا ہوں جو انتہائی سرکش اور متمرد ہوتے ہیں، اور میری رحمت ایسی عام ہے کہ سب اشیاء کو محیط ہو رہی ہے باوجودیکہ ان میں سے بہت سے لوگ مثلاً سرکش، و نافرمان اس کے مستحق نہیں مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا ہی میں سہی، پس جب میری رحمت سب غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے تو وہ رحمت ان لوگوں کے لئے تو کامل طور پر ضرور ہی لکھ دوں گا جو حسب وعدہ اس کے مستحق بھی ہیں بوجہ اس کے کہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، تو یہ لوگ پہلے ہی سے مستحق رحمت ہیں اس لئے آپ کو قبولِ

دعا کی بشارت دیتے ہیں۔

اس جواب کی تقریر میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں کیونکہ یہاں صاف لفظوں میں قبولیت دعا مذکور نہیں، جیسے دوسرے مواقع میں صاف فرما دیا گیا قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى یعنی اے موسیٰ آپ کا سوال پورا کردیا گیا، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی اے موسیٰ و ہارون آپ دونوں کی دعا قبول کرلی گئی، یہاں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان آیات کا مفہوم یہ قرار دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ درخواست اپنی امت کے بارے میں تو قبول نہ ہوئی البتہ امت محمدیہ کے حق میں قبول کرلی گئی جن کا ذکر بعد کی آیات میں وضاحت کے ساتھ آرہا ہے، مگر تفسیر روح المعانی میں اس احتمال کو بعید قرار دیا ہے، اس لئے جواب کی صحیح تقریر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے دو جزء تھے ایک یہ کہ جن لوگوں پر عتاب و عذاب ہوا ہے ان کو معافی دی جائے اور ان پر رحمت کی جائے، دوسرا یہ کہ میرے لئے اور میری پوری قوم کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی مکمل لکھ دی جائے، پہلی دعا کا جواب اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری دعا کا جواب دوسری آیت میں مذکور ہے، پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ میری عادت ہی یہ ہے کہ میں ہر گنہگار پر عذاب نہیں کرتا بلکہ صرف ان پر جن کو میں (بوجہ انتہائی سرکشی کے) عذاب ہی دینا چاہتا ہوں اس لئے ان لوگوں کو بھی عذاب نہ دیا جائے گا آپ بے فکر رہیں، رہی رحمت کی درخواست سو میری رحمت تو ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے انسان ہو یا غیر انسان، مؤمن ہو یا کافر، فرماں بردار ہو یا نافرمان، بلکہ جن کو دنیا میں کوئی عذاب و تکلیف دی جاتی ہے وہ بھی رحمت سے خالی نہیں ہوتے کم از کم یہ کہ جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس سے بڑی مصیبت ان پر نہیں ڈالی گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت تھی۔

استاذ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وسعت رحمت کے یہ معنی ہیں کہ رحمت کا دائرہ کسی سے تنگ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر چیز مرحوم ہے جیسا ابلیس ملعون نے کہا کہ میں بھی ایک شئ ہوں اور ہر شئ مرحوم ہے لہٰذا میں بھی مرحوم ہوں، قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ ہر شئ پر رحمت کی جائے گی بلکہ یہ فرمایا کہ صفت رحمت تنگ نہیں وسیع ہے جس پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمانا چاہیں فرما سکتے ہیں، قرآن کریم میں اس کی شہادت دوسری جگہ اس طرح آئی ہے فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ، یعنی اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو ان سے فرما دیجئے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے مگر مجرمین سے ان کے عذاب کو کوئی نہیں ٹال سکتا، اس میں بتلا دیا کہ وسعت رحمت مجرمین پر عذاب کے منافی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا ان لوگوں کے حق میں بلا کسی شرط کے قبول کرلی گئی یعنی مغفرت و معافی کی بھی اور رحمت کی بھی۔

اور دوسری دُعا جس میں دُنیا و آخرت کی مکمل بھلائی ان کے لئے لکھ دینے کی درخواست تھی اس کے متعلق چند شرائط لگائی گئیں، مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر مؤمن و کافر پر رحمت عام ہو سکتی ہے مگر عالم آخرت اچھے بُرے کے امتیاز کا مقام ہے یہاں رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ ہوں گے جو چند شرائط کو پورا کریں، اول یہ کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں، یعنی تمام واجباتِ شرعیہ کو ادا کریں اور ناجائز کاموں سے دُور رہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے زکوٰۃ نکالیں، تیسرے یہ کہ ہماری سب آیات پر بلا کسی استثناء اور تاویل کے ایمان لائیں، یہ موجودہ لوگ بھی اگر یہ صفات پوری اپنے اندر پیدا کرلیں تو ان کے لئے بھی دنیا و آخرت کی مکمل بھلائی لکھ دی جائے گی۔

لیکن اس کے بعد کی آیت میں اس طرف اشارہ کردیا کہ ان صفات کو پوری جامعیت کے ساتھ حاصل کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آخر زمانہ میں آئیں گے اور نبیِ امّی کا اتباع کریں گے، اور اس کے نتیجہ میں وہ مکمل فلاح کے مستحق ہوں گے۔

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ جب آیت وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ نازل ہوئی تو ابلیس نے کہا کہ میں اس رحمت میں داخل ہوں، لیکن بعد کے جملوں میں بتلا دیا کہ رحمت آخرت ایمان وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس کو سن کر ابلیس مایوس ہوگیا، مگر یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم میں تو یہ صفات بھی موجود ہیں یعنی تقویٰ اور ادائے زکوٰۃ اور ایمان، مگر اس کے بعد جو شرط نبی امّی پر ایمان لانے کی بیان ہوئی تو اس سے وہ یہود و نصاریٰ نکل گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔

غرض اس اسلوب بدیع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبولیت دُعا کا بیان بھی ہوگیا اور امتِ محمدیہ کے مخصوص فضائل کا ذکر بھی۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امّی ہے کہ جس کو پاتے ہیں

مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

لکھا ہوا اپنے پاس توریت اور انجیل میں وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا

وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ

منع کرتا ہے بُرے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر

الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ

ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ

سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور کے جو

اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷) ع

اس کے ساتھ اترا ہے وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو۔

ع ۱۹ / ۹

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس توراۃ وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں (گو وہ پہلی شرائع میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو (پہلی شرائع میں) بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا ہوا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام ان کی شریعت میں منسوخ ہو جاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)

معارف و مسائل

خاتم النبیین محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے مخصوص صفات و فضائل

پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ یوں تو اللہ کی رحمت ہر چیز ہر شخص کے لئے وسیع ہے آپ کی موجودہ امت بھی اس سے محروم نہیں لیکن مکمل نعمت و رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو ایمان و تقویٰ اور زکوٰۃ وغیرہ کی مخصوص شرائط کو پورا کریں۔

اس آیت میں ان لوگوں کا پتہ دیا گیا ہے کہ ان شرائط پر پورے اترنے والے کون لوگ ہوں گے اور بتلایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں، اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خصوصی فضائل و کمالات و علامات کا بھی ذکر فرمایا۔ آپ پر صرف ایمان لانے کا نہیں بلکہ آپ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ فلاح آخرت کے لئے

ایمان کے ساتھ اتباعِ شریعت و سنت ضروری ہے۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ اس جگہ رسول اور نبی کے دو لقبوں کے ساتھ آپ کی ایک تیسری صفت اُمّی بھی بیان کی گئی ہے، اُمّی کے لفظی معنی اَن پڑھ کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، عام قومِ عرب کو قرآن میں اُمّیین اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اور اُمّی ہونا کسی انسان کے لئے کوئی صفتِ مدح نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے، مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف اور خصوصیات اور حالات و کمالات کے ساتھ اُمّی ہونا آپ کے لئے بڑی صفت کمال بن گئی ہے، کیونکہ اگر علمی عملی اخلاقی کمالات کسی لکھے پڑھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ایک اُمّی محض سے ایسے بیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق و معارف کا صُدور اس کا ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند و مخالف بھی انکار نہیں کرسکتا، خصوصاً جب کہ آپ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکایک آپ کی زبان مبارک پر وہ کلام جاری ہوا جس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہوگئی، تو ان حالات میں آپ کا اُمّی ہونا آپ کے رسول من جانب اللہ ہونے اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایک بہت بڑی شہادت ہے اس لئے اُمّی ہونا اگرچہ دوسروں کے لئے کوئی صفت مدح نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت بڑی صفت مدح و کمال ہے، جیسے متکبر کا لفظ عام انسانوں کے لئے صفتِ مدح نہیں بلکہ عیب ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے خصوصیت سے صفتِ مدح ہے۔

آیت میں چوتھی صفت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ آپ کو تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے، یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کی صفات و حالات کو لکھا ہوا پائیں گے بلکہ یَجِدُوْنَہٗ کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو لکھا ہوا پائیں گے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تورات و انجیل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ایسی تفصیل و وضاحت کے ساتھ ہوں گی کہ ان کو دیکھنا ایسا ہوگا جیسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا، اور تورات و انجیل کی تخصیص یہاں اس لئے کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل انہیں دو کتابوں کے قائل ہیں ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و صفات کا ذکر زبور میں بھی موجود ہے۔

آیتِ مذکورہ کے اصل مخاطب موسیٰ علیہ السلام ہیں جس میں اُن کو بتلایا گیا ہے کہ دُنیا و آخرت کی مکمل فلاح آپ کی امت کے ان لوگوں کا حصہ ہے جو نبیِّ اُمّی خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ و

السلام کا اتباع کریں جن کا ذکر وہ تورات وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔

تورات وانجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات وعلامات

موجودہ تورات وانجیل بے شمار تحریفات اور تغیر وتبدل ہوجانے کے سبب قابل اعتماد نہیں رہی، اس کے باوجود اب بھی ان میں ایسے کلمات موجود ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ دیتے ہیں، اور اتنی بات بالکل واضح ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ خاتم الانبیاء کی صفات وعلامات تورات وانجیل میں لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہوتی تو اس زمانہ کے یہود ونصاریٰ کے لئے تو اسلام کے خلاف ایک بہت بڑا ہتھیار ہاتھ آجاتا کہ اس کے ذریعہ قرآن کی تکذیب کرسکتے تھے کہ تورات وانجیل میں کہیں نبی امی کے حالات کا ذکر نہیں، لیکن اس وقت کے یہود ونصاریٰ نے اس کے خلاف کوئی اعلان نہیں کیا، یہ خود اس پر شاہد ہے کہ اُس وقت تورات وانجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات وعلامات واضح طور پر موجود تھیں جس نے ان لوگوں کی زبانوں پر مُہر لگادی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات وانجیل میں لکھی تھیں ان کا کچھ بیان تو قرآن کریم میں بحوالہ تورات وانجیل آیا ہے اور کچھ روایات حدیث میں ان حضرات سے منقول ہے جنہوں نے اصلی تورات وانجیل کو دیکھا اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک پڑھ کر ہی وہ مسلمان ہوئے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ اتفاقاً بیمار ہوگیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یا رسول اللہ یہ غلط کہتا ہے، تورات میں ہم آپؐ کا ذکر اور آپؐ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز وتکفین مسلمان کریں، باپ کے حوالہ نہ کریں (مظہری)۔

اور حضرت علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا، اس نے آکر اپنا قرض مانگا آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مُہلت دو، یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب

تک میرا قرض ادا نہ کردو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں اختیار ہے میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب عشاء کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی، صحابہ کرامؓ یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضبناک ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہؓ سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے، آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد وغیرہ پر ظلم کروں"

یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس طرح مشرف باسلام ہو کر اس نے کہا یا رسول اللہ میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں دے دیا، اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں، میں **نے تورات میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں:**

"محمد بن عبداللہ، ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا، نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے"

اب میں نے ان تمام صفات کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا، اس لئے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ میرا آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں، اور یہ یہودی بہت مالدار تھا، آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی، اس روایت کو تفسیر مظہری میں بحوالہ دلائل النبوۃ بیہقی نقل فرمایا ہے۔

اور امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبارؓ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ

"محمد اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں، نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ گو، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی، ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حمادین ہوگی، یعنی راحت و کلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر ادا کرے گی، ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی

وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ وقت کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے، وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے، ان کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا، جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز جماعت میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے" (مظہری)

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولی خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ

"وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دراز قد، سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہوگی، صدقہ قبول نہ کریں گے، حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیا کریں گے، پیوند زدہ کرتہ استعمال فرمادیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے، وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔"

اور ابن سعد نے طبقات میں، دارمی نے اپنے مسند میں، بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت نقل کی ہے، جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے، انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں،

اے نبی، ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا، اور برے عمل والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور امیین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کردیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کردیں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہوجائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں، اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنادیں اور بندھے ہوئے دلوں کو کھول دیں۔"

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی مذکور ہے۔

اور کتب سابقہ کے بڑے عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا، میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں، ان کی امت امتِ مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا۔ اے داؤد میں نے محمدؐ اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں، اول یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا، جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کردوں گا، اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا، اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ و رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنادوں گا، وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنادوں۔" (روح المعانی)

سینکڑوں میں سے یہ چند روایت تورات، انجیل، زبور کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں پوری روایات کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

تورات و انجیل میں خاتم الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امتِ مرحومہ کے خاص فضائل و صفات اور علامات کی تفصیل پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس آخری دور میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس کو بڑے شرح و بسط اور تفصیل و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے، اس میں موجودہ زمانے کی تورات و انجیل جس میں بے انتہا تحریفات ہو چکی ہیں ان میں بھی بہت سی صفات و فضائل کا ذکر موجود ہونا ثابت کیا ہے، اس کا عربی سے اردو میں ترجمہ حال میں شائع ہو چکا ہے، قابلِ دید ہے۔

سابقہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات و علامات کا تفصیلی بیان تھا جو تورات و انجیل اور زبور میں لکھی ہوئی تھیں، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ مزید

صفات بھی مذکور ہیں۔

جن میں پہلی صفت "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے، "معروف" کے لفظی معنی جانا پہچانا ہوا، اور "منکر" کے لغوی معنی اوپرا، اجنبی جو پہچانا نہ جائے، اس جگہ معروف سے وہ نیک کام مراد ہیں جو شریعت اسلام میں جانے پہچانے ہوئے ہیں اور منکر سے وہ برے کام جو دین و شریعت سے اجنبی ہیں۔

اس جگہ اچھے کاموں کو معروف کے لفظ سے اور برے کاموں کو منکر کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین میں نیک کام صرف ان کو سمجھا جائے گا جو قرن اول کے مسلمانوں میں رائج ہو اور جانا پہچانا گیا ہو، اور جو ایسا نہ ہو وہ منکر کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ و تابعین نے جس کام کو نیک نہیں سمجھا وہ خواہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو از روئے شریعت وہ بھلا نہیں، احادیث صحیحہ میں اسی لئے ان کاموں کو جن کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی طرف سے نہیں پائی جاتی ان کو محدثات الامور اور بدعت فرما کر مردود قرار دیا ہے، معنی آیت کے اس جملہ کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع فرما دیں گے۔

یہ صفت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ ہر نبی اور رسول اسی کام کے لئے بھیجے جاتے ہیں کہ لوگوں کو نیک کاموں کی طرف ہدایت کریں اور برے کاموں سے منع کریں لیکن اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کے موقع پر اس کا بیان کرنا اس کی خبر دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صفت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام سے کوئی خاص امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ امتیاز کئی وجہ سے ہے، اول اس کام کا خاص سلیقہ کہ ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے مناسب حال طریق سے فہمائش کرنا جس سے بات ان کے دل میں اتر جائے اور بھاری نہ معلوم ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں غور کیا جائے تو اس کا مشاہدہ ہوگا کہ آپ کو حق تعالیٰ نے اس میں خصوصی اور امتیازی سلیقہ عطا فرمایا تھا، عرب کے بدوی جو اونٹ اور بکری چرانے کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے ان سے ان کے انداز فہم پر گفتگو فرماتے اور دقیق علمی مضامین کو ایسے سادہ الفاظ میں سمجھا دیتے تھے کہ ان پڑھ لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائے، اور قیصر و کسریٰ اور دوسرے ملوک عجم اور ان کے بھیجے ہوئے ذی علم و فہم سفراء سے ان کے انداز کے مطابق گفتگو ہوتی تھی اور بالآخر سب ہی اس گفتگو سے متاثر ہوتے تھے، دوسرے آپ کی اور آپ کے کلام کی خداداد مقبولیت اور دلوں میں تاثیر بھی ایک معجزانہ انداز رکھتی ہے بڑے سے بڑا دشمن بھی جب آپ کا کلام سنتا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

در بحوالۂ تورات جو صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی گئی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کو بینا اور بہرے کانوں کو سننے والا بنا دے گا اور بند دلوں کو کھول دے گا، یہ اوصاف شاید اسی خصوصیت کا نتیجہ ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تیاری سلیقہ عطا فرمایا تھا۔

دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لئے پاکیزہ اور پسندیدہ چیزوں کو حلال فرما دیں گے اور گندی چیزوں کو حرام، مراد یہ ہے کہ بہت سی پاکیزہ اور پسندیدہ چیزیں جو بنی اسرائیل پر بطور سزا کے حرام کردی گئی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حرمت کو ختم کر دیں گے مثلاً حلال جانوروں کی چربی وغیرہ جو بنی اسرائیل کی بدکاریوں کی سزا میں ان پر حرام کردی گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حلال قرار دیا، اور گندی چیزوں میں خون اور مردار جانور، شراب اور تمام حرام جانور داخل ہیں اور تمام حرام ذرائع آمدنی بھی مثلاً سُود، رشوت جُوا وغیرہ، (ابن کثیر المنیر) اور بعض حضرات نے بُرے اخلاق و عادات کو بھی گندی چیزوں میں شمار فرمایا ہے۔

تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہٹا دیں گے لوگوں سے ان کا بوجھ اور بندش جو ان پر مسلط تھی۔

لفظ اِصر کے معنی بار گراں کے ہیں جو آدمی کو حرکت کرنے سے روک دے اور اغلال غُل کی جمع ہے، اس ہتکڑی کو غُل کہتے ہیں جس کے ذریعہ مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔

اِصر اور اغلال یعنی بار گراں اور قیود سے مراد اس آیت میں وہ احکام شاقہ اور دشوار واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کر دیئے گئے تھے مثلاً کپڑا ناپاک ہو جائے تو پانی سے دھو دینا بنی اسرائیل کے لئے کافی نہ تھا بلکہ یہ واجب تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس کو کاٹ دیا جائے، اور کفار سے جہاد کر کے جو مال غنیمت ان کے ہاتھ آئے، ان کے لئے حلال نہیں تھا بلکہ آسمان سے ایک آگ آ کر اس کو جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کھیلنا ان کے لئے حرام تھا جن اعضاء سے کوئی گناہ صادر ہو ان اعضاء کو کاٹ دینا واجب تھا، کسی کا قتل خواہ عمداً ہو یا خطاءً دونوں صورتوں میں قصاص یعنی قاتل کا قتل کرنا واجب تھا، خون بہا دینے کا قانون نہ تھا۔

ان احکام شاقہ کو جو بنی اسرائیل پر نافذ تھے قرآن میں اِصر اور اغلال فرمایا اور یہ خبر دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سخت احکام کو منسوخ کر کے سہل احکام جاری فرما دیں گے۔

الْأُمِّيَّ فرمایا تھا اور آخر میں وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ فرمایا۔

ان میں سے پہلے جملہ میں نبی امی کے اتباع کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نجاتِ آخرت کتاب اور سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے کیونکہ نبی امی کا اتباع ان کی سنت ہی کے اتباع کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

رسول کا صرف اتباع بھی کافی نہیں، اور ان دونوں جملوں کے درمیان عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ فرما کر ادب واحترام و محبت بھی فرض ہے اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے عام دنیا کے حکام کا اتباع جبراً قہراً کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو، کیونکہ امت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور امت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری امت ان کی محب۔

ایک یہ کہ رسول اپنے کمالاتِ علمی، عملی، اخلاقی کی بناء پر صاحبِ عظمت ہے، اور ساری امت ان کے مقابلہ میں پست اور عاجز۔

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجۂ کمال میں پائی جاتی ہیں اس لئے امت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالاتِ نبوت ان کی تعظیم و تکریم بجا لائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاعت و اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام وادب کو بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھلائے گئے ہیں۔

اس آیت میں تو عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ آیا ہے، اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یعنی اے مسلمانو، اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو، یعنی جس مجلس میں حضور تشریف

پیغمبر ہونے کی حیثیت ختم شدہ ہے، کیونکہ جب آپ کی بعثت و رسالت قیامت تک آنے والی نسلوں
کے لئے اور پورے عالم کے لئے عام ہوگئی تو اب کسی دوسرے جدید نبی و رسول کی ضرورت باقی
نہیں رہتی، اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ
اپنی نبوت پر برقرار ہونے کے باوجود شریعت محمدی پر عمل کریں گے، جیسا کہ صحیح روایات حدیث
سے ثابت ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت ساری دنیا اور قیامت تک کے لئے
عام ہونے پر یہ آیت کتنی بہت واضح ثبوت ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس
پر شاہد ہیں، مثلاً ارشاد ہے وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ، یعنی یہ قرآن
مجھ پر بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن
کو میرے بعد یہ قرآن پہنچے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد سند قوی کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوۂ
چند اہم خصوصیات تبوک کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد میں مشغول تھے
صحابہ کرامؓ کو خوف ہوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کردے اس لئے آپ کے گرد جمع ہوگئے، جب آپ
نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ آج کی رات مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی
رسول و نبی کو نہیں ملیں، اول یہ کہ میری رسالت و نبوت کو ساری دنیا کی کل اقوام کے لئے عام کیا گیا
ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء آئے ان کی دعوت و بعثت صرف اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص
ہوتی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ مجھے میرے دشمن کے مقابلہ میں ایسا رعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ
سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رعب اس پر چھا جاتا ہے، تیسرے یہ کہ میرے لئے کفار
سے حاصل شدہ مال غنیمت حلال کردیا گیا حالانکہ پچھلی امتوں کے لئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا استعمال
کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا، ان کے مالِ غنیمت کا صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے
اور اس کو جلا کر خاک کردے، چوتھے یہ کہ میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنادیا
کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہوجاتی ہے مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف پہلی امتوں کے کہ
ان کی عبادت صرف ان کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی اپنے گھروں میں یا جنگل وغیرہ
میں ان کی نماز و عبادت نہ ہوتی تھی، نیز یہ کہ جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، خواہ پانی نہ
ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب تو وضو کے بجائے مٹی سے تیمم کرنا اس امت کے لئے
طہارت و وضو کے قائم مقام ہوجاتا ہے، پچھلی امتوں کے لئے یہ آسانی نہ تھی، پھر فرمایا: اور
پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول

اس کے بعد ارشاد فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔

یعنی جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لئے رسول ونبی ہیں، ان کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو ضروری ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود بھی اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کا اتباع کرو تاکہ تم صحیح راستہ پر قائم رہو۔

اللہ کے کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتابیں تورات، انجیل، قرآن وغیرہ ہیں، ایمان کے حکم کے بعد پھر اتباع کا مزید حکم دے کر اس کی طرف اشارہ کردیا ہے کہ محض ایمان لانا یا زبانی تصدیق کرنا آپ کی شریعت کا اتباع کرنے کے بغیر ہدایت کے لئے کافی نہیں۔

حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے کل راستے بند ہیں بجز اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم　　دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ میں ایک حق پرست جماعت　　بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو خود بھی حق کا اتباع کرتی ہے اور اپنے نزاعی معاملات کے فیصلوں میں حق کے موافق فیصلے کرتی ہے۔

سابقہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی کجروی، کج بحثی اور گمراہی کا بیان ہوا تھا، اس آیت میں بتلایا گیا کہ پوری قوم ہی سب ایسی نہیں بلکہ ان میں کچھ لوگ اچھے بھی ہیں جو حق کا اتباع کرتے ہیں، اور حق فیصلے کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے تورات و انجیل کے زمانہ میں ان کی ہدایات کے موافق پورا عمل کیا۔ اور جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو تورات وانجیل کی بشارت کے موافق آپ پر ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا۔

بنی اسرائیل کی اس حق پرست جماعت کا ذکر بھی قرآن میں بار بار آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ، یعنی اہل کتاب میں ایک ایسی جماعت بھی ہے جو حق پر قائم ہے، اللہ کی آیات کو رات بھر تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ یعنی وہ لوگ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتاب تورات و انجیل دی گئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔

اور ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ ایک عجیب حکایت نقل کی ہے کہ اس جماعت

فَانۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۗ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے پہچان لیا ہر قبیلہ نے

مَّشْرَبَهُمْ ۗ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ

اپنا گھاٹ اور سایہ کیا ہم نے ان پر ابر کا اور اتارا ہم نے ان پر

الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۗ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۗ وَمَا

من اور سلویٰ کھاؤ ستھری چیزیں جو ہم نے روزی دی تم کو اور

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ

انھوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے رہے اور جب حکم ہوا

لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

ان کو کہ بسو اس شہر میں اور کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو

وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓــٰٔتِكُمْ ۭ

اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری تقصیریں

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

البتہ زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو سو بدل ڈالا ظالموں نے ان میں سے

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ

دوسرا لفظ اس کے سوا جو کہہ دیا گیا تھا ان سے پھر بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان

السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع

سے بسبب ان کی شرارت کے

ع ۲۰ / ۱۰

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (ایک نعمت یہ بھی دی جس کا یہاں ذکر ہے کہ) ان کی سہولت و انتظام کے لئے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کرکے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کردی (اور ہر ایک پر ایک سردار نگرانی کے لئے مقرر کردیا جس کا ذکر مائدہ کے رکوع سوم میں ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا) اور (ایک نعمت یہ دی کہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا جبکہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا (اور انھوں نے حق تعالیٰ سے دعا کی، اس وقت یہ حکم ہوا) کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آویگا بس ان کے مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے (بعدد ان بارہ خاندانوں کے) پھوٹ نکلے (چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا اور (ایک نعمت یہ کی کہ) ہم نے ان پر ابر کو سایہ فگن کیا اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ان کو (خزانہ غیب سے) ترنجبین اور بٹیریں پہنچائیں (اور اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (لیکن وہ لوگ اس میں بھی ایک بات خلاف حکم کر بیٹھے) اور (اس سے) انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے (یہ واقعات وادی تیہ کے ہیں جن کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گذر چکی) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ان کو حکم دیا گیا

کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کرو اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب اندر جانے لگو تو زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے توبہ اور عاجزی سے جھکے جھکے دروازے میں داخل ہونا ہم تمہاری پچھلی خطائیں معاف کر دیں گے یہ تو سب کیلئے ہوگا اور جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید برآں اور دیں گے، سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے اُن پر ایک آفت سماوی بھیجی، اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

ذلیل۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان (اپنے ہمعصر یہودی) لوگوں سے (بطور تنبیہ کے) اس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے اور اس میں یہودی رہتے تھے جن کو ہفتہ کے روز شکار کرنا ممنوع تھا) اس وقت کا حال پوچھئے جب کہ وہ (وہاں کے بسنے والے، ہفتہ (کے متعلق جو حکم تھا اس) کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان (کے دریا) کی مچھلیاں (پانی سے سر نکال نکال) ظاہر ہو ہو کر (سطح دریا پر) ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں (بلکہ وہاں سے دور کہیں چلی جاتی تھیں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ) ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے (کہ کون حکم پر ثابت رہتا ہے کون نہیں رہتا اور یہ آزمائش) اس سبب سے (تھی کہ وہ پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے (اسی لئے ایسے سخت حکم سے ان کی آزمائش کی ورنہ اہل طاعت کی آزمائش لطف اور توفیق اور تائید سے مقرون ہوا کرتی ہے) اور (اس وقت کا حال پوچھئے) جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے (جو کہ ان کو نصیحت کرتے کرتے توقع نفع ہونے سے مایوس ہوگئے تھے ایسے لوگوں سے جو اب بھی نصیحت کئے چلے جارہے تھے اور اس قدر مایوس ابھی نہ ہوئے تھے جیسا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ سے معلوم ہوتا ہے) یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن سے قبول کی کچھ امید نہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا ہلاک نہ ہوئے تو ان کو (کسی اور طرح کی) سخت سزا دینے والے ہیں (یعنی ایسوں کے ساتھ کیوں دماغ خالی کرتے ہو) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے (اور اپنے) رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے (ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ کے روبرو کہہ سکیں کہ اے اللہ ہم نے تو کہا تھا مگر انہوں نے نہ سنا ہم معذور ہیں) اور (نیز) اس لئے کہ شاید یہ ڈر جاویں (اور عمل کرنے لگیں مگر وہ کب عمل کرتے تھے) سو آخر جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے ان لوگوں کو تو (عذاب سے) بچا لیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے (خواہ برابر منع کرتے رہے اور خواہ بوجہ عذر مذکور کے بیٹھ رہے) اور ان لوگوں کو جو کہ (حکم مذکور میں) زیادتی کرتے تھے ان کی (اس عدول حکمی کی وجہ سے) ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا یعنی جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے (یہ تو تفسیر ہوئی نسیان ما ذکروا بہ کی) تو ہم نے ان کو (براہ قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (یہ تفسیر ہوئی عذاب بئیس کی)

واقعات مندرجہ آیات مذکورہ بھی معارف القرآن جلد اول سورۂ بقرہ میں تفصیل و تشریح کے

ساتھ آچکے ہیں، اس کے متعلق ضروری باتیں وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کر دی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے

يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ

شخص کو کہ دیا کرے ان کو برا عذاب، بیشک تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے،

وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٧﴾ وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِّنْهُمُ

اور وہ بخشنے والا مہربان ہے، اور متفرق کر دیا ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے، بعضے ان میں

الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَ

نیک اور بعضے اور طرح کے، اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوبیوں میں اور

السَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٦٨﴾ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ

برائیوں میں تاکہ وہ پھر آئیں، پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف

وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ

جو وارث بنے کتاب کے، لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ

سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ

ہم کو معاف ہو جائے گا اور اگر ایسا ہی اسباب ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیویں، کیا ان سے کتاب

عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَ

میں عہد نہیں لیا گیا کہ نہ بولیں اللہ پر سوائے سچ کے اور

دَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ

انہوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے، اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لیے

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦٩﴾

کیا تم نہیں سمجھتے

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے (انبیاء بنی اسرائیل کی معرفت) یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر (ان کی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی سزا میں) قیامت (کے قریب) تک ایسے (کسی نہ کسی) شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید (ذلت و خواری و

محکومیت کی تکلیف پہنچاتا رہے گا (چنانچہ مدت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم و مقہور ہی چلے آتے ہیں) بلاشبہ آپ کا رب واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی (اگر باز آجاوے تو) بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا (بھی) ہے اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کر دیں (چنانچہ) بعضے ان میں نیک (بھی) تھے اور بعضے ان میں اور طرح کے تھے (یعنی بد تھے) اور ہم ان کو (یعنی بدوں کو بھی اپنی عنایت اور تربیت و اصلاح کے اسباب جمع کرنے سے کبھی مہمل نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ) ان کو خوش حالیوں (یعنی صحت وغنا) اور بدحالیوں (یعنی بیماری و فقر) سے آزماتے رہے کہ شاید (اسی سے) باز آجائیں (کیونکہ گاہے حسنات سے ترغیب ہو جاتی ہے اور گاہے سیئات سے ترہیب ہو جاتی ہے، یہ حال تو ان کے سلف کا ہوا) پھر ان (سلف) کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب (یعنی توراۃ) کو (تو) ان سے حاصل کیا (لیکن اس کے ساتھ ہی حالت خود ایسے ہیں کہ احکام کتاب کے عوض میں) اس دنیائے دنی کا مال متاع (اگر ملے تو بے تکلف اس کو) لے لیتے ہیں اور حالت ایسی ہے کہ اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہو جاوے گی (کیونکہ ہم اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ہیں ایسے گناہ ہماری مقبولیت کے روبرو کیا چیز ہیں) حالانکہ (اپنی بے باکی اور استخفاف معصیت پر مُصر ہیں حتیٰ کہ) اگر ان کے پاس (پھر) ویسا ہی (دین فروشی کے عوض) مال متاع آنے لگے تو (اسی بے باکی کے ساتھ پھر) اس کو لے لیتے ہیں (اور استخفاف معصیت کا تو دکفر ہے، جس پر مغفرت کا احتمال بھی نہیں تا بہ یقین چہ رسد، چنانچہ آگے یہی ارشاد ہے کہ) کیا ان سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ خدا کی طرف بجز حق (اور واقعی) بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (مطلب یہ ہے کہ جب کسی آسمانی کتاب کو مانا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس کے سب مضامین مانیں گے) اور (عہد بھی کوئی اجمالی عہد نہیں لیا گیا جس میں احتمال ہو کہ شاید اس مضمون خاص کا اس کتاب میں ہونا ان کو معلوم نہ ہوگا بلکہ تفصیلی عہد لیا گیا چنانچہ انہوں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا تھا اس کو پڑھ (بھی) لیا جس سے وہ احتمال بھی جاتا رہا پھر بھی یہ ایسی بڑی بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ باوجود استخفاف معصیت کے مغفرت کا اعتقاد کئے ہوئے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ پر محض تہمت ہے، اور انہوں نے یہ سب قصہ دنیا کے لئے کیا، باقی) آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے اس دنیا سے بہتر ہے جو ان عقائد و اعمال قبیحہ سے پرہیز رکھتے ہیں پھر کیا اے یہود، تم (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِل

آیات مذکورہ سے پہلی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بقیہ قصہ ذکر

کرنے کے بعد ان کی امت (یہود) کے غلط کاروں کی مذمت اور ان کے انجام بد کا بیان آیا ہے، ان آیتوں میں بھی ان کی سزاؤں میں سے ایک کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ان کی دو سزاؤں کا بیان ہے جو دنیا ہی میں ان پر مسلط کر دی گئی ہیں اوّل یہ کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ ان پر کسی ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت سزا دیتا رہے اور ذلت و خواری میں مبتلا رکھے، چنانچہ اس وقت سے آج تک ہمیشہ یہود ہر جگہ مقہور و مغلوب اور محکوم رہے، آج کل کی اسرائیلی حکومت سے اس پر شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آج بھی اسرائیل کی نہ اپنی کوئی قوت ہے نہ حکومت، وہ روس اور امریکہ کی اسلام دشمن سازش کے نتیجہ میں انہیں کی ایک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور آج بھی وہ بدستور انہیں کے محکوم و مقہور ہیں جس دن جس وقت یہ دونوں اس کی امداد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اسی روز اسرائیل کا وجود دنیا سے ختم ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت میں یہودیوں پر ایک دوسری سزا کا ذکر ہے، جو اسی دنیا میں ان کو دی گئی، وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہو گئی، کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا، وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا کا یہی مطلب ہے، قَطَّعْنَا، مصدر تَقْطِيْع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور اُمَم، اُمَّة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک جماعت یا ایک فرقہ، مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق کر دیئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خدا تعالیٰ کا انعام و احسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر ہو جانا ایک طرح کا عذاب الٰہی، مسلمانوں پر حق تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہے ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہو گئی، مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق و مغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا، مشرق بعید میں، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اسی کے نتیجہ میں بنیں، اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار و اختیار ان کے ہاتھ نہ آیا۔

چند سال سے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ صادق و مصدوق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ میں قرب قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد

کر کے ان کو قتل کریں گے۔ خدا کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑا نہیں جایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ملک شام دمشق میں ہونے والا ہے یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں بننا ہے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کر دینا سہل ہو، قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور بے قدری کا عذاب چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسانی کے لئے ان کو ان کے مقتل میں جمع فرما دیا اس لئے یہ اجتماع اس عذاب کے منافی نہیں۔

رہا ان کی موجودہ حکومت اور مصنوعی اقتدار کا قضیہ سو یہ ایک ایسا دھوکہ ہے جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع کا پردہ چڑھایا ہوا ہے لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیلی مملکت کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت روس، امریکہ اور انگلینڈ کی ایک مشترک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی وہ محض ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے اور ان کے تابع فرمان رہنے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے، ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دے دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا، قرآن کریم نے ان کے بارے میں تا قیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی بدستور موجود ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے، وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ، یعنی جب کہ آپ کے رب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان لوگوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلط کر دے گا جو ان کو برا عذاب چکھائے۔

جیسا کہ اول سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے پھر بخت نصر کے ذریعہ اور آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اور باقیماندہ حضرت فاروق اعظمؓ کے ذریعہ ہر جگہ سے ذلت و خواری کے ساتھ ان کا نکالا جانا مشہور و معروف اور تاریخ کے مسلمات میں سے ہے

اس آیت کا دوسرا جملہ یہ ہے، مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ، یعنی ان لوگوں میں کچھ لوگ نیک ہیں اور کچھ دوسری طرح کے، دوسری طرح سے مراد کفار فجار بدکار لوگ ہیں مطلب یہ ہے کہ یہودیوں میں سب ایک ہی طرح کے لوگ نہیں، کچھ نیک بھی ہیں، مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو تورات کے زمانہ میں احکام تورات کے پورے پابند رہے، نہ ان کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے نہ کسی تاویل و تحریف کے درپے ہوئے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ حضرات ہوں جو نزول قرآن کے بعد قرآن کے

تابع ہوگئے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، اس کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے تورات کو آسمانی کتاب ماننے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کی یا اس کے احکام میں تحریف کرکے اپنی آخرت کو دنیا کی گندی چیزوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا۔

آخر آیت میں ارشاد ہے وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، یعنی ہم نے اچھی بُری حالتوں سے ان کا امتحان لیا تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ اچھی حالتوں سے مراد ان کو مال و دولت کے ذخیرے اور عیش و عشرت کے سامان دینا ہے، اور بُری حالتوں سے مراد یا تو ذلت و خواری کے وہ واقعات ہیں جو ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے پیش آتے رہے اور یا کسی وقت کا قحط و افلاس جوان پر پڑ گیا وہ مراد ہے، بہرحال مطلب یہ ہے کہ انسان کی فرماں برداری یا سرکشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں، دونوں استعمال کرلئے گئے ایک یہ کہ احسانات و انعامات کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ احسان کرنے والے اور انعام دینے والے کے شکرگزار فرماں بردار ہوتے ہیں یا نہیں، دوسرے یہ کہ ان کو مختلف تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے اور اپنی بداعمالیوں سے توبہ کرتے ہیں یا نہیں۔

لیکن قوم یہود ان دونوں امتحانوں میں فیل ہوگئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت کے دروازے کھولے، مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی تو کہنے لگے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ یعنی معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی، اور جب ان کو افلاس و ناداری سے آزمایا گیا تو کہنے لگے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ یعنی اللہ کا ہاتھ تنگ ہوگیا۔

فوائد اس آیت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کا منتشر ہونا عذاب، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس دنیا کی راحت و کلفت اور خوشی و غم درحقیقت خداوندی امتحان کے مختلف پرچے ہیں جن کے ذریعے اس کے ایمان اور خدا پرستی کی آزمائش کی جاتی ہے، نہ یہاں کی تکلیف کچھ زیادہ رونے دھونے کی چیز ہے نہ کوئی راحت مسرور و مغرور ہوجانے کا سامان، عاقبت اندیش عقلمند کے لئے یہ دونوں چیزیں قابلِ توجہ نہیں ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیشِ ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

تیسری آیت میں ارشاد ہے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ، اس میں

پہلا لفظ خَلَفَ مصدر خلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں، قائم مقام اور خلیفہ ہوگئے، اور دوسرا لفظ خَلْفٌ مصدر ہے جو قائم مقام، و خلیفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مفرد اور جمع دونوں کے لئے یکساں بولا جاتا ہے، لیکن خَلْفٌ بسکون لام اکثر برے خلیفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے بڑوں کے طرز کے خلاف برائیوں میں مبتلا ہو، اور خَلَف بفتح لام اس کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کو کہا جاتا ہے جو اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلے اور ان کے مقصد کی تکمیل کرے، اس لفظ کا اکثری استعمال اسی طرح ہے کہیں کہیں اس کے خلاف بھی استعمال ہوا ہے۔

وَرِثُوا الْكِتٰبَ وراثت سے مشتق ہے، وہ چیز جو مرنے والوں کے بعد زندہ رہنے والوں کو ملتی ہے اس کو میراث یا وراثت کہا جاتا ہے، معنی یہ ہیں کہ کتاب تورات ان لوگوں کو اپنے بڑوں سے وراثت میں مل گئی یعنی ان کے مرنے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ آئی۔

لفظ عَرَض سامان کے معنی میں بولا جاتا ہے جو نقد کے بدلہ میں خریدا جاتا ہے اور کبھی مطلقاً مال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان، تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جگہ یہی عام معنی مراد ہیں، اور اس جگہ مال کو لفظ عرض سے تعبیر کرنے میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کا مال کتنا ہی ہو ناپائیدار اور عارضی ہے کیونکہ عرض کا لفظ اصل میں جوہر کے بالمقابل ناپائیدار چیز کے لئے مستعمل ہوتا ہے جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہ ہو بلکہ وہ اپنے وجود میں دوسری کسی چیز کا تابع ہو، اسی لئے عَارِض کا لفظ بادل کے معنی میں آتا ہے کیونکہ اس کا وجود قائم رہنے والا نہیں، جلد زائل اور ختم ہوجاتا ہے، قرآن کریم میں هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا اسی معنی کے لئے آیا ہے۔

هٰذَا الْاَدْنٰى میں لفظ اَدْنٰى، دُنُوٌّ بمعنی قرب سے بھی مشتق کہا جاسکتا ہے، اس صورت میں اَدْنٰى کے معنی اقرب کے ہوجائیں گے، اسی کا مؤنث دُنْيَا ہے جس کے معنی قریب کے ہیں، آخرت کے مقابلہ میں یہ جہان انسان سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اس کو اَدْنٰى اور دُنْیَا کہا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ دَنَاءَة بمعنی ذلت سے مشتق ہو تو اس کے معنی ذلیل وحقیر کے ہوجائیں گے، دنیا اور اس کے سب سامان بمقابلہ آخرت کے حقیر و ذلیل ہیں اس لئے اس کو اَدْنٰى اور دُنْیَا کہا گیا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ پہلے دور کے یہودیوں میں تو دو قسم کے لوگ تھے کچھ نیک صالح، پابند شریعت تورات اور کچھ نافرمان گنہگار، مگر ان کے بعد جو لوگ ان کی نسل میں ان کے خلیفہ اور قائم مقام اور تورات کے وارث بنے انہوں نے یہ حرکت اختیار کی کہ اللہ کی کتاب کو سوداگری

کا مال بنالیا کہ اہل غرض سے رشوت لے کر اللہ کے کلام میں تحریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بنانے لگے۔

وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا، اس پر مزید جرأت یہ کہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ہم نے گناہ کیا ہے مگر یہ گناہ ہمارا بخش دیا جائے گا، حق تعالیٰ نے ان کی غلطی پر اگلے جملے میں اس طرح تنبیہ فرمائی وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ، یعنی ان کا حال یہ ہے کہ اگر اس وقت بھی ان کو تحریف کلام اللہ کے بدلہ میں کوئی مال ملنے لگے تو یہ اب بھی مال لے کر تحریف کرنے سے باز نہ آئیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش بجا اور حق ہے مگر انہیں لوگوں کے لئے جو اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ اس کے چھوڑنے کا پختہ عزم کرلیں جس کا اصطلاحی نام توبہ ہے

یہ لوگ اپنے جرم پر اصرار کے باوجود مغفرت کے امیدوار ہیں حالانکہ اس وقت ان کو پیسہ ملے تو تحریف کرنے میں کوتاہی نہ کریں، گناہ پر اصرار کرتے ہوئے مغفرت کی امید رکھنا خودفریبی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

کیا ان لوگوں سے تورات میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے اس معاہدہ کو تورات میں پڑھا پڑھایا بھی ہے، یہ سب ان کی عاقبت نااندیشی ہے، بات یہ ہے کہ دار آخرت ہی پرہیزگاروں کے لئے بہترین لازوال دولت ہے کیا وہ اتنی بات کو نہیں سمجھتے

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا
اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بیشک ہم

لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ
ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا، اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر

كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ
مثل سائبان کے اور ڈرے کہ وہ ان پر گرے گا، ہم نے کہا پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے

بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾
زور سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچتے رہو

خلاصۂ تفسیر

اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب یعنی تورات کے پابند ہیں (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر ایمان لانے کا بھی حکم ہے پس پابندی یہی ہے کہ مسلمان ہو گئے) اور (عقائد کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی (اس طرح) اصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان (بنی اسرائیل) کے اوپر (محاذات میں) معلق کردیا اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرا اور (اس وقت یہ کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی تورات اور) مضبوطی کے ساتھ (قبول کرو) اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں، جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ایک عہد و میثاق کا ذکر تھا جو خصوصی طور پر علماء بنی اسرائیل سے تورات کے متعلق لیا گیا تھا کہ اس میں کوئی تصرف و تغیر نہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بجز حق اور صحیح بات کے کوئی چیز منسوب نہ کریں گے، اور یہ بات پہلے بیان ہو چکی تھی کہ ان علماء بنی اسرائیل نے عہد شکنی کی اور اہلِ غرض سے رشوتیں لے کر تورات کے احکام بدلے اور ان کی منشاء کے مطابق کر کے بتلائے

اب یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے کہ علماء بنی اسرائیل سب کے سب ایسے نہیں، ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے تورات کے احکام کو مضبوطی سے تھاما، اور ایمان کے ساتھ عمل کے بھی پابند ہوئے، اور نماز کو پورے آداب کے ساتھ قائم کیا، ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے، تو جن لوگوں نے ایمان و عمل کے دونوں فرائض ادا کر کے اپنی اصلاح کرلی ان کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں چند فوائد قابلِ غور ہیں، اوّل یہ کہ کتاب سے مراد اس میں وہی کتاب ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی تورات، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانی کتاب تورات، انجیل، قرآن سب مراد ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کتاب کو صرف اپنے پاس احتیاط و تعظیم کے ساتھ رکھ لینے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے احکام کی پابندی مطلوب ہے شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں کتاب کے لینے یا پڑھنے کا ذکر نہیں، ورنہ یَاْخُذُوْنَ یا یَقْرَءُوْنَ کا لفظ ہوتا اس کی جگہ یُمَسِّکُوْنَ کا لفظ اختیار کیا گیا جس کے معنی ہیں مضبوطی کے ساتھ پوری طرح تھامنا یعنی اس کے احکام کی تعمیل کرنا۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ یہاں احکام تورات کی تعمیل اور پابندی کا ذکر تھا اور احکام تورات سینکڑوں ہیں، ان میں سے اس جگہ صرف اقامتِ صلوٰۃ کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا، اس میں اشارہ

اس بات کی طرف ہے کہ کتاب اللہ کے احکام میں سب سے زیادہ اہم اور افضل و اعلیٰ نماز ہے نیز یہ کہ نماز کی پابندی احکامِ الٰہیہ کی پابندی کی خاص نشانی اور علامت بھی ہے کہ اس کے ذریعہ فرمان بردار اور نافرمان کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی پابندی میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جو نماز کا پابند ہوگیا اس کے لئے دوسرے احکام خداوندی کی پابندی بھی سہل ہو جاتی ہے اور جس نے نماز کی پابندی نہ کی اُس سے دُوسرے احکام کی پابندی بھی نہ ہو سکے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز دین کا عمود ہے جس پر اس کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے جس نے اس عمود کو قائم کرلیا اس نے دین کو قائم کرلیا اور جس نے اس کو منہدم کر دیا اس نے پورے دین کی عمارت منہدم کردی۔

اسی لئے اس آیت میں وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتٰبِ کے بعد وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ فرماکر یہ بتلا دیا کہ کتاب سے تمسّک کرنے والا اور اس کی پابندی کرنے والا صرف اُسی کو سمجھا جائے گا جو نماز کو اس کے آداب وشرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرے، اور جو نماز میں کوتاہی کرے وہ کتنے ہی وظائف پڑھے یا مجاہدے کرے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ نہیں اگرچہ اس سے کشف وکرامت کا صدور بھی ہوتا ہو۔

یہاں تک بنی اسرائیل کو ان کی عہد شکنی اور احکام تورات میں تحریف کرنے پر تنبیہ کا بیان تھا اس کے بعد دوسری آیت میں بنی اسرائیل ہی کے ایک خاص عہد کا ذکر ہے جو ان سے احکام تورات کی پابندی کے لئے ڈرا دھمکا کر گویا زبردستی لیا گیا تھا، جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی آچکا ہے۔

اس آیت میں لفظ نَتَقْنَا ، نتق سے مشتق ہے جس کے معنی کھینچنے اور اُٹھانے کے ہیں، سورۂ بقرہ میں اسی واقعہ کا ذکر لفظ رَفَعْنَا سے کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی حضرت ابن عباسؓ نے نَتَقْنَا کی تفسیر رَفَعْنَا سے فرمائی ہے۔

اور لفظ ظُلَّةٌ ، ظِلٌّ بمعنی سایہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سائبان، مگر لفظ سائبان عرف میں ایسی چیز کیلئے بولا جاتا ہے جس کا سایہ سر پر پڑتا ہو مگر وہ کسی عمود پر قائم ہو، اور اس واقعہ میں پہاڑ ان کے سر پر معلق کر دیا گیا تھا سائبان کی صورت میں نہ تھا اسی لئے اس کو حرف تشبیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ ہم نے بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو اُٹھا کر معلق کر دیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ اب ہم پر پہاڑ گرا چاہتا ہے، اس حالت میں ان سے کہا گیا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ یعنی مضبوط پکڑو ان احکام کو جو ہم نے تمہیں دیئے ہیں

اور یاد رکھو تورات کی ہدایات کو تاکہ تم برے اعمال و اخلاق سے باز آجاؤ۔

واقعہ اس کا یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کی خواہش و فرمائش کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کتاب و شریعت مانگی اور حسب الحکم اس سلسلہ میں چالیس راتوں کا اعتکاف کوہ طور پر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب ملی اور بنی اسرائیل کو سنائی تو اس میں بہت سے احکام ایسے پائے جو ان کی طبیعت اور سہولت کے خلاف تھے ان کو سن کر انکار کرنے لگے کہ ہم سے تو ان احکام پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم دیا انہوں نے کوہ طور کو اس بستی کے اوپر معلق کردیا جس میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ اس کا رقبہ تاریخی روایتوں میں تین مربع میل بیان کیا گیا ہے، اس طرح ان لوگوں نے موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو سب سجدہ میں گر گئے اور احکام تورات کی پابندی کا عہد کرلیا، لیکن اس کے باوجود پھر بار بار خلاف ورزی ہی کرتے رہے۔

دین میں جبر و اکراہ نہیں، اس کا صحیح مطلب اور شبہ کا جواب

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کا عام اعلان ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں جبر و اکراہ نہیں کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

لیکن ذرا غور کیا جائے تو فرق کھلا ہوا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد و میثاق کا پابند ہوگیا اس کے بعد وہ اگر احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اس سے معلوم ہو کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو بجبر مسلمان نہیں بنایا جائے گا، اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود احکام تورات کی پابندی سے انکار کردیا، اس لئے ان پر جبر و اکراہ کرکے پابندی کرانا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو

وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ

اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب بولے ہاں ہے،

شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا

ہم اقرار کرتے ہیں، کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی

غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ

بے خبر تھے یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے

وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور ہم ہوئے ان کی اولاد ان کے پیچھے، تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آئیں

خلاصۂ تفسیر

اور ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے، جب کہ آپ کے رب نے عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی پشت سے تو خود ان کی اولاد کو اور اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے (اس عقلِ خداداد سے حقیقت امر کو سمجھ کر) جواب دیا کہ کیوں نہیں (واقعی آپ ہمارے رب ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا، ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (اور یہ اقرار اور شہادت سب اس لئے ہوا کہ) تم لوگ (یعنی جو تم میں ترک توحید اور اختیارِ شرک پر سزا پائیں) قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے (اور عادۃً نسل عقائد و خیالات میں تابع اپنی اصل کے ہوتی ہے اس لئے ہم بے خطا ہیں پس ہمارے فعل پر تو ہم کو سزا ہو نہیں سکتی، اگر ہوگی تو لازم آتا ہے کہ ان بڑوں کی خطا میں ہم ماخوذ ہوں) سو کیا ان غلط راہ (نکالنے) والوں کے فعل پر آپ ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتے ہیں (سو اب اس اقرار و شہادت کے بعد تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے پھر اس کے بعد ان سب سے وعدہ کیا گیا کہ یہ عہد تم کو دنیا میں پیغمبروں کے ذریعہ سے یاد دلایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ ان بھی اول میں واذ اخذ کے ترجمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کو اس واقعہ کے ذکر کا حکم ہوا، اور آخر میں بھی اس یاد دہانی کو بتلاتے ہیں کہ) ہم اسی طرح (اپنی) آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں (تاکہ ان کو اس عہد کا ہونا معلوم ہو جائے) اور تاکہ (معلوم ہونے کے بعد شرک وغیرہ سے) وہ باز آجائیں۔

معارف و مسائل

عہدِ الست کی تفصیل و تحقیق ان آیتوں میں اس عظیم الشان عالمگیر عہد و پیمان کا ذکر ہے جو خالق و

مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان اس وقت ہوا جب کہ مخلوق اس جہان کون و فساد میں آئی بھی نہ تھی، جسکو عہدِ ازل یا عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

اللہ جلّ شانہٗ سارے عالموں کا خالق و مالک ہے، زمین و آسمان اور ان کے درمیان اور ان کے ماسوا جو کچھ ہے اس کی مخلوق اور مملوک ہے، نہ اس پر کوئی قانون کسی کا چل سکتا ہے، نہ اس کے کسی فعل پر کسی کو کوئی سوال کرنے کا حق ہے۔

لیکن اس نے محض اپنے فضل و کرم سے عالم کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز کا ایک ضابطہ اور قانون ہے، قانون کے موافق چلنے والوں کے لیے ہر طرح کی دائمی راحت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے ہر طرح کا عذاب مقرر ہے۔

پھر خلاف ورزی کرنے والے مجرم کو سزا دینے کے لئے اس کا ذاتی علم محیط کافی تھا جو عالم کے ذرہ ذرہ پر حاوی ہے اور اس کے لئے کھلے اور چھپے ہوئے تمام اعمال و افعال بلکہ دلوں میں پوشیدہ ارادے تک بالکل ظاہر ہیں اس لیے کوئی ضرورت نہ تھی کہ نگران مقرر کئے جائیں، اعمال نامے لکھے جائیں، اعمال تولے جائیں اور گواہ کھڑے کئے جائیں۔

لیکن اُس نے خالص اپنے فضل و کرم سے یہ بھی چاہا کہ کسی کو اس وقت تک سزا نہ دیں جب تک دستاویزی ثبوت و ناقابلِ انکار شہادتوں سے اس کا جرم اس کے سامنے اس طرح مکمل کر نہ دیا جائے کہ وہ خود بھی اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرلے اور اپنے آپ کو مستحقِ سزا سمجھ لے۔

اس کے لئے ہر انسان کے ساتھ اس کے ہر عمل اور قول کو لکھنے والے فرشتے مقرر فرمائے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ یعنی کوئی کلمہ انسان کی زبان سے نہیں نکلتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگرانی کرنے والا فرشتہ مقرر نہ ہو، اور فرمایا كُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ یعنی انسان کا ہر چھوٹا بڑا کام لکھا ہوا ہے۔

پھر محشر میں میزانِ عدل قائم فرماکر انسان کے اعمال نیک و بد کو تولا جائے گا، اگر نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگیا تو نجات پائے گا اور گناہوں اور جرائم کا پلہ بھاری ہوگیا تو گرفتارِ عذاب ہوگا۔

اس کے علاوہ جب احکم الحاکمین کا دربارِ عام محشر میں قائم ہوگا تو ہر ایک کے عمل پر شہادتیں بھی لی جائیں گی بعض مجرم گواہوں کی تکذیب کریں گے تو اس کے ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح سے اور اس زمین و مکان سے جس میں یہ افعال کئے گئے گواہی لی جائے گی وہ سب بحکمِ خداوندی گویا ہوکر صحیح صحیح واقعات بتلادیں گے یہاں تک کہ مجرمین کو انکار و تکذیب کا کوئی

موقع باقی نہ رہے گا وہ اعتراف واقرار کریں گے، فَاعْتَرَفُوا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔

پھر رؤف و رحیم مالک نے اس نظام عدل و انصاف کے قائم کرنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا، اور دنیا کی حکومتوں کی طرح نرا ایک ضابطہ اور قانون ان کو نہیں دے دیا بلکہ قانون کے ساتھ ایک نظام تربیت قائم کیا۔

جیسے بلا تشبیہ کے کوئی شفیق باپ اپنے گھریلو معاملات کو درست رکھنے اور اہل و عیال کو تہذیب و ادب سکھانے کے لئے کوئی گھریلو قانون اور ضابطہ بناتا ہے کہ جو شخص اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا ملے گی، مگر اس کی شفقت و عنایت اس کو اس پر بھی آمادہ کرتی ہے کہ ایسا اقدام کرے جس کے سبب ان میں سے کوئی سزا کا مستحق نہ ہو بلکہ سب کے سب اُس ضابطہ کے مطابق چلیں، بچے کے لئے اگر صبح کو اسکول جانے کی ہدایت اور اس کے خلاف کرنے پر سزا مقرر کردی ہے تو باپ سویرے اس کی بھی فکر کرتا ہے کہ بچہ اس کام کے لئے وقت سے پہلے تیار ہو جائے۔

ربُّ العالمین کی رحمت اپنی مخلوق پر ماں اور باپ کی شفقت و رحمت سے کہیں زائد ہے اس لئے اس نے اپنی کتاب کو محض قانون اور تعزیرات نہیں بنایا بلکہ ایک ہدایت نامہ بنایا ہے اور ہر قانون کے ساتھ ایسے طریقے بھی سکھائے ہیں جن کے ذریعہ قانون پر عمل آسان ہو جائے۔

اسی نظام ربوبیت کے تقاضے سے اپنے انبیاء بھیجے ان کے ساتھ آسمانی ہدایت نامے بھیجے، فرشتوں کی بہت بڑی تعداد دنیا والوں کی طرف ہدایت کرنے اور مدد کرنے کے لئے مقرر فرمادی

اسی نظام ربوبیت کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ہر قوم اور ہر فرد کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنے رب کریم کو یاد کرنے کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کئے، زمین و آسمان کی تمام مخلوق اور دن رات کے تغیرات اور خود انسان کے اپنے وجود کی کائنات میں اپنی یاد دلانے والی ایسی نشانیاں رکھ دیں کہ اگر ذرا بھی ہوش سے کام لے تو کسی وقت اپنے مالک کو نہ بھولے، وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ، وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، یعنی زمین میں اہل بصیرت کے لئے ہماری نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے

اسی طرح غافل انسان کو بیدار کرنے اور عمل صالح پر لگانے کے لئے ایک انتظام ربُّ العالمین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ افراد و جماعتوں اور قوموں سے مختلف اوقات اور حالات میں اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عہد و پیمان لے کر ان کو قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا گیا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بہت سے معاہدات و مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے جو مختلف جماعتوں سے مختلف اوقات و حالات میں لئے گئے، انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا کہ جو کچھ ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے پیغام رسالت ملے وہ اپنی اپنی امتوں کو ضرور پہنچا دیں گے، اس میں ان کے لئے کسی کا خوف اور لوگوں کی ملامت و توہین کا اندیشہ حائل نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی اس مقدس جماعت نے اپنے اس معاہدہ کا پورا حق ادا کر دیا، پیغام رسالت کے پہنچانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

اسی طرح ہر رسول و نبی کی امت سے اس کا معاہدہ لیا گیا کہ وہ اپنے اپنے انبیاء کا اتباع کریں گے، پھر خاص خاص اہم معاملات میں خصوصیت کے ساتھ اس کے پورا کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کا عہد لیا گیا، جس کو کسی نے پورا کیا کسی نے نہیں کیا۔

انہی معاہدات میں سے ایک اہم معاہدہ وہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام سے ہمارے رسول کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا کہ سب انبیاء نبی امی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں گے، اور جب موقع پائیں گے ان کی مدد کریں گے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ۔

یہ تمام عہود و مواثیق حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ کے مظاہر ہیں اور مقصد ان کا یہ ہے کہ انسان جو کثیر النسیان ہے کثر اپنے فرائض کو بھول جاتا ہے، اس کو بار بار ان معاہدات کے ذریعہ ہوشیار کیا گیا تاکہ وہ ان کی خلاف ورزی کر کے تباہی میں نہ پڑ جائے۔

بیعت لینے کی حقیقت انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی سنت الہیہ کا اتباع ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے معاملات میں صحابۂ کرامؓ سے بیعت لی، جن میں سے بیعت رضوان کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ یعنی اللہ راضی ہو گیا ان لوگوں سے جنہوں نے ایک خاص درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ہجرت سے پہلے انصار مدینہ کی بیعت عقبہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں سے ہے۔

بہت سے صحابۂ کرامؓ سے ایمان اور عمل صالح کی پابندی پر بیعت لی۔ صوفیائے کرام میں جو بیعت معروف ہے وہ بھی ایمان اور عمل صالح کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کا عہد ہے اور اسی سنت اللہ اور سنت الانبیاء کا اتباع ہے، اسی وجہ سے اس میں خاص برکات ہیں، انسان کو گناہوں سے بچنے اور احکام شرعیہ بجا لانے کی ہمت اور توفیق بڑھ جاتی ہے، بیعت کی حقیقت

معلوم ہونے سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جس طرح کی بیعت عام طور پر ناواقف جاہلوں میں رواج پاگئی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ بیٹھتے ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، بیعت ایک معاہدہ کا نام ہے، اس کا فائدہ جبھی ہے جب اس معاہدہ کو عملاً پورا کیا جائے ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔

سورۂ اعراف کی گزشتہ آیات میں ان معاہدات کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے احکام تورات کی پابندی کے سلسلے میں لئے گئے تھے، مذکور الصدر آیات میں اس عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولادِ آدم سے اس عالم دنیا میں آنے سے بھی پہلے ازل میں لیا گیا جو عام زبانوں پر عہدِ الست کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ الآیۃ، ان آیتوں میں اولادِ آدم کے لئے لفظِ ذریت استعمال فرمایا ہے، امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ یہ لفظ دراصل لفظ ذرء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیدا کرنے کے، قرآن کریم میں کئی جگہ یہ لفظ اس معنی کے لئے استعمال ہوا ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا، وغیرہ، اس لئے ذریت کا لفظی ترجمہ مخلوق کا ہوا، اس لفظ سے اشارہ کردیا گیا کہ یہ عہد ان تمام لوگوں کے لئے عام و شامل تھا جو آدم علیہ السلام کے واسطہ سے اس دنیا میں پیدا کئے جائیں گے

روایاتِ حدیث میں اس عہدِ ازل کی مزید کچھ تفصیلات آئی ہیں:

امام مالکؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے بروایت مسلم بن یسار نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت فاروقِ اعظمؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دستِ قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا تو جتنے گناہگار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا اور فرمایا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے ہی کے کام کریں گے۔

صحابہؓ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی

متعین کر دیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کے لئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہل جنت ہی کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طبقہ میں داخل ہے تو اس کو اپنی توانائی اور قدرت و اختیار ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہئے جو اہل جنت کے کام ہیں اور یہی امید رکھنا چاہئے کہ وہ انہی میں سے ہوگا۔

اور امام احمد کی روایت میں یہی مضمون بروایت حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں اتنا اور زیادہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلے وہ سفید رنگ کے تھے جن کو اہل جنت فرمایا، اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے جن کو اہل جہنم قرار دیا۔

اور ترمذی میں یہی مضمون بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اس طرح قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد آدم جو ظہور میں آئی ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

اب غور طلب یہ ہے کہ ان احادیث میں تو ذریت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے لینے اور نکالنے کا ذکر ہے اور قرآن کریم کے الفاظ میں بنی آدم یعنی اولاد آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے۔ تطبیق اس کی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلاواسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولاد آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا۔

حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس سب ذریت آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لینے میں اس کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ ذریت آدم جو اس وقت پشتوں سے نکالی گئی تھی صرف ارواح نہیں تھیں بلکہ روح اور جسم کا ایسا مرکب تھی جو جسم کے لطیف ترین ذرات سے بنائے گئے تھے، کیونکہ ربوبیت اور تربیت کی ضرورت زیادہ تر وہیں ہوتی ہے جہاں جسم و روح کا مرکب ہو اور جس کو ایک حال سے دوسرے

حال کی طرف ترقی کرتا ہو، ارواح کی یہ شان نہیں وہ تو اول سے آخر تک ایک ہی حال پر ہوتی ہیں، اس کے علاوہ احادیث مذکورہ میں جو ان کے رنگ سفید و سیاہ مذکور ہیں یا ان کی پیشانی کی چمک مذکور ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح بلا جسم نہیں تھی ورنہ روح کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا، جسم ہی کے ساتھ یہ اوصاف متعلق ہوتے ہیں۔

اور اس پر کوئی تعجب نہ کیا جائے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسان ایک جگہ میں کس طرح سما گئے، کیونکہ حضرت ابو الدرداءؓ کی حدیث مذکور میں اس کی بھی تصریح ہے کہ اس وقت جو ذریت پشت آدم علیہ السلام سے نکالی گئی تھی وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی جس میں وہ دنیا میں آئیں گے بلکہ چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھی، اور سائنس کی اس ترقی کے زمانہ میں تو کسی سمجھدار انسان کو کوئی اشکال اس میں ہونا ہی نہیں چاہئے کہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ایک چیونٹی کے جثہ میں کیسے ظاہر ہوا، آج تو ایٹم کے اندر تمام نظام شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، فلم کے ذریعہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک نقطہ کی مقدار دکھلایا جا سکتا ہے، اس لئے یہ کیا مشکل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عہد و میثاق کے وقت تمام بنی آدم کو بہت چھوٹے جثہ میں وجود عطا فرمایا ہو۔

عہد ازل کے متعلق چند سوال و جواب اس عہد ازل کے متعلق چند چیزیں اور قابل غور ہیں:

اوّل یہ کہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا؟

دوسرے یہ کہ جب اقرار اس حال میں لیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا انسان پیدا بھی نہ ہوا تھا تو ان کو یہ عقل و علم کیسے حاصل ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کے رب ہونے کا اقرار کریں، کیونکہ ربوبیت کا اقرار وہ کر سکتا ہے جس نے شان تربیت کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ مشاہدہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے؟

پہلا سوال کہ یہ عہد و اقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا، اس کے متعلق مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت بسند قوی امام احمد، نسائی اور حاکم نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عہد و اقرار اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا، اور مقام اس اقرار کا وادی نعمان ہے جو میدان عرفات کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ (تفسیر مظہری)

رہا دوسرا سوال کہ یہ نئی مخلوق جس کو ابھی وجود عنصری بھی پوری طرح عطا نہیں ہوا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا اور پروردگار ہے، ایسی حالت میں ان سے سوال کرنا بھی ایک قسم کی ناقابل برداشت تکلیف ہے، اور وہ جواب بھی کیا دے سکتے ہیں۔ اس کا

جواب یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی قدرتِ کاملہ نے تمام انسانوں کو ایک ذرّہ کی صورت میں پیدا فرمایا، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ اس نے ان کو عقل وفہم اور شعور وادراک بھی اس وقت بقدرِ ضرورت دے دیا ہو، اور یہی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس مختصر وجود میں انسان کے تمام قُویٰ کو جمع فرما دیا تھا جن میں سب سے بڑی قوت عقل وشعور کی ہے۔

انسان کے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ شانہ کی عظمت وقدرت کی وہ بے شمار نشانیاں ہیں جن پر ذرا بھی غور کرنے والا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے غافل نہیں رہ سکتا، قرآن کریم کا ارشاد ہے، وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ، وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ، یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے، اور خود تمہارے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے

یہاں ایک تیسرا سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ازلی عہد ومیثاق کتنا ہی یقینی اور صحیح کیوں نہ ہو مگر جب انسانوں کو یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا تو پھر عہد کا فائدہ کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اسی نوعِ بنی آدم میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے، حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ ونادر کے درجہ میں ہیں، اس لئے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بات عام اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد واقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ درحقیقت اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفتِ حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہوکر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہوگیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، پھر چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہوکر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (وفی بعض الروایات عَلَى هٰذِهِ الْمِلَّةِ، اخرجہ بخاری ومسلم) یعنی ہر پیدا ہونے والا دینِ فطرت

یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے۔

اسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال و اقوال ہیں جو اس دنیا میں بھی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے وہ بہرحال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں۔

مثلاً بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت و تکبیر کہنے کی جو سنت ہر مسلمان جانتا ہے اور بحمد اللہ پورے عالم اسلام میں جاری ہے، اگرچہ بچہ نہ کلمات کے معنی سمجھتا ہے نہ اس کو بڑا ہونے کے بعد یاد رہتا ہے کہ میرے کان میں کیا الفاظ کہے گئے تھے، اس کی حکمت یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ اس اقرار ازلی کو قوت پہنچا کر کانوں کی راہ سے دل میں ایمان کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اور اسی کا یہ اثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑا ہونے کے بعد اگرچہ یہ اسلام اور اسلامیات سے کتنا ہی دور ہو جائے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں کی فہرست سے الگ ہونے کو انتہائی برا سمجھتا ہے، اسی طرح جو لوگ قرآن کی زبان نہیں جانتے ان کو بھی تلاوتِ قرآن کا حکم شاید اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اس سے بھی کم از کم یہ مخفی فائدہ ضرور پہنچتا ہے کہ انسان کے قلب میں نورِ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ھٰذَا غٰفِلِیۡنَ یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے لیا ہے کہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس ازلی سوال و جواب سے تمہارے دلوں میں ایمان کی بنیاد ایسی قائم ہو گئی کہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لو تو اللہ جل شانہ کی ربوبیت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا، اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِھِمۡ ۚ اَفَتُھۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ، یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے بھی لیا ہے کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ عذر نہ کرنے لگو کہ شرک و بت پرستی تو دراصل ہمارے بڑوں نے اختیار کر لی تھی اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے، کھرے کھوٹے اور صحیح غلط کو نہیں پہچانتے تھے اس لئے بڑوں نے جو کچھ کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں دی جائے۔ حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ دوسروں کے فعل کی سزا تم کو نہیں دی گئی بلکہ خود تمہاری غفلت

کی سزا ہے کیونکہ اس قرارِ ازلی نے انسان میں ایک ایسی عقل وبصیرت کا تخم ڈال دیا تھا کہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لیتا تو اتنی بات سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ پتھر کے بت جن کو ہم نے اپنے ہاتھوں تراشا ہے، یا آگ اور پانی، اور درخت یا کوئی انسان، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو کوئی انسان اپنا پیدا کرنے والا اور پروردگار یا حاجت روا مشکل کشا یقین کر سکے۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح آیا ہے، وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، یعنی ہم اسی طرح اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے ہیں تاکہ لوگ غفلت اور کجروی سے باز آجائیں، مراد یہ ہے کہ آیاتِ الٰہیہ میں ذرا بھی غور کریں تو وہ اس عہد ومیثاق کی طرف لوٹ آئیں جو ازل میں کیا گیا تھا یعنی اللہ جل شانہ کی ربوبیت کا اعتراف کرنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں اس کی اطاعت کو لازم سمجھیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

اور سنا دے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا

پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں اور ہم چاہتے

لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ

تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہش کے

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ

تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے

يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

تو ہانپے، یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَاۨ

سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں بری مثال ہے

الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا

ان لوگوں کی کہ جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو اور وہ اپنا ہی

يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نقصان کرتے رہے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں کو (عبرت کے واسطے) اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں (یعنی احکام کا علم دیا) پھر وہ ان آیتوں سے بالکل ہی نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہوگیا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں (کے مقتضا پر عمل کرنے) کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے (یعنی اگر وہ ان آیتوں پر عمل کرتا جس کا وابستۂ قضا و قدر ہونا امر معلوم ہے تو اس کا رتبۂ قبول بڑھتا، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور (اس میلان کے سبب) اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا (اور آیات و احکام پر عمل چھوڑ دیا، سو (آیات کو چھوڑ کر جو پریشانی اور ذلت دائمی اس کو نصیب ہوئی اس کے اعتبار سے) اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (اور مار کر نکال دے) تب بھی ہانپے یا اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دے تب بھی ہانپے (کسی حالت میں اس کو راحت نہیں اسی طرح یہ شخص ذلت میں تو کتے کے مشابہ ہوگیا اور پریشانی میں کتے کی اس صفت میں شریک ہوا پس جیسی اس شخص کی حالت ہوئی) یہی حالت (عام طور پر) ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو (جو کہ توحید و رسالت پر دال ہیں) جھٹلایا (کہ وضوح حق کے بعد محض ہوی پرستی کے سبب حق کو ترک کرتے ہیں) سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ (اس کو سن کر) کچھ سوچیں، (حقیقت میں) ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے جو ہماری آیات (دالہ علی التوحید والرسالۃ) کو جھٹلاتے ہیں اور (اس تکذیب سے) وہ اپنا (ہی) نقصان کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں بنی اسرائیل کا ایک عبرت ناک قصہ مذکور ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم و مشہور مقتدا کا علم و معرفت کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے بعد دفعۃً گمراہ و مردود ہو جانے کا واقعہ مع اس کے اسباب کے بیان کیا گیا ہے اور اس میں بہت سی عبرتیں ہیں۔

اور مناسبت اس واقعہ کی پچھلی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں عہد و میثاق کا ذکر تھا جو ازل میں حق تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اور پھر خاص خاص حالات میں خاص خاص اقوام یہود و نصاریٰ وغیرہ سے لئے تھے، اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر آیا تھا کہ عہد کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس عہد پر قائم نہیں رہے، جیسے یہود کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ا

دنیا میں تشریف لانے سے پہلے آپ کے آنے کا انتظار کرتے اور آپ کی صفات و شمائل لوگوں سے بیان کیا کرتے اور ان کی تصدیق کیا کرتے تھے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے سے باز رہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عالم مقتدا کی گمراہی کا عبرتناک واقعہ

ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ واقعہ پڑھ کر سنائیے جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم و عارف اور مشہور پیشوا کا ایسا ہی حال عروج کے بعد تنزّل اور ہدایت کے بعد گمراہی کا مذکور ہے کہ وسیع علم اور پوری معرفت حاصل ہونے کے باوجود، جب نفسانی اغراض اس پر غالب آئیں تو یہ سب علم و معرفت اور مقبولیت ختم ہو کر گمراہ اور ذلیل و خوار ہو گیا۔

قرآن کریم میں اس شخص کا نام اور کوئی مشخص مذکور نہیں، ائمۂ تفسیر صحابہؓ و تابعین سے اس کے بارے مختلف روایتیں مذکور ہیں جن میں زیادہ مشہور اور جمہور کے نزدیک قابل اعتماد روایت وہ ہے جو حضرت ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ اس شخص کا نام بلعم بن باعور ہے یہ ملک شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں کا علم اس کو حاصل تھا، قرآن کریم میں جو اس کی صفت میں اَلَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فرمایا ہے اس سے اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

جب غرق فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور جبارین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچ گئے اور ان کے مقابل قوم فرعون کا غرق و ندرت ہونا ان کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا تو ان کو فکر ہوئی اور جمع ہو کر بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سخت آدمی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے لشکر ہیں اور وہ ہم لئے آئے ہیں کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ان کو ہمارے مقابلہ سے واپس کر دیں، وجہ یہ تھی کہ بلعم بن باعوراء کو اسم اعظم معلوم تھا وہ اس کے ذریعہ جو دعا کرتا تھا قبول ہوتی تھی۔

بلعم نے کہا افسوس ہے تم کیسی بات کہتے ہو، وہ اللہ کے نبی ہیں ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں میں ان کے خلاف بددعا کیسے کر سکتا ہوں حالانکہ ان کا مقام جو اللہ کے نزدیک ہے وہ بھی میں جانتا ہوں اگر میں ایسا کروں گا تو میرا دین دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو اس پر بلعم نے کہا کہ اچھا میں اپنے رب سے اس معاملہ میں معلوم کر لوں کہ ایسی دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں، اس نے اپنے معمول کے مطابق

معلوم کرنے کے لئے استخارہ یا کوئی عمل کیا، خواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، اس نے قوم کو بتلا دیا کہ مجھے بد دعا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، اس وقت قوم جبارین نے بلعم کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کر لیا تو پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ آپ ضرور یہ کام کر دو اور الحاح واصرار کی حد نہ رہی، بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ رشوت قبول کر لیں اور ان کا کام کر دیں، اس وقت بیوی کی رضا جوئی اور مال کی محبت نے اس کو اندھا کر دیا تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بد دعا کرنا شروع کی۔

اس وقت قدرتِ الٰہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ جو کلمات بد دعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظ بد دعا خود اپنی قوم جبارین کے لئے نکلے، وہ چلّا اٹھے کہ تم تو ہمارے لئے بد دعا کر رہے ہو، بلعم نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینہ پر لٹک گئی، اور اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دنیا و آخرت تباہ ہوگئی اب دُعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو۔

وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کر دو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ان کے ساتھ جو کچھ کریں کرنے دیں، رکاوٹ نہ بنیں، یہ لوگ مسافر ہیں، اپنے گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے ہیں، اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام کاری انتہائی مبغوض چیز ہے جس قوم میں یہ ہو، اس پر ضرور قہر و عذاب نازل ہوتا ہے، وہ فتح و کامران نہیں ہو سکتی۔

بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آگئی، اس پر عمل کیا گیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس وبال سے روکا مگر وہ باز نہ آیا، اور شیطانی جال میں مبتلا ہوگیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیلا جس سے ایک روز میں ستر ہزار اسرائیلی مر گئے، یہاں تک کہ جس شخص نے برا کام کیا تھا اس جوڑے کو بنی اسرائیل نے قتل کر کے منظر عام پر لٹکا دیا کہ سب لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور توبہ کی، اس وقت یہ طاعون رفع ہوا۔

قرآن مجید کی مذکورالصدر آیات میں اس کے متعلق فرمایا فَانْسَلَخَ مِنْهَا یعنی ہم نے اپنی آیات اور ان کا علم و معرفت اس شخص کو عطا کیا تھا لیکن وہ اس سے نکل گیا، انسلاخ کا لفظ اصل میں جانور کے کھال کے اندر سے یا سانپ کا کینچلی کے اندر سے نکل جانے کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ علم آیات کو ایک لباس یا کھال کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ بتلایا گیا کہ یہ شخص علم و معرفت سے بالکل جدا ہوگیا، فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ یعنی پیچھے لگ گیا اس کے شیطان، مطلب یہ ہے کہ جب تک علم آیات اور ذکر اللہ اس کے ساتھ تھا شیطان کا قابو اس پر نہ چل سکتا تھا جب وہ جاتا رہا تو شیطان اس پر قابو یافتہ ہوگیا فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ، یعنی پھر ہوگیا وہ گمراہوں میں سے، مطلب یہ ہے کہ شیطان کے قابو میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں شامل ہوگیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ، یعنی اگر ہم چاہتے تو انہی آیات کے ذریعہ اس کو بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگا، لفظ اَخْلَدَ، اخلاد سے مشتق ہے، جس کے معنی میں کسی چیز کی طرف میلان کے یا کسی جگہ کو لازم پکڑنے کے اور ارض کے اصلی معنی زمین کے ہیں، دنیا کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب یا خود زمین ہے یا زمین سے متعلق گھر، جائداد، کھیتی، باغ وغیرہ ہیں، یا زمین سے ہی پیدا ہونے والی کروڑوں چیزیں ہیں جو انسان کی زندگی اور عیش کا مدار ہیں، اس لئے لفظ ارض بول کر اس جگہ پوری دنیا مراد لی گئی ہے، اس آیت میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ آیات الٰہیہ اور ان کا علم ہی اصل میں سربلندی اور ترقی کا سبب ہیں، لیکن جو شخص ان آیات کا احترام نہ کرے اور دنیا کی ذلیل خواہشات کو آیات الٰہیہ پر مقدم جانے اس کے لئے یہی علم ایک وبال بن جاتا ہے۔

اسی وبال کا ذکر آیت میں اس طرح کیا گیا ہے، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ، لفظ لہث کے اصل معنی یہ ہیں کہ زبان نکال کر سختی کے ساتھ سانس لیا جائے۔

ہر جاندار اپنی زندگی میں اس کا محتاج ہے کہ اندر کی گرم اور زہریلی ہوا کو باہر پھینکے اور باہر سے تازہ ہوا حلق اور ناک کے راستہ سے اندر لے جائے، اسی پر جاندار کی زندگی کا مدار ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کیلئے اس اہم کام کو ایسا آسان کر دیا ہے کہ بلا ارادہ اور بلا محنت اس کی ناک کے نتھنوں سے اندر کی ہوا باہر اور باہر کی تازہ ہوا اندر جاتی ہے، اس میں نہ اس کو کوئی زور لگانا پڑتا ہے نہ کسی اختیاری عمل کی ضرورت پڑتی ہے، قدرتی اور فطری طور پر یہ

کام مسلسل خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

جانداروں میں صرف کتا ایسا جانور ہے جس کو اپنے سانس کی آمد و رفت میں زبان نکال کر زور لگانا اور محنت کرنی پڑتی ہے، اور دوسرے جانوروں کی یہ کیفیت صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ ان پر کوئی حملہ کرے یا وہ تھک جائیں یا کوئی اتفاقی محنت ان پر پڑ جائے۔

قرآن کریم نے اس شخص کی کتے کے ساتھ مثال دی، وجہ یہ ہے کہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی اس کو یہ سزا ملی تھی کہ زبان منہ سے نکل کر سینہ پر لٹک گئی تھی اور وہ برابر کتے کی طرح ہانپتا تھا خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے وہ ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا، ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا، یعنی یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مراد اس سے اہل مکہ ہیں جو ہمیشہ سے یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس کوئی ہادی اور رہبر آئے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی طرف بلائے اور طاعت کے صحیح طریقے سکھائے، پھر جب وہ رہبر آ گئے اور ایسی کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے کہ ان کے صدق و حقانیت میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تو ان کی تکذیب کرنے اور آیاتِ الٰہیہ سے روگردانی کرنے لگے۔

اور بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جو بعثت نبوی سے پہلے آپ کی علامات و خصوصیات تورات میں پڑھ کر لوگوں کو بتلایا کرتے اور آپ کی تشریف آوری کا انتظار کیا کرتے تھے، مگر جب آپ تشریف لائے تو سب سے زیادہ دشمنی اور مخالفت انہی لوگوں نے کی اور تورات کے احکام سے ایسے صاف نکل گئے جیسے بلعم بن باعورا نکل گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ یعنی آپ اس شخص کا واقعہ ان لوگوں کو سنا دیجئے، شاید یہ کچھ سوچیں اور اس کے واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلانے والوں کا برا حال ہے اور یہ لوگ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔

آیاتِ مذکورہ اور ان میں بیان کئے ہوئے واقعہ میں اہل فکر کے لئے بہت سے فوائد اور عبرتیں اور نصیحتیں ہیں:-

اول یہ کہ کسی شخص کو اپنے علم و فضل اور زہد و عبادت پر ناز نہیں کرنا چاہئے، حالات بدلتے اور بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی، جیسے بلعم بن باعور کا حشر ہوا، طاعت و عبادت کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دعا اور اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہیئے جہاں اس کو اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو خصوصاً مال اور اہل و عیال کی محبت میں اس انجام بد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ مفسد اور گمراہ لوگوں کے ساتھ تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔ بلعم اس بلا میں ان کا ہدیہ قبول کرنے کے سبب مبتلا ہوا۔

چوتھے یہ کہ بے حیائی اور حرامکاری پوری قوم کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہے، جو قوم اپنے آپ کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہے اس پر لازم ہے کہ اپنی قوم کو بے حیائی کے کاموں سے پورے اہتمام کے ساتھ روکے ورنہ خدا تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہوگا۔

پانچویں یہ کہ آیات الٰہیہ کی خلاف ورزی خود بھی ایک عذاب ہے اور اس کی وجہ سے شیطان اس پر غلب آکر ہزاروں خرابیوں میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم دین عطا کیا ہو اُس کو چاہیئے کہ اس کی قدر کرے اور اصلاح عمل کی فکر سے کبھی وقت فارغ نہ ہو۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ

جس کو اللہ رستہ دے وہی رستہ پاوے اور جس کو وہ بچلاوے سو وہی

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ

ہیں ٹوٹے میں ۔ اور ہم نے پیدا کئے دوزخ کے واسطے بہت سے

الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ

جن اور آدمی ، ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں ، اور آنکھیں ہیں

لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ

کہ ان سے دیکھتے نہیں ، اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں ، وہ ایسے ہیں

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ، وہی لوگ ہیں غافل ۔

خلاصۂ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو گمراہ

کردے سوایسے ہی لوگ (ابدی) خسارہ میں پڑ جاتے ہیں (پھر ان سے توقع ہدایت کی کرنا اور ہدایت نہ ہونے سے مغموم ہونا بیکار) اور (جب وہ لوگ اپنے قویٰ مُدرکہ سے کام ہی نہیں لیتے تو ہدایت کہاں سے ہو، سوان کے نصیب میں تو دوزخ ہی ہے چنانچہ) ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ (ہی میں رہنے) کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے (نام کو تو) دل (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (حق بات کو) نہیں سمجھتے (چونکہ اس کا ارادہ ہی نہیں کرتے) اور جن کے (نام کو تو) آنکھیں (ہیں مگر) ایسی ہیں جن سے (بنظر استدلال کے طور پر کسی چیز کو) نہیں دیکھتے اور جن کے (نام کو تو) کان (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (متوجہ ہو کر حق بات کو) نہیں سنتے (غرض) یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلف تو نہیں بنایا گیا سوان کا متوجہ نہ ہونا مذموم نہیں اور ان کو تو اس کا حکم ہے پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں سو اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ) یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے، جیسا اوپر بیان ہوا)

معارف و مسائل

پہلی آیت کا مضمون یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے صحیح راستہ کی ہدایت کردی وہ ہی ہدایت پانے والا ہے اور جن کو گمراہ کردیا تو وہ ہی خسارے اور نقصان میں پڑنے والے ہیں۔

یہ مضمون قرآن مجید کی بہت سی آیات میں بار بار آیا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اور ہر خیر و شر، اچھے بُرے کا خالق صرف اللہ جلّ شانہٗ ہے، انسان کے سامنے اچھے بُرے، صحیح غلط دونوں راستے کردیئے گئے ہیں اور اس کو ایک خاص قسم کا اختیار دیا گیا ہے وہ اپنے اس اختیار کو اگر اچھے اور صحیح راستہ میں خرچ کرتا ہے تو ثواب اور جنت کا مستحق ہوتا ہے، بُرے اور غلط راستے میں لگاتا ہے تو عذاب اور جہنم میں ٹھکانا ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہدایت پانے والے کو بصیغۂ مفرد ذکر کیا گیا اور گمراہی اختیار کرنے والوں کو بصیغۂ جمع، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دینِ حق ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہم السلام کا طریق رہا ہے، اصول سب کے مشترک اور ایک ہیں، اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانہ میں اور کسی نبی کی امت میں اور کسی دین و مذہب سے متعلق ہوں وہ سب ایک ہیں۔

اور گمراہی کے ہزاروں راستے الگ الگ ہیں اس لئے گمراہوں کو بصیغۂ جمع فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ فرمایا گیا۔

نیز اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ گمراہی اختیار کرنے والوں کی تو سزا اور انجام بد کا ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں، اس کے بالمقابل ہدایت یافت حضرات کی کسی خاص جزاء کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں — اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہدایت ایسی عظیم الشان نعمت ہے جو دین و دنیا کی ساری نعمتوں اور رحمتوں پر حاوی ہے، دُنیا میں حیاتِ طیبہ اور آخرت میں جنت کی لازوال نعمتیں سب ہدایت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لحاظ سے ہدایت خود ایک بھاری نعمت اور بہت بڑا انعام ہے جس کے بعد ان نعمتوں کے شمار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جو ہدایت کے صلہ میں ملنے والی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کوئی بڑی حکومت و سلطنت کا مالک کسی شخص کو یہ کہدے کہ تم ہمارے مقرب ہو ہم تمہاری بات سنیں اور مانیں گے تو ہر جاننے والا جانتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی عہدہ و منصب یا کوئی دولت اس کے لئے نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو ہدایت یافتہ کا خطاب دے دیا تو اس کو دین و دنیا کی ساری نعمتیں حاصل ہوگئیں، اسی لئے بزرگانِ سلف نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر و عبادت خود ہی اپنی جزاء اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان عطا ہے، جو شخص ذکر اللہ میں مشغول ہے وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کا انعام نقد پارہا ہے، آخرت و جنت کا انعام دوسری نعمت ہے، اسی سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے جس میں فرمایا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً کہ ایک ہی چیز کو جزاء بھی فرمایا گیا اور عطا بھی، حالانکہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، جزا کسی عمل کا معاوضہ ہوتا ہے اور عطاء بلا معاوضہ۔

اس میں جزاء و عطاء کی حقیقت بتلا دی کہ جس چیز کو تم جزاء اور عمل کا بدلہ سمجھتے ہو وہ بھی درحقیقت ہماری عطاء و انعام ہی ہے کیونکہ جس عمل کا یہ بدلہ ملا ہے وہ عمل خود ہمارا انعام تھا۔

دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں جس کو ہدایت مل گئی اس سے سارے کام ہدایت ہی کے مناسب سرزد ہوتے ہیں ؎

خرد چون دفتر تلقین کشاید — زمن آن در وجود آید کہ باید

اور جو گمراہی میں پڑ گیا اس کے سارے کام اسی انداز کے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا، یعنی ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے بہت سے جنات اور انسانوں کو جن کی علامت یہ ہے کہ ان کے پاس سمجھنے کے لئے قلوب اور دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان سب کچھ موجود ہیں، جن سے وہ حق سمجھ لیں تو صراطِ مستقیم کو پالیں، و نفع نقصان کو سمجھ لیں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ نہ وہ قلوب سے بات سمجھتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور نہ کانوں سے سننے کی چیزوں کو سنتے ہیں۔

اس میں یہ بتلا دیا کہ اگرچہ تقدیرِ الٰہی ایک رازِ سربستہ ہے جس کا کسی کو اس دنیا میں علم نہیں ہوتا لیکن اس کی علامات سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اہلِ جہنم کی علامت یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو ان کے صحیح کاموں میں نہ لگائیں، صحیح علم و معرفت کے لئے جو اللہ جل شانہ نے عقل اور آنکھ کان عطا فرمائے ہیں ان کو وہ بے مصرف چیزوں میں لگاتے ہیں اور اصل مقصد جس کے ذریعہ دائمی اور لازوال راحت و دولت مل سکتی تھی اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

آیت میں کافروں سے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی جو بظاہر مشاہدہ کے خلاف ہے، کس حقیقت پر مبنی ہے؟

اس آیت میں ان لوگوں کی سمجھ بوجھ اور بینائی و شنوائی سب چیزوں کی بالکل نفی کی گئی ہے کہ یہ نہ کچھ سمجھتے ہیں نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں نہ کوئی کلام سنتے ہیں، حالانکہ واقعہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ نہ پاگل و دیوانے ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھیں اور نہ نابینا ہوتے ہیں کہ کچھ نہ دیکھیں اور نہ بہرے ہوتے ہیں کہ کچھ نہ سنیں، بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ اکثر لوگوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نظر آتے ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے اندر اس کی ضرورت کے مطابق اور اس کے مقصدِ حیات کے مناسب عقل و شعور رکھا ہے، جن چیزوں کو ہم بے عقل اور بے حس و بے شعور کہتے اور سمجھتے ہیں درحقیقت وہ بھی حس و ادراک اور عقل و شعور سے خالی نہیں، البتہ یہ چیزیں ان میں اسی مقدار سے ہیں جو مقدار ان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو، سب سے کم عقل و شعور اور حس جمادات یعنی مٹی اور پتھر وغیرہ میں ہے، جن کو نہ کچھ بڑھنا ہے نہ اپنی جگہ سے نکلنا اور چلنا پھرنا، وہ اتنی قلیل ہے کہ ان میں حیات کے آثار کا پہچاننا بھی بہت دشوار ہے، اس سے کچھ زائد نباتات میں ہے جن کے مقصدِ وجود

میں بڑھنا، پھیلنا پھولنا داخل ہے، اسی کے مناسب عقل و درک ان کو دے دیا گیا، اس کے بعد حیوانات کا نمبر ہے، جن کے مقصدِ وجود میں بڑھنا بھی داخل ہے چلنا پھرنا بھی اور چل پھر کر اپنی غذا حاصل کرنا بھی اور مضر و ہلاک چیزوں سے بچنا بھاگنا بھی اور نسل پیدا کرنا بھی، اس لئے ان کو جو عقل و شعور ملا وہ اوروں سے زیادہ ملا مگر اتنا ہی جس سے وہ اپنے کھانے پینے پیٹ بھرنے سونے جاگنے وغیرہ کا انتظام کرلیں اور دشمن سے اپنی جان بچالیں، سب کے بعد انسان کا نمبر ہے جس کا مقصدِ وجود سب چیزوں سے آگے یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو پہچانے، اس کی مرضی کے مطابق چلے، اس کی ناپسند چیزوں سے پرہیز کرے، ساری مخلوقات کے حقائق پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے اور ہر چیز کے نتائج اور عواقب کو سمجھے، کھرے کھوٹے اچھے برے کو پرکھے، برائیوں سے بچے، اچھائیوں کو اختیار کرے، اسی نوع انسانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو ترقی کرنے کا بڑا میدان ملا ہے جو دوسری نوع کو حاصل نہیں، یہ جب ترقی کرتا ہے تو فرشتوں کی صف سے آگے مقام پاتا ہے، اسی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اعمال و افعال پر جزاء و سزا ہے، اسی لئے اس کو عقل و شعور تمام انواع مخلوقات سے زائد ملا ہے تاکہ وہ عام حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر اپنے مقصدِ وجود کے مناسب کاموں میں لگے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مخصوص عقل و شعور اور اس کی بخشی ہوئی بینائی و شنوائی کو اسی کام میں صرف کرے۔

جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو ایک انسان کا سمجھنا دیکھنا، سننا دوسرے جانوروں کے سمجھنے دیکھنے، سننے سے مختلف ہونا چاہئے اگر اس نے بھی صرف انہی چیزوں میں اپنی عقل اور بینائی و شنوائی کی طاقتوں کو لگا دیا جن میں دوسرے جانور لگاتے ہیں اور جو کام انسان کے لئے مخصوص تھا کہ ہر چیز کے نتائج و عواقب پر نظر رکھے اور برائیوں سے بچے بھلائیوں کو اختیار کرے، ان پر دھیان نہ دیا، اس کو باوجود عقل رکھنے کے بے عقل، باوجود بینا ہونے نابینا، باوجود سننے والا ہونے کے بہرا ہی کہا جائے گا، اسی لئے قرآن کریم نے دوسری جگہ ایسے لوگوں کو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ، یعنی بہرے، گونگے، اندھے فرمایا ہے۔

اس میں اس کا بیان نہیں کہ وہ اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کی ضروریات کو سمجھتے نہیں، یا یہ کہ ان کے متعلق چیزوں کو دیکھتے سنتے نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے ان لوگوں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا، يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ ظاہر حیات دنیا کو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل و جاہل ہیں، اور فرعون و ہامان اور ان کی قوموں کے بارے میں فرمایا وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ

یعنی یہ لوگ بڑے روشن خیال تھے، مگر چونکہ ان کی دانائی و بینائی کا سارا مصرف صرف اُتنا ہی رہا جتنا عام جانوروں کا ہوتا ہے کہ اپنے تن بدن کی خدمت کرلیں، روح کی خدمت اور اس کی راحت کے متعلق کچھ نہ سوچا نہ دیکھا، اس لئے وہ ان معاشیات اور عمرانیات میں کتنی ہی ترقی کرلیں، چاند اور مریخ کو فتح کرلیں، مصنوعی سیاروں سے دنیا کی فضا کو بھر دیں لیکن یہ سب خدمت صرف تن بدن کے ڈھانچہ اور پیٹ ہی کی ہے، اس سے آگے نہیں جو روح کے لئے دائمی چین و راحت کا سامان بنے، اس لئے قرآن کریم ان کو اندھا بہرا کہتا ہے اور اس آیت میں ان کے سمجھنے، دیکھنے، سننے کی نفی کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو سمجھنا چاہئے تھا وہ نہیں سمجھے جو دیکھنا چاہئے تھا وہ نہیں دیکھا جو سننا چاہئے تھا وہ نہیں سنا، اور جو کچھ سمجھا اور دیکھا اور سُنا وہ عام حیوانات کی سطح کی چیزیں تھیں جن میں گدھا گھوڑا، بیل بکری سب شریک ہیں۔

اسی لئے آیت مذکورہ کے آخر میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا، اُولٰۤىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ کہ یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں کہ بدن کے صرف موجودہ ڈھانچہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، روٹی اور پیٹ ان کے فکر کی آخری معراج ہے، پھر فرمایا بَلْ هُمْ اَضَلُّ بلکہ یہ لوگ چوپاؤں اور جانوروں سے بھی زیادہ بے وقوف ہیں، وجہ یہ ہے کہ جانور احکام شرعیہ کے مکلف نہیں، ان کے لئے جزاء و سزا نہیں، ان کا مقصد اگر صرف موجودہ زندگی اور اس کے ڈھانچہ کی درستی تک رہے تو صحیح ہے، مگر انسان کو تو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس پر جزاء و سزا ہونے والی ہے، اس لئے اس کا ان کاموں کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھنا جانوروں سے زیادہ بے وقوفی ہے، اس کے علاوہ جانور اپنے آقا و مالک کی خدمت پوری بجالاتے ہیں اور نافرمان انسان اپنے رب اور مالک کی خدمت میں قصور کرتا ہے اس لئے وہ جانوروں سے زیادہ بے وقوف اور غافل ٹھہرا، اسی لئے فرمایا اُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۤءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ

اور اللہ کے لئے ہیں سب اچھے نام سو اس کو پکارو وہی نام کہہ کر اور چھوڑ دو ان کو جو کج راہ چلتے ہیں

فِيْۤ اَسْمَاۤىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اس کے ناموں میں وہ بدلہ پا رہیں گے اپنے کئے کا

خلاصۂ تفسیر

اور اچھے اچھے (مخصوص) نام اللہ ہی کے لئے (خاص) ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی

کو موسوم کیا کرو اور (دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق مت کیا کرو بلکہ) ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے (مذکورہ) ناموں میں کج روی کرتے ہیں (اس طرح سے کہ غیر اللہ پر ان کا اطلاق کرتے ہیں جیسا وہ لوگ ان کو معبود اور اِلٰہ اعتقاد کے ساتھ کہتے تھے)، ان لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اہل جہنم کا ذکر تھا جنہوں نے اپنی عقل و حواس کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے میں صرف نہیں کیا اور آخرت کی دائمی اور لازوال زندگی کے لئے کوئی سامان فراہم نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوگیا کہ وہ خداداد عقل و بصیرت کو ضائع کرکے ذکر اللہ کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح و فلاح سے غافل ہوگئے اور جانوروں سے زیادہ گمراہی اور بے وقوفی میں مبتلا ہوگئے۔

مذکورہ آیت میں ان کے مرض کا علاج اور درد کی دوا بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور ذکر اللہ کی کثرت ہے، فرمایا وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا، یعنی اللہ ہی کے لئے ہیں اچھے نام، تو تم پکارو اس کو انہی ناموں سے۔

اسماءِ حسنیٰ کی تشریح اچھے نام سے مراد وہ نام ہیں جو صفات کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ نہ ہوسکے وہ صرف خالق کائنات جلّ وعلا شانہٗ ہی کو حاصل ہے اس کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہر کامل سے دوسرا شخص اکمل اور فاضل سے افضل ہوسکتا ہے فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ کا یہی مطلب ہے کہ ہر ذی علم سے بڑھ کر کوئی دوسرا علیم ہوسکتا ہے۔

اسی لئے اس آیت میں ایسی عبارت اختیار کی گئی جس سے معلوم ہو کہ یہ اسماء حسنیٰ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے دوسروں کو حاصل نہیں، فَادْعُوْهُ بِهَا، یعنی جب یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء حسنیٰ ہیں اور وہ اسماء اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اور انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارو۔

پکارنا یا بلانا دُعاء کا ترجمہ ہے، اور دُعاء کا لفظ قرآن میں دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک اللہ کا ذکر، اس کی حمد و ثنا تسبیح و تحمید کے ساتھ، دوسرے حاجات و مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب و آفات سے نجات

اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا، اس آیت میں فَادْعُوْهُ بِهَا کا لفظ دونوں معنی کو شامل ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ حمد و ثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے اور مشکلات و مصائب سے نجات اور حاجت روائی بھی صرف اسی کے قبضہ میں ہے۔ اس لئے حمد و ثنا کرو تو اسی کی کرو اور حاجت روائی مشکل کشائی کے لئے پکارو تو اسی کو پکارو۔

اور پکارنے کا طریقہ بھی یہ بتلا دیا کہ انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔

دُعا کے بعض آداب اس لئے اس آیت سے دو ہدایتیں امت کو ملیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات حقیقی حمد و ثنا یا مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے پکارنے کے لائق نہیں، دوسرے یہ کہ اس کے پکارنے کے لئے بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو الفاظ چاہے اختیار کرلے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں وہ الفاظ بھی تلا دیئے جو اس کے شایاں ہیں اور ہمیں پابند کر دیا کہ انہی الفاظ کے ساتھ اس کو پکاریں، اپنی تجویز سے دوسرے الفاظ نہ بدلیں کیونکہ انسان کی قدرت نہیں کہ تمام پہلوؤں کی رعایت کر کے شایان شان الفاظ بنا سکے۔

بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں جو شخص ان کو محفوظ کرلے وہ جنت میں داخل ہوگا، یہ ننانوے نام امام ترمذی اور حاکم نے تفصیل کے ساتھ بتلائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے نام پڑھ کر جس مقصد کے لئے دعا کی جائے قبول ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یعنی تم مجھے پکارو تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، حاجات و مشکلات کے لئے دعا سے بڑھ کر کوئی تدبیر ایسی نہیں جس میں کسی ضرر کا خطرہ نہ ہو اور نفع یقینی ہو، اپنی حاجات کے لئے اللہ جل شانہ سے دعا کرنے میں کسی نقصان کا تو کوئی احتمال ہی نہیں، اور ایک نفع نقد ہے کہ دعا ایک عبادت ہے، اس کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا کرنا عبادت کا مغز ہے اور جس مقصد کے لئے اس نے دعا کی ہے اکثر تو وہ مقصد بعینہٖ پورا ہو جاتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس نے اپنا مقصد بنایا تھا وہ اس کے حق میں مفید نہ تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دعا کو دوسری طرف پھیر دیتے ہیں جو اس کے لئے مفید ہو، اور حمد و ثنا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ایمان کی غذا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی رغبت و

محبت اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جاتی ہے اور دنیا کی تکلیفیں اگر پیش بھی آویں تو حقیر اور آسان ہو جاتی ہیں۔

اسی لئے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی کی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی غم یا بے چینی یا اہم کام پیش آئے اس کو چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے، سب مشکلات آسان ہو جائیں گی وہ کلمات یہ ہیں :

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ،

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ

اور مستدرک حاکم میں بروایت انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمہارے لئے اس سے کیا چیز مانع ہے کہ تم میری وصیت کو سن لو (اور اس پر عمل کیا کرو) وہ وصیت یہ ہے کہ صبح شام یہ دعا کر لیا کرو :

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ کُلَّہٗ وَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ ۔

یہ دعا بھی تمام حاجات و مشکلات کے لئے بے نظیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ کے اس جملہ میں دو ہدایتیں امت کو دی گئیں، ایک یہ کہ حمد و ثنا اور مشکلات و حاجات کے لئے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو مخلوقات کو نہیں، دوسرے یہ کہ اس کو انہی ناموں سے پکارو جو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، اس کے الفاظ نہ بدلو۔

آیت کے اگلے جملہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ، یعنی چھوڑئیے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں الحاد یعنی کجروی کرتے ہیں، ان کو ان کی کجروی کا بدلہ مل جائے گا، الحاد کے معنی لغت میں میلان اور درمیانی راہ سے ہٹ جانے کے آتے ہیں، اسی لئے قبر کی لحد کو لحد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ درمیان سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے، قرآن کریم میں لفظ الحاد قرآن کریم کے صحیح معانی کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی تاویل و تحریف کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے تعلق بھی چھوڑ دیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں الحاد یعنی تحریف اور کجروی سے کام لیتے ہیں۔

اسماء الٰہیہ میں کج روی کی ممانعت اور اس کی مختلف صورتیں

اسماء الٰہیہ میں تحریف یا کجروی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس آیت کے مضمون میں داخل ہیں :

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہ نام استعمال کیا جائے جو قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں، علماء حق کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام و صفات میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ جو چاہے نام رکھ دے یا جس صفت کے ساتھ چاہے اس کی حمد و ثنا کرے بلکہ صرف وہی الفاظ ہونا ضروری ہیں جو قرآن و سنت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بطور نام یا صفت کے ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو کریم کہہ سکتے ہیں، سخی نہیں کہہ سکتے، نور کہہ سکتے ہیں ابیض نہیں کہہ سکتے، شافی کہہ سکتے ہیں طبیب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ دوسرے الفاظ منقول نہیں **اگرچہ انہی الفاظ کے ہم معنی ہیں۔**

دوسری صورت الحاد فی الاسماء کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو نام قرآن و سنت سے ثابت ہیں ان میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دے، اس کا بے ادبی ہونا ظاہر ہے۔

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے مخصوص نام سے موسوم یا مخاطب کرنا جائز نہیں

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی دوسرے شخص کے لئے استعمال کرے، مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اسماء حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن و حدیث میں دوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ، اور اسماء حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن و حدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا الحاد مذکور میں داخل اور ناجائز و حرام ہے مثلاً رحمٰن، سبحان، رزّاق، خالق، غفّار، قدّوس وغیرہ

پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق یا رازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق، رزاق یا رحمٰن، سبحان کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ ہونے کی وجہ سے گناہ شدید ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیئے، ان کی صورت و سیرت سے تو پہلے بھی مسلمان سمجھنا ان کا مشکل تھا، نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے نام انگریزی طرز کے رکھے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خواتین اسلام کے طرز کے خلاف خدیجہ، عائشہ، فاطمہ کے بجائے نسیمہ، شمیم، شہناز، نجمہ، پروین ہونے لگے، اس سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ جن لوگوں کے اسلامی نام ہیں، عبدالرحمٰن، عبدالخالق،

عبدالرزاق، عبد غفور، عبد قدوس وغیرہ، ان میں تخفیف کا یہ غلط طریقہ اختیار کر لیا گیا کہ صرف آخری لفظ ان کے نام کی جگہ پکارا جاتا ہے، رحمٰن، خالق، رزاق، غفار کا خطاب انسانوں کو دیا جا رہا ہے اور اس سے زیادہ غضب کی بات یہ ہے کہ قدرت اللہ کو اللہ صاحب اور قدرتِ خدا کو خدا صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ سب ناجائز و حرام اور گناہ کبیرہ ہے، جتنی مرتبہ یہ لفظ پکارا جاتا ہے اتنی ہی مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے اور سننے والا بھی گناہ سے خالی نہیں رہتا۔

یہ گناہ بے لذت اور بے فائدہ ایسا ہے جس کو ہمارے ہزاروں بھائی اپنے شب و روز کا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں اور کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس ذرا سی حرکت کا انجام کتنا خطرناک ہے جس کی طرف آیت مذکورہ کے آخری جملہ میں تنبیہ فرمائی گئی ہے، سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ یعنی ان کو اپنے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، اس بدلہ کی تعیین نہیں کی گئی، اس ابہام سے عذاب شدید کی طرف اشارہ ہے۔

جن گناہوں میں کوئی دنیوی فائدہ یا لذت و راحت ہے ان میں تو کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی خواہش یا ضرورت سے مجبور ہو گیا، مگر افسوس یہ ہے کہ آج مسلمان ایسے بہت سے فضول گناہوں میں بھی اپنی جہالت یا غفلت سے مبتلا نظر آتے ہیں جن میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے نہ ادنیٰ درجہ کی کوئی راحت و لذت، وجہ یہ ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی طرف دھیان ہی نہ رہا۔ نعوذ باللہ منہ

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

اور ان لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے جو بتلاتے ہیں سچی راہ اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ

اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ

ان کو خبر بھی نہ ہوگی، اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پکا ہے، کیا انہوں نے

يَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ

دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کچھ بھی جنون نہیں وہ تو ڈرانے والا ہے

مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

صاف، کیا انہوں نے نظر نہیں کی سلطنت میں آسمان اور زمین کی

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓی اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ

اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے اور اس میں کہ شاید قریب آ گیا ہو

اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

ان کا وعدہ، سو اس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہماری مخلوق جن و انس میں (سب گمراہ ہی نہیں بلکہ) ایک جماعت (ان میں) ایسی بھی ہے، جو دین حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت (بھی) کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طور کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دنیا میں عذاب نازل کر ڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں، بیشک میری تدبیر بہت مضبوط ہے کیا ان لوگوں نے اس بات میں غور نہ کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں (جو کہ اصالۃً پیغمبر کا کام ہوتا ہے) اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں (تاکہ ان کو توحید کا علم استدلالی حاصل ہو جاتا) اور اس بات میں (بھی) غور نہیں کیا، کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی پہنچی ہو (تاکہ احتمالِ عذاب سے ڈرتے اور اس سے بچنے کی فکر کرتے اور اس فکر سے دین حق مل جاتا اور امکان قرب اجل ہر وقت ہے اور جب قرآن جیسے مؤثر کلام سے ان کی تحریک کو حرکت نہیں ہوتی تو) پھر قرآن کے بعد کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

مَعَارِف ومَسَائِل

پچھلی آیات میں اہلِ جہنم کے حالات وصفات اور ان کی گمراہی کا یہ سبب بیان کیا تھا کہ انہوں نے خدا داد عقل و بصیرت اور فطری قوتوں کو ان کے اصلی کام میں نہ لگایا اور ضائع کر دیا پھر اس کے بعد ان کے مرض کا علاج اسماء الٰہیہ اور ذکر اللہ کے ذریعہ بتلایا گیا تھا، مذکورہ آیات سے پہلی آیت میں ان کے بالمقابل اہل ایمان اور اہلِ حق کا ذکر ہے جنہوں نے عقل خداداد سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کیا، ارشاد ہے، وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ یعنی جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک امت ایسی ہے جو حق

کے موافق ہدایت کرتے ہیں یعنی لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور جب ان کے آپس میں کوئی نزاع یا مقدمہ پیش آئے تو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ بھی حق یعنی قانونِ الٰہی کے ماتحت کرتے ہیں۔

امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کرکے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق و انصاف یعنی قانونِ الٰہی کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق و انصاف کو سامنے رکھیں گے۔

اور عبد بن حُمید کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو خطاب کرکے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی، وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ، مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی رہنمائی میں اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں حق یعنی شریعتِ الٰہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی، اور امتِ محمدیہ کو بھی حق تعالیٰ نے اِن صفات میں خصوصی امتیاز بخشا ہے۔

خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کا اتباع کریں، دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آجائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

غور کیا جائے تو یہی دو صفتیں ہیں جو کسی قوم اور جماعت کی خیر و خوبی اور فلاحِ دنیا و آخرت کی ضامن ہو سکتی ہیں کہ صلح و جنگ اور دوستی اور عداوت کی ہر حالت میں ان کا نصب العین حق و انصاف ہی ہو، اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جو طریقِ کار بتلائیں اس میں بھی حق کا اتباع ہو اور دشمنوں اور حریفوں کے جھگڑوں میں بھی حق کے آگے اپنے سارے خیالات و خواہشات کو ترک کردیں، جس کا خلاصہ ہے حق پرستی۔

امتِ محمدیہ کی دوسری تمام امتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز اور ان کا طغرائے امتیاز یہی حق پرستی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا، جس جماعت یا پارٹی کی قیادت اور رہنمائی کی وہ بھی خالص حق کے تقاضوں کے مطابق کی، اپنی ذاتی خواہشات اور خاندانی یا قومی رسوم کو اس میں مطلق دخل نہیں دیا، اور باہمی نزاعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے گردن جھکادی، صحابہ و تابعین کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے۔

اور جب سے اس امت میں ان دو خصلتوں کے اندر خلل اور نقصان آیا اسی وقت سے اس کا تنزل و انحطاط شروع ہوگیا۔

نہایت رنج و افسوس کا مقام ہے کہ آج یہی حق پرست امت خالص ہوا پرست بنکر رہ گئی ہے، اس کی پارٹیاں اور جماعتیں بنتی ہیں تو وہ بھی خالص نفسانی اغراض اور دنیا کی حقیر و ذلیل منفعت کی بنیادوں پر بنتی ہیں، ایک دوسرے کو جن امور کی پابندی کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ بھی خالص اہوائِ نفسانی یا خاندانی رسوم ہوتی ہیں، کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو سب اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں، لیکن حق و شریعت کے مطابق چلنے کا نہ کہیں معاہدہ ہوتا ہے نہ کوئی اس کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو کہتا ہے نہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کسی کی پیشانی پر بل آتا ہے۔

اسی طرح باہمی جھگڑوں اور نزاعی مقدمات میں دنیا کے چند روزہ موہوم نفع کی خاطر اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاغوتی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرانے پر راضی ہیں۔

اسی کا یہ انجام بد ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں مشاہدہ میں آرہا ہے کہ یہ امت ہر جگہ ذلیل و خوار نظر آتی ہے، الا ماشاء اللہ، انہوں نے حق سے منہ موڑا، حق نے ان کی نصرت و امداد سے رُخ پھیر لیا۔

حق پرستی کے بجائے ہوا پرستی اختیار کر کے شخصی طور پر کسی کسی فرد کو جو دنیوی منافع مل گئے وہ اس پر مگن ہیں، مگر پوری قوم و ملت کی تباہی جو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس کا کوئی دیکھنے سننے والا نہیں، اگر پوری امت کی فلاح و ترقی پیشِ نظر ہو تو اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ان قرآنی اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے، خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

دوسری آیت میں اس شبہ کا جواب ہے کہ جب قومی ترقی کا مدار حق پرستی اور حق و انصاف کی پیروی پر ہے تو دوسری غیر مسلم قومیں جو حق سے سرا سر دور ہیں وہ کیوں دنیا میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں، جواب یہ ہے وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی ہم اپنی آیات کے جھٹلانے والوں کو اپنی حکمت و رحمت کی بنا پر دفعۃً نہیں پکڑتے بلکہ آہستہ آہستہ تدریجاً پکڑتے ہیں جس کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اس لئے دنیا میں کفار و فجار کی مالداری یا عزت و جاہ سے دھوکہ نہ کھایا جائے، کیونکہ وہ درحقیقت ان کے لئے کوئی بھلائی کا سامان نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، استدراج کے معنی درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں، اصطلاحِ قرآن و سنت میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ بندہ کے

گناہ پر دنیا میں کوئی تکلیف و مصیبت نہ آئے بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا جائے، دنیاوی مال و اسباب اور بڑھتے جائیں، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی بدکرداری پر کسی وقت تنبیہ نہیں ہوتی اور غفلت سے آنکھ نہیں کھلتی اور اپنے برے عمل اس کو برے نظر نہیں آتے کہ وہ ان سے باز آنے کی فکر کرے۔

انسان کی یہ حالت اس مریض لاعلاج کے مشابہ ہے جو بیماری ہی کو شفا، اور زہر ہی کو تریاق سمجھ کر استعمال کرنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو دنیا میں ہی یہ شخص دفعۃً عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے اور کبھی موت تک یہ سلسلہ چلتا ہے بالآخر موت ہی اس کی مستی اور بے ہوشی کا خاتمہ کرتی ہے اور دائمی عذاب اس کا ٹھکانا بن جاتا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف سورتوں اور آیتوں میں اس استدراج کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ، یعنی جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جو ان کو یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ یہ اپنی ملی ہوئی نعمت و دولت پر اکڑ گئے تو ہم نے ان کو اچانک عذاب میں پکڑ لیا تو وہ خدا ہی سے ناامید ہو کر رہ گئے۔

یہ استدراج کفار کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور مسلمان گنہگار کے ساتھ بھی، اسی لئے صحابہ اور سلف صالحین کو جب کبھی دنیا کی نعمت و دولت حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تو غلبہ خوف کی وجہ سے استدراج سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں یہ دنیا کی دولت ہمارے لئے استدراج نہ ہو۔

تیسری آیت میں اسی استدراج کا بیان ہے وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ یعنی میں ان گناہگاروں کو مہلت دیتا رہتا ہوں، میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

چوتھی آیت میں کفار کے اس لغو خیال کی تردید ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنون میں مبتلا ہیں، فرمایا أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِم مِّن جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ، یعنی کیا ان لوگوں نے غور و فکر نہیں کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں، ان کی عقل و حکمت کے سامنے تو ساری دنیا کے عقلاء و حکماء حیران ہیں، ان کے بارے میں جنون کا گمان کرنا خود جنون ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو صاف صاف حقائق کو بیان کر کے آخرت اور عذاب خداوندی سے ڈرانے والے ہیں۔

پانچویں آیت میں ان کو دو چیزوں کی طرف دعوت فکر دی گئی ہے، اول اللہ تعالیٰ کی مخلوقات آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی بے شمار مصنوعات عجیبہ میں غور و فکر، دوسرے

اپنی مدتِ عمر اور فرصتِ عمل پر نظر۔
مصنوعاتِ قدرت میں ذرا بھی عقل و فہم کے ساتھ غور کیا جائے تو ایک موٹی سمجھ والے انسان کو بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کی معرفت اور نظارہ ہونے لگتا ہے، اور ذرا گہری نظر کرنے والے کے لئے تو عالم کا ذرہ ذرہ قادرِ مطلق اور حکیمِ مطلق کی حمد و ثنا کا تسبیح خوان نظر آنے لگتا ہے، جس کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ایک فطری تقاضہ بن جاتا ہے۔

اور اپنی مدت عمر میں غور و فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ جب انسان یہ سمجھ لے کہ موت کا وقت معلوم نہیں کب آجائے تو ضروری کاموں کے پورا کرنے میں غفلت سے باز آجاتا ہے، اور مستعدی سے کام کرنے لگتا ہے، موت سے غفلت ہی انسان کو تمام خرافات اور جرائم میں مبتلا کرتی ہے، اور موت کا استحضار ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بہت سے جرائم سے بچنے پر آمادہ کر دیتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتُ یعنی تم اس چیز کو کثرت سے یاد کیا کرو جو سب لذتوں کو ختم کر دینے والی ہے یعنی موت۔

اسی لئے آیتِ مذکورہ میں فرمایا گیا اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ، لفظ مَلَکُوْت ملک کے معنی میں مبالغہ کے لئے بولا جاتا ہے اس کے معنی ہیں ملکِ عظیم، معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان منکرین نے کیا اللہ تعالیٰ کے ملک عظیم میں غور نہیں کیا جو آسمانوں اور زمینوں اور بیشمار اشیاء پر محیط ہے اور کیا اس پر نظر نہیں کی کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی موت قریب ہو جس کے بعد ایمان و عمل کی فرصت ختم ہو جائے گی۔

آخر آیت میں فرمایا فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ، یعنی جو لوگ قرآن کریم کی ایسی واضح نشانیوں سے بھی ایمان نہیں لاتے وہ اور کس چیز پر ایمان لائیں گے

مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَیَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ
جس کو اللہ بھٹکائے اس کو کوئی نہیں راہ دکھانے والا، اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے ان کو ان کی

یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ؕ
شرارت میں سرگرداں، تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت،

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؕ
تو کہہ اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی کھول دکھائے گا اس کو اس کے وقت پر

ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ
وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں، جب تم پر آئے گی تو بے خبر آئے گی،

وقف لازم

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ

تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں گویا تو اس کی تلاش میں لگا ہوا ہے، تو کہہ دے اس کی خبر ہے خاص اللہ کے پاس

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۷

لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا (پھر غم کرنا لاحاصل) اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے (تا آنکہ ایک دفعہ ہی پوری سزا دے دے) یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ اس کا (یہ) علم (کہ کب واقع ہوگی) صرف میرے رب ہی کے پاس ہے دوسرے کسی کو اس کی اطلاع نہیں، اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا اور وہ ظاہر کرنا یہ ہوگا کہ اس کو واقع کر دے گا اس وقت سب کو پوری خبر ہو جاوے گی اس کے قبل ویسے کسی کو بتلانے کے طور پر بھی اس کو ظاہر نہ کیا جاوے گا کیونکہ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا اس لئے، وہ تم پر محض اچانک بے خبری میں آپڑے گی تاکہ وہ جس طرح اجسام پر ان کو متغیر و متفرق کر دینے میں بھاری ہے اسی طرح قلوب پر بھی اس کا بھاری اثر ہوگا اور پہلے سے بتلا دینے میں یہ بات نہیں رہتی اور پوچھتے بھی تو ان کا معمولی طور پر نہیں بلکہ) وہ آپ سے اس طرح (اصرار و مبالغہ سے) پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں (اور تحقیقات کے بعد آپ کو اس کا پورا احاطہ ہو گیا ہے) آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم (مذکور) خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے (کہ بعض علوم حق تعالیٰ نے اپنے خزانۂ علم میں مخزون رکھے ہیں انبیاء کو بھی تفصیلاً اطلاع نہیں دی، پس اس کے نہ جاننے سے کسی نبی کے عدم اطلاع تعیین قیامت کو معاذ اللہ دلیل نفی نبوت کی سمجھتے ہیں، اس طرح سے کہ نبوت کے لئے یہ علم لازم ہے اور انتفاء لازم مستلزم انتفاء ملزوم ہے، حالانکہ پہلا مقدمہ محض غلط ہے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں کفار و منکرین کی ضد وہٹ دھرمی اور کھلی ہوئی آیات قدرت کے ہوتے ہوئے ایمان نہ لانے کا ذکر تھا، یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے

امت اور عام مخلوق کے ساتھ غایتِ شفقت و رحمت کی بنا پر انتہائی رنج و غم کا سبب ہو سکتا تھا، اس لئے متذکرہ تین آیات میں سے پہلی آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور قبول حق سے اعراض پر آپ رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ آپ کا فریضۂ منصبی اتنا ہی تھا کہ حق بات کو صاف صاف مؤثر انداز میں پہنچا دیں وہ آپ پورا کر چکے، آپ کی ذمہ داری ختم ہو چکی اب کسی کا ماننا یا نہ ماننا یہ ایک تقدیری امر ہے جس میں آپ کو دخل نہیں پھر آپ غمگین کیوں ہوں۔

اس سورت کے مضامین میں سے تین مضمون بہت اہم تھے، توحید، رسالت، آخرت، اور یہی تین چیزیں ایمان اور اسلام کی اصل بنیادیں ہیں، ان میں سے توحید و رسالت کا مضمون پچھلی آیتوں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے آخری دو آیتیں مضمون آخرت و قیامت کے بیان میں ہیں جن کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے جو امام تفسیر ابن جریر اور عبد بن حُمید نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور استہزاء و تمسخر کے دریافت کیا کہ آپ قیامت کے آنے کی خبریں دیتے اور لوگوں کو اس سے ڈراتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو متعین کر کے بتلایئے کہ قیامت کس سن اور کس تاریخ میں آنے والی ہے تاکہ ہم اس کے آنے سے پہلے کچھ تیاری کر لیں، آپ کے اور ہمارے درمیان جو تعلقات رشتہ داری ہیں ان کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ اگر آپ عام طور سے لوگوں کو بتلانا نہیں چاہتے تو ہم کو خفیہ میں بتلا دیجئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَةِ، الآیة

اس میں لفظ ساعة عربی لغت میں تھوڑے سے زمانہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کی کوئی خاص تحدید لغت کے اعتبار سے نہیں ہے، اور اہل نجوم کی اصطلاح میں رات اور دن کے چوبیس حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ساعة ہے جس کو اردو میں گھنٹہ کہا جاتا ہے، اور قرآن کی اصطلاح میں یہ لفظ اس دن کے لئے بولا جاتا ہے جو ساری مخلوقات کی موت کا دن ہوگا اور اس دن کے لئے بھی جس میں ساری مخلوقات دوبارہ زندہ ہو کر ربُّ العالمین کے دربار میں حاضر ہوں گی۔ اَیَّانَ کے معنی کب اور مُرۡسٰی کے معنی ٹھہرنے اور قائم ہونے کے ہیں۔

لَا یُجَلِّیۡهَا، تجلیہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کھولنے اور ظاہر کرنے کے،

بَغْتَةً کے معنی اچانک۔ حَفِيٌّ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عالم اور باخبر کے بیان کئے ہیں، اور اصل میں اس شخص کو حفی کہا جاتا ہے جو سوالات کر کے کسی معاملہ کی پوری تحقیق کرلے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی، آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اس کی تعیین کا صحیح علم صرف میرے رب کے پاس ہے، نہ پہلے سے اور کسی کو معلوم ہے اور نہ عین وقت پر بھی کسی کو پہلے معلوم نہ ہوگا، جب وقت مقدر آجائے گا تو خود اللہ تعالیٰ ہی اس کو ظاہر فرما دیں گے کوئی واسطہ درمیان میں نہ ہوگا، یہ حادثہ قیامت آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری واقعہ ہوگا کہ ان کے ٹکڑے ہو کر اڑ جائیں گے اس لئے تقاضائے حکمت یہ ہے کہ ایسے شدید واقعہ کا اظہار پہلے سے نہ کیا جائے ورنہ یقین کرنے والوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی، اور منکرین کو مزید استہزاء و تمسخر کا موقع ملے گا، اس لئے فرمایا لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً یعنی قیامت تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دفعۃً اور اچانک آنے کے متعلق یہ بیان فرمایا کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہوں گے، ایک شخص نے گاہک کو دکھلانے کے لئے کپڑے کا تھان کھولا ہوا ہوگا وہ ابھی معاملہ طے نہ کر پائیں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی، ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے چلے گا اور ابھی اس کو استعمال کرنے نہ پائے گا کہ قیامت آجائے گی، کوئی شخص اپنے حوض کی مرمت کر رہا ہوگا اس سے فارغ نہ ہو پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی، کوئی شخص کھانے کا لقمہ ہاتھ میں اٹھائے گا ابھی منہ تک نہ پہنچے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی (روح المعانی)

مقصد اس کا یہ ہے کہ جس طرح انسان کی شخصی موت کی تاریخ اور وقت کو غیر معین و مبہم رکھنے میں بڑی حکمتیں ہیں اسی طرح قیامت کو جو پورے عالم کی اجتماعی موت کا نام ہے اس کو مخفی و مبہم رکھنے میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، اول تو یہی کہ یقین کرنے والوں کے لئے اس صورت میں زندگی دوبھر اور دنیا کے کام مشکل ہو جائیں گے، اور منکرین کو طویل میعاد سن کر استہزاء و تمسخر کا بہانہ ملے گا اور ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہوگا۔

اس لئے بتقاضائے حکمت اس کی تاریخ کو مبہم رکھا گیا تاکہ لوگ اس کے ہولناک واقعات سے ہمیشہ ڈرتے رہیں اور یہ ڈر ہی انسان کو جرائم سے باز رکھنے کا سب سے زیادہ مؤثر علاج ہے۔ اس لئے ان آیات سے تعلیم یہ دی گئی کہ جب اس کا یقین ہے کہ قیامت کسی روز آئے گی اور رب العالمین کے سامنے سب کی پیشی ہوگی، ان کے عمل کے چھوٹے بڑے

اچھے برے سب اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، جس کے نتیجہ میں یا جنت کی ناقابل قیاس اور لازوال نعمتیں ملیں گی، اور یا پھر معاذ اللہ جہنم کا وہ شدید عذاب ہوگا جس کے تصور سے بھی پتہ پانی ہونے لگتا ہے، تو پھر ایک عقلمند کا کام یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فرصت عمل کے وقت کو ان بحثوں میں ضائع کرے کہ یہ واقعہ کب کس سن اور کس تاریخ میں ہوگا، بلکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فرصت عمر کو غنیمت جان کر اس دن کے لئے تیاری میں مشغول ہو جائے، رب العالمین کے احکام کی خلاف ورزی سے ایسا ڈرے جیسے آگ سے انسان ڈرتا ہے۔

آیت کے آخر میں پھر ان لوگوں کے سوال کا اعادہ کرکے فرمایا یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا، پہلا سوال تو اس بات سے متعلق تھا کہ جب ایسا اہم واقعہ ہونے والا ہے تو ہمیں اس کا پورا پورا صحیح تاریخ اور وقت کے ساتھ علم ہونا چاہئے، جس کا جواب دے دیا گیا کہ یہ سوال بے عقلی اور بے وقوفی سے پیدا ہوا ہے، عقل کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اس کی تعیین کی کسی کو خبر نہ کی جائے تاکہ ہر عمل کرنے والا ہر وقت عذاب آخرت سے ڈر کر نیک عمل کے اختیار کرنے اور بُرے اعمال سے باز رہنے میں پوری توجہ دے۔

اور اس دوسرے سوال کا منشاء ان لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور قیامت کی صحیح تاریخ اور وقت معلوم ہے اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے تحقیق کرکے اس کا علم ضرور حاصل کرلیا ہے مگر آپ کسی وجہ سے بتاتے نہیں، اس لئے اپنی قرابت و رشتہ داری کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کیا کہ ہمیں قیامت کا پورا پتہ بتلا دیں، اس سوال کے جواب میں ارشاد ہوا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

یعنی آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ حقیقت یہی ہے کہ قیامت کی صحیح تاریخ کا سوائے اللہ جل شانہ کے کسی فرشتہ یا نبی کو بھی علم نہیں ہے، مگر بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قیامت سے علوم اللہ تعالیٰ صرف اپنے لئے محفوظ رکھتے ہیں جن کا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو بھی پتہ نہیں ہوتا، لوگ اپنی جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ قیامت کا علم نبوت و رسالت کے لئے لازمی ہے اور پھر اس کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا پورا علم نہیں تو یہ علامت اس کی ہے کہ معاذ اللہ آپ نبی نہیں، مگر اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ خیال سرے سے غلط ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے سوالات کرنے والے بڑے بے وقوف اور بے خبر ہیں، نہ ان کو مسئلہ کی حقیقت معلوم ہے نہ اس کی حکمت اور نہ سوال کرنے کا طریقہ۔

ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کی کچھ علامات کا علم دیا گیا تھا اور یہ کہ وہ اب

قریب ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث صحیحہ میں واضح طور پر بیان فرمادیا ہے، ارشاد فرمایا کہ میری بعثت اور قیامت اس طرح ملی ہوئی ہیں جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ (ترمذی)

اور بعض اسلامی کتابوں میں جو پوری دنیا کی عمر سات ہزار سال بتلائی ہے یہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں، بلکہ اسرائیلی روایات سے لیا ہوا مضمون ہے۔

علماء طبقات ارض نے جو نئی تحقیقات سے دنیا کی عمر لاکھوں سال بتلائی ہے یہ نہ کسی قرآنی آیت سے ٹکراتی ہے نہ کسی حدیث صحیح سے، اسرائیلی روایات میں ایسی بھی بے سند باتوں کو داخل کر دینے کا مقصد ہی شاید اسلام کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا ہو، جن کی تردید خود صحیح احادیث میں موجود ہے، ایک صحیح حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو مخاطب کرکے ارشاد ہے کہ تمہاری مثال پچھلی امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سیاہ بیل کے بدن پر ایک سفید بال ہو، اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی عمر کتنی دراز ہے کہ اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، اسی لئے حافظ ابن حزم اندلسی نے فرمایا کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس کا صحیح علم صرف پیدا کرنے والے ہی کو ہے۔ (مراغی)

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۸۸)

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا

لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا

لَنَكُونَنَّ مِنَ الشّٰكِرِينَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا

تو ہم تیرا شکر کریں، پھر جب ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے

لَهٗ شُرَكَآءَ فِيمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۹۰﴾

اس کے لئے شریک اس کی بخشی ہوئی چیز میں، سو اللہ برتر ہے ان کے شریک بنانے سے

اَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا

کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک چیز بھی اور وہ پیدا ہوئے ہیں، اور نہیں

يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ

کر سکتے ہیں ان کی مدد، اور نہ اپنی مدد کریں، اور اگر

تَدْعُوهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ

تم ان کو پکارو رستہ کی طرف تو نہ چلیں تمہاری پکار پر، برابر ہے تم پر

اَدَعَوْتُمُوهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صٰمِتُونَ ﴿۱۹۳﴾

کہ ان کو پکارو یا چپکے رہو

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے (جبھی چہ جائیکہ دوسرے کے لئے) کسی نفع (تکوینی) کے حاصل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر (تکوینی) کے دفع کرنے کا (اختیار رکھتا ہوں) مگر اتنا ہی کہ جتنا خدا تعالیٰ نے چاہا ہو (کہ مجھ کو اختیار دے دیں اور جس امر میں اختیار نہیں دیا اس میں بعض اوقات منافع فوت ہو جاتے ہیں اور مضار واقع ہو جاتے ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ) اگر میں غیب کی باتیں (امور اختیاریہ کے متعلق) جانتا ہوتا تو میں اپنے لئے بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی (کیونکہ علم غیب کے سبب معلوم ہو جاتا کہ فلاں امر میرے لئے یقیناً نافع ہوگا اس کو اختیار کر لیا کرتا اور فلاں امر میرے لئے یقیناً مضر ہوگا اس سے احتراز کرتا اور اب چونکہ علم غیب نہیں اس لئے بعض اوقات نافع کا علم نہیں ہوتا کہ اس کو اختیار کروں اسی طرح مضر کا علم نہیں ہوتا کہ اس سے بچوں بلکہ کبھی بالعکس نافع کو مضر اور مضر کو نافع سمجھ لیا جاتا ہے، حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ علم غیب کے لئے نفع و ضرر کا مالک ہونا لازم تھا، یہ مقدمہ ذکر میں مؤخر ہے اور لازم منتفی ہے یہ مقدمہ ذکر میں مقدم ہے پس ملزوم یعنی علم غیب منتفی ہے اور یہی مطلوب ہے، غرض میں ایسے امور کا علم نہیں رکھتا) میں تو محض (احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی) بشارت دینے والا اور

(عذاب سے) ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں (خلاصہ یہ کہ نبوت کا اصلی مقصود امور تکوینیہ کا احاطہ نہیں اس لئے ان امور کا علم جن میں تعیینِ قیامت بھی داخل ہے نبی کو ملنا ضروری نہیں البتہ نبوت کا اصل مقصود امور تشریعیہ کا علم دینی ہے سو وہ مجھ کو حاصل ہے) وہ اللہ ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تم کو ایک تن واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد حوا جس کی کیفیت شروع تفسیر سورۂ نساء میں گزر چکی) تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے (پس جب وہ خالق بھی ہے اور محسن بھی تو عبادت اسی کا حق ہے) پھر (آگے ان کی اولاد بڑھی اور ان میں بھی میاں بی بی ہوئے لیکن ان میں بعض کی یہ حالت ہوئی کہ) جب میاں نے بی بی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا (جو اول اول) ہلکا سا رہا، سو وہ اس کو (پیٹ میں) لئے ہوئے (بے تکلف) چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ (حاملہ اس حمل کے بڑھ جانے سے) بوجھل ہوگئی (اور دونوں میاں بی بی کو یقین ہوگیا کہ حمل ہے تو (اس وقت ان کو طرح طرح کے احتمالات و توہمات ہونے لگے جیسا کہ بعضے حمل میں خطرات پیش آتے ہیں اس لئے) دونوں میاں بی بی اللہ سے جو کہ ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے (جیسا عام عادت ہے کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے بڑے بڑے عہد و پیمان ہوا کرتے ہیں) سو جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے (مختلف طور پر کسی نے اعتقاد سے کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ نے دی ہے، کسی نے عمل سے کہ اس کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگے یا بچہ کو لے جا کر اس کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیا، یا قول سے کہ اس کی بندگی پر نام رکھ دیا جیسے عبد شمس یا بندہ علی وغیرہ تھا، یعنی یہ حق تو تھا خدا کا جو کہ منعم اور خالق اور قادر و محسن ہے اور صرف کیا اس کو دوسرے معبودوں کے لئے) سو اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے (یہاں تک تو حق تعالیٰ کی صفات مذکور تھیں جو مقتضی ہیں اس کے استحقاق معبودیت کو، آگے آلہہ باطلہ کے نقائص کا ذکر ہے جو مقتضی ہیں ان کے عدم استحقاق معبودیت کو پس فرماتے ہیں کہ) کیا (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بنا نہ سکیں اور (بلکہ) وہ خود ہی بنائے جاتے ہوں (چنانچہ ظاہر ہے کہ بت پرست خود ان کو تراشتے تھے) اور (کسی چیز کا بنانا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ اس سے آسان کام بھی نہیں کر سکتے مثلاً) ان کو کسی قسم کی مدد بھی نہیں دے سکتے اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ) وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے (اگر کوئی حادثہ ان کو پیش آجائے مثلاً کوئی شخص ان کو توڑنے پھوڑنے ہی لگے، اور اس سے بھی بڑھ کر سنو کہ)

اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں (اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ تم ان کو پکارو کہ وہ تم کو کوئی بات بتلائیں تو تمہارا کہنا نہ کریں یعنی نہ بتلائیں اور دوسرے اس سے زیادہ یہ کہ تم ان کو پکارو کہ آؤ ہم تم کو کچھ بتلائیں تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہ کرسکیں بہرحال) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو (وہ جب نہیں سنتے) اور یا تم خاموش رہو (جب تو نہ سننا ظاہر ہی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو کام سب سے سہل تر ہے کہ کوئی بات بتلانے کے لئے پکارے تو سن لینا وہ اسی سے عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر ان سب سے جو دشوار تر ہے کہ کسی شئے کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجۂ اولیٰ زیادہ تر عاجز ہوں گے پھر ایسے عاجز محتاج کب معبودیت کے لائق ہوسکتے ہیں)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مشرکین اور عوام کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہے جو ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں قائم کر رکھا تھا کہ وہ غیب داں ہوتے ہیں، ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرح تمام کائنات کے ذرہ ذرہ پر حاوی ہوتا ہے، نیز یہ کہ وہ ہر نفع اور نقصان کے مالک ہوتے ہیں جس کو جو چاہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اور اسی عقیدہ کے سبب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ بتلانے کا مطالبہ کرتے تھے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔

اس آیت نے ان کے اس مشرکانہ عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے بتلا دیا کہ علم غیب اور تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے اس میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی و رسول شرک اور ظلم عظیم ہے، اسی طرح ہر نفع نقصان کا مالک ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے اس میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی شرک ہے، جس کے مٹانے ہی کے لئے قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں بار بار اس کو واضح فرما دیا ہے کہ علم غیب اور علم محیط جس سے کوئی ذرہ چھپا نہ رہے یہ صرف اللہ جل شانہ کی صفت خاص ہے اسی طرح قدرت مطلقہ کہ ہر نفع نقصان قبضہ میں ہو یہ بھی صفت خاص ہے حق تعالیٰ شانہ کی، ان صفتوں میں غیر اللہ کو شریک قرار دینا شرک ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کردیں کہ میں اپنے نفس کے لئے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں، دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی اعلان کردیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لئے ضروری ہو، اور اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کرلیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا، اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا، حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے، اور بہت سی تکلیفیں اور مضرتیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ مضرت و تکلیف پہنچ گئی غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر آپ صحابۂ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کرکے حدودِ حرم تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہوسکی سب کو احرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم پہنچے اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معروف و مشہور ہیں۔

اور شاید ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملاً یہ بات واضح کردی جائے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل خلائق ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم و قدرت کے مالک نہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کے شکار نہ ہوجائیں جس میں عیسائی اور نصرانی مبتلا ہوگئے کہ اپنے رسول کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور اس طرح شرک میں مبتلا ہوگئے۔

اس آیت نے بھی یہ واضح کردیا کہ انبیاء علیہم السلام نہ قادر مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم و قدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔

ہاں اس میں شک و شبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا، اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر عام و خاص نے مشاہدہ کیا، اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علم غیب نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ سے رسول کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی اعلان کر دیں کہ میرا فریضۂ منصبی صرف یہ ہے کہ میں بدکاروں کو عذاب سے ڈراؤں اور نیک لوگوں کو ثواب عظیم کی خوشخبری سناؤں۔

دوسری آیت میں عقیدہ توحید کا ذکر ہے جو اسلام کا سب سے بڑا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کے ساتھ شرک کے باطل اور نامعقول ہونے کا بیان کسی قدر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا ایک مظہر حضرت آدم و حوا کی پیدائش سے اس طرح بیان فرمایا هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا، یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے جس نے سارے بنی آدم کو ایک ذات آدم سے پیدا کیا اور انہیں سے ان کی بی بی حضرت حوا کو پیدا کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو ایک ہم جنس ہم دم کے ذریعہ سکون حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ کی اس صنعت عجیبہ کا تقاضہ یہ تھا کہ تمام اولاد آدم ہمیشہ اس کی شکر گزار ہوتی اور کسی مخلوق کو اس کی صفات کاملہ میں شریک نہ ٹھہراتی، مگر غفلت شعار انسان نے معاملہ اس کے خلاف کیا جس کا بیان اسی آیت کے دوسرے جملہ اور بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا گیا:

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

یعنی اولاد آدم نے اپنی غفلت و ناشکری سے اس معاملہ میں عمل یہ کیا کہ جب نر و مادہ کے باہمی اختلاط سے حمل قرار پایا تو شروع شروع میں جب تک حمل کا کوئی بوجھ نہ تھا عورت آزادی کے ساتھ چلتی پھرتی رہی پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تین اندھیریوں کے اندر اس حمل کی تربیت کر کے اس کو بڑھایا اور اس کا بوجھ محسوس ہونے لگا تو اب ماں باپ فکر میں پڑ گئے اور یہ خطرے محسوس کرنے لگے کہ اس حمل سے کیسی اولاد پیدا ہوگی کیونکہ بعض اوقات انسان ہی کے پیٹ سے عجیب عجیب طرح کی مخلوق بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوتا ہے، اندھا یا بہرہ، یا گونگا یا ہاتھ پیر سے معذور، ان خطرات کے

سبب ماں باپ یہ دعائیں مانگنے لگے کہ یا اللہ ہمیں صحیح سالم بچہ عنایت فرمائیے اگر صحیح سالم بچہ پیدا ہوا تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں اور بچہ صحیح سالم عطا کر دیا تو اب شکر گزاری کے بجائے شرک میں مبتلا ہوگئے اور یہ اولاد ہی ان کے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئی، جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی تو عقیدہ ہی فاسد ہوتا ہے، یوں سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ بیٹا کسی ولی یا بزرگ نے دیا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ عملاً اس بچہ کو کسی زندہ یا مُردہ بزرگ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کے نام کی نذر و نیاز کرنے لگتے ہیں یا بچہ کو لے جا کر اُن کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیتے ہیں اور کبھی بچہ کا نام رکھنے میں مشرکانہ انداز اختیار کرتے ہیں، عبداللات، عبدالعزّیٰ یا عبدالشمس یا بندہ حسی وغیرہ ایسے نام رکھدیتے ہیں جن سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان بتوں یا ان بزرگوں کا پیدا کیا ہوا بندہ ہے یہ سب مشرکانہ عقائد و اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کے مقابلہ میں شکر کے بجائے ناشکری کی مختلف صورتیں ہیں۔

تیسری آیت کے آخر میں ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو واضح کرنے کیلئے فرمایا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ، یعنی پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔

آیاتِ مذکورہ کی اس تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت کے پہلے جملہ میں حضرت آدم و حوا کا ذکر کر کے اولادِ آدم کو ان کے اتباع اور شکر گزاری کی تعلیم دی گئی ہے، اور آخری جملوں میں بعد کی آنے والی اولادِ آدم کی گمراہی اور کجروی کا بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے بجائے شکر گزاری کے شرک کو اختیار کر لیا۔

اس سے معلوم ہُوا کہ شرک اختیار کرنے والوں کے معاملہ کا تعلق حضرت آدم و حوا سے مطلق نہیں جس کے سبب حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی شبہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بعد کی آنے والی نسلوں کے عمل سے ہے، اور یہ تفسیر جو ہم نے اختیار کی ہے تفسیر درمنثور میں بروایت ابن المنذر و ابن ابی حاتم مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

ترمذی اور حاکم کی روایات میں جو یک قصہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا اور شیطان کے فریب دینے کا مذکور ہے اس کو بعض نے اسرائیلی روایات قرار دے کر ناقابلِ اعتماد بتلایا ہے لیکن بہت سے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے، متذکرہ تفسیر پر اگر اس قصہ کی روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا۔

اس آیت سے چند احکام و فوائد حاصل ہوئے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورت و مرد کے جوڑے کو ہم جنس بنایا تاکہ طبعی موافقت اور پورا انس ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہو سکے اور ازدواجی زندگی سے جو تعمیر عالم کے فوائد وابستہ ہیں وہ پوری طرح انجام پا سکیں۔

دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق و فرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون کو برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں، اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے، اور چار طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو مستحسن سمجھ لیا گیا ہے جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنے والی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالمگیر ہوتی جاتی ہے اس کو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جوں جوں یہ بے پردگی اور بے حیائی عورتوں میں بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے گھریلو سکون و اطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ بچوں کے ایسے نام رکھنا جن سے مشرکانہ مفہوم لیا جا سکتا ہو، چاہے نام رکھنے والوں کی نیت یہ نہ ہو، وہ بھی ایک مشرکانہ رسم ہونے کے سبب گناہ عظیم ہے جیسے **عبدالشمس عبدالعزیٰ وغیرہ نام رکھنا۔**

چوتھے یہ کہ بچوں کے نام رکھنے میں بھی ادائے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نام اللہ و رسول کے ناموں پر رکھے جائیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن، عبداللہ وغیرہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں سے یہ رہی سہی اسلامی رسم بھی ختم ہوتی جاتی ہے، اول تو نام ہی غیر اسلامی رکھے جاتے ہیں، اور جو کہیں ماں باپ نے اسلامی نام رکھ بھی دیئے تو ان کو بھی انگریزی کے مخفف حروف میں منتقل کر کے ختم کر دیا جاتا ہے، سیرت و صورت سے تو کسی کا مسلمان سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو چکا تھا، ناموں کے اس نئے طرز نے اسلام کی اس آخری علامت کو بھی رخصت کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم اور اسلام کی محبت عطا فرمائے، آمین

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے

فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

بھلا پکارو تو ان کو پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر تم سچے ہو ،

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں ، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں ،

اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ

یا ان کے آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں ، یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں ،

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ

تو کہدے کہ پکارو اپنے شریکوں کو پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو ڈھیل نہ دو میرا

وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب ، اور وہی حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی ،

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہیں کر سکتے تمہاری مدد اور نہ

اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى

اپنی جان بچا سکیں ، اور اگر تم ان کو پکارو رستہ کی طرف

لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

تو کچھ نہ سنیں ، اور تو دیکھتا ہے ان کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے ۔

خلاصۂ تفسیر

(غرض واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے اللہ کے مملوک) بندے ہیں (یعنی تم سے بڑھ کر نہیں خواہ گھٹے ہوئے ہوں) سو (ہم تو تم کو سچا جب جانیں کہ) تم (تو) ان کو پکارو (اور) پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کردیں، اگر تم (ان کے اعتقادِ الوہیت میں) سچے ہو (اور وہ بیچارے تمہارا کہنا تو کیا کریں گے، کہنا ماننے کے آلات تک ان کو نصیب نہیں، دیکھ لو) کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں (جب ان میں قویٰ فاعلہ تک نہیں تو کوئی فعل ان سے کیا صادر ہوگا اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جس طرح وہ اپنے معتقدین کو نفع پہنچانے سے عاجز ہیں اسی طرح اپنے مخالفین کو ضرر بھی نہیں پہنچا سکتے، جیسا تم کہا کرتے ہو کہ ہمارے بتوں کی بے ادبی نہ کیا کرو ورنہ

وہ تم پر کوئی آفت نازل کردیں گے خرجہ فی الدر عن عبد الرزاق فی قولہ تعالیٰ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ مجھ کو ضرر پہنچا سکتے ہیں تو، تم (اپنا ارمان نکال لو اور) اپنے سب شرکاء کو بلا لو پھر (سب مل کر) میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر (جب تدبیر بن جائے تو) مجھ کو ذرا مہلت مت دو (بلکہ فوراً اس کو نافذ کردو، دیکھوں کیا ہوتا ہے اور خاک بھی نہیں ہوگا کیونکہ شرکاء تو مہمل محض ہیں، رہ گئے تم جو کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو تو تم میرا اس لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ) یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس کے مددگار اور رفیق ہونے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ اس) نے (مجھ پر) یہ کتاب (مبارک جامع خیر دارین) نازل فرمائی (اور اگر میرا رفیق و معین نہ ہوتا تو اتنی بڑی نعمت کیوں عطا فرماتا، اور علاوہ اس دلیل خاص کے ایک عام قاعدہ سے بھی اس کا مددگار ہونا معلوم ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ) وہ (عموماً) نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے (تو انبیاء تو ان نیک بندوں میں فرد کامل ہیں اور میں نبی ہوں تو میرا بھی ضرور مددگار ہوگا، غرض یہ کہ جن کے ضرر سے ڈراتے ہو وہ عاجز اور جو مجھ کو ضرر سے بچاتا ہے وہ قادر، پھر اندیشہ کا ہے کا، اور اگر ان کا عاجز ہونا اوپر بابلغ وجوہ بیان ہو چکا ہے لیکن چونکہ وہاں بیان عجز مقصود بالغیر تھا اور مقصود بالذات نفی استحقاق معبودیت تھی اس لئے آگے مقصوداً بیان عجز کا فرماتے ہیں کہ) تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہارے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں، تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ (اپنے دشمن کے مقابلہ میں جیسا میں ہوں) اپنی مدد کر سکتے ہیں اور (امداد کرنا تو بڑی بات ہے ان کو تو) اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو بھی تو نہ سنیں (اس کے بھی وہی مذکورہ بالا دونوں معنی ہو سکتے ہیں) اور (جیسے ان کے پاس سننے کا آلہ نہیں اسی طرح دیکھنے کا آلہ بھی نہیں اور ان کی تصویر میں جو آنکھیں بنادی جاتی ہیں وہ محض نام ہی کی ہوتی ہیں کام کی نہیں چنانچہ، اُن (بتوں) کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں (کیونکہ شکل تو آنکھوں کی سی بنی ہوئی ہے) اور وہ (واقع میں) کچھ بھی نہیں دیکھتے (کیونکہ حقیقت میں تو وہ آنکھیں نہیں اسی پر دوسرے قویٰ و علم ادراک و ارجل کی نفی سمجھ لینا چاہئے، پس ایسے عاجز کا کیا ڈراوا دکھلاتے ہو)

معارف و مسائل

اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ڮ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ، یہاں ولی کے معنی محافظ و مددگار کے ہیں، اور کتاب سے مراد قرآن اور صالحین سے مراد بقول ابن عباسؓ وہ لوگ

ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو برابر نہ کریں اس میں انبیاء علیہم السلام سے لے کر عام نیک مسلمانوں تک سب داخل ہیں۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفت کی اس لئے پرواہ نہیں کہ میرا محافظ و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی سب صفات میں سے قرآن نازل کرنے کو خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا کہ تم جو میری عداوت و مخالفت پر جمے ہو اس کی وجہ قرآن کی تعلیم و دعوت ہے جو میں تمہیں دیتا ہوں تو جس نے مجھ پر یہ قرآن نازل کیا ہے وہ ہی میرا مددگار و محافظ ہے اس لئے مجھے کیوں فکر ہو۔

اس کے بعد آخری جملے میں عام ضابطہ بتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے عام صالح اور نیک مسلمانوں کا بھی اللہ متولی و کفیل ہوتا ہے ان کی مدد کرتا ہے اس لئے ان کو کسی دشمن کی مخالفت اور دشمنی مضر نہیں ہوتی، اکثر اوقات تو دنیا ہی میں وہ ان پر غالب کر دیا جاتا ہے اور اگر کسی وقت بتقاضائے حکمت غلبہ بھی نہ ہو تو بھی اس کے اصل مقصد میں کوئی خلل نہیں پڑتا وہ ظاہر میں ناکام ہو کر بھی مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہی ہوتا ہے کیونکہ مومن صالح کا اصل مقصد ہر کام میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے، اگر وہ دنیا میں کسی وجہ سے ناکام بھی ہو جائے تو رضائے الٰہی کا اصل مقصد پھر بھی اس کو حاصل ہوتا ہے اور وہ کامیاب ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ

اور اگر ابھارے تجھ کو شیطان کی چھیڑ تو پناہ مانگ اللہ سے وہی ہے

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ

سننے والا جاننے والا جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا

مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ

گزر چونک گئے پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطانوں کے

يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

خلاصۂ تفسیر

لوگوں سے یہ برتاؤ رکھیئے کہ ان کے اعمال و اخلاق میں سے (سرسری نظر میں جو) برتاؤ (معقول و مناسب معلوم ہوں ان) کو قبول کر لیا کیجیے (ان کی تہ اور حقیقت کی تلاش نہ کیجیے بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہو اس کو بھلائی پر محمول کیجیے، باطن کا حال اللہ کے سپرد کیجیے کیونکہ پورا اخلاص و نیز شرائط قبول کی جامعیت اخص الخواص کا حصہ ہے، حاصل یہ کہ معاشرت میں سہولت رکھیئے، تشدد نہ کیجیے، یہ برتاؤ تو اچھے کاموں میں ہے) اور (جو کام ظاہر نظر میں بھی برا ہو اس میں یہ برتاؤ رکھیئے کہ اس باب میں) نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجیے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجیے (اور ان کے بہت درپے نہ ہو جیئے) اور اگر (اتفاقاً ان کی جہالت پر) آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا) آنے لگے (جس میں احتمال ہو کہ کوئی بات خلاف مصلحت کے صادر ہو جائے، تو (ایسی حالت میں فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (آپ کے استعاذہ کو سنتا ہے، آپ کے مقصود کو جانتا ہے وہ آپ کو اس سے پناہ دے گا اور جس طرح استعاذہ و توجہ الی اللہ آپ کے لئے نافع ہے اسی طرح تمام خدا ترس لوگوں کے لئے بھی نافع ہے چنانچہ) یقیناً (یہ بات ہے کہ) جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا یا اور کسی امر کا) آجاتا ہے تو وہ (فوراً خدا کی) یاد میں لگ جاتے ہیں (جیسے استعاذہ و دعا اور خدا تعالیٰ کی عظمت و عذاب و ثواب کو یاد کرنا) سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (اور حقیقت امر ان پر منکشف ہو جاتی ہے جس سے وہ خطرہ اثر نہیں کرتا) اور (برخلاف اس کے) جو شیاطین کے تابع ہیں وہ (شیاطین) ان کو گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں پس وہ (تابعین گمراہی سے) باز نہیں آتے (نہ وہ استعاذہ کریں نہ محفوظ رہیں، سو وہ مشرکین تو شیطان کے تابع ہیں یہ کب باز آئینگے اس لئے ان کے غم و غصہ میں پڑنا بے کار ہے)

معارف و مسائل

اخلاق قرآنی کا ایک جامع ہدایت نامہ

آیاتِ مذکورہ قرآنی اخلاقِ فاضلہ کا ایک جامع ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کر کے آپ کو تمام اولین و آخرین میں صاحبِ خلق عظیم کا خطاب دیا گیا ہے۔

پچھلی آیتوں میں دشمنانِ اسلام کی کجروی، ہٹ دھرمی اور بداخلاقیوں کا ذکر کرنے

کے بعد ان آیات میں اس کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاقِ فاضلہ کی ہدایت دی گئی ہے جس کے تین جملے ہیں، پہلا جملہ خُذِ الْعَفْوَ ہے، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ عفو کے کئی معنیٰ ہو سکتے ہیں اور اس موقع پر ہر معنیٰ کی گنجائش ہے، اسی لئے علماء تفسیر کی مختلف جماعتوں نے مختلف معنیٰ لئے ہیں، جمہور مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عفو کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ بغیر کسی کلفت اور مشقت کے ہو سکے، تو معنیٰ اس جملہ کے یہ ہوئے کہ آپ قبول کر لیا کریں اُس چیز کو جو لوگ آسانی سے کر سکیں یعنی واجباتِ شرعیہ میں آپ لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ جس پیمانہ پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکیں اُتنے ہی درجہ کو قبول کر لیا کریں، مثلاً نماز کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ ساری دُنیا سے منقطع اور یکسو ہو کر اپنے رب کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے اس لئے کھڑا ہے کہ حمد وثنا کے ساتھ اپنے معروضات کو بلاواسطہ بارگاہ الٰہی میں خود پیش کر رہا ہے گویا وہ اس وقت براہِ راست حق تعالیٰ شانہ سے مخاطب ہے، اس کے جو آثار خشوع، خضوع ادب واحترام کے ہونا چاہئیں، ظاہر ہے کہ لاکھوں نمازیوں میں سے کسی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتے ہیں عام لوگ اس درجہ کو نہیں پا سکتے تو اس آیت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اس اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ رکھیں بلکہ جس درجہ کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہ ہی قبول فرمالیں، اسی طرح دوسری عبادات زکوٰۃ، روزہ، حج اور عام معاملات ومعاشرت کے واجباتِ شرعیہ میں جو لوگ پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے ان سے سرسری اطاعت وفرماں برداری ہی کو قبول کر لیا جائے۔

صحیح بخاری میں بروایت عبداللہ بن زبیرؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کے یہی معنیٰ نقل کئے گئے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے، میں نے عزم کر لیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا (ابن کثیر)

ائمہ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، صدیقہ عائشہؓ اور مجاہدؒ وغیرہ نے اس جُملہ کے بھی یہی معنیٰ قرار دیئے ہیں۔

دوسرے معنیٰ عفو کے معافی اور درگزر کرنے کے بھی آتے ہیں، علماء تفسیر کی ایک

جماعت نے اس جگہ یہی معنی مراد لے کر اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آپ گناہگاروں، خطاکاروں کے گناہ وقصور کو معاف کردیا کریں۔

امام تفسیر ابن جریر طبری نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین سے آیت کا مطلب پوچھا، جبریل امین نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتلایا کہ اس آیت میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کردیں اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں اور جو آپ سے تعلق قطع کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔

اسی جگہ ابن مردویہ نے بروایت سعد بن عبادہؓ نقل کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر نعش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہؓ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرکے چھوڑوں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ عفو ودرگزر سے کام لیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے عقبہؓ بن عامر کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکارم اخلاق کی تعلیم دی وہ وہی تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو معاف کردو، جو تم سے قطع تعلق کردے تم اس سے ملا کرو، جو تمہیں محروم کردے تم اس کو بخشش دیا کرو۔

اور بیہقی نے بروایت علی مرتضیٰؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اولین وآخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کرے تم اس پر بخشش کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو، جو تم سے تعلق قطع کرے تم اُس سے بھی ملا کرو۔

لفظ عفو کے پہلے اور دوسرے معنی میں اگرچہ فرق ہے لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت وفرماں برداری کو قبول فرمالیا کریں، زیادہ تجسس اور تفتیش میں نہ پڑیں، اور ان سے اعلیٰ معیار کی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں اور ان کی خطاؤں اور قصور سے درگزر فرمائیں، ظلم کا انتقام نہ لیں، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واخلاق ہمیشہ اسی سانچے میں ڈھلے رہے، جس کا پورا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مکہ فتح ہوکر آپ کے جانی دشمن آپ کے قبضہ میں آئے تو آپ نے سب کو

آزاد کرکے فرمایا کہ تمہارے مظالم کا بدلہ لینا تو کیا ہم تمہیں پچھلے معاملات پر ملامت بھی نہیں کرتے ۔

دوسرا جملہ اس ہدایت نامہ کا وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ ہے، عُرْف بمعنی معروف ہر اچھے اور مستحسن کام کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ برائی اور ظلم سے پیش آئیں آپ ان سے انتقام نہ لیں بلکہ معاف کردیں مگر ساتھ ہی ان کو نیک کام کی ہدایت بھی کرتے رہیں، گویا بدی کا بدلہ نیکی سے، ظلم کا بدلہ صرف انصاف ہی سے نہیں بلکہ احسان سے دیں ۔

تیسرا جملہ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جاہلوں سے آپ کنارہ کش ہوجائیں، مطلب یہ ہے کہ ظلم کا انتقام چھوڑ کر آپ ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں مگر بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس شریفانہ معاملہ سے متاثر نہیں ہوتے، اس کے باوجود جہالت اور سختی سے پیش آتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے دلخراش اور جاہلانہ کلام سے متاثر ہوکر انہیں جیسی سخت گفتگو نہ کریں بلکہ ان سے کنارہ کش ہوجائیں ۔

امام تفسیر ابن کثیر نے فرمایا کہ کنارہ کش ہونے کا بھی مطلب یہ ہے کہ ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ معنی نہیں کہ ان کو ہدایت کرنا چھوڑ دیں کہ یہ وظیفہ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں ۔

صحیح بخاری میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کی خلافت کے زمانہ میں عیینہ ابن حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حُر ابن قیسؓ کا مہمان ہوا، حضرت حر بن قیس اُن اہل علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروق اعظمؓ کی مجلس مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجے حر بن قیسؓ سے کہا کہ تم امیر المؤمنین کے مقرب ہو میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو، حُر بن قیسؓ نے فاروق اعظمؓ سے درخواست کی کہ میرا چچا عیینہ آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ نے اجازت دے دی ۔

مگر عیینہ نے فاروقِ اعظم کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں، فاروقِ اعظمؓ کو اس پر غصہ آیا تو حُر بن قیس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ، اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے، یہ آیت

سنتے ہی فاروقِ اعظمؓ کا سارا غصہ ختم ہوگیا اور اس کو کچھ نہیں کہا، حضرت فاروق اعظمؓ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ کَانَ وَقَّافًا عِندَ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ یعنی کتاب اللہ کے احکام کے آگے گردن ڈالتے تھے۔

یہ آیت مکارم اخلاق کی جامع آیت ہے، بعض علماء نے اس کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں ایک محسن یعنی اچھے کام کرنے والے، دوسرے بدکار ظالم، اس آیت نے دونوں طبقوں کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ برتنے کی یہ ہدایت دی ہے کہ نیک کام کرنے والوں سے ان کی ظاہری نیکی کو قبول کرلو، زیادہ تفتیش و تجسس میں نہ پڑو، اور نیکی کے اعلیٰ معیار کا ان سے مطالبہ نہ کرو بلکہ جتنا وہ آسانی سے کرسکیں اس کو کافی سمجھو، اور بدکاروں کے معاملہ میں یہ ہدایت دی کہ ان کو نیک کام سکھلاؤ اور نیکی کا راستہ بتلاؤ، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں اور اپنی گمراہی اور غلطی پر جمے رہیں اور جاہلانہ گفتگو سے پیش آئیں تو ان سے علٰحدہ ہوجائیں اور ان کی جاہلانہ گفتگو کا جواب نہ دیں، اس طرز سے یہ امید ہے کہ ان کو کسی وقت ہوش آئے اور اپنی غلطی سے باز آجائیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ، یعنی اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ سے پناہ مانگ لیں، وہ سُننے والا جاننے والا ہے۔

درحقیقت یہ آیت بھی پہلی آیت کے مضمون کی تکمیل ہے کیونکہ اُس میں جو ہدایت دی گئی ہے کہ ظلم کرنے والوں اور جہالت سے پیش آنے والوں کی خطا سے درگزر کریں، ان کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، یہ بات انسانی طبیعت کے لئے سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہے، خصوصًا ایسے مواقع میں شیطان اچھے بھلے انسان کو بھی غصہ دلاکر لڑنے جھگڑنے پر آمادہ کر ہی دیتا ہے، اس لئے دوسری آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر ایسے صبر آزما موقع میں غصہ کے جذبات زیادہ مشتعل ہوتے نظر آئیں تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

حدیث میں ہے کہ دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لڑ جھگڑ رہے تھے اور ایک شخص غصہ میں بے قابو ہورہا تھا، آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا یہ اشتعال جاتا رہے، فرمایا وہ کلمہ یہ ہے، اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ، اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر فورًا یہ کلمہ پڑھ لیا تو فورًا ہی سارا غصہ اور اشتعال ختم ہوگیا۔

فائدہ عجیبہ امام تفسیر ابن کثیرؒ نے اس جگہ ایک عجیب بات یہ لکھی ہے کہ پورے قرآن میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تلقین کے لئے جامع آئی ہیں اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، ایک تو یہی سورۂ اعراف کی آیت ہے، دوسری سورۂ مومنون کی یہ آیت ہے، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ، (مومنون ۹۷) یعنی دفع کرو برائی کو بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور آپ یوں دُعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

تیسری آیت سورہ حم سجدہ کی یہ ہے، وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں، اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے

ان تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو و درگزر اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے، جہاں جھگڑے کا کوئی موقعہ پیش آتا ہے شیاطین اس کو اپنی شکارگاہ بنا لیتے ہیں، اور بڑے سے بڑے بُردبار باوقار آدمی کو غصہ دلا کر حدود سے نکال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جب غصہ قابو میں نہ آتا دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ شیطان مجھ پر غالب آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس سے پناہ مانگیں تب مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہو سکے گی، اسی لئے بعد کی تیسری اور چوتھی آیت میں بھی شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ

اور جب تو لے کر نہ جائے ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ چھانٹ لایا تو اپنی طرف سے، تو کہہ دے

اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ

میں تو چلتا ہوں اس پر جو حکم آئے میری طرف میرے رب سے، یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ

ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کو جو مومن ہیں، اور جب قرآن پڑھا جائے

الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب آپ (ان کے فرمائشی معجزات میں سے جن کی فرمائش براہ عناد کرتے تھے) کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ حق تعالیٰ اس معجزہ کو بمقتضائے حکمت پیدا نہیں کرتے) تو وہ لوگ (بقصد نفی رسالت آپ سے) کہتے ہیں کہ آپ (اگر نبی ہیں تو) یہ معجزہ کیوں نہ (ظاہر) لائے، آپ فرما دیجئے کہ (میرا کام معجزات باختیار خود لانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ) میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے حکم بھیجا گیا ہے (اس میں تبلیغ بھی آگئی البتہ نبوت کے اثبات کے لئے نفس معجزہ ضروری ہے سو ان کا وقوع ہو چکا ہے چنانچہ ان میں سب سے اعظم ایک یہی قرآن ہے جس کی شان یہ ہے کہ) یہ (قرآن) بجائے خود (گویا) بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے (کیونکہ اس کی ہر مقدار سورت مثل ایک معجزہ کے ہے تو اس حساب سے مجموعہ قرآن کتنی دلیلیں ہوا اور اس کا یہ دلیل ہونا تو عام ہے، اور رہا اس کا نفع بالفعل تو وہ خاص ہے ماننے والوں کے ساتھ چنانچہ وہ) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور (آپ ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) جب قرآن پڑھا جایا کرے (مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرمائیں) تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو (تاکہ اس کا معجز ہونا اور اس کی تعلیم کی خوبی سمجھ میں آئے جس سے) امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (جدید یا مزید)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول برحق ہونے کا ثبوت اور اس

پر مخالفین کے شبہات کا جواب اور ان دونوں کے ضمن میں چند احکام شرعیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

رسالت کے ثبوت کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے جاتے ہیں، سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مناسبت سے اتنے معجزات عطا کئے گئے جو پچھلے انبیاء کے معجزات سے بہت زائد بھی ہیں اور واضح بھی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو قرآن مجید اور صحیح روایات حدیث سے ثابت ہیں ان کی بڑی تعداد ہے، علماء نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب خصائص کبریٰ دو ضخیم جلدوں میں اسی موضوع پر لکھی ہوئی مشہور و معروف ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات سامنے آنے کے باوجود مخالفین اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اپنی طرف سے متعین کر کے نئے نئے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جس کا ذکر اسی سورت میں پہلے بھی آچکا ہے۔

مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں ان کا ایک اصولی جواب دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر کا معجزہ اس کی رسالت کی ایک شہادت اور ثبوت ہوتا ہے اور جب مدعی کا دعویٰ کسی معتبر شہادت سے ثابت ہو جائے اور فریق مخالف نے اس پر کوئی جرح بھی نہ کی ہو تو اس کو دنیا کی کسی عدالت میں یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مدعی سے اس کا مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں مخصوص لوگوں کی شہادت پیش کرے تو ہم مانیں گے موجودہ شہادت پر کوئی جرح پیش کئے بغیر ہم تسلیم نہیں کرتے، اس لئے بہت سے واضح معجزات کے دیکھنے کے بعد مخالفین کا یہ کہنا کہ فلاں قسم کا خاص معجزہ دکھلا دیجئے تو ہم آپ کو رسول مانیں — یہ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جس کو کوئی عدالت صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں کا متعین کیا ہوا کوئی خاص معجزہ نہیں دکھلاتے تو یہ آپ کی رسالت کا انکار کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ آپ نے فلاں معجزہ کیوں نہیں دکھلایا، تو آپ ان کو یہ جواب دے دیجئے کہ میرا کام باختیار خود معجزات دکھلانا نہیں بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ میں ان احکام کا اتباع کروں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجے جاتے ہیں جن میں تبلیغ بھی شامل ہے اس لئے میں اپنے اصلی کام میں مشغول ہوں اور رسالت کے لئے وہ دوسرے معجزات بھی کافی ہیں جو تم سب لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد کسی خاص معجزہ کا مطالبہ ایک معاندانہ

مطالبہ ہے جو قابلِ التفات نہیں۔

اور جو معجزات دکھلائے گئے ہیں ان میں سے قرآن خود ایک عظیم معجزہ ہے جس نے ساری دنیا کو اپنا بلکہ اپنی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل لانے کا کھلا چیلنج دیا اور ساری دنیا باوجود پوری کوششوں کے اس کا مثل لانے سے عاجز ہوگئی جو نہایت واضح علامت اس بات کی ہے کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ اللہ جل شانہ کا بے مثل کلام ہے۔

اس لئے فرمایا هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بہت سی دلیلوں اور معجزوں کا مجموعہ ہے، جن میں ادنیٰ غور کرنے والا یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ شانہ کا ہی ہے، کسی مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں، اس کے بعد فرمایا وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ، یعنی یہ قرآن دلیلِ حق تو سارے جہاں کیلئے ہے مگر مقصد تک پہنچانے والا اور رحمتِ حق تعالیٰ کا مستحق بنانے والا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس پر ایمان لائیں۔

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ قرآن مجید مؤمنین کے لئے رحمت ہے مگر اس رحمت سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و آداب ہیں جن کو خطاب عام کے ساتھ اس طرح ذکر فرمایا، وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو تم اس پر کان لگاؤ اور خاموش رہو۔

اس آیت کے شانِ نزول میں روایات مختلف ہیں کہ یہ حکم نماز کی قرارت کے بارے میں آیا ہے یا خطبہ کے یا مطلق قرارت قرآن کے خواہ نماز یا خطبہ میں ہو یا دوسرے حالات میں، لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح الفاظ آیت کے عام ہیں اسی طرح اس کا حکم بھی سب حالات کے لئے عام ہے بجز خاص استثنائی مواقع کے۔

اسی لئے حنفیہ نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرارت نہیں کرنا چاہیئے، اور جن فقہاء نے مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے ان میں بھی بعض نے اس کی رعایت رکھی ہے کہ امام کے سکتہ کے وقت فاتحہ پڑھی جائے یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں، اس بحث میں علماء نے مستقل کتابیں چھوٹی بڑی بہت لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اصل مضمون آیت کا یہ ہے کہ قرآن کریم جن لوگوں کے لئے رحمت قرار دیا گیا اس کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن کے ادب و احترام کو پہچانیں اور اس پر عمل کریں، اور بڑا ادب قرآن کا یہ ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو سننے والے اپنے کان اس پر لگائیں اور خاموش رہیں۔

کان لگانے میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو سنیں اور یہ بھی کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کی جدوجہد کریں، (مظہری و قرطبی) آخر آیت میں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کا رحمت ہونا اس کے مذکورہ آداب بجا لانے پر موقوف ہے۔

تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہ کر سننے کے متعلق چند ضروری مسائل

اس کے بالمقابل یہ خود ظاہر ہے کہ اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کر کے قرآن کی بے حرمتی کی تو وہ رحمت کے بجائے قہر و غضب **کا مستحق ہوگا۔**

نماز کے اندر قرآن کی طرف کان لگانا اور خاموش رہنا تو عام طور پر مسلمانوں کو معلوم ہے گو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ امام نے کونسی سورت پڑھی ہے، ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن کی عظمت کو پہچانیں اور سننے کی طرف دھیان رکھیں، خطبہ جمعہ وغیرہ کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، علاوہ اس آیت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد **خاص طور سے خطبہ کے متعلق یہ آیا ہے کہ**

اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام یعنی جب امام خطبہ کے لئے نکل آئے تو نہ نماز ہے نہ کلام۔

اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت کوئی شخص دوسرے کو نصیحت کے لئے زبان سے یہ بھی نہ کہے کہ خاموش رہو کرنا ہی ہو تو ہاتھ سے اشارہ کر دے، غرض دوران خطبہ میں کسی طرح کا کلام تسبیح درود یا نماز وغیرہ جائز نہیں۔

فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو حکم خطبہ جمعہ کا ہے وہی عیدین کے خطبہ کا اور نکاح وغیرہ کے خطبہ کا ہے کہ اس وقت کان لگانا اور خاموش رہنا واجب ہے۔

البتہ نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہے تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے اس صورت میں بھی کان لگانے اور خاموش رہنے کو واجب اور اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا ہے، اور اسی لئے ایسی جگہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا آرام کرتے ہوں کسی کے لئے بآواز بلند قرآن پڑھنے کو جائز نہیں رکھا اور جو شخص ایسے مواقع میں قرآن بآواز بلند پڑھتا ہے اس کو گناہگار فرمایا ہے، خلاصۃ الفتاوٰی وغیرہ میں **ایسا ہی لکھا ہے۔**

لیکن بعض دوسرے فقہاء نے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کان لگانا اور سننا صرف ان جگہوں میں واجب ہے جہاں قرآن کو سنانے ہی کے لئے پڑھا جا رہا ہو، جیسے نماز و خطبہ وغیرہ میں

اور اگر کوئی شخص بطورِ خود تلاوت کر رہا ہے یا چند آدمی کسی ایک مکان میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہیں تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں، کیونکہ احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں جہرًا قراءت فرماتے تھے اور ازواجِ مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں، بعض اوقات حجرہ سے باہر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔

اور بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں رات کو پڑاؤ ڈالنے کے بعد صبح کو فرمایا کہ میں نے اپنے اشعری رفقائے سفر کو ان کی تلاوت کی آوازوں سے رات کے اندھیرے میں پہچان لیا کہ ان کے خیمے کس طرف اور کہاں ہیں، اگرچہ دن میں مجھے ان کے جائے قیام کا علم نہیں تھا۔

اس واقعہ میں بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعری حضرات کو اس سے منع نہیں فرمایا کہ بلند آواز سے کیوں قرأت کی اور نہ سونے والوں کو ہدایت فرمائی کہ جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو تم سب اٹھ بیٹھو اور قرآن سنو۔

اس قسم کی روایات سے فقہاء نے خارج نماز کی تلاوت کے معاملہ میں کچھ گنجائش دی ہے، لیکن اولیٰ اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ خارج نماز بھی جب کہیں سے تلاوتِ قرآن کی آواز آئے تو اس پر کان لگائے اور خاموش رہے اور اسی لئے ایسے مواقع میں جہاں لوگ سونے میں یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوں، تلاوتِ قرآن بآوازِ بلند کرنا مناسب نہیں۔

اس سے ان حضرات کی غلطی معلوم ہوگئی جو تلاوتِ قرآن کے وقت ریڈیو ایسے مجامع میں کھول دیتے ہیں جہاں لوگ اس کے سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اسی طرح رات کو لاؤڈ اسپیکر لگا کر مسجدوں میں تلاوتِ قرآن اس طرح کرنا کہ اس کی آواز سے باہر کے سونے والوں کی نیند یا کام کرنے والوں کے کام میں خلل آئے، درست نہیں۔

علامہ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت و دوزخ کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس وقت جنت کی دعاء یا دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو تلاوتِ قرآن کے وقت خاموش رہے، اور جو خاموش نہ رہے اس سے وعدہ نہیں، البتہ نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے اور موجبِ ثواب ہے (مظہری)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ

اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کم ہو

مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

پکار کر بولنے سے کم ہو صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت رہ بے خبر ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ

بیشک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور

يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ۩

یاد کرتے ہیں اس کی پاک ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ، اے شخص) اپنے رب کی یاد کیا کر (قرآن سے یا تسبیح وغیرہ سے خواہ) اپنے دل میں (یعنی آہستہ آواز سے) عاجزی کے ساتھ اور (خواہ) زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ (اسی عاجزی اور خوف کے ساتھ) صبح و شام، (یعنی علی الدوام) اور (دوام کا مطلب یہ ہے کہ) اہلِ غفلت میں شمار مت ہونا (کہ اذکارِ مامور بہا بھی ترک کر دو) یقیناً جو (ملائکہ) تیرے رب کے نزدیک (مقرب) ہیں وہ اس کی عبادت سے (جس میں اصلی عقائد ہیں) تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (جو کہ طاعت لسانی ہے) اور اس کو سجدہ کرتے ہیں (جو کہ اعمالِ جوارح سے ہے)۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں قرآن مجید سننے کا ذکر اور اس کے آداب کا بیان تھا، ان دو آیتوں میں جمہور کے نزدیک مطلق ذکر اللہ کا حکم اور اس کے آداب کا بیان ہے جس میں تلاوتِ قرآن بھی شامل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک اس میں بھی ذکر سے مراد قرآن ہی ہے اور جو آداب اس میں بیان ہوئے ہیں وہ بھی تلاوتِ قرآن ہی سے متعلق ہیں، لیکن یہ کوئی اختلاف نہیں کیونکہ علاوہ قرآن کے دوسرے اذکار کا بھی سب کے نزدیک یہی حکم اور یہی آداب ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کو اللہ کی یاد اور ذکر کا حکم اور اس کے ساتھ اس کے اوقات اور آداب کا بیان ہے۔

ذکرِ خفی اور ذکرِ جہر کے احکام پہلا ادب ذکر کے آہستہ یا بلند آواز سے کرنے کے متعلق ہے اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے اس آیت میں دو طرح کا اختیار دیا ہے، ذکرِ خفی اور ذکر جہر۔ ذکرِ خفی کے بارے میں فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ یعنی اپنے رب کو یاد کیا کرو اپنے دل میں، اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بغیر زبان کی حرکت کے صرف دل میں دھیان اور خیال اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا رکھے جس کو ذکرِ قلبی یا تفکّر کہا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان سے بھی آہستہ آواز میں اسماءِ الٰہیہ کے حروف ادا کرے، سب سے افضل اور بہتر صورت یہی ہے کہ جو ذکر کر رہا ہے اس کے مفہوم کو سمجھ کر دل میں بھی اس کا پورا استحضار اور دھیان ہو اور زبان سے بھی ادا کرے کیونکہ اس صورت میں قلب کے ساتھ زبان بھی ذکر میں شریک ہو جاتی ہے اور اگر صرف دل ہی دل میں دھیان اور تفکّر میں مشغول رہے زبان سے کوئی حرف ادا نہ کرے وہ بھی بڑا ثواب ہے اور سب سے کم درجہ اس کا ہے کہ صرف زبان پر ذکر ہو اور قلب اس سے خالی اور غافل ہو۔ ایسے ہی ذکر کو مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر این چنیں تسبیح کے دارد اثر

اور مقصد مولانا رومیؒ کا یہ ہے کہ قلب غافل کے ذکر کرنے سے ذکر کے آثار و برکات کامل حاصل نہیں ہوتے، اس کا انکار نہیں کہ یہ صرف زبانی ذکر بھی ثواب اور فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ بعض اوقات یہ زبانی ذکر ہی قلبی ذکر کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے، زبان سے کہتے کہتے قلب بھی متاثر ہونے لگتا ہے اور کم از کم ایک عضو تو ذکر میں مشغول ہے ہی، وہ بھی ثواب سے خالی نہیں۔ اس لئے جن لوگوں کو ذکر و تسبیح میں دلجمعی اور دھیان اور استحضار نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑیں نہیں، جاری رکھیں اور استحضار کی کوشش کرتے رہیں۔

دوسرا طریقہ ذکر کا اسی آیت میں یہ بتلایا وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ، یعنی زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔ یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کر نہ کرے متوسط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب و احترام ملحوظ رہے، بہت زور سے ذکر و تلاوت کرنا اس کی علامت ہوتی ہے کہ مخاطب کا ادب و احترام اس کے دل میں نہیں، جس ہستی کا ادب و احترام اور رعب انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کے سامنے طبعی طور پر انسان بہت بلند آواز سے نہیں بول سکتا، اس لئے عام ذکر اللہ ہو یا تلاوتِ قرآن جب آواز سے پڑھا جائے تو اس

کی رعایت رکھنا چاہئے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے، ایک یہ کہ صرف ذکرِ قلبی یعنی معانی قرآن اور معانی ذکر کے تصور اور تفکر پر اکتفاء کرے، زبان کو بالکل حرکت نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت دے مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں، یہ دونوں طریقے ذکر کے ارشادِ ربانی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ میں داخل ہیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ استحضارِ قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی، مگر اس طریق کے لئے ادب یہ ہے کہ آواز کو زیادہ بلند نہ کرے، متوسط حد سے آگے نہ بڑھائے، یہ طریقہ ارشادِ قرآنی وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ میں تلقین فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے، وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اپنی قراءت میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفاء، بلکہ جہر اور اخفاء کے درمیانی کیفیت رکھا کریں۔

نماز میں قراءت قرآن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو یہی ہدایت فرمائی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر رات میں گھر سے نکلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کر رہے تھے، پھر حضرت عمر بن خطابؓ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے، اسی طرح فاروق اعظمؓ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ قراءت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صدیق اکبرؓ کو یہ ہدایت کی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور فاروق اعظمؓ کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں۔ (ابوداؤد)

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہراً کرتے تھے یا سراً؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہراً کبھی سراً دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔

رات کی نفل نماز میں اور خارج نماز تلاوت میں بعض حضرات نے جہر پسند کیا بعض نے آہستہ کو، اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے تلاوت کرے، البتہ آواز سے تلاوت کرنے میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں، اوّل یہ کہ اس میں نام ونمود اور ریار کا اندیشہ نہ ہو، دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کا حرج یا تکلیف نہ ہو، کسی دوسرے شخص کی نماز وتلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو، اور جہاں نام ونمود اور ریار کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

اور جو حکم تلاوتِ قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار وتسبیح کا ہے کہ آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع وخضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو۔

اور اس کا فیصلہ کہ سرًّا اور جہرًا میں سے افضل کیا ہے، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے، بعض لوگوں کے لئے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کے لئے آہستہ نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سر۔ (تفسیر مظہری وروح البیان وغیرہ)

دوسرا ادب تلاوت اور ذکر کا یہ ہے کہ عاجزی اور تضرع کے ساتھ ذکر کیا جاوے جو نتیجہ اس کا ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال مستحضر ہو اور جو ذکر کر رہا ہے اس کے معنی ومفہوم پر نظر ہو۔

تیسرا ادب اسی آیت میں لفظ خِیْفَةً سے یہ بتلایا گیا کہ ذکر وتلاوت کے وقت انسان پر ہیبت اور خوف کی کیفیت ہونا چاہئے، خوف اس کا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عظمت کا حق ادا نہیں کر سکتے ممکن ہے کہ ہم سے کوئی بے ادبی ہو جائے، نیز اپنے گناہوں کے استحضار سے عذاب الٰہی کا خوف نیز انجام اور خاتمہ کا خوف کہ معلوم نہیں ہمارا خاتمہ کس حال پر ہونا ہے، بہرحال ذکر وتلاوت اس طرح کیا جائے جیسے کوئی ہیبت زدہ ڈرنے والا کیا کرتا ہے۔

یہی آداب دعار اسی سورۂ اعراف کے شروع میں بھی ایک آیت میں اس طرح آئے ہیں اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، اس میں خِیْفَةً کے بجائے خُفْيَةً کا لفظ آیا ہے جس کے معنی آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے ہیں، گویا ذکر وتلاوت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آہستہ پست آواز سے کیا جائے، لیکن اس آیت نے اس کے معنی بھی واضح کر دیئے کہ کچھ آواز سے ذکر کرنا بھی ممنوع نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ کرے، نیز اتنی بلند نہ کرے

جس میں خشوع خضوع اور عاجزی وتضرع کی کیفیت جاتی رہے۔

آخر آیت میں ذکر وتلاوت کے اوقات بتلائے کہ صبح وشام ہونا چاہئے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کم از کم دن میں دو مرتبہ صبح اور شام ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح شام بول کر مراد تمام لیل ونہار کے اوقات ہوں جیسے مشرق مغرب بول کر سارا عالم مراد لیا جاتا ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ انسان پر لازم ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں ذکر وتلاوت کا پابند رہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ، یعنی اللہ کی یاد کو چھوڑ کر غفلت والوں میں شامل نہ ہو جانا کہ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔

دوسری آیت میں لوگوں کی عبرت ونصیحت کے لئے مقربانِ بارگاہِ الٰہی کا ایک مخصوص حال بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونا ہے جس میں سب فرشتے اور تمام انبیاء علیہم السلام اور صالحینِ امت شامل ہیں، اور تکبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھ کر ان عبادات میں قصور نہیں کرتے بلکہ اپنے کو عاجز ومحتاج سمجھ کر ہمیشہ اللہ کی یاد اور عبادت میں مشغول اور تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو دائمی عبادت اور یادِ خدا کی توفیق ہوتی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے پاس ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معیت ان کو حاصل ہے

سجدہ کے بعض فضائل اور احکام | یہاں عباداتِ نماز میں سے صرف سجدہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ تمام ارکانِ نماز میں سجدہ کو خاص فضیلت حاصل ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے جس سے میں جنت میں جا سکوں، حضرت ثوبانؓ خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، پھر بھی خاموش رہے، جب تیسری مرتبہ سوال کو دہرایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، آپ نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم ایک سجدہ کرتے ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں، یہ شخص کہتے ہیں کہ حضرت ثوبانؓ کے بعد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ملا تو ان سے بھی یہی سوال کیا، انہوں نے

بھی یہی جواب دیا۔

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ بندہ سجدہ میں ہو، اس لئے تم سجدہ کی حالت میں خوب دُعاء کیا کرو کہ اس کے قبول ہونے کی بڑی اُمید ہے۔

یاد رہے کہ تنہا سجدہ کی کوئی عبادت معروف نہیں، اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کثرت سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں، جتنی نفلیں زیادہ ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے۔

لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دُعاء کرلے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور سجدہ میں دعاء کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کے لئے مخصوص ہے فرائض میں نہیں۔

سورۂ اعراف ختم ہوئی، اس کی آخری آیت آیت سجدہ ہے، صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ جب کوئی آدم کا بیٹا کوئی آیت سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا بھاگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ملا اور اس نے تعمیل کرلی تو اس کا ٹھکانہ جنت ہوا، اور مجھے سجدہ کا حکم ہوا میں نے نافرمانی کی تو میرا ٹھکانہ جہنم ہوا۔

سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ

سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰیَۃً وَّعَشْرُ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچہتر آیتیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا ، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ،

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗۤ

سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو آپس میں ، اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا

اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۱

اگر ایمان رکھتے ہو ۔

مضامینِ سورت

سورۂ انفال جو اس وقت شروع ہو رہی ہے مدنی سورت ہے۔ اس سے پہلی سورت یعنی سورۂ اعراف میں مشرکین اور اہل کتاب کے جہل و عناد اور کفر و فساد کا تذکرہ اور اس کے متعلقہ مباحث کا بیان تھا۔

اس سورت میں زیادہ تر مضامین غزوۂ بدر کے موقع پر انہیں لوگوں کے انجام بد، ناکامی اور شکست، اور اُن کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی اور فتوحات سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کے لئے احسان و انعام اور کفار کے لئے عذاب و انتقام تھا۔

اور چونکہ اس انعام کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا خلوص اور للّٰہیت اور اُن کا باہمی اتفاق ہے اور یہ اخلاص و اتفاق نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کا اس لئے شروع سورت میں تقویٰ اور اطاعتِ حق اور ذکر اللہ اور توکل وغیرہ کی تعلیم دی گئی۔

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں (یعنی وہ اللہ کی ملک ہیں اُس کو ہی حق ہے کہ اُن کے متعلق جو چاہیں حکم دے) اور رسول کی ہیں (بایں معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اُس کو نافذ کریں گے حاصل یہ ہے کہ اموالِ غنیمت کے بارہ میں تمہاری رائے اور تجویز کا کوئی دخل نہیں بلکہ اُس کا فیصلہ حکمِ شرعی پر ہوگا) تو تم (دنیا کی حرص مت کرو آخرت کے طالب رہو اس طرح پر کہ) اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ آپس میں حسد اور بغض نہ رہے) اور اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

معارف ومسائل

یہ آیت غزوۂ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ آیت کی مفصل تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جو کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ تھا اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرام کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جو اخلاص و اتفاق کے اُس مقام کے شایان نہ تھا جس پر صحابہ کرام کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی اس لئے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرما دیا گیا تاکہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق و اخلاص اور اتفاق و ایثار کے سوا کچھ نہ رہے۔

اس واقعہ کی تفصیل غزوۂ بدر کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک، حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت سے کسی نے آیتِ مذکورہ میں لفظ انفال کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر ہی کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارہ میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرینِ بدر میں اُس کو مساوی طور پر تقسیم فرما دیا۔

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو اب ہمارے

لشکر کے تین حصے ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکے۔ کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اس لئے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہ کردے۔ جب جنگ ختم ہوگئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں۔ اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے اُنھوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو۔ کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسپا کیا اور تمھارے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کرلو۔ اور جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آپ کے گرد جمع رہے اُنھوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمھارے ساتھ شریک ہوتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے اس لئے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

صحابہ کرام کی یہ گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے واضح کردیا کہ یہ مال اللہ کا ہے اس کا کوئی مالک و حقدار نہیں بجز اُس کے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادِ ربانی کے ماتحت اس مال کو سب شرکاءِ جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرما دیا (ابن کثیر)۔ اور سب کے سب اللہ و رسول کے اس فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ اور اُن کے خلافِ شان جو صورت حال باہمی مسابقت کی پیش آگئی تھی اس پر نادم ہوئے۔

اور مسند احمد ہی میں اس آیت کے شانِ نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا بھی منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میرے بھائی عُمیر شہید ہوگئے۔ میں نے اُن کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کردیا اور اُس کی تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مالِ غنیمت میں جمع کردو۔ میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اُس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اُس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی مگر بایں ہمہ تعمیلِ ارشاد کے لئے مالِ غنیمت میں جمع کرنے کے لئے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے مجھے بلا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرما دی۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض بھی کیا تھا کہ یہ تلوار مجھے دے دی جائے

مگر آپ نے فرمایا کہ نہ یہ میری چیز ہے جو کسی کو دے دوں اور نہ آپ کی ملک ہے اس کو پورے مالِ غنیمت میں جمع کردو اس کا فیصلہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا۔ (ابن کثیر مظہری)

اس میں کوئی بُعد نہیں کہ یہ دونوں واقعے پیش آئے ہوں اور دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

آیت کی پوری تفسیر یہ ہے

اس میں لفظ انفال نفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل وانعام۔ نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے ذمہ لازم وواجب نہیں، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ اصطلاحِ قرآن وسنت میں لفظ نفل اور انفال مالِ غنیمت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں اس معنی کے لئے تین لفظ استعمال ہوئے ہیں انفال، غنیمہ، فیئ۔ لفظ انفال تو اسی آیت میں مذکور ہے اور لفظ غنیمۃ اور اُس کی تفصیل اسی سورت کی اکتالیسویں آیت میں آنے والی ہے اور لفظ فیئ اور اُس کے متعلق تفصیل سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ الخ اور ان تینوں کے معانی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مالِ غنیمت کے لئے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔

غنیمۃ عموماً اُس مال کو کہتے ہیں جو جنگ وجہاد کے ذریعہ مخالف فریق سے حاصل ہو۔ اور فیئ اُس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کفار سے ملے خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ یا رضامندی سے دینا قبول کریں۔ اور نفل اور انفال کا لفظ اکثر اُس انعام کے لئے بولا جاتا ہے جو امیر جہاد کسی خاص مجاہد کو اُس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ حصۂ غنیمت کے بطور انعام عطا کرے۔ یہ معنی تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کئے ہیں (ابن کثیر)۔ اور کبھی مطلقاً مالِ غنیمت کو بھی نفل و انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی لئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی عام معنی نقل کئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لئے بولا جاتا ہے اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔ اور اس کی بہترین تشریح وتحقیق وہ ہے جو امام ابو عبیدؒ نے اپنی کتاب الاموال میں ذکر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اصل لغت میں نفل کہتے ہیں فضل وانعام کو اور اس اُمتِ مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جہاد وقتال کے ذریعہ جو اموال کفار سے حاصل ہوں ان کو مسلمانوں کے لئے حلال کردیا گیا۔ ورنہ پچھلی اُمتوں میں یہ دستور نہ تھا بلکہ مالِ غنیمت کے لئے قانون یہ تھا کہ وہ کسی کے لئے حلال نہیں تھے تمام اموالِ غنیمت کو ایک جگہ جمع کردیا جاتا تھا۔ اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی اور اُس کو جلا کر خاک کردیتی تھی یہی اُس جہاد کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہوتی تھی۔

اور اگر کوئی مالِ غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے آکر اس کو نہ جلا دیا تو یہ علامت اس کی ہوتی تھی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں اس لئے اُس مالِ غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا اور اسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایتِ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور اُن کی اُمت کو نہیں ملیں۔ انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ اُحِلَّت لی الغنائم ولم تحل لاحد قبلی یعنی میرے لئے اموالِ غنیمت حلال کر دیئے گئے حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھے۔

آیتِ مذکورہ میں انفال کا حکم یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ کے ہیں اور رسول کے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ اصل ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور متصرف اُن میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو حکمِ خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر اُن کو تقسیم کرتے ہیں۔

اسی لئے ائمۂ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، سُدّی وغیرہ داخل ہیں یہ فرمایا کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جب تک تقسیم غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا جو اسی سورت کے پانچویں رکوع میں آرہا ہے کیونکہ اس میں پورے مالِ غنیمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں اور آگے جو تفصیلی احکام آئے ہیں اُن میں یہ ہے کہ کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے محفوظ کر دیا جائے اور چار حصے شرکاء جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں جن کی تفصیل احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے۔ اس تفصیلی بیان نے سورۂ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے سورۂ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے۔ البتہ مالِ فَیۡ جس کے احکام سورۂ حشر میں بیان ہوئے ہیں وہ پورا کا پورا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تصرف ہے آپ اپنی صوابدید سے جس طرح چاہیں عمل فرمائیں۔ اسی لئے اُس جگہ احکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اُس کو لے لو اور جس کو روک دے اُس سے باز رہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مالِ فَیۡ وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے۔ اور لفظ انفال دونوں کے لئے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اُس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے۔

اس سلسلہ میں غازیوں کو انعام دینے کی چار صورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے رائج ہیں

ایک یہ کہ یہ اعلان فرمادیں کہ جو شخص کسی مخالف کو قتل کرے تو جو سامان مقتول سپاہی سے حاصل ہو وہ اسی کا ہے جس نے قتل کیا یہ سامان مالِ غنیمت میں جمع ہی نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ بڑے لشکر میں سے کوئی جماعت الگ کر کے کسی خاص جانب جہاد کیلئے بھیجی جائے اور یہ حکم دے دیا جائے کہ اس جانب سے جو مالِ غنیمت حاصل ہو وہ اسی خاص جماعت کا ہوگا جو وہاں گئی ہے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اُس مال میں سے پانچواں حصہ عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے اس میں سے کسی خاص غازی کو اُس کی ممتاز کارگزاری کے صلہ میں امیر کی صوابدید کے مطابق دیا جائے۔ چوتھے یہ کہ پورے مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ الگ کر کے خدمت پیشہ لوگوں کو بطور انعام دیا جائے جو مجاہدین کے گھوڑوں وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور اُن کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ (ابن کثیر)

خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگ آپ سے انفال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ اُن سے کہدیجئے کہ انفال سب اللہ کے ہیں اور اُس کے رسول کے یعنی خود کوئی اُن کا حقدار یا مالک نہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُس کے رسول جو کچھ فیصلہ فرمائیں وہ ہی نافذ ہوگا۔

لوگوں کے باہمی اتفاق و اتحاد کی بنیاد تقویٰ اور خوفِ خدا ہے

اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ جس میں صحابہ کرام کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو اس میں اشارہ اُس واقعہ کی طرف ہے جو غزوۂ بدر میں، مالِ غنیمت کی تقسیم کی بابت صحابہ کرام کے آپس میں پیش آگیا تھا جس میں باہمی کشیدگی اور ناراضی کا خطرہ تھا۔ حق تعالیٰ نے تقسیم غنیمت کا قضیہ تو خود اس آیت کے ذریعہ طے فرما دیا۔ اب اُن کے دلوں کی اصلاح اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کی تدبیر بتلائی گئی ہے جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جب تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ اہلِ تقویٰ کا حال بقول مولانا رومیؒ یہ ہو جاتا ہے ؎

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد کیں دلم از صلحہا ہم میرمد

یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ وجدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی۔ ان کو تو خلائق کی صلح اور درستی کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی۔ کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت و خوف اور یاد میں مشغول ہو اُس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت ؎

۱۲

بسودائی جاناں زجاں مشتغل بذکر حبیب از جہاں مشتغل

اسی لئے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتلا کر فرمایا اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ یعنی بذریعہ تقویٰ آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو، اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یعنی اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت ہو اگر تم مؤمن ہو یعنی ایمان کا تقاضا ہے اطاعت اور اطاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا، اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہو جائیں تو اُن کے آپس کے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور دشمنی کی جگہ دلوں میں الفت و محبت پیدا ہو جائے گی۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ
ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل

وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ
اور جب پڑھا جائے اُن پر اُس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے اُن کا ایمان اور وہ اپنے رب پر

یَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو اور ہم نے جو ان کو روزی دی ہے اس میں سے

یُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ
خرچ کرتے ہیں۔ وہی ہیں سچے ایمان والے، ان کے لئے درجے ہیں

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝۴
اپنے رب کے پاس اور معافی اور روزی عزت کی۔

خلاصۂ تفسیر

(بس) ایمان والے تو وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جب (اُن کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا ہے تو (اُس کی عظمت کے استحضار سے) اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں اُن کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (اور) جو کہ نماز کی اقامت کرتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں (بس) سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں اُن کے لئے بڑے بڑے درجے ہیں اُن کے رب کے پاس اور (ان کے لئے) مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔

معارف و مسائل

مؤمن کی مخصوص صفات آیات مذکورہ میں اُن مخصوص صفات کا بیان ہے جو ہر مؤمن میں ہونا چاہئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر مؤمن اپنی ظاہری و باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اُس نے اس کو مؤمنین کی صفات عطا فرما دیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں یا ہے مگر ضعیف و کمزور ہے تو اُس کے حاصل کرنے یا قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صفت خوف خدا پہلی صفت یہ بیان فرمائی اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں رچی اور بھری ہوئی ہے جس کا یک تقاضا ہیبت و خوف ہے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا ذکر کر کے اہل محبت کو بشارت دی گئی ہے وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ یعنی خوشخبری دے دیجئے اُن متواضع نرم خو لوگوں کو جن کے دل ڈر جاتے ہیں جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے۔ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے ایک خاص تقاضا کا ذکر ہے یعنی ہیبت اور خوف اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ اُس سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس خوف و ہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون و اطمینان کے خلاف نہیں جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کر دیتا ہے ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے اور اسی لئے یہاں لفظ خوف استعمال نہیں فرمایا وَجِلَ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالت شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اللہ کے ذکر اور یاد سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر رہا تھا اسی حال میں اُس کو خدا تعالیٰ کی یاد آگئی تو وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گیا اور گناہ سے باز آگیا۔ اس صورت میں خوف سے مراد خوف عذاب ہی ہوگا۔ (بحر محیط)

دوسری صفت ایمان میں ترقی مؤمن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اُس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اُس کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین و محدثین کا اتفاق ہے یہ ہیں کہ ایمان کی

قوت وکیفیت اور نور ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ عمل صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرح صدر پیدا ہو جاتا ہے کہ اعمال صالحہ اُس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں جس کے چھوڑنے سے اُس کو تکلیف ہوتی ہے اور گناہ سے اُس کو طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس نہیں جاتا۔ ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں حلاوت ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

واذا حلت الحلاوة قلب		نشطت فی العبادة الاعضاء

یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان جگہ پکڑ لیتی ہے تو اُس کے ہاتھ پیر اور سب اعضاء عبادت میں راحت ولذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس لئے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہو گیا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ جب اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں تو اُس کے ایمان میں جلا اور ترقی ہو اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب و احترام کا کوئی اہتمام ہے نہ اللہ جل شانہ کی عظمت پر نظر ہے ایسی تلاوت مقصود و اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

تیسری صفت اللہ پر توکل

تیسری صفت مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔ توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال و احوال میں اُس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذات واحد حق تعالیٰ پر ہو۔ صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادی اسباب اور تدبیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب و آلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت وہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اُسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُن اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں۔ ہو گا وہی جو وہ چاہیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا اجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ۔ یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کر لو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ اپنے دل و دماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔

چوتھی صفت اقامت صلوٰۃ

چوتھی صفت مؤمن کی اقامت صلوٰۃ بتلائی۔ اس میں یہ بات قابل یاد رکھنے کے ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کا نہیں بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے۔ اقامت کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں۔ مراد اقامت صلوٰۃ سے

یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب وشرائط اُس طرح بجالائے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول وعمل سے بتلائے ہیں۔ آداب وشرائط میں کوتاہی ہوئی تو اُس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر اقامت صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے۔ قرآن مجید میں نماز کے جو فوائد اور آثار اور برکات ذکر کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ یعنی نماز روکتی ہے بے حیائی اور ہر گناہ سے۔ یہ بھی اقامت صلوٰۃ ہی پر موقوف ہے جب نماز کے آداب میں کوتاہی ہوئی تو گو فتوٰی کی رُو سے اُس کی نماز کو جائز ہی کہا جائے مگر نماز کی برکات میں کوتاہی کی مقدار پر فرق پڑجائے گا۔ اور بعض صورتوں میں ان برکات سے کُلی طور پر محرومی ہوجائے گی۔

پانچویں صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

پانچویں صفت مرد مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُس کو رزق دیا ہے وہ اُس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے تمام صدقات وخیرات اور وقف و صلہ کو جس میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ واجبات شرعی بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات و تبرعات بھی، مہمانوں، دوستوں، بزرگوں کی مالی خدمت بھی۔

مرد مؤمن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ یعنی ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں جن کا ظاہر وباطن یکساں اور زبان اور دل متفق ہیں ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ کہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ نہ اطاعت رسول کا۔ اُن کے اعمال اُن کے اقوال کی تردید کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب وہ حاصل نہ ہو حق حاصل نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابو سعید کیا آپ مؤمن ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں۔ تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر اور جنت دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بیشک میں مؤمن ہوں۔ اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۂ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں اُن میں داخل ہوں یا نہیں۔ سورۂ انفال کی آیات سے وہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ نے سُنی ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔

اس میں سچے مؤمنین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک درجات عالیہ، دوسرے

مغفرت، تیسرے رزق عمدہ۔

تفسیر بحرمحیط میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مؤمنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے جیسے ایمان ۔خوفِ خدا۔ توکل علی اللہ دوسرے وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے جیسے نماز وغیرہ ۔تیسرے وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے ۔ درجاتِ عالیہ قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں اور مغفرت اُن عمل کے مقابلہ میں جو انسان کے ظاہر بدن سے متعلق ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ جیساکہ حدیث میں آیا ہے کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے ور رزق کریم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بامقابل آیا ہے کہ جو کچھ خرچ کیا اُس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اُس کو آخرت میں ملے گا۔

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِٱلْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے، اور ایک جماعت اہل

ٱلْمُؤْمِنِينَ لَكَٰرِهُونَ ۝٥ يُجَٰدِلُونَكَ فِى ٱلْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ

ایمان کی راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اُس کے ظاہر ہوچکنے کے بعد

كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى ٱلْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝٦

گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے ۔

خلاصۂ تفسیر

(مالِ غنیمت کا لوگوں کی مرضی کے موافق تقسیم نہ ہونا بلکہ منجانب اللہ اس کی تقسیم ہونا اگرچہ بعض لوگوں کو طبعاً گراں گزرا ہو مگر مصالح کثیرہ کی وجہ سے یہی خیر و بہتر ہے۔ اور یہ معاملہ خلافِ طبع مگر مصالح کثیرہ کو متضمن ہونے میں ایسا ہی ہے) جیسا آپ کے رب نے آپ کے گھر (اور بستی) سے مصلحت کے ساتھ آپ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت (اپنی تعداد اور سامانِ جنگ کی قلت کی وجہ سے طبعاً اس کو گراں سمجھتی تھی وہ اس مصلحت (کے کام) میں (یعنی جہاد اور مقابلہ لشکر کے معاملے میں) بعد اس کے کہ اُس کا ظہور ہوچکا تھا (اپنے بچاؤ کے لئے بطور مشورہ کے) آپ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی اُن کو موت کی طرف ہانکے لئے جاتا ہے اور وہ (موت کو گویا) دیکھ رہے ہیں (مگر آخرکار انجام اس کا بھی اچھا ہوکہ اسلام غالب اور کفر مغلوب ہوا)۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہوچکا ہے کہ سورۂ انفال کے بیشتر مضامین کفار و مشرکین پر عذاب و انتقام اور مسلمانوں پر احسان و انعام کے متعلق ہیں اور اُس کے ضمن میں دونوں فریق کے لئے عبرت و نصیحت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان معاملات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ غزوۂ بدر کا تھا جس میں بڑے ساز و سامان اور تعداد و قوت کے باوجود مشرکین کو جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ شکست اور مسلمانوں کو باوجود ہر طرح کی قلت اور بے سامانی کے فتح عظیم نصیب ہوئی۔ اس سورت میں واقعہ بدر کا تفصیلی بیان ہے۔ جو آیاتِ مذکورہ سے شروع ہو رہا ہے۔

پہلی آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ بعض مسلمانوں کو بدر کے موقع پر جہاد کے لئے اقدام ناپسند تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فرمان کے ذریعہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا تو ناپسند کرنے والے بھی ساتھ ہوگئے۔ اس بات کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم نے جو الفاظ اختیار فرمائے ہیں وہ کئی طرح سے قابلِ غور ہیں۔

اوّل یہ کہ آیت کا شروع كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ سے ہوتا ہے۔ اس میں لفظ كَمَا ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو غور طلب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی کس چیز سے ہے۔ حضرات مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں۔ امام تفسیر ابوحیان نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کئے ہیں ان میں زیادہ اقرب تین احتمال ہیں۔

اوّل یہ کہ اس تشبیہ سے مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح غزوۂ بدر کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت صحابہ کرام کے آپس میں کچھ اختلاف رائے ہوگیا تھا پھر حکم خداوندی کے تحت سب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی برکات اور اچھے نتائج کا مشاہدہ کرلیا گیا۔ اسی طرح اس جہاد کے شروع میں کچھ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا پھر حکم ربانی کے ماتحت سب نے اطاعت کی اور اُس کے مفید نتائج اور اعلیٰ ثمرات کا مشاہدہ ہوگیا۔ یہ توجیہ فراء اور مبرد کی طرف منسوب ہے (بحر محیط)۔ اسی کو بیان القرآن میں ترجیح دی ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہوچکا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں سچے مؤمنین کے لئے آخرت میں درجاتِ عالیہ اور مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس آیت میں اس وعدہ کے یقینی ہونے کا ذکر اس طرح کیا گیا کہ آخرت کا وعدہ اگرچہ ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ نصرت و فتح غزوۂ بدر میں آنکھوں کے سامنے آچکا ہے اس سے عبرت پکڑو اور یقین کرو کہ جس طرح یہ وعدہ دنیا ہی میں پورا ہوچکا ہے اسی طرح آخرت کا وعدہ بھی ضرور پورا ہوگا۔ تفسیر قرطبی بحوالہ نحاس

تیسرا احتمال وہ ہے جس کو ابو حیان نے مفسرین کے پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے ان میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا۔ ایک روز میں اسی آیت پر غور و فکر کرتے ہوئے سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی جگہ جا رہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے میں اسی آیت کے متعلق اُس سے بحث کر رہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے۔ پھر یکایک خواب ہی میں میرے دل میں پڑا کہ یہاں لفظ نَصَرَكَ محذوف ہے اس کو خود میں نے بھی پسند کیا اور جس شخص سے بحث کر رہا تھا اُس نے بھی پسند کیا۔ بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اشکال ختم ہو گیا کیونکہ اس صورت میں لفظ کَمَا تشبیہ کے لئے نہیں بلکہ بیان سبب کے لئے مستعمل ہوا ہے اور معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ جل شانہ کی طرف سے جو خاص نصرت و امداد آپ کی ہوئی اُس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں بلکہ خالص امر ربّی اور حکم خداوندی کے تابع کیا اسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے۔ اور اطاعت حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے اور یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی مدد و نصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

بہرحال آیت کے اس جملہ میں یہ تینوں معنی محتمل اور صحیح ہیں۔ اس کے بعد اس پر نظر ڈالئے کہ قرآن کریم نے اس جہاد کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود نکلنا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکالا۔ اس میں اشارہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال عبدیت و اطاعت کی طرف کہ آپ کا فعل درحقیقت حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو آپ کے اعضاء و جوارح سے صادر ہوتا ہے۔ جیسا ایک حدیث قدسی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت و عبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں اُس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ پکڑتا ہے جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ چلتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جن افعال کا صدور بظاہر اُس کے آنکھ کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اس میں قدرت حق تعالیٰ شانہ کی کارفرما ہوتی ہے ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اَخْرَجَكَ میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد کے لئے نکلنا درحقیقت حق تعالیٰ کا نکالنا تھا جو آپ کی ذات سے ظاہر ہوا۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ فرمایا جس میں اللہ جل شانہ کا ذکر صفت رب

کے ساتھ کرکے اس طرف اشارہ کردیا کہ اس جہاد کیلئے آپ کو نکالنا شان ربوبیت سے اور تربیت کے تقاضا سے تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ مظلوم و مقہور مسلمانوں کے لئے فتح یاب اور مغرور و ظالم کفار کے لئے پہلے عذاب کا مظاہرہ کرنا تھا۔

مِنۡۢ بَیۡتِكَ کے معنی ہیں آپ کے گھر سے۔ مطلب یہ ہوا کہ نکالا آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر یا خود مدینہ طیبہ ہے جس میں ہجرت کے بعد آپ مقیم ہوئے۔ کیونکہ واقعۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال میں پیش آیا ہے۔ اس کے ساتھ لفظ بِالۡحَقِّ کا اضافہ کرکے بتلادیا کہ یہ ساری کارروائی احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے عمل میں آئی ہے۔ دوسری حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس یا بادشاہوں کا غصہ اس کا سبب نہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو گراں سمجھتی اور ناپسند کرتی تھی۔ صحابہ کرام کو یہ گرانی کس طرح اور کیوں پیش آئی اس کے سمجھنے کے لئے نیز آئندہ آنے والی دوسری آیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے غزوۂ بدر کے ابتدائی حالات اور اسباب کا پہلے معلوم کرلینا مناسب ہے۔ اس لئے پہلے غزوۂ بدر کا پورا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

ابن عقبہ و ابن عامر کے بیان کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں یہ خبر ملی کہ ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ملک شام سے مال تجارت لے کر مکہ معظمہ کی طرف جارہے ہیں۔ اور اس تجارت میں مکہ کے تمام قریشی شریک ہیں۔ ابن عقبہ کے بیان کے مطابق مکہ کا کوئی قریشی مرد یا عورت باقی نہ تھا جس کا اس میں حصہ نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک مثقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) سونا بھی تھا تو اس نے اس میں بہ حصہ ڈال دیا تھا۔ اس قافلہ کے پورے سرمایہ کے متعلق ابن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ پچاس ہزار دینار تھے۔ دینار سونے کا سکہ ہے جو ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے سونے کے موجودہ بھاؤ کے حساب سے اس کی قیمت باون روپیہ اور پورے سرمایہ کی قیمت چھبیس ۲۶ لاکھ روپیہ بنتی ہے اور یہ بھی آج کے نہیں بلکہ اب سے چودہ سو برس پہلے کے چھبیس لاکھ ہیں جو آج کے چھبیس ۲۶ کروڑ سے بھی زیادہ کی حیثیت رکھتے تھے اس تجارتی قافلہ کی حفاظت اور کاروبار کے لئے قریش کے ستر جوان اور سردار ساتھ تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ تجارتی قافلہ درحقیقت قریش مکہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی۔

بغوی نے بروایت ابن عباسؓ وغیرہ نقل کیا ہے کہ اس قافلہ میں قریش کے چالیس سوار قریش کے سرداروں میں سے تھے جن میں عمرو بن العاص، مخرمہ بن نوفل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ قریش کی سب سے بڑی طاقت ان کی یہی تجارت اور تجارتی سرمایہ تھا جس کے بل پر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تنگ کرکے مکہ چھوڑنے پر مجبور

کر دیا تھا۔ اس وقت جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر شام سے اس قافلہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ کی رائے ہوئی کہ اس وقت اس قافلہ کا مقابلہ کرکے قریش کی طاقت توڑ دینے کا موقع ہے۔ صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو زمانہ رمضان کا تھا پہلے سے کسی جنگ کی تیاری نہ تھی۔ بعض حضرات نے تو چستی اور ہمت کا اظہار کیا مگر بعض نے کچھ پس و پیش کی۔ آپ نے بھی سب پر اس جہاد کی شرکت کو لازم نہ قرار دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ جن لوگوں کے پاس سواریاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اس وقت بہت سے آدمی جہاد میں جانے سے رک گئے اور جو لوگ جانا چاہتے تھے اور اُن کی سواریاں دیہات میں تھیں اُنھوں نے اجازت چاہی کہ ہم اپنی سواریاں لے آویں تو ساتھ چلیں۔ مگر وقت اتنے انتظار کا نہ تھا۔ اس لئے حکم یہ ہوا کہ جن لوگوں کی سواریاں پاس موجود ہیں اور جہاد میں جانا چاہیں صرف وہی لوگ چلیں۔ باہر سے سواریاں منگانے کا وقت نہیں۔ اس لئے ساتھ جانے کا ارادہ رکھنے والوں میں سے بھی تھوڑے ہی آدمی تیار ہوسکے۔ اور جن حضرات نے اس جہاد میں ساتھ جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اُس کا سبب بھی یہ تھا کہ آپ نے سب کے ذمہ اس جہاد کی شرکت کو واجب نہ قرار دیا تھا۔ اور ان لوگوں کو یہ بھی اطمینان تھا کہ یہ تجارتی قافلہ ہے کوئی جنگی لشکر نہیں جس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو زیادہ لشکر اور مجاہدین کی ضرورت پڑے۔ اس لئے صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد اس جہاد میں شریک نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیر سقیا پر پہنچ کر قیس بن صعصعہؓ کو حکم دیا کہ لشکر کو شمار کریں تو اُنھوں نے شمار کرکے اطلاع دی کہ تین سو تیرہ حضرات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تعداد اصحاب طالوت کی ہے اس لئے فال نیک فتح اور کامیابی کی ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ کل ستر اونٹ تھے۔ ہر تین آدمی کے لئے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو حضرات ایک اونٹ کے شریک تھے ابو لبابہؓ اور حضرت علیؓ۔ جب آپ کی باری پیدل چلنے کی آتی تو یہ حضرات عرض کرتے کہ آپ سوار رہیں ہم آپ کے بدلے پیدل چلیں گے۔ رحمۃ للعالمین کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ نہ تو تم مجھ سے زیادہ قوی ہو اور نہ میں آخرت کے ثواب سے مستغنی ہوں کہ اپنے ثواب کا موقع تمھیں دے دوں اس لئے اپنی باری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیدل ہی چلتے تھے۔

دوسری طرف کسی شخص نے ملک شام کے مشہور مقام عین زرقاء پر پہنچ کر رئیس قافلہ ابوسفیان کو اس کی خبر پہنچا دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قافلہ کے انتظار میں ہیں ان کا تعاقب کریں گے۔ ابوسفیان نے احتیاطی تدبیر اختیار کیں۔ جب یہ قافلہ حدود حجاز میں داخل ہوا تو ایک ہوشیار مستعد آدمی ضمضم بن عمرو کو بیس مثقال سونا یعنی تقریباً دو ہزار روپیہ اُجرت دے کر

اس پر راضی کیا کہ وہ تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر جلد سے جلد مکہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچا دے کہ ان کے قافلہ کو صحابہ کرام سے خطرہ لاحق ہے۔

ضمضم بن عمر نے اُس زمانہ کی خاص رسم کے مطابق خطرہ کا اعلان کرنے کے لئے اپنی اونٹنی کے ناک کان کاٹ دیئے اور اپنے کپڑے آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالے۔ اور کجاوہ کو اُلٹا کر کے اونٹنی کی پشت پر رکھا۔ یہ علامات اُس زمانہ میں خطرہ کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی۔ جب وہ اس شان سے مکہ میں داخل ہوا تو پورے مکہ میں ہلچل مچ گئی اور تمام قریش مدافعت کے لئے تیار ہوگئے۔ جو لوگ اس جنگ کے لئے نکل سکتے تھے خود نکلے اور جو کسی وجہ سے معذور تھے اُنھوں نے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر جنگ کے لئے تیار کیا۔ اور صرف تین روز میں یہ لشکر پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہوگیا۔

ان میں جو لوگ اس جنگ میں شرکت سے ہچکچاتے اُس کو یہ لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور مسلمانوں کا ہمخیال سمجھتے اس لئے ایسے لوگوں کو خصوصیت سے جنگ کے واسطے نکلنے پر مجبور کیا جو لوگ علانیہ طور پر مسلمان تھے اور ابھی تک بوجہ اپنے اعذار کے ہجرت نہیں کر سکے تھے بلکہ مکہ میں بس رہے تھے اُن کو اور بنو ہاشم کے خاندان میں جس پر بھی یہ گمان تھا کہ یہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے اُن کو بھی اس جنگ کے لئے نکلنے پر مجبور کیا۔ انھیں مجبور لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ اور ابوطالب کے دو بیٹے طالب اور عقیل بھی تھے۔

اس طرح اس لشکر میں ایک ہزار جوان دو سو گھوڑے اور چھ سو زرہیں اور ترانے گانے والی لونڈیاں اور اُن کے طبلے وغیرہ لے کر بدر کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہر منزل پر دس اونٹ ان لوگوں کے کھانے کے لئے ذبح ہوتے تھے۔

دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک تجارتی قافلہ کے اندازے سے مقابلہ کی تیاری کر کے بارہ رمضان کو شنبہ کے دن مدینہ طیبہ سے نکلے اور کئی منزل طے کرنے کے بعد بدر کے قریب پہنچ کر آپ نے دو شخصوں کو آگے بھیجا کہ وہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر لائیں۔ (مظہری)

مخبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ ابوسفیان کا قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب کی خبر پاکر ساحلِ دریا کے کنارے کنارے گذر گیا اور اُس کی حفاظت اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ مکرمہ سے ایک ہزار جوانوں کا لشکر جنگ کے لئے آرہا ہے۔ (ابن کثیر)

ظاہر ہے کہ اس خبر نے حالات کا نقشہ پلٹ دیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا۔ کہ اس آنے والے لشکر سے جنگ کرنا ہے یا نہیں۔ حضرت ابوایوب انصاری اور بعض دوسرے حضرات نے عرض کیا کہ ہم میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور نہ ہم اس قصد سے آئے ہیں۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ کھڑے ہوئے اور تعمیلِ حکم کے لئے اپنے آپ کو

پیش کیا پھر فاروق اعظمؓ کھڑے ہوئے اور اسی طرح تعمیل حکم اور جہاد کے لئے تیار ہونے کا اظہار کیا پھر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ

یا رسول اللہ جو کچھ آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہے آپ اُس کو جاری کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ یعنی جائیے آپ اور آپ کا رب لڑ بھڑ لیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں ملک حبشہ کے مقام برک غماد تک بھی لے جائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ جنگ کے لئے چلیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور اُن کو دُعائیں دیں۔ مگر ابھی تک حضرات انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہ اٹھی تھی اور یہ احتمال تھا کہ حضرات انصار نے جو معاہدہ نصرت و امداد کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا وہ اندرون مدینہ کا تھا۔ مدینہ سے باہر امداد کرنے کے وہ پابند نہیں اس لئے آپ نے پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگو مجھے مشورہ دو کہ اس جہاد پر اقدام کریں یا نہیں۔ اس خطاب کا روئے سخن انصار کی طرف تھا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاریؓ سمجھ گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ سعد بن معاذؓ نے عرض کیا

یا رسول اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور اس کی شہادت دی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں سب حق ہے اور ہم نے آپ سے عہد و پیمان کئے ہیں کہ ہر حال میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ اس لئے آپ کو جو کچھ اللہ تعالیٰ کا حکم ملا ہو اُس کو جاری فرمائیے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہم کو سمندر میں لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ دریا میں گھس جائیں گے ہم میں سے ایک آدمی بھی آپ سے پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں اس میں کوئی گرانی نہیں کہ آپ کل ہی ہمیں دشمن سے بھڑا دیں۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے کام سے ایسے حالات کا مشاہدہ کرائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ہمیں اللہ کے نام پر جہاں چاہیں لے چلئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ اللہ کے نام پر چلو۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر ہمارا غلبہ ہوگا۔ دونوں جماعتوں سے مراد۔ ایک ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اور دوسرا یہ مکہ سے آنے والا لشکر ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم میں گویا اپنی آنکھوں سے مشرکین کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ پورا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری سے لیا گیا ہے۔

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد ان آیات مذکور صدر کو دیکھئے پہلی آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۔ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو بھاری سمجھ رہی تھی۔ اس سے اشارہ اس حال کی طرف ہے جو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کے وقت بعض صحابہ کرام کی طرف سے ظاہر ہوا کہ اُنھوں نے جہاد سے پست ہمتی کا اظہار کیا۔

اور اسی واقعہ کا بیان دوسری آیت میں ہے يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۔ یعنی یہ لوگ آپ سے حق کے معاملہ میں مجادلہ اور اختلاف کرتے ہیں گویا ان کو موت کی طرف کھینچے جا رہا ہے جس کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

صحابہ کرام نے اگرچہ کوئی عدول حکمی نہ کی تھی بلکہ مشورہ کے جواب میں اپنے ضعف اور پست ہمتی کا اظہار کیا تھا۔ مگر رسول کے ساتھیوں سے ایسی رائے کا اظہار بھی ان کے مقام بلند کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند تھا اس لئے ناراضی کے الفاظ سے اُس کو بیان فرمایا گیا۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ

اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ

غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ

جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کر دے سچ کو اپنے کلاموں سے

وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ

اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی ۔ تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کر دے جھوٹ کو اور

لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ

اگرچہ ناراض ہوں گنہگار ۔ جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں

مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا

مدد کو بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے ۔ اور یہ تو دی اللہ نے فقط

بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ

خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل ، اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے ،

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

بیشک اللہ زور آور ہے حکمت والا ۔

ع ۱ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور تم لوگ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے اُن دو جماعتوں (یعنی تجارتی قافلہ یا لشکر) میں سے ایک (جماعت) کا وعدہ کر رہے تھے کہ وہ (جماعت) تمہارے ہاتھ آجائے گی (یعنی مغلوب ہو جائے گی۔ یہ وعدہ مسلمانوں سے بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی ہوا تھا۔ اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت (یعنی تجارتی قافلہ) تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا (اُس کو عملاً غلبہ دے کر) ثابت کر دے اور (یہ منظور تھا کہ) ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا (عملاً) ثابت کر دے گو یہ مجرم لوگ (یعنی مغلوب ہونے والے کفار اس کو کتنا ہی) ناپسند کریں۔ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے (اپنی تعداد اور سامانِ جنگ کی قلت اور دشمن کی کثرت دیکھ کر) فریاد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی (اور وعدہ فرمایا) کہ تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آویں گے اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد صرف اس (حکمت) کے لئے کی کہ (تم کو غلبہ پانے کی) بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو قرار آجائے (یعنی انسان کی تسلی طبعی طور پر اسباب و سامان سے ہوتی ہے اس لئے وہ بھی جمع کر دیا گیا) اور (واقع میں تو نصرت (اور غلبہ) صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والے ہیں۔

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں غزوۂ بدر کا واقعہ اور اُس میں جو حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت و امداد کے مخصوص انعامات مسلمانوں پر مبذول ہوئے ان کا بیان ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو یہ اطلاع ملی کہ قریشیوں کا ایک عظیم لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے مکہ سے نکل چکا ہے تو اب مسلمانوں کے سامنے دو جماعتیں تھیں ایک تجارتی قافلہ جس کو روایات میں عِیْر سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری یہ مسلح فوج جو مکہ سے چلی تھی جس کو نفیر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بواسطہ آپ کے سب مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر تم کو مکمل قبضہ ہو جائے گا، کہ اُس کے متعلق جو تم چاہو گے کر سکو گے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ تجارتی قافلہ پر قبضہ آسان اور بے خطر تھا اور مسلح فوج پر مشکل اور خطرات سے پُر۔ اس لئے اس مبہم وعدہ کو سُن کر بہت سے صحابہ کرام کی تمنا اور خواہش یہ ہوئی کہ وہ جماعت جس پر

مسلمانوں کا قبضہ ہونے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے وہ غیر مسلح تجارتی قافلہ ہو جائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے اکابر صحابہ کا باشارتِ ربانی یہ ارادہ ہوا کہ مسلح فوج پر قبضہ ہو تو بہتر ہوگا۔

اس آیت میں غیر مسلح جماعت پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمھیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے یکسوئی کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ پر تمہارا قبضہ ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو یعنی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ مسلح فوج سے مقابلہ اور اُس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو۔

خلاصہ اس کا مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے جو صورت پسند کی وہ نہایت پست ہمتی اور آرام طلبی اور وقتی اور ہنگامی فائدہ کی چیز تھی اور اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا وہ عالی ہمتی اور بلند مقاصد اور مکمل اور دائمی فوائد پر مشتمل تھا۔ پھر دوسری آیت میں اس کو مزید واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت سے تو کوئی چیز باہر نہ تھی اگر وہ چاہتے تو تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہو جاتا مگر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی شان کے شایان اس کو سمجھا کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو کر اس پر قبضہ ہو تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ تو علیم و خبیر اور ہر کام کے آغاز و انجام سے باخبر ہیں اُن کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کرکے بھی فرما سکتے تھے کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا۔

اس ابہام کی وجہ واللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام کا امتحان کرنا تھا کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو۔ اور اُن کی اخلاقی تربیت بھی تھی جس کے ذریعہ اُن کو عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبرانا سکھایا گیا۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں اُس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں نصرت و امداد کی دعاء کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ آپ دعاء مانگتے تھے اور صحابہ کرام آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں

یا اللہ مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اُس کو جلد پورا فرما دے۔ یا اللہ اگر یہ

تھوڑی سی جماعت مسلمین فنا ہوگئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا (کیونکہ ساری زمین کفر و شرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی طرح الحاح و زاری کے ساتھ دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

آیت میں اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے رب سے استغاثہ کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے یہ استغاثہ اگرچہ دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا تھا مگر تمام صحابہ آمین کہہ رہے تھے اس لئے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

اس کے بعد اس دعا کی قبولیت کا بیان اس طرح فرمایا فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا جو یکے بعد دیگرے قطار کی صورت میں آنے والے ہوں گے۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بے نظیر قوت و طاقت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو قوم لوط علیہ السلام کی زمین کا تختہ الٹنے کے وقت پیش آیا کہ جبریل امین نے ایک پر کے ذریعہ یہ تختہ الٹ دیا۔ ایسی بے مثل طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلہ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی ایک بھی کافی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس لئے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا تاکہ ان کے قلوب پوری طرح مطمئن ہوجائیں۔

چوتھی آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد فرمایا وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تمہیں بشارت ہو اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہوجائیں۔

غزوۂ بدر میں جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے امداد کے لئے بھیجے گئے ان کی تعداد اس جگہ ایک ہزار مذکور ہے اور سورۂ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے۔ اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کئے گئے ہیں۔ پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہوا جس کا سبب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی۔ دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۂ آل عمران میں پہلے مذکور ہے وہ اس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لئے اور کمک آرہی ہے۔ روح المعانی میں ابن ابی شیبہ اور ابن منذر وغیرہ سے بروایت شعبی منقول ہے کہ

مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کے لئے کمک لے کر آرہا ہے۔ اس خبر سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس پر آل عمران کی آیت اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ. نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لئے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔

اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کے ساتھ مشروط تھا کہ اگر فریق مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی وہ آل عمران کی آیت مذکورہ کے بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدہ میں تین شرطیں تھیں ایک ثابت قدمی دوسرے تقویٰ تیسرے مخالف فریق کا یکبارگی حملہ۔ پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام میں موجود تھیں اور اس میدان میں اول سے آخر تک اُن میں کہیں فرق نہیں آیا مگر تیسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی اس لئے پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کی نوبت نہیں آئی۔

اس لئے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا۔ جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے اُن کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اُس پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ ان تین آیتوں میں ملائکہ کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے۔ سورۂ انفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اُس میں تو ان ملائکہ کی صفت میں مُرْدِفِيْنَ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے لگانے والے اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں۔ اور سورۂ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت مُنْزَلِيْنَ ارشاد فرمائی۔ یعنی یہ فرشتے آسمان سے اُتارے جائیں گے اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں ان سے کام لینے کے بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کے لئے بھیجے جائیں گے اور آل عمران کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اُس میں ملائکہ کی صفت مُسَوِّمِيْنَ ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوۂ حنین میں مدد کے لئے آنے والے فرشتوں کے عمامے سرخ تھے۔

تَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

اس میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمادی کہ جو مدد بھی کہیں سے آتی ہے خواہ کسی ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اسی کے قبضہ میں ہے فرشتوں کی مدد بھی اسی کے تابع فرمان ہے اس لئے تمہاری نظر صرف اسی ذات وحدہ لاشریک لہ کی طرف رہنی چاہئے کیونکہ وہ بڑا قدرت والا حکمت والا ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

جس وقت کہ ڈال دی تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے اور اتارا تم پر آسمان سے

مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ

پانی کہ اس سے تم کو پاک کر دے اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدم۔ جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو

اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا

کہ میں ساتھ ہوں تمہارے سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے، میں ڈال دوں گا دل میں کافروں کے

الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۭ ذٰلِكَ

دہشت سو مارو گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور۔ یہ

بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اس واسطے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے اور جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا

فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ

تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝

کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا۔

خلاصۂ تفسیر

اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کے لئے اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس پانی کے ذریعہ تم کو بے وضو یا بے غسل ہونے کی حالت سے)

پاک کر دے اور (تاکہ اُس کے ذریعہ) تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے اور (تاکہ) تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور (تاکہ) تمہارے پاؤں جما دے (یعنی تم ریگ میں نہ دھنسو)۔ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ آپ کا رب (اُن) فرشتوں کو (جو مدد کے لئے نازل ہوئے تھے) حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں تو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رُعب ڈالے دیتا ہوں سو تم کفار کی گردنوں پر (حربہ) مارو اور اُن کے پور پور کو مارو۔ یہ اس بات کی سزا ہے کہ انھوں نے اللہ کی اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اُس کو) سخت سزا دیتے ہیں (خواہ دنیا میں کسی حکمت سے یا آخرت میں یا دونوں میں) سو (بالفعل) یہ سزا چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب مقرر ہی ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورۂ انفال سے اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا بیان ہو رہا ہے جو اُس کے فرمانبردار بندوں پر مبذول ہوئے۔ غزوۂ بدر کے واقعات بھی اُسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ غزوۂ بدر میں جو انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے اُن میں سے پہلا انعام تو خود اس جہاد کے لئے مسلمانوں کو نکالنا ہے جس کا بیان آیت كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ میں ہوا ہے۔ دوسرا انعام فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہے جس کا ذکر آیت اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ میں آیا ہے۔ تیسرا انعام دُعا کی قبولیت اور مدد کا وعدہ پورا کرنا ہے جس کا ذکر آیت اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ میں ہوا ہے۔ مذکورالصدر آیات میں سے پہلی آیت میں چوتھے انعام کا تذکرہ ہے جس میں مسلمانوں کے لئے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک سب پر نیند غالب آکر پریشانی اور تکان کا دور ہو جانا دوسرے بارش کے ذریعہ ان کے لئے پانی مہیا فرمانا اور میدانِ جنگ کو ان کے لئے ہموار اور دشمن کے لئے دَلدل بنا دینا۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفارِ مکہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر تھا۔ پانی اُس کے قریب تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصہ میں جگہ ملی۔ قرآن کریم نے اس میدانِ جنگ کا نقشہ اسی سورت کی بیالیسویں آیت میں اس طرح کھینچا ہے اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى جس کا مفصل بیان بعد میں آئے گا۔

جس جگہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام فرمایا، اُس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذرؓ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیش نظر اختیار

فرمایا گیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکم خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جا سکتا ہے تب حضرت حباب بن منذرؓ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اُس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ مل جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اُس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنا دیں جہاں آپ مقیم رہیں اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔

منشا اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ میں جہاد کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر ان صحابہ کرام کے ساتھ جا ملیں، جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے ہیں کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جانثاری اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر ان کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا، آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے رفیق کار رہیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس جانبازانہ پیش کش پر دعائیں دیں اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ کے لئے بنا دیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذؓ دروازہ پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ کی پہلی رات تھی۔ تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا۔ میدان جنگ کا بھی اچھا مقام اُن کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی، بعض لوگوں کے دل میں شیطان نے یہ وساوس بھی ڈالنے شروع کئے کہ تم لوگ اپنے آپ کو حق پر کہتے ہو اور اس وقت بھی بجائے آرام کرنے کے نماز تہجد وغیرہ میں مشغول ہو مگر حال یہ ہے کہ دشمن ہر حیثیت سے تم پر غالب اور تم سے بڑھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک خاص قسم کی نیند مسلط فرما دی جس نے ہر مسلمان کو خواہ اُس کا ارادہ سونے کا تھا یا نہیں جبراً سلا دیا۔

حافظ حدیث ابویعلی نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ غزوہ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سو نہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نماز تہجد میں مشغول رہے۔

اور ابن کثیرؒ نے بحوالہ صحیح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں جب کہ

اپنے عریش یعنی سائبان میں نماز تہجد میں مشغول تھے آپ کو بھی کسی قدر اونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔ اے ابوبکر خوشخبری سنو یہ جبرئیل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں اور یہ کہہ کر آپ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی۔ اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری)

اور جیسا غزوۂ بدر میں تکان اور پریشانی دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام پر خاص قسم کی نیند مسلط فرمائی اسی طرح غزوۂ اُحد میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن و اطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

دوسری نعمت مسلمانوں کو اس رات میں یہ ملی کہ بارش ہوگئی جس نے میدان جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ دیا، قریشی لشکر نے جس جگہ پر قبضہ کیا تھا وہاں تو بارش بہت تیز آئی اور میدان میں دلدل ہو کر چلنا مشکل ہوگیا۔ اور جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ مقیم تھے یہاں ریت کی وجہ سے چلنا مشکل تھا یہاں بارش ہلکی ہوئی جس نے تمام ریتے کو جما کر میدان کو نہایت ہموار خوشگوار بنا دیا۔

آیتِ مذکورہ میں انہیں دو نعمتوں کا ذکر ہے نیند اور بارش جس نے میدان کارزار کا نقشہ پلٹ کر وہ شیطانی وساوس دھو ڈالے جو بعض کمزور لوگوں کو ستا رہے تھے کہ ہم حق پر ہونے کے باوجود مقہور و مغلوب نظر آتے ہیں اور دشمن باطل پر ہونے کے باوجود قوت و شوکت اور اطمینان کی حالت میں ہے۔

آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ اُس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا چین دینے کے لئے اور تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اُس پانی سے تم کو پاک کر دے۔ اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمہارے پاؤں جما دے۔

دوسری آیت میں پانچویں انعام کا ذکر ہے جو اس غزوۂ بدر کے میدانِ کارزار میں مسلمانوں پر مبذول ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے بھیجے تھے اُن کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں بھی کفار کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم کفار کی گردنوں پر ضرب مارو اور اُن کے پور پور کو مارو۔

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آکر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور اُن میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی اُن کے سپرد ہو کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت و قوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر درمنثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔

تیسری آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس معرکۂ کفر و اسلام میں جو کچھ ہوا اُس کا سبب یہ تھا کہ ان کفار نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور جو اللہ و رسول کی مخالفت کرتا ہے اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب شدید اور سخت ہوا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غزوۂ بدر میں ایک طرف تو مسلمانوں پر انعامات نازل ہوئے فتح و نصرت اُن کو حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کفار پر مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب نازل فرما کر اُن کی بدکرداریوں کی تھوڑی سی سزا دے دی گئی۔ اور اس سے زیادہ بھاری سزا آخرت میں ہونے والی ہے جس کو چوتھی آیت میں بیان فرمایا ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ۔

یعنی یہ ہمارا تھوڑا سا عذاب ہے اس کو چکھو اور سمجھ لو کہ اس کے بعد کافروں کے لئے جہنم کا عذاب آنے والا ہے جو نہایت شدید و مدید اور ناقابل قیاس ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ

اے ایمان والو　جب بھڑو تم　کافروں سے میدان جنگ میں تو مت پھیرو ان سے

الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ

پیٹھ۔　اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اُس دن　مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا　یا

مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ

جا ملتا ہو فوج میں　سو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر　اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا

اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔　سو تم نے ان کو نہیں مارا　لیکن اللہ نے ان کو مارا،　اور تو نے

میں جوان کو محنت پیش آئی ہم کو اس کی اصلاح سے ان کو اس پر جزا دیں گے) ایک بات تو یہ ہوئی اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کافروں کی تدبیر کا کمزور کرنا تھا (اور زیادہ کمزوری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اپنے بر بردے کے بلکہ پٹنے سے کمزور کے ہاتھ سے مغلوب ہو جائے اور یہ بھی موقوف ہے اس پر کہ وہ آثار مؤمنین کے ہاتھ سے ظاہر ہوں ورنہ کہہ سکتے تھے کہ تدابیر تو ہماری قوی تھیں لیکن اقوای کے سامنے کہ تدبیر الہٰی ہے نہ چل سکیں تو اس سے آئندہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا حوصلہ پست نہ ہو کیونکہ ان کو تو ضعیف ہی سمجھتے) اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے پاس آموجود ہوا کہ جو حق پر تھا اس کو غلبہ ہو گیا) اور اگر اب حق زیادہ واضح ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے باز آجاؤ تو یہ تمہارے لئے نہایت خوب ہے اور اگر (اب بھی باز نہ آئے بلکہ) تم پھر وہی کام کرو گے (یعنی مخالفت) تو ہم بھی پھر وہی کام کریں گے (یعنی تم کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب کر دیں) اور (اگر تم کو اپنی جمعیت کا گھمنڈ ہو کہ اب کی بار اس سے زیادہ جمع کر لیں گے تو یاد رکھو کہ) تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آئے گی گو کتنی زیادہ ہو اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اصل میں) ایمان والوں کے ساتھ (یعنی ان کا مددگار) ہے (گو کسی عارض کی وجہ سے کسی وقت ان کے غلبہ کا ظہور نہ ہو لیکن اصل محل غلبہ کے یہی ہیں اس لئے ان سے مقابلہ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اسلام کا ایک جنگی قانون بتلایا گیا ہے پہلی آیت میں لفظ زَحْفًا سے مراد دونوں لشکروں کا مقابلہ اور اختلاط ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ایسی جنگ چھڑ جانے کے بعد پشت پھیرنا اور میدان سے بھاگنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

دوسری آیت میں اس حکم سے ایک استثناء کا ذکر اور ناجائز طور پر بھاگنے والوں کے عذاب شدید کا بیان ہے۔

استثناء دو حالتوں کا ہے اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ یعنی جنگ کے وقت پشت پھیرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہے۔ ایک تو یہ کہ میدان سے پشت پھیرنا محض ایک جنگی چال کے طور پر دشمن کو دکھلانے کے لئے ہو حقیقۃً میدان سے ہٹنا مقصد نہ ہو بلکہ مخالف کو ایک غفلت میں ڈال کر یکبارگی حملہ پیش نظر ہو یہ معنی ہیں اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ کے کیونکہ تحرّف کے معنی کسی ایک جانب مائل ہونے کے آتے ہیں۔ (روح المعانی)

دوسری استثنائی حالت جس میں میدان سے پشت پھیرنے کی اجازت ہے یہ ہے کہ اپنے موجودہ

لشکر کی کمزوری کا احساس کرکے اس سے پیچھے ہٹیں کہ مجاہدین کی مزید کمک حاصل کرکے پھر حملہ آور ہوں۔ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ کے یہی معنی ہیں کیونکہ تَحَيُّز کے لفظی معنی انضمام اور ملنے کے ہیں اور فِئَة کے معنی جماعت کے، مطلب یہ ہے کہ اپنی جماعت سے مل کر قوت حاصل کرنے اور پھر حملہ کرنے کی نیت سے میدان چھوڑے تو یہ جائز ہے۔

یہ استثناء ذکر کرنے کے بعد اُن لوگوں کی سزا کا ذکر ہے جنہوں نے استثنائی صورت کے بغیر ناجائز طور پر میدان چھوڑ یا پشت موڑی۔ ارشاد ہے فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ یعنی میدان سے بھاگنے والے اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ حکم معلوم ہوا کہ فریق مقابل کتنی ہی زیادہ تعداد اور قوت و شوکت میں ہو مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ سے پشت پھیرنا حرام ہے بجز دو استثنائی صورتوں کے کہ پشت پھیرنا بھاگنے کے لئے نہ ہو بلکہ یا تو جنگی پینترا بدلنے کے طور پر ہو اور یا کمک حاصل کرکے دوبارہ حملہ کرنے کے قصد سے ہو۔

غزوۂ بدر میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اس وقت یہی حکم عام تھا کہ خواہ کتنی ہی بڑی تعداد سے مقابلہ ہو جائے اور اپنی تعداد سے اُن کی کوئی نسبت نہ ہو پھر بھی پشت پھیرنا اور میدان چھوڑنا جائز نہیں۔ میدانِ بدر میں یہی صورت تھی کہ تین سو تیرہ کا مقابلہ تگنی تعداد یعنی ایک ہزار سے ہو رہا تھا۔ بعد میں تخفیف کے احکام سورۂ انفال کی آیت (۶۵) اور (۶۶) میں نازل ہوئے آیت ۶۵ میں بیس مسلمانوں کو دو سو کافروں کے اور سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کے مقابلہ میں جہاد کرنے کا حکم ہے اور آیت (۶۶) میں مزید تخفیف کا یہ قانون نازل ہوگیا۔ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ یعنی اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کر دی اور تمہارے ضعف کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کفار پر غالب آسکیں گے۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ اپنے سے دوگنی تعداد تک تو مسلمانوں ہی کے غالب رہنے کی توقع ہے اس لئے پشت پھیرنا جائز نہیں۔ ہاں فریق مخالف کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگا نہیں ہاں جو دو آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے (روح البیان) اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے۔ جمہور اُمت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک حکم شرعی یہی ہے کہ جب تک فریق مخالف کی تعداد دوگنی سے زائد نہ ہو اُس وقت تک میدان جنگ سے بھاگنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کو انسان کے لئے مہلک فرمایا اُن میں میدان جنگ سے بھاگ جانا بھی شمار فرمایا۔ اور غزوۂ حُنین کے واقعہ میں صحابہ کرام کی ابتدائی پسپائی کو قرآن کریم نے ایک شیطانی لغزش قرار دیا جو اُس کے گناہ عظیم ہونے کی دلیل ہے ارشاد فرمایا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ۔

اور ترمذی، ابوداؤد کی ایک روایت میں جو قصہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا منقول ہے کہ ایک مرتبہ جنگ سے بھاگ کر انھوں نے مدینہ میں پناہ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف جرم کیا کہ ہم میدان جنگ سے بھاگنے والے مجرم ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اظہار ناراضی کے ان کو تسلی دی اور فرمایا بَلْ اَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ وَاَنَا فِئَتُكُمْ یعنی تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارے لئے کمک ہوں۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ ان لوگوں کا بھاگ کر مدینہ میں پناہ لینا اُسی استثناء کے اندر داخل ہے جس میں کمک حاصل کرنے کے لئے میدان چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حق تعالیٰ کے خوف و ہیبت و عظمت کا جو مقام خاص حاصل تھا اُس کی بنا پر وہ اس ظاہری پسپائی سے بھی گھبرائے اور اپنے آپ کو مجرم کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تیسری آیت میں غزوۂ بدر کے بقیہ واقعہ کا بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ غزوۂ بدر کی حیرت انگیز فتح میں کثرت کے قلت سے اور قوت کے ضعف سے مغلوب ہوجانے کو اپنی سعی و عمل کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اُس ذات پاک کی طرف دیکھو جس کی نصرت و امداد نے یہ نقشہ جنگ پلٹ دیا۔

واقعہ جو اس آیت میں بیان ہوا اُس کی تفصیل ابن جریر طبریؒ اور بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس وغیرہ سے یہ نقل کی ہے کہ معرکۂ بدر کے دن جب مکہ کے ایک ہزار جوانوں کا لشکر ٹیلہ کے پیچھے سے میدان میں آیا تو مسلمانوں کی قلت وضعف اور اپنی کثرت و قوت پر فخر کرتا ہوا متکبرانہ انداز سے سامنے آیا، اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ یا اللہ یہ تیرے جھٹلانے والے قریش فخر و تکبر کرتے ہوئے آرہے ہیں آپ نے جو فتح کا وعدہ مجھ سے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرما (روح البیان)۔ تو جبریل امین نازل ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ایک مٹھی خاک کی لے کر دشمن کے لشکر کی طرف پھینک دیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن زید نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ مٹی اور کنکروں کی مٹھی بھری ایک لشکر کے داہنے حصہ پر دوسری بائیں حصہ پر تیسری سامنے کی جانب پھینک دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس ایک یا تین مٹھی بھر کنکریوں کو قدرت نے

معجزانہ انداز میں اس طرح پھیلا دیا کہ مخالف لشکر کا کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں اور چہرہ دل پر یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں جس کا اثر یہ ہوا کہ پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا فرشتے الگ ان کے ساتھ شریک قتال تھے۔ (مظہری۔ روح)

بالآخر کچھ لوگ مخالف فریق کے قتل ہوگئے کچھ گرفتار کرلئے گئے باقی بھاگ گئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔

بالکل مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں یہ فتح عظیم مسلمانوں کو حاصل ہوئی میدانِ جنگ سے واپس آکر آپس میں گفتگوئیں شروع ہوئیں صحابہ کرام اپنے اپنے کارنامے ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ جس میں اُن کو یہ ہدایت دی گئی کہ اپنی سعی وعمل پر ناز نہ کرو یہ جو کچھ ہوا وہ صرف تمھاری محنت وکوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خالص حق تعالیٰ کی نصرت وامداد کا ثمرہ تھا۔ جو دشمن تمھارے ہاتھوں قتل ہوئے اُن کو درحقیقت تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے۔

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد ہوا۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى یعنی یہ مٹھی کنکریوں کی جو آپ نے پھینکی وہ درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھینکنے کا یہ نتیجہ کہ لشکر دشمن کے ہر فرد کی آنکھوں میں پہنچ کر سب کو سراسیمہ کردے یہ آپ کے پھینکنے کا اثر نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ صورت پیدا فرمائی ؎

مارمیت اذ رمیت گفت حق کارما بر کارہا دارد سبق

غور کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے جہاد کی فتح وکامیابی سے زیادہ قیمتی یہ ہدایت تھی جس نے اُن کے ذہنوں کو اسباب سے پھیر کر مسبب الاسباب سے وابستہ کردیا اور اس کے ذریعہ اُس فخر وعُجب کی خرابی سے بچایا جس کے نشہ میں عموماً فاتح قوم مبتلا ہوجایا کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتلایا کہ فتح وشکست ہمارے حکم کے تابع ہیں۔ اور ہماری فتح ونصرت اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو طاعت گزار رہیں۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا یعنی یہ فتح عظیم ہم نے اس لئے دی کہ مؤمنین کو اُن کی محنت کا پورا صلہ دے دے۔ بلاء کے لفظی معنی امتحان کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا امتحان کبھی مصیبت ومشقت میں مبتلا کرکے ہوتا ہے اور کبھی راحت ودولت دے کر۔ بلاءِ حَسَن اُس امتحان کو کہا گیا ہے جو راحت، دولت اور فتح ونصرت دے کر لیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ہمارا انعام سمجھ کر شکر گزار رہتے ہیں یا اُس کو اپنی ذاتی قابلیت کا اثر سمجھ کر فخروناز میں مبتلا ہوجاتے اور اپنے عمل کو برباد کردیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کے فخروناز کی کوئی

گنجائش نہیں ہے بقول مولانا رومیؒ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

چوتھی آیت میں اس کے بعد اس فتح کا ایک اور فائدہ بھی یہ بتلایا گیا کہ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی یہ فتح و نصرت اس لئے بھی مسلمانوں کو دی گئی کہ اس کے ذریعہ کافروں کی تدبیروں کو ناکام اور ان کا زور توڑ دیا جائے۔ جس سے وہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ نہیں اور کوئی تدبیر بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پانچویں آیت میں شکست خوردہ قریشی کفار کو خطاب اور ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو قریشی لشکر کے مسلمانوں کے مقابلہ پر مکہ سے نکلنے کے وقت پیش آیا تھا۔

وہ یہ کہ جب قریشی کفار کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا تو مکہ سے نکلنے سے پہلے لشکر کے سردار ابوجہل وغیرہ نے بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دعائیں مانگی تھیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس دعا میں انہوں نے اپنی فتح کی دعا کرنے کے بجائے عام الفاظ میں اس طرح دعا مانگی

یا اللہ دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ و افضل ہے اور دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اور دونوں پارٹیوں میں سے جو زیادہ کریم و شریف ہے اور دونوں میں سے جو دین افضل ہے اُس کو فتح دیجئے۔ (مظہری)

یہ بے وقوف تو یوں سمجھ رہے تھے کہ بمقابلہ مسلمانوں کے ہم ہی اعلیٰ و افضل اور زیادہ ہدایت پر ہیں اس لئے یہ دعا ہمارے حق میں ہے اور اس دعاء کے ذریعہ وہ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ اور جب ہم فتح پائیں تو یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے حق پر ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

مگر اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ اس دعاء میں درحقیقت وہ اپنے لئے بددعا اور مسلمانوں کے لئے دعاء کر رہے ہیں۔ انجام جنگ سامنے آنے کے بعد قرآن کریم نے ان کو بتلایا اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ یعنی اگر تم خدائی فیصلہ چاہتے ہو تو وہ سامنے آچکا کہ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہو گئی۔ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اور اگر تم اب بھی اپنے کفر و عناد سے باز آگئے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ اور اگر تم پھر اپنی شرارت اور جنگ کی طرف لوٹے تو ہم بھی مسلمانوں کی مدد کی طرف لوٹیں گے۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ یعنی تمہاری جماعت اور جتھا کتنا ہی زیادہ ہو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے مقابلہ میں تمہیں کچھ کام نہ دے گا۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی کوئی جماعت تمہیں کیا کام دے سکتی ہے جب کہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو

تَسْمَعُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا

سن کر۔ اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے

يَسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ

نہیں۔ بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو

لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ

نہیں سمجھتے۔ اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا، اور اگر ان کو اب سنا دے

لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ

تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر۔ اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا

وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ

اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے، اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے

بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

آدمی سے اس کے دل کو اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہو گے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس کا کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم (اعتقاد سے) سن تو لیتے ہی ہو (یعنی جیسا اعتقاد سے سن لیتے ہو ایسا ہی عمل بھی کیا کرو) اور تم (ترک اطاعت میں) ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا (جیسا کفار کہ مطلق سماع کے اور منافقین سماع مع اعتقاد کے مدعی تھے) حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں (کیونکہ تفہم اور اعتقاد دونوں ہیں مفقود ہے مطلب یہ کہ ثمرہ اعتقاد سننے کا عمل ہے جب عمل نہ ہوا تو بعض وجوہ سے مشابہ اسی کے ہو گیا کہ جیسے اعتقاد کے ساتھ سنا ہی نہیں جس کو تم بھی سخت مذموم جانتے ہو) بیشک (یہ بات ضرور ہے کہ اعتقاد سے سن کر عمل نہ کرنے والے اور ایک بلا اعتقاد سننے والے جو مثل نہ سننے کے ہے برے ہونے میں متفاوت ضرور ہیں کیونکہ کافر اور عاصی برابر نہیں چنانچہ) بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو (حق بات کو اعتقاد کے ساتھ سننے سے) بہرے ہیں (اور حق بات کے کہنے سے) گونگے ہیں اور جو کہ (حق بات کو) ذرا نہیں سمجھتے (اور باوجود اعتقاد کے جن سے عمل میں

کوتاہی ہو جاتی ہے وہ بدتر نہیں ہیں گو بد ہیں سو بد بھی نہ ہونا چاہئے) اور (حق تعالیٰ نے جو ان کا حال مذکور ہوا کہ وہ اعتقاد سے نہیں سنتے وجہ اس کی یہ ہے کہ ان میں ایک بڑی خوبی کی کمی ہے اور وہ خوبی طلب حق ہے کیونکہ مبدأ اعتقاد کا بھی طلب اور تلاش ہے گو اس وقت معتقد نہ ہو مگر کم از کم تردد تو ہو پھر اسی تردد و طلب کی برکت سے حق واضح ہو جاتا ہے اور وہ تردد اعتقاد بن جاتا ہے جس پر سماع کا نافع ہونا موقوف ہے سو ان میں یہی خوبی مفقود ہے چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے (مراد یہ کہ ان میں وہ خوبی مذکور ہوتی کیونکہ خوبی کے وجود کے وقت علم الٰہی کا تعلق لازم ہے پس لازم بول کر ملزوم مراد لے لیا اور کوئی خوبی اس لئے کہا کہ جب یہی خوبی نہیں جس پر مدار نجات ہے تو گویا کوئی خوبی بھی نہیں یعنی اگر ان میں طلب حق ہوتی) تو (اللہ تعالیٰ) ان کو (اعتقاد کے ساتھ) سننے کی توفیق دیتے (جیسا مذکور ہوا کہ طلب سے اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے) اور اگر (اللہ تعالیٰ) ان کو اب (حالت موجودہ میں کہ ان میں طلب حق نہیں ہے) سنا دیں (جیسے کہ گاہ گاہ ظاہری کانوں سے سن ہی لیتے ہیں) تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے (یعنی یہ نہیں کہ تامل و تدبر کے بعد بوجہ ظہور غلطی کے روگردانی کی ہو کیونکہ یہاں غلطی کا نام و نشان ہی نہیں بلکہ غضب تو یہ ہے کہ ادھر توجہ ہی نہیں کرتے اور) اے ایمان والو! (ہم نے جو اوپر تم کو طاعت کا حکم کیا ہے تو یاد رکھو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کہ وہ حیات ابدی ہے جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجا لایا کرو جب کہ رسول (جن کا ارشاد خدا ہی کا ارشاد ہے) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف (یعنی دین کی طرف جس سے زندگی جاوید میسر ہوتی ہے) بلاتے ہوں (تو اس حالت میں جب کہ ہر طرح تمہارا ہی فائدہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ تم عمل نہ کرو) اور (اس کے متعلق دو باتیں اور جان رکھو ایک بات یہ) کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں (دو طریق سے ایک طریق یہ کہ مؤمن کے قلب میں طاعت کی برکت سے کفر و معصیت کو نہیں آنے دیتا دوسرا طریق یہ کہ کافر کے قلب میں مخالفت کی نحوست سے ایمان و طاعت کو نہیں آنے دیتا اس سے معلوم ہوا کہ طاعت کی مداومت بڑی نافع چیز ہے اور مخالفت کی مواظبت بڑی مضر چیز ہے) اور (دوسری بات یہ جان رکھو کہ) بلاشبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے (اس وقت طاعت پر جزا اور مخالفت پر سزا ہوگی اس سے بھی طاعت کا نافع ہونا اور مخالفت کا مضر ہونا ثابت ہوا)۔

معارف و مسائل

غزوۂ بدر جس کا واقعہ پچھلی آیات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اس میں اہل اسلام اور کفار دونوں کے لئے عبرت اور حکمت کے بہت سے اسباق ہیں جن کی طرف قصہ کے

درمیانی جملوں میں تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

مثلاً پچھلی آیت میں مشرکینِ مکہ کی شکست و ذلت کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی ہر طرح کی قوت و سامان کے باوجود مشرکین مکہ کی شکست کا اصلی سبب اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت تھی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے جو زمین و آسمان کے خالق و مالک کی قدرتِ کاملہ اور غیبی قوت سے قطع نظر کرکے صرف مادی قوتوں پر بھروسہ کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے باوجود اُس کی مدد و نصرت کی غلط آرزوؤں سے اپنے نفس کو فریب دیتے ہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی مضمون کا دوسرا رُخ مسلمانوں کو خطاب کرکے بیان فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو باوجود قلت تعداد و بے سامانی کے یہ فتح عظیم صرف اللہ جل شانہٗ کی نصرت و امداد سے حاصل ہوئی اور یہ نصرت و امداد نتیجہ ہے اُن کی اطاعت حق کا۔ اس اطاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی اے ایمان والو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کرو اور اُس پر مضبوطی سے قائم رہو۔ پھر اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے فرمایا وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۔ یعنی قرآن اور کلمۂ حق سن لینے کے باوجود اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔

سُن لینے سے مراد حق بات کا سننا ہے اور سننے کے چار درجات ہیں، ایک یہ کہ کوئی آواز صرف کانوں سے سن لی مگر نہ اُس کو سمجھنے کی کوشش کی نہ سمجھا اور نہ اُس پر اعتقاد و اعتماد کیا اور نہ عمل کیا۔ دوسرے یہ کہ کانوں سے سنا بھی اور سمجھا بھی مگر نہ اُس پر اعتقاد کیا نہ عمل۔ تیسرے یہ کہ سُنا بھی اور سمجھا بھی اور اعتقاد و اعتماد بھی کیا مگر عمل نہیں کیا۔ چوتھے یہ کہ سُنا بھی سمجھا بھی اور اعتماد بھی کیا اور عمل بھی۔

یہ ظاہر ہے کہ سننے کا اصل مقصد پوری طرح تو چوتھے درجہ ہی سے حاصل ہوتا ہے جو مؤمنین کاملین کا مقام ہے اور ابتدائی تینوں درجوں میں سننا ناقص اور نامکمل ہے جس کو ایک حیثیت سے نہ سننا بھی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ اگلی آیات میں آتا ہے۔ اور تیسرا درجہ جس میں حق کا سننا، سمجھنا، اعتقاد کرنا تو موجود ہے مگر عمل نہیں۔ اس میں اگرچہ سننے کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا مگر اعتقاد بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ بھی بیکار نہیں، یہ درجہ گنہگار مسلمانوں کا ہے۔ اور دوسرا درجہ جس میں صرف سننا اور سمجھنا ہے نہ اعتقاد ہے نہ عمل یہ منافقین کا درجہ ہے کہ قرآن کو سنتے بھی ہیں سمجھتے بھی ہیں اور ظاہر میں اعتقاد و عمل کا دعوٰی بھی ہے مگر حقیقت میں عقیدہ اور عمل سے خالی ہیں اور پہلا درجہ عام مشرکین و کفار کا ہے جنھوں نے کلمہ حق اور قرآن کی آیات کانوں سے

تو سُن لی مگر کبھی سمجھنے اور غور کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق بات کو سن تو لیتے ہی ہو یعنی سننا، سمجھنا، اعتقاد رکھنا تو تمہاری طرف سے موجود ہے مگر آگے اُس پر عمل بھی پورا کرو اطاعت سے روگردانی نہ کرو تاکہ سننے کا اصل مقصد مکمل ہو جائے۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید کے لئے ارشاد فرمایا وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ۔ یعنی تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے سُن لیا مگر درحقیقت سنا سنایا کچھ نہیں۔ ان لوگوں سے مراد عام کفار بھی ہیں جو سننے کا دعویٰ کرتے ہیں اعتقاد کا نہیں کرتے۔ اور منافقین بھی ہیں جو سننے کے ساتھ سمجھنے اور اعتقاد رکھنے کے بھی مدعی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غور و فکر اور صحیح سمجھ سے یہ دونوں محروم ہیں اس لئے ان کا سُننا نہ سننے کے حکم میں ہے مسلمانوں کو ان لوگوں کے مشابہ ہونے سے منع فرمایا گیا۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کی شدید مذمت ہے جو حق بات کو غور و تدبر کے ساتھ نہیں سنتے اور اُس کو قبول نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ۔

لفظ دوآبّ دابۃ کی جمع ہے اصل لغت کے اعتبار سے ہر زمین پر چلنے والے کو دابۃ کہا جاتا ہے مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابۃ کہتے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہوئے کہ سب سے بدترین چوپائے اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو حق کو سننے سے بہرے اور اُس کے قبول کرنے سے گونگے ہیں اور بہرے گونگے میں اگر کچھ عقل ہو تو وہ بھی اشاروں سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا ہے اور دوسروں کی بات سمجھ لیتا ہے یہ لوگ بہرے گونگے ہونے کے ساتھ بے عقل بھی ہیں اور یہ ظاہر ہے جو بہرا گونگا عقل سے بھی خالی ہو اُس کے سمجھنے سمجھانے کا کوئی راستہ نہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ انسان کو جو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا اور اشرف المخلوقات اور مخدوم کائنات بنایا گیا یہ سب انعامات صرف اطاعتِ حق میں مضمر اور منحصر ہیں جب انسان نے حق بات کے سننے سمجھنے اور ماننے سے اعراض کیا تو یہ سارے انعامات اُس سے سلب ہو جاتے ہیں اور وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

تفسیر رُوح البیان میں ہے کہ انسان اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے سب جانوروں سے افضل و اعلیٰ ہے اور فرشتوں سے کم درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے سعی و عمل اور طاعتِ حق میں جدوجہد کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ و اشرف ہو جاتا ہے اور اگر اُس نے اطاعتِ حق سے روگردانی کی تو پھر وہ اسفل سافلین میں جاتا ہے اور جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتا ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد ہے وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اُن میں کوئی بھلائی دیکھتے تو اُن کو اعتقاد کے ساتھ سننے کی توفیق بخش دیتے اور اگر ان کو بحالت موجودہ کہ اُن میں طلب حق نہیں ہے حق بات سنا دیں تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

بھلائی سے مراد اس جگہ طلب حق ہے کہ طلب ہی کے ذریعہ تدبر اور فہم کے دروازے کھلتے ہیں اور اسی سے اعتقاد و عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اور جس میں طلب حق نہیں گویا اُس میں کوئی بھلائی نہیں معنی یہ ہیں کہ اگر اُن میں کوئی بھلائی موجود ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی جب اللہ تعالیٰ کے علم میں اُن کے اندر کوئی بھلائی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ درحقیقت وہ ہر بھلائی سے محروم ہیں اور اسی محرومی کی حالت میں اگر ان کو غور و تدبر اور اعتقاد حق کی دعوت دی جائے تو وہ ہرگز قبول نہ کریں گے بلکہ اُس سے منہ پھیر کر بھاگیں گے۔ یعنی ان کی یہ روگردانی اس بنا پر نہ ہوگی کہ دین میں اُن کو اعتراض کی بات نظر آگئی اس لئے نہیں مانا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حق بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔

اس تقریر سے وہ منطقی شبہ بھی رفع ہوگیا جو بعض اہل علم کے دلوں میں کھٹکتا ہے کہ یہ قیاس کی شکل اول ہے حد اوسط حذف کریں تو نتیجہ غلط نکل رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں حد وسط مکرر نہیں کیونکہ پہلے لاسمعهم کا مفہوم الگ ہے دوسرے اسمعهم کا الگ پہلے میں سماع قبول اور سماع نافع مراد ہے دوسرے میں خالی سماع۔

پانچویں آیت میں پھر اہل ایمان کو خطاب کرکے اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل و اطاعت کا حکم ایک خاص انداز سے دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں جس چیز کی دعوت دیتے ہیں اُس میں اللہ اور رسول کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں بلکہ سب احکام تمھارے ہی فائدہ کیلئے دیئے گئے ہیں ارشاد فرمایا اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ یعنی بات مانو اللہ کی اور رسول کی جب کہ رسول تم کو ایسی چیز کی طرف بلائے جو تمھارے لئے زندگی بخش ہے۔

وہ حیات جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے اس میں کئی احتمال ہیں اس لئے علماء تفسیر نے مختلف قول اختیار کئے ہیں سُدّی نے کہا کہ وہ حیات بخش چیز ایمان ہے کیونکہ کافر مردہ ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ وہ قرآن ہے جس میں دنیا و آخرت کی زندگی اور فلاح مضمر ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ وہ حق ہے۔ ابن اسحاق نے فرمایا کہ مراد اُس سے جہاد ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عزت بخشی۔ اور یہ سب احتمالات اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں اور مراد یہ ہے کہ ایمان یا قرآن یا اتباع حق وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کا دل زندہ ہوتا ہے اور دل کی زندگی یہ ہے کہ بندہ اور اللہ تعالیٰ کے

درمیان جو غفلت و شہوت وغیرہ کے حجابات حائل ہیں وہ راستے ہٹ جائیں اور حجابات کی ظلمت دور ہو کر نور معرفت دل میں جگہ کرلے۔

ترمذی اور نسائی نے بروایت حضرت ابوہریرہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اُبی بن کعبؓ کو بلایا، اُبی بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے جلدی جلدی نماز پوری کرکے حاضر ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ میرے پکارنے پر آنے میں دیر کیوں لگائی۔ اُبی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ میں نماز میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سُنا اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ۔ اُبی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس کی اطاعت کروں گا، اگرچہ نماز بھی آپ بلائیں گے فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔

اس حدیث کی بنا پر بعض فقہاء نے فرمایا کہ حکم رسول کی اطاعت سے نماز میں جو کام بھی کریں اس سے نماز میں خلل نہیں ہوتا اور بعض نے فرمایا کہ اگرچہ خلاف نماز افعال سے نماز قطع ہو جائے گی اور اس کی بعد میں قضا کرنا پڑے گی لیکن کرنا یہی چاہئے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو بلائیں اور وہ نماز میں بھی ہو تو نماز کو قطع کرکے تعمیل حکم کرے۔

یہ صورت تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتھ مخصوص ہے لیکن دوسرے ایسے کام جن میں تاخیر کرنے سے کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو اُس وقت بھی نماز قطع کر دینا اور پھر قضا کرلینا چاہئے جیسے کوئی نمازی یہ دیکھے کہ نابینا آدمی کنویں یا گڑھے کے قریب پہنچ کر گرا چاہتا ہے تو فوراً نماز توڑ کر اس کو بچانا چاہئے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ یعنی یہ بات سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اُس کے قلب کے درمیان۔ اس جملہ کے دو معنی ہوسکتے ہیں اور دونوں میں عظیم حکمت و موعظت پائی جاتی ہے جو ہر انسان کو ہر وقت یاد رکھنی چاہئے۔

ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ جب کسی نیک کام کے کرنے یا گناہ سے بچنے کا موقع آئے تو اُس کو فوراً کر گزرو۔ دیر نہ کرو اور اس فرصت وقت کو غنیمت سمجھو کیونکہ بعض اوقات آدمی کے ارادہ کے درمیان قضاء الٰہی حائل ہو جاتی ہے وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کوئی بیماری پیش آجائے یا موت آجائے یا کوئی ایسا مشغلہ پیش آجائے کہ اس کام کی فرصت نہ ملے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرصت عمر اور فرصت وقت کو غنیمت سمجھ کر آج کا کام کل پر نہ ڈالے کیونکہ معلوم نہیں کل کیا ہونا ہے ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش ای ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اور دوسرا مطلب اس جملہ کا یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے نہایت قریب

ہونا بتلا گیا جیسے دوسری آیت میں نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ میں اللہ تعالیٰ کا انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہونے کا بیان ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کا قلب ہر وقت حق تعالیٰ کے خاص تصرف میں ہے جب وہ کسی بندے کی برائیوں سے حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے قلب اور گناہوں کے درمیان آڑ کر دیتے ہیں اور جب کسی کی بدبختی مقدر ہوتی ہے تو اُس کے دل اور نیک کاموں کے درمیان آڑ کر دی جاتی ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی دُعاؤں میں اکثر یہ دُعا کیا کرتے تھے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ. یعنی اے دلوں کے پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت اور قائم رکھئے۔

حاصل اس کا بھی یہی ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل میں دیر نہ لگاؤ اور فرصت وقت کو غنیمت جان کر فوراً کر گزرو معلوم نہیں کہ پھر دل میں نیکی کا یہ جذبہ درمنگ باقی رہتی ہے یا نہیں۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَ

اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر ، اور

اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ

جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے ۔ اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے

مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ

مغلوب پڑے ہوئے ملک میں ڈرتے تھے کہ اُچک لیں تم کو لوگ

فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ

پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم

تَشْكُرُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

شکر کرو ۔ اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ

اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں جان کر ۔ اور جان لو کہ بیشک تمھارے مال

وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے ۔

خلاصۂ تفسیر

اور جس طرح تم پر اپنی اصلاح کے متعلق طاعت واجب ہے اسی طرح یہ بھی طاعت واجب ہے

دخل ہے کہ بقدر وسع دوسروں کی اصلاح میں بطریق امر بالمعروف ونہی عن المنکر بالید یا باللسان ترک اختلاط یا نفرت بالقلب جو کہ آخری درجہ ہے کوشش کرو ورنہ درصورت مداہنت ان منکرات کا وبال جیسا مرتکبین منکرات پر واقع ہوگا ایسا ہی کسی درجہ میں ان مداہنت کرنے والوں پر بھی واقع ہوگا جب یہ بات ہے تو) تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں میں مرتکب ہوئے ہیں (بلکہ ان گناہوں کو دیکھ کر جنہوں نے مداہنت کی ہے وہ بھی اس میں شریک ہوں گے اور اس سے بچنا یہی ہے کہ مداہنت مت کرو) اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں (ان کی سزا سے خوف کرکے مداہنت سے بچو) اور (اس غرض سے کہ نعمتوں کے یاد کرنے سے اطاعت منعم کا شوق ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو اور خاص کر) اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم ایک وقت میں یعنی قبل ہجرت مدہ میں بھی، قلیل تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی، سرزمین مکہ میں کمزور شمار کئے جاتے تھے (اور بغایت ضعف حال سے) اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو (مخالف) لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں سو (ایسی حالت میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو (مدینہ میں اطمینان سے) رہنے کو جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی (سامان سے بھی اور مردم شماری کو زیادہ کرنے سے بھی جس سے قلت اور استضعاف اور خوف اختطاف سب زائل ہوگیا) اور (صرف یہی نہیں کہ تمہاری مصیبت ہی کو دور کردیا ہو بلکہ اعلیٰ درجہ کی خوشحالی بھی عطا فرمائی کہ دشمنوں پر تم کو غلبہ دے کر کثرت فتوحات سے) تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم (ان نعمتوں کا) شکر کرو (اور بڑا شکر یہ ہے کہ اطاعت کرو) اے ایمان والو ہم مخالفت اور معصیت سے اس لئے ممانعت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے تم پر کچھ حقوق ہیں جن کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے اور معصیت سے ان حقوق میں خلل پڑتا ہے جس سے واقع میں تمہارے ہی نفع میں خلل پڑتا ہے جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو اور (باعتبار نتائج کے اس مضمون کو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تم) اپنی قابل حفاظت چیزوں میں (کہ وہ تمہارے منافع ہیں جو اعمال پر مرتب ہوتے ہیں) خلل مت ڈالو اور تم تو (اس کا مضر ہونا) جانتے ہو اور (اکثر اوقات مال و اولاد کی محبت مخل طاعت ہو جاتی ہے اس لئے تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ) تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان کی محبت کو ترجیح دیتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے سو تم ان کی محبت کو ترجیح مت دینا) اور (اگر ان کے منافع کی طرف نظر جائے تو تم) اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں) بڑا بھاری اجر (موجود) ہے (کہ اس کے سامنے یہ فانی منفعتیں محض ہیچ ہیں)۔

معارف ومسائل

قرآن کریم نے غزوۂ بدر کی کچھ تفصیلات اور اُس میں مسلمانوں پر اپنے نعامات کا ذکر فرمانے کے بعد اُس سے حاصل شدہ نتائج اور پھر اُس کے مناسب مسلمانوں کو کچھ پند ونصیحت کے ارشادات بیان فرمائے ہیں جن کا سلسلہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ سے شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آیات ہیں جو اوپر لکھی گئی ہیں۔

ان میں سے پہلی آیت میں ایسے گناہ سے بچنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے جس کا عذاب شدید صرف گناہ کرنے والوں پر محدود نہیں رہتا بلکہ ناکردہ گناہ لوگ بھی اُس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وہ گناہ کونسا ہے اس میں علماء تفسیر کے متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گناہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت اور بُرے کاموں سے روکنے کی جد وجہد کا ترک کر دینا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا حکم دیا ہے کہ کسی جُرم وگناہ کو اپنے ماحول میں قائم نہ رہنے دیں کیونکہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا یعنی جرم وگناہ دیکھتے ہوئے باوجود قدرت کے اُس کو منع نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں گے جس سے نہ گنہگار بچیں گے نہ بے گناہ۔

اور بے گناہ سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اصل گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں مگر امر بالمعروف کے ترک کر دینے کے گنہگار وہ بھی ہیں اس لئے یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک کے گناہ کا عذاب دوسرے پر ڈالنا بے انصافی اور قرآنی فیصلہ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں گنہگار اپنے اصل گناہ کے وبال میں اور بے گناہ ترک امر بالمعروف کے گناہ میں پکڑے گئے کسی کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا گیا۔

امام بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں بروایت حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ وصدیقہ عائشہؓ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کے گناہ کا عذاب عام لوگوں پر نہیں ڈالتے جب تک کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول میں گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور اُن کو یہ قدرت بھی ہو کہ اُس کو روک سکیں اس کے باوجود انہوں نے اس کو روکا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سب کو گھیر لیتا ہے۔

اور ترمذیؒ ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ آپ نے فرمایا کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں وظلم سے اُس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنا عذاب عام کر دیں۔

صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گنہگار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت کرنے والے ہیں، یعنی باوجود قدرت کے ان کو گناہ سے نہیں روکتے ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقہ والے اوپر آ کر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کر کے اس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچیں گے۔

ان روایات کی بنا پر بہت سے حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا کہ اس آیت میں فتنہ سے مراد یہی گناہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کر دینا ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس گناہ سے مراد ترکِ جہاد کا گناہ ہے خصوصاً اُس وقت جبکہ امیر المومنین کی طرف سے جہاد کی دعوتِ عام مسلمانوں کو دے دی جائے اور اسلامی شعائر کی حفاظت اس پر موقوف ہو کیونکہ اس وقت ترکِ جہاد کا وبال صرف تارکینِ جہاد پر نہیں بلکہ پورے مسلمانوں پر پڑتا ہے کفار کے غلبہ کے سبب عورتیں بچے بوڑھے اور بہت سے بے گناہ مسلمان قتل و غارت کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے جان و مال خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں **عذاب سے مراد دنیوی مصائب اور تکلیفیں ہوں گی۔**

اور قرینہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ پچھلی آیات میں بھی ترکِ جہاد کرنے والوں پر ملامت کی گئی ہے وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ۔ اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ۔ وغیرہ آیاتِ سابقہ اسی بیان میں آئی ہیں۔

اور غزوۂ احد میں جبکہ چند مسلمانوں کو لغزش ہوئی کہ گھاٹی کی حفاظت چھوڑ کر نیچے آ گئے تو اُس کی مصیبت صرف غلطی کرنے والوں پر نہیں بلکہ پورے مسلم لشکر پر پڑی یہاں تک کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معرکہ میں زخم آیا۔

دوسری آیت میں بھی احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کو آسان کرنے اور اُس پر ترغیب دینے کے لئے مسلمانوں کو ان کی پچھلی خستہ حالی اور ضعف و کمزوری پھر اُس کے بعد اپنے فضل و انعام سے حالات بدل کر اُن کو قوت اور اطمینان عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ ارشاد فرمایا

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

یعنی اے مسلمانو اپنے اُس حال کو یاد کرو جو قبل ہجرت مکہ معظمہ میں تھا کہ تعداد میں بھی کم تھے اور قوت میں بھی ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ دشمن اُن کو نوچ کھسوٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مدینہ میں بہترین ٹھکانا عطا فرمایا۔ اور نہ صرف ٹھکانا بلکہ اپنی تائید و نصرت سے اُن کو قوت اور دشمنوں پر فتح اور اموال عظیمہ عطا فرما دیئے۔ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یعنی تمہارے حالات کی اس کایا پلٹ اور انعاماتِ الٰہیہ کا مقصد یہ ہے کہ تم شکر گزار بندے بنو۔ اور ظاہر ہے کہ شکر گزاری اُس کے احکام کی اطاعت میں منحصر ہے۔

تیسری آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں یا آپس میں بندوں کے حقوق میں خیانت نہ کریں کہ حق ادا ہی نہ کریں یا اُس میں کوئی اور کوتاہی کر کے ادا کریں۔ آخر آیت میں وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فرما کر یہ بتلا دیا کہ تم تو خیانت کی بُرائی اور اُس کے وبال کو جانتے ہی ہو پھر اُس پر اقدام کرنا قرینِ دانشمندی نہیں۔ اور چونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے غفلت و کوتاہی کا سبب عموماً انسان کے اموال و اولاد ہوا کرتے ہیں اس لئے اس پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ یعنی یہ بات سمجھ رکھو کہ تمہارے مال و اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔

فتنہ کے معنی امتحان کے بھی آتے ہیں اور عذاب کے بھی اور ایسی چیزوں کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے جو عذاب کا سبب بنیں۔ قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معنی کے لئے لفظ فتنہ استعمال ہوا ہے یہاں تینوں معنی کی گنجائش ہے بعض وقت مال و اولاد خود بھی انسان کے لئے دنیا ہی میں وبالِ جان بن جاتے ہیں اور ان کے سبب غفلت و معصیت میں مبتلا ہو کر سبب عذاب بن جانا تو بالکل ظاہر ہے۔ اول یہ کہ مال و اولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے کہ یہ چیزیں ہمارے انعامات ہیں۔ تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت شعار بنتے ہو یا ناشکرے اور نافرمان۔ دوسرے اور تیسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال و اولاد تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے۔ بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور دنیا ہی میں اس مال و اولاد کو وہ عذاب محسوس کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کے لئے سانپ بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اور بے شمار روایاتِ حدیث میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ اور تیسرے معنی یہ کہ یہ چیزیں سبب عذاب بن جائیں یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں۔ آخر آیت میں فرمایا وَاَنَّ اللّٰهَ

عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ - یعنی یہ بھی سمجھ لو کہ جو شخص اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل میں مال و اولاد کی محبت سے مغلوب نہ ہو اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس بہت بڑا اجر ہے ۔

اس آیت کا مضمون تو سب مسلمانوں کو عام اور شامل ہے مگر واقعہ اس کے نزول کا اکثر مفسرین کے نزدیک حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوۂ بنو قریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے بنو قریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی آپ نے ان کی شرارتوں کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذؓ تمہارے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کریں اُس پر راضی ہو جاؤ۔ اُنھوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذؓ کے بجائے ابولبابہؓ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے ۔ کیونکہ حضرت ابولبابہؓ کے اہل و عیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے، ان سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔ آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہ کو بھیج دیا۔ بنو قریظہ کے سب مرد و زن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اُتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے ۔ ابولبابہؓ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے ۔ اُنھوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ وزاری سے اور کچھ اپنے اہل و عیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کئے جاؤ گے ۔ گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا ۔

مال و اولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے ۔ مگر فوراً متنبہ ہوئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی ۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ کی خدمت میں لوٹنے کے بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہوں گا چاہے اسی حالت میں موت آجائے ۔ چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اول اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اول ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی اب جب کہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے ۔

چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ جب تک خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھولنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔ آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال و اولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اُس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔ واللہ اعلم۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَتَّقُوا۟ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ

اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہوگے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ اور دور کردے گا

عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾ وَإِذْ

تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ اور جب

يَمْكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ

فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں،

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ

اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ اور جب کوئی پڑھے

عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُنَا قَالُوا۟ قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَآ ۙ إِنْ

اُن پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سُن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو

هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذْ قَالُوا۟ ٱللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا

کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں اگلوں کے۔ اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین

هُوَ ٱلْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ ٱلسَّمَآءِ

حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر آسمان سے

أَوِ ٱئْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ۚ

یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک۔ اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا اُن پر جب تک تو رہتا ان میں،

وَمَا كَانَ ٱللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾

اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا اُن پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

(اور) اے ایمان والو (اطاعت کی اور برکات سنو وہ یہ کہ) اگر تم اللہ سے ڈر کر اطاعت

کرتے رہوگے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (اس میں ہدایت اور نور قلب جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور غلبہ علی الاعداء اور نجات آخرت جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہوتا ہے سب آگیا) اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے (خدا جانے اپنے فضل سے اور کیا کیا دے دے جو قیاس و گمان میں بھی نہ آتا ہو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے سامنے تذکیر نعمت کے لئے) اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بُری بُری) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ (آیا) آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کردیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر (ان تدبیروں کے دفع کرنے کے لئے) کر رہے تھے اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے (جس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں گاؤ خورد ہوگئیں اور آپ بال بال محفوظ رہے اور صحیح سالم مدینہ آپہنچے چونکہ آپ کا اس طرح بچ رہنا مؤمنین کے حق میں بے انتہا ابواب سعادات کی مفتاح ہے اس لئے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا) اور (ان کفار کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن (کر دیکھ) لیا (یہ تو کوئی معجزہ نہیں کیونکہ) اگر ہم ارادہ کریں تو اس کی برابر ہم بھی کہہ لائیں (پس) یہ (قرآن) تو (کلام الٰہی و معجزہ وغیرہ) کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (کہ پہلے اہل ملل بھی یہی دعوٰی توحید و بعثت وغیرہ کے کرتے آئے ہیں انہی کے مضامین آپ نقل کر رہے ہیں) اور (اس سے بڑھ کر قابلِ ذکر وہ حالت ہے) جب کہ ان لوگوں نے (اپنے اس جہل مرکب میں غایت صلابت و جلادت ظاہر کرنے کو یہ بھی) کہا کہ اے اللہ اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر (اس کے نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر برسائیے یا ہم پر کوئی (اور) دردناک عذاب واقع کر دیجئے (جو کہ خارق عادت ہونے میں مثل بارش سنگ کے ہو اور جب ایسے عذاب واقع نہ ہوئے تو اپنی حقانیت پر ناز کرتے ہیں) اور (یہ نہیں سمجھتے کہ باوجود ان کے بطلان کے خاص موانع کی وجہ سے یہ عقوبات مذکورہ نازل نہیں ہوتیں ان موانع کا بیان یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب دیں اور (نیز) اللہ تعالیٰ ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں (گو وہ آخرت میں بوجہ ایمان نہ ہونے کے نافع نہ ہو لیکن آخر عمل صالح ہے دنیا میں تو کفار کو نافع ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان عقوبات خارقہ سے دو امر مانع ہیں ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف رکھنا مکہ میں یا دنیا میں۔ اور دوسرا ان لوگوں کا اپنے طواف وغیرہ میں یہ کہنا غفرانک جو کہ بعد ہجرت و بعد وفات بھی باقی تھا اور ایک مانع حدیثوں میں ہے کہ حضورؐ کی امت میں کسی کا ہونا گو امت دعوت ہی ہو یہ مانع باوجود کسی کے استغفار نہ کرنے کے

بھی باقی ہے پس یہ امور فی نفسہ مانع ہوئے گو احیاناً مانع کے ہوتے ہوئے بھی کوئی عذاب خارق کسی عارضی مصلحت سے واقع ہو جائے جیسا قذف و مسخ وغیرہ کا قرب قیامت میں ہونا حدیثوں میں وارد ہے)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیت میں اس کا ذکر تھا کہ انسان کے لئے مال اور اولاد ایک فتنہ یعنی آزمائش کی چیز ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کی محبت میں مغلوب ہو کر انسان عموماً خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے حالانکہ اس عظیم نعمت کا عقلی تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی وجہ سے اُس کی طرف اور زیادہ جھکتا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت اُسی مضمون کی تکمیل ہے اس میں فرمایا ہے کہ جو شخص عقل کو طبیعت پر غالب رکھ کر اس آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت کو سب چیزوں پر مقدم رکھے جس کو قرآن و شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہا جاتا ہے تو اُس کو اس کے صلہ میں تین چیزیں عطا ہوتی ہیں فرقان، کفارۂ سیئات، مغفرت۔

فرقان اور فرق دونوں مصدر ایک ہی معنی کے ہیں۔ محاورات میں فرقان اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق و فصل کر دے۔ اسی لئے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہل حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے والوں کو فرقان عطا ہونے کا اکثر مفسرین صحابہ کے نزدیک یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد اور حفاظت اُن کے ساتھ ہوتی ہے کوئی دشمن اُن کو گزند نہیں پہنچا سکتا اور تمام مقاصد میں کامیابی اُن کی رفیق ہوتی ہے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوائے گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

تفسیر مہائمی میں ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پچھلے واقعہ میں حضرت ابولبابہؓ سے جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت کی خاطر لغزش ہو گئی تھی وہ اس لئے بھی خطا تھی کہ اہل و عیال کی حفاظت کا بھی صحیح راستہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کمل اطاعت کو اپنا شعار بنایا جاتا تو سب مال و اولاد اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آجاتے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعہ حق و باطل،

کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے تو معنی یہ ہوئے کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت اور فراست عطا فرما دیتے ہیں کہ اُن کو اچھے بُرے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں عطا ہوتی ہے وہ کفّارۂ سیئات ہے یعنی جو خطائیں اور لغزشیں اُس سے سرزد ہوتی ہیں دنیا میں ان کا کفارہ اور بدل کر دیا جاتا ہے یعنی اُس کو ایسے اعمال صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے جو اُس کی سب لغزشوں پر غالب آجاتے ہیں۔ تیسری چیز جو تقویٰ کے صلہ میں ملتی ہے وہ آخرت کی مغفرت اور سب گناہوں خطاؤں کی معافی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ یعنی اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ عمل کی جزاء تو عمل کے پیمانہ پر ہوتی ہے۔ یہاں بھی تقویٰ کی جو جزاءِ خیر تین چیزوں میں مذکور ہے وہ تو جزاء اور بدلہ کے طور پر ہے مگر اللہ تعالیٰ بڑے فضل و احسان والے ہیں اُن کی داد و دہش کسی پیمانہ کے ساتھ مقید نہیں اور اُن کے احسان و انعام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اس لئے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے ان تین چیزوں کے علاوہ بھی بہت بڑی امیدیں رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک خاص انعام و احسان کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر بلکہ پوری دنیا پر ہوا ہے۔ کہ قبل از ہجرت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے نرغہ میں تھے اور وہ آپ کے قید یا قتل کرنے کے مشورے کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بسلامت و عافیت مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔

جس کا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری میں بروایت محمد بن اسحاق و امام احمد و ابن جریرؒ وغیرہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ سے آنے والے انصار کا مسلمان ہو جانا مکہ میں مشہور ہوا تو قریش مکہ کو یہ فکر دامنگیر ہوگئی کہ اب تک تو ان کا معاملہ صرف مکہ میں دائر تھا جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اب جب کہ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا اور بہت سے صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو اب ان کا ایک مرکز مدینہ طیبہ قائم ہو گیا جہاں یہ ہر طرح کی قوت ہمارے خلاف جمع کر سکتے ہیں، اور پھر ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ اب تک تو کچھ صحابہ کرام ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اب یہ بھی قوی امکان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی وہاں چلے جائیں اس لئے رؤسا مکہ نے مشورہ کے لئے دار الندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی۔ دار الندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور زمانہ اسلام میں اُس کو مسجد حرام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب الزیادات ہی وہ جگہ تھی جس کو دار الندوہ کہا جاتا تھا۔

حسب عادت اس مہم مشورہ کے لئے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہوا جس میں ابوجہل، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف، ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہوئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ کی تدبیریں زیر غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کون ہو کیوں آئے ہو۔ بتلایا کہ میں نجد کا باشندہ ہوں مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیش نظر میں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے میں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔

یہ سن کر اس کو اندر بلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہوا تو سہیلی کی روایت کے مطابق ابوالبختری ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذ اللہ وہ آپ اپنی موت مر جائیں۔ یہ سن کر شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی اور ان کے صحابہ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چھڑا لیں۔ سب طرف سے آوازیں اُٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکہ سے نکال دیا جائے یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مامون ہو جائے گا۔ اور ہمیں کچھ جنگ و جدل بھی کرنا نہ پڑے گا۔

شیخ نجدی یہ سن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں لوگ اُن کا کلام سن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر اُن کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنا لیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے۔ اب ابوجہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں۔ یہ سب لوگ یکبارگی اُن پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ہم ان کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں۔ اب رہا اُن کے قبیلہ بنو عبد مناف کا مطالبہ جو ان کے قتل کا سبب ہم پر عائد ہو گا سو ایسی صورت میں جب کہ قتل کسی ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو بڑی نہیں رہ سکتا۔ صرف خونبہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے اُن کو دے دیں گے اور بے فکر ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سُن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں۔ پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دے دی اور آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پورا کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔

مگر انبیاء علیہم السلام کی غیبی طاقت کو یہ جاہل کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس طرف جبرئیل امین نے ان کے دار المشورہ کی ساری کیفیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با خبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات میں آپ اپنے بستر پر آرام نہ کریں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

ادھر مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر آرام کریں اور یہ خوشخبری سنادی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور آپ کے بستر پر لیٹ گئے مگر اب مشکل یہ در پیش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس محاصرہ سے کیسے نکلیں۔ اس مشکل کو اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے ذریعہ حل کیا وہ یہ کہ بامر الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مٹھی میں مٹی بھر کر باہر تشریف لائے اور محاصرہ کرنے والے جو کچھ آپ کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے اُس کا جواب دیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی نظروں اور فکروں کو آپ کی طرف سے پھیر دیا کہ کسی نے آپ کو نہ دیکھا حالانکہ آپ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو اُنہوں نے بتلایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتظار میں۔ اس نے کہا کہ تم کس خام خیالی میں ہو وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں اس لئے قتل پر اقدام نہیں کیا۔ صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ خائب و خاسر ہو کر واپس ہو گئے۔ یہ رات اور اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خاص فضائل میں سے ہے۔

قریشی سرداروں کے مشورہ میں جو تین رائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش کی گئی تھیں اُن تینوں کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ - یعنی وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ کفار آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی سب تدبیریں خاک میں ملا دیں۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ - یعنی اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔ جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ ہوا۔

لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں یہ ہیں کہ کسی حیلہ و تدبیر کے ذریعہ اپنے مقابل شخص کو اس کے ارادہ سے روک دیا جائے۔ پھر اگر یہ کام کسی نیک مقصد سے کیا جائے تو یہ مکر محمود اور اچھا ہے اور کسی بُرے مقصد سے کیا جائے تو مذموم اور بُرا ہے، اس لئے یہ لفظ انسان کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایسے ماحول میں استعمال ہوتا ہے جہاں کلام کے سیاق اور تقابل کے ذریعہ مکر مذموم کا شبہ نہ ہوسکے (مظہری) جیسے یہاں ہے۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ آخر آیت میں جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ بصیغہ مضارع ہیں جو حال و استقبال کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ یعنی وہ اہل ایمان کی ایذا رسانی کی تدبیریں کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی تدبیروں کے ناکام کرنے کی تدبیر کرتے رہیں گے اس میں اشارہ ہے کہ کفار کا یہ دائمی شعار رہے گا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد بھی ہمیشہ ان سچے مسلمانوں سے ان کی تدبیروں کو دفع کرتی رہے گی۔

اکتیسویں اور بتیسویں آیتوں میں اسی دار الندوہ کے ایک شریک نضر بن حارث کی ایک بے ہودہ گفتگو اور تینتیسویں آیت میں اس کا جواب مذکور ہے۔ نضر بن حارث چونکہ تجارت پیشہ آدمی تھا مختلف ملکوں کے سفروں میں یہود و نصاریٰ کی کتابیں اور ان کی عبادتیں دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوتا تھا اس نے جب اس نے قرآن کریم میں پچھلی امتوں کے حالات سنے تو کہنے لگا کہ قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ - یعنی یہ باتیں تو ہماری سنی ہوئی ہیں اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب بعض صحابہ نے اس کو جواب دیا کہ اگر تم ایسا کلام کہہ سکتے ہو تو پھر کہتے کیوں نہیں جب کہ قرآن نے حق و باطل کا فیصلہ اس پر رکھ دیا ہے اور پوری دنیا کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر خلاف کرنے والے سچے ہیں تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ہی کی مثال پیش کریں۔ اور خلاف میں سر دھڑ کی بازی لگانے والے مال و اولاد قربان کرنے والے سب مل کر بھی ایک چھوٹی سی سورت قرآن کے مقابلہ میں پیش نہ کرسکے تو اب یہ کہنا کہ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں ایک ایسی بات ہے جو کوئی غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔ پھر جب نضر بن حارث سے

صحابہ کرامؓ نے اس کلام الٰہی کا حق ہونا بیان کیا تو اپنے غلط مذہب پر پختگی دکھلانے کے لئے کہنے لگا۔ اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ یعنی اے اللہ اگر یہی قرآن آپ کی طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھر برسا دیجئے یا کوئی دوسرا سخت عذاب نازل کر دیجئے۔

قرآن کریم نے خود اس کا جواب دیا، جیسے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے کہ آپ کے مکہ میں ہوتے ہوئے اُن پر عذاب نازل کریں، کیونکہ اول تو سب ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جس بستی میں وہ موجود ہوں اُس پر اُس وقت تک عذاب نازل نہیں فرماتے جب تک اپنے پیغمبروں کو وہاں سے نکال نہ لیں۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے معاملہ میں مشاہدہ ہوا کہ جب تک یہ حضرات بستی میں رہے عذاب نہیں آیا جب وہاں سے نکال لئے گئے اُس وقت عذاب نازل ہوا۔ خصوصاً سید الانبیاء جو رحمۃ للعالمین کا لقب دے کر بھیجے گئے ہیں آپ کے کسی بستی میں موجود ہوتے ہوئے اُن پر عذاب آنا آپ کی شان کے خلاف تھا۔

خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ تم تو قرآن اور اسلام کی مخالفت کی وجہ سے اسی کے مستحق ہو کہ تم پر پتھر برسائے جائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا اس سے مانع ہے۔ امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ آیت کا یہ حصہ اُس وقت نازل ہوا جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں موجود تھے پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد آیت کا دوسرا حصہ یہ نازل ہوا وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن پر عذاب نازل کرنے والے نہیں جب کہ وہ استغفار کرتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپ کے مدینہ شریف چلے جانے کے بعد اگرچہ عذابِ عام کا یہ مانع رفع ہو گیا کہ آپ وہاں موجود تھے مگر اس وقت بھی ایک مانع عذاب کا یہ موجود رہا کہ بہت سے ضعفاء مسلمین جو ہجرت نہ کر سکتے تھے مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے۔ اُن کی خاطر سے اہلِ مکہ پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔

پھر جب یہ سب حضرات بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو بعد کی آیت کا یہ جملہ نازل ہوا وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اب موانع عذاب دونوں رفع ہو چکے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے اور نہ استغفار کرنے والے مسلمان مکہ میں باقی رہے تو اب عذاب آنے سے کوئی رکاوٹ باقی نہیں۔ خصوصاً ان کے استحقاق عذاب میں خود مخالفت اسلام ہونے کے علاوہ اس جرم کا بھی اضافہ ہو گیا کہ

یہ لوگ خود تو عبادت کے قابل نہ تھے اور جو مسلمان عبادت عمرہ وطواف کے لئے مسجد حرام میں جانا چاہیں اُن کو روکنے لگے تو اب ان کا استحقاقِ عذاب بالکل مکمل ہوگیا چنانچہ فتح مکہ کے ذریعہ ان پر عذاب نازل کیا گیا۔

مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنے کا واقعہ غزوۂ حدیبیہ میں پیش آیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے قصد سے تشریف لے گئے اور مشرکین مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور آپ کو اور سب صحابہ کرام کو اپنے احرام کھولنے اور واپس جانے پر مجبور کیا یہ واقعہ ۶ھ ہجری کا ہے اس کے دو سال بعد ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، اس طرح ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔

ابن جریرؒ کی اس تفسیر کا مدار اس پر ہے کہ مانع عذاب آپ کا مکہ میں ہونا قرار دیا جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں وجود مانع عذاب ہے جب تک آپ دنیا میں تشریف فرما ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آپ کا حال دوسرے انبیاء کی طرح نہیں کہ وہ خاص خاص مقامات یا قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ جب وہاں سے نکل کر کسی دوسرے خطہ میں پہنچ گئے تو ان کی قوم پر عذاب آجاتا تھا۔ بخلاف سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی نبوت و رسالت سارے عالم کے لئے اور قیامت تک کے لئے عام اور شامل ہے پوری دنیا آپ کا مقام بعثت اور دائرہ رسالت ہے اس لئے جب تک آپ دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہیں آپ کی قوم پر عذاب نہیں آسکتا۔

اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ اہل مکہ کے افعال کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر پتھر برسائے جائیں مگر دو چیزیں اس عذاب سے مانع ہوئیں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف فرما ہونا، دوسرے اہل مکہ کا استغفار کرنا کیونکہ یہ لوگ مشرک و کافر ہونے کے باوجود اپنے طواف وغیرہ میں غفرانک غفرانک کہا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ استغفار کفر و شرک کے ساتھ گو آخرت میں نافع نہ ہو مگر دنیا میں اُس کا بھی یہ نفع اُن کو مل گیا کہ دنیا میں عذاب سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے، کفار و مشرکین اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں تو اس کا بدلہ اُن کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب نہ دے حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں، اس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ دنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لوگ مغرور اور مطمئن نہ ہوجائیں کہ ہم مجرم ہی نہیں یا ہم پر عذاب نہیں ہوگا۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت کے عذاب سے ان کی کسی طرح نجات نہیں۔ اس تفسیر پر مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ میں عذاب سے عذاب آخرت مراد ہوگا۔

آیاتِ مذکورہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ جس بستی میں لوگ استغفار کرتے ہوں اللہ تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ اُس پر عذاب نازل نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ کی اُمت پر خواہ مسلم ہوں یا کافر عذاب نہیں آئے گا اور مراد اس سے یہ ہے کہ عذابِ عام جس سے پوری قوم تباہ ہو جائے ایسا عذاب نہیں آئے گا جیسے قوم نوح، قوم لوط، قوم شعیب وغیرہ کے ساتھ پیش آیا کہ اُن کا نام و نشان مٹ گیا۔ افراد و احاد پر کوئی عذاب آجائے وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت میں خسف اور مسخ کا عذاب آئے گا۔ خسف کے معنی زمین میں اُتر جانا اور مسخ کے معنی صورت مسخ ہو کر بندر، سُور وغیرہ جانوروں کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ اس کی مراد یہی ہے کہ بعض بعض افرادِ اُمت پر ایسے عذاب بھی آئیں گے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ہونا قیامت تک باقی رہے گا کیونکہ آپ کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی زندہ ہیں گو اُس زندگی کی صورت سابق زندگی سے مختلف ہے اور یہ بحث لغو اور فضول ہے کہ ان دونوں زندگیوں میں فرق کیا ہے کیونکہ نہ اس پر اُمت کا کوئی دینی یا دنیوی کام موقوف ہے نہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام نے ایسی فضول اور بے ضرورت بحثوں کو پسند فرمایا بلکہ منع فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ قیامت تک دنیا میں ہیں اس لئے یہ اُمت قیامت تک عذابِ عام سے مامون رہے گی۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے اُن پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

اور وہ اس کے اختیار والے نہیں، اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو

لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ

اس کی خبر نہیں۔ اور اُن کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور

تَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

تالیاں، سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا۔ بیشک جو لوگ

كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا

کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے، سو ابھی اور خرچ کریں گے

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ

پھر آخر ہوگا وہ اُن پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف

يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ

ہانکے جائیں گے۔ تاکہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو

بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ

ایک کو ایک پر پھر اُس کو ڈھیر کر دے اکٹھا پھر ڈال دے اُس کو دوزخ میں، وہی لوگ

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا

ہیں نقصان میں۔ تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو اُن کو جو کچھ

قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

ہو چکا، اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی۔

ع ۱۸

خلاصۂ تفسیر

اور (ان موانع کے سبب عذاب خارق نازل نہ ہونے سے بالکل ہی عذاب سے مطمئن نہ ہو جائیں کیونکہ جس طرح امور مذکورہ مانع عذاب ہیں اسی طرح ان کی حرکتیں مقتضی عذاب بھی ہیں پس مانع کا اثر عذاب خارق میں ظاہر ہوا اور مقتضی کا اثر نفس عذاب میں ظاہر ہوگا کہ عذاب غیر خارق ان پر نازل ہوگا چنانچہ اس مقتضی کا بیان فرماتے ہیں کہ) ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ (بالکل ہی معمولی) سزا (بھی) نہ دے حالانکہ (ان کی یہ حرکتیں مقتضی سزا کی ہیں مثلاً) وہ لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو) مسجد حرام (میں جانے اور اس میں نماز پڑھنے اور اس میں طواف کرنے) سے روکتے ہیں (جیسا حدیبیہ میں حقیقۃً روکا جس کا قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا اور زمانۂ قیام مکہ میں حکماً روکا کہ اس قدر تنگ کیا کہ ہجرت کی ضرورت ہوئی) حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولی (بننے کے بھی لائق) نہیں (اور عابدین کو روکنا تو درکنار رہا جس کا اختیار خود متولی کو بھی نہیں ہوتا، اس کے متولی (بننے کے لائق) تو سوا متقیوں کے (کہ وہ اہل ایمان ہیں) اور کوئی بھی شخص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اپنی نالائقی کا) علم نہیں رکھتے (خواہ علم ہی نہ ہو یا یہ کہ جب

اس علم پر عمل نہ کیا تو وہ مثل عدم علم کے ہے غرض جو سچے نمازی تھے ان کو تو مسجد سے اس طرح روکا اور (خود مسجد کا کیسا حق ادا کیا اور اس میں کیسی اچھی نماز پڑھی جس کا بیان یہ ہے کہ) ان کی نماز خانۂ کعبہ (مذکور بعنوان مسجد حرام) کے پاس صرف یہ تھی سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا (یعنی بجائے نماز کے ان کی یہ نامعقول حرکتیں ہوتی تھیں) سو (ان حرکات کا ضرور مقتضا ہے کہ ان پر کوئی نہ کوئی عذاب گو وہ معمولی اور عادی ہو نازل کر کے ان کو خطاب کیا جائے کہ لو) اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کے سبب (جس کا ایک اثر وہ قول ہے لَوْ نَشَآءُ الخ اور ایک اثر وہ قول ہے اِنْ كَانَ هٰذَا الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے یَصُدُّوْنَ الخ اور ایک اثر وہ فعل ہے مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ، چنانچہ غزوات متعددہ میں یہ سزا واقع ہوئی جیسا کہ اس سورت کے رکوع دوم میں بھی ہے ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ اور بَعْدَ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا الخ کے یہاں تک تو ان لوگوں کے اقوال و اعمال بدنیہ کا ذکر تھا آگے ان کے اعمال مالیہ کا بیان ہے کہ) بلاشک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے (یعنی دین سے لوگوں کو) روکیں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور مخالفت کے سامان جمع کرنے میں ظاہر ہے کہ جو خرچ ہوتا تھا اس میں یہی غرض تھی) سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو اسی غرض کے لئے) خرچ کرتے ہی رہیں گے (مگر) پھر (آخر میں جب آثار ناکامی کے محسوس ہوں گے) وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے (کہ خواہ مخواہ خرچ کیا اور) پھر (آخر) مغلوب (بھی) ہو جائیں گے (جس سے حسرت ضیاع اموال کے ساتھ یہ دوسری حسرت مغلوبیت کی جمع ہو جائے گی) اور (یہ سزا حسرت و مغلوبیت تو ان کی دنیا میں ہے باقی آخرت کی سزا وہ الگ ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف (لے جانے کے لئے قیامت میں) جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کر دے (کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے ظاہر ہے کہ اہل جنت ان سے علیحدہ رہ جائیں گے) اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر دے پھر (متصل کر کے) ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ پورے خسارہ میں ہیں (جس کا کہیں منتہیٰ نہیں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آ جائیں گے (اور اسلام قبول کریں گے) تو ان کے سارے گناہ جو (اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے (یہ حکم تو حالت اسلام کا ہوا) اور اگر اپنی وہی (کفر کی) عادت رکھیں گے تو (ان کو سنا دیجیے کہ) کفار سابقین کے حق میں (ہمارا) قانون نافذ ہو چکا ہے (کہ دنیا میں ہلاک اور آخرت میں عذاب وہی تمہارے لئے ہوگا چنانچہ قتل سے ہلاک بھی ہوئے اور غیر کفار عرب کا ہلاک ذمی ہونا بھی ہے تم جانو)۔

معارف ومسائل

پچھلی آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مشرکین مکہ اپنے کفر و انکار کی وجہ سے اگرچہ اس کے مستحق ہیں کہ اُن پر آسمانی عذاب آجائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں موجود ہونا عذاب عام آنے سے مانع ہے اور ہجرت کے بعد اُن ضعفاء مسلمین کی وجہ سے ایسا عذاب نہیں آتا جو مکہ میں رہ کر اللہ سے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ضعفاء مسلمین کی رعایت سے اگر دنیا میں اُن کا عذاب ٹل ہی گیا تو ان لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں بلکہ ان کا استحقاقِ عذاب کھلا ہوا ہے اور علاوہ کفر و انکار کے اور بھی ان کے ایسے جرائم ہیں جن کی وجہ سے ان پر عذاب آجانا چاہئے۔ ان دونوں آیتوں میں اُن کے تین جرم شمار کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ یہ لوگ خود تو مسجد حرام میں عبادت گزاری کے قابل ہی نہیں اور جو مسلمان وہاں عبادت نماز طواف وغیرہ ادا کرنا چاہتے ہیں اُن کو آنے سے روک دیتے ہیں۔ اس میں واقعہ حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ ؁۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور مشرکین مکہ نے آپ کو روک کر واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔

دوسرا جرم یہ فرمایا کہ یہ بے وقوف یوں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم مسجد حرام کے متولی ہیں جس کو چاہیں اس میں آنے کی اجازت دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔

ان کا یہ خیال دو غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا اول یہ کہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی سمجھا حالانکہ کوئی کافر کسی مسجد کا متولی نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ متولی کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے مسجد میں آنے سے روک دے جب کہ مسجد خانۂ خدا ہے اُس میں آنے سے روکنے کا کسی کو حق نہیں بجز ایسی خاص صورتوں کے جن میں مسجد کی بے حرمتی یا دوسرے نمازیوں کی تکلیف کا اندیشہ ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے، اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی، اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کی ایذاء بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لئے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔

قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں صرف پہلی بات بیان کرنے پر کتفا کیا کہ ان لوگوں کو مسجد حرام کا متولی کیسے مانا جائے۔ جب کہ اصول یہ ہے کہ اُس کے متولی صرف متقی مسلمان ہی ہوسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہوسکتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت وسنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

تیسرا جرم ان لوگوں کا یہ بتلایا کہ کفر و شرک کی گندگی تو تھی ہی ان کے افعال و اعمال تو عام انسانی سطح سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جس فعل کا نام نماز رکھتے ہیں وہ بجز اس کے نہیں کہ اُس میں کچھ مُنہ سے سیٹیاں بجائیں کچھ ہاتھوں سے تالیاں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل ہو وہ ان افعال کو عبادت و نماز کیا کوئی صحیح انسانی فعل بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ یعنی تمہارے کفر اور جرائم کا انجام یہی ہے کہ اب اللہ کا عذاب چکھو۔ عذاب سے اس جگہ عذابِ آخرت بھی مراد ہوسکتا ہے اور عذابِ دنیا بھی جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر نازل ہوا۔

اس کے بعد چھتیسویں آیت میں کفار مکہ کے ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قوت جمع کرنے کے لئے مال عظیم جمع کیا اور پھر اُس کو دینِ حق اور مسلمانوں کے مٹانے کے لئے خرچ کیا۔ مگر انجام کار یہ ہوا کہ وہ مال بھی ہاتھ سے گیا اور مقصد حاصل ہونے کے بجائے خود ذلیل وخوار ہوئے۔

واقعہ اس کا بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے یہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست زدہ زخم خوردہ، بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ان لوگوں نے اس کو منظور کرکے ایک بڑی رقم دے دی جس کو انھوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوۂ اُحد میں خرچ کیا اور اس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہوگئی۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے

انجام کی خبر دے دی۔ ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو کافر ہیں، اپنے مالوں کو اس کام کے لئے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روک دیں۔ سو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجام کار مغلوب ہو جائیں گے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد میں ٹھیک یہی صورت ہوئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا۔ اور پھر مغلوب ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ حسرت و ندامت ہوئی۔

اور بغوی وغیرہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوۂ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا ہے کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لئے تھے جن میں ابو جہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی۔ تو ان لوگوں کو اپنی شکست کے ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت و ندامت پیش آئی۔ (مظہری)

آخر آیت میں آخرت کے اعتبار سے ان لوگوں کے انجام بد کا بیان ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ۔ یعنی جو لوگ کافر ہیں ان کا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

مذکورہ آیتوں میں دینِ حق سے روکنے کے لئے مال خرچ کرنے کا جو انجام بد ذکر کیا گیا ہے اُس میں آج کے وہ کفار بھی داخل ہیں جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل کی طرف دعوت دینے پر لاکھوں روپیہ شفاخانوں، تعلیم گاہوں اور صدقہ خیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے جزءی عقائد میں شبہات و اوہام پیدا کر کے اُن کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ بڑے بڑے اموال خرچ کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔

سینتیسویں آیت میں واقعاتِ مذکورہ کے کچھ نتائج کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے جو اموال کفار نے اسلام کے خلاف استعمال کئے، اور پھر اُن کو حسرت و ندامت ہوئی اور ذلیل و خوار ہوئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ گندی چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر کر دیں۔ لفظ خبیث اور طیب دو متقابل لفظ ہیں۔ لفظ خبیث ناپاک، گندے اور حرام کے لئے بولا جاتا ہے اور طیب اس کے بالمقابل پاک صاف ستھرے اور حلال کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموال خبیثہ اور مسلمانوں کے اموال طیبہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں

مطلب یہ ہے کہ کفار نے جو مال عظیم خرچ کئے وہ مال خبیث اور ناپاک تھے اُس کا بُرا نتیجہ یہ حاصل ہو کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئیں اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا مگر وہ مال پاک اور حلال تھا۔ اُن کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے اور مزید مال غنیمت بھی ہاتھ آیا اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝	یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث کو دوسرے خبیث کے ساتھ پھر ان سب کو جمع کر دے گا جہنم میں یہی لوگ خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے کہربا گھاس کو کھینچتا ہے اور نئی سائنس کے تجربات میں ساری دنیا کا نظام باہمی کشش پر قائم ہے اسی طرح اعمال واخلاق میں بھی کشش ہے۔ ایک بُرا عمل دوسرے بُرے عمل کو اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے مال خبیث دوسرے مال خبیث کو کھینچتا ہے اور یہ پھر اموال خبیثہ آثار خبیثہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جتنے اموال خبیثہ ہیں سب کو جہنم میں جمع فرمادیں گے۔ اور یہ مال والے بڑے خسارہ میں پڑجائیں گے۔

اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس جگہ خبیث اور طیب کی مراد عام قرار دی ہے یعنی پاک اور ناپاک۔ پاک سے مؤمن اور ناپاک سے کافر مراد ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حالاتِ مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ پاک وناپاک یعنی مؤمن وکافر میں امتیاز ہوجائے مؤمنین جنت میں اور کفار سب ایک جگہ جہنم میں جمع کر دیئے جائیں۔

اڑتیسویں آیت میں کفار کے لئے پھر ایک مربیانہ خطاب ہے جس میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ ترغیب اس کی ہے کہ اگر وہ ان تمام افعال شنیعہ کے بعد اب بھی توبہ کریں اور ایمان لے آئیں تو پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ترہیب یہ کہ اگر وہ اب بھی باز نہ آئے تو سمجھ لیں کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی نیا قانون بنانا یا سوچنا نہیں پڑتا۔ پچھلے زمانہ کے کافروں کے لئے جو قانون جاری ہو چکا ہے وہ ہی اُن پر بھی جاری ہوگا کہ دنیا میں ہلاک وبرباد ہوئے اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوئے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے حکم سب اللہ کا،

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳۹ وَاِنْ تَوَلَّوْا

پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے، کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (پھر ان کے اس کافر رہنے کی صورت میں اے مسلمانو) تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (اللہ کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کے دین کا خالصۃً اللہ ہی کے لئے ہو جانا موقوف ہے قبول اسلام پر۔ تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کریں۔ خلاصہ یہ کہ اگر اسلام نہ دیں تو ان سے لڑو جب تک اسلام نہ لائیں کیونکہ کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا) پھر اگر یہ (کفر سے) باز آجائیں تو (ان کے ظاہری اسلام کو قبول کرو دل کا حال مت ٹٹولو کیونکہ اگر یہ دل سے ایمان نہ لائیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں (وہ آپ سمجھ لیں گے تم کو کیا) اور اگر (اسلام سے) روگردانی کریں تو (اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ سے مت ہٹو اور) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (ان کے مقابلہ میں) تمہارا رفیق ہے وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے (سو وہ تمہاری رفاقت اور نصرت کرے گا)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ انفال کی انتالیسویں آیت ہے اس میں دو لفظ قابل غور ہیں ایک لفظ فتنہ دوسرا دین۔ یہ دونوں لفظ عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ائمۂ تفسیر صحابہ و تابعین سے اس جگہ دو معنی منقول ہیں۔ ایک یہ کہ فتنہ سے مراد کفر و شرک اور دین سے مراد دین اسلام لیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کو کفار سے قتال اس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک کہ کفر مٹ کر اس کی جگہ اسلام آجائے اسلام کے سوا کوئی دین و مذہب باقی نہ رہے۔ اس صورت میں یہ حکم صرف اہل مکہ اور اہل عرب کے لئے مخصوص ہوگا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا گھر ہے اس میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین رہے تو دین اسلام کے لئے خطرہ ہے۔ باقی ساری دنیا میں دوسرے ادیان و مذاہب کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث اس پر شاہد ہیں۔

اور دوسری تفسیر جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ فتنہ سے مراد اس جگہ وہ ایذاء اور عذاب و مصیبت ہے جس کا سلسلہ کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر ہمیشہ جاری رہا تھا

جب تک وہ مکہ میں تھے تو ہر وقت ان کے زغہ میں پھنسے ہوئے طرح طرح کی ایذائیں سہتے رہے پھر جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو ایک ایک مسلمان کا تعاقب کرکے قتل و غارتگری کرتے رہے مدینہ میں پہنچنے کے بعد بھی پورے مدینہ پر حملوں کی صورت میں ان کا غیظ و غضب ظاہر ہوتا رہا۔

اور اس کے بالمقابل دین کے معنی قہر و غلبہ کے ہیں اس صورت میں تفسیر آیت کی یہ ہوگئی کہ مسلمانوں کو کفار سے اُس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہوجائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہوجائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کرسکے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف نے فوج کشی کی اور دونوں طرف مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاء میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوگیا اور غلبہ دین اسلام کا ہوگیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کرکے فتنہ پھر پیدا کردو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دینِ حق کے خلاف کا ہوجائے۔ مقصد یہ تھا کہ جہاد و قتال کا حکم فتنہ کفر اور مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کرچکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہوگیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اُس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اُس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر اُن کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہوجائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہوجائے۔ اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

اعداءِ اسلام کے خلاف جہاد و قتال کے نتیجہ میں دو صورتیں پیدا ہوسکتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں پر ظلم و جور سے باز آجائیں خواہ اس طرح کہ اسلامی برادری میں داخل ہوکر بھائی بن جائیں

یا اس طرح کہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم و ستم سے باز آجائیں اور اطاعت کا معاہدہ کرلیں دوسرے یہ کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو قبول نہ کریں اور مقابلہ پر جمے رہیں اگلی آیت میں ان دونوں صورتوں کے احکام مذکور ہیں۔ ارشاد فرمایا،

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ یعنی اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں۔

اُس کے مطابق اُن کی ساتھ معاملہ فرما دیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے خلاف جہاد کو بند کر دیا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو یہ خطرہ ہو سکتا تھا کہ موکہ قتال کے بعد کفار کی طرف سے صلح کا معاہدہ یا مسلمان ہو جانے کا اظہار بہت ممکن ہے کہ محض کوئی جنگی چال اور دھوکہ ہو۔ ایسی صورت میں جنگ بند کر دینا مسلمانوں کے لئے مضر ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ان الفاظ سے دیا گیا کہ مسلمان تو ظاہری اعمال کے پابند ہیں، دلوں کا دیکھنے والا اور اُن کے مخفی سرائر کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے جب وہ مسلمان ہونے کا اظہار کریں یا معاہدہ صلح کرلیں تو مسلمان اس پر مجبور ہیں کہ جہاد و قتال بند کر دیں۔ رہا یہ معاملہ کہ انھوں نے سچے دل سے اسلام یا صلح کو قبول کیا ہے یا اس میں دھوکہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے جانتے ہیں اگر وہ ایسا کریں گے تو اُس کا دوسرا انتظام ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو ان خیالات اور خطرات پر اپنے معاملات کی بنیاد نہیں رکھنا چاہئے۔

اگر اظہار اسلام یا معاہدہ صلح کے بعد اُن پر ہاتھ اُٹھایا گیا تو جہاد کرنے والے مجرم ہو جائیں گے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنانِ اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو قبول کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کرلیں تو اُن کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے۔ بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے ماتحت کسی جرم کی پاداش میں اُن کو سزا دی جائے۔ اور اُن کے دلوں کا حساب اللہ پر رہے گا کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ اور اعمال اسلام کو قبول کر رہے ہیں یا نفاق سے۔

دوسری ایک حدیث جو ابو داؤد نے بہت سے صحابہ کرام کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد پر یعنی اُس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت و وفاداری کا معاہدہ کرلیا ہو کوئی ظلم کرے یا اُس کو نقصان پہنچائے یا اُس سے کوئی ایسا کام لے جو اُس کی طاقت سے زائد ہے یا اُس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضا مندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔

قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور روایتِ حدیث نے بظاہر مسلمانوں کو ایک سیاسی خطرہ میں مبتلا

کر دیا کہ بڑے سے بڑا دشمنِ اسلام جب ان کی زد میں آجائے اور محض جان بچانے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ لے تو مسلمانوں پر لازم کر دیا کہ فوراً اپنا ہاتھ روک لیں اس طرح تو وہ کسی دشمن پر بھی قابو نہیں پا سکتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے مخفی اسرار کو اپنے ذمہ لے کر معجزانہ انداز میں یہ کر دکھایا کہ عملی طور پر مسلمانوں کو کسی میدانِ جنگ میں ایسا ابتلاء پیش نہیں آیا۔ البتہ صلح کی حالت میں سیکڑوں منافقین پیدا ہوئے جنھوں نے دھوکہ دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بظاہر نماز روزہ بھی ادا کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کم ظرف لوگوں کا تو اتنا ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں سے کچھ فوائد حاصل کرلیں اور دشمنی کرنے کے باوجود ان کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ اور بعض وہ بھی تھے جو سیاسی مقصد لے کر مسلمانوں کے راز معلوم کرنے اور مخالفین سے سازش کرنے کے لئے ایسا کر رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے قانون نے ان سب کے بارہ میں مسلمانوں کو یہی ہدایت دی کہ وہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں جب تک خود اُن کی طرف سے اسلام دشمنی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ثابت نہ ہو جائے۔

قرآن کی یہ تعلیم تو اُس صورت میں تھی جب کہ دشمنانِ اسلام اپنی دشمنی سے باز آجانے کا قرار اور معاہدہ کرلیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ضد اور عناد پر قائم رہیں اُس کے متعلق حکم اس کے بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۔ یعنی اگر وہ بات نہ مانیں تو تم یہ سمجھ رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار حمایتی ہے اور وہ بہت اچھا حمایتی اور بہت اچھا مددگار ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم و جور اور کفر و شرک سے باز نہ آئیں تو مسلمانوں کے ذمہ وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اُن سے قتال جاری رکھیں۔ اور جہاد و قتال چونکہ بڑے لشکر اور بہت سے اسلحہ اور ساز و سامان پر عادۃً موقوف ہے اور مسلمانوں کو عام طور پر یہ چیزیں کم حاصل تھیں اس لئے یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو حکم قتال بھاری معلوم ہو یا وہ اپنی قلتِ تعداد اور قلتِ سامان کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس کا علاج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو بتلایا گیا کہ گرچہ تعداد اور سامان ان لوگوں کے پاس مسلمانوں سے زائد سہی مگر وہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت و حمایت کہاں سے لائیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہے جس کو وہ ہر میدان میں اپنے ساتھ مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اور فرمایا کہ یوں تو امداد و حمایت دنیا میں ہر فریق کسی نہ کسی سے حاصل کر ہی لیتا ہے مگر مدد کا مدار مددگار کی قوت و طاقت اور علم و تجربہ پر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوت اور علم و خبر سے زیادہ کیا، برابر بھی سارے جہان کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ سب سے بہتر حمایتی اور مددگار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ

اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اُتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اس بات کو جان لو کہ جو شئ (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کئے جائیں جن میں سے چار حصے تو مقاتلین کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہوگا جن میں سے ایک تو) اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا جن کو دینا بمنزلہ اس کے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے (ایک حصہ) غریبوں کا ہے اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس چیز پر (یقین رکھتے ہو) جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مؤمنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں نازل فرمایا تھا (مراد اس سے امداد غیبی بواسطۂ ملائکہ کے ہے یعنی اگر ہم پر اور ہمارے الطافِ غیبیہ پر یقین رکھتے ہو تو اس حکم کو جان رکھو اور عمل کرو یہ اس لئے بڑھا دیا کہ خُمس نکالنا شاق نہ ہو اور یہ سمجھ لیں کہ یہ ساری غنیمت اللہ ہی کی امداد سے تو ہاتھ آئی پھر اگر ہم کو ایک خمس نہ ملا تو کیا ہوا وہ چار خمس بھی تو ہماری قدرت سے خارج تھے بلکہ محض قدرتِ الٰہیہ سے حاصل ہوئے) اور اللہ (ہی) ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (پھر تمہارا استحقاق تو اتنا بھی نہیں تھا یہ بھی بہت مل گیا)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مالِ غنیمت کے احکام اور اس کی تقسیم کا قانون مذکور ہے۔ اس سے پہلے چند ضروری الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔

لفظ غنیمت لغت میں اُس مال کے لئے بولا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اصطلاحِ شریعت میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ و قتال اور قہر و غلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اُس کو غنیمت کہتے ہیں اور جو صلح و رضامندی سے حاصل ہو جیسے جزیہ و خراج وغیرہ اُس کو فَیْئ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں انھیں دونوں لفظوں سے ان دونوں قسموں کے احکام بتلائے گئے ہیں۔ سورۂ انفال میں مالِ غنیمت کے احکام کا ذکر ہے جو جنگ و قتال کے وقت غیر مسلموں سے حاصل ہو۔

یہاں سب سے پہلے ایک بات پیشِ نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ اسلامی اور قرآنی نظریہ کے مطابق تمام کائنات کی اصلی ملکیت صرف اُس ذاتِ حق تعالیٰ کی ہے جس نے انھیں پیدا کیا ہے انسان کی طرف کسی چیز کی ملکیت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے ذریعہ کسی شخص کی ملکیت قرار دے دی ہو۔ جیسے سورۂ یٰسٓ میں چوپائے جانوروں کے ذکر میں ارشاد فرمایا اَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ۔ یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ اُن کے مالک بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملکیت ذاتی نہیں ہم نے اپنے فضل سے اُن کو مالک بنا دیا۔

جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرتی ہے یعنی کفر و شرک میں مبتلا ہوجاتی ہے تو پہلے حق تعالیٰ ان کی اصلاح کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجتے ہیں جو بدبخت اس انعامِ الٰہی سے بھی متأثر نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اُن کے مقابلہ میں جہاد و قتال کا حکم دے دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان باغیوں کے جان و مال سب مباح کر دیئے گئے ان کو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اموال سے نفع اُٹھانے کا حق نہیں رہا۔ بلکہ ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہوگئے۔ انھیں ضبط شدہ اموال کا دوسرا نام مالِ غنیمت ہے۔ جو کفار کی ملکیت سے نکل کر خالص حق تعالیٰ کی ملکیت میں رہ گئے۔

ان ضبط شدہ اموال کے لئے زمانۂ قدیم سے حق تعالیٰ کا قانون یہ رہا ہے کہ ان سے کسی کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ ایسے اموال کو جمع کرکے کسی کھلی جگہ میں رکھ دیا جاتا اور آسمان سے ایک بجلی آکر اُن کو جلا دیتی تھی۔ یہی علامت ہوتی تھی اس جہاد کے قبول ہونے کی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چند خصوصیات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئیں اُن میں ایک

یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت آپ کی اُمت کے لئے حلال کر دیا گیا۔ (کمافی حدیث مسلم) اور حلال بھی ایسا کہ اُس کو طیب الاموال کہا جاتا ہے یعنی سب سے زیادہ پاک مال۔ وجہ یہ ہے کہ جو مال انسان اپنے کسب و کمائی سے حاصل کرتا ہے اُس میں انسانوں کی ملکیت سے واسطہ در واسطہ منتقل ہو کر ایک مال اس کی ملکیت میں آتا ہے اور ان واسطوں میں حرام و ناجائز یا مکروہ طریقوں کا احتمال رہتا ہے بخلاف مالِ غنیمت کے کہ کفار کی ملکیت اُن سے ختم ہو کر براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت رہ گئی اور اب جس کو ملتا ہے براہِ راست حق تعالیٰ کی ملکیت سے ملتا ہے جس میں کوئی شبہ اور شائبۂ حُرمت یا کراہت کا نہیں رہتا جیسے کنویں سے نکالا ہو پانی یا خودرو گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا انعام انسان کو ملتا ہے کوئی انسانی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مالِ غنیمت جو پچھلی امتوں کے لئے حلال نہیں تھا اُمتِ مرحومہ کے لئے بطورِ انعام حلال کر دیا گیا۔ آیت مذکورہ میں اُس کی تقسیم کا ضابطہ اس عنوان سے بیان فرمایا گیا ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ۔ اس میں عربی لغت کے قاعدہ سے اوّل تو لفظ مَا عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اُس عموم کی تاکید مزید کے لئے لفظ مِنْ شَيْءٍ بڑھایا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ چھوٹی بڑی چیز مالِ غنیمت میں حاصل ہو وہ سب اسی قانون کے تحت داخل ہے کسی چیز کو معمولی یا چھوٹی سمجھ کر کوئی شخص قانون تقسیم کے علاوہ اگر لے لے گا تو وہ سخت مجرم قرار پائے گا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک سوئی اور اُس کا دھاگہ بھی جو مالِ غنیمت کا جُز ہو کسی کے لئے اُس کا بغیر اپنے حصہ شرعی کے لے لینا جائز نہیں۔ اور مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز بغیر حصہ کے لینے کو حدیث میں غلول فرما کر اُس پر شدید وعید فرمائی ہے۔ اور عام چوری سے زیادہ **شدید حرام قرار دیا ہے۔**

ضابطۂ تقسیم کا یہ عنوان دے کر تمام مجاہد مسلمانوں کو اس سے باخبر کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مال تمہارے لئے حلال کر دیا ہے مگر ایک خاص ضابطہ کے تحت حلال ہے اُس کے خلاف اگر **کوئی لے گا تو وہ جہنم کا ایک انگارہ ہوگا۔**

قرآنی قانون کا یہی وہ امتیاز ہے جو دنیا کے دوسرے قوانین کو حاصل نہیں اور یہی قانونِ قرآنی کی تاثیر کامل اور کامیابی کا اصلی راز ہے کہ اول خوفِ خدا و آخرت کو پیش نظر کر کے اُس سے ڈرایا گیا دوسرے نمبر میں تعزیری سزائیں بھی جاری کی گئیں۔

ورنہ غور کا مقام ہے کہ عین میدانِ جنگ کی افراتفری کے وقت جو اموال غیر مسلموں کے قبضہ سے حاصل کئے جائیں جن کی تفصیل نہ پہلے سے مسلمانوں کے امیر کے علم میں ہے نہ کسی دوسرے کے۔ اور موقع میدانِ جنگ کا ہے جو عموماً جنگل اور صحراء ہوتے ہیں جن میں چھپنے چھپانے کے ہزاروں

مواقع ہوتے ہیں۔ نرے قانون کے زور سے ان اموال کی حفاظت کسی کے بس میں نہیں، صرف خوف خدا و آخرت ہی وہ چیز تھی جس نے ایک ایک مسلمان کو ان اموال میں ادنیٰ تصرف کرنے سے باز رکھا۔

اب اس ضابطۂ تقسیم کو دیکھئے ارشاد فرمایا فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ یعنی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس کے رشتہ داروں کا اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں کا ہے۔

یہاں پہلے تو یہ بات غور طلب ہے کہ ضابطہ پورے مالِ غنیمت کی تقسیم کا بیان ہو رہا ہے مگر قرآن نے صرف اس کے پانچویں حصے کی تقسیم کا ضابطہ یہاں ذکر فرمایا باقی چار حصوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں کیا راز ہے اور باقی چار حصوں کی تقسیم کا کیا قانون ہے۔ لیکن قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ان دونوں باتوں کا جواب انہیں لفظوں میں یہ نکل آتا ہے کہ قرآن کریم نے جہاد کرنے والے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا مَا غَنِمْتُمْ یعنی جو کچھ تم نے غنیمت میں حاصل کیا۔ اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ مال ان حاصل کرنے والوں کا حق ہے اور اس کے بعد جب یہ ارشاد فرما دیا کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول وغیرہ کا ہے تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکل آیا کہ باقی چار حصے غانمین اور مجاہدین کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے قانونِ وراثت میں ایک جگہ ارشاد ہے وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ۔ یعنی جب کسی شخص کے وارث اس کے ماں باپ ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے۔ یہاں بھی صرف ماں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ باقی دو حصے باپ کا حق ہیں۔ اسی طرح مَا غَنِمْتُمْ کے بعد جب صرف پانچویں حصہ کو اللہ کے لئے رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ باقی چار حصے مجاہدین کا حق ہیں۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل نے اس کو اور اس کی پوری تفصیلات کو واضح کر دیا کہ یہ چار حصے مجاہدین میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم فرمائے۔

اب اس پانچویں حصہ کی تفصیل سنئے جس کو قرآن کریم نے اس آیت میں متعین فرما دیا ہے الفاظِ قرآنی میں اس جگہ چھ الفاظ مذکور ہیں لِلّٰهِ۔ لِلرَّسُوْلِ۔ لِذِی الْقُرْبٰى۔ الْيَتٰمٰى۔ الْمَسٰكِيْن۔ ابْنِ السَّبِيْلِ۔

اس میں لفظ لِلّٰهِ تو ایک جلی عنوان ہے اُن مصارف کا جن میں یہ پانچواں حصہ تقسیم ہوگا یعنی یہ سب مصارف خالص اللہ کے لئے ہیں۔ اور اس لفظ کے اس جگہ لانے میں ایک خاص حکمت ہے جس کی طرف تفسیر مظہری میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے صدقات کا مال حرام قرار دیا گیا ہے کہ وہ آپ کے شایانِ شان نہیں کیونکہ عام لوگوں کے اموال کو پاک کرنے کے لئے ان میں سے نکالا ہوا حصہ ہے جس کو حدیث میں اوساخ الناس

فرمایا ہے یعنی لوگوں کا میل کچیل۔ وہ شانِ نبوت کے لائق نہیں۔

مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہوکر نہیں آیا بلکہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ہے۔ جیساکہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کفار کی ملک سے نکل کر براہِ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہوجاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام تقسیم ہوتا ہے۔ اس لئے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذوی القربیٰ کو جو حصہ مالِ غنیمت کے خمس سے دیا گیا ہے وہ لوگوں کے صدقات کا نہیں بلکہ براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے فضل و انعام ہے۔ شروع آیت میں فرمایا گیا لِلّٰہِ یعنی یہ سب مال اصل میں خالص ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اُسی کے فرمان کے مطابق مذکورہ مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔

اس لئے اس خُمس کے اصلی مصرف پانچ رہ گئے رسول۔ ذوی القربیٰ۔ یتیم۔ مسکین۔ مسافر۔ پھر ان میں استحقاق کے درجے مختلف ہیں۔ قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان درجاتِ استحقاق کا فرق کس باریک اور لطیف انداز سے ظاہر فرمایا گیا ہے کہ ان پانچ میں سے پہلے دو پر حرف لام لایا گیا لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی اور باقی تین قسموں کو بغیر حرف لام کے باہم معطوف بنا کر ذکر کردیا گیا۔

حرف لام عربی زبان میں کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ لِلّٰہِ میں حرف لام اختصاص ملکیت کے بیان کے لئے ہے کہ اصل مالک سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اور لفظ للرسول میں استحقاق کی خصوصیت کا بیان مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خُمس غنیمت کے صَرف کرنے اور تقسیم کرنے کا حق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ جس کا حاصل امام طحاوی کی تحقیق اور تفسیر مظہری کی تقریر کے مطابق یہ ہے کہ اگرچہ اس جگہ خُمس کے مصارف میں پانچ ناموں کا ذکر ہے لیکن درحقیقت اس میں پورا تصرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ اپنی صوابدید کے مطابق ان پانچ قسموں میں خُمس غنیمت کو صَرف فرمائیں جیساکہ سورۂ انفال کی پہلی آیت میں پورے مالِ غنیمت کا حکم یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں صرف فرمائیں جس کو چاہیں دیں۔ آیت وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ نے کل مالِ غنیمت کے پانچ حصے کرکے چار کو مجاہدین کا حق قرار دے دیا مگر پانچواں حصہ بدستور اُسی حکم میں رہا کہ اس کا صَرف کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑا گیا صرف اتنی بات کا اضافہ ہوا کہ اس پانچویں حصے کے پانچ مصارف بیان کردیئے گئے کہ یہ ان میں دائر رہے گا۔ مگر جمہور ائمہ اہلِ تحقیق کے نزدیک آپ کے ذمہ یہ لازم نہیں تھا کہ اس خُمس کے پانچ حصے برابر کریں درمندرجہ آیت پانچوں قسموں میں برابر تقسیم کریں بلکہ صرف

آپ پر ضروری تھا کہ خمس غنیمت کو انہیں پانچ قسموں کے اندر سب کو یا بعض کو اپنی صوابدید کے مطابق عطا فرمائیں۔

اس کی سب سے بڑی واضح دلیل خود اس آیت کے الفاظ اور اُن میں بیان کی ہوئی مصارف کی قسمیں ہیں کہ یہ سب قسمیں عملاً الگ الگ نہیں بلکہ باہم مشترک بھی ہو سکتی ہیں مثلاً جو شخص ذَوِی القُربٰی میں داخل ہے وہ یتیم بھی ہو سکتا ہے مسکین اور مسافر بھی۔ اسی طرح مسکین اور مسافر یتیم بھی ہو سکتے ہیں ذوی القربیٰ بھی، جو مسکین ہے وہ مسافر کی فہرست میں بھی آسکتا ہے اگر ان سب قسموں میں الگ الگ برابر تقسیم کرنا مقصود ہوتا تو یہ قسمیں ایسی ہونا چاہئے تھیں کہ ایک قسم کا آدمی دوسری قسم میں داخل نہ ہو۔ ورنہ پھر یہ لازم آئیگا کہ جو ذوی القربیٰ میں سے ہے اور وہ یتیم بھی ہے مسکین بھی مسافر بھی تو اُس کو ہر حیثیت سے ایک ایک حصہ ملا کر چار حصے دیئے جائیں جیسا کہ تقسیم فرائض وراثت کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک شخص کو میت کے ساتھ مختلف قسم کی قرابتیں حاصل ہیں تو ہر قرابت کا حصہ اُس کو الگ ملتا ہے اور اُمت میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ ایک شخص کو چار حصے دیئے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اس آیت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کرنا نہیں ہے کہ ان سب قسموں کو ضروری دیں اور برابر دیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ خمس غنیمت کا مال ان پانچ قسموں میں سے جس قسم پر جتنا خرچ کرنا آپ کی رائے میں مناسب ہو اُتنا دے دیں (تفسیر مظہری)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب اس خمس میں سے ایک خادم کا سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور گھر کے کاموں میں اپنی محنت و مشقت اور کمزوری کا سبب بھی ظاہر کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عذر فرما کر اُن کو دینے سے انکار کر دیا کہ میرے سامنے تمہاری ضرورت سے زیادہ اہل صفہ صحابہ کرام کی ضرورت ہے جو انتہائی فقر و افلاس میں مبتلا ہیں اُن کو چھوڑ کر میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اس سے واضح ہو گیا کہ ہر ایک قسم کا الگ حق نہیں تھا ورنہ ذوی القربیٰ کے حق میں فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے کون مقدم ہوتا۔ بلکہ یہ سب بیانِ مصارف ہے بیانِ استحقاق نہیں۔

تقسیم خمس بعد وفات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جمہور ائمہ کے نزدیک خمس غنیمت میں جو حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا گیا وہ آپ کے منصب نبوت و رسالت کی بنا پر ایسا ہی تھا جیسے آپ کو خصوصی طور پر یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ پورے مال غنیمت میں آپ اپنے لئے کوئی چیز انتخاب کر کے لے لیں جس کی وجہ سے بعض غنیمتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشیاء لی بھی تھیں۔ اور خمس غنیمت میں سے آپ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ خود بخود ختم ہو گیا کیونکہ آپ کے بعد کوئی رسول و نبی نہیں۔

خُمس ذوی القربیٰ اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں کہ فقراء ذوی القربیٰ کا حق خمس غنیمت میں دوسرے مصارف یعنی یتیم، مسکین، مسافر سے مقدم ہے۔ کیونکہ فقراء ذوی القربیٰ کی امداد زکوٰۃ وصدقات سے نہیں ہوسکتی دوسرے مصرف زکوٰۃ وصدقات سے بھی ہوسکتے ہیں (کما صرح بہ فی الہدایہ ویقدمون) البتہ غنیء ذوی القربیٰ کو ——— اس میں سے دیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذوی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اُس کی دو بنیادیں تھیں ایک اُن کی حاجتمندی اور فقر دوسرے اقامت دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وامداد۔ دوسرا سبب تو وفاتِ نبوی کے ساتھ ختم ہوگیا صرف پہلا سبب فقر و حاجتمندی رہ گیا اُس کی بنا پر تا قیامت ہر امام و امیر اُن کو دوسروں سے مقدم رکھے گا (ہدایہ۔ جصاص)۔ امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے (قرطبی)

اور بعض فقہاء کے نزدیک سہم ذوی القربیٰ بحیثیت قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے باقی ہے جس میں اغنیاء اور فقراء سب شریک ہیں البتہ امیرِ وقت اپنی صوابدید کے مطابق اُن کو حصہ دے گا۔ (مظہری)

اور اصل چیز اس معاملہ میں خلفاء راشدین کا تعامل ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا۔ صاحب ہدایہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان الخلفاء الاربعة الراشدين قسموه على ثلثة اسهم۔	چاروں خلفاء راشدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس غنیمت کو صرف تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے یتیم، مسکین، فقیر۔

البتہ حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ فقراء ذوی القربیٰ کو خمس غنیمت سے دیا کرتے تھے (اخرجہ ابوداؤد) اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص صرف فاروق اعظمؓ کی نہیں دوسرے خلفاء کا بھی یہی عمل ہوگا۔

اور جن روایات سے یہ ثابت ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اپنے آخری زمانۂ خلافت تک ذوی القربیٰ کا حق نکالتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اُس کا متولی بنا کر ذوی القربیٰ میں تقسیم کراتے تھے (کما فی روایۃ کتاب الخراج لابی یوسف) تو یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ تقسیم فقراء ذوی القربیٰ کے لئے مخصوص ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

فائدہ ذوی القربیٰ کی تعیین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمادی کہ بنوہاشم تو آپ کا اپنا قبیلہ ہی تھا بنو المطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لئے شامل

فرمایا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت و اسلام میں کبھی بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے یہاں تک کہ قریش مکہ نے جب غذائی مقاطعہ بنو ہاشم کا کیا اور اُن کو شعب ابی طالب میں بند کر دیا تو بنو المطلب کو اگرچہ قریش نے مقاطعہ میں داخل نہیں کیا تھا مگر یہ لوگ اپنی رضامندی سے مقاطعہ میں شریک ہوگئے (مظہری)

غزوۂ بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا گیا

آیت مذکورہ میں بدر کے دن کو یوم الفرقان فرمایا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے پہلے مادی اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی واضح فتح اور کفار کی عبرتناک شکست اس دن میں ہونے کی بنا پر کفر و اسلام کا ظاہری فیصلہ بھی اس دن ہوگیا۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ

جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر اور قافلہ

أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِنْ

نیچے اتر گیا تھا تم سے، اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ لیکن

لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ

اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا، تاکہ مرے جس کو مرنا ہے قیام حجت

بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾

کے بعد اور جیوے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد، اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا

جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے، اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا

لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ

تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچا لیا، اس کو خوب معلوم ہے

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي

جو بات ہے دلوں میں۔ اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری

أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ

آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا اُن کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے اللہ ایک کام جو مقرر

مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾

ہو چکا تھا، اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام۔

۵٦٧

خلاصہ تفسیر

یہ وہ وقت تھا کہ جب تم اس میدان کے ادھر والے کنارہ پر تھے اور وہ لوگ (یعنی کفار) اُس میدان کے ادھر والے کنارہ پر تھے (ادھر والے سے مراد مدینہ سے نزدیک کا موقع اور اُدھر والے سے مراد مدینہ سے دور کا موقع) اور وہ قافلہ (قریش کا) تم سے نیچے کی طرف کو (بچا ہوا) تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا حاصل یہ کہ پورے جوش کا سامان جمع ہو رہا تھا کہ دونوں آپس میں آمنے سامنے تھے کہ ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر جوش میں آئے اُدھر قافلہ رستہ ہی میں تھا جس کی وجہ سے لشکر کفار کو اس کی حمایت کا خیال دلنشین ہو جس سے درجوش میں زیادتی ہو غرض وہ ایسا شدید وقت تھا پھر بھی خدا تعالیٰ نے تم پر امداد غیبی نازل کی جیسا اوپر ارشاد ہوا ہے اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا) اور (وہ تو مصلحت یہ ہوئی کہ اتفاقاً مقابلہ ہو گیا ورنہ) اگر (پہلے سے حسب معمول و عادت) تم اور وہ (لڑائی کے لئے) کوئی بات ٹھہراتے (کہ فلاں وقت لڑیں گے) تو (مقتضا حالتِ موجودہ کا یہ تھا کہ) ضرور اس تقرر کے بارہ میں تم میں اختلاف ہوتا، یعنی خواہ صرف مسلمانوں میں باہم کہ بوجہ بے سروسامانی کے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا اور خواہ کفار کے ساتھ اختلاف ہوتا جس کی وجہ اس طرف کی بے سروسامانی اور اس طرف مسلمانوں کا رعب ہے، جس دونوں طرح اس جنگ کی نوبت نہ آتی پس اس میں جو فوائد ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے جن کا بیان لِیَهْلِكَ میں آتا ہے) لیکن (اللہ تعالیٰ نے ایسا سامان کر دیا کہ اس کی نوبت نہیں آئی بدقصد لڑائی ٹھن گئی) تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے یعنی تاکہ (حق کا نشان ظاہر ہو جائے اور) جس کو برباد (یعنی گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ (یعنی ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ (بھی) نشان آئے پیچھے زندہ ہو مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا لڑائی ہونا تاکہ ایک خاص طریق سے اسلام کا حق ہونا ظاہر ہو جائے کہ اس قلتِ عدد و کم سامانی پر مسلمان غالب آئے جو کہ خارق عادت ہے جس سے معلوم ہوا کہ اسلام حق ہے پس اس سے حجت الٰہیہ تمام ہو گئی اس کے بعد جو گمراہ ہو گا وہ وضوحِ حق کے بعد ہو گا کہ جس میں عذاب کا پورا استحقاق ہو گیا اور عذر کی گنجائش ہی نہ رہی اسی طرح جس کو ہدایت ہونا ہو گا وہ حق کو قبول کر لے گا۔ خلاصہ حکمت کا یہ ہوا کہ حق واضح ہو جائے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ اس وضوح کے بعد زبان اور قلب سے کون کفر کرتا ہے اور کون ایمان لاتا ہے اور) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب میں آپ کو وہ لوگ کم دکھلائے (چنانچہ آپ نے صحابہ کو اس خواب کی خبر کی ان کے دل خوب قوی ہو گئے) اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ زیادہ کر کے دکھا دیتے (اور آپ صحابہ سے فرما دیتے)

تو (اے صحابہؓ) تمہاری ہمتیں ہار جاتیں اور اس امر (قتال) میں تم میں باہم نزاع (اور اختلاف) ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے (اس کم ہمتی اور اختلاف سے تم کو) بچا لیا بیشک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے (اس کو معلوم تھا کہ اس طرح ضعف پیدا ہوگا اس طرح قوت، اس لئے ایسی تدبیر کی) اور (صرف خواب ہی میں آپ کو کم دکھلانے پر کفایت نہیں کیا بلکہ تتمیم حکمت کے لئے بیداری میں مقابلہ کے وقت مسلمانوں کی نظر میں بھی کفار کم دکھلائی دیئے جیسا کہ بالعکس بھی ہوا جو کہ واقع کے مطابق بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ) اس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جبکہ تم مقابل ہوئے ان لوگوں کو تمہاری نظر میں کم کر کے دکھلا رہے تھے اور (اسی طرح) ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے (جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے لیھلك من ھلك الخ) اور سب مقدمے خدا ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (وہ مالک اور حق یعنی گمراہ اور مہتدی کو سزا و جزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

غزوۂ بدر کفر و اسلام کا وہ پہلا معرکہ تھا جس نے ظاہری اور مادی طور پر بھی اسلام کی برتری اور حقانیت کا ثبوت دیا اس لئے قرآن کریم نے اس کی تفصیلات بیان کرنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ آیاتِ متذکرہ میں اسی کا بیان ہے۔ جس کے ذکر میں بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے علاوہ ایک خاص مصلحت اس کا اظہار ہے کہ اس معرکہ میں ظاہری اور مادی طور پر مسلمانوں کے فتح پانے کا کوئی امکان نہ تھا اور مشرکینِ مکہ کی شکست کا کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی غیبی قوت نے سارے ساز و سامان اور ظاہری اسباب کی کایا پلٹ دی۔ اسی واقعہ کی وضاحت کے لئے ان آیات میں غزوۂ بدر کے محاذِ جنگ کا پورا نقشہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے ان آیات کی تشریح سے پہلے **چند الفاظ و لغات کی تشریح دیکھ لیجئے۔**

عُدْوَة کے معنی ایک جانب کے آتے ہیں اور لفظ دنیا ادنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قریب تر۔ آخرت کے مقابلہ میں اس جہان کو بھی دنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم آخرت کی نسبت انسان کی طرف قریب تر ہے۔ اور لفظ قُصْویٰ اقصٰی سے بنا ہے اقصٰی کے معنی **ہیں بعید تر۔**

بیالیسویں آیت میں ہلاکت اور اس کے مقابلہ میں حیات کا ذکر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے موت و حیات کے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنوی موت و حیات یا ہلاکت و نجات مراد ہے۔ معنوی حیات اسلام و ایمان ہے اور موت شرک و کفر۔ قرآن کریم نے کئی جگہ یہ الفاظ اس معنی میں

استعمال کئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ یعنی اے ایمان والو تم کہا مانو اللہ و رسول کا جب تم کو وہ ایسی چیز کی طرف بلائیں جس میں تمہاری حیات ہے۔ مراد حیات سے وہ حقیقی حیات اور دائمی راحت ہے جو ایمان و اسلام کے صلہ میں ملتی ہے۔ اب آیات کی تفسیر یہ ہوئی کہ۔

بیالیسویں آیت میں غزوہ بدر کے محاذِ جنگ کا نقشہ یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان عُدْوَةِ دُنیا کے پاس تھے اور کفار عُدْوَةِ قُصْوٰی کے پاس مسلمانوں کا مقام اس میدان کے اس کنارہ پر تھا جو مدینہ سے قریب تھا اور کفار میدان کے دوسرے کنارے پر تھے جو مدینہ سے بعید تھا۔ اور ابو سفیان کا تجارتی قافلہ جس کی وجہ سے یہ جہاد کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی مکہ سے آنے والے لشکر کفار سے قریب اور مسلمانوں کی زد سے باہر تین میل کے فاصلہ پر سمندر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اس نقشہ جنگ کے بیان سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنگی اعتبار سے مسلمان بالکل بے موقع غلط جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے دشمن پر قابو پانے کا بلکہ اپنی جان بچانے کا بھی کوئی امکان ظاہری اعتبار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس میدان کی وہ جانب جو مدینہ سے قریب تھی ایک ریتیلی زمین تھی جس میں چلنا بھی دوبھر تھا۔ پھر پانی کی کوئی جگہ ان کے پاس نہ تھی۔ اور مدینہ سے بعید والی جانب جس پر کفار نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا وہ صاف زمین تھی اور پانی بھی وہاں سے قریب تھا۔

اور اس میدان کے دونوں کناروں کا پتہ دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ دونوں لشکر بالکل آمنے سامنے تھے کہ کسی کی طاقت یا ضعف دوسرے سے مخفی نہ رہ سکتا۔ نیز یہ بھی بتلا دیا کہ مشرکین مکہ کے لشکر کو یہ بھی اطمینان حاصل تھا کہ ہمارا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے نکل چکا ہے اب اگر ہمیں ضرورت پڑے تو وہ بھی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل مسلمان اپنی جگہ کے اعتبار سے بھی تکلیف و پریشانی میں تھے اور کہیں سے کمک ملنے کا بھی کوئی احتمال نہ تھا۔ اور یہ بات پہلے سے متعین اور ہر لکھے پڑھے آدمی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار۔ مسلمانوں کے پاس نہ سواریوں کی تعداد کافی تھی اور نہ اسلحہ کی۔ اُس کے بالمقابل لشکرِ کفار ان سب چیزوں سے آراستہ تھا۔

نہ مسلمان اس جہاد میں کسی مسلح لشکر سے جنگ کی طیاری کر کے نکلے تھے۔ ہنگامی طور پر ایک تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے اور دشمن کی قوت کو پست کرنے کے خیال سے صرف تین سو تیرہ مسلمان بے سامانی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے تھے چونکہ غیر ارادی طور پر ایک ہزار جوانوں کے مسلح لشکر سے مقابلہ پڑ گیا۔

قرآن کی اس آیت نے بتلایا کہ لوگوں کی نظر میں یہ واقعہ اگرچہ ایک اتفاقی حادثہ کی صورت میں

بلا ارادہ پیش آئے۔ لیکن دنیا میں جتنے اتفاقات غیر اختیاری صورت سے پیش آیا کرتے ہیں اُن کی سطح اور صورت اگرچہ محض اتفاقات کی ہوتی ہے لیکن خالق کائنات کی نظر میں وہ سب کے سب ایک مستحکم نظام کی لگی بندھی کڑیاں ہوتی ہیں اُن میں کوئی چیز بے ربط یا بے موقع نہیں ہوتی۔ جب وہ پورا نظام سامنے آجائے اُس وقت انسان کو پتہ لگ سکتا ہے کہ اس اتفاقی واقعہ میں کیا کیا حکمتیں مستور تھیں۔

غزوۂ بدر ہی کے واقعہ کو لے لیجئے اس کی اتفاقی اور غیر اختیاری صورت سے ظاہر ہونے میں یہ مصلحت تھی کہ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ یعنی اگر عام دنیا کی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی تمام پہلوؤں پر غور و فکر اور باہمی قرار دادوں کے ذریعہ لڑی جاتی تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جنگ ہوتی ہی نہیں بلکہ اس میں اختلاف پڑ جاتا خواہ اس طرح کہ خود مسلمانوں کی رائے اپنی قلت و کمزوری اور مقابل کی کثرت و قوت کو دیکھ کر مختلف ہو جاتی یا اس طرح کہ دونوں فریق اہل کفر و اہل اسلام مقررہ وعدہ پر میدان میں نہ پہنچتے۔ مسلمان تو اپنی قلت و کمزوری کو دیکھ کر اقدام کی ہمت نہ کرتے اور کفار پر حق تعالیٰ نے مسلمانوں کا رعب جمایا ہوا تھا وہ کثرت و قوت کے باوجود مقابلہ پر آنے سے گھبراتے۔

اس لئے قدرت کے مستحکم نظام نے دونوں طرف ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مکہ والوں کو تو ابوسفیان کے قافلہ کی گھبرائی ہوئی فریاد نے ایک ہولناک صورت میں سامنے آکر بے سوچے سمجھے چلنے پر آمادہ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس خیال نے کہ ہمارے مقابلہ پر کوئی جنگی مسلح لشکر نہیں، ایک معمولی تجارتی قافلہ ہے۔ مگر علیم و خبیر کو منظور یہ تھا کہ دونوں میں باقاعدہ جنگ ہو جائے تاکہ اس جنگ کے پیچھے جو نتائج فتح اسلام کے ظہور میں آنے والے ہیں وہ سامنے آجائیں۔ اسی لئے فرمایا وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا یعنی ان حالات کے باوجود جنگ اس لئے ہو کر رہی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرنا ہے اُس کی تکمیل کر دکھائے۔ اور وہ یہ تھا کہ ایک ہزار جوانوں کے مسلح باسامان لشکر کے مقابلہ میں تین سو تیرہ بے سروسامان فاقہ زدہ مسلمانوں کی ایک ٹولی اور وہ بھی محاذ جنگ کے اعتبار سے بے موقع جب اس پہاڑ سے ٹکرتی ہے تو یہ پہاڑ پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہ چھوٹی سی جماعت فتحمند ہوتی ہے، جو کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہے کہ اس جماعت کی پیٹھ پر کوئی بڑی قدرت اور طاقت کام کر رہی تھی جس سے یہ ایک ہزار کا لشکر محروم تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کی تائید اسلام کی وجہ سے اور اس کی محرومی کفر کی وجہ سے تھی۔ جس سے حق و باطل اور کھرے کھوٹے کا پورا امتیاز ہر سمجھدار انسان کے سامنے آگیا۔ اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۔ یعنی واقعہ بدر میں اسلام کی

کی کھلی حقانیت اور کفر و شرک کے باطل و مردود ہونے کو اس لئے کھول دیا گیا کہ آئندہ جو ہلاکت میں پڑے وہ دیکھ بھال کر پڑے اور جو زندہ رہے وہ بھی دیکھ بھال کر رہے۔ اندھیرے اور مغالطہ میں کوئی کام نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظ میں ہلاکت سے مراد کفر اور حیات و زندگی سے مراد اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق واضح ہو جانے کے بعد غلط فہمی کا احتمال اور عذر تو ختم ہو گیا اب جو کفر اختیار کرتا ہے وہ دیکھتی آنکھوں ہلاکت کی طرف جا رہا ہے اور جو اسلام اختیار کرتا ہے وہ دیکھ بھال کر دائمی زندگی اختیار کر رہا ہے پھر فرمایا وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ خوب سننے والے جاننے والے ہیں کہ سب کے دلوں میں چھپے ہوئے کفر و ایمان تک اُن کے سامنے ہیں اور ہر ایک کی سزا و جزا بھی۔

تینتالیسویں اور چوالیسویں دونوں آیتوں میں ایک خاص کرشمۂ قدرت کا ذکر ہے جو غزوۂ بدر کے میدان میں اس غرض کے لئے عمل میں لایا گیا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دونوں لشکروں میں سے کوئی بھی میدانِ جنگ چھوڑ کر اس جنگ کو ہی ختم کر ڈالے کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں مادی حیثیت سے بھی حقانیتِ اسلام کا مظاہرہ کرنا مقدر تھا۔

اور وہ کرشمۂ قدرت یہ تھا کہ لشکرِ کفار اگرچہ واقع میں مسلمانوں سے تین گنا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کو اُن کی تعداد بہت کم کر کے دکھلائی، تاکہ مسلمانوں میں کمزوری اور اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔ اور یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھلایا گیا آپ نے سب مسلمانوں سے بتلا دیا جس سے اُن کی ہمت بڑھ گئی۔ دوسری مرتبہ عین میدانِ جنگ میں جب کہ دونوں فریق آمنے سامنے کھڑے تھے مسلمانوں کو اُن کی تعداد کم دکھلائی گئی۔ آیت ۴۳ میں خواب کا واقعہ اور ۴۴ میں بیداری کا مذکور ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں اپنا مقابل لشکر ایسا نظر آرہا تھا کہ میں نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ نوّے آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے، اس شخص نے کہا کہ نہیں سَو ہوں گے۔

آخری آیت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی مقابل لشکر کی نظر میں کم کر کے دکھلایا۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد تو حقیقت ہی میں کم تھی وہ صحیح تعداد اُن کو دکھلا دی اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنی تعداد واقعی تھی اُس سے بھی کم کر کے دکھلایا گیا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کی تعداد تو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی جن کی خوراک ایک اونٹ ہو۔ عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لئے اس سے اندازہ قائم کیا جاتا تھا کہ

کتنے جانور ان کی خوراک کے لئے ذبح ہوتے ہیں، ایک اونٹ سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میدان بدر میں وہاں کے کچھ لوگوں سے قریش مکہ کے لشکر کا پتہ چلانے کے لئے پوچھا تھا کہ ان کے لشکر میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں تو آپ کو دس اونٹ روزانہ بتلائے گئے جس سے آپ نے ایک ہزار لشکر کا تخمینہ قائم فرمایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابوجہل کی نظر میں مسلمان کل سو آدمی کی تعداد میں دکھلائے گئے۔ یہاں بھی کم کرکے دکھلانے میں یہ حکمت تھی کہ مشرکین کے قلوب پر مسلمانوں کا رعب پہلے ہی نہ چھا جائے جس کی وجہ سے وہ میدان چھوڑ بھاگیں۔

فائدہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات معجزہ اور خرق عادت کے طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ غلط ہو جائے۔ جیسا یہاں ہوا۔

اسی لئے اس جگہ دوبارہ فرمایا لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۔ یعنی یہ کرشمہ قدرت اور آنکھوں کے مشاہدات پر تصرف اس لئے ظاہر کیا گیا کہ جو کام اللہ تعالیٰ کرنا چاہتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔ یعنی مسلمانوں کو قلت و بے سامانی کے باوجود فتح دے کر اسلام کی حقانیت اور تائید غیبی کا اظہار جو اس جنگ سے مقصود تھا وہ پورا کر دکھائے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یعنی آخر کار سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتے ہیں جو چاہے کرے جو چاہے حکم دے۔ قلت کو کثرت پر قوت کو ضعف پر غلبہ دے دے کم کو زیادہ، زیادہ کو کم کر دے۔ مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

گر تو خواہی عین غم شادی شود — عین بند پائے آزادی شود

چوں تو خواہی آتش آب خوش شود — ور تو خواہی آب ہم آتش شود

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند — با من و تو مردہ با حق زندہ اند

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت

كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا

یاد کرو تاکہ تم مراد پاؤ۔ اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور آپس میں نہ جھگڑو

فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾

پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا اور صبر کرو، بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ

اور نہ ہو جاؤ اُن جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو

وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾

اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے، اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو جب تم کو (کفار کی کسی) جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو (ان آداب کا لحاظ رکھو ایک یہ کہ) ثابت قدم رہو (بھاگو مت) اور (دوسرے یہ کہ) اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو (کہ ذکر کے سبب میں قوت ہوتی ہے) امید ہے کہ تم (مقابلہ میں) کامیاب ہو (کیونکہ ثباتِ قدم اور ثباتِ قلب جب جمع ہوں تو کامیابی غالب ہے) اور (تیسرے یہ کہ تمام امور متعلقہ حرب میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (کا لحاظ) کیا کرو (کہ کوئی کارروائی خلافِ شرع نہ ہو) اور (چوتھے یہ کہ اپنے امام سے اور باہم بھی) نزاع مت کرو ورنہ (باہمی نااتفاقی سے) کم ہمت ہو جاؤ گے (کیونکہ قوتیں منتشر ہو جائیں گی ایک کو دوسرے پر وثوق نہ ہوگا اور اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (ہوا خیزی سے مراد بدرعبی ہے کیونکہ دوسروں کو اس نااتفاقی کی اطلاع ہونے سے یہ امر لازمی ہے) اور (پانچویں یہ کہ اگر کوئی امر ناگواری کا پیش آئے تو اس پر) صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں (اور معیتِ الٰہی موجبِ نصرت ہے) اور (چھٹے یہ کہ نیت خالص رکھو تفاخر اور نمائش میں) ان (کافر) لوگوں کے مشابہ مت ہونا کہ جو اسی واقعۂ بدر میں، اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی شان و سامان) دکھلاتے ہوئے نکلے اور (اس فخر و ریا کے ساتھ یہ بھی نیت تھی کہ) لوگوں کو اللہ کے رستہ (یعنی دین) سے روکتے تھے (کیونکہ مسلمانوں کو زک دینے چلے تھے جس کا اثر عام طبائع پر بھی دین سے بُعد ہوتا) اور اللہ تعالیٰ (ان لوگوں کو پوری سزا دے گا چنانچہ وہ) ان کے اعمال کو (اپنے علم کے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

معارف و مسائل

جنگ و جہاد میں کامیابی کے لئے قرآنی ہدایت پہلی دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو میدانِ جنگ اور مقابلۂ دشمن کے لئے ایک خاص ہدایت نامہ دیا ہے جو اُن کے لئے دنیا میں کامیابی اور

فتحمندی کا اور آخرت کی نجات و فلاح کا نسخہ اکسیر ہے اور قرونِ اُولیٰ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں کی فوق العادت کامیابیوں اور فتوحات کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اور وہ چند چیزیں ہیں۔

اوّل ثبات۔ یعنی ثابت رہنا اور جمنا۔ جس میں ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم دونوں داخل ہیں کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط اور ثابت نہ ہو اس کا قدم اور اعضاء ثابت نہیں رہ سکتے اور یہ چیز ایسی ہے جس کو ہر مومن و کافر جانتا اور سمجھتا ہے اور دنیا کی ہر قوم اپنی جنگوں میں اس کا اہتمام کرتی ہے۔ کیونکہ اہلِ تجربہ سے مخفی نہیں کہ میدانِ جنگ کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار ثبات قلب و قدم ہی ہے دوسرے سارے ہتھیار اس کے بغیر بیکار ہیں۔

دوسرے ذکر اللہ یہ وہ مخصوص اور معنوی ہتھیار ہے جس سے مومن کے سوا عام دنیا غافل ہے پوری دنیا جنگ کے لئے بہترین اسلحہ فراہم کرنے سے نیا سامان مہیا کرنے اور فوج کے ثابت قدم رکھنے کی تو پوری تدبیریں کرتی ہے۔ مگر مسلمانوں کے اس روحانی اور معنوی ہتھیار سے بے خبر اور ناآشنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر میدان میں جہاں مسلمانوں کا مقابلہ ان ہدایت کے مطابق کسی قوم سے ہوا مخالف کی پوری طاقت اور اسلحہ اور سامان کو بیکار کر دیا۔ ذکر اللہ کی اپنی ذاتی اور معنوی برکات تو اپنی جگہ ہیں ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ثباتِ قدم کا اس سے بہتر کوئی نسخہ بھی نہیں۔ اللہ کی یاد اور اس پر اعتماد وہ بجلی کی طاقت ہے جو ایک انسانِ ضعیف کو پہاڑوں سے ٹکر جانے پر آمادہ کر دیتی ہے اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ کی یاد سب کو ہوا میں اڑا دیتی ہے اور انسان کے قلب کو مضبوط اور قدم کو ثابت رکھتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھئے کہ جنگ وقتال کا وقت عادۃً ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا اپنی فکر پڑی ہوتی ہے۔ اسی لئے جاہلیت عرب کے شعراء میدانِ جنگ میں بھی اپنے محبوب کو یاد کرنے پر فخر کیا کرتے ہیں کہ وہ بڑی قوت قلب اور محبت کی پختگی کی دلیل ہے ایک جاہلی شاعر نے کہا ہے ؎ ذکرتك والخطی یخطر بیننا۔ یعنی میں نے تجھے اس وقت بھی یاد کیا جب کہ نیزے ہمارے درمیان لچک رہے تھے۔

قرآن کریم نے اس پُرخطر موقع میں مسلمانوں کو ذکر اللہ کی تلقین فرمائی اور وہ بھی کثیرًا کی تاکید کے ساتھ۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پورے قرآن میں ذکر اللہ کے سوا کسی عبادت کو کثرت سے کرنے کا حکم نہیں صَلٰوۃً کَثِیْرًا صِیَامًا کَثِیْرًا کہیں مذکور نہیں۔ سبب یہ ہے کہ ذکر اللہ ایک ایسی آسان عبادت ہے کہ اس میں نہ کوئی بڑا وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت نہ کسی دوسرے کام میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ذکر اللہ کے لئے

کوئی شرط اور پابندی، وضو، طہارت، لباس و قبلہ وغیرہ کی بھی نہیں لگائی ہر شخص ہر حال میں باوضو، بے وضو، کھڑے، بیٹھے، لیٹے کر سکتا ہے اور اُس پر اگر امام جزری کی اس تحقیق کا اضافہ کر لیا جائے جو انھوں نے حصن حصین میں لکھی ہے کہ ذکر اللہ صرف زبان یا دل سے ذکر کرنے ہی کو نہیں کہتے بلکہ ہر جائز کام جو اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں رہ کر کیا جائے وہ بھی ذکر اللہ ہے۔ تو اس تحقیق پر ذکر اللہ کا مفہوم اس قدر عام اور آسان ہو جاتا ہے کہ سوتے ہوئے بھی انسان کو ذاکر کہہ سکتے ہیں۔ جیسے بعض روایت میں ہے نوم العالم عبادۃ یعنی عالم کی نیند بھی عبادت میں داخل ہے کیونکہ عالم جو اپنے علم کے مقتضیٰ پر عمل کرتا ہو اُس کے لئے یہ لازم ہے کہ اُس کا سونا اور جاگنا سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کے دائرہ میں ہو۔

میدان جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اگرچہ بظاہر مجاہدین کے لئے ایک کام کا اضافہ نظر آتا ہے جو عادۃً مشقت و محنت کو چاہتا ہے۔ لیکن ذکر اللہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ محنت نہیں لیتا بلکہ ایک فرحت و قوت اور لذت بخشتا ہے اور انسان کے کام میں اور معین و مددگار بنتا ہے۔ یوں بھی محنت و مشقت کے کام کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کلمہ یا گیت گنگنایا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اُس کا نعم البدل دے دیا جو ہزاروں فوائد اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ یعنی اگر تم نے ثبات اور ذکر اللہ کے دو گُر یاد کر لئے اور ان کو میدان جنگ میں استعمال کیا تو فلاح و کامیابی تمہاری ہے۔

میدانِ جنگ کا ذکر ایک تو وہ ہے جو عام طور پر نعرۂ تکبیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر نظر اور اعتماد و توکل اور دل سے اُس کی یاد۔ لفظ ذکر اللہ ان سب کو شامل ہے۔

چھیالیسویں آیت میں ایک تیسری چیز کی تلقین اور کی گئی وہ ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت اُس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے معصیت و نافرمانی تو اللہ کی ناراضی اور ہر فضل سے محرومی کے اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح میدانِ جنگ کے لئے قرآنی ہدایت نامہ کی تین دفعات ہو گئیں ثبات، ذکر اللہ، اطاعت۔ اس کے بعد فرمایا وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا۔ اس میں مضر پہلوؤں پر تنبیہ کر کے اُن سے بچنے کی ہدایت ہے۔ اور وہ مضر پہلو جو جنگ کی کامیابی میں مانع ہوتا ہے باہمی نزاع و اختلاف ہے۔ اس لئے فرمایا وَلَا تَنَازَعُوْا۔ یعنی آپس میں نزاع و کشمکش نہ کرو۔ ورنہ تم میں بزدلی پھیل جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس میں باہمی نزاع کے دو نتیجے بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ تم ذاتی طور پر کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی دشمن کی نظروں میں حقیر ہو جاؤ گے باہمی کشاکش

اور نزاع سے دوسروں کی نظر میں حقیر ہو جانا تو بدیہی امر ہے لیکن خود اپنی قوت پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے کہ اس میں کمزوری اور بزدلی آجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہمی اتحاد و اعتماد کی صورت میں ہر ایک انسان کے ساتھ پوری جماعت کی طاقت لگی ہوئی ہوتی ہے اس لئے ایک آدمی اپنے اندر بقدر اپنی جماعت کے قوت محسوس کرتا ہے اور جب باہمی اتحاد و اعتماد نہ رہا تو اس کی اکیلی قوت رہ گئی وہ ظاہر ہے جنگ و قتال کے میدان میں کوئی چیز نہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاصْبِرُوْا یعنی صبر کو لازم پکڑو۔ سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتلایا گیا ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ کوئی جماعت کتنی ہی متحد الخیال اور متحد المقصد ہو مگر افراد انسانی کی طبعی خصوصیات ضرور مختلف ہو کرتی ہیں، نیز کسی مقصد کے لئے سعی و کوشش میں اہل عقل و تجربہ کی رایوں کا اختلاف بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے دوسروں کے ساتھ چلنے اور اُن کو ساتھ رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو اور اپنی رائے پر اتنا جماؤ اور اصرار نہ ہو کہ اُس کو قبول نہ کیا جائے تو لڑ بیٹھے۔ اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔ آج کل یہ تو ہر شخص جانتا اور کہتا ہے کہ آپس کا نزاع بہت بُری چیز ہے مگر اُس سے بچنے کا جو گُر ہے کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے کا خوگر ہو اپنی بات منوانے اور چلانے کی فکر میں نہ پڑے۔ یہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اسی لئے اتحاد و اتفاق کے سارے وعظ و پند بے سود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آدمی کو دوسرے سے اپنی بات منوانے پر تو قدرت نہیں ہوتی مگر خود دوسرے کی بات مان لینا اور اگر اُس کی عقل و دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ اُس کو نہ مانے تو کم از کم نزاع سے بچنے کے لئے سکوت کر لینا تو بہرحال اختیار میں ہے اس لئے قرآن کریم نے نزاع سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی ہر فرد جماعت کو کر دی تاکہ نزاع سے بچنا عملی دنیا میں آسان ہو جائے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآنِ کریم نے اس جگہ لَا تَنَازَعُوْا فرمایا ہے یعنی باہمی کشاکش کو روکا ہے رائے کے اختلاف یا اُس کے اظہار سے منع نہیں کیا۔ اختلاف رائے جو دیانت اور اخلاص کے ساتھ ہو وہ کبھی نزاع کی صورت اختیار نہیں کیا کرتا۔ نزاع و جدال وہیں ہوتا ہے جہاں اختلاف رائے کے ساتھ اپنی بات منوانے اور دوسرے کی بات نہ ماننے کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کو قرآن کریم نے وَاصْبِرُوْا کے لفظ سے ختم کیا ہے اور آخر میں صبر کرنے کا ایک عظیم الشان فائدہ بتلا کر صبر کی تلخی کو دور فرما دیا۔ ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں ان کا رفیق ہوتا ہے اور یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ دونوں جہان کی ساری دولتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں انہیں ہدایات کو مستحضر کرانے کے لئے عین میدانِ جنگ میں یہ خطبہ دیا "اے لوگو دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور جب ناگزیر طور پر مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر صبر و ثبات کو لازم پکڑو اور یہ سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے"۔ (مسلم)

سینتالیسویں آیت میں ایک اور مضر پہلو پر تنبیہ اور اُس سے پرہیز کی ہدایت دی گئی ہے وہ ہے اپنی قوت و کثرت پر ناز یا کام میں اخلاص کے بجائے اپنی کوئی اور غرض مضمر ہونا کیونکہ یہ دونوں چیزیں بھی بڑی بڑی طاقتور جماعتوں کو پسپا اور زیر کر دیا کرتی ہیں۔

اس آیت میں اشارہ قریش مکہ کے حالات کی طرف بھی ہے جو اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے بھاری تعداد اور سامان لے کر اپنی قوت و کثرت پر اتراتے ہوئے نکلے تھے۔ اور جب تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے باہر ہو گیا اُس وقت بھی اس لئے واپس نہیں ہوئے کہ اپنی شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرنا تھا۔

مستند روایات میں ہے کہ جب ابوسفیان اپنا تجارتی قافلہ لے کر مسلمانوں کی زد سے بچ نکلے تو ابوجہل کے پاس قاصد بھیجی کہ اب تمہارے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں رہی واپس آجاؤ اور بھی بہت سے قریش سرداروں کی یہی رائے تھی۔ مگر ابوجہل اپنے کبر و غرور اور شہرت پرستی کے جذبہ میں قسم کھا بیٹھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک چند روز مقام بدر پر پہنچ کر اپنی فتح کا جشن نہ منالیں۔

جس کے نتیجہ میں وہ اور اُس کے بڑے بڑے ساتھی سب وہیں ڈھیر ہوئے اور ایک گڑھے میں ڈالے گئے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ان کے طریقہ کار سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ

اور جس وقت خوشنما کر دیا شیطان نے اُن کی نظروں میں اُن کے عملوں کو اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہو گا تم پر

الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتٰنِ

آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں، پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں

نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّنْكُمْ إِنِّيٓ أَرٰى مَا لَا

تو وہ اُلٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم

تَرَوْنَ إِنِّيٓ أَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ إِذْ يَقُوْلُ

نہیں دیکھتے میں ڈرتا ہوں اللہ سے، اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔ جب کہنے لگے

ع ۲

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ

منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر،

وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾

اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جب کہ شیطان نے ان (کفار) کو (بذریعہ وسوسہ) ان کے اعمال (کفریہ عداوت و مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) خوشنما کرکے دکھلائے (کہ انہوں نے ان باتوں کو اچھا سمجھا) اور (وسوسہ سے بڑھ کر یہ کیا کہ بامشافہ ان سے) کہا کہ (تم کو وہ قوت و شوکت ہے کہ تمہارے مخالف) لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں (نہ بیرونی دشمنوں سے ڈرو اور نہ اندرونی دشمنوں سے اندیشہ کرو) پھر جب دونوں جماعتیں (کفار و مسلمین کی) ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں (اور اس نے ملائکہ کا نزول دیکھا) تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہہ کر میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں میں حامی وامی کچھ نہیں بنتا کیونکہ میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں (مراد فرشتے ہیں) میں تو خدا سے ڈرتا ہوں (کبھی کسی فرشتہ سے دنیا ہی میں میری خبر لوا دے) اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب منافقین (مدینہ والوں میں سے) اور جن کے دلوں میں (شک کی) بیماری تھی (مکہ والوں میں سے مسلمانوں کا بے سروسامانی کے ساتھ مقابلہ کفار میں آجانا دیکھ کر) یوں کہتے تھے کہ ان (مسلمان) لوگوں کو ان کے دین نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ اپنے دین کے حق ہونے کے بھروسے ایسے خطرہ میں آپڑے۔ اللہ جواب دیتے ہیں) اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو (وہ اکثر غالب ہی آتا ہے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (اس لئے اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے کو غالب کر دیتے ہیں اور احیاناً ایسا شخص مغلوب ہو جائے تو اس میں کچھ مصلحت ہوتی ہے کیونکہ) وہ حکمت والے (بھی) ہیں (غرض ظاہری سامان و بے سامانی پر مدار نہیں قادر کوئی اور ہی ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ انفال میں شروع سے غزوۂ بدر میں پیش آنے والے واقعات اور حالات کا اور ان سے حاصل ہونے والی نصائح اور عبرتوں کا اور متعلقہ احکام کا بیان چل رہا ہے۔

اسی میں یک واقعہ قریش مکہ کو شیطان کے فریب دے کر مسلمانوں کے مقابلہ پر اُبھارنے اور پھر عین میدانِ جنگ میں ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانے کا ہے جو آیت مذکورہ کے شروع میں مذکور ہے۔

شیطان کا یہ فریب قریش کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی صورت سے تھا یا انسانی شکل میں آکر روبرو گفتگو سے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں مگر الفاظ قرآن سے زیادہ تر تائید دوسری ہی صورت کی ہوتی ہے کہ بشکل انسانی سامنے آکر فریب دیا۔

امام ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریش مکہ کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں پر ایک خطرہ اس کا سوار تھا کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنو بکر بھی ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقع پا کر ہمارے گھروں اور عورتوں، بچوں پر چھاپہ مار دے۔ امیر قافلہ ابوسفیان کی گھبرائی ہوئی فریاد پر طیار ہو کر نکل تو کھڑے ہوئے مگر یہ خطرہ ان کے لئے زنجیر پا بنا ہوا تھا کہ اچانک شیطان سراقہ بن مالک کی صورت میں اس طرح سامنے آیا کہ اس کے ہاتھ میں جھنڈا اور اُس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا ہے۔ سراقہ بن مالک اُس علاقہ اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا جن سے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قریشی جوانوں کے لشکر سے خطاب کیا اور دو طرح سے فریب میں مبتلا کیا۔ اول یہ کہ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ یعنی آج تمام لوگوں میں تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے مقابل فریق کی قوت کا بھی اندازہ ہے اور تمہاری قوت و کثرت کو بھی دیکھ رہا ہوں اس لئے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بے فکر ہو کر آگے بڑھو تمہیں غالب رہو گے کوئی تمہارے مقابلہ پر غالب آنے والا نہیں۔

دوسرے یہ کہ اِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ یعنی تمہیں جو بنی بکر وغیرہ سے خطرہ لگا ہوا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے مکہ پر چڑھ دوڑیں گے۔ اس کی میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا میں تمہارا حامی ہوں۔ قریش مکہ سراقہ بن مالک اور اُس کی بڑی شخصیت اور اثر و رسوخ سے پہلے سے واقف تھے اُس کی بات سُن کر ان کے دل جم گئے اور قبیلہ بنی بکر کے خطرہ سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس دوگونہ فریب سے شیطان نے ان لوگوں کو اپنے مقتل کی طرف ہانک دیا فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔ جب مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کی دونوں جماعتیں (مقام بدر میں) آمنے سامنے ہوئیں تو شیطان پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔

غزوۂ بدر میں چونکہ مشرکین مکہ کی پیٹھ پر ایک شیطانی لشکر بھی آگیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ

نے اُن کے مقابلہ میں فرشتوں کا لشکر جبرئیل و میکائیل کی قیادت میں بھیج دیا۔ امام ابن جریر وغیرہ نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ شیطان نے جو اُس وقت بشکل انسانی سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنے شیطانی لشکر کی قیادت کر رہا تھا، جب جبریل امین اور اُن کے ساتھ فرشتوں کا لشکر دیکھا تو گھبرا اُٹھا اُس وقت اُس کا ہاتھ ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا فوراً اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کرتے ہو تو اُس کے سینہ پر مار کر حارث کو گرا دیا۔ اور اپنے شیطانی لشکر کو لے کر بھاگ پڑا۔ حارث نے اُس کو سراقہ سمجھتے ہوئے کہا کہ اے عرب کے سردار سراقہ تو نے تو یہ کہا تھا کہ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں اور عین میدانِ جنگ میں یہ حرکت کر رہے ہو۔ تو شیطان نے بشکل سراقہ جواب دیا۔ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ یعنی میں تمہارے معاہدہ سے بری ہوتا ہوں کیونکہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہاری آنکھیں نہیں دیکھتیں مراد فرشتوں کا لشکر تھا۔ اور یہ کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اس لئے تمہارا ساتھ چھوڑتا ہوں۔

شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو اُن کی قوت سے وہ واقف تھا سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ امام تفسیر قتادہ نے کہا کہ یہ اس نے جھوٹ بولا اگر وہ خدا سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور عذاب شدید کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ نرا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

ابوجہل نے جب سراقہ اور اُس کے لشکر کی پسپائی سے اپنے لشکر کی ہمت کو ٹوٹتے دیکھا تو بات بنائی اور کہا کہ سراقہ کے بھاگ جانے سے تم متاثر نہ ہو اس نے تو خفیہ طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سازش کر رکھی تھی۔ شیطان کی پسپائی کے بعد ان کا جو حشر ہونا تھا ہو گیا۔ پھر جب یہ لوگ مکہ واپس آئے اور ان میں سے کسی کی ملاقات سراقہ بن مالک کے ساتھ ہوئی تو اُس نے سراقہ کو ملامت کی کہ جنگِ بدر میں ہماری شکست اور سارے نقصان کی ذمہ داری تجھ پر ہے تو نے عین میدان جنگ میں پسپا ہو کر ہمارے جوانوں کی ہمت توڑ دی۔ اس نے کہا کہ میں نہ تمہارے ساتھ گیا نہ تمہارے کسی کام میں شریک ہوا۔ میں نے تو تمہاری شکست کی خبر بھی تمہارے مکہ پہنچنے کے بعد سنی۔

یہ سب روایت امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان لعین کی یہ عام عادت ہے کہ انسان کو بُرائی میں مبتلا کر کے عین موقع پر الگ ہو جاتا ہے قرآن کریم نے اس کی یہ عادت بار بار بیان فرمائی ہے۔ ایک آیت میں ہے کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ

اَلْكُفْرَ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

شیطانی دجل و فریب اور اس سے بچنے کا طریقہ

آیتِ متذکرہ کے اس واقعہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔

اَوّل یہ کہ شیطان انسان کا دشمن ہے اُس کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کے حیلے کرتا اور بہروپ بدلتا ہے۔ بعض اوقات محض دل میں وسوسہ ڈال کر پریشان کرتا ہے اور بعض اوقات سامنے آکر دھوکا دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قدرت دی ہے کہ وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایک مشہور حنفی فقیہ کی کتاب آکام المرجان فی احکام الجان میں اس کو بوضاحت ثابت کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین صوفیائے کرام جو اصحابِ کشف و شہود ہیں اُنھوں نے لوگوں کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر یا اس کا کلام سن کر بغیر تحقیقِ حال کے اس کے پیچھے چلنا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کشف و الہام میں بھی شیطانی تلبیسات ہو سکتی ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ست پس بہر دستے نشاید داد دست

اور حافظ نے فرمایا ؎

در راہِ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش را بہ پیامِ سروش دار

پیامِ سروش سے مراد وحیِ الٰہی ہے۔

کامیابی کے لئے صرف اخلاصِ نیت ہی کافی نہیں اس سے پہلے راستہ سیدھا ہونا ضروری ہے

تیسرے یہ کہ جو لوگ کفر و شرک یا دوسرے ناجائز اعمال میں مبتلا ہوتے ہیں، اُس کا بیشتر سبب یہی ہوتا ہے کہ شیطان ان کے اعمالِ بد کو خوبصورت مستحسن اور نفع بخش ظاہر کرکے ان کے دل و دماغ کو حق و صدق اور صحیح نتائج کی طرف سے پھیر دیتا ہے وہ اپنے باطل ہی کو حق اور بُرے کو بھلا سمجھنے لگتے ہیں، اور اہلِ حق کی طرح اپنے باطل پر جان دینے کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے قریشی لشکر اور اس کے سردار جب بیت اللہ سے رخصت ہو رہے تھے تو بیت اللہ کے سامنے ان الفاظ سے دُعا کرکے چلے تھے کہ اللّٰھم انصر اھدی الطائفتین یعنی اے اللہ ہم دونوں جماعتوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہے اس کی مدد فرمائیے اور فتح دیجئے۔ یہ بے خبر لوگ شیطانی فریب میں آکر اپنے آپ ہی کو زیادہ ہدایت پر اور حق بجانب سمجھتے تھے۔ اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنے باطل کی حمایت و نصرت میں جان مال قربان کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ نرا اخلاص کافی نہیں جب تک کہ عمل کا رُخ درست نہ ہو۔

اس کے بعد کی دوسری آیت میں منافقینِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کا ایک مشترک مقولہ مسلمانوں

کے بارہ میں یہ نقل کیا جو گویا ان پر ترس کھا کر کہا گیا ہے کہ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ. یعنی میدانِ بدر میں یہ مٹھی بھر مسلمان اتنے بھاری اور قوی لشکر سے ٹکرانے آگئے ان بے چاروں کو ان کے دین نے فریب میں ڈال کر موت کے منہ میں دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کر لیتا ہے تو یاد رکھو کہ وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اُس کی حکمت کے سامنے سب کی عقل و دانش رکھی رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ صرف مادہ اور مادیات کو جاننے والے اور اُسی پر بھروسہ کرنے والے ہو تمہیں اُس مخفی طاقت کی خبر نہیں جو اس مادہ اور مادیت کے پیدا کرنے والے کے خزانوں میں ہے اور جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتماد رکھتے ہیں۔

آج بھی دیندار بھولے بھالے مسلمانوں کو دیکھ کر بہت سے عقل و دانش کے مدعی یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

لیکن اگر ان میں اللہ پر ایمان اور اعتماد پورا ہو تو انہیں اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ

اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے مارتے ہیں اُن کے منہ پر

وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ

اور ان کے پیچھے، اور کہتے ہیں چکھو عذاب جلنے کا۔ یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا

اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ

اپنے ہاتھوں اور اس واسطے کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر۔ جیسے دستور فرعون والوں کا

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ

اور جو ان سے پہلے تھے، کہ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا اُن کو اللہ نے ان کے گناہوں پر،

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا

بیشک اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنے والا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں

نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ۙ

اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر آپ (اس وقت کا واقعہ) دیکھیں (تو عجیب واقعہ نظر آئے) جب کہ فرشتے ان (موجودہ) کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہیں (اور) ان کے منہ پر اور ان کی پشتوں پر مارتے جاتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ (ابھی کیا ہے آگے چل کر) آگ کی سزا جھیلنا (اور) یہ عذاب ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں (سو اللہ تعالیٰ نے بے جرم سزا نہیں دی پس) ان کی حالت (اس بارہ میں کہ کفر پر سزایاب ہوئے) ایسی ہے جیسی فرعون والوں کی اور ان سے پہلے (کافر) لوگوں کی حالت تھی کہ انہوں نے آیاتِ الٰہیہ کا انکار کیا سو خدا تعالیٰ نے ان کے (ان) گناہوں پر ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے سخت سزا دینے والے ہیں (کہ ان کے مقابلہ میں کوئی ایسی قوت نہیں کہ ان کے عذاب کو ہٹا سکے اور) یہ بات (کہ بلا جرم ہم سزا نہیں دیتے) اس سبب سے ہے (کہ ہمارا ایک قاعدہ کلیہ مقرر ہے اور بلا جرم سزا نہ دینا اسی قاعدہ کی ایک فرع ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں (پس وہ تغیر قولی کو سنتے ہیں تغیر فعلی کو جانتے ہیں سو ان کفار موجودین نے اپنی یہ حالت بدلی کہ ان میں باوجود کفر کے اول ایمان لانے کی استعداد قریب تھی انکار و مخالفت کر کر کے اس کو بعید کر ڈالا پس ہم نے اپنی نعمت امہال کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی مبدل بہلاکت کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے بطریق مذکور نعمت قربِ استعداد کو بدل ڈالا)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی دو آیتوں میں موت کے وقت کافروں کے عذاب اور فرشتوں کی تنبیہات کا ذکر ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کافروں کا حال اُس وقت دیکھتے جبکہ اللہ کے فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ آگ میں جلنے کا عذاب چکھو۔ تو آپ ایک بڑا ہیبتناک منظر دیکھتے۔

ائمۂ تفسیر میں سے بعض حضرات نے اس کو اُن کفارِ قریش کے متعلق قرار دیا ہے جو میدانِ بدر میں مسلمانوں کے مقابلہ پر آئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی امداد کے لئے فرشتوں کا لشکر

بھیج دیا تھا اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ میدانِ بدر میں جو قریشی سردار مارے گئے اُن کے مارنے میں فرشتوں کا ہاتھ تھا جو اُن کے سامنے سے چہروں پر اور پیچھے سے اُن کی پشتوں پر مار کر اُن کو ہلاک کر رہے تھے، اور ساتھ ہی آخرت میں جہنم کے عذاب کی خبر سنا رہے تھے۔

اور جن حضرات نے الفاظِ آیت کے عموم کی بنا پر اس کا مضمون عام رکھا ہے اُن کے مطابق معنی آیت کے یہ ہیں کہ جب کوئی کافر مرتا ہے فرشتۂ موت اُن کی روح قبض کرنے کے وقت اُن کے چہرہ اور پشت پر مارتا ہے بعض روایات میں ہے کہ آگ کے کوڑے، اور لوہے کے گرز اُن کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جن سے وہ مرنے والے کافر کو مارتے ہیں۔ مگر چونکہ اس عذاب کا تعلق اس عالمِ ناسوت سے نہیں بلکہ عالمِ قبر سے ہے جس کو برزخ کہا جاتا ہے اس لئے یہ عذاب عام طور پر آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خطاب کیا گیا کہ اگر آپ دیکھتے تو بڑا عبرتناک منظر دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ موت کے بعد عالمِ برزخ میں کفار کو عذاب ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اس لئے عام طور پر دیکھا نہیں جاتا۔ عذابِ قبر کا ذکر قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے اور روایاتِ حدیث تو اس معاملہ میں بے شمار ہیں۔

دوسری آیت میں کفار کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ عذابِ دنیا و آخرت تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، چونکہ عام کاروبار ہاتھوں ہی سے وجود میں آتے ہیں اس لئے ہاتھوں کا ذکر کر دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں کہ بلاوجہ کسی کو عذاب میں مبتلا کر دیں۔

تیسری آیت میں بتلا دیا گیا کہ ان مجرموں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب کوئی انوکھی چیز نہیں بلکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اُن کو عقل و فہم دیتے ہیں۔ گرد و پیش میں اُن کے لئے بیشمار ایسی چیزیں موجود ہوتی ہیں جن میں غور و فکر کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و عظمت کو پہچانیں اور عاجز مخلوق کو اُس کا شریک نہ بنائیں پھر مزید تنبیہ کے لئے اپنی کتابیں اور رسول بھیجتے ہیں۔ اللہ کے رسول اُن کے فہم و تفہیم میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے وہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ کے مظاہر بھی بشکل معجزات دکھلاتے ہیں۔ جب کوئی فرد یا قوم ان سب چیزوں سے بالکل آنکھیں بند کر لے اور خدائی تنبیہات میں سے کسی پر کان نہ دھرے تو پھر عادت اللہ تعالیٰ کی ایسی لوگوں کے بارہ میں یہی ہے کہ دنیا میں بھی اُن پر عذاب آتا ہے اور آخرت کے دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہوتے ہیں۔ ارشاد فرمایا كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ دأب کے معنی عادت کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے اٰلِ فرعون اور اُن سے پہلے کافروں

سرکشوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی عادت دنیا کو معلوم ہو چکی ہے کہ فرعون کو اس کے سارے حشم و خدم سمیت دریا میں غرق کر دیا اور اُن سے پہلے عاد و ثمود کی قوموں کو مختلف قسم کے عذابوں سے ہلاک کر دیا۔

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عذاب میں پکڑ لیا۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی ہے کوئی قوت و شجاعت و دنیاوی قوت کے بل پر اُس کے عذاب سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا بھی بڑی سخت ہے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے انعام و عطاء کے قائم و باقی رکھنے کا ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتے ہیں اُس کو اُس وقت تک بدلتے نہیں جب تک یہ لوگ خود ہی اپنے حالات اور اعمال کو نہ بدل دیں۔

یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے عطاء نعمت کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بیان فرمایا، نہ اُس کے لئے کوئی قید و شرط لگائی نہ اُس کو کسی کے اچھے عمل پر موقوف رکھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلی نعمت جو خود ہمارا وجود ہے اور اُس میں قدرت حق جل شانہ کی عجیب صنعت گری سے ہزاروں حیرت انگیز نعمتیں ودیعت رکھی گئی ہیں یہ نعمتیں ظاہر ہے کہ اُس وقت عطا ہوئیں جب کہ نہ ہم تھے نہ ہمارا کوئی عمل تھا ۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

اگر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بندوں کے نیک اعمال کے منتظر رہا کرتے تو ہمارا وجود ہی قائم نہ ہوتا۔

حق تعالیٰ کی نعمت و رحمت تو اُس کے رب العالمین اور رحمن و رحیم ہونے کے نتیجہ میں خود بخود ہے۔ ہاں اس نعمت و رحمت کے قائم و باقی رہنے کا ایک ضابطہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دیتے ہیں اُس سے اُس وقت تک واپس نہیں لیتے جب تک وہ اپنے حالات اور اعمال کو بدل کر خود ہی اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دے۔

حالات کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال اور حالات کو بدل کر بُرے اعمال اور بُرے حالات اختیار کر لے یا یہ کہ اللہ کی نعمتیں مبذول ہونے کے وقت جن اعمالِ بد اور گناہوں میں مبتلا تھا نعمتوں کے ملنے کے بعد اُن سے زیادہ بُرے اعمال میں مبتلا ہو جائے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن قوموں کا ذکر پچھلی آیت میں آیا ہے یعنی کفار قریش اور آل فرعون ان کا تعلق اس آیت سے اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملنے کے

وقت بھی کچھ اچھے حالت میں نہیں تھے سب کے سب مشرک اور کافر ہی تھے۔ لیکن انعامات کے بعد یہ لوگ اپنی بدعملیوں اور شرارتوں میں پہلے سے زیادہ تیز ہوگئے۔

آل فرعون نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے مظالم کرنے شروع کر دیئے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہوگئے جو ان کے پچھلے جرائم میں ایک شدید اضافہ تھا جس کے ذریعہ انھوں نے اپنے حالات مزید برائی کی طرف بدل ڈالے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو نقمت اور عذاب سے بدل دیا۔ اسی طرح قریش مکہ اگرچہ مشرک اور بدعمل تھے لیکن اس کے ساتھ ان میں کچھ اچھے اعمال صلۂ رحمی، مہمان نوازی، حجاج کی خدمت، بیت اللہ کی تعظیم وغیرہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر دین و دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے۔ دنیا میں اُن کی تجارتوں کو فروغ دیا۔ اور ایسے ملک میں جہاں کسی کا تجارتی قافلہ سلامتی سے نہ گزر سکتا تھا ان لوگوں کے تجارتی قافلے ملک شام و یمن میں جاتے اور کامیاب آتے تھے جس کا ذکر قرآن کریم نے سورہ لایلٰف میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ کے عنوان سے کیا ہے۔

اور دین کے اعتبار سے وہ عظیم نعمت ان کو عطا ہوئی جو پچھلی کسی قوم کو نہیں ملی تھی کہ سید الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ان میں مبعوث ہوئے اللہ تعالیٰ کی آخری اور جامع کتاب قرآن ان میں بھیجی گئی۔

مگر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی شکرگزاری اور قدر کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے حالات کو درست کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ گندے کر دیئے کہ صلہ رحمی کو چھوڑ کر مسلمان ہو جانے والے بھائی بھتیجوں پر وحشیانہ مظالم کرنے لگے۔ مہمان نوازی کے بجائے ان مسلمانوں پر آب و دانہ بند کرنے کے عہدنامے لکھے گئے۔ حجاج کی خدمت کے بجائے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنے لگے۔ یہ وہ حالات تھے جن کو کفار قریش نے بدلا۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو نقمتوں اور عذاب کی صورت میں تبدیل کر دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوئے اور جو ذات رحمۃ للعالمین بن کر آئی تھی اُسی کے ذریعہ انھوں نے اپنی موت و ہلاکت کو دعوت دے دی۔

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں تیسرے دادا کے دادا ہیں یہ ابتداء سے دین ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے پابند اور اُس پر قائم تھے اور نسلاً بعد نسل اس دین کی قیادت و سیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کرتے اور بتلایا

کرتے تھے کہ ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے، اُن کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو اُن پر ایمان نہ لائے گا اُس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اُن کے عربی اشعار شعراء جاہلیت میں مشہور و معروف ہیں۔ اور قصی بن کلاب تمام حجاج کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہد مبارک تک قائم رہیں۔ اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالت سے یہ مراد ہو کہ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی۔

بہرحال مضمون آیت سے یہ معلوم ہوا کہ بعض وقت حق تعالیٰ اپنی نعمت بعض ایسے لوگوں کو بھی عطا فرماتے ہیں جو اپنے عمل سے اُس کے مستحق نہیں ہوتے لیکن عطاء نعمت کے بعد اگر وہ اپنے اعمال کا رخ اصلاح و درستی کی طرف پھیرنے کے بجائے اعمال بد میں اور زیادتی کرنے لگیں تو پھر یہ نعمت اُن سے چھین لی جاتی ہے اور وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی ہر گفتگو کو سننے والے اور اُن کے تمام اعمال و افعال کو جاننے والے ہیں اس میں کسی غلطی یا غلط فہمی کا امکان نہیں۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے، کہ انھوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا

پھر ہلاک کر دیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر اور ڈبو دیا ہم نے فرعون والوں کو، اور سارے

ظٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَاۗبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا

ظالم تھے۔ بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں

يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ

ایمان لاتے۔ جن سے تو نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد

كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ

ہر بار اور وہ ڈر نہیں رکھتے۔ سو اگر کبھی تو پائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی سزا

بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ

دے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں ان کے پچھلے تاکہ ان کو عبرت ہو۔ اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے

خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ۝ؑ

دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز۔

ع ۷

خلاصۂ تفسیر

(پس اس امر تغیر میں بھی) ان کی حالت فرعون والوں اور ان سے پہلے والوں کی سی حالت ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا اس پر ہم نے ان کو ان کے (ان) گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور (ان میں) فرعون والوں کو خاص طور پر ہلاک کیا کہ ان کو) غرق کر دیا اور وہ (فرعون والے اور پہلے والے) سب ظالم تھے بلاشبہ بدترین خلائق اللہ کے نزدیک یہ کافر لوگ ہیں (جب یہ علم الٰہی میں ایسے ہیں) تو یہ ایمان نہ لائیں گے جن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ ان سے (کئی بار) عہد لے چکے ہیں مگر پھر (بھی) وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (عہد شکنی سے) ڈرتے نہیں سو اگر آپ لڑائی میں ان لوگوں پر قابو پائیں (اور یہ آپ کے ہاتھ آئیں) تو ان پر حملہ کر کے (اس) کے ذریعہ سے اور لوگوں کو جو کہ ان کے علاوہ ہیں منتشر کر دیجئے تاکہ وہ لوگ سمجھ جائیں (کہ نقض عہد کا یہ وبال ہوا ہم ایسا نہ کریں۔ یہ حکم تو اس وقت ہے کہ جب ان لوگوں نے عہد علانیہ توڑ دیا ہو) اور اگر (ابھی تک علانیہ تو نہیں توڑا لیکن) آپ کو کسی قوم سے خیانت یعنی عہد شکنی کا اندیشہ ہو تو اجازت ہے کہ آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے (یعنی اس طرح اس عہد کے باقی نہ رہنے کی اطلاع کر دیجئے) کہ آپ اور وہ (اس اطلاع میں) برابر ہو جائیں (اور بدون ایسی صاف اطلاع کے لڑنا خیانت ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت کا مضمون بلکہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو ایک آیت پہلے آ چکے ہیں كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ مگر مقصد بیان دونوں میں جدا جدا ہے پہلی آیت میں اس کا بیان مقصود تھا کہ ان لوگوں کا کفران کے عذاب کا سبب بنا اور اس آیت میں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مبذول ہوں اور وہ ان کی قدر نہ پہچانے اور اللہ کے سامنے نہ جھکے تو اس کی نعمتیں نقمتوں اور مصیبتوں سے بدل دی جاتی ہیں۔ قوم فرعون اور ان سے پہلی قوم نے بھی جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی تو ان سے نعمتیں چھین لی گئیں اور نعمتوں کے بجائے عذاب میں پکڑ لئے گئے، کچھ الفاظ میں بھی کہیں کہیں فرق کر کے خاص خاص اشارے فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً پہلی آیت میں كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ کے الفاظ تھے اور یہاں بِآيَاتِ رَبِّهِمْ کا لفظ ہے لفظ اللہ کے بجائے صفت رب ذکر کر کے اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ بڑے ہی ظالم ناحق شناس تھے کہ جو ذات ان کی رب ہے ان کے

ابتداء وجود سے لے کر موجودہ حالات تک اُس کی نعمتوں ہی میں ان کی پرورش ہوئی ہے اُسی کی نشانیوں کو جھٹلانے لگے۔

نیز پہلی آیت فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ فرمایا تھا یہاں فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ارشاد فرمایا۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل و تشریح ہوگئی کیونکہ پہلی آیت میں ان کا عذاب میں پکڑا جانا ذکر کیا گیا جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ زندہ و باقی رہتے ہوئے مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں یا سرے سے ان کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔ اس آیت میں اَهْلَكْنٰهُمْ فرما کر واضح کر دیا کہ ان سب قوموں کی سزا سزائے موت تھی ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔ ہر قوم کی ہلاکت کی مختلف صورتیں ظاہر ہوئیں ان میں سے فرعون چونکہ خدائی کا دعویدار تھا اور اس کی قوم اُس کی تصدیق کرتی تھی اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا گیا وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ یعنی ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔ دوسری قوموں کی ہلاکت کی صورتیں یہاں بیان نہیں کی گئیں، دوسری آیت میں اُس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ کسی پر زلزلہ آیا، کوئی زمین کے اندر دھنسا دی گئی، کسی کی صورتیں مسخ ہوگئیں، کسی پر ہوا کا طوفان مسلط ہوگیا، اور آخر میں مشرکین مکہ پر غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے عذاب آیا۔

اس کے بعد کی آیت میں انہیں کافروں کے بارہ میں ارشاد فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس میں لفظ دوآب دابّہ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی زمین پر چلنے والے کے ہیں اس لئے انسان اور جتنے جانور زمین پر چلتے ہیں سب کو یہ لفظ شامل ہے مگر عام محاورات میں یہ لفظ خاص چوپائے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا حال بے شعوری میں جانوروں سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا اس لئے اس لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ معنی آیت کے واضح ہیں کہ تمام جانوروں اور انسانوں میں سب سے بدترین جانور یہ لوگ ہیں۔ آخر آیت میں فرمایا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خداداد استعداد و قابلیت کو ضائع کر دیا، چوپائے جانوروں کی طرح کھانے پینے سونے جاگنے کو مقصد زندگی بنا لیا، اس لئے ان کی رسائی ایمان تک نہیں ہو سکتی۔

حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے چھ آدمیوں کے بارہ میں آئی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے پیشگی خبر دے دی کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائیں گے۔

نیز اس لفظ میں اُن لوگوں کو عذاب سے مستثنیٰ کرنا منظور ہے جو اگرچہ اُس وقت کفار کے ساتھ لگے ہوئے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جدوجہد میں مشغول ہیں مگر آئندہ کسی وقت اسلام قبول کر کے اپنی سابق غلط کاریوں سے توبہ کرلیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے بہت بڑی جماعت مسلمان ہو کر نہ صرف خود صالح متقی بن گئی بلکہ دنیا کے لئے مصلح اور تقویٰ کی داعی بن کر کھڑی ہوئی۔

تیسری آیت اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ۔ یہ آیت یہود مدینہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے متعلق ہے ۔ پچھلی آیتوں میں مشرکینِ مکہ پر میدان بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب الٰہی نازل ہونے کا ذکر اور پچھلی امتوں کے کفار سے اُن کی تمثیل کا بیان ہوا تھا ۔ اس آیت میں اُس غدار جماعت کا ذکر ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لئے مارِ آستین بنی اور جو ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ صلح و آشتی کی دعویدار تھی دوسری طرف مشرکین مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی تھی ۔ یہ لوگ مذہباً یہود تھے اور جس طرح مشرکین مکہ میں اسلام کے خلاف سب سے بڑا علمبردار ابوجہل تھا اسی طرح یہود مدینہ میں اس کا علمبردار کعب بن اشرف تھا ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر یہ لوگ مرعوب تو ہوئے مگر دل میں اسلام دشمنی کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی ۔

اسلامی سیاست کا تقاضا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو یہود مدینہ کو کسی نہ کسی معاہدہ کے تحت ساتھ لگایا جائے تاکہ وہ مکہ والوں کو مدد نہ پہنچائیں ۔ یہود بھی اپنی مرعوبیت کی بنا پر اسی کے خواہشمند تھے ۔

اسلامی سیاست کا پہلا قدم
اسلامی قومیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر اسلامی سیاست کی سب سے پہلی بنیاد اس کو بنایا کہ مہاجرین و انصار کی وطنی اور قومی عصبیتوں کو ختم کرکے ایک نئی قومیت اسلام کے نام پر قائم فرمائی مہاجرین و انصار کے مختلف قبائل کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ۔ اور آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انصار کے باہمی اختلافات جو صدیوں سے چلے آرہے تھے سب کو دور فرما کر آپس میں بھی اور مہاجرین کے ساتھ بھی بھائی بھائی بنا دیا ۔

دوسرا قدم
معاہدۂ یہود

اس سیاست کا دوسرا قدم یہ تھا کہ حریف مقابل دو تھے ایک مشرکین مکہ جن کی ایذاؤں نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ دوسرے یہود مدینہ جو اب مسلمانوں کے پڑوسی بن گئے تھے ان میں سے یہود کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کا عہدنامہ مفصل لکھا گیا اس معاہدہ کی پابندی اطرافِ مدینہ کے سب یہودیوں پر اور اس طرف تمام مہاجرین و انصار پر عائد تھی ۔ معاہدہ کا پورا متن البدایہ والنہایہ ابن کثیرؒ میں اور سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مفصل موجود ہے اس کا سب سے اہم جزء یہ تھا کہ باہمی اختلاف کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سب کے لئے واجب التعمیل ہوگا ، دوسرا جزء یہ تھا کہ یہودِ مدینہ مسلمانوں کے خلاف کسی دشمن کو ظاہراً یا باطناً کوئی امداد نہیں دیں گے ۔ لیکن ان لوگوں نے غزوۂ بدر کے وقت عہد شکنی

کر کے مشرکینِ مکہ کو اسلحہ اور سامانِ جنگ سے مدد پہنچائی۔ مگر جب غزوۂ بدر کا انجام مسلمانوں کی فتح مبین اور کفار کی ہزیمت و شکست کی صورت میں سامنے آیا تو پھر ان لوگوں پر رعب غالب ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر عذر کیا کہ اس مرتبہ ہم سے غلطی ہو گئی اس کو معاف فرما دیں آئندہ عہد شکنی نہیں کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حلم و کرم جو آپ کا شعار تھا اُس کی بنا پر دوبارہ معاہدہ کی تجدید فرمالی۔ مگر یہ لوگ اپنی سرشت سے مجبور تھے غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست اور نقصان کا علم ہو کر ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور ان کا سردار کعب بن اشرف خود سفر کر کے مکہ پہنچا اور مشرکینِ مکہ کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ اب وہ پوری طیاری کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کریں اور یہودِ مدینہ اُن کے ساتھ ہوں گے۔

یہ دوسری عہد شکنی تھی جو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف کی۔ آیتِ مذکورہ میں اس بار بار کی عہد شکنی کا ذکر فرما کر ان لوگوں کی شرارت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے آپ نے معاہدہ کر لیا مگر یہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے رہے۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ۔ یعنی یہ لوگ ڈرتے نہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ چونکہ ہوس دنیا میں مست و بے ہوش ہیں آخرت کی فکر ہی نہیں اس لئے آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے بدکردار عہد شکن لوگوں کا جو انجام بد اس دنیا میں ہوا کرتا ہے یہ لوگ اپنی غفلت و نادانی کی وجہ سے اُس سے نہیں ڈرتے۔

پھر ساری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان لوگوں نے اپنی اس بدکرداری کی سزا چکھی۔ ابوجہل کی طرح کعب بن اشرف مارا گیا، اور یہودِ مدینہ جلا وطن کئے گئے۔

چوتھی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بدعہدوں کے بارہ میں ایک ہدایت نامہ دیا جس کے الفاظ یہ ہیں

فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝

اس میں لفظ تَثْقَفَنَّهُمْ کے معنی ہیں ان پر قابو پانے کے اور شَرِّدْ مصدر تشرید سے بنا ہے جس کے اصلی معنی بھگا دینے اور منتشر کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر آپ کسی جنگ میں ان لوگوں پر قابو پالیں تو ان کو ایسی سخت دردناک سزا دیں جو دوسروں کے لئے عبرت ہو جائے ان کے پیچھے جو لوگ ان کے سہارے پر اسلام دشمنی میں لگے ہوئے ہیں وہ یہ سمجھ لیں کہ اب خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچائیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دی جائے جس کو دیکھ کر مشرکینِ مکہ اور دوسرے دشمن قبائل بھی متاثر ہوں اور آئندہ اُن کو مسلمانوں کے

مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ رہے۔

آخر آیت میں لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ فرما کر رب العالمین کی رحمت عامہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس دردناک سزا کا اصلی مقصد بھی کوئی انتقام لینا یا اپنے غصہ کو فرو کرنا نہیں بلکہ انھیں کی یہ مصلحت ہے کہ شاید یہ صورت حال دیکھ کر یہ لوگ کچھ ہوش میں آجائیں اور اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لیں۔

معاہدۂ صلح کو ختم کرنے کی صورت

پانچویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ و صلح کے قانون کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے ہم اُن کے خلاف کوئی اقدام کریں بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ اُن کو اطمینان و فرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں اس لئے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔

یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو اُن کا عہد اُن کی طرف ایسی صورت سے واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ صلح ہو چکا ہے اُس کے مقابلہ میں کوئی جنگی اقدام کرنا خیانت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اگرچہ یہ خیانت دشمن کافروں ہی کے حق میں کی جائے۔ وہ بھی جائز نہیں البتہ اگر دوسری طرف سے عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے کہ کھلے طور پر ان کو اعلان کے ساتھ آگاہ کر دیں کہ ہم آئندہ معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے۔ مگر یہ اعلان اسی طرح ہو کہ مسلمان اور دوسرا فریق اُس میں برابر ہوں۔ یعنی ایسی صورت نہ کی جائے کہ اس اعلان و تنبیہ سے پہلے اُن کے مقابلہ کی تیاری کر لی جائے اور وہ خالی الذہن ہونے کی بنا پر تیاری نہ کر سکیں بلکہ جو کچھ تیاری کرنا ہے وہ اس اعلان و تنبیہ کے بعد کریں۔

یہ ہے اسلام کا عدل و انصاف کہ خیانت کرنے والے دشمنوں کے بھی حقوق کی حفاظت کی

جاتی ہے اور مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ میں اس کا پابند کیا جاتا ہے کہ عہد کو واپس کرنے سے پیشتر کوئی تیاری بھی اُن کے خلاف نہ کریں۔ (مظہری وغیرہ)

ایفائے عہد کا ایک واقعۂ عجیبہ

ابو داؤد، ترمذی، نسائی، امام احمد بن حنبلؒ نے سلیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التواءِ جنگ کا معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامانِ جنگ اُس قوم کے قریب پہنچا دیں تاکہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر عین اُس وقت جب حضرت معاویہؓ کا لشکر اُس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ۔ یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہیئے اُس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہیئے کہ اُن کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہؓ کو اس کی خبر کی گئی دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تاکہ التواءِ جنگ کی میعاد میں لشکرکشی پر اقدام کرکے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابن کثیر)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۚ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے، وہ ہرگز تھکا نہ سکیں گے ہم کو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ

اور تیار کرو اُن کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ

کہ اُس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر اُن کے سوا،

لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ

جن کو تم نہیں جانتے، اللہ اُن کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا

کی راہ میں وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا۔ اور اگر وہ جھکیں

لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

صلح کی طرف تو تو بھی جھک اُسی طرف اور بھروسہ کر اللہ پر، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ

اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے اللہ، اسی نے

اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ اپنے کو یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے یقیناً وہ لوگ (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آئیں یا تو دنیا ہی میں مبتلائے عقوبت کر دے گا ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے) اور ان کافروں سے (مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس (سامان) کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور (تمہاری فکر میں رہنے کی وجہ سے) تمہارے دشمن ہیں (جن سے شب و روز تم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے) اور ان کے علاوہ دوسرے کافروں پر بھی (رعب جمائے رکھو) جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے، جیسے کفار فارس اور روم وغیرہم جن سے اس وقت سابقہ نہیں پڑا مگر صحابہ کا ساز و سامان و فن سپہگری اپنے وقت میں ان کے مقابلہ میں بھی کام آیا اور ان پر بھی رعب جما، بعض مقابل ہو کر مغلوب ہوئے بعض نے جزیہ قبول کیا کہ یہ بھی اثر رعب کا ہے) اور اللہ کی راہ میں (جس میں جہاد بھی آگیا) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (جس میں وہ خرچ بھی آگیا جو ساز و یراق درست کرنے میں کیا جاوے) وہ (یعنی اس کا ثواب) تم کو (آخرت میں) پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارے لئے (اس میں) کچھ کمی نہ ہوگی اور اگر وہ کفار صلح کی طرف جھکیں تو آپ (کو) بھی (اجازت ہے کہ اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جائیے اور (اگر باوجود مصلحت کے یہ احتمال ہو کہ یہ ان کی چال نہ ہو تو) اللہ پر بھروسہ رکھئے (ایسے احتمالوں سے اندیشہ نہ کیجئے) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (ان کے اقوال اور احوال کو سنتا جانتا ہے ان کا خود انتظام کر دے گا، اور اگر واقع میں وہ احتمال صحیح ہو اور) وہ لوگ (اس صلح سے) آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ (کی مدد اور حفاظت کرنے) کے لئے کافی ہیں (جیسا کہ اس کے قبل بھی آپ کی کفایت فرماتے تھے چنانچہ) وہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی (غیبی) امداد (یعنی ملائکہ) سے اور (ظاہری امداد یعنی) مسلمانوں سے قوت دی۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اُن کفار کا ذکر ہے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لئے بچ گئے یا شریک ہونے کے بعد بھاگ نکلے اس طرح اپنی جان بچا لی۔ ان لوگوں کے متعلق اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ یوں نہ سمجھیں کہ ہم بچ نکلے۔ کیونکہ غزوۂ بدر کفار کے لئے ایک عذاب الٰہی تھا اور اُس کی پکڑ سے بچنا کسی کے بس میں نہیں۔ اس لئے فرمایا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ یعنی یہ لوگ اپنی چالاکی سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے وہ جب پکڑنا چاہیں گے یہ ایک قدم نہ سرک سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا ہی میں پکڑ لئے جائیں ورنہ آخرت میں تو ان کی گرفتاری ظاہر ہے۔

اس آیت نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ کوئی مجرم گنہگار اگر کسی مصیبت اور تکلیف سے نجات پا جائے اور پھر بھی توبہ نہ کرے بلکہ اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو یہ اس کی علامت نہ سمجھو کہ وہ کامیاب ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا بلکہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور یہ ڈھیل اُس کے عذاب اور مصیبت کو اور بڑھا رہی ہے گو اُس کو محسوس نہ ہو۔

جہاد کے لئے اسلحہ اور سامانِ حرب کی تیاری فرض ہے

دوسری آیت میں اسلام سے دفاع اور کفار کے مقابلہ کے لئے طیاری کے احکام ہیں، ارشاد فرمایا وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ۔ یعنی سامانِ جنگ کی طیاری کرو کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے۔ اس میں سامانِ جنگ کی طیاری کی ساتھ مَا اسْتَطَعْتُمْ کی قید لگا کر یہ اشارہ فرما دیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے مقابل کے پاس جیسا اور جتنا سامان ہے تم بھی اتنا ہی حاصل کر لو۔ بلکہ اتنا کافی ہے کہ اپنی مقدور بھر جو سامان ہو سکے وہ جمع کر لو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اس کے بعد اس سامان کی کچھ تفصیل اس طرح فرمائی مِّنْ قُوَّةٍ یعنی مقابلہ کی قوت جمع کرو۔ اس میں تمام جنگی سامان اسلحہ، سواری وغیرہ بھی داخل ہیں اور اپنے بدن کی ورزش، فنونِ جنگ کا سیکھنا بھی۔ قرآن کریم نے اس جگہ اُس زمانہ کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ قوت کا عام لفظ اختیار فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانہ اور ہر ملک و مقام کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ اُس زمانہ کے اسلحہ تیر، تلوار، نیزے تھے اس کے بعد بندوق توپ کا زمانہ آیا۔ پھر اب بموں اور راکٹوں کا وقت آ گیا۔ لفظ قُوَّت ان سب کو شامل ہے اس لئے آج کے مسلمانوں کو بقدرِ استطاعت ایٹمی قوت، ٹینک اور لڑاکا طیارے، آبدوز کشتیاں جمع کرنا چاہئے کیونکہ یہ سب اسی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور اس کے لئے جس علم و فن کو سیکھنے کی ضرورت پڑے وہ سب اگر اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کا اور کفار کے

مقابلہ کا کام لیا جائے گا تو وہ بھی جہاد کے حکم میں ہے۔

لفظ قُوَّۃ عام ذکر کرنے کے بعد ایک خاص قوت کا صراحۃً بھی ذکر فرما دیا وَمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ لفظ رباط مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مربوط کے معنی میں بھی پہلی صورت میں اس کے معنی ہوں گے گھوڑے باندھنا اور دوسری صورت میں بندھے ہوئے گھوڑے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ جہاد کی نیت سے گھوڑے پالنا اور ان کو باندھنا یا بندھے ہوئے گھوڑوں کو جمع کرنا۔ سامانِ جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ اُس زمانہ میں کسی ملک و قوم کے فتح کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر و مفید گھوڑے ہی تھے۔ اور آج بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھ دی ہے۔

صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان جنگ فراہم کرنے اور اس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجب ثواب عظیم قرار دیا ہے۔ تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں سے دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور ہر قوم کا جدا ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی عن انسؓ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح دفاع و جہاد ہتھیاروں سے ہوتا ہے بعض اوقات زبان سے بھی ہوتا ہے اور قلم بھی زبان ہی کے حکم میں ہے۔ اسلام اور قرآن سے کفر و الحاد کے حملوں اور تحریفوں کی مدافعت زبان یا قلم سے یہ بھی اس صریح نص کی بنا پر جہاد میں داخل ہے۔

آیت مذکورہ میں سامان جنگ کی طیاری کا حکم دینے کے بعد اُس سامان کے جمع کرنے کی مصلحت اور اصل مقصد بھی ان الفاظ میں بیان فرمایا تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ یعنی سامانِ جنگ اور دفاع جمع کرنے کا اصل مقصد قتل و قتال نہیں بلکہ کفر و شرک کو زیر کرنا اور مرعوب و مغلوب کر دینا ہے وہ کبھی صرف زبان یا قلم سے بھی ہو سکتا ہے اور بعض وقت اُس کے لئے قتل و قتال ضروری ہوتا ہے۔ جیسی صورت حال ہو اُس کے مطابق دفاع کرنا فرض ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جنگ و جہاد کی طیاری سے جن لوگوں کو مرعوب کرنا مقصود ہے اُن میں سے بعض کو تو مسلمان جانتے ہیں اور وہ وہ لوگ ہیں جن سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری تھا یعنی کفار مکہ اور یہود مدینہ۔ اور کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کو ابھی تک مسلمان نہیں جانتے۔ مراد اس سے پوری دنیا کے کفار و مشرکین ہیں جو ابھی تک مسلمانوں کے مقابلہ پر نہیں آئے مگر

آئندہ اُن سے بھی تصادم ہونے والا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت نے بتلا دیا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے موجودہ حریف کے مقابلہ کی تیاری کر لی تو اس کا رعب صرف انہیں پر نہیں بلکہ دور دور کے کفار کسریٰ وقیصر وغیرہ پر بھی پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور خلفائے راشدین کے عہد میں یہ سب مغلوب و مرعوب ہو گئے۔

جنگی سامان جمع کرنے اور جنگ کرنے میں ضرورت مال کی بھی پڑتی ہے بلکہ سامان جنگ بھی مال ہی کے ذریعہ مہیا کیا جا سکتا ہے اس لئے آخر آیت میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اُس کا اجر عظیم اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے اُس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دے دیا جائے گا۔ بعض اوقات تو دنیا میں بھی مال غنیمت کی صورت میں یہ بدلہ مل جاتا ہے ورنہ آخرت کا بدلہ تو متعین ہے اور ظاہر ہے کہ وہ زیادہ قابل قدر ہے۔

تیسری آیت میں صلح کے احکام اور اس کے متعلقات کا بیان ہے ارشاد فرمایا وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا لفظ سَلْم بفتح سین اور سِلْم بکسر سین دونوں طرح صلح کے معنی میں آتا ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر کفار کسی وقت صلح کی طرف جھکیں تو آپ کو بھی جھک جانا چاہئے۔ یہاں صیغہ امر تخییر کے لئے استعمال فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ جب کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ کو بھی اختیار ہے اگر مسلمانوں کی مصلحت صلح میں محسوس کریں تو صلح کر سکتے ہیں۔

اور اِنْ جَنَحُوْا کی قید سے معلوم ہوا کہ صلح اُسی وقت کی جا سکتی ہے جب کفار کی طرف سے صلح کی خواہش ظاہر ہو۔ کیونکہ بغیر اُن کی خواہش کے اگر مسلمان خود ہی صلح کی تحریک کریں تو یہ اُن کی کمزوری سمجھی جائے گی۔

ہاں اگر کوئی موقع ایسا آپڑے کہ مسلمان کسی نرغہ میں گھر جائیں اور اپنی سلامتی کے لئے کوئی صورت بجز صلح کے نظر نہ آئے تو صلح میں پیش قدمی بھی بقول فقہاء جائز اور اشارات نصوص سے ثابت ہے۔

اور چونکہ دشمن کی جانب سے صلح کی خواہش ہونے میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر غفلت میں ڈال دیں اور پھر یکبارگی حملہ کر دیں اس لئے آخر آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یعنی آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں کہ وہی خوب سننے والے جاننے والے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کو بھی سنتے ہیں اور اُن کے دلوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو بھی جانتے ہیں وہ آپ کی مدد کے لئے کافی ہیں۔ آپ ایسے بے دلیل احتمالات پر اپنے کاموں کی بنیاد نہ رکھیں۔ اور ایسے خطرات کو اللہ کے حوالہ کر دیں۔

اس کے بعد چوتھی آیت میں اسی مضمون کو اور زیادہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس طرح

بیان فرمایا وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭهُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔

یعنی اگر یہی احتمال واقع ہو جائے کہ صلح کرنے سے ان کی نیت خراب ہو آپ کو دھوکہ ہی دینا چاہیں تب بھی آپ کوئی پروا نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے کافی ہیں پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کی امداد و تائید سے آپ کا کام چلا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مدد سے آپ کی تائید فرمائی جو آپ کی فتح و کامیابی کی اصل بنیاد درحقیقت ہے اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت آپ کی امداد کے لئے کھڑی کردی جو اسباب ظاہرہ میں سے ہیں۔ تو جس مالک حقیقی اور قادر مطلق نے تمام اسباب فتح و کامیابی کو وجود عطا فرمایا وہ آج بھی دشمنوں کے دھوکہ فریب کے معاملہ میں آپ کی مدد فرمائے گا۔

اسی وعدہ خداوندی کے تحت اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر بھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ دشمنوں کے دھوکہ فریب سے کوئی گزند پہنچی ہو۔ اسی لئے علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا ہے جیسا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کا وعدہ کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی کرنے والے صحابہ کرام کو مطمئن اور سبکدوش فرما دیا تھا۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا (بیان القرآن)۔ دوسرے لوگوں کو ظاہری تدبیر اور گردو پیش کے حالات کے تابع کام کرنا چاہیے۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَي الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ

اور الفت ڈالی ان کے دلوں میں اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی ان میں، بیشک وہ زور آور ہے حکمت والا۔ اے نبی کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں مسلمان۔ اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا، اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دو سو پر، اور اگر

ع ۸

يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ

ہوں تم میں سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ وہ

قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ

لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ

فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ

تم میں سستی ہے، سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دو سو پر،

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

اور اگر ہوں تم میں ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے۔

خلاصۂ تفسیر

اور مسلمانوں کو ذریعہ امداد بننے کے لئے ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر باہم اتفاق نہ ہو تو کوئی کام خصوص دین کی نصرت مل کر نہیں کر سکتے اور ان میں بوجہ حب ریاست اور غلبہ بغض و عداوت اتفاق ہونا دشوار تھا کہ اگر آپ باوجودیکہ عقل و تدبیر بھی کامل رکھتے ہیں اور سامان بھی اس کے لئے آپ کے پاس کافی ہوتا یہاں تک کہ) دنیا بھر کا مال اس کام کے لئے خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی کا کام تھا کہ اس نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا بیشک وہ زبردست ہیں (کہ جو چاہیں اپنی قدرت سے کر دیں اور) حکمت والے ہیں (کہ جس طریق سے مناسب جانیں اس کام کو کر دیں اور جب اللہ تعالیٰ کا اپنی غیبی امداد اور مؤمنین سے آپ کی نصرت فرمانا معلوم ہو گیا تو) اے نبی (اس سے ثابت ہو گیا کہ) آپ کے لئے (حقیقت میں) اللہ کافی ہے اور جن مؤمنین نے آپ کا اتباع کیا ہے (ظاہراً) وہ کافی ہیں اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے اور اس کے متعلق یہ قانون سنا دیجئے کہ) اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دس گونہ عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آ جائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے سو آدمی ہوں گے تو ہزار کفار پر غالب آ جائیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے (اور اس وجہ سے کفر پر مصر ہیں اور اس سبب سے ان کو غیبی مدد نہیں پہنچتی اس سبب سے وہ مغلوب

ہو جاتے ہیں پس تم پر واجب ہے کہ اپنے سے دس گونہ کے مقابلہ سے بھی پسپا نہ ہو۔ اول یہ حکم نازل ہوا تھا جب صحابہؓ پر شاق ہوا تو عرض کیا ایک مدت کے بعد یہ دوسری آیت جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا نازل ہوئی یعنی) اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کردی اور معلوم کرلیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو (اب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دوگونہ عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آجائیں گے اور (ہم نے جو صبر کی قید لگائی تو اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ صابرین (یعنی جو دل اور قدم سے ثابت رہیں ان) کے ساتھ ہیں (یعنی ان کی مدد کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سورۂ انفال کی مذکورہ چار آیتوں میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے اصلی سبب اور اس کے حصول کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے اپنی خاص مدد سے اور مسلمانوں کی جماعت سے آپ کی تائید اور نصرت فرمائی ہے۔ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے کسی کی امداد و نصرت تو جب ہے کہ صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب کہ یہ جماعت باہم متفق اور متحد ہو اور بقدر اتفاق و اتحاد ہی اس کی قوت اور وزن ہوتا ہے باہمی اتحاد و یگانگت کے رشتے قوی ہیں تو پوری جماعت قوی ہے اور اگر یہ رشتے ڈھیلے ہیں تو پوری جماعت ڈھیلی اور کمزور ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس خاص انعام کا ذکر فرمایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کے لئے عام مسلمانوں پر ہوا کہ اُن کے دلوں میں مکمل وحدت و الفت پیدا کردی گئی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے پہلے ان کے دو قبیلوں اوس و خزرج کے آپس میں شدید جنگیں لڑی جا چکی تھیں اور جھگڑے چلتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان جانی دشمنوں کو باہم شیر و شکر بھائی بھائی بنا دیا۔ مدینہ میں قائم ہونے والی نئی اسلامی ریاست کے قیام و بقاء اور دشمنوں پر غالب آنے کا حقیقی اور معنوی سبب تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد تھی، اور ظاہری سبب مسلمانوں کی آپس میں مکمل الفت و محبت اور اتفاق و اتحاد تھا۔

اسی کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ مختلف لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر ان میں اُلفت و محبت پیدا کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں صرف اُس ذات کا کام ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان ساری دنیا کی دولت بھی اس کام کے لئے خرچ کر ڈالے کہ باہم

منافرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں الفت پیدا کردے تو وہ کبھی اس پر قابو نہیں پا سکتا۔

مسلمانوں کا آپس میں حقیقی اور پائیدار اتفاق اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری پر موقوف ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کے قلوب میں باہمی الفت و محبت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ اُس کے انعام کو حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ حصولِ انعام کے لئے اُس کی اطاعت و رضا جوئی شرط ہے۔

جماعتوں اور افراد کے درمیان وحدت و اتفاق ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود اور مفید ہونے سے کسی مذہب و ملت اور کسی فکر و نظر والے کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور اسی لئے ہر شخص جو لوگوں کی اصلاح کی فکر کرتا ہے وہ ان کو آپس میں متفق کرنے پر زور دیتا ہے لیکن عام دنیا اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ دلوں کا پورا اور پائیدار اتفاق عامی تدبیروں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت و رضا جوئی سے حاصل ہوتا ہے قرآن حکیم نے اس حقیقت کی طرف کئی آیتوں میں اشارے فرمائے ہیں ایک جگہ ارشاد ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ اس میں اختلاف و تفرقہ سے بچنے کی یہ تدبیر بتلائی گئی ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسّی یعنی قرآن یا شریعتِ اسلام کو مضبوط تھام لیں تو سب آپس میں خود بخود متفق ہوجائیں گے اور باہمی تفرقے ختم ہوجائیں گے۔ رائے کا اختلاف دوسری چیز ہے وہ جب تک اپنی حد کے اندر رہے تفرقہ اور جھگڑے کا سبب کبھی نہیں بنتا۔ جھگڑا فساد جبھی ہوتا ہے جب کہ حدودِ شریعت سے تجاوز کیا جائے۔ آج اتفاق اتفاق تو سب پکارتے ہیں مگر اتفاق کے معنی ہر شخص کے نزدیک یہ ہوتے ہیں کہ لوگ میری بات مان لیں تو اتفاق ہوجائے۔ اور دوسرے بھی اتفاق کے لئے اسی فکر میں ہوتے ہیں کہ وہ ہماری بات مان لیں تو اتفاق ہوجائے۔ حالانکہ سب رایوں کا اختلاف اہل عقل و دیانت میں ناگزیر اور ضروری ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص دوسرے کے ساتھ متفق ہونے کو اس پر موقوف رکھے کہ دوسرا اس کی بات مان لے تو قیامت تک آپس میں اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اتفاق کی صحیح اور فطری صورت وہ ہی ہے جو قرآن نے بتلائی کہ دونوں مل کر کسی تیسرے کی بات کو تسلیم کرلیں اور تیسرا وہی ہونا چاہئے جس کے فیصلے میں غلطی کا امکان نہ ہو وہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے اس لئے آیت مذکورہ میں اس کی ہدایت فرمائی گئی کہ سب مل کر اللہ کی کتاب کو مضبوط تھام لو تو آپس کے جھگڑے ختم ہو کر اتفاق کامل پیدا ہوجائے گا۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۔ یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں محبت و مودت پیدا فرما دیتے ہیں۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ دلوں میں حقیقی محبت و مودت پیدا ہونے کا اصل طریق

ایمان اور عمل صالح کی پابندی ہے اس کے بغیر اگر کہیں کوئی تعلق و اتحاد مصنوعی طور پر قائم کر بھی لیا جائے تو وہ محض بے بنیاد اور کمزور ہوگا ذرا سی ٹھیس میں ختم ہو جائے گا۔ جس کا مشاہدہ تمام اقوام دنیا کے حالات و تجربات سے ہوتا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے اُس انعام کی وضاحت کی گئی ہے جو مدینہ کے تمام قبائل کے دلوں میں الفت پیدا کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد و نصرت کے لئے ان کو ایک آہنی دیوار کی طرح بنا کر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی یہی مضمون خلاصہ کے طور پر بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی گئی ہے کہ آپ کے لئے حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اور ظاہر کے اعتبار سے مؤمنین کی جماعت کافی ہے آپ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی تعداد یا سامان سے خوف زدہ نہ ہوں۔ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی تاکہ قلیل التعداد، بے سامان مسلمان اپنے مقابل کی بھاری تعداد اور بھاری سامان سے مرعوب نہ ہو جائیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک جنگی قانون کا ذکر ہے کہ اُن کو کس حد تک اپنے حریف کے مقابلہ پر جمنا فرض اور اس سے ہٹنا گناہ ہے۔ پچھلی آیات اور واقعات میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد غیبی مسلمانوں کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے ان کا معاملہ عام اقوام دنیا کا سا معاملہ نہیں یہ تھوڑے بھی بہت سوں پر غالب آسکتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (یعنی بہت سی قلیل التعداد جماعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کثرت والے مقابل پر غالب آجاتی ہیں)۔

اس لئے اسلام کے سب سے پہلے جہاد غزوۂ بدر میں دس مسلمانوں کو سو آدمیوں کے برابر قرار دے کر یہ حکم دیا گیا کہ

اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو دشمنوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم سو ہوگے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجاؤ گے۔

عنوان تعبیر اس میں ایک خبر کا رکھا گیا ہے کہ سو مسلمان ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے مگر مقصد یہ حکم دینا ہے کہ سو مسلمانوں کو ایک ہزار کفار کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں۔ عنوان خبر کا رکھنے میں مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل اس خوشخبری سے مضبوط ہو جائیں کہ اللہ کا وعدہ ہماری حفاظت و غلبہ کا ہے۔ اگر حکم کو صیغہ امر قانون کی صورت میں پیش کیا جاتا تو فطری طور پر وہ بھاری معلوم ہوتا۔

غزوۂ بدر پہلے یہی کی جنگ ایسی حالت میں تھی جب کہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد ہی بہت کم تھی اور وہ بھی سب کے سب محاذ جنگ پر گئے نہ تھے بلکہ فوری طور پر جو لوگ طیار ہوسکے وہی اس جنگ کی فوج بنے اس لئے اس جہاد میں سو مسلمانوں کو ایک ہزار کافروں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور ایسے انداز میں دیا کہ فتح و نصرت کا وعدہ ساتھ تھا۔

چوتھی آیت میں اس حکم کو آئندہ کے لئے منسوخ کرکے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ

اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی اور معلوم کرلیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے سو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔

یہاں بھی مقصد یہ ہے کہ سو مسلمانوں کو دو سو کافروں کے مقابلے سے گریز کرنا جائز نہیں۔ پہلی آیت میں ایک مسلمان کو دس کے مقابلہ سے گریز ممنوع قرار دیا تھا اس آیت میں ایک کو دو کے مقابلہ سے گریز ممنوع رہ گیا۔ اور یہی آخری حکم ہے جو ہمیشہ کے لئے جاری اور باقی ہے۔

یہاں بھی حکم کو حکم کے عنوان سے نہیں بلکہ خبر اور خوشخبری کے انداز سے بیان فرمایا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ایک مسلمان کو دو کافروں کے مقابلہ پر جمنے کا حکم معاذ اللہ کوئی بے انصافی یا تشدد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان میں اس کے ایمان کی وجہ سے وہ قوت رکھ دی ہے کہ ان میں کا ایک دو کی برابر رہتا ہے۔

مگر دونوں جگہ اس فتح و نصرت کی خوشخبری کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان ثابت قدم رہنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ قتل و قتال کے میدان میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ثابت قدم رہنا اسی کا کام ہوسکتا ہے جس کا ایمان کامل ہو۔ کیونکہ ایمان کامل انسان کو شوق شہادت کا جذبہ عطا کرتا ہے اور یہ جذبہ اس کی طاقت کو بہت کچھ بڑھا دیتا ہے۔

آخر آیت میں عام قانون کی صورت سے بتلا دیا وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا ساتھی ہے۔ اس میں میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے والے بھی شامل ہیں اور عام احکام شرعیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنے والے حضرات بھی ان سب کے لئے معیت الہیہ کا وعدہ ہے اور یہ معیت ہی ان کی فتح و ظفر کا اصلی راز ہے۔ کیونکہ جس کو قادر مطلق کی معیت نصیب ہوگئی اس کو ساری دنیا مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ
نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خوب خونریزی نہ کرلے ملک میں،
تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ
تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہیے آخرت اور اللہ زور آور ہے
حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ
حکمت والا، اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا
عذاب بڑا، سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا، اور ڈرتے رہو
اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾
اللہ سے، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

خلاصۂ تفسیر

اے مسلمانو! تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان قیدیوں کے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا یہ بے جا تھا کیونکہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں، (بلکہ قتل کر دیے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کرلیں (کیونکہ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض دفع فساد ہے اور بدون اس حد کے جس میں کہ بالکل شوکت کفر کی ٹوٹ جاوے دفع فساد ممکن نہیں پس اس قوت سے پہلے قیدیوں کو زندہ چھوڑ دینا آپ کی شان اصلاح کے مناسب نہیں البتہ جب ایسی قوت ہو جاوے پھر قتل ضروری نہیں بلکہ اور صورتیں بھی مشروع ہیں پس ایسی نامناسب رائے تم نے آپ کو کیوں دی، تم تو دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو (اس لئے فدیہ کی رائے دی) اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں (اور وہ اس میں ہے کہ کفار خوف سے مغلوب ہو جاویں جس میں آزادی سے اسلام کا نور و ہدایت پھیلے، اور بے روک ٹوک لوگ بکثرت مسلمان ہوں اور نجات پاویں) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں (وہ تم کو کفار پر غالب کرتے اور فتوحات کی کثرت سے تم کو مالدار کر دیتے گو کسی حکمت کے سبب اس میں دیر ہوتی جو فعل تم سے واقع ہوا ہے وہ بہت ناپسندیدہ ہے کہ) اگر خدا تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا (وہ یہ کہ ان قیدیوں میں بہت لوگ مسلمان ہو جاویں گے جس سے فساد محتمل واقع نہ ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوتا) تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں

تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی، لیکن چونکہ کوئی فساد نہ ہوا اور اتفاقاً تمہارا مشورہ صائب نکل آیا اس لئے تم سزا سے بچ گئے یعنی ہم نے اس فدیہ کو مباح کر دیا) سو جو کچھ تم نے (ان سے فدیہ میں) لیا ہے اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ آئندہ ہر طرح کی احتیاط رکھو) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ تمہارا گناہ بھی معاف کر دیا یہ مغفرت ہے اور فدیہ بھی حلال کر دیا یہ رحمت ہے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کا تعلق غزوۂ بدر کے ایک خاص واقعہ سے ہے اس لئے ان کی تفسیر سے پہلے صحیح اور مستند روایاتِ حدیث کے ذریعہ اس واقعہ کا بیان ضروری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر اسلام میں سب سے پہلا جہاد ہے اور اچانک پیش آیا ہے اُس وقت تک جہاد سے متعلقہ احکام کی تفصیل قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھی جہاد میں اگر مالِ غنیمت ہاتھ آجائے تو اُسے کیا کیا جائے۔ دشمن کے سپاہی اپنے قبضہ میں آجائیں تو اُن کو گرفتار کرنا جائز ہے یا نہیں اور گرفتار کر لیے جائیں تو پھر اُن کے ساتھ معاملہ کیا کرنا چاہئے۔

مالِ غنیمت کے متعلق پچھلے تمام انبیاء کی شریعتوں میں قانون یہ تھا کہ مسلمانوں کو اُس سے نفع اُٹھانا اور استعمال کرنا حلال نہیں تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ پورا مالِ غنیمت جمع کر کے کسی میدان میں رکھ دیا جائے اور دستورِ الٰہی یہ تھا کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور اُس سارے مال کو جلا کر خاک کر دیتی۔ یہی علامت اُس جہاد کے مقبول ہونے کی سمجھی جاتی تھی۔ اگر مالِ غنیمت کو جلانے کے لئے آسمانی آگ نہ آئے تو یہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ جہاد میں کوئی کوتاہی رہی ہے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کفار سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت کسی کے لئے حلال نہیں تھا مگر اُمت مرحومہ کے لئے حلال کر دیا گیا۔ مالِ غنیمت کا اس امت کے لئے خصوصی طور پر حلال ہونا اللہ تعالیٰ کے تو علم میں تھا مگر غزوۂ بدر کے واقعہ تک اس کے متعلق کوئی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے حلال ہونے کے متعلق نازل نہیں ہوئی تھی۔ اور غزوۂ بدر میں صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بالکل خلافِ قیاس غیر معمولی فتح عطا فرمائی۔ دشمن نے مال بھی چھوڑا، جو بطورِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ان کے بڑے بڑے ستر سردار مسلمانوں

نے گرفتار کرلے مگر ان دونوں چیزوں کے جائز ہونے کی صراحت کسی وحی الٰہی کے ذریعہ ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

اس لئے صحابہ کرام کے اس جلد بازانہ قدم پر عتاب نازل ہوا، اسی عتاب و ناراضی کا اظہار ایک وحی کے ذریعہ کیا گیا جس میں جنگی قیدیوں کے متعلق بظاہر تو مسلمانوں کو دو چیزوں کا اختیار دیا گیا تھا مگر اسی اختیار دینے میں ایک اشارہ اس کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ مسئلہ کے دونوں پہلوؤں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک پسندیدہ اور دوسرا ناپسندیدہ ہے۔ جامع ترمذی، سنن نسائی، صحیح ابن حبان میں بروایت علی مرتضیٰ منقول ہے کہ اس موقع پر حضرت جبرئیل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور یہ حکم سنایا کہ آپ صحابہ کرام کو دو چیزوں میں اختیار دے دیجئے ایک یہ کہ ان قیدیوں کو قتل کر کے دشمن کی شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔ دوسرے یہ کہ ان کو فدیہ یعنی کچھ مال لے کر چھوڑ دیا جائے لیکن اس دوسری صورت میں بامر الٰہی یہ طے شدہ ہے کہ اس کے بدلہ آئندہ سال مسلمانوں کے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے جتنے قیدی آج مال لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ یہ صورت اگرچہ تخییر کی تھی اور صحابہ کرام کو دونوں چیزوں کا اختیار دے دیا گیا تھا مگر دوسری صورت میں ستر مسلمانوں کی شہادت کا فیصلہ ذکر کرنے میں اس طرف ایک خفیف اشارہ ضرور موجود تھا کہ یہ صورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں کیونکہ اگر یہ پسند ہوتی تو ستر مسلمانوں کا خون اس کے نتیجہ میں لازم نہ ہوتا۔

صحابہ کرام کے سامنے جب یہ دونوں صورتیں بطور اختیار کے پیش ہوئیں تو بعض صحابہ کرام کا خیال یہ ہوا کہ اگر ان لوگوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ یہ سب یا بعض کسی وقت مسلمان ہو جائیں جو اصل فائدہ اور مقصد جہاد ہے۔ دوسرا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان اس وقت افلاس کی حالت میں ہیں گرفتار آدمیوں کا مال فدیہ ان کو مل گیا تو ان کی تکلیف بھی دور ہوگی اور آئندہ کے لئے جہاد کی تیاری میں بھی مدد مل جائے گی۔ رہا ستر مسلمانوں کا شہید ہونا سو وہ مسلمانوں کے لئے خود ایک نعمت و سعادت ہے اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ ان خیالات کے پیش نظر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ کرام نے یہی رائے دی کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ صرف حضرت عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ وغیرہ چند حضرات نے اس رائے سے اختلاف کر کے ان سب کو قتل کر دینے کی رائے اس بنیاد پر دی کہ یہ اتفاق ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں قوت و طاقت فراہم کرنے والے سارے قریشی سردار اس وقت قابو میں آگئے ہیں ان کا قبول اسلام تو موہوم خیال

ہے مگر یہ گمان غالب ہے کہ یہ لوگ واپس ہو کر پہلے سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف سرگرمی کا سبب بنیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہو کر تشریف لائے تھے اور رحمت مجسم تھے صحابہ کرام کی دو رائیں دیکھ کر آپ نے اس رائے کو قبول کر لیا جس میں قیدیوں کے معاملہ میں رحمت اور سہولت تھی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ آپ نے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو خطاب کر کے فرمایا لو اتفقتما ما خالفتکما یعنی اگر تم دونوں کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا (مظہری)۔ اختلاف رائے کے وقت آپ کی رحمت و شفقت علی الخلق کا تقاضا یہی ہوا کہ ان کے معاملے میں آسانی اختیار کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اس کے نتیجہ میں آئندہ سال غزوۂ احد کے موقع پر اشارات ربانی کے مطابق ستر **مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا۔**

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا میں ان صحابہ کرام کو خطاب ہے جنھوں نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی تھی۔ اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ آپ حضرات نے ہمارے رسول کو نامناسب مشورہ دیا۔ کیونکہ کسی نبی کے لئے یہ شایان شان نہیں ہے کہ اس کو دشمنوں پر قابو مل جائے تو ان کی قوت و شوکت کو نہ توڑے اور مفسد قسم کے دشمن کو باقی رکھ کر مسلمانوں کے لئے ہمیشہ **کی مصیبت قائم کر دے۔**

اس آیت میں حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ اثخان کے معنی لغت میں کسی کی قوت و شوکت کو توڑنے میں مبالغہ سے کام لینے کے ہیں۔ اسی معنی کی تاکید کے لئے لفظ فِي الْاَرْضِ بڑھا دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ دشمن کی شوکت کو خاک میں ملا دے۔

جن صحابہ کرام نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اگرچہ ان کی رائے میں ایک جز خالص دینی تھا یعنی آزادی کے بعد ان لوگوں کے مسلمان ہو جانے کی امید، مگر ساتھ ہی دوسرا جز اپنی ذاتی منفعت کا بھی تھا کہ ان کو مال ہاتھ آ جائے گا۔ اور ابھی تک کسی نص صریح سے اس مال کا جائز ہونا بھی ثابت نہ تھا۔ اس لئے انسانوں کا وہ معاشرہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تربیت اس پیمانہ پر بنایا جا رہا تھا کہ ان کا مرتبہ فرشتوں سے بھی آگے ہو ان کے لئے یہ مال کی طرف دھیان بھی ایک قسم کی معصیت سمجھی گئی۔ اور جو کام جائز و ناجائز کاموں سے مرکب ہو اس کا مجموعہ ناجائز ہی کہلاتا ہے اس لئے صحابہ کرام کا یہ عمل قابل عتاب **قرار دے کر یہ ارشاد نازل ہوا۔**

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ یعنی تم لوگ

دنیا کو چاہتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم آخرت کے طالب بنو۔ یہاں جو عتاب کے اُن کے صرف اُس فعل کا ذکر کیا گیا جو وجہ ناراضی تھا دوسرا سبب یعنی قیدیوں کے مسلمان ہو جانے کی امید اس کا یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام جیسی پاک اور مخلص جماعت کے لئے ایسی مشترک نیت جس میں کچھ دین کا جز ہو کچھ اپنے دنیوی نفع کا یہ بھی قابلِ قبول نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں عتاب و تنبیہ کا خطاب صحابہ کرام کی طرف ہے، اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی رائے کو قبول فرما کر یک گونہ شرکت ان کے ساتھ کرلی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل خالص آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا مظہر تھا کہ صحابہ میں اختلاف رائے ہونے کی صورت میں اُس صورت کو اختیار فرمالیا جو قیدیوں کے حق میں سہولت و شفقت کی تھی۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں اگر آپ لوگ جلد بازی نہ کرتے تو وہ اپنے فضل سے آئندہ فتوحات میں تمہارے لئے مال و دولت کا بھی سامان کر دیتے۔

دوسری آیت بھی اسی عتاب کا تتمہ ہے جس میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو کام تم نے اختیار کیا کہ مال لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اُس کے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہو جاتی۔

اس نوشتہ تقدیر سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مالِ غنیمت تم سے پہلے کسی قوم کسی اُمت کے لئے حلال نہیں تھا۔ بدر کے موقع میں جب مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لئے مالِ غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مالِ غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آجانا چاہئے تھا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس اُمت کے لئے مالِ غنیمت حلال کیا جائے گا اس لئے مسلمانوں کی اس خطا پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔ (مظہری)

بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عذابِ الٰہی بالکل سامنے آچکا تھا۔ اللہ نے اپنے فضل سے روک دیا اور اگر عذاب آجاتا تو بجز عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ کے کوئی اس سے نہ بچتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سببِ عتاب قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دینا تھا اور ترمذی کی روایتِ سابقہ سے اس کا سبب مالِ غنیمت جمع کرنا معلوم ہوتا ہے مگر دونوں میں کوئی تضاد نہیں قیدیوں سے

فدیہ لینا بھی مالِ غنیمت ہی کا جز ہے۔

مسئلہ۔ آیت مذکورہ میں قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کرنے یا مالِ غنیمت جمع کرنے پر جو عتاب نازل ہوا، اور عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا مگر پھر معافی دے دی گئی۔ اس سے یہ بات نہ کھلی کہ آئندہ کے لئے ان معاملات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس لئے اگلی آیت میں مالِ غنیمت کا مسئلہ توصاف کر دیا گیا فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ یعنی جو مالِ غنیمت تم کو ہاتھ آگیا ہے وہ اب کھا سکتے ہو وہ آئندہ کے لئے تمہارے واسطے حلال کر دیا گیا۔ مگر اس میں بھی ایک شبہ یہ رہ جاتا ہے کہ مال غنیمت حلال کرنے کا حکم تو اب ملا ہے۔ اس حکم سے پہلے جو غلطی سے جمع کر لیا گیا تھا شاید اس میں کسی قسم کی کراہت ہو اس لئے اس کے بعد حَلٰلًا طَيِّبًا فرما کر یہ شبہ بھی دور کر دیا گیا کہ اگرچہ نزولِ حکم سے پہلے جمع غنیمت کا اقدام درست نہ تھا مگر اب جب کہ مالِ غنیمت حلال ہونے کا حکم آ گیا تو پہلا جمع کیا ہوا بھی بغیر **کسی کراہت کے حلال ہے۔**

مسئلہ۔ یہاں اصولِ فقہ کا ایک مسئلہ قابل نظر اور قابل یادداشت ہے کہ جب کسی ناجائز اقدام کے بعد مستقل آیت کے ذریعہ اس مال کو حلال کرنے کا حکم نازل ہو جائے تو سابقہ اقدام کا اس میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ یہ مال حلال طیب ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں ہوا لیکن اسی کی ایک دوسری نظیر یہ ہے کہ کسی معاملہ میں حکم تو پہلے سے نازل شدہ تھا مگر اس کا ظہور عمل کرنے والوں پر نہیں تھا اس بنا پر اس کی خلاف ورزی کر گزرے، بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا یہ عمل قرآن و سنت کے فلاں حکم کے خلاف تھا۔ تو اس صورت میں ظہور حکم کے بعد وہ مال حلال نہیں رہتا گرچہ سابقہ غلطی کو معاف بھی کر دیا جائے۔ (نور الانوار ملا جیون)

آیت مذکورہ میں مال غنیمت کو حلال طیب تو قرار دے دیا گیا مگر آخر آیت میں یہ قید لگا دی گئی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ مالِ غنیمت اگرچہ حلال کر دیا گیا ہے مگر وہ بھی ایک خاص قانون کے تحت حلال ہوا ہے اس قانون کے خلاف یا اپنے حق سے **زائد لیا جائے گا تو وہ جائز نہیں۔**

یہاں دو معاملے تھے ایک مالِ غنیمت دوسرے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا۔ پہلے معاملے کے متعلق تو اس آیت نے بات صاف کر دی مگر دوسرا معاملہ ابھی تک صاف نہیں ہوا۔ اس کے متعلق سورۂ محمد میں یہ آیت نازل ہوئی فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (یعنی جب جنگ میں کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مار دو

یہاں تک کہ جب تم خون ریزی کے ذریعہ ان کی قوت شوکت توڑ چکو تو پھر اُن کو قید کر کے مضبوط باندھو۔ اس کے بعد یا تو اُن پر احسان کر کے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے پر عتاب نازل ہوا، یہ اسلام کا پہلا جہاد تھا اس وقت تک کافروں کی قوت و شوکت ٹوٹ نہیں چکی تھی اتفاقاً اُن پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی پھر جب اسلام اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ حاصل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ حکم منسوخ کرنے کے لئے سورۂ محمد کی آیت مذکورہ نازل فرما دی۔ جس میں نبی کریم اور مسلمانوں کو قیدیوں کے بارے میں چار اختیار دے دیئے گئے وہ ہیں۔

ان شاءوا قتلوهم وان شاءوا استعبدوهم وان شاءوا فادوهم وان شاءوا اعتقوهم (مظہری)

چاہیں تو سب کو قتل کر دیں یا چاہیں تو غلام بنا لیں یا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں یا چاہیں تو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیں۔

مذکورہ چار اختیارات میں سے پہلے دو پر تو پوری اُمت کا اتفاق اور اجماع ہے کہ امیر مسلمین کے لئے قیدیوں کو قتل کر دینے کا بھی اختیار ہے اور غلام بنا لینے کا بھی لیکن ان کو بلا معاوضہ چھوڑ دینے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینے میں فقہاء اُمت کا اختلاف ہے۔

امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ثوریؒ، اسحٰقؒ اور تابعین میں سے حضرت حسن بصریؒ اور عطاءؒ کا قول یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں بھی امیر المسلمین کے لئے جائز ہیں کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دے یا بلا معاوضہ آزاد کر دے یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کرے۔

اور امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، اوزاعی اور قتادہ اور ضحاک اور سُدّی اور ابن جُریجؒ فرماتے ہیں کہ بلا معاوضہ چھوڑنا تو بالکل جائز نہیں۔ فدیہ لے کر چھوڑنا بھی امام ابو حنیفہؒ کے مشہور مذہب میں جائز نہیں۔ البتہ سیر کبیر کی روایت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو تو فدیہ لے کر چھوڑ سکتے ہیں۔ البتہ مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں ان کو چھوڑ دینا امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے (کما ہو اظہر الروایتین عنہم مظہری)

جن حضرات نے فدیہ لے کر یا بلا فدیہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق سورہ محمد کی آیت کو انفال کی آیت کا ناسخ اور آیت انفال کو منسوخ قرار دیتے ہیں فقہاء حنفیہ نے آیت سورہ محمد کو منسوخ قرار دیا ہے اور سورہ انفال کی آیت فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ اور آیت اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے اس لئے قیدیوں کو آزاد کر دینا خواہ فدیہ لے کر ہو یا بلا فدیہ ان کے نزدیک جائز نہیں۔ (مظہری)

لیکن اگر سورۂ انفال کی آیت کے الفاظ اور سورۂ محمد کے الفاظ میں غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی ناسخ و منسوخ نہیں، بلکہ دو مختلف حالتوں کے دو حکم ہیں۔ سورۂ انفال کی آیت میں بھی اصل حکم اثخان فی الارض یعنی قتل کے ذریعہ کافروں کی قوت توڑ دینا، اور سورۂ محمد کی آیت میں بھی جو منّ و فداء (یعنی قیدیوں کو بلامعاوضہ یا معاوضہ لے کر آزاد کرنے) کا اختیار دیا گیا ہے اُس سے پہلے اثخان فی الارض کا بیان ہو چکا ہے یعنی خون ریزی کے ذریعہ کفر کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد یہ بھی اختیار ہے کہ قیدیوں کو فدیہ پر یا بلا فدیہ آزاد کر دیا جائے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کی روایت سیر کبیر کا بھی یہی منشاء ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات اور ضرورت پر نظر کر کے دونوں قسم کے احکام دیئے جا سکتے ہیں۔ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ
اے نبی کہہ دے اُن سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں قیدی اگر

يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ
جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دے گا تم کو اُس سے جو بہتر ہے جو تم سے چھن گیا

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ
اور تم کو بخشے گا، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان، اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی

فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱
سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے پھر اس نے اُن کو پکڑوا دیا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے پیغمبر آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں (ان میں جو مسلمان ہو گئے ہیں) آپ ان سے فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہوگا (یعنی تم دل سے مسلمان ہوئے ہو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو مطابق واقع کے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مسلمان اسی کو جانیں گے جو واقع میں مسلمان ہوگا اور جو شخص غیر مسلم ہوگا اس کو غیر مسلم ہی جانیں گے پس اگر تم دل سے مسلمان ہو گے) تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے (دنیا میں) اس سے بہتر تم کو دے دے گا اور (آخرت میں) تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے تم کو بخش

دیں گے اور بڑی رحمت والے ہیں (اس لئے تم کو نعم البدل دیں گے) اور اگر بالفرض یہ لوگ صدق دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں بلکہ ظاہر اسلام سے محض آپ کو دھوکا ہی دینا چاہیں اور دل میں آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا (یعنی نقض عہد کرکے مخالفت ومقابلہ کا) ارادہ رکھتے ہوں تو کچھ فکر نہ کیجئے اللہ تعالیٰ ان کو پھر آپ کے ہاتھوں میں گرفتار کرا دے گا جیسا اس سے پہلے انہوں نے اللہ کے ساتھ خیانت کی تھی (اور آپ کی مخالفت اور مقابلہ کیا) پھر اللہ نے ان کو آپ کے ہاتھوں میں گرفتار کرا دیا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون خائن ہے اور) بڑی حکمت والے ہیں (ایسی صورتیں پیدا کر دیتا ہے جس سے خائن مغلوب ہو جائے)۔

معارف ومسائل

غزوۂ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وہ دشمن جنہوں نے ان کے ستانے، مارنے، قتل کرنے میں کسی وقت بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور جب موقع مل گیا انتہائی وحشیانہ مظالم ان پر کئے مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو جانے کے بعد ان کی جان بخشی کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی ان کے لئے بڑی غنیمت اور انتہائی لطف وکرم تھا فدیہ میں جو رقم ان سے لی گئی وہ بھی نہایت معمولی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم دیکھئے کہ اس معمولی رقم کے دینے سے جو ایک قسم کی تکلیف ان کو پیش آئی اُس کو بھی کس طرح رفع فرمایا جاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں ارشاد ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کوئی خیر پائیں گے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اُس سے بہتر تمہیں دے دیں گے۔ اور اُس پر مزید یہ کہ تمہارے پچھلے گناہ بخش دیں گے۔ خیر سے مراد ایمان اور اخلاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ان قیدیوں میں جو لوگ ایمان واسلام کو اخلاص کے ساتھ اختیار کرلیں گے تو جو کچھ فدیہ میں دیا ہے اُس سے زیادہ اور بہتر اُن کو مل جائے گا۔ قیدیوں کو آزاد وخود مختار کر دینے کے ساتھ اس طرح دعوت دی گئی کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے نفع نقصان پر غور کریں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ ان لوگوں میں سے جو مسلمان ہو گئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی مغفرت اور جنت کے درجات عالیہ کے علاوہ دنیا میں بھی اُن کو اتنا مال ودولت دے دیا جو اُن کے فدیہ سے بدرجہا زائد تھا۔

اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارہ میں نازل ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور اُن

سے بھی فدیہ لیا گیا تھا۔ ان کی خصوصیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ جنگ بدر میں یہ مکہ سے اپنے ساتھ تقریباً سات سو گنی سونا لے کر چلے تھے تاکہ وہ لشکرِ کفار پر خرچ کیا جائے۔ اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ مع اس سونے کے گرفتار کر لئے گئے۔

جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اُس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مال آپ کفر کی امداد کے لئے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کا مال غنیمت بن گیا۔ فدیہ اُس کے علاوہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں۔ عباسؓ نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بار مجھ پر ڈالا گیا تو مجھے قریش سے بھیک مانگنی پڑے گی میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ ام الفضل کے حوالہ کیا ہے۔ حضرت عباس نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا جب کہ وہ میں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے اُس کی پوری تفصیل بتلا دی۔ حضرت عباس کے دل میں یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے معتقد تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت رفع فرما دیئے اور وہ درحقیقت اسی وقت سے مسلمان ہو گئے۔ مگر ان کا بہت سا روپیہ قریش مکہ کے ذمہ قرض تھا۔ اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا اس لئے اعلان نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ فتح مکہ سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آجائیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباسؓ کی اس گفتگو پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ میں آیا ہوا وعدہ بھی اُن کو بتلا دیا کہ اگر آپ نے اسلام قبول کر لیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہو گئے تو جو کچھ مال فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرما دیں گے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ اظہارِ اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھ سے بیس۲۰ اُوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے

اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ

رفیق ہیں، اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا تم کو ان کی

وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ

رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں، اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں

فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ

دین میں تو تم کو لازم ہے ان کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو،

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ

اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے

بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ؕ

رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں اور بڑی خرابی ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے

اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ

ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور

رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

روزی عزت کی۔ اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے

مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ

تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہیں میں ہیں، اور رشتہ دار آپس میں حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے

فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

اللہ کے حکم میں، تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

ع ۶ / ۱۰

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد بھی کیا، (جس کا وقوع لوازم عادیہ ہجرت سے ہے گو مدار حکم توارث نہیں اور یہ جماعت مہاجرین سے ملقب ہے) اور جن لوگوں نے ان مہاجرین کو رہنے کو جگہ دی اور ان کی،

مدد کی اور یہ تمام [illegible] نصرت کے مستحق ہے، یہ دونوں قسم کے لوگ باہم ایک دوسرے کے
وارث ہوں گے اور جو لوگ ایمان تو لائے اور ہجرت نہیں کی تمہارا (یعنی مہاجرین کا) ان سے
میراث کا کوئی تعلق نہیں (نہ یہ ان کے وارث نہ وہ ان کے) جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور
جب ہجرت کرلیں پھر وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوجائیں گے اور اگر ان سے تمہارا توارث نہ ہو
لیکن اگر وہ تم سے دین کے کام (یعنی قتال مع الکفار) میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمے (ان کی)
مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں باہم عہد (صلح کا) ہو اور
اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتے ہیں (پس ان کے مقررہ احکام میں خلل ڈال کر مستحق
ناخوشی نہ ہونا) اور (جس طرح باہم تم میں علاقہ توارث کا ہے اسی طرح) جو لوگ کافر ہیں وہ
باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں (نہ تم ان کے وارث نہ وہ تمہارے وارث) اگر اس (حکم مذکور)
پر عمل نہ کروگے (بلکہ باوجود تخالف دین محض قرابت کی بناء پر مومن و کافر میں علاقہ توارث قائم
رکھوگے) تو دنیا میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا (کیونکہ توارث سے سب ایک جماعت سمجھی
جائے گی اور بدون جدا جماعت ہوئے اسلام کو قوت و شوکت حاصل نہیں ہوسکتی اور ضعف
اسلام سرمایہ تمام تر فتنہ و فساد عظیم کا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، اور اس حکم توارث بین المہاجرین
والانصار میں اگرچہ سب مہاجرین برابر ہیں خواہ زمانہ ہجرت نبویہ میں انہوں نے ہجرت کی ہو یا
بعد میں لیکن فضیلت و مرتبہ میں باہم متفاوت ہیں چنانچہ) جو لوگ اول مسلمان ہوئے اور
انہوں نے ہجرت نبویہ کے زمانہ میں ہجرت کی اور اول ہی سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے
رہے اور جن لوگوں نے ان مہاجرین کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہ لوگ تو ایمان
کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں (کیونکہ اس کا حق یہی ہے کہ اس کے قبول کرنے میں سبقت کرے)
ان کے لئے (آخرت میں) بڑی مغفرت اور (جنت میں) بڑی معزز روزی مقرر ہے اور
جو لوگ (ہجرت نبویہ کے) بعد کے زمانہ میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد
کیا (یعنی کام تو سب کئے مگر بعد میں) سو یہ لوگ (گو فضیلت میں تمہارے برابر نہیں لیکن تاہم)
تمہارے ہی شمار میں ہیں (فضیلت میں تو من وجہ کیونکہ اعمال کے تفاوت سے مرتبہ میں تفاضل
ہوجاتا ہے اور احکام میراث میں من کل الوجوہ کیونکہ عمل کے تفاضل سے احکام شرعیہ میں تفاوت
نہیں ہوتا) اور (ان بعد والے مہاجرین میں) جو لوگ (باہم یا مہاجرین سابقین کے) رشتہ دار
ہیں (گو فضل و مرتبہ میں کم ہوں لیکن میراث کے اعتبار سے) کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی یا
آیت میراث) میں ایک دوسرے کی میراث کے (بہ نسبت غیر رشتہ داروں کے) زیادہ
حقدار ہیں (گو غیر رشتہ دار فضل و مرتبہ میں زیادہ ہوں) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب

جانتے ہیں، اس لئے ہر وقت کی مصلحت کے مناسب حکم مقرر فرماتے ہیں۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ انفال کی آخری چار آیتیں ہیں، ان میں اصل مقصود ہجرت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلق مہاجر مسلمانوں کی وراثت سے ہے، اس کے بالمقابل غیر مہاجر مسلمان اور غیر مسلموں کی وراثت کا بھی ذکر آیا ہے۔

خلاصہ ان احکام کا یہ ہے کہ جن لوگوں پر شرعی احکام عائد ہوتے ہیں وہ اولاً دو قسم پر ہیں، مسلم، کافر۔ پھر مسلم اس وقت کے لحاظ سے دو قسم کے تھے ایک مہاجر جو مکہ سے ہجرت فرض ہونے پر مدینہ طیبہ میں آکر مقیم ہوگئے تھے۔ دوسرے غیر مہاجر جو کسی جائز عذر سے یا کسی دوسری وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

باہمی رشتہ داری اور قرابت ان سب قسم کے افراد میں دائر تھی کیونکہ اوائل اسلام میں بکثرت ایسا تھا کہ بیٹا مسلمان ہے باپ کافر، یا باپ مسلمان ہے بیٹا کافر، اسی طرح بھائی بھتیجوں اور نانے ماموں وغیرہ کا حال۔ اور مسلمان مہاجر و غیر مہاجر میں رشتہ داریاں ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ اور حکمت بالغہ کی وجہ سے مرنے والے انسان کے چھوڑے ہوئے مال کا مستحق اسی کے قریبی عزیزوں، رشتہ داروں کو قرار دیا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ جس کو جو کچھ دنیا میں ملا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کی ملک حقیقی تھا، اسی کی طرف سے زندگی بھر استعمال کرنے، نفع اٹھانے کے لئے انسان کو دے کر عارضی مالک بنا دیا گیا تھا اس لئے تقاضائے عقل و انصاف تو یہ تھا کہ ہر مرنے والے کا ترکہ اللہ تعالیٰ کی ملک کی طرف لوٹ جاتا جس کی عملی صورت اسلامی بیت المال میں داخل کرنا تھا جس کے ذریعہ ساری خلق خدا تعالیٰ کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ مگر ایسا کرنے میں ایک تو انسان کے طبعی جذبات کو ٹھیس لگتی جب کہ وہ جانتا کہ میرا مال میرے بعد نہ میری اولاد کو ملے گا نہ ماں باپ اور بیوی کو، اور پھر اس کا یہ نتیجہ بھی طبعی طور پر لازمی سا تھا کہ کوئی شخص اپنا مال بڑھانے اور اس کو محفوظ رکھنے کی فکر نہ کرتا صرف اپنی زندگی کی حد تک ضروریات جمع رکھنے سے زائد کوئی شخص محنت و جانفشانی نہ کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پورے انسانوں اور شہروں کے لئے تباہی و بربادی کی صورت اختیار کرتا۔

اس لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے میراث کو انسان کے رشتہ داروں کا حق قرار دے دیا

بالخصوص ایسے رشتہ داروں کا جن کے فائدہ ہی کے لئے وہ اپنی زندگی میں مال جمع کرتا اور طرح طرح کی محنت مشقت اُٹھاتا تھا۔

اس کے ساتھ اسلام نے اُس اہم مقصد کو بھی وراثت کی تقسیم میں سامنے رکھا جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت۔ اور اس کے لحاظ سے پورے عالم انسان کو دو الگ الگ قومیں قرار دے دیا۔ مؤمن اور کافر۔ آیت قرآن خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ کا یہی مطلب ہے۔

اسی دو قومی نظریہ نے نسبی اور خاندانی رشتوں کو میراث کی حد تک قطع کر دیا کہ نہ کسی مسلمان کو کسی رشتہ دار کافر کی میراث سے کوئی حصہ ملے گا اور نہ کسی کافر کا کسی مسلمان رشتہ دار کی وراثت میں کوئی حق ہوگا۔ پہلی دو آیتوں میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور یہ حکم دائمی اور غیر منسوخ حکم ہے کہ اول اسلام سے لے کر قیامت تک یہی اسلام کا اصولِ وراثت ہے۔

اس کے ساتھ ایک دوسرا حکم مسلمان مہاجر اور غیر مہاجر دونوں کے آپس میں وراثت کا ہے۔ جس کے متعلق پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان جب تک مکہ سے ہجرت نہ کرے اُس وقت تک اس کا تعلق بھی ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے وراثت کے بارہ میں منقطع ہے۔ نہ مہاجر مسلمان اپنے غیر مہاجر مسلمان رشتہ دار کا وارث ہوگا اور نہ غیر مہاجر کسی مہاجر مسلمان کی وراثت سے کوئی حصہ پائے گا یہ حکم ظاہر ہے کہ اُس وقت تک تھا جب تک کہ مکہ مکرمہ فتح نہیں ہوا تھا فتح مکہ کے بعد تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا لا هجرة بعد الفتح۔ یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم ختم ہوگیا اور جب ہجرت کا حکم ہی ختم ہوگیا تو ترک ہجرت کرنے والوں سے بے تعلقی کا سوال ختم ہوگیا۔

اسی لئے اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم فتح مکہ سے منسوخ ہو چکا ہے اور اہل تحقیق کے نزدیک یہ حکم بھی دائمی غیر منسوخ ہے مگر حالات کے تابع بدلا ہے۔ جن حالات میں نزولِ قرآن کے وقت یہ حکم آیا تھا اگر کسی زمانہ میں یا کسی ملک میں پھر ویسے ہی حالات پیدا ہوجائیں تو پھر یہی حکم جاری ہو جائے گا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہر مسلمان مرد وعورت پر مکہ سے ہجرت کو فرضِ عین قرار دیا گیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں بجز معدودے چند مسلمانوں کے سبھی مسلمان ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آگئے تھے اور اُس وقت مکہ سے ہجرت نہ کرنا اس کی علامت بن گیا تھا کہ وہ مسلمان نہیں اس لئے اُس وقت غیر مہاجر کا اسلام بھی مشتبہ اور مشکوک تھا اس لئے مہاجر اور غیر مہاجر کی باہمی وراثت کو قطع کر دیا گیا تھا۔

اب اگر کسی ملک میں پھر بھی ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں کہ وہاں رہ کر اسلامی فرائض کی ادائیگی بالکل نہ ہو سکے تو اس ملک سے ہجرت کرنا پھر فرض ہو جائے گا اور ایسی حالت میں بلا عذر قوی ہجرت نہ کرنا اگر یقینی طور پر علامت کفر کی ہو جائے تو پھر بھی یہی حکم عائد ہوگا کہ مہاجر اور غیر مہاجرین باہمی وراثت جاری نہ رہے گی۔ اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مہاجر اور غیر مہاجرین میں قطع وراثت کا حکم درحقیقت کوئی جداگانہ حکم نہیں بلکہ وہ پہلا ہی حکم ہے جو مسلم اور غیر مسلم میں قطع وراثت کو بیان کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس علامتِ کفر کی وجہ سے وراثت سے تو محروم کر دیا گیا مگر محض اتنی علامت کی وجہ سے اُس کو کافر نہیں قرار دیا جب تک اُس سے صریح اور واضح طور پر کفر کا ثبوت نہ ہو جائے۔

اور غالباً اسی مصلحت سے اس جگہ ایک دوسرا حکم غیر مہاجر مسلمانوں کا ذکر کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ مہاجر مسلمانوں سے امداد و نصرت کے طالب ہوں تو مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کرنا ضروری ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ غیر مہاجر مسلمانوں کو بالکل کافروں کی صف میں نہیں رکھا بلکہ اُن کا یہ اسلامی حق باقی رکھا گیا کہ ضرورت کے وقت اُن کی امداد کی جائے۔

اور چونکہ اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص ہجرت ہے مکہ سے مدینہ کی طرف اور غیر مہاجر مسلمان وہی تھے جو مکہ میں رہ گئے تھے اور کفار مکہ کے نرغہ میں تھے تو ظاہر ہے کہ ان کا امداد طلب کرنا نہیں کفار مکہ کے مقابلہ میں ہو سکتا تھا۔ اور جب قرآن کریم نے مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کا حکم دے دیا تو بظاہر اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ہر حال میں اور ہر قوم کے مقابلہ میں ان کی امداد کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ قوم جس کے مقابلہ پر اُن کو امداد مطلوب ہے اُس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ترکِ جنگ کا بھی ہو چکا ہو۔ حالانکہ اصول اسلام میں عدل و انصاف اور معاہدہ کی پابندی ایک اہم فریضہ ہے اس لئے اسی آیت میں ایک استثنائی حکم یہ بھی ذکر فرما دیا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان مہاجر مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر مدد طلب کریں جس سے مسلمانوں نے ترکِ جنگ کا معاہدہ کر رکھا ہے تو پھر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد بھی معاہد کفار کے مقابلہ میں جائز نہیں۔

یہ خلاصۂ مضمون ہے پہلی دو آیتوں کا۔ اب الفاظ آیت اس کو ملاحظہ کر لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا۔

یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے وطن اور عزیز و اقارب

چھوڑا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ مال خرچ کرکے ہتھیار اور سامانِ جنگ خریدا اور میدانِ جنگ کے لئے اپنی جانوں کو پیش کر دیا۔ اس سے مراد مہاجرین اولین ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے رہنے کو جگہ دی اور مدد کی۔ اس سے مراد انصار مدینہ ہیں۔ ان دونوں فریق کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت نہیں کی تمھارا ان سے کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔

اس جگہ قرآن کریم نے لفظ ولی اور ولایت استعمال فرمایا ہے جس کے اصلی معنی دوستی اور گہرے تعلق کے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حسن، قتادہ، مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس جگہ ولایت سے مراد وراثت اور ولی سے مراد وارث ہے اور بعض حضرات نے ولایت کے لغوی معنی یعنی دوستی اور امداد و اعانت ہی مراد لئے۔

پہلی تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان مہاجر و انصار آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے ان کا تعلق وراثت نہ غیر مسلم کے ساتھ قائم رہے گا نہ ان مسلمانوں کے ساتھ جنھوں نے ہجرت نہیں کی۔ پہلا حکم یعنی اختلاف دین کی بنا پر قطع وراثت تو دائمی اور باقی رہا مگر دوسرا حکم فتح مکہ کے بعد جب کہ ہجرت ہی کی ضرورت نہ رہی تو مہاجر و غیر مہاجرین قطع وراثت کا حکم بھی باقی نہ رہا۔ اس سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اختلاف دین قطع وراثت کا سبب ہے اسی طرح اختلاف دارین بھی قطع وراثت کا سبب ہے جس کی تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ یعنی یہ لوگ جنھوں نے ہجرت نہیں کی اگرچہ ان سے تعلق وراثت منقطع کر دیا گیا ہے مگر وہ بہرحال مسلمان ہیں اگر وہ اپنے دین کی حفاظت کے لئے مہاجر مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کے ذمہ ان کی امداد کرنا واجب ہے۔ مگر اس کے ساتھ اصول عدل و انصاف اور پابندی معاہدہ کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اگر وہ کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر تم سے مدد طلب کریں جس قوم سے تمھارا معاہدہ ترک جنگ کا ہو چکا ہے تو ان کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کی مدد بھی جائز نہیں۔

صلح حدیبیہ کے وقت ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے صلح کی اور شرائط صلح میں یہ بھی داخل تھا کہ مکہ سے جو شخص اب مدینہ جائے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں گے عین اسی معاہدہ صلح کے وقت ابو جندل رضی جن کو

واعانت بھی داخل ہے اور وراثت بھی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت کے مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں کے آپس میں وراثت کا تعلق نہ رہنا چاہئے۔ مگر امداد و نصرت کا تعلق بشرائط کے ساتھ باقی رہنا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں ان کے قانون ولایت اور وراثت میں کوئی دخل اندازی مسلمانوں کو نہیں چاہئے۔

اگر ان احکام پر عمل نہ کیا گیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ یہ تنبیہ غالباً اس لئے کی گئی کہ جو احکام اس جگہ بیان ہوئے ہیں وہ عدل و انصاف اور امن عامہ کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان آیات نے یہ واضح کر دیا کہ باہمی امداد و اعانت اور وراثت کا تعلق جیسے رشتہ داری پر مبنی ہے ایسے ہی اس میں مذہبی اور دینی رشتہ بھی قابل لحاظ ہے بلکہ نسبی رشتہ پر دینی رشتہ کو ترجیح حاصل ہے اسی وجہ سے کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ آپس میں نسبی رشتہ سے باپ اور بیٹے یا بھائی بھائی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی تعصب اور عصبیت جاہلیت کی روک تھام کرنے کے لئے یہ بھی ہدایت دے دی گئی ہے کہ مذہبی رشتہ اگرچہ اتنا قوی اور مضبوط ہے مگر معاہدہ کی پابندی اس سے بھی زیادہ مقدم اور قابل ترجیح ہے۔ مذہبی تعصب کے جوش میں معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہدایت دے دی گئی کہ کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور وارث ہیں ان کی شخصی ولایت و وراثت میں مداخلت نہ کی جائے۔ دیکھنے کو تو یہ چند فرعی اور جزئی احکام ہیں مگر درحقیقت امن عامہ کے لئے عدل و انصاف کے بہترین اور جامع بنیادی اصول ہیں۔ اسی لئے اس جگہ ان احکام کو بیان فرمانے کے بعد ایسے الفاظ سے تنبیہ فرمائی جو عام طور پر دوسرے احکام کے لئے نہیں کی گئی کہ اگر تم نے ان احکام پر عمل نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ ان الفاظ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احکام فتنہ و فساد کو روکنے میں خاص دخل اور اثر رکھتے ہیں۔

تیسری آیت میں مکہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ اور ان کی مدد کرنے والے انصار مدینہ کی تعریف و ثنا اور ان کے سچے مسلمان ہونے کی شہادت اور ان سے مغفرت اور باعزت رزق کا وعدہ مذکور ہے ارشاد فرمایا أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی یہی لوگ سچے پکے مسلمان ہیں اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ ہجرت نہ کرنے والے حضرات بھی اگرچہ مسلمان ہیں مگر ان کا اسلام کامل بھی نہیں اور یقینی بھی نہیں کیونکہ یہ احتمال بھی ہے کہ دراصل منافق ہوں بظاہر اسلام کا دعویٰ رکھتے ہوں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ۔ یعنی ان کے لئے مقرر ہے مغفرت جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ وَالْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا۔

یعنی مسلمان ہوجانا پچھلے سب گناہوں کے انبار کو ڈھا دیتا ہے اسی طرح ہجرت کرنا پچھلے سب گناہوں کو ختم کردیتا ہے۔

چوتھی آیت میں مہاجرین کے مختلف طبقات کا حکم بیان فرمایا ہے کہ اگرچہ اُن میں بعض لوگ مہاجرین اولین ہیں جنھوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی اور بعض دوسرے درجہ کے مہاجر ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی اور اس کی وجہ سے اُن کے اُخروی درجات میں فرق ہوگا مگر احکام دنیا میں، اُن کا حکم بھی وہی ہے جو مہاجرین اولین کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ اسی لئے مہاجرین کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ یعنی یہ دوسرے درجہ کے مہاجرین بھی تمھارے ہی زمرہ میں شامل ہیں اس لئے وراثت کے احکام میں بھی ان کا حکم عام مہاجرین کی طرح ہے۔

یہ سورۂ انفال کی بالکل آخری آیت ہے اس کے آخر میں قانون میراث کا ایک جامع ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے جس کے ذریعہ اُس عارضی حکم کو منسوخ کردیا گیا ہے جو اوائل ہجرت میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کے ذریعہ ایک دوسرے کا وارث بننے کے متعلق جاری ہوا تھا۔ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ۔

لفظ اولو عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں والے سے کیا جاتا ہے۔ اولو العقل عقل والے، اولو العزم عزم والے، اسی لئے اولو الارحام کے معنی ہوئے رحام والے۔ ارحام رحم کی جمع ہے جو اصل میں اُس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لئے اولو الارحام رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقت ضرورت ایک دوسرے کی امداد واعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں۔ فِي كِتَابِ اللَّهِ کے معنی اس جگہ فِي حُكْمِ اللَّهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم خاص سے یہ قانون بنا دیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتا دیا کہ تقسیم وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہئے۔ اور لفظ اولو الارحام مطلقاً قرابت اور رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اُن میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۂ نساء میں متعین فرما دیئے جن کو علم میراث کی اصطلاح میں اہل فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے، اُن کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس

آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں کیونکہ دُور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلا شبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم و حوّا علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے جس کا تفصیلی بیان احادیث رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔

اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علم میراث و فرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام انھیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے قرآن کریم میں اُولُوا الْاَرْحَام کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے جس میں ذوی الفروض، اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

پھر اس کی کچھ تفصیل سورۂ نساء کی آیات میں آگئی جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصّے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیئے جن کو اصطلاحِ میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولیٰ رجل ذکر۔ (بخاری)

یعنی جن کے حصّے قرآن نے مقرر کر دیئے ہیں وہ پورے اُن کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت سے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو اصطلاح میراث میں عصبات کہا جاتا ہے۔ اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں خالہ وغیرہ۔

سورۂ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے سابقی وراثت کا وہ قانون منسوخ کر دیا جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے جن کی رو سے مہاجرین و انصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی اگرچہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو کیونکہ یہ حکم ایک

ہنگامی حکم ہے جو دَور ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔

سورۂ انفال ختم ہوگئی اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے سمجھنے اور پھر اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

تمت سورة الانفال بعون الله تعالیٰ وحمده ليلة الخميس ثمانی و عشرين من جمادی الأُخری سنہ ١٣٩١ھ و اسأل الله تعالیٰ التوفيق و العون فی تفسير سورة التوبة ولله الحمد اوله واخره۔

محمد شفیع عفی عنه

وتم النظر الثانی عليه يوم جمعة لتسعة عشر من جمادی الاولیٰ سنہ ١٣٩٠ھ و الحمد لله علیٰ ذٰلك۔

سُوْرَةُ تَوْبَة

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورہ توبہ مدینہ میں اُتری اور اس کی ایک سو انتیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١﴾

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي

سو پھر لو اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے

اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢﴾ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ

اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔ اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اُس کے

اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڏ

رسول کی، لوگوں کو دن بڑے حج کے کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے

وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا

اور اُس کا رسول، سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر نہ مانو تو جان لو

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣﴾

کہ تم ہرگز نہ تھکا سکو گے اللہ کو، اور خوشخبری سنا دے کافروں کو عذاب دردناک کی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَمْ

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد

يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ

نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی سو اُن سے پورا کر دو اُن کا عہد اُن کے وعدہ تک ،

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٤﴾ فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا

بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے . پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو

الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ

مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

اور بیٹھو ہر جگہ اُن کی تاک میں . پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز

وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾

اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو اُن کا رستہ ، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان .

خلاصۂ تفسیر

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے (بلا تعیین مدت) عہد کر رکھا تھا (اور یہ حکم جماعت سوم کا ہے اور عہد شکنی تصریحاً ثابت نہیں ہوئی اور جماعت چہارم یعنی جن سے کچھ بھی عہد نہ تھا ان کا بھی حکم اس سے بدرجۂ اولیٰ مفہوم ہو گیا کہ جب معاہدین سے رفع امن کر دیا تو غیر معاہدین میں تو کوئی احتمال امن کا پہلے سے بھی نہیں ہے) سو (ان دونوں جماعتوں کو اطلاع کر دو کہ) تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو (اجازت ہے تاکہ اپنا موقع اور پناہ ڈھونڈھ لو) اور (اس کے ساتھ) یہ بھی جان رکھو کہ (اس مہلت کی بدولت صرف مسلمانوں کی دست برد سے بچ سکتے ہو لیکن) تم خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے قبضہ سے نکل سکو) اور یہ (بھی جان رکھو) کہ بے شک اللہ تعالیٰ (آخرت میں) کافروں کو رسوا کریں گے (یعنی عذاب دیں گے، تمہاری سیاحت اس سے نہیں بچا سکتی اور احتمال قتل دنیا میں الگ رہا، اس میں ترغیب ہے توبہ کی) اور (پہلی دوسری جماعت کا حکم یہ ہے کہ) اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں (بدون مقرر کرنے کسی میعاد کے ابھی) دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے (جنہوں نے خود نقض عہد کیا، مراد جماعت اول ہے مگر) پھر (بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ) اگر تم (کفر سے) توبہ کر لو تو تمہارے لئے (دونوں جہان میں) بہتر ہے

(دنیا میں تو اس لئے کہ تمہاری عہد شکنی معاف ہو جائے گی اور قتل سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں ظاہر ہے کہ نجات ہوگی) اور اگر تم نے (اسلام سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے کہ کہیں نکل کر بھاگ جاؤ اور (آگے خدا کو عاجز نہ کر سکنے کی تفسیر ہے کہ) ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے (جو آخرت میں واقع ہوگی یہ تو یقینی اور احتمال سزائے دنیا کا الگ، مطلب یہ ہوا کہ اگر اعراض کرو گے تو سزا بھگتو گے) ہاں مگر وہ مشرکین (اس رفع امان و دست برداری سے) مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا پھر انہوں نے (عہد پورا کرنے میں) تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں (تمہارے) کسی (دشمن) کی مدد کی (مراد اس سے جماعت دوم ہے) سو ان کے معاہدہ کو ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کر دو (اور بدعہدی نہ کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم احتیاط رکھو گے تو تم بھی پسندیدۂ حق ہو جاؤ گے۔ آگے جماعت اول کے حکم کا تتمہ ہے کہ جب ان کو کوئی مہلت نہیں تو گو ان سے ابھی قتال کی گنجائش ہو سکتی تھی لیکن ابھی محرم کے ختم تک اشہر حرم مانع قتال ہیں) سو (ان کے گزرنے کا انتظار کر لو اور) جب اشہر حرم گزر جائیں تو (اس وقت) ان مشرکین (جماعت اول) کو جہاں پاؤ مارو اور پکڑو اور باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو (یعنی لڑائی میں جو جو ہوتا ہے سب کی اجازت ہے) پھر اگر (کفر سے) توبہ کر لیں اور (اسلام کے کام کرنے لگیں یعنی مثلاً) نماز پڑھنے لگیں، زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو (یعنی قتل و قید مت کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں (اس واسطے ایسے شخص کا کفر بخش دیا اور اس کی جان بچا لی اور یہی حکم بقیہ جماعت کا ہوگا ان کی میعادیں گزرنے کے بعد)۔

معارف ومسائل

سورۂ براءت شروع ہو رہی ہے جس کو سورۂ توبہ بھی کہا جاتا ہے۔ براءت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں کفار سے براءت کا ذکر ہے اور توبہ اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کی توبہ قبول ہونے کا بیان ہے (مظہری)۔ اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصاحف قرآن میں اس سورت کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی، اس کے سوا تمام قرآنی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید تیئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے ایک ہی سورت کی آیتیں مختلف اوقات میں نازل ہوئیں جبریل امین جب وحی لے کر آتے تو ساتھ ہی بحکم الٰہی یہ بھی بتلاتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت

میں فلاں آیت کے بعد رکھی جائے۔ اسی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبینِ وحی کو ہدایت فرما کر لکھوا دیتے تھے۔

اور جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تھی تو سورت شروع ہونے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم ہوگئی اب دوسری سورت شروع ہو رہی ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں ایسا ہی ہوا۔ سورۂ توبہ نزول کے اعتبار سے بالکل آخری سورتوں میں سے ہے۔ اس کے شروع میں عام دستور کے مطابق نہ بسم اللہ نازل ہوئی اور نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبِ وحی کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اسی حال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

جامع قرآن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کو کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہوگیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو۔ اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جزء ہو تو وہ کونسی سورت ہو سکتی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے سورۂ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی۔

اور حضرت عثمانؓ سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان دونوں سورتوں کو قرینتین یعنی ملی ہوئی کہا جاتا تھا۔ (مظہری) اس لئے سورۂ انفال کے بعد اس کو رکھ دیا گیا۔ یہ احتیاط تو اس لئے کی گئی کہ دوسری سورت کا جز ہو تو اُس کے ساتھ رہنا چاہئے مگر احتمال یہ بھی تھا کہ علیحدہ مستقل سورت ہو اس لئے لکھنے میں یہ صورت اختیار کی گئی کہ سورۂ انفال کے ختم پر سورۂ توبہ کے شروع سے پہلے کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جیسے عام سورتوں میں بسم اللہ کی جگہ ہوتی ہے۔

سورہ برأت یا توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی یہ تحقیق خود جامع قرآن حضرت عثمانؓ سے ابوداؤد، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی میں مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک سوال کے جواب میں منقول ہے۔ اس سوال میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ قرآن کی سورتوں کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بڑی سورتیں رکھی گئیں جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہوں جن کو اصطلاح میں مئین کہا جاتا ہے اُس کے بعد وہ بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں سو سے کم آیت ہیں جن کو مثانی کہا جاتا ہے۔ اُس کے بعد چھوٹی سورتیں رکھی گئی ہیں جن کو مفصلات کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سورۂ توبہ کو سورۂ انفال سے پہلے رکھا جائے کیونکہ سورۂ توبہ کی آیتیں سو سے زائد اور

انفال کی سورت کم ہیں۔ شروع کی سات طویل سورتیں جن کو سبع طوال کہا جاتا ہے اُس میں بھی بجائے انفال کے سورۂ توبہ ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن قرآن کے معاملہ میں احتیاط کا مقتضیٰ وہی ہے جو اختیار کیا گیا۔ کیونکہ اگر سورۂ توبہ مستقل سورت نہ ہو بلکہ سورۂ انفال کا جزء ہو تو یہ ظاہر ہے کہ سورۂ انفال کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور توبہ کی اس کے بعد۔ اس لئے اُن کو انفال کی آیات پر مقدم کرنا بغیر وحی کے جائز نہیں اور وحی میں ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملی اس لئے انفال کو مقدم اور توبہ کو مؤخر کیا گیا۔

اس تحقیق سے یہ معلوم ہوگیا کہ سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا احتمال ہے کہ سورۂ توبہ علیحدہ سورت نہ ہو بلکہ انفال کا جزء ہو اس احتمال پر یہاں بسم اللہ لکھنا ایسا نادرست ہوگا جیسے کوئی شخص کسی سورت کے درمیان بسم اللہ لکھ دے۔

اسی بناء پر حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۂ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے۔ لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اُس کو چاہئے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر شروع کرے بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں یہ غلط ہے اور اُس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام سے نہیں ہے

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباسؓ یہ منقول ہے کہ سورۂ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ امان ہے اور سورۂ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کیا گیا ہے۔ سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں۔ یعنی اصلی سبب تو یہی ہے کہ سورۂ انفال اور توبہ کے ایک ہونے کے احتمال کی بناء پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی پھر اس نہ لکھے جانے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سورت میں کفار سے براءت اور رفع امان مذکور ہے جو بسم اللہ کے مناسب نہیں اس لئے تکوینی طور پر یہاں ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ بسم اللہ یہاں نہ لکھی جائے۔

سورۂ توبہ کی آیات مذکورہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے چند واقعات کا جاننا ضروری ہے جن کے سبب سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس لئے پہلے ان واقعات کی مختصر تفصیل لکھی جاتی ہے۔

(۱) پوری سورۂ توبہ میں چند غزوات اور اُن سے متعلقہ واقعات کا اور اُن کے ضمن میں بہت سے احکام و مسائل کا بیان ہوا ہے۔ مثلاً تمام قبائل عرب سے معاہدات کا ختم کردینا،

فتح مکہ۔ غزوۂ حنین۔ غزوۂ تبوک۔ ان واقعات میں فتح مکہ سب سے پہلے ۸ سنہ ہجری میں پھر غزوۂ حنین اسی سال میں پھر غزوۂ تبوک رجب ۹ سنہ ہجری میں پھر تمام قبائل عرب سے معاہدت ختم کرنے کا اعلان ذی الحجہ ۹ سنہ ہجری میں ہوا۔

(۲) نبذ عہد یعنی معاہدات ختم کر دینے کے متعلق جو مضامین ان آیات میں مذکور ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶ سنہ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا قصد فرمایا اور قریش مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ در مقام حدیبیہ میں ان سے صلح ہوئی۔ اس صلح کی میعاد روح المعانی کی نقل کے مطابق دس سال کی تھی۔ مکہ میں علاوہ قریش کے دوسرے قبائل بھی تھے معاہدۂ صلح کی ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں جس کا جی چاہے وہ قریش کا حلیف اور ساتھی بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہو کر آپ کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف بننا پسند کیا اور آپ کے ساتھ ہو گئے اور قبیلہ بنی بکر نے قریش کے ساتھ ہونا اختیار کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ لازمی تھا کہ دس سال کے اندر نہ باہمی جنگ ہو گی نہ کسی جنگ کرنے والے کو کسی جانب سے کوئی مدد دی جائے گی اور جو قبیلہ کسی فریق کا حلیف ہے وہ بھی اُسی کے حکم میں سمجھا جائے گا کہ اُس پر حملہ کرنا یا حملہ آور کو مدد دینا معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

یہ معاہدہ ۶ سنہ ہجری میں ہوا ۷ سنہ ہجری میں معاہدہ کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے فوت شدہ عمرہ کی قضا کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تین روز قیام کر کے حسب معاہدہ واپس تشریف لے آئے۔ اس وقت تک کسی فریق کی طرف سے معاہدۂ صلح کی کوئی خلاف ورزی نہ تھی۔

اس کے بعد پانچ چھ ماہ گزرے تھے کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر رات کے وقت چھاپہ مارا اور قریش نے بھی یہ سمجھ کر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت دور ہیں اور رات کا وقت ہے آپ تک واقعہ کی تفصیلات پہنچنا مشکل ہے اس حملہ میں بنی بکر کو ہتھیاروں اور اپنے جوانوں سے امداد دی۔

ان واقعات اور حالات کے مطابق جن کو بالآخر قریش نے بھی تسلیم کر لیا وہ معاہدۂ صلح ٹوٹ گیا جو حدیبیہ میں دس سال کے التواء جنگ کا ہوا تھا۔

قبیلہ خزاعہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے انھوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ کو دے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی عہد شکنی کی خبر پا کر قریش کے خلاف

جنگ کی خفیہ تیاری شروع کردی۔

قریش کو بدر و احد اور احزاب کے معرکوں میں مسلمانوں کی غیبی اور ربانی طاقت کا اندازہ ہو کر اپنی قوت و طاقت کا نشہ اتر چکا تھا اس وقت عہد شکنی کرنے کے بعد مسلمانوں کی طرف سے جنگ کا خطرہ تو بیدا ہو ہی چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچنے کے بعد مکمل خاموشی سے یہ خطرہ اور زیادہ قوی ہو گیا۔ مجبور ہو کر ابوسفیان کو مدینہ بھیجا کہ وہ خود جا کر حالات کا اندازہ لگائیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جنگ کی تحریک کا اندازہ ہو تو پچھلے واقعہ پر عذر و معذرت کر کے آئندہ کے لئے تجدید معاہدہ کریں۔

ابوسفیان کو مدینہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی طیاریوں کا کچھ علم ہوا تو پریشان ہو کر اکابر صحابہ میں سے ایک ایک کے پاس گئے کہ وہ سفارش کر کے معاہدہ کی تجدید کرا دیں مگر سب نے ان کے سابقہ اور لاحقہ تلخ معاملات کے سبب انکار کر دیا۔ اور ابوسفیان ناکام واپس آئے۔ قریش مکہ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔

ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب روایت بدایۃ و ابن کثیر ۱۰ رمضان ۸ھ کو مدینہ طیبہ سے صحابہ کرام کی بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ پر حملہ کرنے کے قصد سے کوچ فرمایا۔ اور بالآخر مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

فتح مکہ کے وقت مغلوب دشمنوں کے ساتھ بے نظیر کریمانہ سلوک

فتح کے وقت بہت سے رؤسا قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کر سکتے تھے اب اُن کو موقع مل گیا وہ مشرف باسلام ہو گئے۔ اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے رہے اُن کو بھی بجز معدودے چند افراد کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جان و مال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا وہ ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصور بھی نہیں ہو سکتا اُن کی تمام گزشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظر انداز فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اُس وقت کہی تھی جب کہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچے تھے۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ یعنی تمہارے ظلم و جور کا انتقام لینا یا کوئی سزا دینا تو کیا ہم تم کو ملامت کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

فتح مکہ کے وقت مشرکین کی چار قسمیں اور اُن کے احکام

بہر حال اس وقت مکہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا مکہ اور اطراف مکہ میں رہنے والے غیر مسلموں کو جان و مال کا امان دے دیا گیا۔ لیکن اس وقت ان غیر مسلموں کے مختلف حالات تھے۔ ایک قسم تو وہ لوگ تھے جن سے حدیبیہ میں صلح کا

معاہدہ ہوا اور انھوں نے خود اس کو توڑ دیا اور وہی فتح مکہ کا سبب ہوا۔ دوسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ کسی خاص میعاد کے لئے کیا گیا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہے جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمرہ اور بنی مدلج جن سے ایک مدت کے لئے صلح ہوئی تھی اور سورۂ برارت نازل ہونے کے وقت بقول خازن ان کی میعاد صلح کے نو مہینے باقی تھے۔

تیسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے معاہدہ صلح بغیر تعیینِ مدت کے ہوا تھا۔ چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

فتح مکہ سے پہلے جتنے مشرکین یا اہل کتاب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدات کئے اُن سب کا یہ تلخ تجربہ مسلسل ہوتا رہا کہ انھوں نے خفیہ اور علانیہ عہد شکنی کی اور دشمنوں سے سازش کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی مقدور بھر پوری کوششیں کیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مسلسل تجربہ اور اشارات الٰہیہ کے ماتحت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاہدۂ صلح نہ کیا جائے گا۔ اور جزیرۃ العرب کو ایک اسلامی قلعہ کی حیثیت سے صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مکہ اور جزیرۃ العرب پر اقتدار حاصل ہوتے ہی اعلان کر دیا جاتا کہ غیر مسلم یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے اصول عدل و انصاف اور رحیمانہ سلوک اور رحمۃ للعالمین کی رحمت عامہ کے ماتحت بلا مہلت کے ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ اسی لئے سورۂ برارت کے شروع میں ان چاروں قسم کی غیر مسلم جماعتوں کے جداجدا احکام نازل ہوئے۔

پہلی جماعت جو قریش مکہ کی تھی جنھوں نے میثاق حدیبیہ کو خود توڑ دیا تھا اب یہ کسی مزید مہلت کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ یہ زمانہ اَشْہُرِ حُرُم کا زمانہ تھا جن میں جنگ و قتال منجانب اللہ ممنوع تھا اس لئے اُن کے متعلق تو وہ حکم آیا جو سورۂ توبہ کی پانچویں آیت میں مذکور ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ الآیۃ جس کا حاصل یہ تھا کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کر کے اپنا کوئی حق باقی نہیں چھوڑا مگر اَشْہُرِ حُرُم کا احترام بہرحال ضروری ہے اس لئے اشہر حرم ختم ہوتے ہی یا وہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا **مسلمان ہو جائیں ورنہ اُن سے جنگ کی جائے۔**

اور دوسری جماعت جن سے کسی خاص میعاد کے لئے معاہدۂ صلح کیا گیا اور وہ اس پر قائم رہے ان کا حکم سورۂ توبہ کی چوتھی آیت میں یہ آیا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ یعنی وہ مشرک لوگ جن سے تم نے معاہدۂ صلح کر لیا پھر انھوں نے

معاہدہ پر قائم رہنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں تمہارے کسی دشمن کی مدد کی، تو تم ان کے معاہدہ کو اُس کی مدت تک پورا کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ حکم بنوضمرہ اور بنومدلج کا تھا جس کی رو سے اُن کو نو مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور تیسری اور چوتھی دونوں جماعتوں کا ایک ہی حکم ہے جو سورہ توبہ کی پہلی اور دوسری آیت میں مذکور ہے بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ○ یعنی اعلان دست برداری ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اُس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکین کے لئے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔ سو تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو۔ اور یہ جان رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے۔

غرض پہلی دوسری آیتوں کی رو سے اُن سب لوگوں کو جن سے بلا تعیینِ مدت کوئی معاہدہ تھا یا جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا چار مہینے کی مہلت مل گئی۔

اور چوتھی آیت کی رو سے اُن لوگوں کو تا اختتامِ معاہدہ مہلت مل گئی جن کے ساتھ کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور پانچویں آیت سے مشرکینِ مکہ کو اشہرِ حرم ختم ہونے تک مہلت مل گئی۔

کفار سے معاہدات ختم ہو جانے پر بھی ان احکام کا نفاذ اور مہلت کا شروع اُس وقت سے تجویز ہوا جبکہ اُن کو مہلت دینے کا کریمانہ سلوک ان احکام کا اعلان تمام عرب میں ہو جائے۔ اس اعلانِ عام کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ ۹ھ ہجری کے ایامِ حج میں منیٰ و عرفات کے عام اجتماعات میں اُس کا اعلان کیا جائے جس کا ذکر سورہ توبہ کی تیسری آیت میں اس طرح آیا ہے وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ یعنی اعلانِ عام ہے عام لوگوں کے سامنے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں اس بات کا کہ اللہ اور اُس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے، پھر اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر تم نے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

کفار سے معاہدہ ختم کیا جائے تو اعلانِ عام اور سب کو ہوشیار کر دینے بغیر اُن کے خلاف کوئی عمل درست نہیں چنانچہ اس حکمِ ربانی کی تعمیل کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ ہجری کے حج میں حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ بھیج کر میدانِ عرفات اور منیٰ میں جہاں

تمام قبائل عرب کا اجتماع تھا یہ اعلان کرا دیا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ اس عظیم الشان مجمع کی معرفت پورے عرب میں اس حکم کا مشتہر ہو جانا لازمی تھا۔ پھر احتیاطاً حضرت علیؓ کی معرفت یمن میں بالتخصیص اس کا اعلان کرا دیا۔

اس اعلانِ عام کے بعد صورت حال یہ ہوگئی کہ پہلی جماعت یعنی مشرکین مکہ کو اشہر حرم کے خاتمہ یعنی محرم سنہ ۱۰ ہجری کے ختم تک اور دوسری جماعت کو رمضان سنہ ۹ ہجری تک اور تیسری چوتھی جماعتوں کو ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۰ ہجری تک حدود سے خارج ہو جانا چاہیے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے وہ مستحق قتال ہے۔ اس طرح اگلے سال کے زمانۂ حج تک کوئی کافر داخل حدود نہ رہنے پائے گا۔ جس کا ذکر سورۂ توبہ کی اٹھائیسویں آیت میں آئے گا جس میں ارشاد ہے فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ یعنی یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جا سکیں گے۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لایحجن بعد العام مشرک کا یہی مطلب ہے سورۂ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں کی تفسیر واقعات کی روشنی میں سامنے آچکی۔

مذکورہ پانچ آیات سے متعلق چند مسائل اور فوائد

اول یہ کہ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ اور دوسرے دشمن قبائل کے ساتھ جو معاملہ عفو و درگزر اور رحم و کرم کا فرمایا اس نے عملی طور پر مسلمانوں کو یہ اخلاقی درس دیا کہ جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے قابو میں آجائے اور تمہارے سامنے عاجز ہو جائے تو اُس سے گزشتہ عداوتوں اور ایذاؤں کا انتقام نہ لو بلکہ عفو و کرم سے کام لے کر اسلامی اخلاق کا ثبوت دو۔ گرچہ ایسا کرنا اپنے طبعی جذبات کو کچلنا ہے لیکن اس میں چند عظیم فائدے ہیں اول خود اپنے لئے کہ انتقام لے کر یا غصہ اتار لینے سے وقتی طور پر گرچہ نفس کو کچھ راحت محسوس ہو لیکن یہ راحت فنا ہونے والی ہے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے درجات عالیہ جو اس کو ملنے والے ہیں وہ اس سے ہر حیثیت میں زیادہ بھی ہیں اور دائمی بھی، اور عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ دائمی کو فانی پر ترجیح دے۔

دوسرے یہ کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اپنے غصہ کے جذبات کو دبا دینا اس کا ثبوت ہے کہ ان کی لڑائی اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لئے تھی اور یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جو اسلامی جہاد اور عام بادشاہوں کی جنگ میں امتیاز اور جہاد و فساد میں فرق کرنے والا ہے کہ جو لڑائی اللہ کے لئے اور اُس کے احکام جاری کرنے کے لئے ہو وہ جہاد ہے ورنہ فساد۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ دشمن جب مقہور و مغلوب ہونے کے بعد ان اخلاق فاضلہ کا مشاہدہ کرے گا تو شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت پیدا ہوگی جو اُس کے لئے

کلیدِ کامیابی ہے اور یہی جہاد کا اصل مقصد ہے۔

کفار سے عفو و درگزر کے یہ معنی نہیں کہ (۲) دوسرا مسئلہ جو آیت مذکورہ سے سمجھا گیا یہ ہے کہ عفو
اُن کے ضرر سے بچنے کا اہتمام بھی نہ کیا جائے و کرم کے یہ معنی نہیں کہ دشمنوں کے شر سے اپنی حفاظت
نہ کرے اور اُن کو ایسا آزاد چھوڑ دے کہ وہ پھر ان کو نقصان اور ایذاء پہنچاتے رہیں۔ بلکہ عفو
و کرم کے ساتھ تقاضائے عقل یہ ہے کہ پچھلے تجربوں سے آئندہ زندگی کے لئے سبق حاصل کرے
اور اُن تمام رخنوں کو بند کرے جہاں سے یہ خود دشمنوں کی زد میں آسکے۔ اسی لئے آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ ارشاد ہے لایُلدغ المرء من جحر واحد مرتین۔ یعنی عقلمند آدمی
ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جس سوراخ سے ایک مرتبہ کسی زہریلے جانور نے اس
کو کاٹا ہے اُس میں دوبارہ ہاتھ نہیں دیتا۔

سنہ ۹ ہجری کے قرآنی اعلان برأت اور مشرکین کو مہلت و اطمینان کے ساتھ حدود حرم
خالی کر دینے کی ہدایات اسی حکمتِ عملی کا ثبوت ہیں۔

(۳) تیسرا فائدہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات سے یہ معلوم ہوا کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ
سے نکل جانے کا حکم یا ان پر یکبارگی حملہ بزدلی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔ جب ایسا کرنا ہو تو
پہلے سے اعلانِ عام کر دیا جائے اور ان کو اس کی پوری مہلت دی جائے کہ وہ اگر ہمارے قانون
کو تسلیم نہیں کرتے تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں بسہولت جا سکیں۔ جیسا کہ مذکورہ آیتوں میں
سنہ ۹ ہجری کے اعلانِ عام اور اُس کے بعد تمام جماعتوں کو مہلت دینے کے احکام سے
واضح ہوا۔

(۴) چوتھا مسئلہ آیتِ مذکورہ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ صلح کر لینے کے بعد
اگر میعاد سے پہلے اُس معاہدہ کو ختم کر دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اگرچہ چند شرائط کے ساتھ
اس کی اجازت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کو اس کی میعاد تک پورا کر دیا جائے جیسا کہ سورۂ توبہ
کی چوتھی آیت میں بنو ضمرہ اور بنو مدلج کا معاہدہ نو مہینہ تک پورا کرنے کا حکم آیا ہے۔

(۵) پانچواں مسئلہ ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کے ساتھ ہر معاملہ میں اس کا خیال
رہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی دشمنی اُن کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے کافرانہ عقائد و خیالات کے
ساتھ ہے جو خود انہیں کے لئے دنیا و آخرت کی بربادی کے اسباب ہیں۔ اور مسلمانوں کی اُن سے
مخالفت بھی درحقیقت اُن کی ہمدردی اور خیرخواہی پر مبنی ہے۔ اسی لئے جنگ و صلح کے ہر مقام
پر اُن کو نصیحت و خیرخواہانہ فہمائش کسی وقت نہ چھوڑنا چاہیئے۔ جیسا کہ ان آیتوں میں جا بجا
اس کا ذکر ہے کہ اگر تم اپنے خیالات سے تائب ہو گئے تو یہ تمہارے لئے فلاحِ دنیا و آخرت ہے

اور اُس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اگر تائب نہ ہوئے تو صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں قتل و غارت کئے جاؤ گے جس کو بہت سے کافر اپنا قومی کارنامہ سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھ رکھو کہ مرنے کے بعد بھی عذاب سے نجات نہ پاؤ گے۔ مذکورہ آیتوں میں اعلانِ برأت کے ساتھ ہمدردانہ فہمائش کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

(۶) چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ چوتھی آیت میں جہاں مسلمانوں کو میعادِ صلح کے ختم ہونے تک عہد کو پورا کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ آیت کو اس جملہ پر ختم کیا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ معاہدہ پورا کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیں۔ عام قوموں کی طرح اُس میں حیلے اور تاویلیں نکال کر خلاف ورزی کی راہ نہ ڈھونڈیں۔

(۷) ساتواں مسئلہ پانچویں آیت کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ جب صحیح مقصد کے لئے کسی قوم سے جنگ چھڑ جائے تو پھر اُن کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی قوت پورے طور پر استعمال کرنا چاہئے اُس وقت رحم دلی یا نرمی درحقیقت رحم دلی نہیں بلکہ بزدلی ہوتی ہے۔

(۸) آٹھواں مسئلہ مذکورہ پانچویں آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کسی غیر مسلم کے مسلمان ہو جانے پر اعتماد تین چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک توبہ دوسرے اقامتِ صلوٰۃ تیسرے ادائے زکوٰۃ، جب تک اس پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھ لینے سے اُن کے ساتھ جنگ بند نہ کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اُن کے مقابلہ پر صدیق اکبرؓ نے جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر تمام صحابہ کو مطمئن کر دیا تھا۔

(۹) نواں مسئلہ ان آیات میں یہ ہے کہ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے کیا مراد ہے۔ اس میں حضراتِ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، فاروق اعظمؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ نے فرمایا کہ یوم الحج الاکبر سے مراد یوم عرفہ ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الحج عرفۃ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یوم نحر یعنی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے۔ حضرت سفیان ثوری اور بعض دوسرے ائمہ نے ان سب اقوال کو جمع کرنے کے لئے فرمایا کہ حج کے پانچوں دن یوم حج اکبر کا مصداق ہیں جن میں عرفہ اور یوم نحر دونوں داخل ہیں اور لفظ یوم مفرد لانا اس محاورہ کے مطابق ہے جیسے غزوہ بدر کے چند ایام کو قرآن کریم میں یَوْمَ الْفُرْقَانِ کے مفرد نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور عرب کی عام جنگوں کو لفظ یوم ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے گرچہ اُن میں کتنے ہی ایام صرف ہوئے ہوں جیسے یوم بعاث، یوم احد وغیرہ۔

اور چونکہ عمرہ کو حج اصغر یعنی چھوٹا حج کہا جاتا ہے اس سے ممتاز کرنے کے لئے حج کو حج اکبر کہا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی اصطلاح میں ہر سال کا حج حج اکبر ہی ہے۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ جس سال عرفہ بروز جمعہ واقع ہو صرف وہی حج اکبر ہے اس کی اصلیت اس کے سوا نہیں ہے کہ اتفاق سے جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع ہوا ہے اس میں عرفہ بروز جمعہ ہوا تھا، یہ اپنی جگہ ایک فضیلت ضرور ہے مگر آیت مذکورہ کے مفہوم سے اس کا تعلق نہیں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ ایام حج کو حج اکبر فرمانے سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ ایام حج میں عمرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان ایام کو قرآن کریم نے حج اکبر کے لئے مخصوص فرما دیا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ سن لے

كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

کلام اللہ کا پھر پہنچا دے اس کو اس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا

کیونکر ہووے مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک مگر

الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ

جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں

فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ

تم ان سے سیدھے رہو، بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے۔ کیونکر رہے صلح اور اگر

يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ

وہ تم پر قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا، تم کو راضی کر دیتے ہیں

بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِشْتَرَوْا

اپنے منہ کی بات سے اور ان کے دل نہیں مانتے اور اکثر ان میں بدعہد ہیں۔ بیچ ڈالے انہوں نے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَـمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا

اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر پھر روکا اس کے رستے سے، برے کام ہیں جو وہ

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

لوگ کر رہے ہیں۔ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا، اور وہی

هُمُ الْمُعْتَدُونَ ۝ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ

ہیں زیادتی پر۔ سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ

فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝١١

تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں، اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے لوگوں کے واسطے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے (زمانۂ اباحت قتل میں بعد ختم میعاد امن کے توحید و اسلام کے فوائد و برکات سن کر اس طرف راغب ہو اور حقیقت و حقیت اسلام کی تلاش کی غرض سے آپ کے پاس آکر) آپ سے پناہ کا طالب ہو (تاکہ اطمینان سے سن سکے اور سمجھ سکے) تو (ایسی حالت میں) آپ اس کو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی (مراد مطلق دلائل دین حق کے ہیں) سن لے پھر (اس کے بعد) اس کو اس کی امن کی جگہ میں پہنچا دیجئے (یعنی پہنچنے دیجئے تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کرلے) یہ حکم (اتنی پناہ دینے کا) اس سبب سے دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے (اس لئے قدرے مہلت دینا ضروری ہے۔ جماعت اولیٰ نے جو نقض عہد کیا تھا ان کے نقض عہد سے پہلے بطور پیشین گوئی کے فرماتے ہیں کہ) ان مشرکین (قریش) کا عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے (قابل رعایت) رہے گا (کیونکہ رعایت تو اس عہد کی ہوتی ہے جس کو دوسرا شخص خود نہ توڑے ورنہ رعایت نہیں باقی رہتی۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ عہد کو توڑ دیں گے اس وقت اس طرف سے بھی رعایت نہ ہوگی) مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام (یعنی حرم) کے نزدیک عہد لیا ہے (مراد دوسری جماعت ہے جن کا استثناء اوپر بھی إِلَّا الَّذِينَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ الخ میں آچکا ہے یعنی ان سے امید ہے کہ یہ عہد کو قائم رکھیں گے) سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں (یعنی عہد نہ توڑیں) تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو (اور مدت عہد کی ان سے پوری کردو چنانچہ زمانہ نزول برأت میں اس مدت میں نو ماہ باقی تھے اور بوجہ ان کی عہد شکنی نہ کرنے کے ان کی یہ مدت پوری کی گئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم بھی احتیاط رکھنے سے پسندیدہ حق ہو جاؤ گے۔ یہ استثناء کرکے پھر عود ہے مضمون متعلق جماعت اولیٰ کی طرف کہ) کیسے (ان کا عہد قابل رعایت رہے گا یعنی وہ لوگ عہد پر کب قائم رہیں گے) حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ

تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا، کیونکہ ان کی یہ صلح مجبوری اور خوف جہاد سے ہے دل سے نہیں ہیں) یہ لوگ تم کو (صرف) اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے (پس جب دل سے اس عہد کے پورا کرنے کا عزم نہیں ہے تو کیا پورا ہوگا) اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں (کہ عہد پورا کرنا نہیں چاہتے ورنہ اگر ایک آدھ پورا کرنا بھی چاہتا ہو تو زیادہ کے سامنے ایک دو کی کب چلتی ہے اور وجہ ان کے شریر ہونے کی یہ ہے کہ) انہوں نے احکام الٰہیہ کے عوض (دنیا کی) متاع ناپائدار کو اختیار کر رکھا ہے (جیسا کہ کفار کی حالت ہوتی ہے کہ دین کو چھوڑ کر دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جب دنیا زیادہ محبوب ہوگی تو جب عہد شکنی میں دنیوی غرض حاصل ہوتی نظر آئے گی اس میں کچھ باک نہ ہوگا بخلاف اس شخص کے جو دین کو ترجیح دیتا ہے وہ احکام الٰہیہ اور وفائے عہد وغیرہ کا پابند ہوگا) سو (اس ترجیحِ دُنیا عَلَی الدین کی وجہ سے) یہ لوگ اللہ کے (سیدھے) رستہ سے (جس میں وفائے عہد بھی داخل ہے) ہٹے ہوئے ہیں (اور) یقیناً یہ ان کا عمل بہت ہی برا ہے (اور ہم نے جو اوپر کہا ہے لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ الخ سو اس میں تمہاری کچھ تخصیص نہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ) یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں (بھی) نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا اور یہ لوگ (خصوص اس باب میں) بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں سو (جب ان کے عہد پر اعتماد و اطمینان نہیں بلکہ احتمال عہد شکنی کا بھی ہے جیسا کہ اس کی جانب مخالف کا بھی احتمال ہے اس لئے ہم ان کے بارے میں خاص حکم سناتے ہیں کہ) اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کرلیں (یعنی مسلمان ہوجائیں) اور (اسلام کو ظاہر بھی کردیں مثلاً) نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو (پھر ان کی عہد شکنی وغیرہ پر اصلاً نظر نہ ہوگی خواہ انہوں نے کچھ ہی کیا ہو، اسلام لانے سے) وہ تمہارے دینی بھائی ہوجائیں گے (اور جو کچھ کیا ہوا سب معاف ہوجائے گا) اور ہم سمجھدار لوگوں (کو بتلانے) کے لئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں (چنانچہ اس مقام پر بھی ایسا ہی کیا گیا)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس کا ذکر تھا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ اور اس کے اطراف کے تمام مشرکین و کفار کو جان و مال کا عام امان دے دیا گیا مگر ان کی سابقہ غداری اور عہد شکنی کے تجربہ کی بنا پر آئندہ کے لئے ان سے کوئی معاہدہ نہ کیا جانا طے ہوگیا۔ اس قرارداد کے باوجود جن لوگوں سے کوئی معاہدہ اس سے پہلے ہو چکا تھا اور انھوں نے عہد شکنی نہیں کی تو ان کا

معاہدہ ختم میعاد تک پورا کرنے کے احکام ان آیات میں نازل ہوئے۔ اور جن سے کوئی معاہدہ نہیں تھا یا کسی معین میعاد کا معاہدہ نہیں تھا اُن کے ساتھ بھی یہ رعایت کی گئی کہ اُن کو فوری طور پر مکہ چھوڑ دینے کے حکم کے بجائے چار مہینہ کی وسیع مہلت دے دی گئی کہ اس عرصہ میں وہ مکہ چھوڑ کر جہاں مناسب سمجھیں سہولت و اطمینان کے ساتھ چلے جائیں۔ یا اگر اسلام کی حقانیت اُن پر روشن ہو چکی ہے تو مسلمان ہو جائیں۔ ان احکام کا نتیجہ یہ تھا کہ سال آئندہ تک مکہ مکرمہ سہولت کے ساتھ ان سب غدار مشرکین سے خالی ہو جائے۔ اور چونکہ یہ خالی کرنا بھی کسی انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ مسلسل تجربوں کے بعد اپنی حفاظت کے پیش نظر عمل میں لایا گیا تھا اس لئے ان کی اصلاح و خیر خواہی کا دروازہ اب بھی کھلا رکھا گیا۔ جس کا ذکر چھٹی آیت میں ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو آپ کو پناہ دینی چاہئے تاکہ وہ آپ کے قریب آکر اللہ کا کلام سن سکے اور اسلام کی حقانیت کو سمجھ سکے۔ اور صرف یہی نہیں کہ وقتی طور پر اُس کو پناہ دے دی جائے بلکہ جب وہ اپنے اس کام سے فارغ ہو جائے تو اپنی حفاظت اور نگرانی میں اُس کو اُس مقام تک پہنچانا بھی مسلمانوں کے ذمہ ہے جہاں یہ اپنے آپ کو محفوظ و مطمئن سمجھتا ہے۔ آخر آیت میں فرمایا کہ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ پوری خبر نہیں رکھتے قریب آکر باخبر ہو سکتے ہیں۔

اس آیت سے بھی چند مسائل اور فوائد حاصل ہوئے جن کو امام ابوبکر جصاص نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حقانیت اسلام کو دلائل کے ساتھ سمجھانا علماء دین کا فرض ہے

اول یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمانوں سے اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کی حقانیت دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اُس کو اجازت دیں اور اُس کی حفاظت کریں۔ اُس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ اُس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور حاکم مسلمین کی صوابدید پر موقوف ہے مناسب سمجھے تو اجازت دے ورنہ اختیار ہے۔

غیر مسلم جو دارالاسلام کے باشندے نہ ہوں اُن کو ضرورت سے زائد دارالاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے

تیسرے یہ کہ غیر مسلم حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہ ہو اُس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی

اجازت نہ دی جائے کیونکہ آیت مذکورہ میں پناہ دینے اور ٹھہرانے کی یہ حد مقرر کر دی گئی ہے حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ یعنی اُس کو پناہ دیجئے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے۔

چوتھے یہ کہ مسلمان حکمرانوں کے فرائض میں سے ہے کہ جب کوئی حربی غیر مسلم کسی ضرورت کی بنا پر ہم سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اُس کے حالات پر نظر رکھے اور جب وہ اپنا کام پورا کر چکے اُس کو حفاظت کے ساتھ واپس کر دے۔

ساتویں آٹھویں نویں دسویں چار آیتوں میں اُس اعلانِ براءت کی حکمت کا بیان ہے جو سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس آیت میں عہد شکنی کرنے والے مشرکین کی طبعی خست اور مسلمانوں سے بغض و عناد کی شدت کا ذکر کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ ان سے وفاءِ عہد کی امید رکھنا ہی غلط ہے۔ ارشاد فرمایا کہ بجز چند لوگوں کے جن سے مسجد حرام کے پاس تمہارا معاہدہ ہوا تھا ان مشرکین کا کوئی عہد اللہ اور اُس کے رسول کے نزدیک قابل رعایت کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اُن کا یہ حال ہے کہ اگر اُن کو کسی وقت بھی ذرا موقع مل جائے تو وہ تمہارے بارہ میں نہ کسی قرابت داری کی رعایت کریں نہ عہد و پیمان کی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ معاہدہ کرنے کے وقت بھی دل میں اس کے پورا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ صرف الفاظ سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں اور اُن میں سے اکثر لوگ فاسق یعنی عہد شکن غدار ہیں۔

کفار کے مقابلہ میں بھی سچائی پر قائم رہنے اور اُن کے متعلق مبالغہ آمیزی سے پرہیز کرنے کی تعلیم

قرآن کریم کے اس بیان نے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ اپنے دشمن مخالفین کے معاملہ میں بھی جب کوئی گفتگو آئے تو سچائی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لیں جیسا کہ ان آیات میں مشرکین مکہ کے بارہ میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے کہ اگرچہ معدودے چند لوگوں کے سوا سبھی نے غدر و عہد شکنی کی تھی اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو بُرا کہا کرتے ہیں مگر قرآن کریم نے اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر اُن لوگوں کا استثناء کر دیا جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی اور یہ حکم دیا کہ جب تک وہ استقامت اور وفاء عہد پر قائم رہیں تم بھی عہد پر قائم رہو، دوسرے لوگوں کی خیانت سے متاثر ہو کر ان کے عہد کو نہ توڑو۔

اس کے بعد عہد شکنی کرنے والوں کا جہاں یہ حال بیان فرمایا کہ ان لوگوں کے دلوں میں شروع ہی سے خیانت تھی وفائے عہد کا ارادہ ہی نہ تھا یہاں بھی اَکْثَرُھُمْ فٰسِقُوْنَ فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان میں بھی سب کا یہ حال نہیں بعض شریف لوگ ایسے بھی ہیں جو عہد پر قائم رہنا چاہتے تھے مگر دوسروں کے سامنے اُن کی بات نہ چلی۔

یہ وہی مضمون ہے جس کی ہدایت قرآن کریم نے دوسری جگہ صاف لفظوں میں اس طرح دی ہے لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ یعنی کسی قوم کی عداوت تمھیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔

اس کے بعد نویں آیت میں ان غدار مشرکین کی غداری کی علت اور ان کے مرض کا سبب بیان فرما کر ان کو بھی ایک ہدایت نامہ دے دیا کہ اگر یہ غور کریں تو اپنی اصلاح کرلیں اور عام مسلمانوں کو بھی متنبہ کردیا کہ جس سبب سے یہ لوگ غدر و خیانت میں مبتلا ہوئے اُس سبب سے پورے طور پر پرہیز کو اپنا شعار رہنا ہیں۔ اور وہ سبب ہے حبِّ دنیا کہ دنیا کے مال و متاع کی محبت نے ان کو اندھا کردیا ہے تھوڑے سے پیسوں کے بدلہ میں اللہ کی آیات اور اپنے ایمان کو بیچ ڈالتے ہیں۔ اور ان کا یہ کردار نہایت بُرا ہے۔

دسویں آیت میں انھیں لوگوں کی انتہائی کجروی کا یہ بیان ہے لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے عہد کرنے والے مسلمانوں سے غداری کی اور اُن کی قرابت اور عہد و پیمان کو پیچھے ڈال دیا بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ یہ قرابت کی رعایت کرنے والے ہیں نہ کسی عہد و پیمان کی۔

مشرکین کے مذکورہ حالات کا طبعی تقاضا یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمان ان سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہوجائیں۔ اور کسی حالت میں بھی ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اسی لئے قرآنی عدل و انصاف نے گیارھویں آیت میں یہ ہدایت دے دی۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ یعنی اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اب یہ بھی تمھارے دینی بھائی ہیں۔

اس میں بتلا دیا کہ کوئی کیسا ہی دشمن ہو اور کتنی ہی ایذاء اُس نے پہنچائی ہو جب وہ مسلمان ہوگیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ اُس کے سب پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ پچھلے سب معاملات کو دل سے بھلا دیں اور آج سے اُن کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ تعلق کے حقوق ادا کریں۔

اسلامی برادری میں داخل ہونے کی تین شرطیں اس آیت نے واضح کردیا کہ اسلامی برادری میں داخل ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں اول کفر و شرک سے توبہ دوسرے نماز تیسرے زکوٰۃ۔ کیونکہ ایمان و توبہ تو ایک امر مخفی ہے جس کی حقیقت کا عام مسلمانوں کو علم نہیں ہوسکتا اس لئے اس کی دو ظاہری علامتوں کو بیان کردیا گیا، یعنی نماز و زکوٰۃ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت نے اہل قبلہ مسلمانوں کے خون کو حرام

کردیں، یعنی جو لوگ نماز زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اسلام کے خلاف کوئی قول و فعل ان کا ثابت نہ ہو وہ تمام احکام میں مسلمان سمجھے جائیں گے، اگرچہ ان کے دل میں صحیح ایمان نہ ہو بلکہ نفاق ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زکوٰۃ سے انکار کرنیوالوں پر جہاد کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال فرما کر صحابہ کرامؓ کو مطمئن کیا تھا (ابن کثیر)

آخر آیت میں معاہدین و ناقضین سے متعلقہ احکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید کرنے کیلئے ارشاد فرمایا وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ، یعنی ہم سمجھدار لوگوں کے لئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ

اور اگر وہ توڑ دیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگاویں تمہارے دین میں

فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ

تو لڑو کفر کے سرداروں سے بیشک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ

يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا

باز آویں کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں

بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ

کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے، کیا ان سے ڈرتے ہو

فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ

سو اللہ کا ڈر چاہئے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو، لڑو ان سے

يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ

تاکہ عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے اور

يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ

ٹھنڈے کرے دل مسلمان لوگوں کے، اور نکالے ان کے دل کی جلن،

وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ

اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، کیا

حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ

تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا

حالت پر چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے (ایسے موقع پر) جہاد کیا ہو اور اللہ و رسول اور مومنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو (جس کے ظاہر ہونے کا اچھا ذریعہ ایسے موقع کا جہاد ہے جہاں مقابلہ عزیزوں و اقارب سے ہو کہ پورا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کو چاہتا ہے اور کون برادری کو) اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمہارے سب کاموں کی (پس اگر جہاد میں چستی کرو گے یا سستی کرو گے اسی کے موافق تم کو جزا دے گا)۔

معارف و مسائل

قریش مکہ جن سے ۶ھ میں بمقام حدیبیہ ایک معاہدہ ترک جنگ کا ہو گیا تھا ان کے متعلق سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتوں میں بطور پیشگوئی کے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ یہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم نہ رہیں گے جس کا ذکر سورۂ توبہ کی ساتویں آیت میں کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ کے الفاظ میں گذر چکا ہے اور پھر آٹھویں نویں دسویں آیتوں میں ان کی عہد شکنی کے سبب کا بیان ہوا، گیارہویں آیت میں اس کا بیان آیا کہ عہد شکنی کے اس جرم عظیم کے بعد بھی اگر یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور اپنے اسلام کا اظہار نماز روزہ کے ذریعہ کرنے لگیں تو پھر مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے پچھلے جرائم کا کوئی اثر اپنے معاملات میں باقی نہ رکھیں، بلکہ ان کو اپنا دینی بھائی سمجھیں اور برادرانہ معاملات کریں، مذکورہ بارہویں آیت میں اس کا بیان ہے کہ پیشگوئی کے مطابق جب یہ لوگ عہد شکنی کر ڈالیں تو پھر ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس میں ارشاد فرمایا وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ، یعنی اگر یہ لوگ اپنے معاہدہ اور قسموں کو توڑ ڈالیں اور مسلمان بھی نہ ہوں بلکہ برابر تمہارے دین اسلام پر طعن و تشنیع کرتے رہیں تو کفر کے پیشواؤں کے ساتھ جنگ کرو۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مقتضائے مقام اس جگہ بظاہر یہ تھا کہ فَقَاتِلُوْهُمْ فرمایا جاتا یعنی ان لوگوں سے قتال کرو، قرآن کریم نے اس جگہ مختصر ضمیر استعمال کرنے کے بجائے فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ فرمایا، ائمہ، امام کی جمع ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنی عہد شکنی کی وجہ سے کفر کے امام اور قائد ہو کر اس کے مستحق ہوگئے کہ ان سے جنگ کی جائے، اس میں حکم قتال کی علت اور وجہ کا بھی بیان ہوگیا، اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں ائمۃ الکفر سے مراد قریش مکہ کے وہ سردار ہیں جو لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے اور جنگی تیاریوں میں لگے رہتے تھے، ان سے جنگ کرنے کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کہ اہل مکہ کی

اصل طاقت کا سرچشمہ یہی لوگ تھے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی قریبی رشتہ داری بھی انہی لوگوں سے تھی جس کی وجہ سے اس کا خطرہ ہو سکتا تھا کہ ان کے معاملہ میں کوئی رعایت برتی جائے (مظہری)

دار الاسلام میں غیر مسلم ذمیوں کو اسلام پر علمی تنقید کی تو اجازت ہے مگر طعن و تشنیع کی نہیں ہے

طَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ، کے لفظ سے بعض حضرات نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کے دین پر طعن و تشنیع کرنا عہد شکنی کرنے میں داخل ہے، جو شخص اسلام اور شریعت اسلام پر طعنہ زنی کرے وہ مسلمانوں کا معاہد نہیں رہ سکتا، مگر باتفاق فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت اور تحقیر کے طور پر اعلاناً کی جائے، احکام و مسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن و تشنیع کہتے بھی نہیں۔

اس لئے دار الاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جا سکتی ہے، مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر و توہین کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اسی آیت میں فرمایا اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ "یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی قسم کوئی قابل اعتبار قسم نہیں، کیونکہ یہ لوگ قسم توڑنے اور عہد شکنی کرنے کے عادی ہیں، اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنی قسم توڑ دی تو اب مسلمانوں پر بھی ان کی قسم اور عہد کی کوئی ذمہ داری نہیں رہی۔

آخر آیت میں ہے لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ، تاکہ وہ باز آجائیں، اس آخری جملہ میں بتلا دیا کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد عام دنیا کے لوگوں کی طرح دشمن کو ستانا اور جوش انتقام کو فرو کرنا یا عام بادشاہوں کی طرح ملک گیری نہ ہونا چاہئے، بلکہ ان کی جنگ کا مقصد دشمنوں کی خیر خواہی اور ہمدردی اور یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگ اپنی غلط روش سے باز آجائیں۔

اس کے بعد تیرہویں آیت میں مسلمانوں کو جہاد و قتال کی ترغیب کے لئے فرمایا کہ تم ایسی قوم کے ساتھ جنگ کے لئے کیوں تیار نہ ہوگے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے کا منصوبہ بنایا، مراد اس سے یہود مدینہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور کہا تھا لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ، یعنی ایسا ضرور ہوگا کہ عزت و قوت والے کمزور ذلیل کو مدینہ سے نکال دے گا، ان کے نزدیک عزت والے وہ لوگ تھے اور مسلمانوں کو کمزور و ذلیل سمجھتے تھے، جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کے ہی قول کو اس طرح پورا کر دکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان کو مدینہ سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ عزت والے مسلمان ہی ہیں اور کمزور و ذلیل یہود تھے۔

دوسری وجہ ان سے جنگ کرنے کی یہ ارشاد فرمائی وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ،

یعنی جنگ وقتال کی پہل بھی لوگوں کی طرف سے ہوئی، اب تو صرف مدافعانہ کارروائی ہے، جو ہر فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے۔

پھر مسلمانوں کے دلوں سے ان لوگوں کا رعب دور کرنے کے لئے فرمایا اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ، یعنی کیا تم لوگ ان سے خوف کھاتے ہو حالانکہ خوف و ڈر تو صرف اللہ تعالیٰ سے چاہئے، جس کے عذاب کو کوئی طاقت رد نہیں کر سکتی، آخر میں اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فرما کر بتلا دیا کہ غیر اللہ سے ایسا خوف کھانا جو احکام شرعیہ کی ادائیگی میں حائل ہو سکے کسی مؤمن مسلمان کا کام نہیں۔

چودھویں اور پندرہویں آیت میں بھی مسلمانوں کو جنگ وجہاد کی ترغیب ایک دوسرے عنوان سے دی گئی ہے، جس میں چند چیزیں بتلائی گئیں۔

اول یہ کہ اگر تم ان سے جنگ کے لئے تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے شامل حال ہوگی، اور یہ قوم اپنے اعمال بد کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی مستحق تو ہو ہی چکی ہے، مگر ان پر اللہ کا عذاب پچھلی قوموں کی طرح آسمان یا زمین سے نہیں آئے گا، بلکہ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیں گے۔

دوسرے یہ کہ اس جنگ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دلوں کو اس رنج وغم سے شفا عطا فرمائیں گے جو کفار کی طرف سے ان کو مسلسل پہنچتا رہا ہے۔

تیسرے یہ کہ ان کی غداری اور عہد شکنی کے سبب جو غیظ وغضب مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا انہی کے ہاتھوں ان کو عذاب دے کر ان کے غیظ کو دور فرما دیں گے۔

پچھلی آیت میں لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ فرما کر مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنا غصہ اتارنے کے لئے نہ لڑیں، بلکہ ان کی اصلاح و ہدایت کو مقصد بنائیں، اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ جب وہ اپنی نیت کو اللہ کے لئے صاف کریں اور محض اللہ کے لئے لڑیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسی صورتیں بھی پیدا فرما دیں گے کہ ان کے غم وغصہ کا انتقام بھی خود بخود ہو جائے۔

چوتھی چیز یہ ارشاد فرمائی وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ، یعنی ان میں سے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس کی توبہ قبول فرمائیں گے۔

جس سے معلوم ہوا کہ اس جہاد کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دشمن کی جماعت میں سے بہت سے لوگوں کو اسلام کی توفیق ہو جائے گی، وہ مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ فتح مکہ میں بہت سے سرکش ذلیل وخوار ہوئے اور بہت سے لوگ مشرف باسلام ہو گئے۔

اور بھیدی کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اسی معنی کے لئے لفظ بطانۃ استعمال کیا گیا ہے، بطانہ کے اصل معنی اس کپڑے کے ہیں جو دوسرے کپڑوں کے نیچے بطن اور بدن کے ساتھ متصل ہو، مراد اس سے ایسا آدمی ہے جو اندر کے رازوں سے واقف ہو، اس آیت کے الفاظ یہ ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا

اے ایمان والو اپنے مسلمانوں کے سوا کسی کو ہمراز اور بھیدی دوست نہ بناؤ وہ تمہیں دھوکہ دے کر برباد کرنے میں کوئی کسر نہ رکھیں گے۔

اس کے بعد سترہویں اور اٹھارہویں آیتوں میں مسجد حرام اور دوسری مساجد کو عبادات باطلہ سے پاک کرنے اور صحیح و مقبول طریقہ پر عبادت کرنے کی ہدایات ہیں

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ اور مسجد حرام سے ان تمام بتوں کو نکال ڈالا جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، اس طرح ظاہری طور پر تو مسجد حرام بتوں سے پاک ہوگئی لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدیم دشمنوں پر غالب آنے کے بعد سب کو معافی اور امان دیدیا تھا، اور وہ مشرکین اب بھی بیت اللہ اور حرم محترم میں عبادت وطواف وغیرہ اپنے باطل طریقوں پر کیا کرتے تھے۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جس طرح مسجد حرام کو بتوں سے پاک کر دیا گیا اسی طرح بت پرستی اور اس کے تمام باطل طریقوں سے بھی اس مقدس زمین کو پاک کیا جائے، اور اس پاک کرنے کی ظاہری صورت یہی تھی کہ مشرکین کا داخلہ مسجد حرام میں ممنوع قرار دیدیا جائے لیکن امان دیئے ہوئے امن کے خلاف تھا، اور معاہدوں کی پابندی اسلام میں ان سب چیزوں سے مقدم اور اہم تھی، اس لئے فوری طور پر ایسے احکام نہیں دیئے گئے بلکہ فتح مکہ سے اگلے ہی سال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ منیٰ اور عرفات کے عام اجتماع میں یہ اعلان کرا دیا کہ آئندہ کوئی مشرک مشرکانہ طرز کی عبادت اور حج وطواف وغیرہ حرم میں نہ کر سکے گا، اور جاہلیت میں جو ننگے ہو کر طواف کرنے کی رسم چل پڑی تھی آئندہ اس حرکت کی اجازت نہ دی جائے گی، چنانچہ حضرات صحابہ کرام مذکورین نے منیٰ کے اجتماع میں یہ اس کا اعلان کر دیا کہ:۔

لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ	یعنی اس سال کے بعد کوئی مشرک حج
وَلَا يَطُوْفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ	نہ کرسکے گا اور کوئی ننگا آدمی بیت اللہ
	کا طواف نہ کرسکے گا

اور یہ سال بھر کی مہلت اس لئے دیدی گئی کہ ان میں بہت سے وہ لوگ تھے جن کے ساتھ

مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور وہ ابھی تک معاہدہ پر قائم تھے، میعادِ معاہدہ پورا ہونے سے پہلے ان کو کسی نئے قانون کا پابند کرنا اسلامی رواداری کے خلاف تھا، اس لئے ایک سال پہلے سے یہ اعلان جاری کر دیا گیا۔ حرم محترم کو مشرکانہ عبادات اور رسوم سے پاک کرنا طے کر دیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی عبادت درحقیقت عبادت اور مسجد کی آبادی نہیں بلکہ ویرانی ہے۔

یہ مشرکین مکہ اپنی مشرکانہ رسوم کو عبادت اور مسجد حرام کی عمارت و آبادی کا نام دیتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ و مسجد حرام کے متولی اور اس کی عمارت کے ذمہ دار ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عباس جب اسلام لانے سے پہلے غزوہ بدر میں گرفتار ہوئے اور مسلمانوں نے ان کو کفر و شرک پر قائم رہنے سے عار دلائی، تو انہوں نے جواب دیا کہ تم لوگ صرف ہماری برائیاں یاد رکھتے ہو اور بھلائیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کو آباد رکھنے، اور اس کا انتظام کرنے اور حجاج کو پانی پلانے وغیرہ کی خدمات کے متولی بھی ہیں، اس پر قرآن کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں، مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ یعنی مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کی تعمیر کریں، کیونکہ مسجد صرف اسی جگہ ہے جو ایک اللہ وحدہٗ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہو، شرک و کفر اس کی ضد ہے، وہ عمارت مسجد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

عمارت مسجد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے کئی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک ظاہری در و دیوار کی تعمیر، دوسرے مسجد کی حفاظت اور صفائی اور ضروریات کا انتظام، تیسرے عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہونا، عمرہ کو عمرہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی زیارت اور عبادت کے لئے حاضری ہوتی ہے۔

مشرکین مکہ تینوں معنی کے اعتبار سے اپنے آپ کو معمار بیت اللہ اور عمارت مسجد حرام کا ذمہ دار سمجھتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ مشرکین کو اللہ کی مساجد کی عمارت کا کوئی حق نہیں جبکہ وہ خود اپنے کفر و شرک کے گواہ ہیں، ان لوگوں کے اعمال حبط اور ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

خود اپنے کفر و شرک کی گواہی کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اپنے مشرکانہ افعال و اعمال کے سبب گویا خود اپنے کفر و شرک کی گواہی دے رہے ہیں، اور یا یہ کہ عادۃً جب کسی نصرانی یا یہودی سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو؟ تو وہ اپنے آپ کو نصرانی یا یہودی کہتا ہے، اسی طرح مجوس اور بت پرست اپنے کافرانہ ناموں ہی سے اپنا تعارف کراتے ہیں، یہی ان کے کفر و شرک کا اعتراف اور شہادت ہے (ابن کثیر)

اس آیت میں عمارت مسجد کا منفی پہلو بیان کیا گیا تھا کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں عمارت مسجد کا مثبت پہلو اس طرح ارشاد فرمایا۔ اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ، "یعنی مسجدوں کو آباد کرنا بس ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور بجز اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں سو ایسے لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے"۔

مطلب یہ ہے کہ مساجد کی اصلی عمارت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے احکام الٰہی کے پابند ہوں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان کا ذکر کیا، رسول پر ایمان کے ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ رسول پر ایمان لائے، اور اس کے ذریعہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں ان کو دل سے قبول کرے، اس لئے ایمان باللہ میں ایمان بالرسول فطری طور پر داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلا دیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے **(مظہری بحوالہ صحیحین)**

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے، ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل و فطرت ہے، درندے، زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی۔ اس لئے ایذاء اور نقصان پہونچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکم قرآنی کے خلاف ہے، نہ رسالت اور ولایت کے، ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مؤمن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

بعض مسائل متعلقہ آیت — اور عمارت مسجد جس کے متعلق ان آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ مشرک کافر نہیں کر سکتے بلکہ وہ صرف نیک صالح مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے مراد مساجد کی تولیت اور انتظامی ذمہ داری

وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ
اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے،

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾
ان کیلئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ
خوشخبری دیتا ہے ان کو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں

فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ
ان کو آرام ہے ہمیشہ کا، رہا کریں ان میں مدام، بے شک اللہ کے پاس

اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ
بڑا ثواب ہے، اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو

وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ
اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے،

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گنہگار

خلاصۂ تفسیر

کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کی برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو (یعنی وہ عمل ایمان و جہاد، یعنی یہ عمل برابر نہیں اور جب اعمال برابر نہیں تو) یہ (عامل) لوگ (بھی باہم) برابر نہیں اللہ کے نزدیک (غرض عمل عمل باہم اور عامل عامل باہم برابر نہیں مقصود بقرینہ سیاق یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر واحد افضل ہے، سقایہ اور عمارت کے ہر واحد سے یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے اور اس سے جواب ہوگیا مشرکین کا کہ ان میں ایمان نہ تھا، اور جہاد بھی دونوں سے افضل ہے اس سے جواب ہوگیا بعض مؤمنین کا جو کہ باوجود ایمان کے سقایہ اور عمارت کو جہاد پر تفضیل دیتے تھے) اور (پہلا مذکور بہت ہی ظاہر ہے لیکن) جو لوگ بے انصاف ہیں (مراد مشرک ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو

سمجھ نہیں دیتا اس لئے وہ نہیں مانتے بخلاف اہل ایمان کے کہ وہ اس تحقیق کو فوراً مان گئے، آگے اس مضمون کی تصریح ہے جو اوپر کی آیتوں سے مقصود تھا یعنی جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کے واسطے) انھوں نے ترک وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک (بمقابلہ اہل سقایہ و اہل عمارت کے) بہت بڑے ہیں (کیونکہ اگر اہل سقایہ و اہل عمارت میں ایمان نہ ہو تب تو یہ بڑائی انہی مومنین مہاجرین مجاہدین میں منحصر ہے اور اگر ان میں ایمان ہو تو گو وہ بھی بڑے ہیں مگر یہ زیادہ بڑے ہیں) اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں (کیونکہ اگر ان کے مقابلین میں ایمان نہ ہو تب تو کامیابی کا حصر انہی میں ہے، اور اگر ایمان ہو تو کامیابی مشترک ہے لیکن ان کی کامیابی ان سے اعلیٰ ہے، آگے اس درجہ اور فوز کا بیان ہے کہ) ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور (جنت کے) ایسے باغوں کی ان کے لئے کہ ان (باغوں) میں ان کیلئے دائمی نعمت ہوگی (اور) ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے، (اس میں سے ان کو دیا جاوے گا) اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو اپنا رفیق مت بناؤ اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں (کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے) اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (مطلب یہ کہ بڑا مانع ہجرت سے ان لوگوں کا تعلق ہے اور خود وہ جائز نہیں پھر ہجرت میں کیا دشواری ہے)۔

معارف و مسائل

شروع کی چار آیتیں ۱۹ سے ۲۲ تک ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، وہ یہ کہ بہت سے مشرکین مکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مسجد حرام کی آبادی اور حجاج کو پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں ہو سکتا، اسلام لانے سے پہلے جب حضرت عباسؓ غزوہ بدر میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کی قید میں آئے، اور ان کے مسلم عزیزوں نے ان کو اس پر ملامت کی کہ آپ نعمت ایمان سے محروم ہیں تو انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آپ لوگ ایمان و ہجرت کو اپنا بڑا سرمایۂ فضیلت سمجھتے ہیں، مگر ہم بھی تو مسجد حرام کی عمارت اور حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمات کے متولی ہیں جن کی برابر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں،

(ابن کثیر بروایت علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس)

اور مسند عبدالرزاق کی بعض روایت میں ہے کہ حضرت عباسؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد طلحہ بن شیبہؓ اور حضرت عباسؓ اور علی کرم اللہ وجہہ کے آپس میں گفتگو ہو رہی تھی، طلحہ نے کہا کہ مجھے وہ فضیلت حاصل ہے جو تم میں سے کسی کو حاصل نہیں، کہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ

میں جو میں اگر چاہوں تو بیت اللہ کے اندر جا کر رات گذار سکتا ہوں، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میں حجاج کو پانی پلانے کا متولی اور منتظم ہوں، اور مسجد حرام میں میرے اختیارات ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ حضرات کس چیز پر فخر کر رہے ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ میں نے سب لوگوں سے چھ مہینہ پہلے بیت اللہ کی طرف نمازیں پڑھی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہوں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں واضح کر دیا گیا کہ کوئی عمل کتنا ہی اعلیٰ و افضل ہو ایمان کے بغیر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں، اور بحالت شرک میں ایسے اعمال کا کرنے والا اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجد نبوی میں چند حضرات صحابہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس جمع تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام و ایمان کے بعد میرے نزدیک حجاج کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں، اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پرواہ نہیں، ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں اللہ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے، ان دونوں میں بحث ہونے لگی، تو حضرت فاروق اعظمؓ نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا کہ منبر نبوی کے پاس شور و شغب نہ کرو، مناسب بات یہ ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یہ بات خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو، اس تجویز کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں جہاد کو عمارت مسجد حرام اور سقایۃ حجاج سے افضل عمل بتلایا گیا۔

اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ اصل آیت کا نزول تو مشرکین کے فخر و تکبر کے جواب میں ہوا ہو، پھر اس کے بعد جو واقعات مسلمانوں کے باہم پیش آئے، ان میں بھی اسی آیت کو بطور استدلال کے پیش کیا گیا ہو جس سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیت اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔

بہرحال آیات مذکورہ میں دونوں قسم کے واقعات کا یہ جواب ہو گیا کہ شرک کے ساتھ تو کوئی عمل کتنا ہی بڑا ہو مقبول اور قابل ذکر ہی نہیں، اس لئے کسی مشرک کو عمارت مسجد، یا سقایۃ حجاج کی وجہ سے کوئی فضیلت و بزرگی مسلمانوں کے مقابلہ میں حاصل نہیں ہو سکتی، اور ایمان کے بعد بھی ایمان و جہاد کا درجہ بہ نسبت عمارتِ مسجدِ حرام اور سقایۃ الحاج کے بہت زیادہ ہے، جو مسلمان ایمان و جہاد میں مقدم رہے وہ ان مسلمانوں سے افضل ہیں جنھوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی، صرف مسجد حرام کی تعمیر اور حجاج کے پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تمہید کے بعد آیت مذکورہ کے الفاظ اور ترجمہ پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے، ارشاد فرمایا

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو، یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

بقرینۂ سیاق مقصود یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر ایک افضل ہے سقایۂ حجاج اور عمارتِ مسجد سے، یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے اور جہاد بھی، ایمان کے افضل ہونے سے مشرکین کی بات کا جواب ہو گیا، اور جہاد کے افضل ہونے سے ان مسلمانوں کی بات کا جواب ہو گیا **جو عمارتِ مسجد اور سقایۂ حجاج کو جہاد سے افضل کہتے تھے۔**

ذکر اللہ جہاد سے افضل ہے: تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں جو عمارتِ مسجد پر جہاد کو فضیلت اور ترجیح دی گئی ہے یہ عمارت کے ظاہری معنی کی رو سے ہے یعنی مسجد کی تعمیر و ظاہری انتظامات کہ جہاد کا ان کے مقابلہ میں افضل ہونا مسلّم ہے۔

لیکن عمارتِ مسجد کے ایک دوسرے معنی عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مسجد میں حاضری کے بھی آتے ہیں، اور درحقیقت مسجد کی اصل عمارت تو یہی ہے، اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات کی بناء پر عمارتِ مسجد جہاد سے افضل و اعلیٰ ہے جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتلا دوں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم میدان میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عمل ضرور بتلائیے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارتِ مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر و غرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر **تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔**

اور قرآن و سنت کے مجموعی ارشادات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا دوسرے عمل سے افضل و اعلیٰ ہونا حالات و واقعات کے تابع ہوتا ہے، بعض حالات میں ایک عمل دوسرے سے افضل ہوتا ہے، اور حالات بدلنے کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہوگا، جیسا کہ غزوۂ خندق میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہو جانے

کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ اور جس وقت ایسی شدید ضرورت نہ ہو تو ذکر اللہ اور عبادت بمقابلہ جہاد کے افضل ہوگا۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فرما کر یہ بتلا دیا کہ یہ کوئی دقیق اور باریک بات نہیں بلکہ بالکل واضح ہے کہ ایمان سارے اعمال کی بنیاد اور ان سب سے افضل ہے۔ اور یہ کہ جہاد بہ نسبت عمارتِ مسجد اور سقایۃ الحجاج کے افضل ہے، مگر اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو سمجھ نہیں دیتا، اس لئے وہ ایسی کھلی اور ظاہری باتوں میں بھی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔

بیسویں آیت میں اس مضمون کی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں لَا يَسْتَوٗنَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، یعنی ایمان لانے والے مجاہد اور صرف عمارتِ مسجد و سقایۃ حجاج کرنے والے اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، اس میں ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ؀ "یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بڑے ہیں، اور پورے کامیاب یہی لوگ ہیں"

کیونکہ ان کے مقابلہ میں جو مشرک ہیں ان کو تو کامیابی کا کوئی درجہ بھی حاصل نہیں اور جو مسلمان ہیں اگرچہ نفسِ کامیابی میں وہ بھی شریک ہیں، مگر ان کی کامیابی ان سے گھٹی ہوئی ہے۔ اس لئے پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں ان کامیاب لوگوں کے اجرِ عظیم اور درجاتِ آخرت کا بیان ہے: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ؀ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ؀ "یعنی ان لوگوں کو ان کا پروردگار خوشخبری سناتا ہے اپنی رحمت اور رضا کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں ہوں گی اور یہ لوگ بھی ان نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے ان کو یہاں سے کبھی نہ نکالا جائے گا، بیشک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے"

آیاتِ مذکورہ میں ہجرت اور جہاد کے فضائل کا بیان آیا ہے جن میں وطن اور اعزہ و اقربا اور احباب و اصحاب اور اموال و املاک سب کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت پر یہ کام سب سے زیادہ شاق اور دشوار ہیں، اس لئے اگلی آیت میں ان چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق اور محبت کی مذمت فرما کر مسلمانوں کے ذہنوں کو ہجرت و جہاد کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ؀

۲۲

"یعنی اے ایمان والو تم اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے عزیز رکھیں، اور تم میں سے جو شخص ان کے ساتھ باوجود ان کے کفر کے رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں"۔

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، مگر اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے، ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول کے تعلق کے . . . مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں، تو پھر رشتہ تعلق اللہ و رسول ہی کا قائم رکھنا ہے، اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

آیات مذکورہ کے متعلق چند فوائد و مسائل

مذکورہ پانچ آیتوں سے چند فوائد و مسائل حاصل ہوئے:

اوّل یہ کہ ایمان روحِ عمل ہے، اس کے بغیر کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ صرف صورت بے جان اور ناقابل قبول ہے، نجاتِ آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ کے یہاں بے انصافی نہیں، کافروں کے ایسے بے روح اعمالِ حسنہ بھی بالکل ضائع نہیں کئے جاتے، ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں آرام و عیش اور دولت و راحت دے کر بیباق کر دیا جاتا ہے، جس کا بیان قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

دوسرا فائدہ ان آیات سے یہ حاصل ہوا کہ معصیت و نافرمانی سے انسان کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے کہ بُرے کو بھلا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، تیسری آیت کے آخر میں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل ایک آیت میں اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ طاعت و تقویٰ سے انسان کی عقل کو جلا ہوتی ہے، سلامت فکر نصیب ہوتی ہے، وہ اچھے بُرے کی تمیز میں غلطی نہیں کرتا۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں بھی باہمی تفاضل ہے اور اسی کی مناسبت سے عمل کرنے والوں کے درجات میں تفاضل قائم ہوتا ہے، سب عمل کرنے والے ایک درجہ میں نہیں رکھے جا سکتے، اور مدار کثرتِ عمل پر نہیں بلکہ حسنِ عمل پر ہے، سورۂ ملک میں آیا ہے: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا، "یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کریں گے، کہ کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے"۔

چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ راحت و نعمت کے دائمی رہنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ نعمتیں کسی وقت ختم نہ ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کسی وقت ان لوگوں کو ان نعمتوں سے جدا نہ کیا جائے، اس لئے اللہ کے مقبول بندوں کے لئے دونوں چیزوں کی ضمانت دیدی گئی، نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ فرما کر نعمتوں کا دائمی ہونا بیان فرما دیا، اور خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، فرما کر ان لوگوں کو کبھی ان نعمتوں

سے الگ نہ کرنے کا اطمینان دلایا۔

اصل رشتہ اسلام و ایمان کا رشتہ ہے، نسبی وطنی تعلقات سب اس پر قربان کرنے ہیں

پانچواں مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مقدم ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے، صحابہ کرام کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان و مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کرکے زبانِ حال سے کہا ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن ٭ ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور قریشِ مکہ، انصارِ مدینہ تو سب آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، اور بدر و اُحد کے میدانوں میں باپ بیٹے، بھائی بھائی کی تلواریں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اسکی شہادت دی کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد ٭ فدائے یک تنِ بیگانہ کآشنا باشد

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَھُمْ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیْنَا وَخَشْیَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدَنَا

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں

وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ

اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے

كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول

وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم، اور اللہ رستہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع

نافرمان لوگوں کو۔

۳ ع ۸ ۹

خلاصۂ تفسیر

(آگے اسی مضمون کی زیادہ تفصیل ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے)

کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں (رہنے) کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترک ہجرت کا) بھیج دیں (جیسے دوسری آیت میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ الی قولہ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ) اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا (یعنی ان کا مقصود تھا ان چیزوں سے تمتع وہ بہت جلد خلاف اس کی توقع کے موت سے منقطع ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کی یہ آیت دراصل ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے مکہ سے ہجرت فرض ہونے کے وقت ہجرت نہیں کی، ماں باپ، بھائی، بہن، اولاد اور بیوی اور مال و جائداد کی محبت نے ان کو فریضۂ ہجرت ادا کرنے سے روک دیا، ان کے بارے میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ:

"اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا"

اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں،

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ حکم سے مراد جہاد و قتال اور فتح مکہ کا حکم ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت دنیاوی تعلقات پر اللہ و رسولؐ کے تعلقات کو قربان کرنے والوں کا انجام بد عنقریب سامنے آنے والا ہے، جبکہ مکہ فتح ہوگا، اور نافرمانی کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے، اور ان کے یہ تعلقات اس وقت ان کے کام نہ آئیں گے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکم عذاب ہے کہ دنیوی تعلقات پر اُخروی تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں اُن پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے، آیت میں اس جگہ مقصود تو ترک ہجرت پر وعید ہی، مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ

کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترکِ وطن ہی کا حکم ہوا ہے، اس میں کچھ لوگ ہمت ہار بیٹھے، آگے جہاد کا حکم آنے والا ہے، جس میں اللہ اور رسولؐ کی محبت پر ساری محبتوں کو اور خود اپنی جان کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ ہجرت ہی کو جہاد سے تعبیر کر دیا ہو کیونکہ وہ بھی حقیقت میں جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے۔

اور آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ حکم ہجرت کے باوجود اپنے دنیوی تعلقات کو ترجیح دے کر اپنے خویش و عزیز اور مال و مکان سے چمٹے رہے، ان کا یہ عمل دنیا میں بھی اُن کے لئے مفید نہیں ہوگا، اور اُن کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور مال و مکان میں امن و چین سے بیٹھیں رہیں، بلکہ حکم جہاد شروع ہوتے ہی یہ سب چیزیں اُن کے لئے وبالِ جان بن جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتے۔

مسائل متعلقہ ہجرت

اوّل، جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کر دی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہو گیا، اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے احکام نماز روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کے لئے فرض ہے، بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر ایسی جگہ کو چھوڑ دے جہاں فسق و فجور کا غلبہ ہو یہ ہمیشہ کیلئے مستحب ہے (تفصیل فتح الباری میں ہے)

آیت مذکورہ میں براہِ راست تو خطاب ان لوگوں سے ہے جنھوں نے ہجرت فرض ہونے کے وقت دنیوی تعلقات کی محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت نہیں کی، لیکن الفاظِ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اُس پر غالب نہ آئے، اور جس نے اس درجے کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحق عذاب ہو گیا، اس کو عذاب الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

سچا ایمان اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ اللہ اور رسولؐ کی محبت ساری دنیا اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ ہو!!!

سی لئے ایک صحیح حدیث میں جو صحیحین میں بروایت انسؓ منقول ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اور ابوداؤد ترمذی میں بروایت ابوامامہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس نے کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لئے کی اور دشمنی کی تو وہ بھی اللہ ہی کے لئے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لئے اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رُکا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

ان روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو، اور انسان کی دوستی دشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکمِ خدا اور رسول ؐ کے تابع ہو۔

امام تفسیر قاضی بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں، کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد و زاہد اور عالم و متقی بھی اہل و عیال اور مال و متاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں، اِلَّا مَا شَاءَ اللہ، مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے، غیر اختیاری و طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت و اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ و رسول ؐ کے احکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ و رسول ؐ کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے، جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے، مگر عقلاً اس کو اپنی نجات و سلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابلِ مذمت نہیں، اور نہ کوئی عقلِ سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے، کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کرکے احکامِ الٰہیہ بجالائے تو وہ بھی قابلِ ملامت نہیں، بلکہ قابلِ تحسین ہے، اور اللہ و رسول ؐ کی محبت کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ طبیعت پر بھی محبت غالب آجائے، اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی و تکلیف کو بھی لذیذ بنا دے، جیسا دنیا کی فانی لذت و راحت کے طلبگاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے، کہ بڑی سے بڑی محنت و مشقت کو ہنس کھیل کر اختیار کرلیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند، آرام اور سارے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں، سفارشوں، اور رشوتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے ؎

رنج و راحت شد چو مطلب شد بزرگ ؛ گردِ گلہ توتیائے چشمِ گرگ

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ و رسولؐ اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے، وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے، تیسرے یہ کہ کفر و شرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔

اس حدیث میں حلاوتِ ایمان سے مراد محبت کا یہی مقام ہے جو انسان کے لئے ہر مشقت و محنت کو لذیذ بنا دیتا ہے ؎ از محبت تلخہا شیریں شود، اسی مقام کے متعلق بعض علماء نے فرمایا ہے ؎

وَاِذَا حَلَّتِ الْحَلَاوَۃُ قَلْبًا ٭ نَشَطَتْ فِی الْعِبَادَۃِ الْاَعْضَاءُ

"یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جاتی ہے، تو عبادت و طاعت میں اس کے اعضاء لذت پانے لگتے ہیں"

اسی کو بعض روایات میں بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ محبت خدا و رسول کا یہ مقام ایک نعمتِ کبریٰ ہے، مگر وہ صرف اللہ والوں کی صحبت و معیت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے صوفیائے کرام اس کو خدمتِ مشائخ سے حاصل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، صاحب روح البیان نے فرمایا کہ یہ مقامِ خلت اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خلیل اللہ کی طرح اپنے مال، اولاد اور جان کو اللہ کی محبت میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو ؎

خلیل آسا درِ ملک یقین زن ٭ نوائے لا احب الآفلین زن

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و شریعت کی حفاظت اور اس میں رخنے ڈالنے والوں کی مدافعت بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک کھلا نشان ہے، رزقنا اللہ تعالیٰ وجمیع المسلمین حبّہ وحبّ رسولہ کما یحب ویرضاہ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن، جب

اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ

خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہو گئی تم پر

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ

زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر ، پھر اتاری اللہ نے

سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ

اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اتاریں فوجیں کہ جن کو

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے منکروں کی

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تم کو خدا تعالیٰ نے (لڑائی کے) بہت موقعوں میں (کفار پر) غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ) اور حُنین کے دن بھی (جس کا قصہ عجیب وغریب ہے تم کو غلبہ دیا) جبکہ (یہ واقعہ ہوا تھا کہ) تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور (کفار کے تیر برسانے سے ایسی پریشانی ہوئی کہ) تم پر زمین باوجود اپنی (اس) فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (کے قلب) پر اور دوسرے مومنین (کے قلوب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی، اور (مدد کے لئے) ایسے لشکر (آسمان سے) نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا (مراد فرشتے ہیں جس کے بعد تم پھر مستعد قتال ہوئے اور غالب آئے) اور (اللہ تعالیٰ نے) کافروں کو سزا دی (کہ ان پر ہزیمت اور قتل وقید واقع ہوئی) اور یہ کافروں کی (دنیا میں) سزا ہے، پھر اللہ تعالیٰ (ان کافروں میں سے) جس کو چاہیں توبہ نصیب کر دیں (چنانچہ بہت سے مسلمان ہوگئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، (کہ جو شخص ان میں مسلمان ہوا اس کے سب پچھلے گناہ معاف کر کے مستحق جنت کا بنا دیا)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں غزوۂ حُنین کے واقعات شکست وفتح کا اور ان کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل اور فوائد کا بیان ہے، جیسا کہ اس سے پہلی سورت میں فتح مکہ اور اس کے متعلقات کا ذکر تھا، شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس انعام واحسان کا ذکر فرمایا ہے،

جو مسلمانوں پر ہر موقع اور ہر حالت میں مبذول رہا ہے، ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ "یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی بہت سے مقامات میں" اور اس تمہید کے بعد خصوصیت کے ساتھ فرمایا وَيَوْمَ حُنَيْنٍ "یعنی غزوۂ حنین کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی"

غزوۂ حنین کی خصوصیت اس وجہ سے فرمائی ہو کہ اس میں بہت سے واقعات اور حالات خلافِ توقع عجیب انداز سے ظاہر ہوئے، جن میں غور کرنے سے انسان کے ایمان میں قوت اور عمل میں ہمت پیدا ہوتی ہے، اس لئے آیاتِ مذکورہ کی لفظی تفسیر سے پہلے اس غزوہ کے ضروری واقعات جو حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں میں مذکور ہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کر دینا مناسب ہے، تاکہ آیاتِ مذکورہ کے سمجھنے میں آسانی ہو اور جن فوائد کے لئے یہ واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سامنے آجائیں، ان واقعات کا بیشتر حصہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، جس میں بحوالہ کتب حدیث و تاریخ واقعات کا ذکر ہے۔

حُنَین، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انھوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا، کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہو گئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رُخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کر دیں، اس کام کے لئے قبیلۂ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہو گئے۔

اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے، اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے، اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا، قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دو شاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دیدی تھی، انھوں نے کہا کہ اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمد کے خلاف جمع ہو جائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے، ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے، باقی سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک ابن عوف نے ان سب کو پوری

قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی یہ تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل وعیال بھی ساتھ تھے، اور اپنا
اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچوں
اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے۔
ان کی تعداد کے بارے میں اہل تاریخ کے مختلف اقوال ہیں، حافظ حدیث علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے راجح
اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا، اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان
کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل وعیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو، اور لڑنے
والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی
تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرمایا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسید کو امیر بنایا،
اور حضرت معاذ بن جبل کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور
قریش مکہ سے اسلحہ اور سامان جنگ عاریت کے طور پر مانگا، صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار
تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ سامان جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی، یہ
سن کر اس نے سو زرہیں مستعار دیں، اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کردیئے،
امام زہری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ کا لشکر لے کر اس
جہاد کی طرف متوجہ ہوئے، جن میں بارہ ہزار انصار مدینہ تھے جو فتح مکہ کے لئے آپ کے ساتھ
آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان
ہوگئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ اس غزوہ کے لئے
نکلے، اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ ہمارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا، جہاں جمع ہو کر
قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا، ان کے ساتھ مکہ کے بیشمار لوگ مرد و عورت
تماشائی بن کر نکلے، جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی
اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں

اسی قسم کے لوگوں میں ایک شیبہ بن عثمان بھی تھے، جنھوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا
واقعہ بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علی کرم اللہ
وجہہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کا جوش انتقام اور انتہائی غیظ میرے دل میں تھا، میں اس موقع
کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا کہ جب کہیں موقع پاؤں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر

حملہ کردوں، میں ان کے ساتھ ہوکر ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پاکر حضورؐ کے قریب پہونچا، مگر دیکھ کر داہنی طرف حضرت عباسؓ آپ کی حفاظت کر رہے ہیں، اور بائیں طرف ابوسفیان بن حارث، اس لئے میں پیچھے کی طرف پہونچ کر ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکبارگی تلوار سے آپ پر حملہ کردوں کہ یکایک آپ کی نظر مجھ پر پڑی، اور آپ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ، اپنے قریب بلاکر دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا، اور دعا کی کہ یا اللہ اس سے شیطان کو دُور کردے، اب جو میں نظر اٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل میں اپنے آنکھ، کان اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہوجاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو، اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان آپ پر قربان کر رہا تھا، اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی کردی، کہ تم مکہ سے اس نیت پر چلے تھے، اور میرے گرد میرے قتل کے لئے گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہوکر رہا۔

اسی طرح کا واقعہ نضر بن حارث کو پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حنین گئے تھے، وہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی، اور ایک مرد مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرا گئے۔

اسی سفر میں ابو بردہ بن نیارؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پہنچکر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں، اور ایک اور شخص آپ کے پاس بیٹھا ہے آپ نے ذکر فرمایا کہ میں سو گیا تھا، یہ شخص آیا اور ...... میری تلوار اپنے قبضہ میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ اے محمدؐ! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ بچا سکتا ہے، یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، ابو بردہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں اس دشمنِ خدا کی گردن ماردوں، یہ دشمن قوم کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بردہ خاموش رہو اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرنے والا ہے، جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے، اور آپ نے اس شخص کو کوئی ملامت بھی نہ فرمائی، اور آزاد چھوڑ دیا۔

مقامِ حنین پر پہونچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آگیا ہے، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر تبسم فرمایا، اور کہا کہ پروانہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حدرد کو جاسوس بناکر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں، وہ ان کی قوم میں جاکر دو دن رہے، سب حالات دیکھتے سنتے رہے، ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ محمدؐ کو ابتک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کرکے انھیں اپنی طاقت کا زعم ہوگیا، اب ان کو پتہ لگے گا، تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے بیوی بچے اور مال ہو، اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو، اور سب مل کر یکبارگی حملہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے، اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپادیا تھا۔

اس طرف کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے، اور سامانِ جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا، اور یہ لوگ بدر و اُحد کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامان لوگوں نے ایک ہزار کے لشکرِ جرار پر فتح پائی، تو آج اپنی کثرت و تیاری پر نظر کرکے حاکم و بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہوجائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک و ملکوت کو یہی چیز ناپسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلۂ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی حملہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا، گرد و غبار نے دن کو رات بنادیا، تو صحابۂ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابۂ کرام جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپؐ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورۂ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں، اور وہ انصار کہاں ہیں جنھوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباسؓ کی ایک آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی، اور یکایک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی، اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج دی، ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل و عیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا، اور طائف کے قلعہ میں جا چھپا، اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی، ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا، ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، چھ ہزار جنگی قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں چار ہزار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔

پہلی اور دوسری آیت میں اسی مضمون کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ جب تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کار آمد نہ ہوئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور ایسے لشکر فرشتوں کے نازل کر دیئے، جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو تمہارے ہاتھ سے سزا دلوادی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ "یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور سب مسلمانوں پر اپنی تسلی نازل فرمادی"۔

معنی اس کے یہ ہیں کہ غزوہ حنین کے ابتدائی حملہ میں جن صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر اپنی تسلی نازل فرمادی جس سے ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، اور بھاگنے والے پھر لوٹ آئے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان صحابہ پر جو مضبوطی کے ساتھ محاذ پر جمے رہے تسلی نازل فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی، اور چونکہ تسلی کی یہ دو قسمیں تھیں ایک بھاگنے والوں کے لئے دوسری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہنے والوں کے لئے، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کو علیحدہ علیحدہ تکرار عَلٰی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا، یعنی ایسے لشکر نازل فرمادیئے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس سے مراد عام طور پر لوگوں کا نہ دیکھنا ہے، احاد و افراد سے جو بعض روایتوں میں اس لشکر کا دیکھنا منقول ہو وہ اس کے منافی نہیں۔

پھر فرمایا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ "یعنی کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سزا دیدی، اور کافروں کی یہی سزا ہے"، اس سزا سے مراد ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح اور مغلوب ہونا ہے، جو واضح طور پر مشاہدہ میں آیا، مطلب یہ ہو کہ یہ دنیاوی سزا تھی، جو فوری طور پر مل گئی،

آگے آخرت کے معاملہ کا ذکر بعد کی آیت میں اس طرح آیا ہے :
ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "یعنی پھر خدا تعالیٰ جس کو چاہیں توبہ نصیب کر دیں، اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں" اس میں اشارہ ہے کہ اس جہاد میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب اور مفتوح ہونے کی سزا مل چکی ہے، اور ابھی تک وہ اپنے کفر پر قائم ہیں، ان میں سے بھی کچھ لوگوں کو توفیق ایمان نصیب ہوگی، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے :

حُنین کی فتح، اور ہوازن و ثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہو کر حاضر ہونا قیدیوں کی واپسی

حنین میں قبیلہ ہوازن و ثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ جو ان کے اہل و عیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مال غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب کو **اموالِ غنیمت کا نگراں مقرر فرمایا۔**

پھر شکست خوردہ ہوازن و ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہو کر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا، یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان لوگوں کے لئے بد دعا فرمایئے، مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرما کر واپسی کا قصد فرمایا، اور مقام جعرانہ پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جا کر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح و شکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مال غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا ابھی اموال غنیمت تقسیم ہو ہی رہے تھے کہ دفعۃً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا .... جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابویرقان بھی تھے، انھوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل و عیال اور اموال ہمیں واپس دیدیئے جائیں، اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم بسلسلہ رضاعت آپ کے

خویش و عزیز ہیں، اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، آپ ہم پر احسان فرمائیں، رئیسِ وفد ایک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر ہم بادشاہِ روم یا شاہِ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیشِ نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاق فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے، آپ سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا، کہ ایک طرف ان لوگوں پر رحم و کرم کا تقاضا یہ کہ ان کے سب قیدی اور اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں، دوسری طرف یہ کہ اموالِ غنیمت میں تمام مجاہدین کا حق ہوتا ہے، ان سب کو ان کے حق سے محروم کر دینا ازروئے انصاف درست نہیں، اس لئے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے، جو ان اموال کے حق دار ہیں، میں سچی اور صاف بات کو پسند کرتا ہوں، اس لئے آپ لوگوں کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو یا اموالِ غنیمت ان دونوں میں جس کو تم انتخاب کرو وہ تمھیں دیدیئے جائیں گے، سب نے قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ:

"یہ تمھارے بھائی تائب ہو کر آ گئے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس دیدیئے جائیں، تم میں سے جو لوگ خوشدلی کے ساتھ اپنا حصہ واپس دینے کے لئے تیار ہوں وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم ان کو آئندہ اموالِ فئے میں سے اس کا بدلہ دیدیں گے۔"

حقوق کے معاملہ میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے عوامی جلسوں کی آوازیں کافی نہیں، ہر ایک سے علیحدہ رائے معلوم کرنی چاہیے

مختلف اطراف سے یہ آواز اٹھی کہ ہم خوش دلی کے ساتھ سب قیدی واپس کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر عدل و انصاف اور حقوق کے معاملہ میں احتیاط کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا، اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے خوش دلی سے تیار ہوئے اور کون ایسے ہیں جو شرما شرمی خاموش رہے، معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہے، اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کے لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔

اس کے مطابق سرداروں نے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ اجازت حاصل کرنے کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ سب لوگ خوش دلی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی ان کو واپس کر دیئے

یہی وہ لوگ تھے جن کے تائب ہونے کی طرف مذکورہ تیسری آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے ثُمَّ یَتُوۡبُ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ الآیۃ، غزوۂ حنین میں پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا کچھ حصہ تو خود قرآن کریم میں مذکور ہے اور باقی مستند روایاتِ حدیث سے لیا گیا ہے (مظہری و ابن کثیر)

احکام و مسائل

ان واقعات کے ضمن میں بہت سے احکام و ہدایات اور ضمنی فوائد آئے ہیں، وہی ان واقعات کے بیان کرنے کا اصل مقصد ہیں۔

آیات مذکورہ میں سب سے پہلی ہدایت تو یہ دی گئی کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی اپنی جمعیت اور طاقت پر غرّہ نہ ہونا چاہئے، جس طرح کمزوری اور بے سامانی کے وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد پر رہتی ہے اسی طرح قوت و طاقت کے وقت بھی ان کا مکمل اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی پر ہونا چاہئے۔

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد کی کثرت اور سامانِ حرب کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابہ کرام کی زبان پر جو بڑا بول آگیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں جو ہم سے بازی لیجا سکے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبوب جماعت کی زبان سے ایسے کلمات پسند نہ آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی حملے کے وقت مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اور بھاگنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ ہی کی غیبی امداد سے یہ میدان فتح ہوا۔

مفتوح و مغلوب کفار میں عدل و انصاف اور احتیاط

دوسری ہدایت اس واقعہ سے یہ حاصل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے لئے مکہ کے مفتوح غیر مسلموں سے جو سامانِ جنگ زرہیں وغیرہ لئے تھے یہ ایسا موقع تھا کہ ان سے زبردستی بھی یہ چیزیں لی جا سکتی تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاریت کہہ کر لیا اور پھر سب کو ان کی مستعار چیزیں واپس کر دیں۔

اس واقعہ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ بھی پورے عدل و انصاف اور رحم و کرم کے معاملہ کا سبق دیا۔

تیسری ہدایت اس ارشادِ نبوی سے حاصل ہوئی جس میں حنین کی طرف جاتے ہوئے خیف بنی کنانہ میں قیام کے وقت فرمایا کہ کل ہم ایسے مقام پر قیام کریں گے جس میں بیٹھ کر ہمارے دشمن قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کی قرارداد پر معاہدہ کیا تھا، اس میں

۲۱

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو مشرک لوگ (بوجہ عقائد خبیثہ کے) نرے ناپاک ہیں سو (اس ناپاکی پر جو احکام متفرع ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ) یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی حرم) کے پاس بھی نہ آنے پائیں (یعنی حرم کے اندر داخل نہ ہوں) اور اگر تم کو (اس حکم کے جاری کرنے سے بدیں وجہ، مفلسی کا اندیشہ ہو کہ لین دین انہی سے زیادہ متعلق ہے جب یہ نہ رہیں گے تو کام کیسے چلے گا) تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا ان کا محتاج نہ رکھے گا، بیشک اللہ تعالیٰ (احکام کی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا ہے (اور ان مصلحتوں کی تکمیل کے بارے میں) بڑا حکمت والا ہے (اس لئے یہ حکم مقرر کیا اور تمہارے افلاس کے انسداد کا سامان بھی کرے گا)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کے شروع میں کفار و مشرکین سے اعلانِ براءت کیا گیا تھا، مذکورۃ الصدر آیت میں اس اعلانِ براءت سے متعلقہ احکام کا ذکر ہے، اعلانِ براءت کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کفار کے معاہدات ختم یا پورے کر دیئے جائیں، اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حدودِ حرم میں نہ رہنے پائے۔

اس آیت میں اسی کا بیان ایک خاص انداز میں ... کیا گیا ہے جس میں اس حکم کی حکمت و مصلحت بھی بتلا دی اور اس کی تعمیل میں جو بعض مسلمانوں کو خطرات تھے ان کا بھی جواب دیدیا، اس میں لفظ نَجَسٌ بفتح جیم استعمال فرمایا ہے جو نجاست کے معنی میں ہے، اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے، امام راغب اصفہانیؒ نے فرمایا کہ اس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ، ناک یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو، اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعہ معلوم ہو، اس لئے لفظ نجس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں، اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بناء پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت، اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، جیسے عقائدِ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ۔

آیت مذکورہ میں کلمہ اِنَّمَا لایا گیا ہے جو حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ کے معنی یہ ہوگئے کہ مشرکین نری نجاست ہی ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ عام طور پر مشرکین میں تینوں قسم کی نجاستیں ہوتی ہیں، کیونکہ بہت سی ظاہری ناپاک چیزوں

کو وہ ناپاک نہیں سمجھتے، اس لئے ان ظاہری نجاستوں سے بھی نہیں بچتے جیسے شراب اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، اور معنوی نجاست سے غسلِ جنابت وغیرہ کے تو وہ معتقد ہی نہیں، اسی طرح عقائدِ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں مشرکین کو نری نجاست قرار دے کر یہ حکم دیا گیا فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا "یعنی یہ لوگ نہ آنے پائیں مسجد حرام کے پاس اس سال کے بعد" یعنی یہ سال ختم ہونے کے بعد یہ مشرکین مسجد حرام کے پاس نہ جا سکیں"

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد ..... چہار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، جیسا کہ واقعۂ معراج میں مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے باتفاق یہی معنی مراد لئے گئے ہیں، کیونکہ واقعۂ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت اُم ہانی رضؓ کے مکان سے ہوا ہے، اسی طرح آیت کریمہ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے، کیونکہ جس واقعۂ صلح کا اس میں ذکر ہے، وہ مقام حُدیبیہ پر ہوا ہے، جو حدودِ حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔ (جصاص)

اس لئے معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدودِ حرم میں ممنوع ہے، اس سال سے مراد کونسا سال ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ سنہ ۱۰ ہجری مراد ہے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک سنہ ۹ ہجری راجح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ براءت حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ موسم حج میں اسی سنہ ۹ھ میں کرایا ہے، اس لئے سنہ ۹ھ سے سنہ ۱۰ھ تک مہلت کا سال ہے، سنہ ۱۰ ہجری کے بعد یہ قانون نافذ ہوا۔

مشرکین کے مسجد حرام میں داخلے کی ممانعت کا مطلب، اور یہ کہ مسجد حرام کی خصوصیت ہے یا سب مساجد کے لئے عام ہے

آیت مذکورہ میں جو حکم دیا گیا ہے کہ سنہ ۱۰ھ کے بعد سے کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں، کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے یا دنیا کی دوسری مسجدیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں اور اگر مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے تو کسی مشرک کا داخلہ مسجد حرام میں مطلقاً ممنوع ہے، یا صرف حج وعمرہ کیلئے داخلہ کی ممانعت ہی دیسے جا سکتا ہے، تیسرے یہ کہ آیت میں یہ حکم مشرکین کا بیان کیا گیا ہے، **کفار اہل کتاب بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں۔**

ان تفصیلات کے متعلق چونکہ الفاظ قرآن ساکت ہیں اس لئے اشاراتِ قرآن اور

روایات حدیث کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق احکام بیان فرمائے، اس سلسلہ میں پہلی بحث اس میں ہے کہ قرآن کریم نے مشرکین کو نجس کس اعتبار سے قرار دیا ہے، اگر ظاہری نجاست یا معنوی جنابت وغیرہ مراد ہے تو ظاہر ہے کہ کسی مسجد میں نجاست کا داخل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جنابت والے شخص یا حیض و نفاس والی عورت کا داخلہ کسی مسجد میں جائز نہیں، اور اگر اس میں نجاست سے مراد کفر و شرک کی باطنی نجاست ہی تو ممکن ہے کہ اس کا **حکم ظاہری نجاست سے مختلف ہو۔**

تفسیر قرطبی میں ہے کہ فقہائے مدینہ امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مشرکین ہر حیثیت کے اعتبار سے نجس ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عموماً اجتناب نہیں کرتے، اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل کا بھی اہتمام نہیں کرتے، اور کفر و شرک کی باطنی نجاست تو ان میں ہے ہی، اس لئے یہ حکم تمام مشرکین اور تمام مساجد کے لئے عام ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ فرمان پیش کیا جس میں انھوں نے امراء بلاد کو ہدایت کی تھی کہ کفار کو مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اس فرمان میں اسی آیت مذکورہ کو تحریر فرمایا تھا:

نیز یہ کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا اُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ،	یعنی مسجد میں داخل ہونا کسی حائضہ عورت یا جنبی شخص کیلئے میں حلال نہیں سمجھتا۔

اور مشرکین و کفار عموماً حالت جنابت میں غسل کا اہتمام نہیں کرتے، اس لئے ان کا **داخلہ مساجد میں ممنوع ہے۔**

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ حکم مشرکین اور اہل کتاب سب کے لئے عام ہے، مگر مسجد حرام کے لئے مخصوص ہے، دوسری مساجد میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں، (قرطبی)، اور دلیل میں ثمامہ ابن اُثال کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے یہ گرفتار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج و عمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلان براءت کردیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، جس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا۔ اس لئے اس آیت میں فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ کے معنی بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہیں کہ ان کو حج و عمرہ کی ممانعت کردی گئی،

اور کسی ضرورت سے باجازت امیر المؤمنین داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام نے عرض بھی کیا، یا رسول اللہ یہ نجس قوم ہے، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا (جصاص)

اس روایت نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ قرآن کریم میں مشرکین کو نجس کہنے سے انکی نجاست کفر و شرک مراد ہے، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، اسی طرح حضرت جابر ابن عبد اللہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مشرک مسجد کے پاس نہ جائے، بجز اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو بضرورت اس کو داخل کر سکتے ہیں (قرطبی)

یہ حدیث بھی اسی کی شاہد ہے کہ نجاست ظاہری کو سبب قرار دے کر مشرکین کو مسجد حرام سے نہیں روکا گیا ورنہ اس میں غلام و جاریہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، بلکہ بنیاد اصل کفر و شرک اور ان کے غلبہ کا خطرہ ہے، غلام و کنیز میں یہ خطرہ نہیں، ان کو اجازت دیدی گئی، اس کے علاوہ ظاہری نجاست کے اعتبار سے تو مسلمان بھی اس میں داخل ہیں کہ نجاست یا حدث کی حالت میں ان کے لئے بھی مسجد حرام کا داخلہ ممنوع ہے۔

نیز جمہور کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ جب پورا حرم مراد ہے تو وہ بھی اسی کی مقتضی ہے کہ یہ ممانعت ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں بلکہ کفر و شرک کی نجاست کی بناء پر ہے، اسی لئے صرف مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا، بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کا حصن اور ایک قلعہ ہے، اس میں کسی غیر مسلم کو رکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ نجاسات سے مساجد کی تطہیر بھی ایک مستقل مسئلہ ہے، جو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے، لیکن اس آیت کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں بلکہ اسلام کے اس سیاسی حکم سے ہے جس کا اعلان سورۃ برأت کے شروع میں کیا گیا ہے، کہ جتنے مشرکین مکہ میں موجود تھے، ان سب سے حرم محترم کو خالی کرانا مقصود تھا، لیکن بتقاضائے عدل و انصاف و رحم و کرم مکہ فتح ہوتے ہی سب کو یک قلم خارج کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ جن لوگوں سے کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور وہ لوگ اس معاہدہ پر قائم رہے تو ان کی میعاد معاہدہ پوری کر کے اور باقیوں کو کچھ کچھ مہلت دے کر سال بھر کے اندر اس تجویز کی تکمیل پیش نظر تھی، اسی کا بیان اس آیت مذکورہ میں آیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدود حرم میں ممنوع ہو جائیگا وہ مشرکانہ حج و عمرہ نہ کرنے پائیں گے۔

اور جس طرح سورۃ توبہ کی آیات میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ۹ھ ہجری کے بعد

کوئی مشرک حدودِ حرم میں داخل نہ ہو سکے گا، روایاتِ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کو اور وسیع فرما کر پورے جزیرۃ العرب کے لئے بھی حکم دیدیا تھا، مگر عہدِ رسالتؐ میں اس کی تکمیل نہ ہونے پائی، پھر صدیق اکبرؓ بھی دوسرے ہنگامی مسائل کی وجہ سے اس پر توجہ نہ دے سکے **فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ فرمایا۔**

اب رہا کفار کی نجاست اور مساجد کی نجاسات سے تطہیر کا مسئلہ وہ اپنی جگہ ہے جس کے مسائل کتبِ فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں، کوئی مسلمان بھی ظاہری نجاست یا حالتِ جنابت میں کسی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا، اور عام کفار و مشرکین بلکہ اہل کتاب وہ بھی عموماً ان نجاسات سے پاک نہیں ہوتے، اس لئے بلا ضرورتِ شدیدہ ان کا داخلہ بھی کسی مسجد میں جائز نہیں

اس آیت کے نزول پر جب کفار و مشرکین کا داخلہ حرم میں ممنوع کر دیا گیا تو مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی مسئلہ یہ پیش آیا کہ مکہ میں کوئی پیداوار نہیں، باہر کے آنے والے ہی اپنے ساتھ ضروریات لاتے تھے، اور موسمِ حج میں اہل مکہ کے لئے سب ضروریات جمع ہو جاتی تھیں، اب ان کا داخلہ ممنوع ہو جانے کے بعد ہم کیسے جئیں گے، اس کا جواب قرآن میں یہ دیا گیا کہ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۤءَ "یعنی اگر تمہیں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ نظامِ معاش تمام مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے، اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں ان سب کفار سے مستغنی کر دیں گے۔ درمیان "اگر چاہیں گے" کی قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کوئی شک و تردد ہے، بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت بعید از عقل نظر آتی ہے کہ ظاہری ذریعہ معاش یہی غیر مسلم تھے، ان کا داخلہ ممنوع کرنا اپنے لئے اسبابِ معاش منقطع کرنے کے مترادف ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جاتا ہے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں، اس لئے اِنْ شَاۤءَ **فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔**

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا

لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ

حرام جانتے ہیں اس کو جسکو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ
ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل

صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى
ہو کر، اور یہود نے کہا کہ عزیرؑ اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا

الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِــــُٔوْنَ قَوْلَ
کہ مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے ریس کرنے لگے اگلے کافروں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ڄ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾
کی بات کی، ہلاک کرے ان کو اللہ، کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) یمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر (پورا ایمان رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں، اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا (جس کا واقع میں کہیں نام و نشان نہیں) یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں (مراد مشرکین عرب جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مطلب یہ کہ ان کو تو یہ بھی کافر سمجھتے ہیں، پھر انہی کی سی کفریات بکتے ہیں، اور پہلے ہونا اس معنی پر ہو کہ مشرکین کی گمراہی قدیم تھی) خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر اُلٹے جا رہے ہیں (کہ خدا پر ایسے افترا باندھتے ہیں یہ تو ان کے اقوال کفریہ تھے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں مشرکین مکہ سے جہاد و قتال کا ذکر تھا، ان آیات میں اہل کتاب سے جہاد کا بیان ہے، یہ گویا غزوۂ تبوک کی تمہید ہے جو اہل کتاب کے مقابلہ میں

پیش آیا ہے، تفسیر درمنثور میں بروایت ابن منذر حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیات غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اور لفظ اہل کتاب اگرچہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ہر اُس کافر جماعت پر حاوی ہے جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتی ہو، لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ لفظ صرف یہود نصاریٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، کیونکہ عرب کے قرب وجوار میں یہی دو فرقے اہل کتاب کے معروف تھے، اسی لئے قرآن کریم نے مشرکین عرب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ۔

اور جہاد و قتال کا جو حکم اس آیت میں بمقابلہ اہل کتاب دیا گیا ہے وہ درحقیقت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام طوائف کفار کا یہی حکم ہے، کیونکہ اس آیت میں حکم قتال کی جو وجوہ آگے بیان کی گئی ہیں وہ سب کفار میں مشترک ہیں تو حکم بھی مشترک ہونا چاہئے، مگر ذکر میں اہل کتاب کی خصوصیت اس لئے کی گئی کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں جہاد و قتال کرنے سے اس بناء پر جھجک ہو کہ یہ لوگ کسی درجہ میں، ایمان رکھتے ہیں، تورات وانجیل اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام پر ان کا ایمان ہے تو ممکن تھا کہ انبیاء سابقین اور ان کی کتابوں کے ساتھ ان کا منسوب ہونا مسلمانوں کے لئے جہاد سے رکاوٹ کا سبب بن جائے، اس لئے بالتخصیص ان کے ساتھ قتال کا ذکر کر دیا گیا۔

دوسرے اس جگہ ذکر میں اہل کتاب کے ساتھ تخصیص کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ ایک حیثیت سے یہ لوگ زیادہ سزا کے مستحق ہیں کیونکہ یہ اہل علم تھے، ان کے پاس توریت و انجیل کا علم تھا، جس میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اور حلیہ تک تفصیل سے مذکور ہے، اس علم کے باوجود ان کا کفر و انکار اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں تو ایک حیثیت سے ان کا جرم زیادہ شدید ہوگیا، اس لئے خصوصی طور پر ان سے جنگ کا ذکر کیا گیا۔

جنگ کے حکم کی چار وجوہ اس آیت میں بتلائی گئی ہیں، اول لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ، یعنی وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، دوسرے وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسرے لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ یعنی ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ نے حرام بتلایا ہے، چوتھے لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ، یعنی سچے دین کو قبول نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ تو بظاہر خدا تعالیٰ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور آخرت و قیامت کے بھی قائل ہیں، پھر ان چیزوں پر ان کے ایمان کی نفی کیوں کی گئی وجہ یہ ہے کہ محض ایمان لانے کے الفاظ تو کافی نہیں، جس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک

مطلوب ہے، جب اس طرح کا ایمان نہ ہو تو وہ نہ ہونے کے حکم میں ہے، یہود و نصاریٰ نے اگرچہ علانیہ طور پر توحید کا انکار نہیں کیا، مگر جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر اس کی خدائی میں شریک ٹھہرا دیا، اس لئے **ان کا اقرار توحید لغو اور ایمان کا دعویٰ غلط ہوگیا۔**

اسی طرح آخرت پر جس طرح کا ایمان مطلوب ہے وہ بھی اکثر اہل کتاب میں نہیں رہا تھا، ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قیامت میں حشر اجساد یعنی مادی اجسام کی دوبارہ زندگی نہ ہوگی، بلکہ ایک قسم کی روحانی زندگی ہوگی، اور جنت و دوزخ بھی کوئی خاص مقامات نہیں، رُوح کی خوشی کا نام جنت اور رنج کا نام جہنم ہے جو ارشاداتِ ربانی کے سراسر خلاف ہے، اس لئے یوم آخر پر بھی ان کا ایمان درحقیقت ایمان نہ ہوا۔

تیسری چیز جو یہ فرمائی کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے یہ ان کو حرام نہیں سمجھتے اس سے مراد یہ ہے کہ بہت سی چیزیں جن کو تورات یا انجیل نے حرام قرار دیا تھا یہ اس کی حرمت کے قائل نہیں، جیسے ربا (سود) اسی طرح اور بہت سی کھانے پینے کی چیزیں جو تورات و انجیل میں حرام قرار دی گئی تھیں انھوں نے ان کو حرام نہ سمجھا، اور ان میں مبتلا ہوگئے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو حلال سمجھنا صرف ایک گناہ ہی کا ارتکاب نہیں بلکہ کفر ہے، اسی طرح کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی کفر ہے، ہاں اگر حرام کو حرام سمجھتے ہوئے عمل کوتاہی غلطی سے ہو جائے تو وہ کفر نہیں، فسق و گناہ ہے۔

آیت مذکورہ میں ان لوگوں سے جہاد و قتال کرتے رہنے کی ایک حد اور انتہا بھی بتلائی ہے، حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ، یعنی یہ حکم قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ ماتحت ہوکر رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کریں۔

جزیہ کے لغوی معنی بدلے اور جزاء کے ہیں، اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو **کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔**

وجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اللہ اور رسولؐ کی بغاوت ہے جس کی اصلی سزا قتل ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں یہ تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے، اور اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے اُن کی جان و مال، آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی، ان کی مذہبی رسوم میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے، اسی رقم کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

جزیہ کا تعین اگر باہمی مصالحت اور رضامندی سے ہو تو شرعاً اس کی کوئی تحدید نہیں،

جتنی مقدار اور جس چیز پر باہمی معاہدہ صلح کا ہو جائے وہی ان سے لیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حلّے دینے پر معاہدہ ہو گیا، حُلّہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں، ایک تہبند ایک چادر، ہر حُلّہ کی قیمت کا اندازہ بھی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہو گا، اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

اسی طرح نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت فاروق اعظمؓ کا اس پر معاہدہ ہوا کہ ان کا جزیہ اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے دُوگنا۔

اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا پھر وہاں کے باشندوں کی جائداد ان کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا، اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہو گئے تو ان کے جزیہ کی مقدار شرح یہ ہو گی جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار متمول سے چار درہم اور متوسط الحال سے اس کا نصف صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت و تجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا صرف ایک درہم ماہوار یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو بالکل مفلس یا اپاہج یا معذور ہیں ان کو کچھ نہ لیا جائے، اسی طرح عورتوں، بچوں بوڑھوں سے اور ان کے تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔

اتنی قلیل مقدار کے لینے کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ تھیں کہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے، اور جو شخص کسی غیر مسلم باشندہ پر ظلم کرے گا تو میں قیامت کے روز ظالم کے مقابلہ میں اس غیر مسلم کی حمایت کروں گا (مظہری)

اسی طرح کی روایات سے بعض ائمہ فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ دراصل جزیہ کی کوئی خاص شرح شرعاً مقرر نہیں ہے، بلکہ حاکم وقت کی صوابدید پر ہے کہ ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لیکر اس کے مناسب تجویز کریں۔

اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ جزیہ کفار سے سزائے قتل رفع کرنے کا معاوضہ ہے اسلام کا بدلہ نہیں، اس لئے یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام سے اعراض اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیسے دیدی گئی، اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، اپاہج معذور، اگر جزیہ اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہیے تھا۔

آیت مذکورہ میں عطاء جزیہ کے ساتھ جو عَنْ یَّدٍ فرمایا ہے اس میں حرف عَنْ بمعنی سبب اور یَدٌ بمعنی قوت و غلبہ ہے، اور معنی یہ ہیں کہ یہ جزیہ کا دینا بطور اختیاری چندہ یا خیرات کے نہ ہو، بلکہ اسلامی غلبہ کو تسلیم کرنے اور اس کے ماتحت رہنے کی حیثیت سے ہو (کذا فی الروح) اور وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ کے معنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ وہ لوگ اسلام کے عام (جنرل) قانون کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم قرار دیں (روح المعانی و مظہری)

اور اس آیت میں جو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب یہ لوگ جزیہ ادا کرنا منظور کرلیں تو جنگ بند کردی جائے، اس میں جمہور فقہاء کے نزدیک تمام کفار شامل ہیں، خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، البتہ مشرکین عرب اس سے مستثنیٰ ہیں، کہ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا گیا۔

دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے، جس کا ذکر پہلی آیت میں اجمالاً آیا ہے کہ یہ اہل کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اس دوسری آیت میں فرمایا کہ یہود تو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اس لئے ان کا دعوٰی توحید اور ایمان کا غلط ہوا۔

پھر فرمایا ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ "یعنی یہ اُن کا قول ہے ان کے مُنہ سے"، اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ صاف طور پر اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کرتے ہیں کوئی مخفی چیز نہیں اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ کلمہ کفر صرف ان کی زبانوں پر ہے نہ اس کی کوئی وجہ بتاسکتے ہیں نہ دلیل۔

پھر ارشاد فرمایا يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ "یعنی یہ اُن لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو اُن سے پہلے کافر ہوچکے ہیں، خدا ان کو غارت کرے، یہ کدھر اُلٹے جارہے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ . . . . . . انبیاء کو خدا کا بیٹا کہنے میں ایسے ہی ہوگئے جیسے پچھلے کفار و مشرکین تھے، کہ فرشتوں کو اور لات و منات کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ

ٹھہرا لیا انھوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح

ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰــهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ

مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں

إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ

اس کے سوا وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے ، چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ

اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ

کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے برا مانیں

الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ

کافر ، اسی نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین

الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک ،

النصف

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ

اے ایمان والو بہت سے عالم اور درویش اہل کتاب کے

لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی

اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا

راہ سے ، اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا

اللہ کی راہ میں سو ان کو خوشخبری سنا دے عذاب دردناک کی ، جس دن کہ آگ دہکائیں گے اس

فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ

مال پر دوزخ کی ، پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں (کہا جائے گا)

هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ

یہ ہے جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے

تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

گاڑھنے کا ۔

خلاصۂ تفسیر

(آگے افعال کفریہ کا بیان ہے کہ) انھوں نے (یعنی یہود و نصاریٰ نے) خدا (کی توحید فی الطاعۃ) کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے (کہ ان کی اطاعت تحلیل اور تحریم میں مثل اطاعت خدا کے کرتے ہیں کہ نص پر ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسی طاعت بالکل عبادت ہے بس اس حساب سے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں) اور مسیح بن مریم (علیہ السلام) کو بھی (ایک اعتبار سے رب بنا رکھا ہے کہ ان کو ابن اللہ کہتے ہیں کہ الوہیت اس کے لوازم سے ہے) حالانکہ ان کو (کتب الٰہیہ میں) صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود برحق کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور یہ تو بیان تھا اتباع باطل کا آگے بیان ہے اس کا کہ وہ دین حق کو رد کرتے ہیں کہ یہ بھی کفر ہے یعنی) وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار مار کر) بجھا دیں (یعنی منہ سے رد و اعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دین حق کو فروغ نہ ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، گو کافر لوگ (جن میں یہ بھی آگئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ (اسی اتمام نور کے لئے) اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (کہ وہی نور مذکور ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے (کہ یہی تمام ہے) گو مشرک (جن میں یہ بھی داخل ہوگئے) کیسے ہی ناخوش ہوں، اے ایمان والو! اکثر احبار و رہبان (یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ عوام) لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے ...... (جاتے) ہیں (یعنی احکام حقہ کو پوشیدہ رکھ کر موافق مرضی عوام کے فتوے دے کر ان سے نذرانے لیتے ہیں) اور (اس کی وجہ سے وہ) اللہ کی راہ (یعنی دین اسلام) سے (لوگوں کو) باز رکھتے ہیں (کیونکہ ان کے جھوٹے فتووں کے دھوکہ میں آکر گمراہی میں پھنسے رہتے ہیں اور حق کو قبول بلکہ طلب بھی نہیں کرتے) اور (غایت حرص سے مال بھی جمع کرتے ہیں جس کی نسبت یہ وعید ہے کہ) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں (اول) تپایا جائے گا، پھر ان سے لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا، (اور یہ جتلایا جائے گا کہ) یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر کر کے رکھا تھا، سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

اس آیت میں تو ان کے اتباعِ رسل اور تحقیقِ حق کی ناجائز اطاعت کا ذکر تھا اس کے بعد کی آیت میں ان کی ایک اور گمراہی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ صرف اسی پر بس نہیں کرتے کہ خود گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، بلکہ ہدایت اور دینِ حق کے مٹانے اور رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو بطور مثال کے اس طرح فرمایا ہے کہ یہ لوگ اپنے مُنہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ اپنے نور یعنی دینِ اسلام کو مکمل اور پورا ہی کریں گے خواہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اس کے بعد تیسری آیت کے مضمون کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت کا سامان یعنی قرآن اور دینِ حق یعنی اسلام دے کر اسی لئے بھیجا ہے تاکہ اس کو دنیا کے تمام بقیہ دینوں پر غالب کردے، تقریباً انہی لفظوں کے ساتھ قرآن کریم میں متعدد آیات آئی ہیں جن میں یہ وعدہ ہے کہ دینِ اسلام کو تمام دنیا کے ادیان پر غالب کیا جائے گا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ دینِ اسلام کو تمام دوسرے دینوں پر غالب کرنے کی خوشخبری اکثر زمانوں اور کثیر حالات کے اعتبار سے ہے جیسا کہ حضرت مقداد کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے، عزت والوں کی عزت کے ساتھ اور ذلیل لوگوں کی ذلت کے ساتھ جن کو اللہ تعالیٰ عزت دیں گے وہ مسلمان ہو جائیں گے اور جن کو ذلیل کرنا ہے گو وہ اسلام کو قبول تو نہ کریں گے مگر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، ایک ہزار سال کے قریب اسلام کی شان و شوکت پوری دنیا پر چھائی رہی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے عہد مبارک میں تو اس نور کی تکمیل و اتمام کا مشاہدہ ساری دنیا کر ہی چکی ہے، اور آئندہ بھی دلائل اور حقانیت کے اعتبار سے ہر زمانہ میں دینِ اسلام ایسا مکمل دین ہے کہ کسی معقول پسند انسان کو اس پر حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا، اس لئے کفر کی مخالفتوں کے باوجود یہ دینِ حق اپنی حجت و دلیل کے اعتبار سے ہمیشہ غالب ہے، اور جب مسلمان اس دین کی پوری پیروی کریں تو ان کا ظاہری غلبہ اور حکومت و سلطنت بھی اس کے لوازم میں سے ہے، جیسا کہ تاریخ اسلام کا تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن و سنت پر پوری طرح عمل کیا تو کوئی گروہ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکا، اور یہ پوری دنیا پر غالب آکر رہے، اور جب کبھی جہاں کہیں ان کو مغلوب یا مقہور ہونے کی نوبت آئی ہے تو وہ قرآن و سنت کے احکام سے غفلت اور خلاف ورزی کا نتیجہ بد تھا، جو ان کے سامنے آیا، دینِ حق پھر بھی اپنی جگہ مظفر و منصور ہی رہا۔

چوتھی آیت میں مسلمانوں کو مخاطب بنا کر یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کے ایسے حالات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے عوام میں گمراہی پھیلی، مسلمانوں کو مخاطب کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ حالات یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کے بیان ہو رہے ہیں لیکن ان کو بھی اس سے متنبہ رہنا چاہئے کہ ان کے ایسے حالات نہ ہو جائیں۔

اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کے بہت سے علماء و مشائخ کا یہ حال ہے کہ باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور اللہ کے سیدھے راستے سے ان کو روکتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے اکثر علماء و مشائخ کا یہی حال تھا اور ایسے حالات میں عام طور پر کہنے والے سبھی کو برا کہا کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اس جگہ لفظ کَثِيْرًا کا اضافہ کر کے مسلمانوں کو دشمنوں کے معاملہ میں بھی احتیاط کلام کی تلقین فرما دی کہ یہ حال سب لوگوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان میں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں، ان کی گمراہی یہ بتلائی گئی کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں، باطل طریقہ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ بعض اوقات ان لوگوں سے پیسے لے کر حکم تورات کے خلاف فتویٰ دیدیتے تھے، اور بعض اوقات احکام الٰہی میں اخفاء و تلبیس سے کام لیتے تھے، اس پر مزید ان کی یہ گمراہی بتلائی گئی کہ یہ کم بخت صرف خود ہی گمراہ نہیں بلکہ دوسرے طالبانِ رشد و ہدایت کو اللہ کے راستہ سے روکنے کا سبب بھی ہیں کیونکہ جب لوگ اپنے مقتداؤں کو ایسے کام کرتے دیکھیں تو ان میں بھی جذبۂ حق پرستی مرجاتا ہے، اس کے علاوہ ان کے غلط فتووں کی بنیاد پر وہ گمراہی اور غلطی کو درست و صواب و صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کی یہ بیماری کہ پیسوں کے لالچ میں غلط فتویٰ دیدیں چونکہ حبِّ مال اور حرصِ دنیا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، اس لئے آیت مذکورہ میں حُبِّ مال کے اندر غلو کے نتائج بد اور عذاب الیم کا بیان اور اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ذکر کیا ہے، ارشاد ہے، وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ”یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دیجئے“۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا کے لفظوں سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ بقدر ضروری اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو باقی ماندہ جمع کیا ہوا مال ان کے حق میں مضر نہیں۔

حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ کنز مذموم میں داخل نہیں۔ (ابوداؤد، احمد وغیرہ)

جس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال باقی رہے اس کا جمع رکھنا کوئی گناہ نہیں۔

جمہور فقہاء و ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا کی ضمیر فِضَّة کی طرف راجع ہے، جس کے معنی چاندی کے ہیں، اوپر سونے اور چاندی دو چیزوں کا ذکر تھا مگر ضمیر صرف چاندی کی طرف راجع کی گئی، تفسیر مظہری میں اس کو اشارہ اس بات کا قرار دیا ہے کہ جب کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی تھوڑا تھوڑا موجود ہو تو اعتبار چاندی کا کیا جائے گا، سونے کی قیمت بھی چاندی کے حساب میں لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

پانچویں آیت میں اس عذاب الیم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے: يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ "یعنی زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کو یہ عذاب الیم اس دن ہوگا جب کہ ان کے جمع کئے ہوئے سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر داغ دیئے جائیں گے، اور ان سے زبانی سزا کے طور پر کہا جائے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اپنے جمع کئے ہوئے سرمایہ کو چکھو، اس سے معلوم ہوا کہ جزاء عمل عین عمل ہے، جو سرمایہ ناجائز طور پر جمع کیا تھا، یا اصل سرمایہ تو جائز تھا مگر اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خود وہ سرمایہ ہی ان لوگوں کا عذاب بن گیا۔

اس آیت میں داغ لگانے کے لئے پیشانیوں، پہلوؤں، پشتوں کا ذکر کیا گیا ہے، یا تو اس سے مراد پورا بدن ہے، اور یا پھر ان تین چیزوں کی تخصیص اس بناء پر ہو کہ بخیل آدمی جو اپنا سرمایہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا نہیں چاہتا، جب کوئی سائل یا زکوٰۃ کا طلبگار اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر سب سے پہلے اس کی پیشانی پر بل آتے ہیں، پھر اس سے نظر بچانے کے لئے یہ داہنے بائیں مڑنا چاہتا ہے، اور اس سے بھی سائل نہ چھوڑے تو اس کی طرف پشت کر لیتا ہے، اس لئے پیشانی، پہلو، پشت اس عذاب کے لئے مخصوص کئے گئے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن اس نے پیدا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ

کئے آسمان اور زمین ان میں چار مہینے ہیں ادب کے، یہی ہے سیدھا دین

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا

سو ان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب مشرکوں سے ہر حال میں جیسے

يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا

وہ لڑتے ہیں تم سے سب جمع ہو کر اور جان رکھو کہ اللہ ساتھ ہے ڈر والوں کے۔ یہ جو

النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ

مہینہ ہٹا دینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں گمراہی میں پڑتے ہیں اس سے کافر، حلال

عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا

کر لیتے ہیں اس مہینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں دوسرے برس تاکہ پوری کر لیں گنتی ان مہینوں کی جو

مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

اللہ نے ادب کیلئے رکھے ہیں، پھر حلال کر لیتے ہیں جو مہینہ کہ اللہ نے حرام کیا بھلے کر دیئے گئے ان کی نظر میں ان کے برے کام، اور

الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

اللہ رستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو

ع ۵ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

یقیناً شمار مہینوں کا (جو کہ) کتاب الٰہی (یعنی حکم شرعی) میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں (اور کچھ آج سے نہیں بلکہ) جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے (اسی روز سے) اور ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب) یہی (امر مذکور) دین مستقیم ہے (یعنی ان مہینوں کا بارہ ہونا اور چار کا بتخصیص اشہر حرم ہونا اور بخلاف عادت جاہلیت کے کبھی سال کے مہینوں کا عدد بڑھا دیتے اور کبھی اشہر حرم کی تخصیص چھوڑ دیتے کہ یہ بد دینی ہے) سو تم ان سب مہینوں کے بارے میں (دین کے خلاف کر کے جو کہ موجب گناہ ہے) اپنا نقصان مت کرنا (یعنی اس عادت جاہلیت کے موافق مت کرنا) اور ان مشرکین سے (جبکہ یہ اپنی کفریات کو جن میں یہ خاص عادت بھی آگئی نہ چھوڑیں) سب سے لڑنا جیسا کہ وہ تم سب (مسلمانوں) سے (لڑنے کو ہر وقت تیار رہا کرتے ہیں) اور (اگر ان کے جمعیت و سامان سے اندیشہ ہو تو) یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے (پس ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار رکھو اور کسی سے مت ڈرو، آگے ان کی عادت جاہلیت کا بیان ہے کہ) یہ (مہینوں کا یا ان کی حرمت کا آگے کو) ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے جس سے (عام) کافر گمراہ کئے جاتے ہیں (اس طور پر کہ وہ اس حرام مہینہ کو کسی سال (نفسانی غرض سے) حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال

رجب کو کوئی غرض نہ ہو، حرام سمجھتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں (صرف) ان کی گنتی (برابر) خواہ تخصیص و تعیین پوری کریں پھر (بسبب تخصیص و تعیین نہ رہی تو) اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بد اعمالیاں ان کو مستحسن معلوم ہوتی ہیں، اور (ان کے اصرار علی الکفر پر غم کرنا بے سود ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (کیونکہ یہ خود راہ پر آنا نہیں چاہتے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کے کفر و شرک، گمراہی اور بد اعمالیوں کا ذکر تھا، ان دو آیتوں میں بھی اسی سلسلہ کا ایک مضمون اہل عرب جاہلیت کی ایک جاہلانہ رسم بد کا بیان اور مسلمانوں کو اس سے اجتناب کی ہدایت ہے، وہ رسم بد ایک واقعہ سے متعلق ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد قدیم سے تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اور ان میں سے چار مہینے بڑے متبرک اور ادب و احترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے، تین مہینے مسلسل ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک رجب کا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل و قتال بھی ممنوع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے قائل اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، اور چونکہ ملت ابراہیم میں بھی ان چار مہینوں اشہر حرم میں قتل و قتال اور فساد ممنوع تھا، اہل جاہلیت پر اس حکم کی تعمیل کرنی سخت دشوار تھی، کیونکہ دور جاہلیت میں قتل و قتال ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نفسانی اغراض کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی اشہر حرم کے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آئی یا لڑتے لڑتے شہر حرام آجاتا تو کہہ دیتے کہ اب کے سال یہ مہینہ حرام نہیں ہوگا، مثلاً محرم آگیا تو کہتے کہ اس سال محرم کا مہینہ حرام نہیں بلکہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاول حرام ہوگا، یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ پہلے آگیا، محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنادیا، غرض سال بھر میں چار مہینے تو پورے کر لیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب

اور تعیین کا بھی یہ اختیار رکھتے تھے کہ جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں جس کو چاہیں مقدم کر دیں جس کو چاہیں مؤخر کر دیں اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی مثلاً لڑتے لڑتے دس مہینے گذر گئے اور سال ختم ہونے میں صرف دو ہی مہینے باقی رہ گئے، تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھا دیتے، اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اس طرح باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہر حرم بنا لیتے تھے۔

غرض اہل جاہلیت بھی اتنا تو احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں قتل و قتال سے باز رہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی متعین فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا اس میں طرح طرح کی ترمیمیں کر کے اپنی اغراض نفسانی کو پورا کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز بڑا دشوار ہو گیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان کا، شوال کا ہے اور کونسا ذی قعدہ، ذی الحجہ یا رجب کا ہے، ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور نویں سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کو موسم حج میں تمام کفار و مشرکین سے برأت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، مگر جاہلیت کے اسی پرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی قعدہ کا قرار دیا تھا، اور اس سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ بجائے ذی الحجہ کے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر سنہ ۱۰ھ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو قدرتی طور پر ایسا نظام بن گیا کہ مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا اہل جاہلیت کے حساب سے بھی وہ ذی الحجہ ہی قرار پایا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، یعنی زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اسی ہیئت پر آ گیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا، یعنی جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسم جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین میں کمی بیشی اور ردوبدل کر کے کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں ان تمام احکام شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً عشرۂ ذی الحجہ میں احکام حج اور عشرۂ محرم کے روزے اور ختم سال پر زکوٰۃ وغیرہ کے احکام۔

بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر مقدم و مؤخر کر دیا، کہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں احکام شرعیہ کی تحریف ہو کر عمل برباد ہوا، قرآن مجید کی ان دو آیتوں میں اسی رسم جاہلیت کی خرابی اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا، اس میں لفظ عِدَّۃ

تعداد کے معنی میں ہے، اور شہور، شہر کی جمع ہے، شہر کے معنی مہینہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ متعین ہے، اس میں کسی کو کمی بیشی کا کوئی اختیار نہیں۔

اس کے بعد فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ کا لفظ بڑھا کر بتلا دیا کہ یہ بات ازل سے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی، پھر یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فرما کر اشارہ کر دیا کہ قضاء خداوندی اس معاملہ میں اگرچہ ازل میں جاری ہو چکی تھی، لیکن یہ مہینوں کی ترتیب اور تعیین اس وقت عمل میں آئی جب آسمان و زمین پیدا کئے گئے۔

پھر ارشاد فرمایا مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، یعنی ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، ان کو حرمت والا دو معنی کے اعتبار سے کہا گیا، ایک تو اس لئے کہ ان میں قتل و قتال حرام ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ مہینے متبرک اور واجب الاحترام ہیں، ان میں عبادات کا ثواب زیادہ ملتا ہے، ان میں سے پہلا حکم تو شریعت اسلام میں منسوخ ہو گیا، مگر دوسرا حکم احترام و ادب اور ان میں عبادت گذاری کا اہتمام اسلام میں بھی باقی ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبۂ یوم النحر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہینوں کی تشریح یہ فرمائی کہ تین مہینے مسلسل ہیں، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور ایک مہینہ رجب کا ہے، مگر ماہ رجب کے معاملہ میں عرب کے دو قول مشہور تھے، بعض قبائل اس مہینہ کو رجب کہتے تھے جس کو ہم رمضان کہتے ہیں، اور قبیلۂ مضر کے نزدیک رجب وہ مہینہ تھا جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجب مضر فرما کر یہ وضاحت بھی فرما دی کہ جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے وہ ماہ رجب مراد ہے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، یہی دین مستقیم ہے یعنی مہینوں کی تعیین و ترتیب اور ان میں ہر مہینہ خصوصاً شہر حرم کے متعلق جو احکام ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم ازلی کے مطابق رکھنا ہی دین مستقیم ہے، اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی و تغیر و تبدل کرنا کج فہمی اور کج طبعی کی علامت ہے۔

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ، یعنی ان مقدس مہینوں میں تم اپنا نقصان نہ کر بیٹھنا کہ ان کے معینہ احکام و احترام کی خلاف ورزی کر دو، یا عبادت گذاری میں کوتاہی کرو۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان متبرک مہینوں کا خاصہ یہ ہے کہ ان میں جو شخص کوئی عبادت کرتا ہے اس کو بقیہ مہینوں میں بھی عبادت کی توفیق اور ہمت ہوتی ہے، اسی طرح جو شخص کوشش کر کے ان مہینوں میں اپنے آپ کو گناہوں اور برے کاموں سے بچالے تو باقی سال کے مہینوں میں اس کو ان برائیوں سے بچنا آسان

ہو جاتا ہے، اس لئے ان مہینوں سے فائدہ نہ اٹھانا ایک عظیم نقصان ہے۔

یہاں تک مشرکین مکہ کی ایک خاص رسم جاہلیت کا بیان اور اس کا ابطال تھا، آخر آیت میں پھر اس حکم کا اعادہ ہے جو شروع سورۃ میں دیا گیا تھا کہ میعاد معاہدہ ختم ہونے کے بعد تمام مشرکین وکفار سے جہاد واجب ہے۔

دوسری آیت میں بھی اسی رسم جاہلیت کا ذکر اس طرح فرمایا اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ، لفظ نسیئ مصدر ہے، جس کے معنی پیچھے ہٹا دینے اور مؤخر کر دینے کے ہیں، اور بمعنی مؤخر بھی استعمال ہوتا ہے۔

مشرکین عرب نے ان مہینوں کے آگے پیچھے کرنے کو یہ سمجھا تھا کہ اس طرح ہماری اغراض نفسانی بھی فوت نہ ہوں گی، اور حکم خداوندی کی تعمیل بھی ہو جائے گی، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارا مہینوں کو مؤخر کرنا اور اپنی جگہ سے ہٹا دینا کفر میں اور زیادتی ہے، جس سے ان کفار کی گمراہی اور بڑھتی ہے، کہ وہ شہر حرام کو کسی سال تو حرام قرار دیں اور کسی سال حلال کر لیں۔ لِّیُوَاطِــُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، یعنی تاکہ وہ پوری کر لیں گنتی ان مہینوں کی جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض گنتی پوری کر لینے سے تعمیل حکم نہیں ہوتی، بلکہ جو حکم جس مہینہ کے لئے دیا گیا ہے اسی مہینہ میں اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

احکام و مسائل

مذکورہ آیتوں سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور ان مہینوں کے جو نام اسلام میں معروف ہیں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں، بلکہ رب العالمین نے جس دن آسمان و زمین پیدا کئے اسی دن یہ ترتیب اور یہ نام اور ان کے ساتھ خاص خاص مہینوں کے خاص خاص احکام متعین فرما دیئے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک احکام شرعیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے، اسی قمری حساب پر تمام احکام شرعیہ، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دائر ہیں، لیکن قرآن حکیم نے تاریخ و سال معلوم کرنے کے لئے جیسے قمر کو علامت قرار دیا ہے اسی طرح آفتاب کو بھی اس کی علامت فرمایا ہے، لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ، اس لئے تاریخ و سال کا حساب چاند اور سورج دونوں سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے لئے چاند کے حساب کو پسند فرمایا، اور احکام شرعیہ اس پر دائر فرمائے، اس لئے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے، اگر ساری امت قمری حساب ترک کر کے اس کو بھلا دے تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی جائز ہے، لیکن سنت اللہ اور سنت سلف کے خلاف ضرور ہے، اس لئے بلا ضرورت اس کو اختیار کرنا اچھا نہیں۔

حساب کو پورا کرنے کے لئے جو لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا ہے بعض لوگوں نے اس کو بھی اس آیت کے تحت ناجائز سمجھا ہے، مگر وہ صحیح نہیں، کیونکہ جس حساب میں لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں اس سے احکام شرعیہ کا تعلق نہیں، اہل جاہلیت قمری اور شرعی مہینوں میں زیادتی کر کے شرعی احکام کو بدلتے تھے، اس لئے منع کیا گیا، لوند کا کوئی اثر شرعی احکام پر نہیں پڑتا اس لئے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں

اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا

تو گرے جاتے ہو زمین پر کیا خوش ہو گئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر سو کچھ نہیں

مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ

نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت تھوڑا، اگر تم نہ نکلو گے تو دے گا تم کو عذاب

عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ

دردناک اور بدلہ میں لا دے گا اور لوگ تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے تم اس کا، اور اللہ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ

سب چیز پر قادر ہے، اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت اس کو

الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ

نکال دیا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ

سے تو غم نہ کھا، بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین اور اس کی مدد

بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَ

کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں اور نیچے ڈالی بات کافروں کی، اور

كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾ انْفِرُوا خِفَافًا

اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے، اور اللہ زبردست ہے حکمت والا، نکلو ہلکے

وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ

اور بوجھل اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں یہ

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا

بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے ، اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر

قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ

ہلکا تو وہ لوگ ضرور تیرے ساتھ ہوتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب قسمیں کھائیں گے

بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ

اللہ کی کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور چلتے تمہارے ساتھ، وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو، اور اللہ

يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

ع ۵ / ۱۲

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (یعنی نکلتے اور چلتے نہیں) کیا تم نے آخرت کے عوض دنیوی زندگی پر قناعت کرلی سو دنیوی زندگی کا تمتع تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل ہے، اگر تم (جہاد کے لئے) نہ نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا (یعنی تم کو ہلاک کر دیگا) اور تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اللہ (کے دین) کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے اگر تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ کرو گے تو اللہ آپ کی مدد کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اس وقت کرچکا ہے جبکہ (اس سے زیادہ مصیبت و پریشانی کا وقت تھا جبکہ) آپ کو کافروں نے (تنگ کر کر کے مکہ سے) جلاوطن کر دیا تھا جبکہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے (اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے) جس وقت کہ دونوں (صاحب) غار (ثور) میں (موجود) تھے جبکہ آپ اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم (کچھ) غم نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ (کی مدد) ہمارے ہمراہ ہے سو (وہ مدد یہ ہوئی کہ) اللہ تعالیٰ نے آپ (کے قلب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی اور آپ کو (ملائکہ کے) ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات

(اور تدبیر) نیچی کر دی (کہ وہ ناکام رہے) اور اللہ ہی کا بول بالا رہا (کہ ان کی تدبیر اور حفاظت غالب رہی) اور اللہ زبردست حکمت والا ہے (اسی لئے اسی کی بات اور حکمت غالب رہی جہاد کیلئے) نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سامان سے (ہو) اور (خواہ) زیادہ سامان سے (ہو) اور اللہ ہی کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو، (تو دیر مت کرو) اگر کچھ لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی ہوتا تو یہ (منافق) لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی (اس لئے یہاں ہی رہ گئے) اور ابھی (جب تم لوگ واپس آؤ گے تو) خدا کی قسمیں کھا جائیں گے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے، یہ لوگ (جھوٹ بول بول کر) اپنے آپ کو تباہ (یعنی مستحق عذاب) کر رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں (بلاشبہ انکو استطاعت تھی اور پھر یہ نہیں گئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک اہم غزوہ کا بیان اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں، یہ غزوہ غزوۂ تبوک کے نام سے موسوم ہے، اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا تقریباً آخری غزوہ ہے۔

تبوک، مدینہ کے شمال میں سرحدِ شام پر ایک مقام کا نام ہے، شام اس وقت رومی مسیحیوں کی حکومت کا ایک صوبہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ ہجری میں جب فتح مکہ اور غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت جزیرۃ العرب کے اہم حصے اسلامی حکومت کے زیر نگیں آچکے تھے، اور مشرکینِ مکہ کی ہشت سالہ مسلسل جنگوں کے بعد اب مسلمانوں کو ذرا سکون کا وقت ملا تھا۔

مگر جس ذات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، نازل فرما کر پورے عالم کی فتوحات اور اس میں اپنے دین حق کو غالب کرنے کی بشارت دیدی تھی اس کو اور اس کے رفقاء کار کو فرصت کہاں، مدینہ پہونچتے ہی ملک شام سے آنے والے تجارت پیشہ لوگ جو شام سے زیتون کا تیل لاکر مدینہ وغیرہ میں فروخت کیا کرتے تھے، ان لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ شاہِ روم ہرقل نے اپنی فوجیں مقامِ تبوک میں سرحدِ شام پر جمع کر دی ہیں، اور فوجیوں کو پورے ایک سال کی تنخواہیں پیشگی دے کر مطمئن اور خوش کر دیا ہے، اور عرب کے بعض قبائل سے بھی ان کی سازباز ہے، ان کا تہیہ یہ ہے کہ مدینہ پر یکبارگی حملہ کریں۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہونچی تو آپ نے یہ ارادہ فرمالیا کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے پیش قدمی کرکے دیں۔ . . . مقابلہ کیا جائے جہاں ان کی فوجیں جمع ہیں (تفسیر مظہری بحوالہ محمد بن یوسف صالحی)

یہ زمانہ اتفاق سے سخت گرمی کا زمانہ تھا، اور مدینہ کے حضرات عموماً زراعت پیشہ لوگ تھے، ان کی کھیتیاں اور باغات کے پھل پک رہے تھے جس پر ان کی ساری معیشت اور پوری سال کے گذارہ کا مدار تھا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح ملازمت پیشہ لوگوں کی جیبیں مہینہ کے آخری دنوں میں خالی ہوجاتی ہیں اسی طرح زراعت پیشہ لوگ فصل کے ختم پر خالی ہاتھ ہوتے ہیں، ایک طرف افلاس دوسری طرف قریب آمدنی کی امید، اس پر مزید موسم گرما کی شدت اس قوم کے لئے جس کو ابھی ابھی ایک حریف کے ساتھ آٹھ سال مسلسل جنگوں کے بعد ذرا دم لینے کا موقع ملا تھا، ایک انتہائی صبر آزما امتحان تھا۔

مگر وقت کا تقاضا تھا، اور یہ جہاد اپنی نوعیت میں پہلی سب جنگوں سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ پہلے تو اپنی ہی طرح کے عوام سے جنگ تھی، اور یہاں ہرقل شاہ روم کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ تھا، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے پورے مسلمانوں کو اس جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دیدیا، اور کچھ آس پاس کے دوسرے قبائل کو بھی شرکت جہاد کے لئے دعوت دی تھی۔

یہ اعلان عام اسلام کے فداکاروں کا ایک سخت امتحان تھا، اور منافق دعویداروں کا امتیاز بھی اس کے علاوہ لازمی نتیجہ کے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کے مختلف حالات ہوگئے، قرآن کریم نے ان میں سے ہر حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں۔

ایک حالت ان کامل مخلص حضرات کی تھی جو بلا تردد جہاد کے لئے تیار ہوگئے، دوسری وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردد کے بعد ساتھ ہوگئے، ان دونوں طبقوں کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ، "یعنی وہ لوگ قابل مدح ہیں جنھوں نے سخت تنگی کے وقت رسول کریمؐ کا اتباع کیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک فریق کے قلوب لغزش کرنے لگے تھے"۔

تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح عذر کی بناء پر اس جہاد میں نہ جاسکے، اس کے متعلق قرآن کریم نے آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَي الْمَرْضٰى میں ان کے عذر کی قبولیت کا اظہار فرما دیا۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی کے سبب جہاد میں

شریک نہیں ہوئے، ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں، اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ اور اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اور وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا الآیۃ تینوں آیتیں ایسے ہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں جن میں ان کی کاہلی پر زجر و تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی توبہ قبول ہونے کی بشارت بھی۔

پانچواں طبقہ منافقین کا تھا جو اپنے نفاق کی وجہ سے اس سخت امتحان میں اپنے نفاق کو چھپا نہ سکے، اور شرکت جہاد سے الگ رہے، اس طبقہ کا ذکر بہت سی آیات میں آیا ہے۔

چھٹا طبقہ ان منافقین کا تھا جو جاسوسی اور شرارت کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا تھا ان کی حالت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہے، وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ - وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ - وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا۔

لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود شرکت جہاد سے باز رہنے والوں کی مجموعی تعداد پھر بھی برائے نام تھی، بھاری اکثریت انہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے منافع اور راحت کو قربان کر کے اللہ کی راہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے، اسی لئے اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی جہاد میں نظر نہیں آئی۔

نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ جب ہرقل شاہ روم کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کے مقابلہ پر آنے کی خبر پہنچی تو اس پر رعب طاری ہو گیا، مقابلہ پر نہیں آیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرشتہ خصلت صحابہ کرام کے لشکر کے ساتھ چند روز محاذِ جنگ پر قیام کر کے جب مخالف کے مقابلہ پر آنے سے مایوس ہو گئے تو واپس تشریف لے آئے۔

جو آیتیں اوپر لکھی گئی ہیں بظاہر ان کا تعلق اس چوتھی جماعت سے ہے جو بغیر کسی صحیح عذر کے اپنی سستی اور کاہلی کی بناء پر شریک جہاد نہیں ہوئے، پہلی آیت میں ان کو اس کاہلی اور غفلت پر تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ ان کے اس مرض غفلت و کاہلی کا سبب اور پھر اس کا علاج بھی ارشاد فرما دیا گیا، جس کے ضمن میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ:

دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت تمام جرائم کی بنیاد ہے

کیونکہ مرض کا جو سبب اور علاج اس جگہ بیان فرمایا گیا ہے اگرچہ اس جگہ اس کا تعلق ایک خاص واقعہ سے تھا، لیکن اگر غور کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی، سستی اور غفلت اور تمام جرائم اور گناہوں کا اصلی سبب یہی دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت ہے، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، حُبُّ الدُّنْيَا رَاْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ، یعنی دنیا کی محبت ہر خطا کی

گناہ کی بنیاد ہے، اسی لئے آیت مذکورہ میں فرمایا گیا کہ:

"اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا کہ جب تمہیں اللہ کے راستہ میں نکلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (حرکت کرنا نہیں چاہتے) کیا تم آخرت کے بدلے صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہوگئے!"

تشخیص مرض کے بعد اس کا علاج اگلے جملہ میں اس طرح ارشاد ہوا کہ:

"دنیوی زندگی سے نفع اٹھانا تو کچھ بھی نہیں بہت قلیل و حقیر ہے"

جس کا حاصل یہ ہے کہ بڑی فکر آخرت کی دائمی زندگی کی چاہئے، اور یہ فکر آخرت ہی درحقیقت سارے امراض کا واحد اور مکمل علاج ہے اور انسداد جرائم کے لئے بے نظیر نسخہ اکسیر ہے۔

عقائد اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں: توحید، رسالت اور آخرت، ان میں عقیدۂ آخرت درحقیقت اصلاح عمل کی روح اور جرائم اور گناہوں کے آگے ایک آہنی دیوار ہے، اگر غور کیا جاوے تو بدیہی طور پر معلوم ہوگا کہ دنیا میں امن و سکون اس عقیدہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ آج کی دنیا میں مادی ترقیات اپنے شباب کو پہنچی ہوئی ہیں، جرائم کے انسداد کے لئے بھی کسی ملک و قوم میں مادی تدبیروں کی کوئی کمی نہیں، قانون کی جکڑ بندی اور اس کے لئے انتظامی مشینری روز بروز ترقی پر ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی آنکھوں دیکھا حال ہے کہ جرائم ہر جگہ اور ہر قوم میں روز بروز ترقی ہی پر ہیں، ہماری نظر میں اس کی وجہ اس کے سوا نہیں کہ مرض کی تشخیص اور علاج کا رُخ صحیح نہیں، مرض کا سرچشمہ مادہ پرستی اور مادیت میں انہماک اور آخرت سے غفلت و اعراض ہے، اور اس کا واحد علاج ذکر اللہ اور آخرت کی فکر ہے، جس وقت اور جس جگہ بھی دنیا میں اس اکسیری نسخہ کو استعمال کیا گیا پوری قوم اور اس کا معاشرہ صحیح انسانیت کی تصویر بن کر فرشتوں کے لئے قابل رشک ہوگیا، عہد رسالت اور عہد صحابہ کرام کا مشاہدہ اس کے لئے کافی دلیل ہے۔

آج کی دنیا جرائم کا انسداد تو چاہتی ہے، مگر خدا و آخرت سے غافل ہو کر چاہتی ہے اور قدم قدم پر ایسے سامان جمع کرتی ہے جس میں رہ کر خدا و آخرت کی طرف دھیان بھی نہ آئے تو اس کا لازمی نتیجہ وہی تھا جو آنکھوں کے سامنے آرہا ہے، کہ بہتر سے بہتر قانون اور قانونی مشینریاں سب فیل نظر آتی ہیں، جرائم اپنی جگہ نہ صرف موجود بلکہ روز بروز نئی رفتار سے بڑھ رہے ہیں کاش ایک مرتبہ عقلاء دنیا اس قرآنی نسخہ کو استعمال کرکے دیکھیں تو انھیں معلوم ہو کہ کس قدر آسانی کے ساتھ جرائم پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

دوسری آیت میں سستی و کاہلی برتنے والوں کو ان کے مرض اور علاج پر متنبہ کرنے

کے بعد آخری فیصلہ یہ بھی سنا دیا کہ :

"اگر تم جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیں گے اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیں گے، اور دین پر عمل نہ کرنے سے تم اللہ کو یا اللہ کے رسول کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

تیسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ پیش کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول کسی انسان کی نصرت و امداد کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو براہ راست غیب سے امداد پہنچا سکتے ہیں، جیسے کہ ہجرت کے وقت پیش آیا جب آپ کو آپ کی برادری اور اہل وطن نے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، سفر میں آپ کا رفیق بھی بجز صدیق کے سوا کوئی نہ تھا، دشمنوں کے پیادے اور سوار تعاقب کر رہے تھے، آپ کی جائے پناہ بھی کوئی مستحکم قلعہ نہ تھا بلکہ ایک غار تھا، جس کے کنارے تک تلاش کرنے والے دشمن پہونچ چکے تھے، اور رفیق غار ابوبکرؓ کو اپنی جان کا تو غم نہ تھا، مگر اس لئے سہمے ہوئے تھے کہ یہ دشمن سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو جائیں گے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ ثبات بنے ہوئے نہ صرف خود مطمئن تھے، بلکہ اپنے رفیق صدیقؓ کو فرما رہے تھے لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا "تم غمگین نہ ہو کیونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

یہ بات کہنے کو تو دو لفظ ہیں جن کا بولنا کچھ مشکل نہیں، مگر سننے والے حالات کا پورا نقشہ سامنے رکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ محض مادیت پر نظر رکھنے والے سے یہ اطمینان ممکن ہی نہیں، اس کا سبب اس کے سوا نہ تھا جس کو قرآن نے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ :

"اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک پر تسلی نازل فرما دی، اور ایسے لشکروں سے آپ کی امداد فرمائی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا"۔

یہ لشکر فرشتوں کے لشکر بھی ہو سکتے ہیں اور پورے عالم کی قوتیں خود بھی خدائی لشکر ہیں وہ بھی ہو سکتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر کفر کا کلمہ پست ہو کر رہ اور اللہ ہی کا بول بالا ہوا۔

چوتھی آیت میں پھر تاکید کے طور پر اس حکم کا اعادہ فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دیدیا تو تم پر نکلنا ہر حال میں فرض ہو گیا، اور اس حکم کی تعمیل ہی میں تمہاری ہر بھلائی کا انحصار ہے۔

پانچویں آیت میں جہاد میں بوجہ غفلت و سستی شریک نہ ہونے والوں کے ایک عذر کا بیان کر کے اس کی تردید کی گئی ہے کہ یہ عذر قابل قبول نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اختیار اور قدرت عطا فرمائی تھی انہوں نے اس کو اللہ کی راہ میں مقدور بھر استعمال نہیں کیا، اس لئے عدم استطاعت کا عذر صحیح نہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا

اللہ بخشے تجھ کو کیوں رخصت دیدی تو نے ان کو یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے تجھ پر سچ کہنے والے

وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

اور جان لیتا تو جھوٹوں کو ، نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لاتے اللہ پر اور

الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

ڈر والوں کو ، رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور آخرت کے دن پر اور شک میں پڑے ہیں دل ان کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں ،

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ

اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اس کا لیکن پسند نہ کیا اللہ نے

انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ

ان کا اٹھنا سو روک دیا ان کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو ساتھ بیٹھنے والوں کے ، اگر

خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ

نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر

يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

بگاڑ کرانے کی تلاش میں اور تم میں بعضے جاسوس ہیں ان کے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ

ظالموں کو ، وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور الٹتے رہے ہیں

الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

تیرے کام یہاں تک کہ آپہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا اور وہ ناخوش ہی رہے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ

اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے وہ تو گمراہی میں پڑ چکے ہیں

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ

اور بیشک دوزخ گھیر رہی ہے کافروں کو، اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بری لگتی ہے انکو

وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ

اور اگر پہنچے کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور

يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

پھر کر جاویں خوشیاں کرتے، تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ

لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ

نے ہمارے لئے وہی ہے کارساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ کریں مسلمان، تو کہہ

هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ

تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم امیدوار ہیں تمہارے

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ

حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں،

فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کردیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دیدی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہوجاتے اور (جب تک کہ) جھوٹوں کو معلوم نہ کرلیتے (تاکہ وہ خوش تو نہ ہونے پاتے کہ ہم نے آپ کو دھوکہ دیدیا اور) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں (اس میں شریک نہ ہونے کی کبھی) آپ سے رخصت نہ مانگیں گے (بلکہ وہ حکم کے ساتھ

دوڑے پھریں گے، اور اللہ تعالیٰ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے (ان کو جزاء ثواب دے گا)، البتہ وہ لوگ (جہاد میں نہ جانے کی) آپ سے رخصت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل (اسلام سے) شک میں پڑے ہیں سو وہ اپنے شکوک میں پڑے ہوئے حیران ہیں (کبھی موافقت کا خیال ہوتا ہے کبھی مخالفت کا)، اور اگر وہ لوگ (غزوہ میں) چلنے کا ارادہ کرتے (جیسا کہ وہ اپنے عذر کے وقت ظاہر کرتے ہیں کہ جانے کا ارادہ تھا، لیکن کیا کیا جائے فلاں ضرورت پیش آگئی سو اگر ایسا ہوتا) تو اس (چلنے) کا کچھ سامان تو درست کرتے (جیسا کہ سفر کے لوازم عادیہ سے ہے) لیکن (انھوں نے تو شروع سے ارادہ ہی نہیں کیا اور اس میں خیر ہوئی جیسا آگے آتا ہے لو خرجوا فیکم اور اس کے خیر ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو (اور ان کے جانے میں خیر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ) اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوا اس کے کہ اور دونا فساد کرتے اور کیا ہوتا (وہ فساد یہ ہوتا کہ) تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے (لگائی بجھائی کرکے آپس میں تفریق ڈلواتے، اور جھوٹی خبریں اڑا کر پریشان کرتے، دشمن کا رعب تمہارے قلوب میں ڈالنے کی کوشش کرتے، اس لئے ان کا جانا ہی اچھا ہوا) اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں (جن کو اس سے زیادہ فساد کی تدبیر میں مہارت نہیں)، اور اللہ ان ظالموں کو خوب سمجھے گا، اور ان لوگوں کی مفسدہ سازی وفتنہ پردازی کچھ آج نئی نہیں، انھوں نے تو پہلے (جنگ احد وغیرہ میں) بھی فتنہ پردازی کی فکر کی تھی (کہ ساتھ ہوکر عین وقت پر ہٹ گئے کہ مسلمان دل شکستہ ہوجائیں، اور اس کے علاوہ بھی) آپ کی (ضرر رسانی کے) لئے کارروائیوں کی الٹ پھیر کرتے ہی رہے، یہاں تک کہ سچا وعدہ آگیا اور اس کا آنا یہ ہے کہ) اللہ کا حکم غالب رہا اور ان کو ناگوار ہی گذرتا رہا، (اسی طرح آئندہ بھی بالکل تسلی رکھئے کچھ فکر نہ کیجئے)، اور ان (منافقین متخلفین) میں بعضا شخص وہ ہے جو (آپ سے) کہتا ہے کہ مجھ کو (غزوہ میں نہ جانے کی اور گھر رہنے کی) اجازت دیدیجئے، اور مجھ کو خرابی میں نہ ڈالئے، خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ خرابی میں تو پڑ ہی چکے ہیں (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور کفر سے بڑھ کر اور کونسی خرابی ہوگی)، اور یقیناً دوزخ (آخرت میں) ان کافروں کو گھیرے گی، اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو وہ ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے، اور اگر آپ پر کوئی حادثہ پڑتا ہے تو (خوش ہوکر) کہتے ہیں کہ ہم نے تو اسی واسطے پہلے سے اپنا احتیاط کا پہلو اختیار کر لیا تھا، (کہ ان کے ساتھ لڑائی وغیرہ میں نہیں گئے تھے)

اور (یہ کہہ کر) وہ خوش ہوتے ہوئے چلے جاتے ہیں آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرما دیجئے، (ایک تو یہ کہ) ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارا مالک ہے (پس مالک حقیقی جو تجویز کرے مملوک کو اس پر راضی رہنا واجب ہے) اور (ہماری کیا تخصیص ہے) اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں (دوسری بات یہ) فرما دیجئے کہ (ہمارے لئے جیسی اچھی حالت بہتر ہے ویسے ہی حوادث بھی باعتبار انجام کے کہ اس میں رفع درجات وقطع سیئات ہوتا ہے، بہتر ہے، پس) تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک بہتری ہی کے منتظر رہتے ہو (یعنی تم جو ہماری حالت کے منتظر رہتے ہو کہ دیکھیں کیا ہو تو خواہ وہ حسنہ ہو یا مصیبت ہمارے لئے دونوں ہی میں بہتری ہے) اور ہم تمہارے حق میں اس کے منتظر رہا کرتے ہیں، کہ خدا تعالیٰ تم پر کوئی عذاب واقع کرے گا (خواہ) اپنی طرف سے (دنیا میں یا آخرت میں) یا ہمارے ہاتھوں سے (جب کہ تم اپنے کفر کو ظاہر کر دو، تو مثل دوسرے کفار کے قتل کئے جاؤ) سو تم (اپنے طور پر) انتظار کرو (اور) ہم تمہارے ساتھ (اپنے طور پر) انتظار میں ہیں۔

معارف ومسائل

اس پورے رکوع کی سترہ آیتوں میں بیشتر ان منافقین کا ذکر ہے، جنھوں نے جھوٹے عذر پیش کرکے غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی اجازت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر لی تھی، اس کے ضمن میں بہت سے احکام ومسائل اور ہدایات ہیں۔

پہلی آیت میں ایک لطیف انداز سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی شکایت ہے کہ ان منافقین نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا اور آپ نے قبل اس کے کہ ان کے حال کی تحقیق کرکے جھوٹ سچ کا پتہ لگاتے ان کو رخصت دیدی، جس کی بنا پر یہ لوگ خوشیاں مناتے اور یہ کہتے پھرے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب دھوکہ دیا، اگرچہ اگلی آیتوں میں حق تعالیٰ نے اس کا بھی اظہار فرما دیا کہ یہ لوگ محض حیلہ جوئی کے لئے عذر پیش کر رہے تھے، ورنہ اگر ان کو اجازت نہ دی جاتی جب بھی یہ لوگ جانے والے نہ تھے اور ایک آیت میں اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اگر بالفرض یہ لوگ اس جہاد میں جاتے بھی تو ان سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، بلکہ ان کی سازش اور فتنہ پردازی سے اور خطرہ ہوتا۔

لیکن منشاء یہ ہے کہ ان کو اگر اجازت نہ دی جاتی تو پھر بھی یہ جانے والے تو نہ تھے، مگر ان کا نفاق کھل جاتا، اور ان کو مسلمانوں پر یہ طعنے کسنے کا موقع نہ ملتا کہ ہم نے ان کو خوب

بیوقوف بنایا اور مقصد درحقیقت عتاب نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ آئندہ ان لوگوں کی چالوں سے باخبر رہیں، درصورتیکہ جو ایک قسم کا عتاب بھی ہے تو کس لطف و عنایت کے ساتھ کہ عتاب کی بات جو لِمَ اَذِنْتَ لَہُمْ سے شروع ہوتی ہے، یعنی آپ نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دیدی اس کے ذکر کرنے سے پہلے ہی عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ ذکر فرما دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرما دیا۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب و مقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو غایت تعلق حضرت حق جل شانہٗ کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپ کا قلب مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے، اگر شروع میں لِمَ اَذِنْتَ لَہُمْ کے الفاظ ذکر فرما دیئے جاتے جن میں صورۃً جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا، اس لئے اس سے پہلے عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ فرما کر ایک طرف تو اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہو گیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف اس کی معافی کی اطلاع پہلے دیدی تاکہ اگلا کلام قلب مبارک پر زیادہ شاق نہ ہو۔

اور لفظ معافی سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ معافی تو جرم و گناہ کی ہو کرتی ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ سے معصوم ہیں تو پھر معافی کے یہاں کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ معافی جیسے گناہ کی ہوتی ہے ایسے ہی خلاف اَولیٰ و ناپسندیدہ چیز کے لئے بھی معافی کا استعمال کیا جا سکتا ہے، اور وہ عصمت کے منافی نہیں۔

دوسری اور تیسری آیت میں مؤمنین اور منافقین کا یہ فرق بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان رکھنے والے ایسے موقع پر کبھی اپنی جان و مال کی محبت میں جہاد سے جان چھڑانے کے لئے آپ سے رخصت نہیں مانگا کرتے، بلکہ یہ کام صرف انہی لوگوں کا ہے جن کا اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان صحیح نہیں، اور اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو خوب جانتے ہیں۔

چوتھی آیت میں ان کا عذر غلط ہونے کا ایک قرینہ یہ بتلایا گیا ہے کہ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَہٗ عُدَّۃً، یعنی اگر واقعی یہ لوگ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ کچھ تیاری بھی تو کرتے، لیکن انھوں نے کوئی تیاری نہیں کی جس سے معلوم ہوا کہ عذر کا بہانہ غلط تھا، درحقیقت ان کا ارادہ ہی جہاد کے لئے نکلنے کا نہیں تھا۔

عذر معقول اور نامعقول میں امتیاز

اس آیت سے ایک اہم اصول مستفاد ہوا جس سے معقول اور نامعقول عذر میں امتیاز کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ عذر انہی لوگوں

اکا قابلِ قبول ہوسکتا ہے جو تعمیلِ حکم کے لئے تیار ہوں، پھر کسی اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہوگئے، معذوروں کے تمام معاملات کا یہی حکم ہے جس نے تعمیلِ حکم کے لئے کوئی تیاری ہی نہیں کی اور ارادہ ہی نہیں کیا، پھر کوئی عذر بھی پیش آگیا تو یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کی ایک مثال ہوگی، صحیح عذر نہ سمجھا جائے گا، جو شخص نمازِ جمعہ کی حاضری کے لئے تیاری مکمل کرچکا ہے، اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ دفعۃً کوئی ایسا عذر پیش آگیا جس کی وجہ سے جا نہ سکا تو اس کا عذر معقول ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس کی عبادت کا پورا اجر عطا فرماتے ہیں، اور جس نے کوئی تیاری کی ہی نہیں، پھر اتفاقاً کوئی عذر بھی سامنے آگیا تو وہ محض ایک بہانہ ہے۔

صبح کو سویرے نماز کے لئے اٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگایا، یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگادے، پھر اتفاق سے یہ تدبیریں غلط ہوگئیں جس کی وجہ سے نماز قضا ہوگئی، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ التعریس میں پیش آیا، کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلالؓ کو بٹھادیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگادیں، مگر اتفاق سے ان پر بھی نیند غالب آگئی، اور آفتاب نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی، تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے، جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: لَا تَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ اِنَّمَا التَّفْرِيْطُ فِي الْيَقْظَةِ، یعنی نیند میں آدمی معذور ہے، کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کوتاہی کرے، وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کرلیا گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیلِ حکم کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول یا نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔

پانچویں آیت میں دھوکہ سے اجازت لینے والے منافقین کا یہ حال بھی بتلا دیا گیا، کہ ان کا جہاد میں نہ جانا ہی بہتر تھا، اگر یہ جاتے تو سازشوں اور جھوٹی خبروں سے فساد ہی پھیلاتے، وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ، یعنی تم میں کچھ بھولے بھالے مسلمان ایسے بھی ہیں جو ان کی جھوٹی افواہوں سے متاثر ہوسکتے تھے۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ، یعنی یہ لوگ اس سے پہلے بھی ایسا فتنہ و فساد پھیلا چکے ہیں، جیسے غزوہ اُحد میں پیش آیا تھا۔

وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ، یعنی غالب آیا حکم اللہ کا حالانکہ منافقین اس سے بہت پیچ و تاب میں تھے، اس سے اشارہ فرما دیا کہ غلبہ اور فتح حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، جیسا پہلے واقعات میں آپ کو فتح دی گئی، اس جہاد میں بھی ایسا ہی ہوگا اور

منافقین کی سب چالیں ناکام ہو جائیں گی۔

چھٹی آیت میں ایک خاص منافق جد بن قیس کا ایک خاص بہانہ ذکر کر کے اس کی گمراہی بیان فرمائی ہے، اس نے جہاد میں جانے سے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں نوجوان آدمی ہوں، رومیوں کے مقابلہ پر جاؤں گا تو ان کی حسین عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے، قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرمایا اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا کہ یہ بیوقوف ایک موہوم فتنہ کا بہانہ کر کے ایک یقینی فتنہ یعنی اللہ اور رسول کی خلاف ورزی اور ترک جہاد کے گناہ میں فی الحال مبتلا ہو گئے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ، یعنی جہنم ان سب کافروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جس سے نکل نہیں سکتے، اس کی مراد تو یہ ہے کہ آخرت میں جہنم ان کو گھیرے میں لے لیگی اور یہ بھی کہ جہنم میں پہونچنے کے اسباب جو اس وقت ان کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں، انہی کو جہنم سے تعبیر فرما دیا، اس معنی کے اعتبار سے گویا فی الحال بھی یہ لوگ جہنم ہی کے دائرہ میں ہیں۔

ساتویں آیت میں ان کی ایک اور کم ظرفی کا بیان ہے، کہ یہ لوگ اگرچہ ظاہر میں مسلمانوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں، لیکن حال یہ ہے کہ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ یعنی اگر آپ کو کوئی فتح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو سخت ناگوار ہوتا ہے، وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ، یعنی اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں، اسی لئے ہم نے اپنی مصلحت کو اختیار کیا، ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور یہ کہہ کر وہ خوشی خوشی واپس ہو جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو منافقین کے مذکورہ اقوال سے متاثر ہونے اور اصل حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہدایت ان الفاظ میں دی قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ، یعنی آپ ان مادی اسباب کی پرستش کرنے والوں کو بتلا دیجئے کہ تم دھوکہ میں ہو، یہ مادی اسباب محض ایک پردہ ہیں، ان کے اندر کام کرنے والی قوت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، ہمیں جو حال پیش آتا ہے وہ سب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، اور وہی ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے، اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی پر اصل بھروسہ رکھیں، مادی اسباب کو صرف اسباب و علامات ہی کی حیثیت سے دیکھیں، ان پر کسی بھلائی یا برائی کا مدار نہ جانیں۔

اعتقاد تقدیر استعمالِ تدبیر کے ساتھ ہونا چاہئے بے تدبیری کا نام توکل رکھنا غلط ہے

اس آیت نے مسئلۂ تقدیر اور مسئلۂ توکل کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی، کہ تقدیر و توکل پر یقین رکھنے کا یہ حاصل نہ ہونا چاہئے کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، اور یہ کہے کہ جو کچھ قسمت میں ہوگا وہ ہو جائیگا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اسبابِ اختیاریہ کے لئے اپنی پوری توانائی اور ہمت صرف کی جائے اور بجز قدرت اسباب جمع کرنے کے بعد معاملہ کو تقدیر و توکل کے حوالہ کریں، نظر صرف اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ نتائج ہر کام کے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

مسئلہ تقدیر و توکل میں عام دنیا کے لوگ بڑی افراط و تفریط میں پائے جاتے ہیں، کچھ بے دین لوگ تو وہ ہیں جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں خود مادی اسباب ہی کو خدا بنایا ہوا ہے، اور کچھ واقف ایسے بھی ہیں جنھوں نے تقدیر و توکل کو اپنی کم ہمتی اور بیکاری کا بہانہ بنا لیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاد کے لئے پوری پوری تیاری اور اس کے بعد اس آیت کے نزول نے اس افراط و تفریط کو ختم کر کے صحیح راہ دکھلا دی کہ "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند" یعنی اسباب اختیاریہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی نعمت ہیں ان سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری اور بیوقوفی ہے البتہ اسباب کو اسباب کے درجہ سے آگے نہ بڑھاؤ، اور عقیدہ یہ رکھو کہ نتائج و ثمرات ان اسباب کے تابع نہیں، بلکہ فرمانِ حق جل شانہ کے تابع ہیں۔

دوسری آیت نے مردِ مومن کی ایک عجیب شان ذکر کر کے اُن کی مصیبت پر خوش ہونے والے منافقین کو یہ جواب دیدیا کہ تم جس چیز کو ہمارے لئے مصیبت سمجھ کر خوش ہوتے ہو ہمارے نزدیک وہ مصیبت بھی مصیبت نہیں، بلکہ راحت و کامیابی ہی کی ایک دوسری صورت ہے، کیونکہ مردِ مومن اپنے عزم میں ناکام ہو کر بھی دائمی اجر و صلہ کا مستحق بنتا ہے، جو ساری کامیابیوں کا مقصود اصلی ہے، اس لئے وہ ناکام ہو کر بھی کامیاب رہتا ہے، وہ بگڑنے میں بھی بنتا ہے ؎

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی　　بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

مذکورہ آیت میں هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ کا یہی مطلب ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ کفار کا حال اس کے بالکل برعکس ہے، کہ ان کو کسی حال عذاب و مصیبت سے چھٹکارا نہیں، یا تو دنیا ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اُن پر خدا کا عذاب آجائیگا، اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب چکھیں گے، اور اگر دنیا میں کسی طرح اس سے بچ گئے تو آخرت کے عذاب سے خلاصی کا کوئی امکان نہیں۔

قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ مِنكُمْ ۖ إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا

کہہ دے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے بیشک تم نافرمان

فَاسِقِينَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ

لوگ ہو، اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر اسی بات پر

كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ

کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی

كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ﴿٥٤﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ

سے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے، سو تو تعجب نہ کر

أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا

ان کے مال اور اولاد سے، یہی چاہتا ہے اللہ کہ ان کو عذاب میں رکھے

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٥٥﴾ وَ

ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں اور وہ تم میں نہیں ولیکن وہ لوگ

يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا

ڈرتے ہیں تم سے، اگر وہ پاویں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ تو

لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ

الٹے بھاگیں اسی طرف رسیاں تڑاتے، اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے

فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا

ہیں خیرات بانٹنے میں سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو

مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ

جب ہی وہ ناخوش ہو جاویں، اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اسی پر جو دیا ان کو

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اللہ نے اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ اور وہ دیگا ہم کو اپنے فضل سے

وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝۵۹

اور اس کا رسول ہم کو تو اللہ ہی چاہیے۔

ع ۱۷ / ۱۲

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان منافقین سے) فرما دیجئے کہ تم (جہاد وغیرہ میں) خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم کسی طرح (خدا کے نزدیک) مقبول نہیں (کیونکہ) بلاشبہ تم نافرمانی کرنے والے لوگ ہو (مراد اس سے کفر ہے جیسا کہ آگے آتا ہے) اور ان کی خیرات قبول ہونے سے اس کے سوا کوئی مانع نہیں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا (اسی کو اوپر نافرمانی کہا تھا اور کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں) اور (اس کفر باطنی کی علامت ظاہر میں یہ ہے کہ) وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور (نیک کام میں) خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ (کیونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں جس سے امید ثواب ہو اور اس امید سے رغبت ہو محض بدنامی سے بچنے کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اور جب وہ ایسے مردود ہیں) تو ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے غیر مقبول مردود لوگوں کو اتنے انعامات کس طرح عطا ہوئے، کیونکہ واقع میں ان کے لئے نعمت نہیں ایک قسم کا عذاب ہی ہے کیونکہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جاوے (جس سے آخرت میں بھی گرفتار عذاب ہوں تو جس مال و اولاد کا یہ انجام ہو اس کو انعام سمجھنا ہی غلطی ہے) اور یہ (منافق) لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں (یعنی مسلمان ہیں) حالانکہ (واقع میں) وہ تم میں سے نہیں، لیکن (بات یہ ہے کہ) وہ ڈرپوک لوگ ہیں (ڈر کے مارے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کفر کو چھپاتے ہیں کہ ہمارے ساتھ دوسرے کفار کا سا معاملہ مسلمانوں کی طرف سے نہ ہونے لگے، اور کسی دوسری جگہ ان کا ٹھکانا نہیں جہاں آزادی سے جا رہیں ورنہ) ان لوگوں کو اگر کوئی پناہ کی جگہ مل جاتی یا (کہیں پہاڑ وغیرہ میں) غار (مل جاتے) یا کوئی گھس بیٹھنے کی ذرا جگہ (مل جاتی)، تو یہ ضرور منہ اٹھا کر ادھر ہی چل دیتے (مگر یہ صورت ہے نہیں، اس لئے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو مسلمان بتاتے ہیں) اور ان میں بعض لوگ وہ ہیں جو

صدقات (تقسیم کرنے) کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں (کہ اس تقسیم میں نعوذ باللہ انصاف نہیں کیا گیا) تو اگر صدقات میں سے ان کو (ان کی خواہش کے مطابق) مل جاتا ہے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان صدقات میں سے ان کو (ان کی خواہش کے مطابق) نہیں ملتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا منشا، دراصل کوئی اصول نہیں، بلکہ حرص دنیا اور خود غرضی ہے) اور ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی رہتے جو کچھ اللہ نے ان کو (دلوایا تھا) اور اس کے رسول نے دیا تھا اور (اس کے متعلق) یوں کہتے ... کہ ہم کو اللہ (کا دیا) کافی ہے (ہم کو اتنا ہی قاعدہ سے مل سکتا تھا اسی میں خیر و برکت ہوگی، اور پھر اگر حاجت پیش آئے گی اور مصلحت ہوگی تو) آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) (دیں گے ہم (دل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں (اسی سے سب امیدیں رکھتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منافقین کی بد اخلاقی اور بد اعمالی کا ذکر تھا، مذکورہ تمام آیات میں بھی یہی مضمون ہے۔ اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا، میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منافقین کے مال و اولاد ان کے لئے نعمت نہیں عذاب ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں انہماک انسان کیلئے اس دنیا ہی میں ایک عذاب و مصیبت بن جاتا ہے، اوّل مال دنیا کے حاصل کرنے کی تمناؤں اور پھر تدبیروں میں کیسی کیسی محنت، مشقت اور کوفت جسمانی اور روحانی اٹھانی پڑتی ہے، نہ دن کا چین نہ رات کی نیند، نہ اپنے تن بدن کی خبر، نہ اہل و عیال ہی میں دل بہلانے کی فرصت، پھر اگر وہ حاصل ہو گیا تو اس کی حفاظت اور اس کے بڑھانے کی فکر دن رات کا عذاب ہے، اور اگر ذرا سا نقصان ہو گیا کوئی بیماری پیش آ گئی، تو غموں کا پہاڑ آ پڑا، اور اگر ساری چیزیں اتفاق سے طبیعت اور خواہش کے مطابق حاصل بھی ہو جائیں تو اس کے گھٹ جانے کا اندیشہ اور بڑھاتے چلے جانے کی فکر کسی وقت چین نہیں لینے دیتی۔

پھر جب آخرکار یہ چیزیں موت کے وقت یا پہلے ہی اس کے ہاتھ سے جاتی ہیں تو اس پر حسرت و یاس مسلط ہو جاتی ہے، یہ سب عذاب ہی عذاب ہے، جس کو ہوقوف انسان جس نے سامانِ راحت کا نام راحت رکھ لیا ہے، اور حقیقی راحت یعنی قلب کا سکون و اطمینان .... کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی، اس لئے سامان راحت ہی کو راحت سمجھ کر اس پر مگن رہتا ہے، جو حقیقت میں اس کیلئے دنیا کے چین و آرام کا بھی دشمن ہے اور آخرت کے عذاب کا مقدمہ بھی۔

کیا صدقات کا مال کافر کو دیا جا سکتا ہے

آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال صدقات میں سے منافقین کو بھی حصہ ملا کرتا تھا، مگر وہ خواہش کے مطابق نہ ملنے پر ناراض ہو جاتے اور طعن و تشنیع کرنے لگتے تھے، یہاں اگر صدقات سے مراد عام معنی لئے جائیں جس میں صدقات واجبہ اور نافلہ سب شامل ہیں، تو کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاق امت جائز اور سنت سے ثابت ہے اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوٰۃ، عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بنا پر تھا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور ظاہری کوئی حجت ان کے کفر پر قائم نہ ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے بمصلحت حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (بیان القرآن ملخصاً)

لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى، اس آیت میں منافقین کی دو علامتیں بتلائی گئی ہیں، ایک یہ کہ نماز کو آئیں تو سستی کاہلی اور بے دلی سے آئیں، دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو ناگواری کے ساتھ خرچ کریں۔

اس میں مسلمانوں کو بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نماز میں سستی، کاہلی اور زکوٰۃ و صدقات سے دلی ناگواری پیدا ہونا علامت نفاق ہے، مسلمانوں کو کوشش کر کے ان علامات سے بچنا چاہئے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ

زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانیوالوں کا اور

الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ

جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ

اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

کے رستہ میں اور راہ کے مسافر کو، ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(فرض) صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات (کی تحصیل وصول کرنے) پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (خرچ کیا جاوے) اور قرضداروں کے قرضہ ادا کرنے میں اور جہاد والوں کے سامان میں اور مسافروں کی امداد میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

معارف و مسائل

مصارفُ الصَّدقات

اس سے پہلی آیتوں میں صدقات کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض منافقین کے اعتراضات اور جواب کا ذکر تھا، جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا آپ (معاذ اللہ) صدقات کی تقسیم میں انصاف نہیں کرتے، جس کو چاہتے ہیں جو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصارفِ صدقات کو متعین فرما کر ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خود متعین فرما دی ہے کہ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم صدقات میں اسی ارشادِ ربانی کی تعمیل فرماتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتے۔

اس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت زیاد بن حارث صدائی کی روایت سے نقل کی ہے، یہ فرماتے ہیں کہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ ان کی قوم کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر مسلمانوں کا روانہ فرما رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ لشکر نہ بھیجیں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ وہ سب مطیع و فرمانبردار ہو کر آجائیں گے، پھر میں نے اپنی قوم کو خط لکھا تو سب کے سب مسلمان ہو گئے، اس پر آپ نے فرمایا یَا اَخَا صُدَاءٍ اَلْمُطَاعُ فِیْ قَوْمِہٖ، جس میں گویا ان کو یہ خطاب دیا گیا کہ یہ اپنی قوم کے محبوب اور مقتدا ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ان کو ہدایت ہوگئی اور وہ مسلمان ہوگئے، یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے اس کو یہ جواب دیا کہ:

> ”صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں، انتہی۔ (تفسیر قرطبی، ص ۱۶۸، ج ۸)

آیت کا شانِ نزول معلوم کرنے کے بعد آیت کی مکمل تفسیر اور تشریح سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہ نے تمام مخلوقات انسان و حیوان وغیرہ کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا، اور ساتھ ہی اپنی حکمت بالغہ سے ایسا نہیں کیا کہ سب کو رزق میں برابر کر دیتے، غنی و فقیر کا فرق نہ رہتا، اس میں انسان

کی اخلاقی تربیت اور نظامِ عالم سے متعلق سیکڑوں حکمتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اس حکمت کے ماتحت کسی کو مالدار بنا دیا کسی کو غریب فقیر، پھر مالداروں کے مال میں غریب فقیر کا حصہ لگا دیا، ارشاد فرمایا وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ جس میں بتلا دیا کہ مالداروں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے ایک معین مقدار کا حصہ فقراء کے لئے رکھ دیا ہے، جو اُن فقراء کا حق ہے۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ مالداروں کے مال میں سے جو صدقہ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یہ کوئی ان کا احسان نہیں، بلکہ فقراء کا ایک حق ہے جس کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری ہے، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک متعین ہے، یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے جب چاہے اس میں کمی بیشی کر دے، اللہ تعالیٰ نے اس معین حق کی مقدار بھی بتلانے کا کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا، اور اسی لئے آپؐ نے اس کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ صحابہ کرام کو صرف زبانی بتلا دینے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس معاملہ کے متعلق مفصل فرمان لکھوا کر حضرت فاروق اعظمؓ اور عمرو بن حزمؓ کو سپرد فرمائے، جس سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدار زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے واسطے سے متعین کر کے بتلا دیئے ہیں، اس میں کسی زمانہ اور کسی ملک میں کسی کو کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔

صدقہ زکوٰۃ کی فرضیت صحیح یہ ہے کہ اوائل اسلام ہی میں مکہ مکرمہ کے اندر نازل ہو چکی تھی، جیسا کہ امام تفسیر ابن کثیرؒ نے سورۃ مزمل کی آیت فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ سے استدلال فرمایا ہے، کیونکہ یہ سورۃ بالکل ابتداءِ وحی کے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے، اس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی ہے، البتہ روایاتِ حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءِ اسلام میں زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص نصاب یا خاص مقدار مقرر نہ تھی، بلکہ جو کچھ ایک مسلمان کی اپنی ضرورتوں سے بچ رہے وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کیا جاتا تھا، نصابوں کا تعین اور مقدار زکوٰۃ کا بیان بعد از ہجرت مدینہ طیبہ میں ہوا ہے، اور پھر زکوٰۃ و صدقات کی وصول یابی کا نظام محکمانہ انداز کا تو فتح مکہ کے بعد عمل میں آیا ہے۔

اس آیت میں باجماعِ صحابہ و تابعین اسی صدقہ واجبہ کے مصارف کا بیان ہے جو نماز کی طرح مسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ جو مصارف اس آیت میں متعین کئے گئے ہیں وہ صدقاتِ فرض کے مصارف ہیں، نفلی صدقات میں روایات کی تصریحات کی بنا پر بہت وسعت ہے، وہ اُن آٹھ مصارف میں منحصر نہیں ہیں۔

اگرچہ اوپر کی آیات میں صدقات کا لفظ عام صدقات کے لئے استعمال ہوا ہے جس میں واجب اور نفلی دونوں داخل ہیں، مگر اس آیت میں باجماعِ امت صدقات فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے، اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو وہاں صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے

اس آیت کو لفظ اِنَّمَا سے شروع کیا گیا ہے، یہ لفظ حصر و اختصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس شروع ہی کے کلمہ نے بتو دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقات واجبہ صرف انہیں میں خرچ ہونے چاہئیں ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرف خیر میں صدقاتِ واجبہ صرف نہیں ہو سکتے، جیسے جہاد کی تیاری یا بناءِ مسجد و مدارس یا دوسرے رفاہِ عام کے ادارے، یہ سب چیزیں بھی اگرچہ ضروری ہیں، اور ان میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، مگر صدقاتِ فرض جن کی مقداریں متعین کر دی گئی ہیں، ان کو ان میں نہیں لگایا جا سکتا۔

آیت کا دوسرا لفظ صَدَقٰتُ، صدقہ کی جمع ہے، صدقہ لغت میں اس مال کے جز کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لئے خرچ کیا جائے (قاموس) امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے قول و فعل میں صادق ہوں، اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اسی لئے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رُو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے، فرض زکوٰۃ کو بھی، نفل کے لئے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لئے بھی قرآن کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے، جیسے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اور آیت زیر بحث اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ وغیرہ، بلکہ قرطبی کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا جاتا ہے تو اس سے صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے، اور روایات حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اُٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لئے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دیدینا بھی صدقہ ہے، اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرا لفظ اس کے بعد لِلْفُقَرَاءِ سے شروع ہوا ہے، اس کے شروع میں حرف

لام ہے جو تخصیص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوں گے کہ تمام صدقات صرف انہی لوگوں کا حق ہے جن کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔

اب ان آٹھ مصارف کی تفصیل سنئے جو اس کے بعد مذکور ہیں:۔

ان میں پہلا مصرف فقراء ہیں، دوسرا مساکین، فقیر اور مسکین کے اصلی معنی میں اگرچہ اختلاف ہے، ایک کے معنے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، دوسرے کے معنی ہیں جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن حکم زکوٰۃ میں دونوں یکساں ہیں، کوئی اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے، ضروریات میں رہنے کا مکان استعمالی برتن اور کپڑے اور فرنیچر وغیرہ سب داخل ہیں، نصاب یعنی سونا ساڑھے سات تولہ یا چاندی ساڑھے باون تولہ یا اس کی قیمت جس کے پاس ہو اور وہ قرضدار بھی نہ ہو نہ اس کو زکوٰۃ لینا جائز ہے نہ دینا، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس کچھ چاندی یا کچھ پیسے نقد ہیں، اور تھوڑا سا سونا ہے تو سب کی قیمت لگا کر اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ بھی صاحب نصاب ہے، اس کو زکوٰۃ دینا اور لینا جائز نہیں اور جو شخص صاحب نصاب نہیں مگر تندرست، قوی اور کمانے کے قابل ہے اور ایک دن کا گذارہ اس کے پاس موجود ہے اس کو اگرچہ زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے اس میں بہت سے لوگ غفلت برتتے ہیں، سوال کرنا ایسے لوگوں کے لئے حرام ہے، ایسا شخص جو کچھ سوال کر کے حاصل کرتا ہے اس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا انگارہ فرمایا ہے (ابوداؤد بروایت علیؓ، قرطبی)

حاصل یہ ہے کہ فقیر اور مسکین میں زکوٰۃ کے باب میں کوئی فرق نہیں، البتہ وصیت کے حکم میں فرق پڑتا ہے کہ مساکین کے لئے وصیت کی ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے، اور فقراء کے لئے ہے تو کیسے لوگوں کو دیا جائے جس کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں، فقیر اور مسکین کے دونوں مصرفوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ جس کو مال زکوٰۃ دیا جائے وہ مسلمان ہو اور حاجات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال کا مالک نہ ہو۔

اگرچہ عام صدقات غیر مسلموں کو بھی دیئے جا سکتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تَصَدَّقُوْا عَلٰٓی اَهْلِ الْاَدْیَانِ كُلِّهَا، "یعنی ہر مذہب والے پر صدقہ کرو" لیکن صدقہ زکوٰۃ کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مال زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے، اور انہی کے فقراء پر صرف کیا جائے، اس لئے مال زکوٰۃ کو صرف مسلم فقراء و مساکین ہی پر صرف کیا جا سکتا ہے،

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات یہاں تک کہ صدقۃ الفطر بھی غیر مسلم فقیر کو دینا جائز ہے (ہدایہ)۔

اور دوسری شرط مالکِ نصاب نہ ہونے کی خود فقیر و مسکین کے معنی سے واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ یا تو اس کے پاس کچھ نہ ہوگا، یا کم از کم مالِ نصاب کی مقدار سے کم ہوگا، اس سے فقیر اور مسکین دونوں اتنی بات میں مشترک ہیں کہ ان کے پاس بقدر نصاب مال موجود نہیں۔
ان دونوں مصرفوں کے بعد اور چھ مصارف کا بیان آیا ہے، ان میں پہلا مصرف عاملین صدقہ ہیں۔

تیسرا مصرف اَلْعَامِلِیْنَ عَلَیْھَا، یہاں عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات زکوٰۃ و عشر وغیرہ ... لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چونکہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لئے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارفِ زکوٰۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مدِ زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا فریضہ براہِ راست رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَةً "یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ"، اس آیت کا مفصل بیان تو آئندہ آئے گا، یہاں یہ بتلانا منظور ہے کہ اس آیت کی رُو سے مسلمانوں کے امیر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوٰۃ و صدقات وصول کرے، اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان و مددگاروں کے نہیں کر سکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکور الصدر آیت میں وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْھَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

انہی آیات کی تعمیل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے، اور آیتِ مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوٰۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مالدار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے، ایک وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگرچہ گھر میں مالدار ہو، دوسرے عامل صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگرچہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجودہ مال سے زیادہ کا مقروض ہے، چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا

مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خریدے، یا بجز یں وہ شخص جسکو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا **حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کردیا ہو۔**

رہا یہ مسئلہ کہ عاملینِ صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ ان کی محنت وعمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی (احکام القرآن جصاص، قرطبی)

البتہ یہ ضروری ہوگا کہ عاملین کی تنخواہیں نصف زکوٰۃ سے بڑھنے نہ پائیں، اگر زکوٰۃ کی وصول یابی اتنی کم ہو کہ عاملین کی تنخواہیں دے کر نصف بھی باقی نہیں رہتی تو پھر تنخواہوں میں کمی کی جائے گی، نصف سے زائد صرف نہیں کیا جائے گا (تفسیر مظہری، ظہیریہ)

مسئلہ: مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ عاملینِ صدقہ کو جو رقم مدِ زکوٰۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لئے باوجود غنی اور مالدار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں، اور زکوٰۃ سے اُن کو دینا جائز ہے، اور مصارفِ زکوٰۃ کی آٹھ مدات میں سے صرف ایک یہی مد ایسی ہے جس میں رقم زکوٰۃ بعوض معاوضۂ خدمت دی جاتی ہے، ورنہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضۂ خدمت کے دیا جائے، اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت **لے کر مالِ زکوٰۃ دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔**

اس پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ مالِ زکوٰۃ کو معاوضۂ خدمت میں کیسے دیا گیا، دوسرے یہ کہ مالدار کے لئے یہ مالِ زکوٰۃ حلال کیسے ہوا، ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ عاملینِ صدقہ کی اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل مؤکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کسی کو وکیل مختار بنادے، اور قرضدار یہ قرض وکیل کو سپرد کردے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرضدار بری ہوجاتا ہے، تو جب رقم زکوٰۃ عاملین صدقہ نے فقراء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کرلی تو ان کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انھوں نے وصول کی ہے، اب جو رقم بطور حق الخدمت کے اُن کو دی جاتی ہے وہ مالداروں کی طرف سے نہیں بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی، اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضۂ خدمت دیدیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں، یہ اُن کے وکیل کیسے بن گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جسکو امیر کہا جاتا ہے وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ پورے ملک کے فقراء غرباء کا وکیل ہوتا ہے، کیونکہ ان سب کی ضروریات

کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے امیر مملکت جس جس کو صدقات کی وصولیابی پر عامل بنادے وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہوجاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا وہ درحقیقت زکوٰۃ نہیں دی گئی بلکہ زکوٰۃ جن فقراء کا حق ہے ان کی طرف سے معاوضہ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنائے اور اس کا حق الخدمت زکوٰۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کرے تو یہاں نہ تو دینے والا بطور زکوٰۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکوٰۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

فائدہ تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لئے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جا سکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہو زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لئے ان کے قبضہ ہوجانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کردیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ تحقیق ہو، پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بناء پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لئے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کردیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کرکے اس کو سالہا سال رکھے رہتے ہیں، اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی رقم مصارف زکوٰۃ میں صرف ہوجائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لئے جائز ہے نہ لینے والوں کے لئے۔

ایک اور سوال عبادت پر اجرت یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے اشارات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ کسی

عبادت پر اجرت و معاوضہ لینا حرام ہے، مسند احمد کی حدیث میں بروایت عبدالرحمن بن شبل منقول
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِقْرَؤُا الْقُرْاٰنَ وَلَا تَاْکُلُوْا بِہٖ یعنی قرآن پڑھو،
مگر اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ، اور بعض روایات میں اس معاوضہ کو قطعہ جہنم فرمایا ہے جو قرآن
پر لیا جائے، اسی کی بناء پر فقہاء امت کا اتفاق ہے کہ طاعات و عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں
اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صدقات وصول کرنے کا کام ایک دینی خدمت اور عبادت ہے، رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک قسم کا جہاد فرمایا ہے، اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس پر بھی کوئی اجرت
و معاوضہ لینا حرام ہوتا، مگر قرآن کریم کی اس آیت نے صراحۃً اس کو جائز قرار دیا، اور زکوٰۃ
کے آٹھ مصارف میں اس کو داخل فرمایا۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا کہ جو عبادات فرض یا واجب عین ہیں
اُن پر اجرت لینا مطلقاً حرام ہے، لیکن جو فرض کفایہ ہیں ان پر کوئی معاوضہ لینا اسی آیت
کی رُو سے جائز ہے، فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک کام پوری امت یا پورے شہر کے ذمہ
فرض کیا گیا ہے، مگر یہ لازم نہیں کہ سب ہی اس کو کریں، اگر بعض لوگ ادا کرلیں تو سب
سبکدوش ہوجاتے ہیں، البتہ اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اسی آیت سے ثابت ہوا کہ امامت و خطابت کا معاوضہ
لینا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی واجب علی العین نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہے، انتہی۔ اسی طرح تعلیم
قرآن و حدیث اور دوسرے دینی علوم کا بھی یہی حال ہے، کہ یہ سب کام پوری امت کے ذمہ
فرض کفایہ ہیں، اگر بعض لوگ کرلیں تو سب سبکدوش ہوجاتے ہیں، اس لئے اگر اس پر کوئی
معاوضہ اور تنخواہ لی جائے تو وہ بھی جائز ہے۔

چوتھا مصرف مصارف زکوٰۃ میں سے مؤلفۃ القلوب ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی
دلجوئی کے لئے ان کو صدقات دیئے جاتے تھے، عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں
تین قسم کے لوگ شامل تھے، کچھ مسلمان کچھ غیر مسلم، پھر مسلمانوں میں بعض تو وہ لوگ تھے
جو غریب حاجتمند بھی تھے، اور نو مسلم بھی، ان کی دلجوئی اس لئے کی جاتی تھی کہ اسلام
پر پختہ ہوجائیں، اور بعض وہ تھے جو مالدار بھی تھے اور مسلمان ہوگئے تھے، مگر ابھی تک
ایمان کا رنگ ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا، اور بعض وہ لوگ تھے جو خود تو پکے مسلمان
تھے مگر ان کی قوم کو ان کے ذریعہ ہدایت پر لانا اور پختہ کرنا مقصود تھا، اور غیر مسلموں میں
بھی کچھ وہ لوگ تھے جن کے شر سے بچنے کے لئے ان کی دلجوئی کی جاتی تھی، اور بعض وہ
تھے جن کے بارے میں یہ تجربہ تھا کہ نہ تبلیغ و تعلیم سے اثر پذیر ہوتے ہیں، نہ جنگ و تشدد سے

بلکہ احسان و حسن سلوک سے متاثر ہوتے ہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ چاہتے تھے کہ خلق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نورِ ایمان میں لے آئیں، اس کے لئے ہر وہ جائز تدبیر کرتے تھے جس سے یہ لوگ متاثر ہو سکیں، یہ سب قسمیں عام طور پر "مؤلفۃ القلوب" میں داخل سمجھی جاتی ہیں جن کو صدقات کا چوتھا مصرف اس آیت میں قرار دیا ہے۔

چوتھا مصرف مؤلفۃ القلوب ہیں، ان کے متعلق گزشتہ صفحات میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دل جوئی کے لئے ان کو صدقات سے حصہ دیا جاتا تھا، عام خیال کے مطابق ان میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے، غیر مسلموں کی دلجوئی اسلام کی ترغیب کے لئے اور نومسلموں کی دلجوئی اسلام پر پختہ کرنے کے لئے کی جاتی تھی، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خاص ملت اور مصلحت کے لئے جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے، صدقات دیئے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب کہ اسلام کو مادی قوت بھی حاصل ہوگئی اور کفار کے شر سے بچنے یا نومسلموں کو اسلام پر پختہ کرنے کے لئے اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی تو وہ علت اور مصلحت ختم ہوگئی اس لئے ان کا حصہ بھی ختم ہوگیا جس کو بعض فقہاء نے منسوخ ہو جانے سے تعبیر فرمایا ہے، فاروق اعظمؓ حسن بصریؒ، شعبیؒ، ابو حنیفہؒ، مالک بن انسؒ ...... کی طرف یہی قول منسوب ہے۔

اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ منسوخ نہیں، بلکہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ان کا حصہ ساقط کر دیا گیا، آئندہ کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آجائے تو پھر دیا جا سکتا ہے، امام زہریؒ، قاضی عبدالوہابؒ، ابن عربیؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی مذہب ہے، لیکن تحقیقی اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کو صدقات وغیرہ سے کسی وقت کسی زمانہ میں حصہ نہیں دیا گیا، اور نہ وہ مؤلفۃ القلوب میں داخل ہیں، جن کا ذکر مصارف صدقات میں آیا ہے۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں جن کی دل جوئی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات سے حصہ دیا ہے، اور یہ سب شمار کرنے کے بعد فرمایا ہے: وَبِالْجُمْلَةِ فَكُلُّهُمْ مُؤْمِنٌ وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ كَافِرٌ، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب سب کے سب مسلمان ہی تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں ہے: لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى اَحَدًا مِّنَ الْكُفَّارِ لِلْاِيْلَافِ شَيْئًا مِّنَ الزَّكٰوةِ، یعنی یہ بات کسی روایت سے

ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کو مالِ زکوٰۃ میں سے اس کی دلجوئی کیلئے حصہ دیا ہو، اس کی تائید تفسیر کشاف کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارفِ صدقات کا بیان یہاں ان کفار منافقین کے جواب میں آیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم صدقات کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے کہ ہم کو صدقات نہیں دیتے، اس آیت میں مصارفِ صدقات کی تفصیل بیان فرمانے سے مقصد یہ کہ ان کو بتلا دیا جائے کہ کافر کا کوئی حق مالِ صدقات میں نہیں ہے، اگر مؤلفۃ القلوب میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی۔

تفسیر مظہری میں اس مغالطہ کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے جو بعض روایاتِ حدیث کے سبب لوگوں کو پیش آیا ہے، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غیر مسلموں کو کچھ عطیات دیئے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم اور ترمذی کی روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان ابن امیہ کو کافر ہونے کے زمانے میں کچھ عطیات دیئے، اس کے متعلق امام نوویؒ کے حوالہ سے تحریر فرمایا کہ یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ غزوہ حنین کے مالِ غنیمت کا جو خمس بیت المال میں داخل ہوا اس میں سے دیئے گئے، اور یہ ظاہر ہے کہ بیت المال کی اس مد سے مسلم و غیر مسلم دونوں پر خرچ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے، پھر فرمایا کہ امام بیہقی، ابن سید الناس، امام ابن کثیر وغیرہم سب نے یہی قرار دیا ہے کہ یہ عطاء مال زکوٰۃ سے نہیں، بلکہ خمسِ غنیمت سے تھی۔

ایک عظیم فائدہ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اموال صدقات اگرچہ بیت المال ہی میں جمع کئے جاتے تھے مگر ان کا حساب بالکل جدا تھا، اور بیت المال کی دوسری مدات جیسے خمسِ غنیمت یا خمس معادن وغیرہ ان کا حساب جدا، اور ہر ایک کے مصارف جدا تھے، جیسا کہ حضرات فقہاء نے تصریح فرمائی ہے، کہ اسلامی حکومت کے بیت المال میں چار مد علیحدہ علیحدہ رہنی چاہئیں اور اصل حکم یہ ہے کہ صرف حساب علیحدہ رکھنا نہیں بلکہ ہر ایک مد کا بیت المال الگ ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک کو اس کے مصرف میں خرچ کرنے کی پوری احتیاط قائم رہے، البتہ اگر کسی وقت کسی خاص مد میں کمی ہو تو دوسری مد سے بطور قرض لے کر اس پر خرچ کیا جا سکتا ہے یہ مدات بیت المال یہ ہیں :-

اوّل خمس غنائم : یعنی جو مال کفار سے بذریعہ جنگ حاصل ہو اس کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر کے باقی پانچواں حصہ : بیت المال کا حق ہے، اور خمس معادن یعنی مختلف قسم کی کانوں سے نکلنے والی اشیاء میں سے پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، خمس رکاز، یعنی جو

قدیم خزانہ کسی زمین سے برآمد ہوا اس کا بھی پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے، یہ تینوں قسم کے خمس بیت المال کی ایک ہی مد میں داخل ہیں۔

دوسری مد صدقات ہیں جس میں مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، اور ان کی زمینوں کا عشر داخل ہے۔

تیسری مد خراج اور مال فیئ ہے، جس میں غیر مسلموں کی زمینوں سے حاصل شدہ خراج اور ان کا جزیہ اور ان سے حاصل شدہ تجارتی ٹیکس اور وہ تمام اموال داخل ہیں جو غیر مسلموں سے ان کی رضامندی کے ساتھ مصالحانہ طور پر حاصل ہوں۔

چوتھی مد ضوائع کی ہے، جس میں لاوارث مال، لاوارث شخص کی میراث وغیرہ داخل ہیں، ان چار مدات کے مصارف اگرچہ الگ الگ ہیں، لیکن فقراء و مساکین کا حق ان چاروں مدات میں رکھا گیا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت میں قوم کے اس ضعیف عنصر کو قوی کرنے کا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے، جو درحقیقت اسلامی حکومت کا طغرائے امتیاز ہے، ورنہ دنیا کے عام نظاموں میں ایک مخصوص طبقہ ہی بڑھتا رہتا ہے، غریب کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا، جس کے ردِ عمل نے اشتراکیت اور کمیونزم کو جنم دیا، مگر وہ بالکل ایک غیر فطری اصول اور بارش سے بھاگ کر پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو جانے کے مرادف اور انسانی اخلاق کے لئے سمِ قاتل ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدات کے لئے الگ الگ مقرر ہیں اور فقراء و مساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے، ان میں سے پہلی تین مدوں کے مصارف خود قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں، پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف کا بیان سورۂ انفال دسویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے، اور دوسری مد یعنی صدقات کے مصارف کا بیان سورۂ توبہ کی مذکورۃ الصدر ساٹھویں آیت میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مالِ فیئ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بیان سورۂ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسلامی حکومت کی اکثر مدات فوجی اخراجات اور عمالِ حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں، چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاہج محتاجوں اور لاوارث بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ (شامی، کتاب الزکوٰۃ)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے بیت المال کی چاروں مدات بالکل الگ الگ رکھنے اور اپنے اپنے معینہ مصارف میں خرچ کرنے کی جو ہدایات دی ہیں، یہ سب قرآنی ارشادات

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر خلفائے راشدین کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہیں۔

اس ضمنی فائدہ کے بعد پھر اصل مسئلہ مؤلفۃ القلوب کو سمجھئے کہ مذکور الصدر بیان میں محققین محدثین و فقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ کسی کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور نہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اور جن غیر مسلموں کو دینا ثابت ہے وہ مد صدقات و زکوٰۃ سے نہیں بلکہ خمس غنیمت میں سے دیا گیا ہے جس میں سے ہر حاجت مند مسلم و غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے، تو مؤلفۃ القلوب صرف مسلم رہ گئے، اور ان میں جو فقراء ہیں ان کا حصہ بدستور باقی ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے، اختلاف صرف اس صورت میں رہ گیا کہ یہ لوگ غنی صاحب نصاب ہوں تو امام شافعیؒ امام احمدؒ کے نزدیک چونکہ تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر و حاجت مندی شرط نہیں، اس لئے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحب نصاب ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عاملین صدقہ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر و حاجت مندی شرط ہے۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، جیسے غارمین ورقاب، ابن سبیل وغیرہ سب میں اسی شرط کے ساتھ ان کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کہ وہ اس جگہ حاجتمند ہوں، گو وہ اپنے مقام میں مال دار ہوں۔

اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض حضرات نے فقراء و مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں فقر و حاجت مندی کے ساتھ مشروط نہیں کیا، اور بعض نے یہ شرط کی ہے، جن حضرات نے یہ شرط رکھی ہے وہ مؤلفۃ القلوب میں بھی صرف انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو حاجتمند اور غریب ہوں، بہر حال یہ حصہ قائم اور باقی ہے۔ (تفسیر مظہری)

یہاں تک صدقات کے آٹھ مصارف میں سے چار کا بیان آیا ہے، ان چاروں کا حق حرف لام کے تحت بیان ہوا، لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ، آگے جن چار مصارف کا ذکر ہے ان میں عنوان بدل کر لام کی جگہ حرف فی استعمال فرمایا: فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ، زمخشری نے کشاف میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ آخری چار مصرف بہ نسبت پہلے چار کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے بولا جاتا ہے، جس کی وجہ سے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ صدقات کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہئے، اور ان کے زیادہ مستحق ہونے کی وجہ ان کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے، کیونکہ جو شخص کسی کا مملوک غلام ہے

وہ بہ نسبت عام فقراء کے زیادہ تکلیف میں ہے، اسی طرح جو کسی کا قرضدار ہے اور قرضخواہوں کا اس پر تقاضا ہے وہ عام غرباء، فقراء سے زیادہ تنگی میں ہے کہ اپنے اخراجات کے فکر سے بھی **زیادہ قرضداروں کے قرض کی فکر اس کے ذمہ ہے۔**

ان باقی ماندہ چار مصارف میں سب سے پہلے وَفِی الرِّقَابِ کا ذکر فرمایا ہے، رقاب رَقَبَۃ کی جمع ہے، اصل میں گردن کو رَقَبَہ کہتے ہیں، عرف میں اس شخص کو رَقَبَہ کہہ دیا جاتا ہے **جس کی گردن کسی دوسرے کی غلامی میں مقید ہو۔**

اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ رقاب سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ جمہور فقہاء و محدثین اس پر ہیں کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جن کے آقاؤں نے کوئی مقدار مال کی متعین کر کے کہہ دیا ہے کہ اتنا مال کما کر ہمیں دیدو تو تم آزاد ہو جس کو قرآن و سنت کی اصطلاح میں مکاتب کہا جاتا ہے ایسے شخص کو آقا اس کی اجازت دیدیتا ہے کہ وہ تجارت یا مزدوری کے ذریعہ مال کمائے، اور آقا کو لا کر دے، آیت مذکورہ میں رقاب سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کو رقم زکوٰۃ میں سے **حصہ دے کر اس کی گلو خلاصی میں امداد کی جائے۔**

یہ قسم غلاموں کی باتفاق مفسرین و فقہاء لفظ وَفِی الرِّقَابِ کی مراد ہے، کہ رقم زکوٰۃ ان کو دے کر ان کی گلو خلاصی میں امداد کی جائے، ان کے علاوہ دوسرے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا یا ان کے آقاؤں کو رقم زکوٰۃ دے کر یہ معاہدہ کر لینا کہ وہ ان کو آزاد کر دیں گے، اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے، جمہور ائمہ ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہ رحمہم اللہ اس کو جائز نہیں سمجھتے، اور حضرت امام مالکؒ بھی ایک روایت میں جمہور کے ساتھ متفق ہیں کہ فی الرِّقَاب کو صرف مکاتب غلاموں کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں، اور ایک روایت میں امام مالکؒ سے یہ بھی منقول ہے وہ فی الرِّقَاب میں عام غلاموں کو داخل کر کے اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ رقم زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں (احکام القرآن ابن عربی مالکی)

جمہور ائمہ فقہاء جو اس کو جائز نہیں رکھتے ان کے پیش نظر ایک فقہی اشکال ہے کہ اگر رقم زکوٰۃ سے غلام کو خرید کر آزاد کیا گیا تو اس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہیں آتی، کیونکہ صدقہ وہ مال ہے جو کسی مستحق کو بلامعاوضہ دیا جائے، رقم زکوٰۃ اگر آقا کو دی جائے تو ظاہر ہے کہ نہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے اور نہ اس کو یہ رقم بلامعاوضہ ... دی جا رہی ہے، اور غلام جو مستحق زکوٰۃ ہے اس کو یہ رقم دی نہیں گئی، یہ الگ بات ہے کہ اس رقم کے دینے کا فائدہ غلام کو پہونچ گیا کہ اس نے خرید کر آزاد کر دیا، مگر آزاد کرنا صدقہ کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا، اور حقیقی معنی کو بلاوجہ چھوڑ کر صدقہ کے مجازی معنی یعنی عام مراد لینے کا بلاضرورت کوئی جواز نہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ میں

مصارف صدقات کے بیان کئے جا رہے ہیں، اس لئے فِي الرِّقَابِ کا مصداق کوئی ایسی چیز نہیں بن سکتی جس پر صدقہ کی تعریف ہی صادق نہ آئے، اور اگر یہ رقم زکوٰۃ خود غلام کو دی جائے تو غلام کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ خود بخود آقا کا مال بن جائے گا، پھر آزاد کرنا نہ کرنا بھی اس کے اختیار میں رہے گا۔

اس فقہی اشکال کی وجہ سے جمہور ائمہ اور فقہاء نے فرمایا کہ فِي الرِّقَابِ سے مراد صرف غلام مکاتب ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صدقہ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ کسی مستحق کو مالک بنا کر اس کے قبضہ میں دیدیا جائے جب تک مستحق کا مالکانہ قبضہ اس پر نہیں ہوگا زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

چھٹا مصرف اَلْغَارِمِيْنَ، غارم کی جمع ہے جس کے معنی مدیون یعنی قرضدار کے ہیں یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ پچھلا اور چھٹا مصرف جو حرف فِي کے ساتھ بیان کیا گیا ہے استحقاق میں پہلے چاروں مصارف سے زیادہ ہیں اس لئے غلام کی گلو خلاصی کے لئے یا قرضدار کو ادائے قرض کے لئے دینا عام فقراء و مساکین کو دینے سے زیادہ افضل ہے، شرط یہ ہے کہ اس قرضدار کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ قرض ادا کرسکے، کیونکہ غارم لغت میں ایسے ہی قرضدار کو کہا جاتا ہے، اور بعض ائمہ فقہاء نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ قرض اس نے کسی ناجائز کام کے لئے نہ لیا ہو، اور اگر کسی گناہ کے لئے قرض کر لیا جیسے شراب وغیرہ یا شادی غمی کی ناجائز رسمیں وغیرہ تو ایسے قرضدار کو مد زکوٰۃ سے نہ دیا جائے گا، تاکہ اس کی معصیت اور اسراف بے جا کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

ساتواں مصرف فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہے یہاں پھر حرف فِي کا اعادہ کیا گیا۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ مصرف پچھلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے وجہ یہ کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک تو غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیونکہ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اس لئے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی، اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لئے لیتے ہیں (روح بحوالہ ظہیریہ)

اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو

اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کرسکے، جیسے دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کے لئے نشر و اشاعت، کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مالِ زکوٰۃ سے کردی جائے **مگر مالدار صاحبِ نصاب کو نہیں دیا جاسکتا۔**

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو "فی سبیل اللہ" کی تفسیر میں مذکور ہیں فقر و حاجتمندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحبِ نصاب کا اس مد میں بھی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کرسکتا ہو جو جہاد یا حج کے لئے درپیش ہے تو اگرچہ بقدرِ نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے، مگر وہ بھی اس اعتبار سے فقیر و حاجتمند ہی ہوگیا کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لئے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں، فتح القدیر میں شیخ ابن ہمامؒ نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصارف ذکر کئے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجتمندی کی بناء پر مستحق ہیں، لفظ فقیر مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بناء پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضۂ خدمت دیا جاتا ہے، اسی لئے اس میں غنی و فقیر برابر ہیں، جیسے غارمین کے مصرف میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، کیونکہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ لفظ فی سبیل اللہ کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لئے کئے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کردیا جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفاخانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا، اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات ان سب کو انھوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کرکے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو سراسر غلط ہے، اور اجماعِ امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنھوں نے قرآن کو براہِ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں

اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ ...... وقف کر دیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو (مبسوط سرخسی، ص ۱۰ ج ۳)

امام ابن جریر، ابن کثیر، قرآن کی تفسیر روایت حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ "فی سبیل اللہ" کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لئے مخصوص کیا ہے جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو، اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و حاجتمند تو خود ہی مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ اور فقہاء امت میں سے کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء حنفیہ میں سے شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط[1] اور شرح سیر[2] میں اور فقہاء شافعیہ میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دردیر شرح مختصر خلیل[3] میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفق نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔

ائمہ تفسیر اور فقہاء امت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے تو اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات و عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جا سکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبوی ﷺ بالکل غلط ٹھہرتا ہے، معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ

---

[1] مبسوط، ص ۲۰۲ ج ۲ [2] شرح سیر ص ۲۴۴ ج ۴ [3] شرح مختصر الخلیل ص ۱۶۱/ ج ۱

اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ مراد وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ وتابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔

آٹھواں مصرف ابن السبیل ہے، سبیل کے معنی راستہ، اور ابن کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن عربی محاورات میں ابن اور اب اور اخ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لئے بھی بولے جاتے ہیں جن سے زیادہ تعلق کسی سے ہو، اسی محاورہ کے مطابق ابن السبیل راہ گیر مسافر کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہونچنے سے ہے، اور مصارف زکوٰۃ میں اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس سفر میں بقدر ضرورت مال نہ ہو، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس کتنا ہی مال ہو، ایسے مسافر کو مال زکوٰۃ دیا جا سکتا ہے جس سے وہ اپنے سفر کی ضروریات پوری کرلے، اور وطن واپس جا سکے۔

یہاں تک ان آٹھ مصارف کا بیان پورا ہوگیا جو آیت مذکورہ میں صدقات زکوٰۃ کے لئے بیان فرمائے گئے ہیں، اب کچھ ایسے مسائل بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق ان تمام مصارف سے یکساں ہے۔

مسئلہ تملیک جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہونچتا ہے جو مصرف زکوٰۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح فقہاء امت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میت کا کفن رقم زکوٰۃ سے نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رقم زکوٰۃ کسی غریب مستحق کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت

کے کفن پر خرچ کر دے. اسی طرح اگر اس میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقم زکوٰۃ سے براہِ راست ادا نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس کے وارث غریب مستحق زکوٰۃ ہوں، تو ان کو مالکانہ طور سے دیا جا سکتا ہے، وہ اس رقم کے مالک ہو کر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میت کا قرض ادا کر سکتے ہیں، اسی طرح رفاہِ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پُل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر گرچہ ان کا فائدہ مستحقین زکوٰۃ کو بھی پہونچتا ہے، مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے ...... زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ مجتہدین ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور فقہاءِ امت متفق ہیں، شمس الائمہ سرخسیؒ نے اس مسئلہ کو امام محمدؒ کی کتابوں کی شرح مبسوط اور شرح سیر میں پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اور فقہ شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ کی عام کتابوں میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

فقیہ شافعی امام ابوعبید نے کتاب الاموال میں فرمایا کہ میت کی طرف سے اس کے قرض کی ادائیگی یا اس کے دفن کے اخراجات میں اور مساجد کی تعمیر میں، نہر کھودنے وغیرہ میں مالِ زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں، کیونکہ سفیان ثوریؒ اور تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ اس میں خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اُن آٹھ مصارف میں سے نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

اسی طرح فقیہ حنبلی موفقؒ نے مغنی میں لکھا ہے کہ بجز اُن مصارف کے جن کا بیان قرآن کریم میں مذکور ہے اور کسی نیک کام میں زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں جیسے مساجد یا پلوں اور پانی کی سبیلوں کی تعمیر یا سڑکوں کی درستی یا مُردوں کو کفن دینا یا مہمانوں کو کھانا کھلانا وغیرہ جو بلاشبہ موجبِ ثواب ہیں، مگر مصارفِ صدقات میں داخل نہیں۔

ملک العلماء نے بدائع میں ادائگی زکوٰۃ کے لئے شرط تملیک کی یہ دلیل دی ہے کہ قرآن میں عموماً زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا لفظ ایتاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ، اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ، اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وغیرہ اور لفظ ایتاء لغت میں عطاء کرنے کے معنی میں آتا ہے، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا وَالْاِیْتَاءُ الْاِعْطَاءُ وَخُصَّ وَضْعُ الصَّدَقَةِ فِی الْقُرْاٰنِ بِالْاِیْتَاءِ، یعنی ایتاء کے معنی عطاء فرمانے کے ہیں، اور قرآن میں صدقہ واجبہ ادا کرنے کو ایتاء کے لفظ کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی چیز عطاء کرنے کا مفہوم حقیقی یہی ہے کہ اس کو اس

چیز کا مالک بنا دیا جائے۔

اور علاوہ زکوٰۃ و صدقات کے بھی لفظ ایتاء قرآن کریم میں مالک بنا دینے ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، مثلاً وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ یعنی دیدو عورتوں کو ان کے مہر، ظاہر ہے مہر کی ادائیگی جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب رقم مہر پر عورت کو مالکانہ قبضہ دیدے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور صدقہ کے معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجتمند کو اس کا مالک بنا دیا جائے کسی کو کھانا کھلا دینا یا رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا حقیقی معنی کے اعتبار صدقہ نہیں کہلاتا، شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ حقیقت صدقہ کی بھی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنا دیا جائے اسی طرح امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تملیک کا نام ہے (جصاص، ص ۵۲، ج ۲)

ادائے زکوٰۃ کے متعلق بعض اہم مسائل مسئلہ: صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو صدقات وصول کرنے کے بارے میں یہ ہدایت دی تھی کہ خُذْهَا مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَرُدَّهَا فِىْ فُقَرَآئِهِمْ یعنی صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لیکر انہی کے فقراء میں صرف کر دو، اسی کی بنا پر فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ بلا ضرورت ایک شہر یا بستی کی زکوٰۃ دوسرے شہر یا بستی میں نہ بھیجی جائے، بلکہ اسی شہر اور بستی کے فقراء اس کے زیادہ حقدار ہیں، البتہ اگر کسی شخص کے عزیز قریب غریب ہیں اور وہ کسی دوسرے شہر میں ہیں تو اپنی زکوٰۃ ان کو بھیج سکتا ہے، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ نے اس میں دوہرے اجر و ثواب کی بشارت دی ہے۔

اسی طرح اگر کسی دوسری بستی کے لوگوں کا فقر و فاقہ اور اپنے شہر سے زیادہ ضرورت معلوم ہو تو بھی وہاں بھیجا جا سکتا ہے کیونکہ مقصد صدقات دینے کا فقراء کی حاجت کو رفع کرنا ہے، اسی وجہ سے حضرت معاذؓ یمن کے صدقات میں اکثر کپڑے لیا کرتے تھے تاکہ فقراء مہاجرین کے لئے مدینہ طیبہ بھیج دیں (قرطبی بحوالہ دارقطنی)

گر ایک شخص خود کسی شہر میں رہتا ہے، مگر اس کا مال دوسرے شہر میں ہے تو جس شہر میں خود رہتا ہے اس کا اعتبار ہوگا کیونکہ ادائے زکوٰۃ کا مخاطب یہی شخص ہے (قرطبی)

مسئلہ: جس مال کی زکوٰۃ واجب ہے اس کی ادائیگی کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اسی مال کا چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دیدے، جیسے تجارتی کپڑا، برتن، فرنیچر وغیرہ اور یہ بھی ہے کہ مقدار زکوٰۃ مال کی قیمت نکال کر وہ مستحقین میں تقسیم کرے، احادیث صحیحہ

سے ایسا کرنا ثابت ہو (قرطبی) اور بعض ائمۂ فقہاء نے فرمایا کہ اس زمانہ میں نقد قیمت ہی دینا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ فقراء کی ضرورتیں مختلف اور کثیر ہیں، نقد پیسوں کو کسی بھی ضرورت کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: اگر اپنے عزیز غریب لوگ مستحق زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ و صدقات دینا زیادہ بہتر اور دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلۂ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو یہ جتلا کر دے کہ صدقہ یا زکوٰۃ دے رہا ہوں، کسی تحفہ یا ہدیہ کے عنوان سے بھی دیا جاسکتا ہے، تاکہ لینے والے شریف آدمی کو اپنی خفت محسوس نہ ہو۔

مسئلہ: جو شخص اپنے آپ کو اپنے قول یا عمل سے مستحق زکوٰۃ حاجت مند ظاہر کرے اور صدقات وغیرہ کا سوال کرے، کیا دینے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقیقی حالات کی تحقیق کریں، اور بغیر اس کے صدقہ نہ دیں، اس کے متعلق روایاتِ حدیث اور اقوالِ فقہاء یہ ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے ظاہری حال سے اگر یہ گمان غالب ہو کہ یہ شخص حقیقت میں فقیر حاجت مند ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ نہایت شکستہ حال آئے، آپ نے ان کے لئے لوگوں سے صدقات جمع کرنے کے لئے فرمایا کافی مقدار جمع ہوگئی تو وہ ان کو دیدی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان لوگوں کے اندرونی حالات کی تحقیق فرماتے (قرطبی)

البتہ قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ مصارف صدقات میں سے ایک مدیون بھی ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ذمہ اتنا قرض ہے اس کی ادائیگی کے لئے مجھے زکوٰۃ کی رقم دیدی جائے تو اس قرض کا ثبوت اس سے طلب کرنا چاہئے (قرطبی) اور ظاہر یہ ہے کہ غارم، فی سبیل اللہ، ابن السبیل وغیرہ میں بھی ایسی تحقیق کرلینا دشوار نہیں، ان مصارف میں حسب موقع تحقیق کرلینا چاہئے۔

مسئلہ: مال زکوٰۃ اپنے عزیز رشتہ داروں کو دینا زیادہ ثواب ہے، مگر میاں بی بی اور والدین و اولاد آپس میں ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کو دینا ایک حیثیت سے اپنی ہی پاس رکھنا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے مصارف عموماً مشترک ہوتے ہیں شوہر نے اگر بیوی کو یا بیوی نے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دیدی، تو درحقیقت وہ اپنے ہی استعمال میں رہی، اسی طرح والدین اور اولاد کا معاملہ ہے، اولاد کی اولاد اور دادا پردادا کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق اور مصرفِ زکوٰۃ سمجھ کر زکوٰۃ دیدی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی کا غلام یا کافر تھا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی چاہئے کیونکہ غلام کی ملکیت تو آقا ہی کی ملکیت ہوتی ہے، وہ اس کی ملک سے نکلا ہی نہیں، اس لئے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اور کافر زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہو کہ جسکو زکوٰۃ دی گئی ہے وہ مالدار یا سید ہاشمی یا بنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے تو زکوٰۃ کے اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ رقمِ زکوٰۃ اس کی ملک سے نکل کر محلِ ثواب میں پہونچ چکی ہے، اور تعیینِ مصرف میں جو غلطی کسی اندھیرے یا مغالطہ کی وجہ سے ہوگئی وہ معاف ہے (درمختار) آیتِ صدقات کی تفسیر اور اس کے متعلقہ مسائل کی تفصیل بقدرِ ضرورت پوری ہوگئی۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ

اور بعضے ان میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں یہ شخص تو کان ہے تو کہہ

أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ

کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے

لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ

ایمان والوں کے حق میں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی ان کے لئے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ

عذاب ہے دردناک، قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے تاکہ تم کو راضی کریں، اور اللہ کو

وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ أَلَمْ

اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر وہ ایمان رکھتے ہیں کیا وہ

يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ

جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اس کے رسول سے تو اس کیواسطے ہے دوزخ کی

خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ

آگ سدا رہے اس میں، یہی ہے بڑی رسوائی، ڈرا کرتے ہیں منافق

أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا

اس بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر ایسی سورت کہ جتا دے ان کو جو ان کے دل میں ہے، تو کہہ دے ٹھٹھے کرتے رہو

إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ

اللہ کھول کر رہے گا اس چیز کو جس کا تم کو ڈر ہے، اور اگر تو ان سے پوچھے تو وہ کہیں گے

إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ

ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی، تو کہہ کیا اللہ سے اور اس کے حکموں سے اور اس کے رسول سے

تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ

تم ٹھٹھے کرتے تھے، بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہار ایمان کے پیچھے۔

إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ

اگر ہم معاف کر دیں گے تم میں سے بعضوں کو تو البتہ عذاب بھی دیں گے بعضوں کو اس

كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

سبب سے کہ وہ گنہگار تھے۔

ع ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور ان (منافقین) میں بعضے ایسے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایذا پہنچاتے ہیں (یعنی آپ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سن کر آپ کو ایذا ہو) اور (جب کوئی روکتا ہے تو) کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں (آپ کو جھوٹ بول کر دھوکہ دے دینا آسان ہے، اس کی کچھ فکر نہیں) آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ (تم کو خود دھوکہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بات کو سن لینا دو طور پر ہے، ایک تصدیق کے طور پر کہ دل سے بھی اس کو صحیح سمجھیں، دوسرا خوش خلقی اور کریم النفسی کے طور پر کہ باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ بات محض غلط ہے شرافت نفس اور حسن خلق کی بنا پر اس کو ٹال دیں، اور کہنے والے پر رد و گیر یا اس کی صریح تکذیب نہ کریں سو) وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں خیر (ہی خیر) ہے، (جس کا حاصل اور نتیجہ یہ ہے کہ) وہ اللہ کی باتوں (وحی سے معلوم کر کے ان) پر ایمان لاتے ہیں (جن کی تصدیق کا خیر ہونا تمام عالم کے لئے ظاہر ہے کیونکہ تعلیم دین و عدل اسی

تصدیق پر موقوف ہے اور مؤمنین مخلصین کی باتوں کا (جو بحیثیت ایمان و اخلاص ہوں) یقین کرتے ہیں (اس کا خیر ہونا بھی ظاہر ہے کہ عدل عام موقوف ہے احوال کی صحیح اطلاع پر اور اس کا ذریعہ یہی مؤمنین مخلصین ہیں، غرض کان دے کر درست سمجھ کر تو صدق سمجھے اور مخلصین کی باتیں سنتے ہیں اور (باقی تمہاری شرارت آمیز باتیں جو سُن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں (گو دل میں ایمان نہ ہو) پس اس مہربانی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے تمہاری باتیں سُن لیتے ہیں اور باوجود اس کی حقیقت سمجھ جانے کے درگذر اور خاموشی برتتے ہیں پس ان باتوں کا سننا دوسرے طور کا ہے تم نے اپنی حماقت سے اس کو بھی اول طور پر محمول کر لیا خلاصہ یہ کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ حقیقت کو حضرت نہیں سمجھتے اور واقع میں حقیقت کو تم ہی نہیں سمجھتے) اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچاتے ہیں (خود ان باتوں سے جن کے کہنے کے بعد اُذُن کہا تھا یا خود اسی ہُوَ اُذُنٌ کے کہنے سے کیونکہ ان کا آپ کو اُذُن کہنا آپ کی تنقیص کے لئے تھا کہ معاذ اللہ آپ کو سمجھ نہیں جو کچھ سُن لیتے ہیں اسکو مان لیتے ہیں) ان لوگوں کے لئے دردناک سزا ہوگی، یہ لوگ تمہارے (مسلمانوں کے) سامنے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں (کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی یا ہم غزوہ میں فلاں عذر سے نہ جا سکے) تاکہ تم کو راضی کرلیں جس سے ان کا جان و مال محفوظ رہے، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں (جو کہ موقوف ہے اخلاص اور ایمان پر) کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا (جیسا یہ لوگ کر رہے ہیں، تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا (اور) یہ بڑی رسوائی کی بات ہے، منافق لوگ (طبعًا) اس سے اندیشہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر (بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی ایسی سورت (یعنی آیت) نازل نہ ہو جاوے جو ان کو ان منافقین کے مافی الضمیر پر اطلاع دیدے (یعنی انھوں نے جو استہزاء کی باتیں خفیہ کی ہیں کہ مسلمانوں کے اعتبار سے وہ مثل ان اسرار کے ہیں جو دلوں میں پوشیدہ ہیں ان کی خبر نہ ہو جاوے) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو (اس میں ان کے استہزاء پر مطلع ہو جانے کو جتلا دیا جیسا آگے خود ارشاد ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس کے (اظہار) سے تم اندیشہ کرتے تھے (چنانچہ اِسْتَهْزَءُوْا میں ظاہر کر دیا کہ تم استہزاء کر رہے تھے، اور اظہار ہو جانے کے بعد) اگر آپ ان سے (اس استہزاء کی وجہ) پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض ہنسی اور خوش طبعی کر رہے تھے (اس کلام کے حقیقی معنی مقصود نہ تھے، محض جی خوش کرنے کو جس سے سفر آسانی سے قطع ہو ایسی باتیں زبانی کر رہے تھے) آپ ان سے

کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے یعنی خواہ غرض کچھ بھی ہو مگر یہ تو دیکھتے کہ تم استہزا کس کا کر رہے ہو جن کے ساتھ استہزا کسی غرض سے بھی درست نہیں تم اب (یہ بیہودہ) عذر مت کرو (مطلب یہ ہے کہ عذر مقبول نہیں اور اس عذر سے استہزا جائز نہیں ہوجاتا) تم تو اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے (کیونکہ دین کے ساتھ استہزاء مطلقاً کفر ہے گو دل میں تو پہلے بھی ایمان نہ تھا، البتہ اگر کوئی دل سے توبہ کرلے اور مومن مخلص بن جاوے تو البتہ کفر اور عذاب کفر سے چھوٹ جاوے، لیکن اس کی بھی سب کو توفیق نہ ہوگی ہاں بعض البتہ مسلمان ہوجاویں گے، اور وہ معاف کردیئے جائیں گے، پس حاصل یہ ٹھہرا کہ) اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں (اس لئے کہ وہ مسلمان ہوگئے) تو ہم بعض کو (ضرور ہی) سزا دیں گے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی میں) مجرم تھے (یعنی وہ مسلمان نہیں ہوئے)۔

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں بھی سابقہ آیات کی طرح منافقین کے بیہودہ اعتراضات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور پھر جھوٹی قسمیں کھاکر اپنے ایمان کا یقین دلانے کے واقعات اور ان پر تنبیہ ہے۔

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بطور استہزاء یہ کہتے ہیں کہ "وہ تو بس کان ہیں" یعنی جو کچھ کسی سے سُن لیتے ہیں اسی پر یقین کرلیتے ہیں، اس لئے ہمیں کچھ فکر نہیں، اگر ہماری سازش کھل بھی گئی تو ہم پھر قسم کھاکر آپ کو اپنی برأت کا یقین دلادیں گے جس کے جواب میں حق تعالیٰ نے ان کی حماقت کو واضح فرمادیا، کہ وہ جو منافقین اور مخالفین کی غلط باتوں کو سُن کر اپنے مکارم اخلاق کی بناء پر خاموش ہو رہتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھو کہ آپ کو حقیقت حال کی خبر نہیں، صرف تمہارے کہنے پر یقین کرتے ہیں، بلکہ وہ سب کی پوری پوری حقیقت سے باخبر ہیں، تمہاری غلط باتیں سُن کر وہ تمہاری سچائی کے قائل نہیں ہوجاتے، البتہ اپنی شرافتِ نفس اور کرم کی بناء پر تمہارے مُنہ پر تمہاری تردید نہیں کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ، اس آیت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ حق تعالیٰ منافقین کی خفیہ سازشوں اور شرارتوں کو ظاہر فرما دیں گے، جس کا ایک واقعہ غزوہ تبوک سے واپسی کا ہے جب کہ بارہ منافقین نے آپ کے قتل کی سازش کی تھی حق تعالیٰ نے آپ کو اس پر بذریعہ جبرئیل مطلع کرکے اس راستہ سے ہٹا دیا جہاں یہ منافقین اس کام کے لئے جمع ہوئے تھے۔

(مظہری عن البغوی)

اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ستر منافقین کے نام مع ان کی ولدیت اور پورے نشان پتے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیئے تھے، مگر رحمۃ للعالمینؐ نے ان کو لوگوں پر ظاہر نہیں فرمایا (مظہری)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ

منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی ایک چال ہے سکھائیں بات بری

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ

اور چھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی، بھول گئے اللہ کو

فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ

سو وہ بھول گیا ان کو، تحقیق منافق وہی ہیں نافرمان، وعدہ دیا ہے اللہ نے

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ

منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو دوزخ کی آگ کا، پڑے رہیں گے اس میں

هِىَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

وہی بس ہے ان کو اور اللہ نے ان کو پھٹکار دیا، اور ان کے لئے عذاب ہے برقرار رہنے والا،

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا

جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال

وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ

اور اولاد، پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصہ سے، پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے

كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ

جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصہ سے، اور تم بھی چلتے ہو

كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

انہی کی سی چال، وہ لوگ مٹ گئے ان کے عمل دنیا میں

اور جیسا ان کے اموال و اولاد ان کے کام نہ آئے تم تو ان چیزوں میں ان سے کم ہو، تمہارے بدرجۂ اولیٰ کام نہ آویں گے، یہ تو ضرر آخرت کی وعید ہوئی آگے ضرر دنیا کے ذکر سے متنبہ فرماتے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کو ان (کے عذاب و ہلاک) کی خبر نہیں پہنچی جو اُن سے پہلے ہوئے ہیں، جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور اُلٹی ہوئی بستیاں (یعنی قری قوم لوطؑ) کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر صاف نشانیاں (حق کی) لے کر آئے (لیکن نہ ماننے سے برباد ہوئے) سو (اس بربادی میں) اللہ تعالیٰ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (اسی طرح ان منافقین کو بھی ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں منافقین کا یک حال یہ بتلایا کہ وہ اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں، يَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ، تفسیر قرطبی میں ہے کہ ہاتھ بند رکھنے سے مراد ترک جہاد اور حقوق واجبہ کا ادا نہ کرنا ہے، نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ، اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو بھلا دیا، اللہ تعالیٰ تو نسیان اور بھول سے پاک ہیں، مراد اس جگہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے احکام کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے بھول گئے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی ثواب آخرت کے معاملہ میں ان کو ایسا ہی کر چھوڑا کہ نیکی اور ثواب میں کہیں ان کا نام نہ رہا۔

آیت (۶۹) كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ خطاب منافقین کو ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں آچکا، اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ خطاب مسلمانوں کو ہے یعنی کالذین من قبلکم، مراد یہ ہے کہ تم لوگ بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح ہو جس طرح وہ لوگ دنیا کی لذائذ میں منہمک ہو کر آخرت کو بھول بیٹھے اور طرح طرح کے معاصی اور بداخلاقیوں میں مبتلا ہو گئے تم بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی وہی طریقے اختیار کرو گے جو تم سے پہلی اُمتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت یعنی ہو بہو ان کی نقل اتارو گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابوہریرہؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کی تصدیق کے لئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا: مَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ یعنی آج کی رات گذشتہ شب سے کیسی ملتی جلتی اور مشابہ ہے، یہ بنی اسرائیل ہیں ہمیں ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے (قرطبی)

حدیث کا مقصود و صحیح ہے کہ آخر زمانے میں مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر چلنے لگیں گے اور منافقین کا عذاب بیان کرنے کے بعد اس کا بیان کرنا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے طریقوں کا اتباع کرنے والے مسلمان وہی ہوں گے جن کے دلوں میں مکمل ایمان نہیں نفاق کے جراثیم ان میں پائے جاتے ہیں۔ صلحاءِ امت کو اس سے بچنے اور بچانے کی ہدایت اس آیت میں دی گئی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ

اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں سکھلاتے ہیں

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

نیک بات اور منع کرتے ہیں بری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں

الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ

زکوٰۃ اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے وہی لوگ ہیں جن پر رحم کرے گا اللہ

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ

باغوں کا کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں اور ستھرے

طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ

مکانوں کا رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی ان سب سے بڑی ہے یہی ہے

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۷۲ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ

بڑی کامیابی۔ اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور

الْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ

منافقوں سے اور تندخوئی کر ان پر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور

بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۷۳

وہ برا ٹھکانا ہے۔

ع ۹ ۱۵

خُلاصۂ تفسیر

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا (جس کی تفصیل وَعَدَ اللّٰهُ میں عنقریب آتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے (جزاء تام دے سکتا ہے) حکمت والا ہے (جزاء مناسب دیتا ہے، اب اس رحمت کا بیان ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا (وعدہ کر رکھا ہے) جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور (ان سب نعمتوں کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی رضامندی (جو ان کو جنت میں ہمیشہ رہے گی، ان) سب (نعمتوں) سے بڑی چیز ہے یہ (جزائے مذکور) بڑی کامیابی ہے، اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بالسنان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منافقین کے حالات، ان کی سازشوں اور ایذاؤں اور ان کے عذاب کا بیان تھا، قرآنی اسلوب کے مطابق مناسب تھا کہ اس جگہ مؤمنین مخلصین کے حالات اور ان کے ثواب اور درجات کا بھی بیان آجائے، آیت مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اس موقع پر منافقین اور مؤمنین مخلصین کے حالات کا تقابل ذکر کیا گیا، مگر ایک جگہ منافقین کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ اور اس کے مقابل مؤمنین کا ذکر آیا تو اس میں فرمایا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، اس میں اشارہ ہے کہ منافقین کے باہمی تعلقات اور روابط تو محض خاندانی اشتراک یا اغراض پر مبنی ہوتے ہیں، نہ ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور نہ اُن پر وہ ثمرات مرتب ہوتے ہیں جو دلی دوستی اور قلبی ہمدردی کے تعلق پر مرتب ہوتے ہیں، بخلاف مؤمنین کے کہ وہ ایک دوسرے کے مخلص دوست اور سچے ہمدرد ہوتے ہیں۔ (قرطبی)

اور چونکہ یہ دوستی اور ہمدردی خالص اللہ کے لئے ہوتی ہے وہ ظاہراً و باطناً و حاضر

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ

قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا اور بیشک کہا ہے انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہو گئے

إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ

مسلمان ہو کر اور قصد کیا تھا اس چیز کا جو ان کو نہ ملی اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولتمند کر دیا

اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَإِنْ

ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے سو اگر توبہ کر لیں تو بھلا ہے ان کے حق میں اور اگر

يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ

نہ مانیں گے تو عذاب دیگا ان کو اللہ عذاب دردناک، دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٧٤﴾ وَمِنْهُمْ مَنْ

اور نہیں ان کا روئے زمین پر کوئی حمایتی اور نہ مددگار، اور بعضے ان میں وہ ہیں

عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ

کہ عہد کیا تھا اللہ سے اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور ہو رہیں ہم

الصَّالِحِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا

نیکی والوں میں، پھر جب دیا ان کو اپنے فضل سے تو اس میں بخل کیا اور پھر گئے

وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٧٦﴾ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ

ٹلا کر، پھر اس کا اثر رکھ دیا نفاق ان کے دلوں میں جس دن تک کہ

يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿٧٧﴾

وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے ان کا بھید اور ان کا مشورہ اور یہ کہ

اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٧٨﴾

اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

نصیب ہوگئی، اور باوجود کفر مضمر کے جو اسلام اور طاعت کا اظہار کرتے ہیں تو) کیا ان (منافقین) کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا راز اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام غیب کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (اور اس لئے وہ ظاہری اسلام اور اطاعت ان کے کام نہیں آسکتے) بالخصوص آخرت میں، پس سزائے جہنم ضروری ہے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ میں منافقین کا تذکرہ ہے کہ وہ اپنی مجلسوں میں کلماتِ کفر کہتے رہتے ہیں، پھر اگر مسلمانوں کو اطلاع ہوگئی تو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی براءت ثابت کرتے ہیں، اس آیت کے شانِ نزول میں بغویؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک خطبہ دیا جس میں منافقین کی بدحالی اور انجامِ بد کا ذکر فرمایا، حاضرین میں ایک منافق جلاس بھی موجود تھا، اس نے اپنی مجلس میں جاکر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں، اس کا یہ کلمہ ایک صحابی عامر بن قیسؓ نے سن لیا تو کہا بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے اور تم واقعی گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہو۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر تبوک سے واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو عامر بن قیسؓ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا دیا، اور جلاس اپنے کہے سے مکر گیا، اور کہنے لگا کہ عامر بن قیسؓ نے مجھ پر تہمت باندھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ منبر نبوی کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں، جلاس نے بیدھڑک جھوٹی قسم کھالی کہ میں نے ایسا نہیں کہا، عامر جھوٹ بول رہے ہیں، حضرت عامرؓ کا نمبر آیا تو انھوں نے بھی قسم کھائی، اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ یا اللہ آپ اپنے رسول پر بذریعہ وحی اس واقعہ کی حقیقت روشن فرما دیں، ان کی دعا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں نے آمین کہی، ابھی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ جبرئیل امین وحی لے کر حاضر ہوگئے جس میں آیت مذکورہ تھی۔

جلاس نے جب آیت سنی تو فوراً کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ اب میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی، اور عامر بن قیس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا، مگر اسی آیت میں حق تعالیٰ نے مجھے توبہ کا بھی حق دیدیا ہے، میں اب اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور جلاس اپنی توبہ پر قائم رہے ان کے حالات درست ہوگئے (مظہری)

بعض حضرات مفسرین نے اسی طرح کے دوسرے واقعات اس کے شان نزول میں بیان فرمائے ہیں، خصوصاً اس لئے کہ اس آیت کا ایک جملہ یہ بھی ہے وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا یعنی انہوں نے ارادہ کیا ایک ایسے کام کا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کسی ایسے واقعہ سے متعلق ہے جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے، جیسے اسی غزوۂ تبوک سے واپسی کا واقعہ معروف ہے کہ بارہ آدمی منافقین میں سے پہاڑ کی ایک گھاٹی میں اس غرض سے چھپ کر بیٹھ گئے کہ جب آپ یہاں پہونچیں تو یکبارگی حملہ کرکے آپ کو قتل کردیں، جبرئیل امین نے آپ کو خبر دیدی تو آپ اس راستہ سے ہٹ گئے، اور ان کی سازش خاک میں مل گئی۔

اور بعض دوسرے واقعات بھی منافقین کی طرف سے ایسے پیش آئے ہیں، مگر اس میں تضاد یا بُعد نہیں کہ وہ سب ہی واقعات اس آیت میں مراد ہوں۔

دوسری آیت وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ بھی ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے، ابن جریرؒ، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو امامہ باہلیؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ درخواست کی کہ آپ دعا کریں کہ میں مالدار ہو جاؤں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو میرا طریقہ پسند نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر میں چاہتا تو مدینہ کے پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ پھرا کرتے، مگر مجھے ایسی مالداری پسند نہیں۔ یہ شخص چلا گیا، مگر دوبارہ پھر آیا اور پھر یہی درخواست اس معاہدہ کے ساتھ پیش کی کہ اگر مجھے مال مل گیا تو میں ہر حقدار کو اس کا حق پہنچاؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کردی جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ اس کی بکریوں میں بے پناہ زیادتی شروع ہوئی، یہاں تک کہ مدینہ کی جگہ اس پر تنگ ہوگئی، تو باہر چلا گیا، اور ظہر عصر کی دو نمازیں مدینہ میں آکر آپ کے ساتھ پڑھتا تھا، باقی نمازیں بھی جنگل میں جہاں اس کا یہ مال تھا وہیں ادا کرتا تھا۔

پھر ان بکریوں میں اور زیادتی اتنی ہوگئی کہ یہ جگہ بھی تنگ ہوگئی، اور شہر مدینہ سے دور جاکر کوئی جگہ لی، وہاں سے صرف جمعہ کی نماز کے لئے مدینہ میں آتا اور پنجگانہ نمازیں وہیں پڑھنے لگا، پھر اس مال کی فراوانی اور بڑھی تو یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی، اور مدینہ سے بہت دور چلا گیا، جہاں جمعہ اور جماعت سب سے محروم ہوگیا۔

کچھ عرصہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ اس کا مال اتنا زیادہ ہوگیا کہ شہر کے قریب میں اس کی گنجائش ہی نہیں،

اس لئے کسی دوسری جگہ پر جاکر اس نے قیام کیا ہے، اور اب یہاں نظر نہیں پڑتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تین مرتبہ فرمایا یَا وَیْحَ ثَعْلَبَۃَ، یعنی ثعلبہ پر افسوس ہے ثعلبہ پر افسوس ہے، ثعلبہ پر افسوس ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں آیت صدقات نازل ہوگئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے صدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً) آپ نے مویشی کے صدقات کا مکمل قانون لکھوا کر دو شخصوں کو عامل صدقہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مویشی کے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا، اور ان کو حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی پہونچیں، اور بنی سُلیم کے ایک اور شخص کے پاس جانے کا بھی حکم دیا۔

یہ دونوں جب ثعلبہ کے پاس پہونچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دکھایا تو ثعلبہ کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہوگیا، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، اور پھر کہا کہ اچھا اب تو آپ جائیں جب واپس ہوں تو یہاں آجائیں، یہ دونوں چلے گئے۔

اور دوسرے شخص سُلیمی نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا تو اپنے مویشی اونٹ اور بکریوں میں جو سب سے بہتر جانور تھے، نصاب صدقہ کے مطابق وہ جانور لے کر خود ان دونوں قاصدانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گئے، انھوں نے کہا کہ ہمیں تو حکم یہ ہے کہ جانوروں میں اعلیٰ چھانٹ کر نہ لیں، بلکہ متوسط وصول کریں، اس لئے ہم تو یہ نہیں لے سکتے، سُلیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے یہی پیش کرنا چاہتا ہوں، یہی جانور قبول کر لیجئے۔

پھر یہ دونوں حضرات دوسرے مسلمانوں سے صدقات وصول کرتے ہوئے واپس آئے تو پھر ثعلبہ کے پاس پہونچے، تو اس نے کہا کہ لاؤ وہ قانون صدقات مجھے دکھلاؤ، پھر اس کو دیکھ کر یہی کہنے لگا کہ یہ تو ایک قسم کا جزیہ ہوگیا، جو مسلمانوں سے نہیں لینا چاہئے، اچھا اب تو آپ جائیں میں غور کروں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا

جب یہ دونوں حضرات واپس مدینہ طیبہ پہونچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے حالات پوچھنے سے پہلے ہی پھر وہ کلمہ دُہرایا جو پہلے فرمایا تھا یَا وَیْحَ ثَعْلَبَۃَ یَا وَیْحَ ثَعْلَبَۃَ یَا وَیْحَ ثَعْلَبَۃَ (یعنی ثعلبہ پر سخت افسوس ہے) یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا، پھر سُلیمی کے معاملہ پر خوش ہوکر اس کے لئے دعاء فرمائی، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ، یعنی ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو مال عطا فرمادیں گے تو ہم صدقہ خیرات کریں گے، اور صالحین میں سے ہوجائیں گے، یعنی رشتہ داروں اور غریبوں کے حقوق ادا کریں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے مال دیدیا تو بخل کرنے لگے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے پھر گئے

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدعملی اور بدعہدی کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں نفاق کو اور پختہ کر دیا، کہ اب ان کو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوگی۔

فائدہ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمالِ بد کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

ابن جریر نے حضرت ابو امامہ کی تفصیلی روایت جو ابھی ذکر کی گئی ہے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے لئے یَا وَیحَ ثَعْلَبَۃَ تین مرتبہ فرمایا تو اس مجلس میں ثعلبہ کے کچھ عزیز واقارب بھی موجود تھے، یہ سن کر ان میں سے ایک آدمی فوراً سفر کر کے ثعلبہ کے پاس پہونچا، اور اس کو ملامت کی، اور بتلایا کہ تمہارے بارے میں قرآن کی آیت نازل ہوگئی ہے، یہ سن کر ثعلبہ گھبرایا، اور مدینہ حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرا صدقہ قبول کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے، یہ سن کر ثعلبہ اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو تمہارا اپنا عمل ہے، میں نے تمہیں حکم دیا تم نے اطاعت نہ کی، اب تمہارا صدقہ قبول نہیں ہو سکتا، ثعلبہ ناکام واپس ہوگیا، اور اس کے کچھ دن بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور صدیق اکبرؓ خلیفہ ہوئے تو ثعلبہ صدیق اکبرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میرا صدقہ قبول کر لیجئے، صدیق اکبرؓ نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کیا تو میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔

پھر صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد ثعلبہ فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور وہی درخواست کی اور وہی جواب ملا جو صدیق اکبرؓ نے دیا تھا، پھر حضرت عثمان غنیؓ کے زمانۂ خلافت میں اُن سے درخواست کی انھوں نے بھی انکار کر دیا، اور خلافتِ عثمانؓ کے زمانہ میں ثعلبہ مر گیا، (نعوذ باللہ من سیئات الاعمال) (مظہری)

مسئلہ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہو کر حاضر ہوگیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی، وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کر رہا ہے، اس کے دل میں نفاق موجود ہے، محض وقتی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے، اس لئے قبول نہیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منافق قرار دیدیا تو بعد کے خلفاء کو اس کا صدقہ قبول کرنے کا حق نہیں رہا کیونکہ زکوٰۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کسی شخص کے دل کا نفاق قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے آئندہ کا حکم یہی ہے کہ جو

شخص توبہ کرلے اور اسلام و ایمان کا اعتراف کرلے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو (بیان القرآن)

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور

الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ

ان پر جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت کا پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں، اللہ نے ان

اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ

سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے، تو ان کے لئے بخشش مانگ یا

لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ

نہ مانگ، اگر تو ان کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا

اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

ان کو اللہ، یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اللہ رستہ

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو

خلاصۂ تفسیر

یہ منافقین ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں (تھوڑا ہونے پر) طعن کرتے ہیں اور (بالخصوص) ان لوگوں پر (اور زیادہ) جن کو بجز محنت مزدوری کی آمدنی کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا (اور وہ بیچارے اسی مزدوری میں سے ہمت کرکے کچھ صدقہ نکال دیتے ہیں) یعنی ان سے تمسخر کرتے ہیں (یعنی مطلق طعن تو سب ہی پر کرتے ہیں کہ کیا تھوڑی سی چیز صدقہ میں لائے اور ان محنت کش غریبوں سے تمسخر بھی کرتے ہیں کہ لو یہ بھی صدقہ دینے کے قابل ہوگئے) اللہ تعالیٰ ان کو اس تمسخر کا (تو خاص) بدلہ دے گا اور (ویسے مطلق طعن کا یہ بدلہ ملے گا کہ) ان کے لئے (آخرت میں) دردناک سزا ہوگی، آپ خواہ ان منافقین کے لئے استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں (دونوں حال برابر ہیں کہ ان کو اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا، کی

مغفرت نہیں کی جائے گی) اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ (یعنی بکثرت بھی) استغفار کریں تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ تعالیٰ ایسے سرکش لوگوں کو (جو کبھی ایمان اور حق کی طلب ہی نہ کریں) ہدایت نہیں کیا کرتا (اس وجہ سے یہ عمر بھر کفر ہی پر قائم رہے، اسی پر مر گئے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں نفلی صدقات دینے والے مسلمانوں پر منافقین کے طعن و تشنیع کا ذکر ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابومسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا، اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم محنت مزدوری کرتے تھے (کوئی مال ہمارے پاس نہ تھا، اسی مزدوری سے جو کچھ ہمیں ملتا تھا اسی میں سے صدقہ بھی نکالتے تھے، چنانچہ ابوعقیلؓ نے آدھا صاع (تقریباً پونے دو سیر) صدقہ پیش کیا، دوسرا آدمی آیا اس نے اس سے کچھ زیادہ صدقہ کیا، منافقین ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے کہ کیا حقیر اور ذرا سی چیز صدقہ میں لائے، اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی ضرورت نہیں، اور جس نے کچھ زیادہ صدقہ کیا اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ریا: لوگوں کو دکھلانے کے لئے صدقہ کیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

سَخِرَ اللّٰہُ مِنْهُمْ میں جزاء تمسخر کو تمسخر سے تعبیر کیا گیا ہے

دوسری آیت میں جو منافقین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمایا گیا کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے، اور کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہیں ہوگی، اس کا پورا بیان آگے آنے والی آیت لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ کے تحت آئے گا۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ

خوش ہو گئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہو کر رسول اللہ سے اور گھبرائے اس

يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا

سے کہ لڑیں اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں اور بولے

لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا

کہ مت کوچ کرو گرمی میں، تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے، اگر ان کو

کے طور پر باتیں بنا رہے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا مافی الضمیر بتلا دیا ہے، اس لئے نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ، تم کبھی بھی میرے ساتھ (جہاد میں) نہ چلوگے اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمن (دین) سے لڑو گے (جو کہ اصلی مقصود ہے چلنے سے کیونکہ) تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا (اور اب بھی عزم وہی ہے) تو (خواہ مخواہ جھوٹی باتیں کیوں بناتے ہو، بلکہ مثل سابق اب بھی) ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو (جو واقعی) پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں (بوجہ عذر کے جیسے بوڑھے اور بچے اور عورتیں)

معارف و مسائل

اوپر سے مسلسل منافقین کے حالات کا بیان رہا ہے، جو غزوہ تبوک میں حکم عام کے باوجود شریک نہیں ہوئے، مذکورا لصدر آیات میں بھی انہی کا ایک حال دوسرے ان کی سزائے آخرت کی وعید اور دنیا میں آئندہ کے لئے ان کا نام مجاہدین اسلام کی فہرست سے خارج کر دینا اور آئندہ **ان کو کسی جہاد میں شرکت کی اجازت نہ ہونا مذکور ہے۔**

مُخَلَّفُوْنَ، مُخَلَّفٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں متروک، یعنی جس کو چھوڑ دیا گیا ہو، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ تو یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے سے بچایا، اور جہاد میں شرکت نہیں کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اس فضیلت کو پا سکیں، اس لئے وہ تارک جہاد نہیں، بلکہ متروک ہیں، کہ اللہ و رسولؐ نے ہی ان کو چھوڑ دینے کے قابل سمجھا۔

خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ، لفظ خلاف کے معنی یہاں پیچھے اور بعد کے بھی ہو سکتے ہیں، ابو عبیدہ نے یہی معنی لئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد پر چلے جانے کے بعد آپ کے پیچھے بیٹھ کر خوش ہو رہے ہیں، جو درحقیقت خوشی کی چیز نہیں، بِمَقْعَدِهِمْ **یہ لفظ یہاں مصدری معنی میں بمعنے قعود ہے۔**

دوسرے معنی خلاف کے اس جگہ مخالفت کے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کر کے گھر میں بیٹھے رہے، اور صرف خود ہی نہیں بیٹھے، بلکہ دوسروں کو بھی یہ تلقین کی کہ لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ، یعنی گرمی کے زمانہ میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ غزوہ تبوک کا قصد اس وقت ہوا تھا جب کہ گرمی سخت پڑ رہی تھی حق تعالیٰ نے ان کی بات کا جواب یہ دیا قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا، یعنی یہ بدنصیب اس وقت کی گرمی کو تو دیکھ رہے ہیں اور اس سے بچنے کی فکر کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں حکم خدا و رسولؐ

کی نافرمانی پر جو جہنم کی آگ سے سابقہ پڑنے والا ہے، اس کی فکر نہیں کرتے کیا یہ موسم کی گرمی جہنم کی گرمی سے زیادہ ہے، اس کے بعد فرمایا:

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا الآیۃ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہنسو تھوڑا اور روؤ زیادہ، یہ لفظ اگرچہ بصیغۂ امر لایا گیا مگر حضرات مفسرین نے اس کو خبر کے معنی میں قرار دیا ہے، اور بصیغۂ امر ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی و ہنسی صرف چند روزہ ہے، اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لئے رونا ہی رونا ہوگا، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ:

اَلدُّنْيَا قَلِيْلٌ فَلْيَضْحَكُوْا فِيْهَا مَا شَاۗءُوْا فَاِذَا انْقَطَعَتِ الدُّنْيَا وَصَارُوْا اِلَى اللّٰهِ فَيَسْتَاْنِفُوْا الْبُكَاۗءَ بُكَاۗءً لَا يَنْقَطِعُ اَبَدًا (مظہری)

”دنیا چند روزہ ہے اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہوگے تو رونا شروع ہوگا جو کبھی ختم نہ ہوگا“

دوسری آیت میں لَنْ تَخْرُجُوْا کا ارشاد ہے، اس کا مفہوم مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں تو یہ بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ اگر آئندہ کسی جہاد میں شرکت کا ارادہ بھی کریں تو چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں وہ ارادہ بھی اخلاص سے نہ ہوگا جب نکلنے کا وقت آئے گا اس وقت پہلے کی طرح حیلے بہانے کر کے رہ جائیں گے، اس لئے آپ کو حکم ہوا کہ جب وہ کسی جہاد میں شریک ہونے کو خود بھی کہیں تو آپ یہ حقیقت حال ان کو بتلا دیں کہ مجھے تمہارے کسی قول و فعل پر اعتماد نہیں، تم نہ جہاد کو نکلو گے نہ کسی دشمن اسلام سے میرے ساتھ قتال کرو گے۔

اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم ان کے لئے بطور دنیاوی سزا کے نافذ کیا گیا کہ اگر وہ سچ مچ کسی جہاد میں شرکت کو کہیں تو بھی انہیں شریک نہ کیا جائے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ

اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، وہ

كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور وہ مر گئے نافرمان۔

خلاصۂ تفسیر

اور ان میں کوئی مرجاوے تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھیے اور نہ (دفن وغیرہ کیواسطے) اس کی قبر پر کھڑے ہوجیے (کیونکہ) انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ حالتِ کفر ہی میں مرے ہیں۔

معارف و مسائل

احادیث صحیحہ سے باتفاقِ امت ثابت ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن اُبی منافق کی موت اور اس پر نماز جنازہ کے متعلق نازل ہوئی، اور صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ اس کے جنازہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، پڑھنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، اور اس کے بعد آپ نے کبھی کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے واقعۂ نزول کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جب عبداللہ بن اُبی ابن سلول مرگیا تو اس کے صاحبزادے عبداللہ جو مخلص مسلمان اور صحابی تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور درخواست کی کہ آپ اپنا قمیص عطا فرمائیں تاکہ میں اپنے باپ کو اس کا کفن پہناؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک عطا فرمادیا، پھر حضرت عبداللہ نے یہ بھی درخواست کی کہ آپ اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھا دیں، آپؐ نے قبول فرمالیا اور نمازِ جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے تو حضرت عمر بن خطابؓ نے آپ کا کپڑا پکڑ کر عرض کیا کہ آپ اس منافق کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی نمازِ جنازہ سے منع فرمادیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دعا مغفرت کروں یا نہ کروں، اور آیت میں جو ستّر مرتبہ استغفار پر بھی مغفرت نہ ہونے کا ذکر ہے تو میں ستّر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرسکتا ہوں، آیت سے مراد سورۂ توبہ کی وہی آیت ہے جو ابھی گذر چکی ہے، یعنی اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی، نماز کے بعد ہی یہ آیت نازل ہوئی، لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ الخ (چنانچہ اس کے بعد آپؐ نے کبھی کسی منافق کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی)۔

واقعہ مذکورہ پر چند اشکالات اور اُن کے جوابات

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن اُبی ایک ایسا منافق تھا جس کا نفاق مختلف اوقات میں ظاہر بھی ہو چکا تھا، اور سب منافقوں کا سردار مانا جاتا تھا، اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امتیازی سلوک کیسے ہوا **کہ اس کے کفن کے لئے اپنا قمیص مبارک عطا فرما دیا؟**

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں، اول اس کے صاحبزادے جو مخلص صحابی تھے، ان کی درخواست محض ان کی دلجوئی کے لئے ایسا کیا گیا، دوسرا سبب ایک اور بھی ہو سکتا ہے جو بخاری کی حدیث میں بروایت حضرت جابرؓ منقول ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر جب کچھ قریشی سردار گرفتار کئے گئے، تو ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بھی تھے، آپ نے دیکھا کہ ان کے بدن پر کرتہ نہیں تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ان کو قمیص پہنا دیا جائے، حضرت عباس دراز قد تھے، عبداللہ بن اُبی کے سوا کسی کا قمیص ان کے بدن پر درست نہ آیا، تو عبداللہ بن اُبی کا قمیص لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباس کو پہنا دیا تھا اس کے اسی احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص اُن کو عطا فرما دیا (قرطبی)

دوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق کے جنازہ کی نماز سے منع فرمایا ہے، یہ کس بنا پر کہا، کیونکہ اس سے پہلے کسی آیت میں صراحۃً آپ کو منافق کی نماز جنازہ سے منع نہیں فرمایا گیا، اس سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ممانعت کا مضمون اسی سورۃ توبہ کی سابقہ آیت ...... اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ الآیۃ سے سمجھا ہوگا، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت ممانعت نماز جنازہ پر دلالت کرتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت کیوں نہ قرار دی، بلکہ یہ فرمایا کہ اس آیت میں مجھے اختیار دیا گیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ درحقیقت الفاظِ آیت کا ظاہری مفہوم اختیار ہی دینا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ستر مرتبہ کا ذکر بھی اس جگہ تحدید کیلئے نہیں بلکہ کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، تو اس آیت کا حاصل اس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ہو گیا کہ منافق کی مغفرت تو نہ ہوگی خواہ آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کریں، لیکن اس میں صراحۃً آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا، اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سورۃ یٰسٓ کی اس کی نظیر ہے جس میں فرمایا گیا کہ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۔ جیسے اس آیت نے آپ کو انذار و تبلیغ سے منع نہیں کیا بلکہ دوسری آیات سے تبلیغ و دعوت کا سلسلہ ان کے لئے بھی جاری رکھنا ثابت ہے، بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ، اور اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ، وغیرہ

حاصل یہ ہے کہ آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے تو آپ کو اختیار ہی دینا ثابت ہوا تھا، پھر مستقل دلیل سے اندا کو جاری رکھنے۔۔۔۔۔ ثابت ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ سے بھی یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی مغفرت نہیں ہو گی، مگر کسی دوسری آیت کے ذریعہ اب تک آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا تھا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے قمیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہو گی، مگر اس سے دوسری مصالح سرمیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آجائیں گے، اور مسلمان ہو جائیں گے، اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھ لی۔

اس جواب کا شاہد ایک تو وہ جملہ ہے جو صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دعاء مغفرت کرنے سے اس کی **مغفرت ہو جائے گی تو میں یہ بھی کرتا۔ (قرطبی)**

دوسرا شاہد وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا کرتہ اس کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، مگر میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ مجھے امید ہے کہ اس عمل سے اس کی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ مغازی ابن اسحاق اور بعض کتب تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کو دیکھ کر خزرج قبیلہ کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو گئے[1]

خلاصہ یہ ہے کہ آیت سابقہ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہو گی، مگر چونکہ ظاہر الفاظ آیت میں اختیار دیا گیا تھا، اور کسی دوسری آیت سے بھی اس کی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی، دوسری طرف ایک کافر کے احسان سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ میں دوسرے کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع بھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھنے کو ترجیح دی، اور فاروق اعظمؓ نے یہ سمجھا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ مغفرت نہیں ہو گی تو اس کیلئے نماز جنازہ پڑھ کر دعاء مغفرت کرنا ایک فعل عبث اور بے کار ہے، جو شان نبوت کے خلاف ہے، اسی کو انھوں نے ممانعت سے تعبیر فرمایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس فعل کو فی نفسہ مفید نہ سمجھتے تھے مگر دوسروں کے اسلام لانے کا فائدہ پیش نظر تھا، اس لئے فعل عبث نہ رہا، اس طرح نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر کوئی اشکال رہتا ہے نہ فاروق اعظمؓ کے قول پر (بیان القرآن)

[1] دیکھئے تفسیر قرطبی (۸: ۲۲۱)

البتہ جب صراحۃً یہ آیت نازل ہوگئی لَا تُصَلِّ، تو معلوم ہوا کہ اگرچہ نماز پڑھنے میں ایک دینی مصلحت آپ کے پیشِ نظر تھی، مگر اس میں ایک خرابی اور مفسدہ بھی تھا، جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دھیان نہیں ہوا، وہ یہ کہ خود مخلص مسلمانوں میں اس عمل سے ایک بے دلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا کہ ان کے یہاں مخلص مسلمان اور منافق سب ایک پلڑے میں تولے جاتے ہیں، اس خطرہ کے پیشِ نظر قرآن میں یہ ممانعت نازل ہوگئی اور پھر کبھی آپ نے کسی منافق کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے دعاءِ مغفرت جائز نہیں۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز و اکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کے لئے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کے لئے ہو یا کسی مجبوری کے لئے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس کو اسی طرح بغیر رعایت طریقِ مسنون کے گڑھے میں دبا سکتا ہے (بیان القرآن)

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ

اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب

يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

میں رکھے ان کو ان چیزوں کے باعث دنیا میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں،

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اس کے رسول کے ساتھ ہوکر

اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ

تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور والے ان کے اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جاویں ساتھ

الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰي

بیٹھنے والوں کے، خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ، اور مہر کردی گئی ان کے

قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

دلوں پر سو وہ نہیں سمجھتے، لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں

مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ

ساتھ اس کے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے اور انہی کے لئے ہیں خوبیاں،

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے، تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے واسطے باغ کہ بہتی

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں ان میں، یہی ہے بڑی

الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

کامیابی۔

ع ۱۱ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور ان کے اموال اور اولاد آپ کو اس تعجب میں نہ ڈالیں کہ ایسے مغضوبین پر یہ نعمتیں کیسے ہوئیں، سو یہ واقع میں اُن کے لئے نعمتیں نہیں بلکہ آلات عذاب ہیں کیونکہ ان کو صرف یہ منظور ہے کہ ان مذکورہ چیزوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کا دم حالت کفر ہی میں نکل جائے (جس سے آخرت میں بھی مبتلائے عذاب رہیں) اور جب کبھی کوئی ٹکڑا قرآن کا اس مضمون میں نازل کیا جاتا ہے کہ تم (خلوص دل سے) اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ہمراہ ہو کر جہاد کرو تو ان میں کے مقدور والے آپ سے رخصت مانگتے ہیں اور رخصت کا یہ مضمون ہوتا ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں (البتہ ایمان بالاخلاص کے دعوے میں کچھ کرنا نہیں پڑتا اس کو کہہ دیا کہ ہم تو مخلص ہیں) وہ لوگ (غایت بے حمیتی سے) خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے، اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس سے وہ (حمیت و بے حمیتی کو) سمجھتے ہی نہیں ہاں لیکن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی ہمراہی میں جو مسلمان ہیں انھوں نے (اس حکم کو مانا اور) اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور انہی کے لئے ساری خوبیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں، (اور وہ خوبی اور کامیابی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں

جاری ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ کو رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں بھی انہی منافقین کا حال بیان کیا گیا جو غزوۂ تبوک میں شریک ہونے سے حیلے بہانے کر کے رُک گئے تھے، ان منافقین میں بعض مالدار خوشحال لوگ بھی تھے، ان کے حال سے مسلمانوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہیں تو ان کو دنیا میں ایسی نعمتیں کیوں ملیں۔

اس کے جواب میں پہلی آیت میں فرمایا کہ اگر غور کرو گے تو ان کے اموال و اولاد ان کے لئے رحمت و نعمت نہیں بلکہ دنیا میں بھی عذاب ہی ہیں، آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، دنیا میں عذاب ہونا اس طرح ہے کہ مال کی محبت، اس کی حفاظت کی اور پھر اس کے بڑھانے کی فکریں ان کو ایسی لگی رہتی ہیں کہ کسی وقت کسی حال چین نہیں لینے دیتیں، ساز و سامان راحت کا ان کے پاس کتنا ہی ہو مگر راحت نہیں ہوتی جو قلب کے سکون و اطمینان کا نام ہے، اس کے علاوہ یہ دنیا کا مال و متاع چونکہ ان کو آخرت سے غافل کر کے کفر و معاصی میں انہماک کا سبب بھی بن رہا ہے اس لئے سبب عذاب ہونے کی وجہ سے بھی اس کو عذاب کہا جا سکتا ہے، اسی لئے الفاظ قرآن میں لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان اموال ہی کے ذریعہ ان کو سزا دینا چاہتا ہے۔

اُولُوا الطَّوْلِ کا لفظ تخصیص کے لئے نہیں، بلکہ اس سے غیر اولی الطول یعنی غیر مستطیع لوگوں کا حال بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا، کہ ان کے پاس تو ایک ظاہری عذر بھی تھا

وَجَاۤءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ

اور آئے بہانہ کرنے والے گنوار تاکہ ان کو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنھوں نے

كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

جھوٹ بولا تھا اللہ سے اور اس کے رسول سے اب پہنچے گا ان کو جو کافر ہیں ان میں

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۹۰

عذاب دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

اور کچھ بہانہ باز لوگ دیہاتیوں میں سے آئے تاکہ ان کو (گھر رہنے کی) اجازت مل جائے اور (ان دیہاتیوں میں سے) جنھوں نے خدا سے اور اس کے رسول سے (دعوائے ایمان میں) بالکل ہی جھوٹ بولا تھا وہ بالکل ہی بیٹھ رہے (جھوٹے عذر کرنے بھی نہ آئے) ان میں جو (آخر تک) کافر رہیں گے اُن کو (آخرت میں) دردناک عذاب ہوگا (اور جو توبہ کرلیں تو عذاب سے بچ جائیں گے)۔

معارف و مسائل

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دیہاتیوں میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ جو حیلے بہانے پیش کرنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کو جہاد میں جانے سے رخصت دیدی جائے، اور کچھ ایسے سرکش بھی تھے جنھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ رخصت لے لیں وہ از خود ہی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس کو جہاد میں نہ جانے کی اجازت دیدی تو چند منافقین بھی خدمت میں حاضرِ خدمت ہوئے، اور کچھ حیلے بہانے پیش کرکے ترکِ جہاد کی اجازت مانگی، آپ نے اجازت تو دیدی، مگر سمجھ لیا کہ یہ جھوٹے عذر کر رہے ہیں، اس لئے ان سے اعراض فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلا دیا کہ ان کا عذر قابلِ قبول نہیں، اس لئے ان کو عذابِ الیم کی وعید سنا دی گئی، البتہ اس کے ساتھ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْهُمْ فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان میں سے بعض کا عذر کفر و نفاق کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ طبعی سستی کے سبب تھا وہ اس کفر کے عذاب میں شامل نہیں۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہے

مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ

خرچ کرنے کو کچھ گناہ جبکہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ نہیں ہے نیکی والوں

مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ

پر الزام کی کوئی راہ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور نہ ان لوگوں پر کہ جب تیرے پاس

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں ایسے لوگوں کے حالات کا بیان تھا جو درحقیقت جہاد میں شرکت سے معذور نہ تھے مگر سستی کے سبب عذر کرکے بیٹھ رہے، یا ایسے منافق جنھوں نے اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے حیلے بہانے تراش کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لی تھی، اور کچھ وہ سرکش بھی تھے جنھوں نے عذر کرنے اور اجازت لینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی، ویسے ہی بیٹھ رہے، ان کا غیر معذور ہونا اور ان میں جو کفر و نفاق کے مرتکب تھے ان کیلئے عذاب الیم کا ہونا سابقہ آیات میں بیان ہوا ہے۔

مذکور الصدر آیات میں ان مخلص مسلمانوں کا ذکر ہے جو حقیقۃً معذور ہونے کے سبب شرکت جہاد سے قاصر رہے، ان میں کچھ تو نابینا، بیمار معذور تھے جن کا عذر کھلا ہوا تھا، اور کچھ وہ لوگ بھی تھے جو جہاد میں شرکت کے لئے تیار تھے، بلکہ جہاد میں جانے کے لئے بے قرار تھے، مگر ان کے پاس سفر کے لئے سواری کا جانور نہ تھا، سفر طویل اور موسم گرمی کا تھا، انھوں نے اپنے جذبۂ جہاد اور سواری نہ ہونے کی مجبوری کا ذکر کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لئے سواری کا کوئی انتظام ہو جائے۔

کتب تفسیر و تاریخ میں اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں، بعض کا معاملہ تو یہ ہوا کہ شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عذر کر دیا کہ ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں، مگر یہ لوگ روتے ہوئے واپس ہوئے اور روتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان کر دیا کہ چھ اونٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسی وقت آگئے، آپ نے یہ اُن کو دیدیئے، (مظہری) اور ان میں سے تین آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کر دیا حالانکہ وہ اس سے پہلے بہت بڑی تعداد کا انتظام اپنے خرچ سے کر چکے تھے۔

بعض وہ بھی رہے کہ جن کو آخر تک سواری نہ ملی، اور مجبور ہو کر رہ گئے، آیات مذکورہ میں یہی سب حضرات کا ذکر آیا ہے، جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا، آخر میں پھر اس پر تنبیہ فرما دی کہ وبال تو صرف ان لوگوں پر ہے جنھوں نے قدرت کے باوجود جہاد سے غیر حاضر رہنا عورتوں کی طرح پسند کیا۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ کا یہی مطلب ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے اُن کی طرف ، تو کہہ

لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ

بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال،

وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

اور ابھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے طرف اس جاننے والے

وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ

چھپے اور کھلے کی سو وہ بتلائے گا تم کو جو تم کر رہے تھے ، اب قسمیں کھائیں گے اللہ

بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا

کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے اُن کی طرف تاکہ تم ان سے درگذر کرو سو تم درگذر کرو

عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

ان سے بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ، بدلہ ان کے

يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا

کاموں کا ، وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو اگر تم راضی

عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

ہو گئے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے ۔

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ تمہارے (سب کے) سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے، (سو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (سب کی طرف سے صاف) کہہ دیجئے کہ (بس رہنے دو) یہ عذر پیش مت کرو ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری (واقعی حالت کی) خبر دے چکے ہیں (کہ تم کو کوئی عذر صحیح نہ تھا) اور (خیر) آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری کارگذاری دیکھ لیں گے (معلوم ہو جاوے گا کہ حسب زعم خود کتنے مطیع اور مخلص ہو) پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤ گے

جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے (جس سے تمہارا کوئی اعتقاد کوئی عمل مخفی نہیں، پھر وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کرتے تھے (اور اس کا بدلہ دے گا) ہاں وہ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جاویں گے (کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اور ملامت وغیرہ نہ کرو) سو تم (ان کا مطلب پورا کر دو اور) ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اس غرض ذاتی کے حاصل ہونے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا، کیونکہ) وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور (آخر میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کے بدلے میں جو کچھ وہ (نفاق وخلاف وغیرہ) کیا کرتے تھے (نیز اس کا بھی مقتضا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاوے، کیونکہ تعرض سے مقصود ہے اصلاح اور اس کی ان کے خبث سے امید نہیں اور نیز) یہ اس لئے قسمیں کھاویں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ سو (اوّل تو تم دشمنان خدا سے راضی ہی کیوں ہوتے تھے لیکن بالفرض) اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو (ان کو کیا نفع کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریر لوگوں سے راضی نہیں ہوتا (اور بدون رضائے خالق کے رضائے خلق محض بے سود ہے) ۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اُن منافقین کا ذکر تھا جنھوں نے غزوۂ تبوک میں نکلنے سے پہلے جھوٹے حیلے بہانے کرکے جہاد میں جانے سے عذر کر دیا تھا۔ مذکورالصدر آیت میں ان کا ذکر ہے، جنھوں نے جہاد سے واپسی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی جہاد سے غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کئے، یہ آیات مدینہ طیبہ واپس آنے سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں آئندہ پیش آنے والے واقعہ کی خبر تھی کہ جب آپ مدینہ واپس پہونچیں گے تو منافقین عذر کرنے کے لئے آپ کے پاس آئیں گے، چنانچہ اسی طرح واقعہ پیش آیا۔

آیت مذکورہ میں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین حکم دیئے گئے، اوّل یہ کہ جب یہ عذر کرنے کے لئے آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ فضول جھوٹے عذر نہ کرو، ہم تمہاری بات کی تصدیق نہ کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہمیں تمہارے سب حالات اور خیالات اور تمہاری شرارت اور دلوں میں چھپے ہوئے خفیہ رازے سب بتلا دیئے ہیں، جس سے تمہارا جھوٹا ہونا ہم پر واضح ہو گیا، اس لئے عذر بیان کرنا فضول ہے، اس کے بعد فرمایا وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ الآیۃ اس میں ان کو مہلت دی گئی کہ اب بھی توبہ کریں نفاق چھوڑ کر سچے مسلمان ہو جائیں، کیونکہ اس میں یہ فرمایا کہ آئندہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول تمہارا عمل دیکھیں گے کہ وہ کیا اور کیسا رہتا ہے؟ اس کے مطابق عمل ہوگا، اگر تم توبہ کرکے سچے مسلمان ہو گئے، تو تمہارے گناہ معاف ہو جاویں گے

ورنہ یہ جھوٹے حیلے بہانے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیں گے۔

دوسرا حکم دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر آپ کو مطمئن کرنا چاہیں گے اور مقصد اس سے یہ ہوگا کہ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ یعنی آپ ان کی اس غیر حاضری جہاد کو نظر انداز کر دیں، اس پر ملامت نہ کریں، اس پر یہ ارشاد ہوا کہ ان کی یہ خواہش آپ پوری کر دیں فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ یعنی آپ ان سے اعراض کریں، نہ تو ان پر ملامت و سرزنش کریں اور نہ شگفتہ تعلقات ان سے رکھیں، کیونکہ ملامت سے تو کوئی فائدہ نہیں جب اُن کے دل میں ایمان ہی نہیں اور اس کی طلب بھی نہیں تو ملامت کرنے سے کیا ہوگا، فضول اپنا وقت ضائع کیوں کیا جائے۔

تیسرا حکم تیسری آیت میں یہ ہے کہ یہ لوگ قسمیں کھا کر آپ کو اور مسلمانوں کو راضی کرنا چاہیں گے اس کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ ہدایت فرما دی کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ کی جائے، آپ ان سے راضی نہ ہوں اور یہ بھی فرما دیا کہ بالفرض اگر آپ راضی بھی ہوگئے تو ان کو کوئی فائدہ اس سے نہیں پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی نہیں ہے اور اللہ کیسے راضی ہو جبکہ یہ اپنے کفر و منافقت پر قائم ہیں۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ

گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۹۷ وَمِنَ الْاَعْرَابِ

جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور بعضے گنوار ایسے

مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ

ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا، انہی پر

دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۹۸ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ

آئے گردش بری، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ

يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ

ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ

اور دعا لینی رسول کی، سنتا ہے وہ ان کے حق میں نزدیکی ہے، داخل کرے گا ان کو اللہ

فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٩﴾ ع

اپنی رحمت میں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

(ان منافقین میں جو) دیہاتی (ہیں وہ) لوگ (بوجہ سخت مزاجی کے) کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور (بوجہ بُعد علماء و عقلاء کے) ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائے ہیں (کیونکہ جب جاننے والوں سے دور دور رہیں گے تو ان کا جاہل رہنا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور اسی وجہ سے مزاج میں سختی اور مجموعہ سے کفر و نفاق میں شدت ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (وہ ان سب امور پر مطلع ہیں اور حکمت سے مناسب سزا دیں گے) اور ان (مذکورہ منافقین) دیہاتیوں میں سے بعض بعض ایسے ہیں کہ (کفر و نفاق و جہل کے علاوہ بخل و عداوت کے ساتھ بھی موصوف ہے یعنی کہ) جو کچھ (جہاد و زکوٰۃ وغیرہ کے مواقع میں مسلمانوں کی شرما شرمی) خرچ کرتا ہے اس کو (مثل) جرمانہ سمجھتا ہے (یہ تو بخل ہوا، اور عداوت یہ ہے کہ) تم مسلمانوں کے واسطے (زمانہ کی) گردشوں کا منتظر رہتا ہے (کہ کہیں ان پر کوئی حادثہ پڑ جائے تو ان کا خاتمہ ہو سو) بُرا وقت انہی (منافقین) پر پڑنے والا ہے (چنانچہ فتوحات کی وسعت ہوئی، کفر ذلیل ہوگیا، ان کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں، اور تمام عمر رنج اور خوف میں کٹی) اور اللہ تعالیٰ (ان کے کفر و نفاق کی باتیں) سنتے ہیں (اور ان کے دلی خیالات تخاذ مغرم و تربص دوائر کو) جانتے ہیں (پس ان سب کی سزا دیں گے) اور بعضے اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا لینے کا ذریعہ بناتے ہیں (کیونکہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ ایسے مواقع پر خرچ کرنے والے کو دعا دیتے تھے جیسا کہ احادیث میں ہے) یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان لوگوں کے لئے موجب قربت (عند اللہ) ہے، اور دعا کا ہونا تو یہ خود دیکھ سن لیتے ہیں، اس کی خبر دینے کی ضرورت نہ تھی اور وہ قرب یہ ہے کہ) ضرور ان کو اللہ تعالیٰ اپنی (خاص) رحمت میں داخل کرلیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں (پس ان کی لغزشیں معاف کرکے اپنی رحمت میں لے لیں گے)۔

معارف و مسائل

آیات سابقہ میں منافقین مدینہ کا ذکر تھا ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو مدینہ کے مضافات دیہات کے رہنے والے تھے۔

اعراب، یہ لفظ عرب کی جمع نہیں بلکہ اسم جمع ہے، جو دیہات کے باشندوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس کا مفرد بنانا ہوتا ہے تو اعرابی کہتے ہیں، جیسے انصار کا مفرد انصاری آتا ہے۔

ان کا حال آیت مذکورہ میں یہ بتلایا کہ یہ کفر و نفاق میں شہر والوں سے بھی زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ علم اور علماء سے دور رہنے کے سبب عموماً جہالت اور قساوت میں مبتلا ہوتے ہیں، سخت دل ہوتے ہیں وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، یعنی ان لوگوں کا ماحول ہی ایسا ہے کہ وہ اللہ کی نازل کی ہوئی حدود سے بے خبر رہیں، کیونکہ نہ قرآن ان کے سامنے آتا ہے، نہ اس کے معانی و مطالب اور احکام سے ان کو واقفیت ہوتی ہے۔

دوسری آیت میں بھی اعراب کا ایک حال یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو زکوٰۃ وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو ایک تاوان سمجھ کر دیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ دل میں ایمان تو ہے نہیں محض اپنے کفر کو چھپانے کے لئے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، اور زکوٰۃ فرض بھی دیدیتے ہیں، مگر دل میں کڑھتے ہیں کہ یہ مال فضول گیا، اسی لئے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں پر کوئی مصیبت پڑے اور ان کو شکست ہو جائے تو اس تاوان سے ہماری نجات ہو، اَلدَّوَآئِرُ دائرہ کی جمع ہے، عربی لغت کے اعتبار سے دَآئِرَۃ اس بدلی ہوئی حالت کو کہتے ہیں جو پہلی اچھی حالت کے بعد بُری ہو جائے، اسی لئے قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ، یعنی انہی پر بُری حالت آنے والی ہے، اور یہ اپنے ان افعال و اقوال کی بناء پر زیادہ ذلیل ہوں گے۔

دیہاتی منافقین کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد قرآنی اسلوب کے مطابق تیسری آیت میں ان دیہاتیوں کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا گیا جو سچے اور پکے مسلمان ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دیہات کے باشندے بھی سب ایک سے نہیں ہوتے، ان میں مخلص مسلمان اور سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ وہ جو زکوٰۃ و صدقات دیتے ہیں تو اس کو اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی امید پر دیتے ہیں۔

صدقات کا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی امید اس بناء پر ہے کہ قرآن حکیم نے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں سے

اموال زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے آپ دعا بھی کیا کریں جیسے آگے آنے والی آیت میں ارشاد ہے، خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ، اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدقات وصول کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ ان کے لئے دعا کیا کریں، یہ حکم لفظ صلوٰۃ کے ساتھ آیا ہے صَلِّ عَلَيْهِمْ، اسی لئے مذکورہ آیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو لفظ صلوات سے تعبیر کیا ہے

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو

اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ

ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ

واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں ہمیشہ، یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

بڑی کامیابی۔

خلاصۂ تفسیر

اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب امت سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ امت میں جتنے لوگ خلوص کے ساتھ ایمان لانے میں) ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا (کہ ان کا ایمان قبول فرمایا جس پر ان کو جزا ملے گی) اور وہ سب اللہ سے راضی ہوگئے (کہ اطاعت اختیار کی جس کی جزا سے یہ رضا اور زیادہ ہوگی) اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں دیہاتی مؤمنین مخلصین کا ذکر تھا، اس آیت میں تمام مؤمنین مخلصین کا ذکر ہے جن میں ان کے درجات فضیلت کا بھی بیان ہے۔

السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ، اس جملہ میں اکثر حضرات

مفسرین نے حرف مِن کو تبعیض کے لئے قرار دے کر مہاجرین و انصار صحابہ کرام کے دو طبقے قرار دئیے ہیں، ایک سابقین اوّلین کا، دوسرا دوسرے درجے کے حضرات صحابہ کرام کا۔

پھر اس میں اقوال مختلف ہیں، بعض حضرات نے صحابہ کرام میں سے سابقین اولین ان کو قرار دیا ہے جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے، یعنی تحویل قبلہ سے پہلے جو مسلمان ہو چکے تھے، وہ سابقین اوّلین ہیں یہ قول سعید بن مسیب اور قتادہ کا ہے، حضرت عطاء بن رباح نے فرمایا کہ سابقین اوّلین وہ صحابہ ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، اور شعبی نے فرمایا کہ جو صحابہ حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک ہوئے وہ سابقین اوّلین ہیں اور ہر قول کے مطابق باقی صحابہ کرام مہاجرین یا انصار سابقین اولین کے بعد دوسرے درجے میں ہیں، (مظہری، قرطبی)

اور تفسیر مظہری میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ حرف مِن کو اس جگہ تبعیض کے لئے نہ لیا جائے بلکہ بیان کے معنی میں ہو تو مفہوم اس جملے کا یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام بہ نسبت باقی امت کے سابقین اوّلین ہیں، اور مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ اس کا بیان ہے بیان القرآن کا خلاصۂ تفسیر جو اوپر نقل کیا گیا اس میں اسی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق صحابہ کرام میں دو طبقے ہو جاتے ہیں، ایک سابقین اوّلین کا، دوسرا وہ جو تحویل قبلہ یا غزوۂ بدر یا بیعت رضوان کے بعد مسلمان ہوئے اور آخری تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ صحابہ کرام سب کے سب سابقین اوّلین ہی ہیں کیونکہ ان کا ایمان باقی امت سے اوّل اور سابق ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ یعنی جن لوگوں نے اعمال و اخلاق میں سابقین اولین کا اتباع مکمل طریقہ پر کیا؛ پہلے جملے کی پہلی تفسیر کے مطابق ان لوگوں میں درجہ اوّل ان مہاجرین و انصار صحابہ کا ہے جو تحویل قبلہ یا غزوۂ بدر یا بیعت حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر صحابہ کرام میں داخل ہوئے، دوسرا درجہ ان کے بعد کے سب مسلمانوں کا ہے جو قیامت تک ایمان اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ میں صحابہ کرام کے اسوہ پر چلے اور ان کا مکمل اتباع کیا۔

اور دوسری تفسیر کے مطابق اَلَّذِينَ اتَّبَعُوا میں صحابہ کرام کے بعد کے حضرات داخل ہیں جن کو اصطلاح میں تابعی کہا جاتا ہے، اور پھر اس اصطلاحی تابعین کے بعد قیامت تک آنے والے وہ سب مسلمان بھی اس میں شامل ہیں جو ایمان و عمل صالح میں صحابہ کرام کا مکمل اتباع کریں۔

صحابہ کرام سب کے سب بلا استثناء جنتی اور اللہ تعالیٰ کی رضا سے مشرف ہیں: محمد بن کعب قرظیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں آپ کیا

فرماتے ہیں، انھوں نے کہا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں گرچہ وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں، اس شخص نے دریافت کیا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی (اس کی کیا دلیل ہے) انھوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو: اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بلا کسی شرط کے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ارشاد فرمایا گر البتہ تابعین کے معاملہ میں اتباع باحسان کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوانِ الٰہی سے سرفراز ہیں۔

تفسیر مظہری میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک سب صحابہ کرام کے جنتی ہونے پر اس سے بھی زیادہ واضح استدلال اس آیت سے ہے لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، اس آیت میں پوری صراحت سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام اولین ہوں یا آخرین سب سے **اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔**

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس مسلمان کو نہیں چھو سکتی جس نے مجھے دیکھا ہے یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے (ترمذی عن جابرؓ)

تنبیہ: جو لوگ صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات اور ان میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں جن کو پڑھنے والوں کے قلوب اُن کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکیں وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں، نعوذ باللہ منہ

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ

اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں، اور بعضے لوگ مدینہ

الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ

والے اڑ رہے ہیں نفاق پر تو اُن کو نہیں جانتا ہم کو وہ

نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى

معلوم ہیں ان کو ہم عذاب دیں گے دوبار پھر وہ لوٹائے جائیں گے

عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

بڑے عذاب کی طرف۔

مع عذر منفقون　وقف منزل

خلاصۂ تفسیر

اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینہ والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حدِ کمال پر (ایسے) پہونچے ہوئے ہیں کہ آپ (بھی) ان کو نہیں جانتے (کہ یہ منافق ہیں بس) ان کو ہم ہی جانتے ہیں ہم ان کو (دوسرے منافقین کی نسبت آخرت سے پہلے بھی) دوہری سزا دیں گے (ایک نفاق کی دوسرے کمال نفاق کی اور) پھر (آخرت میں بھی) وہ بڑے بھاری عذاب (یعنی جہنم مع خلودِ دائمی) کی طرف بھیجے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سابقہ بہت سی آیات میں ان منافقین کا ذکر آیا ہے جن کا نفاق ان کے اقوال و افعال سے ظاہر ہو گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے کہ یہ منافق ہیں، اس آیت میں ایسے منافقین کا ذکر ہے جن کا نفاق انتہائی کمال پر ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اب تک مخفی رہا، اس آیت میں ایسے شدید منافقین پر آخرت سے پہلے دو عذاب ہونے کا ذکر آیا ہے، ایک دنیا ہی میں کہ ہر وقت اپنے نفاق کو چھپانے کی فکر اور ظاہر ہونے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی بغض و عداوت رکھنے کے باوجود ظاہر میں ان کی تعظیم و تکریم اور ان کے اتباع پر مجبور ہونا بھی کچھ کم عذاب نہیں، اور دوسرا عذاب قبر و برزخ کا عذاب ہے، جو قیامت و آخرت سے پہلے ہی ان کو پہونچے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انھوں نے اپنے گناہوں کا ملایا انھوں نے ایک کام نیک اور دوسرا

سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

بد، قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے

صَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

اور دعا دے ان کو بیشک تیری دعا ان کے لئے تسکین ہے اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے

الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوا

زکوٰتیں اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے، اور کہہ کہ عمل کئے جاؤ

فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ وَسَتُرَدُّونَ

پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول اور مسلمان، اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے

إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں سے واقف ہے پھر وہ جتا دے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ

اور بعضے وہ لوگ ہیں کہ ان کا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ ان کو عذاب دے اور یا ان کو

عَلَيْهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠٦﴾

معاف کرے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے معترف ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے (جیسے اعتراف جس کا منشا ندامت ہے اور یہی توبہ ہے، اور جیسے اور غزوات جو پہلے ہو چکے ہیں، غرض یہ کام تو اچھے کئے) اور کچھ برے (کئے جیسے تخلف بلا عذر وغیرہ) اللہ سے امید (یعنی ان کا وعدہ) ہے کہ ان (کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرماویں (یعنی توبہ قبول کرلیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں، (جب اس آیت سے توبہ قبول ہو چکی اور وہ حضرات ستونوں سے کھل چکے تو اپنا مال آپ کی خدمت میں لے کر آئے اور درخواست کی کہ اس کو اللہ کی راہ میں صرف کیا جاوے تو ارشاد ہوا کہ) آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے (لینے کے) ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کردیں گے اور (جب آپ لیں تو) ان کے لئے دعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اعتراف کو) خوب سنتے ہیں (اور ان کی ندامت کو

خوب جانتے ہیں اس لئے ان کے اخلاص کو دیکھ کر آپ کو یہ احکام دیئے گئے، ان اعمال صالحہ مذکورہ یعنی توبہ وندامت وانفاق فی الخیر کی ترغیب ۔۔۔ اور عمل سیئہ مثل تخلف وغیرہ سے آئندہ کے لئے ترہیب ہے، پس اول ترغیب ہے یعنی) کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور (کیا ان کو) یہ (خبر نہیں) کہ اللہ ہی (اس) توبہ قبول کرنے (کی صفت) میں اور رحمت کرنے (کی صفت) میں کامل ہے (اسی لئے ان کی توبہ قبول کی اور اپنی رحمت سے مال قبول کرنے کا حکم اور ان کے لئے دعا کرنے کا حکم فرمایا، پس آئندہ بھی خطایا و ذنوب کے صدور پر توبہ کر لیا کریں، اور اگر توفیق ہو تو خیرات کیا کریں) اور (ترغیب کے بعد آگے ترہیب ہے یعنی) آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جو چاہو) عمل کئے جاؤ سو (اول تو دنیا ہی میں) ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور اہل ایمان (پس برے عمل پر دنیا ہی میں ذلت وخواری ہو جاتی ہے) اور پھر آخرت میں ضرور تم کو ایسے (اللہ) کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے، سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلا دے گا (پس برے عمل سے مثل تخلف وغیرہ کے آئندہ سے احتیاط رکھو یہ قسم اول کا بیان تھا، آگے قسم دوم کا ذکر ہے) اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم آنے تک ملتوی ہے کہ (عدم اخلاص توبہ کی وجہ سے) ان کو سزا دے گا یا (خلوص کی وجہ سے) ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ (خلوص وعدم خلوص کا حال) خوب جاننے والا ہے (اور) بڑا حکمت والا ہے (پس بمقتضائے حکمت خلوص کی توبہ کو قبول کرتا ہے، اور بغیر خلوص کے قبول نہیں کرتا اور اگر کبھی بلا توبہ معاف کرنے میں حکمت ہو تو ایسا بھی کر دیتا ہے)۔

معارف ومسائل

غزوۂ تبوک کے لئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ عام اور سب مسلمانوں کو چلنے کا حکم ہوا تو زمانہ سخت گرمی کا تھا، مسافت دور دراز کی تھی اور ایک باقاعدہ بڑی حکومت کی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ تھا جو اسلام کی تاریخ میں پہلا ہی واقعہ تھا، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے اس حکم کے متعلق لوگوں کے حالات مختلف ہو گئے، اور ان کی جماعتوں کی کئی قسمیں ہو گئیں۔

ایک قسم ان حضرات مخلصین کی تھی جو اول حکم سنتے ہی بلا تردد جہاد کے لئے تیار ہو گئے، دوسری قسم وہ لوگ تھے جو ابتداءً کچھ تردد میں رہے پھر ساتھ ہو لئے، آیت الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

میں انہی حضرات کا ذکر ہے۔

تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو واقعی طور پر معذور تھے، اس لئے نہ جا سکے، ان کا ذکر آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ میں آیا ہے، چوتھی قسم ان مؤمنین مخلصین کی ہے جو عذر نہ ہونے کے باوجود سستی کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے، ان کا ذکر مذکور الصدر آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا اور اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ میں آیا ہے، پانچویں قسم منافقین کی تھی جو نفاق کے سبب شریک جہاد نہیں ہوئے، ان کا ذکر گذشتہ بہت سی آیات میں آچکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیات سابقہ میں بیشتر ذکر پانچویں قسم منافقین کا ہوا ہے، آیت مذکور الصدر میں چوتھی قسم کے حضرات کا ذکر ہے جو مؤمن ہونے کے باوجود سستی و کاہلی سے شریک جہاد نہیں ہوئے۔

پہلی آیت میں فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ان لوگوں کے اعمال ملے جلے ہیں، کچھ اچھے کچھ برے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دس حضرات تھے جو بلا کسی صحیح عذر کے غزوۂ تبوک میں نہ گئے تھے پھر ان کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی، ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول کر کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نہ کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، ان حضرات میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے نام پر سب روایتیں متفق ہیں، دوسرے اسماء میں مختلف روایتیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو بندھا ہوا دیکھا، اور معلوم ہوا کہ انھوں نے عہد یہ کیا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو نہ کھولیں گے اس وقت تک بندھے رہیں گے، تو آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہ دے گا، کیونکہ جرم بڑا ہے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کھولنے کا حکم دیدیا، اور وہ کھول دیئے گئے (قرطبی)

سعید بن مسیبؒ کی روایت میں ہے کہ جب ابولبابہ کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انھوں نے انکار کیا، اور کہا کہ جب تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپؐ تشریف لائے تو دست مبارک سے ان کو کھولا۔

نیک و بد ملے جلے عمل کیا تھے؟

آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے کچھ عمل نیک تھے اچھے برے، ان کے نیک عمل تو ان کا ایمان، نماز، روزہ کی پابندی اور اس جہاد سے پہلے غزوات

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت اور خود اس واقعہ تبوک میں اپنے جرم کا اعتراف کر لینا اور نادم ہوکر توبہ کرنا وغیرہ ہیں، اور بُرے عمل غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونا اور دوسرے عمل سے منافقین کی موافقت کرنا ہے۔

جن مسلمانوں کے اعمال اچھے بُرے ملے جلے ہوں قیامت تک وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر حکم اس کا قیامت تک عام ہے، ان مسلمانوں کے لئے جن کے اعمال نیک و بد ملے جلے ہوں اگر وہ اپنے گناہوں سے تائب ہوجائیں تو ان کے لئے معافی اور مغفرت کی امید ہے۔

ابو عثمانؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس امت کے لئے بڑی امید دلانے والی ہے اور صحیح بخاری میں بروایت سمرہ بن جندبؓ معراج نبوی کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ساتویں آسمان پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو ان کے پاس کچھ لوگ دیکھے جن کے چہرے سفید تھے، اور کچھ ایسے کہ ان کے چہروں میں کچھ داغ دھبے تھے یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کرکے واپس آئے تو ان کے چہرے بھی بالکل صاف سفید ہوگئے تھے، جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کو بتلایا کہ یہ سفید چہرے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر گناہوں سے پاک صاف رہے، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ، اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ملے جلے اچھے بُرے سب طرح کے کام کئے پھر توبہ کرلی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور گناہ معاف ہوگئے (قرطبی)

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً، واقعہ اس آیت کا یہ ہے کہ جن حضرات کا اوپر ذکر ہوا کہ بلا عذر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے، پھر نادم ہوکر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا پھر آیت مذکورہ سابقہ میں ان کی توبہ کی قبولیت نازل ہوئی اور قید سے کھولے گئے تو ان حضرات نے بطور شکرانہ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے پیش کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کرنے سے انکار فرمایا کہ مجھے مال لینے کا حکم نہیں ہے، اس پر یہ آیت مذکورہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ نازل ہوئی، اور آپؐ نے پورے مال کے بجائے ایک تہائی مال کا صدقہ کرنا قبول فرمایا کیونکہ آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ پورا مال نہ لیا جائے بلکہ اس کا کوئی حصہ لیا جائے، حرف مِنْ اس پر شاہد ہے۔

مسلمانوں کے صدقات زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنا اور ان کے مصارف پر خرچ کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے

اس آیت میں اگرچہ شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص جماعت سے صدقہ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے۔

تفسیر قرطبی، احکام القرآن جصاص، مظہری وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے، اور قرطبی اور جصاص نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر اس آیت میں شانِ نزول وہی خاص واقعہ قرار دیا جائے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو پھر بھی اصولِ قرآنی کی رُو سے یہ حکم عام ہی رہے گا، اور قیامت تک کے مسلمانوں پر حاوی ہوگا، کیونکہ قرآن کریم کے بیشتر احکام خاص خاص واقعات میں نازل ہوتے، مگر ان کا دائرہ عمل کسی کے نزدیک اس خاص واقعہ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جب تک کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو یہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے عام اور شامل ہی قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ پوری اُمتِ محمدیہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مگر یہ حکم نہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ آپ کے زمانہ تک محدود بلکہ ہر وہ شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام مسلمانوں کا امیر ہوگا وہ اس حکم کا مخاطب اور مامور ہوگا، اس کے فرائض میں داخل ہوگا کہ مسلمانوں کی زکوٰۃ، صدقات کے وصول کرنے اور مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔

صدیق اکبرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں جو مانعین زکوٰۃ پر جہاد کرنے کا واقعہ پیش آیا اس میں بھی زکوٰۃ نہ دینے والے کچھ تو وہ لوگ تھے جو کھلم کھلا اسلام سے باغی اور مرتد ہوگئے تھے اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے مگر زکوٰۃ نہ دینے کا یہ بہانہ کرتے تھے کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا حکم آپ کی حیات تک تھا، ہم نے اس کی تعمیل کی، آپ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ کو کیا حق ہے کہ ہم سے زکوٰۃ و صدقات طلب کریں، اور شروع شروع میں حضرت عمرؓ کو ان پر جہاد کرنے میں اسی لئے تردد پیش آیا کہ یہ مسلمان ہیں ایک آیت کی تاویل کر کے بچ جاتے ہیں، اس لئے اُن کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جائے جو عام مرتدین کے ساتھ کیا جاتا ہے، مگر صدیق اکبرؓ نے پورے عزم و جزم کے ساتھ فرمایا کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اس پر جہاد کریں گے۔

اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ جو لوگ حکم زکوٰۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے اور آپ کے بعد اس کے ساقط ہوجانے کے قائل ہوئے وہ کل کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ قرآن کریم میں یہ آیت بھی آئی ہے، اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ جس میں اقامت صلوٰۃ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر جس طرح آیت نماز کا حکم پوری اُمت کے لئے عام ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہونے کی غلط تاویل کرنے والا کفر سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح آیت خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ میں یہ تاویل بھی کفر و ارتداد سے نہیں بچائے گی، اس پر

فاروق اعظمؓ کو بھی اطمینان ہو گیا اور باجماع صحابہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا گیا۔

زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے: قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ کے بعد جو ارشاد فرمایا صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کوئی حکومت کا ٹیکس نہیں جو عام حکومتیں نظامِ حکومت چلانے کے لئے وصول کرتی ہیں، بلکہ اس کا مقصد خود اصحابِ اموال کو گناہوں سے پاک صاف کرنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو وصول کرنے سے درحقیقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں، ایک فائدہ خود صاحبِ مال کا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ گناہوں سے اور مال کی حرص و محبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے پاک و صاف ہوجاتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قوم کے اس ضعیف عنصر کی پرورش ہوتی ہے جو خود اپنی ضروریات پورا کرنے سے مجبور ہیں، جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، اپاہج و معذور مرد و عورتیں اور عام فقراء و مساکین وغیرہ۔

لیکن قرآن حکیم نے اس جگہ صرف پہلا فائدہ بیان کرنے پر اکتفاء کرکے اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ زکوٰۃ و صدقات کا اصل مقصد پہلا ہی فائدہ ہے، دوسرا فائدہ اس سے ضمنی طور پر حاصل ہوجاتا ہے، اس لئے اگر بالفرض کسی جگہ یا کسی وقت کوئی یتیم، بیوہ، فقیر، مسکین موجود نہ ہو جب بھی اصحابِ اموال سے زکوٰۃ کا حکم ساقط نہ ہوگا۔

اس مضمون کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ پچھلی امتوں میں جو مال اللہ کے لئے نکالا جاتا تھا اس کا استعمال کسی کے لئے جائز نہ تھا بلکہ دستور یہ تھا کہ اس کو کسی علیحدہ جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور آسمانی بجلی آکر اس کو جلا دیتی تھی یہی علامت تھی اس بات کی کہ صدقہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اور جہاں یہ آسمانی آگ نہ آئی تو صدقہ کے غیر مقبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی پھر اس منحوس مال کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا تھا۔

اس سے واضح ہوگیا کہ زکوٰۃ و صدقات کی اصل حقیقت کسی کی حاجت روائی کے لئے نہیں، بلکہ وہ ایک مالی حق اور عبادت ہے، جیسے نماز روزہ بدنی عبادتیں ہیں، یہ امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ مال جو اللہ کے لئے نکالا گیا ہے اس امت کے فقراء و مساکین کے لئے اس کا استعمال جائز کردیا گیا، جیسا کہ مسلم کی حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح منقول ہے۔

ایک سوال اور جواب: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ قبول کرلی گئی تو گناہ کی معافی اور تطہیر توبہ ہی کے ذریعہ ہوچکی پھر ان سے لینے کو ذریعہ تطہیر

قرار دینے کے معنی کیا ہوں گے ؟

جواب یہ ہے کہ اگرچہ توبہ سے گناہ معاف ہوگیا مگر گناہ معاف ہونے کے بعد اس کی کچھ ظلمت وکدورت باقی رہ سکتی ہے جو آئندہ ارتکاب گناہ کا سبب بن سکتی ہے، صدقہ کرنے سے وہ کدورت دور ہو کر تطہیر کامل ہوجائے گی۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ، اس میں لفظ صلوٰۃ سے مراد ان کے لئے دعاء رحمت کرنا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہی ہے کہ بعض لوگوں کے لئے آپ نے الفاظ صلوٰۃ ہی سے دعاء فرمائی جیسے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِيْ اَوْفٰى حدیث میں آیا ہے، لیکن بعد میں لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کی مخصوص علامت بن گئی، اس لئے ائمہ فقہاء رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اب کسی شخص کے لئے دعاء بہ لفظ صلوٰۃ نہ کی جائے، بلکہ اس لفظ کو صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص رکھا جائے، تاکہ تلبیس اور اشتباہ نہ ہو (بیان القرآن وغیرہ)

یہاں آپ کو صدقہ دینے والوں کے لئے دُعاء کرنے کا حکم ہے، اس وجہ سے بعض حضرات فقہاء نے فرمایا کہ امام و امیر کو صدقہ ادا کرنے والوں کے لئے دعاء کرنا واجب ہے، اور بعض حضرات نے اس کو امر استحباب قرار دیا ہے (قرطبی)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ، دس حضرات مومنین جو بلا عذر کے غزوۂ تبوک کے پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے سات نے تو اپنی ندامت و افسوس کا پورا اظہار اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ کر کردیا تھا اُن کا حکم پہلی آیت میں آچکا، وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا، اس آیت سے باقی وہ تین حضرات مراد ہیں جنھوں نے یہ عمل مسجد میں قید ہونے کا نہیں کیا تھا، اور اس طرح کھلے طور پر اعتراف نہیں کیا، اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیدیا کہ مسلمان ان کا مقاطعہ کریں، ان سے سلام کلام بند کردیں، یہ معاملہ ہونے کے بعد ان کی حالت درست ہوگئی اور اخلاص کے ساتھ اعتراف جرم کرکے تائب ہوگئے، تو ان کے لئے بھی معافی کے احکام دیدیئے گئے (صحیح بخاری ومسلم)

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ

اور جنھوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ

میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی جو لڑ رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٠٧﴾

اور وہ قسمیں کھاویں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں،

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴿١٠٨﴾ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾

تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی پرہیزگاری پر اول دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو، اور اللہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو، بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں، اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو، ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی شبہ ان کے دلوں میں مگر جب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل، اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا۔

ع ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ اسلام کو ضرر پہنچاویں اور اس میں بیٹھ بیٹھ کر کفر (یعنی عداوت رسول) کی باتیں کریں اور اس کی وجہ سے ایمانداروں کے مجمع میں تفریق ڈالیں (کیونکہ جب دوسری مسجد بنائی جاتی ہے اور ظاہر کیا جاوے کہ خوش نیتی سے بنی ہے تو ضرور ہے کہ پہلی مسجد کا مجمع کچھ نہ کچھ منتشر ہو ہی جاتا ہے) اور اس میں بھی غرض ہے کہ اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس (مسجد بننے) کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے مراد ابو عامر

میں ایک شخص ابوعامر نامی زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا، اور ابوعامر راہب کے نام سے مشہور تھا، یہ وہی شخص ہے جس کے لڑکے حنظلہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں جن کی لاش کو فرشتوں نے غسل دیا اس لئے غسیل ملائکہ کے نام سے معروف ہوئے، مگر باپ اپنی گمراہی اور نصرانیت پر قائم رہا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابوعامر راہب حاضر خدمت ہوا اور اسلام پر اعتراضات کئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر بھی اس بدنصیب کا اطمینان نہ ہوا، بلکہ یہ کہا کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہو وہ مردود اور احباب و اقارب سے دور ہو کر مسافرت میں مرے، اور کہا کہ آپ کے مقابلہ میں جو بھی دشمن آئے گا میں اس کی مدد کروں گا، چنانچہ غزوہ حنین تک تمام غزوات میں مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ قتال میں شرکت کی جب ہوازن کا بڑا اور قوی قبیلہ بھی شکست کھا گیا تو یہ مایوس ہو کر ملک شام بھاگ گیا کیونکہ یہی ملک نصرانیوں کا مرکز تھا وہیں جاکر اپنے احباب واقارب سے دور مرگیا، جو دعا کی تھی وہ اس کے سامنے آگئی جب کسی شخص کی رسوائی مقدر ہوتی ہے تو وہ ایسے ہی کام کیا کرتا ہے، خود اپنی دعا سے ذلیل و خوار ہوا۔

مگر جب تک زندہ رہا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگا رہا، چنانچہ قیصر ملک روم کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے لشکر سے مدینہ پر چڑھائی کردے، اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دے۔

اسی سازش کا ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ اس نے منافقین مدینہ کو جن کے ساتھ اس کا ساز باز تھا خط لکھا کہ میں اس کی کوشش کررہا ہوں کہ قیصر مدینہ پر چڑھائی کرے، مگر تم لوگوں کی کوئی اجتماعی طاقت ہونی چاہئے جو اس وقت قیصر کی مدد کرے، اس کی صورت یہ ہے کہ تم مدینہ ہی میں ایک مکان بناؤ، اور یہ ظاہر کرو کہ ہم مسجد بنا رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو شبہ نہ ہو پھر اس مکان میں تم اپنے لوگوں کو جمع کرو اور جس قدر اسلحہ اور سامان جمع کر سکتے ہو وہ بھی کرو اور یہاں مسلمانوں کے خلاف آپس کے مشورہ سے معاملات طے کیا کرو۔

اس کے مشورہ پر بارہ منافقین نے مدینہ طیبہ کے محلہ قبا میں جہاں اول ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور ایک مسجد بنائی تھی وہیں ایک دوسری مسجد کی بنیاد رکھی ان منافقین کے نام بھی ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کئے ہیں، پھر مسلمانوں کو فریب دینے اور دھوکے میں رکھنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نماز اس جگہ پڑھوا دیں تاکہ سب مسلمان مطمئن ہوجائیں کہ یہ بھی ایک مسجد ہے جیسا کہ اس سے پہلے ایک مسجد یہاں بن چکی ہے۔

ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قبا کی موجودہ مسجد بہت سے لوگوں سے دور ہے، ضعیف بیمار آدمیوں کو وہاں تک پہونچنا مشکل ہے،

اور خود مسجد قبا اتنی وسیع بھی نہیں کہ پوری بستی کے لوگ اس میں سما سکیں، اس لئے ہم نے ایک دوسری مسجد اس کام کے لئے بنائی ہے تاکہ ضعیف مسلمانوں کو فائدہ پہونچے، آپ اس مسجد میں **ایک نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہوجائے۔**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ تبوک کی تیاری میں مشغول تھے، آپ نے یہ وعدہ کرلیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھیں گے۔

لیکن غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت جبکہ آپ مدینہ طیبہ کے قریب ایک مقام پر فروکش ہوئے تو آیاتِ مذکورہ آپ پر نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کی سازش کھول دی گئی تھی، آیات کے نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند اصحاب جن میں عامر بن سکن اور وحشی قاتل حمزہؓ وغیرہ شریک تھے، ان کو حکم دیا کہ ابھی جا کر اس مسجد کو ڈھا دو، اور اس میں آگ لگا دو، یہ سب حضرات اسی وقت گئے اور حکم کی تعمیل کرکے اس کی عمارت کو ڈھا کر زمین برابر کردی، یہ تمام واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری کی بیان کی ہوئی روایت سے اخذ کیا گیا ہے۔

تفسیر مظہری میں محمد بن یوسف صالحی کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینہ منورہ میں پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی، آپ نے عاصم ابن عدی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اس جگہ میں اپنا گھر بنا لیں، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جس جگہ کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوچکی ہیں میں تو اس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا، البتہ ثابت بن اقرم ضرورتمند ہیں ان کے پاس کوئی گھر نہیں ان کو اجازت دیدیجئے، کہ وہ یہاں مکان بنالیں، ان کے مشورہ کے مطابق آپ نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دیدی، مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابتؓ اس مکان میں مقیم ہوئے ان کے کوئی بچہ نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا۔

اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا اس جگہ میں کوئی مرغی بھی انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی کوئی کبوتر اور جانور بھی اس میں پھلا پھولا نہیں چنانچہ اس کے بعد سے یہ جگہ آج تک مسجد قبا **کے کچھ فاصلہ پر ویران پڑی ہے۔**

واقعہ کی تفصیل سننے کے بعد آیاتِ مذکورہ کے متن کو دیکھئے، پہلی آیت میں فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا، یعنی جس طرح اوپر دوسرے منافقین کے عذاب اور ذلت و رسوائی کا ذکر ہوا ہے یہ منافقین بھی ان میں شامل ہیں جنھوں نے مسجد کا نام رکھ کر ایک ایسی عمارت بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہونچانا تھا۔

اس آیت میں مسجد مذکور کے بنانے کی تین غرضیں ذکر کی گئی ہیں، اوّل ضِرَارًا، یعنی مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے لئے، لفظ "ضرر" اور "ضرار" دونوں عربی زبان میں نقصان پہنچانے

کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں بعض حضرات نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ "ضرر" تو اس نقصان کو کہا جاتا ہے جس میں اس کے کرنے والے کا اپنا تو فائدہ ہو دوسروں کو نقصان پہونچے، اور "ضرار" دوسروں کو وہ نقصان پہونچانا ہے جس میں اس پہونچانے والے کا اپنا کوئی فائدہ بھی نہیں، چونکہ اس مسجد کا انجام یہی ہونے والا تھا کہ بنانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہونچے، اس لئے یہاں لفظ ضرار استعمال کیا گیا۔

دوسری غرض اس مسجد کی تَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ بتلائی گئی ہے، یعنی ان کا مقصد اس مسجد کے بنانے سے یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جاویں، ایک ٹکڑا اس مسجد میں نماز پڑھنے والوں کا الگ ہو جائے، ورنہ قدیم مسجد قبا کے نمازی گھٹ جائیں اور کچھ لوگ یہاں نماز پڑھا کریں۔

تیسری غرض اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰهَ بتلائی گئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس مسجد سے یہ کام بھی لینا تھا کہ یہاں اللہ اور رسول کے دشمنوں کو پناہ ملے اور وہ یہاں مسلمانوں کے خلاف سازش کیا کریں۔

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ڈھایا گیا اور آگ لگائی گئی درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لئے تھا بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ آجکل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں، تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گنہگار ہوگا، لیکن باینہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا، اور تمام آداب اور احکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہ گناہ رہے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس طرح ریاء و نمود کے لئے یا ضد و عناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنائے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاح قرآن والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا، بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہدیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لئے اس کے بنانے کو روکا بھی جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت فاروقؓ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی

جماعت اور رونق متاثر ہو (تفسیر کشاف)

اس مسجد ضرار کے متعلق دوسری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے، لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا، اس میں قیام سے مراد نماز کے لئے قیام ہے مطلب یہ ہے کہ آپ اس نام کی مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

مسئلہ: اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض ریاء ونمود کے لئے یا ضد وعناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں، اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔

اسی آیت میں آپ کو یہ بھی ہدایت دی گئی کہ آپ کا نماز پڑھنا اسی مسجد میں درست ہے جس کی بنیاد اول سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور اس میں ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جن کو پاکی اور طہارت میں پوری احتیاط محبوب ہے، اور اللہ بھی ایسے مُطَّہَّرین کو پسند کرتا ہے۔

سیاق آیت سے ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے مسجد قبا ہے جس میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے، اور بعض روایتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (کما رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس وعمرو بن شیبۃ عن سہل الانصاری وابن خزیمۃ فی صحیحہ عن عویم بن ساعدہ، از مظہری)

اور بعض روایات میں جو یہ آیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ مسجد نبوی جس کی بنیاد وحی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے رکھی ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مطہر کون ہو سکتا ہے، اس لئے وہ بھی اس کی مصداق ضرور ہے (کما رواہ الترمذی وصححہ عن ابی سعید الخدریؓ مرفوعاً، از قرطبی)

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا، آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے لئے اس مسجد کو احق قرار دیا جس کی بنیاد اول سے تقویٰ پر رکھی گئی جس کے مفہوم میں مسجد قبا اور مسجد نبوی دونوں داخل ہیں، اس مسجد کی ایک فضیلت یہ بھی بتلائی گئی کہ اس مسجد کے نمازی ایسے لوگ ہیں جو طہارت کا بہت زیادہ خیال اور اہتمام کرتے ہیں، طہارت کے مفہوم میں اس جگہ عام نجاسات وگندگیوں سے پاکی بھی ..... داخل ہے، اور معاصی اور اخلاقِ رذیلہ سے پاکی بھی، مسجد قبا اور مسجد نبوی کے نمازی عموماً ان سب اوصاف کے ساتھ متصف تھے۔

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مسجد کی فضیلت کا اصل مدار تو اس پر ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے بنائی گئی ہو، اس میں کسی ریاء ونام ونمود کا یا کسی اور غرض فاسد

کا کوئی دخل نہ ہو اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیوں کے نیک، صالح، عالم، عابد ہونے سے بھی مسجد کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، جس مسجد کے نمازی عام طور پر علماء، صلحاء، تقوٰی شعار ہوں اس میں نماز ادا کرنے کی فضیلت زیادہ ہے۔

تیسری اور چوتھی آیت میں اس مسجد مقبول کے مقابلہ میں منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار کی مذمت بیان کی گئی ہے، کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دریا کے کنارے بعض اوقات پانی زمین کے حصہ کو اندر سے کھا لیتا ہے اور اوپر زمین کی سطح ہموار نظر آتی ہے، اس پر اگر کوئی تعمیر کرے تو ظاہر ہے کہ وہ فوراً گر جائے گی، اسی طرح اس مسجد ضرار کی بنیاد ناپائیدار تھی اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ گر پڑی، اور جہنم کی آگ میں گئی، جہنم کی آگ میں جانا مجازی معنی کے لئے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بنانے والوں کے لئے اس نے جہنم کا راستہ ہموار کر دیا، اور بعض حضرات نے اس کو حقیقت پر بھی محمول کیا ہے کہ حقیقۃً جب یہ مسجد گرائی گئی ہے، تو جہنم میں گئی، واللہ اعلم۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ تعمیر ہمیشہ ان کے شک اور نفاق کو بڑھاتی ہی رہے گی، جب تک کہ ان کے قلوب قطع نہ ہو جائیں یعنی جب تک ان کی زندگی ختم نہ ہو جائے، ان کا شک و نفاق اور حسد و غیظ بڑھتا ہی رہے گا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم

اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال

بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَ

اس قیمت پر کہ ان کیلئے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور

يُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَ

مرتے ہیں وعدہ ہو چکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل اور

الْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ

قرآن میں اور کون ہے قول کا پورا اللہ سے زیادہ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر

الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾ التَّائِبُونَ

جو تم نے کیا ہے اس سے اور یہی ہے بڑی کامیابی، وہ توبہ کرنے والے ہیں

الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ

بندگی کرنیوالے شکر کرنیوالے بے تعلق رہنیوالے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ
حکم کرنیوالے نیک بات کا اور منع کرنیوالے بُری بات سے اور حفاظت کرنے والے

لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾
اللہ کی باندھی حدوں کی اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی (اور خدا کے ہاتھ مال و جان بیچنے کا مطلب یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) لڑتے ہیں جس میں (کبھی) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل کئے جاتے ہیں (یعنی وہ بیع جہاد کرنا ہے خواہ اس میں قاتل ہونے کی نوبت آئے یا مقتول ہونے کی) اس (قتال) پر (ان سے جنت کا) سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور (یہ مسلّم ہے کہ) اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے (اور اس نے اس بیع پر وعدہ جنت کا کیا ہے) تو (اس حالت میں) تم لوگ (جو کہ جہاد کر رہے ہو) اپنی اس بیع (مذکور) پر جس کا تم نے (اللہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ (کیونکہ اس بیع پر تم کو حسب وعدہ مذکورہ جنت ملے گی) اور یہ (جنت ملنا) بڑی کامیابی ہے (تو ضرور تم کو یہ سودا کرنا چاہئے) وہ (مجاہدین ایسے ہیں جو علاوہ جہاد کے ان اوصاف کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے (ہیں اور اللہ کی) حمد کرنے والے (ہیں اور) روزہ رکھنے والے (ہیں اور) رکوع اور سجدہ کرنے والے (ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور) نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے (ہیں) اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے (ہیں) اور اللہ کی حدود کا (یعنی احکام کا) خیال رکھنے والے (ہیں) اور ایسے مومنین کو (جن میں جہاد اور یہ صفات ہوں) آپ خوشخبری سنا دیجئے (کہ ان سے جنت کا وعدہ مذکورہ ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات سابقہ آیات میں جہاد سے بلا عذر رُکنے کی مذمت کا بیان تھا، ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت کا بیان ہے۔

شانِ نزول حسب تصریح اکثر حضرات مفسرین یہ آیت بیعتِ عقبہ کے شرکاء کے متعلق

نازل ہوئی ہیں جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں انصار مدینہ سے لی گئی تھی اس لئے پوری سورت کے مدنی ہونے کے باوجود ان آیات کو مکی کہا گیا ہے۔

عقبہ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے، آجکل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہے اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے، پہلی بیعت بعثت نبوی کے گیارہویں سال میں ہوئی جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اس جگہ جمع ہوئے جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے، سب نے بیعت کی، اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی جو چالیس نفر سے زائد تھی انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کے لئے کسی کو بھیج دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیجدیا، انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا اور اسلام کی تبلیغ بھی کی، جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئیں۔

اس کے بعد بعثت نبوی کے تیرہویں سال میں ستر مرد دو عورتیں اس جگہ جمع ہوئے یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے، اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے، یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار سے جہاد اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہونچیں تو آپ کی حفاظت و حمایت پر لی تھی اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے آپ جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کر دی جائیں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اسکی عبادت کریں گے اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لئے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کرتے ہو، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کر دیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہو کر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں صورت ... ایک بیع یعنی دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت بلفظ بیع و شراء نازل ہوئی، اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ، یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرورؓ اور ابوالہیثمؓ اور اسعد

رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، کہ ہم اس معاملہ پر تیار ہیں، آپؐ کی حفاظت اپنی عورتوں بچوں کی طرح کریں گے، اور آپؐ کے مقابلہ پر اگر دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہو جائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جہاد کی سب سے پہلی یہی آیت ہے مکہ معظمہ میں جہاد و قتال کے احکام نہیں تھے، یہ سب سے پہلی آیت ہے جو مکہ مکرمہ ہی میں قتال کے متعلق نازل ہوئی، اور اس کا عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا، اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی، اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ، جب یہ بیعت عقبہ کفارِ قریش مکہ سے خفیہ مکمل ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے مدینہ کی ہجرت کا حکم دیدیا، اور تدریجی صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے کے منتظر رہے، صدیق اکبرؓ نے ہجرت کا قصد کیا تو آپؐ نے ان کو اپنے ساتھ کے لئے روک لیا (یہ پورا واقعہ تفسیر مظہری میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے)۔

یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الیٰ) فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد و قتال کا حکم تمام پچھلی امتوں کے لئے بھی سب کتابوں میں نازل کیا گیا، اور یہ جو مشہور ہے کہ انجیل میں جہاد کا حکم نہیں، ممکن ہے کہ بعد کے لوگوں نے جو تحریفات اس میں کی ہیں اس میں احکامِ جہاد کو خارج کر دیا گیا ہو، واللہ اعلم

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ، اس واقعہ بیعتِ عقبہ میں جو معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اس کی ظاہری صورت بیع و شراء کی بن گئی، اس لئے شروع آیت میں شراء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، اس جملہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ معاملہ بیع تمھارے لئے نفع کا سودا اور مبارک ہے، کیونکہ ایک فانی چیز جان و مال دے کر ہمیشہ باقی رہنے والی چیز بدلے میں ملتی اور غور کیا جائے تو خرچ صرف مال ہوا، جان تو یعنی روح تو مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی اور ہمیشہ رہے گی، اور مال پر غور کیا جائے تو وہ بھی تو حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، انسان تو اپنی پیدائش کے وقت خالی ہاتھ آیا تھا، اسی نے سب سامان اور مال و دولت کا اس کو مالک بنایا ہے، اپنے ہی عطیہ کو آخرت کی نعمتوں اور جنت کا معاوضہ بنا کر جنت دیدی، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ یہ عجیب بیع ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمھیں ہی دیدیئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ نے ہر مؤمن کیلئے کھول دی ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمھیں مال بخشا ہے تم اس میں سے تھوڑا خرچ کر کے جنت خرید لو (مظہری)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الآیۃ، یہ صفات انہی مؤمنین کی ہیں جن کے بارے میں

وَلَوْ كَانُوٓا أُولِي قُرْبَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَٰبُ

اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جبکہ کھل چکا اُن پر کہ وہ ہیں دوزخ

الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن

والے، اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر وعدہ

مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَآ إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥٓ أَنَّهُۥ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے، پھر جب کھل گیا ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا تو اس سے بیزار ہو گیا

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾

بیشک ابراہیم بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

خلاصۂ تفسیر

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعاء مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی (کیوں نہ) ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں (اس وجہ سے کہ کافر ہو کر مرے ہیں، اور (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے شبہ ہو کہ انھوں نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی (اس کا جواب یہ ہے کہ) ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (وہ اس کے قبل تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر ہو جاوے اور وہ بھی) صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انھوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا (اس قول میں سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ، غرض جواز تو اس لئے تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر نہ ہوا تھا، اور وقوع کو اس کے ترجیح ہو گئی تھی کہ وعدہ کر لیا تھا، ورنہ وجہ جواز کے بھی وقوع نہ ہوتا) پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن (یعنی کافر ہو کر مرا) ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے (کہ استغفار بھی چھوڑ دیا، کیونکہ اس وقت دعائے مغفرت کرنا بے معنی ہے، کیونکہ کافر میں احتمال مغفرت کا ہی نہیں، بخلاف حالت حیات کے کہ دعائے مغفرت کے معنی اس وقت طلب توفیق ہدایت ہو سکتے ہیں کہ توفیق ہدایت کے لئے مغفرت لازم ہے، اور یہ کہ وعدہ ہی کر لیا تھا وجہ اس کی یہ ہے کہ) واقعی ابراہیم (علیہ السلام) بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے (کہ باوجودیکہ باپ نے ان کو کیسی کیسی سخت باتیں کہیں، مگر حلم سے کام لیا اور مزید براں یہ کہ شفقت کے جوش سے وعدہ کر لیا، اور احتمال نفع تک اس وعدہ کو پورا فرمایا، جب یاس ہو گیا اس کو چھوڑ دیا، بخلاف تمہارے استغفار کے کہ مشرکین کے مرنے

... کے بعد ہو رہا ہے، جس کا حالتِ شرک پر مرنا ظاہر ہو چکا ہے معلوم ہوا اور حکمِ شرعیہ میں ظاہر کافی ہے، پھر قیاس کب صحیح ہے، اور اس قیاس پر شبہ کب مبنی ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ پوری کفار و مشرکین سے تبرّی اور علیحدگی کے احکام پر مشتمل ہے، سورۃ کا شروع ہی بَرَاۗءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ سے ہوا ہے، اور اسی لئے اس سورۃ کا ایک نام سورۂ براءت بھی معروف ہے اور جس قدر احکام آئے وہ دنیوی زندگی میں کفار و مشرکین سے براءت اور قطع تعلق کے متعلق ہیں، اس آیت میں یہی حکم براءت اور قطع تعلق کا آخرت کی زندگی کے لئے آیا ہے، کہ مرنے کے بعد کافر و مشرک کے لئے دعاءِ مغفرت کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے ایک آیت میں منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا ہے۔

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و حفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمۂ اسلام پڑھ لیں، اور ایمان لے آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے، مرض وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ شریف پڑھ لیں تو کام ہو جائے، چنانچہ اس حالت میں آپ ان کے پاس پہونچے، مگر ابوجہل عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ میرے چچا، کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیں تو میں آپ کی بخشش کے لئے کوشش کروں گا، مگر ابوجہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دہرایا، مگر یہ ہر مرتبہ ابوجہل یہی بات کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابو طالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے، اس پر یہ آیت ممانعت کی نازل ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے لئے دعاءِ مغفرت کرنے سے منع فرما دیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

اس پر بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے کافر باپ کے لئے دعاء کی تھی، اس کے جواب میں دوسری آیت نازل ہوئی، مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ

اِبۡرٰهِيۡمَ الآیۃ جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے والد کے لئے دعاء کی تھی اس کا معاملہ یہ ہے کہ شروع میں جب تک ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر تک کفر ہی پر قائم رہے گا، اسی پر مرے گا تو اس کا دوزخی ہونا یقینی نہیں تھا، اس وقت انھوں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں آپ کے لئے دعاء مغفرت کروں گا، سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ، پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے یعنی کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہے تو اس سے بے تعلقی اختیار کر لی اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

قرآن مجید کے مختلف مواقع میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لئے دعاء مغفرت کرنا منقول ہے وہ سب اسی پر محمول ہونا چاہئے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو ایمان و اسلام کی توفیق دے تاکہ ان کی مغفرت ہو سکے۔

غزوۂ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو کفار نے زخمی کر دیا تو آپ چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ دعاء فرما رہے تھے، اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِقَوۡمِيۡ اِنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ، "یعنی یا اللہ میری قوم کی مغفرت فرما دے وہ نادان ہیں" اس دعاء مغفرت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرما دے کہ یہ مغفرت کے قابل ہو جائیں۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ زندہ کافر کے لئے اس نیت سے دعاء مغفرت کرنا جائز ہے کہ اس کو ایمان کی توفیق ہو اور یہ مستحق مغفرت ہو جائے۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ، لفظ اَوّاہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرطبیؒ نے اس میں پندرہ قول نقل کئے ہیں، مگر سب معانی متقارب ہیں، کوئی اختلاف حقیقی نہیں، ان میں سے چند معانی یہ ہیں: بکثرت آہ کرنے والا، یا بکثرت دعاء کرنے والا، اللہ کے بندوں پر رحم کرنے والا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہی معنی منقول ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوۡمًاۢ بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮهُمۡ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمۡ

اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر لا چکا جب تک کھول نہ دے ان پر

مَّا يَتَّقُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۞ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ

جس سے ان کو بچنا چاہئے بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے، اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور

الۡاَرۡضِ ؕ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ؕ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۱۶﴾

زمین میں جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے سوا حمایتی اور نہ مددگار

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کئے پیچھے گمراہ کردے جب تک کہ اُن چیزوں کو صاف صاف نہ بتلادے جن سے وہ بچتے رہیں (پس جب ہم نے تم کو مسلمانوں کو ہدایت کی ہے تو اس کے قبل استغفار للمشرکین کی ممانعت نہ بتلائی تھی تو اس کے کرنے سے تم پر یہ الزام نہیں دیا جائے گا کہ تم میں گمراہی کا مادہ پیدا کردیا جاوے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں، سو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بدون ہمارے بتلائے ہوئے ایسے احکام کو کوئی نہیں جان سکتا، اس لئے ان واقعات سے مضرت بھی نہیں پہنچنے دیتے اور) بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں وہی جلاتا اور مارتا ہے (یعنی ہر طرح کی حکومت اور قدرت اسی کے ساتھ خاص ہے اس لئے جو چاہے حکم دے سکتا ہے اور جس ضرر سے چاہے بچا سکتا ہے) اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار (بلکہ وہی یار و مددگار ہے اس لئے قبل ہی تم کو ضرر سے بچا دیا ہے اور اگر تم نے بعد نہی اطاعت نہ کی تو اور کوئی بچانے والا نہیں)۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اللہ مہربان ہوا نبیؐ پر اور مہاجرین اور انصار پر جو

اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ

ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں

فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷)

بعضوں کے اُن میں سے پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ

اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا، یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین

بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ

باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں اُن پر ان کی جانیں اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں

مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

اللہ سے مگر اسی کی طرف، پھر مہربان ہوا اُن پر تاکہ وہ پھر آئیں بیشک اللہ ہی ہے

ع ۱۴ ۳

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا		
مہربان رحم والا ، اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو		
	مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾	
	ساتھ سچوں کے ۔	

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ آپ کو نبوت اور امامت جہاد اور تمام خوبیاں عطا فرمائیں) اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی، توجہ فرمائی کہ ان کو ایسی مشقت کے جہاد میں ثابت قدم رکھا) جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہو چلا تھا (اور جہاد میں جانے سے ہمت ہارنے کو تھے مگر پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ ان کو سنبھال لیا اور آخر ساتھ ہو لئے پس) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے (کہ اپنی مہربانی سے ہر ایک کے حال پر کس کس طرح توجہ فرمائی) اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ زمین باوجود اپنی (اتنی بڑی) فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوگئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی (ایسے مواقع مصیبت ومعصیت میں اللہ کی طرف) رجوع رہا کریں بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں، اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ چلو کہ تم بھی صدق اختیار کرو)۔

معارف ومسائل

یہاں سے چند آیات پہلے آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا کے بیان میں یہ لکھا گیا تھا کہ غزوۂ تبوک کے لئے سب مسلمانوں کو نکلنے کا حکم عام ہونے کے وقت اہل مدینہ کے لوگوں کی پانچ قسمیں ہوگئی تھیں، دو قسمیں منافقین غیر معذور کی تھیں جن کا بیان سابقہ آیات میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، مذکورۃ الصدر آیات میں مؤمنین مخلصین کی تین قسموں کا ذکر ہے، اوّل وہ لوگ جو حکم جہاد پاتے ہی

فوراً تیار ہوگئے، ان کا بیان آیت مذکورہ کے ابتدائی جملے میں اِتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ میں ہوا ہے، دوسرے وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردد میں رہے، مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کے لئے سب کے ساتھ ہوگئے ان کا بیان اسی آیت کے اس جملے میں ہے، مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ۔

تیسرے وہ مؤمنین تھے جو اگرچہ وقتی کاہلی و سستی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے، مگر بعد میں نادم اور تائب ہوئے، اور بالآخر ان سب کی توبہ قبول ہوگئی، مگر ان میں بھی دو قسم ہوگئی تھیں پہلی دس آدمی تھے جن میں سے سات آدمیوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت و توبہ کا اظہار اس شان سے کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی بندھے رہیں گے، ان کی آیت توبہ تو اسی وقت نازل ہوگئی جس کا بیان پہلے ہوچکا ہے، تین آدمی وہ تھے جنھوں نے یہ عمل نہیں کیا ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مقاطعہ کا حکم دیدیا کہ کوئی ان کے ساتھ سلام و کلام نہ کرے، جس سے یہ حضرات سخت پریشان ہوگئے، ان کا ذکر دوسری آیت وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا میں ہوا ہے، جس میں بالآخر ان کی توبہ کے قبول ہونے کا بیان ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان سے مقاطعہ کا حکم ختم کردیا گیا۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ، "اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرلی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان مہاجرین و انصار کی جنھوں نے تنگی اور تکلیف کے وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کیا"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ تو گناہ و معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے معصوم ہیں، ان کی توبہ قبول کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے علاوہ جو صحابہ مہاجرین و انصار اول ہی جہاد کے لئے تیار ہوگئے انھوں نے بھی کوئی قصور نہیں کیا تھا ان کی توبہ کس جرم کی تھی جو قبول کی گئی۔

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو گناہ سے بچا دیا، اس کو توبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا یا یہ کہ ان سب حضرات کو حق تعالیٰ نے توّاب بنا دیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ توبہ کی حاجت و ضرورت سے کوئی شخص مستغنی نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخصوص صحابہ بھی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا، یعنی توبہ کرو اللہ سے سب کے سب" وجہ یہ ہے کہ قرب الی اللہ کے درجات غیر متناہی ہیں، جو شخص جس مقام پر پہنچ گیا اس سے آگے بھی اس سے بلند مقام ہے، جس کے مقابلہ میں موجودہ مقام پر رک جانا ایک نقص و کوتاہی ہے، مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو ایک شعر میں اس طرح بیان فرمایا ہے

اے برادر بے نہایت درگہیست ؛ ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

اس لحاظ سے موجودہ مقام پر رہنے سے توبہ کی ضرورت ہے، تاکہ اگلا مقام حاصل ہو۔

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ، اسی جہاد کے موقع کو قرآن کریم نے ساعۃ العسرۃ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ مسلمان اس وقت افلاس اور تنگی میں تھے، حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ دس آدمیوں کے لئے ایک سواری تھی جس پر باری باری سوار ہوتے تھے، توشۂ سفر بھی بہت کم اور معمولی تھا، دوسری طرف گرمی سخت وشدید تھی، پانی بھی رستہ میں کہیں کہیں اور تھوڑا تھا۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ، اس میں جو بعض لوگوں کے قلوب کا زیغ بیان کیا گیا ہے اس سے مراد دین سے انحراف نہیں، بلکہ سختیِ موسم اور قلتِ سامان کے سبب ہمت ہار دینا اور جہاد سے جان چرانا مراد ہے، روایات حدیث اس پر شاہد ہیں، اسی قصور پر ان کی توبہ قبول کی گئی۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا، اس میں خُلِّفُوْا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، مراد یہ ہے کہ جن کی توبہ کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا، یہ تین حضرات ... حضرت کعب بن مالکؓ شاعر، اور مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ ہیں تینوں انصاری بزرگ تھے، جو اس سے پہلے بیعت عقبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے غزوات میں شریک رہ چکے تھے، مگر اس وقت اتفاقی طور سے اس لغزش میں مبتلا ہوگئے، اور منافقین جو اس جہاد میں اپنے نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے انھوں نے بھی ان کو ایسے ہی مشورے دیئے جس سے اُن کی ہمت ٹوٹ گئی، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو ان سب منافقین نے حاضر ہو کر جھوٹے اعذار پیش کرکے اور جھوٹی قسمیں کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی باطنی حالت کو اللہ کے سپرد کیا، اور ظاہری قسموں کو قبول کرلیا، یہ لوگ آرام سے رہنے لگے، کچھ لوگوں نے ان تینوں انصاری بزرگوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ تم بھی جھوٹے عذر کرکے اپنی صفائی پیش کردو، مگر ان کے دلوں نے ملامت کی کہ ایک گناہ تو جہاد سے تخلف کا کر چکے ہیں، اب دوسرا گناہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹ بولنے کا کریں، اس لئے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کرلیا، جس کی سزا میں ان سے مقاطعہ سلام وکلام جاری کیا گیا، انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان سب کی حقیقت کھول دی، جھوٹی قسمیں کھا کر عذر کرنے والوں کا پردہ فاش کردیا، جس کا ذکر اور ان کے انجام بد کا حال اس سے پہلی کئی آیات میں يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ سے عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ تک بیان ہوا ہے، اور ان تین بزرگوں نے جو سچ بولا اور اعتراف کیا اُن کی توبہ

اس آیت میں نازل ہوئی، اور پچاس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، عام اور صحابہ کرام کے مقاطعہ سلام وکلام کی انتہائی سخت مصیبت جھیلنے کے بعد بڑی سرخروئی اور مبارکبادوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں میں مقبول ہوئے۔

ان تینوں انصاری بزرگوں کے واقعہ کی تفصیل احادیث صحیحہ سے صحیحین بخاری ومسلم اور اکثر کتب حدیث میں اس واقعہ کے متعلق حضرت کعب بن مالکؓ کی ایک طویل حدیث لکھی گئی ہے، جو بہت سے فوائد اور مسائل اور حقائق پر مشتمل ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا پورا ترجمہ یہاں نقل کر دیا جائے، ان تین بزرگوں میں سے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے انھوں نے اپنے واقعہ کی تفصیل اس طرح بتلائی ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے غزوات میں شرکت کی میں ان سب میں بجز غزوۂ تبوک کے آپ کے ساتھ شریک رہا، البتہ غزوۂ بدر کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو اس میں شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا، اور شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب بھی نہیں فرمایا تھا اس میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا، اور میں لیلۃ العقبہ کی بیعت میں بھی حاضر تھا جس میں ہم نے اسلام کی حمایت وحفاظت کا معاہدہ کیا تھا، اور مجھے یہ بیعت عقبہ کی حاضری غزوۂ بدر کی حاضری سے بھی زیادہ محبوب ہے، اگرچہ غزوۂ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے، اور میرا واقعہ غزوۂ تبوک میں غیر حاضری کا یہ ہے کہ میں کسی وقت بھی اُس وقت سے زیادہ خوش حال اور مالدار نہ تھا۔ .... بخدا میرے پاس کبھی اس سے پہلے دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں، جو اس وقت موجود تھیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ غزوات کے معاملہ میں یہ تھی کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت اپنے ارادے کے اخفاء کے لئے ایسا کرتے تھے کہ جس سمت میں جا کر جہاد کرنا ہوتا مدینہ سے اس کے خلاف سمت کو نکلتے تھے، تاکہ منافقین مخبری کرکے فریق مقابل کو آگاہ نہ کردیں اور فرمایا کرتے تھے کہ جنگ میں اس طرح کا خداع (دھوکہ) جائز ہے۔

یہاں تک کہ یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا، (یہ جہاد کئی وجہ سے ممتاز تھا) آپ نے سخت گرمی اور تنگدستی کی حالت میں اس جہاد کا قصد فرمایا، اور سفر بھی بڑی دُور کا تھا، مقابلہ پر دشمن کی قوت اور تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تاکہ مسلمان اس جہاد کے لئے پوری تیاری کرسکیں۔

اس جہاد میں شریک ہونے والوں کی تعداد صحیح مسلم کی روایت کے مطابق دس ہزار سے زائد تھی، اور حاکم کی روایت حضرت معاذؓ سے یہ ہے کہ ہم اس جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ نکلے تو ہماری تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔

اور اس جہاد میں نکلنے والوں کی کوئی فہرست نہیں لکھی گئی تھی اس لئے جو لوگ جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے ان کو یہ موقع مل گیا کہ ہم نہ گئے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد کے لئے نکلے تو وہ وقت تھا کہ کھجوریں پک رہی تھیں، باغات والے انہیں میں مشغول تھے، اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں نے سفر کی تیاری شروع کردی، اور جمعرات کے روز آپ نے اس سفر کا آغاز کیا، اور سفر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا، خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسرے مقصد کا۔

میرا حال یہ تھا کہ میں روز صبح کو ارادہ کرتا کہ جہاد کی تیاری کروں مگر بغیر کسی تیاری کے واپس آجاتا، میں دل میں کہتا تھا کہ میں جہاد پر قادر ہوں مجھے نکلنا چاہئے، مگر یوں ہی امروز و فردا میں میرا ارادہ ملتوی ہوتا رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان جہاد کے لئے روانہ ہوگئے، پھر بھی میرے دل میں یہ آتا رہا کہ میں بھی روانہ ہو جاؤں اور کہیں راستہ میں مل جاؤں، اور کاش کہ میں ایسا کر لیتا، مگر یہ کام (افسوس ہے کہ) نہ ہو سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں مدینہ میں کہیں جاتا تو یہ بات مجھے غمگین کرتی تھی کہ اس وقت پورے مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر پڑتے تھے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے، یا پھر ایسے بیمار معذور جو قطعی سفر کے قابل نہ تھے، دوسری طرف پورے راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال کہیں نہیں آیا، یہاں تک کہ تبوک پہونچ گئے، اس وقت آپ نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ کعب بن مالک کو کیا ہوا (وہ کہاں ہیں)؟

بنو سلمہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ان کو جہاد سے ان کے عمدہ لباس اور اس پر نظر کرتے رہنے نے روکا ہے، حضرت معاذ بن جبل نے عرض کیا تم نے یہ بری بات کی ہے یا رسول اللہ بخدا میں نے ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔

حضرت کعب کا بیان ہے کہ جب مجھے یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور قریب تھا کہ میں اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر گھڑ کر تیار کر لیتا اور ایسی باتیں پیش کر دیتا جس کے ذریعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی سے نکل جاتا، اور اس کے لئے اپنے اہل رائے دوستوں سے بھی مدد لیتا (میرے دل میں یہ خیالات، وساوس گھومتے رہے) یہاں تک کہ جب یہ خبر ملی کہ حضور تشریف لے آئے ہیں تو خیالات فاسدہ میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ میں آپ کی ناراضی سے کسی ایسی بنیاد پر نہیں نکل سکتا جس میں جھوٹ

یہ تم نے کیا بے وقوفی کی کہ اس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا دوسرے متخلفین نے پیش کیا، اور تمھارے گناہ کی معافی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا کافی ہو جاتا، بخدا یہ لوگ مجھے بار بار ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں لوٹ جاؤں، اور پھر جا کر عرض کروں کہ میں نے جو بات پہلے کہی تھی وہ غلط تھی، میرا عذر صحیح موجود تھا۔

مگر پھر میں نے دل میں کہا کہ میں ایک گناہ کے دو گناہ نہ بناؤں، ایک گناہ تو تخلف کا سرزد ہو چکا ہے دوسرا گناہ جھوٹ بولنے کا کر گذروں، پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ متخلفین میں کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے جس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہو، ان لوگوں نے بتلایا کہ دو آدمی اور ہیں جنھوں نے تمھاری طرح اقرار جرم کر لیا، اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں کہا گیا ہے، (کہ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو) میں نے پوچھا کہ وہ دو کون ہیں، انھوں نے بتلایا کہ ایک مرارہ ابن ربیع العمری دوسرے ہلال بن امیہ واقفی ہیں۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ ان میں سے پہلے (یعنی مرارہؓ) کے تخلف کا تو سبب یہ ہوا کہ ان کا ایک باغ تھا جس کا پھل اس وقت پک رہا تھا، تو انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے اس سے پہلے بہت سے غزوات میں حصہ لیا ہے، اگر اس سال جہاد میں نہ جاؤ تو کیا جرم ہے، اس کے بعد جب انھیں اپنے گناہ پر تنبہ ہوا، تو انھوں نے اللہ سے عہد کر لیا کہ یہ باغ میں نے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

اور دوسرے بزرگ حضرت ہلال بن امیہ کا یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے اہل و عیال عرصے سے متفرق تھے، اس موقع پر سب جمع ہو گئے تو یہ خیال کیا کہ اس سال میں جہاد میں نہ جاؤں اپنے اہل و عیال میں بسر کروں، ان کو بھی جب اپنے گناہ کا خیال آیا تو انھوں نے یہ عہد کیا کہ اب میں اپنے اہل و عیال سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایسے دو بزرگوں کا ذکر کیا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین میں سے ہیں، تو میں نے کہا کہ بس میرے لئے انہی دونوں بزرگوں کا عمل قابلِ تقلید ہے، یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا گیا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو ہم تینوں کے ساتھ سلام کلام کرنے سے منع فرما دیا، اس وقت ہم تو سب مسلمانوں سے بدستور محبت کرتے تھے مگر ان سب کا رُخ ہم سے پھر گیا تھا۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اب ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم لوگوں کے پاس جاتے تو کوئی ہم سے کلام نہ کرتا نہ سلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔

مسند عبد الرزاق میں ہے کہ اس وقت ہماری دنیا بالکل بدل گئی یہ معلوم ہونے لگا کہ نہ وہ لوگ ہیں جو پہلے تھے نہ ہمارے باغ اور مکانات وہ ہیں جو پہلے تھے، سب اجنبی نظر آنے لگے، مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر میں اسی حال میں مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے یا خدانخواستہ اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو میں عمر بھر اسی طرح سب لوگوں میں ذلیل و خوار پھرتا رہوں گا، اس کی وجہ سے میرے لئے ساری زمین بیگانہ اور ویرانہ نظر آنے لگی، اسی حال میں ہم پر پچاس راتیں گذر گئیں۔ اس زمانہ میں میرے دونوں ساتھی (مرارہ اور ہلال) تو شکستہ دل ہو کر گھر میں بیٹھ رہے اور رات دن روتے تھے، لیکن میں جوان آدمی تھا باہر نکلتا اور چلتا پھرتا تھا اور نماز میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور بازاروں میں پھرتا تھا مگر نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا نہ میرے سلام کا جواب دیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں نماز کے بعد حاضر ہوتا اور سلام کرتا تو یہ دیکھا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک کو جواب سلام کیلئے حرکت ہوئی یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا تو نظر چرا کر آپ کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو آپ میری طرف دیکھتے ہیں اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو رُخ پھیر لیتے ہیں۔

جب لوگوں کی یہ بے رخی دراز ہوئی تو ایک روز میں اپنے چچا زاد بھائی ابو قتادہؓ کے پاس گیا جو میرے سب سے زیادہ دوست تھے میں ان کے باغ میں دیوار پھاند کر داخل ہوا اور ان کو سلام کیا، خدا کی قسم! انھوں نے بھی میرے سلام کا جواب نہ دیا، میں نے پوچھا ابو قتادہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں، اس پر بھی ابو قتادہ نے سکوت کیا کوئی جواب نہیں دیا، جب میں نے بار بار یہ سوال دہرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اللہ جانتا ہے اور اس کا رسول ہی، میں رو پڑا اور اسی طرح دیوار پھاند کر باغ سے باہر آگیا، اسی زمانہ میں ایک روز میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ اچانک ملک شام کا ایک نبطی شخص جو غلہ فروخت کرنے کیلئے شام سے مدینہ میں آیا تھا اس کو دیکھا کہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا سکتا ہے؟ لوگوں نے مجھے دیکھ کر میری طرف اشارہ کیا وہ آدمی میرے پاس آگیا اور مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو ایک ریشمی رومال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے نبی نے آپ سے بے وفائی کی اور آپکو دور کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں ذلت اور ہلاکت کی جگہ میں نہیں رکھا ہے، تم اگر ہمارے یہاں آنا پسند کرو تو آجاؤ ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ ایک اور امتحان اور آزمائش آئی کہ اہل کفر کو مجھ سے اس کی طمع اور توقع ہو گئی (کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں) میں یہ خط لے کر آگے بڑھا ایک دکان پر تنور لگا ہوا تھا اس میں جھونک دیا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب پچاس میں سے چالیس راتیں گذر چکی تھیں تو اچانک دیکھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قاصد خزیمہ بن ثابت میرے پاس آئے ہیں اور یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنی بیوی سے بھی علیحدگی اختیار کرو، میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دیدوں؟ انھوں نے بتلایا کہ نہیں عملاً اس سے الگ رہو قریب نہ جاؤ، اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا، میں نے بیوی سے کہدیا کہ تم اپنے میکہ میں چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

ہلال بن امیہؓ کی اہلیہ خولہ بنت عاصم یہ حکم سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہلال بن امیہؓ ایک بڑھے ضعیف آدمی ہیں اور کوئی ان کا خادم نہیں، ابن ابی شیبہؒ کی روایت یہ بھی ہے کہ وہ ضعیف البصر بھی ہیں کیا آپ یہ پسند نہیں فرمائیں گے کہ میں انکی خدمت کرتی رہوں، فرمایا کہ خدمت کرنیکی ممانعت نہیں البتہ وہ تمہارے پاس نہ جائیں، انھوں نے عرض کیا کہ وہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ایسے ہوگئے ہیں کہ انہیں کوئی حرکت ہی نہیں، اور واللہ ان پر تو مسلسل گریہ طاری ہے رات دن روتے رہتے ہیں۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں مجھے بھی میرے بعض متعلقین نے مشورہ دیا کہ تم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیوی کو ساتھ رکھنے کی اجازت لیلو جیسے آپ نے ہلال کو اجازت دیدی ہے، میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کروں گا معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیں، اس کے علاوہ میں جوان آدمی ہوں بیوی کو ساتھ رکھنا احتیاط کے خلاف ہے، چنانچہ اسی حال پر میں نے دس راتیں اور گذاریں یہاں تک کہ پچاس راتیں مکمل ہوگئیں، مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری توبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تہائی رات گذرنے کے وقت نازل ہوئی، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ جو اس وقت حاضر تھیں انھوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالکؓ کو اسی وقت اس کی خبر کردی جائے، آپ نے فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہو جائیگا، رات کی نیند مشکل ہو جائے گی۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ پچاسویں رات کے بعد صبح کی نماز پڑھکر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے کہ مجھ پر میری جان اور زمین باوجود وسعت کے تنگ ہوچکی تھی اچانک میں نے سلع پہاڑ کے اوپر سے کسی چیخنے والے آدمی کی آواز سنی جو بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ اے کعب بن مالکؓ بشارت ہو۔

محمد بن عمرو کی روایت میں ہے کہ یہ بلند آواز سے کہنے والے ابوبکرؓ تھے جنھوں نے جبل سلع پر چڑھکر یہ آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے کعبؓ کی توبہ قبول فرمالی بشارت ہو، اور عقبہ کی روایت میں یہ ہے کہ یہ خوشخبری حضرت کعبؓ کو سنانے کے لئے دو آدمی دوڑے ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا تو جو پیچھے رہ گیا تھا اس نے یہ کیا کہ سلع پہاڑ پر چڑھکر آواز دیدی اور کہا جاتا ہے کہ یہ دوڑنے والے دو بزرگ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سنکر میں سجدے میں گر گیا اور انتہائی فرحت سے رونے لگا، اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اب کشادگی آگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونے کی خبر دی تھی اب سب طرف سے لوگ ہم تینوں کو مبارکباد دینے کیلئے دوڑ پڑے، بعض لوگ گھوڑے پر سوار ہوکر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی آواز سب سے پہلے پہونچ گئی۔

یا قبیلہ کے جہاد کے لئے جا رہے ہیں، اسی کو آپ نے فرمایا اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ یعنی جنگ میں دھوکہ دینا جائز ہے، اس سے بعض لوگ اس مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ جنگ و جہاد میں جھوٹ بول کر مخالف کو دھوکہ دینا جائز ہے، یہ صحیح نہیں بلکہ مراد اس دھوکہ سے یہ ہے کہ اپنا عمل ایسا کرے جس سے مخالف دھوکہ میں پڑ جائیں، جیسے جہاد کیلئے مخالف سمت سے نکلنا، صریح جھوٹ بول کر دھوکہ دینا مراد نہیں وہ جنگ میں بھی جائز نہیں، اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عملی دھوکہ جسکو جائز قرار دیا ہے اس کو کوئی تعلق عہد و معاہدہ سے نہیں، وہ عہد شکنی صلح ہو یا جنگ کسی حال میں جائز نہیں۔

۲۔ سفر کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعرات کا دن پسند تھا، خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسری ضرورت کا۔

۳۔ اپنے کسی بزرگ، مرشد یا استاد و باپ کو راضی کرنے کیلئے جھوٹ بولنا جائز بھی نہیں اور اس کا انجام بھی اچھا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حقیقت حال کا علم بذریعہ وحی ہو جاتا تھا، اس لئے جھوٹ بولنے کا انجام برا تھا جیسا کہ کعب بن مالکؓ اور دوسرے متخلفین کے واقعہ مذکورہ سے واضح ہوا، آپ کے بعد دوسرے بزرگوں کو وحی تو ہو نہیں سکتی الہام و کشف سے علم ہو جانا بھی ضروری نہیں، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ جھوٹ بولنے کی ایک نحوست ہوتی ہے کہ قدرتی طور پر ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ بالآخر یہ بزرگ اس سے ناراض ہو ہی جاتا ہے۔

۴۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام کلام قطع کر دینے کا حکم دیدے جیسے اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

۵۔ اس واقعہ سے صحابہ کرام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس ناراضی اور مقاطعہ سلام و کلام کے زمانہ میں بھی غایت محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری بھی نہیں چھوڑی اور کن انکھیوں سے دیکھ کر آپ کی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

۶۔ کعب بن مالکؓ کے گہرے دوست قتادہؓ کا معاملہ، کہ انکے سلام کا جواب نہ دیا اور کوئی کلام نہ کیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض سے نہیں بلکہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نافذ کیا ہوا قانون صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی در حضور غائب کسی حال میں اسکے خلاف نہ کرتے تھے اگرچہ انہیں کسی بڑے سے بڑے دوست عزیز بیٹے باپ ہو

۷۔ حضرت کعبؓ کے پاس بادشاہ غسان کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ سے صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے مقاطعہ سے سخت پریشان ہونے کے عالم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی میلان پیدا نہیں ہوا۔

۸۔ قبول توبہ نازل ہونے کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور عام صحابہ کرامؓ کا کعب بن مالکؓ کو بشارت دینے کیلئے دوڑنا، اور اس سے پہلے سب کا سلام و کلام تک سے سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقاطعہ کے زمانے میں بھی ان سب کے دلوں میں حضرت کعبؓ سے محبت اور تعلق تھا، مگر حکم رسولؐ کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب آیت توبہ نازل ہوئی تو ان کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمیشہ کیلئے) مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہئے کہ (جہاد کیلئے) سب کے سب ہی نکل کھڑے ہوں (کہ اس میں دوسری اسلامی ضروریات معطل ہوتی ہیں) سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور کچھ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تاکہ (یہ) باقیماندہ لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آپ سے اور آپ کے بعد علماء شہر سے) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہوئے ہیں) جبکہ وہ ان کے پاس واپس آویں (دین کی باتیں سنا کر خدا کی نافرمانی سے) ڈراویں تاکہ وہ (ان سے دین کی باتیں سن کر برے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ میں بڑی اہمیت کیساتھ غزوۂ تبوک کا ذکر مسلسل چلا آیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفیر عام کا اعلان کیا گیا تھا کہ سب مسلمان اس میں شریک ہوں، اس حکم کی خلاف ورزی بلا عذر صحیح جائز نہ تھی، جو لوگ خلاف ورزی میں مبتلا ہوئے انہیں زیادہ تو منافقین تھے جن کا ذکر بہت سی آیات میں اوپر آیا ہے، کچھ مخلص مؤمن بھی تھے جو وقتی کاہلی اور سستی کے سبب رہ گئے تھے، ان کی توبہ حق تعالیٰ نے قبول فرمالی، ان سب واقعات سے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر جہاد و غزوہ میں سب مسلمانوں کو نکلنا فرض اور ترک کرنا حرام ہے، حالانکہ حکم شرعی یہ نہیں بلکہ جہاد عام حالات میں فرض کفایہ ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کی کچھ جماعت جو جہاد کے لئے کافی ہو جہاد میں مشغول رہے تو باقی مسلمان بھی فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، ہاں اگر جہاد میں شریک ہونے والی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی تقویت کے لئے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان سے متصل ہونے والوں پر یہاں تک کہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جس سے تخلف کرنا حرام ہے، اسی طرح فرض عین ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نفیر عام کرے، اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلف حرام ہو جاتا ہے جیسا واقعہ غزوۂ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے پیش آیا، مذکور الصدر آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوۂ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو، کیونکہ جہاد کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور ضروریات بھی ہیں جو جہاد ہی کی طرح فرض کفایہ ہیں ان کے لئے بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تقسیم کار کے اصول پر کام کرنا ہے، اس لئے سب مسلمانوں کو ہر جہاد میں نکلنا نہیں چاہئے۔ اسی سے فرض کفایہ کی حقیقت بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو کام شخصی نہیں اجتماعی ہیں اور سب مسلمانوں پر ان کے پورا کرنے کی ذمہ داری ہے، ان کو شریعت میں فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے، تاکہ تقسیم کار کے اصول

دوسرے وہ علم جس سے اس کے بعد بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں، مثلاً شاگرد عالم ہوگئے، ان سے آگے لوگوں کو علم دین سکھانے کا سلسلہ چلتا رہا، یا کوئی کتاب تصنیف کی جس سے اس کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے، تیسرے اولاد صالح جو اس کیلئے دعاء اور ایصال ثواب کرتی رہے (از قرطبی)

علم دین کے فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل

ابن عدی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (از مظہری)

"یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر"، یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں علم سے مراد علم دین ہی ہے، دنیوی علوم و فنون اگرچہ دنیا کے کاروبار کی طرح انسان کے لئے ضروری ہیں مگر ان کے وہ فضائل نہیں جو احادیث مذکورہ میں آئے ہیں، پھر علم دین ایک علم نہیں بہت سے علوم پر مشتمل ایک جامع نظام ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس پر قادر نہیں کہ ان سب علوم کو پورا حاصل کرسکے، اس لئے حدیث مذکور میں جو ہر مسلمان پر فرض فرمایا ہے اس سے مراد علم دین کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ فرائض ادا کرسکتا ہے نہ حرام چیزوں سے بچ سکتا ہے، جو ایمان و اسلام کیلئے ضروری ہے، باقی علوم کی تفصیلات قرآن و حدیث کے تمام معارف و مسائل پھر قرآن سے نکالے ہوئے احکام و شرائع کی پوری تفصیل یہ نہ ہر مسلمان کی قدرت میں ہے نہ ہر ایک پر فرض عین ہے، البتہ پورے عالم اسلام کے ذمہ فرض کفایہ ہے، ہر شہر میں ایک عالم ان تمام علوم و شرائع کا ماہر موجود ہو تو باقی مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، اور جس شہر یا قصبہ میں ایک بھی عالم نہ ہو تو شہر والوں پر فرض ہے کہ اپنے میں سے کسی کو عالم بنائیں یا باہر سے کسی عالم کو بلا کر اپنے شہر میں رکھیں، کہ ضرورت پیش آنے پر باریک مسائل کو اس عالم سے فتویٰ لے کر سمجھ سکیں، اور عمل کرسکیں، اس لئے علم دین میں فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل یہ ہے کہ:-

فرض عین | ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائد صحیحہ کا علم حاصل کرے اور طہارت نجاست کے احکام سیکھے، نماز، روزہ اور تمام عبادات جو شریعت نے فرض و واجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے، جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرے، جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے مسائل و احکام معلوم کرے، جس کو حج پر قدرت ہو اس کیلئے فرض عین ہے کہ حج کے احکام و مسائل معلوم کرے، جس کو بیع و شراء کرنا پڑے یا تجارت و صنعت یا مزدوری و اجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرض عین ہے کہ بیع و اجارہ وغیرہ کے مسائل و احکام سیکھے، جب نکاح کرے تو نکاح کے احکام و مسائل اور طلاق کے احکام و مسائل معلوم کرے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض و واجب کئے ہیں ان کے احکام و مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

علم تصوف بھی فرض عین میں داخل ہے

احکام ظاہرہ نماز روزے کو تو سبھی جانتے ہیں کہ فرض عین ہیں اور ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض عین ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے

تفسیر مظہری میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اعمال باطنہ اور محرمات باطنہ کا علم جس کو عرف میں علم تصوف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرض عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرض عین ہے۔

آجکل جس کو علم تصوف کہا جاتا ہے وہ بھی بہت سے علوم و معارف اور مکاشفات و واردات کا مجموعہ بن گیا ہے، اس جگہ فرض عین سے مراد اس کا صرف وہ حصہ ہے جس میں اعمال باطنہ فرض و واجب کی تفصیل ہے، مثلاً عقائد صحیحہ جن کا تعلق باطن سے ہے یا صبر، شکر، توکل، قناعت وغیرہ ایک خاص درجے میں فرض ہیں، یا غرور و تکبر، حسد و بغض، بخل، حرص دنیا وغیرہ جو از روئے قرآن و سنت حرام ہیں، ان کی حقیقت اور ان کے حاصل کرنے یا حرام چیزوں سے بچنے کے طریقے معلوم کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، علم تصوف کی اصل بنیاد اتنی ہی ہے جو فرض عین ہے۔

فرض کفایہ پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا، تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن و سنت سے جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا، یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کرکے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں، اس لئے شریعت نے اس علم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، کہ بقدر ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

علم دین کا نصاب قرآن حکیم نے اس جگہ علم دین کی حقیقت اور اس کا نصاب بھی ایک ہی لفظ میں بتلا دیا ہے، وہ ہے لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ، یہ موقع بظاہر اس کا تھا کہ یہاں يَتَعَلَّمُوْنَ الدِّيْنَ کہا جاتا، یعنی علم دین حاصل کریں، مگر قرآن نے اس جگہ تعلّم کا لفظ چھوڑ کر تفقّہ کا لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ علم دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں، وہ تو بہت سے کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں، اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے، بلکہ علم دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے، یہی لفظ تفقّہ کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے، فقہ کے معنی سمجھ بوجھ کے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے لِيَفْقَهُوا الدِّيْنَ "یعنی تاکہ دین کو سمجھ لیں" نہیں فرمایا، بلکہ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ فرمایا، جو باب تفعّل سے ہے، اس کے معنی میں محنت و مشقت کا مفہوم شامل ہے، مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت و مشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں، یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت، نجاست یا نماز روزے، زکوٰۃ و حج کے مسائل معلوم کرلے، بلکہ دین کی سمجھ بوجھ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون کا آخرت میں اس سے حساب لیا جائے گا، اس کو اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے، دراصل اسی فکر کا نام دین کی سمجھ بوجھ ہے، اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ "انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لئے ضروری ہے" اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لئے ضروری ہے، آجکل جو علم فقہ مسائل جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے، قرآن و سنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس رہتے ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہئے (یعنی جہاد کے وقت بھی مضبوط رہنا چاہئے اور ویسے بھی غیر زمانہ صلح میں ان سے ڈھیلے پن نہ برتنا چاہئے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی امداد متقی لوگوں کے ساتھ ہے (پس ان سے ڈرو مت) اور جب کوئی سورت (جدید) نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین (غرباء مسلمین سے بطور تمسخر) کہتے ہیں کہ (کہو) اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی، آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جواب چاہتے ہو، سو (سنو) جو لوگ ایمان دار ہیں اس سورت نے ان کے (تو) ایمان میں ترقی دی ہے اور وہ (اس ترقی کے ادراک سے) خوش ہو رہے ہیں (مگر چونکہ وہ امر قلبی ہے اور تم کو نصیب نہیں اس لئے اس کا ادراک بھی نصیب نہیں اور تمسخر کرتے ہو) اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) آزار ہے اس سورت نے ان میں ان کی (پہلی) گندگی کے ساتھ اور (نئی) گندگی بڑھا دی (کیونکہ پہلے ایک حصہ قرآن کا منکر تھا اب اس جدید حصہ کا انکار مزید ہوا) اور وہ حالت کفر ہی میں مر گئے (یعنی جو ان میں مر چکے ہیں وہ کافر مرے اور جو اسی اصرار پر رہیں گے وہ کافر مریں گے، حاصل جواب یہ ہوا کہ قرآن میں ایمان کو ترقی دینے کی بیشک خاصیت ہے بشرطیکہ محل میں قابلیت بھی تو ہو اور اگر پہلے سے خباثت مستحکم ہو تو اور بھی اس کو ترقی کا موجب ہو جائے گا "در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس"، اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں (مگر) پھر بھی (اپنی حرکات شنیعہ سے) باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں (جس سے باز آنے کی آئندہ امید ہو، یعنی ان حوادث سے ان کو عبرت پکڑنا اور عبرت پکڑ کر اپنی اصلاح کر لینا چاہئے تھا، یہ تو ان کے تمسخر کا بیان ہوا جو کہ مجالس میں کرتے تھے، آگے تنفر کا بیان ہے جو مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان سے صادر ہوتا تھا، چنانچہ ارشاد ہے) اور جب کوئی سورت (جدید) نازل کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں (اور اشارہ سے باتیں کرتے ہیں) کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھتا تو نہیں (کہ اٹھتے ہو دیکھ لے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا لگا دے) پھر (اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کر کے وہاں سے اٹھ کر) چل دیتے ہیں (یہ لوگ مسجد نبوی سے کیا پھرے) خدا تعالیٰ نے ان کا دل (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں جہاد کی ترغیب تھی، آیت مذکورہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوْا الخ میں یہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کفار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے جہاد و قتال میں ترتیب

کیا ہونا چاہئے، اس آیت میں ارشاد یہ ہے کہ کفار میں سے جو لوگ تم سے قریب ہوں پہلے جہاد ان سے کیا جائے، قریب ہونا مقام کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ جائے سکونت کے قریب رہنے والے کفار ہیں وہ جہاد میں مقدم کئے جاویں، اور رشتہ نسب اور تعلقات کے اعتبار سے بھی جو قریب ہوں وہ دوسروں سے مقدم کئے جاویں کیونکہ اسلامی جہاد درحقیقت انہی کی خیر خواہی کے تقاضہ سے ہے، اور خیر خواہی و ہمدردی میں رشتہ دار و تعلقات والے مقدم ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی اپنے قریبی عزیزوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعمیل فرمائی، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے کلمہ حق پہونچایا، اسی طرح مقامی قرب و بعد کا اعتبار کر کے مدینہ کے قرب و جوار کے کفار بنو قریظہ، بنو نضیر، اہل خیبر کو دوسروں پر مقدم کیا گیا، اس کے بعد باقی عرب سے قتال ہوا، اس سے فارغ ہونے کے بعد سب سے آخر میں کفار روم سے قتال کا حکم ہوا جس کے نتیجہ میں غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً، غلظت کے معنی شدت و قوت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ کفار کے ساتھ برتاؤ میں ایسی صورت اختیار کرو کہ وہ کسی حیثیت سے تمہاری کمزوری محسوس نہ کریں، فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کی تلاوت اور ان میں غور و فکر اور مقتضیٰ پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے، یہ زیادتی نور ایمان اور حلاوت ایمان کی ہوتی ہے، جس کا ثمرہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ و رسول کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے، عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے، گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے کلفت محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایمان جب قلب میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ جیسا ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ سارا قلب نورانی ہو جاتا ہے، اسی طرح کفر و نفاق شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح قلب پر لگتا ہے، پھر جوں جوں معاصی کا ارتکاب اور کفر کی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے (مظہری)

اسی لئے صحابہ کرام ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ دیر مل کر بیٹھو، دین اور آخرت کی باتوں کا **مذاکرہ کرو تاکہ ہمارا ایمان بڑھے۔**

يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ، اس میں منافقین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے نفاق اور عہد شکنی وغیرہ معاصی کی وجہ سے ہر سال مختلف قسم کی مصیبتوں میں کبھی ایک بار کبھی دو بار مبتلا ہوتے رہتے ہیں، کبھی ان کے دوست کفار مغلوب ہو گئے، کبھی ان کے نفاق کی باتیں کھل گئیں، اس سے پریشانی میں مبتلا رہے، یہاں ایک دو کا عدد خاص مراد نہیں، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، کہ ان چیزوں کو دیکھ کر بھی انھیں عبرت نہیں ہوتی۔

———— ———— ————

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے

عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ

تمہاری بھلائی پر ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے، پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے

حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾

کافی ہے مجھ کو اللہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا

١٦ ع ٧ ٥

خلاصۂ تفسیر

(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی ضرر نہ پہنچے) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے پھر بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ (تو) بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (ایسے رسول سے مستفید نہ ہونا بڑی محرومی ہے) پھر اگر (اس پر بھی آپ کو رسول ماننے سے اور آپ کے اتباع کرنے سے) روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے (میرا کیا نقصان ہے) (تو) میرے لئے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ و ناصر) کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں (پس معبودیت اس کے ساتھ مختص ہے تو لامحالہ دوسرے کمالات علم و قدرت اس میں کامل ہونگے پھر مجھ کو کسی کی مخالفت سے کیا اندیشہ) میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے (تو اور چیزیں تو بدرجہ اولیٰ اس کی مملوک ہوں گی، پس اس پر بھروسہ کرنے کے بعد مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں البتہ تم اپنی فکر کرو حق کا انکار کر کے کہاں رہو گے)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ توبہ کی آخری آیتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری خلق خدا پر خصوصاً مسلمانوں پر حد سے زیادہ مہربان اور شفیق و ہمدرد ہونا بیان فرمایا ہے اور آخری آیت میں آپ کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود اگر پھر بھی کچھ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔

سورۂ توبہ کے آخر میں یہ مضمون اس لئے مناسب ہوا کہ پوری سورت میں کفار سے برأت، قطع تعلق، قتال و جہاد کا ذکر تھا جو دعوت الی اللہ کی آخری صورت ہے جبکہ زبانی دعوت و تبلیغ سے اصلاح کی توقع نہ رہے، لیکن اصل کام انبیاء علیہم السلام کا یہی ہے کہ شفقت و رحمت اور ہمدردی و

خیرخواہی کے جذبے سے خلق خدا کو خدا کی طرف آنے کی دعوت دیں، اور ان کی طرف سے اعراض یا کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کو اللہ کے سپرد کردیں اس پر توکل کریں، کیونکہ وہ رب العرش العظیم ہے، یہاں عرشِ عظیم کا رب کہہ کر یہ بتلانا منظور ہے کہ وہ کُل کائناتِ عالم پر محیط ہے۔

آخری دو آیتیں حضرت ابی بن کعبؓ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، یہی قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ (قرطبی)

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح و شام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرما دیتے ہیں (قرطبی) واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ لِتَكْمِيْلِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى وَالْطُفْ بِنَا فِيْ تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ فَاِنَّ تَيْسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ ؕ

سُورۂ توبہ تمام شد

سورۂ یونس علیہ السلام

سُوْرَةُ یُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعُ اٰيٰتٍ وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس کی ایک سو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی

اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

ہم نے ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو

اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا

کہ ان کے لئے پایہ سچا ہے اپنے رب کے یہاں کہنے لگے منکر بیشک یہ تو

لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ② اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

جادوگر ہے صریح تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور

الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ

زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا ہے کام کی

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ

کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ

کیا تم دھیان نہیں کرتے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو وعدہ ہے اللہ کا سچا وہی

يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

پیدا کرتا ہے اول بار پھر دوبارہ کرے گا اس کو تاکہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے اور کئے تھے

الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ

کام نیک انصاف کے ساتھ اور جو کافر ہوئے ان کو پینے کو کھولتا پانی

مَعَارف و مَسَائِل

سورۂ یونس مکی سورتوں میں سے ہے، بعض حضرات نے اس کی صرف تین آیتوں کو مدنی کہا ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

اس سورت میں بھی قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو کائنات عالم اور اس میں ہونے والے تغیرات و مشاہدات سے استدلال کرکے ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کے ساتھ کچھ عبرت خیز تاریخی واقعات و قصص کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو حق تعالیٰ کی ان کھلی نشانیوں پر نظر نہیں کرتے، اور اسی کے ضمن میں شرک کا ابطال اور اس سے متعلق بعض شبہات کا جواب ارشاد ہوا ہے، یہ خلاصہ مضامین سورت کا۔ سورت کے ان مضامین پر غور کرنے سے یہ بھی بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ پچھلی سورت یعنی توبہ اور اس سورت میں باہمی کیا ربط ہے، سورۂ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے منکرین و کفار کے ساتھ جہاد اور ان کی شوکت کو مادی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ احکام جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو مکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل و براہین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

الۗرٰ، یہ حروف مقطعہ کہلاتے ہیں جو قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، الۗمّۗ، حٰمۗ، حٰمۗ عۗسۗقۗ وغیرہ، ان کے معانی کی تحقیق میں مفسرین کی بحثیں طویل ہیں، صحابہ و تابعین اور جمہور سلف کی تحقیق اس قسم کے تمام حروف مقطعہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ خاص رموز ہیں ان کے معنی غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائے گئے ہیں، مگر آپ نے عام امت کو صرف ان علوم و معارف سے آگاہ فرمایا جن کو ان کے ذہن برداشت کرسکیں اور جن کے معلوم نہ ہونے سے امت کے کاموں میں کوئی حرج واقع ہوتا ہے، حروف مقطعہ کے رموز ایسے نہیں جن پر امت کا کوئی کام موقوف ہو، یا ان کے نہ جاننے سے ان کا کوئی حرج ہو، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے معانی کو امت کے لئے غیر ضروری سمجھ کر بیان نہیں فرمایا اس لئے ہمیں بھی اس کی تفتیش میں نہ پڑنا چاہئے، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر ان کے معانی جاننے میں ہماری کوئی مصلحت ہوتی تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بیان کرنے میں کوتاہی نہ فرماتے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ میں لفظ تِلْكَ سے اشارہ اس سورت کی آیات کی طرف

ہے جن کا ذکر آگے آتا ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے اس کی صفت اس جگہ حکیم کے لفظ سے بیان فرمائی ہے جس کے معنی اس جگہ حکمت والی کتاب کے ہیں۔

دوسری آیت میں مشرکین کے ایک شبہ اور اعتراض کا جواب ہے، شبہ کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جہالت سے یہ قرار دے رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول یا پیغمبر آئے وہ بشر یعنی انسان نہیں ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہونا چاہئے، قرآن کریم نے ان کے اس لغو خیال کا جواب کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا ہے، ایک آیت میں ارشاد فرمایا قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا یعنی اگر زمین پر بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم ان کے لئے رسول بھی کسی فرشتہ ہی کو بناتے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسالت کا مقصد بغیر اس کے پورا نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے ان لوگوں میں اور اس رسول میں باہمی مناسبت ہو، فرشتوں کی مناسبت فرشتوں سے اور انسان کی انسان سے ہوتی ہے، جب انسانوں کے لئے رسول بھیجنا مقصد ہے تو کسی بشر ہی کو رسول بنانا چاہئے۔

اس آیت میں ایک دوسرے عنوان سے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا اس بات پر تعجب کرنا کہ بشر کو کیوں رسول بنایا گیا اور اس کو نافرمان انسانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور فرماں برداروں کو اس کے ثواب کی خوشخبری سنانے کا کام کیوں سپرد کیا گیا، یہ تعجب خود قابل تعجب ہے کیونکہ جنس بشر کی طرف بشر کو رسول بناکر بھیجنا عین مقتضائے عقل ہے۔

اس آیت میں ایمان والوں کو خوشخبری ان الفاظ میں دی گئی اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ، اس لفظ قدم کے اصلی معنی تو وہی ہیں جو اردو میں سمجھے جاتے ہیں یعنی پاؤں، چونکہ انسان کی سعی و عمل اور اس کے سبب ترقی کا ذریعہ قدم ہوتا ہے، اس لئے مجازاً بلند مرتبہ کو قدم کہہ دیا جاتا ہے، اور لفظ قدم کی اضافت صِدق کی طرف کرکے یہ بتلا دیا کہ یہ بلند مرتبہ جو ان کو ملنے والا ہے وہ حق اور یقینی بھی ہے اور قائم و باقی رہنے والا لازوال بھی، دنیا کے منصبوں اور عہدوں کی طرح نہیں کہ کسی عمل کے نتیجہ میں اول تو ان کا حاصل ہونا ہی یقینی نہیں ہوتا اور حاصل بھی ہو جاتے تو ان کا باقی رہنا یقینی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا فانی اور زائل ہونا یقینی ہے کبھی تو زندگی ہی میں زائل ہو جاتا ہے اور موت کے وقت تو دنیا کے ہر منصب و عہدہ اور دولت و نعمت سے انسان خالی ہاتھ ہو جاتا ہے، غرض لفظ صدق کے مفہوم میں اس کا یقینی ہونا بھی شامل ہے اور کامل مکمل

لازوال ہونا بھی، اس لئے معنی جملہ کے یہ ہوئے کہ ایمان والوں کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑا درجہ ہے جو یقینی ملے گا اور لازوال دولت ہوگی۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ صدق لانے میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت کے یہ درجات عالیہ صرف صدق و سچائی اور اخلاص ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں نرا زبانی جمع خرچ و صرف زبان سے کلمۂ ایمان پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دل اور زبان دونوں سے سچائی کے ساتھ ایمان اختیار نہ کر لیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی پابندی اور برے اعمال سے پرہیز ہے۔

تیسری آیت میں توحید کو اس ناقابل انکار حقیقت کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے میں اور پھر پورے عالم کے کاموں کی تدبیر کرنے اور چلانے میں جب اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں تو پھر عبادت و طاعت میں کوئی دوسرا کیسے شریک ہو سکتا ہے، بلکہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنا بڑی بے انصافی اور ظلم عظیم ہے۔

اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا ہے، لیکن ہمارے عرف میں دن اس وقت کو کہا جاتا ہے جو آفتاب کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آسمان و زمین اور ستاروں کے پیدا ہونے سے پہلے آفتاب ہی کا وجود نہیں تو طلوع و غروب کا حساب کیسے ہو اس لئے مراد یہاں وہ مقدار وقت ہے جو آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان اس جہان میں ہونے والی تھی۔

چھ دن کے تھوڑے سے وقت میں اتنے بڑے جہان کو جو آسمانوں اور زمین اور سیارات اور تمام کائنات عالم پر مشتمل ہے، بنا کر تیار کر دینا اسی ذات قدوس کا مقام ہے جو قادر مطلق ہے اس کی تخلیق کے لئے نہ پہلے سے خام مواد کا موجود ہونا ضروری ہے اور نہ بنانے کے لئے کسی عملہ اور خدم کی ضرورت ہے بلکہ اس کی قدرت کاملہ کا یہ مقام ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہیں تو بغیر کسی سامان اور کسی کی امداد کے ایک آن میں پیدا فرما دیں، یہ چھ دن کی مہلت بھی خاص حکمت و مصلحت کی بناء پر اختیار کی گئی ہے ورنہ ان کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ تمام آسمان و زمین اور اس کی کائنات کو ایک آن میں پیدا فرما دیتے۔

اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی پھر قائم ہوا عرش پر۔ اتنی بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ عرش رحمن کوئی ایسی مخلوق ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم پر محیط ہے سارا جہان اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں، جو انسان اپنی سائنس کی انتہائی ترقی کے زمانہ

اس کی چال کے لئے منزلیں مقرر کیں کہ ہر روز ایک منزل قطع کرتا ہے تاکہ (تم) ان اجرام کے ذریعہ سے، تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں، وہ یہ دلائل ان لوگوں کو صاف صاف بتلا رہے ہیں جو دانش رکھتے ہیں، بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان سب میں ان لوگوں کے واسطے توحید کے دلائل ہیں جو خدا کا ڈر مانتے ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں کائنات عالم کی بہت سی نشانیاں مذکور ہیں جو اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر شاہد اور اس کے دلائل ہیں کہ رب العزت اس پر پوری طرح قادر ہے کہ اس عالم کو فنا کرنے اور ذرہ ذرہ کر دینے کے بعد پھر ان ذرات کو جمع کر دے اور ازسرنو ان سب کو زندہ کر دے اور حساب وکتاب کے بعد جزاء و سزا کا قانون نافذ کر دے اور یہ کہ یہی عقل و حکمت کا مقتضی ہے، اس طرح یہ آیتیں اس اجمال کی تفصیل ہیں جو گزشتہ تیسری آیت میں آسمان و زمین کی چھ دن میں پیدائش اور پھر استواء علی العرش کے بعد یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اس نے عالم کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہر وقت ہر آن میں ہر چیز کا نظام و انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی نظام و انتظام کا ایک جزء یہ ہے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا

ضیاء اور نور دونوں کے معنی چمک اور روشنی کے ہیں اسی لئے بہت سے ائمہ لغت نے ان دونوں لفظوں کو مرادف کہا ہے، علامہ زمخشری اور طیبی وغیرہ نے فرمایا اگرچہ روشنی کے معنی ان دونوں لفظوں میں مشترک ہیں مگر لفظ نور عام ہے، ہر قوی وضعیف ہلکی اور تیز روشنی کو نور کہا جاتا ہے اور ضوء و ضیاء قوی اور تیز روشنی کو کہتے ہیں، انسان کو دونوں قسم کی روشنیوں کی ضرورت پڑتی ہے، عام کاروبار کے لئے دن کی تیز روشنی درکار ہے اور معمولی کاموں کے لئے رات کی ہلکی روشنی محبوب ہے، اگر دن کو بھی صرف چاند کی ہلکی روشنی رہے تو کاروبار میں خلل آئے اور رات کو بھی آفتاب چمکتا رہے تو نیند اور رات کے مناسب کاموں میں خلل آئے، اس لئے قدرت نے دونوں طرح کی روشنی کا انتظام اس طرح فرمایا کہ آفتاب کی روشنی کو ضوء و ضیاء کا درجہ دیا اور کاروبار کے وقت اس کا ظہور فرمایا اور چاندنی کی روشنی کو ہلکی اور دھیمی روشنی بنایا اور رات کو اس کا محل ظہور بنایا۔

قرآن کریم نے شمس و قمر کی روشنیوں میں فرق و امتیاز کو متعدد جگہ مختلف عنوانات سے

بیان فرمایا ہے، سورۂ نوح میں ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا، سورۂ فرقان میں فرمایا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا، سراج کے معنی چراغ کے ہیں اور چونکہ چراغ کا نور ذاتی ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے حاصل کردہ نہیں ہوتا اس لئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ضیاء کسی چیز کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس کو جو دوسرے سے مستفاد اور حاصل کردہ ہو، مگر یہ قول یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے ورنہ لغت میں اس کی کوئی اصل نہیں، اور قرآن کریم نے بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔

زجاج نے لفظ ضیاء کو ضوء کی جمع قرار دیا ہے، اس کی رو سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس قزح میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (منار)

نظام شمس و قمر میں آیات قدرت کا ایک دوسرا مظاہرہ یہ ہے وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ، قَدَّرَ لفظ تقدیر سے بنا ہے، تقدیر کے معنی کسی چیز کو زمانہ یا مکان یا صفات کے اعتبار سے ایک مخصوص مقدار اور پیمانہ پر رکھنے کے ہیں، رات اور دن کے اوقات کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، مکانی فاصلے اور مسافت کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لئے دوسری جگہ ملک شام اور سبا کی درمیانی بستیوں کے متعلق فرمایا وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ، اور عام مقادیر کے متعلق فرمایا وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔

لفظ مَنَازِلَ مَنْزِل کی جمع ہے جس کے اصل معنی جائے نزول کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے شمس و قمر دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے، چاند چونکہ اپنا دورہ ہر مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا انتیس ہوتی ہیں مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لئے عموماً چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہل ہیئت و ریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں، قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس و قمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں قَدَّرَهُ مَنَازِلَ بضمیر مفرد استعمال کیا ہے، حالانکہ منزلیں شمس و قمر دونوں کی ہیں، اس لئے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ ذکر مفرد کا ہے مگر مراد ہر ہر واحد کے

فائدہ کے لئے بنایا اور ایک محکم نظام کا پابند کیا، اُس سے یہ ممکن نہیں کہ اس مخدوم کائنات کو اس نے بے فائدہ محض کھانے پینے کے لئے پیدا کیا ہو، اس کے ذمہ کچھ فرائض نہ لگائے ہوں، اور جب یہ لازم ہوا کہ اس مخدوم کائنات پر بھی کچھ پابندیاں ہونا ضروری ہے تو یہ بھی لازم ہوا کہ ان پابندیوں کو پورا کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کا کبھی کہیں حساب ہو، پورا کرنے والوں کو اچھا بدلہ ملے اور نہ کرنے والوں کو سزا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں تو جزاء و سزا کا یہ دستور نہیں، یہاں تو مجرم بسا اوقات متقی پارسا سے زیادہ اچھی زندگی گذارتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حساب اور جزاء و سزا کا کوئی دن مقرر ہو، اسی کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا
البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن

بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴿٧﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ
ہوگئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں، ایسوں کا ٹھکانا ہے آگ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
بدلہ اس کا جو کماتے تھے، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے

يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي
ہدایت کرے گا ان کو رب ان کا ان کے ایمان سے، بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں

جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٩﴾ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ
باغوں میں آرام کے، ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ اور ملاقات ان کی

فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾ ع ۲
سلام، اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار ہے سارے جہان کا۔

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے جو بعث پر دلالت کرتی ہیں، بالکل غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے ان اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے اور یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کا رب ان کو بوجہ ان کے مؤمن ہونے کے ان کے مقصد یعنی جنت،

تک پہنچا دے گا، ان کے مسکن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی چین کے باغوں میں (اور جس وقت وہ جنت میں جاویں گے اور عجائبات کا دفعۃً معائنہ کریں گے تو اس وقت) ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور پھر جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ان کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم اور جب اطمینان سے وہاں جا بیٹھیں گے اور اپنے پرانے مصائب اور متاعب اور اس وقت کے غیر مکدر دائمی عیش کا موازنہ کریں گے تو ان کی اس وقت کی باتوں میں اخیر بات یہ ہوگی الحمد للہ رب العالمین جیسا دوسری آیت میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ و حکمت کے خاص خاص مظاہر آسمان اور زمین شمس و قمر وغیرہ کی تخلیق کا ذکر کر کے عقیدۂ توحید و آخرت کو ایک بلیغ انداز میں ثابت کیا گیا تھا، مذکور الصدر آیات میں سے پہلی تین آیتوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کائنات عالم کی ایسی کھلی کھلی نشانیوں اور شہادتوں کے باوجود انسانوں کے دو طبقے ہوگئے، ایک وہ جس نے ان آیات قدرت کی طرف ذرا دھیان نہ دیا، نہ اپنے پیدا کرنے والے مالک کو پہچانا اور نہ اس پر غور کیا کہ ہم دنیا کے عام جانوروں کی طرح ایک جانور نہیں، رب العزت نے ہمیں ادراک و شعور عقل و ہوش تمام جانوروں سے زیادہ دیا ہے اور ساری مخلوقات کو ہمارا خادم بنا دیا ہے تو ہمارے ذمہ بھی کوئی کام رکھا گیا ہوگا اور اس کا ہمیں بھی حساب دینا ہوگا جس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی روز حساب اور روز جزاء مقرر ہو جس کو قرآن کی اصطلاح میں قیامت اور حشر و نشر سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کو عام جانوروں کی سطح پر رکھا، پہلی دو آیتوں میں اُن لوگوں کی خاص علامات بتلا کر ان کی سزائے آخرت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا کہ "جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ آخرت کی دائمی زندگی اور اس کی راحت و تکلیف کو چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے۔

دوسرے یہ کہ "اس دنیا میں ایسے مطمئن ہو کر بیٹھے ہیں کہ گویا یہاں سے کہیں جانا ہی نہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا ہے، ان کو کبھی یہ دھیان نہیں آتا کہ اس دنیا سے ہر شخص کو رخصت ہونا تو ایسا بدیہی مسئلہ ہے جس میں کبھی کسی کو شبہ ہی نہیں ہو سکتا، اور جب یہاں سے جانا یقینی ہے تو جہاں جانا ہے وہاں کی کچھ تیاری ہونی چاہئے"۔

تیسرے یہ کہ "یہ لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے مسلسل غفلت ہی غفلت میں ہیں،"

و قوطبی، اس لحاظ سے بھی کلمہ سبحانک اللھم دُعاء کہا جا سکتا ہے۔

اہل جنت کا دوسرا حال یہ بتلایا کہ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌ، تحیۃ عرف میں اس کلمہ کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے جیسے سلام یا خوش آمدید یا اهلاً وسهلاً وغیرہ، اس آیت نے بتلایا کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یا فرشتوں کی طرف سے اہل جنت کا تحیہ لفظ سلام سے ہوگا، یعنی یہ خوش خبری کہ تم ہر تکلیف اور ناگوار چیز سے سلامت رہوگے، یہ سلام خود حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جیسے سورۂ یٰس میں ہے سَلَٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ، اور فرشتوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے وَالْمَلَٰٓئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ سَلَٰمٌ عَلَيْكُم یعنی فرشتے اہل جنت کے پاس ہر دروازہ سے سلام علیکم کہتے ہوئے داخل ہوں گے۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں کہ کسی وقت براہ راست اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچے اور کسی وقت فرشتوں کی طرف سے، اور سلام کا لفظ اگرچہ دنیا میں دُعاء ہے لیکن جنت میں پہنچ کر تو مطلب حاصل ہوگا اس لئے وہاں یہ لفظ دعاء کے بجائے خوش خبری کا کلمہ ہوگا (روح)۔

تیسرا حال اہل جنت کا یہ بتلایا کہ ءَاخِرُ دَعْوَىٰهُمْ أَنِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ، یعنی اہل جنت کی آخری دُعاء ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی نصیب ہوگی جیسا کہ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک رسالہ میں فرمایا کہ جنت میں پہنچ کر عام اہل جنت کو علم و معرفت کا وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو دنیا میں علماء کا ہے، اور علماء کو وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو یہاں انبیاء کا ہے، اور انبیاء کو وہ مقام حاصل ہوجائے گا جو دنیا میں سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں قرب خداوندی کا انتہائی مقام حاصل ہوگا، اور ممکن ہے کہ اسی مقام کا نام مقام محمود ہو جس کے لئے اذان کی دعا میں آپ نے دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل جنت کی ابتدائی دعاء سُبْحَٰنَكَ ٱللَّهُمَّ اور آخری دعاء ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ہوگی، اس میں اللہ جل شانہٗ کی صفات کی دو قسموں کی طرف اشارہ ہے، ایک صفاتِ جلال، جن میں اللہ جل شانہٗ کے ہر عیب اور ہر برائی سے پاک ہونے کا ذکر ہے دوسری صفاتِ اکرام، جن میں اس کی بزرگی و برتری اور علو کمال کا ذکر ہے، قرآن کریم کی آیت تَبَٰرَكَ ٱسْمُ رَبِّكَ ذِى ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ میں ان دونوں قسموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سبحانیت اللہ تعالیٰ کی صفت جلال میں سے ہے اور مستحق حمد وثنا

ہونا صفات اکرام میں سے ہے اور ترتیب طبعی کے مطابق صفت جلال صفت اکرام سے مقدم ہیں، اس لئے اہل جنت شروع میں صفت جلال کو بلفظ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ بیان کریں گے اور آخر میں صفت اکرام کو بلفظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ذکر کریں گے یہی ان کا رات دن کا مشغلہ ہے۔

اور ان تینوں احوال کی ترتیب طبعی یہ ہے کہ اہل جنت جب سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے تو اس کے جواب میں ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے سلام پہنچے گا، اس کے نتیجہ میں وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہیں گے۔ (روح المعانی)

احکام و مسائل قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ کھانے پینے اور تمام کاموں میں سنت اہل جنت کے اس عمل کے مطابق یہ ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمد للہ پر ختم کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے پیئے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور فارغ ہو کر الحمد للہ کہے۔

مستحب ہے کہ دعا کرنے والا آخر میں یہ کہے وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور قرطبی نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ سورۂ صٰفّٰت کی آخری آیتیں بھی پڑھے یعنی سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ

اور اگر جلدی پہنچا دے اللہ لوگوں کو برائی جیسے جلدی مانگتے ہیں وہ بھلائی تو ختم کر دی جائے

اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ

ان کی عمر، سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں

يَعْمَهُوْنَ ۝ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ

سرگرداں، اور جب پہنچے انسان کو تکلیف، پکارے ہم کو پڑا ہوا یا

قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ

بیٹھا یا کھڑا، پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چل نکلے گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو

اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۲

کسی تکلیف پہنچنے پر، اسی طرح پسند آیا بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ
اور ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو تم سے پہلے جب ظالم ہوگئے، حالانکہ لائے تھے انکے پاس
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي
رسول ان کے کھلی نشانیاں، اور ہرگز نہ تھے ایمان لانے والے، یوں ہی سزا دیتے ہیں ہم
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ
قوم گنہگاروں کو، پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں
مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ
ان کے بعد تاکہ دیکھیں تم کیسے کرتے ہو، اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے
آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ
آیتیں ہماری واضح، کہتے ہیں وہ لوگ کہ امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی لے آ کوئی قرآن اس کے
هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ
سوا یا اس کو بدل ڈال، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے،
إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ
میں تابعداری کرتا ہوں اسی کی جو حکم آوے میری طرف، میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے
يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ
عذاب سے، تو کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے اور نہ وہ تم کو خبر کرتا
بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾
اس کی، کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس سے پہلے، کیا پھر تم نہیں سوچتے
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ
پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک
لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾
بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کی جلدی مچانے کے موافق جلدی سے نقصان واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لئے جلدی مچاتے ہیں اور اس کے موافق وہ فائدہ جلد واقع

کر دیتا ہے اسی طرح اگر مقصود بھی وقوع کر دیا جاتا تو ان کا وعدہ عذاب کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا لیکن ہماری حکمت جس کا بیان ابھی آتا ہے چونکہ اس کو مقتضی نہیں ہے) سو اس لئے ہم ان لوگوں کو جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے ان کے حال پر (بلا عذاب چندروز) چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں اور مستحق عذاب کے ہو جاویں اور وہ حکمت یہی ہے، اور جب انسان کو (یعنی ان میں سے بعض کو) کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے، لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی، (اور اس وقت کوئی بت وغیرہ یاد نہیں رہتا ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ) پھر جب (اس کی دعا و انتظار کے بعد) ہم اس کی وہ تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی حالت پر آجاتا ہے (اور ہم سے ایسا بے تعلق ہو جاتا ہے) کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا (اور پھر وہی شرک کی باتیں کرنے لگتا ہے، جیسی مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا) ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال (بد) ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں (جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے) اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے گروہوں کو (انواع عذاب سے) ہلاک کر دیا ہے جب کہ انہوں نے ظلم (یعنی کفر و شرک) کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے پیغمبر بھی دلائل لے کر آئے اور وہ (بوجہ غایت عناد کے) ایسے کب تھے کہ ایمان لے آتے، ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (جیسا ہم نے ابھی بیان کیا ہے) پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو آباد کیا تاکہ (ظاہری طور پر بھی) ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو (آیا ویسا ہی شرک و کفر کرتے ہو یا ایمان لاتے ہو) اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے آپ سے یوں کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائیے (جس میں ہمارے مسلک کے خلاف مضامین نہ ہوں) یا (کم از کم) اسی (قرآن) میں کچھ ترمیم کر دیجئے (کہ ہمارے مسلک کے خلاف مضامین اس سے حذف کر دیجئے اور اس منطوق سے یہی مفہوم ہوا کہ وہ لوگ قرآن کو کلام محمدی سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ اسی بنا پر جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ یوں کہہ دیجئے کہ (قطع نظر اس سے کہ ایسے مضامین کا حذف کرانا غرض کیسی ہے خود) مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں (اور جب بعض کا حذف بھی ممکن نہیں تو کل کا حذف تو بدرجہ اولیٰ ناممکن ہے کیونکہ وہ میرا کلام تو ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے آیا ہے جب یہ ہے تو) بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے (اور بالفرض خدانخواستہ) اگر میں (وحی کا اتباع نہ کروں بلکہ) اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے

عذاب کا اندیشہ رکھتے ہوں جو اہلِ عصیان کے لئے مخصوص ہے اور بوجہ عصیان کے تمہارے نصیب میں ہے سو میں تو اس عذاب یا اس کے سبب یعنی عصیان کی جرأت نہیں رکھتا اور اگر ان کو اس کے وحی ہونے میں کلام ہے اور یہ آپ ہی کا کلام سمجھے جاتے ہیں تو، آپ یوں کہہ دیجئے کہ (یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کلام معجز ہے کوئی بشر اس پر قادر نہیں ہوسکتا خواہ میں ہوں یا تم ہو، اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا کہ میں یہ کلام معجز تم کو نہ سنا سکوں اور اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے تم کو اس کی اطلاع نہ دے) تو (مجھ پر اس کو نازل نہ فرماتا پس) نہ تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا، پس جب میں تم کو سنا رہا ہوں اور میرے ذریعہ سے تم کو اطلاع ہو رہی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کلام معجز کا سنوانا اور اطلاع کرنا منظور ہوا اور سنانا اور اطلاع دینا بدون وحی کے بوجہ اس کے معجز ہونے کے ممکن نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی منزل اور کلام الٰہی ہے) کیونکہ (آخر) اس (کلام کے ظاہر کرنے) سے پہلے بھی تو ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں (پھر اگر یہ میرا کلام ہے تو یا تو اتنی مدت تک ایک جملہ بھی اس طرز کا نہ نکلا اور یا دفعۃً اتنی بڑی بات بنالی یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے) پھر کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے ہو (جب اس کا کلام الٰہی اور حق ہونا ثابت ہوگیا اور پھر بھی مجھ سے درخواست ترمیم کی کرتے ہو اور اس کو نہیں مانتے تو سمجھ لو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (جیسا میرے لئے تجویز کرتے ہو) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلا دے (جیسا اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے) یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی (بلکہ معذب ابدی ہوں گے)

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آخرت کے منکر ہیں، اسی وجہ سے جب ان کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ بطور استہزاء کہنے لگتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ عذاب ابھی بلا لو یا یہ کہ پھر یہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا جیسے نضر بن حارث نے کہا تھا "یا اللہ اگر یہ بات سچی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے یا اور کوئی سخت عذاب بھیج دیجئے"

پہلی آیت میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہیں، یہ عذاب موعود فوراً اس وقت بھی نازل فرما سکتے ہیں مگر وہ اپنی حکمت بالغہ اور لطف و کرم سے ایسا نہیں کرتے یہ نادان جو اپنے حق میں بددعا کرتے اور مصیبت طلب کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان کی بددعا کو بھی اسی طرح جلد قبول فرمالیا کرتے جس طرح ان کی اچھی دعا کو اکثر کر لیتے ہیں تو یہ سب

ہلاک ہوجاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعائے خیر اور اچھی دعا کے متعلق تو حق تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ اکثر جلد قبول کرلیتے ہیں اور کبھی کسی حکمت و مصلحت سے قبول نہ ہونا اس کے منافی نہیں، مگر جو انسان کبھی اپنی نادانی سے اور کبھی کسی غصہ اور رنج سے اپنے لئے یا اپنے اہل و عیال کے لئے بددعا کر بیٹھتا ہے یا انکارِ آخرت کی بناء پر عذاب کو کھیل سمجھ کر اپنے لئے دعوت دیتا ہے اُس کو فوراً قبول نہیں کرتے بلکہ مہلت دیتے ہیں تاکہ منکر، غور و فکر کرکے اپنے انکار سے باز آنے کا موقع ملے اور اگر کسی وقتی رنج و غصہ یا دل تنگی کے سبب بددعا کر بیٹھا ہے تو اس کو اس کی مہلت مل جائے کہ اپنے بھلے بُرے کو دیکھے اور انجام پر نظر ڈال کر اس سے باز آجائے۔

امام ابن جریر طبری نے بروایتِ قتادہ اور بخاری و مسلم نے بروایتِ مجاہد نقل کیا ہے کہ اس جگہ بددعا سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال و دولت کے تباہ ہونے کی بددعا کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسی دعا قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے، امام قرطبی نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہ سے دعا کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بددعا اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرماویں، اور شہر بن حوشب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج و غصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے وہ فوراً قبول ہوجاتی ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لئے کبھی بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیتِ دعا کا ہو اور یہ بددعا فوراً قبول ہوجائے اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے (صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے غزوۂ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے)۔

ان سب روایات کا حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ کا اصل خطاب اگرچہ منکرین آخرت اور ان کے فوری طلب عذاب سے متعلق ہے لیکن اس کے عموم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو کسی رنج و غصہ کی وجہ سے اپنے یا اپنے مال و اولاد کے لئے بددعا کر بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عادت اُن کے فضل و کرم کی وجہ سے دونوں کے ساتھ یہی ہے کہ ایسی بددعاؤں کو فوراً نافذ نہیں فرماتے تاکہ انسان کو سوچنے و غور کرنے کا موقع مل جائے۔

دوسری آیت میں منکرین توحید و آخرت کو ایک دوسرے بلیغ انداز سے قائل کیا گیا ہے وہ یہ کہ لوگ عام حالات راحت و اطمینان میں خدا و آخرت کے خلاف حجت بازی کرتے اور غیروں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے اور ان سے حاجت روائی کی امیدیں باندھے رکھتے ہیں، لیکن جب کوئی بڑی مصیبت آپڑتی ہے اس وقت یہ لوگ خود بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اپنی ساری امیدگاہوں سے مایوس ہو کر صرف اسی کو پکارتے ہیں، اور لیٹے بیٹھے کھڑے غرض ہر حال میں اسی کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو خدا تعالیٰ سے ایسے آزاد و بے فکر ہو جاتے ہیں کہ گویا کبھی اس کو پکارا ہی نہ تھا اور اس سے کوئی حاجت مانگی ہی نہ تھی، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاجت روائی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے والے خود بھی اپنے اس عقیدہ کا بطلان مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، مگر بیجا عناد و ضد کی وجہ سے اسی باطل عقیدہ پر جمے رہتے ہیں۔

تیسری آیت میں اسی دوسری آیت کے مضمون کی مزید توضیح اور تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھے کہ دنیا میں عذاب آہی نہیں سکتا، پچھلی قوموں کی تاریخ اور ان کی سرکشی و نافرمانی کی سزا میں مختلف قسم کے عذاب اسی دنیا میں آچکے ہیں اس امت میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اکرام کی وجہ سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ عذاب عام نہ آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کے اسی لطف و کرم نے ان لوگوں کو ایسا بے باک کر دیا ہے کہ وہ بڑی جرأت سے عذاب الٰہی کو دعوت دینے اور اس کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یاد رہے کہ عذاب الٰہی سے بے فکری ان کے لئے بھی کسی حال میں روا نہیں، کیونکہ پوری امت اور پوری دنیا پر عذاب عام نہ بھیجنے کا وعدہ تو ہے مگر خاص خاص افراد اور قوموں پر عذاب آجانا اب بھی ممکن ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ، یعنی پھر پچھلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تمہیں ان کا قائم مقام بنایا اور زمین کی خلافت تمہارے حوالہ کر دی مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ زمین کی خلافت تمہارے عیش و آرام کے لئے تمہیں سپرد کی گئی ہے بلکہ اس اعزاز و اکرام کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارا امتحان لیا جائے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو، پچھلی تاریخ امم سے متاثر ہو کر اپنے حالات کی اصلاح کرتے ہو یا حکومت و دولت کے نشہ میں سرشار ہو جاتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حکومت و اقتدار کوئی فخر و ناز کی چیز نہیں بلکہ ایک بھاری

بوجھ ہے جس کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں چار آیتوں میں منکرینِ آخرت کے ایک غلط خیال اور بے جا فرمائش کی تردید ہے، ان لوگوں کو نہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی اور نہ وحی و رسالت کے سلسلہ سے واقف تھے، انبیاء علیہم السلام کو بھی عام انسانوں کی طرح جانتے تھے، قرآن کریم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو پہنچا اس کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ یہ خود آپ کا کلام اور آپ کی تصنیف ہے، اسی خیال کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ یہ قرآن تو ہمارے اعتقادات و نظریات کے خلاف ہے، جن بتوں کی ہمارے باپ دادا ہمیشہ تعظیم کرتے آئے اور ان کو حاجت روا مانتے آئے ہیں قرآن ان سب کو باطل اور لغو قرار دیتا ہے، بہت سی چیزیں اور معاملات جو ہم برابر استعمال کرتے آئے ہیں قرآن اُن سب کو حرام قرار دیتا ہے، اور پھر قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور حساب کتاب دینا ہوگا، یہ سب چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہم ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اس لئے آپ یا تو ایسا کریں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن بنا دیں جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم از کم اسی میں ترمیم کر کے ان چیزوں کو نکال دیں۔

قرآن کریم نے اول ان کے غلط اعتقاد کو رد کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ نہ میرا کلام ہے، نہ اپنی طرف سے اس کو بدل سکتا ہوں، میں تو صرف وحی الٰہی کا تابع ہوں، اگر میں ذرہ بھی اس میں اپنے اختیار سے کوئی تبدیلی کروں تو سخت گناہ کا مرتکب ہوں گا اور نافرمانی کرنے والوں پر جو عذاب مقرر ہے میں اس سے ڈرتا ہوں **اس لئے ایسا نہیں کر سکتا۔**

پھر فرمایا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں فرمانِ خداوندی کے تابع کرتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ تمہیں یہ کلام نہ سنایا جائے تو نہ میں تمہیں سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے باخبر کرتے، اور جب اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ تمہیں یہی کلام سنوایا جائے تو کس کی مجال ہے جو اس میں کوئی **کمی بیشی کر سکے۔**

اس کے بعد قرآن کے من جانب اللہ اور کلام الٰہی ہونے کو ایک واضح دلیل سے سمجھایا، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ، یعنی تم ذرا یہ بھی تو سوچو کہ نزول قرآن سے پہلے میں نے تمہارے سامنے چالیس سال کی طویل مدت گزاری ہے، اس مدت میں تم نے کبھی مجھے شعر و سخن یا کوئی مقالہ کہتے ہوئے نہیں سنا، اگر میں اپنی طرف سے ایسا کلام کہہ سکتا تو کچھ نہ کچھ ان چالیس سال کے عرصہ میں بھی کہا ہوتا، اس کے علاوہ ان چالیس سالہ طویل زندگی میں تم میرے

چال چلن میں صدق و دیانت کا تجربہ کر چکے ہو کہ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا تو آج چالیس سال کے بعد آخر جھوٹ بولنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صادق امین ہیں، قرآن میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اُسی کی طرف سے آیا ہوا ہے۔

اہم فائدہ | قرآن کریم کی اس دلیل نے صرف قرآن کے کلام حق ہونے پر ہی مکمل ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ عام معاملات میں کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان کا ایک اصول بھی بتا دیا کہ کسی شخص کو کوئی عہدہ یا منصب سپرد کرنا ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کو جانچنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے، اگر اس میں صدق و امانت درجہ موجود ہے تو آئندہ بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے اور اگر پچھلی زندگی میں اس کی دیانت و امانت اور صدق و سچائی کی شہادت موجود نہیں تو آئندہ کے لئے محض اس کے کہنے اور دعوے کی وجہ سے اس پر اعتماد کر لینا کوئی دانشمندی نہیں، آج عہدوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی سپردگی میں جس قدر غلطیاں اور ان کی وجہ سے عظیم مفاسد پیدا ہو رہے ہیں ان سب کی اصلی وجہ اسی اصول فطرت کو چھوڑ کر رسمی چیزوں کے پیچھے پڑ جانا ہے۔

آٹھویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید وارد ہوئی ہے جس میں کسی کلام کو غلط طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کا عذاب شدید مذکور ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَ

اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ نقصان پہنچا سکیں ان کو اور نہ نفع اور

يَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ

کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس، تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو

بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا

جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان سے جن کو

يُشْرِكُونَ ۝ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ

شریک کرتے ہیں، اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ

اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکتی تیرے رب کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں جس بات میں کہ

يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ

جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اس کے رب سے ۔

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

سو تو کہہ دے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو ۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں ۔

ع ۲

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ اللہ کی توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ (عبادت کرنے کی صورت میں) ان کو نفع پہنچا سکیں اور (اپنی طرف سے بلا دلیل یہ بات تجویز کر کے) کہتے ہیں کہ یہ (معبود) اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں) آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز بتلاتے ہو جو خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں (یعنی جو چیز اللہ کے علم میں نہ ہو اس کا وجود اور وقوع محال ہے تو تم ایک محال چیز کے پیچھے لگے ہو) اللہ تعالیٰ پاک و برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے اور (پہلے) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے تھے (یعنی سب موحد تھے، کیونکہ آدم علیہ السلام عقیدہ توحید کو لے کر آئے ان کی اولاد بھی ایک زمانہ تک انہیں کے عقیدہ اور طریقہ پر رہی، پھر (اپنی گمراہی سے) انہوں نے (یعنی بعض نے) اختلاف پیدا کر لیا (یعنی توحید سے پھر گئے، مشرک ہوگئے) اور (یہ مشرک لوگ ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں دیا جائے گا) تو جس چیز میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا قطعی فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (براہ عناد سینکڑوں معجزات ظاہر ہو جانے کے باوجود خصوصاً معجزہ قرآن دیکھنے اور اس کی مثال سے عاجز ہونے کے باوجود) یوں کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوا؟ تو آپ فرما دیجئے کہ (معجزہ کا اصل مقصد رسول کے صدق و حقانیت کو ثابت کرنا ہے، وہ تو بہت سے معجزات کے ذریعہ ہو چکا ہے، اب فرمائشی معجزات کی ضرورت تو ہے نہیں، ہاں امکان ہے کہ ظاہر ہوں یا نہ ہوں اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور) غیب کا علم صرف خدا کو ہے (مجھ کو نہیں) اس لئے تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ تمہاری یہ فرمائش پوری ہوتی ہے یا نہیں، اور فرمائشی معجزات کے ظاہر نہ کرنے کی حکمت قرآن کریم میں کئی جگہ بتلا دی گئی ہے کہ ان کے ظہور کے بعد عادۃ اللہ یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لائیں تو ساری قوم ہلاک کر دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس امت کے لئے ایسا عذاب

عام منظور نہیں بلکہ اس کو تا قیامت باقی رکھنا مقدر ہو چکا ہے۔

معارف و مسائل

کافر و مسلم دو قومیں بن گئیں۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً، یعنی تمام اولاد آدم شروع میں نسلی اور وطنی قومیت کے بجائے ایک ہی ملت ایک ہی قوم موحدین کی تھی، شرک و کفر کا نام نہیں تھا، پھر توحید میں اختلاف پیدا کر کے مختلف قومیں مختلف گروہ بن گئے۔

یہ زمانہ امت واحدہ اور سب کے مسلمان ہونے کا کتنا تھا اور کب تک رہا؟ روایات حدیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہی صورت تھی، نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک و کفر ظاہر ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا (تفسیر مظہری)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک ایک طویل زمانہ ہے دنیا میں انسانوں کی نسلیں اور آبادی کافی پھیل چکی تھی، ان تمام انسانوں میں رنگ و روپ اور طرز معاشرت کا اختلاف ہونا بھی ایک طبعی امر ہے اور مختلف خطوں میں پھیل جانے کے بعد وطن کا اختلاف بھی یقینی ہے اور ممکن ہے کہ بول چال میں زبانیں بھی کچھ مختلف ہو گئی ہوں، مگر قرآن کریم نے ان نسبی، قبائلی، لونی، وطنی اختلاف کو جو امور فطریہ ہیں، وحدت امت میں خلل انداز قرار نہیں دیا، اور ان اختلافات کی وجہ سے اولاد آدم کو مختلف قومیں مختلف ملتیں نہیں بلکہ امت واحدہ قرار دیا۔

ہاں جب ایمان کے خلاف کفر و شرک پھیلا تو کفر و شرک کو الگ قوم الگ ملت قرار دے کر فرق ظاہر فرمایا، قرآن کریم کی آیت هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ نے اس مضمون کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ اللہ کی مخلوق اولاد آدم کو مختلف قوموں میں بانٹنے والی چیز صرف ایمان و اسلام سے انحراف ہے، نسبی وطنی رشتوں سے قومیں الگ الگ نہیں ہوتیں، اور زبان اور وطن یا رنگ و نسل کی بناء پر انسانوں کو مختلف گروہ قرار دینے کی جہالت یہ نئی جاہلیت ہے جو نئی روشنی نے پیدا کی ہے اور آج کے بہت سے لکھے پڑھے اس نیشنلزم کے پیچھے لگ گئے جو ہزاروں فتنے اور فساد اپنے دامن میں رکھتا ہے، اَعَاذَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْہُ۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ

اور جب چکھاتے ہیں ہم لوگوں کو مزہ اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے جو ان کو پہنچی تھی اسی وقت بنانے لگتے ہیں

فِیْٓ اٰیٰتِنَا ؕ قُلِ اللّٰہُ اَسْرَعُ مَکْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ

وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ

جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا

اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ

الشّٰکِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ

الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ

الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ

نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ

الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ ۙ

اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ

کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

حل لغات عَاصِفٌ سخت تیز ہوا، حَصِیْدًا کٹی ہوئی کھیتی، کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ یَغْنِیَ بِالْمَکَانِ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں۔

اور جب ہم لوگوں کو بعد اس کے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں شرارت کرنے لگتے ہیں (یعنی ان سے اعراض کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تکذیب و استہزاء سے پیش آتے ہیں اور براہ اعتراض و عناد دوسرے معجزات کی فرمائشیں کرتے ہیں اور مصیبت گزشتہ سے عبرت نہیں پکڑتے پس معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا اصل سبب اللہ کی نازل کردہ آیات و معجزات سے اعراض ہے اور یہ اعراض دنیا کی نعمتوں میں مست ہو جانے سے پیدا ہوا ہے، آگے وعید ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس شرارت کی سزا بہت جلد دے گا، بالیقین ہمارے فرشتے تمہاری سب شرارتوں کو لکھ رہے ہیں (پس علاوہ علم الٰہی میں محفوظ ہونے کے دفتر میں بھی محفوظ ہیں) وہ (اللہ) ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لئے لئے پھرتا ہے (یعنی جن آلات و اسباب سے تم چلتے پھرتے ہو وہ سب اللہ ہی کے دیئے ہوئے ہیں) یہاں تک کہ (بعض اوقات) جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ اُن (کی رفتار) سے خوش ہوتے ہیں (اسی حالت میں دفعۃً) ان پر ایک جھونکا (مخالف) ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان (لوگوں) پر موجیں اٹھی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (بری طرح) گھر گئے، (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ اے اللہ) اگر آپ ہم کو اس (مصیبت) سے بچا لیں تو ہم ضرور حق شناس (یعنی موحد) بن جاویں (یعنی اس وقت جیسا اعتقاد توحید کا ہو گیا ہے اس پر قائم رہیں) پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو (اس مہلکہ سے) بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین (کے مختلف قطعوں) میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں (یعنی وہی شرک و معصیت) اے لوگو (سن لو) یہ تمہاری سرکشی تمہارے لئے وبال (جان) ہونے والی ہے (بس) دنیوی زندگی میں (چندے اس سے) فائدہ اٹھا رہے ہو پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتلا دیں گے (اور اس کی سزا دیں گے) بس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس (پانی) سے زمین کے نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلے یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہو گئی (یعنی سبزہ سے خوشنما معلوم ہونے لگی) اور اس (زمین) کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس

کے نباتات پھلوں پر بالکل قبضہ ہو چکے تو ایسی حالت میں، دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا (جیسے پالا یا خشکی یا اور کچھ) سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا کل (یہاں) وہ موجود ہی نہ تھی (پس اسی نباتات کے مثل دنیوی زندگی ہے)، ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے سمجھانے کے لئے جو سوچتے ہیں۔

مَعارف و مسائل

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ، عربی لغت کے اعتبار سے لفظ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہو سکتی ہے بری بھی، اردو زبان کے محاورہ سے دھوکہ نہ کھائیں کہ لفظ مکر اردو میں دھوکہ فریب کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے حق تعالیٰ بری ہے۔

اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ یعنی تمہارے ظلم کا وبال تمہارے ہی اوپر پڑ رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کا وبال یقینی ہے اور آخرت سے پہلے دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی اور لوگوں پر احسان کرنے کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ آخرت سے پہلے دنیا میں اس کی برکات نظر آنے لگتی ہیں) اور ظلم اور قطع رحمی کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے) (رواہ الترمذی و ابن ماجہ بسند حسن) اور ایک حدیث میں بروایت حضرت عائشہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کا وبال اپنے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ظلم، بدعہدی، اور دھوکہ فریب (رواہ ابو الشیخ و ابن مردویہ فی تفسیر، از مظہری)۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف، اور دکھاتا ہے جس کو چاہے رستہ سیدھا

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶

جنہوں نے کی بھلائی ان کے لئے ہے بھلائی اور زیادتی اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی، وہ ہیں جنت والے، وہ اسی میں رہا کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ

اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلا برائی کا اس کے برابر اور ڈھانکے گی ان کو رسوائی

مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا

کوئی نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے

مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧﴾

اندھیری رات کے، وہ ہیں دوزخ والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے ان کو جو شرک کرتے تھے کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم

وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا

اور تمہارے شریک، پھر توڑ دیں گے ہم آپس میں ان کو اور کہیں گے ان کے شریک تم ہماری تو

تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ

بندگی نہ کرتے تھے، سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے اور تمہارے بیچ میں، ہم کو

عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَ

تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی، وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور

رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾

رجوع کریں گے اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے ان کا اور جاتا رہے گا ان کے پاس سے جو جھوٹ باندھتے تھے

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے، یا کون مالک ہے کان

وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ

اور آنکھوں کا، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو

الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣١﴾

زندہ سے، اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی، سو بول اٹھیں گے کہ اللہ، تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو

فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا، پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے مگر بھٹکنا

فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ﴿٣٢﴾

سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو۔

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ دار البقاء کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر پہنچنے کی توفیق دے دیتا ہے جس سے دار البقاء تک رسائی ہو سکتی ہے آگے جزاء و سزا کا بیان ہے کہ

افعال کا فاعل اللہ ہے، تو ان سے کہئے کہ پھر شرک سے، کیوں نہیں پرہیز کرتے سو (جس کے یہ افعال و اوصاف مذکور ہوئے) یہ ہے اللہ جو تمہارا رب حقیقی ہے اور جب امر حق ثابت ہوگیا، پھر امر حق کے بعد اور کیا رہ گیا بجز گمراہی کے (یعنی جو امر حق کی ضد ہوگی وہ گمراہی ہے اور توحید کا حق ہونا ثابت ہوگیا پس شرک یقیناً گمراہی ہے) پھر (حق کو چھوڑ کر، کہاں (باطل کی طرف) پھرے جاتے ہو۔

مَعَارِفْ وَمَسَائِل

پچھلی آیت میں دنیاوی زندگی اور اس کی ناپائیداری کی مثال اس کھیتی سے دی گئی تھی جو آسمانی پانی سے سیراب ہوکر لہلہانے لگی اور ہر طرح کے پھل پھول نکل آئے اور کھیتی والے خوش ہونے لگے کہ اب ہماری ساری تمنائیں اس سے پوری ہوں گی، مگر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے رات یا دن میں ہمارے عذاب کا کوئی حادثہ پڑ جس نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا یہاں کوئی چیز موجود ہی نہ تھی، یہ تو دنیا کی زندگی کا حال تھا، اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس کے بالمقابل دارِ آخرت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو دارالسلام کی طرف دعوت دیتا ہے یعنی ایسے گھر کی طرف جس میں ہر طرح کی سلامتی ہی سلامتی ہے نہ اس میں کسی طرح کی کوئی تکلیف ہے نہ رنج و غم، نہ بیماری کا خطرہ، نہ فنا ہونے یا حالت بدل جانے کی فکر۔

دارالسلام سے مراد جنت ہے، اس کو دارالسلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن و سکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دارالسلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتے رہے گا، بلکہ لفظ سلام ہی اہلِ جنت کی اصطلاح ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کریں گے اور فرشتے ان کو مہیا کریں گے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کی طرف بلایا، تو اس دعوتِ الٰہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کر دی تو وہ کامیاب ہوگی اور تو دارالسلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلوں گا

تو تیرا راستہ روک دیا جائے گا، تو وہیں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دار العمل نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دار السلام جنّت کے سات ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی جگہ کا نام دار السلام رکھنا مناسب نہیں، جیسے جنّت یا فردوس وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں۔

اس کے بعد آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ یعنی پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستہ پر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دار السلام کی دعوت تو سارے انسانوں کے لئے عام ہے اور اس معنی کے اعتبار سے سب کے لئے ہدایت بھی عام ہے لیکن ہدایت کی خاص قسم کہ سیدھے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے اور چلنے کی توفیق دی جائے یہ مخصوص خاص ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

مذکورہ دو آیتوں میں دار دنیا اور دار آخرت کا تقابل اور اہل دنیا اور اہل آخرت کے احوال کا ذکر تھا، اگلی چار آیتوں میں دونوں فریق کی جزاء و سزا کا بیان ہے، پہلے اہل جنّت کا ذکر اس طرح فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے نیکی اختیار کی یعنی سب سے بڑی نیکی ایمان اور پھر عمل صالح پر قائم رہے ان کو ان کے عمل کا عمدہ اور بہت بدلہ ملے گا، اور صرف بدلہ ہی نہیں بلکہ بدلے سے کچھ زیادہ بھی۔

اس آیت کی تفسیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی وہ یہ ہے کہ اس جگہ اچھے بدلہ سے مراد جنّت ہے، اور زیادۃ سے مراد حق تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہے جو اہل جنّت کو حاصل ہوگی۔ (تفسیر قرطبی بروایت انسؓ)

جنّت کی اپنی حقیقت سے تو ہر مسلمان واقف ہے کہ وہ ایسی راحتوں اور نعمتوں کا مرکز ہے جن کو انسان اس وقت تصور میں نہیں لا سکتا، اور حق تعالیٰ کی زیارت ان سب نعمتوں پر فائق ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنّت جنّت میں داخل ہو چکیں گے تو حق تعالیٰ ان سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ ہم اس کو پورا کریں گے، اہل جنّت جواب دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے، ہمیں جنّت میں داخل فرمایا، جہنّم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں، اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور

سب اہلِ جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی، بقول مولانا رومیؒ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود — لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

اور پھر انہیں اہلِ جنت کا یہ حال بیان فرمایا کہ نہ ان کے چہروں پر کبھی کدورت یا تکلیف وغم کا اثر چھائے گا اور نہ ذلت کا اثر ہوگا جو دنیا میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی پیش آیا کرتا ہے اور آخرت میں اہلِ جہنم کو پیش آئے گا۔

اس کے بالمقابل اہلِ جہنم کا یہ حال بیان فرمایا کہ جن لوگوں نے برے عمل کئے ان کو برائی کا بدلہ برابر سرابر ملیگا اس میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوگی، کوئی شخص ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں کی سیاہی کا یہ حال ہوگا کہ گویا اندھیری رات کے پرت کے پرت ان پر لپیٹ دیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیتوں میں ایک مکالمہ مذکور ہے جو اہلِ جہنم میں اور ان کو گمراہ کرنیوالے بتوں یا شیطانوں کے درمیان محشر میں ہوگا، ارشاد فرمایا کہ اس دن ہم سب کو جمع کریں گے پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے تجویز کئے ہوئے معبود ذرا اپنی جگہ ٹھہرو تاکہ تمہیں اپنے عقیدہ کی حقیقت معلوم ہو جائے، اس کے بعد ان لوگوں میں اور ان کے معبودوں میں جو رشتہ اتحاد دنیا میں پایا جاتا تھا اس کو قطع کر دیا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے بت خود بول اٹھیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کیا کرتے تھے، اور خدا کو گواہ بنا کر کہیں گے کہ ہم کو تمہاری مشرکانہ عبادت کی کچھ خبر بھی نہ تھی، کیونکہ نہ ہم میں حس و حرکت ہے اور نہ ان مسائل کو سمجھنے کے قابل عقل و شعور ہے۔

چھٹی آیت میں دونوں فریق اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا ایک مشترک حال بیان فرمایا ہے کہ اس مقام یعنی محشر میں ہر شخص اپنے اپنے کئے ہوئے اعمال کو آزما لے گا کہ وہ نفع بخش تھے یا نقصان رساں، اور سب کے سب اپنے معبودِ حق کے پاس پہنچا دیئے جائیں گے، اور سارے بھروسے اور سہارے جو دنیا میں انسان ڈھونڈتا ہے ختم کر دیئے جائیں گے، اور مشرکین جن بتوں کو اپنا مددگار اور سفارشی سمجھا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

ساتویں اور آٹھویں آیت میں قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اور معجزانہ طریق پر مشرکین کی آنکھیں کھولنے کے لئے ان سے کچھ سوالات قائم کئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا، ان لوگوں سے کہیے کہ آسمان اور زمین میں سے تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ یا کان

اور آنکھوں کا کون مالک ہے کہ جب چاہے ان میں شنوائی اور بینائی پیدا کردے اور جب چاہے سلب کرلے، اور کون ہے جو مردہ چیزوں سے زندہ کو پیدا کردیتا ہے جیسے مٹی سے گھاس اور درخت، یا نطفہ سے انسان اور جانور یا بیضہ سے پرندہ، اور زندہ میں سے مردہ کو پیدا کردیتا ہے، جیسے انسان اور جانور سے نطفہ بے جان، اور کون ہے جو تمام کائنات کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟

پھر فرمایا کہ جب آپ ان لوگوں سے یہ سوال کریں گے تو سب کے سب یہی کہیں گے کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے! تو آپ ان سے فرمادیں کہ پھر تم کیوں خدا سے نہیں ڈرتے؟ جب ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور باقی رکھنے والا اور ان سب کے کام میں لگانے کا انتظام کرنے والا اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے تو پھر عبادت و اطاعت کا حق دار اس کے سوا کسی کو کیوں بناتے ہو۔

آخری آیت میں فرمایا فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ یعنی یہی ہے وہ ذات جس کی صفات کا ذکر ابھی ابھی گزرا ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کا معبود برحق ہونا ثابت ہوگیا تو پھر اس حق کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ پھیرنا کس قدر نامعقول بات ہے۔

اس آیت کے مسائل و فوائد میں سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیت میں مَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق اور ضلال کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جو حق نہیں ہوگا وہ ضلال و گمراہی میں داخل ہوگا، ایسا کوئی کام نہیں ہوسکتا جو نہ حق ہو نہ گمراہی، اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دو متضاد چیزیں حق ہوں، تمام اصول عقائد میں یہ قاعدہ جمہور امت کے نزدیک مسلّم ہے، البتہ جزئی مسائل اور جزئیات فقہیہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک اجتہادی مسائل میں دونوں جانبوں کو حق کہا جائے گا اور جمہور اس پر متفق ہیں کہ اجتہادی مسائل میں جانب خلاف کو ضلال و گمراہی نہیں کہہ سکتے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رب کی ان نافرمانوں پر کہ یہ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ

ایمان نہ لاویں گے۔ پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو پیدا کرے خلق کو

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى

پھر دوبارہ زندہ کرے، تو کہہ اللہ پہلے بناتا ہے خلق کو پھر اس کو دہرائے گا سو کہاں سے

إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ

تیری طرف کیا تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو اور بعضے ان میں

مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿۴۳﴾

جو نگاہ کرتے ہیں تیری طرف کیا تو راہ دکھلائے گا اندھوں کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۴۴﴾

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر ان دلائل کے بعد بھی آپ کو جھٹلاتے رہیں تو (بس اخیر بات) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا صاحب) میرا کیا ہوا مجھ کو ملے گا اور تمہارا کیا ہوا تم کو ملے گا تم میرے عمل کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عمل کا جواب دہ نہیں ہوں (جس طریقہ پر چاہو رہو آپ معلوم ہوجاوے گا) اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ ان میں گو بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھتے ہیں (لیکن دل میں ارادہ ایمان اور حق طلبی کا نہیں ہے پس اس اعتبار سے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے پس ان کی حالت بہروں کی سی ہوئی تو پھر) کیا آپ بہروں کو سناتے (اور ان سے ماننے کا انتظار کرتے) ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو (ہاں اگر سمجھ ہوتی تو بہرے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا) اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہر میں) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں (لیکن طلب حق نہ ہونے سے ان کی حالت مثل اندھوں کے ہے تو) پھر کیا آپ اندھوں کو رستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو (ہاں اگر بصیرت ہوتی تو اندھے پن میں بھی کچھ کام چل سکتا اور ان کی عقلیں جو اس طرح تباہ ہوگئیں تو) یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا (کہ ان کو قابلیت ہدایت کی نہ دے اور پھر مؤاخذہ فرماوے) لیکن لوگ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں (کہ قابلیت موہوبہ کو فنا کردیتے ہیں اور اس سے کام نہیں لیتے)۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی دن کی، ایک دوسرے کو

بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۴۵﴾

پہچانیں گے، بیشک خسارے میں پڑے جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر۔

مسلمانو) یہ وعدہ (عذاب کا) کب (واقع) ہوگا، اگر تم سچے ہو (تو وقوع کیوں نہیں کرا دیتے) آپ
(سب کی طرف سے جواب میں) فرما دیجئے کہ میں (خود) اپنی ذاتِ خاص کے لئے تو کسی نفع (کے
حاصل کرنے) کا اور کسی ضرر (کے دفع کرنے) کا اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) خدا کو
منظور ہو (اتنا اختیار البتہ حاصل ہے، پس جب خاص اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں تو دوسرے
کے نفع و نقصان کا تو کیونکر مالک ہوں گا، پس عذاب واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں، رہا
یہ کہ کب واقع ہوگا، سو بات یہ ہے کہ) ہر امت کے (عذاب کے) لئے (اللہ کے نزدیک) ایک
معین وقت ہے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں) سو جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو اس
وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں (بلکہ فوراً عذاب واقع ہوجاتا
ہے اسی طرح تمہارے عذاب کا بھی وقت معین ہے، اس وقت اس کا وقوع ہو جاوے گا اور
وہ جو فرمائش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے جلدی ہو جاوے جیساکہ آیت مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اور
رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا میں ان کی اس جلدبازی کا ذکر ہے، تو) آپ (اس کے متعلق
ان سے) فرما دیجئے کہ یہ تو بتلاؤ کہ اگر تم پر خدا کا عذاب رات کو آپڑے یا دن کو (آپڑے، تو یہ
تو بتلاؤ کہ) عذاب میں کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں (یعنی
عذاب تو سخت چیز اور پناہ مانگنے کی چیز ہے نہ کہ جلدی مانگنے کی اور چونکہ جلدبازی سے مقصود
ان کا تکذیب ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ) کیا اب تو تکذیب کر رہے ہو جو کہ وقت ہے تصدیق
کے نافع ہونے کا، پھر جب وہ (اصلی موعود) آہی پڑے گا (اس وقت) اس کی تصدیق
کرو گے (جس وقت کہ تصدیق نافع نہ ہوگی اور اس وقت کہا جائے گا کہ) ہاں اب مانا حالانکہ
(پہلے سے) تم (بقصدِ تکذیب) اس کی جلدی مچایا کرتے تھے پھر ظالموں (یعنی مشرکوں) سے کہا
جاوے گا کہ ہمیشہ کا عذاب چکھو، تم کو تو تمہارے ہی کئے کا بدلہ ملا ہے اور وہ (غایتِ تعجب
وانکار سے) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی امر ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ
ہاں قسم میرے رب کی کہ وہ واقعی امر ہے، اور تم کسی طرح خدا کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ وہ عذاب
دینا چاہے اور تم بچ جاؤ) اور (اس عذاب کی یہ شدت ہوگی کہ) اگر ہر ہر مشرک شخص کے پاس
اتنا (مال) ہو کہ ساری زمین میں بھر جاوے تب بھی اس کو دے کر اپنی جان بچانا چاہیں گے
(اگرچہ نہ خزانہ ہوگا اور نہ لیا جاوے گا لیکن شدت اس درجہ کی ہوگی کہ مال ہونے کی تقدیر پر
سب دینے پر راضی ہو جاویں گے) اور جب عذاب دیکھیں گے تو (مزید فضیحت کے خوف سے
پشیمانی کو (اپنے دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھیں گے یعنی اس کے آثار قولیہ و فعلیہ کو ظاہر
نہ ہونے دیں گے، تاکہ دیکھنے والے زیادہ نہ ہنسیں لیکن آخر میں یہ ضبط و تحمل بھی اس کی شدت

کے سامنے نہ چلے گی، اور ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہوگا اور ان پر ذرا ظلم نہ ہوگا، یاد رکھو کہ جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی ملک ہیں (ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور ان میں یہ مجرمین بھی داخل ہیں ان کا فیصلہ بھی بطریق مذکور کر سکتا ہے) یاد رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے (پس قیامت ضرور آئے گی) لیکن بہت سے آدمی یقین ہی نہیں کرتے، وہی جان ڈالتا ہے، وہی جان نکالتا ہے (پس دوبارہ پیدا کرنا اس کو کیا مشکل ہے) اور تم سب اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اور حساب و کتاب اور پھر اس پر ثواب و عذاب ہوگا)

مَعَارِفْ وَمَسَائِل

یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَہُمْ یعنی جب قیامت میں مردے قبروں سے اٹھائے جاویں گے تو ایک دوسرے کو پہچانیں گے جیسے کوئی تھوڑی مدت ملے ہوئے گزری ہو۔

امام بغوی نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ پہچان شروع میں ہوگی بعد میں قیامت کے ہولناک واقعات سامنے آجائیں گے تو یہ پہچان منقطع ہو جائے گی اور بعض روایات میں ہے کہ پہچان تو پھر بھی رہے گی مگر ہیبت کے مارے بات نہ کر سکیں گے (مظہری)

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِہٖ آٰلْئٰنَ یعنی کیا تم ایمان اس وقت لاؤ گے جب تم پر عذاب واقع ہو جائے گا خواہ موت کے وقت یا اس سے پہلے ہی، مگر اس وقت تمہارے ایمان کے جواب میں یہ کہا جائے گا آٰلْئٰنَ کیا اب ایمان لائے ہو، جب کہ ایمان کا وقت گزر چکا، جیسے غرق ہونے کے وقت فرعون نے جب کہا اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِیْلَ جواب میں کہا گیا تھا آٰلْئٰنَ، اور اس کا یہ ایمان قبول نہیں کیا گیا، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہی رہتا ہے جب تک کہ وہ غرغرۂ موت میں گرفتار نہ ہو جائے یعنی غرغرۂ موت کے وقت کا ایمان اور توبہ اللہ کے نزدیک معتبر نہیں، اسی طرح دنیا میں وقوعِ عذاب سے پہلے پہلے توبہ قبول ہو سکتی ہے، جب عذاب آپڑے پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، آخر سورت میں قوم یونس علیہ السلام کا جو واقعہ آرہا ہے کہ ان کی توبہ قبول کرلی گئی، وہ اسی ضابطے کے تحت ہے کہ انہوں نے عذاب کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر پہلے ہی سے الحاح و زاری کے ساتھ توبہ کرلی اس لئے عذاب ہٹا دیا گیا، اگر عذاب ان پر واقع ہو جاتا پھر توبہ قبول نہ ہوتی۔

یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِیْ

اے لوگو تمہارے پاس آئی ہے نصیحت تمہارے رب سے اور شفاء دلوں کے

الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ

ذرہ بھر زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ چھوٹا اس سے اور نہ بڑا

اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۱

جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں۔

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو بُرے کاموں سے روکنے کے لئے نصیحت ہے اور اگر اس پر عمل کرکے بُرے کاموں سے بچیں تو دلوں میں جو بُرے کاموں سے روگ ہو جاتے ہیں ان کے لئے شفاء ہے اور نیک کاموں کے لئے رہنمائی کرنے والی ہے اور اگر اس پر عمل کرکے نیک کاموں کو اختیار کریں تو رحمت

دنیا بھی جنت بن جائے۔

پہلی آیت میں قرآن کریم کی چار خصوصیات کا ذکر ہے:

اول مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، موعظہ اور وعظ کے اصل معنی ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو آخرت کی فکر سامنے آجائے۔ قرآن کریم اول سے آخر تک اسی موعظہ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلّغ ہے۔ اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید، ثواب کے ساتھ عذاب، دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا ملا جُلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے، پھر اُس پر قرآن کریم کا اعجازِ بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔

مَّوْعِظَةٌ کے ساتھ مِّنْ رَّبِّكُمْ کی قید نے قرآنی وعظ کی حیثیت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعظ کسی اپنے جیسے عاجز انسان کی طرف سے نہیں جس کے ہاتھ میں کسی کا نفع و نقصان یا عذاب و ثواب کچھ نہیں، بلکہ ربِّ کریم کی طرف سے ہے جس کے قول میں غلطی کا امکان نہیں، اور جس کے وعدے اور وعید میں کسی عجز و کمزوری یا غرض کا کوئی خطرہ نہیں۔

قرآن کریم کی دوسری صفت شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ارشاد فرمائی، شفاء کے معنے بیماری دور ہونے کے ہیں، اور صُدُوْر، صدر کی جمع ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں، مراد اس سے قلب ہے۔

معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفاء کا نسخۂ اکسیر ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے، جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں (روح المعانی)

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی و جسمانی، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں، اس لئے اس جگہ ذکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیماریوں کے لئے شفا نہیں ہے۔

روایاتِ حدیث اور علمائے امت کے بیشمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لئے اکسیرِ اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک

شخص حاضر ہوا، اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ یعنی قرآن شفاء ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں (روح المعانی از ابن مردویہ)

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔

علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع بھی کر دیئے ہیں، امام غزالیؒ کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لئے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کج روی بھی ظاہر ہوگی جو قرآن کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ روحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے

ترا حاصل زیٰس ش جز ایں نیست کہ از ہم خواندنش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورۂ یٰس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے۔ حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق و معارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔

بعض اہل تحقیق مفسرین نے فرمایا کہ قرآن کی پہلی صفت یعنی موعظہ کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال کے ساتھ ہے جن کو شریعت کہا جاتا ہے، قرآن کریم ان عمل کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے، اور شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ کا تعلق انسان کے اعمال باطنہ کے ساتھ ہے، جس کو طریقت اور تصوّف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں تیسری صفت قرآن کریم کی هُدًی اور چوتھی رَحْمَةٌ بیان کی گئی ہے۔ هُدًی کے معنی ہدایت یعنی رہنمائی کے ہیں، قرآن کریم انسان کو طریق حق و یقین کی طرف دعوت

دیتا ہے، اور انسان کو بتلاتا ہے کہ آفاق عالم اور خود ان کے نفوس میں اللہ تعالیٰ نے جو اپنی عظیم نشانیاں رکھی ہیں، ان میں غور و فکر کرو تاکہ تم ان سب چیزوں کے خالق اور مالک کو پہچانو۔

دوسری آیت میں فرمایا قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ، یعنی لوگوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت ہی کو اصلی خوشی کی چیز سمجھیں اور صرف اسی چیز پر خوش ہوں، دنیا کے چند روزہ مال و متاع اور راحت و عزت درحقیقت خوش ہونے کی چیز ہی نہیں، کیونکہ اول تو وہ کتنی ہی زیادہ سی کو حاصل ہو، ادھوری ہی ہوتی ہے مکمل نہیں ہوتی، دوسرے ہر وقت اس کے زوال کا خطرہ لاحق ہے۔ اس لئے آخر آیت میں فرمایا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ، یعنی اللہ کا فضل و رحمت ان تمام مال و دولت اور عزت و سلطنت سے بہتر ہے جن کو انسان اپنی زندگی بھر کا سرمایہ سمجھ کر جمع کرتا ہے۔

اس آیت میں دو چیزوں کو فرحت و مسرت کا سامان قرار دیا ہے، ایک فضل دوسرے رحمت، ان دونوں سے مراد یہاں کیا ہے؟ اس بارے میں ایک حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی (روح المعانی از ابن مردویہ)۔

یہی مضمون حضرت براء بن عازبؓ اور ابو سعید خدریؓ سے بھی منقول ہے اور بہت سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اسلام ہے، اور مطلب اس کا بھی وہی ہے جو حدیث سابق سے معلوم ہوا کہ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی، کیونکہ اسلام اسی حقیقت کا ایک عنوان ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن کریم کی آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے، اور حاصل اس کا بھی پہلی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں کیونکہ عمل بالقرآن یا اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پیروی کے مختلف عنوانات ہیں۔

اس آیت میں مشہور قراءت کے مطابق فَلْيَفْرَحُوْا بصیغہ غائب آیا ہے، حالانکہ اس کے اصل مخاطب اس وقت کے موجودین حاضرین تھے جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ صیغہ خطاب کا استعمال کیا جاتا، جیسا کہ بعض قراءتوں میں آیا بھی ہے، مگر مشہور قراءت میں صیغہ

مخاطب استعمال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام کی رحمت عامہ صرف اس وقت کے حاضرین و موجودین کے لئے مخصوص نہیں تھی بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والی نسلوں کو بھی شامل ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرح و خوشی کا اس دنیا میں کوئی مقام ہی نہیں، ارشاد ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ یعنی خوشی میں مست نہ ہو، اللہ ایسے خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اور آیت مذکورہ میں بصیغۂ امر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے، اس ظاہری تعارض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں خوش ہونے کو منع فرمایا ہے وہاں خوشی کا تعلق متاع دنیا سے ہے، اور جہاں خوش ہونے کا حکم دیا ہے وہاں خوشی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے، دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ ممانعت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد نہیں بلکہ خوشی میں بدمست ہو جانا مراد ہے، اور اجازت کی جگہ میں مطلق خوشی مراد ہے۔

تیسری آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو حلال و حرام کے معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو دخل دیتے ہیں، اور قرآن و سنت کی سند کے بغیر جس چیز کو چاہا حلال قرار دیدیا جس کو چاہا حرام کہہ دیا، اس پر قیامت کی شدید وعید ذکر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز یا کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کا اصل مدار انسانی رائے پر نہیں بلکہ وہ خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے ان کے احکام کے بغیر کسی چیز کو نہ حلال کہنا جائز ہے نہ حرام۔

چوتھی آیت میں اللہ جل شانہ کے علم محیط اور اس کی بے مثال وسعت کا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے کہ آپ جس کام اور جس حال میں ہمیشہ ہوتے ہیں یا قرآن پڑھتے ہیں اس کا کوئی جزو ہم سے مخفی نہیں اسی طرح تمام انسان جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی ایک ذرہ بھی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر چیز کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔

بظاہر اس جگہ علم الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کو محیط ہونے کے بیان میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے کہ اگرچہ مخالف اور دشمن آپ کے بہت ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت آپ کے ساتھ ہے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ
جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے ہے خوشخبری دنیا کی

الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
زندگانی میں اور آخرت میں، بدلتی نہیں اللہ کی باتیں، یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝
بڑی کامیابی۔

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو علم الٰہی کا بیان ہوا آگے مخلصین و مطیعین کی محفوظیت کا بیان ہے کہ) یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوف ناک اور غم ناک حوادث سے بچاتا ہے اور) وہ (اللہ کے دوست) وہ ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں (یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور خوف وحزن سے ان کے محفوظ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (من جانب اللہ خوف وحزن سے بچنے کی) خوش خبری ہے (اور) اللہ کی باتوں میں (یعنی وعدوں میں) کچھ فرق ہوا نہیں کرتا (پس جب بشارت میں ان سے وعدہ کیا گیا اور وعدہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اس لئے عدمِ خوف وعدمِ حزن لازم ہے اور) یہ (بشارت جو مذکور ہوئی، بڑی کامیابی ہے۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان پھر دنیا وآخرت میں ان کے لئے بشارت کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہوجانے کا غم، اور اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی، ان کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔

اس میں چند باتیں قابلِ غور ہیں: اوّل یہ کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟

دوسرے یہ کہ اولیاء اللہ کی تعریف کیا ہے اور ان کی علامات کیا ہیں؟ تیسرے یہ کہ

دنیا و آخرت میں ان کی بشارت سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہیں ہوتا، اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آخرت میں حساب کتاب کے بعد جب ان کو ان کے مقام جنت میں داخل کر دیا جائے گا تو خوف و غم سے ان کو ہمیشہ کے لئے نجات ہو جائے گی، نہ کسی تکلیف و پریشانی کا خطرہ رہے گا نہ کسی محبوب و مطلوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہوگا، بلکہ جنت کی نعمتیں دائمی اور لازوال ہوں گی، اس معنی کے اعتبار سے تو مضمون آیت پر کوئی اشکال نہیں لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کی کوئی خصوصیت نہ رہی بلکہ تمام اہل جنت جن کو جہنم سے نجات مل گئی وہ اسی حال میں ہوں گے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ انجام کار جنت میں پہنچ گئے وہ سب اولیاء اللہ ہی کہلائیں گے، دنیا میں ان کے اعمال کتنے ہی مختلف رہے ہوں مگر دخول جنت کے بعد سب کے سب اولیاء اللہ کی ہی فہرست میں شمار ہوں گے۔

لیکن بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف و غم نہ ہونا دنیا و آخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف و غم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف و غم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں۔

مگر اس پر حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ اشکال ہے کہ دنیا میں تو یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ اولیاء اللہ تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں خوف و غم سے محفوظ نہیں بلکہ ان کا خوف و خشیت اوروں سے زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے پوری طرح علماء ہی ڈرتے ہیں، اور دوسری جگہ میں اولیاء اللہ ہی کا یہ حال بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ یعنی یہ لوگ اللہ کے عذاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں جس سے کوئی بے فکر ہو کر بیٹھ سکے۔

اور واقعات بھی یہی ہیں جیسا کہ شمائل ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حالات میں متفکر و غمگین نظر آتے تھے، اور آپ نے خود فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

صحابہ کرامؓ میں سب سے افضل حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہؓ و تابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوف آخرت کے واقعات بیشمار ہیں۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسی نے یہ فرمایا کہ حضرت اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف و غم

سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف و غم میں عام طور سے اہلِ دنیا مبتلا رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام و راحت عزت و دولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف و پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوتے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا و بلند ہوتا ہے، ان کی نظروں میں نہ دنیا کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت و کلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ؎

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے بہ پیش ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

اللہ جل شانہٗ کی عظمت و محبت اور خوف و خشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اُس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج و راحت، سود و زیاں پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے بقولِ بعض ؎

یہ ننگِ عاشقی ہیں سُود و حاصل دیکھنے والے

یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

دُوسری بات اولیاء اللہ کی تعریف اور ان کی علامات سے متعلق ہے، اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظِ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست و محب کے معنیٰ میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان و حیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آسکتی، تمام عالم کے وجود کی اصلی علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہٗ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے یہ قربِ محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں ہی اسکے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت و سکون اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایتِ خاصہ کے درجات بیشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فنار کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کر دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اُس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو۔ اسی حالت کی علامت ہے کثرتِ ذکر اور دوامِ طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مذکور ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، (مظہری از ابن مردویہ) اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجۂ ولایت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیضِ صحبت صحابۂ کرام رضہ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے

وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنّت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرتِ ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرتِ ذکر سے آئینہ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نورِ ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمرؓ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت و صحبت انسان کے لئے حصولِ ولایت کا ذریعہ ہے۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت رزینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رزینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہلِ ذکر کی مجلس و صحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کے لئے کرو (مظہری)

مگر یہ صحبت و مجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبعِ سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف و کرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں۔ اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگرچہ اس سے کبھی کوئی کشف و کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے۔ (مظہری)

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیثِ قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماء بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی

اَلَّذِیْنَ اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ، یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف وکرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف او غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ ولیاء کے لئے دنیا میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی، آخرت کی خوش خبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوش خبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوش خبری دی جائے گی جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل لا الٰہ الا اللہ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھینگے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔

اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں ہیں جو انسان خود دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لئے خوش خبری ہو۔ (رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ رضؓ)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرٰی الْمُؤْمِنِ یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مؤمن کے لئے نقد خوش خبری ہے۔ (مسلم وبغوی)

وَلَا یَحْزُنْکَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۭ هُوَ السَّمِیْعُ

اور رنج مت کر ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کے لئے ہے، وہی ہے سننے والا

الْعَلِیْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ۭ وَمَا

جاننے والا۔ سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے زمین میں، اور یہ

یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَکَآءَ ۭ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ

جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے، سو یہ کچھ نہیں مگر

إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾

پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں (یعنی ان کے کفریات سے مغموم نہ ہوں کیونکہ علم و حفاظت مذکورہ کے علاوہ) تمام تر غلبہ (اور قدرت بھی) خدا ہی کے لئے (ثابت) ہے (وہ اپنی قدرت سے حسب وعدہ آپ کی حفاظت کرے گا، وہ (ان کی باتیں) سنتا ہے (اور ان کی حالت) جانتا ہے (وہ آپ کا بدلہ ان سے خود لے لے گا) یاد رکھو کہ جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں (یعنی فرشتے اور جن و انس) یہ سب اللہ ہی کے مملوک ہیں (اس کی حفاظت یا مکافات کو کوئی روک نہیں سکتا پس باہمہ وجوہ تسلی رکھنا چاہئے) اور (اگر کسی کو شبہ ہو کہ شاید شرکاء مزاحمت کرسکیں تو اس کی حقیقت سن لو کہ) جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کر رہے ہیں (خدا جانے) کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں (یعنی ان کے اس عقیدہ کی کیا دلیل ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ بھی دلیل نہیں) محض بے سند خیال کا اتباع کر رہے ہیں اور محض خیالی باتیں کر رہے ہیں (پس واقع میں ان میں صفات الوہیت کے مثل علم و قدرت وغیرہ نہیں ہیں پھر ان میں احتمال مزاحمت کی کب گنجائش ہے)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو اس میں اور دن دیا دکھلانے والا بیشک

فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ

اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، کہتے ہیں ٹھہرا لیا اللہ نے بیٹا

سُبْحَانَهُ ۖ هُوَ الْغَنِيُّ ۖ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنْ

وہ پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، نہیں

عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ بِهَٰذَا ۚ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

تمہارے پاس کوئی سند اس کی، کیوں جھوٹ کہتے ہو اللہ پر جس بات کی تم کو خبر نہیں،

قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ

کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ بھلائی نہیں پاتے تھوڑا سا نفع

فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ

اٹھالینا دنیا میں پھر ہماری طرف ان کو لوٹنا ہے پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت عذاب

بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

بدلہ ان کے کفر کا۔

خلاصۂ تفسیر

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن بھی اس طور پر بنایا کہ (بوجہ روشن ہونے کے، دیکھنے بھالنے کا ذریعہ ہے، اس (بنانے) میں دلائل (توحید) ہیں ان لوگوں کے لئے جو (تدبر کے ساتھ ان مضامین کو) سنتے ہیں، (مشرکین ان دلائل میں غور نہیں کرتے اور شرک کی باتیں کرتے ہیں چنانچہ) وہ کہتے ہیں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیسی سخت بات کہی) وہ تو کسی کا محتاج نہیں (اور سب اس کے محتاج ہیں)، اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (پس سب مملوک ہوئے اور وہ مالک ہوا پس ثابت ہوا کہ کمالات میں کوئی اس کا مشابہ ومجانس نہیں پس اگر اولاد کو اللہ کا مجانس یعنی ہم جنس کہا جائے تو مجانست باطل ہو چکی اور اگر غیر مجانس کہو تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے اور عیوب سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، جیسا سُبْحٰنَهٗ میں اس طرف اشارہ بھی ہے پس اولاد کا ہونا مطلقاً باطل ہو گیا، ہم نے جو نفی اولاد کا دعویٰ کیا تھا اس پر تو ہم نے دلیل تمام کر دی ہے، اب رہا تمہارا دعویٰ سو) تمہارے پاس (بجز بیہودہ دعویٰ کے، اس (دعویٰ) پر کوئی دلیل بھی نہیں (تو) کیا اللہ کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم (کسی دلیل سے) علم نہیں رکھتے آپ (ان کا مفتری ہونا ثابت کرکے اس افتراء کی وعید سنانے کے لئے) کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں (جیسے مشرکین) وہ (کبھی) کامیاب نہ ہوں گے، (اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو ایسوں کو دنیا میں خوب کامیاب اور آرام و راحت میں پاتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ) یہ دنیا میں (چند روزہ) تھوڑا سا عیش ہے (جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے) پھر (مر کر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہے پھر (آخرت میں) ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سزائے سخت (کا مزہ) چکھا دیں گے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ

اور سنا ان کو حال نوح کا، جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے تم پر

مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ

میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام

وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوٓا اِلَيَّ

اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ

وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ

اور مجھ کو مہلت نہ دو ، پھر اگر منہ پھیرو گے تو میں نے نہیں چاہی تم سے مزدوری ، میری

اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

مزدوری ہے اللہ پر ، اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں فرماں بردار ،

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ

پھر اس کو جھٹلایا سو ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو قائم کر دیا جگہ پر

وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اور ڈبا دیا ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو ، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام

الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

ان کا جن کو ڈرایا تھا ۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنائیے (جو کہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا (یعنی وعظ گوئی کی حالت میں رہنا) اور احکامِ خداوندی کی نصیحت کرنا بھاری (اور ناگوار) معلوم ہوتا ہے تو (ہوا کرے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا کیونکہ) میرا تو خدا ہی پر بھروسہ ہے سو تم (میرے ضرر پہنچانے کے متعلق) اپنی تدابیر (جو کچھ کر سکو) مع اپنے شرکاء (یعنی بتوں) کے پختہ کر لو (یعنی تم اور تمہارے معبود سب مل کر میری ضرر رسانی میں اپنا ارمان نکال لو) پھر تمہاری وہ تدبیر تمہاری گھٹن (اور دل تنگی) کا باعث نہ ہونا چاہئے (یعنی اکثر خفیہ تدبیر سے طبیعت گھٹا کرتی ہے، سو خفیہ تدبیر کی ضرورت نہیں، جو کچھ تدبیر کرو دل کھول کر علانیہ کرو، میرا نہ لحاظ پاس کرو اور نہ میرے چلے جانے نکل جانے کا اندیشہ کرو کیونکہ اتنے آدمیوں کے پہرہ میں سے ایک آدمی کا نکل جانا بھی مستبعد ہے پھر اخفا کی کیا ضرورت ہے) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا ہے) کر گزرو اور مجھ کو (ذرا) مہلت نہ دو (حاصل یہ کہ میں تمہاری ان باتوں سے نہ ڈرتا ہوں اور نہ تبلیغ سے رک سکتا ہوں یہاں تک تو نفی خوف کی فرمائی، آگے نفی طمع کی فرماتے ہیں، یعنی) پھر بھی اگر تم

اعراض ہی کئے جاؤ تو یہ سمجھو کہ میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا اور میں تم سے کیوں مانگتا کیونکہ، میرا معاوضہ تو صرف (حسب وعدۂ کرم) اللہ ہی کے ذمہ ہے (غرض نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خواہش رکھتا ہوں) اور (چونکہ) مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں رہوں (اس لئے تبلیغ میں حکم کی تعمیل رکھتا ہوں اگر تم نہ مانوگے میرا کیا نقصان ہے) سو (باوجود اس موعظہ بلیغہ کے بھی) وہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے پس (اس پر عذاب طوفان کا مسلط ہوا اور) ہم نے (اس عذاب سے) ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے ان کو نجات دی اور ان کو (زمین پر) آباد کیا اور (باقی جو لوگ رہ گئے تھے) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو (اس طوفان میں) غرق کر دیا، سو دیکھنا چاہئے کیسا (برا) انجام ہوا ان لوگوں کا جو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے جا چکے تھے (یعنی بے خبری میں ہلاک نہیں کئے گئے، پہلے کہہ دیا، سمجھا دیا، نہ مانا سزا پائی)۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

پھر بھیجے ہم نے نوح کے بعد کتنے پیغمبر ان کی قوم کی طرف پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى

سو ان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے آئیں اس بات پر جس کو جھٹلا چکے تھے پہلے سے، اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں

قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

دلوں پر حد سے نکل جانے والوں کے۔

خلاصۂ تفسیر

پھر نوح (علیہ السلام) کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، سو وہ ان کے پاس معجزات لے کر آئے، مگر پھر (بھی ان کی ضد و ہٹ کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اول (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ نہ ہوا کہ پھر اس کو مان لیتے اور جیسے یہ لوگ دل کے سخت تھے، اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس

بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ

اپنی نشانیاں دے کر پھر تکبر کرنے لگے اور وہ تھے لوگ گنہگار، پھر جب پہنچی ان کو سچی بات

مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ

ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ تو جادو ہے کھلا ۔ کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو

لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا

حق بات کو جب وہ پہنچی تمہارے پاس، کیا یہ جادو ہے ، اور نجات نہیں پاتے جادو کرنے والے ۔ بولے

اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا

کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو

الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ

سرداری مل جائے اس ملک میں ، اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے اور بولا

فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ

فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا ، پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو

مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى

موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو ، پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا

مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ

کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے ، اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے ، بیشک اللہ نہیں سنوارتا شریروں

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

کے کام ، اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں گنہگار

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورہ) پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنے معجزات، عصا اور ید بیضاء دے کر بھیجا سو انہوں نے (دعوے کے ساتھ ہی ان کی تصدیق کرنے سے) تکبر کیا (اور طلب حق کے لئے غور بھی تو نہ کیا) اور وہ لوگ جرائم کے خوگر تھے (اس لئے اطاعت نہ کی) پھر جب (بعد دعوی کے) ان کو ہمارے پاس سے نبوت موسویہ پر صحیح دلیل پہنچی (مراد اس سے معجزہ ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یقیناً یہ صریح جادو ہے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اس صحیح دلیل کی نسبت جب کہ وہ تمہارے پاس پہنچی ایسی بات کہتے ہو کہ یہ جادو ہے، کیا یہ جادو ہے، حالانکہ جادوگر (جب کہ دعوائے نبوت کریں تو اظہار معجزہ میں) کامیاب نہیں ہوا کرتے (اور میں کامیاب ہوا کہ اول دعوی کیا پھر معجزات ظاہر کر دیئے) وہ لوگ (اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکے، ویسے ہی براہ جہالت)

کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے اور (اس لئے آئے ہو کہ) تم دونوں کو دنیا میں ریاست (اور سرداری) مل جاوے اور (تم خوب سمجھ لو کہ) ہم تو تم دونوں کو کبھی نہ مانیں گے، اور فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا کہ میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو (جو ہمارے قلمرو میں ہیں) حاضر کرو (چنانچہ جمع کئے گئے) سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے، سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو یہ ہے (نہ وہ جس کو فرعون والے جادو کہتے ہیں) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا (جو معجزہ کے ساتھ مقابلہ سے پیش آویں، اور اللہ تعالیٰ جس طرح اہل باطل کے باطل کو بمقابلہ معجزاتِ حقہ کے باطل کر دیتا ہے اسی طرح دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق (کہ اثبات نبوت انبیاء کے متعلق ہیں) ثابت کر دیتا ہے گو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ

پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی قوم کے ڈرتے ہوئے فرعون سے

وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ

اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں ان کو بچلا نہ دے، اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں، اور اس نے

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ

ہاتھ چھوڑ رکھا ہے، اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر

فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ

تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرمانبردار، تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

اے رب ہمارے نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا، اور چھڑا دے ہم کو مہربانی کرکے

مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

ان کافر لوگوں سے۔

خلاصۂ تفسیر

پس (جب عصا کا معجزہ ظاہر ہوا تو) موسیٰ (علیہ السلام) پر (ابتداءً شروع میں) ان

کی قوم میں سے صرف تھوڑے سے آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں (ظاہر ہونے پر) ان کو تکلیف (نہ) پہنچا دے اور واقع میں (ڈرنا ان کا بےجا نہ تھا کیونکہ) فرعون اس ملک میں زور (سلطنت) رکھتا تھا اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد (انصاف) سے باہر ہو جاتا تھا، (ظلم کرنے لگتا تھا پھر جو شخص حکومت کے ساتھ ظلم کرتا ہو اس سے تو ڈر لگتا ہی ہے)، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (جب ان کو خائف دیکھا تو ان سے) فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم (سچے دل سے) اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو (سوچ بچار مت کرو بلکہ) اسی پر توکل کرو اگر تم (اس کی) اطاعت کرنے والے ہو، انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا (بعد اس کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالم لوگوں کا تختہ مشق نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت کے صدقے ان کافروں سے نجات دے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۷

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو اور قائم کرو نماز اور خوشخبری دے ایمان والوں کو

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا

اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو رونق اور مال

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓي

دنیا کی زندگی میں اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے اے رب مٹا دے

اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ

ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب

الْاَلِيْمَ ۝۸۸ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰۗنِّ

دردناک فرمایا قبول ہو چکی دعا تمہاری سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو

سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ

راہ ان کی جو ناواقف ہیں، اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ

پھر پیچھا کیا ان کا فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدی سے یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ

بولا یقین کرلیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر ایمان لائے بنی اسرائیل

وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ

اور میں ہوں فرماں برداروں میں، اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور رہا

مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

گمراہوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (اس دعا کے قبول کرنے کا سامان کیا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے بھائی (ہارون علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو (یعنی وہ ڈر کر گھر نہ چھوڑیں ہم ان کے محافظ ہیں) اور (نماز کے اوقات میں) تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو (مسجد کی حاضری خوف کی وجہ سے معاف ہے) اور (یہ ضروری ہے کہ) نماز کے پابند رہو (تاکہ نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ جلدی اس مصیبت سے چھڑا دے) اور (اے موسیٰ) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں (کہ اب جلدی یہ مصیبت ختم ہوجاوے گی)، اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہوچکی تو اب ان کے اموال اور نفوس کو کیوں باقی رکھا جاوے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کردیجئے اور (ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کردیجئے اس طرح کہ) ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کردیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہوجاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہوکر اس) کو دیکھ لیں (سو اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا، موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے۔ کذا فی الدر المنثور) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی (کیونکہ آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہونا ہے یعنی ہم ان کے اموال و نفوس اب ہلاک کرنے والے ہیں) سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو (یعنی گو ہدایت ان کی تقدیر میں نہ ہو مگر تبلیغ میں تمہارا تو فائدہ ہے) اور ان لوگوں

کی راہ نہ چلنا جن کو ہمارے وعدے کے سچے ہونے کا یا توقف میں حکمت ہونے کا یا تبلیغ کے ضروری ہونے کا، علم نہیں (یعنی ہمارے وعدہ کو سچا سمجھو اور اگر بلکت میں دیر ہو جاوے اس میں حکمت سمجھو اور اپنے منصبی کام میں لگے رہو) اور (جب ہم نے فرعون کو ہلاک کرنا چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے باہر نکال لے جائیے، چنانچہ وہ سب کو لے کر چلے اور رستہ میں دریائے شور حائل ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے اس میں راستہ ہوگیا اور) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون مع اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادہ سے (دریا میں، چلا (کہ دریا سے نکل کر ان سے قتل وقتال کرے لیکن وہ دریا سے پار نہ ہوسکا) یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہوکر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں (سو مجھ کو اس غرق سے اور عذاب آخرت سے نجات دی جاوے فرشتہ کے ذریعہ سے) جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے (جبکہ معائنہ آخرت کا شروع ہوگیا) اور (معائنہ آخرت کے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل و قوم فرعون کے کچھ حالات اور ان سے متعلقہ احکام مذکور ہیں، پہلی آیت میں ایک خاص واقعہ سے متعلق حکم ہے وہ یہ کہ بنی اسرائیل جو دین موسوی پر عامل تھے یہ سب عام عادت کے مطابق نمازیں صرف اپنے صومعوں، عبادت گاہوں، میں ادا کرتے تھے، اور پچھلی امتوں کے لئے حکم بھی یہی تھا کہ ان کی نماز اپنے گھروں میں ادا نہیں ہوتی تھی، یہ خصوصی سہولت امت محمدیہ کو عطا ہوئی کہ ہر جگہ جہاں چاہیں نماز ادا کرلیں، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چند خصوصیات میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجدوں میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنت مؤکدہ قرار دیا گیا۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں، فرعون جوان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتا اور ان پر ظلم ڈھاتا تھا، اس نے یہ دیکھ کر ان کے تمام عبادت خانوں کو مسمار کر دیا تاکہ یہ اپنے

مذہب کے مطابق نماز پڑھ سکیں، اس پر حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دونوں پیغمبروں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو وہ حکم دیا جو اس آیت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کیلئے مصر میں مکان نئے بنائے جائیں اور ان مکانات کا رُخ قبلہ کی طرف ہو تاکہ وہ انہیں مکانات میں نماز ادا کرسکیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں میں اگرچہ عام حکم یہی تھا کہ نمازیں صرف عبادتخانوں میں پڑھی جائیں، لیکن اس خاص حادثہ کی وجہ سے بنی اسرائیل کے لئے اس کی عارضی اجازت دے دی گئی کہ گھروں ہی میں نماز ادا کرلیا کریں اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف سیدھا رکھیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ضرورت کے وقت بھی ان کو مخصوص گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا رُخ قبلہ کی طرف کیا گیا تھا، عام گھروں اور عام مقامات پر نماز کی اجازت اس وقت بھی نہیں تھی، جس طرح امت محمدیہ کو شہر اور جنگل کے ہر مقام پر نماز ادا کرنے کی سہولت حاصل ہے (روح)

یہاں یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کو جس قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد کونسا قبلہ ہے، کعبہ یا بیت المقدس؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کا قبلہ تھا، (قرطبی و روح) بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔

اور جس حدیث میں یہ ارشاد ہے کہ یہود اپنی نمازوں میں صخرہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں اس کو اس زمانہ پر محمول کیا جائے گا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوگئے، یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ قیام مصر کے زمانہ میں آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی ہو۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے لئے استقبال قبلہ کی شرط انبیاء سابقین کے زمانہ میں بھی تھی، اسی طرح طہارت اور ستر عورت کا تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرط نماز ہونا بھی معتبر روایات سے ثابت ہے۔

گھروں کو قبلہ رُخ بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان میں نمازیں ادا کی جائیں اس لئے اس کے بعد اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم دے کر یہ ہدایت کردی گئی کہ اگر فرعون عبادت گاہوں میں نماز ادا کرنے سے روکتا ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی اپنے گھروں میں ادا کرو۔

آخر آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرکے حکم دیا گیا کہ مومنین کو آپ خوشخبری

سنادیں کہ ان کا مقصود پورا ہوگا، دشمن پر ان کو غلبہ نصیب ہوگا اور آخرت میں جنت ملے گی۔ (روح)

آیت کے شروع میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بصیغۂ تثنیہ خطاب کیا گیا کیونکہ مکانات قبلہ رُخ کر کے اُنمیں نماز پڑھنے کی اجازت انہیں کا کام تھا، اُس کے بعد بصیغۂ جمع سب بنی اسرائیل کو شامل کر کے اقامت نماز کا حکم دیا گیا کیونکہ اس حکم میں پیغمبر اور امت سب داخل ہیں، آخر میں بشارت دینے کا حکم خاص موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا کیونکہ اصل صاحب شریعت نبی آپ ہی تھے، بشارتِ جنت دینے کا آپ ہی کو حق تھا۔

دوسری آیت میں قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کا ذکر ہے جس کے شروع میں انہوں نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کیا ہے کہ آپ نے قوم فرعون کو زینت دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت بہت عطا فرما رکھا ہے، مصر سے لے کر ارض حبشہ تک سونے چاندی اور زبرجد وزمرد یاقوت وغیرہ جواہرات کی کانیں عطا فرما رکھی ہیں (قرطبی)، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تیرے راستے سے گمراہ کرتے ہیں، کیونکہ عام لوگ ان کے ظاہری ساز و سامان اور عیش و راحت کو دیکھ کر اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ گمراہی پر ہوتے تو ان کو اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں کیوں ملتیں، کیونکہ عام لوگوں کی نظریں اس حقیقت تک نہیں پہنچتیں کہ دنیا کا فروغ بغیر نیک عمل کے کسی انسان کے حق پر ہونے کی علامت نہیں ہو سکتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کی اصلاح سے مایوس ہونے کے بعد ان کے مال و دولت سے دوسروں کی گمراہی کا خطرہ محسوس کر کے بددعا کی، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ یعنی اے میرے پروردگار ان کے اموال کی صورت بدل کر مسخ و بیکار کر دے۔

حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ اس دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قوم فرعون کے تمام زر و جواہرات اور نقد سکے اور باغوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ایک تھیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔

ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام پھلوں، ترکاریوں اور غلّہ کو پتھر بنا دیا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی اُن نو آیات (معجزات) میں سے ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ۔

دوسری بددعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے یہ کی، وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ، یعنی اے پروردگار ان کے دلوں کو ایسا سخت

کر دے کہ ان میں ایمان اور کسی خیر کی صلاحیت ہی نہ رہے تاکہ وہ عذاب الیم آنے سے پہلے ایمان نہ لاسکیں۔

یہ بددُعا بظاہر ایک رسول و پیغمبر کی زبان سے بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر کا وظیفۂ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایمان و عملِ صالح کی طرف دعوت دیں اور اس کے لئے تدبیریں کریں۔

مگر یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساری تدبیریں کرنے کے بعد ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے اور اب چاہتے تھے کہ یہ اپنے اعمال کی سزا دیکھیں، اس میں یہ احتمال تھا کہ کہیں یہ لوگ عذاب کو دیکھ کر ایمان کا اقرار نہ کرلیں اور اس طرح عذاب ٹل جائے، اس لئے کفر سے بغض و نفرت اس دعا کا سبب بنی۔ جیسے فرعون غرق ہونے کے وقت ایمان کا اقرار کرنے لگا تو جبریل امین نے اس کا منہ بند کر دیا کہ کہیں رحمتِ الٰہی متوجہ ہو کر یہ عذاب سے نہ بچ جائے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بددعا درحقیقت بددعا نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے شیطان پر لعنت کہ وہ تو نصِ قرآن خود ہی ملعون ہے جس پر لعنت کرنے کا منشا اس کے سوا نہیں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت مسلط کردی ہم بھی اس پر لعنت کرتے ہیں اس صورت میں مطلب اس کا یہ ہوگا کہ ان کے دلوں کا سخت اور ناقابل ایمان و اصلاح ہونا من جانب اللہ مقرر ہو چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بصورتِ بددعا اس کا اظہار فرمایا۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کو بیان فرمایا ہے مگر عنوان میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شریک دعا قرار دے کر یہ خطاب کیا گیا قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی، وجہ یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دُعا کر رہے تھے تو حضرت ہارون آمین کہتے جاتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی دعا پر آمین کہنا بھی دعا ہی میں داخل ہے، اور چونکہ دعا کا مسنون طریقہ قرآن کریم میں آہستہ آواز سے کرنے کا بتلایا گیا ہے تو اس سے آمین کو بھی آہستہ کہنے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

اس آیت میں قبولیت دُعا کی اطلاع ان دونوں پیغمبروں کو دیدی گئی، مگر تھوڑا سا امتحان ان کا بھی لیا گیا کہ قبولیت دعا کا اثر بقول بغوی چالیس سال بعد ظاہر ہوا، اسی لئے اس آیت میں قبولیت دعا کے ذکر کے ساتھ ان دونوں حضرات کو یہ بھی ہدایت کردی گئی کہ فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ، یعنی اپنے کام منصبی دعوت و تبلیغ میں لگے رہیں، قبولیت دعا کا اثر دیر میں ظاہر ہو تو جاہلوں کی طرح جلد بازی نہ کریں۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشہور معجزہ عبورِ دریا کا اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، یعنی جب اس کو غرقابی نے پکڑ لیا تو بول اٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اطاعت کرنے والوں میں سے ہوں۔

پانچویں آیت میں خود حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اس کا یہ جواب آیا ہے آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ، یعنی کیا اب تم مسلمان ہوتے ہو جب کہ ایمان و اسلام کا وقت گزر چکا۔

اس سے ثابت ہوا کہ عین موت کے وقت کا ایمان لانا شرعاً معتبر نہیں، اس کی مزید تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتے رہتے ہیں جب تک غرغرۂ موت کا وقت نہ آجائے۔ (ترمذی)

غرغرۂ موت سے مراد وہ وقت ہے جب نزعِ روح کے وقت فرشتے سامنے آجاتے ہیں اس وقت دارالعمل دنیا کی زندگی ختم ہو کر آخرت کے احکام شروع ہو جاتے ہیں، اس لئے اس وقت کا کوئی عمل قابلِ قبول نہیں، نہ ایمان نہ کفر، ایسے وقت جو ایمان لاتا ہے اس کو بھی مومن نہیں کہا جائے گا اور اس کے ساتھ کفن دفن میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہ کیا جائے گا جیسا کہ فرعون کے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ بالاجماع فرعون کی موت کفر پر قرار دی گئی ہے نصوصِ قرآن سے بھی یہی واضح ہے اور جس کسی نے فرعون کے اس ایمان کو معتبر کہا ہے یا تو اس کی کوئی تاویل کی جائے ورنہ لئے غلط کہا جائے گا۔ (روح)

اسی طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزعِ روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمہ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کلمہ ان کی زبان سے نکلا، یہ تھا لوگ اس کو کلمہ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت روح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی کہ یہ وقت نزعِ روح کا اور غرغرۂ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ وَإِنَّ

سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی، اور بیشک

كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ﴿٩٢﴾ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي

بہت لوگ ہماری قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے، اور جگہ دی ہم نے

إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا

بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی

حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا

یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر، بیشک تیرا رب ان میں فیصلہ کرے گا قیامت کے دن جس

كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾ فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ

بات میں کہ ان میں پھوٹ پڑی، سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری ہم نے تیری طرف

فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن

تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات

رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ

تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا، اور مت ہو ان میں جنہوں نے

كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ

جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا، جن پر ثابت ہو چکی

كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ

بات تیرے رب کی وہ ایمان نہ لائیں گے اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک نہ دیکھ لیں عذاب

الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا

دردناک، سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا ان کو ایمان لانا مگر

قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ

یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی اٹھا لیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دنیا کی

الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

زندگانی میں اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک۔

خلاصۂ تفسیر

سو (بجائے نجات مطلوب کے) آج ہم تیری لاش کو پانی میں تہ نشین ہونے سے،

نجات دیں گے تاکہ تو ان کے لئے موجب عبرت ہو جو تیرے بعد موجود ہیں کہ تیری بدحالی اور تباہی دیکھ کر مخالفت احکام الٰہیہ سے بچیں، اور حقیقت یہ ہے کہ (پھر بھی) بہت سے آدمی ہماری ایسی ایسی عبرتوں سے غافل ہیں (اور مخالفت احکام سے نہیں ڈرتے اور ہم نے (غرقِ فرعون کے بعد) بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا (کہ اس وقت تو مصر کے مالک ہوگئے اور ان کی اولاد ہی نسل کو بیت المقدس اور ملک شام عمالقہ پر فتح دے کر عطا فرمایا) اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں کھانے کو دیں (مصر میں بھی جنت وعیون تھے اور شام کی نسبت بٰرَكْنَا فِيهَا آیا ہے، سو چاہئے تھا کہ ہماری اطاعت میں زیادہ سرگرم رہتے لیکن انہوں نے اُلٹا دین میں اختلاف کرنا شروع کیا اور غضب یہ کہ) انہوں نے (جہل کی وجہ سے) اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کے پاس (احکام کا) علم پہنچ گیا (تھا، پھر اختلاف کیا آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ) یقینی بات ہے کہ آپ کا رب ان (اختلاف کرنے والوں) کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ (عملی) کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (اثبات حقیقت دین محمدی کے واسطے ہم ایک ایسا کافی طریقہ بتلاتے ہیں کہ غیر صاحب وحی کے لئے تو کیسے کافی نہ ہوگا وہ ایسا ہے کہ آپ صاحب وحی ہیں مگر آپ سے بھی اگر اس کا خطاب بطور قضیہ شرطیہ کے کیا جاوے تو ممکن ہے اس طرح سے کہ اگر (بالفرض) آپ اس (کتاب) کی طرف سے شک (وشبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو (اس شک کے دفع کا ایک سہل طریقہ یہ بھی ہے کہ) آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں (مراد توریت وانجیل ہیں وہ من حیث القراءۃ اس کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس قرآن کے صدق کو بتلا دیں گے) بیشک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں اور نہ (شک کرنے والوں سے بڑھ کر) ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، کہیں آپ (نعوذ باللہ) تباہ نہ ہوجاویں یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی (یہ ازلی) بات (کہ یہ ایمان نہ لاویں گے) ثابت ہوچکی ہے وہ (کبھی) ایمان نہ لاویں گے گو ان کے پاس تمام دلائل (ثبوت حق کے) پہنچ جاویں، جب تک کہ عذاب دردناک کو نہ دیکھ لیں (مگر اس وقت ایمان نافع نہیں ہوتا) چنانچہ (جن بستیوں پر عذاب آچکا ہے ان میں سے) کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا (کیونکہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق نہ ہوئی تھی) ہاں مگر یونس (علیہ السلام) کی قوم (کہ ان کے ایمان کے ساتھ مشیت متعلق ہوئی تھی، اس لئے وہ عذاب موعود کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے اور) جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی

ہیں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت خاص (یعنی وقت موت تک (خیر خوبی کے ساتھ) عیش دیا (پس اور قوموں کا ایمان نہ لانا اور قوم یونس علیہ السلام کا ایمان لانا دونوں مشیت سے ہوئے

معارف ومسائل

پہلی آیت میں فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ غرقابی کے بعد ہم تیرے بدن کو پانی سے نکال دیں گے، تاکہ تیرا یہ بدن پچھلے لوگوں کے لئے قدرتِ خداوندی کی نشانی اور عبرت بن جائے۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ دریا سے عبور کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس قدر مرعوب مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونۂ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ جبل فرعون کے نام سے معروف ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں، اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈالدیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ بہت سے لوگ ہماری آیتوں اور نشانیوں سے غافل ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے ورنہ عالم کے ہر ذرہ ذرہ میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت میں فرعون کے انجام بد کے بالمقابل اس قوم کا مستقبل دکھلایا ہے جس کو فرعون نے حقیر و ذلیل بنا رکھا تھا، فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا کہ

پورا ملک مصر بھی ان کو مل گیا اور اردن و فلسطین کی زمین مقدسہ بھی ان کو مل گئی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے لئے میراث بنا دیا تھا، اچھے ٹھکانے کو قرآن میں مُبَوَّأَ صِدْقٍ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، صِدْق کے معنی اس جگہ صالح اور مناسب کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ایسا ٹھکانا ان کو دیا جو ان کے لئے ہر اعتبار سے لائق اور مناسب تھا پھر فرمایا کہ ہم نے اُن کو حلال پاک چیزوں سے رزق دیا، دنیا کی تمام لذتیں اور راحتیں ان کو عطا فرما دیں۔

آخر آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے کہ ان میں بھی بہت سے لوگوں نے اقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے تورات میں جو نشانیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے یہی لوگ ایمان لاتے، مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخر الزمان پر اعتقاد رکھتے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کا وقت قریب ہونے کی خبریں لوگوں کو بتایا کرتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخر الزمان کا وسیلہ دے کر دعا کیا کرتے تھے مگر جب نبی آخر الزمان اپنی پوری شہادتوں کے ساتھ اور تورات کی بتلائی ہوئی نشانیوں کے ساتھ تشریف لائے تو یہ لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگے، کچھ لوگ ایمان لائے باقیوں نے انکار کیا، اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کو لفظ جَآءَهُمُ الْعِلْمُ سے تعبیر کیا ہے، یہاں علم سے مراد یقین بھی ہو سکتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ جب مشاہدہ کے ساتھ یقین کے اسباب جمع ہوگئے تو یہ لوگ مختلف ہونے لگے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ علم سے مراد معلوم ہے یعنی جب وہ حق سامنے آگیا جو تورات کی پیشین گوئیوں کے ذریعہ پہلے سے معلوم تھی تو اب لگے اختلاف کرنے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کے اختلاف کا فیصلہ فرما دیں گے حق و باطل نکھر جائے گا، اہل حق جنت میں اور اہل باطل دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

تیسری آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں، اس لئے اس خطاب کے ذریعہ مقصود امت کو سنانا ہے خود آپ مقصود نہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہو کہ اے انسان اگر تجھ کو اس وحی الٰہی میں کوئی شک ہے جو بواسطہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف بھیجی گئی تو تو ان لوگوں سے دریافت کر جو تجھ سے پہلے اللہ کی کتاب تورات و انجیل پڑھتے تھے

وہ تجھے بتلائیں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری دیتی آئی ہیں، جس سے تیرے وساوس دُور ہوجائیں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو دین کے معاملہ میں کوئی شبہ پیش آجائے تو اس پر لازم ہے کہ علماءِ حق سے سوال کرکے اپنے شبہات دور کرے اُن کی پرورش نہ کرتا رہے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیتوں میں اسی مضمون کی تائید وتاکید اور غفلت برتنے والوں کو تنبیہ ہے۔

ساتویں آیت میں غفلت شعار منکرین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو، انکار وسرکشی سے اب بھی باز آجاؤ، ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کروگے تو توبہ قبول نہ ہوگی، ایمان لاؤ گے تو ایمان مقبول نہ ہوگا اور وہ وقت وہ ہوگا جبکہ موت کے وقت آخرت کا عذاب سامنے آجائے، اسی سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا جس میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لے آتیں کہ ان کا ایمان ان کو نفع دیتا یعنی موت کے وقت یا وقوع عذاب اور مبتلاءِ عذاب ہوچکنے کے بعد یا قیامت کے وقت جب کہ توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا کسی کی توبہ اور ایمان مقبول نہ ہوگا، اُس سے پہلے پہلے اپنی سرکشی سے باز آجاتیں اور ایمان لے آتیں بجز قوم یونس علیہ السلام کے کہ انہوں نے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جب خدا تعالیٰ کا عذاب آتا دیکھا تو فوراً توبہ کرلی اور ایمان لے آئے جس کی وجہ سے ہم نے اُن سے ہوا کرنے والا عذاب ہٹا لیا۔

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہوسکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اور عذاب آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہوگا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہوکر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہوجانا عام ضابطہ الہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ اُنہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کرلی، بخلاف فرعون اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرہ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

قوم یونس علیہ السلام کے واقعہ کی ایک نظیر خود قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا وہ واقعہ ہے جس میں کوہ طور کو ان کے سروں پر معلّق کر کے ان کو ڈرایا گیا اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا انہوں نے توبہ کرلی تو وہ توبہ قبول ہوئی، جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آیا ہے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا — ہم نے ان کے سروں پر کوہ طور کو معلق کر کے حکم دیا کہ جو احکام

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ۔ — نہیں دیئے گئے ہیں ان کو مضبوطی سے پکڑو۔

وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عذاب کے واقع ہونے اور موت میں مبتلا ہونے سے پہلے محض عذاب کا اندیشہ دیکھ کر توبہ کرلی تھی، اسی طرح قوم یونس علیہ السلام نے عذاب کو آتا ہوا دیکھ کر اخلاص اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ کرلی جس کی تفصیل آگے آتی ہے تو اس توبہ کا قبول ہوجانا ضابطہ مذکورہ کے خلاف نہیں (قرطبی)

اس جگہ بعض معاصرین سے ایک سخت غلطی ہوئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف فریضہ رسالت ادا کرنے میں کوتاہیوں کی نسبت کردی اور قوم سے عذاب ہٹ جانے کا سبب پیغمبر کی کوتاہی کو قرار دیا، اور اسی کوتاہی کو سبب عتاب بنایا جس کا ذکر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفٰت میں آیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لئے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا، قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو سوفت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کرلیتا پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا" (تفہیم القرآن مولانا مودودی صاحب ص ۳۱۲ ج ۲ طبع ۱۹۶۲ء)

یہاں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مسلّمہ عقیدہ ہے جس پر تمام اُمت کا اجماع ہے، اسکی تفصیلات میں کچھ جزوی اختلاف بھی ہے کہ یہ عصمت ہر قسم کے صغیرہ گناہوں سے ہے یا صرف کبیرہ سے اور

---

[1] تفہیم القرآن کے بعد کے ایڈیشنوں میں اس عبارت سے کسی رجوع کے اعلان کے بغیر یہاں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے یعنی فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی" کے الفاظ نئی عبارت میں موجود نہیں ہیں، لیکن یہ بات اب بھی عبارت میں باقی ہے کہ جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اسکی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔ لہٰذا تفہیم القرآن کی عبارت میں تبدیلی کے باوجود معارف القرآن کا تبصرہ علیٰ حالہ برقرار ہے۔ ناشر شعبان، اکتوبر ۱۹۹۱ء

یہ کہ عصمت قبل نبوت کے زمانے کو بھی شامل ہے یا نہیں، لیکن اس میں کسی فرقہ کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے، کیونکہ نبیاء کے لئے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ جس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں، یہ تو فرض منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے، اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔

قرآن وسنت کے مسلم اصول اور اجماعی عقیدہ عصمت انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن وحدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصول مسلمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر ومعنیٰ کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی جس سے وہ قرآن وحدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم ومختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنف موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفہ یونسؑ کی تفصیلات کے حوالے سے پیش کیا ہے وہ صحیفہ یونسؑ میں ہو تو ہو جس کا اہل اسلام میں کوئی اعتبار نہیں، قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے، پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ قوم یونس علیہ السلام سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا جو خود اسی آیت کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہل تحقیق ائمہ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، اس کے ساتھ یہ فرض کر لیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقع پر اس لئے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں، اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا کہ پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کر دیا گیا تھا، وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضہ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگر ذرا بھی غور وانصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ قرآن وحدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔

خود آیت قرآن کے سباق پر غور کیجئے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ۔

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطور اظہار افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہو گئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان قبول ہو جاتا، مگر قوم یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثار عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے

پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہوگئی۔

آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان کا ایمان اور توبہ قبول کر لی گئی ہے۔

اکثر مفسرین بحر محیط، قرطبی، زمخشری، مظہری، روح المعانی وغیرہ نے آیت کا یہی مفہوم لکھا ہے جس میں قوم یونسؑ کی توبہ قبول ہونا عام قانون الٰہی کے تحت ہے۔ قرطبی کے الفاظ یہ ہیں:

وقال ابن جبیر غشیہم العذاب کما یغشی الثوب القبر فلما صحت توبتہم رفع اللہ عنہم العذاب وقال الطبری خص قوم یونسؑ من بین سائر الامم بان تیب علیہم بعد معاینۃ العذاب وذکر ذلک عن جماعۃ من المفسرین وقال الزجاج انہم لم یقع بہم العذاب وانما رأوا العلامۃ التی تدل علی العذاب ولو رأوا عین العذاب لما نفعہم ایمانہم۔ قلت قول الزجاج حسن فان المعاینۃ التی لا تنفع التوبۃ معہا ھی التلبس بالعذاب کقصۃ فرعون ولہذا جاء بقصۃ قوم یونسؑ علی اثر قصۃ فرعون ویعضد ھذا قولہ علیہ السلام ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر والغرغرۃ الحشرجۃ وذلک ھو حال التلبس بالموت وقد روی معنی ما قلناہ عن ابن مسعودؓ (الیٰ) وھذا یدل علی ان توبتہم قبل رؤیۃ العذاب (الیٰ) وعلی ھذا فلا اشکال ولا تعارض ولا خصوص۔

ترجمہ: ابن جبیر کہتے ہیں کہ عذاب نے ان کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے قبر پر چادر، پھر چونکہ ان کی توبہ صحیح ہوئی اور وقوع عذاب سے پہلے تھی، تو ان کا عذاب اٹھا دیا گیا، طبری فرماتے ہیں کہ قوم یونسؑ کو تمام اقوام عالم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ معاینہ عذاب کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی۔ زجاج نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ابھی عذاب پڑا نہیں تھا بلکہ علامات عذاب دیکھی تھیں اور اگر عذاب پڑ جاتا تو ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوتی۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ زجاج کا قول اچھا اور درست ہے کیونکہ جس معاینہ عذاب کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ عذاب میں مبتلا ہو جائے جیسا واقعہ فرعون میں پیش آیا، اسی لئے اس سورۃ میں قوم یونسؑ کا واقعہ فرعون کے واقعہ کے بعد متصلاً ذکر فرمایا تاکہ فرق واضح ہو جائے کہ فرعون کا ایمان مبتلاء عذاب ہونے کے بعد تھا، بخلاف قوم یونسؑ کے، وہ وقوع عذاب سے پہلے ہی ایمان لے آئی۔ اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک وہ غرغرہ کی حالت میں نہ پہونچ جائے، اور غرغرہ موت کے وقت طاری ہونے والے سکرات کو کہتے ہیں۔ اور یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں بتلایا ہے کہ قوم یونس نے وقوع عذاب سے پہلے توبہ کر لی تھی، قرطبی فرماتے ہیں کہ اس تقریر و تفسیر پر نہ کوئی اشکال ہے نہ تعارض نہ قوم یونس کی تخصیص۔

اور طبری وغیرہ مفسرین نے بھی جو اس واقعہ کو قوم یونسؑ کی خصوصیت بتلایا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس خصوصیت کا سبب یونسؑ علیہ السلام کی کوتاہیاں تھیں بلکہ اس قوم کا سچے دل سے توبہ کرنا اور علم الٰہی میں مخصص ہونا، وغیرہ وجوہات لکھی ہیں۔

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ قوم یونس علیہ السلام کا عذاب ٹل جانا عام قانون قدرت کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ عین مطابق تھا تو اس کلام کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔

اسی طرح کسی قرآنی اشارے سے یہ ثابت نہیں کہ عذاب کی وعید سنانے کے بعد یونس علیہ السلام بغیر اذن خداوندی اپنی قوم سے الگ ہوگئے بلکہ سیاق آیات اور تفسیری روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تمام سابق امتوں کے ساتھ معاملہ ہوتا آیا تھا کہ جب ان کی امت پر عذاب آنے کا فیصلہ کر لیا جاتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکل جانے کا حکم دے دیتے تھے جیسے لوط علیہ السلام کا واقعہ تفصیل قرآن میں مذکور ہے، اسی طرح یہاں بھی جب اللہ کا یہ حکم یونس علیہ السلام کے ذریعہ ان لوگوں کو پہنچا دیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آنے کا تو یونس علیہ السلام کا اس جگہ سے نکل جانا ظاہر یہی ہے کہ بامر خداوندی ہوا ہے۔

البتہ یونس علیہ السلام سے جو بغیرا نسان کے اعتبار سے ایک لغزش ہوئی اور اس پر سورۂ انبیاء اور سورۂ صٰفّٰت کی آیتوں میں عتاب کے الفاظ آئے اور اسی کے نتیجہ میں مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ پیش آیا، وہ یہ نہیں کہ انہوں نے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کردی تھی بلکہ واقعہ وہ ہے جو اوپر مستند تفسیروں کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کے حکم کے مطابق تین دن کے بعد عذاب کے آنے کی وعید سنادی اور پھر باذن الٰہی اپنی جگہ کو چھوڑ کر باہر چلے گئے اور بعد میں یہ ثابت ہوا کہ عذاب نہیں آیا تو اب یونس علیہ السلام کو اس کی فکر لاحق ہوئی کہ میں اپنی قوم میں واپس جاؤں گا تو جھوٹا قرار دیا جاؤں گا اور اس قوم کا یہ دستور تھا کہ جس کا جھوٹ ثابت ہو جائے اس کو قتل کردیں تو اب اپنی قوم کی طرف لوٹ کر جانے میں جان کا بھی اندیشہ ہوا، ایسے وقت بجز اس کے کوئی راستہ نہ تھا کہ اس وطن ہی سے ہجرت کر جائیں لیکن سنت انبیاء علیہم السلام کی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ آجائے محض اپنی رائے سے ہجرت نہیں کرتے تو یونس علیہ السلام کی لغزش یہ تھی کہ اللہ کی اجازت آنے سے پہلے ہجرت کا قصد کر کے کشتی پر سوار ہوگئے جو اگرچہ اپنی ذات میں کوئی گناہ نہیں تھا مگر سنت انبیاء سے مختلف تھا، اگر آیات قرآن کے الفاظ میں غور کریں تو یونس علیہ السلام کی لغزش فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی

کوتاہی نہیں بلکہ قوم کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے ہجرت قبل الاذن کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوگی، سورۂ صٰفّٰت کی آیت اس مضمون کے لئے تقریباً صریح ہے، جس میں فرمایا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، اس میں بقصد ہجرت کشتی پر سوار ہونے کو اَبَقَ کے لفظ سے بطور عتاب کے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا اور سورۂ انبیاء کی آیت میں ہے وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ جس میں طبعی خوف کی بناء پر قوم سے جان بچا کر ہجرت کرنے کو بطور عتاب کے اس شدید عنوان سے بیان فرمایا ہے، اور یہ سب فرائض رسالت کی مکمل ادائیگی کے بعد اس وقت پیش آیا جب کہ اپنی قوم میں واپس جانے سے جان کا خطرہ لاحق ہوگیا، تفسیر رُوح المعانی میں یہی مضمون بالفاظ ذیل لکھا ہے:

ای غضبان علی قومه لشدة شکیمتهم وتمادی اصرارهم مع طول دعوته ایّاهم وکان ذهابه هذا هجرة عنهم لکنه لم یؤمر به۔

یعنی یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اس لئے چلے گئے کہ قوم کی شدید مخالفت اور اپنے قدیم ... طویل مدت تک دعوت رسالت پہنچاتے ... ہو چکے تھے اور ان کا یہ جانا ہجرت کے طور پر تھا مگر ابھی تک ان کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

اس میں واضح کردیا ہے کہ دعوت و رسالت میں کوئی کوتاہی سبب عتاب نہیں تھی بلکہ قبل از اجازت ہجرت کرنا سبب عتاب بنا ہے جو فی نفسہ کوئی گناہ نہ تھا مگر سنت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عتاب آیا ہے۔ معاصر موصوف کو بعض علماء نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا تو سورۂ صٰفّٰت کی تفسیر میں انہوں نے اپنے موقف کی حمایت و تائید میں بہت سے مفسرین کے اقوال بھی نقل فرمائے ہیں جن میں وہب بن منبہ وغیرہ کی بعض اسرائیلی روایتوں کے سوا کسی سے ان کا یہ موقف صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے معاذ اللہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں۔

اور یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عام طور پر حضرات مفسرین اپنی تفسیروں میں اسرائیلی روایات بھی نقل کر دیتے ہیں جن کے بارے میں ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ روایات مستند و معتبر نہیں، کسی حکم شرعی کا ان پر مدار نہیں رکھا جاسکتا، اسرائیلی روایات خواہ مفسرین اسلام کی کتابوں میں ہوں یا صحیفۂ یونس میں صرف انہیں کے سہارے حضرت یونس علیہ السلام پر یہ بہتان عظیم لگایا جاسکتا ہے کہ ان سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور کسی مفسر اسلام نے اس کو قبول نہیں کیا، وللہ سبحانہ وتعالیٰ علمہ وبہ استغیث ان یعصمنا عن الخطایا والآثام۔

حضرت یونس علیہ السلام کا مفصّل واقعہ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں مذکور ہے اور کچھ روایات حدیث و تاریخ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام نینویٰ میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتلائی ہے ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا، حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کردو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، حضرت یونسؑ نے قوم میں اس کا اعلان کردیا، قوم یونسؑ نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اس لیے ان کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، مشورہ میں یہ طے ہوا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے اندر اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں تو سمجھو کہ کچھ نہیں ہوگا، اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کرلو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا، حضرت یونسؑ بارشادِ خداوندی رات کو اس بستی سے نکل گئے، صبح ہوئی تو عذاب الٰہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا اور فضاء آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا تو ان کو یقین ہوگیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت یونسؑ کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر مشرف بایمان ہوجائیں اور پچھلے انکار سے توبہ کرلیں مگر یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاصِ نیت کے ساتھ توبہ و استغفار میں لگ گئے، بستی سے ایک میدان میں نکل آئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کردیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر عجز و زاری کے ساتھ اس میدان میں توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ و بکا سے گونجنے لگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور عذاب ان سے ہٹا دیا جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ یہ عاشوراء یعنی دسویں محرم کا دن تھا۔

ادھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا، ان کے توبہ و استغفار کا حال ان کو معلوم نہ تھا، جب عذاب ٹل گیا تو ان کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ میں نے اعلان کیا تھا کہ تین دن کے اندر عذاب آجائے گا، اس قوم میں قانون یہ تھا کہ جس شخص کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ اپنے کلام پر کوئی شہادت نہ پیش کرے تو اس کو قتل کردیا جاتا تھا، یونس علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دے کر قتل کردیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام ہر گناہ و معصیت سے معصوم ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت و طبیعت سے جُدا نہیں ہوتے، اس وقت یونس علیہ السلام کو طبعی طور پر یہ خیال ہوا کہ میں نے بحکم الٰہی اعلان کیا تھا اور اب میں اعلان کی وجہ سے جھوٹا قرار دیا جاؤں گا، اپنی جگہ واپس ہوؤں تو کس منہ سے جاؤں اور قوم کے قانون کے مطابق گردن زدنی ہوں، اس رنج و غم اور پریشانی کے عالم میں اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر کے چل دیئے یہاں تک کہ بحر روم کے کنارہ پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے، یونس علیہ السلام کو ان لوگوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، کشتی روانہ ہو کر جب وسط دریا میں پہنچ گئی تو دفعۃً ٹھہر گئی، نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے چلتی ہے، کشتی والوں نے منادی کی کہ ہماری اس کشتی کی من جانب اللہ یہی شان ہے کہ جب اس میں کوئی ظالم گنہگار یا بھاگا ہوا غلام سوار ہوتا ہے تو یہ کشتی خود بخود رک جاتی ہے، اس آدمی کو ظاہر کر دینا چاہئے تاکہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آئے۔

حضرت یونس علیہ السلام بول اٹھے کہ وہ بھاگا ہوا غلام گنہگار میں ہوں، کیونکہ اپنے شہر سے غائب ہو کر کشتی میں سوار ہونا ایک طبعی خوف کی وجہ سے تھا باذن الٰہی نہ تھا، اس بغیر اذن کے اس طرف آنے کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان نے ایک گناہ قرار دیا کہ پیغمبر کی کوئی نقل و حرکت بلا اذن کے نہ ہونی چاہئے تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے دریا میں ڈال دو تو تم سب اس عذاب سے بچ جاؤ گے، کشتی والے اس پر تیار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے قرعہ اندازی کی تاکہ قرعہ میں جس کا نام نکل آئے اس کو دریا میں ڈال جائے، اتفاق قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا، ان لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو کئی مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر مرتبہ بحکم قضاء و قدر حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آتا رہا، قرآن کریم میں اس قرعہ اندازی اور اس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلنے کا ذکر موجود ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ۔

یونس علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ان کے مخصوص پیغمبرانہ مقام کی وجہ سے تھا کہ اگرچہ انہوں نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جس کو گناہ اور معصیت کہا جاتا ہے اور کسی پیغمبر سے اس کا امکان نہیں، کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں لیکن پیغمبر کے مقام بلند کے مناسب نہ تھا کہ محض خوف طبعی سے کسی جگہ بغیر اذن خداوندی منتقل ہو جاویں، اس خلاف شان عمل پر بطور عتاب یہ معاملہ کیا گیا۔

اس طرف قرعہ میں نام نکل کر دریا میں ڈالے جانے کا سامان ہو رہا تھا دوسری طرف ایک بہت بڑی مچھلی بحکم خداوندی کشتی کے قریب منہ پھیلائے ہوئے لگی ہوئی تھی کہ یہ دریا میں

آئیں تو ان کو اپنے پیٹ میں جگہ دے، جس کو حق تعالیٰ نے پہلے سے حکم دے رکھا کہ یونس علیہ السلام کا جسم جو تیرے پیٹ کے اندر رکھا جائے گا یہ تیری غذا نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کا مسکن بنایا ہے، یونس علیہ السلام دریا میں گئے تو فوراً اس مچھلی نے منہ میں لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز رہے یہ ان کو زمین کی تہ تک لے جاتی اور دُور دراز کی مسافتوں میں پھراتی رہی، بعض حضرات نے سات، بعض نے پانچ دن اور بعض نے ایک دن کے چند گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدّت بتلائی ہے (مظہری)، حقیقتِ حال حق تعالیٰ کو معلوم ہے، اس حالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دُعاء کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمالیا اور بالکل صحیح و سالم حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پر ڈال دیا۔

مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے ان کے بدن پر کوئی بال نہ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ایک کدّو (لوکی) کا درخت اگا دیا، جس کے پتّوں کا سایہ بھی حضرت یونس علیہ السلام کیلئے ایک راحت بن گئی، اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمادیا کہ وہ صبح و شام ان کے پاس آکھڑی ہوتی اور وہ اس کا دودھ پی لیتے تھے۔

اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ بھی ہوگئی، اور بعد میں ان کی قوم کو بھی پورا حال معلوم ہوگیا۔

اس قصہ میں جتنے اجزاء قرآن میں مذکور یا مستند روایاتِ حدیث سے ثابت ہیں وہ تو یقینی ہیں باقی اجزاء تاریخی روایات کے ہیں جن پر کسی شرعی مسئلہ کا مدار نہیں رکھا جاسکتا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ
اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے تمام، اب کیا تو

تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ
زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں با ایمان، اور کسی سے نہیں ہو سکتا

اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ
کہ ایمان لائے مگر اللہ کے حکم سے، اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو

لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾
نہیں سوچتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ان اقوام وذوات کی کیا تخصیص ہے) اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ نہ چاہا اس لئے سب ایمان نہیں لائے) سو (جب یہ بات ہے تو) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آئیں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدون خدا کے حکم (یعنی مشیت) کے ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر (کفر کی) گندگی واقع کر دیتا ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ

توکہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور

النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ

ڈرانے والے ان لوگوں کو جو نہیں مانتے، سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہی کے سے دن

الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ

جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے، توکہہ اب راہ دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ

الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا

راہ دیکھتا ہوں، پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے اسی طرح ذمہ ہے

عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

ہمارا بچا لیں گے ایمان والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمان میں اور زمین میں، (آسمانوں میں ستارے وغیرہ اور زمین میں بے انتہا مخلوق نظر آتی ہے یعنی ان میں غور کرنے سے توحید کی دلیل عقلی حاصل ہوگی، یہ بیان ہوا ان کے مکلف ہونے کا، اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے (یہ بیان ہوا ان کے عناد کا) سو (ان کی اس حالتِ عناد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (بدلالت حال) صرف ان لوگوں کے سے واقعات کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (یعنی باوجود دلائل

اور وعیدوں کے جو ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت اس شخص کے مشابہ ہے جو ایسے عذاب کا منتظر ہو جو کہ پہلی قوموں پر آیا تھا سو، آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو تم (اس کے) انتظار میں رہو میں بھی تمہارے ساتھ (اس کے) انتظار کرنے والوں میں ہوں (جن گزشتہ قوموں کا اوپر ذکر تھا ہم ان پر تو عذاب واقع کرتے تھے) پھر ہم (اس عذاب سے) اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کو بچا لیتے تھے (جس طرح ان مؤمنین کو ہم نے نجات دی تھی)، ہم اسی طرح سب ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں یہ (حسب وعدہ) ہمارے ذمہ ہے (پس اسی طرح اگر ان کفار پر کوئی افتاد پڑی تو مسلمان اس سے محفوظ رہیں گے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ

کہہ دے اے لوگو، اگر تم شک میں ہو میرے دین سے تو میں عبادت نہیں کرتا جنکی

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ

تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو کھینچ لیتا ہے تم کو

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ

اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں، اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا

لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ

دین پر سب سے ہو کر اور مت ہو شرک والوں میں، اور مت پکار اللہ

دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا

کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اس وقت

مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ

ہو ظالموں میں، اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا

اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ

اس کے سوا، اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو، پہنچائے اپنا فضل

يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

جس پر چاہے اپنے بندوں میں، اور وہی ہے بخشنے والا مہربان

خلاصۂ تفسیر

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک (اور تردد)

میں ہو تو (میں تم کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن ہاں اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے اور مجھ کو (منجانب اللہ) یہ حکم ہوا ہے کہ میں (ایسے معبود پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور (مجھ کو) یہ (حکم ہوا ہے) کہ اپنے آپ کو اس دین (مذکور توحید خالص) کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جاؤ، اور کبھی مشرک مت بننا اور (یہ حکم ہوا ہے کہ خدا کی توحید) کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ (عبادت کرنے کی حالت میں) کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ (ترک عبادت کی حالت میں) کوئی ضرر پہنچا سکے پھر اگر (بالفرض) ایسا کیا (یعنی غیر اللہ کی عبادت کی) تو اس حالت میں (اللہ کا حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے اور (مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ) اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچا دے تو بجز اس کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں (بلکہ) وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں (اور فضل کے تمام افراد مغفرت اور رحمت میں داخل ہیں اور وہ مغفرت اور رحمت عظیمہ کے ساتھ موصوف ہیں پس لامحالہ صاحب فضل بھی ہیں)۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى

کہہ دے اے لوگو، پہنچ چکا تم کو حق تمہارے رب سے، اب جو کوئی راہ پر آئے

فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا

سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو، اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے برے کو، اور میں

عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۸ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ

تم پر نہیں ہوں مختار، اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ

وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۱۰۹

اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا۔

ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس (دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے سو (اس کے پہنچ جانے کے بعد) جو شخص راہ راست پر آجاوے گا سو وہ اپنے (نفع کے) واسطے راہ راست پر آدے گا، اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اسی پر پڑے گا اور میں تم پر (کچھ بطور ذمہ داری

کے، مسلط نہیں کیا گیا (کہ تمہاری بے راہی کی باز پرس مجھ سے ہونے لگے تو میرا کیا نقصان ہے)، اور آپ اس کا اتباع کرتے رہیئے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے (اس میں سب اعمال کے ساتھ تبلیغ بھی آگئی)، اور (ان کے کفر و ایذا پر) صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (ان کا) فیصلہ کر دیں گے (خواہ دنیا میں ہلاکت کے ساتھ خواہ آخرت میں عذاب کے ساتھ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی اور منصبی کام میں لگے رہیئے، ان کی فکر نہ کیجیے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہے۔

سُوْرَۃُ ہُوْد علیہ السلام

سُوْرَۃُ هُوْدٍ مَّكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَلٰثٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّعَشْرُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ ہود مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو تیئیس آیتیں ہیں اور دس رکوع۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ

یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک حکمت والے خبردار کے

خَبِيْرٍ ۝۱ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲

پاس سے، کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی، میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا

اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ

ایک وقت مقرر تک اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی، اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں

اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ

ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے۔ اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا

ہر چیز پر قادر ہے۔ سنتا ہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ چھپائیں

مِنْهُ ۭ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا

اس سے، سنتا ہے جس وقت اوڑھتے ہیں اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

ظاہر کرتے ہیں ، وہ تو جاننے والا ہے دلوں کی بات ۔

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (کے معنی تو اللہ کو معلوم) یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف (بھی) بیان کی گئی ہیں (اور وہ کتاب ایسی ہے کہ) ایک حکیم باخبر (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف سے (آئی ہے جس کا بڑا مقصد یہ ہے) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو میں تم کو اللہ کی طرف سے (ایمان نہ لانے پر عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان لانے پر ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں اور (اس کتاب کے مقاصد میں سے یہ (بھی) ہے) کہ تم لوگ اپنے گناہ (شرک وکفر وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو، پس ایمان وعمل صالح کی برکت سے) وہ تم کو وقت مقررہ (یعنی وقت موت) تک (دنیا میں) خوش عیشی دیگا اور (آخرت میں) ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب دے گا (یہ کہنا بھی بمنزلہ بشیر کے کہنے کے ہے) اور اگر (ایمان لانے سے) تم لوگ اعراض (ہی) کرتے رہے تو مجھ کو (اس صورت میں) تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ کہنا بمنزلہ نذیر کے کہنے کے ہے، اور عذاب کو مستبعد مت سمجھو کیونکہ) تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ ہر شئ پر پوری قدرت رکھتا ہے (پھر استبعاد کی کوئی وجہ نہیں البتہ اگر وہاں تمہاری حاضری نہ ہوتی یا نعوذ باللہ اس کو قدرت نہ ہوتی تو عذاب واقع نہ ہوتا پس ایسی حالت میں ایمان اور توحید سے اعراض نہ کرنا چاہئے، آگے علم الٰہی کا اثبات ہے، اور ایسا علم وقدرت دونوں دلیل توحید ہیں) یاد رکھو وہ لوگ دوہرے کئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میں جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہوجاوے اور جس کو اعتقاد ہو گا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے اور آپ کا صاحب وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے پس وہ اخفاء کی ایسی تدبیر کبھی نہ کرے گا کیونکہ ایسی تدبیر کرنا گویا بدلالتِ حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے سو یاد رکھو) کہ وہ لوگ جس وقت (دوہرے ہوکر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں (کیونکہ) بالیقین وہ (تو) دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے (تو زبان سے کہی ہوئی تو کیوں نہ جانے گا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود اُن سورتوں میں سے ہے جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہرِ الٰہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور جزاء و سزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہوگئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور اظہار رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، اور بعض روایات میں سورۂ ہود کے ساتھ سورۂ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور سورۂ تکویر کا بھی ذکر ہے۔ (رواہ الحاکم والترمذی)

مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوگئے۔

اس کی پہلی آیت کو الٓرٰ سے شروع کیا گیا ہے، یہ ان حروف میں سے ہیں جن کی مراد اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے درمیان راز ہے دوسروں کو اس پر مطلع نہیں کیا گیا، ان کو اس کی فکر میں پڑنے سے بھی روکا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے، لفظ محکم احکام سے بنا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کلام کو ایسا دُرست کیا جائے جس میں کسی لفظی اور معنوی غلطی یا فساد کا احتمال نہ رہے، اس بناء پر آیات کے محکم بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ان آیات کو ایسا بنایا ہے کہ ان میں کسی لفظی غلطی یا معنوی فساد اور خلل یا باطل کا کوئی اِمکان و احتمال نہیں۔ (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ محکم اس جگہ منسوخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے مجموعی حیثیت سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے یعنی جس طرح پچھلی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ نزول قرآن کے بعد منسوخ ہوگئیں، اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد چونکہ سلسلہ نبوت و وحی ہی ختم ہوگیا اس لئے یہ کتاب تاقیامت منسوخ نہ ہوگی۔ (قرطبی) اور قرآن کی بعض آیات کا خود قرآن ہی کے ذریعہ منسوخ ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

اسی آیت میں قرآن کی دوسری شان یہ بتلائی گئی ثُمَّ فُصِّلَتْ یعنی پھر ان آیات کی تفصیل کی گئی، تفصیل کے اصلی معنی یہ ہیں کہ دو چیزوں کے درمیان فصل و امتیاز کیا جائے، اسی لئے عام کتابوں میں مختلف مضامین کو فصل فصل کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، اس جگہ

تفصیلِ آیات سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق وغیرہ مضامین کی آیات کو جدا جدا کرکے واضح بیان فرمایا گیا ہے۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو بیک وقت پورا کا پورا لوح محفوظ میں ثبت کردیا گیا تھا مگر پھر مختلف قوموں اور ملکوں کے حالات وضروریات کے تحت بہت سی قسطوں میں تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا گیا تاکہ اس کا حفظ بھی آسان ہو اور ان پر تدریجی عمل بھی سہل ہوجائے۔

اس کے بعد فرمایا مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ یعنی یہ سب آیات ایک ایسی ہستی کی طرف سے آئی ہیں جو حکیم بھی ہے اور باخبر بھی، یعنی جس کے ہر فعل میں اتنی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں کہ انسان ان کا احاطہ نہیں کرسکتا اور وہ کائنات عالم کے ذرہ ذرہ موجودہ اور آئندہ سے پوری طرح باخبر ہے، ان کے سب حالاتِ موجودہ وآئندہ کو جانتا ہے ان سب پر نظر کرکے احکام نازل فرماتا ہے، انسانوں کی طرح نہیں کہ وہ کتنے ہی عقلمند، ہوشیار، تجربہ کار ہوں مگر ان کی عقل و دانش ایک محدود دائرہ میں گھری ہوئی اور ان کا تجربہ صرف اپنے گردوپیش کی پیداوار ہوتا ہے جو بسا اوقات آئندہ زمانہ اور آئندہ حالات میں ناکام وغلط ثابت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں متذکرہ آیات کا بیان ایک سب سے اہم اور مقدم چیز سے شروع ہوتا ہے یعنی حق تعالیٰ کی توحید، ارشاد ہوتا ہے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ یعنی ان آیات میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان میں سب سے اہم و مقدم یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ یعنی ان آیات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ سارے جہاں کے لوگوں سے کہہ دیں کہ میں اللہ کی طرف سے تم کو ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں، مراد یہ ہے کہ نافرمانی اور اپنی ناجائز خواہشات کا اتباع کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور اطاعت شعار نیک لوگوں کو آخرت کی نعمتوں اور دونوں عالم کی راحتوں کی خوش خبری دیتا ہوں۔

نَذِيْرٌ کا ترجمہ ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ ڈرانے والے دشمن یا درندے یا دوسرے نقصان پہنچانے والوں کے لئے نہیں بولا جاتا، بلکہ نذیر صرف اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی اپنے عزیز کو شفقت و محبت کی بناء پر ایسی چیزوں سے ڈرائے اور بچائے جو اس کے لئے دنیا یا آخرت یا دونوں میں مضرت پہنچانے والی ہیں۔

تیسری آیت میں آیاتِ قرآنی کی ہدایات میں سے ایک دوسری ہدایت کا بیان اس طرح

فرمایا ہے وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی ان آیاتِ محکمات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اپنے رب سے مغفرت اور معافی مانگا کریں اور توبہ کیا کریں، مغفرت کا تعلق پچھلے گناہوں سے ہے اور توبہ کا تعلق آئندہ ان کے پاس نہ جانے کے عہد سے ہے، اور درحقیقت صحیح توبہ یہی ہے کہ پچھلے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی طلب کرے اور آئندہ ان کے نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آئندہ کو گناہ سے بچنے کا پختہ عزم اور اہتمام کئے بغیر محض زبان سے استغفار کرنا کَذَّابِیْن یعنی جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے، (قرطبی) اور ایسے ہی استغفار کے متعلق بھی بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ؎

معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ما

یا یہ کہ ایسی توبہ خود قابلِ توبہ ہے۔

اس کے بعد صحیح طور پر استغفار و توبہ کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی فلاح اور عیش و راحت کی خوشخبری اس طرح دی گئی ہے، يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی جن لوگوں نے صحیح طور پر اپنے پچھلے گناہوں سے استغفار کیا اور آئندہ ان سے بچنے کا پختہ عزم اور پورا اہتمام کیا تو صرف یہی نہیں کہ ان کی خطا بخش دی جائے گی بلکہ ان کو اچھی زندگی عطا کی جائے گی، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ زندگی عام ہے دنیا کی زندگی اور آخرت کی دائمی زندگی دونوں کو شامل ہے، جیسے ایک دوسری آیت میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے لَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی ہم ضرور ان کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے، اس آیت کے متعلق بھی جمہور مفسرین کی تحقیق یہی ہے کہ دنیا و آخرت کی دونوں زندگیاں اس میں شامل ہیں، سورۂ نوح میں اس کی تصریح بھی اس طرح آگئی ہے کہ استغفار کرنے والوں کے متعلق یہ فرمایا ہے يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا یعنی اگر تم نے صحیح طور سے اللہ سے مغفرت مانگی تو اللہ تعالیٰ تم پر بارانِ رحمت نازل فرمائے گا اور تم کو مال و اولاد سے بامراد کرے گا اور تمہارے لئے باغات اور نہریں عطا فرماتے گا، ظاہر ہے کہ بارانِ رحمت اور مال و اولاد کا تعلق اسی حیاتِ دنیا سے ہے۔

اسی لئے آیت مذکور میں متاعِ حَسَن کی تفسیر بھی اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے گا اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا، اور چونکہ حیاتِ دُنیا کا ایک روز ختم ہو جانا لازمی ہے اور اس کی عیش و راحت قانونِ قدرت کے تحت دائمی نہیں ہو سکتی، اس لئے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فرما کر

ہدایت کر دی کہ دنیا میں پاکیزہ زندگی اور عیش کی سہولتیں ایک خاص میعاد یعنی موت تک حاصل رہیں گی، آخر کار موت ان سب چیزوں کا خاتمہ کر دے گی۔

مگر اس موت کے فوراً بعد ہی دوسرے عالم کی زندگی شروع ہو جائے گی اور اس میں بھی توبہ و استغفار کرنے والوں کے لئے دائمی راحتیں میسر ہوں گی۔

اور حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ مَتَاعِ حَسَن سے مراد یہ ہے کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ مَتَاعِ حَسَن یہ ہے کہ انسان موجود پر قناعت کرے، مفقود کے غم میں نہ پڑے یعنی دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے۔

دوسری خوشخبری توبہ و استغفار کرنے والوں کو یہ دی گئی کہ وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ، اس میں پہلے فضل سے مراد انسان کا عمل صالح اور دوسرے فضل سے فضل خداوندی یعنی جنت ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر نیک عمل والے کو اللہ تعالیٰ اپنا فضل یعنی جنت عطا فرما دیں گے۔

پہلے جملہ میں دنیا و آخرت دونوں میں متاعِ حسن یعنی اچھی زندگی کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسرے جملہ میں جنت کی لازوال نعمتوں کا، آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ، یعنی اگر اس نصیحت و خیرخواہی سے منہ موڑا اور پچھلے گناہوں سے استغفار اور آئندہ ان سے بچنے کا اہتمام نہ کیا تو یہ اندیشہ قوی ہے کہ تم ایک بڑے دن کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے بھی ایک ہزار سال کا دن ہوگا اور اس میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑا دن ہوگا۔

پانچویں آیت میں اسی مضمون کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں تم کچھ بھی کرو اور کسی طرح بھی بسر کرو مگر انجام کار مرنے کے بعد تمہیں خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد تمہارے سب ذرات کو جمع کر کے تم کو از سر نو انسان بنا کر کھڑا کر دے۔

چھٹی آیت میں منافقین کے ایک گمانِ بد اور خیالِ فاسد کی تردید ہے کہ یہ لوگ اپنی عداوت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنے نزدیک خوب چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سینوں میں جو حسد و بغض کی آگ بھری ہوئی ہے اس پر ہر طرح کے پردے ڈالتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہمارا اصل حال کسی کو معلوم نہ ہوگا، مگر حقیقت یہ کہ

وہ کپڑوں کی تہ میں پردوں کے نیچے جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر سب کچھ روشن ہے، اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، کیونکہ وہ تو دلوں کے پوشیدہ اسرار کو بھی خوب جانتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ

اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی اور جانتا ہے

مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ

جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے، سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں، اور وہی ہے جس نے

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى

بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں اور تھا اس کا تخت پانی

الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ

پر تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام، اور اگر تو کہے کہ تم

مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ

اٹھو گے مرنے کے بعد تو البتہ کافر کہنے لگیں یہ کچھ نہیں

اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ

مگر جادو ہے کھلا ہوا، اور اگر ہم روکے رکھیں ان سے عذاب کو ایک مدت

مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا

معلوم تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک رکھا عذاب کو، سنتا ہے جس دن آئے گا ان پر نہ پھیرا جائیگا

عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ع

ان سے اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو (اور رزق رسانی کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے سو وہ ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چند روز رہنے کی جگہ کو جانتا ہے (اور ہر ایک کو وہاں ہی رزق پہنچاتا ہے، اور گو سب چیزیں علم الٰہی میں تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ہی) سب چیزیں کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (بھی منضبط و مندرج) ہیں (غرض واقعات ہر طرح محفوظ ہیں، آگے تخلیق کا مع اس کی

بعض حکمتوں کے بیان ہے جس سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ابتدائی تخلیق دلیل ہے اس پر کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے) اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ سب آسمان اور زمین کو چھ دن (کی مقدار) میں پیدا کیا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا کہ یہ دونوں چیزیں پہلے سے پیدا ہو چکی تھیں اور یہ پیدا کرنا اس لئے ہے) تاکہ تم کو آزماوے کہ (دیکھیں) تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے (مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کو پیدا کیا، تمہارے حوائج و منافع اس میں پیدا کئے تاکہ تم ان کو دیکھ کر توحید پر استدلال کرو اور ان سے منتفع ہو کر منعم کا شکر اور خدمت کہ عبادت ہے عمل صالح سے، بجا لاؤ، سو بعض نے ایسا کیا، بعض نے نہ کیا) اور اگر آپ (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یقیناً تم لوگ مرنے کے بعد (قیامت کے روز دوبارہ) زندہ کئے جاؤ گے تو (ان میں) جو لوگ کافر ہیں وہ (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ تو نرا صاف جادو ہے (جادو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ باطل ہوتا ہے مگر مؤثر، اسی طرح قرآن کو نعوذ باللہ باطل سمجھتے تھے لیکن اس کے مضامین کا مؤثر ہونا بھی مشاہدہ کرتے تھے، اس مجموعہ پر یہ حکم کیا، نعوذ باللہ منہ، مقصود اس سے آخرت کا انکار تھا، آگے ان کے منشاءِ انکار کا جواب ارشاد ہے) اور اگر تھوڑے دنوں تک (مراد دنیوی زندگی ہے) ہم ان سے عذاب (موعود) کو ملتوی رکھتے ہیں (کہ اس میں حکمتیں ہیں) تو (بطور انکار و استہزاء کے) کہنے لگتے ہیں کہ (جب ہم تمہارے نزدیک مستحقِ عذاب ہیں تو) اس عذاب کو کون چیز روک رہی ہے (یعنی اگر عذاب کوئی چیز ہوتی تو اب تک ہو چکتا جب نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں، حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) یاد رکھو جس دن (وقتِ موعود پر) وہ (عذاب) ان پر آ پڑے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا اور جس (عذاب) کے ساتھ یہ استہزاء کر رہے تھے وہ ان کو آگھیرے گا (مطلب یہ کہ باوجود استحقاق کے یہ تاخیر اس لئے ہے کہ بعض حکمتوں سے اس کا وقت معین ہے پھر اس وقت ساری کسر نکل جاوے گی)

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں حق تعالیٰ کے علم محیط کا ذکر تھا جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور دلوں کے چھپے ہوئے راز بھی مخفی نہیں، آیاتِ مذکورہ میں پہلی آیت میں اس کی مناسبت سے انسان پر ایک عظیم الشان احسان کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اس کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی، وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چل جاتا ہے اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے، تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپا لیں جہالت اور بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں، پھر اس کے عموم میں

جنگل کے تمام درندے، پرندے اور حشرات الارض، دریا اور خشکی کے تمام جانور داخل ہیں اس عموم ہی تاکید کے لئے لفظ مِنْ کا اضافہ کرکے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فرمایا ہے، دَآبَّة ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے، پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین ہی پر ہوتا ہے، دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں، ان سب جانداروں کے رزق کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو، ارشاد فرمایا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق،

یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں بجز اس کے کہ اسی نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرمالیا، مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف ورزی کا کوئی امکان نہیں، اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ عَلَى لایا گیا ہے جو فرائض کے بیان کے لئے استعمال ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نہ کسی حکم کا پابند ہے نہ اس کے ذمہ کوئی چیز فرض یا واجب۔

رزق لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء، اور جسم میں نمو یعنی فربہی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

رزق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہے وہ اس کا مالک بھی ہو، کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے مگر رزق ان کو ملتا ہے۔

رزق کے اس عام معنی کے اعتبار سے علماء نے فرمایا کہ رزق حلال بھی ہوسکتا ہے، حرام بھی کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کر کھالے تو یہ مال غذا تو اس شخص کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا، اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اس کے لئے مقرر تھا وہ جائز طور پر اس کو ملتا۔

رزق کی خدائی ذمہ داری پر ایک سوال اور جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں، اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔

ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہوجاتی، جب یہ عمر پوری ہوگئی تو اس کو بہرحال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا رزق بند کردیا گیا، اس سے موت

واقع ہوئی۔

امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت ابوموسیٰ اور ابومالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہوگیا، انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرما دیں، یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا، اس شخص کو یہ آیت سُن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کرکے وہیں سے واپس ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا، واپس جاکر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ، تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد آرہی ہے، اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسب قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے، وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اٹھائے لارہے ہیں، قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تسلہ یا سینی، لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا، انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرمادیں، اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا بھیجا ہو کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میں نے نہیں بلکہ اُس ذات قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لیا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیات الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر

فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کون متکفل ہوگا، اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں، انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا، حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں، ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا، اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہوگئے، زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے، وہاں جا رہا ہوں۔

ساری مخلوق کی رزق رسانی کا عجیب و غریب نظام قدرت

اس آیت میں حق تعالیٰ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا کہ ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا بلکہ انسان کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا، اس آیت میں مستقر اور مستودع کی مختلف تفسیریں منقول ہیں مگر لغت کے اعتبار سے وہ اقرب ہے جس کو کشاف نے اختیار کیا ہے کہ مستقر اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں کوئی شخص مستقل طور پر جائے قیام یا وطن بنالے اور مستودع اس جگہ کو جہاں عارضی طور پر کسی ضرورت کے لئے ٹھہرے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو دنیا کے لوگوں اور حکومتوں کی ذمہ داری پر قیاس نہ کرو، دنیا میں اگر کوئی شخص یا کوئی ادارہ آپ کے رزق کی ذمہ داری لے لے تو اتنا کام بہرحال آپ کو کرنا پڑے گا کہ اگر اپنی مقررہ جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جانا ہو تو اس فرد یا ادارہ کو اطلاع دیں کہ میں فلاں تاریخ سے فلاں تک فلاں شہر یا گاؤں میں رہوں گا، رزق کے وہاں پہنچنے پہنچانے کا انتظام کیا جائے، مگر حق تعالیٰ کی ذمہ داری میں آپ پر اس کا بھی کوئی بار نہیں کیونکہ وہ آپ کی ہر نقل و حرکت سے باخبر ہے، آپ کے مستقل جائے قیام کو بھی جانتا ہے اور عارضی اقامت کی جگہ سے بھی واقف، بغیر کسی درخواست اور نشان دہی کے آپ کا راشن وہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت مطلقہ کے پیش نظر صرف اس کا ارادہ فرمالینا تمام کاموں کے سرانجام ہونے کے لئے کافی تھا کسی کتاب یا رجسٹر میں لکھنے لکھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر مسکین انسان جس نظام کا خوگر ہوتا ہے اس کو اس نظام پر قیاس کرکے بھول چوک کا کھٹکا ہوسکتا ہے اس لئے اس کے مزید اطمینان کے لئے فرمایا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ یعنی یہ سب کچھ ایک

واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے، اس واضح کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں تمام کائنات کی روزی، عمر، عمل وغیرہ کی پوری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جو حسب موقع وضرورت متعلقہ فرشتوں کے سپرد کردی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے پہلے مختلف دور سے گزرتا ہے، جب اس کے اعضاء کی تکمیل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم کرتے ہیں جو اس کے متعلق چار چیزیں لکھ لیتا ہے، اول اس کا عمل جو کچھ وہ کرے گا، دوسرے اس کی عمر کے سال، مہینہ، دن اور منٹ اور سانس تک لکھ لئے جاتے ہیں، تیسرے اس کو کہاں مرنا اور کہاں دفن ہونا ہے، چوتھے اس کا رزق کتنا اور کس کس طریقے سے پہنچنا ہے، اور لوح محفوظ میں آسمان زمین کی پیدائش سے بھی پہلے لکھا ہونا اس کے منافی نہیں۔

دُوسری آیت میں حق تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت قاہرہ کا ایک اور مظہر ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور ان چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے عرشِ رحمٰن پانی پر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پیدا کیا گیا ہے اور آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے کی تفصیل سورۂ حٰم سجدہ کی آیت (۱۰، ۱۱) میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، دو دن میں زمین کے پہاڑ دریا درخت اور جانداروں کی غذا وبقاء کا سامان بنایا گیا، دو دن میں سات آسمان بنائے گئے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ آسمان سے مراد وہ تمام علویات ہیں جو اوپر کی سمت میں ہیں اور زمین سے مراد تمام سفلیات ہیں جو نیچے کی جہت میں ہیں، اور دن سے مراد وہ مقدار وقت ہے جو آسمان زمین کی پیدائش کے بعد آفتاب کے طلوع سے غروب تک ہوتا ہے اگرچہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت نہ آفتاب تھا نہ اس کا طلوع وغروب۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں یہ بھی تھا کہ ان تمام چیزوں کو ایک آن میں پیدا فرمادیں مگر اس نے اپنی حکمت سے اس عالم کے نظام کو تدریجی بنایا ہے جو انسان کے مزاج کے مناسب ہے۔

آخر آیت میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے کا مقصد یہ بتلایا ہے لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ

عَمَلًا یعنی یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ ہم تمہارا امتحان لیں کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کا پیدا کرنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ ان کو عمل کرنے والے انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ وہ ان چیزوں سے اپنے معاش کا فائدہ بھی حاصل کریں اور ان میں غور کرکے اپنے مالک و رب کو بھی پہچانیں۔

حاصل یہ ہوا کہ آسمان و زمین کی پیدائش سے اصل مقصود انسان ہے بلکہ انسان میں بھی اہل ایمان ہیں اور ان میں بھی وہ انسان جو سب سے اچھا عمل کرنے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ سارے بنی آدم میں سب سے اچھا عمل کرنے والے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ تمام کائنات کے پیدا کرنے کا اصل مقصد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہے۔ [illegible]

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے اس جگہ اَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا ہے یعنی کون اچھا عمل کرنے والا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ کون زیادہ عمل کرنے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمال صالحہ نماز، روزہ، تلاوت و ذکر کی محض کثرت اور بہت بڑی مقدار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی نظر حسن عمل پر ہے، اسی حُسنِ عمل کو ایک حدیث میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور کوئی دنیوی غرض اس میں نہ ہو اور عمل کی صورت بھی وہ اختیار کی جائے جو ثابت ہو [illegible] جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بتلایا اور [illegible] اتباع سنت کو لازم قرار دیا، خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑا عمل جو پورے اخلاص کے ساتھ سنت کے مطابق ہو وہ اس زیادہ عمل سے بہتر ہے جس میں یہ چیزیں نہ ہوں یا کم ہوں۔

ساتویں آیت میں منکرین قیامت و آخرت کا حال بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے اس کو جادو کہہ کر ٹال دیا کرتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو عذاب کی وعیدوں پر انبیاء علیہم السلام کا استہزاء کرکے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی وعید تھی وہ کیوں نہیں آجاتا۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ

اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں اس سے، تو وہ ناامید

لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے (خلاصہ یہ ہے کہ بجز مؤمنین کے اکثر آدمی ایسے ہی ہیں کہ ذرا سی دیر میں نڈر ہو جاویں ذرا سی دیر میں ناامید ہو جاویں اس لئے یہ لوگ تاخیر عذاب کے سبب بے خوف اور منکر ہو گئے، یہ لوگ جو انکار و استہزاء سے پیش آتے ہیں) سو شاید آپ (تنگ ہو کر) ان احکام میں سے جو کہ آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں بعض کو (ان کی تبلیغ کو) چھوڑ دینا چاہتے ہیں (یعنی کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں سو ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ تو آپ کر نہیں سکتے پھر تنگ ہونے سے کیا فائدہ) اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو) ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا یا ان کے ہمراہ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی بولتا چالتا) کیوں نہیں آیا (یعنی ایسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے سو ایسی باتوں سے آپ تنگ نہ ہوجیے کیونکہ) آپ تو (ان کے اعتبار سے) صرف ڈرانے والے ہیں (یعنی پیغمبر ہیں جس کے لئے درحقیقت کسی بھی معجزے کی ضرورت نہیں) اور پورا اختیار رکھنے والا ہر شے پر تو صرف اللہ ہی ہے (آپ نہیں ہیں، جب یہ بات ہے تو ان معجزات کا ظاہر نہ کرنا آپ کے اختیار سے باہر ہے پھر اس کی فکر اور اس فکر سے تنگی کیوں ہو اور چونکہ پیغمبر کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے اور آپ کا بڑا معجزہ قرآن ہے تو اس کو نہ ماننے کی کیا وجہ، کیا (اس کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو اپنی طرف سے خود بنایا ہے، آپ جواب میں فرما دیجئے کہ اگر یہ میرا بنایا ہوا ہے تو اچھا تم بھی اس جیسی دس سورتیں (جو تمہاری بنائی ہوئی ہوں) لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو پھر یہ کفار اگر تم لوگوں کا (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کا یہ) کہنا نہ کریں (یعنی اس کی مثل بنا لاؤ) نہ کر سکیں تو (ان سے کہہ دو کہ اب تو) یقین کر لو کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم اور قدرت سے اترا ہے (اس میں آدمی کے علم کا دخل ہے اور نہ قدرت کا) اور یہ بھی یقین کر لو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں (کیونکہ معبود حقیقی کی صفت میں کمال ہوتا ہے پھر اگر دوسرا کوئی ہوتا تو اس کی قدرت بھی پوری ہوتی اور اس قدرت سے وہ تم لوگوں کی مدد کرتا کہ تم اس کی مثل لے آتے کیونکہ موقع تحقیق دین کا اس کو مقتضی تھا لیکن اس کی مثل بنانے سے ان کے عاجز ہونے سے رسالت اور توحید دونوں ثابت ہو گئے جب دونوں ثابت ہو گئے تو اب بھی مسلمان ہوتے ہو یا نہیں۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق اور اس میں شبہات نکالنے والوں کا جواب مذکور ہے، اور اس کے شروع یعنی پہلی تین آیتوں میں انسان کی ایک طبعی

عادتِ قبیحہ کا ذکر اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت ہے

پہلی دو آیتوں میں فطری طور پر انسان کا غیر مستقل مزاج جلدی پسند ہونا اور موجودہ حالت میں منہمک رہ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینا بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے کہ اگر ہم انسان کو کوئی نعمت چکھاتے ہیں اور پھر اس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ بڑا ہمت ہار، نا امید اور ناشکرا بن جاتا ہے، اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پیش آئی ہو کسی نعمت کا مزا چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا، اور وہ اترانے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے

مطلب یہ ہے کہ انسان فطرۃً عجول اور موجودہ حالت کو سب کچھ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے، اگلے پچھلے حالات و واقعات میں غور و فکر اور ان کو یاد رکھنے کا خوگر نہیں ہوتا، اسی لئے نعمت کے بعد تکلیف آجائے تو رحمت سے نا امید ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے، یہ خیال نہیں کرتا کہ جن ذات حق نے پہلے نعمت دی تھی وہ پھر بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کو تکلیف و مصیبت کے بعد کوئی راحت و نعمت مل جائے تو بجائے اس کے کہ پچھلی حالت میں غور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا اس کا شکر کرتا، وہ زیادہ اکڑنے اترانے لگتا ہے، اور پچھلی حالت کو بھول کر یوں سمجھنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو میرا حق ہے مجھے ملنا ہی چاہئے اور میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا۔ غافل یہ خیال نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت و راحت کی حالت بھی باقی نہ رہے

چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

انسان کی موجود پرستی اور ماضی و مستقبل کو بھول جانے کا یہ عالم ہے کہ ایک صاحب اقتدار کے ظلم و جور پر دوسرا شخص اپنے اقتدار کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف نظر نہیں کرتا کہ اس سے پہلا صاحب اقتدار بھی اسی طرح رہا کرتا تھا، اس کے انجام سے بے خبر ہو کر اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

اسی موجود پرستی اور ظاہر بینی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور رسول آتے ہیں جو انسان کو ماضی کے عبرتناک واقعات یاد دلا کر مستقبل کی فکر سامنے کر دیتے ہیں اور یہ سبق سکھاتے ہیں کہ کائنات کے بدلتے ہوئے حالات و تغیرات میں غور کرو کہ کوئی دوسری طاقت ان کے پردے میں کام کر رہی ہے، بقول حضرت شیخ الہندؒ

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں دیکھو ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

مومن کامل بلکہ انسان کامل وہی ہے جو ہر تغیر و انقلاب اور ہر رنج و راحت میں دستِ قدرت کی مستور قوت کا مشاہدہ کرے، کسی خوشی و راحت و رنج اور اس کے ظاہری مادی اسباب پر دل نہ لگائے،

دلتنگی ہونی چاہئے، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف سے نذیر یعنی ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں اور سب کاموں کو سرانجام دینا تو اللہ ہی کی قدرت میں ہے، ڈرانے والے کی تخصیص مخاطب کی خصوصیت کی وجہ سے کی گئی کیونکہ یہ کافر تو ڈرانے ہی کے مستحق ہیں ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نذیر یعنی ڈرانے والے ہیں ایسے ہی بشیر یعنی نیک لوگوں کو خوشخبری سنانے والے بھی ہیں، اس کے علاوہ نذیر درحقیقت اُس ڈرانے والے کو کہتے ہیں جو شفقت و محبت کی بنا پر [illegible] اور مضر چیزوں سے ڈرائے، اس لئے نذیر کے مفہوم میں بشیر کا مفہوم بھی ایک حیثیت سے شامل ہے۔

آیت مذکورہ میں مشرکین کی طرف سے خاص قسم کے معجزات کا مطالبہ تھا، اگلی آیتوں میں ان کو اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن ایک ایسا معجزہ تمہارے سامنے آچکا ہے جس کے معجزہ ہونے کا تم بھی انکار نہیں کرسکتے، تو اگر یہ معجزات کا مطالبہ نیک نیتی سے رسول کی سچی حقانیت معلوم کرنے کے لئے ہے تو وہ پورا ہوچکا اور اگر محض عناد کے لئے ہے تو اگر تمہارے مطلوبہ معجزات بھی دکھلا دیئے جائیں تو [illegible] ضد سے کیا توقع ہے کہ اُن کو دیکھ کر بھی وہ اسلام قبول کرلیں گے، بہرحال قرآن کریم کا واضح معجزہ ہونا ناقابلِ انکار ہے۔

اس پر مشرکین و کفار کی طرف سے جو غلط شبہات پیدا کئے گئے ان کی تردید اگلی دو آیتوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنالیا ہے اللہ کا کلام نہیں۔

اس کے جواب میں [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ قرآن خود بنا سکتے ہیں تو تم بھی [illegible] نہیں تو دس سورتیں کوئی ایک ہی آدمی نہ بنائے بلکہ دنیا جہان کے لوگ سب مل کر بھی بنا لیں، اور جب وہ دس سورتیں بنانے سے بھی عاجز ہوں تو آپ فرمادیجئے کہ اب تو حقیقت واضح ہوگئی کیونکہ اگر یہ قرآن کسی انسان کا کلام ہوتا تو دوسرے انسان بھی اس جیسا کلام بناسکتے اور سب کا عاجز ہونا اس کی قوی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم سے نازل ہوا ہے جس میں کسی ادنیٰ کمی بیشی کی گنجائش نہیں اور انسانی طاقت سے برتر ہے۔

قرآن کریم نے اس جگہ دس سورتیں مقابلہ میں بنا کر لانے کا ارشاد فرمایا ہے اور دوسری ایک آیت میں یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ ایک ہی سورت اس جیسی بنا لاؤ؛

وجہ یہ ہے کہ پہلے دس سورتیں بنانے کا حکم دیا گیا جب وہ اس سے عاجز ہوگئے تو پھر اُن کے عاجز ہونے کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت میں فرمایا کہ تم قرآن کو کسی انسان

کلام سمجھتے ہو تو تم بھی زیادہ نہیں صرف ایک ہی سورت اس جیسی بنا لاؤ، مگر وہ قرآن کریم کی اس تحدی اور ان کے لئے انتہائی آسانی کر دینے کے باوجود کچھ نہ کرسکے تو قرآن کریم کا معجزہ ہونا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونا ثابت ہوگیا، اسی لئے آخر میں فرمایا فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ یعنی کیا تم اب بھی مسلمان اور اطاعت گزار ہوگے، یا اسی طرح غفلت میں رہوگے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتٰبُ مُوسٰىٓ إِمَامًا وَّرَحْمَةً ۚ أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

یقین نہیں کرتے۔

خلاصۂ تفسیر

جو شخص اپنے اعمال خیر سے محض حیاتِ دنیوی کی منفعت اور اس کی رونق حاصل کرنا چاہتا ہے (جیسے شہرت و نیک نامی وجاہ) اور ثوابِ آخرت حاصل کرنے کی اس کی نیت نہ ہو، تو ہم ان لوگوں کے ان اعمال کی جزاء ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں، اور ان

کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی (یعنی دنیا ہی میں ان کے اعمال کے عوض ان کو نیک نامی اور صحت و فراغ عیش و کثرت اموال و اولاد عنایت کر دیا جاتا ہے جب کہ ان کے اعمال کا ثمرہ ان کے اضداد پر غالب ہو اور اگر اضداد غالب ہوں تو پھر یہ اثر نہیں مرتب ہوتا، یہ تو دنیا میں ہوا رہا آخرت میں، سو) یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ اب بھی بے اثر ہے (بوجہ فساد نیت کے گو صورت ظاہری کے اعتبار سے ثابت سمجھا جاتا آخرت میں یہ صورت بھی زائل ہو جاوے گی) کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے (یعنی اس کا معجز ہونا جو کہ دلیل عقلی ہے) اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (یعنی توریت اس کے ساتھ شہادت کے لئے موجود ہے) جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے) امام ہے اور (احکام پر جو ثمرہ و ثواب ملے گا اس کے اعتبار سے وہ کتاب سبب رحمت ہے (اور یہ دلیل نقلی ہے پس نفس قرآن کے صدق و صحت کے لئے عقلی اور نقلی دونوں دلیلیں موجود ہیں پس ان ہی دلائل کے سبب سے) ایسے لوگ (جن کا ذکر ہوا کہ وہ صاحب بینہ ہیں) اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور (کافر کا یہ حال ہے کہ) جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس قرآن کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدہ کی جگہ ہے (پس منکر قرآن مصدق قرآن کے برابر کب ہوا) سو (اے مخاطب تو) قرآن کی طرف سے شک میں مت پڑ بلاشک وشبہ وہ سچی کتاب ہے تمہارے رب کے پاس سے آئی ہے لیکن (باوجود ان دلائل کے غضب ہے کہ) بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔

معارف ومسائل

بعض لوگوں کو جب عذاب کی وعیدیں سنائی جاتیں تو وہ اپنی خیرات و صدقات اور خدمت خلق وغیرہ کے کاموں کو سند میں پیش کرتے تھے کہ ہم ایسے نیک کام کرتے ہیں پھر ہم کو عذاب کیسا؟ آج کل تو بہت ناواقف مسلمان بھی اس شبہ میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جو کفار ظاہری اعمال، اخلاق درست رکھتے ہیں، خلق خدا کی خدمت اور خیرات و صدقات کرتے ہیں، سڑکیں، پل، شفاخانے، پانی کی سبیلیں بناتے اور چلاتے ہیں ان کو مسلمانوں سے اچھا جانتے ہیں، مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ ہر عمل کے مقبول اور باعث نجات آخرت ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے لئے کیا گیا ہو اور اللہ کے لئے کرنا وہی معتبر ہے جو اس کے رسول کے بتلائے ہوئے

تحقیق پا گیا ہو، جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان ہی نہیں رکھتا اس کے تمام اعمال واخلاق ایک بے روح ڈھانچہ ہے جس کی شکل وصورت تو اچھی بھلی ہے مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے دار آخرت میں اس کا کوئی وزن اور اثر نہیں، البتہ دنیا میں چونکہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ظاہری صورت کے اعتبار سے وہ نیک عمل ہے اس لئے اللہ جل شانہ نے اپنے کمال عدل وانصاف کی بنا پر اس عمل کو بھی بالکل ضائع نہیں قرار دیا بلکہ اس کے کرنے والے کے پیش نظر جو مقصد تھا کہ دنیا میں اس کی عزت ہو لوگ اس کو سخی کریم بڑا آدمی سمجھیں، دنیا کی دولت، تندرستی اور راحت نصیب ہو، اللہ تعالیٰ اس کو یہ سب کچھ دنیا میں دیدیتے ہیں، آخرت کا تصور اور وہاں کی نجات اس کے پیش نظر ہی نہ تھی اور نہ اس کا بے روح عمل وہاں کی نعمتوں کی قیمت بن سکتا تھا اس لئے ان اعمال کا وہاں کچھ عوض نہ ملیگا اور معصیت کی وجہ سے جہنم میں رہے گا، یہ خلاصہ مضمون ہے **پہلی آیت کا، اب اس کے الفاظ کو دیکھئے۔**

ارشاد ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی زندگی اور اس کی رونق ہی کا ارادہ کرتا ہو تو ہم اس کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیتے ہیں، ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی، یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں

یہاں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن میں اس جگہ مَنْ اَرَادَ کا مختصر لفظ چھوڑ کر مَنْ کَانَ یُرِیْدُ کا لفظ اختیار فرمایا ہے جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے جس کا ترجمہ ارادہ کرتا رہا کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال صرف ایسے لوگوں کا ہے جو اپنے اعمال حسنات سے صرف دنیا ہی کا فائدہ چاہتے رہے کبھی آخرت کی فکر ہی نہ ہوئی، اور جو شخص آخرت کی فکر اور وہاں کی نجات کے لئے عمل اچھے کرتا ہے اس کے ساتھ کچھ دنیا کا بھی ارادہ کرے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

ائمہ تفسیر کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں آئی ہے یا مسلمانوں کے، یا **مسلم وکافر دونوں سے متعلق ہے؟**

آیت کے آخری جملہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے بجز دوزخ کے کچھ نہیں، اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار ہی کے متعلق ہے کیونکہ مسلمان کتنا ہی گنہگار ہو گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار جنت میں جائے گا، اسی لئے ضحاک وغیرہ مفسرین نے اس کو کفار ہی کے متعلق قرار دیا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کی عزت دولت راحت کے طلبگار ہیں، نیک عمل اسی نیت سے کرتے ہیں کہ دنیا میں عزت و راحت ملے، اور مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اپنے اعمال بد کی سزا نہ بھگت لیں گے

اس وقت تک ان کو بجز دوزخ کے کچھ نہ ملے گا۔

اور زیادہ راجح اور واضح بات یہ ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمال صالحہ کو صرف دنیا کے فوائد دولت، عزت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اس کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضرات مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کرکے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مومن جو نیک کام کرتا ہے اُس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے، اور کافر چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اس کا حساب دنیا ہی میں بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ مومن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہشمند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوئے تو

سارے گھر میں چند کچی پکی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرمادیں، کیونکہ ہم فارس و روم کو دیکھتے ہیں وہ دنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ لفظ سن کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (مظہری)

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دل کو غنی کردیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرمادیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہوکر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کردیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوس دنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آجاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے۔

آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ دنیا کا ارادہ کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیا جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ باوجود دنیا کا ارادہ کرنے اور کوشش کرنے کے دنیا میں بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا اور بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا ــ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں اس جگہ اجمال ہے اس کی پوری تفصیل سورۂ اسرا کی اس آیت میں ہے جس میں فرمایا، مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ، یعنی جو شخص دنیا ہی کا ارادہ کرتا رہتا ہے ہم اس کو دنیا ہی میں نقد دیدیتے ہیں مگر یہ دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، اول یہ کہ جس قدر دینا چاہیں اتنا ہی دیتے ہیں ان کی مانگ اور طلب کے برابر دینا ضروری نہیں، دوسرے یہ کہ صرف اسی شخص کو دیتے ہیں جس کو دینا بتقاضائے حکمت مناسب سمجھتے ہیں ہر ایک کو دینا ضروری نہیں۔

دوسری آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین مخلصین کا حال ان لوگوں کے مقابلہ میں پیش کیا گیا جن کا مبلغ علم اور منتہائے مقصود صرف دنیا ہے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے، پھر ان کا یہ حال بیان کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا تمام عالم انسان کے لئے قیامت تک عام ہونا، اور جو شخص آپ پر ایمان نہ لائے خواہ اعمال کچھ بھی کرے اس کا گمراہ اور جہنمی ہونا بیان فرمایا ہے۔

پہلے جملہ میں فرمایا کہ کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے اور اس سے پہلے موسٰیؑ کی کتاب گواہ ہے، جو قابل اقتدار لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجی گئی تھی۔

اس آیت میں بَیِّنَةٍ سے مراد قرآن ہے اور شَاهِدٌ کے معنی میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں، بیان القرآن میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس کو اختیار کیا ہے کہ شاہد سے مراد وہ اعجاز قرآنی ہے جو خود قرآن میں موجود ہے، تو معنی یہ ہوگئے کہ وہ لوگ جو قرآن پر قائم ہیں اور ان کے پاس قرآن کی حقانیت کا ایک گواہ تو خود قرآن میں موجود ہے یعنی اس کا اعجاز اور دوسرا گواہ اس سے پہلے بصورت تورات آچکا ہے جو موسٰی علیہ السلام لوگوں کے لئے قابل اقتدا اور رحمت حق کی حیثیت سے لائے تھے کیونکہ تورات میں قرآن کریم کا حق ہونا واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے جملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کو قیامت تک مدار نجات قرار دینے کا بیان اس طرح فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اور ملتوں میں سے جو شخص بھی آپ کا انکار کریگا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جو یہودی یا نصرانی میری دعوت کو سنے اور اس کے باوجود میری لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو وہ اہل جہنم میں سے ہوگا

اس سے ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہوجانی چاہئے جو بہت سے یہود و نصاریٰ یا دوسرے مذہب کے پیروؤں کے بعض ظاہری اعمال کی بنا پر ان کو حق پر کہتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے بغیر صرف ظاہری اعمال کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، یہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور حدیث کی اس صحیح روایت سے کھلا تصادم ہے۔ والعیاذ باللہ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی

اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ وہ لوگ روبرو آئیں گے اپنے

رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا

رب کے اور کہیں گے گواہی دینے والے یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر سن لو

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

پھٹکار ہے اللہ کی ان ظالموں پر جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے

وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ

اور ڈھونڈتے ہیں اس میں کجی اور وہی ہیں آخرت سے منکر وہ لوگ

لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ

نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا

مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ

کوئی حمایتی دونا ہے ان کے لئے عذاب نہ طاقت رکھتے تھے

السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

سننے کی اور نہ دیکھتے تھے وہی ہیں جو کھو بیٹھے اپنی جان

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ

اور گم ہو گیا ان سے جو جھوٹ باندھا تھا اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں

هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ

یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان میں البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک اور

أَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾

عاجزی کی اپنے رب کے سامنے وہ ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں رہا کریں گے

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا دیکھتا اور سنتا کیا

يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

برابر ہے دونوں کا حال، پھر کیا تم غور نہیں کرتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ایسے شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (کہ اس کی توحید کا اور کسی رسول کی رسالت کا اور اس کے کلام ہونے کا انکار کرے) ایسے لوگ (قیامت کے روز) اپنے رب کے سامنے (مفتری ہونے کی حیثیت سے) پیش کئے جائیں گے اور (اعمال کے) گواہ فرشتے (علی الاعلان) یوں کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے اپنے رب کی نسبت جھوٹی باتیں لگائی تھیں، سب سن لو کہ ایسے ظالموں پر خدا کی (زیادہ) لعنت ہے جو کہ (اپنے کفر و ظلم کے ساتھ دوسروں کو بھی) خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اور اس (راہ دین) میں کجی (اور شبہات) نکالنے کی تلاش (و فکر) میں رہا کرتے تھے (تاکہ دوسروں کو گمراہ کریں) اور آخرت کے بھی منکر تھے (ان فرشتوں کے قول کا مضمون تمام ہوا، آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) یہ لوگ تمام زمین

(کے تحت) پر بھی) خدا تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے تھے (کہ کہیں جا چھپتے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ نہ آتے) اور نہ ان کا خدا کے سوا کوئی مددگار ہوا (کہ بعد گرفتاری کے چھڑا لیتا) ایسوں کو (اوروں سے) دونی سزا ہوگی (ایک کافر ہونے کی اور ایک دوسروں کو کافر بنانے کی کوشش کرنے کی) یہ لوگ (مارے نفرت کے احکام الٰہی کو) سن نہ سکتے تھے اور نہ (غایت عناد سے راہ حق کو) دیکھتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو برباد کر بیٹھے اور جو معبود انہوں نے تراش رکھے تھے (آج) ان سے سب غائب (اور گم) ہوگئے (کوئی بھی کام نہ آیا پس) لازمی بات ہے کہ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ میں یہی لوگ ہوں گے (یہ تو انجام ہوا کافروں کا آگے مسلمانوں کا انجام مذکور ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کئے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف جھکے (یعنی انقیاد اور خشوع دل میں پیدا کیا) ایسے لوگ اہل جنت ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہا کریں گے (یہ دونوں کے انجام کا تفاوت بیان ہوگیا، آگے تفاوت حال کی مثال ہے جس پر انجام کا تفاوت مرتب ہوتا ہے پس ارشاد ہے کہ) دونوں فریق (مذکورین یعنی مومن و کافر) کی حالت ایسی ہے جیسے ایک شخص ہو اندھا بھی ہو اور بہرا بھی (جو نہ عبارت کو سنے نہ اشارہ کو دیکھے تو اس کے سمجھنے کی مدد کوئی صورت ہی نہیں) اور ایک شخص ہو جو دیکھتا بھی ہو اور سنتا بھی ہو (اس کو سمجھنا بہت آسان ہو) کیا یہ دونوں شخص حالت میں برابر ہیں (ہرگز نہیں یہی حالت کافر اور مسلمان کی ہے کہ وہ ہدایت سے بہت دور ہے اور یہ ہدایت سے موصوف ہے) کیا تم (اس فرق کو) سمجھتے نہیں (ان دونوں میں فرق بدیہی ہے اس میں شبہ کی گنجائش نہیں)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر سنانے والا ہوں کھول کر کہ نہ پرستش کرو

اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ

اللہ کے سوا میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے پھر بولے سردار

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ

جو کافر تھے اس کی قوم کے ہم کو تو نظر نہیں آتا کہ تو ایک آدمی ہم جیسا اور دیکھتے نہیں

اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا

کوئی تابع ہوا ہو تیرا مگر جو ہم میں نیچ قوم ہے بے تامل اور ہم نہیں دیکھتے تم کو اپنے

مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ

کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو بولا اے قوم دیکھو تو اگر

کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ

میں ہوں صاف رستہ پر اپنے رب کے اور اس نے دی مجھ کو رحمت اپنے پاس سے پھر اس کو

عَلَیْکُمْ ؕ اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا کٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَیٰقَوْمِ لَاۤ

تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اس پر اور تم اس سے بیزار ہو اور اے میری قوم

اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ

نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال میری مزدوری نہیں مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰکِنِّیْۤ اَرٰىکُمْ قَوْمًا

ایمان والوں کو ان کو ملنا ہے اپنے رب سے لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ

جاہل ہو اور اے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر ان کو ہانک دوں

اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ

کیا تم دھیان نہیں کرتے اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ

اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَکٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ

میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ یہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ کہوں گا ان لوگوں کو کہ تمہاری آنکھ میں

اَعْیُنُکُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ

حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے

اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ

یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں بولے اے نوح تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت

جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ

جھگڑ چکا اب لے آ ہم پر جس چیز کا تو وعدہ کرتا ہے اگر تو سچا ہے کہا

اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا

کہ لائے گا تو اس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر اور نہ

یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ اِنْ کَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ

کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں کہ تم کو نصیحت کروں اگر اللہ چاہتا ہوگا

أَنْ يُغْوِيَكُمْ ۚ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ يَقُولُونَ

کہ تم کو گمراہ کرے وہی ہے رب تمہارا اور اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے کیا کہتے ہیں کہ

افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا

بنا لایا قرآن کو کہہ دے اگر میں بنا لایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا ذمہ نہیں جو

تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

تم گناہ کرتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس رسول بنا کر (یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو (اور جو بت تم نے قرار دے رکھے ہیں، ودّ اور سُواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے جا کر ان سے فرمایا کہ) میں تم کو (بصورت عبادت غیر اللہ کے) صاف صاف ڈراتا ہوں (اور اس ڈرانے کی تفصیل یہ ہے کہ) میں تمہارے حق میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں سو ان کی قوم میں جو کافر سردار تھے وہ (جواب میں) کہنے لگے کہ (تم جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہو جیسا نذیر مبین سے معلوم ہوتا ہے تو ہمارے جی کو یہ بات نہیں لگتی کیونکہ) ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں (اور بشر کا نبی ہونا دور از کار ہے، اور اگر بعض لوگوں کے اتباع کرنے سے استدلال کیا جاوے تو وہ قابل استدلال نہیں کیونکہ) ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ہم میں بالکل رذیل ہیں (جن کی عقل اکثر خفیف ہوتی ہے پھر) وہ (اتباع بھی محض سرسری رائے سے (ہوا ہے یعنی اول تو ان کی عقل ہی صائب نہیں غور کے بعد بھی غلطی کرتے دوسرے بعد غور بھی نہیں کیا، اس لئے ایسے لوگوں کا تم کو نبی سمجھ لینا یہ کوئی حجت نہیں بلکہ بالعکس ہمارے اتباع سے مانع ہے کیونکہ شرفاء کو رذیلوں کی موافقت سے عار آتی ہے نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کے اغراض بھی حصول مال یا ترفع ہوا کرتا ہے، سو یہ لوگ بھی دل سے ایمان نہیں لائے، اور اگر یہ کہا جاوے کہ باوجود رذیل ہونے کے ان لوگوں کو کسی خاص امر کے اعتبار سے ہم پر فضیلت ہے جس کے اعتبار سے ان کی رائے اس باب میں صائب ہے سو) ہم تم لوگوں میں (یعنی تم میں اور مسلمانوں میں) کوئی بات اپنے سے زیادہ نہیں پاتے (اس لئے تم مسلمانوں کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے، بلکہ ہم تم کو بالکل) جھوٹا سمجھتے ہیں، نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری نبوت جی کو نہیں لگتی تو) بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل

پر (تم، ہوں جس سے میری نبوت ثابت ہوتی ہو) اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو پھر وہ (نبوت یا اس کی حجت) تم کو نہ سوجھتی ہو تو (میں کیا کروں مجبور ہوں، کیا) ہم اس (دعوی یا دلیل) کو تمہارے سر منڈھ دیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ، (مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ جی کو نہیں لگتی یہ محض اس وجہ سے ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، اور میرے پاس اس کے واقع اور صحیح ہونے کی دلیل موجود ہے یعنی معجزہ وغیرہ نہ کہ کسی کا اتباع، اس سے اس کا جواب بھی ہوگیا کہ ان کا اتباع حجت نہیں لیکن کسی دلیل کا فائدہ موقوف ہے غور وفکر پر وہ تم کرتے نہیں اور میرے بس سے باہر ہے، اور اتنی بات اور زائد فرمائی کہ) اے میری قوم (یہ تو سوچو کہ اگر میں نبوت کا غلط دعوی کرتا تو آخر اس میں میرا کچھ مطلب تو ہوتا مثلاً یہی ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے خوب مال کماؤں گا تو تم کو معلوم ہے کہ) میں تم سے اس (تبلیغ) پر کچھ مال نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (اسی سے آخرت میں اس کا طالب ہوں اسی طرح اور اغراض بھی اگر غور کرو تو منتفی پاؤ گے پھر جب کوئی غرض نہیں پھر مجھ کو جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا خلاصہ یہ ہے کہ کذب دعوی کو کوئی امر مقتضی نہیں اور صدق دعوی پر دلیل قائم ہے پھر نبوت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، اور اے تم جو اتباع اراذل کو اپنے اتباع سے مانع بتلاتے ہو اور صراحۃً یا دلالۃً یہ چاہتے ہو کہ میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں سو) میں تو ان ایمان والوں کو نکالتا نہیں (کیونکہ) یہ لوگ اپنے رب کے پاس (عزت مقبولیت کے ساتھ) جانے والے ہیں (اور بھلا کوئی شخص مقربان شاہی کو نکالا کرتا ہے اور اس سے اس کا بھی جواب ہوگیا کہ یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے) لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ (خواہ مخواہ کی) جہالت کر رہے ہو (اور بے ڈھنگی باتیں کر رہے ہو) اور (بالفرض والتقدیر اگر میں ان کو نکال بھی دوں تو یہ بتلاؤ کہ) مجھ کو خدا کی گرفت سے کون بچائے گا (کیا تم میں اتنی ہمت ہے جو ایسے بیہودہ مشورے دے رہے ہو) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے اور (اس تقریر میں ان کے تمام شبہات کا جواب ہوگیا لیکن آگے ان سب جوابوں کا تتمہ ہے یعنی جب میری نبوت دلیل سے ثابت ہے تو اول تو دلیل کے سامنے استبعاد کوئی چیز نہیں پھر یہ کہ وہ مستبعد بھی نہیں البتہ کسی امر عجیب وغریب کا اگر دعوی کرتا تو انکار واستبعاد چنداں منکر ومستبعد نہ تھا گو دلیل کے بعد پھر وہ بھی مسموع نہیں البتہ اگر دلیل بھی مقتضی استبعاد کو ہو تو پھر واجب ہے لیکن میں تو کسی ایسے امر عجیب کا دعوی نہیں کرتا چنانچہ) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور

یہ تو اپنی نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا، آگے اپنے تابعین کے متعلق ارشاد ہے یعنی) جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں میں ان کی نسبت (تمہاری طرح) یہ نہیں کہہ سکتا کہ (یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے اس لئے) اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو ثواب نہ دے گا ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، (تو ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں اخلاص ہو تو پھر میں ایسی بات کیونکر کہہ دوں) میں تو (اگر ایسی بات کہہ دوں تو اس صورت میں) ستم ہی کروں (کیونکہ بے دلیل دعویٰ کرنا گناہ ہے، جب نوح علیہ السلام نے سب باتوں کا پورا پورا جواب دے دیا جس کا جواب پھر ان سے کچھ بن نہ پڑا تو عاجز ہو کر) وہ لوگ کہنے لگے کہ اے نوح تم ہم سے بحث کر چکے پھر اس بحث کو بڑھا بھی چکے سو اب بحث چھوڑ دو اور جس چیز سے تم ہم کو دھمکایا کرتے ہو (کہ عذاب آجاوے گا) وہ ہمارے سامنے لے آؤ انہوں نے فرمایا کہ (اس کو لانے والا میں کون ہوں مجھ کو پہنچا دینے سنا دینے کا حکم تھا سو میں بجا لا چکا) اس کو تو اللہ تعالیٰ بشرطیکہ اس کو منظور ہو تمہارے سامنے لاوے گا اور (اس وقت پھر) تم اس کو عاجز نہ کر سکو گے (کہ وہ عذاب واقع کرنا چاہے اور تم نہ ہونے دو) اور (جو میرا کام تھا پہنچا دینا اور سنا دینا اس میں میں نے تمہاری پوری خیر خواہی اور دلسوزی کی لیکن) میری خیر خواہی تمہارے کام نہیں آسکتی گو میں تمہاری کیسی ہی خیر خواہی کرنا چاہوں جب کہ اللہ ہی کو تمہارا گمراہ کرنا منظور ہو (جس کی وجہ تمہارا عناد و استکبار ہے مطلب یہ کہ جب تم ہی اپنی بدقسمتی سے اپنے لئے نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا نہ چاہو تو میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) وہی تمہارا مالک ہے (اور تم مملوک تو تم پر اس کے تمام حقوق واجب ہیں اور تم ان کو براہ عناد ضائع کر کے مجرم ہو رہے ہو) اور اسی کے پاس تم کو جانا ہے (وہ تمہارے اس سارے عناد و کفر کی کسر نکال دے گا) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن خود تراش لیا ہے آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اگر (بالفرض) میں نے تراشا ہوگا تو میرا یہ جرم مجھ پر (عائد) ہوگا (اور تم میرے جرم سے بری الذمہ ہو گے) اور (اگر تم نے یہ دعویٰ تراشا ہوگا یعنی مجھ پر بہتان لگایا ہوگا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہوگا اور) میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ رہوں گا۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دی تو قوم نے ان کی نبوت و رسالت پر چند شبہات و اعتراضات پیش کئے، حضرت نوح علیہ السلام نے باذن اللہ ان کے جوابات دیئے جن کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل دیانت اور

معاشرت سے بھی آگئے ہیں، آیاتِ مذکورہ میں یہی مکالمہ بیان فرمایا گیا ہے۔

تیسری آیت میں مشرکین کی گفتگو ہے جس میں چند شبہات و اعتراضات کئے گئے ہیں، اس آیت کے حل طلب الفاظ کی تشریح یہ ہے:

لفظ مَلَأ عام طور پر جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، بعض ائمہ لغت کا کہنا ہے کہ قوم کے سرداروں اور ذمہ داروں کی جماعت کو مَلَأ کہتے ہیں، بَشَر کا ترجمہ ہے انسان یا آدمی أراذل أرذل کی جمع ہے حقیر و ذلیل کو کہا جاتا ہے جس کی قوم میں کوئی حیثیت اور عزت نہ ہو، بَادِیَ الرَّأْیِ کے معنی ہیں "ابتدائی اور سطحی رائے"

ان لوگوں کا پہلا اعتراض حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت و رسالت پر یہ تھا کہ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا، یعنی آپ تو ہمیں جیسے انسان اور آدمی ہو ہماری ہی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے ہو پھر ہم آپ کا یہ فوق العادت امتیاز کیسے تسلیم کرلیں کہ آپ خدا کے رسول اور پیغمبر ہیں۔

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانوں کی طرف جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بناکر بھیجا جائے وہ جنس بشر سے نہ ہونا چاہئے بلکہ کوئی فرشتہ ہو جسکا امتیاز سارے انسانوں کو چار و ناچار تسلیم کرنا پڑے۔

اس کا جواب چوتھی آیت میں یہ دیا گیا، یٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ،

اس میں بتلایا گیا کہ رسول کا بشر یا آدمی ہونا تو نبوت و رسالت کے منافی نہیں بلکہ غور کرو تو یہی ضروری ہے کہ آدمیوں کا رسول آدمی ہونا چاہئے تاکہ آدمیوں کو اُس سے دین سیکھنا آسان ہو انسان اور فرشتہ کے مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، اگر فرشتہ کو رسول بناکر بھیجا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہوجاتا، کیونکہ فرشتہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اُس کو انسانی ضروریات و حوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کر سکتے، یہ مضمون قرآن کی دوسری آیتوں میں صراحۃً اور اشارۃً کئی جگہ آچکا ہے یہاں اس کا ذکر کرنے کے بجائے یہ بتلایا کہ اگر عقل سے کام لو تو رسول و پیغمبر کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ آدمی نہ ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بیّنہ اور حجت اس کے ساتھ ہو جس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ تسلیم کرنا آسان ہوجائے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، وہ بیّنہ اور حجت عام لوگوں کے لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہوتے ہیں، اسی لئے

نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ اللہ کی طرف سے بینہ اور حجت اور رحمت لیکر آیا ہوں تم اس کو دیکھتے اور غور کرتے تو انکار نہ کرتے، مگر تمہارے انکار و عناد نے تمہاری نگاہوں کو اُس سے اندھا کردیا اور تم انکار کر بیٹھے اور اپنی ضد پر جم گئے۔

مگر خدا تعالیٰ کی یہ رحمت جو پیغمبر کے ذریعہ آتی ہے ایسی چیز نہیں کہ زبردستی لوگوں کے سر ڈال دی جائے جب تک وہ خود اس کی طرف رغبت نہ کریں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ دولتِ ایمان جو میں لے کر آیا ہوں اگر میرا بس چلتا تو تمہارے انکار اور ضد کے باوجود تمہیں دے ہی دیتا، مگر یہ قانون قدرت کے خلاف ہے، یہ نعمت زبردستی کسی کے سر نہیں ڈالی جاسکتی، اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زبردستی کسی کو مؤمن یا مسلمان بنانا کسی دور نبوت میں جائز نہیں رکھا گیا، بزورِ شمشیر اسلام پھیلانے کا سفید جھوٹ گھڑنے والے خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں مگر ایک بات ہے جو ناواقفوں کے دلوں میں تردّد پیدا کرنے کے لئے چلتی کی جاتی ہے۔

اس کے ضمن میں اس کی وجہ بھی سمجھی گئی کہ فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا گیا، وجہ یہ ہے کہ فرشتہ جو مافوق العادت قوت و طاقت رکھتا ہے اور اپنے وجود کی ہر حیثیت میں انسان سے ممتاز ہے اُس کو دیکھ کر ایمان لانا تو ایک جبری عمل ہو جاتا، کسی کی مجال نہ تھی کہ فرشتہ کے سامنے وہ ہٹ دھرمی کرتا جو انبیاء کے سامنے کی جاتی ہے ورنہ خاص وہ ایمان مقبول نہیں جو کسی قوتِ قاہرہ سے مجبور ہو کر اختیار کیا جائے، بلکہ مطلوب ایمان بالغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کا پورا مشاہدہ کئے بغیر ایمان اختیار کیا جائے۔

ان کا دُوسرا اعتراض یہ تھا مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ، یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر ایمان لانے والے سب سرسری نظر میں حقیر و ذلیل کمینے لوگ ہیں، کوئی شریف بڑا آدمی نہیں، اس اعتراض کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ تمہاری بات اگر حق اور صحیح ہوتی تو قوم کے بڑے لوگ اس کو قبول کرتے، ان چھوٹے اور رذیل لوگوں کا قبول کرنا اس کی علامت ہے کہ آپ کی دعوت ہی قبول کرنے کے قابل نہیں، دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے لئے آپ کی دعوت ایمان قبول کرنے سے رکاوٹ یہ ہے کہ ہم ایمان لے آئیں تو بحیثیت مسلمان ہم بھی ان کے برابر سمجھے جائیں گے، نمازوں کی صفوف اور دوسری مجالس میں ہمیں ان کے ساتھ ان کے برابر بیٹھنا پڑے گا یہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔

حقیقت سے دُور ان ناواقفوں نے غرباء فقراء کو جن کے پاس مال کی بہتات نہیں اور دنیوی جاہ و مال نہیں اُن کو رذیل قرار دے رکھا تھا، حالانکہ یہ خود ایک جاہلانہ خیال ہے عزت و ذلت اور عقل و فہم مال و دولت کے تابع نہیں بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ جاہ و مال کا ایک نشہ ہوتا ہے

جو انسان کو بہت سی معقول و صحیح باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے سے روک دیتا ہے، لہٰذا غریب آدمی کی نظر کے سامنے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں وہ حق اور صحیح بات کو قبول کرنے میں مسابقت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانِ قدیم سے عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اول ایمان لانے والے غربا، فقرا، ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے جب ہرقل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دعوتِ ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرے چونکہ اس نے تورات و انجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں اس لئے اُس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کر کے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں! اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا دل اول اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ غربا، و فقرا، کو رذیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رذیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اس کے احکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے، کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کر کے کسی دوسرے کی دنیا سنوارے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابہ کرامؓ کو برا کہے کیونکہ وہ پوری امت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ **دولتِ ایمان و شریعت اُن کو پہنچی ہے۔**

بہرحال ان کے اس جاہلانہ خیال کی تردید تیسری آیت میں اول تو اس طرح کی گئی ہے کہ پیغمبر کی نظر کسی کے مال پر نہیں ہوتی وہ کسی سے اپنی خدمت و ہمدردی کا معاوضہ نہیں لیتا اُس کا معاوضہ تو صرف حق تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے اس کی نظر میں امیر و غریب برابر ہوتے ہیں، تم اس سے نہ ڈرو کہ ہم مالدار ہیں، مسلمان ہو جائیں گے تو ہم سے مال کا مطالبہ کیا جائے گا۔

دوسرے یہ بتلایا گیا کہ تم جو ایمان قبول کرنے کے لئے یہ شرط پیش کرتے ہو کہ میں غریب لوگوں کو اپنے پاس سے نکال دوں تو سمجھ لو کہ یہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ یہ لوگ اگرچہ غریب ہیں مگر بارگاہِ رب العزت میں ان کی رسائی اور اعزاز ہے ایسے لوگوں کو نکالنا کوئی عقل کا کام نہیں،

اور مَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر بالفرض میں ان کو نکال دوں تو قیامت کے روز یہ لوگ جب اپنے رب کے سامنے جائیں گے اور فریاد کریں گے تو میرے پاس کیا جواب ہوگا، چوتھی آیت کا یہی مضمون ہے کہ اگر میں ان کو نکال دوں تو مجھے خدا کے عذاب سے کون بچائے گا، آخر میں فرمایا کہ یہ سب تمہاری جہالت ہے کہ تم آدمیت کو نبوت کے منافی سمجھتے ہو یا غریب لوگوں کو نکال دینے کی فرمائش کرتے ہو۔

پانچویں آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ تقریر نقل کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے سب اعتراضات سننے کے بعد ان کو کچھ اصولی ہدایات دینے کے لئے ارشاد فرمائی جس میں بتلایا گیا ہے کہ نبوت و رسالت کیلئے وہ چیزیں ضروری نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہیں۔

مثلاً پہلے فرمایا وَلَآ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اس میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید ہے کہ جب اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں تو ان کے ہاتھ میں خزانے ہونے چاہئیں جن سے لوگوں کو داد و دہش کرتے رہیں، نوح علیہ السلام نے بتلا دیا کہ انبیاء کی بعثت کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو متاع دنیا میں الجھائیں، اس لئے خزانوں سے اُن کا کیا کام۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اُس خیال کی تردید ہو جو بعض لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کو بلکہ اولیاء کو بھی مکمل اختیارات دے دیئے ہیں، اللہ کی قدرت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جسکو چاہیں دیں جسکو چاہیں نہ دیں تو نوح علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے خزانوں کا مکمل اختیار کسی نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، اولیاء کا تو کیا ذکر ہے، البتہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں اور خواہشیں اپنی قدرت سے پوری فرماتے ہیں۔

دوسرے فرمایا وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ، ان جاہلوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کا رسول ہو وہ عالم الغیب بھی ہونا چاہئے، اس جملہ نے واضح کر دیا کہ نبوت و رسالت علم غیب کی مقتضی نہیں اور کیسے ہوتی جبکہ علم غیب حق تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے جس میں کوئی نبی یا فرشتہ شریک نہیں ہو سکتا، ہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں میں سے جسکو چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں غیب کے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کو عالم الغیب کہنا درست نہیں ہوتا کیونکہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جس غیب کو چاہیں معلوم کر لیں۔

تیسری بات یہ فرمائی وَلَآ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ یعنی میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس میں ان کے اس خیال کی تردید ہو گئی کہ رسول کو فرشتہ ہونا چاہئے۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہاری نظروں میں جن غریب بے سر و سامان لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں میں تمہاری طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کوئی خیر اور بھلائی نہ دیگا کیونکہ خیر و بھلائی کا تعلق مال و دولت سے نہیں بلکہ انسان کے قلب سے ہے اور دلوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا قلب خیر و صلاح کے قابل ہے کس کا نہیں۔

پھر فرمایا کہ اگر میں بھی تمہاری طرح ان کو حقیر و ذلیل کہنے لگوں تو میں بھی ظالم ہو جاؤنگا۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لاوے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا

فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا

سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو کر رہے ہیں اور بنا کشتی روبرو ہمارے

وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بیشک غرق ہوں گے

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ

اور وہ کشتی بناتا تھا اور جب گزرتے اس پر سردار اس کی قوم کے ہنسی کرتے اس سے

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸ فَسَوْفَ

بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو، اب جلد

تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ

جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب

مُّقِيْمٌ ۝۳۹ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا

دائمی یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں

مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ

ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم

وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰

اور سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے

خلاصۂ تفسیر

اور جب نصیحت کرتے ہوئے ایک زمانہ دراز گزر گیا اور کچھ اثر نہ ہوا تو، نوح علیہ السلام

کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو اس وقت تک (ایمان لا چکے ہیں اور کوئی (نیا) شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ (کفر و ایذا و استہزاء) کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو (کیونکہ غم تو خلاف توقع سے ہوتا ہے جب ان سے مخالفت کے سوا کوئی اور توقع ہی نہیں پھر کیوں غم کیا جاوے) اور (چونکہ ہمارا ارادہ اب ان کو غرق کرنے کا ہے اور اس لئے طوفان آنے کو ہے پس) تم (اس طوفان سے بچنے کے لئے) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کر لو (کہ اس کے ذریعہ سے طوفان سے تم اور مؤمنین محفوظ رہو گے) اور (یہ سن لو کہ) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جاویں گے (ان کے لئے یہ قطعی طور پر تجویز ہو چکا ہے تو ان کی سفارش بے کار ہوگی، غرض نوح علیہ السلام نے سامان کشتی کا جمع کیا، اور وہ کشتی تیار کرنے لگے خواہ خود یا دوسرے کاریگروں کے ذریعے سے، اور اثنائے تیاری میں، جب کبھی ان کی قوم میں کسی رئیس گروہ کا ان پر گزر ہوتا تو ان کو کشتی بناتا دیکھ کر اور یہ سن کر کہ طوفان آنے والا ہے) ان سے ہنسی کرتے (کہ دیکھو پانی کا کہیں نام و نشان نہیں مفت مصیبت جھیل رہے ہیں) آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو (کہ عذاب ایسا نزدیک آپہنچا ہے اور تم کو ہنسی سوجھ رہی ہے ہم اس پر ہنستے ہیں) سو ابھی تم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا جاتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور (بعد مرگ) اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے (غرض اسی طرح کے مکالمات اور معاملات ہوا کرتے) یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچا اور زمین سے پانی ابلنا شروع ہوا اور یہ علامت تھی طوفان شروع ہو جانے کی، اور اوپر سے پانی برسنا شروع ہوا اس وقت، ہم نے (نوح علیہ السلام سے) فرمایا کہ ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے لئے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس (کشتی) میں چڑھا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (چڑھا لو) باستثناء اس کے جس پر (غرق ہونے کا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی ان میں جو کافر ہو جن کی نسبت اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ کہہ دیا گیا ہے، اس کو سوار مت کرنا اور گھر والوں کے علاوہ) دوسرے ایمان والوں کو بھی (سوار کر لو) اور بجز قلیل آدمیوں کے ان کے ساتھ کوئی ایمان نہ لایا تھا (بس ان ہی کے سوار کرنے کا حکم ہوگیا)۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تقریباً ایک ہزار سال کی عمر دراز عطا فرمائی، اس کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے اور قوم کی اصلاح کرنے کی فکر اور پیغمبرانہ جدوجہد کا بھی یہ درجہ عطا فرمایا کہ

اس طویل مدت عمر میں ہمیشہ اپنی قوم کو دینِ حق اور کلمۂ توحید کی دعوت دیتے رہے، قوم کی طرف سے سخت سخت ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا ان کی قوم ان پر پتھراؤ کرتی یہاں تک کہ بے ہوش ہوجاتے پھر جب ہوش آتا تو دُعا کرتے کہ یا اللہ میری قوم کو معاف کر دے یہ بے وقوف جاہل ہیں جانتے نہیں، قوم کی ایک نسل کے بعد دوسری کو اور دوسری کے بعد تیسری کو اس اُمید پر دعوت دیتے کہ شاید یہ حق کو قبول کرلیں۔

جب اس عمل پر صدیاں گزر گئیں تو ربّ العزت کے سامنے ان کی حسرتِ زار کی شکایت کی جو سورۂ نوح میں مذکور ہے رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَھَارًا، فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا، اور اتنے طویل مصائب کے بعد اس مردِ خدا کی زبان پر یہ دُعا آئی، رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ، یعنی اے میرے پروردگار ان کی تکذیب کے بالمقابل آپ میری مدد کیجئے۔

قوم نوحؑ کا ظلم وجور حد سے گزر جانے کے بعد حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان آیات سے خطاب فرمایا جو اُوپر مذکور ہیں (بغوی، مظہری)

ان میں اول تو حضرت نوح علیہ السلام کو یہ بتایا گیا کہ آپ کی قوم میں جنکو ایمان لانا تھا وہ لے آئے اب کوئی اور شخص ایمان قبول نہ کرے گا ان کے دلوں پر انکی ہٹ دھرمی اور کج بحثی کی بنا پر مہر لگ چکی ہے اس لئے اب آپ اس قوم کا غم نہ کیجئے اور ان کے ایمان قبول نہ کرنے سے پریشان نہ ہوں۔

دوسری بات یہ بتلائی گئی کہ اب ہم اس قوم پر عذاب پانی کے طوفان کا بھیجنے والے ہیں اس لئے آپ ایک کشتی تیار کریں جس میں آپ کے اہل وعیال اور جتنے مسلمان ہیں مع اپنی ضروریات کے سما سکیں تاکہ طوفان کے وقت یہ سب اس میں سوار ہوکر نجات پاسکیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء کی علامات سامنے آگئیں کہ زمین سے پانی اُبلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل وعیال کے اور اُن لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہوجائیں، اور انسانوں کی ضروریات جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کرلیا۔

آخر میں فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور کشتی میں سوار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

یہ خلاصہ مضمون ہے آیاتِ متذکرہ کا، اب ہر ایک آیت کے مفہوم کی تشریح اور اُن سے متعلقہ مضامین و مسائل دیکھئے۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر یہ وحی بھیجی گئی کہ ان کی قوم میں سے جو ایمان لانے والے تھے لا چکے ہیں آئندہ اور کوئی ایمان نہ لائے گا اس لئے یہ لوگ جو کچھ معاملہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں اُس سے آپ غمگین و پریشان نہ ہوں، کیونکہ غم و پریشانی عموماً جب ہوتی ہے جب کسی سے صلاح و فلاح کی امید وابستہ ہو، مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہوتی ہے آپ ان سے مایوس ہوجایئے، اور جو تکلیف و صدمہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی ایذاؤں سے پہنچ رہا تھا اُس کے انتظام کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا کہ ان کو پانی کے طوفان میں غرق کردیا جائے گا، انہیں حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر اپنی قوم کے لئے وہ بددُعا آئی تھی جس کا ذکر سورۂ نوح میں کیا گیا ہے:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ، إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۔

یعنی اے میرے پروردگار، اب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑیئے، کیونکہ اگر یہ رہے تو ان کی آئندہ نسل بھی ایسی ہی سرکش اور فاجر و کافر ہوگی۔

یہی دُعا قبول ہوکر پوری قوم نوح طوفان میں غرق کی گئی۔

نوح علیہ السلام کو کشتی سازی کی تعلیم حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی بنانے کا حکم ملا اُس وقت وہ نہ کشتی کو جانتے تھے نہ اس کے بنانے کو، اس لئے دوسری آیت میں انکی سفینہ سازی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا یعنی آپ کشتی بنائیں ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق۔

روایاتِ حدیث میں ہے کہ جبرئیل امین نے بذریعہ وحی الٰہی حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی تمام ضروریات اور اس کا طریقہ بتلایا، اُنہوں نے سال کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی بعض تاریخی روایات میں اس کی پیمائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو[300] گز لانبا، پچاس[50] گز چوڑا، تیس گز اونچا، سہ منزلہ جہاز تھا اور روشن دان مروجہ طریق کے مطابق دائیں بائیں کھلتے تھے اس طرح یہ جہاز سازی کی صنعت وحی خداوندی کے ذریعہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں شروع ہوئی، پھر اس میں ترقیات ہوتی رہیں۔

تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی کے ذریعہ ہوئی حافظ شمس الدین ذہبی کی الطب النبوی میں بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی کسی نہ کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے پھر حسب ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں، سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام

کی طرف جو وحی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے، بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات میں سے ہے۔

سرسید صاحب بانی علیگڑھ کالج نے خوب فرمایا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کرلیں لیکن مدارِ کار ہر قسم کی گاڑیوں کا دُھری اور پہیئے پر ہی رہا، وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لیکر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے اس لئے سب سے بڑا مُوجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہیئے ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی رُوح پہیہ ہی ہے اور معلوم ہوچکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الٰہی عمل میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ بطورِ وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ آپکی قوم پر طوفان آئے گا، وہ غرق ہوں گے، اُس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے میں کوئی سفارش نہ کریں۔

تیسری آیت میں سفینہ سازی کے زمانہ میں قوم نوح علیہ السلام کی غفلت اور انجام سے بے فکری کا حال ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام بحکم خداوندی کشتی بنانے میں مشغول تھے انکی قوم کے سردار جب ان کو دیکھتے اور پوچھتے کہ کیا کر رہے ہو؟ تو یہ فرماتے کہ طوفان آنے والا ہے اس لئے کشتی تیار کر رہا ہوں انکی قوم ان کا مذاق اڑاتی اور استہزاء کرتی تھی کہ یہاں پینے کے لئے تو پانی کا قحط ہے، یہ بزرگ اس خشکی میں کشتی چلانے کی فکر میں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا کہ "اگر آج تم ہم سے استہزاء کرتے ہو تو یاد رکھو کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں ہم تم سے استہزاء کریں گے"، مراد یہ ہے کہ حالات ایسے پیش آئیں گے جو خود تمہارے استہزاء کے موجب ہوں گے، کیونکہ حقیقۃً استہزاء و تمسخر شانِ انبیاء کے خلاف ہے وہ کسی کے لئے جائز نہیں بلکہ حرام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ، یعنی کوئی کسی کے ساتھ استہزاء نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس استہزاء کرنیوالے سے بہتر ہو، اس لئے یہاں استہزاء سے مراد اُن کے استہزاء کا عملی جواب ہے کہ جب تم عذاب میں گرفتار ہوگے تو ہم تمہیں بتلائیں گے کہ یہ ہے تمہارے استہزاء کا انجام، جیسا کہ اس کے بعد چوتھی آیت میں فرمایا ہے کہ "عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کس پر ایسا عذاب

آپ چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور کس پر دائمی عذاب ہوتا ہے"۔ پہلے عذاب سے دنیا کا اور عذاب مقیم سے آخرت کا دائمی عذاب مراد ہے۔

پانچویں آیت میں طوفان کی ابتداء، اور اس سے متعلقہ ہدایات اور واقعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس میں ارشاد فرمایا حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ یعنی جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنّور سے پانی اُبلنا شروع ہوگیا۔

لفظ تَنُّوْر کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے، سطح زمین کو بھی تنور کہتے ہیں، روٹی پکانے کے تنور کو بھی تنور کہا جاتا ہے، زمین کے بلند حصہ کے لئے بھی لفظ تنور بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ اس جگہ تنور سے مراد سطح زمین ہے کہ اس سے پانی ابلنے لگا ۔۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام "عین وردہ" ملک شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا ۔۔ بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا، وہ مراد ہے، اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاہدؒ شعبیؒ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبیؒ تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی ابلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آگیا۔ (قرطبی و مظہری)

مفسر قرطبیؒ نے فرمایا کہ اگرچہ تنور کے معنی میں مفسرین کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی اختلاف نہیں، جب طوفان کا پانی ابلنا شروع ہوا تو روٹی پکانے کے تنور سے بھی نکلا، سطح زمین سے بھی اور ملک شام عین وردہ کے تنور سے بھی نکلا، جیسا کہ قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا یعنی ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے لئے کھول دیئے اور زمین سے چشمے ہی چشمے پھوٹ پڑے۔

شعبیؒ نے اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا کہ یہ کوفہ کی جامع مسجد، مسجد حرام اور مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد چوتھی مسجد ہے جو ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔

آیت میں آگے یہ بیان فرمایا کہ جب طوفان شروع ہوگیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا اِحْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ یعنی سوار کر لیجئے اس کشتی میں ہر جوڑے والے جانوروں کا ایک ایک جوڑا۔

اس سے معلوم ہو کہ کشتی نوحؑ میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔

اس سے وہ شبہ دور ہو گیا جو سطحی نظر میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کشتی میں اتنی وسعت کیسے ہو گئی کہ دنیا بھر کے جانور سما گئے۔

اور پھر نوح علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جو کفر پر ہیں کشتی میں سوار کر لیں اور ان سب لوگوں کو بھی جو آپ پر ایمان لائے ہیں، مگر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن و حدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ تعداد کل اسّی آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ

اور بولا سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے، اور وہ لئے جا رہی تھی ان کو لہروں میں جیسے پہاڑ، اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے، اے بیٹے سوار ہو جا ساتھ ہمارے اور مت رہ ساتھ کافروں کے، بولا جا لگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچا لے گا مجھ کو پانی سے، کہا کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہو گئی دونوں میں موج پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں، اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان

أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ

تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر

وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

اور حکم ہوا کہ دور ہو قوم ظالم۔

خلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) نے (سب جانوروں کو سوار کرکے اپنے متبعین سے) فرمایا کہ (آؤ) اس کشتی میں سوار ہو جاؤ (اور غرق سے کچھ اندیشہ مت کرنا کیونکہ) اس کا چلنا اور ٹھہرنا (سب) اللہ ہی کے نام سے ہے (اور وہی اس کے محافظ ہیں پھر اندیشہ کیوں کیا جاوے اور گو بندوں کے گناہ مقتضی غرق ہی ہیں مگر) بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے (وہ اپنی رحمت سے گناہ بخش دیتا ہے اور حفاظت بھی کرتا ہے، غرض سب کشتی پر سوار ہو گئے اور اس اثنا میں پانی بڑھ گیا) اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے (ایک سگے یا سوتیلے) بیٹے کو (جس کا نام کنعان تھا اور وہ باوجود فہمائش کے ایمان نہ لایا تھا اور بوجہ ایمان نہ لانے کے کشتی میں سوار نہ کیا تھا اور اس وقت کشتی کنارے کے قریب ہی تھی اور وہ کنارہ پر موجود تھا بطور آخری دعوت کے) پکارا اور وہ (کشتی سے) علیحدہ مقام پر تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے (کشتی میں سوار ہونے کی شرط کہ ایمان ہے بجا لاکر جلدی) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور (عقیدہ میں) کافروں کے ساتھ مت ہو (یعنی کفر کو چھوڑ دے کہ غرق سے بچ جاوے) وہ کہنے لگا میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی (میں غرق ہونے) سے بچا لے گا (کیونکہ وہ وقت ابتدا طوفان کا تھا پہاڑوں کے اوپر پانی نہ پہنچا تھا) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں (نہ پہاڑ اور نہ اور کوئی چیز) لیکن جس پر وہی رحم کرے تو اس کو خود ہی بچا لے (غرض کنعان اس وقت بھی ایمان نہ لایا اور پانی زور شور کے ساتھ اس طرف سے بڑھ گیا) اور دونوں (باپ بیٹوں) کے بیچ میں ایک موج حائل ہو گئی پس وہ (بھی مثل دوسرے کافروں کے) غرق ہو گیا اور (جب کفار سب غرق ہو چکے تو) حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی (جو کہ تیری سطح پر موجود ہے) نگل جا اور اے آسمان (برسنے سے) تھم جا (چنانچہ دونوں امر واقع ہو گئے) اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی (کوہ) جودی پر آ ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور۔

۴۰

معارف و مسائل

کشتیوں اور دوسری سواریوں پر سوار ہونے کے آداب

آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں کشتی اور سواری پر سوار ہونے کے آداب کی تعلیم ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا کہہ کر سوار ہوں، مجریٰ کے معنی جاری ہونا اور چلنا اور مُرسیٰ کے معنی رکنا اور ٹھہرنا ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اس کشتی اور سواری کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور اس کے نام سے ہے اور رکنا اور ٹھہرنا بھی اسی کی قدرت کے تابع ہے۔

ہر سواری کا چلنا اور ٹھہرنا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے

انسان اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کشتی ہو یا کوئی پر چلنے والی کوئی سواری، نہ اس کا پیدا کرنا بنانا اس کی قدرت میں ہے نہ چلانا اور ٹھہرانا اس کے بس کا ہے، انسان اپنی سطحی اور سرسری نظر کی بنا پر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو بنایا اور چلایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس نے وہ لوہا، لکڑی پیتل، المونیم وغیرہ پیدا کئے ہیں جو ان تمام سواریوں کا خام مادّہ ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ ایک تولہ لوہا یا ایک فٹ لکڑی پیدا کر سکے، پھر ان خام اجناس (میٹیریل) سے طرح طرح کے کل پرزے بنانے کی عقل و فہم کس نے دی، کیا یہ عقل و فہم انسان نے خود پیدا کرلی ہے؟ اگر خود پیدا کرلینا انسان کے بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے وقوف کم عقل نہ رہتا، ہر شخص افلاطون و ارسطو ہی بنکر رہتا، کہیں کی لکڑی کہیں کا لوہا، کہیں کے آلات و اوزار استعمال کرکے سواری کا ڈھانچہ بھی بن گیا، اب ان منوں، اور ٹنوں کے بھاری بوجھ کو لے کر زمین پر دوڑنے یا ہوا پر اڑنے کے لئے جس طاقت (پاور) کی ضرورت ہے وہ خواہ پیٹرول سے حاصل کی جائے یا ہوا اور پانی کے ٹکراؤ سے برقی صورت میں حاصل کی جائے، بہرحال سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے انسان نے کس چیز کو پیدا کیا ہے، پیٹرول اس نے پیدا کیا یا ہوا پانی اس نے بنایا، ان میں آکسیجن، ہائیڈروجن کی طاقتیں اس نے پیدا کیں؟

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو اسکو سائنس کی اعجوبہ کاری اور عروج کے اس زمانہ میں بھی اپنی بےبسی اور عاجزی ہی کا مشاہدہ ہوگا، اور اس اقرار کے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ہر سواری کا چلنا اور رکنا سب خالقِ کائنات حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے۔

غافل انسان اپنے ظاہری جوڑ توڑ کے تصرفات جنکا دوسرا نام سائنسی ایجادات ہے ان پر فخر و غرور کے نشہ میں ایسا مست ہوجاتا ہے کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس غفلت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

کی اصل حقیقت سامنے کردیتے ہیں، دیکھنے میں تو یہ ایک دو لفظی فقرہ ہے مگر غور کیجئے تو یہ کلید اور کنجی ہے ایک ایسے دروازہ کی جہاں سے انسان اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے روحانی عالم کا باشندہ بن جاتا ہے، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہیں سے مؤمن کی دنیا اور کافر کی دنیا میں فرق نمایاں ہوجاتا ہے، سواری پر دونوں سوار ہوتے ہیں لیکن مؤمن کا قدم جو سواری پر آتا ہے وہ اُس کو صرف زمین کی مسافت قطع نہیں کرتا بلکہ عالم بالا سے بھی روشناس کردیتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیت میں بتلایا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے سب اہل و عیال کشتی میں سوار ہوگئے مگر ایک لڑکا جسکا نام کنعان بتلایا جاتا ہے سوار ہونے سے رہ گیا تو پدرانہ شفقت سے حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو پکارا کہ ہمارے ساتھ کشتی میں آجاؤ، کافروں کے ساتھ نہ رہو کہ غرق ہوجاؤ گے، یہ لڑکا کافروں دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور حقیقت میں کافر تھا مگر غالباً حضرت نوح علیہ السلام کو اس کے کافر ہونے کا یقینی طور پر علم نہ تھا اور اگر علم تھا تو کفر سے توبہ کرکے ایمان لانے کی دعوت کے طور پر اس کو کشتی میں سوار ہونے اور کافروں کا ساتھ چھوڑنے کی نصیحت فرمائی، مگر اس بدبخت نے اسوقت بھی طوفان کو سرسری سمجھا اور کہنے لگا کہ آپ فکر نہ کریں، میں پہاڑ پر چڑھ کر طوفان سے بچ جاؤں گا، حضرت نوح علیہ السلام نے پھر متنبہ کیا کہ ظالم کس خیال میں ہے آج کوئی اونچی عمارت یا پہاڑ کسی کو اللہ کے عذاب سے بچانیوالا نہیں اور بچنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم فرمادیں، باپ بیٹے کی یہ گفتگو دور سے چل ہی رہی تھی کہ ایک موج اس طوفان کی آئی اور بیٹے کو بہالے گئی تاریخی روایات میں ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام کا پانی بڑے سے بڑے پہاڑ کی چوٹی سے پندرہ گز اور بعض روایات کے لحاظ سے چالیس گز اونچائی پر تھا۔

چوتھی آیت میں طوفان کے ختم ہونے اور حالات کے ہموار ہونے کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو خطاب کرکے حکم دیا یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ اے زمین تو اپنا پانی نگل لے، مراد یہ تھی کہ جس قدر پانی زمین سے اُبلا تھا اس کے لئے یہ حکم دے دیا کہ اس کو پھر زمین اپنے اندر اتار لے، آسمان کو حکم دیا گیا کہ اب پانی برسانا بند کردے، اس طرح زمین سے نکلا ہوا پانی پھر زمین میں چلا گیا اور آسمان سے آئندہ پانی برسنا بند ہوگیا، آسمان سے برسا ہوا جتنا پانی زمین پر موجود تھا اس کو قدرت نے دریاؤں اور نہروں کی شکل دیدی جس سے انسان فائدہ اٹھائے (تفسیر قرطبی و مظہری)

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو خطاب کرکے احکام دیئے ہیں، حالانکہ

ظاہر نظر میں وہ کوئی ذی شعور چیزیں نہیں ہیں، اسی لئے بعض حضرات نے اس کو مجاز و استعارہ پر محمول کیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری نظر اور ہمارے اعتبار سے دنیا کی جتنی چیزیں بے شعور، بے حس، بے جان ہیں، حقیقت میں وہ سب ذی روح ذی شعور چیزیں ہیں البتہ اُن کا شعور و ادراک اس درجہ کا نہیں جس درجہ کا انسان وغیرہ کو حاصل ہے اسی لئے ان کو غیر ذی شعور قرار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف نہیں بنایا گیا، قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس پر شاہد ہیں جیسے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اس کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت عقل و شعور پر، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں عقل و شعور اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق موجود ہے اُسی عقل و شعور سے وہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور جس کام پر اُس کو اُس کے پیدا کرنے والے نے لگا دیا ہے اُس کام کو ہر چیز خوب سمجھتی ہے اور اُس کی ادائیگی میں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی ہے، آیتِ قرآن اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی کا یہی مطلب ہے، اس لئے اس آیت میں اگر آسمان و زمین کے خطاب کو حقیقی معنیٰ میں خطاب قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بقول رومیؒ ؎

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند   بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

چوتھی آیت کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان نے احکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصّہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام جُودی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے "رحمت سے دُور" کہہ دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اسی نام سے قائم ہے اس کا محل وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطنِ اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ بن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام جُودی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جُودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی۔

قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جنکو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا، پھر ۱۰ محرم یوم عاشورا

میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل جودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ (مظہری و قرطبی)

روزہ عاشورا یعنی محرم کی دسویں تاریخ کی اہمیت تمام شرائع انبیاء میں قدیم سے چلی آتی ہے ابتداء اسلام میں رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشوراء کا روزہ فرض تھا، رمضان کی فرضیت نازل ہونے کے بعد فرض نہیں، مگر سنت اور ثواب عظیم ہمیشہ کے لئے ہے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ

اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ

الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۴۵ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ

سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھر والوں میں

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ڮ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ

اس کے کام ہیں خراب سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو

اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۴۶ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ

کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں بولا اے رب میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ

اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ

پوچھوں تجھ سے جو معلوم نہ ہو مجھ کو اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں

مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۴۷ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ

نقصان والوں میں حکم ہوا اے نوح اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں

عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ

کے ساتھ تجھ پر اور ان فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور دوسرے فرقے ہیں کہ ہم فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا

مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴۸ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ

ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف

مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ڔ فَاصْبِرْ ڔ

نہ تجھ کو ان کی خبر تھی نہ تیری قوم کو اس سے پہلے سو تو صبر کر

اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۹ۧ

البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (جب) نوح (علیہ السلام) نے کنعان کو ایمان لانے کے لئے فرمایا اور اس نے نہ مانا تو اس کے غرق ہونے کے قبل انہوں نے (اس امید پر کہ شاید حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے دل میں ایمان القاء فرما دے اور ایمان لے آوے) اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا (یہ) وعدہ بالکل سچا ہے (کہ گھر والوں میں جو ایمان والے ہیں ان کو بچا لوں گا، اور گو یہ بدست ایمان والا اور مستحق نجات نہیں ہے لیکن) آپ احکم الحاکمین (اور بڑی قدرت والے) ہیں (اگر آپ چاہیں تو اس کو مومن بنا دیں تاکہ یہ بھی اس وعدۂ حقہ کا محل بن جائے، خلاصہ معروض کا دعاء ہے اس کے مومن ہو جانے کے لئے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نوح یہ شخص (ہمارے علم ازلی میں) تمہارے (ان) گھر والوں میں نہیں (جو ایمان لا کر نجات پاویں گے یعنی اس کی قسمت میں ایمان نہیں بلکہ) یہ (خاتمہ تک) تباہ کار (یعنی کافر رہنے والا) ہے سو مجھ سے ایسی چیز کی درخواست مت کرو جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی ایسے امر محتمل کی دعاء مت کرو) میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں داخل نہ ہو جاؤ، نوح نے عرض کیا کہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ (آئندہ) آپ سے ایسے امر کی درخواست کروں جس کی مجھ کو خبر نہ ہو اور (گزشتہ معاف کر دیجئے کیونکہ) اگر آپ میری مغفرت نہ فرماویں گے اور مجھ پر رحم نہ فرماویں گے تو میں تو بالکل تباہ ہی ہو جاؤں گا (جب جودی پر کشتی ٹھہرنے کے چند روز بعد پانی بالکل اتر گیا اس وقت نوح علیہ السلام سے) کہا گیا (یعنی اللہ تعالیٰ نے خود یا کسی فرشتہ کے ذریعہ سے ارشاد فرمایا) کہ اے نوح (اب جودی پر سے زمین پر) اترو ہماری طرف سے سلام اور برکتیں لے کر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر کہ تمہارے ساتھ ہیں (کیونکہ ساتھ والے سب مسلمان تھے اور اس علت کے اشتراک سے قیامت تک کے مسلمانوں پر بھی سلام و برکات کا نزول معلوم ہو گیا، اور چونکہ یہ کلام بعد والے مسلمانوں پر بھی برکات کے نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور بعد والوں میں بعضے کافر بھی ہوں گے اس لئے ان کا حال بھی بیان فرماتے ہیں کہ) بہت سی ایسی جماعتیں بھی ہوں گی کہ ہم ان کو (دنیا میں) چند روز عیش دیں گے پھر (آخرت میں) ان پر ہماری طرف سے سزائے سخت واقع ہوگی، یہ قصہ (آپ کے اعتبار سے) منجملہ اخبار غیب کے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو پہنچاتے ہیں اس (قصہ) کو اس (ہمارے بتلانے) کے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم (جانتی تھی، اس اعتبار سے غیب تھا اور بجز وحی کے دوسرے سب اسباب علم کے یقیناً مفقود ہیں پس ثابت ہو گیا

کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے اور یہی نبوت ہے لیکن یہ لوگ بعد ثبوت نبوت کے بھی آپ کی مخالفت کرتے ہیں، سو صبر کیجئے (جیسا اس قصہ میں نوح علیہ السلام کا صبر آپکو معلوم ہوا ہے)، یقیناً نیک انجامی متقیوں ہی کے لئے ہے (جیسا نوح علیہ السلام کے قصہ میں معلوم ہوا کہ کفار کا انجام برا اور مسلمانوں کا انجام اچھا ہوا اسی طرح ان کفار کا چند روزہ زور شور ہے پھر اخیر میں غلبہ حق ہی کو ہوگا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ہودؑ کی مذکورہ پانچ آیتوں میں طوفان نوح علیہ السلام کا باقی قصہ اور اس سے متعلق ہدایات مذکور ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان جب والد بزرگوار کی نصیحت اور دعوت کے باوجود کشتی میں سوار نہ ہوا تو اس کو موجِ طوفان میں مبتلا دیکھ کر شفقت پدری نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کیا کہ آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میرے گھر والوں کو طوفان سے بچائیں گے اور بلاشبہ آپ کا وعدہ حق و صحیح ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ میرا بیٹا جو میرے گھر والوں میں داخل ہے وہ طوفان کی نذر ہو رہا ہے اور آپ تو احکم الحاکمین ہیں ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، اب بھی اسکو طوفان سے بچا سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ لڑکا آپ کے اہل و عیال میں داخل نہیں، کیونکہ اُس کا عمل اچھا نہیں بلکہ تباہ کار ہے اس لئے آپ کو نہیں چاہئے کہ اس حقیقت حال سے بے خبر رہ کر مجھ سے کوئی سوال کریں، ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں میں داخل نہ ہوجاؤ۔

حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس بیٹے کے کفر کا پورا حال معلوم نہ تھا اس کے نفاق کی وجہ سے وہ اس کو مسلمان ہی جانتے تھے، اسی لئے اس کو اپنے اہل کا ایک فرد قرار دیکر طوفان سے بچانے کی دعا کر بیٹھے ورنہ اگر ان کو حقیقت حال معلوم ہوتی تو ایسی دعا نہ کرتے، کیونکہ اُن کو صریح طور پر پہلے ہی یہ ہدایت دیدی گئی تھی کہ جب طوفان آجائے تو پھر آپ ان سرکشوں میں سے کسی کے متعلق کوئی سفارش کی گفتگو نہ فرمائیں، جیسا کہ پچھلی آیات میں گزر چکا ہے وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ، اس صاف و صریح حکم کے بعد ناممکن تھا کہ پیغمبر خدا اس کی خلاف ورزی کی جرأت کرتے بجز اس احتمال کے جسکو اوپر خلاصہ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ اس دعاء کا حاصل اس بیٹے کے

مؤمن ہو جانے کی دُعاء ہے یہ نہیں کہ اس کے موجودہ حال میں اس کو طوفان سے بچا یا جائے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی اس کے کفر سے بے علمی اور اس کی بنا پر دعاء نجات کو بھی حق تعالیٰ نے عذر صحیح قرار نہیں دیا اور اسی لئے تنبیہ کی گئی کہ بغیر علم کے ایسی دُعاء کیوں کی، اور یہ پیغمبرانہ شان کی ایک ایسی لغزش ہے جس کو حضرت نوح علیہ السلام اُس وقت بھی اپنے عذر میں پیش کریں گے جب محشر میں پوری مخلوق خدا آپ سے شفاعت کرنے کی درخواست کرے گی تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے ایسی لغزش ہو چکی ہے اس لئے میں شفاعت کی جرأت نہیں کرسکتا۔

[illegible] کام کے لئے دُعاء جائز نہیں

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دُعاء کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دعاء کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دعاء کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دعاء کرنے سے منع فرما دیا گیا ہے، تفسیر رُوح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دعاء کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز و حرام ہونا معلوم ہو اُس کے لئے دُعاء کا ناجائز ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آجکل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہوگیا ہے کہ جو شخص کسی دعاء کے لئے آیا اُس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دُعاء کردی حالانکہ اکثر اُن کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدمہ کے لئے یہ دُعاء کرا رہا ہے اُس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دُعاء کرا رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں، کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلا ہوگا یا کسی کی حق تلفی کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے گا۔

ایسی دُعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام و ناجائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہو تو حقیقتِ حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دُعاء کیلئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

مؤمن و کافر میں رشتہ اخوت نہیں ہوسکتا۔ وطنی یا نسبی بنیاد پر قومیت کی تعمیر اصولِ اسلام سے بغاوت ہے

دُوسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مؤمن و کافر کے درمیان اگرچہ رشتہ قرابت کا ہو مگر دینی اور اجتماعی معاملات میں اس رشتہ داری کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کوئی شخص کتنا ہی عالی نسب ہو، کتنے ہی بڑے بزرگ کی اولاد ہو یہاں تک کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہونے کا شرف رکھتا ہو، اگر وہ مؤمن نہیں ہے تو دینی معاملات میں اُسکے اس نسب عالی اور قرابت نبوی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا، تمام دینی معاملات میں تو مدار کار ایمان اور صلاح و تقویٰ پر ہے، جو صالح و متقی ہے وہ اپنا ہے جو ایسا نہیں وہ بیگانہ ہے، سه

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد — فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

اگر دینی معاملات میں بھی ان رشتہ داریوں کی رعایت ہوتی تو بدر و اُحد کے میدانوں میں بھائی کی تلوار بھائی پر نہ چلتی، بدر و اُحد اور احزاب کے معرکے تو سب کے سب ایک ہی خاندانوں کے افراد کے درمیان پیش آئے ہیں، جس نے واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت اور برادری نسبی تعلقات یا وطنی اور لسانی وحدتوں پر دائر نہیں ہوتی بلکہ ایمان و عمل پر دائر ہے، ایمان والے خواہ کسی ملک کے باشندے اور کسی خاندان کے افراد اور کوئی زبان بولنے والے ہوں سب ایک قوم اور ایک برادری ہیں، اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کا یہی مطلب ہے، اور جو ایمان و عمل صالح سے محروم ہیں وہ اسلامی برادری کے فرد نہیں، قرآن کریم نے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی زبانی اس حقیقت کو بہت واضح لفظوں میں بیان فرمایا ہے اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، یعنی ہم تم سے بھی بری ہیں اور تمہارے معبودوں سے بھی۔

اس مسئلہ میں احقر نے دینی معاملات کی قید اس لئے لگائی ہے کہ دنیوی معاملات میں حسنِ معاشرت، حسنِ اخلاق اور احسان و کرم کا سلوک کرنا الگ چیز ہے وہ غیر صالح سے بھی جائز بلکہ مستحسن اور ثواب ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تعامل غیر مسلموں کے ساتھ احسان و سلوک کے بیشمار واقعات اس پر شاہد ہیں۔

آج کل جو وطنی اور لسانی یا لونی بنیادوں پر قومیت کی تعمیر کی جاتی ہے، عرب برادری ایک قوم، ہندی، سندھی دوسری قوم قرار دی جاتی ہے، یہ قرآن و سنت کے خلاف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول سیاست سے بغاوت کے مرادف ہے۔

تیسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے جو معذرت پیش ہوئی اس کا ذکر ہے، جس کا خلاصہ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع و التجاء، اور غلط کاموں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ لینے کی دعاء اور پھر گزشتہ لغزش کی معافی اور مغفرت و رحمت کی درخواست ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان سے اگر کوئی خطا سرزد ہو جائے تو آئندہ اُس سے بچنے کیلئے تنہا اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ سے پناہ اور یہ دُعاء مانگے کہ یا اللہ آپ ہی مجھے خطاؤں اور گناہوں سے بچا سکتے ہیں۔

چوتھی آیت میں قصہ طوفان کا خاتمہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب طوفان ختم ہو چکا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور زمین کا پانی زمین نے جذب کر لیا، اور آسمان کا باقیماندہ پانی نہروں، دریاؤں کی شکل میں محفوظ ہو گیا جس کے نتیجہ میں زمین انسانی رہائش کے قابل ہو گئی تو حضرت نوح علیہ السلام سے کہا گیا کہ اب آپ پہاڑ سے زمین پر اتریئے، ور ہمار ی

فکر نہ کیجئے کیونکہ آپ کے ساتھ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہوں گی، یعنی آفات اور مصائب سے سلامتی اور مال و اولاد میں وسعت و برکت ہوگی۔

اس ارشاد کے مطابق طوفان کے بعد دنیا میں ساری انسانی آبادی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہے، قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ، یعنی اس واقعہ کے بعد دنیا میں باقی رہنے والی سب قومیں صرف نوح علیہ السلام ہی کی ذریت و اولاد ہونگی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو اہل تاریخ آدم ثانی کا نام دیتے ہیں۔

پھر یہ سلامت و برکت کا وعدہ جو حضرت نوح علیہ السلام سے کیا گیا ہے صرف ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ فرمایا گیا وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ یعنی جو امتیں اور جماعتیں آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہیں ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور برکت نازل ہوگی، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو آیت میں اُمَم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو اُمّۃ کی جمع ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے مختلف قوموں اور امتوں پر مشتمل تھے حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کشتی میں سوار ہونے والے زیادہ تر حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے لوگ تھے اور معدودے چند دوسرے مؤمن بھی تھے، تو ان لوگوں کو مختلف امتیں اور قومیں اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ انکی آنے والی نسلوں میں مختلف اُمتیں اور قومیں ہونگی، اس سے معلوم ہوا کہ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ کے لفظ میں وہ تمام نسل انسانی داخل ہے جو قیامت تک پیدا ہوگی۔

اسی لئے اس کی ضرورت پڑی کہ سلامت و برکت کے مضمون میں تفصیل کی جائے کیونکہ قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی میں تو مؤمن بھی ہوں گے کافر بھی، مؤمن کے لئے تو سلامت و برکت اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے درست ہے کہ دنیا میں بھی ان کو سلامت و برکت نصیب ہوگی آخرت میں بھی لیکن اسی نسل میں جو کفار ہوں گے وہ تو جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان کو سلامت و برکت کا محل قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا اس لئے آخر آیت میں فرما دیا وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ یعنی دنیا کی سلامت و برکت تو اللہ تعالیٰ کا خوان یغما ہے جس سے دوست دشمن سبھی کھاتے پیتے ہیں اس میں وہ لوگ بھی شریک ہونگے جو نوح علیہ السلام کی اولاد میں کفر اختیار کریں گے لیکن آخرت کی نجات و فلاح یہ صرف مؤمنین کے لئے مخصوص ہوگی، کافروں کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دلا کر فارغ کر دیا جائے گا، آخرت میں اُن کے لئے بجز عذاب کے کچھ نہ ہوگا۔

طوفانِ نوح کی یہ تفصیلی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعۂ وحی معلوم کر کے اپنی قوم کو

سنائیں تو یہ واقعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی ایک شہادت بن گیا، اس پر متنبہ کرنے کے لئے پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ نوح علیہ السلام اور ان کے طوفان کے واقعات یہ غیب کی خبریں ہیں جنکو نہ آپ پہلے سے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، سب ہی اس سے ناواقف تھے، آپ نے ان کو بتلایا تو اس کا راستہ بجز اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے، کیونکہ اگر آپ کی قوم کے لوگ لکھے پڑھے اور تاریخ عالم سے واقفیت رکھنے والے ہوتے تو یہ خیال بھی ہوسکتا تھا کہ آپ نے ان لوگوں سے سُنکر یہ واقعات بیان کردیئے ہیں، لیکن جبکہ پوری قوم بھی ان واقعات سے بے خبر تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی دوسرے ملک میں تشریف نہیں لے گئے تو اس خبر کا راستہ صرف وحی متعین ہوگیا جو نبی کے نبی برحق ہونے کی واضح دلیل ہے۔

آخر آیت میں رسول کریم کی تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ آپ کی نبوت و رسالت پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل کے ہوتے ہوئے بھی اگر کچھ بدبخت نہیں مانتے اور آپ سے جھگڑا کرتے ہیں تو آپ کو اپنے پہلے پیغمبر نوح علیہ السلام کا اسوہ دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے ایک ہزار سال کی طویل عمر ساری انہیں اذیتوں میں گزار دی، تو جس طرح انہوں نے صبر کیا آپ بھی ایسا ہی صبر سے کام لیں، کیونکہ یہ متعین ہے کہ انجام کار کامیابی متقی لوگوں کو ہی ملے گی۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ

اور عاد کی طرف بھیجا ان کے بھائی ہود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں

غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ

سوائے اس کے تم سب جھوٹ کہتے ہو ۔ اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اس پر مزدوری

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيَا قَوْمِ

میری مزدوری اسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر کیا تم نہیں سمجھتے ۔ اور اے قوم

اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَ

گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اسی کی طرف چھوڑ دے گا تم پر آسمان سے دھاریں اور

يَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا يَا هُودُ

زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور روگردانی نہ کرو گنہگار ہوکر ۔ بولے اے ہود

مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ

تو ہمارے پاس کوئی سند لیکر نہیں آیا اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور ہم نہیں

لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٥٣﴾ إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ

تجھ کو ماننے والے، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے معبود نے بُری طرح

قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾ مِن

بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کے سوا

دُونِهِ ۖ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ﴿٥٥﴾ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ

سو برائی کرو میرے حق میں تم سب مل کر پھر مجھ کو مہلت نہ دو، میں نے بھروسہ کیا اللہ پر

رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي

جو رب ہے میرا اور تمہارا، کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے ہاتھ میں ہے چوٹی اس کی، بیشک میرا رب ہے

عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٦﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ

سیدھی راہ پر، پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو میں پہنچا چکا تم کو جو میرے ہاتھ بھیجا تھا

بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ

تمہاری طرف، اور قائم مقام کرے گا میرا رب کوئی اور لوگ، اور نہ بگاڑ سکو گے اس کا کچھ

إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَ

تحقیق میرا رب ہے ہر چیز پر نگہبان، اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور

الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٨﴾

جو لوگ ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے، اور بچا دیا ان کو ایک بھاری عذاب سے

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ

اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا

كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ

جو سرکش تھے مخالف، اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن بھی

أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾ وَإِلَىٰ ثَمُودَ

سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رب سے، سن لو پھٹکار ہے عاد کو جو قوم تھی ہود کی، اور ثمود کی طرف بھیجا

أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ

ان کا بھائی صالح، بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا حاکم اس کے سوا، اسی نے

أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ

بنایا تم کو زمین سے اور بسایا تم کو اس میں سو گناہ بخشواؤ اس سے اور رجوع کرو اس کی طرف

إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا

تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنے والا ۔ بولے اے صالح تجھ سے تو ہم کو امید تھی

قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا

اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے اور ہم کو تو شبہ ہے

تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ

اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا ۔ بولا اے قوم بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ مل گئی

مِّن رَّبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ

اپنے رب کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے مجھ کو اس سے اگر اس کی نافرمانی کروں

فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾ وَيَا قَوْمِ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً

سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے ۔ اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی

فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ

سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں اور مت ہاتھ لگاؤ اس کو بری طرح پھر پکڑے گا تم کو عذاب

قَرِيبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ

بہت جلد ۔ پھر اس کے پاؤں کاٹے تب کہا فائدہ اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن یہ

وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ

وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا ۔ پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو

آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

ایمان لائے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے ۔ بیشک تیرا رب وہی ہے

الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا

زور والا زبردست ۔ اور پکڑ لیا ان ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے

فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٦٧﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا

اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے ۔ جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں ۔ سن لو

إِنَّ ثَمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا

ثمود منکر ہوئے اپنے رب سے ۔ سن لو پھٹکار ہے

لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾ ع

ثمود کو ۔

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں تم (اس بت پرستی کے اعتقاد میں) محض مفتری ہو (کیونکہ اس کا باطل ہونا دلیل سے ثابت ہے، اے میری قوم (میری نبوت جو دلائل سے ثابت ہے اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ) میں تم سے (تبلیغ پر) کچھ معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اس (اللہ) کے ذمہ ہے جس نے مجھ کو (عدم محض سے) پیدا کیا پھر کیا تم (اس کو) نہیں سمجھتے (کہ دلیل نبوت موجود ہے اور اس کے خلاف کوئی وجہ شبہ کی نہیں پھر نبوت میں شبہ کی کیا وجہ) اور اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ اور) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو یعنی عمل صالح کرو (پس ایمان و عمل صالح کی برکت سے) وہ تم پر خوب بارش برسا دیگا (در منثور میں ہے کہ قوم عاد پر تین سال متواتر قحط پڑا تھا اور ویسے بارش خود بھی مطلوب ہے) اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو قوت دیکر تمہاری قوت (موجودہ) میں ترقی کر دے گا (پس ایمان لاؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو، ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے ہود آپ نے ہمارے سامنے (اپنے رسول من اللہ ہونے کی) کوئی دلیل تو پیش نہیں کی (یہ قول ان کا عناداً تھا) اور ہم آپ کے (صرف) کہنے سے تو اپنے معبودوں (کی عبادت) کو چھوڑنے والے ہیں نہیں اور ہم کسی طرح آپ کا یقین کرنے والے نہیں (اور ہمارا قول تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے آپ کو کسی خرابی میں (مثل جنون وغیرہ کے) مبتلا کر دیا ہے (چونکہ آپ نے انکی شان میں گستاخی کی انہوں نے باؤلا کر دیا اس لئے ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو کہ خدا ایک ہے میں نبی ہوں) ہود (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم جو کہتے ہو کہ کسی بت نے مجھ کو باؤلا کر دیا ہے تو میں (علی الاعلان) اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی (سن لو اور) گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے (بالکل) بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک (عبادت) قرار دیتے ہو، سو (میری عداوت اول تو پہلے سے ظاہر ہے اور اب اس اعلان برأت سے اور زیادہ مؤکد ہو گئی تو اگر ان بتوں میں کچھ قوت ہے تو) تم (اور وہ) سب ملکر میرے ساتھ (ہر طرح کا) داؤ گھات کر لو اور پھر مجھ کو ذرا مہلت نہ دو اور کوئی کسر نہ چھوڑو، دیکھوں تو سہی میرا کیا کرلیں گے (جب وہ مع تمہارے کچھ نہیں کر سکتے تو اکیلے تو کیا خاک کر سکتے ہیں اور میں یہ دعویٰ اس لئے دل کھول کر کر رہا ہوں کہ بت تو محض عاجز ہیں

ان سے تو اس لئے نہیں ڈرتا، رہ گئے تم، سو تم کو کچھ قدرت طاقت حاصل ہے یقین میں تم سے
اس لئے نہیں ڈرتا کہ میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے
جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اس نے پکڑ رکھی ہے (یعنی سب اس کے قبضے
میں ہیں بے اس کے حکم کے کوئی کان نہیں ہلا سکتا اس لئے میں تم سے بھی نہیں ڈرتا اور اس تقریر
سے ایک نیا معجزہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ایک شخص تن تنہا ایسے بڑے بڑے زور آور لوگوں سے ایسی
مخالفت کرتا ہے اور وہ اس کا کچھ نہ کر سکیں پس وہ جو کہتے تھے مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ اس سے اس
کا بھی کافی جواب ہو گیا کہ اگر معجزہ سابقہ سے قطع نظر کی جاوے تو لو یہ دوسرا معجزہ ہے پس نبوت پر
دلیل قائم ہو گئی اور اس میں جو منشا اشتباہ تھا اِعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ اس کا بھی جواب
ہو گیا پس نبوت ثابت ہو گئی اس سے توحید کا وجوب بھی ثابت ہو گیا جس کی طرف میں دعوت
کرتا ہوں اور تمہارا کہنا مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا باطل ہو گیا اور صراط مستقیم یہی ہے اور)
یقیناً میرا رب صراط مستقیم پر چلنے سے ملتا ہے (پس تم بھی اس صراط مستقیم کو اختیار کرو تاکہ
مقبول و مقرب ہو جاؤ) پھر اگر (اس بیان بلیغ کے بعد بھی قبول حق سے) پھرے رہو گے تو میں تو
(معذور سمجھا جاؤں گا کیونکہ) جو پیغام دے کر مجھ کو بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا ہوں، لیکن تمہاری کمبختی
آوے گی کہ تم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے گا اور تمہاری جگہ میرا رب دوسرے لوگوں کو اس زمین میں
آباد کر دے گا، سو تم اس اعراض و کفر میں اپنا ہی نقصان کر رہے ہو) اور اس کا تم کچھ نقصان نہیں
کر رہے (اور اگر اس طرف سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ کیا خبر کون کیا کر رہا ہے تو خوب سمجھ لو کہ)
بالیقین میرا رب ہر شے کی نگہداشت کرتا ہے (اس کو سب خبر رہتی ہے، غرض ان تمام تبلیغوں پر
بھی ان لوگوں نے نہ مانا، اور سامان عذاب شروع ہوا سو) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) پہنچا
(اور ہوا کے طوفان کا عذاب نازل ہوا) تو ہم نے ہود (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان
تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور ان کو ہم نے ایک بہت ہی سخت عذاب
سے بچا لیا (آگے اوروں کو عبرت دلانے کے لئے فرماتے ہیں) اور یہ (جن کا ذکر ہوا) قوم عاد تھی جنہوں
نے اپنے رب کی آیات (یعنی دلائل و احکام) کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر
ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے (اور ان افعال کا یہ نتیجہ ہوا کہ) اس دنیا
میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ ساتھ رہے گی چنانچہ
دنیا میں ان کا عذاب طوفان سے ہلاک ہونا تھا اور آخرت میں دائمی عذاب ہوگا) خوب سن لو، قوم
عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے دوری ہوئی
(دونوں جہان میں) عاد کو جو کہ ہود علیہ السلام کی قوم تھی، اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے

بھائی صالح (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا اے میری قوم تم صرف اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اس کا تم پر یہ انعام ہے کہ) اس نے تم کو زمین (کے مادہ) سے پیدا کیا اور تم کو اس (زمین) میں آباد کیا (یعنی پیدا و ابقاء دونوں نعمتیں عطا فرمائیں جس میں سب نعمتیں آگئیں، جب وہ ایسا منعم ہے) تو تم اپنے گناہ (شرک و کفر وغیرہ) اس سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ) اور پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف (عبادت سے) متوجہ رہو (یعنی عمل صالح کرو) بیشک میرا رب (اس شخص سے) قریب ہے (جو اس کی طرف متوجہ ہو اور اس شخص کی درخواست) قبول کرنے والا ہے (جو اس سے گناہ معاف کراتا ہے)، وہ لوگ کہنے لگے اے صالح تم تو اس سے قبل ہم میں ہونہار (معلوم ہوتے) تھے (یعنی ہم کو تم سے امید تھی کہ اپنی لیاقت و وجاہت سے قوم اور ہمارے لیے باعث ناز ہو گے لیکن اب تو بالکل ہی پست ہو گئے، افسوس اس وقت جو باتیں کر رہے ہو ان سے تو ساری امیدیں خاک میں ملتی نظر آتی ہیں) کیا تم ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے منع کرتے ہو جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں (یعنی تم ان کو منع مت کرو) اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو (یعنی توحید) واقعی ہم تو اس کی طرف سے بڑے بھاری شبہ میں ہیں جس نے ہم کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ مسئلہ توحید ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا)، آپ نے (جواب میں) فرمایا اے میری قوم (تم جو کہتے ہو کہ تم توحید کی دعوت و رسالت سے کنارہ کش ہو جاؤ تو) بھلا یہ تو بتلاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر قائم ہوں (جس سے توحید ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہو (جس سے اس توحید کی دعوت کا میں مامور ہوں، سو اس حالت میں) اگر میں خدا کا کہنا نہ مانوں (اور دعوت توحید کو ترک کر دوں جیسا تم کہتے ہو) تو (یہ بتلاؤ کہ) پھر مجھ کو خدا (کے عذاب) سے کون بچا لے گا تو تم تو (ایسا مشورہ دے کر) سراسر میرا نقصان ہی کر رہے ہو (یعنی اگر خدانخواستہ قبول کر لوں تو بجز نقصان کے اور کیا ہاتھ آوے گا) اور چونکہ انہوں نے معجزہ کی بھی ثبوت رسالت کے لئے درخواست کی تھی اس لئے آپ نے فرمایا) اور اے میری قوم (تم معجزہ چاہتے ہو سو) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی کہ اللہ کی دلیل ہے، سو علاوہ اس کے کہ یہ بوجہ معجزہ ہونے کے میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو فوری عذاب آپکڑے (یعنی دیر نہ لگے) سو انہوں نے (باوجود اس تمام حجت کے) اس اونٹنی کو مار ڈالا تو صالح (علیہ السلام) نے فرمایا خیر تم اپنے گھروں میں تین دن اور بسر کر لو (تین دن کے بعد عذاب آتا ہے) اور یہ ایسا وعدہ ہے جس میں ذرا جھوٹ نہیں (کیونکہ منجانب اللہ ہے، سو تین دن گزرنے کے بعد) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا ہم نے صالح (علیہ السلام) کو اور جو ان کے ہمراہ

اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور (ان کو کیسی چیز سے بچا لیا) اس دن کی بڑی رسوائی سے بچا لیا (کیونکہ قہر ہی میں مبتلا ہونے سے بڑھ کر کیا رسوائی ہوگی) بیشک آپ کا رب ہی قوت والا غلبہ والا ہے (جس کو چاہے سزا دیدے جسکو چاہے بچالے) اور ان ظالموں کو ایک نعرہ نے آدبایا (کہ وہ آواز تھی جبریل علیہ السلام کی) جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (اور ان کی یہ حالت ہوگئی) جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (قوم) ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، خوب سن لو (اس کفر کا یہ خمیازہ ہوا کہ) رحمت سے ثمود کو دوری ہوئی۔

معارف و مسائل

سورۂ ہود کی مذکورہ پہلی گیارہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جنکے نام سے یہ سورت موسوم ہے، اس صورت میں نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک قرآن کریم کے قصص حذر میں سات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات مذکور ہیں جن میں عبرت و موعظت کے ایسے مضامین موجود ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی حیات اور شعور باقی ہو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، عبرت کے علاوہ ایمان اور عمل صالح کے بہت سے اصول و فروع اور انسان کے لئے بہترین ہدایات موجود ہیں۔

قصص و واقعات تو اس میں سات پیغمبروں کے درج ہیں مگر سورت کا نام حضرت ہود علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہود علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے قوم عاد میں مبعوث فرمایا، یہ قوم اپنے ڈیل ڈول اور قوت و شجاعت کے اعتبار سے پورے عالم میں ممتاز سمجھی جاتی تھی، حضرت ہود علیہ السلام بھی اسی قوم کے فرد تھے لفظ اَخَاهُمْ هُوْدًا میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مگر یہ اتنی قوی اور بہادر قوم افسوس کہ اپنے عقل و فکر کو کھو بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں سے تراشی ہوئی پتھروں کی مورتیوں کو اپنا خدا و معبود بنا رکھا تھا۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جو دعوتِ دین اپنی قوم کے سامنے پیش کی اس کی تین اصولی باتیں ابتدائی تین آیتوں میں مذکور ہیں :- اوّل دعوتِ توحید اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو لائقِ عبادت سمجھنا جھوٹ اور افتراء ہے، دوسرے یہ کہ میں جو یہ دعوت توحید لیکر آیا ہوں اور اس کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے تم یہ تو سوچو سمجھو کہ میں نے یہ مشقت و محنت کیوں اختیار کر رکھی ہے، نہ میں

تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ مانگتا ہوں نہ مجھے تمہاری خلف سے کوئی مادی فائدہ پہنچتا ہے اگر میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فرمان اور حق نہ سمجھتا تو آخر ضرورت کیا تھی کہ تمہیں دعوت دینے اور تمہاری **اصلاح کرنے میں اتنی محنت برداشت کرتا۔**

وعظ و نصیحت اور دعوت دین پر اجرت

قرآن کریم نے یہ بات تقریباً سب ہی انبیاء کی زبان سے نقل کی ہے کہ ہم تم سے اپنی دعوت و محنت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا اگر معاوضہ لیا جائے تو دعوت موثر نہیں رہتی، جس پر تجربہ شاہد ہے کہ وعظ و نصیحت پر اُجرت لینے والوں کی بات سامعین پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اپنی پچھلی زندگی میں جو کفر و گناہ تم کر چکے ہو، اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت مانگو اور اگلی زندگی میں ان سب گناہوں سے توبہ یعنی اس کا پختہ ارادہ اور معاہدہ کرو کہ اب اُن کے پاس نہ جائیں گے، اگر تم نے یہ استغفار و توبہ کا عمل کر لیا تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی دائمی فلاح تو ملے ہی گی، دنیا میں بھی اس کے بڑے بڑے فوائد کا مشاہدہ کرو گے، ایک یہ کہ توبہ و استغفار کرنے سے تمہاری قحط سالی دور ہو جائے گی، وقت پر خوب بارش ہوگی جس سے تمہارے رزق میں وسعت پیدا ہوگی، دوسرے یہ کہ تمہاری طاقت و قوت بڑھ جائے گی۔

یہاں طاقت و قوت کا لفظ عام ہے جس میں بدنی صحت و قوت بھی داخل ہے اور وہ طاقت بھی جو مال اور اولاد کی جہت سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں سے توبہ و استغفار کا خاصہ یہ ہے کہ دنیا میں بھی رزق میں **وسعت اور مال و اولاد میں برکت ہوتی ہے۔**

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے ان کی دعوت کا جواب وہی اپنی جاہلانہ روش سے یہ دیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ تو دکھایا نہیں صرف زبانی بات ہے اس لئے ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو تو چھوڑیں گے اور آپ پر ایمان نہ لائیں گے، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے معبود بتوں کو برا کہنے کی وجہ سے آپ کسی دماغی خرابی میں مبتلا ہوگئے اس لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں ہود علیہ السلام نے پیغمبرانہ جرأت کے ساتھ فرمایا کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو سن لو کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اللہ کے سوا تمہارے سب معبودوں سے بیزار ہوں، اب تم اور تمہارے بُت سب ملکر میرے خلاف جو کچھ داؤ گھات کر سکتے ہو کر لو اور اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو **تو بگاڑ لو اور مجھے ذرا مہلت بھی نہ دو۔**

اور فرمایا کہ اتنی بڑی بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کر لیا ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، جتنے روئے زمین پر چلنے والے ہیں سب کی چوٹی اُس نے پکڑ رکھی ہے

کسی کی مجال نہیں کہ اُس کے اذن و مشیت کے بغیر کسی کو ذرّہ برابر نقصان یا تکلیف پہنچا سکے، یقیناً میرا رب صراط مستقیم پر ہے، یعنی جو صراط مستقیم پر چلتا ہے رب اُس کو ملتا ہے، اُس کی مدد کرتا ہے۔

پوری قوم کے مقابلہ میں ایسا بلند بانگ دعویٰ اور ان کو غیرت دلانا اور پھر پوری بہادر قوم میں سے کسی کی مجال نہ ہونا کہ اُن کے مقابلہ میں کوئی حرکت کرے، یہ سب ایک مستقل معجزہ تھا ہود علیہ السلام کا، جس سے ان کی اس بات کا بھی جواب ہوگیا کہ آپ نے ہمیں کوئی معجزہ نہیں دکھلایا، اور اسکا بھی جواب ہوگیا کہ ہمارے بتوں نے آپکو دماغی خرابی میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ اگر بتوں میں یہ طاقت ہوتی تو اس وقت ان کو زندہ نہ چھوڑتے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم اسی طرح حق سے برگشتہ رہوگے تو سمجھ لو کہ جو پیغام دیکر مجھے بھیجا گیا ہے میں تمہارے سامنے پہنچا چکا ہوں تو اب اس کا نتیجہ اسکے سوا کیا ہے کہ تم پر خدا کا قہر و غضب آجائے اور تم سب نیست و نابود ہوجاؤ، اور میرا رب تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اس زمین پر آباد کردے، اور اس معاملہ میں جو کچھ کر رہے ہو اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہیں کر رہے، یقیناً میرا رب ہر چیز کی نگہداشت کرتا ہے وہ تمہارے ہر کام اور خیال سے باخبر ہے۔

ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا، آدمی اور جانور ہوا میں اُڑ کر آسمانی فضا تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ پکار سنائی دیتی تھی یہانتک کہ یہ بےمثال قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و برباد ہوگئی۔

جب اس قوم پر عذاب الٰہی کا حکم نافذ ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے سنتِ الٰہیہ کے مطابق اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچالیا کہ عذاب آنے سے پہلے اُن کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔

قوم عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم عاد جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری ان کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ قوم عاد پر ہوا کا طوفان مسلط ہوا تھا، مگر سورۂ مومنون میں یہ مذکور ہے کہ ان کو ایک سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کیا گیا، ہوسکتا ہے کہ قوم ہود علیہ السلام پر دونوں قسم

کے عذاب نازل ہوئے ہوں۔

قوم عاد اور ہود علیہ السلام کا واقعہ تمام ہوا۔

اِس کے بعد آٹھ آیتوں میں حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے جو قوم عاد ہی کی دوسری شاخ یعنی قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید کی دعوت دی، قوم نے حسب عادت ان کو جھٹلایا اور یہ ضد کی کہ آپ کا نبی برحق ہونا ہم جب تسلیم کریں جب کہ ہمارے سامنے اس پہاڑ کی چٹان میں سے ایک اونٹنی ایسی ایسی نکل آئے۔

صالح علیہ السلام نے ان کو ڈرایا کہ تمہارا منہ مانگا معجزہ اگر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کردیا اور پھر بھی تم نے ایمان لانے میں کوئی کوتاہی کی تو عادۃ اللہ کے مطابق تم پر عذاب آجائے گا اور سب ہلاک و برباد ہوجاؤ گے، مگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے اللہ تعالیٰ نے ان کا مطلوبہ معجزہ اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر فرمادیا، پہاڑ کی چٹان شق ہوکر ان کے بتائے ہوئے اوصاف کی اونٹنی برآمد ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس اونٹنی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں ورنہ تم پر عذاب آجائے گا مگر وہ اس پر بھی قائم نہ رہے، اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا، بالآخر خدا تعالیٰ نے اُن کو پکڑ لیا، حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے مؤمن ساتھی عذاب سے بچالئے گئے باقی پوری قوم ایک سخت ہیبت ناک آواز کے ذریعہ ہلاک کردی گئی۔

اس واقعہ میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا قَدۡ كُنۡتَ فِيۡنَا مَرۡجُوًّا قَبۡلَ هٰذَآ، یعنی آپ کے دعوائے نبوت اور بت پرستی کو منع کرنے سے پہلے ہم کو آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ آپ ہماری قوم کے لئے بڑے مصلح اور رہنما ثابت ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء کی پرورش بچپن ہی سے نہایت پاکیزہ اخلاق و عادات میں کرتے ہیں جسکو دیکھ کر سبھی ان سے محبت کرتے اور عظمت سے پیش آتے ہیں جیسے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اعلانِ نبوت سے پہلے سارا عرب امین کا خطاب دیتا اور سچا اور صالح اعتقاد رکھتا تھا، نبوت کے دعوے اور بت پرستی سے ممانعت کرنے پر یہ سب مخالف ہوگئے۔

تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ یعنی جب لوگوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کر کے اس معجزہ والی اونٹنی کو مار ڈالا تو جیسا پہلے ان کو متنبہ کردیا گیا تھا کہ ایسا کرو گے تو اللہ کا عذاب تم پر آئے گا، اب وہ عذاب اس طرح آیا کہ ان کو تین روز کی مہلت دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ چوتھے روز تم سب ہلاک کئے جاؤ گے۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ تین روز جمعرات، جمعہ اور ہفتہ تھے، اتوار کے روز ان پر عذاب نازل ہوا وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ یعنی ان ظالموں کو پکڑ لیا ایک سخت آواز نے، یہ سخت آواز

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تھی جس میں ساری دنیا کی بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جسکو انسانی قلب و دماغ برداشت نہیں کرسکا، ہیبت سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوم صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورۂ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیا ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی پکڑ لیا اُن کو زلزلہ نے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کردیئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ

اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے سلام وہ بولا سلام ہے

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ

پھر دیر نہ کی کہ لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا۔ پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے

اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ

کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں

اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ

طرف قوم لوط کی۔ اور اس کی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی اس کو اسحاق کی

وَمِنْ وَّرَاۗءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ

کے پیدا ہونے کی، اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی۔ بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں

وَّھٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ ھٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ

اور یہ خاوند میرا ہے بوڑھا، یہ تو ایک عجیب بات ہے۔ وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ

اللہ کے حکم سے اللہ کی رحمت ہے اور برکتیں تم پر اے گھر والو! تحقیق اللہ ہے

حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

تعریف کیا گیا بڑائیوں والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے (بشکل بشر) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (اُن کے فرزند

اسحاق علیہ السلام کی بشارت لیکر آئے (گو مقصود اعظم ان کے آنے کا قوم لوط پر عذاب واقع کرنا تھا، لقولہ تعالیٰ فَمَا خَطْبُكُمْ الخ) اور (آنے کے وقت) انہوں نے سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی سلام کیا (اور پہچانا نہیں کہ یہ فرشتے ہیں معمولی مہمان سمجھے، پھر دیر نہیں لگائی کہ ایک تلا ہوا (فربہ لقولہ تعالیٰ سَمِيْنٍ) بچھڑا لائے (اور ان کے سامنے رکھ دیا، یہ تو فرشتے تھے کیوں کھانے لگے تھے) سو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے تک نہیں بڑھتے تو ان سے متوحش ہوئے اور ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ مہمان تو نہیں کوئی مخالف نہ ہوں کہ بارادہ فاسد آئے ہوں اور میں گھر میں ہوں احباب و اصحاب پاس نہیں یہاں تک کہ بے تکلفی سے اس کو زبان سے بھی ظاہر کردیا لقولہ تعالیٰ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ) وہ فرشتے کہنے لگے ڈرو مت (ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں آپ کے پاس بشارت لیکر آئے ہیں کہ آپ کے ایک فرزند پیدا ہوگا اسحاق اور اس کے پیچھے ایک فرزند ہوگا یعقوب، اور بشارت اس لئے کہا کہ اول تو اولاد خوشی کی چیز ہے، پھر ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تھے بی بی بھی بہت بوڑھی تھیں امید اولاد کی نہ رہی تھی، آپ نے نور نبوت سے توجہ کرکے پہچان لیا کہ واقعی فرشتے ہیں، لیکن فراست نبوت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کے سوا اور بھی کسی بڑے کام کے لئے آئے ہیں اس لئے اس کی تعیین کے ساتھ سوال کیا فَمَا خَطْبُكُمْ یعنی کس کام کے لئے آئے ہیں؟ اس وقت انہوں نے کہا کہ ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں کہ ان کو سزائے کفر میں ہلاک کریں، ان میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی) اور ابراہیم علیہ السلام کی بی بی (حضرت سارہ کہیں) کھڑی (سن رہی) تھیں پس (اولاد کی خبر سنکر جس کی ان کو بعد اس کے کہ اسمٰعیل علیہ السلام بطن ہاجرہ سے متولد ہوئے تمنا بھی تھی، خوشی سے) ہنسیں (اور بولتی پکارتی آئیں اور تعجب سے ماتھے پر ہاتھ مارا، لقولہ تعالیٰ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا) سو ہم نے (یعنی ہمارے فرشتوں نے) ان کو (مکرر) بشارت دی اسحاق (کے پیدا ہونے) کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی (جو کہ اسحاق کے فرزند ہوں گے جس سے معلوم ہوگیا کہ تمہارے ہاں فرزند ہوگا اور زندہ رہے گا یہاں تک کہ وہ بھی صاحب اولاد ہوگا، اس وقت) کہنے لگیں کہ ہائے خاک پڑے اب میں بچہ جنوں گی بڑھیا ہوکر اور یہ میرے میاں (بیٹھے) ہیں بالکل بوڑھے، واقعی یہ بھی عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا کہ کیا (خاندان نبوت میں رہ کر اور ہمیشہ معجزات و معاملات عجیبہ دیکھ دیکھ کر) تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو اور خصوصاً اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ تعالیٰ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع و اقسام کی) برکتیں (نازل ہوتی رہتی) ہیں بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے (وہ بڑے سے بڑا کام کرسکتا ہے، پس بجائے تعجب کے اس کی تعریف اور شکر میں مشغول ہو)۔

معارف و مسائل

ان پانچ آیتوں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہم السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند فرشتوں کو ان کے پاس اولاد کی بشارت دینے کے لئے بھیجا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ سے کوئی اولاد نہ تھی اور ان کو اولاد کی تمنا تھی مگر دونوں کا بڑھاپا تھا بظاہر کوئی امید نہ تھی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ خوشخبری بھیجی اور وہ بھی اس شان کی کہ نرینہ اولاد ہوگی اور ان کا نام بھی اسحاق تجویز فرمادیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ وہ زندہ رہیں گے اور وہ بھی صاحب اولاد ہوں گے، ان کے لڑکے کا نام یعقوب ہوگا اور دونوں اللہ تعالیٰ کے رسول و پیغمبر ہوں گے، یہ فرشتے چونکہ بشکل انسانی آئے تھے اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے ان کو عام مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی، بھونا ہوا گوشت لاکر سامنے رکھا، مگر وہ تو حقیقۃً فرشتے تھے کھانے پینے سے پاک، اس لئے کھانا سامنے ہونے کے باوجود اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیکھ کر اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ مہمان نہیں معلوم ہوتے ممکن ہے کسی فساد کی نیت سے آئے ہوں، فرشتوں نے ان کا یہ اندیشہ معلوم کرکے بات کھول دی اور بتلا دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں آپ گھبرائیں نہیں، ہم آپ کو اولاد کی بشارت دینے کے علاوہ ایک اور کام کے لئے بھی بھیجے گئے ہیں کہ قوم لوط پر عذاب نازل کریں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ پس پردہ یہ گفتگو سن رہی تھیں، جب معلوم ہوگیا کہ یہ انسان نہیں فرشتے ہیں تو پردہ کی ضرورت نہ رہی، بڑھاپے میں اولاد کی خوشخبری سُن کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں کہ کیا میں بڑھیا ہوکر والدہ بنوں گی، اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں، فرشتوں نے جواب دیا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب کرتی ہو جس کی قدرت میں سب کچھ ہے، خصوصاً تم خاندان نبوت میں رہ کر اس کا مشاہدہ بھی کرتی رہتی ہو کہ اس خاندان پر اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی رحمت و برکت نازل ہوتی رہتی ہے جو اکثر سلسلۂ اسباب ظاہری سے بالاتر ہوتی ہے پھر تعجب کی کیا بات ہے ــ یہ اس واقعہ کا خلاصہ ہے آگے آیات مذکورہ کی پوری تفصیل دیکھئے!

پہلی آیت میں بتلایا ہے کہ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کوئی خوشخبری لے کر آئے تھے اس خوشخبری کا ذکر آگے تیسری آیت میں ہے، فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تین فرشتے، جبریل، میکائیل، اور اسرافیل تھے (قرطبی) انھوں نے بشکل انسانی آکر ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کو انسان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ انسان ہیں جنہوں نے دنیا میں مہمان نوازی کی رسم جاری

فرمائی (قرطبی) ان کا معمول یہ تھا کہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے تھے بلکہ ہر کھانے کے وقت تلاش کرتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کھائیں۔

قرطبی نے بعض اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ ایک روز کھانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان کی تلاش شروع کی تو ایک اجنبی آدمی ملا جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بسم اللہ کہو، اس نے کہا کہ میں جانتا نہیں اللہ کون اور کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دسترخوان سے اٹھا دیا، جب وہ باہر چلا گیا تو جبریل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اس کے کفر کے باوجود ساری عمر اس کو رزق دیا اور آپ نے ایک لقمہ دینے میں بھی بخل کیا؟ یہ سنتے ہی ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو واپس بلایا، اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہ بتلائیں کہ پہلے کیوں مجھے نکالا تھا اور اب پھر کیوں بلا رہے ہیں میں اس وقت تک آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتلا دیا تو یہی واقعہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب بن گیا، اس نے کہا کہ وہ رب جس نے یہ حکم بھیجا ہے بڑا کریم ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گیا اور مؤمن ہو کر باقاعدہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادت مہمان نوازی کے مطابق بشکل انسانی آنے والے فرشتوں کو انسان اور مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی اور فوراً ہی ایک تلا ہوا بچھڑا سامنے لا کر رکھ دیا

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ آنے والے فرشتے گو بشکل انسانی آئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت ان کو بشری خواص کھانے پینے کے بھی عطا کر دیئے جاتے مگر حکمت اسی میں تھی کہ یہ کھانا نہ کھائیں تاکہ ان کے فرشتے ہونے کا راز کھلے اس لئے شکل انسانی میں بھی اُن کے مَلَکی خواص کو باقی رکھا گیا جس کی وجہ سے اُنہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ بڑھایا۔

بعض روایات میں ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ تیر تھے اُن کی نوک اس تلے ہوئے گوشت میں لگانے لگے، ان کے اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے عُرف کے مطابق یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ شاید یہ کوئی دشمن ہوں کیونکہ اُن کے عُرف میں کسی مہمان کا کھانے سے انکار کرنا ایسے ہی شر و فساد کی علامت ہوتا تھا (قرطبی) فرشتوں نے بات کھول دی کہ ہم فرشتے ہیں اس لئے نہیں کھاتے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

احکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں معاشرت سے متعلق بہت سے احکام اور اہم ہدایات آئی ہیں جنکو امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے لکھا ہے۔

سنتِ سلام | قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں آنے والے مہمان کو اس میں پیشقدمی کرنا چاہئے اور دوسرے کو جواب دینا چاہئے۔

یہ رسم تو ہر قوم و ملت میں پائی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت یکدوسرے کو خوش کرنے کیلئے کچھ کلمات بولتے ہیں مگر اسلام کی تعلیم اس معاملہ میں بھی بے نظیر اور بہترین ہے کیونکہ سلام کا مسنون لفظ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اللہ کے نام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ذکر اللہ بھی ہے اور مخاطب کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعا بھی اور اپنی طرف سے اس کی جان و مال و آبرو کیلئے سلامتی کی ضمانت بھی۔

قرآن کریم میں اس جگہ فرشتوں کی طرف سے صرف سَلٰمًا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جواب میں سَلٰمٌ ذکر کیا گیا ہے لفظ بلفظ پورے الفاظ سلام کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، جیسے عرف و محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کو سلام کیا، مراد یہ ہوتی ہے کہ پورا کلمہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہا۔ اسی طرح یہاں لفظ سَلٰم سے پورا کلمہ مسنونہ سلام کا مراد ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے لوگوں کو بتلایا ہے، یعنی ابتداء سلام میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اور جواب سلام وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللہِ

مہمانی اور مہمان داری کے چند اصول | فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ یعنی نہیں ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام مگر صرف اس قدر کہ لے آئے تلا ہوا بچھڑا۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے ہی جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو وہ جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لا رکھے، پھر اگر صاحب وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے (قرطبی)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان کے لئے بہت زیادہ تکلفات کی فکر میں نہ پڑے، آسانی سے جو اچھی چیز میسر ہو جائے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کردے، حضرت ابراہیم کے یہاں گائے بیل رہتے تھے، اس لئے بچھڑا ذبح کر کے فوری طور پر اس کا گوشت تلکر سامنے رکھا (قرطبی)

تیسرے یہ کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آداب اسلام اور مکارم اخلاق میں سے ہے، انبیاء و صلحاء کی عادت ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں، سنت اور مستحسن ہے۔ بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے، اس لئے شہر والوں پر واجب نہیں۔ قرطبی

نے اپنی تفسیر میں یہ مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ یعنی جب دیکھا ابراہیم علیہ السلام نے کہ انکے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچتے تو متوحش ہوگئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کے آداب میں سے یہ ہے کہ میزبان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے اُس کو قبول کرے، کھانے کو دل نہ چاہے یا مضر سمجھیں تو معمولی سی شرکت دلجوئی کے لئے کرلیں۔

اسی جملہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ میزبان کو چاہئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں، جیسا ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ فرشتوں کے کھانا نہ کھانے کو محسوس کیا۔

مگر یہ نظر رکھنا اس طرح ہو کہ مہمان کے کھانے کو تکتا نہ رہے، سرسری نظر سے دیکھ لے، کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آداب ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعث شرمندگی ہوتا ہے، جیسا ہشام بن عبدالملک کے دسترخوان پر ایک روز ایک اعرابی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ اعرابی کے لقمہ میں بال تھا، امیر المؤمنین ہشام نے دیکھ کر بتلایا، اعرابی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ہم ایسے شخص کے پاس کھانا نہیں کھاتے جو ہمارے لقموں کو دیکھتا ہے۔

امام سدی نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ اول جب فرشتوں نے کھانے سے انکار کیا تو یہ کہا تھا کہ ہم مفت کا کھانا نہیں کھاتے اگر آپ قیمت لے لیں تو کھالیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اس کھانے کی ایک قیمت ہے وہ ادا کردو، وہ قیمت یہ ہے کہ شروع میں اللہ کا نام لو اور آخر میں اس کی حمد کرو، جبرئیل امین نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خلیل بنایا ہے یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہنا سنت ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ
پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اس کو خوشخبری جھگڑنے لگا ہم سے

قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴿۷۵﴾ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ
قوم لوط کے حق میں، البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا اے ابراہیم چھوڑ

عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾
یہ خیال وہ تو آچکا حکم تیرے رب کا اور ان پر آتا ہے عذاب جو لوٹایا نہیں جاتا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا

هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ

آج دن بڑا سخت ہے ۔ اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار، اور آگے سے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ

کر رہے تھے برے کام بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

سو ڈرو اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن ۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

بولے تو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰي رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ

کہنے لگا کاش کہ مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں مہمان بولے اے لوط

اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ

ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ

اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو ان کو پہنچے گا

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ

ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح ، کیا صبح نہیں ہے نزدیک پھر جب پہنچا

اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ

حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے

مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع

تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور

خلاصۂ تفسیر

پھر جب ابراہیم علیہ السلام کا وہ خوف زائل ہوگیا (جب فرشتوں نے لَا تَخَفْ کہا اور ان کا فرشتہ ہونا معلوم ہوگیا) اور ان کو خوشی کی خبر ملی (کہ اولاد پیدا ہوگی) تو ادھر سے بے فکر ہو کر دوسری طرف

متوجہ ہوئے کہ قوم لوط ہلاک کی جاوے گی تو) ہم سے لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں (سفارش جو باعتبار مبالغہ واصرار کے صورۃً جدال تھا) کرنا شروع کیا (جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے کہ وہاں تو لوط علیہ السلام بھی موجود ہیں اس لئے عذاب نہ بھیجا جاوے کہ ان کو گزند پہنچے گا، مطلب یہ ہوگا کہ اس بہانہ سے قوم بچ جاوے جیسا فِي قَوْمِ لُوطٍ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے اور شاید ابراہیم علیہ السلام کو ان کے مومن ہونے کی امید ہو) واقعی ابراہیم بڑے حلیم، رحیم المزاج، رقیق القلب تھے (اس لئے سفارش میں مبالغہ کیا، ارشاد ہوا کہ) اے ابراہیم (گو بہانہ لوط علیہ السلام کا ہے مگر اصلی مطلب معلوم ہو گیا کہ قوم کی سفارش ہے سو) اس بات کو جانے دو (وہ ایمان نہ لاویں گے اسی لئے) تمہارے رب کا حکم (اس کے متعلق) آ چکا ہے اور (اس کے سبب سے) ان پر ضرور ایسا عذاب آنے والا ہے جو کسی طرح ہٹنے والا نہیں (اس لئے اس باب میں کچھ کہنا سننا بیکار ہے، رہا لوط علیہ السلام کا وہاں ہونا سو ان کو اور سب ایمان والوں کو وہاں سے علیحدہ کر دیا جاوے گا اس کے بعد عذاب آوے گا تاکہ ان کو گزند نہ پہنچے، چنانچہ اس پر بات ختم ہو گئی، اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو لوط علیہ السلام ان کے آنے کی وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا، اور (اس وجہ) ان کے (آنے کے) سبب بہت تنگدل ہوئے (اور غایت تنگدلی سے) کہنے لگے کہ آج کا دن بہت بھاری ہے (کہ ان کی تو ایسی صورتیں اور قوم کی یہ حرکتیں اور میں تن تنہا، دیکھئے کیا ہوتا ہے) اور ان کی قوم (نے جو یہ خبر سنی تو) ان کے (یعنی لوط علیہ السلام کے) پاس دوڑے ہوئے آئے اور پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے (اسی خیال سے اب بھی آئے، لوط علیہ السلام بڑے گھبرائے اور براہ تملق) فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لئے (اچھی) خاصی ہیں سو (امردوں پر نگاہ کرنے کے باب میں) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت مت کرو (یعنی ان مہمانوں کو کچھ کہنا مجھ کو شرمندہ اور رسوا کرنا ہے، اگر ان کی رعایت نہیں کرتے کہ مسافر ہیں تو میرا خیال کرو کہ تم میں رہتا سہتا ہوں، افسوس اور تعجب ہے) کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی اور) بھلا مانس نہیں (کہ اس بات کو سمجھے اور اوروں کو سمجھائے) وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی ان (بہو) بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ عورتوں سے ہم کو رغبت ہی نہیں) اور آپ کو تو معلوم ہے (یہاں آنے سے) جو ہمارا مطلب ہے، لوط علیہ السلام (نہایت عاجز و زچ ہو کر) فرمانے لگے کیا خوب ہوتا اگر میرا تم پر کچھ زور چلتا (کہ خود تمہارے شر کو دفع کرتا) یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا (مراد یہ کہ میرا کوئی کنبہ قبیلہ

ہوتا کہ میری مدد کرتا، لوط علیہ السلام کا جو اس قدر اضطراب دیکھا تو (فرشتے کہنے لگے کہ اے لوط (ہم آدمی نہیں جو آپ اسقدر گھبراتے ہیں) ہم تو آپکے رب کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں (تو ہمارا تو کیا کر سکتے ہیں اور آپ اپنے لئے بھی اندیشہ نہ کریں، آپ تک (بھی) ہرگز انکی رسائی نہیں ہوگی (کہ آپ کو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اور ہم ان پر عذاب نازل کرنے آتے ہیں) سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر (یہاں سے باہر) چلے جائیے اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں، ہاں مگر آپ کی بیوی (بوجہ مسلمان نہ ہونے کے نہ جاوے گی اس پر بھی وہی آفت آنیوالی ہے جو اور لوگوں پر آوے گی، اور ہم رات کے وقت نکل جانے کو اس لئے کہتے ہیں کہ) انکے (عذاب کے) وعدہ کا وقت صبح کا وقت ہے (لوط علیہ السلام بہت دق ہوگئے تھے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہو ابھی ہو جاوے کذا فی الدر المنثور، فرشتوں نے کہا) کیا صبح کا وقت قریب نہیں (غرض لوط علیہ السلام شبا شب دور نکل گئے، اور صبح ہوئی اور عذاب کا سامان شروع ہوا سو) جب ہمارا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا تو ہم نے اس زمین (کو الٹ کر اس) کا اوپر کا تختہ تو نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا، اور اس سرزمین پر کھنگر کے پتھر (مراد جب وہ جو پک کر مثل پتھر کے ہو جاتا ہے) برسانا شروع کئے جو لگاتار گر رہے تھے جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالم غیب میں) خاص نشان بھی تھا (جس سے اور پتھروں سے وہ پتھر ممتاز تھے، اور اہل مکہ کو چاہئے کہ اس قصہ سے عبرت پکڑیں کیونکہ) یہ بستیاں (قوم لوط کی) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں (ہمیشہ شام کو آتے جاتے انکی بربادی کے آثار دیکھتے ہیں پس ان کو اللہ اور رسول کی مخالفت سے ڈرنا چاہئے)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِل

سورۂ ہود میں اکثر انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی بنا پر مختلف قسم کے آسمانی عذابوں کا بیان آیا ہے، آیات مذکورہ میں حضرت لوط علیہ السلام اور انکی قوم کا حال اور قوم لوط پر عذاب شدید کا بیان ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کافر ہونے کے علاوہ ایک ایسی خبیث بدکاری اور بے حیائی میں مبتلا تھی جو دنیا میں کبھی پہلے نہ پائی گئی تھی جس سے جنگل کے جانور بھی نفرت کرتے ہیں کہ مرد مرد کے ساتھ منہ کالا کرے جسکا وبال وعذاب عام بدکاری سے بدرجہا زیادہ ہے، اسی لئے اس قوم پر ایسا شدید عذاب آیا جو عام بے حیائی اور بدکاری کرنے والوں پر کبھی نہیں آیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ جو ان آیات میں مذکور ہے اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چند فرشتے جن میں جبرئیل امین بھی شامل تھے اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے بھیجے جو پہلے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں فلسطین پہنچے جسکا واقعہ پچھلی آیت میں بیان ہو چکا ہے، اُسکے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے جنکا مقام وہاں سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تھا

اللہ تعالیٰ شانہٗ جس قوم کو عذاب میں پکڑتے ہیں تو اُن پر اُن کے عمل کے مناسب ہی عذاب مسلط فرماتے ہیں، اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہ فرشتے حسین لڑکوں کی شکل میں بھیجے گئے جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے تو ان کو بشکل انسانی دیکھ کر انہوں نے بھی مہمان سمجھا اور اسوقت وہ سخت فکر وغم میں مبتلا ہو گئے کہ مہمانوں کی مہمانی نہ کی جائے تو یہ شان پیغمبری کے خلاف ہے اور اگر ان کو مہمان بنایا جاتا ہے تو اپنی قوم کی خباثت معلوم ہے، اسکا خطرہ ہے کہ وہ مکان پر چڑھ آئیں اور ان مہمانوں کو اذیت پہنچائیں اور وہ اُن کی مدافعت نہ کر سکیں، اور دل میں کہنے لگے کہ آج بڑی سخت مصیبت کا دن ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے اس عالم کو عجیب عبرت کی جگہ بنایا ہے جس میں اُسکی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے عجیب مظاہر ہوتے ہیں، آزر بُت پرست کے گھر میں اپنا خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا کر دیا، حضرت لوط علیہ السلام جیسے مقبول و برگزیدہ پیغمبر کے گھر میں ان کی بیوی کافروں سے ملی ہوئی اور حضرت لوط علیہ السلام کی مخالفت کرتی تھی، جب یہ معزز مہمان حسین لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں مقیم ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کی قوم کے اوباش لوگوں کو خبر کر دی کہ آج ہمارے گھر میں اس طرح کے مہمان آئے ہیں (قرطبی و مظہری)

حضرت لوط علیہ السلام کا سابقہ اندیشہ سامنے آگیا، جسکا بیان دوسری آیت میں ہے وَجَاۗءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ یعنی آگئی انکے پاس ان کی قوم دوڑتی ہوئی، اور وہ پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے۔

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ اپنے خبیث عمل کی نحوست سے اس قدر بے حیاء ہو چکے تھے کہ علانیہ حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ دوڑے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ انکی مدافعت مشکل ہے تو ان کو شر سے باز رکھنے کے لئے فرمایا کہ تم اس شر و فساد سے باز آجاؤ تو میں اپنی لڑکیاں تمہارے سرداروں کے نکاح میں دیدوں گا، اُس زمانہ میں مسلمان لڑکی کا نکاح کافر سے جائز تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ تک یہی حکم جاری تھا اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے کر دیا تھا حالانکہ یہ دونوں کفر پر تھے، بعد میں وہ آیت نازل ہوئی جن میں مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام قرار دیدیا (قرطبی)

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اپنی لڑکیوں سے مراد اپنی پوری قوم کی لڑکیاں ہیں کیونکہ

پیغمبر اپنی قوم کیلئے مثل باپ کے ہوتا ہے اور پوری امت اس کی روحانی اولاد ہوتی ہے جیسا کہ آیت کریمہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام امت کا باپ قرار دیا ہے، اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی خبیث عادت سے باز آؤ شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو، انکو بیبیاں بناؤ۔

پھر لوط علیہ السلام نے انکو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کے لئے فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ اور پھر عاجزانہ درخواست کی وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ یعنی مجھ کو میرے مہمانوں کے متعلق رسوا نہ کرو، اور فرمایا اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ یعنی کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا مانس اور شریف آدمی نہیں جو میری فریاد سنے۔

مگر وہاں شرافت و انسانیت کا کوئی اثر کسی میں باقی نہ تھا، سب نے جواب میں کہا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَّاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ یعنی آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپکی لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہیں، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔

اس وقت ہر طرح سے عاجز ہو کر لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمہ آیا لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ یعنی کاش مجھ میں اتنی قوت ہوتی کہ میں اس پوری قوم کا خود مقابلہ کر سکتا یا پھر کوئی جتھہ اور جماعت ہوتی جو مجھے ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلاتی۔

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھ کر بات کھول دی اور کہہ کہ گھبرائیے نہیں آپ کی جماعت بڑی قوی و مضبوط ہے، ہم اللہ کے فرشتے ہیں ان کے قابو میں آنے والے نہیں، ان پر عذاب واقع کرنے کے لئے آئے ہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوطؑ پر رحم فرمادیں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جسکا کنبہ قبیلہ اس کا حامی نہ ہو، چنانچہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار قریش نے ہر طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب میں وہ سب آپ کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم شعب ابی طالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفار قریش نے ان پر دانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قوم لوط ان کے گھر پر چڑھ آئی تو

لُوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شریر قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی وہ مہمان بھی مکان کے اندر تھے، ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اُس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لُوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبریل امین نے اپنے پَر کا اشارہ ان کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہوگئے اور بھاگنے لگے۔

اس وقت فرشتوں نے بحکم ربانی حضرت لُوط علیہ السلام کو کہا فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ یعنی آپ رات کے آخری حصہ میں اپنے اہل وعیال کو لیکر یہاں سے نکل جائیے — اور یہ ہدایت کر دیجئے کہ ان میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، بجز آپکی بیوی کے کیونکہ اُس پر تو وہی عذاب پڑنیوالا ہے جو قوم پر پڑیگا۔

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی کو ساتھ نہ لیں، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ آپ کے اہل میں داخل ہو کر ساتھ چلے گی مگر وہ آپ کے اس حکم پر عمل نہ کرے گی جو آپ اپنے اہل عیال کو دیں گے کہ کوئی مُڑ کر نہ دیکھے، بعض روایات میں ہے کہ یوں ہی ہوا کہ یہ بیوی بھی ساتھ چلی مگر جب قوم پر عذاب آنے کا دھماکہ سُنا تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور قوم کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرنے لگی، اسی وقت ایک پتھر آیا جس نے اسکا بھی خاتمہ کر دیا۔ (قرطبی و مظہری)

فرشتوں نے یہ بھی بتلا دیا کہ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ یعنی ان پر صبح ہوتے ہی عذاب آجائیگا حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اور بھی جلد عذاب آجائے، اس پر فرشتوں نے کہا اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ یعنی صبح تو کچھ دور نہیں ہوا چاہتی ہے۔

پھر اس عذاب کا واقعہ قرآن نے اس طرح بیان فرمایا کہ جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے ان بستیوں کے اوپر کا حصہ نیچے کر دیا، اور ان پر ایسے پتھر برسائے جن پر ہر ایک کے نام کی علامت لگی ہوئی تھی۔

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے بڑے شہر تھے جن میں یہ لوگ بستے تھے، انہیں بستیوں کو قرآن کریم میں دوسری جگہ "مؤتفکات" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو جبریل امین نے اپنا پَر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اٹھا لیا کہ ہر چیز اپنی جگہ رہی، پانی کے برتن سے پانی بھی نہیں گرا، آسمان کی طرف سے کتّوں اور جانوروں اور انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں ان سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اُٹھانے کے بعد اوندھا کرکے پلٹ دیا، جو ان کے عمل خبیث کے مناسب حال تھا۔

آخر آیت میں قوم لوط کا عذاب ذکر کرنے کے بعد موجودہ اقوام دنیا کو متنبہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ یعنی پتھراؤ کا عذاب آج بھی ظالموں سے کچھ دور نہیں، جو لوگ اس قوم کی طرح ظلم و بے حیائی پر جمے رہیں وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے دور نہ سمجھیں آج بھی یہ عذاب آسکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بھی کچھ لوگ وہ عمل کریں گے جو قوم لوط کرتی تھی، جب ایسا ہونے لگے تو انتظار کرو کہ ان پر بھی وہی عذاب آئے گا جو قوم لوط پر آیا ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود

غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ
اس کے سوا اور نہ گھٹاؤ ناپ اور تول کو میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور میں

اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ
ڈرتا ہوں تم پر عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے اور اے قوم پورا کرو ناپ اور

الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي
تول کو انصاف سے اور نہ گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں

الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ
خرابی مچاتے جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ
اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان بولے اے شعیب کیا تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا کہ

نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ
ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے یا چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں تو ہی

الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ
بڑا باوقار ہے نیک چلن بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آ گئی اپنے رب

رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ
کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے

عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ
چھڑاؤں میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بن آنا ہے اس کی مدد سے

۴۲

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ وَيَا قَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَنْ

اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔ اور اے میری قوم نہ کمائیو میری ضد کر کے یہ کہ

يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا

پڑے تم پر جیسا کچھ کہ پڑ چکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر اور

قَوْمُ لُوطٍ مِنْكُمْ بِبَعِيدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ

قوم لوط تم سے کچھ دور نہیں۔ اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور رجوع کرو اس کی طرف

إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ

البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا۔ بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے

وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنْتَ

اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کر ڈالتے، اور

عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَ

ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں۔ بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے اور

اتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٩٢﴾ وَ

اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر، تحقیق میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور

يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ

اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں، آگے معلوم کر لوگے کس پر

يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿٩٣﴾

آتا ہے عذاب رسوا کرنے والا اور کون ہے جھوٹا، اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَ

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے شعیب کو اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ اپنی مہربانی سے اور

أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٩٤﴾

آ پکڑا ان ظالموں کو کڑک نے، پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے۔

كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾ ع

گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے، سن لو پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔

ع ۸

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا انہوں نے اہل مدین سے، فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اسکے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں (یہ حکم تو دیانات و عقائد کے متعلق ان کے مناسب حال تھا، اور دوسرا حکم معاملات کے متعلق ان کے مناسب یہ فرمایا کہ) تم ناپ تول میں کمی مت کیا کرو (کیونکہ) میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں (پھر تم کو ناپ تول میں کمی کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور حقیقۃً تو کسی کو بھی ضرورت نہیں ہوتی) اور (علاوہ اس کے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضہ ہے خود خوف ضرر بھی اس کو مقتضی ہے کیونکہ اس میں) مجھ کو تم پر اندیشہ ہے ایسے دن کے عذاب کا جو انواعِ عذاب کا جامع ہوگا اور (ہر چند کہ کمی نہ کرنا مستلزم ہے پورا کرنے کو مگر تاکید کے لئے اسکی ممانعت کے بعد اس امر کی تصریح بھی فرمائی کہ) اے میری قوم تم ناپ اور تول پوری پوری طرح کیا کرو اور لوگوں کا ان چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا تمہاری عادت ہے) اور (شرک اور لوگوں کے حقوق میں کمی کر کے) زمین میں فساد کرتے ہوئے (حد توحید و عدل) سے مت نکلو (لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد) اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بچ جائے وہ تمہارے لئے (اس حرام کمائی سے) بدرجہا بہتر ہے (کیونکہ حرام میں گو وہ کثیر ہو برکت نہیں اور انجام اسکا جہنم ہے اور حلال میں گو وہ قلیل ہو برکت ہوتی ہے اور انجام اسکا رضائے حق ہے) اگر تم کو یقین آوے (تو مان لو) اور (اگر یقین نہ آوے تو تم جانو) میں تمہارا پہرہ دینے والا تو ہوں نہیں (کہ تم سے جبراً یہ افعال چھڑا دوں جیسا کرو گے بھگتو گے)، وہ لوگ (یہ تمام مواعظ و نصائح سنکر) کہنے لگے اے شعیب کیا تمہارا (مصنوعی اور وہمی) تقدس تم کو (ایسی ایسی باتوں کی) تعلیم کر رہا ہے کہ (تم ہم سے کہتے ہو کہ) ہم ان چیزوں کی پرستش کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں اور اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ بڑے عقلمند دین پر چلنے والے ہیں (یعنی جن باتوں سے ہم کو منع کرتے ہو دونوں میں سے کوئی برا نہیں کیونکہ ایک کی دلیل تو نقلی ہے کہ ہمارے بڑوں سے بت پرستی ہوتی آئی ہے، دوسرے کی دلیل عقلی ہے کہ اپنا مال ہے اس میں ہر طرح کا اختیار ہے پس ہم کو منع نہ کرنا چاہئے، اور حلیم رشید تمسخراً سے کہا، جیسا بد دینوں کی عادت ہوتی ہے دینداروں کے ساتھ تمسخر کرنے کی اور انکی نقلی و عقلی دونوں دلیلوں کا فساد بدیہی ہے) شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا اے میری قوم (تم جو مجھ سے چاہتے ہو کہ میں توحید و عدل کی نصیحت نہ کروں تو بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب

سے دلیل پر قائم ہوں (جس سے توحید و عدل ثابت ہے) اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے ایک عمدہ دولت (یعنی نبوت) دی ہو (جس سے مجھ پر تبلیغ ان احکام کی واجب ہو یعنی توحید و عدل کا حق ہونا بھی ثابت اور ان کی تبلیغ بھی واجب) تو پھر کیسے تبلیغ نہ کروں اور میں جس طرح ان باتوں کی تم کو تعلیم کرتا ہوں خود بھی تو اس پر عمل کرتا ہوں، یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں (برخلاف سے یہی مراد ہے کہ تم کو اور راہ بتلاؤں اور خود اور راہ پر چلوں، مطلب یہ ہے کہ میری نصیحت محض خیرخواہی و دلسوزی سے ہے جسکا قرینہ یہ ہے کہ میں وہی باتیں بتلاتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے بھی پسند کرتا ہوں غرض) میں تو اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہے اور مجھ کو جو کچھ (عمل و اصلاح کی) توفیق ہو جاتی ہے صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے (ورنہ کیا میں اور کیا میرا ارادہ) اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف تمام امور میں رجوع کرتا ہوں (خلاصہ یہ کہ توحید و عدل کے وجوب پر دلائل بھی قائم، اور امر خداوندی اسکی تبلیغ، اور ناصح ایسا دلسوز اور مصلح، پھر بھی نہیں مانتے بلکہ اُلٹی مجھ سے امید رکھتے ہو کہ میں کہنا چھوڑ دوں چونکہ اس تقریر میں دلسوزی اور اصلاح کی اپنی طرف نسبت کی ہے، اس لئے مَا تَوْفِيقِي فرمایا، یہانتک قوم کے قول کا جواب ہو گیا، آگے ترہیب و ترغیب فرماتے ہیں) اور اے میری قوم میری ضد (اور عداوت) تمہارے لئے اسکا باعث نہ ہو جاوے کہ تم پر بھی اسی طرح کی مصیبتیں آپڑیں جیسے قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر پڑی تھیں (اور اگر ان قوموں کا قصہ پرانا ہو چکا ہے اور اس لئے اس سے متاثر نہیں ہوتے تو قوم لوط تو (ابھی) تم سے (بہت) دور (زمانہ میں) نہیں ہوئی (یعنی ان قوموں کی نسبت ان کا زمانہ نزدیک ہے، یہ تو ترہیب کا مضمون ہو گیا، آگے ترغیب ہے) اور تم اپنے رب سے اپنے گناہ (یعنی شرک و ظلم) معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ کیونکہ ایمان سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، گو حقوق ادا کرنے پڑیں) پھر (اطاعت عبادت کے ساتھ) اسکی طرف متوجہ ہو بلاشک میرا رب بڑا مہربان بڑی محبت والا ہے (وہ گناہ کو معاف کر دیتا ہے اور طاعت کو قبول کرتا ہے) وہ لوگ (یہ لاجواب دل آویز تقریر سنکر جواب معقول سے عاجز ہو کر براہ جہالت) کہنے لگے کہ شعیب! بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں (یہ بات یا تو اس وجہ سے کہی ہو کہ اچھی طرح توجہ سے آپ کی باتیں نہ سنی ہوں یا تحقیراً کہا ہو کہ نعوذ باللہ یہ بذیان ہے سمجھنے کے قابل نہیں، چنانچہ بددینوں سے یہ سب امور واقع ہوتے ہیں) اور ہم تم کو اپنے (مجمع) میں کمزور دیکھ رہے ہیں اور اگر تمہارے خاندان کا کہ ہمارے ہم مذہب ہیں ہم کو پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی کا) سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری کچھ توقیر ہی نہیں لیکن جسکا لحاظ ہوتا ہے اُس کے سبب

اس کے رشتہ دار کی بھی رعایت ہوتی ہے، مطلب انکا یہ تھا کہ تم ہم کو یہ مضامین مت سناؤ ورنہ تمہاری جان کا خطرہ ہے، پہلے تمسخر کے طور پر تبلیغ سے روکا تھا، اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ الخ اور اب دھمکی دیکر روکا، شعیب (علیہ السلام) نے جواب میں، فرمایا اے میری قوم (افسوس اور تعجب ہے کہ میری جو نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے کہ میں اسکا نبی ہوں وہ تو میرے ایذا سے مانع نہ ہوئی اور جو میری نسبت خاندان کے ساتھ ہے کہ انکا رشتہ دار ہوں وہ اس سے مانع ہوئی تو اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تم خاندان کا لحاظ اللہ سے بھی زیادہ کرتے ہو تو) کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ سے بھی زیادہ باتوقیر ہے (کہ خاندان کا تو پاس کیا) اور اس کو (یعنی اللہ تعالیٰ کو) تم نے پس پشت ڈال دیا (یعنی اس کا پاس نہ کیا، سو اس کا خمیازہ عنقریب بھگتو گے کیونکہ) یقیناً میرا رب تمہارے سب اعمال کو (اپنے علم میں) احاطہ کئے ہوئے ہے اور اے میری قوم (اگر تم کو عذاب کا بھی یقین نہیں آتا تو اخیر بات یہ ہے کہ تم جانو بہتر ہے، تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں (سو) اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دیگا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا تھا (یعنی تم مجھ کو دعوئ نبوت میں جھوٹا کہتے ہو اور حقیر سمجھتے ہو تو اب معلوم ہو جاویگا کہ جرم کذب کا مرتکب اور سزائے ذلت کا مستوجب کون تھا تم یا میں) اور تم بھی منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (کہ دیکھیں عذاب کا وقوع ہوتا ہے جیسا میں کہتا ہوں یا عدم وقوع جیسا تمہارا گمان ہے، غرض ایک زمانہ کے بعد عذاب کا سامان شروع ہوا) اور جب ہمارا حکم (عذاب کیلئے) آپہنچا تو، ہم نے (اس عذاب سے) شعیب (علیہ السلام) کو اور جو انکی ہمراہی میں اہلِ ایمان تھے انکو اپنی عنایت خاص سے بچالیا اور ان ظالموں کو ایک سخت آواز نے (کہ نعرہ جبرئیل تھا) آپکڑا سو اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے رہ گئے (اور مر گئے) جیسے کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے، خوب سن لو (اور عبرت پکڑو) مدین کو رحمت سے دوری ہوئی جیسا ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔

معارف و مسائل

مذکورالصدر آیات میں حضرت شعیب علیہ السلام اور انکی قوم کا واقعہ مذکور ہے، اُن کی قوم کفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی بھی کرتی تھی، حضرت شعیب علیہ السلام نے اُن کو ایمان کی دعوت دی اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا اور اس کے خلاف کرنے پر عذاب الٰہی سے ڈرایا اگر یہ اپنے انکار و سرکشی پر قائم رہے تو پوری قوم ایک سخت عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیگئی۔ جسکی

تفصیل اس طرح ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ، یعنی ہم نے بھیجا مَدْیَن کی طرف اُنکے بھائی شُعیبؑ کو ۔ مَدْیَن اصل میں ایک شہر کا نام تھا جسکو مَدْیَن بن ابراہیم نے بسایا تھا اس کا محلِ وقوع ملکِ شام کے موجودہ مقام "معان" کو بتلایا جاتا ہے ، اس شہر کے باشندوں کو بھی بجائے اہلِ مدین کے مدین کہہ دیا جاتا ہے ، شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں جو اسی قوم مدین میں سے ہیں اسی لئے اُن کو مدین کا بھائی فرماکر اس نعمت کی طرف اشارہ کردیا کہ اس قوم کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی قوم سے بنایا تاکہ ان سے مانوس ہوکر اُنکی ہدایات کو بآسانی قبول کرسکیں۔

قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ،

اس میں حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے تو اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی کیونکہ یہ لوگ مُشرک تھے ، درختوں کی پُوجاپاٹ کیا کرتے تھے ، جسکو قرآن میں لفظ اَيْكَه سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی نسبت سے اہلِ مدین کو اَصْحٰبُ الْاَيْكَه کا بھی لقب دیا گیا ہے ، اس کفر و شرک کے ساتھ ان میں ایک اور عیب وگناہ نہایت سخت یہ تھا کہ بیوپار اور لین دین کے وقت ناپ تول میں کمی کرکے لوگوں کا حق مار لیتے تھے ، حضرت شُعیب علیہ السلام نے انکو اس سے منع فرمایا۔

فائدہ | یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ کفر و شرک سب گناہوں کی جڑ ہے جو قوم اس میں مُبتلا ہے اُس کو پہلے ایمان ہی کی دعوت دی جاتی ہے ، ایمان سے پہلے دُوسرے معاملات اور اعمال پر توجہ نہیں دیجاتی ، دُنیا میں اُن کی نجات یا عذاب بھی اسی ایمان وکفر کی بنیاد پر ہوتا ہے ، تمام انبیاء سابقین اور انکی قوموں کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں اسی طرزِ عمل کے شاہد ہیں ، صرف دو قومیں ایسی ہیں جن پر عذاب نازل ہونے میں کُفر کے ساتھ اُن کے اعمال خبیثہ کو بھی دخل رہا ہے ، ایک لُوط علیہ السلام کی قوم جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے کہ اُن پر جو عذاب پوری بستی اُلٹ دینے کا واقع ہوا اُس کا سبب انکے عمل خبیث کو بتلایا گیا ہے ، دُوسری قوم شُعیب علیہ السلام کی ہے جنکے عذاب کا سبب کفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی کرنے کو بھی قرار دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ دونوں کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب گُناہوں سے زیادہ مبغوض اور شدید ہیں ، بظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ پوری نسل انسانی کو اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے اور پُورے عالَم میں اس سے فسادِ عظیم پھیل جاتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے کے خبیث عمل سے روکنے کیلئے پیغمبرانہ شفقت کے ساتھ اول تو یہ فرمایا:

اِنِّیْٓ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ، یعنی میں تمہیں اس وقت خوشحالی میں دیکھتا ہوں، کوئی فقر و فاقہ اور مالی تنگی نہیں جسکی وجہ سے اس بدعمل میں مبتلا ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر اس کو مقتضی ہے کہ تم اسکی مخلوق پر ظلم نہ کرو، اور پھر یہ بھی بتلا دیا کہ اگر تم نے میری بات نہ سنی اور اس عمل خبیث سے باز نہ آئے تو مجھے خطرہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب تمہیں گھیر لے، اس عذاب سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا کا بھی، پھر دنیا کے عذاب بھی مختلف قسم کے آ سکتے ہیں، ادنیٰ عذاب یہ ہے کہ تمہاری یہ خوشحالی ختم ہو جائے اور تم قحط اور گرانی اشیاء میں مبتلا ہو جاؤ، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قحط اور گرانی اشیاء کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں"

اور اگرچہ ناپ تول کی کمی کو منع کرنے سے پورا ناپنا تولنا خود ہی ضروری ہو جاتا ہے لیکن مزید تاکید کے لئے شعیب علیہ السلام نے فرمایا، وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ، یعنی اے میری قوم تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں کو کم نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، پھر ان کو شفقت کے ساتھ سمجھایا۔

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ، وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ، یعنی لوگوں کے حقوق ناپ تول پورا کر کے ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے تمہارے لئے وہی بہتر ہے، اگر تم میری بات مانو، اور اگر میری بات نہ مانو گے تو یہ دیکھو میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم پر کوئی عذاب آ جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ خطیب الانبیاء ہیں، آپ نے اپنے حسن بیان سے اپنی قوم کو سمجھانے اور ہدایت پر لانے کی پوری کوشش میں انتہا کر دی، مگر یہ سب کچھ سننے کے بعد قوم نے وہی جواب دیا جو جاہل قومیں اپنے مصلحین کو دیا کرتی ہیں، ان پر پھبتیاں کسیں، استہزاء کیا، کہنے لگے:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا، اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ، یعنی کیا تمہاری نماز تمہیں یہ بتلاتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے آباء و اجداد کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ کہ ہم اپنے مملوک اموال میں خود مختار نہ رہیں کہ جس طرح ہمارا جی چاہے معاملہ کریں بلکہ اپنے معاملات بھی آپ سے پوچھ پوچھ کر کیا کریں کہ کیا حلال ہے کیا حرام؟

حضرت شعیب علیہ السلام کی نماز پوری قوم میں معروف تھی کہ بکثرت نوافل و عبادت میں لگے رہتے تھے اس لئے ان کے ارشادات کو بطور استہزاء کے نماز کی طرف منسوب کیا کہ تمہاری یہ نماز ہی

تمہیں (معاذ اللہ) ایسی غلط باتیں سوجھتی ہے، اُن کے اِس کلام سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی یوں سمجھتے تھے کہ دین و شریعت کا کام صرف عبادت تک محدود ہے معاملات میں اس کا کیا دخل ہے، ہر شخص اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اُس پر کوئی پابندی لگانا دین کا کام نہیں جیسے اس زمانہ میں بھی بہت سے بے سمجھ لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں۔

قوم نے مخلص ہمدردی، دلسوزی اور نصیحت کا جواب اسقدر تلخ دیا مگر حضرت شعیب علیہ السلام شانِ پیغمبری رکھتے ہیں، یہ سب کچھ سُننے کے بعد بھی اُسی ہمدردی کے ساتھ مخاطب ہو کر مزید فہمائش کے لئے فرمانے لگے:

یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا، یعنی اے میری قوم مجھے بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے اپنی بات کے حق ہونے پر دلیل اور کافی شہادت رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے بہترین رزق بھی عطا فرمایا ہو، کہ ظاہری رزق جس پر معاش کا مدار ہے وہ بھی عطا فرمایا اور باطنی رزق فہم و عقل اور اس پر وحی و نبوت کا انعام گرانمایہ بھی عطا فرمایا تو پھر کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے میں بھی تمہاری طرح گمراہی اور ظلم کو اختیار کرلوں اور حق بات تمہیں نہ پہنچاؤں، اس کے بعد فرمایا:

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰی مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ، یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ و مبلغ کے عمل کو اسکی وعظ و نصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو اُسکی بات کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر فرمایا:

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ، یعنی میرا مقصد اس ساری جدوجہد اور تمہیں بار بار کی فہمائش سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ مقدور بھر اصلاح کی کوشش کروں، اور پھر فرمایا کہ یہ کوشش بھی درحقیقت میرے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہوں، ورنہ میرے بس میں کچھ نہ تھا، اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف ہر کام میں، میں رجوع کرتا ہوں۔

اس پند و نصیحت کے بعد پھر اُن کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا، وَیٰقَوْمِ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْٓ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ، وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ، یعنی تم سوچو سمجھو ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت اور عداوت تم پر کوئی ایسا عذاب لا ڈالے جیسا تم سے پہلے قوم نوحؑ یا قوم ہودؑ یا قوم صالحؑ پر آچکا ہے، اور لوط علیہ السلام کی قوم اور اُن کا

عبرتناک عذاب تو تم سے کچھ دُور بھی نہیں، یعنی مقامی اعتبار سے بھی قوم لوطؑ کی اُلٹی ہوئی بستیاں مَدْیَن کے قریب ہی ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے بھی تم سے بہت قریب زمانہ میں ان پر عذاب آیا ہے اس سے عبرت حاصل کرو اور اپنی ضد سے باز آجاؤ۔

اُن کی قوم اس کو سُن کر اور بھی زیادہ اشتعال میں آگئی اور کہنے لگی کہ اگر آپکے خاندان کی حمایت آپکو حاصل نہ ہوتی تو ہم آپکو سنگسار کر دیتے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اس پر بھی ان کو نصیحت فرمائی کہ تمکو میرے خاندان کا تو خوف ہوا مگر خدا تعالیٰ کا کچھ خوف نہ آیا جسکے قبضہ میں سب کچھ ہے۔

بالآخر جب قوم نے کوئی بات نہ مانی تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا تم اب عذاب کا انتظار کرو، اس کے بعد حق تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام اور اُن پر ایمان لانے والوں کو سب کو تو اس بستی سے نکال لیا اور باقی سب کے سب جبریل علیہ السلام کی ایک سخت آواز سے یکدم ہلاک ہوگئے۔

احکام و مسائل

ناپ تول کی کمی کا مسئلہ | مذکورہ آیات میں قوم شعیب علیہ السلام پر عذاب آنیکا ایک سبب اُنکا ناپ تول میں کمی کرنا تھا جسکو تطفیف کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ میں اُنکے عذابِ شدید کا بیان فرمایا ہے اور باجماع امت ایسا کرنا سخت حرام ہے، حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک ارشاد کے ماتحت حضرت امام مالکؒ نے مؤطا میں فرمایا کہ ناپ تول کی کمی سے اصل مراد یہ ہے کہ کسی کا جو حق کسی کے ذمہ ہو اُسکو پورا ادا نہ کرے بلکہ اس میں کمی کرے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا دُوسری طرح کی، اگر کوئی ملازم اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، کسی دفتر کا ملازم یا کوئی مزدور اپنے کام کے وقت مقرر میں کمی کرتا ہے یا مقررہ کام کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ بھی اسی فہرست میں داخل ہے، کوئی شخص نماز کے آداب و سُنن پورے بجا نہیں لاتا وہ بھی اسی تطفیف کا مجرم ہے، نعوذ باللہ منہ

مسئلہ | تفسیر قرطبی میں ہے کہ قوم شُعیبؑ کی ایک عادت یہ بھی کہ مُلک کے رائج سکوں درہم و دینار میں سے کنارے کاٹ کر سونا چاندی بچا لیتے اور یہ کٹے ہوئے سکّے پُوری قیمت سے چلتے کر دیتے تھے، حضرت شُعیب علیہ السلام نے ان کو اس سے منع فرمایا۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی سلطنت کے سکّوں کا توڑنا حرام قرار دیا ہے، اور آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت زید بن اسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ لوگ درہم و دینار کو توڑ کر اپنا فائدہ حاصل کر لیا کرتے تھے جسکو قرآن نے فسادِ عظیم قرار دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ درہم کو کاٹ رہا تھا۔ موصوف نے اُس کو کوڑوں کی سزا دی اور سر منڈھوا کر شہر میں گشت کرایا۔ (تفسیر قرطبی)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ

اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر فرعون اور

مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ

اس کے سرداروں کے پاس پھر وہ چلے حکم پر فرعون کے، اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کی، آگے ہوگا

قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾

اپنی قوم کے قیامت کے دن پھر پہنچائے گا ان کو آگ پر، اور برا گھاٹ ہے جس پر پہنچے

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے بھی، برا انعام ہے جو ان کو ملا

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض ان میں سے اب تک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی،

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن ظلم کر گئے وہ اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے ان کے ان کے معبود

الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا

جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم تیرے رب کا اور نہیں

زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿١٠١﴾

بڑھایا ان کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (بھی) اپنے معجزات اور دلیل روشن دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا سو (نہ فرعون نے مانا نہ) ان کے سرداروں نے مانا بلکہ فرعون بھی اپنے کفر پر رہا اور وہ لوگ بھی) فرعون ہی کی رائے پر چلتے رہے اور فرعون کی رائے کچھ ٹھیک نہ تھی وہ (فرعون) قیامت کے دن اپنی قوم سے آگے آگے ہوگا پھر ان سب کو دوزخ میں جا اتارے گا، اور وہ (دوزخ) بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جاویں گے اور اس دنیا میں بھی

لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی (ان کے ساتھ رہے گی، چنانچہ یہاں قہر سے غرق ہوئے اور وہاں دوزخ نصیب ہوگا، بُرا انعام ہے جو اُن کو دیا گیا، یہ (جو کچھ اوپر قصص میں مذکور ہوا، اُن (غارت شدہ) بستیوں کے بعض حالات تھے جنکو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں (تو) بعضی بستیاں تو ان میں (اب بھی) قائم ہیں (مثلاً مصر کہ آلِ فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بھی آباد رہا) اور بعض کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور (ہم نے جو ان مذکورہ بستی والوں کو سزائیں دیں سو ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا (کہ بلا قصور سزا دی ہو جو صورۃً ظلم ہے) لیکن انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا (کہ ایسی حرکتیں کیں جن سے مستوجب سزا ہوئے، سو ان کے وہ معبود جنکو وہ خدا کو چھوڑ کر پوجتے تھے انکو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے جب آپ کے رب کا حکم (عذاب کے لئے) آپہنچا (کہ ان کو عذاب سے بچا لیتے) اور (فائدہ تو کیا پہنچاتا اور) اُلٹا انکو نقصان پہنچایا (یعنی سبب نقصان کے ہوئے کہ انکی پرستش کی بدولت سزایاب ہوئے)

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ

اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں، بیشک اس کی پکڑ

اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ

دردناک ہے شدت کی ۔ اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت کے عذاب سے

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ

وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہونگے سب لوگ اور وہ دن ہے سب کے پیش ہونے کا، اور اس کو ہم دیر جو کرتے ہیں

اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ

سو ایک وعدہ کیلئے جو مقرر ہے ۔ جس دن وہ آئیگا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اس کے حکم سے سو ان میں بعض

شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ

بدبخت ہیں اور بعض نیک بخت ۔ سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں ان کو وہاں چیخنا ہے اور

شَهِيْقٌ ۝۱۰۶ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ

دھاڑنا ۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے

رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۰۷ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي

تیرا رب ۔ بیشک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہے ۔ اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو جنت

الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ

میں ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب ۔

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ

بخشش ہے بے انتہا سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جنکو پوجتے ہیں یہ لوگ

مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ

کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے ان کے باپ دادے اس سے پہلے، اور ہم دینے والے ہیں ان کو

نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ

ان کا حصہ یعنی عذاب بے نقصان ، اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں پھوٹ

فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ

پڑ گئی اور اگر نہ ہوتی ایک بات کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو جاتا ان میں اور ان کو اس میں

شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ

شبہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا ، اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا دے گا رب تیرا ان کو ان کے اعمال ،

اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کے رب کی دارو گیر ایسی ہی (سخت) ہے جب وہ کسی بستی والوں پر دارو گیر کرتا ہے جبکہ وہ ظلم (وکفر) کیا کرتے ہوں، بلاشبہ اس کی دارو گیر بڑی الم رساں اور سخت ہے (کہ اس سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا) ان واقعات میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو (وجہ عبرت ظاہر ہے کہ جب دنیا کا عذاب ایسا سخت ہے حالانکہ یہ دار الجزاء نہیں تو آخرت کا جو کہ دار الجزاء ہے کیسا سخت عذاب ہوگا) وہ (یعنی آخرت کا دن) ایسا دن ہوگا کہ اس میں تمام آدمی جمع کئے جاویں گے اور وہ سب کی حاضری کا دن ہے اور (وہ دن گو ابتک آیا نہیں لیکن اس سے کوئی اس کے آنے میں شک نہ کرے آوے گا ضرور) ہم اسکو صرف تھوڑی مدت کے لئے (بعض مصلحتوں سے) ملتوی کئے ہوئے ہیں (پھر) جس وقت وہ دن آوے گا (ہمارے ہیبت کے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ) کوئی شخص بدون خدا کی اجازت کے بات تک بھی نہ کر سکے گا (یہاں جب حساب کتاب کیلئے حاضری ہوگی اور ان کے اعمال پر جواب طلب کیا جاوے گا اس وقت البتہ منہ سے بات نکلے گی خواہ وہ بات مقبول ہو یا مقبول نہ ہو سو اس حالت میں تو سب اہل موقف شریک ہونگے، پھر آگے) ان میں (یہ) فرق ہوگا کہ بعض تو شقی (یعنی کافر) ہوں گے اور بعض سعید (یعنی مومن) ہونگے

دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اللہ کے سوا مددگار پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

خلاصۂ تفسیر

جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (راہ دین پر) مستقیم رہیئے اور وہ لوگ بھی (مستقیم رہیں) جو کفر سے توبہ کرکے آپ کے ساتھ ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو یقیناً وہ تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور (اے مسلمانو) ان ظالموں کی طرف (یعنی جو انکی مثل ہوں انکی طرف دل و دوستی سے یا اعمال و احوال میں مشارکت و مشابہت سے) مت جھکو، کبھی تمکو دوزخ کی آگ لگ جاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر تمہاری حمایت کسی طرف سے بھی نہ ہو (کیونکہ رفاقت تو حمایت سے سہل ہے جب رفاقت کرنے والا بھی کوئی نہیں تو حمایت کرنے والا کون ہوتا)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِل

سورۂ ہودؑ میں انبیاء سابقین اور انکی قوموں کے واقعات نوح علیہ السلام سے شروع کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک خاص ترتیب و تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں جن میں سینکڑوں مواعظ و حکم اور احکام و ہدایات ہیں۔ ان واقعات کے ختم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے امت محمدیہ کو اُن سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دیگئی، فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ لیعنی یہ ہیں پہلے شہروں اور بستیوں کے واقعات جو ہم نے آپ کو سنائے ہیں، یہ بستیاں جن پر اللہ تعالیٰ کے عذاب آئے ان میں سے بعض کے تو ابھی کچھ عمارات یا کھنڈرات موجود ہیں اور بعض بستیاں ایسی کردیگئی ہیں جیسے کھیتی کاٹنے کے بعد زمین ہموار کردی جاتی ہے، پچھلی کھیتی کا نشان تک نہیں رہتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کو چھوڑ کر بتوں اور دوسری چیزوں کو اپنا خدا بنا بیٹھے، جسکا انجام یہ ہوا کہ جب خدا تعالیٰ کا عذاب آیا تو ان خودساختہ خداؤں نے انکی کوئی مدد نہ کی، اور اللہ تعالیٰ جب بستیوں کو عذاب میں پکڑتے ہیں تو انکی گرفت ایسی ہی سخت اور دردناک ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد انکو آخرت کی فکر میں مشغول کرنے کے لئے فرمایا کہ ان واقعات میں اُن لوگوں کیلئے بڑی عبرت اور نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں جس دن تمام اولاد آدم ایک جگہ جمع اور

موجود ہوگی، اُس دن کا حال یہ ہوگا کہ کسی شخص کی مجال نہ ہوگی کہ بغیر اجازت خداوندی ایک حرف بھی زبان سے بول سکے۔

اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ یعنی آپ دین کے راستہ پر اس طرح مستقیم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی مستقیم رہیں جو کفر سے توبہ کر کے آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود سے نہ نکلو کیونکہ وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

استقامت کا مفہوم اور اہم فوائد و مسائل

"استقامت" کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے، پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہ ہو، لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، "استقامت" لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اسکے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اسکی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر اُسکے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

دُنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر و شرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُسکی ذات و صفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اس میں افراط و تفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت و محبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی زیادتی کا گمراہ و گستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غلو کر کے رسول کو خدائی صفات و اختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود و نصاریٰ اسی گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لئے جو طریقے قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیئے ہیں ان میں ذرا سی کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گرا دیتی ہے اسیطرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے

یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں اپنے رب کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بدعات و محدثات سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور سخت گمراہی قرار دیا ہے، اس سے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لئے کرے تو کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کر لے کہ یہ کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس کیفیت و صورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاق و معاشرت کے تمام ابواب میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کر دیا ہے، جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور بردباری، کنجوسی اور سخاوت، کسب معاش اور ترک دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسباب ضروریہ کی فراہمی اور مسبب الاسباب پر نظر، ان سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراط مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی، اس کو اختیار کرنے سے ہی انسان، انسان کامل بنتا ہے، اس میں استقامت سے ذرا ہٹنے ہی کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء و ارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، آپ نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ، یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اس پر مستقیم رہو، (رواہ مسلم۔ از قرطبی)

اور عثمان بن حاضر ازدی فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا عَلَیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالْاِسْتِقَامَۃِ اِتَّبِعْ وَلَا تَبْتَدِعْ (رواہ الدارمی فی مسندہ۔ از قرطبی) یعنی تم تقویٰ اور خوف خدا کو لازم پکڑو اور استقامت بھی جس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہی ہے، اسی لئے محققین صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استقامت کا مقام کرامت سے بالاتر ہے یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے اگرچہ عمر بھر اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ پورے قرآن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اور فرمایا کہ جب صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ سفید بال دیکھ کر بطور حسرت و افسوس کے عرض کیا کہ اب آپ پر تیزی سے بڑھاپا آ رہا ہے تو فرمایا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ہود میں جو پچھلی قوموں پر

سخت و شدید عذاب کے واقعات مذکور ہیں وہ بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں مگر ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہی اُس کا سبب ہے۔

تفسیر قرطبی میں ابو علی سری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو عرض کیا کہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ مجھے سورۂ ہُودؑ نے بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اس سورت میں جو انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور انکی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے اس نے آپکو بوڑھا کیا، تو فرمایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ!

یہ ظاہر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو انسانِ کامل کی مثالی صورت بنکر اس دُنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپکی عادت تھی مگر پھر اس قدر بار یا تو اس لئے محسوس فرمایا کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امرِ الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہیئے، انبیاء علیہم السّلام پر جسقدر خوف و خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ جل شانہٗ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پُوری ہوئی یا نہیں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنی استقامت کی تو زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ وہ بحمداللہ حاصل تھی مگر اس آیت میں پوری امت کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، امت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر و غم طاری ہوا۔

حکمِ استقامت کے بعد فرمایا وَلَا تَطْغَوْا، یہ لفظ مصدر "طغیان" سے بنا ہے، اس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اُسکے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔

دُوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لئے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ، یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ انکے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے ـــ لَا تَرْكَنُوْٓا مصدر رکون سے بنا ہے جسکے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دُنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان، اُن سے راضی ہونا، اُن پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اُسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔

اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مُراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ و تابعین کے چند اقوال منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریجؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابوالعالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال وافعال کو پسند نہ کرو (قرطبی) سدیؒ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو یعنی ان کے بُرے اعمال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم وجور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ انکی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور انکے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اُس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے (مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے اُن سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لا کے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لَا تَطْغَوْا اور دوسرا دوسری آیت میں لَا تَرْكَنُوْا، پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ

اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے، البتہ نیکیاں دُور کرتی ہیں

السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ

برائیوں کو، یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کو، اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ

نیکی کرنیوالوں کا، سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ

منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچا لیا ان میں سے اور چلے وہ لوگ جو

ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى

ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گنہگار، اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے

قطعے کے ہیں، دن کے دونوں سروں کی نماز کے متعلق اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ پہلے سرے کی نماز نماز فجر ہے، آخری سرے کی نماز بعض حضرات نے مغرب کو قرار دیا ہے کہ دن کے بالکل ختم پر ہے اور بعض حضرات نے عصر کی نماز کو دن کے آخری سرے کی نماز قرار دیا ہے کیونکہ دن کی آخری نماز وہی ہے، وقت مغرب دن کا نہیں بلکہ دن گزرنے کے بعد آتا ہے، اور زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ یعنی رات کے حصوں کی نماز سے مراد جمہور مفسرین حسن بصری، مجاہد، محمد بن کعب، قتادہ، ضحاک وغیرہم نے مغرب و عشاء کی نماز کو قرار دیا ہے، اور ایک حدیث سے اسکی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ مغرب و عشاء ہیں (تفسیر ابن کثیر)

بنا بر طَرَفَيِ النَّهَارِ سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہوئی اور زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ سے مغرب و عشاء کی تو اس آیت میں چار نمازوں کے اوقات کا بیان آ گیا صرف ظہر کی نماز کا بیان رہ گیا جو دوسری آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ میں آیا ہے۔

اس آیت میں اوقات مذکورہ میں اقامت صلوٰۃ کے حکم کے بعد ایک اہم فائدہ بھی بتلایا گیا ہے، اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ "نیک کام" سے تمام نیک کام مراد ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات، حسن خلق، حسن معاملہ وغیرہ سب داخل ہیں مگر نماز کو ان سب میں اولیت حاصل ہے، اسی طرح "سیئات" کا لفظ تمام برے کاموں کو حاوی اور شامل ہے خواہ وہ کبیرہ گناہ ہوں یا صغیرہ لیکن قرآن مجید کی ایک دوسری آیت نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات نے اسکو صغیرہ گناہوں کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، معنی یہ ہیں کہ نیک کام جن میں نماز سب سے افضل ہے، صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں اور ان کے گناہ کو مٹا دیتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ یعنی اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کا خود کفارہ کر دیں گے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک ان تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں جو انکے درمیان صادر ہوں، جبکہ یہ شخص کبائر یعنی بڑے گناہوں سے بچا رہا ہو، مطلب یہ ہے کہ بڑے گناہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے مگر چھوٹے گناہ دوسرے نیک کام نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کرنے سے خود بھی معاف ہو جاتے ہیں، مگر تفسیر بحر محیط میں محققین علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صغیرہ گناہ بھی نیک کام کرنے سے جبھی معاف ہوتے ہیں جبکہ آدمی ان کے کرنے پر نادم ہو اور آئندہ کیلئے نہ کرنے کا ارادہ کرے، ان پر اصرار نہ کرے، روایات حدیث میں جتنے واقعات کفارہ ہو جانے کے منقول ہیں ان سب میں یہ تصریح بھی ہے کہ انکا کرنے والا جب اپنے فعل پر نادم ہوا اور آئندہ کیلئے توبہ کی اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو گناہ معاف ہو جانے کی بشارت سنائی۔ واللہ اعلم

مشہور و معروف روایات حدیث میں کبیرہ یعنی بڑے گناہ ان چیزوں کو بتلایا ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک یا برابر قرار دینا، قصداً کسی فرض نماز کو چھوڑنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، حرام کاری، چوری، شراب نوشی، ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹی قسم، جھوٹی گواہی، جادو کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال ناجائز طور پر لے لینا، میدان جہاد سے بھاگنا، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا، کسی کا مال ناجائز طور پر غصب کرنا، عہد شکنی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، کسی کو گالی دینا، کسی شخص کو ناحق مجرم قرار دے دینا، وغیرہ ـــ کبیرہ اور صغیرہ یعنی بڑے اور چھوٹے گناہوں کی تفصیل مستقل رسالوں میں علماء نے لکھ دی ہیں، میرے رسالہ گناہ بے لذت میں بھی مذکور ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسری آیت مذکورہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نیک کام کرنے سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بُرے کام کے بعد نیک کام کرلو تو وہ اسکی برائی کو مٹا دیگا، اور فرمایا کہ لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو (ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

حضرت ابوذر غفاری نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے تو اس کے بعد کوئی نیک کام کرلو تاکہ وہ اسکو مٹا دے۔

درحقیقت ان احادیث میں گناہ سے توبہ کرنے کا مسنون و محفوظ طریقہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ مسند احمد میں بروایت صدیق اکبرؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اسکو چاہئے کہ وضو کر کے دو رکعت نماز نفل ادا کرلے تو اس گناہ کی معافی ہوجائے گی (الروایات کلہا من ابن کثیر) اس نماز کو نماز توبہ بھی کہا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ یعنی یہ ایک نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے، اس میں ذلک کا اشارہ قرآن کریم کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور ان کاموں کی طرف بھی جن کا ذکر اس سے پہلے آیا ہے، مراد یہ ہے کہ یہ قرآن یا نیک مذکورہ احکام ان لوگوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہیں جو نصیحت سننے اور ماننے کے عادی ہیں اس میں اشارہ یہ ہے کہ ہٹ دھرم ضدی آدمی جو سچی بات پر غور ہی نہ کرے وہ ہر ہدایت سے محروم رہتا ہے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی آپ صبر و ثابت قدمی کے ساتھ رہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

"صبر" کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں، مراد اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کیلئے بھی "صبر" بولا جاتا ہے جس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ نیک کاموں کے کرنے پر اپنے نفس کو ثابت قدم رکھے اور یہ بھی کہ بُرے کاموں میں مبتلا ہونے سے اس کو روکے، اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم دینے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ جو احکام آیات مذکورہ میں آپکو دیئے گئے ہیں مثلاً استقامت، اقامت صلوٰۃ وغیرہ ان پر آپ مضبوطی سے قائم رہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور ایذاء پر صبر کی تلقین مقصود ہو، اور اسکے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ محسنین یعنی نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اس میں لفظ "محسنین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیات مذکورہ کے احکام امر و نہی کے پابند ہوں یعنی دین میں استقامت کا مقام نکو حاصل ہو، حدودِ شرعیہ کی پوری رعایت کرتے ہوں، ظالموں کے ساتھ دوستی اور بے ضرورت تعلق نہ رکھتے ہوں، نماز کو آداب کے ساتھ افضل وقت میں ادا کرنے کے پابند ہوں، تمام احکامِ دین پر ثابت قدم ہوں۔

اور خلاصہ ان سب کا وہی ہے جو "احسان" کی تعریف میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں، جب انسان کو حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے یقین کا یہ درجہ حاصل ہو جائے تو اُس کے تمام اقوال و افعال خود بخود درست ہو جاتے ہیں، علماء سلف میں تین کلمے ایسے معروف تھے جو باہم ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے، وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں اول یہ کہ جو شخص آخرت کیلئے کام میں مشغول ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسکے دُنیا کے کاموں کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں اور اُنکی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ جو شخص اپنی باطنی حالت کو درست کرے کہ قلب کا رُخ سب سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دے تو اللہ تعالیٰ اُسکی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں، تیسرے یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملہ کو صحیح و درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور تمام لوگوں کے درمیان کے معاملات کو خود درست فرما دیتے ہیں، اصل عبارت ان تین کلمات کی یہ ہے: كَانَ أَهْلُ الْخَيْرِ يَكْتُبُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ بِثَلَاثِ كَلِمَاتٍ، مَنْ عَمِلَ لِآخِرَتِهِ كَفَاهُ اللّٰهُ أَمْرَ دُنْيَاهُ، وَمَنْ أَصْلَحَ سَرِيْرَتَهُ أَصْلَحَ اللّٰهُ عَلَانِيَتَهُ، وَمَنْ أَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللّٰهِ أَصْلَحَ اللّٰهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّاسِ۔ (تفسیر روح البیان بحوالہ)

تیسری اور چوتھی آیتوں میں پچھلی اقوام پر عذاب نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اُس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ فرمایا:

"ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھدار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے اور باقی پوری قوم دُنیا کی لذتوں میں پھنس کر جرائم پیشہ بن گئی"۔

اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھدار لوگوں کو لفظ "اُولُوْا بَقِيَّةٍ" سے تعبیر کیا ہے، بقیہ کا لفظ بقیمتی چیز کیلئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اُسکو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اُسکو نہیں دیتا، اسی لئے عقل و بصیرت کو "بقیہ" کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا کہ آپ کا رب شہروں اور بستیوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ ان کے بسنے والے نیکوکار یعنی مسلمان ہوں ـــ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم و جور کا کوئی امکان نہیں جبکہ

ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مُصْلِحُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود مشرک کافر ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان وایذاء نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دُنیا کا عذاب کسی قوم پر محض اُن کے مشرک کافر ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال واخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین میں فساد پھیلتا ہے، پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے اُن کے خاص خاص اعمالِ بد اُس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، قوم شعیب علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کرکے فساد پھیلایا، قوم لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآن کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنے کا سبب انہی اعمال وافعال کو بتلایا ہے، نرے کفر و شرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں، اُس کی سزا تو جہنم ہی میں آگے ہے۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ مُلک و سلطنت کفر و شرک کے ساتھ تو چل سکتے ہیں مگر **ظلم و جور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔**

اختلاف مذموم اور محمود

پانچویں آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت و ملت بنادیتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبول اسلام پر مجبور کرڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہوجاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا، مگر بتقاضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کردیا ہے اُس کے ماتحت وہ اچھا یا بُرا جو چاہے عمل کرسکتا ہے، اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اس لئے راہیں مختلف ہوتی ہیں، عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دینِ حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے بجز اُن لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دینِ حق اور تعلیمِ انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہاء اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہدِ صحابہؓ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمتِ الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلافات کو اس آیت کی رُو سے غلط، خلافِ رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاقِ آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فہرست مضامین معارف القرآن جلد پنجم

فہرست مضامین ختم شد

سورۃ یوسف

سُوْرَةُ يُوْسُفَ

مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا

لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ

تاکہ تم سمجھ لو ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ

اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن اور تو تھا اس سے پہلے

لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ

البتہ بے خبروں میں جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝۴

خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۝

کہا اے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ

البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو

رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ

تیرا رب اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کریگا اپنا انعام تجھ پر

وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ

اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم

وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶

اور اسحٰق پر البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا۔

ع ۲ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک واضح کتاب کی (جس کے الفاظ اور معانی اور بیان سب صاف ہیں) ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم (اہل زبان ہونے کی وجہ سے دوسروں سے پہلے) سمجھو (پھر تمہارے واسطے سے دوسرے لوگ سمجھیں)۔ ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے پہلے آپ (اس قصہ سے) بالکل بے خبر تھے (کیونکہ نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، نہ کسی عالم سے کچھ سیکھا تھا۔ اور قصہ کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ عوام جانتے ہوں۔ غرض قصہ) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے کہا کہ ابا میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، انھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندان نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج چاند والد اور والدہ ہیں اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمہارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) تو وہ تمہارے (ایذا رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی بھائیوں میں سے اکثر، کیونکہ دس بھائی علاتی تھے، ان سے خطرہ تھا، صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا، مگر یہ احتمال تھا کہ ان کے منہ سے بات نکل جائے) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اس لئے بھائیوں کے دل میں وسوسہ ڈالے گا) اور (جس طرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع و مطیع ہوں گے) اسی طرح تمہارا رب تم کو (دوسری عزت نبوت کیلئے بھی) منتخب کریگا اور تم کو خوابوں کی تعبیر کا علم دیگا اور (دوسری نعمتیں دیکر بھی) تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کریگا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم و اسحٰق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کرچکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ یوسف چند آیتوں کے سوا پوری مکی سورت ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے پورے قرآن میں دوبارہ اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصۂ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پورے قرآن میں خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کرکے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کے لئے بڑے سبق ہوتے ہیں جن کی قدرتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب و دماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے محنت ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے، اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے، جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کے لئے نسخہ کیمیا ہے، مگر قرآن کریم نے تاریخ عالم کے اس حصہ کو بھی اپنے مخصوص و بے مثال انداز میں اس طرح لیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ہر مقام پر جس قصہ کا کوئی جزء عبرت و موعظت کیلئے ضروری سمجھا گیا صرف اتنا ہی حصہ وہاں بیان کردیا گیا، اور پھر کسی دوسرے موقع پر اس حصہ کی ضرورت سمجھی گئی تو پھر اس کا اعادہ کردیا گیا، اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کردیا گیا ہے، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے، کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گذشتہ واقعات کا پڑھنا یا یاد رکھنا خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ و خبر سے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

اسی لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے، خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے، اس میں اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں، کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہئے جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے

اور نہ اتنا طویل ہونا چاہئے کہ اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ یہود نے آزمائش کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمیں بتلایئے کہ آلِ یعقوب ملکِ شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے، اور یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا تھا؛ ان کے جواب میں بذریعہ وحی یہ پورا قصہ نازل کیا گیا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی نبوت کا بڑا شاہد تھا، کہ آپ امی محض تھے اور عمر بھر مکہ میں مقیم رہے، کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی کتاب پڑھی، پھر وہ تمام واقعات جو تورات میں مذکور تھے، صحیح صحیح بتلا دیئے، بلکہ بعض وہ چیزیں بھی بتلا دیں جن کا ذکر تورات میں نہ تھا، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں جو آگے بیان ہوں گی۔

سب سے پہلی آیت میں حروف الۤرٰ مقطعات قرآنیہ میں سے ہیں، جن کے متعلق جمہور سلف صحابہ و تابعین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ متکلم اور مخاطب یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جس کو کوئی تیسرا آدمی نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کی تحقیق کے درپے ہو۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ، یعنی یہ ہیں آیتیں اس کتاب کی جو احکام حلال و حرام اور ہر کام کی حدود و قیود بتلا کر انسان کو ہر شعبۂ زندگی میں ایک معتدل سیدھا نظامِ حیات بخشتی ہیں جن کے نازل کرنے کا وعدہ تورات میں پایا جاتا ہے، اور یہود اس سے واقف ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، یعنی ہم نے نازل کیا اس کو قرآن عربی بنا کر کہ شاید تم سمجھ بوجھ حاصل کرو۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قصۂ یوسف علیہ السلام کا سوال کرنے والے عرب کے یہودی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں یہ قصہ نازل فرما دیا تاکہ وہ غور کریں، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر ایمان لائیں اور اس قصہ میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔

اسی لئے اس جگہ لفظ لَعَلَّ بمعنے شاید لایا گیا ہے، کیونکہ ان مخاطبوں کا حال معلوم تھا کہ ایسی واضح آیات بینات سامنے آنے کے بعد بھی ان سے قبولِ حق کی توقع مشکوک تھی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ، یعنی ہم بیان کرتے ہیں آپ کے لئے بہترین قصہ اس قرآن کو بذریعہ وحی آپ پر نازل کر کے بیشک آپ اس سے پہلے ان تمام واقعات سے ناواقف تھے۔

اس میں یہود کو تنبیہ ہے کہ تم نے جس طرح ہمارے رسول کی آزمائش کرنا چاہی اس میں بھی رسول کا کمال واضح ہو گیا، کیونکہ وہ پہلے سے کتب اور تاریخ عالم سے ناواقف تھے، اب اس واقفیت کا کوئی ذریعہ بجز تعلیم الٰہی اور وحی نبوت کے نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تھا جس کی تعبیر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ گیارہ ستاروں سے مراد یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور سورج اور چاند سے مراد ماں باپ تھے۔

قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے وفات پا چکی تھیں، مگر ان کی خالہ والد ماجد کے نکاح میں آ گئی تھیں، خالہ خود بھی ماں کے قائم مقام سمجھی جاتی ہے خصوصاً جبکہ وہ والد کی زوجیت میں آ جائے تو عرفاً اس کو ماں ہی کہا جائے گا۔

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ یعنی بیٹا تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا، ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خواب سن کر تمہاری عظمت شان معلوم کر کے تمہیں ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر کریں، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، وہ دنیا کے جاہ و مال کی خاطر انسان کو ایسے کاموں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ان آیات میں چند مسائل قابل ذکر ہیں:-

خواب کی حقیقت اور درجہ اور اس کی قسمیں: سب سے اول خواب کی حقیقت اور اس سے معلوم ہونے والے واقعات واخبار کا درجہ و مقام ہے، تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفس انسان جس وقت نیند یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کو اس کی قوت خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے، پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح و صادق ہے، مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کچھ عوارض شامل ہو کر اس کو فاسد و ناقابل اعتبار کر دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں متشکل ہو کر نظر آجاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے یہ دونوں قسمیں باطل ہیں جن کی نہ کوئی حقیقت و اصلیت ہے نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے، ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسویل شیطانی کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندہ کو متنبہ کرنے یا خوش خبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے، یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے (مظہری)

اس کی تحقیق صوفیائے کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں، اس وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے، اور اس عالم مثال میں جس طرح جواہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں اور شکلیں ہوتی ہیں، اسی طرح معانی اور اعراض کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں، خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہو جاتا ہے، وہاں جو کائنات کی شکلیں ہیں وہ اس کو نظر آجاتی ہیں، پھر یہ صورتیں عالم غیب سے دکھائی جاتی ہیں، بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ کچھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں حقیقت واقعہ واضح نہیں ہوتی، ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ مختلف ہو جاتا ہے، اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہو اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوئے ہوں، اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے، ان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو

ناقابلِ اعتماد بنا دیتی ہے، بعض اوقات تعبیر صحیح سمجھ میں نہیں آتی۔

خواب کی یہ تین قسمیں جو ذکر کی گئی ہیں یہی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے آپؐ نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم شیطانی ہے جس میں شیطان کی طرف سے کچھ صورتیں ذہن میں آتی ہیں، دوسری وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں سامنے آجاتی ہیں، تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ نبوت کے اجزاء میں سے چھیالیسواں جزء ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہے۔

خواب میں جزء نبوت ہونے کے معنی اور اس کی تشریح

یہ قسم جو حق اور صحیح ہے اور صحیح احادیث نبویہ میں نبوت کا ایک جزء قرار دی گئی ہے، اس میں روایاتِ حدیث مختلف ہیں بعض میں چالیسواں جزء، اور بعض میں چھیالیسواں جزء بتلایا، اور بعض روایات میں انچاس اور پچاس، اور سترواں جزء ہونا بھی منقول ہے، یہ سب روایتیں تفسیر قرطبی میں جمع کر کے ابن عبدالبر کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ان میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ ہر ایک روایت اپنی جگہ صحیح و درست ہے، اور تعدادِ اجزاء کا یہ اختلاف خواب دیکھنے والوں کے مختلف حالات کی بناء پر ہے، جو شخص سچائی، امانت، دیانت اور کمالِ ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہوگا، اور جو ان اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھیالیسواں یا پچاسواں جزء ہوگا، اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا سترواں جزء ہوگا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سچے خواب کے جزء نبوت ہونے سے کیا مراد ہے، تفسیر مظہری میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نبوت کا سلسلہ تئیس سال جاری رہا، ان میں سے پہلے ششماہی میں یہ وحی الٰہی خوابوں کی صورت میں آتی رہی، باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبرئیل امینؑ کی پیغام رسانی کی صورت میں آئی، اس حساب سے سچے خواب وحی نبوت کا چھیالیسواں جزء ہوا، اور جن روایات میں کم و بیش عدد مذکور ہیں ان میں یا تقریبی کلام کیا گیا ہے یا وہ سند کے اعتبار سے ساقط ہیں۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس کے جزء نبوت ہونے سے مراد یہ ہے کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں، مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے، یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد و الہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، جو اصل میں خاصۂ نبوت ہے، اس لئے اس کو ایک جزء نبوت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجال کے ایک مغالطہ کی تردید

یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگا ہے کہ اس جزء نبوت

کے دنیا میں باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوّت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ بیٹھے، جو قرآن مجید کی نصوصِ قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدۂ ختمِ نبوّت کے منافی ہے، اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کا ایک جزء موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا، اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مشین کے بہت سے کل پرزوں میں سے اگر کسی کے پاس ایک پُرزہ یا ایک سکرو موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریحِ حدیث بلاشبہ جزءِ نبوّت ہیں مگر نبوّت نہیں، نبوّت تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ، یعنی آئندہ نبوّت کا کوئی جزء بجز مبشرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ "سچے خواب"، جس سے ثابت ہوا کہ نبوّت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا جزء باقی ہے جس کو مبشرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کافر فاسق آدمی کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے

اور یہ بات بھی قرآن وحدیث سے ثابت اور تجربات سے معلوم ہے کہ سچے خواب بعض اوقات فاسق فاجر بلکہ کافر کو بھی آسکتے ہیں سورۂ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہِ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن میں مذکور ہے، حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسریٰ کا خواب مذکور ہے، جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسریٰ مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی عاتکہ نے بحالتِ کفر آپؐ کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آجائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک، صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچّے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں، فساق و فجار کے عموماً حدیث النفس یا تسویل شیطانی کی قسم باطل سے ہوا کرتے ہیں، مگر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔

بہرحال سچے خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زائد کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کے لئے کسی معاملہ میں حجت ہیں نہ دوسروں کے لئے، بعض ناواقف لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سچے خوابوں میں بھی بکثرت نفسانی یا شیطانی یا دونوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں

مسئلہ: آیت قَالَ يٰبُنَيَّ الخ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے جو اس کا خیر خواہ اور ہمدرد نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے، اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جائے جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے، اس لئے چاہئے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے بجز ایسے شخص کے کہ جو عالم و عاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیر خواہ ہو۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے، اور اگر اس میں کوئی بری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور اللہ سے اس کی برائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے، تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہو جائیں گے اور اگر سچا خواب ہے تو اس عمل کے ذریعہ اس کی برائی دور ہو جانے کی بھی امید ہے۔

مسئلہ: خواب کی تعبیر خواب پر موقوف رہنے کا مطلب تفسیر مظہری میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض تقدیری امور تقدیر مبرم یعنی قطعی نہیں ہوتے، بلکہ معلق ہوتے ہیں کہ فلاں کام ہو گیا تو یہ مصیبت ٹل جائے گی، اور نہ ہوا تو پڑ جائے گی، جس کو قضائے معلق کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں بری تعبیر دینے سے معاملہ برا اور اچھی تعبیر سے اچھا ہو جاتا ہے، اسی لئے

ترمذی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہ ہو یا اس کا خیرخواہ وہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بُری تعبیر سُنکر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے میں اس کے حق میں ویسا ہی ہو جاتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادۃ اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضروری ہو گیا۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف و مصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں اس لئے اگر کسی سے بیان کردے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ غزوۂ اُحد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی جو بڑا حادثہ ہے، مگر آپؐ نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرما دیا تھا۔ (قرطبی)

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اُس کی کسی بُری خصلت یا نیت کا اظہار کر دینا جائز ہے، یہ غیبت میں داخل نہیں مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس شخص کو باخبر کردے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مسئلہ:۔ اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا، اور نقصان پہونچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت وعزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ دنیا میں ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے"

مسئلہ:۔ اس آیت اور بعد کی آیات سے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے یا کنویں میں ڈالنے کا مشورہ اور اس پر عمل مذکور ہے، یہ بھی واضح ہو گیا کہ

یوسف علیہ السلام کے بھائی اللہ کے نبی اور پیغمبر نہ تھے، ورنہ قتل یوسف کا مشورہ اور پھر ان کو ضائع کرنے کی تدبیر اور باپ کی نافرمانی کا عمل ان سے نہ ہوتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا سب گناہوں سے پاک ہونا اور معصوم ہونا ضروری ہے، کتاب طبری میں جو اُن کو انبیاء کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں (قرطبی)

چھٹی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے چند انعامات عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اول وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انعامات و احسانات کے لئے آپ کا انتخاب فرمائیں گے، جس کا ظہور ملک مصر میں حکومت اور عزت و دولت ملنے سے ہوا، دوسرے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ، اس میں احادیث سے مراد لوگوں کے خواب ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تعبیر خواب کا علم سکھا دیں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایک مستقل فن ہے جو اللہ تعالیٰ کسی کسی کو عطا فرما دیتے ہیں، ہر شخص اس کا اہل نہیں۔

مسئلہ:۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ عبداللہ بن شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

تیسرا وعدہ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ یعنی اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمت پوری فرما دیں گے" اس میں عطاء نبوت کی طرف اشارہ ہے، اور اسی کی طرف اشارہ بعد کے جملوں میں ہے كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ، یعنی جس طرح ہم اپنی نعمت نبوت تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحق علیہما السلام پر آپ سے پہلے پوری کر چکے ہیں، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ تعبیر خواب کا فن جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، اسی طرح ابراہیم و اسحق علیہم السلام کو بھی سکھایا گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ یعنی تمہارا پروردگار بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے،، نہ اس کے لئے کسی کو کوئی فن سکھانا مشکل ہے، اور نہ از روئے حکمت وہ یہ فن ہر شخص کو سکھاتا ہے، بلکہ اپنی حکمت کے تحت انتخاب کر کے کسی کو یہ ہنر دیدیتا ہے

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۷) اِذْ قَالُوْا

البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کیلئے، جب کہنے لگے

لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ

البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم اُن سے زیادہ قوت والے لوگ ہیں، البتہ

أَبَانَا لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾ ٱقْتُلُوا۟ يُوسُفَ أَوِ ٱطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ

ہمارا باپ صریح خطا پر ہے، مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے

لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا۟ مِنۢ بَعْدِهِۦ قَوْمًا صَٰلِحِينَ ﴿٩﴾

تم پر توجہ تمہارے باپ کی، اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ،

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا۟ يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِى غَيَٰبَتِ ٱلْجُبِّ

بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گمنام کنوئیں میں

يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ ٱلسَّيَّارَةِ إِن كُنتُمْ فَٰعِلِينَ ﴿١٠﴾ قَالُوا۟ يَٰٓأَبَانَا

کہ اٹھا لے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے، بولے اے باپ

مَا لَكَ لَا تَأْمَ۫نَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُۥ لَنَٰصِحُونَ ﴿١١﴾ أَرْسِلْهُ

کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں، بھیج اس کو

مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ﴿١٢﴾ قَالَ إِنِّى

ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں، بولا مجھ کو

لَيَحْزُنُنِىٓ أَن تَذْهَبُوا۟ بِهِۦ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ ٱلذِّئْبُ وَ

غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور

أَنتُمْ عَنْهُ غَٰفِلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا۟ لَئِنْ أَكَلَهُ ٱلذِّئْبُ وَنَحْنُ

تم اس سے بے خبر رہو، بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک

عُصْبَةٌ إِنَّآ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ ﴿١٤﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوا۟ بِهِۦ وَأَجْمَعُوٓا۟

جماعت ہیں قوت ور تو تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا، پھر جب لیکر چلے اس کو اور متفق ہوئے

أَن يَجْعَلُوهُ فِى غَيَٰبَتِ ٱلْجُبِّ وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم

کہ ڈالیں اس کو گمنام کنوئیں میں، اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو

بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥﴾ وَجَآءُوٓ أَبَاهُمْ عِشَآءً

ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے، اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے

يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا۟ يَٰٓأَبَانَآ إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ

روتے ہوئے، کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو

عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا

اپنے اسباب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا، اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ

سچے ہوں، اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ، بولا یہ ہرگز نہیں

سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ

بلکہ بنا دی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں

عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ

اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو، اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے

فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ

لٹکا دیا اپنا ڈول کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا، اور چھپا لیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں، اور بیچ آئے اس کو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی

مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

چونیاں، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

ع ۲
۱۲

خلاصۂ تفسیر

یوسف (علیہ السلام) کے اور ان کے (علاتی) بھائیوں کے قصہ میں (خدا کی قدرت اور آپ کی نبوت کے) دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو آپ سے ان کا قصہ) پوچھتے ہیں، (کیونکہ یوسف علیہ السلام کو ایسی بے کسی اور بے بسی سے سلطنت و حکومت تک پہونچا دینا یہ خدا ہی کا کام تھا، جس سے مسلمانوں کے لئے عبرت اور قوت ایمان حاصل ہوگی، اور یہود جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ پوچھا تھا ان کے لئے اس میں دلیل نبوت مل سکتی ہے) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ اُن (علاتی) بھائیوں نے (باہمی مشورہ کے طور پر) یہ گفتگو کی کہ (یہ کیا بات ہے کہ) یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ (وہ دونوں کم عمری کی وجہ سے آن کی خدمت کے قابل بھی نہیں، اور) ہم ایک جماعت کی جماعت ہیں، (کہ اپنی قوت و کثرت کی وجہ سے ان کی ہر طرح

کی خدمت بھی کرتے ہیں) واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (اس لئے تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ ان دونوں میں بھی زیادہ پیار یوسف سے ہے اس کو کسی طرح ان کے پاس سے ہٹانا چاہئے جس کی صورت یہ ہے کہ) یا تو یوسف کو قتل کر ڈالو یا اس کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال آؤ تو (پھر) تمہارے باپ کا رُخ خالص تمہاری طرف ہو جاوے گا اور تمہارے سب کام بن جاویں گے، انہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو (کہ وہ بڑا جرم ہے) اور ان کو کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈال دو (جس میں اتنا پانی نہ ہو جس میں ڈوبنے کا خطرہ ہو کیونکہ وہ تو قتل ہی کی ایک صورت ہے، البتہ بستی اور رہگذر سے بہت دور بھی نہ ہو) تاکہ انکو کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جاوے، اگر تم کو (یہ کام) کرنا ہی ہے (تو اس طرح کرو، اس پر سب کی رائے متفق ہوگئی اور) سب نے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے (کہ کبھی کہیں ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے) حالانکہ ہم اس کے (دل وجان سے) خیرخواہ ہیں (ایسا نہ چاہئے بلکہ) آپ اس کو کل ہمارے ساتھ (جنگل) بھیجئے کہ ذرا وہ کھاویں کھیلیں اور ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (مجھے ساتھ بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حزن اور ایک خوف، حزن تو یہ کہ) مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم (میری نظروں کے سامنے سے) لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جاوے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو (کیونکہ اس جنگل میں بھیڑئیے بہت تھے) وہ بولے اگر اس کو بھیڑیا کھا لے اور ہم ایک جماعت کی جماعت (موجود) ہوں تو ہم بالکل ہی گئے گذرے ہوئے (غرض کہہ سُن کر یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو لے کر چلے) تو جب ان کو (اپنے ساتھ جنگل) لے گئے اور (قرار داد سابق کے مطابق) سب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان کو کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیں (پھر اپنی تجویز پر عمل بھی کر لیا) اور (اس وقت یوسف کی تسلی کے لئے) ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ (تم مغموم نہ ہو ہم تم کو یہاں سے خلاصی دے کر بڑے رتبہ پر پہنچا دیں گے اور ایک دن وہ ہوگا کہ) تم ان لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو (اس وجہ سے کہ غیر متوقع طور پر شاہانہ صورت میں دیکھیں گے) پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ بھائی مصر پہونچے اور آخرکار یوسف علیہ السلام نے ان کو جتلایا ہَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ، یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا) اور (ادھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے پہنچے (اور جب باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو) کہنے لگے ابا ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے میں (کہ کون آگے نکلے) لگ گئے اور یوسف کو ہم نے (ایسی جگہ جہاں بھیڑیا آنے کا گمان نہ تھا) اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس (اتفاقاً) ایک بھیڑیا

(آیا اور) ان کو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں اور (جب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو) یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے (کہ کسی جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنی قول کی سند کے لئے پیش کیا) یعقوبؑ نے (دیکھا تو کرتہ کہیں سے پھٹا نہیں تھا، کما رواہ الطبری عن ابن عباس، تو) فرمایا (یوسفؑ کو بھیڑیئے نے ہرگز نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنا لی ہے، سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (صبر جمیل کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرف شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کی ہے) اور جو باتیں تم بناتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے (کہ اس وقت مجھے اس پر صبر آجائے اور آئندہ تمہارا جھوٹ کھل جائے، بہرحال حضرت یعقوبؑ صبر کر کے بیٹھ رہے) اور (یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ ہوا کہ اتفاق سے اُدھر) ایک قافلہ آنکلا (جو مصر کو جا رہا تھا) اور انھوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنویں پر) بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا (یوسف علیہ السلام نے ڈول کو پکڑ لیا جب ڈول باہر آیا اور یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو خوش ہو کر) کہنے لگا بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا (اور قافلہ والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے) اور ان کو مال (تجارت) قرار دے کر (اس خیال سے) چھپا لیا (کہ کوئی دعویدار نہ کھڑا ہو جائے تو پھر اس کو مصر لے جا کر بڑی قیمت پر فروخت کریں گے) اور اللہ کو ان سب کی کارگذاریاں معلوم تھیں (ادھر وہ بھائی بھی آس پاس لگے رہتے، اور کنویں میں یوسف کی خبر گیری کرتے کچھ کھانا بھی پہنچاتے جس سے مقصد یہ تھا کہ یہ ہلاک بھی نہ ہوں اور کوئی آ کر انھیں کسی دوسرے ملک میں لیجائے اور یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہو، اس روز جب یوسفؑ کو کنویں میں نہ دیکھا اور پاس ایک قافلہ پڑا دیکھا تو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہونچے، یوسف علیہ السلام کا پتہ لگ گیا تو قافلہ والوں سے کہا کہ ہمارا غلام ہے بھاگ کر آگیا تھا اور اب ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے) اور (یہ بات بنا کر) ان کو بہت ہی کم قیمت پر (قافلہ والوں کے ہاتھ) بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے میں اور (وجہ یہ تھی کہ) یہ لوگ کچھ ان کے قدردان تو تھے ہی نہیں (کہ ان کو عمدہ مال سمجھ کر بڑی قیمت سے بیچتے، بلکہ ان کا مقصد تو ان کو یہاں سے ٹالنا تھا)۔

معارف و مسائل

سورۂ یوسف کی مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں آنے والے قصۂ یوسف علیہ السلام کو محض ایک قصہ نہ سمجھو، بلکہ اس میں سوال کرنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور ہدایتیں ہیں۔

اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ آپؐ سے پوچھا تھا ان کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں، روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپؐ کی خبر مدینہ طیبہ میں پہونچی تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کے لئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جا کر آپؐ کی آزمائش کریں، اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپؐ خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلائیے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملک شام سے مصر لے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے نابینا ہو گئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی، نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بحوالۂ تورات وانجیل اس قصہ کا کوئی جزء معلوم ہو سکتا، ان کے اس سوال پر ہی پوری سورۂ یوسف نازل ہوئی جس میں حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کا پورا قصہ مذکور ہے، اور اتنی تفصیل سے مذکور ہے کہ تورات وانجیل میں بھی اتنی تفصیل نہیں، اس لئے اس کا بیان کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ تھا۔

اور اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قطع نظر سوال یہود کے خود یہ واقعہ ایسے امور پر مشتمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بڑی نشانیاں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی ہدایتیں اور احکام ومسائل موجود ہیں، کہ جس بچے کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی، اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں، اور یہ کہ جو شخص نیکی وتقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں کیسی عزت دیتے ہیں، اور مخالفین کو اس کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں، یہ سب عبرتیں اور نصیحتیں اور قدرتِ الٰہیہ کی عظیم نشانیاں ہیں، جو ہر تحقیق کرنے والے اور غور کرنے والے کو معلوم ہو سکتی ہیں (قرطبی ومظہری)

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، اُن کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ ۱۲ لڑکے تھے، ان میں سے ہر لڑکا صاحبِ اولاد ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ ۱۲ خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

ان بارہ لڑکوں میں دس بڑے لڑکے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی زوجۂ محترمہ

حضرت لیّا بنت لیّان کے بطن سے تھے، ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام نے لیّا کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا ان کے بطن سے دو لڑکے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے، اس لئے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی صرف بنیامین تھے، باقی دس بھائی علاتی یعنی باپ شریک تھے، یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں بنیامین کی ولادت کے بعد ہوگیا تھا (قرطبی)

دوسری آیت میں یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے، کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ یوسف علیہ السلام سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے بھائیوں کو حاصل نہیں، اس لئے ان پر حسد ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طرح ان کو یوسف علیہ السلام کے خواب بھی معلوم ہوگئے ہوں جس سے انھوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان کی بڑی شان ہونے والی ہے اس سے حسد پیدا ہوا، اور آپس میں گفتگو کی کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والد کو بہ نسبت ہمارے یوسف اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین سے زیادہ محبت ہے، حالانکہ ہم دس ہیں اور ان سے بڑے ہیں، گھر کے کام کاج سنبھالنے کی قوت رکھتے ہیں، اور یہ دونوں چھوٹے بچے ہیں جو کچھ کام نہیں کر سکتے، ہمارے والد کو اس کا خیال کرنا اور ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کھلی ہوئی بے انصافی کر رکھی ہے، اس لئے یا تو تم یوسف کو قتل کر ڈالو، یا پھر کسی دور زمین میں پھینک آؤ جہاں سے واپس نہ آسکے۔

اس آیت میں ان بھائیوں نے اپنے متعلق لفظ عُصْبَۃٌ استعمال کیا ہے، یہ لفظ عربی زبان میں پانچ سے لے کر دس تک کی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، اور اپنے والد کے بارے میں جو یہ کہا کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اس میں لفظ ضلال کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں، مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں ورنہ یہ خیال کرنے سے یہ سب کے سب کافر ہوجاتے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر اور نبی ہیں ان کی شان میں ایسا خیال قطعی کفر ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق خود قرآن کریم میں مذکور ہے، کہ بعد میں انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے والد سے دعاء مغفرت کی درخواست کی جس کو ان کے والد نے قبول کیا جس سے ظاہر یہ ہے کہ ان سب کی خطا معاف ہوئی، یہ سب اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ سب مسلمان ہوں، ورنہ کافر کے حق میں دعاء مغفرت جائز نہیں، اسی لئے ان بھائیوں کے انبیاء ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مسلمان ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ضلال اس جگہ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ بھائیوں کے حقوق میں برابری نہیں کرتے۔

تیسری آیت میں یہ بیان ہے کہ ان بھائیوں میں مشورہ ہوا، بعض نے یہ رائے دی کہ یوسف

کو قتل کر ڈالو، بعض نے کہا کہ کسی غیر آباد کنویں کی گہرائی میں ڈال دو، تا کہ یہ کانٹا درمیان سے نکل جائے اور تمہارے باپ کی پوری توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے، رہا یہ گناہ جو اس کے قتل یا کنویں میں ڈالنے سے ہوگا سو بعد میں توبہ کر کے تم نیک ہو سکتے ہو، آیت کے جملہ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ کے یہ معنی بھی بیان کیے گئے ہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف کے قتل کے بعد تمہارے حالات درست ہو جائیں گے، کیونکہ باپ کی توجہ کا یہ مرکز ختم ہو جائے گا، یا کہ قتل کے بعد باپ سے عذر معذرت کر کے تم پھر ویسے ہی ہو جاؤ گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے، کیونکہ انھوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا، ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ، باپ کی ایذا رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، پھر جھوٹی سازش وغیرہ، انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے۔

چوتھی آیت میں ہے کہ انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو کنویں کی گہرائی میں بس جگہ ڈال دو جہاں یہ زندہ رہے، اور راہ رو مسافر جب اس کنویں پر آئیں تو وہ اس کو اٹھا کر لے جائیں، اس طرح تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور اس کو لے کر تمہیں خود کسی دور مقام پر جانا بھی نہ پڑے گا، کوئی قافلہ آئے گا وہ خود اس کو اپنے ساتھ کسی دور مقام پر پہونچا دے گا۔

یہ رائے دینے والا ان کا سب سے بڑا بھائی یہودا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ روبیل سب سے بڑا تھا، اسی نے یہ رائے دی، اور یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کو روک لیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جا کر باپ کو کیا منھ دکھاؤں گا، اس لئے میں واپس کنعان نہیں جاتا۔

اس آیت میں لفظ غَيٰبَتِ الْجُبِّ فرمایا ہے، غیابہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کر دے، اسی لئے قبر کو بھی غیابہ کہا جاتا ہے، اور جُب ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس کی منڈھ بنی ہوئی نہ ہو۔

يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ، لفظ التقاط لقطہ سے بنا ہے، لقطہ اس گری پڑی چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلب مل جائے، غیر جاندار چیز ہو تو اس کو لقطہ اور جاندار کو فقہاء کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جبکہ وہ بچہ ہو، عاقل بالغ نہ ہو، قرطبی نے اسی لفظ سے استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچے تھے، نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی ان کے

بچہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے، کیونکہ بھیڑیئے کا کھا جانا بچوں ہی کے معاملہ میں متصور ہے، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔ (مظہری)

امام قرطبی نے اس جگہ لقطہ اور لقیط کے شرعی احکام کی تفصیل دی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ اس کے متعلق ایک اصولی بات یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی نظام میں عام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت، راستوں اور سڑکوں کی صفائی وغیرہ کو صرف حکومت کے محکموں کی ذمہ داری نہیں بنایا، بلکہ ہر شخص کو اس کا مکلف بنایا ہے، راستوں اور سڑکوں میں کھڑے ہو کر یا اپنا کوئی سامان ڈال کر چلنے والوں کے لئے تنگی پیدا کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، فرمایا کہ "جو شخص مسلمانوں کا راستہ تنگ کرے اس کا جہاد مقبول نہیں"، اسی طرح اگر راستہ میں کوئی ایسی چیز پڑی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ جانے کا خطرہ ہے جیسے کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے یا پتھر وغیرہ ان کو راستہ سے ہٹانا صرف میونسپل بورڈ کی ذمہ داری نہیں بنایا بلکہ ہر مسلمان کو ترغیبی انداز میں اس کا ذمہ دار بنایا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے لئے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی اصول پر کسی شخص کا گمشدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو چرائے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے، اور اعلان و تلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غریب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور ہر دو صورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اسی کو ملے گا، گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔

یہ ہیں خدمت عامہ اور امداد باہمی کے وہ اصول جن کی ذمہ داری اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر عائد کی گئی ہے، کاش مسلمان اپنے دین کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے لگیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جائیں، کہ حکومت کے بڑے بڑے محکمے کروڑوں روپیہ کے خرچ سے جو کام انجام نہیں دے سکتے، وہ اس آسانی کے ساتھ کس شان سے پورا ہو جاتا ہے۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ہے کہ ان بھائیوں نے والد کے سامنے درخواست ان لفظوں میں پیش کر دی کہ ابا جان، یہ کیا بات ہے کہ آپ کو یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں، حالانکہ ہم

اس کے پورے خیر خواہ، ورہمدرد ہیں، کل اس کو آپ ہمارے ساتھ (سیر و تفریح کے لئے) بھیجدیجئے کہ وہ بھی آزادی کے ساتھ کھائے پیئے اور کھیلے، اور ہم سب اس کی پوری حفاظت کریں گے۔

بھائیوں کی اس درخواست سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس سے پہلے بھی ایسی درخواست کر چکے تھے جس کو والد بزرگوار نے قبول نہ کیا تھا، اس لئے اس مرتبہ ذرا تاکید اور اصرار کے ساتھ والد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر و تفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر و تفریح کھیل کود جو جائز حدود کے اندر ہو مباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو (قرطبی وغیرہ)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہے کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑیا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی، اور یا اس وجہ سے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں، اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں، اچانک دس بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیئے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

جس کی تعبیر بعد میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ دس بھیڑیئے یہ دس بھائی تھے اور جس بھیڑیئے نے مدافعت کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا وہ بڑے بھائی یہوداہ تھے، اور زمین میں چھپ جانا کنوئیں کی گہرائی سے تعبیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا، مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی (قرطبی)

بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ کا یہ خوف و خطرہ عجیب ہے

ہم دس آدمیوں کی قوی جماعت اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے، اگر ہم سب کے ہوتے ہوئے اس کو بھیڑیا کھا جائے تو ہمارا تو وجود ہی بیکار ہو گیا اور پھر ہم سے کس کام کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کیونکہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی، دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جاتی کہ اگر اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے، اس لئے اجازت دیدی مگر بھائیوں سے مستحکم عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے، اور بڑے بھائی روبیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبرگیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مونڈھوں پر اٹھا لیا اور باری باری سب اٹھاتے رہے، کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو رخصت کرنے کے لئے باہر گئے۔

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا، یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے، مگر کم عمر تھے ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکار، وہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ و غضب کا سبب بنا۔

آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور صغر سنی اور اپنے والد ضعیف کے دل پر رحم کریں اور اس عہد کو یاد کریں جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ نے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو بھلا دیا، یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہونچا سکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے، خدا سے ڈرو اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہونچا دو، البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کرے، بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کر لو، اس لئے سن لو کہ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمہیں بھی

قتل کردیں گے، یہود نے دیکھا کہ تو بھائیوں کے مقابلہ میں تنہا کچھ نہیں کرسکتے تو کہا کہ اچھا اگر تم یہی طے کرچکے ہو کہ اس بچہ کو ضائع کردو تو میری بات سنو، یہاں قریب ہی ایک پرانا کنواں ہے جس میں بہت سے جھاڑ نکل آئے ہیں، سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں، تم اس کو کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کردیا تو تمہاری مراد حاصل ہے، اور تم اپنے ہاتھ سے اس کا خون بہانے سے بری رہے، اور اگر یہ زندہ رہا تو کوئی قافلہ شاید یہاں آئے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالے اور یہ نکل آئے تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچا دے گا، اس صورت میں بھی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اس بات پر سب بھائیوں کا اتفاق ہوگیا، جس کا بیان آیات مذکورہ میں سے تیسری آیت میں اس طرح آیا ہے، فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ، "یعنی جب یہ بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے، اور اس پر سب متفق ہوگئے کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اپنے بھائیوں کو ان کے اس کرتوت پر تنبیہ کروگے اور وہ کچھ نہ جانتے ہوں گے۔

یہاں لفظ وَاَوْحَيْنَآ، فَلَمَّا ذَهَبُوْا کی جزاء اور جواب ہے، حرف واؤ اس جگہ زائد ہے (قرطبی) مطلب یہ ہے کہ بھائیوں نے مل کر کنویں میں ڈالنے کا عزم کر ہی لیا، تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تسلّی کے لئے وحی بھیجدی جس میں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں سے ملاقات کی اور اس کی خوشخبری دی گئی ہے کہ اس وقت آپ ان بھائیوں سے مستغنی اور بالادست ہوں گے، جس کی وجہ سے ان کے اس ظلم وستم پر مواخذہ کریں گے، اور وہ اس سارے معاملہ سے بےخبر ہوں گے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ وحی ان کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ان کی تسلّی اور یہاں سے نجات کی خوشخبری دینے کے لئے آئی ہو، دوسرے یہ کہ کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو پیش آنے والے حالات و واقعات سے بذریعہ وحی باخبر کردیا، جس میں یہ بھی بتلا دیا کہ آپ اس ہلاکت سے سلامت رہیں گے، اور ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آپ کو ان بھائیوں پر سرزنش کرنے کا موقع ملے گا جب کہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں، کہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔

یہ وحی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر زمانۂ طفولیت میں نازل ہوئی، تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ وحیِ نبوت نہ تھی کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے، بلکہ یہ وحی ایسی ہی تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا، یوسف علیہ السلام پر وحیِ نبوت کا سلسلہ

مصر پہونچنے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا، جیسا کہ ارشاد ہے وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، اور ابن جریر، ابن ابی حاتم وغیرہ نے اس کو استثنائی طور پر وحی نبوت ہی قرار دیا ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن ہی میں نبوت عطا کی گئی۔ (مظہری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہونچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیجیں (قرطبی) یہی وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبرِ خدا نے جیل سے رہائی اور ملکِ مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے۔

اللہ جل شانہٗ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاجتمند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا تو ان کو بھی دینا مقصود ہو۔

امام قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ جب ان کو ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی منڈیر سے چمٹ گئے، بھائیوں نے ان کا کرتہ نکال کر اس سے ہاتھ باندھے، اس وقت پھر یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے رحم کی درخواست کی، مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھے سجدہ کرتے ہیں ان کو بلا وہی تیری مدد کریں گے، پھر ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکایا، جب نصف تک پہونچے، تو اس کی رسی کاٹ دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے یوسف کی حفاظت فرمائی، پانی میں گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ نہ آئی، اور قریب ہی ایک پتھر کی چٹان نکلی ہوئی نظر آئی، صحیح سالم اس پر بیٹھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا، انہوں نے چٹان پر بٹھا دیا۔

یوسف علیہ السلام تین روز اس کنویں میں رہے، ان کا بھائی یہودا دوسرے بھائیوں سے چھپ کر روزانہ ان کے لئے کھانا پانی لاتا اور ڈول کے ذریعہ ان تک پہنچا دیتا تھا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ، یعنی عشاء کے وقت یہ بھائی روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس پہونچے، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے پوچھا کیا حادثہ ہے؛ کیا تمہاری بکریوں کے گلہ پر کسی نے حملہ کیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟ تو بھائیوں نے کہا:-

يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ، "یعنی ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا اس درمیان میں یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، اور ہم کتنے ہی سچے ہوں آپکو ہمارا یقین تو آئے گا نہیں"

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ باہمی مسابقت (دوڑ) شریعت میں مشروع اور اچھی خصلت ہے جو جنگ وجہاد میں کام آتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس خود بھی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے اور گھوڑوں کی مسابقت کرانا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ دوڑ میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آگئے۔

آیت مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں، تیر اندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی باہمی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دیدینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہار جیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھہرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، آجکل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوئے اور قمار سے خالی نہیں اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔

پچھلی آیتوں میں مذکور تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس کی گفت وشنید کے بعد بالآخر ان کو ایک غیر آباد کنویں میں ڈال دیا اور والد کو آکر یہ بتلایا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا ہے، مذکور الصدر آیات میں اگلا قصہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیئے کے کھانے کا یقین دلائیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا، کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے جس سے بھیڑیئے کا کھانا ثابت ہوتا، انھوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کرتہ صحیح سالم دیکھ کر فرمایا میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتہ کہیں سے نہیں پھٹا۔

اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعلسازی کا راز فاش ہو گیا، اور فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ، یعنی "یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی ہے، اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں"۔

مسئلہ:۔ یعقوب علیہ السلام نے کرتہ صحیح سالم ہونے سے برادران یوسفؑ کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کیساتھ

حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے (قرطبی)

ماوردیؒ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ خون آلود کرکے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا، اس میں بھی ان کا کرتہ ہی معجزہ کا مظہر ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ: بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اس وقت کہی تھی کہ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا، یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے، یہی بات اس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام میں پکڑ لئے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ، یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی دوسری صحیح نہیں تھی، کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی بتقاضائے بشریت ہوسکتی ہے، گرچہ بعد میں ان کو بذریعہ وحی اس غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا۔

نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہوسکتی ہے، اس لئے ہر صاحب رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ، سیارہ کے معنی قافلہ، وارد سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ مہیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اِدْلَاء کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سرزمین پر آنکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مصر جا رہا تھا، راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا، اور پانی لانے والوں کو کنویں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ رستہ بھول کر یہاں پہنچے، اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن رازِ کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں۔ یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو رستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے، اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے، یہی حال ہر

ان تمام حالات و واقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت و اتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلۂ تکوین میں کوئی بخت و اتفاق نہیں، حق سبحانہ و تعالیٰ جس کی شان فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے مخفی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کردیتے ہیں کہ ظاہری واقعات سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا، تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہرحال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن دُعبر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہونچا، ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ کیا، اس ڈول کی رسی پکڑلی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آگیا جس کی آئندہ ہونے والی عظمت شان سے بھی قطع نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن و جمال اور معنوی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور ہونہار بچے کو دیکھ کر پکار اٹھا، يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ، ارے بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا ہے، صحیح مسلم میں شب معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً، یعنی چھپالیا اس کو ایک مالِ تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہے کہ شروع میں تو مالک بن دُعبر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکار اٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کرکے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کرکے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہوگیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہوجائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقتِ واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مالِ تجارت بنالیا، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہونچانے کے لئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آکر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا، یہ سب بھائی جمع ہوکر وہاں پہونچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آگیا ہے، تم نے بہت برا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن دُعبر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائیں گے، اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔

تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ برادرانِ یوسف نے خود ہی یوسف کو ایک مالِ تجارت بنالیا اور فروخت کردیا، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کی سب کارگذاریاں معلوم تھیں

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کو سب معلوم تھا کہ برادرانِ یوسف کیا کریں گے، اور ان سے خریدنے والا قافلہ کیا کرے گا، اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتے تھے کہ ان سب کے منصوبوں کو خاک میں ملادیں، لیکن تکوینی حکمتوں کے تحت اللہ تعالیٰ نے ان منصوبوں کو چلنے دیا۔

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپ کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم و قدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب کو بدل ڈالیں، لیکن تقاضائے حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے، اور انجام کار آپ کو ان پر غالب کرکے حق کو غالب کیا جائے گا، جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ، لفظ شراء عربی زبان میں خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، ضمیر اگر برادرانِ یوسف کی طرف عائد کی جائے تو فروخت کرنے کے معنی ہوں گے، اور قافلہ والوں کی طرف عائد کی جائے تو خریدنے کے معنی ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ بیچ ڈالا برادرانِ یوسف نے یا خرید لیا قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت تھوڑی قیمت یعنی گنتی کے چند دراہم کے معاوضہ میں۔

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجار کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراہم کے ساتھ معدودہ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ دراہم کی مقدار چالیس سے کم تھی، ابن کثیر نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ لکھا ہے کہ بیس درہم کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دو دو درہم آپس میں تقسیم کرلئے، تعداد دراہم میں بائیس اور چالیس درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں (ابن کثیر)

وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ، زاہدین، زاہد کی جمع ہے، جو زہد سے مشتق ہے، زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں، محاورات میں دنیا کی مال و دولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے، ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کرلیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ

اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے رکھ اس کو شاید

أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي

ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اس کو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو

الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ

اس ملک میں، اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا اور اللہ زور آور رہتا ہے

عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾ وَلَمَّا بَلَغَ

اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اور جب پہنچ گیا

أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٢﴾

اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ

اور پھسلایا اس کو اس عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے اور بند کر دیے دروازے

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ

اور بولی شتابی کر، کہا خدا کی پناہ وہ عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾

بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

(قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے، وہاں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا) اور جس شخص نے مصر میں ان کو خریدا تھا (یعنی عزیز) اس نے (ان کو اپنے گھر لا کر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور) اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو خاطر سے رکھنا کیا عجب ہے کہ (بڑا ہو کر) ہمارے کام آوے، یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں (مشہور یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا کہ ان کے اولاد نہ تھی) اور ہم نے (جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت سے اس اندھیرے کنوئیں سے نجات دی) اسی طرح یوسف کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہے، اور یہ نجات دینا اس غرض سے بھی تھا) تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں (مطلب یہ تھا کہ نجات دینے کا مقصد

اُن کو ظاہری اور باطنی دولت سے مالا مال کرنا تھا) اور اللہ تعالیٰ اپنے (چاہے ہوئے) کام پر غالب (اور قادر) ہے (جو چاہے کردے)، لیکن اکثر آدمی جانتے نہیں (کیونکہ اہلِ ایمان و یقین کم ہی ہوتے ہیں، یہ مضمون قصہ کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی موجودہ حالت یعنی غلام بن کر رہنا بظاہر کوئی اچھی حالت نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ حالت چندروزہ بطور ذریعہ کے ہے، اصل مقصد ان کو اونچا مقام عطا فرمانا ہے اور اس کا ذریعہ عزیزِ مصر کو اور اس کے گھر میں پرورش پانے کو بنا دیا گیا، کیونکہ امراء کے گھر میں پرورش پانے سے سلیقہ و تجربہ بڑھتا ہے، امورِ سلطنت کا علم ہوتا ہے، اسی کا بقیہ آگے یہ ہے) اور جب وہ اپنی جوانی (یعنی سنِ بلوغ یا کمالِ شباب) کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا (مراد اس سے علومِ نبوت کا عطا کرنا ہے، اور کنوئیں میں ڈالنے کے وقت جو اُن کی طرف وحی بھیجنے کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وحی نبوت نہیں تھی، بلکہ ایسی وحی تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی بھیجی گئی تھی) اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں (جو قصہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگانے کا آگے بیان ہوگا، اس سے پہلے ان جملوں میں بتلا دیا گیا ہے کہ وہ سراسر تہمت اور جھوٹ ہوگا، کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و حکمت عطا ہو اس سے ایسے کام صادر ہو ہی نہیں سکتے، آگے اس تہمت کے قصہ کا بیان ہے کہ یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر کے گھر میں آرام و راحت کے ساتھ رہنے لگے) اور اسی درمیان میں یہ ابتلاء پیش آیا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ (اُن پر فریفتہ ہوگئی اور) اُن سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی اور (گھر کے) سارے دروازے بند کر دیئے اور (ان سے) کہنے لگی آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ اول تو یہ خود بڑا بھاری گناہ ہے) اللہ بچائے (دوسرے) وہ یعنی تیرا شوہر میرا مُربّی (و محسن) ہے کہ مجھ کو کیسی اچھی طرح رکھا (تو کیا میں اس کے ناموس میں خیانت درازی کروں، ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی (بلکہ اکثر تو دنیا ہی میں ذلیل اور پریشان ہوتے ہیں ورنہ آخرت میں تو عذاب یقینی ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی سرگزشت بیان ہوچکی ہے کہ قافلہ والوں نے جب اُن کو کنوئیں سے نکال لیا تو برادرانِ یوسف نے ان کو اپنا غلام گریختہ بتاکر تھوڑے سے درہموں میں ان کا سودا کرلیا، اوّل تو اس لئے کہ ان کو اس بزرگ ہستی کی قدر معلوم

نہ تھی، دوسرے اس لئے کہ ان کا اصل مقصد ان سے پیسہ کمانا نہیں بلکہ باپ سے دور کر دینا تھا، اس لئے صرف فروخت کر دینے پر بس نہیں کی، کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں قافلہ والے ان کو یہیں نہ چھوڑ جائیں اور یہ پھر کسی طرح والد کے پاس پہونچ کر ہماری سازش کا راز فاش کر دے، اس لئے امام تفسیر مجاہدؒ کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کے لئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دور تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو بھاگ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باندھ کر رکھو، اس دُرِّ شہوار کی قدر و قیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے (تفسیر ابن کثیر)

آیات مذکورہ میں اس کے بعد کا قصہ اس طرح مذکور ہے، اور قرآنی ایجاز کے ساتھ قصہ کے جتنے اجزاء خود بخود سمجھ میں آسکتے ہیں اُن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مثلاً قافلہ کا مختلف منزلوں سے گذر کر مصر تک پہونچنا، اور وہاں جا کر یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا وغیرہ، سب کو چھوڑ کر یہاں سے بیان ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ "یعنی کہا اس شخص نے جس نے یوسف علیہ السلام کو مصر میں خریدا اپنی بیوی سے کہ یوسفؑ کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کرو"

مطلب یہ ہے کہ قافلہ والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر قرطبی میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا، یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کی برابر سونا اور اسی کی برابر مُشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدر کی تھی اس نے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

جیسا کہ پہلے ارشاد قرآنی سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ رب العزت کی بنائی ہوئی مستحکم تدبیر کے اجزاء ہیں، مصر میں یوسفؑ کی خریداری کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے عزت والے شخص کو مقدر فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے، اور بادشاہ مصر اس زمانہ میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریان بن اُسید تھا، (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا (مظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتلایا گیا ہے، عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دنیا میں تین آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے، اول عزیز مصر جس نے ان کے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کرکے بیوی کو یہ ہدایت دی، دوسرے شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ، "یعنی ابا جان! ان کو ملازم رکھ لیجئے، اس لئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"، تیسرے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں جنھوں نے اپنے بعد فاروق اعظمؓ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا (ابن کثیر)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ، یعنی اس طرح حکومت دیدی ہم نے یوسف کو زمین کی، اس میں آئندہ آنے والے واقعہ کی بشارت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جو عزیز مصر کے گھر میں اس وقت بحیثیت غلام داخل ہوتے ہیں عنقریب یہ ملک مصر کے سب سے بڑے آدمی ہوں گے، اور حکومت کا اقتدار اُن کو ملے گا۔

وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ یہاں شروع میں حرف واؤ کو اگر عطف کیلئے مانا جائے تو ایک جملہ اس معنی کا محذوف مانا جائے گا، کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین کی حکومت اس لئے دی کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف کے ذریعہ امن و امان قائم کریں، اور باشندگانِ ملک کی راحت کا انتظام کریں، اور اس لئے کہ ہم ان کو باتوں کا ٹھکانے لگانا سکھادیں، باتوں کا ٹھکانے لگانا ایک ایسا عام مفہوم ہے جس میں وحیِ الٰہی کا سمجھنا اور اس کو بروئے کار لانا بھی داخل ہے، اور تمام ضروری علوم کا حاصل ہونا بھی اور خوابوں کی تعبیر صحیح بھی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ غالب اور قادر ہے اپنے کام پر جو اس کا ارادہ ہوتا ہے تمام عالم کے اسباب ظاہرہ اس کے مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسا ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا کے سارے اسباب اس کے لئے تیار کر دیتے ہیں، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور اسبابِ ظاہرہ ہی کو سب کچھ سمجھ کر انہی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مسبب الاسباب اور قادرِ مطلق کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، "یعنی جب پہونچ گئے یوسف علیہ السلام اپنی پوری قوت اور جوانی پر تو دیدی ہم نے ان کو حکمت اور علم"،

یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوئی، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی، ضحاکؒ نے بیس سال اور حسن بصریؒ

نے چالیس سال بتلائی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوّت ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوّت مصر پہونچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی ہے، اور کنوئیں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحیِ نبوّت نہ تھی، بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر نبیا کو بھی بھیجی جاسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریمؑ کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ، "اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو"، مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہونچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی، خدا ترسی اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ تھا، یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ، "یعنی جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام رہتے تھے وہ اُن پر مفتون ہوگئی اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اُن کو پھسلانے لگی، اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیئے، اور اُن سے کہنے لگی کہ جلد آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں"،

پہلی آیت میں معلوم ہوچکا ہے کہ یہ عورت عزیزِ مصر کی بیوی تھی، مگر اس جگہ قرآن کریم نے زوجۂ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا کے الفاظ اختیار کئے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے گھر میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے، اس کے کہنے کو نظرانداز کرنا آسان نہ تھا۔

اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے	گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ خود اللہ سے پناہ مانگنا ہے

خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ، محض اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و موعظت کے ساتھ خود زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا، کہ وہ بھی خدا سے ڈرے اور اپنے ارادے سے باز آجائے، فرمایا:

إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ، "وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی"،

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیزِ مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا،

میرا محسن ہے میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے
اس کے ضمن میں خود زلیخا کو بھی یہ سبق دیدیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہچانتا ہوں
تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچاننا چاہئے۔

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو رب فرمایا، حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک او مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی لئے شریعت محمدیہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے، اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے، مگر یہ خصوصیت شریعت محمدیہ کی ہے جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے، مگر اسباب و ذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی اسی وجہ سے پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی مگر شریعت محمدیہ چونکہ قیامت تک کے لئے آئی ہے، اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کے لئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہو سکیں، بہرحال یوسف علیہ السلام کا **إِنَّهُ رَبِّي فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔**

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنَّہٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور یہ کہ ٹھکانا بھی درحقیقت اسی نے دیا اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے **والوں کو فلاح نہیں۔**

بعض مفسرین سدی اور ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس خلوت میں زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے لئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کی، کہا کہ تمہارے بال کس قدر حسین ہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بال موت کے بعد سب سے پہلے میرے جسم سے علیحدہ ہو جائیں گے، پھر کہا تمہاری آنکھیں کتنی حسین ہیں تو فرمایا موت کے بعد یہ سب پانی ہو کر میرے چہرے پر بہہ جائیں گی، پھر کہا تمہارا چہرہ کتنا حسین ہے، تو فرمایا کہ یہ سب مٹی کی غذا ہے، اللہ تعالیٰ نے فکر آخرت آپ پر اس طرح مسلط کر دی کہ نوجوانی کے عالم میں دنیا کی ساری لذتیں ان کے سامنے گرد ہو گئیں، صحیح ہے کہ فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان **کو ہر جگہ ہر شر سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔**

[illegible]

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی یوں ہی ہوا

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال (عزم کے درجہ میں) جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال (امر طبعی کے درجہ میں) ہو چلا تھا، جو کہ اختیار سے باہر ہے جیسے گرمی کے روزہ میں پانی کی طرف میلان طبعی ہوتا ہے، گو روزہ توڑنے کا وسوسہ تک بھی نہیں آتا، البتہ اگر اپنے رب کی دلیل کو (یعنی اس فعل کے گناہ ہونے کی دلیل کو جو کہ حکم شرعی ہے) انھوں نے نہ دیکھا ہوتا (یعنی اُن کو شریعت کا علم مع قوتِ عملیہ کے حاصل نہ ہوتا) تو زیادہ خیال ہو جانا عجب نہ تھا (کیونکہ اس کے دواعی اور اسباب سب قوی جمع تھے مگر) ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں (یعنی ارادہ سے بھی بچا لیا اور فعل سے بھی، کیونکہ) وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عظیم ابتلاء و امتحان مذکور تھا کہ عزیز مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی، اور اپنی طرف راغب کرنے اور مبتلا کرنے کے سارے ہی اسباب جمع کر دیئے، مگر رب العزت نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلاء میں ثابت قدم رکھا، اس کی مزید تفصیل اس آیت میں ہے کہ زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی ہی، یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر اختیاری میلان پیدا ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے عین اُس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا، اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے۔

اس آیت میں لفظ ہَمّ بمعنی خیال زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا، اور یہ معلوم ہے کہ زلیخا کا ہَمّ یعنی خیال گناہ

کا تھا، اس سے یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا، اور یہ باجماعِ امت شانِ نبوت و رسالت کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے نہ سہو و خطاء کی راہ سے ہو سکتا ہے، البتہ صغیرہ گناہ سہو و خطاء کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے (مسامرہ) اور یہ مسئلہ عصمت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا، اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

اس لئے اجمالی طور پر یہ تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ہَمّ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا، پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے، ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی درج فرما دیتے ہیں اور دوسری صورت کہ محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آ جائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے (قرطبی) اور صحیحین میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیک عمل کر لے تو دس نیکیاں لکھو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کر ہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ہَمّ کا ان دونوں معنی کے لئے استعمال عرب کے محاورات اور

اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ہَمّ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا، مگر ان دونوں کے ہَمّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں، قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے، کیونکہ دونوں کا ہَمّ و خیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ وَلَقَدْ هَمَّا کہہ دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا، اس کو چھوڑ کر دونوں کے ہَمّ و خیال کا بیان الگ الگ فرمایا هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا، اور زلیخا کے ہَمّ و خیال کے ساتھ تاکید کے لفظ لَقَدْ کا اضافہ کیا، یوسف علیہ السلام کے ہَمّ کے ساتھ لام اور قَدْ کی تاکید نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے یہی جتلانا ہے کہ زلیخا کا ہَمّ کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا دوسری طرح کا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ابتلا پیش آیا تو فرشتوں نے اللہ جل شانہ سے عرض کی کہ آپ کا یہ مخلص بندہ گناہ کے خیال میں ہے، حالانکہ وہ اس کے وبال کو خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انتظار کرو، اگر وہ یہ گناہ کرے تو جیسا کیا ہے وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دو، اور اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اس کے نامۂ اعمال میں نیکی درج کرو، کیونکہ اس نے صرف میرے خوف سے اپنی خواہش کو چھوڑا ہے، (جو بہت بڑی نیکی ہے) (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا، جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ جو بعد میں مذکور ہے وہ اصل میں مقدم ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی حجت و برہان کو نہ دیکھ لیتے، لیکن برہان رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ہَمّ اور خیال سے بھی بچ گئے، مضمون یہ بھی درست ہے مگر بعض حضرات نے اس تقدیم و تاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے بھی پہلی ہی تفسیر راجح ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ و طہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے، کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ اس کی جزا محذوف ہے، اور معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھتے تو اس خیال میں مبتلا رہتے مگر

برہان رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر اختیاری خیال اور وسوسہ بھی قلب سے نکل گیا۔

قرآن کریم نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ وہ برہان ربی جو یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی کیا چیز تھی؟ اسی لئے اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ مجاہدؒ سعید بن جبیرؒ محمد بن سیرینؒ حسن بصریؒ وغیرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت اس طرح ان کے سامنے کردی کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت ان کے سامنے کردی گئی، بعض نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نظر چھت کی طرف اٹھی تو اس میں یہ آیت قرآن لکھی ہوئی دیکھی، وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا، یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ کیونکہ وہ بڑی بے حیائی (اور قہر خداوندی کا سبب) اور (معاشرہ کے لئے) بہت برا راستہ ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ زلیخا کے مکان میں ایک بت تھا اس نے اس بت پر پردہ ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے، اس کے سامنے گناہ کرنے کی جرأت نہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیاء کا مستحق ہے، اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفت الٰہیہ خود ہی برہان رب تھی۔

امام تفسیر ابن جریرؒ نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہل تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے، وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلادی ہے صرف اسی پر اکتفا کیا جائے، یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے وسوسہ ان کے دل سے جاتا رہا، اس چیز کی تعیین میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں لیکن قطعی طور پر کسی کو متعین نہیں کیا جا سکتا، (ابن کثیر)

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ

یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اس لئے دکھلائی کہ ان سے برائی اور بے حیائی کو ہٹادیں، برائی سے مراد صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے کبیرہ گناہ ہے (مظہری)

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ برائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹادینے کا ذکر فرمایا ہے، یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا جس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شان نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے، مگر برائی اور بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا، قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوئے، اور ان کے

دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہ تھا ورنہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا دیا نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹا دیا۔

کیونکہ یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں، لفظ مُخْلَصِيْنَ اس جگہ بفتح لام مخلَص کی جمع ہے، جس کے معنی منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں، جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کار رسالت اور اصلاح خلق کے لئے انتخاب فرمایا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے، کہ وہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہوسکیں، خود شیطان نے بھی اس بات کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا، اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ "یعنی قسم ہے تیری عزت و قوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کروں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرما لیا ہے۔

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ بکسر لام مُخْلِصِيْنَ بھی آیا ہے، اور مخلِص کے معنی یہ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و فرمانبرداری اخلاص کے ساتھ کرے، اس میں کسی دنیاوی اور نفسانی غرض شہرت و جاہ وغیرہ کا دخل نہ ہو، اس صورت میں مراد اس آیت کی یہ ہوگی کہ جو شخص بھی اپنے عمل اور عبادت میں مخلص ہو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے میں اس کی امداد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو لفظ سُوْء اور فَحْشَاء کے استعمال فرمائے ہیں، سوء کے لفظی معنی برائی کے ہیں، اور مراد اس سے صغیرہ گناہ ہے، اور فحشاء کے معنی بے حیائی کے ہیں، اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف قرآن میں جس ہمّ یعنی خیال کو منسوب کیا ہے وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ کا ہمّ تھا جو نہ کبیرہ گناہ میں داخل ہے نہ صغیرہ میں، بلکہ معاف ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا

اور دونوں دوڑے دروازہ کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے

لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ

دروازہ کے پاس، بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی، مگر یہی کہ

يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ

قید میں ڈالا جاوے یا عذاب دردناک، یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو اور

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے، اگر ہے اس کا کرتہ پھٹا آگے سے تو عورت سچی ہے اور

وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ

وہ ہے جھوٹا، اور اگر ہے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے

وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ

اور وہ سچا ہے، پھر جب دیکھا عزیز نے کرتہ اس کا پھٹا ہوا پیچھے سے کہا

اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ

بیشک یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا، البتہ تمہارا فریب بڑا ہے، یوسف جانے دے اس

عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾

ذکر کو، اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ، بیشک تو ہی گنہگار تھی۔

ع ۳ / ۹ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

(اور جب اس عورت نے پھر بھی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے چلی اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور دوڑنے میں جو اُن کو پکڑنا چاہا تو اس عورت نے ان کا کُرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا (یعنی اس نے کُرتہ پکڑ کر کھینچا تھا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کُرتہ پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے اور عورت بھی ساتھ تھی تو) دونوں نے (اتفاقی) اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس (کھڑا) پایا، عورت (خاوند کو دیکھ کر سٹ پٹائی اور فوراً بات بنا کر) بولی کہ جو شخص تیری بی بی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا بجز اس کے اور کیا (ہو سکتی) ہے کہ وہ جیل خانے بھیجا جاوے یا اور کوئی دردناک سزا ہو (جیسے ضرب جسمانی) یوسف (علیہ السلام) نے کہا (کہ یہ جو میری طرف الزام کا اشارہ کرتی ہے بالکل جھوٹی ہے، بلکہ معاملہ برعکس ہی) یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھ کو پھسلاتی تھی اور (اس موقع پر) اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیر خوار بچہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے معجزے

سے بول پڑا اور آپ کی براءت پر) شہادت دی (اس بچہ کا بولنا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا، اس پر دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اس شیر خوار بچہ نے ایک معقول علامت بتا کر عاقلانہ فیصلہ بھی کیا اور کہا) کہ ان کا کرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں، سو جب (عزیز نے) اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا (عورت سے) کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے، بیشک تمہاری چالاکیاں بھی غضب کی ہوتی ہیں (پھر یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا) اے یوسف اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا یا خیال مت کرو) اور (عورت سے کہا کہ اے عورت تو یوسف سے) اپنے قصور کی معافی مانگ بیشک سرتاسر تو ہی قصوروار ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مشغول تھی، اور یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے مگر فطری اور غیر اختیاری خیال کی کشمکش بھی تھی، تو حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی اعانت کیلئے بطور معجزہ کے کوئی ایسی چیز سامنے کر دی جس نے دل سے وہ غیر اختیاری خیال بھی نکال ڈالا خواہ وہ چیز اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت ہو یا وحی الٰہی کی کوئی آیت۔

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برہانِ رَبّ کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑے عزیز کی بیوی اُن کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہ رُکے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے، اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، انکی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کے لئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ بُرے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے، یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انہوں نے

حقیقت کا اظہار کیا کہ ہی رَاوَدتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ یعنی یہی مجھے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معاملہ بڑا نازک اور عزیز مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سچا سمجھے، شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا، مگر اللہ جل شانہ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو معصوم و محفوظ رکھتے ہیں اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فرما دیتے ہیں، اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادۃً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے، مگر بطور معجزہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی براءت کا اظہار فرما دیتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن (اور راجح قول کے مطابق چالیس) کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی، اور قدرت خداوندی کا ایک خاص منظر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جُریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی براءت کے لئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما دی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی، یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا کسی کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا، اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے، جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے، اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے، میدان حشر میں حساب کتاب کے وقت انسان اپنی دنیا کی قدیم عادت کی بناء پر جب اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کرے گا تو اسی کے ہاتھ پاؤں اور کھال اور در و دیوار کو اس کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا، وہ اس کی ایک ایک حرکت کو محشر کے عظیم الشان مجمع کے سامنے کھول کر رکھ دے گا، اس وقت انسان کو پتہ لگے گا کہ ہاتھ پاؤں اور گھر کے در و دیوار اور حفاظتی انتظامات میں سے کوئی بھی میرا نہ تھا، بلکہ یہ سب رب العزت کے خفیہ کارندے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا بچہ جو گہوارہ میں بظاہر اس دنیا کی ہر چیز سے غافل اور بے خبر پڑا تھا وہ

یوسف علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر عین اس وقت بول اٹھا جب کہ عزیز مصر اس واقعہ سے **کشمکش میں مبتلا تھا۔**

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں براءت کی بڑی شہادت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچے کی زبان پر ایک حکیمانہ بات کہلوائی کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں، اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچے کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی، اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کرتہ کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی براءت ظاہری علامات سے بھی ظاہر ہوگئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرمادی، یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمد نے اپنے مسند میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے، یہ چاروں وہی ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، (مظہری) اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں مگر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں:۔

اوّل: آیت وَاسْتَبَقَا الْبَابَ سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہئے، جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ: یہ کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے اور تاریخی روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی

ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد و اعانت کو بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرما دیتے ہیں، مولانا رومی رح نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ✿ خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکرست ✿ نامرادی نے مراد دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز بنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر جمعہ کے لئے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہونچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا، اور وہ نماز جمعہ ادا کر لیتے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا جس پر ہزاروں کرامتیں قربان ہیں کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر جمعہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا، یہی وہ استقامت ہے، جس کو اکابر صوفیاء نے کرامت سے بالاتر فرمایا ہے۔

تیسرا مسئلہ :۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی جائے تو اپنی صفائی پیش کرنا سنتِ انبیاء ہے، یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔

چوتھا مسئلہ :۔ اس میں شاہد کا ہے، یہ لفظ جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے، تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزاع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جس کو شاہد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس نے کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک صورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو اصطلاحی صورت پر شاہد نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحات سب بعد کے علماء و فقہاء نے افہام و تفہیم کے لئے اختیار کر لی ہیں، قرآن حکیم کی نہ یہ اصطلاحیں ہیں نہ وہ ان کا پابند ہے، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہو جاتا ہے، اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس بچہ کے

بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہوگیا، کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے لئے شاہد تھی اور پھر اس نے جو عدمات بتدئیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام ہی کی برارت کا ثبوت ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچ نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کر دیا تھا، اور زلیخا کے سچے ہونے کو ایک ایسی صورت میں بھی فرضی طور پر تسلیم کر لیا تھا، جس میں ان کا سچا ہونا یقینی نہ تھا، بلکہ دوسرا بھی احتمال موجود تھا، کیونکہ کرتے کا سامنے سے پھٹنا دونوں صورتوں میں ممکن ہے، اور یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے کو صرف ایسی صورت میں تسلیم کیا تھا، جس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن انجام کار نتیجہ اس حکمت عملی کا یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام کا بری ہونا ثابت ہو۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصومات کے فیصلوں میں قرائن اور علامات سے کام لیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی، اس معاملہ میں اتنی بات پر تو سب فقہار کا اتفاق ہے کہ معاملات کی حقیقت پہچاننے میں علامات اور قرائن سے ضرور کام لیا جائے جیسا کہ یہاں کیا گیا، لیکن محض علامات و قرائن کو کافی ثبوت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، واقعہ یوسف علیہ السلام میں بھی درحقیقت برارت کا ثبوت تو اس بچہ کی معجزانہ انداز سے گویائی ہے، علامات و قرائن جن کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس معاملہ کی تائید ہوگئی۔

بہرحال یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت والزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو خلاف عادت گویائی دے کر اس کی زبان سے حکیمانہ فیصلہ صادر فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو، اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو یہ اس کی صاف علامت ہے کہ وہ بھاگ رہے تھے، اور زلیخا پکڑ رہی تھی، یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں۔

مذکورہ آیات میں سے آخری دو آیتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ عزیز مصر بچہ کے اس طرح بولنے ہی سے یہ سمجھ چکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی برارت ظاہر کرنے کے لئے یہ مافوق العادہ صورت پیش آئی ہے، پھر اس کے کہنے کے مطابق جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ بھی پیچھے سے ہی پھٹا ہے تو یقین ہوگیا کہ قصور زلیخا کا ہے، یوسف علیہ السلام بری ہیں، تو اس نے پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا اِنَّہٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ، یعنی یہ سب تمہارا مکر وحیلہ ہے،

کہ اپنی خطا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر و حیلہ بہت بڑا ہے، کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہراں کا نرم و نازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آجاتا ہے، مگر عقل و دیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (مظہری)

تفسیر قرطبی میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا کید اور مکر شیطان کے کید و مکر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کے کید کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا اور عورتوں کے کید کے متعلق یہ فرمایا کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ یعنی تمہارا کید بہت بڑا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سب عورتیں نہیں بلکہ وہی ہیں جو اس طرح کے مکر و حیلہ میں مبتلا ہوں، عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ، یعنی خطا سراسر تمہاری ہے، تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے، کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

فائدہ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بے حیائی ثابت ہوجانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون و اطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے پھر رسوائی سے بچانے کا فوق العادت انتظام فرمایا، اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا، ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے ورنہ زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے، اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہوجاتا تو ممکن ہو کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہوجاتی، یہ قدرت حق کے کرشمے ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

بعد کی آیتوں میں اور واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو پچھلے قصہ سے ہی وابستہ ہے،

وہ یہ کہ یہ واقعہ چھپانے کے باوجود درباری لوگوں کی عورتوں میں پھیل گیا، ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو لعن طعن کرنا شروع کیا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ پانچ عورتیں عزیز مصر کے قریبی افسروں کی بیویاں تھیں۔ (قرطبی، مظہری)

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں کہ دیکھو کیسی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اتنے بڑے مرتبہ پر ہوتے ہوئے اپنے نوجوان غلام پر فریفتہ ہو کر اس سے اپنی مطلب آری چاہتی ہے، ہم تو اس کو بڑی گمراہی پر سمجھتے ہیں، آیت میں لفظ فتاھا فرمایا ہے، فتیٰ کے معنی نوجوان کے ہیں، عرف میں مملوک غلام جب چھوٹا ہو تو اس کو غلام کہتے ہیں، جوان ہو تو لڑکے کو فتیٰ اور لڑکی کو فتاۃ کہا جاتا ہے، اس میں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کا غلام یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ شوہر کی چیز کو بھی عادۃً بیوی کی چیز کہا جاتا ہے، اور یا اس لئے کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر سے بطور ہبہ اور تحفہ لے لیا تھا (قرطبی)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اس کے جی

نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا

کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر ، پھر جب

سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ

سنا اس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور

اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا

دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری اور بولی یوسف نکل آ ان کے سامنے، پس جب

رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا

دیکھا ان کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں حاشا للہ! نہیں یہ شخص

بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ

آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ ، بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے

لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ

مجھ کو اس کے واسطے، اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھام رکھا اور بیشک اگر

يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ

نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑے گا اور ہوگا بے عزت ، یوسف بولا اے رب

السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ

مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں، اور اگر تو دفع نہ کرے گا مجھ سے

كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ

ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل ، سو قبول کر لی

لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب، البتہ وہی ہے سننے والا خبردار ۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

پھر یوں سوجھا ان لوگوں کو ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت ۔

ع ۴ ۶ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بی بی اپنے غلام کو اس سے اپنا ناجائز مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے (کیسی کمینہ حرکت ہے کہ غلام پر گرتی ہے) اس غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ پکڑ گیا ہے۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بدگوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ ان کو بلا بھیجا (کہ تمہاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکیہ لگایا اور (جب وہ آئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے) ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دیدیا (جو ظاہر میں تو پھل تراشنے کا بہانہ تھا، اور اصل مقصد وہ تھا جو آگے آتا ہے کہ یہ حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھوں کو زخمی کرلیں گی) اور (یہ سب سامان درست کر کے یوسف علیہ السلام کو جو کسی دوسرے مکان میں تھے) کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آجاؤ (یوسف علیہ السلام یہ سمجھ کر کہ کوئی صحیح غرض ہوگی باہر آگئے) سو عورتوں نے جب انکو دیکھا تو (ان کے جمال سے) حیران رہ گئیں اور (اس حیرت میں) اپنے ہاتھ کاٹ لئے (چاقو سے پھل تراش رہی تھیں، یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھائی کہ چاقو ہاتھ پر چل گیا) اور کہنے لگیں حاش للہ! یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص

یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو برا بھلا کہتی تھیں (کہ اپنے غلام کو چاہتی ہے) اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور (پھر یوسف علیہ السلام کے دھمکانے اور سنانے کو کہا کہ) اگر آئندہ میرا کہنا نہ مانے گا (جیسا کہ اب تک نہیں مانا) تو بیشک جیل خانہ بھیج دیا جاوے گا اور بے عزت بھی ہوگا (وہ عورتیں بھی یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ تم کو اپنی محسن عورت سے ایسی اعتنائی مناسب نہیں جو یہ کہے اس کو ماننا چاہئے یوسف (علیہ السلام) نے (یہ باتیں سنی کہ یہ تو سب کی سب اسی کی موافقت کرنے لگیں تو حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے رب جس (ناجائز) کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو جیل میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا، سو ان کی دعا ان کے رب نے قبول کی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا (اور ان کے احوال کا) خوب جاننے والا ہے (پھر یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی) مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد (جن سے خود تو اس کا پورا یقین ہو گیا، مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو قطع کرنے کی غرض سے) ان لوگوں کو (یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت تک قید میں رکھیں۔

معارف ومسائل

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ، یعنی جب زلیخا نے ان عورتوں کے مکر کا حال سنا تو ان کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا۔

یہاں ان عورتوں کے تذکرہ کرنے کو زلیخا نے مکر کہا ہے، حالانکہ بظاہر انھوں نے کوئی مکر نہیں کیا تھا، مگر چونکہ خفیہ خفیہ اس کی بدگوئی کرتی تھیں، اس لئے اس کو مکر سے تعبیر کیا۔

وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً، یعنی ان کے لئے مسند تکیوں سے مجلس آراستہ کی،

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا، یعنی جب یہ عورتیں آگئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے ہر ایک کو ایک ایک تیز چاقو بھی دیدیا جس کا ظاہری مقصد تو پھل تراشنا تھا، مگر دل میں وہ بات پوشیدہ تھی جو آگے آتی ہے، کہ یہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جائیں گی اور چاقو سے اپنے ہاتھ زخمی کرلیں گی۔

وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ، یعنی یہ سب سامان درست کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام سے جو کسی دوسرے مکان میں تھے زلیخا نے کہا کہ ذرا باہر آجاؤ، یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کی غرض فاسد معلوم نہ تھی اس لئے باہر اس مجلس میں تشریف لے آئے۔

فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ، یعنی ان عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں، اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے، یعنی پھل تراشتے وقت جب یہ حیرت انگیز واقعہ سامنے آیا تو چاقو ہاتھ پر چل گیا، جیسا کہ دوسری طرف خیال بٹ جانے سے اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے اور کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، مطلب یہ تھا کہ ایسا نورانی تو فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِنَ الصَّاغِرِينَ، وہ عورت بولی کہ دیکھو وہ شخص یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے برا بھلا کہتی تھیں، اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، مگر یہ پاک صاف رہا، اور آئندہ یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو بیشک جیل خانے بھیجا جائے گا، اور بے عزت بھی ہوگا۔

اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ میرا راز ان عورتوں پر فاش تو ہو ہی چکا ہے، اس لئے ان کے سامنے ہی یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے لگی، بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس وقت یہ سب عورتیں بھی یوسف علیہ السلام کو کہنے لگیں کہ یہ عورت تمہاری محسن ہے اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔

اور قرآن کریم کے بعض الفاظ جو آگے آتے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً يَدْعُونَنِي اور كَيْدَهُنَّ، جن میں چند عورتوں کا قول بصیغۂ جمع ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی موافقت اور تائید کر رہی ہیں اور ان کے مکر و کید سے بچنے کی ظاہری کوئی تدبیر نہ رہی تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف ہی رجوع فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ، یعنی اے میرے پالنے والے یہ عورتیں مجھے جس کام کی طرف دعوت دیتی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ہی ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں، یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے

کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے، کیونکہ آپ نے کہا تھا اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے دعا میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت اور بلاء کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہئے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعاء مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلاء و مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ سے صبر کی دعاء مانگنے کے بجائے عافیت کی دعاء مانگو (ترمذی)، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعاء تلقین فرما دیجئے، تو آپ نے فرمایا کہ اپنے رب سے عافیت کی دعاء مانگا کریں، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر میں نے آپ سے تلقین دعاء کا سوال کیا، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کریں (مظہری بحوالہ ترمذی)

اور یہ فرمانا کہ اگر آپ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں یہ عصمتِ نبوت کے خلاف نہیں، کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچا لیں، اور گو بمقتضائے نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا، مگر پھر بھی غایت خوف و ادب سے اس کی دعاء کرنے پر مجبور ہو گئے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے، علم کا تقاضا گناہ سے بچنا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یعنی ان کی دعاء ان کے رب نے قبول فرمائی، اور ان عورتوں کے مکر و حیلہ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے"

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے جال سے بچنے کے لئے یہ سامان کر دیا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقویٰ و طہارت کی کھلی نشانیاں دیکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا، مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا، اس کو ختم کرنے کے لئے ان کو مصلحت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا جائے، تاکہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے، اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچا بھی ختم ہو جائے، ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ، یعنی پھر

عزیز اور اس کے مشیروں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے، چنانچہ جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَعْصِرُ

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں

خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِىْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ

شراب، اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ جانور کھاتے

الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۳۶ قَالَ

ہیں اس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا۔ بولا

لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ

نہ آنے پائے گا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتلا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے

يَّاْتِيَكُمَا ۭ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ۭ اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

پہلے، یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ

لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۳۷ وَاتَّبَعْتُ

ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے

مِلَّةَ اٰبَاۗءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ

دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک

نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي

کریں اللہ کا کسی چیز کو، یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۳۸ يٰصَاحِبَيِ

پر، لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے، اے رفیقو

السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۳۹

قید خانہ کے، بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست،

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ

کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے

٥

مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا

نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرما دیا کہ نہ پوجو

اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾

مگر اسی کو یہی ہے راستہ سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے،

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ

اے رفیقو قید خانہ کے! ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائے گا اپنے مالک کو شراب اور دوسرا جو ہے سو

فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ

سولی دیا جائے گا پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے، فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق

تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿٤١﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ

تم چاہتے تھے، اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا

عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ

اپنے مالک کے پاس، سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے مالک سے پھر رہا قید میں

بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿٤٢﴾

کئی برس۔

ع ٥
١٥

خلاصۂ تفسیر

اور یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی اسی زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے (جن میں ایک ساقی تھا، دوسرا اردلی پکانے والا باورچی اور ان کی قید کا سبب یہ شبہ تھا کہ انھوں نے کھانے میں اور شراب میں زہر ملا کر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے قید کر دیئے گئے، انھوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو) ان میں سے ایک نے (حضرت یوسف علیہ السلام سے) کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے انگور کا شیرہ) نچوڑ رہا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر روٹیاں لئے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوچ نوچ کر) کھاتے ہیں، ہم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلایئے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں یوسف (علیہ السلام) نے (جب

یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوتے ہیں تو چاہا کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جاوے، اس لئے اول اپنا نبی ہونا ایک معجزہ سے ثابت کرنے کے لئے) فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمھارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے، میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہوجاتا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیل نبوت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعہ میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اثبات نبوت کے بعد آگے اثبات توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ) میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر ہیں اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے، ابراہیمؑ کا اور اسحٰقؑ کا اور یعقوبؑ کا (علیہم السلام اور اس مذہب کا رکن اعظم یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں یہ (عقیدۂ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو اختیار نہیں کرتے) اے قید خانہ کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرالیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو یہی (توحید در عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدھا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، (ایمان کی دعوت و تبلیغ کے بعد اب ان کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں کہ) اے قید خانہ کے رفیقو تم میں ایک تو (جرم سے بری ہوکر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا، اور دوسرا (مجرم قرار پاکر) سولی دیا جاوے گا اور اس کے سر کو پرندے (نوچ نوچ کر) کھاویں گے، اور جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدر ہوچکا (چنانچہ مقدمہ کی تنقیح کے بعد اسی طرح ہوا کہ ایک بری ثابت ہوا اور دوسرا مجرم، دونوں جیل خانہ سے بلائے گئے، ایک رہائی کیلئے دوسرا سزا کے لئے، اور (جب وہ لوگ جیل خانہ سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اس سے یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (کہ ایک

شخص بے قصور قید میں ہے، اس نے وعدہ کرلیا) پھر اس کو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا شیطان نے بھلادیا تو (اس وجہ سے) قید خانہ میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ایک ذیلی واقعہ مذکور ہے، یہ بات آپ بار بار معلوم کرچکے ہیں کہ قرآن حکیم نہ کوئی تاریخی کتاب ہے، نہ قصہ کہانی کی، اس میں جو تاریخی واقعہ یا قصہ ذکر کیا جاتا ہے اس سے مقصود صرف انسان کو عبرت و موعظت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اہم ہدایت ہوتی ہیں، پورے قرآن اور بے شمار انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں صرف ایک ہی قصہ یوسف علیہ السلام ایسا ہے جس کو قرآن نے مسلسل بیان کیا ہے، ورنہ ہر مقام کے مناسب تاریخی واقعہ کا کوئی ضروری جزء ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام کو اوّل سے آخر تک دیکھئے تو اس میں سینکڑوں عبرت و موعظت کے مواقع اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے لئے اہم ہدایتیں ہیں، یہ ذیلی قصہ بھی بہت سی ہدایات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی براءت اور بزرگی بالکل واضح ہوجانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کرلیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعاء اور خواہش کی تکمیل تھی، کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہوگیا تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی اور دوسرا باورچی تھا، ابن کثیر نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انھوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی، مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے، جو بیمار ہوگیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے، جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے، اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی

آپ کی بزرگی کے معتقد ہوگئے، جیل کا افسر بھی متاثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

فائدہ عجیبہ جیل کے افسر نے یا قیدیوں میں سے بعض نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے، تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کے لئے مجھ سے محبت نہ کرو، کیونکہ جب کسی نے مجھ سے محبت کی ہے تو مجھ پر آفت آئی ہے، بچپن میں پھوپی کو مجھ سے محبت تھی اس کے نتیجہ میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنوئیں کی قید پھر غلامی اور جلاوطنی میں مبتلا ہوا، عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں پہونچا (ابن کثیر، مظہری)

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انھوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمۂ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انھوں نے حقیقۃً دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محض یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہرحال اُن میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوتِ ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں اور اصولِ دعوت کے ماتحت حکمت و دانشمندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمھارے لئے جو کھانا تمھارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا، اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے، ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ، اور یہ کوئی رمل، جفر کا فن یا کہانت وغیرہ کا شعبدہ نہیں، بلکہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے بتلا دیتا ہے، میں اس کی اطلاع دیدیتا ہوں، اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیل نبوت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے، اس کے بعد اوّل کفر کی بُرائی اور ملتِ کفر سے اپنی بیزاری بیان کی، اور پھر یہ بھی جتلا دیا کہ میں خاندانِ نبوت ہی کا ایک فرد اور انہی کی

ملتِ حق کا پابند ہوں، میرے آباء واجداد ابراہیم و اسحٰق و یعقوب ہیں، یہ خاندانی شرافت بھی عادۃً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں، پھر فرمایا کہ یہ دینِ حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامتِ فہم عطا فرما کر قبولِ حق ہمارے لئے آسان کر دیا، مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے، پھر انہی قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پرستار ہو یہ بہتر ہے یا یہ کہ صرف ایک اللہ کا بندہ بنے جس کا قہر و قوت سب پر غالب ہے، پھر بت پرستی کی برائی ایک دوسرے طریقہ سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے، یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں، نہ ان میں ذاتی صفات اس قابل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت و طاقت کا مالک سمجھا جائے، کیونکہ وہ سب بےحس و حرکت ہیں، یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے، دوسرا راستہ ان کے معبودِ حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پرستش کے لئے احکام نازل فرمائے، تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتی، مگر حکمِ خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو چھوڑ کر اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کی عبادت کیلئے کوئی حجت و دلیل نازل نہیں فرمائی، بلکہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی وہ دینِ قیم ہے جو میرے آباء و اجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ و دعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا، اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا، اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی، اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور باورچی کو سولی دی جائے گی، مگر پیغمبرانہ شفقت و رافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی، تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔

آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محض اٹکل اور تخمینہ سے نہیں

بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا بعض حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ، چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہوگا جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیرِ خواب میں بیان ہوئی۔

پھر جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام تعبیرِ خواب کے ذریعہ یہ سمجھے تھے کہ وہ رہا ہوگا اس سے کہا کہ جب تم آزاد ہو کر جیل سے باہر جاؤ اور شاہی دربار میں رسائی ہو تو اپنے بادشاہ سے میرا بھی ذکر کر دینا کہ وہ بے گناہ قید میں پڑا ہوا ہے، مگر اس شخص کو آزاد ہونے کے بعد یوسف علیہ السلام کی یہ بات یاد نہ رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگی، اور اس واقعہ کے بعد چند سال مزید قید میں رہے، یہاں قرآن میں لفظ بِضْعَ سِنِيْنَ آیا ہے، یہ لفظ تین سے لے کر نو تک صادق آتا ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد سات سال مزید قید میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

احکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور فوائد و ہدایات حاصل ہوتے ہیں ان میں غور کیجئے:۔

پہلا مسئلہ:۔ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حُسنِ اخلاق، حُسنِ معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہو گئے جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں، خطاکاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کر کے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ:۔ آیت کے جملے اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیرِ خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جن کے نیک، صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ:۔ یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاحِ خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے حُسنِ اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں اُن کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندانِ نبوّت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا

یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو یہ وہ تزکیۂ نفس نہیں جسکی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ: تبلیغ و ارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہو کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت و تبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھول لے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیرِ خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیرِ خواب کے جواب سے پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد و ہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ: بھی اسی ارشاد و اصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہوسکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اِس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملّتِ کفر کو چھوڑ کر ملّتِ اسلام کو اختیار کیا، اور پھر کفر و شرک کی خرابیاں دلنشیں انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیرِ خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کر کے نہیں کہا کہ تم سُولی چڑھائے جاؤ گے (ابن کثیر، مظہری)

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ وہ بے قصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔

آٹھواں مسئلہ: یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے، شاید اسی لئے یہ قیدی یوسف علیہ السلام کے اس کہنے کو بھول گیا اور انکو مزید کئی سال جیل میں رہنا پڑا، ایک حدیث میں بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دبلی

وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي

اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے

رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ

خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے، بولے یہ خیالی خواب ہیں،

وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِي نَجَا

اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں، اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں

مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾

میں سے اور یاد آ گیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو،

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ

جا کر کہا اے یوسف اے سچے! حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائیں

سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي

سات دبلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، تاکہ

أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ

لے جاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو، کہا تم کھیتی کرو گے سات

سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا

برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا

مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ

جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو

مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَأْتِي

رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا اس کے

مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿٤٩﴾ ع

پیچھے ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

ع ۶ / ۷ ۱۶

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا

رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ

اپنے خاوند کے پاس اور پوچھ اس سے کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنھوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے، میرا

رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۞

رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور بادشاہِ مصر نے (بھی ایک خواب دیکھا اور ارکانِ دولت کو جمع کر کے ان سے کہا کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں فربہ ہیں جن کو سات لاغر گائیں کھا گئیں، اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں (اور خشک بالوں نے اسی طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کر دیا) اے دربار والو اگر تم (خواب کی) تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو وہ لوگ کہنے لگے کہ (اول تو یہ کوئی خواب ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں) یونہی پریشان خیالات ہیں، اور (دوسرے) ہم لوگ (کہ امورِ سلطنت میں ماہر ہیں) خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے (دو جواب اس لئے دیئے کہ اول جواب سے بادشاہ کے قلب سے پریشانی اور وسواس دور کرنا ہے، اور دوسرے جواب سے اپنا عذر ظاہر کرنا ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابلِ تعبیر نہیں دوسرے ہم اس فن سے واقف نہیں) اور ان (مذکورہ) دو قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا (وہ مجلس میں حاضر تھا) اس نے کہا اور مدت کے بعد اس کو (یوسف ؑ کی وصیت کا) خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائے دیتا ہوں، آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے (چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قید خانہ میں یوسف ؑ کے پاس پہنچا اور جا کر کہا) اے یوسف اے صدق مجسم آپ ہم لوگوں کو اس (خواب) کا جواب (یعنی تعبیر) دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دُبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں (کہ ان خشک کے لپٹنے سے وہ ہری بھی خشک ہو گئیں آپ تعبیر بتلائیے) تاکہ میں (جنھوں نے مجھ کو بھیجا ہے) ان لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں (اور بیان کروں) تاکہ (اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال) ان کو بھی معلوم ہو جائے (تعبیر کے موافق عملدرآمد کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے) آپ نے فرمایا کہ (ان سات

فربہ گایوں اور سات سبز بالوں سے مراد پیداوار و بارش کے سال ہیں پس) تم سات سال متواتر (خوب) غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا (تاکہ گھن نہ لگ جاوے) ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آوے (وہ بالوں میں سے نکالا ہی جاوے گا، پھر اس (سات برس) کے بعد سات برس ایسے سخت (و در قحط کے) آویں گے جو کہ اس (تمامتر) ذخیرہ کو کھاجاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھ ہوگا، ہاں مگر تھوڑا سا جو (بیج کے واسطے) رکھ چھوڑ دگے (وہ البتہ بچ جاوے گا، اور ان خشک بالوں اور دُبلی گایوں سے اشارہ ان سات سال کی طرف ہی) پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اور اس میں (بوجہ اس کے کہ انگور کثرت سے پھلیں گے) شیرہ بھی نچوڑیں گے (اور شرابیں پئیں گے

غرض وہ شخص تعبیر لیکر دربار میں پہنچا) اور (جا کر بیان کیا) بادشاہ نے (جو سنا تو آپ کے علم و فضل کا معتقد ہوا اور) حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ (چنانچہ یہاں سے قاصد چلا) پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا (اور پیغام دیا تو) آپ نے فرمایا کہ (جب تک میرا اس تہمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہو جائے گا میں نہ آؤں گا) تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہی) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (مطلب یہ تھا کہ ان کو بلا کر اس واقعہ کی جس میں مجھ کو قید کی گئی تفتیش و تحقیق کی جاوے، اور عورتوں کے حال سے مراد ان کا واقف یا ناواقف ہونا ہے حال یوسفؑ سے اور ان عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی ہو کہ ان کے سامنے زلیخا نے اقرار کیا تھا، وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ) میرا رب ان عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے (یعنی اللہ کو تو معلوم ہی ہے کہ زلیخا کا مجھ پر تہمت لگانا کید تھا، مگر عندالناس بھی اس کی تنقیح ہو جانا مناسب ہے، چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو حاضر کیا)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں یہ بیان ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لئے پردۂ غیب سے ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ بادشاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے وہ پریشان ہوا، اپنی مملکت کے تعبیر دینے والے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر خواب دریافت کی، وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دیدیا کہ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ، اضغاث، ضغث کی جمع ہے، جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف قسم کے خس و خاشاک گھاس پھونس جمع ہوں، معنی یہ تھے کہ یہ خواب کچھ ملی جلی ہے،

جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے، کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کر دیتے۔

اس واقعہ کو دیکھ کر مدت مدیدہ کے بعد اس رہا شدہ قیدی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ کو اس خواب کی تعبیر بتلا سکوں گا، اس وقت اس نے یوسف علیہ السلام کے کمالات اور تعبیرِ خواب میں مہارت اور پھر مظلوم ہو کر قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر کے یہ چاہا کہ مجھے جیل خانہ میں ان سے ملنے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے اس کا انتظام کیا وہ یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو صرف ایک لفظ فَاَرْسِلُوْنِ فرما کر بیان کیا ہے، جس کے معنی ہیں مجھے بھیج دو، یوسف علیہ السلام کا تذکرہ پھر سرکاری منظوری اور پھر جیل خانہ تک پہونچنا یہ واقعات خود ضمنی طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں، اس لئے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ یہ بیان شروع کیا۔

یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ، یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہونچکر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلائیے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فربہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر و کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سرسبز ہرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا، لَعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہو جائیں۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالمِ مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فنِ تعبیرِ خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سنکر سمجھ لیا کہ سات بیل فربہ اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگانے میں خاص دخل ہے، اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فربہ بیلوں کے کھا لینے سے یہ مراد ہے کہ پچھلے

سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہو جائے گا صرف بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کے سال کُل سات ہی ہیں تو عادۃ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کر دیا تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہونچے، جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل و کمال ظاہر ہو کر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پرانا ہونے کے بعد کیڑا نہ لگ جائے، یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ، یعنی پہلے سات سال کے بعد پھر سات سال سخت خشک سالی اور قحط کے آئیں گے، جو پچھلے جمع کئے ہوئے ذخیرہ کو کھا جائیں گے خواب میں چونکہ یہ دیکھا تھا کہ ضعیف کمزور بیلوں نے فربہ اور قوی بیلوں کو کھا لیا، اس لئے تعبیر خواب میں اس کے مناسب یہی فرمایا کہ قحط کے سال پچھلے سالوں کے جمع کردہ ذخیرہ کو کھا جائیں گے، اگرچہ سال تو کوئی کھانے والی چیز نہیں، مراد یہی ہے کہ انسان اور جانور قحط کے سالوں میں پچھلے ذخیرہ کو کھا لیں گے۔

قصہ کے سیاق سے ظاہر ہے کہ یہ شخص تعبیر خواب یوسف علیہ السلام سے معلوم کر کے لوٹا اور بادشاہ کو خبر دی وہ اس سے مطمئن اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کا معتقد ہو گیا، مگر قرآن کریم نے ان سب چیزوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ خود بخود مفہوم ہو سکتی ہیں، اس کے بعد کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖ، یعنی بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیلخانہ سے نکالا جائے، اور دربار میں لایا جائے، چنانچہ بادشاہ کا کوئی قاصد بادشاہ کا یہ پیغام لے کر جیل خانہ پہونچا۔

موقع بظاہر اس کا تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ کی طویل مدت سے عاجز آ رہے تھے

اور خلاصی چاہتے تھے، جب بادشاہ کا پیغام بلانے کے لئے پہنچا تو فوراً تیار ہو کر ساتھ چل دیتے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جو مقام بلند عطا فرماتے ہیں اس کو دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے، اس قاصد کو جواب یہ دیا :

قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام نے قاصد سے کہا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا کر پہلے یہ دریافت کرو کہ آپ کے نزدیک ان عورتوں کا معاملہ کس طرح ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، کیا اس واقعہ میں وہ مجھے مشتبہ سمجھتے ہیں اور میرا کوئی قصور قرار دیتے ہیں

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا، جو اصل سبب تھی، اس میں اس حق کی رعایت تھی جو عزیز کے گھر میں پرورش پانے سے فطرۃً شریف انسان کے لئے قابل لحاظ ہوتا ہے (قرطبی)

اور ایک بات یہ بھی ہے کہ اصل مقصود اپنی برارت کا ثبوت تھا، وہ ان عورتوں سے بھی ہو سکتا تھا، اور اس میں عورتوں کی بھی کوئی زیادہ رسوائی نہ تھی، اگر وہ سچی بات کا اقرار بھی کر لیتیں تو صرف مشورہ ہی کی مجرم ٹھہرتیں، بخلاف عزیز کی بیوی کے کہ اس کو تحقیقات کا ہدف بنایا جاتا، تو اس کی رسوائی زیادہ تھی، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ، یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہی ہے میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقت واقعہ سے واقف ہو جائیں، جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برارت کا اظہار بھی ہے۔

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبریؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق قابلِ تعجب ہیں، جب اُن سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا، پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا (قرطبی)

اس حدیث میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ منشار حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق کی تعریف و مدح کرنا ہے، مگر اس کے بالمقابل جس صورتِ حال کو

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کرکے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا، اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طرزِ عمل کو افضل فرمارہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کر پاتا، بلکہ اس کے مقابلہ میں مفضول کو اختیار کر لیتا، جو بظاہر افضل الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان نہیں، تو اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں، مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ جیسے تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریقِ کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے، اور وہ اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقِ کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیمِ امت اور خیر خواہی عوام کے لئے وہی مناسب اور افضل ہے، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے، یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسولِ خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمۃ للعالمین کے مزاج و مذاق میں عامہ خلق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ

کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت سے، بولیں

لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ الْـٰٔنَ

حاشا للہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی، بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی سچی

حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

بات، میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ

الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥١﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ

سچا ہے، یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی

اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٢﴾

چھپ کر اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی خواہش کی (یعنی ایک نے خواہش کی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کہ اعانتِ فعل بھی مثلِ فعل کے ہے، اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا، شاید بادشاہ نے اس طور پر اس لئے پوچھا ہو کہ مجرم سُن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے اُن سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید اس کا نام بھی معلوم ہو، اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، بس اس طرح شاید خود اقرار کرلے) عورتوں نے جواب دیا کہ حاش للہ ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی (وہ بالکل پاک صاف ہیں، شاید عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ مقصود یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا ثبوت تھا اور وہ حاصل ہوگیا، یا زلیخا کے روبرو ہونے سے حیاء مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں) عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہو ہی گئی (اب اخفاء بیکار ہی ہے سچ یہی ہے کہ) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انھوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا، ما جزاء من الخ) اور بیشک وہی سچے ہیں (اور غالباً ایسے امر کا اقرار کرلینا مجبوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا، غرض تمام صورت مقدمہ اور اظہارات اور یوسف علیہ السلام کی برات کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا اس وقت) یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا کہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی حرمت میں خیانت کی تھی کہ دوسرے پر نگاہ کی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی، پس میری غرض یہ تھی)۔

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہی قاصد رہائی کا پیغام دے کر بلانے کے لئے آیا اور انھوں نے قاصد کو یہ جواب دیا کہ پہلے ان عورتوں سے میرے معاملہ کی تحقیق کرو جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، اس میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جیسے دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقل کامل اور معاملات و حالات کی پوری بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں، یوسف علیہ السلام نے شاہی پیغام سے یہ اندازہ کرلیا کہ اب جیل سے رہائی کے بعد بادشاہِ مصر مجھے کوئی

اعزاز دیں گے، اس وقت دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ جس عیب کی تہمت ان پر لگائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی حقیقت بادشاہ اور سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہو اور ان کی براءت میں کسی کو شبہ نہ رہے، ورنہ اس کا انجام یہ ہوگا کہ شاہی اعزاز سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہو جائیں گی، مگر ان کے دلوں میں یہ خیالات کھٹکتے رہیں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے آقا کی بیوی پر دست درازی کی تھی، اور ایسے حالات کا پیدا ہو جانا بھی شاہی درباروں میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت بادشاہ بھی لوگوں کے ایسے خیالات سے متاثر ہو جائے، اس لئے رہائی سے پہلے اس معاملہ کی صفائی اور تحقیق کو ضروری سمجھا، اور مذکور الصدر دو آیتوں میں سے دوسری آیت میں خود یوسف علیہ السلام نے اپنے اس عمل در رہائی میں تاخیر کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

اول یہ کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ، یعنی یہ تاخیر میں نے اس لئے کی کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں کوئی خیانت نہیں کی۔

عزیز مصر کو یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا، اور اس پر سکوت ان کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا وہ چونکہ ایک زمانہ تک آقا کی حیثیت میں رہ چکا تھا، اس لئے یوسف علیہ السلام کی شرافت نفس نے اس کی اذیت کو گوارا نہ کیا، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جب عزیز مصر کو براءت کا یقین ہو جائے گا تو دوسرے لوگوں کی زبانیں خود بند ہو جائیں گی۔

دوسری حکمت یہ ارشاد فرمائی وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ، یعنی یہ تحقیقات اس لئے کرائی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا"

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تحقیقات کے ذریعہ خیانت کرنے والوں کی خیانت ظاہر ہو کر سب لوگ متنبہ ہو جائیں کہ خیانت کرنے والوں کا انجام آخر کار رسوائی ہوتا ہے، تاکہ آئندہ سب لوگ ایسے کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں، دوسرے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا، اور خیانت کی برائی دلوں سے نکل جاتی، بہرحال مذکورہ بالا حکمتوں کے پیش نظر یوسف علیہ السلام رہائی کا پیغام پاتے ہی فوراً نکل جانا پسند نہیں کیا، بلکہ شاہی انداز سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مذکور الصدر پہلی آیت میں اس تحقیقات کا خلاصہ مذکور ہے، قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهِ، "یعنی بادشاہ نے اُن عورتوں کو جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حاضر کر کے سوال کیا کہ کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسفؑ سے اپنے مطلب کی خواہش کی"، بادشاہ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اس کو اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں ان عورتوں ہی کا ہے، اسی لئے یہ کہا تم نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی، اس کے بعد عورتوں کا جواب یہ مذکور ہے:۔

قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۝ "یعنی سب عورتوں نے کہا کہ حاش للہ! ہمیں ان میں ذرا بھی کوئی بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوتی، عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی۔ میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی، اور بیشک وہی سچے ہیں"

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ' جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق و صفائی کے لئے کھل جاتی ہیں، اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہارِ حق کا اعلان خود کر دیا، یہاں تک جو حالات و واقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سُنے ہیں، ان میں بہت سے فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔

ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں، مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید **مسائل اور ہدایات یہ ہیں:۔**

نواں مسئلہ:۔ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کے لئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنونِ احسان کرنا پسند نہیں فرماتے، یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردۂ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت و شان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔

اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہِ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا جس کی تعبیر سے اس کے درباری اہلِ علم و فن عاجز ہوئے، اس طرح ضرورتمند ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا (ابن کثیر)

دسواں مسئلہ: اس میں حسن خلق کی تعلیم ہے کہ رہا ہونے والے قیدی نے یوسف علیہ السلام کا اتنا کام نہ کیا کہ بادشاہ سے ذکر کر دیتا، جس کی وجہ سے ان کو مزید سات سال قید کی مصیبت میں گذارنے پڑے، اب سات سال کے بعد جب وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کا لے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہو سکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ خلق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا (ابن کثیر و قرطبی)

گیارھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ وہ پریشان نہ ہوں جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف تعبیر خواب بتا دینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ایک حکیمانہ اور خیرخواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیداوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں، اور بقدر ضرورت صاف کر کے نکالیں، تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جائیں۔

بارھواں مسئلہ: یہ ہے کہ عالم مقتدا کو اس کی بھی فکر رہنی چاہئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہئے، کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو، بہرحال ان کی دعوت و ارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے، لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے، یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے، خصوصاً علماء کو اس میں دوہری احتیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہراتؓ میں سے ایک بی بی آپ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آ گئے، تو آپ نے دور ہی سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہو جائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہو جائیں۔

تیرھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر نا گزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی بھی پڑے

تو اس میں بھی مقدور بھر حقوق و احترام کی رعایت کرنا شرافت کا مقتضی ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا جنھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

چودھواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ[۱۲] سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت اُن سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہونچے جیسے آیت لِیَعۡلَمَ اَنِّیۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَیۡبِ میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بیشک جی تو سکھلاتا ہے برائی مگر

مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِیۡ

جو رحم کر دیا میرے رب نے بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان۔ اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے

بِهٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡهُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا

پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس

مَكِیۡنٌ اَمِیۡنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ

جگہ پائی معتبر ہو کر، یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان

حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ

ہوں خوب جاننے والا، اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیۡعُ

اس میں جہاں چاہتا، پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں، اور ضائع نہیں کرتے ہم

اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا

بدلہ بھلائی والوں کا، اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے

وَكَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾ ع

اور رہے پرہیزگاری میں۔

ع ۸ ۷ ۱

خلاصۂ تفسیر

اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہر ایک کا) بُری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس میں بُرائی کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، مطمئنہ جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصہ مطلب یہ ہو کہ میری نزاہت و عصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں، بلکہ رحمت و عنایت الٰہیہ کا اثر ہے، اس لئے میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا، ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا) بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے، (یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں امّارہ اور مطمئنہ، سو امّارہ اگر توبہ کرلے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے، اور درجۂ توبہ میں وہ لوّامہ کہلاتا ہے، اور جو مطمئنہ ہے کمال اس کا لازم ذات نہیں، بلکہ عنایت و رحمت کا اثر ہے، پس امّارہ کے لوّامہ ہونے پر صفت غفور کا ظہور ہوتا ہے اور مطمئنہ میں صفت رحیم کا۔

یہ تمام تر مضمون ہوا یوسف علیہ السلام کی تقریر کا، باقی یہ امر کہ یہ صورت اثبات نزاہت کی بعد رہائی کے بھی تو ممکن تھی پھر رہائی پر اس کو مقدم کیوں رکھا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جتنا یقین اس ترتیب میں ہو سکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ دلائل کی دلالت تو مشترک ہی، لیکن اس صورت مجوزہ میں یہ امر زائد ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب بدون تبریہ کے یہ رہا ہونا نہیں چاہتے، حالانکہ ایسی حالت میں رہائی قیدی کی انتہائی تمنا ہوتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نزاہت و براءت کا کامل یقین ہے اس لئے اس کے ثابت ہو جانے کا پورا اطمینان ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین بری ہی کو ہو سکتا ہے نہ کہ ملوث کو۔)

یہ ساری باتیں بادشاہ نے سنیں اور (یہ سن کر) بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا (اور عزیز سے ان کو لے لوں گا کہ اس کے ماتحت نہ رہیں گے چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لائے) پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں (اور باتوں سے زیادہ فضل و کمال آپ کا ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے (ان سے) کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہو (بعد اس کے اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قحط کا اہتمام بڑا بھاری کام ہے، یہ انتظام کس کے سپرد کیا جاوے) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کر دو میں (ان کی) حفاظت (بھی) رکھوں گا اور (آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی) خوب واقف ہوں (چنانچہ بجائے اس کے

کہ ان کو کوئی خاص منصب دیا مثل اپنے پورے اختیارات ہر قسم کے دیدیئے، گویا حقیقت میں بادشاہ یہی ہوگئے، گو برائے نام وہ بادشاہ رہا، اور یہ عزیز کے عہدہ سے مشہور ہوگئے) چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں بااختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں (جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے، یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنوئیں میں محبوس تھے، پھر عزیز کی تحقیق میں مقید رہے، اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی، بات یہ ہے کہ) ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے، کہ حیاتِ طیبہ عطا فرماتے ہیں، خواہ مالدار بنا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے لئے تھا، اور خواہ بغیر مالداری کے قناعت و رضا عطا کر کے جس سے عیش لذیذ میسر ہوتا ہے یہ تو آج دنیا میں ہوا) اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے۔"

معارف و مسائل

اپنی پاکبازی بیان کرنا درست نہیں، مگر خاص حالات میں

اس سے پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول مذکور تھا کہ جو الزام مجھ پر عائد کیا تھا اس کی صفائی اور معاملہ کی مکمل تحقیق سے پہلے میں قید سے رہائی کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ عزیز اور بادشاہِ مصر کو پورا یقین ہو جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی تھی، بلکہ الزام سراسر جھوٹا تھا، اس میں چونکہ اپنی برأت اور پاکبازی کا ذکر ایک ناگزیر ضرورت سے ہو رہا تھا جو بظاہر اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا اظہار ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ "یعنی کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ وہ جس کو چاہیں پاک قرار دیں۔" ——— اور سورۂ نجم میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى "یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کے مدعی نہ بنو، اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون واقعی پرہیزگار متقی ہے۔"

اس لئے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جتلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے، بجز اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک

کردے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ایسے ابتلاء عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں کہ خواہشِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ ایک قسم کا خیال تو بہرحال ان کے دل میں بھی پیدا ہو ہی گیا تھا، گو وہ غیر اختیاری وسوسے کی حد تک تھا، مگر شانِ نبوت کے سامنے وہ بھی ایک لغزش اور برائی ہی تھی، اس لئے اس کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے نفس کو بھی بالکل ہی بری اور پاک نہیں سمجھتا۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اس میں ہر نفسِ انسانی کو اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ یعنی بُرے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کرکے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

بہرحال آیت مذکورہ اور ان روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی بُرے ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورۂ قیامہ میں اسی نفسِ انسانی کو لوّامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اور سورۂ والفجر میں اسی نفسِ انسانی کو نفسِ مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ، اس طرح نفسِ انسانی کو ایک جگہ اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ کہا گیا، دوسری جگہ لوّامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفسِ انسانی اپنی ذات میں تو اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ یعنی بُرے کاموں کا

تقاضا کرنے والا ہے، لیکن جب انسان خدا و آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوامہ بن جاتا ہے، یعنی بُرے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنیوالا جیسے عام صلحاء اُمت کے نفوس ہیں اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہونچا دے کہ بُرے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے، صلحاء اُمت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے، اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطاء خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، آخر آیت میں فرمایا کہ میرا رب بڑا مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے، لفظ غفور میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ جب اپنی خطا پر نادم ہو کر توبہ کرے، اور نفس لوامہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت بڑی ہے، وہ معاف فرما دیں گے اور لفظ رحیم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے، کہ جس شخص کو نفس مطمئنہ نصیب ہو وہ بھی اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ الخ یعنی بادشاہ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کے فرمانے کے مطابق عورتوں سے واقعہ کی تحقیق فرمائی اور زلیخا اور دوسری سب عورتوں نے حقیقتِ واقعہ کا اقرار کر لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے پاس لایا جائے تاکہ میں اُن کو اپنا مشیر خاص بنالوں، حکم کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیلخانہ سے دربار میں لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو گیا، تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے معزز اور معتمد ہیں۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہونچا، اور بادشاہ کی دعوت پہونچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعا کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربار شاہی پر پہونچے تو یہ دعا کی حَسْبِيْ رَبِّيْ مِنْ دُنْيَايَ وَحَسْبِيْ رَبِّيْ مِنْ خَلْقِهٖ عَزَّ جَارُهٗ وَجَلَّ ثَنَاۤؤُهٗ وَلَاۤ اِلٰهَ غَيْرُهٗ۔ یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے، اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے، جو اسکی پناہ میں آگیا وہ بالکل محفوظ ہے، اور اسکی بڑی تعریف ہے اور اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔

جب دربار میں پہونچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا، اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ اور بادشاہ کیلئے دعا عبرانی زبان میں کی

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا، مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا، عبرانی زبان میں۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کر دی۔

پھر شاہِ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلا واسطہ سُنوں، یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہِ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں، اس کے بعد شاہِ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے، تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کرا کر غلہ اگانے کا انتظام کریں، اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہلِ مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں، کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اُس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلقِ خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہو جائے گا، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہِ مصر اس مشورہ سے بیحد مسرور و مطمئن ہوا، مگر کہنے لگا، کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ، یعنی ملک کے خزانے (جن میں زمین کی پیداوار بھی شامل ہے) آپ میرے سپرد کر دیں میں ان کی حفاظت بھی پوری کر سکتا ہوں، اور خرچ کرنے کے مواقع اور مقدار خرچ کے اندازہ سے بھی پورا واقف ہوں (قرطبی، مظہری)

ان دو لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا، جو ایک وزیر خزانہ میں ہونے چاہئیں، کیونکہ پہلی ضرورت تو امینِ خزانہ کے لئے اس کی ہے کہ

وہ سرکاری اموال کو ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری حفاظت سے جمع کرے، پھر غیر مستحق لوگوں اور غلط قسم کے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے اور دوسری ضرورت اس کی ہے کہ جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے، اس میں نہ کوتاہی کرے اور نہ مقدارِ ضرورت سے زائد خرچ کرے، لفظ "حفیظ" پہلی ضرورت کی پوری ضمانت ہے اور لفظ "علیم" دوسری ضرورت کی۔

شاہِ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا گرویدہ اور ان کی دیانت اور عقل کامل کا پورا معتقد ہو چکا تھا، مگر بالفعل وزارتِ خزانہ کا منصب ان کو سپرد نہیں کیا، بلکہ ایک سال تک ایک معزز مہمان کی طرح رکھا۔

سال بھر پورا ہونے کے بعد نہ صرف وزارتِ خزانہ بلکہ پورے امورِ مملکت ان کے سپرد کر دیئے، شاید مقصد یہ تھا کہ جب تک گھر میں رکھ کر ان کے اخلاق و عادات کا پورا تجربہ نہ ہو جائے اتنا بڑا منصب سپرد کرنا مناسب نہیں، جیسے کہ سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ہے ؎

چو یوسف کسے در صلاح و تمیز　　بیک سال باید کہ گردد عزیز

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قطفیر کا انتقال ہو گیا تو شاہِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کر دی، اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی، اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گذری، تاریخی روایات کے مطابق دو لڑکے بھی پیدا ہوئے، جن کا نام افرائیم اور منشا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی، زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی، اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات مضمحل ہو گئے، یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور مظہری میں بیان ہوا ہے۔

قصۂ یوسف علیہ السلام کے ضمن میں جو عام انسانوں کی صلاح و فلاح کے لئے بہت سی ہدایات اور تعلیمات آئی ہیں، ان کا ذکر کچھ پہلے ہو چکا ہے، مذکور الصدر آیات میں مزید مسائل اور ہدایات حسب ذیل ہیں:

پہلا مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گنہگاروں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ ارشاد یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جمائیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے نفسِ امّارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا، ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر بُرے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنا جائز نہیں مگر چند شرائط کے ساتھ اجازت ہے

دوسرا مسئلہ: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے، جیسے یوسف علیہ السلام نے خزائن ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارہ میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا، اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ حبِّ جاہ وہاں اس کا سبب نہ ہو، بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا، اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدۂ امارت حاصل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا اِنَّا لَنْ نَّسْتَعْمِلَ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَہٗ، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا طلب عہدہ خاص حکمت پر مبنی تھا	مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بادشاہ مصر کافر ہے، اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہے

اور ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے، اس وقت خودغرض لوگ عام خلق اللہ پر رحم نہ کھائیں گے اور لاکھوں انسان بھوک سے مرجائیں گے، کوئی دوسرا آدمی ایسا موجود نہ تھا جو غریبوں کے حقوق میں انصاف کرسکے، اس لئے خود اس عہدہ کی درخواست کی، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی بضرورت کرنا پڑا، تاکہ بادشاہ مطمئن ہوکر عہدہ ان کو سپرد کردے۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے جاہ و مال کے لئے نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھا لینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا، صحابہ کرام حضرت علیؓ اور معاویہؓ و حضرت حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ وغیرہم کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی پر مبنی تھے، کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فریضہ خلافت کو میں اپنے مقابل سے زیادہ حکمت و قوت کے ساتھ پورا کرسکوں گا، جاہ و مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔

کیا کسی کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے	**تیسرا مسئلہ:** یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر کی ملازمت قبول فرمائی، حالانکہ وہ کافر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ

کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

لیکن امام جصاصؒ نے آیت کریمہ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت کی رو سے ظالموں کا فروں کی اعانت کرنا جائز نہیں، اور ظاہر ہے انکی حکومت کا عہدہ قبول کرنا ان کے عمل میں شریک ہونا اور اعانت کرنا ہے، اور ایسی اعانت کو قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اس ملازمت کو نہ صرف قبول فرمایا بلکہ درخواست کرکے حاصل کیا، اس کی خاص وجہ امام تفسیر مجاہدؒ نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہِ مصر اس وقت مسلمان ہوچکا تھا، مگر چونکہ قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہِ مصر کے معاملہ

سے یہ معلوم کر چکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلافِ شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیارات دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانونِ حق پر عمل کر سکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کبھی خلافِ شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگرچہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم و جور کا اندیشہ قوی ہو تو بمجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہو جاتی ہے، جس میں خود کسی خلافِ شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہو جائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ و تابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کر لینا ثابت ہے (قرطبی و مظہری)

علامہ ماوردی نے سیاستِ شرعیہ سے متعلق اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی بناء پر کفار و ظالم حکمرانوں کا عہدہ قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ خود اس کو کوئی کام خلافِ شرع نہ کرنا پڑے، اور بعض حضرات نے اس شرط کے ساتھ بھی اس کو اس لئے جائز نہیں رکھا کہ اس میں بھی اہلِ ظلم و جور کی تقویت اور تائید ہوتی ہے، یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے فعل کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات یا اُن کی شریعت کے ساتھ مخصوص تھا، اب دوسروں کے لئے جائز نہیں، مگر جمہور علماء و فقہاء نے پہلے ہی قول کو اختیار فرما کر جائز قرار دیا ہے۔ (قرطبی)

تفسیر بحرِ محیط میں ہے کہ جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء و صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، انصاف نہ ہو سکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے، بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلافِ شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

چوتھا مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ سے یہ ثابت ہوا، کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کر دینا تزکیۂ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے، بشرطیکہ

اس کا ذکر کرنا کبر و غرور اور فخر و تعلّی کی وجہ سے نہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ یعنی جس طرح ہم نے یوسف ؑ کو بادشاہِ مصر کے دربار میں عزت و منزلت عطا کی اسی طرح ہم ان کو پورے ملکِ مصر پر اقتدار کامل عطا کر دیا، کہ اس کی زمین میں جس طرح چاہیں احکام جاری کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و نعمت سے یوں ہی نوازا کرتے ہیں، اور ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہِ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا جس میں تمام عمّالِ دولت اور معززینِ حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امورِ مملکت کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا، (قرطبی و مظہری وغیرہ)

حضرت یوسف علیہ السلام نے امورِ سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گرویدہ ہو گیا اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہو گئی، خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا رنج و تکلیف پیش نہیں آئی۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس سارے جاہ و جلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوتے، کہ شاہِ مصر کو اسلام و ایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ مسلسل دعوت و کوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہِ مصر بھی مسلمان ہو گیا۔

وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ "یعنی اور آخرت کا اجر و ثواب اس دنیا کی نعمت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے، ان لوگوں کے لئے جو مؤمن ہوئے، اور جنھوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی۔"

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی دولت و سلطنت اور مثالی حکومت تو عطا ہوئی ہی تھی، اس کے ساتھ آخرت کے درجاتِ عالیہ بھی ان کے لئے تیار ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ یہ درجاتِ دنیا و آخرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ صلائے عام ہے ہر اس شخص کے لئے جو ایمان اور تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کر لے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانۂ حکومت میں عوام کی راحت رسانی کے وہ کام کئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے، جب تعبیرِ خواب کے مطابق سات سال خوش حالی کے

گذر گئے اور قحط شروع ہوا تو یوسف علیہ السلام نے پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا، لوگوں نے کہا کہ ملک مصر کے سارے خزانے آپ کے قبضہ میں ہیں اور آپ بھوکے رہتے ہیں، تو فرمایا کہ میں یہ اس لئے کرتا ہوں تاکہ عام لوگوں کی بھوک کا احساس میرے دل سے غائب نہ ہو، اور شاہی باورچیوں کو بھی حکم دیدیا کہ دن میں صرف ایک مرتبہ دوپہر کو کھانا پکایا کرے، تاکہ شاہی محل کے سب افراد بھی عوام کی بھوک میں کچھ حصہ لے سکیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ

مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ

نہیں پہچانتے، اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب، کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو

مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ

تمہارا ہے باپ کی طرف سے، تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ اور خوب طرح اتارتا ہوں

الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ

مہمانوں کو، پھر اگر اس کو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں میرے نزدیک

وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور میرے پاس نہ آئیو، بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے،

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

اور کہہ دیا اپنے خدمتگاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید

يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

اس کو پہچانیں جب پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں۔

خلاصہ تفسیر

(غرض یوسف علیہ السلام نے باختیار ہو کر غلہ کاشت کرانا اور جمع کرانا شروع کیا اور سات برس کے بعد قحط شروع ہوا، یہاں تک کہ دور دور سے یہ خبر سن کر کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے غلہ فروخت ہوتا ہے جوق جوق لوگ آنا شروع ہوئے) اور (کنعان میں بھی قحط ہوا) یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (بھی بجز بنیامین کے غلہ لینے مصر میں)

آئے پھر یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہونچے سو یوسف (علیہ السلام) نے (تو) اُن کو پہچان لیا اور انھوں نے یوسف (علیہ السلام) کو نہیں پہچانا (کیونکہ ان میں تغیر کم ہوا تھا، نیز یوسف علیہ السلام کو ان کے آنے کا خیال اور قوی احتمال بھی تھا، پھر نو وارد سے پوچھ بھی لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور شناسا لوگوں کو تھوڑے پتہ سے اکثر پہچان بھی لیتے ہیں بخلاف یوسف علیہ السلام کے کہ ان میں (چونکہ مفارقت کے وقت بہت کم عمر تھے) تغیر بھی زیادہ ہو گیا تھا اور ان کو یوسف علیہ السلام کے ہونے کا احتمال بھی نہ تھا، پھر حکام سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا، کہ آپ کون ہیں؟ یوسف علیہ السلام کا معمول تھا کہ ہر شخص کے ہاتھ غلہ بقدر حاجت فروخت کرتے تھے، چنانچہ ان کو بھی جب فی آدمی ایک ایک اونٹ غلہ قیمت دے کر ملنے لگا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا ایک علاتی بھائی اور ہے، اس کو باپ نے اس وجہ سے کہ ان کا ایک بیٹا گم ہو گیا تھا اپنی تسلی کے لئے رکھ لیا ہے، اس کے حصہ کا بھی ایک اونٹ غلہ زیادہ دیدیا جاوے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اگر اس کا حصہ لینا ہے تو وہ خود آکر لے جاوے، غرض اُن کے حصہ کا غلہ اُن کو دلوا دیا) اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ کا) تیار کر دیا تو (چلتے وقت) فرما دیا کہ (اگر یہ غلہ خرچ کر کے اب کے آنے کا ارادہ کرو تو) اپنے علاتی بھائی کو بھی (ساتھ) لانا (تاکہ اس کا حصہ بھی دیا جا سکے) تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں (پس اگر تمہارا وہ بھائی آوے گا اس کو بھی پورا حصہ دوں گا، اور اس کی خوب خاطر داشت کروں گا جیسا تم نے اپنے ساتھ دیکھا، غرض آنے میں تو نفع ہی نفع ہے) اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اس کو میرے پاس نہ لائے تو (میں سمجھوں گا کہ تم مجھ کو دھوکہ دے کر غلہ زیادہ لینا چاہتے تھے تو اس کی سزا میں) نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلہ ہوگا، اور نہ تم میرے پاس آنا (پس اس کے نہ لانے میں یہ نقصان ہوگا کہ تمھارے حصہ کا غلہ بھی سوخت ہو جاوے گا) وہ بولے (دیکھئے) ہم (اپنی حد امکان تک تو) اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم اس کام کو (یعنی کوشش اور درخواست) ضرور کریں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے) اور (جب وہاں سے بالکل چلنے لگے تو) یوسف (علیہ السلام) نے اپنے نوکروں سے کہدیا کہ ان کی جمع پونجی (جس کے عوض انھوں نے غلہ مول لیا ہے) ان (ہی) کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو (جب وہ اسباب میں سے نکلے) پہچانیں، شاید (یہ احسان و کرم دیکھ کر) پھر دوبارہ آئیں (چونکہ یوسف علیہ السلام کو ان کا دوبارہ آنا اور ان کے بھائی کا لانا منظور تھا اس لئے کسی طرح سے سکی

تدبیر کی اوّل وعدہ کیا کہ اگر اس کو لاؤ گے تو اس کا بھی حصہ ملے گا، دوسرے وعید سنادی کہ اگر نہ لاؤ گے تو اپنا حصہ بھی نہ پاؤ گے تیسرے دام جو کہ نقد کے علاوہ کوئی اور چیز تھی واپس کر دی، دو خیال سے ایک یہ کہ اس سے احسان و کرم پر استدلال کر کے پھر آئیں گے، دوسرے اس لئے کہ شاید ان کے پاس اور دام نہ ہوں اور اس لئے پھر نہ آسکیں، اور جب یہ دام ہوں گے انہی کو لیکر پھر آسکتے ہیں) ÷

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ملکِ مصر کا کامل اقتدار اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو جانے کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں برادرانِ یوسفؑ کا غلہ لینے کے لئے مصر آنا بیان ہوا ہے، اور یہ بھی ضمناً آگیا کہ دس بھائی مصر آئے تھے، یوسف علیہ السلام کے حقیقی چھوٹے بھائی ساتھ نہ تھے۔

درمیانی قصہ کی تفصیل قرآن نے اس لئے نہیں دی کہ پچھلے واقعات سے وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے، ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد ابن اسحٰق وغیرہ کے حوالہ سے جو تفصیل بیان کی ہے وہ اگر تاریخی، در اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابلِ قبول ہے کہ نسقِ قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو سلطنتِ مصر کی وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیرِ خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاہیت کے آئے، پیداوار خوب ہوئی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزء سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجودہ ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا، اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدر ان کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرا دیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف و اکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا، کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قرطبی نے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دو سو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملکِ مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارضِ کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پُر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے، یہیں حضرت ابراہیم و اسحٰق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں، یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی، ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ وہاں غلہ قیمتاً مل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہونچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ، مصر سے غلہ لے کر آؤ۔

اور چونکہ یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں دیا جاتا، اس لئے سب ہی صاحبزادوں کو بھیجنے کی تجویز ہوئی، مگر سب سے چھوٹے بھائی بنیامین جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے، اور یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت و شفقت ان کے ساتھ زیادہ متعلق ہوگئی تھی، ان کو اپنے پاس اپنی تسلّی اور خبرگیری کے لئے روک لیا۔

دس بھائی کنعان سے سفر کرکے مصر پہونچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت و تاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہوچکے تھے (قرطبی، مظہری)

ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ میں انسان کا حلیہ بھی کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے، اور ان کا یہ وہم و خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ جس بچہ کو غلام بنا کر بیچ گیا تھا، وہ کسی ملک کا وزیر یا بادشاہ ہوسکتا ہے اس لئے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا، مگر یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا آیت مذکورہ میں فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ کے یہی معنی ہیں، عربی زبان میں انکا کے اصلی معنی اجنبی سمجھنے ہی کے آتے ہیں، اس لئے مُنْكِرُوْنَ کے معنی ناواقف اور انجان کے ہوگئے۔

یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے متعلق ابن کثیر نے بحوالہ سُدّی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب یہ دس بھائی دربار میں پہونچے تو یوسف علیہ السلام نے مزید اطمینان کے لئے ان سے ایسے سوالات کئے، جیسے مشتبہ لوگوں سے کئے جاتے ہیں، تاکہ وہ پوری حقیقت واضح

کر کے بیان کر دیں، اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے، آپ یہاں کیسے پہونچے، انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے، اور ہم نے آپ کی تعریف سُنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو، تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں، تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمھارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمھارے سوا ہے، تو انھوں نے بتلایا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی، اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا، تاکہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سُنکر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں، اور قاعدہ کے موافق غلہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم کر لینے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آنا طبعی امر تھا کہ یہ بھی دوبارہ بھی آئیں، اس کے لئے ایک انتظام تو ظاہراً یہ کیا کہ خود ان بھائیوں سے کہا ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ، یعنی جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی باپ شریک کو بھی لے کر آنا، تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح پورا پورا غلہ دیتا ہوں اور کس طرح مہمانی کرتا ہوں۔

اور ساتھ ہی یک دھمکی بھی دیدی فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ، یعنی اگر تم اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو پھر میں تم میں سے کسی کو بھی غلہ نہ دوں گا، (کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے) اس طرح تم میرے پاس نہ آنا۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر

ادا کیا تھا اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ انکو اس وقت پتہ نہ لگے تاکہ جب گھر پہنچکر سامان کھولیں اور اپنا نقد و زیور بھی نکلے تو پھر دوبارہ غلہ لینے کیلئے آسکیں۔

ابن کثیر نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل میں کئی احتمال بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ یوسف علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کے پاس اس نقد و زیور وغیرہ کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر دوبارہ غلہ لینے کے لئے نہیں آسکیں گے، دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد اور بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا گوارا نہ ہو، اس لئے شاہی خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کر دیا ان کی رقم ان کو واپس کردی، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واپس شدہ سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

بہرحال یوسف علیہ السلام نے یہ سب انتظامات اس لئے کئے کہ آئندہ بھی بھائیوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہے اور چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات بھی ہو جائے۔

مسائل و فوائد

یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے اس کا جواز معلوم ہوا کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ اگر حکومت نظم قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہو جائیں تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب قیمت مقرر کرسکتی ہے، حضرات فقہاء امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

یوسف علیہ السلام کا اپنے حالات سے والد کو اطلاع نہ دینا بامر الٰہی تھا

یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے، اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں، باپ سے فطری اور طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں، لیکن چالیس سال کے طویل زمانہ میں ایک مرتبہ بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہونچا دیں خبر پہونچا دینا تو اس حالت میں بھی کچھ بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہونچ گئے تھے، پھر عزیز مصر کے گھر میں تو ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے، اس وقت کسی ذریعہ سے گھر تک خط یا خبر پہونچا دینا کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں ادھر

کی اُدھر پہونچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملکِ مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اُس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہئے تھا، اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی۔

لیکن پیغمبر خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہو، اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کے بغیر رخصت کر دیا۔

یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصور نہیں ہو سکتے، اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ہمیشہ یہی جواب دل میں آیا کرتا تھا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہوگا، تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی، کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو وہی جانتے ہیں، انسان ان کا کیا احاطہ کر سکتا ہے، کبھی کوئی چیز کسی کی سمجھ میں بھی آجاتی ہے، یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جا رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا، بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے، تو اس کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہونچتے، تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا، اور پھر مدتوں کے بعد انھوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ "جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو"، جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرما دیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی ہم سے بھرتی،

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ

سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں، کہا میں کیا

آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَآ أَمِنتُكُمْ عَلَىٰٓ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَٱللَّهُ خَيْرٌ

اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے سو اللہ بہتر

حَٰفِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَمَّا فَتَحُوا۟ مَتَٰعَهُمْ

ہے نگہبان اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان اور جب کھولی اپنی چیز بست

وَجَدُوا۟ بِضَٰعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا۟ يَٰٓأَبَانَا مَا نَبْغِى ۖ

پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی اُن کی طرف، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہئے،

هَٰذِهِۦ بِضَٰعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا

یہ پونجی ہماری پھیر دی ہے ہم کو، اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خبرداری کریں گے اپنے

وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُۥ

بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی، وہ بھرتی آسان ہے، کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو

مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ ٱللَّهِ لَتَأْتُنَّنِى بِهِۦٓ إِلَّآ أَن

تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ

يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّآ ءَاتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ ٱللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾

گھیرے جاؤ تم سب، پھر جب دیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

غرض جب لوٹ کر اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے ابا (ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلہ بھی ملا مگر بنیامین کا حصہ نہیں ملا، بلکہ بدون بنیامین کے ساتھ جائے ہوئے آئندہ بھی) ہمارے لئے مطلق غلہ کی بندش کر دی گئی سو (اس صورت میں ضروری ہے کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ (دوبارہ غلہ لانے سے جو امر مانع ہے وہ مرتفع ہو جاوے اور) ہم (بھی) غلہ لا سکیں اور (اگر ان کے بھیجنے سے آپ کو کوئی اندیشہ مانع ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ) ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تمہارا اعتبار کر چکا ہوں (یعنی دل تو میرا گواہی دیتا نہیں مگر تم کہتے ہو کہ بدون اس کے گئے ہوئے آئندہ

غلّہ نہ ملے گا، اور عادۃً زندگی کا مدار غلہ ہی پر ہے اور جان بچانا فرض ہے) سو (خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو)
اللہ (کے سپرد وہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہے (میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب
مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (میری محبت اور شفقت سے کیا ہوتا ہے) اور (اس گفتگو کے
بعد) جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا تو (اس میں) ان کی جمع پونجی (بھی) ملی کہ ان ہی کو واپس
کردی گئی، کہنے لگے کہ اے ابا (لیجئے) اور ہم کو کیا چاہئے یہ ہماری جمع پونجی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی
گئی (ایسا کریم بادشاہ ہے، اور اس سے زیادہ کس عنایت کا انتظار کریں، یہ عنایت بس ہے، اس کا
مقتضی بھی یہی ہے کہ ایسے کریم بادشاہ کے پاس پھر جائیں، اور وہ موقوف ہے بھائی کے ساتھ لیجانے
پر، اس لئے اجازت ہی دیدیجئے ان کو ساتھ لے جائیں گے) اور اپنے گھر والوں کیواسطے (اور)
رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت رکھیں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اور زیادہ
لائیں گے، (کیونکہ جس قدر اس دفعہ لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلہ ہے (جلدی ختم ہوجائے گا،
پھر اور ضرورت ہوگی، اور اس کا ملنا موقوف ہے انکے لیجانے پر) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (خیر
اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں، لیکن) اسوقت تک ہرگز اسکو تمہارے ہمراہ نہ بھیجونگا جب تک کہ اللہ
کی قسم کھاکر مجھ کو پکا قول نہ دوگے کہ تم اسکو ضرور لے ہی آؤگے ہاں، اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے (چنانچہ
سب نے اس پر قسم کھالی) سو جب وہ قسم کھاکر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات
چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے (یعنی وہی ہمارے قول واقرار کا گواہ ہے [illegible] ہے اور وہی
اس قول کو پورا کرسکتا ہے، پس اس کہنے سے دو غرض ہوئیں، اوّل انکو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب
اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر وناظر سمجھنے سے یہ بات ہوتی ہے، اور دوسرے اس تدبیر کا منتہیٰ تقدیر
کو قرار دینا کہ توکل کا حاصل ہے، اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دیدی، غرض
دوبارہ مصر کے سفر کو مع بنیامین سب تیار ہوگئے)؛

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں واقعہ کا بقیہ حصہ اس طرح مذکور ہے کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام مصر سے غلہ لے کر گھر واپس آئے تو مصر کے معاملہ کا تذکرہ والد ماجد سے کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ عزیز مصر نے آئندہ کے لئے ہمیں غلہ دینے کے لئے یہ شرط کردی ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لاؤ گے تو ملے گا ورنہ نہیں، اس لئے آپ آئندہ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہمیں آئندہ بھی غلہ مل سکے، اور ہم اس بھائی کی تو پوری حفاظت کرنے والے ہیں، ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔

والد ماجد نے فرمایا کہ کیا ان کے بارے میں تم پر ایسا ہی اطمینان کر دوں جیسا اس سے پہلے ان کے بھائی یوسف کے بارہ میں کیا تھا، مطلب ظاہر ہے کہ اب تمہاری بات کا اعتبار کیا ہے ایک مرتبہ تم پر اطمینان کر کے مصیبت اٹھا چکا ہوں تم نے یہی الفاظ حفاظت کرنے کے اس وقت بھی بولے تھے یہ تو ان کی بات کا جواب تھا، مگر پھر خاندان کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبرانہ توکل اور اس حقیقت کو اصل قرار دیا کہ کوئی نفع نقصان کسی بندہ کے ہاتھ میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت وارادہ نہ ہو اور جب ان کا ارادہ ہو جائے تو پھر اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس لئے مخلوق پر بھروسہ بھی غلط ہے، اور ان کی شکایات پر معاملہ کا مدار رکھنا بھی نامناسب ہے۔

اس لئے فرمایا فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا، یعنی تمہاری حفاظت کا نتیجہ تو پہلے دیکھ چکا ہوں، اب تو میں اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کرتا ہوں وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ، اور وہ سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے، اسی سے امید ہے کہ وہ میری ضعیفی اور موجودہ غم واندوہ پر نظر فرما کر مجھ پر دوہرے صدمے نہ ڈالے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ظاہری حالات اور اپنی اولاد کے عہد وپیمان پر بھروسہ نہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ۔

یعنی اب تک تو برادران یوسف علیہ السلام کی یہ ابتدائی گفتگو حالات سفر بیان کرنے کے دوران میں ہو رہی تھی، ابھی سامان کھولا نہ تھا، اس کے بعد جب سامان کھولا اور دیکھا کہ ان کی وہ پونجی جو غلہ کی قیمت میں ادا کر کے آئے تھے وہ بھی سامان کے اندر موجود ہے تو اس وقت انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام سہواً نہیں ہوا بلکہ قصداً ہماری پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اسی لئے رُدَّتْ اِلَيْنَا کہا، یعنی یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اور پھر والد محترم سے عرض کیا مَا نَبْغِيْ یعنی ہمیں اور کیا چاہئے کہ غلہ بھی آ گیا اور اس کی قیمت بھی واپس مل گئی، اب تو ہمیں ضرور دوبارہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اطمینان سے جانا چاہئے، کیونکہ اس معاملہ سے معلوم ہوا کہ عزیز مصر ہم پر بہت مہربان ہیں، اس لئے کوئی اندیشہ نہیں، ہم اپنے خاندان کے لئے غلہ لائیں اور بھائی کی بھی حفاظت سے رکھیں، اور بھائی کے حصہ کا غلہ مزید مل جائے، کیونکہ ہم جو کچھ لائے ہیں یہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے، چند روز میں ختم ہو جائے گا۔

برادرانِ یوسفؑ نے جو یہ جملہ مَا نَبْغِيْ کہا، اس کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ابھی بتلایا گیا کہ ہمیں اس سے زیادہ کیا چاہیے، اور اس جملہ میں حرف مَا کو نفی کے معنی میں لیا جائے تو یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اولاد یعقوب علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ اب تو ہمارے پاس غلہ لانے کے لئے قیمت موجود ہے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے، آپ صرف بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔

والد محترم نے یہ سب باتیں سنکر جواب دیا، لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖ، "یعنی میں بنیامین کو تمھارے ساتھ اس وقت تک نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ تعالیٰ کی قسم اور یہ عہد و پیمان مجھے نہ دیدو کہ تم اس کو ضرور اپنے ساتھ واپس لاؤ گے" مگر چونکہ حقیقت بین نظروں سے یہ بات کسی وقت غائب نہیں ہوتی کہ انسان بیچارہ ظاہری قوت و قدرت کتنی ہی رکھتا ہو پھر بھی ہر چیز میں مجبور اور قدرتِ حق جل شانہ کے سامنے عاجز ہے وہ کسی شخص کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کا عہد و پیمان ہی کیا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اس پر مکمل قدرت نہیں رکھتا، اس لئے اس عہد و پیمان کے ساتھ ایک استثناء بھی لگا دیا: اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ، یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گھیرے میں آجاؤ، امام تفسیر مجاہدؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ، اور قتادہؒ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ۔

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ، یعنی جب صاحبزادوں نے مطلوبہ طریقہ پر عہد و پیمان کر لیا، یعنی سب نے قسمیں کھائیں اور والد کو اطمینان دلانے کیلئے بڑی شدت سے حلف کئے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کی حفاظت کے لئے حلف دینے اور حلف اٹھانے کا جو کام ہم کر رہے ہیں اس سب معاملہ کا بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، اسی کی توفیق سے کوئی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے، ورنہ انسان بے بس ہے، اس کے ذاتی قبضہ قدرت میں کچھ نہیں۔

ہدایات و مسائل

مذکورہ آیات میں انسان کے لئے بہت سی ہدایات اور احکام ہیں ان کو یاد رکھئے:

اولاد سے گناہ و خطا ہو جائے تو قطع تعلق کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرنا چاہئے

پہلی ہدایت: برادرانِ یوسف علیہ السلام سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرہ اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اوّل جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھیجدیں، دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی، تیسرے چھوٹے معصوم بھائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف

والد کی انتہائی دل آزاری کی پروا نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً و ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضیٰ بظاہر یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی خدمت میں رہے یہاں تک کہ انھیں کو مصر سے غلّہ لانے کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کو چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض کرنے کا موقع ملا اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی ان کے حوالہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ و خطا سرزد ہو جائے تو باپ کو چاہئے کہ تربیت کر کے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور جب تک اصلاح کی امید ہو قطع تعلق نہ کرے، جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور گناہوں سے تائب ہوئے، ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کر لینا مناسب ہے۔

دوسری ہدایت : اس حسنِ معاملہ اور حسنِ خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے اتنے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرأت کر سکے۔

تیسری ہدایت یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطاکار کو جتلا دینا بھی مناسب ہے کہ تمہارے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگذر کرتے ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہو کر اس سے کلی طور پر تائب ہو جائے، جیسے کہ یعقوب علیہ السلام نے اول جتلایا، کہ کیا بنیامین کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کر لوں جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا، مگر جتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کر کے اللہ پر توکل کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کر دیا۔

چوتھی ہدایت یہ ہے کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے، وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے، اسی لئے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے

کہنے پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قسم ہے میری عزت و جلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

پانچواں مسئلہ اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں نکلے اور قرائنِ قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کے لئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے، تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جیسے یہ پونجی جو برادرانِ یوسف کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرائنِ قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رقم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں ملک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہئے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح سالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابۂ کرام سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگا دی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

ساتواں مسئلہ اس میں یہ ہے کہ برادرانِ یوسف سے عہد و پیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالہ بالنفس جائز ہے، یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے۔

اس مسئلہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے، وہ صرف مالی ضمانت کو جائز رکھتے ہیں، نفسِ انسانی کی ضمانت کو جائز نہیں رکھتے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ

اور کہا اے بیٹو! نہ داخل ہونا ایک دروازے سے، اور داخل ہونا کئی دروازوں

اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ

سے جدا جدا، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے،

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ چاہئے بھروسہ

الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم

کرنے والوں کو، اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے

مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ

کچھ نہیں بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے

يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ

جی میں سو پوری کر لی، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے سکھا یا اس کو لیکن بہت لوگوں کو

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ

خبر نہیں، اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس

إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا

رکھا اپنے بھائی کو، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے

يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

جو انھوں نے کئے ہیں۔

ع ۸

خلاصہ تفسیر

اور (چلتے وقت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو! (جب مصر میں پہنچو تو) سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا اور (یہ محض ایک تدبیر ظاہری ہے بعض مکروہات مثل نظر بد وغیرہ سے بچنے کی باقی) خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا (چلتا) ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے، (یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا تدبیر پر نظر مت کرنا، غرض سب رخصت ہو کر چلے) اور جب (مصر پہونچ کر) جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا اسی طرح شہر کے اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا (باقی) ان کے باپ کو ان سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا، تاکہ ان پر کسی قسم کا اعتراض اس تدبیر کے نافع نہ ہونے سے اور شبہ لازم آئے جب کہ خود انھوں نے ہی فرما دیا تھا ما اُغنی عنکم، لیکن یعقوب (علیہ السلام) کے جی میں

(و جہ تدبیر میں) ایک ارمان (آیا) تھا جسکو انھوں نے ظاہر کردیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے انکو علم دیا تھا (وہ علم کے خلاف تدبیر کو اعتقاداً موثر حقیقی کب سمجھ سکتے تھے، صرف ان کے اس قول کی وجہ وہی عملاً ایک تدبیر کا ارتکاب تھا جو کہ مشروع و محمود ہے) لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے (بلکہ جہل سے تدبیر کو موثر حقیقی اعتقاد کر لیتے ہیں) اور جب یہ لوگ (یعنی برادران یوسف) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے (اور بنیامین کو پیش کر کے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے موافق ان کو لائے ہیں) انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں ان سے) کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا رنج مت کرنا (کیونکہ اب تو اللہ نے ہم کو ملا دیا اب سب غم بھلا دینا چاہئے، یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی تو ظاہر اور مشہور ہے، رہا بنیامین کے ساتھ، سو یا تو ان کو بھی کچھ تکلیف دی ہو، ورنہ یوسف علیہ السلام کی جدائی کیا ان کے حق میں کچھ کم تکلیف تھی، پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ بنیامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہیں کیونکہ ویسے رہنے میں تو اور بھائیوں کا بوجہ عہد و سوگند کے اصرار ہوگا نہ حق جھگڑا ہوگا، اور پھر اگر وجہ بھی ظاہر ہوگئی تو راز کھلا، اور اگر مخفی رہی تو یعقوب علیہ السلام کا رنج بڑھے گا کہ بلا سبب کیوں رکھے گئے، یا کیوں رہے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تدبیر تو ہے مگر ذرا تمہاری بدنامی ہے، بنیامین نے کہا کچھ پرواہ نہیں، غرض ان میں یہ امر قرار پا گیا، اور ادھر سب کو غلہ دے کر ان کی رخصت کا سامان درست کیا گیا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں برادران یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جا رہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے سب داخل نہ ہونا، بلکہ شہر پناہ کے پاس پہونچ کر متفرق ہو جا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند قد آور صاحب جمال و صاحب وجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے، جس سے ان کو کوئی تکلیف پہونچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے ہی سفر میں ملکِ مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا جس سے عام ارکانِ دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہوگیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہوگیا کہ کسی کی نظر لگ جائے، یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہوجانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے، محض جاہلانہ وہم و خیال نہیں، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصدیق فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی اور اُمت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کل عین لامّۃ بھی مذکور ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے (قرطبی)

صحابۂ کرام میں سہل بن حُنیف کا واقعہ معروف ہے، کہ انھوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کے لئے کپڑے اُتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حُنیف کو سخت بخار چڑھ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں، یہ پانی سہل بن حُنیف کے بدن پر ڈالا جائے، ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے اس پر روانہ ہوگئے، اس واقعہ میں آپؐ نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علام یقتل احدکم اخاہ الا برکت ان العین حقٌ ،	"کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے، تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب

ان کا بدن تمھیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعا کر لیتے، نظر کا اثر ہو جانا حق ہے"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان و مال میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہیئے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے کہ

اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمادیں، بعض روایات میں ہے کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ، کہے، اس سے نظر بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسالہ اس کے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہونچ جانا حق ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں، دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بنا پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات واوہام کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان دمال میں ایک قسم کا مسمریزم ہے، اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کر دیتی ہے، گرمی، سردی کی شدت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح نظر بد یا مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت و ارادہ کے تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہو سکتی ہے، نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَآ أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝ یعنی نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر میں نے بتلائی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کو نہیں ٹال سکتی، حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے، البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے، اس لئے یہ وصیت کی گئی، مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے، ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہو گئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا، ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام

ہوگئی، اگرچہ نظرِ بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقدیرِ الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کرسکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا، اور بڑی عافیت و عزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

اسی مضمون کا بیان اس کے بعد کی آیت میں اس طرح آیا کہ صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی، شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے، تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا، ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی، مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت و محبت کا تقاضا تھا جو انھوں نے پورا کرلیا۔

اس آیت کے آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مدح ان الفاظ میں کی گئی کہ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، یعنی یعقوب علیہ السلام بڑے علم والے تھے، کیونکہ ان کو ہم نے علم دیا تھا، مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح ان کا علم کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ بلاواسطہ عطاءِ خداوندی اور وہبی علم تھا، اسی لئے انھوں نے ظاہری تدبیر جو شرعاً مشروع اور محمود ہے وہ تو کرلی، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا، مگر بہت سے لوگ اس بات کی حقیقت کو نہیں جانتے اور ناواقفیت سے یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ایسے شبہات میں مبتلا ہوجاتے ہیں، کہ یہ تدبیریں پیغمبر کی شان کے شایاں نہ تھیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں لفظ علم سے مراد علم کے مقتضٰی پر عمل کرنا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو علم ان کو عطا کیا وہ اس پر عامل اور اس کے پابند تھے، اسی لئے ظاہری تدبیروں پر بھروسہ نہیں فرمایا، بلکہ اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر فرمایا۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی جب شہر مصر پہونچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا، امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لئے فرمایا، جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام

نے حقیقی بھائی پر راز فاش کردیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اب تم کوئی فکر نہ کرو، اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

احکام و مسائل

مذکورہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے:

اول یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شانِ انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کردے، اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلادے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظرِ بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر بارک اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے، تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

چھٹے یہ کہ نظرِ بد سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعاء اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتویں یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے دانائے رومؒ نے فرمایا ع "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"

یہی پیغمبرانہ توکل اور سنتِ رسولؐ ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو تو بلانے کے لئے بھی کوشش اور تاکید کی، اور پھر جب وہ آگئے تو ان پر اپنا راز بھی

ظاہر کر دیا، مگر والد محترم کے یہاں آنے کی فکر فرمائی اور نہ ان کو اپنی خیریت سے مطلع کرنے کا کوئی اقدام کیا، اس کی وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے کہ اس پورے چالیس سال کے عرصہ میں بہت سے مواقع تھے کہ والد ماجد کو اپنے حال اور خیریت کی اطلاع دیدیتے، لیکن یہ جو کچھ ہوا وہ بحکم قضاء و قدر باشاراتِ وحی ہوا، ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ ملی ہوگی کہ والد محترم کو حالات سے باخبر کیا جائے، کیونکہ ابھی ان کا ایک اور امتحان بنیامین کی مفارقت کے ذریعہ بھی ہونے والا تھا، اس کی تکمیل ہی کے لئے یہ سب صورتیں پیدا کی گئیں

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے

ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَ

پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو۔ کہنے لگے منہ

أَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہو گئی۔ بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ

وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوا تَاللَّهِ

اور جو کوئی اس کو لے کر آوے اس کو ملے ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن۔ بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾

تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے۔

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾ قَالُوا جَزَاؤُهُ

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے۔ کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے

مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي

کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آوے وہی اس کے بدلے میں جاوے، ہم یہی سزا دیتے ہیں

الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ

ظالموں کو۔ پھر شروع کی یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے آخر کو وہ

اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ

برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے۔ یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ

وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے، مگر جو چاہے اللہ

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾

ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا۔

خلاصۂ تفسیر

پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ اور روانگی کا) تیار کردیا تو (خود یا کسی معتمد کی معرفت) پانی پینے کا برتن (کہ وہی پیمانہ غلہ دینے کا بھی تھا) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر (جب یہ لدپھاند کر چلے تو یوسف علیہ السلام کے حکم سے) پیچھے سے ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو، وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے (جس کی چوری کا ہم پر شبہ ہوا) انھوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہے) اور جو شخص اس کو (لاکر) حاضر کرے اس کو ایک بار شتر غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا (اور یا یہ مطلب ہو کہ اگر خود چور بھی مال دیدے تو عفو کے بعد انعام پائے گا) اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں (غالباً یہ ندا اور یہ وعدہ انعام بحکم یوسف علیہ السلام ہوگا) یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے (جس میں چوری بھی داخل ہے) نہیں آئے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں (یعنی ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے) ان (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے نکلے (اور تم میں سے کسی پر سرقہ ثابت ہوگیا) تو اس (چور) کی کیا سزا ہے انھوں نے (موافق شریعت یعقوب علیہ السلام کے) جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں سے ملے پس وہی اپنی سزا ہے (یعنی چوری کی عوض میں خود اس کی ذات کو صاحب مال اپنا غلام بنا لے) ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی ہماری شریعت میں یہی مسئلہ اور عمل ہے، غرض یہ امور باہم ٹھہرنے کے بعد اسباب اتروایا گیا، پھر (تلاشی کے وقت) یوسف (علیہ السلام) نے (خود یا کسی معتمد کی معرفت) اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتداء اول دوسرے بھائیوں کے (اسباب کے) تھیلوں سے کی پھر (اخیر میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے برآمد کیا، ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح (بنیامین کے رکھنے کی) تدبیر فرمائی (وجہ اس تدبیر کی یہ ہوئی کہ) یوسف اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر

کے قانون کی رُو سے نہیں لے سکتے تھے، کیونکہ اس کے قانون میں کچھ تادیب و جرمانہ تھا (روی الطبرانی عن معمر والاول فی روح المعانی، مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور تھا (اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ تدبیر آئی، اور ان لوگوں کے منہ سے یہ فتویٰ نکلا، اور اس مجموعہ سے تدبیر راست آگئی اور چونکہ یہ حقیقۃً غلام بنانا نہ تھا بلکہ بنیامین کی خوشی سے صورت غلامی کی اختیار کی تھی، اس لئے استرقاق حُر کا شبہ لازم نہیں آیا، اور گو یوسف علیہ السلام بڑے عالم و عاقل تھے، مگر پھر بھی ہماری تدبیر سکھانے کے محتاج تھے، بلکہ) ہم جس کو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں، اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے، (یعنی اللہ تعالیٰ جب مخلوق کا علم ناقص ٹھہرا اور علم خالق کا کامل تو لامحالہ ہر مخلوق اپنے علم میں اور تدبیر میں محتاج ہوگی خالق کی، اس لئے کِدْنَا اور اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کہا گیا، حاصل یہ کہ جب اُن کے اسباب سے وہ برتن برآمد ہوگیا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعدہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔

بنیامین کے لئے جو غلہ اونٹ پر لادا گیا اس میں ایک برتن چھپا دیا گیا، اس برتن کو قرآن کریم نے ایک جگہ بلفظ سِقَايَة اور دوسری جگہ صُوَاعَ الْمَلِكِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، سقایہ کے معنی پانی پینے کا برتن اور صُواع بھی اسی طرح کے برتن کو کہتے ہیں، اس کو مَلِک کی طرف منسوب کرنے سے اتنی بات اور معلوم ہوئی کہ یہ برتن کوئی خاص قیمت اور حیثیت رکھتا تھا، بعض روایات میں ہے کہ زبرجد کا بنا ہوا تھا، بعض نے سونے کا بعض نے چاندی کا بتلایا ہے، بہرحال یہ برتن جو بنیامین کے سامان میں چھپا دیا گیا تھا خاصہ قیمتی برتن ہونے کے علاوہ مَلِکِ مصر سے کوئی اختصاص بھی رکھتا تھا، خواہ یہ کہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے یا یہ کہ مَلِک نے بامر خود اس برتن کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ، یعنی کچھ دیر کے بعد ایک منادی کرنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو"

یہاں لفظ ثُمَّ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منادی فوراً ہی نہیں کی گئی، بلکہ کچھ مہلت دی گئی یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہوگیا اس کے بعد یہ منادی کی گئی تاکہ کسی کو جعلسازی کا شبہ نہ ہو جائے

بہرحال اس منادی کرنے والے نے برادرانِ یوسفؑ کے قافلہ کو چور قرار دیدیا۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ، یعنی برادرانِ یوسف منادی کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم ہمیں چور بنا رہے ہو، یہ تو کہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے؟"

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاۗءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ، "منادی کرنے والوں نے کہا کہ بادشاہ کا صُوَاع یعنی برتن گم ہوگیا ہے اور جو شخص اس کو کہیں سے برآمد کرے گا اس کو ایک اونٹ بھر غلہ انعام میں ملے گا، اور میں اس کا ذمہ دار ہوں"

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا، جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد بر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟

دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ جعلسازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی، اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو، یہ سب کام ناجائز ہیں، اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہوگئے، تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے، مجھے اپنے پاس رکھئے، یوسف علیہ السلام نے اول یہی عذر کیا کہ اگر تم یہاں رُک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا، دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں، اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں، بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہوگئے۔

لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہو جانے سے تو جائز نہیں ہو سکتا، اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم و اجازت سے نہ ہوگا، ایک بے دلیل دعویٰ اور صورت واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے، اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا اس لئے ان کو چور کہا گیا، یہ بھی ایک تاویل ہی، اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے، کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا،

نہ یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا، بلکہ یہ سب کام بامرِ آلہی اس کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے، جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل ہو رہی تھی، اس جواب کی طرف خود قرآن کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ یعنی ہم نے اس طرح تدبیر کی یوسف کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی۔

اس آیت میں واضح طور پر اس حیلہ و تدبیر کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، کہ یہ سب کام جب کہ بامرِ خداوندی ہوئے تو ان کو ناجائز کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے، ان کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا، لڑکے کو قتل کرنا وغیرہ، جو بظاہر گناہ تھے، اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نکیر کیا، مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام باذن خداوندی خاص مصالح کے تحت کر رہے تھے، اس لئے ان کا کوئی گناہ نہ تھا، قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ، یعنی جب شاہی منادی نے برادرانِ یوسف پر چوری کا الزام لگایا تو انھوں نے کہا کہ ارکانِ دولت بھی خود ہمارے حالات سے واقف ہیں کہ ہم کوئی فساد کرنے یہاں نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں"

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ، یعنی شاہی ملازمین نے کہا کہ اگر تمھارا جھوٹ ثابت ہو جائے تو بتلاؤ کہ چور کی کیا سزا ہے"، قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ "یعنی برادرانِ یوسف نے کہا کہ جس شخص کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو وہ شخص خود ہی اس کی جزا ہے، ہم چوروں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ شریعتِ یعقوب علیہ السلام میں چور کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کا مال چرایا ہے وہ شخص اس چور کو اپنا غلام بنا کر رکھے، سرکاری ملازمین نے اس طرح خود برادرانِ یوسف سے چور کی سزا شریعتِ یعقوبی کے مطابق معلوم کر کے ان کو اس کا پابند کر دیا کہ بنیامین کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو تو وہ اپنے ہی فیصلہ کے مطابق بنیامین کو یوسف علیہ السلام کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ، "یعنی سرکاری تفتیش کرنے والوں نے اصل سازش پر پردہ ڈالنے کے لئے پہلے سب بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی، پہلے ہی بنیامین کا سامان نہیں کھولا تاکہ ان کو شبہ نہ ہو جائے"

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ، "یعنی آخر میں بنیامین کا سامان کھولا گیا تو اس میں سے صواع الملک کو برآمد کر لیا"، اس وقت تو سب بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں، اور بنیامین کو سخت سُست کہنے لگے کہ تو نے ہمارا منہ کالا کر دیا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ یعنی اس طرح ہم نے تدبیر کی یوسف کے لئے، وہ اپنے بھائی کو شاہ مصر کے قانون کے ماتحت گرفتار نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مصر کا قانون چور کے متعلق یہ تھا کہ چور کو مار پیٹ کی سزا دیکر اور مال مسروقہ سے دوگنی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیا جائے مگر انہوں نے یہاں برادرانِ یوسف ہی سے چور کا حکم شریعتِ یعقوبی کے مطابق دریافت کر لیا تھا، اس کی رُو سے بنیامین کو اپنے پاس روک لینا صحیح ہوگیا، اس طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے یوسف علیہ السلام کی یہ مراد بھی پوری ہوگئی نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ؀ "یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، جیسے اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں کے مقابلہ میں بلند کر دیئے گئے، اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے"،

مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے، بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا ہی کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا تو پھر ربّ العزت جل شانہٗ کا علم تو سب سے بالاتر ہے ہی۔

احکام و مسائل

آیاتِ مذکورہ سے چند احکام و مسائل حاصل ہوئے:

اوّل بآیت وَلِمَنْ جَاۗءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ سے ثابت ہوا کہ کسی معین کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دیا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر انعام یا اجرت ملے گی، جیسے اشتہاری مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورتِ معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق نہیں آتی، مگر اس آیت کی رُو سے اس کا بھی جواز ثابت ہوگیا (قرطبی)

دوسرے اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے، اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ صاحبِ حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی چاہے وصول کر سکتا ہے، ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہوگا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا ہے وہ اصل مدیون سے وصول کرے (قرطبی خذ ذلک)

تیسرے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بنا پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصطلاح میں حیلۂ شرعیہ کہا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے، شرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم

نہ آتا ہو، ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے یہ باتفاق حرام ہے، ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض قوموں پر عذاب بھی آیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے، اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہوجاتا بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے، ایک اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جعل سازی کا مرادف ہے، اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں ثابت کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے تب آہستہ سے کہا یوسف

فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ

نے اپنے جی میں اور ان کو نہ جتایا کہا جی میں تم بدتر ہو درجہ میں اور اللہ

اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا

خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو، کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بہت بوڑھا

كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

بڑی عمر کا، سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ، ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا،

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ

تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے، پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو،

قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا

بولا ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے عہد

مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ

اللہ کا اور پہلے جو قصور کرچکے ہو یوسف کے حق میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا

الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ

اس ملک سے جب تک کہ حکم دے مجھ کو میرا باپ یا فیصلہ کرے اللہ میری طرف اور وہ ہے سب سے بہتر

الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ

چکانے والا، پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو

سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

چوری کی، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا

وَسْــَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ

اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں،

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

کہنے لگے کہ صاحب، اگر اس نے چوری کی تو (تعجب نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی (تھا وہ) بھی (اسی طرح) اس کے پہلے چوری کر چکا ہے (جس کا قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کی پھوپھی پرورش کرتی تھیں، جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام نے لینا چاہا، وہ ان کو چاہتی بہت تھیں انہوں نے ان کو رکھنا چاہا، اس لئے انھوں نے ان کی کمر میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا، اور سب کی تلاشی لی تو ان کی کمر میں نکلا، اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو پھوپھی کے قبضہ میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ ان کی پھوپھی نے وفات پائی، پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آ گئے اھ، اور ممکن ہے یہ صورت استرقاق کی بھی یوسفؑ کی رضامندی سے ہوئی ہو، اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بننا لازم نہیں آیا اور ہر چند کہ قرائن و اخلاق یوسفیہ میں ذرا تامل کرنے سے آپ کی برأت اس فعل سے یقیناً معلوم تھی مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی) پس یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے) ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ برے ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقت سرقہ صادر نہیں ہوا، اور تم نے تو اتنا بڑا کام کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تم نے آدمی غائب کر دیا، کہ مجھ کو باپ سے بچھڑا دیا، اور ظاہر ہے کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت جرم ہے) اور جو کچھ تم (ہم دونوں بھائیوں

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر دو بھران کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے اُن پر چوری کا جرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا، تو شرم سے اُن کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے:

اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ یعنی اگر اس نے چوری کر لی تو کچھ زیادہ تعجب نہیں اس کا ایک بھائی تھا جس نے بھی اسی طرح اس سے پہلے چوری کی تھی"، مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں، علاتی ہے، اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت خود یوسف علیہ السلام پر بھی چوری کا الزام لگا دیا جس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بچپن میں پیش آیا تھا، جس میں ٹھیک اسی طرح جیسے یہاں بنیامین پر چوری کا الزام لگانے کی سازش کی گئی ہے، اس وقت یوسف علیہ السلام پر ان کی بے خبری میں ایسی ہی سازش کی گئی تھی، اور یہ سب بھائیوں کو پوری طرح معلوم تھا کہ یوسف علیہ السلام اس الزام سے بالکل بری ہیں، مگر اس وقت بنیامین پر غصہ کی وجہ سے، اُس واقعہ کو بھی چوری کا قرار دے کر اس کا الزام ان کے بھائی یوسفؑ پر لگا دیا ہے۔

وہ واقعہ کیا تھا اس میں روایات مختلف ہیں، ابن کثیرؒ نے بحوالہ محمد بن اسحاق مجاہدؒ (امام تفسیر) سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنیامین پیدا ہوئے تو یہ ولادت ہی والدہ کی موت کا سبب بن گئی، یوسفؑ اور بنیامین دونوں بھائی بغیر ماں کے رہ گئے، تو ان کی تربیت و حضانت ان کی پھوپھی کی گود میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بچپن سے ہی کچھ ایسی شان عطا فرمائی تھی کہ جو دیکھتا ان سے بے حد محبت کرنے لگتا تھا، پھوپی کا بھی یہی حال تھا کہ کسی وقت اُن کو نظروں سے غائب کرنے پر قادر نہ تھیں، دوسری طرف والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، مگر بہت چھوٹا ہونے کی بنا پر ضرورت اس کی تھی کہ کسی عورت کی نگرانی میں رکھا جائے، اس لئے پھوپی کے حوالے کر دیا تھا، اب جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کا ارادہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھیں، پھوپی سے کہا تو انھوں نے عذر کیا، پھر زیادہ اصرار پر مجبور ہو کر یوسف علیہ السلام کو ان کے

والد کے حوالے تو کر دیا مگر ایک تدبیر ان کو واپس لینے کی یہ کر دی کہ پھوپی کے پاس ایک پٹکا تھا، جو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف سے ان کو پہنچا تھا اور اس کی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی، یہ پٹکا پھوپی نے یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے کمر پر باندھ دیا۔

یوسف علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ شہرت دی کہ میرا پٹکا چوری ہو گیا، پھر تلاشی لی گئی تو وہ یوسفؑ کے پاس نکلا، شریعتِ یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق اب پھوپی کو یہ حق ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا مملوک بنا کر رکھیں، یعقوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے پھوپی یوسفؑ کی مالک بن گئی، تو ان کے حوالے کر دیا، اور جب تک پھوپی زندہ رہیں یوسف علیہ السلام انہی کی تربیت میں رہے۔

یہ واقعہ تھا جس میں چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگا، اور پھر ہر شخص پر حقیقتِ حال روشن ہو گئی، کہ یوسف علیہ السلام چوری کے ادنیٰ شبہ سے بھی بری ہیں، پھوپھی کی محبت نے ان سے یہ سازش کا جال پھیلوایا تھا، بھائیوں کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی، اس کی بنا پر کسی طرح زیبا نہ تھا کہ ان کی طرف چوری کو منسوب کرتے، مگر ان کے حق میں بھائیوں کی جو زیادتی اور بے راہ روی ابتک ہوتی چلی آئی تھی یہ بھی اسی کا ایک آخری جزء تھا۔

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ”یعنی یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی یہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی، کہ یہ لوگ اب تک بھی میرے درپے ہیں کہ چوری کا الزام لگا رہے ہیں، مگر اس کا اظہار بھائیوں پر نہیں ہونے دیا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی ہے اور اس سے کچھ اثر لیا ہے۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ”یوسف علیہ السلام نے (اپنے دل میں) کہا کہ تم لوگ ہی بُرے درجہ اور بُرے حال میں ہو کہ بھائی پر چوری کی تہمت جان بوجھ کر لگاتے ہو، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والے ہیں، کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط“، پہلا جملہ تو دل میں کہا گیا ہے، یہ دوسرا جملہ ممکن ہے کہ بھائیوں کے جواب میں اعلاناً کہہ دیا ہو۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ، برادرانِ یوسف نے جب دیکھا کہ کوئی بات چلتی نہیں اور بنیامین کو یہاں چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تو عزیزِ مصر کی خوشامد شروع کی، اور یہ درخواست کی کہ اس کے والد بہت بوڑھے ہیں اور ضعیف ہیں (اس کی مفارقت ان سے برداشت نہ ہوگی) اس لئے آپ اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی کو گرفتار کر لیں، یہ درخواست آپ سے ہم اس امید پر

کر رہے ہیں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بہت احسان کرنے والے ہیں، یا یہ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمایا ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی درخواست کا جواب ضابطہ کے مطابق یہ دیا کہ یہ بات تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ جس کو چاہیں پکڑ لیں، بلکہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہوا اگر اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں تو ہم تمہارے ہی فتوے و فیصلے کے مطابق ظالم ہو جائیں گے، کیونکہ تم نے ہی یہ کہا ہے کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہ ہی اس کی جزاء ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا، یعنی جب برادرانِ یوسف بنیامین کی رہائی سے مایوس ہو گئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہو گئے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ ان کے بڑے بھائی نے کہا کہ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے بنیامین کے واپس لانے کا پختہ عہد لیا تھا، اور یہ کہ تم اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے معاملہ میں ایک قصور اور غلطی کر چکے ہو، اس لئے میں تو اب مصر کی زمین کو اس وقت تک نہ چھوڑونگا جب تک میرے والد خود ہی مجھے یہاں سے واپس آنے کا حکم نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم کرنے والے ہیں۔

یہ بڑے بھائی جن کا کلام بیان ہوا ہے بعض نے فرمایا کہ یہودا ہیں، اور اگرچہ عمر میں سب سے بڑے نہیں مگر علم و فضل میں بڑے تھے، اور بعض مفسرین نے کہا کہ روبیل ہیں جو عمر میں سب سے بڑے ہیں، اور یوسف علیہ السلام کے قتل نہ کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا تھا، اور بعض نے کہا کہ یہ بڑے بھائی شمعون ہیں جو جاہ و رتبہ کے اعتبار سے سب بھائیوں میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ، یعنی بڑے بھائی نے کہا کہ میں تو یہیں رہوں گا، آپ سب لوگ اپنے والد کے پاس واپس جائیں اور ان کو بتلائیں کہ آپ کے صاحبزادہ نے چوری کی، اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے چشم دید حالات ہیں کہ مال مسروقہ ان کے سامان میں سے ہمارے سامنے برآمد ہوا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ، یعنی ہم نے جو آپ سے عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو ضرور [illegible] گے یہ عہد ظاہری حالات کے اعتبار سے تھا، غیب کا حال تو ہم نہ جانتے تھے کہ یہ [illegible] اور ہم مجبور ہو جائیں گے، اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی [illegible] کہ کوئی ایسا کام ان سے نہ ہو جائے جس کے باعث وہ تکلیف

میں پڑیں، مگر ہماری یہ کوشش ظاہری حال ہی کی حد تک ہو سکتی تھی، ہماری نظروں سے غائب لاعلمی میں ان سے یہ کام ہو جائے گا ہم کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔

چونکہ برادرانِ یوسف اس سے پہلے ایک فریب اپنے والد کو دے چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارے مذکور الصدر بیان سے والد کا ہرگز اطمینان نہ ہوگا، اور وہ ہماری بات پر یقین نہ کریں گے اس لئے مزید تاکید کے لئے کہا کہ آپ کو ہمارا یقین نہ آئے تو آپ اس شہر کے لوگوں سے تحقیق کرلیں جس میں ہم تھے، یعنی شہر مصر، اور آپ اس قافلہ سے بھی تحقیق کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہی مصر سے کنعان آیا ہے، اور ہم اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

تفسیر مظہری میں اس جگہ اس سوال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کے ساتھ اس قدر بے رحمی کا معاملہ کیسے گوارا کر لیا، کہ خود اپنے حالات سے بھی اطلاع نہیں دی، پھر چھوٹے بھائی کو بھی روک لیا، جبکہ بار بار یہ بھائی مصر آتے رہے، نہ ان کو اپنا راز بتایا نہ والد کے پاس اطلاع بھیجی، ان سب باتوں کا جواب تفسیر مظہری نے یہی دیا ہے: اِنَّہٗ عَمِلَ ذٰلِكَ بِاَمْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی لِيَزِيْدَ فِيْ بَلَاءِ يَعْقُوْبَ، ''یعنی یوسف علیہ السلام نے یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کئے جن کا منشاء حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان اور ابتلاء کی تکمیل تھی''

احکام و مسائل

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا سے ثابت ہوا کہ انسان جب کسی سے کوئی معاملہ اور معاہدہ کرتا ہے تو وہ ظاہری حالات ہی پر محمول ہوتا ہے، یسی چیزوں پر حاوی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادرانِ یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا اور یہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آ گیا اور اس میں پکڑے گئے اس سے معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے، علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جا سکتی ہے، اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو بچشم خود دیکھ کر دی جا سکتی ہے اسی طرح کسی معتبر ثقہ سے سنکر بھی دی جا سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کر دے، کہ یہ واقعہ خود نہیں دیکھا، فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے، اسی اصول کی بناء پر فقہاء مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص حق اور راستی پر ہو مگر موقع ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہو سکتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ اس شبہ کو دور کر دے، تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعہ بنیامین میں

پچھلے واقعۂ یوسف علیہ السلام کی بنا پر موقع تہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اس کی صفائی کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، جبکہ آپ حضرت صفیہؓ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُور ہی سے فرما دیا کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارے میں کسی کو کوئی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں شبہ ڈال دے (بخاری ومسلم)

(قرطبی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

بولا کوئی نہیں بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے، شاید اللہ لے آئے

يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ

میرے پاس ان سب کو، وہی ہے خبردار حکمتوں والا، اور اُلٹا پھرا اُن کے پاس سے

قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

اور بولا اے افسوس یوسف پر، اور سفید ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے، سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا،

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ

کہنے لگے قسم ہے اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہو جائے

مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ

مُردہ، بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور

اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، اے بیٹو! جاؤ اور تلاش کرو

يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ

یوسف کی، اور اس کے بھائی کی اور نا امید مت ہو اللہ کے فیض سے، بیشک نا امید نہیں

مِن رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

یعقوب (علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان سب سے غیر مطمئن ہو چکے تھے تو سابق پر قیاس کر کے فرمانے لگے (کہ بنیامین چوری میں ماخوذ نہیں ہوا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو (خیر مثل سابق) صبر ہی کروں گا، جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (مجھ کو) اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو (یعنی یوسفؑ اور بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہے ان تینوں کو) مجھ تک پہنچا دے گا (کیونکہ) وہ (حقیقت حال سے) خوب واقف ہے (اس سے اس کو سب کی خبر ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس حال میں ہیں اور وہ) بڑی حکمت والا ہے (جب ملانا چاہے گا تو ہزاروں اسباب و تدابیر درست کر دے گا) اور (یہ جواب دے کر بوجہ اس کے کہ ان سے رنج پہنچا تھا) ان سے دوسری طرف رُخ کر لیا اور (بوجہ اس کے کہ اس نئے غم سے وہ پُرانا غم اور تازہ ہو گیا، یوسفؑ کو یاد کر کے) کہنے لگے ہائے یوسفؑ افسوس! اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں (کیونکہ زیادہ رونے سے سیاہی آنکھوں کی کم ہو جاتی ہے اور آنکھیں بے رونق یا بالکل بے نور ہو جاتی ہیں) اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے (کیونکہ شدتِ غم کے ساتھ جب شدتِ ضبط ہوگا جیسا کہ صابرین کی شان ہے تو کظم کی کیفیت پیدا ہو گی) بیٹے کہنے لگے بخدا (معلوم ہوتا ہے) تم ہمیشہ ہمیشہ یوسف کی یادگاری میں لگے رہو گے، یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بلب ہو جاؤ گے، یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے (تو اتنے غم سے فائدہ کیا) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (باتوں سے مراد یا تو لطف و کرم و رحمتِ اتم ہے اور یا مراد الہام ہے ان سب کے ملنے کا جو بلا واسطہ ہو یا بواسطۂ خواب یوسفؑ کے جس کی تعبیر اب تک واقع نہیں ہوئی تھی، اور واقع ہونا اس کا ضرور ہی) اے میرے بیٹو (اظہارِ غم تو صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں مسبب الاسباب وہی ہے، لیکن ظاہری تدبیر تم بھی کرو کہ ایک بار پھر سفر میں) جاؤ اور یوسفؑ اور ان کے بھائی کی تلاش کرو (یعنی اس فکر و تدبیر کی جستجو کرو جس سے یوسفؑ کا نشان ملے، اور بنیامین کو رہائی ہو) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

معارف و مسائل

یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے بنیامین کی مصر میں گرفتاری کے بعد ان کے بڑے بھائی واپس آئے اور یعقوب علیہ السلام کو یہ ماجرا سنایا، اور یقین دلانا چاہا کہ ہم اس واقعہ میں بالکل سچے ہیں، آپ اس بات کی تصدیق مصر کے لوگوں سے بھی کر سکتے ہیں، اور جو قافلہ ہمارے ساتھ مصر سے کنعان آیا ہے اس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بنیامین کی چوری پکڑی گئی، اس لئے وہ گرفتار ہو گئے، یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان صاحبزادوں کا جھوٹ ثابت ہو چکا تھا، اس لئے اس مرتبہ بھی یقین نہیں آیا، اگرچہ فی الواقع اس وقت انہوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس لئے اس موقع پر بھی وہی کلمات فرمائے جو یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے وقت فرمائے تھے، بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا، فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، یعنی یہ بات جو تم کہہ رہے ہو صحیح نہیں، تم نے خود بات بنائی ہے، مگر میں اب بھی صبر کرتا ہوں، وہی میرے لئے بہتر ہے۔

قرطبی نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہیں اس میں ابتداءً غلطی ہو جانا ممکن ہے جیسے اس معاملہ میں پیش آیا کہ بیٹوں کے سچ کو جھوٹ قرار دیدیا، مگر انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو منجانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور انجام کار وہ حق کو پا لیتے ہیں۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا، اس آیت کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا، یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا، اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں بات کچھ اور ہی، یہ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

فَهُوَ كَظِيْمٌ ۝ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس دوسرے صدمے کے بعد صاحبزادوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کی، اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج وغم ہے یوسف پر اور اس رنج وغم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں، یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہوگئی۔ مقاتل امام تفسیر نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی، فَهُوَ كَظِيْمٌ" یعنی پھر وہ خاموش ہوگئے، کسی سے اپنا دکھ نہ کہتے تھے کَظِيْمٌ کظم سے بنا ہے جس کے معنی بند ہوجانے اور بھر جانے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ غم واندوہ سے ان کا دل بھر گیا، اور زبان بند ہوگئی، کہ کسی سے اپنا رنج وغم بیان نہ کرتے تھے۔

اسی لئے کظم کے معنی غصہ کو پی جانے کے آتے ہیں کہ غصہ دل میں بھرے ہوئے ہونے کے باوجود زبان یا ہاتھ سے کوئی چیز غصہ کے مقتضیٰ کے مطابق سرزد نہ ہو، حدیث میں ہے وَمَنْ يَّكْظِمِ الْغَيْظَ يَأْجُرْهُ اللّٰهُ " یعنی جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کے تقاضے پر باوجود قدرت کے عمل نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دیں گے "

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مجمع عام کے سامنے لاکر جنت کی نعمتوں میں اختیار دیں گے جو چاہیں لیلیں۔

امام ابن جریرؒ نے اس جگہ یک حدیث نقل کی ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، پڑھنے کی تلقین اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ کلمہ انسان کو رنج وغم کی تکلیف سے نجات دینے میں بڑا مؤثر ہے، خصوصیت ملت محمدیہ کی اس سے معلوم ہوتی کہ اس شدید غم وصدمہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کلمہ کے بجائے يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ فرمایا، بیہقی نے شعب الایمان میں بھی یہ حدیث ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا شغف محبت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیوں تھا

اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ غیر معمولی محبت اور ان کے گم ہونے پر اتنا اثر کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بنا پر چالیس سال اور بعض کی بنا پر اسی سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا، یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی بظاہر ان کی پیغمبرانہ شان کے شایان نہیں، کہ اولاد سے اتنی محبت کریں، جب کہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے، ارشاد ہے: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، یعنی تمہارے مال اور اولاد فتنہ اور آزمائش ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ، یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کردیا ہے، وہ صفت ہے دار آخرت کی یاد، مالک بن دینارؒ نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ

ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال دی اور صرف آخرت کی محبت سے ان کے قلوب کو معمور کر دیا، ان کا مطمح نظر کسی چیز کے لینے یا چھوڑنے میں صرف آخرت ہوتی ہے۔

اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت مجدد الف ثانی کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے، قرآن و حدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے، یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حُسنِ صورت ہی نہیں، بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حُسنِ سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی، انتہیٰ۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یہ محبت اگرچہ درحقیقت دنیا کی محبت نہ تھی مگر بہرحال اس میں ایک حیثیت دنیوی بھی تھی، اسی وجہ سے یہ محبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور امتحان کا ذریعہ بنی، اور چالیس سال کی مفارقت کا ناقابلِ برداشت صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور اس واقعہ کے اجزاء اوّل سے آخر تک اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ ایسی صورتیں بنتی چلی گئیں کہ یہ صدمہ طویل ہوتا چلا گیا ورنہ واقعہ کے شروع میں اتنی شدید محبت والے باپ سے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ بیٹوں کی بات سُن کر گھر میں بیٹھ رہتے، بلکہ موقع پر پہنچ کر تفتیش و تلاش کرتے تو اسی وقت پتہ چل جاتا، مگر اللہ ہی کی طرف سے ایسی صورتیں بن گئیں کہ اُس وقت یہ دھیان نہ آیا، پھر یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے حال کی اپنے والد کو خبر بھیجیں، یہاں تک کہ مصر کی حکومت و اقتدار ملنے کے بعد بھی انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں فرمایا، اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما وہ واقعات تھے جو بار بار ان کے بھائیوں کے مصر جانے کے متعلق پیش آتے رہے، اس وقت بھی نہ بھائیوں پر اظہار فرمایا نہ والد کو خبر بھیجنے کی کوشش فرمائی، بلکہ دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس ایک تدبیر کے ذریعہ روک کر والد کے صدمہ کو دُہرا کر دیا، یہ سب چیزیں یوسف علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُن کو بذریعہ وحی اس سے نہ روک دیا گیا ہو، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس سارے عمل کو وحیِ خداوندی کی تلقین قرار دیا ہے، اور کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ کے

قرآنی ارشاد میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ، یعنی صاحبزادے والد کے اس شدید غم واندوہ اور اس پر صبر جمیل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ بخدا آپ تو یوسف کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں اور ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائیں، (آخر ہر صدمہ اور غم کی کوئی انتہا ہوتی ہے، مرور ایام سے انسان اس کو بھول جاتا ہے، مگر آپ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی اسی روز اول میں ہیں، اور آپ کا غم اسی طرح تازہ ہے)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی بات سنکر فرمایا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ، یعنی میں تو اپنی فریاد و رنج و غم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا، بلکہ اللہ جل شانہٗ کی ذات سے کرتا ہوں، اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرمایا کہ میرا یہ یاد کرنا خالی نہ جائے گا، میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ پھر مجھے ان سب سے ملائیں گے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ، یعنی اے میرے بیٹو جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ اس کی رحمت سے بجز کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اتنے عرصہ کے بعد صاحبزادوں کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور اُن کے بھائی کو تلاش کرو، اور ان کے ملنے سے مایوس نہ ہو، اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا تھا، یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی کے تابع تھیں اس سے پہلے ملنا مقدر نہ تھا، اس لئے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا گیا، اور اب ملاقات کا وقت آچکا تھا، حق اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب تدبیر دل میں ڈالی۔

اور دونوں کی تلاش کا رُخ مصر ہی کی طرف قرار دیا، جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا، مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے مناسب اسباب جمع فرما دیتے ہیں، اس لئے اس مرتبہ تلاش و تفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ انکی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہو گیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف کریم ہے شاید یوسف ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ واقعۂ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتداء کرے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔

اور حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

مَنْ بَثَّ لَمْ یَصْبِرْ، یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔

امام قرطبی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس شدید ابتلاء و امتحان کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے جو بعض روایات میں آئی ہے کہ ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نماز تہجد پڑھ رہے تھے، اور یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سو رہے تھے، اچانک یوسف علیہ السلام سے کچھ خراٹے کی آواز نکلی، تو ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف چلی گئی، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا دیکھو یہ میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے، قسم ہے میری عزت و جلال کی میں ان کی یہ دونوں آنکھیں نکال لوں گا جن سے میرے غیر کی طرف توجہ کی ہے، اور جس کی طرف توجہ کی ہے اس کو ان سے مدتِ دراز کے لئے جدا کر دوں گا۔

اسی لئے بخاری کی حدیث میں بروایت عائشہؓ وارد ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز میں کسی دوسری طرف دیکھنا کیسا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ شیطان بندہ کی نماز کو اُچک لیتا ہے، والعیاذ باللہ سبحانہ وتعالیٰ۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ

لائے ہیں ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر ، اللہ

اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ

بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو ، کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے

وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ

اور اس کے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی ، بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف ، کہا

اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ

میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور

يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ

صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا ، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ

البتہ پسند کرلیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تھے چوکنے والے ، کہا کچھ الزام نہیں

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

تم پر آج ، بخشے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (حضرت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے موافق کہ انھوں نے فرمایا تھا تَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ، مصر کو چلے کیونکہ بنیامین کو مصر ہی میں چھوڑا تھا، یہ خیال ہوا ہوگا کہ جس کا نشان معلوم ہے پہلے اس کے لانے کی تدبیر کرنا چاہئے، کہ بادشاہ سے مانگیں، پھر یوسف علیہ السلام کے نشان کو ڈھونڈیں گے، غرض مصر پہونچ کر) جب یوسف (علیہ السلام) کے پاس (جس کو عزیز سمجھ رہے تھے) پہنچے (اور غلّہ کی بھی حاجت تھی، پس یہ خیال ہوا کہ غلہ کے بہانے سے عزیز کے پاس چلیں، اور اس کی خرید کے ضمن میں خوشامد کی باتیں کریں، جب اس کی طبیعت میں نرمی دیکھیں، اور مزاج خوش پائیں تو بنیامین کی درخواست کریں، اس لئے اوّل غلّہ لینے کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قحط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور (چونکہ ہم کو ناداری نے

گھیر رکھا ہے اس لئے خرید غلہ کے واسطے کھرے دام بھی میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ یہ نکمی چیز لائے ہیں، سو آپ (اس کے نکمے ہونے سے قطع نظر کر کے) پورا غلہ دیدیجئے (اور اس نکمے ہونے سے غلہ کی مقدار میں کمی نہ کیجئے) اور (ہمارا کچھ استحقاق نہیں، ہم کو خیرات (سمجھ کر) دیدیجئے بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو (خواہ حقیقۃً خیرات دیں خواہ سہولت و رعایت کریں کہ وہ بھی مثل خیرات کے ہے) جزاء (خیر) دیتا ہے (اگر مومن ہے تو آخرت میں بھی ورنہ دنیا ہی میں) یوسف (علیہ السلام) نے (جو اُن کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے تو رہا نہ گیا اور بے ختیار جی چاہا کہ اب اُن سے کھل جاؤں، اور عجب نہیں کہ نور قلب سے معلوم ہو گیا ہو کہ اب کی بار اُن کو تجسس بھی مقصود ہے اور یہ بھی منکشف ہو گیا ہو کہ اب زمانہ مفارقت کا ختم ہو چکا، پس تمہید تعارف کے طور پر) فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد ہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا (اور بُرے بھلے کی سوچ نہ تھی یہ سنکر بیٹے تو چکرائے کہ عزیز مصر کو یوسفؑ کے قصہ سے کیا واسطہ ادھر اس شروع زمانہ کے خواب سے غالب احتمال تھا ہی کہ شاید یوسفؑ کسی بڑے رتبہ کو پہنچیں کہ ہم سب کو ان کے سامنے گردن جھکانا پڑے اس لئے اس کلام سے شبہ ہوا اور غور کیا تو کچھ کچھ پہچانا اور مزید تحقیق کیلئے کہنے لگے کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو انھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا (حقیقی) بھائی ہے (یہ اس لئے بڑھا دیا کہ اپنے یوسفؑ ہونے کی اور تاکید ہو جاوے یا انکے تجسس کی کامیابی کی بشارت ہے کہ جن کو تم ڈھونڈنے نکلے ہو ہم دونوں ایک جگہ جمع ہیں) ہم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا (کہ ہم دونوں کو اول توفیق صبر و تقویٰ کی عطا فرمائی پھر اُس کی برکت سے ہماری تکلیف کو راحت سے اور افتراق کو اجتماع سے اور قلت مال و جاہ کو کثرتِ مال و جاہ سے مبدل فرما دیا) واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور (مصائب پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا وہ (تمام گذشتہ قصوں کو یاد کر کے نادم ہو کر اور معذرت کے طور پر) کہنے لگے کہ بخدا کچھ شک نہیں تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی (اور تم اسی لائق تھے) اور (ہم نے جو کچھ کیا) بیشک ہم (اس میں) خطا وار تھے (اللہ معاف کر دو) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (بے فکر رہو میرا دل صاف ہو گیا) اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (تائب کا قصور معاف کر ہی دیتا ہے، اسی دعا سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ میں نے بھی معاف کر دیا) ؞

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا باقی قصہ مذکور ہے، کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو تو انہوں نے تیسری مرتبہ مصر کا سفر کیا، کیونکہ بنیامین کا تو وہاں ہونا معلوم تھا، پہلی کوشش اسی کی خلاصی کے لئے کرنا تھی، اور یوسف علیہ السلام کا وجود اگرچہ مصر میں معلوم نہ تھا مگر جب کسی کام کا وقت آجاتا ہے تو انسان کی تدبیریں غیر شعوری طور پر بھی درست ہوتی چلی جاتی ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرما لیتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود جمع کر دیتے ہیں، اس لئے تلاش یوسف کے لئے بھی غیر شعوری طور پر مصر ہی کا سفر مناسب تھا، اور غلّہ کی ضرورت بھی تھی، اور یہ بات بھی تھی کہ غلّہ طلب کرنے کے بہانے سے عزیز مصر سے ملاقات ہوگی اور ان سے اپنے بھائی بنیامین کی خلاصی کے متعلق عرض معروض کر سکیں گے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا الآیۃ یعنی جب برادرانِ یوسف والد کے حکم کے مطابق مصر پہونچے اور عزیز مصر سے ملے تو خوشامد کی گفتگو شروع کی، اپنی محتاجی اور بےکسی کا اظہار کیا کہ اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے سخت تکلیف پہونچ رہی ہے، یہاں تک کہ اب ہمارے پاس غلّہ خریدنے کے لئے بھی کوئی مناسب قیمت موجود نہیں، ہم مجبور ہو کر کچھ نکمی چیزیں غلّہ خریدنے کے لئے لے آئے ہیں، آپ اپنے کریمانہ اخلاق سے انہی نکمی چیزوں کو قبول کرلیں، اور ان کے بدلے میں غلّہ پورا اتنا ہی دیدیں جتنا اچھی قیمتی چیزوں کے بالمقابل دیا جاتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں آپ ہم کو خیرات سمجھ کر دیدیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

یہ نکمی چیزیں کیا تھیں؟ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں، مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے کہا کہ کھوٹے دراہم تھے جو بازار میں نہ چل سکتے تھے، بعض نے کہا کہ کچھ گھریلو سامان تھا، یہ لفظ مزجاۃ کا ترجمہ ہے اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اس کو زبردستی چلایا جائے۔

یوسف علیہ السلام نے جب بھائیوں کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے اور شکستہ حالت دیکھی تو طبعی طور پر اب حقیقتِ حال ظاہر کر دینے پر مجبور ہو رہے تھے اور واقعات کی رفتار کا انداز یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر جو اظہارِ حال کی پابندی منجانب اللہ تھی اب اس کے خاتمہ کا وقت بھی آچکا تھا، اور تفسیر قرطبی و مظہری میں بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"من جانب یعقوب صفی اللہ ابن اسحٰق ذبیح[1] اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ بخدمت عزیز مصر!
امابعد؛ ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے، میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولادِ انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے، نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام "

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے، اور بے اختیار رونے لگے، اور اپنے راز کو ظاہر کردیا، اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تمھاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے بُرے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ سوال سُنا تو چکرا گئے کہ عزیزِ مصر کو یوسف کے قصے سے کیا واسطہ، پھر ادھر بھی دھیان گیا کہ یوسفؑ نے جو بچپن میں خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر یہی تھی کہ ان کو کوئی بلند مرتبہ حاصل ہوگا کہ ہم سب کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، کہیں یہ عزیزِ مصر خود یوسف ہی نہ ہوں، پھر جب اور غور و تأمل کیا تو کچھ علامات سے پہچان لیا، اور مزید تحقیق کیلئے اُن سے کہا:

ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ "کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو؟" تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں ہی یوسف ہوں، اور یہ بنیامین میرا حقیقی بھائی ہے، بھائی کا ذکر اس لئے بڑھا دیا کہ ان کو اچھی طرح یقین آجائے، نیز اس لئے بھی کہ اُن پر اس وقت اپنے مقصد کی مکمل کامیابی واضح ہوجائے کہ جن دو کی تلاش میں تم نکلے تھے وہ دونوں یکجا تمہیں مل گئے، پھر فرمایا:

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ "یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان و کرم فرمایا کہ اوّل ہم دونوں کو صبر و تقویٰ کی دو صفتیں عطا فرمائیں، جو کلید کامیابی اور ہر مصیبت سے امان ہیں، پھر ہماری تکلیف کو راحت سے، افتراق کو اجتماع سے مال و جاہ کی قلت کو ان سب کی کثرت سے تبدیل فرمادیا، بیشک جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ

---

[1] ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے، یا حضرت اسماعیل علیہ السلام؟ اسکی پوری تحقیق سورۂ الصّٰفّٰت (جلد ہفتم ص ۴۶۲ تا ۴۶۶) پر دیکھی جائے۔ ناشر

ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے ہیں۔

اب تو برادرانِ یوسف کے پاس بجز جرم و خطا کے اعتراف اور یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کے اقرار کے چارہ نہ تھا، سب نے یک زبان ہو کر کہا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ، "بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور آپ اسی کے مستحق تھے، اور ہم نے جو کچھ کیا بے شک ہم اس میں خطاوار تھے، للہ معاف کر دیجئے"، یوسف علیہ السلام نے جواب میں اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ، "یعنی میں تم سے تمہارے مظالم کا انتقام تو کیا لیتا، آج تم پر کوئی ملامت بھی نہیں کرتا"، یہ تو اپنی طرف سے معافی کی خوشخبری سنا دی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی: يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ، "یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دیں، وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں"۔

پھر فرمایا اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا، وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ، "یعنی میرا یہ کرتہ لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی جس سے وہ یہاں تشریف لا سکیں گے اور اپنے باقی گھر والوں کو بھی سب کو میرے پاس لے آؤ تاکہ سب ملیں اور خوش ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور شکرگذار رہوں"۔

احکام و ہدایات

آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایات حاصل ہوئیں:

اول لفظ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ اولاد انبیاء ہیں ان کے لئے صدقہ خیرات کیسے حلال تھا؟ دوسرے اگر صدقہ حلال بھی ہو تو سوال کرنا کیسے جائز تھا، برادرانِ یوسف اگر انبیاء بھی نہ ہوں تو بھی یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے انہوں نے اس غلطی پر کیوں متنبہ نہیں فرمایا؟

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ خیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انھوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں، اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کر کے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اولاد انبیاء کے لئے صدقہ خیرات کی حرمت صرف امتِ محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے (بیان القرآن)

اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کی ایک جزاء تو عام ہے، جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رد بلاء اور دفع مصائب، اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے، اور برادران یوسف کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہے یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا وآخرت دونوں کی جزاء شامل ہے۔ (بیان القرآن)

اس کے علاوہ بظاہر موقع تو اس جگہ اس کا تھا کہ چونکہ عزیز مصر سے خطاب تھا اس لئے اس جملہ میں بھی خطاب ہی کے صیغہ سے یہ کہا جاتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں گے، لیکن چونکہ ان کا تو مومن ہونا معلوم نہ تھا اس لئے عام عنوان اختیار کیا خصوصی طور پر ان کو جزاء ملنے کا ذکر نہیں کیا (قرطبی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف ومصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گذشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام واحسان ہی کا ذکر کرنا چاہئے جو اب حاصل ہوا ہے، مصیبت سے نجات اور انعام الٰہی کے حصول کے بعد بھی پچھلی تکلیف ومصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے، ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کَنُوْد کہا گیا ہے، اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ، کنود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھے۔

اسی لئے یوسف علیہ السلام کو، بھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

صبر وتقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے

اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ سے معلوم ہوا کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنا اور تکلیفوں پر صبر وثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلاء ومصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح وکامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا، "یعنی اگر تم نے صبر وتقویٰ اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند اور نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعاء کر رہے ہیں کہ ہمارے صبر وتقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجات عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقوے کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے، فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى، "یعنی اپنی پاکی نہ جتلاؤ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون

متقی ہے"، مگر یہاں درحقیقت دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث بنعمۃ اللہ اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے، کہ اس نے اول ہم کو صبر و تقویٰ کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں
لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ، یعنی آج تم پر کوئی ملامت نہیں" یہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ مقام ہے کہ ظالم کو صرف معاف ہی نہیں کر دیا بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تم پر کوئی ملامت بھی نہیں۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ
لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ
اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا ، اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے

اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ
میں پاتا ہوں بو یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا ، لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو

لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى
اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے ، پھر جب پہنچی خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتا

وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ
اس کے منہ پر پھر لوٹ کر ہوگیا دیکھنے والا ، بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ
کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ، بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو

اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ
بیشک ہم تھے چوکنے والے ، کہا دم تو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہے

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ
بخشنے والا مہربان ، پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنے پاس

اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾
اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جمعی سے

ربع

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا
اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدے میں اور کہا اے باپ یہ
تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ
بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا اس کو میرے رب نے سچ کر دیا اور اس نے انعام کیا مجھ پر
اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ
جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ
اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ
جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے
اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰
بیشک وہی ہے خبردار حکمت والا۔

خلاصۂ تفسیر

اب تم (میرے باپ کو جا کر بشارت دو اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ کُرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی (اور یہاں تشریف لے آئیں گے) اور اپنے (باقی) گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ (کہ سب مل کر خوش ہوں، کیونکہ حالتِ موجودہ میں میرا جانا مشکل ہے، اس لئے گھر والے ہی چلے آئیں) اور جب (یوسف علیہ السلام سے بات چیت ہو چکی، اور آپ کے فرمانے کے موافق کُرتہ لے کر چلنے کی تیاری کی، اور) قافلہ (شہر مصر سے) چلا (جس میں یہ لوگ بھی تھے) تو ان کے باپ نے (پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے (معجزہ اختیاری نہیں ہوتا اس لئے اس سے پہلے یہ ادراک نہ ہوا) وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور ملیں گے اسی خیال کے غلبہ سے اب خوشبو کا وہم ہو گیا، اور واقع میں نہ خوشبو ہے نہ کچھ اور ہے، یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے) پس جب (یوسفؑ کے صحیح سلامت ہونے کی) خوش خبری لانے والا (مع کُرتہ کے یہاں) آ پہنچا تو (آتے ہی) اس نے وہ کُرتہ ان کے منہ پر لا کر ڈال دیا پس (آنکھوں کو لگنا تھا اور دماغ میں خوشبو پہنچنا کہ) فوراً ہی

ان کی آنکھیں کھل گئیں (اور انھوں نے سارا ماجرا آپ سے بیان کیا) آپ نے (بیٹوں سے) فرمایا کیوں، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (و اسی لئے میں نے تم کو یوسف کے تجسس کے لئے بھیجا تھا، دیکھو آخر اللہ تعالیٰ میری امید راست لایا ان کا یہ قول اس سے اوپر کے رکوع میں آچکا ہے، اُس وقت) سب بیٹوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دعاءِ مغفرت کیجئے (ہم نے جو کچھ آپ کو یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں تکلیف دی) ہم بیشک خطاوار تھے (مطلب یہ ہے کہ آپ بھی معاف کر دیجئے، کیونکہ عادۃً کسی کے لئے استغفار وہی کرتا ہے جو خود بھی مواخذہ کرنا نہیں چاہتا)۔ یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمہارے لئے اپنے رب سے دعاءِ مغفرت کر دوں گا بے شک وہ غفور رحیم ہے (اور اسی سے ان کا معاف کر دینا بھی معلوم ہو گیا اور عنقریب کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کا وقت آنے دو جو کہ قبولیت کی ساعت ہے کذا فی الدر المنثور مرفوعاً غرض سب مصر کو تیار ہو کر چل دیئے اور یوسف علیہ السلام خبر سن کر استقبال کے لئے مع عسکر بر تشریف لائے اور باہر ہی ملاقات کا سامان کیا گیا) پھر جب سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے (سب سے مل ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی، اور (بات چیت سے فارغ ہو کر) کہا سب مصر میں چلئے (اور) انشاء اللہ تعالیٰ (وہاں) امن چین سے رہئے (مفارقت کا غم اور قحط کا الم سب کافور ہو گئے، غرض سب مصر میں پہنچے) اور (وہاں پہنچ کر تعظیماً) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا، اور (اس وقت سب کے قلوب پر یوسف علیہ السلام کی ایسی عظمت غالب ہوئی کہ) سب کے سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور (یہ حالت دیکھ کر) وہ کہنے لگے کہ اے ابا یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانہ میں دیکھا تھا (کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں) میرے رب نے اس (خواب) کو سچا کر دیا (یعنی اس کی سچائی کا ظہور کر دیا) اور (اس شرف کے سوا میرے رب نے مجھ پر اور انعامات بھی فرمائے، چنانچہ) میرے ساتھ (ایک) اُس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس مرتبہ سلطنت تک پہنچایا) اور (دوسرا یہ انعام فرمایا کہ) بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوا دیا تھا (جس کا مقتضاء یہ تھا کہ عمر بھر بھی مجتمع و متفق نہ ہوتے، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ) تم سب کو (جن میں میرے بھائی بھی ہیں) باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملا دیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم اور حکمت والا ہے، (اپنے علم و حکمت سے سب امور کی تدبیر درست کر دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے متعلق سابقہ آیات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب باذنِ خداوندی اس کا وقت آ گیا کہ یوسف علیہ السلام اپنا راز بھائیوں پر ظاہر کر دیں تو انھوں نے حقیقت ظاہر کر دی، بھائیوں نے معافی مانگی، انھوں نے نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا، بلکہ گزشتہ واقعات پر کوئی ملامت کرنا بھی پسند نہ کیا، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی، اور اب والد سے ملاقات کی فکر ہوئی، حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں تشریف لائیں، مگر معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی بینائی اس مفارقت میں جاتی رہی، اس لئے سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی اور بھائیوں سے کہا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا، یعنی تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی عود کر آئے گی، یہ ظاہر ہے کہ کسی کے کرتے کا چہرہ پر ڈال دینا بینائی کے عود کرنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک معجزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو باذنِ خداوندی معلوم ہو گیا کہ جب انکا کرتہ والد کے چہرے پر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی بینائی بحال فرما دیں گے۔

اور ضحاک اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس کرتے کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اُس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈالا تھا، پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پاس رہا، اُن کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا، آپ نے اس کو ایک بڑی متبرک شے کی حیثیت سے ایک نلکی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گلے میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا، تاکہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں، برادرانِ یوسف نے جب ان کا کرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اُتار لیا، اور وہ برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیئے گئے تو جبرئیل امین تشریف لائے، اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اس سے یہ کرتہ برآمد کیا، اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا، اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلا آیا، اس وقت بھی جبرئیل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے، اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا

حُسن وجمال اور ان کا وجود خود جنت ہی کی ایک چیز تھی، اس لئے ان کے جسم سے متصل ہونیوالے ہر کرتے میں یہ خاصیت ہوسکتی ہے (مظہری)

فَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ، "یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس مصر لے آؤ"، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی، اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہیگا تو وہ خود بھی ضرور تشریف لائیں گے، قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں سے یہودا نے کہا کہ یہ کرتہ میں لے جاؤں گا، کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہئے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ "یعنی جب قافلہ شہر سے باہر نکلا ہی تھا" تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے بیوقوف نہ کہو تو میں تمھیں بتلادوں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، شہر مصر سے کنعان تک ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی مسافت کا راستہ تھا، اور حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ اسّی فرسخ یعنی تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی دور سے قمیص یوسفؑ کے ذریعہ حضرت یوسفؑ کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہونچادی، اور یہ عجیب بات ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی، یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل وعمل بھی نہیں ہوتا، یہ براہ راست فعل اللہ ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کردیتے ہیں، اور جب اذنِ خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہوجاتا ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ، "یعنی حاضرینِ مجلس نے یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں" کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ، "یعنی جب بشارت دینے والا کنعان پہونچا" اور قمیص یوسفؑ کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا، تو فوراً ان کی بینائی عود کر آئی، بشارت دینے والا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائی یہودا تھا، جو ان کا کرتہ مصر سے لایا تھا۔

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ، "یعنی کیا میں نہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جس کی آپ لوگوں کو خبر نہیں" کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ، اب جبکہ حقیقت حال واضح ہو کر سامنے آگئی تو برادرانِ یوسفؑ نے والد سے بھی خطاؤں کی معافی اس طرح سے مانگی کہ والد سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس کی خطا معاف کرنے کی دعا کریگا وہ خود بھی تو خطا معاف کردیگا۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ، یعنی یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کردوں گا۔

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً ہی دعا کرنے کے بجائے وعدہ کیا کہ عنقریب دعا کردوں گا، اس کی وجہ عام مفسرین نے یہی لکھی ہے کہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اہتمام کے ساتھ آخر شب کے وقت میں دعا کریں کیونکہ اس وقت کی دعا خصوصیت سے قبول کی جاتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں زمین سے قریب آسمان پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے، تو میں اس کو قبول کرلوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کردوں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ، بعض روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دو سو اونٹوں پر لدا ہوا بہت سا سامان کپڑوں اور دوسری ضروریات کا بھیجا تھا، تاکہ پورا خاندان مصر آنے کے لئے عمدہ تیاری کر سکے اس کے مطابق یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد اور تمام متعلقین مصر کے لئے تیار ہو کر نکلے، تو ایک روایت میں ان کی تعداد بہتّر اور دوسری میں ترانوے ۹۳ نفوس مرد و عورت پر مشتمل تھی۔

دوسری طرف جب مصر پہونچنے کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ملکِ مصر کے لوگ استقبال کے لئے شہر سے باہر تشریف لائے اور چار ہزار سپاہی ان کے ساتھ سلامی دینے کے لئے نکلے، جب یہ حضرات مصر میں یوسف علیہ السلام کے مکان میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھہرایا۔

یہاں ذکر والدین کا ہے، حالانکہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا مگر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے مرحومہ کی بہن لیّا سے نکاح کر لیا تھا جو یوسف علیہ السلام کی خالہ ہونے کی حیثیت سے بھی مثل والدہ کے تھیں، اور والد کے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ ہی کہلانے کی مستحق تھیں[1]

وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ، یوسف علیہ السلام نے سب خاندان

---

[1] یہ توجیہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ بنیامین کی ولادت کے وقت وفات پا گئی تھیں اسی بنا پر یہاں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت صفحہ ۲۹ و ۳۰ ج ۵ کی عبارت سے متضاد معلوم ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کو قرار دیا گیا ہے لیکن دراصل اس معاملے میں کوئی مستند روایت تو ہے نہیں، اسرائیلی روایات ہیں اور ان میں بھی تعارض ہے خود صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودی حضرات حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کے بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال کے قائل نہیں ہیں اگر اس روایت کو لیا جائے تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا، اس صورت میں ورفع ابویہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ مراد ہونگی۔ ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ ابن کثیرؒ اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں قال ابن جریر ولم یقم دلیل علی موت امہ (ای ام یوسف علیہ السلام) وظاھر القرآن یدل علی حیاتھا۔ محمد تقی عثمانی

کے لوگوں سے کہا کہ آپ سب باذنِ خداوندی مصر میں بے خوف و خطر بغیر کسی پابندی کے داخل ہوجائیں مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملک میں داخل ہونے والے مسافروں پر جو پابندیاں عادۃً ہوا کرتی ہیں آپ ان سب پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تختِ شاہی پر بٹھایا۔

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا، یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا، یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدۂ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدۂ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعتِ اسلام میں ذریعہ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہوگیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔

وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ، یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں ماں باپ اور گیارہ بھائیوں نے بیک وقت سجدہ کیا تو ان کو اپنا وہ بچپن کا خواب یاد آگیا، اور فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو آنکھوں سے دکھلا دیا۔

احکام و مسائل

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و دعاءِ مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ ”عنقریب تمہارے لئے دعاءِ مغفرت کروں گا“، اور فوراً دعا نہیں کی۔

اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہوجائے کہ انھوں نے ان کی خطا معاف کردی ہے یا نہیں، کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عنداللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعاءِ مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ صاحب حق اپنا حق وصول کرلے یا معاف کردے، محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔

۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہودا قمیصِ یوسف لے کر آئے اور یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انھوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ

ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پوچھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پوچھنا یہ ہے کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انھوں نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتلائے، یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں، ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہئے۔

۳۔ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیصِ یوسف لے کر پہونچا، تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات سازگار نہ تھے، اس لئے عذر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں پکی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکرتِ موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعا، ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔

۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنتِ انبیاء ہے، صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے، کہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب اُن پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبولِ توبہ کی بشارت لایا تھا اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقتِ واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا اس پر لازم ہے کہ فوراً اس حق کو ادا کرے یا اس سے معاف کرالے۔

صحیح بخاری میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذاء ہاتھ یا زبان سے پہونچائی ہو اس کو چاہئے کہ آج اس کو ادا کر دے، یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کرلے، قبل اس کے کہ قیامت کا دن آجائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا، اس لئے اس کے اعمالِ صالحہ مظلوم کو دیدیئے جائیں گے، یہ خالی رہ جائے گا، اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یوسف علیہ السلام کا مقام صبر و شکر

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگذشت بیان کرنا شروع کی، یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے کہ آج اگر کسی کو اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے، جتنے یوسف علیہ السلام پر گذرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور مایوسی کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگذشت کیا بیان کرے گا، کتنا روئے گا اور رُلائے گا، اور کتنے دن رات مصائب کی داستان سننے میں صرف کرے گا، مگر یہاں طرفین میں اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیے، یعقوب علیہ السلام کے بچھڑے ہوئے محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گذرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں:

وَقَدْ أَحْسَنَ بِيٓ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِنۢ بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِيٓ، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا، اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا،

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصائب ترتیب وار تین بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، اوّل بھائیوں کا ظلم و جور، دوسرے والدین سے طویل جدائی، تیسرے قید خانے کی تکالیف، خدا تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکلیف کا نام نہیں لیا، بلکہ قید خانہ سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا، قید خانہ سے نجات اور اس پر شکرِ الٰہی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا، بھائیوں نے جس کنوئیں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کنوئیں سے نکالا، وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے، اور فرما چکے تھے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنوئیں کا کسی طرح سے بھی ذکر آئے، تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزما مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ کیا، کہ آپ کو بدو یعنی دیہات سے شہر مصر میں پہونچا دیا، اس میں اس نعمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ یعقوب علیہ السلام کا وطن دیہات میں تھا، جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ اندر پہنچا دیا۔

اب پہلی بات رہ گئی، بھائیوں کا ظلم وجور، سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیباق کر دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے، شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرا دیا۔

یہ ہے شانِ نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکرگذار نہ ہوں، بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کوئی مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں، قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ "یعنی انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے"۔

یوسف علیہ السلام نے داستانِ مصائب کو تین لفظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ "یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے"۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا،

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت میں،

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

(اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہتے رہے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر ختم پر پہنچی، اور بعد وفات ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے، پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا، اور دعاء کی کہ) اے میرے پروردگار آپ نے مجھ کو (ہر طرح کی نعمتیں دیں، ظاہری بھی باطنی بھی، ظاہری یہ کہ مثلاً) سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور (باطنی یہ کہ مثلاً) مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ علم عظیم ہے خصوصاً

جب کہ وہ یقینی ہو جو موقوف ہے وحی پر پس اس کا وجود مستلزم ہوگا عطاء نبوت کو) اے خالق آسمان اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنا دیئے کہ سلطنت دی، علم دیا، اسی طرح آخرت کے کام بھی بنا دیجئے کہ) مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے (یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیاء عظام ہوئے ہیں ان میں مجھ کو بھی پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعا میں مشغول ہو گئے، فرمایا

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ؀ "یعنی اے میرے پروردگار آپ نے ہی مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا، اے آسمان و زمین کے خالق آپ ہی دنیا و آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور مجھ کو کامل نیک بندوں میں شامل رکھئے"، کامل نیک بندے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں، جو ہر گناہ سے معصوم ہیں (مظہری)

اس دعا میں حسن خاتمہ کی دعا خاص طور پر قابل نظر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا و آخرت کے اُن کو نصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ و منصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت اُن پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں، اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے

یہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب و غریب قصہ اور اس کے ضمن میں آئی ہوئی ہدایات کا سلسلہ جو قرآن میں مذکور ہے پورا ہو گیا، اس کے بعد کا قصہ قرآن کریم یا کسی حدیث مرفوع میں منقول نہیں، اکثر علماء تفسیر نے تاریخی یا اسرائیلی روایات کے حوالہ سے نقل کیا ہے

تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، پھر اسّی سال والد سے غائب رہے، اور والدین کی ملاقات کے بعد تیئس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس

سال کی عمر میں وفات پائی۔

اور محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ اہل کتاب کی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی مفارقت کا زمانہ چالیس سال تھا، پھر یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لانے کے بعد یوسف علیہ السلام کے ساتھ سترہ سال زندہ رہے، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

تفسیر قرطبی میں اہل تاریخ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مصر میں چوبیس سال رہنے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی، اور وفات سے پہلے یوسف علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش کو میرے وطن بھیج کر میرے والد اسحٰق علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے۔

سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سال کی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا۔ اسی وجہ سے عام یہود میں یہ رسم چل گئی کہ اپنے مُردوں کو دور دور سے بیت المقدس میں لے جا کر دفن کرتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر وفات کے وقت ایک سو سینتالیس سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام مع اپنی اولاد کے جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد ترانوے ۹۳ مرد و عورت پر مشتمل تھی، اور جب یہ اولاد یعقوب یعنی بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی (قرطبی و)

یہ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ سابق عزیز مصر کے انتقال کے بعد شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا کے ساتھ کرادی تھی۔

تورات اور اہل کتاب کی تاریخ میں ہے کہ ان سے یوسف علیہ السلام کے دو لڑکے افرائیم اور منشا اور ایک لڑکی رحمت بنت یوسف پیدا ہوئے، رحمت کا نکاح حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ ہوا، اور افرائیم کی اولاد میں یوشع بن نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوا، اور دریائے نیل کے کنارے پر دفن کئے گئے۔

ابن اسحٰق نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں، تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو مصر میں نہ چھوڑیں، اس کو اپنے ساتھ لے کر ملک شام چلے جائیں، اور ان کے آباء و اجداد کے پاس دفن کریں، اس حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کرکے ان کی قبر دریافت کی، جو ایک سنگِ مرمر کے تابوت میں

تھی، اس کو اپنے ساتھ ارضِ کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کر دیا (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دینِ یوسف علیہ السلام پر قائم رہے، مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا (تفسیر مظہری)

ھدایات اور احکام

آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ تو یہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم و تکریم واجب ہے جیسے کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تعظیمی جائز تھا، اسی لئے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا، مگر شریعتِ محمدیہ میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دے کر غیر اللہ کے لئے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ جب ملک شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپؐ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے آپؐ کو سجدہ کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا لَا تَسْجُدْ لِیْ یَا سَلْمَانُ وَاسْجُدْ لِلْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ یعنی اے سلمان: مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ صرف اس ذات کو کرو جو حی وقیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں" (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بعض اوقات زمانہ دراز کے بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسے اس واقعہ میں چالیس یا اسّی سال کے بعد ظہور ہوا (ابن جریر و ابن کثیر)

قَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو پھر اس سے نجات ہو جائے تو سنتِ پیغمبری یہ ہے کہ نجات پر شکر ادا کرے، اور مرض و مصیبت کے ذکر کو بھول جائے۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کی ایسی لطیف اور مخفی تدبیریں اور سامان کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا، میں یوسف علیہ السلام نے ایمان و اسلام پر موت کی دعا مانگی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خاص حالات میں موت کی دعا کرنا ممنوع نہیں، اور احادیث صحیحہ میں جو موت کی تمنا کو منع فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی تکلیفوں سے گھبرا کر بے صبری سے موت مانگنے لگے، یہ درست نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے، اگر کہنا ہی ہے تو یوں کہے کہ یا اللہ مجھے جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک زندہ رکھ اور جب موت بہتر ہو تو مجھے موت دیدے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس

اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ

جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے، اور اکثر لوگ نہیں ہیں

وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ

یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے، اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ۧ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

یہ تو اور کچھ نہیں مگر نصیحت سارے عالم کو، اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمان اور

الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا

زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے، اور نہیں

يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ

ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں، کیا نڈر ہوگئے اس سے

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

کہ آ ڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آ پہنچے قیامت اچانک،

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي

اور ان کو خبر نہ ہو، کہہ دے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، سمجھ

ع ۱۱
۵

بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے

الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ

رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

انجام ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے

لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾

پرہیز کرنے والوں کو، کیا اب بھی نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ قصہ (جو اوپر بیان کیا گیا آپ کے اعتبار سے) غیب کی خبروں میں سے ہے (کیونکہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا صرف) ہم (ہی) وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور (یہ ظاہر ہے کہ) آپ ان (برادرانِ یوسف ؑ) کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انھوں نے اپنا ارادہ (یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کا) پختہ کرلیا تھا اور وہ (اس کے متعلق) تدبیریں کر رہے تھے (کہ آپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائیں، وغیر ذلک، اور اس طرح یہ امر یقینی ہے کہ آپ نے کسی سے یہ قصہ سُنا سنایا بھی نہیں، بس یہ صاف دلیل ہے نبوت کی اور صاحب وحی ہونے کی) اور (باوجود نبوت پر دلائل قائم ہونے کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو اور (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا تو کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ آپ ان سے اس (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں (جس میں یہ احتمال ہو کہ اگر یہ قرآن کو قبول نہ کریں گے تو آپ کا معاوضہ فوت ہو جائے گا) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے (جو نہ مانے گا اسی کا نقصان ہوگا) اور (جیسے یہ لوگ منکر نبوت ہیں اسی طرح باوجود دلائل کے منکر توحید بھی ہیں چنانچہ) بہت سی نشانیاں ہیں

(کہ توحید پر دلالت کرنے والی) آسمانوں میں (جیسے کواکب وغیرہ) اور زمین میں (جیسے عناصر وعنصریات) جن پر ان کا گذر ہوتا رہتا ہے (یعنی ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں) اور وہ ان کی طرف (ذرا) توجہ نہیں کرتے (یعنی ان سے استدلال نہیں کرتے) اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں (پس بدون توحید خدا کا ماننا مثل نہ ماننے کے ہے پس یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے بھی کفر کرتے ہیں اور نبوت کیساتھ بھی کفر کرتے ہیں) سو کیا (اللہ و رسول کے منکر ہو کر پھر بھی اس بات) سے مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان پر خدا کے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو ان کو محیط ہو جاوے یا ان پر اچانک قیامت آجائے، اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ مقتضاء کفر کا عقوبت ہے خواہ دنیا میں نازل ہو جائے یا قیامت کے دن واقع ہو، پس ان کو ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہئے) آپ فرما دیجئے کہ میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں (توحید کی اور اپنے داعی من اللہ ہونے کی) دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی (یعنی میرے پاس بھی دلیل ہے توحید و رسالت کی اور میرے ساتھ والے بھی استدلال کے ساتھ مجھ پر ایمان لائے ہیں، میں بے دلیل بات کی طرف کسی کو نہیں بلاتا، دلیل سنو اور سمجھو، پس حاصل طریق یہ ہوا کہ خدا واحد ہے اور میں داعی ہوں) اور اللہ (شرک سے) پاک ہے اور میں (اس طریق کو قبول کرتا ہوں اور) مشرکین میں سے نہیں ہوں اور (یہ جو نبوت پر شبہ کرتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے محض مہمل بات ہے کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے (کوئی بھی فرشتہ نہ تھا جنھوں نے ان کو نہ مانا، اور ایسے ہی مہمل شبہات کرتے رہے، ان کو سزائیں دی گئیں، اسی طرح ان کو بھی سزا ہوگی خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں، اور یہ لوگ جو بے فکر ہیں) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہوا جو ان سے پہلے (کافر) ہو گذرے ہیں اور (یاد رکھو کہ جس دنیا کی محبت میں مدہوش ہو کر تم نے کفر اختیار کیا ہے یہ دنیا فانی اور ہیچ ہے) البتہ عالم آخرت اُن لوگوں کے لئے نہایت بہبودی کی چیز ہے جو (شرک وغیرہ سے) احتیاط رکھتے ہیں (اور توحید واطاعت اختیار کرتے ہیں) تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ فانی اور بے حقیقت چیز اچھی ہے یا باقی اور پائدار) ؎

معارف ومسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ، یعنی یہ قصہ غیب کی اُن خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے،، آپ برادرانِ یوسف ؑ کے پاس موجود نہ تھے،

جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنا طے کر چکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کر رہے تھے۔

اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح بیان کر دینا آپ کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصہ آپ کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے، نہ آپ وہاں موجود تھے، کہ دیکھ کر بیان فرمادیا ہو اور نہ آپ نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی، کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سنکر بیان فرمادیا ہو اس لئے بجز وحی الٰہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

قرآن کریم نے اس جگہ صرف اتنی بات پر اکتفاء فرمایا ہے کہ آپ وہاں موجود نہ تھے، کسی دوسرے شخص یا کتاب سے اس کا علم حاصل نہ ہونے کا ذکر اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ پورا عرب جانتا تھا، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں، آپ نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ آپ کی پوری عمر مکہ معظمہ میں گذری ہے، ملک شام کا ایک سفر تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ کیا تھا، جس میں راستے ہی سے واپس تشریف لے آئے، دوسرا سفر تجارت کے لئے کیا، چند ایام میں کام کرکے واپس تشریف لے آئے، اس سفر میں بھی کسی عالم سے ملاقات یا کسی علمی ادارے سے تعلق کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اس لئے اس جگہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کا بھی ذکر فرمادیا ہے مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا، "یعنی نزول قرآن سے پہلے ان واقعات کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم"۔

امام بغوی نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلائیے کہ کیا اور کس طرح ہوا، جب آپ نے بوحی الٰہی یہ سب بتلادیا اور وہ پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جمے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہونچا، اس پر اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ آپ کی نبوت و رسالت کے دلائل واضح ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان لانے والے نہیں، آپ کتنی ہی کوشش کریں، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ اور اصلاح کی کوشش ہے اس کا کامیاب بنانا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ آپ کے ذمہ ہے، نہ آپ کو اس کا کوئی رنج ہونا چاہئے اس کے بعد فرمایا،

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ، یعنی آپ جو کچھ ان کو تبلیغ کرنے اور صحیح راستے پر لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اس پر ان لوگوں سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگتے، جس کی وجہ سے انکو اس کے سننے یا ماننے میں کوئی دشواری ہو، بلکہ آپ کا کلام تو خالص خیرخواہی

اور نصیحت ہی تمام جہان والوں کے لئے، اس میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب اس کوشش سے آپ کا مقصد کوئی دنیوی منفعت نہیں، بلکہ ثوابِ آخرت اور قوم کی خیرخواہی ہی تو وہ مقصد آپ کا حاصل ہو چکا پھر آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ "یعنی یہ لوگ صرف یہی نہیں کہ کسی ناصح کی نصیحت ضد اور ہٹ دھرمی سے نہیں سنتے بلکہ ان کا تو حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی جو کھلی کھلی نشانیاں آسمان و زمین میں ہر وقت سامنے رہتی ہیں ان پر بھی یہ غفلت و اعراض سے گذرے چلے جاتے ہیں، ذرا دھیان نہیں دیتے کہ یہ کس کی قدرت و عظمت کی نشانیاں ہیں، آسمان و زمین میں حق تعالیٰ شانہٗ کی خدائی و حکمت و قدرت کی نشانیاں بے شمار ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ پچھلی قوموں پر جو عذاب آئے اور ان کی اُلٹی ہوئی یا برباد کی ہوئی بستیاں ان کی نظروں سے گذرتی ہیں، مگر ان سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔

یہ بیان تو ایسے لوگوں کا تھا جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی حکمت و قدرت ہی کے قائل نہیں تھے، آگے ان کا بیان ہے جو وجود باری تعالیٰ کے تو قائل ہیں، مگر اس کی خدائی میں دوسری چیزوں کو شریک قرار دیتے ہیں، فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ، یعنی ان میں جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو وہ بھی شرک کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت وغیرہ اوصاف میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، جو سراسر ظلم اور جہل ہے۔

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو ایمان کے باوجود مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہیں، مسند احمد میں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم پر جس چیز کا خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک شرکِ اصغر ہے، صحابہ کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ریاء شرکِ اصغر ہے، اسی طرح ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا ہے (ابن کثیر عن الترمذی) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام کی منّت اور نیاز ماننا بھی باتفاقِ فقہاء اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد ان کی غفلت و جہالت پر اظہارِ افسوس و تعجب ہو کہ یہ لوگ اپنے انکار و سرکشی کے باوجود اس بات سے کیسے بے فکر ہو گئے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حادثہ عذاب کا آپڑے، یا دفعۃً ان پر قیامت آجائے اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، "یعنی آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ (تم مانو یا نہ مانو) میرا تو یہی

طریقہ اور مسلک ہے کہ لوگوں کو بصیرت اور یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتا رہوں، میں بھی اور وہ لوگ بھی جو میرا اتباع کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری یہ دعوت کسی سرسری نظر پر مبنی نہیں بلکہ پوری بصیرت اور عقل و حکمت کا ثمرہ ہے، اس دعوت و بصیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین اور پیروؤں کو بھی شامل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو علوم رسالت کے خزانے اور خداوند سبحانہ وتعالیٰ کے سپاہی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے، تکلّف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت و خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے، تم انہی کے اخلاق و عادات اور طریقوں کو سیکھو کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔

اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ مَنِ اتَّبَعَنِیْ عام ہو ہر اُس شخص کے لئے جو قیامت تک دعوتِ رسولؐ کو امت تک پہنچانے کی خدمت میں مشغول ہو کلبی اور ابن زید نے فرمایا کہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا دعویٰ کرے اس پر لازم ہے کہ آپؐ کی دعوت کو لوگوں میں پھیلائے، اور قرآن کی تعلیم کو عام کرے (مظہری)

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک سے پاک ہے اللہ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں، اوپر چونکہ یہ ذکر آیا تھا کہ اکثر لوگ جب اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو اس کے ساتھ شرک جلی یا خفی ملا دیتے ہیں، اس لئے شرک سے اپنی بالکل برارت کا اعلان فرمایا، خلاصہ یہ ہے کہ میری دعوت کا یہ مطلب نہیں کہ میں لوگوں کو اپنا بندہ بناؤں، بلکہ میں خود بھی اللہ کا بندہ ہوں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، البتہ بحیثیت داعی مجھ پر ایمان لانا فرض ہے۔

اس پر جو مشرکین مکہ یہ شبہ پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور قاصد تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے، اس کا جواب اگلی آیت میں اس طرح فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، یعنی ان کا یہ خیال بے بنیاد اور لغو ہے کہ اللہ کا رسول اور پیغمبر فرشتہ ہونا چاہئے انسان نہیں ہو سکتا بلکہ معاملہ برعکس ہے، کہ انسانوں کے لئے اللہ کا رسول ہمیشہ انسان ہی ہوتا چلا آیا ہے، البتہ عام انسانوں سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ اس کی طرف براہِ راست حق تعالیٰ کی وحی اور پیغام آتا ہے، اور وہ کسی کی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندوں میں سے جس کو

مناسب سمجھتے ہیں اس کام کے لئے انتخاب فرمالیتے ہیں، اور یہ انتخاب ایسی خاص صفاتِ کمال کی بناء پر ہوتا ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔

آگے ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی طرف داعی اور رسول کی ہدایات کی خلاف ورزی کرکے عذابِ الٰہی کو دعوت دیتے ہیں، فرمایا:

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، "یعنی کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان کو پچھلی قوموں کے حالات کا مشاہدہ ہو کہ رسولوں کے انکار نے ان کو کس انجام بد میں مبتلا کیا، مگر یہ لوگ دنیا کی ظاہری زینت و راحت میں مست ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں، حالانکہ پرہیزگاروں کے لئے آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے، کیا ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ دنیا کی چند روزہ راحت کو آخرت کی دائمی اور مکمل نعمتوں اور راحتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

احکام و ہدایات

اخبارِ غیب اور علمِ غیب میں فرق

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ "یہ سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں"، یہی مضمون تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ آلِ عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریمؑ کے قصہ میں آیا ہے، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ، اور سورۂ ہود کی آیت نمبر ۴۹ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے، تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْكَ۔

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں، خصوصاً ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے، کتبِ حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علمِ غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے، اور یہ وصف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجۂ اتم موجود ہے، اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے، مگر قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عالم الغیب سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا، علمِ غیب اللہ جل شانہ کی صفت خاصہ ہے اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مرادف اور عیسائیوں کا عمل ہی، جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں، قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہوگئی کہ علمِ غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ ہے، اور عالم الغیب صرف اللہ جل شانہ ہی ہیں، البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلا دیتے ہیں، یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علمِ غیب نہیں کہلاتا، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علمِ غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علمِ غیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ سے

اختلافِ خلق از نام اوفتاد　　چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رِجَالًا سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں، عورت نبی یا رسول نہیں ہوسکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا، بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم اُمِ عیسیٰ علیہ السلام، کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ بحکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحی الٰہی سے کوئی بات معلوم ہوئی، مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

اور اسی آیت میں لفظ اَهْلِ الْقُرٰى سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں میں سے بھیجتے ہیں، دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے، کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل و فہم میں کامل نہیں ہوتے (ابن کثیر وقرطبی وغیرہ)۔

حَتّٰىٓ اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ

یہاں تک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو

نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

ہماری مدد پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا

البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو، کچھ بنائی ہوئی بات

يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ

نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز

شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

ع ۷ / ۶

خلاصۂ تفسیر

اگر تم کو کفار پر تاخیر عذاب سے شبہ عدم وقوع کا ہوتا ہو تو تمہاری غلطی ہے، اس لئے کہ پہلی امتوں کے کفار کو بھی بڑی بڑی مہلتیں دی گئی تھیں یہاں تک کہ (مدتِ مہلت دراز ہونے کی وجہ سے) پیغمبر (اس بات سے) مایوس ہو گئے (کہ ہم نے اللہ کی طرف سے کفار پر عذاب آنے کے وعدہ کا جو وقت اپنے قیاس اور اندازے سے مقرر کر لیا تھا کہ اس وقت میں کفار پر عذاب آ کر ہمارا غلبہ اور حقانیت واضح ہو جائے گی) اور ان (پیغمبروں) کو گمان غالب ہو گیا کہ (وعدۂ الٰہیہ کا وقت مقرر کرنے میں، ہمارے فہم نے غلطی کی (کہ بلا تنصیص محض قرائن یا نصرتِ الٰہیہ کے جلد آنے کی خواہش سے قریب کا وقت معین کر لیا، حالانکہ وعدہ مطلق ہے ایسی مایوسی کی حالت میں) ان کو ہماری مدد پہنچی (وہ مدد یہ کہ کفار پر عذاب آیا) پھر (اُس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا، (مراد اس سے مؤمنین ہیں) اور (اس عذاب میں کفار ہلاک کئے گئے، کیونکہ) ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، (بلکہ اُن پر ضرور واقع ہوتا ہے، گو بدیر سہی، پس یہ کفار مکہ بھی اس دھوکہ میں نہ رہیں) ان (انبیاء و امم سابقین) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے (بڑی) عبرت ہے (جو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں کہ اطاعت کا یہ انجام ہوا اور معصیت کا یہ انجام ہوا) یہ قرآن (جس میں یہ قصے ہیں) کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں (کہ اس سے عبرت نہ ہوتی) بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں یہ اُن کی تصدیق کرنیوالا ہے اور

ہر ضروری بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت و رحمت ہے (پس ایسی کتاب میں جو مضامین عبرت کے ہوں گے ان سے تو عبرت حاصل کرنا لازم ہی ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوتِ حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیاتِ مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجامِ بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گرد و پیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجامِ بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے، قومِ لوط علیہ السلام کی بستی الٹ دی گئی، قومِ عاد و ثمود کو طرح طرح کے عذابوں سے نیست و نابود کر دیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔

دوسری آیت میں ہدایت کی گئی کہ دنیا کی تکلیف و راحت تو بہرحال چند روزہ ہے، اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے، جس کا قیام دائمی اور رنج یا راحت بھی دائمی ہے اور فرمایا کہ آخرت کی درستی تقویٰ پر موقوف ہے، جس کے معنی تمام احکامِ شرعیہ کی پابندی کرنا ہیں۔

اس آیت میں پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کے حالات سے موجودہ لوگوں کو متنبہ کرنا تھا اس لئے اگلی آیت میں ان کے ایک شبہ کو دور کیا گیا، وہ یہ کہ اکثر لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عذابِ الٰہی سے ڈرانے کا ذکر عرصہ سے سن رہے تھے اور کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا تھا، اس سے ان کی ہمتیں بڑھ رہی تھیں کہ کوئی عذاب آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا، اس لئے فرمایا کہ اللہ جل شانہ اپنی رحمت اور حکمتِ بالغہ سے بسا اوقات مجرم قوموں کو مہلت دیتے رہتے ہیں، اور یہ مہلت بعض اوقات بڑی طویل بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے سرکشوں کی جرأت بڑھ جاتی ہے، اور پیغمبروں کو ایک گونہ پریشانی پیش آتی ہے، ارشاد فرمایا:

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ یعنی پچھلی امتوں کے نافرمانوں کو بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں، یہاں تک کہ مدتِ دراز تک ان پر عذاب نہ آنے سے پیغمبر یہ خیال کرکے مایوس ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدۂ عذاب کا جو وقت ہم نے اپنے اندازے سے اپنے ذہن میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب نہ آئے گا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا، اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہوگیا کہ وعدۂ الٰہیہ کا اپنے اندازہ سے وقت مقرر کرنے میں ہماری فہم نے غلطی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی معین وقت بتلایا نہیں تھا، ہم نے مخصوص قرائن سے ایک مدت

متعین کرلی تھی، اسی مایوسی کی حالت میں ان کو ہماری مدد پہونچی، وہ یہ کہ وعدے کے مطابق کفار پر عذاب آیا، پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا اس کو بچا لیا، مراد اس سے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے مؤمنین کو بچا لیا گیا، اور کفار ہلاک ہوگئے، کیونکہ ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، بلکہ ضرور آکر رہتا ہے، اس لئے کفار مکہ کو چاہئے کہ عذاب میں دیر ہونے سے دھوکہ میں نہ رہیں۔

اس آیت میں لفظ کُذِبُوْا مشہور قراءت کے مطابق پڑھا گیا ہے، اور اس کی جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ سب سے زیادہ اسلم اور بے غبار ہے، کہ لفظ کُذِبُوْا کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے، جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے کوئی ایسی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جب کوئی اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے، بلکہ ان کو باخبر کر کے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ صلح حدیبیہ اس مضمون کے لئے کافی شاہد ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خواب ہے، آپ نے دیکھا کہ آپ مع صحابہؓ کے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی بحکم وحی ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا ہونا یقینی ہو گیا، مگر خواب میں اس کا کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہوگا، اس لئے صحابۂ کرام میں اعلان کر کے ان کی خاصی تعداد کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے مکہ معظمہ کو روانہ ہوگئے، مگر قریش مکہ نے مزاحمت کی اور اس وقت طواف وعمرہ کی نوبت نہ آئی بلکہ اس کا مکمل ظہور دو سال بعد ۸ھ ہجری میں فتح مکہ کی صورت سے ہوا، اور اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ جو خواب آپ نے دیکھا تھا وہ حق و یقینی تھا، مگر اس کا وقت جو قرائن یا اندازہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا اس میں غلطی ہوئی مگر اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ہو گیا۔

اسی طرح آیت مذکورہ میں قَدْ كُذِبُوْا کا بھی یہی مفہوم ہے کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، اور جو وقت اندازہ سے انبیاء نے اپنے ذہن میں مقرر کیا تھا اس وقت عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے وقت متعین کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے اور علامہ طیبی نے کہا کہ یہ روایت صحیح ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ذکر کی گئی ہے (مظہری)

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ ذال کی تشدید کے ساتھ قَدْ كُذِّبُوْا بھی آیا ہے، جو مصدر تکذیب سے مشتق ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انبیاء نے جو اندازہ سے وقت عذاب مقرر کر دیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے سے ان کو یہ خطرہ ہو گیا کہ اب جو مسلمان ہیں وہ بھی ہماری

تکذیب نہ کرنے لگیں، کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، منکروں پر عذاب آپڑا اور مؤمنین کو اس سے نجات مل، اس طرح اُن کا غلبہ ظاہر ہوگیا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ "یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے"

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان ہوا ہے وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہو کر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید و نصرت ہوتی ہے، کہ کنویں سے نکال کر ایک تختِ سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہا پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکر و فریب کرنے والوں کا انجام ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ "یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی گھڑی ہوئی بات، بلکہ تصدیق ہے اُن کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں"، کیونکہ تورات و انجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصے سے کوئی خالی نہیں (مظہری)

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ "یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی، مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں، اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے، اس میں ایمان لانے والوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہنچ سکتا ہے، کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بدعملی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابومنصور نے فرمایا کہ پوری سورۃ یوسف اور اس میں درج شدہ قصہ یوسف کے بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ کو جو کچھ ایذائیں اپنی قوم کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچتی رہی ہیں مگر بالآخر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو غالب فرمایا آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے ۞

سورۃ یوسف تمام شد

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ رعد مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تینتالیس آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے

الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ

سو حق ہے لیکن بہت لوگ نہیں مانتے ، اللہ وہ ہے جس نے اونچے

السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ

بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو تم ان کو پھر قائم ہوا عرش پر اور کام میں لگا دیا

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

سورج اور چاند کو ، ہر ایک چلتا ہے وقت مقرر پر تدبیر کرتا ہے کام کی

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ② وَهُوَ الَّذِيْ

ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ شاید تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو ، اور وہی ہے جس نے

مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ

پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ اور ندیاں اور ہر

الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ

میوے کے رکھے اس میں جوڑے دو دو قسم کے، ڈھانکتا ہے دن پر رات کو اس میں

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ

نشانیاں ہیں اُن کے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں، اور زمین میں کھیت ہیں مختلف

مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ

ایک دوسرے سے متصل اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسری سے ملی

صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ

ہوئی اور بعضی بن ملی اُن کو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں سے ایک کو ایک سے

فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④

میووں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آپ سن رہے ہیں) آیتیں ہیں ایک بڑی کتاب (یعنی قرآن) کی، اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ بالکل سچ ہے اور (اس کا مقتضا یہ تھا کہ سب ایمان لاتے) لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے، (ربط، اوپر حقیقتِ قرآن کا مضمون تھا، آگے توحید کا مضمون ہے جو کہ اعظم مقاصدِ قرآن سے ہے) اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اونچا کھڑا کر دیا چنانچہ تم ان (آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تختِ سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگا دیا (ان دونوں میں سے) ہر ایک (اپنے مدار پر) ایک وقتِ معین میں چلتا رہتا ہے (چنانچہ سورج اپنے مدار کو سال بھر میں قطع کر لیتا ہے اور چاند مہینہ بھر میں) وہی (اللہ) ہر کام کی (جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے) تدبیر کرتا ہے (اور) دلائل (تکوینیہ و تشریعیہ) کو صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا (یعنی قیامت کا) یقین کر لو (اس کے امکان کا تو اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی عظیم چیزوں کی تخلیق پر قادر ہے تو مُردوں کو زندہ کرنے پر کیوں نہیں قادر ہوگا، اور اس کے وقوع کا یقین اس طرح کہ مخبرِ صادق نے ایک امرِ ممکن کے وقوع

کی خبر دی، لامحالہ وہ سچی اور صحیح ہے) اور وہ ایسا ہے کہ جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے، میٹھے یا چھوٹے، اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا اور) شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو چھپا دیتا ہے (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ان امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں (جس کی تقریر پارہ دوم کے رکوع چہارم کے شروع میں گذری ہے) اور (اسی طرح اور بھی دلائل ہیں توحید کے چنانچہ) زمین میں پاس پاس (اور پھر) مختلف قطعے ہیں (جن کا باوجود متصل ہونے کے مختلف الاثر ہونا عجیب بات ہے) اور انگوروں کے باغ ہیں اور (مختلف) کھیتیاں ہیں اور کھجور (کے درخت) ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ اوپر جاکر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضوں میں دو تنے نہیں ہوتے (بلکہ جڑ سے شاخوں تک ایک ہی تنہ چلا جاتا ہے، اور) سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور (باوجود اس کے پھر بھی) ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں، ان امور (مذکورہ) میں (بھی) سمجھداروں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں :

معارف و مسائل

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی کل آیتیں تینتالیس ۴۳ ہیں، اس سورۃ میں بھی قرآن مجید کا کلام حق ہونا، اور توحید و رسالت کا بیان اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

الٓمّٓرٰ، یہ حروف مقطعہ ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑنا بھی مناسب نہیں۔

حدیث رسول بھی قرآن　پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الٰہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب کی طرح وحی الٰہی ہے　سے مراد قرآن ہے اور وَالَّذِيٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو لیکن واؤ حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور اَلَّذِيٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور اَلَّذِيٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپ دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جا سکتی۔

معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ یہ قرآن اور جو کچھ احکام آپ پر نازل کئے جاتے ہیں وہ سب حق ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن اکثر لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے اس پر ایمان نہیں لاتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے دلائل مذکور ہیں، کہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات کو ذرا غور سے دیکھو تو یقین کرنا پڑے گا کہ ان کی بنانے والی کوئی ایسی ہستی ہے جو قادر مطلق ہے اور تمام مخلوقات و کائنات اس کے قبضہ میں ہیں۔

ارشاد فرمایا اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، "یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے لئے بڑے وسیع اور بلند قبہ کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کردیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو"

کیا آسمان کا جرم آنکھوں سے نظر آتا ہے عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں تَرَوْنَهَا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا (روح المعانی)

اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، "یعنی پھر عرش پر جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے، قائم اور اس طرح جلوہ فرما ہوا جو اس کی شان کے لائق ہے، اس جلوہ فرمانے کی کیفیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، اتنا اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ جس طرح کا استواء شانِ حق کے

شایان ہے وہ مراد ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو مسخر اور تابع حکم کیا ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک، ایک معین رفتار سے چلتا ہے۔

مسخر کرنے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کو جس جس کام پر لگا دیا ہے برابر لگے ہوئے ہیں، ہزاروں سال گذر گئے ہیں لیکن نہ کبھی اُن کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے، نہ تھکتے ہیں، نہ کبھی اپنے مقررہ کام کے خلاف کسی دوسرے کام میں لگتے ہیں، اور معین مدت کی طرف چلنے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ پورے عالم دنیا کے لئے جو آخری مدت قیامت متعین ہے، سب اسی کی طرف چل رہے ہیں اس منزل پر پہونچ کر ان کا یہ سارا نظام ختم ہوجائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کر دیا ہے وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کر لیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔

ان سیاروں کا عظیم الشان وجود پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی صنعت میں سائنس کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزارواں حصہ ملنا بھی ناممکن ہے، یہ نظام قدرت بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو انسانی ادراک وشعور سے بالاتر ہے۔

ہر چیز کی تدبیر حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ "یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے" انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کرسکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا صحیح استعمال سمجھ لے، تمام اشیاءِ عالم کے استعمال کا نظم بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہے جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرت خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے، کہ ہر چیز کھنچی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ سے لے کر رنگ وروغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان، اور اپنا ہنر لئے ہوئے آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامانِ تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھرا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا

کہ اپنے مال یا تدبیر کے زور سے یہ ساری چیزیں مہیا کر سکے، نہ انسانوں کو اپنی خدمت کے لئے حاضر کر لیتے، آپ تو کیا کوئی بڑی سے بڑی حکومت بھی قانون کے زور سے یہ نظام قائم نہیں کر سکتی، بلاشبہ یہ تدبیر اور نظامِ عالم کا قیام صرف حی و قیوم ہی کا کام ہے، انسان اگر اس کو اپنی تدبیر قرار دے تو جہالت کے سوا کیا ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، یعنی وہ اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہو سکتی ہیں جن کو حق تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ نازل فرمایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مزید اُن کا بیان اور تفسیر فرمائی۔

اور آیات سے مراد آیاتِ قدرت یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں جو آسمان زمین اور خود انسان کے وجود میں موجود ہیں، وہ بھی ہو سکتی ہیں، جو بڑی تفصیل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ انسان کی نظر کے سامنے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ؁ یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب و غریب نظام و تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، تو تمہیں آخرت اور قیامت کا یقین ہو جائے، کیونکہ اس نظامِ عجیب اور پیدائشِ عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخلِ قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہو گیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک رہ سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ اور وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بوجھل پہاڑ اور نہریں بنائیں۔

زمین کا پھیلانا اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا، پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرما دیئے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہونچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحرِ منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوض ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال، نہ سڑنے کا امکان، پھر اس کو ایک زیرِ زمین قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ ساری دنیا

میں پھیلایا جاتا ہے، اسی سے کہیں تو کھلی ہوئی ندیاں اور نہریں نکلتی ہیں اور کہیں زیر زمین مستور رہ کر کنوؤں کے ذریعہ اس پائپ لائن کا سراغ لگا کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ، یعنی پھر اس زمین سے طرح طرح کے پھل نکالے اور ہر ایک پھل دو دو قسم کے پیدا کئے، چھوٹے بڑے، سرخ، سفید کھٹے میٹھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد صرف دو نہ ہوں بلکہ متعدد انواع و اقسام مراد ہوں جن کی تعداد کم سے کم دو ہوتی ہے، اس لئے زوجین اثنین سے تعبیر کر دیا گیا، اور کچھ بعید نہیں کہ زوجین سے مراد نر و مادہ ہوں، جیسے بہت سے درختوں کے متعلق تو تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان میں نر و مادہ ہوتے ہیں، جیسے کھجور، پپیتہ وغیرہ دوسرے درختوں میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ ابھی تک تحقیقات وہاں تک نہ پہونچی ہوں۔

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر، مراد یہ ہے کہ دن کی روشنی کے بعد رات لے آتا ہے جیسے کسی روشن چیز کو کسی پردہ میں ڈھانپ دیا جائے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۞ بلاشبہ اس تمام کائنات کی تخلیق اور اس کی تدبیر و نظام میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کاملہ کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ، یعنی پھر زمین میں بہت سے قطعے آپس میں ملے ہوئے ہونے کے باوجود مزاج اور خاصیت میں مختلف ہیں، کوئی اچھی زمین ہے کوئی کھاری، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کے قابل کوئی باغ کے قابل، اور ان قطعات میں باغات ہیں، انگور کے، اور کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں بعض ایسے ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں، اور بعض میں ایک ہی تنہ رہتا ہے۔

اور یہ سارے پھل اگرچہ ایک ہی زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں، اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں اور مختلف قسم کی ہوائیں بھی ان سب کو یکساں پہونچتی ہیں مگر پھر بھی ان کے رنگ اور ذائقے مختلف اور چھوٹے بڑے کا نمایاں فرق ہوتا ہے۔

باوجود اتصال کے پھر یہ طرح طرح کے اختلافات اس بات کی قوی اور واضح دلیل ہے کہ یہ سب کاروبار کسی حکیم و مدبر کے فرمان کے تابع چل رہا ہے، محض مادّہ کے تطورات

نہیں، جیسا کہ بعض جاہل سمجھتے ہیں کیونکہ ذرّے کے تطورات ہوتے تو سب مواد کے مشترک ہونے کے باوجود یہ اختلاف کیسے ہوتا، ایک ہی زمین سے ایک بھی ایک ہو تمیں نکلتی ہیں دوسرے دوسرے ہوتے ہیں، ایک ہی درخت کی ایک ہی شاخ پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے اور مختلف ذائقہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۞ اس میں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اس کی وحدت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے وہ عقل والے نہیں گو دنیا میں ان کو کیسا ہی عقلمند سمجھا اور کہا جاتا ہو۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ
اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کیا ہم نئے سرے سے بنائے
جَدِیْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ
جائیں گے، وہی ہیں جو منکر ہوگئے اپنے رب سے اور وہی ہیں کہ طوق ہیں
فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۞
ان کی گردنوں میں، اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہیں گے برابر۔
وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ
اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے اور گذر چکے ہیں ان سے
قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی
پہلے بہت سے عذاب اور تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے
ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ۞ وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ
ظلم کے اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے، اور کہتے ہیں کافر
كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ
کیوں نہ اُتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے،

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ
اور ہر قوم کیلئے ہوا ہے راہ بتانیوالا، اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑتے ہیں
الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿٨﴾
پیٹ اور بڑھتے ہیں ، اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے -

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو (ان لوگوں کے انکار قیامت سے) تعجب ہو تو (واقعی) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم (مرکر) خاک ہوگئے کیا (خاک ہوکر) ہم پھر (قیامت کو) از سر نو پیدا ہوں گے (تعجب کے لائق اس لئے کہ جو ذات ایسی اشیاء مذکورہ کے خلق پر ابتداءً قادر ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اور اسی سے جواب ہوگیا استبعادِ بعث کا اور انکارِ نبوت کا بھی جس کا مبنیٰ وہ استبعاد تھا ایک کے جواب سے دوسرے کا جواب ہوگیا، آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا (کیونکہ انکارِ بعث سے اُس کی قدرت کا انکار کیا، اور انکار قیامت سے انکارِ نبوت لازم آتا ہے) اور ایسے لوگوں کی گردنوں میں (دوزخ میں) طوق ڈالے جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ لوگ عافیت (کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے مصیبت (کے نازل ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں (کہ اگر آپ نبی ہیں تو جلدی عذاب منگا دیجئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے وقوع کو بہت بعید سمجھتے ہیں) حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعاتِ عقوبت گذر چکے ہیں (تو ان پر آنا کیا مستبعد ہے) اور (اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کو سُن کر یہ لوگ مغرور نہ ہو جاویں کہ اب ہم کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ وہ صرف غفور و رحیم ہی نہیں ہیں اور پھر سب کے لئے غفور و رحیم نہیں ہیں بلکہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی) یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی (ایک خاص درجہ کی) بیجا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت سزا دیتا ہے، (یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں اور ہر ایک کے ظہور کی شرطیں اور اسباب ہیں، پس انھوں نے بلا سبب اپنے کو مستحقِ رحمت و مغفرت کیسے سمجھ لیا، بلکہ کفر کی وجہ سے اُن کے لئے تو اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہی) اور یہ کفار (انکارِ نبوت کی غرض سے) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں نہیں نازل کیا گیا (اور یہ اعتراض محض حماقت ہے کیونکہ آپ مالک معجزات نہیں، بلکہ) آپ

صرف (عذاب خدا سے کافروں کو) ڈرانے والے (یعنی نبی) ہیں اور نبی کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہے جو کہ ظاہر ہو چکا ہے نہ کسی خاص معجزہ کی) اور (کوئی آپ انوکھے نبی نہیں ہوئے بلکہ) ہر قوم کیلئے (امم ماضیہ میں) ہادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعویٰ نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا، خاص دلیل کا التزام نہیں ہوا) اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے، اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی پہلی تین آیتوں میں کفار کے شبہات کا جواب ہے، جو نبوت کے متعلق تھے اور اس کے ساتھ منکرین کے لئے عذاب کی وعید مذکور ہے۔

ان کے شبہات تین تھے، ایک یہ کہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور محشر کے حساب و کتاب کو محال خلاف عقل سمجھتے تھے، اسی بناء پر آخرت کی خبر دینے والے انبیاء کی تکذیب اور ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم نے ان کے اس شبہ کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے، هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اس میں انبیاء کا مذاق اڑانے کے لئے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو تمہیں یہ بتلاتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور تمہاری مٹی کے ذرات بھی سارے جہان میں پھیل جائیں گے تم اس وقت پھر دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ان کے اس شبہ کا جواب دیا گیا، وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ کفار آپ کے لئے کھلے ہوئے معجزات اور آپ کی نبوت پر اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اور مانتے ہیں تو ایسے بے جان پتھروں کو مانتے ہیں جن میں نہ حس ہے نہ شعور، خود اپنے نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں دوسروں کو کیا نفع پہونچا سکتے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا، قرآن نے وجہ اس تعجب کی بالتصریح بیان نہیں کی، کیونکہ پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے عجیب عجیب مظاہر بیان کر کے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسا قادر مطلق ہے جو ساری مخلوق کو عدم سے وجود میں

لایا، اور پھر ہر چیز کے وجود میں کیسی کیسی حکمتیں رکھیں کہ انسان ان کا ادراک و احاطہ بھی نہیں کر سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ بالکل عدم سے ایک چیز کو موجود کر سکتی ہے اس کو دوبارہ موجود کر دینا کیا مشکل ہے، انسان بھی جب کوئی نئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلی مرتبہ اس کو مشکل پیش آتی ہے اور اسی کو دوبارہ بنانا چاہے تو آسان ہو جاتا ہے۔

تو تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے تو قائل ہیں کہ پہلی مرتبہ تمام کائنات کو بے شمار حکمتوں کے ساتھ اسی نے پیدا فرمایا ہے پھر دوبارہ پیدا کرنے کو کیسے محال اور خلافِ عقل سمجھتے ہیں۔

شاید ان منکرین کے نزدیک بڑا اشکال یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد انسان کے اجزاء اور ذرات دنیا بھر میں منتشر ہو جاتے ہیں، ہوائیں ان کو کہیں سے کہیں لیجاتی ہیں اور دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی یہ ذرات سارے جہان میں پھیل جاتے ہیں، پھر قیامت کے روز ان تمام ذرات کو جمع کس طرح کیا جائے گا اور پھر ان کو جمع کر کے دوبارہ زندہ کیسے کیا جائیگا؟

مگر وہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت جو وجود ان کو حاصل ہے اس میں کیا سارے جہان کے ذرات جمع نہیں، دنیا کے مشرق و مغرب کی چیزیں پانی ہوا اور ان کے لائے ہوئے ذرات انسان کی غذا میں شامل ہو کر اس کے بدن کا جزء بنتے ہیں، اس مسکین کو بسا اوقات خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایک لقمہ جو منہ تک لے جا رہا ہے اس میں کتنے ذرات افریقہ کے کتنے امریکہ کے اور کتنے مشرقی ممالک کے ہیں، تو جس ذات نے اپنی حکمتِ بالغہ اور تدبیر امور کے ذریعہ اس وقت ایک ایک انسان اور جانور کے وجود کو سارے جہان کے منتشر ذرات جمع کر کے کھڑا کر دیا ہے، کل اس کے لئے یہ کیوں مشکل ہو جائے گا کہ ان سب ذرات کو جمع کر ڈالے، جبکہ دنیا کی ساری طاقتیں ہوا اور پانی اور دوسری قوتیں سب اس کے حکم کے تابع اور مسخر ہیں، اس کے اشارہ پر ہوا اپنے اندر کے، دریا اپنے اندر کے اور فضاء اپنے اندر کے سب ذرات کو جمع کر دیں اس میں کیا اشکال ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور حکمِ حق کے تابع چلتے ہیں ؎

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند

با من و تو مردہ با حق زندہ اند

خلاصہ یہ ہے کہ کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود جس طرح ان کا نبوت سے انکار قابل تعجب ہے اس سے زیادہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حشر کے دن سے انکار تعجب

کی چیز ہے۔

اس کے بعد ان معاند منکرین کی سزا کا ذکر کیا گیا کہ یہ لوگ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت اپنے رب کا انکار کرتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہوگی کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

دوسرا شبہ منکرین کا یہ تھا کہ اگر فی الواقع آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں تو نبی کی مخالفت پر جو عذاب کی وعیدیں آپ سناتے ہیں وہ عذاب آتا کیوں نہیں، اس کا جواب دوسری آیت میں دیا گیا وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ "یعنی یہ لوگ ہمیشہ عافیت کی میعاد ختم ہونے سے پہلے آپ سے مصیبت کے نازل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں، کہ اگر آپ نبی ہیں تو فوری عذاب منگا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے کو بہت ہی بعید و ناممکن سمجھتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے دوسرے کافروں پر بہت سے واقعات عذاب کے گذر چکے ہیں جن کا سب لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے، تو ان پر عذاب آجانا کیا مستبعد ہے، یہاں لفظ مَثُلٰت مُثلہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کر دے، اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے۔

پھر فرمایا کہ بیشک آپ کا رب لوگوں کے گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود بڑی مغفرت و رحمت والا بھی ہے، اور جو لوگ اس مغفرت و رحمت سے فائدہ نہ اٹھائیں، اپنی سرکشی و نافرمانی پر جمے رہیں ان کے لئے سخت عذاب دینے والا بھی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے غفور و رحیم ہونے سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں، کہ ہم پر عذاب آ ہی نہیں سکتا

تیسرا شبہ ان کفار کا یہ تھا کہ اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ہم دیکھ چکے ہیں لیکن جن خاص خاص قسم کے معجزات کا ہم نے مطالبہ کیا ہے وہ کیوں ظاہر نہیں کرتے؟ اس کا جواب تیسری آیت میں یہ دیا گیا ہے:

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ "یعنی یہ کفار آپ کی نبوت پر اعتراض کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ جس کو طلب کرتے ہیں وہ کیوں نازل نہیں کیا گیا، سو اس کا جواب واضح ہے کہ معجزہ ظاہر کرنا پیغمبر اور نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ براہ راست وہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، وہ اپنی حکمت سے جس وقت جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، وہ کسی کے مطالبہ اور خواہش کے پابند نہیں، اسی لئے فرمایا اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ، یعنی

آپ کافروں کو خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والے ہیں، معجزہ ظاہر کرنا آپ کا کام نہیں۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، یعنی ہر قوم کے لئے پچھلی امتوں میں ہادی ہوتے چلے آئے ہیں، آپ کوئی انوکھے نبی نہیں، سب ہی انبیاء کا وظیفہ یہ تھا کہ وہ قوم کو ہدایت کریں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں معجزات کا ظاہر کرنا کسی کے اختیار میں نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ جب اور جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔

کیا ہر قوم اور ہر ملک میں نبی آنا ضروری ہے؟ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطۂ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت کرنے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا خواہ وہ کوئی نبی ہو یا اس کے قائم مقام نبی کی دعوت کو پھیلانے والا ہو جیسے سورۂ یٰسٓ میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت و ہدایت کے لئے بھیجنے کا ذکر ہے، جو خود نبی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا مذکور ہے۔

اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی و رسول پیدا ہوا ہو البتہ دعوتِ رسول کے پہونچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے، اور پھر یہاں بے شمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

یہاں تک تین آیتوں میں نبوت کا انکار کرنے والوں کے شبہات کا جواب تھا، چوتھی آیت میں پھر وہی اصل مضمون توحید کا مذکور ہے جس کا ذکر اس سورۃ کی ابتداء سے آرہا ہے، ارشاد ہے

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ یعنی اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے لڑکا ہو یا لڑکی حسین ہو یا بدشکل، نیک ہو یا بد، اور جو کچھ ان عورتوں کے رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کہ کبھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے کبھی زیادہ اور کبھی جلدی پیدا ہوتا ہے کبھی دیر میں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے، کہ وہ عالم الغیب ہیں، تمام کائنات و مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرہ کے بدلتے ہوئے حالات سے باخبر ہیں اس کے ساتھ ہی تخلیقِ انسانی کے ہر دور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا ذکر ہے کہ حمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی یا دونوں یا کچھ بھی نہیں صرف پانی یا ہوا ہے، قرائن اور تخمینہ سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے، ایکسرے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو کھولنے سے قاصر ہے، اس کا حقیقی اور یقینی علم صرف

اللہ جل شانہٗ ہی کو ہو سکتا ہے، اسی کا بیان ایک دوسری آیت میں ہے وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔

لفظ تَغِيضُ عربی زبان میں کم ہونے اور خشک ہونے کے معنی میں آتا ہے، آیت مذکورہ میں اس کے بالمقابل تَزْدَادُ کے لفظ نے متعین کر دیا کہ اس جگہ معنی کم ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ کمی بیشی ہوتی ہے اس کا علم صحیح بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس کمی اور بیشی سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی تعداد میں کمی بیشی ہو کہ حمل میں صرف ایک بچہ ہے یا زیادہ، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ پیدائش کی کمی بیشی مراد ہو، یعنی کتنے مہینے کتنے دن اور کتنے گھنٹوں میں پیدا ہو کر یہ انسان کو شرہ ہستی میں وجود دے گا اس کا یقینی علم بھی بجز اللہ جل شانہٗ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ زمانہ حمل میں جو خون عورت کو آجاتا ہے وہ حمل کی جسامت و صحت میں کمی کا باعث ہوتا ہے، تَغِيضُ الْأَرْحَامُ سے مراد یہ کمی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جتنے اقسام کمی کے ہیں آیت کے الفاظ سب پر حاوی ہیں، اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔

كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص انداز اور پیمانہ مقرر ہے، نہ اس سے کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہے کہ کتنے دن رحم میں رہے گا، پھر کتنے زمانہ تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہٗ کا یہ بے مثال علم اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴿٩﴾ سَوَاۗءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر، برابر ہے تم میں جو

اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ

آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں

بِالنَّهَارِ ﴿١٠﴾ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ

پھرتا ہے دن کو، اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ

اللہ کے حکم سے، اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ

اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی، اور کوئی نہیں ان کا اس کے سوا

مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنْشِئُ

مددگار، وہی ہے تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر کو اور امید کو اور اٹھاتا ہے

السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ

بادل بھاری، اور پڑھتا ہے گرجنے والا خوبیاں اس کی اور سب فرشتے اس کے

خِیْفَتِهٖ ۚ وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَهُمْ

ڈر سے اور بھیجتا ہے کڑاکے کی بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ لوگ

یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ

جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی آن سخت ہے، اسی کا پکارنا سچ ہے،

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا

اور جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے

كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ

پھیلا دیے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے گا اس تک اور جتنی پکار ہے

الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ

کافروں کی سب گمراہی ہے، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمان اور

الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة

زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام

خلاصۂ تفسیر

وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے سب سے بڑا (اور) عالی شان ہے تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں (یعنی سب کو یکساں جانتا ہے اور

جیسا تم میں سے ہر شخص کو جانتا ہے اسی طرح ہر ایک کی حفاظت بھی کرتا ہے چنانچہ تم میں سے ہر شخص (کی حفاظت) کے لئے کچھ فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا بہت بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، اور اس سے کوئی یوں نہ سمجھ جاوے کہ جب فرشتے ہمارے محافظ ہیں پھر تو چاہو کرو، معصیت خواہ کفر کسی طرح عذاب نازل نہ ہوگا، یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ واقعی اللہ تعالیٰ ابتداءً تو کسی کو عذاب دیتا نہیں چنانچہ اس کی عادت ہے کہ وہ کسی قوم کی اچھی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی صلاحیت کی حالت کو نہیں بدل دیتے (مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنی صلاحیت میں خلل ڈالنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مصیبت و عقوبت تجویز کی جاتی ہے) اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں (وہ واقع ہو جاتی ہے) اور ایسے وقت میں کوئی خدا کے سوا جن کی حفاظت کا ان کو زعم ہے، ان کا مددگار نہیں رہتا (حتیٰ کہ فرشتے بھی ان کی حفاظت نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی تو حفاظت ان کے کام نہ آسکتی وہ ایسا عظیم الشان) ہے کہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہ بادلوں کو بھی بلند کرتا ہے جو پانی سے بھرے ہوتے ہیں اور رعد (فرشتہ) اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور (دوسرے) فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تحمید و تسبیح کرتے ہیں) اور وہ (زمین کی طرف) بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہے گرا دیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں باوجود اس کے ایسے عظیم الشان ہونے کے) جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑا شدید القوت ہے (کہ جس سے ڈرنا چاہئے مگر یہ لوگ ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں) اور وہ ایسا مجیب الدعوات ہے کہ سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے (کیونکہ اس کو قبول کرنے کی قدرت ہے) اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ (اپنے حوائج و مصائب میں) پکارتے ہیں وہ (بوجہ عدم قدرت کے) ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے، جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو (اور اس کو اشارہ سے اپنی طرف بلا رہا ہو) تاکہ وہ (پانی) اس کے منہ تک (اڑ کر) آجاوے اور وہ (از خود) اس کے منہ تک (کسی طرح) آنے والا نہیں (پس جس طرح پانی ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہے اسی طرح ان کے معبود عاجز ہیں، اس لئے) کافروں کی (ان سے) درخواست کرنا محض بے اثر ہے اور اللہ کی ایسی قدرت مطلق ہے کہ (اس) کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں

(بعضے) خوشی سے اور (بعضے) مجبوری سے (خوشی سے یہ کہ باختیار خود عبادت کرتے ہیں اور مجبوری کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتا) اور (ان زمین والوں) کے سائے بھی (سرخم کرتے ہیں) صبح و شام کے وقتوں میں (یعنی سایہ کو جتنا چاہیں بڑھائیں جتنا چاہیں گھٹائیں اور صبح و شام کے وقت چونکہ دراز ہونے اور گھٹنے کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اس لئے تخصیص کی گئی ورنہ سایہ بھی باین معنی ہر طرح مطیع ہے) ۞

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے اللہ جل شانہٗ کی مخصوص صفات کمال کا سلسلہ چل رہا ہے، جو درحقیقت توحید کے دلائل ہیں، اس آیت میں فرمایا:

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ۔ غیب سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی حواس سے غائب ہو یعنی نہ آنکھوں سے اس کو دیکھا جاسکے نہ کانوں سے سُنا جاسکے، نہ ناک سے سونگھا جاسکے نہ زبان سے چکھا جاسکے، نہ ہاتھوں سے چھُو کر معلوم کیا جاسکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حاضر و موجود کو جانتا ہے۔

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہے کہ وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور برتر ہے، کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کے لئے اجمالی طور پر بڑائی اور کبریائی کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اپنے قصورِ فہم سے اللہ تعالیٰ کو بھی عام انسانوں پر قیاس کرکے اللہ کے لئے ایسی صفات ثابت کرتے تھے جو اس کی شان سے بہت ابعد ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ نے اللہ کے لئے بیٹا ثابت کیا، کسی نے اللہ کے لئے انسان کی طرح جسم اور اعضاء ثابت کئے، کسی نے جہت اور سمت کو ثابت کیا، حالانکہ وہ ان تمام حالات و صفات سے بالا و بلند اور منزّہ ہے، قرآن کریم نے ان کی بیان کردہ صفات سے برات کے لئے بار بار فرمایا سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ یعنی پاک ہے اللہ ان صفات سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

پہلے جملے عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ میں نیز اس سے پہلی آیت اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰی میں اللہ جل شانہٗ کے کمال علمی کا بیان تھا، اس دوسرے جملے اَلْكَبِیْرُ الْمُتَعَالِ میں کمال قدرت و عظمت کا ذکر ہے، کہ اس کی طاقت و قدرت انسانی تصورات سے بالاتر ہے، اس کے بعد کی آیت میں بھی اسی کمال علمی اور کمال قدرت کو ایک خاص انداز

سے بیان فرمایا ہے:

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ۔

اَسَرَّ الْقَوْلَ، اسرار سے بنا ہے جس کے معنی خفیہ کلام اور جہر کے معنی علانیہ کلام کے ہیں جو کلام انسان کسی دوسرے کو سنانے کے لئے کرتا ہے اسے جہر کہتے ہیں، اور جو خود اپنے آپ کو سنانے کے لئے کرتا ہے اس کو سِر کہا جاتا ہے، مستخف کے معنی چھپنے والا، سارب کے معنی آزادی اور بے فکری سے راستہ پر چلنے والا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ کے علم محیط کی وجہ سے اس کے نزدیک خفیہ کلام کرنے والا اور بلند آواز سے کلام کرنے والا دونوں برابر ہیں، وہ دونوں کے کلام کو یکساں طور پر سنتا اور جانتا ہے، اسی طرح جو شخص رات کی اندھیری میں چھپا ہوا ہے، اور جو دن کے اُجالے میں کھلے راستے پر چل رہا ہے، یہ دونوں اس کے علم اور قدرت کے اعتبار سے برابر ہیں، کہ دونوں کے اندرونی اور ظاہری سب حالات اس کو یکساں معلوم ہیں، اور دونوں پر اس کی قدرت یکساں حاوی ہے، کوئی اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں، اسی کا مزید بیان اگلی آیت میں اس طرح ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ

مُعَقِّبٰت، معقبة کی جمع ہے، اس جماعت کو جو دوسری جماعت کے پیچھے متصل آئے اس کو مُعَقِّبَہ یا متعقبہ کہا جاتا ہے، مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ کے لفظی معنی ہیں دونوں ہاتھ کے درمیان، مراد انسان کے سامنے کی جہت اور سمت، وَمِنْ خَلْفِهٖ پیچھے کی جانب مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ میں مِن بمعنی بار سببیت کے لئے ہے، بِاَمْرِ اللّٰهِ کے معنی میں آیا ہے، بعض قراءتوں میں یہ لفظ بِاَمْرِ اللّٰهِ منقول بھی ہے (روح)

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر شخص خواہ اپنے کلام کو چھپانا ہے یا ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی طرح اپنے چلنے پھرنے کو رات کی تاریکیوں کے ذریعہ مخفی رکھنا چاہے یا کھلے بندوں سڑکوں پر پھرے ان سب انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے فرشتوں کی جماعتیں مقرر ہیں، جو اُن کے آگے اور پیچھے سے احاطہ کئے رہتے ہیں، جن کی خدمت اور ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور وہ یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں، اُن کے ذمہ یہ کام سپرد ہے کہ وہ بحکمِ خداوندی انسانوں کی حفاظت کریں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں

ایک رات کے لئے دوسرے دن کے لئے اور یہ دونوں جماعتیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں صبح کی نماز کے بعد رات کے محافظ رخصت ہو جاتے ہیں دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں، اور عصر کی نماز کے بعد یہ رخصت ہو جاتے ہیں، رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آجاتے ہیں۔

ابو داؤد کی ایک حدیث میں بروایت علی مرتضیٰؓ مذکور ہے، کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گر جائے، یا کسی گڑھے اور غار میں نہ گر جائے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہونچائے، البتہ جب حکم الٰہی کسی انسان کو بلاء و مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافذ ہو جاتا ہے تو محافظ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی ایک حدیث بروایت عثمان غنیؓ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیوی مصائب اور تکلیفوں ہی سے حفاظت نہیں بلکہ وہ انسان کو گناہوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں انسان کے دل میں نیکی اور خوف خدا کا داعیہ پیدا کرتے رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ گناہ سے بچے، اور اگر پھر بھی وہ فرشتوں کے الہام سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہی ہو جائے تو وہ اس کی دعاء اور کوشش کرتے ہیں کہ جلد توبہ کرکے گناہ سے پاک ہو جائے، پھر اگر وہ کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تب وہ اس کے نامۂ اعمال میں گناہ کا کام لکھدیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں، حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے یہ حفاظت خداوندی کا پہرہ ہٹادیا جائے تو جنات ان کی زندگی وبال کردیں، لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اسی وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیر الٰہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندہ کو مبتلا کرنا چاہیں تو یہ حفاظتی پہرا ہٹ جاتا ہے،

اسی کا بیان اگلی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت امن و عافیت کو آفت و مصیبت میں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اعمال و احوال کو برائی اور فساد میں تبدیل نہ کرلے، اور جب وہ اپنے حالات کو سرکشی اور نافرمانی سے بدلتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرز بدل دیتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کا برا چاہیں اور عذاب دینا چاہیں تو نہ پھر کوئی اس کو ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی حکم ربانی

کے خلاف ان کی مدد کو پہونچ سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے، لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور اس کی اطاعت چھوڑ کر بد عملی بدکرداری اور سرکشی ہی اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ بھی یہ حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں، پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب اُن پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں تغییرِ حال سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم طاعت اور شکر گذاری چھوڑ کر اپنے حالات میں بُری تبدیلی پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرزِ رحمت وحفاظت کا بدل دیتے ہیں۔

اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے،

اسی مفہوم میں یہ شعر مشہور ہے ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حال کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الٰہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں، ؎

دادِ حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت دادِ ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان اور سب قوی و اعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی مل رہی ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

البتہ انعامات کا استحقاق اور وعدہ بغیر سعی کے حاصل نہیں ہوتا، اور کسی قوم کو بغیر سعی و عمل کے انعامات کا انتظار کرتے رہنا خود فریبی کے مرادف ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے، جو تمہیں برق و بجلی دکھلاتا ہے جو انسان کے لئے خوف بھی بن سکتی ہے کہ جس جگہ پڑ جائے سب کچھ خاک کر ڈالے اور طمع بھی ہوتی ہے کہ بجلی کی چمک کے بعد بارش آئے گی، جو انسان اور حیوانات کی زندگی کا سہارا ہے، اور وہی ذات پاک ہے جو بڑے بڑے بھاری بادل سمندر سے مان سون بنا کر اٹھاتا ہے، اور پھر ان پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو فضا میں بڑی سرعت کے ساتھ کہیں سے کہیں لے جاتا ہے، اور اپنے حکم قضا و قدر کے مطابق جس زمین پر چاہتا ہے برساتا ہے۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهٖ یعنی تسبیح پڑھتا ہے رعد اللہ تعالیٰ کے حمد و شکر کی، اور تسبیح پڑھتے ہیں فرشتے اس کے خوف سے، رعد، عرف و محاورہ میں بادل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے، اس کے تسبیح پڑھنے سے مراد وہی تسبیح ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن یہ تسبیح عام لوگ سن نہیں سکتے۔

اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو بارش برسانے پر مسلط اور مامور ہے، اس معنی کے اعتبار سے تسبیح پڑھنا ظاہر ہے۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ، صواعق، صاعقہ کی جمع ہے، زمین پر گرنے والی بجلی کو صاعقہ کہا جاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ بجلیاں زمین پر بھیجتا ہے جن کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے ہلاک کر دیتا ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ، لفظ محال، بکسر میم حیلہ و تدبیر کے معنی میں ہے، اور عذاب و عقاب کے معنی میں بھی، اور قدرت کے معنی میں بھی، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کے معاملہ میں باہمی جھگڑے اور مجادلہ میں مبتلا ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوی تدبیر کرنے والے ہیں جس کے سامنے کسی کی چال نہیں چلتی۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہ دے اللہ، کہہ پھر کیا تم نے پکڑے ہیں

مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ

اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے اور برے کے، کہہ

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ

کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہے اندھیرا اور

النُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ

اُجالا، کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ

عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

ہوگئی پیدائش ان کی نظر میں، کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست،

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ

اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق پھر اوپر لے آیا

السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ

وہ نالا جھاگ پھولا ہوا، اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے

ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ

زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی، یوں بیان کرتا ہے اللہ

الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا

حق اور باطل کو، سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں، اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے یوں) کہئے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار (یعنی [illegible] جس
خالق و حافظ کون ہے (اور چونکہ اس کا جواب متعین ہے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے
کہ اللہ ہے (پھر) آپ یہ کہئے کہ کیا (پھر بھی) تم نے خدا کے سوا دوسرے

مددگار (یعنی معبود) قرار دے رکھے ہیں جو (بوجہ غایت عجز کے) خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے (اور پھر شرک کے ابطال اور توحید کے احقاق کے بعد اہل توحید و اہل شرک اور خود توحید و شرک کے درمیان اظہار فرق کے لئے) آپ یہ (بھی) کہئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے (یہ مثال ہے مشرک اور موحد کی) یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہے (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انھوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسا خدا (ان کے عقیدہ کے موافق بھی) پیدا کرتا ہے پھر (اس وجہ سے) ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو (اور اس سے استدلال کیا ہو کہ جب دونوں یکساں خالق ہیں تو دونوں یکساں معبود بھی ہوں گے اس کے متعلق بھی) آپ (یہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی (اپنی ذات و صفات کمال میں) واحد ہے (اور سب مخلوقات پر) غالب ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر (اس پانی سے) نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے (یعنی چھوٹے نالے میں تھوڑا پانی اور بڑے نالے میں زیادہ پانی) پھر وہ سیلاب (کا پانی) خس و خاشاک کو بہا لایا جو اس (پانی کی سطح کے) اوپر (آرہا) ہے (ایک کوڑا کرکٹ تو یہ ہے) اور جن چیزوں کو آگ کے اندر (رکھ کر) زیور یا اور اسباب (ظروف وغیرہ) بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آجاتا) ہے (پس ان دو مثالوں میں دو چیزیں ہیں ایک کارآمد چیز کہ اصل پانی اور اصل مال ہے اور ایک ناکارہ چیز کہ کوڑا کرکٹ میل کچیل ہے) غرض اللہ تعالیٰ حق (یعنی توحید و ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر و شرک وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے (جس کی تکمیل اگلے مضمون سے ہوتی ہے، سو ان دونوں مذکورہ مثالوں میں) جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے کار آمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے اور جس طرح حق و باطل کی مثال بیان کی گئی، اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔

معارف ومسائل

حاصل دونوں مثالوں کا یہ ہے کہ جیسا کہ ان مثالوں میں میل کچیل برائے چندے اصلی چیز کے اوپر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار وہ پھینک دیا جاتا ہے، اور اصلی چیز رہ جاتی ہے، اسی طرح باطل اگرچہ چندروز حق کے اوپر غالب نظر آئے، لیکن آخر کار باطل محو اور مغلوب

ہو جاتا ہے اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے، کذا فی الجلالین۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے، اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا

لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا

اگر ان کے پاس ہو جو کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں

بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ

اپنے بدلے میں ان لوگوں کے لئے ہے برا حساب، اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے، اور وہ بری

الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ

آرام کی جگہ ہے، بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے،

كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ

برابر ہو سکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہے، سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے، وہ لوگ جو پورا

يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ

کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو، اور وہ لوگ جو

يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا ملانا اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے،

وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ

اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا، اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو

وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

اپنے رب کی اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ

پوشیدہ اور ظاہر اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی ان لوگوں کے لئے

ساتھ کی جا دے حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں (یعنی کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو بھی برائی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں) اس جہان میں (یعنی آخرت میں) نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتیں جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور اُن کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں گے (گو ان موصوفین کے درجہ کے نہ ہوں، وہ بھی (جنت میں ان کی برکت سے انہی کے درجوں میں داخل ہوں گے) اور فرشتے ان کے پاس ہر (سمت کے) دروازہ سے آتے ہوں گے اور یہ کہتے ہوں گے کہ تم (ہر آفت اور خطرہ سے) صحیح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم (دین حق پر) مضبوط رہے تھے، سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حق و باطل کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا تھا، مذکورہ آیات میں اہل حق اور اہل باطل کی علامات و صفات اور ان کے اچھے اور برے اعمال اور ان کی جزاء و سزا کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں احکام ربانی کی تعمیل و اطاعت کرنے والوں کے لئے اچھے بدلے کا اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے عذاب شدید کا ذکر ہے۔

دوسری آیت میں ان دونوں کی مثال بینا اور نابینا سے دی گئی ہے، اور اس کے آخر میں فرمایا اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ، یعنی اگرچہ بات واضح ہے مگر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں، جن کی عقلیں غفلت و معصیت نے بیکار کر رکھی ہیں وہ اتنے بڑے عظیم فرق کو بھی نہیں سمجھتے۔

تیسری آیت سے ان دونوں فریق کے خاص خاص اعمال، اور علامات کا بیان شروع ہوا ہے، پہلے احکام الٰہیہ کے ماننے والوں کی صفات یہ ذکر فرمائی ہیں، اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، مراد اس سے وہ تمام عہد و پیمان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لئے ہیں، جن میں سب سے پہلا وہ عہد ربوبیت ہے جو ازل میں تمام ارواح کو حاضر کر کے لیا گیا تھا، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جس کے جواب میں سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا، بَلٰی یعنی کیوں نہیں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں، اسی طرح تمام احکام الٰہیہ کی اطاعت تمام فرائض کی ادائیگی اور ناجائز چیزوں سے اجتناب کی منجانب اللہ وصیت اور بندوں

کی طرف سے اس کا اقرار مختلف آیاتِ قرآن میں مذکور ہے۔

دوسری صفت وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ہے یعنی وہ کسی عہد و میثاق کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہیں جن کا ذکر ابھی پہلے جملے میں عَهْدُ اللّٰهِ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اور وہ عہد بھی جو امت کے لوگ اپنے نبی و رسول سے کرتے ہیں، اور وہ معاہدے بھی جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔

ابوداؤد نے بروایت عوف ابن مالکؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے اس پر عہد و بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امیر کی اطاعت کریں گے، اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندیِ عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو کسی انسان سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھا دو، بلکہ خود سواری سے اُتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور جذبۂ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں اور اتفاق سے ان کے دخولِ مسجد کے وقت آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ بیٹھ جاؤ، عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہو تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبۂ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اُسی جگہ بیٹھ گئے۔

تیسری صفت اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی یہ بتلائی گئی وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُوصَلَ، یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں، اس کی مشہور تفسیر تو یہی ہے کہ رشتہ داری کے تعلق قائم رکھنے اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے یہ لوگ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے ساتھ پچھلے انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان کو ملا دیتے ہیں۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ یعنی یہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں

یہاں لفظ خوف کے بجائے خشیۃ کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا خوف اس طرح کا نہیں جیسے درندہ جانور یا موذی انسان سے طبعاً خوف ہوا کرتا ہے، بلکہ ایسا خوف ہے جیسے اولاد کو ماں باپ کا، شاگرد کو استاد کا خوف عادۃً ہوتا ہے کہ اس کا منشا کسی ایذا رسانی کا خوف نہیں ہوتا بلکہ عظمت و محبت کی وجہ سے خوف اس کا ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی قول و فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور مکروہ نہ ہو جائے، اسی لئے مقام مدح میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے خوف کا ذکر ہے عموماً وہاں یہی لفظ خشیت کا استعمال ہوا ہے، کیونکہ خشیت اسی خوف کو کہا جاتا ہے جو عظمت و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اگلے جملہ میں جہاں حساب کی سختی کا خوف بیان کیا گیا ہے وہاں خشیت کا لفظ نہیں بلکہ خوف ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد فرمایا:

وَيَخَافُونَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ، یعنی یہ لوگ بُرے حساب سے ڈرتے ہیں، بُرے حساب سے مراد حساب میں سختی اور جزرسی ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمت الٰہی سے ہو سکتی ہے کہ حساب اعمال کے وقت اجمال اور عفو و درگذر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص سے بھی پورا پورا ذرہ ذرہ کا حساب لیا جائے اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و خطا کبھی سرزد نہ ہوا ہو، یہ حساب کی سختی کا خوف نیک و فرمانبردار لوگوں کی پانچویں صفت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، یعنی وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر کرتے ہیں،

صبر کے معنی عربی زبان میں اس مفہوم سے بہت عام ہیں جو اردو زبان میں سمجھے جاتے ہیں کہ کسی مصیبت اور تکلیف پر صبر کریں، کیونکہ اس کے اصلی معنی خلاف طبع چیزوں سے پریشان نہ ہونا، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام پر لگے رہنا ہے، اسی لئے اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، ایک صبر علی الطاعۃ، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر ثابت قدم رہنا، دوسرے صبر عن المعصیۃ یعنی گناہوں سے بچنے پر ثابت قدم رہنا۔

صبر کے ساتھ ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلق صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبرے انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیاری ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیر اختیاری کیفیت کا اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی، "یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتدا صدمہ کے

وقت اختیار کرلیا جائے، ورنہ بعد میں تو کبھی نہ کبھی مجبور ہوکر انسان کو صبر آہی جاتا ہے، بلکہ قابل مدح وثنا وہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے خلافِ طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض و واجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات و مکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہوگیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کرکے واپس آگیا، تو یہ غیر اختیاری صبر کوئی مدح وثواب کی چیز نہیں ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔

ساتویں صفت أَقَامُوا الصَّلٰوةَ ہے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا ہے، محض نماز پڑھنا نہیں، اسی لئے قرآن کریم میں عموماً نماز کا حکم اقامتِ صلوٰۃ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

آٹھویں صفت وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اللہ کے نام پر بھی خرچ کرتے ہیں، اس میں اشارہ کیا گیا کہ تم سے جس زکوٰۃ وغیرہ کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہ کچھ تم سے نہیں مانگتا بلکہ اپنے ہی دیئے ہوئے رزق کا کچھ حصہ وہ بھی صرف ڈھائی فیصد جیسی قلیل و حقیر مقدار میں آپ سے مانگا جاتا ہے، جس کے دینے میں آپ کو طبعاً کوئی پس و پیش نہ ہونی چاہئے۔

مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً کی قید سے معلوم ہوا کہ صدقہ خیرات میں ہر جگہ اخفاء ہی مسنون نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا اظہار بھی درست وصحیح ہوتا ہے، اسی لئے علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا اعلان و اظہار ہی افضل و بہتر ہے اس کا اخفاء مناسب نہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ اور ترغیب ہو، البتہ نفلی صدقات کا خفیہ دینا افضل و بہتر ہے، جن احادیث میں خفیہ دینے کی فضیلت آئی ہے وہ نفلی صدقات ہی کے متعلق ہے۔

نویں صفت يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی سے، دشمنی کو دوستی سے، ظلم کو عفو و درگذر سے دفع کرتے ہیں، بُرائی کے جواب میں بُرائی سے پیش نہیں آتے، اور بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ گناہ کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، یعنی اگر کسی وقت کوئی خطاء و گناہ سرزد ہوجاتا ہے تو اس کے بعد طاعت و عبادت کی کثرت اور اہتمام اتنا کرتے ہیں کہ اس سے پچھلا گناہ محو ہوجاتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضؓ کو وصیت فرمائی کہ "بدی کے بعد نیکی کرلو، تو وہ بدی کو مٹادے گی"، مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہوکر توبہ

کرلی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کر لینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کی یہ نو صفتیں بیان کرنے کے بعد ان کی جزاء یہ بیان فرمائی أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ، دار سے مراد دار آخرت ہے، یعنی انہی لوگوں کے لئے ہے دار آخرت کی فلاح، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دار سے مراد دار دنیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ نیک لوگوں کو اگرچہ اس دنیا میں تکلیفیں بھی پیش آتی ہیں مگر بالآخر دنیا میں بھی فلاح و کامیابی انہی کا حصہ ہوتا ہے،

آگے اسی عُقْبَى الدَّارِ یعنی دار آخرت کی فلاح کا بیان ہے، کہ وہ جَنّٰتُ عَدْنٍ ہوں گی جن میں وہ داخل ہوں گے، عدن کے معنی قیام و قرار کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان جنتوں سے کسی وقت ان کو نکالا نہ جائے گا، بلکہ ان میں ان کا قرار و قیام دائمی ہوگا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عدن وسط جنت کا نام ہے جو جنت کے مقامات میں بھی اعلیٰ مقام ہے۔

اس کے بعد ان حضرات کے لئے ایک اور انعام یہ ذکر فرمایا گیا کہ یہ انعام ربانی صرف ان لوگوں کی ذات تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ان کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں اور اولاد کو بھی اس میں حصہ ملے گا، شرط یہ ہے کہ وہ صالح ہوں جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مسلمان ہوں، اور مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں کا اپنا عمل اگرچہ اس مقام پر پہونچنے کے قابل نہ تھا، مگر اللہ کے مقبول بندوں کی رعایت اور برکت سے ان کو بھی اسی مقام بلند پر پہونچا دیا جائے گا۔

اس کے بعد دار آخرت میں ان کی فلاح و کامیابی کا مزید بیان یہ ہے کہ فرشتے ہر دروازہ سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمہارے صبر کی وجہ سے تمام تکلیفوں سے سلامتی ہے، اور یہ کیسا اچھا انجام ہے دار آخرت کا۔[1]

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ

اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں ایسے لوگ

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ

ان کے واسطے ہے لعنت اور ان کے لئے ہے برا گھر، اللہ کشادہ کرتا ہے

[1] ان آیات سے مستنبط شدہ مزید احکام و ہدایات (پ ۱۳) صفحہ ۱۹۷ پر درج ہیں۔

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا
روزی جسکو چاہے اور تنگ کرتا ہے، اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاع حقیر، اور کہتے ہیں کافر
لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ
کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے کہدے اللہ گمراہ کرتا ہے جسکو چاہے،
وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ
اور راہ دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا، وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں
قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾
ان کے دل اللہ کی یاد سے، سنتا ہے اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل۔
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾
جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے، خوش حالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا
كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟
اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گذر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سنا دے تو
عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ
ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمٰن سے۔
قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾
تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کرکے

۳ ع ۹

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معاہدوں کو ان کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں، اور خدا تعالیٰ نے جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی اور اُن کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی (یعنی ظاہری دولت و ثروت

تو دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ یہ لوگ مورد رحمت ہیں کیونکہ رزق کی تو یہ کیفیت ہے کہ اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے (رحمت و غضب کا یہ مدار نہیں) اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگانی پر (اور اس کے عیش و عشرت پر) اتراتے ہیں اور (ان کا اترانا بالکل فضول اور غلطی ہے، کیونکہ) یہ دنیوی زندگی (اور اس کی عیش و عشرت) آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک متاع قلیل کے اور کچھ بھی نہیں، اور یہ کافر لوگ (آپ کی نبوت میں طعن و اعتراض کرنے کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر کوئی معجزہ (ہمارے فرمائشی معجزوں میں سے) ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ کہہ دیجئے کہ (تمہاری ان بیہودہ فرمائشوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں (وجہ معلوم ہونے کی ظاہر ہے کہ باوجود معجزات کافیہ کے جن میں سب سے اعظم قرآن ہے پھر فضول باتیں کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسمت ہی میں گمراہی لکھی ہے) اور (جس طرح ان معاندین کو قرآن جو اعظم معجزات ہے ہدایت کے لئے کافی نہ ہوا اور گمراہی ان کو نصیب ہوئی اسی طرح، جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے (اور طریق حق کا طالب ہوتا ہے جس کا مصداق آگے آتا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ الخ) اس کو اپنی طرف (رسائی دینے کے لئے) ہدایت کر دیتے ہیں (اور گمراہی سے بچا لیتے ہیں) مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے (جس کی بڑی فرد قرآن ہے) ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے (جس کی بڑی فرد ایمان ہے یعنی وہ قرآن کے اعجاز کو دلالت علی النبوۃ کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور واہی تباہی فرمائش نہیں کرتے پھر خدا کی یاد اور طاعت میں ان کو ایسی رغبت ہوتی ہے کہ متاعِ حیاتِ دنیا سے مثل کفار کے ان کو رغبت اور فرحت نہیں ہوتی اور) خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (کی ایسی ہی خاصیت ہے کہ اس) سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے (یعنی جس مرتبے کا ذکر ہو اسی مرتبہ کا اطمینان، چنانچہ قرآن سے ایمان اور اعمال صالحہ سے طاعت کا شدت شوق اور توجہ الی اللہ میسر ہوتا ہے، غرض) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے (جن کا ذکر اوپر ہوا) ان کے لئے (دنیا میں) خوشحالی اور (آخرت میں) نیک انجامی ہے (جس کو دوسری آیت میں فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ الخ سے تعبیر فرمایا) اسی طرح ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ اس (امت) سے پہلے اور بہت سی امتیں گذر چکی ہیں (اور آپ کو ان کی طرف اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ آپ ان کو وہ کتاب پڑھ کر سنا دیں جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہے اور (ان کو چاہئے تھا کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے اور اس کتاب پر کہ وہ معجزہ بھی ہے ایمان لے آتے مگر) وہ لوگ ایسے بڑے رحمت والے کی ناسپاسی کرتے ہیں (اور قرآن پر ایمان نہیں لاتے) آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی ضرر

نہیں کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ مخالفت کرو گے، سو اس سے مجھ کو اس لئے اندیشہ نہیں کہ) وہ میرا مربی (اور نگہبان ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (پس لامحالہ وہ کامل الصفات ہوگا اور حفاظت کے لئے کافی ہوگا اس لئے) میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور اسی کے پاس مجھ کو جانا ہے (خلاصہ یہ کہ میری حفاظت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے تم مخالفت کر کے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ تمہارا ہی ضرر ہے)۔

معارف و مسائل

شروع رکوع میں کل انسانوں کی دو قسم کر کے بتلایا گیا تھا کہ ان میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں کچھ نافرمان، پھر فرمانبردار بندوں کی چند صفات و علامات بیان کی گئیں، اور آخرت میں اُن کے لئے بہترین جزاء کا ذکر کیا گیا۔

اب دوسری قسم کے لوگوں کی علامات و صفات اور ان کی سزا کا بیان ان آیات میں ہے،

اس میں ان سرکش اور نافرمان بندوں کی ایک خصلت تو یہ بتلائی گئی:

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ، یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں آکر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور معبود بنا بیٹھے۔

اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ضمن میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آجاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے۔

دوسری خصلت ان نافرمان بندوں کی یہ بتلائی گئی:

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ، یعنی یہ لوگ اُن تعلقات کو قطع کر دیتے ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان میں انسان کا وہ تعلق بھی شامل ہے جو اس کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس تعلق کا قطع کرنا یہی ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے، اور رشتہ داری کے وہ تعلقات بھی اس میں شامل ہیں

جن کو قائم رکھنے اور اُن کے حقوق ادا کرنے کی قرآن کریم میں جابجا ہدایت کی گئی ہے۔
اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ان حقوق و تعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں مثلاً ماں باپ، بھائی بہن، پڑوسی، اور دوسرے متعلقین کے جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے انسان پر عائد کئے ہیں، یہ لوگ ان کو ادا نہیں کرتے۔

تیسری خصلت یہ بتلائی ہے:
وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ "یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں" اور یہ تیسری خصلت درحقیقت پہلی ہی دو خصلتوں کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے عہد کی پرواہ نہیں کرتے اور کسی کے حقوق و تعلقات کی رعایت نہیں کرتے ظاہر ہے کہ ان کے اعمال و افعال دوسرے لوگوں کے لئے مضرت اور ایذا کا سبب بنیں گے، لڑائی جھگڑے، قتل و قتال کے بازار گرم ہوں گے یہی زمین کا سب سے بڑا فساد ہے۔

سرکش اور نافرمان بندوں کی یہ تین خصلتیں بتلانے کے بعد ان کی سزا یہ بتلائی گئی ہے:
أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ "یعنی ان کے لئے لعنت ہے اور بُرا ٹھکانا ہے" لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور اور محروم ہونے کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کی رحمت سے دور ہونا سب عذابوں سے بڑا عذاب اور ساری مصیبتوں سے بڑی مصیبت ہے۔

احکام و ہدایات

مذکورہ آیات میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق خاص خاص احکام و ہدایات آئی ہیں، بعض صراحۃً اور بعض اشارۃً مثلاً:

(۱) اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ، سے ثابت ہوا کہ جو معاہدہ کسی سے کر لیا جائے اس کی پابندی فرض اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے، خواہ وہ معاہدہ اللہ اور رسولؐ سے ہو جیسے عہدِ ایمانی یا مخلوقات میں کسی سے ہو، خواہ مسلمان سے یا کافر سے عہد شکنی بہرحال حرام ہے۔

(۲) وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیم راہبانہ انداز سے ترکِ تعلقات کی نہیں بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق، دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے نفل عبادت میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔

صلہ رحمی اور رشتہ داری کے تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کی خبرگیری اور ادائے حقوق

کی تاکید قرآن کریم کی بے شمار آیات میں مذکور ہے۔

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں وسعت اور کاموں میں برکت عطا فرمادیں تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، صلہ رحمی کے معنی یہی ہیں کہ جن سے رشتہ داری کے خصوصی تعلقات ہیں ان کی خبر گیری اور بقدر گنجائش امداد و اعانت کرے۔

اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک گاؤں والا اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ مجھے یہ بتلا دیجئے کہ وہ عمل کونسا ہے جو مجھے جنت سے قریب اور جہنم سے دور کردے، آپؐ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو (بغوی)

اور صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اتنی بات کا نام نہیں کہ تم دوسرے عزیز کے احسان کا بدلہ ادا کردو اور اس نے تمہارے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو تم اس پر احسان کردو، بلکہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ دار عزیز تمہارے حقوق میں کوتاہی کرے، تم سے تعلق نہ رکھے تم پھر بھی محض اللہ کے لئے اس سے تعلق کو قائم رکھو اور اس پر احسان کرو۔

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے تعلقات کو نبھانے ہی کے خیال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نسب ناموں کو محفوظ رکھو جن کے ذریعہ تمہیں اپنی رشتہ داریاں محفوظ رہ سکیں، اور تم ان کے حقوق ادا کرسکو، پھر ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے)۔

اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑی صلہ رحمی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں سے وہی تعلقات قائم رکھے جو باپ کے سامنے تھے۔

(۳) وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، سے معلوم ہوا کہ صبر کے جو فضائل قرآن و حدیث میں آئے ہیں کہ صبر کرنے والے کو اللہ جل شانہٗ کی معیت اور نصرت و امداد حاصل ہوتی ہے اور بے حساب اجر و ثواب ملتا ہے وہ سب اسی وقت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر اختیار کیا ہو، ورنہ یوں تو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی صبر آہی جاتا ہے۔

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور ثابت قدم رہنے کے ہیں جس کی مختلف

صورتیں ہیں ایک مصیبت اور تکلیف پر صبر کہ گھبرائے نہیں اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ پر نظر رکھے اور امیدوار رہے، دوسرے طاعت پر صبر کہ احکامِ الٰہیہ کی پابندی اگرچہ نفس کو دشوار معلوم ہو اس پر قائم رہے، تیسرے معصیت اور برائیوں سے صبر کہ اگرچہ نفس کا تقاضا برائی کی طرف چلنے کا ہو لیکن خدا تعالیٰ کے خوف سے اس طرف نہ چلے۔

(۴) وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے درست ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ صدقات واجبہ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ کو علانیہ ادا کرے تاکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ادائیگی کی ترغیب ہو، اور صدقات نافلہ جو واجب نہیں ان کو خفیہ ادا کرے تاکہ ریاکاری اور نام و نمود کے شبہ سے نجات ہو۔

(۵) يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ سے معلوم ہوا کہ ہر برائی کو دفع کرنا جو عقلی اور طبعی تقاضا ہے اسلام میں اس کا طریقہ یہ نہیں کہ برائی کا جواب برائی سے دے کر دفع کیا جائے، بلکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو، جس نے تم پر ظلم کیا ہے تم اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو، جس نے تمہارے متعلق کا حق ادا نہیں کیا تم اس کا حق ادا کرو، جس نے تم پر غصہ کیا تم اس کا جواب حلم و بردباری سے دو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دوست ہو جائے گا اور شریر بھی آپ کے سامنے نیک بن جائے گا۔

اور اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ گناہ کا بدلہ طاعت سے ادا کرو، اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ، تو اس سے تمہارا پچھلا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم سے کوئی برائی یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بعد تم نیک عمل کرو، اس سے وہ گناہ مٹ جائے گا، (رواہ احمد بسند صحیح، مظہری) اس نیک عمل کی شرط یہ ہے کہ پچھلے گناہ سے توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ، بیوی اور اولاد کو بھی، شرط یہ ہے کہ یہ لوگ صالح یعنی مومن اور مسلمان ہوں کافر نہ ہوں، گو عمل صالح میں اپنے اس بزرگ کے برابر نہ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقام جنت میں پہونچا دیں گے جو اس بزرگ کا مقام ہے جیسے دوسری آیت میں مذکور ہے، اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ یعنی اپنے نیک بندوں کی ذریت

اور اولاد کو بھی انہی کے ساتھ کردیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا وہ آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع دے گا۔

(۶) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ سے معلوم ہوا کہ آخرت کی نجات اور درجاتِ عالیہ سب اس کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ انسان دنیا میں صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو ادا کرنے اور اس کی نافرمانیوں سے بچنے پر اپنے نفس کو مجبور کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ، جس طرح پہلی آیات میں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی جزا یہ ذکر فرمائی ہے کہ ان کا مقام جنت میں ہوگا، فرشتے ان کو سلام کریں گے، اور بتلائیں گے کہ یہ جنت کی دائمی نعمتیں سب تمہارے صبر و ثبات اور فرمانبرداری کا نتیجہ ہیں، اسی طرح اس آیت میں نافرمان سرکش لوگوں کا انجام بد یہ بتلایا ہے کہ اُن پر اللہ کی لعنت ہے، یعنی وہ رحمت سے دور ہیں، اور ان کے لئے جہنم کا ٹھکانا مقرر ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ عہد شکنی اور رشتہ داروں، عزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنم کا سبب ہے، نعوذ باللہ منہ

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہو وے اس سے زمین،

اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْـــَٔسِ الَّذِيْنَ

یا بولیں اس سے مُردے تو کیا ہوتا، بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں، سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان

اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ

والوں کو اس پر کہ اگر چاہے اللہ تو راہ پر لاوے سب لوگوں کو اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں

كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ

کو ان کے کرتوت پر صدمہ یا اُترے گا اُن کے گھر سے نزدیک جب تک

حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۳۱ وَلَقَدِ

کہ پہنچے وعدہ اللہ کا، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ، اور ٹھٹھا

ع ۴ ۵ ۱۰

اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ

کر چکے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا،

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

سو کیسا تھا میرا بدلہ ، بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے ،

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ

اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک، کہہ اُن کا نام لو یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا

فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

زمین میں یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں یہ نہیں بلکہ بھلے سجھا دیئے ہیں منکروں کو

مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ

ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو

مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

راہ بتانے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے پیغمبر اور اے مسلمانو! ان کافروں کی عناد کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی جو موجودہ حالت ہے کہ اس کا معجزہ ہونا غور و فکر پر موقوف ہے بجائے اس کے) اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جاتے یا اس کے ذریعے سے زمین جلدی جلدی طے ہو جاتی یا اس کے ذریعہ سے مُردوں کے ساتھ کسی کو باتیں کرادی جاتیں (یعنی مُردہ زندہ ہو جاتا اور کوئی اس سے باتیں کر لیتا اور یہ وہ معجزے ہیں جن کی فرمائش اکثر کفار کیا کرتے تھے، بعضے مطلقاً بعضے اس طرح سے کہ قرآن کو بحالتِ موجودہ تو ہم معجزہ مانتے نہیں، البتہ گر قرآن سے ان خوارق کا ظہور ہو تو ہم اس کو معجزہ مان لیں، مطلب یہ کہ قرآن سے ایسے ایسے معجزات کا بھی ظہور ہوتا جس سے دونوں طرح کے لوگوں کی فرمائش پوری ہو جاتی، یعنی جو نفس خوارق مذکورہ کے مستدعی تھے اور جو ان کا ظہور قرآن سے چاہتے تھے) تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے (کیونکہ یہ اسباب مؤثر حقیقی نہیں، بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کو ہے (وہ جس کو توفیق عطا فرماتے ہیں وہی ایمان لاتی

اور نئی عادت کیوں ڈالیں) بلکہ توفیق دیتے ہیں اور بعض کو محروم رکھتے ہیں اور چونکہ بعض مسلمانوں کا جی چاہتا تھا کہ ان معجزات کا ظہور ہو جاتا تو شاید ایمان لے آویں اس لئے آگے ارشاد ہے کہ کیا (یہ تقریر کہ معجزوں میں ہدایت نہ دینے اور یہ کہ سب اختیار خدا ہی کو ہے اور یہ کہ اسباب مؤثر حقیقی نہیں ہیں، سب یہ سنکر) پھر بھی ایمان والوں کو اس بات میں دل جمعی نہیں ہوئی کہ اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو تمام (دنیا بھر کے) آدمیوں کو ہدایت کر دیتا، مگر بعض حکمتوں سے مشیت نہیں ہوئی تو سب ایمان نہ لاویں گے جس کی بڑی وجہ عناد ہے، پھر ان معاندین کے ایمان لانے کے فکر میں کیوں لگے ہیں) اور (جب محقق ہو گیا کہ یہ لوگ ایمان نہ لاویں گے تو اس امر کا خیال آسکتا ہے کہ پھر ان کو سزا کیوں نہیں دی جاتی اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) یہ (مکہ کے) کافر تو ہمیشہ (آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب اُن پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے (کہیں قتل، کہیں قید، کہیں ہزیمت و شکست) یا (بعض حادثہ اگر ان پر نہیں بھی پڑتا مگر) ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے (مثلاً کسی قوم پر آفت آئی اور ان کو خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں ہم پر بھی بلا نہ آوے) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) اللہ کا وعدہ آجاوے گا (یعنی آخرت کے عذاب کا سامنا ہو جاوے گا، جو کہ مرنے کے بعد شروع ہو جاوے گا اور) یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے (پس عذاب کا وقوع ان پر یقینی ہے گو بعض اوقات کچھ دیر سے سہی) اور (ان لوگوں کا یہ معاملہ تکذیب و استہزاء کچھ آپ کے ساتھ خاص نہیں، اور اسی طرح ان کے عذاب میں توقف ہونا کچھ ان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پہلے رُسل اور ان کی امتوں کے ساتھ بھی ایسا ہو چکا ہے چنانچہ) بہت سے پیغمبروں کے ساتھ جو کہ آپ کے قبل ہو چکے ہیں، (کفار کی طرف سے) استہزاء ہو چکا ہے، پھر میں ان کافروں کو مہلت دیتا رہا پھر میں نے اُن پر دار و گیر کی سو (سمجھنے کی بات ہے کہ) میری سزا کس طرح کی تھی (یعنی نہایت سخت تھی، جب اللہ تعالیٰ کی شان معلوم ہو گئی کہ وہی مختار کل ہیں تو اس کے معلوم اور ثابت ہونے کے بعد پھر بھی) کیا جو (خدا) ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو اور ان لوگوں کے شرکاء برابر ہو سکتے ہیں اور (باوجود اس کے) ان لوگوں نے خدا کے لئے شرکاء تجویز کئے ہیں آپ کہئے کہ (ذرا) اُن (شرکاء) کے نام تو لو (میں بھی سنوں کون ہیں اور کیسے ہیں) کیا (تم حقیقۃً ان کو شرکاء سمجھ کر دعویٰ کرتے ہو تب تو یہ لازم آتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو کہ دنیا (بھر) میں اس (کے وجود) کی خبر اللہ تعالیٰ کو نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی کو موجود جانتے ہیں جو واقع میں موجود ہو، اور معدوم کو موجود نہیں جانتے، کیونکہ اس سے علم کا غلط ہونا لازم آتا ہے گو انکشاف میں دونوں یکساں ہیں، غرض ان کو حقیقی شریک کہنے سے یہ امر محال لازم آتا ہے، پس ان کا شریک ہونا بھی محال ہے) یا (یہ کہ ان کو حقیقۃً شریک نہیں کہتے بلکہ) محض ظاہری لفظ کے اعتبار

ان کو شریک کہتے ہو) اور مصداق واقعی اس کا کہیں نہیں ہے، اگر یہ شق ثانی ہے تو ان کے شریک نہ ہونے کو از خود تسلیم کرتے ہو، پس مصوب کہ بطلان شراک ہے دونوں شقوں پر ثابت ہوگیا اول شق میں دلیل سے دوسری شق میں تمھاری تسلیم سے ورنہ یہ تقریر باوجودیکہ اعلیٰ درجہ میں کافی ہے مگر یہ لوگ نہ مانیں گے) بلکہ ان کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں (جس سے تمسک کرکے مبتلائے شرک ہیں) مرغوب معلوم ہوتی ہیں اور (اسی وجہ سے) یہ لوگ راہ (حق) سے محروم رہ گئے ہیں اور (اصل وہی بات ہے جو اوپر (بَل لِّلّٰهِ الْاَمْرُ) سے مفہوم ہو چکی ہے یعنی) جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں (البتہ وہ اسی کو گمراہ رکھتا ہے جو باوجود وضوح حق کے عناد کرتا ہے)۔

معارف و مسائل

مشرکین مکہ کے سامنے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں آپ کی زندگی کے ہر شعبہ سے، پھر حیرت انگیز معجزات سے پوری طرح روشن ہو چکی تھیں، اور ان کا سردار ابوجہل یہ کہہ چکا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا خاندانی مقابلہ ہے ہم ان کی اس برتری کو کیسے قبول کرلیں کہ خدا کا رسول ان میں سے آیا، اس لئے وہ کچھ بھی کہیں اور کیسی ہی نشانیاں دکھلائیں ہم ان پر کسی حال ایمان نہیں لائیں گے اسی لئے وہ ہر موقع پر اس ضد کا مظاہرہ لغو قسم کے سوالات اور فرمائشوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے، آیات مذکورہ بھی ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں۔

تفسیر بغوی میں ہے کہ مشرکین مکہ جن میں ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ ابن امیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ایک روز بیت اللہ کے پیچھے جاکر بیٹھ گئے، اور عبداللہ بن امیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اس نے کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم اور ہم سب آپ کو رسول تسلیم کرلیں اور آپ کی پیروی کریں، تو ہمارے چند مطالبات ہیں اپنے قرآن کے ذریعہ ان کو پورا کر دیجئے تو ہم سب اسلام قبول کرلیں گے۔

مطالبات میں ایک تو یہ تھا کہ شہر مکہ کی زمین بڑی تنگ ہے، سب طرف پہاڑوں سے گھری ایک طولانی زمین ہے جس میں نہ کاشت اور زراعت کی گنجائش ہے، نہ باغات اور دوسری ضروریات کی، آپ معجزہ کے ذریعہ ان پہاڑوں کو دور ہٹا دیجئے، تاکہ مکہ کی زمین فراخ ہو جائے، آخر آپ ہی کے کہنے کے مطابق داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے گئے تھے، جب وہ تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کرتے تھے، آپ اپنے قول کے مطابق اللہ کے

نزدیک داؤدؑ سے کمتر تو نہیں ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے آپ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسخر کر کے زمین کے بڑے بڑے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیں کہ ہمیں شام، یمن وغیرہ کے سفر آسان ہو جائیں۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے آپ ان سے کچھ کم تو نہیں، آپ بھی ہمارے لئے ہمارے دادا قُصَیّ کو زندہ کر دیجئے، تاکہ ہم ان سے یہ دریافت کر سکیں کہ آپ کا دین سچا ہے یا نہیں، (مظہری بحوالہ بغوی و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ)

مذکور الصدر آیت میں ان معاندانہ مطالبوں کا یہ جواب دیا گیا:

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ

اس میں تسییر جبال سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹنا اور قطعت بہ الارض سے مراد مختصر وقت میں بڑی مسافت قطع کرنا اور کلّم بہ الموتٰی سے مُردوں کو زندہ کر کے کلام کرنا مراد ہے اور لَو حرف شرط کا جواب بقرینۂ مقام محذوف ہے، یعنی لَمَا آمَنُوْا، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ایسا ہی مضمون اور اس کا یہی جواب مذکور ہے، وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا،

اور معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن کے ذریعہ بطور معجزہ کے ان کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں، کیونکہ وہ ان مطالبات سے پہلے ایسے معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں جو اُن کے مطلوبہ معجزات سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا پہاڑوں کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے اور تسخیر ہوا سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے، اسی طرح بے جان کنکریوں کا آپ کے دستِ مبارک میں بولنا اور تسبیح کرنا کسی مُردہ انسان کے دوبارہ زندہ ہو کر بولنے سے کہیں زیادہ عظیم معجزہ ہے، لیلۃ المعراج میں مسجدِ اقصیٰ اور پھر وہاں سے آسمانوں کا سفر اور بہت مختصر وقت میں واپسی تسخیر ہوا اور تختِ سلیمانی کے اعجاز سے کتنا زیادہ عظیم ہے، مگر یہ ظالم یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی جب ایمان نہ لائے تو اب ان مطالبات سے بھی ان کی نیت معلوم ہے کہ محض دفع الوقتی ہے، کچھ ماننا اور کرنا نہیں ہے، مشرکین کے ان مطالبات کا مقصد چونکہ یہی تھا کہ ہمارے مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو ہم کہیں گے کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کو ان کاموں پر قدرت نہیں، یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اللہ تعالیٰ کے یہاں مسموع

اور مقبول نہیں جس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول نہیں، اس لئے اس کے جواب ارشاد فرمایا بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا، یعنی اللہ ہی کے لئے ہے اختیار سب کا سب، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مطالبات کا پورا نہ کرنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصالح عالم کو وہی جاننے والے ہیں، انھوں نے اپنی حکمت سے ان مطالبات کو پورا کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مطالبہ کرنے والوں کی ہٹ دھرمی اور بدنیتی ان کو معلوم ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ سب مطالبے پورے کر دیئے جائیں گے جب بھی یہ ایمان نہ لائیں گے۔

اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا۔ امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام نے جب مشرکین مکہ کے یہ مطالبات سنے تو یہ تمنا کرنے لگے کہ بطور معجزہ کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تو بہتر ہے، سارے مکہ والے مسلمان ہو جائیں گے اور اسلام کو بڑی قوت حاصل ہو جائے گی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ کیا اہل ایمان ان مشرکین کی حیلہ جوئی اور معاندانہ بحثوں کو دیکھتے سنتے کے باوجود اب تک ان کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے، کہ ایسی تمنائیں کرنے لگے، جب کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب ہی انسانوں کو ایسی ہدایت دیدیتا، کہ وہ مسلمان بنے بغیر نہ رہ سکتے مگر حکمت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ سب کو اسلام وایمان پر مجبور کر دیا جائے، بلکہ حکمت یہی تھی کہ ہر شخص کا اپنا اختیار باقی رہے، اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کرے یا کفر کو۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قارعہ کے معنی مصیبت اور آفت کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان مشرکین کے مطالبات تو اس لئے منظور نہیں کئے گئے کہ ان کی بدنیتی اور ہٹ دھرمی معلوم تھی کہ پورے کرنے پر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں، یہ تو اللہ کے نزدیک اسی کے مستحق ہیں کہ ان پر دنیا میں بھی آفتیں اور مصیبتیں آئیں جیسا کہ اہل مکہ پر کبھی قحط کی مصیبت آئی، کبھی اسلامی غزوات بدر واحد وغیرہ میں ان پر قتل اور قید ہونے کی آفت نازل ہوئی، کسی پر بجلی گر گئی، کوئی اور کسی بلا میں مبتلا ہوا، اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ یعنی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ مصیبت براہ راست اُن پر نہیں آئے گی، بلکہ ان کے قریب والی بستیوں پر آئے گی جس سے ان کو عبرت حاصل ہو اور ان کو اپنا انجام بھی نظر آنے لگے۔

حَتّٰي يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ یعنی ان مصائب وآفات کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہ ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی ٹل نہیں سکتا، مراد اس وعدہ سے فتح مکہ کا وعدہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر مختلف

قسم کی آفتیں آتی رہیں گی، یہاں تک کہ آخر میں مکہ مکرمہ فتح ہوگا، اور یہ سب لوگ مغلوب و مقہور ہوجائیں گے۔

آیت مذکورہ میں اَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ سے معلوم ہوا کہ جس قوم اور بستی کے قرب جوار پر کوئی عذاب یا آفت و مصیبت آتی ہے تو اس میں حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ حکمت بھی مستور ہوتی ہے کہ آس پاس کی بستیوں کو بھی تنبیہ ہوجائے اور وہ دوسروں سے عبرت حاصل کرکے اپنے اعمال درست کرلیں، تو یہ دوسروں کا عذاب اُن کے لئے رحمت بن جائے، ورنہ پھر ایک دن ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو دوسروں کا مشاہدہ میں آیا ہے۔

آج ہمارے ملک میں ہمارے قرب و جوار میں روز روز کسی جماعت کسی بستی پر مختلف قسم کی آفتیں آتی رہتی ہیں، کہیں سیلاب کی تباہ کاری کہیں ہوا کے طوفان، کہیں زلزلہ کا عذاب، کہیں کوئی اور آفت، قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق یہ صرف ان بستیوں اور قوموں ہی کی سزا نہیں ہوتی بلکہ قرب و جوار کے لوگوں کو بھی تنبیہ ہوتی ہے، پچھلے زمانہ میں اگرچہ علم و فن کی اتنی ٹیپ ٹاپ نہ تھی مگر لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا، کسی جگہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آجاتا تو خود وہ لوگ بھی، اور اس کے قرب و جوار والے بھی سہم جاتے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے، اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، اور استغفار، صدقہ و خیرات کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے، اور آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ ان کی مصیبتیں بڑی آسانی سے ٹل جاتی تھیں، آج ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ مصیبت کے وقت بھی خدا ہی یاد نہیں آتا اور سب کچھ یاد آتا ہے، دنیا کے عام غیر مسلموں کی طرح ہماری نظریں بھی صرف مادی اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں، مسبّب الاسباب کی طرف توجہ کی اس وقت بھی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ اس طرح کے مسلسل حوادث ہیں جن سے دنیا ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔

حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، یعنی ان کفار مشرکین پر دنیا میں بھی مختلف عذابوں اور آفتوں کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آپہونچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی خلاف نہیں کرتے۔

وعدہ سے مراد اس جگہ فتح مکہ ہے، جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا تھا، اور مطلب آیت کا یہ ہوا کہ آخر میں تو مکہ فتح ہوکر ان سب مشرکین کو زیر و زبر اور مغلوب و مقہور ہونا ہی ہے، اس سے پہلے بھی ان کے جرائم کی کچھ کچھ سزا ان کو ملتی رہے گی، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وَعْدُ اللَّهِ سے مراد اس جگہ روزِ قیامت ہو، جس کا وعدہ سب پیغمبروں سے کیا ہوا ہے، اور ہمیشہ سے کیا ہوا ہے، اس روز تو ہر کافر مجرم اپنے کئے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔

مذکور الصدر واقعہ میں مشرکین کے معاندانہ سوالات اور ان کی ہٹ دھرمی سے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و تکلیف پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے اگلی آیت میں آپ کی تسلی کے لئے فرمایا گیا: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۔ یہ حالات جو آپ کو درپیش ہیں کچھ آپ ہی کو پیش نہیں آئے، آپ سے پہلے انبیاء کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے کہ مجرموں اور منکروں کو ان کے جرم پر فوراً نہیں پکڑا گیا اور وہ انبیاء کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتے رہے، جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو پھر ان کو عذابِ الٰہی نے پکڑ لیا اور کیسا پکڑا کہ کسی کو مقابلہ کی تاب نہ رہی۔

اَفَمَنْ هُوَ قَاۗىِٕمٌ عَلٰي كُلِّ نَفْسٍ، اس آیت میں مشرکین کی جہالت اور بے عقلی کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ یہ کیسے بیوقوف ہیں کہ بے جان و بے شعور بتوں کو اس ذاتِ پاک کے برابر ٹھہراتے ہیں جو ہر نفس پر نگراں اور اس کے اعمال و افعال کا محاسبہ کرنے والی ہے، پھر فرمایا کہ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ان کی اس جہالت ہی کو ان کی نظر میں مزیّن کر رکھا ہے وہ اسی کو بڑا کمال اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا

اُن کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی

لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ

نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پرہیزگاروں سے

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى

بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں، میوہ اس کا ہمیشہ ہے اور سایہ بھی، یہ بدلہ ہے اُن کا

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

جو ڈرتے رہے، اور بدلہ منکروں کا آگ ہے، اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے

الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ

کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو نازل ہوا تجھ پر اور بعضے فرقے نہیں مانتے

يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ

اس کی بعضی بات، کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں

بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا

اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا، اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم

عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَمَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

عربی زبان میں، اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا،

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا

۵ ع ۱۱

خلاصۂ تفسیر

ان کافروں کے لئے دنیوی زندگانی میں (بھی) عذاب ہے (وہ قتل و قید و ذلت یا مراض و مصائب ہے) اور آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے (کیونکہ شدید بھی ہے اور دائم بھی ہے) اور اللہ (کے عذاب) سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا (اور) جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک و کفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ کہ اس (کی عمارات اور اشجار) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا اور جن لوگوں کو ہم نے (آسمانی) کتاب (یعنی توراۃ و انجیل) دی ہے (اور وہ اس کو پورے طور سے مانتے تھے) وہ اس (کتاب) سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے (کیونکہ اس کی خبر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور خوش ہو کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں، جیسے یہود میں عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں نجاشیؓ اور ان کے فرستادے جن کا ذکر اور آیت میں بھی ہے) اور انہی کے گروہ میں بعضے ایسے ہیں کہ اس (کتاب) کے بعض حصہ کا (جس میں ان کی کتب کے خلاف احکام ہیں) انکار کرتے ہیں (اور کفر کرتے ہیں) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ (احکام دو قسم کے ہیں اصول اور فروع، اگرچہ اصول میں مخالفت ہو سو وہ سب شرائع میں مشترک ہیں چنانچہ) مجھ کو (توحید کے متعلق) صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں (اور نبوت کے متعلق یہ بات ہے کہ) میں (لوگوں کو) اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں (یعنی نبوت کا حاصل یہ ہے کہ میں داعی الی اللہ ہوں) اور (معاد کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ) اسی کی طرف مجھ کو (دنیا سے لوٹ کر) جانا ہے (یعنی اصول یہ تین ہیں، سو ان میں سے ایک بات بھی قابل انکار نہیں، چنانچہ توحید سب کے نزدیک مسلّم ہے، جیسا کہ یہی مضمون دوسری آیت میں ہے تعالوا الی کلمۃ سواۗءٍ

یُنۡکِرُ الخ، اور نبوت میں اپنے لئے مال وجاہ نہیں چاہتا جس پر انکار کی گنجائش ہو، محض دعوت الی اللہ کرتا ہوں، سو ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں جن کو تم بھی مانتے ہو، جیسا یہی مضمون دوسری جگہ بھی ہے مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ الخ اسی طرح معاد کا عقیدہ مشترک اور مسلّم اور غیر قابل انکار ہے اور اگر فروع میں مخالف ہو تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ یوں دیتے ہیں کہ ہم نے جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص احکام دیئے) اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ خاص حکم ہے عربی زبان میں (عربی کی تصریح سے اشارہ ہو گیا دوسرے انبیاء کی دوسری زبانوں کی طرف، اور زبانوں کے اختلاف سے اشارہ ہو گیا اختلافِ اُمم کی طرف، تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ فروع میں اختلاف بسبب اختلافِ اُمم کے ہوا، کیونکہ مصالح اُمم کے ہر زمانہ میں جداگانہ ہیں، پس یہ اختلاف شرائع کا مقتضی مخالفت نہیں، چنانچہ خود تمہاری شرائع مسلّمہ میں بھی ایسا اختلاف فروع کا ہوا ہے، پھر تمہاری مخالفت وانکار کی کیا گنجائش ہے) اور (اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اگر آپ (بفرضِ محال) ان کے نفسانی خیالات کا (یعنی احکام منسوخہ یا احکامِ محرّفہ کا) اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس (احکامِ مقصودہ کا) علم (صحیح) پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (اور جب نبی کو ایسا خطاب کیا جا رہا ہے تو اور لوگ انکار کرکے کہاں رہیں گے، سو اس میں تعریض ہے اہل کتاب کے ساتھ، پس دونوں شقوں پر منکرین ومخالفین کا جواب ہو گیا)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جوروئیں اور اولاد

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ

اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر ایک وعدہ ہے

كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ

لکھا ہوا، مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اسی کے پاس ہے

الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

اصل کتاب، اور اگر دکھلاویں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو اٹھا لیویں

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي

سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے حساب لینا ، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں

الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے ، اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس

لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کا حکم ، اور وہ جلد لیتا ہے حساب ، اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے ، سو

فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ

اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب ، جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی ، اور اب معلوم کئے لیتے ہیں

الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ

کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھر ، اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں

مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهُ

آیا ، کہہ دے اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں اور جس کو خبر

عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

ہے کتاب کی ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اہل کتاب میں سے بعضوں کا جو نبوّت پر یہ طعن ہے کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے (یہ کونسا امر منافی رسالت ہے، ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں ہے أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ الخ) اور (چونکہ اختلافِ شرائع کا شبہ دیگر شبہات سے زیادہ مشہور اور دائر اور محض اجمال کے ساتھ مذکور تھا، اس لئے اس کو آگے مکرر و مفصّل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی پر اختلاف شرائع کا شبہ کرتا ہے وہ در پردہ نبی کو مالکِ احکام سمجھتا ہے حالانکہ) کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بدون خدا کے حکم کے (اپنی طرف سے) لا سکے (بلکہ احکام کا مقرر ہونا اذن و اختیارِ خداوندی پر موقوف ہے ، اور

خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے یہ معمول مقرر ہے کہ) ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں (پھر دوسرے زمانے میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہوجاتے ہیں اور بعضے بحالہٖ باقی رہتے ہیں پس) خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و مستمر اس میں درج ہیں وہ سب کی جامع اور گویا منبع الکل ہے، یعنی جہاں سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پس احکام سابقہ کے موافق یا مغایر احکام لانے کی کسی کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہوسکتی)

اور (یہ لوگ جو اس بنا پر انکار نبوت کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو انکار نبوت پر جس عذاب کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ عذاب کیوں نہیں نازل ہوتا، اس کے متعلق سن لیجئے کہ) جس بات کا (یعنی عذاب کا) ہم ان سے (انکار نبوت پر) وعدہ کر رہے ہیں، اس میں کا بعض واقعہ اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں کوئی عذاب ان پر نازل ہوجاوے) تو وہ (قبل نزول اس عذاب کے، ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر بعد میں وہ عذاب واقع ہو خواہ دنیا میں یا آخرت میں دونوں حالتوں میں آپ فکر و اہتمام نہ کریں کیونکہ) بس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور داروگیر کرنا تو ہمارا کام ہے (آپ اس فکر میں کیوں پڑیں کہ اگر واقع ہوجائے تو بہتر ہے، شاید ایمان لے آویں، اور ان لوگوں پر بھی تعجب ہے کہ وقوع عذاب علی الکفر کا کیسے یک لخت انکار کر رہے ہیں) کیا (مقدمات عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم (فتح اسلام کے ذریعہ سے ان کی) زمین کو ہر چہار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں (یعنی ان کی عملداری بسبب کثرت فتوحات اسلامیہ کے روز بروز گھٹتی جارہی ہے، سو یہ بھی تو یک قسم کا عذاب ہے جو مقدمہ ہے اصلی عذاب کا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ) اور اللہ (جو چاہتا ہے) حکم کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں (پس عذاب ادنیٰ خواہ عذاب اکبر جو بھی ہو اس کو کوئی ان کے شرکاء یا غیر شرکاء میں سے رد نہیں کرسکتا) اور (اگر ان کو چندے مہلت بھی ہو گئی تو کیا ہے، وہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے (وقت کی دیر ہے، پھر فوراً ہی سزائے موعود شروع ہوجاوے گی)، اور (یہ لوگ جو ایذاء رسول یا تنقیص اسلام میں طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں تو ان سے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ) ان سے پہلے جو (کافر) لوگ ہوچکے ہیں انھوں نے (بھی ان ہی اغراض کے لئے بڑی بڑی) تدبیریں کیں سو (کچھ بھی نہ ہوا کیونکہ) اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے (اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، سو اللہ نے ان کی وہ تدبیریں نہ چلنے دیں، اور) اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو کچھ بھی کرتا ہے (پھر اس کو وقت پر

سزا دیتا ہے) اور (اسی طرح) ان کفار (کے اعمال کی بھی سب اس کو خبر ہے سو ان (کو (بھی) ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصہ میں ہے (آیا ان کے یا مسلمانوں کے یعنی عنقریب ان کو اپنی بدانجامی اور سزائے اعمال معلوم ہو جائے گی) اور یہ کافر لوگ (ان سزاؤں کو بھولے ہوئے) یوں کہہ رہے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے انکار بے معنی سے کیا ہوتا ہے) میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے (جس میں میری نبوت کی تصدیق ہے) کافی گواہ ہیں (مراد اس سے علماء اہل کتاب جو منصف تھے اور نبوت کی پیشینگوئی دیکھ کر ایمان لے آئے تھے، مطلب یہ ہوا کہ میری نبوت کی دو دلیلیں ہیں عقلی اور نقلی، عقلی تو یہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو معجزات عطا فرمائے جو دلیل نبوت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے کے یہی معنی ہیں، اور نقلی یہ ہے کہ کتب سماویہ سابقہ میں اس کی خبر موجود ہے، اگر یقین نہ آئے تو منصف علماء سے پوچھ لو وہ ظاہر کر دیں گے، پس دلائل نقلیہ و عقلیہ کے ہوتے ہوئے نبوت کا انکار کرنا بجز شقاوت کے اور کیا ہے، کسی عاقل کو اس سے شبہ نہ ہونا چاہئے)۔

معارف و مسائل

کفار و مشرکین کا رسول و نبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنس بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیال فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے تخیلات کے در پے ہوتے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال و اخلاق سیکھیں، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے ہمجنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے، مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ، نہ اس کو نیند آوے نہ تکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوت و رسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کی تو ابتداء آفرینش سے یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحب اہل و عیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گذرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوت کے تم بھی قائل

وہ سب متعدد بیویاں رکھتے تھے، اور صاحبِ اولاد تھے، اس کو نبوت و رسالت یا بزرگی اور ولایت کے خلاف سمجھنا نادانی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں) اور فرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابلِ اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، یعنی کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ ایک آیت بھی بغیر حکمِ خدا تعالیٰ کے خود لا سکے۔

کفار و مشرکین جو معاندانہ سوالات ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے پیش کرتے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس زمانہ کے مشرکین نے پیش کئے، ان میں دو سوال بہت عام ہیں، ایک یہ کہ اللہ کی کتاب میں ہماری خواہش کے مطابق احکام نازل ہوا کریں، جیسے سورۂ یونس میں اُن کی یہ درخواست مذکور ہے کہ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ، یعنی یا تو آپ اس موجودہ قرآن کے بجائے بالکل ہی کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں ہمارے بتوں کی عبادت کو منع نہ کیا گیا ہو، یا پھر آپ خود ہی اس کے لائے ہوئے احکام کو بدل دیجئے، عذاب کی جگہ رحمت اور حرام کی جگہ حلال کر دیجئے۔

دوسرا سوال، انبیاء علیہم السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھلائیے تو ہم مسلمان ہوں، قرآن کریم کے اس جملہ میں لفظ آیۃ سے دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ اصطلاح قرآن میں قرآنی آیات کو بھی آیت کہا جاتا ہے اور معجزہ کو بھی، اسی لئے اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین میں سے بعض نے آیت قرآنی مراد لے کر یہ مطلب بیان کیا کہ کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے اپنی کتاب میں کوئی آیت بنا لے، اور بعض نے اس آیت سے مراد معجزہ لے کر یہ معنی قرار دیئے کہ کسی رسول و نبی کو اللہ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ جس وقت چاہے اور جس طرح کا چاہے معجزہ ظاہر کر دے تفسیر روح المعانی میں فرمایا کہ عموم مجاز کے قاعدہ پر اس جگہ یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، اور دونوں تفسیریں صحیح ہو سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہوا کہ ہمارے رسول سے قرآنی آیات کے بدلنے کا مطالبہ بے جا اور غلط ہے، ہم نے ایسا اختیار کسی رسول کو نہیں دیا، اسی طرح یہ مطالبہ کہ فلاں خاص قسم کا معجزہ دکھلائیے، یہ بھی حقیقتِ نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ کسی نبی و رسول

کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق جو وہ چاہیں معجزہ ظاہر کردیں۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ، اجل کے معنی مدتِ معینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے، اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا، اور اتنے دن زندہ رہے گا، کہاں کہاں جائے گا، کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکامِ قرآن میں نازل کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاندانہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ، اُمّ الکتٰب کے لفظی معنی اصل کتاب کے ہیں، مراد اس سے وہ لوحِ محفوظ ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے، اور اس محو و اثبات کے بعد جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے جس پر نہ کسی کی دسترس ہے، نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع کے محو و اثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکامِ شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں، اور اصل کتاب بہرحال ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے یہ ایک خاص میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بنا پر ہے، جب وہ میعاد گذر جائیگی، یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا۔ اس ام الکتٰب میں اس کی میعاد اور وقتِ مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ احکام خداوندی کبھی منسوخ نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ کوئی حکم جاری کرنے کے بعد منسوخ کرنا علامت اس کی ہے کہ حکم جاری کرنے والے کو حالات کا اندازہ نہ تھا اس لئے حالات دیکھنے کے بعد اس کو منسوخ کرنا پڑا، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہو، کیونکہ تقریر مذکور سے معلوم ہو گیا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اتنی مدت کے لئے جاری کیا گیا ہے، اس کے بعد بدلا جائے گا، اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مریض کا حال دیکھ کر کوئی حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا اس وقت کے مناسب حال تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کا یہ اثر ہوگا اس کے بعد اس دوا کو بدل کر فلاں دوسری دوا دی جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر کے مطابق آیت میں محو و اثبات سے مراد احکام کا منسوخ ہونا اور باقی رہنا ہے۔

اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سفیانؒ ثوری وکیعؒ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی دوسری تفسیر نقل کی جس میں مضمون آیت کو نوشتۂ تقدیر کے متعلق قرار دیا ہے، اور معنی آیت کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق مخلوقات کی تقدیریں اور ہر شخص کی عمر اور زندگی بھر میں ملنے والا رزق اور پیش آنے والی راحت یا مصیبت اور ان سب چیزوں کی مقداریں اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں، پھر بچہ کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بھی لکھوا دیا جاتا ہے، اور ہر سال شب قدر میں اس سال کے اندر پیش آنے والے معاملات کا چٹھا فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر فرد مخلوق کی عمر، رزق، حرکات و سکنات سب متعین ہیں، اور لکھے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس نوشتۂ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ، یعنی اصل کتاب جس کے مطابق محو و اثبات کے بعد انجام کار عمل ہونا ہے، وہ اللہ کے پاس ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق بڑھ جاتے ہیں، بعض سے گھٹ جاتے ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ صلہ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے، اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور ماں باپ کی خدمت و اطاعت سے عمر بڑھ جاتی ہے، اور تقدیر الٰہی کو کوئی چیز بجز دعاء کے ٹال نہیں سکتی۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دُعاء کی وجہ سے بھی تقدیر

بدلی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتاب تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دُعا کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے مراد وہ کتب تقدیر ہیں جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے، اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو و اثبات ہوتا رہتا ہے، لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ نے بتلا دیا، کہ اس تقدیر معلق کے اوپر ایک تقدیر مبرم ہے، جو اُمّ الکتاب میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ صرف علم الٰہی کے لئے مخصوص ہے، اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائط اعمال یا دعاء کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں، اسی لئے وہ محو و اثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر)

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ، اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے آپ سے کئے ہیں کہ اسلام کی مکمل فتح ہوگی، اور کفر و کافر ذلیل و خوار ہوں گے، یہ تو ہو کر رہے گا، مگر آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ فتح مکمل کب ہوگی، ممکن ہے کہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وفات کے بعد ہو، اور آپ کے اطمینان کے لئے تو یہ بھی کافی ہے کہ آپ برابر دیکھ رہے ہیں کہ ہم کفار کی زمینوں کو ان کے اطراف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، یعنی یہ اطراف مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں، اس طرح ان کی مقبوضہ زمین گھٹتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے کشائش ہوتی جاتی ہے، اس طرح ایک دن اس فتح کی تکمیل بھی ہو جائے گی، حکم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ؛

سُورۂ رعد تمام شد

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی باون آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ① اللّٰهِ

اجالے کی طرف، ان کے رب کے حکم سے رستہ پر اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے

الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ

جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور مصیبت ہے کافروں کو

مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ② الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی

عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ

آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی

اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ③

وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور۔

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبۂ تبلیغ میں کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لادیں (روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلادیں) جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور (جب یہ کتاب خدا کا راستہ بتلاتی ہے تو) بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں بلکہ) دنیوی زندگانی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (اس لئے دین کی جستجو نہیں کرتے) اور (نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں بلکہ) اللہ کی (اس) راہ (مذکور) سے روکتے ہیں اور اس میں کجی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں (جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کرسکیں) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں (یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ اور اس کے مضامین یہ قرآن کریم کی چودہویں سورۃ سورۂ ابراہیم شروع ہوتی ہے یہ سورۃ مکی ہے، قبل از ہجرت نازل ہوئی، بجز چند آیات کے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ مدنی ہیں یا مکی۔

اس سورۃ کے شروع میں رسالت و نبوّت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۂ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ، الٓرٰ، ان حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلفِ صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ھٰذا محذوف کی خبر قرار دی جائے، اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف، اور خطاب کی نسبت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا

ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبت ہے کہ اس کو خود ذات حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، دوسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ لفظ ناس عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں، ظُلُمٰت ظلمۃ کی جمع ہے جس کے معنی اندھیرے کے معروف و مشہور ہیں، یہاں ظُلُمٰت سے مراد کفر و شرک اور بداعمالیوں کی ظلمت ہے، اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے، اسی لئے لفظ ظُلُمٰت کو بصیغہ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اسی طرح بُرے اعمال بھی بیشمار ہیں، اور لفظ نُوْر کو بصیغہ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق واحد ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و شرک اور بُرے کاموں کی اندھیریوں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں اُن کے رب کی اجازت سے، یہاں لفظ رب لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبر کے ذریعہ اُن کو اندھیریوں سے نجات دلائیں اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شانِ ربوبیت سے اُن پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف خدا کا فعل ہے اس آیت میں اندھیری سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ "یعنی آپ باختیار خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"، اسی لئے اس آیت میں بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا گیا کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ کفر و شرک کی اندھیریوں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپ کر سکتے ہیں۔

احکام وھدایات

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوع انسانی کو بُرائیوں کی اندھیریوں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہی

جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن و امان اور عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے، اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو برائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر و شرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دام میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدھی سنگٹھن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہوچکا ہے، کہ ان کے دام میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف اُن گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے: يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے، اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو برائیوں سے پاک کرنا، اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنتِ رسول کی تعلیم دینا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے، اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں مؤثر ہونا بھی واضح ہے، اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں باذنِ خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرکے یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، قرآن کریم

کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلا دی ہو اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے ظاہر ہو کہ یہ وہ اندھیری اور روشنی نہیں جو عام آنکھوں سے نظر آتے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے، نہ وہ مقصد تک پہونچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہونچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نامِ حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذاتِ قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائگاں ہوگی بلکہ اس کا منزلِ مقصود پر پہونچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا اَللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، یعنی یہ وہ ذات ہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملک خاص ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ، لفظ ویل عذاب شدید اور ہلاکت کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمتِ قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہو اس عذاب شدید سے جو اُن پر آنے والا ہے۔

خلاصۂ مفہوم آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستہ کی روشنی میں لے آئے، مگر جو بدنصیب قرآن ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں، جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہو وہ بدنصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بری نہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝ اس آیت میں منکرین قرآن کافروں کے تین حال بتلائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا کی زندگی کو بہ نسبت آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں، اور ترجیح دیتے ہیں، اسی لئے دنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا گوارا کرلیتے ہیں، اس میں اُن کے مرض کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ قرآن کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے منکر کیوں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنی اندھیری ہی پسند ہے، روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔

دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیریوں میں رہنے کو پسند کرتے ہی ہیں اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

قرآن فہمی میں بعض غلطیوں کی نشاندہی

تیسری خصلت يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بدباطنی اور بدعملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں، کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کجی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے، ابن کثیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملہ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے یعنی قرآن و سنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے، تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن و حدیث میں اس کے مؤیدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولی ہی غلط ہے کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب و سنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ، اس جملہ میں ان کفار کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کی تین صفتیں اوپر بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دور پہنچ گئے ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

احکام و مسائل

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحۃً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں، اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دور چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رُو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے، ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔

(۲) دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔

(۳) قرآن و سنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ نعوذ باللہ منہ

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ انکو سمجھائے پھر بستہ بھلاتا ہے اللہ

مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۴﴾

جس کو چاہے اور رستہ دکھلا دیتا ہے جسکو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہے جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کر لیا ہوگا عجمی زبان میں کیوں نہیں تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دوسری کتب سماویہ سے عجمی ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ) ہم نے تمام (پہلے پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ (ان کی زبان میں) ان سے (احکام الٰہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں) پھر (بیان کرنے کے بعد) جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول کر لیتا ہے) اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (کہ پس غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کر سکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقتضی نہ ہوئیں)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہمزبان بھیجا ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہیہ انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو، اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام سمجھنے میں امت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی، اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملکِ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطۂ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان و مقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپؐ کے دائرۂ رسالت و نبوّت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کی سب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں داخل ہوں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا "یعنی اے لوگو، میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف" اور صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہو کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی

۱۵

اور اقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے، زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسبِ حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشو و نما سن کمال کو پہونچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، "یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی"۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا، لیکن شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیلِ دین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی وجہ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر **سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔**

قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہو؟ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کے رسول ان کے ہم زبان بھیجے گئے، ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی، لیکن غور و فکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جُدا جدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوامِ عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوامِ عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے، وہ اس صورت سے حاصل نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن و حدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریفِ قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے، اور قرآنِ کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرینِ قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ معجزانہ

خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہو جاتیں کہ کوئی نقطۂ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلاف جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے، جو قرآن پر کسی درجہ میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت کا پوری اقوام دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسولؐ کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہونچائے اور پھیلائے جائیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپؐ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی کی خصوصیت اوّل یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوحِ محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے، اور جنت جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے، طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَّالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَّكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ، (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے) حافظ حدیث ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجۂ حسن سے کم نہیں، (فیض القدیر شرح جامع صغیر، ص ۱۷۹، ج ۱)

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے"۔

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیر آ ہو کر سریانی زبان پیدا ہوگئی

اس سے اُن روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کرکے پیغمبروں کو بتلایا اور انھوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہنچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کرکے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں، یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفت الٰہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس ملک میں پہونچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداعمالیوں کے شکار تھے مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول کو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرما دیئے جنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان، مال، اولاد سب کچھ قربان کیا اور آپ کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور فرمایا:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً، یعنی مجھ سے سُنی ہوئی بات کو امت تک پہنچا دو۔" جاں نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پلّے باندھا، اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گذرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت کا ایسا پیدا فرما دیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے، اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد نحو و صرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن و سنت کی جمع و تدوین پھر تفسیر و تشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی، اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک و قوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہونچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ

اُجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر

صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ

کرنے والا ہے شکر گذار، اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے

عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب،

وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ

اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو اور اس میں مدد

بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان

شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

مانوگے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے،

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کروگے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے،

فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا۔

ع ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر و معاصی کی) تاریکیوں سے نکال کر ایمان و طاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات (نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے

(کیونکہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور نقمت یعنی عتاب کو پھر اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا) اور (اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب رہنمائے اس ارشاد بالا کے موافق (موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی ہو کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے کار خدمت لیں سو یہ بھی مثل ذبح ہی کے ایک عقوبت تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلاء تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلاء و نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی نعمت و نقمت دونوں کی تذکیر فرمادی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم) وہ وقت یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر (میری نعمتوں کو سن کر) تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کو سن کر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں اس کا احتمال ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ) بالکل بے احتیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (ستکمال بالغیر کا وہاں احتمال نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ضرر محتمل ہی نہیں اور تم اپنا ضرر سن چکے ہو اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْد اس لئے شکر کرنا ناشکری مت کرنا)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر و معصیت کی تاریکیوں سے ایمان و طاعت کی روشنی میں لے آئیں۔

لفظ آیات سے آیات تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ ان کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات خاص طور سے عطا فرمائے تھے جن میں عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا کئی جگہ قرآن میں مذکور ہے، آیات کو معجزات کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے ہوئے معجزات دے کر بھیجا گیا جن کو دیکھنے کے بعد کوئی شریف سمجھدار انسان اپنے انکار اور نافرمانی

پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک نکتہ اس آیت میں لفظ قوم آیا ہے کہ اپنی قوم کو اندھیری سے روشنی میں لائیں، لیکن یہی مضمون اسی سورۃ کی پہلی آیت میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے بیان کیا گیا تو وہاں قوم کے بجائے لفظ ناس استعمال کیا گیا، لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بعثت صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور مصری اقوام کی طرف تھی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے انسانوں کے لئے ہے۔

پھر ارشاد فرمایا وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ، یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو ایام اللہ یاد دلاؤ۔

ایام اللہ اَیّام، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ اَیّام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوۂ بدر و اُحد اور احزاب و حُنین وغیرہ کے واقعات، یا پچھلی اُمتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات میں جن میں بڑی بڑی قومیں زیر و زبر یا نیست و نابود ہوگئیں، اس صورت میں اَیّام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجامِ بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی اَیّام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرما جاتا ہے۔

قرآن مجید کا اُسلوب اور طریقِ اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں، یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہِ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں، ایک سزا سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں کہ پچھلی اُمتوں کے نافرمانوں کا انجامِ بد اُن پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل و خوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کرکے اس سے بچ جائیں، اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے

مبذول ہوئی ہیں، مثلاً وادی تیہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے مَنّ و سلویٰ کا نزول، پانی کی ضرورت ہوئی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ۝ اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں، اور صبّار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گذار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اَیّامُ اللّٰہ یعنی پچھلے واقعات خواہ وہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات سے متعلق بہرحال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل اگرچہ ہر غور کرنے والے کی ہدایت کے لئے ہیں مگر بدنصیب کفار ان میں غور و فکر ہی نہیں کرتے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، فائدہ صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں، جو صبر و شکر کے جامع ہیں، مراد اس سے مؤمن ہیں، کیونکہ بیہقی نے بروایت انس نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے دو حصے ہیں آدھا صبر اور آدھا شکر (مظہری)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے، اور صحیح مسلم اور مسند احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا ہے، جو اس کے لئے دین و دنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدۂ الٰہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت و راحت کا سامان ہو جاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝،

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال بُرا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی

اُبھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، سہ

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی،
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت و تکلیف کو بھی راحت و نعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی اُمت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسبِ منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعہ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل و حلم کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم ان کو اپنے علم و حلم کا ایک حصہ عطا فرما دیں گے (مظہری)

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ طبع امور پر پریشان نہ ہو اپنے قول و عمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجر عظیم کا یقین رکھے۔

دوسری آیت میں مضمون سابق کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص نعمت یاد دلائیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے ان کو ناجائز طور پر غلام بنایا ہوا تھا، اور پھر ان غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت کا سلوک نہ تھا، ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، اور صرف لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لئے پالا جاتا تھا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فرعونی عذاب سے نجات دیدی۔

شکر اور ناشکری کے نتائج

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ، لفظ تاذن، اذن اور اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرما دیا ہے کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کہ ان کو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے

اور ان کے بقاء و دوام میں بھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ مظہری)، اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے، یا اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں سستی کرے، اور کفران نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہوجائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھاسکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گذاروں کے لئے تو اجر و ثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لَاَزِيْدَنَّكُمْ لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لَاُعَذِّبَنَّكُمْ یعنی میں تمھیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہونچے، وہ بڑا سخت ہوتا ہے، اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتارِ عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور جتنے آدمی زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگو تو یاد رکھو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو سب کی حمد وثنا، اور شکر و ناشکری سے بے نیاز اور بالاتر ہے اور وہ اپنی ذات میں حمید یعنی مستحق حمد ہے، اس کی حمد تم نہ کرو تو اللہ کے سارے فرشتے اور کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔

شکر کا فائدہ جو کچھ ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے، اس لئے شکر گذاری کی تاکید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ بسبب رحمت تمھیں ہی فائدہ پہونچانے کے لئے ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڛ　مع

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود

وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ڜ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو آئے ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ
نشانیاں لے کر پھر لوٹائے انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو

اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝
دے کر بھیجا گیا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو خلجان میں ڈالنے والا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ
بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا
تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے کہنے لگے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ
تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے

يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ
ہمارے باپ دادا سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی، ان کو کہا ان کے رسولوں نے

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ
ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر

عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي
چاہے، اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَي اللّٰهِ وَقَدْ
پر بھروسہ چاہئے ایمان والوں کو، اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور

هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری راہیں، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہئے

الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ۧ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
بھروسے والوں کو، اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو

مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ
اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں، تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٣﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ
ان ظالموں کو، اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں اُن کے پیچھے، یہ ملتا ہے
لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ
اس کو جو ڈرا میرے سامنے کھڑے ہونے سے اور ڈرا میرے عذاب کے وعدے سے، اور فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر اور نامراد
كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾
ہوا ہر ایک سرکش ضدی۔

خلاصۂ تفسیر

(اے کفار مکہ) کیا تم کو ان لوگوں (کے واقعات) کی خبر (گو اجمالاً ہی) نہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثمود (قوم صالح) اور جو لوگ اُن کے بعد ہوئے ہیں جن (کی مفصل حالت) کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، (کیونکہ ان کے حالات تفصیلات منضبط و منقول نہیں ہوئے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبر اُن کے پاس دلائل لے کر آئے سو ان قوموں (میں جو کفار تھے انھوں) نے اپنے ہاتھ اُن پیغمبروں کے منہ میں دیدیئے (یعنی مانتے تو کیا یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو (بزعم تمہارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید و ایمان) ہم اس کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو (یعنی وہی توحید و ایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو (ہم کو) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید و رسالت دونوں کا انکار ہے، توحید کا تو ظاہر ہے اور رسالت کا تَدْعُوْنَنَا میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم خود اپنی رائے سے دعوتِ توحید کر رہے ہو، مامور و مرسل من اللہ نہیں ہو) ان کے پیغمبروں نے (اس بات کے جواب میں) کہا کیا (تم کو) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (و انکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اس کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود دلیل اس کی ہستی اور وحدانیت کی ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کرنا بڑی تعجب کی بات ہے اور تم جو دعوت الی التوحید کو استقلالاً ہماری طرف منسوب کرتے ہو یہ

بھی محض غلط ہے گو توحید بوجہ حق ہونے کے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت کرے تو بھی زیبا ہے، لیکن محل متنازع فیہ میں تو ہماری دعوت بحکم خداوند تعالیٰ ہے)

وہ (ہی) تم کو (توحید کی طرف) بلا رہا ہے تاکہ (اس کے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارے (گذشتہ) گناہ معاف کردے اور (تمہاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر و خوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید علاوہ اس کے کہ فی نفسہٖ حق ہے تمہارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، اور اس جواب میں دونوں امر کے متعلق جواب ہوگیا، توحید کے متعلق بھی اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ الخ اور رسالت کے متعلق بھی يَدْعُوْكُمْ میں جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے) پھر انہوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت منافی رسالت ہے، تم جو کہتے ہو وہ من اللہ نہیں ہے بلکہ، تم (اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو سو (اگر رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل بینات مذکورہ کے اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب سے واضح تر ہو، اس میں نبوت پر تو کلام ظاہر ہے، اور يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا میں توحید کلام کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شرک کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس کو کرتے تھے) ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمہاری تقریر کے کئی جزو ہیں، انکارِ توحید دلیل فعل آباء، انکار نبوت مطالبہ سلطان مبین علاوہ بیناتِ سابقہ، سو امر اول کے متعلق فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، میں جواب ہوگیا کیونکہ دلیل عقلی کے روبرو رسم دعوت کوئی چیز نہیں، امر دوم کے متعلق ہم اپنی بشریت کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہیں لیکن (بشریت اور نبوت میں تنافی نہیں، کیونکہ نبوت ایک اعلیٰ درجہ کا احسانِ خداوندی ہے اور) اللہ (کو اختیار ہے کہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرما دے (اور احسان کے غیر بشر کے ساتھ مختص ہونے کی کوئی دلیل نہیں) اور (امر سوم کے متعلق یہ ہے کہ دعویٰ کے لئے جس میں دعوئ نبوت بھی داخل ہے، نفسِ دلیل اور مطلق بینہ جو دعویٰ نبوت کی صورت میں معجزہ ہوگا ضروری ہے جو کہ پیش کی جا چکی ہے، رہا دلیل معجزۂ خاص جس کو سلطان مبین یعنی صاف دلیل سے تعبیر کر رہے ہو سو اولاً حسب قواعد مناظرہ ضروری نہیں ثانیاً) یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے (پس تمہارے تمام تر شبہات کا جواب ہوگیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمہاری مخالفت سے نہیں ڈرتے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب

ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے، (چونکہ ہم بھی با ایمان ہیں اور ایمان مقتضی ہے توکل کو اس لئے ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں) اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے، حالانکہ اس نے (ہمارے حال پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) رستے بتلا دیئے (جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہئے) اور (ضرر خارجی سے تو یوں بے فکر ہوگئے، رہا ضرر داخلی کہ تمہاری مخالفت کا غم و حزن ہوتا ہو) تم نے (عناد و خلاف کرکے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (پس اس سے بھی ہم کو ضرر نہ رہا اور حاصل اس صبر کا بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہئے اور (ان تمام اتمام حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلی کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کردیں گے اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سرزمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ (وعدہ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو جس کی علامت خوفِ قیامت اور خوفِ وعید ہے سب کیلئے یہ وعدہ عذاب سے نجات دینے کا عام ہے) اور (پیغمبروں نے جو یہ مضمون کفار کو سنایا کہ تم نے دلائل سے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ جہل مرکب و عناد میں غرقاب تھے اس سے بھی نہ ڈرے بلکہ کمال بیباکی سے وہ) فیصلہ چاہنے لگے (جیسا آیت فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا وامثالہا سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) ضدی لوگ تھے وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہوگئے اور جو ان کی مراد تھی کہ اپنے کو حق پر سمجھ کر فتح و ظفر چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی)۔

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا

پیچھے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا، گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور

يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ

گلے سے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف سے اور وہ نہیں مرتا، اور

مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

اس کے پیچھے عذاب ہے سخت۔

خلاصۂ تفسیر

(جس جبار عنید کا اوپر ذکر ہوا ہے علاوہ دنیوی عذاب کے) اس کے آگے دوزخ (کا عذاب آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جاوے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو (غایت تشنگی کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور (غایت حرارت و کراہت کی وجہ سے) گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں (بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہ بھی نہیں کہ یہی عذاب مذکور ایک حالت پر رہے بلکہ) اس (شخص) کو اور (زیادہ) سخت عذاب کا سامنا (برابر) ہوا کرے گا (جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا کقولہٖ تعالیٰ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا)۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ راکھ کہ زور کی چلے اس پر

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ

ہوا آندھی کے دن، کچھ اُن کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے،

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا، تونے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور

الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ۙ

زمین جیسی چاہیے، اگر چاہے تم کو لیجاوے اور لائے کوئی پیدائش نئی،

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں، اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے پھر کہیں گے

الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ

کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے، سو کیا بچاؤ گے

مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا مِنۡ عَذَابِ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قَالُوۡا لَوۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ، وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ

لَهَدَیۡنٰکُمۡ ؕ سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَجَزِعۡنَاۤ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ

تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے، اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں

مَّحِیۡصٍ ﴿۲۱﴾ وَ قَالَ الشَّیۡطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَکُمۡ

خلاصی، اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا

وَعۡدَ الۡحَقِّ وَ وَعَدۡتُّکُمۡ فَاَخۡلَفۡتُکُمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ

سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر جھوٹا کیا، اور میری تم پر کچھ حکومت نہ

سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ وَ لُوۡمُوۡۤا

تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تمکو پھر تم نے مان لیا میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

اَنۡفُسَکُمۡ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّ ؕ اِنِّیۡ کَفَرۡتُ

اپنے آپ کو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچو، میں منکر ہوں

بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۲﴾

جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے، البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک۔

خلاصۂ تفسیر

ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہم کو نافع ہوں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ) جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اڑنے میں بہت خفیف ہوتی ہے) جسکو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جائے (کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام و نشان بھی نہ رہے گا اسی طرح) ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر و نفع کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہوگا (اس راکھ کی طرح ضائع و برباد جائے گا) یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے (کہ گمان تو ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر ظاہر ہوں بد اور مضر جیسے عباداتِ اصنام یا غیر نافع جیسے اعتاق و صلۂ رحمی، اور چونکہ حق سے اس کو

۳ ع ۹ ۱۵

۱۶

بہت بُعد ہے اس لئے کہا گیا، پس اس طریق سے تو نجات کا احتمال نہ رہا، اور اگر ان کا یہ زعم ہو کہ قیامت ہی کا وجود محال ہے اور اس صورت میں عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ) کیا (اے مخاطب) تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی مشتمل بر منافع و مصالح) پیدا کیا ہے (اور اس سے قادر ہونا اس کا ظاہر ہے پس جب وہ قادر مطلق ہے تو) اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے) اور (اگر یہ وسوسہ ہو کہ ہمارے اکابر ہم کو بچا لیں گے تو اس کی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن) خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی عوام و تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی خواص و متبوعین سے بطور ملامت و عتاب) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے (اور دین کی جو راہ تم نے ہم کو بتلائی ہم اسی پر ہو لیے، اور آج ہم پر مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ہٹا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر ہی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں (جیسا کہ تمہاری پریشانی فَهَلْ أَنتُم مُّغْنُونَ سے ظاہر ہے اور ہماری پریشانی تو لَوْ هَدَانَا اللَّهُ سے عیاں ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال و جواب سے یہ معلوم ہو گیا کہ طریق کفر کے اکابر بھی اپنے متبعین کے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ طریق بھی نجات کا محتمل نہ رہا) اور (اگر اس کا بھروسہ ہو کہ یہ معبودین غیر اللہ کام آ دیں گے اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ) جب (قیامت میں) تمام مقدمات فیصل ہو چکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو (اہل دوزخ سب شیطان کے پاس کہ وہ بھی وہاں ہو گا جا کر ملامت کریں گے کہ کمبخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈبویا اُس وقت) شیطان (جواب میں) کہے گا کہ (مجھ پر تمہاری ملامت ناحق ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہو گی اور کفر سے ہلاکت ہو گی اور ایمان سے نجات ہو گی) اور میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہو گی اور تمہارا طریقہ کفر بھی طریقہ نجات ہے) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائلِ قطعیہ قائم تھے، سو باوجود اس کے تم نے میرے وعدوں کو صحیح

اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا، تو اپنے ہاتھوں تم ڈوبے) اور (اگر تم یوں کہو کہ آخر آپ نے وعدوں کو جھوٹا سمجھنے اور جھوٹے وعدوں کو سچ سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوا تو بات یہ ہے کہ واقعی میں اغوار کے مرتبہ میں سبب ضرور ہوا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے اغوار کے بعد تم مختار تھے، یا مضطر و مجبور، سو ظاہر ہے کہ) میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا، بجز اس کے کہ میں نے تم کو (گمراہی کی طرف) بلایا تھا سو تم نے (باختیار خود) میرا کہنا مان لیا، اگر نہ مانتے تو میں بزور تم کو گمراہ نہ کر سکتا تھا، جب یہ بات ثابت ہے) تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ اصل علت عذاب کی تمہارا ہی فعل ہے اور میرا فعل تو محض سبب ہے جو بعید اور غیر مستلزم ہے، پس ملامت کا تو یہ جواب ہے اور اگر مقصود اس قول سے استعانت و استمداد ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا خود ہی مبتلائے مصیبت و محتاج امداد ہو رہا ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے مدد چاہتا کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے بس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہو سکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے طریقہ شرک کو حق سمجھتا تو بھی اس تعلق کی وجہ سے نصرت کا مطالبہ کرنے کی گنجائش بھی تھی لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی درباره عبادت اصنام وغیرہا میری ایسی اطاعت کرتے تھے جو اطاعت کہ خاصہ حق تعالیٰ ہے، پس اصنام کو شریک ٹھہرانا بایں معنی شیطان کو شریک ٹھہرانا ہے، پس مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں نہ تم کو استمداد کا کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے (بس عذاب میں پڑے رہو نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو جو میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، بس گفتگو قطع کرو، یہ حاصل ہوا ابلیس کے جواب کا، پس اس سے معبودین غیر اللہ کا بھروسہ بھی قطع ہوا کیونکہ جو ان معبودین کی عبادت کا اصل بانی و محرک ہے اور در حقیقت عبادت غیر اللہ سے زیادہ راضی وہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر قیامت کے دن دوزخ میں اہل نار اسی سے کہیں سنیں گے، اور کسی معبود غیر اللہ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب دیدیا تو اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے، پس نجات کفار کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اور یہی مضمون مقصود تھا)۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے نیک، باغوں میں جن کے نیچے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی باہم بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی، لقولہ تعالیٰ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ولقولہ تعالیٰ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ الآیۃ)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

تونے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال بات ستھری جیسے ایک درخت ستھرا اس کی

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ

جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی ہے آسمان میں، لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ فکر کریں۔

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں (یعنی اب معلوم ہوگیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی (یعنی کلمۂ توحید و ایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مراد کھجور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجاوے) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو کوئی فصل ماری نہ جاتی ہو، اسی طرح کلمۂ توحید یعنی لا الٰہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے، یعنی اعتقاد جو مؤمن کے قلب میں استحکام کے ساتھ جاگیر ہے، اور اس کی کچھ شاخیں ہیں یعنی اعمالِ صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو بارگاہِ قبولیت میں آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ

(اس قسم کی مثالیں لوگوں (کے بتلانے) کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگ معانی مقصود کو خوب سمجھ لیں (کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب توضیح ہوجاتی ہے)

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ

اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندا اکھاڑ لیں اس کو زمین کے اوپر سے

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ

کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ، مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

میں اور آخرت میں اور بچلادیتا ہے اللہ بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ جو چاہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ

تو نے نہ دیکھا ان کو جنھوں نے بدل کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو

دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

تباہی کے گھر میں، جو دوزخ ہے داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمۂ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا باعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی کو ہوتی ہو یہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابل فرمایا اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تَفَكُّهًا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمۂ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضمحل و مغلوب ہوجانا مشابہ اسی کے ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی تصریح سے کفر کا یہی اضمحلال و مغلوبیت بتلانا مقصود ہو، اور چونکہ اس کے اعمال مقبول نہیں ہوتے، اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضا میں نہیں پھیلیں، اور چونکہ اس کے

اعمال پر رضا سے اُن کی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی نہ ہوئی اور چونکہ قبول و رضا کا کفر میں بالکل احتمال نہیں اسی لئے مشبہ بہ کی جانب میں شاخوں اور پھل کا ذکر قطعاً متروک فرما دیا ہو، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے، یہ تو دونوں کی مثال ہوگئی، آگے ثمر کا بیان ہے کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ ثابت الاصل کی برکت) سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں پس) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی ان کا حال عجیب ہے) جنھوں نے بجائے نعمت الٰہی (کے شکر) کے کفر کیا (مراد اس سے کفارِ مکہ ہیں کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی ان کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بُری جگہ ہے (اس میں اشارہ ہوگیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہوگا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ راکھ کی مانند ہیں جس پر تیز اور سخت ہوا چل جائے تو اس کا ذرہ ذرہ ہوا میں منتشر ہوکر بے نشان ہو جائے، پھر کوئی اس کو جمع کر کے اس سے کوئی کام لینا چاہے تو ناممکن ہو جائے، مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ، مطلب یہ ہے کہ کافر کے اعمال جو بظاہر اچھے بھی ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لئے سب ضائع اور بیکار ہیں۔

اس کے بعد مذکورہ آیات میں پہلے مؤمن اور اس کے اعمال کی ایک مثال دی گئی ہے پھر کفار و منافقین کے اعمال کی، پہلی آیت میں مؤمن اور اس کے اعمال کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی ہے جس کا تنہ مضبوط اور بلند ہو اور اس کی جڑیں زمین میں گہری گئی ہوئی ہوں اور زیر زمین پانی کے چشموں سے سیراب ہوتی ہوں، گہری جڑوں کی وجہ سے اس درخت کو استحکام اور مضبوطی بھی حاصل ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گر نہ جائے، اور سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے اس کا پھل گندگی سے پاک صاف رہے، دوسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کی شاخیں بلندی پر

آسمان کی طرف ہوں، تیسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کا پھل ہر وقت ہر حال میں کھایا جاتا ہو۔

یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے، اور روایاتِ حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں، اس کی جڑوں کا زمین کی دُور گہرائی تک پہونچنا بھی معروف و معلوم ہے، اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے، جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی واچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے، پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح و شام، دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے، اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے، اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے، اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں، اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے، اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرۃ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور **شجرۃ خبیثۃ حنظل کا درخت (مظہری)**

اور مسند احمد میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپؐ کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے، اس وقت آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے ایک ایسا درخت بھی ہے جو مردِ مؤمن کی مثال ہے، (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر مجلس میں ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی، پھر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے، جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے، مؤمنین کاملین صحابہ و تابعین بلکہ ہر زمانہ کے پکے مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں

نہ جان کی پروا کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت ونظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی مثال ہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں، مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح، تہلیل، قراءۃ قرآن وغیرہ کرتا ہے یہ صبح شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت ہر حال، ہر موسم میں لیل ونہار کھایا جاتا ہے مؤمن کے اعمالِ صالحہ بھی ہر وقت، ہر موسم اور ہر حال میں صبح شام جاری ہیں، اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کار آمد ہے، مؤمن کا ہر قول وفعل اور حرکت وسکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع ومفید ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیمات خدا ورسول کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ میں اُکُل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حین سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

کفار کی مثال

اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شجرۃ خبیثۃ سے دی گئی، جس طرح کلمۃ طیبۃ سے مراد قول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ایمان ہے، اسی طرح کلمۃ خبیثۃ سے مراد کلمات کفر اور افعال کفر ہیں، شجرۂ خبیثہ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے، اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۂ خبیثہ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں کیونکہ اُجْتُثَّتْ کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔

کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں، ذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں، دوسرے دنیا کی گندگی سے متاثر ہوتے ہیں، تیسرے ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال وافعال عند اللہ کارآمد نہیں۔

ایمان کا خاص اثر

اس کے بعد مؤمن کے ایمان اور کلمۂ طیبہ کا ایک خاص اثر دوسری

آیت میں بیان فرمایا ہے يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ یعنی مؤمن کا کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم درخت کی طرح ایک قول ثابت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، بشرطیکہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اور لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

قبر کا عذاب و ثواب قرآن و حدیث سے ثابت ہے

حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مؤمن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید ربانی اس کلمہ پر قائم رہے گا، اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا، اور پھر فرمایا کہ ارشاد قرآنی يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، (یہ روایت حدیث حضرت براء بن عازبؓ نے نقل فرمائی) اسی طرح تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیرؒ نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں ستر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے، ان سب حضرات صحابہ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، رہ وہ عامیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے، سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی، مگر موجود ہے، جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں

گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے، جب خالق کائنات نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہونچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی خبر دیدی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کلمہ طیبہ اور قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے اُن کے لئے راحت کے سامان جمع ہو جاتے ہیں، مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت و امداد نہیں ملتی، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ''یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے'' کوئی طاقت نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے، حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو چیز حاصل ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا، اسی طرح جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا، اور فرمایا کہ اگر تمھیں اس پر یقین و اعتماد نہ ہو تو تمھارا ٹھکانا جہنم ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ یعنی کیا آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں کفر اختیار کر لیا، اور اپنی قوم کو جو اُن کے کہنے پر چلتی تھی ہلاکت و بربادی کے مقام میں اُتار دیا، وہ جہنم میں جلیں گے، اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

یہاں نِعْمَتَ اللّٰهِ سے اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو محسوس و مشاہد ہیں اور جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء، زمین اور مکان وغیرہ اور وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کے رشد و ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں، مثلاً انبیاء، اور آسمانی کتابیں اور جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی اپنے وجود کے ہر جوڑ میں پھر زمین اور اس کی بے شمار مخلوقات میں، آسمان اور اس کی ناقابلِ ادراک کائنات میں انسان کی ہدایت کا سامان ہیں۔

ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا اس کی نعمتوں کا شکر گذار ہو کر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا، مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کا

مقابلہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

احکام و ہدایات

ان تینوں آیتوں میں توحید اور کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجام بد کا بیان ہوا ہے کہ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائید ایزدی ساتھ ہوتی ہے، اور آخرت اور قبر میں بھی، اور اس سے انکار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عذاب سے بدل ڈالنے کے مرادف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ

اور ٹھہرائے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے، تو کہہ مزا اڑا لو پھر

مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝۳۰ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا

تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی، کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں

الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ

نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝۳۱ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ

آئے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی، اللہ وہ ہے جس نے بنائے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ

تمہاری میوے، اور کہنے میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے

فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگا دیا تمہارے ندیوں کو، اور کام میں لگا دیا تمہارے سورج

وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝۳۳ وَاٰتٰىكُمْ

اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو، اور دیا تم کو

مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ

ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع

بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

ع ۷ ۵ ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور (اوپر جو کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے شکرِ نعمت کی جگہ کفر کیا اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا اس کفر اور پہنچانے کا بیان یہ ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں (پس ساجھی قرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے) آپ (ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالتِ کفر میں رہنا ہی کیونکہ ہر شخص کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور چندے کفر کر لو یہ تہدید ہے، اور مطلب "کیونکہ" کا یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے کفر سے باز آنا تمہارا مشکل ہے، خیر اور چندے گذار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہوہی گا اور) جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفر نعمت کے وبال پر متنبہ کر کے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ (نعمتِ الٰہی کے اس طرح شکر گذار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (حسب قواعد شرعیہ) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی (مطلب یہ کہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ یہی شکر ہے نعمت کا) اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (وقدرت) سے دریا میں چلے (اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ اسی سے پانی پیو اور آب پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ) اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں (تاکہ تم کو روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا (تاکہ تم کو معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو) اور جو جو چیز تم نے مانگی (اور

وہ تمہارے مناسبِ حال ہوتی) تم کو ہر چیز دی اور (اشیائے مذکورہ ہی پر کیا منحصر ہے) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اور بالعکس کفر و معصیت کرنے لگتا ہے، جیسا اوپر آیا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا)۔

معارف و مسائل

سورۂ ابراہیم کے شروع میں رسالت و نبوت اور معاد (آخرت) کے متعلق مضامین تھے اس کے بعد توحید کی فضیلت اور کلمۂ کفر و شرک کی مذمت کا بیان مثلوں کے ذریعہ کیا گیا، پھر مشرکین کی مذمت اس بات پر کی گئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے **ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔**

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں کفار و مشرکین کی مذمت اور ان کے انجام بد کا ذکر ہے، دوسری آیت میں مؤمنین کی فضیلت اور ان کو ادائے شکر کے لئے کچھ احکام الٰہیہ کی تاکید کی گئی ہے، تیسری، چوتھی اور پانچویں آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرما کر اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف نہ کریں۔

تفسیر و تشریح

اَنْدَادًا، ندّ کی جمع ہے، جس کے معنی مثل اور برابر کے ہیں، بتوں کو انداد اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشرکین نے ان کو اپنے عمل میں خدا کی مثل یا برابر قرار دے رکھا تھا، تمتّع کے معنی کسی چیز سے چند روزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے اس غلط نظریہ پر نکیر ہے کہ انھوں نے بتوں کو خدا کے مثل اور اس کا شریک ٹھہرا دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو جتلا دیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے فرمایا کہ چند روزہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھالو، مگر تمہارا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

دوسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ (کفار مکہ نے تو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اب) آپ میرے مؤمن بندوں سے فرما دیں کہ نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، پوشیدہ اور علانیہ طور پر، اس آیت میں مؤمن بندوں کے لئے بڑی بشارت اور اعزاز ہے، اوّل تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندہ کہہ کر پکارا، پھر صفت ایمان کے ساتھ موصوف کیا، پھر ان کو دائمی راحت اور اعزاز دینے کی ترکیب بتلائی، کہ نماز کی پابندی کریں، نہ اس کے اوقات میں سستی کریں

نہ آداب میں کوتاہی، اور اللہ ہی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی راہ میں بھی خرچ کیا کریں خرچ کرنے کی دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ خیرات کریں یا اعلان و اظہار کے ساتھ کریں، بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفلی صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام و نمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدار نیت اور حالات پر ہے، اگر اعلان و اظہار میں نام و نمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہو جاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان و اظہار جائز ہے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ، لفظ خلال، خلۃ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں، جیسے قتال، دفاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کئے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقت فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں، اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہو تو اس کی قضا کریں، اسی طرح آج مال تمہاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کر کے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو، لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی، نہ تمہارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے، نہ تمہاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا، جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کر سکو، اور اس دن میں کوئی بیع و شراء اور خرید و فروخت بھی نہ ہو سکے گی، کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آ سکیں گے، کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھا سکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔

"اس دن" سے مراد بظاہر حشر و قیامت کا دن ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موت کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں، نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے، نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔

احکام و ہدایات

اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض دنیاوی دوستیاں اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے

کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے، اور قرآن عزیز میں ارشاد ہے اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ "یعنی وہ لوگ جو دنیا میں باہم دوست تھے، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے، کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنے گناہ ڈال کر خود بری ہوجائیں، مگر وہ لوگ جو تقویٰ شعار ہیں" کیونکہ اہل تقویٰ وہاں بھی ایک دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کرسکیں گے۔

تیسری چوتھی اور پانچویں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کی یاددہانی کرکے انسان کو اس کی عبادت و اطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے جس پر انسانی وجود کی ابتداء اور بقاء موقوف ہے، پھر آسمان سے پانی اتارا جس کے ذریعہ طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے تاکہ وہ تمہارا رزق بن سکیں، لفظ ثَمَرَات، ثمرہ کی جمع ہے، ہر چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لئے لفظ ثمرات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے سہنے کا مکان بنتی ہیں، کیونکہ لفظ رزق جو اس آیت میں مذکور ہے وہ ان تمام ضروریات انسانی پر حاوی اور شامل ہے (مظہری)

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ ہی نے کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگادیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں، لفظ سَخَّرَ جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کردیا ہے، لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار و آلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے، کیونکہ جن چیزوں سے اُن میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی تم نے پیدا کی ہے نہ کرسکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرفات کرکے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کردیا، کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں دَاۗىِٕـبَيْنِ، دَأَبٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا ان دونوں سیاروں کی عادت بنادی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں،

کیونکہ اگر شمس و قمر کو اس طرح انسان کا مسخر کر دیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے، کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں، اس لئے رب العزت جل شانہ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمتِ خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع و غروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمھارے لئے مسخر کر دیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ، "یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اُس چیز میں سے جو تم نے مانگی"۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود ॥ لطفِ تو ناگفتہ ما می شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج، وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے، اگرچہ تم نے مانگا ہو لیکن اگر الفاظ کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تو ان میں بھی کچھ اشکال نہیں کہ عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو دے ہی دیا جاتا ہے، اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا، مگر علیم و خبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبالِ جان بن جائیگا ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے، مگر انسان اپنے قصورِ علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا، اس لئے غمگین ہوتا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، "یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر اس قدر ہیں کہ سب انسان مل کر ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، انسان کا اپنا وجود خود ایک عالمِ اصغر ہے، اُس کی آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں اور بدن کے ہر جوڑ بلکہ ہر رگ و ریشہ میں رب العزت کی غیر متناہی نعمتیں مستور ہیں، جن سے یہ چلتی پھرتی سیکڑوں نازک مشینوں کی عجیب و غریب فیکٹری ہر وقت مشغول بکار ہے، پھر آسمان و

زمین اور دونوں کی مخلوقات سمندروں پہاڑوں کی مخلوقات کہ آج کی جدید تحقیقات اور اس میں عمریں کھپانے والے ہزاروں ماہرین بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکے، پھر نعمتیں صرف وہی نہیں جو مثبت صورت میں عام طور پر نعمت سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ہر مرض، ہر تکلیف ہر مصیبت ہر رنج و غم سے محفوظ رہنا الگ الگ مستقل نعمت ہے، ایک انسان کو کتنی قسم کی بیماریاں اور کتنی اقسام کی بدنی اور ذہنی تکلیفیں دنیا میں پیش آسکتی ہیں انہی کا شمار ایک انسان سے نہیں ہوسکتا، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پورے عطیات اور نعمتوں کا شمار کس سے ہوسکتا ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بے شمار نعمتوں کے بدلہ میں بے شمار عبادت اور بے شمار شکر لازم ہوتا، مگر اللہ جل شانہ نے ضعیف البنیان انسان کی رعایت فرمائی، جب وہ حقیقت پر نظر کرکے یہ اعتراف کرے کہ شکر واجب سے سبکدوش ہونا اس کی قدرت میں نہیں، تو اسی اعتراف کو ادائے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ایسے ہی اعتراف پر ارشاد فرمایا کہ الآن قد شکرت یا داؤد، یعنی یہ اعتراف کرلینا ہی ادائے شکر کے لئے کافی ہے۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے، یعنی مقتضیٰ انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف و مصیبت پیش آئے تو صبر و سکون سے کام لے، زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے، اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آتا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے، وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بنا پر ایک نعمت ہی ہے، اور جب کوئی راحت و نعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گذار ہو، مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہے، کہ ذرا مصیبت و تکلیف پیش آجائے، تو بے صبری میں مبتلا ہوجائیں، اور کہتے پھریں، اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں، اسی لئے مؤمنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صَبَّار اور شَكُور بتلائی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور

بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝۳۵ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ

میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو، اے رب انھوں نے گمراہ کیا بہت

۱۷

النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٦﴾

لوگوں کو سو جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے،

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے

الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

پاس، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ

تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾

مائل ہوں اُن کی طرف اور روزی دے اُن کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِن

اے رب ہمارے تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی

شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٣٨﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ

چیز زمین میں اور نہ آسمان میں، شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا

لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٩﴾

مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسمٰعیل اور اسحٰق، بیشک میرا رب سنتا ہے دعا کو

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میرے اور قبول

دُعَاءِ ﴿٤٠﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ

کر میری دعا، اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس

يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾

دن قائم ہو حساب۔

ع ۲ ۱۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (حضرت

اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کو بحکم الٰہی میدانِ مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعاء کے طور پر) کہا
کہ اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیجئے (کہ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں،
یعنی حرم کر دیجئے) اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت
جہلا میں شائع ہے) بچائے رکھئے (جیسا اب تک بچائے رکھا) اے میرے پروردگار (میں بتوں
کی عبادت سے بچنے کی دعاء اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا،
(یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہوگئے، اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد
کے بچنے کی دعاء کرتا ہوں، اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا) پھر (میرے کہنے سننے کے بعد)
جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے وعدۂ مغفرت ہے ہی) اور جو شخص
(اس باب میں) میرا کہنا نہ مانے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت
(اور) کثیر الرحمۃ ہیں (ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں مقصود
اس دعاء سے شفاعت مومنین کے لئے اور طلب ہدایت غیر مومنین کے لئے ہے) اے ہمارے
رب میں اپنی اولاد کو (یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو) آپ کے
معظم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس
کا ادب کرتے آئے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (بوجہ سنگستان ہونے کے) زراعت
کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں اے ہمارے رب (بیت الحرام کے پاس اس لئے آباد
کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان
ہی) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے (کہ یہاں آکر رہیں سہیں تاکہ آبادی
پر رونق ہو جاوے) اور (چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت
سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ (ان نعمتوں کا) شکر کریں، اے ہمارے رب (یہ دعائیں
محض اپنی بندگی اور حاجتمندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے
نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور
(ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں
اور نہ آسمان میں (کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا، تاکہ
شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں، چنانچہ فرمایا) تمام حمد (و ثناء) خدا کے
لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت
میں میرا رب دعاء کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے (کہ عطائے اولاد کے متعلق میری یہ
دعاء رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ قبول کر لی، پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ

دعائیں پیش کرتے ہیں، اے میرے رب (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے، اور جیسا اُن کے لئے اہتمامِ نماز میرا مطلوب ہے اسی طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے دونوں کے لئے دعا کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہوگیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعا سب کے لئے نہیں کرسکتا ہوں، پس ان مضامین پر نظر کرکے یہ دعا کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنیوالا رکھئے اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب اور میری (یہ) دعا قبول کیجئے (اور) اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے) ؐ

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں عقیدۂ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی جہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ میں زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد تھا، اسی لئے دینِ ابراہیمی کو خاص طور پر **دینِ حنیف کا نام دیا جاتا ہے۔**

اسی مناسبت سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلی ایک آیت اَلَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا میں قریشِ مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنھوں نے تقلیدِ آبائی کی بناء پر ایمان کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمہارے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تاکہ تقلیدِ آبائی کے خوگر اسی پر نظر کرکے اپنے کفر سے **باز آجائیں (بحر محیط)**

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد صرف ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں، انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار **دُہرائے جاتے ہیں۔**

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دو دعائیں مذکور ہیں، اوّل رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، یعنی اے میرے پروردگار اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنا دیجئے، سورۃ

بقرہ میں بھی یہی دعا، مذکور ہے، مگر اس میں لفظ بَلَد بغیر الف لام کے بَلَدًا فرمایا ہے، جس کے معنی غیر معتین شہر کے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ دعا، اُس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی، اس لئے عام الفاظ میں یہ دعا، کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنا دیجئے۔

اور دوسری دعا، اس وقت کی ہے جبکہ مکہ کی بستی بس چکی تھی، تو شہر مکہ کو متعین کر کے دعا، فرمائی، کہ اس کو جائے امن بنا دیجئے، دوسری دعا، یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، مگر یہاں حضرت خلیل ؑ نے اس دُعا، میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعا کرنا تھا، اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شامل دعا، فرما لیا۔

اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل کی دُعا، قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بت پرستی سے محفوظ رہی، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہلِ مکہ تو عموماً اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان میں تو بُت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عُیَیْنَہ یہ دیا ہے کہ اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بُت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کر کے اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت وعظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اُٹھا لے گئے تھے، ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رُخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رُخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بُت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعا، کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بُت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر و صلاح سے محروم کر دیا۔

آخر آیت میں فرمایا فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

"یعنی ان میں سے جو شخص میرا اتباع کرے یعنی ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جائے وہ تو میرا ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس پر فضل و کرم کی امید تو ظاہر ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو آپ بہت مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں" اس میں نافرمانی سے اگر بعمر عملی نافرمانی یعنی بدعملی مراد لی جائے تو معنی ظاہر ہیں، کہ آپ کے فضل سے ان کی بھی مغفرت کی امید ہے، اور اگر نافرمانی سے مراد کفر و انکار لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہونے اور ان کی شفاعت نہ کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہو چکا تھا، پھر ان کی مغفرت کی امید کا اظہار کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بحر محیط میں فرمایا کہ اس جگہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کی سفارش یا دعاء کے الفاظ نہیں اختیار کئے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کی مغفرت کر دیں، البتہ پیغمبرانہ شفقت جس کے دامن میں کافر بھی رہتے ہیں اور ہر پیغمبر کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی کافر بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو اپنی اس طبعی خواہش کا اظہار اس عنوان سے کر دیا کہ "آپ تو بڑے غفور و رحیم ہیں" یوں نہیں فرمایا کہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے کافروں کے بارے میں فرمایا وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، یعنی اگر آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو آپ قوی اور حکمت والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں۔"

ان دونوں بزرگوں نے کافروں کے معاملہ میں سفارش پر اقدام تو اس لئے نہیں کیا کہ وہ ادب حق کے خلاف تھا، مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ ان کافروں پر آپ عذاب نازل کر دیں بلکہ ادب کے ساتھ ایک خاص عنوان سے ان کے بھی بخشے جانے کی طبعی خواہش کا اظہار کر دیا۔

احکام و ہدایات

دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جزء ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف و خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن و اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال و دولت

کی نعمتیں سب تلخ ہو جاتی ہیں۔
دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت و عبادت اور احکام الہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کرسکتا ہے جب اس کو کچھ سکون و اطمینان نصیب ہو۔
اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعا میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی و اقتصادی اور دینی و اخروی سب داخل ہوگئیں، اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔
اس دعاء سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسب قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترک دنیا کے منافی نہیں۔
دوسری دعاء میں بھی بڑی جامعیت ہے، کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک و بت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعاء فرما دی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے عمل سے بھی ہو سکتا ہے، اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جا سکتے ہیں، اور اگر عبادتِ اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بُت ہے اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کرلینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعاء یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آ جاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے ؎

ہر خیالِ شہوتے در رہ بُتے ست

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور حکیمانہ دعاء اس طرح مذکور ہے کہ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ الآیۃ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت یعنی اہل و عیال کو ایک ایسے دامنِ کوہ میں ٹھہرا دیا ہے جس میں کوئی کھیتی وغیرہ نہیں ہو سکتی (اور بظاہر وہاں زندگی کا کوئی سامان نہیں) یہ دامنِ کوہ آپ کے عظمت والے گھر کے پاس ہے، تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں، اس لئے آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیں، کہ ان کے اُنس اور آبادی کا سامان ہو جائے، اور ان کو ثمرات (پھل) عطا فرمائیے تاکہ

یہ لوگ شکر گذار ہوں۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعاء کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفانِ نوح میں بے نشان ہوگئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرما کر ان کو ملک شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہِ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی، دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملک شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگئے، بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق و دق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعاء سے ہوگا جو بعد میں کی گئی مگر حکم ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دیدیں، اور کچھ تسلّی کے الفاظ کہدیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھ تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا، تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے، تو آ[illegible] دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے، تب حضرت ابرا[illegible] علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں' حضرت ہاجرہؑ نے یہ سن کر فرمایا اِذًا لَا یُضَیِّعُنَا "یعنی اب کوئی پرواہ نہیں، جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہونچ گئے، جہاں ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہوگئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعاء مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعاء کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے :-

دعاء ابراہیمی کے اسرار و حکم

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقام خلیل ہی کا حق ادا کیا کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لق و دق میدان میں اہلیہ اور شیرخوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی، اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جاکر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل و عیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن و اطمینان کے ساتھ رہنے کی دعاء فرمائی، ان کی راحت کا سامان کر دیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعاء کی جائے گی بارگاہِ کریم سے وہ ہرگز رد نہ ہوگی، اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بیکس و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے، بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریاتِ زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسنِ انتظام کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوبُ الحال نہیں ہوتے، اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کامل بنتا ہے۔

(۲) غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا، اس لئے بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ مَآءٍ نہیں کہا، بلکہ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

(۳) عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، جیسا کہ امام قرطبیؒ نے تفسیر سورۂ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے، جب

ان کو زمین پر اُتارا گیا، تو بطور معجزہ جبلِ سراندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہونچا دیا گیا، اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفانِ نوح میں بیت اللہ کو اٹھا لیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبرئیل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بناءِ ابراہیمی عہدِ جاہلیت عرب میں منہدم ہو گئی، تو قریش جاہلیت نے از سرِ نو تعمیر کی جس کی تعمیر میں ابو طالب کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت مُحَرَّمٌ ذکر کی گئی ہے، محرم کے معنی معزز کے بھی ہوسکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں، کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے، اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

(۴) لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ، حضرت خلیلؑ نے شروع دعاء میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعاء کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا و آخرت کی تمام خیرات و برکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنا دیا جائے، اور اگرچہ وہاں اُس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعاء میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعاء میں ان سب کو شریک کرلیا۔

(۵) اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ، اَفئِدَہ، فُؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی دل کے ہیں، اس جگہ لفظ اَفئِدہ کو نکرہ اور اسکے ساتھ حرف مِن لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اس لئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعاء میں یہ حرف تبعیض و تقلیل نہ ہوتا بلکہ اَفئِدَةَ النَّاسِ کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم و غیر مسلم یہود و نصاریٰ اور مشرق و مغرب کے سب آدمی مکہ پر ٹوٹ پڑتے، جو اُن کے لئے باعثِ زحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیشِ نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعاء میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے۔

(۶) وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، ثمرات، ثمرۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے دعاء کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائیے۔

اور کبھی لفظ ثمرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اُس کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اُجرت اور تنخواہ کہلائیگی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعا میں ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ کا لفظ بھی آیا ہے، اس میں لفظ "شجر" کے بجائے لفظ "شیٔ" لایا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہؑ نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دعا نہیں فرمائی، بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعا مانگی ہے جس میں دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر طرح کی قابلِ انتفاع چیزیں داخل ہیں، شاید اس دعا کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ باوجود یکہ نہ کوئی زراعتی ملک ہے نہ تجارتی یا صنعتی، لیکن دنیا بھر کی ساری چیزیں مشرق و مغرب سے پہنچ کر مکہ معظمہ میں آتی ہیں، جو غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی نصیب نہیں۔

(۷) حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے یہ دعا نہیں فرمائی کہ مکہ کی زمین کو قابلِ کاشت بنا دیں، ورنہ کچھ مشکل نہ تھا کہ مکہ کی وادی اور سارے پہاڑ سرسبز کر دیئے جاتے، جن میں باغات اور کھیت ہوتے، مگر خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے یہ زراعت کا مشغلہ پسند نہ کیا، اس لئے دعا فرمائی کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیئے جائیں، جو مشرق و مغرب اور اطرافِ عالم سے یہاں آیا کریں، ان کا یہ اجتماع پوری دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا اور اہلِ مکہ کی خوش حالی کا ذریعہ بنے، اطرافِ عالم کی چیزیں بھی یہاں پہونچ جائیں، اور اہلِ مکہ کو کسبِ مال کے ذرائع بھی ہاتھ آجائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، اور آج تک اہلِ مکہ زراعت اور کاشت سے بے نیاز ہو کر تمام ضروریاتِ زندگی سے مالا مال ہیں۔

(۸) لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ، میں اشارہ کر دیا کہ اولاد کے لئے معاشی راحت و سکون کی دعا بھی اسی لئے کی گئی کہ یہ شکر گذار بن کر اس پر بھی اجر حاصل کریں، اس طرح دعا کی ابتداء نماز کی پابندی سے ہوئی، اور انتہا شکر گذاری پر، درمیان میں معاشی راحت و سکون کا ذکر آیا، اس میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے، کہ اس کے اعمال و احوال خیالات و افکار پر آخرت کی فلاح کا غلبہ ہو، اور دنیا کا کام بقدرِ ضرورت ہو۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ○

اس آیت میں دُعا کا تکملہ اللہ جل شانہ کے علمِ محیط کا حوالہ دے کر کیا گیا ہے، اور

لفظ رَبَّنَا کو الحاح وزاری کے لئے مکرر لایا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارے ہر حال سے واقف اور ہماری قلبی باطنی کیفیات اور ظاہری عرض ومعروض سب سے باخبر ہیں۔

باطنی کیفیات سے مراد وہ رنج وغم اور فکر ہے جو شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کو ایک کھلے میدان میں بے سروسامان فریاد کرتے ہوئے چھوڑنے اور ان کی جدائی سے فطری طور پر لاحق ہو رہا تھا، اور ظاہری عرض ومعروض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اور حضرت ہاجرہؓ کے وہ کلمات مراد ہیں جو انہوں نے امرِ الٰہی کی خبر سن کر کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم کیا ہے تو وہ ہمارے لئے بھی کافی ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا، آخر آیت میں علمِ الٰہی کی اسی وسعت کا مزید بیان ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہی کیا، تمام زمین وآسمان میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ اس آیت کا مضمون بھی اس دعاء کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ دعاء کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا، کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء قبول فرما کر اولاد صالح حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام عطا فرمائے۔

اس حمد وثناء میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار ومددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے، آخر میں حمد وثناء کا تکملہ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ سے کیا گیا، یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

اس حمد وثناء کے بعد پھر دعاء میں مشغول ہوگئے، اور فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ، جس میں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نماز کی پابندی پر قائم رہنے کی دعاء کی، اور آخر میں پھر بطور الحاح کے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری یہ دعاء قبول فرمایئے۔

آخر میں ایک جامع دعاء فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مؤمنین کی مغفرت فرما، اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائیگا

اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعاء فرمائی، حالانکہ والد یعنی آذر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ دعاء اس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا، جیسے دوسری جگہ

قرآن کریم میں ہے وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝

احکام و ہدایات

آیت مذکورہ سے دعاء کے آداب یہ معلوم ہوئے کہ بار بار الحاح وزاری کے ساتھ کی جائے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بھی کی جائے اس طرح دعاء کی قبولیت کی بڑی امید ہوجاتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے اُن کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی

لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ

ہے اس دن کے لئے کہ پتھرا جائیں گی آنکھیں، دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر

لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ

پھر کر نہیں آئیں گی ان کی طرف انکی آنکھیں، اور دل اُن کے اُڑ گئے ہوں گے، اور ڈرا دے

النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ

لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے

اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ

مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک، کہ ہم قبول کرلیں تیری بلانے کو اور پیروی کرلیں رسولوں کی کیا تم

تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ

پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ٹلنا، اور آباد تھے تم

فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا

بستیوں میں انہی لوگوں کی جنھوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ

ہم نے اُن سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے، اور یہ بنا چکے ہیں اپنے داؤ اور

عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے بیشک اللہ زبردست ہے

انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ

بدلہ لینے والا، جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور

بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ

لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے، اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن

مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى

باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں، کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی

وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ

ہے ان کے مُنہ کو آگ، تاکہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا، بیشک

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ

اللہ جلد کرنے والا ہے حساب، یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں اس سے

وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔

ع ۱۱
19

خلاصۂ تفسیر

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی عذاب نہ دینے کی بناء پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں اُن لوگوں کی نگاہیں (مارے حیرت اور ہیبت کے) پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ موقف حساب کی طرف حسب الطلب) دوڑتے ہوں گے (اور فرط حیرت سے) اپنے سر اوپر اٹھا رکھے ہوں گے (اور) ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آویگی (یعنی ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ آنکھ نہ جھپکیں گے) اور ان کے دل (شدت ہول سے) بالکل بدحواس ہوں گے اور (جب وہ دن آجاوے گا پھر مہلت نہ ہوگی پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے) سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آپڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک مدت قلیل تک ہم کو (اور) مہلت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھیجدیجئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا

سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی اور) کیا تم نے (اس مہلت طویل ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جانا ہی نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے، کقولہ تعالیٰ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ) حالانکہ (انکار سے باز آجانے کے اسباب سب مجتمع تھے چنانچہ) تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنھوں نے (کفر و انکار قیامت کر کے) اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو (تواتر اخبار سے) یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا (کہ ان کے کفر و انکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ انکار کرنا موجب غضب ہے، پس تصدیق واجب ہے، اور ان کے مساکن میں رہنا ہر وقت ان کے ان حالات کی یاد دلانے کا سبب ہو سکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور (علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے) ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی کتب سماویہ میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی ایسے ہی مغضوب و مستحق عذاب ہو گے پس واقعات کا واقعہ اخبار سے سننا پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر بالتصریح تنبیہ کر دینا یہ سب اسباب مقتضی اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے) اور (ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر و انکار پر سزائیں دیں) ان لوگوں نے (دین حق کے مٹانے میں) اپنی سی بہت ہی بڑی بڑی تدبیریں کی تھیں اور ان کی یہ سب تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں (اس کے علم سے مخفی نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ٹل جاویں (مگر پھر بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہو گئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ حق وہی ہے جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کا انکار موجب غضب و عذاب ہے، جب قیامت میں ان کا مخلوق ہونا معلوم ہو گیا) پس (اے مخاطب) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھنا، (چنانچہ قیامت کے دن ان کے منکرین سے عذاب کا وعدہ تھا سو وہ پورا ہو گا، جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل پھر مشیت کا تعلق اوپر معلوم ہوا، پھر خلف وعدہ کا کیا احتمال رہا اور یہ بدلہ اس روز ہو گا) جس روز دوسری زمین بدل جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی (دوسرے بدل دیئے جاویں گے ان آسمانوں کے علاوہ کیونکہ اول بار کے نفخ صور سے سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاویں گے، پھر دوسری بار میں از سر نو زمین و آسمان بنیں گے)،

اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے یعنی قیامت میں بدلہ لیا جاوے گا) اور (اس روز اے مخاطب) تو مجرموں کو (یعنی کافروں کو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا (اور) ان کے کرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران لپٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے اور قطران درخت چیڑ کا روغن ہوتا ہے، کما فی کتب اللغات والطب) اور آگ اُن کے چہروں پر (بھی) لپٹی ہوگی (یہ سب کچھ اس لئے ہوگا) تاکہ اللہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور گو ایسے مجرم بے انتہا ہونگے مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب و کتاب کچھ دشوار نہیں کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا ہے (سب کا فیصلہ شروع کر کے فوراً ہی ختم کر دے گا) یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا ہے (تاکہ مبلغ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب سے) ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

معارف و مسائل

سورۃ ابراہیم میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے کچھ حالات و معاملات کی تفصیل اور احکام الٰہیہ کی مخالفت کرنے والوں کے انجام بد اور آخر میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا، جنھوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اور جن کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی بستی بسائی، اور اس کے بسنے والوں کو ہر طرح کا امن وامان اور غیر معمولی طور پر معاشی سہولتیں عطا فرمائیں، انہی کی اولاد بنی اسمٰعیل قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اول ہیں۔

سورۃ ابراہیم کے اس آخری رکوع میں خلاصہ کے طور پر انہی اہل مکہ کو پچھلی قوموں کی سرگذشت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین اور اب بھی ہوش میں نہ آنے کی صورت میں قیامت کے ہولناک عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مظلوم کی تسلی اور ظالم کے لئے سخت عذاب کی دھمکی ہے کہ ظالم اور مجرم لوگ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل دینے سے بے فکر نہ ہو جائیں، اور یہ نہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جرائم کی خبر نہیں، اس لئے باوجود جرائم کے وہ پھل پھول رہے ہیں، کوئی عذاب و مصیبت ان پر نہیں آتی، بلکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، مگر وہ اپنی رحمت اور حکمت کے تقاضے سے ڈھیل دے رہے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا، یعنی نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کو غافل، یہ خطاب بظاہر ہر اُس

شخص کے لئے ہے جس کو اس کی غفلت اور شیطان نے اس دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، اور اگر اس کا خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بھی مقصود اس سے امت کے غافلوں کو سنانا اور تنبیہ کرنا ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو حالات سے بے خبر یا غافل سمجھیں۔

دوسری آیت میں بتلایا کہ ان ظالموں پر فوری طور سے عذاب نہ آنا ان کے لئے کچھ اچھا نہیں کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک قیامت اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے آگے ختم سورۃ تک اسی عذاب آخرت کی تفصیلات اور ہولناک وقائع کا بیان ہے۔

یَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِیۡهِ الۡاَبۡصَارُ، یعنی اس دن جبکہ پھٹی رہ جائیں گی آنکھیں " مُهۡطِعِیۡنَ مُقۡنِعِیۡ رُءُوۡسِهِمۡ " یعنی خوف و حیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تحاشا دوڑ رہے ہوں گے، " لَا یَرۡتَدُّ اِلَیۡهِمۡ طَرۡفُهُمۡ " ان کی پلکیں نہ جھپک سکیں گی، " وَاَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ " ان کے دل خالی بدحواس ہوں گے۔

یہ حالات بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنی قوم کو اس دن کے عذاب سے ڈرایئے جس میں ظالم اور مجرم لوگ مجبور ہو کر پکاریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں کچھ اور مہلت دیدیجئے یعنی پھر دنیا میں چند روز کے لئے بھیج دیجئے تاکہ ہم آپ کی دعوت قبول کریں، اور آپ کے رسولوں کا اتباع کرکے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست کا یہ جواب ہوگا کہ اب تم یہ کہہ رہے ہو کیا تم نے اس سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہماری دولت و شوکت کو زوال نہ ہوگا ہم ہمیشہ دنیا میں یونہی عیش و عشرت میں رہیں گے اور دوبارہ زندگی اور عالم آخرت کا انکار کیا تھا۔

وَسَکَنۡتُمۡ فِیۡ مَسٰکِنِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَتَبَیَّنَ لَکُمۡ کَیۡفَ فَعَلۡنَا بِهِمۡ وَضَرَبۡنَا لَکُمُ الۡاَمۡثَالَ، ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب مشرکین عرب کو ہے، جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے اَنۡذِرِ النَّاسَ۔ یعنی ڈرائیے ان لوگوں کو، اس خطاب میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و انقلابات تمہارے لئے بہترین واعظ ہیں تعجب ہے کہ تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے، حالانکہ تم انھی ہلاک شدہ قوموں کے گھروں میں بستے اور چلتے پھرتے ہو، اور تمہیں کچھ حالات کے مشاہدہ سے کچھ متواتر خبروں سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیسا سخت عذاب نازل کیا، اور ہم نے بھی تمہارے راہ پر لانے کے لئے بہت سی مثالیں بیان کیں، پھر بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

۱۸

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ، "یعنی ان لوگوں نے دینِ حق مٹانے اور دعوتِ حق قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذا پہونچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں، اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنا دینے پر قادر ہیں، اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد وثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکینِ عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دور رس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔

اور اکثر مفسرین نے وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ اِنْ کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن اُن کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم واستقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد اُمتِ محمدیہ کو سنانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بالاخطاب کو یہ تنبیہ کی گئی: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ "یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے فتح ونصرت اور کامیابی کے کئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست اور انتقام لینے والا ہے، وہ ضرور اپنے پیغمبروں کے دشمنوں سے انتقام لے گا، اور پیغمبروں سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرے گا۔

اس کے بعد کی آیات میں پھر قیامت کے ہولناک حالات و واقعات کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ، "یعنی قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ اس میں موجودہ زمین بھی بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی، اور سب کے سب اللہ واحد وقہار کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

زمین وآسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل وصورت بدل دی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایاتِ حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنادی جائے گی، جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہوگی، نہ درخت وغیرہ کی، نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی، قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح فرمایا ہے

لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا، یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آجکل راستے اور سڑکیں مُڑ کر گذرتی ہیں، اور کہیں اونچی ہے کہیں گہرائی، یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہو جائے گا۔

اور تبدیلِ زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنا دیئے جائیں، روایاتِ حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی

امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے (تفسیر مظہری)

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اُٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف سفید ہوگی جیسے مَیدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی، جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار، اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے گی، اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہوگی، اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی جس پر وہ کھڑا ہو سکے، پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا، میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا، کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے۔

اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہوگی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے، مگر ذاتِ زمین یہی باقی رہے گی، اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہوگی، اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے نفخہ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔

تفسیر مظہری میں مسند عبد ابن حمید سے حضرت عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جاوے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعۂ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ و تابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے، گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا، اور حقیقتِ حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ؛ نینگیختن علت از کارِ تو

آخری آیات میں اہلِ جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے گا، یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یکجا باندھ دیئے جائیں گے، اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہوگا جس کو تارکول کہا جاتا ہے، اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ سب احوال قیامت کا بیان کرنا لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے، تاکہ وہ اب بھی سمجھ لیں کہ قابلِ عبادت واطاعت صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اور تاکہ جن میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے وہ شرک سے باز آجائیں ؛

سُورَۂ ابراہیم ختم شد

ایک یادداشت اور اطلاع

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے، نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ کی بے نظیر متوسط تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمونِ قرآن سمجھنا مشکل ہو نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو، پھر خداداد علم و ذکاوت اور تقویٰ و طہارت کی برکت سے اقوالِ مختلفہ میں ایک کو ترجیح دے کر لکھ دینے کا جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ بڑی بڑی تفسیروں سے بھی حاصل ہونا مشکل تھا، مگر یہ تفسیر حضرتؒ نے اہل علم کے لئے انہی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانہ کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کو اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا۔

اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے مضامین عجیبہ کو آجکل کی آسان زبان میں لکھا جائے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

بحکم قضاء و قدر اس کی ابتداء اس طرح ہوگئی کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر صاحب نے مجھ پر اصرار کیا کہ ریڈیو پر ایک سلسلہ قرآن کی خاص خاص آیت کا بعنوان "معارف القرآن" جاری کیا جائے ان کا اصرار اس کام کے آغاز کا سبب بن گیا، اور ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کے روز جمعہ ۳ شوال ۱۳۷۳ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہو کر ۱۰ صفر ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، جو سورۂ ابراہیم کے اختتام پر منجانب محکمۂ ریڈیو پاکستان ختم کر دیا گیا۔

حق تعالیٰ نے اس کو میرے وہم و گمان سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اور اطرافِ عالم سے اس کو کتابی صورت میں طبع کرنے کا تقاضا ہوا، اس کا ارادہ کیا تو جتنا کام اس وقت تک ہو چکا تھا وہ بھی اس لحاظ سے ناتمام تھا کہ یہ سلسلہ منتخب آیات کا تھا، درمیانی آیات کو جو خالص علمی تھیں ریڈیو پر عوام کو ان کی تفسیر سمجھانا آسان نہ تھا، وہ رہ گئی تھیں، کتابی شکل میں طبع کرنے کے لئے ان کا سلسلہ بھی پورا کرنا تھا جو بوجہ دوسرے مشاغل کے پورا کرنا مشکل تھا۔

عجائبِ قدرت سے ہے کہ رمضان ۱۳۸۸ھ میں احقر سخت بیمار ہو کر نقل و حرکت سے معذور صاحبِ فراش ہو گیا، اور موت سامنے محسوس ہونے لگی، تو اس کا افسوس ستانے لگا کہ یہ مسودات یوں ہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرما دیا کہ لیٹے بیٹھے "معارف القرآن" کے مسودات پر نظرِ ثانی اور درمیانی آیات جو رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کسی طرح اسی حالت میں کر دی جائے۔

ادھر بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا، بیماری نے تمام دوسرے مشاغل پہلے ہی چھڑا دیئے تھے، اب صرف یہی مشغلہ رہ گیا، اس لئے قدرت کے عجیب و غریب انتظام نے اسی بیماری میں بحمد اللہ یہ کام ۲۹ رجب سنہ ۱۳۹۰ھ تک پورا کرا دیا۔

یہاں تک کہ سورۂ ابراہیم کا ختم اور قرآن پاک کے تیرہ پارے اسی ریڈیو کی نشری دروس کے ذریعہ پورے ہو گئے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اگلے حصہ کے لکھنے کی توفیق و ہمت بھی عطا فرما دی، نقل و حرکت سے معذوری کی تکلیف بھی رفع فرما دی، اگرچہ سلسلہ مختلف امراض کا تقریباً مسلسل رہا اور ضعف بھی بڑھتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کی امداد سے ۳۰ رشعبان سنہ ۱۳۹۰ھ سے قرآن کے اگلے پاروں کی تفسیر کا لکھنا شروع ہو کر اس وقت جبکہ معارف القرآن کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یعنی ۲۵ رصفر سنہ ۱۳۹۱ھ میں اس تفسیر کا مسودہ قرآن کریم کی چوتھی منزل سورۂ فرقان انیسویں پارے تک بعون اللہ سبحانہ مکمل ہو چکا ہے۔

اس وقت بھی مختلف امراض اور ضعف کا سلسلہ بھی ہے، اور بحمد اللہ یہ کام بھی جاری ہے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرما دیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

بندہ محمد شفیع
۲۵ رصفر سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوۡرَۃُ الۡحِجۡرِ

سُوۡرَۃُ الۡحِجۡرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسۡعٌ وَّتِسۡعُوۡنَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوۡعَاتٍ

سورۂ حجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ننانوے آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَقُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ۝۱

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی،

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ۝۲

کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان،

ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَیَتَمَتَّعُوۡا وَیُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ۝۳

چھوڑ دے ان کو کھالیں اور برت لیں اور امید میں لگے رہیں سو آئندہ معلوم کرلیں گے

وَمَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا وَلَہَا کِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝۴ مَا تَسۡبِقُ

اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر، نہ سبقت کرتا ہے

مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَمَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ۝۵

کوئی فرقہ اپنے وقت مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

الٓرٰ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور

قرآن واضح کی (یعنی اس کی دونوں صفتیں ہیں، کامل کتاب ہونا بھی اور قرآن واضح ہونا بھی، ان کلمات سے قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے، یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، فرمایا رُبَمَا يَوَدُّ یعنی جب قیامت کے حشر و نشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو) کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار اس لئے کہ جب کوئی نئی شدت و مصیبت دیکھیں گے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی) آپ (دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور) ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے، کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور دنیا میں جو اُن کو ان کے کفر اور بدعملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا) اور ہم نے جتنی بستیاں (کفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لئے ایک معیّن وقت لکھا ہوا ہوتا رہا ہے اور (ہمارا اصول ہے کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے (بلکہ وقت مقرر پر ہلاک ہوئی ہے، اسی طرح جب اُن کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی)۔

معارف و مسائل

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا الخ سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو مقصد اور اصلی مشغلہ بنا لینا اور دنیا کی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہو کر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی سے ہو سکتا ہے، جن کا آخرت اور اس کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، اور معاش کا بقدر ضرورت سامان کرتا ہے، اور آئندہ کاروبار کے منصوبے بھی بناتا ہے، مگر موت اور فکر آخرت سے غافل ہو کر یہ کام نہیں کرتا، اسی لئے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر رہتی ہے، اور فضول منصوبہ بندی کو مشغلہ نہیں بناتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بدنصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا (یعنی اپنے گناہوں، غفلتوں پر نادم ہو کر نہ رونا) اور سخت دلی، طولِ امل اور دنیا کی حرص (قرطبی عن مسند البزار عن انسؓ)

اور طولِ امل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور حرص میں انہماک اور موت و آخرت سے بے فکری کے ساتھ دور دراز کے منصوبے بنائے جائیں، (قرطبی) جو منصوبے دینی مقاصد

کے لئے یا کسی قوم و ملک کے آئندہ مفاد کے لئے بنائے جاتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ وہ فکرِ آخرت ہی کی ایک صورت ہے۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے پہلے طبقہ کی نجات ایمان کامل اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور آخری امت کے لوگ بخل اور طول امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جامع مسجد دمشق کے منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے اہل دمشق! کیا تم اپنے ایک ہمدرد خیر خواہ بھائی کی بات سنو گے سن لو! کہ تم سے پہلے بہت بڑے بڑے لوگ گذرے ہیں، جنھوں نے مال و متاع بہت جمع کیا اور بڑے بڑے شاندار محلات تعمیر کئے اور دور دراز کے طویل منصوبے بنائے، آج وہ سب ہلاک ہو چکے ہیں، اُن کے مکانات اُن کی قبریں ہیں، اور ان کی طویل امیدیں سب دھوکہ اور فریب ثابت ہوئیں، قوم عاد تمھارے قریب تھی جس نے اپنے آدمیوں سے اور ہر طرح کے مال و متاع سے اور اسلحہ اور گھوڑوں سے ملک کو بھر دیا تھا، آج کوئی ہے جو ان کی وراثت مجھ سے دو درہم میں خریدنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی میں طویل امیدیں باندھتا ہے اس کا عمل ضرور خراب ہو جاتا ہے (قرطبی)

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے، کیوں نہیں

تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ

لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے، ہم نہیں اُتارتے

الْمَلٰۗىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝

فرشتوں کو مگر کام پورا کر کے اور اُس وقت نہ ملے گی اُن کو مہلت۔

خلاصۂ تفسیر

(اِلَّا بِالْحَقِّ میں لفظ حق سے مراد فیصلۂ عذاب ہے، اور بعض مفسرین نے قرآن یا رسالت

کو مراد قرار دیا ہے، بیان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، یہ معنی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہیں، تفسیر آیات یہ ہے)۔

اور ان کفار (مکہ) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) یوں کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نعوذ باللہ) مجنون ہو (اور نبوت کا غلط دعویٰ کرتے ہو ورنہ) اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے (جو ہمارے سامنے تمہارے صدق کی گواہی دیں کقولہ تعالیٰ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۔ اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جاتی (بلکہ جب اُن کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی متیقن ہے تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے جیسا کہ سورۃ انعام کے اوّل رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور (یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا معجزہ ہونا اس پر دلیل ہے، اور قرآن کے ایک اعجاز کا بیان تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسرا اعجاز یہ ہے کہ) ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں (اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا، جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے، یہ ایسا صریح معجزہ ہے جس کو ہر عام و خاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک ان پڑھ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

مامون کے دربار کا ایک واقعہ

امام قرطبیؒ نے اس جگہ سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مامون کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار

میں علمی مسائل پر بحث و مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے، جس میں ہر اہلِ علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا جو صورت شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تو وہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی جب مجلس ختم ہوگئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے امتحان لینے کے لئے کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔

اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہوگئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا، اور مجلسِ مذاکرہ میں فقہِ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سال گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا کہ اُس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھکر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہونچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں، جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔

اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہوگیا، قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاق سے اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا، انھوں نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہئے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحییٰ ابن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ قرآن عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ، یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات و انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و

نصاریٰ نے فریضہ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں مسخ و محرّف ہو کر ضائع ہو گئیں، بخلاف قرآن کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی تو دشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطہ اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا۔ آج عہدِ رسالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس ہو چکے ہیں تمام دینی اور اسلامی امور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآن کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔

حفاظتِ قرآن کے وعدے میں حفاظتِ حدیث بھی داخل ہے

تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآنی کا نام ہے نہ صرف معانیٔ قرآن کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامینِ قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامینِ قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا، کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھدے تو اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحفِ ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی زبان اردو یا انگریزی وغیرہ میں جو صرف ترجمہ قرآن کا شائع کر کے لوگ اس کو اردو یا انگریزی قرآن کا نام دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ وہ قرآن نہیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزو ہیں، تو حفاظتِ قرآن کی جو ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی اور مضامینِ قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ تعالیٰ ہی نے لے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانیٔ قرآن وہی ہیں جن کے تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلادیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو ان کے لئے نازل کیا گیا۔

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔
یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ، اور اسی لئے آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی، انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیث رسول کو غیر محفوظ کہنے والا درحقیقت قرآن کو غیر محفوظ کہتا ہے

جو لوگ آجکل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں مدون کیا گیا ہے۔

اول تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہد رسالت میں شروع ہو چکی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کے علاوہ حدیث رسولؐ درحقیقت تفسیر قرآن اور معانی قرآن ہیں ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسولؐ) ضائع ہو جائیں؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ
اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں، اور نہیں آتا ان کے پاس

مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۱﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ
کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی، اسی طرح بٹھادیتے ہیں ہم

فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
اس کو دل میں گنہگاروں کے، یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾
پہلوں کی، اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سارے دن اس میں چڑھتے رہیں

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع ۱
تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہے ہماری نگاہ کو، نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے

اَللُّغَات اَلشِّيَعِ جمع شیعہ کی ہے جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں، اور ایسے فرقہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں، مراد یہ ہے کہ ہم نے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اندر رسول بھیجے ہیں اس میں لفظ اُمّی کے بجائے فِي شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہر گروہ کا رسول اسی گروہ کے لوگوں میں سے بھیجا گیا، تاکہ لوگوں کو اس پر اعتماد کرنا آسان ہو، اور یہ بھی اُن کی طباع اور مزاج سے واقف ہو کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب پروگرام بنا سکے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی تکذیب سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا، (اور ان کی یہ حالت تھی کہ) کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا (جو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوا تھا) اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرمین (یعنی کفارِ مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہے کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو درکنار اس سے بڑھ کر) اگر (خود ان کو آسمان پر بھیجا جاتے اس طرح سے کہ) ہم اُن کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور اونگھ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو) اس (دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جاویں تب بھی یوں کہدیں کہ ہماری نظر بند کر دیگئی تھی (جس سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور واقع میں نہیں چڑھ رہے، اور نظر بندی میں کچھ اسی واقعہ کی تخصیص نہیں) بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے (اگر ہم کو اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا جائے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا)۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا، ان آیات میں جو آگے

آ رہی ہیں، اللہ جل شانہٗ کے وجود، توحید، علم، قدرت کے واضح دلائل، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات و مشاہدات سے بیان کئے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا:

اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو (ستاروں سے) آراستہ کیا۔

معارف و مسائل

بُرُوْجًا، بُرج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمہ تفسیر مجاہدؒ، قتادہؒ، ابو صالحؒ وغیرہ نے اس جگہ بُرُوْج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جو ان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاء آسمانی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنی میں اطلاق عام معروف ہے، جرمِ آسمان کو بھی سماء کہا جاتا ہے، ور آسمان سے بہت نیچے جو فضاء آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جابجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیارات اور ستاروں کا آسمانوں کے اندر نہیں بلکہ فضاء آسمانی میں ہونا، مکمل تحقیق قرآن کریم کی آیات سے نیز قدیم و جدید علم فلکیات کی تحقیق سے انشاء اللہ سورۂ فرقان کی آیت ۶۱ تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا کی تفسیر میں آئے گی۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سُن بھاگا سو

فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا۔

خلاصۂ تفسیر

آسمان کو (ستاروں کے ذریعہ) ہر شیطان مردود سے محفوظ فرما دیا (کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی) ہاں مگر کوئی بات (فرشتوں کی) چوری چھپے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے۔ (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بد حواس ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

شہابِ ثاقب ان آیات سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ شیاطین کی رسائی آسمانوں تک نہیں ہو سکتی ابلیس لعین کا تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت آسمانوں میں ہونا اور آدم و حوا علیہما السلام کو دھوکہ میں مبتلا کرنا وغیرہ یہ سب آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول سے پہلے کے واقعات ہیں، اس وقت تک جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع نہیں تھا، نزولِ آدم علیہ السلام اور اخراجِ شیطان کے بعد سے یہ داخلہ ممنوع ہوا، سورۂ جن کی آیات میں جو یہ مذکور ہے اِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک شیاطین آسمانوں کی خبریں فرشتوں کی باہمی گفتگو سے سُن لیا کرتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین آسمانوں میں داخل ہو کر سنتے تھے، نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ کے الفاظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چوروں کی طرح آسمانی فضاء میں جہاں بادل ہوتے ہیں چھپ کر بیٹھ جاتے اور سُن لیا کرتے تھے، ان الفاظ سے خود بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ قبل بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا، مگر فضاءِ آسمانی تک پہونچکر چوری سے کچھ سُن لیا کرتے تھے، بعثتِ نبوی کے بعد حفاظتِ وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا۔

رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سُن سکتے تھے، سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں، بہت ممکن ہے کہ اجرامِ سماویہ سماعتِ اصوات سے مانع نہ ہوں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اُتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سُن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں کبھی کسی وقت یہاں تک اُترتے ہیں، اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں، شیاطین اسی فضاءِ آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہابِ ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورۂ جن میں اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ کی تفسیر میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ: ان آیات میں شہابِ ثاقب کا ہے، قرآنِ کریم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظتِ وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے، تاکہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سُن سکیں۔

اس میں ایک اشکال تو یہ ہے کہ فضائے آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اُٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں، اوپر جا کر جب اُن کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہونچتی ہے تو وہ سُلگ اُٹھتے ہیں، اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارہ ٹوٹا ہے، اسی لئے محاورات میں اس کو ستارہ ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے انقضاض کوکب کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، زمین سے اُٹھنے والے بخارات مشتعل ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہو، مگر بعثت نبوی سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا کہ شیاطین جو فرشتوں کی باتیں چوری سے سننا چاہیں ان کو اس شعلے سے مارا جاتا ہے۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور نقل کیا ہے کہ امام حدیث زہریؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں! اس پر اس نے سورۂ جن کی مذکورہ آیت معارضہ کے لئے پیش کی تو فرمایا کہ شہاب ثاقب تو پہلے بھی تھے، مگر بعثت نبویؐ کے بعد جب شیاطین پر تشدد کیا گیا تو ان سے شیاطین کے دفع کرنے کا کام لے لیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباسؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے، کہ ستارہ ٹوٹا، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم زمانۂ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرے گا، یا پیدا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ یہ لغو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن

کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں، مقصد قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیئے اس پر بوجھ اور اُگائی اس میں

كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ

ہر چیز اندازے سے، اور بنا دیئے تمھارے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں

لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَاۗىِٕنُهٗ وَمَا

جن کو تم روزی نہیں دیتے، اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور

نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ

اتارتے ہیں ہم اندازہ معین پر، اور چلائیں ہم نے ہوائیں رس بھری،

فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا اور تمھارے پاس نہیں

بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس کا خزانہ، اور ہم ہی ہیں جلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے،

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس زمین میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی (ضرورت کی پیداوار) ایک معین مقدار سے اُگائی، اور ہم نے تمہارے واسطے اس زمین میں معاش کے سامان بنائے (جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے، پہننے

اور رہنے سہنے سے متعلق ہیں) اور (یہ سامانِ معاش اور ضروریاتِ زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا، بلکہ) ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے (یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورد و نوش اور زندگی گذارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو جانور بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریات معاش حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے برّی اور بحری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامانِ معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور یہ جانور اتنے بے حد و بے شمار ہیں کہ انسان نہ اُن سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کرسکتا ہے) اور جتنی چیزیں (ضروریاتِ زندگی سے متعلق) ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز) کو ایک معین مقدار سے اُتارتے رہتے ہیں اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے، (کہ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے) اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں، اور مارتے ہیں اور (سب کے مرنے کے بعد) ہم ہی باقی رہ جاویں گے، اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) محشور فرمادے گا (یہ اس لئے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، اس میں منکرِ توحید کی سزا کی طرف اشارہ کردیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دیگا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے)۔

معارف و مسائل

حکمتِ الٰہیہ، ضروریاتِ معاش میں تناسب و موزونیت

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ترجمہ میں لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر اُگنے والی چیز کی ایک مقدار معین اُگائی جس سے کم ہو جاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں، اور زیادہ ہو جاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی، انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ پھل اگر اتنے زیادہ پیدا ہو جائیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑ جائیں گے، ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا، اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی نہ رہیگی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر

انسان کی زندگی موقوف ہے، ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مفت مل جایا کرتے، اور بے فکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی اُن کے بڑے ذخیرے پڑے رہتے، لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا، اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے، کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بچیں۔

اور مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اُگنے والی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تناسب اور موزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس سے اس میں حُسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے، مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل، مختلف سائز اور مختلف شکل، مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آب رسانی اور آبپاشی کا عجیب و غریب نظام الٰہی

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ سے مَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ تک قدرتِ الٰہیہ کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، چرندوں، پرندوں، درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق آب رسانی کا ایسا نظامِ محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں، درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے، اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے، پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، نہ کسی سے مانگی جاتی ہے۔

اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرتِ الٰہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے، کہ سمندر میں بخارات پیدا فرمائے جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں، جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنا دیں، پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہونچانا ہے پہونچا دیں، پھر فرمانِ الٰہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے، اس کے مطابق یہ خودکار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھر بیٹھے مل جائے، اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے، کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے، حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا کرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے

اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں، اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جاکر پڑتا ہے، اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا، اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی بھی مشکل ہو جاتی، اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھارا بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلاظتیں اس میں پہونچ کر بھسم ہو جاتی ہیں، غرض اس حکمت کی بناء پر سمندر کا پانی کھارا بلکہ تلخ بنایا گیا، جو نہ پیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، نظام قدرت نے جو پانی کے ہوائی جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بغیر کسی ظاہری مشین کے پیدا کر دیئے کہ اس پانی کا نمک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا، سورۂ مرسلٰت میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا، اس میں لفظ فرات کے معنی ہیں ایسا میٹھا پانی جس سے پیاس بجھے، معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گذار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تمہارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔

سورۂ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا ہے: اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ "بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے"۔

یہاں تک تو قدرت الٰہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے پورے روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس حسن نظام کیساتھ پہونچایا، کہ ہر خطہ کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ ان جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں گھر بیٹھے پانی پہونچا دیا، اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہونچا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا کیونکہ پانی انکی ایسی ضرورت ہے جس کی احتیاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے، اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہوا کرتی، لیکن اس صورت میں ان کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی، مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا، اس کا اندازہ کسی اہل تجربہ کے لئے مشکل نہیں، سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطل پیدا کرتی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جاتی کہ اس کا پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جاتا، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ

مقرر کر کے اس کے سپرد کیا جائے کہ وہ اپنے کوٹہ اور حصہ کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔

اندازہ لگائیے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا جن میں تین یا چھ مہینہ کی ضرورت کا پانی جمع کر کے رکھ لے، اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر ہے کہ چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جاتا، اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا، اس لئے قدرت الٰہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقتِ ضرورت ہر جگہ مل جانے کا یک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا، کہ جو پانی برسایا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں، کھیتوں اور انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آہی جاتا ہے، کچھ کھلے تالابوں، جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بحرِ منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے، جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی، پھر اگر وہ پانی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعہ کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہونچ جانے کا خطرہ رہتا، پرندے جانوروں کے اس میں گرنے مرنے کا اندیشہ رہتا، جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا، مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بحرِ منجمد (برف) بنا کر پہاڑوں پر لاد دیا جہاں سے تھوڑا تھوڑا رس کر وہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور پھر چشموں کی صورت میں ہر جگہ پہونچ جاتا ہے، اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی تہہ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہے اور کنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آب رسانی کا یہ نظام الٰہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوتے ہے، اول تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے، پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہونچانا دوسری نعمت ہے، پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنا دینا تیسری نعمت ہے، پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے، پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظام محکم پانچویں نعمت ہے، پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے، کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ اُن کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو، قرآن کریم کی آیت فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ۝ میں انہی نعماءِ الٰہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے میں درجات کا فرق

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ میں مستقدمین اور مستاخرین کی چند تفسیریں ائمہ صحابہ و تابعین سے مختلف منقول ہیں:۔ مستقدمین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستاخرین وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے (قتادہ و عکرمہ) مستقدمین سے مراد اموات ہیں اور مستاخرین سے وہ لوگ جو اب

زندہ ہیں (ابن عباس رضی اللہ عنہ)، مستقدمین سے مراد امتِ محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستاخرین سے امتِ محمدیہ (مجاہد) مستقدمین سے مراد اہلِ طاعت وخیر ہیں اور مستاخرین سے اہلِ معصیتُ غفلت (حسن وقتادہ) مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوف یا جہاد کی صفوف اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستاخرین وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں، حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ کا علم محیط ان تمام اقسام کے مستقدمین ومستاخرین پر حاوی ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیۃ سے نماز میں صفِ اوّل اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اذان کہنے اور نماز کی صفِ اوّل میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہے تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعبؓ آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید اگلی صفوف میں اللہ کا کوئی بندہ اس شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے، انتہیٰ کلامہٗ۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اس فضیلت تو صفِ اوّل ہی میں ہے، جیسا کہ آیتِ قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا، لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صفِ اوّل میں جگہ نہ ملی تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید اگلی صفوف کے کسی نیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے، اور آیتِ مذکورہ میں جیسے نماز کی صفِ اوّل کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صفِ اوّل کی افضلیت بھی ثابت ہو گئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٦﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے،

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ وَإِذْ قَالَ

اور جن کو بنایا ہم نے اس سے پہلے لو کی آگ سے، اور جب کہا

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے،

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

پھر جب ٹھیک کر دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر، مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ

يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ

ہو سجدہ کرنے والوں کے، فرمایا، اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا

السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ

سجدہ کرنے والوں کے، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کھنکھناتے

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ

سنے ہوئے گارے سے، فرمایا تو تو نکل یہاں سے تجھ پر مار ہے، اور تجھ پر

عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى

پھٹکار ہے اُس دن تک کہ انصاف ہو، بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اُس دن تک کہ

يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ

مُردے زندہ ہوں، فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی، اسی مقرر وقت کے دن

الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

تک، بولا اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو، مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں،

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی، جو میرے بندے ہیں تیرا اُن پر کچھ

سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ
زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا بہکے ہوؤں میں ، اور دوزخ پر وعدہ ہے ان
اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ
سب کا ، اس کے سات دروازے ہیں ، ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے
جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾
ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصل اول آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا (یعنی اول گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بو آنے لگی، پھر وہ خشک ہوگیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹکی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابو الجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے (مطلب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزاء دخانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزاء کثیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ) اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضائے جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنا لیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر و ذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے کیونکہ میں نورانی مادہ آتش

سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کروں، ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل، کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہیگی (جیسا دوسری آیت میں ہے عَلَيْكَ لَعْنَتِي، یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے بعید رہے گا، توبہ کی توفیق نہ ہوگی اور مقبول و مرحوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ قیامت تک جو محل رحمت نہ ہو تو پھر قیامت میں تو مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں، پس جس وقت تک احتمال تھا اس کی نفی کر دی، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ مقصود قیامت تک عمر دینا نہیں کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیات دنیویہ میں تو ملعون ہے گو وہ قیامت تک ممتد کیوں نہ ہو) کہنے لگا (کہ اگر مجھ کو آدمؑ کی وجہ سے مردود کیا ہے) تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے، تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدمؑ اور اولاد آدم کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے اُن بندوں کے جو اُن میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ (منتخب ہو جانا جس کا طریقہ اعمال صالحہ و اطاعت کاملہ ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر ہمارا مقرب ہو جاتا ہے) واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے سے)

معارف و مسائل

بدنِ انسانی میں نفخ رُوح اور اس کو مسجودِ ملائکہ بنانے کی مختصر تحقیق

روح کوئی جسم ہے یا جوہر مجرد، اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبدالرؤف مناوی نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہونچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جا سکتا، امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جوہر مجرد ہے، امام رازی نے اس کے بارہ دلائل پیش کئے ہیں۔

مگر جمہور علماء امت رُوح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی پھونک مارنے

کے ہیں، اگر بقول جمہور رُوح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جوہر مجرد مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)

روح اور نفس کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ کی تحقیق

یہاں اس طویل، لذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفار کیا جاتا ہے جو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ رُوح کی دو قسم ہیں، علوی اور سفلی، روح علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہل کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے، اور رُوح علوی بنظر کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، سِر، خفی، اخفیٰ، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔

اور رُوحِ سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدنِ انسانی کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس رُوحِ سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے، ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے، اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے، اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح ارواح علویہ اگرچہ اپنے تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع اور بہت مسافتِ بعیدہ پر ہیں مگر ان کا عکس اس رُوحِ سفلی کے آئینہ میں آکر ارواحِ علویہ کی کیفیات و آثار اس میں منتقل کر دیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے ارواحِ جزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ رُوحِ سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدنِ انسانی میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، رُوحِ سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے ارواحِ علویہ سے حاصل کیا ہے، یہ روحِ سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو شرائین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدنِ انسانی کے ہر حصہ میں پہونچ جاتی ہے۔

رُوحِ سفلی کے بدنِ انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخِ رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کو اپنی طرف منسوب کر کے مِنْ رُّوْحِیْ اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روحِ انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے، کیونکہ وہ بغیر مادّہ کے محض امرِ الٰہی سے پیدا ہوئی ہے، نیز اس میں تجلّیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی رُوح میں نہیں ہے۔

اور انسان کی پیدائش میں اگرچہ عنصرِ غالب مٹی کا ہے، اور اسی لئے قرآن عزیز میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ دس چیزوں کا جامع ہے جن میں پانچ عالمِ خلق کی ہیں اور پانچ عالمِ امر کی، عالمِ خلق کے چار عنصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، اور پانچواں ان چاروں سے پیدا ہونے والا ابخار لطیف جس کو رُوحِ سفلی یا نفس کہا جاتا ہے، اور عالمِ امر کی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی قلب، روح، سر، خفی، اخفی۔

اسی جامعیت کے سبب انسان خلافتِ الٰہیہ کا مستحق بنا، اور نورِ معرفت اور نارِ عشق و محبت کا متحمل ہوا، جس کا نتیجہ بے کیف معیتِ الٰہیہ کا حصول ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ "یعنی ہر انسان اس فرد کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے"۔

اور انسان میں تجلّیاتِ الٰہیہ کی قابلیت اور معیتِ الٰہیہ کا جو درجہ اس کو حاصل ہے، اسی کی وجہ سے حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا جائے، ارشاد ہوا فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

حکم سجدہ فرشتوں کو ہوا تھا ابلیس اس میں تبعاً شامل قرار دیا گیا

سورۂ اعراف میں ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ ابلیس کو بھی دیا گیا تھا، اسی لئے اس سورت کی جو آیات ابھی آپ نے پڑھی ہیں جن سے بظاہر اس حکم کا فرشتوں کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اصالۃً یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کے اندر موجود تھا، اس لئے تبعاً وہ بھی اس حکم میں شامل تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لئے جب اللہ تعالیٰ کی بزرگترین مخلوق فرشتوں کو حکم دیا گیا تو دوسری مخلوق کا تبعاً اس حکم میں داخل ہونا بالکل ظاہر تھا، اسی لئے ابلیس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کا حکم دیا ہی نہیں گیا تو عدمِ تعمیل کا جرم مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اور شاید قرآن کریم کے الفاظ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ اَبٰى اَنْ يَّسْجُدَ کے بجائے اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ذکر فرمایا جس سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل ساجدین تو فرشتے ہی تھے، مگر عقلاً لازم تھا کہ

ابلیس بھی جب ان میں موجود تھا تو وہ بھی ملائکہ ساجدین کے ساتھ شامل ہو جاتا، اس کے عدم شمول پر عتاب فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کے معنی اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا، مگر اسی واقعہ آدم میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدم و حوا پر اس کا فریب چل گیا، اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا (آل عمران) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب و عقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا، کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے۔

اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں، کیونکہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ کی، اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہؓ نے بھی توبہ کر لی تھی، اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلاء ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

جہنم کے سات دروازے لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، امام احمدؒ ابن جریر طبریؒ اور بیہقی نے بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ لکھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے اوپر نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے، ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا (قرطبی)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

پرہیزگار ہیں باغوں میں اور چشموں میں کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے جمع خاطر سے

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ

اور نکال ڈالی ہم نے جو اُن کے جیوں میں تھی خفگی، بھائی ہوگئے تختوں پر بیٹھے

مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴿۴۸﴾

آمنے سامنے، نہ پہنچے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ
خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں اصل بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب
الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾
وہی عذاب دردناک ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہل ایمان) باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے، (خواہ اول ہی سے اگر معصیت نہ ہو یا معاف ہوگئی ہو اور خواہ سزائے معصیت بھگتنے کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ) تم ان (باغات و چشموں) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو (یعنی اس وقت بھی ہر ناپسند چیز سے سلامتی ہے، اور آئندہ بھی کسی شر کا اندیشہ نہیں) اور (دنیا میں طبعی تقاضے سے) ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب (ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے کے قبل ہی) دور کردیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے، تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے مطلع ہو کر ایمان اور تقویٰ کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب پہلے ان کے سامنے پانی کے دو چشمے پیش کئے جائیں گے پہلے چشمہ سے وہ پانی پئیں گے تو ان سب کے دلوں سے باہمی رنجش جو کبھی دنیا میں پیش آئی تھی اور طبعی طور پر اس کا اثر آخر تک موجود رہا وہ سب دُھل جائے گی، اور سب کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائیگی، کیونکہ باہمی رنجش بھی ایک تکلیف و عذاب ہے، اور جنت ہر تکلیف سے پاک ہے۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کینہ کسی مسلمان سے ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا، اس سے مراد وہ کینہ اور بغض ہے جو دنیوی غرض سے اور اپنے قصد و اختیار سے ہو اور اس کی وجہ سے یہ شخص اس کے درپے رہے کہ جب موقع پائے

اپنے دشمن کو تکلیف اور نقصان پہونچائے، طبعی انقباض جو خاصہ بشری اور غیر اختیاری ہے وہ اس میں داخل نہیں، اسی طرح جو کسی شرعی بنیاد پر مبنی ہو، ایسے ہی بغض و انقباض کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اہلِ جنت کے دلوں سے ہر طرح کا انقباض اور رنجش دور کردی جائے گی۔

اسی کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے دلوں کا غبار جنت میں داخلہ کے وقت دور کردیا جائے گا"۔ اشارہ اُن اختلافات و مشاجرات کی طرف ہے جو ان حضرات اور حضرت علیؓ کے درمیان پیش آئے تھے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ اس آیت سے جنت کی دو خصوصیات معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہوگا، بخلاف دنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے، خالص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی، نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے اس شخص کو نکالا جائے گا، سورۂ صٓ میں ارشاد ہے إِنَّ هَٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ، یعنی یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اس آیت میں فرمایا وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ، یعنی ان کو کبھی ان نعمتوں راحتوں سے نکالا نہیں جائے گا، بخلاف معاملاتِ دنیا کے کہ یہاں اگر کوئی کسی کو بڑے سے بڑا انعام و راحت دے بھی دے تو یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ جس نے یہ انعامات دیئے ہیں وہ کسی وقت ناراض ہوکر یہاں سے نکال دے گا۔

ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اُکتا جائے اور باہر جانا چاہے، قرآنِ عزیز نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کردیا ہے کہ لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا، یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا

اور حال سنادے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا، جب چلے آئے اس کے گھر میں اور بولے

سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا

سلام وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، بولے ڈر مت ہم تجھ کو

وقف لازم

نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ

خوش خبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی ، بولا کیا خوش خبری سناتے ہو مجھ کو جب پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا

فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾

اب کاہے پر خوش خبری سناتے ہو ، بولے ہم نے تجھ کو خوش خبری سنائی سچی سو مت ہو نا امید دلوں میں ،

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ

بولا اور کون آس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں ، بولا پھر

فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ

کیا مہم ہے تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوؤ ، بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم

مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ

گنہگار پر ، مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچالیں گے سب کو ، مگر ایک اس کی عورت

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِ ۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾

ہم نے ٹھہرالیا ، وہ رہ جانے والوں میں ، پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا

بولا تم لوگ ہو اوپرے ، بولے نہیں پر ہم لیکر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں

فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

وہ جھگڑتے تھے ، اور ہم لائے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں ،

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ

سو لے نکل اپنے گھر والوں کو کچھ رات رہے سے ، اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ

تم میں سے کوئی ، اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے ، اور مقرر کر دی ہم نے اس کو

ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ

یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے ، اور

جَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ

آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے ، لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں

فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ

سو مجھ کو رسوا مت کرو، اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ، بولے کیا ہم نے تجھ کو منع

نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

نہیں کیا جہان کی حمایت سے، بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے،

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ

قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں، پھر آ پکڑا ان کو چنگھاڑ

الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا

نے سورج نکلتے وقت، پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے

عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ان پر پتھر کھنگر کے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنیوالوں کو

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور وہ بستی واقع ہے سیدھی راہ پر البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (لوگوں) کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجئے (وہ قصہ اسوقت واقع ہوا تھا) جب کہ وہ (مہمان جو کہ واقع میں فرشتے تھے، اور بشکل انسانی ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان سمجھا) ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے پھر (آ کر) انھوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے لئے کھانا تیار کر کے لائے، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے، انھوں نے کھایا نہیں تب) ابراہیم (علیہ السلام دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے کیونکہ وہ فرشتے بشکل بشر تھے ان کو بشر ہی سمجھا اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں مخالف نہ ہوں اور) کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے ہیں منجانب اللہ ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور) آپ کو ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ

علم انبیاء کو ہوتا ہے، مراد اس فرزند سے اسحٰق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے، ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بڑھاپا آگیا سو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (مطلب یہ کہ یہ امر فی نفسہ عجیب ہے، نہ یہ کہ قدرت سے بعید ہے) وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی تولد فرزند یقیناً ہونے والا ہے) سو آپ نا امید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے اسباب عادیہ پر نظر کرنے سے وساوس ناامیدی کے غالب ہوتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت سے کب موصوف ہو سکتا ہوں، محض مقصود اس امر کا عجیب ہونا ہے باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہے، بعد اس کے فراست نبوت سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے علاوہ بشارت کے اور بھی کوئی مہم عظیم مقصود ہے اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرائن سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے، تو یہ بتلاؤ کہ) اب تم کو کیا مہم درپیش ہے اے فرشتو. فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچا لیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلا دیں گے کہ ان مجرموں سے علیحدہ ہو جائیں) بجز ان کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بی بی کے کہ اس کی نسبت ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی)۔

پھر جب وہ فرشتے خاندان لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ بشکل بشر تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو، (دیکھئے شہر والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں) انہوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں، سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر (یہاں سے) چلے جائیے، اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لوٹ نہ جائے، اور آپ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت کر دی گئی ہے) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) اور جس جگہ (جانے کا) تم کو حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (تفسیر درمنثور میں بحوالہ سدی نقل کیا ہے

کہ وہ جگہ ملک شام ہے، جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرت کو حکم دیا گیا تھا) اور ہم نے (ان فرشتوں کے واسطے سے) لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجی کہ صبح ہوتے ہی بالکل اُن کی جڑ کٹ جائیگی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہو جائیں گے، فرشتوں کی یہ گفتگو وقوع کے اعتبار سے اس قصہ کے بعد ہوئی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے، لیکن اس کو ذکر کرنے میں اس لئے مقدم کر دیا کہ قصہ بیان کرنے سے جو بات مقصود ہے، یعنی نافرمانوں پر عذاب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی وہ پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہو جائے، اگلا قصہ یہ ہے) اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں حسین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسد نیت اور بُرے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر پہونچے) لوط (علیہ السلام) نے (جو اب تک ان کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے ان کے فاسد ارادوں کا احساس کر کے) فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کر کے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان پردیسیوں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہے) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں) وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں آپنے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ ان کو مہمان بنایا) کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں (کو اپنا مہمان بنانے) سے (بارہا) منع نہیں کر چکے (نہ آپ ان کو مہمان بناتے نہ اس رسوائی کی نوبت آتی) لوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو بتلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، قضاء شہوت کے طبعی تقاضے کے لئے) یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں، اگر تم میرا کہنا کرو (تو شریفانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سننے تھے) آپ کی جان کی قسم اپنی مستی میں مدہوش تھے، بس سورج نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدبایا (یہ ترجمہ مُشرقین کا ہے، اس سے پہلے مُصبحین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی صبح ہوتے ہوتے کے ہیں، ان دونوں کا اجتماع اس اعتبار سے ممکن ہے کہ صبح سے ابتدا ہوئی اور اشراق تک خاتمہ ہوا) پھر (اس سخت آواز کے بعد) ہم نے ان بستیوں (کی زمین کو اُلٹ کر اُن) کا اوپر کا تختہ تو نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہل بصیرت کے لئے (مثلاً ایک تو یہ کہ بُرے فعل کا نتیجہ آخر کار بُرا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور ڈھیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت و عزت

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرکے فریب میں مبتلا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ وغیر ذلک

معارف و مسائل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اعزاز و اکرام قولہٖ لَعَمْرُكَ روح المعانی میں جمہور مفسرین کا قول یہ نقل کیا ہے کہ لَعَمْرُكَ کے مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات کی قسم کھائی ہے، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور ابو نعیم و ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات و کائنات میں کسی کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت و مرتبہ عطا نہیں فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر یا کسی فرشتے کی حیات پر کبھی قسم نہیں کھائی، اور اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر و حیات کی قسم کھائی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھائے، کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے، اور ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو (رواہ ابو داؤد والنسائی عن ابی ہریرۃ)

اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا کہ "خبردار رہو اللہ تعالیٰ باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کرے ورنہ خاموش رہے (قرطبی، مائدہ)

لیکن یہ حکم عام مخلوقات کے لئے ہے، اللہ جل شانہٗ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں، یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے اس چیز کا اشرف اور عظیم النفع ہونا بیان کرنا ہے، اور عام مخلوق کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ آپ کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں، کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے

مخصوص ہے۔

جن بستیوں پر عذاب نازل ہو ان سے عبرت حاصل کرنا چاہئے	إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ۝ اس میں حق تعالیٰ نے ان بستیوں کا محل وقوع بیان فرمایا جو عرب سے شام

تک جانے والے راستہ پر ہیں، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ان میں اہل بصیرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ان کے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے لَمْ تُسْكَن مِّنۢ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا، یعنی یہ بستیاں عذابِ الٰہی کے ذریعہ ویران ہونے کے بعد پھر دوبارہ آباد نہیں ہوئیں بجز چند بستیوں کے،" اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان بستیوں اور ان کے مکانات کو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بنایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان مقامات سے گذرے ہیں تو آپ پر ہیبتِ حق کا ایک خاص حال ہوتا تھا جس سے سر مبارک جھک جاتا تھا، اور آپ اپنی سواری کو ان مقامات میں تیز کر کے جلد عبور کرنے کی سعی فرماتے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے یہ سنت قائم کر دی کہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے اُن کو تماشاگاہ بنانا بڑی قساوت ہے بلکہ ان سے عبرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور اس کے عذاب کا خوف طاری ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تختہ اُلٹ گیا ہے، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق عرب سے شام کو جانے والے رستہ پر اردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطحِ سمندر سے کافی گہرائی میں ایک عظیم صحرا کی صورت میں موجود ہے، اس کے ایک بہت بڑے رقبہ پر ایک خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، اس پانی میں کوئی مچھلی، مینڈک وغیرہ جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحرِ میّت اور بحرِ لوط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اس میں پانی کے اجزاء بہت کم اور تیل کی قسم کے اجزاء زیادہ ہیں، اس لئے اس میں کوئی دریائی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آجکل آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنا دیئے ہیں، اور آخرت سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آجکل اس کو ایک سیرگاہ بنایا ہوا ہے، لوگ تماشے کے طور پر اسے دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم نے اسی غفلت شعاری پر تنبیہ کیلئے آخر میں فرمایا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ، یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشم بصیرت رکھنے والے کیلئے عبرت آموز ہیں لیکن اس عبرت سے فائدہ اٹھانیوالے مومنین ہی ہوتے ہیں، دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ کر رو انہ ہو جاتے ہیں

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَإِنَّهُمَا

اور تحقیق تھے بَن کے رہنے والے گنہگار، سو ہم نے بدلہ لیا اُن سے اور یہ دونوں

لَبِإِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾

بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر، اور بیشک جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو،

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ

اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں سو رہے ان سے منہ پھیرتے، اور تھے کہ تراشتے تھے

الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾

پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ، پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے صبح ہونے کے وقت

فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ

پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا، اور ہم نے بنائے نہیں آسمان

وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ

اور زمین اور جو اُن کے بیچ میں ہے بغیر حکمت، اور قیامت بیشک

لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

آنے والی ہے سو کنارہ کر اچھی طرح کنارہ، تیرا رب جو ہے وہی ہے

الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

پیدا کرنے والا خبردار۔

خلاصہ تفسیر

قصۂ اصحابِ ایکہ اور اصحابِ حجر

اور بن والے (یعنی شعیب علیہ السلام کی امت بھی) بڑے ظالم تھے سو ہم نے ان سے (بھی) بدلہ لیا (اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا) اور دونوں (قوم کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں (اور شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں) اور حجر (کے رہنے) والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھوٹا بتلایا (کیونکہ جب صالح علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا) اور ہم نے انکو اپنی (طرف سے) نشانیاں دیں (جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید اور

حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوتی تھی مثلاً دلیل توحید یا ناقہ معجزہ صالح علیہ السلام کا تھا) سو وہ لوگ ان (نشانیوں) سے روگردانی ہی کرتے رہے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ (ان میں سب آفات سے) امن میں رہیں سو ان کو صبح کے وقت (خواہ دن ہی صبح میں یا دن چڑھے۔ علی الاحتمالین) آواز سخت نے آپکڑا سو ان کے (دنیوی) ہنران کے کچھ بھی کام نہ آئے (ان ہی مستحکم گھروں میں عذاب سے کام تمام ہوگیا، اس آفت سے اُن کے گھروں نے نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو، احتمال بھی نہ تھا، اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتے)۔

معارف ومسائل

ایکہ، بن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مدین کے پاس ایک بن تھا، اس لئے ایکہ اصحابِ مدین ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحاب ایکہ اور اصحابِ مدین دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں، ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ "اِنَّ مَدْيَنَ وَ اَصْحَابَ الْاَيْكَةِ اُمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهِمَا شُعَيْبًا" واللہ اعلم

اور حجر ایک وادی ہے جو حجاز و شام کے درمیان واقع ہے، اس میں قوم ثمود آباد تھی۔

شروع سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ کو جو شدید عناد و مخالفت تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جا رہا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

بقیہ خلاصۂ تفسیر اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کے عناد و مخالفت سے غم نہ کیجئے کیونکہ اس کا ایک روز فیصلہ ہونے والا ہے، اور وہ روز قیامت ہے جس کی آمد کے متعلق ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صانع عالم کے وجود اور وحدت و عظمت پر استدلال کر کے اس کے احکام کی اطاعت کریں، اور بعد اقامت اس حجت کے جو ایسا نہ کرے وہ معذب ہو) اور (دنیا میں پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے اس کے لئے قیامت مقرر ہے پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو بھگتا یا جائے گا) سو آپ (کچھ غم نہ کیجئے بلکہ) خوبی کے ساتھ (ان کی شرارتوں سے) درگذر کیجئے (درگذر کا مطلب یہ کہ اس غم میں نہ پڑئیے، اس کا خیال نہ کیجئے، اور خوبی یہ کہ شکوہ و شکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ،

بلاشبہ آپ کا رب (چونکہ) بڑا خالق (ہے اس سے ثابت ہوا کہ) بڑا عالم (بھی) ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے آپ کے صبر کا بھی، ان کی شرارت کا بھی، اس لئے ان سے پورا پورا بدلہ لے گا)۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا، مت ڈال اپنی

عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ ج

اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے، اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانیوالا کھول کر

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾

جیسا ہم نے بھیجا ہے ان بانٹنے والوں پر، جنھوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے، جو کچھ وہ کرتے تھے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ

سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پروا نہ کر مشرکوں کی، ہم بس ہیں تیری طرف سے

الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ج

ٹھٹھے کرنے والوں کو، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی،

فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ

سو عنقریب معلوم کرلیں گے، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رکتا ہے ان کی

بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنیوالوں سے

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور بندگی کئے جا اپنے رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

الربع ۔ ع ۲

خُلاصۂ تفسیر

اور (آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ موجب غم ہوتا ہے، ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے، کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر لطف و عنایت ہے چنانچہ) ہم نے آپ کو (ایک بڑی بھاری نعمت یعنی) سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع مضامین عظیمہ ہونے کے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جاوے کہ) قرآن عظیم دیا (مراد اس سے سورۂ فاتحہ ہے جس کی عظمت کی وجہ سے اس کا نام اُمّ القرآن بھی ہے، پس اس نعمت او منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ آپ کا قلب مسرور و مطمئن ہو، ان لوگوں کے عناد و خلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور) آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے (نہ بلحاظ افسوس نہ بلحاظ ناراضگی) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ مجوس اور مشرکین کو) برتنے کے لئے دے رکھی ہے (اور بہت جلد ان سے جدا ہو جاوے گی) اور ان (کی حالت کفر) پر (کچھ) غم نہ کیجئے (بلحاظ ناراضگی نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ وہ دشمن خدا ہیں اس لئے بوجہ بغض فی اللہ غصہ آئے کہ ایسی نعمتیں ان کے پاس نہ ہوتیں، اس کے جواب کی طرف مَتَّعْنَا میں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں کہ ان مبغوضین کے پاس نہ ہوتیں، یہ تو متاع فانی ہے، بہت جلد جاتا رہے گا، اور بلحاظ افسوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آئیں، اس کا جواب لَا تَحْزَنْ میں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کی طینت میں حد درجہ عناد ہے، ان سے کسی طرح توقع نہیں، اور حزن ہوتا ہے خلاف توقع پر جب توقع نہیں تو پھر حزن بے وجہ ہے، اور بلحاظ حرص نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر و غم میں نہ پڑیئے) اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے) اور (کافروں کے لئے چونکہ فکر مصلحت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے، اور اتنا) کہہ دیجئے کہ میں کھلم کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں (اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (مختلف اوقات گذشتہ میں) نازل کیا ہے جنھوں نے (احکام الٰہی کے) حصے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتب کے مختلف اجزاء قرار دے رکھے تھے (ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا جو مرضی کے خلاف ہوا اس

نکار کر دیا، مراد ان سے سابق یہود و نصاریٰ ہیں جن پر مخالفتِ انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے عذابوں کا ہونا مثل مسخ بصورت بندر و خنزیر، قید، قتل اور ذلت مشہور و معروف تھا، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا امر بعید نہیں، پہلے ہو چکا ہے اگر تم پر بھی ہو جاوے تو تعجب کی کونسی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں، اور جب تقریر مذکور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح پچھلے لوگ مخالفتِ انبیاء کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں) سو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب (اگلوں اور پچھلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے) غرض (حاصل کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے) کا حکم کیا گیا ہے اس کو (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور (اگر یہ نہ مانیں تو) ان مشرکوں (کے نہ ماننے) کی (مطلق) پروانہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے جیسا اوپر آیا ہے لَا تَحْزَنْ، اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے کہ یہ مخالف بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں چنانچہ آپ پر تو) ہنستے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان (کے شر و ایذاء) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (کہ استہزاء اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کا ہے کا خوف ہے) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر و استہزاء کی) باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آ جاوے (یعنی مرتے دم تک ذکر و عبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ یہ خاصیت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج و غم اور تکلیف و مصیبت ہلکی ہو جاتی ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا متن اور خلاصہ ہے ان آیات میں سورۂ فاتحہ کو قرآن عظیم کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک حیثیت سے پورا قرآن ہے، کیونکہ اصولِ اسلام سب اس میں سموئے ہوئے ہیں۔

محشر میں سوال کس چیز کا ہوگا آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا ہے

کہ ان سب اگلوں پچھلوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی۔

صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملے کے متعلق ہوگا، تو آپ نے فرمایا قول لا الٰہ الا اللہ کے متعلق، تفسیر قرطبی میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد اس عہد کو عملی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کیونکہ زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و ہیئت بنانے سے اور دین محض تمنائیں کرنے سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا ہو اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا، لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان کو اللہ کے محارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے (قرطبی)

تبلیغ وارشاد میں تدریج بقدر استطاعت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ، اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ بھی خفیہ ہی ایک ایک دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار و اعلان میں کفار کی ایذاء رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے استہزاء کرنے والے اور ایذاء دینے والے کفار کی ایذاء سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان و اظہار کے ذریعہ تلاوت و عبادت اور تبلیغ و دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ، میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، عاص بن وائل، اسود بن المطلب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، حارث بن الطلاطلہ یہ پانچوں معجزانہ طور پر یک ہی وقت میں حضرت جبرئیلؑ کے اشارے سے ہلاک کر دیئے گئے، اس واقعہ سے تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں یہ حاصل ہوا کہ اگر انسان کسی ایسے مقام پر، ایسے حال میں مبتلا ہو جائے کہ وہاں حق بات کو علی الاعلان کہنے سے ان لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہونچنے کی توقع نہ ہو، اور اپنے آپ کو نقصان و تکلیف پہونچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ کام خفیہ طور پر کرنا بھی درست اور جائز ہے، البتہ جب اظہار و اعلان کی قدرت ہو جائے تو پھر اعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

دشمنوں کی ایذاء سے تنگدلی کا علاج

وَلَقَدْ نَعْلَمُ الی فَسَبِّحْ سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دشمنوں کی باتوں سے رنج پہونچے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دور فرما دیں گے۔

سُورۂ حجر تمام شد

سُوْرَةُ النَّحْلِ

سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ نحل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱)

آپہنچا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ

اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں

اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۲)

کہ خبردار کر دو کہ کسی کی بندگی نہیں سوا میرے، سو مجھ سے ڈرو

خلاصۂ تفسیر

اس سورۃ کا نام سورۂ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب وغریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے، اس کا دوسرا نام سورۂ نعم بھی ہے (قرطبی) نعم بکسر نون نعمت کی جمع ہے، اس لئے کہ اس سورۃ میں خاص طور پر اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی سزائے کفر کا وقت قریب) آپہنچا سو تم اس میں (منکرانہ) جلدی مت مچاؤ (بلکہ توحید اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے وہ اللہ تعالیٰ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہیں (یعنی انبیاء پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ (ہے) کہ لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت

نہیں سو مجھ سے ہی ڈرتے رہو (یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ورنہ سزا ہوگی)۔

معارف و مسائل

اس سورۃ کو بغیر کسی خاص تمہید کے ایک شدید وعید اور ہیبت ناک عنوان سے شروع کیا، جس کی وجہ مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیامت سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غالب کرنے اور مخالفوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں تو یہ کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آتا، اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ **"آپہونچا حکم اللہ کا تم جلد بازی نہ کرو"**

حکم اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے کیا ہے، کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جاوے گا، اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہوگی، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہیبت ناک لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حکم اللہ کا آپہنچا، یعنی پہونچنے ہی والا ہے **جس کو تم عنقریب دیکھ لوگے۔**

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں حکم اللہ سے مراد قیامت ہے، اس کے آپہونچنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کا وقوع قریب ہے، اور پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے دیکھا جاوے تو قیامت کا قریب ہونا یا آپہونچنا بھی کچھ بعید نہیں رہتا (بحر محیط)

اس کے بعد کے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو حق تعالیٰ کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں یہ کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ **اس سے پاک ہیں (بحر)**

اس آیت کا خلاصہ ایک وعید شدید کے ذریعہ توحید کی دعوت دینا ہے، دوسری آیت میں دلیل نقلی سے توحید کا اثبات ہے، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کے مختلف خطوں، مختلف زمانوں میں جو بھی رسول آیا ہے، اس نے یہی عقیدۂ توحید پیش کیا ہے، حالانکہ ایک کو دوسرے کے حال اور تعلیم کی بظاہر اسباب کوئی اطلاع بھی نہ تھی، غور کرو کہ کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار حضرات عقلاء، جو مختلف اوقات میں مختلف ملکوں مختلف خطوں میں پیدا ہوں اور وہ سب ایک ہی بات کے قائل ہوں تو فطرۃً انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہو سکتی، ایمان لانے کے لئے تنہا یہ دلیل بھی کافی ہے۔

لفظ روح سے مراد اس آیت میں بقول ابن عباسؓ وحی اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہے (بحر)، اس آیت میں توحید کا روایتی اور نقلی ثبوت پیش کرنے کے بعد اگلی آیتوں میں اسی عقیدۂ توحید کو عقلی طور سے حق تعالیٰ کی نعمتیں پیش نظر

کر کے ثابت کیا جاتا ہے، ارشاد ہے:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳ خَلَقَ

بنائے آسمان اور زمین ٹھیک ٹھیک وہ برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے بنایا

الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴ وَالْاَنْعَامَ

آدمی کو ایک بوند سے پھر جب ہی ہو گیا جھگڑا کرنیو لا بولنے والا، اور چوپائے

خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵ وَلَكُمْ

بنا دیئے تمھارے واسطے ان میں جڑاول ہے اور کتنے فائدے اور بعضوں کو کھاتے ہو، اور تم کو

فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶ وَتَحْمِلُ

ان سے عزت ہے جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لیجاتے ہو، اور اٹھا لے چلتے ہیں

اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ

بوجھ تمھارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر جان مار کر،

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ

بیشک تمھارا رب بڑا شفقت کرنیوالا مہربان ہے، اور گھوڑے پیدا کئے اور خچریں اور گدھے

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے اور پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے

لغات کی تشریح خصیم، خصومت سے مشتق ہے، بمعنی جھگڑالو، اَنعام، نَعَم (بفتح نون) کی جمع ہے، چوپایوں میں سے اونٹ، بکری، گائے کو کہا جاتا ہے (مفردات راغب)

دِفْءٌ، گرمی اور گرمائی حاصل کرنے کی چیز، مراد اُون ہے جس کے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں، تُرِیْحُوْنَ، رواح سے اور تَسْرَحُوْنَ، سراح سے مشتق ہے، چوپائے جانوروں کے صبح کے وقت چراگاہ کی طرف جانے کو سراح اور شام کو گھر میں واپس آنے کو رواح کہا جاتا ہے، بِشِقِّ الْاَنْفُسِ، جان کی محنت و مشقت۔

خلاصۂ تفسیر

(اللہ تعالیٰ نے) آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور) انسان کو نطفہ سے بنایا پھر وہ اچانک کھلم کھلا (خدا ہی کی ذات و صفات میں) جھگڑنے لگا (یعنی بعض ایسے بھی ہوئے، مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ نعمتیں اور انسان کی طرف سے ناشکری) اور اسی نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے (جانوروں کے بال اور کھال سے انسان کے پوستین اور کپڑے بنتے ہیں) اور بھی بہت سے فائدے ہیں (دودھ، سواری، باربرداری وغیرہ) اور ان میں (جو کھانے کے قابل ہیں ان کو) کھاتے بھی ہو اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جب کہ شام کے وقت (جنگل سے گھر) لاتے ہو اور جب کہ صبح کے وقت (گھر سے جنگل کو) چھوڑ دیتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ بھی (لاد کر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون جان کو محنت میں ڈالے ہوئے نہیں پہونچ سکتے، واقعی تمہارا رب بڑی شفقت و رحمت والا ہے (کہ تمہارے آرام کے لئے کیا کیا سامان پیدا کئے) اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کئے تاکہ ان پر سوار ہو اور نیز زینت کے لئے بھی، اور وہ ایسی ایسی چیزیں (تمہاری سواری وغیرہ کے لئے) بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں ۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تخلیق کائنات کی عظیم نشانیوں سے حق تعالیٰ کی توحید کا اثبات ہے، اول تو سب سے پہلی مخلوق آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا، اس کے بعد تخلیق انسان کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدوم کائنات بنایا ہے، انسان کی ابتدا ایک حقیر نطفہ سے ہونا بیان کر کے فرمایا فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ، یعنی جب اس ضعیف الخلقت انسان کو طاقت اور قوتِ گویائی عطا ہوئی تو خدا ہی کی ذات وصفات میں جھگڑے نکالنے لگا۔

انسان کے بعد اُن اشیاء کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو انسان کے فائدے کے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی ہیں، اور قرآن کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے، اور عرب کی معیشت کا بڑا مدار پالتو چوپاؤں اونٹ، گائے، بکری پر تھا، اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا پھر اَنعام سے جو فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے دو فائدے خاص طور سے بیان کر دیئے، ایک لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ، یعنی اُن جانوروں کے اُون سے انسان اپنے کپڑے اور کھال سے پوستین اور ٹوپیاں وغیرہ تیار کر کے جاڑے کے موسم میں گرمائی حاصل کرتا ہے۔

دوسرا فائدہ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ، یعنی انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے اپنی خوراک بھی

بنا سکتا ہے، اور جب تک زندہ ہے ان کے دودھ سے اپنی بہترین غذا پیدا کرتا ہے، دودھ کی مکھن، گھی اور ان سے بننے والی تمام اشیاء اس میں داخل ہیں۔

اور باقی عام فوائد کے لئے فرمایا وَمَنَافِعُ، یعنی بے شمار منافع اور فوائد انسان کے جانوروں کے گوشت، چمڑے، ہڈی، اور بالوں سے وابستہ ہیں، اس ابہام و اجمال میں ان سب نئی سے نئی ایجادات کی طرف بھی اشارہ ہے جو حیوانی اجزاء سے انسان کی غذا، لباس، دوا، استعمالی اشیاء کے لئے اب تک ایجاد ہو چکی ہیں، یا آئندہ قیامت تک ہوں گی۔

اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ایک اور فائدہ عرب کے مذاق کے مطابق یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمھارے لئے جمال اور رونق کا ذریعہ ہیں، خصوصاً جب وہ شام کو چراگاہوں سے تمھارے مویشی خانوں کی طرف آتے ہیں یا صبح کو گھروں سے چراگاہوں کی طرف جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت مویشی سے ان کے مالکان کی خاص شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

آخر میں ان جانوروں کا ایک اور اہم فائدہ یہ بیان کیا کہ یہ جانور تمھارے بوجھل سامان دور دراز شہروں تک پہونچا دیتے ہیں جہاں تمھاری اور تمھارے سامان کی رسائی جان جوکھوں میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھی، اونٹ اور بیل خاص طور سے انسان کی یہ خدمت بڑے پیمانے پر انجام دیتے ہیں، آج ریل گاڑیوں، ٹرکوں، ہوائی جہازوں کے زمانے میں بھی انسان ان جانوروں سے مستغنی نہیں، کتنے مقامات دنیا میں ایسے ہیں جہاں یہ تمام نوایجاد سواریاں باربرداری کا کام نہیں دے سکتیں وہاں پھر انہی کی خدمات حاصل کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔

اَنْعَام یعنی اونٹ اور بیل وغیرہ کی باربرداری کا ذکر آیا تو اس کے بعد اُن چوپایہ جانوروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوا جن کی تخلیق ہی سواری اور باربرداری کے لئے ہے، ان کے دودھ یا گوشت سے انسان کا فائدہ متعلق نہیں، کیونکہ از روئے شرع وہ اخلاقی بیماریوں کا سبب ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں، فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً "یعنی ہم نے گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کئے، تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو، اس میں باربرداری بھی ضمناً آگئی، اور ان کو اس لئے بھی پیدا کیا کہ یہ تمھارے لئے زینت بنیں "، زینت سے وہی شان و شوکت مراد ہے جو عادتاً ان جانوروں کے مالکان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں ریل موٹر ہوائی جہاز کا ذکر آخر میں سواری کے تین جانور گھوڑے، خچر، گدھے کا خاص طور سے بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی سواریوں کے متعلق بصیغۂ استقبال فرمایا:۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ "یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے"۔

اس میں وہ تمام نو ایجاد سواری گاڑیاں بھی داخل ہیں جن کا زمانہ قدیم میں نہ وجود تھا نہ کوئی تصور، مثلاً ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں داخل ہیں جو آئندہ زمانے میں ایجاد ہوں گی، کیونکہ تخلیق ان سب چیزوں کی درحقیقت خالق مطلق ہی کا فعل ہے، سائنس قدیمہ وجدیدہ کا اس میں صرف اتنا ہی کام ہے کہ قدرت کی پیدا کی ہوئی دھاتوں میں قدرت ہی کی دی ہوئی عقل و فہم کے ذریعہ جوڑ توڑ کر کے ان کے مختلف کل پرزے بنا لے اور پھر ان میں قدرت الٰہیہ کی بخشی ہوئی ہوا، پانی، آگ وغیرہ سے برقی رو پیدا کرے، یا قدرت ہی کے دیئے ہوئے خزانوں میں سے پیٹرول نکال کر ان سواریوں میں استعمال کرے، سائنس قدیمہ وجدیدہ مل کر بھی نہ کوئی لوہا، پیتل پیدا کر سکتی ہے، نہ ایلومونیم قسم کی ہلکی دھاتیں بنا سکتی ہے، نہ لکڑی پیدا کر سکتی ہے، نہ ہوا اور پانی پیدا کرنا اس کے بس میں ہے، اس کا کام اس سے زائد نہیں کہ قدرتِ الٰہیہ کی پیدا کی ہوئی قوتوں کا استعمال سیکھ لے، دنیا کی ساری ایجادات صرف اسی استعمال کی تفصیلیں ہیں، اس لئے جب ذرا بھی کوئی غور و فکر سے کام لے تو ان سب نئی ایجادات کو تخلیق خالق مطلق کہنے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل نظر ہے کہ پچھلی تمام اشیاء کی تخلیق میں لفظ ماضی خَلَقَ استعمال فرمایا گیا ہے، اور معروف سواریوں کا ذکر کرنے کے بعد بصیغۂ مستقبل یَخْلُقُ ارشاد ہوا ہے، اس تغییر عنوان سے واضح ہو گیا کہ یہ لفظ ان سواریوں اور دوسری اشیاء کے متعلق ہے جو ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگلے زمانے میں کیا کیا سواریاں اور دوسری اشیاء پیدا کرنا ہیں، ان کا اظہار اس مختصر جملے میں فرما دیا۔

حق جل شانہٗ یہ بھی کر سکتے تھے کہ آئندہ وجود میں آنے والی تمام نئی ایجادات کا نام لیکر ذکر فرما دیتے، مگر اس زمانے میں اگر ریل، موٹر، طیارہ وغیرہ کے الفاظ ذکر بھی کر دیئے جاتے، تو اس سے بجز تشویش ذہن کے کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ ان اشیاء کا اُس وقت تصور کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا، اور نہ یہ الفاظ ان چیزوں کے لئے اس وقت کہیں مستعمل ہوتے تھے کہ اس سے کچھ مفہوم سمجھا جا سکے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے استاذ استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ریل کا ذکر موجود ہے، اور اسی آیت سے استدلال فرمایا، اس وقت تک موٹریں عام نہ ہوئی تھیں اور ہوائی جہاز ایجاد

نہ ہونے تھے اس سے رکوب کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

مسئلہ: قرآن کریم نے اوّل نعم یعنی اونٹ، گائے، بکری کا ذکر فرمایا، اور ان کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ان کا گوشت کھانا بھی قرار دیا پھر اس سے الگ کر کے فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ، ان کے فوائد میں سواری لینے اور ان سے اپنی زینت حاصل کرنے کا تو ذکر کیا، مگر گوشت کھانے کو یہاں ذکر نہیں کیا، اس میں یہ دلالت پائی جاتی ہے کہ گھوڑے، خچر، گدھے کا گوشت حلال نہیں، خچر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے پر تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے، اور ایک مستقل حدیث میں ان کی حرمت کو صراحۃً بھی ذکر کیا ہے، مگر گھوڑے کے معاملہ میں حدیث کی دو روایتیں متعارض آئی ہیں، ایک سے حلال اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے فقہاء امت کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہو گئے، بعض نے حلال قرار دیا بعض نے حرام، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسی تعارضِ دلائل کی وجہ سے گھوڑے کے گوشت کو گدھے اور خچر کی طرح حرام تو نہیں کہا مگر مکروہ قرار دیا (احکام القرآن جصاص)

مسئلہ: اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تفاخر و تکبر حرام ہیں، فرق یہ ہے کہ جمال و زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے وہ حرام ہے (بیان القرآن)

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩﴾

اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے اور اگر وہ چاہے تو سیدھی راہ دے تم سب کو۔

ع ۹ / ۷

خلاصہ تفسیر

اور (دلائل مذکورہ سابقہ ولاحقہ سے جو) سیدھا رستہ (دین کا ثابت ہوتا ہے وہ خاص) اللہ تک پہنچتا ہے اور بعضے رستے (جو کہ دین کے خلاف ہیں) ٹیڑھے بھی ہیں (کہ ان سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں، پس بعض تو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھے پر) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو

(منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں مگر وہ اسی کو پہنچاتے ہیں جو صراطِ مستقیم کا طالب بھی ہو وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، اس لئے تم کو چاہئے کہ دلائل میں غور کرو اور ان سے حق کو طلب کرو کہ تم کو منزلِ مقصود تک رسائی عطا ہو)

معارف ومسائل

ان آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم الشان نعمتوں کا ذکر فرما کر توحید کے عقلی دلائل جمع کئے گئے، آگے بھی انہی نعمتوں کا ذکر ہے، درمیان میں یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے لائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ قدیمہ کی بناء پر اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ لوگوں کے لئے وہ صراطِ مستقیم واضح کر دے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے، اسی لئے نعمائے الٰہیہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کے دلائل جمع کئے جا رہے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف کچھ لوگوں نے دوسرے ٹیڑھے راستے بھی اختیار کر رکھے ہیں، وہ ان تمام واضح آیات اور دلائل سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو سیدھے راستہ پر مجبور کر کے ڈال دیں، تو ان کے اختیار میں تھا، مگر حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جبر نہ کیا جائے، دونوں راستے سامنے کر دیئے جائیں، چلنے والا جس راستہ پر چلنا چاہے چلا جائے، صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ اور جنت تک پہونچائے گا، اور ٹیڑھے راستے جہنم پر پہونچیں گے، انسان کو اختیار دیدیا کہ جس کو چاہے انتخاب کرے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ

وہی ہے جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لئے پانی اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے

فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ

ہیں جن میں چراتے ہو، اُگاتا ہے تمہارے واسطے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں

وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ

اور انگور اور ہر قسم کے میوے، اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کو

يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ

جو غور کرتے ہیں، اور تمہارے کام میں لگا دیئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو

وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو سمجھ رکھتے ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور جو چیزیں پھیلائیں تمہارے واسطے زمین میں رنگ برنگ کی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سوچتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو کہ کھاؤ اس میں سے گوشت تازہ اور نکالو اس میں سے گہنا جو پہنتے ہو، اور دیکھتا ہے تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ احسان مانو اور رکھ دیئے زمین پر بوجھ کہ کبھی جھک پڑے تم کو لے کر اور بنائیں ندیاں اور راستے تاکہ تم راہ پاؤ، اور بنائیں علامتیں اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

وہ اللہ ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس (کے سبب) سے درخت (پیدا ہوتے) ہیں جن میں تم (اپنے مواشی کو) چرنے چھوڑ دیتے ہو (اور) اس (پانی) سے تمہارے فائدے کے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل (زمین سے) اُگاتا ہے بیشک اس (مذکور) میں سوچنے والوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور اس (اللہ) نے تمہارے (فائدہ کے) لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنی) مسخر (قدرت) بنایا اور (اسی طرح اور) ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر (قدرت) ہیں بیشک اس (مذکور) میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لئے (توحید کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں اور (اسی طرح) ان چیزوں کو بھی مسخر (قدرت) بنایا جن کو تمہارے (فائدہ کیلئے)

اس طور پر پیدا کیا ہے کہ ان کے قسام (یعنی اجناس و انواع و اصناف) مختلف ہیں (اس میں تمام حیوانات و نباتات و جمادات، مفردات و مرکبات داخل ہوگئے) بیشک اس (مذکورہ) میں (بھی) سمجھدار لوگوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے دریا کو (بھی) مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس میں سے تازہ تازہ گوشت (یعنی مچھلی نکال نکال کر) کھاؤ اور (تاکہ) اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم (مرد و عورت سب) پہنتے ہو اور (اے مخاطب اس دریا کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ) تو کشتیوں کو (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی جیسے بڑے جہاز توان کو) دیکھتا ہے کہ اس (دریا) میں (اس کا) پانی چیرتی ہوئی چلی جارہی ہیں اور (نیز اس لئے دریا کو مسخر قدرت بنایا) تاکہ تم (اس میں مال تجارت لے کر سفر کرو اور اس کے ذریعہ سے) خدا کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان سب فائدوں کو دیکھ کر اس کا) شکر (ادا) کرو اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تاکہ وہ (زمین) تم کو لے کر ڈگمگانے (اور ہلنے) نہ لگے اور اس نے (چھوٹی چھوٹی) نہریں اور رستے بنائے تاکہ (ان رستوں کے ذریعہ سے اپنے) منزل مقصود تک پہنچ سکو اور (ان رستوں کی پہچان کے لئے) بہت سی نشانیاں بنائیں (جیسے پہاڑ درخت، تعمیرات وغیرہ جن سے رستہ پہچانا جاتا ہے ورنہ اگر تمام زمین کی سطح یکساں حالت پر ہوتی تو رستہ ہرگز نہ پہچانا جاتا) اور ستاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں (چنانچہ ظاہر و معلوم ہے)۔

معارف و مسائل

مِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ، لفظ شجر کثر درخت کے لئے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، گھاس اور بیل بوٹے وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے، اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔

تُسِيمُونَ، اسامت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چرنے کیلئے چھوڑنا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، ان تمام آیات میں نعمائے الٰہیہ اور عجیب و غریب حکمت کے ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر ہے، جس میں غور و فکر کرنے والوں کو ایسے دلائل اور شواہد ملتے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی توحید کا گویا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، اسی لئے ان نعمتوں کا ذکر کرتے کرتے بار بار اس پر متنبہ کیا گیا ہے، اس آیت کے اخیر میں فرمایا کہ اس میں سوچنے والوں کے لئے دلیل ہے، کیونکہ کھیتی اور درخت اور ان کے پھل پھول وغیرہ کا تعلق اللہ جل شانہ کی صنعت و حکمت کے ساتھ کسی قدر غور و فکر چاہتا ہے، کہ آدمی یہ سوچے کہ دانہ یا گٹھلی زمین کے

انڈ ڈالنے اور پانی دینے سے تو خود بخود یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں سے ایک عظیم الشان درخت نکل آئے اور اس پر رنگا رنگ کے پھول لگنے لگیں اس میں کسی کاشتکار زمیندار کے عمل کا کوئی دخل نہیں، یہ سب قادر مطلق کی صنعت و حکمت سے وابستہ ہے، اور اس کے بعد لیل و نہار اور ستاروں کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع چلنے کا ذکر آیا تو آخر میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ؕ یعنی ان چیزوں میں چند دلائل ہیں عقل والوں کے لئے "اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ ان چیزوں کا حکم الٰہی کا مسخر ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس میں بہت کچھ غور فکر کی ضرورت نہیں جسکو ذرا بھی عقل ہوگی وہ سمجھ لے گا، کیونکہ نباتات اور درختوں کے اُگانے میں تو بظاہر کچھ نہ کچھ انسانی عمل کا دخل تھا بھی یہاں وہ بھی نہیں۔

اس کے بعد زمین کی دوسری مختلف انواع و اقسام کی پیداوار کا ذکر فرما کر فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ ؕ کہ اس میں دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑتے ہیں، مراد یہ ہے کہ یہاں بھی بہت گہرے فکر و نظر کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی دلالت بالکل کھلی ہوئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اس کی طرف توجہ سے دیکھے، اور نصیحت حاصل کرے، ورنہ بیوقوف بے فکر آدمی جو ادھر دھیان ہی نہ دے اس کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّہَارَ، رات اور دن کو مسخر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو انسان کے کام میں لگانے کے لئے اپنی قدرت کا مسخر بنا دیا، کہ رات انسان کو آرام کے سامان مہیا کرتی ہے اور دن اس کے کام کے راستے ہموار کرتا ہے، اس کے مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ رات اور دن انسان کے حکم کے تابع چلیں۔

ھُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا، آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان میں انسان کے منافع اور فوائد بیان کرنے کے بعد بحر محیط (سمندر) کے اندر حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ سے انسان کے لئے کیا کیا فوائد ہیں ان کا بیان ہے، کہ دریا میں انسان کی خوراک کا کیسا اچھا انتظام کیا گیا ہے کہ مچھلی کا تازہ گوشت اس کو ملتا ہے۔

لِتَاْکُلُوْا مِنْہُ لَحْمًا طَرِیًّا، کے الفاظ میں مچھلی کو تازہ گوشت قرار دینے سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دوسرے جانوروں کی طرح اس میں ذبح کرنے کی شرط نہیں وہ گویا بنا بنایا گوشت ہے۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْہُ حِلْیَۃً تَلْبَسُوْنَہَا، یہ دریا کا دوسرا فائدہ بتلایا گیا ہے، کہ اس میں غوطہ لگا کر انسان اپنے لئے حلیہ نکال لیتا ہے، حلیہ کے لفظی معنی زینت کے ہیں، مراد وہ موتی، مونگا اور جواہرات ہیں جو سمندر سے نکلتے ہیں اور عورتیں ان کے ہار بنا کر گلے میں یا دوسرے طریقہ

سے کانوں میں پہنتی ہیں، یہ زیور اگرچہ عورتیں پہنتی ہیں، لیکن قرآن نے لفظ مذکر استعمال فرمایا
تَلْبَسُوْنَهَا یعنی تم لوگ پہنتے ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عورتوں کا زیور پہننا درحقیقت
مردوں ہی کے مفاد کے لئے ہے، عورت کی زینت درحقیقت مرد کا حق ہے، وہ اپنی بیوی کو زینت کا لباس
اور زیور پہننے پر مجبور بھی کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جواہرات کا استعمال مرد بھی انگوٹھی وغیرہ میں کر سکتے ہیں

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ، یہ تیسرا فائدہ دریا کا بتلایا گیا ہے
فُلک کے معنی کشتی، اور مواخر، ماخرہ کی جمع ہے، مَخر کے معنی پانی کو چیرنے کے ہیں، مراد وہ کشتیاں
اور بحری جہاز ہیں جو پانی کی موجوں کو چیرتے ہوئے مسافت طے کرتے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ دریا کو اللہ تعالیٰ نے بلاد بعیدہ کے سفر کا راستہ بنا دیا ہے، دور دراز
کے ملکوں میں دریا ہی کے ذریعہ سفر کرنا اور تجارتی مال کی درآمد و برآمد کرنا آسان فرما دیا ہے، اور اس
کو حصولِ رزق کا عمدہ ذریعہ قرار دیا کیونکہ دریا کے راستہ سے تجارت سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ، رواسی، راسیہ کی جمع ہے، بھاری پہاڑ
کو کہا جاتا ہے، تمید، مَید مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈگمگانا یا مضطربانہ قسم کی حرکت کرنا ہے

معنی آیت کے یہ ہیں کہ زمین کے کرہ کو حق تعالیٰ نے بہت سی حکمتوں کے ماتحت ٹھوس اور
متوازن اجزاء سے نہیں بنایا، اس لئے وہ کسی جانب سے بھاری کسی جانب سے ہلکی واقع ہوئی ہے
اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زمین کو عام فلاسفروں کی طرح ساکن مانا جائے یا کچھ قدیم و جدید فلاسفروں
کی طرح حرکت مستدیرہ کے ساتھ متحرک قرار دیا جائے، دونوں حال میں زمین کے اندر ایک
اضطرابی حرکت ہوتی جس کو اردو میں کانپنے یا ڈگمگانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس اضطرابی حرکت
کو روکنے اور اجزاء زمین کو متوازن کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کا وزن رکھ دیا
تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کر سکے، باقی رہا معاملہ حرکت مستدیرہ کا، جیسے تمام سیارات کرتے ہیں
اور قدیم فلاسفہ میں سے فیثاغورث کی یہی تحقیق تھی، اور جدید فلاسفہ سب اس پر متفق ہیں اور
نئے تجربات نے اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا ہے تو قرآن کریم میں نہ کہیں اس کا اثبات ہے نہ
اس کی نفی بلکہ یہ اضطرابی حرکت جس کو پہاڑوں کے ذریعہ بند کیا گیا ہے اس حرکت مستدیرہ کے
لئے اور زیادہ معین ہوگی جو سیارات کی طرح زمین کے لئے ثابت کی جاتی ہے، واللہ اعلم

وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ، اوپر چونکہ تجارتی سفر کا ذکر آیا ہے تو مناسب
ہوا کہ ان آسانیوں کا بھی ذکر کیا جائے جو حق تعالیٰ نے مسافروں کی قطع مسافت اور منزل مقصود
تک پہونچنے کے لئے زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس لئے فرمایا وَعَلٰمٰتٍ، یعنی ہم نے
زمین میں راستہ پہچاننے کے لئے بہت سی علامات پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، مکانوں وغیرہ کے

ذریعہ قائم کر دی ہیں، ظاہر ہے کہ اگر زمین ایک سپاٹ کرہ ہوتا تو انسان کسی منزل تک پہونچنے کے لئے کس طرح راستے میں بھٹکتا۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ، یعنی سفر کرنے والے جیسے زمینی علامات سے راستہ پہچانتے ہیں اسی طرح ستاروں کے ذریعہ بھی سمت معلوم کر کے راستہ پہچان لیتے ہیں، اس عنوان میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق کا اصل مقصد تو کچھ اور ہے، اس کے ساتھ ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان سے راستے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تَعُدُّوا

بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے، کیا تم سوچتے نہیں اور اگر شمار کرو

نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکو گے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے

مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ

جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوائے

اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ

کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، مُردے ہیں جن میں جان نہیں

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۲۱﴾ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ

اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے، معبود تمہارا معبود ہے اکیلا،

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ

سو جن کو یقین نہیں آخرت کی زندگی کا ان کے دل نہیں مانتے اور وہ

مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

مغرور ہیں، ٹھیک بات ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۳﴾

کچھ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ نہیں پسند کرتا غرور کرنے والوں کو

ع ۲ / ۱۲ / ۸

خلاصۂ تفسیر

سو (جب اللہ تعالیٰ کا خالق اشیاء مذکورہ ہونا اور اس میں اس کا منفرد ہونا ثابت ہو چکا تو) کیا جو شخص پیدا کرتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ اس جیسا ہو جاوے گا جو پیدا نہیں کر سکتا (کہ تم دونوں کو معبود سمجھنے لگے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی اہانت ہے کہ اس کو بتوں کے برابر کر دیا) پھر کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے اور (اللہ تعالیٰ نے جو اوپر دلائل توحید میں بعض نعمتیں بتلائی ہیں ان پر کیا حصر ہے وہ تو اس کثرت سے ہیں کہ) اگر تم اللہ تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو گننے لگو تو (کبھی) نہ گن سکو (مگر مشرکین شکر اور قدر نہیں کرتے اور یہ جرم تو عظیم تھا کہ نہ معاف کرانے سے معاف ہوتا اور نہ اصرار پر یہ نعمتیں ملتیں لیکن) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ کوئی شرک سے توبہ کرے تو مغفرت ہو جاتی ہے اور نہ کرے جب بھی تمام نعمتیں حیات تک منقطع نہیں ہوتیں، اور وہاں نعمتوں کے ناقص ہونے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کبھی سزا نہ ہوگی، بلکہ آخرت میں سزا ہوگی کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری احوال سب جانتے ہیں، بس ان کے موافق سزا دیں گے (یہ تو حق تعالیٰ کے خالق اور منعم ہونے کا بیان تھا) اور جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود ہی مخلوق ہیں (اور اوپر قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے کہ غیر خالق اور خالق مساوی نہیں، پس یہ معبودین کیسے مستحق عبادت ہو سکتے ہیں اور) وہ (معبودین) مردے (بے جان) ہیں (خواہ دواماً جیسے بت یا فی الحال جیسے وہ لوگ جو مر چکے ہیں یا فی المآل جو مریں گے مثل جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم) زندہ رہنے والے نہیں (پس خالق تو کیا ہوتے) اور ان (معبودین) کو اتنی بھی خبر نہیں کہ (قیامت میں) مردے کب اٹھائے جاویں گے (یعنی بعض کو تو علم ہی نہیں اور بعض کو تعیین معلوم نہیں، اور معبود کے لئے علم تو محیط چاہئے، خصوصاً قیامت کا کہ اس پر جزا ہوگی عبادت و عدم عبادت کی تو اس کا علم تو معبود کے لئے بہت ہی مناسب ہے، پس خدا کے برابر تو علم میں کیا ہوں گے، اس تقریر سے ثابت ہوا کہ) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو (اس ایضاح حق پر بھی) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے (اور اسی لئے ان کو ڈر نہیں کہ توحید کو قبول کریں معلوم ہوا کہ) ان کے دل (ہی ایسے ناقابل ہیں کہ معقول بات کے) منکر ہو رہے ہیں اور (معلوم ہوا کہ) وہ (قبول حق سے) تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے احوال پوشیدہ و ظاہر جانتے ہیں (اور یہ بھی) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (پس جب ان کا تکبر معلوم ہو تو ان کو بھی ناپسند کریں گے اور سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں کا اور تخلیق کائنات کا مفصل ذکر کرنے کے بعد اس بات پر تنبیہ فرمائی جس کے لئے ان سب نعمتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور وہ ہے توحید حق تعالیٰ کی کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس لئے فرمایا کہ جب یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تنہا زمین و آسمان بنائے، کوہ و دریا بنائے، نباتات و حیوانات بنائے، درخت اور ان کے پھول پھل بنائے تو کیا وہ ذات پاک جو ان سب چیزوں کی خالق ہے ان بتوں کی مانند ہو جائے گی جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٤﴾

اور جب کہے ان سے کہ کیا اتارا ہے تمہارے رب نے تو کہیں کہانیاں ہیں پہلوں کی،

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ

تاکہ اٹھائیں بوجھ اپنے پورے دن قیامت کے اور کچھ بوجھ ان کے جن کو

يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ

بہکاتے ہیں بلا تحقیق سنتا ہے برا بوجھ ہے جو اٹھاتے ہیں، البتہ دغابازی کر چکے ہیں

مِن قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ

جو تھے ان سے پہلے پھر پہنچا حکم اللہ کا ان کی عمارت پر بنیادوں سے پھر گر پڑی ان پر

السَّقْفُ مِن فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

چھت اوپر سے اور آیا ان پر عذاب جہاں سے ان کو خبر نہ تھی،

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ

پھر قیامت کے دن رسوا کرے گا ان کو اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن پر تم کو

تُشَاقُّونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ

بڑی ضد تھی، بولیں گے جن کو دی گئی تھی خبر بیشک رسوائی آج کے دن

وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ

اور برائی منکروں پر ہے جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اور وہ برا کر رہے ہیں

اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ

اپنے حق میں تب ظاہر کریں گے اطاعت کہ ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی کیوں نہیں اللہ

عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ

خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے، سو داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے رہا کرو سدا

فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

اسی میں سو کیا برا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (یعنی کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے یا کوئی واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے) کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے، (یعنی قرآن جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا فرماتے ہیں آیا یہ صحیح ہے) تو کہتے ہیں کہ (صاحب وہ رب کا نازل کیا ہوا کہاں ہے) وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں (یعنی اہل ملل پہلے سے توحید و نبوت و معاد کے مدعی ہوتے آئے ہیں انہی سے یہ بھی نقل کرنے لگے باقی یہ دعوے خدا کے تعلیم کئے ہوئے نہیں) نتیجہ اس کہنے کا یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا (گمراہ کرنے سے مراد یہی کہنا ہے اساطیر الاولین کا، کیونکہ اس سے دوسرے آدمی کا اعتقاد خراب ہوتا ہے، اور جو شخص کسی کو گمراہ کیا کرتا ہے اس گمراہ کو تو گمراہی کا گناہ ہوتا ہے اور اس گمراہ کرنے والے کو اس کی گمراہی کے سبب بن جانے کا، اس حصۂ تسبب کو کچھ بوجھ فرمایا گیا، اور اپنے گناہ کا کامل طور پر اٹھانا ظاہر ہے) خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو یہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ برا بوجھ ہے (اور انھوں نے جو گمراہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ دوسروں کو ایسی باتیں کر کے بہکاتے ہیں، سو یہ تدبیریں حق کے مقابلہ میں نہ چلیں گی، بلکہ خود انہی پر ان کا وبال عود کرے گا، چنانچہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں انھوں نے (انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیروں کا بنا بنایا گھر جڑ بنیاد

سے ڈھا دیا پھر (وہ ایسے ناکام ہوئے جیسے گویا) اوپر سے ان پر (ان کے گھر کی) چھت آپڑی ہو (یعنی جس طرح چھت آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل خائب و خاسر ہوئے) اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر خدا کا عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (کیونکہ توقع تو اس تدبیر میں کامیابی کی تھی خلاف توقع ان پر ناکامی سے بڑھ کر عذاب آگیا جو کوسوں بھی ان کے ذہن میں نہ تھا کفار سابقین پر عذابوں کا آنا معلوم و معروف ہے یہ حالت تو ان کی دنیا میں ہوئی) پھر قیامت کے دن ان کے واسطے یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور اس میں سے ایک رسوائی یہ ہوگی کہ ان سے یہ پوچھے گا کہ تم نے جو میرے شریک بنا رکھے تھے (جن کے بارے میں تم انبیاء و اہل ایمان سے لڑائی جھگڑا کرتے تھے) وہ اب کہاں ہیں (اس حالت کو دیکھ کر حق کے بتلانے والے کہیں گے کہ آج پوری رسوائی اور عذاب کافروں پر ہے جن کی جان فرشتوں نے حالت کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے شاید ان اہل علم کا قول بیچ میں اس لئے بیان فرمایا ہو کہ کفار کی رسوائی کا علم اور عدل پر ہونا معلوم ہو جائے) پھر کافر لوگ (اپنے شرکاء کے جواب میں) صلح کا پیغام ڈالیں گے اور کہیں گے کہ (شرک جو حاصل میں مذہب کی برائی اور مخالفت حق تعالیٰ کی ہے ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اس کے مرتکب ہوتے) ہم تو کوئی برا کام (جس میں ادنیٰ مخالفت بھی حق تعالیٰ کی ہو) نہ کرتے تھے (اس کو صلح کا مضمون اس لئے کہا گیا کہ دنیا میں شرک کا جو کہ مخالفت یقینیہ ہے بڑے جوش و خروش سے اقرار تھا کہتے تھے لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا اور شرک کا اقرار مخالفت کا اقرار تھا خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو خود صریح مخالفت کے عادی تھے وہاں اس شرک کے انکار سے مخالفت کا انکار کریں گے اس لئے اس کو صلح فرمایا اور یہ کہنا ایسا ہے جیسا دوسری آیت میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، حق تعالیٰ ان کے اس قول کو رد فرمائیں گے کہ) کیوں نہیں، بلکہ واقعی تم نے بڑے بڑے کام مخالفت کے کئے بیشک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے سو (اچھا) جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ (اور) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو غرض (حق سے) تکبر (اور مخالفت اور مقابلہ) کرنے والوں کا وہ برا ٹھکانا ہے (یہ عذاب آخرت کا ذکر ہو گیا پس حاصل آیات کا یہ ہوا کہ تم نے اپنے سے پہلے کافروں کا حال خسارہ و عذاب دنیا و آخرت کا سن لیا اسی طرح جو تدبیریں اور مکر دین حق کے مقابلہ میں تم کر رہے ہو اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہو یہی انجام تمہارا ہوگا۔

معارف ومسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور تخلیق عالم میں یکتا ہونے کا ذکر کرکے مشرکین کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، ان آیات میں دوسروں کو گمراہ کرنے اور اس کے عذاب کا بیان ہے، اور اس سے پہلے ایک سوال قرآن کے متعلق ہے، اور اس سوال کے مخاطب یہاں تو مشرکین ہیں اور انہی کا جاہلانہ جواب بیان ذکر کرکے ان پر وعید بیان کی گئی ہے، اور پانچ آیتوں کے بعد یہی سوال مؤمنین متقین کو خطاب کرکے کیا گیا اور ان کا جواب اور اس پر وعدۂ انعامات کا ذکر ہے۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کھولا کہ سوال کرنے والا کون تھا، اس لئے مفسرین کے اس میں اقوال مختلف ہیں، کسی نے کافروں کو سوال کرنے والا قرار دیا، کسی نے مسلمانوں کو، کسی نے ایک سوال مشرکین کا اور دوسرا مؤمنین کا قرار دیا، لیکن قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھ کر اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ اس بحث میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ سوال کس کی طرف سے تھا، دیکھنا تو جواب اور اس کے نتیجہ کا ہے جن کا قرآن نے خود بیان کردیا ہے۔

مشرکین کی طرف سے خلاصہ جواب یہ ہے کہ انھوں نے اسی کو تسلیم نہیں کیا کہ کوئی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا بھی ہے، بلکہ قرآن کو پچھلے لوگوں کی کہانیاں قرار دیا، قرآن کریم نے اس پر یہ وعید سنائی کہ یہ ظالم قرآن کو کہانیاں بتلا کر دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ان کو بھگتنا پڑے گا، کہ قیامت کے روز اپنے گناہوں کا پورا وبال تو ان پر پڑنا ہی ہے، جن کو یہ گمراہ کر رہے ہیں ان کا بھی کچھ وبال ان پر پڑے گا، اور پھر فرمایا کہ گناہوں کے جس بوجھ کو یہ لوگ اپنے اوپر لاد رہے ہیں، وہ بہت بُرا بوجھ ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ

اور کہا پرہیزگاروں کو کیا اتارا تمہارے رب نے بولے نیک بات جنھوں نے

أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ

بھلائی کی اس دنیا میں ان کو بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے۔ اور کیا خوب

دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

گھر ہے پرہیزگاروں کا، باغ ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے بہتی ہیں انکے نیچے سے

الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ (۳۱)

نہریں، ان کے واسطے وہاں ہے جو چاہیں ایسا بدلہ دیگا اللہ پرہیزگاروں کو

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا

جن کی جان قبض کرتے ہیں فرشتے اور وہ ستھرے ہیں کہتے ہیں فرشتے سلامتی تم پر جاؤ

الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ

بہشت میں بدلہ اس کا جو تم کرتے تھے، کیا کافر اسی کے منتظر ہیں کہ آئیں ان پر

الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ

فرشتے یا پہنچے حکم تیرے رب کا اسی طرح کیا تھا ان سے اگلوں نے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳۳) فَاَصَابَهُمْ

اور اللہ نے ظلم نہ کیا ان پر لیکن وہ خود اپنا برا کرتے رہے، پھر پڑے ان کے

سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۴)

سر ان کے برے کام اور الٹ پڑا ان پر جو ٹھٹھا کرتے تھے۔

ع ۴ ۹ ۱۰

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان سے (جو قرآن کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ بڑی خیر اور برکت کی چیز نازل فرمائی ہے جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں (جس میں یہ قول مذکور اور تمام اعمال صالحہ آگئے) ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے (وہ بھلائی ثواب کا وعدہ و بشارت ہے) اور عالم آخرت تو (بوجہ اس کے کہ وہاں اس وعدہ کا تحقق و ظہور ہو جائے گا) اور زیادہ بہتر ہے اور موجب سرور ہے اور واقعی وہ شرک سے بچنے والوں کا اچھا گھر ہے وہ گھر (کیا ہے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے ان باغوں کے (اشجار و عمارات کے) نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا وہاں ان کو ملے گی (اور خاص انہی کی کیا تخصیص ہے جن کا قول اس مقام پر مذکور ہے بلکہ) اسی طرح کا عوض اللہ تعالیٰ سب شرک سے بچنے والوں کو دے گا، جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک (صاف) ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ مرتے دم تک توحید

تو تم جنت میں (داخل) ہو جاؤ (فرشتے) کہتے جاتے ہیں سلام علیکم (قبض روح کے بعد) جنت میں چلے جانا اپنے اعمال کے سبب سے۔ یہ لوگ جو اپنے کفر و عناد و جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور باوجود وضوح دلائل حق کے ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس (موت کے) فرشتے آجائیں یا آپ کے پروردگار کا حکم (یعنی قیامت) آجائے (یعنی کیا موت کے وقت یا قیامت میں ایمان لائیں گے جبکہ ایمان قبول نہ ہوگا۔ گو اس وقت تمام کفار بوجہ انکشاف حقیقت کے توبہ کریں گے جیسے اصرار کفر پر یہ لوگ کر رہے ہیں) ایسا ہی اُن سے پہلے جو لوگ تھے انھوں نے بھی (کفر پر اصرار) کیا تھا اور (اس اصرار کی بدولت سزایاب ہوئے سو ان پر اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا۔ لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے (کہ سزا کے کام جان جان کے کرتے تھے) آخر ان کے اعمال بد کی ان کو سزائیں ملیں اور جس عذاب (کی خبر پانے) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی (عذاب) نے آ گھیرا (بس یہی ان کا حال ہوگا)۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ

اور بولے شرک کرنے والے اگر چاہتا اللہ نہ پوجتے ہم اس کے سوا کسی

شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ

چیز کو اور نہ ہمارے باپ اور نہ حرام ٹھہرا لیتے ہم بدون اس کے حکم کے کسی چیز کو

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ

اسی طرح کیا ان سے اگلوں نے سو رسولوں کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا

الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

صاف صاف۔ اور ہم نے اٹھائے ہیں ہر امت میں رسول کہ بندگی کرو اللہ کی

وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ

اور بچو ہڑدنگے سے پھر کسی کو ان میں سے ہدایت کی اللہ نے اور کسی پر

حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ

ثابت ہوئی گمراہی۔ سو سفر کرو ملکوں میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ

جھٹلانے والوں کا۔ اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی تو

اللّٰہَ لَا یَہْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَہُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقْسَمُوْا

اللہ راہ نہیں دیتا جس کو بچلاتا ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار ۔ اور قسمیں کھاتے ہیں

بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰہُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰی وَعْدًا

اللہ کی سخت قسمیں کہ نہ اٹھائے گا اللہ جو کوئی مر جائے کیوں نہیں وعدہ

عَلَیْہِ حَقًّا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِیُبَیِّنَ لَہُمُ

ہو چکا ہے اس پر پکا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ اٹھائے گا تاکہ ظاہر کرے ان پر

الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّہُمْ کَانُوْا

جس بات میں جھگڑتے ہیں اور تاکہ معلوم کر لیں کافر کہ وہ جھوٹے

کٰذِبِیْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿۴۰﴾

تھے ۔ ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے

ع ۵ / ۱۱

خلاصۂ تفسیر

اور مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہوتا (کہ ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے اصول میں سے ہے اور بعض اشیاء کی تحریم نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے فروع میں سے ہے مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ اصول و فروع کو ناپسند کرتے) تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بدون (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا طریقہ پسند ہے ورنہ ہم کو کیوں کرنے دیتے، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے مغموم نہ ہوں کیونکہ یہ بیہودہ مجادلہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ) جو (کافر) ان سے پہلے ہوئے ہیں ایسی ہی حرکت انھوں نے بھی کی تھی (یعنی بیہودہ مجادلات اپنے پیغمبروں سے کئے تھے) سو پیغمبروں (کا اس سے کیا بگڑا اور وہ جس طریق کی طرف بلاتے ہیں اس کو کیا ضرر پہنچا (ان) کے ذمہ تو (احکام کا) صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (صاف صاف یہ کہ دعویٰ واضح ہو اور دلیل صحیح اس پر قائم ہو اسی طرح آپ کے ذمہ بھی یہی کام تھا جو آپ کر رہے ہیں، پھر اگر براہ عناد دعویٰ اور دلیل میں غور نہ کریں تو آپ کی بلا سے) اور (جس طرح ان کا معاملہ آپ کے ساتھ یعنی مجادلہ کوئی نئی بات نہیں اسی طرح آپ کا معاملہ ان کے ساتھ یعنی توحید و دین حق کی طرف بلانا کوئی نئی بات نہیں

بلکہ اس کی تعلیم بھی قدیم سے چلی آئی ہے چنانچہ) ہم ہر اُمت میں (امم سابقہ سے) کوئی نہ کوئی پیغمبر (اس بات کی تعلیم کے لئے) بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے رستہ) سے (کہ وہ شرک وکفر ہے) بچتے، سو (اس میں اشیاء کی وہ تحریم بھی آگئی جو مشرکین اپنی رائے سے کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ شعبہ شرک وکفر کا تھا) سو ان میں بعضے وہ ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت دی (کہ انھوں نے حق کو قبول کرلیا) اور بعضے ان میں وہ ہوئے جن پر گمراہی کا ثبوت ہوگیا۔

(مطلب یہ کہ کفار اور انبیاء میں یہ معاملہ اسی طرح چلا آ رہا ہے، اور ہدایت و اضلال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ہمیشہ سے یوں ہی جاری ہے کہ مجادلہ کفار کا بھی قدیم اور تعلیم انبیاء علیہم السلام کی بھی قدیم اور سب کا ہدایت نہ پانا بھی قدیم پھر آپ کو غم کیوں ہو؟ یہاں تک تسلی فرمائی گئی جس میں اخیر کے مضمون میں ان کے شبہ کا اجمالی جواب بھی ہوگیا کہ یہ باتیں کرنا گمراہی ہے جس کے گمراہی ہونے کی آگے تائید اور جواب کی زیادہ توضیح ہے، یعنی اگر مجادلہ مع الرسل کا گمراہی ہونا تم کو معلوم نہ ہو) تو (اچھا) زمین میں چلو پھرو دیکھو (آثار سے دیکھو کہ (پیغمبروں کے) جھٹلانے والوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا، پس اگر وہ گمراہ نہ تھے تو ان پر عذاب کیوں نازل ہوا، اور واقعات اتفاقیہ ان کو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ خلاف عادت ہوئے اور انبیاء علیہم السلام کی پیشنگوئی کے بعد ہوئے اور مومنین اس سے بچے رہے، پھر اس کے عذاب ہونے میں کیا شک ہے، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے کسی فرد کی گمراہی سے بھی سخت صدمہ پہنچتا تھا اس لئے آگے پھر آپ کو خطاب ہے کہ جیسے پہلے بعضے لوگ ہوئے ہیں جن پر گمراہی تمام ہو چکی تھی، اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں سو ان کے راہِ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو کچھ نتیجہ نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کیا کرتا جس کو (اس شخص کے عناد کے سبب) گمراہ کرتا ہے (البتہ اگر وہ عناد کو چھوڑ دے تو ہدایت کردیتا ہے، لیکن یہ عناد کو چھوڑیں گے نہیں، اس لئے ان کو ہدایت بھی نہ ہوگی) اور (ضلالت وعذاب کے بارے میں اگر ان کا یہ گمان ہو کہ ہمارے معبود اس حالت میں بھی عذاب سے بچا لیں گے تو وہ سمجھ رکھیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (یہاں تک ان کے پہلے شبہ کے جواب کی تقریر تھی، آگے دوسرے شبہ کے متعلق کلام ہے) اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (اور قیامت نہ آئے گی آگے جواب ہے) کیوں نہیں زندہ کرے گا (یعنی ضرور زندہ کرے گا) (اس وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے، لیکن اکثر لوگ (باوجود قیام دلیل صحیح کے اس پر) یقین نہیں لاتے اور یہ دوبارہ زندہ کرنا اس لئے ہوگا) تاکہ (دین کے متعلق) جس چیز میں

یہ لوگ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے (اور انبیاء کے فیصلہ سے راستہ پر نہ آتے تھے) انکے روبرو اس (کی حقیقت) کا (بطور معاینہ کے) ظاہر کردے اور تاکہ (اس اظہار حقیقت کے وقت) کافر لوگ (پورا) یقین کرلیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے (اور انبیاء و مؤمنین سچے تھے، پس قیامت کا آنا یقینی اور عذاب سے فیصلہ ہونا ضروری ہے، یہ جواب ہوگیا اَلَا یَبْعَثُ اللّٰهُ کا اور چونکہ وہ لوگ قیامت کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ مر کر زندہ ہونا ان کے خیال میں کسی کے بس میں نہ تھا اس لئے آگے اپنی قدرت کاملہ کے اثبات سے ان کے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت ایسی عظیم ہے کہ) ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں (ہمیں اس میں کچھ محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی) بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو (پیدا) ہو جا بس وہ (موجود) ہو جاتی ہے (تو اتنی بڑی قدرت کاملہ کے روبرو بے جان چیزوں میں دوبارہ جان کا پڑ جانا کونسا دشوار ہے، جیسے پہلی بار ان میں جان ڈال چکے ہیں، اب دونوں شبہوں کا پورا جواب ہو چکا وللہ الحمد)

معارف و مسائل

ان کفار کا پہلا شبہ تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اگر ہمارا کفر و شرک اور ناجائز کام پسند نہیں تو وہ ہمیں زبردستی اس سے روک کیوں نہیں دیتے۔

اس شبہ کی بیہودگی واضح تھی، اس لئے اس کا جواب دینے کے بجائے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی پر اکتفا کیا گیا، کہ ایسے بیہودہ سوالات سے آپ غمگین نہ ہوں، اور شبہ کی بیہودگی کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم دنیا کا نظام ہی اس بنیاد پر قائم فرمایا ہے کہ انسان کو بالکل مجبور نہیں رکھا گیا، ایک قسم کا اختیار اس کو دیا گیا، اسی اختیار کو وہ اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے تو ثواب ورنہ نافرمانی میں استعمال کرے تو عذاب کے وعدے اور وعید فرمائے، اسی کے نتیجہ میں قیامت و حشر و نشر کے سارے ہنگامے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو مجبور کر کے اپنی اطاعت کرائیں تو کس کی مجال تھی کہ اطاعت سے باہر جاتا، مگر بتقاضائے حکمت مجبور کر دینا درست نہ تھا، اس لئے انسان کو اختیار دیا گیا تو اب کافروں کا یہ کہنا کہ اگر اللہ کو ہمارا طریقہ پسند نہ ہوتا تو ہمیں مجبور کیوں نہ کر دیتے ایک احمقانہ اور معاندانہ سوال ہے۔

کیا ہندوستان پاکستان میں بھی اللہ کا کوئی رسول آیا ہے؟

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا، اس آیت سے نیز دوسری آیت وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے علاقوں میں بھی اللہ کے پیغمبر ضرور آئے ہوں گے

خواہ وہ یہیں کے باشندے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں اور ان کے نائب اور مبلغ یہاں پہونچے ہوں اور آیت لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس امت کی طرف بھیجے گئے ہیں ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا، اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بعض ہر وہ قوم عرب ہے جو آپ کی بعثت و نبوت کی سب سے پہلے مخاطب ہوئی کہ ان میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد سے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس لئے ان لوگوں کا لقب قرآن کریم میں اُمِّيِّيْنَ رکھا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی دنیا میں بھی آپ سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہو، واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ

اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ظلم اٹھایا البتہ ان کو ہم ٹھکانا

فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۱)

دیں گے دنیا میں اچھا اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہے اگر ان کو معلوم ہوتا،

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (۴۲)

جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

خلاصۂ تفسیر

(اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن (مکہ) چھوڑ دیا (اور حبشہ چلے گئے) بعد اس کے کہ ان پر (کفار کی طرف سے) ظلم کیا گیا (کیونکہ ایسی مجبوری میں وطن چھوڑنا بڑا شاق گذرتا ہے) ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے (یعنی ان کو مدینہ پہنچا کر خوب امن و راحت دیں گے چنانچہ بعد چندے مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا اور اس کو وطن اصلی قرار دیا گیا، اس لئے اس کو ٹھکانا کہا اور ہر طرح کی وہاں ترقی ہوئی اس لئے حسنہ کہا گیا اور حبشہ کا قیام عارضی تھا اس لئے اس کو ٹھکانا نہیں فرمایا) اور آخرت کا ثواب (اس سے) بدرجہا بڑا ہے (کہ خیر بھی ہے اور ابقی بھی) کاش (اس اجر آخرت کی) ان (بے خبر کافروں) کو (بھی) خبر ہوتی (اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت سے مسلمان ہو جاتے) وہ (مہاجرین ان وعدوں کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ) ایسے ہیں جو (ناگوار واقعات پر) صبر کرتے ہیں (چنانچہ وطن کا چھوڑنا گو ان کو ناگوار ہے، لیکن بدون اس کے دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے، دین کے لئے وطن چھوڑا،

اور صبر کیا) اور (وہ ہر حال میں) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (وطن چھوڑنے کے وقت یہ خیال نہیں کرتے کہ کھائیں پئیں گے کہاں سے)۔

معارف ومسائل

تشریح وتفسیر اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا، ہجرت سے مشتق ہے، ہجرت کے لغوی معنی ترک وطن کے ہیں، ترکِ وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت و عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا، یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں "

یہ ہجرت بعض صورتوں میں فرض و واجب اور بعض صورتوں میں مستحب و افضل ہوتی ہے، اس کے مفصل احکام تو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۷ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں، اس جگہ صرف ان وعدوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے کئے ہیں۔

کیا ہجرت دنیا میں بھی فراخی عیش کا سبب ہوتی ہے؟ آیاتِ مذکورہ میں چند شرائط کے ساتھ مہاجرین کے لئے دو عظیم الشان وعدے کئے گئے ہیں، اول تو دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینے کا، دوسرے آخرت کے بے حساب ثواب عظیم کا، "دنیا میں اچھا ٹھکانا" ایک نہایت جامع لفظ ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مہاجر کو سکونت کے لئے مکان اور پڑوسی اچھے ملیں، یہ بھی داخل ہے کہ اس کو رزق اچھا ملے، دشمنوں پر فتح وغلبہ نصیب ہو، عام لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف اور بھلائی ہو، عزت و شرف ملے جو ان کے خاندان اور اولاد تک چلے، (قرطبی)

آیت کا شانِ نزول اصالۃً وہ پہلی ہجرت ہے جو صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف کی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہجرت حبشہ اور اس کے بعد کی ہجرتِ مدینہ منورہ دونوں اس میں داخل ہوں آیت میں یہاں انہی مہاجرین حبشہ یا مہاجرین مدینہ کا ذکر ہے اس لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ وعدہ انہی حضرات صحابہ کے لئے تھا، جنھوں نے حبشہ کی طرف یا پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دنیا میں پورا ہو چکا، جس کا سب نے مشاہدہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ان کا کیسا اچھا ٹھکانا بنا دیا، ایذاء دینے والے پڑوسیوں کے بجائے غمخوار، ہمدرد و جاں نثار پڑوسی ملے، دشمنوں پر فتح وغلبہ نصیب ہوا، ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ گذرنے کے بعد اُن پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے، فقراء و مساکین مالدار ہو گئے، دنیا کے ممالک فتح ہوئے، ان کے حسن اخلاق حسنِ عمل کے کارنامے رہتی دنیا تک ہر موافق و مخالف کی زبان پر ہیں، ان کو ورائی

نسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت و شرف بخشا، یہ تو دنیا میں ہونے والی چیزیں تھیں جو ہو چکیں اور آخرت کا وعدہ پورا ہونا بھی یقینی ہے، لیکن تفسیر بحر محیط میں ابوحیان کہتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا عَمَّ فِي الْمُهَاجِرِيْنَ كَائِنًا مَا كَانُوْا فَيَشْمَلُ أَوَّلَهُمْ وَآخِرَهُمْ، (ص ۴۹۲ ج ۵)

"اَلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا کا لفظ تمام مہاجرین عالم کے لئے عام اور شامل ہے کسی بھی خطے اور زمانہ کے مہاجر ہوں، اس لئے یہ لفظ مہاجرین اولین کو بھی شامل ہے اور قیامت تک اللہ کے لئے ہر ہجرت کرنے والا اس میں داخل ہے"

عام تفسیری ضابطہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آیت کا شان نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ اور خاص جماعت ہو مگر اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، اس سے اس وعدہ میں تمام دنیا کے اور ہر زمانہ کے مہاجرین بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں وعدے تمام مہاجرین کے لئے پورا ہونا امر یقینی ہے۔

اسی طرح کا ایک وعدہ مہاجرین کے لئے سورۂ نساء کی اس آیت میں کیا گیا ہے وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً، جس میں وسعت مکانی اور فراخی عیش خاص طور سے موعود ہیں، مگر قرآن کریم نے ان وعدوں کے ساتھ مہاجرین کے کچھ اوصاف اور ہجرت کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائی ہیں، اس لئے ان وعدوں کے مستحق وہی مہاجرین ہو سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہوں اور جنھوں نے مطلوبہ شرائط پوری کر دی ہوں۔

ان میں سب سے پہلی شرط تو فِي اللّٰهِ کی ہے، یعنی ہجرت کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو، اس میں دنیاوی منافع تجارت، ملازمت وغیرہ اور نفسانی فوائد پیش نظر نہ ہوں، دوسری شرط ان مہاجرین کا مظلوم ہونا ہے، مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا، تیسرا وصف ابتدائی تکالیف و مصائب پر صبر اور ثابت قدم رہنا ہے اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا، چوتھا وصف تمام مادی تدبیروں کا اہتمام کرتے ہوئے بھی بھروسہ صرف اللہ پر رکھنا ہے، کہ فتح و نصرت اور ہر کامیابی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مشکلات و تکالیف تو ہر کام میں ہوا ہی کرتی ہیں، ان کو عبور کرنے کے بعد بھی اگر کسی مہاجر کو اچھا ٹھکانا اور اچھے حالات نہیں ملتے تو قرآن کے وعدے میں شبہ کرنے کے بجائے اپنی نیت و اخلاص اور اس حسن عمل کا جائزہ لے جس پر یہ وعدے کئے گئے ہیں تو اس کو معلوم ہو گا کہ قصور اپنا ہی تھا، کہیں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، کہیں صبر و ثبات اور توکل کی کمی ہوتی ہے۔

ترک وطن اور ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام

امام قرطبی نے اس جگہ ہجرت اور ترک وطن کی قسمیں اور ان کے کچھ احکام پر ایک مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، تتمام فائدہ کے لئے اس کو نقل کرتا ہوں

قرطبی نے بحوالہ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں اور اس کی چھ قسمیں ہیں۔

اول، یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا، یہ قسم سفر عہد رسالت میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرط استطاعت وقدرت فرض ہے، جبکہ دار الکفر میں اپنے جان ومال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو، اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گنا ہگار ہوگا۔

دوسرا دار البدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں جس میں سلف صالحین پر سب وشتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کرکے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کرسکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ۔

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي، ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ۔

پانچواں سفر آب وہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب وہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابو عبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دار الخلافہ اُردن سے منتقل کرکے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب وہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا دوبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں

اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَّ اَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَّلَسْتُمْ بِهَا فَلَا تَهْبِطُوا عَلَيْهَا (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)	جب کسی خطہ میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں ہو وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے گا نہیں اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چھٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں:-

۱۔ سفر عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت و سفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے، فَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

۲۔ سفرِ حج: اس کا چند شرائط کے ساتھ فرض اسلامی ہونا سب کو معلوم ہے۔

۳۔ سفرِ جہاد: اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

۴۔ سفرِ معاش۔ جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہوسکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کرکے دوسری جگہ تلاش روزگار کرے۔

۵۔ سفرِ تجارت: یعنی قدرِ ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ابتغاءِ فضل سے مراد اس آیت میں تجارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج میں بھی تجارت کی اجازت دیدی ہے، تو تجارت کے لئے ہی سفر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہو۔

۶۔ طلبِ علم کے لئے سفر: اس کا بقدرِ ضرورت دین فرضِ عین ہونا، اور زائد از ضرورت کا فرضِ کفایہ ہونا معلوم و معروف ہے۔

۷۔ کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا: یہ بجز تین مسجدوں کے درست نہیں، مسجد حرام (مکہ مکرمہ) مسجد نبوی (مدینہ طیبہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) (یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دوسرے اکابر علماء سلف و خلف نے عام مقامات متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، **محمد شفیع**)۔

۸۔ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر: جس کو رباط کہا جاتا ہے، احادیث کثیرہ میں **اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔**

۹۔ عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لئے سفر: حدیث میں اس کو بھی باعثِ اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقرباء و احباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والے کے لئے فرشتوں کی دعاء کا ذکر فرمایا گیا ہے (یہ جب ہے کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو کوئی مادی غرض نہ ہو) واللہ علم (قرطبی، ص ۳۴۹ تا ۳۵۱ ج ۵، سورۂ نساء)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ

اور تجھ سے پہلے بھی ہم نے یہی مرد بھیجے تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کی طرف سو پوچھو یاد رکھنے

الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ

والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں، بھیجا تھا ان کو نشانیاں دیکر اور ورقے اور اتاری ہم نے

إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾

تجھ پر یاد داشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری اُن کے واسطے تاکہ وہ غور کریں

خلاصۂ تفسیر

اور یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت و نبوت کا اس بناء پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر اور انسان ہیں، اور نبی و رسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہ ہونا چاہئے، یہ ان کا جاہلانہ خیال ہے کیونکہ ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں کہ انہیں پر وحی بھیجا کرتے تھے (تو اے مکہ کے منکرین) اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور وہ تمہارے خیال میں بھی مسلمانوں کی طرفداری نہ کریں، اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر) آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایات (آپ کے واسطے سے) لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں اور تاکہ وہ ان میں غور و فکر کیا کریں۔

معارف و مسائل

روح المعانی میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مشرکین مکہ نے اپنے قاصد مدینہ طیبہ کے یہود کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجے کہ کیا یہ بات واقعی ہے کہ پہلے بھی سب انبیاء جنس بشر و انسان سے ہوتے آئے ہیں۔

اگرچہ لفظ اہل الذکر میں اہل کتاب اور مؤمنین سب داخل تھے مگر یہ ظاہر ہے کہ مشرکین کا اطمینان غیر مسلموں ہی کے بیان سے ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ خود رسول کریم کی بات پر مطمئن نہیں تھے، تو دوسرے مسلمانوں کی بات کیسے مان سکتے تھے۔

اَهْلَ الذِّكْرِ، لفظ ذکر چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تورات کو بھی ذکر فرمایا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ میں قرآن مراد ہے، اس لئے اہل الذکر کے لفظی معنی اہل علم کے ہو گئے، اور یہاں اہل علم سے کون لوگ مراد ہیں، اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ قول ابن عباس، حسن، السدی وغیرہ کا ہے، اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لے کر اہل الذکر کی تفسیر اہل قرآن سے کی ہے، اس میں زیادہ واضح بات

رمانی، زجاج، ازہری کی ہے، وہ کہتے ہیں "المراد باھل الذکر علماء اخبار الامم السالفة کائنا من کان فالذکر بمعنی الحفظ کانہ قیل اسئلوا المطلعین علی اخبار الامم یعلموکم بذلک"، اس تحقیق کی بنا پر اس میں اہلِ کتاب بھی داخل ہیں اور اہلِ قرآن بھی۔

بَيِّنٰتٌ کے معنی معروف ہیں اور مراد اس سے یہاں معجزات ہیں، زُبُر، دراصل زُبْرَۃ کی جمع ہے جو لوہے کے بڑے ٹکڑوں کے لئے بولا جاتا ہے، "اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ"، ٹکڑوں کو جوڑنے کی مناسبت سے لکھنے کو زَبْر کہا جاتا ہے، اور لکھی ہوئی کتاب کو زبر اور زبور بولتے ہیں یہاں مراد اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جس میں تورات، انجیل، زبور، قرآن سب داخل ہیں۔

ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے

آیت مذکورہ کا یہ جملہ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے، مگر الفاظ عام ہیں جو تمام معاملات کو شامل ہیں، اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام کو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔

امت میں عہدِ صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے، کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں، اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقعِ اجماع کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر مذکور ہیں، اور علماء صحابہ و تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں، ان احکام میں وہ علماء براہِ راست قرآن و حدیث اور اجماع پر عمل کریں، ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید کی ضرورت نہیں، لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور نہیں، یا جن میں آیاتِ قرآن اور روایاتِ حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے یا جن میں صحابہ و تابعین کے درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے، یہ مسائل و احکام محلِّ اجتہاد ہوتے ہیں، ان کو اصطلاح میں مُجْتَہَد فِیْہ مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جس عالم

کو درجۂ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے، محض اپنی ذاتی رائے کے بھروسہ پر ایک آیت یا روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جو احکام قرآن وسنت میں صراحۃً مذکور نہیں ان کو قرآن وسنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی انہی مجتہدین امت کا کام ہے جن کو عربی زبان عربی لغت اور محاورات اور طرق استعمال کا نیز قرآن وسنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع وتقوی کا اونچا مقام حاصل ہو، جیسے امام اعظم ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ یا اوزاعیؒ، فقیہ ابواللیثؒ وغیرہ، جن میں حق تعالیٰ نے قرب زمانۂ نبوت اور صحبت صحابہ وتابعین کی برکت سے شریعت کے اصول ومقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور منصوص احکام سے غیر منصوص کو قیاس کرکے حکم نکالنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا، ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید لازم ہے، ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء محدثین وفقہاء امام غزالیؒ، رازیؒ، ترمذیؒ، طحاویؒ، مزنیؒ، ابن ہمامؒ، ابن قدامہؒ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف وخلف باوجود علوم عربیت وعلوم شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ہی کے پابند رہے ہیں، سب مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں سمجھا۔

البتہ ان حضرات کو علم وتقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا، کہ مجتہدین کے اقوال وآراء کو قرآن وسنت کے دلائل سے جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمہ مجتہدین میں جس امام کے قول کو وہ کتاب وسنت کے ساتھ اقرب پاتے، اس کو اختیار کرلیتے تھے، مگر ائمہ مجتہدین کے مسلک سے خروج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے، تقلید کی اصل حقیقت اتنی ہی ہے۔

اس کے بعد روز بروز علم کا معیار گھٹتا گیا، اور تقویٰ وخدا ترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں، ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دی جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کرلیں اور جس میں چاہیں کسی دوسرے کا قول لے لیں تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباع شریعت کا نام لے کر اتباع ہویٰ میں مبتلا ہوجائیں، کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کرلیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین وشریعت کا اتباع نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اغراض واہواء کا اتباع ہوگا، جو باجماع امت حرام ہے، علامہ شاطبیؒ نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ابن تیمیہؒ نے بھی

عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع کو اپنے فتووں میں باجماع امت حرام کہا ہے، اس لئے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنے والوں کو کسی ایک ہی امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے، یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے، جس سے دین کا انتظام قائم رہے اور لوگ دین کی آڑ میں اتباع ہویٰ کے شکار نہ ہو جائیں، اس کی مثال بعینہ وہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ نے باجماع صحابہ قرآن کے سبعۃ احرف (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کر دینے میں کیا، کہ اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغات تھے، جبرئیل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے، حضرت عثمان غنیؓ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے، اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے، بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن از تحریف کی بناء پر صرف ایک لغت اختیار کر لیا گیا، اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں، بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کر لیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیموں ڈاکٹروں میں سے کسی ایک کو اپنے علاج کے لئے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھ کر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لئے کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے ڈاکٹر ماہر نہیں، یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں۔

حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی، اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باہمی جدال و شقاق کی گرم بازاری نہ کوئی دین کا کام ہے نہ کبھی اہل بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا، اور بعد میں طعن و طنز تک نوبت آگئی، پھر جاہلانہ جنگ و جدال نے وہ نوبت پہونچا دی جو آج عموماً دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا، فالی اللہ المشتکی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

تنبیہ: مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ یہاں لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے، جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل موجود ہیں خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد رابع باب الاجتہاد، اور علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث القاعدة الثالثة فی المجتہدین، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد، اس مسئلے میں خاص طور سے قابلِ دید ہیں، اہلِ علم ان کی طرف مراجعت فرمائیں۔

قرآن فہمی کے لئے حدیثِ رسول ضروری ہے، حدیث کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ، اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق قرآن کریم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیت کا بیان اور وضاحت لوگوں کے سامنے کردیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسبِ منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

علامہ شاطبی نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے، کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ، اور حضرت صدیقہ عائشہؓ نے اس خلقِ عظیم کی تفسیر یہ فرمائی کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن، اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، بعض تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتے ہیں، جن کو عام اہلِ علم جانتے ہیں، اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ حسبِ تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات سب کی سب بوحی خداوندی اور بحکم قرآن ہیں، اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو بالآخر وحی الٰہی سے یا اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کردی جاتی ہے، اس لئے وہ بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر و بیان کو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ جمعہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد بعثت کو ذکر کیا گیا ہے، اب وہ ذخیرۂ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متأخرین محدثین تک امت کے باکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کرکے امت تک پہونچایا ہے، اور اس کی چھان بین میں عمریں صرف کرکے روایاتِ حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں، اور جس روایت کو بحیثیت سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے، اس کو ذخیرۂ حدیث سے الگ کرکے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرۂ حدیث کو کسی حیلے بہانے سے ناقابلِ اعتماد کہتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکمِ قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ مضامینِ قرآن کو بیان نہیں کیا، یا یہ کہ آپ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، بہر دو صورت قرآن بحیثیت معنے کے محفوظ نہ رہا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، اس کا یہ دعویٰ اس نصِ قرآن کے خلاف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنتِ رسول کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت قرآن ہی کا منکر ہے، نعوذ باللہ

أَفَأَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ

سو کیا نڈر ہوگئے وہ لوگ جو برے فریب کرتے ہیں اس سے کہ دھنسا دیوے اللہ ان کو

الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾

زمین میں یا آپہنچے ان پر عذاب جہاں سے خبر نہ رکھتے ہوں

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ

یا پکڑلے ان کو چلتے پھرتے سو وہ نہیں ہیں عاجز کرنے والے، یا

يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾

پکڑلے ان کو ڈرانے کے بعد، سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان

النصف

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (دینِ حق کے باطل کرنے کو) بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں (کہ کہیں اس میں شبہات و اعتراض نکالتے ہیں اور حق کا انکار کرتے ہیں کہ ضلال ہے کہیں دوسروں کو روکتے ہیں یہ اضلال ہے) کیا ایسے لوگ (یہ کارروائیاں کفر کی کرکے) پھر بھی اس بات سے بے فکر (بیٹھے ہوئے) ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو (ان کے کفر کے وبال میں) زمین میں غرق کر دے، یا اُن پر ایسے موقع سے عذاب آپڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو (جیسے جنگِ بدر میں ایسے بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی کہ کبھی ان کو اس کا احتمال عقلی بھی نہ ہوتا کہ یہ ہم پر غالب آسکیں گے) یا ان کو چلتے پھرتے (کسی آفت میں) پکڑ لے (جیسے کوئی مرض ہی دفعۃً آکھڑا ہو) سو (اگر ان امور میں سے کوئی امر ہو جائے تو) یہ لوگ خدا کو ہرا (بھی) نہیں سکتے یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑے (جیسے قحط و وبا پڑے اور تدریجاً خاتمہ ہو جائے، یعنی نڈر ہونا نہیں چاہئے، خدا کو سب قدرت ہے، مگر مہلت جو دی رکھی ہے) سو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تمہارا رب شفیق مہربان بڑا ہے (اس لئے مہلت دی ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور فلاح اور نجات کا طریق اختیار کر لو)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں کفار کو عذابِ آخرت سے ڈرایا گیا تھا ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُخْزِیْهِمْ ان آیات میں ان کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ جس زمین پر بیٹھے ہو اسی کے اندر دھنسا دیئے جاؤ، یا اور کسی بے گمان راستہ سے اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جیسے غزوۂ بدر میں ایک ہزار بہادر مسلح نوجوانوں کو چند بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ایسی سزا ملی جس کا ان کو کبھی وہم گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چلتے پھرتے کسی عذابِ الٰہی میں پکڑے جاؤ کہ کوئی بیماری جان لیوا آکھڑی ہو، یا کسی اونچی جگہ سے گر کر یا کسی سخت چیز سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاؤ، اور عذاب کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دفعۃً عذاب نہ آئے مگر مال اور صحت اور تندرستی اور اسبابِ راحت و سکون گھٹتے چلے جائیں، اسی طرح گھٹاتے گھٹاتے اس قوم کا خاتمہ ہو جائے۔

لفظ تخوّف جو اس آیت میں آیا ہے بظاہر خوف سے مشتق ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اسی معنی کے اعتبار سے یہ تفسیر کی ہے کہ ایک جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے تاکہ دوسری جماعت ڈر جائے، اسی طرح دوسری جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے جس سے تیسری جماعت

ڈر جائے، یوں ہی ڈراتے ڈراتے سب کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر مفسر القرآن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہاں لفظ تخوف کو تنقص کے معنی میں لیا ہے، اور اسی معنی کے اعتبار سے ترجمہ گھٹاتے گھٹاتے کیا گیا ہے۔

حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو بھی اس لفظ کے معنی میں تردد پیش آیا تو آپ نے برسرِ منبر صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لفظ تخوّف کے آپ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ عام مجمع خاموش رہا، مگر قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! یہ ہمارے قبیلہ کا خاص لغت ہے، ہمارے یہاں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی بتدریج گھٹانا، فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس نے عرض کیا کہ ہاں، اور اپنے قبیلہ کے شاعر ابو کبیر ہذلی کا ایک شعر پیش کیا، جس میں یہ لفظ بتدریج گھٹانے کے معنی میں لیا گیا تھا، اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ: لوگو! تم اشعارِ جاہلیت کا علم حاصل کرو، کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن فہمی کے لئے معمولی عربی دانی کافی نہیں

اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ معمولی طور پر عربی زبان بولنے لکھنے کی قابلیت قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس میں اتنی مہارت اور واقفیت ضروری ہے جس سے قدیم عرب جاہلیت کے کلام کو پورا سمجھا جا سکے، کیونکہ قرآن کریم اسی زبان اور انہی کے محاورات میں نازل ہوا ہے، اس درجہ کا ادب عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

عربی ادب سیکھنے کے لئے شعراءِ جاہلیت کا کلام پڑھنا جائز ہے اگرچہ وہ خرافات پر مشتمل ہو

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے زمانہ جاہلیت کی عربی زبان اور اس کا لغت و محاورات سمجھنے کے لئے شعراء جاہلیت کا کلام پڑھنا پڑھانا جائز ہے، گرچہ یہ ظاہر ہے کہ شعراء جاہلیت کا کلام جاہلانہ رسموں اور خلاف اسلام جاہلانہ افعال و اعمال پر مشتمل ہوگا، مگر قرآن فہمی کی ضرورت سے اس کا پڑھنا پڑھانا جائز قرار دیا گیا۔

دنیا کا عذاب بھی ایک طرح کی رحمت ہے

آیاتِ مذکورہ میں دنیا کے مختلف اقسامِ عذاب کا ذکر کرنے کے بعد خاتمہ آیت پر فرمایا فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، اس میں اول تو لفظ ربّ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے عذاب انسان کو متنبہ کرنے کے لئے شانِ ربوبیت کے تقاضے سے ہیں، پھر لام تاکید کے ساتھ حق تعالیٰ کا مشفق و مہربان ہونا بتلا کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ دنیا کی تنبیہات درحقیقت شفقت و رحمت ہی کے داعیہ سے ہیں تاکہ غافل انسان متنبہ ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح کر لے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ

کیا نہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ ڈھلتے ہیں سائے اس کے داہنی طرف

وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

سے اور بائیں طرف سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اور وہ عاجزی میں ہیں ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو

فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ

آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں سے اور فرشتے اور وہ

لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٩﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

تکبر نہیں کرتے ، ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں جو

يُؤْمَرُونَ ﴿٥٠﴾ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ

حکم پاتے ہیں ، اور کہہ دیا اللہ نے مت پکڑو معبود دو وہ معبود

إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٥١﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

ایک ہی ہے ، سو مجھ سے ڈرو ، اور اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین

وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُم مِّن

میں اور اسی کی عبادت ہے ہمیشہ سو کیا سوائے اللہ کے کسی سے ڈرتے ہو ، اور جو کچھ تمہارے پاس

نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿٥٣﴾

ہے نعمت سو اللہ کی طرف سے ، پھر جب پہنچتی ہے تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو ،

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

پھر جب کھول دیتا ہے سختی تم سے اسی وقت ایک فرقہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ لگتا ہے شریک بتلانے

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ وَ

کہ منکر ہو جائیں اس چیز سے جو کہ ہم نے ان کو دی ، سو مزے اڑا لو آخر معلوم کر لوگے ، اور

يَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَاللَّهِ

ٹھہراتے ہیں ان کے لئے جن کی خبر نہیں رکھتے ایک حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے قسم اللہ کی

۲۳

لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ

تم سے پوچھنا ہے جو تم بہتان باندھتے ہو اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں

سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝

وہ اس سے پاک ہے اور اپنے لئے جو دل چاہتا ہے

خلاصۂ تفسیر

کیا (ان) لوگوں نے اللہ کی ان پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھا (اور دیکھ کر توحید پر استدلال نہیں کیا) جن کے سائے کبھی ایک طرف کو کبھی دوسری طرف کو اس طور پر جھکتے جاتے ہیں کہ (بالکل خدا کے حکم کے تابع ہیں یعنی سائے کے اسباب کہ آفتاب کا نورانی ہونا اور سایہ دار جسم کا کثیف ہونا ہے اور حرکت سایہ کا سبب کہ آفتاب کی حرکت ہے، پھر سایہ کے خواص، یہ سب بحکم الٰہی ہے) اور وہ (سایہ دار چیزیں بھی اللہ کے روبرو) عاجز (اور تابع حکم) ہیں، اور (اس طرح یہ اشیاء مذکورہ جن میں حرکت ارادیہ نہیں جیسا کہ يَتَفَيَّؤُا کی اسناد ظلال کی طرف اس کا قرینہ ہے، کیونکہ متحرک بالارادہ میں سایہ کی حرکت خود اس متحرک بالارادہ کی حرکت سے ہوتی ہے حکم خدا کے تابع ہیں اسی طرح، اللہ ہی کے مطیع (محکوم ہیں) جتنی چیزیں (بالارادہ) چلنے والی آسمانوں میں (جیسے فرشتے) اور زمین میں (جیسے حیوانات) موجود ہیں اور (بالخصوص) فرشتے (بھی) اور وہ (فرشتے باوجود علو مکان و رفعت شان کے طاعت خداوندی سے) تکبر نہیں کرتے (اور اسی لئے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا باوجودیکہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ میں داخل تھے) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالادست ہے، اور ان کو جو کچھ (خدا کی طرف سے) حکم کیا جاتا ہے وہ اس کو کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے (تمام مکلفین کو بواسطہ رسل کے) فرمایا ہے کہ دو (یا زیادہ) معبود مت بناؤ بس ایک معبود ہی ہے (اور جب یہ بات ہے) تو تم لوگ خاص مجھ ہی سے ڈرا کرو (کیونکہ جب الوہیت میرے ساتھ خاص ہے تو جو اس کے لوازم ہیں کمال قدرت وغیرہ وہ بھی میرے ہی ساتھ خاص ہوں گے تو انتقام وغیرہ کا خوف مجھ ہی سے چاہئے اور شرک انتقام کو مستدعی ہے پس شرک نہ کرنا چاہئے) اور اسی کی (ملک) ہیں سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور لازمی طور پر طاعت بجا لانا اسی کا حق ہے (یعنی وہی اس امر کا مستحق ہے کہ سب اس کی طاعت بجا لاویں جب یہ بات ثابت ہے) تو کیا پھر بھی اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو، (اور ان سے ڈر کر انکو پوجتے ہو)

الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٠﴾

سب سے اوپر، اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔

ع ١٠ ١٣

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان میں کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر دی جاوے (جس کو اللہ کے لئے تجویز کرتے ہیں) تو (اس قدر ناراض ہو کہ) سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے (یعنی تولد دختر) اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے اور دل میں اتار چڑھاؤ کرے کہ آیا اس مولود جدید کو ذلت (کی حالت) پر لئے رہے یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت بری ہے (کہ اول تو خدا کے لئے اولاد ثابت کرنا، پھر کس قدر بری بات، پھر وہ بھی وہ جس کو خود اس قدر ذلیل و باعث عار سمجھیں پس) جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بری حالت ہے (دنیا میں بھی کہ ایسے جہل میں مبتلا ہیں اور آخرت میں بھی کہ مبتلائے عقوبت و ذلت ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو بڑے اعلیٰ درجہ کی صفات ثابت ہیں (نہ وہ جو کہ یہ مشرکین بکتے ہیں) اور وہ بڑے زبردست ہیں (اگر ان کو دنیا میں شرک کی سزا دینا چاہیں تو کچھ مشکل نہیں، لیکن ساتھ ہی بڑی حکمت والے (بھی ہیں بمقتضائے حکمت بعد موت تک سزا کو مؤخر فرما دیا ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں کفار عرب کی دو خصلتوں پر مذمت کی گئی ہے کہ اول تو وہ اپنے گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو اتنا برا سمجھتے ہیں کہ شرمندگی کے سبب لوگوں سے چھپتے پھریں، اور اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ لڑکی پیدا ہونے سے جو میری ذلت ہو چکی ہے اس پر صبر کروں یا اس کو زندہ درگور کر کے پیچھا چھڑاؤں، اور اس پر مزید جہالت یہ ہے کہ جس اولاد کو اپنے لئے پسند نہ کریں، اللہ جل شانہ کی طرف اسی کو منسوب کریں کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیں۔

دوسری آیت کے آخر میں اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ کا مفہوم تفسیر بحر محیط میں بحوالہ ابن عطیہ یہی دونوں خصلتیں قرار دی ہیں کہ ان لوگوں کا یہ فیصلہ بہت برا فیصلہ ہے کہ لڑکیوں کو ایک عذاب اور ذلت سمجھیں، دوسرے پھر جس چیز کو اپنے لئے ذلت سمجھیں اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں۔

تیسری آیت کے آخر میں وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ

مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ

تجھ سے پہلے پھر اچھے کر کے دکھلائے ان کو شیطان نے ان کے کام سو وہی رفیق ان کا ہے آج اور

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ

ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔ اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے تو

لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں اور سیدھی راہ سمجھانے کو اور واسطے بخشش ایمان لانے والوں کے

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ

اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے،

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سنتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم (یعنی شرک و کفر) کے سبب (فی الفور دنیا میں پوری) دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حس و حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے (بلکہ سب کو ہلاک کر دیتے) لیکن (فی الفور دارو گیر نہیں فرماتے بلکہ) ایک میعاد معین تک مہلت دے رہے ہیں (تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو گنجائش ہو) پھر جب ان کا (وہ) وقت معین (نزدیک) آ پہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً سزا ہو جاوے گی)، اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ امور تجویز کرتے ہیں جن کو خود (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں (جیسا اوپر آیا ہے وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ) اور (پھر) اس پر اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے جاتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے (برتقدیر وقوع قیامت) ہر طرح کی بھلائی ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھلائی کہاں سے آئی تھی بلکہ) لازمی بات ہے کہ ان کے لئے (قیامت کے دن) دوزخ ہے اور بیشک وہ لوگ (دوزخ میں) سب سے پہلے بھیجے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے کفر و جہالت پر کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ) بخدا آپ (کے زمانہ) سے پہلے جو امتیں ہو گذری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا (جیسا کہ آپ کو ان کے پاس بھیجا ہے) سو (جس طرح یہ لوگ اپنی کفریات کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قائم ہیں اسی طرح) ان کو بھی شیطان نے ان کے اعمال (کفریہ) مستحسن کر کے

دکھلائے پس وہ (شیطان) آج (یعنی دنیا میں) ان کا رفیق ہے (یعنی رفیق تھا کہ ان کو بہکاتا سکھاتا تھا پس دنیا میں تو ان کو یہ خسارہ ہوا) اور (پھر قیامت میں) ان کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے (غرض یہ لاحقین بھی ان سابقین کی طرح کفر کر رہے ہیں اور انہی کی طرح ان کو سزا بھی ہوگی آپ کیوں غم میں پڑے) اور ہم نے آپ پر یہ کتاب (جس کا نام قرآن ہے) اس واسطے نازل نہیں کی (کہ سب کا ہدایت پر لانا آپ کے ذمہ ہوتا کہ بعض کے ہدایت پر نہ آنے سے آپ مغموم ہوں، بلکہ) صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں (مثل توحید و معاد و احکام حلال و حرام) آپ (عام) لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں (یہ فائدہ تو قرآن کا عام ہے) اور ایمان والوں کی ہدایت (خاصہ) اور رحمت کی غرض سے (نازل فرمایا ہے سو یہ امور بفضلہ تعالیٰ حاصل ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا (یعنی اس کی قوت نامیہ کو بعد اس کے کہ خشک ہوجانے سے کمزور ہوگئی تھی تقویت دی) اس (امر مذکور) میں ایسے لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو (دل سے ان باتوں کو) سنتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ

اور تمہارے واسطے چوپایوں میں سوچنے کی جگہ ہے، پلاتے ہیں ہم تم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں

فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ (۶۶)

سے گوبر اور لہو کے بیچ میں سے دودھ ستھرا خوشگوار پینے والوں کے لئے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (نیز) تمہارے لئے مواشی میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر و خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ کہ ایک حصہ خون کا ہے، بعد ہضم کے جدا کرکے تھن کے مزاج سے ان کا رنگ بدل کر اس کو) صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (بناکر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

بُطُوْنِهٖ کی ضمیر اَنْعَام کی طرف راجع ہے لفظ اَنْعَام جمع مؤنث ہونے کا تقاضہ یہ تھا کہ بُطُوْنِهَا کہا جاتا جیساکہ سورۂ مؤمنون میں اسی طرح نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا فرمایا گیا ہے۔

قرطبی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ سورۂ مومنون میں معنی جمع کی رعایت کر کے ضمیر مؤنث لائی گئی اور سورۂ نحل میں لفظ جمع کی رعایت سے ضمیر مذکر مستعمل ہوئی۔ اور محاورات عرب میں اس کی نظیریں بے شمار ہیں کہ لفظ جمع کی طرف ضمیر مفرد راجع کی جاتی ہے۔

گوبر اور خون کے درمیان سے صاف دودھ نکلنے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جانور جو گھاس کھاتا ہے جب وہ اس کے معدہ میں جمع ہو جاتی ہے تو معدہ اس کو پکاتا ہے، معدہ کے اس عمل سے غذا کا فضلہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اوپر دودھ ہو جاتا ہے، اور اس کے اوپر خون، پھر قدرت نے یہ کام جگر کے سپرد کیا ہے کہ ان تینوں قسموں کو الگ الگ ان کے مقامات میں تقسیم کر دیتا ہے، خون کو الگ کر کے رگوں میں منتقل کر دیتا ہے اور دودھ کو الگ کر کے جانور کے تھنوں میں پہنچا دیتا ہے اور اب معدہ میں صرف فضلہ رہ جاتا ہے جو گوبر کی صورت میں نکلتا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ لذیذ اور شیریں کھانے کا استعمال زہد کے خلاف نہیں ہے جبکہ اس کو حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ کی گئی ہو، حضرت حسن بصری نے یہی فرمایا ہے (قرطبی)

مسئلہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کوئی کھانا کھاؤ تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَاَطْعِمْنَا خَيْرًا مِّنْهُ (یا اللہ ہمیں اس میں برکت عطا فرما اور آئندہ اس سے اچھا کھانا نصیب فرما) اور فرمایا کہ جب دودھ پیو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ (یا اللہ ہمارے لئے اس میں برکت دیجئے اور زیادہ عطا فرمائیے) اس سے بہتر کا سوال اس لئے نہیں کیا کہ انسانی غذا میں دودھ سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے، اسی لئے قدرت نے ہر انسان و حیوان کی پہلی غذا دودھ ہی بنائی ہے جو ماں کی چھاتیوں سے اسے ملتی ہے (قرطبی)

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا

اور میووں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور

وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ۶۷

روزی خاصی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (نیز) کھجور اور انگوروں (کی حالت میں غور کرنا چاہئے) کہ ان کے پھلوں سے تم لوگ

نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں (جیسے خرمے خشک و کشمش اور شربت اور سرکہ) بناتے ہو بیشک اس میں بھی توحید اور منعم ہونے کی ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دودھ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نُسْقِیْکُمْ استعمال فرمایا کہ ہم نے پلایا دودھ۔

اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا بھی کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزقِ حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور اس سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے، یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور چیز یعنی شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت تو نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا گیا کہ "سَکَر" کے مقابل "رزق حسن" رکھا جس سے معلوم ہوا کہ "سَکَر" اچھا رزق نہیں ہے، سَکَر کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں (روح المعانی، قرطبی، جصا

؎ بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص و قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

یہ آیت باتفاق امت مکی ہے اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزول آیت کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحۃً شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہوگئے (ملخص از جصاص و قرطبی)

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ

اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنالے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں

الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ

اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں، پھر کھا ہر طرح کے میووں سے پھر چل

سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ

راستوں میں اپنے رب کے صاف پڑے ہیں نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف

اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ

رنگ ہیں اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کیلئے

يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۶۹

جو دھیان کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر (یعنی چھتہ) بنالے اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں (بھی چھتہ لگالے چنانچہ ان سب موقعوں پر وہ چھتہ لگاتی ہے) پھر ہر قسم کے (مختلف) پھلوں سے (جو تجھ کو مرغوب ہوں) چوستی پھر، پھر (چوس کر چھتہ کی طرف واپس آنے کے لئے) اپنے رب کے راستوں میں چل جو (تیرے لئے باعتبار چلنے کے اور یاد رہنے کے) آسان ہیں، (چنانچہ بڑی بڑی دور سے بے راستہ بھولے ہوئے اپنے چھتے کو لوٹ آتی ہے، پھر جب چوس کر اپنے چھتہ کی طرف لوٹتی ہے تو) اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (یعنی شہد) جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں کہ اس میں لوگوں (کی بہت سی بیماریوں) کیلئے شفا ہے اس میں بھی ان لوگوں کیلئے (توحید کی اور منعم ہونے کی، بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں،

معارف ومسائل

اَوْحٰی وحی یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ لغوی معنی میں ہے، وہ یہ کہ متکلم مخاطب کو کوئی خاص بات مخفی طور پر اس طرح سمجھا دے کہ دوسرا شخص اس بات کو نہ سمجھ سکے۔

اَلنَّحْلِ، شہد کی مکھی اپنی عقل وفراست اور حسن تدبیر کے لحاظ سے تمام حیوانات میں ممتاز جانور ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان کا کیا ہے، باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے طور پر اَعْطٰی كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى فرمایا، لیکن اس ننھی سی مخلوق کے بارے میں خاص کرکے اَوْحٰى رَبُّكَ فرمایا، جس سے اشارہ اس بات کی طرف کردیا کہ یہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت عقل وشعور اور سوجھ بوجھ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

شہد کی مکھیوں کی فہم وفراست کا اندازہ ان کے نظام حکومت سے بخوبی ہوتا ہے، اس ضعیف جانور کا نظام زندگی انسانی سیاست وحکمرانی کے اصول پر چلتا ہے، تمام نظم ونسق ایک بڑی مکھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جو تمام مکھیوں کی حکمران ہوتی ہے، اس کی تنظیم اور تقسیم کار کی وجہ سے پورا نظام صحیح سالم چلتا رہتا ہے، اس کے عجیب وغریب نظام اور مستحکم قوانین وضوابط کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، خود یہ "ملکہ" تین ہفتوں کے عرصہ میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے، یہ اپنی قد وقامت اور وضع وقطع کے لحاظ سے دوسری مکھیوں سے ممتاز ہوتی ہے، یہ ملکہ تقسیم کار کے اصول پر اپنی رعایا کو مختلف امور پر مامور کرتی ہے، ان میں سے بعض دربانی کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور کسی نامعلوم اور خارجی فرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتیں، بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، بعض نابالغ بچوں کی تربیت کرتی ہیں، بعض معماری اور انجینئرنگ کے فرائض ادا کرتی ہیں، ان کے تیار کردہ اکثر چھتوں کے خانے بیس ہزار سے تیس ہزار تک ہوتے ہیں، بعض موم جمع کرکے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہیں جس سے وہ اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں، یہ موم نباتات پر جمے ہوئے سفید قسم کے سفوف سے حاصل کرتی ہیں، گنے پر یہ مادہ بکثرت نظر آتا ہے، ان میں سے بعض مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں پر بیٹھ کر اس کو چوستی ہیں، جو ان کے پیٹ میں شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے، یہ شہد ان کی اور ان کے بچوں کی غذا ہے، اور یہی ہم سب کے لئے بھی لذت وغذا کا جوہر اور دوا وشفاء کا نسخہ ہے، یہ مختلف پارٹیاں نہایت سرگرمی سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور اپنی "ملکہ" کے حکم کو دل وجان سے قبول کرتی ہیں، ان میں سے اگر کوئی گندگی پر بیٹھ جائے تو چھتے کے دربان اسے باہر روک لیتے ہیں، اور ملکہ اس کو قتل کردیتی ہے، ان کے اس حیرت انگیز نظام اور حسن کارکردگی کو دیکھ کر انسان

حیرت میں پڑجاتا ہے (از الجواہر)

بُیُوۡتًا۔ شہد کی مکھی کو جو ہدایت دی گئی ہے ان میں سے یہ پہلی ہدایت ہے جس میں گھر بنانے کا ذکر ہے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر جانور اپنے رہنے سہنے کے لئے گھر تو بناتا ہی ہے، پھر اس اہتمام سے "گھروں" کی تعمیر کا حکم مکھیوں کو دینے میں کیا خصوصیت ہے، پھر یہاں لفظ بیوت کا استعمال فرمایا جو عموماً انسانی رہائش گاہوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے اشارہ ایک تو اس طرف کر دیا کہ مکھیوں کو چونکہ شہد تیار کرنا ہے، اس کے لئے پہلے سے ایک محفوظ گھر بنالیں، دوسرے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو گھر یہ بنائیں گی وہ عام جانوروں کے گھروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ساخت و بناوٹ غیر معمولی قسم کی ہوگی چنانچہ ان کے گھر عام جانوروں کے گھروں سے ممتاز ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر انسانی عقل بھی ششدر رہ جاتی ہے، ان کے گھر مسدس شکل کے ہوتے ہیں پرکار اور مسطر سے بھی اگر ان کی پیمائش کی جائے تو بال برابر بھی فرق نہیں۔ مسدس شکل کے علاوہ وہ دوسری کسی شکل مثلاً مربع اور مخمس وغیرہ کو اس لئے اختیار نہیں کرتیں کہ ان کے بعض کونے بیکار رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو محض گھر بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا محل وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ کسی بلندی پر ہونا چاہئے کیونکہ ایسے مقامات پر شہد کو تازہ اور صاف ہوا پہنچتی رہتی ہے اور وہ گندی ہوا سے بچی رہتی ہے، اور توڑ پھوڑ سے بھی محفوظ رہتی ہے، چنانچہ فرمایا:

مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ۔ یعنی ان گھروں کی تعمیر پہاڑوں درختوں اور بلند عمارتوں پر ہونی چاہئے، تاکہ شہد بالکل محفوظ طریقے سے تیار ہو سکے۔

ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ، یہ دوسری ہدایت ہے جس میں مکھی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق پھل پھول سے رس چوسے، یہاں مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فرمایا، لیکن بظاہر یہاں لفظ "کل" سے دنیا بھر کے پھل پھول مراد نہیں ہیں، بلکہ جن تک آسانی سے اس کی رسائی ہو سکے، اور مطلب حاصل ہو سکے۔ "کل" کا یہ لفظ ملکہ سبا کے واقعہ میں بھی وارد ہوا ہے وَ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی استغراق کلی مراد نہیں ہے، کہ ملکہ سبا کے پاس ہوائی جہاز اور ریل موٹر ہونا بھی لازم آئے، بلکہ اس وقت کی تمام ضروریات و مناسب مراد ہیں، یہاں بھی مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ سے یہی مراد ہے۔ یہ مکھی ایسے ایسے لطیف اور قیمتی اجزا چوستی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں مشینوں سے بھی وہ جوہر نہیں نکالا جا سکتا۔

فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا، یہ مکھی کو تیسری ہدایت دی جا رہی ہے کہ اپنے رب کے ہموار کئے ہوئے راستوں پر چل پڑ، یہ جب گھر سے دور دراز مقامات پر پھل پھولوں کا رس چوسنے

کہ یہ بہترین فیصلہ اپنی زبان حال سے پکار پکار کر گویا ہیں کہ ہمارا ایک خالق ہے، یکتا و حکمت والا خالق، وہی عبادت و بندگی کا مستحق ہے، وہی مشکل کشا ہے، اور شکر و حمد اسی کو سزاوار ہے۔

فوائد (۱) آیت سے معلوم ہوا کہ عقل و شعور انسانوں کے علاوہ دوسرے جانداروں میں بھی ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ، البتہ عقل کے درجات مختلف ہیں انسان کی عقل تمام ذی حیات اشیاء کی عقول سے زیادہ کامل ہے، اسی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کا مکلف ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر جنون کی وجہ سے انسان کی عقل میں فتور آ جائے تو دوسری مخلوقات کی طرح وہ بھی مکلف نہیں رہتا۔

(۲) شہد کی مکھی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی فضیلت میں حدیث وارد ہوئی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلذُّبَابُ كُلُّهَا فِي النَّارِ يَجْعَلُهَا عَذَابًا لِاَهْلِ النَّارِ اِلَّا النَّحْلَ،
(نوادر الاصول از قرطبی)

"یعنی دوسری ایذا رساں جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جائیں گی، جو وہاں جہنمیوں پر بطور عذاب مسلط کر دی جائیں گی، مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جائے گی"

نیز ایک حدیث میں آپ نے اس کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابو داؤد)

(۳) ارباب علم کا اس میں کلام ہے کہ شہد مکھی کا فضلہ ہے یا اس کا لعاب ہے، ارسطاطالیس نے شیشے کا ایک نفیس چھتہ بنا کر مکھیوں کو اس میں بند کر دیا تھا، وہ ان کے نظام کار کو جاننا چاہتا تھا، لیکن ان مکھیوں نے سب سے پہلے برتن کے اندرونی حصہ پر موم اور کیچڑ کا پردہ چڑھا دیا اور جب تک پوری طرح پردہ پوش نہیں ہو گئیں اس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دنیا کی حقارت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

اَشْرَفُ لِبَاسِ بَنِيْ اٰدَمَ فِيْهِ لُعَابُ دُوْدَةٍ وَّاَشْرَفُ شَرَابِهٖ رَجِيْعُ نَحْلَةٍ،

"انسان کا بہترین ریشمی لباس اسی کی ایک چھوٹے سے کیڑے کا لعاب ہے، اور اس کا نفیس لذت بخش مشروب مکھی کا فضلہ ہے"

(۴) فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوا سے مرض کا علاج کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بطور انعام ذکر کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، حدیث میں دوا استعمال کرنے اور علاج کرنے کی ترغیب آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض حضرات نے سوال کیا کہ کیا ہم دوا استعمال کریں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، علاج کیا کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی مرض پیدا کیا ہے اس کے لئے دوا بھی پیدا فرمائی ہے، مگر ایک مرض کا علاج نہیں، انھوں نے سوال کیا وہ مرض کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا بڑھاپا (ابوداؤد والترمذی بحوالہ قرطبی)

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ جو ہم جھاڑ پھونک کا عمل کرتے ہیں یا دوا سے اپنا علاج کرتے ہیں، اسی طرح بچاؤ اور حفاظت کے جو انتظامات کرتے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ بھی تو تقدیر ہی کی صورتیں ہیں۔

غرض یہ کہ علاج کرنے اور دوا استعمال کرنے کے جواز پر تمام علماء متفق ہیں، اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی اولاد میں اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تھا تو اُسے تریاق پلاتے تھے، اور جھاڑ پھونک سے اس کا علاج فرماتے، آپ نے لقوہ کے مریض پر داغ لگا کر اس کا علاج کیا (قرطبی)

بعض صوفیاء کے متعلق منقول ہے کہ وہ علاج کو پسند نہیں کرتے تھے، اور حضرات صحابہ میں سے بھی بعض کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے، مثلاً روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور ان سے پوچھا، آپ کو کیا شکایت ہے؟ انھوں نے جواب دیا مجھے اپنے گناہوں کی فکر ہے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا پھر کس چیز کی خواہش ہے؟ فرمایا میں اپنے رب کی رحمت کا طلبگار ہوں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا آپ پسند کریں تو میں طبیب کو بلا دیتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا، طبیب ہی نے تو مجھے لٹایا ہے (یعنی مجازی طور پر طبیب سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں)

لیکن اس قسم کے واقعات اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ حضرات علاج کو مکروہ سمجھتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت اُن کے ذوق کو گوارہ نہیں تھا، اس لئے طبیعت کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے پسند نہیں کیا، یہ وقتی طور پر غلبۂ حال کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کو علاج کے ناجائز یا مکروہ ہونے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، حضرت عثمانؓ کا حضرت ابن مسعودؓ سے درخواست کرنا کہ میں آپ کے لئے طبیب لے آتا ہوں خود اس بات کی دلیل ہے کہ علاج جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں یہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ
اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے نکمی عمر
الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۷۰)
کو تاکہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے، اللہ خبردار ہے قدرت والا۔

ع ۹ ۵ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

(اور اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا پھر (عمر ختم ہونے پر) تمہاری جان قبض کرتا ہے (جن میں بعض تو ہوش و حواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو نکمی عمر تک پہنچائے جاتے ہیں (جن میں نہ قوتِ جسمانیہ رہی نہ قوتِ عقلیہ رہی) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتے ہیں (جیسا کہ اکثر ایسے بڈھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھ رہے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مصلحت جانتے ہیں، اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں، بس یہ بھی دلیل ہے توحید کی)۔

معارف و مسائل

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے پانی، نباتات، چوپائے اور شہد کی مکھی کے مختلف احوال بیان فرما کر انسان کو اپنی قدرت کاملہ اور مخلوق کے لئے اپنے انعامات پر متنبہ کیا، اب ان آیات سے اس کو اپنے اندرونی حالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کچھ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود کی دولت سے نوازا، پھر جب چاہا موت بھیج کر وہ نعمت ختم کر دی، اور بعضوں کو تو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے، ان کے ہاتھ پاؤں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کوئی بات سمجھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھی ہوئی یاد رکھ سکتے ہیں، یہ آفاقی اور انفسی تغیر و تبدل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم و قدرت اسی ذات کے خزانہ میں ہے جو خالق و مالک ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ، مَنْ يُّرَدُّ کے لفظ سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان پر پہلے بھی ایک ضعف و کمزوری کا وقت گزر چکا ہے، یہ اس کے بچپن کا ابتدائی دور تھا جس

تھی یہ کسی سوجھ بوجھ کا بھی نہ تھا، اس کے قویٰ بالکل ضعیف و ناتواں تھے، یہ اپنی بھوک پیاس کو دور کرنے اور اپنے اُٹھنے بیٹھنے میں غیروں کا محتاج تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جوانی عطا کی یہ اس کی ترقی کا زمانہ ہے پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑھاپے کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جس میں یہ بالکل اسی طرح کمزوری، ضعف اور اضمحلال کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جیسا کہ بچپن میں تھا۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، اس سے مراد بڑھاپے کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ مختل ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْٓءِ الْعُمُرِ وَفِیْ رِوَایَةٍ مِّنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔	"یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بُری عمر سے، اور ایک روایت میں ہے کہ پناہ مانگتا ہوں ارذل عمر سے۔"

ارذل العمر کی تعریف میں کوئی تعیین نہیں ہے، البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے، جس کی طرف قرآن نے بھی لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش و حواس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے

ارذل العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں، بعض نے اسّی سال کی عمر کو ارذل العمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوّے سال کو، حضرت علیؓ سے بھی پچھتّر سال کا قول منقول ہے، (صحیحین بحوالہ مظہری)

لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا، بڑھاپے کے انتہائی درجہ میں پہنچنے کے بعد آدمی میں نہ قوت جسمانیہ رہتی ہے اور نہ ہی عقلیہ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے، وہ تمام معلومات بھول کر بالکل کل کے بچے کی مانند ہو جاتا ہے جس کو نہ علم و خبر ہے اور نہ ہی فہم و فراست، حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ہوگی

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی قدرت والے ہیں۔ (علم سے ہر شخص کی عمر کو جانتے ہیں اور قدرت سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، اگر چاہیں تو طاقتور نوجوان پر ارذل العمر کے آثار طاری کر دیں، اور چاہیں تو سو سال کا معمر انسان بھی طاقتور جوان رہے، یہ سب کچھ اسی ذات کے دستِ قدرت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو

فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ

بڑائی دی وہ نہیں پہنچادیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک اُن کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب

سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

اس میں برابر ہوجائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اثباتِ توحید کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں سنو کہ) اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق (کے باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنا دیا، کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو دے نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے (کہ ان کے پاس مال بھی ہو اور غلام بھی ہیں) وہ (لوگ) اپنے حصّہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہو جائیں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کرکے دیا تو مساوات ممکن ہو مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بُت وغیرہ جب باعترافِ مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے معبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہو جاویں گے، اس میں شرک کی انتہائی تقبیح ہے کہ جب تمھارے غلام تمھارے شریکِ رزق نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریکِ الوہیت کیسے ہو سکتے ہیں) کیا (یہ مضامین سنکر) پھر بھی (خدائے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفاتِ علم و قدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا، اس آیت میں اسی مضمونِ توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسانی مصالح کے پیش نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا، بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور مختلف درجات قائم فرمائے، کسی کو ایسا غنی بنادیا جو ساز و سامان کا مالک ہے، حشم و خدم، غلام و خدمتگار رکھتا ہے، وہ خود بھی اپنی منشاء کے مطابق خرچ کرتا ہے، اور غلاموں، خدمتگاروں کو بھی اس کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو غلام و خدمتگار بنادیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا ہے، اور کسی کو متوسط الحال بنایا، نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے، نہ اتنا فقیر و محتاج کہ اپنی ضروریات میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا یہ اثر سب کے مشاہدہ میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں، خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کردے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہو جائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بت اور دوسری مخلوقات جن کی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک اپنے خالق و مالک کے برابر ہو جائیں، کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں دیکھ کر اور یہ مضامین سنکر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور برابر قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود تراشیدہ بت کا یا کسی انسان اور جن کا کوئی دخل نہیں ہے تو پھر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے؟

یہی مضمون سورۂ روم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ، (سورۂ روم آیت ۲۸) "تمہارے لئے تم ہی میں سے ایک مثال دی ہے، جو لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں تمہارے شریک ہیں کہ تم اس میں برابر ہو گئے ہو"۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے برابر ہو جائیں۔

معاش میں درجات کا اختلاف انسانوں کے لئے رحمت ہے

اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنیٰ اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہو کوئی امیر

کوئی متوسط الحال، یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہے اور انسانی مصالح کا مقتضیٰ اور انسانوں کے لئے رحمت ہے، اگر یہ صورت نہ رہے، اور مال وسامان میں سب انسان برابر ہو جائیں تو نظامِ عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے گا، اسی لئے جب سے دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب انسان مال ومتاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے، اور نہ ہو سکتے ہیں، اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہو جائے گا، حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل ودماغ اور قوت وطاقت اور صلاحیتِ کار میں مختلف مزاجوں پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں ادنیٰ، اعلیٰ، متوسط کی اقسام ہیں، جس کا کوئی صاحبِ عقل انکار نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال ومتاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا صلہ پائے، اور اگر اہل صلاحیت اور نااہل کو برابر کر دیا گیا تو اہلِ صلاحیت کی حوصلہ شکنی ہوگی، جب معیشت میں اس کو نااہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کونسا داعیہ ہے جو اسے جدوجہد اور فکر وعمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیتِ کار کو برباد کرنا ہوگا۔

ارتکازِ دولت کے خلاف قرآنی احکام

البتہ خالقِ کائنات نے جہاں عقلی وجسمانی قوتوں میں بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں تفاوت قائم فرمایا، وہیں معاش کا یہ لازمی محکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسبِ معاش کے مرکزوں پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کر لے، دوسرے اہلِ صلاحیت کے کام کرنے کا میدان ہی باقی نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر معاش میں ترقی کر سکیں، اس کے لئے قرآن کریم سورۂ حشر میں ارشاد فرمایا، کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ "یعنی ہم نے تقسیمِ دولت کا قانون اس لئے بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے"

آجکل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے وہ اس ربانی قانونِ حکمت کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے، ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر سود وقمار کے راستہ سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام بنانے پر مجبور کر دیتی ہیں، ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا، وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود صنعت وتجارت کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم وجور کے ردّ عمل کے طور پر ایک متضاد نظامِ اشتراکیت کمیونزم یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے، جس کا نعرہ غریب وامیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب

میں مساوات پیدا کرنا ہے، لیکن ملک سرمایہ داری کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا، معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، اور غریب اپنی غربت اور فقر و فاقہ کے ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترام انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا، نظام اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر قیمت مشین کے ایک پرزے سے زائد نہیں، کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں، اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں، بلکہ سب ریاست کی مشین کے کل پرزے ہیں جن کو مشین اسٹارٹ ہوتے ہی اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا ان کا کوئی ضمیر ہے نہ آواز، ریاست کے جبر و تشدد اور ناقابل برداشت محنت سے کراہنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے، جس کی سزا موت ہے، خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظام اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا، ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں، کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنا سکتے ہیں (؟) ...

قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور احمقانہ اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت عامۂ مخلوق کو اپنا غلام نہ بنا سکے، اور مصنوعی گرانی اور قحط میں مبتلا نہ کر سکے، سود اور جوئے کو حرام قرار دے کر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی، پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا، جو غریبوں پر احسان نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے، آیت فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ اس پر شاہد ہے، پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افراد خاندان میں تقسیم کر کے ارتکاز دولت کا خاتمہ کر دیا، قدرتی چشموں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خودرو پیداوار کو تمام خلق خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا، جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں، جب کہ سرمایہ داری نظام میں یہ سب چیزیں صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دیدی گئی ہیں۔

چونکہ علمی عملی صلاحیتوں کا متفاوت اور مختلف ہونا ایک امر فطری ہے، اور تحصیل معاش بھی انہی صلاحیتوں کے تابع ہے، اس لئے مال و دولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے، جس کو دنیا کا کچھ بھی عقل و شعور ہو وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور مساوات کے نعرے لگانے والے بھی چند قدم چلنے کے بعد اس مساوات کے دعوے

کو چھوڑنے اور معیشت میں تفاوت و تفاضل پیدا کرنے پر مجبور ہوگئے۔

خروشیف نے ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو سپریم سوویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں، ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں۔ یہ لینن کی تعلیم ہے' اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا"

(سوویٹ ورلڈ، ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدم مساوات تو ابتدا ہی سے سامنے آگئی تھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

لیون شیڈو لکھتا ہے:

"شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا تفاوت ہو جتنا روس میں ہے"۔

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ کی جبری تصدیق منکرین کی زبانوں سے کرادی وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔ یہاں اس آیت کے تحت تو صرف اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق ہے، باقی تقسیم دولت کے اسلامی اصول، اور سرمایہ داری و اشتراکیت دونوں سے اس کا امتیاز تو انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ زخرف پارہ نمبر ۲۵ آیت نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ کے تحت میں آئے گا، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ بھی کافی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں اور دیئے تم کو تمہاری

اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ

عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دیں تم کو ستھری چیزیں سو کیا جھوٹی

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ

باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے، اور پوجتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کے سوائے ایسوں کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین سے

شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ

کچھ بھی اور نہ قدرت رکھتے ہیں، سو مت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں، بیشک

اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اللہ نے بتلائی ایک مثال ایک بندہ

مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ

پرایا مال نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے خاصی روزی

يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ

وہ خرچ کرتا ہے اس میں سے چھپا کر اور سب کے روبرو، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہے، پر

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ

بہت لوگ نہیں جانتے۔ اور بتلائی اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں

اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ

ایک گونگا کچھ کام نہیں کر سکتا، اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب پر

اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ

جس طرف اس کو بھیجے نہ کر کے لائے کچھ بھلائی، کہیں برابر ہے وہ اور ایک وہ شخص جو حکم

بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

کرتا ہے انصاف سے اور ہے سیدھی راہ پر۔

ع ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک بڑی نعمت اور دلیلِ قدرت اللہ تعالیٰ کی خود تمہارا وجود و بقاءِ شخصی و نوعی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے (یعنی تمہاری جنس اور نوع سے) تمہارے لئے بیبیاں بنائیں اور (پھر) ان بیبیوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے

(کہ یہ بقاء نوعی ہے، اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں (کہ یہ بقاء شخصی ہوا اور چونکہ بقاء موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا) کیا (یہ سب دلائل و نعم سنکر) پھر بھی بے بنیاد چیز پر (یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل ہے) ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بے قدری) کرتے رہیں گے، اور (مطلب اس ناشکری کا یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو اُن کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش برسانے کا ان کو اختیار ہے نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی) قدرت رکھتے ہیں (اس کی نفی سے زیادہ مبالغہ ہوگیا، کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص بالفعل تو بااختیار نہیں ہے لیکن جد و جہد سے اختیارات حاصل کر لیتا ہے، اس لئے اس کی بھی نفی فرما دی) سو (جب شرک کا بطلان ثابت ہوگیا تو) تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گھڑو (کہ اللہ تعالیٰ کی مثال بادشاہان دنیا کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے عرض حاجت نہیں کرسکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں کہ عوام ان سے عرض حاجت کرتے ہیں، پھر وہ سلاطین سے عرض کرتے ہیں کذا فی الکبیر و ہو ماخوذ من قولہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا وَهٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں محض مہمل ہیں) اور تم (بوجہ عدم تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو بک ڈالتے ہو اور) اللہ تعالیٰ (شرک کے بطلان ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو) غلام ہے (کسی کا) مملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا (بلا اجازت آقا) اختیار نہیں رکھتا اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی تو اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے (اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں (پس جب مالک مجازی و مملوک مجازی برابر نہیں ہو سکتے، تو مالک حقیقی و مملوک حقیقی تو کب برابر ہو سکتے ہیں اور استحقاق عبادت موقوف ہے مساوات پر، اور وہ ہے نہیں) ساری تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں (کیونکہ کامل الذات والصفات وہی ہیں پس معبود بھی وہی ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی مشرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے) بلکہ ان میں اکثر تو (بوجہ عدم تدبر کے) جانتے ہی نہیں (اور چونکہ عدم علم کا سبب خود ان کا عدم تدبر ہے اس لئے معذور نہ ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ (اس کی توضیح کے لئے) ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں ایک تو (علاوہ غلام ہونے کے) گونگا (بہرا بھی) ہے (اور بوجہ بہرے اندھے بے عقل ہونے کے)

کوئی کام نہیں کرسکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبال جان ہے (کہ وہ مالک ہی اس کے سارے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کرکے نہیں لاتا، (یعنی خود تو کیا کرتا دوسروں کی تعلیم سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا ہو) کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو (جس سے اس کا ناطق، عاقل، صاحب قوت علمیہ ہونا معلوم ہوتا ہے) اور خود بھی (ہر امر میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو، جس سے قوت عملیہ منتظمہ معلوم ہوتی ہے، جب مخلوق مخلوق میں باوجود اشتراک ماہیت و اشتراک اوصاف کے یہ تفاوت ہے تو کجا مخلوق و خالق، اور لایقدر کے ترجمہ میں بلا اجازت آقا کی قید سے جو سالقہ آیت میں ہے نفی شبہات مندفع ہوگئے، اور کوئی وسوسہ میں نہ پڑے کہ شاید معبود غیر اللہ کو بھی اذن ہوگیا ہو، جواب یہ ہے کہ ربوبیت کے لئے کسی کو اذن نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا، اس آیت میں ایک اہم نعمت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس اور قوم میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں، تاکہ باہمی موانست بھی پوری ہو، اور نسل انسانی کی شرافت و بزرگی بھی قائم رہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیبیں تمہاری ہی جنس کی ہیں ان کی ضروریات اور جذبات بھی تمہارے ہی جیسے ہیں، ان کی رعایت تم پر لازم ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً، یعنی تمہاری بیبیوں سے ہم نے تمہارے بیٹے پوتے پیدا کئے"

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اولاد تو ماں باپ دونوں ہی سے مل کر پیدا ہوتی ہے، اس آیت میں اس کو صرف ماؤں سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ بچے کی تولید و تخلیق میں بہ نسبت باپ کے ماں کا دخل زیادہ ہے، باپ سے تو صرف ایک قطرہ بے جان نکلتا ہے، اس قطرہ پر مختلف قسم کے دور گزرتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہونا اور اس میں جان پڑنا قدرت کے ان سارے تخلیقی کارناموں کا محل تو ماں کا پیٹ ہی ہے، اسی لئے حدیث میں ماں کے حق کو باپ کے حق پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس جملے میں بیٹوں کے ساتھ پوتوں کا ذکر فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس جوڑے بنانے کا اصل مقصد نسل انسانی کی بقاء ہو کہ اولاد پھر اولاد کی اولاد ہوتی رہے تو یہ انسان کی بقاء نوعی کا سامان ہوا۔

پھر وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ میں اس کی بقاءِ شخصی کے سامان کا ذکر فرمادیا کہ انسان پیدا ہو جائے تو پھر اس کی بقاءِ شخصی کے لئے غذاء کی ضرورت ہے، وہ بھی حق تعالیٰ نے مہیا فرمادی، آیت میں لفظ حَفَدَة کے اصلی معنی مددگار اور خدمت گار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہئے (قرطبی)

فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں ایک اہم حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس سے غفلت برتنا ہی تمام کافرانہ شکوک وشبہات کو جنم دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حق تعالیٰ کو اپنے بنی نوع انسان پر قیاس کر کے ان میں سے اعلیٰ ترین انسان مثلاً بادشاہ و فرمانروا کو اللہ تعالیٰ کی مثل قرار دیتے ہیں، اور پھر اس غلط بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے نظامِ قدرت کو بھی انسانی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کر کے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح کسی سلطنت و حکومت میں اکیلا بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کرسکتا بلکہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے افسروں کو اختیارات سپرد کر کے ان کے ذریعہ نظمِ مملکت چلایا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے ماتحت کچھ اور معبود بھی ہوں جو اللہ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں، یہی تمام بت پرست اور مشرکین کا عام نظریہ ہے، اس جملے نے ان کے شبہات کی جڑ قطع کر دی، کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق کی مثالیں پیش کرنا خود بے عقلی ہے، وہ مثال و تمثیل اور ہمارے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔

آخری دو آیتوں میں انسان کی جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں سے پہلی مثال میں تو آقا اور غلام یعنی مالک اور مملوک کی مثال دے کر بتلایا کہ جب یہ دونوں ایک ہی جنس، ایک ہی نوع کے ہوتے ہوئے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے تو کسی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیسے برابر ٹھہراتے ہو۔

اور دوسری مثال میں ایک طرف ایک انسان ہے، جو لوگوں کو عدل و انصاف اور اچھی باتیں سکھاتا ہے، جو اس کی قوتِ علمیہ کا کمال ہے، اور خود بھی معتدل اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے، جو اس کی قوتِ عملیہ کا کمال ہے، اس علمی اور عملی قوت میں مکمل انسان کے بالمقابل وہ انسان ہے جو نہ خود اپنا کام کرسکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کوئی کام درست کرسکتا ہے، یہ دونوں قسم کے انسان ایک ہی جنس ایک ہی نوع ایک ہی برادری کے ہونے کے باوجود آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، تو خالق و مالکِ کائنات جو حکیم مطلق اور قادرِ مطلق اور علیم و خبیر ہے اس کے ساتھ کوئی مخلوق کیسے برابر ہوسکتی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ

اور اللہ ہی کے پاس ہیں بھید آسمانوں اور زمین کے اور قیامت کا کام تو ایسا ہے جیسے لپک

الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۷۷) وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ

نگاہ کی یا اس سے بھی قریب اللہ ہر چیز پر قادر ہے ، اور اللہ نے تم کو نکالا

مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان اور

الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۸) اَلَمْ يَرَوْا اِلَى

آنکھیں اور دل ، تاکہ تم احسان مانو ، کیا نہیں دیکھے

الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ

اُڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوا میں کوئی نہیں تھام رہا ان کو سوائے اللہ کے اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷۹) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ، اور اللہ نے بنا دیئے تم کو تمہارے گھر

سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ

بسنے کی جگہ اور بنا دیئے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن

ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ

سفر میں ہو اور جس دن گھر میں ہو ، اور بھیڑوں کی اُون سے اور اونٹوں کی برو سے اور بکریوں کے بالوں

اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۸۰) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا

سے کتنے اسباب استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ، اور اللہ نے بنا دیئے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سائے

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ

اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں اور بنا دیئے تم کو کرتے جو بچاؤ ہیں

الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

گرمی میں اور کرتے جو بچاؤ ہیں لڑائی میں ، اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ﴿٨١﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ﴿٨٢﴾ يَعْرِفُونَ

تاکہ تم حکم مانو ، پھر اگر پھر جاویں تو تیرا کام تو یہی ہے کھول کر سنا دینا ، پہچانتے ہیں

نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُونَ ﴿٨٣﴾

اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں اور بہت ان میں ناشکر ہیں ۔

ع ۱۱ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں (جو کسی کو معلوم نہیں باعتبار علم کے اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں (تو صفت علم میں وہ کامل ہیں) اور (قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیوب میں سے جو ایک امر عظیم ہے یعنی قیامت (اس) کا معاملہ بس ایسا (جھٹ پٹ) ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدی (قیامت کے معاملہ سے مراد ہے مُردوں میں جان پڑنا اور اس کا بہ نسبت آنکھ جھپکنے کے جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت زمانی ہوتی ہے، اور جان پڑنا آنی ہے، اور آنی ظاہر ہے کہ زمانی سے اسرع ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور اثبات قدرت کے لئے تخصیص قیامت کی شاید اس وجہ سے کی ہو کہ وہ منجملہ غیوب خاصہ کے بھی ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں کی دلیل ہے، قبل الوقوع تو علم کی، اور بعد الوقوع قدرت کی) اور (منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے (اس درجہ کا نام فلسفہ کی اصطلاح میں عقل ہیولانی ہے) اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (استدلال علی القدرت کے لئے) کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تلے) فضا میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) انکو (اس جگہ) کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے (ورنہ ان کے اجسام کا ثقیل ہونا اور مادہ ہوا کا رقیق و لطیف ہونا طبعاً مقتضی اس کو ہے کہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس امر مذکور میں) ایمان والوں کے لئے (قدرت الٰہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں (چند نشانیاں اس لئے فرمایا کہ پرندوں کو خاص وضع پر پیدا کرنا جس سے اڑنا ممکن ہو ایک دلیل ہے، پھر فضاء کو ایسے طرز پر پیدا کرنا جس میں اڑنا ممکن ہو دوسری دلیل ہے، پھر بالفعل اس طیران کا وقوع تیسری دلیل ہے اور جن اسباب کو طیران میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان اسباب پر مسبب یعنی طیران کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیتِ الٰہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی

ہوتا ہے کہ کسی چیز کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا فرمایا گیا، اور منجملہ وجوہ نعمت و دلائل قدرت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالتِ حضر میں) تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالتِ سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب سہل معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اُون اور ان کے رُووؤں اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عادۃً یہ سامان بہ نسبت روئی کے کپڑوں کے دیرپا ہوتا ہے، اور منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعضی مخلوقات کے سائے بنائے (جیسے درخت و مکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی سردی، بارش، موذی دشمن جانور، آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کُرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (مراد اس سے زرہیں ہیں) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ تم (ان نعمتوں کے شکریہ میں) فرمانبردار رہو (اور ہرچند کہ مذکورہ نعمتوں میں بعض مصنوعات عباد بھی ہیں، مگر ان کا مادّہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے منعم حقیقی وہی ہیں پھر ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں آپ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) آپ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں ایسے ہی ناشکرے ہیں۔

معارف و مسائل

قولہ تعالیٰ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا، اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضروریاتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے، جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلم کا، سب سے پہلے اس کو رونا سکھایا، اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے، بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے، سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے، کوئی اور تکلیف

پہونچے تو رو دیتا ہے، قدرت نے اس کی ضرورت کے لئے ماں باپ کے دلوں میں خاص الفت ڈال دی کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلایا کرے، اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لئے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے، اگر یہ تعلیم فطری اور بلاواسطہ نہ ہوتی تو کس معلم کی مجال تھی جو اس نومولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا، اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں قدرت نے اس کو بلاواسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے آس پاس کے آدمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے، اور پھر ان سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا کے بعد فرمایا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ، یعنی گرچہ ابتداء پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کر دئیے تھے، ان آلات میں سب سے پہلے سمع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے راستہ سے آتا ہے، شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے مگر کان سنتے ہیں، اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھ سے دیکھی ہوئی معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر ان معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور و فکر کر کے معلوم کرتا ہے، اور یہ کام ارشادات قرآنی کے مطابق انسان کے قلب کا ہے، اس لئے تیسرے نمبر میں اَفْـِٕدَةَ فرمایا، جو فؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی قلب کے ہیں، فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد قرآنی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم و ادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے، اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے، گویائی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں، بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ سمع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آگیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گونگا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے، اور

شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں، جس کو سُن کر بولنا سیکھے، واللہ اعلم۔
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا، بیوت، بیت کی جمع ہے، جس مکان میں رات گذاری جائے
اس کو بیت کہتے ہیں، امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

كُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ فَهُوَ سَقْفٌ وَسَمَاءٌ، وَكُلُّ مَا اَقَلَّكَ فَهُوَ اَرْضٌ، وَكُلُّ مَا سَتَرَكَ مِنْ جِهَاتِكَ الْاَرْبَعِ فَهُوَ جِدَارٌ، وَاِذَا انْتَظَمَتْ وَاتَّصَلَتْ فَهُوَ بَيْتٌ،	"جو چیز تمہارے سر سے بلند ہو اور تم پر سایہ کرے وہ چھت یا سماء کہلاتی ہے، اور جو چیز تمہارے وجود کو اپنے اوپر اٹھائے وہ زمین ہے، اور جو چیز چاروں طرف سے تمہارا پردہ کرے وہ دیواریں ہیں اور جب یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ بیت ہے"

گھر بنانے کا اصل مقصد قلب و جسم کا سکون ہے اس میں حق تعالیٰ نے انسان کے بیت یعنی گھر کو سکن فرما کر گھر بنانے کا فلسفہ اور حکمت واضح فرمادی، کہ اس کا اصل مقصد جسم اور قلب کا سکون ہے، عادۃً انسان کا کسب و عمل گھر سے باہر ہوتا ہے، جو اس کی حرکت سے وجود میں آتا ہے، اس کے گھر کا اصلی منشاء یہ ہے کہ جب حرکت و عمل سے تھک جائے تو اس میں جاکر آرام کرے، اور سکون حاصل کرے اگرچہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں بھی حرکت و عمل میں مشغول رہتا ہے مگر یہ عادۃً کم ہے۔

اس کے علاوہ سکون اصل میں قلب و دماغ کا سکون ہے، وہ انسان کو اپنے گھر میں ہی حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ انسان کے مکان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اس میں سکون ملے، آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے، اور ان میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بے حد خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو، بعض اوقات تو مصنوعی تکلفات خود ہی آرام و سکون کو برباد کر دیتے ہیں، اور وہ بھی نہ ہو تو گھر میں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس سکون کو ختم کر دیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ جھگی اور جھونپڑی اچھی ہے جس کے رہنے والے کے قلب و جسم کو سکون حاصل رہا ہو۔

قرآن کریم ہر چیز کی رُوح اور اصل کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے بڑی غرض وغایت سکون کو قرار دیا، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون قرار دیا ہے، لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا، جس ازدواجی زندگی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ اس کے اصل فائدے سے محروم ہے، آج کی دنیا میں ان چیزوں میں رسمی اور غیر رسمی تکلفات اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد نہیں رہی، اور مغربی تمدن و معاشرت نے ان چیزوں میں ظاہری زیب و زینت کے سارے سامان جمع کر دیئے، مگر سکونِ قلب و جسم سے قطعاً محروم کر ڈالا۔

تو مِنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ اور مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا، سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی کھال اور بال اور اُون سب کا استعمال انسان کے لئے حلال ہے، اس میں یہ بھی قید نہیں کہ جانور مذبوح ہو یا مردار اور نہ یہ قید ہے کہ اس کا گوشت حلال ہے یا حرام، ان سب قسم کے جانوروں کی کھال دباغت دے کر استعمال کرنا حلال ہے، اور بال اور اُون پر تو جانور کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، وہ بغیر کسی خاص صنعت کے حلال اور جائز ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، البتہ خنزیر کی کھال اور اس کے تمام اجزاء ہر حال میں نجس اور ناقابلِ انتفاع ہیں۔

سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ، یہاں انسان کو کرتے کی غرض گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے، حالانکہ کرتہ انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے، اس کا ایک جواب تو امام قرطبیؒ اور دوسرے مفسرین نے یہ دیا ہے کہ قرآن حکیم عربی زبان میں آیا ہے، اس کے اولین مخاطب عرب ہیں، اس لئے اس میں عرب کی عادات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر کلام کیا گیا ہے، عرب ایک گرم ملک ہے، وہاں برف باری اور سردی کا تصور ہی مشکل ہے، اس لئے گرمی سے بچانے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا، حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ فرما کر لباس کے ذریعہ سردی بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دفع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں سے ایک بتلانے والا پھر حکم نہ ملے منکروں کو

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اور نہ ان سے توبہ لی جائے، اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ

ہلکا نہ ہوگا ان سے اور نہ ان کو ڈھیل ملے، اور جب دیکھیں

اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ

مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو

كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۚ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾

ہم پکارتے تھے تیرے سوا، تب وہ ان پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو،

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾

اور آ پڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں جو جھوٹ باندھتے تھے،

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

جو لوگ منکر ہوئے ہیں اور روکتے رہے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ

عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے، اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں

شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ

ایک بتلانے والا ان پر انہی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر،

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت

وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿٨٩﴾

اور خوش خبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

ع ۱۲
۱۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اس امت کا پیغمبر ہوگا) قائم کریں گے (جو ان کے اعمال سیئہ کی شہادت دیں گے) پھر ان کافروں کو (عذر و معذرت کرنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم توبہ یا کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کر لو، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آخرت دار الجزاء ہے دار العمل نہیں)، اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے) تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں) کچھ مہلت دیئے جائیں گے (کہ چند روز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے) اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے) دیکھیں گے تو (بطور اقرار جرم کے) کہیں گے کہ

اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک یہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے سو وہ (شرکاء ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو (اصل مطلب ان کا یہ ہوگا کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں جس سے مقصود اپنی حفاظت ہے اب خواہ یہ مطلب ان کا صحیح ہو جیسا اگر مقبولین مثل ملائکہ وانبیاء علیہم السلام کے یہ بات کہیں تو صحیح ہے، کقولہ تعالیٰ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اور خواہ یہ غلط ہو جیسے خود شیاطین کہنے لگیں، اور خواہ ان کو صحیح غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو جیسے اصنام واشجار وغیرہ کہنے لگیں) اور یہ مشرک اور کافر لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پردازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گے (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے (اور دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے ان کے لئے ہم ایک سزا پر (کہ کفر کے مقابلہ میں ہوگی، دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہِ خدا سے روکتے تھے) بڑھا دیں گے۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرانے کا ہے) جس دن ہم ہر ہر امت کے ایک ایک گواہ جو انہی میں کا ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے اور انہی میں کا ہونا عام ہے خواہ باعتبار شرکت نسب کے ہو خواہ باعتبار شرکت سکنیٰ کے ہو) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس اخبار شہادت سے جو آپ کی رسالت کا اخبار مفہوم ہوتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (علاوہ معجز ہونے کے جو کہ مدار ہے اثبات رسالت کا، ان خوبیوں کا جامع ہے) کہ تمام (دین کی) باتوں کا (بواسطہ یا بلاواسطہ عامۃ الناس کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے۔

معارف و مسائل

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ، اس میں کتاب یعنی قرآن کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے، مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی ونبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈھنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی تو سب مسائل مذکور نہیں تو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کہنا کیسے درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول اللہ ان مسائل کا بیان کرتی ہیں، اور کچھ تفصیلات کو اجماع و قیاس شرعی

کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع و قیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے ہیں ۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا

عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾

ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے اور تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو ۔

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور (کسی پر) ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اور مامورات و منہیات مذکورہ میں تمام اعمال صالحہ اور سیئہ آگئے، اس جامعیت کی وجہ سے قرآن کا تبیان ہونا صاف ظاہر ہے اور) اللہ تعالیٰ تم کو (امور مذکورہ کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو (اور عمل کرو، کیونکہ ہدیٰ اور رحمت اور بشریٰ ہونا اسی پر موقوف ہے)۔

معارف و مسائل

یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے، اسی لئے سلفِ صالحین کے عہد مبارک سے آج تک دستور چلا آرہا ہے کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت سورۂ نحل میں یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ (ابن کثیر)

اور حضرت اکثم بن صیفی رضؓ تو اسی آیت کی بنا پر اسلام میں داخل ہوئے، امام ابن کثیر نے حافظِ حدیث ابو یعلی کی کتاب معرفۃ الصحابہ میں سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی اپنی قوم کے سردار تھے، جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اشاعتِ اسلام کی خبر ملی تو ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، آپ کا خود جانا مناسب نہیں، اکثمؓ نے کہا کہ اچھا تو قبیلہ کے دو آدمی منتخب کرو جو وہاں جائیں، اور حالات کا جائزہ لے کر مجھے بتلائیں، یہ دونوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اکثم بن صیفی کی طرف سے دو باتیں دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں، اکثم کے دو سوال یہ ہیں:

مَنْ اَنْتَ وَمَا اَنْتَ، | آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟

آپ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ میں محمد بن عبداللہ ہوں اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے بعد آپ نے سورہ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیۃ ان دونوں قاصدوں نے درخواست کی کہ یہ جملے ہمیں پھر سنا دیجئے، آپ اس آیت کی تلاوت کرتے رہے یہاں تک کہ ان قاصدوں کو آیت یاد ہوگئی۔

قاصد واپس اکثم بن صیفی کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم نے پہلے سوال میں یہ چاہا تھا کہ آپ کا نسب معلوم کریں، مگر آپ نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی صرف باپ کا نام بیان کر دینے پر اکتفا کیا، مگر جب ہم نے دوسروں سے آپ کے نسب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے عالی نسب شریف ہیں، اور پھر بتلایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کچھ کلمات بھی سنائے تھے وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

ان قاصدوں نے آیت مذکورہ اکثم بن صیفی کو سنائی، آیت سنتے ہی اکثم نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکارم اخلاق کی ہدایت کرتے ہیں اور برے اور رذیل اخلاق سے روکتے ہیں، تم سب اُن کے دین میں داخل ہو جاؤ تاکہ تم دوسرے لوگوں سے مقدم اور آگے رہو، پیچھے تابع بن کر نہ رہو (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں میں نے لوگوں کے کہنے سننے سے شرما شرمی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک آپ پر نزول وحی کے آثار ظاہر ہوئے، اور بعض عجیب حالات کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قاصد میرے پاس آیا، اور یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی، حضرت عثمان بن مظعون فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اور آیت سن کر میرے دل میں ایمان مضبوط و مستحکم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، (ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے تلاوت فرمائی تو اس کا تاثر یہ تھا جو اس نے اپنی قوم قریش کے سامنے بیان کیا:

واللہ ان لہ لحلاوۃ وان | خدا کی قسم اس میں ایک خاص حلاوت ہے اور

علیہ لطلاوۃ وان اصلہ لمغدق	اس کے اوپر ایک خاص رونق اور نور ہے اس کی جڑ
واعلاہ لمثمر وما ھو بقول بشر	شاخیں ہری ہونے نکلنے والی ہیں اور شاخوں پر پھل لگنے

والا ہے، یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

تین چیزوں کا حکم اور | اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے، عدل، احسان، اور اہل قرابت
تین چیزوں کی ممانعت | کو بخشش اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، فحش کام، اور ہر برا کام، اور ظلم و
تعدی، ان چھ الفاظ کی شرعی مفہوم اور اس کے حدود کی تشریح یہ ہے:

عَدْل، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے، جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہوجاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضاجوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلاوجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہنچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبداللہ رازیؒ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہے کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (بحر محیط)

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں یہ تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور بُرے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

اَلْاِحْسَان، اس کے اصل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ فعل یا خُلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف اِلٰی استعمال ہوتا ہے، جیسا ایک آیت میں اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فرمایا ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبرئیلؑ کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر استحضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزء ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر کا ئنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عادات کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبرگیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اوّل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا وصول کرلے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچا دو کم نہ زیادہ، اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو، اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کرلو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہونچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کردو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرع کے طور پر ہوا

اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی، تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ ایتائے ذی القربیٰ ہے، ایتاء کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قربیٰ کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربیٰ کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتاء ذی القربیٰ کے معنی ہوئے رشتہ دار کو کچھ دینا، یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ، "یعنی دو رشتہ دار کو اس کا حق" ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبرگیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت و حرمت کے احکام ہیں:۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے فحشاء اور منکر اور بغی سے، فحشاء ہر ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو برا سمجھے، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو، اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے، یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی برائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کرکے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لئے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں

تک متعدی ہوتا ہے، اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ وجدال تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہونچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ احکام ایجابی اور تحریمی دیئے ہیں، اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللہ تعالیٰ اتباعہ۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے

تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا

کے بعد اور تم نے کیا ہے اللہ کو اپنا ضامن اللہ جانتا ہے جو تم

تَفْعَلُوْنَ (۹۱) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ

کرتے ہو۔ اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کاتا ہوا محنت کے بعد

اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ

ٹکڑے ٹکڑے کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو

اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ

چڑھا ہوا دوسرے سے یہ تو اللہ پرکھتا ہے تم کو اس سے اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو

الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۹۲) وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

قیامت کے دن، جس بات میں تم جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ چاہتا تو تم سب کو

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سمجھاتا ہے جس کو چاہے،

وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا

اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے ۔ اور نہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دھوکا

بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ

آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے اور تم چکھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ

اللہ کی راہ سے اور تم کو بڑا عذاب ہو ۔ اور نہ لو اللہ کے عہد پر

اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مول تھوڑا سا بیشک جو اللہ کے یہاں ہے وہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٥﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ

جانتے ہو ۔ جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہوگا اور ہم بدلے میں دیں گے

الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

صبر کرنیوالوں کو ان کا حق اچھے کاموں پر جو کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

ایفاء عہد کا حکم اور عہد شکنی کی مذمت

اور تم اللہ کے عہد کو (یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو) پورا کرو (اس سے وہ نکل گیا جو خلافِ شرع عہد ہو اور باقی سب عہود مشروعہ خواہ متعلق حقوق اللہ کے ہوں یا متعلق حقوق العباد کے ہوں اس میں داخل ہو گئے) جبکہ تم اس کو (تخصیصاً یا تعمیماً) اپنے ذمہ کر لو (تخصیصاً یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعمیماً یہ کہ ایمان لائے تو تمام احکام واجبہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آ گئی) اور (بالخصوص جن عہود میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابلِ اہتمام ہیں سو ان میں) قسموں کو بعد ان کے مستحکم کرنے کے (یعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے) مت توڑو اور تم (ان قسموں کی وجہ سے ان عہود میں) اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو (یہ قیدیں بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اور وَقَدْ جَعَلْتُمْ، قیود واقعی ہیں وفاءِ عہد پر تنبیہ کے لئے تصریح کی گئی) بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو (خواہ وفاء یا عہد شکنی پس اسی کے موافق تم کو جزاء و سزا دے گا) اور تم (نقضِ عہد کر کے) اس (عورت) کی طرح مت بنو جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا (یعنی اس پاگل عورت کے

مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتے پیچھے بوٹی بوٹی کرکے نوچ ڈالا کہ (اس کی طرح) تم (بھی) اپنی قسموں کو (بعد درستی کے توڑ کر ان کو) آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم و عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو برانگیختگی پیدا ہوتی ہے، اور یہ اصل ہو فساد کی اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے (یعنی مثلاً کفار کے دو گروہ ہوں جن میں باہم مخالفت ہو اور تمہاری ایک سے صلح ہو جائے پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہوا دیکھ کر جس گروہ سے صلح کی تھی اس سے غدر کرکے دوسرے گروہ سے سازش کرلے، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہوا اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہد اسلام کو توڑ کر مرتد ہو جائے، اور یہ جو ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتا ہے، تو) بس اس (زائد ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے (کہ دیکھیں وفاء عہد کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر اُدھر ڈھل جاتے ہو) اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمہارے سامنے (عملاً) ظاہر کر دے گا (کہ حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی، آگے اس اختلاف کی حکمت بطور جملہ معترضہ کے اجمالاً بیان فرماتے ہیں) اور (ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتے لیکن (بمقتضائے حکمت جس کی تفصیل و تعیین یہاں ضروری نہیں) جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ منجملہ ہدایت کے وفائے عہد اور منجملہ ضلالت کے نقض عہد بھی ہے) اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے ہرگز نہیں بلکہ قیامت میں) تم سے تمہارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی اور (جیسا نقض عہد و قسم سے محسوس ضرر ہوتا ہے جس کا اوپر بیان تھا، اسی طرح اس سے معنوی ضرر بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے یعنی) تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو) کبھی اس کو دیکھ کر کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے (یعنی دوسرے بھی تمہاری تقلید کریں، اور عہد شکنی کرنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہِ خدا سے مانع ہوئے تکلیف بھگتنا پڑے (کیونکہ وفاء عہد راہِ خدا ہے تم اس کے توڑنے کے سبب بن گئے اور یہی ہے وہ معنوی ضرر کہ دوسروں کو بھی عہد شکن بنایا اور تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں) تم کو بڑا عذاب ہوگا اور (جس طرح گروہ غالب میں شامل ہو کر جاہ حاصل کرنے کی غرض سے نقض عہد

ممنوع ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اسی طرح تحصیل مال کی غرض سے جو عہد توڑ ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ) اور تم لوگ عہدِ خداوندی کے عوض میں (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو (عہدِ خداوندی کے معنی تو شروع آیت میں معلوم ہوئے اور ثمن قلیل سے مراد دنیا ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ) بس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرۂ آخرت) وہ تمہارے لئے (متاعِ دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (بس متاعِ آخرت کثیر ہوئی اور متاعِ دنیوی خواہ کتنی بھی ہو قلیل ہوئی) اور (علاوہ تفاوتِ قلیل وکثیر کے دوسرا تفاوت یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جاوے گا، خواہ زوال سے یا موت سے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ (وفائے عہد وغیرہ احکامِ دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی نعمتِ باقیہ مذکورہ) ان کو ضرور دیں گے (بس وفائے عہد کرکے دولتِ کثیرۂ غیر فانیہ کو حاصل کرو اور قلیل فانی کے لئے نقضِ عہد مت کرو)

معارف ومسائل

عہد شکنی حرام ہے لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔

اور یہ آیات درحقیقت آیتِ سابقہ کی تشریح و تکمیل ہیں، آیتِ سابقہ میں عدل و احسان کا حکم تھا، لفظ عدل کے مفہوم میں ایفاءِ عہد بھی داخل ہے (قرطبی)

کسی سے عہد معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر کوئی کفارہ مقرر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدانِ حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی اس کے خلاف کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، آخرت میں وبالِ عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے (قرطبی)

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ، اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہو کہ جس جماعت سے تمہارا معاہدہ ہو جائے اس معاہدہ کو دنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو مثلاً تمہیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے یہ کمزور اور تعداد میں قلیل ہے،

یا مال کے اعتبار سے مفلس ہے، دوسری کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے یا مال و دولت والی ہے، تو صرف اس طمع سے کہ قوی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیادہ ہوں گے، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع و ضرر کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے، البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے، وہ اگر خلاف شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس کا عہد توڑ دینا واجب ہے، بشرطیکہ واضح طور پر ان کو جتلا دیا جائے کہ ہم اب اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے، جیسا کہ آیت فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ میں مذکور ہے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورتِ حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں، کہ یہ اپنے نفس کی غرض و خواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ ڈالتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

کسی کو دھوکہ دینے کے لئے قسم کھانے میں سلب ایمان کا خطرہ ہے وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا، اس آیت میں ایک اور عظیم گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے، وہ یہ کہ قسم کھاتے وقت ہی سے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم کھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے، فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

رشوت لینا سخت حرام اور اللہ سے عہد شکنی ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا، یعنی اللہ کے عہد کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے میں نہ توڑو، یہاں تھوڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور اس کے منافع ہیں وہ مقدار میں کتنے بھی بڑے ہوں، آخرت کے منافع کے مقابلہ میں ساری دنیا اور اس کی ساری دولتیں بھی قلیل ہی ہیں، جس نے آخرت کے بدلے میں دنیا لے لی اس نے انتہائی خسارہ کا سودا کیا، کہ ہمیشہ رہنے والی عمدہ ترین نعمت و دولت کو بہت جلد فنا ہونے والی گھٹیا قسم کی چیز کے عوض بیچ ڈالا کوئی سمجھ بوجھ والا انسان گوارا نہیں کر سکتا۔

ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمہ ہے، اس کے پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے، اسی طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کو کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لے کر مفوضہ

خدمت پوری کروں گا، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ٹلائے تو یہ عہد اللہ کو توڑ رہا ہے، اسی طرح جس کام کو اس کے محکمہ کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر ڈالنا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے (بحر محیط)

رشوت کی جامع تعریف | ابن عطیہ کے اس کلام میں رشوت کی جامع مانع تعریف بھی آگئی جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے:

اخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الآخذ فعلہ او فعل ما یجب علیہ ترکہ | یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہو اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (تفسیر بحر محیط، ص ۵۳۳ ج ۵)

اور پوری دنیا کی ساری نعمتوں کا قلیل ہونا اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے (مراد اس سے دنیوی منافع ہیں) وہ سب ختم اور فنا ہونے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (مراد اس سے آخرت کا ثواب و عذاب ہے) وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

دنیا کی راحت و کلفت، دوستی دشمنی سب فنا ہونے والے ہیں اور ان کے ثمرات و نتائج جو اللہ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں

مَا عِنْدَكُمْ کے لفظ سے عام طور پر ذہن صرف مال و متاع کی طرف جاتا ہے استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لفظ مَا لغت کے اعتبار سے عام ہے اور عموم کے معنی مراد دینے سے کوئی امر شرعی مانع نہیں، اس لئے اس میں دنیا کا مال و متاع بھی داخل ہے، اور اس میں پیش آنے والے تمام حالات و معاملات، خوشی اور غم، رنج و راحت، بیماری اور صحت، نفع اور نقصان کسی کی دوستی یا دشمنی یہ سب چیزیں شامل ہیں کہ سب کی سب فنا ہونے والی ہیں، البتہ ان حالات و معاملات پر جو آثار مرتب ہونے والے ہیں اور قیامت میں اُن پر عذاب و ثواب ہونے والا ہے وہ سب باقی رہنے والے ہیں، فنا ہوجانے والے حالات و معاملات کی دُھن میں لگا رہنا اور اپنی زندگی اور اس کی توانائی کو اسی کی فکر میں لگا کر دائمی عذاب و ثواب سے غفلت برتنا کسی ذی عقل کا کام نہیں ؎

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت | تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد | بر گردن وے بماند و بر ما بگذشت

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک

طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾

اچھی زندگی اور بدلے میں دیں گے اُن کو حق اُن کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیات میں ایفاء عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے اس آیت میں تمام اعمالِ صالحہ اور عاملین صالحین کا عمومی بیان ہے، مضمون آیت کا یہ ہے، کہ آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا کی برکات صرف ایفائے عہد میں منحصر نہیں اور نہ کسی عامل کی تخصیص ہے بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو (کیونکہ کافر کے اعمالِ صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں اُن کا اجر دیں گے۔

معارف و مسائل

حیات طیبہ کیا چیز ہے؟ | جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیاتِ طیبہ سے مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطف زندگی ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے، اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر و فاقہ یا بیماری پیش نہ آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مومن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر و فاجر کے کہ اگر اس کو تنگدستی اور بیماری پیش آتی ہے، تو اس کے لئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، بعض وقت خودکشی کی نوبت آجاتی ہے، اور اگر اس کو فراخیٔ عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کروڑپتی ہو جاتا ہے تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے۔

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مومنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی وہ فرحت و انبساط اور پُرلطف زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت

تو ان کی زندگی کا پُرلطف ہونا ظاہر ہے ہی، خصوصاً اس بنا پر کہ بقدر ضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے، اور اگر تنگدستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اُن کا مکمل یقین اور مشکل کے بعد آسانی تکلیف کے بعد راحت ملنے کی قوی اُمید ان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشتکار کھیت بولنے اور اس کی پرورش کے وقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا صلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی محنت و مشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے، مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مومن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے رنج و راحت اور سرد و گرم سب کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے، اس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشوش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جو مومن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾

اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ ع

اس کا زور تو انہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو شریک مانتے ہیں۔

ربطِ آیات سابقہ آیات میں اوّل ایفاءِ عہد کی تاکید اور مطلقاً اعمالِ صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا ہے، انسان کو ان احکام میں غفلت اغواءِ شیطانی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے اس آیت میں شیطان رجیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہی، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قراءتِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تلاوت قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے ؎

دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں خوانند

اور بعض خاص آیات اور سورتیں بالخصوص شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے مجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے (بیان القرآن)، اس کے باوجود جب تلاوتِ قرآن کے ساتھ شیطان سے تعوذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا۔

اس کے علاوہ خود تلاوتِ قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے، کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے، تدبر و تفکر، و خشوع خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوس شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا (ابن کثیر، مظہری وغیرہ)

خلاصۂ تفسیر

(اور جب عمل صالح کی فضیلت معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی شیطان اس میں خلل ڈالتا ہی، کبھی وفائے عہد میں بھی خلل ڈالتا ہے اور کبھی دوسرے عمل مثل قراءتِ قرآن میں بھی، تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے واسطے آپ کی امت سن لیں کہ) جب آپ (کسی بھی نیک کام کرنا چاہیں حتیٰ کہ) قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں (قصداً تو دل سے خدا پر نظر رکھنا ہے اور یہی حقیقت استعاذہ کی واجب ہی اور قراءت میں پڑھ لینا زبان سے بھی مسنون ہے، اور پناہ مانگنے کا حکم ہم اس لئے دیتے ہیں کہ) یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (چلتا ہے) جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

ابن کثیرؒ نے مقدمۂ تفسیر میں فرمایا کہ انسان کے دشمن دو قسم کے ہیں، ایک خود نوعِ انسانی میں سے جیسے عام کفار، دوسرے جنات میں سے جو شیطان نافرمان ہیں، پہلی قسم کے دشمن کے ساتھ اسلام نے جہاد و قتال کے ذریعہ مدافعت کا حکم دیا ہے، مگر دوسری قسم کے لئے صرف اللہ سے پناہ مانگنے کا حکم ہوا، کیونکہ پہلی قسم کا دشمن اپنی ہی جنس و نوع سے ہے اس کا حملہ ظاہر ہو کر ہوتا ہے اس لئے اس سے جہاد و قتال فرض کر دیا گیا، اور دشمن شیطانی نظر نہیں آتا، اس کا حملہ بھی انسان پر آمنے سامنے

نہیں ہوتا، اس لئے اس کی مدافعت کے لئے ایک ایسی ذات کی پناہ لینا واجب کیا گیا جو نہ انسان کو نظر آتی ہے نہ شیطان کو، اور شیطان کی مدافعت کو تعوذ بخدا تعالیٰ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جو اس سے مغلوب ہو جائے وہ اللہ کے نزدیک راندۂ درگاہ اور مستحق عذاب ہے، بخلاف عدو انسانی یعنی کفار کہ انکے مقابلہ میں کوئی شخص مغلوب ہو جائے یا مارا جائے تو وہ شہید اور مستحق ثواب ہے۔ اس لئے عدو انسانی کا مقابلہ اعضاء و جوارح سے کرنا ہر حال میں نفع ہی نفع ہے، یہ دشمن غالب آگیا تو اس کی قوت کو ختم کر دیگا یا پھر خود شہید ہو کر عند اللہ ماجور ہوگا۔

مسئلہ :- تلاوتِ قرآن سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کا پڑھنا اس آیت کی تعمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مگر کبھی کبھی اس کا ترک کرنا بھی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اس لئے جمہور علماء امت نے اس حکم کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے، اور ابن جریر طبریؒ نے اس پر اجماعِ امت نقل کیا ہے۔ اس معاملے میں روایاتِ حدیثیہ قولی اور عملی تلاوت سے پہلے اکثر حالات میں اعوذ باللہ پڑھنے کی اور بعض حالات میں نہ پڑھنے کی یہ سب ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے شروع میں مبسوط ذکر کی ہیں۔

مسئلہ :- نماز میں تعوذ (یعنی اعوذ باللہ) صرف پہلی رکعت کے شروع میں پڑھا جائے یا ہر رکعت کے شروع میں، اس میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں پڑھنا چاہئے، اور امام شافعیؒ ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں، دونوں کے دلائل تفسیر مظہری میں مبسوط لکھے گئے ہیں۔ (ص ۴۹ ج ۵)

مسئلہ :- تلاوتِ قرآن نماز میں ہو یا خارجِ نماز دونوں صورتوں میں تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے، مگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو آگے جتنا پڑھتا رہے وہی ایک تعوذ کافی ہے، البتہ تلاوت کو درمیان میں چھوڑ کر کسی دنیوی کام میں مشغول ہو گیا اور پھر دوبارہ شروع کیا، تو اس وقت دوبارہ تعوذ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ :- تلاوتِ قرآن کے علاوہ کسی دوسرے کلام یا کتاب پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں، وہاں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہئے، (درمختار، شامی)

البتہ مختلف اعمال اور حالات میں تعوذ کی تعلیم حدیث میں منقول ہے، مثلاً جب کسی کو غصہ زیادہ آئے تو حدیث میں ہے کہ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنے سے شدتِ غضب فرو ہو جاتی ہے (ابن کثیر)

نیز حدیث میں ہے کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ، پڑھنا مستحب ہے (شامی)

اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل شیطانی تسلط سے نجات کا راستہ ہے

اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو برائی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار و قدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے، اسی لئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال و اعمال میں اپنی قوت ارادی کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچنے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراض نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اُسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا، اور ہر برائی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

یہی مضمون سورۂ حجر کی آیت کا ہے جس میں شیطان کے دعوے کے مقابلہ میں خود حق تعالیٰ نے یہ جواب دیا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ "یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا ہاں اس پر ہوگا جو خود ہی گمراہ ہو اور تیرا اتباع کرنے لگے"۔

وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کہتے ہیں تُو تو

اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ

بنا لاتا ہے یہ بات نہیں، پر اکثروں کو اُن میں خبر نہیں۔ تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک

الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًی وَّ

فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلا شبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور

بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ

خوش خبری مسلمانوں کے واسطے، اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو سکھلاتا ہے،

بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ

ایک آدمی، جس کی طرف تعریض کرتے ہیں اس کی زبان ہے عجمی اور یہ قرآن زبان

عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿١٠٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ
عربی ہے صاف وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں ان کو اللہ راہ

اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا
نہیں دیتا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾
نہیں اللہ کی باتوں پر اور وہی لوگ جھوٹے ہیں

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات اس سے پہلی آیت میں تلاوت قرآن کے وقت اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت تھی، جس میں اشارہ ہے کہ شیطان تلاوت کے وقت انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، مذکور آیات میں اسی طرح کے وساوس شیطانی کا جواب ہے۔

نبوت پر کفار کے شبہات کا جواب مع تہدید | اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک آیت کو لفظاً یا معنیً منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیجدیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالیٰ جو حکم (پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ) بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے (کہ جن کو حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی پھر حالت بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہوگئی) تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ آپ خدا پر) افترا کرنے والے ہیں (کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا۔ اور یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ بعض اوقات سب حالات کا علم ہونے کے باوجود پہلی حالت پیش آنے پر پہلا حکم دیا جاتا ہے اور دوسری حالت پیش آنے کا اگرچہ اس وقت بھی علم ہے مگر بتقاضائے مصلحت اس دوسری حالت کا حکم اس وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ جب وہ حالت پیش آجاتی ہے اس وقت بیان کیا جاتا ہے، جیسے طبیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال سے حالت بدلے گی، اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر مریض کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں بتلاتا، یہی حقیقت نسخ احکام کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے، جو حقیقت سے واقف نہیں وہ باغوا شیطانی نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفتری نہیں، بلکہ انہی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ احکام میں نسخ کو بلا کسی دلیل کے کلام الٰہی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں، آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں احکام کی تبدیلی بمقتضائے حکمت و مصلحت ہے اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تاکہ ایمان والوں کو (ایمان پر) ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری (کا ذریعہ) ہو جائے (اس کے بعد کفار کے ایک اور لغو شبہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی روم کا باشندہ لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مقیس تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جی لگا کر سنتا تو حضور کبھی اس کے پاس جا بیٹھتے اور وہ کچھ انجیل وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات چلتی کی کہ یہی شخص حضور کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، کذا فی الدر المنثور، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو مجموعہ الفاظ و معانی کا نام ہے تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالفرض قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آ گئی؟ کیونکہ) جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے (کوئی عجمی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی ہوگی تو اس کا واضح جواب اس تحدی (چیلنج) سے پوری طرح ہو چکا ہے جو سورۂ بقرہ میں آ چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذنِ خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دیا تھا، کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہو تو تم بھی انسان ہو اور بڑی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجودیکہ آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان و مال قربان کرنے کو تیار تھا، مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے بعد منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں پر وعید و تہدید ہے کہ) جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ آپ کو مفتری کہتے ہیں) جھوٹ افترا کرنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ

جو کوئی منکر ہوا اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا

مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا

دل برقرار ہے ایمان پر، ولیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہوا

فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶) ذٰلِكَ

سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے، یہ

بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ

اس واسطے کہ انہوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۷) اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي

راستہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو، یہ وہی ہیں کہ مہر کر دی اللہ نے ان کے

قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۰۸)

دل پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اور یہی ہیں بے ہوش،

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۰۹)

خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں

خلاصۂ تفسیر

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں کفر بالرسول اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں) مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے (کہ اگر تو کفر کا فلاں کلام یا فلاں قول نہیں کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں) بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور برا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمۂ کفر یا فعلِ کفر میں مبتلا ہو جانا ایک عذر کی بنا پر ہے، اس لئے جو وعید ارتداد کی آگے آرہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں) لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کفر کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور

ان کو بڑی سزا ہوگی، اور یہ غضب و عذاب اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو (جو دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں بلکہ مجموعہ سبب ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ عزم فعل کے بعد عادۃ اللہ یہ ہے کہ خلق فعل ہوتا ہے جس پر صدور فعل مرتب ہوتا ہے، یہاں استحبوا سے عزم اور لا یہدی سے خلق کی طرف اشارہ ہے، اور اس مجموعہ پر فعل قبیح کا صدور مرتب ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ (دنیا میں ان کے امراض کفر کی حالت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھاٹے میں رہیں گے۔

معارف و مسائل

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ اگر یہ کلمہ نہ کہے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور یہ بھی بظن غالب معلوم ہو کہ دھمکی دینے والے کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے تو ایسے اکراہ کی حالت میں اگر وہ زبان سے کلمہ کفر کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو اور اس کلمہ کو باطل اور برا جانتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگی (قرطبی، مظہری)

یہ آیت اُن صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ یا وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات حضرت عمارؓ اور ان کے والدین یاسرؓ اور سمیہؓ اور صہیبؓ اور بلالؓ اور خبابؓ رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسرؓ اور ان کی زوجہ سمیہؓ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسرؓ کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو دوڑایا گیا جس سے اُن کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو کر شہید ہوئیں، اور یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح حضرت خبابؓ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمارؓ نے جان کے خوف سے زبانی اقرار کفر کا کر لیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب یہ دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج و غم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انھوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن

کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی و مظہری)

اکراہ کی تعریف و تحدید | اکراہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار دبے تو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔

دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مسلوب الاختیار اور مجبور محض کر دے، ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دی ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (مظہری)

مسئلہ: معاملات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری ہے، جیسے خرید و فروخت و ہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملہ کے لئے شرط ہے بنص قرآن اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ، "یعنی کسی دوسرے شخص کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو" اور حدیث میں ہے:

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ	"یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو"

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرالئے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضا سے باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے، دل

کا قصد وارادہ یا رضا وخوشی شرط معاملہ نہیں، مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ، ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے، ثلث جدّھن جدٌّ وھزلھن جدّ النکاح والطلاق والرجعۃ، رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ یعنی اگر دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہوجائے گا، اور طلاق پڑجائے گی، نیز رجعت صحیح ہوجائے گی (مظہری)

امام اعظم ابوحنیفہ، شعبی، زہری، نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق مکرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ حالتِ اکراہ میں گرچہ وہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظ طلاق کہہ دیئے، اور وقوعِ طلاق کا تعلق صرف الفاظِ طلاق ادا کردینے سے ہے، دل کا قصد وارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیثِ مذکور سے ثابت ہے، اس سے یہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

مگر امام شافعی اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک حالتِ اکراہ کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں ہے:

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ، رواہ الطبرانی عن ثوبانؓ | "یعنی میری امت سے خطاء اور نسیان اور جس چیز پر ان کو مضطر و مجبور کردیا جائے سب اٹھا دیئے گئے۔"

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حدیث احکامِ آخرت کے متعلق ہے، کہ خطاء یا نسیان سے یا اکراہ کی حالت میں جو کوئی قول وفعل شریعت کے خلاف کرلیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، باقی رہے احکامِ دنیا اور وہ نتائج جو اس فعل پر مرتب ہوسکتے ہیں ان کا وقوع تو محسوس مشاہد ہے، اور دنیا میں اس وقوع پر جو آثار واحکام مرتب ہوتے ہیں وہ ہو کر رہیں گے، مثلاً کسی نے کسی کو خطاءً قتل کردیا تو اس کو قتل کا گناہ اور آخرت کی سزا تو بے شک نہ ہوگی، مگر جس طرح قتل کا محسوس اثر مقتول کی جان کا چلا جانا واقع ہے اسی طرح اس کا یہ شرعی اثر بھی ثابت ہوگا کہ اس کی بیوی عدت کے بعد نکاح ثانی کرسکے گی، اس کا مال وراثت میں تقسیم ہوجائے گا، اسی طرح جب الفاظِ طلاق یا نکاح یا رجعت زبان سے ادا کردیئے تو ان کا شرعی اثر بھی ثابت ہوجائے گا (مظہری وقرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ جنھوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ مصیبت اٹھائی پھر جہاد کرتے

وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١٠﴾ يَوْمَ تَأْتِي

رہے اور قائم رہے بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے، جس دن آئے گا

كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ وَهُمْ

ہر جی جواب سوال کرتا اپنی طرف سے اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کیا اور ان پر

لَا يُظْلَمُونَ ﴿١١١﴾ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً

ظلم نہ ہوگا، اور بتلائی اللہ نے ایک مثال ایک بستی تھی، چین

مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ

امن سے چلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے پھر ناشکری کی اللہ کے

اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ

احسانوں کی پھر چکھایا اس کو اللہ نے مزہ کہ اس کے تن کے کپڑے ہوگئے بھوک اور ڈر بدلہ اس کا جو وہ کرتے تھے،

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آ پکڑا ان کو

الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١١٣﴾

عذاب نے اور وہ گنہگار تھے۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتداد کا کفر، اس کے بعد کی مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں قیامت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ جزاء و سزا سب قیامت کے بعد ہی ہونے والی ہے، تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا کہ کفر و معاصی کی اصلی سزا تو قیامت کے بعد

ہی ملے گی، مگر بعض گناہوں کی سزا دنیا میں بھی کچھ مل جاتی ہے، تینوں آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:۔
پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آویں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے کہ جنھوں نے مبتلاء کفر ہونے کے بعد (ایمان لاکر) ہجرت کی پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب (ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہوجاویں گے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے، کفر سے پہلے کے گناہ تو صرف ایمان سے معاف ہوجاتے ہیں، جہاد وغیرہ اعمالِ صالحہ شرط معافی نہیں لیکن اعمالِ صالحہ درجاتِ جنت ملنے کے اسباب ہیں، اس لئے اس کے ساتھ ذکر کردیا گیا)

اور یہ جزاء و سزاء مذکور اس روز واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری میں گفت گو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، گو اللہ کی رحمت سے زیادتی ہوجانے کا امکان ہے اور بدی کے بدلے میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہوجاوے، یہی مطلب ہے اس کا کہ) اُن پر ظلم نہ کیا جاوے گا (اس کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ کفر و معصیت کی پوری سزا حشر کے بعد ہوگی، مگر کبھی دنیا میں بھی اس کا وبال عذاب کی صورت میں آجاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں رہتے تھے (اور) ان کے کھانے پینے پہننے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چار طرف سے ان کے پاس پہونچا کرتی تھیں (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ) انھوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی (یعنی کفر و شرک اور معصیت میں مبتلا ہوگئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان کی حرکتوں کے سبب سے ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال و دولت کی فراوانی سلب ہو کر قحط اور بھوک میں مبتلا ہوگئے، اور دشمنوں کا خوف مسلط کرکے ان کی بستیوں کا امن و اطمینان بھی سلب کرلیا) اور (اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں کی گئی بلکہ اوّل اس کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے) ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھی (منجانب اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال خود اپنی قوم میں ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح معلوم تھا) سو اس (رسول) کو (بھی) انھوں نے جھوٹا بتلایا تب ان کو عذاب نے آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔

معارف و مسائل

آخری آیت میں بھوک اور خوف کا مزہ چکھنے کے لئے لفظ لباس استعمال فرمایا کہ لباس بھوک اور خوف کان کو چکھایا گیا، حالانکہ لباس چکھنے کی چیز نہیں، مگر یہاں لباس کا لفظ محیط اور ہمہ گیر ہونے کے لئے تشبیہاً استعمال ہوا ہے، کہ یہ بھوک اور خوف اُن سب کے سب پر ایسے چھا گیا کہ جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم ملزوم ہو جاتا ہے، یہ بھوک اور خوف بھی ان پر اسی طرح مسلط کر دیئے گئے۔

یہ مثال جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک تو عام مثال ہے کسی خاص بستی سے اس کا تعلق نہیں، اور اکثر حضرات نے اس کو مکہ مکرمہ کا واقعہ قرار دیا کہ وہ سات سال تک شدید قحط میں مبتلا رہے، کہ مردار جانور اور کتے اور غلاظتیں کھانے پر مجبور ہو گئے، اور مسلمانوں کا خوف اُن پر مسلط ہو گیا، پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کفر و نافرمانی کے قصوروار تو مرد ہیں، عورتیں، بچے تو بے قصور ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مدینہ طیبہ سے کھانے وغیرہ کا سامان بھجوا دیا۔ (مظہری)

اور ابو سفیان نے بحالت کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تو صلہ رحمی اور عفو و درگذر کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعاء کیجئے کہ یہ قحط ہم سے دُور ہو جائے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعاء فرمائی اور قحط ختم ہوا (قرطبی)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کو پوجتے ہو، اللہ نے تو یہی حرام کیا ہے تم پر مُردار اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

لہو اور سُور کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور مت کہو اپنی زبانوں کے

تَصِفُ اَلۡسِنَتُكُمُ الۡكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفۡتَرُوۡا

جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر

عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ

بہتان باندھو، بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا

لَا يُفۡلِحُوۡنَ ؕ مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى

بھلا نہ ہوگا، تھوڑا سا فائدہ اٹھا لیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے، اور جو

الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا مَا قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَمَا

لوگ یہودی ہیں ان پر حرام کیا تھا جو تجھ کو پہلے سنا چکے، اور ہم نے

ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ

ان پر ظلم نہیں کیا پر وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے، پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب

لِلَّذِيۡنَ عَمِلُوا السُّوۡۤءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَ

ان لوگوں پر جنھوں نے برائی کی نادانی سے پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور

اَصۡلَحُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع ۵/۹ ۲۱

سنوارا اپنے آپ کو، سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیت میں اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اول تو مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ ناشکری نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے جو حلال نعمتیں ان کو دی ہیں ان کو شکر کے ساتھ استعمال کریں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی ایک خاص صورت یہ بھی اختیار کر رکھی تھی کہ بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حلال کیا تھا، اپنی طرف سے ان کو حرام کہنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ نے حرام کہا تھا ان کو حلال کہنے لگے، مسلمانوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسا نہ کریں، کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا صرف اس ذات کا حق ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے اپنی طرف سے ایسا کرنا خدائی اختیارات میں دخل دینا اور اللہ تعالیٰ پر افترا کرنا

آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے جہالت سے اس طرح کے جرائم کئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر وہ توبہ کرلیں اور صحیح ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیں گے، مختصر تفسیر آیات کی یہ ہے:-

سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال و پاک دی ہیں ان کو (حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جہالت ہے) بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو، تم پر تو (منجملہ اُن چیزوں کے جن کو تم حرام کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے) صرف مُردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (مارے فاقہ کے) بالکل بے قرار ہو جاوے بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو، اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے اگر وہ ان چیزوں کو کھالے) بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے، اور جن چیزوں کے متعلق محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، (اور اس پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں) اُن کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ربع کے قریب آیات وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دو گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے، (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں یا صرف آخرت میں) یہ دنیا میں چند روزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) اُن کے لئے دردناک سزا ہے اور (یہ مشرکین ملتِ ابراہیمی کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں جن کو انھوں نے حرام قرار دیدیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد اُن اشیاء میں سے) صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم اس کے قبل (سورۂ انعام میں) آپ سے کر چکے ہیں (اور ان کی تحریم میں بھی) ہم نے اُن پر (صورۃً بھی) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کر کے) زیادتی کیا کرتے تھے (تو معلوم ہوا کہ اشیاء طیبہ کو بالقصد تو کبھی حرام نہیں کیا گیا اور شریعتِ ابراہیمی میں کسی وقتی ضرورت کی وجہ سے بھی نہیں ہوئی پھر یہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا)۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے بُرا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کرلیا پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کرلئے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

محرمات مذکورہ میں حصر اضافی ہے حقیقی نہیں اس آیت میں لفظ اِنّمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں جو آیت میں مذکور ہیں اور اس سے زیادہ صریح طور پر آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الآیۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق باجماع امت اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ عام حرام و حلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشرکین جاہلیت نے جو بہت سی چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا ان کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ تمہاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرمات کے احکام کا مفصل بیان سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں "معارف القرآن" جلد اول صفحہ ۳۵۸ سے صفحہ ۳۷۰ تک آچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

توبہ سے گناہ کی معافی عام ہے خواہ بے سمجھی سے کرے یا جان بوجھ کر آیت ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ میں لفظ جہل نہیں بلکہ جہالت استعمال فرمایا ہے، جہل تو علم کے بالمقابل آتا ہے، ناعلمی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور جہالت کا لفظ جاہلانہ حرکت کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہو گیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ مقید نہیں۔

اِنَّ اِبْرٰہِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَکُ مِنَ

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک

الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ ؕ اِجْتَبٰہُ وَہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ

کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چُن لیا اور چلایا سیدھی

مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ

راہ پر، اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ

اچھے لوگوں میں ہے، پھر حکم بھیجا تجھ کو ہم نے کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ

اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں، ہفتہ کا دن جو مقرر کیا سو انہی پر جو اس

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

میں اختلاف کرتے تھے، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اختلاف کرتے تھے۔

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات پچھلی آیات میں اصول شرک وکفر یعنی انکار توحید وانکار رسالت پر رد اور کفر وشرک کے بعض فروع یعنی تحلیل حرام اور تحریم حلال پر رد وابطال کی تفصیل تھی اور مشرکین مکہ جو قرآن کریم کے پہلے اور بلاواسطہ مخاطب تھے اپنے کفر وبت پرستی کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی کے پابند ہیں، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ہیں، اس لئے مذکورہ چار آیتوں میں ان کے اس دعوے کی تردید انہی کے مسلمات سے ان کے جاہلانہ خیالات کا ابطال اس طرح کیا گیا کہ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام اقوامِ عالم کا مسلّم مقتدا ہونا بیان فرمایا، جو نبوت ورسالت کا اعلیٰ مقام ہے، اس سے ان کا عظیم الشان نبی ورسول ہونا ثابت ہوا، اس کے ساتھ ہی مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گذار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرما کر ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا وآخرت میں کامیاب وبامراد ہونا اور چوتھی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صحیح ملتِ ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرما کر یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔

پانچویں آیت اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ میں اشارۃً یہ بیان فرمایا کہ ملت ابراہیمی میں اشیاء طیبہ حرام نہیں تھیں، جن کو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، مختصر تفسیر آیات مذکورہ کی یہ ہے:۔

بیشک ابراہیم (علیہ السلام جن کو تم بھی مانتے ہو، بڑے مقتدار (یعنی نبی اولوالعزم اور اُمّتِ عظیمہ کے متبوع و مقتدا) اللہ تعالیٰ کے پورے فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے، (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکر گذار تھے (پھر تم شرک و کفر میں مبتلا ہو کر ناشکری کیوں کرتے ہو، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثل نبوت و رسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی (اعلیٰ درجہ کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور وہ طریقہ بنحصر ہے طریقہ محمدیہ میں جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے چلئے (اور چونکہ اس زمانہ کے وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے مکرر فرمایا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے موجودہ طریقہ پر بھی رد ہو جائے جو شرک سے خالی نہیں، اور چونکہ یہ لوگ تحریم طیبات کی جاہلانہ مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، اس لئے فرمایا کہ) بس ہفتہ کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت جو تحریم طیبات کی ایک فرد ہے وہ تو) صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنہوں نے اس میں (عملاً) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے مانا اور عمل کیا، کسی نے اس کے خلاف کیا، مراد اس سے یہود ہیں، کہ تحریم طیبات کی یہ صورت مثل دوسری صورتوں کے صرف یہود کے ساتھ مخصوص تھی، ملتِ ابراہیمی میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں، آگے احکام الٰہیہ میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملاً) فیصلہ کر دے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

معارف ومسائل

لفظ اُمّت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک اُمت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں اور ایک معنی لفظ اُمت کے مقتدائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور قانت کے معنی تابع فرمان کے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی ملت کے اتباع کو عزت و فخر جانتے ہیں، یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، مشرکین عرب بت پرستی کے باوجود اس بُت شکن کے معتقد اور ان کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں اور قانت و مطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گذرے ہیں، آتش نمرود، اہل و عیال کو لق و دق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوؤں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی قربانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے **اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے جو شریعت دی وہ اکثر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کی ملت ابراہیمی کا اتباع فرماتے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اسی کے مطابق رکھی گئی، اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو مفضول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں، اول تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے، اور معلوم و معروف ہوچکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، دوسرے بقول علامہ زمخشری یہ حکم اتباع بھی تعظیم و اکرام خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے، اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ ثُمَّ سے اشارہ کردیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل و کمالات ایک طرف اور ان سب پر فائق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے افضل **رسول و حبیب کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم فرمایا۔**

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام

بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ

دے ان کو جس طرح بہتر ہو، تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا اس کی راہ سے

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ

اور وہی بہتر جانتا ہے ان کو جو راہ پر ہیں، اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف

بِهٖ ۭ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ

پہنچائی جائے، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو، اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے

اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اللہ ہی کی مدد سے اور نہ اُن پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے،

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ ع

اللہ ساتھ ہے اُن کے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں۔

ع ۱۶ ۹ ۲۲

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات سے مقصود یہ تھا کہ اُمت آپ کے احکام کی تعمیل کرکے رسالت کے حقوق ادا کریں، مذکورہ آیات میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادائے رسالت کے حقوق و آداب کی تعلیم ہے، جس کے عموم میں تمام مؤمنین شریک ہیں، مختصر تفسیر یہ ہے:۔

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلائیے (حکمت سے وہ طریقۂ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو سکے، اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیرخواہی و ہمدردی کے جذبہ سے بات کہی جائے، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو، دل خراش توہین آمیز نہ ہو) اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو وہ بھی شدت اور خشونت سے اور مخاطب پر الزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے، بس اتنا کام آپ کا ہے، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیئے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستے سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے (اور اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی جدال اور ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو بدلہ لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی پس اگر پہلی صورت اختیار کرو یعنی)

بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو، اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجر عظیم ہے) اور (صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ) آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیق خاص سے ہے (اس لئے آپ مطمئن رہیں کہ صبر میں آپ کو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہوجئے (ان کی مخالف تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو احسان اور تقویٰ کی صفت حاصل ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے اصول اور مکمل نصاب

اس آیت میں دعوت و تبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سموئی ہوئی ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم بن حیانؓ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمایئے، تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۂ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دعوۃ کے لفظی معنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے، پھر تمام تعلیماتِ نبوت و رسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں، قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے، وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ۴۶) يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ (احقاف ۳۱)

اُمت پر بھی آپ کے نقشِ قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴)	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دیں (یعنی) نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے روکیں

اور ایک آیت میں ارشاد ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ | "گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہو سکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا"

تعبیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی دعوت الی الخیر کا اور کبھی دعوت الی سبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہی ہے کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دین اور صراط مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ، اس میں اللہ جل شانہ کی خاص صفت "رب" اور پھر اس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفتِ ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کر کے وہ طرز اختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تاثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہونچا دینا اور سنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا جس سے مخاطب کو وحشت و نفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا گیا ہو۔

بِالْحِكْمَةِ، لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن کریم، بعض نے قرآن و سنت، بعض نے حجتِ قطعیہ کو قرار دیا ہے، اور روح المعانی نے بحوالہ بحر محیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے:

انہا الکلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع (رح) | "یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے"

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں، اور صاحب روح البیان نے بھی تقریباً یہی مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحۃً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو۔

الْمَوْعِظَةُ، موعظہ اور وعظ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیرخواہی کی بات کو اسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و فوائد اور نہ کرنے کے عذاب و مفاسد ذکر کئے جائیں (قاموس و مفردات راغب)

الْحَسَنَةُ کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے شکوک و شبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کرے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اس کی خیرخواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

موعظۃ کے لفظ سے خیرخواہی کی بات موثر انداز میں کہنا تو واضح ہو گیا تھا، مگر خیرخواہی کی بات بعض اوقات دل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی اہانت محسوس کرے (روح المعانی) اس طریقہ کو چھوڑنے کے لئے لفظ حسنہ کا اضافہ کر دیا گیا۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، لفظ جدال، مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بالتی ہی احسن سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقے سے ہونا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں تاکہ مخاطب کے شکوک دور ہوں، اور وہ ہٹ دھرمی کے راستہ پر نہ پڑ جائے، اور قرآن کریم کی دوسری آیات میں ارشاد ہے کہ یہ احسن فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے، وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو قَوْلًا لَيِّنًا کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

دعوت کے اصول و آداب

آیت مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اوّل حکمت، دوسرے موعظہ حسنہ، تیسرے مجادلہ بالتی ہی احسن۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بناء پر ہیں، دعوت بالحکمۃ اہل علم و فہم کے لئے، دعوت بالموعظہ عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں شکوک و شبہات ہوں، یا جو عناد و ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے بیان القرآن میں فرمایا کہ ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہوں، سیاق آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے، ظاہر یہ

ظاہر یہ ہے کہ یہ آداب دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے ہیں کہ دعوت میں سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیرخواہی و ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے رکھنا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرز بیان و کلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصلحت اور خیرخواہی کے لئے کہہ رہے ہیں، مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

البتہ صاحب رُوح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل دعوت اس میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، تیسری چیز مجادلہ اصولِ دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریق دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحب روح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اصول دعوت ہوتیں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عطف کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا، بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ والجدال الاحسن، مگر قرآن حکیم نے حکمت و موعظت کو تو عطف کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اختیار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم درحقیقت دعوت الی اللہ کا رکن یا شرط نہیں بلکہ طریق دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریق دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصول دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء و خواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے جو شکوک و اوہام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثہ پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ کی قید لگا کر بتلا دیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب

دعوت الی اللہ درحقیقت انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے، اُمت کے علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں، جو دعوت اُن طریقوں پر نہ رہے وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ و جدال کا موجب ہو جاتی ہے

دعوت پیغمبرانہ کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے لئے نقل کی گئی ہے کہ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ "یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے" یہ ہر داعیِ حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علمِ الٰہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتاری کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں، آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر ہادی و داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب سے سخت کلامی کریں اس پر فقرے کسیں اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعنہ زنی کرنیوالوں کے جواب میں کوئی تفنیس کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:۔

سورۂ اعراف کے ساتویں رکوع میں آیت ۵۹ سے ۶۰ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت سست الزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طول عمر دنیا میں مشہور ہے، ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بدبخت قوم میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کا کوئی مدعی دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس کا سب و لہجہ کیسا ہوتا، اندازہ لگائیے، پھر دیکھئے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیرخواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:۔

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (اعراف)	"ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں"

ادھر سے اللہ کے پیغمبر بجائے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں کی پردہ چاک کرتے جواب میں کیا فرماتے ہیں:۔

يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝	"میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں میں تو رب العالمین کا رسول اور قاصد ہوں تمہارے فائدہ کی باتیں بتلاتا ہوں"

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلایا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہے، پھر یہ احسان بھی جتلایا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبطی بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا اس پر غصہ و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں کافروں میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو احسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ فرعون خود خدائی کا دعویدار تھا، **تو جو اس کی خدائی کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔**

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنئے، جو پیغمبرانہ آداب دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری، و کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو اُن سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبطی کو ہٹانے کے لئے ایک مُکا اس کے مارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گو یہ قتل عمداً ارادۃً نہیں تھا، مگر کوئی دینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعتِ موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے **پہلے یہ اعتراف فرمایا:-**

فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ **(سورۂ شعراء)**	"یعنی میں نے یہ کام اُس وقت کیا تھا، **جبکہ میں ناواقف تھا"**

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطاءِ نبوت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا، جب کہ مجھے اس بارہ میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ **(سورۂ شعراء)**	"پھر مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی، اور مجھ کو اپنے پیغمبروں **میں شامل کر دیا"**

پھر اس کے احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتانا صحیح نہیں، کیونکہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم و عدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہونچنے کی نوبت **آئی، فرمایا:**

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ	"وہ احسان جتلانا پرورش کا، سو یہ

عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ (سورۂ شعراء)	وہ نعمت جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال رکھا تھا!

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی رب العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور استہزاء کے حاضرین سے کہا اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ، یعنی تم سن رہے ہو کہ یہ کیسی بے تکی کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝	"وہی تمہارا اور تمہارے باپ دادوں کا بھی وہی رب پروردگار ہے"

اس پر فرعون نے جھنجلا کر کہا:

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝	"یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول ہونے کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے"

مجنون دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا اور اپنا عاقل ہونا ثابت کرتے اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العالمین کی ایک اور صفت بیان فرمادی:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝	"وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو"

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے، جو سورۂ شعراء کے تین رکوع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کو اول سے آخر تک دیکھئے، نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلمہ ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلہ میں کئے گئے ہیں، اور مجادلہ بالتی ہی احسن جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہے۔

مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان و تعبیر میں حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور دلپذیر بنانے کے لئے جو طرزِ عمل

اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی روح ہے، اس کی تفصیلات تو تمام تعلیمات نبوی علیہ السلام میں پھیلی ہوئی ہیں، نمونے کے طور پر چند چیزیں دیکھئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بار نہ ہونے پائے، صحابہ کرام جیسے عشاق رسول جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپ کی باتیں سننے سے اکتا جائیں گے، ان کے لئے بھی آپ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے، تاکہ ہم اکتا نہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا	لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو۔
(صحیح بخاری کتاب العلم)	

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ ربانی، حکماء، علماء اور فقہاء بنو، صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ربانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ و تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے وہ عالم ربانی ہے، آجکل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی سُبکی یا رسوائی نہ ہو، اس لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور برے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے

مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَّفْعَلُوْنَ کَذَا	"لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں کام کرتے ہیں"

اس عام خطاب میں جس کو سنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دل میں شرمندہ

ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۂ یٰسین میں ہے وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ، یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں، ظاہر ہے کہ یہ قاصد رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغول عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا نہیں، اور یہ بلانا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان یٰقَوْمِ سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے جتلا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے، کہ ہم تم تو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہرقل شاہ روم کے نام بھیجا، اس میں اول تو شاہ روم کو "عظیم الروم" کے لقب سے یاد فرمایا جس میں اس کا جائز اکرام ہے کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لئے اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:۔

"اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف جلدی سے آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے"	يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ۔ (سورۂ آل عمران)

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطۂ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اس طرح کے آداب و اصول ملیں گے، آجکل اول تو دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انہوں نے صرف بحث و مباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقرے کسنے اور اس کی تحقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے

اسلام کی بڑی مذمت کی اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

مروجہ مجادلات کی دینی مضرتیں: آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصود شرع دعوت الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں، حکمت اور موعظت حسنہ، مجادلہ کی صورت کبھی سر آپڑے تو اس کے لئے بھی حسن کی قید لگا کر اجازت دیدی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تدبیر ہے جس میں قرآن کریم نے بالتی ہی احسن کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلا دیا ہے کہ وہ نرمی، خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائل واضحہ مخاطب کے مناسب حال بیان کرنا چاہئے مخاطب کی توہین و تحقیر سے کلی اجتناب کرنا چاہئے۔ اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود متکلم کے لئے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاق رذیلہ حسد، بغض، تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہ کبیرہ ہیں، اور آجکل کے بحث و مباحثہ مناظرہ، مجادلہ میں شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پائے تو ممکن ہے ورنہ عادۃً ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالی نے فرمایا کہ جس طرح شراب ام الخبائث ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ میں جب مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنی علمی تفوق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کیلئے ام الخبائث ہے جس کے نتیجہ میں بہت سے روحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر، غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اس کی برائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبول حق سے استکبار، دوسرے کے قول پر انصاف و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب دہی کی فکر خواہ اس میں قرآن و سنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں بڑے بڑے علماء بھی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین میں پہونچتا ہے تو دست و گریبان و جنگ و جدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، انا للہ

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:۔

"علم تو اہل علم و فضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتۂ اخوت و برادری) ہے، تو وہ لوگ جنھوں نے علم ہی کو عداوت بنا لیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے مذہب کی اقتدار کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، ان کے پیش نظر دوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر ان سے باہمی انس و مودت اور مروت کا تصور کیسے کیا کیا جا سکتا ہے، اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور برائی اور

کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کردے اور مؤمنین متقین کے اخلاق سے محروم کردے ۔"

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ علمِ دین اور دعوتِ حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصولِ صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادتِ ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوتِ ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ عَالِمٌ لَّمْ يَنْفَعْهُ اللّٰهُ بِعِلْمِهٖ

"سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو"

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَآءَ وَلِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَآءَ وَلِتَصْرِفُوْا بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَهُوَ فِي النَّارِ (ابن ماجہ من حدیث جابر باسناد صحیح کذا فی ...)

"علمِ دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں فخر و عزت حاصل کرو یا کم علم لوگوں سے جھگڑا کرو یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرو، جو ایسا کرے گا وہ آگ میں ہے۔"

اسی لئے ائمہ فقہاء و اہلِ حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں جبکہ دعوتِ حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھے اس کو نرمی اور خیرخواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطا پر متنبہ کردے پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلی احتراز کرے، حضرت امام مالکؒ کا ارشاد ہے۔

كَانَ مَالِكٌ يَقُوْلُ الْمِرَآءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ وَقِيْلَ لَهٗ رَجُلٌ لَّهٗ عِلْمٌ بِالسُّنَّةِ فَهَلْ يُجَادِلُ عَنْهَا قَالَ لَا وَلٰكِنْ يُّخْبِرُ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ قُبِلَ مِنْهُ وَاِلَّا سَكَتَ

(اوجز المسالک شرح مؤطا ص ...)

"امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو کیا وہ حفاظتِ سنت کیلئے جدال کرسکتا ہے فرمایا نہیں بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے۔"

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔
ایک تو یہ کہ فساد زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت و آخرت سے غافل ہو گئے ہیں اور قبول حق کی توفیق کم ہو گئی ہے اور بعض تو اس قہر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اندھے ہو جائیں گے بھلے برے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اٹھ جائے گا۔

دوسرا سبب یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت حق کے فرائض سے غفلت عام ہو گئی ہے عوام تو کیا ذکر خاص علماء و صلحاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا کہ اگر اپنے عمل درست کر لئے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ ان کی اولاد بیوی، بھائی دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا ہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ ہر شخص کے ذمہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وغیرہ۔ پھر کچھ لوگ دعوت و اصلاح کے فریضہ کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوت پیغمبرانہ کے اصول و آداب سے ناآشنا ہیں، بے سوچے سمجھے جس کو جس وقت جو چاہا کہہ ڈالا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالانکہ یہ طرز عمل سنت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور اس کے کام دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقیص اور استہزاء و تمسخر تک پہونچ جاتے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:

"جس شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگر تم نے اس کو تنہائی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو رسوا کیا تو یہ فضیحت ہے"

آجکل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعے منظر عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں تک دعوت کے اصول و آداب کا بیان ہوا اس کے بعد فرمایا:
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ یہ جملہ داعیان دین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا ہے کیونکہ مذکور الصدر آداب دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری

ہو جائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے، اس لئے اس جملے میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو اصولِ صحیحہ کے مطابق ادا کر دینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے نہ آپ کی ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہمت نہ ہاریں مایوس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا تتمہ ہے۔

داعی حق کو کوئی ایذا پہونچائے تو بدلہ لینا بھی جائز ہے مگر صبر بہتر ہے

اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم ہدایت ہے، وہ یہ کہ بعض وقت ایسے سخت دل جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی و خیرخواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہو جاتے ہیں، زبان درازی کر کے ایذا پہونچاتے ہیں اور بعض وقت اس سے بھی تجاوز کر کے ان کو جسمانی تکلیف پہونچانے بلکہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس کے لئے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ الخ میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیدیا گیا کہ جو آپ پر ظلم کرے آپ کو بھی اس سے اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقدارِ ظلم سے تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اُتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔

اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہے لیکن صبر کریں اور انتقام نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیاتِ مذکورہ کا شانِ نزول اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تعمیلِ حکم

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوۂ احد میں ستر صحابہ کی شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مثلہ کرنے کے واقعہ میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ:

"غزوۂ احد میں جب مشرکین لوٹ گئے تو صحابہ کرام میں سے ستر اکابر کی لاشیں سامنے آئیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہؓ بھی تھے چونکہ مشرکین کو اُن پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد اُن کی لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان، اور دوسرے اعضاء کاٹے گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ پہنچا، اور آپؐ نے فرمایا کہ میں حمزہؓ کے بدلے میں مشرکین کے ستر آدمیوں کا اسی طرح مثلہ کروں گا، جیسا انھوں نے حمزہؓ کو کیا ہے، اس واقعہ میں یہ تین آیات

نازل ہوئیں، واللہ اعلم (از تفسیر قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ دوسرے حضرات صحابہ کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ مُثلہ کرنے کا کیا تھا۔

(رواہ الترمذی واحمد وابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحہ عن ابی بن کعبؓ)

اس میں چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ غم سے بلا لحاظ تعداد ان صحابہ کے بدلے میں ستر مشرکین کے مثلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا جو اللہ کے نزدیک اس اصول عدل و مساوات کے مطابق نہ تھا جس کو آپ کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مقدار و پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے بلا لحاظ تعداد چند کا بدلہ ستر سے لینا درست نہیں، دوسرے آپ کو مکارم اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ نصیحت کی گئی کہ برابر سرابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور مجرموں پر احسان کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا (مظہری عن البغوی) فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے قبضہ میں تھے یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم و ارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ احد کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل اختیار کیا گیا، شاید اسی بناء پر بعض روایات میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرر ہوا ہو، اول غزوۂ احد میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں (کما حکاہ المظہری عن ابن الحصار)

مسئلہ: اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا جو کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل کر ڈالے تو ولی مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔

البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیت قتل کی صحیح مقدار متعین نہیں کی جا سکتی کہ کتنی ضربوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملہ میں حقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو تلوار ہی سے قتل کیا جائے گا (جصاص)

مسئلہ: آیت کا نزول اگرچہ جسمانی تکلیف اور بدنی نقصان پہنچنے کے متعلق ہوا ہے مگر الفاظ عام ہیں جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے یا چوری کر کے لے لے بشرطیکہ جو مال یا ہو وہ اپنے حق کی جنس سے ہو مثلاً نقد روپیہ ہو تو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقد روپیہ غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلہ کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے، خواہ جنس حق سے ہو یا کسی دوسری جنس سے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ میں عام قانون مذکور تھا جس میں سب مسلمانوں کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز مگر صبر کرنا افضل و بہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین و ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپ کی شان عظیم اور منصب بلند کے لئے دوسروں کی نسبت سے بھی زیادہ موزوں و مناسب تھا اس لئے فرمایا وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی آپ تو انتقام کا ارادہ بھی نہ کریں صبر ہی کو اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ آپ کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوگا، یعنی صبر کرنا آپ کے لئے آسان کر دیا جائے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حاصل ہونے کا یہ بتلا دیا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو دو صفتوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ دوسرے احسان، تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور احسان کا مفہوم اس جگہ خلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمال صالحہ کے پابند ہوں اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں حق تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معیت و نصرت حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

الحمد للہ سورۃ نحل کی تفسیر آج ۵ر شعبان ۱۳۸۹ھ شب شنبہ میں پوری ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا ۝

سُورۃ نحل تمام شد

سُورۃ بنی اسرآءیل

سُورَۃُ بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡل

سُوۡرَۃُ بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّاِحۡدٰی عَشۡرَۃَ اٰیَۃً وَّاِثۡنَا عَشَرَ رُکُوۡعًا

سورۂ بنی اسرائیل مکہ میں اُتری اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد

الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ

حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ

لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے۔ غرض اُس مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کرلینا اور سب انبیاء سے ملاقات کرنا اور اُن کی باتیں سننا وغیرہ اور بعض آگے کے متعلق ہیں۔ مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں کے

عجائبات کا مشاہدہ کرنا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقوال کو سنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب اُن کو یہ خاص امتیاز اور اعزاز بخشا اور اپنے قرب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہیں ملا)

معارف و مسائل

اس آیت میں واقعہ معراج کا بیان ہے جو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خصوصی اعزاز اور امتیازی معجزہ ہے لفظ اَسْرٰی سریٰ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی رات کو لیجانا ہیں اس کے بعد لَیْلًا کے لفظ سے صراحۃً بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا اور لفظ لیلا کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس تمام واقعہ میں پوری رات بھی صرف نہیں بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسراء کہتے ہیں اور یہاں سے سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے اسراء اس آیت کی نص قطعی سے ثابت ہے اور معراج کا ذکر سورۂ نجم کی آیات میں ہے اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے بِعَبْدِہٖ اس مقام اعزاز و اکرام میں لفظ بِعَبْدِہٖ ایک خاص محبوبیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرما دیں کہ یہ میرا بندہ ہے اس سے بڑھ کر کسی بشر کا کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا حضرت حسن دہلوی نے خوب فرمایا ہے

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ توام　　　تو بزبانِ خود بگو بندہ نوازِ کیستی

یہی بات ہے جیسے ایک دوسری آیت میں عِبَادُ الرَّحْمٰنِ فرما کر اپنے مقبولان بارگاہ کا اعزاز بڑھانا مقصود ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبد کامل بن جائے اس لئے کہ خصوصی اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفت عبدیت کو منتخب کیا گیا اور اس لفظ سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی مقصود ہے کہ اس حیرت انگیز سفر سے جس میں اول سے آخر تک سب خرق العادت معجزات ہی ہیں کسی کو خدائی کا وہم نہ ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے اس لئے لفظ عَبْد کہکر یہ بتلا دیا کہ ان تمام صفات و کمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے ہی ہیں خدا نہیں۔

معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن وسنت کے دلائل اور اجماع

قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے جنکا ذکر آگے آتا ہے ثابت ہے کہ اسراء و معراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سُبْحٰنَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کونسی عجیب بات ہے خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا فلاں

فلاں کام کرے۔

دوسرا اشارہ لفظ عَبْدٌ سے اسی طرف ہے کیونکہ عَبْدٌ صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ۔

واقعہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانی رضؓ کو بتلایا تو انھوں نے حضورؐ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفار مکہ نے تکذیب کی اور مذاق اڑایا یہاں تک کہ بعض نو مسلم اس خبر کو سن کر مرتد ہو گئے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے اور بعد میں کوئی معراج روحانی بصورت خواب بھی ہوئی ہو جمہور امت کے نزدیک آیت قرآن وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ میں رُؤیا سے مراد رویت ہے مگر اس کو بلفظ رؤیا (جو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر رؤیا کہا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رؤیا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پیچھے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ ام المومنین رضؓ سے جو اس کا واقعہ خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسراء کی متواتر ہیں اور نقاش نے بیس صحابہ کرام کی روایات اس باب میں نقل کی ہیں اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور زیادہ تفصیل دی ہے۔ (قرطبی)

اور امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری جرح و تعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے پھر پچیس صحابہ کرام کے اسماء ذکر کئے ہیں جن سے یہ روایات منقول ہیں ان کے اسماء یہ ہیں۔ حضرت عمر ابن خطاب، علی مرتضیٰ، ابن مسعود، ابوذر غفاری، مالک بن صعصعہ، ابو ہریرہ، ابو سعید، ابن عباس، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبدالرحمن بن قرظ، ابو حبہ، ابو لیلیٰ، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، حذیفہ بن یمان، بریدہ، ابو ایوب انصاری، ابو امامہ، سمرہ بن جندب، ابو الحمراء، صہیب الرومی، ام ہانی، عائشہ ام المومنین، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے بعد ابن کثیر نے فرمایا۔

فحديث الاسراء اجمع عليه المسلمون واعرض عنه الزنادقة والملحدون۔ (ابن کثیر)	واقعہ اسراء کی حدیث پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے صرف ملحد و زندیق لوگوں نے اس کو نہیں مانا

مختصر واقعۂ معراج ابن کثیرؒ کی روایت سے

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیث متعلقہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر اسراء بیداری میں پیش آیا خواب میں نہیں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا، جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا جس میں نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے اُس زینہ کے ذریعہ آپ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زینہ کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا آجکل بھی زینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں ایسے زینے بھی ہیں جو خود حرکت میں لفٹ کی صورت کے زینے بھی ہیں اس معجزانہ زینہ کے متعلق کسی شک و شبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں) ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپکا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پھر آپ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں قلم تقدیر کے لکھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جس پر اللہ جل شانہ کے حکم سے سونے کے پروانے اور مختلف رنگ کے پروانے گر رہے تھے اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا اسی جگہ حضرت جبرئیل امین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلی شکل میں دیکھا جن کے چھ سو بازو تھے اور وہیں پر ایک رفرف سبز رنگ کا دیکھا جس نے افق کو گھیرا ہوا تھا رفرف سے مراد سبز رنگ کی پالکی ہے اور آپ نے بیت معمور کو بھی دیکھا جس کے پاس بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار سے کمر لگائے بیٹھے ہوئے تھے اس بیت معمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جن کی باری دوبارہ داخل ہونے کی قیامت تک نہیں آتی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بچشم خود معائنہ فرمایا، اس وقت آپ کی اُمت پر اول پچاس نمازوں کے فرض ہونے کا حکم ملا پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ واپس بیت المقدس میں اُترے اور جن انبیاء علیہم السلام کیساتھ مختلف آسمانوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی آپ کے ساتھ اترے (گویا) آپکو رخصت کرنے کے لئے بیت المقدس تک ساتھ آئے اس وقت آپ نے نماز کا وقت ہو جانے پر سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی، یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا کیونکہ

آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعہ میں یہ منقول ہے کہ سب انبیاء سے جبرئیل امین نے آپکا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہوچکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور یوں بھی ظاہر یہی ہے کہ اس سفر کا اصل مقصد ملاء اعلیٰ میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے پھر جب اس اصل کام سے فراغت ہوئی تو تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے ساتھ مشایعت رخصت کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپ کو جبرئیل امین کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت اور سب پر فضیلت کا عملی ثبوت دیدیا گیا۔

اس کے بعد آپ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہو کر اندھیرے وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

واقعہ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابونعیم اصبہانی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں محمد بن عمر واقدیؔ کی سند سے بروایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نامہ مبارک دیکر حضرت دحیہ ابن خلیفہ رض کو بھیجا اس کے بعد حضرت دحیہ رض کے خط پہونچانے اور شاہ روم تک پہونچنے اور اس کے صاحب عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا، جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے جسکے آخر میں ہے کہ شاہ روم ہرقل نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے شاہ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جنکی تفصیل صحیح بخاری ومسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادہ سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں تھی کہ کہیں میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جسکا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں البتہ مجھے اسوقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جسکا جھوٹ ہونا

عــه واقدی کی روایت حدیث میں محدثین نے ضعیف کہا ہے لیکن امام ابن کثیر جیسے محقق محدث نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے شاید اس لئے کہ اس کا تعلق عقائد و احکام سے نہیں اور ایسے تاریخی معاملات میں ان کی روایت معتبر ہے ۱۲ منہ

بادشاہ خود سمجھ لیگا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کر لیںگے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

ایلیاء (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سرہانے پر قریب کھڑا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپکو اسکا علم کیسے اور کیونکر ہوا اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اسوقت تک سوتا نہیں تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کر دیئے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا تو میں نے اپنے عملہ کے لوگوں کو بلایا انھوں نے ملکر کوشش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہو سکا دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں میں نے عاجز ہو کر کاریگروں اور نجاروں کو بلوایا انھوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازہ کی عمارت کا بوجھ پڑ گیا ہے اب صبح سے پہلے اس کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جاوے۔ میں مجبور ہو کر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں سوراخ کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھا گیا ہے اس وقت میں نے اپنے رفیقوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس لئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپنے ہماری مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں (ابن کثیر ص ۲۴ ج ۳)

اسراء و معراج کی تاریخ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ معراج کی تاریخ میں روایات بہت مختلف ہیں موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ام المومنینؓ کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا واقعہ بعثت نبوی کے سات سال بعد ہوا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ واقعہ معراج بعثت نبوی سے پانچ سال بعد میں ہوا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعہ معراج ہجرت مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حربی کہتے ہیں کہ واقعہ اسراء و معراج ربیع الثانی کی ستائیسویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے اور ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ حضرات

محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور عام طور پر یہ ہے کہ ماہِ رجب کی ستائیسویں شب، شبِ معراج ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مسجد حرام اور مسجد اقصےٰ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ "مسجد حرام" پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کونسی تو آپ نے فرمایا "مسجد اقصےٰ" میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فصل ہے تو آپ نے فرمایا چالیس سال پھر فرمایا کہ مسجدوں کی ترتیب تو یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں نماز ادا کر لیا کرو۔ (رواہ مسلم)

امام تفسیر مجاہد رح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے، اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر تک پہنچی ہوئی ہیں اور مسجد اقصےٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے (رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمر رض) (تفسیر قرطبی ص ۲۱۳ ج ۴)

اور مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض روایات میں پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس دوسرے معنی کے لحاظ سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ بعض روایات میں آپ کا سفر کے لئے تشریف لیجانا حضرت ام ہانی کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے کہ مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ کچھ مستبعد نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی رض کے مکان میں ہوں وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے سفرِ اسراء کی ابتدا ہوئی واللہ اعلم۔

مسجد اقصےٰ اور ملک شام کی برکات

آیت میں بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ میں حول سے مراد پوری زمین شام ہے ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں سے فلسطین کی زمین کو تقدس خاص عطا فرمایا ہے (روح المعانی)

اس کی برکات دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ دینی برکات تو یہ ہیں کہ وہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن و مدفن ہے اور دنیوی برکات اس کی زمین کا سرسبز ہونا اور اس میں عمدہ چشمے، نہریں باغات وغیرہ کا ہونا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رض فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ملک شام تو تمام شہروں میں سے میرا منتخب خطہ ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو پہنچاؤں گا، (قرطبی)

اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ دجال ساری زمین میں پھرے گا مگر چار مسجدوں تک اس کی رسائی نہ ہوگی۔

مسجد مدینہ۔ مسجد مکہ مکرمہ۔ مسجد اقصیٰ۔ مسجد طور۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ
اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اُس کو ہدایت بنی اسرائیل

اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؀ (۲)
کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کارساز

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا
تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو چڑھا لیا ہم نے نوح کے ساتھ بے شک وہ تھا بندہ

شَكُوْرًا (۳)
حق ماننے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی اور ہم نے اُس کو بنی اسرائیل کے لئے (آلۂ) ہدایت بنایا (جس میں اور احکام کے ساتھ یہ توحید کا عظیم الشان حکم بھی تھا) کہ تم میرے سوا (اپنا) کوئی کارساز مت قرار دو، اے اُن لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (ہم تم سے خطاب کر رہے ہیں تاکہ اس نعمت کو یاد کرو کہ اگر ہم اُن کو کشتی پر سوار کرکے نہ بچاتے تو آج تم اُن کی نسل کہاں ہوتے، اور نعمت کو یاد کرکے اس کا شکر کرو جس کی بڑی فرد توحید ہے اور) وہ نوح (علیہ السلام) بڑے شکرگذار بندہ تھے (پس جب انبیاء شکر کرتے رہے تو تم کیسے اُس کے تارک ہو سکتے ہو۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ
اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے

فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴) فَاِذَا
ملک میں دو بار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی پھر جب

جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ

آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی

شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا

والے پھر پھیل پڑے شہروں کے بیچ اور وہ وعدہ

مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ

ہونا ہی تھا پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری ان پر اور قوت دی تم کو

بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ

مال سے اور بیٹوں سے اور اس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر اگر بھلائی کی تم نے

اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ

تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے لئے پھر جب پہنچا

وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ

وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں

كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷

جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ

بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر اور اگر پھر وہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے اور

جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸

کیا ہے ہم نے دوزخ کو قیدخانہ کافروں کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں (خواہ توریت میں یا دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں) یہ بات (بطور پیشین گوئی کے) بتلا دی تھی کہ تم سرزمین شام میں دو مرتبہ (گناہوں کی کثرت سے) خرابی کرو گے (ایک مرتبہ شریعت موسویہ کی مخالفت اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت) اور دوسروں پر بھی بڑا زور چلانے لگو گے (یعنی ظلم و زیادتی کرو گے

کم کر دی تو سنبھل گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی شرارتیں اور بد عملیاں ان میں پھیل گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے دشمن کے ہاتھ سے سزا دلوائی قرآن کریم میں دو واقعوں کا ذکر ہے مگر تاریخ میں اس طرح کے چھ واقعات مذکور ہیں۔

پہلا واقعہ | حضرت سلیمان علیہ السلام بانی مسجد اقصیٰ کی وفات سے کچھ عرصہ کے بعد پیش آیا کہ بیت المقدس کے حاکم نے بے دینی اور بدعملی اختیار کرلی تو مصر کا ایک بادشاہ اس پر چڑھ آیا اور بیت المقدس کا سامان سونے چاندی کا لوٹ کر لے گیا مگر شہر اور مسجد کو منہدم نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ | اس سے تقریباً چار سو سال بعد کا ہے کہ بیت المقدس میں بسنے والے بعض یہودیوں نے بت پرستی شروع کر دی اور باقیوں میں نااتفاقی اور باہمی جھگڑے ہونے لگے، اس کی نحوست سے پھر مصر کے کسی بادشاہ نے ان پر چڑھائی کر دی اور کسی قدر شہر اور مسجد کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا پھر ان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔

تیسرا واقعہ | اس سے چند سال بعد جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر کو فتح کر کے بہت سا مال لوٹ لیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر لے گیا اور پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے قائم مقام کی حیثیت سے اس شہر کا حاکم بنا دیا

چوتھا واقعہ | اس نئے بادشاہ نے جو بت پرست اور بدعمل تھا بخت نصر سے بغاوت کی تو بخت نصر دوبارہ چڑھ آیا اور کشت و خون اور قتل و غارت کی کوئی حد نہ رہی شہر میں آگ لگا کر میدان کر دیا یہ حادثہ تعمیر مسجد سے تقریباً چار سو پندرہ سال کے بعد پیش آیا اس کے بعد یہود یہاں سے جلاوطن ہو کر بابل چلے گئے جہاں نہایت ذلت و خواری سے رہتے ہوئے ستر سال گذر گئے اس کے بعد شاہ ایران نے شاہ بابل پر چڑھائی کر کے بابل فتح کر لیا پھر شاہ ایران کو ان جلاوطن یہودیوں پر رحم آیا اور ان کو واپس ملک شام میں پہنچا دیا اور ان کا لوٹا ہوا سامان بھی واپس کر دیا۔ اب یہود اپنے اعمال بد اور معاصی سے تائب ہو چکے تھے، یہاں نئے سرے سے آباد ہوئے تو شاہ ایران کے تعاون سے پھر مسجد اقصیٰ کو سابق نمونہ کے مطابق بنا دیا۔

پانچواں واقعہ | یہ پیش آیا کہ جب یہود کو یہاں اطمینان اور آسودگی دوبارہ حاصل ہو گئی تو اپنے ماضی کو بھول گئے اور پھر بدکاری اور بد عملی میں منہمک ہو گئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سو ستر سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس بادشاہ نے انطاکیہ آباد کیا تھا اس نے چڑھائی کر دی اور چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا چالیس ہزار کو قیدی اور غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور مسجد کی بھی بہت بے حرمتی کی مگر عمارت مسجد کی بچ گئی مگر پھر اس بادشاہ کے جانشینوں نے شہر اور مسجد کو بالکل میدان کر دیا اس کے کچھ عرصہ کے بعد بیت المقدس پر سلاطین روم کی حکومت ہوگئی انھوں نے مسجد کو پھر درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

چھٹا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صعود اور رفع جسمانی کے چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے اپنے حکمران سلاطین روم سے بغاوت اختیار کرلی، رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کو تباہ کر کے وہی حالت بنادی جو پہلے تھی، اس وقت کے بادشاہ کا نام طیطس تھا جو نہ یہودی تھا نہ نصرانی کیونکہ اس کے بہت زمانہ کے بعد قسطنطین اول عیسائی ہوا ہے اور اس کے بعد سے حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانہ تک یہ مسجد ویران پڑی رہی یہاں تک کہ آپ نے اس کی تعمیر کرائی، یہ چھ واقعات تفسیر بیان القرآن میں بحوالہ تفسیر حقانی لکھے گئے ہیں۔

اب یہ بات کہ قرآن کریم نے جن دو واقعوں کا ذکر کیا ہے وہ ان میں سے کون سے ہیں اس کی قطعی تعیین تو مشکل ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے جو واقعات زیادہ سنگین اور بڑے ہیں جنہیں یہود کی شرارتیں بھی زیادہ ہوئیں اور سزا بھی سخت ملی ان پر محمول کیا جائے، اور وہ چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے، تفسیر قرطبی میں یہاں ایک طویل حدیث مرفوع بروایت حذیفہؓ نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تعیین ہوتی ہے کہ ان دو واقعوں سے مراد چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے۔ اس طویل حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظیم القدر مسجد ہے آپ نے فرمایا کہ وہ دنیا کے سب گھروں میں ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے چاندی اور جواہرات یاقوت و زمرد سے بنایا تھا اور یہ اس طرح کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی تو حق تعالیٰ نے جنات کو ان کے تابع کردیا، جنات نے یہ جواہرات اور سونے چاندی جمع کرکے ان سے مسجد بنائی، حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ پھر بیت المقدس سے یہ سونا چاندی اور جواہرات کہاں اور کس طرح گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں اور بدعملیوں میں مبتلا ہوئے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر بادشاہ کو مسلط کردیا جو مجوسی تھا اس نے سات سو برس بیت المقدس پر حکومت کی اور قرآن کریم میں آیت فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ سے یہی واقعہ مراد ہے بخت نصر کا لشکر مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا، مردوں کو قتل اور عورتوں بچوں کو قید کیا اور بیت المقدس کے تمام اموال اور سونے چاندی جواہرات کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں میں بھر کر لے گیا اور اپنے ملک بابل میں رکھ لیا، اور سو برس تک ان بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح کی بامشقت خدمت ذلت کے ساتھ ان سے لیتا رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کردیا جس نے بابل کو فتح کیا اور باقیماندہ بنی اسرائیل کو بخت نصر کی قید سے آزاد کرایا اور جتنے اموال وہ

بیت المقدس سے لایا تھا وہ سب واپس بیت المقدس میں پہنچادیئے اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اگر تم پھر نافرمانی اور گناہوں کی طرف لوٹ جاؤگے تو ہم بھی پھر قتل و قید کا عذاب تم پر لوٹا دیں گے آیت قرآن عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا سے یہی مراد ہے۔

پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس میں لوٹ آئے (اور سب اموال و سامان بھی قبضہ میں آگیا) تو پھر معاصی اور بداعمالیوں کی طرف لوٹ گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو مسلط کر دیا آیت فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ سے یہی مراد ہے شاہ روم نے ان لوگوں سے بری اور بحری دونوں راستوں پر جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل اور قید کیا اور پھر تمام ان اموال بیت المقدس کو ایک لاکھ ستر ہزار گاڑیوں پر لاد کر لے گیا اور اپنے کنیسۃ الذہب میں رکھدیا یہ سب اموال ابھی تک وہیں ہیں اور وہیں رہینگے یہاں تک کہ حضرت مہدیؑ پھر ان کو بیت المقدس میں ایک لاکھ ستر ہزار کشتیوں میں واپس لائینگے اور اسی جگہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو جمع کر دیں گے۔ (الحدیث بطولہ رواہ القرطبی فی تفسیرہ)

بیان القرآن میں ہے کہ دو واقعے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اس سے مراد دو شریعتوں کی مخالفت ہے پہلے شریعت موسوی کی مخالفت اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شریعت عیسویہ کی مخالفت ہے اس طرح پہلی مخالفت میں وہ سب واقعات درج ہو سکتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، واقعات کی تفصیل کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر دیکھئے۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر واقعات کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ وہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے دین و دنیا میں فائز المرام اور کامیاب رہیں گے اور جب کبھی دین سے انحراف کریں گے ذلیل و خوار کئے جاوینگے اور دشمنوں کافروں کے ہاتھوں ان پر مار ڈالی جائے گی اور صرف یہی نہیں کہ دشمن ان پر غالب ہوکر ان کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں بلکہ ان کے ساتھ ان کا قبلہ جو بیت المقدس ہے وہ بھی اس دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہے گا ان کے کافر دشمن مسجد بیت المقدس میں گھس کر اس کی بے حرمتی اور توڑ پھوڑ کریں گے یہ بھی بنی اسرائیل کی سزا ہی کا ایک جز ہوگا۔ قرآن کریم نے ان کے دو واقعے بیان فرمائے پہلا واقعہ شریعت موسویہ کے زمانے کا ہے دوسرا شریعت عیسویہ کے زمانہ کا ان دونوں میں بنی اسرائیل نے اپنے وقت کی شریعت الٰہیہ سے انحراف کرکے سرکشی اختیار کی تو پہلے واقعہ میں ایک مجوسی کافر بادشاہ کو ان پر اور بیت المقدس پر مسلط کر دیا گیا جس نے تباہی مچائی اور دوسرے واقعہ میں ایک رومی بادشاہ کو

مسلط کیا جس نے ان کو قتل و غارت کیا اور بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا اسی کے ساتھ یہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے کہ دونوں مرتبہ جب بنی اسرائیل اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر تائب ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ملک و دولت اور آل و اولاد کو بحال کر دیا۔

ان دونوں واقعات کے ذکر کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں اپنا ضابطہ بیان فرما دیا وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا یعنی اگر تم پھر نافرمانی اور سرکشی کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر اسی طرح کی سزا و عذاب تم پر لوٹا دیں گے یہ ضابطہ قیامت تک کے لئے ارشاد ہوا ہے اور اس کے مخاطب وہ بنی اسرائیل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے جس میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جس طرح پہلے شریعت موسویہ کی مخالفت سے اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت سے تم لوگ سزا و عذاب میں گرفتار ہوئے تھے اب تیسرا دور شریعت محمدیہ کا ہے جو قیامت تک چلیگا اس کی مخالفت کرنے کا بھی وہی انجام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہو کہ ان لوگوں نے شریعت محمدیہ اور اسلام کی مخالفت کی تو مسلمانوں کے ہاتھوں جلاوطن اور ذلیل و خوار ہوئے اور بالآخر انکے قبلہ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ فرق یہ رہا کہ پچھلے بادشاہوں نے ان کو بھی ذلیل و خوار کیا تھا اور ان کے قبلہ بیت المقدس کی بے حرمتی بھی کی تھی اب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو مسجد بیت المقدس جو صدیوں سے منہدم اور غیر آباد پڑی تھی اس کو از سر نو تعمیر کیا اور اس قبلہ انبیاء کے احترام کو بحال کیا۔

واقعات بنی اسرائیل مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں موجودہ واقعہ بیت المقدس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے	بنی اسرائیل کے یہ واقعات قرآن کریم میں بیان کرنے اور مسلمانوں کو سنانے سے بظاہر مقصد یہی ہے کہ مسلمان

بھی اس ضابطہ الٰہیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں دنیا و دین میں ان کی عزت و شوکت اور مال و دولت اطاعت خداوندی کے ساتھ وابستہ ہیں جب وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان کے دشمنوں اور کافروں کو ان پر غالب اور مسلط کر دیا جائے گا جن کے ہاتھوں ان کے معابد و مساجد کی بے حرمتی بھی ہوگی۔

آجکل جو حادثہ فاجعہ بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ کا اور پھر اس کو آگ لگانے کا سارے عالم اسلام کو پریشان کئے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی قرآنی ارشاد کی تصدیق ہو رہی ہے مسلمانوں نے خدا و رسول کو بھلا یا آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی شان و شوکت میں لگ گئے اور قرآن و سنت کے احکام سے بیگانہ ہو گئے تو وہی ضابطہ قدرت الٰہیہ سامنے آیا کہ کروڑوں عربوں پر چند لاکھ یہودی غالب آگئے انھوں نے ان کی جان و مال کو بھی نقصان پہنچایا اور شریعت اسلام کی رو سے دنیا کی تین عظیم الشان مسجدوں میں سے ایک جو تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے وہ ان

سے چھین لیا گیا اور ایک ایسی قوم غالب آگئی جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھی جاتی رہی ہے یعنی یہود۔ اس پر مزید یہ مشاہدہ ہے کہ وہ قوم نہ تعداد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ مسلمانوں کے مجموعی موجودہ سامان حرب کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ واقعہ یہود کو کوئی عزت کا مقام نہیں دیتا البتہ مسلمانوں کے لئے ان کی سرکشی کی سزا ضرور ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری بد عملیوں کی سزا کے طور پر ہوا اور اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم پھر اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر سچی توبہ کریں احکام الٰہیہ کی اطاعت میں لگ جائیں سچے مسلمان بنیں غیروں کی نقالی اور غیروں پر اعتماد کے گناہ عظیم سے باز آجائیں تو حسب وعدہ ربانی انشاء اللہ تعالیٰ بیت المقدس اور فلسطین پھر ہمارے قبضہ میں آئے گا مگر افسوس یہ ہے کہ آجکل کے عرب حکمران اور وہاں کے عام مسلمان ابتک بھی اس حقیقت پر متنبہ نہیں ہوئے وہ اب بھی غیروں کی امداد پر سہارا لگائے ہوئے بیت المقدس کی واپسی کے پلان اور نقشے بنا رہے ہیں جسکا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا فالی اللہ المشتکی۔

وہ اسلحہ و سامان جس سے بیت المقدس اور فلسطین پھر مسلمانوں کو واپس مل سکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع، آخرت پر یقین، احکام شرعیہ کا اتباع اپنی معاشرت اور سیاست میں غیروں پر اعتماد اور ان کی نقالی سے اجتناب اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے خالص اسلامی اور شرعی جہاد ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عرب حکمرانوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرما دیں۔

ایک عجیب معاملہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اپنی عبادت کے لئے دو جگہوں کو عبادت کرنے والوں کا قبلہ بنایا ہے، ایک بیت المقدس دوسرا بیت اللہ مگر قانون قدرت دونوں کے متعلق الگ الگ ہے بیت اللہ کی حفاظت اور کفار کا اس پر غالب نہ آنا یہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذمہ لے لیا ہے اسی کا نتیجہ وہ واقعہ فیل ہے جو قرآن کریم کی سورۂ فیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ یمن کے نصرانی بادشاہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تو اللہ تعالیٰ نے مع اس کے ہاتھیوں کی فوج کے بیت اللہ کے قریب تک جانے سے پہلے ہی پرندے جانوروں کے ذریعہ ہلاک و برباد کر دیا۔

لیکن بیت المقدس کے متعلق یہ قانون نہیں بلکہ آیات مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمان گمراہی اور معاصی میں مبتلا ہوں گے تو ان کی سزا کے طور پر ان سے یہ قبلہ بھی چھین لیا جائے گا اور کفار اس پر غالب آجائیں گے۔

کافر بھی اللہ کے بندے ہیں مگر اس کے مقبول نہیں مذکور الصدر دونوں واقعہ میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اہل دین فتنہ و فساد پر اتر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو ان کے گھروں میں گھس کر ان کو قتل و غارت کریں گے اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عِبَادًا لَّنَآ

فرمایا ہے عبادنا نہیں کہا حالانکہ وہ مختصر تھا حکمت یہ ہے کہ کسی بندہ کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف ہو جانا اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے جیسا کہ اسی سورۃ کے شروع میں اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ کے تحت میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انتہائی اعزاز اور غایت قرب شب معراج میں نصیب ہوا قرآن نے اس واقعہ کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی یا کوئی صفت بیان کرنے کے بجائے صرف عَبْدِہٖ کہکر یہ بتلا دیا کہ انسان کا آخری کمال اور انتہائی اونچا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنا بندہ کہکر نوازیں آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی سزا کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو عِبَادًا کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے اضافت و نسبت کو توڑ کر عِبَادًا لَّنَا فرمایا جسمیں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت و اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا سکے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو

الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾

جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ اُن کے لئے ہے ثواب بڑا

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو اُن کے لئے تیار کیا ہے ہم نے عذاب

اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ

دردناک　اور مانگتا ہے آدمی برائی جیسے مانگتا ہے بھلائی اور ہے

الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

انسان جلد باز۔

ربطِ آیات

شروع سورت میں معجزۂ معراج سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کا بیان تھا ان آیات میں معجزہ قرآن سے اُسکا اثبات ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام) اور (اس طریقہ کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا بھی بتلاتا ہے کہ) ان ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور (بعض) انسان (جیسے کفار ہیں) برائی (یعنی عذاب) کی ایسی دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کی دعا (کیجاتی ہے) اور انسان (کچھ طبعًا ہی) جلد باز (رہتا) ہے۔

معارف و مسائل

طریق اقوم قرآن جس طریقہ کی ہدایت کرتا ہے اس کو اقوم کہا گیا ہے اقوم کی تفسیر یہ ہے کہ وہ راستہ جو منزل مقصود تک پہونچانے میں قریب بھی ہو، آسان بھی ہو، خطرات سے خالی بھی ہو، (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ان تینوں اوصاف کے جامع ہیں اگرچہ انسان اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بعض اوقات اس راستہ کو دشوار یا پُرخطر سمجھنے لگے لیکن رب العالمین جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم رکھنے والے ہیں ماضی و مستقبل اس کے سامنے یکساں ہے وہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ انسان کا نفع کس کام اور کس صورت میں زیادہ ہے اور خود انسان چونکہ مجموعی حالات سے واقف نہیں وہ اپنے بھلے بُرے کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکتا۔

شاید اسی مناسبت سے مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ انسان تو بعض اوقات جلد بازی میں اپنے لئے ایسی دعا مانگ لیتا ہے جو اس کے لئے تباہی و بربادی کا سبب ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کی ایسی دعا کو قبول فرمالیں تو یہ برباد ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ اکثر ایسی دعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ خود انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری یہ درخواست غلط اور میرے لئے سخت مضر تھی اور آیت کے آخری جملہ میں انسان کی ایک طبعی کمزوری کو بطور ضابطہ کے بھی ذکر فرمایا کہ انسان اپنی طبیعت سے ہی جلد باز واقع ہوا ہے سرسری نفع نقصان پر نظر رکھتا ہے انجام بینی اور عاقبت اندیشی میں کوتاہی کرتا ہے فوری راحت چاہے تھوڑی ہو اس کو بڑی اور دائمی راحت پر ترجیح دینے لگتا ہے اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں عام انسانوں کی ایک طبعی کمزوری کا بیان ہے۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے اس آیت کو ایک خاص واقعہ کے متعلق قرار دیا ہے وہ یہ کہ نضر بن حارث نے اسلام کی مخالفت میں ایک مرتبہ یہ دعا کر ڈالی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یعنی یا اللہ اگر آپ کے نزدیک یہ اسلام ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب بھیجدے۔ اس صورت میں انسان سے یہ خاص انسان یا جو اس کے ہم طبع ہوں مراد ہوں گے۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ
اور ہم نے بنائے رات اور دن دو نمونے پھر مٹا دیا رات کا نمونہ اور بنا دیا

اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا
دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو

عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾
گنتی برسوں کی اور حساب اور سب چیزیں سنائیں ہم نے کھول کر

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ
اور جو آدمی ہے لگا دی ہم نے اسکی بری قسمت اس کی گردن سے اور کال دکھائیں گے اس کو

الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ
قیامت کے دن ایک کتاب کہ دیکھے گا اسکو کھلی ہوئی پڑھ لے کتاب اپنی تو ہی بس ہے

الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ۭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ
آج کے دن اپنا حساب لینے والا جو کوئی راہ پر آیا تو آپ اپنے ہی بھلے کو

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ
اور جو کوئی بہکا رہا تو بہکار اپنے ہی برے کو اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے

اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾
کا اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا، سو رات کی نشانی (یعنی خود رات) کو ہم نے دھندلا بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا (کہ اس میں سب چیزیں بے تکلف دکھائی دیں) تاکہ (دن میں) اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور (رات اور دن کی آمد و رفت اور دونوں کے رنگ میں امتیاز کہ ایک روشن دوسرا اندھیرا ہے اور دونوں کی مقداروں میں اختلاف سے) برسوں کا شمار اور (دوسرے چھوٹے چھوٹے) حساب معلوم کر لو (جیسا کہ سورۂ یونس کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے) اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (لوح محفوظ میں تو تمام کائنات کی مکمل تفصیل بغیر کسی استثناء کے ہے اور قرآن کریم میں تفصیل بقدرِ ضرورت ہے اس لئے یہ بیان دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے) اور ہم نے ہر عمل کرنے والے (انسان کا عمل (نیک ہو یا بد) اس کے گلے کا ہار بنا رکھا ہے (یعنی ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ لازم و ملازم ہے) اور (پھر) قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے (دیکھنے کے) واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا (اور اس سے کہا جاویگا کہ لے) اپنا اعمال نامہ (خود) پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ تیرے اعمال کو کوئی دوسرا آدمی گنوا دے بلکہ تو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھتا جا اور حساب لگاتا جا کہ تجھے کتنی سزا (کتنی جزا) ملنی چاہئے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی عذاب سامنے نہیں آیا مگر وہ ٹلنے والا نہیں ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسان اپنے سب اعمال کو کھلی آنکھوں دیکھ لیگا، اور عذاب کی حجت اس پر قائم ہو جائے گی اور جو شخص (دنیا میں سیدھی) راہ پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے (وہ اُس وقت اس کا خمیازہ بھگتے گا کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھا وے گا (اور جس کسی کو کوئی سزا دیجاتی ہے وہ اس پر حجت تمام کرنے کے بعد دیجاتی ہے کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم (کبھی سزا) نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو (اس کی ہدایت کے لئے) نہیں بھیج لیتے۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں اوّل رات اور دن کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا اور پھر بتلایا کہ رات کو تاریک اور دن کو روشن کرنے میں بڑی حکمتیں ہیں۔ رات کے تاریک کرنے کی

حکمت تو اس جگہ بیان نہیں فرمائی۔ دوسری آیات میں مذکور ہے کہ رات کی تاریکی نیند اور آرام کے لئے مناسب ہے اور قدرت نے ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر انسان اور جانور کو اسی رات کی تاریکی میں نیند آتی ہے پورا عالم بیک وقت محوِ خواب ہوتا ہے اگر مختلف لوگوں کی نیند کے مختلف اوقات ہوتے تو جاگنے والوں کے شور و شغب اور کام کاج کی وجہ سے سونے والوں کی نیند بھی حرام ہو جاتی۔

اور دن کو روشن کرنے کی اس جگہ دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں اوّل یہ کہ دن کی روشنی میں آدمی اپنی روزی تلاش کر سکتا ہے محنت مزدوری صنعت و حرفت سب کے لئے روشنی کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ رات دن کی آمد و رفت سے سالوں اور برسوں کی تعداد معلوم کیا سکے کہ تین سو ساٹھ دن پورے ہونے پر مثلاً ایک سال پورا ہو گیا،

اسی طرح دوسرے سب حسابات بھی رات دن کی آمد و رفت سے متعلق ہیں اگر رات دن کا یہ اختلاف نہ ہو تو مزدوری کی مزدوری ملازم کی ملازمت معاملات کی میعادیں متعین کرنا سب مشکل ہو جائے گا۔

نامۂ اعمال گلے کا ہار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی جگہ کسی حال میں رہے اس کا صحیفۂ عمل اس کے ساتھ رہتا ہے، اس کا عمل لکھا جاتا رہتا ہے جب وہ مرتا ہے تو بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے پھر قیامت کے روز یہ صحیفۂ عمل ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا کہ خود پڑھ کر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کرلے کہ وہ مستحق ثواب ہے یا مستحق عذاب۔ حضرت قتادہؒ سے منقول ہے کہ اس روز بے پڑھا آدمی بھی نامۂ اعمال پڑھ لیگا، اس موقع پر اصبہانی نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض لوگوں کا نامۂ اعمال جب ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ دیکھے گا کہ اس کے بعض اعمال صالحہ اس میں لکھے ہوئے نہیں ہیں تو عرض کرے گا کہ میرے پروردگار اس میں میرے فلاں فلاں عمل درج نہیں ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا کہ ہم نے ان اعمال کو اس لئے مٹا دیا کہ تم لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے (مظہری)

بعثتِ رسل سے قبل عذاب نہ ہونے کی تشریح اس آیت کی بنا پر بعض ائمۂ فقہاء کے نزدیک ان لوگوں کو کفر کے باوجود کوئی عذاب نہیں ہوگا جن کے پاس کسی نبی اور رسول کی دعوت نہیں پہنچی اور بعض ائمہ کے نزدیک جو اسلامی عقائد عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اس کی توحید وغیرہ جو لوگ اسکے منکر ہوں گے ان کو کفر پر عذاب ہوگا اگرچہ ان کو کسی نبی و رسول کی دعوت نہ پہنچی ہو البتہ عام معاصی دوسرے گناہوں پر سزا بغیر دعوت و تبلیغ انبیاء کے نہیں ہوگی اور بعض حضرات نے اس جگہ رسول سے مراد عام لی ہے خواہ وہ رسول و نبی ہو خواہ انسانی عقل کہ وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ

کا رسول ہی ہے۔

اولادِ مشرکین کو عذاب نہ ہوگا | آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى کے تحت تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین و کفار کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مرجائیں ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کے کفر سے وہ سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس مسئلہ میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟
اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیج دیا اس کے عیش کرنے والوں کو پھر انہوں نے

فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ⑯ وَكَمْ
نافرمانی کی اس میں تب ثابت ہوگئی ان پر بات پھر اکھاڑ مارا ہم نے ان کو اٹھا کر اور بہت

أَهْلَكْنَا مِنَ ٱلْقُرُونِ مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ
غارت کر دیے ہم نے قرن نوح کے پیچھے اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہ

عِبَادِهِۦ خَبِيرًۢا بَصِيرًا ⑰
جاننے والا دیکھنے والا۔

ربطِ آیات | اس سے پہلی آیات میں اس کا بیان تھا کہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات نہ پہنچ جائیں اور پھر بھی وہ اطاعت نہ کریں اس وقت تک ان پر عذاب نہیں بھیجتے۔ مذکورہ آیات میں اس کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جب کسی قوم کے پاس رسول اور اللہ کے پیغام پہنچ گئے اور پھر بھی انہوں نے سرکشی سے کام لیا تو اس پر عذاب عام بھیج دیا جاتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ہم کسی بستی کو (جو اپنے کفر و نافرمانی کی وجہ سے بمقتضائے حکمت الٰہیہ ہلاک کرنے کے قابل ہو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو (اس کو بعثت رسل سے پہلے ہلاک نہیں کرتے بلکہ پہلے کسی رسول کی معرفت) اس (بستی) کے خوش عیش (یعنی امیر و رئیس) لوگوں کو (خصوصاً اور دوسرے عوام کو عموماً ایمان و اطاعت کا) حکم دیتے ہیں پھر (جب وہ لوگ کہنا نہیں مانتے بلکہ) وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں اور (اسی عادت کے موافق) ہم نے بہت سی

اُنہوں کو نوح (علیہ السلام کے زمانہ کے) بعد اُن کے کفر و معصیت کے سبب) ہلاک کیا ہے (جیسے عاد و ثمود وغیرہ اور نوح علیہ السلام کی قوم کا غرق ہو کر ہلاک ہونا مشہور و معروف ہے اس لئے مِنۢ بَعْدِ نُوْحٍ پر اکتفا کیا گیا خود قوم نوح کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شروع سورت میں آیت ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ میں لفظ حَمَلْنَا سے طوفان نوح کی طرف اشارہ موجود ہے اس کو قوم نوح کی ہلاکت کا بیان قرار دے کر یہاں ما بعد نوح (علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا) اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔ تو جیسا کسی قوم کا گناہ ہوتا ہے ویسی سزا دیتا ہے۔

معارف و مسائل

ایک شبہ اور اس کا جواب الفاظ آیت اِذَآ اَرَدْنَآ اور اس کے بعد اَمَرْنَا کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصود خداوندی تھا اس لئے اُن کو اوّل بذریعہ انبیاء ایمان و اطاعت کا حکم دیا پھر ان کے فسق و فجور کو عذاب کا سبب بنانا یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تو اس صورت میں یہ بیچارے معذور و مجبور رہے۔ اس کے جواب کی طرف ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر کے ضمن میں یہ اشارہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و اختیار دیا اور عذاب و ثواب کے راستے متعین کر دیئے جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کے کام کا عزم کرے تو عادت اللہ یہ ہے کہ وہ اس کے عذاب کے اسباب مہیا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود ان کا عزم اور قصد ہے کفر و معصیت کا نہ کہ محض ارادہ اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

آیت مذکورہ کی ایک دوسری تفسیر لفظ اَمَرْنَا کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی حکم دیا ہے لیکن اس آیت میں اس لفظ کی قرأتیں مختلف ہیں ایک قرأت میں جس کو ابوعثمان نہدی ابو رجاء ابوالعالیہ اور مجاہد نے اختیار کیا ہے یہ لفظ بتشدید میم آیا ہے یعنی اَمَّرْنَا جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے امیر و حاکم بنا دیا خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور سب قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔

اور حضرت علی و ابن عباس رض کی ایک قرأت میں یہ لفظ آمَرْنَا پڑھا گیا جس کی تفسیر انھیں حضرات سے اکثرنا نقل کی گئی ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے اور وہ اپنے فسق و فجور کے ذریعہ پوری قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

انمیں سے پہلی قرأت کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنا دیا جاتا ہے اور دوسری قرأت کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں سے یہ معلوم ہوا کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں

عذابِ الٰہی کی علامت ہے حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوتے ہیں اور اس کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے حکام ایسے لوگ بنا دیئے جاتے ہیں جو عیش پسند، عیاش ہوں یا حاکم بھی نہیں تو اس قوم کے افراد میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دیجاتی ہے دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہوات ولذات میں مست ہو کر اللہ کی نافرمانیاں خود بھی کرتے ہیں دوسروں کے لئے بھی اس کی راہ ہموار کرتے ہیں بالآخر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔

مالداروں کا قوم پر اثر ہونا ایک طبعی امر ہے آیت میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ فطری طور پر عوام اپنے مالداروں اور حاکموں کے اخلاق و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں جب یہ لوگ بدعمل ہو جائیں تو پوری قوم بدعمل ہو جاتی ہے، اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دیا ہے ان کو اس کی زیادہ فکر ہونا چاہئے کہ اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرتے رہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عیش پرستی میں پڑ کر اس سے غافل ہو جائیں اور پوری قوم ان کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جائے تو قوم کے اعمالِ بد کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اسکو اُسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ

پھر ٹھہرایا ہے ہم نے اُسکے واسطے دوزخ داخل ہوگا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جاکر اور جس نے

اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

چاہا پچھلا گھر اور دوڑ کی اُس کے واسطے جو اسکی دوڑ ہے اور وہ یقین پر ہے سو

كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ

ایسوں کی دوڑ ٹھکانے لگی ہے ہر ایک کو ہم پہنچائے جاتے ہیں ان کو اور ان کو تیرے

عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ

رب کی بخشش میں سے اور تیرے رب کی بخشش کسی نے نہیں روک لی دیکھ کیسا

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

بڑھا دیا ہم نے ایک کو ایک سے اور پچھلے گھر میں تو اور بڑے درجے ہیں اور بڑی فضیلت

فرمایا ہے اس کے لئے تو الفاظ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ استعمال فرمائے جو اصرار و دوام پر دلالت کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سزائے جہنم صرف اس صورت میں ہے کہ اس کے ہر عمل میں ہر وقت صرف دنیا ہی کی غرض چھائی ہوئی ہو آخرت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ ہو، اور ارادہ آخرت کرنے اور اس کی جزاء کے بیان میں لفظ أَرَادَ الْآخِرَةَ کا استعمال فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس وقت بھی جس عمل میں آخرت کا ارادہ اور نیت کرلیگا اس کا وہ عمل مقبول ہو جائے گا خواہ کسی دوسرے عمل کی نیت میں کوئی فساد بھی شامل ہوگیا ہو۔

پہلا حال صرف کافر منکر آخرت کا ہو سکتا ہے اس لئے اس کا کوئی بھی عمل مقبول نہیں اور دوسرا حال مومن کا ہے اُس کا وہ عمل جو خالص نیت کے ساتھ آخرت کے لئے ہو اور باقی شرائط بھی موجود ہوں وہ مقبول ہو جائے گی اور اس کے بھی جس عمل میں اخلاص نہ ہو یا دوسری شرطیں مفقود ہوں وہ مقبول نہیں ہوگا۔

بدعت اور خود رائی کا عمل کتنا ہی اچھا نظر آئے مقبول نہیں

اس آیت میں سعی و عمل کے ساتھ لفظ سَعْيَهَا بڑھا کر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل و سعی وہی معتبر ہے جو مقصد (آخرت) کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اس لئے جو نیک اعمال خود رائی اور منگھڑت طریقوں سے کئے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی بھلے اور مفید نظر آئیں مگر آخرت کے لئے سعی مناسب نہیں اس لئے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کارآمد۔

اور تفسیر روح المعانی نے سَعْيَهَا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں استقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اس پر استقامت و مداومت بھی ہو بدنظمی کے ساتھ کبھی کرلیا کبھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا ﴿٢٢﴾

مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم پھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بیکس ہو کر

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل

اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ

لَهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ

اُن کو ہوں اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن سے بات ادب کی اور جھکا دے

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا

اُن کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیازمندی سے اور کہہ اے رب اُن پر رحم کر جیسا

رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ

پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر

تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

تم نیک ہوگے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے ۔

ربط آیات

سابقہ آیات میں قبول اعمال کے لئے چند شرائط کا بیان آیا ہے جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عمل مقبول وہی ہو سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ہو اور شریعت و سنت کے مطابق ہو، ان آیات میں ایسے ہی خاص خاص اعمال کی ہدایت کی گئی ہے جو شریعت کے بتلائے ہوئے احکام ہیں ان کی تعمیل آخرت کی نجات اور ان کی خلاف ورزی آخرت کی ہلاکت کا سبب ہے اور چونکہ شرائط مذکورہ میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

حکم اول توحید۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (اے مخاطب) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت تجویز کر (یعنی شرک نہ کر) ورنہ تو بدحال بے یار و مددگار ہو کر بیٹھ رہے گا (آگے پھر اسی کی تاکید ہے) تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس (معبود برحق) کے کسی کی عبادت مت کر، یہ سعی آخرت کے طریقہ کی تفصیل ہے۔

حکم دوم۔ در حقوق والدین وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو اگر (وہ) تیرے پاس (ہوں اور) ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہونچ جائیں جس کی وجہ سے محتاج خدمت ہو جائیں اور جبکہ طبعاً ان کی خدمت کرنا بھاری معلوم ہوتا اس وقت بھی اتنا ادب کرو کہ) ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے حق تعالیٰ

سے، یوں دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن (کی عمر) میں پالا پرورش کیا ہے (اور صرف اس ظاہری توقیر و تعظیم پر اکتفا مت کرنا دل میں بھی انکا ادب اور قصد اطاعت رکھنا کیونکہ) تمہارا رب تمہارے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے (اور اسی وجہ سے تمہارے لئے اس کی تعمیل آسان کرنے کے واسطے ایک تخفیف کا حکم بھی سناتے ہیں کہ) اگر تم (حقیقت میں دل ہی سے) سعادتمند ہو (اور غلطی یا تنگ مزاجی یا دل تنگی سے کوئی ظاہری کوتاہی ہو جائے اور پھر نادم ہو کر معذرت کر لو) تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

معارف و مسائل

والدین کے ادب و احترام اور اطاعت کی بڑی اہمیت

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورۂ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (یعنی میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گذار ہونا واجب ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ "اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے" آپ نے ارشاد فرمایا کہ "نماز اپنے وقت (مستحب) میں" اس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ نے فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک" (قرطبی)

والدین کی اطاعت و خدمت کے فضائل روایات حدیث میں

(۱) مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم میں بسند صحیح حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا ضائع کر دو" (مظہری) (۲) اور جامع ترمذی و مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی روایت ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کی رضا باپ کی رضا میں ہے **اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں۔**"

(۳) ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے، آپ نے فرمایا کہ "وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں" مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت و خدمت جنت میں لیجاتی ہے اور ان کی بے ادبی اور ناراضی دوزخ میں۔

(۴) بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن عساکر نے بروایت حضرت ابن عباس رضؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو اُن کا نافرمان ہوا اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا تو ایک دروازہ، جنت یا دوزخ کا کھلا رہیگا، اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ جہنم کی وعید کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا وَإِنْ ظَلَمَا وَإِنْ ظَلَمَا وَإِنْ ظَلَمَا یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو ایذا رسانی پر جہنم کی وعید ہے خواہ ماں باپ نے ہی لڑکے پر ظلم کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقام لینے کا حق نہیں کہ انھوں نے ظلم کیا تو یہ بھی ان کی خدمت واطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں)۔

(۵) بیہقی نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خدمتگذار بیٹا اپنے والدین پر رحمت وشفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرے، آپ نے فرمایا کہ "ہاں سو مرتبہ بھی (ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا)، اللہ تعالیٰ بڑا ہے (اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی)"

والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے

(۶) بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابی بکرہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اس کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دی جاتی ہے (یہ سب روایات تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں)

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں واجب ہے اور کہاں مخالفت کی گنجائش ہے

اس پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے ناجائز یا گناہ کے کام میں اطاعت واجب تو کیا جائز بھی نہیں حدیث میں ہے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کے لئے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں

امام قرطبیؒ نے اس مسئلہ کی شہادت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ میری والدہ جو مشرک ہے مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خاطر مدارات کروں آپ نے فرمایا "صِلِي أُمَّكِ" (یعنی اپنی ماں کی صلہ رحمی اور خاطر مدارات کرو)، اور کافر ماں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا یعنی جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اسکو بھی کافر ہونے کا حکم

۳۰

دین تو ان کا اس معاملے میں حکم ماننا تو جائز نہیں مگر دنیا میں ان کے ساتھ معروف طریقہ کا برتاؤ کیا جائے ظاہر ہے کہ معروف طریقہ سے یہی مراد ہے کہ ان کے ساتھ مدارات کا معاملہ کریں۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرضِ عین نہ ہو جائے فرضِ کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی لڑکے کے لئے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا ففیھما فجاھد یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہکر جہاد کرو مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت ہی میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں اس پر آپ نے فرمایا کہ جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رلایا ہے یعنی ان سے جا کر کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جہاد میں نہیں جاؤں گا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرضِ عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں اسی میں علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم بننے کے لئے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ و دعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔

مسئلہ: والدین کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم قرآن و حدیث میں آیا ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے خصوصاً ان کی وفات کے بعد صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور حضرت ابو اسید بدری رضؓ نے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا تھا ایک انصاری شخص آیا اور سوال کیا یا رسول اللہ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی انکا کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ ان کے لئے دعاء اور استغفار کرنا اور جو عہد انھوں نے کسی سے کیا تھا اس کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا اور ان کے ایسے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جن کا رشتہ قرابت صرف انہیں کے واسطے سے ہے والدین کے یہ حقوق ہیں جو ان کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ حضرت خدیجہؓ ام المومنین کی وفات کے بعد ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے جس سے حضرت خدیجہ کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔

والدین کے ادب کی رعایت خصوصاً بڑھاپے میں

والدین کی خدمت واطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے لیکن واجبات وفرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃً رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑا بنا دیتے ہیں تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات ومطالبات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انھوں نے اپنی راحت وخواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل وشرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو آیت میں كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات مذکورہ میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے وقت چند تاکیدی احکام دیئے گئے ہیں

اول یہ کہ ان کو اُف بھی نہ کہے لفظ اُف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو یہاں تک کہ ان کی بات سن کر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے اس پر ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اسی کلمہ اُف میں داخل ہے ایک حدیث میں بروایت حضرت علی رضؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایذا رسانی میں اُف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا (حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے)۔

دوسرا حکم ہے وَلَا تَنْهَرْهُمَا لفظ نہر کے معنی جھڑکنے ڈانٹنے کے ہیں اس کا سبب ایذا ہونا ظاہر ہے تیسرا حکم وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ہے پہلے دو حکم منفی پہلو سے متعلق تھے جنمیں والدین کی ادنیٰ سے ادنیٰ بار خاطر کو روکا گیا ہے اس تیسرے حکم میں مثبت انداز سے والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھلایا گیا ہے کہ ان سے محبت وشفقت کے نرم لہجہ میں بات کی جائے حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا جس طرح کوئی غلام اپنے سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہے

چوتھا حکم وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے سامنے اپنے آپ کو عاجز وذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے جناح کے معنی

بازو کے ہیں لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لئے اپنے بازوئے عجز و ذلت کے ساتھ جھکائے آخر میں من الرحمۃ کے لفظ سے ایک تو اس پر متنبہ کیا کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو بلکہ قلبی رحمت و عزت کی بنیاد پر ہو دوسرے شاید اس طرف بھی ہے کہ والدین کے سامنے ذلت کے ساتھ پیش آنا حقیقی عزت کا مقدمہ ہے کیونکہ یہ واقعی ذلت نہیں بلکہ اس کا سبب شفقت و رحمت ہے۔

پانچواں حکم وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ والدین کی پوری راحت رسانی تو انسان کے بس کی بات نہیں اپنی مقدور بھر راحت رسانی کی فکر کے ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسان اور تکلیفوں کو دور فرماوے یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ **والدین کی خدمت کرسکتا ہے۔**

مسئلہ والدین اگر مسلمان ہوں تو ان کے لئے رحمت کی دعاء ظاہر ہے لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو ان کی زندگی میں یہ دعاء اس نیت سے جائز ہوگی کہ ان کو دنیوی تکلیف سے نجات ہو اور ایمان کی توفیق ہو مرنے **کے بعد اُن کے لئے دعاء رحمت جائز نہیں (قرطبی ملخصا)**

ایک واقعہ عجیبہ قرطبی نے اپنی سند متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رض سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے آپؐ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد کو لیکر پہونچا تو آپؐ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اسکی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِیْہٍ جسکا مطلب یہ تھا کہ بس حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد اس کے والد سے دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جنکو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا، اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمیں ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ آپ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں (جو بات کسی نے نہیں سنی اسکی آپ کو اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے) پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے تھے جنکو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپؐ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے یہ اشعار ذیل سنائے۔

غَذَوْتُكَ مَوْلُوْدًا وَّمُنْتُكَ یَافِعًا ۔۔۔ تُعَلُّ بِمَا اَجْنِیْ عَلَیْكَ وَتَنْهَلُ

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا

اِذَا لَیْلَةٌ ضَافَتْكَ بِالسُّقْمِ لَمْ اَبِتْ ۔۔۔ لِسُقْمِكَ اِلَّا سَاهِرًا اَتَمَلْمَلُ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گذاری

كَاَنِّیْ اَنَا الْمَطْرُوْقُ دُوْنَكَ بِالَّذِیْ ۔۔۔ طُرِقْتَ بِهٖ دُوْنِیْ فَعَیْنِیْ تَهْمُلُ

گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

تَخَافُ الرَّدٰی نَفْسِیْ عَلَیْكَ وَاِنَّهَا ۔۔۔ لَتَعْلَمُ اَنَّ الْمَوْتَ وَقْتٌ مُّؤَجَّلُ

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہو سکتی

فَلَمَّا بَلَغْتَ السِّنَّ وَالْغَایَةَ الَّتِیْ ۔۔۔ اِلَیْهَا مَدٰی مَا كُنْتُ فِیْكَ اُؤَمِّلُ

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جَعَلْتَ جَزَائِیْ غِلْظَةً وَّفَظَاظَةً ۔۔۔ كَاَنَّكَ اَنْتَ الْمُنْعِمُ الْمُتَفَضِّلُ

تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تمہی مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔

فَلَیْتَكَ اِذْ لَمْ تَرْعَ حَقَّ اُبُوَّتِیْ ۔۔۔ فَعَلْتَ كَمَا الْجَارُ الْمُصَاقِبُ یَفْعَلُ

کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے

فَاَوْلَیْتَنِیْ حَقَّ الْجِوَارِ وَلَمْ تَكُنْ ۔۔۔ عَلَیَّ بِمَالٍ دُوْنَ مَالِكَ تَبْخَلُ

تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا۔ انت ومالك لابيك یعنی جا تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے (تفسیر قرطبی صفحہ ۲۴۶ ج ۱۰) یہ اشعار عربی ادب کی مشہور کتاب حماسہ میں بھی نقل کئے گئے مگر ان کو امیہ بن ابی الصلت شاعر کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ عبدالاعلی کے اشعار ہیں بعض نے ان کی نسبت ابو عباس اعمٰی کی طرف کی ہے حاشیہ قرطبی۔

مذکورہ آیات میں سے آخری آیت رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ میں اس دل تنگی کو رفع فرمادیا گیا ہے جو والدین کے ادب و تعظیم کے متعلقہ احکام مذکورہ سے اولاد کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ والدین کے ساتھ ہر وقت رہنا ہے ان کے اور اپنے حالات بھی ہر وقت یکساں نہیں ہوتے کسی وقت زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو مذکور الصدر آداب کے خلاف ہو تو اس پر جہنم کی وعید ہے اس طرح گناہ

سے بچنا سخت مشکل ہوگا اس آیت میں اس شبہ اور اس سے دلتنگی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بغیر ارادہ بے ادبی کے کبھی کسی پریشانی یا غفلت سے کوئی کلمہ صادر ہو جائے، اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہیں کہ وہ کلمہ بے ادبی یا ایذا کے لئے نہیں کہا تھا وہ معاف فرمانے والے ہیں لفظ اوّابین بمعنے توّابین ہے حدیث میں بعد مغرب کی چھ رکعات اور اشراق کی نوافل کو صلوٰۃ الاوّابین کہا گیا ہے جسمیں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوّابین اور توّابین ہیں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا
اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت
تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ
اڑا بے جا بے شک اڑانے والے بھائی ہیں
الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾
شیطانوں کے اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکرا۔

خلاصۂ تفسیر

ان دونوں آیتوں میں حقوق عباد سے متعلق دو مزید حکم مذکور ہیں، اوّل والدین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق، دوسرے خرچ کرنے میں فضول خرچی کی ممانعت مختصر تفسیر یہ ہے اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی وغیر مالی، دیتے رہنا اور محتاج و مسافر کو بھی (ان کے حقوق) دیتے رہنا اور (مال کو) بے موقع مت اڑا بیشک بے موقع مال اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں (یعنی ان کے مشابہ ہوتے ہیں) اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے (کہ حق تعالیٰ نے اس کو دولت عقل کی دی اس نے اس دولت عقل کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا اسیطرح فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دولت مال کی دی مگر وہ اسکو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

عام رشتے داروں کے حقوق کا اہتمام

پہچھلی آیتوں میں والدین کے حقوق اور ان کے ادب و احترام کی تعلیم تھی، اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ کا حق ادا کیا جائے

جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اور وہ اگر حاجتمند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اسمیں داخل ہے اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر شخص پر اسکے عام رشتہ دار عزیزوں کا بھی حق ہے۔ وہ کیا اور کتنا ہے اس کی تفصیل مذکور نہیں مگر عام صلہ رحمی اور حُسنِ معاشرت کا اسمیں داخل ہونا واضح ہے امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گذارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر بھی قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا اندھا ہو اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گذارہ ہو سکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گذارہ نفقہ دیا جائے گا سورۂ بقرہ کی آیت وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ سے بھی یہ حکم ثابت ہے (تفسیر مظہری)

اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین و مسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتلانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے کسی پر احسان نہیں کر رہا۔

تبذیر یعنی فضول خرچی کی ممانعت فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ایک تبذیر اور دوسرے اسراف تبذیر کی ممانعت تو اسی آیت مذکورہ میں واضح ہے اسراف کی ممانعت آیت وَلَا تُسْرِفُوْا سے ثابت ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں کسی معصیت میں یا بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے اسکو اسراف کہتے ہیں اسلئے تبذیر بہ نسبت اسراف کے اشد ہے مبذرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے

امام تفسیر حضرت مجاہد رح نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لئے خرچ کر دے تو وہ تبذیر نہیں اور اگر باطل کے لئے ایک مُد (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رض نے فرمایا کہ غیر حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے (مظہری) امام مالک رح نے فرمایا کہ تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلاف حق خرچ کر ڈالے اور اس کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام ہے۔ (قرطبی)

امام قرطبی نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تبذیر میں داخل ہے ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اسکے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں (قرطبی ج ۱۰ ص ۲۴۸)

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا

اور اگر کبھی تغافل کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی تجھ کو

فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾

توقع ہے تو کہہ دے ان کو بات نرمی کی ۔

خلاصۂ تفسیر

اس آیت میں حقوق العباد سے متعلق پانچواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو انکی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی ان کو روکھا جواب نہ دیا جائے بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے۔ آیت کی تفسیر یہ ہے۔

اور اگر (کسی وقت تمہارے پاس ان لوگوں کو دینے کے لئے مال نہ ہو اور اس لئے) تم کو اس رزق کے انتظار میں جسکی اپنے پروردگار سے توقع ہو اس کے نہ آنے تک اُن سے پہلوتہی کرنا پڑے تو (اتنا خیال رکھنا کہ) اُن سے نرمی کی بات کہدینا (یعنی دلجوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کرلینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کہیں سے آئیگا تو دیں گے دل آزار جواب مت دینا)

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے واسطے سے پوری اُمت کی عجیب اخلاقی تربیت ہے کہ اگر کسیوقت ضرورتمند لوگ سوال کریں اور آپ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو اس لئے ان لوگوں سے اعراض کرنے پر مجبور ہو تو بھی آپ کا یہ اعراض مستغنیانہ یا مخاطب کے لئے توہین آمیز نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ پہلوتہی کرنا اپنے عجز و مجبوری کے اظہار کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اس آیت کے شان نزول میں ابن زید کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کیا کرتے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ان کو دیا جائے گا تو یہ فساد میں خرچ کریں گے اس لئے آپ ان کو دینے سے انکار کر دیتے تھے کہ یہ انکار ان کو فساد سے روکنے کا ذریعہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)

مسند سعید بن منصور میں بروایت سبا بن حکم مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کپڑا آیا تھا آپ نے اس کو مستحقین میں تقسیم فرمادیا اس کے بعد کچھ اور لوگ آئے جبکہ آپ فارغ ہو چکے تھے اور کپڑا ختم ہو چکا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ
اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس
لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ ع
کے واسطے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا

خلاصہ تفسیر

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو (کہ انتہائی بخل سے بالکل ہاتھ خرچ کرنے سے روک لو) اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہئے (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کیا جائے) ورنہ الزام خوردہ (اور) تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے (اور کسی سے تنفر و احتیاج برداشت نہ کر لینا کہ اپنے کو پریشانی میں ڈال لو کوئی معقول بات نہیں کیونکہ) بلاشبہ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی جس پر چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے بیشک وہ اپنے بندوں (کی حالت اور ان کی مصلحت) کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے (سارے عالم کی حاجات پورا کرنا تو رب العالمین ہی کا کام ہے تم اس فکر میں کیوں پڑے کہ جتنے سے ہو سکے یا نہ ہو سکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر سب کی حاجتیں پوری ہی کر دو یہ صورت اس لئے بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی سب کی حاجتیں پوری کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے اس کے لئے تدبیر نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار بھی ہو کیونکہ یہ کام تو صرف مالک کائنات ہی کا ہے کہ سب کی حاجتوں کو جانتا بھی ہے اور سب کی مصلحتوں سے بھی واقف ہے کہ کس وقت کس شخص کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کرنا چاہئے اس لئے انسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ میانہ روی سے کام لے نہ خرچ کرنے کے موقع میں بخل کرے نہ اتنا خرچ کرے کہ کل کو خود ہی فقیر ہو جائے اور اہل و عیال جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں ان کے حقوق ادا نہ ہو سکیں اور بعد میں پچھتانا پڑے)۔

معارف و مسائل

خرچ کرنے میں اعتدال کی ہدایت اس آیت میں بلاواسطہ مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو خطاب ہے، اور مقصود ایسی تعلیم ہے جو دوسروں کی امداد میں حائل بھی نہ ہو اور خود اپنے لئے بھی مصیبت نہ بنے، اس آیت کے شان نزول میں ابن مردویہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بغوی نے بروایت حضرت جابرؓ ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری والدہ آپ سے ایک کرتے کا سوال کرتی ہیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی کرتا اس کے سوا نہیں تھا جو آپ کے بدن مبارک پر تھا، آپ نے لڑکے کو کہا کہ پھر کسی وقت آؤ جبکہ ہمارے پاس اتنی وسعت ہو کہ تمہاری والدہ کا سوال پورا کر سکیں، لڑکا گھر گیا اور واپس آیا اور کہا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ آپ کے بدن مبارک پر جو کرتا ہے وہی عنایت فرما دیں، یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک سے کرتا اتار کر اس کے حوالے کر دیا، آپ ننگے بدن رہ گئے نماز کا وقت آیا حضرت بلالؓ نے اذان دی مگر آپ حسب عادت باہر تشریف نہ لائے تو لوگوں کو فکر ہوئی بعض لوگ اندر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کرتے کے بغیر ننگے بدن بیٹھے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرنا کہ خود پریشانی میں پڑ جائے اس کا درجہ

اس آیت سے بظاہر اس طرح خرچ کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے جس کے بعد خود فقیر و محتاج ہو جائے اور پریشانی میں پڑ جائے، امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ حکم مسلمانوں کے عام حالات کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد تکلیفوں سے پریشان ہو کر پچھلے خرچ کئے ہوئے پر پچھتائیں اور افسوس کریں، قرآن کریم کے لفظ مَحْسُوْرًا میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے (کما قال المظہری) اور جو لوگ اتنے بلند حوصلہ ہوں کہ بعد کی پریشانی سے نہ گھبرائیں اور اہل حقوق کے حقوق بھی ادا کر سکیں ان کے لئے یہ پابندی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہ تھی کہ کل کے لئے کچھ ذخیرہ نہ کرتے تھے جو کچھ آج آیا آج ہی خرچ فرما دیتے تھے اور بسا اوقات بھوک اور فاقہ کی تکلیف بھی پیش آتی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت بھی آجاتی تھی اور صحابہ کرام میں بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس کو منع فرمایا نہ ان کو ملامت کی، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کی ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے جو فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت نہ کر سکیں اور خرچ کرنے کے بعد ان کو حسرت ہو کہ کاش ہم خرچ نہ کرتے یہ صورت ان کے پچھلے عمل کو فاسد کر دیگی اس لئے اس سے منع فرمایا گیا۔

خرچ میں بدنظمی ممنوع ہے

اور اصل بات یہ ہے کہ اس آیت نے بدنظمی کے ساتھ خرچ کرنے کو منع کیا ہے کہ آگے آنے والے حالات سے قطع نظر کر کے جو کچھ پاس ہے اسے اسی وقت خرچ کر ڈالے کل کو دوسرے صاحب حاجت لوگ آئیں، اور کوئی دینی ضرورت اہم پیش آجائے تو اب اس کے لئے قدرت نہ رہے (قرطبی) یا اہل و عیال جن کے حقوق اس کے ذمہ واجب ہیں ان کے حق ادا کرنے سے عاجز ہو جائے (مظہری)، مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا کے الفاظ کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے کہ مَلُوْم کا تعلق پہلی حالت یعنی بخل سے ہے کہ اگر ہاتھ کو گردن سے بالکل

روک رے گا تو لوگ ملامت کریں گے اور محسورا کا تعلق کسی دوسری حالت سے ہے کہ خرچ کرنے میں اتنی زیادتی کرے کہ خود فقیر ہو جائے تو یہ محسورا یعنی تھکا ماندہ عاجز یا حسرت زدہ ہو جائے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ
اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور

اِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾
تم کو بے شک اُن کا مارنا بڑی خطا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو (کیونکہ سب کے رازق ہم ہیں) ہم انکو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی (اگر رازق تم ہوتے تو ایسی باتیں سوچتے) بیشک انکا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں انسانی حقوق کے متعلق ہدایات کا ایک سلسلہ ہے یہ چھٹا حکم اہل جاہلیت کی ایک ظالمانہ عادت کی اصلاح کے لئے ہے زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ ابتداء ولادت کے وقت اپنی اولاد خصوصاً بیٹیوں کو اس خوف سے قتل کر ڈالتے تھے کہ ان کے مصارف کا بار ہم پر پڑے گا۔ آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی جہالت کو واضح کیا ہے کہ رزق دینے والے تم کون، یہ تو خالص اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تمہیں بھی تو وہی رزق دیتا ہے جو تمہیں دیتا ہے وہی ان کو بھی دیگا تم کیوں اس فکر میں قتل اولاد کے مجرم بنتے ہو، بلکہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں اولاد کا ذکر مقدم کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے ہم پہلے ان کو پھر تمہیں دیں گے جسکا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اہل وعیال کا تکفل یا دوسرے غریبوں ضعیفوں کی امداد کرتا ہے تو اس کو اسی حساب سے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ضروریات بھی پوری کر سکے اور دوسروں کی امداد بھی کر سکے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ یعنی تمہارے ضعیف وکمزور طبقہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل وعیال کے متکفل والدین کو جو کچھ ملتا ہے وہ کمزور عورتوں بچوں کی خاطر ہی ملتا ہے

مسئلہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے جسمیں آج کی دنیا گرفتا

ہے کہ کثرتِ آبادی کے خوف سے ضبطِ تولید اور منصوبہ بندی کو رواج دے رہی ہے اس کی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے یہ معاملہ قتلِ اولاد کی برابر گناہ نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور پاس نہ جاؤ بدکاری کے وہ ہے بے حیائی اور بُری راہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو یعنی اس کے مبادی اور مقدمات سے بھی بچو، بلاشبہ وہ (خود بھی) بڑی بے حیائی کی بات ہے اور (دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی) بُری راہ ہے (کیونکہ اس پر عداوتیں اور فتنے اور تضییع نسب مرتب ہوتے ہیں)۔

معارف و مسائل

یہ ساتواں حکم زنا کی حرمت سے متعلق ہے جس کے حرام ہونے کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں اوّل یہ کہ وہ بے حیائی ہے اور انسان میں حیا نہ رہی تو وہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے کسی بھلے بُرے کام کا امتیاز نہیں رہتا، اسی معنی کے لئے حدیث میں ارشاد ہے اذا فاتک الحیاء فافعل ما شئت یعنی جب تیری حیا ہی جاتی رہی تو کسی برائی سے رکاوٹ کا کوئی پردہ نہ رہا تو جو چاہو گے کرو گے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو ایمان کا ایک اہم شعبہ قرار دیا ہے وَالحیاء شعبة من الایمان (بخاری)۔ دوسری وجہ معاشرتی فساد ہے جو زنا کی وجہ سے اتنا پھیلتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کے نتائجِ بد بعض اوقات پورے قبیلوں اور قوموں کو برباد کر دیتے ہیں فتنے چوری، ڈاکہ قتل کی جتنی کثرت آج دنیا میں بڑھ گئی ہے اس کے حالات کی تحقیق کی جائے تو آدھے سے زیادہ واقعات کا سبب کوئی عورت و مرد نکلتے ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے، اس جرم کا تعلق اگرچہ بلاواسطہ حقوقِ عباد سے نہیں مگر اس جگہ حقوق العباد سے متعلقہ احکام کے ضمن میں اس کا ذکر کر دینا شاید اسی بنا پر ہو کہ یہ جرم بہت سے ایسے جرائم ساتھ لاتا ہے جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہیں اور قتل و غارت گری کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں، اسی لئے اسلام نے اس جرم کو تمام جرائم سے اشد قرار دیا ہے اس کی سزا بھی سارے جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت رکھی ہے کیونکہ یہ ایک جرم دوسرے سینکڑوں جرائم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں شادی شدہ

زناکار پر لعنت کرتی ہیں اور جہنم میں ایسے لوگوں کی شرمگاہوں سے ایسی سخت بدبو پھیلے گی کہ اہل جہنم بھی اس سے پریشان ہوں گے، اور آگ کے عذاب کے ساتھ ان کی رسوائی جہنم میں بھی ہوتی رہے گی (رواہ البزار عن بریدۃ مظہری)

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا کرنے والا زنا کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا چوری کرنے والا چوری کرنے کے وقت مومن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب پینے کے وقت مومن نہیں ہوتا یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اس کی شرح ابوداؤد کی روایت میں یہ ہے کہ ان جرائم کے کرنے والے جس وقت مبتلائے جرم ہوتے ہیں تو ایمان ان کے قلب سے نکل کر باہر آجاتا ہے اور پھر جب اس سے لوٹ جاتے ہیں تو ایمان واپس آجاتا ہے (مظہری)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر اور جو

قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف

مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور سو حد سے نہ نکل جائے

فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾

قتل کرنے میں اس کو مدد ملتی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر (قتل کرنا درست ہے یعنی جب کسی شرعی حکم سے قتل کرنا واجب یا جائز ہو جائے تو وہ حرم اللہ میں داخل نہیں) اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (حقیقی یا حکمی) کو اختیار دیا ہے (قصاص لینے کا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہئے (یعنی قاتل پر قتل کا یقینی ثبوت ملے بغیر قتل نہ کرے اور اس کے اعزہ واقارب وغیرہ کو جو فعل میں شریک نہیں ہیں محض جوش انتقام سے قتل نہ کرے اور قاتل کو بھی صرف قتل کرے ناک کان یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ کر مثلہ نہ کرے۔ کیونکہ) وہ شخص (قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً) مدد کے قابل ہے (اور اس نے زیادتی کی تو پھر فریق ثانی مظلوم ہو کر اللہ کی مدد کا مستحق ہو جائے گا اس لئے ولی مقتول کو چاہیئے کہ وہ اپنے منصور حق ہونے کی قدر کرے حد سے بڑھ کر اس نعمت حق کو ضائع نہ کرے)

معارف ومسائل

یہ آٹھواں حکم قتل ناحق کی حرمت کے بیان میں ہے جسکا جرم عظیم ہونا دنیا کی ساری ہی جماعتوں اور مذہبوں اور فرقوں میں مسلّم ہے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک اس سے اہون (ہلکی) ہے کہ کسی مومن کو ناحق قتل کیا جائے (اور بعض روایات میں اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مومن کے قتل ناحق میں شریک ہوجائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دینگے۔ (ابن ماجہ بسند حسن والبیہقی، از مظہری)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں قاتل کی امداد ایک کلمہ سے بھی کی تو میدان حشر میں جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا آئس من رحمۃ اللہ یعنی یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا ہے۔ (مظہری از ابن ماجہ واصبہانی)

اور بیہقی نے بروایت حضرت عبداللہ بن عباس و حضرت معاویہؓ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک گناہ کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے مگر وہ آدمی جو حالت کفر میں مرگیا یا جس نے جان بوجھ کر قصداً کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا۔

قتل ناحق کی تفسیر امام بخاری ومسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں جو اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو بجز تین صورتوں کے۔ ایک یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کیا ہو کہ اسکی شرعی سزا یہ ہے کہ پتھر ڈال کر کے اسکو مار دیا جائے، دوسرے وہ جسنے کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو کہ اس کی سزا یہ ہے کہ ولی مقتول اسکو قصاص میں قتل کر سکتا ہے تیسرے وہ شخص جو دین اسلام سے مرتد ہوگیا ہو کہ اس کی سزا بھی قتل ہے)

قصاص لینے کا حق کسکو ہے آیت مذکورہ میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حق مقتول کے ولی کا ہے۔ اگر نسبی ولی کوئی موجود نہیں تو اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی ایک حیثیت سے سب مسلمانوں کا ولی ہے اسی لئے خلاصۂ تفسیر میں ولی حقیقی یا حکمی لکھا گیا ہے۔

ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے مجرم کی سزا میں بھی انصاف کی رعایت فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اسلامی قانون کی ایک خاص ہدایت ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے لینا جائز نہیں بدلہ میں بھی انصاف کی رعایت لازمی ہے جب تک ولی مقتول انصاف کے ساتھ اپنے مقتول کا انتقام شرعی قصاص کے ساتھ لینا چاہے تو قانون شریعت اس کے حق میں ہے یہ منصور حق ہے اللہ تعالیٰ اس

کا مددگار ہے۔ اور اگر اس نے جوش انتقام میں شرعی قصاص سے تجاوز کیا تو اب یہ مظلوم کے بجائے ظالم ہوگیا اور ظالم اس کا مظلوم بن گیا اب معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون اب اس کی مدد کرنے کے بجائے دوسرے فریق کی مدد کرے گا کہ اس کو ظلم سے بچائے گا۔

جاہلیت عرب میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص قتل ہو تو اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان یا ساتھیوں میں جو بھی ہاتھ لگے اس کو قتل کر دیتے تھے بعض جگہ یہ صورت ہوتی کہ جس کو قتل کیا گیا وہ قوم کا کوئی بڑا آدمی ہے تو اس کے بدلہ میں صرف ایک قاتل کو قصاصاً قتل کرنا کافی نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک خون کے بدلہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی جان لی جاتی تھی بعض لوگ جوش انتقام میں قاتل کے صرف قتل کرنے پر کفایت نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر مثلہ کر دیتے تھے یہ سب چیزیں اسلامی قصاص کی حد سے زائد اور حرام ہیں اس لئے آیت فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ میں ان کو رد کیا گیا ہے۔

یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت بعض ائمہ مجتہدین کے سامنے کسی شخص نے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا حجاج بن یوسف اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا ظالم اور انتہائی بدنام شخص ہے جس نے ہزاروں صحابہ و تابعین کو ناحق قتل کیا ہے اس نے عام طور پر اس کو برا کہنے کی برائی لوگوں کے ذہن میں نہیں رہتی اس بزرگ کے سامنے یہ الزام حجاج بن یوسف پر لگایا گیا انھوں نے الزام لگانے والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس اس الزام کی کوئی سند یا شہادت موجود ہے انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حجاج بن یوسف ظالم سے ہزاروں مقتولین بے گناہ کا انتقام لے گا تو یاد رکھو کہ جو شخص حجاج پر کوئی ظلم کرتا ہے اس کو بھی انتقام سے نہیں چھوڑا جائے گا حجاج کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی لیں گے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی جنبہ داری نہیں ہے کہ بُرے اور گناہگار بندوں پر دوسروں کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جو چاہیں الزام و اتہام لگا دیا کریں۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو جب تک وہ پہنچے اپنی جوانی کو

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿٣٤﴾ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا

اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی اور پورا بھر دو ماپ جب

كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٣٥﴾

ماپ کر دینے لگو اور تولو سیدھی ترازو سے یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام۔

خلاصۂ تفسیر

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس پر تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقہ سے جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد (جائز) کو پورا کیا کرو بیشک عہد کی قیامت میں بازپرس ہونے والی ہے (عہد میں وہ تمام عہد بھی داخل ہیں جو بندہ نے اپنے اللہ سے کئے ہیں اور وہ بھی جو کسی انسان سے کئے ہیں) اور (ناپنے کی چیزوں کو) جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور (تولنے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دو یہ (فی نفسہ بھی) اچھی بات ہے اور انجام بھی اسکا اچھا ہے (آخرت میں تو ثواب اور دنیا میں نیکنامی کی شہرت جو ترقی تجارت کا ذریعہ ہے)

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں تین حکم نواں۔ دسواں۔ گیارہواں مالی حقوق کے متعلق مذکور ہیں سابقہ آیات میں بدنی اور جسمانی حقوق کا ذکر تھا یہ مالی حقوق کا بیان ہے۔

یتیموں کے مال میں احتیاط

ان میں پہلی آیت میں نواں حکم یتیموں کے اموال کی حفاظت اور انمیں احتیاط کا ہے جسمیں بڑی تاکید سے یہ فرمایا کہ یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ یعنی ان میں خلاف شرع یا بچوں کی مصلحت کے خلاف کوئی تصرف نہونے پاوے یتیموں کے مال کی حفاظت اور انتظام جن کے ذمہ ہے ان پر لازم ہے کہ ان میں بڑی احتیاط سے کام لیں صرف یتیموں کی مصلحت کو دیکھ کر خرچ کریں اپنی خواہش یا بےفکری سے خرچ نہ کریں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ یتیم بچے جوان ہو کر اپنے مال کی حفاظت خود نہ کر سکیں جسکا ادنی درجہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنا اور زیادہ اٹھارہ سال تک ہے۔

ناجائز طریقے پر کسی کا مال بھی خرچ کرنا جائز نہیں، یہاں یتیموں کا خصوصیت سے ذکر اسلئے کیا کہ وہ تو خود کوئی حساب لینے کے قابل نہیں دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی جس جگہ کوئی انسان اپنے حق کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو وہاں حق تعالیٰ کا مطالبہ اشد ہو جاتا ہے اسمیں کوتاہی عام لوگوں کے حقوق کی نسبت سے زیادہ گناہ ہو جاتی ہے۔

معاہدات کی تکمیل و تعمیل کا حکم

دسواں حکم عہد پورا کرنے کی تاکید ہے۔ عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اس عہد کا لازمی اثر اسکے احکام کی اطاعت اور اس کی رضاجوئی ہوتا ہے یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا

ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر۔ دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادت ان لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کا حاصل احکام الٰہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضاجوئی ہے۔

دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاہدات سیاسی، تجارتی معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب اور جو خلاف شرع ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم کر دینا واجب ہے جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت میں مرافعہ کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرے۔ معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپ کو فلاں چیز دوں گا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کر دوں گا اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے اور بعض حضرات نے اس کو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدۂ فریقین کی صورت میں اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو دوسرا فریق اس کو بذریعہ عدالت تکمیل معاہدہ پر مجبور کر سکتا ہے مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کرا سکتا ہاں بلا عذر شرعی کے کسی سے وعدہ کر کے جو خلاف ورزی کرے گا وہ شرعاً گنہگار ہوگا حدیث میں اس کو عملی نفاق قرار دیا گیا ہے

اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا یعنی قیامت میں جیسے اللہ فرائض و واجبات اور احکام الٰہیہ کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہوگا ایسا ہی باہمی معاہدات کے متعلق بھی سوال ہوگا۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ اس کا سوال ہوگا آگے سوال کے بعد کیا ہونا ہے اس کو مبہم رکھنے میں خطرہ کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

گیارھواں حکم لین دین کے معاملات میں ناپ تول پورا کرنے کی ہدایت اور اس میں کمی کرنے کی ممانعت کا ہے جس کی پوری تفصیل سورۂ المطففین میں مذکور ہے۔

مسئلہ۔ حضرات فقہاء نے فرمایا کہ آیت میں ناپ تول میں کمی کا جو حکم ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جس کا جتنا حق ہے اس سے کم دینا حرام ہے اس لئے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی ملازم اپنے مفوضہ اور مقررہ کام میں کمی کرے یا جتنا وقت دینا ہے اس سے کم دے یا مزدور اپنی مزدوری میں کام چوری کرے۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت

مسئلہ: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے فرمایا کہ اس آیت میں ناپ تول پورا کرنے کی ذمہ داری بائع (بیچنے والے) پر ڈالی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ناپنے تولنے اور اس کو پورا کرنے کا ذمہ دار بائع ہے۔

میں بغیر تحقیق کے کسی بات پر عمل کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق کے درجات مختلف ہوتے ہیں ایک ایسی تحقیق کہ یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے مخالف جانب کا کوئی شبہ بھی نہ رہے دوسرے یہ کہ گمان غالب کے درجہ میں آ جائے اگرچہ جانب مخالف کا احتمال بھی موجود ہو اسی طرح احکام میں بھی دو قسم ہیں ایک قطعیات اور یقینیات ہیں جیسے عقائد اور اصول دین، ان میں پہلے درجہ کی تحقیق مطلوب ہے اس کے بغیر عمل کرنا جائز نہیں دوسرے ظنیات جیسے فروعی اعمال سے متعلق احکام اس تفصیل کے بعد مقتضی آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ عقائد اور قطعی احکام میں تحقیق بھی درجہ اول کی ہو یعنی قطعیت و یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے اور جب تک یہ نہ ہو عقائد اور اصول اسلام میں اس تحقیق کا اعتبار نہیں اس کے مقتضی پر عمل جائز نہیں اور ظنی فروعی امور میں دوسرے درجہ یعنی ظن غالب کے درجہ کی تحقیق کافی ہے۔ (بیان القرآن)

کان آنکھ اور دل سے متعلق قیامت کے روز سوال

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ اس آیت میں بتلایا ہے کہ قیامت کے روز کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا مطلب یہ ہے کہ کان سے سوال ہوگا کہ تو نے عمر بھر کیا کیا سنا، آنکھ سے سوال ہوگا کہ تم نے عمر بھر کیا کیا دیکھا، دل سے سوال ہوگا کہ تمام عمر دل میں کیسے کیسے خیالات پکائے اور کن کن چیزوں پر یقین کیا۔ اگر کان سے ایسی باتیں سنیں جن کا سننا شرعاً جائز نہیں تھا جیسے کسی کی غیبت یا حرام گانا بجانا وغیرہ یا آنکھ سے ایسی چیزیں دیکھیں جن کا دیکھنا شرعاً حلال نہ تھا جیسے غیر محرم عورت یا امرد لڑکے پر نظر بد کرنا وغیرہ یا دل میں کوئی ایسا عقیدہ جمایا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو یا کسی کے متعلق اپنے دل میں بلا دلیل کوئی الزام قائم کر لیا تو اس سوال کے نتیجہ میں گرفتار عذاب ہوگا یعنی قیامت کے روز اللہ کی دی ہوئی اس کی نعمتوں کا سوال ہوگا۔ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ یعنی تم سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی سب نعمتوں کا سوال ہوگا، کان، آنکھ، دل ان نعمتوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں اس لئے یہاں ان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

تفسیر قرطبی و مظہری میں اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد آیا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ یعنی جس چیز کا تمہیں علم اور تحقیق نہیں اس پر عمل نہ کرو، اسکے متصل کان آنکھ اور دل سے سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بے تحقیق مثلاً کسی شخص پر کوئی الزام لگایا اور بلا تحقیق کسی بات پر عمل کیا اگر وہ ایسی چیز سے متعلق ہے جو کان سے سنی جاتی ہے تو کان سے سوال ہوگا اور آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ اور دل سے سمجھنے کی چیز ہے تو دل سے سوال ہوگا کہ یہ شخص اپنے الزام اور اپنے دل میں جمائے ہوئے خیال میں سچا ہے یا جھوٹا، ہر انسان کے یہ اعضاء خود شہادت دیں گے جو حشر کے میدان میں بے تحقیق الزام لگانے والے

نہیں ہوگا وہ آدمی جس کے دل میں ذرہ کی برابر بھی کبر ہوگا (مظہری بحوالہ صحیح مسلم)

اور ایک حدیث ترمذی میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار، جو شخص مجھ سے ان کو چھیننا چاہے تو میں اس کو جہنم میں داخل کردونگا۔ چادر و ازار سے مراد لباس ہے اور اللہ تعالیٰ تو جسم اور جسمانی چیزوں سے بالاتر ہے اس لئے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفت کبریائی ہے جو شخص اس صفت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بننا چاہے وہ جہنمی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکبر کرنے والے قیامت کے دن چھوٹی چیونٹیوں کے برابر انسانی شکل میں اٹھائے جاویں گے جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری برستی ہوگی، ان کو جہنم کے ایک جیل خانہ کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام بولس ہے، ان پر سب آگوں سے بڑی تیز آگ چڑھی ہوگی اور پینے کے لئے ان کو اہل جہنم کے بدن سے نکلا ہوا پیپ لہو دیا جائے گا (ترمذی بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، از مظہری)

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلند فرماتے ہیں تو وہ اپنے نزدیک تو چھوٹا مگر سب لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرتے ہیں تو وہ خود اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں کتے اور خنزیر سے بھی بدتر ہوتا ہے (مظہری)

احکام مذکورہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا یعنی

مذکورہ تمام بُرے کام اللہ کے نزدیک مکروہ و ناپسند ہیں۔

مذکورہ احکام میں جو محرمات و ممنوعات ہیں ان کا بُرا اور ناپسند ہونا تو ظاہر ہے مگر ان میں کچھ احکام اوامر بھی ہیں جیسے والدین اور قرابت کے حقوق ادا کرنا اور وفائے عہد وغیرہ، لیکن یہ بھی چونکہ مقصود ان کی ضد سے بچانا ہے کہ والدین کی ایذا سے، رشتہ داروں کی قطع رحمی سے، نقض عہد سے پرہیز کریں یہ چیزیں سب حرام و ناپسند ہیں اسلئے مجموعہ کو مکروہ فرمایا گیا ہے (بیان القرآن)

تنبیہ | مذکورہ پندرہ آیتوں میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایک حیثیت سے اس سعی و عمل کی تشریح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوں جس کا ذکر مذکورہ آیتوں سے پہلے آیت وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا میں بتلایا گیا تھا کہ ہر سعی و عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں بلکہ صرف وہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیم کے مطابق ہو۔ ان احکام میں اس مقبول سعی و عمل کے اہم ابواب کا ذکر آگیا ہے جس میں پہلے حقوق اللہ کا پھر حقوق العباد کا بیان ہے۔

یہ پندرہ آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں | حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پوری تورات کے احکام

سورۂ بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں جمع کر دیئے گئے ہیں

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ

یہ ہے اُن باتوں میں سے جو وحی بھیجی تیرے رب نے تیری طرف عقل کے کاموں سے اور مت ٹھہرا اللہ کے

اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

سوا اور کسی کی بندگی پھر پڑے تو دوزخ میں الزام کھا کر دھکیلا جا کر

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنَاثًا ۭ

کیا تم کو چن کر دے دیئے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لئے کر لیا فرشتوں کو بیٹیاں

اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

تم کہتے ہو بھاری بات اور پھیر پھیر کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں

لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ

تاکہ وہ سوچیں اور ان کو زیادہ ہوتا ہے وہی بدکنا کہہ اگر ہوتے اس کے

مَعَهٗٓ اٰلِـهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ

ساتھ اور حاکم جیسا یہ بتلاتے ہیں تو نکالتے صاحب عرش کی طرف

سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

راہ وہ پاک ہے اور بہت برتر ہے اُن کی باتوں سے بے نہایت

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ

اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے اور کوئی

مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ

چیز نہیں جو نہیں پڑھتی خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

بے شک وہ ہے تحمل والا بخشنے والا۔

خلاصۂ تفسیر

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یہ باتیں (یعنی احکام مذکورہ) اس حکمت میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ

حاصل ہونا اور ہمیشہ باقی رہنا عادۃً ممتنع ہے یہ دلیلیں ہیں اگرچہ مختصر انداز میں بیان کی گئی ہے مگر علم کلام کی کتابوں میں ان دلیلوں کا برہانی اور منطقی ہونا بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کے تسبیح کرنے کا مطلب

ان چیزوں میں فرشتے سب کے سب اور انسان و جن مومن ہیں ان کا تو تسبیح کرنا تو ظاہر ہے سبھی جانتے ہیں کافر انسان و جن جو بظاہر تسبیح نہیں کرتے اسی طرح عالم کی دوسری چیزیں جنکو عام طور سے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے ان کے تسبیح پڑھنے کا مطلب کیا ہے بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حالی یعنی ان کے حالات کی شہادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا مجموعی حال بتلا رہا ہے کہ وہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہے نہ اپنے باقی رہنے میں وہ کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے یہی شہادت حال اس کی تسبیح ہے۔

مگر دوسرے اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح اختیاری تو صرف فرشتے اور مومن جن وانس کے ساتھ مخصوص ہے مگر تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنا تسبیح خواں بنا رکھا ہے کافر بھی اول تو عموماً خدا تعالیٰ کو مانتے اور اس کی عظمت کے قائل ہیں اور جو مادہ پرست دہریے یا آجکل کے کمیونسٹ خدا کے وجود کے زبانی قائل نہیں مگر ان کے وجود کا ہر جز جزو جبری طور پر اللہ کی تسبیح کر رہا ہے جیسے درخت اور پتھر مٹی وغیرہ سب جبری تسبیح حق میں مشغول ہیں مگر ان کی یہ تسبیح جو جبری اور تکوینی ہے یہ عام لوگ سنتے نہیں قرآن کریم کا ارشاد وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ہر ذرہ ذرہ کی تسبیح تکوینی کوئی ایسی چیز ہے جسکو عام انسان سمجھ نہیں سکتے تسبیح حالی کو تو اہل عقل و فہم جان سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف حالی نہیں بلکہ حقیقی ہے مگر ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ (ذکرہ القرطبی)

حدیث میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ مذکور ہے کہ آپکی مٹھی میں کنکروں کی تسبیح کرنا صحابہ کرام نے کانوں سے سنا اس کا معجزہ ہونا تو ظاہر ہے مگر خصائص کبریٰ میں شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا حضورؐ کا معجزہ نہیں وہ تو جہاں کہیں بھی ہیں تسبیح پڑھتی ہیں بلکہ معجزہ آپکا یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی وہ تسبیح کانوں سے سنی جانے لگی۔

امام قرطبی نے اسی تحقیق کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر قرآن و سنت کے بہت دلائل پیش کئے ہیں مثلاً سورۂ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ یعنی ہم نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ وہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح و شام تسبیح کرتے ہیں اور

دوسرے اس کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان کی مراد درحقیقت مسحور کہنے سے مجنون کہنا تھا اسی کی تردید قرآن نے فرمائی ہے اس لئے حدیث سحر کے خلاف اور متعارض نہیں۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں جو مضمون آیا ہے اس کا ایک خاص شان نزول ہے جو قرطبی نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن میں سورۂ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی جس میں ابولہب کی بیوی کی بھی مذمت مذکور ہے تو اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئی اس وقت صدیق اکبر مجلس میں موجود تھے اس کو دور سے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ یہاں سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ عورت بڑی بدزبان ہے یہ ایسی باتیں کہے گی جس سے آپ کو تکلیف پہنچے گی آپ نے فرمایا نہیں میرے اور اس کے درمیان اللہ تعالیٰ پردہ حائل کر دیں گے چنانچہ وہ مجلس میں پہنچی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی تو صدیق اکبر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آپ کے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے صدیق اکبر نے فرمایا کہ واللہ وہ تو کوئی شعر و شاعری نہیں کرتے جس میں عادۃً ہجو کی بات ہوتی ہے تو وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم بھی ان کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو اس کے چلے جانے کے بعد صدیق اکبر نے عرض کیا کہ کیا اس نے آپ کو نہیں دیکھا آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ میرے اور اس کے درمیان پردہ کرتا رہا۔

دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کی آنکھوں سے مستور ہونا چاہتے تو قرآن کی تین آیتیں پڑھ لیتے تھے اس کے اثر سے کفار آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے وہ تین آیتیں یہ ہیں ایک آیت سورۂ کہف میں ہے یعنی اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا دوسری آیت سورۂ نحل میں ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ تیسری آیت سورۂ جاثیہ میں ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا اس کو کسی ضرورت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا پھر رومی کفار نے ستایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا ان لوگوں نے اس کا تعاقب کیا اس شخص کو وہ روایت یاد آئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستہ پر یہ چل رہے تھے اسی راستہ پر دشمن گذر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے۔

امام ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت کعب سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے رَے کے رہنے والے ایک شخص کو بتلائی اتفاق سے دیلم کے کفار نے اس کو گرفتار کر لیا کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا پھر

ایک روز موقع پا کر یہ جماعت گھر پر آئی یہ لوگ اس کے تعاقب میں نکلے مگر اس شخص نے بھی یہی تین آیتیں پڑھیں اس کا یہ اثر ہوا کہ حق تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالدیا کہ وہ اسکو نہ دیکھ سکے حالانکہ یہ ساتھ ساتھ ہی راستے پر تھے اور اس کے کپڑے ان کے کپڑوں سے چھو جاتے تھے۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ ان تین آیتوں کے ساتھ وہ آیات سورۂ یٰسین کی بھی ملالی جائیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت پڑھا تھا جبکہ مشرکین مکہ نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا آپ نے یہ آیات پڑھیں اور ان کے درمیان سے نکلتے ہوئے چلے گئے بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گئے کسی کو خبر نہیں ہوئی وہ آیات سورۂ یٰسین کی یہ ہیں، یٰسٓ

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَاۗؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مجھے خود اپنے ملک اندلس میں قرطبہ کے قریب قلعہ منثور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میں دشمن کے سامنے سے بھاگا اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا دشمن نے دو گھوڑے سوار میرے تعاقب میں بھیجے اور میں بالکل کھلے میدان میں تھا کوئی چیز پردہ کرنے والی نہ تھی مگر میں سورۂ یٰسین کی یہ آیتیں پڑھ رہا تھا یہ دونوں سوار میرے برابر سے گذرے پھر جہاں سے آئے تھے یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ یہ شخص کوئی شیطان ہے کیونکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے اللہ تعالیٰ نے ان کو مجھ سے اندھا کردیا تھا۔ (قرطبی)

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝۴۹

اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہو گئے ہڈیاں اور چورا چورا پھر اٹھیں گے نئے بن کر

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝۵۰ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ

تو کہہ تم ہو جاؤ پتھر یا لوہا یا کوئی خلقت جس کو مشکل سمجھو اپنے جی میں

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ

پھر اب کہیں گے کون لوٹا کر لائے گا ہم کو، تو کہہ جس نے پیدا کیا تم کو پہلی بار

فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى

پھر اب مٹکاویں گے تیری طرف اپنے سر اور کہیں گے کب ہوگا یہ، تو کہہ شاید

اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿٥١﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ

نزدیک ہی ہوگا جس دن تم کو پکارے گا پھر چلے آؤ گے اس کی تعریف کرتے ہوئے

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٥٢﴾

اور اٹکل کرو گے کہ دیر نہیں کی تم نے مگر تھوڑی

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور (ہڈیوں کا بھی) چورا یعنی ریزہ ریزہ ہو جاویں گے تو کیا اس کے بعد قیامت میں ہم از سر نو پیدا اور زندہ کئے جاویں گے یعنی اول تو مر کر زندہ ہونا ہی مشکل ہے کہ جسم میں زندگی کی صلاحیت نہیں رہی کچھ جبکہ وہ جسم بھی ریزہ ریزہ ہو کر اس کے اجزاء منتشر ہو جاویں تو اس کے زندہ ہونے کو کون مان سکتا ہے، آپ ان کے جواب میں فرما دیجئے کہ (تم تو ہڈیوں کی حیات کو بعید سمجھتے ہو اور ہم کہتے ہیں کہ) تم پتھر یا لوہا یا اور کوئی ایسی مخلوق ہو کر دیکھو جو تمہارے ذہن میں (زندگی کی صلاحیت سے) بہت ہی بعید ہو (پھر دیکھو کہ زندہ کئے جاؤ گے یا نہیں اور پتھر اور لوہے کو بعید از حیات قرار دینا اس لئے ہے کہ انہیں کسی وقت بھی حیات حیوانی نہیں آئی بخلاف ہڈیوں کے کہ ان میں پہلے اس وقت تک حیات رہ چکی ہے تو جب پتھر لوہے کا زندہ کرنا حق تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں تو عظام کو دوبارہ زندگی بخشنا کیا مشکل ہوگا اور آیت میں لفظ کُوْنُوْا جو صیغہ امر ہے اس سے امر بیان مراد نہیں بلکہ ایک تعلیق و شرطیہ ہے کہ اگر تم بالفرض پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ تو حق تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر ہیں) اس پر وہ پوچھیں گے کہ وہ کون ہے جو دوبارہ ہم کو زندہ کرے گا آپ فرما دیجئے کہ وہ وہ ہے جس نے تم کو اول بار میں پیدا کیا تھا (اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزیں درکار ہیں ایک مادہ اور محل میں وجود کی قابلیت دوسرے اس کو وجود میں لانے کے لئے قوت و علم پہلا سوال محل کی قابلیت سے متعلق تھا کہ وہ مرنے کے بعد زندگی کے قابل نہیں اس کا جواب دے کر محل کی قابلیت ثابت کر دی گئی تو یہ دوسرا سوال فاعلیت سے متعلق کیا گیا کہ ایسا کونسا قوت و قدرت والا ہے جو اپنی قوت فاعلیت سے یہ عجیب کام کر سکے اس کے جواب میں فرما دیا گیا کہ جس نے پہلے تمہیں اپنی قدرت سے پیدا کیا تھا جس میں قابلیت حیات کا کسی کو گمان بھی نہ تھا تو اس کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے، اور جب قابلیت و فاعلیت دونوں کا سوال حل ہو گیا تو اب یہ لوگ زمانہ وقوع کی تحقیق کے لئے آپ کے آگے سر ہلا ہلا کر کہیں گے کہ (اچھا یہ بتلائیے کہ) یہ زندہ ہونا

کب ہوگا؟ آپ فرما دیجئے کہ عجب نہیں کہ یہ قریب ہی آ پہنچا ہو۔ آگے ان حالات کا بیان ہے جو اس نئی زندگی کے وقت پیش آویں گے، یہ اس روز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زندہ کرکے اور میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے فرشتہ کے ذریعہ پکارے گا اور تم بالضطرار اس کی حمد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کرو گے یعنی زندہ بھی ہو جاؤ گے اور میدان حشر میں جمع بھی ہو جاؤ گے۔ اور اس روز کی ہول و ہیبت دیکھ کر تمہارا یہ حال ہوجاوے گا کہ دنیا کی ساری عمر اور قبر میں رہنے کی ساری مدت کی نسبت تم یہ خیال کرو گے کہ بہت ہی کم مدت دنیا میں رہے تھے (کیونکہ دنیا اور قبر میں آج کی مدت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی، سختی اور راحت کا زمانہ انسان کو مصیبت پڑنے کے وقت بہت مختصر معلوم ہوا کرتا ہے)

معارف و مسائل

یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ، لفظ یَدْعُوْکُمْ دعا سے مشتق ہے جس کے معنی آواز دے کر بلانے کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ جس روز اللہ تعالیٰ تم سب کو محشر کی طرف بلائے گا اور یہ بلانا بواسطہ فرشتہ اسرافیل کے ہوگا کہ جب وہ دوسرا صور پھونکیں گے تو سب مردے زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندہ ہونے کے بعد سب کو میدان حشر میں جمع کرنے کے لئے آواز دی جائے (قرطبی)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم کو تمہارے اپنے اور باپ کے نام سے پکارا جائے گا اس لئے اپنے نام اچھے رکھا کرو بیہودہ ناموں سے پرہیز کرو۔ (قرطبی)

محشر میں کافر بھی اللہ کی حمد وثنا کرتے اٹھیں گے

فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ، استجابت کے معنی کسی کے بلانے پر حکم کی تعمیل کرنے اور حاضر ہو جانے کے ہیں معنے یہ ہیں کہ میدان حشر میں جب تم کو بلایا جاوے گا تو تم سب اس آواز کی اطاعت کرو گے اور جمع ہو جاؤ گے بحمدہ یہ تستجیبون کی ضمیر فاعل کا حال ہے جس کے معنی مراد یہ ہے کہ اس میدان میں آنے کے وقت تم سب کے سب اللہ کی حمد وثنا کرتے ہوئے حاضر ہو گے۔

اس آیت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مومن و کافر سب کا یہی حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے کیونکہ اس آیت میں اصل خطاب کفار ہی کو ہے انہیں کے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے کہ سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے اور تفسیر میں حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلتے وقت سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے مگر اس وقت کا حمد وثنا

کرنا کوئی نفع نہیں دیگا، (قرطبی) کیونکہ یہ لوگ جب مرنے کے بعد زندگی دیکھیں گے تو غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے الفاظ نکلیں گے، وہ کوئی عمل نہیں ہوگا جس پر جزاء مرتب ہو۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس حال کو مؤمنین کیلئے مخصوص بتلایا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ کفار کے متعلق تو قرآن کریم میں یہ ہے کہ جب وہ زندہ کئے جاویں گے تو یہ کہیں گے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یعنی ہائے افسوس ہمیں کس نے ہماری قبر سے زندہ کر کے اٹھا دیا) اور دوسری آیت میں ہے کہ یہ کہیں گے یٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (یعنی ہائے حسرت و افسوس ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں بڑی کوتاہی کی ہے)

لیکن تحقیق یہ ہے کہ ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں، ہو سکتا ہے کہ شروع میں سب کے سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں بعد میں جب کافروں کو مؤمنین سے الگ کر دیا جاویگا جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیت میں ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (اے مجرمو تم آج سب الگ ممتاز ہو کر جمع ہو جاؤ) اس وقت ان کی زبانوں سے وہ کلمات بھی نکلیں گے جو آیات مذکورہ میں آئے ہیں اور یہ تمام قرآن و سنت کی بیشمار تصریحات سے معلوم و ثابت ہے کہ حشر کے مواقف مختلف ہوں گے، ہر موقف میں لوگوں کے حالات مختلف ہوں گے، امام قرطبی نے فرمایا کہ حشر کی ابتداء بھی حمد سے ہوگی سب کے سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے اور سب معاملات کا خاتمہ بھی حمد پر ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی سب اہل محشر کا فیصلہ حق کے مطابق کر دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ حمد و شکر ہے اللہ رب العالمین کا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ

اور کہہ دے میرے بندوں کو بات وہی کہیں جو بہتر ہو شیطان جھگڑواتا ہے

بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ

ان میں شیطان ہے انسان کا دشمن صریح تمہارا رب

اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ

خوب جانتا ہے تم کو اگر چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تم کو عذاب دے اور تجھ کو

اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

نہیں بھیجا ہم نے ان پر ذمہ لینے والا اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں میں ہیں

نے اس سے عبرت حاصل نہ کی بلکہ اس کے ساتھ ظلم کیا اور اسکو قتل کر ڈالا تو ظاہر یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کے فرمائشی معجزے دکھلا دیئے گئے تو یہ بھی ایسا ہی کریں گے) اور ہم ایسے معجزات کو صرف اس بات سے ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں کہ اگر یہ فرمائشی معجزہ دیکھکر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو فوراً ہلاک کر دئے جاؤ گے اور معلوم ہو چکا ہے کہ جن لوگوں کے فرمائشی معجزات دکھلائے گئے وہ ایمان تو لائے نہیں اس معاملہ ان کی ہلاکت اور عذاب عام کا سبب بنگیا، اور حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لوگ ابھی ہلاک نہ کئے جاویں اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھلائے جاتے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو پہلے پیش آچکا ہے جسکا ذکر یہ ہے کہ آپ وہ وقت یاد کیجئے جبکہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپکا رب اپنے علم سے تمام لوگوں کے احوال ظاہرہ و باطنہ موجودہ و مستقبلہ کو محیط ہے (اور احوال مستقبلہ میں ان کا ایمان نہ لانا بھی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جسکی ایک دلیل ابھی کا یہ واقعہ ہے کہ) ہم نے (شب معراج میں) جو تماشا بحالت بیداری آپکو دکھلایا تھا اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (یعنی زقوم جو طعام کفار ہے) ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا (یعنی ان لوگوں نے ان دونوں امر کو منکر تکذیب کی معراج کی تکذیب تو اس بناء پر کی کہ ایک رات کی قلیل مدت میں ملک شام جانا اور پھر آسمان پر جانا ان کے نزدیک ممکن نہ تھا اور شجرۂ زقوم کی تکذیب اس بناء پر کی کہ اسکو دوزخ کے اندر بتلایا جاتا ہے آگ میں کوئی درخت کیسے رہ سکتا ہے اگر ہو بھی تو جل جائے گا حالانکہ نہ ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا عقلاً محال ہے نہ آسمان پر جانا ناممکن ہے اور آگ کے اندر درخت کا وجود ان کی سمجھ میں نہ آیا حالانکہ کوئی محال بات نہیں کہ کسی درخت کا مزاج ہی حق تعالیٰ ایسا بنا دیں کہ وہ پانی کے بجائے آگ سے پرورش پائے جیسے بعض جانور) اور ہم ان لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑی سرکشی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے (شجرۂ زقوم کے انکار کے ساتھ یہ لوگ استہزاء بھی کرتے تھے جسکا بیان مع زائد تحقیق کے سورۂ صٰفٰت میں آوے گا)

معارف و مسائل

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ۔ (یعنی شب معراج میں جو تماشا ہم نے آپکو دکھلایا تھا وہ لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھا) لفظ فتنہ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اسکے ایک معنی وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے یعنی گمراہی، ایک معنی آزمائش کے بھی آتے ہیں ایک معنی کسی ہنگامہ فساد کے برپا ہونے کے بھی آتے ہیں یہاں ان سب معانی کا احتمال ہے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ اور حسنؒ اور مجاہدؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے

اس جگہ فتنہ سے مراد یہی آخری معنی لئے ہیں اور فرمایا کہ یہ فتنہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نومسلم لوگ جنہیں ایمان راسخ نہ ہوا تھا اس کلام کی تکذیب کر کے مرتد ہو گئے (قرطبی)

اسی واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لفظ رؤیا عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے مگر اس جگہ مراد خواب کا قصہ نہیں کیونکہ ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے بلکہ اس جگہ مراد رؤیا سے ایک واقعہ عجیبہ کا بحالت بیداری دکھلانا ہے آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض حضرات نے اس کو واقعہ معراج کے سوا دوسرے واقعات پر بھی محمول کیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے وہ یہاں منطبق نہیں ہوتے اس لئے جمہور نے واقعہ معراج ہی کو اس آیت کا محمل قرار دیا ہے (کما فصلہ القرطبی)۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا

بولا کیا میں سجدہ کروں ایک شخص کو جس کو تو نے بنایا مٹی کا کہنے لگا بھلا دیکھ تو یہ شخص

الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ

جس کو تو نے مجھ سے بڑھا دیا اگر تو مجھ کو ڈھیل دیوے قیامت کے دن تک تو میں اس کی اولاد

ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ

کو ڈھا لگا دوں مگر تھوڑے سے فرمایا جا پھر جو کوئی تیرے ساتھ ہوا ان میں سے سو

جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ

دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ پورا اور گھبرا لے ان میں جس کو تو

مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ

گھبرا سکے اپنی آواز سے اور لے آ ان پر اپنے سوار اور پیادے اور ساجھا کر

فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ

ان سے مال اور اولاد میں اور وعدے دے ان کو اور کچھ نہیں وعدہ دیتا ان کو

حاصل کیا جائے یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے یہی شیطان کی اس میں شرکت ہے اور اولاد میں شیطان کی شرکت اولاد حرام ہونے سے بھی ہوتی ہے اور اس سے بھی کہ اولاد کے نام مشرکانہ رکھے یا انکی حفاظت کے لئے مشرکانہ رسوم ادا کرے یا ان کی پرورش کے لئے حرام ذرائع آمدنی اختیار کرے (قرطبی)

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ

تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے واسطے کشتی دریا میں تاکہ تلاش کرو اس کا فضل وہی

كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٦٦﴾ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ

ہے تم پر مہربان اور جب آتی ہے تم پر تکلیف دریا میں بھول جاتے ہو جن کو تم پکارا کرتے تھے

إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ

اللہ کے سوائے پھر جب بچا لایا تم کو خشکی کی طرف پھر جاتے ہو اور ہے انسان

كَفُورًا ﴿٦٧﴾ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ

بڑا ناشکرا سو کیا تم بے ڈر ہو گئے اس سے کہ دھنسا دے تم کو جنگل کے کنارے یا بھیج دے

عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا ﴿٦٨﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ

تم پر آندھی پتھر برسانے والی پھر نہ پاؤ اپنا کوئی نگہبان یا بے ڈر ہو گئے ہو اس سے کہ پھر لے جائے

فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ

تم کو اس میں دوسری بار پھر بھیجے تم پر ایک سخت جھونکا ہوا کا پھر ڈبا دے تم کو

بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ﴿٦٩﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بدلے میں اس ناشکری کے پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اس کا کوئی دعویٰ کرنے والا اور ہم نے عزت دی ہے

بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ

آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴿٧٠﴾

اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر

ع

خلاصۂ تفسیر

سابقہ آیات میں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا، آیات مذکورہ میں بھی یہی مضمون ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بے شمار عظیم الشان نعمتیں جو انسانوں پر ہر وقت مبذول ہیں ان کو بیان کر کے یہ بتلانا منظور ہے کہ ان تمام نعمتوں کا بخشنے والا بجز ایک حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور جب نعمتیں اسی کی ہیں تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا بڑی گمراہی ہے ارشاد فرمایا کہ) تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ رزق کی تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) بیشک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے (کہ بحری سفر تجارت کے لئے عموماً بڑے نفع کا سبب ہوتا ہے) اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (مثلاً دریا کی موجوں اور ہوا کے طوفان سے غرق ہونے کا خطرہ) تو بجز خدا کے اور جس جس کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں (کہ نہ تمہیں خود اس وقت ان کا خیال آتا ہے نہ ان کو پکارتے ہو اور پکارو بھی تو ان سے کسی امداد کی توقع ہو ہی نہیں سکتی، یہ تو عملی طور پر تمہاری طرف سے توحید کا اقرار اور شرک کا ابطال ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم پھر اس سے رخ پھیر لیتے ہو اور انسان ہے بڑا ناشکرا (کہ نعمتیں جلدی بھلا کے انعام اور احسان وغیرہ کو بھول جاتا ہے، اور تم جو خشکی میں پہنچ کر اس سے بے رخی برتتے ہو) تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ تم کو خشکی میں لا کر زمین میں دھنسا دے (مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دریا اور خشکی میں کوئی فرق نہیں وہ جیسے دریا میں غرق کر سکتا ہے ایسا ہی خشکی میں بھی زمین میں دھنسا کر غرق کر سکتا ہے) یا تم پر کوئی ایسی سخت ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے (جیسے کہ قوم عاد اپنی ہوا کے طوفان سے ہلاک کی گئی تھی) پھر تم کسی کو اپنا کارساز (خدا کے سوا) نہ پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجاوے پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر (یعنی غرق کر دینے پر) کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی تم کو نہ ملے جو ہم سے تمہارا بدلہ لے سکے اور ہم نے اولاد آدم کو (مخصوص صفات دیکر) عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں (جانوروں اور کشتیوں پر) سوار کیا اور پاکیزہ نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی

معارف و مسائل

بنی آدم کی فضیلت اکثر مخلوقات پر کس وجہ سے ہے آخری آیت میں اولاد آدم کی اکثر مخلوقات پر فوقیت

سورۂ یٰسین میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ اسمیں امام مبین سے مراد واضح کتاب ہے اور کتاب کو امام اسلئے کہا جاتا ہے کہ بھول چوک اور اختلاف کے وقت کتاب ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جیسے کسی امام مقتدا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (قرطبی)

اور ترمذی کی حدیث بروایت ابوہریرہ رضؓ (جسکو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام سے مراد اس آیت میں کتاب ہے۔ الفاظ حدیث کے یہ ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ قَالَ يُدْعٰى اَحَدُهُمْ فَيُعْطٰى كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ (الحدیث بطولہ) آیت يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اسکا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی متعین ہوگیا کہ امام سے کتاب ہے اور یہی معلوم ہوگیا کہ کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے اسی لئے خلاصۂ تفسیر از بیان القرآن میں اسکا ترجمہ نامۂ اعمال سے کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور مجاہد وغیرہ مفسرین سے یہاں لفظ امام کے معنے مقتدا اور پیشوا کے بھی منقول ہیں کہ ہر شخص کو اس کے مقتدا و پیشوا کا نام لیکر پکارا جائے خواہ وہ مقتدا و پیشوا انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب مشائخ و علماء ہوں یا گمراہی اور معصیت کی طرف دعوت دینے والے پیشوا (قرطبی)

اس معنے کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ میدان حشر میں ہر شخص کو اسکے مقتدا اور پیشوا کے نام سے پکارا جائے گا اور سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا مثلاً متبعین ابراہیم علیہ السلام متبعین موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام و متبعین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے ذیل میں ممکن ہے کہ ان متبعین کے بلاواسطہ مقتداؤں کا نام بھی لیا جائے۔

نامۂ اعمال: قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال صرف کفار کو دیا جائیگا جیسا کہ ایک آیت میں ہے اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ اور ایک دوسری آیت میں ہے اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ پہلی آیت میں صراحۃً ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری میں انکار آخرت مذکور ہے وہ بھی کفر ہی ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال اہل ایمان کو دیا جائیگا خواہ متقی ہوں یا گنہگار، مومن اپنے نامۂ اعمال کو خوشی کے ساتھ پڑھے گا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھوائے گا یہ خوشی ایمان کی وجہ سے اور ہمیشہ کی نجات کی ہوگی گو بعض اعمال پر سزا بھی ہوگی۔

قرآن کریم میں نامۂ اعمال داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیت مذکور نہیں لیکن بعض احادیث میں تطایر الکتب کا لفظ آیا ہے (رواہ احمد عن عائشہ رضؓ مرفوعا) اور بعض

روایات حدیث میں ہے کہ سب نامۂ اعمال عرش کے نیچے جمع ہوں گے پھر ایک ہوا چلے گی جو سب کو اڑا کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی کسی کے داہنے ہاتھ میں کسی کے بائیں ہاتھ میں۔ واخرجہ العقیلی عن انس مرفوعاً۔ (بیان القرآن از روح المعانی)

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ

اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف

لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْ

تاکہ جھوٹ بنا لائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست اور اگر

لَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾

نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا

إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ

تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دونا مزہ زندگی میں اور دونا مرنے میں پھر نہ پاتا تو اپنے

لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ

واسطے ہم پر مدد کرنے والا اور وہ تو چاہتے تھے کہ گھبرا دیں تجھ کو اس

الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾

زمین سے تاکہ نکال دیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا ۖ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿٧٧﴾ ع ۸

دستور چلا آتا ہے ان رسولوں کا جو تجھ سے پہلے بھیجے ہم نے اور نہ پائے گا تو ہمارے دستور میں تفاوت۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کافر لوگ (اپنی قوی تدبیروں کے ذریعہ) آپ کو اس چیز سے بچلانے (اور ہٹانے) ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے (یعنی اس کوشش میں لگے تھے کہ آپ سے حکم خداوندی کے خلاف عمل کرا دیں) اور تاکہ آپ اس (حکم) کے سوا ہماری طرف (عملاً) غلط بات کی نسبت کر دیں (کیونکہ نبی کا فعل خلاف شرع ہوتا نہیں، سو اگر نعوذ باللہ آپ سے کوئی عمل خلاف شرع ہو جاتا تو یہ لازم آتا کہ اس خلاف شرع عمل کو گویا اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں) اور ایسی حالت میں آپ کو

خالص دوست بن جاتے اور (ان کی یہ شرارت ایسی سخت تھی کہ) اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (یعنی معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہونچتے (اور) اگر ایسا ہوجاتا کہ آپ کا یہ میلان ان کی بات کی طرف ہوتا) تو ہم آپ کو (اس وجہ سے کہ مقربان بارگاہ کا مقام بہت بلند ہے) حالت حیات میں بھی اور بعد موت کے بھی دوہرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے (مگر چونکہ آپ کو ہم نے معصوم اور ثابت قدم بنایا اس لئے ان کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہوا اور اس عذاب سے بچ گئے)

اور یہ (کافر) لوگ اس سرزمین (مکہ یا مدینہ) سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ آپ کو اس سے نکال دیں اور اگر ایسا ہو جاتا تو آپ کے بعد یہ بھی بہت کم (یہاں) ٹھہرنے پاتے جیسا اُن انبیاء کے بارے میں (ہمارا) قاعدہ رہا ہے جن کو آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا (کہ جب ان کی قوم نے ان کو وطن سے نکالا تو پھر اس قوم کو بھی وہاں رہنا نصیب نہیں ہوا) اور آپ ہمارے قاعدے میں تغیر تبدل نہ پاویں گے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی تین آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں تفسیر مظہری میں اس واقعہ کی تعیین کے متعلق چند روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے اقرب اور مؤید باشارات قرآن یہ واقعہ ہے جو تخریج ابن ابی حاتم بروایت جبیر ابن نفیرؓ نقل کیا ہے کہ قریش مکہ کے چند سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ واقعی ہماری طرف بھیجے گئے ہیں تو پھر اپنی مجلس سے ان غریب شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجئے جن کے ساتھ بیٹھنا ہمارے لئے توہین ہے تو پھر ہم بھی آپ کے صحابی اور دوست ہوجائیں گے۔ ان کی اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خیال پیدا ہوا کہ ان کی بات پوری کر دیں شاید یہ مسلمان ہوجائیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا گیا کہ ان کی بات فتنہ ہے ان کی دوستی بھی فتنہ ہے آپ کو ان کی بات نہیں ماننی چاہئے اور پھر ارشاد فرمایا کہ اگر ہماری طرف سے آپ کی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ آپ ان کی بات کی طرف میلان کے تھوڑے سے قریب ہوجاتے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھی جاتی ہے کہ کفار قریش کی لغویات کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میلان کا تو کوئی احتمال ہی نہ تھا ہاں میلان کے

قریب ہوجانے کا وہم بھی بہت قلیل حد میں امکان تھی مگر اللہ تعالیٰ نے معصوم بنا کر اس سے بھی بچالیا، غور کیا جائے تو یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علو شان آپ کی خلقت وطبیعت پر بڑی دلیل ہے کہ اگر پیغمبرانہ عصمت بھی نہ ہوتی تب بھی آپ کی فطرت ایسی تھی کہ کفار کی خواہشات کی طرف میلان ہوجانا اس سے ممکن نہ تھا، ہاں میلان سے کچھ قریب بقدر قلیل کا احتمال تھا جو پیغمبرانہ عصمت نے ختم کردیا۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ یعنی اگر بالفرض محال آپ ان کی غلط روش کی طرف میلان کے قریب ہوجاتے تو آپ کا عذاب دنیا میں بھی دوہرا ہوتا اور موت کے بعد قبر یا آخرت میں بھی دوہرا ہوتا کیونکہ مقربان بارگاہ کی معمولی سی غلطی بھی بہت بڑی سمجھی جاتی ہے اور یہ مضمون تقریباً وہی ہے جو ازواج مطہرات کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ یعنی اے نبی کی عورتوں اگر تم میں سے کسی نے کھلی بے حیائی کا کام کیا تو اس کو دوہرا عذاب دیا جائیگا۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ، استفزاز کے معنی قطع کرنے کے ہیں یہاں مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مستقر یعنی مدینہ سے نکال دینا ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ قریب تھا کہ یہ کفار آپ کو اپنی زمین سے نکال دیں، اور اگر وہ ایسا کرلیتے تو اس کی سزا ان کو یہ ملتی کہ وہ بھی آپ کے بعد زیادہ دیر اس شہر میں نہ رہ پاتے، یہ ایک دوسرے واقعہ کا بیان ہے اور اس کی تعیین میں بھی دو روایتیں منقول ہیں، ایک واقعہ مدینہ طیبہ کا ہے کہ یہود مدینہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آپ اپنی نبوت کے دعوے میں سچے ہیں تو آپ کو چاہئے کہ ملک شام میں جا کر رہیں کیونکہ ملک شام ہی محشر کی زمین ہے اور وہی انبیاء کی زمین ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے کلام کا کچھ اثر ہوا، غزوہ تبوک کے وقت جو ملک شام کا سفر ہوا تو آپ کا قصد یہ تھا کہ ملک شام کو اپنا ایک مستقر بنائیں مگر یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ جس میں آپ کو اس ارادہ سے روک دیا گیا مگر ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے ناقابل تسلیم قرار دیا ہے۔

اور اس آیت کا مصداق ایک دوسرا واقعہ بتلایا ہے جو مکہ مکرمہ میں پیش آیا اور اس سورت کا مکی ہونا اس کے لئے قوی قرینہ ہے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کا ارادہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ اور اس میں کفار مکہ کو یہ تنبیہ فرمائی کہ اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیں گے تو پھر خود بھی مکہ میں دیر تک چین سے نہ بیٹھ سکیں گے۔ ابن کثیرؒ نے اسی واقعہ

کا مصداق آیت ہونا بھی ذکر دیا ہے اور پھر تنبیہ کہ قرآن کریم کی یہ وعید بھی کفار مکہ نے کھلی آنکھوں دیکھ لی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو مکہ والے ایک دن بھی مکہ میں چین سے نہیں بیٹھ سکے صرف ڈیڑھ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو میدان بدر میں جمع کر دیا جہاں ان کے ستر سردار مارے گئے اور ان کی قوت ٹوٹ گئی پھر غزوہ احد کے آخری نتیجہ میں ان پر ہیبت طاری ہوگئی اور غزوہ احزاب کے آخری معرکہ نے تو ان کی کمر ہی توڑ دی اور ہجرت سے آٹھویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مکہ مکرمہ فتح کر لیا۔

سُنَّۃَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا، اس آیت میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عام سنت اور قاعدہ پہلے سے یہی چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی کو اس کے وطن سے نکالتی یا نکالنے پر مجبور کرتی ہے تو پھر وہ قوم بھی وہاں باقی نہیں رکھی جاتی اس پر خدا تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ

قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ

بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو ۔ اور کچھ رات جاگتا رہ اس میں قرآن کے ساتھ

نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ وَ

یہ زیادتی ہے تیرے لئے قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود میں ۔ اور

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ

کہہ اے رب داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچا

صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝ وَ

نکالنا اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد ۔ اور

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

کہہ آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ بے شک جھوٹ ہے نکل بھاگنے والا ۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَلَا

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور

یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝

گنہگاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے ۔

خلاصۂ تفسیر

آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے تک نمازیں ادا کیا کیجئے (اس میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء، چار نمازیں آگئیں جیسا کہ حدیث میں ان کی تفصیل بیان کردی گئی ہے) اور صبح کی نماز بھی (ادا کریں) بیشک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے (صبح کا وقت چونکہ نیند سے بیدار ہونے کا وقت ہے جس میں سستی کا خطرہ تھا اسلئے اس کو الگ کرکے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا اور اس کی ایک مزید فضیلت بھی یہ بیان کردی کہ اس وقت میں فرشتے جمع ہوتے ہیں اس کی تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ انسان کی حفاظت اور اسکے عمل کو لکھنے والے فرشتے دن کے الگ اور رات کے الگ ہیں، صبح کی نماز میں دونوں جماعتیں فرشتوں کی جمع ہوتی ہیں رات کے فرشتے اپنا کام ختم کرکے اور دن کے فرشتے اپنا کام سنبھالنے کے لئے مجتمع ہو جاتے ہیں اسی طرح شام کو عصر کی نماز میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اجتماع باعث برکات ہے) اور کسیقدر رات کے حصے میں بھی (نماز ادا کریں) یعنی اس میں نماز تہجد پڑھا کریں جو کہ آپ کے لئے (پانچ نمازوں کے علاوہ) ایک زائد چیز ہے (اس زائد سے مراد بعض کے نزدیک ایک زائد فرض ہے جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کیا گیا اور بعض نے مراد زائد سے نفل لی ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ آپکا رب آپکو مقام محمود میں جگہ دے گا (مقام محمود سے مراد شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جو محشر میں تمام بنی آدم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا) اور آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب (مکہ سے جانے کے بعد) مجھکو (جہاں بھی جانا ہو) خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچائیو اور (جب مکہ سے جانا ہو تو) مجھکو خوبی (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچائیو اور مجھکو اپنے پاس سے (ان کفار پر) ایسا غلبہ دیجئو جسکے ساتھ (آپ کی) نصرت (و مدد) ہو (جس سے وہ غلبہ پائدار اور ترقی پذیر ہو ورنہ عارضی غلبہ تو کبھی کفار کو بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ اللہ کی نصرت نہیں ہوتی، اسلئے پائدار نہیں ہوتا) اور کہدیجئے کہ (اب دین) حق (غالب ہونے کو) آیا اور باطل گیا گذرا ہوا واقعی باطل چیز تو یونہی آتی جاتی رہتی ہے (ہجرت کے بعد مکہ فتح ہوا تو یہ سب وعدے پورے ہو گئے) اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفا اور رحمت ہے (کیونکہ وہ اسکو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں جس سے ان پر رحمت ہوتی اور عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ سے شفا ہوتی ہے) اور ظالموں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے (کہ جب وہ اسکو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں)

معارف و مسائل

دشمنوں کے مکر و کید سے بچنے کا بہترین علاج نماز ہے

سابقہ آیات میں اعداء اسلام کی مخالفت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرنے کی تدبیریں اور اسکا جواب مذکور تھا اس کے بعد آیات صدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دینے میں اسطرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کے مکر و کید اور ایذاؤں سے بچنے کا بہترین علاج نماز کی اقامت ہے جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یہ ارشاد ہے وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ

(یعنی ہم جانتے ہیں کہ کفار کے دل آزار اقوال سے آپ دلتنگ ہوتے ہیں تو آپ اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ (قرطبی)

اس آیت میں دشمنوں کی ایذاؤں کا علاج اللہ کے ذکر، حمد و تسبیح اور نماز میں مشغول ہو جانے کو قرار دیا ہے ذکر اللہ اور نماز بالخاصہ ان سے بچنے کا علاج ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنا اللہ تعالیٰ کی مدد پر موقوف ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا سب سے افضل ذریعہ نماز ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ

(یعنی مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ)

نماز پنجگانہ کا حکم جمہور ائمہ تفسیر نے اس آیت کو پانچوں نمازوں کے لئے جامع حکم قرار دیا ہے کیونکہ دلوک کا لفظ گرچہ اصل میں میلان کے معنی میں آتا ہے اور میلان آفتاب زوال کے وقت شروع ہوتا ہے اور غروب کو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جمہور صحابہ و تابعین نے اس جگہ لفظ دلوک کے معنی زوال آفتاب ہی کے لئے ہیں۔ (کما نقلہ القرطبی و مظہری و ابن کثیر)

اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ لفظ غسق کے معنی رات کی تاریکی مکمل ہو جانے کے ہیں امام مالک نے حضرت ابن عباس رضؓ سے غسق کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے۔

اس طرح دُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّیْلِ میں چار نمازیں آگئیں ظہر عصر مغرب عشاء اور انہیں سے دو نمازوں کا ابتدائی وقت بھی بتلا دیا گیا کہ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عشاء کا وقت غسق لیل سے یعنی جس وقت رات کی تاریکی مکمل ہو جائے اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ نے وقت عشاء کی ابتدا اس وقت سے قرار دی ہے جبکہ شفق احمر کے بعد شفق ابیض بھی غروب ہو جائے یہ سب جانتے ہیں کہ غروب آفتاب کے متصل افق مغرب پر ایک سرخی نمودار ہوتی ہے اور اس سرخی کے بعد ایک قسم کی سفیدی افق پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے پھر وہ سفیدی

بھی غروب ہو جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ رات کی تاریکی مکمل جبھی ہوگی جبکہ افق کی سفیدی بھی ختم ہو جائے اس لئے اس لفظ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، دوسرے ائمہ نے شفق احمر کے غروب ہونے پر وقت عشاء کی ابتداء قرار دی ہے اور اسی کو غَسَقِ الَّيْلِ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اس جگہ لفظ قرآن بولکر نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ قرآن نماز کا جزء اہم ہے اکثر ائمہ تفسیر ابن کثیر، قرطبیؒ، مظہریؒ وغیرہ نے یہی معنے لکھے ہیں اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ دُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ کے الفاظ میں چار نمازوں کا بیان تھا یہ پانچویں نماز فجر کا بیان ہے اسکو الگ کر کے بیان کرنے میں اس نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

كَانَ مَشْهُوْدًا یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جسکے معنے ہیں حاضر ہونا اس وقت میں حسب تصریح احادیث صحیحہ رات اور دن کے دونوں فرشتوں کی جماعتیں حاضر نماز ہوتی ہیں اس لئے اسکو مشہود کہا گیا ہے۔ اس آیت میں پانچ نمازوں کا حکم اجمال کے ساتھ آیا ہے جسکی مکمل تفسیر و تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بتلائی ہیں اور جب تک اس تشریح پر عمل نہ کیا جائے کوئی شخص نماز ادا ہی نہیں کر سکتا معلوم نہیں کہ جو لوگ قرآن کو بغیر حدیث اور بیان رسول کے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ نماز کیسے پڑھتے ہیں اسیطرح اس آیت میں نماز کے اندر قراءت قرآن کا ذکر بھی جمالاً آیا ہے اسکی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے یہ ثابت ہوئی کہ نماز فجر میں قراءت طویل کی جائے بقدر استطاعت اور ظہر و جمعہ میں اس سے کم اور عصر و عشاء میں متوسط اور مغرب میں بہت مختصر، مغرب میں طول قراءت اور فجر میں اختصار جو بعض روایات میں آیا ہے وہ عملاً متروک ہے امام قرطبیؒ نے صحیح مسلم کی وہ روایت جسمیں مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف اور مرسلت وغیرہ طویل سورتوں کا پڑھنا یا صبح کی نماز میں صرف معوذتین پر کفایت کرنا منقول ہے اسکو نقل کر کے فرمایا ہے: متروك بالعمل ولإنكاره على معاذ التطويل وأمره الأئمة بالتخفيف یعنی یہ اتفاقی واقعات مغرب میں طول قراءت، اور فجر میں اختصار کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل سے نیز زبانی ارشادات کی وجہ سے متروک ہیں (قرطبی)

نماز تہجد کا وقت اور اسکے احکام و مسائل

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو متضاد معنے کیلئے مستعمل ہوتا ہے، اس کے معنے سونے کے بھی آتے ہیں، اور جاگنے بیدار ہونے کے بھی اس جگہ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے (مظہری) قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے اسی رات کی نماز کو اصطلاح شرع میں نماز تہجد

کہا جاتا ہے اور عموماً اسکا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے لیکن تفسیر مظہری میں ہے کہ مفہوم اس آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں نماز کے لئے سونے کو ترک کر دو اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سونے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لئے نیند کو موخر کر کے نماز پڑھنے پر بھی صادق ہے اس لئے نماز تہجد کے لئے پہلے نیند ہونے کی شرط قرآن کا مدلول نہیں پھر بعض روایات حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنے پر استدلال کیا ہے۔

اور امام ابن کثیر نے حضرت حسن بصری سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے اسکے الفاظ یہ ہیں۔

قال الحسن البصری ھو ما کان بعد العشاء و یحمل علی ما کان بعد النوم (ابن کثیر)	حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اسکو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے اصل مفہوم میں بعد النوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط موجود نہیں لیکن عموماً تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہو کر پڑھتے تھے اسلئے اسکی افضل صورت یہی ہوگی۔

نماز تہجد فرض ہے یا نفل | نَافِلَةً لَّكَ　لفظ نفل اور نافلہ کے لغوی معنے زائد کے ہیں اسی لئے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہو جسکے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ نَافِلَةً لَّكَ کے الفاظ سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نفل ہے حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت سب ہی شریک ہیں اسی لئے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ نافلہ کو فریضہ کی صفت قرار دیکر معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ نافلہ بمعنے فرض زائد کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں۔

اور تحقیق صحیح اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب سورۂ مزمل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں تو فرض ہوئی نہ تھیں صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی اسی فرض کا ذکر سورۂ مزمل میں ہے پھر شب معراج میں پانچ نمازیں فرض کر دیگئیں تو تہجد کی فرضیت عام اُمت سے تو باتفاق منسوخ ہوگئی۔ اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسکی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصی طور پر آپ کے ذمہ فرض رہا اور اس آیت میں نَافِلَةً لَّكَ کے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد

آپ کے ذمہ ایک زائد فرض ہے مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کئی وجہ سے صحیح نہیں اول یہ کہ فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر کہا جائے کہ مجاز ہے تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جسکی کوئی حقیقت نہیں دوسرے احادیث صحیحہ میں صرف پانچ نمازوں کی تعیین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب معراج میں جو اول پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں پھر تخفیف کر کے پانچ کر دیگئیں تو اگرچہ عدد گھٹا دیا گیا مگر ثواب پچاس ہی کا ملے گا اور پھر فرمایا لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ یعنی میرا قول بدلا نہیں کرتا جب پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا اگرچہ عمل میں کمی کر دی گئی۔

ان روایات کا حاصل یہی ہے کہ عام امت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نافلہ کا لفظ اگر اس جگہ فریضہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَکَ کے بجائے عَلَیْکَ ہونا چاہئے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے لفظ لَکَ تو صرف جواز اور اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسکو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہوگئی اور سب کے لئے نفل رہگیا مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کیا ہے نفل ہونا تو سب ہی کے لئے ثابت ہے پھر نَافِلَةً لَّکَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفلی عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کمی رہ جائے اسکی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی اس لئے آپ کے حق میں نفلی عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے (قرطبی و مظہری)

نماز تہجد نفل ہے یا سنت مؤکدہ

سنت مؤکدہ کے لئے جو عام ضابطہ فقہاء کا ہے کہ جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً مداومت فرمائی ہو اور بلا مجبوری کے نہ چھوڑا ہو وہ سنت مؤکدہ ہے بجز اس کے کہ کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا عام امت کے لئے نہیں تھا اس ضابطہ کا تقاضہ بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کیلئے سنت مؤکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سنت متواترہ سے ثابت ہے اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں اسلئے عام امت کے لئے بھی سنت مؤکدہ ہونا چاہئے۔ تفسیر مظہری میں اسکو مختار اور راجح قرار دیا ہے اور اسکے مؤکد ہونے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تہجد پڑھ کرتا تھا پھر چھوڑ دیا یہ ارشاد فرمایا کہ "اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے" اس طرح کی وعید اور تنبیہ صرف نفل میں نہیں ہو سکتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنّت مؤکدہ ہے۔

اور جن حضرات نے تہجد کو صرف نفل قرار دیا ہے وہ اس مواظبت اور مداومت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور تہجد پڑھنے والے کے ترک تہجد پر جو زجر کے الفاظ ارشاد فرمائے وہ دراصل مطلقاً ترک پر نہیں بلکہ اول عادت ڈالنے کے بعد ترک کرنے پر ہیں کیونکہ آدمی جس نفل کی عادت ڈال لے باتفاق امت اس کو چاہئے کہ اس پر مداومت کرے اگر عادت ڈالنے کے بعد چھوڑ دیگا تو قابل ملامت ہوگا کیونکہ عادت کے بعد بلا عذر ترک ایک قسم کے اعراض کی علامت ہے اور جو شروع سے عادی نہ ہو تو اس پر کوئی ملامت نہیں واللہ اعلم۔

تہجد کی تعداد رکعات | صحیح بخاری و مسلم میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے ان گیارہ رکعات میں حنفیہ کے نزدیک تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں باقی آٹھ تہجد کی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں صدیقہ عائشہ رض کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جنمیں وتر بھی شامل ہیں اور دو رکعتیں سنّت فجر کی بھی (مظہری) سنّت فجر کو رات کی نماز میں بوجہ اتصال کے شمار کر لیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ عام عادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تہجد کی نماز میں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے۔

لیکن صدیقہ عائشہ رض ہی کی ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی اس تعداد سے کم چار یا چھ رکعات پر بھی اکتفا فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ سے یہ منقول ہے کہ حضرت مسروق نے صدیقہ رض سے تہجد کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سات، نو، اور گیارہ رکعات ہوتی تھیں علاوہ سنّت فجر کے (مظہری عن البخاری) حنفیہ کے قاعدہ کے مطابق تین رکعت وتر کی ہوئیں تو سات میں سے چار نو میں سے چھ گیارہ میں سے آٹھ تہجد کی رکعتیں رہ جاتی ہیں۔

نماز تہجد کی کیفیت | جو عام روایات حدیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو رکعت ہلکی مختصر قرأت کے ساتھ پھر باقی رکعات میں قرأت بھی طویل اور رکوع سجدہ بھی طویل ہوتا اور یہ طول بسا اوقات بہت زیادہ ہو جاتا تھا کبھی کچھ کم (یہ خلاصہ ان روایات حدیث کا ہے جو اس جگہ تفسیر مظہری میں نقل کی گئی ہیں)۔

مقام محمود | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقام محمود کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ مقام

تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اس کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں مگر صحیح وہ ہے جو احادیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میدان حشر میں جس وقت تمام بنی آدم جمع ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کر دیں گے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت فرماویں گے تفصیل اس کی روایات حدیث میں طویل ہے جو اس جگہ ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں لکھی ہے۔

انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہوگی

اسلامی فرقوں میں سے خوارج اور معتزلہ شفاعت انبیاء کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کسی کی شفاعت سے معاف نہیں ہوگا مگر احادیث متواترہ اس پر شاہد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بلکہ صلحاء اُمت کی بھی شفاعت گناہگاروں کے حق میں مقبول ہوگی بہت سے لوگوں کے گناہ شفاعت سے معاف کر دیئے جاویں گے۔

ابن ماجہ اور بیہقی میں بروایت عثمان رض منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اول انبیاء علیہم السلام گنہگاروں کی شفاعت کریں گے پھر علماء پھر شہداء اور دیلمی نے بروایت ابن عمر رض نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کی برابر ہو۔

اور ابو داؤد اور ابن حبانؒ نے بروایت ابی الدرداء رض مرفوعاً نقل کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے متعلق قبول کی جاوے گی۔

مسند احمد، طبرانی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت ابو امامہ رض سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت پر قبیلہ ربیعہ اور مضر کے تمام لوگوں سے زیادہ آدمی جنت میں داخل کئے جاویں گے۔

ایک سوال و جواب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرماویں گے اور آپ کی شفاعت سے کوئی مومن دوزخ میں نہ رہ جاویگا تو پھر امت کے علماء و صلحاء کی شفاعت کس لئے اور کیونکر ہوگی۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً صورت یہ ہوگی کہ علماء اور صلحاء امت جن لوگوں کی شفاعت کرنا چاہیں گے وہ اپنی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت فرماویں گے۔

فائدہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ یعنی میری شفاعت میری اُمت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنھوں نے کبیرہ گناہ

سکیں گے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوگی کوئی فرشتہ یا امت کا فرد اہل کبائر کی شفاعت نہ کرسکے گا بلکہ صلحاء امت کی شفاعت صغیرہ گناہ والوں کے لئے ہوگی۔

نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے حضرت مجدد الف ثانی رح نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل نمازِ تہجد کا حکم دیا گیا پھر مقام محمود یعنی شفاعتِ کبریٰ کا وعدہ کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ الآیۃ۔ سابقہ آیات میں اوّل کفار مکہ کی ایذاؤں اور ان تدبیروں کا ذکر تھا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچانے کے لئے کرتے تھے اسکے ساتھ یہ بھی مذکور ہوا کہ ان کی یہ تدبیریں کامیاب نہیں ہوں گی اور ان کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل تدبیر کے درجہ میں تو صرف پنجگانہ نماز قائم کرنے اور تہجد گذاری کی تلقین فرمائی اسکے بعد آخرت میں آپکو سب انبیاء سے اعلیٰ مقام یعنی مقام محمود عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جو آخرت میں پورا ہوگا مذکورہ آیت وَقُلْ رَّبِّ میں حق تعالیٰ نے اسی دنیا میں اوّل آپکو کفار کے نرغہ اور ایذاؤں سے نجات دینے کی تدبیر بصورت ہجرتِ مدینہ ارشاد فرمائی اور اسکے بعد فتح مکہ کی بشارت وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ میں ارشاد فرمائی گئی۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے پھر آپکو ہجرتِ مدینہ کا حکم دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ اس میں لفظ مُدْخَل اور مُخْرَج داخل ہونے اور خارج ہونے کی جگہ کے معنی میں ہے اور ان کے ساتھ صفت صدق بڑھانے سے مراد یہ ہے کہ نکلنا اور داخل ہونا سب اللہ کی مرضی کے مطابق خیر و خوبی کے ساتھ ہو کیونکہ لفظ صدق عربی زبان میں ہر ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ظاہراً اور باطناً درست اور بہتر ہو قرآن کریم میں قدم صدق اور لسان صدق اور مقعد صدق کے الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

داخل ہونے کی جگہ سے مراد مدینہ اور خارج ہونے کی جگہ سے مراد مکہ ہے مطلب یہ ہے کہ یا اللہ مدینہ میں میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے وہاں کوئی خلاف طبع اور ناگوار صورت پیش نہ آئے اور مکہ مکرمہ سے میرا نکلنا خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے کہ وطن اور گھر بار کی محبت میں دل الجھا نہ رہے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور اقوال بھی آئے ہیں مگر یہ تفسیر حضرت حسن بصری اور قتادہ سے منقول ہے ابن کثیر نے اسی کو اصح الاقوال کہا ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ترتیب کا تقاضہ یہ تھا

کہ پہلے مخرج پھر مدخل کا ذکر ہوتا مگر یہاں مدخل کو مقدم اور مخرج کو مؤخر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ مکہ مکرمہ سے نکلنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ بیت اللہ کو چھوڑنا انتہائی صدمہ کی چیز تھی البتہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے مامن تلاش کرنا مقصد تھا جو داخلہ مدینہ کے ذریعہ حاصل ہونے کی امید تھی اسلئے جو مقصد تھا اسکو مقدم رکھا گیا۔

فائدہ | مہم مقاصد کے لئے مقبول دعا ہجرت مدینہ کے وقت حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ سے نکلنا اور مدینہ پہنچنا دونوں خیر و خوبی اور عافیت کے ساتھ ہوں اسی دعا کا ثمرہ تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیبہ کو ظاہراً و باطناً آپ کے اور سب مسلمانوں کے لئے سازگار بنایا اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنا چاہئے اور ہر مقصد کے لئے یہ دعا مفید ہے اسی دعا کا تکملہ بعد کا جملہ ہے وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ منصب رسالت کے فرائض کی ادائیگی اور دشمنوں کے نرغے میں کام کرنا اپنے بس کا نہیں اس لئے حق تعالیٰ سے غلبہ و نصرت کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور اس کے آثار سب کے سامنے آ گئے۔

وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ یہ آیت ہجرت کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی حضرت ابن مسعود رضہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اسوقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بتوں کے مجسمے کھڑے ہوئے تھے بعض علماء نے اس خاص تعداد کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ مشرکین مکہ سال بھر کے دنوں میں ہر دن کا بت الگ رکھتے تھے اس دن میں اسکی پرستش کرتے تھے۔ (قرطبی) آپؐ جب وہاں پہنچے تو یہ آیت آپ کی زبان مبارک پر تھی جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور اپنی لکڑی ایک ایک بت کے سینے میں مارتے جاتے تھے (بخاری و مسلم)

بعض روایات میں ہے کہ اس چھڑی کے نیچے رانگ یا لوہے کی شام لگی ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بت کے سینہ میں اس کو مارتے تو وہ الٹا گر جاتا تھا یہاں تک کہ یہ سب بت گر گئے اور پھر آپؐ نے ان کے توڑنے کا حکم دیدیا (قرطبی بحوالہ قاضی عیاض و قشیری)

شرک و کفر اور باطل کی رسوم و نشانات کا مٹانا واجب ہے امام قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ مشرکین کے بت اور دوسرے مشرکانہ نشانات کو مٹانا واجب ہے اور تمام وہ آلات باطلہ جنکا مصرف صرف معصیت ہو انکا مٹانا بھی اسی حکم میں ہے ابن منذر نے فرمایا کہ تصویریں اور مجسمے جو لکڑی پیتل وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں وہ بھی بتوں ہی کے حکم میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو پھاڑ ڈالا جس پر تصویریں نقش و رنگ سے بنائی گئی تھیں۔ اس سے عام تصویر کا حکم معلوم ہو گیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں تشریف لاویں گے تو صحیح حدیث کے مطابق

صلیبوں کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے یہ سب امور اسکی دلیل ہیں کہ شرک و کفر اور باطل کے آلات کو توڑنا اور ضائع کر دینا واجب ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ - قرآن کریم کا قلوب کے لئے شفار ہونا شرک و کفر اور اخلاق رذیلہ اور امراض باطنہ سے نفوس کی نجات کا ذریعہ ہونا تو کھلا ہوا معاملہ ہے اور تمام اُمّت اسپر متفق ہے اور بعض علمار کے نزدیک قرآن جسطرح امراض باطنہ کی شفار ہے امراض ظاہرہ کی بھی شفار ہے کہ آیات قرآن پڑھکر مریض پر دم کرنا اور تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا امراض ظاہرہ کے لئے بھی شفار ہوتا ہے روایات حدیث اسپر شاہد ہیں تمام کتب حدیث میں ابو سعید خدری رضہ کی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر میں تھی کسی گاؤں کے رئیس کو بچھو نے کاٹ لیا تھا، لوگوں نے حضرات صحابہ سے پوچھا کہ آپ کچھ اسکا علاج کر سکتے ہیں انھوں نے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر اسپر دم کیا مریض اچھا ہوگیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسکا تذکرہ آیا تو آپ نے صحابۂ کرام کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔

اسی طرح دوسری متعدد روایات حدیث سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذات پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابۂ و تابعین سے معوذات اور دوسری آیات قرآن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے جسکو اس آیت کے تحت قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو جب اعتقاد و احترام سے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا شفار ہونا جس طرح ظاہر اور ثابت ہے اسی طرح قرآن کا انکار یا بے ادبی خسارہ اور آفات کا ذریعہ بھی ہے۔

وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا
اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال جاے اور بچا لے اپنا پہلو اور جب

مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ
پہنچے اس کو بُرائی تو رہ جاے نا امید ہوکر تو کہہ ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر

فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾
سو تیرا رب خوب جانتا ہے کس نے خوب پایا راستہ۔

ع ۹

خلاصۂ تفسیر

اور (بعض) آدمی (یعنی کافر) ایسا ہوتا ہے کہ اس کو جب ہم نعمت عطار کرتے ہیں تو (ہم سے

اور ہمارے احکام سے) منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اسکو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو (بالکل رحمت سے) ناامید ہو جاتا ہے (اور یہ دونوں حالتیں دلیل ہیں اللہ تعالیٰ سے بے تعلق کی اور وہی بنیاد ہے ہر کفر و گمراہی کی) آپ فرما دیجئے کہ (مومنین اور کفار اور اخیار و اشرار میں سے) ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کر رہا ہے (یعنی، اپنی اپنی عقل صحیح یا سقیم اور علم یا جہل کی بنیاد پر مختلف طرح کے کام کر رہے ہیں) تو آپ کا رب خوب جانتا ہے اسکو جو زیادہ ٹھیک اور درست راستہ پر ہو (اسی طرح جو ٹھیک راستہ پر نہ ہو اسکو بھی جانتا ہے اور ہر ایک کو اسکے عمل کے موافق جزا یا سزا دیگا۔ یہ نہیں کہ جسکا دل چاہے بلا کسی دلیل کے اپنے کو ٹھیک راستہ پر سمجھنے لگے)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۔ لفظ شاکلۃ کی تفسیر میں ائمہ سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں طبیعت، عادت، جبلت، نیت، طریقہ وغیرہ اور حاصل سب کا یہ ہے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور عادات اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک عادت اور طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اسکا عمل اسی کے تابع رہتا ہے (قرطبی)، اسمیں انسان کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بُرے ماحول، بُری صحبت اور بُری عادتوں سے پرہیز کرے نیک لوگوں کی صحبت اور اچھی عادت کا خوگر بنے (جصاص) کیونکہ اپنے ماحول اور صحبت اور رسم و رواج سے انسان کی ایک طبیعت بنجاتی ہے اسکا ہر عمل اسی کے تابع چلتا ہے امام جصاص نے اس جگہ شاکلہ کے ایک معنی ہم شکل کے بھی لئے ہیں اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آدمی سے مانوس ہوتا ہے نیک آدمی نیک سے اور شریر شریر سے مانوس ہوتا ہے اسی کے طریقہ پر چلتا ہے اور اسکی نظیر حق تعالیٰ کا یہ قول ہے۔
اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ اور وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ یعنی خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے ہیں مراد یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق مرد و عورت سے مانوس ہوتا ہے اور حاصل مطلب اسکا بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خراب صحبت اور خراب عادت سے پرہیز کا اہتمام کرے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ
اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو کہہ دے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم
اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ
کو علم دیا ہے تھوڑا سا اور اگر ہم چاہیں تو لے جائیں

بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

اُس چیز کو جو ہم نے تجھ کو وحی بھیجی پھر تو نہ پائے اپنے واسطے اُس کے لا دینے کو ہم پر کوئی ذمہ دار

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

مگر مہربانی سے تیرے رب کی اُس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ

کہہ اگر جمع ہوں آدمی اور جن اس پر کہ لائیں ایسا

هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

قرآن ہرگز نہ لائیں گے ایسا قرآن اور پڑے مدد کیا کریں ایک دوسرے

ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ

کی اور ہم نے پھیر پھیر کر سمجھائی لوگوں کو اس قرآن میں ہر

كُلِّ مَثَلٍ ؗ فَاَبٰٓی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

مثل سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری کئے

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح (کی حقیقت) کو پوچھتے ہیں آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ روح (کے متعلق بس اتنا اجمالاً سمجھ لو کہ وہ ایک چیز ہے جو) میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور (باقی اس کی مفصل حقیقت سو) تمکو بہت تھوڑا علم (بقدر تمہاری فہم اور ضرورت کے) دیا گیا ہے (اور روح کی حقیقت کا معلوم کرنا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور نہ اسکی حقیقت عام طور پر سمجھ میں آسکتی ہے اسلئے قرآن اسکی حقیقت کو بیان نہیں کرتا)

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے (اور اسکے ذریعہ آپکو علم دیا ہے) سب سلب کرلیں پھر اس (وحی) کے (واپس لانے کے لئے) آپکو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے گا مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اسکا بڑا فضل ہے (مطلب یہ ہے کہ انسان کو روح وغیرہ ہر چیز کی حقیقت کا تو کیا علم ہوتا اسکو جو تھوڑا سا علم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بھی اس کی کوئی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ

چاہے تو دینے کے بعد بھی سلب کر سکتا ہے مگر وہ اپنی رحمت سے ایسا کرتا نہیں وجہ یہ ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے) آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب بھی وہ ایسا نہ کر سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے (یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ کوشش کرے تو کیا کامیاب ہوتا سب کے سب ایکدوسرے کی مدد سے کام کر کے بھی قرآن کا مثل نہیں بنا سکتے) اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے نہ رہے

معارف و مسائل

آیات صدر میں پہلی آیت میں کفار کی طرف سے روح کے متعلق ایک سوال اور حق تعالیٰ کی طرف سے اسکا جواب مذکور ہے لفظ روح لغات و محاورات میں نیز قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، معروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں یعنی جان جس سے حیات اور زندگی قائم ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جبرئیل امین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے اور خود قرآن کریم اور وحی کو بھی روح کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا۔

روح سے مراد کیا ہے اس لئے یہاں پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح کا سوال کس معنی کے لحاظ سے کیا تھا، بعض حضرات مفسرین نے سیاق و سباق کی رعایت سے یہ سوال وحی اور قرآن یا وحی لانے والے فرشتے جبرئیل کے متعلق قرار دیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ میں قرآن کا ذکر تھا اور بعد کی آیات میں پھر قرآن ہی کا ذکر ہے اس کے مناسب اسکو سمجھا کہ اس سوال میں بھی روح سے مراد وحی و قرآن یا جبرئیل ہی ہیں، اور مطلب سوال کا یہ ہوگا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے کون لاتا ہے قرآن کریم نے اس کے جواب میں اسپر اکتفا کیا کہ اللہ کے حکم سے وحی آتی ہے تفصیلات اور کیفیت جنکا سوال تھا وہ نہیں بتلائیں۔

لیکن احادیث صحیحہ مرفوعہ میں جو اس آیت کا شان نزول بتلایا گیا ہے وہ تقریباً اسمیں صریح ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح حیوانی کا سوال کیا تھا، اور مقصد سوال کا روح کی حقیقت معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا چیز ہے بدن انسانی میں کسطرح آتی جاتی ہے اور کس طرح اس سے حیوان اور انسان زندہ ہو جاتا ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ سے روایت

ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے غیر آباد حصے میں چل رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک چھڑی کھجور کی شاخ کی تھی آپ کا گذر چند یہودیوں پر ہوا، یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آرہے ہیں ان سے روح کے متعلق سوال کرو دوسروں نے منع کیا مگر سوال کرنے والوں نے سوال کر ہی ڈالا یہ سوال سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکڑی پر ٹیک لگا کر خاموش کھڑے ہوگئے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ پر وحی نازل ہونے والی ہے کچھ وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھکر سنائی وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ یہاں ظاہر ہے کہ قرآن یا وحی کو روح کہنا یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح تھی ان لوگوں کے سوال کو اس پر محمول کرنا بہت بعید ہے البتہ روح حیوانی والی کا معاملہ ایسا ہے کہ اسکا سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہی ہے اسی لئے جمہور مفسرین ابن کثیر ابن جریر، قرطبی، بحر محیط، روح المعانی سبھی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ سوال روح حیوانی کی حقیقت سے تھا رہا یہ معاملہ کہ سیاق وسباق میں ذکر قرآن کا چلا آیا ہے درمیان میں روح کا سوال جواب بے جوڑ ہے تو اسکا جواب واضح ہے کہ اس سے پہلی آیات میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور معاندانہ سوالات کا ذکر آیا ہے جن سے منظور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دربارۂ رسالت امتحان کرنا تھا یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس لئے بے جوڑ نہیں خصوصاً شان نزول کے متعلق ایک دوسری حدیث صحیح منقول ہے اسمیں یہ بات زیادہ وضاحت سے آگئی ہے کہ سوال کرنے والوں کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا امتحان لینا تھا

چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ قریش مکہ جو جا بے جا سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہتے تھے انکو خیال پیدا ہوا کہ یہود علم والے ہیں انکو پچھلی کتابوں کا بھی علم ہے ان سے کچھ سوالات حاصل کئے جاویں جنکے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیا جائے، اسلئے قریش نے یہود سے دریافت کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے انھوں نے کہا کہ تم ان سے روح کے متعلق سوال کرو (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباس رضی سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ روح پر عذاب کس طرح ہوتا ہے اسوقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بارے میں کوئی بات نازل نہ ہوئی تھی اسلئے اسوقت آپ نے فوری جواب نہیں دیا پھر جبرئیل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (ابن کثیر ملخصاً)

واقعہ سوال مکہ میں پیش آیا یا مدینہ میں

اس سے پہلے یہاں ایک بات اور قابل نظر ہے کہ شان نزول کے متعلق جو دو حدیثیں ابن مسعودؓ وابن عباسؓ کی اوپر نقل کی گئیں ہیں ان میں ابن مسعودؓ

کی روایت کے مطابق یہ واقعہ سوال مدینہ میں پیش آیا، اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اگرچہ اکثر حصہ سورۂ بنی اسرائیل کا مکی ہے، اور ابن عباس رضؓ کی روایت کا تعلق مکہ مکرمہ کے واقعہ سے ہے اسکے مطابق یہ آیت بھی پوری سورت کی طرح مکی باقی رہتی ہے، اسی لئے ابن کثیرؒ نے اسی احتمال کو راجح قرار دیا ہے اور ابن مسعود رضؓ کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ میں دوسری مرتبہ ہوا ہو جیسا کہ بہت سی آیات قرآن کا نزول مکرر سب علماء کے نزدیک مسلم ہے اور تفسیر مظہری نے ابن مسعود رضؓ کی روایت کو ترجیح قرار دیکر واقعہ مدینہ کا اور آیت کو مدنی قرار دیا ہے جس کی دو وجہ بتلائیں ایک یہ کہ یہ روایت صحیحین میں ہے اور سنداً اسکی روایتِ ابن عباس رضؓ سے زیادہ قوی ہے دوسرے یہ کہ اسمیں خود صاحبِ واقعہ ابن مسعود رضؓ اپنا واقعہ بیان کر رہے ہیں بخلاف روایت ابن عباس رضؓ کے کہ اسمیں ظاہر یہی ہے کہ ابن عباس رضؓ نے یہ بات کسی سے سنی ہوگی۔

سوال مذکور کا جواب | قرآن کریم نے یہ دیا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ اس جواب کی تشریح میں حضرات مفسرین کے کلمات اور تعبیرات مختلف ہیں ان میں سب سے زیادہ اقرب اور واضح وہ ہے جو تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس جواب میں جتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے صرف وہ بتلا دیگئی اور روح کی مکمل حقیقت جسکا سوال تھا اسکو اسلئے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی اور اس کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی، یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ آپ ان کے جواب میں یہ فرما دیجئے کہ "روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے" یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تطورات اور توالد وتناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں بلکہ وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے حکم کُنْ سے پیدا ہونے والی چیز ہے، اس جواب نے یہ تو واضح کر دیا کہ روح کو عام مادیات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جس سے وہ تمام شبہات رفع ہوگئے جو روح کو عام مادیات پر قیاس کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور انسان کے لئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے اس سے زائد علم کے ساتھ اسکا کوئی دینی یا دنیوی کام اٹکا ہوا نہیں اسلئے وہ حصہ سوال فضول اور لایعنی قرار دیکر اس کا جواب نہیں دیا گیا خصوصاً جبکہ اس کی حقیقت کا سمجھنا عوام کے لئے تو کیا بڑے بڑے حکماء وعقلاء کے لئے بھی آسان نہیں۔

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں | امام جصاصؒ نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ سائل کے ہر سوال اور سائل کی دینی مصلحت کی رعایت لازم ہے اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصلحت پر نظر رکھکر جواب دینا چاہئے جو جواب

مخاطب کے فہم سے بالاتر ہو یا اسکے غلط فہمی میں پڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے اسی طرح بے ضرورت یا بیکار سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ متعلق اسکو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی یا عالم کو اپنے علم کے مطابق اسکا جواب دینا ضروری ہے (جصاص) امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس مسئلے کا ایک مستقل ترجمۃ الباب لکھکر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اسکا جواب نہیں دینا چاہئے۔

روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں

قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اور فہم کے مطابق دیدیا حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت کو کوئی انسان سمجھ ہی نہیں سکتا اور یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اسکی نفی کرتی ہے نہ اثبات اگر کسی نبی و رسول کو وحی کے ذریعہ یا کسی ولی کو کشف و الہام کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ عقل و فلسفہ کی رو سے بھی اسپر کوئی بحث و تحقیق کی جائے تو اسکو فضول اور بیکار تو کہا جائے گا مگر ناجائز نہیں کہا جا سکتا اسی لئے بہت سے علماء متقدمین و متاخرین نے روح کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں آخری دور میں ہمارے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحنے ایک مختصر سے رسالے میں اس مسئلے کو بہترین انداز سے لکھا ہے اور اسمیں جسقدر حقیقت سمجھنا عام انسان کے لئے ممکن ہے وہ سمجھا دی ہے جسپر ایک تعلیم یافتہ انسان قناعت کر سکتا ہے اور شبہات و اشکالات سے بچ سکتا ہے۔

فائدہ

امام بغوی رحنے اس جگہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک مفصل روایت اس طرح نقل فرمائی ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ مکہ کے قریشی سرداروں نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اندر پیدا ہوئے اور جوان ہوئے ان کی امانت و دیانت اور سچائی میں کبھی کسیکو شبہ نہیں ہوا کبھی ان کے متعلق جھوٹ بولنے کی تہمت بھی کسی نے نہیں لگائی اور اس کے باوجود اب جو دعوی نبوت کا وہ کر رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے ایسا کرو کہ اپنا ایک وفد مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجکر ان سے ان کے بارے میں تحقیقات کرو چنانچہ قریش کا ایک وفد علماء یہود کے پاس مدینہ پہنچا علماء یہود نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم تمہیں تین چیزیں بتلاتے ہیں تم ان سے ان تینوں کا سوال کرو، اگر انھوں نے تینوں کا جواب دیدیا تو وہ نبی نہیں اسیطرح تینوں میں سے کسی کا جواب نہ دیا تو بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیا تیسری چیز کا جواب نہ دیا تو سمجھ لو کہ وہ نبی ہیں وہ تین سوال یہ بتلائے کہ ایک تو ان سے ان لوگوں کا حال پوچھو جو قدیم

لہ یہ مضمون مظہری ص ۳۲ ج ۴ کے مطابق ہے۔ محمد علی عثمانی

زمانے میں شرک سے بچنے کے لئے کسی غار میں چھپ گئے تھے کیونکہ انکا واقعہ عجیب ہے دوسرے اس شخص کا حال پوچھو جس نے زمین کے مشرق و مغرب کا سفر طے کیا کہ اس کا کیا واقعہ ہے تیسرے روح کے متعلق دریافت کرو۔

یہ وفد واپس آیا اور تینوں سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیئے آپؐ نے فرمایا کہ میں اسکا جواب تمہیں کل دونگا، مگر اس پر انشاء اللہ نہیں کہا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا بارہ پندرہ سے لیکر پچیس دن تک کی مختلف روایات ہیں جن میں سلسلہ وحی بند رہا قریش مکہ کو طعن و تشنیع کا موقع ملا کہ کل جواب دینے کو کہا تھا آج اتنے دن ہوگئے جواب نہیں ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پریشانی ہوئی پھر حضرت جبرئیل امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ جسمیں آپکو یہ تلقین کی گئی کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہکر کیا جائے اور اسکے بعد روح کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی جو اوپر مذکور ہوئی اور غار میں چھپنے والوں کے متعلق اصحاب کہف کا واقعہ اور مشرق سے مغرب تک سفر کرنے والے ذوالقرنین کا واقعہ جو سورۂ کہف میں آنے والا ہے اس کی آیات نازل ہوئیں جنمیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ جواب میں بیان فرمایا گیا اور روح کے متعلق جس حقیقت کا سوال تھا اس کا جواب نہیں دیا گیا جس سے یہود کی بتلائی ہوئی علامت صدق نبوت کی ظاہر ہوگئی، اس واقعہ کو ترمذی نے بھی مختصراً بیان کیا ہے (مظہری)

سورۂ حجر کی آیت ۲۹ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کے تحت روح اور نفس وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ایک تحقیق جو تفسیر مظہری سے پہلے گذر چکی ہے جسمیں روح کی اقسام اور ہر ایک کی حقیقت کو کافی حد تک واضح کر دیا گیا ہے

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ پچھلی آیت میں روح کے سوال پر بقدر ضرورت جواب دیکر روح کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش سے یہ کہکر روک دیا گیا تھا کہ انسان کا علم کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر حقائق الاشیاء کی ہمہ گیری کے اعتبار سے کم ہی رہتا ہے اس لئے غیر ضروری مباحث اور تحقیقات میں الجھنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ آیت وَلَئِنْ شِئْنَا میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کو جسقدر بھی علم ملا ہے وہ بھی اسکی ذاتی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسکو بھی سلب کر سکتے ہیں اسلئے اسکو چاہئے کہ موجودہ علم پر اللہ کا شکر ادا کرے اور فضول و لایعنی تحقیقات میں وقت ضائع نہ کرے خصوصاً جبکہ مقصود تحقیق کرنا بھی نہ ہو بلکہ دوسرے کا امتحان لینا یا اسکو خفیف کرنا مقصود ہو اگر اس نے ایسا کیا تو کچھ بعید نہیں کہ اس کج روی کے نتیجہ میں جتنا علم حاصل ہے وہ سب سلب ہو جائے اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر اصل سنانا امت کو مقصود ہے کہ جب رسول کا علم بھی انکے اختیار میں نہیں تو دوسروں کا کیا کہنا ہے

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ یہ مضمون قرآن مجید کی چند آیات میں آیا ہے جن میں پوری دنیائے انسان کو خطاب کرکے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تم قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے بلکہ کسی انسان کا بنایا ہوا مانتے ہو تو پھر تم بھی انسان ہو اس کی مثال بنا کے دکھلا دو۔ اس آیت میں اس دعویٰ کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا کہ صرف انسان نہیں جنات کو بھی اپنے ساتھ ملا لو اور پھر تم سب مل کر قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت کی مثال بھی نہ بنا سکو گے۔

اس مضمون کا اس جگہ پر اعادہ ممکن ہے کہ یہ بتلانے کے لئے ہو کہ تم جو ہمارے رسول سے مختلف قسم کے سوالات روح وغیرہ کے متعلق ان کی رسالت و نبوت کی آزمائش کے لئے کرتے ہو کیوں ان فضول قصوں میں پڑے ہو خود قرآن کریم کو دیکھ لو تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ جب ساری دنیا کے جن و انس اس کی ادنیٰ سی مثال بنانے سے عاجز ہیں تو اس کے کلام الٰہی ہونے میں کیا شبہ رہتا ہے اور جب قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا اس بداہت سے ثابت ہو گیا تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شبہ کی کیا گنجائش رہتی ہے۔

آخری آیت وَلَقَدْ صَرَّفْنَا میں یہ بتلا دیا کہ اگرچہ قرآن کریم کا معجزہ اتنا کھلا ہوا ہے کہ اس کے بعد کسی سوال اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی مگر ہو یہ رہا ہے کہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے نعمت قرآن کی بھی قدر نہیں پہچانتے اسلئے گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾

اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا

یا ہو جائے تیرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا پھر بہائے تو اس کے بیچ نہریں

تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ

چلا کر یا گرا دے ہم پر آسمان جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا

تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ

لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے یا ہو جائے تیرے لئے ایک گھر سنہرا

زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى

یا چڑھ جائے تو آسمان میں اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو جب تک

تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ

نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جسکو ہم پڑھ لیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں

اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ

مگر ایک آدمی ہوں بھیجا ہوا اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی

الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ

ان کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بھیجا آدمی کو پیغام دے کر کہہ اگر

كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰۗىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ

ہوتے زمین میں فرشتے پھرتے بستے تو ہم اتارتے ان پر

مِّنَ السَّمَاۗءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾

آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کر۔

خلاصۂ تفسیر

سابق آیات میں کفار کے چند سوالات اور ان کے جوابات ذکر کئے گئے ہیں مذکور الصدر آیات میں ان کے چند معاندانہ سوالات اور بے ہودہ فرمائشوں کا ذکر اور ان کا جواب ہے، اخرجہ ابن جریر عن ابن عباس، اور یہ لوگ (باوجود اس کے کہ اعجاز قرآنی کے ذریعہ آپ کی نبوت و رسالت کا کافی اور واضح ثبوت ان کو مل چکا ہے پھر بھی از راہ عناد ایمان نہیں لاتے اور یہ بہانے کرتے ہیں کہ) کہتے ہیں کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لاویں گے جب تک آپ ہمارے لئے (مکہ کی) زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دیں یا خاص آپ کے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرا دیں (جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد ہے اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ یعنی ہم چاہیں تو ان کو زمین کے اندر دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں) یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے نہ کھڑا کر دیں (کہ ہم کھلم کھلا دیکھ لیں) یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر (ہمارے سامنے) نہ چڑھ جاویں اور ہم تو آپ کے (آسمان پر) چڑھنے کا کبھی بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ (وہاں سے) آپ ہمارے پاس ایک کتاب نہ لادیں جسکو ہم پڑھ بھی لیں (اور اس میں آپ کے آسمان پر پہونچنے کی تصدیق بطور رسید لکھی ہوئی ہو آپ

(ان سب خرافات کے جواب میں) فرما دیجئے کہ سبحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں (مگر) پیغمبر ہوں اور کیا ہوں (کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا میری قدرت میں ہو یہ قدرت مطلقہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے بشریت اپنی ذات میں خود عجز و بے اختیاری کو مقتضی ہے رہا رسالت کا معاملہ تو وہ بھی اسکو مقتضی نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو ہر چیز کا مکمل اختیار ہو بلکہ نبوت و رسالت کے لئے تو اتنی بات کافی ہے کہ رسالت کی کوئی صاف واضح دلیل آجاوے جسپر اہل عقل کو اعتراض نہ ہو سکے اور وہ دلیل اعجاز قرآنی اور دوسرے معجزات کی صورت میں بارہا پیش کی جاچکی ہے اس لئے نبوت و رسالت کے لئے ان فرمائشوں کا مطالبہ محض لغو ہے ہاں اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر اس سے کسی کو مطالبہ کا حق نہیں جس چیز کو وہ حکمت کے مطابق دیکھتے ہیں ظاہر بھی کر دیتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہاری سب فرمائشیں پوری کریں اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت (یعنی رسالت کی صحیح دلیل مثل اعجاز قرآن کے) پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی (قابل التفات) بات مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے (بشریت کو رسالت کے منافی سمجھا اس لئے) کہا کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا) آپ (جواب میں ہماری طرف سے) فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے (رہتے ہوتے کہ اس پر چلتے بستے تو ہم البتہ ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

معارف و مسائل

بے سروپا معاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب

آیات مذکورہ میں جو سوالات اور فرمائشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دیکر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو سنکر ایک قسم کا تمسخر اور ایمان نہ لانے کا بیہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا ایسے سوالات کے جواب میں انسان کو فطرۃً غصہ آتا ہے اور جواب بھی اسی انداز کا دیتا ہے۔ مگر ان آیات میں ان کے بیہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور مصلحین اُمت کے لئے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بے وقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا، نہ ان پر کوئی فقرہ کسا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے اسے سارے خدائی اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہونا چاہئے یہ تخیل غلط ہے رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ ان کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے معجزات بھی بھیجتے ہیں مگر وہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت

واختیار سے ہوتا ہے رسول کو خدائی کے اختیارات نہیں ملتے وہ ایک انسان ہوتا ہے اور انسانی قوت وقدرت سے باہر نہیں ہوتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسکی امداد کے لئے اپنی قوت قاہرہ کو ظاہر فرمادیں۔

اللہ کا رسول انسان ہی ہوسکتا ہے فرشتے انسانوں کیطرف رسول نہیں ہوسکتے

عام کفار ومشرکین کا خیال تھا کہ بشر یعنی آدمی اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو ہماری طرح تمام حوائج انسانی کا عادی ہوتا ہے پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ ہم اسکو اللہ کا رسول سمجھیں اور اپنا مقتدا بنالیں۔ ان کے اس خیال کا جواب قرآن کریم میں کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا گیا ہے یہاں آیت مَا مَنَعَ النَّاس میں جو جواب دیا گیا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول جن لوگوں کی طرف بھیجا جائے وہ انھیں کی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اگر یہ آدمی ہیں تو رسول بھی آدمی ہونا چاہیئے کیونکہ غیر جنس کے ساتھ باہم مناسبت نہیں ہوتی اور بلا مناسبت کے رشد وہدایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اگر آدمیوں کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیں جو نہ بھوک کو جانتا ہے نہ پیاس کو نہ جنسی خواہشات کو نہ سردی گرمی کے احساس کو نہ اس کو کبھی محنت سے تکان لاحق ہوتا ہے تو وہ انسانوں سے بھی ایسے ہی عمل کی توقع رکھتا انکی کمزوری ومجبوری کا احساس نہ کرتا۔ اسی طرح انسان جب یہ سمجھتے کہ یہ تو فرشتہ ہے ہم اسکے کاموں کی نقل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو اس کا اتباع خاک کرتے۔ یہ فائدہ اصلاح اور رشد وہدایت کا صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو تو جنس بشر سے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا خود بھی حامل ہو مگر ساتھ ہی اسکو ایک شان ملکیت کی بھی حاصل ہو کہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کرسکے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کرے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو پہونچائے۔

اس تقریر سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا کہ جب انسان فرشتہ سے فیض حاصل نہیں کرسکتا تو پھر رسول باوجود انسان ہونے کے کس طرح ان سے فیض وحی حاصل کرسکے گا۔

رہا یہ شبہ کہ جب رسول اور امّت میں مجانست شرط ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جنّات کا رسول کسطرح بنایا گیا جنّات تو انسان کے ہم جنس نہیں تو جواب یہ ہے کہ رسول صرف انسان نہیں بلکہ اسمیں ایک شان ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جنّات کو بھی مناسبت ان سے ہوسکتی ہے۔

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ تم انسان ہونے کے باوجود یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہمارا رسول فرشتہ ہونا چاہیئے یہ مطالبہ تو نامعقول ہے البتہ اگر اس زمین پر فرشتے آباد ہوتے اور ان کیطرف

رسول بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو فرشتہ ہی کو رسول بنایا جاتا اس میں جو زمین پر بسنے والے فرشتوں کا یہ وصف ذکر کیا گیا ہے کہ یَمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ یعنی وہ فرشتے زمین پر مطمئن ہو کر چلتے پھرتے، اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی طرف فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجنے کی ضرورت اسی وقت ہو سکتی تھی جبکہ زمین کے فرشتے خود آسمان پر نہ جا سکتے بلکہ زمین ہی پر چلتے پھرتے رہتے ورنہ اگر وہ خود آسمان پر جانے کی قدرت رکھتے تو زمین پر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ

کہہ اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا میرے اور تمہارے بیچ میں وہ ہے اپنے بندوں سے

خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ

خبردار دیکھنے والا اور جس کو راہ دکھلاوے اللہ وہی ہے راہ پانے والا اور جس کو بھٹکاوے

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پھر تو نہ پاوے اُن کے واسطے کوئی رفیق اللہ کے سوائے اور اُٹھائیں گے ہم اُن کو دن قیامت کے

عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا

چلیں گے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے ٹھکانا اُن کا دوزخ ہے جب لگے گی

خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا

بجھنے اور بھڑکا دیں گے اُن پر یہ اُن کی سزا ہے اس واسطے کہ منکر ہوئے

بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا

ہماری آیتوں سے اور بولے کیا جب ہم ہو گئے ہڈیاں اور چورا چورا کیا ہم کو اٹھائیں گے

جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ

نئے بنا کر کیا نہیں دیکھ چکے کہ جس اللہ نے بنائے آسمان اور زمین وہ سکتا ہے

عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ

کہ بناوے ان جیسے اور مقرر کیا ہے ان کے واسطے ایک وقت بے شبہ سو نہیں رہا جاتا بے انصافوں سے

اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا

بے ناشکری کئے کہہ اگر تمہارے ہاتھ میں ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانے تو ضرور

النصف

لَاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ ۱۰۰

بند کر رکھتے اس ڈر سے کہ خرچ نہ ہو جاویں اور ہے انسان دل کا تنگ ۔

خلاصۂ تفسیر

جب یہ لوگ رسالت و نبوت کے دلائل صحیحہ آجانے اور تمام شبہات دور ہو جانے کے بعد بھی نہیں مانتے تو آپ آخری بات کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے تمہارے درمیان (کے اختلاف میں) کافی گواہ ہے (یعنی خدا جانتا ہے کہ میں واقع میں اس کا رسول ہوں کیونکہ) وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے (تمہارے عناد کو بھی دیکھتا ہے) اور اللہ جس کو راہ پر لاوے وہی راہ پر آتا ہے اور جس کو بے راہ کر دے تو خدا کے سوا آپ کسی کو بھی ایسوں کا مددگار نہ پاویں گے (اور جو کفر کرے یہ خدا کی مدد سے محروم رہے، مطلب یہ ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے دستگیری نہ ہو نہ ہدایت ہو سکتی ہے نہ عذاب سے نجات) اور ہم قیامت کے روز ان کو اندھا گونگا بہرہ کر کے منہ کے بل چلائیں گے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جس کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ (یعنی دوزخ کی آگ) جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی اسی وقت ہم ان کے لئے اور زیادہ بھڑکا دیں گے، یہ ہے ان کی سزا اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور یوں کہا تھا کہ کیا ہم ہڈیاں اور (وہ بھی) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاویں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے (قبروں سے) اٹھائے جاویں گے کیا ان لوگوں کو اتنا معلوم نہیں کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے وہ اس بات پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے (اور منکرین کو شاید یہ وسوسہ ہو کہ ہزاروں لاکھوں مر گئے مگر اب تک تو یہ وعدہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا پورا ہوا نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) ان کے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے ایک میعاد معین کر رکھی ہے کہ اس میعاد معین کے آنے میں ذرا بھی شک نہیں۔ سو بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے (کہ جس کو چاہتے دیتے جس کو چاہتے نہ دیتے) تو اس صورت میں تم اس کے (خرچ ہو جانے کے) اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے (کبھی کسی کو نہ دیتے حالانکہ یہ چیز کسی کو دینے سے گھٹتی بھی نہیں) اور آدمی ہے بڑا تنگدل (کہ نہ گھٹنے والی چیز کو بھی عطا کرنے سے دریغ کرتا ہے جس کی وجہ رسولوں سے عداوت اور بخل کے علاوہ شاید یہ بھی ہو کہ اگر کسی کو نبی اور رسول مان لیں تو پھر اس کے احکام کی پابندی کرنا پڑے گی جیسے کوئی قوم باہم اتفاق کر کے کسی کو اپنا بادشاہ بنا لے تو گو بنایا انھوں نے ہے مگر جب

وہ بادشاہ بنگیا تو اسکی اطاعت کرنی پڑتی ہے)

معارف و مسائل

آخری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہو جاؤ تو تم بخل کروگے کسیکو نہ دوگے اس خطرہ سے کہ اگر لوگوں کو دیتے رہے تو یہ خزانہ ختم ہو جائے گا اگرچہ رحمت رب کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں مگر انسان اپنی طبیعت سے تنگدل کم حوصلہ ہوتا ہے اسکو فراخی کے ساتھ لوگوں کے دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

اسمیں خزائن رحمت رب کے لفظ سے عام مفسرین نے مال و دولت کے خزائن مراد لئے ہیں اور اسکا ربط ماسبق سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اسکی فرمائش کی تھی کہ اگر آپ واقعی نبی حق ہیں تو آپ اس مکہ کے خشک ریگستان میں نہریں جاری کرکے اسکو سرسبز باغات میں منتقل کردیں جیسا ملک شام کا خطہ ہے جسکا جواب پہلے آچکا ہے کہ تم نے تو گویا مجھے خدا ہی سمجھ لیا کہ خدائی کے اختیارات کا مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو میں تو صرف ایک رسول ہوں خدا نہیں کہ جو چاہوں کر دوں یہ آیت بھی اگر اسی کے متعلق قرار دیجائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سرزمین مکہ کو نہری زمین اور سبزہ زار بنانے کی فرمائش اگر میری نبوت و رسالت کے امتحان کے لئے ہے تو اسکے لئے اعجاز قرآن کا معجزہ کافی ہے دوسری فرمائشوں کی ضرورت نہیں اور اگر اپنی قومی اور ملکی ضرورت رفع کرنے کے لئے ہے تو یاد رکھو کہ اگر تمہاری فرمائش کے مطابق تمہیں زمین مکہ میں سب کچھ دے بھی دیا جائے اور خزائن کا مالک تمہیں بنا دیا جائے تو اسکا انجام بھی قومی اور ملک کے عوام کی خوشحالی نہیں ہوگی بلکہ انسانی عادت کے مطابق جنکے قبضہ میں یہ خزائن آجاویں گے وہ ان پر سانپ بنکر بیٹھ جاویں گے عوام پر خرچ کرتے ہوئے افلاس کا خوف ان کو مانع ہوگا ایسی صورت میں بجز اسکے کہ یہ چند رئیس اور زیادہ امیر اور خوشحال ہو جائیں عوام کا کیا فائدہ ہوگا۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے بیان القرآن میں اس جگہ رحمت رب سے مراد نبوت و رسالت اور خزائن رحمت سے مراد کمالات نبوت لئے ہیں اس تفسیر کے مطابق اسکا ربط آیات سابقہ سے یہ ہوگا کہ تم جو نبوت و رسالت کے سلسلے میں بے سروپا اور بیہودہ مطالبات کر رہے ہو اسکا حاصل یہ ہے کہ میری نبوت کو ماننا نہیں چاہتے تو کیا پھر تمہاری خواہش یہ ہے کہ نبوت کا نظام تمہارے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسکو تم چاہو نبی بنا لو۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کسیکو بھی نبوت و رسالت نہ دوگے بخل کرکے بیٹھ جاؤ گے۔ حضرتؒ نے اس تفسیر کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ یہ تفسیر مواہب الہیہ میں سے ہے کہ نظم کے ساتھ نہایت چسپاں ہے اسمیں نبوت کو رحمت کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہی ہوگا

جیسا آیت اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ میں باتفاق رحمت سے مراد نبوت ہی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ

اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں صاف پھر پوچھ بنی اسرائیل سے جب

جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ

آیا وہ ان کے پاس تو کہا اس کو فرعون نے میری اٹکل میں تو موسیٰ تجھ پر جادو ہوا بولا تو جان

عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ

چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سجھانے کو اور

اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

میری اٹکل میں فرعون تو غارت ہوا چاہتا ہے پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین نہ دے اس زمین میں

فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ

پھر ڈبا دیا ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے بنی

اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ

اسرائیل کو آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو

لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

سمیٹ کر اور سچ کے ساتھ اتارا ہم نے یہ قرآن اور سچ کے ساتھ اترا اور تجھ کو جو بھیجا ہم نے سو

مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰي

خوشی اور ڈر سنانے کو اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے اس کو جدا جدا کر کے کہ پڑھے تو اس کو لوگوں پر

مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ

ٹھہر ٹھہر کر اور ہم نے اس کو اتارتے اتارتے اتارا کہہ تم اس کو مانو یا نہ مانو

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ

جن کو علم ملا ہے اس کے پہلے سے جب ان کے پاس اس کو پڑھئے

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ۙ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ

گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر سجدہ میں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب

إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ

بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿١٠٩﴾ السجدة

روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کھلے ہوئے نو معجزے دیئے (جن کا ذکر پارہ نہم کے رکوع ششم آیت اول میں ہے جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے تھے سو آپ بنی اسرائیل سے بھی پوچھ دیکھئے اور چونکہ آپ فرعون کی طرف بھی بھیجے گئے تھے اور فرعون و آل فرعون سے ایمان نہ لانے پر وہ عجائبات معجزات ظاہر ہوئے تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوبارہ ایمان لانے کے لئے یاد دہانی کی اور ان آیات بینہ سے ڈرایا) تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جس سے تمہاری عقل مخبوط ہو گئی کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تو (دل میں) خوب جانتا ہے (گو عار کی وجہ سے زبان سے اقرار نہیں کرتا) کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے کافی ذرائع ہیں اور میرے خیال میں ضرور تیری کمبختی کے دن آ گئے ہیں (غرض فرعون کی یہ حالت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بھی بنی اسرائیل کو مصر سے جانے کی اجازت نہ دیتا تھا اور) پھر (یہ ہوا کہ) اس نے (اس احتمال سے کہ کہیں بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے زور سے قوت نہ پکڑ جاویں خود ہی) چاہا کہ بنی اسرائیل کا اس سرزمین سے قدم اکھاڑ دے (یعنی ان کو شہر بدر کر دے) سو ہم نے (قبل اس کے کہ وہ کامیاب ہو خود اس ہی) کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا اور اس (کے غرق کرنے) کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ (اب) تم اس سرزمین (کے جہاں سے تم کو نکالنا چاہتا تھا مالک ہو تم ہی اس) میں رہو سہو (خواہ بالقوہ یا بالفعل مگر یہ بنسبت حیوٰۃ دنیا تک ہے) پھر جب آخرت کا وعدہ آ جاوے گا تو ہم سب کو جمع کر کے (قیامت کے میدان میں محکومانہ) لا کر حاضر کریں گے (یہ ابتداء میں ہوگا پھر مومن و کافر نیک و بد کو الگ الگ کر دیا جاوے گا) اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیئے اسی طرح آپ کو بھی بہت سے معجزات دیئے جن میں عظیم الشان معجزہ قرآن ہے کہ) ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ تو نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ (آپ پر) نازل ہو گیا (یعنی جیسا کاتب کے پاس سے چلا تھا اسی طرح مکتوب الیہ تک پہنچ گیا اور درمیان میں کوئی تغیر و تبدل و تصرف

نہیں ہوا بلکہ سراسر راستی ہی راستی ہے، اور جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ہدایت ان کے اختیار میں نہ تھی اسی طرح ہم نے آپ کو بھی (صرف ایمان پر ثواب کی) خوشی سنانے والا اور (کفر پر عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (اگر کوئی ایمان نہ لاوے کچھ غم نہ کیجئے) اور قرآن (میں صفت راستی کے ساتھ مقتضائے رحمت اور بھی ایسی صفت کی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے ہدایت زیادہ آسان ہو چنانچہ ایک تو یہ کہ اس) میں ہم نے (آیت وغیرہ کا) جا بجا فصل رکھا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں (جس میں وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کیونکہ تقریر طویل مسلسل بعض اوقات ضبط میں نہیں آتی) اور (دوسرے یہ کہ) ہم نے اس کو اتارنے میں بھی (حسب واقعات) تدریجاً اتارا (تاکہ معانی کا خوب انکشاف ہو اب ان سب امور کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ ایمان لے آتے لیکن اس پر بھی ایمان نہ لاویں تو آپ کچھ پروا نہ کیجئے بلکہ صاف) کہدیجئے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ (مجھ کو کوئی پرواہ نہیں دو وجہ سے اول تو یہ کہ میرا کیا ضرر کیا دوسرے یہ کہ تم ایمان نہ لائے تو کیا ہوا دوسرے لوگ ایمان لے آئے چنانچہ) جن لوگوں کو قرآن (کے نزول) سے پہلے (دین کا) علم دیا گیا تھا (یعنی منصف علماء اہل کتاب) یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب (وعدہ خلافی سے) پاک ہے بیشک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے (سو جس کتاب کا جس نبی پر نازل کرنے کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا تھا اس کو پورا فرما دیا) اور ٹھوڑیوں کے بل (جو گرتے ہیں تو) روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ قرآن (یعنی اس کا سننا) ان کا (دلی) خشوع اور بڑھا دیتا ہے (کیونکہ ظاہر و باطن کا توافق کیفیت کو قوی کر دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو آیات بینات عطا فرمانے کا ذکر ہے، آیت کا لفظ معجزے کے معنی میں بھی آتا ہے اور آیات قرآن یعنی احکام الٰہیہ کے معنی میں بھی اس جگہ دونوں معنی کا احتمال ہے اسی لئے ایک جماعت مفسرین نے اس جگہ آیات سے مراد معجزات لئے ہیں اور نو کے عدد سے یہ ضروری نہیں کہ نو سے زائد نہ ہوں مگر اس جگہ نو کا ذکر کسی خاص اہمیت کی بناء پر کیا گیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رض نے یہ نو معجزات اس طرح شمار فرمائے ہیں (۱) عصائے موسیٰ جو اژدہا بنجاتی تھی (۲) ید بیضا جس کو گریبان میں ڈالکر نکالنے سے چمکنے لگتا تھا (۳) زبان میں لکنت تھی وہ دور کر دی گئی (۴) بنی اسرائیل کے دریا پار کرنے کے لئے دریا کو پھاڑ کر اس کے راستے الگ کر دیئے اور راستہ دیدیا (۵) ٹڈی دل کا عذاب غیر معمولی صورت میں بھیجا گیا (۶) طوفان بھیجا گیا (۷) بدن کے کپڑوں میں بیحد جوئیں پیدا کر دی گئیں جن سے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا (۸) مینڈکوں کا ایک عذاب مسلط کر دیا گیا کہ ہر کھانے پینے کی

چیز میں مینڈک آجاتے تھے (۹) خون کا عذاب بھیجا گیا کہ ہر برتن اور کھانے پینے میں خون ہوتا تھا۔

اور ایک صحیح حدیث کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد احکام الٰہیہ ہیں یہ حدیث ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ میں بسند صحیح حضرت صفوان بن عسال رضہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھے اس نبی کے پاس لے چلو۔ ساتھی نے کہا کہ نبی نہ کہو اگر ان کو خبر ہو گی کہ ہم بھی انکو نبی کہتے ہیں تو ان کی چار آنکھیں ہو جاویں گی یعنی انکو فخر و مسرت کا موقع ملجاوے گا پھر یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نو آیات بینات دی گئی تھیں وہ کیا ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسکو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگا کر قتل و سزا کے لئے پیش نہ کرو (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پر بدکاری کا بہتان نہ باندھو (۹) میدان جہاد سے جان بچا کر نہ بھاگو۔ اور اے یہود خاص کر تمہارے لئے یہ بھی حکم ہے کہ یوم سبت (سنیچر) کے جو خاص احکام تمہیں دیئے گئے انکی خلاف ورزی نہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنکر دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں میرا اتباع کرنے سے کیا چیز روکتی ہے کہنے لگے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ ان کی ذریت میں ہمیشہ نبی ہوتے رہیں اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر ہم آپکا اتباع کرنے لگیں تو یہود ہمیں قتل کر دینگے۔

چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے اس لئے بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا تفسیر مظہری میں ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم میں نہ جاوے گا وہ شخص جو اللہ کے خوف سے رویا جب تک کہ دودھ ہوا دودھ دوبارہ تھنوں میں واپس نہ لوٹ جائے (یعنی جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ تھنوں سے نکالا ہوا دودھ پھر تھنوں میں واپس ڈالدیا جائے اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے خوف سے رونے والا جہنم میں چلا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام کر دی ایک وہ جو اللہ کے خوف سے روئے دوسرے جو اسلامی سرحد کی حفاظت کے لئے رات کو بیدار رہے (بیہقی وحاکم وصححہ) اور حضرت نضر بن سعد رضہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں کوئی اللہ کے خوف سے رونے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اس کی وجہ سے آگ سے نجات عطا فرماوینگے (روح عن الحکیم الترمذی)

آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ ان میں خدا کے خوف

سے رونے والے بہت کم رہ گئے صاحب روح المعانی اس موقع پر خدا کے خوف سے رونے کے فضائل کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ وینبغی ان یکون ذلک حال العلماء، یعنی علماء دین کا یہی حال ہونا چاہئے کیونکہ ابن جریر ابن منذر وغیرہ نے عبدالاعلی تیمی رح کا یہ قول نقل کیا ہے

"جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو جو اسکو رُلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اسکو علم نافع نہیں ملا"

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ

کہہ اللہ کہکے پکارو یا رحمن کہہ کر جو کہہ کر پکارو گے سو اسی کے ہیں سب

الْحُسْنٰی ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ

نام خاصے اور پکار کر مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈلے اس کے بیچ

ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ

میں راہ اور کہہ سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس

لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ

کا ساجھی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ذلت کے وقت پر

وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور اس کی بڑائی کر بڑا جان کر۔

ع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

آپ فرما دیجئے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے (تو بہتر ہے کیونکہ) اس کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں اور اس کا شرک سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک ہی ذات کے کئی نام ہونے سے اسکی توحید میں کوئی فرق نہیں آتا) اور اپنی جہری نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھئے (کہ مشرکین سنیں اور خرافات بکیں اور نماز میں قلب مشوش ہو) اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھیئے (کہ مقتدی نمازیوں کو بھی سنائی نہ دے، کیونکہ اس سے انکی تعلیم و تربیت میں کمی آتی ہے) اور دونوں کے درمیان ایک (متوسط) طریقہ اختیار کر لیجئے (تاکہ مصلحت فوت نہ ہو اور مضرت پیش نہ آئے اور (کفار پر رد کرنے کے لئے علی الاعلان) کہہ دیجئے کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے (خاص) ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اس کا کوئی شریک سلطنت ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا

مددگار ہے اور اسکی خوب بڑائی بیان کیا کیجئے ۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیات ہیں اس سورت کے شروع میں بھی حق تعالیٰ کی تنزیہہ اور توحید کا بیان تھا ان آخری آیات میں بھی اسی پر ختم کیا جا رہا ہے ان آیتوں کا نزول چند واقعات کی بناء پر ہوا، اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز دعا میں یا اللہ اور یا رحمٰن کہہ کر پکارا تو مشرکین نے سمجھا کہ یہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہمیں تو ایک کے سوا کسی اور کو پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں اسکا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے دو ہی نہیں اور بھی بہت سے اچھے اچھے نام ہیں کسی نام سے بھی پکاریں مراد ایک ہی ذات ہے تمہارا وہم غلط ہے ۔

دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بلند آواز سے تلاوت قرآن فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآن اور جبرئیل امین اور خود حق تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جسمیں آپکو جہر و اخفاء میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی کہ ضرورت تو اس درمیانہ آواز سے پوری ہو جاتی ہے اور زیادہ بلند آواز سے جو مشرکین کو موقع ایذا رسانی کا ملتا تھا اس سے نجات ہو ۔

تیسرا قصہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دیتے تھے اور عرب بتوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے اور صابی اور مجوسی یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے مخصوص مقرب نہ ہوں تو اسکی قدر و عزت میں کمی آجاوے ان تینوں فرقوں کے جواب میں آخری آیت نازل ہوئی جسمیں تینوں چیزوں کی نفی ذکر کی گئی ہے ۔

دنیا میں جس سے مخلوق کو کسیقدر قوت پہونچا کرتی ہے وہ کبھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد اور کبھی اپنی برابر ہوتا ہے جیسے شریک اور کبھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی و مددگار، حق تعالیٰ نے اس آیت میں بہ ترتیب تینوں کی نفی فرمادی ۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں نماز کے اندر تلاوت کرنے کا یہ ادب بتلایا گیا ہے کہ بہت بلند آواز سے ہو نہ بہت آہستہ جسکو مقتدی نہ سن سکیں۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے ظہر اور عصر کی نمازوں میں تو بالکل اخفاء ہو، سنت متواترہ سے ثابت ہے ۔

جہری نماز میں مغرب عشاء اور فجر کے فرض بھی داخل ہیں اور نماز تہجد بھی جیسا کہ ایک حدیث میں ہے

کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد کے وقت صدیق اور فاروق اعظم کے پاس سے گذرے تو صدیق اکبر تلاوت آہستہ کر رہے تھے اور فاروق اعظم خوب بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق سے فرمایا کہ آپ ایسا آہستہ کیوں پڑھتے ہیں صدیق نے عرض کیا کہ مجھے جس کو سنانا تھا سنا دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر مخفی سے مخفی آواز کو بھی سنتے ہیں آپ نے فرمایا کسی قدر جہر سے پڑھا کرو، پھر عمر بن خطاب رضؓ سے فرمایا کہ آپ اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہیں حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا کہ میں نیند اور شیطان کو دفع کرنے کے لئے بلند آواز سے پڑھتا ہوں آپ نے ان کو بھی یہ حکم دیا کہ کچھ پست آواز سے پڑھا کرو۔ (ترمذی از مظہری)

نماز اور غیر نماز میں تلاوت قرآن کو جہر سے اور اخفاء سے ادا کرنے کے متعلق مسائل سورۂ اعراف میں بیان ہو چکے ہیں آخری آیت قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ کے متعلق حدیث میں ہے کہ آیت عزت یہ آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ الخ (رواہ احمد والطبرانی عن معاذ الجہنی کذا فی المظہری) اس آیت میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کوئی انسان کتنی ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تحمید کرے اپنے عمل کو اس کے حق کے مقابلہ میں کم سمجھنا اور قصور کا اعتراف کرنا اس کے لئے لازم ہے (مظہری)

اور حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ بنی عبدالمطلب میں جب کوئی بچہ زبان کھولنے کے قابل ہو جاتا تو اس کو آپ یہ آیت سکھا دیتے تھے وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا (مظہری)

اور حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلا اس طرح کہ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا آپ کا گذر ایک ایسے شخص پر ہوا جو بہت شکستہ حال اور پریشان تھا آپ نے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہو گیا، اس شخص نے عرض کیا کہ بیماری اور تنگدستی نے یہ حال کر دیا آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں چند کلمات بتلاتا ہوں وہ پڑھو گے تو تمہاری بیماری اور تنگدستی جاتی رہے گی وہ کلمات یہ تھے تَوَکَّلْتُ عَلَی الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا آیت۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد پھر آپ اس طرف تشریف لے گئے تو اس کو اچھے حال میں پایا آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اس نے عرض کیا کہ جب سے آپ نے مجھے یہ کلمات بتلائے تھے میں پابندی سے ان کو پڑھتا ہوں (ابو یعلیٰ و ابن سنی از مظہری)

تم تفسیر سورۂ بنی اسرائیل بعون اللہ وحمدہ بعد العشاء لعاشر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ فالحمد للہ اولہ وآخرہ۔

عرض حال از مؤلف آج ۲۹ شعبان ۱۳۹۰ھ یوم السبت میں بحمد اللہ معارف القرآن کے مسودہ پر نظر ثانی بھی مکمل ہو گئی ہے اب یہ نصف قرآن کریم کی تفسیر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے پوری کرا دی جس کی بظاہر اسباب کوئی امید نہیں تھی کیونکہ رمضان ۱۳۸۸ھ کے آخر میں یہ ناکارہ ایسے مختلف

امراض میں مبتلا ہوا کہ تقریباً ایک سال تو بستر ہی پر موت و حیات کی کشمکش میں گذرا، اس وقت مجبوری و معذوری کے عالم میں بار بار یہ حسرت ہوتی تھی کہ بعض تصانیف کے مسودات جو قریب تکمیل تھے کاش ان کی تکمیل ہو جاتی، معارف القرآن کے نام سے جو درس قرآن عرصہ دراز تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا بہت سے دو منزلوں کے تتمہ سے اسے نظر ثانی اور درمیان سے باقی رہی ہوئی آیات کی تفسیر کی تکمیل کا جو سلسلہ چل رہا تھا کسی طرح اس کی تکمیل ہو جاتی اسی طرح سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے قرآن کریم کی دو منزلیں پانچویں اور چھٹی کے احکام القرآن بزبان عربی لکھنے کے لئے احقر کو مامور فرمایا تھا اس کا بھی آخری حصہ لکھنے سے باقی رہ گیا تھا، موت و حیات کی کشمکش اٹھنے بیٹھنے سے معذوری ہی کے عالم میں شاید اس حسرت ناتمامی کی شنوائی بارگاہ رب العزت میں ہوگئی اور یہ خیال غالب آیا کہ جو کچھ جتنا بن پڑے وہ کام کر لیا جائے یہ فکر چھوڑ دی جائے کہ جو رہ جائے گا اس کا کیا ہوگا، اس خیال نے ایک عزم کی صورت اختیار کر لی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تفسیر پر نظر ثانی اور احکام القرآن کی تکمیل کا کام شروع کر دیا عجائب قدرت سے ہے کہ اس بیماری کے زمانے میں کام اتنی سرعت سے چلا کہ تندرستی میں بھی یہ رفتار نہ تھی اور پھر شاید اسی کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان معذور و مجبور کر دینے والے امراض سے شفاء بھی فرما دی اور ایک حد تک تندرستی کی صورت حاصل ہوگئی، تو اب وقت کی قدر پہچانی اور ان کاموں پر بقدر استطاعت وقت صرف کیا، یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہی تھا کہ احکام القرآن کی دونوں منزلوں کی تکمیل بھی ہوگئی اور اسی عرصہ میں یہ دونوں جلدیں چھپ کر شائع بھی ہوگئیں، اور تفسیر معارف القرآن کی دو جلدیں سورۂ انفال تک چھپ کر شائع ہوگئیں، تیسری جلد سورۂ اعراف تک زیر طباعت ہے اور آج نصف قرآن کے مسودہ تفسیر پر نظر ثانی کی بھی تکمیل ہوگئی۔ (فللہ الحمد اولہ وآخرہ)

اس وقت جبکہ یہ سطور زیر تحریر ہیں حقر ناکارہ کی عمر کے ۷۵ سال پورے ہو کر ۱۲ شعبان ۱۳۹۰ھ کو عمر کی چھہترویں منزل شروع ہوگئی، مختلف امراض میں ابتلاء ضعف طبعی اس پر مشاغل و افکار کا ہجوم ہے، اب آگے کسی تصنیف و تالیف کی توقع رکھنا میرے لئے وہم سے زائد کچھ نہیں ہو سکتا لیکن خدمت قرآن کے نام پر خامہ فرسائی کتنی ہی ناقص و ناتمام خدمت ہو کہنے والے کیلئے سعادت ہی سعادت ہے اس خیال نے اس پر آمادہ کر دیا کہ سورۂ کہف کی تفسیر بھی بنام خدا تعالیٰ شروع کر دی جائے اور باقیہ عمر میں جو کچھ ہو سکے اس کو غنیمت سمجھا جائے کیونکہ مقصد قرآن ختم کرنا نہیں قرآن میں اپنی عمر و توانائی ختم کرنا ہے واللہ الموفق والمعین۔

سورۂ بنی اسرائیل ختم شد

سُوْرَةُ الْكَهْفِ

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّعَشْرُ اٰيَاتٍ وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ کہف مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ

سب تعریف اللہ کو جس نے اتاری اپنے بندے پر کتاب اور نہ رکھی

لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ

اس میں کچھ کجی، ٹھیک اتاری تاکہ ڈر سنا دے ایک آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوشخبری دے

الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲

ایمان لانے والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں کہ ان کے لئے اچھا بدلہ ہے،

مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴

جس میں رہا کریں ہمیشہ، اور ڈر سنا دے ان کو جو کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَاۗىِٕهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ

کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی اور نہ ان کے باپ دادوں کو، کیا بڑی بات نکلتی ہے

اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں، سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو

عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا
ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچھتا پچھتا کر ۔ ہم نے بنایا جو
مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا
جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق تاکہ جانچیں لوگوں کو کون ان میں اچھا کرتا ہے کام ، اور ہم کو
لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾
کرنا ہے جو کچھ اس پر ہے میدان چھانٹ کر۔

سورۂ کہف کی خصوصیات اور فضائل

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد میں حضرت ابوالدرداءؓ سے ایک روایت ہے کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کرلیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا، اور کتب مذکورہ میں حضرت ابوالدرداءؓ ہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرنے کے متعلق منقول ہے۔

اور مسند احمد میں بروایت حضرت سہل بن معاذؓ یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ کہف کی پہلی اور آخری آیتیں پڑھ لے اس کے لئے اس کے قدم سے سر تک ایک نور ہو جاتا ہے، اور جو پوری سورت پڑھ لے تو اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرلے، اس کے قدم سے لے کر آسمان کی بلندی تک نور ہو جائے گا، جو قیامت کے دن روشنی دے گا، اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، (امام ابن کثیر نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے)

اور حافظ ضیاء مقدسی نے اپنی کتاب مختارہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھ لے وہ آٹھ روز تک ہر فتنہ سے معصوم رہے گا، اور اگر دجال نکل آئے تو یہ اس کے فتنہ سے بھی معصوم رہے گا۔ (یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)۔

روح المعانی میں دیلمی سے بروایت حضرت انسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی، اور ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے جس سے اس کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے۔

شانِ نزول

امام ابن جریر طبری نے بروایت حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ (جب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا ہوا اور قریش مکہ اس سے

پریشان ہوئے تو) انھوں نے اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجا کہ وہ لوگ کتب سابقہ تورات و انجیل کے عالم ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ علماء یہود نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ ان سے تین سوالات کرو، اگر انھوں نے ان کا جواب صحیح[1] دیدیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور یہ نہ کر سکے تو یہ سمجھ لو کہ یہ بات بنانے والے ہیں رسول نہیں، ایک تو ان سے اُن نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے، ان کا کیا واقعہ ہے، کیونکہ یہ واقعہ عجیبہ ہے، دوسرے ان سے اس شخص کا حال پوچھو جس نے دنیا کی مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا اس کا کیا واقعہ ہے، تیسرے ان سے روح کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا چیز ہے؟

یہ دونوں قریشی مکہ مکرمہ واپس آئے اور اپنی برادری کے لوگوں سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن صورت حال لے کر آئے ہیں، اور علماء یہود کا پورا قصہ سنا دیا، پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوالات لے کر حاضر ہوئے، آپ نے سن کر فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا، مگر آپ اس وقت انشاء اللہ کہنا بھول گئے، یہ لوگ لوٹ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کے انتظار میں رہے کہ ان سوالات کا جواب وحی سے بتلا دیا جائے گا، مگر وعدے کے مطابق اگلے دن تک کوئی وحی نہ آئی، بلکہ پندرہ دن اسی حال پر گذر گئے، کہ نہ جبرئیل امین آئے نہ کوئی وحی نازل ہوئی، قریش مکہ نے مذاق اڑانا شروع کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت رنج و غم پہونچا۔

پندرہ دن کے بعد جبرئیل امین سورۂ کہف لے کر نازل ہوئے (جس میں تاخیر وحی کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہنا چاہئے، اس واقعہ میں چونکہ ایسا نہ ہوا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے وحی میں تاخیر ہوئی، اس سورۃ میں اس معاملہ کے متعلق یہ آیتیں آگے آئیں گی وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ) اور اس سورۃ میں نوجوانوں کا واقعہ بھی پورا بتلا دیا گیا جن کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے، اور مشرق و مغرب کے سفر کرنے والے ذی القرنین کے واقعہ کا بھی مفصل بیان آگیا، اور روح کے سوال کا جواب بھی، (قرطبی و مظہری بحوالہ ابن جریر) (مگر روح کے سوال کا جواب اجمال کے ساتھ دینا مقتضائے حکمت تھا، اس کو سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں علیحدہ کر کے بیان کر دیا گیا، اور اسی سبب سے سورۂ کہف کو سورۂ بنی اسرائیل کے بعد لکھا گیا ہے، کذا ذکرہ السیوطی)

[1] یعنی جو جواب انھیں دینا چاہئے وہ دیدیا، اور روح کے بارے میں صحیح جواب یہ ہے کہ اس کی اصلی حقیقت انسان کی سمجھ سے باہر ہے ... حدیث جو تفسیر ابن جریر ص ۹۱ ج ۱۵ میں منقول ہے، اس روایت کے مطابق ... اسی جلد کے صفحہ ۵۲۸ پر سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۵ کے تحت گذر چکی ہے۔ محمد تقی عثمانی

خلاصۂ تفسیر

تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس (کتاب) میں (کسی قسم کی) ذرا بھی کجی نہیں رکھی (نہ لفظی کہ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہو، اور نہ معنوی کہ اس کا کوئی حکم حکمت کے خلاف ہو بلکہ اس کو) بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا (اور نازل اس لئے کیا کہ) تاکہ وہ (کتاب کافروں کو عموماً) ایک سخت عذاب سے جو منجانب اللہ (ان کو آخرت میں ہوگا) ڈرائے اور اہل ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دے کہ ان کو (آخرت میں) اچھا اجر ملے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (کفار میں سے بالخصوص) ان لوگوں کو (عذاب سے) ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے (اور اولاد کا عقیدہ رکھنے والے کافروں کا عام کافروں سے الگ کرکے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس باطل عقیدہ میں عرب کے عام لوگ مشرکین، یہود و نصاریٰ سب ہی مبتلا تھے) نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، (اور) وہ لوگ بالکل (ہی) جھوٹ بکتے ہیں (جو عقلاً بھی ناممکن ہے، کوئی ادنیٰ عقل والا بھی اس کا قائل نہیں ہوسکتا، اور آپ جو ان لوگوں کے کفر و انکار پر اتنا غم کرتے ہیں کہ) تو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے (یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ ہلاکت کے قریب کردے، وجہ یہ ہے کہ دنیا عالم امتحان ہے، اس میں ایمان و کفر اور خیر و شر دونوں کا مجموعہ ہی رہے گا، سبھی مؤمن ہوجائیں گے ایسا نہ ہوگا، اسی امتحان کے لئے) ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس (زمین) کے لئے باعث رونق بنایا تاکہ ہم (اس کے ذریعہ) لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے (یہ امتحان کرنا ہے کہ کون اس دنیا کی زینت اور رونق پر مفتون ہوکر اللہ سے اور آخرت سے غافل ہوجاتا ہے اور کون نہیں، غرض یہ کہ یہ عالم ابتلاء ہے، تو کوئی اس میں کوئی مؤمن ہوگا کوئی کافر رہے گا، پھر غم بیکار ہے آپ اپنا کام کئے جائیے، اور ان کے کفر کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہوجانے کا انتظار نہ کیجئے، کیونکہ وہ ہمارا کام ہے ایک مقرر وقت پر ہوگا چنانچہ ایک روز وہ آئے گا کہ) ہم زمین پر کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان کردیں گے، (نہ اس پر کوئی بسنے والا رہے گا نہ کوئی درخت اور پہاڑ اور نہ کوئی مکان و تعمیر، خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنا کام تبلیغ کا کرتے رہئے، منکرین کے انجام بد کا اتنا غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًاؕ قَيِّمًا ۔ لفظ عوج کے معنی کسی قسم کی کجی اور ایک طرف جھکاؤ کے ہیں، قرآن کریم اپنے لفظی اور معنوی کمال میں اس سے پاک ہے، نہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کسی جگہ ذرہ برابر کمی یا کجی ہوسکتی ہے نہ علم و حکمت کے لحاظ سے، جو مفہوم لفظ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا سے ایک منفی صورت میں بتلایا گیا ہے، پھر تاکید کے لئے اسی مضمون کو مثبت طور پر لفظ قَيِّمًا سے واضح کردیا ہے، کیونکہ قیّماً کے معنے ہیں مُسْتَقِيْماً اور مستقیم وہی ہے جس میں کوئی ادنیٰ کجی و میلان کسی جانب نہ ہو، اور یہاں قیّم کے ایک دوسرے معنی بھی ہوسکتے ہیں، یعنی نگراں و محافظ، اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم جیسا اپنی ذات میں کامل مکمل ہر قسم کی کجی و افراط و تفریط سے پاک ہے، اسی طرح یہ دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا اور بندوں کی تمام مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے، اب خلاصہ ان دونوں لفظوں کا یہ ہوجائے گا کہ قرآن کریم خود بھی کامل و مکمل ہے اور مخلوق خدا کو بھی کامل و مکمل بنانے والا ہے (مظہری)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا ۔ یعنی زمین پر جو مخلوقات حیوانات، نباتات، جمادات اور زمین کے اندر مختلف چیزوں کی کانیں موجود ہیں وہ سب زمین کے لئے زینت اور رونق بنائی گئی ہیں، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مخلوقات ارضیہ میں تو سانپ، بچھو، درندے جانور اور بہت سی مضر اور مہلک چیزیں بھی ہیں ان کو زمین کی زینت اور رونق کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ جتنی چیزیں دنیا میں مضر و مہلک اور خراب سمجھی جاتی ہیں وہ ایک اعتبار سے بیشک خراب ہیں مگر مجموعۂ عالم کے لحاظ سے کوئی چیز خراب نہیں، کیونکہ ہر بُری سے بُری چیز میں دوسری حیثیات سے بہت سے فوائد بھی اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں، کیا زہریلے جانوروں اور درندوں سے ہزاروں انسانی ضروریات معالجات وغیرہ میں پوری نہیں کی جاتیں، اس لئے جو چیزیں کسی ایک حیثیت سے بُری بھی ہیں، لیکن مجموعۂ عالم کے کارخانے کے لحاظ سے وہ بھی بُری نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ... کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور کھوہ کے رہنے والے ہماری قدرتوں میں

عَجَبًا ﴿۹﴾ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ

عجب اچنبھا تھے، جب جا بیٹھے وہ جوان پہاڑ کی کھوہ میں پھر بولے اے رب ہم کو دے اپنے پاس

رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ

سے بخشش اور پوری کردے ہمارے کام کی درستی، پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان

فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ

اس کھوہ میں چند برس گنتی کے، پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ معلوم کریں دو فرقوں میں

اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

کس نے یاد رکھی ہے جتنی مدت وہ رہے۔

ع ۱۲ / ۱۳

تشریح اللغات

کہف، پہاڑی غار جو وسیع ہو اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو اس کو غار کہا جاتا ہے۔ رَقِیم، لغوی اعتبار سے بمعنی المرقوم ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز، اس مقام پر اس کی مراد اس میں مفسرین کے قول مختلف ہیں، ضحاکؒ اور سدیؒ اور ابن جبیرؒ بروایت ابن عباسؓ اس کے معنی ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں، جس پر بادشاہ وقت نے اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازہ پر لگا دیا تھا، اسی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب الرقیم بھی کہا جاتا ہے، قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول یہ ہے کہ رقیم اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے جس میں اصحاب کہف کا غار تھا، بعض نے خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی کا نام ہے یا کسی بستی کا، کعب احبار، وہب بن منبہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رقیم، ایلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے جو بلاد روم میں واقع ہے۔

فِتْيَةٌ، فتی کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نوجوان

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ کے لفظی معنی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں، غفلت کی نیند کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے، جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں) ہماری عجائبات (قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے (جیسا کہ یہود نے کہا تھا کہ ان کا واقعہ عجیب ہے یا خود ہی سوال کرنے والے کفار قریش نے اس کو عجیب سمجھ کر سوال کیا تھا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ یہ واقعہ بھی اگرچہ عجیب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی دوسری عجائبات قدرت کے مقابلہ میں ایسا قابل تعجب نہیں جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ زمین و آسمان اور چاند و سورج اور تمام کائنات زمین و آسمان کو عدم سے وجود میں لانا اصل عجائب میں سے ہے، چند نوجوانوں کا زمانہ دراز تک سوتے رہنا پھر بیدار ہونا اس کے مقابلہ میں کچھ عجیب نہیں۔ اس تمہید کے بعد اصحاب کہف کا قصہ اس طرح بیان فرمایا) اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے (ایک بے دین بادشاہ کی گرفت سے بھاگ کر) اس غار میں (جس کا قصہ آگے آتا ہے) جاکر پناہ لی پھر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگی کہ) کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے (اس) کام میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے (غالباً رحمت سے مراد حصول مقصود ہے، اور درستی کے سامان سے مراد وہ اسباب و مقدمات ہیں جو حصول مقصد کے لئے عادۃً ضروری ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا، اور ان کی حفاظت اور تمام پریشانیوں سے نجات دینے کی صورت اس طرح بیان فرمائی کہ) سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھایا تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کرلیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا۔ (نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان میں ایک گروہ کا قول تو یہ تھا کہ ہم پورا دن یا کچھ حصہ ایک دن کا سوئے ہیں، دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دن سوتے رہے، آیت میں اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ دوسرا گروہ ہی زیادہ حقیقت شناس تھا جس نے مدت کی تعیین کو اللہ کے حوالہ کیا، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہ تھی) ۔

معارف و مسائل

قصۂ اصحاب کہف و رقیم اس قصہ میں چند مباحث ہیں، اول یہ کہ اصحاب کہف و اصحاب رقیم ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں، یا یہ الگ الگ دو جماعتیں ہیں، اگرچہ کسی صحیح حدیث میں اسکی

کوئی تصریح نہیں، مگر امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح میں اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم دو عنوان الگ الگ دیئے، پھر اصحاب الرقیم کے تحت وہ مشہور قصہ تین شخصوں کے غار میں بند ہو جانے پھر دعاؤں کے ذریعہ راستہ کھل جانے کا ذکر کیا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مفصل موجود ہے، امام بخاری کی اس صنیع سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اصحاب کہف ایک جماعت ہے، اور اصحاب رقیم ان تین شخصوں کو کہا گیا ہے جو کسی زمانے میں غار میں چھپے تھے، پھر پہاڑ سے ایک بڑا پتھر اس غار کے دہانے پر آگرا جس سے غار بالکل بند ہو گیا، ان کے نکلنے کا راستہ نہ رہا، ان تینوں نے اپنے اپنے خاص نیک اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کی کہ یہ کام اگر ہم نے خالص آپ کی رضا کے لئے کیا تھا تو اپنے فضل سے ہمارا راستہ کھول دے، پہلے شخص کی دعا سے پتھر کچھ سرک گیا، روشنی آنے لگی، دوسرے کی دعا سے اور زیادہ سرکا، پھر تیسرے کی دعا سے راستہ بالکل کھل گیا۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں یہ واضح کیا ہے کہ از روئے روایت حدیث اس کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے کہ اصحاب رقیم مذکورہ تین شخصوں کا نام ہے، بات صرف اتنی ہے کہ واقعۂ غار کے ایک راوی حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں بعض راویوں نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے، یہ اضافہ فتح الباری میں بزار اور طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اول تو اس حدیث کے عام راویوں کی روایات جو صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مفصل موجود ہیں، ان میں کسی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، خود بخاری کی روایت بھی اس جملے سے خالی ہے، پھر اس جملے میں بھی اس کی تصریح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں بند ہونے والے ان تین شخصوں کو اصحاب الرقیم فرمایا تھا، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ آپ رقیم کا ذکر فرما رہے تھے، اس ضمن میں ان تین شخصوں کا ذکر فرمایا، لفظ رقیم کی مراد کے متعلق صحابہ و تابعین اور عام مفسرین میں جو اختلاف اقوال اوپر نقل کیا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رقیم کی کوئی مراد متعین کرنے کے بارے میں کوئی روایت حدیث نہیں تھی، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لفظ کی مراد خود متعین فرما دیں، پھر صحابہ و تابعین اور دوسرے مفسرین اس کے خلاف کوئی قول اختیار کریں، اسی لئے حافظ ابن حجر شارح بخاریؒ نے اصحاب کہف و رقیم کے دو الگ الگ جماعتیں ہونے سے انکار فرمایا، اور صحیح یہ قرار دیا کہ یہ دونوں ایک ہی جماعت کے نام ہیں، غار میں بند ہو جانے والے تین شخصوں کا ذکر رقیم کے ذکر کے ساتھ آگیا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہی تین شخص اصحاب الرقیم تھے۔

حافظ ابن حجر نے اس جگہ یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن نے جو قصہ اصحاب کہف کا بیان کیا ہے اس کا سیاق خود یہ بتلا رہا ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی جماعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسرین و محدثین ان دونوں کے ایک ہی ہونے پر متفق ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس جگہ خود اس قصے کی تفصیلات کا ہے جس کے دو حصے ہیں ایک وہ جو اس قصہ کی روح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایات و نصائح بھی، دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق اس قصہ کی صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے، بیان مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں، مثلاً یہ قصہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کافر بادشاہ سے بھاگ کر ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد و خیالات تھے، اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہو گئے، پھر یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا کل زمانہ کتنا تھا، اور پھر یہ لوگ اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں ایک قصہ یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ اجزاء موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا۔ (قصہ یوسف علیہ السلام کو اس اسلوب سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سورۂ یوسف کی تفسیر میں گذر چکی ہے)۔

قصہ اصحاب کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزاء جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحاب کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور و فکر اور بحث و تکرار مناسب نہیں ان کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا فرض منصبی معانی قرآن کو بیان کرنا ہے آپ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزاء قصہ کو بیان نہیں فرمایا، اور اکابر صحابہ و تابعین نے اسی قرآنی اسلوب کی بناء پر ایسے معاملات میں ضابطہ کار یہ قرار دیا کہ:

اَبْهِمُوْا مَآ اَبْهَمَهُ اللّٰهُ، (اتقان، سیوطی)

"یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو کہ اس میں بحث و تحقیق کچھ مفید نہیں"۔

اکابر صحابہ و تابعین کے اس طرز عمل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی ان اجزاء قصہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی اور جغرافیائی انکشافات ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علمائے تفسیر نے اسی لئے کم و بیش ان اجزاء کو بھی بیان فرما دیا ہے، اس لئے زیر نظر تفسیر میں قصے کے وہ اجزاء جو خود قرآن میں مذکور ہیں ان کا بیان تو آیات قرآن کی تفسیر کے تحت آجائے گا، باقی تاریخی اور جغرافیائی اجزائے قصہ کو یہاں بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے، اور بیان کرنے کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلامی اور پھر مسیحی تاریخوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنف اپنی تحقیق و رائے کے پیش نظر مقدمات و قرائن کی مدد سے کسی ایک چیز کو متعین کرتا ہے تو دوسرا اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

دین کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لینے والوں کے واقعات مختلف شہروں اور خطوں میں متعدد ہوئے ہیں۔ مؤرخین کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں چونکہ رہبانیت کو دین کا سب سے بڑا کام سمجھ لیا گیا تھا تو ہر خطے اور ہر ملک میں ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے غاروں میں پناہ گزین ہو گئے وہیں عمریں گذار دیں، اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اس پر مؤرخ کو اصحاب کہف کا گمان ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا۔

اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ امام تفسیر قرطبی اندلسی نے اپنی تفسیر میں اس جگہ چند واقعات کچھ سماعی کچھ چشم دید نقل کئے ہیں، جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں، قرطبی نے سب سے پہلے تو ضحاک کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ رقیم روم کے ایک شہر کا نام ہے جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے ہیں، پھر امام تفسیر ابن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ شام میں ایک غار ہے جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں، وہاں کے مجاورین یہ کہتے ہیں کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں، اور اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، اور ان مُردہ لاشوں کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔

اور دوسرا واقعہ اندلس غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک لوشہ نامی گاؤں کے قریب ایک غار ہے جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں ہے، صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور بعض پر ابتک گوشت پوست بھی موجود ہیں، اس پر صدیاں گذر گئیں مگر صحیح سند سے ان کا کچھ حال معلوم نہیں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں،

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں خود ۵۰۴ھ میں وہاں پہنچا تو واقعی یہ لاشیں اسی حالت میں تھیں اور ان کے قریب ہی ایک مسجد بھی ہے، اور ایک رومی زمانے کی تعمیر بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کوئی عالیشان محل ہوگا اس وقت تک بھی اس کی بعض دیواریں موجود ہیں، اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے، اور فرمایا کہ غرناطہ کے بالائی حصہ میں ایک قدیم شہر کے آثار و نشانات پائے جاتے ہیں جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام دقیوس بتلایا جاتا ہے، ہم نے اس کے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں، قرطبی جو اندلس ہی کے رہنے والے ہیں ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو متعین طور پر اصحاب کہف کہنے سے گریز کرتے ہیں، اور خود ابن عطیہ نے بھی اپنے مشاہدے کے باوجود یہ جزم نہیں کیا کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں، محض عام شہرت نقل کی ہے، مگر دوسرے اندلسی مفسر ابوحیان جو ساتویں صدی ۶۵۴ھ میں خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے وہیں رہے، بسے ہیں وہ بھی اپنی تفسیر بحر محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح قرطبی نے کیا ہے، اور ابن عطیہ کے اپنے مشاہدہ کا ذکر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے، تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ وہ لاشیں اب تک وہاں موجود ہیں، اور زیارت کرنے والے ان کو شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان کی تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ ابن عطیہ نے جس شہر دقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ کی جانب قبلہ میں واقع ہے تو اس شہر سے میں خود بے شمار مرتبہ گذرا ہوں، اور اس میں بڑے بڑے غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں ویترجح کون اهل الکهف بالاندلس لکثرة دین النصاری بها حتی هی بلاد مملکتهم العظمیٰ (تفسیر بحر محیط ص ۱۰۲ ج ۶) "یعنی اصحاب کہف کے اندلس میں ہونے کی ترجیح کے لئے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں نصرانیت کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ یہی خطہ ان کی سب سے بڑی مذہبی مملکت ہے" اس میں یہ بات واضح ہے کہ ابوحیان کے نزدیک اصحاب کہف کا اندلس میں ہونا راجح ہے۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۵۶، ۳۵۷ ج ۹)

امام تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے ایلہ (عقبہ) کے قریب ہے، اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم، اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ رقیم اس بستی کا نام ہے، جس میں اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے (روح المعانی)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا جس کو غزوۃ المضیق

کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے، حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے اس ہستی کو بھی منع کر دیا ہے جو آپ سے بہتر تھی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (یعنی اگر آپ ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب و ہیبت سے مغلوب ہو جائیں گے) مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لئے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت بیان کی ہے یہ وہ ان کی زندگی کے وقت تھی یہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی حالت ہو، اس لئے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا، وہ غار پر پہونچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا (روح المعانی، ص ۲۲۷ ج ۱۵)

مذکور الصدر روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتہ دیا ہے اُن کے اقوال تین مقامات کا پتہ دیتے ہیں، ایک خلیج فارس کے ساحل عقبہ (ایلہ) کے قریب، حضرت ابن عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایت میں گذر چکا ہے۔

ابن عطیہ کے مشاہدے اور ابوحیان کی تائید سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار غرناطہ اندلس میں ہے، ان دونوں جگہوں میں سے عقبہ میں ایک شہر یا کسی خاص عمارت کا نام رقیم ہونا بھی بتلایا گیا ہے، اسی طرح غرناطہ میں غار کے متصل عظیم الشان شکستہ عمارت کا نام رقیم بتلایا گیا ہے، اور دونوں قسم کی روایات میں کسی نے بھی اس کا قطعی فیصلہ اور جزم نہیں کیا، کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات کا مدار مقامی شہرت اور سماعی روایات پر ہے، اور تقریباً تمام تفاسیر قرطبی، ابوحیان، ابن جریر وغیرہ کی روایات میں اصحاب کہف جس شہر میں رہتے تھے اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس بتلایا گیا ہے، اس شہر کا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہل تاریخ کے نزدیک مسلّم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار بھی ایشیائے کوچک میں ہے، اس لئے کسی ایک کو قطعی طور پر صحیح اور باقی کو غلط کہنے کی کوئی دلیل نہیں، احتمال تینوں جگہ کا ہو سکتا ہے، بلکہ اس احتمال کی بھی کوئی نفی نہیں کر سکتا کہ ان غاروں کے واقعات صحیح ہونے کے باوجود بھی یہ اُن اصحاب کہف کے غار نہ ہوں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ اور کسی جگہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ رقیم اس جگہ کسی شہر یا عمارت ہی کا نام ہو بلکہ اس احتمال کی بھی نفی نہیں کی جا سکتی کہ رقیم سے مراد وہ کتبہ ہو جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دہانے پر

کسی بادشاہ نے لگا دیا تھا۔

جدید مورخین کی تحقیق عصر حاضر کے بعض مورخین اور علماء نے مسیحی تاریخوں، اور اہل یورپ کی تواریخ کی مدد سے غار اصحاب کہف کی جگہ اور زمانہ متعین کرنے کے لئے کافی بحث و تحقیق کی ہے۔

ابو الکلام صاحب آزاد نے ئلہ (عقبہ) کے قریب موجودہ شہر پیٹرا جس کو عرب مورخین بطرا لکھتے ہیں، اس کو قدیم شہر رقیم قرار دیا ہے، اور موجودہ تاریخوں سے اس کے قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار بھی بتلائے ہیں جس کے ساتھ کسی مسجد کی تعمیر کے آثار بھی بتلائے جاتے ہیں، اس کی شہادت میں لکھا ہے کہ بائبل کی کتاب یشوع (باب ۸، آیت ۲۷) میں جس جگہ کو رقم یا راقم کہا ہے یہ وہی مقام ہے جس کو اب پیٹرا کہا جاتا ہے، مگر اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ کتاب یشوع میں جو رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور یہ علاقہ دریائے اردن اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں شہر پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اس زمانے کے محققین آثار قدیمہ نے اس بات کے ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع سنہ ۱۹۴۶ء جلد ۱۷، ص ۶۵۸)

اور عام مفسرین نے اصحاب کہف کی جگہ شہر افسوس کو قرار دیا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈر اب بھی موجودہ ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰، ۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ نے بھی ارض القرآن میں شہر پیٹرا کا ذکر کرتے ہوئے بین القوسین (رقیم) لکھا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی کہ شہر پیٹرا کا پرانا نام رقیم تھا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا اور اس کی شہادت میں تورات سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ کے حوالہ سے شہر پیٹرا کا نام راقم بیان کیا ہے (ماخوذ از دائرۃ المعارف عرب)

مملکت اردن میں عمان کے قریب ایک سنسان جنگل میں ایک غار کا پتہ لگا تو حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ نے سنہ ۱۹۶۳ء میں اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا تو اس میں مٹی اور پتھروں کے ہٹانے کے بعد ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ تابوت اور دو قبریں برآمد ہوئیں، غار کی جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے جو بزنطینی زبان میں ہیں، یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے، جس کے پاس اصحاب کہف کا یہ غار ہے۔ واللہ اعلم

حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں تفسیر حقانی کے حوالہ سے اصحاب کہف کی جگہ اور مقام کی تاریخی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحاب کہف

نے غار میں پناہ لی تھی اس کا زمانہ ۲۵۰ء تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۵۵۰ء ہوگیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے یہ واقعہ ان کے بیدار ہونے کا پیش آیا، اور تفسیر حقانی میں بھی ان کا مقام شہر افسوس یا طرسوس کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک میں تھا، اب اس کے کھنڈرات موجود ہیں، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

یہ تمام تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات ہیں جو قدمائے مفسرین کی روایات سے پھر جدید مؤرخین کے بیانات سے پیش کی گئی ہیں احقر نے پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضروری حصہ ان سے متعلق ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ قصہ بیان کیا ہے، پھر روایات و حکایات اور ان کے اندر قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق و کاوش کے بعد بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آجکل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھ ہوا ہے، اس کی تسکین کے لئے یہ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں جن سے تقریبی اور تخمینی طور پر اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا، اور بیشتر روایات سے شہر افسوس یا طرسوس کے قریب ہونے پر متفق نظر آتی ہیں واللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے ورنہ اس کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے کی جا سکتی ہے، امام تفسیر و حدیث ابن کثیر نے اس کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ:

قد اخبرنا اللہ تعالٰی بذلک وارادمنا فھمہ وتدبرہ و لم یخبرنا بمکان ھذا الکھف فی ای البلاد من الارض اذ لا فائدۃ لنا فیہ ولا قصد شرعی

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اصحاب کہف کے ان حالات کی خبر دی جن کا ذکر قرآن میں ہے تاکہ ہم ان کو سمجھیں اور ان میں تدبر کریں، اور اس کی خبر نہیں دی کہ یہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے، کیونکہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی شرعی مقصد اس سے متعلق ہے۔

(ابن کثیر ج ۳ ص ۷۵)

اصحاب کہف کا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور غار میں پناہ لینے کے اسباب کیا تھے؟

قصہ کا یہ ٹکڑا بھی ایسا ہے جس پر نہ کسی آیت قرآن کا سمجھنا موقوف ہے، نہ مقصد قصہ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، ورنہ قرآن و سنت میں اس کا بیان ہے، صرف تاریخی حکایات ہیں، اسی لئے ابوحیان نے تفسیر بحر المحیط میں فرمایا:۔

وَالرُّوَاةُ مُخْتَلِفُوْنَ فِیْ قِصَصِهِمْ وَكَيْفَ كَانَ اِجْتِمَاعُهُمْ وَخُرُوْجُهُمْ وَلَمْ يَأْتِ فِي الْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ كَيْفِيَّةُ ذٰلِكَ وَلَا فِي الْقُرْاٰنِ (بحر محیط ص۱۰۱ ج ۶)

"ان حضرات کے قصہ میں راویوں کا سخت اختلاف ہے، اور اس میں کہ یہ اجزاء اس پر دگرام پر کس طرح متفق ہوئے، اور کس طرح نکلے، نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی کیفیت مذکور ہے نہ قرآن میں"

تاہم موجودہ طبائع کی دلچسپی کے لئے جیسے اوپر اصحاب کہف کے مقام سے متعلق کچھ معلومات لکھی گئی ہیں، اس واقعہ کے زمانۂ وقوع اور اسباب وقوع کے متعلق بھی مختصر معلومات تفسیری اور تاریخی روایات سے نقل کی جاتی ہیں، اس قصہ کو پوری تفصیل اور استیعاب کے ساتھ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں مختلف روایات سے نقل فرمایا ہے، مگر یہاں صرف وہ مختصر واقعہ لکھا جاتا ہے جس کو ابن کثیر نے سلف و خلف کے بہت سے مفسرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"اصحاب کہف بادشاہوں کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار تھے، قوم بت پرست تھی، ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لئے شہر سے باہر نکلی جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا تھا، وہاں جا کر یہ لوگ اپنے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے، اور ان کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے ان کا بادشاہ ایک جبار ظالم دقیانوس نامی تھا، جو قوم کو اس بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، اس سال جبکہ پوری قوم اس میلے میں جمع ہوئی، تو یہ اصحاب کہف نوجوان بھی پہونچے، اور وہاں اپنی قوم کی یہ حرکتیں دیکھیں کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے، اور ان کی عبادت کرتے اور ان کے لئے قربانی کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عقل سلیم عطا فرمادی کہ قوم کی اس احمقانہ حرکت سے ان کو نفرت ہوئی، اور عقل سے کام لیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہونی چاہئے جس نے زمین و آسمان اور ساری مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، یہ خیال بیک وقت ان چند نوجوانوں کے دل میں آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قوم کی اس احمقانہ عبادت سے بچنے کے لئے اس جگہ سے ہٹنا شروع کیا، ان میں سب سے پہلے ایک نوجوان مجمع سے دور ایک درخت کے نیچے جاکر بیٹھ گیا، اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور وہ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اسی طرح پھر تیسرا اور چوتھا آدمی آتا گیا، اور درخت کے نیچے بیٹھتا رہا، مگر ان میں کوئی دوسرے کو نہ پہچانتا تھا اور نہ یہ کہ یہاں کیوں آیا ہے، مگر ان کو درحقیقت اس قدرت نے یہاں جمع کیا تھا جس نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمایا"۔

قومیت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ لوگ تو باہمی اجتماع کا سبب

قومیت اور جنسیت کو سمجھتے ہیں، مگر حقیقت وہ ہے جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ درحقیقت اتفاق و افتراق ازل ارواح میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر اس عالم کے ابدان میں پڑتا ہے جن روحوں کے درمیان ازل میں مناسبت اور اتفاق پیدا ہوا وہ یہاں بھی باہم مربوط اور ایک جماعت کی تشکل اختیار کرلیتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت اور باہمی توافق نہ ہوا بلکہ وہاں علیحدگی رہی ان میں یہاں بھی علیحدگی رہے گی، اسی واقعہ کی مثال کو دیکھو کہ کس طرح الگ الگ ہر شخص کے دل میں ایک ہی خیال پیدا ہوا اس خیال نے ان سب کو غیر شعوری طور پر ایک جگہ جمع کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جگہ جمع تو ہوگئے، مگر ہر ایک اپنے عقیدہ کو دوسرے سے اس لئے چھپاتا تھا کہ یہ کہیں جاکر بادشاہ کے پاس مخبری نہ کردے، اور میں گرفتار ہوجاؤں، کچھ دیر سکوت کے عالم میں جمع رہنے کے بعد ان میں سے ایک شخص بولا کہ بھائی ہم سب کے سب قوم سے علیحدہ ہوکر یہاں پہونچنے کا کوئی سبب تو ضرور ہے، مناسب یہ ہو کہ ہم سب باہم ایک دوسرے کے خیال سے واقف ہوجائیں، اس پر ایک شخص بول اٹھا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کو جس دین و مذہب اور جس عبادت میں مبتلا پایا مجھے یقین ہوگیا کہ یہ باطل ہے، عبادت تو صرف اللہ جل شانہٗ کی ہونی چاہئے جس کا تخلیق کائنات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں، اب تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اقرار کیا کہ یہی عقیدہ اور خیال ہے جس نے مجھے قوم سے علیحدہ کرکے یہاں پہونچایا۔

اب ایک متحد الخیال جماعت ایک دوسرے کی رفیق اور دوست ہوگئی، اور انھوں نے الگ اپنی ایک عبادت گاہ بنالی جس میں جمع ہوکر یہ لوگ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرنے لگے۔

مگر رفتہ رفتہ ان کی خبر شہر میں پھیل گئی، اور چغل خوروں نے بادشاہ تک اُن کی خبر پہنچادی، بادشاہ نے ان سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا، یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان کے عقیدے اور طریقے کے متعلق سوال کیا، اللہ نے ان کو ہمت بخشی، انھوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا عقیدۂ توحید بیان کردیا، اور خود بادشاہ کو بھی اس کی طرف دعوت دی، اسی کا بیان قرآن کریم کی آیات میں اس طرح آیا ہے:- وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا (الی قولہ) كَذِبًا ۝

جب ان لوگوں نے بادشاہ کو بیباک ہوکر دعوت ایمان دی تو بادشاہ نے اس سے انکار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا، اور ان کے بدن سے وہ عمدہ پوشاک جو اُن شہزادوں کے بدن پر تھی اُتروادی، تاکہ یہ لوگ اپنے معاملہ میں غور کریں، اور غور کرنے کے لئے چند دن کی مہلت یہ کہہ کر دیدی کہ تم نوجوان ہو میں تمہارے قتل میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کہ تم کو غور کرنے کا موقع مل جائے

اب بھی اگر تم اپنی قوم کے دین و مذہب پر آجاتے ہو تو تم اپنے حال پر رہو گے ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔
یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اپنے مؤمن بندوں پر تھا، کہ اس مہلت نے ان لوگوں کے لئے راہ فرار کھول دی اور یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر ایک غار میں روپوش ہو گئے۔

عام روایات مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، ابن کثیر اور دوسرے تمام مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اگرچہ ابن کثیر نے اس کو قبول اس لئے نہیں کیا کہ اگر یہ لوگ مسیحی دین پر ہوتے تو یہود مدینہ ان سے عداوت کی بنا پر ان کے واقعہ کا سوال نہ کراتے اور ان کو اہمیت نہ دیتے مگر یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں جس کی وجہ سے تمام روایات کو رد کر دیا جائے، یہود مدینہ نے تو محض ایک واقعہ عجیبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا سوال کر دیا، جیسے ذوالقرنین کا سوال بھی اسی بنا پر تھا، اس طرح کے سوالات میں یہودیت و نصرانیت کا تعصب درمیان میں نہ آنا ہی ظاہر ہے۔

تفسیر مظہری میں بروایت ابن اسحٰق ان لوگوں کو ان موحدین میں شمار کیا ہے جو مسیحی دین کے مٹ جانے کے بعد ان کے حق پرست لوگ خال خال رہ گئے تھے، جو صحیح دین مسیح اور توحید پر قائم تھے، ابن اسحٰق کی روایت میں بھی اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، اور جس شہر میں یہ نوجوان غار میں چھپنے سے پہلے رہتے تھے اس کا نام افسوس بتلایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بھی واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے، اور بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، ابن اسحٰق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اصحاب کہف کے بیدار ہونے کے وقت ملک پر دین مسیح علیہ السلام کے پابند جن لوگوں کا قبضہ ہو گیا تھا ان کے بادشاہ کا نام **بیدوسیس تھا۔**

مجموعہ روایات سے یہ بات تو بظن غالب ثابت ہو جاتی ہے کہ اصحاب کہف صحیح دین مسیح علیہ السلام پر تھے اور ان کا زمانہ بعد المسیح ہے، اور جس بادشاہ مشرک سے بھاگے تھے اس کا نام دقیانوس تھا تین سو نو سال کے بعد بیدار ہونے کے وقت جس نیک مؤمن بادشاہ کی حکومت تھی ابن اسحٰق کی روایت میں اس کا نام بیدوسیس بتلایا ہے، اس کے ساتھ موجودہ زمانے کی تاریخوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تخمینی اور تقریبی طور پر ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ تعیین کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کے علم کے اسباب موجود ہیں۔

کیا اصحاب کہف اب بھی زندہ ہیں اس معاملے میں صحیح و ظاہر یہی ہے کہ انکی وفات ہو چکی ہے، تفسیر مظہری میں ابن اسحٰق کی مفصل روایت میں ہے کہ اصحاب کہف کی بیداری اور شہر میں ان کے واقعہ عجیبہ کی شہرت ہو جانے اور اس وقت کے بادشاہ بیدوسیس کے پاس پہونچ کر ملاقات کرنے کے بعد اصحاب کہف نے نیک بیدوسیس سے رخصت چاہی، اور رخصتی سلام کے ساتھ اس کو

لئے دعا کی، اور ابھی بادشاہ اسی جگہ موجود تھا کہ یہ لوگ اپنے لیٹنے کی جگہوں پر جا کر لیٹ گئے، اور اُسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دیدی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ سبھی مفسّرین نے نقل کی ہے کہ:

قَالَ قَتَادَةُ غَزَا ابْنُ عَبَّاسٍ مَعَ حَبِيبِ بْنِ مَسْلَمَةَ فَمَرُّوْا بِكَهْفٍ فِيْ بِلَادِ الرُّوْمِ فَرَأَوْا فِيْهِ عِظَامًا فَقَالَ قَائِلٌ هٰذِهٖ عِظَامُ اَهْلِ الْكَهْفِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ بَلِيَتْ عِظَامُهُمْ مِنْ اَكْثَرَ مِنْ ثَلٰثِمِائَةِ سَنَةٍ (ابن کثیر)

"قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے حبیب ابن مسلمہ کے ساتھ ایک جہاد کیا، تو بلاد روم میں ان کا گذر ایک غار پر ہوا جس میں مردہ لاشوں کی ہڈیاں تھیں، کسی نے کہا کہ یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں، تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو اب تین سو برس پہلے خاک ہو چکی ہیں"

یہ سب اس تاریخی قصّے کے وہ اجزاء تھے جن کو نہ قرآن نے بیان کیا نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ اس واقعہ کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، باقی رہے قصّے کے وہ اجزاء جن کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل انہی آیات کے تحت آئی ہے۔

یہاں تک قرآن کریم نے اس قصّے کا اجمالی ذکر فرمایا تھا، آگے تفصیلی ذکر آتا ہے

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ

ہم سنا دیں تجھ کو اُن کا حال تحقیق وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا

اور زیادہ دی ہم نے ان کو سوجھ، اور گرہ دی اُن کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب ہے

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ

رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوائے کسی کو معبود، نہیں تو

قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰۤؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ

کہی ہم نے بات عقل سے دور، یہ ہماری قوم ہے ٹھہرا لئے انھوں نے اللہ کے سوائے اور معبود

لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ

کیوں نہیں لاتے ان پر کوئی سند کھلی، پھر اس سے بڑا گنہگار کون جس نے باندھا اللہ پر

كَذِبًا ﴿١٥﴾ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى

جھوٹ، اور جب تم نے کنارہ کرلیا ان سے اور جن کو وہ پوجتے ہیں سوائے اللہ کے تو اب جا بیٹھو

الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ

اس کھوہ میں پھیلا دے تم پر تمہارا رب کچھ اپنی رحمت سے اور بنا دیوے تمہارے واسطے

أَمْرِكُم مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾

کام میں آرام۔

خلاصۂ تفسیر

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں (اس میں اشارہ کردیا کہ اس کے خلاف جو کچھ دنیا میں مشہور ہے وہ درست نہیں) وہ لوگ (اصحاب کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر (اس زمانے کے دین عیسوی کے مطابق) ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کردی (کہ صفاتِ ایمان ثابت قدمی اور بدول پر صبر دنیا سے اعراض، آخرت کی فکر وغیرہ بھی عطا کردیں، انہی صفات ایمان وہدایت میں ایک بات یہ تھی کہ) ہم نے ان کے دل مضبوط کردیئے جبکہ وہ پختہ ہو کر (آپس میں یا مخالف بادشاہ کے روبرو) کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے (کیونکہ اگر خدانخواستہ ہم نے ایسا کیا) تو اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی، اور یہ جو ہماری قوم ہے انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں، (کیونکہ ان کی قوم اور بادشاہِ وقت سب بت پرست تھے، سو) یہ لوگ اپنے معبودوں (کے معبود ہونے) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے (جیسا کہ موحدین توحید پر واضح اور یقینی دلیل رکھتے ہیں) تو اس سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگا دے (کہ اس کے کچھ ساجھی اور شریک بھی ہیں) اور پھر (آپس میں کہا کہ) جب تم ان لوگوں سے عقیدہ ہی میں الگ ہوگئے اور ان کے معبودوں (کی عبادت) سے بھی (الگ ہوگئے ہو) مگر اللہ سے (الگ نہیں ہوئے، بلکہ اسی کی وجہ سے سب کو چھوڑا ہے) تو اب (مصلحت یہ

ہے کہ) تم (فلاں) غار میں (جو مشورے سے طے ہوا ہوگا) چل کر پناہ لو (تا کہ امن اور بے فکری کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکو) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کے سامان درست کر دے گا (اللہ تعالیٰ سے اسی امید اور توقع پر غار میں جانے کے وقت انھوں نے سب سے پہلے یہ دعا کی کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا)

معارف و مسائل

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ، فتی کی جمع ہے، نوجوان کے معنی میں آتا ہے، علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصلاحِ اعمال و اخلاق اور رشد و ہدایت کا زمانہ جوانی ہی کی عمر ہے، بڑھاپے میں پچھلے اعمال و اخلاق ایسے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کتنا ہی اس کے خلاف حق واضح ہو جائے ان سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانیوالے بیشتر نوجوان ہی لوگ تھے (ابن کثیر، ابوحیان)

وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ، ابن کثیر کے حوالے سے جو واقعہ کی صورت اوپر بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کے دلوں کو مضبوط کر دینے کا واقعہ اس وقت ہوا جب کہ بُت پرست ظالم بادشاہ نے ان نوجوانوں کو اپنے دربار میں حاضر کر کے سوالات کئے، اس موت و حیات کی کش مکش اور قتل کے خوف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اپنی محبت اور ہیبت و عظمت ایسی مسلط کر دی کہ اس کے مقابلے میں قتل و موت اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر اپنے عقیدے کا صاف صاف اظہار کر دیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی معبود کی عبادت نہیں کرتے، اور آئندہ بھی نہ کریں گے، جو لوگ اللہ کے لئے کسی کام کا عزم پختہ کر لیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی ایسی ہی امداد ہوا کرتی ہے۔

فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اصحابِ کہف نے جو صورت اختیار کی کہ جس شہر میں رہ کر اللہ کی عبادت نہ ہو سکتی تھی اس کو چھوڑ کر غار میں پناہ لی، یہی سنت ہر تمام انبیاء کی کہ ایسے مقامات سے ہجرت کر کے وہ جگہ اختیار کرتے ہیں جہاں عبادت کی جا سکے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ

اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچ کر جاتی ہے اُن کی کھوہ سے داہنے کو

وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ

اور جب ڈوبتی ہے کترا جاتی ہے اُن سے بائیں کو اور وہ میدان میں ہیں اس کے،

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ

یہ ہے اللہ کی قدرتوں سے جسکو راہ دیوے اللہ وہی آئے راہ پر اور جسکو وہ بچلائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ ع وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ

پھر تو نہ پائے اس کا کوئی رفیق راہ پر لانے والا، اور تو سمجھے وہ جاگتے ہیں اور وہ

رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ

سو رہے ہیں اور کروٹیں دلاتے ہیں ہم ان کو داہنے اور بائیں اور کتا ان کا

بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ

پسار رہا ہے اپنی باہیں چوکھٹ پر اگر تو جھانک کر دیکھے ان کو تو پیٹھ دے کر بھاگے

فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

ان سے اور بھر جائے تجھ میں ان کی دہشت۔

خلاصہ تفسیر

اور اے مخاطب (وہ غار ایسی وضع پر واقع ہوا ہے کہ) جب دھوپ نکلتی ہے تو تو اس کو دیکھے گا کہ وہ غار سے داہنی جانب کو بچی رہتی ہے (یعنی غار کے دروازے سے داہنی طرف الگ کو رہتی ہے) اور جب وہ چھپتی ہے تو (غار کے) بائیں طرف ہٹی رہتی ہے (یعنی اُس وقت بھی غار کے اندر دھوپ نہیں جاتی، تاکہ ان کو دھوپ کی تپش سے تکلیف نہ پہونچے) اور وہ لوگ اس غار کے ایک فراخ موقع میں تھے (یعنی ایسے غاروں میں جو عادۃً کہیں تنگ کہیں کشادہ ہوتے ہیں، تو وہ اس غار کے ایسے موقع پر تھے جو کشادہ تھا تاکہ ہوا بھی پہونچے اور جگہ کی تنگی سے جی بھی نہ گھبرائے) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے (کہ اسباب ظاہری کے خلاف ان کے لئے آرام کا سامان مہیا کر دیا پس معلوم ہوا کہ) جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پائینگے

غار کی جو ہیئت بتلائی گئی ہے کہ اس میں نہ طلوع کے وقت صبح کو دھوپ اندر جاتی نہ شام کو غروب کے وقت، یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ غار شمال رویہ یا جنوب رویہ ہو، کیونکہ داہنی بائیں جانب غار میں داخل ہونے والے کی مراد ہو تو غار شمال رویہ ہوگا، اور داہنی بائیں

جانب غار سے نکلنے والے کی مراد ہے، تو غار جنوب رویہ ہوگا)

اور (اے مخاطب) تو اگر اس وقت جبکہ وہ غار میں گئے اور ہم نے ان پر نیند مسلط کر دی اُن کو دیکھتا تو) ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالانکہ وہ سوتے تھے (کیونکہ اللہ کی قدرت نے ان کو نیند کے آثار و علامات سے محفوظ رکھا تھا جیسے سانس کا تغیر، بدن کا ڈھیلا پن، آنکھیں اگر بند بھی ہوں تو سونے کی یقینی علامت نہیں، اور (اس نیند کے زمانہ دراز میں) ہم ان کو (کبھی) داہنی طرف اور (کبھی) بائیں طرف کروٹ دیدیتے تھے اور (اس حالت میں) ان کا کتا (جو کسی وجہ سے ان کے ساتھ آگیا تھا غار کی) دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (بیٹھا تھا) اور ان کے رعب و جلال خداداد کی یہ حالت تھی کہ) اگر (اے مخاطب) تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا، اور تیرے اندر ان کی دہشت سما جاتی (اس آیت میں خطاب عام مخاطبین کو ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرعوب ہونا لازم نہیں آتا، اور یہ تمام سامان حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لئے جمع کر دیئے تھے، کیونکہ جاگتے ہوئے آدمی پر حملہ کرنا آسان نہیں ہوتا، اور نیند کے طویل زمانے میں کروٹیں نہ بدلی جائیں تو مٹی ایک کروٹ کو کھا لیتی، اور غار کے دروازے پر کتے کا بیٹھنا بھی سامان حفاظت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کے تین حال بتائے ہیں، اور تینوں عجیب ہیں جو ان حضرات کی کرامت سے بطور خرقِ عادت ظاہر ہوئے۔

اوّل زمانہ دراز تک مسلسل نیند کا مسلط ہونا اور اس میں بغیر کسی غذا وغیرہ کے زندہ رہنا سب سے بڑی کرامت اور خرقِ عادت ہے، اس کی تفصیل تو اگلی آیات میں آئے گی، یہاں اس طویل نیند کی حالت میں ان کا ایک حال تو یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غار کے اندر اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ صبح شام دھوپ ان کے قریب سے گذرتی مگر غار کے اندر ان کے جسموں پر نہ پڑتی تھی، قریب سے گذرنے کے فوائد زندگی کے آثار کا قیام، ہوا اور سردی گرمی کا اعتدال وغیرہ تھے، اور ان کے جسموں پر دھوپ نہ پڑنے سے جسموں کی اور ان کے لباس کی حفاظت بھی تھی۔

دھوپ کے ان کے اوپر نہ پڑنے کی یہ صورت غار کی کسی خاص وضع کی بنا پر بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا دروازہ جنوب یا شمال میں ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ طبعی اور عادی طور پر اس کے اندر نہ پہنچے، ابن قتیبہؒ نے اس کی وضع خاص متعین کرنے کیلئے تکلف کیا کہ ریاضی کے اصول

قواعد کی رُو سے اس جگہ کا طول بلد عرض بلد اور غار کا رخ متعین کیا، (مظہری) اور رس کے بالمقابل زجاج نے کہا کہ دھوپ کا ان سے الگ رہنا کسی وضع و ہیئت کی بناء پر نہیں بلکہ ان کی کرامت کے بطور خرقِ عادت تھا، اور اس آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ، یہ بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ دھوپ سے حفاظت کا یہ سامان غار کی کسی خاص وضع و ہیئت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک نشانی تھی (قرطبی)

اور صاف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان مہیا فرما دیا تھا کہ دھوپ ان کے جسموں پر نہ پڑے، خواہ یہ سامان غار کی خاص ہیئت اور وضع کے ذریعے ہو یا کوئی بادل وغیرہ دھوپ کے وقت حائل کر دیا جاتا ہو، یا براہِ راست آفتاب کی شعاعوں کو ان سے بطور خرقِ عادت کے ہٹا دیا جاتا ہو، آیت میں یہ سب احتمالات ہیں، کسی ایک کو متعین کرنے پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

اصحاب کہف طویل نیند کے زمانے میں اس حالت میں تھے کہ دیکھنے والا انکو بیدار سمجھے

دوسرا حال یہ بتلایا ہے کہ اصحابِ کہف پر اتنے زمانۂ دراز تک نیند مسلط کر دینے کے باوجود ان کے اجسام پر نیند کے آثار نہ تھے، بلکہ ایسی حالت تھی کہ ان کو دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ جاگ رہے ہیں، عام مفسرین نے فرمایا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، بدن میں ڈھیلا پن جو نیند سے ہوتا ہے وہ نہیں تھا، سانس میں تغیر جو سونے والوں کے ہو جاتا ہے وہ نہیں تھا، ظاہر یہ ہے کہ یہ حالت بھی غیر معمولی اور ایک قسم کی کرامت ہی تھی، جس میں بظاہر حکمت ان کی حفاظت تھی، کہ کوئی ان کو سوتا ہوا سمجھ کر ان پر حملہ نہ کرے، یا جو سامان اُن کے ساتھ تھا وہ نہ چرا لے، اور مختلف کروٹیں بدلنے سے بھی دیکھنے والے کو بیداری کا خیال ہو سکتا ہے، اور کروٹیں بدلنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ مٹی ایک کروٹ کو نہ کھالے۔

اصحاب کہف کا کُتّا

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں کُتّا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شکاری کُتّے یا جانوروں کے محافظ کُتّے کے علاوہ کُتّا پالتا ہو تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط گھٹ جاتے ہیں، (قیراط ایک چھوٹے سے وزن کا نام ہے) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ایک تیسری قسم کے کُتّے کا بھی استثناء آیا ہے، یعنی جو کھیتی کی حفاظت کے لئے پالا گیا ہو۔

ان روایات حدیث کی بناء پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگ اللہ والوں نے کُتّا کیوں ساتھ لیا، اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم کُتّا پالنے کی ممانعت شریعت محمدیہ

کا حکم ہو، ممکن ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو، دوسرے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ صاحب جائداد صاحب مویشی تھے اُن کی حفاظت کے لئے کتّا پلا ہوا اور جیسے کتّے کی وفا شعاری مشہور ہے، یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

نیک صحبت کے برکات کہ اس نے کتّے کا بھی اعزاز بڑھا دیا

ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے بتلایا کہ میں نے ابوالفضل جوہریؒ کا ایک وعظ ۴۶۹ھ ہجری میں جامع مصر کے اندر سنا وہ بر سر منبر یہ فرما رہے تھے کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کی نیکی کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے، دیکھو اصحاب کہف کے کتّے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابن عطیہؒ کی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ایک کتّا صلحاء اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پا سکتا ہے تو آپ قیاس کرلیں کہ مؤمنین موحدین جو اولیاء اللہ اور صالحین سے محبت رکھیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا، بلکہ اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے مسجد کے دروازے پر ایک شخص ملا، اور یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے (جو اس کے آنے کی جلدی کر رہے ہو) یہ بات سُن کر یہ شخص دل میں کچھ شرمندہ ہوا اور پھر عرض کیا کہ میں نے قیامت کے لئے بہت نماز، روزے اور صدقات تو جمع نہیں کئے، مگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو (سُن لو کہ) تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت رکھتے ہو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم یہ جملہ مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنکر اتنے خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ خوشی کبھی نہ ہوئی تھی، اور اس کے بعد حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (الحمد للہ) میں اللہ سے اس کے رسولؐ سے، ابوبکر و عمر سے محبت رکھتا ہوں، اس لئے اس کا امیدوار ہوں کہ ان کے ساتھ ہوں گا (قرطبی)

اصحابِ کہف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا کہ جو دیکھے ہیبت کھا کر بھاگ جائے

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ، ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب عام لوگوں کو ہے اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحابِ کہف کا رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چھا سکتا تھا، عام مخاطبین کو

فرمایا گیا ہے، اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب و ہیبت تم پر طاری ہو جائے۔

یہ رعب و ہیبت کس بنا اور کن اسباب کی وجہ سے تھا، اس میں بحث فضول ہے، اور اسی لئے قرآن و حدیث نے اس کو بیان نہیں کیا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے ایسے حالات پیدا فرما دیئے تھے کہ ان کے بدن پر دھوپ نہ پڑے اور دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے اور دیکھنے والے پر اُن کی ہیبت طاری ہو جائے کہ پوری طرح دیکھ نہ سکے، یہ حالات خاص اسباب طبیعہ کے راستہ سے ہونا بھی ممکن ہے، اور بطور کرامت خرقِ عادت کے طریق سے بھی جب قرآن و حدیث نے اس کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں فرمائی، تو خالی قیاسات اور تخمینوں سے اس میں بحث کرنا بے کار ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور تائید میں ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے روم کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ جہاد کیا جو غزوۃ المضیق کے نام سے معروف ہے، اس سفر میں ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ اصحاب کہف کی تحقیق و مشاہدہ کے لئے غار میں جائیں، ابن عباسؓ نے منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑی اور بہتر ہستی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے مشاہدہ سے منع کر دیا ہے، اور یہی آیت پڑھی لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ (اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک لَوِ اطَّلَعْتَ کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا (غالباً وجہ یہ ہوگی کہ انھوں نے آیت کا مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے عام مخاطبین کو قرار دیا ہوگا، یا یہ کہ یہ حالت قرآن نے اس وقت کی بیان کی ہے جس وقت اصحاب کہف زندہ تھے اور سو رہے تھے، اب ان کی وفات کو عرصہ ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ اب بھی وہی رعب و ہیبت کی کیفیت موجود ہو بہرحال) حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی بات قبول کی اور چند آدمی تحقیق و مشاہدہ کے لئے بھیج دیئے، جب یہ لوگ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت گرم ہوا بھیج دی جس کی وجہ سے یہ کچھ نہ دیکھ سکے (مظہری)

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ

اور اسی طرح ان کو جگا دیا ہم نے کہ آپس میں پوچھنے لگے، ایک بولا ان میں کتنی دیر ٹھہرے تم

قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ

بولے ہم ٹھہرے ایک دن یا دن سے کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانے جتنی دیر تم رہے ہو

فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ
اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اس شہر میں پھر دیکھے کونسا کھانا
اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ
ستھرا ہے سو لائے تمہارے پاس اس میں سے کھانا اور نرمی سے جائے اور جتا نہ دے
بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ
تمہاری خبر کسی کو، وہ لوگ اگر خبر پالیں تمہاری پتھروں سے مار ڈالیں تم کو یا لوٹا لیں تم کو
فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾
اپنے دین میں اور تب تو بھلا نہ ہوگا تمہارا کبھی۔

خلاصہ تفسیر

اور (جس طرح ہم نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو اتنے زمانہ دراز تک سلایا) اسی طرح (اس طویل نیند کے بعد) ہم نے ان کو جگا دیا تاکہ وہ آپس میں پوچھ پاچھ کریں (تاکہ باہمی سوال و جواب کے بعد ان کو حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت منکشف ہو چنانچہ) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ (اس نیند کی حالت میں) تم کس قدر رہے ہوگے (جواب میں) بعض نے کہا کہ (غالباً) ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے ہوں گے۔ دوسرے بعض نے کہا کہ (اس کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے) یہ تو (ٹھیک ٹھیک) تمہارے رب ہی کو خبر ہے کہ تم کس قدر (سوتے) رہے اب (اس فضول بحث کو چھوڑ کر ضروری کام کرنا چاہئے وہ یہ کہ) اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا، کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے، غرضکہ کسی کو یہ روپیہ) دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر (وہ وہاں پہونچ کر) تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے (اس جگہ لفظ اَزْکٰی کی تفسیر بروایت ابن جریر حضرت سعید بن جبیرؓ سے یہی منقول ہے کہ مراد اس سے حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی قوم بت پرست بکثرت اپنے بتوں کے نام ذبح کیا کرتی تھی اور بازار میں بکثرت یہی حرام گوشت بکتا تھا) تو وہ اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے آوے اور کام خوش تدبیری سے کرے (کہ ایسی وضع ہیئت سے جاوے کہ کوئی اس کو پہچانے نہیں اور کھانے کی تحقیق کرنے میں بھی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ بت کے نام کے ذبیحہ کو حرام سمجھتا ہے) اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے (کیونکہ) اگر وہ لوگ (یعنی اہل شہر جن کو اپنے خیال میں اپنے زمانے

کے مشرکین سمجھے ہوئے تھے، کہیں تمھاری خبر پا جائیں گے تو تم کو یا پتھراؤ کر کے مار ڈالیں گے یا (جبراً)
تم کو اپنے مذہب میں پھر داخل کر لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہوگی۔

معارف و مسائل

كَذٰلِكَ یہ لفظ تشبیہ و تمثیل کے لئے ہے، مراد اس جگہ دو واقعوں کی باہم تشبیہ بیان کرنا ہے ایک واقعہ اصحاب کہف کی نوم طویل و زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا ہے، جس کا ذکر شروع قصے میں آیا ہے فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا، دوسرا واقعہ اس زمانہ دراز کی نیند کے بعد صحیح سالم اور باوجود غذا نہ پہنچنے کے قوی اور تندرست اٹھنے اور بیدار ہونے کا ہے، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت ہونے میں متماثل ہیں، اسی لئے اس آیت میں جوان کے بیدار کرنے کا ذکر فرمایا تو لفظ کَذٰلِکَ سے اشارہ کر دیا کہ جس طرح ان کی نیند عام انسانوں کی عادی نیند کی طرح نہیں تھی، اسی طرح ان کی بیداری بھی عام عادتِ طبعی سے ممتاز تھی، اور اس کے بعد جو لِيَتَسَاۤءَلُوْا فرمایا جس کے معنی ہیں "تاکہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں کہ نیند کتنے زمانے رہی"۔ یہ ان کے بیدار کرنے کی علت نہیں، بلکہ عادی طور پر پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس کے لام کو حضرات مفسرین نے لام عاقبت یا لام صیرورت کا نام دیا ہے (ابوحیان، قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ان کی نوم طویل ایک نشانی قدرت کی تھی، اسی طرح سینکڑوں سال کے بعد بغیر کسی غذا کے قوی، تندرست بیدار ہو کر بیٹھ جانا بھی قدرت کاملہ کی نشانی تھی، اور چونکہ قدرت کو یہ بھی منظور تھا کہ خود ان لوگوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ سینکڑوں برس سوتے رہے تو اس کی ابتداء باہمی سوالات سے ہوئی، اور انتہا اس واقعہ سے ہوئی جس کا ذکر اگلی آیت میں وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا میں آیا ہے کہ شہر کے لوگوں پر ان کا راز کھل گیا، اور تعیینِ مدت میں اختلاف کے باوجود زمانہ دراز تک غار میں سوتے رہنے کا سب کو یقین ہو گیا۔

قَالَ قَاۤئِلٌ مِّنْهُمْ، شروع قصہ میں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی کہ غار میں رہنے کی مدت کے متعلق باہم اختلاف رائے ہوا، ان میں سے ایک جماعت کا قول صحیح تھا، یہ اس کی تفصیل ہے کہ اصحابِ کہف میں سے ایک شخص نے سوال اٹھایا کہ تم کتنا سوئے ہو، تو بعض نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا ایک حصہ، کیونکہ یہ لوگ صبح کے وقت غار میں داخل ہوئے تھے، اور بیدار ہونے کا وقت شام کا وقت تھا، اس لئے خیال یہ ہوا کہ یہ وہی دن ہے جس میں ہم غار میں داخل ہوئے تھے، اور سونے کی مدت تقریباً ایک دن ہے، مگر انہی میں سے دوسرے لوگوں کو کچھ یہ احساس ہوا کہ شاید یہ وہ دن نہیں جس میں داخل ہوئے تھے، پھر معلوم نہیں کتنے دن ہو گئے، اس لئے اس کے علم کو

حوالہ کیا، رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ، اور اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر اصل کام کی طرف توجہ دلائی کہ شہر سے کچھ کھانا لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیج دیا جائے۔

إِلَى الْمَدِينَةِ، اس لفظ سے اتنا ثابت ہوا کہ غار کے قریب بڑا شہر تھا، جہاں یہ لوگ رہتے تھے، اس شہر کے نام کے متعلق ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ جس زمانے میں اصحابِ کہف یہاں سے نکلے تھے، اس وقت اس شہر کا نام افسوس تھا، اور اب اس کا نام طرسوس ہے، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ بت پرستوں کے اس شہر پر غلبہ اور جاہلیت کے زمانے میں اس کا نام افسوس تھا، جب اس زمانے کے مسلمان یعنی مسیحی اس پر غالب آئے تو اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔

بِوَرِقِكُمْ سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات غار میں آنے کے وقت اپنے ساتھ کچھ رقم روپیہ پیسہ بھی ساتھ لائے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ضروری نفقہ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے خلاف نہیں (بحر محیط)

أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا لفظ ازکیٰ کے لفظی معنی پاک صاف کے ہیں، مراد اس سے حسبِ تفسیر ابن جبیرؒ حلال کھانا ہے، اور اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ جس زمانے میں یہ لوگ شہر سے نکلے تھے وہاں بتوں کے نام کا ذبیحہ ہوتا، اور وہی بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، اس لئے جانے والے کو یہ تاکید کی کہ اس کی تحقیق کر کے کھانا لائے کہ یہ کھانا حلال بھی ہے یا نہیں۔

مسئلہ:- اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا جس بازار یا ہوٹل میں اکثریت حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

أَن يَرْجُمُوكُمْ، رجم کے معنی سنگسار کرنے کے ہیں، بادشاہ نے غار میں جانے سے پہلے ان کو دھمکی دی تھی کہ اگر اپنا یہ دین نہ چھوڑو گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ان کے دین سے پھر جانے والے کی سزائے قتل بصورتِ سنگساری دی جاتی تھی تاکہ سب لوگ اس میں شریک ہوں، اور ساری قوم اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر کے قتل کریں۔

شاید شریعتِ اسلام میں شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا بھی جو سنگسار کر کے قتل کرنا تجویز کیا گیا ہے اس کا بھی منشا یہ ہو کہ جس شخص نے حیاء کے سارے پردوں کو توڑ کر اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا ہے اس کا قتل منظرِ عام پر سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ ہونا چاہئے تاکہ اس کی رسوائی بھی پوری ہو، اور سب مسلمان عملاً اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں، تاکہ آئندہ قوم میں اس حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔

فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ، اس واقعہ میں جماعت اصحابِ کہف نے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا، اور رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر لائے، قرطبی نے

بحوالہ ابن خویز منداد فرمایا کہ اس سے چند فقہی مسائل حاصل ہوئے۔

چند مسائل اوّل یہ کہ مال میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ رقم سب کی مشترک تھی، دوسری یہ کہ مال میں وکالت جائز ہے، کہ مشترک مال میں کوئی ایک شخص بحیثیت وکیل دوسروں کی اجازت سے تصرف کرے، تیسرے یہ کہ چند رفیق اگر کھانے میں شرکت رکھیں یہ جائز ہے، اگرچہ کھانے کی مقداریں عادۃً مختلف ہوتی ہیں، کوئی کم کھاتا ہے کوئی زیادہ۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ

اور اسی طرح خبر ظاہر کردی ہم نے ان کی تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت

لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ

کے آنے میں دھوکہ نہیں، جب جھگڑ رہے تھے آپس میں اپنی بات پر پھر کہنے لگے بناؤ ان پر

بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ

ایک عمارت، ان کا رب خوب جانتا ہے ان کا حال، بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا ہم بنائیں گے

لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾

ان کی جگہ پر عبادت خانہ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ہم نے جس طرح اپنی قدرت سے ان کو سلا دیا اور جگایا) اسی طرح ہم نے (اپنی قدرت و حکمت سے اس زمانے کے) لوگوں کو ان (کے حال) پر مطلع کردیا تاکہ (منجملہ اور فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ) وہ لوگ (اس واقعہ سے استدلال کر کے) اس بات کا یقین (یا زیادہ یقین) کریں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور وہ یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں (یہ لوگ اگر پہلے سے قیامت میں زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے تو زیادہ یقین اس واقعہ سے ہوگیا، اور اگر قیامت کے منکر تھے تو اب یقین حاصل ہوگیا، یہ واقعہ تو اصحاب کہف کی زندگی میں پیش آیا، پھر اُن صاحبوں نے وہیں غار میں وفات پائی، تو ان کے متعلق اہل عصر میں اختلاف ہوا جس کو آگے بیان فرمایا ہے کہ) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اس زمانے کے لوگ ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے،

(اور وہ معاملہ اس غار کا منہ بند کرنا تھا، تاکہ ان کی لاشیں محفوظ رہیں، یا ان کی یادگار قائم کرنا مقصود تھا) سو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے (غار کے) پاس کوئی عمارت بنوادو (پھر اختلاف ہوا کہ وہ عمارت کیا ہو، اس میں رائیں مختلف ہوئیں؛ تو اختلاف کے وقت) ان کا رب ان (کے احوالِ مختلفہ) کو خوب جانتا تھا (بالآخر) جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی اہلِ حکومت جو اس وقت دینِ حق پر قائم تھے)، انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنادیں گے (تاکہ مسجد اس بات کی بھی علامت رہے کہ یہ لوگ خود عابد تھے معبود نہ تھے اور دوسری عمارتوں میں یہ احتمال تھا کہ آگے آنے والے انہی کو معبود نہ بنالیں)۔

معارف و مسائل

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ، اس آیت میں اصحابِ کہف کے راز کا اہلِ شہر پر منکشف ہوجانا اور اس کی حکمت عقیدۂ آخرت و قیامت کہ سب مُردے دوبارہ زندہ ہوں گے، اس پر ایمان و یقین حاصل ہونا بیان فرمایا ہے، تفسیر قرطبی میں اس کا مختصر قصہ اس طرح مذکور ہے کہ:

اصحابِ کہف کا حال اہلِ شہر پر کھل جانا

اصحابِ کہف کے نکلنے کے وقت جو ظالم اور مشرک بادشاہ دقیانوس اس شہر پر مسلط تھا وہ مرگیا، اور اس پر صدیاں گذر گئیں، یہاں تک اس مملکت پر قبضہ اہلِ حق کا ہوگیا جو توحید پر یقین رکھتے تھے ان کا بادشاہ ایک نیک صالح آدمی تھا جس کا نام تفسیر مظہری میں تاریخی روایات سے بیدوسیس لکھا ہے؛ اس کے زمانے میں اتفاقاً قیامت اور اس میں سب مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مسئلے میں کچھ اختلافات پھیل گئے، ایک فرقہ اس کا منکر ہوگیا کہ یہ بدن گلنے سڑنے، پھر ریزہ ریزہ ہوکر ساری دنیا میں پھیل جانے کے بعد پھر زندہ ہوجائیں گے، بادشاہِ وقت بیدوسیس کو اس کی فکر ہوئی کہ کس طرح ان کے شکوک و شبہات دُور کئے جائیں، جب کوئی تدبیر نہ بنی تو اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ سے دعا کی اور الحاح و زاری شروع کی، کہ یا اللہ آپ ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرمادیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہوجائے اور یہ راہ پر آجائیں، اس طرف یہ بادشاہ گریہ و زاری اور دعا میں مصروف تھا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کی قبولیت کا یہ سامان کردیا کہ اصحابِ کہف بیدار ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک آدمی کو (جس کا نام تملیخا بتلایا جاتا ہے) ان کے بازار میں بھیجدیا وہ کھانا خریدنے کے لئے دُکان پر پہونچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکّہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دُکاندار حیران رہ گیا، کہ یہ سکّہ کہاں سے آیا، کس زمانے کا ہے، بازار کے دوسرے دُکانداروں کو دکھلایا، سب نے یہ کہا کہ اس شخص کو کہیں پرانا

خزانہ ہاتھ آگیا ہے اس میں سے یہ سکّہ نکال کر لایا ہے، اس نے انکار کیا کہ نہ مجھے کوئی خزانہ ملا، نہ کہیں سے لایا یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔

بازار والوں نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا، یہ بادشاہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ایک نیک صالح اللہ والا تھا، اور اس نے سلطنت کے پرانے خزانے کے آثارِ قدیمہ میں کہیں وہ تختی بھی دیکھی تھی جس میں اصحابِ کہف کے نام اور ان کے فرار ہو جانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا، بعض کے نزدیک خود ظالم بادشاہ دقیانوس نے یہ تختی لکھوائی تھی، کہ یہ اشتہاری مجرم ہیں، ان کے نام اور پتے محفوظ رہیں، جب کہیں ملیں گرفتار کر لئے جائیں، اور بعض روایات میں ہے کہ شاہی دفتر میں بعض ایسے مومن بھی تھے جو دل سے بُت پرستی کو بُرا سمجھتے اور اصحابِ کہف کو حق پر سمجھتے تھے، مگر ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی، انھوں نے یہ تختی بطور یادگار کے لکھ لی تھی، اسی تختی کا نام رقیم ہے جس کی وجہ سے اصحابِ کہف کو اصحابِ رقیم بھی کہا گیا۔

الغرض اس بادشاہ کو اس واقعہ کا کچھ علم تھا، اور اس وقت وہ اس دعاء میں مشغول تھا کہ کسی طرح لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ مُردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے کچھ بعید نہیں۔

اس لئے تملیخا سے اس کے حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہو گیا کہ یہ انہی لوگوں میں سے ہے اور اس نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے دعاء کیا کرتا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے ملا دے جو دقیانوس کے زمانے میں اپنا ایمان بچا کر بھاگے تھے، بادشاہ اس پر مسرور ہوا اور کہا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعاء قبول فرمائی، اس میں لوگوں کے لئے شاید کوئی ایسی حجت ہو جس سے ان کو حشرِ اجساد کا یقین آجائے، یہ کہہ کر اس شخص سے کہا کہ مجھے اس غار پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ بہت سے اہلِ شہر کے مجمع کے ساتھ غار پہونچا، جب غار قریب آیا تو تملیخا نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں میں جا کر اپنے ساتھیوں کو حقیقتِ معاملہ سے باخبر کر دوں کہ اب بادشاہ مسلمان موحّد ہے اور قوم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کے لئے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اطلاع سے پہلے آپ پہونچیں تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھ آیا ہے، اس کے مطابق تملیخا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سُنائے تو وہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے، بادشاہ کا استقبال تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے، اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے ساتھیوں کو یہ سارا قصہ سُنایا، اسی وقت سب کی وفات ہو گئی، بادشاہ سے ملاقات نہیں ہو سکی، بحر محیط میں ابوحیان نے اس جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ ملاقات

کے بعد اہلِ غار نے بادشاہ اور اہلِ شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں اور غار کے اندر چلے گئے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دیدی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بہرحال اب اہلِ شہر کے سامنے یہ واقعہ عجیبہ قدرت آلہیہ کا واشگاف ہو کر آ گیا تو سب کو یقین ہو گیا کہ جس ذات کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ تین سو برس تک زندہ انسانوں کو بغیر کسی غذا اور سامانِ زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصہ تک ان کو نیند میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، قوی، تندرست اٹھائے اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد بھی پھر ان اجسام کو زندہ کر دے، اس واقعہ سے ان کے انکار کا سبب دور ہو گیا کہ حشر اجساد کو مستبعد اور خارج از قدرت سمجھتے تھے، اب معلوم ہوا کہ مالک الملکوت کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا خود جہالت ہے۔

اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا، یعنی ہم نے اصحابِ کہف کو زمانہ دراز تک سلانے کے بعد جگا کر بٹھا دیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ یعنی قیامت میں سب مُردوں کے اجسام کو زندہ کرنے کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

اصحابِ کہف کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلافِ رائے

اصحابِ کہف کی بزرگی اور تقدس کے تو سب ہی قائل ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد سب کا خیال ہوا کہ غار کے پاس کوئی عمارت بطور یادگار کے بنائی جائے، عمارت کے بارے میں اختلافِ رائے ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ شہر میں اب بھی کچھ بت پرست لوگ موجود تھے وہ بھی اصحابِ کہف کی زیارت کو آتے تھے ان لوگوں نے عمارت بنانے میں یہ رائے دی کہ کوئی رفاہِ عام کی عمارت بنا دی جائے، مگر اربابِ حکومت اور بادشاہ مسلمان تھے، اور انہی کا غلبہ تھا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنا دی جائے جو یادگار بھی رہے اور آئندہ بت پرستی سے بچنے کا سبب بھی بنے، یہاں اختلافِ رائے کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں قرآن کا یہ جملہ ہے رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ یعنی ان کا رب ان کے حالات کو پوری طرح جانتا ہے۔

تفسیر بحرِ محیط میں اس جملے کے معنی میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، ایک یہ کہ یہ قول انہی حضرات اہلِ شہر کا ہو، کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار بنانے کی رائے ہوئی تو جیسا عموماً یادگاری تعمیرات میں ان لوگوں کے نام اور خاص حالات کا کتبہ لگایا جاتا ہے جن کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے تو ان کے نسب اور حالات کے بارے میں مختلف گفتگو میں ہونے لگیں، جب کسی حقیقت پر نہ پہونچے تو خود انھوں نے ہی آخر میں عاجز ہو کر کہہ دیا رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اور یہ کہہ کر اصل کام یعنی یادگار بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے، جو لوگ غالب تھے ان کی رائے مسجد بنانے کی ہوگئی۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ہے جس میں اس زمانے کے باہم جھگڑا اور اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہیں حقیقت کا علم نہیں، اور اس کے علم کے ذرائع بھی تمہارے پاس نہیں تو کیوں اس بحث میں وقت ضائع کرتے ہو، اور ممکن ہے کہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود وغیرہ جو اس واقعہ میں اسی طرح کی بے اصل باتیں اور بحثیں کیا کرتے تھے، ان کو تنبیہ مقصود ہو، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مسئلہ: اس واقعہ سے اتنا معلوم ہو کہ اولیاء صلحاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنا دینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبور انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنا دینا ہے، جو باتفاق شرک و حرام ہے (مظہری)

سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
اب یہی کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ
کتا بدون نشانہ دیکھے پتھر چلانا، اور یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا،
قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڛ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ
تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے ان کی گنتی، ان کی خبر نہیں رکھتے مگر تھوڑے سے لوگ، سو مت جھگڑ ان کی بات میں
اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ؀ۧ (۲۲)
مگر سرسری جھگڑا، اور مت تحقیق کر ان کا حال ان میں کسی سے

۳ ع ۵ ۱۵

خلاصہ تفسیر

(جس وقت اصحاب کہف کا قصہ بیان کریں گے تو) بعضے لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے اور بعضے کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے (اور) یہ لوگ بے تحقیق بات کو ہانک رہے ہیں اور بعضے کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، آپ (ان اختلاف کرنے والوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے (کہ ان مختلف اقوال میں کوئی قول صحیح بھی ہے یا سب غلط ہیں) ان (کی تعداد) کو (صحیح صحیح) بہت کم لوگ

جانتے ہیں (اور چونکہ تعداد متعین کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لئے آیت میں کوئی صریح فیصلہ نہیں فرمایا، لیکن روایات میں حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا انا من القلیل کانوا سبعۃ یعنی میں بھی ان قلیل لوگوں میں داخل ہوں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ کم لوگ جانتے ہیں وہ سات تھے، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وغیرہ، اور آیت میں بھی اس قول کی صحت کا اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اس قول کو نقل کرکے اس کو رد نہیں فرمایا، بخلاف پہلے دونوں قول کے کہ ان کے تردید میں رجماً بالغیب فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم سو اس پر بھی اگر وہ لوگ اختلاف سے باز نہ آویں تو آپ اس معاملہ میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے (یعنی مختصر طور پر تو ان کے خیالات کا رد قرآن کی آیات میں آہی چکا ہے جو رجماً بالغیب، قل ربی اعلم سے بیان کردیا گیا ہے، بس سرسری بحث یہی ہے کہ اس پر اکتفا کریں، ان کے اعتراض کے جواب میں اس سے زیادہ مشغول ہونا اور اپنے دعوے کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ یہ بحث ہی کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی) اور آپ ان (اصحاب کہف) کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھئے (جس طرح آپ کو ان کے اعتراض و جواب میں زیادہ کاوش سے منع کیا گیا، اسی طرح اس کی بھی ممانعت فرمادی کہ اب اس معاملہ کے متعلق کسی سے سوال یا تحقیق کریں، کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آگئی غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شان نبوت کے خلاف ہے)۔

معارف ومسائل

اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب
سَیَقُوْلُوْنَ، یعنی وہ لوگ کہیں گے، وہ کہنے والے کون لوگ ہیں، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ مراد ان سے وہی لوگ ہوں جن کا باہم اختلاف اصحاب کہف کے زمانے میں ان کے نام و نسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، انہی لوگوں میں سے بعض نے عدد کے متعلق پہلا، بعض نے دوسرا، بعض نے تیسرا قول اختیار کیا تھا۔ (ذکرہ فی البحر عن الماوردی)

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ سَیَقُوْلُوْنَ کی ضمیر نصاریٰ نجران کی طرف عائد ہو، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا، ان کے تین فرقے تھے ایک فرقہ ملکانیہ کے نام سے موسوم تھا، اس نے تعداد کے متعلق پہلا قول کہا، یعنی تین کا عدد بتلایا، دوسرا فرقہ یعقوبیہ تھا، اس نے دوسرا قول یعنی پانچ ہونا اختیار کیا، تیسرا فرقہ نسطوریہ تھا اس نے تیسرا قول کہا کہ سات تھے، اور بعض نے کہا کہ یہ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا، اور بالآخر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور قرآن کے اشارے سے تیسرے قول کا صحیح ہونا معلوم ہوا (بحر محیط)

وَثَامِنُهُمْ، یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس جگہ اصحاب کہف کی تعداد میں تین قول نقل کئے گئے ہیں، تین، پانچ، سات، اور ہر ایک کے بعد ان کے کتے کو شمار کیا گیا ہے، مگر پہلے دو قول میں ان کی تعداد اور کتے کے شمار میں واؤ عاطفہ نہیں دیا گیا، ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ اور خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ بدون واؤ عاطفہ کے آیا اور تیسرے قول میں سَبْعَةٌ کے بعد واؤ عاطفہ کے ساتھ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ فرمایا۔

اس کی وجہ حضرات مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ عرب کے لوگوں میں عدد کی پہلی گرہ سات ہی ہوتی تھی، سات کے بعد جو عدد آئے وہ الگ شمار ہوتا تھا، جیسا کہ آجکل نو کا عدد اس کے قائم مقام ہے کہ نو تک اکائی ہے، دس سے دہائی شروع ہوتی ہے، ایک الگ عدد ہوتا ہے اسی لئے تین سے لے کر سات تک جو تعداد شمار کرتے تو اس میں واؤ عطف نہیں لاتے تھے سات کے بعد کوئی عدد بتلانا ہوتا تو واؤ عطف کے ساتھ الگ کر کے بتلاتے تھے، اور اسی لئے اس واؤ کو واؤ ثمانیہ کا لقب دیا جاتا تھا (مظہری وغیرہ)

اسماء اصحاب کہف: اصل بات تو یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے اصحاب کہف کے نام صحیح ثابت نہیں، تفسیری اور تاریخی روایات میں نام مختلف بیان کئے گئے ہیں ان میں اقرب وہ روایت ہے جس کو طبرانی نے معجم اوسط میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نام یہ تھے:

مُكْسَلْمِينَا، تَمْلِيخَا، مَرْطُونَسْ، سَنُونَسْ، سَارِينُونَسْ، ذُونَوَاسْ، كَعَسْطَطْيُونَسْ

فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ص وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ أَحَدًا، یعنی آپ اصحاب کہف کی تعداد وغیرہ کے متعلق لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں کاوش نہ کریں، بلکہ سرسری بحث فرمادیں، اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس کے متعلق نہ کریں۔

اختلافی معاملات میں طویل بحثوں سے اجتناب کیا جائے: ان دونوں جملوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ درحقیقت علماء امت کے لئے اہم رہنما اصول ہیں، کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے، اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث و تکرار میں وقت

کی اضاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جملے میں یہ دی گئی ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے قصۂ اصحاب کہف کی جتنی معلومات آپ کو دیدی گئی ہیں اُن پر قناعت فرمادیں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے یہ بھی اخلاقِ انبیاء کے خلاف ہے، اس لئے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کردیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لئے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لئے ہو۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ

اور نہ کہنا کسی کام کو کہ میں کروں گا کل کو مگر یہ کہ اللہ چاہے

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ

اور یاد کر لے اپنے رب کو جب بھول جائے اور کہہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو دکھلائے اس سے زیادہ

مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ

نزدیک راہ نیکی کی اور مدت گذری اُن پر اپنی کھوہ میں تین سو برس

وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ

اور ان کے اوپر نو تو کہہ اللہ خوب جانتا ہے جتنی مدت ان پر گذری اسی کے پاس ہیں چھپے

وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ

بھید آسمان اور زمین کے کیا عجیب دیکھتا ہے اور سنتا ہے کوئی نہیں بندوں پر اس کے سوائے مختار،

وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾

اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔

خلاصۂ تفسیر

(اور اگر لوگ آپ سے کوئی بات قابل جواب دریافت کریں اور آپ جواب کا وعدہ کریں تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ضرور ملا لیا کریں، بلکہ وعدہ کی بھی تخصیص نہیں، ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ) آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں

اس کو (مثلاً کل کر دوں گا مگر خدا کے چاہنے کو اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے، اور آئندہ ایسا نہ ہو جیسا اس واقعہ میں پیش آیا کہ آپ سے لوگوں نے روح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوالات کئے، آپ نے بغیر انشاء اللہ کہے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ کرلیا، پھر پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی اور آپ کو بڑا غم ہوا، اس ہدایت کے ساتھ ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی نازل ہوا کذا فی سبب عن ابن عباسؓ) اور جب آپ (اتفاقاً انشاء اللہ کہنا) بھول جاویں اور پھر کبھی یاد آوے، تو (اسی وقت انشاء اللہ کہہ کر) اپنے رب کا ذکر کر لیا کیجئے اور (ان لوگوں سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو (نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس (قصہ) سے بھی نزدیک تر بات بتلا دے (مطلب یہ ہے کہ تم نے میری نبوت کا امتحان لینے کے لئے اصحاب کہف وغیرہ کے قصے دریافت کئے، جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے بتلا کر تمہارا اطمینان کر دیا مگر اصل بات یہ ہے کہ ان قصوں کے سوال و جواب اثبات نبوت کے لئے کوئی بہت بڑی دلیل نہیں ہوسکتی، یہ کام تو کوئی غیر نبی بھی جو تاریخ عالم سے زیادہ واقف ہو وہ بھی کرسکتا ہے، مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کے اثبات کے لئے اس سے بھی بڑے قطعی دلائل اور معجزات عطا فرمائے ہیں، جن میں سب سے بڑی دلیل تو خود قرآن ہے، جس کی ایک آیت کی بھی ساری دنیا مل کر نقل نہیں اتار سکی۔

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے وہ واقعات بذریعہ وحی مجھے بتلا دیئے گئے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے بھی بہ نسبت واقعہ اصحاب کہف و ذوالقرنین کے زیادہ بعید ہیں، اور ان کا علم بھی کسی کے لئے بجز وحی کے ممکن نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ تم نے تو اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات کو سب سے زیادہ عجیب سمجھ کر اسی کو امتحان نبوت کے سوال میں پیش کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی زیادہ عجیب عجیب چیزوں کے علوم عطا فرمائے ہیں) اور (جیسا اختلاف ان لوگوں کا اصحاب کہف کے عدد میں ہے، ایسا ہی ان کے سوتے رہنے کی مدت میں بھی بہت اختلاف ہے، ہم اس میں صحیح بات بتلاتے ہیں کہ) وہ لوگ اپنے غار میں (نیند کی حالت میں) تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے (اور اگر اس صحیح بات کو سن کر بھی وہ اختلاف کرتے رہیں تو) آپ کہہ دیجئے کہ خدا تعالیٰ ان کے (سوتے) رہنے کی مدت کو (تم سے) زیادہ جانتا ہے (اس لئے جو اس نے بتلا دیا وہی صحیح ہے اور اس واقعہ کی کیا تخصیص ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ) تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے، ان کا خدا کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے (خلاصہ یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی مزاحم ہے نہ شریک ایسی ذات عظیم کی مخالفت سے بہت ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر چار آیتوں پر قصہ اصحاب کہف ختم ہو رہا ہے، ان میں سے پہلی دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ یا اقرار کرنا ہو تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ کا کلمہ ملایا کرو کیونکہ آئندہ کا حال کس کو معلوم ہے کہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں اور زندہ بھی رہا تو یہ کام کر سکے گا یا نہیں، اس لئے مومن کو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ دل میں بھی کرے اور زبان سے اس کا اقرار کرے کہ اگلے دن میں کسی کام کے کرنے کو کہے تو یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں یہ کام کل کروں گا، یہی معنی ہیں کلمۂ ان شاء اللہ کے۔

تیسری آیت میں اس اختلافی بحث کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں زمانۂ اصحاب کہف کے لوگوں کی رائیں بھی مختلف تھیں، اور موجودہ زمانے کے یہود و نصاریٰ کے قول بھی مختلف تھے یعنی غار میں سوتے رہنے کی مدت، اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ وہ تین سو نو سال تھے، گویا یہ اس اجمال کا بیان ہے جو شروع قصہ میں بیان ہوا تھا، فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا۔

اس کے بعد چوتھی آیت میں پھر اس میں اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقت حال کی تم کو خبر نہیں اس کو جاننے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب غائبات کو جاننے والا سمیع و بصیر ہے، اس نے جو مدت تین سو نو سال کی بتلا دی اس پر مطمئن ہو جانا چاہئے۔

آئندہ کام کرنے پر انشاء اللہ کہنا: اس باب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پہلی دو آیتوں کے شان نزول کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ جب اہل مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ اصحاب کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہے ہوئے کر لیا تھا، مقربین بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہوا کرتی ہے، اس لئے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا غم ہوا، اور مشرکین مکہ کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ملا، پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہدایت دینے کے لئے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو انشاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے، ان دونوں آیتوں کو قصہ اصحاب کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں انشاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آئے اسی وقت کہہ لے

یہ حکم اس مخصوص معاملہ کے لئے ہے جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، یعنی محض تبرک اور اقرار عبدیت کے لئے یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے، کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاملات بیع وشراء اور معاہدات میں جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور شرط لگانا طرفین کے لئے معاہدہ کا مدار ہوتا ہے وہاں بھی اگر معاہدہ کے وقت کوئی شرط لگانا بھول جائے تو پھر کبھی جب یاد آجائے جو چاہے شرط لگا لے، اس مسئلے میں بعض فقہاء کا اختلاف بھی ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

تیسری آیت میں جو غار میں سونے کی مدت تین سو نو سال بتلائے ہیں، ظاہر نسق قرآن سے یہی ہے کہ یہ بیان مدت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، ابن کثیر نے اسی کو جمہور مفسرین سلف وخلف کا قول قرار دیا ہے، ابوحیان اور قرطبی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر حضرت قتادہؒ وغیرہ سے اس میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول بھی انہی اختلاف کرنے والوں میں سے بعض کا قول ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول صرف وہ ہے جو بعد میں فرمایا ہے اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا، کیونکہ پہلا قول تین سو نو کے تعین کرنے کا اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے بعد اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا کہنے کا موقع نہ تھا، مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں، پہلے میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدت کا بیان آگیا تو اب اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، وہی جاننے والا ہے، محض تخمینوں اور رایوں سے اس کی مخالفت بے عقلی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس مدت میں پہلے تین سو سال بیان کئے اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہوگئے، پہلے ہی تین سو نو نہیں فرمایا اس کا سبب حضرات مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہوگئے، ان دونوں سالوں کا امتیاز بتانے کے لئے یہ عنوان تعبیر اختیار کیا گیا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبویؐ کے اندر یہود ونصاریٰ میں دو باتیں زیر اختلاف تھیں ایک اصحاب کہف کی تعداد دوسری غار میں ان کے سوتے رہنے کی مدت، قرآن نے ان دونوں کو بیان تو کر دیا، مگر اس فرق کے ساتھ کہ تعداد کا بیان صریح الفاظ میں نہیں آیا، اشارے کے طور پر آیا، کہ جو قول صحیح تھا اس کی تردید نہیں کی، اور مدت کی تعیین کو صاف وصریح الفاظ میں بتلا دیا وَلَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ

سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا، وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اسلوب سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دنیوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ مدت دراز تک خلافِ عادتِ انسانی سوتے رہنا اور بغیر غذا کے صحیح تندرست رہنا پھر اتنے عرصہ کے بعد صحیح تندرست اور قوی اٹھ کر بیٹھ جانا ایک نظیر حشر و نشر کی ہے، اس سے مسئلہ قیامت و آخرت پر استدلال ہو سکتا ہے، اس لئے اس کو بصراحت بیان کر دیا۔

جو لوگ معجزات و خوارقِ عادت کے یا منکر ہیں یا کم از کم آج کل کے مستشرقین یہود و نصاریٰ کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر ان میں تاویلیں کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں انھوں نے اس آیت میں بھی حضرت قتادہ کی تفسیر کو سہارا لے کر تین سو نو سال کی مدت کو انہی لوگوں کا قول قرار دے کر رد کرنا چاہا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ قرآن کے ابتدائی جملے میں جو لفظ سِنِيْنَ عَدَدًا آیا ہے اس کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا قول نہیں کہا جا سکتا، خرقِ عادت اور کرامت کے ثبوت کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ سالہا سال کوئی سوتا رہے اور پھر صحیح تندرست زندہ اٹھ کر بیٹھ جائے، واللہ اعلم

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ

اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے، کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۷) وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ

اور کہیں نہ پائے گا تو اس کے سوائے چھپنے کو جگہ، اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ

جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دوڑیں

عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ

تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق زندگانی دنیا کی، اور نہ کہا مان اس کا

اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۲۸)

جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ

اور کہہ سچی بات ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے

فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِن

نہ مانے ہم نے تیار کر رکھی ہے گنہگاروں کے واسطے آگ کہ گھیر رہی ہیں ان کو اس کی قناتیں، اور اگر

يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ

فریاد کریں گے تو ملے گا پانی جیسے پیپ بھون ڈالے منہ کو، کیا برا پینا ہے،

وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا

اور کیا بری آرام کی جگہ۔ بیشک جو لوگ یقین لائے اور کیں نیکیاں ہم

لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ

نہیں کھوتے بدلہ اس کا جس نے بھلا کیا کام۔ ایسوں کے واسطے باغ ہیں بسنے کے

تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، پہنائے جائیں گے ان کو وہاں کنگن سونے کے،

وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ

اور پہنیں گے کپڑے سبز باریک اور گاڑھے ریشم کے، تکیہ لگائے ہوئے

فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

ان میں تختوں پر، کیا خوب بدلہ ہے اور کیا خوب آرام۔

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ آپ کے پاس جو آپ کے رب کی کتاب وحی کے ذریعہ آئی ہے وہ (لوگوں کے سامنے) پڑھ دیا کیجئے۔ اس سے زیادہ اس کی فکر میں نہ پڑیں کہ دنیا کے بڑے لوگ اگر اسلام کی مخالفت کرتے رہے تو دین کو ترقی کس طرح ہوگی، کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے اور اس کی باتوں کو (یعنی وعدوں کو) کوئی نہیں بدل سکتا (یعنی ساری دنیا کے مخالف بھی مل کر اللہ کو وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک سکتے اور اللہ تعالیٰ خود اگرچہ تبدیلی پر قدرت رکھتے ہیں مگر وہ تبدیل نہیں کریں گے) اور اگر آپ نے ان بڑے لوگوں کی دلجوئی اس طرح کی جس سے احکام الٰہیہ ترک ہوجاویں تو پھر آپ خدا کے سوا کوئی پناہ نہ پاویں گے (اگرچہ احکام الٰہیہ کا ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلائل شرعیہ محال ہے، یہاں مبالغہ اور تنبیہ

کے لئے لفظ محض زیادت ہوگیا ہے اور جیسے کفار کے امیروں اور رئیسوں سے آپ کو مستغنی رہنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح فقراء مسلمین کے حال پر مزید توجہ کا آپ کو حکم ہے پس) آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھنے میں) مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں (کوئی غرض دنیوی نہیں) اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پاویں (رونق دنیا کے خیال سے مراد یہ ہے کہ رئیس لوگ مسلمان ہوجاویں تو اسلام کی رونق بڑھے گی، اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ اسلام کی رونق مال و متاع سے نہیں بلکہ اخلاص و اطاعت سے ہے وہ غریب فقیر لوگوں میں ہو تو بھی رونق اسلام کی بڑھے گی) اور ایسے شخص کا کہنا (غریبوں کو مجلس سے ہٹا دینے کے متعلق) نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے (اس کے عناد کی سزا میں) اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال (یعنی اتباع ہویٰ) حد سے گذر گیا ہے اور آپ (ان رؤساء کفار سے صاف) کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے (ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں، بلکہ نفع نقصان خود اس کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے دوزخ کی آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی (یعنی وہ قناتیں بھی آگ ہی کی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے، یہ لوگ اس گھیرے سے نکل نہ سکیں گے) اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جاوے گی جو (مکروہ صورت ہونے میں تو) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا (اور تیز گرم ایسا ہوگا کہ پاس لاتے ہی) مونہوں کو بھون ڈالے گا (یہاں تک کہ چہرے کی کھال تڑ تڑ گر پڑے گی جیسا کہ حدیث میں ہے) کیا ہی برا پانی ہوگا اور وہ دوزخ بھی کیا ہی بری جگہ ہوگی (یہ تو ایمان نہ لانے کا ضرر ہوا اور ایمان لانے کا نفع یہ ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح کام کو کرے، ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ان کے (مساکن کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے (اور) وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا صلہ ہے اور (جنت) کیا ہی اچھی جگہ ہے۔

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے خاص آداب: وَاصْبِرْ نَفْسَکَ، اس آیت کے شان نزول میں چند واقعات مذکور ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ سب ہی اس ارشاد کا سبب بنے ہوں، بغوی نے نقل کیا ہے کہ

عُیَیْنَہ بن حصن فزاری مکہ کا رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جو فقراء صحابہ میں سے تھے، ان کا لباس خستہ اور ہیئت فقیرانہ تھی اور کچھ اسی طرح کے دوسرے غرباء مجمع میں تھے، عیینہ نے کہا کہ ہمیں آپ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے سے یہی لوگ مانع ہیں ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپ ان کو اپنی مجلس سے ہٹا دیں، یا کم از کم ہمارے لئے علیحدہ مجلس بنا دیں اور ان کے لئے الگ۔

ابن مردویہ نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ امیہ بن خلف جمحی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ غریب فقیر شکستہ حال مسلمانوں کو آپ اپنے قریب نہ رکھیں بلکہ مکہ اور قریش کے سرداروں کو ساتھ لگائیں، یہ لوگ آپ کا دین قبول کرلیں گے تو دین کو ترقی ہوگی۔

اس طرح کے واقعات پر یہ ارشاد ربانی نازل ہوا جس میں اُن کا مشورہ قبول کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا، اور صرف یہی نہیں کہ ان کو اپنی مجلس سے ہٹائیں نہیں، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ یعنی آپ اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ باندھ کر رکھیں، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی وقت جدا نہ ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رہیں، معاملات میں انہی سے مشورہ لیں، انہی کی امداد و اعانت سے کام کریں، اور اس کی وجہ اور حکمت ان الفاظ سے بتلا دی گئی کہ یہ لوگ صبح شام یعنی ہر حال میں اللہ کو پکارتے اور اسی کا ذکر کرتے ہیں، ان کا جو عمل ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہے، اور یہ سب حالات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کو کھینچتے ہیں، اللہ کی مدد ایسے ہی لوگوں کے لئے آیا کرتی ہے، چند روز کی کس مپرسی سے گھبرائیں نہیں، انجام کار فتح و نصرت انہی کو حاصل ہوگی۔

اور روساء قریش کا مشورہ قبول نہ کرنے کی ممانعت کو بھی آخر آیات میں یہ بتلا کر کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان کے سب کام اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہیں، اور یہ حالات اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت سے ان کو دور کرنے والے ہیں۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ مشورہ تو قابل عمل تھا کہ ان کے لئے ایک مجلس علیحدہ کر دی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہونچانے میں اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں سہولت ہوتی، مگر اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دلشکنی یا حوصلہ شکنی ہو سکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصول دعوت و تبلیغ یہی قرار دیا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہئے، واللہ اعلم

اہل جنت کے لئے زیور: يُحَلَّوْنَ فِيهَا، اس آیت میں اہل جنت مردوں کو بھی سونے کے کنگن پہنانے کا ذکر ہے، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لئے نہ زیبا ہے، نہ کوئی

جمال اور زینت جنت میں اگر ان کو کنگن پہنائے گئے تو وہ ان کو بدہیئت کردیں گے

جواب یہ ہے کہ زینت و جمال عرف اور رواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت و جمال سمجھی جاتی ہے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابل نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسے ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے دوسرے زمانے میں وہ عیب ہوجاتی ہے جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت و جمال قرار دیئے جائیں گے تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے، کہ یہاں مردوں کو سونے کا کوئی زیور یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی سونے کی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں، جنت کا یہ قانون ہوگا وہ اس سارے جہان سے الگ ایک عالم ہے اس کو اس بناء پر کسی چیز میں بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ

اور بتلا ان کو مثل دو مردوں کی کردیئے ہم نے ان میں سے ایک کے لئے دو باغ انگور کے

وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ

اور گرد ان کے کھجوریں اور رکھی دونوں کے بیچ میں کھیتی، دونوں باغ لاتے ہیں اپنا

اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ

میوہ اور نہیں گھٹاتے اس میں سے کچھ اور بہادی ہم نے ان دونوں کے بیچ نہر، اور ملا

لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ

اس کو پھل پھر بولا اپنے ساتھی سے جب باتیں کرنے لگا اس سے میرے پاس زیادہ ہے تجھ سے مال اور

اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ

آبرو کے لوگ، اور گیا اپنے باغ میں اور وہ برا کر رہا تھا اپنی جان پر، بولا نہیں آتا مجھ کو خیال

اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ

کہ خراب ہوجاوے یہ باغ کبھی، اور نہیں خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہونیوالی ہے، اور اگر کبھی

رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ

پہنچادیا گیا میں اپنے رب کے پاس پاؤں گا بہتر اس سے وہاں پہنچ کر، کہا اس کو دوسرے نے

وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ

جب بات کرنے لگا کیا تو منکر ہو گیا اس سے جس نے پیدا کیا تجھ کو مٹی سے پھر قطرہ سے

ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

پھر پورا کر دیا تجھ کو مرد، پھر میں تو یہی کہتا ہوں وہی اللہ ہے میرا رب اور نہیں مانتا شریک اپنے رب کا کسی کو

وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ

اور جب تو آیا تھا اپنے باغ میں کیوں نہ کہا تو نے جو چاہے اللہ سو ہو، طاقت نہیں مگر جو دے اللہ

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ

اگر تو دیکھتا ہے مجھ کو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں، تو امید ہے کہ میرا رب دیوے مجھ کو

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ

تیرے باغ سے بہتر اور بھیج دے اس پر لوکا ایک جھونکا آسمان سے پھر صبح کو رہ جائے

صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

میدان صاف، یا صبح کو ہو رہے اس کا پانی خشک پھر نہ لا سکے تو اس کو ڈھونڈ کر،

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ

اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور وہ گرا پڑا تھا

عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ

اپنی چھتریوں پر اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا اگر میں شریک نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو، اور نہ ہوئی

تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوائے اور نہ ہوا وہ کہ خود بدلہ لے سکے،

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

یہاں سب اختیار ہے اللہ سچے کا، اسی کا انعام بہتر ہے اور اچھا ہے اسی کا دیا ہوا بدلہ۔

ع ۵ ۱۳ ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اور آپ (دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری ظاہر کرنے کے لئے ، دو شخصوں کا حال (جن میں باہم دوستی یا قرابت کا تعلق تھا) بیان کیجئے (تاکہ کفار کا خیال باطل ہو جائے اور مسلمانوں کو تسلی ہو) ان دو شخصوں میں سے ایک کو (جو کہ بددین تھا) ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے اور دونوں (باغوں) کا کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان میں کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور) دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی (بخلاف عام باغوں کے کہ کبھی کسی درخت میں اور کسی سال پورے باغ میں پھل کم آتا ہے) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس اور بھی سامان دولت کا سامان تھا سو (ایک دن) اپنے اس (دوسرے) ساتھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور مجمع بھی میرا زبردست ہے (مطلب یہ تھا کہ تو میرے طریقے کو باطل اور اللہ کے نزدیک ناپسند کہتا ہے تو اب تو دیکھ لے کہ کون اچھا ہے، اگر تیرا دعویٰ صحیح ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا، کیونکہ دشمن کو کوئی نوازا نہیں کرتا اور دوست کو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا) اور وہ اپنے اس ساتھی کو ساتھ لے کر (اپنے اوپر جرم کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہونچا (اور) کہنے لگا کہ میرا تو خیال نہیں ہے کہ یہ باغ (میری زندگی میں) کبھی بھی برباد ہوگا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے وجود اور ہر چیز پر اس کی قدرت کا قائل نہ تھا، بس ظاہری سامانِ حفاظت کو دیکھ کر اس نے یہ گفتگو کی) اور (اسی طرح) میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آوے گی اور اگر بالفرض محال قیامت آ بھی گئی اور میں اپنے رب کے پاس پہونچایا گیا (جیسا تیرا عقیدہ ہے) تو ضرور اس باغ سے بھی بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی (کیونکہ جنت کی جگہوں کا دنیا سے اچھا اور بہتر ہونے کا تو تجھے بھی اقرار ہے اور یہ بھی تجھے تسلیم ہے کہ جنت اللہ کے مقبول بندوں کو ملے گی، میری مقبولیت کے آثار و علامات تو تو دنیا ہی میں دیکھ رہا ہے اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو باغات کیوں ملتے، اس لئے تمہارے اقرار و تسلیم کے مطابق بھی مجھے وہاں یہاں سے اچھے باغ ملیں گے) اس کی یہ باتیں سنکر اس سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار مگر غریب آدمی تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو (توحید اور قیامت سے انکار کرکے) اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (اول) مٹی سے (جو کہ تیرا مادہ بعیدہ ہے بواسطہ آدم علیہ السلام کے) پیدا کیا پھر (تجھ کو) نطفہ سے (جو کہ تیرا مادۂ قریبہ ہے رحم مادر میں بنایا) پھر تجھ کو صحیح سالم آدمی بنایا (اس کے باوجود تو توحید اور قیامت سے انکار اور کفر کرتا ہے تو کیا کر) لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ (یعنی) اللہ تعالیٰ میرا رب

(حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا اور اب اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ ہر چیز پر ثابت کی، اور اس کے نتیجہ میں یہ کچھ عجب نہیں کہ باغ کی ترقی و حفاظت کے تیرے سارے اسباب و سامان کسی وقت بھی بیکار اور معطل ہو جائیں اور باغ برباد ہو جائے، اس لئے تجھے لازم تھا کہ مسبب الاسباب پر نظر کرتا، تو تو جس وقت اپنے باغ میں پہونچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور (بدون خدا کی مدد کے کسی میں) کوئی قوت نہیں، (جبتک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ باغ قائم رہے گا اور جب چاہے گا ویران ہو جائے گا) اگر تو مجھ کو مال و اولاد میں کمتر دیکھتا ہے (اس سے تجھ کو اپنے مقبول ہونے کا شبہ پڑ گیا ہے) تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دیدے (خواہ دنیا ہی میں یا آخرت میں) اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے (یعنی بلا واسطہ اسباب طبعیہ کے) بھیج دے جس سے وہ باغ دفعۃً ایک صاف چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اس سے اس کا پانی (جو نہر میں جاری ہے) بالکل اندر زمین میں اتر (کر خشک ہو) جائے پھر تو اس (کے دوبارہ لانے اور نکالنے) کی کوشش بھی نہ کر سکے (یہاں اس دیندار ساتھی نے صرف باغ کا تو جواب دیدیا، مگر اولاد کے متعلق کچھ جواب نہیں دیا، شاید وجہ یہ ہے کہ اولاد کی کثرت جبھی نعمت معلوم ہوتی ہے جب اس کی پرورش کے لئے مال موجود ہو ورنہ وہ الٹا وبال جان بنجاتی ہے، حاصل اس کلام کا یہ ہوا کہ تیرے بدعقیدہ ہونے کا سبب تھا کہ تجھ کو دنیا میں اللہ نے دولت دیدی اس کو تو نے اپنی مقبولیت کی علامت سمجھ لیا، اور میرے پاس دولت نہ ہونے سے مجھ کو غیر مقبول سمجھا، تو دنیا کی دولت و ثروت کو مقبولیت عند اللہ کا مدار سمجھ لینا ہی بڑا دھوکا اور غلطی ہے دنیا کی نعمتیں تو رب العالمین سانپوں بچھوؤں اور بھیڑیوں اور بدکاروں سبھی کو دیتے ہیں اصل مدار مقبولیت کا آخرت کی نعمتوں پر ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں سب زوال پذیر ہیں اور اس گفتگو کے بعد واقعہ یہ پیش آیا کہ) اس شخص کے سامان کو تو آفت نے گھیر لیا پس اس نے جو کچھ باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا، اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا (اس سے معلوم ہوا کہ باغ پر آفت آنے سے وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ بلا کفر و شرک کے سبب سے آئی ہے، اگر کفر نہ کرتا تو اول تو یہ آفت ہی شاید نہ آتی، اور آ بھی جاتی تو اس کا بدلہ آخرت میں ملتا، اب دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے، مگر صرف اتنی حسرت و افسوس سے اس کا ایمان ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حسرت و ندامت تو دنیا کے نقصان کی وجہ سے ہوئی، آگے اللہ کی توحید اور قیامت کا اقرار جب تک ثابت نہ ہو اس کو مومن نہیں کہہ سکتے) اور اس کے پاس ایسا کوئی مجمع نہ ہوا جو خدا کے سوا اس کی

مدد کرتا) اس کو اپنے مجمع اور دولت پر ناز تھا وہ بھی ختم ہوا اور نہ وہ خود (ہم سے) بدلہ لے سکا، ایسے موقع پر مدد کرنا تو اللہ برحق ہی کا کام ہے، اور آخرت میں بھی اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور دنیا میں بھی اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے (یعنی مقبولین کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو دونوں جہان میں اس کا ثمرہ نیک ملتا ہے بخلاف کافر کے کہ بالکل خسارہ میں رہ گیا)۔

معارف و مسائل

وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ، لفظ ثمر درختوں کے پھل کو بھی کہا جاتا ہے، اور مطلق مال وزر کو بھی، اس جگہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ سے یہی دوسرے معنی منقول ہیں (ابن کثیر) قاموس میں ہے کہ لفظ ثمرہ درخت کے پھل اور انواع مال وزر سب کو کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس صرف باغات اور کھیت ہی نہیں بلکہ سونا چاندی اور تمام اسباب عیش دوسرے بھی موجود تھے، خود اس کے الفاظ میں جو قرآن نے نقل کئے ہیں اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں (ابن کثیر)

مَا شَاۗءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، شعب الایمان میں حضرت انسؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز دیکھے اور وہ اس کو پسند آئے تو اگر اس نے یہ کلمہ کہہ لیا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو اس کو کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی (یعنی وہ پسندیدہ محبوب چیز محفوظ رہے گی) اور بعض روایت میں ہے کہ جس نے کسی محبوب و پسندیدہ چیز کو دیکھ کر یہ کلمہ پڑھ لیا تو اس کو نظر بد نہ لگے گی۔

حُسْبَانًا، اس لفظ کی تفسیر حضرت قتادہ نے مطلق عذاب سے کی ہے، اور ابن عباسؓ نے آگ سے اور بعض نے پتھروں سے، اس کے بعد جو قرآن میں آیا ہے اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ اس میں ظاہر یہ ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال وزر اور سامانِ عیش پر کوئی بڑی آفت آپڑی جس نے سب کو برباد کر دیا، قرآن نے صراحۃً کسی خاص آفت کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی جس نے سب کو جلا دیا، جیسا کہ لفظ حُسْبَانٌ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی آگ منقول ہے، واللہ اعلم

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ

اور بتلا دے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ

پھر رلا ملا نکلا اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہوا میں اڑتا ہوا اور ہے

اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ

اللہ کو ہر چیز پر قدرت، مال اور بیٹے رونق ہیں دنیا کی زندگی میں

الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ

اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے

اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ

توقع۔ اور جس دن ہم چلائیں پہاڑ اور تو دیکھے زمین کو کھلی ہوئی اور گھیر بلائیں ہم ان کو

فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ

پھر نہ چھوڑیں ان میں سے ایک کو۔ اور سامنے آئیں تیرے رب کے صف باندھ کر، آپہنچے

جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ

تم ہمارے پاس جیسا کہ ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار، نہیں تم تو کہتے تھے کہ نہ مقرر کریں گے ہم

مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا

تمہارے لئے کوئی وعدہ۔ اور رکھا جائے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گنہگاروں کو ڈرتے ہیں اس سے

فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ

جو اس میں لکھا ہے، اور کہتے ہیں ہائے خرابی کیسا ہے یہ کاغذ نہیں چھوٹی اس سے چھوٹی بات اور

لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ

نہ بڑی بات جو اس میں نہیں آگئی، اور پائیں گے جو کچھ کیا ہے سامنے، اور تیرا رب

رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

ظلم نہ کرے گا کسی پر۔

ع ۵ ۱۸

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلے دنیوی زندگی اور اس کے سامان کی ناپائیداری ایک شخصی اور جزوی مثال سے بیان فرمائی تھی، اب یہی مضمون عام اور کلی مثال سے واضح کیا جاتا ہے) اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو پھر اس (پانی سے) زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی ہوں پھر وہ (بعد اس کے کہ سرسبز و تر و تازہ تھی خشک ہوکر) ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو (یہی حال دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آتی ہے کل اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (جب چاہیں ایجاد کریں ترقی دیں اور جب چاہیں فنا کردیں اور جب اس حیات دنیا کا یہ حال ہے اور) مال و اولاد (حیات دنیا کی ایک رونق (اور اس کے توابع میں سے) ہے (تو خود مال و اولاد تو اور بھی زیادہ سریع الزوال ہے) اور جو اعمال صالحہ (ہمیشہ ہمیشہ کو) باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک (یعنی آخرت میں اس دنیا سے) ثواب کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے (یعنی اعمال صالحہ سے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں ضرور پوری ہوں گی، اور اس کی امید سے بھی زیادہ ثواب ملے گا، بخلاف متاع دنیا کے کہ اس سے دنیا میں بھی انسانی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، اور آخرت میں تو کوئی احتمال ہی نہیں، اور اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ہٹا دیں گے (یہ ابتدا میں ہوگا پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے) اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے (کیونکہ پہاڑ، درخت، مکان کچھ باقی نہ رہے گا) اور ہم ان سب کو (قبروں سے اٹھا کر میدان حساب میں) جمع کر دیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہ وہاں نہ لایا جائے) اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو (یعنی موقف حساب میں) برابر کھڑے کرکے پیش کئے جائیں گے (یہ احتمال نہ رہے گا کہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ جائے اور ان میں جو قیامت کا انکار کرتے تھے ان سے کہا جائے گا کہ) دیکھو آخر تم ہمارے پاس (دوبارہ پیدا ہوکر) آئے بھی جیسا ہم نے تم کو پہلی بار (یعنی دنیا میں) پیدا کیا تھا (مگر تم یہی پیدائش کا مشاہدہ کر لینے کے باوجود اس دوسری پیدائش کے قائل نہ ہوئے) بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے (دوبارہ پیدا کرنے کے) لئے کوئی وقت موعود نہ لائیں گے اور نامۂ عمل (خواہ داہنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں دیکر اس کے سامنے کھلا ہوا) رکھ دیا جائے گا (جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا) تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہوگا (اس کو دیکھکر

اس سے (یعنی اس کی سزا سے) ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامۂ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا، اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے، اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا (کہ نہ کیا ہوا گناہ لکھ لے یا کی ہوئی نیکی جو شرائط کے ساتھ کی جائے اس کو نہ لکھے)۔

معارف و مسائل

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ، مسند احمد، ابن حبان اور حاکم نے بروایت حضرت ابوسعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ جمع کیا کرو، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا سُبْحٰنَ اللّٰهِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنا، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور عقیلی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، یہی باقیات صالحات ہیں، یہی مضمون طبرانی نے بروایت حضرت سعد بن عبادہ بھی روایت کیا ہے، اور صحیح مسلم و ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمے یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ میرے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، یعنی سارے جہان سے۔

اور حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ بکثرت پڑھا کرو کیونکہ یہ ننانوے باب بیماری اور تکلیف کے دور کر دیتا ہے، جن میں سب سے کم درجہ کی تکلیف ہم یعنی فکر و غم ہے۔

اسی لئے اس آیت میں لفظ باقیات صالحات کی تفسیر حضرت ابن عباس، عکرمہ، مجاہد نے یہی کی ہے کہ مراد اس سے یہی کلمات پڑھنا ہے، اور سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم نے فرمایا کہ باقیات صالحات سے پانچ نمازیں مراد ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آیت میں باقیات صالحات سے مراد مطلق اعمال صالحہ ہیں جن میں یہ کلمات مذکورہ بھی داخل ہیں، پانچوں نمازیں بھی اور دوسرے تمام نیک اعمال بھی، حضرت قتادہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے (مظہری)

الفاظ قرآن کے مطابق بھی یہی ہے کیونکہ ان الفاظ کا لغوی مفہوم وہ اعمال صالحہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ سب ہی اللہ کے نزدیک باقی اور قائم ہیں ابن جریر طبری اور قرطبی نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ کھیتی دو قسم کی ہوتی ہے، دنیا کی کھیتی تو مال و اولاد ہے اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات ہیں، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ باقیات صالحات انسان کی نیت اور ارادہ ہیں کہ اعمال صالحہ کی قبولیت اسی پر موقوف ہے۔

اور عبید بن عمیر نے فرمایا کہ باقیات صالحات نیک لڑکیاں ہیں کہ وہ اپنے والدین کے لئے سب سے بڑا ذخیرۂ ثواب ہیں، اس پر حضرت صدیقہ عائشہؓ کی ایک روایت دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیدیا گیا، تو اس کی نیک لڑکیاں اس کو چمٹ گئیں اور رونے اور شور کرنے لگیں، اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ انھوں نے دنیا میں ہم پر بڑا احسان کیا، اور ہماری تربیت میں محنت اٹھائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرما کر بخش دیا (قرطبی)

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ، قیامت کے دن سب کو خطاب ہوگا کہ آج تم اسی طرح خالی ہاتھ بغیر کسی ساز و سامان کے ہمارے سامنے آئے ہو، جیسا تمہیں اول پیدائش کے وقت پیدا کیا تھا، بخاری، مسلم، ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے لوگو! تم قیامت میں اپنے رب کے سامنے ننگے پاؤں ننگے بدن پیدل چلتے ہوئے آؤ گے، اور سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے، یہ سن کر حضرت صدیقہ عائشہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا سب مرد و عورت ننگے ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس روز ہر ایک کو ایسا شغل اور ایسی فکر گھیرے رہے گی کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے گا، سب کی نظریں اوپر اٹھی ہوئی ہوں گی۔

قرطبی نے فرمایا کہ ایک حدیث میں جو آیا ہے کہ مُردے برزخ میں ایک دوسرے سے اپنے کفنوں میں ملبوس ہو کر ملاقات کریں گے، وہ اس حدیث کے منافی نہیں، کیونکہ وہ معاملہ قبر و برزخ کا ہے یہ میدان حشر کا، اور بعض روایات حدیث میں جو یہ منقول ہے کہ میت اپنے اسی لباس میں میدانِ حشر میں اٹھے گا جس میں اس کو دفن کیا گیا تھا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اپنے مُردوں کے کفن اچھے بنایا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز اسی کفن میں اٹھیں گے، اس کو بعض حضرات نے شہیدوں پر محمول کیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ محشر میں بعض لوگ ملبوس اٹھیں اور بعض ننگے، اس طرح دونوں قسم کی روایات جمع ہو جاتی ہیں (مظہری)

جزاء عین عمل ہے | وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا، یعنی سب اہلِ محشر اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر پائیں گے، اس کا مفہوم عام طور پر حضرات مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنے

کئے ہوئے اعمال کی جزاء کو حاضر موجود پائیں گے، ہمارے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور کشمیریؒ فرماتے تھے کہ اس تاویل کی ضرورت نہیں، روایات حدیث بے شمار اس پر شاہد ہیں کہ یہی اعمال دنیا و آخرت کی جزاء و سزا بن جائیں گے، ان کی شکلیں وہاں بدل جائیں گی، نیک اعمال جنت کی نعمتوں کی شکل اختیار کرلیں گے، اور برے عمل جہنم کی آگ اور سانپ و بچھو بن جائیں گے۔

احادیث میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کا مال قبر میں ایک بڑے سانپ کی شکل میں آ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا انا مالک (میں تیرا مال ہوں) نیک عمل ایک حسین انسان کی شکل میں انسان کو قبر کی تنہائی میں کچھ وحشت دور کرنے کے لئے انس دلانے آئے گا، قربانی کے جانور پل صراط کی سواری بنیں گے، انسان کے گناہ محشر میں بوجھ کی شکل میں ہر ایک کے سر پر لاد دیئے جائیں گے۔

قرآن میں یتیموں کے مال کو ناحق کھانے کے بارے میں ہے اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا "یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں" ان تمام آیات و روایات کو عموماً مجاز پر محمول کیا جاتا ہے اور اگر اس تحقیق کو لیا جائے تو ان میں کسی جگہ مجاز کی ضرورت نہیں رہتی، سب اپنی حقیقت پر رہتی ہیں۔

قرآن نے یتیم کے ناجائز مال کو آگ فرمایا، تو حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی آگ ہی ہے، مگر اس کے آثار محسوس کرنے کے لئے اس دنیا سے گذر جانا شرط ہے، جیسے کوئی دیا سلائی کے بکس کو آگ کہے تو صحیح ہے مگر اس کے آگ ہونے کے لئے رگڑ کی شرط ہے، اسی طرح کوئی پیٹرول کو آگ کہے تو صحیح سمجھا جائے گا اگرچہ اس کے لئے ذرا سی آگ سے اتصال شرط ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ انسان جو کچھ نیک یا بد عمل دنیا میں کرتا ہے یہ عمل ہی آخرت میں جزاء و سزاء کی شکل اختیار کرے گا اس وقت اس کے آثار و علامات اس دنیا سے الگ دوسرے ہو جاویں گے واللہ اعلم

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس، تھا جن کی

الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ

قسم سے سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے، سو کیا اب تم ٹھہراتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق

مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ

میرے سوائے اور وہ تمہارے دشمن ہیں، برا ہاتھ لگا بے انصافوں کے بدلہ، دکھلا نہیں لیا تھا میں نے

خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ

ان کو بنانا آسمان اور زمین کا اور نہ بنانا خود اُن کا، اور میں وہ نہیں کہ بناؤں

الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ

بہکانے والوں کو اپنا مددگار، اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے شریکوں کو جن کو تم

زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

مانتے تھے پھر پکاریں گے سو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو، اور کر دیں گے ہم انکے اور انکے بیچ مرنے کی جگہ

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا

اور دیکھیں گے گنہگار آگ کو پھر سمجھ لیں گے کہ ان کو پڑنا ہے اس میں اور نہ بدل سکیں گے اس سے

مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ

رستہ، اور بیشک پھیر پھیر کر سمجھائی ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر ایک مثل،

ع ۷
۱۹

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا

اور ہے انسان سب چیز سے زیادہ جھگڑالو، اور لوگوں کو جو روکا اس بات سے کہ یقین لائیں

اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ

جب پہنچی ان کو ہدایت اور گناہ بخشوائیں اپنے رب سے سو اسی انتظار نے کہ پہنچے ان پر رسم پہلوں

الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ

کی یا آکھڑا ہو اُن پر عذاب سامنے کا، اور ہم جو رسول بھیجتے ہیں سو

اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ

خوشخبری اور ڈر سنانے کو، اور جھگڑا کرتے ہیں کافر جھوٹا جھگڑا،

لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

کہ ٹلا دیں اس سے سچی بات کو اور ٹھہرالیا انھوں نے میرے کلام کو اور جو ڈر سنا دیئے گئے ٹھٹھا،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا

اور اس سے زیادہ ظالم کون جس کو سمجھایا گیا اس کے رب کے کلام سے پھر منہ پھیر لیا اس کی طرف سے اور بھول گیا جو

قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ

کچھ آگے بھیج چکے ہیں اس کے ہاتھ، ہم نے ڈال دیئے ہیں اُن کے دلوں پر پردے کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے

اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا

کانوں میں ہے بوجھ، اور اگر تو ان کو بلائے راہ پر تو ہرگز نہ آئیں راہ پر اس وقت

اَبَدًا ۝۵۷ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا

کبھی، اور تیرا رب بڑا بخشنے والا ہے رحمت والا، اگر ان کو پکڑے ان کے کئے

كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ

پر تو جلد ڈالے اُن پر عذاب، پر اُن کے لئے ایک وعدہ ہے کہیں نہ پائیں گے

دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝۵۸ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ

اس کے ورے سرک جانے کی جگہ، اور یہ سب بستیاں ہیں جن کو ہم نے غارت کیا جب وہ ظالم ہوگئے اور

جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝۵۹ ع

مقرر کیا تھا ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وعدہ۔

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا، (کیونکہ جنات کا عنصر غالب جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں آگ ہے، اور عنصر نار کا مقتضا پابند نہ رہنا ہے، مگر اس مقتضائے عنصری کی وجہ سے ابلیس معذور نہ سمجھا جائیگا کیونکہ اس تقاضائے عنصری کو خدا کے خوف سے مغلوب کیا جا سکتا تھا) تو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کی ذریت (اولاد اور توابع) کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر (یعنی میری اطاعت چھوڑ کر اس کے کہنے پر چلتے ہو) حالانکہ وہ (ابلیس اور اس کی جماعت) تمہارے دشمن ہیں (کہ ہر وقت تمہیں ضرر پہونچانے کی فکر میں رہتے ہیں) یہ (ابلیس اور اس کی ذریت کی دوستی) ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے (بدل اس لئے کہا کہ دوست تو بنانا چاہئے تھا مجھے، لیکن انھوں نے میرے بدلے شیطان کو دوست بنا لیا، بلکہ دوست ہی نہیں اس کو خدائی کا شریک

بھی ان [illegible] میں نے ان کو نہ تو آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت (اپنی مدد یا مشورے کے
لئے) بلایا، اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت (جیسا کہ ایک کے پیدا کرنے کے وقت دوسرے
کو نہیں بلایا) اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ (کسی کو بالخصوص) گمراہ کرنے والوں کو (یعنی شیاطین کو)
اپنا دست و بازو بناتا (یعنی مدد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو خود قادر نہ ہو) اور (تم یہاں
ان کو شریک خدائی ٹھہراتے ہو قیامت میں حقیقت معلوم ہوگی) اس دن کو یاد کرو کہ حق تعالیٰ (مشرکین
سے) فرمائے گا کہ جن کو تم ہمارا شریک سمجھا کرتے تھے ان کو (اپنی امداد کے لئے) پکارو تو وہ پکاریں گے
تو وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے (جس سے بالکل ہی مایوسی
ہو جائے ورنہ بغیر آڑ کے بھی ان کا مدد کرنا ممکن نہ تھا)، اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین
کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے، اور ہم نے اس قرآن
میں لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں، اور
(اس پر بھی منکر) آدمی جھگڑنے میں سب سے بڑھ کر ہے (جنات و حیوانات میں اگرچہ شعور و
ادراک ہے مگر وہ بیساختہ اور جھگڑا نہیں کرتے)، اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ہدایت پہنچ چکی،
(جس کا تقاضا تھا کہ ایمان لے آتے) ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے (کفر و معصیت سے)
مغفرت مانگنے سے اور کوئی امر مانع نہیں بجز اس کے کہ ان کو اس کا انتظار ہو کہ اگلے لوگوں کا سا
معاملہ (ہلاکت اور عذاب کا) ان کو بھی پیش آجائے یا یہ کہ عذاب ان کے روبرو آکھڑا ہو،
(مطلب یہ ہے کہ ان کی حالت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عذاب ہی کا انتظار ہے ورنہ اور سب
حجتیں تو تمام ہو چکیں)، اور ہم رسولوں کو تو صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر
بھیجا کرتے ہیں (جس کے لئے معجزات وغیرہ کے ذریعہ کافی دلائل ان کے ساتھ کر دیئے جاتے
ہیں اس سے زائد ان سے کوئی فرمائش کرنا جہالت ہے) اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر
جھگڑے نکالتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ حق بات کو بچلا دیں اور انھوں نے میری آیتوں کو اور
جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے، اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا
جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جاوے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ
اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے
سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور اس کے سننے سے ان کے کانوں میں ڈاٹ دے
رکھی ہے اور (اسی وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تو ہرگز
کبھی راہ پر نہ آئیں (کیونکہ کانوں سے دعوت حق سنتے نہیں، دلوں سے سمجھتے نہیں، اس لئے آپ
غم نہ کریں) اور (تاخیر عذاب کی وجہ سے جو ان کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے کہ اب ان کو ہوش آجائے اور ایمان لے آئیں تو ان کی مغفرت کردی جائے ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ) اگر ان سے ان کے اعمال پر دار و گیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) ان کے (عذاب کے) واسطے ایک معین وقت (ٹھہرا رکھا) ہے (یعنی روز قیامت) کہ اس سے اس طرف (یعنی پہلے) کوئی پناہ کی جگہ نہیں پاسکتے (یعنی اس وقت کے آنے سے پہلے کسی پناہ کی جگہ میں جا چھپیں اور اس سے محفوظ رہیں) اور (یہی قاعدہ پہلے کفار کے ساتھ برتا گیا چنانچہ) یہ بستیاں (جن کے قصے مشہور و مذکور ہیں) جب انھوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) شرارت کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت معین کیا تھا (اسی طرح ان موجودہ لوگوں کے لئے بھی وقت معین ہے)۔

معارف و مسائل

ابلیس کے اولاد اور ذریت بھی ہے وَذُرِّيَّتَهٗ اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے کہ شیطان کے اولاد و ذریت ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ذریت سے مراد معین و مددگار ہیں، یہ ضروری نہیں کہ شیطان کی صلبی اولاد بھی ہو، مگر ایک صحیح حدیث جس کو حمیدی نے کتاب الجمع بین الصحیحین میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جو سب سے پہلے بازار میں داخل ہو جاتے ہیں یا وہ لوگ جو سب سے آخر میں بازار سے نکلتے ہیں کیونکہ بازار ایسی جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بچے دے رکھے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کے انڈوں سے پھیلتی ہے، قرطبی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان کے مددگار اور لشکر ہونا تو قطعی دلائل سے ثابت ہے اولاد صلبی ہونے کے متعلق بھی ایک صحیح حدیث اوپر گذر چکی ہے، واللہ اعلم

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا سارے مخلوقات میں سب سے زیادہ جھگڑالو انسان واقع ہوا ہے، اس کی شہادت میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک شخص کفار میں سے پیش کیا جائے گا اس سے سوال ہوگا کہ ہم نے جو رسول بھیجا تھا ان کے متعلق تمہارا کیا عمل رہا؟ وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار؛ میں تو آپ پر بھی ایمان لایا آپ کے رسول پر بھی، اور عمل میں ان کی اطاعت کی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تیرا اعمال نامہ سامنے رکھا ہے اس میں تو یہ کچھ بھی نہیں، یہ شخص کہے گا

کر میں تو اس اعمال نامہ کو نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ ہمارے فرشتے تو تمہاری نگرانی کرتے تھے وہ تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں، یہ کہے گا کہ میں ان کی شہادت کو بھی نہیں مانتا، اور نہ ان کو پہچانتا ہوں، نہ میں نے ان کو اپنے عمل کے وقت دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو یہ لوح محفوظ سامنے ہے، اس میں بھی تیرا یہی حال لکھا ہے، وہ کہے گا کہ میرے پروردگار! آپ نے مجھے ظلم سے پناہ دی ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بیشک ظلم سے تو ہماری پناہ میں ہے، تو اب وہ کہے گا کہ میرے پروردگار میں ایسی غیبی شہادتوں کو کیسے مانوں جو میری دیکھی بھالی نہیں، میں تو ایسی شہادت کو مان سکتا ہوں جو میرے نفس کی طرف سے ہو، اس وقت اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے کفر و شرک پر گواہی دیں گے، اس کے بعد اس کو آزاد کر دیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس روایت کا مضمون صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے منقول ہے، (قرطبی)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو میں نہ ہٹوں گا جب تک نہ پہنچ جاؤں جہاں ملتے ہیں دو دریا یا

اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ

چلا جاؤں قرنوں، پھر جب پہنچے دونوں دریا کے ملاپ تک بھول گئے اپنی مچھلی پھر اس نے اپنی

سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا

راہ کرلی دریا میں سرنگ بنا کر، پھر جب آگے چلے کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو لا ہمارے پاس ہمارا کھانا

لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ

ہم نے پائی اپنے اس سفر میں تکلیف، بولا وہ دیکھا تو نے جب ہم نے جگہ پکڑی

اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ

اس پتھر کے پاس سو میں بھول گیا مچھلی، اور یہ مجھ کو بھلا دیا شیطان ہی نے کہ

اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ڰ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا

اس کا ذکر کروں، اور اس نے کر لیا اپنا رستہ دریا میں عجیب طرح، کہا یہی ہے جو ہم

كُنَّا نَبْغِ ڰ فَارْتَدَّا عَلٰٓي اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ

چاہتے تھے، پھر الٹے پھرے اپنے پیر پہچانتے، پھر پایا ایک بندہ

عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

ہمارے بندوں میں کا جسکو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھلایا تھا اپنے پاس سے ایک علم

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

کہا اس کو موسیٰ نے کہے تو تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ

بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ ، اور کیونکر ٹھہرے گا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو

تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ

میں نہیں اس کا سمجھنا ، کہا تو پائے گا اگر اللہ نے چاہا مجھ کو ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا

لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْــَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ

کوئی حکم ، بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو مت پوچھو مجھ سے کوئی چیز جب تک میں شروع نہ

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع

کروں تیرے آگے اس کا ذکر۔

ع ۹
۲

خلاصۂ تفسیر

اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے (جن کا نام یوشع تھا رواہ البخاری) فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا (اور وجہ اس سفر کی یہ ہوئی تھی کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں وعظ فرمایا، تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا "میں" مطلب یہ تھا کہ ان علوم میں کہ جن کو قرب الی اللہ کی تحصیل میں دخل ہے میرے برابر کوئی نہیں، اور یہ فرمانا صحیح تھا، اس لئے کہ آپ نبی اولوالعزم تھے، آپ کے برابر دوسرے کو یہ علم نہیں تھا، لیکن ظاہراً لفظ مطلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم دی جائے، غرض ارشاد ہوا کہ ایک ہمارا بندہ مجمع البحرین میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ زیادہ ہے گو ان علوم کو قرب الٰہی میں دخل نہ ہو جیسا عنقریب واضح ہوگا، لیکن اس بناء

پر جواب میں مطلقاً تو اپنے کو اعلم کہنا نہ چاہیے تھا، غرض موسیٰ علیہ السلام ان کے ملنے کے مشتاق ہوئے اور پوچھا کہ ان تک پہونچنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایک بے جان مچھلی اپنے ساتھ لے کر سفر کرو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ شخص وہیں ہے۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یوشعؑ کو ساتھ لیا اور یہ بات فرمائی) پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہونچے (وہاں کسی پتھر سے لگ کر سو رہے اور وہ مچھلی باذنہ تعالیٰ زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی، یوشع علیہ السلام نے بیدار ہو کر مچھلی کو نہ پایا، ارادہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جاگیں گے تو اس کا ذکر کروں گا، مگر ان کو مطلق یاد نہ رہا، شاید اہل وعیال اور وطن وغیرہ کے خیالات کا ہجوم ہوا ہوگا جو ذکر کرنا بھول گئے، ورنہ ایسی عجیب بات کا بھول جانا کم ہوتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت معجزات دیکھتا ہو اس کے ذہن سے کسی ادنیٰ درجہ کی عجیب بات کا نکل جانا کسی خیال کے غلبہ سے عجب نہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پوچھنے کا خیال نہ رہا، اس طرح سے) اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے (اس کے قبل زندہ ہو کر) دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی، پھر جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر (یعنی آج کی منزل) میں بڑی تکلیف پہونچی (اور اس کے قبل کی منزلوں میں نہیں تھکے تھے، جس کی وجہ ظاہراً موقع مقصود سے آگے بڑھ آنا تھا) خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے (اور سو گئے تھے اس وقت اس مچھلی کا ایک قصہ ہوا اور میرا ارادہ آپ سے ذکر کرنے کا ہوا لیکن میں کسی دوسرے دھیان میں لگ گیا) سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا، اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی (ایک عجیب طور پر تو خود زندہ ہو جانا ہے دوسرا عجیب طور یہ کہ وہ مچھلی دریا میں جہاں کو گذری تھی وہاں کا پانی بطور خرق عادت کے اسی طرح سرنگ کے طور پر ہو گیا تھا غالباً پھر مل گیا ہوگا) موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ حکایت سن کر) فرمایا کہ یہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی (وہاں ہی لوٹنا چاہئے) سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے لوٹے (غالباً وہ رستہ سڑک کا نہ ہوگا اس لئے نشان دیکھنے پڑے) سو (وہاں پہونچ کر) انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی (مقبولیت کے معنی میں ولایت اور نبوت دونوں کا احتمال ہے) اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے (یعنی بلا واسطہ اسباب کتساب) ایک خاص طور کا علم سکھلایا تھا (مراد اس سے علم اسرار کونیہ ہے جیسا واقعات آئندہ

سے معلوم ہوگا، اور اس علم کو حصولِ قربِ الٰہی میں کچھ دخل نہیں، جس علم کو قرب میں دخل ہے وہ علم اسرارِ الٰہیہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام بڑھے ہوئے تھے، غرض) موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان کو سلام کیا اور ان سے) فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں (یعنی آپ مجھے اپنی ساتھ رہنے کی اجازت دیجئے، اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو (من جانب اللہ) سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلادیں، ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر (میرے افعال پر) صبر نہ ہو سکے گا (یعنی آپ مجھ پر روک ٹوک کریں گے اور معلم پر تعلیم کے متعلق متعدد کی روک ٹوک کرنے سے مصاحبت مشکل ہے) اور (بھلا) ایسے امور پر (روک ٹوک کرنے سے) آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں (یعنی ظاہر میں وہ امور بوجہ منشا معلوم نہ ہونے کے خلاف شرع نظر آئیں گے اور آپ خلافِ شرع امور پر سکوت نہ کر سکیں گے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (نہیں) ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلافِ حکم نہ کروں گا (یعنی مثلاً اگر روک ٹوک سے منع کر دیں گے میں روک ٹوک نہ کروں گا، اسی طرح اور کسی بات میں بھی خلاف نہ کروں گا) ان بزرگ نے فرمایا کہ (اچھا) تو اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اتنا خیال رہے کہ) مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ اس کے متعلق میں خود ہی ابتداءً ذکر نہ کردوں۔

معارف و مسائل

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ، اس واقعہ میں موسیٰ سے مراد مشہور پیغمبر موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں، نوف بکالی نے جو دوسرے کسی موسیٰ کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے اس پر سخت رد منقول ہے۔

اور فتیٰ کے لفظی معنی نوجوان کے ہیں، جب یہ لفظ کسی خاص شخص کی طرف منسوب کرکے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا خادم مراد ہوتا ہے، کیونکہ خدمت گار اکثر قوی جوان دیکھ کر رکھا جاتا ہے جو ہر کام انجام دے سکے، اور نوکر خادم کو جوان کے نام سے پکارنا اسلام کا حسن ادب ہے کہ نوکروں کو بھی غلام یا نوکر کہہ کر خطاب نہ کرو بلکہ اچھے لقب سے پکارو، اس جگہ فتیٰ کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، اس لئے مراد ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم، اور روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ خادم یوشع بن نون ابن افرائیم بن یوسف علیہ السلام تھے، بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے، مگر اس میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، صحیح روایات سے ان کا نام یوشع بن نون ہونا تو ثابت ہے، باقی اوصاف و حالات کا ثبوت نہیں۔ (قرطبی)

مجمع البحرین کے لفظی معنی ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ مجمع البحرین سے کونسی جگہ مراد ہے، چونکہ قرآن و حدیث میں اس کو معین طور پر نہیں بتلایا، اس لئے آثار و قرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں، قتادہؒ نے فرمایا کہ بحر فارس و روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے، ابن عطیہؒ نے آذربائیجان کے قریب ایک جگہ کو کہا ہے، بعض نے بحر اردن اور بحر قلزم کے ملنے کی جگہ بتلائی ہے، بعض نے کہا یہ مقام طنجہ میں واقع ہے، ابی بن کعبؓ سے منقول ہے کہ یہ افریقہ میں ہے، سدی نے آرمینیہ میں بتلایا ہے، بعض نے بحر اندلس جہاں بحر محیط سے ملتا ہے وہ موقع بتلایا ہے، واللہ اعلم بہرحال اتنی بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مقام معین کر کے بتلا دیا تھا جس کی طرف ان کا سفر واقع ہوا ہے۔ (قرطبی)

قصہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام

اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابی بن کعبؓ اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے) فرمایا کہ "میں سب سے زیادہ علم والا ہوں" (اللہ تعالیٰ اپنے مقرب برگزیدہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے، یعنی یہ کہدیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں اعلم کون ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اعلم ہے، (موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہو تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اعلم ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے) اس لئے عرض کیا یا اللہ مجھے ان کا پتہ نشان بتلایا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو، اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو، جس جگہ پہونچ کر یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے، ان کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے، دوران سفر ایک پتھر کے پاس پہونچکر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے، یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آگئی، اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور (مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ) جس راستہ سے مچھلی دریا میں گئی اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا جریان روک دیا اور اس جگہ

پانی کے اندر ایک سرنگ جیسی ہوگئی، (یوشع بن نون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام سوگئے تھے) جب بیدار ہوئے تو یوشع بن نون مچھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے، اور اس جگہ سے پھر روانہ ہوگئے، پورے یک دن ایک رات کا مزید سفر کیا، جب دوسرے روز کی صبح ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ اس سفر سے کافی تکان ہوچکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (بمقتضائے الٰہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تکان بھی محسوس نہیں ہوا، یہاں تک کہ جس جگہ پہونچنا تھا اس سے آگے نکل آئے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع بن نون کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا، اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا، کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا، کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی، اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ مچھلی تو زندہ ہوکر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزلِ مقصود وہی تھی جہاں مچھلی زندہ ہوکر گم ہوجائے)۔

چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہوگئے، اور ٹھیک اسی راستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے تاکہ وہ جگہ مل جائے، اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے (اسی حال میں) سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس (غیر آباد) جنگل میں سلام کہاں سے آگیا، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو حضرت خضرؑ نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں، اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے، اے موسیٰ! میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں، اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلا دوں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے، اتفاقاً ایک کشتی آگئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی، ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اجرت کے کشتی میں سوار کرلیا، کشتی میں سوار ہوتے ہی خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا، حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے نہ رہا گیا، کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے ہمیں کشتی میں سوار کر لیا آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی کہ یہ سب غرق ہو جائیں، یہ تو آپ نے بہت برا کام کیا خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عذر کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، اس بھول پر آپ سخت گیری نہ کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خضر علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا اور دوسرا بطور شرط کے، اور تیسرا قصداً، اسی اثنا میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چونچ بھر پانی لیا، خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں مل کر بھی اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جتنی اس چڑیا کی چونچ کے پانی کو اس سمندر کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے، اچانک خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ دوسرے لڑکوں میں کھیل رہا ہے، خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا، لڑکا مر گیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا، یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، موسیٰ نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے، اس لئے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے اپنے ساتھ سے الگ کر دیجئے، آپ میری طرف سے عذر کی حد پر پہنچ چکے ہیں۔

اس کے بعد پھر چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گذر ہوا، انھوں نے گاؤں والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجئے، انھوں نے انکار کر دیا، اس بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا، آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے، خضر علیہ السلام نے کہا کہ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ یعنی اب شرط پوری ہو چکی، اس لئے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آگیا ہے،

اس کے بعد خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلا کر کہا ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا "یعنی یہ ہے حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد

فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہیٰ)

صحیح بخاری و مسلم میں یہ طویل حدیث جس طرح آئی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موسیٰ بنی اسرائیل اور نوجوان ساتھی کا نام یوشع بن نون ہونا اور جس بندے کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کی طرف بھیجا گیا تھا ان کا نام خضر ہونا تصریحاً مذکور ہے، آگے آیات قرآن کے ساتھ ان کے مفہوم اور تفسیر کو دیکھئے۔

سفر کے بعض آداب اور لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا یہ جملہ حضرت پیغمبرانہ عزم کا ایک نمونہ ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر یوشع بن نون سے کہا جس کا مطلب اپنے سفر کا رخ اور منزل مقصود رفیق کو بتانا تھا، اس میں بھی حسن ادب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کر دینا چاہئے، متکبر لوگ اپنے خادموں اور نوکروں کو نہ قابل خطاب سمجھتے ہیں نہ اپنے سفر کے متعلق ان کو کچھ بتاتے ہیں۔

حُقُبًا، حُقْبَۃ کی جمع ہے، اہل لغت نے کہا کہ حقبہ اسی سال کی مدت ہو، بعض نے اس سے زیادہ کو حقبہ قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ زمانہ دراز کو کہا جاتا ہے، تحدید و تعیین کچھ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق کو یہ بتلا دیا کہ مجھے مجمع البحرین کی اس جگہ پر پہونچنا ہے جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے، اور عزم یہ ہے کہ کتنا ہی زمانہ سفر میں گذر جائے، جب تک اس منزل مقصود پر نہ پہنچوں سفر جاری رہے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پیغمبرانہ عزم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام سے وصل ہونا موسیٰ علیہ السلام کی خاص تربیت اور ان کے [illegible]

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا، قرآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی کا خاص شرف ان کی مخصوص فضیلت ہے، اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوت میں بھی اختلاف ہے، اور نبوت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں، نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ کوئی خاص امت، اس لئے بہرحال موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے بدرجہا افضل ہیں، لیکن حق تعالیٰ اپنے مقربین کی ادنیٰ سی کمی اور کوتاہی کی اصلاح فرماتے ہیں، ان کی تربیت کے لئے ادنیٰ سی کوتاہی پر بھی سخت عتاب ہوتا ہے، اس کا تدارک بھی ان سے اسی پیمانے پر کرایا جاتا ہے، یہ سارا قصہ اسی خاص انداز تربیت کا مظہر ہے، ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا

کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں، حق تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا تو ان کی تنبیہ کے لئے اپنے ایک ایسے بندے کا ان کو پتہ دیا گیا جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، مگر بہرحال وہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا، ادھر موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلبِ علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے، جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے طالب علمانہ سفر کے لئے تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندے (خضر علیہ السلام) کا پتہ پوچھا، اب یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات یہیں آسانی سے کرا دیتے، یا موسیٰ علیہ السلام ہی کو جب طلب علم کا سفر کرانا تھا تو پتہ صاف بتا دیا جاتا جہاں پہونچنے میں پریشانی نہ ہوتی، مگر ہوا یہ کہ پتہ ایک مبہم بتا دیا گیا کہ جس جگہ پہونچ کر مری ہوئی مچھلی زندہ ہو کر گم **ہو جائے اس جگہ وہ ہمارا بندہ ملے گا۔**

صحیح بخاری کی حدیث سے اس مچھلی کے متعلق اتنا ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لیں، اس سے زائد یہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ مچھلی کھانے کے لئے ساتھ رکھنے کا حکم ہوا تھا یا کھانے سے علیحدہ، دونوں احتمال ہیں، اسی لئے مفسرین میں سے بعض نے کہا کہ یہ بھونی ہوئی مچھلی کھانے کے لئے رکھی گئی تھی، اور اس سفر کے دنوں میں تھی دوران سفر اس میں سے کھاتے بھی رہے، اس کا نصف حصہ کھایا جا چکا تھا، اس کے بعد بطور معجزہ یہ بھونی ہوئی اور آدھی کھائی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔

ابن عطیہ اور بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ مچھلی بطور معجزہ کے پھر دنیا میں باقی بھی رہی اور بہت دیکھنے والوں نے دیکھی بھی کہ اس کی صرف ایک کروٹ ہے دوسری کھائی ہوئی ہے، ابن عطیہ نے خود بھی اپنا دیکھنا بیان کیا ہے (قرطبی)

اور بعض مفسرین نے کہا کہ ناشتہ کھانے کے علاوہ ایک علیحدہ زنبیل میں مچھلی رکھنے کا حکم ہوا تھا، اس کے مطابق رکھ لی گئی تھی، اس میں بھی اتنی بات تو متعین ہے کہ مچھلی مُردہ تھی، زندہ ہو کر دریا میں چلا جانا ایک معجزہ ہی تھا۔

بہرحال حضرت خضر علیہ السلام کا پتہ ایسا مبہم دیا گیا کہ آسانی سے جگہ متعین نہ ہو، ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک مزید امتحان ہی تھا، اس پر مزید امتحان کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ جب عین موقع پر یہ لوگ پہونچ گئے تو مچھلی کو بھول گئے، آیت قرآنی میں یہ بھول حضرت موسیٰ اور ان کے رفیق دونوں کی طرف منسوب کی گئی ہے، نَسِيَا حُوتَهُمَا، لیکن حدیث بخاری سے جو قصہ ثابت ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مچھلی

کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کا وقت آیا تو موسیٰ علیہ السلام سوتے ہوئے تھے، حضرت یوشع بن نون نے یہ واقعہ عجیبہ دیکھا اور ارادہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہو جائیں تو ان کو بتلاؤں گا، مگر بیداری کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر نسیان مسلط کر دیا اور بھول گئے۔ تو یہاں دونوں کی طرف بھولنے کی نسبت ایسی ہوگی جیسے قرآن میں يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں دریائے شیریں اور دریائے شور دونوں سے موتی اور مرجان نکلنے کا بیان آیا ہے، حالانکہ موتی وغیرہ صرف دریائے شور سے نکلتے ہیں مگر محاورات میں تغلیباً ایسا لکھنا ایک عام بات ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے آگے سفر کرنے کے وقت تو مچھلی کو ساتھ لینا دونوں ہی بزرگ بھولے ہوئے تھے، اس لئے دونوں کی طرف نسیان منسوب کیا گیا۔

بہرحال یہ ایک دوسری آزمائش تھی کہ منزل مقصود پر پہنچ کر مچھلی کے زندہ ہو کر پانی میں گم ہو جانے سے حقیقت کھل جاتی ہے اور مقام متعین ہو جاتا ہے، مگر ابھی اس طالب حق کا کچھ اور بھی امتحان لینا تھا، اس لئے دونوں پر بھول مسلط ہوگئی، اور پورے ایک دن اور ایک رات کا مزید سفر طے کرنے کے بعد بھوک اور تکان کا احساس ہوا، یہ تیسرا امتحان تھا، کیونکہ عادۃً تکان اور بھوک کا احساس اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا، وہیں مچھلی یاد آجاتی تو اتنے طویل سفر کی مزید تکلیف نہ ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا کہ کچھ اور مشقت اٹھائے اتنا طویل سفر کرنے کے بعد بھوک پیاس کا احساس ہوا اور وہاں مچھلی یاد آئی اور یہ معلوم ہوا کہ ہم منزل مقصود سے بہت آگے آگئے، اس لئے پھر اسی نشانِ قدم پر واپس ہوئے۔

مچھلی کے دریا میں چلے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ تو سَرَبًا کے لفظ سے آیا ہے، سَرَب کے معنی سرنگ کے ہیں، جو پہاڑوں میں رستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، یا شہروں میں زمین دوز رستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ مچھلی جب دریا میں گئی تو جس طرف کو جاتی پانی میں ایک سرنگ سی بنتی چلی گئی، کہ اس کے جانے کا رستہ پانی سے کھلا رہا، جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہوا، دوسری مرتبہ جب یوشع ابن نون نے موسیٰ علیہ السلام سے اس واقعہ کا ذکر سفر طویل کے بعد کیا وہاں وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا کے الفاظ سے اس واقعہ کو بیان کیا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ پانی کے اندر سرنگ بنتے چلے جانا خود ایک واقعہ عجیبہ خرقِ عادت تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اور ان کی نبوت کا مسئلہ

قرآن کریم میں اگرچہ اس صاحب واقعہ کا نام مذکور نہیں، بلکہ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کہا گیا، مگر صحیح بخاری کی حدیث میں ان کا نام خضر بتلایا گیا ہے، خضر کے لفظی معنی ہرے بھرے کے ہیں، ان کا نام خضر ہونے کی وجہ عامۃ مفسرین نے یہ بتلائی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تو کیسی ہی زمین ہو وہاں گھاس اُگ جاتی، اور

زمین سرسبز ہو جاتی تھی، قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ خضر علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں، ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الٰہی کے ہو نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جا سکتا، اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الٰہی بعض خصوص احکام وہ دیئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انھوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الٰہی سے کیا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں منجانب اللہ سپرد کی گئی تھیں انہی کا علم دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا، تفسیر قرطبی، بحر محیط، ابوحیان اور اکثر تفاسیر میں یہ مضمون بعنوانات مختلف مذکور ہے۔

کسی ولی کو ظاہر شریعت کے حکم کے خلاف ورزی حلال نہیں

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ بہت سے جاہل غلط کار تصوف کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے، بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی ولی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا، یہ کھلا ہوا زندقہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جا سکتا ہے۔

شاگرد پر استاذ کا اتباع لازم ہے

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓي اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی و رسول اور اولوا العزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضر سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ سے آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے، اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل و اعلیٰ بھی ہو (قرطبی، مظہری)۔

عالم شریعت کیلئے جائز نہیں کہ خلاف شرع امر پر صبر کرے

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ

عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے اور کیسے صبر کریں گے جب کہ آپ کو حقیقت امر کی اطلاع نہ ہو، مطلب یہ تھا کہ مجھے جو علم عطا ہوا ہے اس کی نوعیت آپ کے علم سے مختلف ہے، اس لئے آپ کو میرے معاملات قابل اعتراض نظر آئیں گے، جب تک کہ میں ان کی حقیقت سے آپ کو مطلع نہ کر دوں، آپ اپنے فرض منصبی کی بنا پر اس پر اعتراض کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا، اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلاف شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

پہلا واقعہ تو زیادہ سنگین بھی نہیں تھا، صرف کشتی والوں کا مالی نقصان یا غرق ہونے کا صرف خطرہ ہی تھا جو بعد میں رفع ہو گیا، لیکن بعد کے واقعات میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ میں اعتراض نہیں کروں گا، اور جب لڑکے کے قتل کا واقعہ دیکھا تو شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور اپنے اعتراض پر کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر آئندہ اعتراض کروں تو آپ کو حق ہوگا کہ مجھے ساتھ نہ رکھیں، کیونکہ کسی نبی اور پیغمبر سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ خلافِ شرع کام ہوتا دیکھ کر صبر کرے، البتہ چونکہ دوسری طرف بھی پیغمبر ہی تھے اس لئے بالآخر حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ یہ واقعاتِ جزئیہ خضر علیہ السلام کے لئے عام قواعدِ شرعیہ سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا وحیِ الٰہی کے مطابق کیا (مظہری)

علم موسوی اور علم خضری میں ایک بنیادی فرق اور دونوں میں ظاہری تضاد کا حل

یہاں طبعی طور پر یک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی، مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے، ان کی تقریر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاحِ خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جس میں خلق خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول و قواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر

قرآن کریم میں بتصریح نبوت و رسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکۃ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرۂ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کر لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچا لیا جائے یا فلاں کو ہلاک کر دیا جائے فلاں کو ترقی دی جائے فلاں کو زیر کیا جائے ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہیں، ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کر دیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے، وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعات جزئیہ کا عام قانونِ شریعت سے استثناء ہوتا ہے، ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا الجمہور علی ان الخضر نبی وکان علمہ معرفۃ بواطن قد اوحیت الیہ وعلم موسی الاحکام والفتیا بالظاھر (بحر محیط ص ۱۴۷ ج ۶) اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحی نبوت ہو، کسی ولی کا کشف و الہام ایسا استثنا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، اسی لئے حضرت خضر کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے، ان پر کسی غیر نبی کے کشف و الہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نجدہ حروری (خارجی) نے ابن عباسؓ کو خط لکھا کہ خضر علیہ السلام نے لڑکے نابالغ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر کسی بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہو جائے، جو موسیٰ علیہ السلام کے عالم (یعنی خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا تو تمہارے لئے بھی نابالغ کا قتل جائز ہو جائے گا، مطلب یہ تھا کہ خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی نبوت اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو نہیں ہو سکتا

کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جس کو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے (مظہری)، اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا بجز صاحبِ وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا

پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو پھاڑ ڈالا موسیٰ بولا کیا تو نے اس کو پھاڑ ڈالا

لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا (۷۱) قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

کہ ڈبا دے اس کے لوگوں کو البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری۔ بولا میں نے نہ کہا تھا تو نہ

لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (۷۲) قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا

ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، کہا مجھ کو نہ پکڑ میری بھول پر اور مت

تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا (۷۳) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ

ڈال مجھ پر میرا کام مشکل، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا،

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةًۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا نُّكْرًا (۷۴)

موسیٰ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے بیشک تو نے کی ایک چیز نامعقول

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (۷۵)

بولا میں نے تجھ کو نہ کہا تھا کہ تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ

کہا اگر تجھ سے پوچھوں کوئی چیز اس کے بعد تو مجھ کو ساتھ نہ رکھیو، تو اتار چکا

مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا (۷۶) فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ

میری طرف سے الزام، پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب پہنچے ایک گاؤں کے لوگوں تک

اِسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا

کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے انہوں نے نہ مانا کہ ان کو مہمان رکھیں پھر پائی وہاں ایک دیوار

يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾

جو گرا چاہتی تھی اس کو سیدھا کر دیا، بولا موسیٰ اگر تو چاہتا تو لے لیتا اس پر مزدوری

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾

کہا اب جدائی ہے میرے اور تیرے بیچ، اب جتلائے دیتا ہوں تجھ کو پھیر ان باتوں کا جس پر تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصۂ تفسیر

(غرض باہم قول و قرار ہو گیا، پھر دونوں (کسی طرف) چلے (غالباً ان کے ساتھ یوشع علیہ السلام بھی ہوں گے، مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اس لئے ذکر دو کا کیا گیا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہنچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت ہوئی) جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی (کا ایک تختہ نکال کر اس) میں چھید کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کی، ان بزرگ نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا (آخر وہی ہوا، آپ اپنے قول پر نہ رہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں بھول گیا تھا) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ (متابعت) میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے (کہ بھول چوک بھی معاف نہ ہو، بات گئی گذری ہو گئی) پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا موسیٰ (علیہ السلام گھبرا کر) کہنے لگے آپ نے ایک بے گناہ جان کو ہلاک کر دیا (اور وہ بھی) بغیر بدلے کسی جان کے بیشک آپ نے بڑی بے جا حرکت کی (کہ اوّل تو یہ نابالغ کا قتل ہے جس کو قصاص میں بھی قتل کرنا جائز نہیں پھر اس نے تو کسی کو قتل بھی نہیں کیا، یہ فعل پہلے فعل سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ اس میں یقینی نقصان تو صرف مال کا تھا، بیٹھنے والوں کے غرق کا اگرچہ خطرہ تھا، مگر اس کا انسداد کر دیا گیا، پھر لڑکا نابالغ ہر گناہ سے بری) ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ خیر اس مرتبہ اور درگذر کیجئے لیکن)، اگر اس مرتبہ کے بعد میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر

(کی انتہاء کو پہونچ چکے ہیں، اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر پیش نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال انھوں نے قصداً اپنی پیغمبرانہ حیثیت کے مطابق کیا تھا) پھر دونوں (آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گذر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانے کو مانگا (کہ ہم مہمان ہیں)، تو انھوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو (ہاتھ کے اشارے سے بطور خرق عادت کے) سیدھا کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس (کام) پر اجرت ہی لے لیتے (کہ اس وقت کام بھی چلتا اور ان کی بدخلقی کی اصلاح بھی ہوتی) ان بزرگ نے کہا یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے (جیسا کہ آپ نے خود شرط کی تھی) اب میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (جیسا کہ آیات آئندہ میں اس کا بیان آتا ہے)۔

معارف و مسائل

اَخَرَقۡتَهَا لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا جس کی وجہ سے کشتی میں پانی بھر کر غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، مگر تاریخی روایات میں ہے کہ پانی اس کشتی میں داخل نہیں ہوا، خواہ اس لئے کہ خضر علیہ السلام نے ہی پھر اس کی کچھ مرمت کر دی، جیسے بغوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس تختہ کی جگہ خضر علیہ السلام نے ایک شیشہ لگا دیا تھا یا بطور معجزہ پانی کشتی میں نہ آیا، اتنی بات خود قرآن کریم کے سیاق سے معلوم ہو رہی ہے، کہ اس کشتی کو غرقابی کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، جس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا، لفظ غلام عربی زبان کے اعتبار سے نابالغ لڑکے کو کہا جاتا ہے، یہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے کہ وہ نابالغ تھا، اور آگے جو اس کے متعلق آیا نَفۡسًا زَكِيَّةً اس سے بھی اس کے نابالغ ہونے کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ زکیۃ کے معنی ہیں گناہوں سے پاک اور یہ صفت یا پیغمبر کی ہو سکتی ہے یا نابالغ بچے کی جس کے افعال و اعمال پر مواخذہ نہیں، اس کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔

اَهۡلَ قَرۡيَةٍ، یہ بستی جس میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا گذر ہوا اور اس کے

لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں انطاکیہ اور ابن سیرین کی روایت میں ایکہ تھی، اور حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ وہ اندلس کی کوئی بستی تھی (مظہری) واللہ اعلم

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ

وہ جو کشتی تھی سو چند محتاجوں کی جو محنت کرتے تھے دریا میں سو میں نے چاہا کہ

اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

اس میں عیب ڈال دوں اور ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا

اور وہ جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز

طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ

کردے زبردستی اور کفر کر کر، پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے ان کو ان کا رب بہتر اس سے

زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ

پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں، اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں

يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا

کی تھی اس شہر میں اور اس کے نیچے مال گڑا تھا ان کا اور ان کا باپ تھا

صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا

نیک پھر چاہا تیرے رب نے کہ وہ پہنچ جائیں اپنی جوانی کو اور نکالیں اپنا مال

كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ

گڑا ہوا مہربانی سے تیرے رب کی اور میں نے یہ نہیں کیا اپنے حکم سے

ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ع

یہ ہے پھیر ان چیزوں کا جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

ع ۱۰/۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور وہ جو کشتی تھی سو چند غریب آدمیوں کی تھی (جو اس کے ذریعہ) دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے (اسی پر ان کی گذر اوقات تھی)، سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور (وجہ اس کی یہ تھی کہ) ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا (اگر میں کشتی میں عیب ڈال کر بظاہر بیکار نہ کر دیتا تو یہ کشتی بھی چھین لی جاتی اور ان غریبوں کی مزدوری کا سہارا بھی ختم ہو جاتا، اس لئے توڑنے میں یہ مصلحت تھی) اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے (اور اگر وہ بڑا ہوتا تو کافر ظالم ہوتا اور ماں باپ کو اس سے محبت بہت تھی) سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے (یعنی بیٹے کی محبت کے سبب وہ بھی بے دینی میں اس کا ساتھ نہ دینے لگیں) پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ (اس کا تو قصہ تمام کر دیا جائے پھر) اس کے بدلے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) جو کہ پاکیزگی (یعنی دین) میں اس سے بہتر ہو اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں (رہتے) ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو اُن کے باپ سے میراث میں پہونچا ہے) اور ان کا باپ (جو مر گیا ہے وہ) ایک نیک آدمی تھا (اس کے نیک ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اولاد کے مال کو محفوظ کرنا چاہا، اگر دیوار ابھی گر جاتی تو لوگ یہ مال لوٹ لے جاتے اور غالباً جو شخص ان یتیم لڑکوں کا سرپرست تھا اس کو اس خزانے کا علم ہوگا وہ یہاں موجود نہ ہوگا جو انتظام کر لیتا)، اس لئے آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور (یہ سارے کام میں نے اللہ کے حکم سے کئے ہیں ان میں سے) کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت اُن باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا، (جس کو میں حسب وعدہ بتلا چکا ہوں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے رخصت ہو گئے)۔

معارف و مسائل

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ، یہ کشتی جن مسکینوں کی تھی ان کے متعلق کعب سے منقول ہے کہ وہ دس بھائی تھے جن میں پانچ اپاہج معذور تھے، پانچ محنت مزدوری کر کے سب کے لئے معاش کا انتظام کرتے تھے، اور مزدوری ان کی یہ تھی کہ دریا میں ایک کشتی

چلاتے اور اس کا کرایہ حاصل کرتے تھے۔

مسکین کی تعریف بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس کی حاجت اصلیہ ضروریہ سے زائد بقدر نصاب ہو جائے، اس سے کم مال ہو تو وہ بھی مسکین کی تعریف میں داخل ہے، کیونکہ جن لوگوں کو اس آیت میں مساکین کہا گیا ہے ان کے پاس کم از کم ایک کشتی تو تھی جس کی قیمت مقدار نصاب سے کم نہیں ہوتی، مگر چونکہ وہ حاجاتِ اصلیہ ضروریہ میں مشغول تھی، اس لئے ان کو مساکین ہی کہا گیا (مظہری)

مَلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا، بغوی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ یہ کشتی جس طرف جارہی تھی وہاں ایک ظالم بادشاہ تھا جو ادھر سے گذرنے والوں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت خضر نے اس مصلحت سے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا کہ وہ ظالم بادشاہ اس کشتی کو شکستہ دیکھ کر چھوڑ دے، اور یہ مساکین اس مصیبت سے بچ جائیں، دانائے روم نے خوب فرمایا ہے

گر خضر در بحر کشتی را شکست ؛ صد درستی در شکستِ خضر ہست

وَاَمَّا الْغُلٰمُ، یہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ اس لڑکے کی طبیعت میں کفر، اور والدین کے خلاف سرکشی تھی، والدین اس کے نیک صالح تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں خطرہ تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ان صالح ماں باپ کو ستائے گا، اور تکلیف پہنچائے گا، اور کفر میں مبتلا ہو کر ماں باپ کے لئے بھی ایک فتنہ بنے گا، اس کی محبت میں ماں باپ کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا، یعنی اس لئے ہم نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان صالح ماں باپ کو اس لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دیدے، جو اعمال و اخلاق میں پاکیزہ بھی ہو اور ماں باپ کے حقوق کو بھی پورا کرے۔

اس واقعہ میں خَشِيْنَا، اور اَرَدْنَا میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ارادہ اور خشیت خضر علیہ السلام نے اپنی اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف منسوب کیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنی ہی طرف منسوب کیا ہو تو پھر اَرَدْنَا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اللہ سے دعا کی، کیونکہ کسی لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا معاملہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں خضرؑ یا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں یہ شبہ کرنا درست نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لڑکا

کافر ہوگا، اور ماں باپ کو بھی گمراہ کرے گا، تو پھر واقعۂ علم الٰہی کے مطابق ایسا ہی واقع ہونا ضروری تھا، کیونکہ علمِ الٰہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

جواب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں اس تعلیق و شرط کے ساتھ تھا کہ یہ بالغ ہوگا تو کافر ہوگا اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ بنے گا، پھر چونکہ وہ عمر بلوغ سے پہلے ہی قتل کردیا گیا تو جو واقعہ پیش آیا وہ اس علمِ الٰہی کے منافی نہیں (مظہری)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے بروایت عطیہ نقل کیا ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا، اور ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی پیدا ہوئے، بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی اُمت کو ہدایت فرمائی۔

وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا، یہ خزانہ جو یتیم بچوں کے لئے زیر دیوار دفن تھا اس کے متعلق حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ تھا (رواہ الترمذی والحاکم وصححہ از مظہری)

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے مندرجہ ذیل کلمات لکھے ہوئے تھے، یہ روایت حضرت عثمان بن عفان رضؓ نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی (قرطبی)

۱۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔
۲۔ تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہو پھر غمگین کیونکر ہوتا ہے
۳۔ تعجب ہے اس شخص پر جو اس پر ایمان رکھتا ہے کہ رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے پھر ضرورت سے زیادہ مشقت اور فضول قسم کی کوشش میں کیوں لگتا ہے۔
۴۔ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر خوش و خرم کیسے رہتا ہے۔
۵۔ تعجب ہے اس شخص پر جو حسابِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے پھر غفلت کیسے برتتا ہے۔
۶۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کو اور اس کے انقلابات کو جانتا ہے پھر کیسے اس پر مطمئن ہوکر بیٹھتا ہے۔
۷۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

والدین کی نیکی کا فائدہ اولاد در اولاد کو بھی پہنچتا ہے

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا، اس میں اشارہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے مدفون خزانے کی حفاظت کا سامان بذریعہ خضر علیہ السلام اس لئے کرایا گیا تھا کہ ان یتیم

بچوں کا باپ کوئی مردِ صالح اللہ کے نزدیک مقبول تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کرنے اور اس کی اولاد کو فائدہ پہونچانے کا یہ انتظام فرمایا، محمد بن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کی نیکی اور صالحیت کی وجہ سے اس کی اولاد، اور اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی اور اس کے آس پاس کے مکانات کی حفاظت فرماتے ہیں (مظہری)

قرطبی میں ہے کہ حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس شہر اور پورے علاقہ کے لئے امان ہوں جب اُن کی وفات ہوگئی تو ان کے دفن ہوتے ہی کفار دیلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کرلیا، اس وقت لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ ہم پر دوہری مصیبت ہے یعنی شبلی کی وفات اور دیلم کا قبضہ (قرطبی، ص ۲۹ ج ۱۱)

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگوں کو بھی علماء و صلحاء کی اولاد کی رعایت اور اُن پر شفقت کرنی چاہئے جب تک کہ وہ بالکل ہی کفر و فسق و فجور میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا، لفظ اَشُدّ، شدّۃ کی جمع ہے، مراد قوت ہے، اور وہ عمر جس میں انسان اپنی پوری قوت اور بھلے برے کی پہچان پر قادر ہوجاتا ہے، ابوحنیفہؒ کے نزدیک پچیس سال کی عمر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چالیس سال عمر ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (مظہری)

پیغمبرانہ بلاغت اور رعایتِ ادب کی ایک مثال اس مثال کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہوسکتا، خیر و شر سب اس کی مخلوق اور اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، جن امور کو شر یا برا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ خاص افراد اور خاص حالات کے اعتبار سے ضرور شر اور برا کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، مگر مجموعۂ عالم اور عالمِ دنیا کے مزاج کے لئے سب ضروری اور تخلیقِ الٰہی کے اعتبار سے سب خیر ہی ہوتے ہیں، اور سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

خلاصہ یہ ہے کہ جو آفت یا حادثہ دنیا میں پیش آتا ہے، خدا تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس لحاظ سے ہر خیر و شر کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی طرف ہوسکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تخلیق کے اعتبار سے کوئی شر شر نہیں ہوتا، اس لئے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلمات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ

اسی تعلیم و ادب کا سبق دیتے ہیں کہ کھلانے پلانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف فرمائی، پھر بیماری کے وقت شفا دینے کی نسبت بھی اسی کی طرف کی، درمیان میں بیمار ہونے کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ، یعنی جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے شفا عطا فرماتے ہیں، یوں نہیں کہا کہ جب وہ مجھے بیمار کرتے ہیں تو شفا بھی دیتے ہیں۔

اب حضرت خضر علیہ السلام کے کلام پر غور کیجئے انہوں نے جب کشتی توڑنے کا ارادہ کیا تو وہ چونکہ ظاہر میں ایک عیب اور برائی ہے اس کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف کر کے فرمایا اَرَدْتُّ، پھر لڑکے کو قتل کرنے اور اس کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا ذکر کیا تو اس میں قتل تو برائی تھی، اور بدلے میں بہتر اولاد دینا ایک بھلائی تھی، امر مشترک ہونے کی وجہ سے یہاں بصیغۂ جمع متکلم فرمایا اَرَدْنَا، یعنی ہم نے ارادہ کیا، تاکہ اس میں جتنا ظاہری شر ہے وہ اپنی طرف اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، تیسرے واقعہ میں دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کر دینا سراسر خیر ہی خیر ہے، اس کی نسبت پوری حق تعالیٰ کی طرف کر کے فرمایا فَاَرَادَ رَبُّكَ، یعنی آپ کے رب نے ارادہ کیا۔

خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہو چکی

قرآن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں، جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے داخل ہوئے، اور لوگوں کے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اندر پہنچے اور رونے لگے، پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے:۔

اِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِّنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَّعِوَضًا مِّنْ كُلِّ فَائِتٍ وَّخَلَفًا مِّنْ كُلِّ هَالِكٍ فَاِلَى اللّٰهِ فَاَنِيْبُوْا وَاِلَيْهِ فَارْغَبُوْا وَنَظَرُهٗ اِلَيْكُمْ فِي الْبَلَاءِ فَانْظُرُوْا فَاِنَّمَا الْمُصَابُ مَنْ لَّمْ يُجْبَرْ۔

"اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلہ ہے ہر فوت ہونے والی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے ہر ہلاک ہونے والے کا، اس لئے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی طرف رغبت کرو، اور اس بات کو دیکھو کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کر کے آزماتا ہے اصل مصیبت زدہ وہ ہے جس کی مصیبت کی تلافی نہ ہو۔"

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر رخصت ہوگئے تو حضرت ابوبکر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام تھے، اس روایت کو جزریؒ نے حصن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایت اس میں درج کرتے ہیں۔

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ دجال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلے گا جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا، یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا، ابو اسحٰق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (قرطبی)

اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الہواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو خضر علیہ السلام نے ان کو ایک دعا بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہے وہ دعا یہ ہے:۔

يَامَنْ لَّا يَشْغَلُهٗ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ وَّيَامَنْ لَّا تُغْلِطُهُ الْمَسَائِلُ وَيَامَنْ لَّا يَبْرَمُ مِنْ اِلْحَاحِ الْمُلِحِّيْنَ اَذِقْنِيْ بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ مَغْفِرَتِكَ (قرطبی)	"اے وہ ذات جسکو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا، اور وہ ذات جو دعا میں الحاح و اصرار کرنے، دربارہ کہنے سے ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عفو و کرم کا ذائقہ چکھا دیجئے، اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمائیے"

اور پھر اسی کتاب میں بعینہٖ یہی واقعہ اور یہی دعا، اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا ہے (قرطبی)

اسی طرح اولیاء امت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخر حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپؐ کھڑے ہوگئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے:

اَرَءَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَاِنَّ عَلٰى رَاْسِ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ	"کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو اس رات سے سو سال گذرنے پر کوئی شخص ان میں زندہ نہ رہے گا جو آج زمین کے اوپر ہے"

۴۰

حضرت ابن عمرؓ نے یہ روایت نقل کرکے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن ختم ہو جائے گا۔

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بھی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے لیکن علامہ قرطبیؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں جو حیاتِ خضرؑ کو باطل کہتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کے لئے عموم کے الفاظ ہیں اور عموم بھی مؤکد کرکے دیا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو، کیونکہ اولادِ آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کئے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ عَلَى الْاَرْضِ میں الف لام عہد کا ہے، اور مراد ارض سے ارضِ عرب ہے، پوری زمین جس میں ارضِ یاجوج ماجوج اور بلادِ مشرق اور جزائر جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قرطبی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختمِ نبوت کو حیاتِ خضر کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختمِ نبوت کے منافی نہیں حضرت خضرؑ کی حیات بھی ایسی ہی ہوسکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضر پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود ہوتے تو اُن پر لازم تھا کہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپؐ کے تابع ہو کر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے، کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ" یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا (کیونکہ میرے آنے سے دینِ موسوی منسوخ ہوچکا ہے)۔ لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوت عام انبیاء کی شریعت سے مختلف ہو، ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کے لئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں، رہا اتباعِ شریعتِ محمدیہ تو اس میں کوئی بُعد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے انھوں نے اپنا عمل شریعتِ محمدیہ پر شروع کردیا ہو، واللہ اعلم۔

ابوحیان نے تفسیر بحرِ محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:

وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰٓى اَنَّهٗ مَاتَ (بحر محیط، ص ۱۴۷ ج ۶)

"جمہور علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام کی وفات ہوگئی"

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل

اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکاشفہ سے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالم کشف میں دریافت کیا انھوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت وحیات سے ہمارا کوئی اعتقادی یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث وتحیص کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورۂ صدر تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳ۭ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو کہہ اب پڑھتا ہوں تمھارے آگے اس کا کچھ احوال

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝۸۴ۙ فَاَتْبَعَ

ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان، پھر پیچھے پڑا

سَبَبًا ۝۸۵ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ

ایک سامان کے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ پایا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی

حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ

ندی میں اور پایا اس کے پاس لوگوں کو ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تُو لوگوں کو تکلیف دے

وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ

اور یا رکھ ان میں خوبی، بولا جو کوئی ہوگا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے،

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸۷ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ

پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس وہ عذاب دیگا اس کو برا عذاب، اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا

صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ اِۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝۸۸ۭ

کام سو اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی۔

خلاصۂ تفسیر

ذُوالقرنین کا پہلا سفر

اور یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں (اس پوچھنے کی وجہ یہ تھی ہے کہ ان کی تاریخ قریب قریب گم تھی، اور اسی لئے اس قصہ کے جو امور قرآن میں مذکور نہیں کہ وہ اصل قصہ سے زائد تھے، ان امور کے متعلق آج تک اہل تاریخ میں اختلافات شدید پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے قریش مکہ نے بمشورہ یہودِ مدینہ اس قصہ کا سوال کے لئے انتخاب کیا تھا، اس لئے اس قصہ کی تفصیلات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل ہے) آپ فرما دیجئے کہ میں اس کا ذکر ابھی تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں (آگے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی حکایت شروع ہوئی کہ ذوالقرنین ایک ایسے جلیل القدر بادشاہ ہو گذرے ہیں کہ) ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے ان کو ہر قسم کا سامان رکافی) دیا تھا (جس سے وہ اپنے شاہی منصوبوں کو پورا کر سکیں) چنانچہ وہ (بارادہ فتوحات ملکِ مغرب) ایک راہ پر ہو لئے (اور سفر کرنا شروع کیا) یہاں تک کہ جب (سفر کرتے کرتے درمیانی شہروں کو فتح کرتے ہوئے) غروبِ آفتاب کے موقع (یعنی جانبِ مغرب میں انتہائی آبادی) پر پہونچے تو آفتاب ان کو ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا (مراد اس سے غالباً سمندر ہے کہ اس کا پانی اکثر جگہ سیاہ نظر آتا ہے، اور اگرچہ آفتاب حقیقۃً سمندر میں غروب نہیں ہوتا مگر سمندر سے آگے نگاہ نہ جاتی ہو تو سمندر ہی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوگا) اور اس موقع پر انھوں نے ایک قوم دیکھی (جن کے کافر ہونے پر اگلی آیت اَمَّا مَنْ ظَلَمَ دلالت کرتی ہے) ہم نے (بصورتِ الہام یا اس زمانے کے پیغمبر کے واسطے سے) یہ کہا کہ اے ذوالقرنین (اس قوم کے بارے میں دو اختیار ہیں، خواہ (ان کو ابتداء ہی سے قتل وغیرہ کے ذریعہ) سزا دو اور خواہ ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کرو (یعنی ان کو ایمان کی دعوت دو پھر نہ مانیں تو قتل کردو، بغیر تبلیغ و دعوت کے ابتداء ہی قتل کرنے کا اختیار شاید اس لئے دیا گیا ہو کہ ان کو اس سے پہلے کسی ذریعہ سے دعوت ایمان پہونچ چکی ہوگی، لیکن دوسری صورت یعنی پہلے دعوت پھر قتل کا بہتر ہونا اشارہ سے بیان کردیا، کہ اس دوسری صورت کو اتخاذِ حسن سے تعبیر فرمایا) ذوالقرنین نے عرض کیا کہ (میں دوسری ہی صورت اختیار کرکے پہلے ان کو دعوتِ ایمان دوں گا) لیکن (دعوتِ ایمان کے بعد) جو ظالم (یعنی کافر) رہے گا سو اس کو تو ہم لوگ (قتل وغیرہ کی) سزا دیں گے (اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) پھر وہ (مرنے کے بعد) اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو (دوزخ کی) سخت سزا دے گا، اور جو شخص (دعوتِ ایمان کے بعد) ایمان لے آئے گا

اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لئے (آخرت میں بھی) بدلے میں بھلائی ملے گی اور ہم بھی (دنیا میں) اپنے برتاؤ میں اس کو آسان (اور نرم) بات کہیں گے (یعنی ان پر کوئی عملی سختی تو کیا کی جاتی زبانی اور قولی بھی کوئی سختی نہیں کی جائے گی)

معارف و مسائل

یَسْئَلُوْنَكَ (یعنی وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں) یہ لوگ سوال کرنے والے کون ہیں روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قریشِ مکہ تھے جن کو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور حقانیت کا امتحان کرنے کے لئے تین سوال بتلائے تھے، رُوح کے متعلق اور اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں، ان میں دو کا جواب آچکا ہے، اصحابِ کہف کا قصہ ابھی گذرا ہے، اور روح کا سوال پچھلی سورۃ کے آخر میں گذر چکا ہے، یہ تیسرا سوال ہے کہ ذوالقرنین کون تھا اور اس کو کیا حالات پیش آئے (بحر محیط)

ذوالقرنین کون تھے؟ کس زمانے اور کس ملک میں تھے؟ اور ان کو ذوالقرنین کہنے کی وجہ

ذوالقرنین کا نام ذوالقرنین کیوں ہوا، اس کی وجہ میں بے شمار اقوال اور سخت اختلافات ہیں، بعض نے کہا کہ ان کی دو زلفیں تھیں اس لئے ذوالقرنین کہلائے، بعض نے کہا کہ مشرق و مغرب کے ممالک پر حکمران ہوئے اس لئے ذوالقرنین نام رکھا گیا، کسی نے یہ بھی کہا کہ ان کے سر پر کچھ ایسے نشانات تھے جیسے سینگ کے ہوتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ ان کے سر پر دونوں جانب چوٹ کے نشانات تھے اس لئے ذوالقرنین کہا گیا، واللہ اعلم، مگر اتنی بات متعین ہے کہ قرآن نے خود ان کا نام ذوالقرنین نہیں رکھا، بلکہ یہ نام یہود نے بتلایا ان کے یہاں اس نام سے ان کی شہرت ہوگی، واقعہ ذوالقرنین کا جتنا حصہ قرآن کریم نے بتلایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ:-

"وہ ایک صالح عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہونچے اور ان کے ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے عطا کر دیئے گئے تھے، انھوں نے فتوحات کرتے ہوئے تین اطراف میں سفر کئے، مغرب اقصیٰ تک اور مشرق اقصیٰ تک، پھر جانب شمال میں کوہستانی سلسلے تک اسی جگہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا جس سے یاجوج ماجوج کی تاخت و تاراج سے اس علاقہ کے لوگ محفوظ ہو گئے،

یہود نے جو سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت و نبوت کا امتحان کرنے کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس جواب سے مطمئن ہوگئے، انھوں نے مزید یہ سوالات نہیں کئے، کہ ان کا نام ذوالقرنین کیوں تھا، یہ کس ملک میں اور کس زمانے میں تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کو خود یہود نے بھی غیر ضروری اور فضول سمجھا، اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تاریخ و قصص کا صرف اتنا حصہ ذکر کرتا ہے جس سے کوئی فائدہ دین یا دنیا کا متعلق ہو یا جس پر کسی ضروری چیز کا سمجھنا موقوف ہو، اس لئے نہ قرآن کریم نے ان چیزوں کو بتلایا اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی یہ تفصیلات بیان کی گئیں، اور نہ قرآن مجید کی کسی آیت کا سمجھنا ان چیزوں کے علم پر موقوف ہے، اسی لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اب معاملہ صرف تاریخی روایت کا، یا موجودہ تورات و انجیل کا رہ گیا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کو بھی مسلسل تحریفات نے یک آسمانی کتاب کی حیثیت میں نہیں چھوڑا، ان کا مقام بھی اب زیادہ سے زیادہ ایک تاریخ ہی کا ہو سکتا ہے، اور زمانۂ قدیم کی تاریخی روایات زیادہ تر اسرائیلی قصوں کہانیوں سے ہی پُر ہیں جن کی نہ کوئی سند ہے، نہ وہ کسی زمانے کے عقلاء و حکماء کے نزدیک قابلِ اعتماد پائی گئی ہیں، حضرات مفسرین نے بھی اس معاملہ میں جو کچھ لکھا وہ سب انہی تاریخی روایات کا مجموعہ ہے، اسی لئے ان میں اختلافات بے شمار ہیں، اہل یورپ نے اس زمانے میں تاریخ کو بڑی اہمیت دی، اس پر تحقیق و تفتیش میں بلاشبہ بڑی محنت و کاوش سے کام لیا آثار قدیمہ کی کھدائی اور وہاں کے کتبات وغیرہ کو جمع کر کے ان کے ذریعہ قدیم واقعات کی حقیقت تک پہونچنے میں وہ کام انجام دیئے جو اس سے پہلے زمانہ میں نظر نہیں آتے، لیکن آثارِ قدیمہ اور ان کے کتبات سے کسی واقعہ کی تائید میں مدد تو مل سکتی ہے مگر خود ان سے کوئی واقعہ پورا نہیں پڑھا جا سکتا، اس کے لئے تو تاریخی روایات ہی بنیاد بن گئی ہیں، اور ان معاملات میں زمانۂ قدیم کی تاریخی روایات کا حال ابھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، قدیم و جدید علماءِ تفسیر نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایات ایک تاریخی حیثیت ہی سے نقل کی ہیں، جن کی صحت پر کوئی قرآنی مقصد موقوف نہیں، یہاں بھی اسی حیثیت سے بقدرِ ضرورت لکھا جاتا ہے، اس واقعہ کی پوری تفتیش و تحقیق مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں لکھی ہے، تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ پوری دنیا پر سلطنت و حکومت کرنے والے چار بادشاہ ہوئے ہیں، دو مؤمن اور دو کافر، مؤمن بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں

اور کافر نمرود اور بخت نصر ہیں۔

ذوالقرنین کے معاملہ میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس نام سے دنیا میں متعدد آدمی مشہور ہوئے ہیں، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہر زمانے کے ذی القرنین کے ساتھ لقب سکندر بھی شامل ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک بادشاہ سکندر کے نام سے معروف و مشہور ہے جس کو سکندر یونانی، مقدونی، رومی وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا وزیر ارسطو تھا، اور جس کی جنگ دارا سے ہوئی اور اسے قتل کر کے اس کا ملک فتح کیا، سکندر کے نام سے دنیا میں معروف ہونے والا آخری شخص یہی تھا، اسی کے قصے دنیا میں زیادہ مشہور ہیں بعض لوگوں نے اس کو بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین کہہ دیا، یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ شخص آتش پرست مشرک تھا، قرآن کریم نے جس ذوالقرنین کا ذکر کیا ہے، ان کے نبی ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مؤمن صالح ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور خود قرآن کی نصوص اس پر شاہد ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بحوالہ ابن عساکر اس کا پورا نسب نامہ لکھا ہے، جو اوپر جا کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملتا ہے، اور فرمایا کہ یہی وہ سکندر ہے جو یونانی مصری مقدونی کے ناموں سے معروف ہے، جس نے اپنے نام پر شہر اسکندریہ آباد کیا، اور روم کی تاریخ اسی کے زمانے سے چلتی ہے، اور یہ سکندر ذی القرنین اول سے ایک طویل زمانے کے بعد ہوا ہے، جو دو ہزار سال سے زائد بتلایا جاتا ہے، اسی نے دارا کو قتل کیا اور شاہانِ فارس کو مغلوب کر کے ان کا ملک فتح کیا، مگر یہ شخص مشرک تھا، اس کو قرآن میں مذکور ذوالقرنین قرار دینا سر سر غلطی ہے، ابن کثیر کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

فاما ذوالقرنین الثانی فهو اسكندر بن فيلبس بن مصريم بن هرمس بن ميطون بن رومی بن نعطی بن یونان بن یافث بن یونه بن شرخون بن رومه بن شرخط بن توفيل بن رومی بن الاصفر بن یقز بن العيص بن اسحٰق بن ابرٰهيم الخليل عليه الصلوٰة والسلام كذا نسبه الحافظ ابن عساكر فی تاریخه المقدونی، اليونانی المصری بانی الاسكندرية الذی يؤرخ بايامه الروم وكان متأخراً عن الاول بدهر طويل وكان هذا قبل المسيح بنحو من ثلثمائة سنة وكان ارطاطاليس الفيلسوف وزيره وهو الذی قتل دارا و اذل ملوك الفرس واوطأ ارضهم وانما نبهنا عليه لان كثيراً من الناس يعتقد انهما واحد وان المذكور فی القرآن هو الذی كان ارطاطاليس وزيره فيقع بسبب ذلك خطاء كبير وفساد عريض طويل فان الاول كان عبداً مؤمناً صالحاً وملكا

عادلاً وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیًّا علی ما قررناہ قبل ھذا واما الثانی فکان مشرکا کان وزیرہ فیلسوفًا وقد کان بین زمانیھما ازید من الفی سنۃ واین ھذا من ھذا لا یستویان ولا یشتبھان الا علی غبی لا یعرف حقائق الامور (البدایۃ والنہایۃ ص۱۰۶ ج۲)

حدیث وتاریخ کے امام ابن کثیرؒ کی اس تحقیق سے ایک تو یہ مغالطہ رفع ہوا کہ یہ اسکندر جو حضرت مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے گذرا ہے، جس کی جنگ دارا اور ملوکِ فارس سے ہوئی، اور بانی اسکندریہ ہے، یہ وہ ذوالقرنین نہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، یہ مغالطہ بعض اکابر مفسرین کو بھی لگا ہے، ابوحیان نے بحر محیط میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو ذوالقرنین مذکور فی القرآن کہہ دیا ہے۔

دوسری بات وَاِنَّہٗ کَانَ نَبِیًّا کے جملے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن کثیرؒ کے نزدیک ان کا نبی ہونا راجح ہے، اگرچہ جمہور کے نزدیک راجح وہ قول ہے جو خود ابن کثیرؒ نے بروایت ابی الطفیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ نہ وہ نبی تھے نہ فرشتہ بلکہ ایک نیک صالح مسلمان تھے اسی لئے بعض علماء نے یہ توجیہ کی کہ اِنَّہٗ کَانَ کی ضمیر ذوالقرنین کی طرف نہیں خضر علیہ السلام کی طرف راجع ہے، وھو الاقرب۔

اب مسئلہ یہ رہتا ہے کہ پھر وہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے کون ہیں اور کس زمانے میں ہوئے ہیں، اس کے متعلق بھی علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں، ابن کثیرؒ کے نزدیک ان کا زمانہ اسکندر یونانی مقدونی سے دو ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے اور ان کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں سلف صالحین سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ذوالقرنین پیادہ پا حج کے لئے پہونچے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے آنے کا علم ہوا تو مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا، اور حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کے لئے دعاء بھی کی اور کچھ وصیتیں اور نصیحتیں بھی ان کو فرمائیں (البدایہ ص۱۰۸ ج۲) اور تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ ازرقی نقل کیا ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ طواف کیا، پھر قربانی دی۔

اور ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ میں کہا ہے کہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے ابوبکر بن سمی بن عمر بن افریقیس حمیری ہے جس نے زمین کے مشارق و مغارب کو فتح کیا، اور تبع حمیری یمنی نے اپنے اشعار میں اس پر فخر کیا ہے کہ میرے دادا ذوالقرنین مسلمان تھے، ان کے اشعار یہ ہیں ؎

قد کان ذوالقرنین جدی مسلمًا ⁂ ملکًا علا فی الارض غیر مبعّد

تَبَعُ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ يَبْتَغِي نَسَبًا مِنْ كَرِيمٍ سَيِّدٍ

یہ روایت بحر محیط میں ابوحیان نے نقل کی ہے، ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں اس کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ ذوالقرنین تبابعہ یمن میں سب سے پہلا تبع ہے، اور یہی وہ شخص ہے جس نے بیر سبع کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فیصلہ دیا تھا (البدایہ ص ۱۰۵ ج ۲) ان تمام روایات میں ان کی شخصیت اور نام و نسب کے بارے میں اختلاف ہونے کے باوجود ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ بتلایا گیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں جو ذوالقرنین کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن فارس کا وہ بادشاہ ہے جس کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں جس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے دانیال ؑ کا زمانہ بتلایا جاتا ہے، جو سکندر مقدونی قاتل دارا کے زمانے کے قریب قریب ہوجاتا ہے، مگر مولانا موصوف نے بھی ابن کثیر وغیرہ کی طرح اس کا شدت سے انکار کیا ہے کہ ذوالقرنین وہ سکندر مقدونی جس کا وزیر ارسطو تھا وہ نہیں ہوسکتا، وہ مشرک آتش پرست تھا، یہ مؤمن صالح تھے۔

مولانا موصوف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورۂ بنی اسرائیل میں جو دو مرتبہ بنی اسرائیل کے شر و فساد میں مبتلا ہونے اور دونوں مرتبہ کی سزا کا ذکر تفصیل سے آیا ہے اس میں بنی اسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر جو قرآن کریم نے فرمایا ہے بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ (یعنی تمہارے فساد کی سزا میں ہم مسلط کردیں گے تم پر اپنے کچھ ایسے بندے جو بڑی قوت و شوکت والے ہوں گے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑیں گے) اس میں یہ قوت و شوکت والے لوگ بخت نصر اور اس کے اعوان ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں چالیس ہزار اور بعض روایت میں ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو قید کرکے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا، اور اس کے بعد جو قرآن کریم نے فرمایا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (یعنی ہم نے پھر لوٹادیا تمہارا غلبہ ان پر) یہ واقعہ اسی کیخسرو خورس بادشاہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا، یہ مؤمن صالح تھا، اس نے بخت نصر کا مقابلہ کرکے اس کے قیدی بنی اسرائیل کو اس کے قبضہ سے نکالا، اور دوبارہ فلسطین میں آباد کیا، بیت المقدس کو جو ویران کردیا تھا اس کو بھی دوبارہ آباد کیا، اور بیت المقدس کے خزائن اور اہم سامان جو بخت نصر یہاں سے لے گیا تھا وہ سب

واپس بنی اسرائیل کے قبضہ میں دیدیے، اس لئے یہ شخص بنی اسرائیل (یہود) کا نجات دہندہ ثابت ہوا۔

یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہود مدینہ نے جو امتحان نبوت کے لئے قریش مکہ کے واسطے سوالات متعین کئے ان میں ذوالقرنین کے سوال کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ یہود اس کو اپنا نجات دہندہ مان کر اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی اس تحقیق پر موجودہ تورات کے حوالہ سے انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں سے بھی تاریخی روایات سے اس پر کافی شواہد پیش کئے ہیں، جو صاحب مزید تحقیق کے درپے ہوں وہ اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، میرا مقصد ان تمام روایات کے نقل کرنے سے صرف اتنا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت اور ان کے زمانے کے بارے میں علماء امت اور ائمہ تاریخ و تفسیر کے اقوال سامنے آجائیں، ان میں سے راجح کس کا قول ہے یہ میرے مقصد کا جزء نہیں، کیونکہ جن امور کا نہ قرآن نے دعویٰ کیا نہ حدیث نے ان کو بیان کیا ان کے معین و مبین کرنے کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں، اور ان میں جو قول بھی راجح اور صحیح قرار پائے مقصد قرآنی ہر حال میں حاصل ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم، آگے آیات کی تفسیر دیکھئے:

قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا، اس میں یہ قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ ذکرہٗ کا مختصر لفظ چھوڑ کر مِنْهُ ذِكْرًا کے دو کلمے کیوں اختیار کئے، غور کیجئے تو ان دو کلموں میں اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کا پورا قصہ اور اس کی تاریخ ذکر کرنے کا وعدہ نہیں کیا، بلکہ اس کے ذکر کا ایک حصہ بیان کرنے کے لئے فرمایا، جس پر حرف مِنْ اور ذِكْرًا کی تنوین بقواعد عربیت شاہد ہے، اور جو تاریخی بحث ذوالقرنین کے نام و نسب اور زمانے وغیرہ کی لکھی گئی ہے، قرآن کریم نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دینے کا پہلے ہی اظہار فرما دیا ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا، لفظ سبب عربی لغت میں ہر اس چیز کیلئے بولا جاتا ہے جس سے اپنے مقصد حاصل کرنے میں مدد لی جاتی ہے جس میں آلات و وسائل مادیہ بھی شامل ہیں اور علم و بصیرت و تجربہ وغیرہ بھی (بحر محیط) اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی ضرورت نظام سلطنت کے لئے ایک بادشاہ اور حکمران کو پیش آتی ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو اپنی عدل گستری، امن عامہ کے قیام اور فتوحات ممالک کے لئے جس جس سامان کی ضرورت اس زمانے میں تھی وہ سب کے سب ان کو عطا کر دیئے گئے تھے۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا، مراد یہ ہے کہ سامان تو ہر قسم کے اور دنیا کے ہر خطہ میں پہونچنے کے ان کو دیدیئے گئے تھے، انھوں نے سب سے پہلے جانب مغرب سفر کے سامان سے کام لیا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ، مراد یہ ہے کہ جانب مغرب میں اُس حد تک پہنچ گئے جس سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔

فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ، لفظ حمئۃ کے لغوی معنی سیاہ دلدل یا کیچڑ کے ہیں، مراد اس سے وہ پانی ہے جس کے نیچے سیاہ کیچڑ ہو جس سے پانی کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا ہو، اور آفتاب کو ایسے چشمے میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آفتاب اس چشمے میں ڈوب رہا ہے، کیونکہ آگے آبادی یا کوئی خشکی سامنے نہیں تھی، جیسے آپ کسی ایسے میدان میں غروب کے وقت ہوں جہاں دور تک جانب مغرب میں کوئی پہاڑ، درخت، عمارت نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب زمین کے اندر گھس رہا ہے۔

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا، یعنی اس سیاہ چشمے کے پاس ذوالقرنین نے ایک قوم کو پایا آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کافر تھی، اس لئے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیدیا کہ آپ چاہیں تو ان سب کو پہلے ان کے کفر کی سزا دیدیں، اور چاہیں تو ان سے احسان کا معاملہ کریں، کہ پہلے دعوت و تبلیغ اور وعظ و پند سے ان کو اسلام و ایمان قبول کرنے پر آمادہ کریں، پھر ماننے والوں کو اس کی جزاء ورنہ ماننے والوں کو سزا دیں جس کے جواب میں ذوالقرنین نے دوسری ہی صورت کو تجویز کیا، کہ اول ان کو وعظ و نصیحت سے صراط مستقیم پر لانے کی کوشش کریں گے، پھر جو کفر پر قائم رہے ان کو سزا دیں گے، اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کو اچھا بدلہ دیں گے۔

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو حق تعالیٰ نے خود خطاب کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے، اگر ذوالقرنین کو نبی قرار دیا جائے تب تو اس میں کوئی اشکال ہی نہیں کہ بذریعہ وحی ان سے کہہ دیا گیا، اور اگر ان کی نبوت تسلیم نہ کی جائے تو پھر اس قُلْنَا اور يٰذَا الْقَرْنَيْنِ کے خطاب کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پیغمبر کے واسطہ سے یہ خطاب ذوالقرنین کو کیا گیا ہے، جیسا کہ روایات میں حضرت خضرؑ کا ان کے ساتھ ہونا مذکور ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وحی نبوت و رسالت نہ ہو، ایسی لغوی وحی ہو، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے قرآن میں وَاَوْحَيْنَا کے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ اُن کے نبی یا رسول ہونے کا کوئی احتمال نہیں، مگر ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ ذوالقرنین کو جو یہاں حکم دیا گیا ہے، وہ اس قوم کے قتل و سزا کا حکم ہے، اس طرح کا کوئی حکم بغیر وحی نبوت کے نہیں دیا جا سکتا، یہ کام نہ کشف و الہام سے ہو سکتا ہے نہ بغیر وحی نبوت کے کسی اور ذریعہ، اس لئے اس کے سوا کوئی احتمال صحیح نہیں کہ یا تو ذوالقرنین کو خود نبی مانا جائے یا پھر کوئی نبی ان کے زمانے میں موجود ہوں ان کے ذریعہ ان کو خطاب ہوتا ہو، واللہ اعلم۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ

پھر لگا ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچے سورج نکلنے کی جگہ پایا اس کو کہ نکلتا ہے

عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ

ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے اُن کے لئے آفتاب سے ورے کوئی حجاب، یوں ہی ہے اور

قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

ہمارے قابو میں آچکی ہے اس کے پاس کی خبر۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (ممالک مغربیہ فتح کرکے مشرقی ممالک فتح کرنے کے ارادہ سے مشرق کی طرف) ایک راہ پر ہولئے یہاں تک کہ جب طلوع آفتاب کے موقع پر (یعنی جانب مشرق میں منتہائی آبادی پر) پہنچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جن کے لئے ہم نے آفتاب کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی (یعنی اس جگہ ایک ایسی قوم آباد تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ وغیرہ بنانے کے عادی نہ تھے، بلکہ شاید لباس بھی نہ پہنتے ہوں، جانوروں کی طرح کھلے میدان میں رہتے تھے) یہ قصہ اسی طرح ہے، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ (سامان وغیرہ) تھا ہم کو اس کی پوری خبر ہے (اس میں اثباتِ نبوّت کے لئے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرنے والوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ہم جو کچھ بتلا رہے ہیں وہ علم و خبر کی بنیاد پر ہے، عام تاریخی کہانیوں کی طرح نہیں، تاکہ نبوّتِ محمدیہ کی حقانیت واضح ہو جائے)

معارف و مسائل

ذوالقرنین نے مشرق کی جانب میں جو قوم آباد پائی، اس کا یہ حال تو قرآن کریم نے ذکر فرمایا کہ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی سامان، مکان، خیمہ، لباس وغیرہ کے ذریعہ نہ کرتے تھے، لیکن ان کے مذہب و اعمال کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اور نہ یہ کہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کافر ہی تھے، اور ذوالقرنین نے ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو مغربی قوم کے ساتھ اوپر مذکور ہو چکا ہے، مگر اس کے بیان کرنے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں سمجھی کہ پچھلے واقعہ پر قیاس کرکے اس کا بھی علم ہو سکتا ہے (کذا فی البحر المحیط عن ابن عطیہ)

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا

پھر لگا ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا دو پہاڑوں کے بیچ، پائے اُن سے ورے ایسے

قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ

لوگ جو لگتے نہیں کہ سمجھیں ایک بات، بولے اے ذوالقرنین یہ

يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا

یاجوج و ماجوج دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں سو تو کہے تو ہم مقرر کر دیں تیرے

عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ

واسطے کچھ محصول اس شرط پر کہ بنا دے تو ہم میں اور ان میں ایک آڑ، بولا جو مقدور دیا مجھ کو میرے رب نے وہ

خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِىْ

بہتر ہے سو مدد کرو میری محنت میں بنا دوں تمہارے اور ان کے بیچ ایک دیوار موٹی، لادو مجھ کو

زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ

تختے لوہے کے، یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پھانکوں تک پہاڑ کی کہا دھونکو،

حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا

یہاں تک کہ جب کر دیا اس کو آگ، کہا لاؤ میرے پاس کہ ڈالوں اس پر پگھلا ہوا تانبا، پھر نہ چڑھ سکیں

اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ

اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ، بولا یہ ایک مہربانی ہے میرے

مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ

رب کی، پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا گرا دے اس کو ڈھا کر اور ہے وعدہ

رَبِّىْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

میرے رب کا سچا۔

خلاصۂ تفسیر

پھر (مغرب و مشرق فتح کرکے) ایک اور راہ پر ہو لئے (قرآن میں اس سمت کا نام نہیں۔ مگر آبادی زیادہ جانب شمال ہی ہے، اس لئے مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں) یہاں تک کہ جب ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا پہونچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو (زبان اور لغت سے ناواقف وحشیانہ زندگی کی وجہ سے) کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہونچتے تھے (ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف زبان سے ناواقفیت نہ تھی کیونکہ سمجھ بوجھ ہو تو غیر زبان والے کی باتیں بھی کچھ اشارے کنائے سے سمجھی جاسکتی ہیں، بلکہ وحشیانہ زندگی نے سمجھ بوجھ سے بھی دور رکھا تھا مگر پھر شاید کسی ترجمان کے واسطے سے) انھوں نے عرض کیا اے ذوالقرنین قوم یاجوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں ہماری) اس سرزمین میں (کبھی کبھی آکر) بڑا فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارتگری کرتے ہیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں) سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کرکے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں (کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں) ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جس مال میں میرے رب نے مجھ کو (تصرف کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندہ جمع کرنے اور مال دینے کی تو ضرورت نہیں البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی محنت مزدوری) سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں گا (جس کی صورت یہ ہوگی کہ) تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (قیمت ہم دیں گے، ظاہر یہ ہے کہ اس آہنی دیوار بنانے کے لئے اور بھی ضرورت کی چیزیں منگوائی ہوں گی، مگر یہاں وحشی ملک میں سب سے زیادہ کمیاب چیز لوہے کی چادریں تھیں اس لئے ان کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، سب سامان جمع ہوجانے پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا) یہاں تک کہ جب (اس دیوار کے ردے ملاتے ملاتے) ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (کے خلاء) کو (پہاڑوں کے) برابر کردیا تو حکم دیا کہ دھونکو (دھونکنا شروع ہوگیا) یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال (انگار) کردیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ (جو پہلے سے تیار کرایا ہوگا) کہ اس پر ڈال دوں (چنانچہ یہ پگھلا ہوا تانبا لایا گیا اور آلات کے ذریعہ اوپر سے چھوڑ دیا گیا کہ دیوار کی تمام درزوں میں گھس کر پوری دیوار ایک ذات ہوجائے، اس کا طول و عرض خدا کو معلوم ہے) تو اس کی بلندی

اور چکناہٹ کے سبب) نہ تو یاجوج ماجوج اس پر چڑھ سکتے اور نہ اس میں (غایت استحکام کے سبب کوئی) نقب لگا سکتے تھے، ذوالقرنین نے (جب اس دیوار کو تیار دیکھا جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو بطور شکر کے) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر بھی کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یاجوج ماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا، تو اس کو ڈھا کر زمین کے) برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (اور اپنے وقت پر ضرور واقع ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

لغات مشکلہ کا حل | بَيْنَ السَّدَّيْنِ لفظ سَدّ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ بن جائے خواہ دیوار ہو یا پہاڑ، قدرتی ہو یا مصنوعی، یہاں سدین سے دو پہاڑ مراد ہیں، جو یاجوج ماجوج کے راستہ میں رکاوٹ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیانی درّے سے وہ حملہ آور ہوتے تھے جس کو ذوالقرنین نے بند کیا۔

زُبَرَ الْحَدِيْدِ، زبر، زبرہ کی جمع ہے، جس کے معنی تختی یا چادر کے ہیں، مراد لوہے کے ٹکڑے ہیں جن کو اس درّہ کو بند کرنے والی دیوار میں اینٹ پتھر کے بجائے استعمال کرنا تھا۔

الصَّدَفَيْنِ، دو پہاڑوں کی دو جانبیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں۔

قِطْرًا، قطر کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلے ہوئے تانبے کے ہیں، بعض نے پگھلے ہوئے لوہے یا رانگ کو بھی قطر کہا ہے (قرطبی)

دَكَّآءَ، یعنی ریزہ ریزہ ہو کر زمین کے برابر ہو جانے والی۔

یاجوج ماجوج کون ہیں اور کہاں ہیں سدِّ ذوالقرنین کس جگہ ہے؟

ان کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سروپا عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں، جن کو بعض حضرات مفسرین نے بھی تاریخی حیثیت سے نقل کر دیا ہے، مگر وہ خود ان کے نزدیک بھی قابلِ اعتماد نہیں، قرآن کریم نے ان کا مختصر سا حال اجمالاً بیان کیا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدرِ ضرورت تفصیلات سے بھی امت کو آگاہ کر دیا، ایمان لانے اور اعتقاد رکھنے کی چیز صرف اتنی ہی ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں آ گئی ہے، اس سے زائد تاریخی اور جغرافیائی حالات جو مفسرین محدثین اور مؤرخین نے ذکر کئے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، ان میں جو اہلِ تاریخ کے اقوال مختلف ہیں وہ قرائن اور قیاسات

اور تخمینوں پر مبنی ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی اثر قرآنی ارشادات پر نہیں پڑتا۔
میں اس جگہ پہلے وہ احادیث نقل کرتا ہوں جو اس معاملے میں محدثین کے نزدیک صحیح یا قابلِ اعتماد ہیں اس کے بعد بقدر ضرورت تاریخی روایات بھی لکھی جاویں گی۔

یاجوج ماجوج کے متعلق روایاتِ حدیث

قرآن و سنت کی تصریحات سے اتنی بات تو بلاشبہ ثابت ہے کہ یاجوج ماجوج انسانوں ہی کی قومیں ہیں عام انسانوں کی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، کیونکہ قرآن کریم کی نصِ صریح ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ، یعنی طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہیں اور رہیں گے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہوں گے، تاریخی روایات اس پر متفق ہیں کہ وہ یافث کی اولاد میں ہیں، ایک ضعیف حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ان کے باقی حالات کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی اور صحیح حدیث حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی ہے جس کو صحیح مسلم اور تمام مستند کتبِ حدیث میں نقل کیا گیا ہے اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اس میں خروجِ دجال، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام پھر خروج یاجوج ماجوج وغیرہ کی پوری تفصیل مذکور ہے، اس پوری حدیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کے وقت دجال کا تذکرہ فرمایا، اور تذکرہ فرماتے ہوئے بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے اس کا حقیر و ذلیل ہونا معلوم ہوتا تھا (مثلاً یہ کہ وہ کانا ہے، اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا فتنہ سخت اور عظیم ہے (مثلاً جنت و دوزخ کا اس کے ساتھ ہونا اور دوسرے خوارقِ عادات)۔ آپ کے بیان سے ہم پر ایسا خوف طاری ہو کہ گویا دجال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے (یعنی قریب ہی موجود ہے) جب ہم شام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے قلبی تاثرات کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ تم نے کیا سمجھا؟ ہم نے عرض کیا کہ آپ نے دجال کا تذکرہ فرمایا اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں جن سے اس کا معاملہ حقیر اور آسان معلوم ہوتا تھا، اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی قوت ہوگی اس کا فتنہ بڑا عظیم ہے، ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے قریب ہی وہ کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے، تمہارے بارے میں جن فتنوں کا مجھے خوف ہے ان میں دجال کی بہ نسبت دوسرے فتنے زیادہ قابلِ خوف ہیں، (یعنی دجال کا فتنہ اتنا عظیم نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے) اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو میں اس کا مقابلہ خود کر لوں گا، (تمہیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں) اور اگر وہ میرے بعد آیا تو

ہر شخص اپنی ہمت کے موافق اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے گا، حق تعالیٰ میری غیر موجودگی میں ہر مسلمان کا ناصر و مددگار ہے، (اس کی علامت یہ ہے کہ وہ نوجوان سخت پیچدار بالوں والا ہے، اس کی ایک آنکھ اوپر کو ابھری ہوئی ہے، (اور دوسری آنکھ سے کانا ہے، جیساکہ دوسری روایات میں ہے) اور گویا میں (اس کی قبیح صورت میں) اس کو کسی کے ساتھ تشبیہ دے سکتا ہوں تو وہ عبدالعزیٰ بن قطن ہے (یہ زمانۂ جاہلیت میں بنو خزاعہ قبیلہ کا ایک بدشکل شخص تھا) اگر تم میں سے کسی مسلمان کا دجال کے ساتھ سامنا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ لے (اس سے دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا) دجال شام و عراق کے درمیان سے نکلے گا، اور ہر طرف فساد مچائے گا، اے اللہ کے بندو! اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا

ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر مدت رہے گا، آپ نے فرمایا وہ چالیس دن رہے گا، لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، اور دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا، اور تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا ہم اس میں صرف ایک دن کی (پانچ نمازیں) پڑھیں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ وقت کا اندازہ کر کے پورے سال کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی، پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر سرعت کے ساتھ سفر کرے گا فرمایا اس ابر کے مانند تیز چلے گا جس کے پیچھے موافق ہوا لگی ہوئی ہو، پس دجال کسی قوم کے پاس سے گذرے گا، ان کو اپنے باطل عقائد کی دعوت دے گا، وہ اس پر ایمان لائیں گے تو وہ بادلوں کو حکم دے گا تو وہ برسنے لگیں گے، اور زمین کو حکم دے گا تو وہ سرسبز و شاداب ہو جائے گی (اور ان کے مویشی اس میں چریں گے) اور شام کو جب واپس آئیں گے تو ان کے کوہان پہلے کی بہ نسبت بہت اونچے ہوں گے، اور تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے، اور ان کی کوکھیں پر ہوں گی، پھر دجال کسی دوسری قوم کے پاس سے گذرے گا اور ان کو بھی اپنے کفر و ضلال کی دعوت دے گا، لیکن وہ اس کی باتوں کو رد کر دیں گے، وہ ان سے مایوس ہو کر چلا جائے گا تو یہ مسلمان لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ان کے پاس کچھ مال نہ رہے گا، اور ویران زمین کے پاس سے اس کا گذر ہوگا، تو وہ اس کو خطاب کرے گا کہ اپنے خزانوں کو باہر لے آ، چنانچہ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں گے، جیساکہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے ہو لیتی ہیں، پھر دجال ایک آدمی کو بلائے گا جس کا شباب پورے زور پر ہوگا، اس کو تلوار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا، اور دونوں ٹکڑے اس قدر فاصلہ پر کر دیئے جائیں گے جس قدر تیر انداز اور نشانہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے، پھر وہ اس کو بلائے گا، وہ زندہ ہو کر دجال کی طرف

اس کے بعد یہ شخص برہنہ ہو کر دمشق جائے گا، تو ساتھ جاتا رہے گا، اسی اثنا میں حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کو نازل فرمائیں گے، چنانچہ وہ دو رنگین چادریں پہنے ہوئے دمشق کی مشرقی جانب کے سفید
مینارہ پر اس طرح نزول فرمائیں گے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے
ہوں گے، جب اپنے سر مبارک کو نیچے کریں گے تو اس سے پانی کے قطرات ٹپکیں گے (جیسے کوئی
ابھی غسل کرکے آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جو موتیوں
کی طرح صاف ہوں گے گریں گے، جس کافر کو آپ کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ وہیں مر جائے گا،
اور آپ کا سانس اتنی دور تک پہنچے گا جس قدر دور آپ کی نگاہ جائے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
دجال کو تلاش کریں گے، یہاں تک کہ آپ اسے باب لُدّ پر جا پکڑیں گے (یہ بستی اب بھی بیت المقدس
کے قریب اسی نام سے موجود ہے) وہاں اس کو قتل کر دیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں
کے پاس تشریف لائیں گے، اور ازراہِ شفقت ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے، اور جنت
میں اعلیٰ درجات کی ان کو خوشخبری سنائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی اسی حال میں ہوں گے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ میں اپنے بندوں
میں ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کے مقابلہ کی کسی کو طاقت نہیں، آپ مسلمانوں کو جمع کرکے کوہِ طور
پر چلے جائیں (چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے) اور حق تعالیٰ یاجوج ماجوج کو کھول دیں گے
تو وہ سرعتِ سیر کے سبب ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے، ان میں سے پہلے لوگ
بحیرۂ طبریہ سے گذریں گے اور اس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیں گے کہ جب ان میں سے دوسرے
لوگ اس بحیرہ سے گذریں گے تو دریا کی جگہ کو خشک دیکھ کر کہیں گے کہ کبھی یہاں پانی ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کوہِ طور پر پناہ لیں گے، اور دوسرے مسلمان
اپنے قلعوں اور محفوظ جگہوں میں پناہ لیں گے، کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوگا، مگر وہ کم پڑ جائے گا،
تو ایک بیل کے سر کو سو دینار سے بہتر سمجھا جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے
مسلمان اپنی تکلیف دفع ہونے کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کریں گے (حق تعالیٰ دعا قبول
فرمائیں گے) اور ان پر وبائی صورت میں ایک بیماری بھیجیں گے اور یاجوج ماجوج تھوڑی دیر
میں سب کے سب مر جائیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہِ طور سے
نیچے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ زمین میں ایک بالشت جگہ بھی ان کی لاشوں سے خالی نہیں (اور
لاشوں کے سڑنے کی وجہ سے) سخت تعفن پھیلا ہوگا، (اس کیفیت کو دیکھ کر دوبارہ) حضرت
عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی حق تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ یہ مصیبت بھی دفع ہو،
حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے، اور بہت بھاری بھرکم پرندوں کو بھیجیں گے جن کی گردنیں اونٹ

کی گردن کے مانند ہوں گی، اور وہ ان کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیں گے بعض روایت میں ہے کہ دریا میں ڈالیں گے پھر حق تعالیٰ بارش برسائیں گے، کوئی شہر و جنگل ایسا نہ ہوگا جہاں بارش نہ ہوتی ہوگی، ساری زمین دُھل جائے گی اور شیشہ کے مانند صاف ہو جائیگی پھر حق تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ اپنے پیٹ سے پھلوں اور پھولوں کو اُگا دے، اور از سر نو اپنی برکات کو ظاہر کر دے، (چنانچہ ایسا ہی ہوگا) اور اس قدر برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار ایک جماعت کے کھانے کے لئے کفایت کرے گا اور لوگ اس کے چھلکے کی چھتری بنا کر سایہ حاصل کریں گے، اور دودھ میں اس قدر برکت ہوگی کہ ایک اونٹنی کا دودھ ایک بہت بڑی جماعت کے لئے کافی ہوگا، اور ایک گائے کا دودھ ایک قبیلہ کے سب لوگوں کو کافی ہو جائے گا، اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری کو کافی ہو جائے گا، (یہ غیر معمولی برکات اور امن و امان کا زمانہ چالیس سال رہنے کے بعد جب قیامت کا وقت آجائے گا تو) اس وقت حق تعالیٰ ایک خوشگوار ہوا چلائیں گے جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کی بغلوں کے نیچے ایک خاص بیماری ظاہر ہو جائے گی اور سب کے سب وفات پا جائیں گے، اور باقی صرف شریر و کافر رہ جائیں گے، جو زمین پر کھلم کھلا حرام کاری جانوروں کی طرح کریں گے، ایسے ہی لوگوں پر قیامت آئے گی۔

اور حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کی روایت میں یاجوج و ماجوج کے قصہ کی زیادہ تفصیل آئی ہے، وہ یہ کہ بحیرۂ طبریہ سے گذرنے کے بعد یاجوج ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو سب کو قتل کر دیا ہے، اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں، چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اور وہ تیر حق تعالیٰ کے حکم سے خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے، (تاکہ وہ احمق یہ سمجھ کر خوش ہوں کہ آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا)

اور دجال کے قصہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ دجال مدینہ منورہ سے دور رہے گا، اور مدینہ کے راستوں پر بھی اس کا آنا ممکن نہ ہوگا تو وہ مدینہ کے قریب ایک شور زمین کی طرف آئے گا، اس وقت ایک آدمی دجال کے پاس آئے گا، اور وہ آدمی اس وقت کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا، اور اس کو خطاب کر کے کہے گا کہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی، یہ سن کر، دجال کہنے لگے گا، لوگو! مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اس آدمی کو قتل کر دوں اور پھر اسے زندہ کر دوں تو میرے خدا ہونے میں شک کرو گے، وہ جواب دیں گے نہیں

چنانچہ وہ اس آدمی کو قتل کرے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا، تو وہ دجّال کو کہیگا کہ اب مجھے تیرے دجال ہونے کا پہلے سے زیادہ یقین ہوگیا ہے، دجّال اس کو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کرے گا، لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا۔ (صحیح مسلم)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذریت میں سے بعث النار (یعنی جہنمی لوگ) اٹھائیے، وہ عرض کریں گے، اے رب وہ کون ہیں تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے، صحابہ کرام سہم گئے اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک جنتی کون ہوگا، تو آپؐ نے فرمایا غم نہ کرو، کیونکہ یہ نوسو ننانوے جہنمی تم میں سے ایک اور یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے،

اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دس حصے کئے، ان میں سے نو حصے یاجوج ماجوج کے ہیں اور باقی ایک حصہ میں باقی ساری دنیا کے انسان ہیں (روح المعانی)

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان روایات کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ یاجوج ماجوج کی تعداد ساری انسانی آبادی سے بہت زیادہ ہے۔

مسند احمد اور ابوداؤد میں بسند صحیح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد چالیس سال زمین پر رہیں گے، مسلم کی ایک روایت میں جو سات سال کا عرصہ بتلایا ہے حافظ نے فتح الباری میں اس کو مؤوّل یا مرجوح قرار دے کر چالیس سال ہی کے عرصہ کو صحیح قرار دیا ہے، اور حسب تصریح احادیث یہ پورا عرصہ امن و امان اور برکات کے ظہور کا ہوگا، بغض و عداوت آپس میں قطعاً نہ رہے گا، کبھی دو آدمیوں میں کوئی جھگڑا یا عداوت نہیں ہوگی (روایت مسلم و احمد)

بخاری نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج و عمرہ خروج یاجوج ماجوج کے بعد بھی جاری رہیگا (تفسیر مظہری)

بخاری و مسلم نے حضرت زینب بنت جحشؓ ام المؤمنینؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک روز) نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سُرخ ہو رہا تھا، اور آپ کی زبانِ مبارک پر یہ جملے تھے،

لا الٰہ الا اللّٰہ ویل للعرب	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، خرابی ہے
من شر قد اقترب فتح الیوم	عرب کی اس شر سے جو قریب آچکا ہے،

فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوجَ وَمَاجُوجَ مِثْلُ هٰذِهٖ وَحَلَّقَ تِسْعِيْنَ

آج کے دن یاجوج ماجوج کی ردم یعنی سد میں اتنا سوراخ کھل گیا ہے، اور

آپ نے عقد تسعین یعنی انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ملا کر حلقہ بنا کر دکھلایا۔

ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ اس ارشاد پر ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا ہم ایسے حال میں ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے اندر صالحین موجود ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہلاک ہو سکتے ہیں، جبکہ خبث (یعنی شر) کی کثرت ہو جائے۔ رواہ فی الصحیحین عن ابی ہریرۃؓ، کذا فی البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر۔ اور سدِ یاجوج میں بقدر حلقہ سوراخ ہو جانا اپنے حقیقی معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور مجازی طور پر سدِ ذوالقرنین کے کمزور ہو جانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے (ابن کثیر، ابوحیان)

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج ہر روز سدِ ذوالقرنین کو کھودتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس آہنی دیوار کے آخری حصہ تک اتنے قریب پہونچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی روشنی نظر آنے لگے، مگر یہ کہہ کر لوٹ جاتے ہیں کہ باقی کو کل کھود کر پار کر دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ اس کو پھر ویسی ہی مضبوط درست کر دیتے ہیں، اور اگلے روز پھر نئی محنت اس کے کھودنے میں کرتے ہیں، یہ سلسلہ کھودنے میں محنت کا اور پھر منجانب اللہ اس کی درستی کا اس وقت تک چلتا رہے گا جس وقت تک یاجوج ماجوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ان کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اس روز جب محنت کر کے آخری حد میں پہونچا دیں گے اس دن یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل اس کو پار کر لیں گے (اللہ کے نام اور اس کی مشیت پر موقوف رکھنے سے آج توفیق ہو جائے گی) تو اگلے روز دیوار کا باقی ماندہ حصہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اس کو توڑ کر پار کر لیں گے۔

ترمذی نے اس روایت کو بسند ابی عوانہ عن قتادہ عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ نقل کر کے فرمایا: غریب لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا:-

اِسْنَادُهٗ جَيِّدٌ قَوِيٌّ وَلٰكِنْ مَتْنُهٗ فِيْ رَفْعِهٖ نَكَارَةٌ

اس کی سند جید اور قوی ہے، لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے اس کو مرفوع کرنا یعنی اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں ایک نکارت واجنبیت معلوم ہوتی ہے۔

اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے

کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ کعب احبار کی روایت ہے تب تو بات صاف ہوگئی کہ یہ کوئی قابل اعتماد چیز نہیں اور اگر اس روایت کو وہم راوی سے محفوظ قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد قرار دیا جائے تو پھر مطلب اس کا یہ ہوگا کہ یاجوج ماجوج کا یہ عمل سد کو کھودنے کا اس وقت شروع ہوگا جبکہ ان کے خروج کا وقت قریب آجائے گا، اور قرآنی ارشاد کہ اس دیوار میں نقب نہیں لگائی جاسکتی یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ذوالقرنین نے اس کو تعمیر کیا تھا، اس لئے کوئی تعارض نہ رہا، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقب سے مراد وہ رخنہ اور سوراخ ہے جو آرپار ہوجائے اور اس روایت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ سوراخ آرپار نہیں ہوتا (بدایہ صفحہ ۱۱۲ ج ۲)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث کو عبد بن حمید اور ابن حبان کے حوالے سے بھی نقل کرکے کہا ہے کہ ان سب کی روایت حضرت قتادہ سے ہے، اور ان میں سے بعض کی سند کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں، اور حدیث کے مرفوع قرار دینے پر بھی کوئی شبہ نہیں کیا، اور بحوالہ ابن عربی بیان کیا کہ اس حدیث میں تین آیات الٰہیہ یعنی معجزات ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا کہ سد کو کھودنے کا کام رات دن مسلسل جاری رکھیں، ورنہ اتنی بڑی قوم کے لئے کیا مشکل تھا کہ دن اور رات کی ڈیوٹیاں الگ الگ مقرر کرلیتے، دوسرے ان کے ذہنوں کو اس طرف سے بھی روک دیا کہ اس سد کے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں، اس کے لئے آلات سے مدد لیں، حالانکہ وہب بن منبہ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحب زراعت وصنعت ہیں، ہر طرح کے آلات رکھتے ہیں، ان کی زمین میں درخت بھی مختلف قسم کے ہیں، کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اوپر چڑھنے کے ذرائع وسائل پیدا کرلیتے، تیسرے یہ کہ ساری مدت میں ان کے قلوب میں یہ بات نہ آئی کہ انشاء اللہ کہہ لیں، صرف اس وقت یہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہوگا، جب ان کے نکلنے کا وقت مقرر آجائے گا۔

ابن عربی نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے وجود اور اس کی مشیت وارادے کو مانتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر کسی عقیدے کے ہی ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ یہ کلمہ جاری کردے، اور اس کی برکت سے ان کا کام بن جائے، (شرط الساعۃ تفسیر مظہری، ص ۳۴ د) مگر ظاہر یہی ہے کہ ان کے پاس بھی انبیاء علیہم السلام کی دعوت پہنچ چکی ہے، ورنہ نص قرآنی کے مطابق ان کو جہنم کا عذاب نہ ہونا چاہئے، وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا، معلوم ہوا کہ دعوت ایمان ان کو بھی پہنچی ہے، مگر یہ لوگ کفر پر جمے رہے، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے وجود

اور اس کے ارادہ و مشیت کے قائل ہوں گے، اگرچہ صرف یہ عقیدہ ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک رسالت اور آخرت پر ایمان نہ ہو، بہرحال اللہ کا کلمہ کہنا باوجود کفر کے بھی بعید نہیں۔

روایاتِ حدیث سے حاصل شدہ نتائج | مذکور الصدر احادیث میں یاجوج ماجوج کے متعلق جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) یاجوج ماجوج عام انسانوں کی طرح انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، جمہور محدثین و مؤرخین ان کو یافث ابن نوح علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یافث ابن نوح کی اولاد نوح علیہ السلام کے زمانے سے ذوالقرنین کے زمانے تک دور دور تک مختلف قبائل اور مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی، یاجوج ماجوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب سدِ ذوالقرنین کے پیچھے ہی محصور ہو گئے ہوں، ان کے کچھ قبائل اور قومیں سدِ ذوالقرنین کے اس طرف بھی ہوں گے، البتہ ان میں سے جو قتل و غارت گری کرنے والے وحشی لوگ تھے، وہ سدِ ذوالقرنین کے ذریعے روک دیئے گئے مؤرخین عام طور سے ان کو ترک اور مغول یا منگولین لکھتے ہیں، مگر ان میں سے یاجوج ماجوج کا نام صرف ان وحشی غیر متمدن خونخوار ظالم لوگوں کا ہے جو تمدن سے آشنا نہیں ہوئے، انہی کی برادری کے مغول اور ترک یا منگولین جو متمدن ہو گئے وہ اس نام سے خارج ہیں۔

(۲) یاجوج ماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زائد، کم از کم ایک اور دس کی نسبت سے ہے **(حدیث نمبر ۲)**

(۳) یاجوج ماجوج کی جو قومیں اور قبائل سدِ ذی القرنین کے ذریعہ اس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح محصور رہیں گے، ان کے نکلنے کا وقت مقدر ظہور مہدی علیہ السلام پھر خروج دجال کے بعد وہ ہوگا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر چکیں گے۔ **(حدیث نمبر ۱)**

(۴) یاجوج ماجوج کے کھلنے کے وقت سدِ ذوالقرنین منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، (آیت قرآن) اس وقت یہ یاجوج ماجوج کی بے پناہ قومیں بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی سرعتِ رفتار کے سبب ایسی معلوم ہوں گی کہ گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور یہ لاتعداد وحشی انسان عام انسانی آبادی اور پوری زمین پر ٹوٹ پڑیں گے، اور ان کے قتل و غارت گری کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا، اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بامر الٰہی اپنے ساتھی مسلمانوں کو لے کر کوہِ طور پر پناہ لیں گے، اور عام دنیا کی آبادیوں میں جہاں کچھ قلعے یا محفوظ مقامات ہیں وہ ان میں بند ہو کر بچ جائیں بچ جائیں گے، کھانے پینے کا سامان ختم ہو جانے کے بعد

ضروریات زندگی تنگ ہو جائے گی، باقی انسانی آبادی کو یہ وحشی قومیں ختم کر ڈالیں گی، ان کے دریاؤں کو چاٹ جائیں گی (حدیث نمبر۱)

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی دعا سے پھر یہ ٹڈی دل قسم کی بے شمار قومیں بیک وقت ہلاک کر دی جائیں گی، ان کی لاشوں سے ساری زمین پٹ جائے گی، اس کی بدبو کی وجہ سے زمین پر بسنا مشکل ہو جائے گا (حدیث نمبر۱)

(۶) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء ہی کی دعا سے ان کی لاشیں دریا برد یا غائب کر دی جائیں گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین کو دھو کر تختۂ آئینہ بنا دیا جائے گا (حدیث نمبر۱)

(۷) اس کے بعد تقریباً چالیس سال امن و امان کا دور دورہ ہوگا، زمین اپنی برکات اُگل دے گی، کوئی مفلس محتاج نہ رہے گا، کوئی کسی کو نہ ستائے گا، سکون و اطمینان آرام و راحت عام ہوگی (حدیث نمبر۳)

(۸) اس امن و امان کے زمانے میں بیت اللہ کا حج و عمرہ جاری رہے گا (حدیث نمبر۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور روضۂ اقدس میں دفن روایات حدیث سے ثابت ہے اس کی بھی یہی صورت ہوگی کہ وہ حج یا عمرہ کے لئے حجاز کا سفر کریں گے (کما رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ التصریح) اس کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوگی، روضۂ اقدس میں دفن کیا جائے گا۔

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں بذریعہ وحی خواب آپ کو دکھلایا گیا کہ سدّ ذوالقرنین میں ایک سوراخ ہو گیا ہے جس کو آپ نے عرب کے لئے شر و فتنہ کی علامت قرار دی، اس دیوار میں سوراخ ہو جانے کو بعض محدثین نے اپنی حقیقت پر محمول کیا ہے، اور بعض نے اس کا مطلب بطور استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب یہ سدّ ذوالقرنین کمزور ہو چکی ہے، خروج یاجوج ماجوج کا وقت قریب آ گیا ہے اور اس کے آثار عرب قوم کا تنزل و انحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ واللہ اعلم

(۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کا قیام زمین پر چالیس سال ہوگا، (حدیث نمبر۳) ان سے پہلے حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ بھی چالیس سال رہے گا جس میں کچھ حصہ دونوں کے اجتماع و اشتراک کا ہوگا، سید شریف برزنجی نے اپنی کتاب اشراط الساعۃ صفحہ ۱۴۵ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتلِ دجال اور امن و امان کے بعد چالیس سال ہوگا، اور مجموعہ قیام پینتالیس سال ہوگی، اور صفحہ ۲ میں ہے کہ مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیس سے اوپر کچھ سال پہلے ظاہر ہوں گے، اور ان کا مجموعہ زمانہ چالیس سال ہوگا، اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع رہے گا، اور ان دونوں زمانوں

کی یہ خصوصیت ہوگی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہوگی، زمین اپنی برکات اور خزائن اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، لوگوں کے آپس میں بغض و عداوت قطعاً نہ رہے گی، ہاں حضرت مہدی علیہ السلام کے آخری زمانے میں دجال اکبر کا فتنہ عظیم سوائے مکہ اور مدینہ اور بیت المقدس اور کوہ طور کے سارے عالم پر چھا جائے گا، اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے عظیم تر ہوگا دجال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہے گا، مگر ان چالیس دنوں میں سے پہلا دن ایک سال کا، دوسرا دن ایک مہینہ کا، تیسرا دن ایک ہفتہ کا ہوگا، باقی دن عام دنوں کی طرح کے ہوں گے، جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقۃً یہ دن اتنے طویل کر دیئے جائیں، کیونکہ اس آخر زمانے میں تقریباً سارے واقعات ہی خرق عادت اور معجزہ کے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن رات تو اپنے معمول کے مطابق ہوتے رہیں مگر دجال کا بڑا ساحر ہونا حدیث سے ثابت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے سحر کے اثر سے عام مخلوق کی نظروں پر یہ دن رات کا تغیر و انقلاب ظاہر نہ ہو، وہ اس کو ایک ہی دن دیکھتے اور سمجھتے رہیں، حدیث میں جو اس دن کے اندر عام دنوں کے مطابق اندازہ لگا کر نمازیں پڑھنے کا حکم آیا ہے، اس سے بھی تائید اس کی ہوتی ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو دن رات بدلتے رہیں گے، مگر لوگوں کے احساس میں یہ بدلنا نہیں ہوگا، اس لئے اس ایک سال کے دن میں تین سو ساٹھ دنوں کی نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر دن حقیقۃً ایک ہی دن ہوتا تو قواعد شرعیہ کی رو سے اس میں صرف ایک ہی دن کی پانچ نمازیں فرض ہوتیں، خلاصہ یہ ہے کہ دجال کا کل زمانہ اس طرح کے چالیس دن کا ہوگا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر کے اس فتنہ کو ختم کریں گے، مگر اس کے متصل ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا جو پوری دنیا میں فساد اور قتل و غارت گری کریں گے، مگر ان کا زمانہ بھی چند ایام ہی ہوں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ سب بیک وقت ہلاک ہو جائیں گے، غرض حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے کے آخر میں اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے شروع میں دو فتنے دجال اور یاجوج ماجوج کے ہوں گے جو تمام زمین کے لوگوں کو تہہ و بالا کر دیں گے، ان ایام محدودہ سے پہلے اور بعد میں پوری دنیا کے اندر عدل و انصاف اور امن و سکون، اور برکات و ثمرات کا دور دورہ ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کے سوا کوئی کلمہ و مذہب زمین پر نہ رہے گا، زمین اپنے خزائن دفائن اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، درندے اور زہریلے جانور بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں گے۔

یاجوج ماجوج اور سد ذوالقرنین کے متعلق یہ معلومات تو وہ ہیں جو قرآن اور احادیث نبویہ نے اُمت کو بتلا دیئے ہیں، اسی پر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت ناجائز ہے،

باقی رہی اس کی جغرافیائی بحث کہ سدِ ذوالقرنین کس جگہ واقع ہے، اور قوم یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے، اور اس وقت کہاں کہاں بستی ہے، اگرچہ اس پر نہ کوئی اسلامی عقیدہ موقوف ہے، اور نہ قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا اس پر موقوف ہے، لیکن مخالفین کی ہفوات کے جواب اور مزید بصیرت کے لئے علماءِ امت نے اس سے بحث فرمائی ہے، اس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں بحوالہ سدیؒ نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بائیس قبیلوں میں سے اکیس قبیلوں کو سدِ ذوالقرنین سے بند کر دیا گیا، ان کا ایک قبیلہ سدِ ذوالقرنین کے اندر اس طرف رہ گیا، وہ تُرک ہیں، اس کے بعد قرطبی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تُرک کے متعلق جو باتیں بتلائی ہیں وہ یاجوج ماجوج سے ملتی ہوئی ہیں، اور آخر زمانے میں مسلمانوں کی ان سے جنگ ہونا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، پھر فرمایا کہ اس زمانے میں تُرک قوم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلی ہوئی ہے جن کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، وہی مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی یاجوج ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا مقدمہ ہیں (قرطبی، ص ۵۸ ج ۱۱) (قرطبی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے جس میں فتنہ تاتار ظاہر ہوا، اور اسلامی خلافت کو تباہ و برباد کیا، ان کا عظیم فتنہ تاریخ اسلام میں معروف اور تاتاریوں کا مغول ترک میں سے ہونا مشہور ہے)۔ مگر قرطبی نے ان کو یاجوج ماجوج کے مشابہ اور ان کا مقدمہ قرار دیا ہے، ان کے فتنہ کو وہ خروج یاجوج ماجوج نہیں بتایا جو علاماتِ قیامت میں سے ہے، کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث مذکور میں اس کی تصریح ہے کہ وہ خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کے زمانے میں ہوگا۔

اسی لئے علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں ان لوگوں پر سخت رد کیا ہے جنھوں نے تاتاری کو یاجوج ماجوج قرار دیا، اور فرمایا کہ ایسا خیال کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے، اور نصوصِ حدیث کی مخالفت ہے، البتہ یہ انھوں نے بھی فرمایا کہ بلاشبہ یہ فتنہ یاجوج ماجوج کے فتنہ کے مشابہ ضرور ہے، (روح ص ۴۴ ج ۱۶) اس سے ثابت ہوا کہ اس زمانے میں جو بعض مؤرخین موجودہ روس یا چین یا دونوں کو یاجوج ماجوج قرار دیتے ہیں، اگر اس سے ان کی مراد وہی ہوتی جو قرطبی اور آلوسی نے فرمایا کہ ان کا فتنہ فتنۂ یاجوج ماجوج کے مشابہ ہے تو یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوتا، مگر اسی کو وہ خروج یاجوج ماجوج قرار دینا جس کی خبر قرآن و حدیث میں بطور علاماتِ قیامت دی گئی، اور اس کا وقت نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بتلایا گیا یہ قطعاً غلط اور گمراہی اور نصوصِ حدیث کا انکار ہے۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اقلیم سادس کی بحث میں یاجوج ماجوج

اور سدِ ذوالقرنین اور ان کے محل و مقام کے متعلق جغرافیائی تحقیق اس طرح فرمائی ہے :-

"ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جو قفچاق اور چرکس کہلاتے ہیں، اور مشرق کی جانب یاجوج ماجوج کی آبادیاں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حدِ فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے، کہ وہ بحر محیط سے شروع ہوتا ہے، جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے، اور پھر بحر محیط سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتی کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور یہاں پہونچ کر جنوب سے شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے، اور اسی سلسلۂ کوہ کے درمیان سدِ سکندری واقع ہے، اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ سدِ سکندری ہے، جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ خلیفہ عباسی کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ سد کھل گئی ہے، چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافت حال کے لئے سلام ترجمان کو روانہ کیا، اس نے واپس آکر اسی سد کے حالات و اوصاف بیان کئے (مقدمہ ابن خلدون ص۹۹)

واثق باللہ خلیفۂ عباسی کا سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کرنے کے لئے ایک جماعت کو بھیجنا اور ان کا تحقیق کر کے آنا ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے، اور یہ کہ یہ دیوار لوہے سے تعمیر کی گئی ہے، اس میں بڑے بڑے دروازے بھی ہیں جن پر قفل پڑا ہوا ہے، اور یہ شمال مشرق میں واقع ہے، اور تفسیر کبیر و طبری نے اس واقعہ کو بیان کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ جو آدمی اس دیوار کا معائنہ کر کے واپس آنا چاہتا ہے تو رہنا اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہونچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں ہے۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۳)

حضرت الاستاذ حجۃ الاسلام سیدی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام میں یاجوج ماجوج اور سدِ ذوالقرنین کا حال اگرچہ ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے مگر جو کچھ بیان کیا ہے وہ تحقیق و روایت کے اعلیٰ معیار پر ہے، آپ نے فرمایا کہ مفسد اور وحشی انسانوں کی تاخت و تاراج سے حفاظت کے لئے زمین پر ایک نہیں بہت سی جگہوں میں سدیں (دیواریں) بنائی گئی ہیں جو مختلف بادشاہوں نے

مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، ان میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے، جس کا طول ابوحیان اندلسی (دربار ایران کے شاہی مؤرخ) نے بارہ سو میل بتلایا ہے، اور یہ کہ اس کا بانی فغفور بادشاہ چین ہے، اور اس کی بناء کی تاریخ ہبوط آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی، اور یہ کہ اس دیوار چین کو مغل لوگ اَتکُوَہ اور ترک لوگ بُوقُورقہ کہتے ہیں، اور فرمایا کہ اسی طرح کی اور بھی متعدد دیواریں سدیں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

ہمارے خواجہ تاش مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں حضرت شیخ کے اس بیان کی تاریخی توضیح بڑی تفصیل و تحقیق سے لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم کا شکار تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ہر وقت اُن کی زد میں تھے، انہی یاجوج ماجوج کے شر و فساد سے بچنے کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر متعدد سدیں تعمیر کی گئیں، ان میں سب سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے، یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی، اور شاہ روم کے خاص ہمنشین سیلابرجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلافجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس جگہ سے گذرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی سد موصل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے (از تفسیر جواہر القرآن طنطاوی ص ۱۹۸ ج ۹)

تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے، یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، ادریسی نے جغرافیہ میں، اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحر خزر (کاسپین) کے غربی کنارہ پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۴۳-۳ شمالاً اور طول البلد ۴۸-۱۵ شرقی ہے، اور اس کو دربند نوشیرواں بھی کہتے ہیں، اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے۔"

چوتھی سد اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند حصوں میں ہے جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ، درہ داریال کے نام سے مشہور ہے، اس جگہ یہ چوتھی سد

جو قفقاز یا جبل قوقا یا کوہ قاف کی سد کہلاتی ہے، بستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے:

"اور اسی کے (یعنی سد باب الابواب کے) قریب ایک اور سد ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے، غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا، بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی ہے، اور بعض نے کسریٰ و نوشیرواں کی طرف اور یاقوت کہتے ہیں کہ یہ تانبہ پگھلا کر اس سے تعمیر کی گئی ہے، (دائرۃ المعارف جلد ۷، ص ۶۵۱، معجم البلدان جلد ۸، ص ۹)"

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں ہیں، اور تقریباً ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی گئی ہیں، اس لئے ان میں سے سدِ ذوالقرنین کونسی ہے، اس کے متعین کرنے میں اشکالات پیش آتے ہیں، اور بڑا خلفشار آخری دو سدوں کے معاملہ میں پیش آیا، کیونکہ دونوں مقامات کا نام بھی دربند ہے اور دونوں جگہ سد بھی موجود ہے، مذکور الصدر چار سدوں میں سے دیوار چین جو سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ قدیم ہے، اس کے متعلق تو سدِ ذوالقرنین ہونے کا کوئی قائل نہیں اور وہ بجائے شمال کے مشرق اقصیٰ میں ہے، اور قرآن کریم کے اشارہ سے اس کا شمال میں ہونا ظاہر ہے۔

اب معاملہ باقی تین دیواروں کا رہ گیا جو شمال ہی میں ہیں، ان میں سے عام طور پر مؤرخین مسعودی، اصطخری، حموی وغیرہ اس دیوار کو سد ذوالقرنین بتاتے ہیں جو داغستان یا کاکیشیا کے علاقہ باب الابواب کے دربند میں بحر خزر پر واقع ہے، بخارا و ترمذ کے دربند اور اس کی دیوار کو جن مورخین نے سدِ ذوالقرنین کہا ہے وہ غالباً لفظ دربند کے اشتراک کی وجہ سے ان کو اختلاط ہوا ہے، اب تقریباً اس کا محلِ وقوع متعین ہو گیا کہ علاقہ داغستان کاکیشیا کے دربند باب الابواب میں یا اس سے بھی اوپر جبل قفقاز یا کوہ قاف کی بلندی پر ہے، اور ان دونوں جگہوں پر سد کا ہونا مؤرخین کے نزدیک ثابت ہے۔

ان دونوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ قدس سرہ نے عقیدۃ الاسلام میں کوہ قاف قفقاز کی سد کو ترجیح دی ہے کہ یہ سد ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ہے (عقیدۃ الاسلام ص ۲۹۷)

سد ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گی یا وہ ٹوٹ چکی ہے؟

آجکل تاریخ و جغرافیہ کے ماہرین اہل یورپ اس وقت ان شمالی دیواروں میں سے کسی کا موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے، اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب بھی یاجوج ماجوج کا راستہ بند ہے، اس بناء پر بعض اہل اسلام مؤرخین نے بھی یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے کہ یاجوج ماجوج

جن کے خروج کا قرآن و حدیث میں ذکر ہے وہ ہو چکا ہے، بعض نے چھٹی صدی ہجری میں طوفان بن کر اٹھنے والی قوم تاتار ہی کو اس کا مصداق قرار دیدیا ہے، بعض نے اس زمانے میں دنیا پر غالب آجانے والی قوموں روس اور چین اور اہل یورپ کو یاجوج ماجوج کہہ کر اس معاملہ کو ختم کر دیا ہے مگر جیسا کہ اوپر بحوالہ روح المعانی بیان ہو چکا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے، احادیث صحیحہ کے انکار کے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس خروج یاجوج ماجوج کو قرآن کریم نے بطور علامتِ قیامت بیان کیا اور جس کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث نواس بن سمعان وغیرہ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ واقعہ خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور قتلِ دجال کے بعد پیش آئے گا وہ واقعہ ہو چکا، کیونکہ خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اب تک نہیں ہوا۔

البتہ یہ بات بھی قرآن و سنت کی کسی نصِ صریح کے خلاف نہیں ہے کہ سدِ ذوالقرنین اس وقت ٹوٹ چکی ہو اور یاجوج ماجوج کی بعض قومیں اس طرف آچکی ہوں، بشرطیکہ اس کو تسلیم کیا جائے کہ ان کا آخری اور بڑا ہلہ جو پوری انسانی آبادی کو تباہ کرنے والا ثابت ہوگا وہ ابھی نہیں ہوا، بلکہ قیامت کی ان بڑی علامات کے بعد ہوگا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت الاستاذ حجۃ الاسلام علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ اہل یورپ کا یہ کہنا تو کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ہم نے ساری دنیا چھان ماری ہے ہمیں اس دیوار کا پتہ نہیں لگا، کیونکہ اول تو خود انہی لوگوں کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ سیاحت و تحقیق کے انتہائی معراج پر پہونچنے کے باوجود آج بھی بہت سے جنگل اور دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، دوسرے یہ بھی احتمال بعید نہیں کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے گرنے اور باہم مل جانے کے سبب ایک پہاڑ ہی کی صورت اختیار کر چکی ہو، لیکن کوئی نصِ قطعی اس کے بھی منافی نہیں کہ قیامت سے پہلے یہ سد ٹوٹ جائے یا کسی دور دراز کے طویل راستہ سے یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آسکیں۔

اس سدِ ذوالقرنین کے تا قیامت باقی رہنے پر بڑا استدلال تو قرآن کریم کے اس لفظ سے کیا جاتا ہے کہ فَإِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّي جَعَلَهُۥ دَكَّآءَ، یعنی ذوالقرنین کا یہ قول کہ جب میرے رب کا وعدہ آپہونچے گا (یعنی خروج یاجوج ماجوج کا وقت آجائے گا) تو اللہ تعالیٰ اس آہنی دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دیں گے، اس آیت میں وَعۡدُ رَبِّي کا مفہوم ان حضرات نے قیامت کو قرار دیا ہے، حالانکہ الفاظِ قرآن اس بارے میں قطعی نہیں، کیونکہ وَعۡدُ رَبِّي کا صریح

مفہوم تو یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا راستہ روکنے کا جو انتظام ذوالقرنین نے کیا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے، جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ ان کا راستہ کھل جائے تو یہ دیوار منہدم و مسمار ہو جائے گی اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل قیامت کے متصل ہو چنانچہ تمام حضرات مفسرین نے وَعْدُ رَبِّي کے مفہوم میں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں ہے: والوعد یحتمل ان یراد بہ یوم القیٰمۃ وان یراد بہ وقت خروج یاجوج وماجوج۔

اس کا تحقق یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار منہدم ہو کر راستہ ابھی کھل گیا ہو، اور یاجوج و ماجوج کے حملوں کی ابتداء ہو چکی ہو، خواہ اس کی ابتداء چھٹی صدی ہجری کے فتنہ تاتار سے قرار دی جائے، یا اہل یورپ اور روس و چین کے غلبہ سے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان متمدن قوموں کے خروج اور فساد کو جو آئینی اور قانونی رنگ میں ہو رہا ہے وہ فساد نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا پتہ قرآن و حدیث دے رہے ہیں کہ خالص قتل و غارت گری اور ایسی خوں ریزی کے ساتھ ہوگا کہ تمام انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر دے گا، بلکہ اس کا حاصل پھر یہ ہوگا کہ انہی مفسد یاجوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آ کر متمدن بن گئیں اسلامی ممالک کے لئے بلاشبہ وہ فساد عظیم اور فتنہ عظیمہ ثابت ہوئیں مگر ابھی ان کی وحشی قومیں جو قتل و خوں ریزی کے سوا کچھ نہیں جانتیں وہ تقدیری طور پر اس طرف نہیں آئیں اور بڑی تعداد ان کی ایسی ہی ہے، ان کا خروج قیامت کے بالکل قریب میں ہوگا۔

دوسرا استدلال ترمذی اور مسند احمد کی اس حدیث سے کیا جاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ یاجوج ماجوج اس دیوار کو روزانہ کھودتے رہتے ہیں، مگر اول تو اس حدیث کو ابن کثیر نے معلول قرار دیا ہے، دوسرے اس میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں کہ جس روز یاجوج ماجوج انشاء اللہ کہنے کی برکت سے اس کو پار کرلیں گے وہ قیامت کے متصل ہی ہوگا، اور اس کی بھی اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں کہ سارے یاجوج ماجوج اسی دیوار کے پیچھے رُکے ہوئے رہیں گے، اگر ان کی کچھ جماعتیں یا قومیں کسی دوسرے دور دراز کے راستہ سے اس طرف آ جائیں، جیسا کہ آجکل کی طاقتور بحری جہازوں کے ذریعہ ایسا ہو جانا کچھ مستبعد نہیں، اور بعض مؤرخین نے لکھا بھی ہے کہ یاجوج ماجوج کو طویل بحری سفر کر کے اس طرف آنے کا راستہ مل گیا ہے، تو اس حدیث سے اس کی بھی نفی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل صریح اور قطعی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ سد ذوالقرنین قیامت تک باقی رہے گی، یا ان کے ابتدائی اور معمولی حملے قیامت سے پہلے اس طرف کے انسانوں پر نہیں ہو سکیں گے، البتہ وہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن حملہ

معارف و مسائل

بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ، بَعْضَہُمْ کی ضمیر میں ظاہر یہی ہے کہ یاجوج ماجوج کی طرف راجع ہے، اور ان کا جو حال اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجائیں گے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ان کا راستہ کھلے گا، اور وہ زمین پر پہاڑوں کی بلندیوں سے جلد بازی کے ساتھ اتریں گے، مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں۔

وَجَمَعْنٰهُمْ، ضمیرہم مخلوق جن و انس کی طرف راجع ہے، مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں تمام مکلف مخلوق جن و انس کو جمع کر دیا جائے گا۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ

اب کیا سمجھتے ہیں منکر کہ ٹھہرائیں میرے بندوں کو میرے سوا

اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا (۱۰۲) قُلْ هَلْ

حمایتی ہم نے تیار کیا ہے دوزخ کو کافروں کی مہمانی، تو کہہ ہم

نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا (۱۰۳) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي

بتائیں تم کو کن کا کیا ہوا گیا بہت اکارت، وہ لوگ جن کی کوشش بھٹکتی رہی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۰۴)

دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ خوب بناتے ہیں کام،

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

وہی ہیں جو منکر ہوئے اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے ملنے سے سو برباد گیا ان کا کیا ہوا

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۰۵) ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ

پھر نہ کھڑی کریں گے ہم ان کے واسطے قیامت کے دن تول، یہ بدلہ ان کا ہے دوزخ اس

بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (۱۰۶) اِنَّ الَّذِيْنَ

پر کہ منکر ہوئے اور ٹھہرایا میری باتوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا، جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام ان کے واسطے ہے ٹھنڈی چھاؤں کے باغ مہمانی،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

رہا کریں ان میں نہ چاہیں وہاں سے جگہ بدلنی۔

خلاصۂ تفسیر

کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو (یعنی جو میرے مملوک و محکوم ہیں خواہ اختیاراً یا اضطراراً ان کو) اپنا کارساز (یعنی معبود اور حاجت روا) قرار دیں (جو شرک اور کفر کھلا ہوا ہے) ہم نے کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے (دعوت بطور تحقیر و تہکم کے فرمایا) اور اگر ان کو اپنے ان اعمال پر ناز ہو جن کو وہ حسنہ اور نیکی سمجھتے ہوں اور اس کے سبب وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ عذاب سے محفوظ سمجھتے ہوں تو آپ ان سے کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرائی محنت (جو اعمال حسنہ میں کی تھی) سب گئی گذری ہوئی اور وہ (بوجہ جہالت کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں (آگے ان لوگوں کا مصداق ایسے عنوان سے بتلاتے ہیں جس سے ان کی محنت ضائع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے، اور پھر اس حبط اعمال کی تصریح بھی بطور تفریع کے فرماتے ہیں یعنی) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں (اس لئے) ان کے سارے (نیک) کام غارت گئے تو قیامت کے روز ہم ان کے نیک اعمال کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے (بلکہ) ان کی سزا وہی ہوگی (جو اوپر مذکور ہوئی) یعنی دوزخ، اس لئے کہ انھوں نے کفر کیا تھا اور (اس کفر کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ) میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔ (آگے ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کی مہمانی کے لئے فردوس (یعنی بہشت) کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (نہ ان کو کوئی نکالے گا) اور نہ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہیں گے۔

معارف و مسائل

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ، تفسیر بحرمحیط میں ہے کہ اس جگہ عبارت میں حذف ہے، یعنی فیجدیهم نفعًا و ینتفعون بذلك الاتخاذ، اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ کفر کرنے والے جنھوں نے میرے بجائے میرے بندوں کو اپنا معبود اور کارساز بنالیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو معبود و کارساز بنالینا ان کو کچھ نفع بخشے گا، اور وہ اس سے کچھ فائدہ اٹھالیں گے، اور یہ استفہام انکاری ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا سمجھنا غلط اور جہالت ہے

عِبَادِي سے مراد اس جگہ فرشتے اور وہ انبیاء ہیں جن کی دنیا میں لوگوں نے پرستش کی اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، جیسے حضرت عزیر اور مسیح علیہ السلام، فرشتوں کی عبادت کرنے والے بعض عرب تھے، اور عزیر علیہ السلام کو یہود نے، عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا کا شریک قرار دیا، اس لئے اَلَّذِينَ كَفَرُوا سے اس آیت میں کفار کے یہی فرقے مراد ہیں، اور جن بعض مفسرین نے اس جگہ عبادی سے مراد شیاطین لئے تو الَّذِينَ كَفَرُوا سے وہ کفار مراد ہوں گے جو جنات و شیاطین کی پرستش کرتے ہیں، بعض نے اس جگہ لفظ عبادی کو مخلوق و مملوک کے معنی میں لے کر عام قرار دیا جس میں سب معبوداتِ باطلہ بت، آگ، اور ستارے بھی داخل ہو گئے، خلاصۂ تفسیر میں لفظ محکوم و مملوک سے اسی کی طرف اشارہ ہے، بحرمحیط وغیرہ میں پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

أَوْلِيَاءَ، ولی کی جمع ہے، یہ لفظ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس سے مراد کارساز، حاجت روا ہے، جو معبود برحق کی خاص صفت ہے، مقصود اس سے ان کو معبود قرار دینا ہے۔

الْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا، اس جگہ یہی دو آیتیں اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ہر اس فرد یا جماعت کو شامل ہیں جو کچھ اعمال کو نیک سمجھ کر اس میں جد و جہد اور محنت کرتے ہیں، مگر اللہ کے نزدیک ان کی محنت برباد اور عمل ضائع ہے، قرطبی نے فرمایا کہ یہ صورت دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے، ایک فسادِ اعتقاد، دوسرے ریاکاری، یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہو وہ عمل کتنے ہی اچھے کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہیں۔ اسی طرح جس کا عمل مخلوق کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ہو وہ بھی عمل کے ثواب سے محروم ہے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے بعض حضرات صحابہ نے اس کا مصداق خوارج کو اور بعض مفسرین نے معتزلہ اور روافض وغیرہ گمراہ فرقوں کو قرار دیا

مگر اگلی آیت میں یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ اس جگہ مراد وہ کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور قیامت و آخرت کے منکر ہوں، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ، اس لئے قرطبی، ابوحیان، مظہری وغیرہ میں ترجیح اس کو دی گئی ہے کہ اصل مراد اس جگہ وہی کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہوں، مگر صورۃً وہ لوگ بھی اس کے مفہوم عام سے بے تعلق نہیں ہو سکتے جن کے اعمال ان کے عقائد فاسدہ نے برباد کر دیئے، اور ان کی محنت رائیگاں ہو گئی بعض صحابہ کرام حضرت علیؓ اور سعدؓ سے جو ایسے اقوال منقول ہیں ان کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا، یعنی ان کے اعمال جو ظاہر میں بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر میزانِ حساب میں اُن کا کوئی وزن نہ ہوگا کیونکہ یہ اعمال کفر و شرک کی وجہ سے بے کار اور بے وزن ہوں گے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک آدمی قد آور فربہ آئے گا جو اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی وزن دار نہ ہوگا، اور پھر فرمایا کہ اگر اس کی تصدیق کرنا چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا

اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ (قیامت کے روز) ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو جسامت کے اعتبار سے تہامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے، مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ (قرطبی)

جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ، فردوس کے معنی سرسبز باغ کے ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یا عجمی، جن لوگوں نے عجمی کہا ہے اس میں بھی فارسی ہے یا رومی یا سریانی مختلف اقوال ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے اس کے اوپر عرش رحمن ہے، اور اسی سے جنت کی سب نہریں نکلتی ہیں (قرطبی)

لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا، مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنت کا یہ مقام ان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرما دیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا وہ وہاں سے کبھی نکالا نہ جائے گا، مگر یہاں ایک خطرہ کسی کے دل میں یہ گذر سکتا تھا کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ ایک جگہ رہتے رہتے اُکتا جاتا ہے، وہاں سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کی

خواہش ہوتی ہے، اگر جنت سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہ ہوئی تو ایک قید محسوس ہونے لگے گی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ جنت کو دوسرے مقامات پر قیاس کرنا جہالت ہے، جو شخص جنت میں چلا گیا پھر جو کچھ دنیا میں دیکھا اور برتا تھا جنت کی نعمتوں اور دلکش فضاؤں کے سامنے اس کو وہ سب چیزیں لغو معلوم ہوں گی، اور یہاں سے کہیں باہر جانے کا کبھی کسی کے دل میں خیال بھی نہ آئے گا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ

تو کہہ اگر دریا سیاہی ہو کہ لکھے میرے رب کی باتیں بیشک دریا خرچ ہو چکے ابھی نہ

تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا

پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگرچہ دوسرا بھی لائیں ہم ویسا ہی اس کی مدد کو۔ تو کہہ میں بھی

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ

ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے، سو پھر

كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ

جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے سو وہ کرے کچھ کام نیک اور شریک نہ کرے

بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

ع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات و عبارات جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہوں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف کو کوئی بیان کرنے لگے تو ایسے کلمات کو) لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو (اور اس سے لکھنا شروع کرے) تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (اور سب باتیں احاطہ میں نہ آئیں گی) اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لئے ہم لے آئیں (تب بھی وہ باتیں ختم نہ ہوں اور دوسرا سمندر بھی ختم ہو جائے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر متناہی ہیں، اس کے سوا جن چیزوں کو کافروں نے اللہ کا شریک مانا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، اس لئے الوہیت و ربوبیت [خدا ہونا اور رب ہونا] اسی کی

ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے ان لوگوں سے آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ میں تو تم سب کی طرح بشر ہوں (نہ خدائی کا دعوے دار ہوں نہ فرشتہ ہونے کا، ہاں) میرے پاس (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے (اور) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے اور اس کا محبوب بننا چاہے) تو (مجھ کو رسول مان کر میری شریعت کے موافق) نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

معارف و مسائل

سورۂ کہف کی آخری آیت میں وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا، کا شان نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرک خفی یعنی ریاء ہے۔

امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے، اور اس کو صحیح علیٰ شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرلے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا)۔

اور ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں طاؤسؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں بعض اوقات کسی نیک کام کے لئے یا عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا قصد اس سے اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ دل میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ لوگ میرے عمل کو دیکھیں، آپؐ نے یہ سن کر سکوت فرمایا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اور ابو نعیم اور تاریخ ابن عساکر میں بروایت ابن عباسؓ لکھا ہے کہ جندب بن زہیرؓ صحابی جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے پھر دیکھتے کہ لوگ ان اعمال سے انکی تعریف و ثنا کر رہے ہیں تو اس سے ان کو خوشی ہوتی، اور اپنے اس عمل کو اور زیادہ کر دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریاکاری کا شرک خفی ہے، اور یہ کہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لئے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی نفسانی غرض شہرت و وجاہت کی بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے، جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رساں بنا دیتا ہے۔

لیکن بعض دوسری احادیث صحیحہ سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، مثلاً ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات اپنے گھر کے اندر اپنے جائے نماز پر (نماز میں مشغول) ہوتا ہوں، اچانک کوئی آدمی آجائے تو مجھے یہ بات اچھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا (تو کیا یہ ریا ہوگئی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوہریرہ خدا تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے تمہیں اس وقت دو اجر ملتے ہیں، ایک خفیہ عمل کا جو پہلے سے کر رہے تھے دوسرا علانیہ عمل کا جو اس آدمی کے آجانے کے بعد ہوگیا (یہ ریا نہیں)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں فرمائیے کہ جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، پھر لوگوں کو سُنے کہ وہ اس عمل کی تعریف و مدح کر رہے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی یہ تو مؤمن کے لئے نقد بشارت ہے (کہ اس کا عمل اللہ کے نزدیک قبول ہوا اس نے اپنے بندوں کی زبانوں سے اس کی تعریف کرادی)۔

تفسیر مظہری میں ان دونوں قسم کی روایتوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے اس کی تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ پہلی روایت جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی اس صورت میں ہیں جب کہ انسان اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے ساتھ مخلوق کی رضاجوئی یا اپنی شہرت و وجاہت کی نیت کو بھی شریک کرے، یہاں تک کہ لوگوں کی تعریف کرنے پر اپنے اس عمل کو اور بڑھا دے یہ بلاشبہ ریا اور شرک خفی ہے۔

اور بعد کی روایات ترمذی اور مسلم کی اس صورت سے متعلق ہیں جبکہ اس نے عمل خالص اللہ کے لئے کیا ہو لوگوں میں اس کی شہرت یا ان کی مدح و ثناء کی طرف کوئی التفات نہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو مشہور کردیں اور لوگوں کی زبانوں پر اس کی تعریف جاری فرمادیں تو اس کا ریا سے کوئی تعلق نہیں، یہ مؤمن کے لئے نقد بشارت (قبولِ عمل کی) ہے۔

ریاکاری کے نتائج بد اور اس پر حدیث کی وعید شدید

حضرت محمود بن لبیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ریا (رواہ احمد فی مسندہ)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کرکے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزاء عطا فرمائیں گے تو ریاکار لوگوں سے

فرما دیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزا لینے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لئے کوئی جزا ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں شرکاء میں شریک ہونے سے غنی اور بالاتر ہوں جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اس کو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا (رواہ مسلم)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص اپنے نیک عمل کو لوگوں میں شہرت کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں وہ حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے، (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان، از تفسیر مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ سے اخلاص اور ریاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تمھیں اپنے نیک اور اچھے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب ہو اور بُرے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب نہ ہو، پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال لوگوں پر ظاہر فرما دیں تو تم یہ کہو کہ یا اللہ یہ سب آپ کا فضل ہے احسان ہے میرے عمل اور کوشش کا اثر نہیں

اور حکیم ترمذی نے صدیق اکبرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ ھُوَ فِیْکُمْ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ، یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمھیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کر لو تو شرک اکبر و شرک اصغر (یعنی ریاء) سب سے محفوظ ہو جاؤ تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعاء کیا کرو، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَآ اَعْلَمُ ۔

سورۂ کہف کے بعض فضائل اور خواص

حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد رکھیں وہ دجّال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (رواہ مسلم واحمد وابوداؤد والنسائی)۔

اور امام احمد، مسلم، اور نسائی نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ہی اس روایت میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں، کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں یاد رکھیں وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اور حضرت انسؓ کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے ایک نور ہو جائے گا، اس کے قدم سے لیکر سر تک اور جس نے یہ سورۃ پوری پڑھی اس کے لئے نور ہوگا زمین سے آسمان تک (اخرجہ ابن السنی و احمد فی مسندہ)

اور حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پوری پڑھ لی، تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا (رواہ الحاکم وصححہ والبیہقی فی الدعوات) از مظہری

اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے کہا کہ میں دل میں ارادہ کرتا ہوں کہ آخر رات میں بیدار ہو کر نماز پڑھوں، مگر نیند غالب آجاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ جب تم سونے کے لئے بستر پر جاؤ تو سورۂ کہف کی آخری آیتیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا سے آخر سورت تک پڑھ لیا کرو تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اسی وقت بیدار کر دیں گے (رواہ الثعلبی)

اور مسند دارمی میں ہے کہ زر بن حبیشؓ نے حضرت عبدہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورۂ کہف کی یہ آخری آیتیں پڑھ کر سوئے گا تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا اسی وقت بیدار ہو جائے گا، عبدہؒ کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک اہم نصیحت ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ طرطوشیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری عمر عزیز کے اوقات اپنے ہمعصروں سے مقابلے اور دوستوں سے میل جول ہی میں نہ گذر جائیں، دیکھو اللہ تعالیٰ نے بیان کو اس آیت پر ختم فرمایا ہے:- فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا، یعنی جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو حصہ دار نہ بنائے (قرطبی)

الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، آج ۸ ذی القعدہ ۱۳۸۹ھ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ سورۂ کہف کی یہ تفسیر مکمل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہی ہے کہ اس وقت قرآن کریم کا نصف اول سے کچھ زائد پورا ہو گیا، جبکہ عمر کا چہترواں سال چل رہا ہے، اور ضعف طبعی کے ساتھ دو سال سے مختلف امراض نے بھی گھیرا ہوا ہے، اور افکار کا ہجوم بھی غیر معمولی ہے، کچھ عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے باقی قرآن کی بھی تکمیل کرا دیں، وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

جلد پنجم تمام شد

معارف القرآن

جلد

۶

مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مؤمنون، نور، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم

پارہ ۱۶، رکوع ۴ تا پارہ ۲۱، رکوع ۹

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

[illegible]

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
احاطہ دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰
فون: ۵۰۴۹۷۳۳، ۵۰۳۲۰۲۰

باہتمام : محمد مشتاق سنی
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین معارف القرآن جلد ششم ۶

سورۂ حج ۲۲

سورۂ مؤمنون ۲۳

سورۂ فرقان ۲۵

سُورَۃ الشعراء ۲۶ پ ۱۹

سُوْرَۃُ نَمْل پ۱۹

تمت

سورة مريم

سورۂ مریم

سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ مریم مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اٹھانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾ اِذْ نَادٰى

یہ مذکور ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندہ زکریا پر جب پکارا اس نے

رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿٣﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ

اپنے رب کو چھپی آواز سے بولا اے میرے رب بوڑھی ہوگئیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا

الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٤﴾ وَاِنِّيْ

سر سے بڑھاپے کا اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا اور میں

خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ

ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور عورت میری بانجھ ہے سو بخش تو

لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿٥﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ

مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اٹھانے والا جو میری جگہ بیٹھے اور یعقوب کی اولاد کی،

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿٦﴾ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ

اور کر اس کو اے رب من مانتا اے زکریا ہم تجھ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک لڑکے کی جس کا نام ہے

يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿٧﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ

یحییٰ نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی بولا اے رب کہاں سے ہوگا مجھ کو

لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ

لڑکا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا یہاں تک کہ

عِتِيًّا ﴿٨﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ

اکڑ گیا — کہا یونہی ہوگا — فرما دیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے — اور تجھ کو پیدا کیا میں نے

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿٩﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ

پہلے سے — اور نہ تھا تو کوئی چیز — بولا اے رب ٹھہرا دے میرے لئے کوئی نشانی — فرمایا

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿١٠﴾ فَخَرَجَ عَلٰي

تیری نشانی یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے تین رات تک — صحیح تندرست — پھر نکلا اپنے لوگوں

قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿١١﴾

کے پاس حجرہ سے — تو اشارہ سے کہا اُن کو — کہ یاد کرو — صبح — اور شام

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّ

اے یحییٰ — اُٹھا لے کتاب زور سے — اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکا پن میں — اور

حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ

شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی — اور تھا پرہیزگار — اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے — اور

يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ

نہ تھا زبردست خود سر — اور سلام ہے اُس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے

وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ ع

اور جس دن اُٹھ کھڑا ہو زندہ ہوکر

ع ۱۵

خلاصۂ تفسیر

کٓھٰیٰعٓصٓ ○ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آئندہ قصہ آتا ہے) تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے (مقبول) بندہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام کے حال) پر جبکہ اُنھوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا (جس میں یہ) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں (بوجہ پیری کے) کمزور ہوگئیں اور (میرے) سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی (یعنی تمام بال سفید ہوگئے اور اس حالت کا مقتضا یہ ہے کہ میں اس حالت میں اولاد کی درخواست نہ کروں مگر چونکہ آپ کی قدرت و رحمت بڑی کامل ہے) اور (میں اس قدرت و رحمت کے ظہور کا خوگر ہمیشہ) رہا ہوں چنانچہ

اس کے قبل کبھی) آپ سے (کوئی چیز) مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں (اس بناء پر بعید سے بعید مقصود بھی طلب کرنا مضائقہ نہیں) اور (اس طلب کا مرجح یہ امر خاص ہوگیا ہے کہ) میں اپنے (مرنے کے) بعد (اپنے) رشتہ داروں (کی طرف) سے (یہ) اندیشہ رکھتا ہوں (کہ میری مرضی کے موافق شریعت اور دین کی خدمت نہ بجالاویں گے۔ یہ امر مرجح ہے طلبِ اولاد کے لئے جس میں خاص خاص اوصاف پائے جاویں جن کو توقع خدمتِ دین میں دخل ہو) اور (چونکہ میری پیرانہ سالی کے ساتھ میری بیوی (بھی) بانجھ ہے جس کے کبھی باوجود صحتِ مزاج کے اولاد ہی نہیں ہوئی اسلئے اسبابِ عادیہ اولاد ہونے کے بھی مفقود ہیں سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے (یعنی بلا توسط اسباب عادیہ کے) ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دیدیجئے کہ وہ (میرے علومِ خاصہ میں) میرا وارث بنے اور (میرے جد یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (کے علوم متوارثہ میں اُن) کا وارث بنے (یعنی علوم سابقہ و لاحقہ اُس کو حاصل ہوں) اور (بوجہ باعمل ہونے کے) اس کو اے میرے رب (اپنا) پسندیدہ (و مقبول) بنا یئے (یعنی عالم بھی ہو اور عامل بھی ہو۔ حق تعالیٰ کا بواسطہ ملائکہ کے ارشاد ہوا کہ) اے زکریا ہم تم کو یک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جسکا نام یحیٰی ہوگا کہ اسکے قبل (خاص اوصاف میں) ہم نے کسی کو اسکا ہم صفت نہ بنایا ہوگا (یعنی جس علم و عمل کی تم دُعا کرتے ہو وہ تو اس فرزند کو ضرور ہی عطا کریں گے اور مزید برآں کچھ اوصافِ خاصہ بھی عنایت کئے جاویں گے مثلاً خشیتِ الٰہیہ سے خاص درجہ کی رقّتِ قلب وغیرہ۔ چونکہ اس اجابتِ دُعا میں کوئی خاص کیفیت حصولِ ولد کی بتلائی نہ گئی تھی اس لئے اس کے استفسار کیلئے) زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے میرے رب میرے اولاد کس طرح پر ہوگی حالانکہ میری بی بی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں (میں معلوم نہیں کہ ہم جوان ہونگے یا مجھ کو دوسرا نکاح کرنا ہوگا یا بحالتِ موجودہ اولاد ہوگی) ارشاد ہوا کہ حالت (موجودہ) یوں ہی رہے گی (اور پھر اولاد ہوگی اے زکریا) تمہارے رب کا قول ہے کہ یہ (امر) مجھ کو آسان ہے اور (یہ کیا اس سے بڑا کام کرچکا ہوں مثلاً) میں نے تم کو (ہی) پیدا کیا ہے حالانکہ (پیدائش کے قبل) تم کچھ بھی نہ تھے (اسی طرح خود اسبابِ عادیہ بھی کوئی چیز نہ تھے جب معدوم کو موجود کرنا آسان ہے تو ایک موجود سے دوسرا موجود کردینا کیا مشکل ہے یہ سب ارشاد تقویتِ رجا کے لئے تھا نہ کہ دفعِ شبہ کے لئے، کیونکہ زکریا علیہ السلام کو کوئی شبہ نہ تھا جب) زکریا (علیہ السلام کو قوی اُمید ہوگئی تو اُنھوں) نے عرض کیا کہ اے میرے رب (وعدہ پر تو اطمینان ہوگیا اب اس وعدہ کے قریب وقوع یعنی حمل کی بھی) کوئی علامت میرے لئے مقرر فرما دیجئے (تاکہ زیادہ شکر کروں اور خود وقوع تو محسوسات ظاہرہ ہی میں سے ہے، ارشاد ہوا کہ تمہاری (وہ) علامت یہ ہے کہ تم تین رات (اور تین دن تک) آدمیوں سے بات (چیت) نہ کرسکو گے حالانکہ تندرست ہوگے (کوئی بیماری وغیرہ

نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ذکر اللہ کے ساتھ تکلم پر قدرت رہے گی چنانچہ بإذن اللہ تعالیٰ زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہوئیں اور حسب اخبار الٰہی زکریا علیہ السلام کی زبان بستہ ہوگئی) پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے اور ان کو اشارہ سے فرمایا (کیونکہ زبان سے تو بول نہ سکتے تھے) کہ تم لوگ صبح اور شام خدا کی پاکی بیان کیا کرو۔ (یہ تسبیح اور امر بالتسبیح یا تو حسب معمول تھا ہمیشہ تذکیر زبان سے کہتے تھے آج اشارہ سے کہا یا اس نعمت جدیدہ کے شکر میں خود بھی تسبیح کی کثرت فرمائی اور دوسروں کو بھی اسی طور پر امر فرمایا غرض پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو ان کو حکم ہوا کہ) اے یحییٰ کتاب کو (یعنی توریت کو کہ اسوقت وہی کتاب شریعت تھی اور انجیل کا نزول بعد میں ہوا) مضبوط ہو کر لو (یعنی خاص کوشش کے ساتھ عمل کرو) اور ہم نے ان کو (ان کے) لڑکپن ہی میں (دین کی) سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب (کی صفت) اور پاکیزگی (اخلاق کی) عطا فرمائی تھی (حکم میں علم کی طرف اور حنان اور زکوٰۃ میں اخلاق کی طرف اشارہ ہوگیا) اور (آگے اعمال ظاہرہ کیطرف اشارہ فرمایا کہ) وہ بڑے پرہیزگار اور اپنے والدین کے خدمت گزار تھے (اسمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی طرف اشارہ ہوگیا) اور وہ (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنیوالے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے اور (عند اللہ ایسے وجیہ اور مکرم تھے کہ انکے حق میں منجانب اللہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ) ان کو (اللہ تعالیٰ کا) سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اٹھائے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سورۂ کہف کے بعد سورۂ مریم شاید اس مناسبت سے رکھی گئی کہ جیسے سورۂ کہف بہت سے واقعاتِ عجیبہ پر مشتمل تھی اسی طرح سورۂ مریم بھی ایک واقعات غریبہ پر مشتمل ہے۔ (روح المعانی)

کٓھٰیٰعٓصٓ حروف مقطعہ اور متشابہات میں سے ہے جسکا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے بندوں کے لئے اس کی تفتیش بھی اچھی نہیں۔ نِدَآءً خَفِيًّا، اس سے معلوم ہوا کہ دُعا کا آہستہ اور خفیہ کرنا افضل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی، یعنی بہترین ذکر خفی (آہستہ) ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے (ضرورت سے نہ گھٹے نہ بڑھے) (قرطبی)

اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا، کمزوری ہڈیوں کی ذکر فرمائی کیونکہ ہڈی ہی عمود بدن ہیں، جب ہڈی ہی کمزور ہو جائے تو سارے بدن کی کمزوری ہے۔ اشتعل کے لفظی معنی بھڑک اٹھنے کے ہیں اس جگہ بالوں کی سفیدی کو آگ کی روشنی سے تشبیہ دیکر سفید بال سر پر پھیل جانا مقصود ہے۔

دُعا میں اپنی حاجتمندی کا اظہار مستحب ہے | اس جگہ دُعا سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے

ضعف و کمزوری کا ذکر کیا، اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان حالات کا مقتضا یہ تھا کہ اولاد کی خواہش نہ کریں۔ ایک دوسری وجہ امام قرطبی نے تفسیر میں یہ بھی بیان فرمائی کہ دعا مانگنے کے وقت اپنے ضعف و بدحالی اور حاجتمندی کا ذکر کرنا قبولیت دعاء کے لئے اقرب ہے، اسی لئے علماء نے فرمایا کہ انسان کو چاہیئے کہ دعاء کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حاجتمندی کا ذکر کرے۔

مَوَالِیَ، مولیٰ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی چچا زاد بھائی اور اپنے عصبات کے بھی آتے ہیں، اس جگہ یہی مراد ہے۔

انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی | یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ، باتفاق جمہور علماء اس جگہ وراثت سے وراثت مالی مراد نہیں، کیونکہ اوّل تو حضرت زکریا کے پاس کوئی بڑی دولت ہونا ثابت نہیں جس کی فکر ہو کہ اسکا وارث کون ہوگا اور ایک پیغمبر کی شان سے بھی ایسی فکر کرنا بعید ہے اس کے علاوہ صحیح حدیث جس پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہے اس میں ہے

ان العلماء ورثة الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درهمًا انما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر رواه احمد وابو داؤد وابن ماجه والترمذی	بے شک علماء وارث ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہم السلام دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی وراثت علم ہوتا ہے جس نے علم حاصل کر لیا اس نے بڑی دولت حاصل کر لی۔

یہ حدیث کتب شیعہ کافی، کلینی وغیرہ میں بھی موجود ہے، اور صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا نورث وما ترکنا صدقة	ہم انبیاء کی مالی وراثت کسی کو نہیں ملتی ہم جو مال چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے

اور خود اس آیت میں یَرِثُنِیْ کے بعد وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کا اضافہ اس کی دلیل ہے کہ وراثت مالی مراد نہیں کیونکہ جس لڑکے کی پیدائش کی دعا کی جارہی ہے اس کا آل یعقوب کے لئے مالی وارث بننا بظاہر حال ممکن نہیں، کیونکہ آل یعقوب کے وارث اُن کے عصبات قریبہ ہونگے اور وہ وہی مَوَالِیَ ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا وہ بلاشبہ قرابت و عصوبت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے اقرب ہیں اقرب کے ہوتے ہوئے عصبہ بعید کو وراثت ملنا اُصولِ وراثت کے خلاف ہے۔

روح المعانی میں کتب شیعہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

روی الکلینی فی الکافی عن ابی البختری عن ابی عبد اللہ قال ان سلیمان ورث داؤد وان محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم ورث سلیمان	سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی مالی وراثت ملنے کا کوئی احتمال و امکان ہی نہیں، مراد اس سے علوم نبوت کی وراثت ہے اس سے معلوم ہوا کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ میں بھی وراثت مالی مراد نہیں۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا، لفظ سمی کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں، اور مثل و مشابہ کے بھی، اس جگہ اگر پہلے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے پہلے یحییٰ نام کسی شخص کا نہیں ہوا تھا۔ یہ نام کی یکتائی اور امتیاز بھی بعض خاص صفات میں اُنکی یکتائی کیطرف مشیر تھی اسلئے اس کو ان کی صفتِ خاص میں ذکر کیا گیا اور اگر دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب یہ ہوگا کہ بعض خاص صفات اور حالات اُن کے ایسے ہیں جو پچھلے انبیاء میں کسی میں نہ تھے اُن صفاتِ خاصہ میں وہ بے مثل تھے۔ مثلاً اُن کا حَصُوْر ہونا وغیرہ اسلئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یحییٰ علیہ السلام پچھلے سارے انبیاء سے مطلقاً افضل ہوں کیونکہ اُن میں حضرت خلیل اللہ اور حضرت کلیم اللہ کا ان سے افضل ہونا مسلم و معروف ہے۔ (مظہری)

عِتِيًّا، عتو سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تاثر قبول نہ کرنے کے ہیں مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہو جانا ہے۔ سَوِيًّا، کے معنے تندرست کے ہیں یہ لفظ اس لئے بڑھا دیا گیا کہ زکریا علیہ السلام پر اس حالت کا طاری ہونا کہ کسی انسان سے بات نہ کر سکیں کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا اور اسی وجہ سے ذکر اللہ اور عبادت میں اُنکی زبان ان تینوں دنوں میں برابر کھلی ہوئی تھی بلکہ یہ حالت بطور معجزہ اور علامت حمل کے اُن پر طاری کی گئی تھی۔ حَنَانًا، اس لفظ کے لغوی معنے رقتِ قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو امتیازی طور پر دی گئی تھی۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا

اور مذکور کر کتاب میں مریم کا جب جدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان

شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۖ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا

میں پھر پکڑ لیا اُن سے ورے ایک پردہ پھر بھیجا ہم نے اسکے پاس

رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ

اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اُس کے آگے آدمی پورا بولی مجھ کو رحمٰن کی

بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ

پناہ تجھ سے اگر ہے تو ڈر رکھنے والا بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے

رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُونُ لِي

رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا بولی کہاں سے ہوگا میرے

غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ

لڑکا اور چھوا نہیں مجھ کو آدمی نے اور میں بدکار کبھی نہیں تھی بولا یونہی ہے

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً

فرمایا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے اور اس کو ہم کیا چاہتے ہیں لوگوں کے لئے نشانی اور مہربانی اپنی

مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ﴿۲۱﴾

طرف سے، اور ہے یہ کام مقرر ہو چکا

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کتاب (یعنی قرآن کے اس خاص حصہ یعنی سورت) میں (حضرت) مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کہ وہ ذکر، زکریا علیہ السلام کے قصۂ مذکورہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اس وقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے (خود درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی آڑ میں غسل کر سکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا اور وہ (فرشتہ) ان کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت و شکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا (چونکہ حضرت مریم نے اس کو انسان سمجھا اسلئے گھبرا کر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاوے گا)، فرشتہ نے کہا (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو بلکہ) میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس لئے آیا ہوں) تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں (یعنی تمہارے منہ میں یا گریبان میں دم کر دوں جس کے اثر سے باذن اللہ حمل رہ جاوے اور لڑکا پیدا ہو) وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ میرے لڑکا کس طرح ہو جاوے گا حالانکہ (اس کی شرائط عادیہ میں سے مرد کے ساتھ مقاربت ہے اور وہ بالکل مفقود ہے کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی بشر کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہو جاوے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ بغیر اسباب عادیہ کے بچہ پیدا کر دوں) مجھ کو آسان ہے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم بغیر اسباب عادیہ کے اس خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنا دیں اور (نیز اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعث رحمت بنا دیں اور یہ (بے باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہو کر رہے گی)۔

معارف و مسائل

اِنْتَبَذَتْ ، نبذ سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے دُور ڈالنے اور پھینکنے کے ہیں۔ انتباذ کے معنی مجمع سے ہٹ کر دُور چلے جانے کے ہوئے۔ مَكَانًا شَرْقِيًّا ، یعنی گھر کے اندر مشرقی جانب کے کسی گوشہ میں چلی گئیں۔ اُن کا گوشہ میں جانا کس غرض کے لئے تھا اسمیں احتمالات اور اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ غسل کرنے کے لئے اُس گوشہ میں گئی تھیں۔ بعض نے کہا کہ حسب عادت عبادتِ الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے محراب کی شرقی جانب کے کسی گوشہ کو اختیار کیا تھا۔ قرطبی نے اسی دوسرے احتمال کو حسن قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نصاریٰ نے جو جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنایا اور اس جانب کی تعظیم کرتے ہیں اُس کی وجہ یہی ہے۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا ، رُوح سے مُراد جمہور کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے بطن سے پیدا ہونے والے بشر کی شبیہ اُن کے سامنے کردی۔ مگر پہلا قول راجح ہے بعد کے کلمات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ، فرشتہ کو اُس کی اپنی اصلی صورت و ہیئت میں دیکھنا انسان کے لئے آسان نہیں، اُس کی ہیبت غالب آجاتی ہے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کو غارِ حرا میں اور بعد میں پیش آیا۔ اس مصلحت سے جبرئیلِ امین حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشکلِ انسانی ظاہر ہوئے۔ جب حضرت مریم نے ایک انسان کو اپنے قریب دیکھا جو پردہ کے اندر آگیا تو خطرہ ہوا کہ اس کا ارادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اس لئے فرمایا:

إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ ، (میں اللہ رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے) بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امین نے یہ کلمہ سُنا تو اللہ کے نام کی تعظیم کے لئے کچھ پیچھے ہٹ گئے۔

إِن كُنتَ تَقِيًّا ، یہ کلمہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی ظالم سے مجبور ہو کر فریاد کرے کہ اگر تو مؤمن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر۔ تیرا ایمان اس ظلم سے روکنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے مناسب ہے کہ اللہ سے ڈرو، غلط اقدام سے بچو۔ خلاصہ یہ ہے کہ إِن كُنتَ تَقِيًّا استعاذہ کی شرط نہیں بلکہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ کلمہ بطور مبالغہ کے لایا گیا ہے کہ اگر تم متقی بھی ہو تب بھی میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اور اسکے خلاف ہو تو معاملہ ظاہر ہے۔ (مظہری)

لِأَهَبَ لَكِ ، اس میں عطار فرزند کو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے بھیجا تھا کہ اُن کے گریبان میں پھونک ماردیں۔ یہ پھونک عطار فرزند کا ذریعہ بن جائے گی، اگرچہ یہ عطار دراصل فعلِ الٰہی ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ

پھر پیٹ میں لیا اس کو پھر یکسو ہوئی اسکو لیکر ایک بعید مکان میں، پھر لے آیا اسکو درد زہ

اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ

ایک کھجور کی جڑ میں بولی کسی طرح میں مر چکتی اس سے پہلے اور ہو جاتی

نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ

بھولی بسری پس آواز دی اسکو اسکے نیچے سے کہ غمگین مت ہو کر دیا تیرے

رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ

رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ

تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ

اُس سے گریں گی تجھ پر پکی کھجوریں اب کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ

پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی تو کہیو میں نے مانا ہے رحمٰن کا

صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ ۚ

روزہ سو بات نہ کروں گی آج کسی آدمی سے

خلاصۂ تفسیر

پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے اُن کے گریبان میں پھونک مار دی جس سے) اُن کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں پھر (جب درد شروع ہوا تو) دردِ زہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اُٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی نیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت و ضرورت کا ہونا چاہیئے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی، پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور اُن کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے بلکہ جس مقام پر حضرت مریم تھیں، اس سے اسفل مقام میں آڑ میں آئے اور

اُنھوں) نے اُن کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا (جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اُسی
فرشتہ کی آواز ہے جو اوّل ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا خوفِ بدنامی سے) مغموم مت ہو،
(کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رب نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک
نہر پیدا کردی ہے (جس کے دیکھنے سے اور پانی پینے سے فرحتِ طبعی ہو، نیز حسبِ روایت روح انکو اس
وقت پیاس بھی لگی تھی اور حسبِ مسئلہ طبیہ گرم چیزوں کا استعمال قبلِ وضع یا بعد وضع مسہلِ ولادت
و دافعِ فضلات و مقوّی طبیعت بھی ہے اور پانی میں گرمخونت (گرمی) بھی ہو جیسا بعض چشموں میں
مشاہد ہے تو اور زیادہ مزاج کے موافق ہوگا، نیز کھجور کثیر الغذاء، مولّدِ خون، مسمّن و مقوّی گردہ و کمر و
مفاصل ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے اور حرارت کی وجہ سے جو
اُس کی مضرت کا احتمال ہے سو اوّل تو رطب میں حرارت کم ہے، دوسرے پانی سے اسکی اصلاح ہوسکتی ہے
تیسرے مضرت کا ظہور جب ہوتا ہے کہ عضو میں ضعف ہو ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ مضرت سے خالی
نہیں ہوتی، نیز خرقِ عادت (کرامت) کا ظہور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت ہونے کی وجہ سے موجبِ
مسرّتِ روحانی بھی ہے) اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تر و تازہ کھجوریں
جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کے کھانے میں لذتِ جسمانی اور بطور خرقِ عادت کے پھل کے آنے میں
لذتِ روحانی مجتمع ہے) پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی
بچہ کے دیکھنے سے اور کھانے پینے سے اور علامت قبول عند اللہ ہونے سے خوش رہو)، پھر (جب بدنامی
کے احتمال کا موقع آوے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو تو اسکا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں
میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا بلکہ اشارہ سے اس سے)
کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے) روزہ کی منت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے
سو (اسوجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر اور دُعا میں
مشغول ہونا اور بات ہے بس تم اتنا جواب دیکر بے فکر ہوجانا، اللہ تعالیٰ اس مولود مسعود کو خرقِ
عادت کے طور پر بولتا کردیگا جس سے ظہورِ اعجاز دلیلِ نزاہت و عصمت ہوجاویگی غرض ہر
غم کا علاج ہوگیا۔)

معارف و مسائل

تمنائے موت کا حکم یہ تمنائے موت اگر غمِ دُنیا سے تھی تب تو غلبۂ حال کو اسکا عذر کہا جاویگا جس
میں انسان من کل الوجوہ مکلف نہیں رہتا اور اگر غمِ دین سے تھا کہ لوگ بدنام کریں گے اور
شاید مجھے اس پر صبر نہ ہوسکے تو بے صبری کی معصیت میں ابتلا ہوگا، موت سے اس معصیت
کی حفاظت رہیگی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے اور اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو کہا گیا کہ تم کہہ دینا

کہ میں نے نذر کی ہے سو انھوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اس سے یہ حکم بھی مفہوم ہو گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اس کو ظاہر کر دینا۔

سکوت کا روزہ شریعتِ اسلامیہ میں منسوخ ہو گیا قبل از اسلام یہ بھی عبادت میں داخل تھا کہ بولنے کا روزہ رکھے، صبح سے رات تک کسی سے کلام نہ کرے۔ اسلام نے اس کو منسوخ کر کے یہ لازم کر دیا کہ صرف بُرے کلام گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ عام گفتگو ترک کرنا اسلام میں کوئی عبادت نہیں رہی اس لئے اس کی نذر ماننا بھی جائز نہیں۔ لما رواہ ابوداؤد مرفوعاً لایتم بعد احتلام ولا صمات یوم الی اللیل وحسنہ السیوطی والعزیزی، یعنی بچہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے مرنے سے یتیم نہیں کہلاتا، اس پر احکام یتیم کے جاری نہیں ہوتے اور صبح سے شام تک خاموش رہنا تو (اسلام میں) کوئی عبادت نہیں۔ اور درد زہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طبّاً بھی مفید ہے اور اکل و شرب کا حکم بظاہر اباحت کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلافِ عقل نہیں اور حمل و تولد بدون توسط مرد کے خارق عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں بلکہ وصفِ اعجاز کا اور زیادہ ظاہر ہے لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ استبعاد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتبِ طب عورت کی منی میں قوتِ منعقدہ کے ساتھ قوتِ عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رجا میں اعضاء کی کچھ نا تمام صورت بھی بن جاتی ہے کما صرح بہ فی القانون، پس اگر یہی قوتِ عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا، حالانکہ اُس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر اُن کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں اُن کی گود میں گر جاتیں مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں تحصیلِ رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ (رُوح المعانی)

سَرِیًّا، لفظ سری کے لغوی معنی چھوٹی نہر کے ہیں۔ اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر اپنی قدرت سے بلا واسطہ جاری فرما دی یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کرا دیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا۔ **کُلِیْ وَاشْرَبِیْ**، وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا ہے خصوصاً جبکہ ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اُسکے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔ (رُوح المعانی)

فَأَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۚ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا

پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں وہ اس کو کہنے لگے اے مریم تو نے کی یہ چیز طوفان

فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ

کی اے بہن ہارون کی نہ تھا تیرا باپ بُرا آدمی اور نہ تھی تیری

اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ

ماں بدکار پھر ہاتھ سے بتلایا اس لڑکے کو بولے ہم کیونکر بات کریں اس شخص سے

فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ

کہ وہ ہے گود میں لڑکا وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور

جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِيْ

مجھ کو اس نے نبی کیا اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں اور تاکید کی مجھ کو

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ

نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں

يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ

بنایا مجھ کو زبردست بدبخت اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن

اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

مروں اور جس دن اٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر

خلاصۂ تفسیر

(غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلّی ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے) پھر وہ ان کو گود میں لئے ہوئے (وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہو کر) کہا اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، اور یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے بُرا ہے لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ) تمہارے باپ کوئی بُرے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو، پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام ان ہارون نبی کے نام پر رکھا

گیا ہے، وہ کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جسکا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اُس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے،) پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سُن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ اس سے کہو جو کچھ کہنا ہو یہ جواب دیگا) وہ لوگ (سمجھے کہ یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اُس شخص سے کی جاتی ہے جو کہ وہ بھی بات چیت کرتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات پر قادر نہیں، تو اس سے کیا بات کریں اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اُٹھا کہ میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو اللہ ہوں جیسا کہ جہلاء نصاریٰ سمجھیں گے اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے اور بندہ ہونے کے اور پھر خاص ہونے کے یہ آثار ہیں کہ) اُس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی (یعنی گو آئندہ دے گا مگر بوجہ یقینی ہونے کے ایسا ہی ہے جیسا کہ دیدی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بنا دے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے خلق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ پر برکت پہنچیگی وہ نفع تبلیغ دین ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے اُنھوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جبتک میں (دُنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلف نہیں رہے اور یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ اور دلائل ہیں خصوصیت کے، اور مجھ کو میری والدہ کا خدمتگذار بنایا (اور چونکہ بے باپ پیدا ہوئے ہیں اس لئے والدہ کی تخصیص کی گئی) اور اس نے مجھکو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ ادائے حقِ خالق یا ادائے حقِ والدہ سے سرکشی کروں یا حقوق واعمال کے ترک سے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ زمانہ قرب قیامت کا بعد نزول من السماء کے ہوگا) اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام دلیل ہے خاص بندہ ہونے کی)۔

معارف ومسائل

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ، ان الفاظ سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت مریم کو جب غیبی بشارتوں کے ذریعہ اسکا اطمینان ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدنامی اور رُسوائی سے بچادیں گے تو خود ہی اپنے نومولود بچے کو لیکر اپنے گھر واپس آگئیں۔ پھر یہ واپسی پیدائش کے کتنے دن بعد ہوئی۔ ابن عساکر کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولادت سے چالیس روز بعد جب نفاس سے فراغت وطہارت ہو چکی اُس وقت اپنے گھر والوں کے پاس آئیں (رُوح المعانی)

شَيْـًٔا فَرِيًّا، لفظ فری عربی زبان میں دراصل کاٹنے اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے، جس کام یا جس چیز کے ظاہر ہونے میں غیر معمولی کاٹ چھانٹ ہو اُس کو فری کہتے ہیں۔ ابو حیان نے فرمایا کہ

ہر امرِ عظیم کو فری کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھائی کے اعتبار سے عظیم ہو یا بُرائی کے اعتبار سے۔ اس جگہ بڑی بُرائی کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا اکثر استعمال ایسی ہی چیز کے لئے معروف ہے جو اپنی شناعت اور بُرائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور بڑی سمجھی جاتی ہو۔

یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ ، حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسٰی علیہ السلام کے بھائی اور ساتھی تھے حضرت مریم کے زمانے سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے یہاں حضرت مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا ظاہر ہے کہ اپنے اس ظاہری مفہوم کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا اسی لئے جب حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے پاس بھیجا تو انھوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اُخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارون علیہ السلام اُن سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہدیا کہ اہلِ ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکاً انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھتے ہیں اور اُن کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد و مسلم والترمذی والنسائی) اس حدیث کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت مریم کی نسبت حضرت ہارون کی طرف اس لئے کردی گئی کہ وہ اُن کی نسل و اولاد میں سے ہیں اگرچہ زمانہ کتنا ہی بعید ہو گیا ہو جیسے عرب کی عادت ہے کہ قبیلہ تمیم کے آدمی کو اخا تمیم اور عرب کے آدمی کو اخا عرب بولتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں ہارون سے مراد ہارون نبی حضرت موسٰی علیہ السلام کے رفیق مراد نہیں بلکہ حضرت مریم کے اپنے بھائی کا نام ہارون تھا جو تبرکاً حضرت ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا تھا اس طرح مریم کو اخت ہارون کہنا اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے درست ہو گیا۔

مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ ، ان الفاظِ قرآن سے اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ اور صالحین کی اولاد میں ہو وہ اگر کوئی بُرا کام کرتا ہے تو وہ عام لوگوں کے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُس کے بڑوں کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے اس لئے اولادِ صالحین کو اعمالِ صالحہ اور تقوٰی کی زیادہ فکر کرنا چاہیئے۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ، ایک روایت میں ہے کہ جس وقت خاندان کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنا شروع کی حضرت عیسٰی علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ جب انھوں نے ان لوگوں کی ملامت کو سُنا تو دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لیکر اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس پہلے ہی لفظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ اگرچہ میری پیدائش معجزانہ انداز سے ہوئی ہے مگر میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں تاکہ لوگ میری پرستش میں مبتلا نہ ہو جائیں

اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا، ان الفاظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور کتاب ملنے کی خبر دی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوت و کتاب نہیں ملی اسلئے مفہوم اسکا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما دیا ہے کہ مجھے اپنے وقت پر نبوت اور کتاب دیں گے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نبوت اُس وقت عطا کر دی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اُن کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ عطاء نبوت کا وعدہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قطعی اور یقینی تھا یہاں بھی اسی یقین کو عطاء نبوت کے لفظ ماضی سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ عطاء نبوت کا اظہار کرنے سے ان لوگوں کی بدگمانی رفع کر دی گئی کہ میری والدہ پر بدکاری کا الزام لگانا سر اسر غلط ہے کیونکہ میرا نبی ہونا اور مجھے رسالت کا ملنا اسکی دلیل ہے کہ میری پیدائش میں کسی گناہ کا دخل نہیں ہو سکتا۔

اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ، کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اسکو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی اسکا مفہوم یہی ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا۔

نماز اور زکوٰۃ، ایسی عبادتیں ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی و رسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں البتہ مختلف شریعتوں میں انکی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے۔ رہا یہ معاملہ کہ عیسٰی علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے، نہ گھر بنایا نہ کچھ جمع کیا پھر زکوٰۃ کا اُن کو حکم دینا کس بناء پر ہے؟ تو اسکا مقصد واضح یہ ہے کہ انکی شریعت میں قانون یہ بنا دیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اُسپر زکوٰۃ فرض ہے عیسٰی علیہ السلام بھی اسکے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدرِ نصاب جمع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کریں پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اُس کے منافی نہیں۔ (روح)

مَا دُمْتُ حَیًّا، یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم میرے لئے دائمی ہے جب تک زندہ ہوں ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ حیات ہے جو اس عالم دُنیا میں زمین پر ہے کیونکہ یہ اعمال اسی زمین پر ہو سکتے ہیں اور یہیں سے متعلق ہیں آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد نزول کے زمانے تک رخصت کا زمانہ ہے۔

بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ، اس جگہ صرف والدہ کا ذکر کیا والدین کا نہیں۔ اسمیں اشارہ کر دیا کہ میرا وجود معجزانہ طور پر بغیر والد کے ہوا ہے اور بچپن کا یہ معجزانہ کلام اسکے لئے کافی شہادت اور دلیل ہے۔

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ

یہ ہے عیسٰی مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ

يَمْتَرُوْنَ ۝٣٤ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ

جھگڑتے ہیں اللہ ایسا نہیں کہ رکھے اولاد وہ پاک ذات ہے

اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٣٥ وَاِنَّ اللّٰهَ

جب ٹھہرا لیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے اسکو کہ ہو وہ ہو جاتا ہے اور کہا بیشک

رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝٣٦

اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا، سو اسکی بندگی کرو، یہ ہے راہ سیدھی

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

پھر جُدی جُدی راہ اختیار کی فرقوں نے اُن میں سے سو خرابی ہے

كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٣٧ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ

منکروں کو جس وقت دیکھیں گے ایک دن بڑا کیا خوب سُنتے اور

اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ

دیکھتے ہونگے جس دن آئیں گے ہمارے پاس، پر بے انصاف آج کے دن صریح بہک

مُّبِيْنٍ ۝٣٨ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ

رہے ہیں اور ڈر سُنا دے اُن کو اُس پچھتاوے کے دن کا، جب فیصل ہو چکے گا کام

وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٩ اِنَّا نَحْنُ

اور وہ بھول رہے ہیں اور وہ یقین نہیں لاتے ہم وارث ہوں گے

نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝٤٠

زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر اور وہ ہماری طرف پھر آئیں گے

خلاصۂ تفسیر

یہ ہیں عیسٰی بن مریم (جن کے اقوال و احوال مذکور ہوئے جس سے ان کا بندۂ مقبول ہونا معلوم ہوتا ہے نہ جیسے کہ عیسائیوں نے ان کو بندوں کی فہرست سے خارج کر کے خدا تک پہنچا دیا ہے اور نہ ویسے جیسا کہ یہودیوں نے ان کو مقبولیت سے خارج کر کے طرح طرح کی تہمتیں لگائی ہیں) میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جس میں یہ (افراط و تفریط کرنے والے) لوگ جھگڑ رہے ہیں (چنانچہ

یہود و نصاریٰ کے اقوال اوپر معلوم ہوئے اور چونکہ یہود کا قول ظاہراً بھی موجبِ تنقیصِ نبی تھا جو کہ بداہۃً باطل ہے اس لئے اسکے رد کی طرف اس مقام پر توجہ نہیں فرمائی بخلاف قولِ نصاریٰ کے کہ ظاہراً مثبت زیادتِ کمال تھا کہ نبوت کے ساتھ خدا کا بیٹا ہونا ثابت کرتے تھے اس لئے آگے اس کو رَد فرماتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ اسمیں حق تعالیٰ کی تنقیص بوجہ انکارِ توحید کے لازم آتی ہے حالانکہ) اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو) اولاد بنائے وہ (بالکل) پاک ہے (کیونکہ اس کی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے (اور ایسے کمال کے واسطے اولاد کا ہونا عقلاً نقص ہے) اور (آپ اثباتِ توحید کے لئے لوگوں سے فرما دیجئے کہ مشرکین بھی سُن لیں کہ) بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (خالص خدا کی عبادت کرنا یعنی توحید اختیار کرنا دین کا) سیدھا راستہ ہے سو (توحید پر باوجود ان عقلی اور نقلی دلائل قائم ہونے کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارہ میں) باہم اختلاف ڈال دیا (یعنی توحید کا انکار کر کے طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے) سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے (بھاری) دن کے آجانے سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے کہ یہ دن ایکہزار سال دراز اور ہولناک ہونے کی وجہ سے بہت عظیم ہوگا) جس روز یہ لوگ (حساب و جزا کے لئے) ہمارے پاس آویں گے (اس روز) کیسے کچھ شنوا اور بینا ہو جائیں گے۔ (کیونکہ قیامت میں یہ حقائق پیش نظر ہو جاویں گے اور تمامتر غلطیاں رفع ہو جاویں گی) لیکن یہ ظالم آج (دُنیا میں کیسی) صریح غلطی میں (مبتلا ہو رہے) ہیں، اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جبکہ (جنت دوزخ کا) اخیر فیصلہ کر دیا جاویگا (جسکا ذکر حدیث میں ہے کہ جنت اور دوزخ والوں کو موت دکھلا کر اس کو ذبح کر دیا جاویگا اور دونوں کو خلود (یعنی ہمیشہ ہمیشہ اسی حال میں زندہ رہنے کا حکم سُنا دیا جاوے گا، رواہ الشیخان والترمذی۔ اور اسوقت کی حسرت کا بیحد ہونا ظاہر ہے) اور وہ لوگ (آج دُنیا میں، غفلت میں (پڑے) ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لیکن آخر ایک دن مریں گے) اور تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث (یعنی آخر مالک) ہم ہی رہ جاویں گے اور یہ سب ہمارے ہی پاس لوٹائے جاویں گے (پھر اپنے کفر و شرک کی سزا بھگتیں گے)۔

معارف و مسائل

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ، حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق یہود و نصاریٰ کے بیہودہ خیالات میں افراط و تفریط کا یہ عالم تھا کہ نصاریٰ نے تو تعظیم میں اتنی زیادتی کی کہ اُنکو خدا تعالےٰ

کا بیٹا بنادیا، اور یہود نے اُن کی توہین و تذلیل میں یہاں تک کہا کہ معاذ اللہ یوسف نجار کی ناجائز اولاد ہیں۔ معاذ اللہ، حق تعالیٰ نے ان دونوں غلط کاروں کی غلطی پر تنبیہ کر کے اصل حقیقت ان آیات میں واضح فرمادی۔ (قرطبی)

قَوْلَ الْحَقِّ، بفتح لام اس کی واضح ترکیب نحوی یہ ہے کہ اقول قول الحق اس کی اصل ہے اور بعض قراءتوں میں قَوْلُ الحق بضم لام بھی ہے تو اس صورت میں مراد یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود قول حق ہیں جیسا کہ ان کو کلمۃ اللہ کا لقب بھی دیا گیا ہے کیونکہ آپ کی پیدائش بلا واسطہ سبب ظاہری کے صرف اللہ تعالیٰ کے قول سے ہوئی ہے۔ (قرطبی)

یَوْمَ الْحَسْرَةِ، اس روز کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کہ اہل جہنم کو تو یہ حسرت ہونا ظاہر ہے کہ اگر وہ مومن صالح ہوتے تو ان کو جنت ملتی ب جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ ایک خاص قسم کی حسرت اہل جنت کو بھی ہوگی جیسا کہ طبرانی اور ابو یعلیٰ نے بروایت حضرت معاذ یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کو کسی چیز پر حسرت نہ ہوگی بجز ان لمحات وقت کے جو بغیر ذکر اللہ کے گزر گئے۔ اور بغویؒ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مرنے والے کو حسرت و ندامت سے سابقہ پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یہ ندامت و حسرت کس بناء پر ہوگی تو آپؐ نے فرمایا کہ نیک اعمال کرنے والے کو اس پر حسرت ہوگی کہ اور زیادہ نیک اعمال کیوں نہ کرلئے کہ اور زیادہ درجاتِ جنت ملتے اور بدکار آدمی کو اس پر حسرت ہوگی کہ وہ اپنی بدکاری سے باز کیوں نہ آگیا۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ

اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا بیشک تھا وہ سچا نبی جب

قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ

کہا اپنے باپ کو اے باپ میرے کیوں پوجتا ہے اس کو جو نہ سنے اور نہ دیکھے

وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ

اور نہ کام آئے تیرے کچھ اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک

الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلا دوں تجھ کو راہ سیدھی

يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ

اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بیشک شیطان ہے رحمٰن کا

عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يَٰٓأَبَتِ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ
نافرمان اے باپ میرے میں ڈرتا ہوں کہیں آلگے تجھ کو ایک آفت

ٱلرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ
رحمٰن سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی وہ بولا کیا تو پھرا ہوا ہے

عَنْ ءَالِهَتِى يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَٱهْجُرْنِى
میرے ٹھاکروں سے اے ابراہیم اگر تو باز نہ آئے گا تو تجھ کو سنگسار کرونگا اور دور ہو جا میرے

مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلَٰمٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّىٓ ۖ إِنَّهُۥ
پاس سے ایک مدت کہا تیری سلامتی رہے میں گناہ بخشواؤں گا تیرا اپنے رب سے بیشک

كَانَ بِى حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ
وہ ہے مجھ پر مہربان اور چھوڑتا ہوں تم کو اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا

وَأَدْعُوا۟ رَبِّى عَسَىٰٓ أَلَّآ أَكُونَ بِدُعَآءِ رَبِّى شَقِيًّا ﴿٤٨﴾
اور میں بندگی کرونگا اپنے رب کی، امید ہے کہ نہ رہوں گا اپنے رب کی بندگی کر کر محروم

فَلَمَّا ٱعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَهَبْنَا لَهُۥٓ
پھر جب جدا ہوا اُن سے اور جن کو وہ پوجتے تھے اللہ کے سوا بخشا ہم نے اُس کو

إِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن
اسحٰق اور یعقوب اور دونوں کو نبی کیا اور دیا ہم نے اُن کو اپنی

رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾
رحمت سے اور کیا اُن کے واسطے سچا بول اونچا

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) میں (لوگوں کے سامنے حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) ذکر کیجئے (تاکہ ان کو توحید و رسالت کا مسئلہ زیادہ منکشف ہو جاوے) وہ (ہر قول فعل میں) بڑے راستی والے تھے (اور) پیغمبر تھے (اور وہ قصہ جس کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے اُس وقت ہوا تھا) جب کہ انھوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک

تھا) کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سُنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے (مُراد بت ہیں حالانکہ اگر کوئی دیکھتا سُنتا کچھ کام آتا بھی ہو مگر واجب الوجود نہ ہو تب بھی لائق عبادت نہیں چہ جائیکہ ان اوصاف سے بھی عاری ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ لائق عبادت نہ ہوگا)، اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا (مراد اس سے وحی ہے جس میں احتمال غلطی کا ہو ہی نہیں سکتا پس میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قطعاً حق ہے جب یہ بات ہے) تو تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا (اور وہ توحید ہے) اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو (یعنی شیطان کو اور اس کی عبادت کو تو تم بھی بُرا سمجھتے ہو اور بُت پرستی میں شیطان پرستی بالیقین لازم ہے کہ وہی یہ حرکت کراتا ہے۔ اور کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں بھی اسکی تعلیم کو حق سمجھے یہی عبادت ہے پس بُت پرستی میں شیطان پرستی ہوئی اور) بیشک شیطان (حضرت) رحمان کا نافرمانی کرنے والا ہے (تو وہ کب اطاعت کے لائق ہوگا) اے میرے باپ، میں اندیشہ کرتا ہوں (اور وہ اندیشہ یقینی ہے) کہ تم پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے (خواہ دُنیا میں یا آخرت میں) پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھی ہو جاؤ (یعنی جب اطاعت میں اس کا ساتھ دوگے تو نفس عقوبت میں بھی اسکا ساتھ ہوگا گو شیطان کو دُنیا میں عذاب نہ ہوا ہو اور اس شیطان کی معیت اور مشارکت فی العقوبت کو کوئی اپنی بھلائی چاہنے والا پسند نہ کریگا۔

ابراہیم علیہ السّلام کی یہ تمام تر نصائح سنکر) باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم (اور اس لئے مجھ کو بھی منع کرتے ہو یاد رکھو) اگر تم (ان بُتوں کی مذمت سے اور مجھ کو ان کی عبادت سے منع کرنے سے) باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مار پتھروں کے سنگسار کر دونگا (پس تم اس سے باز آجاؤ) اور ہمیشہ ہمیش کے لئے مجھ (کو کہنے سُننے) سے برکنار رہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا (بہتر) میرا سلام لو (اب تم سے کہنا سُننا بے سود ہے) اب میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی (اس طرح) درخواست کرونگا (کہ تمکو ہدایت کرے جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے)، بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (اس لئے اسی سے عرض کرونگا جسکا قبول فرمانا یا نہ فرمانا دونوں مختلف اعتبار سے رحمت اور مہربانی ہے) اور (تم اور تمہارے ہم مذہب جب میری حق بات کو بھی نہیں مانتے تو تم میں رہنا بھی فضول ہے اس لئے) میں تم لوگوں سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو اُن سے (بدناً بھی) کنارہ کرتا ہوں (جیسا قلباً پہلے ہی سے برکنار ہوں، یعنی یہاں رہتا بھی نہیں) اور (اطمینان سے علیحدہ ہوکر) اپنے رب کی عبادت کرونگا (کیونکہ یہاں رہ کر اسمیں بھی مزاحمت ہوگی) اُمید (یعنی یقین) ہے

کہ اپنے رب کی عبادت کرکے محروم نہ رہوں گا (جیسا بُت پرست اپنے باطل معبودوں کی عبادت کرکے محروم رہتے ہیں، غرض اس گفتگو کے بعد اُن سے اس طرح علیحدہ ہوئے کہ ملک شام کیطرف ہجرت کرکے چلے گئے) پس جب ان لوگوں سے اور جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے اُن سے (اس طرح) علیحدہ ہوگئے (تو) ہم نے اُن کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا جو کہ رفاقت کے لئے اُن کی بُت پرست برادری سے بدرجہا بہتر تھے) اور ہم نے (ان دونوں میں) ہر ایک کو نبی بنایا اور ان سب کو ہمنے (طرح طرح کے کمالات دیکر) اپنی رحمت کا حصہ دیا اور (آئندہ نسلوں میں) ہمنے انکا نام نیک اور بلند کیا (کہ سب تعظیم اور ثنار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور اسحٰق کے قبل اسماعیل ان ہی صفات کے ساتھ عطا ہوچکے تھے)

معارف و مسائل

صدیق کی تعریف | صِدِّيقًا نَّبِيًّا، لفظ صدیق بکسر صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اسکے معنے اور تعریف میں علمار کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو اور اسکا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔ روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنے کو اختیار کیا ہے اور پھر صدیقیت کے درجات متفاوت ہیں۔ اصل صدیق تو نبی و رسول ہی ہوسکتا ہے اور ہر نبی و رسول کے لئے صدیق ہونا وصف لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صدیق ہو اسکا نبی ہونا ضروری ہو بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی و رسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کرلے وہ بھی صدیق کہلائے گا۔ حضرت مریم کو خود قرآنِ کریم نے أُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ کا خطاب دیا ہے حالانکہ جمہور اُمّت کے نزدیک وہ نبی نہیں، اور کوئی عورت نبی نہیں ہوسکتی۔

اپنے بڑوں کو نصیحت کرنے کا طریقہ اور اُس کے آداب | يَا أَبَتِ، عربی لغت کے اعتبار سے یہ لفظ باپ کی تعظیم و محبت کا خطاب ہے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالےٰ نے جو مقام جامعیتِ اوصاف و کمالات کا عطا فرمایا تھا، اُن کی یہ تقریر جو اپنے والد کے سامنے ہورہی ہے اعتدالِ مزاج اور رعایتِ اضداد کی ایک بے نظیر تقریر ہے کہ ایک طرف باپ کو شرک و کفر اور کھُلی گمراہی میں نہ صرف مبتلا بلکہ اسکا داعی دیکھ رہے ہیں جس کے مٹانے ہی کے لئے خلیل اللہ پیدا کئے گئے ہیں، دوسری طرف باپ کا ادب اور عظمت و محبت ہے ان دونوں ضدوں کو حضرت خلیل اللہ نے کس طرح جمع فرمایا اوّل تو يَا أَبَتِ کا لفظ جو باپ کی مہربانی اور محبت کا

داعی ہے ہر جملہ کے شروع میں اس لفظ سے خطاب کیا، پھر کسی جملہ میں باپ کی طرف کوئی لفظ ایسا منسوب نہیں جس سے انکی توہین یا دل آزاری ہو کہ اُن کو گمراہ یا کافر کہتے بلکہ حکمت پیغمبرانہ کے ساتھ صرف اُن کے بُتوں کی بے بسی اور بے حسی کا اظہار فرمایا کہ ان کو خود اپنی غلط روش کیطرف توجہ ہو جائے۔ دوسرے جملہ میں اپنی اس نعمت کا اظہار فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو علوم نبوت کی عطا فرمائی تھی۔ تیسرے اور چوتھے جملے میں اُس انجام بد سے ڈرایا جو اس شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والا تھا۔ اس پر بھی باپ نے بجائے کسی غور و فکر یا یہ کہ آپکی فرزندانہ گزارش پر کچھ نرمی کا پہلو اختیار کرتے پورے تشدد کے ساتھ خطاب کیا، اُنھوں نے تو خطاب يَآ أَبَتِ کے پیارے لفظ سے کیا تھا جسکا جواب عرف میں يَا بُنَيَّ کے لفظ سے ہونا چاہئے تھا مگر آزر نے ان کا نام لیکر يَآ اِبْرٰهِيْمُ سے خطاب کیا اور اُن کو سنگسار کر کے قتل کرنے کی دھمکی اور گھر سے نکل جانیکا حکم دیدیا۔ اسکا جواب حضرت خلیل اللہ کیطرف سے کیا ملتا ہے وہ سُننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَيْكَ، یہاں لفظ سلام دو معنے کے لئے ہو سکتا ہے اول یہ کہ یہ سلام متارکہ ہو یعنی کسی سے قطع تعلق کرنیکا شریفانہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ بات کا جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول صالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، یعنی جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ اُن سے دو بدو ہونیکے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمھیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام عرفی سلام ہی کے معنے میں ہو۔ اسمیں فقہی اشکال یہ ہے کہ کسی کافر کو ابتداءً سلام کرنا حدیث میں ممنوع ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَبْدَءُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى بِالسَّلَامِ (یعنی یہود و نصاریٰ کو ابتداءً سلام نہ کرو) مگر اس کے بالمقابل بعض روایات حدیث میں ایک ایسے مجمع کو ابتدائی سلام کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس میں کفار و مشرکین اور مسلمان سب جمع تھے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت اُسامہ رضؓ کی روایت سے ثابت ہے۔

اسی لئے فقہاءِ اُمت کا اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہوا بعض صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے قول و عمل سے اسکا جواز ثابت ہوتا ہے بعض سے عدم جواز، جس کی تفصیل قرطبی نے احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت بیان کی ہے۔ اور امام نخعی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تمھیں کسی کافر یہودی نصرانی سے ملنے کی کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت پیش آجائے تو اس کو ابتدائی سلام کرنے میں مضائقہ نہیں اور بے ضرورت سلام کی ابتدا کرنے سے بچنا چاہیئے۔ اسمیں مذکورہ

دونوں حدیثوں کی تطبیق ہو جاتی ہے واللہ اعلم۔ (قرطبی)

سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ، یہاں بھی یہ اشکال ہے کہ کسی کافر کے لئے استغفار کرنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا کہ واللہ لاستغفرن لک ما لم انہ عنہ (یعنی بخدا میں آپ کے لئے اسوقت تک ضرور استغفار یعنی دعاء مغفرت کرتا رہونگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے منع نہ فرما دیا جائے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ (یعنی نبی اور ایمان والوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں) اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے چچا کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا

جواب اشکال کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ سے وعدہ کرنا کہ آپ کے لئے استغفار کرونگا یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے اس کے بعد ممانعت کر دی گئی سورۂ ممتحنہ میں حق تعالیٰ نے خود اس واقعہ کو بطور استثناء ذکر فرما کر اس کی اطلاع دیدی ہے إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ اور اُس سے زیادہ واضح سورۂ توبہ میں آیت مذکورہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ یہ استغفار اور اسکا وعدہ باپ کے کفر پر جمے رہنے اور خدا کا دشمن ثابت ہونے سے پہلے کا تھا جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو انھوں نے بھی برات کا اعلان کر دیا۔

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي ، ایک طرف تو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باپ کے ادب و محبت کی رعایت میں یہ انتہا کر دی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے دوسری طرف یہ بھی نہیں ہونے دیا کہ حق کے اظہار اور اُس پر مضبوطی کو کوئی ادنیٰ سی ٹھیس لگے، باپ نے جو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اس کو اس جملہ میں بخوشی منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ میں تمہارے بتوں سے بیزار ہوں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ، اس جملے سے پہلے جملے میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے دعا کرنے میں ناکام و نامراد نہیں ہونگا۔ ظاہر یہ ہے کہ گھر اور خاندان سے جدائی کے بعد تنہائی کی وحشت وغیرہ کے اثرات سے بچنے کی دعا مراد تھی مذکورہ جملہ میں اس دعاء کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے گھر خاندان اور اُن کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکی مکافات اس طرح فرمائی کہ ان کو صاحبزادہ اسحٰق علیہ السلام عطا فرمایا اور ساتھ ہی اس کا

عمر دراز پانا اور صاحبِ اولاد ہونا بھی لفظ یعقوب بڑھا کر ذکر فرما دیا اور صاحبزادہ کا عطا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا تھا، تو اسکا حاصل یہ ہوا کہ باپ کے خاندان سے بہتر ایک مستقل خاندان دے دیا جو انبیار صلحار پر مشتمل تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ

اور مذکور کر کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ تھا چُنا ہوا اور تھا

رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ

رسُول نبی اور پکارا ہم نے اس کو داہنی طرف سے طور پہاڑ کی اور

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

نزدیک بُلایا اسکو بھید کہنے کو اور بخشا ہم نے اس کو اپنی مہربانی سے بھائی اُس کا ہارون

نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ

نبی اور مذکور کر کتاب میں اسمٰعیل کا وہ تھا وعدہ کا

الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ

سچا اور تھا رسُول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا

وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ

اور زکوٰۃ کا اور تھا اپنے رب کے یہاں پسندیدہ اور مذکور کر کتاب میں

اِدْرِيْسَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا

ادریس کا وہ تھا سچا نبی اور اُٹھا لیا ہم نے اسکو ایک اونچے

عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

مکان پر یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں

مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ

آدم کی اولاد میں اور ان میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى

اولاد میں اور اسرائیل کی اور اُن میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا جب اُن کو

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدة

سُنائے آیتیں رحمٰن کی گرتے ہیں سجدہ میں اور روتے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے (یعنی لوگوں کو سنایئے ورنہ کتاب میں ذکر کرنے والا تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے) وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خاص کئے ہوئے (بندے) تھے اور وہ رسول بھی تھے، نبی بھی تھے اور ہم نے اُن کو کوہِ طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور ہم نے اُن کو راز کی باتیں کرنے کے لئے مقرب بنایا اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت (اور عنایت) سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بناکر عطا کیا (یعنی اُن کی درخواست کے موافق اُن کو نبی کیا کہ اُن کی مدد کریں) اور اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے (بڑے) سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا (خصوصاً اور بھی احکام کا عموماً) حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بیشک وہ بڑی راستی والے نبی تھے اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رتبہ تک پہنچا دیا یہ (حضرات جن کا شروع سورت سے یہاں تک ذکر ہوا زکریا علیہ السلام سے ادریس علیہ السلام تک یہ) وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے (خاص) انعام فرمایا ہے (چنانچہ نبوت سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوگی) منجملہ (دیگر) انبیاء (علیہم السلام) کے (یہ وصف سب مذکورین میں مشترک ہے اور یہ سب) آدم (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے) اور (بعضے ان میں) ان لوگوں کی نسل سے (تھے) جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (چنانچہ بجز ادریس علیہ السلام کے کہ وہ اجداد نوح علیہ السلام سے ہیں باقی سب میں یہ وصف ہے) اور (بعضے ان میں) ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے چنانچہ حضرت زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و موسیٰ علیہ السلام دونوں کی اولاد میں تھے اور اسحٰق و اسمٰعیل و یعقوب علیہ السلام صرف حضرت ابراہیم کی اولاد میں تھے) اور (یہ سب حضرات) اُن لوگوں میں سے (تھے) جنکو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا (اور باوجود اس مقبولیت واختصاص کے ان سب حضرات موصوفین کی عبدیت کی یہ کیفیت تھی کہ) جب ان کے سامنے (حضرت) رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو (غایت افتقار و انکسار و انقیاد کے اظہار کے لئے) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

معارف و مسائل

كَانَ مُخْلَصًا، مخلص بفتح لام وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خالص کر لیا ہو یعنی جس کو غیر اللہ کیطرف التفات نہ ہو، اُس نے اپنے نفس اور تمام خواہشات کو اللہ کی مرضی کے لئے مخصوص کر دیا ہو۔ یہ شان خصوصی طور پر انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے جیساکہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ، یعنی ہم نے ان کو مخصوص کر دیا ہے ایک خاص کام یعنی دار آخرت کی یاد کے لئے۔ اُمت میں جو حضرات کاملین انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر ہوں اُن کو بھی اس مقام کا ایک درجہ ملتا ہے اسکی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ قدرتی طور پر گناہوں اور بُرائیوں سے بچائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ، یہ مشہور پہاڑ ملک شام میں مصر اور مَدین کے درمیان اتبک آج بھی اسی نام سے مشہور ہے حق تعالیٰ نے اسکو بھی بہت سی چیزوں میں ایک خصوصیت و امتیاز دیا ہے الْاَیْمَنِ، طور کی یہ داہنی جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کیونکہ وہ مَدین سے چلے تھے جب طور کے بالمقابل پہنچے تو طور انکی داہنی جانب تھا۔ نَجِيًّا سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نجی کہا جاتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ، ھبہ کے لفظی معنے عطیہ کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ان کی امداد کے لئے حضرت ہارون کو بھی نبی بنا دیا جائے یہ دُعا قبول کی گئی اسی کو لفظ وَهَبْنَا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ہم نے عطیہ دیدیا موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کا۔ اسی لئے حضرت ہارون کو ھبۃ اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ، ظاہر یہی ہے کہ اس سے مُراد حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر اُن کا ذکر اُن کے والد اور بھائی ابراہیم و اسحٰق کے ذکر کے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر درمیان میں آنے کے بعد ان کا ذکر فرمایا۔ شاید اس سے مقصود ان کے ذکر کا خاص اہتمام ہو کہ ضمنی لانے کے بجائے مستقلاً ذکر کیا گیا اور یہاں جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے اُنہیں انکے زمانہ بعثت کی ترتیب نہیں رکھی گئی کیونکہ ادریس علیہ السلام جن کا ذکر ان سب کے بعد آرہا ہے وہ زمانے کے لحاظ سے ان سب سے مقدم ہیں۔

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، ایفاء وعدہ ایک ایسا خلق حسن ہے کہ ہر شریف آدمی اس کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو ایک رذیل حرکت قرار دیا جاتا ہے حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت بتلایا ہے، اسی لئے اللہ کا کوئی نبی و رسول ایسا نہیں جو

صادق الوعدہ ہو مگر اس سلسلہ کلام میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے ذکر کیساتھ کوئی خاص وصف بھی ذکر کیا گیا ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ یہ وصف دوسروں میں نہیں بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انمیں یہ خاص صفت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے جیسے ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ان کا مُخلَص ہونا ذکر فرمایا ہے حالانکہ یہ صفت بھی تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسمیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا اس لئے اُن کے ذکر میں اسکا ذکر فرمایا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صدقِ وعدہ میں امتیاز اس بنار پر ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کا وعدہ اللہ سے یا کسی بندے سے کیا اس کو بڑی مضبوطی اور اہتمام سے پورا کیا، اُنھوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو ذبح کرنے کے لئے پیش کر دیں گے اور اُس پر صبر کرینگے اس میں پُورے اُترے۔ ایک شخص سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا وہ وقت پر نہ آیا تو اُسکے انتظار میں تین دن اور بعض روایات میں ایک سال اُسکا انتظار کرتے رہے (مظہری) اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ترمذی میں بروایت عبداللہ ابن ابی الحمساء ایسا ہی واقعہ وعدہ کر کے تین دن تک اُسی جگہ انتظار کرنے کا منقول ہے (قرطبی)

ایفائے وعدہ کی اہمیت اور اُس کا درجہ ایفائے وعدہ انبیاء وصلحاء کا وصفِ خاص اور تمام شریف انسانوں کی عادت ہے اسکے خلاف کرنا فساق فجار رذیل لوگوں کی خصلت ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے العدۃ دین ؛ وعدہ ایک قرض ہے یعنی جس طرح قرض کی ادائیگی انسان پر لازم ہے اسی طرح وعدہ پورا کرنے کا اہتمام بھی لازم ہے۔ دوسری ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں وأی المؤمن واجب یعنی وعدہ مومن کا واجب ہے۔

حضرات فقہار نے باتفاق یہ فرمایا ہے کہ وعدہ کا قرض ہونا اور ایفاء وعدہ کا واجب ہونا اس معنی میں ہے کہ بلا عذر شرعی اس کو پورا نہ کرنا گناہ ہے لیکن وہ ایسا قرض نہیں جس کی چارہ جوئی عدالت سے کی جاسکے اور زبردستی وصول کیا جاسکے جس کو فقہار کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ دیانۃً واجب ہے قضاءً واجب نہیں۔ (قرطبی وغیرہ)

مصلح کا فرض ہے کہ اصلاح کا [illegible] کام اپنے اہل و عیال سے شروع کرے [illegible] بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ. حضرت اسماعیل علیہ السلام [illegible] میں ایک یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مومن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے۔ قرآنِ حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا [illegible] بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو

آگ سے بچھا اسمیں حضرت اسماعیل کی خصوصیت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلف ہیں لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اسکے اہتمام و انتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیساکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے آپ نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کر کے خصوصی خطاب فرمایا۔

دوسری بات یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب پوری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ سبھی کو پیغامِ حق پہنچاتے اور امرِ الٰہی کا پابند کرتے ہیں، اہل و عیال کی خصوصیت میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ دعوتِ پیغمبرانہ کے خاص اُصول ہیں اُن میں یہ اہم بات ہے کہ جو ہدایت عام خلق اللہ کو دی جائے اُس کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرے۔ اپنے گھر والوں کو اسکا ماننا اور منوانا نسبتہً آسان بھی ہوتا ہے اُس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے اور وہ جب کسی خاص رنگ کو اختیار کرلیں اور اُسمیں پختہ ہو جادیں تو اس سے ایک دینی ماحول پیدا ہو کر دعوت کو عام کرنے اور دوسروں کی اصلاح کرنے میں بڑی قوت پیدا ہو جاوے گی۔ اصلاحِ خلق کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ایک صحیح دینی ماحول کا وجود میں لانا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر بھلائی یا برائی تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم سے زیادہ ماحول کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ، حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے ایکہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں (روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم) اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی و رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے نازل فرمائے (کما فی حدیث ابی ذر، زمخشری) اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو علم نجوم اور حساب بطور معجزہ عطا کیا گیا (بحر محیط)، اور سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا ان سے پہلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال بجائے لباس استعمال کرتے تھے، سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ نے ہی ایجاد فرمائے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپ سے شروع ہوئی۔ آپ نے اسلحہ تیار کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا (بحر محیط۔ قرطبی۔ مظہری۔ روح)

وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، یعنی ہم نے ادریس علیہ السلام کو مقام بلند پر اُٹھا لیا۔ معنے یہ ہیں کہ اُن کو نبوت و رسالت اور قربِ الٰہی کا خاص مقام عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایات میں جو اُنکا آسمان پر اُٹھانا منقول ہے اُن کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا:

هذا من اخبار كعب الاحبار الاسرائيليات وفی بعضه نكارة	یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہے اور اُن میں سے بعض میں نکارت و اجنبیت ہے۔

اور قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ بہرحال اس معاملہ میں صریح نہیں کہ یہاں رفعتِ درجہ مراد ہے یا زندہ آسمان میں اُٹھانا مُراد ہے اسلئے اُنکا رفع الی السّمار قطعی نہیں اور تفسیر قرآن اُس پر موقوف نہیں (بیان القرآن)

فائدہ از بیان القرآن رسُول اور نبی کی تعریف میں فرق اور باہمی نسبت

رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیاتِ مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم وخصوص من وجہ کی ہے۔ رسُول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف اُن کی اُمت کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی لیکن قوم جُرہم جن کی طرف اُن کو مبعوث فرمایا تھا اُن کو اس شریعت کا علم پہلے سے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا۔ اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں یا جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے فرستادہ قاصد جن کو آیتِ قرآن اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔

اور نبی وہ ہے جو صاحبِ وحی ہو خواہ شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعتِ قدیمہ کی جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعتِ موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کئے گئے جیسا کہ آیاتِ مذکورہ میں رَسُوْلًا نَّبِيًّا آیا ہے وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں کوئی تضاد نہیں لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں جیسے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ میں تو اس جگہ بقرینۂ مقام لفظ نبی کو خاص اُس شخص کے معنی میں لیا جائیگا جو شریعتِ سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ، اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ، اس سے مراد صرف ابراہیم علیہ السلام ہیں وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ، اس سے مُراد اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام ہیں وَاِسْرَآءِيْلَ، اس سے مُراد حضرت موسیٰ و ہارون و حضرت زکریا و یحیٰی و عیسٰی علیہ السلام ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا، سابقہ آیات میں چند اکابر انبیاء علیہم السلام کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے جس میں اُن کی عظمتِ شان کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ انبیاء کی عظمت میں عوام سے غلو کرنے کا خطرہ تھا جیسے یہود نے حضرت عُزیر کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا ہی بنا دیا اسلئے اس مجموعہ کے بعد ان سب کا اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گزار اور خوف و خشیت سے بھرپور ہونا اس آیت میں ذکر فرما دیا گیا تاکہ افراط و تفریط کے درمیان رہیں۔ (بیان القرآن)

تلاوتِ قرآن کے وقت بکار یعنی آب دیدہ ہونا سُنّتِ انبیاء ہے

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ قرآن کی تلاوت کے وقت بکار (رونے) کی کیفیت پیدا ہونا محمود اور انبیاء علیہم السلام کا وصف ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ و تابعین اور اولیاء اللہ سے بکثرت ایسے واقعات منقول ہیں۔

قرطبی نے فرمایا کہ علماء نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیتِ سجدہ تلاوت کی جائے اُس کے سجدے میں اُس کے مناسب دُعا کیجائے، مثلاً سورۂ سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ السَّاجِدِیْنَ لِوَجْھِکَ الْمُسَبِّحِیْنَ بِحَمْدِکَ وَاَعُوْذُبِکَ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ عَنْ اَمْرِکَ اور سُبْحَانَ الَّذِیْ کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْبَاکِیْنَ اِلَیْکَ الْخَاشِعِیْنَ لَکَ اور آیتِ مذکورہ خَرُّوْا سُجَّدًا کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِکَ الْمُنْعَمِ عَلَیْھِمِ الْمُھْتَدِیْنَ السَّاجِدِیْنَ لَکَ الْبَاکِیْنَ عِنْدَ تِلَاوَۃِ اٰیَاتِکَ (قرطبی)

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا

پھر اُن کی جگہ آئے ناخلف کھو بیٹھے نماز اور پیچھے پڑ گئے

الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

مزوں کے سو آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا

وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

اور کی نیکی سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہوگا

شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ

کچھ باغوں میں بسنے کے جن کا وعدہ کیا ہے رحمٰن نے اپنے بندوں سے

بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ

اُن کے بن دیکھے بیشک ہے اُس کے وعدہ پر پہنچنا نہ سُنیں گے وہاں

فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً

بک بک سوائے سلام اور اُن کے لئے ہے اُن کی روزی وہاں صبح

وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ

اور شام یہ وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی

كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

ہو گا پرہیزگار

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورین) کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا (خواہ اعتقاداً کہ انکار کیا یا عملاً کہ اس کے ادا کرنے میں یا حقوق و آدابِ ضروریہ میں کوتاہی کی) اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی (جو ضروری طاعت سے غافل کرنے والی تھیں) سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے (خواہ ابدی ہو یا غیر ابدی) ہاں مگر جس نے (کفر و معصیت سے) توبہ کرلی (اور مطلب کفر سے توبہ کرنے کا یہ ہے کہ) ایمان لے آیا اور (معصیت سے توبہ کرنا یہ ہے کہ) نیک کام کرنے لگا سو یہ لوگ (بلا خرابی دیکھے) جنت میں جاویں گے اور (جزا ملنے کے وقت) ان کا ذرا نقصان نہ کیا جاویگا (یعنی ہر نیک عمل کی جزا ملے گی یعنی) ان ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (جاویں گے) جنکا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے (اور) اس کے وعدہ کی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے اس (جنت) میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سُننے پاویں گے (کیونکہ وہاں فضول بات ہی نہ ہوگی) بجز (فرشتوں اور ایک دوسرے کے) سلام (کرنے) کے (اور ظاہر ہے کہ سلام سے بہت ہی خوشی اور راحت ہوتی ہے تو وہ فضول نہیں) اور اُن کو کھانا صبح و شام ملا کریگا (یعنی یہ تو معیّن طور پر ہوگا اور یوں دوسرے وقت بھی اگر چاہیں گے ملے گا) یہ جنّت (جسکا ذکر ہوا) ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اسکا مالک ایسے لوگوں کو بنادیں گے جو کہ خدا سے ڈرنے والے ہوں (جو مبنیٰ ہے ایمان اور عمل صالح کا)

معارف و مسائل

خَلْف، یہ لفظ بسکون لام بُرے قائمقام بُری اولاد کے لئے اور بفتح لام اچھے قائمقام اور اچھی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے (مظہری) مجاہدؒ کا قول ہے کہ یہ واقعہ قرب قیامت میں صلحاء اُمّت کے ختم ہو جانے کے بعد ہوگا کہ نماز کی طرف التفات نہ رہے گا اور فسق و فُجور کُھلّم کُھلاّ ہونے لگے گا۔

نماز بے وقت یا بلا جماعت پڑھنا اضاعتِ نماز اور گناہِ عظیم ہے

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ، نماز کے ضائع کرنے سے مُراد جمہور مفسرین عبداللہ بن مسعود۔ نخعی۔ قاسم۔ مجاہد۔ ابراہیم۔ عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کے نزدیک نماز کو اُس کے وقت سے مؤخر کرکے پڑھنا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کے آداب و شرائط میں سے کسی میں کوتاہی کرنا جسمیں وقت بھی داخل ہے اضاعتِ نماز میں شامل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اضاعتِ صلوٰۃ سے مُراد بے جماعت کے گھر میں نماز پڑھ لینا ہے (قرطبی۔ بحر محیط)

حضرت فاروق اعظم رضؓ نے اپنے سب عمّالِ حکومت کو یہ ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا تھا:

ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ۔ فمن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع (موطاء مالک)

میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے تو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے تمام احکام دین کو بھی اور زیادہ ضائع کرے گا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے آداب اور تعدیل ارکان میں کوتاہی کرتا ہے تو اُس سے دریافت کیا کہ تم کب سے یہ نماز پڑھتے ہو؟ اُس نے کہا کہ چالیس سال سے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی اور اگر تم اسی طرح کی نمازیں پڑھتے ہوئے مرگئے تو یاد رکھو کہ فطرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مروگے۔

ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو نماز میں اقامت نہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ جو رکوع اور سجدہ میں اور رکوع سے کھڑے ہو کر یا دو سجدوں کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا یا سیدھا بیٹھنے کا اہتمام نہ کرے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے وضو اور طہارت میں کوتاہی کی یا نماز کے رکوع سجدے میں یا ان دونوں کے درمیان سیدھا کھڑے ہوتے بیٹھنے میں جلد بازی کی اُس نے نماز کو ضائع کر دیا۔

حضرت حسن رحمہ اللہ نے اضاعتِ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات کے بارے میں فرمایا کہ مسجدوں کو معطل کر دیا اور صنعت و تجارت اور لذات و خواہشات میں مبتلا ہوگئے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ ان روایات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ آج اہلِ علم اور معروف بالصلاح لوگوں میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نماز کے آداب سے غافل، محض نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ چھٹی ہجری کا حال تھا جس میں ایسے لوگ خال خال پائے جاتے تھے آج یہ صورتِ حال نمازیوں میں عام ہوگئی، الا ماشاء اللہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَاَعْمَالِنَا

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ، شہوات سے مُراد دُنیا کی وہ لذتیں ہیں جو انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کریں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شاندار مکانوں کی تعمیر اور ایسی شاندار سواریوں کی سواری جس پر لوگوں کی نظریں اُٹھیں، اور ایسا لباس جس سے عام لوگوں میں امتیاز کی شان نظر آئے شہواتِ مذکورہ میں داخل ہیں (قرطبی)

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا، لفظ غیّ عربی زبان میں رشاد کے بالمقابل ہے ہر بھلائی اور خیر کو رشاد اور ہر بُرائی اور شر کو غیّ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس میں سارے جہنم سے زیادہ طرح طرح کے عذاب جمع ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے

اس کو اللہ تعالیٰ نے اُس زناکار کے لئے تیار کیا ہے جو اپنی زناکاری پر مصر اور عادی ہے اور اُس شراب خور کے لئے جو شراب کا عادی ہے اور اس سود خور کے لئے جو سود خوری سے باز نہیں آتا اور اُن لوگوں کے لئے جو ماں باپ کی نافرمانی کریں اور جھوٹی شہادت دینے والوں کے لئے اور اُس عورت کے لئے جو کسی دوسرے کے بچہ کو اپنے شوہر کا بچہ بنادے۔ (قرطبی)

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا، لغو سے مُراد کلام باطل فضول اور گالی گلوچ اور ایذاء دینے والا کلام ہے کہ اہل جنت اس سے پاک صاف رہیں گے کوئی کلمہ اُنکے کان میں ایسا نہ پڑیگا جو اُن کو رنج و تکلیف پہنچائے

إِلَّا سَلَامًا، یہ استثناء منقطع ہے مُراد یہ ہے کہ وہاں جسکا جو کلام سُننے میں آویگا وہ سلامتی اور بھلائی اور خوشی میں اضافہ کرے گا۔ اصطلاحی سلام بھی اس میں داخل ہے جو اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کو کریں گے اور اللہ کے فرشتے ان سب کو کریں گے۔ (قرطبی)

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا، جنت میں یہ نظام شمسی اور طلوع و غروب باللیل والنہار تو نہ ہوگا، ایک قسم کی روشنی ہمہ وقت رہے گی مگر رات اور دن اور صبح اور شام کے امتیازات کسی خاص انداز سے ہوں گے۔ اسی صبح و شام میں اہل جنت کا رزق ان کو پہنچے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اہل جنت کو جس وقت جس چیز کی خواہش ہوگی وہ اُسی وقت بلا تاخیر پوری کیجاوے گی (وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ) اعلان عام ہے پھر صبح شام کی تخصیص، کیونکہ انسانی عادت و فطرت کی بناء پر ہے کہ وہ صبح شام کھانے پینے کا عادی ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ جس شخص کو صبح شام کی غذا پوری ملے وہ آرام و عیش والا ہے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرما کر کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے صبح اور شام۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں صبح شام کا لفظ بول کر عموم مراد ہے جیسے رات دن کا لفظ بھی یا مشرق مغرب کا لفظ عموم کے لئے بولا جاتا ہے کوئی خاص وقت یا جگہ مراد نہیں ہوتی تو مطلب یہ ہوگا کہ اُنکا رزق اُن کی خواہش کے موافق ہر وقت موجود رہے گا۔ واللہ اعلم (قرطبی)

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا

اور ہم نہیں اُترتے مگر حکم سے تیرے رب کے اُسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو

خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ

ہمارے پیچھے اور جو اسکے بیچ میں ہے اور تیرا رب نہیں ہے بھولنے والا رب

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ

آسمانوں کا اور زمین کا اور جو اُنکے بیچ ہے سو اُسی کی بندگی کر اور قائم رہ اسکی بندگی پر

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ

کسی کو پہچانتا ہے تو اُسکے نام کا — اور کہتا ہے آدمی کیا جب میں مرجاؤں

لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ

تو پھر نکلوں گا زندہ ہوکر — کیا یاد نہیں رکھتا آدمی کہ ہم نے اسکو بنایا

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ

پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا — سو قسم ہے تیرے رب کی ہم گھیر بلائیں گے اُن کو

وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ

اور شیطانوں کو پھر سامنے لائیں گے گرد دوزخ کے گھٹنوں پر گرے ہوئے — پھر

لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

جُدا کرلیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے جونسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمٰن سے اکڑ

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ

پھر ہم کو خوب معلوم ہے جو بہت قابل ہیں اُس میں داخل ہونے کے — اور کوئی نہیں

مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ

تم میں جو نہ پہنچے گا اُس پر — ہو چکا یہ وعدہ تیرے رب پر لازم مقرر — پھر

نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

بچائیں گے ہم اُن کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اسمیں اوندھے گرے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہ آرزو ظاہر فرمائی کہ ذرا زیادہ آیا کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور (ہم آپ کی درخواست کا جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے جواب دیتے ہیں سُنیے وہ یہ ہے کہ) ہم (یعنی فرشتے) بدون آپکے رب کے حکم کے وقتاً فوقتاً نہیں آسکتے اسی کی (ملک) ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں (مکان ہو یا زمان، مکانی ہو یا زمانی) اور (اسی طرح) ہمارے پیچھے کی سب چیزیں اور جو چیزیں اُن کے درمیان میں ہیں (آگے کا مکان تو جو منہ کے سامنے ہو اور پیچھے کا جو پشت کی طرف ہو اور مابین ذٰلک جسمیں یہ شخص خود ہو اور آگے کا زمان جو مستقبل ہو اور پیچھے کا جو ماضی ہو اور مابین ذٰلک جو زمانہ حال ہو) اور آپ

کا رب بھولنے والا نہیں (چنانچہ یہ سب اُمور آپ کو پہلے سے معلوم ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم تکوینا و تشریعاً مسخرِ امرِ رب
اپنی رائے سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں یا جب ہم چاہیں کہیں آجا نہیں سکتے لیکن جب ہمارا
بھیجنا مصلحت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھیج دیتے ہیں یہ احتمال نہیں کہ شاید کسی مصلحت کے وقت بھول جاتے ہوں)
وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو اِن دونوں کے درمیان میں ہیں سو (جب ایسا حاکم
و مالک ہے تو اے مخاطب) تو اسکی عبادت (اور اطاعت) کیا کر اور (ایک آدھ بار نہیں بلکہ) اسکی عبادت
پر قائم رہ (اور اگر اس کی عبادت نہ کریگا تو کیا دوسرے کی عبادت کریگا) بھلا تو کسی کو اسکا ہم صفت جانتا ہے
(یعنی کوئی اسکا ہم صفت نہیں تو لائق عبادت بھی کوئی نہیں، پس اسی کی عبادت کرنا ضرور ہوا) اور انسان
(منکرِ آخرت) یوں کہتا ہے کہ میں جب مرجاؤنگا تو کیا پھر زندہ کرکے قبر سے نکالا جاؤں گا (اللہ تعالیٰ جواب
دیتے ہیں کہ) کیا (یہ) انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو اسکے قبل (عدم سے) وجود میں لاچکے ہیں، اور
یہ (اسوقت) کچھ بھی نہ تھا (جب ایسی حالت سے حیات کی طرف لانا آسان ہے تو دوبارہ حیات دینا تو
بدرجۂ اولیٰ آسان ہے) سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو (قیامت میں زندہ کرکے موقفِ حشر میں) جمع کرینگے
اور (انکے ساتھ) شیاطین کو بھی (جو دُنیا میں ان کے ساتھ رہ کر بہکاتے سکھاتے تھے جیسا دوسری آیت
میں ہے قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ) پھر ان (سب) کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر
کریں گے کہ (مارے ہیبت کے) گھٹنوں کے بل گرے ہونگے پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے
(جیسے یہود و نصاریٰ و مجوس بت پرست) ان لوگوں کو جُدا کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ
سے سرکشی کیا کرتے تھے (تاکہ ایسوں کو اوروں سے پہلے دوزخ میں داخل کریں) پھر (یہ نہیں کہ
اس جُدا کرنے میں ہم کو کسی تحقیقات کی ضرورت پڑے کیونکہ) ہم (خود) ایسے لوگوں کو خوب جانتے
ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ (یعنی اوّل) مستحق ہیں (پس اپنے علم سے ایسوں کو الگ کرکے
اوّل اُن کو پھر دوسرے کفار کو دوزخ میں داخل کریں گے اور یہ ترتیب صرف اوّلیت میں ہے، اور
آخریت نہ ہونے میں تو سب مساوی ہیں اور جہنّم کا وجود ایسا یقینی ہے کہ اسکا معائنہ سب مومن و
کافر کو کرایا جائے گا گو صورت اور غرض معائنہ کی مختلف ہوگی کفار کو بطور دخول کے اور تعذیب
ابدی کے واسطے اور مومنین کو بطور عبورِ پُل صراط اور زیادتِ شکر اور فرح کے واسطے کہ اُس کو دیکھ کر جو
جنت میں پہنچیں گے تو اور زیادہ شکر کریں گے اور خوش ہونگے) اور (بعض گنہگاروں کو سزائے محدود
کے لئے جو کہ درحقیقت تطہیر ہے اسی عموم معائنہ کی خبر دی جاتی ہے کہ) تم میں سے کوئی بھی نہیں جسکا
اس پر گزر نہ ہو (کسی کا دخولاً اور کسی کا عبوراً) یہ (وعدہ کے موافق) آپ کے رب کے اعتبار سے
(بطور) لازم (مؤکد کے) ہے جو (ضرور) پورا ہو کر رہے گا پھر (اس جہنّم پر عبور سے یہ نہ سمجھا جائے کہ
اسمیں مومن و کافر برابر ہیں بلکہ) ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو خدا سے ڈر (کر ایمان لا) کے تھے،

(خواہ اول ہی دفعہ میں نجات ہو جاوے جیسے مؤمنین کاملین کو اور خواہ بعد کسی قدر تکلیف کے جیسے کہ مؤمنین ناقصین کو) اور ظالموں کو یعنی کافروں کو) اس میں (ہمیشہ کے لئے) ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج و غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

معارف و مسائل

وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ، لفظ اصطبار کے معنے مشقت و تکلیف پر ثابت قدم رہنا ہے اس میں اشارہ ہے کہ عبادت پر دوام و ثبات مشقت چاہتا ہے عبادتگزار کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا، لفظ سمی کے مشہور معنے ہمنام کے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشرکین اور بت پرستوں نے اگرچہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سے انسانوں، فرشتوں پتھروں اور بتوں کو شریک کر ڈالا تھا اور ان سب کو الٰہ یعنی معبود کہتے تھے مگر کسی نے لفظ اللہ معبود باطل کا نام کبھی نہیں رکھا۔ یہ ایک تکوینی اور تقدیری امر تھا کہ دنیا میں اللہ کے نام سے کوئی بت اور کوئی الٰہ باطل موسوم نہیں ہوا اس لئے اس معنے کے اعتبار سے بھی مضمون آیت کا واضح ہے کہ دنیا میں اللہ کا کوئی ہمنام نہیں۔

اور اکثر مفسرین مجاہد، ابن جبیر، قتادہ، ابن عباس رض سے اس جگہ اس لفظ کے معنی مثل اور شبیہ کے منقول ہیں اسکا مطلب واضح ہے کہ صفاتِ کمال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل و عدیل یا نظیر نہیں ہے۔

لَنَحۡشُرَنَّهُمۡ وَالشَّيٰطِيۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّهُمۡ، اس جگہ والشیاطین کا واؤ بمعنے مَعَ ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر کافر کو اس کے شیطان کے ساتھ ایک سلسلہ میں باندھ کر اٹھایا جائیگا۔ اس صورت میں یہ صرف کافروں کے حشر کا بیان ہوگا، اور اگر مراد عام لیجائے جس میں مؤمن و کافر سب داخل ہیں تو شیاطین کے ساتھ ان سب کے حشر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کافر تو اپنے شیطان کے ساتھ بندھا ہوا حاضر ہوگا اور مؤمنین بھی اس موقفِ حشر میں الگ نہیں ہوں گے اس لحاظ سے سب کیساتھ شیاطین کا اجتماع ہو جائے گا۔ (قرطبی)

حَوۡلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا، ابتدائے حشر کے وقت مؤمنین و کفار؛ و سعداء و اشقیاء سب جہنم کے گرد جمع کئے جاویں گے اور سب پر ہیبت طاری ہوگی سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہونگے پھر مؤمنین اور سعداء کو جہنم سے عبور کرا کر جنت میں داخل کیا جائے گا تاکہ اس منظر جہنم کو دیکھنے کے بعد ان کو مکمل خوشی اور دائمی اور مخالفین دین پر شماتت اور اس پر اللہ کا مزید شکر نصیب ہو۔

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ كُلِّ شِيۡعَةٍ، لفظ شیعہ اصل لغت میں کسی ذاتِ شخص یا خاص عقیدہ

کے متبعین کو کہا جاتا ہے اس لئے بمعنی فرقہ بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ کفار کے مختلف فرقوں میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوگا اس کو ان سب میں ممتاز کر کے مقدم کیا جاوے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جہنم میں اس ترتیب سے داخل کیا جائے گا کہ جس کا جرم سب سے زیادہ ہوگا وہ سب سے پہلے اسکے بعد دوسرے اور تیسرے درجے کے مجرمین داخلِ جہنم کئے جاویں گے۔ (مظہری)

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا، یعنی کوئی انسان مؤمن یا کافر ایسا نہ رہے گا جسکا ورود جہنم پر نہ ہو۔ ورود سے مُراد دخول نہیں بلکہ عبور ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں لفظ مرور بھی آیا ہے۔ اور اگر دخول مُراد لیا جاوے تو مؤمنین متقین کا دخول اس طرح ہوگا کہ جہنم اُن کے لئے بَرْد و سلام بن جائے گی اُن کو اُس کی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی جیسا کہ حضرت ابو سُمَیّہؒ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نیک آدمی یا فاجر آدمی باقی نہ رہے گا جو ابتداءً جہنم میں داخل نہ ہو مگر اسوقت مؤمنین متقین کے لئے جہنم بَرْد و سلام بن جائے گی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے نارِ نمرود بَرْد و سلام بنا دی گئی تھی اس کے بعد مؤمنین کو یہاں سے نجات دیکر جنت میں لیجایا جائے گا یہی معنے آیت کے اس اگلے جملے کے ہیں ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا، یہ مضمون حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے اور قرآن کریم میں جو لفظ ورود کا آیا ہے اگر اسکے معنے دخول کے بھی لئے جاویں تو دخول بطور عبور کے مُراد ہوگا اسلئے کوئی تضاد نہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا

اور جب سُنائے اُن کو ہماری آیتیں کھلی ہوئی کہتے ہیں جو لوگ کہ منکر ہیں ایمان والوں کو

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا

دونوں فرقوں میں کس کا مکان بہتر ہے اور کس کی اچھی لگتی ہے مجلس اور کتنی ہلاک کر چکے

قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْیًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ

ہم پہلے ان سے جماعتیں وہ ان سے بہتر تھے سامان میں اور نمود میں تو کہہ جو رہا

فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا

بھٹکتا سو چاہیئے اس کو کھینچ لے جائے رحمٰن لمبا یہاں تک کہ جب دیکھیں گے

یُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ

جو وعدہ ہوا تھا اُن سے یا آفت اور یا قیامت سو تب معلوم کر لیں گے کس کا

شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ

بُرا ہے مکان اور کس کی فوج کمزور ہے اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سوجھنے والوں کو سوجھ

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کو جگہ

خُلاصۂ تفسیر

اور جب ان منکر لوگوں کے سامنے ہماری (وہ) کُھلی کُھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جنہیں مؤمنین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا مذکور ہوتا ہے) تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ (یہ بتلاؤ کہ ہم) دونوں فریقوں میں (یعنی ہم میں اور تم میں دُنیا میں) مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے (یعنی ظاہر ہے کہ خانگی اور مجلسی ساز و سامان اور اہل و اعوان میں ہم بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ تو محسوس ہے اور دوسرا مقدمہ عرفی ہے کہ انعام و احسان اور عطاءِ نعمت اُس شخص کے لئے ہوتا ہے جو دینے والے کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو، ان دونوں مقدموں سے ثابت ہوا کہ ہم اللہ کے محبوب و مقبول ہیں اور تم مغضوب و مخذول۔ آگے اللہ تعالیٰ ایک جواب الزامی اور ایک تحقیقی دیتے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں، اور (یہ نہیں دیکھتے کہ) ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے ایسے گروہ (ہیبت ناک سزاؤں سے کہ بالیقین عذاب تھے) ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی (کہیں زیادہ) اچھے تھے (اس سے معلوم ہوا کہ مقدمہ ثانیہ غلط ہے بلکہ کسی حکمت اور مصلحت سے نعمتِ دنیویہ مبغوض و مردود کو بھی دی جا سکتی ہے، آگے دوسرا جواب ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے (یعنی اس نعمتِ دنیوی میں یہ حکمت ہے کہ مہلت دے کر اتمامِ حجت کر دے جیسا دوسری آیت میں ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ اور یہ مہلت چند روزہ ہے) یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو (دُنیا میں) خواہ قیامت کو (دوسرے عالم میں) سو (اُس وقت) اُن کو معلوم ہو جاوے گا کہ بُرا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں (یعنی دُنیا میں جو اپنے اہلِ مجلس کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں وہاں معلوم ہوگا کہ ان میں کتنا زور ہے کیونکہ وہاں تو کسی کا کوئی زور ہوگا ہی نہیں۔ اسی کو اضعف فرمایا تھا) اور (مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو (دُنیا میں تو) ہدایت بڑھاتا ہے (یعنی اصل سرمایہ یہ ہے کہ اگر اسکے ساتھ مال و دولت نہ ہو

مضر نہیں) اور (آخرت میں ظاہر ہوگا کہ) جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ تمہارے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں (پس اُن کو ثواب میں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی جن میں مکان اور باغات سب کچھ ہوں گے اور انجام ان اعمال کا ابدیت اور دوام ہے ان نعمتوں کا بس کیفیۃً وکمیۃً مسلمانوں ہی کی حالت اخیرہ بہتر ہوگی اور اخیر ہی کا اعتبار بھی ہے)۔

معارف و مسائل

خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا، یہاں کفار نے مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے دو چیزیں پیش کیں۔ اوّل دُنیا کا مال و دولت اور ساز و سامان دوسرے حشم خدم اور اپنا جتھہ اور جماعت کہ یہ بظاہر کفار کو بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ حاصل تھی اور یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کے لئے نشہ کا کام کرتی ہیں اور اُن کا فخر و غرور اچھے اچھے عقلمند ذہین لوگوں کو غلط راستوں پر ڈالدیتا ہے اور پچھلے دَور کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور حکومت و سلطنت والوں کی عبرت خیز تاریخ سے غافل کر کے اپنے موجودہ حال کو اپنا ذاتی کمال اور دائمی راحت کا ذریعہ باور کرا دیتا ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق دُنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ کسی کو اپنا ذاتی کمال یا دائمی ساتھی نہ سمجھیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے بھی ادا کریں اور اُس کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرنے میں بھی اسکے احکام کی پابندی کریں اور اسکے فنا یا کم ہوجانے کے خطرہ سے بھی کسی وقت غافل نہ ہوں تو وہی اس شر سے محفوظ رہتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام میں، حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام اور صحابہ کرامؓ میں بہت سے اغنیاء صحابہ اور اسی طرح اُمت میں لاکھوں اولیاء، صلحاء جن کو حق تعالیٰ نے دُنیا کا مال و دولت بھی خوب عطا فرمایا اور دین کی دولت اور اپنا خوف بھی بے انتہا۔

کفار کے اس مغالطہ کو قرآن حکیم نے اس طرح دُور فرمایا کہ دُنیا کی چند روزہ نعمتُ دولت نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوسکتی ہے نہ دُنیا ہی میں وہ کسی ذاتی کمال کی علامت سمجھی جاتی ہے کیونکہ بہت سے بے عقل جاہلوں کو دُنیا میں یہ چیزیں عقلاء اور دانشمندوں سے زیادہ مل جاتی ہیں۔ پچھلی تاریخ اُٹھا کر دیکھو تو یہ حقیقت کُھل جائے گی کہ ایسی ایسی بلکہ ان سے بھی زیادہ کتنی دولتوں اور شوکتوں کے ڈھیر زمین پر ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

رہا حشم و خدم اور دوست و احباب کی کثرت سو اس کی حقیقت بھی اول تو دُنیا ہی میں ظاہر ہوجاتی ہے کہ آڑے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ پھر اگر دُنیا میں وہ برابر خدمت کرتے بھی رہے تو دو کے دن کی، اس کے بعد محشر کے میدان میں اُن کا کون ساتھی ہوگا؟

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا، باقیات صالحات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جس کی تفصیل سورۂ کہف میں گزر چکی ہے اور مختار قول یہی ہے کہ اس سے مراد وہ تمام طاعات اور نیک کام ہیں جن کے فوائد باقی رہنے والے ہیں۔ مَرَدًّا کا لفظ بمعنے مرجع ہے مراد انجام و عاقبت ہے۔ مراد آیت کی واضح ہے کہ اعمال صالحہ ہی اصل دولت ہیں جن کا ثواب بڑا اور انجام دائمی راحت ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾

بھلا تو نے دیکھا اُس کو جو منکر ہوا ہماری آیتوں سے اور کہا مجھ کو مل کر رہے گا مال اور اولاد

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ

کیا جھانک آیا ہے غیب کو، یا لے رکھا ہے رحمٰن سے عہد یہ نہیں،

سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ

ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور بڑھاتے جائیں گے اس کو عذاب میں لمبا اور ہم لے لیں گے

مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً

اس کے مرنے پر جو کچھ وہ بتلا رہا ہے اور آئیگا ہمارے پاس اکیلا۔ اور پکڑ رکھا ہے لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو

لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ

معبود تاکہ وہ ہوں اُنکے لئے مدد، ہرگز نہیں، وہ منکر ہوں گے اُن کی بندگی سے اور

يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

ہو جائیں گے اُن کے مخالف

ع ۵ ۱۷ ۸

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ (جن کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا جن میں سے آیاتِ بعث بھی ہیں) کفر کرتا ہے اور (علیٰ سبیل الاستہزاء) کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے (مطلب یہ کہ اس کی حالت بھی قابلِ تعجب ہے آگے اسکا رد ہے کہ) کیا یہ شخص غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے (یعنی اس دعوے کا علم آیا بلا واسطہ اسباب ہوا ہے

کہ علم غیب ہے یا بواسطہ اسباب ہوا ہے، پھر چونکہ وہ دعویٰ حکم عقلی تو ہے نہیں بلکہ امر نقلی ہے۔
اس لئے صرف دلیل نقلی کہ اخبار خداوندی ہے اس کی دلیل ہو سکتی ہے سو دونوں طریق مفقود
ہیں اول تو عقلاً بھی ممتنع ہے اور دوسرا وقوعاً منتفی ہے) ہرگز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور)
ہم اسکا کہا ہوا بھی لکھ لیتے ہیں (اور وقت پر یہ سزا دیں گے کہ) اسکے لئے عذاب بڑھاتے چلے
جائیں گے اور اسکی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جاویں گے (یعنی وہ تو دنیا سے مرجائیگا
اور اموال و اولاد پر کوئی اسکا اختیار نہ رہے گا ہم ہی سب کے مالک رہیں گے اور قیامت
میں ہم اس کو نہ دیں گے بلکہ) وہ ہمارے پاس (مال و اولاد سے) تنہا ہوکر آوے گا اور ان
لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ ان کے لئے وہ (عنداللہ) باعث عزت
ہوں (جیسا اس آیت میں حکایت ہے يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ سوالیا) ہرگز
نہیں ہوگا بلکہ وہ تو (قیامت میں خود) ان کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں گے (جیسا سورۂ یونس
کے تیسرے رکوع میں گزر چکا قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ) اور (اُلٹے) ان
کے مخالف ہوجاویں گے، (قالاً بھی جیسا گزرا اور حالاً بھی کہ بجائے عزت کے سبب ذلت ہوجاوینگے
ان معبودین میں اصنام بھی ہوں گے سو ان کا ناطق ہونا جیسا یکفرون کا مقتضا ہے مثل نطق جوارح
کے مستبعد و مستغرب نہیں)۔

معارف و مسائل

لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا، بخاری و مسلم میں حضرت خباب بن الارتؓ کی روایت ہے
کہ ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمہ تھا یہ اُنکے پاس تقاضہ کے لئے گئے اُس نے کہا میں تو تمہارا
قرض اُسوقت تک نہیں دوں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر و انکار کا معاملہ نہ
کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا جبتک کہ تم مر کر پھر زندہ ہو۔ عاص بن وائل
نے کہا کہ اچھا کیا میں مر کر پھر زندہ ہونگا۔ اگر ایسا ہے تو بس تمہارا قرض بھی اُسیوقت چکاؤں گا
جب دوبارہ زندہ ہونگا کیونکہ اُسوقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہونگے۔ (قرطبی)

قرآن کریم نے اس احمق کے جواب میں فرمایا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ دوبارہ زندہ ہونے
کے وقت بھی اُسکے پاس مال اور اولاد ہونگے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ، کیا اسنے غیب کی باتوں کو جھانک کر
معلوم کرلیا ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا اللہ رحمن سے اس نے مال و اولاد کے لئے کوئی
عہد اور وعدہ لے لیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں۔ پھر اسنے یہ خیال کیسے پکالیا
وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ، یعنی جس مال اور اولاد کا یہ ذکر کر رہا ہے آخرت میں ملنے کا معاملہ تو بہت دور ہے

دُنیا میں بھی جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس کو بھی چھوڑنا پڑیگا اور اسکے وارث آخرکار ہم ہونگے یعنی یہ مال و اولاد اس سے چھن کر بالآخر اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَيَأْتِينَا فَرْدًا ، اور قیامت کے روز یہ اکیلا ہمارے دربار میں حاضر ہوگا نہ کوئی اولاد ساتھ ہوگی نہ مال۔ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ، یعنی یہ خود تراشیدہ بُت اور معبود باطل جن کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہ اُن کے مددگار ہونگے محشر میں اس کے برعکس یہ اُن کے دشمن ہوجاویں گے اللہ تعالیٰ اُن کو نُطق و زبان عطا فرمادیں گے اور یہ بولیں گے کہ یا اللہ ان کو عذاب و سزا دیجئے کہ انھوں نے تجھ کو چھوڑ کر ہمیں معبود بنالیا تھا۔ (قرطبی)

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اُچھالتے ہیں ان کو اُبھار کر

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ

سو تو جلدی نہ کر اُن پر ہم تو پُوری کرتے ہیں اُن کی گنتی جس دن ہم اکٹھا کرلائینگے

الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ

پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بُلائے ہوئے اور ہانک لے جائیں گے گنہگاروں کو

جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ

دوزخ کیطرف پیاسے نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا مگر جس نے لے لیا ہے

عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

رحمٰن سے وعدہ

خلاصۂ تفسیر

(آپ جو ان کی گمراہی سے غم کرتے ہیں تو) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر (ابتلاءً) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو (کفر و ضلال پر) خوب اُبھارتے (اور اُکساتے) رہتے ہیں (پھر جو خود ہی اپنے اختیار سے اپنے بدخواہ کے بہکانے میں آجاوے اسکا کیوں غم کیا جاوے) سو (جب شیاطین ابتلاءً مسلط ہوئے ہیں اور تعجیل سزائے مستحق میں ابتلاء رہتا نہیں تو) آپ اُن کے لئے جلدی (عذاب ہونے کی درخواست) نہ کیجئے ہم اُن کی باتیں (جن پر سزا ہوگی) خود شمار کر رہے ہیں، (اور وہ سزا اُس روز واقع ہوگی) جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن (کے دارالنعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع

کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کیطرف پیاسا ہانکیں گے (اور کوئی ان کا سفارشی بھی نہ ہوگا کیونکہ وہاں) کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہے (وہ انبیاء و صلحاء ہیں اور اجازت خاص ہے مومنین کے ساتھ بس کفار محلِ شفاعت نہ ہوئے)۔

معارف و مسائل

تَؤُزُّهُمْ اَزًّا، عربی لغت میں لفظ ھَزٌّ، اَزٌّ، فَزٌّ، حَثٌّ، سب ایک معنی میں ہیں یعنی کسی کام کے لئے اُبھارنا اور آمادہ کرنا۔ خفت و شدت اور کمی زیادتی کے لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے۔ لفظ اَزٌّ کے معنی پوری قوت اور تدبیر و تحریک کے ذریعہ کسی شخص کو کسی کام کے لئے آمادہ بلکہ مجبور کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ شیاطین ان کو اعمالِ بد پر اُبھارتے رہتے ہیں اور اُن کی خوبیاں اُن کے دل پر مسلط کر دیتے ہیں خرابیوں پر نظر نہیں ہونے دیتے۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں وہ تو عنقریب ہونے ہی والا ہے کیونکہ ہم نے اُن کو گنے چُنے ایام اور جو مدت دُنیا میں رہنے کی دی ہے وہ بہت جلد پوری ہونے والی ہے اسکے بعد عذاب ہی عذاب ہے نَعُدُّ لَهُمْ، یعنی ہم ان کیلئے شمار کرتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ انکی کوئی چیز آزاد نہیں اُن کی عمر کے دن رات گِنے ہوئے ہیں، اُنکے سانس، اُن کی نقل و حرکت کا ایک ایک قدم، اُن کی لذات اُن کی زندگی کا ایک ایک لحظہ ہم گِن رہے ہیں، یہ گنتی پوری ہوتے ہی ان پر عذاب ٹوٹ پڑے گا۔

مامون رشید نے ایک مرتبہ سورۂ مریم پڑھی۔ جب اس آیت پر پہنچے تو حاضرینِ مجلس جو علماء فقہاء تھے اُن میں سے ابنِ سماک کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے متعلق کچھ کہیں اُنھوں نے عرض کیا کہ جب ہمارے سانس گِنے ہوئے ہیں ان پر زیادتی نہیں ہوسکتی تو یہ کسقدر جلد ختم ہو جائیں گے اسی کو بعض شعراء نے کہا ہے ؎

حیاتك انفاس تعد فکلما ⁂ مضی نفس منك انتقصت به جزءا

یعنی تیری زندگی کے سانس گنے ہوئے ہیں، جب ایک سانس گزرتا ہے تو تیری زندگی کا ایک جزء کم ہو جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ انسان دن رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ (قرطبی)

اور بعض حضرات نے فرمایا ؎

وکیف یفرح بالدنیا ولذتها ⁂ فتی یعد علیه اللفظ والنفس

یعنی دُنیا اور اسکی لذت پر وہ شخص کیسے مگن اور بے فکر ہو سکتا ہے جس کے الفاظ اور سانس گِنے جا رہے ہوں (روح) یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا، لفظ وفد ایسے آنے والوں کے

لئے بولا جاتا ہے جو کسی بڑے بادشاہ یا امیر کے پاس اکرام و اعزاز کے ساتھ جائیں بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر پہنچیں گے اور سواری ہر شخص کی وہ ہوگی جس کو وہ دنیا میں اپنے لئے پسند کرتا تھا۔ اونٹ، گھوڑا یا دوسری سواریاں بعض حضرات نے فرمایا کہ انکے اعمال صالحہ ان کی مرغوب سواریوں کی صورت اختیار کرلیں گے۔ یہ روایاتِ حدیث، روح المعانی اور قرطبی نے نقل کی ہیں۔

إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا، وِرْد کے لفظی معنے پانی کی طرف جانے کے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ پیاس ہی کے وقت کوئی آدمی یا جانور پانی پر جاتا ہے اس لئے وِرْدًا کا ترجمہ پیاسا کیا گیا۔

مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد شہادت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ہے، بعض نے فرمایا کہ عہد سے مراد حفظ کتاب اللہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ہر ایک کو نہیں ملے گا بجز اُن لوگوں کے جو ایمان کے عہد پر مضبوط رہے۔ (روح)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ

اور لوگ کہتے ہیں رحمٰن رکھتا ہے اولاد بیشک تم آ پھنسے ہو بھاری چیز میں ابھی

السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ

آسمان پھٹ پڑیں اس بات سے اور ٹکڑے ہو زمین اور گر پڑیں پہاڑ

هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ

ڈھے کر اس پر کہ پکارتے ہیں رحمٰن کے نام پر اولاد اور نہیں پھبتا رحمٰن کو

أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا

کہ رکھے اولاد، کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو

آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَ

نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہوکر اسکے پاس اُن کی شمار ہے اور گن رکھی ہے اُن کی گنتی، اور

كُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

ہر ایک اُنمیں آئیگا اُسکے سامنے قیامت کے دن اکیلا البتہ جو یقین لائے ہیں اور کی ہیں

الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ

اُنھوں نے نیکیاں اُن کو دیگا رحمٰن محبت سو ہم نے آسان کردیا

بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ

یہ قرآن تیری زبان میں اسی واسطے کہ خوشخبری سُنادے تو ڈرنے والوں کو، اور ڈرادے جھگڑالو لوگوں کو۔ اور بہت

أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۗ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ

ہلاک کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں، آہٹ پاتا ہے تو اُن میں کسی کی

أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾

یا سُنتا ہے اُن کی بھنک؟

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اولاد (بھی) اختیار کر رکھی ہے (چنانچہ نصاریٰ کثرت سے اور یہود قلت سے اور مشرکین عرب اس عقیدہ فاسدہ میں مبتلا تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) تم نے (جو) یہ (بات کہی تو) ایسی سخت حرکت کی ہے کہ اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اُڑ جاویں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے (کیونکہ) جتنے کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہو کر حاضر ہوتے ہیں (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور (اپنے علم سے) سب کو شمار کر رکھا ہے (یہ حالت تو ان کی فی الحال ہے) اور قیامت کے روز سب کے سب اسکے پاس تنہا تنہا حاضر ہونگے (کہ ہر شخص خدا ہی کا محتاج اور محکوم ہوگا، پس اگر خدا کے اولاد ہو تو خدا ہی کی طرح وجوب وجود و لوازم وجوب کے ساتھ موصوف ہونا چاہیئے اور خدا کی یہ صفات ہیں جو مذکور ہوئیں، عموم قدرت، عموم علم۔ اور غیر خدا کی یہ صفتیں ہیں افتقار و انقیاد جو ضد ہیں وجوب کے پھر ضدین کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے)۔

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ (ان کو علاوہ نعم مذکورہ اخرویہ کے دُنیا میں یہ نعمت دیگا کہ) ان کے لئے (خلائق کے دل میں) محبت پیدا کر دیگا سو (آپ ان کو یہ بشارت دید یجئے کیونکہ) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو خوشخبری سُنا دیں اور (نیز) اس سے جھگڑالو آدمیوں کو خوف دلادیں اور (ان خوف کی چیزوں میں سے نعمت دنیویہ کا ایک یہ بھی مضمون ہے کہ) ہم نے ان کے قبل بہت سے گروہوں کو (عذاب و قہر سے) ہلاک کر دیا ہے (سو) کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان (میں سے کسی) کی کوئی آہستہ آواز سُنتے ہیں (یہ کنایہ ہے بے نام و نشان ہونے سے سو کفار اس نعمت دنیویہ کے بھی مستحق ہیں گو کسی مصلحت سے کسی کافر کے لئے اس کا

وقوع نہ ہو مگر اندیشہ کے قابل تو ہے۔

معارف و مسائل

وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا، ان آیات سے معلوم ہوا کہ زمین اور پہاڑ اور اُس کی تمام چیزوں میں ایک خاص قسم کا عقل و شعور موجود ہے اگرچہ وہ اس درجہ کا نہ ہو جس پر احکام الٰہیہ مرتب ہوتے ہیں جیسے انسان کی عقل و شعور۔ یہی عقل و شعور ہے جس کی وجہ سے دُنیا کی ہر چیز اللہ کے نام کی تسبیح کرتی ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، یعنی کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو ان چیزوں کا یہی شعور و ادراک ہے جسکا ذکر ان آیاتِ مذکورہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے خصوصاً اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دینے سے زمین، اور پہاڑ وغیرہ سخت گھبراتے اور ڈرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضہ نے فرمایا کہ جن و انس کے علاوہ تمام مخلوقات خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک سے بہت ڈرتی ہیں اور یہ خطرہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ (روح المعانی)

وَعَدَّهُمْ عَدًّا، یعنی حق تعالیٰ شانہٗ تمام انسانوں کے اشخاص و اعمال کا پورا علم رکھتے ہیں اُنکے سانس اُنکے قدم اُنکے لقمے اور گھونٹ اللہ کے نزدیک شمار کئے ہوئے ہیں نہ کم ہو سکتے ہیں نہ زیادہ۔

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا، یعنی ایمان اور عمل صالح پر دائم رہنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کر دیتے ہیں دوستی اور محبت، یعنی ایمان اور عمل صالح جب مکمل ہوں اور بیرونی عوارض سے خالی ہوں تو اُن کا خاصہ یہ ہے کہ مؤمنین صالحین کے درمیان آپس میں بھی اُلفت و محبت ہو جاتی ہے۔ ایک نیک صالح آدمی دوسرے نیک آدمی سے مانوس ہوتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں اور مخلوقات کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ اُن کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

بخاری، مسلم، ترمذی، وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے کو پسند فرماتے ہیں تو جبرئیل امین سے کہتے ہیں کہ میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں تم بھی اُنسے محبت کرو جبرئیل امین سارے آسمانوں میں اسکی منادی کرتے ہیں اور سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر یہ محبت زمین پر نازل ہوتی ہے (تو زمین والے بھی سب اس محبوبِ خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اسپر شاہد ہے یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مظہری) اور ہرم بن حیانؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے پُورے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کے دل اسکی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنی اہلیہ ہاجرہ اور شیر خوار صاحبزادے

اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان ریگستان میں بحکم خدا تعالیٰ چھوڑ کر ملک شام واپس جانے کا ارادہ فرمایا تو اُن کے لئے بھی دُعا مانگی تھی فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ یعنی یا اللہ میرے بے کس اہل و عیال کے لئے آپ کچھ لوگوں کے قلوب کو مائل اور متوجہ فرما دیجئے۔ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال گزر چکے ہیں کہ مکہ اور اہلِ مکہ کی محبت ساری دُنیا کے دِلوں میں بھر دی گئی ہے اور دُنیا کے ہر گوشے سے بڑی بڑی محنت و مشقت اُٹھا کر اور عمر بھر کی کمائی خرچ کر کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور دُنیا کے ہر گوشہ کی چیزیں مکہ معظمہ کے بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔

اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا، رکز وہ مخفی آواز ہے جو سمجھ میں نہ آئے جیسے مرنے والے کی زبان لڑکھڑانے کے بعد جو آواز ہوتی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ سب حکومت و سلطنت والے اور شوکت و حشمت اور طاقت و قوت والے جب اللہ کے عذاب میں پکڑے گئے اور فنا کئے گئے تو ایسے ہو گئے کہ اُن کی کوئی مخفی آواز اور حس و حرکت بھی سُنائی نہیں دیتی۔

سُوْرَةُ طٰهٰ

سُوْرَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّخَمْسٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّثَمَانُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینتیس آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اس سورت کا دوسرا نام سورۂ کلیم بھی ہے (کما ذکر السخاوی) وجہ یہ ہے کہ اس میں حضرت کلیم اللہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔

مسند دارمی میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کرنے سے بھی دو ہزار سال پہلے سورۂ طٰہٰ و یٰسٓ پڑھی (یعنی فرشتوں کو سنائی)، تو فرشتوں نے کہا کہ بڑی خوش نصیب اور مبارک ہے وہ اُمت جس پر یہ سورتیں نازل ہونگی اور مبارک ہیں وہ سینے جو ان کو حفظ رکھیں گے اور مبارک ہیں وہ زبانیں جو ان کو پڑھیں گی، یہی وہ مبارک سورت ہے جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر کے نکلنے والے عمر بن خطابؓ کو ایمان قبول کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گرنے پر مجبور کر دیا جس کا واقعہ کتب سیرت میں معروف و مشہور ہے:

ابن اسحٰق کی روایت اس طرح ہے کہ عمر بن خطاب رضؓ ایک روز تلوار لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں نُعیم بن عبداللہ مل گئے، پوچھا کہاں کا ارادہ ہے عمر بن خطابؓ نے کہا کہ میں اس گمراہ شخص کا کام تمام کرنے کے لئے جا رہا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا، اُن کے دین و مذہب کو بُرا کہا اُن کو بیوقوف بنایا اور اُنکے بتوں کو بُرا کہا۔ نُعیم نے کہا کہ عمر تمہیں تمہارے نفس نے دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو گے اور اُن کا قبیلہ بنو عبد مناف تمہیں زندہ چھوڑے گا کہ زمین پر چلتے پھرتے رہو۔ اگر تم میں عقل ہے تو

اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو کہ وہ مسلمان اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے تابع ہو چکے ہیں، عمر بن خطاب پر اُن کی بات اثر کر گئی اور یہیں سے اپنی بہن، بہنوئی کے مکان کی طرف پھر گئے۔ اُس مکان میں حضرت خباب بن ارت صحابی رضی اللہ عنہ ان دونوں کو قرآن کی سُورت طٰہٰ پڑھا رہے تھے جو ایک صحیفہ میں لکھی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے جب محسوس کیا کہ عمر بن خطاب آرہے ہیں تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ گھر کے کسی کمرہ یا گوشہ میں چھپ گئے اور ہمشیرہ نے یہ صحیفہ اپنی ران کے نیچے چھپا لیا مگر عمر بن خطاب کے کانوں میں خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی اور اُن کے کچھ پڑھنے کی آواز پہنچ چکی تھی اس لئے پُوچھا کہ یہ پڑھنے پڑھانے کی آواز کیسی تھی جو میں نے سُنی ہے؟ انھوں نے (اوّل بات کو ٹالنے کے لئے) کہا کہ کچھ نہیں، مگر اب عمر بن خطاب نے بات کھول دی کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع اور مسلمان ہو گئے ہو، یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اُن کی ہمشیرہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ دیکھا تو شوہر کو بچانے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ عمر بن خطاب نے اُن کو بھی مار کر زخمی کر دیا۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بہن بہنوئی دونوں نے بیک زبان کہا کہ سُن لو ہم بلاشبہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسُول پر ایمان لے آئے ہیں اب جو تم کر سکتے ہو کر لو۔ ہمشیرہ کے زخم سے خون جاری تھا اس کیفیت کو دیکھ کر عمر بن خطاب کو کچھ ندامت ہوئی اور بہن سے کہا کہ وہ صحیفہ مجھے دکھلاؤ جو تم پڑھ رہی تھیں تاکہ میں بھی دیکھوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تعلیم لائے ہیں عمر بن خطاب لکھے پڑھے آدمی تھے اسلئے صحیفہ دیکھنے کے لئے مانگا۔ بہن نے کہا کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہم نے یہ صحیفہ اگر تمہیں دے دیا تو تم اس کو ضائع کر دو یا بے ادبی کرو۔ عمر بن خطاب نے اپنے بتوں کی قسم کھا کر کہا کہ تم یہ خوف نہ کرو میں اس کو پڑھ کر تمہیں واپس کر دوں گا۔ ہمشیرہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ رُخ دیکھا تو ان کو کچھ اُمید ہو گئی کہ شاید عمر بھی مسلمان ہو جائیں۔ اسوقت کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ تم نجس ناپاک ہو اور اس صحیفہ کو پاک آدمی کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو غسل کر لو۔ عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کر لیا پھر یہ صحیفہ انکے حوالہ کیا گیا تو اسمیں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی اسکا شروع حصہ ہی پڑھ کر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ کلام تو بڑا اچھا اور نہایت محترم ہے۔ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ جو مکان میں چھپے ہوئے یہ سب کچھ سُن رہے تھے عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ سُنتے ہی سامنے آگئے اور کہا کہ اے عمر بن خطاب مجھے اللہ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنے رسُول کی دعا کے لئے منتخب فرما لیا ہے کیونکہ گزشتہ کل میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرتے ہوئے سنا ہے کہ اللّٰھم ایّد الاسلام بابی الحکم بن ھشام او بعمر بن الخطاب، یا اللہ اسلام کی تائید و تقویت فرما ابوالحکم بن ہشام (یعنی ابوجہل) کے ذریعہ یا پھر عمر بن خطاب کے ذریعہ۔ مطلب یہ تھا

کہ ان دونوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کی کمزور جماعت میں جان پڑ جائے۔ پھر خبابؓ نے کہا کہ اے عمرؓ اب تو اس موقع کو غنیمت سمجھو۔ عمر بن خطابؓ نے خبابؓ سے کہا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو (قرطبی) آگے ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا اور اسلام قبول کرنا مشہور و معروف واقعہ ہے۔

طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً
اس واسطے نہیں اُتارا ہم نے تجھ پر قرآن کہ تو محنت میں پڑے، مگر نصیحت کے واسطے

لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴
اسکی جو ڈرتا ہے اُتارا ہوا ہے اسکا جس نے بنائی زمین اور آسمان اونچے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا
وہ بڑا مہربان عرش پر قائم ہوا اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور

فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ
زمین میں اور ان دونوں کے درمیان اور نیچے گیلی زمین کے اور اگر تو بات کہے

بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ
پکار کر تو اس کو تو خبر ہے چھپی ہوئی بات کی اور اس سے بھی چھپی ہوئی کی، اللہ ہے جسکے سوا بندگی نہیں کسی کی

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸
اُسی کے ہیں سب نام خاصے

خُلاصۂ تفسیر

طٰہٰ (کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں)، ہم نے آپ پر قرآن (مجید) اس لئے نہیں اُتارا کہ آپ تکلیف اُٹھائیں بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے (اُتارا ہے) جو (اللہ سے) ڈرتا ہو یہ اس (ذات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے (اور) وہ بڑی رحمت والا عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہے (جو کہ اسکی شان کے لائق ہے اور وہ ایسا ہے کہ) اسی کی ملک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں (یعنی آسمان سے نیچے اور زمین سے

اوپر) اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں (یعنی زمین کے اندر جو تر مٹی ہے جسکو ثریٰ کہتے ہیں جو چیز کہ اس کے نیچے ہے، مراد یہ کہ زمین کی تہ میں جو چیزیں ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت و سلطنت تھی) اور (علم کی یہ شان ہے کہ) اگر تم (اے مخاطب) پکار کر بات کہو تو (اس کے سننے میں تو کیا شبہ ہے) وہ تو (ایسا ہے کہ) چپکے سے کہی بات کو اور (بلکہ) اس سے بھی زیادہ خفی بات کو (یعنی جو ابھی دل میں ہے) جانتا ہے (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کا مستحق) نہیں اس کے (بڑے) اچھے اچھے نام ہیں (جو اوصاف و کمالات پر دلالت کرتے ہیں سو قرآن ایسی ذات جامع الصفات کا نازل کیا ہوا ہے اور یقینی حق ہے)۔

معارف و مسائل

طٰہٰ، اس لفظ کی تفسیر میں علماء تفسیر کے اقوال بہت ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے اس کے معنی یا رجل اور ابن عمرؓ سے یا حبیبی منقول ہیں، بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ اور یٰسٓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہیں اور بے غبار بات وہ ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ اور جمہور علماء نے فرمائی کہ جس طرح قرآن کی بہت سی سورتوں کے ابتداء میں آئے ہوئے حروف مقطعہ مثلاً الٓمٓ وغیرہ متشابہات یعنی اسرار میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لفظ طٰہٰ بھی اسی میں داخل ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی، لِتَشْقٰی، شَقَاءٌ سے مشتق ہے جسکے معنی تعب اور مشقت و تکلیف کے ہیں۔ نزولِ قرآن کی ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تمام رات عبادت کے لئے کھڑے رہتے اور نماز تہجد میں تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین مبارک پر ورم آگیا اور دن بھر اس کی فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح کفار کو ہدایت ہو وہ قرآن کی دعوت کو قبول کرلیں۔ اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کی مشقت سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت اور تکلیف میں پڑجائیں، تمام رات جاگنے اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ بن گیا کہ شروع رات میں آرام فرماتے تھے اور آخر شب میں بیدار ہوکر تہجد ادا فرماتے تھے۔

اسی طرح اس آیت میں اسکی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و دعوت کا ہے جب آپ نے یہ کام کرلیا تو پھر اس کی فکر آپ کے ذمہ نہیں کہ کون ایمان لایا اور کس نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ (تلخیص از قرطبی)

إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ نزولِ قرآن کی ابتدا میں ساری رات تہجد و تلاوت میں مشغول رہنے سے بعض کفار نے مسلمانوں پر یہ آوازے کسے کہ ان لوگوں پر قرآن کیا نازل ہوا ایک مصیبت نازل ہوگئی نہ رات کا آرام نہ دن کا چین - اس آیت میں حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ یہ جاہل بدنصیب حقائق سے بے خبر کیا جانیں کہ قرآن اور اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم خیر ہی خیر اور سعادت ہی سعادت ہے اس کو مصیبت سمجھنے والے بے خبر اور احمق ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں بروایت معاویہؓ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ، یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کا علم اور سمجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

اس جگہ امام ابن کثیر نے ایک صحیح حدیث دوسری بھی نقل فرمائی ہے جو علماء کیلئے بڑی بشارت ہے یہ حدیث طبرانی نے حضرت ثعلبہ بن الحکم رضؓ سے روایت کی ہے ابن کثیر نے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے۔ حدیث یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالیٰ للعلماء یوم القیامۃ اذا قعد علی کرسیہ لقضاء عبادہ انی لم اجعل علمی وحکمتی فیکم الا و انا ارید ان اغفر لکم علی ما کان منکم ولا ابالی (ابن کثیر ص ۱۴۲ ج ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی کرسی پر تشریف فرما ہونگے تو علماء سے فرمادینگے کہ میں نے اپنا علم و حکمت تمہارے سینوں میں صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا ہوں باوجود اُن خطاؤں کے جو تم سے سرزد ہوئیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مُراد وہی علماء ہیں جن میں علم کی قرآنی علامت خشیت اللہ موجود ہو اس آیت میں لفظ لِمَن يَخْشَىٰ اسی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ علامت نہ ہو وہ اس کے مستحق نہیں۔ واللہ اعلم

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ ، استواء علی العرش کے متعلق صحیح بے غبار وہی بات ہے جو جمہور سلف صالحین سے منقول ہے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔ متشابہات میں سے ہے۔ عقیدہ اتنا رکھنا ہے کہ استواء علی العرش حق ہے اُس کی کیفیت اللہ جل شانہٗ کی شان کے مطابق و مناسب ہوگی جسکا ادراک دُنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔

وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ ، ثریٰ ، نمناک گیلی مٹی کو کہتے ہیں جو زمین کھودنے کے وقت نکلتی ہے مخلوقات کا علم تو صرف ثریٰ تک ختم ہو جاتا ہے ، آگے اس ثریٰ کے نیچے کیا ہے اسکا

علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اس نئی تحقیق در لیسرچ اور نئے نئے آلات اور سائنس کی انتہائی ترقی کے باوجود اب سے چند سال پہلے زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش .. توں تک جاری رہی۔ ان سب تحقیقات اور انتھک کوششوں کا نتیجہ اخبارات میں سب کے سامنے آچکا ہے کہ صرف چھ میل کی گہرائی تک یہ آلاتِ جدیدہ کام کر سکے، آگے ایک ایسا غلاف حجری ثابت ہوا جہاں کھودنے کے سارے آلات اور سائنس جدید کے سب اوزار عاجز ہوگئے یہ صرف چھ میل تک کا علم انسان حاصل کر سکا ہے جبکہ زمین کا قطر ہزاروں میل کا ہے اس لئے اس اقرار کے سوا چارہ نہیں کہ ما تحت الثریٰ کا علم حق تعالیٰ ہی کی مخصوص صفت ہے

يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ، سِر سے مُراد وہ چیز ہے جو انسان نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی کسی پر ظاہر نہیں اور اخفیٰ سے مراد وہ بات ہے جو ابھی تک تمہارے دل میں بھی نہیں آئی آئندہ کسی وقت دل میں آوے گی حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے واقف و باخبر ہیں کہ اسوقت کسی انسان کے دل میں کیا ہے اور کل کو کیا ہوگا۔ کل کا معاملہ ایسا ہے کہ خود اس شخص کو بھی آج اسکی خبر نہیں کہ کل کو میرے دل میں کیا بات آوے گی۔ (قرطبی)

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ

اور پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی جب اُس نے دیکھی ایک آگ تو کہا اپنے

امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ

گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ، شاید لے آؤں تمہارے پاس اس میں سے سلگا کر، یا

اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱

پاؤں آگ پر پہنچ کر رستہ کا پتہ پھر جب پہنچا آواز آئی اے موسیٰ

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ

میں ہوں تیرا رب، سو اتار ڈال اپنی جوتیاں تو ہے پاک میدان طویٰ

طُوًى ۝۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا

میں اور میں نے تجھ کو پسند کیا ہے سو تو سنتا رہ جو حکم ہو میں جو ہوں اللہ

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴

ہوں کسی کی بندگی نہیں سوا میرے سو میری بندگی کر، اور نماز قائم رکھ میری یادگاری کو

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ

قیامت بیشک آنے والی ہے، میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں اُس کو تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو

بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا

جو اُس نے کمایا ہے سو کہیں تجھ کو نہ روک دے اس سے وہ شخص جو یقین نہیں رکھتا اُس کا

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ﴿١٦﴾

اور پیچھے پڑ رہا ہے اپنے مزے کے پھر تو پٹکا جائے

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام کے قصہ) کی خبر پہنچی ہے (یعنی وہ سُننے کے قابل ہے کہ اسمیں توحید و نبوت کے متعلق علوم ہیں جن کی تبلیغ نافع ہوگی وہ قصہ یہ ہے کہ) جب کہ اُنھوں نے (مدین سے آتے ہوئے ایک رات کو جس میں سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے تھے کوہِ طور پر) ایک آگ دیکھی (کہ واقع میں وہ نور تھا مگر شکل آگ کی سی تھی) سو اپنے گھر والوں سے (جو صرف بی بی تھی یا خادم وغیرہ بھی) فرمایا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو (یعنی میرے پیچھے پیچھے مت آنا کیونکہ یہ تو احتمال ہی نہ تھا کہ بدون ان کے آگے سفر کرنے لگیں گے) میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ (کسی لکڑی وغیرہ میں لگاکر) لاؤں (تاکہ سردی کا علاج ہو) یا (وہاں) آگ کے پاس رستہ کا پتہ (جاننے والا کوئی آدمی بھی) مجھ کو مل جاوے سو وہ جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو (ان کو منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جُوتیاں اُتار ڈالو، (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو (یہ اس میدان کا نام ہے) اور میں نے تمکو (نبی بنانے کے لئے منجملہ دیگر خلائق کے) منتخب فرمایا ہے سو (اسوقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اسکو (غور سے) سُن لو (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، تو تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو (دوسری بات یہ سنو کہ) بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں (اور قیامت اس لئے آوے گی) تاکہ ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ ملجاوے سو (جب قیامت کا آنا یقینی ہے تو) تم کو (قیامت کے لئے مستعد رہنے) سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پاوے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے (یعنی تم ایسے شخص کے اثر سے قیامت کے لئے تیاری کرنے سے

بے فکر نہ ہوجانا) کہیں تم (اس بے فکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہوجاؤ۔

معارف و مسائل

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى، سابقہ آیات میں قرآن کریم کی عظمت اور اس کے ضمن میں تعظیم رسول کا بیان ہوا تھا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس مناسبت سے ذکر کیا گیا کہ منصب رسالت و دعوت کی ادائیگی میں جو مشکلات اور تکلیفیں پیش آیا کرتی ہیں، اور انبیاء سابقین نے ان کو برداشت کیا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آجائیں تاکہ آپ اس کے لئے پہلے سے مستعد اور تیار ہو کر ثابت قدم رہیں جیسا کہ ایک آیت میں ارشاد ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ۔ یعنی رسولوں کے یہ سب قصے ہم آپ سے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کا قلب مضبوط ہوجائے اور منصب نبوت کا بار اٹھانے کے لئے تیار ہوجائے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ جو یہاں مذکور ہے اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب وہ مدین پہنچ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر اس معاہدہ کے ساتھ مقیم ہوگئے کہ آٹھ یا دس سال تک ان کی خدمت کریں گے اور انھوں نے تفسیر بحر محیط وغیرہ کی روایت کے مطابق ابعد الاجلین یعنی دس سال پورے کرلئے تو شعیب علیہ السلام سے رخصت چاہی کہ میں اب اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لئے مصر جاتا ہوں اور جس خطرہ کی وجہ سے مصر چھوڑا تھا کہ فرعونی سپاہی ان کی گرفتاری اور قتل کے درپے تھے عرصہ دراز گزر جانے کے بعد اب وہ خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو مع اہلیہ یعنی اپنی صاحبزادی کے کچھ مال اور سامان دیکر رخصت فرمادیا راستہ میں ملک شام کے بادشاہوں سے خطرہ تھا اس لئے عام راستہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ موسم سردی کا تھا اور اہلیہ محترمہ حاملہ قریب الولادت تھیں کہ صبح شام میں ولادت کا احتمال تھا۔ غیر معروف راستہ اور جنگل میں راستہ سے ہٹ کر طور پہاڑ کی مغربی اور داہنی سمت میں جانکلے، رات اندھیری سردی برفانی تھی اسی حال میں اہلیہ کو درد زہ شروع ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سردی سے حفاظت کے لئے آگ جلانا چاہا۔ اُس زمانے میں دیا سلائی (ماچس) کے بجائے چقماق پتھر استعمال کیا جاتا تھا جس کو مارنے سے آگ پیدا ہوجاتی تھی اس کو استعمال کیا مگر اس سے آگ نہ نکلی۔ اسی حیرانی و پریشانی کے عالم میں کوہ طور پر آگ نظر آئی جو درحقیقت نور تھا تو گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے آگ لاؤں اور ممکن ہے کہ آگ کے پاس کوئی راستہ جاننے والا مل جائے تو راستہ بھی معلوم کرلوں۔ گھر والوں میں اہلیہ محترمہ کا ہونا تو متعین ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خادم بھی ساتھ تھا وہ بھی اس

خطاب میں داخل ہے بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ رفیقِ سفر بھی ساتھ تھے مگر راستہ بھولنے میں یہ اُن سے جُدا ہوگئے تھے۔ (بحر محیط)

فَلَمَّآ اَتٰىهَا، یعنی جو آگ دُور سے دیکھی جب اُس کے پاس پہنچے۔ مسند احمد وغیرہ میں وہب بن منبہؒ کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف چلے اور اسکے قریب پہنچے تو ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ایک بڑی آگ ہے جو ایک ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی ہے مگر حیرت یہ ہے کہ اُس درخت کی کوئی شاخ یا پتہ جلتا نہیں بلکہ آگ نے درخت کے حسن اور تری و تازگی اور رونق میں اور زیادتی کر دی ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر کچھ دیر تک اس انتظار میں دیکھتے رہے کہ شاید کوئی چنگاری آگ کی زمین پر گرے تو یہ اُٹھالیں۔ جب دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے گھاس وغیرہ کے کچھ تنکے جمع کرکے اُس آگ کے قریب کیا کہ اِن میں آگ لگ جائیگی تو ان کا کام ہو جائے گا مگر جب یہ گھانس پھونس آگ کے قریب کئے تو آگ پیچھے ہٹ گئی، اور بعض روایات میں ہے کہ آگ اُن کی طرف بڑھی یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، بہرحال آگ حاصل کرنے کا مطلب پورا نہ ہوا۔ یہ عجیب و غریب آگ سے حیرت کے عالم میں تھے کہ ایک غیبی آواز آئی (روح) یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے دامن میں پیش آیا جو ان کی داہنی جانب تھا اور جس کا نام طُوٰی تھا۔

نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، بحر محیط، روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی اسکی کوئی جہت متعین نہیں تھی اور سُننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء بدن سے سُنا گیا جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آواز کا حاصل یہ تھا کہ جس چیز کو آپ آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ نہیں اللہ تعالیٰ کی ایک تجلّی ہے اور اسمیں فرمایا کہ میں ہی آپ کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آواز کے متعلق یہ یقین کس طرح ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی آواز ہے؟ اسکا اصل جواب تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیا کہ وہ یقین کرلیں کہ یہ آواز حق تعالیٰ ہی کی ہے دوسرے اس آگ کے حیرت انگیز حالات کہ درخت کو جلانے کے بجائے اسکی تازگی اور حسن بڑھا رہی ہے اور آواز بھی عام لوگوں کی آواز کی طرح نہیں کہ ایک سمت سے آئے بلکہ ہر طرف سے یہ آواز یکساں سُنی گئی دوسرے صرف کانوں نے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا جو سُننے کیلئے وضع نہیں ہوئے سب اسکی سماعت میں شریک تھے اس سے بھی سمجھا گیا کہ حق تعالیٰ کیطرف سے یہ آواز ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا کلام لفظی بلا واسطہ سُنا

روح المعانی میں بحوالہ مسند احمد وہب کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب ندا یا موسیٰ کے لفظ سے دی گئی

تو اُنھوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا اور عرض کیا کہ میں آواز سُن رہا ہوں مگر آواز دینے والے کی جگہ معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں تو جواب آیا کہ میں تیرے اوپر، سامنے، پیچھے اور تیرے ساتھ ہوں پھر عرض کیا کہ میں یہ کلام خود آپ کا سُن رہا ہوں یا آپ کے بھیجے ہوئے کسی فرشتہ کا؟ تو جواب آیا کہ میں خود ہی آپ سے کلام کر رہا ہوں۔ اس پر صاحبِ روح فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام لفظی بلا واسطہ فرشتہ کے خود سُنا ہے جیسا کہ اہل السنۃ والجماعت میں سے ایک جماعت کا مسلک یہی ہے کہ کلام لفظی بھی قدیم ہونے کے باوجود سُنا جاسکتا ہے اس پر جو شبہ حدوث کا کیا جاتا ہے اسکا جواب اُن کی طرف سے یہ ہے کہ کلام لفظی اسوقت حادث ہوتا ہے جبکہ وہ مادی زبان سے ادا کیا جائے جس کے لئے جسم، سمت، جہت شرط ہے، نیز سننے کیلئے صرف کان مخصوص ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح سُنا کہ نہ آواز کی کوئی جہت وسمت تھی اور نہ سُننے کے لئے صرف کان مخصوص تھے سارے اعضاء سُن رہے تھے، ظاہر ہے یہ صورت احتمال حدوث سے پاک ہے۔ واللہ اعلم

مقامِ اَدب میں جوتے اُتار دینا اَدب کا مقتضا ہے!

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، جُوتے اُتارنے کا حکم یا تو اس لئے دیا گیا کہ مقام ادب ہے اور جُوتا اُتار کر ننگے پاؤں ہو جانا مقتضائے ادب ہے اور یا اس لئے کہ جوتے مُردار کی کھال کے بنے ہوئے تھے جیسا کہ بعض روایات میں ہے حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ اور ابن جریجؒ سے وجہ اول ہی منقول ہے اور جُوتا اُتارنے کی مصلحت یہ تبلائی تاکہ آپ کے قدم اس مبارک وادی کی مٹی سے لگ کر اُس کی برکت حاصل کریں اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم خشوع اور تواضع کی صورت بنانے کے لئے ہوا جیسا کہ سلف صالحین طواف بیت اللہ کے وقت ایسا ہی کرتے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن خصاصیہ کو قبروں کے درمیان جوتے پہن کر چلتے دیکھا تو فرمایا اذا كنت فی مثل ھذا المکان فاخلع نعليك یعنی جب تم اس جیسے مکان سے گزرو (جسکا احترام مقصود ہے) تو اپنے جوتے اُتار لو۔

جوتے اگر پاک ہوں تو ان میں نماز درست ہو جانے پر سب فقہاء کا اتفاق ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے پاک جوتے پہن کر نماز پڑھنا صحیح روایات سے ثابت بھی ہے مگر عام عادت وسُنّت یہی معلوم ہوتی ہے کہ جوتے اُتار کر نماز پڑھی جاتی تھی کہ وہ اقرب الی التواضع ہے۔ (قرطبی)

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى، حق تعالے نے زمین کے خاص خاص حصّوں کو اپنی حکمت سے خاص امتیاز اور شرف بخشا ہے جیسے بیت اللہ۔ مسجد اقصٰی۔ مسجد نبوی

اسی طرح وادیٔ طُویٰ بھی اُنہی مقاماتِ مقدسہ میں ہے جو کوہِ طور کے دامن میں ہے (قرطبی)

قرآن سُننے کا ادب | فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى، حضرت وہب بن مُنبہ سے منقول ہے کہ قرآن سُننے کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعضاء کو فضول حرکت سے روکے کہ کسی دوسرے شغل میں کوئی عضو بھی نہ لگے اور نظر نیچی رکھے اور کلام سمجھنے کی طرف دھیان لگائے اور جو شخص اس ادب کے ساتھ کوئی کلام سُنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو اسکے سمجھنے کی بھی توفیق دیدیتے ہیں۔ (قرطبی)

إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيٓ، اس کلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دین کے تمام اُصول کی تعلیم دیدی گئی یعنی توحید، رسالت، آخرت فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى میں رسالت کیطرف اشارہ ہے اور فَاعْبُدْنِي کے معنی یہ ہیں کہ صرف میری عبادت کریں، میرے سوا کسی کی عبادت نہ کریں یہ مضمون توحید کا ہو گیا آگے إِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ میں آخرت کا بیان ہے۔ فَاعْبُدْنِي کے حکم میں اگرچہ نماز کا حکم بھی داخل ہے لیکن اسکو جداگانہ اسلئے بیان فرمادیا کہ نماز تمام عبادات میں افضل و اعلیٰ بھی ہے اور حدیث کی تصریح کے مُطابق دین کا عمود اور ایمان کا نور ہے اور ترکِ نماز کافروں کی علامت ہے۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيٓ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی رُوح ذکر اللہ ہے اور نماز اوّل سے آخر تک ذکر ہی ذکر ہے زبان سے بھی دل سے بھی اور دوسرے اعضاء سے بھی اسلئے نماز میں ذکر اللہ سے غفلت نہ ہونی چاہیئے اور اسکے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کوئی شخص نیند میں مغلوب ہو گیا یا کسی کام میں لگ کر بھول گیا اور نماز کا وقت نکل گیا تو جب نیند سے بیدار ہو یا بھول پر تنبہ ہو اور نماز یاد آئے اُسی وقت نماز کی قضا پڑھ لے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے۔

أَكَادُ أُخْفِيهَا، یعنی قیامت کے معاملہ کو میں تمام مخلوقات سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں یہانتک کہ انبیاء اور فرشتوں سے بھی اور أَكَادُ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگر لوگوں کو قیامت و آخرت کی فکر دلا کر ایمان و عمل صالح پر اُبھارنا مقصود نہ ہوتا تو اتنی بات بھی ظاہر نہ کیجاتی کہ قیامت آنے والی ہے جیسا کہ اُوپر آیت میں آیا ہے إِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ، مقصود اس سے اخفائے قیامت میں مُبالغہ کرنا ہے۔

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (تاکہ جزاء دیا جائے ہر نفس اپنے عمل کی) اس جملہ کا تعلق اگر لفظ اٰتِيَةٌ سے ہے تو معنی ظاہر ہیں کہ قیامت کے آنے کی حکمت و مصلحت یہی کہ دُنیا تو دارالجزاء نہیں یہاں نیک و بد عمل کی جزاء کسی کو نہیں ملتی، اور اگر کبھی دُنیا میں کچھ جزاء مل بھی جاتی ہے تو وہ عمل کی پوری جزاء نہیں ہوتی ایک نمونہ سا ہوتا ہے اسلئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جہاں ہر نیک و بد عمل کی جزاء و سزا پوری دی جائے۔

اور اگر جملہ کا تعلق اَکَادُ اُخْفِیْھَا سے قرار دیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے اور معنے یہ ہوں گے کہ قیامت اور موت کے وقت اور تاریخ کو مخفی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے عمل اور سعی میں لگے رہیں اپنی شخصی قیامت یعنی موت اور پورے عالم کی قیامت یعنی حشر کے دن کو دُور سمجھ کر غافل نہ ہو بیٹھیں۔ (مظہری)

فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْھَا : اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ آپ کافروں اور بے ایمانوں کے کہنے سے قیامت کے معاملے میں غفلت برتنے لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ کسی نبی و رسول سے جو معصوم ہے یہ غفلت نہیں ہوسکتی اسکے باوجود ایسا خطاب کرنا دراصل اُن کی اُمت اور عام مخلوق کو سنانا ہے کہ جب اللہ کے پیغمبروں کو بھی ایسی تاکید کی جاتی ہے تو ہمیں اسکا کتنا اہتمام کرنا چاہیئے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا

اور یہ کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ بولا یہ میری لاٹھی ہے اس پر ٹیک

عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

لگاتا ہوں اور پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں پر اور میرے اسمیں چند کام ہیں اور بھی،

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾

فرمایا ڈالدے اس کو اے موسیٰ تو اُس کو ڈالدیا، پھر اُسیوقت وہ سانپ ہوگیا دوڑتا ہوا

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

فرمایا پکڑ لے اُس کو اور مت ڈر ہم ابھی پھیر دیں گے اس کو پہلی حالت پر

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ

اور ملالے اپنا ہاتھ اپنی بغل سے کہ نکلے سفید ہو کر بلا عیب

سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾

یہ نشانی دوسری تاکہ دکھاتے جائیں ہم تجھ کو اپنی نشانیاں بڑی،

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾

جا طرف فرعون کی کہ اُس نے بہت سر اُٹھایا

ع

خلاصۂ تفسیر

اور (حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انھوں نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں (مثلاً کندھے پر رکھ کر اسباب وغیرہ لٹکا لینا یا اس سے موذی جانوروں کو دفع کرنا وغیرہ وغیرہ) ارشاد ہوا کہ اس (عصا) کو (زمین پر) ڈالدو اے موسیٰ سو انھوں نے اس کو (زمین پر) ڈال دیا تو یکایک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا (جس سے موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے) ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں ہم ابھی (پکڑتے ہی) اس کو اس کی پہلی حالت پر کردیں گے (یعنی یہ پھر عصا بن جاویگا اور تم کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا معجزہ اور دیا جاتا ہے کہ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت روشن ہو کر) نکلے گا کہ یہ دوسری نشانی (ہماری قدرت اور تمھاری نبوت کی) ہوگی (اور یہ حکم لاٹھی کے ڈالدینے اور ہاتھ کو گریبان میں دینے کا اس لئے ہے) تاکہ ہم تم کو اپنی (قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھلائیں (تو اب یہ نشانیاں لیکر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے (کہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کو تبلیغ توحید کرو اور اگر نبوت میں شبہ کرے تو یہی معجزے دکھلادو)۔

معارف و مسائل

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى، بارگاہ رب العالمین کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کرنا کہ آپکے ہاتھ میں کیا چیز ہے موسیٰ علیہ السلام پر لطف و کرم اور خاص مہربانی کا آغاز ہے تاکہ حیرت انگیز مناظر کے دیکھنے اور کلام ربانی کے سننے سے جو ہیبت اور دہشت اُن پر طاری تھی وہ دُور ہو جائے یہ ایک دوستانہ انداز کا خطاب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کے علاوہ اس سوال میں یہ حکمت بھی ہے کہ آگے اس عصا کو جو اُن کے ہاتھ میں تھی ایک سانپ اور اژدھا بنانا تھا۔ اس لئے پہلے ان کو متنبہ کر دیا کہ دیکھ لو تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے جب اُنھوں نے دیکھ لیا کہ وہ لکڑی کا عصا ہے تب اُس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا گیا ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں شاید لاٹھی کی جگہ سانپ ہی پکڑ لایا ہوں۔

قَالَ هِیَ عَصَایَ ، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال صرف اتنا ہوا تھا کہ ہاتھ میں کیا چیز ہے اسکا اتنا جواب کافی تھا کہ لاٹھی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ تین باتیں اصل سوال کے جواب سے زیادہ عرض کیں اوّل یہ کہ یہ عصا میری ہے ، دوسرے یہ کہ میں اس سے بہت سے کام لیتا ہوں ایک یہ کہ اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں دوسرے یہ کہ اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں تیسرے یہ کہ اس سے اور بھی میرے بہت سے کام نکلتے ہیں، اس طویل اور تفصیلی جواب میں عشق و محبت اور اس کے ساتھ رعایت ادب کی جامعیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے ۔ عشق و محبت کا تقاضا ہے کہ جب محبوب مہربان ہو کر متوجہ ہے تو بات درازکی جائے تاکہ اسکا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ادب کا مقتضا یہ بھی ہے کہ بہت بے تکلف ہو کر کلام زیادہ طویل بھی نہ ہو۔ اس دوسرے مقتضار پر عمل کرنے کے لئے اخیر میں اختصار کر دیا کہ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ، یعنی میں اس سے اور بھی بہت سے کام لیا کرتا ہوں اور ان کاموں کی تفصیل بیان نہیں کی (روح و مظہری)

تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ضرورت اور مصلحت سے ایسا کرنا بھی جائز ہے کہ جو بات سوال میں نہ پوچھی گئی ہو اس کو بھی جواب میں بیان کر دیا جائے۔

مسئلہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہاتھ میں عصا رکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی سنت تھی اور اسمیں بے شمار دینی دنیوی فوائد ہیں۔ (قرطبی)

فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں جو عصا تھی بحکم ربانی اس کو ڈالدیا تو وہ سانپ بن گئی، اس سانپ کے بارے میں قرآن کریم کی آیات میں ایک جگہ تو یہ آیا ہے کَاَنَّهَا جَآنٌّ ، جان عربی لغت میں چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہتے ہیں ۔ اور دوسری جگہ آیا ہے فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ ، ثعبان کے معنے اژدہا اور بڑے موٹے سانپ کے ہیں، اور اس آیت میں جو لفظ حَیَّةٌ آیا ہے یہ عام ہے ہر چھوٹے بڑے اور پتلے موٹے سانپ کو حیہ کہا جاتا ہے ۔ تطبیق ان آیات کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ سانپ شروع میں پتلا اور چھوٹا ہو پھر موٹا اور بڑا ہو گیا، یا یہ کہ سانپ تو بڑا اور اژدہا ہی تھا مگر اس کو جَآنّ یعنی ہلکا چھوٹا سانپ اس مناسبت سے کہا گیا کہ یہ عظیم الشان اژدہا سرعت سیر کے اعتبار سے چھوٹے سانپ کی طرح تھا یعنی عام عادت کے خلاف کہ بڑے اژدہے تیز نہیں چل سکتے یہ بڑی تیزی سے چلتا تھا اور آیت میں لفظ کَاَنَّهَا سے جو تشبیہ کے معنی میں ہے اسطرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ جَآنّ سے اسکو تشبیہ ایک خاص وصف سرعت سیر میں دی گئی ہے۔ (مظہری)

وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ ، جَنَاح ۔ دراصل جانور کے بازو کو کہا جاتا ہے

اس جگہ اپنے بازو کے یعنی بغل میں ہاتھ لگا لینے کا حکم ہوا ہے تاکہ یہ دوسرا معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جاوے کہ جب بغل کے نیچے ہاتھ ڈال کر نکالیں تو آفتاب کی طرح چمکنے لگے حضرت ابن عباسؓ سے تخرج بیضاء کی یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری)

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ، اپنے رسول کو دو عظیم الشان معجزوں سے مسلح کرنے کے بعد اُن کو حکم دیا گیا کہ فرعون سرکش کو دعوت ایمان دینے کے لئے چلے جائیں۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْۤ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾

بولا اے رب کشادہ کر میرا سینہ اور آسان کر میرا کام

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ

اور کھول دے گرہ میری زبان سے کہ سمجھیں میری بات اور دے مجھ کو

لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾

ایک کام بٹانے والا میرے گھر کا ہارون میرا بھائی اس سے مضبوط کر میری کمر

وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّ

اور شریک کر اسکو میرے کام میں کہ تیری پاک ذات کا بیان کریں ہم بہت سا، اور

نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ

یاد کریں ہم تجھ کو بہت سا تو تو ہے ہم کو خوب دیکھتا فرمایا

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾

ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ

خلاصۂ تفسیر

(جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مجھ کو پیغمبر بنا کر فرعون کی فہمائش کے لئے بھیجا جارہا ہے تو اس وقت اس منصب عظیم کے مشکلات کی آسانی کے لئے درخواست کی اور) عرض کیا کہ اے میرے رب میرا حوصلہ (اور زیادہ) فراخ کر دیجئے (کہ تبلیغ میں انقباض یا تکذیب مخالفت میں ضیق نہ ہو) اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجئے (کہ اسباب تبلیغ کے مجتمع اور موانع تبلیغ کے مرتفع ہو جاویں) اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں اُن کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے اور اُن کو میرے (اس تبلیغ کے)

کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر مامور بالتبلیغ کیجئے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں اور میرے قلب کو قوت پہنچے) تاکہ ہم دونوں (مل کر تبلیغ و دعوت کے وقت) آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک و نقائص سے) بیان کریں اور آپ (کے اوصاف و کمال) کا خوب کثرت سے ذکر کریں (کیونکہ اگر دو شخص مبلغ ہونگے تو ہر شخص کا بیان دوسرے کی تائید سے وافر اور مکاثر ہوگا) بیشک آپ ہم کو (اور ہمارے حال کو) خوب دیکھ رہے ہیں (اس حالت سے ہماری احتیاج اس امر کی کہ ایک دوسرے کے معاون ہوں آپ کو معلوم ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (ہر) درخواست (جو کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي الخ میں مذکور ہے) منظور کی گئی اے موسیٰ۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلام الٰہی کا شرف خاص حاصل ہوا اور منصب نبوت و رسالت عطا ہوا تو اپنی ذات اور اپنی طاقت پر بھروسہ چھوڑ کر خود حق تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوگئے کہ اس منصب عظیم کی ذمہ داریاں اُسی کی مدد سے پوری ہو سکتی ہیں اور اُن پر جو مصائب اور شدائد آنا لازمی ہیں اُن کی برداشت کا حوصلہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہو سکتا ہے اسلئے اسوقت پانچ دعائیں مانگیں، پہلی دعا اِشْرَحْ لِي صَدْرِي، یعنی میرا سینہ کھولدے اسمیں ایسی وسعت عطا فرما دے جو علوم نبوت کا متحمل ہو سکے اور دعوت ایمان لوگوں تک پہنچانے میں جو اُن کی طرف سے سخت سُست سُننا پڑتا ہے اس کو برداشت کرنا بھی اسمیں شامل ہے۔

دوسری دعا وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (یعنی میرا کام میرے لئے آسان کر دے) یہ فہم و فراست بھی نبوت ہی کا ثمرہ تھا کہ کسی کام کا مشکل یا آسان ہونا بھی ظاہری تدبیروں کے تابع نہیں یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطیہ ہوتا ہے وہ اگر چاہتے ہیں تو کسی کے لئے مشکل سے مشکل بھاری سے بھاری کام آسان کر دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو آسان سے آسان کام مشکل ہو جاتا ہے اسی لئے حدیث شریف میں مسلمانوں کو اس دعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ سے اسطرح دعا مانگا کریں اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِنَا فِي تَيْسِيرِ كُلِّ عَسِيرٍ فَإِنَّ تَيْسِيرَ كُلِّ عَسِيرٍ عَلَيْكَ يَسِيرٌ یعنی یا اللہ ہم پر مہربانی فرما ہر مشکل کام کو آسان کرنے کے لئے کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کر دینا آپ کے قبضہ میں ہے۔

تیسری دعا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي، یعنی کھولدے میری زبان کی بندش تاکہ لوگ میرا کلام سمجھنے لگیں۔ اس بندش کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دودھ پینے کے زمانے میں تو اپنی والدہ ہی کے پاس تھے اور دربار فرعون سے اُن کو دودھ

پلانیکا وظیفہ اور صلہ ملتا رہا۔ جب دودھ چھڑایا گیا تو فرعون اور اس کی بیوی آسیہ نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اس لئے والدہ سے واپس لے کر اپنے یہاں پلنے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑلی اور اسکے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور بعض روایات میں ہے کہ ایک چھڑی ہاتھ میں تھی جس سے کھیل رہے تھے وہ فرعون کے سر پر ماری، فرعون کو غصہ آیا اور اس کے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ بیوی آسیہ نے کہا کہ شاہا، آپ بچے کی بات پر خیال کرتے ہیں جس کو کسی چیز کی عقل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو تجربہ کرلیں کہ اس کو کسی بھلے بُرے کا امتیاز نہیں۔ فرعون کو تجربہ کرانے کے لئے ایک طشت میں آگ کے انگارے اور دوسرے میں جواہرات لاکر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیئے خیال یہ تھا کہ بچہ ہے یہ بچوں کی عادت کے مطابق آگ کے انگارے کو روشن خوبصورت سمجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا جواہرات کی رونق بچوں کی نظر میں ایسی نہیں ہوتی کہ اس طرف توجہ دیں، اس سے فرعون کو تجربہ ہوجائیگا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بچپن کی نادانی سے کیا۔ مگر یہاں تو کوئی عام بچہ نہیں تھا، خدا تعالےٰ کا ہونے والا رسُول تھا جن کی فطرت اوّل پیدائش سے ہی غیر معمولی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام نے آگ کے بجائے جواہرات پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ آگ کے طشت میں ڈالدیا اور انھوں نے آگ کا انگارہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا، جس سے زبان جل گئی اور فرعون کو یقین آگیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل کسی شرارت سے نہیں بچپن کی بے خبری کے سبب سے تھا۔ اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں ایک قسم کی تکلیف پیدا ہوگئی اسی کو قرآن میں عُقدہ کہا گیا ہے اور اسی کو کھولنے کی دُعا حضرت موسیٰؑ نے مانگی (مظہری و قرطبی)

پہلی دو دُعائیں تو عام تھیں سب کا مومنین اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لئے، تیسری دُعا میں اپنی ایک محسوس کمزوری کے ازالہ کی درخواست کی گئی کہ رسالت و دعوت کیلئے زبان کی طلاقت اور فصاحت بھی ایک ضروری چیز ہے۔ آگے ایک آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ سب دُعائیں قبول کرلی گئیں جسکا ظاہر یہ ہے کہ زبان کی یہ لکنت بھی ختم ہوگئی ہوگی مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ رسالت میں شریک کرنے کی جو دُعا کی ہے اُسمیں یہ بھی فرمایا ہے کہ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّىۡ لِسَانًا، یعنی ہارون علیہ السلام زبان کے اعتبار سے بہ نسبت میرے زیادہ فصیح ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر لکنت کا کچھ باقی تھا۔ نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عیوب لگائے اُن میں یہ بھی کہا کہ وَلَا يَكَادُ يُبِيۡنُ، یعنی یہ اپنی بات کو صاف بیان نہیں کرسکتے۔ بعض حضرات نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی دُعا میں اتنی ہی بات مانگی تھی کہ زبان کی بندش اتنی کھل جائے

کہ لوگ میری بات سمجھ لیا کریں، اتنی لکنت دُور کر دی گئی کچھ معمولی اثر پھر بھی رہا ہو تو وہ اس دُعا کی قبولیت کے منافی نہیں۔ چوتھی دُعا وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (یعنی بنادے میرا ایک وزیر میرے ہی خاندان میں سے) پچھلی تین دُعائیں اپنے نفس اور ذات سے متعلق تھیں یہ چوتھی دُعا اعمالِ رسالت کو انجام دینے کے لئے اسباب جمع کرنے سے متعلق ہے اور ان اسباب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اور اہم امر یہ قرار دیا کہ ان کا کوئی نائب اور وزیر ہو جو اُن کی مدد کر سکے۔ وزیر کے معنی ہی لُغت میں بوجھ اُٹھانے والے کے ہیں، وزیرِ سلطنت چونکہ اپنے امیر و بادشاہ کا بار ذمہ داری سے اُٹھاتا ہے اسلئے اسکو وزیر کہتے ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمالِ عقل معلوم ہوا کہ کسی کام یا تحریک کے چلانے کے لئے سب سے پہلی چیز انسان کے اعوان و انصار ہیں وہ منشاء کے مطابق مل جائیں تو آگے سب کام آسان ہو جاتے ہیں اور وہ غلط ہوں تو سارے اسباب و سامان بھی بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں آجکل کی سلطنتوں اور حکومتوں میں جتنی خرابیاں مشاہدہ میں آئی ہیں غور کریں تو ان سب کا اصلی سبب امیرِ ریاست کے اعوان و انصار اور وزراء و امراء کی خرابی بے علمی یا بدعملی یا عدمِ صلاحیت ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالےٰ جب کسی شخص کو کوئی حکومت و امارت سپرد فرماتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ اچھے کام کرے حکومت کو اچھی طرح چلائے تو اُس کو نیک وزیر دیدیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے اگر یہ کسی ضروری کام کو بھول جائے تو وزیر یاد دلا دیتا ہے اور جس کام کا وہ ارادہ کرے وزیر اسمیں اُسکی مدد کرتا ہے (رواہ النسائی عن القاسم بن محمد)

اس دُعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا اسکے ساتھ ایک قید مِّنْ اَهْلِيْ کی بھی لگا دی کہ یہ وزیر میرے خاندان و اقارب میں سے ہو کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات و اخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم اُلفت و مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کر لیا گیا ہو۔ محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو۔ اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت و اخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے۔ اس لئے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش و عزیز کو وزیر یا نائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور جہاں دیانتداری پر بھروسہ پُورا ہو تو کسی صالح و اصلح خویش و عزیز کو کوئی عہدہ سُپرد کر دینا کوئی عیب نہیں بلکہ مہماتِ اُمور کی تکمیل کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین عموماً وہی حضرات ہوئے جو بیت نبوت کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات بھی رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دُعا میں پہلے تو عام بات فرمائی کہ میرے خاندان و

اہل میں سے ہو، پھر متعین کرکے فرمایا کہ وہ میرا بھائی ہارون ہے جس کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں تاکہ میں اُس سے مہماتِ رسالت میں قوت حاصل کرسکوں۔

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین یا چار سال بڑے تھے، اور تین سال پہلے ہی وفات پائی۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی وہ مصر میں تھے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا پر اُن کو بھی نبی بنا دیا تو بذریعہ فرشتہ اُن کو بھی مصر ہی میں اسکی اطلاع ملگئی جب موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں فرعون کی تبلیغ کے لئے روانہ کیا گیا تو اُن کو یہ ہدایت کردی گئی کہ وہ مصر سے باہر اُن کا استقبال کریں اور ایسا ہی واقع ہوا۔ (قرطبی)

وَاَشۡرِكۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ کو اپنا وزیر بنانا چاہا تو یہ اختیار خود اُن کو حاصل تھا مگر حق تعالیٰ کی طرف سے کرنے کی دُعا کی مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کو نبوت و رسالت میں اپنا شریک قرار دیں یہ اختیار کسی رسول و نبی کو خود نہیں ہوتا اس لئے اسکی جداگانہ دُعا کی کہ اُن کو میرے کارِ رسالت میں شریک فرمادے آخر میں فرمایا

صالح رفقاء ذکر و عبادت میں بھی مددگار ہوتے ہیں

كَیۡ نُسَبِّحَكَ كَثِیۡرًا وَّنَذۡكُرَكَ كَثِیۡرًا، یعنی حضرت ہارونؑ کو وزیر اور شریک نبوت بنانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح و ذکر کیا کریں گے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ تسبیح و ذکر تو ایسی چیز ہے کہ ہر انسان تنہا بھی جتنا چاہے کرسکتا ہے اس کے لئے کسی ساتھی کے عمل کا کیا دخل لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر و تسبیح میں بھی سازگار ماحول اور اللہ والے ساتھیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جس کے ساتھی اللہ والے نہ ہوں وہ اتنی عبادت نہیں کرسکتا جتنی وہ کرسکتا ہے جسکا ماحول اللہ والوں کا اور ساتھی ذاکر شاغل ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ذکر اللہ میں مشغول رہنا چاہے اسکو سازگار ماحول کی بھی تلاش کرنا چاہیئے۔

دُعائیں یہاں ختم ہوگئیں آخر میں حق تعالیٰ کی طرف سے ان سب دُعاؤں کے قبول ہوجانے کی بشارت دیدی گئی قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی، یعنی آپ کی مانگی ہوئی سب چیزیں آپ کو دیدی گئیں۔

وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ﴿۳۷﴾ اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی

اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی جب حکم بھیجا ہم نے تیری

اُمِّكَ مَا یُوۡحٰۤی ﴿۳۸﴾ اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ

ماں کو جو آگے سُناتے ہیں کہ ڈال اسکو صندوق میں پھر اس کو ڈال دے دریا میں

فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَ

پھر دریا اُس کو لے ڈالے کنارے پر اُٹھالے اُس کو ایک دشمن میرا اور

عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی

اُس کا اور ڈال دی میں نے تجھ پر محبت اپنی طرف سے اور تاکہ پرورش پائے

عَیْنِیْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی

تو میری آنکھ کے سامنے، جب چلنے لگی تیری بہن اور کہنے لگی میں بتاؤں تم کو ایسا شخص جو اس کو

مَنْ یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا

پالے پھر پہنچا دیا ہم نے تجھ کو تیری ماں کے پاس کہ ٹھنڈی رہے اُسکی آنکھ اور غم

تَحْزَنَ ۬ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ

نہ کھاوے اور تو نے مار ڈالا ایک شخص کو پھر بچا دیا ہم نے تجھ کو اس غم سے اور جانچا ہم نے

فُتُوْنًا ۬ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ۬ۙ ثُمَّ جِئْتَ

تجھ کو ایک ذرا جانچنا، پھر ٹھہرا رہا تو کئی برس مدین والوں میں پھر آیا تو

عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ

تقدیر سے اے موسیٰ اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے جا تو

اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ

اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر اور سستی نہ کریو میری یاد میں جاؤ طرف

اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا

فرعون کی اُس نے بہت سر اُٹھایا سو کہو اُس سے بات نرم

لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ﴿۴۴﴾

شاید وہ سوچے یا ڈرے

وقف لازم

خلاصۂ تفسیر

ہم تو اور دفعہ اور بھی (اس کے قبل بے درخواست ہی) تم پر احسان کر چکے ہیں جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام سے بتلائی جو (بوجہ مہتم بالشان ہونے کے) الہام سے بتلانے کے

(قابل) تھی (وہ) یہ کہ موسیٰ کو (جلادوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے) ایک صندوق میں رکھو، پھر ان کو (مع صندوق کے) دریا میں (جس کی ایک شاخ فرعون کے محل تک بھی گئی تھی) ڈالدو پھر دریا اُن کو (مع صندوق کے) کنارہ (کے پاس) تک لے آویگا کہ (آخر کار) اُن کو ایک ایسا شخص پکڑ لیگا جو (کافر ہونے کی وجہ سے) میرا بھی دشمن ہے اور اُن کا بھی دشمن ہے (خواہ فی الحال بوجہ اسکے کہ سب بچوں کو قتل کرتا تھا خواہ آئندہ ان کا خاص طور پر دشمن ہوگا) اور (جب صندوق پکڑا گیا اور تم اسمیں سے نکالے گئے تو) میں نے تمہارے (چہرے کے) اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈالدیا (تاکہ جو تم کو دیکھے پیار کرے) اور تاکہ تم میری (خاص) نگرانی میں پرورش پاؤ۔ (یہ اسوقت کا قصہ ہے) جبکہ تمہاری بہن (تمہاری تلاش میں فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئیں، پھر (تم کو دیکھ کر اجنبی بن کر) کہنے لگیں (جبکہ تم کسی انا کا دودھ نہ پیتے تھے) کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتہ دُوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے (چنانچہ ان لوگوں نے چونکہ اس کو تلاش تھی منظور کیا اور تمہاری بہن تمہاری ماں کو بُلا کر لائیں) پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُن کو غم نہ رہے (جیسے تھوڑے عرصہ تک فراق سے مغموم رہیں) اور (بڑے ہونے کے بعد یک اور احسان کیا کہ) تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا (جسکا قصہ سورۂ قصص میں ہے اور مار کر غم ہوا خوف عقاب سے بھی اور خوف انتقام سے بھی) پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی (خوف عقاب سے تو اس طرح کہ استغفار کی توفیق دی اور اس کو قبول کیا اور خوف انتقام سے اس طرح کہ مصر سے مدین پہنچا دیا) اور (مدین پہنچنے تک) ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا (اور پھر ان سے خلاصی دی جسکا ذکر سورۂ قصص میں ہے کہ خلاصی دینا بھی منت ہے اور خود ابتلاء بھی بوجہ اس کے کہ وہ سبب ہے حصولِ اخلاق حمیدہ و ملکاتِ فاضلہ کا مستقل احسان ہے)۔

پھر (مدین پہنچے اور) مدین والوں میں کئی سال رہے پھر ایک خاص وقت پر (جو میرے علم میں تمہاری نبوت اور ہمکلامی کے لئے مقدر تھا) تم (یہاں) آئے اے موسیٰ اور (یہاں آنے پر) میں نے تم کو اپنے (نبی بنانے کے) لئے منتخب کیا (سو اب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات کہ اصل دو معجزے ہیں عصا و ید بیضا اور ہر ایک میں وجوہ اعجاز متعدد ہیں) لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوت میں خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا (اب موقع جانے کا بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چلا ہے پھر (اسکے پاس جاکر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جاوے (اور اس سے مان جاوے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو انعامات و عنایات حق اس وقت مبذول ہوئیں کہ شرفِ ہمکلامی سے نوازا گیا، نبوت و رسالت عطا ہوئی، خاص معجزات عطا ہوئے اس کے ساتھ یہاں حق تعالیٰ اپنی وہ نعمتیں بھی اُن کو یاد دلاتے ہیں جو شروع پیدائش سے اسوقت تک زندگی کے ہر دَور میں آپ پر مبذول ہوتی رہیں اور مسلسل آزمائشوں اور جان کے خطروں کے درمیان قدرتِ حق نے کن حیرت انگیز طریقوں سے ان کی حفاظت فرمائی یہ نعمتیں جنکا ذکر آگے آتا ہے زمانہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہیں یہاں جو اُن کو اُخریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نعمتیں اسکے بعد کی ہیں بلکہ لفظ اُخریٰ کبھی مطلقاً دوسرے کے معنے میں بھی آتا ہے جسمیں مقدم مؤخر کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا یہاں بھی یہ لفظ اسی معنے میں ہے (روح) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ پُورا قصہ حدیث کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ، یعنی جبکہ وحی بھیجی ہم نے آپ کی والدہ کے پاس ایک ایسے معاملہ کی جو صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتا تھا وہ یہ کہ فرعونی سپاہی جو اسرائیلی لڑکوں کو قتل کرنے پر مامور تھے اُن سے بچانے کے لئے اُن کی والدہ کو بذریعۂ وحی الٰہی بتلایا گیا کہ اُن کو ایک تابُوت میں بند کر کے دریا میں ڈالدیں اور اُن کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہ کریں ہم اُن کو حفاظت سے رکھیں گے اور پھر آپکے پاس ہی واپس پہنچادیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں عقل و قیاس کی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اُن کی حفاظت کا ناقابلِ قیاس انتظام صرف اُسی کیطرف سے بتلانے پر کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔

کیا وحی کسی غیر نبی و رسول کی طرف بھی آسکتی ہے

صحیح بات یہ ہے کہ لفظ وحی کے لُغوی معنے ایسے خُفیہ کلام کے ہیں جو صرف مخاطب کو معلوم ہو، دُوسرے اس پر مطّلع نہ ہوں۔ اس لُغوی معنے کے اعتبار سے وحی کسی کے لئے مخصوص نہیں۔ نبی و رسول اور عام مخلوق بلکہ جانور تک اسمیں شامل ہو سکتے ہیں۔ (أَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ) میں شہد کی مکھیوں کو بذریعہ وحی تلقین و تعلیم کرنے کا ذکر اسی معنے کے اعتبار سے ہے اور اس آیت میں أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ بھی اس معنی لُغوی کے اعتبار سے ہے اس سے انکا نبی یا رسول ہونا لازم نہیں آتا، جیسے حضرت مریم علیہا السلام کو ارشادات ربانی پہنچے باوجودیکہ باتفاق جمہورِ اُمّت وہ نبی یا رسول نہیں تھیں۔ اس طرح کی لُغوی وحی عموماً بطور الہام کے ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کسی کے قلب میں ایک مضمون ڈالدیں اور اس کو اس پر مطمئن کر دیں کہ اللہ کیطرف سے ہے جیسے عموماً اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہامات ہوتے رہے ہیں، بلکہ ابُو حیان اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت مریم کے واقعہ میں اس کی تصریح ہے کہ جبرئیل امین

نے بشکلِ انسانی متمثل ہو کر ان کو تلقین فرمائی مگر اسکا تعلق صرف اُس شخص کی ذات سے ہوتا ہے جس کو یہ وحی الہام ہوتی ہے۔ اصلاحِ خلق اور تبلیغ و دعوت سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا بخلاف وحیِ نبوت کے کہ اسکا منشا ہی مخلوق کی اصلاح کے لئے کسی کو کھڑا کرنا اور تبلیغ و دعوت کے لئے مامور کرنا ہوتا ہے اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ اپنی وحی پر خود بھی ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اپنی نبوت کے ماننے اور اپنی وحی کے ماننے کا پابند بنائے جو اُس کو نہ مانے اُسے کافر قرار دے۔

یہی فرق ہے اس وحیِ الہام یعنی وحیِ لغوی میں اور وحیِ نبوت یعنی وحیِ اصطلاحی میں۔ وحیِ لغوی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ رہے گی، اور نبوت اور وحیِ نبوت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔ بعض بزرگوں کے کلام میں اسی کو وحیِ تشریعی و غیر تشریعی کے عنوان سے تعبیر کر دیا ہے جس کو مدعیِ نبوت قادیانی نے شیخ محی الدین ابن عربی رح کی بعض عبارتوں کے حوالہ سے اپنے دعوائے نبوت کے جواز کی دلیل بنایا ہے جو خود ابن عربی رح کی تصریحات سے باطل ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث توضیح میری کتاب ختمِ نبوت میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کا نام | روح المعانی میں ہے کہ ان کا مشہور نام یوحانذ ہے، اور اتقان میں ان کا نام لحیانہ بنت یصمد بن لاوی لکھا ہے، اور بعض لوگوں نے ان کا نام بارخا بعض نے بازخت بتلایا ہے۔ بعض تعویذ گنڈے والے ان کے نام کی عجیب خصوصیات بیان کیا کرتے ہیں صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ ہمیں اسکی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوئی اور غالب یہ ہے کہ خرافات میں سے ہے۔

فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، اس جگہ لفظ یم بمعنے دریا سے بظاہر نہر نیل مُراد ہے آیت میں ایک حکم تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو دیا گیا ہے کہ اس بچے (موسیٰ علیہ السلام) کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں، دوسرا حکم (بصیغۂ امر) دریا کے نام ہے کہ وہ اس تابوت کو کنارہ پر ڈال دے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، دریا چونکہ بظاہر بے حس و بے شعور ہے اُس کو حکم دینے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا اسی لئے بعض حضرات نے یہ قرار دیا کہ اگرچہ یہاں صیغہ امر بمعنی حکم استعمال ہوا ہے مگر مُراد اس سے حکم نہیں بلکہ خبر دینا ہے کہ دریا اس کو کنارہ پر ڈال دیگا۔ مگر محققین علماء کے نزدیک یہ امر اپنے ظاہر پر امر اور حکم ہی ہے اور دریا ہی اُس کا مخاطب ہے کیونکہ اُن کے نزدیک دُنیا کی کوئی مخلوق درخت، اور پتھر تک بے عقل و بے شعور نہیں بلکہ سب میں عقل و ادراک موجود ہے اور یہی عقل و ادراک ہے جس کے سبب یہ سب چیزیں حسبِ تصریحِ قرآن اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ انسان اور جن اور فرشتہ کے علاوہ کسی مخلوق میں عقل و شعور اتنا مکمل نہیں جس پر احکام حلال و حرام عائد کر کے مکلف بنایا جائے، دانائے رُوم نے خوب فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ✤ با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ، یعنی اس تابوت اور اسمیں بند کیے ہوئے بچے کو ساحل دریا سے ایسا شخص اُٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰؑ کا بھی، مُراد اس سے فرعون ہے۔ فرعون کا اللہ کا دشمن ہونا تو اُس کے کفر کی وجہ سے ظاہر ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا دشمن کہنا اس لئے محل غور ہے کہ اسوقت تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن نہیں تھا بلکہ اُن کی پرورش پر زرِکثیر خرچ کر رہا تھا پھر اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن فرمانا یا تو انجام کار کے اعتبار سے ہے کہ بالآخر فرعون کا دشمن ہوجانا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ کہا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں کہ جہاں تک فرعون کی ذات کا تعلق ہے وہ فی نفسہٖ اُسوقت بھی دشمن ہی تھا۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ کی تربیت صرف بیوی آسیہ کی خاطر گوارا کی تھی اور اس میں بھی جب اُس کو شبہ ہوا تو اُسی وقت قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا جو حضرت آسیہ کی دانشمندی کے ذریعہ ختم ہوا (روح و مظہری)

وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي، اس جگہ لفظ محبت مصدر بمعنے محبوبیت ہے اور مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمنے اپنی عنایت و رحمت سے آپکے وجود میں ایک محبوبیت کی شان رکھدی تھی کہ جو آپ کو دیکھے آپ سے محبت کرنے لگے۔ حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہ سے یہی تفسیر منقول ہے (مظہری)

وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي، لفظ صنعت سے اس جگہ مُراد عمدہ تربیت ہے جیسے عرب میں صَنَعْتُ فَرَسِی کا محاورہ اسی معنی میں معروف ہے کہ میں نے اپنے گھوڑے کی اچھی تربیت کی اور عَلٰی عَیْنِی سے مُراد علیٰ حفظی یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہترین تربیت براہ راست حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہو اس لئے مصر کی سب سے بڑی ہستی یعنی فرعون کے ہاتھوں ہی اس کے گھر میں یہ کام اس طرح لیا گیا کہ وہ اس سے بے خبر تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو پال رہا ہوں۔ (مظہری)

إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ، موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا اس تابوت کے تعاقب میں جانا اور اُس کے بعد کا قصہ جسکا اجمال اس آیت میں آیا ہے جس کے آخر میں فرمایا ہے وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا یعنی ہم نے آپ کی آزمائش کی بار بار (قالہ ابن عباسؓ) یا آپ کو مبتلائے آزمائش کیا بار بار (قالہ الضحاک) اسکی پُوری تفصیل سُنن نسائی کی ایک طویل حدیث میں بروایت ابن عباسؓ آئی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل قصہ حدیث الفتون کے نام سے طویل حدیث سُنن نسائی کتاب التفسیر میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی ہے اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی اسکو پورا نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس روایت کو مرفوع یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے اور ابن کثیر نے بھی حدیث کے مرفوع ہونے کی توثیق کے لئے فرمایا ہے کہ:-

وَصَدَّقَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ، یعنی اس حدیث کا مرفوع ہونا میرے نزدیک درست ہے پھر اس کے لئے ایک دلیل بھی بیان فرمائی لیکن اسکے بعد یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتمؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہ روایت نقل کی ہے مگر وہ موقوف یعنی ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے، مرفوع حدیث کے جملے اسمیں کہیں کہیں آئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ روایت کعب احبارؒ سے لی ہے جیسا کہ بہت سے مواقع میں ایسا ہوا ہے۔ مگر ابن کثیر جیسے ناقدِ حدیث اور نسائی جیسے امام حدیث اس کو مرفوع مانتے ہیں اور جنھوں نے مرفوع تسلیم نہیں کیا وہ بھی اسکے مضمون پر کوئی نکیر نہیں کرتے اور اکثر حصہ اسکا تو خود قرآن کریم کی آیات میں آیا ہوا ہے اسلئے پوری حدیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی قصے کے ضمن میں بہت سے علمی اور عملی فوائد بھی ہیں۔ حدیث الفتون بسند امام نسائیؒ قاسم بن ابی ایوب فرماتے ہیں کہ مجھے سعید بن جبیرؒ نے خبر دی کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آئی ہے یعنی وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا میں نے دریافت کیا کہ اسمیں فتون سے کیا مراد ہے؟ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اسکا واقعہ بڑا طویل ہے صبح کو سویرے آجاؤ تو بتلا دینگے، جب اگلے دن صبح ہوئی تو میں سویرے ہی ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تاکہ کل جو وعدہ فرمایا تھا اُس کو پورا کراؤں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سنو! ایک روز فرعون اور اس کے ہمنشینوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ اُنکی ذریت میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرما دیں گے۔ بعض شرکاءِ مجلس نے کہا کہ ہاں بنی اسرائیل تو اسکے منتظر ہیں جس میں اُن کو ذرا شک نہیں کہ اُن کے اندر کوئی نبی و رسول پیدا ہوگا اور پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں، جب اُن کی وفات ہو گئی تو کہنے لگے کہ ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ اسکے مصداق نہیں (کوئی اور نبی و رسول پیدا ہوگا جو اس وعدہ کو پورا کریگا)۔ فرعون نے یہ سنا تو (اُس کو فکر لاحق ہو گئی کہ اگر بنی اسرائیل میں جن کو اُس نے غلام بنا رکھا تھا کوئی نبی و رسول پیدا ہو گیا تو وہ ان کو مجھ سے آزاد کرائے گا) اِس لئے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ اس آفت سے بچنے کا کیا راستہ ہے یہ لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے اور انجام کار سب کی رائے اس پر متفق ہو گئی کہ (بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُس کو ذبح کر دیا جائے اس کے لئے) ایسے سپاہی مقرر کر دیئے گئے جن کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں اور وہ بنی اسرائیل کے ایک ایک گھر میں جا کر دیکھتے تھے جہاں کوئی لڑکا نظر آیا اسکو ذبح کر دیا۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد ان کو یہ ہوش آیا کہ ہماری سب خدمتیں اور محنت مشقت کے کام تو بنی اسرائیل ہی انجام دیتے ہیں اگر یہ سلسلہ قتل کا جاری رہا تو اُن کے بوڑھے تو اپنی

موت مرجائیں گے اور بچے ذبح ہوتے رہے تو آئندہ بنی اسرائیل میں کوئی مرد نہ رہے گا جو ہماری خدمتیں انجام دے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے مشقت کے کام ہمیں خود ہی کرنا پڑیں گے اسلئے اب یہ رائے ہوئی کہ ایک سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے، دوسرے سال میں پیدا ہونے والوں کو ذبح کر دیا جائے۔ اس طرح بنی اسرائیل میں کچھ جوان بھی رہیں گے جو اپنے بوڑھوں کی جگہ لے سکیں اور اُن کی تعداد اتنی زیادہ بھی نہیں ہوگی جس سے فرعونی حکومت کو خطرہ ہوسکے۔ یہ بات سب کو پسند آئی اور یہی قانون نافذ کر دیا گیا (اب حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا ظہور اس طرح ہوا کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایک حمل اس وقت ہوا جبکہ بچوں کو زندہ چھوڑ دینے کا سال تھا، اسمیں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے فرعونی قانون کی رُو سے اُن کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اگلے سال جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اُسمیں حضرت موسیٰ حمل میں آئے تو اُن کی والدہ پر رنج و غم طاری تھا کہ اب یہ بچہ پیدا ہوگا تو قتل کر دیا جائیگا۔ ابن عباسؓ نے قصہ کو یہاں تک پہنچا کر فرمایا کہ اے ابن جُبیر فُتون یعنی آزمائش کا یہ پہلا موقع ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ابھی دُنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُن کے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے انکی والدہ کو بذریعہ وحی الہام یہ تسلی دیدی کہ لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْكِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ یعنی تم کوئی خوف و غم نہ کرو (ہم اسکی حفاظت کریں گے اور کچھ دن جُدا رہنے کے بعد) ہم انکو تمہارے پاس واپس کر دیں گے پھر ان کو اپنے رسُولوں میں داخل کریں گے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے تو اُن کی والدہ کو حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا (نیل) میں ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس حکم کی تعمیل کر دی۔ جب وہ تابوت کو دریا کے حوالہ کر چکیں تو شیطان نے اُن کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تو نے کیا کام کیا اگر بچہ تیرے پاس رہ کر ذبح بھی کر دیا جاتا تو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کر کے کچھ تو تسلی ہوتی اب تو اسکو دریا کے جانور کھائیں گے (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی رنج و غم میں مبتلا تھیں کہ) دریا کی موجوں نے تابوت کو ایک ایسی چٹان پر ڈالدیا جہاں فرعون کی باندیاں لونڈیاں نہانے دھونے کے لئے جایا کرتی تھیں، انھوں نے یہ تابوت دیکھا تو اُٹھالیا اور کھولنے کا ارادہ کیا تو انمیں سے کسی نے کہا کہ اگر اسمیں کچھ مال ہوا اور ہم نے کھول لیا تو فرعون کی بیوی کو یہ گمان ہوگا کہ ہم نے اسمیں سے کچھ الگ کھ لیا ہو ہم کچھ بھی کہیں اُس کو یقین نہیں آئے گا اس لئے سب کی رائے یہ ہوگئی کہ اس تابوت کو اسیطرح بند اُٹھا کر فرعون کی بیوی کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

فرعون کی بیوی نے تابوت کھولا تو اسمیں ایک ایسا لڑکا دیکھا جس کو دیکھتے ہی اُس کے دل میں اُس سے اتنی محبت ہوگئی جو اس سے پہلے کسی بچے سے نہیں ہوئی تھی (جو در حقیقت

حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظہور تھا (وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ) دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بوسوسۂ شیطانی اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو بھول گئیں اور حالت یہ ہوگئی وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل ہر خوشی اور ہر خیال سے خالی ہو گیا (صرف موسیٰ علیہ السلام کی فکر غالب آگئی) ادھر جب لڑکوں کے قتل پر مامور پولیس والوں کو فرعون کے گھر میں ایک لڑکا آجانے کی خبر ملی تو وہ چھریاں لیکر فرعون کی بیوی کے پاس پہنچ گئے کہ یہ لڑکا ہمیں دو تاکہ ذبح کردیں۔

ابن عباسؓ نے یہاں پہنچکر پھر ابن جُبیرؒ کو مخاطب کیا کہ اے ابن جُبیر فتون یعنی آزمائش کا (دوسرا) واقعہ یہ ہے۔

فرعون کی بیوی نے ان لشکری لوگوں کو جواب دیا کہ ابھی ٹھہرو کہ صرف اس ایک لڑکے سے تو بنی اسرائیل کی قوت نہیں بڑھ جائے گی میں فرعون کے پاس جاتی ہوں اور اس بچے کی جاں بخشی کراتی ہوں، اگر فرعون نے اسکو بخشدیا تو یہ بہتر ہوگا ورنہ تمہارے معاملے میں دخل نہ دوں گی یہ بچہ تمہارے حوالہ ہوگا۔ یہ کہکر وہ فرعون کے پاس گئی اور کہا کہ یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو معلوم ہے مگر مجھے اسکی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے اگر فرعون اسوقت بیوی کی طرح اپنے لئے بھی موسیٰ علیہ السلام کے قرۃ العین آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کا اقرار کر لیتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ہدایت کر دیتا جیسا کہ اُس کی بیوی کو ہدایت ایمان عطا فرمائی۔

(بہرحال بیوی کے کہنے سے فرعون نے اس لڑکے کو قتل سے آزاد کر دیا) اب فرعون کی بیوی نے اسکو دودھ پلانے کے لئے اپنے آس پاس کی عورتوں کو بلایا۔ سب نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کی خدمت انجام دیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی چھاتی نہ لگتی (وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ) اب فرعون کی بیوی کو یہ فکر ہوگئی کہ جب کسی کا دودھ نہیں لیتے تو زندہ یہ کیسے رہیں گے اسلئے اپنی کنیزوں کے سُپرد کیا کہ اس کو بازار اور لوگوں کے مجمع میں لیجائیں شاید کسی عورت کا دودھ یہ قبول کرلیں۔

اس طرف موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بے چین ہو کر اپنی بیٹی کو کہا کہ ذرا باہر جاکر تلاش کرو اور لوگوں سے دریافت کرو کہ اس تابوت اور بچہ کا کیا انجام ہوا، وہ زندہ ہے یا دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہے اسوقت تک اُن کو اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ یاد نہیں آیا تھا جو حالتِ حمل میں اُن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور چند روزہ مفارقت کے بعد واپسی کا کیا گیا تھا حضرت موسیٰ کی بہن باہر نکلیں تو (قدرتِ حق کا

یہ کرشمہ دیکھا کہ) فرعون کی کنیزیں اس بچے کو لئے ہوئے دودھ پلانے والی عورت کی تلاش میں ہیں۔ جب اُنھوں نے یہ ماجرا دیکھا کہ یہ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں لیتا اور یہ کنیزیں پریشان ہیں تو ان سے کہا کہ میں تمھیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ دیتی ہوں جہاں مجھے اُمید ہے کہ یہ اُن کا دودھ بھی لینگے اور وہ اس کو خیرخواہی و محبت کے ساتھ پالیں گے۔ یہ سُنکر ان کنیزوں نے ان کو اس شبہ پر پکڑ لیا کہ یہ عورت شاید اس بچے کی ماں یا کوئی عزیز خاص ہے جو وثوق کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس کے خیرخواہ اور ہمدرد ہیں (اسوقت یہ بہن بھی پریشان ہوگئی)۔

ابن عباسؓ نے اس جگہ پہنچکر پھر ابن جبیر کو خطاب کیا کہ یہ (تیسرا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے اسوقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے بات بنائی اور کہا کہ میری مُراد اس گھر والوں کے ہمدرد و خیرخواہ ہونے سے یہی تھی کہ فرعونی دربار تک اُن کی رسائی ہوگی اُس سے انکو منافع پہنچنے کی اُمید ہوگی اسلئے وہ اس بچے کی محبت و ہمدردی میں کسر نہ کریں گے۔ یہ سُنکر کنیزوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ یہ واپس اپنے گھر پہنچی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو واقعہ کی خبر دی وہ انکے ساتھ اُس جگہ پہنچیں جہاں یہ کنیزیں جمع تھیں، کنیزوں کے کہنے سے اُنھوں نے بھی بچے کو گود میں لے لیا، موسیٰ علیہ السلام فوراً اُن کی چھاتیوں سے لگ کر دودھ پینے لگے یہاں تک کہ پیٹ بھر گیا۔ یہ خوشخبری فرعون کی بیوی کو پہنچی کہ اس بچے کے لئے دودھ پلانے والی مل گئی۔ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بُلوایا۔ اُنھوں نے آکر حالات دیکھے اور یہ محسوس کیا کہ فرعون کی بیوی میری حاجت و ضرورت محسوس کر رہی ہے تو ذرا خودداری سے کام لیا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ یہاں رہ کر اس بچے کو دودھ پلائیں کیونکہ مجھے اس بچے سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کو اپنی نظروں سے غائب نہیں رکھ سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ میں تو اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکتی کیونکہ میری گود میں خود ایک بچہ ہے جس کو دودھ پلاتی ہوں، میں اسکو کیسے چھوڑوں۔ ہاں اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ بچہ میرے سُپرد کریں میں اپنے گھر رکھ کر اسکو دودھ پلاؤں اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اس بچے کی خبرگیری اور حفاظت میں ذرا کوتاہی نہ کرونگی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اسوقت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ بھی یاد آگیا جسمیں فرمایا کہ چند روز کی جُدائی کے بعد ہم اُن کو تمہارے پاس واپس دیدینگے اسلئے وہ اور اپنی بات پر جم گئیں۔ اہلیہ فرعون نے مجبور ہوکر ان کی بات مان لی اور یہ اُسی روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے گھر آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا نشوونما خاص طریقے پر فرمایا۔

جب موسیٰ علیہ السلام ذرا قوی ہوگئے تو اہلیہ فرعون نے اُن کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ مجھے لاکر دکھلاجاؤ (کہ میں اسکے دیکھنے کیلئے بیچین ہوں) اور اہلیہ فرعون نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ یہ بچہ آج ہمارے گھر میں آرہا ہے تم میں سے کوئی ایسا نہ رہے جو اسکا اکرام نہ کرے اور کوئی ہدیہ اسکو

پیش نہ کرے اور میں خود اس کی نگرانی کروں گی کہ تم لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کیساتھ گھر سے نکلے اُسیوقت سے اُن پر تحفوں اور ہدایا کی بارش ہونے لگی یہانتک کہ اہلیہ فرعون کے پاس پہنچے تو اُسنے اپنے پاس سے خاص تحفے اور ہدیئے الگ پیش کئے۔ اہلیہ فرعون ان کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوئی اور یہ سب تحفے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیدیئے۔ اسکے بعد اہلیہ فرعون نے کہاکہ اب میں ان کو فرعون کے پاس لیجاتی ہوں وہ انکو انعامات اور تحفے دیں گے جب ان کو لیکر فرعون کے پاس پہنچی تو فرعون نے ان کو اپنی گود میں لے لیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا۔ اُسوقت دربار کے لوگوں نے فرعون سے کہاکہ آپنے دیکھ لیاکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک نبی پیدا ہوگا جو آپکے ملک مال کا وارث ہوگا، آپ پر غالب آئیگا اور آپکو پچھاڑ دیگا، یہ وعدہ کس طرح پورا ہورہا ہے۔

فرعون متنبہ ہوا اور اُسیوقت لڑکوں کو قتل کرنے والے سپاہیوں کو بُلالیا تاکہ اسکو ذبح کردیں ابن عباسؓ نے یہاں پہنچکر پھر ابن جبیر کو خطاب کیاکہ یہ (چوتھا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ پھر موت سر پر منڈلانے لگی۔

اہلیہ فرعون نے یہ دیکھ تو کہاکہ آپ تو یہ بچہ مجھے دے چکے ہیں پھر اب یہ کیا معاملہ ہورہا ہے؟ فرعون نے کہاکہ تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکا اپنے عمل سے گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مجھ کو زمین پر پچھاڑ کر مجھ پر غالب آجائیگا۔ اہلیہ فرعون نے کہاکہ آپ ایک بات کو اپنے اور میرے معاملہ کے فیصلہ کے لئے مان لیں جس سے حق بات ظاہر ہوجاوے گی (کہ بچے نے یہ معاملہ بچپن کی بے خبری میں کیا ہے یا دیدہ دانستہ کسی شوخی سے) آپ دو انگارے آگ کے اور دو موتی منگوا لیجئے اور دونوں کو انکے سامنے کردیجئے اگر یہ موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور آگ کے انگاروں سے بچیں تو آپ سمجھ لیں کہ اسکے افعال عقل و شعور سے دیدہ و دانستہ ہیں اور اگر اس نے موتیوں کے بجائے انگارے ہاتھ میں اُٹھالئے تو یہ یقین ہوجائے گا کہ یہ کام کسی عقل و شعور سے نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی عقل والا انسان آگ کو ہاتھ میں نہیں اُٹھا سکتا (فرعون نے اس آزمائش کو مان لیا) دو انگارے اور دو موتی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اُٹھالئے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام موتیوں کیطرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا) فرعون نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اُن کے ہاتھ سے انگارے چھین لئے کہ اُن کا ہاتھ نہ جل جائے (اب تو اہلیہ فرعون کی بات بن گئی) اُسنے کہاکہ آپنے واقعہ کی حقیقت کو دیکھ لیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے پھر یہ موت موسیٰ علیہ السلام سے ٹلادی کیونکہ قدرت خداوندی کو ان سے آگے کام لینا تھا۔

(حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح فرعون کے شاہانہ اعزاز و اکرام اور شاہانہ خرچ پر اپنی والدہ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے یہاں تک کہ جوان ہوگئے)۔

اُن کے شاہی اکرام و اعزاز کو دیکھ کر فرعون کے لوگوں کو بنی اسرائیل پر وہ ظلم و جور اور تذلیل و توہین کرنے کی ہمت نہ رہی جو اس سے پہلے آلِ فرعون کیطرف سے ہمیشہ بنی اسرائیل پر ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام شہر کے کسی گوشہ میں چل رہے تھے تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں جنمیں سے ایک فرعونی ہے اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر امداد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی آدمی کی جسارت پر بہت غصہ آگیا کہ اس نے شاہی دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کو جانتے ہوئے اسرائیلی کو اُن کے سامنے پکڑ رکھا ہے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور لوگوں کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کا تعلق اسرائیلی لوگوں سے صرف رضاعت اور دودھ پینے کی وجہ سے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ یا کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم کرا دیا ہو کہ یہ اپنی دودھ پلانے والی عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اسرائیلی ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر اس فرعونی کے ایک مُکا رسید کیا جس کو وہ برداشت نہ کرسکا اور وہیں مر گیا مگر اتفاق سے وہاں کوئی اور آدمی موسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں لڑنے والوں کے سوا موجود نہیں تھا، فرعونی تو قتل ہوگیا اسرائیلی اپنا آدمی تھا اس سے اسکا اندیشہ نہ تھا کہ یہ مخبری کر دے گا۔

جب یہ فرعونی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ، یعنی یہ کام شیطان کی طرف سے ہوا ہے وہ کھلا دشمن گمراہ کرنے والا ہے (پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی) رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، یعنی اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا (کہ یہ خطا قتلِ فرعونی کی مجھ سے سرزد ہوگئی) مجھے معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا کیونکہ وہ ہی بہت معاف کرنے والا اور بہت رحمت کرنے والا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کے بعد خوف و ہراس کے عالم میں یہ خبریں دریافت کرتے رہے (کہ اسکے قتل پر آلِ فرعون کا ردِ عمل کیا ہوا اور دربار فرعون تک یہ معاملہ پہنچا یا نہیں) معلوم ہوا کہ معاملہ فرعون تک اس عنوان سے پہنچا کہ کسی اسرائیلی نے آلِ فرعون کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اس لئے اسرائیلیوں سے اسکا انتقام لیا جائے۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی ڈھیل کا معاملہ نہ کیا جائے۔ فرعون نے جواب دیا کہ اس کے قاتل کو متعین کر کے مع شہادت کے پیش کرو۔

کیونکہ بادشاہ اگرچہ تمہارا ہی ہے مگر اُس کے لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ بغیر شہادت و ثبوت کے کسی سے قصاص لے لے۔ تم اسکے قاتل کو تلاش کرو اور ثبوت مہیا کرو میں ضرور تمہارا انتقام بصورت قصاص اُس سے لونگا۔ آلِ فرعون کے لوگ یہ سُن کر گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے تھے کہ کہیں اسکے قتل کرنے والے کا سُراغ ملجائے مگر ان کو کوئی سُراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک یہ واقعہ پیش آیا کہ اگلے روز موسیٰ علیہ السلام گھر سے نکلے تو اُسی اسرائیلی کو دیکھا کہ کسی دوسرے فرعونی شخص سے مقاتلہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے پکارا مگر موسیٰ علیہ السلام کل کے واقعہ پر ہی نادم ہو رہے تھے اور اسوقت اسی اسرائیلی کو پھر لڑتے ہوئے دیکھ کر اس پر ناراض ہوئے (کہ خطا اسی کی معلوم ہوتی ہے یہ جھگڑالو آدمی ہے اور لڑتا ہی رہتا ہے) مگر اسکے باوجود موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ فرعونی شخص کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں لیکن اسرائیلی کو بھی بطور تنبیہ کے کہنے لگے تُو نے کل بھی جھگڑا کیا تھا آج پھر لڑ رہا ہے تو ہی ظالم ہے۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ آج بھی اُسی طرح غصے میں ہیں جیسے کل تھے تو اُس کو موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے یہ شبہ ہو گیا کہ یہ آج مجھے ہی قتل کر دیں گے تو فوراً بول اُٹھا کہ اے موسیٰ کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو جیسے کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔

یہ باتیں ہونے کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر فرعونی شخص نے آلِ فرعون کے اُن لوگوں کو جو کل کے قاتل کی تلاش میں تھے جا کر یہ خبر پہنچا دی کہ خود اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ہے کہ تم نے کل ایک آدمی قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر دربار فرعون تک فوراً پہنچائی گئی۔ فرعون نے اپنے سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے بھیجدیئے۔ یہ سپاہی جانتے تھے کہ وہ ہم سے بچکر کہاں جائیں گے۔ اطمینان کے ساتھ شہر کی بڑی سڑک سے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکلے۔ اس طرف ایک شخص کو موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے جو شہر کے کسی بعید حصہ میں رہتا تھا اس کی خبر لگ گئی کہ فرعونی سپاہی موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں بغرض قتل نکل چکے ہیں اس نے کسی گلی کوچے کے چھوٹے راستہ سے آگے پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی۔

یہاں پہنچکر پھر ابن عباسؓ نے ابنِ جُبیر کو خطاب کیا کہ اے ابن جُبیر یہ (پانچواں) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت سر پر آ چکی تھی اللہ نے اُس سے نجات کا سامان کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سُن کر فوراً شہر سے نکل گئے اور مَدْیَن کی طرف رُخ پھیر گیا۔ یہ آج تک شاہی ناز و نعمت میں پلے تھے کبھی محنت و مشقت کا نام نہ آیا تھا مصر سے نکل کھڑے ہوئے مگر راستہ بھی کہیں کا نہ جانتے تھے مگر اپنے رب پر بھروسہ تھا کہ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ، یعنی اُمید ہے کہ میرا رب مجھے راستہ دکھا دیگا۔ جب شہر مَدْیَن کے قریب

پہنچے تو شہر سے باہر ایک کنویں پر لوگوں کا اجتماع دیکھا جو اُس پر اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ اور دیکھا کہ دو عورتیں اپنی بکریوں کو سمیٹے ہوئے الگ کھڑی ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا کہ تم الگ کیوں کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم ان سب لوگوں سے مزاحمت اور مقابلہ کریں اس لئے ہم اس انتظار میں ہیں کہ جب یہ سب لوگ فارغ ہو جائیں تو جو کچھ بچا ہوا پانی ملجائے گا اُس سے ہم اپنا کام نکالیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی شرافت دیکھ کر خود اُن کے لئے کنویں سے پانی نکالنا شروع کر دیا اللہ تعالیٰ نے قوت و طاقت بخشی تھی بڑی جلدی اُن کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ یہ عورتیں اپنی بکریاں لے کر اپنے گھر گئیں، اور موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں چلے گئے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ، یعنی اے میرے پروردگار میں محتاج ہوں اس نعمت کا جو آپ میری طرف بھیجیں (مطلب تھا کہ کھانے کا اور ٹھکانہ کا کوئی انتظام ہو جائے)، یہ لڑکیاں جب روزانہ کے وقت سے پہلے بکریوں کو سیراب کر کے گھر پہنچیں تو اُن کے والد کو تعجب ہوا اور فرمایا آج تو کوئی نئی بات ہے، لڑکیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پانی کھینچنے اور پلانے کا قصہ والد کو سُنا دیا۔ والد نے انہیں سے ایک کو حکم دیا کہ جس شخص نے یہ احسان کیا ہے اسکو یہاں بُلا لاؤ، وہ بُلا لائی، والد نے موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے حالات دریافت کئے اور فرمایا لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ، یعنی اب آپ خوف و ہراس اپنے دل سے نکال دیجئے، آپ ظالموں کے ہاتھ سے نجات پا چکے ہیں ہم نہ فرعون کی سلطنت میں ہیں نہ اسکا ہم پر کچھ حکم چل سکتا ہے۔

اب ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے اپنے والد سے کہا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی ابا جان، ان کو آپ ملازم رکھ لیجئے کیونکہ ملازمت کے لئے بہترین آدمی وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔ والد کو اپنی لڑکی سے یہ بات سُنکر غیرت سی آئی کہ میری لڑکی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ اسلئے اس سے سوال کیا کہ تمھیں اُن کی قوت کا اندازہ کیسے ہوا اور اُن کی امانتداری کس بات سے معلوم کی۔ لڑکی نے عرض کیا کہ اُن کی قوت کا مشاہدہ تو اُن کے کنویں سے پانی کھینچنے کے وقت ہوا کہ سب چرواہوں سے پہلے اُنھوں نے اپنا کام کرایا دوسرا کوئی ان کی برابر نہیں آسکا اور امانت کا حال اس طرح معلوم ہوا کہ جب میں اُن کو بُلانے کے لئے گئی اور اول نظر میں جب انھوں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہوں تو فوراً اپنا سر نیچا کر لیا اور اسوقت تک سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ میں نے ان کو آپکا پیغام نہیں پہنچا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو مگر مجھے اپنے گھر کا راستہ پیچھے سے بتلاتی رہو اور یہ بات صرف وہی مرد کر سکتا ہے جو امانتدار ہو۔ والد کو لڑکی کی اس

دانشمندانہ بات سے مسرت ہوئی اور اس کی تصدیق فرمائی اور خود بھی ان کے بارے میں قوت و امانت کا یقین ہوگیا۔ اُس وقت لڑکیوں کے والد نے (جو اللہ کے رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے) موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو یہ منظور ہے کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کردوں جس کی شرط یہ ہوگی کہ آپ آٹھ سال تک ہمارے یہاں مزدوری کریں، اور اگر آپ دس سال پورے کردیں تو اپنے اختیار سے کردیں بہتر ہوگا مگر ہم یہ پابندی آپ پر عائد نہیں کرتے تاکہ آپ پر زیادہ مشقت نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو منظور فرما لیا جس کی رُو سے موسیٰ علیہ السلام پر صرف آٹھ سال کی خدمت بطور معاہدہ کے لازم ہوگئی باقی دو سال کا وعدہ اختیاری رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے وہ وعدہ بھی پورا کرا کر دس سال پورے کرا دیئے۔

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم مجھے ملا، اُس نے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میعادوں میں سے کونسی میعاد پوری فرمائی؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ اس وقت تک ابن عباسؓ کی یہ حدیث مجھے معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد میں ابن عباسؓ سے ملا اُن سے سوال کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ آٹھ سال کی میعاد پورا کرنا تو موسیٰؑ پر واجب تھا اسمیں کچھ کمی کرنے کا تو احتمال ہی نہیں اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کا اختیاری وعدہ بھی پورا ہی کرنا منظور تھا اس لئے دس سال کی میعاد پوری کی۔ اس کے بعد میں اس نصرانی عالم سے ملا اور اس کو یہ خبر دی تو اُس نے کہا کہ تم نے جس شخص سے یہ بات دریافت کی ہے کیا وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں، میں نے کہا کہ بیشک وہ بہت بڑے عالم اور ہم سب سے افضل ہیں۔

(دس سال کی میعاد خدمت پوری کرنے کے بعد جب) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لیکر شعیب علیہ السلام کے وطن مدین سے رخصت ہوئے، راستہ میں سخت سردی اندھیری رات، راستہ نامعلوم، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اچانک کوہ طور پر آگ دیکھنے پھر وہاں جانے اور حیرت انگیز مناظر کے بعد معجزہ عصا و ید بیضا، اور اسکے ساتھ منصب نبوت و رسالت عطا ہونے کے بعد (جسکا پورا قصہ قرآن میں اوپر گزر چکا ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر ہوئی کہ میں فرعونی دربار کا ایک مفرور ملزم قرار دیا گیا ہوں مجھ سے قبطی کا قصاص لینے کا حکم وہاں سے ہوچکا ہے اب اُس کے پاس دعوت رسالت لیکر جانے کا حکم ہوا ہے، نیز اپنی زبان میں لکنت کا عذر بھی سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض پیش کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کی فرمائش کے مطابق اُنکے بھائی حضرت ہارون کو شریک رسالت بنا کر انکے پاس وحی بھیجدی اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شہر مصر سے باہر استقبال کریں۔ اسکے مطابق موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے۔ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی دونوں بھائی (حسب الحکم) فرعون کو دعوت حق

دینے کے لئے اُس کے دربار میں پہنچے کچھ وقت تک تو اُن کو دربار میں حاضری کا موقع نہیں دیا گیا یہ دونوں دروازے پر ٹھہرے رہے پھر بہت سے پردوں میں گزر کر حاضری کی اجازت ملی اور دونوں نے فرعون سے کہا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ، یعنی ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے قاصد اور پیغامبر ہیں۔ فرعون نے پوچھا فَمَنْ رَّبُّكُمَا (تو بتلاؤ تمہارا رب کون ہے) موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے وہ بات کہی جس کا قرآن نے خود ذکر کر دیا رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی، اس پر فرعون نے پوچھا کہ پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو اور ساتھ ہی قبطی مقتول کا واقعہ ذکر کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجرم ٹھہرایا (اور اپنے گھر میں اُن کی پرورش پانیکا احسان جتلایا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں باتوں کا وہ جواب دیا جو قرآن میں مذکور ہے (یعنی مقتول کے معاملہ میں تو اپنی خطا اور غلطی کا اعتراف کرکے ناواقفیت کا عذر ظاہر کیا اور گھر میں پرورش پر احسان جتلانیکا جواب یہ دیا کہ تم نے سارے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اُن پر طرح طرح کے ظلم کر رہے ہو اُسی کے نتیجہ میں بہ نیرنگ تقدیر میں تمہارے گھر میں پہنچا دیا گیا اور جو کچھ اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا اس میں تمہارا کوئی احسان نہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خطاب کرکے پوچھا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر دو۔ فرعون نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ اگر تمھارے پاس رسولِ رب ہونے کی کوئی علامت ہے تو دکھلاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا زمین پر ڈالدی تو وہ عظیم الشان اژدہا کی شکل میں منہ کھولے ہوئے فرعون کی طرف لپکی۔ فرعون خوفزدہ ہو کر اپنے تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے پناہ مانگی کہ اس کو روک لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسکو پکڑ لیا۔ پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ چمکنے لگا یہ دوسرا معجزہ فرعون کے سامنے آیا پھر دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

فرعون نے ہیبت زدہ ہو کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا (کہ تم دیکھ رہے ہو یہ کیا ماجرا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے) درباریوں نے متفقہ طور پر کہا کہ (کچھ فکر کی بات نہیں) یہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کے ذریعہ تم کو تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمھارے بہترین دین و مذہب کو (جو اُن کی نظر میں فرعون کی پرستش کرنا تھا) یہ مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں (اور کوئی فکر نہ کریں) کیونکہ آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، آپ اُن کو بُلا لیجئے وہ اپنے جادو سے ان کے جادو پر غالب آجائیں گے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے سب شہروں میں حکم دیدیا کہ جتنے آدمی جادوگری میں ماہر ہوں وہ سب دربار میں حاضر کر دیئے جاویں، ملک بھر کے جادوگر جمع ہو گئے تو انھوں نے فرعون سے پوچھا کہ جس جادوگر سے آپ ہمارا مقابلہ کرانا چاہتے ہیں وہ کیا عمل کرتا ہے، اُسنے

بتلایا کہ وہ اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، جادوگروں نے بڑی بے فکری سے کہا کہ یہ تو کوئی چیز نہیں، لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دینے کے جادو کا تو جو کمال ہمیں حاصل ہے اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، مگر یہ طے کردیجئے کہ اگر ہم اس پر غالب آگئے تو ہمیں کیا ملے گا۔

فرعون نے کہا کہ تم غالب آگئے تو تم میرے خاندان کا جزء اور مقربین خاص میں داخل ہوجاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے۔

اب جادوگروں نے مقابلہ کا وقت اور جگہ موسیٰ علیہ السلام سے طے کر کے اپنی عید کے دن چاشت کا وقت مقرر کر دیا۔ ابن جُبیرؓ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ان کا یوم الزینہ (یعنی عید کا دن) جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اُس کے جادوگروں پر فتح عطا فرمائی وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ جب سب لوگ ایک وسیع میدان میں مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے تو فرعون کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ، یعنی ہمیں یہاں ضرور رہنا چاہیئے تاکہ یہ ساحر یعنی موسیٰ و ہارون اگر غالب آجائیں تو ہم بھی ان پر ایمان لے آئیں، اُن کی یہ گفتگو ان حضرات کے ساتھ استہزاء و مذاق کے طور پر تھی (اُن کا یقین تھا کہ یہ ہمارے جادوگروں پر غالب نہیں آسکیں گے)۔

میدانِ مقابلہ مکمل آراستہ ہوگیا تو جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا کہ پہلے آپ کچھ ڈالیں (یعنی اپنا سحر دکھلائیں) یا ہم پہلے ڈال کر ابتداء کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ تم ہی پہل کرو، اپنا جادو دکھلاؤ۔ ان لوگوں نے اپنی لاٹھیاں اور کچھ رسیاں زمین پر یہ کہتے ہوئے ڈالدیں بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ، یعنی بطفیل فرعون ہم ہی غالب آئیں گے (یہ لاٹھیاں اور رسیاں دیکھنے میں سانپ بن کر چلنے لگیں) یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام پر ایک خوف طاری ہوا (فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى)

یہ خوف طبعی بھی ہوسکتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے، انبیاء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خوف اس بات کا ہو کہ اب اسلام کی دعوت جس کو میں لے کر آیا ہوں اس میں رکاوٹ پیدا ہوجائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ اپنی عصا ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالی تو وہ ایک بڑا اژدہا بن گیا جس کا منہ کھلا ہوا تھا اس اژدہا نے اُن تمام سانپوں کو نگل لیا جو جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے بنائے تھے۔

فرعونی جادوگر جادو کے فن کے ماہر تھے یہ ماجرا دیکھ کر اُن کو یقین ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی عصا کا یہ اژدہا جادو سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے جادوگروں نے اُسی وقت

اعلان کر دیا کہ ہم اللہ پر اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پچھلے خیالات و عقائد سے توبہ کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اسکے ساتھیوں کی کمر توڑ دی اور اُنھوں نے جو جال پھیلایا تھا وہ سب باطل ہو گیا (فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ) فرعون اور اسکے ساتھی مغلوب ہو گئے اور ذلت و رُسوائی کیساتھ اس میدان سے پسپا ہوئے۔

جس وقت یہ مقابلہ ہو رہا تھا فرعون کی بیوی آسیہ پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر اللہ تعالےٰ سے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کے لئے دُعا مانگ رہی تھی اور آلِ فرعون کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ فرعون کی وجہ سے پریشان حال ہیں اُسکے لئے دُعا مانگ رہی ہیں حالانکہ اُن کا غم و فکر سارا موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھا (اور اُنھیں کے غالب آنے کی دُعا مانگ رہی تھیں) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوئی معجزہ دکھاتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر حجت تمام ہو جاتی تو اُسی وقت وعدہ کر لیتا تھا کہ اب میں بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجدوں گا مگر جب موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے وہ عذاب کا خطرہ ٹل جاتا تو اپنے وعدہ سے پھر جاتا تھا) اور یہ کہدیتا تھا کہ کیا آپکا رب کوئی اور بھی نشانی دکھا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا بالآخر اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون پر طوفان اور ٹڈی دَل اور کپڑوں میں جوئیں اور برتنوں اور کھانے میں مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب مسلط کر دیئے، جن کو قرآن میں آیات مفصلات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرعون کا حال یہ تھا کہ جب اُن میں سے کوئی عذاب آتا اور اُس سے عاجز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتا کہ کسی طرح یہ عذاب ہٹا دیجئے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے پھر جب عذاب ٹل جاتا تو پھر بدعہدی کرتا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیدیا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے نکل جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لیکر رات کے وقت شہر سے نکل گئے فرعون نے جب صبح کو دیکھا کہ یہ سب لوگ چلے گئے تو اپنی فوج تمام اطراف سے جمع کر کے اُنکے تعاقب میں چھوڑ دی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے اُس دریا کو جو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے راستہ میں تھا یہ حکم دیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تجھ پر لاٹھی ماریں تو دریا میں بارہ راستے بن جانے چاہئیں جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ گزر سکیں۔ اور جب یہ گزر جائیں تو اُن کے تعاقب میں آنے والوں پر یہ دریا کے بارہ حصے پھر مل جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے قریب پہنچے تو یہ یاد نہ رہا کہ لاٹھی مارنے سے دریا میں راستے پیدا ہوں گے اور اُن کی قوم نے اُن سے فریاد کی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ یعنی ہم تو پکڑے گئے (کیونکہ پیچھے سے فرعونی فوجوں کو آتا دیکھ رہے تھے اور آگے یہ دریا حائل تھا) اُسوقت

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ یاد آیا کہ دریا پر لاٹھی مارنے سے اسمیں رستے پیدا ہو جائیں گے اور فوراً دریا پر اپنی لاٹھی ماری یہ وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کے پچھلے حصّوں سے فرعونی افواج کے اگلے حصّے تقریباً مل چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے دریا کے الگ الگ ٹکڑے ہو کر وعدہ ربّانی کے مُطابق بارہ راستے بن گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے۔ فرعونی افواج جو اُن کے تعاقب میں تھی اُنھوں نے دریا میں راستے دیکھ کر اُن کے تعاقب میں اپنے گھوڑے اور پیادے ڈالدیئے تو دریا کے یہ مختلف ٹکڑے بامرِ ربّانی پھر آپس میں مل گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو اُن کے اصحاب نے کہا کہ ہمیں یہ خطرہ ہے کہ فرعون اُنکے ساتھ غرق نہ ہوا ہو اور اُسنے اپنے آپ کو بچالیا ہو تو موسیٰ علیہ السلام نے دُعا فرمائی کہ فرعون کی ہلاکت ہم پر ظاہر کردے قدرت حق نے فرعون کی مُردہ لاش کو دریا سے باہر پھینکدیا اور سبنے اسکی ہلاکت کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا

اس کے بعد یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آگے چلے تو راستہ میں ان کا گزر ایک قوم پر ہوا جو اپنے بنائے ہوئے بُتوں کی عبادت اور پرستش کر رہے تھے، تو یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے (یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰـھًا كَمَا لَھُمْ اٰلِـھَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْـهَلُوْنَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ) یعنی اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے انھوں نے بہت سے معبود بنا رکھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو کہ ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جو بُتوں کی عبادت میں مشغول ہیں انکی عبادت برباد ہونیوالی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) کہ تم اپنے پروردگار کے اتنے معجزات اور اپنے اوپر انعامات دیکھ چکے ہو پھر بھی تمہارے یہ جاہلانہ خیالات نہیں بدلے۔ یہ کہکر حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنے اُن ساتھیوں کے یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام پر جاکر اُن کو ٹھہرادیا اور فرمایا تم سب یہاں ٹھہرو، میں اپنے رب کے پاس جاتا ہوں، تیس دن کے بعد واپس آجاؤنگا اور میرے پیچھے ہارون علیہ السلام میرے نائب وخلیفہ رہیں گے ہر کام میں اُن کی اطاعت کرنا۔

موسیٰ علیہ السلام ان سے رُخصت ہو کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور (اشارۂ ربّانی سے) تیس دن رات کا مُسلسل روزہ رکھا تاکہ اسکے بعد کلامِ ربّانی سے مستفید ہوسکیں مگر تیس دن رات کے مُسلسل روزہ سے جو ایک قسم کی بُو روزہ دار کے منھ میں ہوجاتی ہے یہ فکر ہوئی کہ اس بُو کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے شرفِ ہمکلامی نامناسب ہے تو پہاڑی گھاس کے ذریعہ مسواک کر کے منھ صاف کرلیا۔ جب بارگاہِ حق میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کیطرف سے ارشاد ہوا کہ تم نے افطار کیوں کرلیا (اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا پیا نہیں بلکہ صرف منھ صاف کرلینے کو بغیراذ

امتیاز کی بنا پر افطار کرنے سے تعبیر فرمایا) موسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو سمجھ کر عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ سے ہمکلام ہونے کے لئے منھ کی بُو دُور کر کے صاف کر لوں۔ حکم ہوا کہ موسیٰ کیا تمھیں خبر نہیں کہ روزہ دار کے منھ کی بُو ہمارے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے، اب آپ لوٹ جائیے اور دس دن مزید روزے رکھئے پھر ہمارے پاس آئیے **موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔**

ادھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے دیکھا کہ مقررہ مدت تیس روز گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئے تو اُن کو یہ بات ناگوار ہوئی، ادھر حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہونے کے بعد اپنی قوم میں ایک خطبہ دیا کہ قوم فرعون کے لوگوں کی بہت سی چیزیں جو تم نے عاریۃً مانگ رکھی تھی یا اُنھوں نے تمھارے پاس ودیعت (امانت) رکھوا رکھی تھی وہ سب تم اپنے ساتھ لے آئے ہو اگرچہ تمھاری بھی بہت سی چیزیں قوم فرعون کے پاس عاریت اور ودیعت کی تھیں اور آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اُن کی یہ چیزیں ہماری چیزوں کے معاوضہ میں ہم نے رکھ لی ہیں مگر میں اس کو حلال نہیں سمجھتا کہ اُن کی عاریت اور ودیعت کا سامان تم اپنے استعمال میں لاؤ اور ہم اس کو واپس بھی نہیں کر سکتے اس لئے ایک گڑھا کھدوا کر سب کو حکم دیا کہ یہ چیزیں خواہ زیورات ہوں یا دوسری استعمالی اشیاء سب اس گڑھے میں ڈالدو (ان لوگوں نے اسکی تعمیل کی) ہارون علیہ السلام نے اس سارے سامان کے اوپر آگ جلوا دی جس سے یہ سب سامان جل گیا اور فرمایا کہ اب یہ نہ ہمارا رہا نہ اُن کا۔

اُن کے ساتھ ایک شخص سامری، ایک ایسی قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا مگر جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہو لیا، اس کو یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ اس نے (جبرئیل علیہ السلام) کا ایک اثر دیکھا (یعنی جہاں اُن کا قدم پڑتا ہے اُسمیں زندگی اور نمو پیدا ہو جاتا ہے) اس نے اُس جگہ سے ایک مٹھی مٹی کو اُٹھا لیا، اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے آرہا تھا کہ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ہارون علیہ السلام نے خیال کیا کہ اسکی مٹھی میں کوئی فرعونی زیور وغیرہ ہے اس سے کہا کہ جس طرح سب نے اس گڑھے میں ڈالا ہے تم بھی ڈالدو، اس نے کہا یہ تو اُس رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی ہے جس نے تمھیں دریا سے پار کرایا ہے اور میں اس کو کسی طرح نہ ڈالوں گا بجز اسکے کہ آپ یہ دعا کریں کہ میں جس مقصد کے لئے ڈالوں وہ مقصد پُورا ہو جائے، ہارون علیہ السلام نے دُعا کا وعدہ کر لیا اُسنے وہ مٹھی مٹی کی اس گڑھے میں ڈالدی اور حسب وعدہ ہارون علیہ السلام نے دُعا کی کہ یا اللہ جو کچھ سامری چاہتا ہے وہ پُورا کر دیجئے، جب وہ دُعا کر چکے تو سامری نے

کہاکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ سونا، چاندی، لوہا، بیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا ہے ایک گائے کا بچھڑا بن جائے۔ ہارون علیہ السلام دُعا کر چکے تھے اور وہ قبول ہو چکی تھی جو کچھ زیورات اور تانبا بیتل لوہا اسمیں ڈالا گیا تھا سب کا ایک بچھڑا بن گیا جسمیں کوئی روح تو نہ تھی مگر گائے کی طرح آواز نکلتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ واللہ وہ کوئی زندہ آواز نہیں تھی بلکہ ہوا اُسکے پچھلے حصہ سے داخل ہو کر منہ سے نکلتی تھی اُس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

یہ عجیب و غریب قصہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فرقہ نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا یہی تمہارا خدا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول کر دوسری طرف چلے گئے۔ ایک فرقہ نے یہ کہا کہ ہم سامری کی اس بات کی اُسوقت تک تکذیب نہیں کرسکتے جب تک موسیٰ علیہ السلام حقیقت حال بتلائیں اگر واقع میں یہی ہمارا خدا ہے تو ہم اسکی مخالفت کرکے گنا ہگار نہیں ہونگے اور یہ خدا نہیں تو ہم موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پیروی کریں گے۔

ایک اور فرقہ نے کہا کہ یہ سب شیطانی دھوکہ ہے یہ ہمارا رب نہیں ہوسکتا نہ ہم اس پر ایمان لاسکتے ہیں نہ اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ ایک اور فرقہ کے دل میں سامری کی بات اُتر گئی اور اُس نے سامری کی تصدیق کرکے اسکو اپنا خدا مان لیا۔

ہارون علیہ السلام نے یہ فسادِ عظیم دیکھا تو فرمایا یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ، یعنی اے میری قوم تم فتنہ میں پڑ گئے ہو بلاشبہ تمہارا رب اور خدا تو رحمٰن ہے تم میرا اتباع کرو اور میرا حکم مانو۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ بتلایئے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو کیا ہوا کہ ہم سے تیس دن کا وعدہ کرکے گئے تھے اور وعدہ خلافی کی یہاں تک کہ اب چالیس دن پورے ہو رہے ہیں۔ اُن کے کچھ بے وقوفوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھول گئے۔ اُس کی تلاش میں پھرتے ہونگے۔

اس طرف جب چالیس روزے پورے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس فتنہ کی خبر دی جسمیں اُن کی قوم مبتلا ہو گئی تھی فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا، موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بڑے غصے میں اور افسوس کی حالت میں واپس آئے اور آکر وہ باتیں فرمائیں جو قرآن میں تم نے پڑھی ہیں۔ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اس غصے میں اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے اور الواحِ تورات جو کہ کوہ طور سے ساتھ لائے تھے ہاتھ میں سے رکھدیں پھر غصہ فرو ہونیکے بعد بھائی کا عذر صحیح معلوم کرکے اسکو قبول کیا اور اُن کے لئے اللہ سے استغفار کیا، پھر سامری کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی، اُس نے جواب دیا قَبَضْتُ

قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ، یعنی میں نے رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھائی تھی اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ جس چیز پر ڈالی جائے گی اُسمیں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے، مگر میں نے تم لوگوں سے اس بات کو چھپائے رکھا فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ، یعنی میں نے اس مٹی کو (زیورات وغیرہ کے ڈھیر پر ڈالدیا) میرے نفس نے میرے لئے یہ کام پسندیدہ شکل میں دکھلایا۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو فرمایا کہ جا، اب تیری سزا یہ ہے کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ مجھے کوئی مس نہ کرے (ورنہ وہ بھی عذاب میں گرفتار ہو جائیگا) اور تیرے لئے ایک میعاد مقرر ہے جس کے خلاف نہیں ہوگا کہ زندگی میں تو یہ عذاب چکھتا رہے) اور دیکھ اپنے اُس معبود کو جس کی تو نے پرستش کی ہے ہم اس کو آگ میں جلائینگے پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہادیں گے، اگر یہ خدا ہوتا تو ہم کو اس عمل پر قدرت نہ ہوتی۔

اس وقت بنی اسرائیل کو یقین آگیا کہ ہم فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور سب کو اُس جماعت پر غبطہ اور رشک ہونے لگا، جسکی رائے حضرت ہارون کے مطابق تھی (یعنی یہ ہمارا خدا نہیں ہو سکتا) بنی اسرائیل کو اپنے اس گناہِ عظیم پر تنبہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے دُعا کیجئے کہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھولدے جس سے ہمارے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کام کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے صلحاء نیک لوگوں کا انتخاب کیا جو پوری قوم میں نیکی اور صلاح میں ممتاز تھے اور جو اُن کے علم میں گوسالہ پرستی سے بھی دُور رہے تھے اس انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لیا۔ ان ستر منتخب صلحاء بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر کوہِ طور کی طرف چلے تاکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں عرض کریں موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو زمین میں زلزلہ آیا جس سے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی شرمندگی اس وفد کے سامنے ہوئی اور قوم کے سامنے بھی۔ اس لئے عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا، یعنی اے میرے پروردگار اگر آپ ان کو ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو اس وفد میں آنے سے پہلے ہلاک کر دیتے اور مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے، کیا آپ ہم سب کو اس لئے ہلاک کرتے ہیں کہ ہم میں کچھ بیوقوفوں نے گناہ کیا ہے۔ اور دراصل وجہ اس زلزلہ کی یہ تھی کہ اس وفد میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق و تفتیش کے باوجود کچھ لوگ اُنہیں سے شامل ہو گئے تھے جو پہلے گوسالہ پرستی کر چکے تھے اور اُن کے دلوں میں گوسالہ کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعاء و فریاد کے جواب میں ارشاد ہوا وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری رحمت تو سب کو شامل ہے اور میں عنقریب لکھونگا اپنی رحمت کا پروانہ) اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اتباع کرتے ہیں اُس رسولِ اُمّی کا جسکا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

یہ سُن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار، میں نے آپ سے اپنی قوم کی توبہ کے بارے میں عرض کیا تھا، آپ نے جواب میں رحمت کا عطا فرمانا میری قوم کے علاوہ دوسری قوم کے متعلق ارشاد فرمایا تو پھر آپ نے میری پیدائش کو مؤخر کیوں نہ کردیا کہ مجھے بھی اُسی نبی اُمّی کی اُمتِ مرحومہ کے اندر پیدا فرما دیتے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا ایک طریقہ ارشاد ہوا کہ ان کی توبہ قبول ہونے کی صورت یہ ہے کہ انمیں سے ہر شخص اپنے متعلقین میں سے باپ یا بیٹے جس سے بھی ملے اسکو تلوار سے قتل کردے اُسی جگہ میں جہاں یہ گوسالہ پرستی کا گناہ کیا تھا۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی جن کا حال موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا اور انکو بے قصور صالح سمجھ کر ساتھ لیا تھا مگر درحقیقت اُن کے دل میں گوسالہ پرستی کا جذبہ ابتک تھا وہ بھی اپنے دل میں نادم ہو کر تائب ہو گئے اور اُنھوں نے اُس شدید حکم پر عمل کیا جو اُن کی توبہ قبول کرنے کے لئے بطور کفارہ نافذ کیا تھا (یعنی اپنے عزیز و اقارب کا قتل) اور جب اُنھوں نے یہ عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے قاتل و مقتول دونوں کی خطا معاف فرمادی اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی الواح جن کو غصہ میں ہاتھ سے رکھ دیا تھا اُٹھا کر اپنی قوم کو لے کر ارضِ مقدسہ (شام) کی طرف چل دیئے، وہاں ایک ایسے شہر پر پہنچے جس پر جبارین کا قبضہ تھا جن کی شکل و صورت اور قد و قامت بھی ہیبت ناک تھی اُن کے ظلم و جور اور قوت و شوکت کے عجیب غریب قصے ان سے کہے گئے (موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر بنی اسرائیل پر ان جبارین کے حالات سنکر رُعب چھا گیا اور) کہنے لگے اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑے جبار ظالم لوگ ہیں جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک داخل نہیں ہونگے جب تک یہ جبارین وہاں موجود ہیں، ہاں وہ یہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم اُس شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ ، اس روایت کے راویوں میں جو یزید بن ہارون ہے اُس سے پُوچھا گیا کہ کیا ابن عباسؓ نے اس آیت کی قراءت اسی طرح کی ہے ، یزید بن ہارون نے کہا کہ ہاں ابن عباسؓ کی قراءت یوں ہی ہے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ سے مُراد قوم جبارین کے دو آدمی ہیں جو اس شہر سے آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے ، اُنھوں نے بنی اسرائیل پر اپنی قوم کا رعب طاری دیکھ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے حالات سے خوب واقف ہیں تم اُن کے ڈیل ڈول اور اُن کی جسامت اور اُن کی بڑی تعداد سے ڈر رہے ہو حقیقت یہ ہے کہ اُن میں دل (کی قوت) بالکل نہیں اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تم ذرا شہر کے دروازے تک چلے چلو تو دیکھ لینا کہ (وہ ہتھیار ڈالدیں گے) اور تم ہی اُن پر غالب آؤ گے ۔

اور بعض لوگوں نے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ دو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم بنی اسرائیل کے تھے ۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ، یعنی بنی اسرائیل نے ان دونوں آدمیوں کی نصیحت سُننے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب اس بیہودگی کے ساتھ دیا کہ اے موسیٰ ! ہم تو اس شہر میں اُسوقت تک ہرگز نہ جائیں گے جبتک جبارین وہاں موجود ہیں اگر آپ کو مقابلہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ اور آپکا رب جا کر ان سے لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل پر حق تعالیٰ کے بیشمار انعامات کے ساتھ ہر قدم پر اُن کی سرکشی اور بیہودگی کا مشاہدہ کرتے آرہے تھے مگر اسوقت تک صبر و تحمل سے کام لیتے رہے ، کبھی اُن کے لئے بد دُعا نہیں کی اسوقت ان کے اس بیہودہ جواب سے وہ بہت دل شکستہ اور غمگین ہوگئے ، اور اُن کے لئے بد دُعا کی ، اُن کے حق میں فاسقین کے الفاظ استعمال فرمائے ۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی اور اُن کو اللہ تعالیٰ نے بھی فاسقین کا نام دیدیا اور اس زمین مقدس سے ان لوگوں کو چالیس سال کے لئے محروم کر دیا اور اس کُھلے میدان میں اُن کو ایسا قید کر دیا کہ صبح سے شام تک چلتے رہتے تھے کہیں قرار نہ تھا ۔ مگر چونکہ اللہ کے رسُول حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کے ساتھ تھے اُن کی برکت اور طفیل سے اس قوم فاسقین پر اس سزا کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں برستی رہیں کہ اس میدان تیہ میں یہ جس طرف چلتے تھے بادل ان کے سروں پر سایہ کر دیتا تھا ، اُن کے کھانے کیلئے مَنّ و سلویٰ نازل ہوتے تھے ، اُن کے کپڑے معجزانہ انداز سے نہ میلے ہوتے تھے نہ پھٹتے تھے ۔ اور ان کو ایک مربع پتھر عطا فرما دیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیدیا تھا کہ جب اُن کو پانی کی ضرورت ہو تو اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو تو اسمیں سے بارہ چشمے جاری ہو جاتے تھے ، پتھر کی ہر جانب سے

تین چشمے بہنے لگتے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں یہ چشمے متعین کر کے تقسیم کر دیئے گئے تھے تاکہ باہم جھگڑا نہ پیدا ہو اور جب بھی یہ لوگ کسی مقام سے سفر کرتے اور پھر کہیں جا کر منزل کرتے تو اس پتھر کو وہیں موجود پاتے تھے (قرطبی)

حضرت ابن عباسؓ نے اس حدیث کو مرفوع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے اور میرے نزدیک یہ درست ہے کیونکہ حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کو یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سُنا تو اس بات کو منکر اور غلط قرار دیا جو اس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قبطی کو قتل کیا تھا اور اسکا سُراغ قوم فرعون کو نہیں مل رہا تھا تو اُس کی مخبری اُس دوسرے فرعونی شخص نے کی جس سے دوسرے روز یہ اسرائیلی لڑ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس فرعونی کو تو کل کے واقعہ قتل کا علم نہیں تھا وہ اسکی مخبری کیسے کر سکتا تھا اس کی خبر تو صرف اسی لڑنے والے اسرائیلی کو معلوم تھی۔

جب حضرت معاویہؓ نے انکی حدیث کے اس واقعہ کا انکار کیا تو ابن عباسؓ کو غصہ آیا، اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ پکڑ کر سعد بن مالک زہریؓ کے پاس لے گئے اور اُن سے کہا کہ اے ابو اسحاق کیا تمھیں یاد ہے جب ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتیل موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث بیان فرمائی، اس راز کا افشار کرنے والا اور فرعون کے پاس مخبری کرنے والا اسرائیلی تھا یا فرعونی۔ سعد بن مالک نے فرمایا کہ فرعونی تھا کیونکہ اُسنے اسرائیلی سے یہ سُن لیا تھا کہ کل کا واقعہ قتل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا تھا اسنے اسکی شہادت فرعون کے پاس دے دی، امام نسائیؒ نے یہ پُوری طویل حدیث اپنی کتاب سُنن کبریٰ کی کتاب التفسیر میں نقل فرمائی ہے۔

اور اس پُوری حدیث کو ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسی یزید بن ہارون کی سند سے نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے جس کو انھوں نے کعب بن احبار کی اُن اسرائیلی روایات سے لیا ہے جن کے نقل کرنے اور بیان کرنے کو جائز رکھا گیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کلام میں مرفوع حدیث کے جملے بھی شامل ہیں۔ امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں اس پُوری حدیث اور اُس پر مذکور الصدر تحقیق و تصدیق لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوالحجاج مزی بھی ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی طرح اس روایت کو موقوف یعنی ابن عباسؓ کا کلام قرار دیتے تھے۔ انتہیٰ (تفسیر ابن کثیر از ص۱۴۸ تا ص۱۵۳ جلد ۳)

مذکور الصدر قصہ موسیٰ علیہ السلام سے حاصل شدہ نتائج و عبر اور فوائد مہمہ

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے کہ اکثر سورتوں میں اسکا کچھ نہ کچھ ذکر آ ہی جاتا ہے

وجہ یہ ہے کہ یہ قصہ ہزاروں عبرتوں اور حکمتوں پر اور خدا وند سبحانہٗ وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے عجیب مظاہر پر مشتمل ہے جس سے انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسمیں علمی اور اخلاقی ہدایتیں بھی بیشمار ہیں چونکہ اس جگہ یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اسکے ذیل میں آئی ہوئی عبرتوں، نصیحتوں اور ہدایتوں کا کچھ حصہ بھی لکھدیا جائے۔

فرعون کی احمقانہ تدبیر اور اُس پر قدرتِ حق کا حیرت انگیز ردّ عمل فرعون کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں کوئی لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا تو اسرائیلی لڑکوں کی پیدائش بند کرنے کے لئے قتلِ عام کا حکم دیدیا۔ پھر اپنی ملکی اور ذاتی مصلحت سے ایک سال کے لڑکوں کو باقی رکھنے اور دوسرے سال کے لڑکوں کے قتل کرنے کا فیصلہ نافذ کردیا اللہ تعالیٰ کو قدرت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اُس سال میں پیدا کردیتے جو سال بچوں کو باقی چھوڑنے کا تھا مگر قدرت کو منظور یہ ہوا کہ اس احمق کی اس ظالمانہ تدبیر کو پوری طرح اس پر اُلٹ دیا جائے اور اسکو خوب بیوقوف بنایا جائے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا فرمایا جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اور اپنی حکمتِ بالغہ سے صورت ایسی پیدا کردی کہ موسیٰ علیہ السلام خود اس جبار ظالم کے گھر میں پرورش پائیں، فرعون اور اُس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شوق و رغبت سے اپنے گھر میں پالا، سارے شہر کے اسرائیلی لڑکے موسیٰ کے شبہ میں قتل ہو رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام خود فرعون کے گھر میں آرام و آسائش اور عزت و اکرام کے ساتھ اُن کے خرچ پر پرورش پا رہے تھے ؏

در بہ بند و دشمن اندر خانہ بُود ٭ حیلۂ فرعون زیں افسانہ بُود

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر معجزانہ انعام اور فرعونی تدبیر کا ایک اور انتقام حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام بچوں کی طرح کسی انّا کا دودھ قبول کرلیتے تو اُن کی پرورش اپنے دشمن فرعون کے گھر پھر بھی آرام کے ساتھ ہوتی مگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اُن کی جُدائی سے پریشان رہتیں اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی کافرعورت کا دودھ ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کافرعورت کے دودھ سے بھی بچالیا اور اُن کی والدہ کو بھی جُدائی کی پریشانی سے نجات دی اور نجات بھی اس طرح کہ فرعون کے گھر والے ان کے ممنونِ احسان ہوئے ان پر ہدایا اور تحفوں کی بارش ہوئی اور اپنے ہی محبوب بچے کو دودھ پلانے پر فرعونی دربار سے معاوضہ بھی ملا اور عام ملازموں کی طرح فرعون کے گھر میں بھی رہنا نہ پڑا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

صنعت کاروں اور تاجروں وغیرہ کیلئے ایک بشارت ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو صنعت کار اپنی صنعت و حرفت میں نیت نیک ثواب کی رکھے اُس کی مثال

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جیسی ہوجاتی ہے کہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلا جائیں اور اسکا دوسروں سے معاوضہ لیں (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ کوئی معمار مسجد، خانقاہ، مدرسہ یا کوئی رفاہِ عام کا ادارہ تعمیر کرتا ہے اگر اُس کی نیت صرف اپنی مزدوری کرنے اور پیسے کمانے کی ہے تو اس کو صرف وہی ملے گا، اور اگر اُس نے نیت یہ بھی کرلی کہ یہ تعمیرات نیک کاموں میں آئیں گی اُن سے اہلِ دین کو نفع پہنچے گا اس لئے دوسری قسم کی تعمیرات پر اُن کو ترجیح دی تو اسکو اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کی طرح مزدوری بھی ملے گی اور اپنا دینی فائدہ بھی۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ایک محبوبیت کی شان عطا ہوتی ہے کہ ہر دیکھنے والا اُن سے محبت کرتا ہے

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ میں اسطرف اشارہ فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو ایک خاص شان محبوبیت کی عطا فرما دیتے ہیں جن کو دیکھ کر اپنا پرایا، دوست دشمن سب محبت کرنے لگتے ہیں انبیاء علیہم السلام کا تو بڑا مقام ہے بہت سے اولیاء اللہ میں بھی اس محبوبیت کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔

فرعونی کافر شخص کا قتل جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ ہوگیا اسکو خطا کس بنا پر قرار دیا گیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی مسلمان سے ایک فرعونی کافر کو لڑتا ہوا دیکھ کر فرعونی کو مُکّا مارا جس سے وہ مرگیا اُس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی عملِ شیطان فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس خطا کی معافی طلب کی وہ معاف بھی کردی گئی۔

مگر یہاں ایک فقہی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرعونی شخص ایک کافر حربی تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معاہدہ صلح بھی نہ تھا نہ اُس کو اہلِ ذمہ کافروں کی فہرست میں داخل کیا جاسکتا ہے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے، یہ تو حربی کافر تھا جس کا حکم اسلامی شریعت میں یہ ہے کہ وہ مباح الدم ہے اس کا قتل کوئی گناہ نہیں، پھر یہاں اس کو عملِ شیطان اور خطا کس بنا پر قرار دیا گیا۔

عام کتبِ تفسیر میں کسی نے اس سوال سے تعرض نہیں کیا۔ احقر جب سیدی حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے حکم سے احکام القرآن کی تصنیف میں مشغول تھا اور اسمیں یہ واقعہ زیرِ تحریر آیا تو حضرت نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ اگرچہ اس فرعونی شخص سے براہِ راست کوئی صریح معاہدہ صلح یا ذمہ کا نہیں تھا مگر چونکہ اُسوقت نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت تھی نہ اس فرعونی کی، بلکہ دونوں حکومتِ فرعون کے شہری تھے اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھے یہ ایک قسم کا عملی معاہدہ تھا، فرعونی کے قتل میں اس عملی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی اسلئے اسکو خطا قرار دیا گیا اور یہ خطا چونکہ قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوگئی اسلئے موسیٰ علیہ السلام کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ اسی بنا پر مشترک ہندوستان میں جبکہ مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی حکومت میں رہتے تھے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہ رکھتے تھے کہ وہ کسی ہندو کی جان و مال پر ظلم کرے۔

ضعیفوں کی امداد اور خدمت خلق دین و دنیا کے لئے نافع اور مفید ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر مدین سے باہر کنویں پر دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے ضعف کی بنا پر اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتی تھیں، یہ عورتیں بالکل اجنبی، اور موسیٰ علیہ السلام ایک مسافر تھے مگر ضعیفوں کی امداد و خدمت مقتضائے شرافت اور اللہ کے نزدیک محبوب عمل تھا اسلئے اُن کے واسطے محنت اُٹھائی، اور اُنکی بکریوں کو پانی پلادیا اسکا اجر و ثواب تو اللہ کے پاس بڑا ہے۔ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُنکے اسی عمل کو مسافرانہ بےکسی اور بے سروسامانی کا ایسا علاج بنادیا جو اُن کی اگلی زندگی اُن کی شان کے مطابق سنوارنے کا ذریعہ بن گیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور اُن کی دامادی کا شرف حاصل ہوا، جوان ہونے کے بعد جو کام اُن کی والدہ کو کرنا تھا اللہ تعالیٰ نے غربت کے عالم میں اپنے ایک نبی کے ہاتھ سے انجام دلوایا۔

دو پیغمبروں میں اجیر اور آجر کا معاملہ اور اس کی حکمتیں اور فوائد عجیبہ

موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر مہمان ہوکر فرعونی سپاہیوں کے خوف سے مطمئن ہوئے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے صاحبزادی کے مشورہ پر اُن کو اپنے یہاں اجیر رکھنے کا خیال ظاہر فرمایا اسمیں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور خلق اللہ کے لئے اہم ہدایتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول تھے ایک مسافر غریب الوطن کی اتنی امداد اُن سے کچھ مستبعد نہ تھی کہ کچھ عرصہ اپنے یہاں بلا کسی معاوضہ خدمت کے مہمان رکھ لیتے مگر غالباً اُنھوں نے پیغمبرانہ فراست سے موسیٰ علیہ السلام کا عالی حوصلہ ہونا معلوم کرکے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ دیر تک مہمانی قبول نہ کریں گے، اور کسی دوسری جگہ چلے گئے تو اُن کو تکلیف ہوگی اسلئے بے تکلف معاملہ کی صورت اختیار کری جسمیں دوسروں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ کسی کے گھر جاکر اپنا بار اُس پر ڈالنا شرافت کے خلاف ہے۔

دوسرے اسمیں یہ حکمت بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت سے فائز کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اگرچہ کوئی مجاہدہ و عمل نہ شرط ہے اور نہ وہ کسی عمل و مجاہدہ کے ذریعہ حاصل کیجا سکتی ہے وہ تو خالص اللہ تعالیٰ کیطرف سے عطیہ اور انعام ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو بھی مجاہدات اور محنت و مشقت کے دَور سے گزارتے ہیں جو اخلاقِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ اور دوسروں کی اصلاح کا بڑا سبب بنتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اسوقت تک شاہانہ اعزاز و اکرام میں گزری تھی آگے اُن کو خلقِ خدا کے لئے ہادی و رہبر اور اُنکا

مصلح بننا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ اس مزدوری و محنت کے معاہدہ میں اُن کی اخلاقی تربیت کا راز بھی پوشیدہ تھا، عارف شیرازی نے اسی کو کہا ہے ؎

شبان وادیٔ ایمن گہے رسد بمراد ٭ کہ چند سال بجاں خدمت شعیب کند

تیسرے جو خدمت ان سے لی گئی وہ بکریاں چرانے کی تھی، یہ عجیب بات ہے کہ یہ کام اکثر انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا ہے شاید اسمیں یہ راز بھی ہو کہ بکری ایسا جانور ہے جو گلے سے آگے پیچھے بھاگنے کا عادی ہوتا ہے جس پر چرانے والے کو بار بار غصہ آتا ہے، اس غصہ کے نتیجہ میں اگر وہ اس بھاگنے والی بکری سے قطع نظر کرے تو بکری ہاتھ سے گئی وہ کسی بھیڑیئے کا لقمہ بنے گی اور اپنی مرضی کے تابع چلانے کے لئے اسکو مار پیٹ کرے تو وہ کمزور اتنی ہے کہ ذرا چوٹ مار دو تو ٹانگ ٹوٹ جانے اس لئے چرواہے کو بڑے صبر و حلم سے کام لینا پڑتا ہے۔ عام خلق خدا تعالیٰ کا بھی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی حال ہوتا ہے جسمیں انبیاء نہ اُن سے صرف نظر کرسکتے ہیں اور نہ زیادہ تشدد کرکے اُن کو راستہ پر لاسکتے ہیں صبر و حلم ہی کو شیوہ بنانا پڑتا ہے۔

کسی کو کوئی عہدہ اور ملازمت سپرد کرنے کے لئے بہترین دستور العمل

اس قصہ میں شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے جو اپنے والد کو یہ مشورہ دیا کہ ان کو ملازم رکھ لیا جائے اس مشورہ کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ بہترین اجیر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوی بھی ہو امین بھی۔ قوی سے مراد اس کام کی قوت و صلاحیت والا ہونا ہے جو کام اُسکے سپرد کرنا ہے اور امین سے مراد یہ ہے کہ اُس کی سابقہ زندگی کے حالات اس کی امانت و دیانت پر شاہد ہوں، آجکل مختلف ملازمتوں اور سرکاری وغیر سرکاری عہدوں کے لئے انتخاب کا جو اصول رکھا جاتا ہے اور درخواست گزار میں جن اوصاف کو دیکھا جاتا ہے اگر غور کریں تو سب کے سب ان دو لفظوں میں جمع ہیں بلکہ اُن کے تفصیلی شرائط میں بھی یہ جامعیت عموماً نہیں ہوتی، کیونکہ امانت و دیانت تو کہیں زیر غور ہی نہیں آتی صرف علمی قابلیت کی ڈگریاں معیار ہوتی ہیں اور آجکل جہاں کہیں سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے نظام میں ابتری پائی جاتی ہے وہ بیشتر اسی اصول دیانت کو نظر انداز کر نیکا نتیجہ ہوتا ہے۔ قابل اور عاقل آدمی جب امانت و دیانت سے کورا ہوتا ہے تو پھر وہ کام چوری اور رشوت خوری کے بھی ایسے ایسے راستے نکال لیتا ہے کہ کسی قانون کی گرفت میں نہ آسکے۔ اسی نے آج دُنیا کے بیشتر سرکاری وغیر سرکاری اداروں کو بیکار بلکہ مضر بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام میں اسی لئے اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے جس کے برکات دُنیا نے صدیوں تک دیکھے ہیں۔

ساحروں اور پیغمبروں کے معاملات میں کھلا ہوا فرق

فرعون نے جن جادوگروں کو جمع کیا تھا اور پورے ملک و قوم کا خطرہ اُن کے سامنے رکھ کر کام کرنے کو کہا تھا اسکا تقاضا یہ تھا کہ وہ خود اپنا کام سمجھ کر

اس خدمت کو دل و جان سے انجام دیتے مگر وہاں ہوا یہ کہ خدمت شروع کرنے سے پہلے سودے بازی شروع کر دی کہ ہمیں کیا ملے گا۔

اس کے بالمقابل تمام انبیاء علیہم السلام کا عام اعلان یہ ہوتا ہے وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ، یعنی میں تم سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت کے مؤثر ہونے میں اُن کے اس استغناء کا بڑا دخل ہے۔ جب سے علماء دین اہل فتویٰ اہل خطابت و وعظ کی خدمت کا انتظام اسلامی بیت المال میں نہیں رہا ان کو اپنی تعلیم اور وعظ و امامت پر تنخواہ لینے کی مجبوری پیش آئی وہ اگرچہ متاخرین فقہاء کے نزدیک بدرجہ مجبوری جائز قرار دی گئی مگر اسمیں شبہ نہیں کہ اس معاوضہ لینے کا اثر تبلیغ و دعوت اور اصلاح خلق پر نہایت بُرا ہوا جس نے اُن کی کوششوں کا فائدہ بہت ہی کم کر دیا۔

فرعونی جادوگروں کے جادو کی حقیقت ان لوگوں نے اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو بظاہر سانپ بنا کر دکھلایا تھا کیا وہ واقعی سانپ بن گئی تھیں اسکے متعلق الفاظ قرآن يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً سانپ نہیں بنی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس نے خیالات حاضرین پر تصرف کر کے ایک قسم کی نظر بندی کر دی کہ حاضرین کو وہ چلتے پھرتے سانپ دکھائی دینے لگے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی جادو سے کسی شئے کی حقیقت تبدیل ہی نہیں ہو سکتی، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان جادوگروں کا جادو تبدیل حقیقت کے درجہ کا نہیں تھا۔

قبائلی تقسیم معاشرتی معاملات کی حد تک کوئی مذموم عمل نہیں اسلام نے وطنی، لسانی، نسبی، قبائلی تقسیموں کو قومیت کی بنیاد بنانے پر سخت نکیر کیا ہے اور ان تفرقوں کو مٹانے کی ہر قدم ہر کام میں کوشش کی ہے بلکہ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اسلام کی دینی قومیت ہے جسمیں عربی، عجمی، حبشی، فارسی، ہندی، سندھی سب ایک قوم کے افراد ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے لئے سب سے پہلا کام مہاجرین و انصار میں یگانگت اور مواخات قائم کرنے سے شروع فرمایا تھا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں قیامت تک کے لئے یہ دستور العمل دیدیا تھا کہ علاقائی اور نسبی اور لسانی امتیازات سب بُت ہیں جن کو اسلام نے توڑ ڈالا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں ایک حد تک ان امتیازات کی رعایت کو گوارا کیا گیا ہے کیونکہ کھانے پینے رہنے سہنے کے طریقے مختلف قبائل اور مختلف اوطان کے الگ الگ ہوتے ہیں اُس کے خلاف کرنا تکلیف شدید ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جن بنی اسرائیلیوں کو مصر سے ساتھ لیکر نکلے تھے اُن کے

بارہ قبیلے تھے، حق تعالیٰ نے ان قبیلوں کے امتیاز کو معاشرتی معاملہ میں جائز رکھا اور دریا میں بھی جو راستے بطور معجزہ پیدا فرمائے تو بارہ راستے الگ الگ ہر قبیلے کے لئے پیدا فرمائے۔ اسی طرح وادی تیہ میں جس پتھر سے بطور معجزہ پانی کے چشمے جاری ہوتے تھے وہ بھی بارہ ہوتے تھے۔ تاکہ قبائل میں مزاحمت نہ ہو، ہر ایک قبیلہ اپنا مقررہ پانی حاصل کرے۔ واللہ اعلم

جماعتی انتظام کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک مہینے کے لئے اپنی قوم سے الگ ہو کر کوہ طور پر عبادت میں مشغول ہونا چاہا تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر سب کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے سب ان کی اطاعت کرنا تاکہ آپس میں اختلاف و نزاع نہ پھوٹ پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی جماعت یا خاندان کا بڑا اگر کہیں سفر پر جائے تو سنتِ انبیاء یہ ہے کہ کسی کو اپنا قائم مقام خلیفہ بنا جائے جو ان کے نظم و ضبط کو قائم رکھے

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ سے بچنے کے لئے بڑی سے بڑی برائی کو وقتی طور پر برداشت کیا جا سکتا ہے۔

بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری کے وقت جو گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹا اور اُن کے تین فرقے ہو گئے حضرت ہارون علیہ السلام نے سب کو دعوتِ حق تو دی مگر اُن میں سے کسی فرقہ سے کُلّی اجتناب اور بیزاری و علیحدگی کا موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک اعلان نہیں کیا۔ اس پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے تو اُنھوں نے یہی عذر پیش کیا کہ میں تشدد کرتا تو بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہو جاتے اُن میں تفرقہ پھیل جاتا، اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ، یعنی میں نے اس لئے کسی بھی فرقہ سے علیحدگی اور بیزاری کا شدت سے اظہار نہیں کیا کہ کہیں آپ واپس آکر مجھے یہ الزام نہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری ہدایت کی پابندی نہیں کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اُن کے عذر کو غلط نہیں قرار دیا بلکہ صحیح تسلیم کر کے اُن کے لئے دُعاء و استغفار کیا، اس سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ سے بچنے کے لئے وقتی طور پر اگر کسی بُرائی کے معاملے میں نرمی برتی جائے تو درست ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی جو آیات اُوپر لکھی گئی ہیں اُن کے آخر میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجنے کا حکم ایک خاص ہدایت کے ساتھ دیا گیا ہے یعنی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ اس میں۔

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اصول

یہ بیان ہوا ہے کہ فریقِ مخالف کتنا ہی سرکش اور غلط سے غلط عقائد و خیالات کا حامل ہو اصلاح و ہدایت کا فریضہ انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ اس کے ساتھ بھی ہمدردانہ خیر خواہانہ انداز سے بات نرم کریں اسی کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ مخاطب کچھ

غور و فکر پر مجبور ہو جائے اور اسکے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔

فرعون جو خدائی کا دعویدار جبار اور ظالم ہے، جو اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ہزارہا بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا مجرم ہے اُس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص پیغمبروں کو بھیجتے ہیں تو یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں کہ اُس سے بات نرم کریں تاکہ اسکو غور و فکر کا موقع ملے۔ اور یہ اُس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرعون اپنی سرکشی سے اور گمراہی سے باز آنے والا نہیں ہے مگر اپنے پیغمبروں کو اس اُصول کا پابند کرنا تھا جس کے ذریعہ خلق خدا سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو کر خدا تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے۔ فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو مگر اصول وہ ہونا چاہئے جو **ہدایت و اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔**

آجکل جو بہت سے اہلِ علم اپنے اختلافات میں ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کو اسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں اُنھیں اس پر بہت غور کرنا چاہئے ؛

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ

بولے اے رب ہمارے ہم ڈرتے ہیں کہ بھبک پڑے ہم پر یا جوش میں آجائے فرمایا

لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ

نہ ڈرو میں ساتھ ہوں تمہارے سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں سو جاؤ اس کے پاس اور کہو

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥۙ وَلَا

ہم دونوں بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے سو بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور مت

تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ

ستا ان کو ہم آئے ہیں تیرے پاس نشانی لیکر تیرے رب کی اور سلامتی ہو اسکی جو مان لے

اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي

راہ کی بات ہم کو حکم ملا ہے کہ عذاب اس پر ہے جو جھٹلائے

مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ

اور منہ پھیرے بولا پھر کون ہے رب تم دونوں کا اے موسیٰ کہا

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

رب ہمارا وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سمجھائی

خلاصۂ تفسیر

(جب یہ حکم دونوں صاحبوں کو پہنچ چکا تو) دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار (ہم تبلیغ کے لئے حاضر ہیں لیکن) ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر (تبلیغ سے پہلے ہی) زیادتی نہ کر بیٹھے (کہ تبلیغ ہی رہ جاوے) یا یہ کہ (عین تبلیغ کے وقت اپنے کفر میں) زیادہ شرارت نہ کرنے لگے (کہ اپنی بک بک میں تبلیغ نہ سُننے نہ سننے دے جس سے وہ عدم تبلیغ کے برابر ہو جاوے) ارشاد ہوا کہ (اس امر سے مطلق) اندیشہ نہ کرو (کیونکہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سُنتا دیکھتا ہوں (میں تمہاری حفاظت کروں گا اور اُس کو مرعوب کر دوں گا جس سے پوری تبلیغ کر سکو گے جیسا دوسری آیت میں ہے نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا) سو تم (بے خوف و خطر) اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو (تو ہماری اطاعت کر اصلاح عقیدہ میں بھی کہ توحید کی تصدیق کر اور صلاح اخلاق میں بھی کہ ظلم وغیرہ سے باز آ اور) بنی اسرائیل کو (جن پر تو ناحق ظلم کرتا ہے اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر کے) ہمارے ساتھ جانے دے (کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں رہیں) اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا (اور) ہم (جو دعویٰ نبوت کا کرتے ہیں تو خالی خولی نہیں بلکہ ہم) تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور (تصدیق اور قبول حق کا ثمرہ اس قاعدہ کلیہ سے معلوم ہوگا کہ) ایسے شخص کے لئے (عذاب الٰہی سے) سلامتی ہے جو (سیدھی) راہ پر چلے (اور تکذیب و ردِّ حق کے باب میں) ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب (قہر کا) اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلاوے اور (اس سے) روگردانی کرے (غرض یہ سارا مضمون جا کر اس سے کہو چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور جا کر اس سے سب کہہ دیا) وہ کہنے لگا کہ پھر (یہ تو بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے (جس کا تم اپنے کو فرستادہ بتلاتے ہو) اے موسیٰ (جواب میں) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ ہمارا (دونوں کا بلکہ سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان میں جو جاندار چیزیں تھیں اُن کو ان کے منافع و مصالح کی طرف) رہنمائی فرمائی (چنانچہ ہر جانور اپنی مناسب غذا اور جوڑہ اور مسکن وغیرہ ڈھونڈ لیتا ہے پس وہی ہمارا بھی رب ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ کو خوف کیوں ہوا اِنَّنَا نَخَافُ، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دو طرح کے خوف کا اظہار کیا۔ ایک اَنْ يَّفْرُطَ کے لفظ سے جس کے اصلی

سے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ شاید فرعون ہماری بات سُننے سے پہلے ہی ہم پر حملہ کر دے، دوسرا خوف اَن یَطْغٰی کے لفظ سے بیان فرمایا جسکا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سرکشی پر اُتر آئے کہ آپ کی شان میں نامناسب کلمات بکنے لگے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتدار کلام میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت و رسالت عطا فرمایا گیا اور اُنھوں نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی درخواست کی اور یہ درخواست قبول ہوئی تو اُسی وقت حق تعالیٰ نے اُن کو یہ تبلادیا تھا کہ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا، نیز یہ بھی اطمینان دلادیا گیا تھا کہ آپ کی درخواست میں جو جو چیزیں طلب کی گئی ہیں وہ سب ہم نے آپ کو دیدیں قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى، ان مطلوب چیزوں میں شرح صدر بھی تھا جسکا حاصل یہی تھا کہ مخالف سے کوئی دل تنگی اور خوف و ہراس پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے بعد پھر یہ خوف اور اسکا اظہار کیسا ہے؟ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ پہلا وعدہ کہ ہم آپ کو غلبہ عطا کریں گے اور وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے یہ ایک مبہم وعدہ ہے کہ مراد غلبہ سے حجت و دلیل کا غلبہ بھی ہوسکتا ہے اور مادی غلبہ بھی۔ نیز یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ اُن پر غلبہ تو جب ہوگا کہ وہ ان کے دلائل سُنیں معجزات دیکھیں مگر خطرہ یہ ہے کہ وہ کلام سُننے سے پہلے ہی اُن پر حملہ کر بیٹھیں اور شرح صدر کے لئے یہ لازم نہیں کہ طبعی خوف بھی جاتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خوف کی چیزوں سے طبعی خوف تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جو وعدوں پر پُورا ایمان و یقین ہونے کے باوجود بھی ہوتا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی لاٹھی کے سانپ بن جانے کے بعد اُسکے پکڑنے سے ڈرنے لگے تو حق تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ ڈرو نہیں اور دوسرے تمام مواقع خوف میں ایسا ہی ہوتا رہا کہ طبعی اور بشری خوف لاحق ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت کے ذریعہ اس کو زائل فرمایا۔ اسی واقعہ کی آیات میں فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ اور فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا اور فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى کی آیات اس مضمون پر شاہد ہیں حضرت خاتم الانبیاء اور سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی بشری خوف کی وجہ سے مدینہ شریف کی طرف اور کچھ صحابہ کرام نے پہلے حبشہ کی پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ غزوہ احزاب میں اسی خوف سے بچنے کے لئے خندق کھودی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے وعدہ نصرت و غلبہ بار بار آچکا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مواعید ربانی سے یقین تو ان سب کو پُورا حاصل تھا مگر طبعی خوف جو بمقتضائے بشریت انبیاء میں بھی ہوتا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم دونوں کیساتھ ہوں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہونگا۔ معیت سے مراد نصرت و امداد ہے جسکی پوری حقیقت و کیفیت کا ادراک انسان کو نہیں ہو سکتا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ ایمان کے ساتھ اپنی قوم کو معاشی مصیبت سے بھی چھڑانے کی دعوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام جیسے خلقِ خدا کو ہدایت ایمان دینے کا منصب رکھتے ہیں اسی طرح اپنی اُمت کو دُنیوی اور معاشی مصائب سے آزاد کرنا بھی انکے منصب میں شامل ہوتا ہے اسلئے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ فرعون میں دونوں چیزیں شامل ہیں اوّل اللہ پر ایمان، دوسرے بنی اسرائیل کی آزادی خصوصاً اس آیتِ مذکورہ میں تو صرف اسی دوسرے جزء کے ذکر پر اکتفاء فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور پھر ہر ایک کے وجود کے مناسب اسکو ہدایت فرمائی جس سے وہ اس کام میں لگ گئی

تفصیل اسکی یہ ہے کہ ایک ہدایت جو انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اور فرضِ منصبی ہے وہ تو خاص ہدایت ہے جس کے مخاطب اہلِ عقول انسان اور جنات ہی ہوتے ہیں۔ ایک دوسری قسم کی تکوینی ہدایت بھی ہے جو مخلوقات میں ہر چیز کے لئے عام اور شامل ہے۔ آگ، پانی، مٹی اور ہوا اور ان سے مرکب ہونیوالی ہر شئی کو حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا ادراک و شعور دیا ہے جو اگرچہ انسان و جن کی برابر نہیں، اسی لئے احکام حلال و حرام ان چیزوں پر عائد نہیں ہوتے مگر ادراک و شعور سے خالی نہیں، اسی ادراک و شعور کے راستہ حق تعالیٰ نے ہر شئے کو اسکی ہدایت کردی کہ تو کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے، تجھے کیا کرنا ہے۔ اسی تکوینی حکم اور ہدایت کے تابع زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات اپنے اپنے کام اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔ چاند سورج اپنا کام کر رہے ہیں اور دوسرے سیارے و ثوابت اپنے اپنے کام میں اسطرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک منٹ یا سیکنڈ کا بھی کبھی فرق نہیں ہوتا۔ ہوا، پانی، آگ اور مٹی اپنی اپنی منشاء پیدائش میں لگے ہوئے اُن سے بغیر حکم ربانی سر مُو فرق نہیں کرتے۔ ہاں جب اُن کا حکم ہوتا ہے تو کبھی آگ گلزار بھی بنجاتی ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے، اور کبھی پانی آگ کا بھی کام کرنے لگتا ہے جیسے قوم نوح کیلئے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، بچہ کو ابتداء پیدائش کے وقت جبکہ اسکو کوئی بات سکھانا کسی کے بس میں نہیں یہ کس نے سکھایا کہ ماں کی چھاتی سے اپنی غذا حاصل کرے؟ اسکے لئے چھاتی کو دبا کر چوسنے کا ہنر کس نے بتلایا، بھوک پیاس سردی گرمی کی تکلیف ہو تو رو پڑنا اُس کی ساری ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہوجاتا ہے مگر یہ رونا کس نے سکھایا؟ یہ وہی ہدایت ربانی ہے جو ہر مخلوق کو اسکی حیثیت اور ضرورت کے مطابق غیب سے بغیر کسی کی تعلیم کے عطا ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کیطرف سے ایک عام ہدایت تکوینی ہر ہر مخلوق کے لئے ہے جسکی ہر مخلوق

تکوینی طور پر پابند ہے اور اسکے خلاف کرنا اسکی قدرت سے خارج ہے، دوسری ہدایتِ خاص اہلِ عقول انسان وجن کے لئے ہے یہ ہدایت تکوینی اور جبری نہیں بلکہ اختیاری ہوتی ہے، اسی اختیار کے نتیجہ میں اُس پر ثواب یا عذاب مرتب ہوتا ہے اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی میں پہلی ہی قسم کی ہدایت مذکور ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو سب سے پہلے رب العالمین کا وہ کام بتلایا جو ساری مخلوق پر حاوی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام ہم نے یا کسی دوسرے انسان نے کیا ہے۔ فرعون اسکا تو کوئی جواب نہ دے سکا اب ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹلایا اور ایک سوال موسیٰ علیہ السلام سے کیا کہ جسکا حقیقی جواب عوام سُنیں تو موسیٰ علیہ السلام سے بدگمان ہوجائیں، وہ یہ کہ پچھلے دَور کی تمام اُمتیں اور اقوام عالم جو بُتوں کی پرستش کرتے رہے آپکے نزدیک اُن کا کیا حکم ہے وہ کیسے ہیں اُن کا انجام کیا ہوا؟ مقصد یہ تھا کہ اسکے جواب میں موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یہ سب گمراہ اور جہنمی ہیں تو مجھے یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ لو یہ ساری دُنیا ہی کو بیوقوف گمراہ اور جہنمی سمجھتے ہیں اور لوگ یہ سُنکر اُن سے بدگمان ہونگے تو ہمارا مقصد پورا ہوجائیگا مگر پیغمبرِ خدا موسیٰ علیہ السلام نے اسکا ایسا حکیمانہ جواب دیا جس سے اُسکا یہ منصوبہ غلط ہوگیا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ

بولا پھر کیا حقیقت ہے اُن پہلی جماعتوں کی　　کہا اُن کی خبر میرے رب کے پاس

فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ

لکھی ہوئی ہے　نہ بہکتا ہے میرا رب　اور نہ بھولتا ہے　　وہ ہے جس نے بنا دیا　تمہارے

الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

واسطے زمین کو بچھونا　اور چلا دیں تمہارے لئے اسمیں راہیں　　اور اُتارا　آسمان سے

مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ كُلُوْا

پانی　پھر نکالی ہم نے اُس سے　طرح طرح　کی　سبزی　　کھاؤ

وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۴﴾

اور چَراؤ اپنے چوپایوں کو　البتہ اسمیں نشانیاں ہیں　عقل رکھنے والوں کو

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی ﴿۵۵﴾

اسی زمین سے ہم نے تمکو بنایا اور اسی میں پھر پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو دوسری بار

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا

اور ہم نے فرعون کو دکھلادیں اپنی سب نشانیاں، پھر اُس نے جھٹلایا اور نہ مانا بولا کیا تو آیا ہے

لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ

ہم کو نکالنے ہمارے مُلک سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰ سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں

مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ

ایک ایسا ہی جادو، سو ٹھہرا لے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں اُس کا

وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ

اور نہ تو ایک میدان صاف میں کہا وعدہ تمہارا ہے جشن کا دن

وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

اور یہ کہ جمع ہوں لوگ دن چڑھے

خلاصۂ تفسیر

فرعون نے (اس پر شبہ کیا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى اور) کہا کہ اچھا تو پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا (جو انبیاء کی تکذیب کرتے تھے اُن پر کون سا عذاب نازل ہوا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ میں نے یہ دعوٰی نہیں کیا کہ وہ عذاب موعود دُنیا ہی میں آنا ضرور ہے بلکہ کبھی دُنیا میں بھی آجاتا ہے اور آخرت میں ضرور ہی ہوگا چنانچہ) ان لوگوں (کی بداعمالیوں) کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے (گو ان کو دفتر کی حاجت نہیں مگر بعض حکمتوں سے ایسا ہی کیا گیا ہے غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال معلوم ہیں اور) میرا رب (ایسا جاننے والا ہے کہ) نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے (پس ان کے اعمال کا صحیح صحیح علم اسکو حاصل ہے مگر عذاب کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہے جب وہ وقت آویگا وہ عذاب اُنپر جاری کر دیا جاویگا۔ پس دُنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر و تکذیب علت عذاب کی نہ ہو یہاں تک موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ہو چکی آگے اللہ تعالیٰ اپنی شان ربوبیت کی کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں جسکا ذکر اجمالاً موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام میں تھا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى الخ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ الخ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ الخ چنانچہ ارشاد ہے کہ) وہ (رب) ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور

اس (زمین) میں تمہارے (چلنے کے) واسطے رستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے اقسام مختلفہ کے نباتات پیدا کئے (اور تم کو اجازت دی کہ) خود (بھی) کھاؤ اور اپنے مواشی کو (بھی) چراؤ ان سب (مذکورہ) چیزوں میں اہلِ عقل کے (استدلال کے) واسطے (قدرتِ الٰہیہ کی) نشانیاں ہیں (اور جس طرح نباتات کو زمین سے نکالتے ہیں اسی طرح)، ہم نے تم کو اسی زمین سے (ابتدا میں) پیدا کیا، (چنانچہ آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے سو اُن کے واسطے سے سب کا مادہ بعید خاک ہوئی) اور اسی میں ہم تم کو (بعد موت) لے جاویں گے (چنانچہ کوئی مُردہ کسی حالت میں ہو لیکن آخر کو گو مدتوں کے بعد بھی مگر مٹی میں ضرور ملے گا) اور (قیامت کے روز) پھر دوبارہ اسی سے ہم تم کو نکال لیں گے (جیسا پہلی بار اس سے پیدا کر چکے ہیں)

اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی (وہ) سب ہی نشانیاں دکھلائیں (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں) سو وہ (جب بھی) جھٹلایا ہی کیا اور انکار ہی کرتا رہا (اور) کہنے لگا کہ اے موسیٰ تم ہمارے پاس (یہ دعویٰ لیکر) اس واسطے آئے ہو (گے) کہ ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال باہر کرو (اور خود عوام کو فریفتہ اور تابع بنا کر رئیس بن جاؤ) سو اب ہم بھی تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کر لو جسکے نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم خلاف کرو کسی ہموار میدان میں (تاکہ سب دیکھ لیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلا ہوتا ہے، اور (جس میں) دن چڑھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ میلے کا موقع اکثر ہموار ہی زمین میں ہوتا ہے اسی سے مکان سوی کی شرط بھی پوری ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ، فرعون نے پچھلی اُمتوں کے انجام کا سوال کیا تھا اگر اسکے جواب میں موسیٰ علیہ السلام اُن کے گمراہ اور جہنمی ہونیکا صاف طور سے اظہار کرتے تو فرعون کو موقع اس طعن کا ملجاتا کہ یہ تو صرف ہمیں ہی نہیں ساری دُنیا کو گمراہ جہنمی سمجھتے ہیں اور عوام اس سے شبہ میں پڑ جاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا حکیمانہ جواب دیا کہ بات بھی پوری آگئی اور فرعون کو بہکانیکا موقع نہ ملا۔ فرمایا کہ اُن کا علم میرے رب کے پاس ہے کہ انکا کیا انجام ہوگا، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھُولتا ہے۔ غلطی کرنے سے مُراد یہ ہے کہ کرنا کچھ چاہیے ہو جائے کچھ اور بھُولنے کا مطلب ظاہر ہے۔

اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ، ازواج بمعنے انواع واصناف ہے اور شتّیٰ شتیت

کی جمع ہے جس کے معنی ہیں متفرق۔ مُراد یہ ہے کہ نباتات کی اتنی بیشمار قسمیں پیدا فرمائیں کہ اُنکی قسموں کا احاطہ بھی انسان نہیں کرسکتا۔ پھر ہر نبات جڑی بوٹی، پھُول، پھل، درخت کی چھال میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی خاصیتیں رکھی ہیں کہ علم طب اور ڈاکٹری کے ماہرین حیران ہیں اور ہزاروں سال سے اسکی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہونیکے باوجود یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسکے متعلق جو کچھ لکھدیا گیا ہے وہ حرف آخر ہے اور یہ ساری نباتات کی مختلف قسمیں انسان اور اسکے پالتو جانوروں و جنگلی جانوروں کی غذا یا دوا ہوتی ہیں، ان کی لکڑی سے انسان مکانوں کی تعمیر میں کام لیتا ہے۔ اور گھریلو سامانِ استعمال کی ہزاروں قسمیں بناتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ، اسی لئے اسکے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى، یعنی اسمیں بہت سی نشانیاں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ہیں عقل والوں کے لئے۔ نُہٰی، نُہْيَةٌ کی جمع ہے نہیہ عقل کو اس لئے کہا جاتا کہ وہ انسان کو بُرے اور مضر کاموں سے روکتی ہے۔

ہر انسان کے خمیر میں نُطفہ کے ساتھ اُس جگہ کی مٹی بھی شامل ہوتی ہے جہاں وہ دفن ہوگا

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، منہا کی ضمیر زمین کیطرف راجع ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے تم کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا مخاطب اسکے سب انسان ہیں حالانکہ عام انسانوں کی پیدائش مٹی سے نہیں بلکہ نطفہ سے ہوئی بجز آدم علیہ السلام کے کہ اُن کی پیدائش براہِ راست مٹی سے ہوئی تو یہ خطاب یا تو اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصل اور سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں انکے واسطے سے سب کی تخلیق مٹی کیطرف منسوب کردینا کچھ بعید نہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر نطفہ مٹی ہی کی پیداوار ہوتا ہے اسلئے نطفہ سے تخلیق درحقیقت مٹی ہی سے تخلیق ہوگئی امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظِ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر انسان کی تخلیق میں حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مٹی شامل فرماتے ہیں اسلئے ہر ایک انسان کی تخلیق کو براہِ راست مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے عمل میں آئی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک حدیث اس پر شاہد ہے جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ہر پیدا ہونیوالے انسان پر رحم مادر میں اُس جگہ کی مٹی کا کچھ جزء ڈالا جاتا ہے جس جگہ اُسکا دفن ہونا اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ یہ حدیث ابونعیم نے ابن سیرین کے تذکرہ میں روایت کرکے فرمایا ہے ھٰذا حدیث غریب من حدیث عون لم نکتبہ الا من حدیث عاصم بن نبیل وھو احد الثقات الاعلام من اہل بصرہ، اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے اور عطاء خراسانی نے فرمایا کہ جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے تو جو فرشتہ اسکی

تخلیق پر مامور ہے وہ جاکر اُس جگہ کی مٹی لاتا ہے جس جگہ اسکا دفن ہونا مقرر ہے اور یہ مٹی اُس نطفہ میں شامل کر دیتا ہے اس لئے تخلیق نطفہ اور مٹی دونوں سے ہوتی ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ (قرطبی)

تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونیوالے بچے کی ناف میں ایک جزء مٹی کا ڈالا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اُسی زمین میں دفن ہوتا ہے جہاں کی مٹی اُسکے خمیر میں شامل کی گئی تھی اور فرمایا کہ میں اور ابوبکر و عمر ایک ہی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اُسی میں دفن ہونگے۔ یہ روایت خطیب نے نقل کر کے فرمایا ہے کہ حدیث غریب ہے اور ابن جوزی نے اسکو موضوعات میں شمار کیا ہے مگر شیخ محدث میرزا محمد حارثی بدخشی ؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کے بہت سے شواہد حضرت ابن عمرؓ ابن عباسؓ ابوسعیدؓ ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔ جن سے اس روایت کو قوت پہنچتی ہے اس لئے یہ حدیث حسن (لغیرہ) سے کم نہیں (مظہری)

مَكَانًا سُوًى، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے لئے یہ خود تجویز کیا کہ ایسے مقام پر ہونا چاہیئے جو آلِ فرعون اور حضرت موسیٰ و بنی اسرائیل کے لئے مسافت کے اعتبار سے برابر ہو تاکہ کسی فریق پر زیادہ دُور جانے کی مشقت نہ پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکو قبول کر کے دن اور وقت کی تعیین اس طرح فرمادی مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى، یعنی یہ مقابلہ یوم الزینۃ میں ہونا چاہیئے مراد عید یا کسی میلے وغیرہ کے اجتماع کا دن ہے۔ اسمیں اختلاف ہے کہ وہ کونسا دن تھا؟ بعض نے کہا کہ آلِ فرعون کی کوئی عید مقرر تھی جسمیں وہ زینت کے کپڑے پہنکر شہر سے باہر نکلنے کے عادی تھے، بعض نے کہا کہ وہ نیروز کا دن تھا کسی نے کہا کہ یوم السبت یعنی ہفتہ کا دن تھا جس کی یہ لوگ تعظیم کرتے تھے، بعض نے کہا کہ وہ عاشورا یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔

فائدہ | حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دن اور وقت کی تعیین میں بڑی حکمت سے کام لیا کہ دن ان کی عید کا تجویز کیا جسمیں سب چھوٹے بڑے ہر طبقے کے لوگوں کا اجتماع پہلے سے متعین تھا جسکا نتیجہ لازمی یہ تھا کہ یہ اجتماع بہت بڑا پورے شہر کے لوگوں پر مشتمل ہو جائے اور وقت ضحیٰ یعنی چاشت کا رکھا جو آفتاب کے بلند ہونے کے بعد ہوتا ہے جسمیں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ سب لوگوں کو اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اس میدان میں آنا آسان ہو۔ دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ وقت روشنی اور ظہور کے اعتبار سے سارے دن میں بہتر ہے ایسے ہی وقت میں دلجمعی اور سکون کے ساتھ اہم کام کئے جاتے ہیں اور ایسے وقت کے اجتماع سے جب لوگ

منتشر ہوتے ہیں تو بات دُور دُور تک پھیل جاتی ہے چنانچہ اس روز جب حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی ساحروں پر غلبہ عطا فرمایا تو ایک ہی دن میں پورے شہر میں بلکہ دُور دُور تک اسکی شہرت ہو گئی۔

جادو کی حقیقت اور اسکی اقسام اور شرعی احکام یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ ہاروت ماروت کے قصہ میں معارف القرآن جلد اول ص۲۱۱ سے ص۲۲۳ تک بیان ہو چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝۶۰ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ

پھر اُلٹا پھرا فرعون پھر جمع کئے اپنے سارے داؤ، پھر آیا کہا اُن کو موسیٰ نے کم بختی تمہاری

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ

جھوٹ نہ بولو اللہ پر پھر غارت کر دے تم کو کسی آفت سے، اور مُراد کو نہیں پہنچا

مَنِ افْتَرٰى ۝۶۱ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝۶۲

جس نے جھوٹ باندھا پھر جھگڑے اپنے کام پر آپس میں اور چھپ کر کیا مشورہ

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ

بولے مقرر یہ دونوں جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ نکالدیں تم کو تمہارے ملک سے

بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝۶۳ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ

اپنے جادو کے زور سے اور موقوف کر دیں تمہارے اچھے سے چلن کو سو مقرر کر لو اپنی تدبیر

ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝۶۴ قَالُوْا

پھر آؤ قطار باندھ کر اور جیت گیا آج جو غالب رہا بولے

يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝۶۵

اے موسیٰ یا تو تُو ڈال اور یا ہم ہوں پہلے ڈالنے والے

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ

کہا نہیں تم ڈالو پھر تبھی اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اسکے خیال میں آئیں انکے

سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝۶۶ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝۶۷

جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں پھر پانے لگا اپنے جی میں ڈر موسیٰ،

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۶۸ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ

ہم نے کہا تو مت ڈر، مقرر تو ہی رہے گا غالب اور ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ

کہ نگل جائے جو کچھ انھوں نے بنایا، اُن کا بنایا ہوا تو فریب ہے جادوگر کا، اور بھلا نہیں ہوتا جادوگر کا

حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ

جہاں ہو پھر گر پڑے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے رب پر ہارون

وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ

اور موسیٰ کے بولا فرعون تم نے اس کو مان لیا میں نے ابھی حکم نہ دیا تھا وہ ہی

لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ

تمہارا بڑا ہے جس نے سکھلایا تم کو جادو سو اب میں کٹواؤں گا تمہارے ہاتھ

وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ

اور دوسری طرف کے پاؤں اور سولی دوں گا تم کو کھجور کے تنہ پر

وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ

اور جان لوگے ہم میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر تک رہنے والا وہ بولے ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں

عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ

اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اُس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کر گزر جو تجھ کو

قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ۭ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا

کرنا ہے تو یہی کرے گا اس دُنیا کی زندگی میں ہم یقین لائے ہیں اپنے رب پر

لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ

تاکہ بخشے ہم کو ہمارے گناہ اور جو تو نے زبردستی کروایا ہم سے یہ جادو اور اللہ بہتر ہے

وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ

اور سدا باقی رہنے والا بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے رب کے پاس گناہ لے کر سو اسکے واسطے دوزخ ہے

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰي ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ

نہ مرے اسمیں نہ جیے اور جو آیا اسکے پاس ایمان لے کر نیکیاں کر کر

الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ۙ جَنّٰتُ

سو اُن لوگوں کے لئے ہیں درجے بلند باغ ہیں

عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَ ذٰلِكَ

بسنے کے بہشتیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہا کریں گے اُن میں اور یہ

جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَكّٰی ﴿۷۶﴾

بدلہ ہے اسکا جو پاک ہوا

خلاصۂ تفسیر

غرض (یہ سن کر) فرعون (دربار سے اپنی جگہ) لوٹ گیا پھر اپنا مکر کا (یعنی جادو کا) سامان جمع کرنا شروع کیا پھر (سب کو لیکر اس میدان میں جہاں وعدہ ٹھہرا تھا) آیا (اسوقت) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان (جادوگر) لوگوں سے فرمایا کہ ارے کمبختی مارو! اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افترا مت کرو (کہ اسکے وجود یا توحید کا انکار کرنے لگو یا اسکے ظاہر کئے ہوئے معجزات کو سحر بتلانے لگو) کبھی خدا تعالیٰ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست و نابود ہی کر دے اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ (آخر کو) ناکام رہتا ہے پس جادوگر (یہ بات سنکر ان دونوں حضرات کے بارہ میں) باہم اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے اور خفیہ گفتگو کرتے رہے (بالآخر سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفتر ہی اٹھا دیں تو اب تم ملکر اپنی تدبیر کا انتظام کرو اور صفیں آراستہ کر کے (مقابلہ میں) آؤ اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہو (پھر) انھوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے موسیٰ (کہئے) آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالینگے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں آپ نے (نہایت بے پروائی سے) فرمایا نہیں تم ہی پہلے ڈالو (چنانچہ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور نظر بندی کر دی) پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کی نظر بندی سے موسیٰ (علیہ السلام) کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں سو موسیٰ (علیہ السلام) کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا (کہ جب دیکھنے میں یہ رسیاں اور لاٹھیاں بھی سانپ معلوم ہوتی ہیں اور میرا عصا بھی بہت سے بہت سانپ بن جاویگا تو دیکھنے والے تو دونوں چیزوں کو ایک ہی سا سمجھیں گے تو حق و باطل میں امتیاز کس طرح کرینگے، اور یہ خوف باقتضائے طبع تھا ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے تو اسکے تمام نشیب و فراز کا بھی انتظام کر دیگا اور اپنے مرسل کی کافی مدد کرے گا اور ایسا خوف طبعی جو درجۂ وسوسہ میں تھا شانِ کمال کے منافی نہیں الغرض جب یہ خوف ہوا اسوقت) ہمنے کہا کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے اور (اسکی صورت یہ ہے کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو

(عصا) ہے اس کو ڈالدو، ان لوگوں نے جو کچھ (سانگ) بنایا ہے یہ (عصا) سب کو نگل جاویگا یہ جو کچھ بنایا ہے جادُوگروں کا سانگ ہے اور جادُوگر کہیں جاوے (معجزے کے مقابلے میں کبھی) کامیاب نہیں ہوتا (موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہو گئی کہ اب امتیاز خوب ہو سکتا ہے چنانچہ انھوں نے عصا ڈالا اور واقعی وہ سب کو نگل گیا) سو جادوگروں (نے جو یہ فعل فوق السحر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ بیشک معجزہ ہے اور فوراً ہی سب) سجدہ میں گر گئے (اور بآواز بلند) کہا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے پروردگار پر، فرعون نے (یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو دھمکایا اور) کہا کہ بدون اسکے کہ میں تم کو اجازت دوں (یعنی میری خلاف مرضی) تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے واقعی (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ (سحر میں) تمہارے بھی بڑے (اور اُستاذ) ہیں کہ انھوں نے تم کو سحر سکھلایا ہے (اور اُستاد شاگردوں نے سازش کر کے جنگ زرگری کی ہے تاکہ تمکو ریاست حاصل ہو) سو (اب حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے) میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں (تاکہ سب دیکھ کر عبرت حاصل کریں) اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم دونوں میں (یعنی مجھ میں اور رب موسیٰ میں) کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے ان لوگوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو جو کچھ کرنا ہو (دل کھول کر) کر ڈال تو بجز اسکے کہ اس دنیوی زندگانی میں کچھ کرلے اور کر ہی کیا سکتا ہے بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے تاکہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر وغیرہ) معاف کر دیں اور تو نے جو جادو (کے مقدمہ) میں ہم پر زور ڈالا اسکو بھی معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ (باعتبار ذات وصفات کے بھی تجھ سے) بدرجہا اچھے ہیں اور (باعتبار ثواب وعقاب کے بھی) زیادہ بقا والے ہیں (اور تجھ کو نہ خیریت نصیب ہے، نہ بقا تو تیرا کیا انعام جسکا وعدہ ہم سے کیا تھا اور کیا عذاب جس کی اب وعید سناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے جس ثواب اور عذاب کو بقا ہے اسکا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (بغاوت کا) مجرم ہو کر (یعنی کافر ہو کر) اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا سو اُس کے لئے دوزخ (مقرر) ہے اسمیں نہ مرے ہی گا اور نہ جئے ہی گا (نہ مرنا تو ظاہر ہے اور نہ جینا یہ کہ جینے کا آرام نہ ہوگا) اور جو شخص اس کے پاس مؤمن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں سو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور جو شخص (کفر و معصیت سے) پاک ہو اُس کا یہی انعام ہے (پس اس قانون کے موافق ہم نے کفر کو چھوڑ کر ایمان اختیار کر لیا۔

معارف و مسائل

فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ، فرعون نے اپنے کید یعنی مقابلہ موسیٰ علیہ السلام کی تدبیر میں ساحروں اور اُن کے آلات کو جمع کر لیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے ان ساحروں کی تعداد بہتّر منقول ہے اور دوسرے اقوال کی تعداد میں بہت مختلف ہیں، چار سو سے لیکر نو لاکھ تک انکی تعداد بتلائی گئی ہے، اور یہ سب اپنے ایک رئیس شمعون کے ماتحت اسکے حکم کیمطابق کام کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انکا رئیس ایک اندھا آدمی تھا (قرطبی ودرِ منثور)۔

موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو پیغمبرانہ خطاب جادُو کا مقابلہ معجزات سے کرنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادُوگروں کو ہمدردانہ نصیحت آمیز چند کلمات کہہ کر اللہ کے عذاب سے ڈرایا وہ الفاظ یہ تھے وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ، یعنی تمہاری ہلاکت سامنے آچکی ہے، اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان نہ لگاؤ کہ اسکے ساتھ خدائی میں فرعون یا کوئی اور شریک ہے، اگر تم ایسا کروگے تو وہ تم کو عذاب میں پیس ڈالیگا اور تمہاری جڑ بنیاد اکھاڑ دے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے وہ انجام کار ناکام اور محروم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت و قوت اور حشم و خدم کے سہارے جو لوگ مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آچکے تھے ان واعظانہ کلمات کا اُن پر کوئی اثر ہونا بہت ہی بعید تھا مگر انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کیساتھ حق کی ایک مخفی طاقت و شوکت ہوتی ہے اُن کے سادے الفاظ بھی سخت سے سخت دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ جملے سُن کر ساحروں کی صفوں میں ایک زلزلہ پڑ گیا اور آپس میں اختلاف ہونے لگا کہ یہ کلمات کوئی جادوگر نہیں کہہ سکتا یہ تو اللہ ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں اس لئے بعض نے کہا کہ ان کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں، اور بعض اپنی بات پر جمے رہے (فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ) کا یہی مطلب ہے، پھر اس اختلاف کو دُور کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی اور آہستہ مشورے ہونے لگے (وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى) مگر بالآخر مجموعی رائے مقابلہ کرنے ہی پر جم گئی اور کہنے لگے اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ، یعنی یہ دونوں جادُوگر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم کو یعنی فرعون اور آلِ فرعون کو تمہاری زمین مصر سے نکالدیں، مطلب یہ ہے کہ جادو کے ذریعہ تمہارے ملک پر اپنا قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ تمہارا طریقہ جو سب سے افضل و بہتر ہے اسکو مٹادیں مُثْلٰى، اَمْثَل کا صیغہ مؤنث ہے جس کے معنے افضل و اعلیٰ کے ہیں، مطلب یہ تھا کہ تمہارا مذہب و طریقہ کہ فرعون کو اپنا خدا اور صاحب اختیار و اقتدار مانتے ہو یہی سب سے افضل و بہتر

ع حضرت نافع مدنیؒ وغیرہ کی قراءت میں اِنَّ هٰذَانِ لَسٰحِرٰنِ منقول ہے۔ یہ بظاہر عربی زبان کے نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے بعض لغات میں یہ صورت بھی جائز ہے۔ (خلاصہ قرطبی)

طریقہ ہے یہ لوگ اس کو مٹا کر اپنا دین و مذہب پھیلانا چاہتے ہیں اور لفظ طریقہ کے ایک معنی یہ بھی آتے ہیں کہ قوم کے سرداروں اور نمائندہ لوگوں کو اس قوم کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور علی مرتضیٰ رضؓ سے اس جگہ طریقہ کی یہی تفسیر منقول ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہاری قوم کے سرداروں اور باعزت لوگوں کو ختم کردیں، اسلئے تم لوگوں کو چاہیئے کہ مقابلہ کے لئے اپنی پوری تدبیر و توانائی صرف کرو اور سب جادوگر صف بستہ ہو کر یکبارگی اُن کے مقابلے پر عمل کرو (فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوا صَفًّا) صف بستہ ہونے کو مقابل پر رُعب ڈالنے کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اس لئے جادوگروں نے اپنی صف بندی کرکے مقابلہ کیا۔

جادوگروں نے اپنی بے فکری اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے کہا کہ پہل آپ کرتے ہیں یا ہم کریں یعنی پہلے آپ اپنا عمل کرتے ہیں یا ہم کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا بَلْ أَلْقُوا یعنی پہلے تمہیں ڈالو اور اپنے جادو کا کرشمہ دکھلاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں۔ اول تو ادبِ مجلس کہ جب جادوگروں نے اپنا یہ حوصلہ دکھلایا کہ مخالف کو پہلے حملہ کرنے کی اجازت دی تو اسکا شریفانہ جواب یہی تھا کہ ان کی طرف سے اس سے زیادہ حوصلے کے ساتھ ان کو ابتدا کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے یہ کہ جادوگروں کا یہ کہنا اپنے اطمینان اور بے فکری کا مظاہرہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن ہی کو ابتدا کرنے کا موقع دیکر اپنی بے فکری اور اطمینان کا ثبوت دیدیا۔ تیسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انکے جادو کے سب کرشمے آجاویں اسکے بعد اپنے معجزات کا اظہار کریں تو بیک وقت غلبۂ حق کا ظہور واضح طور پر ہو جائے۔ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد پر اپنا عمل شروع کردیا اور اپنی لاٹھیاں اور رسّیاں جو بڑی تعداد میں تھیں بیک وقت زمین پر ڈالدیں اور وہ سب کی سب بظاہر سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی جادوگروں کا جادو ایک قسم کی نظربندی تھی جو مسمریزم کے ذریعہ بھی ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ لاٹھیاں اور رسّیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، وہ حقیقۃً سانپ نہ بنی تھیں، اور اکثر جادو اسی قسم کے ہوتے ہیں

فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَىٰ، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورتِ حال دیکھ کر خوف طاری ہوا جس کو اُنھوں نے اپنے نفس میں چھپائے رکھا دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ خوف اگر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کے لئے ہوا تو مقتضائے بشریت سے ایسا ہونا نبوت کے خلاف نہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ خوف اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ اسکا تھا کہ اس مجمع کے سامنے ساحروں کا غلبہ محسوس کیا گیا تو جو مقصد دعوتِ نبوت کا تھا وہ پُورا نہ ہو سکے گا اسی لئے اسکے

جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو ارشاد ہوا اُسمیں یہ اطمینان دلایا گیا کہ جادوگر غالب نہ آسکیں گے آپ ہی کو فتح اور غلبہ حاصل ہوگا۔ اگلی آیت میں لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى فرما کر اس خطرہ کو دُور کیا گیا ہے۔

وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ، موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی خطاب ہوا کہ آپکے ہاتھ میں جو چیز ہے اُس کو ڈالدو، مُراد اس سے موسیٰ علیہ السلام کی عصا تھی مگر یہاں عصا کا ذکر نہیں فرمایا۔ اشارہ اس بات کیطرف تھا کہ اُن کے جادو کی کوئی حقیقت نہیں، اسکی پروا نہ کرو اور جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے ڈالدو وہ اُنکے سب سانپوں کو نگل جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالدی وہ ایک بڑا اژدہا بن کر ان سب جادو کے سانپوں کو نگل گیا۔

فرعونی جادوگروں کا مسلمان ہوکر سجدہ میں پڑ جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا نے اژدہا بن کر جب اُن کے خیالی سانپوں کو نگل لیا تو چونکہ یہ لوگ جادو کے ماہرین تھے ان کو یقین ہوگیا کہ یہ کام جادُو کے ذریعہ نہیں ہوسکتا بلکہ یہ بلاشبہ معجزہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتا ہے اسلئے سجدہ میں گر گئے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ بعض روایات حدیث میں ہے کہ ان جادوگروں نے سجدہ سے اُسوقت تک سر نہیں اُٹھایا جبتک کہ اُن کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ قدرت نے نہیں کرا دیا (رواہ عبد ابن حمید وابن ابی حاتم وابن المنذر عن عکرمہ - روح)

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ، فرعون کی رُسوائی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے واضح کردی تو یہ کھلا کر اوّل تو ساحروں کو یہ کہنے لگا کہ بغیر میری اجازت کے تم کیسے ان پر ایمان لائے۔ گویا لوگوں کو یہ تبلانا تھا کہ میری اجازت کے بغیر ان جادوگروں کا کوئی قول فعل معتبر نہیں مگر ظاہر ہے کہ اس کھُلے ہوئے معجزہ کے بعد کسی کی اجازت کی ضرورت کسی عاقل انسان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ اس لئے اب جادوگروں پر اس سازش کا الزام لگایا کہ اب معلوم ہوا کہ تم سب موسیٰ کے شاگرد ہو اسی جادوگر نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور تم نے سازش کر کے اُس کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ، اب جادُوگروں کو سخت سزا سے ڈرایا کہ تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ داہنا ہاتھ کٹے گا تو بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ یہ صورت یا تو اسلئے تجویز کی کہ فرعونی قانون میں سزا کا یہی طریقہ رائج ہوگا یا اسلئے کہ اس صورت میں انسان ایک عبرت کا نمونہ بنجاتا ہے وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ یعنی ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھر تمہیں کھجور کے درختوں پر سُولی دیجادیگی کہ تم اُن پر اسی طرح لٹکے رہو گے یہانتک کہ بھوک اور پیاس سے مرجاؤ۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا، جادوگروں نے فرعون کی یہ سخت دھمکی اور سخت سزا دینے کا اعلان سُنکر اپنے ایمان پر بڑی پختگی کا ثبوت دیا۔ کہنے لگے کہ ہم تجھے یا تیرے کسی قول کو اُن بیّنات و معجزات پر ترجیح نہیں دے سکتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جادوگر جب سجدہ میں گرے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنت کے ان مقاماتِ عالیہ اور نعمتوں کا مشاہدہ کرا دیا جو اُن کو ملنے والے تھے اسکو ان لوگوں نے کہا کہ ان بینات کے ہوتے ہوئے ہم تیری بات نہیں مان سکتے (قرطبی) نیز خالقِ کائنات ربّ سمٰوات کو چھوڑ کر تجھے اپنا رب نہیں مان سکتے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اب جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں فیصلہ کر، اور جو چاہے سزا تجویز کر۔ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، یعنی اگر تو نے ہمیں سزا دے بھی دی تو وہ سزا صرف اسی دُنیا کی چند روزہ زندگی ہی تک ہوگی مرنے کے بعد تو تیرا ہم پر قبضہ نہیں رہے گا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ ہم اسکے قبضہ میں مرنے سے پہلے بھی ہیں اور مرنے کے بعد بھی، اُس کی سزا کی فکر سب سے مقدم ہے۔

وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ، جادوگروں نے اب فرعون پر یہ الزام لگایا کہ ہمیں جادوگری پر تو نے ہی مجبور کر رکھا تھا ورنہ ہم اس لغو کام کے پاس نہ جاتے، اب ہم ایمان لاکر اللہ سے اس جادو کے گناہ کی بھی معافی مانگتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ جادوگر تو خود اپنے اختیار سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے اور اس مقابلہ کی سودا بازی بھی فرعون سے کرچکے تھے کہ ہم غالب آئیں گے تو کیا ملے گا، پھر انکا فرعون پر یہ الزام لگانا کہ تو نے ہمیں جادو کرنے پر مجبور کر رکھا تھا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ اسکی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ جادوگر شروع میں تو شاہی انعام و اکرام کے لالچ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے بعد میں ان کو کچھ احساس ہوا کہ ہم معجزہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اُسوقت فرعون نے ان کو مجبور کیا۔ دوسری وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے اپنے ملک میں جادوگری کی تعلیم کو جبری بنایا ہوا تھا اسلئے ہر شخص جادو سیکھنے پر مجبور تھا (روح)

اہلیۂ فرعون آسیہ کا انجامِ خیر تفسیر قرطبی میں ہے کہ حق و باطل کے اس معرکہ کے وقت فرعون کی بیوی برابر خبر لیتی رہی کہ انجام کیا ہوا۔ جب اُس کو یہ بتلایا گیا کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام غالب آگئے تو فوراً اُس نے اعلان کر دیا کہ میں بھی ربّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئی۔ فرعون کو اپنے گھر کی خبر لگی تو حکم دیا کہ ایک بڑے پتھر کی چٹان اُٹھا کر اسکے اُوپر ڈالدو۔ آسیہ نے جب یہ دیکھا تو آسمان کی طرف نظر اُٹھائی اور اللہ سے فریاد کی۔ حق تعالیٰ نے پتھر اسکے اُوپر گرنے سے پہلے اسکی روح قبض کرلی پھر پتھر اُس بے جان جسم پر گرا۔

فرعونی جادوگروں میں عجیب انقلاب اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا الٰى ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى

یہ کلمات اور حقائق جنکا تعلق خالص اسلامی عقائد اور عالمِ آخرت سے ہے ان جادوگروں کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں اور اسلامی عقائد و اعمال کی کوئی تعلیم اُن کو ملی نہیں، یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کی برکت اور اُن کے اخلاص کا اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے اُن پر دین کے تمام حقائق آن کی آن میں ایسے کھول دیئے کہ اُن کے مقابلے میں نہ اپنی جان کی پروا رہی نہ کسی بڑی سے بڑی سزا اور تکلیف کا خوف رہا، گویا ایمان کیساتھ ساتھ ہی اُن کو ولایت کا بھی وہ مقام حاصل ہو گیا جو دوسروں کو عمر بھر کے مجاہدوں ریاضتوں سے بھی حاصل ہونا مشکل ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور عبید بن عمیرؓ نے فرمایا کہ قدرتِ حق کا یہ کرشمہ دیکھو کہ یہ لوگ شروع دن میں کفار جادوگر تھے اور آخر دن اولیاء اللہ اور شہداء۔ (ابن کثیر)

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ لے نکل میرے بندوں کو رات سے پھر

لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

ڈال دے اُن کے لئے سمندر میں رستہ سوکھا نہ خطرہ کر آ پکڑنے کا اور نہ ڈر ڈوبنے سے،

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ ط

پھر پیچھا کیا اُن کا فرعون نے اپنے لشکروں کو لے کر، پھر ڈھانپ لیا اُن کو پانی نے جیسا کہ ڈھانپ لیا

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اور بہکایا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ سمجھایا اے اولادِ اسرائیل

قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ

چھڑا لیا ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے اور وعدہ ٹھہرایا تم سے داہنی طرف پہاڑ کی

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اور اُتارا تم پر من اور سلویٰ کھاؤ ستھری چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو

وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ

اور نہ کرو اسمیں زیادتی پھر تو اُترے گا تم پر میرا غصہ اور جس پر اُترا میرا

غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

غصہ سو وہ ٹپکا گیا اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے

وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾
اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون اس پر بھی ایمان نہ لایا اور ایک عرصہ تک مختلف معاملات و واقعات ہوتے رہے اسوقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو مصر سے) راتوں رات (باہر) لے جاؤ (اور دُور چلے جاؤ تاکہ فرعون کے ظلم و شدائد سے ان کو نجات ہو) پھر (راہ میں جو دریا ملے گا تو) ان کے لئے دریا میں (عصا مار کر) خشک راستہ بنا دینا (یعنی عصا مارنا کہ اس سے خشک راستہ بن جاویگا) نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا (کیونکہ اہلِ تعاقب کامیاب نہ ہونگے گو تعاقب کریں) اور نہ اور کسی قسم کا (مثلاً غرق وغیرہ کا) خوف ہوگا (بلکہ امن و اطمینان سے پار ہو جاؤگے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام موافق حکم کے انکو شبا شب نکال لے گئے اور صبح مصر میں خبر مشہور ہوئی) پس فرعون اپنے لشکروں کو لیکر ان کے پیچھے چلا (اور بنی اسرائیل موافق وعدۂ الٰہیہ کے دریا سے پار ہو گئے اور ہنوز وہ دریائی راستے اسیطرح اپنی حالت پر تھے جیسا دوسری آیت میں ہے وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ، فرعونیوں نے جلدی میں کچھ آگا پیچھا سوچا نہیں، ان رستوں پر ہو لئے، جب سب اندر آگئے) تو (اس وقت چاروں طرف سے) دریا (کا پانی سمٹ کر) ان پر جیسا ملنے کو تھا آ ملا (اور سب غرق ہو کر رہ گئے) اور فرعون نے اپنی قوم کو بُری راہ پر لگایا اور نیک راہ اُن کو نہ بتلائی (جسکا اسکو دعویٰ تھا قٰ مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ، اور بُری راہ ہونا ظاہر ہے کہ دُنیا کا بھی ضرر ہوا کہ سب ہلاک ہوئے اور آخرت کا بھی، کیونکہ جہنم میں گئے جیسا کہ آیت میں ہے اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ اب پھر بنی اسرائیل کو فرعون کے تعاقب اور غرقِ دریا سے نجات کے بعد اور نعمتیں عنایت ہوئیں مثلاً عطائے توراۃ اور منّ و سلویٰ، ان نعمتوں کو عطا کر کے ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ) اے بنی اسرائیل (دیکھو ہمنے (تم کو کیسی کیسی نعمتیں دیں کہ) تم کو تمہارے (ایسے بڑے) دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے (یعنی تمہارے پیغمبر سے تمہارے نفع کے واسطے) کوہِ طور کی داہنی جانب آنیکا (اور وہاں آنیکے بعد توراۃ دینے کا) وعدہ کیا اور (وادی تیہ میں) ہم نے تم پر منّ و سلویٰ نازل فرمایا (اور اجازت دی کہ) ہمنے جو نفیس چیزیں (شرعاً بھی کہ حلال ہیں اور طبعاً بھی کہ لذیذ ہیں) تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور اس (کھانے) میں حد (شرعی) سے مت گزرو (مثلاً یہ کہ حرام سے حاصل کیا جاوے، کذا فی الدر یا کھا کر معصیت

کی جاوے) کہیں میرا غضب تم پر واقع ہو جائے، اور جس شخص پر میرا غضب واقع ہوتا ہے وہ بالکل گیا گزرا ہوا اور (نیز اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ) میں ایسے لوگوں کے لئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو (کفر و معصیت سے) توبہ کریں اور ایمان لے آویں اور نیک عمل کریں پھر (اسی راہ) پر قائم (بھی) رہیں (یعنی ایمان و عمل صالح پر مداومت کریں یہ مضمون ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تذکیر نعمت اور امر بالشکر و نہی عن المعصیت اور وعد و عید یہ خود بھی دینی نعمت ہے۔

معارف و مسائل

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى، حق و باطل معجزہ اور جادو کے فیصلہ کن معرکہ نے فرعون اور آلِ فرعون کی کمر توڑ دی اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی قیادت میں جمع ہو گئے تو اب ان کو یہاں سے ہجرت کا حکم ملتا ہے۔ اور چونکہ فرعون کے تعاقب اور آگے دریا کے راستہ میں حائل ہونے کا خطرہ سامنے تھا اس لئے دونوں چیزوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطمئن کر دیا گیا کہ دریا پر اپنی لاٹھی ماریں گے تو درمیان سے خشک راستے نکل آئیں گے اور پیچھے سے فرعون کے تعاقب کا خطرہ نہ رہے گا جسکا تفصیلی واقعہ حدیث الفتون کے تحت میں اسی سورۃ میں گزر چکا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا پر لاٹھی ماری تو اسمیں بارہ سڑکیں اس طرح بن گئیں کہ پانی کے تودے بحرِ منجمد کی طرح دونوں طرف پہاڑ کی برابر کھڑے رہے اور درمیان سے راستے خشک نکل آئے جیساکہ سورہ شعراء میں ہے فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، اور درمیان میں جو یہ پانی کی دیواریں ان بارہ سڑکوں کے درمیان تھیں ان کو قدرت نے ایسا بنا دیا کہ ایک سڑک سے گزرنے والے دوسری سڑکوں سے گزرنے والوں کو دیکھتے بھی جاتے تھے اور باہم باتیں بھی کرتے تھے تاکہ ان کے دلوں میں یہ خوف و ہراس بھی نہ رہے کہ ہمارے دوسرے قبیلوں کا کیا حال ہوا (قرطبی)

مصر سے نکلنے کے وقت بنی اسرائیل کے بعض حالات اور ان کی تعداد اور لشکر فرعون کی تعداد

تفسیر روح المعانی میں یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شروع رات میں بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے دریائے قلزم کی طرف نکلے۔ بنی اسرائیل نے اس سے پہلے شہر کے لوگوں میں یہ شہرت دیدی تھی کہ ہماری عید ہے ہم عید منانے کے لئے باہر جائیں گے اور اس بہانے سے قبطی لوگوں سے کچھ زیورات عاریۃً مانگ لئے کہ عید سے آکر واپس کر دیں گے۔ بنی اسرائیل کی تعداد اسوقت چھ لاکھ تین ہزار اور دوسری روایت میں چھ لاکھ ستر ہزار تھی (یہ اسرائیلی روایات ہیں جنمیں مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اتنی بات قرآن کریم کے اشارات اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ ان کے بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلے کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ بھی قدرتِ حق تعالیٰ کا ایک عظیم مشاہدہ تھا کہ

جب یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تو بارہ بھائی تھے، اب بارہ بھائیوں کے بارہ قبیلوں کی اتنی عظیم الشان تعداد مصر سے نکلی جو چھ لاکھ سے زائد بتلائی جاتی ہے۔ فرعون کو جب ان کے نکل جانے کی اطلاع ملی تو اپنی فوجیں جمع کیں جنہیں ستر ہزار سیاہ گھوڑے تھے اور لشکر کے مقدمہ میں سات لاکھ سوار تھے۔ جب پیچھے سے اس فوجی سیلاب کو اور آگے دریائے قلزم کو بنی اسرائیل نے دیکھا تو گھبرا اٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ، کہ ہم تو پکڑ لئے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ، کہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے راستہ دیگا، پھر بحکم ربانی دریا پر لاٹھی ماری اور اس میں بارہ سڑکیں خشک نکل آئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ان سے گزر گئے۔ جس وقت فرعون اور اس کا لشکر یہاں پہنچا تو لشکرِ فرعون یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر سہم گیا کہ ان کے لئے دریا میں کس طرح راستے بن گئے مگر فرعون نے ان کو کہا کہ یہ سب کرشمہ میری ہیبت کا ہے جس سے دریا کی روانی رک کر راستے بن گئے ہیں یہ کہہ کر فوراً آگے بڑھ کر اپنا گھوڑا دریا کے اس راستہ میں ڈالدیا اور سب لشکر کو پیچھے آنیکا حکم دیا۔ جس وقت فرعون مع اپنے تمام لشکر کے ان دریائی راستوں کے اندر سما چکے اسی وقت حق تعالیٰ نے دریا کو روانی کا حکم دیدیا اور دریا کے سب حصے مل گئے فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ کا یہی حاصل ہے (درمنثور)

وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ، فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ان کے واسطے سے تمام بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ کوہِ طور کی داہنی جانب چلے آئیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جائے اور بنی اسرائیل خود بھی ان کے شرفِ ہمکلامی کا مشاہدہ کرلیں۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى، یہ واقعہ اسوقت کا ہے جب بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد آگے بڑھے اور ایک مقدس شہر میں داخل ہونیکا ان کو حکم ملا۔ انھوں نے خلاف ورزی کی، اسکی یہ سزا دی گئی کہ اسی وادی میں جس کو وادیٔ تیہ کہتے ہیں قید کر دیئے گئے۔ یہاں سے چالیس سال تک باہر نہ نکل سکے۔ اس سزا کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے ان پر اس قید کے زمانے میں بھی طرح طرح کے انعامات ہوتے رہے انھیں میں سے منّ و سلویٰ کا انعام تھا جو انکی غذا کیلئے دیا جاتا تھا۔

وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى

اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ بولا وہ یہ آرہے ہیں میرے

اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا

پیچھے اور میں جلدی آیا تیری طرف اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو، فرمایا ہم نے تو بچلا دیا

قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿٨٥﴾ فَرَجَعَ مُوۡسٰٓى

تیری قوم کو تیرے پیچھے اور بہکایا اُن کو سامری نے پھر اُلٹا پھرا موسیٰ

اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ

اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا پچتاتا ہوا کہا اے قوم کیا تم سے وعدہ نہ کیا تھا

رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ؕ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ

تمہارے رب نے اچھا وعدہ کیا لمبی ہوگئی تم پر مدت یا چاہا تم نے

اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ ﴿٨٦﴾

کہ اُترے تم پر غضب تمہارے رب کا اس لئے خلاف کیا تم نے میرا وعدہ

قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا وَلٰـكِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا

بولے ہم نے خلاف نہیں کیا تیرا وعدہ اپنے اختیار سے لیکن اُٹھوایا ہم سے بھاری بوجھ

مِّنۡ زِيۡنَةِ الۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلۡقَى السَّامِرِىُّ ﴿٨٧﴾

قوم فرعون کے زیور کا سو ہم نے اسکو پھینک دیا، پھر اس طرح ڈالا سامری نے

فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوۡا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمۡ

پھر بنا نکالا انکے واسطے ایک بچھڑا ایک دھڑ جسمیں آواز گائے کی، پھر کہنے لگے یہ معبود ہے تمہارا

وَاِلٰهُ مُوۡسٰى ۙ فَنَسِىَ ﴿٨٨﴾ اَفَلَا يَرَوۡنَ اَلَّا يَرۡجِعُ اِلَيۡهِمۡ

اور معبود ہے موسیٰ کا سو وہ بھول گیا بھلا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ جواب تک نہیں دیتا اُن کو

قَوۡلًا ۙ وَّلَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ﴿٨٩﴾

کسی بات کا اور اختیار نہیں رکھتا اُن کے بُرے کا اور نہ بھلے کا

ع ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور (جب اللہ تعالیٰ کو توراۃ دینا منظور ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آنیکا حکم فرمایا اور قوم کو بھی یعنی بعضوں کو ساتھ آنیکا حکم ہوا (کذا فی فتح المنان عن الباب التاسع عشر من سفر الخروج) موسیٰ علیہ السلام شوق میں سب سے آگے تنہا جا پہنچے اور دوسرے لوگ اپنی جگہ رہ گئے طلب کا ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ) اے موسیٰ، آپ کو اپنی قوم سے آگے جلدی آنیکا کیا سبب ہوا، اُنھوں نے (اپنے گمان کے موافق) عرض کیا کہ وہ لوگ یہی تو ہیں میرے پیچھے پیچھے (آرہے ہیں) اور میں (سب سے پہلے) آپ کے پاس (یعنی اُس جگہ جہاں مکالمت و مخاطبت کا آپنے وعدہ فرمایا) جلدی سے اس لئے چلا آیا کہ آپ (زیادہ) خوش ہونگے (کیونکہ امتثالِ امر میں پیشقدمی کرنا زیادہ موجب خوشنودی کا ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری قوم کو تو ہم نے تمہارے (چلے آنے کے) بعد ایک بلا میں مبتلا کر دیا اور ان کو سامری نے گمراہ کر دیا (جسکا بیان آگے آتا ہے فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا الخ اور فتنّا میں اس ابتلاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب اس لئے کیا کہ خالق ہر فعل کا وہی ہے ورنہ اصل نسبت اس فعل کی سامری کی طرف ہے جس کو اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ میں ظاہر فرمایا ہے) غرض موسیٰ (علیہ السلام بعد انقضائے میعاد کے) غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کیطرف واپس آئے (اور) فرمانے لگے کہ اے میری قوم کیا تم سے تمہارے رب نے ایک اچھا (اور سچا) وعدہ نہیں کیا تھا (کہ ہم تمکو ایک کتاب احکام کی دیں گے تو اس کتاب کا تو تم کو انتظار واجب تھا) کیا تم پر (میعاد مقرر سے بہت) زیادہ زمانہ گزر گیا تھا (کہ اس کے ملنے سے نا اُمیدی ہو گئی اسلئے اپنی طرف سے ایک عبادت ایجاد کر لی) یا (باوجود نا اُمیدی نہ ہونے کے) تم کو یہ منظور ہوا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب واقع ہو اس لئے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا (کہ آپ کی واپسی تک کوئی نیا کام نہ کرینگے اور آپکے نائب ہارون علیہ السلام کی اطاعت کرینگے) اسکے خلاف کیا وہ کہنے لگے کہ ہم نے جو آپسے وعدہ کیا تھا اسکو اپنے اختیار سے خلاف نہیں کیا (یہ معنی نہیں کہ کسی نے ان سے زبردستی یہ فعل کرا لیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس رائے کو ہم نے ابتداءً جبکہ خالی الذہن تھے اختیار کر لیا تھا، اس کے خلاف سامری کا فعل ہمارے لئے منشاءِ اشتباہ بن گیا جس سے ہم نے وہ رائے سابق یعنی توحید اختیار نہ کی بلکہ رائے بدل گئی۔ گو اسپر بھی عمل اختیار ہی سے ہوا چنانچہ آئندہ کہا گیا) ولیکن قوم (قبط) کے زیور میں سے ہمپر بوجھ لد رہا تھا سو ہم نے اسکو (سامری کے کہنے سے آگ میں) ڈال دیا پھر اسی طرح سامری نے (بھی اپنے ساتھ کا زیور) ڈال دیا (آگے اللہ تعالیٰ قصہ کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں) پھر اُس (سامری) نے ان لوگوں کے لئے ایک بچھڑا (بنا کر) ظاہر

کیونکہ وہ ایک قالب (خالی از کمالات) تھا جس میں ایک (بے معنی) آواز تھی سو (اس کی نسبت وہ احمق لوگ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ تمہارا اور موسیٰ کا بھی معبود تو یہ ہے (اس کی عبادت کرو، موسیٰ تو بھول گئے (کہ طور پر خدا کی طلب میں گئے ہیں حق تعالیٰ ان کی احمقانہ جسارت پر فرماتے ہیں کہ) کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بواسطہ یا بلا واسطہ) نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ ان کے کسی ضرر یا نفع پر قدرت رکھتا ہے (ایسا ناکارہ خدا کیا ہوگا اور اللہ حق بواسطہ انبیاء کے خطاب و کلام ضروری فرماتا ہے)۔

معارف و مسائل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل فرعون کے تعاقب اور دریا سے نجات پانے کے بعد آگے بڑھے تو ان کا گزر ایک بت پرست قوم پر ہوا اور ان کی عبادت و پرستش کو دیکھ کر بنی اسرائیل کہنے لگے کہ جس طرح انھوں نے موجود اور محسوس چیزوں یعنی بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے احمقانہ سوال کے جواب میں بتلایا کہ تم بڑے جاہل ہو یہ بت پرست لوگ تو سب ہلاک ہونے والے ہیں اور ان کا طریقہ باطل ہے اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ سو وقت حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا کہ اپنی قوم کو ساتھ کو وطور پر آجائیے تو ہم آپ کو اپنی کتاب تورات عطا کریں گے جو آپکے اور آپ کی قوم کے لئے دستور العمل ہوگا مگر عطاء تورات سے پہلے آپ تیس روز اور تیس رات کا مسلسل روزہ رکھیں پھر اسکے بعد اس میعاد میں دس کا اور اضافہ کر کے چالیس روز کر دیئے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنی قوم کے کوہِ طور کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وعدۂ ربانی کی وجہ سے شوق بھڑک اُٹھا اور اپنی قوم کو یہ وصیت کر کے آگے چلے گئے کہ تم بھی میرے پیچھے آباؤ، میں آگے جا کر عبادت روزہ وغیرہ میں مشغول ہوتا ہوں جس کی میعاد مجھے تیس روز بتلائی گئی ہے، میری غیبت میں ہارون علیہ السلام میرے نائب اور قائم مقام ہونگے۔ بنی اسرائیل مع ہارون علیہ السلام کے اپنی رفتار سے پیچھے چلتے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی کر کے آگے بڑھ گئے اور خیال یہ تھا کہ قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے کوہِ طور کے قریب پہنچیں گے مگر وہاں وہ سامری کا فتنہ گوسالہ پرستی کا پیش آگیا۔ بنی اسرائیل کے تین فرقے ہو کر اختلاف میں مبتلا ہوگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے پہنچنے کا معاملہ رُک گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ نے یہ خطاب فرمایا وَمَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى، یعنی اے موسیٰ آپ اپنی قوم سے آگے جلدی کر کے کیوں آگئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عجلت کرنے کا سوال اور اس کی حکمت

سوال کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی حالت سے بے خبر رہ کر یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ بھی کوہِ طور کے قریب پہنچ گئے ہونگے اور قوم فتنہ میں مبتلا ہو چکی ہے اس کی خبر موسیٰ علیہ السلام کو دیدی جائے (از تفسیر ابن کثیر) اور روح المعانی میں بحوالہ کشف اس سوال کی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی تربیت کے متعلق ایک خاص ہدایت دینا اور ان کی اس عجلت پر تنبیہ کرنا تھا کہ آپکے منصبِ رسالت کا تقاضا یہ تھا کہ قوم کے ساتھ رہتے ان کو اپنی نظر میں رکھتے اور ساتھ لاتے۔ آپ کی عجلت کرنیکا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم کو سامری نے گمراہ کر دیا۔ اسمیں خود فعل عجلت کی مذمت کیطرف بھی اشارہ ہے کہ یہ شانِ انبیاء کی نہ ہونی چاہئے۔ اور بحوالہ انتصاف نقل کیا ہے کہ اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کیساتھ سفر کرنیکا طریقہ بتلایا گیا کہ رئیس القوم کو پیچھے رہنا چاہئے جیسے لوط علیہ السلام کے واقعہ میں حق تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ مومنین کو اپنے ساتھ لیکر شہر سے نکل جائیے، اُن کو آگے رکھ کر خود اُن سب کے پیچھے رہئے۔ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق عرض کیا کہ میری قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے پہنچنا ہی چاہتے ہیں اور میں کچھ جلدی کرکے آگے اسلئے آگیا کہ حکم کی تعمیل میں پیشقدمی کرنا حاکم کی زیادہ خوشنودی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ان کو قوم بنی اسرائیل میں پیش آنے والے فتنہ گوسالہ پرستی کی اطلاع دیدی اور یہ کہ انکو تو سامری نے گمراہ کر دیا ہے اور وہ فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

سامری کون تھا بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ آلِ فرعون کا قبطی آدمی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے پڑوس میں رہتا تھا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور جب بنی اسرائیل کو لیکر موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے ایک قبیلہ سامرہ کا رئیس تھا اور قبیلہ سامرہ ملک شام میں معروف ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رہ نے فرمایا کہ یہ فارسی شخص کرمان کا رہنے والا تھا۔ حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی قوم کا آدمی تھا جو گائے کی پرستش کرنے والی تھی یہ کسی طرح مصر پہنچ گیا اور بظاہر دینِ بنی اسرائیل میں داخل ہو گیا مگر اس کے دل میں نفاق تھا (قرطبی) حاشیہ قرطبی میں ہے کہ یہ شخص ہندوستان کا ہندو تھا جو گائے کی عبادت کرتے ہیں۔ انتہیٰ۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا یا پہلے ہی سے منافقانہ طور پر ایمان کا اظہار کیا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

مشہور یہ ہے کہ سامری کا نام موسیٰ ابن ظفر تھا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رض سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ سامری پیدا ہوا تو فرعون کی طرف سے تمام اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا حکم جاری تھا اس کی والدہ کو خوف ہوا کہ فرعونی سپاہی اس کو قتل کر دیں گے تو بچہ کو اپنے سامنے

قتل ہوتا دیکھنے کی مصیبت سے یہ بہتر سمجھا کہ اس کو جنگل کے ایک غار میں رکھ کر اوپر سے بند کر دیا (کبھی کبھی اسکی خبر گیری کرتی ہوگی) ادھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو اس کی حفاظت اور غذا دینے پر مامور کر دیا وہ اپنی ایک انگلی پر شہد ایک پر مکھن ایک پر دودھ لاتے اور اس بچہ کو چٹاتے تھے یہانتک کہ یہ غار ہی میں پل کر بڑا ہو گیا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ کفر میں مبتلا ہوا اور بنی اسرائیل کو مبتلا کیا پھر قہر الٰہی میں گرفتار ہوا۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے دو شعروں میں اسطرح ضبط کیا ہے (از روح المعانی) سے

اذا المرء لم یخلق سعیدا تحیرت عقول مربیہ وخاب المؤمل

فموسی الذی رباہ جبریل کافر وموسی الذی رباہ فرعون مرسل

(ترجمہ) جب کوئی شخص اصل پیدائش میں نیک بخت نہ ہو تو اسکے پرورش کرنے والوں کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں اور اس سے اُمید کرنے والا محروم ہو جاتا ہے۔ دیکھو جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا تھا وہ تو کافر ہو گیا اور جس موسیٰ کو فرعون لعین نے پالا تھا وہ خدا کا رسول بن گیا۔

اَلَمْ یَعِدْکُمْ رَبُّکُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رنج و غم کے عالم میں واپس آ کر قوم سے خطاب کیا اور پہلے اُن کو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یاد دلایا جس کے لئے وہ سب قوم کو لیکر طور کی جانب ایمن کیطرف چلے تھے کہ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ہدایت عطا فرمائینگے اور جس کے ذریعہ دین و دُنیا کے تمام مقاصد تمہارے پُورے ہوں گے۔

اَفَطَالَ عَلَیْکُمُ الْعَھْدُ ۔ یعنی اللہ کے اس وعدہ پر کوئی بڑی مدت بھی تو نہیں گزری جس میں تمہارے بھُول جانے کا احتمال ہو کہ وعدہ کا انتظار زمانہ دراز تک کرنے کے بعد مایوس ہو گئے اس لئے دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔

اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۔ یعنی بھُول جانے یا انتظار سے تھک جانے کا تو کوئی احتمال نہیں تو اب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم نے خود ہی اپنے قصد و اختیار سے اپنے رب کے غضب کو دعوت دی۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا ۔ لفظ مَلْک بفتح میم و بضم میم دونوں کے معنے تقریباً ایک ہیں اور مُراد اس جگہ اس سے اپنا اختیار ہے اور مقصد اسکا یہ ہے کہ تم نے گوسالہ کی پرستش پر اقدام اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ سامری کے عمل کو دیکھ کر ہم مجبور ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے۔ سامری یا اس کے عمل نے ان کو مجبور تو نہیں کر دیا تھا خود ہی غور و فکر سے کام نہ لیا تو مبتلا ہو گئے آگے سامری کا وہ واقعہ بیان کیا۔

وَلٰکِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ ۔ لفظ اوزار وزر کی جمع ہے جکے

معنے ثقل اور بوجھ کے ہیں انسان کے گناہ بھی چونکہ قیامت کے روز اُس پر بوجھ بنکر لادے جائینگے اس لئے گناہ کو وزر اور گناہوں کو اوزار کہا جاتا ہے۔ زینۃ القوم، لفظ زینت سے مُراد زیور ہے اور قوم سے مراد قوم فرعون (قبط) ہے جن سے بنی اسرائیل نے عید کا بہانہ کرکے کچھ زیورات مستعار لے لئے تھے اور وہ پھر اُن کے ساتھ رہے۔ اُن کو اوزار یعنی گناہوں کا بوجھ اس لئے کہا کہ عاریت کا نام کرکے ان لوگوں سے لئے تھے جسکا حق یہ تھا کہ اُن کو واپس کئے جاویں چونکہ واپس نہیں کئے گئے تو اس کو گناہ قرار دیا۔ اور حدیث فتون کے نام سے جو مفصل حدیث اُوپر نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو اُس کے گناہ ہونے پر متنبہ کیا اور ایک گڑھے میں یہ سب زیورات ڈالدینے کا حکم دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے ان کو کہا کہ یہ زیورات دوسروں کا مال ہے تمہارے لئے اس کا رکھنا وبال ہے اسکے کہنے سے گڑھے میں ڈالے گئے۔

کفار کا مال مسلمان کیلئے کس صورت میں حلال ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار جو اہلِ ذمہ یعنی مسلمانوں کی حکومت میں اُن کے قانون کی پابندی کرکے بستے ہیں اسی طرح وہ کفار جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ جان و مال وغیرہ کے امن کا ہوجائے ان کفروں کا مال تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے حلال نہیں لیکن جو کافر نہ مسلمانوں کا اہلِ ذمہ ہے نہ اُس سے انکا کوئی عہد و معاہدہ ہے جن کو فقہاء کی اصطلاح میں کافر حربی کہا جاتا ہے اُن کے اموال تو مسلمانوں کے لئے مباح الاصل اشیاء کی طرح حلال ہیں پھر ہارون علیہ السلام نے ان کو وزر و گناہ کیسے قرار دیا اور اُن کے قبضہ سے نکال کر گڑھے میں ڈالنے کا حکم کیوں دیا۔ اسکا ایک جواب تو مشہور ہے جو عامۂ مفسرین نے لکھا ہے کہ کفار حربی کا مال لینا اگرچہ مسلمان کے لئے جائز ہے مگر وہ مال بحکم مال غنیمت ہے اور مالِ غنیمت کا قانون شریعت اسلام سے پہلے یہ تھا کہ کافروں کے قبضہ سے نکال لینا تو اسکا جائز تھا مگر مسلمانوں کے لئے اسکا استعمال اور اس سے نفع اُٹھانا حلال نہیں تھا بلکہ مال غنیمت جمع کرکے کسی ٹیلہ وغیرہ پر رکھدیا جاتا تھا اور آسمانی آگ (بجلی وغیرہ) آکر اسکو کھا جاتی تھی یہی علامت اُن کے جہاد قبول ہونے کی تھی اور جس مالِ غنیمت کو آسمانی آگ نہ کھائے وہ علامت اسکی تھی کہ جہاد مقبول نہیں اسلئے وہ مال بھی منحوس سمجھا جاتا اور کوئی اسکے پاس نہ جاتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں جو مخصوص رعایتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مال غنیمت کو مسلمانوں کے لئے حلال کردیا گیا جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

اس قاعدہ کے اعتبار سے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہوا مال جو قوم فرعون سے لیا

تھا مالِ غنیمت ہی کے حکم میں قرار دیا جائے تب بھی اس کا استعمال ان کے لئے جائز نہیں تھا اسی وجہ سے اس مال کو اوزار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور حضرت ہارون کے حکم سے اسکو ایک گڑھے میں ڈالدیا گیا۔
فائدہ مہمہ | لیکن فقہی نظر سے اس معاملہ کی جو تحقیق امام محمدؒ کی کتاب سیر اور اسکی شرح سرخسی میں بیان کی گئی ہے وہ بہت اہم اور اقرب الی الصواب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کافر حربی کا مال بھی ہر حال میں مالِ غنیمت نہیں ہوتا بلکہ اسکی شرط یہ ہے کہ باقاعدہ جہاد و قتال کے ذریعہ بزور شمشیر اُسے حاصل کیا جائے اسی لئے شرح سیر میں مغالبہ بالمحاربہ شرط قرار دیا ہے اور کافر حربی کا جو مال مغالبہ اور محاربہ کی صورت سے حاصل نہ ہو وہ مال غنیمت نہیں بلکہ اس کو مال فیئ کہتے ہیں مگر اُس کے حلال ہونے میں ان کفار کی رضا و اجازت شرط ہے جیسے کوئی اسلامی حکومت ان پر ٹیکس عائد کر دے اور وہ اس پر راضی ہو کر ٹیکس دیدے تو اگرچہ یہ کوئی جہاد و قتال نہیں مگر رضامندی سے دیا ہوا مال مال فیئ کے حکم میں ہے اور وہ بھی حلال ہے۔

یہاں قومِ فرعون سے لئے ہوئے زیورات ان دونوں قسموں میں داخل نہیں کیونکہ یہ اُن سے عاریت کہہ کر لئے گئے تھے وہ ان کو مالکانہ طور پر دینے کے لئے رضامند نہ تھے کہ اس کو مال فیئ کہا جائے اور کوئی جہاد و قتال تو وہاں ہوا ہی نہیں کہ مالِ غنیمت شمار کیا جائے اسلئے شریعتِ اسلام کی رُو سے بھی یہ مال اُن کے لئے حلال نہ تھا۔

واقعہ ہجرت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ جانیکا قصد فرمالیا اور آپکے پاس عرب کے کفار کی بہت سی امانتیں رکھی تھیں کیونکہ سارا عرب آپ کو امانتدار یقین کرتا اور امین کے لفظ سے خطاب کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی امانتوں کو واپس کرنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد کر کے اپنے پیچھے ان کو چھوڑا اور حکم دیا کہ جس جس کی امانت ہے اُس کو واپس کر دی جائے آپ اس سے فارغ ہو کر ہجرت کریں۔ اس مال کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے تحت حلال قرار نہیں دیا ورنہ وہ مسلمانوں کا حق ہوتا کافروں کو واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ واللہ اعلم

فَقَذَفْنٰهَا، یعنی ہم نے ان زیورات کو پھینک دیا۔ حدیث فتون مذکورہ کی رُو سے یہ عمل حضرت ہارون علیہ السلام کے حکم سے کیا گیا اور بعض روایات میں ہے کہ سامری نے انکو بہکا کر زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور دونوں باتیں جمع ہو جائیں یہ بھی کوئی مستبعد نہیں۔

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ، حدیث فتون مذکور میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے سب زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور اسمیں آگ جلوا دی کہ سب زیورات پگھل کر یک جسم ہو جائیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے آنے کے بعد اسکا معاملہ طے کیا جاویگا کہ کیا کیا جائے۔ جب سب لوگ اپنے اپنے زیورات اسمیں ڈال چکے تو سامری بھی مٹھی بند کئے ہوئے پہنچا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں بھی ڈالدوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ سمجھ کر اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہوگا، فرمایا کہ ڈالدو۔ اُسوقت سامری نے ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں جب ڈالونگا کہ آپ یہ دُعا کریں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ پُورا ہوجائے۔ ہارون علیہ السلام کو اسکا نفاق و کفر معلوم نہیں تھا دُعا کردی۔ اب جو اُس نے اپنے ہاتھ سے ڈالا تو زیور کے بجائے مٹی تھی جس کو اُس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے کہیں یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھ کر اُٹھا لیا تھا کہ جس جگہ اس کا قدم پڑتا ہے وہیں مٹی میں نشو ونما اور آثارِ حیات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے اُس نے سمجھا کہ اس مٹی میں آثارِ حیات رکھے ہوئے ہیں، شیطان نے اس کو اس پر آمادہ کردیا کہ یہ اس کے ذریعہ ایک بچھڑا زندہ کرکے دکھلادے۔ بہرحال اس مٹی کا ذاتی اثر ہو یا حضرت ہارون علیہ السلام کی دُعا، کا کہ یہ سونے چاندی کا پگھلا ہوا ذخیرہ اس مٹی کے ڈالنے اور ہارون علیہ السلام کی دُعا، کرنے کے ساتھ ایک زندہ بچھڑا بن کر بولنے لگا۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری ہی نے بنی اسرائیل کو زیورات اس گڑھے میں ڈالنے کا مشورہ دیا تھا۔ اُن میں یہ بھی ہے کہ اُس نے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی صورت تیار کرلی تھی مگر اسمیں کوئی زندگی نہیں تھی۔ پھر یہ جبرئیل امین کے نشانِ قدم کی مٹی ڈالنے کے بعد اسمیں حیات پیدا ہوگئی (یہ سب روایات تفسیر قرطبی وغیرہ میں مذکور ہیں اور ظاہر ہے کہ اسرائیلی روایات ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا مگر انکو غلط کہنے کی بھی کوئی دلیل موجود نہیں)، فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ، یعنی نکال لیا سامری نے ان زیورات سے ایک بچھڑے کا جسم جسمیں گائے کی آواز (خُوار) تھی۔ لفظ جسداً سے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ محض ایک جسد اور جسم تھا زندگی اسمیں نہیں تھی اور آواز بھی ایک خاص صفت کے سبب اس سے نکلتی تھی۔ عامہ مفسرین کا قول وہی ہے جو اوپر لکھا گیا کہ اسمیں آثار زندگی کے تھے۔

فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ، یعنی سامری اور اسکے ساتھی یہ بچھڑا بولنے والا دیکھ کر دوسرے بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ یہی تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے موسیٰ علیہ السلام بھول بھٹک کر کہیں اور چلے گئے۔ یہاں تک بنی اسرائیل کے عذرِ لنگ کا بیان تھا جو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عتاب کے وقت پیش کیا اس کے بعد اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا میں ان کی حماقت اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے کہ اگر یہ فی الواقع ایک بچھڑا زندہ ہی ہوگیا اور گائے کی طرح بولنے بھی لگا تو عقل کے دشمنو یہ تو سمجھو کہ خدائی کا اس سے کیا واسطہ ہے جبکہ نہ وہ تمہاری کسی بات کا جواب دے سکتا ہے نہ تمہیں کوئی

نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے تو اس کو خدا ماننے کی حماقت کا کیا جواز ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ

اور کہا تھا ان کو ہارون نے پہلے سے اے قوم بات یہی ہے کہ تم بہک گئے اس بچھڑے سے

وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے سو میری راہ چلو اور مانو بات میری

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا

بولے ہم برابر اسی پر لگے بیٹھے رہیں گے جب تک لوٹ کر آئے ہمارے پاس

مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾

موسیٰ کہا موسیٰ نے اے ہارون کس چیز نے روکا تجھ کو جب دیکھا تھا تو نے کہ وہ بہک گئے

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ

کہ تو میرے پیچھے نہ آیا کیا تو نے رد کیا میرا حکم وہ بولا اے میری ماں کے جنے نہ پکڑ

بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ

میری داڑھی اور نہ سر، میں ڈرا کہ تو کہے گا پھوٹ ڈال دی تو نے

بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

بنی اسرائیل میں اور یاد نہ رکھی میری بات

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں سے ہارون (علیہ السلام) نے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے سے) پہلے بھی کہا تھا کہ اے میری قوم تم اس (گوسالہ) کے سبب گمراہی میں پھنس گئے ہو (یعنی اس کی پرستش کسی طرح درست نہیں ہو سکتی یہ کھلی گمراہی ہے) اور تمہارا رب (حقیقی) رحمان ہے (نہ کہ یہ گوسالہ) سو تم (دین کے بارے میں) میری راہ پر چلو اور (اس باب میں) میرا کہنا مانو (یعنی میرے قول و فعل کی اقتدا کرو) انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس (ہو کر) آئیں اسی (کی عبادت) پر برابر جمے بیٹھے رہیں گے (غرض ہارون علیہ السلام کا کہنا نہیں مانا تھا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آگئے اور قوم سے اوّل خطاب کیا جو اوپر آچکا بعد اس کے ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور) کہا اے ہارون جب تم نے (انکو) دیکھا

تھا کہ یہ (بالکل) گمراہ ہو گئے (اور نصیحت بھی نہیں سُنی) تو (اس وقت) تم کو میرے پاس چلے آنے سے کون امر مانع ہوا تھا (یعنی اسوقت میرے پاس چلا آنا چاہئیے تھا تاکہ ان لوگوں کو اور زیادہ یقین ہو تاکہ تم اُن کے فعل کو نہایت ناپسند کرتے ہو اور نیز ایسے باغیوں سے قطع تعلقات جس قدر زیادہ ہو بہتر ہے) سو کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا (کہ میں نے کہا تھا ﴿لَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ﴾ جیسا پارہ نہم میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مفسدین کے راستہ کا اتباع نہ کریں جس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مفسدین کے ساتھ تعلقات نہ رکھیں اور سب سے الگ ہو جائیں) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (یعنی میرے بھائی) تم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر (کے بال) پکڑو (اور میرا عذر سُن لو میرے تمہارے پاس نہ آنے کی یہ وجہ تھی کہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ (اگر میں آپ کی طرف چلا تو میرے ساتھ وہ لوگ بھی چلیں گے جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں تو بنی اسرائیل کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جاویں گے کیونکہ گوسالہ کی پرستش کو بُرا سمجھنے والے میرے ساتھ ہونگے اور دوسرے لوگ اس کی عبادت پر ہی جمے رہیں گے اور اس حالت میں) تم کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈالدی (جو بعض اوقات انکے ساتھ رہنے سے زیادہ مضر ہوتی ہے کہ مفسدین خالی میدان پاکر بے خطر فساد میں ترقی کرتے ہیں) اور تم نے میری بات کا پاس نہ کیا (کہ میں نے کہا تھا اَصْلِحْ، یعنی اس صورت میں آپ مجھے یہ الزام دیتے کہ میں نے تمہیں اصلاح کرنیکا حکم دیا تھا تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈالکر فساد کھڑا کر دیا)۔

معارف و مسائل

بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹ پڑا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی خلافت اور نیابت کا حق ادا کر کے قوم کو سمجھایا مگر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُن میں تین فرقے ہو گئے ایک فرقہ تو حضرت ہارون کے ساتھ رہا اُن کی اطاعت کی اُس نے گوسالہ پرستی کو گمراہی سمجھا اُن کی تعداد بارہ ہزار بتلائی گئی ہے، کذا فی القرطبی۔ باقی دو فرقے گوسالہ پرستی میں تو شریک ہو گئے فرق اتنا رہا کہ ان دونوں میں سے ایک فرقے نے یہ اقرار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آ کر اس سے منع کریں گے تو ہم گوسالہ پرستی کو چھوڑ دیں گے۔ دوسرا فرقہ اتنا پختہ تھا کہ اسکا یقین یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی واپس آ کر اسی کو معبود بنائیں گے اور ہمیں اس طریقے کو بہر حال چھوڑنا نہیں ہے۔ جب ان دونوں فرقوں کا یہ جواب حضرت ہارون نے سُنا کہ ہم تو موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک گوسالہ ہی کی عبادت پر جمے رہیں گے تو حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ہم عقیدہ بارہ ہزار ساتھیوں کو لیکر اُن سے الگ تو ہو گئے مگر رہنے سہنے وغیرہ کی جگہ وہی تھی اسمیں اُن کے ساتھ اشتراک رہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس آکر اوّل تو بنی اسرائیل کو وہ خطاب کیا جو پچھلی آیتوں میں بیان ہوا ہے پھر اپنے خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اُن پر سخت غصّہ اور ناراضی کا اظہار کیا اُن کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور فرمایا کہ جب ان بنی اسرائیل کو آپ نے دیکھ لیا کہ کھُلی گمراہی یعنی شرک و کفر میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئے تو تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا، میرے حُکم کی خلاف ورزی کیوں کی۔

مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوٓا أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۝ اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ تمھیں میرا اتباع کرنے سے کس چیز نے روکا، اس اتباع کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا کہ اتباع سے مُراد موسیٰ علیہ السلام کے پاس طُور پر چلا جانا ہے اور بعض مفسّرین نے اتباع کی مُراد یہ قرار دی کہ جب یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو آپ نے ان کا مقابلہ کیوں نہ کیا کیونکہ میری موجودگی میں ایسا ہوتا تو میں یقیناً اس شرک و کفر پر قائم رہنے والوں سے جہاد اور مقاتلہ کرتا تم نے ایسا کیوں نہ کیا۔

دونوں صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام پر الزام یہ تھا کہ ایسی گمراہی کی صورت میں یا تو اُن سے مقاتلہ اور جہاد کیا جاتا یا پھر اُن سے برأت اور علیحدگی اختیار کر کے میرے پاس آجاتے، اُن کے ساتھ رہتے بستے رہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اُن کی خطا اور غلطی تھی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اس معاملے کے باوجود ادب کی پوری رعایت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو نرم کرنے کے لئے خطاب یَا بْنَؤُمَّ کے الفاظ سے کیا یعنی میری ماں کے بیٹے اس خطاب میں ایک خاص اشارہ سختی کا معاملہ نہ کرنے کی طرف تھا کہ میں آپ کا بھائی ہی تو ہوں کوئی مخالف تو نہیں اسلئے آپ میرا عُذر سُنیں۔ پھر عذر یہ بیان کیا کہ مجھے خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے پر آپکے آنے سے پہلے اقدام کیا یا انکو چھوڑ کر خود بارہ ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ آپکے پاس چلا گیا، تو بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا ہو جائیگا اور آپ نے جوتے وقت مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ اَخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ میں اس اصلاح کا مقتضا یہ سمجھا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں (ممکن ہے کہ آپکے واپس آنے کے بعد یہ سب ہی سمجھ جائیں اور ایمان و توحید پر واپس آجائیں) اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہارون علیہ السلام کے عُذر میں یہ قول بھی ہے کہ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي یعنی قوم بنی اسرائیل نے مجھے ضعیف و کمزور سمجھا کیونکہ میرے ساتھی دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم تھے اسلئے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے۔

خلاصہ عذر کا یہ ہے کہ میں اُن کی گمراہی کا ساتھی نہیں تھا جتنا سمجھانا اور ہدایت پر رکھنا میرے بس میں تھا وہ میں نے پُورا کیا اُن لوگوں نے میری بات نہ مانی اور میرے قتل کرنے کے درپے ہو گئے ایسی صورت میں اُن سے مقاتلہ کرتا یا اُن کو چھوڑ کر آپکے پاس جانیکا ارادہ کرتا تو صرف یہ بارہ ہزار

بنی اسرائیل میرے ساتھ ہوتے باقی سب مقاطعہ اور مقابلہ پر آجاتے اور باہمی معرکہ گرم ہوجاتا، میں نے اس سے بچنے کے لئے آپ کی واپسی تک کے لئے کچھ مساہلت کی صورت اختیار کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر سُنا تو ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور اصل بانی فساد سامری کی خبر لی۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی رائے کو صحیح مان لیا یا محض اُن کی خطاء اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا۔

دو پیغمبروں میں اختلاف رائے اور دونوں طرف صواب کے پہلو اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور اُنکے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے تھا ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آجاتے جس سے اُن کے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہوجاتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجائیں گے اور تفرقہ قائم ہوجائے گا اور چونکہ اُن کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد اُن کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آویں اس لئے کچھ دنوں کے لئے اُن کے ساتھ مساہلت اور مساکنت کو اُنکی اصلاح کی توقع تک گوارا کیا جائے۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، ایمان و توحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعہ کو اسکی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاح حال کی اُمید تک اُن کے ساتھ مساہلت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لئے نافع سمجھا۔ دونوں جانبین اہل عقل و فہم اور فکر و نظر کے لئے محل غور و فکر ہیں۔ کسی کو خطا کہنا آسان نہیں مجتہدین اُمت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں انہیں کسی کو گناہگار یا نافرمان نہیں کہا جاسکتا رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کے بال پکڑنے کا معاملہ تو یہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے شدت و غضب کا اثر تھا کہ تحقیق حال سے پہلے اُنھوں نے ہارون علیہ السلام کو ایک واضح غلطی پر سمجھا اور جب ان کا عذر معلوم ہوگیا تو پھر اپنے لئے اور اُن کے لئے دُعاء مغفرت فرمائی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا

کہا موسیٰ نے اب تیری کیا حقیقت ہے اے سامری بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا

بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ

پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈالدی اور یہی صلاح

سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ

دی مجھ کو میرے جی نے کہا موسیٰ نے دُور ہو تیرے لئے زندگی بھر تو اتنی سزا ہے

اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ

کہ کہا کرے مت چھیڑو اور تیرے واسطے ایک وعدہ ہے وہ ہرگز تجھ سے خلاف نہ ہوگا

وَانْظُرْ إِلٰٓى إِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۖ لَّنُحَرِّقَنَّهٗ

اور دیکھ اپنے معبود کو جس پر تمام دن تو معتکف رہتا تھا ہم اس کو جلا دیں گے

ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ إِنَّمَآ إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ

پھر بکھیر دیں گے دریا میں اُڑا کر تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کسی

إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

کی بندگی نہیں سب چیز سما گئی ہے اس کے علم میں

خلاصۂ تفسیر

(پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے) کہا کہ اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے (یعنی تو نے یہ حرکت کیوں کی) اس نے کہا کہ مجھ کو ایسی چیز نظر آئی تھی جو اوروں کو نظر نہ آئی تھی (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر چڑھے ہوئے جس وقت دریا سے پار اُترے ہیں جو بسلسلہ نصرت مومنین و اہلاک کفار کے آئے ہوں گے اور تاریخ طبری میں سدی سے بسند نقل کیا ہے کہ حضرت جبرئیل موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ حکم لیکر گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے کہ آپ طور پر جاویں تو اُسوقت سامری نے دیکھا تھا) پھر میں نے اس فرستادہ (خداوندی کی سواری) کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی (بھر کر خاک) اُٹھالی تھی (اور خود بخود میرے قلب میں یہ بات آئی کہ اس میں زندگی کے اثرات ہونگے جس چیز پر ڈالی جائے گی اُسمیں زندگی پیدا ہو جائے گی) سو میں نے وہ مٹھی (خاک اس بچھڑے کے قالب کے اندر) ڈالدی اور میرے جی کو یہی بات (بھائی اور پسند آئی) آپ نے فرمایا تو بس تیرے لئے اس (دنیوی) زندگی میں یہ سزا (تجویز کی گئی) ہے کہ تو یہ کہتا پھریگا کہ مجھ کو کوئی ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لئے (اس سزا کے سوا) ایک وعدہ (حق تعالیٰ کے عذاب کا) ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں (یعنی آخرت میں جو عذاب ہوگا) اور تو اپنے اس معبود (باطل) کو دیکھ جس (کی عبادت) پر تو جما ہوا بیٹھا تھا (دیکھ) ہم اسکو جلا دینگے پھر اس (کی راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہادیں گے (تاکہ نام و نشان اسکا نہ رہے) بس تمہارا

(حقیقی) معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ (اپنے) علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

معارف و مسائل

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ، (یعنی وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی) اس سے مراد جبرئیل امین ہیں اور اُن کے دیکھنے کے واقعہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے دریائے قلزم میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے اور فرعونی لشکر دریا میں داخل ہو رہا تھا تو جبرئیل امین گھوڑے پر سوار یہاں موجود تھے دوسری روایت یہ ہے کہ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر آنے کی دعوت دینے کے لئے جبرئیل امین گھوڑے پر سوار تشریف لائے تھے انکو سامری نے دیکھ لیا دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا اسکی وجہ حضرت ابن عباس رض کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سامری کی پرورش خود جبرئیل امین کے ذریعہ ہوئی تھی جس وقت اسکی ماں نے اسکو غار میں ڈال دیا تھا تو جبرئیل امین روزانہ اسکو غذا دینے کے لئے آتے تھے اس کی وجہ سے وہ اُن سے مانوس تھا اور پہچانتا تھا دوسرے لوگ نہیں پہچان سکے (بیان القرآن)

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ، رسول سے مُراد اس جگہ فرستادہ خداوندی حضرت جبرئیل امین ہیں۔ سامری کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ جبرئیل امین کے گھوڑے کا قدم جس جگہ پڑتا ہے وہاں کی مٹی میں حیات و زندگی کے خاص اثرات ہوں گے یہ مٹی اُٹھالی جاوے اس نے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھالی۔ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے القی فی روعہ انہ لا یلقیھا علی شیء فیقول کن کذا الا کان، یعنی سامری کے دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوئی کہ نشانِ قدم کی اس مٹی کو جس چیز پر ڈال کر یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز بن جا تو وہ وہی چیز بن جائیگی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سامری نے گھوڑے کے نشان قدم کا یہ اثر مشاہدہ کیا کہ جس جگہ قدم پڑتا وہیں سبزہ فوراً نمودار ہو جاتا تھا جس سے یہ استدلال کیا کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں، کذا فی الکمالین۔ اسی تفسیر کو روح المعانی میں صحابہ و تابعین اور جمہور مفسرین سے منقول کہا ہے اور اسمیں آجکل ظاہر پرست لوگوں نے جو شبہات نکالے ہیں ان سب کا جواب دیا ہے فجزاہ اللہ خیر الجزاء (بیان القرآن)

پھر جب بنی اسرائیل کے جمع کئے زیورات سے اس نے ایک بچھڑے کی ہیئت بنالی تو اپنے گمان کے مطابق کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں جس چیز میں ڈال جائے گی اسمیں زندگی پیدا ہو جائے گی اس نے یہ مٹی اُس بچھڑے کے اندر ڈالدی بقدرتِ خداوندی اُسمیں حیات کے

آثار پیدا ہوگئے اور بولنے لگا۔ اور حدیث فتون جو پہلے مفصل آچکی ہے اسمیں یہ ہے کہ اسنے حضرت ہارون علیہ السلام سے دعا کرائی کہ میں اپنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اسکو ڈالتا ہوں شرط یہ ہے کہ آپ یہ دعا کردیں کہ جو میں چاہتا ہوں وہ ہوجاوے۔ حضرت ہارون اسکے نفاق اور گوسالہ پرستی سے واقف نہ تھے دعا کردی اور اُسنے وہ خاک نشانِ قدم کی اسمیں ڈالدی تو حضرت ہارون کی دعا سے اسمیں حیات کے آثار پیدا ہوگئے۔ ایک روایت کے حوالے سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سامری فارس یا ہندوستان کا باشندہ اُس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کرتی ہے، مصر پہنچکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا بعد میں پھر مرتد ہوگیا یا پہلے ہی ایمان کا اظہار منافقانہ کیا تھا پھر نفاق ظاہر ہوگیا۔ اس اظہارِ ایمان کا فائدہ اسکو یہ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دریا سے پار ہوگیا۔

فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے دنیا کی زندگی میں یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے مقاطعہ کریں کوئی اس کے پاس نہ جاوے اور اسکو بھی یہ حکم دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور زندگی بھر اسی طرح وحشی جانوروں کی طرح سب سے الگ رہے۔ یہ سزا ہو سکتا ہے کہ ایک قانون کی صورت میں ہو جس کی پابندی اسپر اور دوسرے سب بنی اسرائیل پر منجانب موسیٰ علیہ السلام لازم کردی گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قانونی حیثیت کی سزا سے آگے خود اسکی ذات میں بقدرتِ خداوندی کوئی ایسی بات پیدا کردی گئی ہو کہ نہ وہ دوسروں کو چھو سکے نہ کوئی دوسرا اسکو چھو سکے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اسمیں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ہاتھ لگا دے یا کوئی اسکو ہاتھ لگا دے تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، کذا فی المعالم۔ اس ڈر کے مارے وہ سب سے الگ بھاگا پھرتا تھا اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو دور سے پکارتا تھا لَا مِسَاسَ یعنی کوئی مجھے نہ چھوئے۔

سامری کی سزا میں ایک لطیفہ | روح المعانی میں بحوالہ بحر محیط نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کردینے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی سخاوت اور لوگوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے قتل کی سزا سے منع فرمادیا (بیان القرآن)

لَنُحَرِّقَنَّهٗ (یعنی ہم اس کو آگ میں جلائیں گے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا سونے چاندی کے زیورات سے گھڑا ہوا تھا تو اسکے آگ میں جلانے کی کیا صورت ہوگی سونا چاندی پگھلنے والی چیز ہے جلنے والی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اول تو خود اسمیں اختلاف ہے کہ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہونے کے بعد بھی وہ چاندی سونے ہی کا رہا یا اسکی حقیقت تبدیل ہوکر گوشت اور خون بن گیا۔ اگر وہ گوشت اور لحم ودم بن گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اسکو جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ذبح کرکے جلادیا جاویگا اور اگر دوسرا قول لیا جاوے تو آگ میں جلانیکا مطلب یہ ہوگا کہ اسکو سوہان سے ریت کر

ذرہ ذرہ کر دیا جاوے گا (کمافی الدر المنثور) یا کسی حیلۂ اکسیریہ سے جلا دیا جاوے گا (کمافی روح المعانی) اور یہ بھی کوئی امر مستبعد نہیں کہ احراق اور جلانا بطور خرق عادت و معجزہ ہو واللہ اعلم (بیان القرآن)

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ

یوں سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے احوال جو پہلے گزر چکے اور ہم نے دی تجھ کو

مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ

اپنے پاس سے پڑھنے کی کتاب جو کوئی منہ پھیرے اس سے سو وہ اٹھائے گا دن

الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

قیامت کے ایک بوجھ سدا رہیں گے اسمیں اور برا ہے ان پر قیامت میں وہ

حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ

بوجھ اٹھانے کا جس دن پھونکیں گے صور میں اور گھیر لائیں گے ہم گنہگاروں کو اس دن

زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَحْنُ

نیلی آنکھیں چپکے چپکے کہتے ہونگے آپس میں تم نہیں رہے مگر دس دن ہم کو

اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ

خوب معلوم ہے جو کچھ کہتے ہیں جب بولے گا ان میں اچھی راہ روش والا تم نہیں رہے

اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ

مگر ایک دن اور تجھ سے پوچھتے ہیں پہاڑوں کا حال سو تو کہہ انکو بکھیر دیگا میرا رب

نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا

اُڑا کر پھر کر چھوڑیگا زمین کو صاف میدان نہ دیکھے تو اس میں موڑ

وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

اور نہ ٹیلا اس دن پیچھے دوڑیں گے پکارنے والے کے ٹیڑھی نہیں جس کی بات اور

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾

دب جائیں گی آوازیں رحمٰن کے ڈر سے پھر تو نہ سنے گا مگر کھس کھسی آواز

يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

اس دن کام نہ آئیگی سفارش مگر جس کو اجازت دی رحمٰن نے

وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

اور پسند کی اُس کی بات   وہ جانتا ہے جو کچھ ہے اُن کے آگے   اور   پیچھے

وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ

اور یہ قابو میں نہیں لا سکتے اسکو دریافت کر کر   اور رگڑتے ہیں منھ آگے اس جیتے ہمیشہ رہنے والے کے

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ

اور خراب ہوا جس نے بوجھ اُٹھایا ظلم کا   اور جو کوئی کرے کچھ بھلائیاں

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ

اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو سو اسکو ڈر نہیں بے انصافی کا اور نہ نقصان پہنچنے کا   اور اسی طرح اُتارا ہم نے

قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ

قرآن عربی زبان کا   اور پھیر پھیر کر سنائی اسمیں ڈرانے کی باتیں   تاکہ وہ

يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ

پرہیز کریں   یا ڈالے ان کے دل میں سوچ   سو بلند درجہ اللہ کا اس سچے

الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ

بادشاہ کا   اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں   جب تک پورا نہ ہو چکے

إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اس کا اُترنا   اور کہہ اے رب زیادہ کر میری سمجھ

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سورۂ طٰہٰ میں اصل بیان توحید، رسالت اور آخرت کے اصولی مسائل کا ہے انبیاء علیہم السلام کے واقعات اسی سلسلہ میں بیان ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بڑی تفصیل سے ذکر ہوا ہے، اور اُس کے ضمن میں رسالتِ محمدیہ کا اثبات بھی ہے اسی اثباتِ رسالتِ محمدیہ کا یہ حصہ ہے جو اگلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ ان واقعات و قصص کا اظہار ایک نبی اُمی کی زبان سے خود دلیل رسالت و نبوت اور وحی الٰہی کی ہے اور ان سب کا سرچشمہ قرآن ہے اور حقیقتِ قرآن کے ذیل میں کچھ تفصیل معاد و آخرت کی بھی آگئی۔ ہے (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا)

اسی طرح ہم آپ سے اور واقعات گزشتہ کی خبریں (اور حکایتیں) بھی بیان کرتے رہتے ہیں (تاکہ نبوت کے دلائل میں زیادتی ہوتی چلی جائے) اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ

دیا ہے (یعنی قرآن جس میں وہ خبریں ہیں اور وہ خود بھی استقلالاً بوجہ اپنے اعجاز کے دلیل نبوت ہے اور وہ نصیحت نامہ لیا ہے کہ) جو لوگ اس (کے منجانب اللہ ہونے کے ماننے) سے روگردانی کریں گے سو وہ قیامت کے روز بڑا بھاری بوجھ (عذاب کا) لادے ہونگے (اور) وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے روز ان کے لئے برا (بوجھ) ہوگا جس روز صور میں پھونک ماری جاوے گی (جس سے مُردے زندہ ہو جاویں گے) اور ہم اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگوں کو (میدان قیامت میں) اس حالت سے جمع کریں گے کہ (نہایت بدصورت ہونگے کہ آنکھوں سے) کرنجے ہونگے (جو آنکھوں کا بدترین رنگ شمار ہوتا ہے اور خوفزدہ اسقدر ہونگے کہ) چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے ہونگے (اور ایک دوسرے سے کہتے ہونگے) کہ تم لوگ (قبروں میں) صرف دس روز رہے ہونگے (مطلب یہ کہ ہم تو یوں سمجھے تھے کہ مر کر پھر زندہ ہونا نہیں یہ گمان تو بالکل غلط نکلا، نہ زندہ ہونا تو درکنار یہ بھی تو نہ ہوا کہ دیر ہی میں زندہ ہوتے بلکہ بہت ہی جلدی زندہ ہو گئے کہ وہ مدت دس روز کے برابر معلوم ہوتی ہے وجہ اس مقدار کے برابر معلوم ہونے کی اس روز کی درازی اور ہول اور پریشانی ہے کہ قبر میں رہنے کی مدت اس کے سامنے اسقدر کم معلوم ہوگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) جس (مدت) کی نسبت وہ بات چیت کریں گے اسکو ہم خوب جانتے ہیں (کہ وہ کتنی ہے) جبکہ ان سب میں کا زیادہ صائب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ نہیں تم تو ایک ہی روز (قبر میں) رہے ہو (اسکو صائب الرائی اسلئے فرمایا کہ یوم کے طول اور ہول کے اعتبار سے یہی نسبت اقرب ہے پس اس شخص کو حقیقت شدت کا زیادہ ادراک ہوا اسلئے اس شخص کی رائے پہلے شخص کے اعتبار سے بہتر ہے اور یہ مقصود نہیں کہ اس شخص کی بات بالکل صحیح ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دونوں مقداریں اصلی تحدید کے اعتبار سے صحیح نہیں اور نہ ان قائلین کا یہ مقصود تھا، اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کا حال سُنکر بعضے) لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا) سو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ میرا رب ان کو (ریزہ ریزہ کرکے) بالکل اُڑا دیگا پھر زمین کو ایک میدان ہموار کر دیگا کہ جس میں تو (اے مخاطب) نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بلندی (پہاڑ ٹیلہ وغیرہ کی) دیکھے گا اس روز سب کے سب (خدائی) بلانیوالے (یعنی صور پھونکنے والے فرشتہ) کے کہنے پر ہو لیں گے (یعنی وہ اپنی صُور پھونکنے کی آواز سے سب کو قبروں سے بلا دیگا تو سب نکل پڑیں گے) اسکے سامنے (کسی کا) کوئی ٹیڑھا پن نہ رہے گا (کہ قبر سے زندہ ہو کر نہ نکلے جیسے دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے سامنے ٹیڑھے رہتے تھے کہ تصدیق نہ کرتے تھے) اور (مارے ہیبت کے) تمام آوازیں اللہ تعالیٰ کے سامنے دب جاویں گی سو (اے مخاطب) تو بجز پاؤں کی آہٹ کے (کہ میدان حشر کی طرف چپکے چپکے چل رہے ہونگے) اور کچھ (آواز) نہ سُنیگا (اور

بوجہ اس کے کہ اسوقت بولتے ہی نہ ہونگے گو دوسرے موقع پر آہستہ آہستہ بولیں، جیسا اُوپر آیا ہے یتخافتون اور خواہ بوجہ اس کے کہ بہت آہستہ بولتے ہونگے جو ذرا فاصلے سے ہو وہ نہ سُن سکے)

اُس روز (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو (انبیاء و صلحاء کی سفارش نفع دیگی)، کہ جس (کی سفارش کرنے) کیواسطے اللہ تعالیٰ نے (شافعین کو) اجازت دیدی ہو اور اُس شخص کیواسطے (شافع کا) بولنا پسند کرلیا ہو (مراد اس سے مؤمن ہے کہ شافعین کو اسکی سفارش کے لئے اجازت ہوگی اور اس باب میں شافع کا بولنا پسند یدہ حق ہوگا اور کفار کیلئے سفارش کی کسی کو اجازت ہی نہ ہوگی پس عدم نفع بوجہ عدم شفاعت کے ہے اسمیں اعتراض کرنیوالے کفار کو ڈرانا ہے کہ تم تو شفاعت سے بھی محروم رہوگے اور) وہ (اللہ تعالیٰ) ان سب کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور اس (کے معلومات) کو انکا علم احاطہ نہیں کرسکتا (یعنی ایسا تو کوئی امر نہیں جو خلق کو معلوم ہو اور اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ ہو اور ایسے بہت اُمور ہیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور خلق کو معلوم نہیں پس ذوات کے سب احوال بھی اسکو معلوم ہیں جن پر شفاعت کی قابلیت یا عدم قابلیت مرتب ہے سو جو اسکا اہل ہوگا اسکے واسطے سفارش کرنیکی شافعین کو اجازت ہوگی اور جو اہل نہ ہوگا اسکے لئے اجازت نہ ہوگی) اور (اس روز) تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہونگے (اور سب متکبرین اور منکرین کا تکبر و انکار ختم ہوجاویگا) اور (اس وصف میں تو سب مشترک ہونگے پھر آگے انمیں یہ فرق ہوگا کہ) ایسا شخص تو (ہر طرح) ناکام رہیگا جو ظلم (یعنی شرک) لیکر آیا ہوگا اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا سو اسکو (کامل ثواب ملیگا) نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا (مثلاً یہ کہ کوئی گناہ اسکے نامۂ اعمال میں زیادہ لکھدیا جاوے یا کوئی نیکی کم لکھدی جاوے اور یہ کنایہ ہے کمال ثواب سے پس اسکے مقابلہ میں کفار سے ثواب کی نفی مقصود ہوگی بوجہ عدم موجب ثواب کے گو ظلم اور حق تلفی کفار کی بھی نہ ہوگی اور کفار کے نیک اعمال کا حساب میں نہ گنا جانا یہ کوئی ظلم نہیں بلکہ اسلئے ہے کہ اُن کے اعمال شرط ایمان سے خالی ہونیکی وجہ سے کالعدم ہوگئے) اور ہم نے (جس طرح یہ مضامین مذکورہ مقام صاف صاف ارشاد کئے ہیں) اسی طرح اسکو (سارے کو) عربی قرآن کرکے نازل کیا ہے (جسکے الفاظ واضح ہیں) اور اسمیں ہم نے طرح طرح سے وعید (قیامت و عذاب کی) بیان کی ہے (جس سے معنی بھی واضح ہوگئے مطلب یہ کہ سارے قرآن کے مضامین ہم نے صاف صاف بتلائے ہیں) تاکہ وہ (سننے والے) لوگ (اس کے ذریعہ سے بالکل) ڈر جائیں (اور فی الحال ایمان لے آئیں) یا (اگر بالکل نہ ڈریں تو یہی ہو کہ) یہ قرآن ان کیلئے کسی قدر (تو) سمجھ پیدا کردے (یعنی اگر پورا اثر نہ ہو تو تھوڑا ہی ہو اور اسی طرح چند بار تھوڑا تھوڑا جمع ہوکر کافی مقدار ہوجاوے اور کسی وقت مسلمان ہوجاویں) سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہِ حقیقی ہے عالی شان ہے (کہ ایسا نافع کلام نازل

فرمایا) اور (جس طرح عمل کرنا اور نصیحت ماننا جو اوپر مذکور ہوئے قرآن کی تبلیغ کا حق واجب ہے، جسکا ادا کرنا سب مسلمانوں پر جو احکام کے مکلف ہیں فرض ہے اسی طرح بعض آداب قرآن کی تنزیل سے بھی متعلق ہیں جن کے ادا کرنیکا تعلق آپ سے ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ) قرآن (پڑھنے) میں قبل اسکے کہ آپ پر اسکی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجئے (کہ اسمیں آپ کو تکلیف ہوتی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام سے سننا اور اس کو پڑھنا ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے سو ایسا نہ کیجئے اور اسکا اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید یاد نہ رہے یاد کرانا ہمارے ذمہ ہے) اور آپ (کبھی یاد ہونے کیلئے ہم سے) یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا دے (اسمیں علم حاصل کے یاد رہنے کی اور غیر حاصل کے حصول کی اور جو حاصل ہونیوالا نہیں اسمیں عدم حصول ہی کو خیر اور مصلحت سمجھنے کی اور سب علوم میں خوش فہمی کی یہ سب دعائیں داخل ہیں تو لا تعجل کے بعد اسکا آنا نہایت ہی مناسب ہوا حاصل یہ کہ تدابیر حفظ میں سے تدبیر تعجیل کو ترک کیجئے اور تدبیر دعا کو اختیار کیجئے)۔

معارف و مسائل

قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا، ذکر سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۔ یعنی جو شخص قرآن سے اعراض (روگردانی) کریگا قیامت کے روز اسکے اوپر گناہوں کا بڑا بوجھ لدا ہوگا۔ قرآن سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں اسکی تلاوت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ کرے نہ کبھی قرآن پڑھنے اور سیکھنے کی فکر کرے یا قرآن کو پڑھے مگر غلط سلط پڑھے تصحیح حروف کی فکر نہ کرے یا صحیح بھی پڑھے مگر بے دلی اور بے پروائی پڑھے یا کسی دنیوی مال و عزت کی خواہش سے پڑھے۔ اسی طرح قرآن کے احکام کو سمجھنے کیطرف توجہ نہ دینا بھی قرآن سے اعراض ہے اور سمجھنے کے بعد اُن پر عمل کرنے میں کوتاہی یا اسکے احکام کی خلاف ورزی یہ تو اعراض کا انتہائی درجہ ہے۔ غرض قرآن کے حقوق سے بے پروائی کرنے کا بڑا وبال ہے جو قیامت کے روز بارِ گراں بن کر اسکی گردن پر لاد دیا جاویگا جیسا کہ روایات حدیث میں ہے کہ انسان کے بُرے اعمال اور گناہ قیامت کے روز ایک بارِ گراں بنکر اسکے اوپر لادا جائیگا۔

يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ صُور کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایک سینگ ہے جسمیں پھونک ماری جائے گی، مراد یہ ہے کہ سینگ کی طرح کی کوئی چیز ہے جسمیں فرشتہ کی پھونک مارنے کا پوری دنیا پر یہ اثر ہوگا کہ سب مُردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جاوینگے حقیقت اس صُور کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ، صحیح حدیث میں حضرت

ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ابتداء وحی میں جب جبرئیل امین کوئی آیت قرآن لیکر آتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سناتے تو آپ اُن کے ساتھ ساتھ آیت کو پڑھنے کی بھی کوشش فرماتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یاد سے نکل جائے اسمیں آپ پر دوہری مشقت ہوتی تھی اول قرآن کو جبرئیل سے سننے اور سمجھنے کی اسکے ساتھ اسکو یاد رکھنے کے لئے اپنی زبان سے ادا کرنے کی حق تعالیٰ نے اس آیت میں نیز سورۂ قیامہ کی آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ میں آپکے لئے آسانی یہ پیدا فرمادی کہ جو آیات قرآن آپ پر نازل کی جاتی ہیں اُن کا یاد رکھنا آپکی ذمہ داری نہیں وہ ہمارے ذمہ ہے ہم خود آپ کو یاد کرادیں گے اسلئے آپ کو جبرئیل امین کے ساتھ ساتھ پڑھنے اور زبان کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں آپ اُسوقت صرف اطمینان کے ساتھ سُنا کریں البتہ یہ دُعا کرتے رہیں کہ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا، یعنی اے میرے پروردگار میرا علم بڑھادیجئے اس جامع دُعا میں نازل شدہ قرآن کا یاد رکھنا بھی داخل ہے اور غیر نازل شدہ کی طلب بھی اور اُسکے سمجھنے کی توفیق بھی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

اور ہم نے تاکید کردی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اسمیں کچھ ہمت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے، مگر نہ مانا ابلیس نے

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا

پھر کہدیا ہم نے اے آدم یہ دشمن تیرا ہے اور تیرے جوڑے کا سو نکلوا نہ دے

مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾

تم کو بہشت سے، پھر تو پڑ جائے تکلیف میں، تجھ کو یہ ملا ہے کہ نہ بھوکا ہو تو اسمیں اور نہ ننگا

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ

اور یہ کہ نہ پیاس کھینچے تو اسمیں اور نہ دھوپ۔ پھر جی میں ڈالا اس کے

الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰي شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ

شیطان نے کہا اے آدم میں بتاؤں تجھ کو درخت سدا زندہ رہنے کا اور

مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا

بادشاہی جو پُرانی نہ ہو پھر دونوں نے کھالیا اُسمیں سے پھر کھل گئیں اُن پر اُنکی بُری چیزیں اور لگے

يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ز وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ

گانٹھنے اپنے اوپر پتے بہشت کے اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا

فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ

پھر راہ سے بہکا پھر نواز دیا اس کو اُس کے رب نے پھر متوجہ ہوا اُس پر اور راہ پر لایا فرمایا

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

اُترو یہاں سے دونوں اکٹھے رہو ایک دوسرے کے دشمن پھر اگر پہنچے تم کو

مِّنِّيْ هُدًى ۙ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

میری طرف سے ہدایت پھر جو چلا میری بتلائی راہ پر سو وہ نہ بہکے گا اور نہ وہ تکلیف میں پڑیگا

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ

اور جس نے منھ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گزران تنگی کی اور لائیں گے ہم اسکو

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ

دن قیامت کے اندھا وہ کہے گا اے رب کیوں اُٹھا لایا تو مجھ کو اندھا اور میں تو

كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ

تھا دیکھنے والا فرمایا یونہی پہنچی تھیں تجھ کو ہماری آیتیں پھر تو نے انکو بھلا دیا، اور اسی طرح

الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ

آج تجھ کو بھلا دیں گے اور اسی طرح بدلہ دیں گے ہم اس کو جو حد سے نکلا اور یقین نہ لایا اپنے

بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

رب کی باتوں پر اور آخرت کا عذاب سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا

خلاصۂ تفسیر

اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم آدم (علیہ السلام) کو ایک حکم دے چکے تھے (جسکا بیان آگے آتا ہے) سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہوگئی اور ہم نے (اس حکم کے اہتمام میں) ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی اور (اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو) وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ (تحیت) کرو

سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اُس نے انکار کیا پھر ہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم (یاد رکھو) یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بی بی کا (اس وجہ سے) دشمن ہے (کہ تمہارے معاملہ میں مردود ہوا) سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے (یعنی اسکے کہنے سے کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ جنت سے باہر کئے جاؤ) پھر مصیبت (اکتساب معاش) میں پڑ جاؤ (اور ساتھ میں تمہاری بی بی بھی مگر زیادہ حصہ مصیبت کا تم کو جھگتنا پڑے اور) یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ (آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے ہوگے (جس سے تکلیف ہو یا اسکی تدبیر میں دیر اور پریشانی ہو) اور نہ ننگے ہوگے (کہ کپڑا نہ ملے یا احتیاج کے اتنی دیر بعد ملے کہ تکلیف ہونے لگے) اور نہ یہاں پیاسے ہوگے (کہ پانی نہ ملے یا دیر ہونے سے تکلیف ہو) اور نہ دھوپ میں تپو گے (کیونکہ جنت میں دھوپ ہی نہیں اور مکان بھی ہر طرح پناہ کے ہیں بخلاف اس حالت کے کہ اگر جنت سے نکل کر دُنیا میں گئے تو یہ ساری مصیبتیں پیش آویں گی اسلئے ان اُمور کو پیش نظر رکھکر خوب ہی ہوشیاری و بیداری سے رہنا) پھر ان کو شیطان نے (جھانسہ دیا یعنی) بہکایا، کہنے لگا کہ اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلا دوں (کہ اسکے کھانے سے ہمیشہ شاد و آباد رہو) اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آوے سو (اسکے بہکانے سے) دونوں نے اس درخت سے کھا لیا (جس سے ممانعت ہوئی تھی اور شیطان نے اسکو شجرۃ الخلد کہہ کر بہکایا تھا، تو (اسکے کھاتے ہی) ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت (کے درختوں) کے پتے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو (جنت میں ہمیشہ رہنے کا مقصد حاصل کرنے کے باب میں) غلطی میں پڑ گئے پھر (جب اُنھوں نے معذرت کی تو) ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنا لیا سو ان پر (مہربانی سے) توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر ہمیشہ قائم رکھا (کہ پھر ایسی خطا نہیں ہوئی اور جب درخت کھا لیا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں جنت سے اُترو (اور دُنیا میں) ایسی حالت سے جاؤ کہ (تمہارے فرزندوں میں) ایک کا دشمن ایک ہوگا پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت (کا ذریعہ یعنی رسول یا کتاب) پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دُنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا، اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کریگا تو اسکے لئے (قیامت سے پہلے دنیا اور قبر میں) تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اسکو اندھا کر کے (قبر سے) اُٹھائیں گے وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اُٹھایا میں تو (دُنیا میں) آنکھوں والا تھا (مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی) ارشاد ہوگا کہ (جیسی تجھ کو سزا ہوئی ہے) ایسا ہی (تجھ سے عمل ہوا تھا وہ یہ کہ) تیرے پاس (انبیاء و علماء کے واسطے سے) ہمارے احکام

پہنچے تھے پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاویگا (جیسا تو نے خیال نہ کیا تھا) اور (جس طرح کہ یہ سزا مناسب عمل دی گئی) اسی طرح (ہر) اُس شخص کو ہم (مناسب عمل) سزا دیں گے جو حد (اطاعت) سے گزر جاوے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لاوے اور واقعی آخرت کا عذاب ہے بڑا سخت اور بڑا دیر پا (کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں تو اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام کرنا واجب ہے)۔

معارف و مسائل

ربط یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوتا ہے یہ قصہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ اور اعراف میں پھر کچھ سورۂ حجر اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے اور آخر میں سورۂ صٓ میں آئیگا، ہر مقام پر اسکے مناسب اجزاء قصہ کو مع ہدایات متعلقہ کے بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس قصہ کی مناسبت پچھلی آیات سے حضرات مفسرین نے مختلف پہلوؤں سے بیان فرمائی ہے انمیں سب سے زیادہ روشن اور بے غبار بات یہ ہے کہ سابقہ آیات میں یہ ارشاد آیا ہے كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ، اسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ آپکی نبوت و رسالت کے اثبات اور آپ کی اُمت کو متنبہ کرنے کے لئے ہم انبیاء سابقین کے حالات و واقعات آپ سے بیان کرتے ہیں جنمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصہ اس آیت سے پہلے بیان ہو چکا ہے اور ان تمام قصوں میں سب سے پہلا اور بعض حیثیات میں سب سے اہم حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ہے۔ یہاں سے اسکو شروع کیا گیا ہے جسمیں اُمتِ محمدیہ کو اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ شیطان تمام بنی آدم کا پرانا دشمن ہے اس نے سب سے پہلے تمہارے ماں باپ سے اپنی دشمنی نکالی اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں اور ہمدردانہ مشوروں کے جال پھیلا کر اُن کو ایک لغزش میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجہ میں جنت سے اُترنے کے احکام جاری ہوئے اور جنت کی پوشاک اُن سے سلب ہوگئی پھر حق تعالیٰ کیطرف رجوع اور لغزش کی معافی ہوکر ان کو رسالت و نبوت کا مقام بلند عطا ہوا۔ اس لئے تمام بنی آدم کو اغواءِ شیطانی سے کبھی بے فکر نہ ہونا چاہیئے، احکامِ دین کے معاملے میں شیطانی وساوس اور حیلوں سے بچنے کا بڑا اہتمام کرنا چاہیئے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا، اسمیں لفظ عَھِدْنَا اَمَرْنَا یا وَصَّیْنَا کے معنے میں ہے (بحر محیط) مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس واقعہ کے متعلق آپ سے بہت پہلے آدم علیہ السلام کو ایک وصیت کی تھی یعنی تاکیدی حکم دیا تھا (جسکا ذکر سورۂ بقرہ وغیرہ میں آچکا ہے

اور آگے بھی کچھ آ رہا ہے کہ ایک درخت کو معیّن کر کے بتلا دیا تھا کہ اس درخت کو یعنی اس کے پھل پھول یا کسی جز، کو نہ کھانا اور اس کے قریب بھی نہ جانا، باقی ساری جنّت کے باغات اور نعمتیں تمہارے لئے کھلی ہوئی ہیں ان کو استعمال کرتے رہو اور جیسا کہ آگے آتا ہے یہ بھی بتلا دیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے کہیں اسکے بہکانے میں نہ آجانا کہ تمہارے لئے مصیبت بنے مگر آدم علیہ السلام بھول گئے اور انہیں ہم نے ارادہ کی پختگی نہ پائی۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں ایک نسیان دوسرے عزم، نسیان کے معنی مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑجانا اور عزم کے لفظی معنے کسی کام کے لئے اپنے ارادے کو مضبوط باندھنے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے مراد اس جگہ کیا ہے اس کے سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور پیغمبر سب کے سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

پہلے لفظ میں حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان اور بھول طاری ہو جانے کا ذکر ہے اور چونکہ بھول اور نسیان غیر اختیاری امر ہے اسلئے اس کو گناہ ہی میں شمار نہیں کیا گیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان، یعنی میری اُمت سے خطا اور نسیان کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم کا ارشادِ عام ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اسکے اختیار و قدرت سے باہر ہو۔ لیکن یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے اسباب بھی رکھے ہیں کہ ان کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انسان بھول اور خطا سے بچ سکتا ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ حق تعالیٰ کے مقربینِ خاص ہیں اُن سے اتنی بات پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے کہ اُن اسبابِ اختیاریہ سے کیوں کام نہ لیا جن کے ذریعہ اس بھول سے بچ سکتے تھے۔ بسا اوقات ایک وزیر سلطنت کیلئے وہ کام قابلِ مؤاخذہ سمجھا جاتا ہے جو عام نوکروں کے لئے قابلِ انعام ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے حسنات الابرار سیئات المقربین، یعنی اُمت کے صالحین اور نیک لوگوں کے بہت سے نیک عمل مقربانِ بارگاہِ الٰہی کے حق میں سیئات اور لغزش قرار دی جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ اول تو نبوت و رسالت سے پہلے کا ہے جس میں کسی گناہ کا صدور انبیاء سے بعض علمائے اہلِ سنّت کے نزدیک عصمت کے خلاف نہیں۔ دوسرے درحقیقت یہ بھول ہے جو گناہ نہیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کے مقام بلند اور تقرب حق سبحانہ وتعالیٰ کے لحاظ سے اس کو بھی اُن کے حق میں ایک لغزش قرار دی گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور اُن کو متنبہ کرنے کے لئے اس لغزش کو عصیان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

دوسرا لفظ عزم ہے اور اسی آیت میں یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں عزم نہ پایا گیا اور عدم

ہو چکا ہے کہ عزم کے معنی کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں حضرت آدم علیہ السلام حکم ربانی کی تعمیل کا مکمل فیصلہ اور قصد کئے ہوئے تھے مگر شیطانی وساوس سے اس قصد کی مضبوطی میں فرق آگیا اور بھول نے اُس پر قائم نہ رہنے دیا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ ، یہ اُس عہد کا مختصر بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیا تھا اسمیں تخلیق آدم کے بعد سب فرشتوں کو اور اُن کے ضمن میں ابلیس کو بھی، کیونکہ اسوقت تک ابلیس جنت میں فرشتوں کیساتھ رہتا سہتا تھا، حکم دیا گیا کہ سب کے سب آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں سب فرشتوں نے سجدہ کر لیا مگر ابلیس نے انکار کر دیا جس کی وجہ دوسری آیات میں اسکا تکبر تھا کہ میں آگ سے بنا ہوں یہ مٹی سے، اور آگ بہ نسبت مٹی کے افضل و اشرف ہے میں اسکا سجدہ کیوں کروں، اس پر ابلیس تو ملعون ہو کر جنت سے نکالا گیا۔ حضرت آدم و حوا کے لئے جنت کے سب باغات اور ساری نعمتوں کے دروازے کھولدیئے گئے اور ہر چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی صرف ایک معین درخت کے متعلق یہ ہدایت کی گئی کہ اسکو (یعنی اسکے پھل پھول وغیرہ کو) نہ کھائیں اور اسکے قریب بھی نہ جائیں۔ یہ مضمون بھی سورۂ بقرہ و اعراف کی آیتوں میں آچکا ہے یہاں اسکا ذکر کرنیکے بجائے حق تعالیٰ نے اپنا وہ ارشاد ذکر کیا ہے جو اس عہد کے محفوظ رکھنے اور اس پر قائم رہنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ دیکھو شیطان ابلیس جیسا کہ واقعہ سجدہ کے وقت ظاہر ہو چکا ہے تم دونوں یعنی آدم و حوا کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مکر و حیلے سے دھوکہ دے کر تم سے اس عہد کی خلاف ورزی کرا دے جسکا نتیجہ یہ ہو کہ تم جنت سے نکالے جاؤ۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ، یعنی یہ شیطان کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے جس کی وجہ سے تم مصیبت اور مشقت میں پڑ جاؤ۔ لفظ تشقی شقاوت سے مشتق ہے۔ یہ لفظ دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک شقاوتِ آخرت، دوسرے شقاوتِ دُنیا یعنی جسمانی مشقت و مصیبت۔ اس جگہ یہی دوسرے معنی مُراد ہو سکتے ہیں کیونکہ پہلے معنی میں کسی پیغمبر کے لئے تو کیا کسی نیک مسلمان کے لئے بھی یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا اسی لئے فراءؒ نے اس شقاوت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ھو ان یاکل من کد یدیہ یعنی شقاوت سے اس جگہ مُراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے خوراک حاصل کرنا پڑے گی (قرطبی) اور اس جگہ قرینۂ مقام بھی دوسرے ہی معنی کے لئے شاہد ہے کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں جنت کی نعمتوں میں سے اُن چار نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو ہر انسان کی زندگی کے لئے عمودی حیثیت رکھتی ہیں اور ضروریات زندگی میں سب سے اہم ہیں۔ یعنی کھانا، پینا، لباس اور مسکن۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ سب نعمتیں جنت میں تو بلا کسی کسب و اکتساب اور محنت و مشقت کے ملتی ہیں۔ اسمیں اشارہ پایا گیا کہ یہاں سے نکل گئے تو یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی اور شاید اسی اشارہ کے لئے یہاں جنت کی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر

نہیں کیا گیا بلکہ صرف اُن کا ذکر کیا جن پر انسانی زندگی موقوف ہے اور اس سے ڈرایا گیا کہ شیطانی اغوا میں آگر کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت سے نکالے جاؤ اور یہ سب نعمتیں سلب ہو جائیں اور پھر زمین پر اُن ضروریاتِ زندگی کو بڑی محنت مشقت اُٹھا کر حاصل کرنا پڑے یہ مفہوم لفظ فَتَشْقٰى کا ہے جو جمہور مفسرین نے لکھا ہے۔ امام قرطبی نے اس جگہ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے تو جبرئیلؑ نے جنت سے کچھ دانے گیہوں چاول وغیرہ کے لا کر دیئے کہ ان کو زمین میں کاشت کرو پھر جب یہ پودا نکلے اور اُس پر دانے جمیں تو اس کو کاٹو پھر پیس کر روٹی بناؤ اور ان سب کاموں کے طریقے بھی حضرت آدم کو سمجھا دیئے اس کے مطابق آدم علیہ السلام نے روٹی پکائی اور کھانے کے لئے بیٹھے تھے کہ روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر پہاڑ کے نیچے ڈھلک گئی آدم علیہ السلام اسکے پیچھے چلے اور بڑی محنت کر کے واپس لائے تو جبرئیل امین نے کہا کہ اے آدم آپ کا اور آپکی اولاد کا رزق زمین پر اسی طرح محنت مشقت سے حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

بیوی کا نفقہ ضروریہ شوہر کے ذمہ ہے

اس مقام پر شروع آیت میں حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حوا کو بھی خطاب میں شریک کیا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ جسمیں بتلایا ہے کہ شیطان آپ کا بھی دشمن ہے اور آپ کی بیوی کا بھی اور یہ کہ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو یہ جنت سے نکلوا دے مگر آخر آیت میں لفظ فَتَشْقٰى کو مفرد لاکر فرمایا بیوی کو اسمیں شریک نہیں کیا ورنہ بمقتضائے مقام فَتَشْقَيَا کہا جاتا۔ امام قرطبی نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی بیوی کی مرد کے ذمہ ہیں ان کے حصول میں جو محنت و مشقت ہو وہ تنہا ذمہ دار مرد ہے اسی لئے فَتَشْقٰى بصیغہ مفرد لا کر اشارہ کر دیا کہ زمین پر اتارے گئے تو ان ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں جو کچھ محنت مشقت اُٹھانا پڑیگی وہ حضرت آدم علیہ السلام پر پڑے گی کیونکہ حوا کا نفقہ اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ان کے ذمہ ہے۔

نفقۂ واجبہ صرف چار چیزیں ہیں

قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت نے ہمیں یہ بھی بتلا دیا کہ عورت کا جو نفقہ مرد کے ذمہ ہے وہ صرف چار چیزیں ہیں۔ کھانا پینا اور لباس اور مسکن۔ اس سے زائد جو کچھ شوہر اپنی بیوی کو دیتا یا اُس پر خرچ کرتا ہے وہ تبرع و احسان ہے واجب و لازم نہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کے علاوہ جس کسی کا نفقہ شریعت نے کسی شخص کے ذمہ عائد کیا ہے اسمیں بھی چار چیزیں اس کے ذمہ واجب ہوتی ہیں جیسے ماں باپ کا نفقہ اولاد کے ذمہ جبکہ وہ محتاج اور معذور ہوں وغیرہ ذلک جسکی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى، جنت میں ضروریاتِ زندگی کی بنیادی چار اول چیزیں بے مانگے بلا مشقت ملتی ہیں۔ اور جنت میں بھوک لگنے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب تک

نہ لگے کھانے کا ذائقہ اور لذت ہی نہیں آسکتی، اسی طرح جبتک پیاس نہ ہو ٹھنڈے پانی کی لذت و راحت نہیں محسوس ہو سکتی وجہ یہ ہے کہ جنت میں بھوک پیاس نہ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ بھوک پیاس کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی کہ بھوک کے وقت کھانے کو اور پیاس کے وقت پینے کو نہ ملے یا دیر میں ملے بلکہ ہر وہ چیز جس کو ان کا دل چاہے گا فوراً حاضر موجود ملے گی۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ الیٰ قولہ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى، اس آیت میں جو یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کو کسی خاص درخت سے کھانے اور اسکے پاس جانے سے بھی روکدیا تھا اور اس پر مزید تنبیہ بھی فرمادی تھی کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے اسکے مکر و کید سے بچتے رہنا وہ کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے اتنی واضح ہدایتوں کے بعد بھی یہ پیغمبر عالی مقام شیطان کے دھوکہ میں کس طرح آگئے اور یہ کہ یہ تو کھلی نافرمانی اور گناہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی و رسول ہیں ان سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوا جبکہ جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سب سوالات کا جواب سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اول صفحہ ۱۳۶ پر گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اور اس آیت میں جو حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت صاف لفظوں میں عصیٰ اور پھر غویٰ فرمایا گیا ہے اس کی وجہ بھی سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام کا یہ عمل شرعی قانون کی رو سے گناہ میں داخل نہیں تھا لیکن حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور مقربین خاص میں سے ہیں اسلئے ان کی ادنیٰ لغزش کو بھی بھاری لفظوں سے عصیان کہکر تعبیر کیا گیا اور اس پر عتاب کیا گیا اور لفظ غویٰ دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک معنی زندگی تلخ ہوجانے اور عیش خراب ہوجانے کے ہیں۔ دوسرے معنی گمراہ ہوجانے یا غافل ہوجانے کے۔ ائمہ تفسیر قشیری اور قرطبی وغیرہ نے اس جگہ لفظ غویٰ کے پہلے معنی ہی کو اختیار کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا زندگی تلخ ہوگئی۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک اہم ... ادب و احترام کی حفاظت

قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں آیت مذکورہ میں جو الفاظ عصیٰ وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں انھوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

لا یجوز لاحد منا الیوم ان یخبر بذلک عن اٰدم الا اذا ذکرناہ فی اثناء قولہ تعالیٰ عنہ او قول نبیہ، فاما ان یبتدئ ذلک من قبل نفسہ فلیس بجائز لنا فی اٰبائنا الادنین الینا المماثلین لنا فکیف فی ابینا الاقدم الاعظم الاکرم النبی

ہم میں سے کسی کیلئے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے بجز اسکے کہ قرآن کی اس آیت کے یا کسی حدیث نبوی کے ضمن میں آیا ہو وہ بیان کرے لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباء و اجداد کے لئے بھی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے

المقدم الذی عذرہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وتاب علیہ وغفرلہ (از تفسیر قرطبی ذکرہ فی البحر المحیط ایضاً)

پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور زیادہ اکرم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں جنکا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور معافی کا اعلان کردیا ان کے لئے تو کسی حال میں جائز نہیں۔

اسی لئے قشیری ابو نصر نے فرمایا کہ اس لفظ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور غاوی کہنا جائز نہیں اور قرآنِ کریم میں جہاں کہیں کسی نبی یا رسول کے بارے میں ایسے الفاظ آئے ہیں یا تو وہ خلاف اولٰے اُمور ہیں یا نبوت سے پہلے کے ہیں۔ اسلئے بضمن آیاتِ قرآن و روایاتِ حدیث تو اُن کا تذکرہ درست ہے لیکن اپنی طرف سے اُن کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں (قرطبی)

اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا، یعنی اتر جاؤ جنت سے (دونوں) یہ خطاب حضرت آدم و ابلیس دونوں کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کا مضمون واضح ہے کہ دُنیا میں جا کر بھی شیطان کی دشمنی جاری رہے گی اور اگر یہ کہا جائے کہ شیطان کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی جنت سے نکالا جا چکا تھا اب اس کو اس خطاب میں شریک قرار دینا بعید ہے تو دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ خطاب آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو ہو۔ اس صورت میں باہمی عداوت سے مراد ان کی اولاد میں باہمی عداوت ہونے کو بیان کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہمی عداوت ماں باپ کی زندگی بھی تلخ کر دیتی ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ، یہاں ذکر سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک بھی جیسا کہ دوسری آیات میں ذِكْرًا رَّسُوْلًا آیا ہے دونوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص قرآن سے یا رسولؐ سے اعراض کرے یعنی قرآن کی تلاوت اور اسکے احکام پر عمل سے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کرے اُسکا انجام یہ ہے کہ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى، یعنی اسکی معیشت تنگ ہوگی اور قیامت میں اسکو اندھا کرکے اُٹھایا جائیگا۔ پہلا عذاب دُنیا ہی میں اسکو مل جائیگا اور دوسرا یعنی اندھا ہونیکا عذاب قیامت میں ہوگا۔

کافر اور بدکار کی زندگی دُنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دُنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار و فجار کے لئے مخصوص نہیں، مومنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد و مصائب اس دُنیا کی زندگی میں اُٹھانے پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری اور تمام کتب حدیث میں بروایت سعدؓ وغیرہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں اُن کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اُسی کی مناسبت سے اسکو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ اسکے بالمقابل عموماً کفار و فجار کو خوشحال اور عیش و عشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشاد قرآنی کہ اُن کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لئے تو ہوسکتا ہے دُنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔

اسکا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دُنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مُراد ہے کہ قبر میں انکی معیشت تنگ کر دی جاویگی۔ خود قبر جو اُن کا مسکن ہوگا وہ اُن کو ایسا دبائیگا کہ انکی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی جیسے بعض احادیث میں اسکی تصریح ہے اور مسند بزار میں بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کے لفظ مَعِيشَةً ضَنكًا کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ اس سے مُراد قبر کا عالم ہے۔ (مظہری)

اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے تنگیٔ معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اُن سے قناعت کا وصف سلب کر لیا جاویگا اور حرصِ دُنیا بڑھا دی جاویگی (مظہری) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُسکے پاس کتنا ہی مال و دولت جمع ہو جائے کبھی قلبی سکون اسکو نصیب نہیں ہوگا ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اسمیں نقصان کا خطرہ اسکو بےچین رکھے گا۔ اور یہ بات عام اہلِ تمول میں مشاہد و معروف ہے جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے پاس سامانِ راحت تو بہت جمع ہو جاتا ہے مگر جس کا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ وہ قلب کے سکون و اطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ

سو کیا اُن کو سمجھ نہ آئی اس بات سے کہ کتنی غارت کر دیں ہم نے اُن سے پہلے جماعتیں یہ لوگ پھرتے ہیں انکے گھروں میں

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن

اسمیں خوب نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو اور اگر نہ ہوتی ایک بات کہ نکل چکی تیرے

رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ

رب کیطرف سے تو ضرور ہو جاتی مٹھ بھیڑ اور اگر نہ ہوتا وعدہ مقرر کیا ہوا سو تو سہتا رہ جو وہ کہیں اور

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ

پڑھتا رہ خوبیاں اپنے رب کی سورج نکلنے سے پہلے اور ڈوب ہونے سے پہلے اور کچھ گھڑیوں میں

اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ

رات کی پڑھا کر اور دن کی حدوں میں شاید تو راضی ہو اور مت پسار اپنی آنکھیں

إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَ

اُس چیز پر جو فائدہ اُٹھانے کو دی ہم نے ان طرح طرح کے لوگوں کو رونق دُنیا کی زندگی کی اُن کے جانچنے کو اور

رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ

تیرے رب کی دی ہوئی روزی بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی اور حکم کر اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی قائم رہ

عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿١٣٢﴾ وَ

اس پر ہم نہیں مانگتے تجھ سے روزی ہم روزی دیتے ہیں تجھ کو اور انجام بھلا ہے پرہیزگاری کا

ع ۱۴

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ

لوگ کہتے ہیں یہ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب سے، کیا پہنچ نہیں چکی ان کو نشانی اگلی کتابوں میں

الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا

کی ۔ اور اگر ہم ہلاک کر دیتے ان کو کسی آفت میں اس سے پہلے تو کہتے اے رب

لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ

کیوں نہ بھیجا ہم تک کسی کو پیغام دے کر کہ ہم چلتے تیری کتاب پر ذلیل اور رسوا ہونے سے

نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ

پہلے ۔ تو کہہ ہر کوئی راہ دیکھتا ہے سو تم بھی راہ دیکھو آئندہ جان لوگے کون ہیں سیدھی

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

راہ والے اور کس نے راہ پائی

خلاصۂ تفسیر

(یہ معترضین جو اعتراض پر اصرار کر رہے ہیں تو) کیا ان لوگوں کو (اب تک) اس سے بھی ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو (اس اعتراض ہی کے سبب عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں کہ اُن (میں سے بعض) کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ بھی چلتے (پھرتے) ہیں (کیونکہ شام کو جاتے ہوئے اہلِ مکہ کے رستہ میں بعض اُن قوموں کے مکانات آتے تھے) اُس (امر مذکور) میں تو اہلِ فہم کے (سمجھنے کے) لئے (کافی) دلائل (اعتراض کے نتائج بد ہونے کے) موجود ہیں اور (اُن پر فوری عذاب نہ آنے سے جو اُن کو شبہ اپنے مذہب کے مذموم نہ ہونے کا ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے فرمائی ہوئی نہ ہوتی (وہ یہ کہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے ان کو مہلت دیجائے گی) اور (عذاب کے لئے) ایک میعاد معین نہ ہوتی (کہ وہ قیامت کا دن ہے) تو (اُن کے کفر و اعراض کے اقتضاء سے) عذاب لازمی طور پر ہوتا (خلاصہ یہ کہ کفر تو مقتضی عذاب کا ہے لیکن ایک مانع کی وجہ سے توقف ہو رہا ہے پس اُن کا وہ شبہ اور فوری عذاب نہ آنے سے اپنے حق پر ہونے کا استدلال غلط ہے، غرض یہ کہ امہال ہے اہمال نہیں) سو (جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو) آپ اُن کی (کفر آمیز) باتوں پر صبر کیجئے (اور بغض فی اللہ کی وجہ سے جو اُن پر غیظ آتا ہے اور ان پر تاخیر عذاب سے اضطراب ہوتا ہے اس اضطراب کو ترک کیجئے) اور اپنے رب کی حمد (و ثنا) کے ساتھ (اُس کی) تسبیح (و تقدیس) کیجئے (اسمیں نماز بھی آگئی) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اور اسکے غروب سے پہلے (مثلاً نماز ظہر و عصر) اور اوقاتِ شب میں (بھی) کیا کیجئے (مثلاً نماز مغرب و عشاء)

اور دن کے اول و آخر میں (تسبیح کرنے کے واسطے اہتمام کے لئے مکرر کہا گیا ہے جس سے نماز فجر و مغرب کے ذکر کا بھی اہتماماً تکریر ہوگئی) تاکہ (آپ کو ثواب ملے، آپ (اس سے) خوش ہوں (مطلب یہ کہ آپ اپنی توجہ معبود حقیقی کی طرف رکھئے لوگوں کی فکر نہ کیجئے) اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ و مشرکین کو) ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اوروں کو سنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لئے یہ ممانعت ہے جنہیں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اسکا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا۔ اور آزمائش یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپکے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملیگا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیرپا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا۔ خلاصہ کلام کا یہ ہوا کہ نہ ان کے اعراض بکسر الہمزہ کی طرف التفات کیا جاوے نہ انکے اغراض بفتح الہمزہ یعنی اسباب عیش کی طرف، سب کا انجام عذاب ہے)، اور اپنے متعلقین کو (یعنی اہل خاندان کو یا مومنین کو) بھی نماز کا حکم کرتے رہئے اور خود بھی اسکے پابند رہئے (یعنی زیادہ توجہ کے قابل یہ امور ہیں) ہم آپ سے اور (اسی طرح دوسروں سے ایسے) معاش (کمانا) نہیں چاہتے (جو طاعات ضروریہ سے مانع ہوں) معاش تو آپ کو (اور اسی طرح اوروں کو) ہم دیں گے (یعنی مقصود اصلی اکتساب نہیں بلکہ دین اور طاعت ہیں، اکتساب کی اسی حالت میں اجازت یا امر ہے کہ ضروری طاعت میں وہ مخل نہ ہو) اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے۔ (اسلئے ہم حکم دیتے ہیں لَا تَمُدَّنَّ اور وَأْمُرْ أَهْلَكَ الخ اور معترضین کے بعض احوال و اقوال جو اوپر معلوم ہوئے اسی طرح ان کا ایک اور قول بھی مذکور ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (عناداً) یوں کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس کوئی نشانی (اپنی نبوت کی) کیوں نہیں لاتے (آگے جواب ہے کہ) کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضمون کا ظہور نہیں پہنچا (مراد اس سے قرآن ہے کہ اس سے کتب سابقہ کے مضمون پیشین گوئی کے صدق کا ظہور ہو گیا مطلب یہ کہ کیا انکے پاس قرآن نہیں پہنچا جس کی پہلے سے شہرت تھی کہ وہ نبوت پر کافی دلیل ہے) اور اگر ہم ان کو قبل قرآن آنے کے (سزائے کفر میں) کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے (اور پھر قیامت کے روز اصلی سزا کفر کی دی جاتی کہ وہ لازم ہی تھی) تو یہ لوگ (بطور عذر کے) یوں کہتے کہ اے ہمارے رب آپ نے ہمارے پاس کوئی رسول (دنیا میں) کیوں نہیں بھیجا تھا کہ ہم آپ کے احکام پر چلتے قبل اسکے کہ ہم (یہاں خود) بے قدر ہوں اور (دوسروں کی نگاہ میں) رسوا ہوں (سو اب اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی، اگر وہ یوں کہیں کہ وہ عذاب کب ہوگا تو) آپ کہہ دیجئے کہ (ہم) سب انتظار کر رہے ہیں سو (چندے) اور انتظار کر لو اب عنقریب تم کو (بھی) معلوم ہو جاویگا کہ راہ راست والے کون ہیں اور وہ کون ہے جو (منزل) مقصود تک پہنچا (یعنی وہ فیصلہ عنقریب بعد موت یا بعد الحشر ظاہر ہو جاوے گا)

معارف و مسائل

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ میں ضمیر فاعل ہدیٰ کیطرف راجع ہے جو اسی لفظ کے ضمن میں مذکور ہے اور ہدیٰ سے مراد قرآن یا رسول ہے تو معنے یہ ہیں کہ کیا قرآن یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو یعنی اہل مکہ کو یہ ہدایت نہیں دی اور اس سے باخبر نہیں کیا کہ تم سے پہلے کتنی اُمتیں اور جماعتیں اپنی نافرمانی کیوجہ سے عذاب خداوندی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو چکی ہیں جن کے گھروں اور زمینوں میں اب تم چلتے پھرتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسمیں ضمیر فاعل اللہ تعالیٰ کیطرف راجع ہو اور معنے یہ ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت نہیں دی۔ الخ

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ، اہل مکہ جو ایمان سے بھاگنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتے تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بُرے بُرے کلمات سے یاد کرتے تھے، کوئی ساحر کوئی شاعر کوئی کاذب کہتا تھا۔ اُن کی ایذاؤں کا علاج قرآن کریم نے اسجگہ دو چیزوں سے بتلایا ہے اول یہ کہ آپ انکے کہنے کیطرف التفات نہ کریں بلکہ صبر کریں۔ دوسری چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جانا ہے جو اگلے جملہ میں وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنے کا علاج صبر اور اللہ کی یاد میں مشغول ہونا ہے دشمنوں سے تو اس دُنیا میں کسی چھوٹے بڑے، اچھے بُرے انسان کو نجات نہیں ملتی۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے اور دشمن کتنا ہی حقیر و ضعیف ہو اپنے مخالف کو کچھ نہ کچھ ایذا پہنچا ہی دیتا ہے، زبانی گالی گلوچ ہی سہی، سامنے ہمت نہ ہو تو پیچھے ہی سہی۔ اسلئے دشمن کی ایذاؤں سے بچنے کی فکر ہر شخص کو ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ان کا بہترین اور کامیاب نسخہ دو چیزوں سے مرکب بیان فرمایا ہے۔ اول صبر یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور انتقام کی فکر میں نہ پڑنا دوسرے اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں مشغول ہو جانا تجربہ شاہد ہے کہ صرف یہی نسخہ ہے جس سے ان ایذاؤں سے نجات مل سکتی ہے ورنہ انتقام کی فکر میں پڑنے والا کتنا ہی قوی اور بڑا اور صاحب اقتدار ہو بسا اوقات مخالف سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا اور یہ فکر انتقام ایک مستقل عذاب اُس کیلئے بن جاتا ہے اور جب انسان کی توجہ حق تعالیٰ کیطرف ہو جائے اور وہ دھیان یہ کرے کہ اس دُنیا میں کوئی کسی کو کسی طرح کا نقصان یا ایذا بغیر مشیت خداوندی کے نہیں پہنچا سکتا اور اللہ تعالیٰ کے اعمال و افعال سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے جو صورت پیش آئی ہے اسمیں ضرور کوئی حکمت ہوگی تو مخالف کی ایذا سے جو پیدا ہوئے الاغیظ و غضب خود بخود کافور ہو جاتا ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكَ تَرْضٰى یعنی اس تدبیر سے آپ راضی خوشی بسر کر سکیں گے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کریں اسکی حمد و شکر کیساتھ۔ اسمیں اشارہ ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے یا کچھ عبادت کرنے کی توفیق ہو جائے اسکو چاہئے کہ اپنے اس عمل پر ناز و فخر کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر کو اپنا وظیفہ بنائے یہ ذکر اللہ یا عبادت اُسی کی توفیق کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اور یہ لفظ سَبِّحْ بھی عام ذکر و حمد کے معنے میں بھی ہو سکتا ہے اور خاص نماز کے معنے میں بھی عموماً

حضرات مفسرین نے اسی کو لیا ہے اور اس کے بعد جو اوقات معین کرکے بتلائے ہیں وہ بھی نمازوں کے اوقات قرار دیئے ہیں مثلاً قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد نماز فجر اور قَبْلَ غُرُوْبِهَا سے مراد نماز ظہر و عصر اور مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مراد رات کی سب نمازیں مغرب عشاء یہاں تک کہ تہجد بھی اسمیں شامل ہے اور پھر لفظ اَطْرَافَ النَّهَارِ سے اس کی مزید تاکید بتلائی گئی ہے۔

دولتِ دُنیا چند روزہ ہے یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ مومن کے لئے خطرہ کی چیز ہے

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ ، اسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور در اصل ہدایت کرنا اُمت کو ہے کہ دُنیا کے مالداروں سرمایہ داروں کو قسم قسم کی دُنیوی رونق اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہیں۔ آپ اُن کی طرف نظر بھی نہ اُٹھایئے کیونکہ یہ سب عیش فانی اور چند روزہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت آپ کو اور آپکے واسطے سے مؤمنین کو عطا فرمائی ہے وہ بدرجہا اُن کی اس چند روزہ رونقِ حیات سے بہتر ہے۔

دُنیا میں کفار و فجار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لئے یہ سوال بنتی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو اُن کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں اور اطاعت شعار مؤمنین کی غربت و افلاس کیوں؟ یہاں تک کہ فاروقِ اعظمؓ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا جسوقت وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپکے خاص حجرہ میں داخل ہوئے جسمیں آپ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپؐ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان تیلیوں کے نشانات آپؐ کے بدن مبارک پر کھڑے ہوگئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ کسریٰ و قیصر اور اُن کے امراء کیسی کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپؐ ساری مخلوق میں اللہ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپؐ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابنِ خطاب کیا تم اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذات و محبوبات اللہ نے اسی دُنیا میں اُن کو دیدی ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں وہاں عذاب ہی عذاب ہے (اور مؤمنین کا معاملہ برعکس ہے) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دُنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے تھے باوجودیکہ آپؐ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لئے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کرلیں۔ اور جب کبھی دُنیا کی دولت آپکے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی و طلب کے آ بھی جاتی تھی تو فوراً اللہ کی راہ میں غرباء و فقراء پر اس کو خرچ کر ڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لئے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابو سعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اخوف ما اخاف علیکم ما یفتح اللہ لکم من زھرۃ الدنیا (ابن کثیر)

مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت و زینتِ دُنیا ہے جو تم پر کھولدی جاویگی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو پہلے ہی یہ خبر بھی دیدی ہے کہ آئندہ زمانے میں تمہاری فتوحات دُنیا میں ہوں گی اور مال و دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی ہو جائے گی۔ وہ صورتِ حال کچھ زیادہ خوش ہونے کی نہیں بلکہ ڈرنے کی چیز ہے کہ اُس میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کے احکام سے غفلت نہ ہو جائے۔

اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو نماز کی پابندی کی تاکید اور اسکی حکمت

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، یعنی آپ اپنے اہل کو بھی نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اُس پر جمے رہیئے۔ یہ بظاہر دو حکم الگ الگ ہیں، ایک اہل و عیال کو نماز کی تاکید دوسرے خود اس کی پابندی لیکن غور کیا جائے تو خود اپنی نماز کی پوری پابندی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ کا ماحول آپکے اہل و عیال اور متعلقین نماز کے پابند ہوں کیونکہ ماحول اسکے خلاف ہوا تو طبعی طور پر انسان خود بھی کوتاہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

لفظ اَھْل میں بیوی، اولاد اور متعلقین سبھی داخل ہیں جن سے انسان کا ماحول اور معاشرہ بنتا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ روزانہ صبح کی نماز کے وقت حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کے مکان پر جا کر آواز دیتے تھے الصَّلٰوۃ الصَّلٰوۃ (قرطبی)

اور حضرت عروہ ابن زبیرؓ جب کبھی امراء و سلاطین کی دولت و حشمت پر اُن کی نظر پڑتی تو فوراً اپنے گھر میں لوٹ جاتے اور گھر والوں کو نماز کے لئے دعوت دیتے اور یہ آیت پڑھ کر سناتے تھے۔ اور حضرت فاروق اعظمؓ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کر دیتے تھے اور یہی آیت پڑھ کر سناتے تھے (قرطبی)

جو آدمی نماز اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسکے لئے رزق کا معاملہ آسان بنا دیتے ہیں

لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا، یعنی ہم تم سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ تم اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق اپنے زورِ علم و عمل سے پیدا کرو بلکہ یہ معاملہ ہم نے اپنے ذمہ رکھا ہے کیونکہ رزق کی تحصیل دراصل انسان کے بس میں ہی نہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ زمین کو نرم قابلِ کاشت بنائے اور کچھ دانے اسمیں ڈالدے مگر دانہ کے اندر سے درخت نکالنا اور پیدا کرنا اسمیں تو اس کا کوئی ادنیٰ دخل نہیں وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ درخت نکل آنے کے بعد بھی انسان کا سارا عمل اس کی حفاظت کرنا اور جو پھل پھول قدرت نے اُس کے اندر پیدا فرمائے ہیں اُن سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ یہ بارِ محنت بھی اسکے لئے آسان اور ہلکا کر دیتے ہیں۔ ترمذی اور ابنِ ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یقول اللہ تعالیٰ یا ابن آدم تفرغ لعبادتی املاء صدرك غنی واسد فقرك وان لم	اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرلے تو میں تیرے سینے کو غناء و استغناء سے بھر دونگا

تفعل ملأت صدرك شغلا ولم اسد فقرك (ابن کثیر)

اور تیری محتاجی کو دور کر دونگا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرا سینہ فکر اور شغل سے بھر دونگا اور محتاجی دور نہ کروں گا (یعنی جتنا مال بڑھتا جائے گا حرص بھی اُتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی اس لئے ہمیشہ محتاج ہی رہے گا)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ:

من جعل همومه همًا واحدا هم المعاد كفاه الله هم دنياه ومن تشعبت به الهموم في احوال الدنيا لم يبال الله في اي اودية هلك رواه ابن ماجه (ابن کثیر)

جو شخص اپنے سارے فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنالے تو اللہ تعالیٰ اسکے دُنیا کے فکروں کی خود کفالت کرلیتا ہے اور جس کے فکر دُنیا کے مختلف کاموں میں لگے رہے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پروا نہیں کہ وہ اُن فکروں کے کسی جنگل میں ہلاک ہو جائے۔

بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولٰى، یعنی پچھلی آسمانی کتابیں تورات و انجیل اور صحف ابراہیم علیہ السلام وغیرہ سب کے سب رسول آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی شہادت دیتے آئے ہیں کیا یہ بیّنات ان منکرین کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت نہیں ہے۔

فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى، یعنی آج تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو زبان دی ہوئی ہے ہر ایک اپنے طریقے اور اپنے عمل کے بہتر اور صحیح ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن یہ دعویٰ کچھ کام دینے والا نہیں۔ بہتر اور صحیح طریقہ تو وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول و صحیح ہو، اور اسکا پتہ قیامت کے روز سب کو لگ جائیگا کہ کون غلطی اور گمراہی پر تھا کون صحیح اور سیدھے راستہ پر۔

اللّٰهم اهدنا لما اختلف فيه من الحق باذنك ولا حول ولا قوة الا بك ولا منجا ولا ملجأ منك الا اليك

الحمد لله الذي وفقني لتكميل سورة طٰهٰ ضحى يوم الخميس لاربعة عشر خلت من ذي الحجة الحرام سنة ۱۳۹۰ھ والله سبحانه وتعالى اسأل تكميل باقي القرآن والله المستعان وعليه التكلان

سُوْرَةُ الْأَنْبِيَاءِ

سُوْرَةُ الْأَنْبِيَاءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّاثْنَتَا عَشْرَةَ آيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ انبیاء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بارہ آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ① مَا يَأْتِيْهِمْ

نزدیک آگیا لوگوں کے اُن کے حساب کا وقت اور وہ بے خبر ٹلا رہے ہیں کوئی نصیحت نہیں

مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ② لَاهِيَةً

پہنچتی اُن کو اُن کے رب سے نئی مگر اس کو سُنتے ہیں کھیل میں لگے ہوئے کھیل میں پڑے ہیں

قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَا اِلَّا

دل اُن کے اور چھپا کر مشورت کی بے انصافوں نے یہ شخص کون ہے ایک

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ قٰلَ رَبِّيْ

آدمی ہے تم ہی جیسا پھر کیوں پھنستے ہو اسکے جادو میں آنکھوں دیکھتے اُس نے کہا میرے رب کو

يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④ بَلْ

خبر ہے بات کی آسمان میں ہو یا زمین میں اور وہی ہے سننے والا جاننے والا اس کو

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا

چھوڑ کر کہتے ہیں بیہودہ خواب ہیں نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے، نہیں، شعر کہتا ہے پھر چاہئے لے آئے

بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ⑤ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ

ہمارے پاس کوئی نشانی جیسے پیغام لے کر آئے ہیں پہلے نہیں مانی اُن سے پہلے کسی بستی نے

اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ⑥ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا

جن کو غارت کر دیا ہم نے کیا اب یہ مان لیں گے اور پیغام نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے مگر یہی مردوں کے ہاتھ

نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑦

وحی بھیجتے تھے ہم اُن کو سو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿۸﴾ ثُمَّ

اور نہیں بنائے تھے ہم نے اُن کے ایسے بدن کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ تھے وہ ہمیشہ رہ جانے والے پھر

صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۹﴾

سچا کر دیا ہم نے اُن سے وعدہ سو بچا دیا اُن کو اور جس کو ہم نے چاہا اور غارت کر دیا حد سے نکلنے والوں کو

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

ہم نے اُتاری ہے تمہاری طرف کتاب کہ اس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اُن (منکر) لوگوں سے اُن کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا (یعنی قیامت وقتاً فوقتاً نزدیک ہوتی جاتی ہے) اور یہ (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے) ہیں (اور اسکے یقین کرنے اور اس کے لئے تیاری کرنے سے) اعراض کئے ہوئے ہیں (اور اُن کی غفلت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ) اُن کے پاس اُنکے رب کیطرف سے جو نصیحت تازہ (حسب حال انکے) آتی ہے (بجائے اسکے کہ اُن کو تنبہ ہوتا) یہ اسکو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں (اور) اُن کے دل (اصلاً اُدھر) متوجہ نہیں ہوتے اور یہ لوگ یعنی ظالم (اور کافر) لوگ (آپس میں) چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں (اس لئے نہیں کہ انکو اہل اسلام کا خوف تھا کیونکہ مکہ میں کفار ضعیف نہ تھے بلکہ اس لئے کہ اسلام کے خلاف خفیہ سازش کر کے اسکو مٹائیں) کہ یہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) محض تم جیسے ایک (معمولی) آدمی ہیں (یعنی نبی نہیں اور یہ جو ایک دلکش دلربا کلام سناتے ہیں اس پر اعجاز کا شبہ اور اس اعجاز سے نبوت کا خیال نہ کرنا کیونکہ وہ حقیقت میں سحر آمیز کلام ہے) تو کیا (باوجود اس بات کے) پھر بھی تم جادو کی بات سننے کو (انکے پاس) جاؤگے حالانکہ تم (اس بات کو خوب) جانتے (بوجھتے) ہو، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے کا حکم ہوا اور اُنھوں) نے (موافق حکم کے جواب میں) فرمایا کہ میرا رب ہر بات کو (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں (ہو اور خواہ ظاہر ہو یا خفی ہو خوب) جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے (سو تمھارے ان اقوال کفریہ کو بھی جانتا ہے اور تم کو خوب سزا دیگا اور اُنھوں نے کلام حق کو صرف جادو کہنے پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ یوں (بھی) کہا کہ یہ (قرآن) پریشان خیالات ہیں (کہ واقع میں دلکش بھی نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) اُنھوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (قصداً واختیاراً اپنے دل سے) تراش لیا ہے (اور خواب کے خیالات میں تو انسان قدرے بے اختیار اور معذور اور مبتلائے اشتباہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ افترا کچھ قرآن ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں (ان کی تمام باتیں ایسی ہی تراشیدہ اور خیالی ہوتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رسول نہیں ہیں اور

بڑے مدّعی رسالت کے ہیں) تو ان کو چاہیئے کہ ایسی کوئی (بڑی) نشانی لاویں جیسا پہلے لوگ رسول بنائے گئے (اور بڑے بڑے معجزات ظاہر کئے اس وقت ہم رسُول مانیں اور ایمان لائیں اور یہ کہنا بھی ایک بہانہ تھا ورنہ انبیاءِ سابقین کو بھی نہ مانتے تھے حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں کہ) اُن سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہمنے ہلاک کیا ہے (باوجود ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہوجانے کے) ایمان نہیں لائے سو کیا یہ لوگ (ان معجزات کے ظاہر ہونے پر) ایمان لے آویں گے (اور ایسی حالت میں ایمان نہ لانے پر عذاب نازل ہوجاویگا اس لئے ہم وہ معجزات ظاہر نہیں فرماتے اور قرآن معجزہ کافی ہے) اور (رسالت کے متعلق جو ان کا یہ شبہ ہے کہ رسول بشر نہ ہونا چاہیئے اُسکا جواب یہ ہے کہ) ہم نے آپ سے قبل صرف آدمیوں ہی کو پیغمبر بنایا ہے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے سو (اے منکرو) اگر تم کو (یہ بات) معلوم نہ ہو تو اہلِ کتاب سے دریافت کرلو (کیونکہ یہ لوگ اگرچہ کافر ہیں مگر خبر متواتر میں راوی کا مُسلمان یا ثقہ ہونا شرط نہیں، پھر تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے ہو تو تمہارے نزدیک اُنکی بات معتبر ہونی چاہیئے) اور (اسی طرح رسالت کے متعلق جو اس شبہ کی دوسری تقریر ہے کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیئے اسکا جواب یہ ہے کہ) ہم نے ان رسُولوں کے (جو کہ گزر چکے ہیں) ایسے بدن نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں (یعنی فرشتہ نہ بنایا تھا) اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کے انتظار میں خوشیاں منا رہے ہیں لقولہ تعالیٰ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ کذا فی المعالم، یہ وفات بھی منافی نبوت نہیں کیونکہ) وہ (گزشتہ حضرات (بھی دُنیا میں) ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے (پس اگر آپ کی بھی وفات ہوجائے تو نبوت میں کیا اعتراض لازم آیا، غرض یہ کہ جیسے پہلے رسُول تھے ویسے ہی آپ بھی ہیں اور یہ لوگ جس طرح آپ کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح ان حضرات کی بھی اُس زمانے کے کفار نے تکذیب کی) پھر ہمنے جو ان سے وعدہ کیا تھا (کہ مکذبین کو عذاب سے ہلاک کریں گے اور تم کو اور مُومنین کو محفوظ رکھیں گے ہم نے) اُس (وعدہ) کو سچا کیا یعنی ان کو اور جن جن کو (نجات دینا) منظور ہوا (اُس عذاب سے) ہم نے نجات دی اور (اس عذاب سے) حد (اطاعت) سے گزرنے والوں کو ہلاک کیا (سو ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے، اے منکرو اس تکذیب کے بعد تم پر دُنیا و آخرت میں عذاب آوے تو تعجب نہیں کیونکہ) ہم تمہارے پاس ایسی کتاب بھیج چکے ہیں کہ اسمیں تمہاری نصیحت (کافی) موجود ہے کیا (باوجود ایسی تبلیغ موعظت کے) پھر بھی تم نہیں سمجھتے (اور نہیں مانتے)۔

معارف و مسائل

سُورۂ انبیاء کی فضیلت | حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ سُورۂ کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ چاروں سُورتیں نزول کے اعتبار سے ابتدائی سُورتیں اور میری یہ قدیم دولت اور کمائی ہیں

جن کی ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں (قرطبی)

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ، یعنی وہ وقت قریب آگیا جبکہ لوگوں سے اُن کے اعمال کا حساب لیا جاویگا مُراد اس سے قیامت ہے اور اُسکا قریب آنا دُنیا کی پچھلی عمر کے لحاظ سے ہے کیونکہ یہ اُمت آخر الامم ہے، اور اگر حساب عام مُراد لیا جائے تو حساب قبر بھی اسمیں شامل ہے جو ہر انسان کو مرنے کے فوراً بعد دینا ہوتا ہے اور اسی لئے ہر انسان کی موت کو اسکی شخصی قیامت کہا گیا ہے من مات فقد قامت قیامتہ، یعنی جو شخص مر گیا اسکی قیامت تو ابھی قائم ہوگئی، اس معنے کے اعتبار سے حساب کا وقت قریب ہونا تو بالکل ہی واضح ہے کہ ہر شخص کی موت خواہ کتنی ہی عمر ہو کچھ دُور نہیں خصوصاً جبکہ عمر کی انتہا نامعلوم ہے تو ہر دن ہر گھنٹہ موت کا خطرہ سامنے ہے۔

مقصود اس آیت سے غفلت شعار لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جسمیں سب مؤمن و کافر داخل ہیں، کہ دنیا کی خواہشات میں مشغول ہو کر اس حساب کے دن کو نہ بھلائیں کیونکہ اس کو بھلا دینا ہی ساری خرابیوں اور گناہوں کی بنیاد ہے۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ

جو لوگ آخرت اور قبر کے عذاب سے غفلت اور اس کے لئے تیاری سے اعراض کرنے والے ہیں یہ ان کے حال کا مزید بیان ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن کی کوئی نئی آیت آتی اور پڑھی جاتی ہے تو وہ اسکو اس حالت میں سُنتے ہیں کہ کھیل اور ہنسی مذاق کرتے ہیں اور ان کے دل اللہ سے اور آخرت سے بالکل غافل ہوتے ہیں اسکی یہ مُراد بھی ہوسکتی ہے کہ قرآن کی آیات سننے کے وقت یہ اپنے کھیل اور شغل میں اسی طرح لگے رہتے ہیں قرآن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ خود آیات قرآن ہی سے کھیل اور ہنسی مذاق کا معاملہ کرنے لگتے ہیں۔

أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ، یعنی یہ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ سرگوشی کر کے یہ کہتے ہیں کہ یہ جو آپ کو نبی اور رسول کہتے ہیں یہ تو ہم جیسے ہی انسان ہیں کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں کہ ہم اُن کی بات مان لیں اور پھر اس کلام الٰہی کو جو اُن کے سامنے پڑھا جاتا تھا اور اس کی حلاوت و بلاغت اور دلوں میں تاثیر کا کوئی کافر بھی انکار نہ کر سکتا تھا اُس سے لوگوں کو ہٹانے کی صورت نکالی کہ اس کو سحر اور جادو قرار دیں اور پھر لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لئے یہ کہیں کہ جب تم سمجھ گئے کہ یہ جادو ہے تو پھر ان کے پاس جانا اور یہ کلام سننا دانشمندی کے خلاف ہے شاید یہ گفتگو آپس میں آہستہ اسلئے کرتے تھے کہ مسلمان سُن لیں گے تو اُن کی احمقانہ تلبیس کا پول کھول دیں گے۔

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ، اضغاث احلام ان خوابوں کو کہا جاتا ہے جسمیں کچھ نفسانی یا شیطانی خیالات شامل ہو جاتے ہیں اسی لئے اسکا ترجمہ پریشان خیالات سے کیا گیا ہے یعنی ان منکرین نے اول تو

قرآن کو جادو کہا پھر اُس سے آگے بڑھے تو پریشان خواب کہنے لگے پھر اس سے بھی آگے بڑھے تو کہنے لگے یہ تو خدا تعالیٰ پر افترا، اور بہتان ہے کہ یہ اسکا کلام ہے پھر کہنے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی شاعر آدمی ہے شاعرانہ خیالات اسکے کلام میں ہوتے ہیں۔

فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ، یعنی اگر یہ واقعی نبی و رسُول ہیں تو ہمارے مانگے ہوئے خاص معجزات دکھلائیں اس کے جواب میں حق تعالےٰ نے فرمایا کہ پچھلی اُمتوں میں اسکا بھی تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جس طرح کا معجزہ اُنھوں نے خود طلب کیا اللہ کے رسُول کے ہاتھوں وہی معجزہ سامنے آگیا مگر وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اور منہ مانگے معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی جو قوم ایمان سے گریز کرے اسکے لئے اللہ کا قانون یہ ہے کہ دُنیا ہی میں عذاب نازل کر کے ختم کر دیجاتی ہے اور چونکہ اُمت محمدیہ کو حق تعالیٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعزاز میں دُنیا کے عذابِ عام سے محفوظ کر دیا ہے اس لئے ان کو ان کے مانگے ہوئے معجزات دکھلانا مصلحت نہیں آگے أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ میں اسیطرف اشارہ ہے کہ کیا منہ مانگے معجزہ کو دیکھ کر یہ ایمان لے آئیں گے مُراد یہ ہے کہ ان سے اسکی کوئی توقع نہیں کیجا سکتی اسلئے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا جاتا۔

فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ، اہلِ ذکر سے مُراد اس جگہ علماء تورات و انجیل ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں پچھلے انبیاء کا حال معلوم نہیں کہ وہ انسان تھے یا فرشتے تو علماء تورات وانجیل سے معلوم کر لو کیونکہ وہ سب جانتے ہیں کہ سب انبیاء سابقین انسان ہی کی نوع سے تھے اسلئے اگر یہاں اہل الذکر سے مطلق اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہی مُراد ہوں تو بعید نہیں کیونکہ اس معاملے کے سبھی شاہد ہیں۔ خلاصۂ تفسیر میں اسی احتمال کو اختیار کر کے تشریح کی گئی ہے۔ مسئلہ :۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جسکو احکامِ شریعت معلوم نہ ہوں اُسپر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اسکے مطابق عمل کرے۔

قرآن کریم عربوں کے لئے عزت و فخر ہے كِتَٰبًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ، کتاب سے مراد قرآن ہے اور ذکر اس جگہ بمعنے شرف و فضیلت اور شہرت کے ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ قرآن جو تمہاری زبان عربی میں نازل ہوا تمھارے لیے ایک بڑی عزت اور نامی شہرت کی چیز ہے تمہیں اس کی قدر کرنا چاہیے جیساکہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ اہلِ عرب کو حق تعالےٰ نے قرآن کی برکت سے ساری دُنیا پر غالب اور فاتح بنا دیا اور پورے عالم میں اُن کی عزت و شہرت کا ڈنکا بجا۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ عربوں کی مقامی یا قبائلی یا لسانی خصوصیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف قرآن کی بدولت ہوا اگر قرآن نہ ہوتا تو شاید آج کوئی عرب قوم کا نام لینے والا بھی نہ ہوتا۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا

اور کتنی پیس ڈالیں ہم نے بستیاں جو تھیں گناہگار اور اٹھا کھڑے کئے اُن کے پیچھے اور

اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا

لوگ پھر جب آہٹ پائی انھوں نے ہماری آفت کی تب لگے وہاں سے ایڑ کرنے ایڑ

تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾

مت کرو اور لوٹ جاؤ جہاں تم نے عیش کیا تھا اور اپنے گھروں میں، شاید کوئی تم کو پوچھے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى

کہنے لگے ہائے خرابی ہماری ہم تھے بیشک گنہگار پھر برابر یہی رہی اُن کی فریاد یہاں تک کہ

جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

ڈھیر کر دیئے گئے کاٹ کر بجھے پڑے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے بہت سی بستیاں جن کے رہنے والے ظالم (یعنی کافر) تھے تباہ کر ڈالیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کر دی تو جب ان ظالموں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو اس بستی سے بھاگنا شروع کیا (تاکہ عذاب سے بچ جاویں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) بھاگو مت اور اپنے سامانِ عیش اور اپنے مکانات کی طرف واپس چلو شاید تم سے کوئی پوچھے پاچھے (کہ تم پر کیا گزری مقصود اس سے بطور تعریض کے ان کی احمقانہ جسارت پر تنبیہ ہے کہ جس سامان اور مکان پر تم کو ناز تھا اب نہ وہ سامان رہا نہ مکان نہ کسی دوست ہمدرد کا نام و نشان رہا) وہ لوگ (نزولِ عذاب کے وقت) کہنے لگے کہ ہائے ہماری کم بختی بیشک ہم لوگ ظالم تھے اُن کا یہی شور و غل رہا یہاں تک کہ ہم نے اُن کو ایسا (نیست و نابود) کر دیا جس طرح کھیتی کٹ گئی ہو یا آگ بجھ گئی ہو۔

معارف و مسائل

اِن آیات میں جن بستیوں کے تباہ کرنے کا ذکر ہے بعض مفسرین نے ان کو یمن کی بستیاں حضورار اور قلابہ قرار دیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسُول بھیجا تھا جس کے نام میں روایات مختلف ہیں بعض میں موسیٰ بن میشا اور بعض میں شعیب ذکر کیا گیا ہے اور اگر شعیب نام ہے تو وہ مدین والے شعیب علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور ہیں ان لوگوں نے اللہ کے رسُول کو قتل کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک کافر بادشاہ بُخت نصر کے ہاتھوں تباہ کرایا۔ بُخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا جیسا کہ بنی اسرائیل

إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ

کی بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو اور کہتے ہیں رحمٰن نے کر لیا کسی کو بیٹا وہ ہرگز اس لائق نہیں

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهٖ

لیکن وہ بندے ہیں جن کو عزت دی ہے اس سے بڑھ کر نہیں بول سکتے اور وہ اسی کے حکم پر کام

يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا

کرتے ہیں اس کو معلوم ہے جو ان کے آگے ہے اور پیچھے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر

لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ

اسکی جس سے اللہ راضی ہو اور وہ اسکی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور جو کوئی ان میں کہے کہ میری

إِنِّيْٓ إِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ ع ۲

بندگی ہے اس سے ورے سو اسکو ہم بدلہ دیں گے جہنم یونہی ہم بدلہ دیتے ہیں بے انصافوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمارے یکتا ہونے پر ہماری مصنوعات دلالت کر رہی ہیں کیونکہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں (بلکہ انمیں بہت سی حکمتیں ہیں جنمیں بڑی حکمت توحید حق پر دلالت ہے اور) اگر ہم کو (آسمان اور زمین کے بنانے سے کوئی حکمت مقصود نہ ہوتی بلکہ ان کو محض) مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا (جس میں کوئی معتد بہ فائدہ مقصود نہیں ہوتا محض دل بہلانا منظور ہوتا ہے) تو ہم خاص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے (مثلاً اپنی صفات کمال کے مشاہدہ کو) اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا (کیونکہ مشغلہ کو مشاغل کی شان سے مناسبت چاہئے تو کہاں ذات خالق کائنات اور کہاں یہ مصنوعات حادثہ اسلئے صفات کو بوجہ قدیم اور لازم ذات ہونے کے باہم مناسبت ہے سو حسب بدلائل عقلیہ اجماع اہل ملل اسکا بھی مشغلہ قرار دیا جانا محال ہے تو مصنوعات حادثہ میں تو کسی کو اسکا وہم بھی نہ ہونا چاہئے پس ثابت ہوا کہ ہم نے عبث شئ نفس پیدا نہیں کیا) بلکہ اثبات حق اور ابطال باطل کیلئے پیدا کیا ہے اور) ہم (اس) حق بات کو (جس کے ثبوت پر مصنوعات دلالت کرتی ہیں) باطل بات پر (اس طرح غالب کر دیتے ہیں جیسے کوئی کچھ کو اس پر) پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (باطل مغلوب ہو کر) دفعتہً جاتا رہتا ہے (یعنی دلائل توحید جو ان مصنوعات سے حاصل ہوتے ہیں شرک کی بالکلیہ نفی کر دیتے ہیں جس کی جانب مخالف کا احتمال ہی نہیں رہتا، اور (تم جو باوجود ان دلائل قاہرہ کے شرک کرتے ہو تو) تمہارے لئے اس بات سے بڑی خرابی ہو جو تم (خلاف حق کے) گھڑتے ہو اور (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ)

جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں اور جو اس کے نزدیک (بڑے مقبول و مقرب) ہیں (ان کی بندگی کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں (بلکہ) شب و روز (اللہ کی) تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے (جب ان کی یہ حالت ہے تو عام مخلوق تو کس شمار میں ہے پس لائق عبادت کے وہی ہے اور جب کوئی دوسرا اہل نہیں تو پھر اسکا شریک سمجھنا کتنی بے عقلی ہے) کیا (باوجود دلائل توحید کے) ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں (بالخصوص) زمین کی چیزوں میں سے (جو کہ اور بھی ادنیٰ تر درجہ میں ہیں جیسے پتھر یا معدنیات کے بت) جو کسی کو زندہ کرتے ہیں (یعنی جو جان بھی نہ ڈال سکتا ہو پس وہ کب معبود ہونے کے قابل ہوگا اور زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے) درہم برہم ہو جاتے (کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا ایک دوسرے سے لڑتے اور اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے متعدد معبود بھی نہیں ہو سکتے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں (کہ نعوذ باللہ اسکے اور شرکا بھی ہیں حالانکہ اس کی ایسی عظمت ہے کہ) وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا) پس کوئی عظمت میں اسکا شریک نہیں ہوا پھر معبودیت میں کوئی کیسے شریک ہو سکتا ہے (یہاں تک تو ابطال اور نقض و استلزام محال کے کلام تھا آگے جواب کے انداز میں کلام ہے کہ) کیا خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں (ان سے) کہئے کہ تم اپنی دلیل (اس دعویٰ پر) پیش کرو (یہاں تک تو سوال اور دلیل عقلی سے شرک کا ابطال تھا آگے دلیل نقلی سے مدعا بیان ہے کہ) یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں (یعنی توریت و انجیل و زبور) موجود ہیں (جن کا کتاب من اللہ ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے اور اوروں میں گو تحریف ہوئی ہے مگر توحید کے مضامین میں تحریف نہیں، پس جو مضمون ان کتب کا قرآن کے مطابق ہوگا وہ یقیناً صحیح ہے اور ان سب میں توحید کا مذکور ہونا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ توحید کے قائل ہو جاتے لیکن پھر بھی قائل نہیں) بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امر حق کا یقین نہیں کرتے سو (اس وجہ سے) وہ (اس کے قبول کرنے سے) اعراض کر رہے ہیں (اور یہ توحید کوئی نئی بات نہیں جس سے توحش ہو بلکہ شرع قدیم ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں پس میری (ہی) عبادت کیا کرو اور یہ (مشرک) لوگ (جو ہیں ان میں بعض) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا رکھی ہے (توبہ توبہ) وہ (اللہ تعالیٰ) اس سے پاک ہے، (وہ فرشتے) اس کی اولاد نہیں بلکہ (اس کے) بندے ہیں (ہاں) معزز بندے ہیں (جس سے بعض عقول کو اشتباہ ہو گیا اور ان کی عبدیت

اور محکومیت اور ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے (بلکہ منتظر حکم رہتے ہیں) اور وہ اُسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں (اس کے خلاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ اُن کے اگلے پچھلے احوال کو (خوب) جانتا ہے (پس جو حکم ہوگا اور جب حکم ہوگا موافق حکمت کے ہوگا اس لئے نہ عملی مخالفت کرتے ہیں نہ قولی مسابقت کرتے ہیں) اور (ان کے ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ بجز اس (شخص) کے جس کے لئے (شفاعت کرنے کی) خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کرتے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور (یہ تو بیان تھا ان کی مغلوبیت اور محکومیت کا، آگے بیان ہے اللہ تعالیٰ کی غالبیت اور حاکمیت کا، گو حاصل دونوں کا متقارب ہے یعنی) ان میں سے جو شخص (بالفرض) یوں کہے کہ (نعوذ باللہ) میں علاوہ خدا کے معبود ہوں سو ہم اس کو سزائے جہنم دیں گے (اور) ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی خدا کا ان پر پورا بس ہے جیسے اور مخلوقات پر پھر وہ خدا کی اولاد جس کے لئے خدا ہونا ضروری ہے کیسے ہو سکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ، یعنی ہم نے آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو لعب اور کھیل کے لئے نہیں بنایا۔ پچھلی آیتوں میں بعض بستیوں کو تباہ و ہلاک کرنے کا ذکر آیا تھا اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس طرح زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات کی تخلیق بڑی بڑی اہم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے جن بستیوں کو تباہ کیا گیا اُن کا تباہ کرنا بھی عین حکمت تھا۔ اس مضمون کو اس آیت میں تعبیر اس طرح کیا گیا کہ یہ توحید یا رسالت کے منکر کیا ہماری قدرت کاملہ اور علم و بصیرت کی ان نمایاں نشانیوں کو جو زمین و آسمان کی تخلیق میں اور تمام مخلوقات کی صنعت گری میں مشاہدہ کی جا رہی ہیں دیکھتے سمجھتے نہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ سب چیزیں فضول ہی محض کھیل کے لئے پیدا کی ہیں۔

لٰعِبِيْنَ، لعب سے مشتق ہے، لعب ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی صحیح مقصد متعلق نہ ہو (راغب) اور لہو اس کام کو کہتے ہیں جس سے کوئی صحیح یا غلط مقصد ہی نہ ہو خالی وقت گزاری کا مشغلہ بنایا جائے منکرین اسلام جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اعتراض اور توحید کا انکار کرتے ہیں، قدرت حق کی ان عظیم الشان نشانیوں کے باوجود نہیں مانتے تو اُن کا یہ عمل گویا اس کا دعویٰ ہے کہ یہ سب چیزیں فضول ہی کھیل کے لئے بنائی گئی ہیں، اُن کے جواب میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ کھیل اور فضول نہیں ذرا بھی غور و فکر سے کام لو تو کائنات کے ایک ایک ذرہ میں اور قدرت کی ایک ایک صنعت میں ہزاروں حکمتیں ہیں اور سب کی سب معرفت حق سبحانہٗ اور اس کی توحید کے خاموش سبق ہیں ۔ ہر گیاہے کہ از زمیں روید ٭ وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ، یعنی اگر ہم کو کوئی مشغلہ بطور کھیل کے بنانا ہی چاہتے اور ہمیں یہ کام کرنا ہی ہوتا تو ہمیں کیا ضرورت تھی کہ زمین و آسمان وغیرہ پیدا کریں یہ کام اپنے پاس کی چیزوں سے بھی ہو سکتا تھا۔

عربی زبان میں حرف لَوْ فرضی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جس کا کوئی وجود نہ ہو اس جگہ بھی اسی حرف سے یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ جو حمق ان تمام علویات اور سفلیات آسمانی اور زمینی مخلوقات اور مصنوعات عجیبہ کو لہو ولعب کہتے ہیں کیا وہ اتنی بھی عقل نہیں رکھتے کہ اتنے بڑے بڑے کام لہو ولعب کیلئے نہیں ہوا کرتے یہ کام جس کو کرنا ہو وہ یوں نہیں کیا کرتا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ لہو ولعب کا کوئی کام حق تعالیٰ کی عظمت شان تو بہت بلند و بالا ہے کسی اچھے معقول آدمی سے بھی متصور نہیں۔

لہو کے اصلی اور معروف معنی بیکاری کے مشغلہ کے ہیں اسی کے مطابق مذکورہ تفسیر کی گئی ہے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ لہو کبھی بیوی کے لئے اور اولاد کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد لیجائے تو مطلب آیت کا یہود و نصاریٰ پر رد کرنا ہوگا جو حضرت مسیح یا عزیر علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اولاد ہی بنانی ہوتی تو انسان مخلوق کو کیوں بناتے اپنے پاس کی مخلوق میں سے بنا لیتے۔ واللہ اعلم

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ، قذف کے لغوی معنی پھینک اور پھینک مارنے کے ہیں دمغ کے معنے دماغ پر ضرب لگانے کے ہیں اور زاہق کے معنے جانے والا اور بے نام ونشان ہو جانے والا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زمین و آسمان کی عجیب و غریب کائنات ہم نے کھیل کے لئے نہیں بلکہ بڑی حکمتوں پر مبنی کر کے بنائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ حق و باطل کا امتیاز ہوتا ہے، مصنوعات قدرت کا مشاہدہ انسان کو حق کی طرف ایسی رہبری کرتا ہے کہ باطل اسکے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اسی مضمون کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ حق کو باطل کے اوپر پھینک مارا جاتا ہے جس سے باطل کا دماغ (بھیجا) نکل جاتا ہے اور وہ بے نام ونشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ، یعنی ہمارے جو بندے ہمارے پاس ہیں مراد اس سے فرشتے ہیں وہ ہر وقت ہماری عبادت میں بغیر کسی وقفہ کے ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اگر تم ہماری عبادت نہ کرو تو ہماری خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انسان چونکہ دوسروں کو بھی اپنے حال پر قیاس کرنیکا عادی اور خوگر ہوتا ہے اسکو دائمی عبادت سے دو چیزیں مانع ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی کی عبادت کرنے کو اپنے درجہ اور مقام کے خلاف سمجھے اسلئے عبادت کے پاس ہی نہ جائے دوسرے یہ کہ عبادت تو کرنا چاہتا ہے مگر دائمی مسلسل اس لئے نہیں کر سکتا کہ مقتضائے بشریت وہ تھوڑا کام کر کے تھک جاتا ہے اس کو آرام کرنے اور سونے کی ضرورت پیش آتی ہے اسلئے آخر آیت میں فرشتوں سے ان دونوں موانع کی نفی کر دی گئی کہ وہ نہ تو ہماری عبادت سے استکبار کرتے ہیں

کہ اسکو اپنی شان کے خلاف جانیں اور نہ عبادت کرنے سے کسی وقت تھکتے ہیں اسی مضمون کی تکمیل بعد کی آیت میں اسطرح فرمائی یُسَبِّحُونَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ، یعنی فرشتے رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں کسی وقت سُست بھی نہیں ہوتے۔

عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے کعب احبار سے پوچھا کہ کیا فرشتوں کو تسبیح کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں، اگر ہے تو پھر دوسرے کاموں کیساتھ ہر وقت کی تسبیح کیسے جاری رہتی ہے۔ کعب نے فرمایا اے میرے بھتیجے کیا تمھارا کوئی کام اور مشغلہ تمھیں سانس لینے سے روکتا ہے اور کام کرنے میں مخل و مانع ہوتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ تسبیح فرشتوں کے لئے ایسی ہے جیسے ہمارا سانس یا آنکھ جھپکنا کہ یہ دونوں چیزیں ہر وقت ہر حال میں جاری رہتی ہیں اور کسی کام میں مانع اور مخل نہیں ہوتیں (قرطبی و بحر محیط)

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ، اسمیں مشرکین کی جہالت کو کئی طرح ظاہر فرمایا ہے۔ اول یہ کہ یہ کیسے احمق ہیں کہ خدا بھی بنایا تو زمین کی مخلوق کو بنایا یہ تو علوی اور آسمانی مخلوقات سے بہرحال کمتر و ابتر ہیں دوسرے یہ کہ جن کو خدا بنایا کیا ان کو انھوں نے یہ کام کرتے دیکھا ہے کہ وہ کسی کو زندہ کرتے اور اسمیں جان ڈالتے ہیں۔ معبود کے لئے تو یہ بات ضروری ہے کہ موت و حیات خدائق اسکے قبضہ میں ہو۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ، یہ توحید کی دلیل عادی ہے جو عام عادات کے اعتبار پر مبنی ہے اور دلیل عقلی کیطرف بھی اشارہ ہے جس کی مختلف تقریریں علم کلام کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور دلیل عادی بس بنا پر ہے کہ اگر زمین و آسمان کے دو خدا اور دونوں مالک و مختار ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں کے احکام پورے پورے زمین و آسمان میں نافذ ہونے چاہئیں اور عادۃً یہ ممکن نہیں کہ جو حکم ایک دے وہی دوسرا بھی دے یا جس چیز کو ایک پسند کرے دوسرا بھی اسی کو پسند کرے اسلئے کبھی کبھی اختلاف رائے اور اختلاف احکام ہونا ناگزیر ہے اور جب دو خداؤں کے احکام زمین و آسمان میں مختلف ہوئے تو نتیجہ ان دونوں کے فساد کے سوا کیا ہے۔ ایک خدا چاہتا ہے کہ اسوقت دن ہو۔ دوسرا چاہتا ہے رات ہو۔ ایک چاہتا ہے بارش ہو دوسرا چاہتا ہے نہ ہو تو دونوں کے متضاد احکام کس طرح جاری ہونگے اور اگر ایک مغلوب ہوگیا تو مالک مختار اور خدا نہ رہا۔ اور یہ شبہ کہ دونوں آپس میں مشورہ کرکے احکام جاری کیا کریں اس میں کیا بُعد ہے اسکے جوابات علم کلام کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئے ہیں۔ اتنی بات یہاں بھی سمجھ لیجائے کہ اگر دونوں مشورہ کے پابند ہوئے ایک بغیر دوسرے کے مشورے کے کوئی کام نہ کرسکے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انمیں سے ایک بھی مالک مختار نہیں، دونوں ناقص ہیں اور ناقص خدا نہیں ہوسکتا اور شاید اگلی آیت لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ میں بھی اسطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو شخص کسی قانون

کا پابند ہو جس کے افعال و اعمال پر کسی کو مواخذہ کرنیکا حق ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا وہی ہے جو کسی کا پابند نہ ہو، جس سے کسی کو سوال کرنیکا حق نہ ہو۔ اگر دو خدا ہوں اور دونوں مشورہ کے پابند ہوں تو ہر ایک کو دوسرے سے سوال کرنے اور ترک مشورہ پر مواخذہ کرنیکا حق لازمی ہو جو خود منصب خدائی کے منافی ہو۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۔ اسکا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ سے مُراد قرآن اور ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ سے مُراد تورات و انجیل اور زبور وغیرہ کتب سابقہ ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ میرا اور میرے ساتھ والوں کا قرآن اور پچھلی اُمتوں کی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ موجود ہیں کیا اُن میں سے کسی کتاب میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی تلقین موجود ہے۔ تورات و انجیل وغیرہ میں تحریف ہو جانے کے باوجود یہ تو آج تک بھی کہیں ثابت نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر کے دوسرا معبود بنا لو۔ بحر محیط میں اسکا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرآن ذکر ہے میرے ساتھ والوں کیلئے بھی اور ذکر ہے مجھ سے پہلوں کیلئے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ والوں کیلئے تو دعوت اور تشریع احکام کے لحاظ سے ذکر ہے اور سابقین کیلئے ذکر بایں معنے ہے کہ اسکے ذریعہ سابقین کے احوال و معاملات اور قصص زندہ ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۔ یعنی فرشتے حق تعالیٰ کی اولاد تو کیا ہوتے وہ تو ایسے خائف اور مؤدب رہتے ہیں کہ نہ قول میں اللہ تعالیٰ سے سبقت کرتے ہیں نہ عمل میں اسکے خلاف کبھی کچھ کرتے ہیں۔ قول میں سبقت نہ کرنیکا مطلب یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ ہی کیطرف سے کوئی ارشاد نہ ہو خود کوئی کلام کرنے میں سبقت کی ہمت نہیں کرتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جب مجلس میں کوئی بات آئے تو جو اس مجلس کا بڑا ہے اسکے کلام کا انتظار کیا جائے پہلے ہی کسی اور کا بول پڑنا خلاف ادب ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا

اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان اور زمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰ وَجَعَلْنَا فِي

اور بنائی ہم نے پانی سے ہر ایک چیز جس میں جان ہے پھر کیا یقین نہیں کرتے اور رکھ دیئے ہم نے

الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا

زمین میں بھاری بوجھ کبھی اُن کو لے کر جھک پڑے اور رکھیں اُس میں کشادہ راہیں

لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳۱ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ

تاکہ وہ راہ پائیں اور بنایا ہم نے آسمان کو چھت محفوظ اور وہ

عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۳۲ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ

آسمان کی نشانیوں کو دھیان میں نہیں لاتے اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۳۳
سورج اور چاند سب اپنے اپنے گھر میں پھرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے (یعنی نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی نہ زمین سے کچھ پیداوار، اسی کو بند ہونا فرمایا جیسا کہ اب بھی اگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار نہ ہو تو اس جگہ یا اس زمانے کے اعتبار سے انکو بند کہا جا سکتا ہے) پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا (کہ آسمان سے بارش اور زمین سے نباتات کا اگنا شروع ہو گیا) اور (بارش سے صرف نباتات ہی کو نمو نہیں ہوتا بلکہ) ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے (یعنی ہر زندہ جاندار کے وجود اور بقاء میں پانی کا دخل ضرور ہے خواہ بلا واسطہ ہو یا کسی واسطہ سے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ) کیا (ان باتوں کو سنکر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے اور ہم نے (اپنی قدرت سے) زمین میں پہاڑ اس لئے بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے، اور ہم نے اس (زمین) میں کشادہ کشادہ رستے بنائے تاکہ لوگ (ان کے ذریعہ) منزل (مقصود) کو پہنچ جاویں اور ہم نے (اپنی قدرت سے) آسمان کو (بمقابلہ زمین کے اس کے اوپر مثل) ایک چھت (کے) بنایا جو (ہر طرح سے) محفوظ ہے۔ (یعنی گرنے سے بھی ٹوٹنے پھوٹنے سے بھی اور اس سے بھی کہ شیطان وہاں تک پہنچ کر آسمان کی باتیں سن سکیں، مگر یہ آسمان کا محفوظ و مضبوط ہونا بھی دائمی نہیں ایک زمانہ معین تک ہے) اور یہ لوگ اس (آسمان) کے (اندر کی موجودہ) نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں (یعنی ان میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے) اور وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے (وہ نشانیاں آسمان کی یہی ہیں اور شمس و قمر میں سے) ہر ایک ایک ایک دائرے میں (اس طرح چل رہے ہیں کہ گویا) تیر رہے ہیں۔

معارف و مسائل

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا، اس جگہ لفظ رؤیت بمعنے علم عام ہے خواہ وہ آنکھوں سے دیکھکر حاصل ہو یا استدلال عقلی سے۔ کیونکہ آگے جو مضمون آرہا ہے اسکا تعلق کچھ مشاہدہ اور دیکھنے سے ہے کچھ علم استدلالی سے۔

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، لفظ رتق کے معنے بند ہونے اور فتق کے معنے کھولدینے کے ہیں۔ ان دو لفظوں کا مجموعہ رتق و فتق کسی کام کے انتظام اور اس کے

پورے اختیار کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ آسمان اور زمین بند تھے ہم نے ان کو کھول دیا۔ اسمیں بند ہونے اور کھول دینے سے مُراد کیا ہے اس کی مُراد میں حضرات مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں مگر ان سب میں جو معنے صحابہ کرام اور جمہور مفسرین نے اختیار فرمائے وہ وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے ہیں کہ بند ہونے سے مُراد آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار کا بند ہونا ہے اور کھولنے سے مراد ان دونوں کو کھول دینا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور اُن سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی اُنھوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس شیخ کے پاس جاؤ ان سے دریافت کرو اور وہ جو جواب دیں مجھے بھی اس کی اطلاع کردو یہ شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ اس آیت میں رتقا اور فتقنا سے کیا مُراد ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پہلے آسمان بند تھے بارش نہ برساتے تھے اور زمین بند تھی کہ اسمیں نباتات نہیں اُگتی تھی جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو آباد کیا تو آسمان کی بارش کھول دی اور زمین کا نشوونما۔ یہ شخص آیت کی تفسیر معلوم کرکے حضرت ابن عمرؓ کے پاس واپس گیا اور جو کچھ ابن عباسؓ سے سنا تھا وہ بیان کیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اب مجھے ثابت ہوگیا کہ واقعی ابن عباسؓ کو قرآن کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے میں تفسیر قرآن کے بارے میں ابن عباسؓ کے بیانات کو ایک جرأت سمجھا کرتا تھا جو مجھے پسند نہ تھی اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انکو علوم قرآن کا خاص ذوق عطا فرمایا ہے اُنھوں نے رتق و فتق کی تفسیر صحیح فرمائی ہے۔

روح المعانی میں ابن عباسؓ کی اس روایت کو ابن المنذر اور ابونعیم اور ایک جماعت محدثین کے حوالہ سے نقل کیا ہے جن میں حاکم صاحب مستدرک بھی ہیں، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

ابن عطیہ عوفی اس روایت کو نقل کرکے کہتے ہیں کہ یہ تفسیر حسن اور جامع اور سیاق و سباق قرآن کے مناسب ہے اسمیں منکرین کے خلاف عبرت اور حجت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور قدرت کاملہ کا اظہار بھی جو معرفت و توحید کی بنیاد ہے اور بعد کی آیت میں جو وجعلنا من الماء کل شیء حی فرمایا ہے اس سے اسی معنے کے اعتبار سے مناسبت ہے۔ بحر محیط میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ قرطبی نے اسی کو عکرمہ کا قول بھی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایک دوسری آیت سے بھی اس معنے کی تائید ہوتی ہے یعنی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ، طبری نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ، مُراد یہ ہے کہ ہر جاندار کی تخلیق میں پانی کا دخل ضرور ہے اور جاندار وذی روح اہلِ تحقیق کے نزدیک صرف انسان اور حیوانات ہی نہیں بلکہ

نباتات بلکہ جمادات میں رُوح اور حیات محققین کے نزدیک ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ پانی کو ان سب چیزوں کی تخلیق و ایجاد اور ارتقاء میں بڑا دخل ہے۔

ابن کثیر نے امام احمدؒ کی سند سے بروایت ابوہریرہ رضؓ نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ رضؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میں جب آپ کی زیارت کرتا ہوں تو میرا دل باغ باغ اور آنکھیں ٹھنڈی ہوجاتی ہیں، آپ مجھے ہر شی (کی تخلیق) کے بارہ میں بتلا دیجئے، آپ نے فرمایا ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اس کے بعد ابوہریرہ رضؓ نے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جس پر عمل کرنے سے میں جنت میں پہنچ جاؤں، آپ نے فرمایا:

افش السلام واطعم الطعام وصل الارحام وقم باللیل والناس نیام ثم ادخل الجنۃ بسلام تفرد بہ احمد وھذا اسناد علی شرط الشیخین الخ

سلام کرنے کو عام کرو (خواہ مخاطب اجنبی ہو) اور کھانا کھلایا کرو، اس کو بھی حدیث میں عام رکھا ہے کھانا کھلانا ہر شخص کو خواہ کافر فاسق ہی ہو ثواب سے خالی نہیں) اور صلہ رحمی کیا کرو اور رات کو تہجد کی نماز پڑھا کرو جب سب لوگ سوتے ہوں تو جنت میں سلامتی کیساتھ داخل ہوجاؤ گے

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ، لفظ مَیدٌ عربی زبان میں اضطرابی حرکت کو کہا جاتا ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ زمین پر پہاڑوں کا بوجھ حق تعالیٰ نے اسکا توازن برقرار رکھنے کے لئے ڈالدیا ہے تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کرسکے جس سے اُس کے اُوپر بسنے والوں کو نقصان پہنچے۔ اس کی فلسفیانہ تحقیق کہ پہاڑوں کے بوجھ کو زمین کے قرار میں کیا دخل ہے اسکی یہاں ضرورت نہیں۔ تفسیر کبیر وغیرہ میں اسکا مفصل بیان اہل علم دیکھ سکتے ہیں اور بقدر ضرورت سورہ نمل کی تفسیر میں حضرت حکیم الامۃ رحؒ نے تفسیر بیان القرآن میں بھی لکھدیا ہے۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ لفظ فلک دراصل ہر دائرے اور گول چیز کو کہا جاتا ہے اسی وجہ سے چرخے میں جو گول چمڑا لگا ہوتا ہے اسکو فلکۃ المغزل کہتے ہیں (روح) اور اسی وجہ سے آسمان کو بھی فلک کہدیا جاتا ہے۔ یہاں مُراد شمس و قمر کی وہ مداریں ہیں جن پر وہ حرکت کرتے ہیں۔ الفاظ قرآن میں اسکی کوئی تصریح نہیں ہے یہ مداریں آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضاء میں۔ حالیہ خلائی تحقیقات نے واضح کر دیا ہے کہ یہ مداریں خلاء اور فضاء میں آسمان سے بہت نیچے ہیں۔

اس آیت کے ظاہر سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آفتاب بھی ایک مدار پر حرکت کرتا ہے جدید فلاسفہ پہلے اسکے منکر تھے اب وہ بھی اسکے قائل ہوگئے ہیں مزید تفصیلات کی یہ جگہ نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالےٰ اعلم

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ﴿٣٤﴾

اور نہیں دیا ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا، پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ

ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو

وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَتَّخِذُونَكَ

اور ہماری طرف پھر کر آجاؤ گے اور جب تجھ کو دیکھیں منکر لوگ تو کوئی کام نہیں ان کو تجھ سے

إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ

مگر ٹھٹھا کرنا کیا یہی شخص ہے جو نام لیتا ہے تمہارے معبودوں کا اور وہ رحمٰن کے نام سے

هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٦﴾ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا

منکر ہیں بنا ہے آدمی جلدی کا اب دکھاتا ہوں تم کو اپنی نشانیاں سو

تَسْتَعْجِلُونِ ﴿٣٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾

مجھ سے جلدی مت کرو اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا

اگر جان لیں یہ منکر اس وقت کو کہ نہ روک سکیں گے اپنے منہ سے آگ اور نہ

عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ

اپنی پیٹھ سے اور نہ ان کو مدد پہنچے گی کچھ نہیں وہ آئے گی ان پر بے خبر پھر ان کے ہوش

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ

کھو دے گی پھر نہ پھیر سکیں گے اس کو اور نہ ان کو فرصت ملے گی اور ٹھٹھے ہو چکے ہیں

بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ

رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر الٹ پڑی ٹھٹھا کرنے والوں پر ان میں سے وہ چیز جس کا

يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ

ٹھٹھا کرتے تھے تو کہہ کون نگہبانی کرتا ہے تمہاری رات میں اور دن میں

الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ

رحمٰن سے کوئی نہیں وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرتے ہیں یا ان کے واسطے کوئی معبود ہیں

تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ

کہ ان کو بچاتے ہیں ہمارے سوا وہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ان کی ہماری

مِّنَّا يُصْحَبُونَ ﴿٤٣﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ

طرف سے رفاقت ہو کوئی نہیں پر ہم نے عیش دیا ان کو اور ان کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بڑھ گئی

عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ

اُن پر زندگی، پھر کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اُس کے

أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۚ وَلَا

کناروں سے، اب کیا وہ جیتنے والے ہیں۔ تو کہہ میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو حکم کے موافق، اور نہیں

يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنْذَرُونَ ﴿٤٥﴾ وَلَئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ

سنتے بہرے پکارنے کو جب کوئی اُن کو ڈر کی بات سنائے۔ اور کہیں پہنچ جائے اُن تک ایک بھاپ

مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٤٦﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ

تیرے رب کے عذاب کی تو کہنے لگیں ہائے کم بختی ہماری بیشک ہم تھے گنہگار۔ اور رکھیں گے ہم ترازویں

الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ

انصاف کی قیامت کے دن، پھر ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ایک ذرہ، اور اگر ہوگا برابر رائی کے

حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ﴿٤٧﴾

دانہ کی تو ہم لے آئیں گے اُس کو، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ جو آپ کی وفات کی خوشیاں منا رہے ہیں (جیسا اللہ تعالیٰ نے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ میں فرمایا ہے، سو) یہ وفات بھی منافی نبوت کی نہیں کیونکہ ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے (خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی دنیا میں) ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا (اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہی تقاضا ہے)، پس جیسے آپ سے پہلے انبیا کو موت آئی اس سے ان کی نبوت میں کسی کو شبہ نہیں ہوا اسی طرح آپ کی وفات سے آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و وفات دونوں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں) پھر یہ کہ اگر آپ کا انتقال ہو جاوے تو کیا یہ لوگ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (آخر یہ بھی مریں گے پھر خوشی کا کیا مقام ہے؟ مطلب یہ کہ آپ کی وفات سے ان کی خوشی اگر ابطال نبوت کے لئے ہے تب تو وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ الخ اس کا جواب ہے اور اگر ذاتی بغض و عداوت سے ہے تو اَفَائِنْ مِّتَّ الخ اسکا جواب ہے غرض ہر حال میں یہ انتظار مہمل اور لغو ہے اور موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں) ہر جاندار موت کا مزا چکھے گا اور (یہ جو ہم نے چند روزہ تم کو زندگی دے رکھی ہے تو اس سے مقصود محض یہ ہے کہ) ہم تم کو بُری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں، بُری حالت سے مراد جو کہ خلاف مزاج ہو جیسے مرض و فقر اور اچھی حالت سے مراد جو کہ موافق مزاج ہو جیسے صحت اور غنا، زندگی میں یہی حالتیں مختلف طور پر پیش آتی ہیں، کوئی ان میں ایمان اور طاعت بجا لاتا ہے اور کوئی کفر و

مصیبت کرتا ہے مطلب یہ کہ زندگی اس لئے دے رکھی ہے کہ دیکھیں کیسے کیسے عمل کرتے ہو) اور (اس زندگی کے ختم پر) پھر تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے (اور ہر ایک کو اس کے مناسب جزا و سزا دیں گے پس اے محمد تم تو موت اور مابعد الموت ہی ہوا اور زندگی محض عارضی ہے، یہ لوگ کس پر اتراتے ہیں اور پیغمبر کی وفات پر خوشیاں مناتے ہیں یہ نہ ہوا کہ اس مہلت زندگی میں دولت ایمان وطاعت کما لیتے جو ان کے کام آتی اور نہ نامۂ اعمال سیاہ اور آخرت کی سزا سے بے فکر رہتے ہیں ڈرتے نہیں) اور (ان منکرین کی یہ حالت ہے کہ) یہ کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے ہنسی کرنے لگتے ہیں (اور آپس میں کہتے ہیں) کہ کیا یہی (صاحب) ہیں جو تمہارے معبودوں کا (برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں (سو آپ پر تو بتوں کے ذکر کا بھی اعتراض ہے) اور خود یہ لوگ حضرت رحمان جل شانہ کے ذکر پر انکار (اور کفر) کیا کرتے ہیں (تو اعتراض کی بات تو درحقیقت یہ ہے، اس لئے ان کو اپنی اس حالت پر استغفار کرنا چاہئے تھا اور ان کی یہ حالت ہے کہ جب سزائے کفر کا مضمون سنتے ہیں جیسے اوپر ہی ذکر ہوا ہے اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ تو بوجہ تکذیب کے اسکا تقاضا کرتے ہیں کہ یہ سزا جلد آجائے اور یہ تقاضا اور عجلت کچھ انسانی طبیعت کا خاصہ اکثر یہی ہے پس اسکا ظہور ہونا ایسا ہے جیسے گویا انسان جلدی ہی (کے خمیر) کا بنا ہوا ہے یعنی عجلت اور جلدی مثل اس کے اجزاء ترکیبیہ کے ہے اسی واسطے یہ لوگ عذاب جلدی جلدی مانگتے ہیں اور اس کے دیر ہونے کو دلیل عدم وقوع کی سمجھتے ہیں لیکن اے کافرو یہ تمہاری غلطی ہے کیونکہ اسکا وقت معین ہے سو ذرا صبر کرو) ہم عنقریب (اسکے وقت آنے پر) تم کو اپنی نشانیاں (قہر کی یعنی سزائیں) دکھائے دیتے ہیں، پس تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ (کیونکہ عذاب وقت سے پہلے آتا نہیں اور وقت پر ٹلتا نہیں) اور یہ لوگ (جب یہ مضمون سنتے ہیں کہ وقت موعود پر عذاب آوے گا تو رسول اور مومنین سے یوں) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کس وقت آوے گا اگر تم (وقوع عذاب کی خبر میں) سچے ہو (تو توقف کیے کا جلدی سے کیوں نہیں واقع کر دیا جاتا، اصل یہ ہے کہ ان کو اس مصیبت کی خبر نہیں جو ایسی بے فکری کی باتیں کرتے ہیں) کاش ان کافروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جبکہ (ان کو سب طرف سے دوزخ کی آگ گھیرے گی اور) یہ لوگ (اس) آگ کو نہ اپنے سامنے سے روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے اور نہ ان کی کوئی حمایت کریگا (یعنی اگر اس مصیبت کا علم ہوتا تو ایسی باتیں نہ بناتے اور یہ جو دنیا ہی میں عذاب نازل کی فرمائش کر رہے ہیں سو یہ ضرور نہیں کہ ان کی فرمائش کے موافق عذاب نازل آجاوے) بلکہ وہ آگ (تو) ان کو ایک دم سے آلگے گی سو ان کو بدحواس کر دے گی پھر نہ اس کے ہٹانے کی ان کو قدرت ہوگی اور نہ ان کو مہلت دی جاوے گی، اور (اگر وہ یوں کہیں کہ اگر یہ عذاب آخرت میں موعود ہونے کی وجہ سے دنیا میں نہیں ہوتا تو اچھا دنیا میں اس کا کوئی نمونہ تو دکھلا دو تو گو بقاعدہ

مناظرہ نمونہ دکھلانا ضرور نہیں لیکن تبرعاً نمونہ کا پتہ بھی دیا جاتا ہے وہ یہ کہ) آپ سے پہلے جو پیغمبر گزرے ہیں اُن کے ساتھ بھی (کفار کی طرف سے) تمسخر کیا گیا سو جن لوگوں نے اُن سے تمسخر کیا تھا اُن پر وہ عذاب واقع ہوگیا جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے (کہ عذاب کہاں ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب عذاب ہے پس اگر دُنیا میں وقوع نہ ہو تو آخرت میں ہوگا اور یہ بھی اُن سے) کہدیجئے (کہ دُنیا میں جو تم عذاب سے محفوظ ہو سو یہ حفاظت بھی حضرت رحمان ہی کر رہا ہے اس میں بھی اُسی کا احسان اور دلالت علی التوحید ہے اور اگر تم اُس کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر بتلاؤ) کہ وہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت کرتا ہو (اور اس مضمون کا مسلّم مقتضا یہ تھا کہ توحید کے قائل ہو جاتے مگر وہ اب بھی قائل نہ ہوئے) بلکہ وہ لوگ (اب بھی بدستور) اپنے رب (حقیقی) کے ذکر (توحید کے قبول کرنے) سے روگرداں (ہی) ہیں (ہاں ہم مَنۡ يَّكۡلَؤُكُمۡ کے مصداق کی توضیح کے لئے تصریحاً دریافت کرتے ہیں کہ) کیا اُنکے پاس ہمارے سوا اور ایسے معبود ہیں کہ (عذاب مذکور سے) اُن کی حفاظت کرلیتے ہوں (وہ بیچارے ان کی تو کیا حفاظت کرتے اُن کی بیچارگی و درماندگی کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ خود اپنی حفاظت کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً اُن کو کوئی توڑنے پھوڑنے لگے تو مدافعت بھی نہیں کرسکتے کقولہ تعالیٰ وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ الخ پس نہ وہ اُن کے معبود ان کی حفاظت کرسکتے ہیں) اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی اُن کا ساتھ دے سکتا ہے (اور یہ لوگ باوجود ان دلائل ساطعہ کے جو حق کو قبول نہیں کرتے تو یہ وجہ نہیں کہ دعویٰ یا دلیل میں کچھ خلل ہے) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) ہم نے ان کو اور اُن کے باپ دادوں کو (دُنیا کا) خوب سامان دیا یہاں تک کہ اُن پر (اسی حالت میں) ایک عرصہ دراز گزر گیا (کہ پشتہا پشت سے عیش آرام کرتے آرہے ہیں پس کھا کھا کے غُرّانے لگے اور آنکھیں پتھرا گئیں مطلب یہ کہ ان ہی میں خلل غفلت کا ہے لیکن باوجود منبہات تشریعیہ تکوینیہ کے اتنی غفلت بھی نہ ہونا چاہیئے چنانچہ ایک امر مُنبِّہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ) کیا اُن کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہم (ان کی) زمین کو (بذریعہ فتوحات اسلامیہ کے) ہر چہار طرف سے برابر گھٹاتے چلے جاتے ہیں سو کیا یہ لوگ (یہ توقع رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین پر) غالب آویں گے (کیونکہ قرائن عادیہ اور دلائل تنزیلیہ متفق ہیں اُن کے مغلوب اور اہل حق کے غالب ہوتے جانے پر تاوقتیکہ مسلمان اطاعت خداوندی سے منھ نہ موڑیں اور حمایت اسلام نہ چھوڑیں بس اس امر میں تأمل کرنا بھی تنبیہ کے لئے کافی ہے اگر اس پر بھی عناد و جہالت سے وقوع عذاب ہی کی فرمائش کریں تو) آپ کہدیجئے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو ڈراتا ہوں (عذاب کا آنا میرے بس سے باہر ہے) اور (گو یہ طریقہ دعوت الی الحق کا اور یہ انذار کافی ہے مگر) یہ بہرے جس وقت (حق کی طرف بُلائے جانے کے واسطے عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں سُنتے ہی نہیں (اور طریق وضوح حق

میں تامل ہی نہیں کرتے بلکہ وہی مُرغی کی ایک ٹانگ عذاب ہی مانگے جاتے ہیں) اور (کیفیت عذاب کی یہ ہے کہ) اگر ان کو آپ کے رب کے عذاب کا ایک جھونکا بھی ذرا لگ جاوے تو (ساری بہادری ختم ہو جاوے اور) یوں کہنے لگیں کہ ہائے ہماری کمبختی (کیسی ہمارے سامنے آئی) واقعی ہم خطاوار تھے (بس اس ہمت پر عذاب کی فرمائش ہے واقعی اُن کی اس شرارت کو تو یہی مقتضا تھا کہ دُنیا ہی میں فیصلہ کر دیتے مگر ہم بہت سی حکمتوں سے دُنیا میں سزائے موعود دینا نہیں چاہتے بلکہ آخرت کیلئے اُٹھا رکھا ہے اور (وہاں) قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کرینگے) سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا اور (ظلم نہ ہونے کا یہ ثمرہ ہوگا کہ) اور اگر (کسی کا کوئی) عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو ہم اُس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے (اور اسکا بھی وزن کریں گے) اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (ہمارے اس وزن اور حساب کے بعد پھر کسی حساب کتاب کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اُسی پر سب فیصلہ ہو جاویگا پس وہاں لوگوں کی شرارتوں کی بھی سزائے مناسب کا فی جاری کر دی جاوے گی)۔

معارف و مسائل

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ، سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کے باطل دعووں اور مشرکانہ عقیدوں کی جن میں حضرت مسیحؑ یا عزیرؑ وغیرہ کو خدائی کا شریک یا فرشتوں اور مسیحؑ کو خدا تعالیٰ کی اولاد کہا گیا ان گمراہ کُن عقائد کی تردید و ابطال واضح دلائل کے ساتھ آیا ہے جن کا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہ تھا ایسے مواقع میں جب مخالف حجت و دلیل سے مغلوب ہو جائے تو جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ مشرکین مکہ اسکی تمنا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد وفات ہو جاوے جیسا کہ دوسری آیات میں ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی اس بیہودہ تمنا کے دو جواب دیئے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی جلد ہی وفات ہو گئی تو تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ اُن کی موت ہو جائے گی تو ہم لوگوں کو بتلا دیں گے کہ یہ نبی و رسول نہیں تھے ورنہ موت نہ آتی تو اسکا یہ جواب دیا کہ جن انبیاء کی نبوت کو تم بھی مانتے ہو کیا اُن کو موت نہیں آئی، جب اُن کی موت سے اُن کی نبوت و رسالت میں کوئی فرق نہیں آیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے آپ کی نبوت کے خلاف کوئی پروپیگنڈا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر تمہارا مقصد آپ کی جلد وفات سے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنا ہے تو یاد رکھو کہ یہ موت کا مرحلہ تمہیں بھی درپیش ہے آخر تمہیں بھی مرنا ہے پھر کسی کی موت سے خوش ہونے کے کیا معنے ؎

اگر بمرد عدو جائے شادمانی نیست ✽ کہ زندگانی ما نیز جاودانی نیست

موت کیا چیز ہے | پھر ارشاد فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے

یہاں مراد ہر نفس سے نفوس ارضیہ یعنی زمینی جاندار ہیں۔ اُن سب کو موت آنا لازمی ہے نفوس ملائکہ اسمیں داخل نہیں، اسمیں اختلاف ہے کہ قیامت کے روز فرشتوں کو بھی موت آئے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایک لحظہ کے لئے تو سب پر موت طاری ہوجائیگی خواہ انسان اور نفوس ارضیہ ہوں یا فرشتے اور نفوس سماویہ۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرشتے اور جنت کے حور و غلمان موت سے مستثنیٰ ہیں۔ واللہ اعلم (روح المعانی) اور موت کی حقیقت جمہور علماء کے نزدیک روح کا جسدِ عنصری سے نکل جانا ہے اور روح خود ایک جسم نورانی لطیف ذی حیات متحرک کا نام ہے جو انسان کے پورے بدن میں ایسا سمایا ہوا رہتا ہے جیسے عرقِ گلاب گلاب کے پھول میں۔ ابن قیم نے روح کی حقیقت بیان کرکے اس کو سو دلائل سے ثابت کیا ہے (روح المعانی)

لفظ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ سے اشارہ اسطرف پایا جاتا ہے کہ ہر نفس موت کی خاص تکلیف محسوس کریگا کیونکہ مزہ چکھنے کا محاورہ ایسے ہی مواقع میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روح کا جیسا اتصال بدن کے ساتھ ہے اُس کے نکلنے کے وقت تکلیف اور الم کا احساس امر طبعی ہے رہا بعض اہل اللہ کا یہ معاملہ کہ اُن کو موت سے لذت و راحت حاصل ہوتی ہے کہ دُنیا کی تنگیوں سے نجات ہوئی اور محبوبِ اکبر سے ملاقات کا وقت آگیا، تو یہ ایک دوسری طرح کی لذت ہے جو مفارقت بدن کی طبعی تکلیف کے منافی نہیں کیونکہ جب کوئی بڑی راحت اور بڑا فائدہ سامنے ہوتا ہے تو اس کے لئے چھوٹی تکلیف برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے اس معنی کے لحاظ سے بعض اہل اللہ نے دُنیا کے غم و رنج اور مصیبتوں کو بھی محبوب قرار دیا ہے کہ "از محبت تلخہا شیریں شوند" ؎

غم چہ استادہ تو بر درِ ما ⁂ اندر آ یارِ ما برادرِ ما

اور مولانا رومی نے فرمایا ؎

رنج راحت شد چو طلب شد بزرگ ⁂ گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

دُنیا کی ہر تکلیف و راحت آزمائش ہے وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ، یعنی ہم شر اور خیر دونوں سے ذریعہ انسان کی آزمائش کرتے ہیں۔ شر سے مُراد ہر خلافِ طبع چیز ہے جیسے بیماری، رنج و غم، فقر و فاقہ اور خیر سے اسکے بالمقابل ہر مرغوب طبع چیز ہے جیسے صحت و عافیت، خوشی و راحت، غناء و اسبابِ ثروت وغیرہ۔ یہ دونوں طرح کی چیزیں اس دُنیا میں انسان کی آزمائش کے لئے آتی ہیں کہ شر یعنی خلافِ طبع اُمور پر صبر کرکے اسکا حق ادا کرنا اور خیر یعنی مرغوبِ خاطر چیزوں پر شکر کرکے اسکا حق ادا کرنا ہی آزمائش یہ ہے کہ کون اس پر ثابت قدم رہتا ہے کون نہیں رہتا۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ حقوقِ شکر پر ثابت قدم رہنا بہ نسبت حقوقِ صبر کے مشکل ہے۔ انسان کو تکلیف پر صبر کرنا اتنا بھاری نہیں ہوتا جتنا عیش و عشرت اور آرام و راحت میں اسکے حق شکر ادا کرنے پر ثابت قدمی مشکل ہوتی ہے اسی بنا پر حضرت

فاروق اعظمؓ نے فرمایا:

بُلینا بالضراء فصبرنا وبلینا بالسراء فلم نصبر (روح المعانی)	یعنی ہم تکلیف میں بتلا کئے گئے اس پر تو ہم نے صبر کرلیا لیکن جب راحت عیش میں مبتلا ہوگئے تو اس پر صبر نہ کرسکے یعنی اس کے حقوق ادا کرنے پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔

جلد بازی مذموم | خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ، عجل کے معنے عجلت، وجلدی کے ہیں یعنی کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا ہے اور یہ وصف فی نفسہ مذموم ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اس کو انسانی کمزوری کے طور پر ذکر فرمایا ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا یعنی انسان بڑا جلد باز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر اپنی قوم سے آگے بڑھ کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو وہاں بھی اس عجلت پر عتاب ہوا۔ اور انبیاء و صلحاء کے بارے میں جو مسارعت اور مسابقت فی الخیرات کا بطور مدح کے ذکر کیا گیا ہے وہ جلد بازی اور عجلت کے مفہوم میں داخل نہیں کیونکہ وہ وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب نہیں بلکہ وقت پر تکثیر خیرات و حسنات کی کوشش ہے **واللہ اعلم**۔

اور خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں جس طرح کچھ دوسری کمزوریاں رکھ دی گئی ہیں انہیں سے ایک کمزوری عجلت کی بھی ہے اور جو چیز طبیعت اور جبلت میں داخل ہوتی ہے عرب اس کو اسی عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ شخص اس چیز سے پیدا کیا گیا جیسے کسی کے مزاج میں غصہ غالب ہوگا تو کہا جائے گا کہ یہ غصہ کا بنا ہوا آدمی ہے۔

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ ، اسمیں آیات سے مراد وہ معجزات اور دلالات ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر شہادت دیتے ہیں (قرطبی) جیسے غزوۂ بدر وغیرہ میں یہ نشانیاں کھلے طور پر سب پر ظاہر ہوئیں، اور انجام کار ان مسلمانوں کا غلبہ سب کی آنکھوں نے دیکھ لیا جن کو سب سے زیادہ ضعیف و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

قیامت میں وزن اعمال اور اس کی میزان | وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ، لفظ موازین میزان کی جمع ہے جو ترازو کے معنے میں آتا ہے اسجگہ میزان کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس سے بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ وزن اعمال کے لئے بہت سی میزانیں استعمال کی جائیں گی خواہ ہر شخص کے لئے الگ الگ میزان ہو یا خاص خاص اعمال کے لئے الگ الگ میزانیں ہوں مگر جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ میزان ایک ہی ہوگی اس کو بصیغہ جمع اس لئے تعبیر کردیا ہے کہ وہ بہت سی موازین کا کام دیگی کیونکہ ساری مخلوقات آدم علیہ السلام سے قیامت تک جنکی تعداد اللہ ہی جانتا ہے ان سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی۔ اور قسط کے معنی عدل و انصاف کے ہیں معنے یہ ہیں کہ یہ میزان عدل و انصاف کے ساتھ وزن کرے گی ذرا کمی بیشی نہ ہوگی۔ مستدرک حاکم میں بروایت حضرت سلمانؓ روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جو میزان وزن اعمال کے لئے رکھی جاوے گی اتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اس میں

آسمان و زمین کو تولنا چاہیں تو وہ بھی اس میں سما جائیں۔ (مظہری)

حافظ ابو القاسم لالکائی نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزان پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا اور ہر انسان کو اس میزان کے سامنے لایا جائیگا۔ اگر اس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگیا تو فرشتہ منادی کریگا جس کو تمام اہل محشر سنیں گے کہ فلاں شخص کامیاب ہوگیا اب کبھی اسکو محرومی نہیں ہوگی، اور اگر نیکیوں کا پلہ ہلکا رہا تو یہ فرشتہ منادی کریگا کہ فلاں شخص شقی اور محروم ہوگیا اب کبھی کامیاب بامراد نہیں ہوگا۔ اور حافظ مذکور نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ جو میزان پر مقرر ہوگا حضرت جبریل امین ہیں۔ (قرطبی)

حاکم اور بیہقی اور آجری نے حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت کیا ہے انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا قیامت کے روز بھی آپ اپنے اہل و اولاد کو یاد رکھیں گے تو فرمایا کہ قیامت میں تین مقام تو ایسے ہونگے کہ اُن میں کوئی کسی کو یاد نہ کریگا۔ ایک وہ وقت جب میزان عدل کے سامنے وزن اعمال کے لئے حاضر ہوں گے جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ اسکا پلہ نیکیوں کا بھاری ہوا یا ہلکا رہا کسی کو کسی کی یاد نہ آئیگی اور دوسرا مقام وہ ہے جب نامۂ اعمال اُڑائے جاویں گے جبتک یہ متعین نہ ہوجائے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آیا (جو نجات کی علامت ہے) یا بائیں ہاتھ یا پشت کیطرف آیا (جو عذاب کی علامت ہے) اور تیسرا مقام پل صراط سے گزرنے کا وقت ہے جبتک پار نہ ہوجائیں کوئی کسی کو یاد نہ کریگا (مظہری)

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا، یعنی یوم حساب اور میزان اعمال کے وقت انسان کے سامنے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اعمال سامنے کر دیئے جائینگے تاکہ حساب و وزن میں شامل ہوں۔

وزن اعمال کی صورت | یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کاغذوں کے لکھے ہوئے اعمالنامے تولے جائیں جیسا کہ حدیث بطاقہ سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ کی شکل دیدی جائے اور ان کا وزن کیا جائے۔ عام طور سے روایات اسی پر شاہد ہیں اور جمہور علماء نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید میں فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وغیرہ آیات اور بہت سی روایات حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے

اعمال کا محاسبہ | ترمذی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر بیٹھا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے دو غلام ہیں جو مجھے جھوٹا کہتے ہیں اور معاملات میں خیانت کرتے ہیں اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اُس کے مقابلے میں میں ان کو زبان سے بھی برا بھلا کہتا ہوں اور ہاتھ سے مارتا بھی ہوں، تو میرا اور ان غلاموں کا انصاف کس طرح ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُن کی نافرمانی اور خیانت اور سرکشی کو تولا جائے گا، پھر تمہارے سب و شتم اور مار پیٹ کو تولا جائیگا اگر تمھاری سزا اور ان کا جرم برابر رہے تو معاملہ برابر ہوجائے گا۔ اور اگر تمھاری سزا اُنکے جرم سے کم رہی تو وہ تمھارا احسان شمار ہوگا اور اگر اُن کے جرم سے بڑھ گئی تو جتنی تم نے زیادتی کی ہے اسکا

تم سے انتقام اور قصاص لیا جاویگا۔ یہ شخص یہاں سے اُٹھ کر الگ بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ، اس نے عرض کیا کہ اب تو میرے لئے اسکے سوا کوئی راہ نہیں کہ میں ان کو آزاد کر کے اس حساب کے غم سے بے فکر ہو جاؤں۔ (قرطبی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے دی تھی موسیٰ اور ہارون کو فیصلے کرنے والی کتاب اور روشنی اور نصیحت ڈرنے والوں کو

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے اور وہ قیامت کا خطرہ رکھتے ہیں

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور یہ ایک نصیحت ہے برکت کی جو ہم نے اُتاری سو کیا تم اس کو نہیں مانتے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (آپ کے قبل) موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور متقیوں کے لئے نصیحت کی چیز (یعنی توریت) عطا فرمائی تھی جو (متقی) اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور (خدا ہی سے ڈرنے کے سبب) وہ لوگ قیامت سے (بھی) ڈرتے ہیں (کیونکہ قیامت میں اسکا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا نہ ہونے لگے) اور (جیسے اُن کو وہ کتاب ہم نے دی تھی اسی طرح) یہ (قرآن بھی) ایک کثیر الفائدہ نصیحت (کی کتاب) ہے جسکو ہم نے نازل کیا، سو کیا (بعد اسکے کہ منزل کتب کا عادۃ اللہ ہونا معلوم ہو گیا اور خود اسکا منزل من اللہ ہونا دلیل سے ثابت ہے) پھر بھی تم اسکے (منزل من اللہ ہونے کے) منکر ہو۔

معارف و مسائل

اَلْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ، یہ تینوں صفتیں تورات کی ہیں کہ فرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ہے اور قلوب کے لئے ضیاء و نور ہے اور لوگوں کے لئے ذکر و تذکیر اور ذریعہ ہدایت ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے جو ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیساتھ رہی کہ فرعون کے گھر میں پرورش ہوئی اور پھر اُس سے مقابلے کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ذلیل کیا پھر لشکر فرعون کے تعاقب کے وقت دریا میں راستے پیدا ہو کر اس سے نجات ملی اور لشکر فرعون غرق کیا گیا اسی طرح بعد کے ہر موقع پر اس مدد خداوندی کا مشاہدہ ہوتا رہا۔ اور ضیاء و ذکر دونوں تورات کی صفتیں ہیں قرطبی نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ الفرقان کے بعد واؤ کے ذریعہ فاصلہ کرنے سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقان تورات سے علیحدہ کوئی چیز ہے واللہ اعلم

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ

اور آگے دی تھی ہم نے ابراہیم کو اس کی نیک راہ اور ہم رکھتے ہیں اس کی خبر جب کہا اس نے

لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ

بولے ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو انہی کی پوجا کرتے بولا مقرر رہے تم

وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ

اور تمہارے باپ دادے صریح گمراہی میں بولے تو ہمارے پاس لایا ہے سچی بات یا تو

مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ

کھلاڑیاں کرتا ہے بولا نہیں رب تمہارا وہی ہے رب آسمان اور زمین کا جس نے

فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ

ان کو بنایا اور میں اسی بات کا قائل ہوں اور قسم اللہ کی میں علاج کروں گا

اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا

تمہارے بتوں کا جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر پھر کر ڈالا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر

كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا

ایک بڑا ان کا تاکہ اس کی طرف رجوع کریں کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے

بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ

معبودوں کے ساتھ وہ تو کوئی بے انصاف ہے وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے

لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اس کو کہتے ہیں ابراہیم وہ بولے اس کو لے آؤ لوگوں کے سامنے شاید وہ دیکھیں

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ

بولے کیا تو نے کیا ہے یہ ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم بولا نہیں پر یہ کیا ہے اس کے

كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓي

اس بڑے نے سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں پھر سوچے اپنے

اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي

جی میں پھر بولے لوگو تم ہی بے انصاف ہو پھر اوندھے ہو گئے

رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ

سر جھکا کر تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں بولا کیا پھر تم پوجتے ہو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَ

اللہ سے ورے ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ برا بیزار ہوں میں تم سے اور

لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے کیا تم کو سمجھ نہیں بولے اس کو جلاؤ

وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ

اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرتے ہو ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور

سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

آرام ابراہیم پر اور چاہنے لگے اسکا برا پھر انہی کو ڈالا ہم نے نقصان میں

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا

اور بچا نکالا ہم نے اسکو اور لوط کو اس زمین کیطرف جسمیں برکت رکھی ہم نے جہان کے واسطے اور بخشا ہم نے

لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ

اس کو اسحٰق اور یعقوب دیا انعام میں اور سب کو نیک بخت کیا اور انکو کیا ہم نے

اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ

پیشوا راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے اور کہہ بھیجا ہم نے ان کو کرنا نیکیوں کا اور قائم رکھنی

الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

نماز اور دینی زکوٰۃ اور وہ تھے ہماری بندگی میں لگے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے اس (زمانۂ موسوی) سے پہلے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان (کے کمالات علمیہ عملیہ) کو خوب جانتے تھے (یعنی وہ بڑے کامل تھے ان کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے (ان کو بت پرستی میں مشغول دیکھ کر) فرمایا کہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو (یعنی یہ ہرگز قابل عبادت نہیں) وہ لوگ (جواب میں) کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے، (اور وہ لوگ عاقل تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورتیں لائق عبادت کے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ بیشک تم اور تمہارے باپ دادے (ان کو لائق عبادت سمجھنے میں) صریح غلطی میں (مبتلا) ہو۔ (یعنی خود ان ہی کے پاس ان کی معبودیت کی کوئی دلیل اور سند نہیں ہے وہ تو اس لئے ضلال میں ہیں اور تم ایسوں کی تقلید کرتے ہو جو بے دلیل بے ثبوت اوہام کے پیچھے چلنے والے ہیں اسلئے تم ضلال میں ہو

چونکہ اُن لوگوں نے ایسی بات سُنی نہ تھی نہایت متعجب ہو کر) وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا تم (اپنے نزدیک) سچی بات (سمجھ کر) ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو یا (یوں ہی) دل لگی کر رہے ہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں (دل لگی نہیں بلکہ سچی بات ہے اور صرف میرے ہی نزدیک نہیں بلکہ واقع میں بھی سچی بات یہی ہے کہ یہ عبادت کے قابل نہیں) بلکہ تمہارا رب (حقیقی جو لائق عبادت ہے) وہ ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے جس نے (علاوہ تربیت کے) ان سب (آسمانوں اور زمین اور اُن میں جو مخلوق ہے جسمیں یہ اصنام بھی داخل ہیں سب) کو پیدا کیا اور میں اس (دعویٰ پر دلیل بھی رکھتا ہوں (تمہاری طرح کورانہ تقلید سے کام نہیں کرتا) اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم (ان کے پاس سے) چلے جاؤ گے (تاکہ ان کا عاجز اور درماندہ ہونا زیادہ مشاہدہ سے ہی آب دے، اُن لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ اکیلے ہمارے مخالف کارروائی کیا کر سکتے ہیں کچھ التفات نہ کیا ہوگا اور چلے گئے) تو (اُن کے چلے جانے کے بعد) انھوں نے اُن بتوں کو (تبر وغیرہ سے توڑ پھوڑ کر) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بجز اُن کے ایک بڑے بت کے (جو جثّے میں یا اُن لوگوں کی نظر میں معظم ہونے میں بڑا تھا کہ اس کو چھوڑ دیا جس سے ایک قسم کا استہزا مقصود تھا کہ ایک کے سالم اور دوسروں کے قطع وبرید سے ایہام ہوتا ہے کہ کہیں اُسی نے تو سب کو نہیں توڑا۔ پس ابتداء تو ایہام ہے پھر جب وہ لوگ قطع وبرید کرنے والے کی تحقیق کریں گے اور اُس بڑے بت پر احتمال بھی نہ کریں گے تو ان کی طرف سے اُس کے عجز کا بھی اعتراف ہو جاویگا اور حجت اور لازم تر ہو جاوے گی۔ پس انتہاءً یہ الزام و افحام ہے یعنی لاجواب کرنا ہے اور مقصود مشترک اثبات عجز ہے، بعض کا انکار سے اور ایک کا اُن کے اقرار سے، غرض ایک کو اس مصلحت سے چھوڑ کر سب کو توڑ دیا) کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف (دریافت کرنے کے طور پر) رجوع کریں (اور پھر وہ تقریر جواب مکرر پوری طرح احقاق حق کر سکیں، غرض وہ لوگ جو بُت خانہ میں آئے تو بتوں کی بُری گت بنی دیکھی آپس میں) کہنے لگے کہ یہ (بے ادبی کا کام) ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے بڑا ہی غضب کیا (یہ بات ایسے لوگوں نے پوچھی جن کو اس قول کی اطلاع نہ تھی وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ الخ یا تو اس وجہ سے کہ وہ اسوقت موجود نہ ہوں گے کیونکہ اس مناظرہ کے وقت تمام قوم کا مجتمع ہونا ضرور نہیں اور یا موجود ہوں مگر سُنا نہ ہو اور بعضوں نے سُن لیا ہو، کذا فی الدر المنثور عن ابن مسعود نحوآمنہ) بعضوں نے کہا (جن کو اس قول کا علم تھا) کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کر کے پکارا جاتا ہے اُن بتوں کا (بُرائی کیساتھ) تذکرہ کرتے سُنا ہے (پھر) وہ (سب) لوگ (یا جنھوں نے اوّل استفسار کیا تھا) بولے کہ (جب یہ بات ہے) تو اچھا اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ (شاید وہ اقرار کرلے اور) وہ لوگ (اسکے اقرار کے) گواہ ہو جائیں (پھر اتمام حجت کے بعد سزا دی جائے جس پر کوئی ملامت نہ کر سکے، غرض سب کے روبرو وہ آئے اور اُن سے) اُن لوگوں نے کہا کہ کیا ہمارے بتوں کیساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم، اُنھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ

(تم یہ احتمال کیوں نہیں فرض کرتے کہ یہ حرکت میں نے) نہیں کی، بلکہ اُن کے اُس بڑے (گرو) نے کی (اور
جب اس کبیر میں فاعل ہونیکا احتمال ہوسکتا ہے تو ان صغار میں ناطق ہونیکا احتمال بھی ہوگا) سو ان
(ہی) سے پوچھ لو (نا) اگر یہ بولتے ہوں (اور اگر بڑے بُت کا فاعل اس عمل کا ہونا اور دوسرے بُتوں
میں بولنے کی طاقت ہونا باطل ہے تو عجز ان کا تمہارے نزدیک مسلم ہوگیا پھر اعتقاد الوہیت کی کیا وجہ)
اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے پھر (آپس میں) کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو اور ابراہیمؑ
حق پر ہے کہ جو ایسا عاجز ہو وہ کیا معبود ہوگا) پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکالیا
(اور ابراہیم علیہ السلام سے نہایت مغلوبانہ لہجہ میں بولے کہ) اے ابراہیم تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بُت
(کچھ) بولتے نہیں (تم اُن سے کیا پوچھیں اور اس سے فاعلیت کبیر کی نفی بدرجۂ اولیٰ ہوگی اسوقت)
ابراہیم (علیہ السلام) نے (خوب خبر لی اور) فرمایا کہ (افسوس جب یہ ایسے ہیں) تو کیا خدا کو چھوڑ کر
تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ (بالمباشرۃ) کچھ نقصان پہنچا سکے تف ہے
تم پر (کہ باوجود وضوحِ حق کے باطل پر مصر ہو) اور اُن پر (بھی) جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم (اتنا
بھی) نہیں سمجھتے (اس تمام تقریر سے خصوص اس سے کہ توڑنے پھوڑنے سے انکار نہیں فرمایا باوجودیکہ احتمال
استفہام متقضی انکار کو تھا ان کو ثابت ہوگیا کہ یہ کام اُن ہی کا ہے اور تقریر کا کچھ جواب بن نہ آیا تو
بمقتضائے اس قول کے کہ ؎

چو حجت نماند جفا جوئے را ٭ بہ پرخاش درہم کشد روئے را

یعنی جب جاہل جواب نہ رکھتا ہو اور قدرت رکھتا ہو تو برسرِ پیکار آجاتا ہے، آپس میں) وہ لوگ
کہنے لگے کہ ان (ابراہیم) کو آگ میں جلادو اور اپنے معبودوں کا (اُن سے) بدلا لو اگر تم کو کچھ کرنا ہے
(تو یہ کام کرو ورنہ بالکل ہی بات ڈوب جاوے گی۔ غرض سب نے متفق ہوکر اسکا سامان کیا اور ان
کو آتشِ سوزاں میں ڈالدیا اُسوقت) ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہوجا
ابراہیم کے حق میں (یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آوے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہوجا کہ
اسکی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے بلکہ مثل ہوائے معتدل کے بن جا چنانچہ ایسا ہی ہوگیا) اور اُن لوگوں نے
اُن کے ساتھ بُرائی کرنا چاہا تھا (کہ ہلاک ہوجاویں گے) سو ہم نے اُن ہی لوگوں کو ناکام کردیا (کہ اُن کا
مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اور بالعکس حقانیت ابراہیم علیہ السلام کا زیادہ ثبوت ہوگیا) اور ہم نے
ابراہیم کو اور (اُن کے برادر زادہ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) لوط علیہ السلام کو (کہ انھوں نے برخلاف
قوم کے ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی تھی قال تعالیٰ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ اور اسوجہ سے لوگ اُن کے بھی
مخالف اور دَرپے تھے) ایسے ملک (یعنی شام) کی طرف بھیجکر (کافروں کے شر و ایذا سے) بچالیا جس میں
ہم نے دنیا جہان والوں کے واسطے (خیر و) برکت رکھی ہے (دُنیوی بھی کہ ہر قسم کے عمدہ پھل پھول بکثرت

پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے منتفع ہو سکتے ہیں اور دینی بھی کہ بکثرت انبیاء علیہم السلام وہاں ہوئے جن کے شرائع کی برکت دُور دُور عالم میں پھیلی یعنی اُنھوں نے ملک شام کیطرف باذن الٰہی ہجرت فرمائی) اور (ہجرت کے بعد) ہم نے اُن کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب پوتا عطا کیا اور ہم نے ان سب (باپ بیٹے پوتے) کو (اعلیٰ درجہ کا) نیک کیا (اعلیٰ درجہ کی نیکی کا مصداق عصمت ہے جو بشریت میں خواص نبوت سے ہے پس مُراد یہ ہے کہ اُن سب کو نبی بنایا) اور ہم نے اُن (سب) کو مقتدا بنایا (جو کہ لوازم نبوت سے ہے) کہ ہمارے حکم سے (خلق کو) ہدایت کیا کرتے تھے (جو کہ مناصب نبوت سے ہے) اور ہم نے اُن کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور (خصوصاً) نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ ادا کرنیکا حکم بھیجا (یعنی یہ حکم بھیجا کہ ان کاموں کو کیا کرو) اور وہ (حضرات) ہماری (خوب) عبادت کیا کرتے تھے (یعنی ان کو جو حکم ہوا تھا اس کو اچھی طرح بجا لاتے تھے پس صالحین میں کمال نبوت کی طرف اور اَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ میں کمال علم کی طرف اور کَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ میں کمال عمل کیطرف اور اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ میں دوسروں کی ہدایت و تربیت کی طرف اشارہ کافیہ ہے۔

معارف و مسائل

وَتَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ، الفاظ آیت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اپنی برادری کے سامنے کہی تھی مگر اس پر شبہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں) کا عذر کر کے اُن کے ساتھ عید کے اجتماع میں جانے سے گریز کیا تھا اور جب بُتوں کو توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو برادری اس تلاش میں پڑی کہ یہ کس نے کیا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام پہلے ہی برادری کو معلوم تھا تو یہ سب باتیں کیسے ہوئیں اسکا جواب اوپر خلاصہ تفسیر میں یہ دیا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اس خیال کے اکیلے آدمی تھے پوری برادری کے مقابلے میں اُن کی کوئی حیثیت نہ سمجھ کر ممکن ہے کہ ان کے کلام کی طرف التفات نہ کیا ہو اور بُھول بھی گئے ہوں (بیان القرآن) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تلاش و تحقیق کرنے والے دوسرے لوگ ہوں جن کو ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کا علم نہیں تھا اور مفسرین میں سے مجاہد اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ یہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برادری کے سامنے نہیں کہا بلکہ اپنے دل میں کہا یا برادری کے جانے کے بعد ایک دو ضعیف آدمی جو رہ گئے تھے اُن سے کہا پھر جب بُت شکنی کا واقعہ پیش آیا اور برادری کو ایسا کرنے والے کی تلاش ہوئی تو ان لوگوں نے مخبری کر دی (قرطبی)

فَجَعَلَھُمْ جُذٰذًا، جذاذ جذ بکسر الجیم کی جمع ہے جس کے معنی ٹکڑے کے ہیں مُراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے توڑ کر ان سب بُتوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ، یعنی صرف بڑے بُت کو بغیر توڑے ہوئے چھوڑ دیا، اسکا بڑا ہونا یا تو جسمی

اعتبار سے ہو کہ اپنے جسم اور جُثّے کے اعتبار سے یہ دوسرے بُتوں سے بڑا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم اور جُثّے میں سب کے برابر ہونیکے باوجود یہ بُت ان بُت پرستوں کے عقیدہ میں سب سے بڑا مانا جاتا ہو۔

لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ، اسمیں الیہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہو جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں ایسا ہی بیان کیا گیا اور اسکے مناسب آیت کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد اس عمل سے خود ہی یہ تھا کہ یہ لوگ میری طرف رجوع کریں مجھ سے پوچھیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو میں اُن کو اُن کی بیوقوفی پر مطلع کر دوں اور إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس اُمید پر کیا کہ شاید اپنے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر اُن میں عقل آجائے کہ یہ پرستش کے قابل نہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کیطرف رجوع ہو جاویں۔ اور کلبی نے فرمایا کہ اِلَیْہِ کی ضمیر کبیر کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جب یہ لوگ واپس آکر سارے بُتوں کے ٹکڑے ٹکڑے اور بڑے بُت کو صحیح سالم اور اسکے مونڈھے پر کلہاڑا رکھا ہوا دیکھیں گے تو شاید اُس بڑے بُت کی طرف رجوع ہوں اور اُس سے پوچھیں کہ ایسا کیوں ہوا وہ کوئی جواب نہ دیگا تو اسکا بھی عاجز ہونا اُن پر واضح ہو جاویگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول جھوٹ نہیں بلکہ ایک کنایہ تھا اس کی تفصیل و تحقیق

قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ، یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی برادری نے گرفتار کر کے بُلایا اور ان سے اقرار لینے کے لئے سوال کیا کہ کیا آپ نے ہمارے بتوں کیساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے تم خود ان سے دریافت کر لو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور اُن کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے۔ اس کے جواب کے لئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں اُنہیں سے ایک وہ بھی ہے جسکو خلاصۂ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بُت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اُس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا۔ لیکن بے غبار اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جسکو بحر محیط۔ قرطبی۔ رُوح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا ہے کہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اسکو بڑے بُت کیطرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنیوالا یہی بُت تھا اور اسکی تخصیص شاید اسوجہ سے ہو کہ اُن کی برادری اُس بُت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اسکی مثال ایسی ہو گی جیسے کوئی چور کی سزا میں اُس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کجروی نے ہاتھ کاٹا ہے

کیونکہ ہاتھ کاٹنے کا سبب اسکا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے اُن کے بُت توڑے تھے یہ کلہاڑا بڑے بُت کے مونڈھے پر یا اُس کے ہاتھ میں رکھدیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہو کہ اُس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اسکی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ انبت الربیع البقلۃ اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی ہے) کہ اگرچہ اُگانے والا درحقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اسکے ایک ظاہری سبب کیطرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اسکو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بُت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کرنا جھوٹ ہرگز نہیں، البتہ بہت سی مصالح دینیہ کے لئے یہ توریہ اختیار فرمایا اُن میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اسطرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بُت کو اس پر غصہ آگیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بُت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رب العالمین ان پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اسوقت پیدا ہونا یقینی تھا کہ جن کو ہم خدا اور مختار کل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی اُن کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ بڑے بُت کی طرف منسوب کر دیں تو جو بُت یہ کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اسمیں گویائی کی بھی قوت ہونی چاہیے اس لئے فرمایا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بُت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا صرف ایک قسم کا توریہ ہے۔

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان ابراھیم علیہ السلام لم یکذب غیر ثلاث (رواہ البخاری ومسلم) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ کے لئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ فرمایا ہے، دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ اِنِّىْ سَقِيْمٌ میں بیمار ہوں اور تیسرا اپنی زوجہ کی حفاظت کے لئے بولا گیا، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کیساتھ سفر میں

تھے ایک ایسی بستی پر گزر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا جب کسی شخص کے ساتھ اسکی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اُس سے بدکاری کرتا۔ مگر یہ معاملہ اُس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کیساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی مخبری اس ظالم بدکار کے سامنے کردی گئی تو اُس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا۔ پکڑنے والوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کے لیے فرمادیا کہ یہ میری بہن ہے (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اسکے باوجود وہ پکڑلے گئے ادھر ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلادیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اسکے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اسوقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مقابلہ پر قدرت نہ تھی۔ اللہ کے سامنے نماز و دعا کی طرف متوجہ ہوگئے، حضرت سارہ جب اُس کے پاس پہنچیں یہ ظالم بُری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج معذور کردیا اس پر اس نے حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دعا کردو کہ میری یہ معذوری دور ہوجاوے میں تمھیں کچھ نہ کہونگا۔ ان کی دعا سے یہ ٹھیک ہوگیا مگر پھر عہد شکنی کی اور بُری نیت سے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ نے اُس کے ساتھ یہی معاملہ کیا اسی طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اسنے حضرت سارہ کو واپس کردیا۔ یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کیطرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شان نبوت و عصمت کے خلاف ہے مگر اسکا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ درحقیقت ان میں سے ایک بھی حقیقی معنی میں جھوٹ نہ تھا بلکہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کے لئے باتفاق جائز ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا۔ اسکی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہہ دیا تھا کہ میں نے تمھیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی اُن کو بتلادی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہوسکیں، سُننے والا اُس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کے لئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اُسپر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جن معنے سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا۔ یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح کی توجیہ پہلے دونوں کلاموں میں ہوسکتی ہے بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ

کی توجیہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اسمیں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بُت کیطرف منسوب کیا ہے اسی طرح اِنِّیْ سَقِیْمٌ کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنے میں آتا ہے اسیطرح رنجیدہ غمگین اور مضمحل ہونے کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنے کے لحاظ سے اِنِّیْ سَقِیْمٌ فرمایا تھا مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنے میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں دو اللہ کی ذات کے لئے تھے یہ خود قرینہ تو یہ اسکا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ کے لئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا اور گناہ کا کام نہونا جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہو بلکہ ایسا کلام ہو جسکے دو معنی ہوسکتے ہوں، ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اسلئے غلط اور باطل کہدیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کیطرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہدینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کیخلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دیجائے یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری اُمت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلّم ہے مگر علماء اُمت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کرکے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہوگیا اُن میں ایک بھی ایسی نہیں ہوسکتی کہ جسکو قرآن کیخلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رَد اور باطل کرنا چاہا اسکو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہوگئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مُراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اُس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بُھول اور لغزش کو عصیٰ اور غویٰ کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورۂ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربانِ بارگاہ حق تعالیٰ کے لئے ادنیٰ کمزوری اور محض رُخصت اور جائز پر عمل کرلینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابلِ مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہو کر حساب جلد ہونیکے متعلق انبیاء سے شفاعت کے طالب ہونگے۔ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء سے پہلے تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کرکے شفاعت کی ہمت نہ کریگا، آخر میں سب خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونگے اور آپ اس شفاعتِ کبریٰ کے لئے

کھڑے ہونگے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کیخلاف تھے اپنا قصور اور کوتاہی قرار دیکر عذر کر دیں گے۔ اسی کوتاہی کیطرف اشارہ کرنے کے لئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کر دیا گیا جسکا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یُوں کہے کہ انھوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ سُورہ طٰہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحر محیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اسطرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں اُن کا ذکر بطور تلاوتِ قرآن یا تعلیم قرآن یا روایتِ حدیث کے تو کیا جا سکتا ہے خود اپنی طرف سے اُن الفاظ کا کسی پیغمبر کیطرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں۔

حدیثِ مذکور میں ایک اہم ہدایت اور اخلاصِ عمل کی باریکی کا بیان

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جن کذباتِ ثلٰثہ کا ذکر آیا ہے حدیث میں ان میں سے پہلے دو کے بارے میں تو یہ آیا کہ اللہ کے لئے تھے، مگر تیسری بات جو حضرت سارہ کے بارے میں کہی گئی اُس کو اللہ کے لئے نہیں فرمایا حالانکہ بیوی کی آبرو کی حفاظت بھی عین دین ہے اس پر تفسیر قرطبی میں قاضی ابوبکر بن عربی سے ایک بڑا نکتہ نقل کیا ہے جس کے متعلق ابن عربی نے فرمایا کہ یہ صلحاء و اولیاء کی کمر توڑ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ تیسری بات بھی اگرچہ کام دین ہی کا تھا مگر اسمیں کچھ اپنا حظِ نفس بیوی کی عصمت اور حرم کی حفاظت کا بھی تھا، اتنی سی غرض دُنیوی شامل ہو جانے کی بنا پر اس کو فی اللہ اور للہ کی فہرست سے الگ کر دیا گیا کیونکہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ یہ معاملہ بیوی کی عصمت کی حفاظت کا اگر ہماری یا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اسکو بھی للہ فی اللہ ہی میں شمار کیا جاتا مگر انبیاء علیہم السلام کی عظمتِ شان کا مقام سب سے بلند ہے اُن کے لئے اتنا سا حظِ نفس شامل ہونا بھی اخلاص کامل کے منافی سمجھا گیا۔ واللہ اعلم وفقنا اللہ للاخلاص فی کل عمل۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود کے گلزار بن جانے کی حقیقت

جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں اُنھوں نے تو اس میں عجیب و غریب تحریفات کی ہیں۔ بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کے لئے لازم ذات ہو وہ اُس سے کسی وقت جُدا نہیں ہو سکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کے لئے حرارت اور جلانا لازم ہے، پانی کے لئے ٹھنڈا کرنا اور بُجھانا لازم ہے۔ مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اسکے عقلی ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کر سکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے

کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اُسکے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانے کا حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص فرد یا جماعت کے حق میں بحکم خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں اُن سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دیا کہ ٹھنڈی ہو جا وہ ٹھنڈی ہو گئی اور اگر برداً کے ساتھ وَسَلٰمًا کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سبب ایذا بن جاتی۔ اور قوم نوحؑ جو پانی میں ڈوبی تھی اُن کے بارے میں قرآن نے فرمایا اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا، یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہو کر آگ میں داخل ہو گئے۔ حَرِّقُوۡهُ یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے۔ تاریخی روایت میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کے لئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اسمیں آگ لگا کر سات دن تک اسکو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اُسکے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہو گئے کہ اگر کوئی پرندہ اُس پر گزرے تو جل جائے۔ اسوقت ارادہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسمیں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اُسکے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی۔ جس وقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جا رہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین و آسمان اور اُن کی مخلوقات سب چیخ اُٹھے کہ یا رب آپ کے خلیل پر کیا گزر رہی ہے حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراہیمؑ کی مدد کرنے کی زت دیدی۔ فرشتوں نے مدد کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے۔ جبرئیل امین نے عرض کیا کہ آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجام دوں، جواب دیا کہ حاجت تو ہے مگر آپ کی طرف نہیں بلکہ اپنے رب کی طرف۔ (مظہری)

قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ، اُوپر گزر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برد و سلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ آگ ہی نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں تبدیل ہو گئی ہو مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھکر آگ میں ڈالا گیا تھا اُن رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ نہیں آئی (کما فی بعض الروایات)

تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی (مظہری)

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ، یعنی حضرت ابراہیم اور انکے ساتھ لوط علیہما السلام کو ہم نے اس زمین سے جس پر نمرود کا غلبہ تھا (یعنی عراق کی زمین) نجات دیکر ایک ایسی زمین میں پہنچا دیا جسمیں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی ہے مُراد اس سے ملک شام کی زمین ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی حیثیت سے بڑی برکتوں کا مجموعہ ہے باطنی برکت تو یہ ہے کہ یہ زمین مخزن انبیا ہے بیشتر انبیا علیہم السلام اسی زمین میں پیدا ہوئے اور ظاہری برکات آب و ہوا کا اعتدال، نہروں اور چشموں کی فراوانی پھل پھول اور ہر طرح کی نباتات کا غیر معمولی نشوو نما وغیرہ ہے جس کے فوائد صرف اس زمین کے رہنے والوں کو نہیں بلکہ عام دُنیا کے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً، یعنی ہم نے عطا کر دیا اس کو بیٹا اسحٰق (اُن کی دُعا و درخواست کے مطابق) اور اُس پر زیادہ دیدیا پوتا یعقوب علیہ السلام یعنی دُعا تو صرف بیٹے کے لئے تھی اللہ نے اپنے فضل سے بیٹا بھی دیا پھر اس سے پوتا بھی اپنی طرف سے زائد عطا فرما دیا اسی لئے اسکو نافلہ کہا گیا ہے

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ		
اور لوط کو دیا ہم نے حکم اور سمجھ اور بچا نکالا اس کو اس بستی سے جو کرتے تھے		
تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ		
گندے کام وہ تھے لوگ بُرے نافرمان اور اس کو لے لیا ہم		
	فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾	
	نے اپنی رحمت میں، وہ ہے نیک بختوں میں	

خلاصۂ تفسیر

اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکمت اور علم (مناسب شان انبیاء) عطا فرمایا اور ہم نے ان کو اس بستی سے نجات دی جس کے رہنے والے گندے گندے کام کیا کرتے تھے (جن میں سب سے بدتر لواطت تھی اور بھی بہت سے بیہودہ اور بُرے افعال کے یہ لوگ عادی تھے۔ شراب خوری، گانا بجانا، داڑھی کٹانا، مونچھیں بڑھانا، کبوتر بازی، ڈھیلے پھینکنا، سیٹی بجانا، ریشمی لباس پہننا، اخرجہ اسحٰق بن بشر والخطیب وابن عساکر عن الحسن مرفوعًا کذا فی الدر) بلاشبہ وہ لوگ بڑے بد ذات بدکار تھے اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں (یعنی جن بندوں پر رحمت ہوتی ہے ان میں) داخل کیا (کیونکہ) بلاشبہ وہ بڑے (درجہ کے) نیکوں میں سے تھے (بڑے درجہ کے نیک سے مراد معصوم ہے جو نبی کی خصوصیت ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت لوط علیہ السلام کو جس بستی سے نجات دینے کا ذکر ان آیات میں آیا ہے اُس بستی کا نام سدُوم تھا اسکے تابع سات بستیاں اور تھیں جن کو جبرئیلؑ نے اُلٹ کر تہ و بالا کر ڈالا تھا صرف ایک بستی باقی چھوڑ دی تھی جس میں لوط علیہ السلام مع اپنے متعلقین مومنین کے رہ سکیں (قالہٗ ابن عباس۔ قرطبی)

تَعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ، خبائث خبیثہ کی جمع ہے۔ بہت سی خبیث اور گندی عادتوں کو خبائث کہا جاتا ہے۔ یہاں ان کی سب سے بڑی خبیث اور گندی عادت جس سے جنگلی جانور بھی پرہیز کرتے ہیں لواطت تھی، یعنی مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پوری کرنا۔ یہاں اسی ایک عادت کو اسکے بڑے جرم ہونے کے سبب خبائث کہہ دیا گیا ہو تو یہ بھی بعید نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے اور اس کے علاوہ دوسری خبیث عادتیں اُن میں ہونا بھی روایات میں مذکور ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بحوالہ رُوح المعانی گزر چکا ہے اس لحاظ سے مجموعہ کو خبائث کہنا تو ظاہر ہی ہے واللہ اعلم

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ

اور نوح کو جب اس نے پکارا اس سے پہلے پھر قبول کرلی ہم نے اسکی دعا سو بچا دیا اسکو اور اسکے گھر والوں کو

الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ

بڑی گھبراہٹ سے اور مدد کی اُس کی ان لوگوں پر جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتیں

اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۷۷﴾

وہ تھے برے لوگ پھر ڈبا دیا ہم نے ان سب کو

خلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ اُس (زمانہ ابراہیمی) سے پہلے اُنھوں نے (اللہ تعالیٰ سے) دُعا کی (کہ ان کافروں سے میرا بدلہ لے لیجئے) سو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو اور اُن کے متبعین کو بڑے بھاری غم سے نجات دی (یہ غم کفار کی تکذیب اور اُسکے ساتھ طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے سے پیش آتا تھا) اور (نجات اس طرح دی کہ) ہم نے ایسے لوگوں سے ان کا بدلہ لیا جنھوں نے ہمارے حکموں کو (جو کہ حضرت نوح علیہ السلام لائے تھے) جھوٹا بتلایا تھا بلاشبہ وہ لوگ بہت بُرے تھے اسلئے ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

معارف و مسائل

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ، من قبل سے مراد ابراہیم و لوط علیہما السلام سے پہلے ہونا ہے

جن کا ذکر اوپر کی آیات میں آیا ہے اور نوح علیہ السلام کی جس ندا کا ذکر اس جگہ مجملاً آیا ہے اسکا بیان سُوْرَۃ نوح میں یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے قوم کے لئے بددعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا، یعنی اے پروردگار روئے زمین پر کافروں میں کسی بسنے والے کو نہ چھوڑ اور ایک جگہ یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم نے کسی طرح اُن کا کہنا نہ مانا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا، اِنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، یعنی میں مغلوب اور عاجز ہو چکا ہوں آپ ہی ان لوگوں سے انتقام لے لیجئے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ، کربِ عظیم سے مراد یا تو طوفان میں غرق ہونا ہے جسمیں پوری قوم مبتلا ہوئی، یا اس قوم کی ایذائیں مراد ہیں جو وہ طوفان سے پہلے حضرت نوحؑ اور اُن کے خاندان کو پہنچاتے تھے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ

اور داؤد اور سلیمان کو جب لگے فیصل کرنے کھیتی کا جھگڑا جب روند گئیں اس کو رات میں ایک قوم کی بکریاں

وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ

اور سامنے تھا ہمارے ان کا فیصلہ پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو اور دونوں کو دیا تھا ہم نے حکم اور

عِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾

سمجھ اور تابع کئے ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ، تسبیح پڑھا کرتے اور اُڑتے جانور اور یہ سب کچھ ہم نے کیا

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

اور اسکو سکھلایا ہم نے بنانا ایک تمھارا لباس کہ بچاؤ ہو تم کو تمھاری لڑائی میں سو کچھ تم شکر

شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ

کرتے ہو اور سلیمان کے تابع کی ہوا زور سے چلنے والی کہ چلتی اسکے حکم سے اس زمین کی طرف

الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ

جہاں برکت دی ہے ہم نے اور ہم کو سب چیز کی خبر ہے اور تابع کئے کتنے شیطان جو

يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

غوطہ لگاتے اسکے واسطے اور بہت سے کام بناتے اسکے سوائے اور ہم نے ان کو تھام رکھا تھا

خلاصۂ تفسیر

اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جسمیں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے کذا فی الدر المنثور) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس (کھیت) میں کچھ لوگوں

کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اُسکو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دیدی۔ اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا صورت مقدمہ کی یہ تھی کہ جسقدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی۔ داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو وہ بکریاں دلوادیں اور اصل قانون شرعی کا یہی مقتضا تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں مگر چونکہ اسمیں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے بطور مصالحت کے جو کہ موقوف تھی جانبین کی رضامندی پر یہ صورت جسمیں دونوں کی سہولت اور رعایت تھی تجویز فرمائی کہ چند روز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جادیں کہ انکے دودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سُپرد کیا جاوے کہ اس کی خدمت آبپاشی وغیرہ سے کریں جب کھیت پہلی حالت پر آجاوے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دیدی جادیں۔ کذا فی الدر المنثور عن مرۃ وابن مسعود ومسروق وابن عباس ومجاہد وقتادہ والزہری۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں کہ ایک کی صحت دوسرے کی عدم صحت کو مقتضی ہو اسلئے کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا بڑھا دیا گیا) اور (یہاں تک تو کرامت عامہ کا ذکر تھا جو دونوں حضرات میں مشترک تھی آگے دونوں حضرات کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) وہ (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورہ سبا میں ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے۔ کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے) اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھائی (یعنی) تاکہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا مقتضا یہ ہے کہ تم شکر کرو) سو تم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا نہیں) اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مُراد ملک شام ہے جو ان کا مسکن تھا کذا فی الدر عن السدی ودیدل علیہ عمارۃ بیت المقدس یعنی جب ملک شام سے کہیں چلے جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہوتا تھا جیسا در منثور میں بروایت وتصحیح حاکم حضرت ابن عباس رضؓ سے اسکی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مع اعیان ملک کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے پھر ہوا کو بلا کر حکم دیتے وہ سب کو اُٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک ماہ کی مسافت قطع کرتی) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی) اور بعضے بعضے شیطان (یعنی

جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر انکے پاس لادیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے اور (گو وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے)

معارف و مسائل

نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ، لفظ نفش کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے یہ ہیں کہ رات کے وقت کوئی جانور کسی کے کھیت پر جا پڑے اور نقصان پہنچائے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ، فہمنٰہا کی ضمیر بظاہر مقدمہ اور اس کے فیصلہ کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ تھا اللہ تعالیٰ نے وہ حضرت سلیمانؑ کو سمجھا دیا۔ اس مقدمہ اور فیصلہ کی صورت اوپر خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی از روئے قانونِ شرعی غلط نہیں تھا مگر جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھایا اسمیں فریقین کی رعایت اور مصلحت تھی اسلئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پسندیدہ قرار دیا گیا۔

امام بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ اور زہری سے اس واقعہ کی روایت اسطرح کی ہے کہ دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے انمیں ایک شخص بکریوں والا دوسرا کھیتی والا تھا کھیتی والے نے بکریوں والے پر یہ دعویٰ کیا کہ اسکی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں گھس گئیں اور کھیت کو بالکل صاف کر دیا کچھ نہیں چھوڑا (غالباً مدعا علیہ نے اسکا اقرار کر لیا ہوگا اور بکریوں کی پوری قیمت اسکے ضائع شدہ کھیت کی قیمت کے برابر ہوگی اسلئے) حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ سنادیا کہ بکریوں والا اپنی ساری بکریاں کھیت والے کو دیدے۔ (کیونکہ جو چیزیں قیمت ہی کے ذریعہ لی اور دی جاتی ہیں جنکو عرف فقہاء میں ذوات القیم کہا جاتا ہے وہ اگر کسی نے ضائع کردی تو اسکا ضمان قیمت ہی کے حساب سے دیا جاتا ہے بکریوں کی قیمت چونکہ ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے مساوی تھی اسلئے یہ ضابطہ کا فیصلہ فرما دیا گیا) یہ دونوں مدعی اور مدعا علیہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت سے واپس ہوئے تو (دروازے پر آپ کے صاحبزادے) حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے دریافت کیا کہ تمہارے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟ ان لوگوں نے بیان کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس مقدمہ کا فیصلہ میں کرتا تو اسکے علاوہ کچھ اور ہوتا جو فریقین کے لئے مفید اور نافع ہوتا۔ پھر خود والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی بات عرض کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تاکید کے ساتھ دریافت کیا کہ وہ کیا فیصلہ ہے جو دونوں کے لئے اس فیصلہ سے بہتر ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بکریاں تو سب کھیت والے کو دیدیں کہ وہ اُن کے دودھ اور اُون وغیرہ سے فائدہ اُٹھاتا رہے اور کھیت کی زمین بکریوں والے کے سپرد کردیں کہ وہ اسمیں کاشت کر کے کھیت اگائے۔ جب

یہ کھیت اُس حالت پر آجائے جس پر بکریوں نے کھایا تھا تو کھیت کھیت والے کو دلوا دیں اور بکریاں بکری والے کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلے کو پسند فرما کر کہا کہ بس اب فیصلہ یہی رہنا چاہیئے اور فریقین کو بُلا کر دوسرا فیصلہ نافذ کر دیا (مظہری و قرطبی وغیرہ)

کیا فیصلہ دینے کے بعد کسی قاضی کا فیصلہ توڑا اور بدلا جا سکتا ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب ایک فیصلہ دے چکے تھے تو سلیمان علیہ السلام کو اُس کے توڑنے کا کیا حق تھا؟ اور اگر خود حضرت داؤد ہی نے اُن کا فیصلہ سُن کر اپنے سابق فیصلے کو توڑا اور دوسرا جاری کیا تو کیا قاضی کو اسکا اختیار ہے کہ ایک فیصلہ دیدینے کے بعد اس کو توڑ دے اور فیصلہ بدلدے۔

قرطبیؒ نے اس جگہ اس طرح کے مسائل پر بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے خلاصہ اُسکا یہ ہے کہ اگر کسی قاضی نے نصوص شرعیہ اور جمہور اُمت کے خلاف کوئی غلط فیصلہ محض اٹکل سے دیدیا ہے تو وہ فیصلہ باتفاقِ اُمت مردود و باطل ہے دوسرے قاضی کو اسکے خلاف فیصلہ دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب اور اس قاضی کا معزول کرنا واجب ہے لیکن اگر ایک قاضی کا فیصلہ شرعی اجتہاد پر مبنی اور اصولِ اجتہاد کے ماتحت تھا تو کسی دوسرے قاضی کو اس فیصلہ کا توڑنا جائز نہیں کیونکہ اگر ایسا کیا جائیگا تو فسادِ عظیم ہوگا اور اسلامی قانون ایک کھیل بن جائے گا اور روز روز حلال و حرام بدلا کرینگے، البتہ اگر خود اسی فیصلہ دینے والے قاضی کو بعد اسکے کہ اصولِ اجتہاد کے تحت وہ ایک فیصلہ نافذ کر چکا ہے اب از روئے اجتہاد یہ نظر آئے کہ پہلے فیصلے اور پہلے اجتہاد میں غلطی ہوگئی ہے تو اسکا بدلنا جائز بلکہ بہتر ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے جو ایک مفصّل خط حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام قضاء اور فصل مقدمات کے اصول پر مشتمل لکھا تھا اُسمیں اس کی تصریح ہے کہ فیصلہ دینے کے بعد اجتہاد بدل جائے تو پہلے فیصلہ کو بدل دینا چاہیئے۔ یہ خط دارقطنی نے سند کیساتھ نقل کیا ہے۔ (قرطبی ملخصًا) اور شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط باب القضاء میں بھی یہ خط مفصّل دیا ہے۔

اور امام تفسیر مجاہد کا قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے فیصلے اپنی اپنی جگہ ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ ضابطہ کا فیصلہ تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو فرمایا وہ درحقیقت مقدمہ کا فیصلہ نہیں، بلکہ فریقین میں صلح کرانے کا ایک طریقہ تھا اور قرآن میں وَالصُّلْحُ خَيْرٌ کا ارشاد وارد ہے اس لئے یہ دوسری صورت اللہ کے نزدیک پسندیدہ ٹھہری (مظہری)

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جب آپکے پاس دو فریق کا مقدمہ آئے تو پہلے ان دونوں میں رضامندی کے ساتھ کسی بات پر صلح کرانے کی کوشش کریں اگر یہ ناممکن ہو جائے تو اپنا شرعی فیصلہ جاری کریں اور حکمت اس کی یہ ارشاد فرمائی کہ حاکمانہ عدالتی

فیصلے سے وہ شخص جس کے خلاف ہوا ہو دب تو جاتا ہے مگر ان دونوں میں بغض و عداوت کا بیج قائم ہو جاتا ہے جو دو مسلمانوں میں نہیں ہونا چاہیئے بخلاف مصالحت کی صورت کے کہ اس سے دلوں کی منافرت بھی دُور ہو جاتی ہے (از معین الحکام)

مجاہد کے اس قول پر یہ معاملہ قاضی کے فیصلہ کو توڑنے اور بدلنے کا نہیں رہا بلکہ فریقین کو جو حکم سنایا تھا وہ ابھی گئے بھی نہ تھے کہ انہیں ایک صورت مصالحت کی نکل آئی اور وہ دونوں اس پر راضی ہو گئے۔

دو مجتہد اگر اپنے اپنے اجتہاد سے دو متضاد فیصلے کریں تو کیا اُن میں سے ہر ایک صواب اور درست ہے یا کسی ایک کو غلط کہا جائے۔

اس موقع پر قرطبی نے بڑی تفصیل سے اور دوسرے مفسرین نے مفصل یا مختصر یہ بحث بھی کی ہے کہ ہر مجتہد ہمیشہ مصیب ہی ہوتا ہے اور دو متضاد اجتہاد ہوں تو دونوں کو حق سمجھا جائے گا یا اُن میں سے ایک فیصلہ کو خطاء اور غلط قرار دیا جائے گا اسمیں قدیم زمانے سے علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ آیت مذکورہ سے دونوں جماعتوں نے استدلال کیا ہے جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں اجتہاد حق ہیں اگرچہ متضاد ہوں اُن کا استدلال آیت کے آخری جملے سے ہے جسمیں فرمایا وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ اس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو حکمت اور علم عطا کرنے کا ارشاد ہے حضرت داؤد علیہ السلام پر کوئی عتاب نہیں ہے نہ ان کو یہ کہا گیا کہ اُن سے غلطی ہو گئی اس سے معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی حق تھا اور سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی، البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو فریقین کے لئے اصلح ہونے کی بناء پر ترجیح دیدی گئی۔ اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اختلافِ اجتہادی کے مواقع میں حق ایک طرف ہوتا ہے دوسرا غلط ہوتا ہے انکا استدلال اسی آیت کے پہلے جملہ سے ہے یعنی فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ۔ کہ اسمیں تخصیص کر کے حضرت سلیمان کے بارہ میں فرمایا ہے کہ ہم نے انکو حق فیصلہ سمجھا دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ حق نہ تھا گو وہ بوجہ اپنے اجتہاد کے اسمیں معذور ہوں اور اُن سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو۔ یہ بحث اصولِ فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئی ہے وہاں دیکھی جا سکتی ہے یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اجتہاد کیا اور کوئی حکم دینی اصول اجتہاد کے ماتحت بیان کیا۔ اگر اسکا اجتہاد صحیح ہوا تو اُس کو دو اجر ملیں گے ایک اجتہاد کرنے کی محنت کا دوسرا صحیح و صواب حکم تک پہنچنے کا اور اگر یہ اجتہاد صحیح نہ ہوا اُس سے خطا ہو گئی تو پھر اسکو ایک اجر اجتہاد کی محنت کا ملے گا دوسرا اجر جو اصل حکم صحیح تک پہنچنے کا تھا وہ نہ ملے گا (یہ حدیث اکثر مستند کتب حدیث میں منقول ہے) اس حدیث سے اس اختلافِ علماء کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت یہ اختلاف ایک نزاعِ لفظی جیسا ہے کیونکہ حق دونوں طرف ہونیکا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد میں خطا کرنے والے مجتہد اور اسکے متبعین کے لئے بھی اجتہاد حق و صحیح ہے اسپر عمل کرنے سے اُن کی نجات ہو جائیگی خواہ یہ اجتہاد اپنی ذات میں خطاء ہی ہو مگر اسپر

عمل کرنے والوں کو کوئی گناہ نہیں اور جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حق ان دونوں میں ایک ہی ہے دوسرا غلط اور خطا ہے اسکا حاصل بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اصل مُراد حق تعالیٰ اور مطلوب خداوندی تک نہ پہنچنے کیوجہ سے اس مجتہد کے ثواب میں کمی آجائے گی اور یہ کمی اسوجہ سے ہے کہ اسکا اجتہاد حق بات تک نہ پہنچا لیکن یہ مطلب اُنکا بھی نہیں ہے کہ مجتہد خاطی پر کوئی ملامت ہوگی یا اُسکے متبعین کو گنا ہگار کہا جائے گا۔ تفسیر قرطبی میں اس مقام پر ان تمام مباحث کو پوری تفصیل سے لکھا ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ فقہیہ کہ اگر کسی کے جانور دوسرے آدمی کی جان یا مال کو نقصان پہنچادیں تو فیصلہ کیا ہونا چاہئے

حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جانور کے مالک پر ضمان آئے گا اگر یہ واقعہ رات میں ہوا ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ داؤد علیہ السلام کی شریعت کا جو فیصلہ ہو وہی شریعتِ محمدیہ میں رہے اسی لئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر رات کے وقت کسی کے جانور کسی دوسرے کے کھیت میں داخل ہو کر نقصان پہنچادیں تو جانور کے مالک پر ضمان آئیگا اور اگر دن میں ایسا ہو تو ضمان نہیں آئے گا اُن کا استدلال حضرت داؤدؑ کے فیصلہ سے بھی ہو سکتا ہے مگر شریعت محمدیہ کے اُصول کے تحت اُنھوں نے ایک حدیث سے استدلال فرمایا ہے جو موطا امام مالک میں مرسلاً منقول ہے کہ حضرت برار بن عازب رضؓ کی ناقہ ایک شخص کے باغ میں داخل ہوگئی اور اسکو نقصان پہنچا دیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ باغوں اور کھیتوں کی حفاظت رات میں انکے مالکوں کے ذمہ ہے اور ان کی حفاظت کے باوجود اگر رات کو کسی کے جانور نقصان پہنچادیں تو جانور کے مالک پر ضمان ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور فقہاء کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ جسوقت جانوروں کے ساتھ ان کا چرانے والا یا حفاظت کرنے والا کوئی آدمی موجود ہو اُس نے غفلت کی اور جانوروں نے کسی کے باغ یا کھیت کو نقصان پہنچا دیا اس صورت میں تو جانور کے مالک پر ضمان آتا ہے خواہ یہ معاملہ رات میں ہو یا دن میں اور اگر مالک یا محافظ جانوروں کیساتھ نہیں جانور خود ہی نکل گئے اور کسی کے کھیت کو نقصان پہنچا دیا تو جانور کے مالک پر ضمان نہیں معاملہ دن اور رات کا اسمیں بھی برابر ہے امام اعظم رحؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم اور تمام محدثین نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جرح العجماء جبار یعنی جانور جو کسی کو نقصان پہنچا دے وہ قابلِ مواخذہ نہیں یعنی جانور کے مالک پر اسکا ضمان نہیں ہے (بشرطیکہ جانور کا مالک یا محافظ اسکے ساتھ نہ ہو جیسا کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے) اس حدیث میں دن رات کی تفریق کے بغیر عام قانون شرعی یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر جانور کے مالک نے خود اپنے قصد وارادے سے کسی کے کھیت میں نہیں چھوڑا، جانور بھاگ کر چلا گیا تو اسکے نقصان کا ضمان جانور کے مالک پر نہیں ہوگا۔ اور حضرت برار بن عازب کے واقعہ کی روایت کی سند میں فقہاء حنفیہ نے کلام کیا ہے اور فرمایا کہ اس کو

صحیحین کی حدیث مذکور کے مقابلے میں حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح | وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ، حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ظاہری کمالات میں سے ایک کمال حسنِ صوت کا بھی عطا فرمایا تھا، جب وہ زبور پڑھتے تھے تو پرندے ہوا میں ٹھہرنے لگتے تھے اور اُن کے ساتھ تسبیح کرنے لگتے تھے اسی طرح پہاڑ اور ہر شجر و مدر سے تسبیح کی آواز نکلنے لگتی تھی خوش آوازی کا کمال تو ظاہری کمالات میں سے تھا اور پرندوں و پہاڑوں کا تسبیح میں شریک ہو جانا تسخیر خداوندی بطور معجزہ کے تھا اور معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پرندوں اور پہاڑوں میں حیات و شعور ہو بلکہ بطور معجزہ ہر غیر ذی شعور میں بھی شعور پیدا ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ تحقیق یہی ہے کہ پہاڑوں اور پتھروں میں بھی حیات و شعور بقدر اُن کی حیثیت کے موجود ہے صحابہ کرام میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بہت خوش آواز تھے ایک روز وہ قرآن پڑھ رہے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر اُن کی طرف ہوا تو آپ اُن کی تلاوت سُننے کے لئے ٹھہر گئے اور سُنتے رہے پھر فرمایا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خوش آوازی حضرت داؤد علیہ السلام کی عطا فرمائی ہے۔ جب ابو موسیٰؓ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی تلاوت سُن رہے تھے تو عرض کیا کہ اگر مجھے آپ کا سُننا معلوم ہو جاتا تو میں اور زیادہ سنوار کر پڑھنے کی کوشش کرتا (ابن کثیر)

فائدہ | اس سے معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن میں حسنِ صوت اور اچھا لہجہ جس سے دلکشی پیدا ہو ایک درجہ میں مطلوب و محبوب ہے بشرطیکہ آجکل کے قراء کی طرح اسمیں غلو نہ ہو کہ صرف آواز ہی سنوار نے اور لوگوں کو لُبھانے کی فکر رہ جائے تلاوت کا اصل مقصد ہی غائب ہو جائے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

زرہ بنانے کی صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کو منجانب اللہ عطا کی گئی۔ | وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ، لفظ لبوس لغت کے اعتبار سے اسلحہ میں سے ہر چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان اوڑھ کر یا گلے میں ڈال کر استعمال کرے مراد اس جگہ آہنی زرہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنی جاتی ہے دوسری آیت میں ہے وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ یعنی ہم نے اُن کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا خواہ اسطرح کہ لوہا اُن کے ہاتھ میں آکر خود بخود نرم ہو جاتا ہو کہ اُس کو جس طرح موڑیں مُڑ جائے اور باریک یا موٹا کرنا چاہیں تو ہو جائے جیسے موم ہوتا ہے یا اس طرح کہ اُن کو آگ میں پگھلا کر نرم کرنے کی تدبیر بتلا دی جو سب لوہے کے کارخانوں میں آج استعمال کی جاتی ہے۔

ایسی صنعت جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے مطلوب اور فعلِ انبیاء ہے | اس آیت میں زرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کو سکھانے کے ذکر کے ساتھ اُس کی حکمت بھی یہ بتلائی ہے کہ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ، یعنی تاکہ یہ زرہ تمھیں جنگ کے وقت تیز تلوار کے خطرہ سے محفوظ رکھ سکے یہ ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس سے اہلِ دین اور اہلِ دُنیا سب کو کام پڑتا ہے اسلئے اس صنعت کے

سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک انعام قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس صنعت کے ذریعہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اسکا سیکھنا سکھانا داخلِ ثواب ہے بشرطیکہ نیت خدمتِ خلق کی ہو، صرف کمائی ہی مقصد نہ ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے مختلف قسم کی صنعتوں کا عمل کرنا منقول ہے حضرت آدم علیہ السلام سے کھیتی بونے کاٹنے کا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو صنعتکار اپنی صنعت میں نیت نیک یعنی خدمتِ خلق کی رکھے اُس کی مثال اُمِّ موسیٰ کی سی ہوجاتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہی بچہ کو دودھ پلایا اور معاوضہ فرعون کیطرف سے مفت میں ملا۔ اسی طرح خدمتِ خلق کی نیت سے صنعتکاری کرنے والے کو اپنا مقصد ثواب خدمتِ خلق تو حاصل ہوگا ہی صنعت کا نفع دنیوی مزید براں اسکو ملیگا۔ یہ حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں سُورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہوا کی تسخیر اور اُس کے متعلقہ مسائل

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا یہ واقعہ پیش آیا کہ لشکری گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہوکر عصر کی نماز فوت ہوگئی تو اپنی اس غفلت پر افسوس ہوا اور یہ گھوڑے جو اس غفلت کا سبب بنے تھے انکو بیکار کرکے چھوڑ دیا چونکہ اُن کا یہ عمل اللہ کی رضاجوئی کیلئے ہوا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے انکو گھوڑوں سے بہتر اور تیز رفتار سواری ہوا کی عطا فرمادی اس واقعہ کی تفصیل اور اس سے متعلقہ آیات کی تفسیر صٓ میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً، یہ جملہ سابقہ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ پر عطف ہے یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کردیا تھا جو اُن کی آواز کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کردیا تھا جس پر سوار ہوکر وہ جہاں چاہتے بہت جلد آسانی سے پہنچ جاتے تھے اس جگہ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ تسخیر داؤد علیہ السلام میں تو لفظ مع استعمال فرمایا کہ اُن کے ساتھ پہاڑوں پرندوں کو مسخر کردیا تھا اور یہاں حرف لام کے ساتھ فرمایا کہ ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کردیا تھا اسمیں لطیف اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ دونوں تسخیروں میں فرق تھا، داؤد علیہ السلام جب تلاوت کرتے تو پہاڑ اور پرندے خود بخود تسبیح کرنے لگتے تھے اُن کے حکم کے منتظر نہ رہتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو اُن کے حکم کے تابع بنادیا گیا کہ جب چاہیں جس وقت چاہیں جسطرف جانا چاہیں ہوا کو حکم دیدیا اُسنے پہنچادیا پھر جہاں اُترنا چاہیں وہاں اُتار دیا پھر جب واپس چلنے کا حکم ہوا واپس پہنچا دیا۔ (روح عن البیضاوی)

تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اُس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا جس پر خود مع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سب سوار ہوجاتے پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع عریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جاکر اُتار دیتی تھی۔ یہ ہوائی تخت صبح

سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جسمیں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کرلیں تاکہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اُٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچادیتی تھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر کے وقت پورے راستہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سر جھکائے ہوئے اللہ کے ذکر و شکر میں مشغول رہتے تھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے (ابن کثیر)

عَاصِفَةً، ریح عاصفہ کے لفظی معنے سخت اور تیز ہوا کے ہیں۔ قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس ہوا کی صفت رُخَاءً بیان کی گئی ہے جس کے معنے نرم ہوا کے ہیں جس سے نہ غبار اُڑے نہ فضا میں تلاطم پیدا ہو۔ بظاہر یہ دو متضاد صفتیں ہیں لیکن دونوں صفتوں کا جمع ہونا اس طرح ممکن ہے کہ یہ ہوا اپنی ذات میں بڑی سخت اور تیز ہو جسکی وجہ سے چند گھنٹوں میں ایک مہینہ کی مسافت طے کر سکے لیکن قدرت حق تعالیٰ نے اُس کو ایسا بنا دیا ہو کہ اُس سے فضا میں تلاطم نہ پیدا ہو چنانچہ اس کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ جس فضا میں یہ تخت روانہ ہوتا تھا وہاں کسی پرندے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔

سلیمان علیہ السلام کیلئے تسخیر جنات وشیاطین

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ، یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا شیاطین جن میں سے ایسے لوگوں کو جو دریاؤں میں غوطہ لگا کر سلیمان علیہ السلام کے لئے جواہرات نکال کر لاتے تھے اور اسکے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ یعنی بناتے ہیں حضرت سلیمان کے لئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی طرح کام دیں اُن سے سلیمانؑ بڑی مشقت کے کام بھی لیتے تھے اور عجیب وغریب صنعتوں کے بھی، اور ہم ہی اُن کے محافظ تھے۔

شَيٰطِيْنَ، وہ آگ کے بنے ہوئے اجسام لطیفہ ہیں جو عقل وشعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں۔ اس نوع کے لئے اصل لفظ جن یا جنات استعمال ہوتا ہے ان میں جو ایمان قبول نہ کریں کافر ہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تو سبھی جنات تھے خواہ مومن ہوں یا کافر، مگر مومنین تو تسخیر کے بغیر بھی سلیمان علیہ السلام کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے کرتے تھے اُن کے لئے تسخیر کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

اسلئے تسخیر میں صرف شیاطین یعنی کفار جنات کا ذکر فرمایا کہ وہ باوجود اپنے کفر و سرکشی کے زیردستی حضرت سلیمان کے تابع فرمان رہتے تھے اور شاید اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا کہ ہم ہی اُن کے محافظ تھے ورنہ کفار جنات سے تو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ وہ کوئی نقصان پہنچا دیں مگر حفاظتِ خداوندی کا پہرہ اُن پر لگا ہوا تھا اسلئے کوئی گزند نہ پہنچا سکتے تھے۔

ایک لطیفہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے تو حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ سخت اور کثیف اجسام کو مسخر فرمایا جن میں پہاڑ اور لوہا جیسی سخت چیزیں شامل ہیں، اسکے بالمقابل سلیمان علیہ السلام کیلئے ایسے اجسام لطیفہ کو مسخر فرمایا جو دیکھنے میں بھی نہ آسکیں جیسے ہوا اور جنات اسمیں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ہر قسم کی مخلوقات پر حاوی ہونا واضح کیا گیا ہے (تفسیر کبیر للرازی)

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور ایوب کو جس وقت پکارا اس نے اپنے رب کو کہ مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ

پھر ہم نے سُن لی اُس کی فریاد سو دُور کر دی جو اُس پر تھی تکلیف اور عطا کئے اسکو اسکے گھر والے اور اتنے ہی اور ان کے ساتھ

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

رحمت اپنی طرف سے اور نصیحت بندگی کرنے والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور ایوب (علیہ السلام) کے قصے کا تذکرہ کیجئے جب کہ اُنھوں نے (مرض شدید میں مبتلا ہونیکے بعد) اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں (تو اپنی مہربانی سے میری یہ تکلیف دُور کر دیجئے) تو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو جو تکلیف تھی اُس کو دُور کر دیا اور (بغیر اُن کی درخواست کے) ہم نے اُن کا کنبہ (یعنی اولاد جو اُن سے غائب ہو گئے تھے (قالہ الحسن کذا فی الدر المنثور) یا مر گئے تھے (کما قال غیرہ) عطا فرمایا (اس طرح سے کہ وہ اُن کے پاس آگئے یا بایں معنی کہ اتنے ہی اور پیدا ہو گئے، قالہ عکرمہ کما فی فتح المنان) اور اُنکے ساتھ (گنتی میں) اُن کے برابر اور بھی (دیئے یعنی جتنی اولاد پہلے تھی اُس کے برابر اور بھی دیدیئے خواہ خود اپنی صلب سے یا اولاد کی اولاد ہونے کی حیثیت سے) (کذا فی فتح المنان من کتاب ایوب) اپنی رحمتِ خاصہ کے سبب سے اور عبادت کرنے والوں کے لئے ایک یادگار رہنے کے سبب سے۔

معارف و مسائل

قصۂ ایوب علیہ السلام حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے میں اسرائیلی روایات بڑی طویل ہیں جن میں سے کچھ کو محدثین نے تاریخی حیثیت میں قابل اعتماد سمجھا ہے وہ نقل کیجاتی ہیں۔ قرآن کریم سے تو صرف اتنی بات ثابت ہے کہ آپ کو کوئی شدید مرض پیش آیا جس پر وہ صبر کرتے رہے، آخر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس سے نجات ملی اور یہ کہ اس بیماری کے زمانے میں ان کی اولاد اور احباب سب غائب ہوگئے خواہ موت کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے پھر حق تعالیٰ نے ان کو صحت عطا دی اور جتنی اولاد تھی وہ سب بھی دیدی بلکہ اتنی ہی اور زیادہ دیدی۔ باقی قصے کے اجزاء بعض مستند روایات میں موجود ہیں زیادہ تر تاریخی روایات ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اس قصے کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ

ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال و دولت اور جائداد اور شاندار مکانات اور سواریاں اور اولاد اور حشم و خدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا یہ سب چیزیں اُنکے ہاتھ سے نکل گئی اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا وہ اس حالت میں زبان و قلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکر ادا کرتے رہتے تھے۔ اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے اُن کو الگ کرکے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈالدیا کوئی اُن کے پاس نہ جاتا تھا صرف اُن کی بیوی اُن کی خبرگیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھی جسکا نام لیا بنت میشا ابن یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) مال و جائداد تو سب ختم ہوچکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کرکے اپنے اور اُن کے لئے رزق اور ضروریات فراہم کرتی اور انکی خدمت کرتی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کوئی حیرت و تعجب کی چیز نہیں، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل، یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں اُن کے بعد دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اُتنی اس کی آزمائش و ابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تاکہ اسی مقدار سے اسکے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں) حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب و شدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو مال و اولاد وغیرہ

عـہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے بارے میں [illegible] معارف القرآن جلد ہفتم صفحہ نمبر ۵۲۲ پر سورہ ص کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں محمد تقی عثمانی ۱۸/۳/۱۴۲۶ھ۔

سب دُنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمائی تو اُنھوں نے فارغ ہو کر اللہ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائداد اور دولتِ دُنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جز پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپکے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیرؒ یہ مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن منبہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اسلئے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید بلا میں کہ سب مال و جائداد اور دولتِ دُنیا سے الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع و فزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیا زوجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دُعا کیجئے کہ یہ تکلیف دُور ہو جائے تو فرمایا کہ میں نے ستر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت و دولت میں گزارے ہیں کیا اسکے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزرنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم و ضبط اور صبر و ثبات کا یہ عالم تھا کہ دُعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کیخلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنا اور اپنی احتیاج و تکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں) بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دُعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے یہ دُعاء دُعاء ہی تھی کوئی بے صبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے اُن کے کمالِ صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما دی ہے فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا اس سبب کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لئے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ (جب ایوب علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اُن کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑ لگایئے یہاں سے صاف پانی کا چشمہ پھُوٹے گا اُس سے غسل کیجئے اور اسکا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائیگا حضرت ایوبؑ نے اسکے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکایک اپنی اصلی حالت پر آ گئے تو) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے جنت کا ایک لباس بھیجدیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسبِ عادت انکی خبر گیری کے لئے آئی تو اُن کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی۔ ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے اُن کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی، اُنھیں سے پُوچھا کہ اے خدا کے بندے (کیا تمھیں معلوم ہے کہ)

وہ بیمار مبتلا جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے اُسے کھا لیا؟ اور کچھ دیر تک اس معاملے میں اُن سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سُن کر ایوب علیہ السلام نے اُن کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا۔ کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ غور کرو میں ہی ایوب ہوں، اللہ تعالیٰ نے میری دُعا قبول فرمائی اور میرا بدن از سرِ نو درست فرما دیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے سامانُ دولت بھی اُن کو واپس دیدیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دیدی (روح المعانی)

ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے سات لڑکے سات لڑکیاں تھیں اس ابتلاء کے زمانے میں یہ سب مر گئے تھے، جب اللہ نے ان کو عافیت دی تو ان کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا اور انکی اہلیہ سے نئی اولاد بھی اتنی ہی اور پیدا ہوگئی جس کو قرآن میں وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ فرمایا ہے۔ ثعلبی نے کہا کہ یہ قول ظاہر آیت قرآن کے ساتھ اقرب ہے۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے فرمایا کہ نئی اولاد خود اپنے سے اُتنی ہی مل گئی جتنی پہلے تھی اور اُن کے مثل اولاد سے مراد اولاد کی اولاد ہے واللہ اعلم

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ
اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یہ سب ہیں صبر والے اور
اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾
لے لیا ہم نے اُن کو اپنی رحمت میں وہ ہیں نیک بختوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل (کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے یہ سب (احکامِ الٰہیہ تشریعیہ اور تکوینیہ پر) ثابت قدم رہنے والے لوگوں میں سے تھے اور ہم نے ان (سب) کو اپنی رحمت (خاصّہ) میں داخل کر لیا تھا بیشک یہ (سب) کمال صلاحیت والوں میں تھے۔

معارف و مسائل

حضرت ذوالکفل نبی تھے یا ولی اور اُن کا قصہ عجیبہ

آیاتِ مذکورہ میں تین حضرات کا ذکر ہے جنمیں حضرت اسمٰعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کا نبی و رسُول ہونا قرآنِ کریم کی بہت سی آیات سے ثابت اور اُن کا تذکرہ بھی قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ تیسرے بزرگ ذوالکفل ہیں۔ ابن کثیرؒ نے

فرمایا کہ ان کا نام ان دونوں پیغمبروں کیساتھ شامل کر کے ذکر کرنے سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بھی کوئی اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمرۂ انبیاء میں نہیں تھے بلکہ ایک مرد صالح اولیاء اللہ میں سے تھے۔ امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کیساتھ مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت یسعؑ (جن کا نبی و پیغمبر ہونا قرآن میں مذکور ہے) جب بوڑھے اور ضعیف ہوگئے تو ارادہ کیا کہ کسی کو اپنا خلیفہ بنادیں جو اُن کی زندگی میں وہ سب کام اُن کی طرف سے کرے جو نبی کے فرائض میں داخل ہیں۔

اس مقصد کے لئے حضرت یسعؑ علیہ السلام نے اپنے سب صحابہ کو جمع کیا کہ میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جس کے لئے تین شرطیں ہیں جو شخص ان شرائط کا جامع ہو اس کو خلیفہ بنادوں گا۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتا ہو اور ہمیشہ راتکو عبادت میں بیدار رہتا ہو اور کبھی غصہ نہ کرتا ہو۔ مجمع میں سے ایک ایسا غیر معروف شخص کھڑا ہوا جس کو لوگ حقیر ذلیل سمجھتے تھے اور کہا کہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت یسعؑ نے دریافت کیا کہ کیا تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہمیشہ شب بیداری کرتے ہو اور کبھی غصہ نہیں کرتے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ بیشک میں ان تین چیزوں کا عامل ہوں۔ حضرت الیسعؑ (کو شاید کچھ اسکے قول پر اعتماد نہ ہوا اسلئے) اُس روز اسکو رد کر دیا پھر کسی دوسرے روز اسیطرح مجمع سے خطاب فرمایا اور سب حاضرین ساکت رہے اور یہی شخص پھر کھڑا ہو گیا اُس وقت حضرت یسعؑ نے ان کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ شیطان نے یہ دیکھا کہ ذوالکفلؑ اسمیں کامیاب ہوگئے تو اپنے اعوان شیاطین سے کہا کہ جاؤ کسی طرح اس شخص پر اثر ڈالو کہ یہ کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے یہ منصب اسکا سلب ہو جائے۔ اعوان شیطان نے عذر کر دیا کہ وہ ہمارے قابو میں آنیوالا نہیں شیطان ابلیس نے کہا کہ اچھا تم اس کو مجھ پر چھوڑ دو (میں اُس سے نمٹ لوں گا) حضرت ذوالکفلؑ اپنے اقرار کے مطابق دن بھر روزہ رکھتے اور رات بھر جاگتے تھے صرف دوپہر کو قیلولہ کرتے تھے (قیلولہ دوپہر کے سونے کو کہتے ہیں) شیطان عین دوپہر کو ان کے قیلولہ کے وقت آیا اور دروازہ پر دستک دی یہ بیدار ہوگئے اور پوچھا کون ہے کہنے لگا کہ میں بوڑھا مظلوم ہوں، اُنھوں نے دروازہ کھولدیا۔ اُس نے اندر پہنچکر ایک افسانہ کہنا شروع کر دیا کہ میری برادری کا مجھ سے جھگڑا ہے اُنھوں نے مجھ پر یہ ظلم کیا وہ ظلم کیا، ایک طویل داستان شروع کردی یہانتک کہ دوپہر کے سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ حضرت ذوالکفلؑ نے فرمایا کہ جب میں باہر آؤں تو میرے پاس آجاؤ میں تمھارا حق دلواؤں گا۔

حضرت ذوالکفلؑ باہر تشریف لائے اور اپنی مجلس عدالت میں اُسکا انتظار کرتے رہے مگر اسکو نہیں پایا۔ اگلے روز پھر جب وہ عدالت میں فیصلہ مقدمات کے لئے بیٹھے تو اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے اور یہ نہ آیا۔ جب دوپہر کو پھر قیلولہ کے لئے گھر میں گئے تو یہ شخص آیا اور دروازہ کوٹنا شروع کیا۔ انھوں نے پھر پوچھا کون ہے؟ جواب دیا کہ ایک مظلوم بوڑھا ہے، اُنھوں نے پھر دروازہ کھولدیا اور فرمایا کہ کیا

میں نے کل تم سے نہیں کہا تھا کہ جب میں اپنی مجلس میں بیٹھوں تو تم آجاؤ (تم نہ کل آئے نہ آج صبح سے آئے) اُسنے کہا کہ حضرت میرے مخالف بڑے خبیث لوگ ہیں جب انھوں نے دیکھا کہ آپ اپنی مجلس میں بیٹھے ہیں اور میں حاضر ہونگا تو آپ اُن کو میرا حق دینے پر مجبور کریں گے تو انھوں نے اُسوقت اقرار کرلیا کہ ہم تیرا حق دیتے ہیں، پھر جب آپ مجلس سے اُٹھ گئے تو انکار کردیا۔ انھوں نے پھر اسکو یہی فرمایا کہ اب جاؤ جب میں مجلس میں بیٹھوں تو میرے پاس آجاؤ۔ اسی گفت و شنید میں آج کے دو پہر کا سونا بھی رہ گیا اور وہ باہر مجلس میں تشریف لے گئے اور اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے (اگلے روز بھی دوپہر تک انتظار کیا وہ نہیں آیا پھر جب تیسرے روز دوپہر کا وقت ہوا اور نیند کو تیسرا دن ہوگیا تھا نیند کا غلبہ تھا) تو گھر میں آکر گھر والوں کو اسپر مقرر کیا کہ کوئی شخص دروازے پر دستک نہ دے سکے۔ یہ بوڑھا پھر تیسرے روز پہنچا اور دروازے پر دستک دینا چاہا لوگوں نے منع کیا تو ایک روشندان کے راستے سے اندر داخل ہوگیا اور اندر پہنچکر دروازہ بجانا شروع کردیا یہ پھر نیند سے بیدار ہوگئے اور دیکھا کہ یہ شخص گھر کے اندر ہے اور دیکھا کہ دروازہ بدستور بند ہے اس سے پوچھا، تو کہاں سے اندر پہنچا، اسوقت حضرت ذوالکفل نے پہچان لیا کہ شیطان ہے اور فرمایا کہ کیا تو خدا کا دشمن ابلیس ہے؟ اس نے اقرار کیا کہ ہاں، اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے میری ہر تدبیر میں تھکا دیا کبھی میرے جال میں نہیں آیا، اب میں نے یہ کوشش کی کہ تجھے کسی طرح غصہ دلادوں تاکہ تو اپنے اس اقرار میں جھوٹا ہوجائے جو یسعؑ نبی کے ساتھ کیا ہے، اس لئے میں نے یہ سب حرکتیں کیں۔ یہ واقعہ تھا جس کی وجہ سے اُن کو ذوالکفل کا خطاب دیا گیا، کیونکہ ذوالکفل کے معنی ہیں ایسا شخص جو اپنے عہد اور ذمہ داری کو پورا کرے، حضرت ذوالکفل اپنے اس عہد پر پورے اُترے۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ایک روایت اور بھی ہے مگر اسمیں ذوالکفل کے بجائے الکفل کا نام آیا ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے اُس روایت کو نقل کرکے کہا کہ یہ کوئی دوسرا شخص کفل نامی ہے وہ ذوالکفل جنکا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ نہیں۔ روایت یہ ہے:-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات مرتبہ سے زائد سُنی ہے وہ یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ کفل بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جو کسی گناہ سے پرہیز نہ کرتا تھا، اُسکے پاس ایک عورت آئی اُسنے اسکو ساٹھ دینار (گنیاں) دیں اور فعل حرام پر اسکو راضی کرلیا۔ جب وہ مباشرت کے لئے بیٹھ گیا تو یہ عورت کانپنے اور رونے لگی اُس نے کہا کہ رونے کی کیا بات ہے کیا میں نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی کی ہے۔ اس نے کہا نہیں جبر تو نہیں کیا، لیکن یہ ایسا گناہ ہے جو میں نے کبھی عمر بھر نہیں کیا اور اسوقت مجھے اپنی ضرورت نے مجبور کردیا اس لئے اسپر آمادہ ہوگئی یہ سنکر وہ شخص

اسی حالت میں عورت سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ جاؤ یہ دینار بھی تمھارے ہیں اور اب سے کفل بھی کوئی گناہ نہیں کریگا، اتفاق یہ ہوا کہ اسی رات میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح اسکے دروازے پر غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی گئی غفر اللّٰہ للکفل یعنی اللہ نے کفل کو بخشدیا ہے۔

ابن کثیر نے یہ روایت مسند احمد کی نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کو صحاح ستہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیا اور اسناد اسکی غریب ہے اور بہرحال اگر روایت ثابت بھی ہے تو اسمیں ذکر کفل کا ہے ذوالکفل کا نہیں، یہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذوالکفل حضرت یسع نبی کے خلیفہ اور ولی صالح تھے اُن کے خاص محبوب اعمال کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ اُن کا ذکر اس آیت میں بزمرہ انبیاء کر دیا گیا اور اسمیں بھی کوئی بعد نہیں معلوم ہوتا کہ شروع میں یہ حضرت یسع کے خلیفہ ہی ہوں پھر حق تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت عطا فرما دیا ہو وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي

اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو پھر پکارا ان

الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر سن لی ہم نے اسکی فریاد اور بچا دیا اسکو اس گھٹنے سے اور یونہی ہم بچا دیتے ہیں ایمان والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب وہ (اپنی قوم سے جبکہ وہ ایمان نہ لائی) خفا ہو کر چل دیئے (اور اُنکی قوم پر سے عذاب ٹلنے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا) اور اُنھوں نے (اپنے اجتہاد سے) یہ سمجھا کہ ہم (اس چلے جانے میں) اُن پر کوئی دار وگیر نہ کریں گے (یعنی چونکہ اس فرار کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے جائز سمجھا اس لئے وحی کا انتظار نہ کیا لیکن چونکہ اُمید وحی تک وحی کا انتظار انبیاء کے لئے مناسب ہے اور یہ مناسب کام اُن سے ترک ہو گیا لہٰذا ان کو یہ ابتلا پیش آیا کہ راستہ میں اُن کو کوئی دریا ملا اور وہاں کشتی میں سوار ہوئے، کشتی چلتے چلتے رُک گئی یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرا یہ بلا اجازت فرار ناپسند ہوا اس کی وجہ سے یہ کشتی رُکی کشتی والوں سے فرمایا کہ مجھ کو دریا میں ڈالدو، وہ راضی نہ ہوئے

غرض قرعہ پر اتفاق ہوا تب بھی ان ہی کا نام نکلا، آخر اُن کو دریا میں ڈالدیا اور خدا کے حکم سے انکو ایک مچھلی نے نگل لیا، اخرجہ ابن ابی حاتم عن ابن عباس کذا فی الدر المنثور) پس اُنھوں نے اندھیروں میں پکارا (ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا، دوسرا دریا کے پانی کا دونوں گہرے اندھیرے جو بہت سی اندھیروں کے قائم مقام، یا تیسرا اندھیرا رات کا، قالہ ابن مسعودؓ کما فی الدر المنثور، غرض ان تاریکیوں میں دُعا کی) کہ آپکے سوا کوئی معبود نہیں (یہ توحید ہے) آپ (سب نقائص سے) پاک ہیں (یہ تنزیہ ہے) میں بیشک قصور وار ہوں (یہ استغفار ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ میرا قصور معاف کرکے اس شدت سے نجات دیجئے) سو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی (جسکا قصہ سورہ صافات میں فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاۗءِ الخ میں مذکور ہے) اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب اور غم سے) نجات دیا کرتے ہیں (جبکہ چندے غم میں رکھنا مصلحت نہ ہو)۔

معارف و مسائل

وَذَا النُّوْنِ، حضرت یونس بن متی علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم نے سورۂ یونس، سورۂ انبیاء پھر سورۂ صافات اور سورۂ نون میں ذکر فرمایا کہیں ان کا اصل نام ذکر فرمایا ہے کہیں ذا النون یا صاحب الحوت کے القاب سے ذکر کیا گیا ہے۔ نون اور حوت دونوں کے معنے مچھلی کے ہیں ذوالنون اور صاحب الحوت کا ترجمہ ہے مچھلی والا، حضرت یونس علیہ السلام کو تقدیر الٰہی چند روز بطن ماہی میں رہنے کا واقعہ غریبہ پیش آیا تھا اس کی مناسبت سے ان کو ذوالنون بھی کہا جاتا ہے اور صاحب الحوت کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔

قصۂ یونس علیہ السلام | تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یونس علیہ السلام کو علاقہ موصل کی ایک بستی نینوای کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یونس علیہ السلام نے ان کو ایمان و عمل صالح کی دعوت دی، اُنھوں نے تمرد اور سرکشی سے کام لیا۔ یونس علیہ السلام ان سے ناراض ہو کر بستی سے نکل گئے اور اُن کو کہدیا کہ تین دن کے اندر تمہارے اوپر عذاب آجائیگا۔ یونس علیہ السلام بستی چھوڑ کر نکل گئے تو ان کو فکر ہوئی کہ اب عذاب آہی جائیگا (اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے بعض آثار کا اُن کو مشاہدہ بھی ہو گیا) تو اُنھوں نے اپنے شرک و کفر سے توبہ کی اور بستی کے سب مرد عورت اور بچے جنگل کیطرف نکل گئے اور اپنے مویشی جانوروں اور ان کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے اور بچوں کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا اور سب نے گریہ وزاری کرنا شروع کی اور الحاح وزاری کے ساتھ اللہ سے پناہ مانگی، جانوروں کے بچوں نے جن کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا گیا تھا الگ شور و غل کیا۔ حق تعالیٰ نے اُن کی سچی توبہ اور الحاح وزاری کو قبول کرلیا

اور عذاب اُن سے ہٹا دیا۔ ادھر حضرت یُونس علیہ السلام اس انتظار میں رہے کہ قوم پر عذاب آ رہا ہے وہ ہلاک ہو گئی ہو گی جب اُن کو یہ پتہ چلا کہ عذاب نہیں آیا اور قوم صحیح سالم اپنی جگہ ہے تو (ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب میں جھُوٹا سمجھا جاؤں گا، اور بعض روایات میں ہے کہ ان کی قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ کسی کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا (مظہری) اس سے حضرت یُونس علیہ السلام کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق ہو گیا تو) یُونس علیہ السلام نے اپنی قوم میں واپس جانے کے بجائے کسی دوسری جگہ کو ہجرت کرنیکے کے قصد سے سفر اختیار کیا راستہ میں دریا تھا اسکو پار کرنے کے لئے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اتفاق سے کشتی ایسے گرداب میں پھنسی کہ غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا ملاحوں نے یہ طے کیا کہ کشتی میں سوار لوگوں میں سے ایک کو دریا میں ڈال دیا جائے تو باقی لوگ غرقابی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اس کام کے لئے کشتی والوں کے نام پر قرعہ اندازی کی گئی اتفاق سے قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر نکل آیا (کشتی والے شاید آکی بزرگی سے واقف تھے) ان کو دریا میں ڈالنے سے انکار کیا اور دوبارہ قرعہ ڈالا پھر بھی اسمیں نام یونس علیہ السلام کا نکلا، ان کو پھر بھی تامل ہوا تو تیسری مرتبہ قرعہ ڈالا پھر بھی اُنھیں کا نام نکل آیا۔ اسی قرعہ اندازی کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے آیا ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ یعنی قرعہ اندازی کی گئی تو یُونس علیہ السلام ہی اس قرعہ میں متعین ہوئے۔ اس وقت یُونس علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور اپنے غیر ضروری کپڑے اُتار کر اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا اُدھر حق تعالیٰ نے بحر اخضر سے ایک مچھلی کو حکم دیا وہ دریاؤں کو چیرتی پھاڑتی فوراً یہاں پہنچ گئی (کما قالہ ابن مسعود رض) اور یُونس علیہ السلام کو اپنے اندر لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو یہ ہدایت فرما دی تھی کہ نہ ان کے گوشت کو کوئی نقصان پہنچے نہ ہڈی کو یہ تیری غذا نہیں بلکہ تیرا پیٹ چند روز کے لئے ان کا قید خانہ ہے (یہاں تک یہ سب واقعہ روایت ابن کثیر میں ہے۔ بجز اُن کلمات کے جو قوسین میں لئے گئے ہیں وہ دوسری کتابوں سے لئے ہوئے ہیں) قرآن کریم کے اشارات اور بعض تصریحات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا بغیر اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہوا اسی پر عتاب نازل ہوا اور دریا میں پھر مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی نوبت آئی۔

حضرت یُونس علیہ السلام نے جو قوم کو تین دن کے اندر عذاب آجانے سے ڈرایا تھا ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنی رائے سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہوا تھا اور اسوقت قوم کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جانا بھی جو قدیم عادت انبیاء علیہم السلام کی ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی بحکم خداوندی ہوا ہو گا یہاں تک کوئی بات لغزش کی موجب عتاب نہیں تھی مگر جب قوم کی سچی توبہ اور الحاح وزاری کو اللہ تعالیٰ نے قبول

فرماکر ان سے عذاب ہٹادیا اُسوقت حضرت یُونس علیہ السلام کا اپنی قوم میں واپس نہ آنا اور بقصد ہجرت سفر اختیار کرنا یہ اپنے اس اجتہاد کی بناء پر ہوا کہ اس حالت میں اگر میں واپس اپنی قوم میں گیا تو جھُوٹا سمجھا جاؤں گا اور میری دعوت بے اثر بے فائدہ ہو جاوے گی بلکہ اُلٹی بربادی کا بھی خطرہ ہے اور اگر میں اُنکو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ مواخذہ و گرفت نہیں ہوگی اپنے اجتہاد کی بناء پر ہجرت کا قصد کر لینا اور اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کا انتظار نہ کرنا اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یُونس علیہ السلام کا یہ عمل پسند نہ آیا کہ وحی کا انتظار کئے بغیر ایک فیصلہ کر لیا اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر خلافِ اولیٰ ضرور ہوا۔ انبیاء علیہم السلام اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی کی شان بہت بلند ہوتی ہے اُن کو مزاج شناس ہونا چاہیئے، اُن سے اس معاملے میں اَدنیٰ کوتاہی ہوتی ہے تو اس پر بھی عتاب اور گرفت ہوتی ہے یہی معاملہ تھا جس پر عتاب ہوا۔

تفسیر قرطبی میں قشیری سے نقل کیا کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ صورت غضبِ یونس علیہ السلام کی اُسوقت پیش آئی جبکہ قوم سے عذاب ہٹ گیا ان کو یہ پسند نہ تھا، اور مچھلی کے پیٹ میں چند روز رہنا بھی کوئی تعذیب نہیں بلکہ تادیب کے طور پر تھا جیسا اپنے نابالغ بچوں پر زجر و تنبیہ تعذیب نہیں ہوتی تادیب ہوتی ہے تاکہ آئندہ وہ احتیاط برتیں (قرطبی) واقعہ سمجھ لینے کے بعد آیاتِ مذکورہ کے الفاظ کی تفسیر دیکھئے۔

ذَهَبَ مُغَاضِبًا، یعنی چلے گئے غصّہ میں آکر، ظاہر یہ ہے کہ مُراد اس سے اپنی قوم پر غصّہ ہے حضرت ابنِ عباس رضہ سے یہی منقول ہے اور جن حضرات نے مغاضب کا مفعول ربّ کو قرار دیا ہے اُن کی مُراد بھی مغاضباً لربّہٖ ہے یعنی اپنے رب کے لئے غصّہ میں بھر کر چلے اور کفار فجّار سے اللہ کے لئے غصّہ کرنا عین علامتِ ایمان ہے (کذا فی القرطبی و البحر المحیط)

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ، لفظ نقدر میں باعتبار لغت ایک احتمال تو یہ ہے کہ مصدر قدرت سے مشتق ہو تو معنے یہ ہونگے کہ اُنھوں نے گمان کر لیا کہ ہم اُن پر قدرت اور قابو نہ پا سکیں گے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر سے تو کیا کسی مسلمان سے بھی سرزد نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا سمجھنا کفر صریح ہے، اس لئے یہاں یہ معنے قطعاً نہیں ہو سکتے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مصدر قدر سے مشتق ہو جس کے معنے تنگی کرنے کے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ، یعنی اللہ تعالیٰ وسعت کر دیتا ہے رزق میں جس کے لئے چاہے اور تنگ کر دیتا ہے جس پر چاہے۔

ائمہ تفسیر میں سے عطاء، سعید بن جبیر، حسن بصری، اور بہت سے علماء نے یہی معنے اس آیت میں لئے ہیں اور مراد آیت کی یہ قرار دی کہ حضرت یُونس علیہ السلام کو اپنے قیاس و اجتہاد سے یہ گمان تھا کہ ان حالات میں اپنی قوم کو چھوڑ کر کہیں چلے جانے سے ہم ان پر کوئی تنگی نہیں کریں گے

اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ قَدَرٌ بمعنے تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنے قضاء اور فیصلہ دینے کے ہیں تو معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو یہ گمان ہوگیا کہ اس معاملہ میں میرے لئے کوئی دقت اور مواخذہ نہیں ہوگا۔ ائمہ تفسیر میں سے قتادہ اور مجاہد اور فرّاء نے اسی معنے کو اختیار کیا ہے۔ بہرحال پہلے معنے کا تو اس جگہ کوئی احتمال نہیں دوسرے یا تیسرے معنے ہو سکتے ہیں۔

دعاء یونس علیہ السلام ہر شخص کے لئے ہر مقصد کیلئے مقبول ہے: وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی جس طرح ہم نے یونس علیہ السلام کو غم اور مصیبت سے نجات دی اسی طرح سب مومنین کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں جبکہ وہ صدق و اخلاص کیساتھ ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہم سے پناہ مانگیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذوالنون کی وہ دعا جو انہوں نے بطن ماہی کے اندر کی تھی یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ جو مسلمان اپنے کسی مقصد کے لئے ان کلمات کیساتھ دعا کریگا اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں گے (رواہ احمد والترمذی والنسائی والحاکم من حدیث سعد بن ابی وقاص۔ از مظہری)

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور زکریا کو جب پکارا اس نے اپنے رب کو اے رب نہ چھوڑ مجھ کو اکیلا اور تو ہے سب سے بہتر وارث

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا

پھر ہم نے سن لی اس کی دعا اور بخشا اس کو یحییٰ اور اچھا کر دیا اس کی عورت کو وہ لوگ دوڑتے تھے

يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو توقع سے اور ڈر سے اور تھے ہمارے آگے عاجز

خلاصۂ تفسیر

اور زکریا علیہ السلام کے قصہ کا تذکرہ کیجئے جب کہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھ کو لاوارث نہ رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیجئے جو میرا وارث ہو) اور (یوں تو) سب وارثوں سے بہتر (یعنی حقیقی وارث) آپ ہی ہیں (اسلئے فرزند بھی وارث حقیقی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت وہ بھی فنا ہو جاویگا لیکن اس ظاہری وارث سے بعض دینی فوائد اور منافع حاصل ہو جائیں گے اسلئے اسکی طلب ہے) سو ہم نے انکی دعا قبول کرلی اور ہم نے انکو یحییٰ (فرزند) عطا فرمایا اور انکی خاطر سے ان کی بی بی کو بھی (جو بانجھ تھیں) اولاد کے قابل کر دیا یہ سب (انبیاء جنکا اس سورت میں ذکر ہوا) نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور امید و بیم کیساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے دب کر رہتے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت زکریا علیہ السلام کی خواہش تھی کہ ایک فرزند وارث عطا ہو اس کی دعا مانگی مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ کہ بیٹا ملے یا نہ ملے بہر حال تو آپ تو بہتر وارث ہیں یہ پیغمبرانہ رعایتِ ادب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اصل توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہونا چاہئے غیر اللہ کی طرف ان کی توجہ ہو بھی تو اصل مرکز سے نہ ہٹنے پاوے۔

یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا، وہ رغبت و خوف یعنی راحت و تکلیف ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی عبادت و دعا کے وقت امید و بیم دونوں کے درمیان رہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے قبول اور ثواب کی امید بھی رہتی ہے اور اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے خوف بھی (قرطبی)

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَ

اور وہ عورت جس نے قابو میں رکھی اپنی شہوت پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں اپنی روح اور کیا اسکو اور

ابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۱﴾

اسکے بیٹے کو نشانی جہان والوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر

اور ان بی بی (مریم کے قصہ) کا بھی تذکرہ کیجئے جنہوں نے اپنے ناموس کو (مردوں سے) بچایا (نکاح سے بھی اور ناجائز سے بھی) پھر ہم نے ان میں (بواسطہ جبریل علیہ السلام) اپنی روح پھونک دی (جس سے ان کو بے شوہر کے حمل رہ گیا) اور ہم نے ان کو اور ان کے فرزند (عیسیٰ علیہ السلام) کو دنیا جہان والوں کے لئے (اپنی قدرت کاملہ کی) نشانی بنا دیا (کہ ان کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ بغیر باپ کے بھی اولاد پیدا کر سکتا ہے اور بغیر ماں اور باپ کے بھی جیسا کہ آدم علیہ السلام)۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَ

یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں رب تمہارا سو میری بندگی کرو اور

تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ

ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لیا لوگوں نے آپس میں اپنا کام سب ہمارے پاس پھر آئیں گے سو جو کوئی کرے کچھ

الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

نیک کام اور وہ رکھتا ہو ایمان سو اکارت نہ کریں گے اسکی سعی کو اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا

اور مقرر ہو چکا ہر بستی پر جس کو غارت کر دیا ہم نے کہ وہ پھر کر نہیں آئیں گے یہاں تک کہ جب

فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

کھول دیے جائیں یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اونچان سے پھسلتے چلے آئیں

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ

اور نزدیک آلگے سچا وعدہ پھر اس دم اوپر لگی رہ جائیں منکروں کی آنکھیں

كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

ہائے کم بختی ہماری ہم بے خبر رہے اس سے، نہیں، پر ہم تھے گنہگار

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا

تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ایندھن ہے دوزخ کا تم کو اس پر

وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا

پہنچنا ہے اگر ہوتے یہ بت معبود تو نہ پہنچتے اس پر اور سارے اس میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ

سدا پڑے رہیں گے ان کو وہاں چلانا ہے اور وہ اس میں کچھ نہ سنیں گے جن کے

الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

لئے پہلے سے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی وہ اس سے دور رہیں گے

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

نہیں سنیں گے اس کی آہٹ اور وہ اپنے جی کے مزوں میں سدا رہیں گے

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ

نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں اور لینے آئیں گے ان کو فرشتے آج دن تمہارا ہے

الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ

جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا جس دن ہم لپیٹ لیویں آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں

لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا

کاغذ جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار، پھر اسکو دوہرائیں گے، وعدہ ضرور ہو چکا ہے ہم پر ہم کو

فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ

پورا کرنا ہے اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہوں گے

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
میرے نیک بندے

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات یہاں تک انبیاء علیہم السلام کے قصص اور واقعات اور اُن کے ضمن میں بہت سے اُصولی اور فروعی مسائل کا بیان تھا۔ اُصول مثلاً توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت، سب انبیاء علیہم السلام میں اُصول مشترک ہیں جو اُن کی دعوت کی بنیاد ہے جیسا کہ واقعاتِ مذکورہ میں ان حضرات کی سب کوششوں کا محور توحیدِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا مضمون تھا۔ اگلی آیات میں بطور نتیجۂ قصص توحید کا اثبات **اور شرک کی مذمت کا بیان ہے۔**

اے لوگو (اُوپر جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ و عقیدہ توحید کا معلوم ہو چکا ہے) یہ تمہارا طریقہ ہے (جس پر تم کو رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (جس میں کسی نبی اور کسی شریعت کو اختلاف نہیں ہوا) اور (حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمہارا رب ہوں تو تم میری عبادت کیا کرو اور (لوگوں کو چاہئے تھا کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں اسی طریقہ کی داعی ہیں تو وہ بھی اسی طریقہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) ان لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف پیدا کر لیا (مگر اس کی سزا دیکھیں گے کیونکہ) سب ہمارے پاس آنے والے ہیں (اور آنے کے بعد ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ ملیگا) تو جو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا بھی ہوگا تو اس کی محنت اکارت جانے والی نہیں اور ہم اسکو لکھ لیتے ہیں (جس میں بھول اور غلطی کا امکان نہیں رہتا اُس لکھے ہوئے کے مطابق اس کو ثواب ملیگا) اور (ہم نے جو یہ کہا ہے کہ سب کے سب ہمارے پاس آنیوالے ہیں اسمیں منکرین یہ شبہ کرتے ہیں کہ دُنیا کی اتنی عمر گزر چکی ہے اب تک تو ایسا ہوا نہیں کہ مُردے زندہ ہوئے ہوں اُن کا حساب ہوا ہو۔ اُن کا یہ شبہ اسلئے غلط ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنے کے لئے ایک دن قیامت کا مقرر ہے اُس سے پہلے کوئی نہیں لوٹتا، یہی وجہ ہے کہ) ہم جن بستیوں کو (عذاب یا موت سے) فنا کر چکے ہیں اُن کے لئے یہ بات (بامتناع شرعی) ناممکن ہے کہ وہ (دُنیا میں حساب کتاب کے لئے) پھر لوٹ کر آدیں (مگر یہ نہ لوٹنا دائمی نہیں بلکہ وقت موعود یعنی قیامت تک ہے) یہاں تک کہ جب (وہ وقت موعود آپہنچیگا جس کا ابتدائی سامان یہ ہوگا کہ) یاجوج ماجوج (جنکا اب سد ذوالقرنین کے ذریعہ راستہ رُکا ہوا ہے وہ) کھول دیئے جاویں گے اور وہ (انتہائی کثرت کے سبب) ہر بلندی (ٹیلہ اور پہاڑ) سے نکلتے (معلوم) ہونگے اور (اللہ کیطرف لوٹنے کا سچا وعدہ) نزدیک آپہنچا

ہوگا تو بس پھر یکایک یہ حالت ہو جائے گی کہ منکروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ یوں کہتے نظر آویں گے) ہائے ہماری کم بختی ہم اس سے غفلت میں تھے (پھر کچھ سوچکر کہیں گے کہ اسکو غفلت تو جب کہا جا سکتا کہ کسی نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتا) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم ہی قصور وار تھے (حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے وہ بھی اسوقت اسکے قائل ہو جاویں گے آگے مشرکین کے لئے وعید ہے) بلاشبہ تم اور جسکو تم خدا کے سوا پوج رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے (اور) تم سب اسمیں داخل ہو گے (اسمیں وہ انبیار اور فرشتے داخل نہیں ہو سکتے جن کو دنیا میں بعض مشرکین نے خدا، و معبود بنالیا تھا کیونکہ اُن میں ایک مانع شرعی موجود ہے کہ وہ اسکے مستحق نہیں اور نہ ان کا اسمیں کوئی قصور ہے آگے آیت میں اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَہُمۡ سے بھی اس شبہ کو دفع کیا گیا ہے اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر (یہ تمھارے معبود) واقعی معبود ہوتے، تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور (جانا بھی ایسا کہ چند روزہ نہیں بلکہ سب (عابدین اور معبودین) اسمیں ہمیشہ کو رہیں گے (اور) اُن کا اسمیں شور و غل ہوگا اور وہاں (اپنے شور و غل میں) کسی کی کوئی بات سُنیں گے بھی نہیں (یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا اور) جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے (اور اسکا ظہور اُن کے اعمال و افعال میں ہوا) وہ لوگ اس (دوزخ) سے (اسقدر) دور رکھے جاویں گے کہ اسکی آہٹ بھی نہ سُنیں گے (کیونکہ یہ لوگ جنت میں ہونگے اور جنت دوزخ میں بڑا بُعد ہے) اور وہ لوگ اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے (اور) ان کو بڑی گبراہٹ (یعنی قیامت میں زندہ ہونے اور محشر کے ہولناک مناظر دیکھنے کی حالت) غم میں نہ ڈالے گی اور (قبر سے نکلتے ہی) فرشتے ان کا استقبال کریں گے (اور کہیں گے) یہ ہے تمہارا وہ دن جسکا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (یہ اکرام کا معاملہ اور بشارت اُن کے لئے زیادہ خوشی و مسرت کا سبب ہو جائیگا اور اگر کسی روایت سے یہ ثابت ہو جائے کہ قیامت کے ہول اور خوف سے کوئی مستثنیٰ نہیں سب کو پیش آئیگی تو چونکہ نیک بندوں کے لئے اسکا زمانہ بہت قلیل ہوگا اسلئے وہ کالعدم ہے اور) وہ دن (بھی) یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم (نفخہ اولیٰ کے بعد) آسمانوں کو اسطرح لپیٹ دینگے جس طرح لکھے ہوئے مضامین کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے (پھر لپیٹنے کے بعد خواہ معدوم محض کر دیا جائے یا نفخہ ثانیہ تک اسی حالت پر رہے دونوں باتیں ممکن ہیں اور) ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنیکے وقت (ہر چیز کی) ابتدار کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اس کو دوبارہ پیدا کردینگے یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور (اسکو پورا) کریں گے اور (اور جو نیک بندوں سے ثواب نعمت کا وعدہ ہوا ہے وہ بہت قدیم اور مؤکد وعدہ ہے چنانچہ ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہونگے (قدامت اس

وعدہ کی تو اس سے ظاہر ہے کہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور تاکید اس بات سے کہ کوئی آسمانی کتاب اس سے خالی نہیں)

معارف و مسائل

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ، اس جگہ لفظ حرام بمعنی ممتنع شرعی کے ہے جسکا ترجمہ خلاصہ تفسیر میں ناممکن سے کیا گیا ہے اور لَا يَرْجِعُوْنَ میں اکثر حضرات مفسرین کے نزدیک حرف لا زائد ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو بستی اور اسکے آدمی ہم نے ہلاک کر دیئے ہیں انکے لئے محال ہے کہ وہ پھر لوٹ کر دنیا میں آجائیں اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ حرام کو اس جگہ بمعنی واجب قرار دیکر لا کو اپنے معروف معنی نفی کے لئے رکھا ہے اور مفہوم آیت کا یہ کہا ہے کہ واجب ہے اس بستی پر جسکو ہم نے عذاب سے ہلاک کر دیا ہے کہ وہ دنیا میں نہیں لوٹیں گے (قرطبی) آیت کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی دنیا میں آکر عمل صالح کرنا چاہے تو اسکا موقع نہیں ملیگا، اب تو صرف روز قیامت کی زندگی ہوگی

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ، لفظ حتّٰی سابق مضمون پر تفریع و ترتیب کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ آیت سابقہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ کفر پر مر چکے ہیں اُن کا دوبارہ دنیا میں زندہ ہو کر لوٹنا ناممکن ہے اس عدم امکان کی انتہا یہ بتلائی گئی کہ دوبارہ زندہ ہو کر لوٹنا ناممکن اُسوقت تک ہے جبتک کہ یہ واقعہ یاجوج ماجوج کا پیش نہ آجائے جو قیامت کی قریبی علامت ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ہم چند صحابہ ایک روز آپس میں کچھ مذاکرہ کر رہے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، دریافت فرمایا کہ کیا مذاکرہ تمھارے درمیان جاری ہے ہم نے عرض کیا کہ قیامت کا ذکر کر رہے ہیں آپ نے فرمایا کہ قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس علامتیں اُس سے پہلے ظاہر نہ ہو جائیں ان دس علامتوں میں خروج یاجوج ماجوج کا بھی ذکر فرمایا۔ آیت میں یاجوج ماجوج کے لئے لفظ فُتِحَتْ یعنی کھولنا استعمال فرمایا گیا ہے جس کے ظاہری معنے یہی ہیں کہ اسوقت سے پہلے وہ کسی بندش اور رکاوٹ میں رہیں گے قربِ قیامت کے وقت جب اللہ تعالےٰ کو اُن کا نکلنا منظور ہوگا تو یہ بندش راستے سے ہٹا دی جاویگی۔ اور ظاہر قرآن کریم سے یہ ہے کہ یہ رکاوٹ سدِّ ذوالقرنین ہے جو قربِ قیامت میں ختم ہو جاوے گی خواہ اس سے پہلے بھی وہ ٹوٹ چکی ہو مگر اُن کے لئے بالکل راستہ ہموار اُسی وقت ہوگا۔ سورۂ کہف میں یاجوج ماجوج اور سدِّ ذوالقرنین کے محلِ وقوع اور دوسرے متعلقہ مسائل پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے وہاں دیکھ لیا جاوے۔

مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ، لفظ حَدَبٍ ہر اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے وہ بڑے پہاڑ ہوں یا چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ سورۂ کہف میں جہاں یاجوج ماجوج کے محل وقوع پر گفتگو کی گئی ہے اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی جگہ دنیا کے شمالی پہاڑوں کے پیچھے ہے اس لئے خروج کے وقت اسی طرف

سے پہاڑوں ٹیلوں سے اُمنڈتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ، یعنی تم اور تمہارے معبود بجز اللہ کے سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اس آیت میں تمام معبوداتِ باطلہ جن کی ناجائز پرستش کفار کے مختلف گروہوں نے دنیا میں کی سب کا جہنم میں داخل ہونا بیان فرمایا گیا ہے اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ناجائز عبادت تو حضرت مسیحؑ اور عزیرؑ اور فرشتوں کی بھی کی گئی ہے تو سب کے جہنم میں جانے کا کیا مطلب ہوگا؟ اسکا جواب حضرت ابن عباسؓ نے دیا ہے اُن کی روایت تفسیر قرطبی میں اسطرح ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک آیت ایسی ہے جسمیں لوگ شبہات کرتے ہیں مگر عجیب اتفاق ہے کہ اسکے متعلق لوگ مجھ سے سوال نہیں کرتے، معلوم نہیں کہ شبہات کا جواب ان لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے اسلئے سوال نہیں کرتے یا انھیں شبہ اور جواب کیطرف التفات ہی نہیں ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ وہ آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ الآیۃ ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش کو سخت ناگوار ہوا اور کہنے لگے کہ اسمیں تو ہمارے معبودوں کی سخت توہین کی گئی ہے یہ لوگ (عالم اہل کتاب) ابن الزبعری کے پاس گئے اور اس کی شکایت کی اُس نے کہا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو اسکا جواب دیتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا جواب دیتے، اسنے کہا کہ میں اُن سے کہتا کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے (کیا معاذ اللہ وہ بھی جہنم میں جائیں گے) کفار قریش یہ سنکر بڑے خوش ہوئے کہ واقعی یہ بات تو ایسی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسکا کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آگے آتی ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بھلائی اور اچھا نتیجہ مقدر ہو چکا ہے وہ اس جہنم سے بہت دور رہیں گے۔

اور اسی ابن الزبعری کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ، یعنی جب ابن زبعری نے حضرت ابن مریم کی مثال پیش کی تو آپکی قوم کے لوگ قریش خوشی سے شور مچانے لگے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ فزع اکبر سے مراد صور کا نفخہ ثانیہ ہے جس سے سب مردے زندہ ہو کر حساب کے لئے کھڑے ہونگے بعض حضرات نے نفخہ اولیٰ کو فزع اکبر قرار دیا ہے۔ ابن عربی کا قول یہ ہے کہ نفخات تین ہونگے پہلا نفخہ نفخہ فزع ہوگا جس سے ساری دنیا کے لوگ گھبرا اُٹھیں گے اسی کو یہاں فزع اکبر کہا گیا ہے۔ دوسرا نفخہ نفخہ صعق ہوگا جس سے سب مر جائیں گے اور فنا ہو جائیں گے، تیسرا نفخہ نفخہ بعث ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہو جائیں گے اس کی شہادت میں مسند ابو یعلیٰ اور بیہقی، عبد بن حمید، ابو الشیخ، ابن جریر طبری

وغیرہ سے حضرت ابوہریرہ رض کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے (مظہری) واللہ اعلم۔
يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ لفظ سجل کے معنے حضرت ابن عباس رض سے صحیفہ کے منقول ہیں علی بن طلحہ۔ عوفی۔ مجاہد۔ قتادہ وغیرہ نے بھی یہی معنے بیان کئے ہیں۔ ابن جریر ابن کثیر وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور کتب اس جگہ بمعنے المکتوب ہے معنی یہ ہیں کہ آسمان کو اسطرح لپیٹ دیا جائیگا جس طرح کوئی صحیفہ اپنے اندر لکھی ہوئی تحریر کیساتھ لپیٹ دیا جاتا ہے (کذا قالہ ابن کثیر و ذکرہ فی الروح) سجل کے متعلق دوسری روایات کہ وہ کسی شخص یا فرشتہ کا نام ہے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں (فصلہ ابن کثیر) آیت کے مفہوم کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب زمینوں اور آسمانوں کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں رکھیں گے ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رض سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کو انکے اندر کی تمام مخلوقات کیساتھ اور ساتوں زمینوں کو انکی تمام مخلوقات کے ساتھ لپیٹ کر ایک جگہ کر دینگے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک رائی کے دانے کی شکل میں ہونگے (ابن کثیر)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ

لفظ زبور، زُبُر کی جمع ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں اور زبور اس خاص کتاب کا نام بھی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس جگہ زبور سے کیا مراد ہے اس میں اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ذکر سے مراد آیت میں تورات ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو تورات کے بعد نازل ہوئیں۔ انجیل۔ زبورِ داؤد۔ اور قرآن (اخرجہ ابن جریر) یہی تفسیر ضحاک سے بھی منقول ہے۔ اور ابن زید نے فرمایا کہ ذکر سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور زبور سے مراد تمام کتابیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ زجاج نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (روح المعانی)

الْأَرْضَ، اس جگہ ارض سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ارضِ جنت ہے۔ ابن جریر نے ابن عباس رض سے یہ تفسیر نقل کی ہے اور یہی تفسیر مجاہد۔ ابن جبیر۔ عکرمہ۔ سدی اور ابوالعالیہ سے بھی منقول ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ قرآن کی دوسری آیت اسی کی مؤید ہے جس میں فرمایا ہے وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ، اور آیت میں جو یہ فرمایا کہ اس ارض کے وارث صالحین ہونگے یہ بھی اسی کا قرینہ ہے کہ ارض سے ارض جنت مراد ہو۔ دُنیا کی زمین کے وارث تو مومن کافر سبھی ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں صالحین کا وارثِ ارض ہونا ذکرِ قیامت کے بعد آیا ہے اور قیامت کے بعد جنت کی زمین کے سوا کوئی دوسری زمین نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رض کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس ارض سے مُراد عام ارض ہے دُنیا کی زمین بھی اور جنت کی زمین

بھی جنت کی زمین کے تو تنہا وارث صالحین ہوں ظاہر ہے۔ دُنیا کی پوری زمین کے وارث ہونا بھی ایک وقت میں مؤمنین صالحین کے لئے موعود ہے جس کی خبر قرآن کریم کی متعدد آیات میں دی گئی ہے۔ ایک آیت میں ہے، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، ایک دوسری آیت میں ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الآیۃ تیسری ایک آیت میں اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ، مؤمنین صالحین کا دُنیا کے معظم معمورہ پر قابض اور وارث ہونا ایک مرتبہ دنیا پہلے مشاہدہ کر چکی ہے اور زمانہ دراز تک یہ صورت قائم رہی اور پھر مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہونے والی ہے (روح المعانی وابن کثیر)

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً

اس میں مطلب کو پہنچتے ہیں لوگ بندگی والے — اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر کر

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ

جہان کے لوگوں پر — تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے پھر کیا

اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ وَاِنْ

تم حکمبرداری کرنے والے — پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تو کہدے میں نے خبر کر دی تم کو دونوں طرف برابر، اور

اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ

میں نہیں جانتا نزدیک ہے یا دور ہے جو تم سے وعدہ ہوا — وہ رب جانتا ہے جو بات

مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ

پکار کر کرو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو — اور میں نہیں جانتا شاید تاخیر میں تمکو جانچنا ہے

لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا

اور فائدہ دینا ہے ایک وقت تک — رسُول نے کہا اے رب فیصلہ کر انصاف کا — اور رب ہمارا

الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

رحمٰن ہے اسی سے مدد مانگتے ہیں ان باتوں پر جو تم بتلاتے ہو

ع ۱۹ النصف

خلاصۂ تفسیر

بلا شبہ اس (قرآن یا اسکے جز یعنی سُورتِ مذکورہ) میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو عبادت کرنے والے ہیں (اور جو عبادت اور اطاعت سے سرکشی کرنے والے ہیں یہ ہدایت تو اُن کے لئے بھی ہے مگر انہیں ہدایت کی طلب نہیں، اس لئے اسکے فائدے سے محروم ہیں) اور ہم نے آپ کو کسی اور بات

کے واسطے (رسول بناکر) نہیں بھیجا مگر دُنیا جہان کے لوگوں پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے وہ اُسکا قصور ہے اُس سے اس مضمون کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا) آپ ان لوگوں سے (بطور خلاصہ کلام کے مکرر) فرما دیجئے کہ میرے پاس تو (موحدین اور مشرکین کے باہمی اختلاف کے بارے میں) صرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو (اس کی حقانیت ثابت ہوجانے کے بعد) اب بھی تم مانتے ہو (یا نہیں یعنی اب تو مان لو) پھر بھی اگر یہ لوگ (اسکے قبول کرنے سے) سرتابی کریں تو آپ (بطور اتمام حجت کے) فرما دیجئے کہ میں تم کو نہایت واضح اطلاع کرچکا ہوں (جسمیں ذرہ برابر خفاء پوشیدگی نہیں رہی توحید اور حقانیت اسلام کی اطلاع بھی اور اسکے انکار پر جو سزا ملیگی وہ بھی صاف صاف بیان ہوچکی ہے اب نہ مجھ پر تبلیغ حق کی کوئی ذمہ داری باقی رہی نہ تمہارا کوئی عذر باقی رہا، اور اگر ابھی تک نہیں تم کو اسوجہ سے شبہ ہو کہ جو سزا بتلائی گئی ہے وہ ابھی کیوں نہیں جاتی تو سمجھ لو کہ سزا کا ملنا تو یقینی ہے مگر) میں یہ نہیں جانتا کہ جس (سزا) کا تم سے وعدہ ہوا ہے آیا وہ قریب (واقع ہونیوالی ہے) یا دُور دراز (زمانے میں واقع ہونے والی) ہے (البتہ اُسکا واقع ہونا ضروری ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تمہاری) پکار کر کہی ہوئی بات کی بھی خبر ہے اور جو تم دل میں رکھتے ہو اُس کی بھی خبر ہے اور (تاخیر عذاب سے اسکے واقع نہونے کے دھوکے میں نہ رہنا یہ تاخیر کسی مصلحت و حکمت سے ہو رہی ہے) میں نہیں جانتا (کہ وہ مصلحت کیا ہے ہاں، اتنا کہہ سکتا ہوں کہ) شاید (یہ تاخیر عذاب) تمہارے لئے امتحان ہو (کہ شاید متنبہ ہوکر ایمان لے آویں) اور ایک وقت (محدود یعنی موت کے وقت) فائدہ پہنچانا ہو (کہ خوب غفلت بڑھے اور عذاب بڑھتا چلا جائے۔ پہلا معاملہ یعنی امتحان رحمت ہے اور دوسرا معاملہ یعنی عمر دراز اور اُس کی سہولتیں دینا یہ عقوبت و سزا ہے، اور جب ان سب مضامین سے ہدایت نہ ہوئی تو) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (باذنِ الٰہی) کہا کہ اے میرے رب (ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان) فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ عملی فیصلہ فرما دیجئے کہ مسلمانوں سے جو فتح و نصرت کے وعدے ہیں وہ واقع کر دیجئے تاکہ اُن پر اور زیادہ حجت تمام ہوجائے) اور (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کفار سے یہ بھی فرمایا کہ) ہمارا رب بڑا مہربان ہے جس سے اُن باتوں کے مقابلے میں مدد چاہی جائے جو تم بنایا کرتے ہو (کہ مسلمان جلد نیست و نابود ہوجاویں گے یعنی ہم اُسی مہربان رب سے تمہارے مقابلہ میں مدد چاہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ: عالمین عالم کی جمع ہے جسمیں ساری مخلوقات

انسان، جن، حیوانات، نباتات، جمادات سبھی داخل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام کائنات کی حقیقی روح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ روح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آجائیگی اور جب ذکر اللہ و عبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ اس دنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انا رحمۃ مھداۃ میں اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی رحمت ہوں۔ (اخرجہ ابن عساکر عن ابی ہریرۃ) اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا رحمۃ مھداۃ برفع قوم وخفض اخرین، یعنی میں اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت ہوں تاکہ (اللہ کے حکم ماننے والی) ایک قوم کو سربلند کردوں اور دوسری قوم (جو اللہ کا حکم ماننے والی نہیں ان کو) پست کردوں (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ کفر و شرک کو مٹانے کیلئے کفار کو پست کرنا اور ان کے مقابلے میں جہاد کرنا بھی عین رحمت ہے جس کے ذریعہ سرکشوں کو ہوش آکر ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جانے کی امید کی جا سکتی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ؏

تم تفسیر سورۃ الانبیاء وللہ الحمد لیلۃ السابع والعشرین من ذی الحجۃ الحرام سنۃ ۱۳۹۰ من الهجرۃ النبویۃ قبل العشاء وله الحمد اولاً واٰخرًا وظاهرًا وباطنًا وهو المرجو لاتمام الباقی وما ذلک علیه بعزیز

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

سُورَةُ الحَجّ

سُورَةُ الحَجِّ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّعَشْرُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ حج مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں اور دس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

لوگو ڈرو اپنے رب سے بیشک بھونچال قیامت کا ایک بڑی چیز ہے

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ

جس دن اس کو دیکھو گے بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے کو اور ڈال دے گی

كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ

ہر پیٹ والی اپنا پیٹ اور تو دیکھے لوگوں پر نشہ اور ان پر

بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

نشہ نہیں پر آفت اللہ کی سخت ہے

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو (اور ایمان و اطاعت اختیار کرو کیونکہ) یقیناً قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی (جس کا آنا ضروری ہے اُس روز کے شدائد سے بچنے کی اب فکر کرو جس کا طریقہ تقویٰ ہے آگے اس زلزلہ کی شدت کا بیان ہے) جس روز تم لوگ اس (زلزلہ) کو دیکھو گے اُس روز (یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والیاں (ہیبت و دہشت کی وجہ سے) اپنے دودھ پیتے (بچہ) کو بھول جاویں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (دن پورے ہونے سے پہلے) ڈال دیں گی اور تجھ کو (اے مخاطب) لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے (کیونکہ وہاں کسی نشہ کی چیز استعمال کرنے کا کوئی امکان و احتمال ہی نہیں) لیکن اللہ کا عذاب

ہی سخت چیز ہے (جس کے خوف کی وجہ سے اُن کی حالت نشہ والے کی سی ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

خصوصیاتِ سورت اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے حضرت ابن عباسؓ ہی سے دونوں روایتیں منقول ہیں جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ سورت آیاتِ مکیہ اور مدنیہ سے مخلوط سورت ہے۔ قرطبی نے اسی کو اصح قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا کہ اس سورت کے عجائب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی آیات کا نزول بعض کا رات میں، بعض کا دن میں، بعض کا سفر میں، بعض کا حضر میں، بعض کا مکہ میں، بعض کا مدینہ میں، بعض کا جنگ و جہاد کے وقت اور بعض کا صلح و امن کی حالت میں ہوا ہے اور اس میں بعض آیتیں ناسخ ہیں اور بعض منسوخ، بعض محکم ہیں بعض متشابہ کیونکہ تمام اصنافِ تنزیل پر مشتمل ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ، یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بحالتِ سفر نازل ہوئی تو آپ نے بلند آواز سے اس کی تلاوت شروع فرمائی۔ رفقاءِ سفر صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنکر جمع ہو گئے۔ آپ نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ زلزلہ قیامت جس کا ذکر اس آیت میں ہے آپ جانتے ہیں کہ کس دن میں ہوگا صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمادیں گے۔ کہ جہنم میں جانے والوں کو اُٹھائیے۔ آدم علیہ السلام دریافت کریں گے کہ وہ جہنم میں جانے والے کون لوگ ہیں تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں نو سو ننانوے، اور فرمایا کہ یہی وہ وقت ہوگا کہ ہول اور خوف سے بچے بوڑھے ہو جاویں گے اور حمل والی عورتوں کا حمل ساقط ہو جاویگا۔ صحابہ کرام یہ سُنکر سہم گئے اور پُوچھنے لگے پھر یا رسول اللہ ہم میں سے وہ کون ہوگا جو نجات پائے تو فرمایا کہ تم بے فکر رہو جہنم میں جانے والا یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک ہوگا۔ یہ مضمون صحیح مسلم وغیرہ کی روایات میں ابوسعید خدری رضہ سے مروی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ اُس روز تم ایسی دو مخلوقوں کے ساتھ ہو گے کہ وہ جب کسی جماعت کے ساتھ ہوں تو وہی تعداد میں غالب اور اکثر رہیں گے۔ ایک یاجوج ماجوج اور دوسرے ابلیس اور اسکی ذریت اور اولادِ آدم میں سے جو لوگ پہلے مر چکے ہیں (اسلئے نو سو ننانوے میں بڑی تعداد اُنھیں کی ہوگی) تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ سب روایات نقل کی ہیں۔

زلزلہ قیامت کب ہوگا قیامت قائم ہونے اور لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد یا اس سے پہلے، بعض نے فرمایا کہ یہ قیامت سے پہلے اسی دُنیا میں ہوگا اور قیامت کی آخری علامت میں

شمار ہوتا جس کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں آیا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا۔ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً۔ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وغیرہ۔ اور بعض حضرات نے حدیث مذکور جس میں آدم علیہ السلام کو خطاب کرنے کا ذکر ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ زلزلہ حشر و نشر اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں قیامت سے پہلے زلزلہ ہونا بھی آیاتِ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور حشر و نشر کے بعد ہونا اس حدیثِ مذکور سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

اس زلزلہ قیامت کی جو کیفیت آگے آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ تمام حمل والی عورتوں کے حمل ساقط ہو جاویں گے اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جاویں گی۔ اگر یہ زلزلہ اسی دنیا میں قبل القیامۃ ہے تو ایسا واقعہ پیش آنے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر حشر و نشر قیامت کے بعد ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ جو عورت اس دنیا میں حالتِ حمل میں مری ہے قیامت کے روز اسی حالت میں اسکا حشر ہوگا۔ اور جو دودھ پلانے کے زمانے میں مرگئی ہے وہ اسی طرح بچے کے ساتھ اٹھائی جائے گی (کما ذکرہ القرطبی۔ واللہ اعلم)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں بے خبری سے اور پیروی کرتا ہے

شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ

ہر شیطان سرکش کی جس کے حق میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اسکا رفیق ہو سو وہ اسکو بہکائے

وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ

اور لے جائے عذاب میں دوزخ کے اے لوگو اگر تم کو

رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ

دھوکا ہے جی اٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا مٹی سے پھر قطرہ سے پھر

مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ

جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی سے اور بدون نقشہ بنی ہوئی سے اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنا دیں

وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ

اور ٹھہرا رکھتے ہیں ہم پیٹ میں جو کچھ چاہیں ایک وقت معین تک پھر تم کو نکالتے ہیں

طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ

لڑکا پھر جب تک کہ پہنچو اپنی جوانی کے زور کو اور کوئی تم میں سے قبضہ کر لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے

مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَ

پھر چلایا جاتا ہے نکمی عمر تک تاکہ سمجھنے کے پیچھے کچھ نہ سمجھنے لگے اور

تَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ

تو دیکھتا ہے زمین خراب پڑی ہوئی پھر جہاں ہم نے اُتارا اُس پر پانی تازی ہوگئی اور

رَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝٥ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ

اُبھری اور اُگائیں ہر قسم قسم رونق کی چیزیں یہ سب کچھ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے

الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝٦ وَ

محقق اور وہ جلاتا ہے مُردوں کو اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے اور

أَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ۝٧

یہ کہ قیامت آنی ہے اسمیں دھوکا نہیں اور یہ کہ اللہ اُٹھائے گا قبروں میں پڑے ہووں کو

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا

اور ایسا شخص وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کی بات میں بغیر جانے اور بغیر دلیل اور بدون

كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝٨ ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۖ لَهُ فِي الدُّنْيَا

روشن کتاب کے اپنی کروٹ موڑ کر تاکہ بہکائے اللہ کی راہ سے، اُس کے لئے دُنیا میں

خِزْيٌ ۖ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝٩ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ

رُسوائی ہے اور چکھائیں گے ہم اُس کو قیامت کے دن جلن کی مار یہ اس کی وجہ سے جو آگے

يَدَاكَ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝١٠

بھیج چکے تیرے دو ہاتھ اور اس وجہ سے کہ اللہ نہیں ظلم کرتا بندوں پر

ع ۱ / ۸

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اسکی ذات یا صفات یا افعال کے متعلق) بے جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں (یعنی گمراہی کی ایسی قابلیت ہے کہ جو شیطان جس طرح بہکا دے اُسکے بہکانے میں آجاتا ہے پس اس شخص میں انتہائی درجہ کی ضلالت ہوئی کہ اس پر ہر شیطان کی دسترس ہو جاتی ہے) جس کی نسبت (خدا کے یہاں سے) یہ بات لکھی جا چکی (اور طے ہو چکی ہے) کہ جو شخص اس سے تعلق رکھیگا (یعنی اسکا اتباع کریگا) تو اسکا کام ہی یہ ہے کہ وہ اسکو (راہ حق سے) بے راہ کر دیگا اور اسکو عذاب دوزخ کا راستہ دکھلا دیگا (آگے ان مجادلین کو خطاب ہے کہ) اے لوگو اگر تم (قیامت کے روز) دوبارہ زندہ ہونے (کے امکان) سے شک میں ہو تو (ذرا مضمون

آئندہ میں غور کر لو تاکہ شک رفع ہو جاوے اور وہ یہ کہ) ہم نے (اول بار) تم کو مٹی سے بنایا (کیونکہ غذا جس سے نطفہ بنتا ہے اوّل عناصر سے پیدا ہوتی ہے جسمیں ایک جزو مٹی بھی ہے) پھر نطفہ سے (جو کہ غذا سے پیدا ہوتا ہے) پھر خون کے لوتھڑے سے (کہ نطفہ میں غلظت اور سُرخی آنے سے حاصل ہوتا ہے) پھر بوٹی سے (کہ علقہ میں سختی آجانے سے حاصل ہوتا ہے) کہ (بعضی) پوری ہوتی ہے (کہ اسمیں پورے اعضا بنجاتے ہیں) اور (بعضی) ادھوری بھی (ہوتی ہے کہ بعض اعضا ناقص رہ جاتے ہیں یہ اسطرح کی ساخت اور ترتیب اور تفاوت سے اسلئے بنایا) تاکہ ہم تمھارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کردیں (اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے) اور (تتمہ اس مضمون کا یہ ہے جس سے اور زیادہ قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ) ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین (یعنی وضع حمل کے وقت) تک ٹھہرائے رکھتے ہیں (اور جس کو ٹھہرانا نہیں چاہتے ہیں وہاں اسقاط ہو جاتا ہے) پھر (اس مدتِ معینہ کے بعد) ہم تم کو بچہ بناکر (ماں کے پیٹ سے) باہر لاتے ہیں پھر (اسکے بعد تین قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم یہ کہ تم میں سے بعض کو جوانی تک مہلت دیتے ہیں) تاکہ تم اپنی بھری جوانی (کی عمر) تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو (جوانی سے پہلے ہی) مر جاتے ہیں (یہ دوسری قسم ہوئی) اور بعضے تم میں وہ ہیں جو نکمی عمر (یعنی زیادہ بڑھاپے) تک پہنچا دیے جاتے ہیں جسکا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتے ہیں (جیسا اکثر بوڑھوں کو دیکھا کہ ابھی ایک بات بتلائی اور ابھی پھر پوچھ رہے ہیں۔ یہ تیسری قسم ہوئی یہ سب احوال بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کی نشانیاں ہیں ایک استدلال تو یہ تھا) اور (آگے دوسرا استدلال ہے کہ) اے مخاطب تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم (یعنی قسم قسم) کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے (سو یہ بھی دلیل ہے قدرت کاملہ کی آگے استدلال کو اور واضح کرنے کے لئے تصرفات مذکورہ کی علت اور حکمت کا بیان فرماتے ہیں یعنی) یہ (جو کچھ اوپر دونوں استدلالوں کے ضمن میں اشیاء مذکورہ کا ایجاد و اظہار مذکور ہوا یہ سب) اس سبب سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے (یہ تو اسکا کمالِ ذاتی ہے) اور وہ ہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے (یہ اسکا کمال فعلی ہے) اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (یہ اسکا کمالِ وصفی ہے اور یہ تینوں اُمور ملکر اُمور مذکورہ کی علت ہیں کیونکہ اگر کمالاتِ ثلاثہ میں سے ایک بھی غیر متحقق ہوتا تو ایجاد نہ پایا جاتا چنانچہ ظاہر ہے) اور (نیز اس سبب سے ہوا کہ) قیامت آنیوالی ہے اُس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ (قیامت میں) قبر والوں کو دوبارہ پیدا کریگا (یہ اُمور مذکورہ کی حکمت ہیں یعنی ہم نے وہ تصرفاتِ مذکورہ اس لئے ظاہر کئے کہ اس میں منجملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت اور غایت یہ بھی کہ ہم کو قیامت کا لانا اور مُردوں کو زندہ کرنا منظور تھا تو ان تصرفات سے اُن کا امکان لوگوں پر ظاہر ہو جاویگا پس ایجاد اشیاء مذکورہ کی تین علتیں اور دو حکمتیں مذکور ہوئیں

اور سبب بالمعنی الاعم سب کو عام ہوا اسلئے بِاَنَّ اللّٰہَ کی باءِ سببیہ سب پر داخل ہوگئی) اور (یہانتک تو مجادلین کی گمراہی اور اُس کے رد میں استدلال مذکور تھا آگے ان کا اضلال۔ یعنی دوسروں کو گمراہ کرنا۔ اور دونوں ضلال و اضلال کا وبال عظیم مذکور ہوتا ہے) بعضے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اسکی ذات یا صفات یا افعال کے مقدمہ میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلالی عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلالی نقلی) کے (اور دوسرے محقق کے اتباع وتقلید سے) تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ (دوسرے لوگوں کو بھی) اللہ کی راہ سے (یعنی دین حق سے) بے راہ کردیں ایسے شخص کے لئے دنیا میں رسوائی ہے (خواہ کسی قسم کی رسوائی ہو چنانچہ بعضے مرۃً قتل وقید وغیرہ سے ذلیل ہوتے ہیں بعضے مناظرۂ اہل حق میں مغلوب ہو کر عقلا کی نظر میں بے عزت ہوتے ہیں) اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھادیں گے (اور اُس سے کہا جاویگا) کہ یہ تیرے ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (پس تجھ کو بلا جرم سزا نہیں دی گئی)۔

معارف ومسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ، یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جو بڑا جھگڑالو تھا، فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں اور قرآن کو پچھلے لوگوں کے افسانے کہا کرتا تھا اور قیامت اور دوبارہ زندہ ہونیکا منکر تھا (کذا رواہ ابن ابی حاتم عن ابی مالک۔ مظہری)

نزول آیت کا اگرچہ ایک خاص شخص کے بارے میں ہوا مگر حکم اس کا سب کے لئے عام ہے جن میں اس طرح کی بُری خصلتیں پائی جائیں۔

بطنِ مادر میں تخلیق انسانی کے درجات اور مختلف احوال

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ، اس آیت میں بطن مادر کے اندر انسان کی تخلیق کے مختلف درجات کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور وہ سچ بولنے والے اور سچے سمجھے جانیوالے ہیں کہ انسان کا مادہ چالیس روز تک رحم میں جمع رہتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ یعنی منجمد خون بن جاتا ہے پھر چالیس ہی دن میں وہ مضغہ یعنی گوشت بن جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کیطرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اسمیں روح پھونک دیتا ہے اور اُس کے متعلق چار باتیں اسی وقت فرشتہ کو لکھوا دی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کی عمر کتنی ہے، دوسرے رزق کتنا ہے، تیسرے عمل کیا کیا کریگا، چوتھے یہ کہ انجام کار یہ شقی اور بدبخت ہوگا یا سعید خوش نصیب (قرطبی)

دوسری ایک روایت میں جس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی سے روایت کیا ہے اسمیں یہ بھی ہے کہ نطفہ جب کئی دور سے گزرنے کے بعد مضغہ گوشت بنجاتا ہے تو اسوقت وہ فرشتہ جو ہر انسان کی تخلیق پر مامور ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرتا ہے یَارَبِّ مُخَلَّقَةٌ اوغیر مخلقۃ (یعنی اس مضغہ سے انسان کا پیدا کرنا آپ کے نزدیک مقدر ہے یا نہیں) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ یہ غیر مخلقہ ہے تو رحم اسکو ساقط کر دیتا ہے تخلیق کے دوسرے مراتب تک نہیں پہنچتا اور اگر حکم ہوتا کہ یہ مخلقہ ہے تو پھر فرشتہ سوال کرتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، اور شقی ہے یا سعید اور اس کی عمر کیا ہے اور اس کا عمل کیسا ہے اور کہاں مریگا (یہ سب چیزیں اُسی وقت فرشتہ کو بتلادی جاتی ہیں (ابن کثیر) مخلقہ و غیر مخلقہ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی منقول ہے (قرطبی)

مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ، حدیث مذکور سے ان دونوں کی تفسیر یہ معلوم ہوئی کہ جس نطفہ انسانی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا ہے وہ مخلقہ ہے اور جسکا ضائع اور ساقط ہوجانا مقدر ہے وہ غیر مخلقہ ہے اور بعض حضرات مفسرین مخلقہ اور غیر مخلقہ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جس بچے کی تخلیق مکمل اور تمام اعضاء صحیح سالم اور متناسب ہوں وہ مخلقہ اور جس کے بعض اعضاء ناقص ہوں یا قد اور رنگ وغیرہ غیر متناسب ہو وہ غیر مخلقہ ہے خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی تفسیر کو لیا گیا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا، یعنی پھر بطنِ مادر سے تم کو نکالتے ہیں بشکل ضعیف کی صورت میں اُس کا بدن بھی کمزور ہوتا ہے سماعت و بصارت بھی۔ حواس و عقل بھی، حرکت و گرفت کی قوت بھی غرضیکہ سب قوتیں انتہائی ضعیف و کمزور ہوتی ہیں پھر تدریجاً اُن میں ترقی دی جاتی ہے یہاں تک کہ پوری قوت تک پہنچ جاتے ہیں ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ کے یہی معنے ہیں۔ لفظ اَشد، شدۃ کی جمع ہے جیسے اَنعُم نعمۃ کی جمع آتی ہے معنے یہ ہوئے کہ تدریجی ترقی کا سلسلہ اسوقت تک چلتا رہتا ہے جبتک کہ تمہاری ہر قوت مکمل نہ ہوجائے جو جوانی کے وقت میں ہوتی ہے۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، یعنی وہ عمر جس میں انسان کے عقل و شعور اور حواس میں خلل آنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عمر سے پناہ مانگی ہے۔ نسائی میں بروایت سعد رضؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسب ذیل الفاظ پر مشتمل یہ دُعا بکثرت مانگتے تھے اور راوی حدیث حضرت سعدؓ یہ دُعا اپنی سب اولاد کو یاد کرادیتے تھے وہ دُعا یہ ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (قرطبی)

انسان کی ابتدائی تخلیق کے بعد عمر کے مختلف مدارج اور انکے احوال

مسند احمد اور مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ جب تک بالغ نہیں ہوتا اسکے نیک عمل اسکے والد یا والدین کے حساب میں لکھے جاتے ہیں اور جو کوئی بُرا عمل کرے تو وہ نہ اسکے حساب

میں لکھا جاتا ہے نہ والدین کے، پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو قلم حساب اسکے لئے جاری ہو جاتا ہے اور دو فرشتے جو اسکے ساتھ رہنے والے ہیں ان کو حکم دیدیا جاتا ہے کہ اسکی حفاظت کریں اور قوت بہم پہنچائیں جب حالتِ اسلام میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو (تین قسم کی بیماریوں سے) محفوظ کر دیتے ہیں یعنی جنون اور جذام اور برص سے۔ جب پچاس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکا حساب ہلکا کر دیتے ہیں۔ جب ساٹھ سال کو پہنچتا ہے تو اللہ اسکو اپنی طرف رجوع کی توفیق دیدیتے ہیں۔ جب ستر سال کو پہنچتا ہے تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے حسنات کو لکھتے ہیں اور سیئات کو معاف فرما دیتے ہیں پھر جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسکے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہل بیت کے معاملے میں شفاعت کرنے کا حق دیتے ہیں اور اسکی شفاعت قبول فرماتے ہیں اور اسکا لقب امین اللہ اور اسیر اللہ فی الارض (یعنی زمین میں اللہ کا قیدی) ہو جاتا ہے (کیونکہ اس عمر میں پہنچکر عموماً انسان کی قوت ختم ہو جاتی ہے کسی چیز میں لذت نہیں رہتی، قیدی کی طرح عمر گزارتا ہے اور جب ارذل عمر کو پہنچ جائے تو اسکے تمام وہ نیک عمل نامۂ اعمال میں برابر لکھے جاتے ہیں جو اپنی صحت و قوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا اور اگر اس سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ لکھا نہیں جاتا۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے مسند ابو یعلیٰ سے نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے ھذا حدیث غریب جدا و فیہ نکارۃ شدیدۃ (یعنی یہ حدیث غریب ہے اور اسمیں سخت نکارت ہے) پھر فرمایا ومع ھذا فقد رواہ الامام احمد بن حنبل فی مسندہ موقوفاً و مرفوعاً (یعنی اس غرابت و نکارت کے باوجود امام احمد نے اپنی مسند میں اسکو موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح روایت کیا ہے پھر ابن کثیر نے مسند احمد سے یہ دونوں قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جنکا مضمون تقریباً وہی ہے جو بحوالہ مسند ابو یعلیٰ اوپر نقل ہوا ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

ثَانِیَ عِطْفِہٖ، عطف کے معنے جانب اور کروٹ کے ہیں یعنی کروٹ موڑنے والا۔ اس سے مراد اسکا اعراض کرنا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ ۨ اطْمَاَنَّ

اور بعضا شخص وہ ہے کہ بندگی کرتا ہے اللہ کی کنارے پر پھر اگر پہنچی اس کو بھلائی تو قائم ہوگیا اس عبادت

بِہٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْہِہٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ

پر اور اگر پہنچ گئی اس کو جانچ پھر گیا الٹا اپنے منہ پر گنوائی دنیا اور آخرت،

ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۱﴾ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہٗ

یہی ہے ٹوٹا صریح پکارتا ہے اللہ کے سوائے ایسی چیز کو کہ نہ اسکا نقصان کرے

وَمَا لَا يَنْفَعُهُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ

اور نہ اسکا فائدہ کرے یہی ہے دُور جا پڑنا گمراہ ہو کر پکارے جاتا ہے اسکو جس کا ضرر

اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

پہلے پہنچے نفع سے بیشک بُرا دوست ہے اور بُرا رفیق

خلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کوئی کسی چیز کے) کنارہ پر (کھڑا ہو اور موقع پاکر چلدینے پر تیار ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دُنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا اور اگر اُس پر کچھ آزمائش ہوگئی تو منھ اُٹھاکر (کفر کیطرف) چلدیا (جس سے) دُنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا یہی ہے کھلا نقصان (دُنیا کا نقصان تو دُنیا دی آزمائش جو کسی مصیبت سے ہوتی وہ ظاہر ہی ہے اور آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ اسلام اور) خدا کو چھوڑ کر اُسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو (اسقدر عاجز اور بے بس ہے کہ) نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے (یعنی اگر اسکی عبادت نہ کرو تو کوئی نقصان پہنچانے کی اور کرو تو نفع پہنچانے کی کوئی قدرت نہیں۔ ظاہر ہے کہ قادرِ مطلق کو چھوڑ کر ایسی بے بس چیز کو اختیار کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے) یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے (صرف یہی نہیں کہ اس کی عبادت سے کوئی نفع نہ پہنچے بلکہ اُلٹا ضرر اور نقصان ہے کیونکہ) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اسکا ضرر اسکے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ ایسا کارساز بھی بُرا اور ایسا رفیق بھی بُرا (جو کسی طرح کسی حال کسی کے کام نہ آوے کہ اسکو مولیٰ اور آقا بنادیا دوست اور ساتھی بنالو کسی حال اُس سے کچھ نفع نہیں)۔

معارف و مسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ، بخاری اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں مقیم ہوگئے تو بعض ایسے لوگ بھی آکر مسلمان ہو جاتے تھے (جن کے دل میں ایمان کی پختگی نہیں تھی) اگر اسلام لانیکے بعد اسکی اولاد اور مال میں ترقی ہوگئی تو کہتا تھا کہ یہ دین اچھا ہے اور اگر اسکے خلاف ہوا تو کہتا تھا کہ یہ بُرا دین ہے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ایک کنارہ پر کھڑے ہیں۔ اگر ان کو ایمان کے بعد دنیوی راحت اور مال و سامان مِل گیا تو اسلام پر جم گئے اور اگر وہ بطور آزمائش کسی تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہوگئے تو دین سے پھر گئے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
اللہ داخل کرے گا اُن کو جو ایمان لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ
نیچے اُن کے نہریں اللہ کرتا ہے جو چاہے جس کو یہ خیال ہو کہ
لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ
ہرگز نہ مدد کریگا اُس کی اللہ دُنیا میں اور آخرت میں تو تان لے ایک رسّی آسمان کو
ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ
پھر کاٹ ڈالے اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی اس تدبیر سے اس کا غصہ اور یوں اُتارا
اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾
ہم نے یہ قرآن کھلی باتیں اور یہ ہے کہ اللہ سمجھا دیتا ہے جس کو چاہے

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی (اور اللہ جس شخص یا قوم کو کوئی ثواب یا عذاب دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ (قادر مطلق ہے) جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے (اور جن لوگوں کے دینِ حق میں مجادلہ کرنے کا ذکر آیا ہے اگلی آیت میں اُن کی ناکامی اور محرومی کا بیان ہے، فرمایا) جو شخص (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت کرکے) اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ (میں غالب آجاؤں گا اور آپکے دین کی ترقی کو روک دونگا اور یہ کہ) اللہ تعالیٰ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم کی) اور آپکے دین کی) دُنیا و آخرت میں مدد نہ کریگا تو اسکو چاہیئے کہ ایک رسّی آسمان تک تان لے (اور آسمان سے باندھ دے) پھر (اس رسّی کے ذریعہ اگر آسمان پر پہنچ سکے تو پہنچ جائے تاکہ) اس وحی کو موقوف کرادے (اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا) تو پھر غور کرنا چاہیئے آیا اس کی (یہ) تدبیر (جس سے بالکل عاجز ہے) اس کے غیظ و غضب کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کر سکتی ہے اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح اُتارا ہے (کہ اسمیں ہمارے ارادے اور قدرت کے سوا کسی کا دخل نہیں) جس میں کھلی کھلی دلیلیں (تعیینِ حق کی) ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

معارف و مسائل

مَنْ كَانَ يَظُنُّ، حاصل یہ ہے کہ اسلام کا راستہ روکنے والے معاند جو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

اپنے رسول اور اُسکے دین کی مدد نہ کرے اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ تو جبھی ہو سکتا ہے جبکہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منصبِ نبوت سلب ہو جائے اور آپ پر وحی آنا منقطع ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت و رسالت سپرد فرماتا ہے اور اسکو وحیِ الٰہی سے نوازتا ہے اُسکی مدد تو دنیا و آخرت میں کرنے کا اُس کیطرف سے پختہ عہد ہے اور عقلاً بھی اسکے خلاف نہ ہونا چاہیئے تو جو شخص آپ کی اور آپ کے دین کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے اُسکو، اگر اسکے قبضہ میں ہو تو ایسی تدبیر کرنا چاہیئے کہ یہ منصبِ نبوت سلب ہو جائے اور وحی الٰہی منقطع ہو جائے۔ اس مضمون کو ایک فرضِ محال کے عنوان سے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے وحی کو منقطع کرنیکا کام کرنا چاہتا ہے تو کسی طرح آسمان پر پہنچے وہاں جاکر اس سلسلہ وحی کو ختم کردے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ کسی کا اسطرح آسمان پر جانا ممکن نہ اللہ تعالےٰ سے قطع وحی کو کہنا ممکن تو پھر جب تدبیر کوئی کارگر نہیں تو اسلام و ایمان کے خلاف غیظ و غضب کا کیا نتیجہ؟ یہ تفسیر بعینہٖ دُرِّ منثور میں ابن زید سے روایت کی ہے اور میرے نزدیک سب سے بہتر اور صاف تفسیر ہے (بیان القرآن مع تسہیل)

قرطبی نے اسی تفسیر کو ابو جعفر نحاس سے نقل کرکے فرمایا کہ یہ سب سے احسن تفسیر ہے اور حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی اس تفسیر کو نقل کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ سماء سے مراد اپنے مکان کی چھت ہے اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ اگر کسی معاند جاہل کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اسکے دین کی مدد نہ کرے اور وہ اسلام کے خلاف غیظ و غضب لئے پھرتے ہے تو سمجھ لے کہ اسکی یہ مُراد تو کبھی پوری نہ ہوگی اس احمق نہ غیظ و غضب کا تو علاج یہی ہے کہ چھت میں رسّی ڈال کر پھانسی لیلے اور مر جائے۔ (مظہری وغیرہ)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَ
جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ اور

الْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ
مجوس اور جو شرک کرتے ہیں مقرر اللہ فیصلہ کریگا ان میں قیامت

الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۱۷﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ
کے دن اللہ کے سامنے ہے ہر چیز تونے نہیں دیکھا کہ اللہ کو

يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند

وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ
اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت آدمی

وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ ۚ
اور بہت ہیں کہ اُن پر ٹھہر چکا عذاب اور جس کو اللہ ذلیل کرے اُسے کوئی نہیں عزت دینے والا

إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۩ ﴿۱۸﴾
اللہ کرتا ہے جو چاہے

خلاصۂ تفسیر

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور مشرکین، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان میں قیامت کے روز (عملی) فیصلہ کردیگا (کہ مسلمانوں کو جنت میں اور سب اقسام کافروں کو جہنم میں داخل کریگا) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔

اے مخاطب کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے (اپنی اپنی حالت کے مناسب) سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور (تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے باوجود انسان جو خاص درجہ کی عقل بھی رکھتا ہے وہ سب کے سب مطیع و فرمانبردار نہیں بلکہ) بہت سے (تو) آدمی بھی (اطاعت اور عاجزی کرتے ہیں) اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب کا استحقاق ثابت ہوگیا ہے اور (سچ یہ ہے کہ) جس کو خدا ذلیل کرے (کہ اُسکو ہدایت کی توفیق نہ ہو) اُس کا کوئی عزت دینے والا نہیں (اور) اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے اپنی حکمت سے) جو چاہے کرے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں تمام اقوامِ عالم مؤمنین اور کفار پھر کفار کے مختلف العقائد گروہوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کا فیصلہ فرما دینگے اور وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے باخبر ہیں۔ فیصلہ کیا ہوگا اسکا ذکر بار بار قرآن میں آچکا ہے کہ مؤمنین صالحین کے لئے ابدی اور لازوال راحت ہے اور کفار کے لئے دائمی عذاب۔ دوسری آیت میں تمام مخلوقات خواہ زندہ ذی روح ہوں یا جمادات و نباتات سب کا حق تعالیٰ کے لئے مطیع اور فرمانبردار ہونا بعنوان سجدہ بیان فرما کر بنی نوع انسان کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مطیع و فرمانبردار سجدہ میں سب کے ساتھ شریک اور دوسرا سرکش باغی سجدہ سے منحرف۔ اور تابع فرمان ہونے کو سجدہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے جسکا ترجمہ خلاصۂ تفسیر میں عاجزی کرنے سے کیا ہے تاکہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر قسم کے سجدہ کو شامل ہو جائے کیونکہ انمیں سے ہر ایک کا سجدہ اُسکے مناسب حال ہوتا ہے انسان کا سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے دوسری مخلوقات

کا سجدہ اپنی اپنی خدمت جس کے لئے اُن کو پیدا کیا گیا ہے اسکو انجام دینے کا اور خدمت کا حق ادا کرنے کا نام ہے

تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کی حقیقت

تمام کائنات و مخلوقات کا اپنے خالق کے زیر حکم اور تابع مشیت ہونا ایک تو تکوینی اور تقدیری طور پر غیر اختیاری ہے جس سے کوئی بھی مخلوق مؤمن یا کافر زندہ یا مُردہ، جمادات یا نباتات مستثنیٰ نہیں اس حیثیت میں سب کے سب یکساں طور پر حق تعالےٰ کے زیر حکم و مشیت ہیں۔ جہان کا کوئی ذرہ یا پہاڑ اُس کے اذن و مشیت کے بغیر کوئی ادنیٰ حرکت نہیں کر سکتا دوسری اطاعت و فرمانبرداری اختیاری ہے کہ کوئی مخلوق اپنے قصد و اختیار سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے اسمیں مؤمن و کافر کا فرق ہوتا ہے کہ مؤمن اطاعت شعار فرمانبردار ہوتا ہے کافر اس سے منحرف اور منکر ہوتا ہے۔ اس آیت میں چونکہ مؤمن و کافر کا فرق بیان فرمایا ہے یہ قرینہ اسکا ہے کہ اسمیں سجدہ اور فرمانبرداری سے مُراد صرف تکوینی و تقدیری اطاعت نہیں بلکہ اختیاری اور ارادی اطاعت ہے۔ اسمیں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اختیاری اور ارادی اطاعت تو صرف ذوی العقول انسان اور جن وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات میں عقل و شعور ہی نہیں تو پھر قصد و ارادہ کہاں اور اطاعت اختیاری کیسی؟ کیونکہ قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقل و شعور اور قصد و ارادہ سے کوئی بھی مخلوق خالی نہیں، کمی بیشی کا فرق ہے۔ انسان اور جن کو اللہ تعالےٰ نے عقل و شعور کا ایک کامل درجہ عطا فرمایا ہے اور اسی لئے ان کو احکام امر و نہی کا مکلف بنایا گیا ہے ان کے سوا باقی مخلوقات میں سے ہر نوع اور ہر صنف کو اس صنف کی ضروریات کے موافق عقل و شعور دیا گیا، انسان کے بعد سب سے زیادہ یہ عقل و شعور حیوانات میں ہے اسکے دوسرے نمبر میں نباتات ہیں، تیسرے میں جمادات ہیں۔ حیوانات کا عقل و شعور تو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے نباتات کا عقل و شعور بھی ذرا سا غور و تحقیق کرنے والا پہچان لیتا ہے لیکن جمادات کا عقل و شعور اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام انسان اس کو نہیں پہچان سکتے۔ مگر اُن کے خالق و مالک نے خبر دی ہے کہ وہ بھی عقل و شعور اور قصد و ارادے کے مالک ہیں۔ قرآن کریم نے آسمان و زمین کے بارے میں فرمایا ہے قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ تم کو ہمارے تابع فرمان رہنا ہے اپنی خوشی سے فرمانبرداری اختیار کرو ورنہ جبراً اور حکماً تابع رہنا ہی ہے تو آسمان و زمین نے عرض کیا کہ ہم اپنے ارادے اور خوشی سے اطاعت و فرمانبرداری قبول کرتے ہیں اور دوسری جگہ پہاڑ کے پتھروں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، یعنی بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خشیت و خوف کے مارے اوپر سے نیچے لڑھک جاتے ہیں۔ اسی طرح احادیث کثیرہ میں پہاڑوں کی باہم گفتگو اور دوسری مخلوقات میں عقل و شعور کی شہادتیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس لئے اس آیت میں جس اطاعت و فرمانبرداری کو سجدہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

اِس سے اطاعتِ اختیاری وارادی مُراد ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ نوعِ انسان کے علاوہ (جن کے ضمن میں جنات بھی داخل ہیں) باقی تمام مخلوقات اپنے قصد و اختیار سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز یعنی تابع فرمان ہیں صرف انسان اور جن ایسے ہیں جنہیں دو حصے ہوگئے ایک مومن و مطیع سجدہ گزار دوسرے کافر و نافرمان سجدہ سے منحرف جن کو اللہ نے ذلیل کر دیا ہے کہ انکو سجدہ کی توفیق نہیں بخشی واللہ اعلم

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ

یہ دو مدعی ہیں جھگڑے ہیں اپنے رب پر سو جو منکر ہوئے اُن کے واسطے بیونتے ہیں

ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ

کپڑے آگ کے ڈالتے ہیں اُن کے سر پر جلتا پانی گل کر نکل جاتا ہے

بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾

اس سے جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے اور کھال بھی اور اُن کے واسطے ہتھوڑے ہیں لوہے کے

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا

جب چاہیں کہ نکل پڑیں دوزخ سے گھٹنے کے مارے پھر ڈال دیئے جائیں اسکے اندر اور چکھتے رہو

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

جلنے کا عذاب بیشک اللہ داخل کرے گا اُن کو جو یقین لائے اور کیں

ع ۲ ۱۲ ۹

الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں اُن کے نیچے نہریں گہنا پہنائیں گے اُن کو وہاں کنگن

مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ

سونے کے اور موتی اور اُن کی پوشاک ہے وہاں ریشم کی اور راہ پائی اُنھوں نے

مِنَ الْقَوْلِ ښ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿٢٤﴾

ستھری بات کی اور پائی اس تعریفوں والے کی راہ

خلاصۂ تفسیر

(جن کا ذکر اوپر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ہوا ہے) یہ دو فریق ہیں (ایک مومن دوسرا کافر۔ پھر کافر گروہ کی کئی قسمیں ہیں۔ یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور بُت پرست) جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں (اعتقاداً اور کبھی کبھی مباحثۃً بھی) باہم اختلاف کیا (اس اختلاف کا فیصلہ قیامت میں اس طرح ہوگا کہ) جو لوگ کافر تھے اُن کے (پہننے کے لئے) آگ کے کپڑے قطع کئے

جاویں گے (یعنی آگ اُن کے پُورے بدن پر اسطرح محیط ہوگی جیسے لباس) اور اُن کے سر کے اُوپر سے
تیز گرم پانی چھوڑا جاویگا جس سے اُن کے پیٹ کی چیزیں (یعنی آنتیں) اور کھالیں سب گل جاویں گی،
(یعنی یہ کھولتا ہوا تیز پانی کچھ پیٹ کے اندر چلا جاویگا جس سے آنتیں اور پیٹ کے اندر کے سب اجزاء و
اعضاء گل جاویں گے کچھ اوپر بہے گا جس سے کھال گل جاوے گی) اور ان کے (مارنے کے لئے) لوہے کے
گُرز ہونگے (اور اس مصیبت سے کبھی نجات نہ ہوگی) وہ لوگ جب (دوزخ میں) گھٹے گھٹے (گھبرا جاوینگے
اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جاویں گے اور کہا جاویگا کہ جلنے کا عذاب
(ہمیشہ کے لئے) چکھتے رہو (کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا اور) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور
انھوں نے نیک کام کئے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جس کے نیچے نہریں جاری ہونگی
اُن کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جاویں گے اور پوشاک اُن کی وہاں ریشم ہوگی اور (یہ سب
انعام و اکرام ان کے لئے اس سبب سے ہے کہ دُنیا میں اُن کو) کلمہ طیب (کے اعتقاد) کی ہدایت ہوگئی
تھی اور اُن کو اس (خدا) کے رستہ کی ہدایت ہوگئی تھی جو لائق حمد ہے (وہ راستہ اسلام ہے)۔

معارف و مسائل

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا، یہ دو فریق جن کا ذکر اس آیت میں ہے عام مؤمنین اور اُن کے مقابلہ میں تمام گروہِ کفار ہیں خواہ قرنِ اول کے ہوں یا قرون مابعد کے۔ البتہ نزول اس آیت کا اُن دو فریق کے بارے میں ہوا ہے جو میدان بدر کے مبارزہ میں ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوئے تھے مسلمانوں میں سے حضرت علی و حمزہ و عبیدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور کفار میں سے عتبہ بن ربیعہ اور اسکا بیٹا ولید اور اسکا بھائی شیبہ تھے جنمیں سے کفار تو تینوں مارے گئے اور مسلمانوں میں سے حضرت علیؓ و حمزہؓ صحیح سالم واپس آئے اور عبیدہؓ شدید زخمی ہو کر آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچکر دم توڑ دیا۔ آیت کا نزول ان مبارزین بدر کے بارے میں ہونا بخاری و مسلم کی احادیث سے ثابت ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم ان کیساتھ مخصوص نہیں پوری اُمت کیلئے عام ہے، کسی بھی زمانے میں ہو۔

اہلِ جنت کو کنگن پہنائے جانے کی حکمت

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ کنگن ہاتھوں میں پہننا عورتوں کا کام اور انھیں کا زیور ہے۔ مردوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے جواب یہ ہے کہ دُنیا کے بادشاہوں کی امتیازی شان رہی ہے کہ سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن استعمال کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن مالک کو جبکہ وہ مسلمان نہیں تھے اور سفر ہجرت میں آپ کو گرفتار کرنے کے لئے تعاقب میں نکلے تھے، جب اُن کا گھوڑا باذنِ خداوندی زمین میں دھنس گیا اور اُنہوں نے توبہ کی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے گھوڑا نکل گیا اسوقت سراقہ بن مالکؓ سے وعدہ فرمایا تھا کہ کسریٰ شاہ فارس

کے کنگن مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے وہ تجھیں دیئے جائیں گے اور جب فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں فارس کا ملک فتح ہوا اور ایران کے یہ کنگن دوسرے اموالِ غنیمت کیساتھ آئے تو سراقہ بن مالکؓ نے مطالبہ کیا اور اُن کو دیدیئے گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جیسے سر پر تاج پہننا عام مردوں کا رواج نہیں، شاہی اعزاز ہے اسی طرح ہاتھوں میں کنگن بھی شاہی اعزاز سمجھے جاتے ہیں اسلئے اہلِ جنت کو کنگن پہنائے جائیں گے۔ کنگن کے متعلق اس آیت میں اور سورہ فاطر میں تو یہ ہے کہ وہ سونے کے ہوں گے اور سُورۂ دھر میں یہ کنگن چاندی کے بتلائے گئے ہیں اس لئے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اہلِ جنت کے ہاتھوں میں تین طرح کے کنگن پہنائے جائیں گے ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا تیسرا موتیوں کا جیسا کہ اس آیت میں موتیوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ (قرطبی)

ریشم کے کپڑے مَردوں کے لئے حرام ہیں آیت مذکورہ میں ہے کہ اہلِ جنت کا لباس ریشم کا ہوگا مُراد یہ ہے کہ اُن کے تمام ملبوسات اور فرش اور پردے وغیرہ ریشم کے ہونگے جو دنیا میں سب سے زیادہ بہتر لباس سمجھا جاتا ہے اور جنت کا ریشم ظاہر ہے کہ دُنیا کے ریشم سے صرف نام کی شرکت رکھتا ہے، ورنہ اُس کی عمدگی اور بہتری کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔

امام نسائی اور بزار اور بیہقی نے بسندِ جید حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت کا ریشمی لباس جنت کے پھلوں میں سے نکلے گا اور حضرت جابرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہوگا جس سے ریشم پیدا ہوگا اہلِ جنت کا لباس اُسی سے تیار ہوگا (مظہری)

حدیث میں امام نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لبس الحرير في الدنيا لم يلبسه في الآخرة ومن شرب الخمر في الدنيا لم يشربها في الآخرة ومن شرب في آنية الذهب والفضة لم يشرب فيها في الآخرة ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لباس اهل الجنة وشراب اهل الجنة وآنية اهل الجنة	جو شخص ریشمی کپڑا دُنیا میں پہنے گا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اور جو دُنیا میں شراب پیئے گا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا اور جو دُنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں (کھائے) پیئے گا وہ آخرت میں سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھائیگا۔ پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تینوں چیزیں اہلِ جنت کے لئے مخصوص ہیں۔

(از قرطبی بحوالہ نسائی)

مراد یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں یہ کام کیے اور توبہ نہیں کی وہ جنت کی ان تین چیزوں سے محروم رہے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دُنیا میں شراب پی، پھر اُس سے توبہ نہیں کی

وہ آخرت میں جنت کی شراب سے محروم رہے گا (رواہ الائمہ۔ قرطبی) نیز ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسہ فی الاٰخرۃ وان دخل الجنۃ لبسہ اھل الجنۃ ولم یلبسہ ھو رواہ ابوداؤد الطیالسی فی مسندہ وقال القرطبی اسنادہ صحیح۔

جس شخص نے دُنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے دوسرے اہل جنت ریشم پہنیں گے یہ نہیں پہن سکے گا۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص جنت میں داخل کر لیا گیا پھر اگر وہ کسی چیز سے محروم کیا گیا تو اسکو حسرت و افسوس رہے گا اور جنت اس کی جگہ نہیں۔ وہاں کسی شخص کو کسی کا غم و افسوس نہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ حسرت و افسوس نہ ہو تو پھر اس محرومی کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اسکا جواب قرطبی نے اچھا دیا ہے کہ اہل جنت کے جس طرح مقامات اور درجات مختلف اور متفاوت اعلیٰ و ادنیٰ ہوں گے۔ اُن کے تفاوت کا احساس بھی سب کو ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہٗ اہل جنت کے قلوب ایسے بنادیگا کہ اُن میں حسرت و افسوس کسی چیز کا نہ رہے گا واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ، حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا قرآن مراد ہے (قرطبی) صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اسمیں داخل ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے

الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ

جو ہم نے بنائی سب لوگوں کے واسطے برابر ہے اسمیں رہنے والا اور باہر سے آنے والا اور جو اُس میں

فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے اُسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور (مسلمانوں کو) اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں (تاکہ مسلمان عمرہ ادا نہ کرسکیں حالانکہ حرم کی حیثیت یہ ہے کہ اسمیں کسی کی خصوصیت نہیں بلکہ) اس کو ہم نے تمام آدمیوں کے واسطے مقرر کیا ہے کہ اسمیں سب برابر ہیں اس (حرم کے داخل حدود) میں رہنے والا بھی (یعنی جو لوگ وہاں مقیم ہیں) اور باہر سے آنیوالا (مسافر) بھی

اور جو کوئی اس میں (یعنی حرم شریف میں) ظلم کے ساتھ کوئی بے دینی کا کام کرنے کا ارادہ کریگا تو ہم اُس شخص کو عذاب دردناک چکھادیں گے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مؤمنین اور کفار کے دو فریق کی باہمی مخاصمت کا ذکر تھا اسی مخاصمت کی ایک خاص صورت اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ ان میں بعض ایسے کفار بھی ہیں جو خود گمراہی پر جمے ہوئے ہیں دوسروں کو بھی اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کو جبکہ وہ عمرہ کا احرام باندھ کر حرم شریف میں داخل ہونا چاہتے تھے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکدیا حالانکہ مسجد حرام اور حرم شریف کا وہ حصہ جس سے لوگوں کی عبادت عمرہ و حج کا تعلق ہے ان کی ملک میں داخل نہیں تھا جس کی بنا پر اُن کو مزاحمت اور مداخلت کا کوئی حق پہنچتا، بلکہ وہ سب لوگوں کے لئے یکساں ہے جہاں باشندگان حرم اور باہر کے مسافر اور شہری اور پردیسی سب برابر ہیں۔ آگے اُن کی سزا کا ذکر ہے کہ جو شخص مسجد حرام (یعنی پورے حرم شریف) میں کوئی بے دینی کا کام کرے گا جیسے لوگوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنا یا دوسرا کوئی خلافِ دین کام کرنا، اسکو عذاب دردناک چکھایا جائے گا خصوصاً جبکہ اس بے دینی کے کام کے ساتھ ظلم یعنی شرک بھی ملا ہوا ہو جیسا کہ مشرکین مکہ کا حال تھا جنھوں نے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکا کہ ان کا یہ عمل بھی خلافِ دین نارواتھا پھر اس کے ساتھ وہ کفر و شرک میں بھی مبتلا تھے۔ اور اگرچہ ہر خلاف دین کام خصوصاً شرک کفر ہر جگہ ہر زمانے میں حرام اور انتہائی جرم و گناہ اور موجبِ عذاب ہے مگر جو ایسے کام حرم محترم کے اندر کرے اُس کا جرم دوگنا ہو جاتا ہے اسلئے یہاں حرم کی تخصیص کرکے بیان کیا گیا ہے۔

يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ، سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ خود تو اسلام سے دُور ہیں ہی دوسروں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، یہ اُن کا دوسرا گناہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ مسجد حرام اصل میں اُس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنائی ہوئی ہے اور یہ حرم مکہ کا ایک اہم جزء ہے لیکن بعض مرتبہ مسجد حرام بول کر پُورا حرم مکہ بھی مُراد لیا جاتا ہے جیسے خود اسی واقعہ یعنی مسلمانوں کو عمرہ کے لئے حرم میں داخل ہونے سے روکنے کی جو صورت پیش آئی وہ یہی تھی کہ کفارِ مکہ نے آپ کو صرف مسجد میں جانے سے نہیں بلکہ حدود حرم مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے اس واقعہ میں مسجد حرام کا لفظ بمعنے مطلق حرم استعمال

فرمایا ہے وَصَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

تفسیر درمنثور میں اس جگہ مسجد حرام کی تفسیر میں پورا حرم مراد ہونا حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے

حرم مکہ میں سب مسلمانوں کے مساوی حق کا مطلب

اتنی بات پر تمام اُمت اور ائمہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ مسجد حرام اور حرم شریف مکہ کے وہ تمام حصے جن سے افعال حج کا تعلق ہے جیسے صفا مروہ کے درمیان کا میدان جس میں سعی ہوتی ہے اور منٰی کا پورا میدان اسی طرح عرفات کا پورا میدان اور مزدلفہ کا پورا میدان، یہ سب زمینیں سب دنیا کے مسلمانوں کے لئے وقف عام ہیں کسی شخص کی ذاتی ملکیت ان پر نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ مکہ مکرمہ کے عام مکانات اور باقی حرم کی زمینیں ان کے متعلق بھی بعض ائمہ فقہاء کا یہی قول ہے کہ وہ بھی وقف عام ہیں۔ اُن کا فروخت کرنا یا کرایہ دینا حرام ہے ہر مسلمان ہر جگہ ٹھہر سکتا ہے مگر دوسرے فقہاء کا مختار مسلک یہ ہے کہ مکہ کے مکانات ملکِ خاص ہو سکتے ہیں انکی خرید و فروخت اور انکو کرایہ پر دینا جائز ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ اُنھوں نے صفوان بن اُمیہ کا مکان مکہ مکرمہ میں خرید کر اس کو مجرموں کے لئے قیدخانہ بنایا تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ سے اسمیں دو روایتیں منقول ہیں ایک پہلے قول کے مطابق دوسری دوسرے قول کے مطابق اور فتویٰ دوسرے قول پر ہے۔ کذا فی روح المعانی۔ یہ بحث کتب فقہ میں مفصل مذکور ہے مگر اس آیت میں حرم کے جن حصوں سے روکنے کا ذکر ہے وہ حصے بہرحال سب کے نزدیک وقف عام ہیں ان سے روکنا حرام ہے آیت مذکورہ سے اسی کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ، الحاد کے معنے لغت میں سیدھے راستے سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اس جگہ الحاد سے مراد مجاہد و قتادہ کے نزدیک کفر و شرک ہے مگر دوسرے مفسرین نے اسکو اپنے عام معنے میں قرار دیا ہے جسمیں ہر گناہ اور اللہ و رسول کی نافرمانی داخل ہے یہاں تک کہ اپنے خادم کو گالی دینا برا کہنا بھی۔ اور اسی معنے کے لحاظ سے حضرت عطاء نے فرمایا کہ حرم میں الحاد سے مراد اسمیں بغیر احرام کے داخل ہو جانا یا ممنوعات حرم میں سے کسی ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا ہے جیسے حرم کا شکار مارنا یا اُسکا درخت کاٹنا وغیرہ۔ اور جو چیزیں شریعت میں ممنوع ناجائز ہیں وہ سبھی جگہ گناہ اور موجب عذاب ہیں حرم کی تخصیص اس بناء پر کی گئی کہ جس طرح حرم مکہ میں نیکی کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کا عذاب بھی بہت بڑھ جاتا ہے (قالہ مجاہد)۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اسکی ایک تفسیر یہ بھی منقول ہے کہ حرم کے علاوہ دوسری جگہوں میں محض گناہ کا ارادہ کرنے سے گناہ نہیں لکھا جاتا جب تک عمل نہ کرے اور حرم میں صرف ارادہ پختہ کر لینے پر بھی گناہ لکھا جاتا ہے قرطبی نے یہی تفسیر ابن عمرؓ سے بھی نقل کی ہے اور اس تفسیر کو صحیح کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حج کے لئے جاتے تو دو خیمے لگاتے تھے ایک حرم کے اندر دوسرا باہر۔ حرم میں اگر اپنے اہل و عیال یا خدام

ومتعلقین میں کسی کو کسی بات پر سرزنش اور عتاب کرنا ہوتا تو حرم سے باہر والے خیمے میں جاکر یہ کام کرتے تھے۔ لوگوں نے مصلحت دریافت کی تو فرمایا ہم سے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ انسان جو عتاب و ناراضی کے وقت کلّا واللہ یا بلیٰ واللہ کے الفاظ بولتا ہے یہ بھی الحاد فی الحرم میں داخل ہے (مظہری)

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَيْـًٔا وَّ

اور جب ٹھیک کر دی ہم نے ابراہیم کو جگہ اس گھر کی کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور

طَهِّرْ بَيْتِیَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾ وَ

پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے واسطے اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع و سجدہ والوں کے اور

اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ

پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چلکر اور سوار ہوکر دُبلے دُبلے اونٹوں پر چلے آئیں

مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا

راہوں دور سے تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور پڑھیں

اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ

اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر چوپایوں مواشی کے جو اللہ نے دیئے ہیں

الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا

ان کو سو کھاؤ اس میں سے، اور کھلاؤ بُرے حال کے محتاج کو پھر چاہیئے کہ ختم

تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾

کر دیں اپنا میل کچیل اور پوری کر دیں اپنی منتیں اور طواف کریں اس قدیم گھر کا

خلاصۂ تفسیر

اور (اس قصہ کا تذکرہ کیجئے) جب کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی (کیونکہ اسوقت خانہ کعبہ بنا ہوا نہ تھا اور حکم دیا) کہ (اس مکان کو عبادت کے لئے تیار کرو اور اس عبادت میں) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا (یہ دراصل ان کے بعد کے لوگوں کو سنانا تھا اور بنا بیت اللہ کے ساتھ شرک کی ممانعت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بیت اللہ کیطرف نماز اور اسکا طواف کرنے سے کسی جاہل کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ یہی معبود ہے) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور (نماز میں) قیام اور رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے (ظاہری اور باطنی نجاسات یعنی کفر و شرک سے) پاک رکھنا (یہ بھی دراصل دوسروں ہی کو سنانا تھا ابراہیم علیہ السلام سے تو اس کے

خلاف کا احتمال ہی نہ تھا) اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کر دو (اس اعلان سے) لوگ تمہارے پاس (یعنی تمہاری اس مقدس عمارت کے پاس) چلے آئیں گے پیادہ بھی اور (طولِ سفر کی وجہ سے دُبلی ہو جانے والی) اُونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی (اور وہ لوگ اس لئے آویں گے) تاکہ اپنے (اپنے دینی اور دُنیوی) فوائد کیلئے حاضر ہو جاویں (دینی فوائد تو معلوم و مشہور ہیں دُنیوی فوائد بھی اگر مقصود نہ ہوں مثلاً خرید و فروخت اور قربانی کا گوشت وغیرہ تو یہ بھی کوئی مذموم نہیں) اور (اس لئے آویں گے) تاکہ ایامِ مقررہ میں (جو قربانی کے ایام دسویں سے بارھویں ذی الحجہ تک ہیں) اُن مخصوص چوپاؤں پر (یعنی قربانی کے جانوروں پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو خدا تعالےٰ نے اُن کو عطا کئے ہیں (ابراہیم علیہ السلام کے خطاب کا مضمون ہو چکا آگے اُمتِ محمدیہ مخاطب ہے) ان (قربانی کے) جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو (کہ یہ جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو پھر (قربانی کے بعد) لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں (یعنی احرام کھول ڈالیں سر منڈالیں) اور اپنے واجبات کو خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو یا بلا نذر جو افعال حج کے واجب ہیں اُن سب کو پُورا کریں اور (انہی ایام معلومات میں) اس مامون و محفوظ گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں مسجد حرام اور حرم سے روکنے والوں پر عذابِ شدید کی وعید آئی ہے آگے اس کی مناسبت سے بیت اللہ کے خاص فضائل اور عظمت کا بیان ہے جس سے اُن کے فعل کی قباحت اور زیادہ واضح ہو جائے۔

بناء بیت اللہ کی ابتدا وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ، بوّء کا لفظ لغت میں کسی کو ٹھکانا اور رہنے کا مکان دینے کے معنے میں آتا ہے۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ بات قابلِ ذکر اور یاد رکھنے کی ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اُس جگہ کا ٹھکانا دیا جہاں بیت اللہ ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے اس زمین پر آباد نہ تھے جیسا کہ روایات سے ثابت ہے کہ اُن کو مُلک شام سے ہجرت کرا کر یہاں لایا گیا تھا۔ اور مکان البیت میں اسطرف اشارہ ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے موجود تھا جیسا کہ معتبر روایات میں ہے کہ اسکی پہلی بناء تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر لانے سے پہلے یا اُسکے ساتھ ہوئی تھی اور آدم علیہ السلام اور اُن کے بعد کے انبیاء بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت بیت اللہ کی تعمیر اُٹھالی گئی تھی بنیادیں اور اسکی معین جگہ موجود تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہیں لا کر ٹھہرایا گیا اور انکو حکم

دیا گیا اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا، یعنی میری عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کرنے کا کوئی احتمال نہیں۔ اُن کی بُت شکنی اور شرک کرنے والوں کا مقابلہ اور اسمیں سخت ترین آزمائش کے واقعات پہلے ہو چکے تھے اس لئے مُراد اس سے عام لوگوں کو سُنانا ہے کہ شرک سے پرہیز کریں۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا وَطَهِّرْ بَیْتِیَ (یعنی میرے گھر کو پاک کیجئے) اسوقت اگرچہ گھر موجود نہیں تھا مگر بیت اللہ دراصل در و دیوار اور تعمیر کا نام نہیں، وہ اُس بقعۂ مقدسہ کا نام ہے جس میں بیت اللہ پہلے بنایا گیا تھا اور اب دوبارہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ بُقعہ اور مکان بہرحال موجود تھا اُس کو پاک کرنیکا حکم اسلئے دیا گیا کہ اس زمانے میں بھی قوم جُرہم اور عمالقہ نے یہاں کچھ بُت رکھے ہوئے تھے جن کی پُوجا پاٹ ہوتی تھی (ذکرہ القرطبی) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم آئندہ آنے والوں کو سُنانا ہو اور پاک کرنے سے مُراد جیسے کفر و شرک سے پاک رکھنا ہے ایسے ہی ظاہری نجاسات اور گندگیوں سے پاک رکھنا بھی مُراد ہے اور ابراہیم علیہ السلام کو اسکا خطاب کرنے سے دوسرے لوگوں کو اہتمام کی فکر دلانا مقصود ہے کہ جب خلیل اللہ کو اسکا حکم ہوا جو خود ہی اس پر عامل تھے تو ہمیں اسکا اہتمام کتنا کرنا چاہیئے۔

تیسرا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیا گیا کہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ، یعنی لوگوں میں اعلان کر دیجئے کہ اس بیت اللہ کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔ بغوی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رض سے نقل کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو فرضیت حج کے اعلان کا حکم ہوا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ (یہاں تو جنگلی میدان ہے کوئی سُننے والا نہیں) جہاں آبادی ہے وہاں میری آواز کیسے پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپکی ذمہ داری صرف اعلان کرنے کی ہے اسکے ساری دُنیا میں پہنچانے اور پھیلانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت اُونچا کر دیا اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے جبل ابی قبیس پر چڑھ کر یہ اعلان کیا، کانوں میں انگلیاں رکھ کر داہنے اور بائیں اور شرقاً و غرباً ہر طرف یہ ندا دی کہ اے لوگو تمہارے رب نے اپنا بیت بنایا ہے اور تم پر اس بیت کا حج فرض کیا ہے تو تم سب اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرو۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ آواز اللہ تعالیٰ نے ساری دُنیا میں پہنچا دی اور صرف اُسوقت کے زندہ انسانوں تک ہی نہیں بلکہ جو انسان آئندہ تا قیامت پیدا ہونیوالے تھے بطور معجزہ اُن سب تک یہ آواز پہنچا دی گئی اور جس جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حج کرنا لکھ دیا ہے اُنمیں سے ہر ایک نے اس آواز کے جواب میں لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہا یعنی حاضر ہونیکا اقرار کیا۔ حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ حج کے تلبیہ کی اصل بنیاد یہی ندائے ابراہیمی کا جواب ہے۔ (قرطبی و مظہری)

آگے آیت میں اُس تاثیر کا ذکر ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو تمام انسانوں تک منجانب اللہ پہنچانے سے قیامت تک کے لئے قائم ہوگئی وہ یہ ہے یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ، یعنی اطرافِ عالم سے لوگ بیت اللہ کی طرف چلے آویں گے کوئی پیادہ کوئی سوار، اور سواری سے آنے والے بھی دُور دراز ملکوں سے آئیں گے جس سے ان کی سواریاں بھی لاغر ہو جائیں گی چنانچہ اُسی وقت سے آج تک کہ ہزاروں سال گزر چکے ہیں بیت اللہ کی طرف حج کے لئے آنے والوں کی یہی کیفیت ہے۔ بعد میں آنے والے سب انبیاء اور اُن کی اُمتیں بھی اس کی پابند رہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو طویل دَورِ جاہلیت کا گزرا ہے اس میں بھی عرب کے باشندے اگرچہ بُت پرستی کی بدعت میں مبتلا ہوگئے تھے مگر حج کے ارکان کے اُسی طرح پابند تھے جس طرح ابراہیم علیہ السلام سے منقول و ماثور چلا آتا تھا۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ، یعنی اُن کی یہ حاضری دور دراز سفر طے کر کے اپنے ہی منافع کیلئے ہے قرآن میں منافع کو بصیغۂ نکرہ لا کر ایک عموم کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں دینی منافع تو بیشمار ہیں ہی دُنیوی منافع بھی بہت مشاہدہ میں آتے ہیں کم از کم اتنی بات خود قابلِ تعجب حیرت ہے کہ حج کے سفر پر عموماً بڑی رقم خرچ ہوتی ہے جو بعض لوگ ساری عمر محنت کر کے تھوڑی تھوڑی بچا کر جمع کرتے ہیں اور یہاں بیک وقت خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن ساری دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ کوئی شخص حج یا عمرہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے فقیر و محتاج ہو گیا ہو اس کے سوا دوسرے کاموں مثلاً بیاہ شادی کی رسموں میں مکان تعمیر کرنے میں خرچ کر کے ہزاروں آدمی محتاج و فقیر ہونے والے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج و عمرہ میں یہ خصوصیت بھی رکھی ہے کہ اس سے کوئی شخص دُنیوی فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ بعض روایات میں ہے کہ حج و عمرہ میں خرچ کرنا افلاس و محتاجی کو دُور کر دیتا ہے غور کیا جائے تو اسکا بھی مشاہدہ عموماً پایا جائیگا اور حج کے دینی منافع تو بہت ہی ہیں ان میں سے یہ کیا کم ہیں جو حضرت ابوہریرہ رضؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کے لئے حج کیا اور اس میں بے حیائی کی باتوں سے اور گناہ کے کاموں سے بچتا رہا تو وہ حج سے ایسی حالت میں واپس آئے گا گویا یہ اپنی ماں کے پیٹ سے آج برآمد ہوا ہے یعنی جیسے ابتدائے ولادت میں بچہ بے گناہ معصوم ہوتا ہے یہ بھی ایسا ہی ہو جائیگا۔ رواہ البخاری ومسلم (مظہری) بیت اللہ کے پاس جمع ہونے والے حجاج کے آنے کا ایک فائدہ تو اوپر مذکور ہوا کہ وہ اپنے دینی اور دُنیوی منافع اور فوائد کا مشاہدہ کریں۔ دوسرا فائدہ یہ بتلایا کہ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، یعنی تاکہ وہ اللہ کا نام ذکر کریں ایام معلومات میں اُن چوپایہ جانوروں پر جو اللہ نے اُن کو عطا فرمائے ہیں۔ اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد پر نظر نہ ہونی چاہیئے بلکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جو ان دنوں میں قربان

کرنے کے وقت جانوروں پر کیا جاتا ہے جو روح عبادت ہے۔ قربانی کا گوشت اُن کے لئے حلال کر دیا گیا یہ مزید انعام ہے۔ اور ایام معلومات سے مُراد وہی دن ہیں جنمیں قربانی جائز ہے یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں بارھویں تاریخیں۔ اور مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ کے الفاظ عام ہیں اسمیں ہر طرح کی قربانی داخل ہے خواہ واجب ہو یا مستحب فَكُلُوا مِنْهَا، یہاں لفظ کلوا اگرچہ بصیغہ امر آیا ہے مگر مُراد اس سے وجوب نہیں بلکہ اباحت اور جواز ہے جیسا قرآن کی آیت وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا میں شکار کا حکم بمعنے اجازت ہے۔

مسئلہ: مکہ مظلمہ اور زمانۂ حج میں مختلف قسم کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو کسی جُرم کی سزا کے طور پر جانور کی قُربانی واجب ہو جاتی ہے جیسے کسی نے حرم شریف کے اندر شکار مار دیا تو اُس پر اسکی جزاء میں کسی جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے کہ کون سے جانور کے بدلے میں کس طرح کا جانور قربان کرنا ہے۔ اسی طرح جو کام احرام کی حالت میں ممنوع ہیں اگر کسی نے وہ کام کر لیا تو اسپر بھی جانور ذبح کرنا لازم اور واجب ہو جاتا ہے جسکو فقہاء کی اصطلاح میں دم جنایت کہا جاتا ہے اسمیں بھی کچھ تفصیل ہے بعض ممنوعات کے کر لینے سے گائے یا اونٹ ہی کی قربانی دینا ضروری ہوتا ہے اور بعض کیلئے بکرے دُنبہ کی کافی ہوتی ہے بعض میں دَم واجب نہیں ہوتا صرف صدقہ دینا کافی ہوتا ہے ان تفصیلات کی یہ جگہ نہیں، احقر نے اپنے رسالہ احکام الحج میں بقدرِ ضرورت لکھدیا ہے۔ یہ قسم دَم کی جو کسی جنایت اور جُرم کی سزا کے طور پر لازم ہوا ہے اسکا گوشت کھانا خود اس شخص کیلئے جائز نہیں بلکہ صرف فقراء و مساکین کا حق ہے کسی دوسرے مالدار آدمی کو بھی اسکا کھانا جائز نہیں۔ اسپر تمام فقہاء اُمت کا اتفاق ہے۔ باقی قسمیں قربانی کی خواہ واجب ہوں یا نفلی، واجب میں حنفیہ مالکیہ شافعیہ کے نزدیک دَم تمتع اور دَم قران بھی داخل ہیں ان سب کا گوشت قربانی کرنے والا اور اسکے احباب اعزاء اگرچہ اغنیاء ہوں وہ بھی کھا سکتے ہیں اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور پوری تفصیل اسکے مسائل کی کتب فقہ میں دیکھی جائے۔ عام قربانی کا گوشت ہو یا خاص حج کی قربانیاں ان سب کا حکم یہی ہے کہ قربانی کرنیوالا خود اور ہر مسلمان غنی ہو یا فقیر اسمیں سے کھا سکتا ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ کم از کم ایک تہائی حصہ غرباء فقراء کو دیدیا جائے۔ اسی امر مستحب کا بیان آیت کے اگلے جملے میں اسطرح فرمایا ہے وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ، بائس کے معنے بہت تنگدست مصیبت زدہ اور فقیر کے معنے محتاج کے ہیں مطلب ہے کہ قربانی کے گوشت میں سے ان کو بھی کھلانا اور دینا مستحب اور مطلوب ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ تفث کے لغوی معنے میل کچیل کے ہیں جو انسان کے بدن پر جمع ہو جاتا ہے حالتِ احرام میں چونکہ بالوں کا مونڈنا، کاٹنا، نوچنا اسی طرح ناخن تراشنا، خوشبو لگانا یہ سب چیزیں حرام ہوتی ہیں تو انکے نیچے میل کچیل جمع ہونا طبعی امر ہے اس آیت میں یہ فرمایا کہ جب حج میں قربانی سے

فارغ ہوجاؤ تو اس مَیل کچیل کو دُور کرو، مطلب یہ ہے کہ اب احرام کھول ڈالو اور سر منڈالو، ناخن تراشو۔ زیرِ ناف کے بال صاف کرلو۔ آیت مذکورہ میں پہلے قربانی کرنیکا ذکر آیا اسکے بعد احرام کھولنے کا اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اسی ترتیب سے کام کرنا چاہئے قربانی سے پہلے حلق کرنا یا ناخن کاٹنا وغیرہ ممنوع ہے اور جو ایسا کریگا اُس پر دَم جنایت واجب ہوگا۔

افعالِ حج میں ترتیب کا درجہ | جو ترتیب افعالِ حج کی قرآن و حدیث میں آئی اور فقہاء نے اسکو منضبط کیا اسی ترتیب سے افعالِ حج ادا کرنا باتفاقِ اُمت کم ازکم سنت ضرور ہے واجب ہونیمیں اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے جس کے خلاف کرنے سے ایک دَم جنایت لازم ہوتا ہے، امام شافعی رحؒ کے نزدیک سُنت ہے اسلئے اسکے خلاف کرنیسے ثواب میں کمی آتی ہے مگر دَم لازم نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی حدیث میں ہے من قدم شیئا من نسکہ او اخرہ فلیھرق دما رواہ ابن ابی شیبۃ موقوفا وھو فی حکم المرفوع (مظہری) یعنی جس شخص نے افعالِ حج میں سے کسی کو مقدم یا مؤخر کردیا اُس پر لازم ہے کہ ایک دَم دے۔ یہ روایت طحاوی نے بھی مختلف طرق سے نقل کی ہے اور حضرت سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ، نخعیؒ، حسن بصریؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ خلافِ ترتیب کرنے والے پر دم لازم کرتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ اس مسئلہ کی پُوری تفصیل و تحقیق مذکور ہے۔ نیز دوسرے مسائلِ حج بھی مفصّل لکھے ہیں۔

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ، نذور، نذر کی جمع ہے جس کو اُردو میں منّت کہا جاتا ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام شرعاً کسی شخص پر لازم، واجب نہیں تھا اگر وہ زبان سے یہ نذر کرلے اور منّت مان لے کہ میں یہ کام کرونگا یا اللہ کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ فلاں کام کروں تو یہ نذر ہوجاتی ہے۔ جسکا حکم یہ ہے کہ اسکا پُورا کرنا واجب ہوجاتا ہے اگرچہ اصل سے واجب نہیں تھا مگر اسکے واجب ہوجانے کے لئے یہ شرط تو باتفاقِ اُمت ہے کہ وہ کام شرعاً گناہ اور ناجائز نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے گناہ کے کام کی نذر مان لی تو اُس پر وہ گناہ کرنا اس سے لازم نہیں ہوجاتا ہے بلکہ اسکے خلاف کرنا واجب ہے البتہ اُسپر کفارۂ قسم لازم ہوجائے گا۔ اور ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ فقہاء کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ وہ کام ایسا ہو جس کی جنس میں کوئی عبادت مقصودہ شرعیہ پائی جاتی ہو جیسے نماز، روزہ، صدقہ، قربانی وغیرہ کہ ان کی جنس میں کچھ شرعی واجبات اور عبادات مقصودہ ہیں۔ تو اگر کوئی شخص نفلی نماز روزے صدقہ وغیرہ کی نذر مان لے تو وہ نفل اسکے ذمہ واجب ہوجاتی ہے اُسکا پُورا کرنا اسکے ذمّہ لازم و واجب ہے۔ آیت مذکورہ سے یہی حکم ثابت ہوتا ہے کیونکہ اسمیں نذر کے ایفاء یعنی پُورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ | یہ یاد رہے کہ صرف دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے سے نذر نہیں ہوتی جبتک زبان

سے الفاظ نذر ادا نہ کرے ۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ نذر اور منت کے احکام و مسائل بڑی تفصیل سے جمع کر دیئے ہیں جو اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر یہاں اُن کی گنجائش نہیں ۔

ایک سوال اور جواب | اس آیت سے پہلے بھی اعمال حج قربانی اور احرام کھولنے وغیرہ کا ذکر ہوا ہے اور آگے بھی طواف زیارت کا بیان ہے درمیان میں ایفاء نذر کا ذکر کس مناسبت سے ہوا جبکہ ایفائے نذر ایک مستقل حکم ہے حج میں ہو یا حج کے بغیر اور حرم شریف میں ہو یا باہر کسی ملک میں ۔

جواب یہ ہے کہ اگرچہ ایفاء نذر ایک مستقل حکم شرعی ہے ایام حج اور افعال حج یا حرم کیساتھ مخصوص نہیں لیکن اسکا ذکر یہاں افعال حج کے ضمن میں شاید اس وجہ سے ہے کہ انسان جب حج کے لئے نکلتا ہے تو دل کا داعیہ ہوتا ہے کہ اس سفر میں زیادہ سے زیادہ نیک کام اور عبادات ادا کرے اسمیں بہت سی چیزوں کی نذر بھی کر لیتا ہے خصوصاً جانوروں کی قربانی کی نذر کرنے کا تو عام رواج ہے حضرت ابن عباس رضؓ نے یہاں نذر سے مراد قربانی ہی کی نذر قرار دی ہے ۔ اور ایک مناسبت نذر کی احکام حج سے یہ بھی ہے کہ جسطرح نذر اور قسم سے انسان پر بہت سی چیزیں جو اصل شرع کی رُو سے واجب نہیں تھیں واجب ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں جو اصل احکام کی رو سے حرام یا ناجائز نہیں تھیں وہ اس شخص پر ناجائز و حرام ہو جاتی ہیں ۔ احرام کے تمام احکام تقریباً ایسے ہی ہیں کہ سِلے ہوئے کپڑے، خوشبو کا استعمال بال منڈانا، ناخن تراشنا وغیرہ فی نفسہ کوئی ناجائز کام نہ تھے مگر اسنے احرام باندھ کر یہ سب کام اپنے اوپر حرام کر لئے ۔ اسی طرح حج کے دوسرے اعمال و افعال جو فرض تو عمر میں ایک ہی مرتبہ ہوتے ہیں مگر بعد میں حج و عمرہ کے لئے احرام باندھ کر یہ سب کام اسکے لئے فرض ہو جاتے ہیں ۔ اسی لئے حضرت عکرمہ رضؓ نے اس آیت نذور کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ اس سے مواجب حج مراد ہیں جو حج کی وجہ سے اسپر لازم ہو گئے ہیں ۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ، یہاں طواف سے مراد طواف زیارت ہے جو دسویں تاریخ ذی الحجہ کو رمی جمرہ اور قربانی کے بعد کیا جاتا ہے یہ طواف حج کا دوسرا رکن اور فرض ہے پہلا رکن وقوف عرفات ہے جو اس سے پہلے ادا ہو جاتا ہے ۔ طواف زیارت پر احرام کے سب احکام مکمل ہو کر پورا احرام کھل جاتا ہے (روی ذلک عن ابن عباس و مجاہد و ضحاک و جماعۃ بل قال الطبری وان لم یسلم لہ لا خلاف بین المتاولین فی انہ طواف الافاضۃ ویکون ذلک یوم النحر از روح المعانی)

بیت عتیق ، بیت اللہ کا نام بیت عتیق اسلئے ہے کہ عتیق کے معنے آزاد کے ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے گھر کا نام بیت عتیق اسلئے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کفار و جبابرہ کے غلبہ اور قبضہ سے آزاد کر دیا ہے (رواہ الترمذی وحسنہ والحاکم وصححہ ابن جریر والطبرانی وغیرہم از روح المعانی) کسی کافر کی مجال نہیں کہ اسپر قبضہ یا غلبہ کر سکے ۔ اصحاب فیل کا واقعہ اسپر شاہد ہے واللہ اعلم تفسیر مظہری میں اس موقع پر طواف کے مفصل احکام و مسائل جمع کر دیئے ہیں جو بہت اہم قابل دید ہیں ۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ

یہ سُن چکے اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سو وہ بہتر ہے اُس کے لئے اپنے رب کے پاس اور حلال ہیں

لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ

تم کو چوپائے مگر جو تم کو سناتے ہیں سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝٣٠ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ

اور بچتے رہو جھوٹی بات سے ایک اللہ کی طرف ہو کر نہ اسکے ساتھ شریک بنا کر اور جس نے

يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ

شریک بنایا اللہ کا سو جیسے گر پڑا آسمان سے پھر اُچکتے ہیں اسکو اُڑنے والے مردار خوار یا جا ڈالا

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝٣١ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ

اس کو ہوا نے کسی دور مکان میں یہ سُن چکے اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام کی چیزوں کا

فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝٣٢ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے تمہارے واسطے چوپایوں میں فائدے ہیں ایک مقرر وعدہ تک

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝٣٣ۧ

پھر اُن کو پہنچنا اس قدیم گھر تک

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

یہ بات تو ہو چکی (جو حج کے مخصوص احکام تھے) اور (اب دوسرے عام احکام جن میں حج اور علاوہ حج کے دوسرے مسائل بھی ہیں سنو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی وقعت کریگا سو یہ اسکے حق میں اسکے رب کے نزدیک بہتر ہے (احکام کی وقعت کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ اُن کا علم بھی حاصل کرے اور یہ بھی کہ اُن پر عمل کا اہتمام کرے۔ اور احکام خداوندی کی وقعت کا اسکے لئے بہتر ہونا اس لئے ہے کہ وہ عذاب سے نجات اور دائمی راحت کا سامان ہے) اور ان مخصوص چوپاؤں کو باستثنائے اُن (بعض بعض) کے جو تم کو پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں (یعنی سورۂ انعام وغیرہ کی آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا میں حرام جانوروں کی تفصیل بتلا دی گئی ہے انکے سوا دوسرے چوپائے) تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے (اس جگہ چوپایہ جانوروں کے حلال ہونیکا ذکر اس لئے کیا گیا کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت سے کسی کو احرام کی حالت میں عام چوپائے جانوروں کی ممانعت کا شبہ نہ ہو جائے اور جب دین و دُنیا کی بھلائی احکام خداوندی کی تعظیم میں منحصر ہے) تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو (کیونکہ بتوں کو خدا کے ساتھ شریک کرنا تو حکم الٰہی سے کھُلی بغاوت ہے اس جگہ شرک سے بچنے

کی ہدایت خاص طور پر اس لئے کی گئی کہ مشرکین مکہ اپنے حج میں جو تلبیہ پڑھتے تھے اُسمیں اِلَّا شَرِیکًا ھُوَ لَکَ ملا دیتے تھے یعنی اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے بجز اُن بتوں کے جو خود اُسی اللہ کے ہیں) اور جھوٹی بات سے بچتے رہو (خواہ وہ عقائد کا جھوٹ ہو جیسے مشرکین کا اعتقادِ شرک یا دوسری قسم کا جھوٹ) اس طور سے کہ اللہ کیطرف جھکے رہو اسکے ساتھ (کسی کو شریک مت ٹھہراؤ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو (اُس کی حالت ایسی ہوگی جیسے) گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اُس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اسکو ہوا نے کسی دُور دراز جگہ لیجا کر پٹک دیا۔ یہ بات بھی (جو بطور قاعدہ کلیہ کے تھی) ہو چکی اور (اب ایک ضروری بات قربانی کے جانوروں کے متعلق اور سُن لو کہ) جو شخص دینِ خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اُسکا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ خدا سے ڈرنے سے حاصل ہوتا ہے (یادگاروں کا لحاظ رکھنے سے مُراد احکامِ الٰہیہ کی پابندی ہے جو قربانی کے متعلق ہیں خواہ ذبح سے قبل کے احکام ہوں یا ذبح کے وقت ہوں جیسا اُس پر اللہ کا نام لینا یا بعد ذبح کے ہوں جیسے اُسکا کھانا یا نہ کھانا کہ جس کا کھانا جس کے لئے حلال ہے وہ کھائے جس کا کھانا جس کے لئے حلال نہیں وہ نہ کھائے۔ ان احکام میں کچھ تو پہلے بھی ذکر کئے جا چکے اور کچھ یہ ہیں کہ) تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے (یعنی جب تک وہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہدی نہ بنائے جاویں تو اُن سے دودھ یا سواری باربرداری وغیرہ کا فائدہ اُٹھانا جائز ہے مگر جب اُن کو بیت اللہ اور حج یا عمرہ کے لئے ہدی بنا دیا تو پھر اُن سے کوئی نفع اُٹھانا جائز نہیں) پھر (یعنی ہدی بننے کے بعد) اسکے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے (مراد پورا حرم ہے یعنی حرم سے باہر ذبح نہ کریں)۔

معارف و مسائل

حُرُمٰتِ اللہِ سے مُراد اللہ کی محترم اور معزز بنائی ہوئی چیزیں یعنی احکامِ شرعیہ ہیں۔ اُن کی تعظیم یعنی اُن کا علم حاصل کرنا اور اسپر عمل کرنا سرمایۂ سعادتِ دُنیا و آخرت ہے۔

اُحِلَّتْ لَکُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ، انعام سے مراد اُونٹ۔ گائے بکرا۔ مینڈھا۔ دُنبہ وغیرہ ہیں کہ یہ جانور حالتِ احرام میں بھی حلال ہیں اور اِلَّا مَا یُتْلٰی میں جن جانوروں کو مستثنیٰ کرنے کا ذکر ہے اُن کا بیان دوسری آیات میں آیا ہے وہ مُردار جانور اور موقوذہ اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو یہ سب ہمیشہ کے لئے حرام ہیں حالت احرام کی ہو یا غیر احرام کی۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ، رجس کے معنے ناپاکی اور گندگی کے ہیں اور اوثان وثن کی جمع ہے بُت کے معنے میں۔ بُتوں کو نجاست اس لئے قرار دیا کہ وہ انسان کے باطن کو شرک

کی نجاست سے بھر دیتے ہیں۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ، قول زور سے مُراد جھوٹ ہے، حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے خواہ عقائدہ فاسدہ شرک و کفر ہوں یا معاملات میں اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب کبیرہ گناہوں میں سے بڑے کبیرہ یہ گناہ ہیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور عام باتوں میں جھوٹ بولنا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری لفظ وَقَوْلَ الزُّوْرِ کو بار بار فرمایا (رواہ البخاری)

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ، شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنے علامت کے ہیں جو چیزیں کسی خاص مذہب یا جماعت کی علامات خاص سمجھی جاتی ہوں وہ اُس کے شعائر کہلاتے ہیں شعائرِ اسلام اُن خاص احکام کا نام ہے جو عرف میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ حج کے اکثر احکام ایسے ہی ہیں۔

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقویٰ کی علامت ہے ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا تعلق اصل میں انسان کے دل سے ہے جب اُسمیں خوفِ خدا ہوتا ہے تو اسکا اثر سب اعمال افعال میں دیکھا جاتا ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، یعنی چوپائے جانوروں سے دودھ، سواری، باربرداری ہر قسم کے منافع حاصل کرنا تمھارے لئے اسوقت تک تو حلال ہے جب تک اُن کو حرم مکہ میں ذبح کرنے کے لئے نامزد کر کے ہَدیٰ نہ بنالیا ہو۔ ہَدیٰ اُسی جانور کو کہتے ہیں جو حج یا عمرہ کرنے والا اپنے ساتھ کوئی جانور لیجائے کہ اس کو حرم شریف میں ذبح کیا جائے گا۔ جب اُس کو ہدی حرم کے لئے نامزد اور مقرر کر دیا تو پھر اُس سے کسی قسم کا نفع اُٹھانا بغیر کسی خاص مجبوری کے جائز نہیں جیسے اونٹ کو ہدی بنا کر ساتھ لیا اور خود پیدل چل رہا ہے سواری کے لئے کوئی دوسرا جانور موجود نہیں اور پیدل چلنا اُسکے لئے مشکل ہو جائے تو مجبوری اور ضرورت کی بنا پر اسوقت سوار ہونے کی اجازت ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ، یہاں بیت عتیق سے مراد پورا حرم شریف ہے جو درحقیقت بیت اللہ ہی کا حریم خاص ہے جیسے سابقہ آیت میں مسجد حرام کے لفظ سے پورا حرم مُراد لیا گیا، یہاں بیتِ عتیق کے لفظ سے بھی پورا حرم مُراد ہے اور مَحِلُّهَا میں مَحِلّ کے معنے موضع حلولِ اجل کے ہیں مُراد اس سے موضع ذبح ہے یعنی ہدی کے جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام بیت عتیق کے پاس ہے اور مراد پورا حرم ہے کہ وہ بیت عتیق ہی کے حکم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدی کا ذبح کرنا حرم کے اندر ضروری ہے حرم سے باہر جائز نہیں۔ اور پھر حرم عام ہے خواہ منحر منیٰ ہو یا مکہ مکرمہ کی کوئی اور جگہ ہو (روح المعانی)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ

اور ہر اُمت کے واسطے ہم نے مقرر کردی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ کے نام ذبح پر چوپایوں کے

مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَ

جو اُن کو اللہ نے دیئے سو اللہ تمہارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو اور

بَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿۳۴﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ

بشارت سُنا دے عاجزی کرنے والوں کو وہ کہ جب نام لیجئے اللہ کا ڈر جائیں اُن کے دل

وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

اور سہنے والے اُس کو جو اُن پر پڑے اور قائم رکھنے والے نماز کے اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ

يُنْفِقُونَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ

کرتے رہتے ہیں اور کعبہ کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں ہم نے تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام

لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ فَإِذَا

کی تمہارے واسطے اسمیں بھلائی ہے سو پڑھو اُن پر نام اللہ کا قطار باندھ کر پھر جب

وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ

گر پڑے اُن کی کروٹ تو کھاؤ اسمیں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے کو اسی طرح

سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا

تمہارے بس میں کر دیا ہم نے ان جانوروں کو تاکہ تم احسان مانو اللہ کو نہیں پہنچتا اُن کا گوشت

وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا

اور ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب اسی طرح اُن کو بس میں کر دیا

لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۷﴾

تمہارے کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی اور بشارت سُنا دے نیکی والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور (اوپر جو قربانی کا حرم میں ذبح کرنے کا حکم ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مقصود اصلی تعظیم حرم کی ہے بلکہ اصل مقصود اللہ ہی کی تعظیم اور اسکے ساتھ تقرب ہے اور مذبوح اور مذبح اسکا ایک آلہ اور ذریعہ ہے اور تخصیص بعض حکمتوں کی وجہ سے ہے اور اگر یہ تخصیصات مقصود اصلی ہوتیں تو کسی شریعت میں نہ بدلتیں مگر ان کا بدلتا رہنا ظاہر ہے البتہ تقرب الی اللہ جو اصل مقصود تھا وہ سب شرائع میں محفوظ رہا چنانچہ) ہم نے (جتنے اہل شرائع گزرے ہیں ان میں سے) ہر اُمت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انکو عطا

فرمایا تھا (پس اصلی مقصود یہ نام لینا تھا) سو (اس سے یہ بات نکل آئی کہ) تمہارا معبود (حقیقی) ایک ہی خدا ہے (جس کا ذکر کرکے سب کو تقرب کا حکم ہوتا رہا) تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو (یعنی موحد خالص رہو، کسی مکان وغیرہ کو معظم بالذات سمجھنے سے ذرہ برابر شرک کا شائبہ اپنے عمل میں نہ ہونے دو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ ہماری اس تعلیم پر عمل کریں) آپ (ایسے احکام الٰہیہ کے سامنے) گردن جھکا دینے والوں کو (جنت وغیرہ کی) خوشخبری سنا دیجئے جو (اس توحید خالص کی برکت سے) ایسے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ (کے احکام وصفات اور وعدہ وعید) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر کہ ان پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (بقدر حکم اور توفیق کے) خرچ کرتے ہیں (یعنی توحید خالص ایسی بابرکت چیز ہے کہ اسکی بدولت کمالات نفسانیہ و بدنیہ و مالیہ پیدا ہو جاتے ہیں) اور (اسی طرح اوپر جو تعظیم شعائر اللہ میں بعض استغاثات کا ممنوع ہونا معلوم ہوا ہے اس سے بھی ان قربانیوں کے معظم بالذات ہونے کا شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ اس سے بھی اصل وہی اللہ تعالیٰ کی اور اسکے دین کی تعظیم ہے اور یہ تخصیصات اسکا ایک طریق ہے پس) قربانی کے اونٹ اور گائے کو (اور اسی طرح بکری بھیڑ کو بھی) ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے (کہ اسکے متعلق احکام کے علم اور عمل سے اللہ کی عظمت اور دین کی وقعت ظاہر ہوتی ہے کہ اسکے نامزد چیز سے منتفع ہونے میں مالک مجازی کی رائے قابل اعتبار نہ رہے جس سے اس کی پوری عبدیت اور مالک حقیقی کی معبودیت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت دینی کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اخروی فائدہ ثواب ہے) سو (جب اس میں یہ حکمتیں ہیں تو) تم ان پر کھڑے کرکے (ذبح کرنیکے وقت) اللہ کا نام لیا کرو (یہ صرف اونٹوں کے اعتبار سے فرمایا کہ ان کا کھڑے کرکے ذبح کرنا بوجہ آسانی ذبح و خروج روح کے بہتر ہے پس اس سے تو اخروی فائدہ یعنی ثواب حاصل ہوا اور نیز اللہ کی عظمت ظاہر ہوئی کہ اسکے نام پر ایک جان قربان ہوئی جس سے اسکا خالق اور اسکا مخلوق ہونا ظاہر کر دیا گیا) پس جب وہ (کسی) کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جاویں) تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی (محتاج) کو (جو کہ باعتبار فقیر کی دو قسمیں ہیں) بھی کھانے کو دو۔ (کہ یہ دنیوی فائدہ بھی ہے اور) ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا (کہ تم باوجود تمہارے ضعف اور ان کی قوت کے اس طرح اسکے ذبح پر قادر ہو گئے) تاکہ تم (اس تسخیر پر اللہ تعالیٰ کا) شکر کرو (یہ حکمت مطلق ذبح میں ہے۔ قطع نظر اس کی قربانی ہونے کے اور آگے ذبح کی تخصیصات کے مقصود بالذات نہ ہونے کو ایک عقلی قاعدے سے بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو ظاہر بات ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون،

(ولیکن اسکے پاس تمہارا تقویٰ (کہ نیتِ تقرب داخلاص اسکے شعبوں میں سے ہے البتہ) پہنچتا ہے (پس وہی تعظیم الٰہی کی مقصودیت ثابت ہوگئی اور جیسے اوپر کَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا الخ میں تسخیر کی ایک عام حکمت یعنی قربانی ہونے کی خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے اعتبار سے بیان ہوئی تھی آگے تسخیر کی ایک خاص حکمت یعنی بلحاظ قربانی ہونے کے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیرِ حکم کر دیا کہ تم (اللہ کی راہ میں ان کو قربانی کر کے) اس بات پر اللہ کی بڑائی (بیان) کرو کہ اس نے تم کو (اس طرح قربانی کرنے کی) توفیق دی (ورنہ اگر توفیق الٰہی رہبر نہ ہوتی تو یا تو ذبح ہی میں شبہات نکال کر اس عبادت سے محروم رہتے اور یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے لگتے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے (اس سے پہلے خوشخبری اخلاص کے شعبوں پر تھی یہ خاص اخلاص پر ہے)

معارف و مسائل

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لفظ مَنْسَك اور نُسُك، عربی زبان کے اعتبار سے کئی معنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ایک معنی جانور کی قربانی کے دوسرے معنے تمام افعالِ حج کے اور تیسرے معنی مطلق عبادت کے ہیں قرآن کریم میں مختلف مواقع پر یہ لفظ ان تین معنے میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں تینوں معنے مراد ہو سکتے ہیں اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے مجاہد وغیرہ نے اس جگہ منسک کو قربانی کے معنے میں لیا ہے۔ اس پر معنے آیت کے یہ ہونگے کہ قربانی کا حکم جو اس امت کے لوگوں کو دیا گیا ہے کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلی سب امتوں کے بھی ذمہ قربانی کی عبادت لگائی گئی تھی۔ اور قتادہؒ نے دوسرے معنے میں لیا ہے جس پر مراد آیت کی یہ ہوگی کہ افعالِ حج جیسے اس امت پر عائد کئے گئے ہیں پچھلی امتوں پر بھی حج فرض کیا گیا تھا۔ ابنِ عرفہ نے تیسرے معنے لئے ہیں اس اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہوگی کہ ہم نے اللہ کی عبادت گزاری سب پچھلی امتوں پر بھی فرض کی تھی طریقہ عبادت میں کچھ کچھ فرق سب امتوں میں رہا ہے مگر اصل عبادت سب میں مشترک رہی ہے

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ لفظ خَبْت عربی زبان میں پست زمین کے معنی میں آتا ہے اسی لئے خبیث اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے آپ کو حقیر سمجھے۔ اسی لئے حضرت قتادہ و مجاہد نے مخبتین کا ترجمہ مواضعین سے کیا ہے۔ عمرو بن اوس فرماتے ہیں کہ مخبتین وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم نہیں کرتے اور اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو اس سے بدلہ نہیں لیتے۔ سفیان نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قضاء و تقدیر پر راحت و کلفت فراخی اور تنگی ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وجل کے اصلی معنے اس خوف و ہیبت کے ہیں جو کسی کی عظمت کی بناء

پر دل میں پیدا ہو۔ اللہ کے نیک بندوں اور صلحاء کا یہی حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نام سن کر انکے دلوں پر اُس کی عظمت اور بڑائی کے سبب ایک خاص ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، پہلے گزر چکا ہے کہ شعائر اُن خاص احکام و عبادات کا نام ہے جو دینِ اسلام کی علامات سمجھی جاتی ہیں۔ قربانی بھی انھیں میں سے ہے ایسے احکام کی پابندی زیادہ اہم ہے۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ، صواف بمعنے مصفوفہ ہے یعنی صف بستہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ جانور تین پاؤں پر کھڑا ہو ایک ہاتھ بندھا ہوا ہو۔ یہ صورت قربانی کی اُونٹ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی قربانی کھڑے ہونے کی حالت میں سنت اور بہتر ہے، باقی جانوروں کو لٹا کر ذبح کرنا سنت ہے۔

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا، یہاں وَجَبَتْ بمعنے سقطت آیا ہے جیسے وجبت الشمس بمعنے سقطت کا محاورہ مشہور ہے مراد اس سے جانور کی جان نکل جاتا ہے۔

الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ، پچھلی آیت میں جن لوگوں کو قربانی کا گوشت دینا چاہیئے انکو بائس فقیر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے ہیں مصیبت زدہ محتاج۔ اس آیت میں اس کی جگہ قانع اور معتر کے دو لفظوں میں اُس کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قانع سے مراد وہ محتاج فقیر ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا اپنی غربت و فقر کے باوجود اپنی جگہ بیٹھ کر جو مل جائے اُس پر قناعت کرتا ہے اور معتر، جو ایسے مواقع پر جائے جہاں سے کچھ ملنے کی اُمید ہو خواہ زبان سے سوال کرے یا نہ کرے (مظہری)

عبادات کی خاص صورتیں اصل مقصود نہیں بلکہ دل کا اخلاص و اطاعت مقصود ہے

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ قربانی جو ایک عظیم عبادت ہے اللہ کے پاس اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا نہ وہ مقصود قربانی ہے بلکہ مقصود اصلی اس پر اللہ کا نام لینا اور حکم ربی کی بجاآوری دلی اخلاص کے ساتھ ہے۔ یہی حکم دوسری تمام عبادات کا ہے کہ نماز کی نشست و برخاست، روزہ میں بھوکا پیاسا رہنا اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود اصلی اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل دلی اخلاص و محبت کیساتھ ہے اگر یہ عبادات اس اخلاص و محبت سے خالی ہیں تو صرف صورت اور ڈھانچہ ہے روح غائب ہے مگر عبادات کی شرعی صورت اور ڈھانچہ بھی اس لئے ضروری ہے کہ حکم ربانی کی تعمیل کیلئے اُس کی طرف سے یہ صورتیں متعین فرمادی گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ

اللہ دشمنوں کو ہٹا دے گا ایمان والوں سے اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی

خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾

دغا باز ناشکر

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مشرکین کے غلبہ اور ایذا رسانی کی قدرت کو) ایمان والوں سے (عنقریب) ہٹا دیگا (کہ پھر حج وغیرہ سے روک ہی نہ سکیں گے) بیشک اللہ تعالیٰ کسی دغاباز کفر کرنیوالے کو نہیں چاہتا (بلکہ ایسے لوگوں سے ناراض ہے اسلئے انجام کار ان لوگوں کو مغلوب اور مؤمنین مخلصین کو غالب کرے گا)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اسکا ذکر تھا کہ مشرکین نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہ کو جو عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے قریب مقام حدیبیہ پر پہنچ چکے تھے حرم شریف اور مسجد حرام میں جانے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا اس آیت میں مسلمانوں کو اس وعدہ کیساتھ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان مشرکین کی اس قوت کو توڑ دیگا جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعہ سلسلہ ہجری میں پیش آیا تھا اسکے بعد سے مسلسل کفار مشرکین کی طاقت کمزور اور ہمت پست ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ سشہ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ اگلی آیات میں اس کی تفصیل آرہی ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ

حکم ہوا اُن لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اسواسطے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر

لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن

قادر ہے وہ لوگ جن کو نکالا اُن کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اسکے کہ وہ

يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ

کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ

تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ

اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾

کا بہت اور اللہ مقرر مدد کریگا اسکی جو مدد کریگا اسکی بیشک اللہ زبردست ہے زور والا

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ

وہ لوگ کہ اگر ہم اُن کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور

اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱

حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا

خلاصۂ تفسیر

(گو اب تک بمصالح کفار سے لڑنے کی ممانعت تھی لیکن اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ اُن پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے (یہ علت ہے مشروعیت جہاد کی) اور (اس حالت اذن میں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت پر نظر نہ کرنا چاہیے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے (آگے ان کی مظلومیت کا بیان ہے کہ) جو (بیچارے) اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی عقیدہ توحید پر کفار کا یہ تمام ترغیظ و غضب تھا کہ ان کو اسقدر پریشان کیا کہ وطن چھوڑنا پڑا آگے جہاد کی حکمت ہے) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا (یعنی اہل حق کو اہل باطل پر وقتاً فوقتاً غالب نہ کرتا رہتا) تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم (اور منعدم) ہوگئے ہوتے (آگے اخلاص فی الجہاد پر غلبہ کی بشارت ہے) اور بیشک اللہ تعالیٰ اُسکی مدد کریگا جو کہ اللہ (کے دین) کی مدد کریگا (یعنی اسکے لڑنے میں خالص غرض اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو) بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے (وہ جس کو چاہے قوت و غلبہ دے سکتا ہے آگے ان کی فضیلت ہے) یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دُنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے (پس مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ انجام بھی ان کا یہی رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ اسکا عکس ہو جاوے چنانچہ ہوا)۔

معارف و مسائل

کفار کیساتھ جہاد کا پہلا حکم | مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار کے مظالم کا یہ حال تھا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی

مسلمان ان کے دستِ ستم سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو۔ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہو چکی تھی وہ کفار کے ظلم و جور کی شکایت اور اُن کے مقابلے میں قتل و قتال کی اجازت مانگتے تھے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے کہ صبر کرو مجھے ابھی تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی یہ سلسلہ دس سال تک اسی طرح جاری رہا (قرطبی عن ابن عربی)

جس وقت رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وطن مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے اور صدیقِ اکبرؓ آپ کے رفیق تھے تو مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت آپ کی زبان سے نکلا اخرجوا نبیہم لیھلکن یعنی ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے اب اُن کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے اسپر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد یہ آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (جس میں مسلمانوں کو کفار سے قتال کی اجازت دیدی گئی) رواہ النسائی والترمذی عن ابن عباس - قرطبی

اور حضرت ابن عباسؓ سے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسکو حسن فرمایا ہے روایت یہ ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتالِ کفار کے معاملہ میں نازل ہوئی جبکہ اس سے پہلے ستر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

جہاد و قتال کی ایک حکمت | وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ، اس میں جہاد و قتال کی حکمت کا اور اسکا بیان ہے کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء اور اُن کی اُمتوں کو بھی قتال کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی سارے ہی دین و مذہب اور ان کی عبادت گاہیں ڈھا دی جاتیں۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ جتنے دین و مذہب دُنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں اُن کی اصل بنیاد اللہ کیطرف سے اور وحی کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہو گئے اور اُن میں تحریف ہو کر کفر و شرک میں تبدیل ہو گئے مگر اپنے اپنے وقت میں وہی حق تھے اُن سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ اپنے اپنے وقت میں اُن کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی اُن مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی جیسے آتش پرست مجوس یا بُت پرست ہندو کیونکہ انکے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

آیت میں صوامع، صومعہ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے تارک الدنیا راہبوں کی مخصوص عبادتگاہ کو کہا جاتا ہے اور بِیَعٌ بِیعۃ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے عام کنیسوں کا نام ہے اور صَلَوٰت صلوٰۃ کی جمع ہے جو یہود کے عبادتخانہ کا نام ہے اور مساجد مسلمانوں کی عبادتگاہوں کا نام ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر کفار سے قتال و جہاد کے احکام نہ آتے تو کسی زمانے میں کسی مذہب و ملت کے لئے امن کی جگہ نہ ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صلوات اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صوامع اور بیع اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدیں ڈھادی جاتیں (قرطبی)

خلفائے راشدین کے حق میں قرآن کی پیشین گوئی اور اُس کا ظہور

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ، اس آیت میں الذین صفت ہے اُن لوگوں کی جن کا ذکر اس سے پہلے آیت میں ان الفاظ سے آیا ہے اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ، یعنی وہ لوگ جن کو اُن کے گھروں سے ظلماً بغیر کسی حق کے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں حکومت و اقتدار دیدیا جائے تو یہ لوگ اپنے اقتدار کو ان کاموں میں صرف کرینگے کہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دیں بُرے کاموں سے روکیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ یہ آیات ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد اُس وقت نازل ہوئی ہیں جبکہ مسلمانوں کو کسی بھی زمین میں حکومت و اقتدار حاصل نہیں تھا مگر حق تعالیٰ نے اُن کے بارے میں پہلے ہی یہ خبر دیدی کہ جب اُن کو اقتدار حکومت ملے گا تو یہ دین کی مذکورہ اہم خدمات انجام دیں گے اسی لئے حضرت عثمان غنی رضؓ نے فرمایا ثناء قبل بلاء، یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عمل کے وجود میں آنے سے پہلے اُس کے عمل کرنے والوں کی مدح و ثنا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی اس خبر کا جس کا وقوع یقینی تھا اس دُنیا میں وقوع اس طرح ہوا کہ چاروں خلفائے راشدین اور مہاجرین اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا کے مصداق صحیح تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کو سب سے پہلے زمین کی تمکنت و قدرت یعنی حکومت و سلطنت عطا فرمائی اور قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اُن کے اعمال و کردار اور کارناموں نے دُنیا کو دکھلا دیا کہ اُنھوں نے اپنے اقتدار کو اسی کام میں استعمال کیا کہ نمازیں قائم کیں زکوٰۃ کا نظام مضبوط کیا اچھے کاموں کو رواج دیا بُرے کاموں کا راستہ بند کیا۔

اسی لئے علماء نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ خلفاء راشدین سب کے سب اسی بشارت کے مصداق ہیں اور جو نظام خلافت اُن کے زمانے میں قائم ہوا وہ حق و صحیح اور عین اللہ تعالیٰ کے ارادے اور رضا اور پیشگی خبر کے مطابق ہے (روح المعانی)

یہ تو اس آیت کے شانِ نزول کا واقعاتی پہلو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن جب عام ہوں تو وہ کسی خاص واقعہ میں منحصر نہیں ہوتے اُن کا حکم عام ہوتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے ضحاکؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت بھی ہے جن کو اللہ تعالیٰ ملک و سلطنت عطا فرمادیں کہ وہ اپنے اقتدار میں یہ کام انجام دیں جو خلفاء راشدین نے اپنے وقت میں انجام دیئے تھے۔ (قرطبی مع توضیح)

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو اُن سے پہلے جھٹلا چکی ہے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور

قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ

ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم اور مدین کے لوگ اور موسٰی کو جھٹلایا پھر میں نے

لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ

ڈھیل دی منکروں کو پھر پکڑ لیا اُن کو تو کیسا ہوا میرا انکار سو کتنی بستیاں ہم نے غارت

اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ

کر ڈالیں اور وہ گنہگار تھیں اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں نکمے پڑے

وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ

اور کتنے محل گچکاری کے کیا سیر نہیں کی ملک کی جو اُن کے دل ہوتے جن سے سمجھتے

بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ

یا کان ہوتے جن سے سنتے سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے

تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ

ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ

يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا

ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم

تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ

گنتے ہو اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے اُن کو ڈھیل دی اور وہ گنہگار تھیں پھر

اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ

میں نے اُن کو پکڑا اور میری طرف پھر کر آنا ہے تو کہہ اے لوگو میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں

نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ

تم کو کھول کر سو جو لوگ یقین لائے اور کیں بھلائیاں اُن کے گناہ بخشے جاتے ہیں اور اُن کو روزی ہے

كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

عزت کی اور جو دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے

ع ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مجادلہ کرنے والے لوگ) اگر آپ کی تکذیب کرتے ہوں (تو آپ مغموم نہ ہوں کیونکہ

ان لوگوں سے پہلے قوم نوح اور عاد و ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور اہل مدین بھی (اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی) تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کاذب قرار دیا گیا (مگر تکذیب کے بعد) میں نے ان کافروں کو (چند روز) مہلت دی جیسے آج کے منکروں کو مہلت دے رکھی ہے پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا تو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا۔ غرض کتنی بستیاں ہیں جنکو ہم نے (عذاب سے) ہلاک کیا جن کی یہ حالت تھی کہ وہ نافرمانی کرتی تھیں تو (اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (یعنی ویران ہیں کیونکہ عادۃً اول چھت گرا کرتی ہے پھر دیواریں آپڑتی ہیں) اور (اسی طرح ان بستیوں میں) بہت سے بیکار کنویں (جو پہلے آباد تھے) بہت سے پختہ قلعی چونے کے محل (جو اب شکستہ ہوگئے یہ سب ان بستیوں کے ساتھ تباہ ہوئے بس اسی طرح وقت موعود پر اس زمانے کے لوگ بھی عذاب میں پکڑے جاویں گے) تو کیا یہ (سُن کر) لوگ مُلک میں چلے پھرے نہیں جس سے اُن کے دل ایسے ہو جاویں کہ ان سے سمجھنے لگیں یا اُن کے کان ایسے ہو جاویں کہ اُن سے سُننے لگیں بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی کچھ) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں (ان موجودہ منکرین کے بھی دل اندھے ہوگئے ورنہ پچھلی اُمتوں کے حالات سے سبق سیکھ لیتے) اور یہ لوگ (نبوت میں شبہ ڈالنے کے لئے) آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں (اور عذاب کے جلدی نہ آنے سے یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ عذاب آنیوالا ہی نہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کریگا (یعنی وعدہ کے وقت ضرور عذاب واقع ہوگا) اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (جس میں عذاب واقع ہوگا یعنی قیامت کا دن اپنے امتداد یا اشتداد میں) ایکہزار سال کی برابر ہے تم لوگوں کی شمار کے مطابق (تو یہ بڑے بیوقوف ہیں کہ ایسی مصیبت کا تقاضا کرتے ہیں) اور (جواب مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن لوگوں کی طرح) بہت سی بستیاں ہیں جن کو میں نے مہلت دی تھی اور وہ نافرمانی کرتی تھیں پھر میں نے اُن کو (عذاب میں) پکڑ لیا اور سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہوگا (اسوقت پوری سزا ملے گی) اور آپ (یہ بھی) کہدیجئے کہ اے لوگو میں تو تمہارے لئے ایک صاف ڈرانے والا ہوں (عذاب واقع کرنے نہ کرنے میں میرا دخل نہیں نہ میں نے اسکا دعویٰ کیا ہے) تو جو لوگ (اس ڈر کو سنکر) ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق (انکے انکار اور ابطال کی) کوشش کرتے رہتے ہیں (نبی کو اور اہل ایمان کو) ہرانے (یعنی عاجز کرنے) کیلئے ایسے لوگ دوزخ میں (رہنے والے) ہیں۔

معارف و مسائل

زمین کی سیر و سیاحت اگر عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مطلوب دینی ہے أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ، اس آیت میں

زمین کی سیر و سیاحت جبکہ بچشم عبرت ہو اس کی طرف ترغیب ہے، اور فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ سے طرف اشارہ ہے کہ زمانہ ماضی اور گزشتہ اقوام عالم کے حالات و کیفیات کا مشاہدہ انسان کو عقل و بصیرت عطا کرنے والا ہے بشرطیکہ ان حالات کو بعض تاریخی سوانح کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبرت کی نظر سے دیکھے تو ہر واقعہ ایک بصیرت کا سبق دیگا۔ ابن ابی حاتم نے کتاب التفکر میں حضرت مالک بن دینارؒ سے نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوہے کے جوتے بناؤ، اور لوہے کی عصا ہاتھ میں لو اور اللہ کی زمین میں اتنے پھرو کہ یہ آہنی جوتے گھس جائیں اور آہنی عصا ٹوٹ جائے (روح المعانی) اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سیر و سیاحت کا مقصد وہی عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے۔

آخرت کا دن ایک ہزار سال ہونے کا مطلب آیتِ مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ، یعنی آپ کے رب کے پاس ایک دن دُنیا کے ایک ہزار سال کی برابر ہوگا۔ اسمیں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس دن سے مُراد قیامت کا دن لیا جائے اور اُسکا ایک ہزار سال کی برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کے ہولناک واقعات اور ہیبتناک حالات کی وجہ سے یہ دن اتنا دراز محسوس ہوگا جیسے ایک ہزار سال خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اشتداد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے بہت سے حضرات مفسرین نے اسکے یہی معنے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقع میں عالمِ آخرت کا ایک دن ہمیشہ کے لئے دُنیا کے ایک ہزار سال ہی کی برابر ہو بعض روایاتِ حدیث سے اسی معنے کی شہادت ملتی ہے۔ مسند احمد، ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فقراء مہاجرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم کو میں قیامت کے روز کمل نور کی بشارت دیتا ہوں اور یہ کہ تم اغنیاء اور مالداروں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے اور اللہ کے یہاں ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا اسلئے فقراء اغنیاء سے پانچسو سال پہلے جنت میں داخل ہونگے (رواہ الترمذی وحسنہ۔ مظہری)

خلاصۂ تفسیر میں اسی دوسرے معنے کو بلفظ امتداد تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

ایک شبہ کا جواب سورۂ معارج میں جو آخرت کے دن کو پچاس ہزار سال کی برابر قرار دیا ہے كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ اسمیں بھی دونوں تفسیریں اشتداد اور امتداد کی ہوسکتی ہیں اور ہر شخص کی شدت و مصیبت چونکہ دوسروں سے مختلف اور کم و بیش ہوگی اسلئے وہ دن کسی کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا کسی کو پچاس ہزار سال کا، اور اگر دوسرے معنے لئے جاویں کہ حقیقۃً آخرت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہوتا ہے کہ ایک میں ایک ہزار سال اور دوسری میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے تو اسکی تطبیق سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ نے بیان القرآن میں بیان فرمائی ہے جو اہل علم کے لئے علمی اور اصطلاحی الفاظ ہی میں نقل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تفاوت

ایک ہزار سال سے پچاس ہزار سال تک اختلاف آفاق کے اعتبار سے ہو جس طرح دُنیا میں معدل النہار کی حرکت کہیں دولابی ہے کہیں حمائلی کہیں رحوی اور اسی وجہ سے خط استوا پر ایک رات دن چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور عرض تسعین (قطب شمالی) پر ایک سال کا اور ان دونوں کے درمیان مختلف مقادیر پر مختلف ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ اول شمس کی حرکت جو معدل کیساتھ ہے بطور خرق عادت و اعجاز اسقدر سست ہو جائے کہ ایک افق پر ایک ہزار سال کا دن ہو اور جو افق اُس سے پچاس حصے بڑھا ہوا ہو اُس پر پچاس ہزار برس کا ہو اور درمیان میں اسی نسبت سے متفاوت ہو۔ واللہ اعلم (بیان القرآن)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے

الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ

شیطان نے ملا دیا اُس کے خیال میں پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا پھر پکی کر دیتا ہے اپنی

اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ۙ۵۲ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً

باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا اس واسطے کہ جو کچھ شیطان نے ملایا اُس سے جانچے

لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ

اُن کو کہ جن کے دل میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور گنہگار تو ہیں

شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ۙ۵۳ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

مخالفت میں دور جا پڑے اور اس واسطے کہ معلوم کر لیں وہ لوگ جن کو سمجھ ملی ہے کہ یہ تحقیق ہے تیرے

رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ

رب کی طرف سے پھر اس پر یقین لائیں اور نرم ہو جائیں اُس کے آگے دل اُن کے اور اللہ سمجھانے والا ہے یقین

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۴ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لانے والوں کو راہ سیدھی اور منکروں کو ہمیشہ رہے گا اسمیں

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ

دھوکا جب تک آ پہنچے اُن پر قیامت بے خبری میں یا آ پہنچے اُن پر آفت ایسے دن کی

يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝۵۵ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

جسمیں راہ نہیں خلاصی کی راج اس دن اللہ کا ہے ان میں فیصلہ کرے گا سو جو یقین لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۵۶ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

اور کیں بھلائیاں نعمت کے باغوں میں ہیں اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری

بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ۧ۵۷

باتیں سو اُن کے لئے ہے ذلت کا عذاب

ع ۹ ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ جو شیطان کے اغواء سے آپ سے مجادلہ کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اسکے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ (اور اعتراض) ڈالا (اور کفار انہی شبہات اور اعتراضات کو پیش کر کے انبیاء سے مجادلہ کیا کرتے جیسا دوسری آیات میں ارشاد ہے وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ) پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جوابات قاطعہ و دلائل واضحہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے (جیسا کہ ظاہر ہے کہ جواب صحیح کے بعد اعتراض دفع ہو جاتا ہے) پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے (گو وہ فی نفسہا بھی مستحکم تھیں لیکن اعتراضات کے جواب سے اس استحکام کا زیادہ ظہور ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ (ان اعتراضات کے متعلق) خوب علم والا ہے (اور اُن کے جواب کے تعلیم میں) خوب حکمت والا ہے (اور یہ سارا قصہ اس لئے بیان کیا ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ایسے لوگوں کے لئے آزمائش (کا ذریعہ) بنا دے جن کے دل میں (شک کا) مرض ہے، اور جن کے دل (بالکل ہی) سخت ہیں (کہ وہ شک سے بڑھ کر باطل کا یقین کئے ہوئے ہیں، سو ان کی آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں بعد جواب کے اب بھی شبہات کا اتباع کرتے ہیں یا جواب کو سمجھ کر حق کو قبول کرتے ہیں) اور واقعی (یہ) ظالم لوگ (یعنی اہل شک بھی اور اہل یقین بالباطل بھی) بڑی مخالفت میں ہیں (کہ حق کو باوجود واضح ہونے کے محض عناد کے سبب قبول نہیں کرتے شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا تصرف تو اس لئے دیا گیا تھا کہ آزمائش ہو) اور (ان شبہات کا اجوبہ صحیحہ دلنویہ سے ابطال اس لئے ہوتا ہے) تاکہ جن لوگوں کو فہم (صحیح) عطا ہوا ہے وہ (ان اجوبہ و نور ہدایت سے) اس امر کا زیادہ یقین کر لیں کہ یہ (جو نبی نے پڑھا ہے وہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے سو ایمان پر زیادہ قائم ہو جاویں پھر (زیادہ یقین کی برکت سے) اُس (پر عمل کرنے) کی طرف اُن کے دل اور بھی جھک جاویں اور واقعی ان ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہ راست دکھلاتا ہے (پھر کیونکر ان کو ہدایت نہ ہو، یہ تو ایمان والوں کی کیفیت ہوئی) اور (رہ گئے) کافر لوگ (سو وہ) ہمیشہ اُس (پڑھے ہوئے حکم) کی طرف سے شک ہی میں رہیں گے (جو اُن کے دل میں شیطان نے ڈالا تھا) یہاں تک کہ اُن پر دفعۃً قیامت آجاوے (جس کی ہول ہی کافی ہے گو عذاب

نہ بھی ہوتا) یا (اس سے بڑھ کر یہ کہ) ان پر کسی بے برکت دن کا (کہ قیامت کا دن ہے) عذاب آپہنچے (اور دونوں کا جمع ہونا جو کہ واقع میں ہوگا اور بھی اشد مصیبت ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بدون مشاہدہ عذاب کفر سے باز نہ آویں گے مگر اسوقت نافع نہ ہوگا) بادشاہی اس روز اللہ ہی کی ہوگی وہ ان سب (مذکورین) کے درمیان (عملی) فیصلہ فرمادے گا۔ سو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور اچھے کام کئے ہوں گے وہ چین کے باغوں میں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا تو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

معارف و مسائل

مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ، ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں ایک نہیں، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ اسمیں اقوال مختلف ہیں مشہور اور واضح یہ ہے کہ نبی تو اس شخص کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت قوم کی اصلاح کے لئے عطا ہوا ہو اور اُس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو خواہ اُس کو کوئی مستقل کتاب اور شریعت دی جائے یا کسی پہلے نبی ہی کی کتاب اور شریعت کی تبلیغ کے لئے مامور ہو۔ پہلے کی مثال حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہم السلام کی ہے اور دوسرے کی مثال حضرت ہارون علیہ السلام کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اور اُنہی کی شریعت کی تبلیغ و تعلیم کے لئے مامور تھے۔ اور رسول وہ ہے جس کو مستقل شریعت اور کتاب ملی ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں، یہ تقسیم انسانوں کیلئے ہے۔ فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لیکر آتا ہی اسکو رسول کہنا اسکے منافی نہیں، اسکی تفصیل سورۂ مریم میں آچکی ہے۔

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ لفظ تمنیٰ اس جگہ بمعنے قرأ ہے اور اُمنیہ کے معنی قراءت کے ہیں۔ عربی لُغت کے اعتبار سے یہ معنے بھی معروف ہیں۔ اس آیت کی جو تفسیر اوپر خلاصۂ تفسیر میں لکھی ہے وہ بہت صاف بے غبار ہے۔ ابو حیان نے بحر محیط میں اور بہت سے دوسرے حضرات مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ کتب حدیث میں اس جگہ ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جو غرانیق کے نام سے معروف ہے یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے بعض حضرات نے اسکو موضوع ملحدین و زنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے اور جن حضرات نے اس کو معتبر بھی قرار دیا ہے تو اسکے ظاہری الفاظ سے جو شبہات قرآن و سُنت کے قطعی اور یقینی احکام پر عائد ہوتے ہیں انکے مختلف جوابات دیئے ہیں لیکن اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس آیتِ قرآن کی تفسیر اُس واقعہ پر موقوف نہیں بلکہ اسکا سیدھا سادہ مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوچکا ہے بلا وجہ اسکو اس آیت کی تفسیر کا جزء بنا کر شکوک و شبہات کا دروازہ کھولنا اور پھر جوابدہی کی فکر کرنا کوئی مفید کام نہیں اسلئے اسکو ترک کیا جاتا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ

اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مرگئے البتہ اُن کو دے گا اللہ

رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ

روزی خاصی اور اللہ ہے سب سے بہتر روزی دینے والا البتہ پہنچائے گا اُن کو

مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹

ایک جگہ جس کو پسند کریں گے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے تحمل والا

خلاصۂ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (یعنی دین کی حفاظت کے لئے) اپنا وطن چھوڑا (جن کا ذکر پچھلی آیت میں بھی اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ کے الفاظ سے آچکا ہے) پھر وہ لوگ (کفار کے مقابلہ میں) قتل کئے گئے یا (ویسے ہی طبعی موت سے) مرگئے (وہ ناکام و محروم نہیں، گو اُن کو دنیاوی فوائد نہ ملے مگر آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور ایک عمدہ رزق دیگا (یعنی جنت کی بیشمار نعمتیں) اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب دینے والوں سے اچھا (دینے والا) ہے (اور اس اچھے رزق کیساتھ) اللہ تعالیٰ اُن کو (مسکن بھی اچھا دیگا یعنی) ایسی جگہ لیجا کر داخل کریگا جس کو وہ (بہت ہی) پسند کریں گے (رہی یہ بات کہ بعض مہاجرین اس طرح دنیاوی فتح و نصرت اور اس کے فوائد سے محروم کیوں ہوئے اور انکے مقابلے کے کفار اُن کے قتل کرنے پر قادر کیوں ہوگئے وہ قہر الٰہی سے کیوں نہ ہلاک کردیئے گئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر کام کی حکمت و مصلحت کو خوب جاننے والا ہے (اُن کی اس ظاہری ناکامی میں بھی بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں اور) بہت حلم والا ہے (اسلئے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا)۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ

یہ سُن چکے اور جس نے بدلہ لیا جیسا کہ اس کو دُکھ دیا تھا پھر اس پر کوئی زیادتی

لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰

کرے تو البتہ اسکی مدد کرے گا اللہ، بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

یہ (مضمون تو) ہو چکا اور (آگے یہ سنو کہ) جو شخص (دشمن کو) اسی قدر تکلیف پہنچائے جس قدر (دشمن کی طرف سے) اس کو تکلیف پہنچائی گئی تھی پھر (اس برابر سرابر ہوجانے کے بعد اگر کس

دشمن کی طرف سے) اس شخص پر زیادتی کی جاوے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی ضرور امداد کریگا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت مغفرت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

چند آیات پہلے یہ مضمون مذکور ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد کرتا ہے وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ مگر مظلوم کی دو قسم ہیں ایک تو وہ جس نے دشمن سے ظلم کا کوئی انتقام اور بدلہ لیا ہی نہیں بلکہ معاف کر دیا یا چھوڑ دیا۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنے دشمن سے برابر سرابر بدلہ اور انتقام لے لیا جسکا مقتضیٰ یہ تھا کہ اب دونوں برابر ہو گئے آگے یہ سلسلہ ختم ہو مگر دشمن نے اس کے انتقام لینے کی بنا پر مشتعل ہو کر دوبارہ حملہ کر دیا اور مزید ظلم کیا تو یہ شخص پھر مظلوم ہی رہ گیا۔ اس آیت میں اس دوسری قسم کے مظلوم کی امداد کا بھی وعدہ ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند یہ ہے کہ آدمی پہلے ہی ظلم پر صبر کرے اور معاف کر دے انتقام نہ لے جیسا کہ بہت سی آیات میں اسکا ذکر ہے مثلاً فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ اور وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ اور وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ان سب آیات میں ترغیب اس کی دی گئی ہے کہ ظلم کا بدلہ نہ لے بلکہ معاف کر دے اور صبر کرے۔ قرآن کریم کی ان ہدایات سے اسی طرز کا افضل و اولیٰ ہونا ثابت ہوا۔ شخص مذکور جس نے اپنے دشمن سے برابر کا بدلہ لے لیا اُس نے اس افضل و اولیٰ اور قرآنی ہدایات مذکورہ پر عمل ترک کر دیا تو اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ اب یہ شاید اللہ کی نصرت سے محروم ہو جائے اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرما دیا إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ، یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کی اس کوتاہی پر کہ افضل و اولیٰ پر عمل نہیں کیا اس سے کوئی مواخذہ نہیں فرمائیگا بلکہ اب بھی اگر مخالف نے اس پر دوبارہ ظلم کر دیا تو اسکی امداد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ (روح معانی)

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ

یہ اس واسطے کہ اللہ لے لیتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں

وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٦١﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ

اور اللہ سنتا دیکھتا ہے یہ اسواسطے کہ اللہ وہی ہے صحیح اور جس کو

مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٦٢﴾

پکارتے ہیں اس کے سوائے وہی ہے غلط اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی پھر زمین ہو جاتی ہے سرسبز

إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿٦٣﴾ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَ

بیشک اللہ جانتا ہے چھپی تدبیریں خبردار ہے، اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور

إِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦٤﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا

اللہ وہی ہے بے پروا تعریفوں والا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے بس میں کر دیا تمہارے جو

فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ

کچھ ہے زمین میں اور کشتی کو جو چلتی ہے دریا میں اُسکے حکم سے اور تھام رکھتا ہے آسمان کو

أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٦٥﴾

اس سے کہ گر پڑے زمین پر مگر اسکے حکم سے بیشک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ ﴿٦٦﴾

اور اسی نے تم کو جلایا پھر مارتا ہے پھر زندہ کرے گا بیشک انسان ناشکر ہے

ع ۱۵

خلاصۂ تفسیر

یہ (مؤمنین کا غالب کر دینا) کہ اللہ تعالیٰ (کی قدرت بڑی کامل ہے وہ) رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے (یہ کائناتی انقلاب ایک قوم کو دوسری پر غالب کرنیوالے انقلاب سے زیادہ عجیب ہے) اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ (ان سب کے اقوال واحوال کو) خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے (وہ کفار کے ظلم اور مؤمنین کی مظلومیت کو سنتا دیکھتا ہے اس لئے وہ سب حالات سے باخبر بھی ہے اور قوت و قدرت بھی اُس کی سب سے بڑی ہے یہ مجموعہ سبب ہوگیا کمزوروں کو غالب کرنے کا) اور (نیز) یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ (اسمیں کسی طاقت کی مجال نہیں جو اسمیں اللہ تعالیٰ کی مزاحمت کرے کیونکہ) اللہ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں وہ بالکل ہی لچر ہیں۔ (کہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج بھی ہیں کمزور بھی وہ کیا اللہ کی مزاحمت کر سکتے ہیں) اور اللہ ہی عالیشان سب سے بڑا ہے (اس میں غور کرنے سے توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کے علاوہ) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہوگئی (پھر) بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان سب باتوں کی خبر رکھنے والا ہے (اسلئے بندوں کی ضرورتوں پر مطلع ہو کر اُن کے مناسب مہربانی فرماتا ہے) سب اُسی کا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ایسا ہے جو کسی کا محتاج نہیں ہر طرح کی تعریف کے لائق ہے (اور اے مخاطب) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا ہے

زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو (بھی) کہ وہ دریا میں اُسکے حکم سے چلتی ہے اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے ہاں مگر یہ کہ اُسی کا حکم ہو جاوے (تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور بندوں کے گناہ اور بُرے اعمال اگرچہ ایسا حکم ہو جانے کے مقتضی ہیں مگر پھر بھی جو ایسا حکم نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ) بالیقین اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑی شفقت اور رحمت فرمانے والا ہے اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی پھر (وقت موعود پر) تم کو موت دیگا پھر (قیامت میں) تم کو زندہ کرے گا (ان انعامات و احسانات کا تقاضا تھا کہ لوگ توحید اور اللہ کے شکر کو اختیار کرتے مگر) واقعی انسان ہے بڑا ناشکر (کہ اب بھی کفر و شرک سے باز نہیں آتا۔ مُراد سب انسان نہیں بلکہ وہی جو اس ناشکری میں مبتلا ہوں)۔

معارف و مسائل

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ، یعنی زمین کی سب چیزوں کو انسان کا مسخر بنا دیا۔ مسخر بنانے کے ظاہری اور عام معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ اس کے حکم کے تابع چلے۔ اس معنے کے لحاظ سے یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ زمین کے پہاڑ اور دریا اور درندے پرندے اور ہزاروں چیزیں انسان کے حکم کے تابع تو نہیں چلتیں مگر کسی چیز کو کسی شخص کی خدمت میں لگا دینا جو ہر وقت یہ خدمت انجام دیتی رہے یہی درحقیقت اس کے لئے تسخیر ہی ہے اگرچہ وہ اس کے حکم سے نہیں بلکہ مالکِ حقیقی کے حکم سے یہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسی لئے یہاں ترجمہ تسخیر کا کام میں لگا دینے سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ ان سب چیزوں کو انسان کا تابع حکم بھی بنا دیتے مگر اسکا نتیجہ خود انسان کے حق میں مضر پڑتا، کیونکہ انسانوں کی طبائع، خواہشات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ایک انسان دریا کو اپنا رُخ دوسری طرف موڑنے کا حکم دیتا اور دوسرا اسکے خلاف تو انجام بجز فساد کے کیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ان سب چیزوں کو تابع حکم تو اپنا ہی رکھا مگر تسخیر کا جو اصل فائدہ تھا وہ انسان کو پہنچا دیا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ

ہر اُمت کے لئے ہم نے مقرر کر دی ایک راہ بندگی کی کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی، سو چاہئے تجھ سے جھگڑا نہ کریں اس کام میں اور

إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ

تو بُلائے جا اپنے رب کی طرف، بیشک تو ہے سیدھی راہ پر سوجھ والا اور اگر تجھ سے جھگڑنے لگیں تو تُو کہہ

اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن

فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ

جس چیز میں تمھاری راہ جُدا جُدا تھی کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان

وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾

اور زمین میں یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں یہ اللہ پر آسان ہے

خلاصۂ تفسیر

(جتنی اُمتیں اہل شرائع گزری ہیں اُن میں) ہم نے ہر اُمت کے واسطے ذبح کرنے کا طریق مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریقہ پر ذبح کیا کرتے تھے تو (اعتراض کرنے والے) لوگوں کو چاہیے کہ اس امر (ذبح) میں آپ سے جھگڑا نہ کریں (اُن کو تو آپ سے بحث اور جھگڑا کرنے کا حق نہیں مگر آپ کو حق ہے اس لئے) آپ (ان کو) اپنے رب (یعنی اسکے دین) کی طرف بُلاتے رہیئے آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں۔ (صحیح راستہ پر چلنے والے کو حق ہوتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے والے کو اپنی طرف بُلائے غلط راستہ والے کو یہ حق نہیں ہوتا) اور اگر (اسپر بھی) یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے رہیں تو آپ یہ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے کاموں کو خوب جانتا ہے (وہی تم کو سمجھے گا آگے اسی کی توضیح یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن (عملی) فیصلہ فرمادیگا جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے (آگے اسی کی تائید ہے کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے (اور علمِ الٰہی میں محفوظ ہونے کے ساتھ یہ بھی) یقینی بات ہے کہ یہ (یعنی ان کے سب اقوال و اعمال) نامۂ اعمال میں (بھی محفوظ) ہیں (بس) یقیناً (ثابت ہوگیا کہ) یہ (فیصلہ کرنا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک آسان ہے۔

معارف و مسائل

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، یہی مضمون تقریباً انہیں الفاظ کے ساتھ اسی سورت کی آیت ۳۴ میں گزر چکا ہے مگر دونوں جگہ لفظ منسک کے معنے در مراد میں فرق ہے۔ وہاں نسک اور منسک قربانی کے معنے میں بضمن احکام حج آیا تھا اور اسلئے وہاں واؤ کیساتھ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ فرمایا گیا۔ یہاں منسک کے دوسرے معنے (یعنی احکام ذبائح یا علم احکام شرعیہ) اور دوسرا مفہوم مراد ہے اور یہ ایک مستقل حکم ہے اسلئے اسکو عطف کر کے نہیں بیان کیا گیا۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ بعض کفار مسلمانوں سے اُن کی ذبائح کے متعلق فضول بحث و جدال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے مذہب کا یہ حکم عجیب ہے کہ جس جانور کو تم خود اپنے ہاتھ سے قتل کردو وہ تو حلال اور جس کو اللہ تعالیٰ براہِ راست مار دے یعنی عام مُردار جانور وہ حرام۔ ان کے اس جدال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی (کما رواہ الحاکم

وصححہ والبیہقی فی الشعب عن علی بن حسن وابن عباسؓ انہا نزلت بسبب قول الخزاعیین۔ (روح المعانی) تو یہاں منسک کے معنی طریقۂ ذبح کے ہونگے اور حاصل جواب کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک اُمت اور شریعت کے لئے ذبیحہ کے احکام الگ الگ رکھے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت ایک مستقل شریعت ہے اسکے احکام کا معارضہ کسی پہلی شریعت کے احکام سے کرنا بھی جائز نہیں چہ جائیکہ تم اُس کا معارضہ خالص اپنی رائے اور خیال باطل سے کرتے ہو یعنی مُردار جانور کا حلال نہ ہونا تو اس اُمت و شریعت کیساتھ مخصوص نہیں سب پچھلی شریعتوں میں بھی حرام رہا ہے تو تمہارا یہ قول تو بالکل ہی بے بنیاد ہے اس بے بنیاد خیال کی بنا پر صاحبِ شریعت نبی سے مجادلہ و معارضہ کرنا حماقت ہی حماقت ہے (کذا بین فی روح المعانی معنی الآیۃ)۔ اور جمہور مفسرین نے اس جگہ لفظ منسک عام احکام شریعت کے معنے میں لیا ہے کیونکہ اصل لُغت میں مَنسک کے معنی ایک معین جگہ کے ہیں جو کسی خاص عمل خیر یا شر کے لئے مقرر ہو اور اسی لئے احکامِ حج کو مناسک الحج کہا جاتا ہے کہ انہیں خاص خاص مقامات خاص احکام و اعمال کے لئے مقرر ہیں (ابن کثیر) اور قاموس میں لفظ نسک کے معنی عبادت کے لکھے ہیں قرآن میں اَرِنَا مَنَاسِكَنَا اسی معنے کے لئے آیا ہے مناسک سے مُراد عبادت کے احکام شرعیہ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ دوسری تفسیر بھی روایت کی گئی ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، قرطبی، رُوح المعانی وغیرہ میں اسی معنی عام کی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے اور آیت کا سیاق و سباق بھی اسی کا قرینہ ہے کہ منسک سے مراد شریعت اور اسکے احکام عام ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین اور مخالفین اسلام جو شریعت محمدیہ اسلام میں جدال اور جھگڑے کرتے ہیں اور بنیاد یہ ہوتی ہے کہ انکے آبائی مذہب میں وہ احکام نہ تھے تو وہ سُن لیں کہ پچھلی کسی شریعت و کتاب سے نئی شریعت و کتاب کا معارضہ مجادلہ کرنا باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو اسکے وقت میں ایک خاص شریعت اور کتاب دی ہے جسکا اتباع اُس اُمت پر اُسوقت تک درست تھا جب تک کوئی دوسری اُمت اور دوسری شریعت اللہ تعالیٰ کیطرف سے نہ آگئی۔ اور جب دوسری شریعت آگئی تو اتباع اس جدید شریعت کا کرنا ہے اگر اسکا کوئی حکم پہلی شریعتوں کے مخالف ہے تو پہلے حکم کو منسوخ اور اسکو ناسخ سمجھا جائیگا اس لئے اس صاحبِ شریعت سے کسی کو مجادلہ اور منازعت کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ آیت کے آخری الفاظ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ کا بھی حاصل ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مستقل شریعت لیکر آگئے تو کسی کو اسکا حق نہیں کہ اُن کی شریعت کے احکام میں جدال اور نزاع پیدا کرے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ پہلی تفسیر اور اس دوسری تفسیر میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا ہے کہ آیت کا نزول کسی خاص نزاع دربارہ ذبائح کے سبب سے ہوا ہو مگر آیت کے عام الفاظ تمام احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں اور اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص مورد کا نہیں ہوتا۔ تو حاصل دونوں تفسیروں کا یہی ہوجائیگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو الگ الگ شریعت دی ہے جن میں احکامِ جزئیہ مختلف بھی

ہوتے ہیں تو کسی پچھلی شریعت پر عمل کرنے والے کو نئی شریعت سے معارضہ اور نزاع کا کوئی حق نہیں بلکہ اُسپر اس نئی شریعت کا اتباع واجب ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا گیا، اُدْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۖ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ، یعنی آپ ان لوگوں کی چہ میگوئیوں اور نزاع و جدال سے متأثر نہ ہوں بلکہ برابر اپنے منصبی فریضہ دعوت الی الحق میں مشغول رہیں کیونکہ آپ حق اور صراط مستقیم پر ہیں آپکے مخالف ہی راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شریعتِ محمدیہ کے نزول کے بعد کسی پہلی شریعت پر ایمان رکھنے والے مثلاً یہودی نصرانی وغیرہ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ خود قرآن نے ہمارے لئے اس آیت میں یہ کہہ کر گنجائش دی ہے کہ ہر شریعت اللہ ہی کیطرف سے ہے اسلئے اگر زمانہ اسلام میں بھی ہم شریعت موسویہ یا عیسویہ پر عمل کرتے رہیں تو مسلمانوں کو ہم سے اختلاف نہ کرنا چاہیئے کیونکہ آیت میں ہر اُمت کو شریعت خاصہ دینے کا ذکر کرنے کے بعد پوری دُنیا کے لوگوں کو یہ حکم بھی دیدیا گیا ہے کہ شریعت محمدیہ کے قائم ہو جانے کے بعد وہ اس شریعت کی مخالفت نہ کریں یہ نہیں فرمایا کہ مسلمان اُن کی سابقہ شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ بولیں اور اس آیت کے بعد کی آیات سے یہ مضمون اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے جنمیں شریعت اسلام کے خلاف مجادلہ کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری ان حرکتوں کو خوب جانتا ہے وہی اسکی سزا دے گا۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ

اور پوجتے ہیں اللہ کے سوائے اُس چیز کو جس چیز کی سند نہیں اُتاری اُسنے اور جس کی خبر نہیں

بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۷۱ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا

اُن کو اور بے انصافوں کا کوئی نہیں مددگار اور جب سُنائے اُن کو ہماری آیتیں

بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ

صاف تو پہچانے تو منکروں کے منہ کی بُری شکل نزدیک ہوتے ہیں کہ حملہ کر پڑیں

بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ

اُن پر جو پڑھتے ہیں اُنکے پاس ہماری آیتیں تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ایک چیز اس سے بدتر وہ

اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۷۲ يٰٓاَيُّهَا

آگ ہے اسکا وعدہ کر دیا ہے اللہ نے منکروں کو اور وہ بہت بُری ہے پھر جانے کی جگہ اے

ع ۱۶

النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

لوگو ایک مثل کہی ہے سو اس پر کان رکھو جن کو تم پوجتے ہو

دُونِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ

اللہ کے سوائے ہرگز نہ بنا سکیں گے ایک مکھی　اگرچہ سارے جمع ہو جائیں　اور　اگر کچھ چھین لے اُن سے

شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا

مکھی چھڑا نہ سکیں وہ اُس سے　بودا ہے چاہنے والا　اور جن کو چاہتا ہے　اللہ کی قدر

اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

نہیں سمجھے جیسی اسکی قدر ہے　بیشک اللہ زور آور ہے　زبردست

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مشرک) لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن (کے جواز عبادت) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی حجت (اپنی کتاب میں) نہیں بھیجی اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی) دلیل ہے اور (قیامت میں) جب (ان کو شرک پر سزا ہونے لگے گی تو) ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (نہ قولاً کہ انکے فعل کے استحسان پر کوئی حجت پیش کر سکے نہ عملاً کہ ان کو عذاب سے بچالے) اور (ان لوگوں کو اسی گمراہی اور اہل حق سے عناد رکھنے میں یہاں تک غلو ہے کہ) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں (متعلق توحید وغیرہ کے) جو کہ (اپنے مضامین میں) خوب واضح ہیں (اہل حق کی زبان سے) پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم کافروں کے چہروں میں (بوجہ ناگواری باطنی کے) برے آثار دیکھتے ہو (جیسے چہرے پر بل پڑ جانا۔ ناک چڑھ جانا۔ تیور بدل جانا اور ان آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) قریب ہے کہ اُن لوگوں پر (اب) حملہ کر بیٹھیں (گے) جو ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھتے ہیں یعنی حملہ کا شبہ ہمیشہ ہوتا ہے اور گاہ گاہ اس حملہ کا تحقق بھی ہوا ہے پس یکادون استمرار کے اعتبار سے فرمایا) آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (تم کو جو یہ آیات قرآنیہ سُنکر ناگواری ہوئی تو) کیا میں تم کو اس (قرآن) سے (بھی) زیادہ ناگوار چیز بتلا دوں وہ دوزخ ہے (کہ) اسکا اللہ تعالیٰ نے کافروں سے وعدہ کیا ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے (یعنی قرآن سے ناگواری کا نتیجہ ناگوار دوزخ ہے اس ناگواری کا تو غیظ سے غضب سے انتقام سے کچھ تدارک بھی کر لیتے ہو مگر اُس ناگواری کا کیا علاج کرو گے جو دوزخ سے ہوگی۔ آگے ایک بدیہی دلیل سے شرک کا ابطال ہے کہ) اے لوگو ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سُنو (وہ یہ ہے کہ) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک (ادنیٰ) مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہو جاویں اور (پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کچھ (انکے چڑھاوے میں سے) چھین لے جائے تو اس کو (تو) اس سے چھڑا (ہی) نہیں سکتے ایسا عابد بھی لچر اور ایسا

معبود بھی لچر (افسوس ہے) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہئے تھی (کہ اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے) وہ نہ کی (کہ شرک کرنے لگے حالانکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے۔ (تو عبادت اسکا خالص حق تھا نہ کہ غیر قوی اور غیر عزیز کا جس کی عدم قوت باوضح وجوہ معلوم ہو چکی)۔

معارف و مسائل

شرک بت پرستی کی احمقانہ حرکت کی ایک مثال سے توضیح

ضُرِبَ مَثَلٌ، ضرب مثل کا لفظ عام طور پر جو کسی خاص قصہ کی تمثیل کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں ضرب مثل سے یہ صورت مراد نہیں بلکہ شرک و بت پرستی کی حماقت کو ایک واضح مثال سے بیان کرنا ہے کہ یہ بت جن کو تم لوگ اپنا کارساز سمجھتے ہو یہ تو ایسے بے کس بے بس ہیں کہ سب ملا کر ایک مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے اور پیدا کرنا تو بڑا کام ہے تم روز ان کے سامنے مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانے کی چیزیں رکھتے ہو اور مکھیاں اُس کو لے جاتی ہیں، ان سے اتنا تو ہوتا نہیں کہ مکھیوں سے اپنی چیز ہی کو بچا لیں یہ تمہیں کسی آفت سے کیا بچائیں گے اسی لئے قرآن میں ان کی جہالت اور بیوقوفی کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ یعنی جس کا معبود ہی ایسا بے بس ہو اسکا عابد اُس سے بھی زیادہ کمزور ہوگا مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ یعنی کیسے بے وقوف احسان فراموش نادان لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ کی کچھ قدر نہ پہچانی کہ ایسے عظیم الشان قدرت والے کے ساتھ ایسے بے بس بے شعور پتھروں کو برابر کر دیا۔ واللہ اعلم

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ

اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں اللہ سنتا

بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

دیکھتا ہے جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے اور اللہ تک پہنچ ہے

الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ

ہر کام کی اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ ۩ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ

اور بھلائی کرو تاکہ تمہارا بھلا ہو اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیئے

جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ

اسکے واسطے محنت، اُس نے تم کو پسند کیا اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ

دین تمہارے باپ ابراہیم کا اُسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان پہلے سے اور اِس

سجدۃ عند الشافعی

هٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

قرآن میں تاکہ رسول ہو بتانے والا تم پر اور تم ہو بتانے والے لوگوں

النَّاسِ ۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۗ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ

پر سو قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑو اللہ کو وہ تمہارا مالک ہے

فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾ ع

سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار

ع ۱۰ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے) منتخب کرلیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام (انبیاء نبیوں کے پاس) پہنچانے والے (مقرر فرما دیتا ہے) اور (اسی طرح) آدمیوں میں سے بھی جس کو چاہے عامۂ ناس کے لئے احکام پہنچانے والے مقرر کردیتا ہے یعنی رسالت کا مدار اصطفاء خداوندی پر ہے اسمیں کچھ ملکیت یعنی فرشتہ ہونے کی خصوصیت نہیں بلکہ جس طرح ملکیت کے ساتھ رسالت جمع ہوسکتی ہے جس کو مشرکین بھی ؛ نتے ہیں چنانچہ فرشتوں کے رسول ہونے کی وہ خود تجویز کرتے تھے اسی طرح بشریت کیساتھ بھی وہ جمع ہوسکتی ہے رہا یہ کہ اصطفا کسی ایک خاص کیساتھ کیوں واقع ہوا تو ظاہری سبب تو اسکا خصوصیاتِ احوال ان رُسُل کے ہیں اور یہ) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (یعنی) وہ اُن (سب فرشتوں اور آدمیوں) کی آئندہ اور گزشتہ حالتوں کو (خوب) جانتا ہے (تو حالتِ موجودہ کو بدرجۂ اولیٰ جانے گا غرض سب احوال مسموعہ مبصرہ اس کو معلوم ہیں ان میں بعض کا حال مقتضی اس اصطفا کا ہوگیا) اور (حقیقی سبب اسکا یہ ہے کہ) تمام کاموں کا مدار اللہ ہی پر ہے (یعنی وہ مالک مستقل بالذات و فاعل مختار ہے اسکا ارادہ مرجح بالذات ہے۔ اس ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں، پس سبب حقیقی ارادہ خداوندی ہے اور اسکا سبب پوچھنا لغو ہے وھو معنی قولہ تعالیٰ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ یعنی اللہ تعالیٰ سے اسکے کسی فعل کا سبب دریافت کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

(آگے ختم سورت پر اول فروع و شرائع کا بیان ہے اور ملۃ ابراہیم پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور اسکی ترغیب کے لئے بعض مضامین ارشاد فرمائے ہیں) اے ایمان والو (تم اُصول کے قبول کرنے کے بعد فروع کی بھی پابندی رکھو خصوصاً نماز کی، پس تم) رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور (عموماً دوسرے فروع بھی بجا لاکر) اپنے رب کی عبادت کیا کرو اور نیک کام کیا کرو۔ اُمید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے، اسنے تم کو (دوسری اُمتوں سے) ممتاز فرمایا (جیسا کہ آیت جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا وغیرہ میں مذکور ہے) اور تم پر دین

میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی (اور اے ایمان والو جس اسلام کا تم کو امر کیا گیا ہے کہ احکام کی پوری بجا آوری ہو اور یہی ملتِ ابراہیمی ہے) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ تمہارے لئے رسول اللہ گواہ ہوں اور (اس شہادتِ رسول کے قبل) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء ہونگے اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہونگی ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو (اور رسُول کی شہادت سے تمہاری شہادت کی تصدیق ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو) سو (ہمارے احکام کی پوری بجا آوری کرو پس) تم لوگ (خصوصیت کیساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (بقیہ احکام میں بھی) اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو (یعنی عزم وہمت کیساتھ دین کے احکام بجالاؤ، غیر اللہ کی رضا وعدم رضا اور اپنے نفس کی مصلحت ومضرت کی طرف التفات مت کرو) وہ تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

معارف و مسائل

سُورۂ حج کا سجدۂ تلاوت | یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، سُورۂ حج میں ایک آیت تو پہلے گزر چکی ہے جس پر سجدۂ تلاوت کرنا باتفاق واجب ہے۔ اس آیت پر جو یہاں مذکور ہے سجدۂ تلاوت کے وجوب میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک اس آیت پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں کیونکہ اسمیں سجدہ کا ذکر رکوع وغیرہ کیساتھ آیا ہے جس سے نماز کا سجدہ مراد ہونا ظاہر ہے جیسے وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ میں سب کا اتفاق ہے کہ سجدۂ نماز مراد ہے، اس کی تلاوت کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا اسی طرح آیت مذکورہ پر بھی سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدۂ تلاوت واجب ہے اُن کی دلیل ایک حدیث ہے جسمیں یہ ارشاد ہے کہ سُورۂ حج کو دوسری سورتوں پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اسمیں دو سجدۂ تلاوت ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک اس روایت کے ثبوت میں کلام ہے تفصیل اس کی کتبِ فقہ و حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، لفظ جہاد اور مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اسکے لئے مشقت برداشت کرنے کے معنے میں آتا ہے۔ کفار کیساتھ قتال میں بھی مسلمان اپنے قول فعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں اسلئے اسکو بھی جہاد کہا جاتا ہے اور حقِ جہاد سے مراد اسمیں پورا اخلاص اللہ کیلئے ہونا ہے جسمیں کسی دنیوی نام ونمود یا مالِ غنیمت کی طمع کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حقِ جہاد یہ ہے کہ جہاد میں اپنی پوری طاقت خرچ کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت پر کان نہ لگائے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ جہاد کے معنی

عام عبادات اور احکام الٰہیہ کی تعمیل میں اپنی پوری طاقت پورے اخلاص کیساتھ خرچ کرنے کے لئے ہیں ضحاک اور مقاتل نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اعملوا للہ حق عملہ واعبدوہ حق عبادتہ یعنی عمل کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اسکا حق ہے اور عبادت کرو اللہ کی جیسا کہ اُس کا حق ہے۔ اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ یہاں جہاد سے مراد اپنے نفس اور اسکی بیجا خواہشات کے مقابلہ میں جہاد کرنا ہے اور یہی حق جہاد ہے۔ امام بغوی وغیرہ نے اس قول کی تائید میں ایک حدیث بھی حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت جو جہاد کفار کے لئے گئی ہوئی تھی واپس آئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قدمتم خیر مقدم من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر قال (یعنی المجاهدة) مجاهدة العبد لهواه رواه البیهقی وقال هذا اسناد فیه ضعف. یعنی تم لوگ خوب واپس آئے چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کیطرف یعنی اپنے نفس کی خواہشات بیجا کے مقابلہ کا جہاد اب بھی جاری ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے روایت کیا ہے مگر کہا ہے کہ اسکے اسناد میں ضعف ہے۔

فائدہ | تفسیر مظہری میں اس دوسری تفسیر کو اختیار کر کے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ صحابۂ کرام جب مقابلۂ کفار میں جہاد کر رہے تھے خواہشاتِ نفسانی کے مقابلہ کا جہاد تو اسوقت بھی جاری تھا مگر حدیث میں اسکو واپسی کے بعد ذکر کیا ہے اسمیں اشارہ یہ ہے کہ اہوار نفس کے مقابلہ کا جہاد اگرچہ میدان کارزار میں بھی جاری تھا مگر عادۃً یہ جہاد شیخ کامل کی صحبت پر موقوف ہے اسلئے وہ جہاد سے واپسی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے وقت ہی شروع ہوا۔

اُمتِ محمدیہ اللہ تعالیٰ کی منتخب اُمت ہے

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ، حضرت واثلہ ابن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمام بنی اسماعیل میں کنانہ کا انتخاب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کا پھر قریش میں سے بنی ہاشم کا پھر بنی ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔ (رواہ مسلم۔ مظہری)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ دین میں تنگی نہ ہونے کا مطلب بعض حضرات نے یہ بیان فرمایا کہ اس دین میں ایسا کوئی گناہ نہیں ہے جو توبہ سے معاف نہ ہوسکے اور عذابِ آخرت سے خلاصی کی کوئی صورت نہ نکلے۔ بخلاف پچھلی اُمتوں کے کہ اُن میں بعض گناہ ایسے بھی تھے جو توبہ کرنے سے بھی معاف نہ ہوتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ تنگی سے مُراد وہ سخت و شدید احکام ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کئے گئے تھے جن کو قرآن میں اِصر اور اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اس اُمت پر ایسا کوئی حکم فرض نہیں کیا گیا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ تنگی سے مُراد وہ تنگی ہے جس کو انسان برداشت نہ کرسکے اس دین کے احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو فی نفسہ ناقابلِ برداشت ہو۔ باقی رہی تھوڑی بہت محنت و مشقت

تو وہ دُنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے پھر ملازمت، تجارت و صنعت میں کیسی کیسی محنتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں مگر اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام بڑے سخت و شدید ہیں۔ ماحول کے غلط اور مخالف ہونے یا ملک و شہر میں اُسکا رواج نہ ہونے کے سبب جو کسی عمل میں دشواری پیش آئے وہ عمل کی تنگی اور تشدد نہیں کہلائے گی۔ کرنے والے کو اس لئے بھاری معلوم ہوتی ہے کہ ماحول میں کوئی اُسکا ساتھ دینے والا نہیں۔ جس ملک میں روٹی کھانے پکانے کی عادت نہ ہو وہاں روٹی حاصل کرنا کسقدر دشوار ہو جاتا ہے وہ سب جانتے ہیں مگر اسکے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روٹی پکانا بڑا سخت کام ہے۔

اور حضرت قاضی ثناء اللہ رہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ دین میں تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو ساری اُمتوں میں سے اپنے لئے منتخب فرمالیا ہے اسکی برکت سے اس اُمت کے لوگوں کو دین کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اُٹھانا بھی آسان بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے۔ محنت سے راحت ملنے لگتی ہے خصوصاً جب دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جائے تو سارے بھاری کام بھی ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ حدیث صحیح میں حضرت انس رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک کردی گئی ہے۔ (رواہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ)

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، یعنی یہ ملت ہے تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی۔ یہ خطاب دراصل مؤمنین قریش کو ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں ہیں پھر سب لوگ قریش کے تابع ہو کر اس فضیلت میں شامل ہو جاتے ہیں جیسے حدیث میں ہے الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم تبع لمسلمھم وکافرھم تبع لکافرھم رواہ البخاری ومسلم (مظہری) یعنی سب لوگ اس دین میں قریش کے تابع ہیں، مسلمان مسلمان قریش کے تابع اور کافر لوگ کافر قریش کے تابع ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ کا خطاب سب اُمت کے مسلمانوں کو ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا ان سب کے لئے باپ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُمت کے روحانی باپ ہیں جیسا کہ ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہونا ظاہر و معروف ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا، یعنی حضرت ابراہیمؑ ہی نے اُمتِ محمدیہ اور تمام اہلِ ایمان کا نام قرآن سے پہلے مُسلم تجویز کیا ہے درخود قرآن میں بھی، جیسا کہ ابراہیمؑ کی دُعا قرآنِ کریم میں یہ منقول ہے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ اور قرآن میں جو اہلِ ایمان کا نام مُسلم رکھا گیا ہے اس کے رکھنے والے اگرچہ براہِ راست ابراہیم علیہ السلام نہیں

مگر قرآن سے پہلے اُن کا یہ نام تجویز کر دینا قرآن میں اسی نام سے موسوم کرنے کا سبب بنا اس لئے اس کی نسبت بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی گئی۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی آپ محشر میں گواہی دیں گے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے احکام اس اُمت کو پہنچا دیئے تھے۔ اور اُمتِ محمدیہ اسکا اقرار کرے گی مگر دوسرے انبیاء جب یہ کہیں گے تو اُن کی اُمتیں منکر جائیں گی اُسوقت اُمتِ محمدیہ شہادت دے گی کہ بیشک سب انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے تھے دوسری اُمتوں کیطرف سے ان کی شہادت پر یہ جرح ہوگی کہ ہمارے زمانے میں تو اُمتِ محمدیہ کا وجود بھی نہ تھا یہ ہمارے معاملے میں کیسے گواہ بن سکتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جرح کا یہ جواب ہوگا کہ بیشک ہم موجود نہ تھے مگر ہم نے یہ بات اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے جن کے صدق میں کوئی شک شبہ نہیں اس لئے ہم یہ گواہی دے سکتے ہیں۔ تو اُن کی شہادت قبول کی جائے گی یہ مضمون اس حدیث کا ہے جس کو بخاری وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، مُراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں پر ایسے احسانات عظیمہ فرمائے ہیں جن کا ذکر اُوپر آیا ہے تو تمھارا فرض ہے کہ احکام الٰہیہ کی پابندی میں پُوری کوشش کرو اُن میں سے اس جگہ نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ بدن کے متعلقہ اعمال واحکام میں نماز سب سے اہم ہے اور مال سے متعلقہ احکام میں زکوٰۃ سب سے زیادہ اہم گویا مُراد تمام ہی احکامِ شرعیہ کی پابندی کرنا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ، یعنی اپنے سب کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو، اُسی سے مدد مانگو اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد اس اعتصام سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگا کرو کہ تم کو تمام مکروہات دُنیا و آخرت سے محفوظ رکھے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ کے معنے یہ ہیں کہ قرآن و سُنت کے ساتھ تمسک کرو انکو ہر حال میں لازم پکڑو جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:-

تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله رواه مالك فى الموطاء مرسلاً۔ (مظہری)	میں نے تمھارے لئے دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ تم جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے اُس کے رسُول کی سُنت۔

تم تفسير سورة الحج بعون الله سبحانه وبحمده نعتصم هو مولانا ونعم النصير

الحمد للہ سُورۂ حج کی تفسیر کا اکثر حصہ اشہرِ حج کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں پُورا ہوا، پُوری سُورت کی تفسیر ساتھ روز میں مکمل ہوئی پانچ روز ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے اور دو روز محرم ۱۳۹۱ھ کے للہ الحمد اولہ وآخرہ وبہ استعین فی تکمیل ما بقی وما ذالک علی اللہ بعزیز

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَمَانَ عَشَرَةَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ مؤمنون مکہ میں اُتری اور اُس کی ایک سو اٹھارہ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿٢﴾

کام نکال لے گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿٣﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾

اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٥﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٦﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ

ہاتھ کے مال باندیوں پر سو اُن پر نہیں کچھ الزام پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٧﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ

سوا سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے اور جو اپنی امانتوں سے

وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩﴾

اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں

وقف لازم

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١﴾

وہی ہیں میراث لینے والے جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

فضائل و خصوصیاتِ سورۂ مؤمنون مسند احمد میں حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ کی روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو پاس والوں کے کان میں ایسی آواز ہوتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز ہوتی ہے۔ ایک روز آپکے قریب ایسی ہی آواز سُنی گئی تو ہم ٹھہر گئے کہ تازہ آئی ہوئی وحی سُن لیں۔ جب وحی کی خاص کیفیت سے فراغت ہوئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ گئے اور یہ دُعا کرنے لگے اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضَ عَنَّا وَاَرْضِنَا (یعنی یا اللہ ہمیں زیادہ دے کم نہ کر اور ہماری عزت بڑھا ذلیل نہ کر اور ہمیں بخشش فرما، محروم نہ کر اور ہمیں دوسروں پر ترجیح دے ہم پر دوسروں کو ترجیح نہ دے اور ہم سے راضی ہو اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے) اسکے بعد فرمایا کہ مجھ پر اسوقت دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص اُن پر پُورا پورا عمل کرے تو وہ (سیدھا) جنت میں جائیگا۔ پھر یہ دس آیتیں جو اُوپر لکھی گئی ہیں پڑھ کر سنائی۔ (ابن کثیر)

اور نسائی نے کتاب التفسیر میں یزید بن بابنوس سے نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خُلق کیسا اور کیا تھا، اُنھوں نے فرمایا آپ کا خُلق یعنی طبعی عادت وہ تھی جو قرآن میں ہے اس کے بعد یہ دس آیتیں تلاوت کر کے فرمایا کہ بس یہی خُلق و عادت تھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔ (ابن کثیر)

خلاصۂ تفسیر

بالتحقیق اُن مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو (تصحیح عقائد کے ساتھ صفات ذیل کیساتھ بھی موصوف ہیں یعنی وہ) اپنی نماز میں (خواہ فرض ہو یا غیر فرض) خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو (یعنی فضول) باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی (حرام شہوت رانی سے) حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی، لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ اُن پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو اسکے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا (جو کسی عقد کے ضمن میں کیا ہو یا ویسے ہی ابتداءً کیا ہو) خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس (بریں) کے وارث ہوں گے (اور) وہ اسمیں ہمیشہ رہیں گے

معارف و مسائل

فلاح کیا چیز ہے اور کہاں اور کیسے ملتی ہے | قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، لفظ فَلاح قرآن و سنت میں بکثرت استعمال ہوا ہے اذان و اقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کو فلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ فلاح کے معنے یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہو اور ہر تکلیف دُور ہو (قاموس) یہ لفظ جتنا مختصر ہے اتنا ہی جامع ایسا ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ کسی چیز کی خواہش کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مکمل فلاح کہ ایک مراد بھی ایسی نہ رہے جو پُوری نہ ہو اور ایک بھی تکلیف ایسی نہ رہے جو دُور نہ ہو، یہ دُنیا میں کسی بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں چاہے دُنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہفت اقلیم ہو یا سب سے بڑا رسُول اور پیغمبر ہو۔ اس دُنیا میں کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز خلاف طبع پیش نہ آئے اور جو خواہش جس وقت دل میں پیدا ہو بلا تاخیر پوری ہو جائے اگر اور بھی کچھ نہیں تو ہر نعمت کے لئے زوال اور فنا کا کھٹکا اور ہر تکلیف کے واقع ہو جانے کا خطرہ، اس سے کون خالی ہو سکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ فلاح کامل تو ایسی چیز ہے جو اس مُلک دُنیا میں دستیاب ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ دُنیا تو دار التکلیف والمحنت بھی ہے اور اس کی کسی چیز کو بقاء و قرار بھی نہیں۔ یہ متاعِ گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے جس کا نام جنّت ہے۔ وہی ایسا ملک ہے جس میں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار حاصل ہوگی وَلَهُمْ مَا يَدَّعُوْنَ (یعنی ان کو ملے گی ہر وہ چیز جو وہ چاہیں گے) اور وہاں کسی ادنیٰ رنج و تکلیف کا گزر نہ ہوگا اور ہر شخص یہ کہتا ہوا وہاں داخل ہوگا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙالَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم دُور کر دیا بلا شبہ ہمارا رب معاف کرنے والا قدردان ہے جس نے ہمیں اپنے فضل سے ایک مقام میں پہنچا دیا جس کی ہر چیز قائم و دائم ہے۔ اس آیت میں یہ بھی اشارہ موجود ہے کہ دار دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کو کبھی کوئی رنج و غم نہ پہنچا ہو اسلئے جنّت میں قدم رکھتے ہوئے ہر شخص یہ کہے گا کہ اب ہمارا غم دُور ہوا۔ قرآن کریم نے سورۂ اعلیٰ میں جہاں فلاح حاصل کرنے کا نسخہ بتلایا کہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى اسکے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ فرمایا کہ کامل فلاح کی جگہ اصل میں آخرت ہے صرف دُنیا سے دل لگانا طالب فلاح کا کام نہیں فرمایا بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، یعنی تم لوگ دُنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے کہ اُسی میں ہر مُراد حاصل اور ہر تکلیف دُور ہو سکتی ہے اور وہ باقی رہنے والی بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کامل و مکمل فلاح تو صرف جنّت ہی میں مل سکتی ہے دُنیا اُسکی جگہ ہی نہیں۔ البتہ اکثری حالات کے اعتبار سے فلاح یعنی بامراد ہونا اور تکلیفوں سے نجات پانا یہ دُنیا میں بھی

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے کا وعدہ ان مؤمنین سے کیا ہے جنہیں وہ سات صفات موجود ہوں جن کا ذکر ان آیات کے اندر آیا ہے۔ یہ فلاح عام اور شامل ہے جسمیں آخرت کی کامل مکمل فلاح بھی داخل ہے اور دنیا میں جسقدر فلاح حاصل ہونا ممکن ہے وہ بھی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ صفات مذکورہ کے حامل مؤمنین کو آخرت کی کامل فلاح ملنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن دنیا میں فلاح تو بظاہر کفار فجار کا حصّہ بنی ہوئی ہے اور ہر زمانے کے انبیاء اور ان کے بعد صلحاءِ اُمت عموماً تکلیفوں میں مبتلا رہے ہیں مگر جواب اسکا ظاہر ہے کہ دنیا میں مکمل فلاح کا تو وعدہ نہیں کہ کوئی تکلیف پیش ہی نہ آوے بلکہ کچھ نہ کچھ تکلیف تو یہاں پر صالح و متقی کو بھی اور ہر کافر فاجر کو بھی پیش آنا ناگزیر ہے اور یہی حال حصولِ مُراد کا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہ مقصد بھی ہر انسان کو خواہ وہ صالح و متقی ہو خواہ کافر و بدکار ہو حاصل ہوتا ہی ہے۔ پھر ان دونوں میں فلاح پانے والا کس کو کہا جائے تو اسکا اعتبار عواقب اور انجام پر ہے۔

دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو اہلِ صلاح ان سات اوصاف کے حامل اور ان سے متصف اور ان پر قائم ہیں گو دنیا میں وقتی تکلیف اُن کو بھی پیش آجائے مگر انجام کار اُن کی تکلیف جلد دُور ہوتی ہے اور مُراد حاصل ہوجاتی ہے ساری دنیا اُن کی عزّت کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور دنیا میں نیک نام اُنھیں کا باقی رہتا ہے۔ جتنا دنیا کے حالات کا غور و انصاف سے مطالعہ کیا جائیگا ہر دور ہر زمانے ہر خطہ میں اسکی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

مؤمن کامل کے وہ سات اوصاف جن پر آیاتِ مذکورہ میں فلاحِ دنیا و آخرت کا وعدہ ہے سب سے پہلا وصف تو مؤمن ہونا ہے مگر وہ ایک بنیادی چیز اور اصل الاصول ہے اُس کو الگ کرکے سات اوصاف جو یہاں بیان کئے گئے ہیں یہ ہیں۔

اوّل نماز میں خشوع، خشوع کے لغوی معنے سکون کے ہیں اصطلاحِ شرع میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں بھی سکون ہو۔ یعنی غیر اللہ کے خیال کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے اور اعضاء بدن میں بھی سکون ہو کہ عبث اور فضول حرکتیں نہ کرے (بیان القرآن) خصوصًا وہ حرکتیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں منع فرمایا ہے اور فقہاء نے اُن کو مکروہاتِ نماز کے عنوان سے جمع کردیا ہے۔ تفسیر مظہری میں خشوع کی یہی تعریف حضرت عمرو بن دینارؒ سے نقل کی ہے، اور دوسرے بزرگوں سے جو خشوع کی تعریف میں مختلف چیزیں نقل کی گئی ہیں وہ دراصل اسی سکونِ قلب و جوارح کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ نظر اور آواز کو پست رکھنے کا نام خشوع ہے۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ دائیں بائیں التفات یعنی گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بچنا خشوع ہے۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ بدن کے کسی حصّہ سے کھیل نہ کرنا خشوع ہے۔ حدیث میں حضرت

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے وقت اپنے بندے کی طرف برابر متوجہ رہتا ہے جب تک وہ دوسری طرف التفات نہ کرے، جب دوسری طرف التفات کرتا ہے یعنی گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے رُخ پھیر لیتے ہیں (رواہ احمد والنسائی و ابو داؤد وغیرہم۔ مظہری) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ اپنی نگاہ اُس جگہ رکھو جس جگہ سجدہ کرتے ہو اور یہ کہ نماز میں دائیں بائیں التفات نہ کرو (رواہ البیہقی فی السنن الکبریٰ مظہری)

اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا ہے تو فرمایا لو خشع قلب ھٰذا لخشعت جوارحہ (رواہ الحکیم الترمذی بسند ضعیف) یعنی اگر اس شخص کے دل میں خشوع ہوتا تو اسکے اعضا میں بھی سکون ہوتا۔ (مظہری)

نماز میں خشوع کی ضرورت کا درجہ امام غزالیؒ و قرطبیؒ اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ نماز میں خشوع فرض ہے، اگر پوری نماز خشوع کے بغیر گزر جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی۔ دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اسمیں شبہ نہیں کہ خشوع روحِ نماز ہے اسکے بغیر نماز بے جان ہے مگر اس کو رکن نماز کی حیثیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خشوع نہ ہوا تو نماز ہی نہ ہوئی اور اُسکا اعادہ فرض قرار دیا جائے۔

حضرت سیدی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ خشوع صحتِ نماز کیلئے موقوف علیہ تو نہیں اور اس درجہ میں وہ فرض نہیں مگر قبولِ نماز کا موقوف علیہ ہے اور اس مرتبہ میں فرض ہے۔ حدیث میں طبرانی نے معجم کبیر میں بسند حسن حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز اس اُمت سے اُٹھ جائیگی یعنی سلب ہو جائیگی وہ خشوع ہے یہاں تک کہ قوم میں کوئی خاشع نظر نہ آئیگا۔ کذا فی مجمع الزوائد (بیان)

مومن کامل کا دوسرا وصف ، لغو سے پرہیز رہنا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ لغو کے معنے فضول کلام یا کام جسمیں کوئی دینی فائدہ نہ ہو۔ لغو کا اعلیٰ درجہ معصیت اور گناہ ہے جس میں فائدہ دینی نہ ہونے کے ساتھ دینی ضرر و نقصان ہے اس سے پرہیز واجب ہے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ مفید ہو نہ مضر، اسکا ترک کم از کم اولیٰ اور موجب مدح ہے حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ یعنی انسان کا اسلام جب اچھا ہو سکتا ہے جبکہ وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔ اسی لئے آیت میں اسکو مومن کامل کی خاص صفت قرار دیا ہے۔

تیسرا وصف زکوٰۃ ہے لفظ زکوٰۃ کے معنے لغت میں پاک کرنے کے ہیں، اصطلاح میں شرح مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ معنے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

اور اس پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے مکہ میں زکوٰۃ فرض نہ ہوئی تھی ہجرت مدینہ کے بعد فرض ہوئی، اسکا جواب ابن کثیر وغیرہ مفسرین کیطرف سے یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی سورۂ مزمل جو بالاتفاق مکی ہے اسمیں بھی اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کیساتھ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا ذکر موجود ہے مگر سرکاری طور پر اُسکے وصول کرنے کا عام انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ طیبہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔ جن لوگوں نے زکوٰۃ کو مدنی احکام میں شمار کیا ہے اُنکا یہی منشا ہے۔ اور جن حضرات نے فرضیتِ زکوٰۃ کو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کا حکم قرار دیا ہے اُنھوں نے اس جگہ زکوٰۃ کا مضمون عام لغوی معنی میں اپنے نفس کو پاک کرنا قرار دیا ہے خلاصہ تفسیر میں بھی یہی لیا گیا ہے اس معنے کا قرینہ اس آیت میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر قرآن کریم میں جہاں زکوٰۃ فرض کا ذکر آیا ہے تو اُس کو اِیۡتَآءُ الزَّکٰوۃِ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے عنوان سے بیان کیا گیا، یہاں عنوان بدلکر لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ فرمانا اسکا قرینہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے وہ اصطلاحی معنے مراد نہیں اسکے علاوہ فاعلون کا بے تکلف تعلق فعل سے ہوتا ہے اور زکوٰۃ اصطلاحی فعل نہیں بلکہ ایک حصہ مال ہے اس حصہ مال کیلئے فاعلون کہنا بغیر تاویل کے نہیں ہوسکتا۔ اگر آیت میں زکوٰۃ کے معنی اصطلاحی زکوٰۃ کے لئے جاویں تو اسکا فرض ہونا اور مؤمن کے لئے لازم ہونا کھلا ہوا معاملہ ہے اور اگر مراد زکوٰۃ سے تزکیہ نفس ہے یعنی اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا تو وہ بھی فرض ہی ہے کیونکہ شرک۔ ریا۔ تکبر۔ حسد۔ بغض حرص۔ بخل جن سے نفس کو پاک کرنا تزکیہ کہلاتا ہے یہ سب چیزیں حرام اور گناہ کبیرہ ہیں۔ نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔

چوتھا وصف شرمگاہوں کی حفاظت حرام سے وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ، یعنی وہ لوگ جو اپنی بیویوں اور شرعی لونڈیوں کے علاوہ سب سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ان دونوں کے ساتھ شرعی ضابطہ کے مطابق شہوتِ نفس پوری کرنیکے علاوہ اور کسی سے کسی ناجائز طریقہ پر شہوت رانی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ، یعنی شرعی قاعدے کیمطابق اپنی بیوی یا لونڈی سے شہوتِ نفس کو تسکین دینے والوں پر کوئی ملامت نہیں اسمیں اشارہ ہے کہ اس ضرورت کو ضرورت کے درجہ میں رکھنا ہے مقصدِ زندگی بنانا نہیں۔ اسکا درجہ اتنا ہی ہے کہ جو ایسا کرے وہ قابلِ ملامت نہیں واللہ اعلم۔

فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ، یعنی منکوحہ بیوی یا شرعی قاعدہ سے حاصل شدہ لونڈی کیساتھ شرعی قاعدے کے مطابق قضاء شہوت کے علاوہ اور کوئی بھی صورت شہوت پورا کرنے کی حلال نہیں اسمیں زنا بھی داخل ہے اور جو عورت شرعاً اُس پر حرام ہے اُس سے نکاح

بھی بحکم زنا ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے حیض و نفاس کی حالت میں یا غیر فطری طور پر جماع کرنا بھی اسمیں داخل ہے یعنی کسی مرد یا لڑکے سے یا کسی جانور سے شہوت پوری کرنا بھی۔ اور جمہور کے نزدیک استمنا بالید یعنی اپنے ہاتھ سے منی خارج کرلینا بھی اسمیں داخل ہے۔ (از تفسیر بیان القرآن۔ قرطبی۔ بحر محیط وغیرہ)

پانچواں وصف امانت کا حق ادا کرنا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ لفظ امانت کے لغوی معنے ہر اُس چیز کو شامل ہیں جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اُٹھائی ہو اور اُس پر اعتماد و بھروسہ کیا گیا ہو۔ اس کی قسمیں چونکہ بیشمار ہیں اسی لئے باوجود مصدر ہونے کے اسکو بصیغہ جمع لایا گیا ہے تاکہ امانت کی سب قسموں کو شامل ہو جائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔ حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض و واجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات و مکروہات سے پرہیز کرنا ہے اور حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت کا داخل ہونا تو معروف و مشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا یہ اُسکی امانت ہے اس کی حفاظت اُسکے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے۔ اسکے علاوہ کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی وہ بھی اُسکی امانت ہے بغیر اذنِ شرعی کے کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے۔ مزدور، ملازم کو جو کام سُپرد کیا گیا اُسکے لئے جتنا وقت خرچ کرنا باہم طے ہو گیا اُسمیں اُس کام کو پورا کرنے کا حق ادا کرنا اور مزدوری ملازمت کے لئے جتنا وقت مقرر ہے اُسکو اُسی کام میں لگانا بھی امانت ہے کام کی چوری یا وقت کی چوری خیانت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت اور اسکا حق ادا کرنا بڑا جامع لفظ ہے سب مذکورہ تفصیلات اُسمیں داخل ہیں۔

چھٹا وصف عہد پورا کرنا ہے۔ عہد ایک تو وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملے کے سلسلے میں لازم قرار دیا جائے اُسکا پورا کرنا فرض اور اسکے خلاف کرنا غدر اور دھوکا ہے جو حرام ہے۔ دوسرا وہ جس کو وعدہ کہتے ہیں یعنی یکطرفہ صورت سے کوئی شخص کسی شخص سے کسی چیز کے دینے کا یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کرلے۔ اسکا پورا کرنا بھی شرعاً لازم و واجب ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے العدۃ دین یعنی وعدہ ایک قسم کا قرض ہے۔ جیسے قرض کی ادائیگی واجب ہے ایسے ہی وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے بلا عذر شرعی اسکے خلاف کرنا گناہ ہے۔ فرق دونوں قسموں میں یہ ہے کہ پہلی قسم کے پورا کرنے پر دوسرا آدمی اُس کو بذریعہ عدالت بھی مجبور کرسکتا ہے یکطرفہ وعدہ کو پورا کرنے کے لئے بذریعہ عدالت مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ دیانۃً اُسکا پورا کرنا بھی واجب اور بلا عذر شرعی خلاف کرنا گناہ ہے۔

ساتواں وصف نماز پر محافظت ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ، نماز کی محافظت سے مراد اُس کی پابندی کرنا اور ہر ایک نماز کو اسکے وقت مستحب میں ادا کرنا ہے۔

(کذا فسرہ ابن مسعود رض۔ روح) یہاں صلوات کا لفظ جمع اسلئے لایا گیا ہے کہ مراد اس سے پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو اپنے اپنے وقت مستحب میں پابندی سے ادا کرنا مقصود ہے اور شروع میں جہاں مقصود بالذکر خشوع تھا وہاں لفظ مفرد لایا گیا کہ مطلقاً جنس نماز خواہ فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا نفل سب کی روح خشوع ہے۔ غور کیا جائے تو ان سات اوصاف مذکورہ میں تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد اور اُن سے متعلقہ احکام آجاتے ہیں جو شخص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو جائے اور اُس پر جما رہے وہ مؤمن کامل فلاحِ دُنیا و آخرت کا مستحق ہے۔

یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان سات اوصاف کو شروع بھی نماز سے کیا گیا اور ختم بھی نماز پر کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگر نماز کو نماز کی طرح پابندی اور آدابِ نماز کیساتھ ادا کیا جائے تو باقی اوصاف اسمیں خود بخود پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط اوصافِ مذکورہ کے حامل لوگوں کو اس آیت میں جنت الفردوس کا وارث فرمایا ہے لفظ وارث میں اشارہ اسطرف ہے کہ جسطرح مورث کا مال اسکے وارث کو پہنچنا قطعی اور لازمی ہے اسی طرح ان اوصاف والوں کا جنت میں داخلہ یقینی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ کے بعد اوصاف مفلحین پورے ذکر کرنے کے بعد اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ فلاحِ کامل اور اصلی فلاح کی جگہ جنت ہی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً

اور ہم نے بنایا آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے رکھا اسکو پانی کی بوند کر کے

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً

ایک جمے ہوئے ٹھکانہ میں پھر بنایا اُس بوند سے لہو جما ہوا پھر بنایا اس لہو جمے ہوئے سے گوشت

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط

کی بوٹی پھر بنائیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر اُٹھا کھڑا کیا اسکو ایک نئی صورت میں

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ط ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ط

سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے پھر تم اسکے بعد مرد گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ق

پھر تم قیامت کے دن کھڑے کیے جاؤ گے اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات رستے

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ

اور ہم نہیں ہیں خلق سے بے خبر اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی ماپ کر پھر اس کو

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا

ٹھہرا دیا زمین میں اور ہم اس کو لے جائیں تو بجا سکتے ہیں پھر اُگا دیئے

لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا

تمہارے واسطے اس سے باغ کھجور اور انگور کے، تمہارے واسطے اُنمیں میوے ہیں بہت اور اُنہی میں سے

تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ

کھاتے ہو اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے لے اُگتا ہے تیل

وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ

اور روٹی ڈبونا کھانے والوں کے واسطے اور تمہارے لیے چوپایوں میں دھیان کرنے کی بات ہے پلاتے ہیں ہم تم کو

مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾

اُن کے پیٹ کی چیز سے اور تمہارے لیے اُن میں بہت فائدے ہیں اور بعضوں کو کھاتے ہو

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور اُن پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو

منزل ۴

ع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

(اوّل بیان ہے ایجادِ انسان کا) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا (یعنی اوّل مٹی ہوتی ہے پھر اس سے بذریعہ نباتات کے غذا حاصل ہوتی ہے) پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا (اور وہ غذا سے حاصل ہوا تھا) پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا (جس سے وہ ہڈیاں ڈھک گئیں) پھر (ان سب انقلابات کے بعد) ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنا دیا (جو حالات سابقہ سے نہایت ہی متمائز و متبائن ہے کیونکہ اس سے پہلے سب انقلابات ایک جماد بے جان میں ہو رہے تھے اور اب یہ ایک ذی حیات زندہ انسان بن گیا) سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھکر ہے (کیونکہ دوسرے صناع تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں جوڑ توڑ کر کے ہی بنا سکتے ہیں، زندگی پیدا کرنا یہ خاص اللہ ہی کا کام ہے اور نطفہ پر مذکورہ انقلابات کی تفصیل اسی ترتیب کیساتھ قانون وغیرہ کتب طبیہ میں بھی مذکور ہے آگے انسان کے آخری انجام فنا کا بیان ہے) پھر تم بعد اس (تمام قصۂ عجیبہ) کے ضرور ہی مرنے والے ہو (آگے بیان ہے اعادہ کا یعنی) پھر تم قیامت

کے روز دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے (اور جس طرح ہم نے تم کو ابتداءً وجود عطا فرمایا اسی طرح تمہاری بقا کا سامان بھی کیا کہ) ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان (جن میں ملائکہ کے آمد و رفت کیلئے راہیں ہیں) بنائے (کہ اس سے تمہاری بھی بعض مصلحتیں متعلق ہیں) اور ہم مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے (بلکہ ہر مخلوق کو مصالح و حکم کی رعایت کرکے بنایا) اور ہم نے (انسان کی بقاء اور نشو و نما کے لئے) آسمان سے (مناسب) مقدار کے ساتھ پانی برسایا پھر ہم نے اسکو (مدت تک) زمین میں ٹھہرایا (چنانچہ کچھ پانی تو زمین کے اوپر رہتا ہے اور کچھ اندر اتر جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے) اور ہم (جس طرح اس کے برسانے پر قادر ہیں اسی طرح) اس (پانی) کے معدوم کردینے پر (بھی) قادر ہیں (خواہ ہوا کی طرف مستحیل کرکے خواہ اتنی دور زمین کی گہرائی میں اتار کر کہ آلات کے ذریعہ سے نہ نکال سکو مگر ہم نے باقی رکھا) پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ پیدا کئے کھجوروں کے اور انگوروں کے تمہارے واسطے ان (کھجوروں انگوروں) میں بکثرت میوے بھی ہیں (جبکہ ان کو تازہ تازہ کھایا جاوے تو میوہ سمجھا جاتا ہے) اور ان میں سے (جو بچا کر خشک کرکے رکھ لیا جاتا ہے اسکو بطور غذا کے) کھاتے بھی ہو اور (اسی پانی سے) ایک (زیتون کا) درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو کہ طور سینا میں (بکثرت) پیدا ہوتا ہے جو اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لیے سالن لئے ہوئے (یعنی اُس کے پھل سے دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ روشن کرنے کے اور مالش کرنے کے کام میں لاؤ خواہ اُسمیں روٹی ڈبو کر کھاؤ یہ سامان مذکور پانی اور نباتات سے تھا) اور (آگے حیوانات کے ذریعہ انسان کے منافع اور آسائیوں کا بیان ہے کہ) تمہارے لئے مواشی میں (بھی) غور کرنے کا موقع ہے کہ ہم تم کو ان کے جوف میں کی چیز (یعنی دودھ) پینے کو دیتے ہیں اور تمہارے لئے انمیں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اون کام آتی ہے) اور (نیز) انہیں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو اور ان (میں جو بار برداری کے قابل ہیں ان) پر اور کشتی پر لدے لدے پھرتے (بھی) ہو۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں انسان کی فلاحِ دنیا و آخرت کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُسکے احکام کی تعمیل میں اپنے ظاہر و باطن کو پاک رکھنے اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرنے سے بیان کیا گیا تھا۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور بنی نوعِ انسان کی تخلیق میں اُسکے مظاہر خاص کا ذکر ہے جس سے واضح ہوجائے کہ انسان جسکو عقل و شعور ہو وہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، سُلالہ بمعنے خلاصہ اور طین، گیلی مٹی،

جس کے معنے یہ ہیں کہ زمین کی مٹی کے خاص اجزار نکال کر اُس سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ انسان کی تخلیق کی ابتدار حضرت آدم علیہ السلام سے اور اُن کی تخلیق اس مٹی کے خلاصہ سے ہوئی اس لئے ابتدائی تخلیق کو مٹی کیطرف منسوب کیا گیا اسکے بعد ایک انسان کا نُطفہ دوسرے انسان کی تخلیق کا سبب بنا۔ اگلی آیت میں اسی کا بیان ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً سے فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ابتدائی تخلیق مٹی سے ہوئی پھر آگے سلسلۂ تخلیق اسی مٹی کے جزر لطیف یعنی نطفہ سے جاری کردی گئی۔ جمہور مفسرین نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر یہی لکھی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سُلٰلَةٍ مِّن طِينٍ سے مراد بھی نطفہ انسانی ہو کیونکہ وہ غذار سے پیدا ہوتا ہے اور غذار انسانی مٹی سے بنتی ہے۔ واللہ اعلم

تخلیق انسانی کے سات مدارج آیاتِ مذکورہ میں انسان کی تخلیق کی سات دَور ذکر کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے سلالۃ من طین، دوسرے درجہ میں نطفہ، تیسرے میں علقہ، چوتھے میں مضغہ پانچویں میں عظام یعنی ہڈیاں، چھٹے دَور میں ہڈیوں پر گوشت چڑھانا۔ ساتواں دور تکمیلِ تخلیق کا ہے یعنی رُوح پھونکنا۔

ایک لطیفہ عجیبہ از حضرت ابن عباسؓ تفسیر قرطبی میں اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے اسی آیت سے استدلال کر کے ایک عجیب لطیفہ شبِ قدر کی تعیین میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے ایک مرتبہ اکابرِ صحابہ کے مجمع سے سوال کیا کہ شبِ قدر رمضان کی کونسی تاریخ میں ہے؟ سب نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اللہُ اعلم کوئی تعیین بیان نہیں کی۔ حضرت ابن عباس رضؓ ان سب میں چھوٹے تھے اُن سے خطاب فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں تو ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے آسمان سات پیدا کئے، زمینیں سات پیدا کیں، انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی۔ انسان کی غذار سات چیزیں بنائیں اسلئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شبِ قدر ستائیسویں شب ہوگی۔ فاروق اعظم رضؓ نے یہ عجیب استدلال سُن کر اکابر صحابہ سے فرمایا کہ آپ سے وہ بات نہ ہو سکی جو اس لڑکے نے کی جس کے سر کے بال بھی ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ یہ حدیث طویل ابن ابی شیبہ کے مُسند میں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے تخلیق انسانی کے سات درجات سے مراد وہی لیا ہے جو اس آیت میں ہے اور انسان کی غذار کی سات چیزیں سورۂ عبس کی آیت میں ہیں فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا، اس آیت میں آٹھ چیزیں مذکور ہیں جنمیں پہلی سات انسان کی غذار اور آخری یعنی اَبّ یہ جانوروں کی غذا ہے۔ (قرطبی)

پھر تخلیق انسانی پر جو سات دَور گزرتے ہیں قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان سب کو ایک ہی انداز سے بیان نہیں فرمایا بلکہ کہیں ایک دَور سے دوسرے دَور تک انقلاب کو لفظ ثُمَّ

سے تعبیر کیا ہے جو تراخی یعنی کچھ دیر سے ہونے پر دلالت کرتا ہے کہیں اس انقلاب کا ذکر حرف فا سے کیا ہے جو بلا تاخیر ہونے پر دلالت کرتا ہے اسمیں اشارہ اس ترتیب کی طرف ہے جو ایک انقلاب سے دوسرے انقلاب کے درمیان فطرۃً ہوتی ہے کہ بعض انقلابات انسانی عقل کے لحاظ سے بہت مشکل اور بہت دیر طلب ہوتے ہیں۔ بعض اتنے دیر طلب نہیں ہوتے چنانچہ قرآن کریم نے ابتدائی تین دَور کو لفظ ثُمَّ کیساتھ بیان کیا ہے اوّل سلالہ طین پھر اس کو نطفہ کی صورت میں تبدیل کرنا۔ اسکو لفظ ثُمَّ سے فرمایا ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً کیونکہ مٹی سے غذا کا پیدا ہونا پھر غذا کا جزوِ بدن ہونا پھر اُسمیں سے جزءِ خاص کا نطفہ کی صورت میں تبدیل ہونا انسانی قیاس کی رو سے بڑا وقت چاہتا ہے۔ اسی طرح اسکے بعد تیسرا درجہ نطفہ کا گوشت کے ٹکڑے کی شکل میں تبدیل ہونا یہ بھی ایک طویل وقت چاہتا ہے اس کو بھی ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً سے تعبیر فرمایا۔ اسکے بعد کے تین دَور علقہ سے مضغہ مضغہ سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھانا ان سب کا تھوڑی تھوڑی مدت میں ہو جانا مستبعد نہیں معلوم ہوتا تو ان تینوں کو حرف فا سے بیان فرمایا ہے۔ پھر آخری دَور جو نفخِ روح اور زندگی پیدا کرنیکا ہے اسکو بھی لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا کیونکہ ایک غیر ذی روح جماد میں رُوح اور حیات پیدا کرنا انسانی عقل میں بڑی مدت چاہتا ہے اسلئے یہاں پھر لفظ ثُمَّ لایا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک دَور سے دوسرے دَور کیطرف انقلاب جن صورتوں میں انسانی عقل و قیاس کے مطابق دیر طلب اور مدت کا کام تھا وہاں لفظ ثُمَّ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا اور جہاں عام انسانی قیاس کی رُو سے زیادہ مدت درکار نہیں تھی وہاں حرف فا سے تعبیر کر کے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اسلئے اس پر اُس حدیث سے شبہ نہیں ہو سکتا جس میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ہر دَور سے دوسرے دَور تک منقلب ہونے میں چالیس چالیس دن صرف ہوتے ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کام ہے جو انسانی قیاس کے تابع نہیں۔

تخلیق انسانی کا آخری مقام یعنی اس میں روح و حیات پیدا کرنا اس کا بیان قرآن کریم نے ایک خاص اور ممتاز انداز سے اسطرح فرمایا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ، یعنی پھر ہم نے اسکو ایک خاص قسم کی اور پیدائش عطا کی۔ اس امتیازِ بیان کی وجہ یہ ہے کہ پہلے چھ دَور تخلیق کے عالم عناصر اور مادیات سے اور اُن میں انقلاب و تبدیل سے متعلق تھے اور یہ آخری ساتواں دَور دوسرے عالم یعنی عالمِ ارواح سے رُوح کو اسکے جسم میں منتقل کرنیکا دَور تھا اسلئے اسکو خلقاً آخر سے تعبیر کیا گیا۔

رُوحِ حقیقی اور روحِ حیوانی یہاں خلقاً آخر کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، شعبیؒ، عکرمہؒ، ضحاکؒ ابو العالیہؒ وغیرہ نے نفخ روح سے فرمائی ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً مراد اس روح سے رُوحِ حیوانی ہے کہ وہ بھی مادّی اور ایک جسم لطیف ہے جو جسم حیوانی کے ہر ہر جزو میں سمایا ہوا ہوتا ہے

جس کو اطباء اور فلاسفہ روح کہتے ہیں۔ اُس کی تخلیق بھی تمام اعضاء انسانی کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے اسلئے اسکو لفظ ثم سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور روح حقیقی جسکا تعلق عالم ارواح سے ہے وہ ہیں سے لاکر اس رُوحِ حیوانی کے ساتھ اسکا کوئی رابطہ حق تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا فرما دیتے ہیں جسکی حقیقت کا پہچاننا انسان کے بس کا نہیں اس روحِ حقیقی کی تخلیق تو تمام انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہو اُنہیں ارواح کو حق تعالیٰ نے ازل میں جمع کر کے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرمایا اور سب نے بَلیٰ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ ہاں اسکا تعلق جسم انسانی کے ساتھ تخلیق اعضاء انسانی کے بعد ہوتا ہے۔ اس جگہ نفخِ روح سے اگر یہ مراد لیجائے کہ روحِ حیوانی کیساتھ روحِ حقیقی کا تعلق اسوقت قائم فرمایا گیا تو یہ بھی ممکن ہے۔ اور درحقیقت حیاتِ انسان اسی رُوحِ حقیقی سے تعلق ہے جب اس کا تعلق روحِ حیوانی کے ساتھ ہو جاتا ہے تو انسان زندہ کہلاتا ہے جب منقطع ہو جاتا ہے تو انسان مُردہ کہلاتا ہے وہ روحِ حیوانی بھی اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ، خلق و تخلیق کے اصلی معنے کسی چیز کو ازسرِنو بغیر کسی مادہ سابقہ کے پیدا کرنا ہے جو حق تعالیٰ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے اس معنے کے اعتبار سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی دوسرا شخص فرشتہ ہو یا انسان کسی ادنیٰ چیز کا خالق نہیں ہو سکتا لیکن کبھی کبھی یہ لفظ خلق و تخلیق صنعت کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور صنعت کی حقیقت اس سے زائد نہیں کہ اللہ جل شانہ نے جو مواد اور عناصر اس جہان میں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرما دیئے ہیں انکو جوڑ توڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ مرکب کر کے ایک نئی چیز بنا دی جائے یہ کام ہر انسان کر سکتا ہے اور اسی معنے کے لحاظ سے کسی انسان کو بھی کسی خاص چیز کا خالق کہہ دیا جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے فرمایا تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ، ان تمام مواقع میں لفظ خلق مجازی طور پر صنعت کے معنے میں بولا گیا ہے۔

اسی طرح یہاں لفظ خٰلِقِيْنَ بصیغہ جمع اسی لئے لایا گیا ہے کہ عام انسان جو اپنی صنعت گری کے اعتبار سے اپنے کو کسی چیز کا خالق سمجھتے ہیں اگر ان کو مجازاً خالق کہا بھی جائے تو اللہ تعالیٰ ان سب خالقوں یعنی صنعت گروں میں سب سے بہتر صنعت کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ، پچھلی تین آیتوں میں انسان کے مبدأ یعنی ابتداء آفرینش کا ذکر تھا۔ اب دو آیتوں میں اسکے معاد یعنی انجام کار کا ذکر ہے۔ آیت مذکورہ میں فرمایا کہ پھر تم سب اس دُنیا میں آنے اور رہنے کے بعد موت سے دوچار ہونے والے ہو جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ پھر فرمایا کہ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ، یعنی مرنے کے بعد پھر قیامت کے روز تم سب زندہ کر کے اُٹھائے جاؤ گے تاکہ تمہارے اعمال کا حساب لیکر اصلی ٹھکانے جنت یا دوزخ تک

پہنچا دیا جائے۔ یہ انسان کا انجام ہوا، آگے آغاز و انجام یعنی مبدأ و معاد کے درمیانی حالات اور اُن میں انسان پر حق تعالیٰ کے احسانات و انعامات کی تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو اگلی آیت میں آسمان کی تخلیق کے ذکر سے شروع فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ، طرائق، طریقہ کی جمع ہے اس کو بمعنی طبقہ بھی لیا جا سکتا ہے جس کے معنے یہ ہوں گے کہ تہ بر تہ سات آسمان تمھارے اُوپر بنائے گئے اور طریقہ کے معنے مشہور راستہ کے ہیں۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سب آسمان فرشتوں کی گزرگاہیں ہیں جو احکام لیکر زمین پر آتے جاتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ آمیت تبلایا کہ ہم نے انسان کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا اور اُس سے غافل نہیں ہو سکتے بلکہ اُس کے نشو و نما، اور رہائش و آسائش کے سامان بھی مہیا کیے۔ جس کی ابتدا ر آسمانوں کی تخلیق سے ہوئی پھر آسمان سے بارش برسا کر انسان کے لئے غذا اور اسکی آسائش کا سامان پھلوں پھولوں سے پیدا کیا جس کا ذکر بعد کی آیت میں اسطرح فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ

انسانوں کو آب رسانی کا قدرتی عجیب و غریب نظام اس آیت میں آسمان سے پانی برسانے کے ذکر کے ساتھ ایک قید بقدر کی بڑھا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسان ایسا ضعیف الخلقت ہے کہ جو چیزیں اس کے لئے مدار زندگی ہیں اگر وہ مقدار مقدر سے زائد ہو جاویں تو وہی اس کیلئے وبالِ جان اور عذاب بن جاتی ہیں پانی جیسی چیز جس کے بغیر کوئی انسان و حیوان زندہ نہیں رہ سکتا اگر ضرورت سے زیادہ برس جائے تو طوفان آجاتا ہے اور انسان اور اسکے سامان کے لئے وبال و عذاب بنجاتا ہے۔ اس لئے آسمان سے پانی برسانا بھی ایک خاص پیمانے سے ہوتا ہے جو انسان کی ضرورت پوری کر دے اور طوفان کی صورت اختیار نہ کرے بجز اُن خاص مقامات کے جن پر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہی کسی وجہ سے طوفان مسلط کرنیکا سبب ہو جائے۔ اس کے بعد بڑا غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پانی اگر روزانہ کی ضرورت کا روزانہ برسا کرے تو بھی انسان مصیبت میں آجائے روز کی بارش اُس کے کاروبار اور مزاج کے خلاف ہے۔ اور اگر سال بھر یا چھ مہینے یا تین مہینے کی ضرورت کا پانی ایک دفعہ برسایا جائے اور لوگوں کو حکم ہو کہ اپنا اپنا کوٹہ پانی کا چھ مہینے کے لئے جمع کر کے رکھو اور استعمال کرتے رہو تو ہر انسان کیا اکثر انسان بھی اتنے پانی کے جمع رکھنے کا انتظام کیسے کریں اور کسی طرح بڑے حوضوں اور گڑھوں میں بھر لینے کا انتظام بھی کریں تو چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جائیگا جسکا پینا بلکہ استعمال کرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اسلئے قدرت حق جل شانہ نے اسکا انتظام یہ بنایا کہ پانی جس وقت برستا ہے اسوقت وقتی طور پر جتنے درخت اور زمینیں سیرابی کے قابل ہیں وہ سیراب ہو جاتے ہیں

پھر زمین کے مختلف تالابوں، حوضوں اور قدرتی گڑھوں میں یہ پانی جمع رہتا ہے جس کو انسان اور جانور ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں مگر ظاہر ہے یہ پانی چند روز میں ختم ہو جاتا ہے۔ دائمی طور پر روزانہ انسان کو تازہ پانی کس طرح پہنچے جو ہر خطے کے باشندوں کو مل سکے؟ اسکا نظام قدرت نے یہ بنایا کہ پانی کا بہت بڑا حصّہ برف کی صورت میں ایک بحر منجمد بنا کر پہاڑوں کے سروں پر ایسی پاک صاف فضاء میں رکھ دیا جہاں نہ گرد و غبار کی رسائی نہ کسی آدمی اور جانور کی اور جس میں نہ سڑنے کا امکان ہو نہ اسکے ناپاک یا خراب ہونے کی کوئی صورت ہے پھر یہ برف کا پانی آہستہ آہستہ رس رس کر پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر پھیلتا ہے اور یہ قدرتی پائپ لائن پوری زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جاتی ہے جہاں سے کچھ تو چشمے خود پھوٹ نکلتے ہیں اور ندی نالے اور نہروں کی شکل میں زمین پر بہنے لگتے ہیں، تازہ بتازہ جاری پانی کروڑوں انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرتا ہے اور کچھ یہی پہاڑی برف سے بہنے والا پانی زمین کی تہ میں اُتر کر نیچے نیچے بہتا رہتا ہے اور اُس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس پورے نظام کو ایک لفظ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ سے بیان فرما دیا ہے آخر میں اسطرف بھی اشارہ کر دیا کہ زمین کی تہ سے جو پانی کنوؤں کے ذریعہ نکالا جاتا ہے یہ بھی قدرت کیطرف سے آسانی ہے کہ بہت زیادہ گہرائی میں نہیں بلکہ تھوڑی گہرائی میں یہ پانی رکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا بلکہ پانی کی طبعی خاصیت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ پانی زمین کی گہرائی میں اُترتا چلا جاتا، جہاں تک انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی مضمون کو آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۔

آگے پانی کے ذریعہ پیدا ہونے والی نعمتوں میں خاص چیزوں کو عرب کے مزاج و مذاق کے مطابق ذکر فرمایا کہ کھجور اور انگور کے باغات اُس سے پیدا ہوئے اور دوسرے پھلوں کو ایک عام لفظ میں جمع کر کے ذکر فرمایا لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ، یعنی ان باغات میں تمہارے لئے کھجور انگور کے علاوہ ہزاروں قسم کے پھل پیدا کئے جن کو تم محض تفریحی اور شوقیہ طور پر بھی کھاتے ہو اور اُن میں سے بعض پھلوں کا ذخیرہ کر کے تمہاری مستقل غذا بھی اُن سے تیار ہوتی ہے وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔ آگے خصوصیت سے زیتون اور اُسکے تیل کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا کیونکہ اسکے منافع بیشمار ہیں۔ اور چونکہ زیتون کے درخت کوہ طور پر زیادہ پیدا ہوتے ہیں اسلئے اسکی طرف نسبت کر دی گئی وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ، سیناء اور سینین اُس مقام کا نام ہے جس میں کوہ طور واقع ہے۔ زیتون کا تیل تیل کی ضروریات مثلاً بدن کی مالش اور چراغ میں جلانے کے بھی کام آتا ہے اور کھانے میں سالن کا بھی کام دیتا ہے اسی کو فرمایا تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ، زیتون کے درخت کے لئے کوہ طور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ درخت سب

سے پہلے کوہ طور ہی پر پیدا ہوا ہے اور بعض نے کہا کہ طوفان نوح کے بعد سب سے پہلا درخت جو زمین پر اُگا ہے وہ زیتون تھا۔ (مظہری)

اس کے بعد اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے جانوروں چوپایوں کے ذریعہ انسان کو عطا فرمائی تاکہ انسان اُن سے عبرت حاصل کرے اور حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور رحمت کاملہ پر استدلال کر کے توحید و عبادت میں مشغول ہو۔ اسی لئے فرمایا وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً، یعنی تمہارے لئے چوپایہ جانوروں میں ایک عبرت و نصیحت ہے آگے اسی کی تفصیل اسطرح بتلائی نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا، کہ ان جانوروں کے پیٹ میں ہم نے تمہارے لئے پاکیزہ دودھ تیار کیا جو انسان کی بہترین غذا ہے اور پھر فرمایا کہ صرف دودھ ہی نہیں، ان جانوروں میں تمہارے لئے بہت سے (بیشمار) منافع اور فوائد ہیں وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ، غور کرو تو جانوروں کے جسم کا ایک ایک جزو بال بال انسان کے کام آتا ہے اور اُس سے انسان کی معیشت کے لئے بیشمار قسم کے سامان تیار ہوتے ہیں۔ جانوروں کے بال، ہڈی، آنتیں، پٹھے اور سبھی اجزاء سے انسان اپنی معیشت کے کتنے سامان بناتا اور تیار کرتا ہے اُسکا شمار بھی مشکل ہے ان بیشمار منافع کے علاوہ ایک بڑا نفع یہ بھی ہے کہ ان میں سے جو جانور حلال ہیں اُن کا گوشت بھی انسان کی بہترین غذا ہے وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ آخر میں ان جانوروں کا ایک اور عظیم فائدہ ذکر کیا گیا کہ تم اُن پر سواری بھی کرتے ہو اور باربرداری کا بھی ان سے کام لیتے ہو۔ اس آخری فائدہ میں چونکہ جانوروں کے ساتھ دریا میں چلنے والی کشتیاں بھی شریک ہیں کہ سواری اور باربرداری کا بڑا کام ان سے چلتا ہے اس لئے کشتیوں کو بھی اسی کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ، فُلک یعنی کشتیوں ہی کے حکم میں وہ تمام سواریاں بھی ہیں جو ہواؤں کے ذریعے چلنے والی ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کے پاس تو اُس نے کہا اے قوم بندگی کرو اللہ کی تمہارا کوئی

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

حاکم نہیں اس کے سوائے کیا تم ڈرتے نہیں تب بولے سردار جو کافر تھے اُس کی

قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ

قوم میں یہ کیا ہے آدمی ہے جیسے تم چاہتا ہے کہ بڑائی کرے تم پر اور اگر اللہ

اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

چاہتا تو اُتارتا فرشتے ہم نے یہ نہیں سُنا اپنے اگلے باپ دادوں میں

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌۢ بِهِۦ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا۟ بِهِۦ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٢٥﴾ قَالَ

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے کہ اس کو سودا ہے سو راہ دیکھو اس کی ایک وقت تک — بولا

رَبِّ ٱنصُرْنِى بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٢٦﴾ فَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِ أَنِ ٱصْنَعِ ٱلْفُلْكَ

اے رب تو مدد کر میری کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا — پھر ہم نے حکم بھیجا اس کو کہ بنا کشتی ہماری

بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ ٱلتَّنُّورُ ۙ فَٱسْلُكْ فِيهَا مِن

آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے پھر جب پہنچے ہمارا حکم، اور اُبلے تنور — تو تو ڈال لے کشتی میں ہر چیز

كُلٍّ زَوْجَيْنِ ٱثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ ٱلْقَوْلُ مِنْهُمْ ۖ

کا جوڑا دو دو اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس کی قسمت میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے بات

وَلَا تُخَٰطِبْنِى فِى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا۟ ۖ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِذَا ٱسْتَوَيْتَ

اور مجھ سے بات نہ کر ان ظالموں کے واسطے — بیشک ان کو ڈوبنا ہے — پھر جب چڑھ چکے

أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى ٱلْفُلْكِ فَقُلِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى نَجَّىٰنَا

تو اور جو تیرے ساتھ ہے کشتی پر — تو کہہ شکر اللہ کا — جس نے چھڑایا ہم کو

مِنَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٨﴾ وَقُل رَّبِّ أَنزِلْنِى مُنزَلًا مُّبَارَكًا وَأَنتَ

گنہگار لوگوں سے — اور کہہ اے رب اتار مجھ کو برکت کا اتارنا اور تو ہے

خَيْرُ ٱلْمُنزِلِينَ ﴿٢٩﴾ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ وَإِن كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ﴿٣٠﴾

بہتر اتارنے والا — اس میں نشانیاں ہیں — اور ہم ہیں جانچنے والے

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیتوں میں انسان کی تخلیق اور اس کی بقاء و آسائش کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کرنے کا ذکر تھا آگے اُس کی روحانی تربیت اور دینی فلاح کا جو انتظام فرمایا اُسکا ذکر ہے) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اُن کی قوم کی طرف پیغمبر کر کے بھیجا سو اُنھوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کیا کرو اُسکے سوا کوئی تمھارے لئے معبود بنانے کے لائق نہیں (اور جب یہ ایک بات ثابت ہے تو) پھر کیا تم (دوسروں کے معبود بنانے سے) ڈرتے نہیں ہو پس (نوح علیہ السلام کی یہ بات سُن کر) اُن کی قوم میں جو کافر رئیس تھے (عوام سے) کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اسکے کہ تمھاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ (رسول وغیرہ) نہیں ہے (اس دعوے سے) اُن کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے (یعنی اسکا مقصد محض اپنی جاہ و عزت ہے) اور اگر اللہ کو (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو (اس کام کے لئے) فرشتوں کو بھیجتا

(پس دعویٰ ان کا غلط ہے اسی طرح ان کی دعوت کرنا توحید کیطرف یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ) ہم نے یہ بات (کہ اور کسی کو معبود مت قرار دو) اپنے پہلے بڑوں میں (کبھی) نہیں سُنی بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے (اس واسطے ساری دُنیا کے خلاف باتیں کرتا ہے کہ میں رسُول ہوں اور معبود ایک ہے) سو ایک وقت خاص (یعنی اسکے مرنے کے وقت) تک اس (کی حالت) کا اور انتظار کر لو (آخر ایک وقت پر پہنچکر ختم ہو جاویگا اور سب پاپ کٹ جاویگا) نوح علیہ السلام نے (اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو کر جناب باری تعالیٰ میں) عرض کیا کہ اے میرے رب (اُن سے) میرا بدلہ لے بوجہ اسکے کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا ہے پس ہم نے (اُن کی دُعا قبول کی اور) اُن کے پاس حکم بھیجا کہ تم کشتی تیار کر لو ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے (کہ اب طوفان آوے گا اور تم اور مؤمنین اسکے ذریعہ سے محفوظ رہوگے) پھر جس وقت ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچے اور (علامت اسکی یہ ہے کہ) زمین سے پانی اُبلنا شروع ہو جاوے تو (اُسوقت) ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہسکتے، جیسا بھیڑ بکری، گائے بیل اونٹ گھوڑا گدھا وغیرہ) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو عدد اس (کشتی) میں داخل کر لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (سوار کر لو) باستثنا اسکے جس پر اُن میں سے (غرق ہونیکا) حکم نافذ ہو چکا ہے (یعنی آپکے اہل و عیال میں جو کافر ہو اسکو مت سوار کرو) اور (یہ سُن لو کہ عذاب آنے کے وقت) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جاویں گے پھر جسوقت تم اور تمھارے ساتھی (مسلمان) کشتی میں بیٹھ چکو تو یوں کہنا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہم کو کافر لوگوں سے (یعنی اُن کے افعال سے اور اُن کے وبال سے) نجات دی اور (جب بعد فرو ہونے طوفان کے کشتی سے زمین پر آنے لگو تو) یُوں کہنا کہ اے میرے رب مجھ کو (زمین پر) برکت کا اُتارنا اُتاریو (یعنی اطمینان ظاہری و باطنی کے ساتھ رکھیو) اور آپ سب (اپنے پاس بطور مہمانی کے) اُتارنے والوں سے اچھے ہیں (یعنی اور لوگ جو مہمان کو اُتار لیتے ہیں وہ اپنے مہمان کی مقصد براری اور مصائب سے نجات پر قدرت نہیں رکھتے آپ کو ان سب چیزوں پر قدرت ہے) اس (واقعہ مذکورہ) میں (اہل عقل کے لئے ہماری قدرت کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم (یہ نشانیاں معلوم کرا کر اپنے بندوں کو) آزماتے ہیں (کہ دیکھیں کہ کون ان سے نفع اُٹھاتا ہے کون نہیں اُٹھاتا، اور نشانیاں یہ ہیں۔ رسُول بھیجنا، ایمان داروں کو بچا لینا، کافروں کو ہلاک کر دینا دفعۃً طوفان پیدا کر دینا، کشتی کو محفوظ رکھنا وغیرہ وغیرہ)۔

معارف و مسائل

وَفَارَ التَّنُّوْرُ، تنور، اُس خاص جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جو روٹی پکانے کیلئے بنائی جاتی ہے اور یہی معنے معروف و مشہور ہیں۔ دوسرے معنے میں تنور پوری زمین کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خلاصۂ تفسیر میں اسی معنے کے اعتبار سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس سے ایک خاص تنور روٹی پکانے والا مراد لیا ہے جو کوفہ کی مسجد میں اور بعض کے نزدیک ملک شام میں کسی جگہ تھا۔ اس تنور سے پانی اُبلنے لگنا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے طوفان کی علامت قرار دی گئی تھی (مظہری) حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے طوفان اور کشتی کا واقعہ پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے)۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا

پھر پیدا کی ہم نے اُن سے پیچھے ایک جماعت اور پھر بھیجا ہم نے ان میں ایک رسول

مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ

اُن میں کا کہ بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا حاکم اس کے سوائے پھر کیا تم ڈرتے نہیں اور

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَ

بولے سردار اُس کی قوم کے جو کافر تھے اور جھٹلاتے تھے آخرت کی ملاقات کو اور

اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا

آرام دیا تھا اُن کو ہم نے دُنیا کی زندگی میں اور کچھ نہیں یہ ایک آدمی ہے جیسے تم کھاتا ہے جس قسم سے

تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا

تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جس قسم سے تم پیتے ہو اور کہیں تم چلنے لگے کہنے پر ایک آدمی کے

مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ

اپنے برابر کے تو تم بیشک خراب ہوئے کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ اور ہو جاؤ مٹی

تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

مٹی اور ہڈیاں تو تم کو نکلنا ہے، کہاں ہو سکتا ہے کہاں ہو سکتا ہے جو تم سے وعدہ ہوتا ہے

اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور کچھ نہیں یہی جینا ہے ہمارا دُنیا کا مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اُٹھنا نہیں

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے باندھ لایا ہے اللہ پر جھوٹ اور اُس کو ہم نہیں ماننے والے

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ

بولا اے رب میری مدد کر کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا فرمایا اب تھوڑے دنوں میں صبح کو وہ رہ جائیں گے

نَادِمِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ

پچھتاتے پھر پکڑا اُن کو چنگھاڑ نے تحقیق پھر کر دیا ہم نے اُن کو کوڑا

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

سو دور ہو جائیں گنہگار لوگ

خلاصۂ تفسیر

پھر (قوم نوح کے بعد) ہم نے دوسرا گروہ پیدا کیا (مراد عاد ہے یا ثمود) پھر ہم نے اُنہیں ایک پیغمبر کو بھیجا جو اُن ہی میں کے تھے (مراد ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام ہیں، اُن پیغمبر نے کہا کہ) تم لوگ اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، کیا تم (شرک سے) ڈرتے نہیں ہو، اور (اُن پیغمبر کی بات سنکر) اُن کی قوم میں سے جو رئیس تھے جنہوں نے (خدا و رسول کے ساتھ) کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے اُن کو دُنیوی زندگانی میں عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ بس یہ تو تمھاری طرح ایک (معمولی) آدمی ہیں (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو اور (جب یہ تمھارے ہی جیسے بشر ہیں تو) اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو (یعنی بڑی بے وقوفی ہے) کیا یہ شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور (مر کر) مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے (چنانچہ جب اجزاء لحمیہ خاک ہو جاتے ہیں تو ہڈیاں بے گوشت رہ جاتی ہیں پھر بعد چندے وہ بھی خاک ہو جاتی ہیں تو یہ شخص کہتا ہے کہ جب اس حالت پر پہنچ جاؤ گے) تو پھر دوبارہ زندہ کر کے زمین سے نکالے جاؤ گے (تو بھلا ایسا شخص کہیں قابل اطاعت و اتباع ہو سکتا ہے اور) بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جو بات تم سے کہی جاتی ہے بس زندگی تو یہی ہماری دُنیوی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ کئے جاویں گے بس یہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے (کہ اس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور کوئی دوسرا معبود نہیں اور قیامت آوے گی) اور ہم تو ہرگز اس کو سچا نہ سمجھیں گے۔ پیغمبر نے دُعا کی کہ اے میرے رب میرا بدلہ لے اس وجہ سے کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ یہ لوگ عنقریب پشیمان ہوں گے چنانچہ ان کو ایک سخت آواز نے (یا سخت عذاب نے) موافق وعدہ برحق کے (کہ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ) آپکڑا (جس سے وہ سب ہلاک ہوگئے) پھر (ہلاک کرنے کے بعد) ہم نے ان کو خس و خاشاک (کی طرح پامال) کر دیا سو خدا کی مار کافر لوگوں پر۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بسلسلہ ہدایت ذکر کیا گیا تھا، آگے دوسرے پیغمبروں اور ان کی اُمتوں کا کچھ حال اجمالاً بغیر نام متعین کئے ذکر کیا گیا ہے۔ آثار و علامات سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مُراد اُن اُمتوں سے عاد یا ثمود یا دونوں ہیں۔ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا اور ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اس قصہ میں ان قوموں کا ہلاک ہونا ایک صَیحہ یعنی غیبی سخت آواز کے ذریعہ بیان فرمایا ہے اور صَیحہ کے ذریعہ ہلاک ہونا دوسری آیات میں قوم ثمود کا بیان ہوا ہے اس سے بعض حضرات نے فرمایا کہ ان آیات میں قَرْنًا اٰخَرِیْنَ سے مُراد ثمود ہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صَیحہ کا لفظ اس جگہ مطلق عذاب کے معنے میں لیا گیا ہو تو پھر یہ قوم عاد کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (اس دُنیا کی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ بس مرنا جینا اسی دُنیا کا ہے اور پھر دوبارہ زندہ ہونا نہیں) یہی قول عام کفار کا ہے جو قیامت کے منکر ہیں۔ یہ کفار جو زبان سے کہتے ہیں وہ تو کھلے کافر ہیں ہی، لیکن افسوس اور بہت فکر کی چیز یہ ہے کہ اب بہت سے مسلمانوں میں بھی عملی طور پر یہ انکار اُن کے ہر قول و فعل سے مترشح ہوتا ہے کہ آخرت اور قیامت کے حساب کی طرف کبھی دھیان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس مصیبت سے نجات عطا فرماویں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ

پھر پیدا کیں ہم نے ان سے پیچھے جماعتیں اور نہ آگے جائے کوئی قوم

اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا

اپنے وعدہ سے اور نہ پیچھے رہے پھر بھیجتے رہے ہم اپنے رسول لگاتار جہاں پہنچا

جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ

کسی اُمت کے پاس اُن کا رسول اسکو جھٹلا دیا، پھر چلاتے گئے ہم ایک کے پیچھے دوسرے اور کر ڈالا اُن کو

اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى

کہانیاں سو دُور ہو جائیں جو لوگ نہیں مانتے پھر بھیجا ہم نے موسیٰ

وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

اور اسکے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر اور کھلی سند فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ

پھر لگے بڑائی کرنے اور وہ لوگ زور پر چڑھ رہے تھے سو بولے کیا ہم مانیں گے اپنی برابر کے دو

مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ

آدمیوں کو اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہیں پھر جھٹلایا ان دونوں کو پھر ہو گئے

الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

غارت ہونے والوں میں اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب تاکہ وہ راہ پائیں

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ

اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اسکی ماں کو ایک نشانی اور ان کو ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ پر

ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی ستھرا

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (عاد یا ثمود) کے (ہلاک ہونے کے) بعد ہم نے اور اُمتوں کو پیدا کیا (چونکہ تکذیب رسُول کے سبب وہ بھی ہلاک ہوئے اور اُن کے ہلاک ہونے کی جو مدت علم الٰہی میں مقرر تھی) کوئی اُمت (ان اُمتوں میں سے) اپنی (اُس) مدت معینہ سے (ہلاکت میں) نہ پیش دستی کر سکتی تھی اور نہ (اس مدت سے) وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے تھے (بلکہ عین وقت پر ہلاک کئے گئے غرض وہ اُمتیں اوّل پیدا کی گئیں) پھر (اُن کے پاس) ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے (ہدایت کے لئے) بھیجا (جس طرح وہ اُمتیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں مگر اُن کی حالت یہ ہوئی کہ) جب کبھی کسی اُمت کے پاس اس اُمت کا (خاص) رسُول (خدا کے احکام لیکر) آیا انھوں نے اسکو جھٹلایا سو ہم نے (بھی ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا تار باندھ دیا اور ہم نے اُن کی کہانیاں بنا دیں (یعنی وہ ایسے نیست و نابود ہوئے کہ بجز کہانیوں کے ان کا کچھ نام و نشان نہ رہا) سو خدا کی مار ان لوگوں پر جو (انبیاء کے سمجھانے پر بھی) ایمان نہ لاتے تھے۔ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ صریحہ کہ دلیل نبوت ہے) دیکر فرعون اور اُسکے درباریوں کے پاس (بھی پیغمبر بناکر) بھیجا (اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا بھی معلوم ہے) سو اُن لوگوں نے (اُن کی تصدیق و اطاعت سے) تکبّر کیا اور وہ لوگ تھے ہی متکبر (یعنی پہلے ہی سے ان کا دماغ سڑا ہوا تھا) چنانچہ وہ (باہم) کہنے لگے کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر جو ہماری طرح کے آدمی ہیں (انمیں کوئی بات امتیاز کی نہیں) ایمان لے آدیں (اور اُن کے

فرمانبردار بن جاویں، حالانکہ ان کی قوم کے لوگ (تو خود) ہمارے زیر حکم ہیں (یعنی ہم کو تو خود انکی قوم پر ریاست حاصل ہے پھر ان دونوں کے اقتدار اور ریاست کو ہم کیسے تسلیم کرسکتے ہیں، اُن لوگوں نے ریاستِ دینیہ کو ریاستِ دُنیویہ پر قیاس کیا کہ ہم کو ایک قسم کی ریاست یعنی دُنیوی حاصل ہے تو دوسری قسم کے بھی ہم ہی مستحق ہیں اور جب ان کو دُنیوی ریاست نہیں ملی تو دینی کیسے مل سکتی ہے اور فساد اس قیاس کا ظاہر ہے) غرض وہ لوگ ان دونوں کی تکذیب ہی کرتے رہے پس (اس تکذیب کی وجہ سے) ہلاک کئے گئے اور (اُن کے ہلاک ہونے کے بعد) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توراۃ) عطا فرمائی تاکہ (اُس کے ذریعہ سے) وہ لوگ (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل ہدایت پائیں اور ہم نے (اپنی قدرت و توحید پر دلالت کے لئے اور نیز بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے) مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اور اُن کی ماں (حضرت مریم علیہا السلام) کو بڑی نشانی (اپنی قدرت کی اور اُن کے صدق کی) بنایا (کہ بے باپ تولد ہونا دونوں کے متعلق آیتِ عظیمہ ہے) اور (چونکہ اُن کو نبی بنانا منظور تھا اور ایک ظالم بادشاہ بچپن ہی میں اُن کے درپے قتل ہوگیا تھا اسلئے) ہم نے (اس سے بچاکر) ان دونوں کو ایک ایسی بلند زمین پر لیجاکر پناہ دی جو (بوجہ غلات اور میوہ جات پیدا ہونیکے) ٹھہرنے کے قابل اور (بوجہ نہر جاری ہونے کے) شاداب جگہ تھی (یہاں تک کہ امن وامان سے جوان ہوئے اور نبوت عطا ہوئی تو توحید و دعویٰ رسالت میں اُن کی تصدیق ضروری تھی مگر بعض نے نہ کی)۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اے رسولو کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا جو تم کرتے ہو میں جانتا

عَلِيْمٌ ۝۵۱ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲

ہوں اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں تمہارا رب سو مجھ سے ڈرتے رہو

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳

پھر پھوٹ ڈال کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے، ہر فرقہ جو اُن کے پاس ہے اس پر ریجھ رہے ہیں

فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۵۴ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ

سو چھوڑ دے اُن کو اُن کی بیہوشی میں ڈوبے ایک وقت تک کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو ہم اُن کو دیے جاتے

مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶

ہیں مال اور اولاد سو دوڑ دوڑ کر پہنچا رہے ہیں ہم اُن کو بھلائیاں یہ بات نہیں وہ سمجھتے نہیں

خلاصۂ تفسیر

ہم نے جس طرح تم کو اپنی نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی اور عبادت کا حکم دیا اسی طرح سب پیغمبروں کو اور اُن کے واسطے سے اُن کی اُمتوں کو بھی حکم دیا کہ) اے پیغمبرو! تم (اور تمھاری اُمتیں) نفیس چیزیں کھاؤ (کہ خدا کی نعمت ہیں) اور (کھا کر شکر ادا کرو کہ) نیک کام کرو (یعنی عبادت اور) میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں (تو عبادت اور نیک کاموں پر اُن کی جزا اور ثمرات عطا کروں گا) اور (ہم نے اُن سے یہ بھی کہا کہ جو طریقہ تمھیں ابھی بتایا گیا ہے) یہ ہے تمھارا طریقہ (جس پر تم کو چلنا اور رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (سب انبیاء اور اُن کی اُمتوں کا کسی شریعت میں یہ طریقہ نہیں بدلا) اور (حاصل اُس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمھارا رب ہوں تم مجھ سے ڈرتے رہو (یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو کیونکہ رب ہونے کی حیثیت سے تمھارا خالق و مالک بھی ہوں اور مُنعم ہونے کی حیثیت سے تم کو بیشمار نعمتیں بھی دیتا ہوں، ان سب چیزوں کا تقاضا اطاعت و فرمانبرداری ہی) سو (اسکا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ سب ایک ہی طریقۂ مذکورہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) اُن لوگوں نے اپنے دین اپنا طریق الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کر لیا ہر گروہ کے پاس جو دین (یعنی اپنا بنایا ہوا طریقہ) ہے وہ اسی پر مگن اور خوش ہے (اُس کے باطل ہونے کے باوجود اُسی کو حق سمجھتا ہے) تو آپ اُن کو انکی جہالت میں ایک خاص وقت تک رہنے دیجئے (یعنی اُن کی جہالت پر آپ غم نہ کیجئے جب مقرر وقت انکی موت کا آجاویگا تو سب حقیقت کھُل جاوے گی اور اب جو فوری طور پر ان پر عذاب نہیں آتا تو) کیا (اس سے) یہ لوگ یُوں گمان کر رہے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (یہ بات ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ (اس ڈھیل دینے کی وجہ) نہیں جانتے (یعنی یہ ڈھیل تو اُن کو بطور استدراج کے دی جا رہی ہے جو انجام کار اُن کے لئے اور زیادہ عذاب کا سبب بنے گی کیونکہ ہماری مہلت اور ڈھیل دینے سے یہ اور مغرور ہو کر سرکشی اور گناہوں میں زیادتی کریں گے اور عذاب زیادہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ، لفظ طیبات کے لغوی معنی ہیں پاکیزہ نفیس چیزیں۔ اور چونکہ شریعتِ اسلام میں جو چیزیں حرام کر دی گئی ہیں نہ وہ پاکیزہ ہیں نہ اہلِ عقل کے لئے نفیس و مرغوب۔ اس لئے طیّبٰت سے مُراد صرف حلال چیزیں ہیں جو ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے پاکیزہ و نفیس ہیں۔ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے

اپنے وقت میں دو ہدایات دی گئی ہیں ایک یہ کہ کھانا حلال اور پاکیزہ کھاؤ، دوسرے یہ کہ عمل نیک صالح کرو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب کیا گیا ہے جن کو اللہ نے معصوم بنایا ہے تو اُن کی اُمّت کے لوگوں کے لئے یہ حکم زیادہ قابل اہتمام ہے اور اصل مقصود بھی اُمتوں ہی کو اس حکم پر چلانا ہے۔

علماء نے فرمایا کہ ان دونوں حکموں کو ایک ساتھ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حلال غذا کا عمل صالح میں بڑا دخل ہے جب غذا حلال ہوتی ہے تو نیک اعمال کی توفیق خود بخود ہونے لگتی ہے اور غذا حرام ہو تو نیک کام کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اس میں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ بعض لوگ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور غبار آلود رہتے ہیں پھر اللہ کے سامنے دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں مگر اُن کا کھانا بھی حرام ہوتا ہے پینا بھی، لباس بھی حرام سے تیار ہوتا ہے اور حرام ہی کی اُن کو غذا ملتی ہے ایسے لوگوں کی دُعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور دُعا کے قبول ہونے میں حلال کھانے کو بڑا دخل ہے جب غذا حلال نہ ہو تو عبادت اور دُعا کی مقبولیت کا بھی استحقاق نہیں رہتا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً، لفظ اُمّت، ایک جماعت اور کسی خاص پیغمبر کی قوم کے معنی میں معروف و مشہور ہے اور کبھی یہ لفظ طریقہ اور دین کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے قرآن کی ایک آیت وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ، اس میں اُمّت سے مُراد ایک دین اور طریقہ ہے۔ یہی معنے اس جگہ بھی مُراد ہیں فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا، زُبُر، زبور کی جمع ہے جو کتاب کے معنے میں آتا ہے اس معنے کے اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو سب انبیاء اور ان کی اُمتوں کو اُصول اور عقائد کے مسائل میں ایک ہی دین اور طریقہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی تھی مگر اُمتوں نے اسکو نہ مانا اور آپس میں ٹکڑے مختلف ہو گئے ہر ایک نے اپنا طریقہ الگ اور اپنی کتاب الگ بنالی۔ اور زُبُر کبھی زُبرہ کی جمع بھی آتی ہے جس کے معنے قطعہ اور فرقہ کے ہیں۔ یہی معنے اس جگہ زیادہ واضح ہیں اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ یہ لوگ عقائد اور اُصول میں بھی مختلف فرقے بن گئے لیکن فروعی اختلاف ائمہ مجتہدین کا اس میں داخل نہیں کیونکہ ان اختلافات سے دین و ملت الگ نہیں ہو جاتا اور ایسا اختلاف رکھنے والے الگ الگ فرقے نہیں کہلاتے۔ اور اس اجتہادی اور فروعی اختلاف کو فرقہ واریت کا رنگ دینا خالص جہالت ہے جو کسی مجتہد کے نزدیک جائز نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ

البتہ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب

بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

کی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ

اور جو لوگ کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور اُن کے دل ڈر رہے ہیں اسلئے کہ اُن کو اپنے رب کیطرف

رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

لوٹ کر جانا ہے وہ لوگ دوڑ دوڑ کر لیتے ہیں بھلائیاں اور وہ ان پر پہنچے سب سے آگے

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ

اور ہم کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی گنجائش کے موافق اور ہمارے پاس لکھا ہوا ہے جو بولتا ہے

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

سچ اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جاکر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا حکم کے موافق نہ ہو مثلاً مال حلال نہ ہو یا نیت اللہ کے لئے خالص نہ ہو اور نیت میں اخلاص کامل نہ ہونا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو اُلٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے تو جن لوگوں میں یہ صفات ہوں) یہ لوگ اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ اُن کی طرف دوڑ رہے ہیں اور (یہ اعمال مذکورہ کچھ سخت بھی نہیں جنکا کرنا مشکل ہو کیونکہ) ہم کسی کو اُس کی وسعت سے زیادہ کام کرنے کو نہیں کہتے (اس لئے یہ سب کام آسان ہیں اور اس کے ساتھ اُن کا اچھا انجام اور ثمرہ یقینی ہے کیونکہ) ہمارے پاس ایک دفتر (نامۂ اعمال کا محفوظ) ہے جو ٹھیک ٹھیک (سب کا حال) بتلا دے گا اور لوگوں پر ذرا ظلم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ، لفظ یُؤْتُوْن، ایتاء سے مشتق ہے جس کے معنے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں اس لئے اس کی تفسیر صدقات کے ساتھ کی گئی ہے اور حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ سے ایک قرارت اسکی یَاْتُوْنَ مَآ اَتَوْا بھی منقول ہے یعنی عمل کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں

اس میں صدقات نماز روزہ اور تمام نیک کام شامل ہو جاتے ہیں۔ دو مشہور قراءت پر اگرچہ ذکر یہاں صدقات ہی کا ہوگا مگر مراد بہر حال عام اعمالِ صالحہ ہیں جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کرکے ڈرنے والے لوگ وہ ہیں جو شراب پیتے یا چوری کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے صدیق کی بیٹی یہ بات نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں اس کے باوجود اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب) قبول نہ ہوں ایسے ہی لوگ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ۔ مظہری) اور حضرت حسن بصری رحؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کرکے اتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرے عمل کرکے بھی اتنا نہیں ڈرتے (قرطبی)

اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ، مسارعت فی الخیرات سے مُراد یہ ہے کہ جیسے عام لوگ دُنیا کے منافع کے پیچھے دوڑتے اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتے ہیں یہ حضرات دین کے فوائد میں ایسا ہی عمل کرتے ہیں! اسی لئے وہ دین کے کاموں میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ

کوئی ہیں اُن کے دل بیہوش ہیں اس طرف سے اور اُن کو اور کام لگ رہے ہیں اُسکے سوا کہ وہ اُن کو

لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ

کر رہے ہیں یہاں تک کہ جب پکڑیں گے ہم اُن کے آسودہ لوگوں کو آفت میں تبھی وہ لگیں گے

يَجْــَٔــرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْــَٔــرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ

چلانے مت چلاؤ آج کے دن تم ہم سے چھوٹ نہ سکو گے تم کو

كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾

سنائی جاتی تھیں میری آیتیں تو تم ایڑیوں پر اُلٹے بھاگتے تھے

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ

اس سے تکبر کرکے ایک قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے سو کیا انھوں نے دھیان نہیں کیا اس کلام میں یا

جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ

آئی ہے اُن کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی اُنکے پہلے باپ دادوں کے پاس یا پہچانا نہیں انھوں نے اپنے پیغام لانے والے کو

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ

سو وہ اسکو اُوپرا سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں اس کو سودا ہے، کوئی نہیں وہ تو لایا ہے انکے پاس سچی بات

وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ

اور اُن میں بہتوں کو سچی بات بری لگتی ہے اور اگر سچا رب چلے ان کی خوشی پر تو خراب ہو جائیں

السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ

آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے ان کو ان کی نصیحت

عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿٧١﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ

سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے یا تو اُن سے مانگتا ہے کچھ محصول سو محصول تیرے رب کا بہتر ہے

وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٧٣﴾

اور وہ ہے بہتر روزی دینے والا اور تو تو بلاتا ہے ان کو سیدھی راہ پر

وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ ﴿٧٤﴾

اور جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو راہ سے ٹیڑھے ہو گئے ہیں

وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور کھول دیں جو تکلیف پہنچی ان کو تو بھی برابر لگے رہیں گے اپنی شرارت میں

يَعْمَهُونَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ

بہکے ہوئے اور ہم نے پکڑا تھا ان کو آفت میں پھر عاجزی کی اپنے رب کے آگے

وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ

اور نہ گڑگڑائے یہاں تک کہ جب کھولیں ہم ان پر دروازہ ایک سخت

شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٧٧﴾

آفت کا تب اس میں ان کی آس ٹوٹے گی

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو اوپر مومنین کی حالت تھی مگر کفار ایسے نہیں ہیں، بلکہ (برعکس) ان کفار کے قلوب اس دین کی طرف سے (جس کا ذکر بآیات مذکورہ میں ہے) جہالت (اور شک) میں ڈوبے ہوئے ہیں (جس کا حال اوپر بھی معلوم ہو چکا فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ) اور اس (جہالت و انکار) کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی (بڑے بڑے خبیث) عمل ہیں جن کو یہ (مسلسل) کرتے رہتے ہیں (یہ لوگ شرک اور اعمال سیئہ کے برابر خوگر رہیں گے) یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو (جن کے پاس مال و دولت اور نوکر چاکر سب کچھ ہے) عذاب (بعد الموت) میں دھر پکڑیں گے (اور غریب غرباء تو کس گنتی میں ہیں اور وہ تو عذاب سے کیا بچاؤ کر سکتے ہیں، غرض یہ کہ جب ان سب پر عذاب نازل ہوگا) تو فوراً چلا اٹھیں گے (اور سارا ناز و تکبار

جس کے اب عادی ہیں کافور ہو جاویگا اسوقت اُن سے کہا جاوے گا کہ) اب مت چلاؤ (کہ کوئی فائدہ نہیں کیونکہ) ہماری طرف سے تمھاری مطلق مدد نہ ہوگی (کیونکہ یہ دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے جس میں چلانا اور عاجزی کرنا مفید ہو جو دار العمل تھا اس میں تو تمھارا یہ حال تھا کہ) میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر (رسُول کی زبان سے) سُنائی جایا کرتی تھیں تو تم اُلٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے (اس قرآن کی شان) میں بیہودہ بکتے ہوئے (کہ کوئی اس کو سحر کہتا تھا کوئی شعر کہتا تھا اور مشغلہ کا یہی مطلب ہے پس تم نے دار العمل میں جیسا کیا آج دار الجزاء میں ویسا بھگتو۔ اور یہ لوگ جو قرآن کی اور صاحب قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں تو اسکا کیا سبب ہے) کیا ان لوگوں نے اس کلام (الٰہی) میں غور نہیں کیا (جس سے اسکا اعجاز ظاہر ہو جاتا اور یہ ایمان لے آتے) یا (تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ) ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے پہلے بڑوں کے پاس نہیں آئی تھی (مُراد اس سے احکام الٰہیہ کا آنا ہے جو کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اُن کی اُمتوں کو بھی احکام دیئے جاتے رہے ہیں کقولہ تعالیٰ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ، پس تکذیب کی یہ وجہ بھی باطل ٹھہری اور یہ دو وجہ تو قرآن کے متعلق ہیں۔ آگے صاحبِ قرآن کے متعلق فرماتے ہیں یعنی) یا (وجہ تکذیب کی یہ ہے کہ) یہ لوگ اپنے رسُول (کی صفتِ دیانت وصدق و امانت) سے واقف نہ تھے اسوجہ سے اُن کے منکر ہیں، (یعنی یہ وجہ بھی باطل ہے کیونکہ آپ کے صدق و دیانت پر سب کا اتفاق تھا) یا (یہ وجہ ہے کہ) یہ لوگ (نعوذ باللہ) آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں (سو آپ کا اعلیٰ درجہ کا صاحبِ عقل اور صاحب الرائے ہونا بھی ظاہر ہے۔ سو واقع میں ان میں سے کوئی وجہ بھی معقول نہیں) بلکہ (اصلی وجہ یہ ہے کہ) یہ رسُول ان کے پاس حق بات لیکر آئے ہیں اور ان میں اکثر لوگ حق بات سے نفرت رکھتے ہیں۔ (پس یہ تمام تر وجہ ہے تکذیب کی اور عدم اتباع حق کی اور یہ لوگ اس دینِ حق کا اتباع تو کیا کرتے یہ تو اور اُلٹا یہ چاہتے ہیں کہ وہ دینِ حق ہی ان کے خیالات کے تابع کر دیا جاوے اور جو مضامین قرآن میں ان کے خلاف ہیں اُن کو خارج یا ترمیم کر دیا جاوے کقولہ تعالیٰ فی سورۃ یُونس قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ) اور (بفرضِ محال، اگر (ایسا امر واقع ہو جاتا) اور دینِ حق اُن کے خیالات کے تابع (اور موافق) ہو جاتا تو (تمام عالم میں کفر و شرک پھیل جاتا اور اسکا اثر یہ ہوتا کہ حق تعالیٰ کا غضب تمام عالم پر متوجہ ہوتا اور اسکا مقتضا یہ تھا کہ) تمام آسمان اور زمین اور جو ان میں (آباد) ہیں سب تباہ ہو جاتے (جیسا قیامت میں تمام انسانوں میں گمراہی عام ہو جانے کے سبب اللہ تعالیٰ کا غضب بھی سب پر عام ہوگا اور غضبِ الٰہی عام ہونے سے سب کی ہلاکت بھی عام ہوگی اور اوّل تو کسی امر کا حق ہونا مقتضی ہے اُس کے وجوبِ قبول کو گو نافع بھی نہ ہو اور اُسکا قبول نہ کرنا خود عیب ہے مگر ان لوگوں میں صرف یہی ایک عیب نہیں کہ حق سے کراہت ہو) بلکہ اس سے بڑھ کر

دوسرا عیب اور بھی ہے کہ حق کا اتباع جو انہیں کے نفع کا سامان ہے اُس سے دور بھاگتے ہیں بس) ہم نے اُن کے پاس اُن کی نصیحت (اور نفع) کی بات بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں یا (علاوہ وجوہِ مذکورہ کے ان کی تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ ان کو یہ شبہ ہوا ہو کہ) آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو (یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب آپ جانتے ہیں کہ) آمدنی تو آپکے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے (تو آپ لوگوں سے کیوں مانگتے ہیں) اور (خلاصہ ان کی حالت کا یہ ہے کہ) آپ تو ان کو سیدھے رستہ کی طرف (جس کو اوپر حق کہا ہے) بلا رہے ہیں اور ان لوگوں کی جو کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یہ حالت ہے کہ اس (سیدھے) رستہ سے ہٹے جاتے ہیں (مطلب یہ کہ حق ہونا اور مستقیم ہونا اور نافع ہونا یہ سب مقتضیات ایمان کے جمع ہیں اور جو وجوہات مانع ہو سکتی تھیں وہ کوئی موجود نہیں، پھر ایمان نہ لانا اشد درجہ کی جہالت اور ضلالت ہے) اور (ان کی قساوت و عناد کی یہ حالت ہے کہ جس طرح یہ لوگ آیاتِ شرعیہ سے متاثر نہیں ہوتے اسی طرح آیاتِ قہریہ مصائب و بلیات سے بھی متاثر نہیں ہوتے گو مصیبت کے وقت طبعی طور پر ہم کو پکارتے بھی ہیں لیکن وہ دفع الوقتی ہوتی ہے چنانچہ) اگر ہم ان پر مہربانی فرما دیں اور ان پر جو تکلیف ہے اُس کو ہم دور بھی کر دیں تو وہ لوگ (پھر) اپنی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے اصرار کرتے رہیں (اور وہ قول و قرار جو مصیبت میں کئے تھے سب ختم ہو جاویں کقولہ تعالیٰ إِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا الخ وقولہ تعالیٰ إِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ الخ) اور (شاہد اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات) ہم نے ان کو گرفتارِ عذاب بھی کیا ہے سو ان لوگوں نے نہ اپنے رب کے سامنے (پورے طور پر) فروتنی کی اور نہ عاجزی اختیار کی (پس جب عین مصیبت میں اور مصیبت بھی ایسی سخت جس کو عذاب کہا جا سکے جیسے قحط جو مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے ہوا تھا اُنھوں نے عاجزی اختیار نہیں کی تو بعد زوال مصیبت کے تو بدرجۂ اولیٰ اُن سے اسکی توقع نہیں مگر ان کی یہ ساری بے پروائی دنیا کی ان مصائب تک ہے جن کے عادی ہو چکے ہیں) یہاں تک کہ ہم جب ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے (جو کہ خرق العادۃ ہو خواہ دنیا ہی میں کہ کوئی غیبی قہر آپڑے یا بعد الموت کہ ضرور ہی واقع ہوگا) تو اسوقت بالکل حیرت زدہ رہ جاویں گے (کہ یہ کیا ہو گیا اور سب نشہ ہرن ہو جاویگا)

معارف و مسائل

غَمْرَۃ، ایسے گہرے پانی کو کہتے ہیں جسمیں آدمی ڈوب جائے اور جو اسمیں داخل ہونے والے کو اپنے اندر چھپا لے، اسی لئے لفظ غمرہ پردہ اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں اُن کی مشرکانہ جہالت کو غمرہ کہا گیا ہے جس میں اُن کے دل ڈوبے ہوئے اور چھپے ہوئے ہیں کہ کسی

طرف سے اُن کو روشنی کی کرن نہیں پہنچتی۔

وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ، یعنی اُن کی گمراہی کے لئے تو ایک شرک و کفر ہی کا پردۂ غفلت کافی تھا مگر وہ اسی پر بس نہیں کرتے اس کے ساتھ دوسرے اعمالِ خبیثہ بھی مسلسل کرتے ہی رہتے ہیں۔

مُتْرَفِيهِمْ، مُتْرَفٌ، تَرَفٌ سے مشتق ہے جس کے معنے تنعّم اور خوشحالی کے ہیں۔ اس جگہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کا ذکر ہے جس میں امیر غریب خوشحال بدحال سبھی داخل ہونگے مگر مترفین اور خوشحالوں کا ذکر خاص طور پر اسلئے کیا کہ ایسے ہی لوگ دُنیا کے مصائب سے اپنے بچاؤ کا کچھ سامان کرلیا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا عذاب جب آتا ہے تو سب سے پہلے یہی لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس آیت میں جس عذاب کے اندر انکے پکڑے جانے کا ذکر ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد وہ عذاب ہے جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تلوار سے ان کے سرداروں پر پڑا تھا۔ اور بعض حضرات نے اس عذاب سے مُراد قحط کا عذاب لیا ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بددُعا سے مکہ والوں پر مسلّط کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ وہ مُردار جانور اور کتّے اور ہڈیاں کھانے پر مجبور ہوگئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے لئے بددُعا بہت کم کی ہے لیکن اس موقع میں مسلمانوں پر اُن کے مظالم کی شدّت سے مجبور ہو کر یہ بددُعا کی تھی۔ اللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ (رواہ البخاری ومسلم)۔ (قرطبی ومظہری)

مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ، اس میں لفظ بِہٖ کی ضمیر اکثر مفسّرین نے حرم کیطرف راجع قرار دی جو اگرچہ اوپر کہیں مذکور نہیں مگر حرم سے قریشِ مکہ کا گہرا تعلق اور اس پر اُن کا ناز اتنا معروف و مشہور تھا کہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور معنے اس کے یہ ہیں کہ قریشِ مکہ کا اللہ کی آیتیں سُن کر پچھلے پاؤں بھاگنے اور نہ ماننے کا سبب حرمِ مکہ کی نسبت اور اُس کی خدمت پر ان کا تکبر اور ناز تھا۔ اور سَامِرًا، سمر سے مشتق ہے جس کے اصل معنے چاندنی رات کے ہیں۔ عرب کی عادت تھی کہ چاندنی رات میں بیٹھ کر قصّے کہانیاں کہا کرتے تھے اس لئے لفظ سمر قصّہ کہانی کے معنے میں استعمال ہونے لگا اور سامر قصّہ گو کو کہا جاتا ہے یہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر معنی میں جمع کے لئے بھی بولا جاتا ہے! اس جگہ سامر بمعنے سامرین جمع کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مشرکین کا ایک حال جو آیاتِ الٰہیہ سے انکار کا سبب بنا ہوا تھا حرمِ مکہ کی نسبت و خدمت پر ان کا ناز تھا۔ دوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ بے اصل اور بے بنیاد قصّے کہانیوں میں مشغول رہنے کے عادی ہیں ان کو اللہ کی آیات سے دلچسپی نہیں۔

تَهْجُرُونَ، یہ لفظ ہُجر بضم الہاء سے مشتق ہے جس کے معنے فضول بکواس اور گالی گلوچ کے ہیں یہ تیسرا حال ان مشرکین کا بیان کیا گیا کہ یہ لوگ فضول بکواس اور گالی گلوچ کے عادی ہیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں بعض ایسے ہی گستاخانہ کلمات کہتے رہتے ہیں۔

عشاء کے بعد قصہ گوئی کی ممانعت اور خاص ہدایات

رات کو افسانہ گوئی کا مشغلہ عرب و عجم میں قدیم سے چلا آتا ہے۔ اور اس میں بہت سے مفاسد اور وقت کی اضاعت تھی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو مٹانے کے لئے عشاء سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد فضول قصہ گوئی کو منع فرمایا۔ حکمت یہ تھی کہ عشاء کی نماز پر انسان کے اعمال یومیہ ختم ہو رہے ہیں جو دن بھر کے گناہوں کا بھی کفارہ ہو سکتا ہے۔ یہی اس کا آخری عمل اس دن کا ہو تو بہتر ہے۔ اگر بعد عشاء فضول قصہ گوئی میں لگ گیا تو اولاً یہ خود فعل عبث اور مکروہ ہے اس کے علاوہ اسکے ضمن میں غیبت جھوٹ اور دوسرے طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایک برا انجام اسکا یہ ہے کہ رات کو دیر تک جاگے گا تو صبح کو سویرے نہیں اٹھ سکے گا اسی لئے حضرت فاروق اعظم جب کسی کو عشاء کے بعد فضول قصوں میں مشغول دیکھتے تو تنبیہ فرماتے تھے اور بعض کو سزا بھی دیتے تھے اور فرماتے کہ جلد سو جاؤ شاید آخر رات میں تہجد کی توفیق ہو جائے۔ (قرطبی)

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ سے اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ تک ایسی پانچ چیزوں کا ذکر ہے جو مشرکین کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے کسی درجہ میں مانع ہو سکتی تھیں اور ان میں سے ہر ایک وجہ کے منتفی ہونے کا بیان اسکے ساتھ کر دیا ہے۔ حاصل اسکا یہ ہے کہ جو وجوہ ان لوگوں کے لئے ایمان سے مانع ہو سکتی تھیں ان میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں اور ایمان لانے کے لئے جو اسباب و وجوہ داعی ہیں وہ سب موجود ہیں اس لئے اب انکا انکار خالص عناد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں جسکا ذکر اسکے بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا ہے بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۔ یعنی انکار رسالت کی کوئی عقلی یا طبعی وجہ تو موجود نہیں پھر انکار کا سبب اسکے سوا کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حق بات لیکر آئے ہیں اور یہ لوگ حق بات ہی کو برا سمجھتے ہیں سننا نہیں چاہتے جسکا سبب ہوا و ہوس کا غلبہ اور جاہلوں کو جو ریاست و اقتدار حاصل ہے اسکی محبت اور جاہلوں کی تقلید ہے۔ یہ پانچ وجوہ جن کا ذکر ایمان اور اقرار بالنبوت سے مانع ہونے کی حیثیت میں کیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ، یعنی ان کے انکار کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جو شخص دعوت حق اور دعوائے نبوت لیکر آیا ہے یہ کہیں باہر سے آیا ہوتا تاکہ یہ لوگ اسکے نام و نسب اور عادات و خصال اور کردار سے واقف نہ ہوتے تو یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم اس مدعی کے حالات سے واقف نہیں اس کو کیسے نبی و رسول مان کر اپنا مقتدا بنالیں۔ مگر یہاں تو یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش ہی کے اعلیٰ نسب میں اسی شہر مکہ میں پیدا ہوئے اور بچپن سے لیکر جوانی اور مابعد کا سارا زمانہ انھیں لوگوں کے سامنے گزرا۔ آپ کا کوئی عمل کوئی عادت ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور دعوائے نبوت سے پہلے تک سارے کفار مکہ آپ کو صادق و امین کہا کرتے تھے آپکے کردار و

عمل پر کسی نے بھی کبھی کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا تو اب ان کا یہ عذر بھی نہیں چل سکتا کہ وہ انکو پہچانتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۔ اس سے پہلی آیت میں مشرکین کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جو عذاب میں مبتلا ہونے کے وقت اللہ سے یا رسول سے فریاد کرتے ہیں اگر ہم ان کی فریاد پر رحم کھا کر عذاب ہٹا دیں تو ان کی جبلی شرارت و سرکشی کا عالم یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے کے بعد پھر اپنی سرکشی اور نافرمانی میں مشغول ہو جائیں گے اس آیت میں اُن کے ایک اسی طرح کے واقعہ کا بیان ہے کہ ان کو ایک عذاب میں پکڑ لیا گیا مگر عذاب سے بدعاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نجات پانے کے بعد بھی یہ اللہ کے سامنے نہیں جھکے اور برابر اپنے کفر و شرک پر جمے رہے۔

اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے اس کا دفع ہونا

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب مسلط ہونے کی دُعا کی تھی اس کی وجہ سے یہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے اور مُردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہوگئے۔ یہ دیکھ کر ابو سفیانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور صلہ رحمی کی، کیا آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں اہلِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، آپ نے فرمایا بیشک کہا ہے اور واقعہ بھی یوں ہی ہے۔ ابو سفیانؓ نے کہا کہ آپ نے اپنی قوم کے بڑوں کو تو بدر کے معرکہ میں تلوار سے قتل کر دیا اور جو اب رہ گئے ہیں اُن کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں اللہ سے دعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے ہٹ جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی یہ عذاب اُسی وقت ختم ہو گیا اسی پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ۔

اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ عذاب میں مبتلا ہونے پھر اس سے نجات پانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے رب کے سامنے نہیں جھکے چنانچہ واقعہ یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے قحط رفع بھی ہو گیا مگر مشرکینِ مکہ اپنے شرک و کفر پر اُسی طرح جمے رہے۔ (مظہری وغیرہ)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا

اور اسی نے بنا دیئے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا

مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ

حق مانتے ہو اور اسی نے تم کو پھیلا رکھا ہے زمین میں اور اسی کی طرف

تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ

جمع ہو کر جاؤ گے اور وہی ہے جلاتا اور مارتا اور اسی کا کام ہے بدلنا رات

وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۸۰﴾ بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿۸۱﴾

اور دن کا سو کیا تم کو سمجھ نہیں کوئی بات نہیں یہ تو وہی کہہ رہے ہیں جیسا کہا کرتے تھے پہلے لوگ

قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ

کہتے ہیں کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو زندہ ہو کر اٹھنا ہے وعدہ دیا

وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ

جا چکا ہے ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو یہی پہلے سے اور کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں

الْأَوَّلِينَ ﴿۸۳﴾ قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۴﴾

پہلوں کی تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے بتاؤ اگر تم جانتے ہو

سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ

اب کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، تو کہہ پھر تم سوچتے نہیں تو کہہ کون ہے مالک ساتوں

السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا

آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا اب بتائیں گے اللہ کو تو کہہ پھر تم

تَتَّقُونَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا

ڈرتے نہیں تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس

يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ

سے کوئی بچا نہیں سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو اب بتائیں گے اللہ کو تو کہہ

فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ﴿۸۹﴾ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۹۰﴾

پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑتا ہے کوئی نہیں ہم نے ان کو پہنچایا سچ اور وہ البتہ جھوٹے ہیں

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ ۚ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے یوں ہوتا تو لے جاتا ہر حکم والا

إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا

اپنی بنائی چیز کو اور چڑھائی کرتا ایک پر ایک اللہ نرالا ہے ان کی بتلائی

يَصِفُونَ ﴿۹۱﴾ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۹۲﴾

باتوں سے جاننے والا چھپے اور کھلے کا وہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو یہ شریک بتلاتے ہیں

ع ۵ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے

(کہ آرام بھی برتو اور دین کا بھی ادراک کرو لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (کیونکہ اصلی شکر یہ تھا کہ اس منعم کے پسندیدہ دین کو قبول کرتے اور دوبارہ قیامت میں زندہ کرنے کا انکار نہ کرتے) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلا رکھا ہے اور تم سب (قیامت میں) اسی کے پاس لائے جاؤگے (اُسوقت اس کفرانِ نعمت کی حقیقت معلوم ہوگی) اور وہ ایسا ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے اور اُسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا گھٹنا بڑھنا سو کیا تم (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کہ یہ دلائل قدرت توحید اور قیامت میں دوسری زندگی دونوں پر دال ہیں مگر) پھر بھی مانتے نہیں، بلکہ یہ بھی ویسی ہی بات کہتے ہیں جو اگلے (کافر) لوگ کہتے چلے آئے ہیں (یعنی) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم جب مرجاویں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں رہ جاویں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کیے جاویں گے اسکا تو ہم سے اور (ہم سے) پہلے ہمارے بڑوں سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے یہ کچھ بھی نہیں محض بےسند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں (چونکہ اس قول سے انکارِ قدرت لازم آتا ہے اور اس سے مثل انکار بعث کے انکار توحید کا بھی ہوتا ہے اس لئے اس قول کے جواب میں اثبات قدرت کے ساتھ اثبات توحید کا بھی ارشاد ہے یعنی) آپ (جواب میں) یہ کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں کس کی ملک ہیں، اگر تم کو کچھ خبر ہے۔ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کے ہیں (تو) ان سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں غور کرتے (کہ قدرت علی البعث اور توحید دونوں کے حکم کا ثبوت ہو جاوے اور) آپ یہ بھی کہئے کہ (اچھا یہ بتاؤ کہ) ان سات آسمانوں کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے (اسکا بھی) وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی (سب) اللہ کا ہے آپ (اسوقت) کہئے کہ پھر تم (اس سے) کیوں نہیں ڈرتے (کہ اس کی قدرت اور آیات بعث کا انکار کرتے ہو اور) آپ (ان سے) یہ بھی کہئے کہ (اچھا) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ (جس کو چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے اور اسکے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہے (تب بھی جواب میں) وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں آپ (اسوقت) کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے (کہ ان سب مقدمات کو مانتے ہو اور نتیجہ کو کہ توحید اور قیامت کا اعتقاد ہے نہیں مانتے یہ تو استدلال تھا مقصود پر، ان کے جواب میں آگے انکے مقدمہ کی دلیل یعنی اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ الخ کا ابطال ہے یعنی یہ جو ان کو بتلایا جارہا ہے کہ قیامت آوے گی اور مُردے زندہ ہونگے یہ اساطیر الاولین نہیں ہے) بلکہ ہم نے ان کو سچی بات پہنچائی ہے اور یقیناً یہ (خود ہی) جھوٹے ہیں (یہاں تک مکالمہ ختم ہو چکا اور توحید و بعث دونوں ثابت ہوگئے مگر ان دونوں مسئلوں میں چونکہ توحید کا مسئلہ زیادہ مہتم بالشان اور حقیقت میں مسئلہ قیامت و آخرت کا بھی مبنیٰ اور محل کلام بھی زیادہ تھا اس لئے تتمۂ تقریر

میں اس کو مستقلاً ارشاد فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا (جیسا مشرکین ملائکہ کی نسبت کہتے تھے) اور نہ اُس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جُدا کر لیتا اور (پھر دُنیا کے بادشاہوں کی عادت کے مطابق دوسرے کی مخلوقات چھیننے کے لئے) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا (پھر مخلوق کی تباہی کی تو کیا انتہا ہے لیکن نظام عالم بدستور قائم ہے اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان (مکروہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ (اسکی نسبت) بیان کرتے ہیں، جاننے والا ہے سب پوشیدہ اور آشکارا کا، غرض ان لوگوں کے شرک سے وہ بالاتر (اور منزہ) ہے۔

معارف و مسائل

وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ، یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عذاب اور مصیبت رنج و تکلیف سے پناہ دیدے اور یہ کسی کی مجال نہیں کہ اسکے مقابلہ پر کسی کو پناہ دیکر اُس کے عذاب و تکلیف سے بچالے۔ یہ بات دُنیا کے اعتبار سے بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کوئی نفع پہنچانا چاہے اسکو کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو کوئی تکلیف و عذاب دینا چاہے اُس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور آخرت کے اعتبار سے بھی یہ مضمون صحیح ہے کہ جس کو وہ عذاب میں مبتلا کریگا اُس کو کوئی بچا نہ سکے گا اور جسکو جنت اور راحت دیگا اُس کو کوئی روک نہ سکے گا (قرطبی)

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ

تو کہہ اے رب اگر تو دکھانے لگے مجھ کو جو اُن سے وعدہ ہوا ہے تو اے رب مجھ کو نہ کرو

فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ

ان گنہگار لوگوں میں اور ہم کو قدرت ہے کہ تجھ کو دکھلادیں جو اُن سے وعدہ

لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ

کر دیا ہے بُری بات کے جواب میں وہ کہہ جو بہتر ہے ہم خوب جانتے ہیں

بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَ

جو یہ بتاتے ہیں اور کہہ اے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کی چھیڑ سے اور

اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ

پناہ تیری چاہتا ہوں اے رب اس سے کہ میرے پاس آئیں یہاں تک کہ جب پہنچے اُن میں کسی کو

الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ

موت کہے گا اے رب مجھ کو پھر بھیج دو شاید کچھ میں بھلا کام کروں اس میں جو پیچھے چھوڑ آیا

كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰

ہرگز نہیں یہ ایک بات ہے کہ وہی کہتا ہے اور ان کے پیچھے پردہ ہے اس دن تک کہ اٹھائے جائیں

خلاصۂ تفسیر

آپ (حق تعالیٰ سے) دعا کیجئے کہ اے میرے رب جس عذاب کا ان کافروں سے وعدہ کیا جا رہا ہے (جیسا اوپر اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ سے بھی معلوم ہوا) اگر آپ مجھ کو دکھا دیں (مقصد یہ کہ وہ عذاب اگر میری زندگی میں اس طور سے آوے کہ میں بھی دیکھوں کیونکہ اس عذاب موعود کا کوئی وقت خاص نہیں بتلایا گیا ہے چنانچہ آیت مذکورہ بھی مبہم ہے جس میں یہ احتمال مذکور بھی ہے غرض اگر ایسا ہوا) تو اے میرے رب مجھ کو ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے اور ہم اس بات پر کہ جو ان سے وعدہ کر رہے ہیں آپ کو بھی دکھلا دیں قادر ہیں (باقی جب تک اُن پر عذاب نہ آوے) آپ (ان کے ساتھ یہ معاملہ رکھئے کہ) ان کی بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کر دیا کیجئے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو (اور اپنی ذات کے لئے بدلہ نہ لیجئے بلکہ ہمارے حوالہ کر دیا کیجئے) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ آپ کی نسبت کہا کرتے ہیں اور (اگر آپ کو بمقتضائے بشریت غیظ آجایا کرے تو) آپ یوں دعا کیا کیجئے کہ اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے (جو مفضی ہو جاویں کسی ایسے امر کی طرف جو خلاف مصلحت ہو گو خلاف شریعت نہ ہو) اور اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آویں (اور وسوسہ ڈالنا تو درکنار پس اس سے وہ غیظ جاتا رہے گا - یہ کفار اپنے کفر و انکار و معاندت سے باز نہیں آتے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی (کے سر) پر موت آ (کھڑی ہو) تی ہے (اور آخرت کا معائنہ ہونے لگتا ہے) اُس وقت (آنکھیں کھلتی ہیں اور اپنے جہل و کفر پر نادم ہو کر) کہتا ہے کہ اے میرے رب (مجھ سے موت کو ٹال دیجئے اور) مجھ کو (دنیا میں) پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں (پھر جا کر) نیک کام کروں (یعنی تصدیق و طاعت حق تعالیٰ اس درخواست کو رد فرماتے ہیں کہ) ہرگز (ایسا) نہیں (ہوگا) یہ (اس کی) ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جا رہا ہے (اور پوری ہونے والی نہیں) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) ان لوگوں کے آگے ایک (چیز) آڑ (کی آنے والی) ہے (کہ جس کا آنا ضروری ہے اور وہی دنیا میں واپس آنے سے مانع ہے مراد اس سے موت ہے کہ اس کا وقوع بھی وقت مقدر پر ضروری ہے وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا اور موت کے بعد دنیا میں لوٹ کر آنا بھی) قیامت کے دن تک (قانوناً ممتنع ہے)

معارف و مسائل

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ○ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○
مطلب ان دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں مشرکین و کفار پر عذاب کی وعید مذکور ہے جو عام ہے قیامت میں تو اسکا وقوع قطعی اور یقینی ہے دُنیا میں ہونیکا بھی احتمال ہے پھر یہ عذاب اگر دُنیا میں ان پر واقع ہو تو اسمیں یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد آئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ ہی کے سامنے اُن پر اللہ کا کوئی عذاب آجائے۔ اور دُنیا میں جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو بعض وقات اُس عذاب کا اثر صرف ظالموں ہی پر نہیں رہتا بلکہ نیک لوگ بھی اُس سے دُنیاوی تکلیف میں متاثر ہوتے ہیں گو آخرت میں انکو کوئی عذاب نہ ہو بلکہ اس دُنیا کی تکلیف پر جو ان کو پہنچتی ہے اجر بھی ملے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً، یعنی ایسے عذاب سے ڈرو جو اگر آ گیا تو صرف ظالموں ہی تک نہیں رہے گا دوسرے لوگ بھی اسکے لپیٹ میں آئیں گے۔

ان آیات میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے کہ یا اللہ اگر ان لوگوں پر آپ کا عذاب میرے سامنے اور میرے دیکھتے ہوئے ہی آنا ہے تو مجھے ان ظالموں کیساتھ نہ رکھئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معصوم اور عذاب الٰہی سے محفوظ ہونا اگرچہ آپ کے لئے یقینی تھا مگر پھر بھی اس دُعا کی تلقین اس لئے فرمائی گئی کہ آپ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھیں اُس سے فریاد کرتے رہیں تاکہ آپ کا اجر بڑھے (قرطبی)

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ، یعنی ہم کو اس پر پوری قدرت ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی آپ کو ان پر عذاب آتا ہوا دکھا دیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ اس اُمت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے عذابِ عام نہ آنے کا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ، یعنی ہم ان لوگوں کو اس حالت میں ہلاک کرنیوالے نہیں کہ آپ ان کے اندر موجود ہوں لیکن خاص خاص لوگوں پر خاص حالات میں عذابِ دُنیا ہی میں آجانا اسکے منافی نہیں۔ اس آیت میں جیسا کہ فرمایا ہے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ آپ کو بھی ان کا عذاب دکھلا دیں وہ اہلِ مکہ پر قحط اور بھوک کا عذاب پھر غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تلوار کا عذاب آپکے سامنے ہی ان پر پڑ چکا تھا (قرطبی)

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ، یعنی آپ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ ظلم کو انصاف کے ذریعہ اور بے رحمی کو رحم کے ذریعہ دفع فرما دیں۔ یہ مکارم اخلاق کی تعلیم ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے جو مسلمانوں کے باہم معاملات کے لئے ہمیشہ جاری ہے البتہ

کفار و مشرکین سے اُن کے مظالم کے مقابلے میں عفو و درگزر ہی کرتے رہنا، اُن پر ہاتھ نہ اٹھانا، یہ حکم آیاتِ جہاد سے منسوخ ہو گیا مگر عین حالتِ جہاد میں بھی اس حُسنِ خلق کے بہت سے مظاہر باقی رکھے گئے کہ عورت کو قتل نہ کیا جائے، بچے کو قتل نہ کیا جائے جو مذہبی لوگ مسلمانوں کے مقابلے پر جنگ میں شریک نہیں اُن کو قتل نہ کیا جائے اور جس کو بھی قتل کریں تو اُس کا مُثلہ نہ بنادیں کہ ناک کان وغیرہ کاٹ لیں، وغیر ذلک من احکام مکارم الاخلاق۔ اسی لئے بعد کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان اور اسکے وساوس سے پناہ مانگنے کی دُعا تلقین کی گئی کہ عین میدانِ قتال میں بھی آپ کی طرف سے عدل و انصاف اور مکارمِ اخلاق کے خلاف کوئی چیز شیطان کے غصہ دلانے سے صادر نہ ہونے پائے وہ دُعا یہ ہے :-

وَقُلْ رَّبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ

لفظ ھمز کے معنے دھکا دینے اور دبانے کے آتے ہیں۔ اور پیچھے کی طرف سے آواز دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دُعا اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ایک جامع دُعا شیطان کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس دُعا کی تلقین فرمائی ہے تاکہ ایسے غصہ اور غیظ و غضب کی حالت میں جبکہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا اور اسمیں ھمز شیطان کا دخل ہوتا ہے اُس سے محفوظ رہیں۔ اس کے علاوہ شیاطین اور جنات کے دوسرے آثار اور حملوں سے بچنے کے لئے بھی یہ دُعا مجرب ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شب میں نیند نہ آتی تھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یہ کلماتِ دُعا تلقین فرمائے کہ یہ پڑھ کر لیٹا کریں۔ اُنھوں نے پڑھا تو یہ شکایت جاتی رہی وہ دُعا یہ ہے أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَعِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَأَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

أَنْ يَّحْضُرُوْنِ، صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان تمھارے ہر کام میں ہر حال میں تمھارے پاس آتا ہے اور ہر کام میں گناہوں اور غلط کاموں کا وسوسہ دل میں ڈالتا رہتا ہے (قرطبی) اسی سے پناہ مانگنے کے لئے یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ، یعنی موت کے وقت کافر پر جب آخرت کا عذاب سامنے آنے لگتا ہے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں پھر دُنیا میں لوٹ جاؤں اور نیک عمل کرکے اس عذاب سے نجات حاصل کرلوں۔

ابن جریر نے بروایت ابن جریج نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت کے وقت مومن جب رحمت کے فرشتے اور رحمت کے سامان سامنے دیکھنے لگتا ہے تو

فرشتے اُس سے پُوچھتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ پھر تمھیں دُنیا میں واپس کر دیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اُس غموں اور تکلیفوں کے عالم میں جاکر کیا کرونگا مجھے تو اب اللہ کے پاس لیجاؤ اور کافر سے پُوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے رَبِّ ارْجِعُوْنِ یعنی مجھے دُنیا میں لوٹا دو۔

كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ، برزخ کے لفظی معنے حاجز اور فاصل کے ہیں۔ دو حالتوں یا دو چیزوں کے درمیان جو چیز فاصل ہو اسکو برزخ کہتے ہیں اسی لئے موت کے بعد قیامت اور حشر تک کے زمانے کو برزخ کہا جاتا ہے کہ یہ دُنیا وی حیات اور آخرت کی حیات کے درمیان حدِ فاصل ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ جب مرنے والا کافر فرشتوں سے دوبارہ دُنیا میں بھیجنے کو کہتا ہے تو یہ کلمہ تو اُس کو کہنا ہی تھا کیونکہ اب عذاب سامنے آچکا ہے مگر اس کلمہ کا اب کوئی فائدہ اسلئے نہیں کہ وہ اب برزخ میں پہنچ چکا ہے جس کا قانون یہ ہے کہ برزخ سے لوٹ کر کوئی دُنیا میں نہیں آتا اور قیامت اور بعث و نشر سے پہلے دوسری زندگی نہیں ملتی۔ واللہ اعلم

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾

پھر جب پھونکی ماریں صُور میں تو نہ قرابتیں ہیں ان میں اس دن اور نہ ایک دوسرے کو پوچھے

فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ

سو جس کی بھاری ہوئی تول تو وہی لوگ کام لے نکلے اور جس کی ہلکی نکلی

مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾

تول تو وہی لوگ ہیں جو ہار بیٹھے اپنی جان دوزخ ہی میں رہا کریں گے

تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿١٠٤﴾ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي

جھلس دے گی اُن کے منہ کو آگ اور وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہونگے کیا تم کو سُنائی نہ تھیں ہماری

تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا

آئیں پھر تم اُن کو جھٹلاتے تھے بولے اے رب زور کیا ہم پر

شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا

ہماری کم بختی نے اور رہے ہم لوگ بہکے ہوئے اے ہمارے رب نکال لے ہم کو اس میں سے اگر ہم پھر کریں

فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾ إِنَّهُ

تو ہم گنہگار فرمایا پڑے رہو پھٹکارے ہوئے اسمیں اور مجھ سے نہ بولو ایک

كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

فرقہ تھا میرے بندوں میں جو کہتے تھے اے رب ہمارے ہم یقین لائے سو معاف کر ہم کو اور رحم کر ہم پر

وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِیًّا حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ

اور تو سب رحم والوں سے بہتر ہے — پھر تم نے ان کو ٹھٹھوں میں پکڑا یہاں تک کہ بھول گئے ان کے پیچھے

ذِكْرِیْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ

میری یاد اور تم اُن سے ہنستے رہے — میں نے آج دیا اُن کو بدلہ اُن کے صبر کرنے کا

اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ

کہ وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے — فرمایا تم کتنی دیر رہے زمین میں برسوں کی

سِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّیْنَ ﴿۱۱۳﴾

گنتی سے — بولے ہم رہے ایک دن یا کچھ دن سے کم تو پوچھ لے گنتی والوں سے

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

فرمایا تم اُس میں بہت نہیں تھوڑا ہی رہے ہو اگر تم جانتے ہوتے

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو اور تم ہمارے پاس پھر کر نہ آؤ گے

خلاصۂ تفسیر

پھر جب (قیامت کا روز ہوگا اور) صور پھونکا جاوے گا تو (ایسی ہول و ہیبت میں گرفتار ہوں گے کہ) اُن میں (جو) باہمی رشتے ناتے (تھے) اُس روز (وہ بھی گویا) نہ رہیں گے (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا جیسے اجنبی اجنبی ہوتے ہیں) اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا (کہ بھائی تم کس حالت میں ہو، غرض نہ رشتہ ناتا کام آوے گا نہ دوستی و تعارف، پس وہاں کام کی چیز ایک ایمان ہوگا جس کی عام شناخت کے لئے کہ سب پر ظاہر ہو جاوے ایک ترازو کھڑی کی جاوے گی اور اس سے اعمال و عقائد کا وزن ہوگا) سو جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مومن ہوگا) تو ایسے لوگ کامیاب (یعنی نجات پانے والے) ہوں گے (اور مذکورہ ہول و ہیبت کے حالات کہ نہ کسی کا رشتہ کام آوے نہ دوستی اور نہ کوئی کسی کو پوچھے کہ کس حال میں ہو، یہ ان مومنین کو پیش نہ آئیں گے لقولہ تعالیٰ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ ـ الآیۃ) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کر لیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے ان کے چہروں کو (اس جہنم کی) آگ جھلستی ہوگی اور اُس (جہنم) میں اُن کے منہ بگڑے ہوں گے (اور ان سے حق تعالیٰ بواسطہ یا بلا واسطہ ارشاد فرماویں گے کہ) کیوں تم کو میری آیتیں (دنیا میں) پڑھ کر سنائی نہیں جایا کرتی تھیں، اور تم اُن کو جھٹلایا کرتے تھے (یہ اُسی کی سزا مل رہی ہے) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب واقعی،

ہماری بدبختی نے ہم کو (ہمارے ہاتھوں) گھیر لیا تھا اور (بیشک) ہم گمراہ لوگ تھے (یعنی ہم جرم کا اقرار اور اس پر ندامت و معذرت کا اظہار کرکے درخواست کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دُنیا میں بھیج دیجئے کقولہ تعالیٰ فی الم السجدۃ فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بیشک پورے قصوروار ہیں (اُسوقت خوب سزا دیجئے اور اب چھوڑ دیجئے) ارشاد ہوگا کہ اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو (یعنی ہم نہیں منظور کرتے، کیا تم کو یاد نہیں رہا کہ) میرے بندوں میں ایک گروہ (ایمانداروں کا) تھا جو (بیچارے ہم سے) عرض کیا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو ہم کو بخش دیجئے اور ہم پر رحمت فرمائیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں سو تم نے (محض اس بات پر جو ہر طرح قابل قدر تھی) ان کا مذاق مقرر کیا تھا اور یہاں تک (اس کا مشغلہ کیا) کہ ان کے مشغلہ نے تم کو ہماری یاد بھی بھلا دی اور تم اُن سے ہنسی کیا کرتے تھے (سو ان کا تو کچھ نہ بگڑا چند روز کی کلفت تھی کہ صبر کرنا پڑا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ) میں نے اُن کو آج اُن کے صبر کا یہ بدلہ دیا، کہ وہی کامیاب ہوئے (اور تم اس ناکامی میں گرفتار ہوئے مطلب جواب کا یہ ہوا کہ تمہارا قصور اس قابل نہیں کہ سزا کے وقت اقرار کرنے سے معاف کردیا جاوے کیونکہ تم نے ایسا معاملہ کیا جس سے ہمارے حقوق کا بھی اتلاف ہوا اور حقوق العباد کا بھی، اور وہ بھی کیسے ہمارے مقبول و محبوب جو ہم سے خصوصیتِ خاصہ رکھتے تھے کیونکہ ان کو مسخر بنانے میں ایک پہلو تو اضاعت حق العبد ہے اور تکذیب حق جو منشا تسخر یہ کا ہے کہ اضاعت حق اللہ ہے دونوں جمع ہیں پس اس کی سزا کا بدوام اور تمام ہی مناسب ہے اور مومنین کو اُن کے سامنے جنت کی نعمتوں سے کامیاب کرنا یہ بھی ایک سزا ہے کفار کیلئے کیونکہ اعداء کی کامیابی سے روحانی ایذا ہوتی ہے یہ تو جواب ہوگیا ان کی درخواست کا آگے تنبیہ ہے اُن کے بطلانِ اعتقاد و مشرب پر تاکہ ذلت پر ذلت و حسرت پر حسرت ہونے سے عقوبت میں شدت ہو اسلئے) ارشاد ہوگا کہ (اچھا یہ بتلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین میں رہے ہوگے (چونکہ وہاں کے ہول و ہیبت سے اُن کے ہوش و حواس گم ہوچکے ہونگے اور اُس دن کا طول بھی پیش نظر ہوگا) وہ جواب دیں گے کہ (برس کیسے، بہت رہے ہونگے تو) ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ہم رہے ہونگے (اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے (یعنی فرشتوں سے کہ اعمال و اعمار سب کا حساب کرتے تھے) پوچھ لیجئے، ارشاد ہوگا کہ (یوم اور بعض یوم تو غلط ہے مگر اتنا تو تمہارے اقرار سے جو کہ صحیح بھی ہے ثابت ہوگیا کہ، تم (دُنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے (لیکن) کیا خوب ہوتا کہ تم (یہ بات اُسوقت) سمجھتے ہوتے (کہ دُنیا کی بقا ناقابلِ اعتبار ہے اور اسکے سوا اور کوئی دار اقرار ہے مگر وہاں تو بقا کو دُنیا ہی میں منحصر سمجھا اور

اس عالم کا انکار کرتے ہے وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ، اور اب جو غلطی ظاہر ہوئی اور صحیح سمجھے تو بیکار، اور غلطی اعتقاد پر تنبیہ کے بعد آگے پھر اس اعتقاد پر زجر ہے، جو بطور خلاصہ مضمون فرد قرار داد جرم کے ہے کہ) ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ (خیال کیا تھا) کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے (مطلب یہ کہ جب ہم نے آیات میں جن کا صدق دلائل صحیحہ سے ثابت ہے قیامت اور اس میں اعمال کے بدلے کی خبر دی تھی تو معلوم ہو گیا تھا کہ مکلفین کی تخلیق کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اسکا منکر ہونا کتنا بڑا امر منکر تھا)۔

معارف و مسائل

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ، قیامت کے روز صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا نفخۂ اولیٰ یعنی پہلے صور کا یہ اثر ہوگا کہ سارا عالم زمین و آسمان اور جو انکے درمیان ہے فنا ہو جائیگا اور نفخۂ ثانیہ سے پھر سارے مردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے قرآن کریم کی آیت ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس آیت میں صور کا نفخۂ اولے مراد ہے یا نفخۂ ثانیہ، اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بروایت ابن جبیرؓ منقول ہے کہ اس آیت میں مراد نفخۂ اولیٰ ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے فرمایا اور بروایت عطاؓ یہی بات حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی منقول ہے کہ مراد اس جگہ نفخۂ ثانیہ ہے۔ تفسیر مظہری میں اسکو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول یہ ہے کہ قیامت کے روز ایک ایک بندے مرد و عورت کو محشر کے میدان میں لایا جائے گا اور تمام اولین و آخرین کے اس بھرے مجمع کے سامنے کھڑا کیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ کا ایک منادی یہ ندا کریگا کہ یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اگر کسی کا کوئی حق اسکے ذمہ ہے تو سامنے آجائے اس سے اپنا حق وصول کرے۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ بیٹا اسپر خوش ہوگا کہ میرا حق باپ کے ذمہ نکل آیا، اور باپ کا کوئی حق بیٹے پر ہوا تو باپ خوش ہوگا کہ اس سے وصول کروں گا اسی طرح میاں بیوی اور بھائی بہن جس کا جس پر کوئی حق ہوگا یہ منادی سنکر اس سے وصول کرنے پر آمادہ اور خوش ہوگا، یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اس آیت مذکورہ میں آیا ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ، یعنی اسوقت باہمی نسبی رشتے اور قرابتیں کام نہ آئیں گی کوئی کسی پر رحم نہ کریگا، ہر شخص کو اپنی اپنی فکر لگی ہوگی یہی مضمون اس آیت کا ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ، یعنی وہ دن جس میں ہر انسان اپنے بھائی سے، ماں اور باپ سے، بیوی اور اولاد سے دور بھاگے گا۔

محشر میں مؤمنین اور کفار کے حالات میں فرق

مگر یہ حال کافروں کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر اسکا ذکر موجود ہے مؤمنین کا یہ حال نہیں ہوگا کیونکہ مؤمنین کا حال خود قرآن نے یہ ذکر کیا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، یعنی مؤمنین صالحین کی اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ (بشرطِ ایمان) اپنے آبا رصالحین کیساتھ لگادیں گے اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جس وقت محشر میں سب پیاسے ہونگے تو مسلمان بچے جو نابالغی کی حالت میں مرگئے تھے وہ جنت کا پانی لئے ہوئے نکلیں گے لوگ اُن سے پانی مانگیں گے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو تلاش کر رہے ہیں یہ پانی اُن کے لئے ہے۔ (رواہ ابن ابی الدنیا عن عبداللہ بن عمرو رض عن ابی ذر رض۔ مظہری)

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں جس کو ابن عساکر نے بسند صحیح حضرت ابن عمر رض سے نقل کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ہر نسبی تعلق یا زوجیت کے تعلق سے جو رشتے پیدا ہونگے وہ سب منقطع ہو جائیں گے (کوئی کسی کے کام نہ آویگا) بجز میرے نسب اور میری زوجیت کے رشتہ کے علماء نے فرمایا کہ اس نسبِ نبوی میں ساری اُمت کے مسلمان بھی داخل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُمت کے باپ اور آپ کی ازواج مطہرات اُمت کی مائیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رشتہ اور دوستی کا کوئی تعلق کسی کے کام نہ آنا یہ حال محشر میں کافروں کا ہوگا مؤمنین ایک دوسرے کی شفاعت اور مدد کریں گے، اور اُن کے تعلقات ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ، یعنی آپس میں کوئی کسی کی بات نہ پوچھے گا اور دوسری ایک آیت میں جو یہ مذکور ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ، یعنی محشر میں لوگ باہم ایک دوسرے سے سوالات کریں گے اور حالات پوچھیں گے۔ اس کے بارہ میں حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ محشر میں مختلف موقف ہوں گے ہر موقف کا حال مختلف ہوگا۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی کسی کو نہ پوچھیگا پھر کسی موقف میں جب وہ ہیبت اور ہول کا غلبہ کم ہو جائیگا تو باہم ایک دوسرے کا حال بھی دریافت کریں گے (مظہری) فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ یعنی میزان عمل میں جس شخص کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ ہی فلاح پانے والے ہیں اور جس کا پلہ نیکیوں کا ہلکا رہے گا تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دُنیا میں خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا اور اب وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنے والے ہیں۔ اس آیت میں مقابلہ صرف مؤمنین کاملین اور کفار کا ہے اور اُنھیں کے وزن اعمال کا اور اُن میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکر کیا گیا کہ مؤمنین کاملین کا پلہ بھاری ہوگا انکو فلاح حاصل ہوگی، کفار کا پلہ ہلکا رہے گا اُن کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑیگا۔

اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے ثابت ہے کہ اس جگہ مؤمنین کاملین کا پلہ بھاری ہونیکا

مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلے یعنی سیئات و معاصی کے پلے میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا وہ خالی نظر آئے گا۔
اور کفار کا پلہ ہلکا ہونیکا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے پلہ میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا بالکل خالی جیسا ہا کا
رہے گا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا، یعنی ہم کفار اور اُنکے عمال
کا قیامت کے دن کوئی وزن ہی قائم نہ کریں گے۔ یہ حال تو مومنین کاملین کا ہوا اور جن سے گناہ
سرزد ہی نہیں ہوئے یا توبہ وغیرہ سے معاف کر دیئے گئے وزن اعمال کے وقت سیئات
کے پلہ میں اُن کے نام پر کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف کفار میں جن کے نیک اعمال بھی شرط ایمان موجود
نہ ہونے کے سبب میزانِ عدل میں بے وزن ہوں گے۔ باقی رہا معاملہ گنہگار مسلمانوں کا جن
کے نیکیوں کے پلہ میں بھی اعمال ہونگے اور سیئات کے پلہ میں بھی اعمال ہونگے ان کا ذکر اس
آیت میں صراحۃً نہیں کیا گیا بلکہ عموماً قرآن کریم میں گنہگار مسلمانوں کی سزا و جزا سے سکوت ہی
اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں جتنے مومنین صحابہ کرامؓ تھے
وہ سب کے سب عدول تھے یعنی عموماً تو وہ کبیرہ گناہوں سے پاک ہی رہے اور اگر کسی سے کوئی
گناہ ہو بھی گیا تو اُسنے توبہ کرلی توبہ سے معاف ہوگیا۔ (مظہری)

قرآن مجید کی ایک آیت خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جنکے نیک
بداعمال ملے جُلے ہیں۔ اُن کے متعلق حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کے روز ان لوگوں
کے اعمال کا حساب اس طرح ہوگا کہ جس شخص کی نیکیاں اُسکے گناہوں سے بڑھ جائیں خواہ
ایک ہی نیکی کی مقدار سے بڑھے وہ جنت میں جائیگا اور جس شخص کے سیئات اور گناہ نیکیوں سے
بڑھ جائیں خواہ ایک ہی گناہ کی مقدار سے بڑھے وہ دوزخ میں جائیگا مگر اس مومن گنہگار کا
دوزخ میں داخلہ تطہیر اور پاک کرنے کے لئے ہوگی جیسے لوہے، سونے وغیرہ کو آگ میں ڈال کر
میل اور زنگ سے صاف کیا جاتا ہے اس کا جہنم میں جانا بھی ایسا ہی ہوگا۔ جسوقت جہنم کی آگ سے
اسکے گناہوں کا زنگ دُور ہو جاویگا تو جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جاویگا، جنت میں
بھیجدیا جائے گا اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کی میزانِ عمل ایسا صحیح وزن کرنے والی
ہوگی کہ ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کمی بیشی ہوگی تو پلہ جھک جائیگا یا اُٹھ جائیگا۔ اور جس شخص کی
حسنات اور سیئات میزان عمل میں بالکل برابر سرابر رہیں گے تو وہ اصحابِ اَعراف میں داخل ہوگا
اور ایک زمانہ تک دوزخ اور جنت کے درمیان حکم ثانی کا منتظر رہے گا اور بالآخر اسکو بھی جنت
میں داخل کر دیا جائے گا (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری)

ابن عباسؓ کے اس قول میں کفار کا ذکر نہیں صرف مومنین گنہگاروں کا ذکر ہے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انسان مومن و کافر کو

میزانِ عدل میں رکھ کر تولا جائے گا۔ کافر کا کوئی وزن نہ ہوگا خواہ وہ کتنا ہی فربہ اور موٹا ہو۔ (بخاری ومسلم من حدیث ابی ہریرۃ رضؓ) اور بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔ ترمذی، ابنِ ماجہ، ابنِ حبّان اور حاکم نے یہ مضمون حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے اعمال جو دُنیا میں بے وزن وبے جسم اَعراض ہوتے ہیں محشر میں ان کو مجسّم کر کے میزانِ عمل میں رکھا جائیگا وہ تولے جائیں گے۔ طبرانی وغیرہ نے یہ روایت ابنِ عباسؓ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ ان سب روایاتِ حدیث کے الفاظ اور متن تفسیر مظہری میں مکمل موجود ہیں وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی آخری قول کی تائید میں ایک حدیث عبدالرزاق نے فضل العلم میں ابراہیم نخعیؒ سے نقل کی ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کے اعمال وزن کے لئے لائے جائیں گے اور ترازو کے پلّہ میں رکھے جائیں گے تو یہ پلّہ ہلکا رہیگا۔ پھر ایک چیز ایسی لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہوگی اس کو بھی اسکے حسنات کے پلّہ میں رکھدیا جائے گا تو یہ پلّہ بھاری ہوجائیگا اسوقت اس شخص سے کہا جائیگا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے (جسنے تمھاری نیکیوں کا پلّہ بھاری کردیا) وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تو بتایا جائے گا کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھایا کرتا تھا۔ اور ذہبی نے فضلِ علم میں حضرت عمران بن حصین رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی (جس سے اُنھوں نے علمِ دین کی کتابیں لکھی تھیں) باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔ (مظہری)

وزنِ اعمال کی کیفیت کے متعلق تینوں قسم کی روایات نقل کرنے کے بعد تفسیر مظہری میں فرمایا کہ اسمیں کوئی بُعد نہیں کہ خود انسان اور اسکے اعمال کو جسمانی شکل میں تولا جائے یا اسکے نامۂ اعمال کو اسکے ساتھ رکھ کر تولا جائے اس لئے ان تینوں روایتوں میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں۔

وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ، کَالِح لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے دونوں ہونٹ اسکے دانتوں کو نہ چھپائیں ایک اوپر رہے دوسرا نیچے دانت نکلے ہوئے نظر آئیں جو نہایت بدصورت ہے جہنّم میں جہنّمی کا اوپر کا ہونٹ اُوپر چڑھ جائیگا اور نیچے کا ہونٹ نیچے لٹک جائیگا دانت کھُلے نکلے نظر آویں گے

وَلَا تُكَلِّمُونِ، حضرت حسن بصری رحؒ نے فرمایا کہ اہلِ جہنّم کا یہ آخری کلام ہوگا جس کے جواب میں حکم ہوجائیگا کہ ہم سے کلام نہ کرو پھر وہ کسی سے کچھ کلام نہ کرسکیں گے جانوروں کی طرح ایک دوسرے کیطرف بھونکیں گے۔ اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن کعبؒ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں اہلِ جہنّم کی پانچ درخواستیں نقل کی گئی ہیں اُن میں سے چار کا جواب دیا گیا اور پانچویں کے جواب میں حکم ہوگیا لَا تُكَلِّمُونِ بس یہ اُنکا آخری کلام ہوگا اس کے بعد کچھ نہ بول سکیں گے۔ (مظہری)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو بہت اوپر ہے اللہ وہ بادشاہ سچا کوئی حاکم نہیں اسکے سوائے مالک اس عزت کے تخت کا

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ

اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم جس کی سند نہیں اسکے پاس سو اس کا حساب ہے

عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ

اسکے رب کے نزدیک، بیشک بھلا نہ ہوگا منکروں کا اور تو کہہ اے رب معاف کر اور رحم کر

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

اور تو ہے بہتر سب رحم والوں سے

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ سب مضامین جب معلوم ہو چکے) سو (اس سے یہ کامل طور پر ثابت ہو گیا کہ) اللہ تعالیٰ بہت ہی عالیشان ہے جو کہ بادشاہ (ہے اور بادشاہ بھی) حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں (اور وہ) عرش عظیم کا مالک ہے اور جو شخص (اس امر پر دلائل قائم ہونے کے بعد) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرے کہ جس (کے معبود ہونے) پر اسکے پاس کوئی بھی دلیل نہیں سو اسکا حساب اس کے رب کے یہاں ہوگا (جسکا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ) یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی (بلکہ ابدالآباد معذب رہیں گے) اور (جب حق تعالیٰ کی یہ شان ہے تو) آپ (اور دوسرے لوگ بدرجۂ اولیٰ) یوں کہا کریں کہ اے میرے رب (میری خطائیں) معاف کر اور (ہر حالت میں مجھ پر) رحم کر (معاش میں بھی، توفیق طاعات میں بھی، نجات آخرت میں بھی، عطائے جنت میں بھی) اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ مومنون کی آخری آیتیں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ سے آخر سورت تک خاص فضیلت رکھتی ہیں۔ بغوی اور ثعلبی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُن کا گزر ایک ایسے بیمار پر ہوا جو سخت امراض میں مبتلا تھا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے کان میں سورۂ مومنون کی یہ آیتیں افحسبتم سے آخر تک پڑھ دی وہ اُسی وقت اچھا ہو گیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ آیتیں پڑھی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے

قبضہ میں میری جان ہے اگر کوئی آدمی جو یقین رکھنے والا ہو یہ آیتیں پہاڑ پر پڑھ دے تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے (قرطبی و مظہری)

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ یہاں اغفر اور ارحم دونوں کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا کہ کیا معاف کریں اور کس چیز پر رحم کریں اس سے اشارہ عموم کی طرف ہے کہ دعاءِ مغفرت شامل ہے ہر مضر اور تکلیف دہ چیز کے ازالہ کو اور دعاءِ رحمت شامل ہے ہر مراد اور محبوب چیز کے حاصل ہونے کو۔ کیونکہ دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت جو انسانی زندگی اور اُسکے مقاصد کا خلاصہ ہیں دونوں اسمیں شامل ہوگئے (مظہری) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دعاءِ مغفرت و رحمت کی تلقین باوجودیکہ آپ معصوم اور مرحوم ہی ہیں درحقیقت اُمت کو سکھلانے کیلئے ہے کہ تمھیں اس دعا کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے (قرطبی)

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ، سورہ مومنون کی ابتدا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے ہوئی تھی اور انتہا لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ پر کی گئی، جس سے معلوم ہوا کہ فلاح یعنی مکمل کامیابی مومنین ہی کا حصہ ہے کفار اس سے محروم ہیں ؂

تمّت سورۃ المؤمنون فی ثمانیۃ ایّامٍ من اوّل المحرّم سنۃ ۱۳۹۱ وذلک فی یوم عاشوراء یوم الاثنین وللہ الحمد اوّلہ وآخرہ وایّاہ اسأل التوفیق لاتمام الباقی کما یحبّ ویرضاہ وان یتقبّل منّی ویجعلہ ذخرًا الآخرتی وھو المستعان

سُورَةُ النُّور

سُورَةُ النُّورِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّ تِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ نور مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چونسٹھ آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ

یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اُتاری اور ذمہ پر لازم کی اور اُتاریں اس میں باتیں صاف تاکہ تم

تَذَكَّرُوْنَ ① اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ

یاد رکھو بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو

جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور دیکھیں اُن کا مارنا کچھ لوگ مسلمان

سورۂ نور کی بعض خصوصیات اس سورت میں زیادہ تر احکام عفت کی حفاظت اور ستر و حجاب کے متعلق ہیں اور اُسی کی تکمیل کے لئے حدِ زنا کا بیان آیا۔ پچھلی سورت یعنی مؤمنون میں مسلمانوں کی فلاحِ دنیا و آخرت کو جن اوصاف پر موقوف رکھا گیا ہے اُن میں ایک اہم وصف شرمگاہوں کی حفاظت تھی جو خلاصہ ہے ابوابِ عفت کا۔ اس سورت میں عفت کے اہتمام کے لئے متعلقہ احکام ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے عورتوں کو اس سورت کی تعلیم کی خصوصی ہدایات آئی ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضؓ نے اہلِ کوفہ کے نام اپنے ایک فرمان میں تحریر فرمایا علموا نساءکم سُورَةَ النُّور، یعنی اپنی عورتوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔

خود اس سورت کی تمہید جن الفاظ سے کی گئی ہے کہ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا، یہ بھی اس سورت کے خاص اہتمام کی طرف اشارہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ ایک سورت ہے جس (کے الفاظ) کو (بھی) ہم (ہی) نے نازل کیا ہے اور اس (کے معانی یعنی احکام) کو (بھی) ہم (ہی) نے مقرر کیا ہے (خواہ وہ فرض و واجب ہوں یا مندوب و مستحب) اور ہم نے (ان احکام پر دلالت کرنے کے لئے) اس (سورت) میں صاف صاف آیتیں نازل کی ہیں تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کے سو دُرّے مارو اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہیئے (کہ رحم کھا کر چھوڑ دو یا سزا میں کمی کر دو) اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیئے (تاکہ اُن کی رُسوائی ہو اور دیکھنے سُننے والوں کو عبرت ہو)۔

معارف و مسائل

اس سورت کی پہلی آیت تو بطور تمہید کے ہے جس سے اسکے احکام کا خاص اہتمام بیان کرنا مقصود ہے اور احکام میں سب سے پہلے زنا کی سزا کا ذکر جو مقصود سورت عفت اور اُس کے لئے نگاہوں تک کی حفاظت، بغیر اجازت کسی کے گھر میں جانے اور نظر کرنے کی ممانعت کے احکام آگے آنیوالے ہیں زنا کا ارتکاب ان تمام احتیاطوں کو توڑ کر عفت کے خلاف انتہائی حد پر پہنچنا اور احکامِ الٰہیہ کی کھلی بغاوت ہے۔ اسی لئے اسلام میں انسانی جرائم پر جو سزائیں (حدود) قرآن میں متعین کر دی گئی ہیں زنا کی سزا بھی ان تمام جرائم کی سزا سے اشد اور زیادہ ہے زنا خود ایک بہت بڑا جرم ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ سیکڑوں جرائم لیکر آتا ہے اور اسکے نتائج پوری انسانیت کی تباہی ہے۔ دُنیا میں جتنے قتل و غارتگری کے واقعات پیش آتے ہیں تحقیق کی جائے تو ان میں بیشتر کا سبب کوئی عورت اور اُس سے حرام تعلق ہوتا ہے اس لئے شروع سورت میں اس انتہائی جرم و بے حیائی کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کی حدِ شرعی بتلائی گئی ہے۔

زنا ایک جُرمِ عظیم اور بہت سے جرائم کا مجموعہ ہے اسلئے اسلام میں اُس کی سزا بھی سب سے بڑی رکھی گئی ہے

قرآن کریم اور احادیث متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اُسکا طریقہ خود متعین کر دیا ہے کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا انھیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں حدود کہا جاتا ہے اُنکے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا بلکہ امیر یا قاضی مجرم کی حالت اور جرم کی حیثیت اور

ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کرکے جسقدر سزا دینے کو انسدادِ جرم کے لئے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدودِ شرعیہ پانچ ہیں [illegible] پاکدامن عورت پر تہمت رکھنا۔ شراب پینا اور زنا کرنا۔ انہیں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دُنیا کے امن وامان کو برباد کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب اور نتائجِ بد جیسے دُنیا کے نظامِ انسانیت کو تباہ وبرباد کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جُرم میں نہیں۔

(۱) کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا اُس کی ہلاکت کا مُرادف ہے۔ شریف انسان کو سارا مال وجائداد اور اپنا سب کچھ قربان کردینا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے حرم کی عفت پر ہاتھ ڈالنا۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں روزمرہ یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن لوگوں کے حرم پر ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر زانی کے قتل وفنا کے درپے ہوتے ہیں اور یہ جوشِ انتقام فسادوں میں چلتا ہے اور خاندانوں کو تباہ کردیتا ہے۔

(۲) جس قوم میں زنا عام ہوجائے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا۔ ماں بہن بیٹی وغیرہ جن سے نکاح حرام ہے جب یہ رشتے بھی غائب ہوگئے تو اپنی بیٹی اور بہن بھی نکاح میں آسکتی ہے جو زنا سے بھی زیادہ اشد جُرم ہے۔

(۳) غور کیا جائے تو دُنیا میں جہاں کہیں بدامنی اور فتنہ وفساد ہوتا ہے اسکا بیشتر سبب عورت اور اُس سے کم مال ہوتا ہے۔ جو قانون عورت اور دولت کی حفاظت صحیح انداز میں کرسکے ان کو اُنکے مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دے وہی قانون اس عالم کا ضامن ہوسکتا ہے۔ یہ جگہ زنا کے تمام مفاسد اور خرابیاں جمع کرنے اور تفصیل سے بیان کرنے کی نہیں۔ انسانی معاشرہ کے لئے اُسکی تباہ کاری کے معلوم ہونے کیلئے اتنا بھی کافی ہے اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا کو دوسرے سارے جرائم کی سزاؤں سے اشد قرار دیا ہے۔ وہ سزا آیتِ مذکورہ میں اسطرح بیان کی گئی ہے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ اسمیں عورت زانیہ کا ذکر پہلے اور مرد زانی کا بعد میں لایا گیا ہے سزا دونوں کی ایک ہی ہے۔ عام قیاس بیان احکام کا یہ ہے کہ اکثر تو صرف مَردوں کو مخاطب کرکے حکم دیدیا جاتا ہے عورتیں بھی اسمیں ضمناً شامل ہوتی ہیں اُن کا علیحدہ ذکر نے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ سارے قرآن میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے صیغۂ مذکر سے جو احکام بیان کئے گئے ہیں عورتیں بھی اُس میں بغیر ذکر شامل قرار دی گئی ہیں۔ شاید حکمت اس کی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو مستور رہنے کا حکم دیا ہے اُن کے ذکر کو بھی ذکرِ رجال کے ضمن میں مستور کرکے بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اس طرز سے یہ احتمال تھا کہ کسی کو یہ شبہ ہوجائے کہ یہ سب احکام مَردوں ہی کے لئے ہیں عورتیں ان سے سبکدوش ہیں اسلئے خاص خاص آیات میں مستقلاً عورتوں کا ذکر بھی کردیا جاتا ہے اَقِمْنَ

الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ اور جہاں مرد و عورت دونوں ہی کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو ترتیب طبعی یہ ہوتی ہے کہ مرد کا ذکر مقدم عورت کا بعد میں ہوتا ہے۔ چوری کی سزا میں اسی ضابطۂ عرفیہ کے مطابق اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا فرمایا ہے جس میں مرد چور کو مقدم اور عورت کو مؤخر ذکر کیا ہے مگر سزائے زنا میں اوّل تو عورت کے ذکر کے ضمنی آجانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صراحۃً ذکر مناسب سمجھا گیا دوسرے عورت کا ذکر مرد پر مقدم کر کے بیان کیا گیا۔ اسمیں بہت سی حکمتیں ہیں اوّل تو عورت ضعیف الخلقۃ اور طبعی طور پر قابلِ رحم سمجھی جاتی ہے اگر اسکا صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید عورت اس سزا سے مستثنیٰ ہے۔ اور عورت کا ذکر مقدم اس لئے کیا گیا کہ فعل زنا ایک ایسی بے حیائی ہے جسکا صدور عورت کیطرف سے ہونا انتہائی بیباکی اور بے پروائی سے ہو سکتا ہے کیونکہ قدرت نے اس کے مزاج میں فطری طور پر ایک حیاء اور اپنی عفت کی حفاظت کا جذبہ قویہ ودیعت فرمایا ہے اور اسکی حفاظت کے لئے بڑے بڑے سامان جمع فرمائے ہیں اُس کی طرف سے اس فعل کا صدور بہ نسبت مرد کے زیادہ اشد ہے بخلاف چور کے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسب اور کمائی کی قوت دی ہے۔ اپنی ضروریات اپنے عمل سے حاصل کرنے کے مواقع اسکے لئے فراہم کئے ہیں یہ کہ اُن کو چھوڑ کر چوری کرنے پر اُتر آئے یہ مرد کیلئے بڑا عار اور عیب ہے۔ عورت کے چونکہ یہ حالات نہیں ہیں اگر اُس سے چوری کا صدور ہو جائے تو مرد کی نسبت سے اہون اور کم درجہ ہے۔

فَاجْلِدُوْا لفظ جَلْد کوڑا مارنے کے معنے میں آتا ہے وہ جلد سے مشتق ہے کیونکہ کوڑا عموماً چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ جَلْد سے تعبیر کرنے میں اسطرف اشارہ ہے کہ یہ کوڑوں یا دُرّوں کی ضرب اس حد تک رہنی چاہئے کہ اسکا اثر انسان کی کھال تک رہے گوشت تک نہ پہنچے۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوڑے لگانے کی سزا میں اسی توسط و اعتدال کی تلقین عملاً فرمائی ہے کہ کوڑا نہ بہت سخت ہو جس سے گوشت تک اُدھڑ جائے اور نہ بہت نرم ہو کہ اُس سے کوئی خاص تکلیف ہی نہ پہنچے اس جگہ اکثر حضرات مفسرین نے یہ روایت حدیث سند اور الفاظ کیساتھ لکھدی ہیں۔

سو کوڑوں کی مذکورہ سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کیلئے مخصوص ہے شادی شدہ لوگوں کی سزا سنگساری ہے

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زنا کی سزا کے احکام بتدریج آئے ہیں اور خفت سے شدت کی طرف بڑھتے گئے ہیں جیسے شراب کی حرمت میں بھی اسی طرح کی تدریج خود قرآن میں مذکور ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے زنا کی سزا کا سب سے پہلا حکم تو وہ تھا جو سُورۂ نساء کی آیات نمبر ۱۵، ۱۶ میں مذکور ہے وہ یہ ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ اُن پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیدیں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہانتک کہ اُٹھا لے اُن کو

اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝
(سورۂ نساء)

موت یا مقرر کر دے اللہ تعالیٰ اُن کے لئے کوئی راہ - اور جو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو اُن کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو ان کا خیال چھوڑ دو - بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے -

اِن دونوں آیتوں کی مکمل تفسیر اور ضروری بیان سورۂ نساء میں آچکا ہے - یہاں اس لئے اسکا اعادہ کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا کا ابتدائی دور سامنے آجائے - اِن آیتوں میں ایک تو ثبوت زنا کا خاص طریقہ چار مردوں کی شہادت کے ساتھ ہونا بیان فرمایا ہے - دوسرے زنا کی سزا عورت کے لئے گھر میں قید رکھنا اور دونوں کے لئے ایذا پہنچانا مذکور ہے اور ساتھ اسمیں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ سزائے زنا کا یہ حکم آخری نہیں آئندہ اور کچھ حکم آنیوالا ہے اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا کا یہی مفہوم ہے -

مذکورہ سزا میں عورتوں کو گھر میں قید رکھنا اُسوقت کافی قرار دیا گیا اور دونوں کو ایذا دینےکی سزا کافی قرار دی گئی مگر اس ایذا اور تکلیف کی کوئی خاص صورت خاص مقدار اور حد بیان نہیں فرمائی بلکہ الفاظِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی ابتدائی سزا صرف تعزیری تھی جس کی مقدار شریعت سے متعین نہیں ہوئی بلکہ قاضی یا امیر کی صوابدید پر موقوف تھی اِسی لئے ایذا دینے کا مبہم لفظ اختیار فرمایا گیا مگر ساتھ ہی اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ ان مجرموں کے لئے سزا کا کوئی اور طریقہ جاری کیا جائے - جب سورۂ نور کی آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورۂ نساء میں جو وعدہ کیا گیا تھا اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا یعنی یہ کہ یا اللہ تعالیٰ انکے لئے کوئی اور سبیل بتا دے تو سورۂ نور کی اس آیت نے وہ سبیل بتلا دی یعنی سو کوڑے مارنے کی سزا عورت مرد دونوں کیلئے متعین فرما دی - اسکے ساتھ ہی حضرت ابن عباسؓ نے سو کوڑے مارنے کی سزا کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص قرار دے کر فرمایا -

یعنی الرّجم للثّیب والجلد للبکر
(صحیح بخاری کتاب التفسیر صفحہ ۶۵۰)

یعنی وہ سبیل اور سزائے زنا کی تعیین یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت سے یہ گناہ سرزد ہو تو اُن کو سنگسار کر کے ختم کیا جائے اور غیر شادی شدہ کے سو کوڑے مارنا سزا ہے -

ظاہر ہے کہ سورۂ نور کی مذکورہ آیت میں تو بغیر کسی تفصیل کے سزائے زنا سو کوڑے ہونا مذکور ہے - اس حکم کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص ہونا اور شادی شدہ کے لئے رجم یعنی سنگساری کی سزا ہونا اُن کو کسی دوسری دلیل حدیث سے معلوم ہوا ہوگا اور وہ حدیث صحیح مسلم، مسند احمد سنن نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی روایت سے اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

خذوا عنی خذوا عنی قد جعل اللہ لہن سبیلا البکر بالبکر جلد مائۃ وتغریب عام والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم۔ (ابن کثیر)

مجھ سے علم حاصل کرو مجھ سے علم حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے زانی مرد و عورت کے لئے وہ سبیل جسکا وعدہ سورۂ نساء کی آیت میں ہوا تھا اب سورۂ نور میں فرما دی ہے وہ یہ ہے کہ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی اور شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سنگساری۔

غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا سو کوڑے جو آیتِ نور میں مذکور ہے اس حدیث میں اُس کے ساتھ ایک مزید سزا کا ذکر ہے کہ مرد کو سال بھر کے لئے جلا وطن بھی کر دیا جائے۔ اسمیں فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ سال بھر کی جلا وطنی کی سزا مرد زانی کو سو کوڑوں کی طرح لازمی ہے یا قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ ضرورت سمجھے تو سال بھر کے لئے جلا وطن بھی کر دے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رہ کے نزدیک یہی آخری صُورت صحیح ہے یعنی حاکم کی رائے پر موقوف ہے۔ دوسری بات اس حدیث میں یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سنگساری سے پہلے سو کوڑوں کی سزا بھی ہے مگر دوسری روایاتِ حدیث اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر خلفاء راشدینؓ کے تعامل سے ثابت یہ ہے کہ یہ دونوں سزائیں جمع نہیں ہوں گی۔ شادی شدہ پر صرف سزائے سنگساری جاری کی جائے گی۔ اس حدیث میں خاص طور پر یہ بات قابلِ نظر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا کی تفسیر فرمائی ہے۔ اور تفسیر میں جو بات سُورۂ نور کی آیت میں مذکور ہے یعنی سو کوڑے لگانا۔ اس پر کچھ مزید چیزوں کا اضافہ بھی ہے اول سو کوڑے کی سزا کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص ہونا، دوسرے سال بھر کی جلا وطنی کا حکم تیسرے شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رجم و سنگساری کا حکم۔ ظاہر ہے کہ اسمیں سُورۂ نور کی آیت پر جن چیزوں کی زیادتی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ بھی وحی الٰہی اور حکم ربانی ہی ہے جیسے اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى۔ اور پیغمبر اور اُن سے براہ راست سُننے والوں کے حق میں وہ وحی جو بصورت قرآن تلاوت کی جاتی ہے اور وہ وحی جس کی تلاوت نہیں ہوتی دونوں برابر ہیں۔ خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے مجمع عام کے سامنے اس پر عمل فرمایا۔ ماعزؓ اور غامدیہ پر سزائے رجم و سنگساری جاری فرمائی۔ جو تمام کتبِ حدیث میں اسانید صحیحہ کیساتھ مذکور ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور زید بن خالد جہنیؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ ایک غیر شادی شدہ مرد نے جو ایک شادی شدہ عورت کا ملازم تھا اس کیساتھ زنا کیا۔ زانی لڑکے کا باپ اس کو لیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واقعہ اقرار سے ثابت ہو گیا تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاقضین بینکما بکتاب اللہ۔ یعنی میں تم دونوں کے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرونگا۔ پھر یہ حکم صادر فرمایا کہ زانی مرد جو غیر شادی شدہ تھا اسکو

سو کوڑے لگائے جاویں اور عورت شادی شدہ تھی اُس کو رجم و سنگسار کرنے کے لئے حضرت اُنیسؓ کو حکم فرمایا اُنھوں نے خود عورت سے بیان لیا اُس نے اعتراف کر لیا تو اس پر بحکم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رجم و سنگساری کی سزا جاری ہوئی (ابن کثیر)

اس حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کو سو کوڑے لگانے کی دوسرے کو سنگسار کرنے کی سزا دی اور دونوں سزاؤں کو قضاء بکتاب اللہ فرمایا، حالانکہ آیت سورۂ نور میں صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے، سنگساری کی سزا مذکور نہیں۔ وجہ وہی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اس آیت کی مکمل تفسیر و تشریح اور تفصیلی حکم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا تھا وہ سارا کتاب اللہ ہی کے حکم میں ہے گو اسمیں سے بعض حصہ کتاب اللہ میں مذکور اور متلو نہیں۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ کتب حدیث میں حضرت فاروق اعظمؓ کا خطبہ بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔

قال عمر بن خطابؓ وھو جالس علی منبر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان اللہ بعث محمدا صلے اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل اللہ علیہ اٰیۃ الرجم قرأناھا ووعیناھا وعقلناھا فرجم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ تعالیٰ فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللہ وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل او الاعتراف (مسلم ص۶۵ ج۲)

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کیساتھ بھیجا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی تو جو کچھ کتاب اللہ میں آپ پر نازل ہوا اسمیں آیت رجم بھی ہے جس کو ہم نے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا اور ہم نے آپکے بعد رجم کیا، اب مجھے یہ خطرہ ہے کہ زمانہ گزرنے پر کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو وہ ایک دینی فریضہ چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جاویں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور سمجھ لو کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں حق ہے اُس شخص پر جو مردوں اور عورتوں میں سے محصن ہو یعنی شادی شدہ جبکہ اسکے زنا پر شرعی شہادت قائم ہو جائے یا حمل اور اعتراف پایا جائے۔

یہ روایت صحیح بخاری میں بھی زیادہ تفصیل کیساتھ مذکور ہے (بخاری ص۱۰۰۹ جلد ۲) اور نسائی میں اس روایت کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

انا لا نجد من الرجم بدا فانہ حد من حدود اللہ الا وان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قد رجم ورجمنا بعدہ ولولا ان یقولوا قائلون ان عمر زاد فی کتاب اللہ ما لیس فیہ لکتبت

زنا کی سزا میں ہم شرعی حیثیت سے رجم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے خوب سمجھ لو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد بھی رجم کیا۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کہنے والے کہیں گے

فی ناحیة المصحف وشهد عمر بن الخطاب وعبد الرحمٰن بن عوف وفلان و فلان ان رسول الله صلے الله علیه وسلم رجم ورجمنا بعده الحدیث

(ابن کثیر)

کہ عمر نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھادیا ہے تو میں قرآن کے کسی گوشہ میں بھی اسکو لکھ دیتا۔ اور عمر بن خطاب گواہ ہے عبدالرحمن بن عوف گواہ ہیں اور فلاں فلاں صحابہ گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور آپکے بعد ہم نے رجم کیا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خطبہ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکم رجم کی کوئی مستقل آیت ہے جو سُورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کے علاوہ ہے مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے اُس آیت کے الفاظ نہیں بتلائے کہ کیا تھے۔ اور نہ یہ فرمایا کہ اگر وہ اس آیتِ نور کے علاوہ کوئی مستقل آیت ہے تو قرآن میں کیوں نہیں اور کیوں اس کی تلاوت نہیں کیجاتی۔ صرف اتنا فرمایا کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ مجھ پر کتاب اللہ میں زیادتی کا الزام لگائیں گے تو میں اس آیت کو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ کما رواہ النسائی

اس روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر وہ واقعی قرآن کی کوئی آیت ہے اور دوسری آیات کی طرح اُس کی تلاوت واجب ہے تو فاروق اعظمؓ نے لوگوں کی بدگوئی کے خوف سے اُس کو کیسے چھوڑ دیا جبکہ اُن کی شدت فی امراللہ معروف و مشہور ہے اور یہ بھی قابل غور ہے کہ خود حضرت فاروقؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں داخل کر دیتا بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ میں اسکو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔

یہ سب اُمور اس کے قرائن ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سُورۂ نور کی آیت مذکورہ کی جو تفسیر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنی جس میں آپ نے سو کوڑے لگانے کے حکم کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص فرمایا اور شادی شدہ کے لئے رجم کا حکم دیا۔ اس مجموعی تفسیر کو اور پھر اُس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعامل کو کتاب اللہ اور آیتِ کتاب اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا اس معنی میں کہ آپکی یہ تفسیر و تفصیل بحکم کتاب اللہ ہے وہ کوئی مستقل آیت نہیں ورنہ حضرت فاروق اعظمؓ کو کوئی طاقت اس سے نہ روک سکتی کہ قرآن کی جو آیت رہ گئی ہے اس کو اسکی جگہ لکھدیں۔ حاشیہ پر لکھنے کا جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ درحقیقت وہ کوئی مستقل آیت نہیں بلکہ آیت سورۂ نور ہی کی تشریح میں کچھ تفصیلات ہیں۔ اور بعض روایات میں جو اس جگہ ایک مستقل آیت کے الفاظ مذکور ہیں وہ اسناد و ثبوت کے اعتبار سے اس درجہ میں نہیں کہ اُس کی بنا پر قرآن میں اسکا اضافہ کیا جاسکے۔ حضرات فقہاء نے جو اسکو منسوخ التلاوۃ غیر منسوخ الحکم کی مثال میں پیش کیا ہے وہ مثال ہی کی حیثیت میں ہے، اُس سے درحقیقت اسکا آیت قرآن ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت مذکورہ میں جو زانیہ اور زانی کی سزا سو کوڑے لگانا مذکور ہے یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مکمل تشریح و تصریح کی بنا پر غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے مخصوص ہے

اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے یہ تفصیل اگرچہ الفاظ آیت میں مذکور نہیں مگر جس ذاتِ اقدس پر یہ آیت نازل ہوئی خود اُن کی طرف سے ناقابلِ التباس وضاحت کیساتھ یہ تفصیل مذکور ہے اور صرف زبانی تعلیم و ارشاد ہی نہیں بلکہ متعدد بار اس تفصیل پر عمل بھی صحابہ کرام کے مجمع کے سامنے ثابت ہے اور یہ ثبوت ہم تک تواتر کے ذریعہ پہنچا ہوا ہے اس لئے شادی شدہ مرد و عورت پر سزائے رجم کا حکم درحقیقت کتاب اللہ ہی کا حکم اور اُسی ... کی طرح قطعی اور یقینی ہے اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم کتاب اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم سنتِ متواترہ سے قطعی الثبوت ہے جیسا کہ حضرت علی رضہ سے یہی الفاظ منقول ہیں کہ رجم کا حکم سنت سے ثابت ہے اور ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ اس مقام پر جہاں جہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے الفاظ احقر نے لکھے ہیں ان الفاظ کو ایک آسان تعبیر کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ اصلی الفاظ محصن اور غیر محصن یا ثیب اور بکر کے حدیث میں آئے ہیں۔ اور محصن کی شرعی تعریف اصل میں یہ ہے کہ جس شخص نے نکاح صحیح کیساتھ اپنی زوجہ سے مباشرت کرلی ہو اور وہ عاقل بالغ بھی ہو۔ مراد احکام میں سب جگہ یہی مفہوم ہے تعبیر کی سہولت کے لئے شادی شدہ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔

سزائے زنا میں تدریج کے تین درجے مذکورہ بالا روایاتِ حدیث اور آیاتِ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زنا کی سزا ہلکی رکھی گئی کہ قاضی یا امیر اپنی صوابدید پر اس جرم کے مرتکب مرد و عورت کو ایذا پہنچائے، اور عورت کو گھر میں مقید رکھا جائے۔ جیسا کہ سورۂ نساء میں اسکا حکم آیا ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے جسکا حکم سورۂ نور کی اس آیت میں آیا ہے کہ دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جاویں تیسرا درجہ وہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آیتِ مذکورہ نازل ہونے کے بعد ارشاد فرمایا کہ سو کوڑوں کی سزا پر اُن لوگوں کے لئے اکتفا کیا جائے جو شادی شدہ نہ ہوں اور شادی شدہ مرد و عورت اس کے مرتکب ہوں تو انکی سزا رجم و سنگساری ہے۔

اسلامی قانون میں جس جرم کی سزا سخت ہے اسکے ثبوت کے لئے شرائط بھی سخت رکھی گئی ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا اسلام میں سب جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت ہے۔ اس کے ساتھ اسلامی قانون میں اُس کے ثبوت کے لئے شرائط بھی بہت سخت رکھی گئی ہیں جن میں ذرا بھی کمی رہے یا شبہ پیدا ہو جائے تو زنا کی انتہائی سزا جس کو حد کہا جاتا ہے وہ معاف ہو جاتی ہے صرف تعزیری سزا بقدرِ جرم باقی رہ جاتی ہے۔ تمام معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ثبوت کے لئے کافی ہوتی ہے مگر حد زنا کے لئے چار مرد گواہوں کی عینی شہادت [illegible] جس میں کوئی [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] شہادت [illegible]

پھر شہادت دینے والوں کی خیر نہیں۔ اُن پر قذف یعنی زنا کی جھوٹی تہمت کا جرم قائم ہو کر حدِ قذف اسّی کوڑے لگائے جانے کی صورت میں جاری کیجاتی ہے۔ اس لئے ذرا سا شبہ ہونے کی صورتمیں کوئی شخص اس کی شہادت پر اقدام نہیں کر سکتا۔ البتہ جس صورت میں صریح زنا کا ثبوت نہ ہو مگر شہادت سے دو مرد و عورت کا غیر مشروع حالت میں دیکھنا ثابت ہو جائے تو قاضی اُن کے جرم کی حیثیت کے مطابق تعزیری سزا کوڑے لگانے وغیرہ کی جاری کر سکتا ہے۔ سزائے زنا اور اس کی شرائط وغیرہ کے مفصل احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی مرد یا جانور کے ساتھ فعل قبیح کا حکم یہ کہ اگر کسی مرد کے ساتھ یا جانور کے ساتھ یہ فعل کرے تو وہ زنا میں داخل ہے یا نہیں اور اُس کی سزا بھی سزائے زنا ہے یا کچھ اور اس کی تفصیل سورۂ نساء کی تفسیر میں گزر چکی ہے کہ اگرچہ لغت اور اصطلاح میں یہ فعل زنا نہیں کہلاتا اور اسی لئے اس پر حدِ زنا کا اطلاق نہیں ہوتا مگر اس کی سزا بھی اپنی سختی میں زنا کی سزا سے کم نہیں۔ صحابۂ کرام نے ایسے شخص کو زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے۔

لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ، سزائے زنا چونکہ بہت سخت ہے اور اس کا احتمال ہے کہ سزا جاری کرنیوالوں کو ان پر رحم آجائے سزا کو چھوڑ بیٹھیں یا کم کر دیں اس لئے اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا کہ دین کے اس اہم فریضہ کی ادائگی میں مجرموں پر رحم اور ترس کھانا جائز نہیں۔ رافت و رحمت اور عفو و کرم ہر جگہ محمود ہے مگر مجرموں پر رحم کھانے کا نتیجہ ساری خلق خدا کے ساتھ بے رحمی ہے اس لئے ممنوع و ناجائز ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی سزائے زنا جاری کرنے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے۔ اسلام میں سب سزاؤں اور خصوصاً حدود کو منظر عام پر جاری کر دینے کا طریقہ رائج ہے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو مگر ایک جماعت کو اسمیں حاضر و موجود رہنے کا حکم یہ بھی سزائے زنا کی خصوصیت ہے۔

اسلام میں ابتداءً جرائم کی پردہ پوشی کا حکم ہے لیکن جب معاملہ شہادت سے ثابت ہو جائے تو پھر مجرموں کی پوری رسوائی بھی عین حکمت قرار دی گئی ہے فحش اور بے حیائی کی روک تھام کے لئے شریعت اسلام نے دُور دُور تک پہرے بٹھائے ہیں عورتوں پر پردہ لازم کر دیا گیا، مردوں کو نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ زیور کی آواز یا عورت کے گانے کی آواز کو ممنوع قرار دیا گیا کہ وہ بے حیائی کے لئے محرک ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جس شخص سے ان معاملات میں کوتاہی دیکھی جائے اسکو خلوت میں تو سمجھانے کا حکم ہے مگر اس کو رسوا کرنے کی اجازت نہیں لیکن جو شخص ان تمام شرعی احتیاطوں کو توڑ کر اس درجہ میں پہنچ گیا کہ اسکا جرم شرعی شہادت سے ثابت ہو گیا تو اب اسکی پردہ پوشی دوسرے لوگوں کی جرأت بڑھانے

کا موجب ہوسکتی ہے اسلئے ابتک جتنا اہتمام پردہ پوشی کا شریعت نے کیا تھا اب اتنا ہی اہتمام اسکی تفضیح اور رُسوائی کا کیا جاتا ہے اسی لئے زنا کی سزا کو صرف منظرِ عام پر جاری کرنے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اُسمیں حاضر اور شریک رہنے کا حکم دیا گیا۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا

بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر

زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳

بدکار مرد یا مشرک اور یہ حرام ہوا ہے ایمان والوں پر

خلاصۂ تفسیر

(زنا ایسی گندی چیز ہے کہ اس سے انسان کی طبیعت کا مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُس کی رغبت بُری ہی چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے ایسے آدمی کیطرف رغبت بھی کسی ایسے ہی خبیث النفس کی ہوسکتی ہے جسکا اخلاقی مزاج بگڑ چکا ہو چنانچہ زانی (اپنے زانی اور راغب الی الزنا ہونیکی حیثیت سے) نکاح بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا بجز زانیہ یا مشرکہ عورت کے اور (اسی طرح) زانیہ کے ساتھ بھی (اُس کے زانیہ اور راغب الی الزنا ہونے کی حیثیت سے) اور کوئی نکاح نہیں کرتا بجز زانی یا مُشرک کے اور یہ (ایسا نکاح جو زانیہ کے زانیہ ہونے کی حیثیت کیساتھ ہو جسکا نتیجہ آئندہ بھی اسکا مبتلائے زنا رہنا ہے یا کسی مشرک عورت کیساتھ ہو) مسلمانوں پر حرام (اور موجب گناہ) کیا گیا ہے (گو صحت و عدم صحت میں دونوں میں فرق ہو کہ زانیہ بحیثیت زانیہ سے کوئی نکاح کر ہی لے تو گناہ ہونے کے باوجود نکاح منعقد اور صحیح ہو جاویگا اور مشرکہ سے نکاح کیا تو ناجائز و گناہ ہونے کے علاوہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا بلکہ باطل ہوگا)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلق دوسرا حکم پہلا حکم سزائے زنا کا تھا جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہو چکا، یہ دوسرا حکم زانی اور زانیہ کے ساتھ نکاح کرنے سے متعلق ہے اسکے ساتھ مشرک مرد یا مشرک عورت سے نکاح کا بھی حکم ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے اقوال بہت مختلف ہیں ان سب میں سہل اور اسلم تفسیر وہی معلوم ہوتی ہے جسکو خلاصہ تفسیر میں بین القوسین کی وضاحتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ آیت کا شروع حقیقۃً کوئی حکم شرعی نہیں بلکہ ایک عام مشاہدہ اور تجربہ کا بیان ہے

جسمیں زنا کا فعلِ خبیث ہونا اور اسکے اثرات کی دُور رس مضرتوں کا ذکر ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زنا ایک اخلاقی زہر ہے اسکے زہریلے اثرات سے انسان کا اخلاقی مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُسے بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی بلکہ بُرائی اور خباثت ہی مرغوب ہو جاتی ہے حلال حرام کی بحث نہیں رہتی۔ اور جو عورت اُس کو پسند آتی ہے اسکا اصلی مقصود اس سے زنا کرنا اور اس کو زناکاری پر راضی کرنا ہوتا ہے اگر زنا کے ارادے میں ناکام ہو جاوے تو مجبوری سے نکاح پر راضی ہوتا ہے مگر نکاح کو دل سے پسند نہیں کرتا کیونکہ نکاح کے جو مقاصد ہیں کہ آدمی عفیف ہو کر رہے اور اولاد صالح پیدا کرے اور اسکے لئے بیوی کے حقوق نفقہ وغیرہ کا ہمیشہ کے لئے پابند ہو جاوے یہ ایسے شخص کو وبال معلوم ہوتے ہیں اور چونکہ ایسے شخص کو دراصل نکاح سے کوئی غرض ہی نہیں اسلئے اسکی رغبت صرف مسلمان عورتوں ہی کی طرف نہیں بلکہ مشرک عورتوں کیطرف بھی ہوتی ہے اور مشرک عورت اگر اپنے مذہب کی وجہ سے یا کسی برادری کی رسم کی وجہ سے نکاح کی شرط لگالے تو مجبوراً وہ اُس سے نکاح پر بھی تیار ہو جاتا ہے اس کی اسکو کچھ بحث ہی نہیں کہ یہ نکاح حلال اور صحیح ہوگا یا شرعاً باطل ٹھہرے گا۔ اس لئے اس پر یہ بات صادق آگئی کہ اسکی جس عورت کیطرف اصلی رغبت ہوگی اگر وہ مسلمان ہے تو زانیہ کیطرف رغبت ہوگی خواہ پہلے سے زنا کی عادی ہو یا اسی کے ساتھ زنا کرکے زانیہ کہلائے یا پھر کسی مشرک عورت کیطرف رغبت ہوگی جس کے ساتھ نکاح بھی زنا ہی کے حکم میں ہے یہ معنی ہوئے آیت کے پہلے جملے کے یعنی اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً۔

اسی طرح جو عورت زنا کی خوگر ہو اور اس سے توبہ نہیں کرتی تو سچے مؤمن مسلمان جنکا مقصود اصلی نکاح اور نکاح کے شرعی فوائد و مقاصد ہیں وہ ایسی عورت سے متوقع نہیں اسلئے ان کو ایسی عورت کی طرف اصلی رغبت نہیں ہوسکتی خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ یہ عورت نکاح کے بعد بھی اپنی بُری عادتِ زنا نہ چھوڑے گی۔ ہاں ایسی عورت کی طرف رغبت یا تو زانی کو ہوگی جسکا اصلی مقصد اپنی خواہش پوری کرنا ہے نکاح مقصود نہیں۔ اسمیں اگر وہ زانیہ کسی اپنی دُنیوی مصلحت سے اس کے ساتھ ملنے کے لئے نکاح کی شرط لگا دے تو بادلِ ناخواستہ نکاح کو بھی گوارا کر لیتا ہے یا پھر ایسی عورت کے نکاح پر وہ شخص راضی ہوتا ہے جو مشرک ہو۔ اور چونکہ مشرک سے نکاح بھی شرعاً زنا ہی ہے اس لئے اسمیں دو چیزیں جمع ہو گئیں کہ مشرک بھی ہے اور زانی بھی۔ یہ معنے ہیں آیت کے دوسرے جملے کے یعنی وَالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ۔

مذکورہ تفسیر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں زانی اور زانیہ سے مُراد وہ ہیں جو زنا سے توبہ نہ کریں اور اپنی اس بُری عادت پر قائم رہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی مردِ خانہ داری یا اولاد کی مصلحت سے کسی پاکدامن شریف عورت سے نکاح کرلے یا ایسی عورت کسی نیک مرد سے نکاح کرلے تو اس آیت سے اس نکاح کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ نکاح شرعاً درست ہو جائے گا۔

جمہور فقہاءِ اُمت امام اعظم ابوحنیفہ، مالک، شافعی وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اور صحابہ کرام سے ایسے نکاح کرانے کے واقعات ثابت ہیں تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی فتویٰ نقل کیا ہے۔

اب رہا آیت کا آخری جملہ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، اسمیں بعض حضرات مفسرین نے تو ذالک کا اشارہ زنا کی طرف قرار دیا ہے تو معنے جملہ کے یہ ہوگئے کہ جب زنا ایسا خبیث فعل ہے تو زنا مومنین پر حرام کردیا گیا۔ اس تفسیر پر معنے میں تو کوئی اشکال نہیں رہتا لیکن ذٰلک سے زنا مُراد لینا سیاقِ آیت سے کسی قدر بعید ضرور ہے۔ اسلئے دوسرے مفسرین نے ذٰلک کا اشارہ نکاح زانی وزانیہ اور مشرک ومشرکہ کیطرف قرار دیا ہے اس صورت میں مشرکہ سے مسلمان مرد کا نکاح اور مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح حرام ہونا تو دوسری نصوصِ قرآن سے بھی ثابت ہے اور تمام اُمت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے اور زانی مرد سے پاکدامن عورت کا نکاح یا زانیہ عورت سے عفیف مرد کا نکاح حرام ہونا جو اس جملے سے مستفاد ہوگا وہ اُس صورت کیساتھ مخصوص ہے کہ عفیف مرد زانیہ عورت سے نکاح کرکے اُس کو زنا سے نہ روکے بلکہ نکاح کے بعد بھی اس کی زناکاری پر راضی رہے کیونکہ اس صورت میں یہ دیوثیت ہوگی جو شرعاً حرام ہے۔ اسی طرح کوئی شریف پاکدامن عورت زنا کے خوگر شخص سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد بھی اسکی زناکاری پر راضی رہے یہ بھی حرام ہے یعنی ان لوگوں کا یہ فعل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا باہمی نکاح صحیح نہ ہو، باطل ہوجائے۔ لفظ حرام شریعت کی اصطلاح میں دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک یہ کہ وہ گناہ ہے اسکا کرنے والا آخرت میں مستحقِ سزا ہے اور دُنیا میں بھی یہ عمل بالکل باطل کالعدم ہے اسپر کوئی شرعی ثمرہ احکامِ دُنیا کا بھی مرتب نہیں ہوگا جیسے کسی مشرک عورت سے یا جو عورتیں ہمیشہ کے لیے حرام ہیں اُنہیں سے کسی سے نکاح کرلیا تو یہ گناہِ عظیم بھی ہے اور ایسا نکاح شرعاً کالعدم ہے زنا میں اور اسمیں کوئی فرق نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل حرام یعنی گناہ موجب سزا ہے مگر دُنیا میں اس فعل کے کچھ ثمرات رہتے ہیں معاملہ صحیح ہوجاتا ہے جیسے کسی عورت کو دھوکہ دیکر یا اغوا کرکے لے آیا پھر شرعی قاعدے کیمطابق دو گواہوں کے سامنے اسکی مرضی سے نکاح کرلیا تو یہ فعل تو ناجائز وحرام تھا مگر نکاح صحیح ہوگیا اولاد ثابت النسب ہوگی۔ اسی طرح زانیہ اور زانی کا نکاح جبکہ اُن کا مقصود اصلی زنا ہی ہو، نکاح محض کسی دُنیوی مصلحت سے کرتے ہوں اور زنا سے توبہ نہیں کرتے ایسا نکاح حرام ہے مگر دُنیوی احکام میں باطل کالعدم نہیں۔ نکاح کے ثمرات شرعیہ نفقہ، مہر، ثبوت نسب اور میراث سب جاری ہوں گے۔ اس طرح لفظ حرّم اس آیت میں مشرکہ کے حق میں پہلے معنے کے اعتبار سے اور زانیہ اور زانی کے حق میں دوسرے معنے کے اعتبار سے صحیح اور درست ہوگیا۔ اس تفسیر پر آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو پھر نہ لائے چار مرد شاہد تو مارو اُن کو

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ④

اسّی دُرّے اور نہ مانو اُن کی کوئی گواہی کبھی اور وہی لوگ ہیں نافرمان

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤

مگر جنھوں نے توبہ کرلی اسکے پیچھے اور سنور گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ (زنا کی) تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو (جن کا زانیہ ہونا کسی دلیل یا قرینہ شرعیہ سے ثابت نہیں) اور پھر چار گواہ (اپنے دعوے پر) نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی دُرّے لگاؤ اور اُن کی کوئی گواہی کبھی قبول مت کرو (یہ بھی تہمت لگانے کی سزا ہی کا جز ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہوگئے یہ تو دنیا کی سزا کا ذکر تھا) اور یہ لوگ (آخرت میں بھی سزا کے مستحق ہیں کیونکہ) فاسق ہیں لیکن جو لوگ اس کے بعد (خدا کے سامنے) توبہ کرلیں (کیونکہ تہمت لگانے میں اُنھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور حق اللہ کو ضائع کیا) اور (جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے معاف کرا کر بھی) اپنی (حالت کی) اصلاح کرلیں (کیونکہ اسکا حق ضائع کیا تھا) تو اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت کرنیوالا رحمت کرنیوالا ہے (یعنی سچی توبہ کرنے سے عذاب آخرت معاف ہوجائے گا اگرچہ شہادت کا مقبول نہ ہونا جو دُنیوی سزا تھی وہ باقی رہے گی کیونکہ وہ حدِ شرعی کا جز ہے اور ثبوتِ جُرم کے بعد توبہ کرنے سے حد شرعی ساقط نہیں ہوتی)۔

معارف ومسائل

زنا کے متعلق تیسرا حکم جھوٹی تہمت کا جُرم ہونا اور اُسکی حدِ شرعی

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ زنا چونکہ سارے جرائم سے زیادہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ ہے اسلئے اسکی سزا شریعتِ اسلام نے دوسرے سب جرائم سے زیادہ سخت رکھی ہے اس لئے عدل وانصاف کا تقاضا تھا کہ اس معاملہ کے ثبوت کو بڑی اہمیت دی جائے بغیر شرعی ثبوت کے کوئی کسی مرد یا عورت پر زنا کا الزام یا تہمت لگانے کی جرأت نہ کرے اس لئے شریعتِ اسلام نے بغیر ثبوت شرعی کے جسکا نصاب چار مرد گواہ عادل ہونا ہے اگر کوئی کسی پر تہمت صریح زنا کی لگائے تو اس تہمت لگانے کو بھی شدید جُرم قرار دیا اور اس جُرم پر بھی حدِ شرعی اسّی کوڑے مقرر کی جسکا لازمی اثر یہ ہوگا کہ کسی شخص پر زنا کا الزام کوئی

شخص اُسی وقت لگانے کی جرأت کرے گا جبکہ اس نے اس فعلِ خبیث کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا بھی ہو اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کو یہ یقین ہو کہ میرے ساتھ اور تین مرد وں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں گے۔ کیونکہ اگر دوسرے گواہ ہیں ہی نہیں یا چار سے کم ہیں یا اُن کے گواہی دینے میں شبہ ہے تو اکیلا یہ شخص گواہی دیکر تہمتِ زنا کی سزا کا مستحق بننا کسی حال گوارا نہ کریگا۔

ایک شبہ اور جواب رہا یہ معاملہ کہ جب زنا کی شہادت کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا دی گئیں تو مجرموں کو کھلی چھٹی مل گئی نہ کسی کو شہادت کی جرأت ہوگی نہ کبھی ثبوت شرعی بہم پہنچے گا نہ ایسے مجرم کبھی سزا یاب ہو سکیں گے۔ مگر یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ زنا کی حدِ شرعی یعنی سو کوڑے یا رجم و سنگساری کی سزا دینے کیلئے تو یہ شرطیں ہیں لیکن دو غیر محرم مرد و عورت کو یکجا قابلِ اعتراض حالت میں یا بیحیائی کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی شہادت دینے پر کوئی پابندی نہیں اور ایسے تمام اُمور جو زنا کے مقدمات ہوتے ہیں یہ بھی شرعاً قابلِ سزائے جُرم ہیں لیکن حدِ شرعی کی سزا نہیں بلکہ تعزیری سزا قاضی یا حاکم کی صوابدید کےمطابق کوڑے لگانے کی دی جاتی ہے اسلئے جس شخص نے دو مرد و عورت کو زنا میں مبتلا دیکھا اگر دوسرے گواہ نہیں ہیں تو صریح زنا کے الفاظ سے تو شہادت نہ دے مگر بے حجابانہ اختلاط کی گواہی دے سکتا ہے اور حاکم قاضی اس پر تعزیری سزا بعد ثبوتِ جُرم جاری کر سکتا ہے۔

محصنٰت کون ہیں یہ لفظ احصان سے مشتق ہے اصطلاحِ شرع میں احصان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جسکا حدِ زنا میں اعتبار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جس پر زنا کا ثبوت ہو جاوے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور کسی عورت کیساتھ نکاح صحیح کر چکا ہو اور اُس سے مباشرت بھی ہو چکی ہو تو اس پر سزائے رجم و سنگساری جاری ہو گی۔ دوسری قسم وہ ہے جس کا اعتبار حدِ قذف یعنی تہمتِ زنا میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور عفیف ہو یعنی پہلے کبھی اس پر زنا کا ثبوت نہ ہوا ہو۔ اس آیت میں یہی معنے محصنٰت کے ہیں (جصاص)

مسئلہ۔ آیتِ قرآن میں عام معروف عادت کےمطابق یا اُس واقعہ کی وجہ سے جو شانِ نزول اس آیت کا ہے تہمتِ زنا اور اُس کی سزا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے مرد ہوں اور جس پر تہمت لگائی گئی وہ پاکدامن عورت ہو مگر حکم شرعی اشتراکِ علت کے سبب سے عام ہے کوئی عورت دوسری عورت پر یا کسی مرد پر یا مرد کسی دوسرے مرد پر تہمتِ زنا لگائے اور ثبوتِ شرعی موجود نہ ہو تو یہ سب بھی اسی سزائے شرعی کے مستحق ہونگے (جصاص ص ۱۵۰ ج ۳)

مسئلہ۔ یہ حدِ شرعی جو تہمتِ زنا پر ذکر کی گئی ہے صرف اسی تہمت کیساتھ مخصوص ہے کسی دوسرے جرم کی تہمت کسی شخص پر لگائی جائے تو یہ حدِ شرعی اُس پر جاری نہیں ہوگی۔ ہاں تعزیری سزا حاکم کی صوابدید کے مطابق ہر جرم کی تہمت پر دی جا سکتی ہے۔ الفاظِ قرآن میں اگرچہ صراحۃً اس حد

کا تہمت زنا کے ساتھ مخصوص ہونا ذکر نہیں مگر چار گواہوں کی شہادت کا ذکر اس خصوصیت کی دلیل ہے کیونکہ چار گواہ کی شرط صرف ثبوتِ زنا ہی کے لئے مخصوص ہے۔ (جصاص، ہدایہ)

مسئلہ۔ حدِ قذف میں چونکہ حق العبد یعنی جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کا حق بھی شامل ہے اس لئے یہ حد بھی جاری کی جائے گی جبکہ مقذوف یعنی جس پر تہمت لگائی گئی وہ حد جاری کرنے کا مطالبہ بھی کرے ورنہ حد ساقط ہو جائے گی (ہدایہ) بخلاف حدِ زنا کے کہ وہ خالص حق اللہ ہے اس لئے کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے حدِ زنا جرم ثابت ہونے پر جاری کی جائے گی۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ، یعنی جس شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے کا جرم ثابت ہو جائے اور مقذوف کے مطالبہ سے اُس پر حدِ قذف جاری ہو جائے تو اُس کی ایک سزا تو فوری ہو گئی کہ اسّی کوڑے لگائے گئے۔ دوسری سزا ہمیشہ کے لئے جاری رہے گی وہ یہ ہے کہ اس کی شہادت کسی معاملہ میں قبول نہ کی جائے گی جبتک یہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے ندامت کیساتھ توبہ نہ کرے اور مقذوف شخص سے معافی حاصل کر کے توبہ کی تکمیل نہ کرے اُس وقت تک تو باجماعِ امت اس کی شہادت کسی بھی معاملہ میں مقبول نہ ہوگی۔ اور اگر توبہ کرلے تب بھی حنفیہ کے نزدیک اس کی شہادت قبول نہیں ہوتی ہاں گناہ معاف ہو جاتا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں گزرا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ، یعنی وہ لوگ جن پر تہمت زنا کی حدِ شرعی جاری کی گئی ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی حالت درست کرلیں کہ آئندہ اس طرح کے اقدام کا اس سے خطرہ نہ رہے اور جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے بھی معاف کرالیں تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

یہ استثناء اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کا امام اعظم ابو حنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک آیتِ سابقہ کے صرف آخری جملہ کیطرف راجع ہے۔ یعنی وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ، تو مطلب اس استثناء کا یہ ہے کہ جس پر حدِ قذف جاری ہوئی ہے وہ فاسق ہے لیکن اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کرے اور اپنی حالت کی اصلاح بھی مقذوف سے معافی لے کر کرے تو پھر وہ فاسق نہیں رہے گا اور آخرت کی سزا اُس سے معاف ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو اس پر دو سزاؤں کا ذکر اس آیت کے شروع میں ہے یعنی اسّی کوڑے لگانا اور مردود الشہادت کر دینا یہ سزائیں توبہ کے باوجود اپنی جگہ رہیں گی کیونکہ ان میں ایک بڑی سزا کوڑے لگانے کی وہ تو جاری ہو ہی چکی ہے دوسری سزا بھی چونکہ اُسی حدِ شرعی کا جزو ہے اور یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ توبہ سے حدِ شرعی معاف نہیں ہوتی اگرچہ آخرت کا عذابِ گناہ معاف ہو کر ٹل جاتا ہے تو جب مردود الشہادت ہونا بھی حدِ شرعی کا جزو ہے تو وہ توبہ سے معاف نہ ہوگا۔ امام شافعی اور بعض دوسرے ائمہ نے استثناء مذکور کو آیتِ سابقہ کے سب جملوں کی طرف راجع کیا ہے جسکا مطلب یہ ہوگا کہ توبہ کر لینے سے جیسا کہ وہ فاسق

نہیں رہا اسلئے مردود الشہادت بھی نہیں رہے گا۔ جصاص اور مظہری میں دونوں طرف کے دلائل اور جوابات کی تفصیل مذکور ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ

اور جو لوگ عیب لگائیں اپنی جورؤں کو اور شاہد نہ ہوں اُن کے پاس سوائے اُن کی جان کے

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑥ وَ

تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ مقرر وہ شخص سچا ہے اور

الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑦ وَيَدْرَؤُا

پانچویں بار یہ کہ اللہ کی پھٹکار ہو اُس شخص پر اگر ہو وہ جھوٹا اور عورت سے

عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۢ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑧

ٹل جائے گی مار یوں کہ وہ گواہی دے چار گواہی اللہ کی قسم کھا کر کہ مقرر وہ شخص جھوٹا ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨

اور پانچویں یہ کہ اللہ کا غضب آئے اس عورت پر اگر وہ شخص سچا ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ⑩ ع

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تمہارے اوپر اور اسکی رحمت اور یہ کہ اللہ معاف کرنے والا ہے حکمتیں جاننے والا تو کیا کچھ نہ ہوتا

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اپنی بیبیوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور اُن کے پاس بجز اپنے (ہی دعوے کے) اور کوئی گواہ نہ ہوں (جو حد میں چار ہونے ضروری ہیں) تو اُن کی شہادت (جو کہ دافع حبس یا حد قذف ہو) یہی ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہدے کہ بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اُس عورت سے سزا (یعنی حبس یا حدِ زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ مرد سچا ہو (اس طریق سے دونوں میاں بیوی سزائے دُنیوی سے بچ سکتے ہیں البتہ وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جاوے گی) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُسکا کرم ہے (کہ ایسے ایسے احکام مقرر کیے جس میں انسان کے فطری جذبات کی پوری رعایت ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے تو تم بڑی مضرتوں میں پڑ جاتے جنکا بیان آگے آتا ہے)

معارف و مسائل

زنا کے متعلقات میں چوتھا حکم لعان کا ہے
لعان اور ملاعنت کے معنے ایک دوسرے پر لعنت اور غضب الٰہی کی بددعا کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں میاں اور بیوی دونوں کو چند خاص قسمیں دینے کو لعان کہا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے یا اپنے بچے کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے اور یہ عورت جس پر الزام لگایا گیا ہے اُس کو جھوٹا بتلا دے اور اُس کا مطالبہ کرے کہ مجھ پر جھوٹی تہمت لگائی ہے اس لئے شوہر پر تہمت زنا کی سزا اسّی کوڑے جاری کیجادے تو اسوقت شوہر سے مطالبہ کیا جاویگا کہ الزام زنا پر چار گواہ پیش کرے۔ اگر اس نے گواہ پیش کردیئے تو عورت پر حدِ زنا لگائی جاوے گی۔ اور اگر وہ چار گواہ نہ لاسکا تو ان دونوں میں لعان کرایا جاویگا۔ یعنی اوّل مرد سے کہا جاویگا کہ وہ چار مرتبہ اُن الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ میں اس الزام میں سچا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اگر شوہر ان الفاظ کے کہنے سے رُکے تو اُس کو قید کردیا جائے گا کہ یا تو اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کردیا مذکورہ الفاظ کے ساتھ پانچ مرتبہ یہ قسمیں کھائے اور جب تک وہ ان دونوں میں سے کوئی کام نہ کرے اُس کو قید رکھا جائے گا۔ اگر اُس نے اپنے جھوٹے ہونیکا اقرار کرلیا تو اس پر حدِ قذف یعنی تہمتِ زنا کی شرعی سزا جاری ہوگی اور اگر الفاظِ مذکورہ کیساتھ پانچ مرتبہ قسمیں کھالیں تو پھر اسکے بعد عورت سے اُن الفاظ میں پانچ قسمیں لی جاویں گی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اُس کو اُسوقت تک قید رکھا جاوے گا جب تک کہ وہ یا تو شوہر کی تصدیق کرے اور اپنے جُرم زنا کا اقرار کرے تو اس پر حدِ زنا جاری کردی جاوے اور یا پھر الفاظِ مذکورہ کیساتھ پانچ قسمیں کھاوے۔ اگر وہ الفاظ مذکورہ سے قسمیں کھانے پر راضی ہوجاوے اور قسمیں کھالے تو اب لعان پُورا ہوگیا جس کے نتیجہ میں دُنیا کی سزا سے دونوں بچ گئے آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ اُن میں سے کون جھوٹا ہے جھوٹے کو آخرت میں سزا ملے گی، لیکن دنیا میں بھی جب دو میاں بیوی میں لعان کا معاملہ ہوگیا تو یہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتے ہیں شوہر کو چاہئے کہ اسکو طلاق دے کر آزاد کردے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم ان دونوں میں تفریق کرسکتا ہے جو بحکمِ طلاق ہوگی۔ بہرحال اب ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح بھی کبھی نہیں ہوسکتا معاملہ لعان کی یہ تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

لعان کا قانون شریعت اسلام میں شوہر کے جذبات و نفسیات کی رعایت کی بنا پر نافذ ہوا ہے کیونکہ کسی شخص پر الزام زنا لگانے کا قانون جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے اُس کی رُو سے یہ ضروری ہے

کہ الزام زنا لگانے والا چار گواہ عینی پیش کرے اور جو یہ نہ کر سکے تو اُلٹی اسی پر تہمت زنا کی حد جاری کی جاوے گی۔ عام آدمی کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ جب چار گواہ میسر نہ ہوں تو وہ الزام زنا لگانے سے خاموش رہے تاکہ تہمتِ زنا کی سزا سے محفوظ رہ سکے لیکن شوہر کے لئے یہ معاملہ بہت سنگین ہے جب اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور گواہ موجود نہیں اگر وہ بولے تو تہمت زنا کی سزا پائے اور نہ بولے تو ساری عمر خون کے گھونٹ پیتا رہے اور اس کی زندگی وبال ہو جائے اس لئے شوہر کے معاملہ کو عام قانون سے الگ کر کے اسکا مستقل قانون بنا دیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لعان صرف میاں بیوی کے معاملہ میں ہو سکتا ہے دوسروں کا حکم وہی ہے جو پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔ کتب حدیث میں اس جگہ دو واقعے ذکر کئے گئے ہیں انمیں سے آیات لعان کا شان نزول کونسا واقعہ ہے اسمیں ائمہ تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ قرطبی نے آیات کا نزول مکرر مان کر دونوں کو شانِ نزول قرار دیا ہے حافظ ابن حجر شارح بخاری اور نووی شارح مسلم نے دونوں میں تطبیق دے کر ایک ہی نزول میں دونوں کو شانِ نزول آیات لعان کا قرار دیا ہے ان کی توجیہ زیادہ صاف ہے جو آگے آجائے گی۔ ایک واقعہ ہلال بن اُمیہ اور اُن کی بیوی کا ہے جو صحیح بخاری میں بروایت ابن عباس مذکور ہے اور اس واقعہ کا ابتدائی حصہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت سے مسند احمد میں اسطرح آیا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں حد قذف کے احکام کی آیات نازل ہوئیں یعنی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً جس میں کسی عورت پر زنا کا الزام لگانیوالے مرد پر لازم کیا گیا ہے کہ یا تو اس الزام پر چار گواہ پیش کرے جنمیں ایک یہ خود ہوگا اور جو ایسا نہ کرے تو اسکو جھوٹا قرار دیکر اس پر اسی کوڑوں کی حد اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہونے کی سزا جاری کی جائے گی یہ آیات سنکر انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا یہ آیات اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سعد بن عبادہؓ کی زبان سے ایسی بات سُن کر بڑا تعجب ہوا) آپؐ نے حضرات انصار کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ سُن رہے ہیں کہ آپ کے سردار کیا بات کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ، آپ اُن کو ملامت نہ فرمادیں۔ ان کے اس کلام کی وجہ ان کی شدتِ غیرت ہے۔ پھر سعد بن عبادہؓ نے خود عرض کیا یا رسول اللہ! میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، میں پوری طرح جانتا ہوں یہ آیات حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ اگر میں بے حیا بیوی کو اس حال میں دیکھوں کہ غیر مرد اُس پر چڑھا ہوا ہو تو کیا میرے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ میں اسکو وہاں ڈانٹوں اور وہاں سے ہٹا دوں بلکہ میرے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں چار آدمیوں کو لاکر یہ حالت دکھلاؤں اور اس پر گواہ بناؤں اور جب تک میں

گواہوں کو جمع کروں وہ اپنا کام کر کے بھاگ جائے (حضرت سعدؓ کے الفاظ اس جگہ مختلف منقول ہیں خلاصہ سب کا ایک ہی ہے۔ قرطبی)

آیاتِ حدِ قذف نازل ہونے اور سعد بن عبادہؓ کے اس کلام پر تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ہلال بن امیہؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس ہوئے تو اپنی بیوی کیساتھ ایک مرد کو بچشم خود دیکھا اور انکی باتیں اپنے کانوں سے سُنیں مگر کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ صبح ہوگئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ سُن کر دل بُرا ہوا اور بڑا بھاری محسوس کیا۔ ادھر حضرات انصار جمع ہوگئے اور آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ جو بات ہمارے سردار سعدؓ بن عبادہ نے کہی تھی ہم اُسی میں مُبتلا ہوگئے اب قانون شرعی کیمطابق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہلال بن اُمیہ کو اسّی کوڑے حدِ قذف کے لگائیں گے اور لوگوں میں انکو ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت قرار دیدیں گے مگر ہلال بن اُمیہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت سے بچالیں گے۔ اور صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال کا معاملہ سنکر قرآنی حکم کیمطابق ہلالؓ سے فرما بھی دیا کہ یا تو اپنے اس دعوے پر بینہ (چار گواہ) لاؤ ورنہ تمھاری پیٹھ پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ ہلال ابن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے عرض کیا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کیساتھ بھیجا ہے میں اپنے کلام میں سچا ہوں اور ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرمادیں گے جو میری پیٹھ کو حدِ قذف کی سزا سے بری کردیگا۔ یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ جبرئیل امین یہ آیت جن میں لعان کا قانون ہے لیکر نازل ہوئے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ الآیۃ

ابو یعلیٰ نے یہی روایت حضرت انسؓ سے بھی نقل کی ہے اُس میں یہ بھی ہے کہ جب آیات لعان نازل ہوئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہ کو بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری مشکل کا حل نازل فرمادیا۔ ہلالؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اسی کی اُمید لگائے ہوئے تھا۔ اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہؓ کی بیوی کو بھی بُلا لیا اور جب دونوں میاں بیوی جمع ہوگئے تو بیوی سے معاملہ کے متعلق پُوچھا گیا۔ اُس نے کہا کہ میرا شوہر ہلال بن اُمیہ مجھ پر جھوٹ الزام لگاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو (اللہ کے عذاب سے ڈر کر) توبہ کرے اور سچی بات ظاہر کردے۔ اس پر ہلال بن اُمیہؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے بالکل سچ بات کہی ہے اور جو کچھ کہا ہے حق کہا ہے تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نازل شدہ آیاتِ قرآن کیمطابق دونوں میں باہمی لعان کرایا جائے۔ پہلے حضرت ہلالؓ سے کہا گیا کہ تم چار مرتبہ ان الفاظ سے شہادت دو جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یعنی میں اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ میں اپنے الزام میں سچا ہوں۔ ہلالؓ نے اسکے مطابق چار مرتبہ اسکی شہادت دی۔ جب پانچویں شہادت

کا نمبر آیا جس کے الفاظِ قرآنی یہ ہیں کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے طور پر ہلال بن اُمیہؓ سے فرمایا کہ دیکھو ہلال خدا سے ڈرو کیونکہ دُنیا کی سزا آخرت کے عذاب سے ہلکی ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کی دی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے اسی پر فیصلہ ہونا ہے مگر ہلال بن اُمیہؓ نے عرض کیا کہ میں بقسم کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس شہادت پر آخرت کا عذاب نہیں دیں گے (کیونکہ بالکل سچی شہادت ہے) جیسا کہ اللہ کے رسُول مجھے دُنیا میں حد قذف کی سزا نہیں دیں گے اور پھر یہ پانچویں شہادت کے الفاظ ادا کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے ہلال کی بیوی سے اسی طرح کی چار شہادات یا چار قسمیں لیں اس نے بھی ہر دفعہ میں قرآنی الفاظ کے مطابق یہ شہادت دی کہ میرا شوہر جھوٹا ہے۔ جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا ٹھہرو، پھر اس عورت سے فرمایا کہ خدا سے ڈرو کہ یہ پانچویں شہادت آخری بات ہے اور خدا کا عذاب لوگوں کے عذاب یعنی زنا کی حدِ شرعی سے کہیں زیادہ سخت ہے یہ سنکر وہ قسم کھانے سے جھجکنے لگی، کچھ دیر اسی کیفیت میں رہی مگر پھر آخر میں کہا کہ واللہ میں اپنی قوم کو رُسوا نہیں کرونگی اور پانچویں شہادت بھی ان لفظوں کیساتھ ادا کر دی کہ اگر میرا شوہر سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ یہ لعان کی کارروائی مکمل ہو گئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میاں بیوی میں تفریق کر دی یعنی ان کا نکاح توڑ دیا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اس عورت کا بچہ کہلائے گا باپ کیطرف منسوب نہیں کیا جائے گا مگر بچے کو مطعون بھی نہ کیا جائے گا۔ انتہیٰ (تفسیر مظہری بحوالہ مسند احمد عن ابن عباسؓ)

دُوسرا واقعہ بھی صحیحین بخاری و مسلم میں مذکور ہے اور واقعہ کی تفصیل امام بغوی نے بروایت ابن عباسؓ اس طرح نقل فرمائی ہے کہ زنا کی تہمت لگانے والے پر حد قذف جاری کرنے کے احکام جن آیات میں نازل ہوئے یعنی وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الآیۃ تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات لوگوں کو سنائیں۔ مجمع میں عاصم بن عدی انصاریؓ بھی موجود تھے یہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میری جان آپ پر قربان ہو اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی عورت کو کسی مرد کیساتھ مبتلا دیکھے تو اگر وہ اپنے دیکھے ہوئے واقعہ کو بیان کرے تو اس کو کوڑے لگائے جاویں گے اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت کر دیا جاویگا اور مسلمان اسکو فاسق کہا کریں گے ایسی حالت میں ہم گواہ کہاں سے لائیں گے اور اگر گواہوں کی تلاش میں نکلیں گے تو گواہ آنے تک وہ اپنا کام کر کے بھاگ چکا ہوگا۔ یہ وہی سوال تھا جو پہلے واقعہ میں حضرت سعد بن عبادہؓ نے کیا تھا اس دوسرے واقعہ میں عاصم بن عدیؓ نے کیا ہے۔

یہ سوال ایک جمعہ کے دن کیا گیا تھا اسکے بعد یہ قصہ پیش آیا کہ عاصم بن عدیؓ کا ایک چچا زاد

بھائی عویمر تھا جسکا نکاح بھی عاصم بن عدیؓ کی چچازاد بہن خولہؓ سے ہوا تھا۔ عویمرؓ نے ایک روز دیکھا کہ اُن کی بیوی خولہ شریک بن سحماء کیساتھ مبتلا ہے اور یہ شریک بن سحماء بھی عاصم کا چچازاد بھائی تھا۔ عویمرؓ نے یہ واقعہ آکر عاصم بن عدیؓ سے بیان کیا، عاصمؓ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور اگلے روز جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پچھلے جمعہ میں مَیں نے آپ سے جو سوال کیا تھا افسوس ہے کہ میں خود اسمیں مبتلا ہو گیا کیونکہ میرے ہی اہل بیت میں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا۔ بغویؒ نے ان دونوں کو حاضر کرنے اور پھر آپس میں لعان کرانیکا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے (مظہری) اور صحیحین میں اسکا خلاصہ حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی کی روایت سے یہ مذکور ہے کہ عویمر عجلانیؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کیساتھ کسی غیر مرد کو دیکھے تو کیا وہ اس کو قتل کر دے جس کے نتیجہ میں لوگ اس کو قتل کریں گے یا پھر وہ کیا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اور تمھاری بیوی کے معاملے میں حکم نازل فرما دیا ہے۔ جاؤ بیوی کو لیکر آؤ۔ حضرت سہل بن سعدؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو بلا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر لعان کرایا (جس کی صورت واقعہ سابقہ میں بیان ہو چکی ہے) جب دونوں طرف سے پانچوں شہادات پوری ہو کر لعان ختم ہوا تو عویمر عجلانیؓ نے کہا یا رسول اللہ، اگر میں اب اسکو بیوی بنا کر رکھوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے اسلئے میں اسے تین طلاق دیتا ہوں (مظہری بحوالہ صحیحین)

ان دونوں واقعوں میں سے ہر ایک میں یہ مذکور ہے کہ آیاتِ لعان اسکے بارے میں نازل ہوئی ہیں حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نوویؒ نے دونوں میں تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا واقعہ ہلال بن امیہؓ کا تھا اور آیاتِ لعان کا نزول اُسی واقعہ کے بارے میں ہوا اسکے بعد عویمرؓ کو ایسا ہی واقعہ پیش آگیا اور اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا انکو ہلال بن امیہ کا معاملہ سابقہ معلوم نہ ہوگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بتلایا کہ تمھارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہے اور قرینہ اسکا یہ ہے کہ ہلال بن امیہؓ کے واقعہ میں تو الفاظ حدیث کے یہ ہیں فنزل جبرئیل، اور عویمرؓ کے واقعہ میں الفاظ یہ ہیں قد انزل اللہ فیك جسکا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے واقعہ جیسے ایک واقعہ میں اسکا حکم نازل فرما دیا ہے واللہ اعلم (مظہری)

مسئلہ: جب دو میاں بیوی کے درمیان حاکم کے سامنے لعان ہو جاوے تو یہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے جیسے حرمت رضاعت ابدی ہوتی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المتلاعنان لا یجتمعان ابدًا۔ حرمت تو لعان ہونے ہی سے ثابت ہو جاتی ہے لیکن عورت کو دوسرے شخص سے بعد عدت نکاح کرنا امام اعظمؒ کے نزدیک جب جائز

ہوگا جبکہ مرد طلاق دیدے یا زبان سے کہدے کہ میں نے اس کو چھوڑ دیا اور اگر مرد ایسا نہ کرے تو حاکم قاضی ان دونوں میں تفریق کا حکم کر دیگا وہ بھی بحکم طلاق ہو جائے گا پھر عدت طلاق تین حیض پورے ہونے کے بعد عورت آزاد ہوگی اور دوسرے کسی شخص سے نکاح کر سکے گی (مظہری وغیرہ)

مسئلہ : جب لعان ہو چکا اس کے بعد اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اُسکے شوہر کیطرف منسوب نہیں ہوگا بلکہ اُس کی نسبت اُس کی ماں کیطرف کی جاویگی ۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہ اور عویمر عجلانی دونوں کے معاملات میں یہی فیصلہ فرمایا ۔

مسئلہ : لعان کے بعد اگرچہ اُن میں جو جھوٹا ہے اُسکا عذاب آخرت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا مگر دُنیا کی سزا اس سے ساقط ہوگئی ۔ اسی طرح دُنیا میں اُس کو زانیہ اور بچے کو ولد الزنا کہنا بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوگا ۔ ہلال ابن اُمیہؓ کے معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ میں یہ حکم بھی فرمایا ۔ وقضی بان لا ترمی ولا ولدھا ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ

جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان تمھیں میں ایک جماعت ہیں تم اسکو نہ سمجھو بُرا اپنے حق میں

بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ

بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ہر آدمی کے لئے اُن میں سے وہ ہے جتنا اُسنے گناہ کمایا اور جس نے

تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ

اُٹھایا ہے اسکا بڑا بوجھ اسکے واسطے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم نے اسکو سنا تھا خیال کیا

الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝

ہوتا ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال اور کہا ہوتا یہ صریح طوفان ہے

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰۗىِٕكَ

کیوں نہ لائے وہ اس بات پر چار شاہد پھر جب نہ لائے شاہد تو وہ لوگ

عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

اللہ کے یہاں وہی ہیں جھوٹے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ

دُنیا اور آخرت میں تو تم پر پڑتی اس چرچا کرنے میں کوئی آفت بڑی جب

تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ

لینے لگے تم اسکو اپنی زبانوں پر اور بولنے لگے اپنے منھ سے جس چیز کی تم کو خبر نہیں اور

وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ

اور تم سمجھتے ہو اسکو ہلکی بات اور یہ اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے اور کیوں نہ جب تم نے اسکو سنا تھا

قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿١٦﴾

کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں یہ بات اللہ تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے

يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ

اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر نہ کرو ایسا کام کبھی اگر تم ایمان رکھتے ہو اور کھولتا ہے

اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ

اللہ تمہارے واسطے پتے کی باتیں اور اللہ سب جانتا ہے حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں کہ

أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي

چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں اُن کے لئے عذاب ہے دردناک دنیا

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ

اور آخرت میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور اگر نہ ہوتا اللہ

اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٢٠﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

کا فضل تم پر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے مہربان تو کیا کچھ نہ ہوتا۔ اے ایمان

ع ۹ النصف

آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ

والو نہ چلو قدموں پر شیطان کے اور جو کوئی چلے گا قدموں پر شیطان کے

فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَ

سو وہ تو یہی بتلائے گا بے حیائی اور بری بات اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور

رَحْمَتُهُ مَا زَكَىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ ۗ

اس کی رحمت تو نہ سنورتا تم میں ایک شخص بھی کبھی ولیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے

وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ

اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے اور قسم نہ کھائیں بڑے درجہ والے تم میں سے اور کشائش والے اس

يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

پر کہ دیں قرابتیوں کو اور محتاجوں کو اور وطن چھوڑنے والوں کو اللہ کی راہ میں

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اور چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا ہے

رَحِيمٌ ﴿٢٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا

مہربان جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں بے خبر ایمان والیوں کو انکو پھٹکار ہے

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ

دُنیا میں اور آخرت میں اور اُن کے لئے ہے بڑا عذاب جس دن کہ ظاہر کر دیں گی

اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ

اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں جو کچھ وہ کرتے تھے اُس دن پوری دے گا

اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾ اَلْخَبِيْثٰتُ

اُن کو اللہ اُن کی سزا جو چاہئے، اور جان لیں گے کہ اللہ وہی ہے سچا کھولنے والا گندیاں ہیں

لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ

گندوں کے واسطے اور گندے واسطے گندیوں کے اور ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے اور ستھرے واسطے

لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

ستھریوں کے وہ لوگ بے تعلق ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں اُنکے واسطے بخشش ہے اور روزی ہے عزت کی

ع ۳ ۹

ربطِ آیات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سُوْرَۃُ نُوْر کا بیشتر حصہ اُن احکام سے متعلق ہے جو عفت و عصمت کی حفاظت کے لئے جاری کئے گئے ہیں، اُنکے بالمقابل عفت و عصمت پر دست اندازی اور اسکی خلاف ورزی کی دُنیوی سزائیں اور اُس پر آخرت کا وبالِ عظیم ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے حدِ زنا پھر حدِ قذف اور پھر لعان کا بیان آ چکا ہے۔ حدِ قذف کے ضمن میں کسی پاکدامن عورت پر بے تک چار گواہوں کی شہادت نہ ہو زنا کا الزام لگانا گناہِ عظیم قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کیلئے حدِ شرعی اسّی کوڑے لگانے کی جاری فرمائی ہے۔ یہ مسئلہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں سے متعلق تھا۔ اور چونکہ سنہ ۶ ہجری میں بعض منافقین نے ام المؤمنین حضرت صدیقہ عائشہؓ پر ایسی تہمت گھڑی تھی، اور تقلیداً بعض مسلمان بھی اُسکا تذکرہ کرنے لگے تھے یہ معاملہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں کے معاملہ سے کہیں زیادہ اشد تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی برات اور پاکی کے بیان میں اس جگہ دس آیتیں مذکور الصدر نازل فرمائیں جنمیں حضرت صدیقہ کی برات و نزاہت کا اعلان اور اُن کے معاملہ میں جن لوگوں نے افترا اور بہتان میں کسی طرح کا حصہ لیا تھا ان سب کو تنبیہ اور دُنیا و آخرت میں اُن کے وبال کا بیان ہے۔ یہ بہتان بندی کا واقعہ قرآن و حدیث میں واقعہ افک کے نام سے مشہور ہے۔ افک کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ و افترا و بہتان کو۔ ان آیات کی تفسیر سمجھنے میں قصہ افک کے معلوم ہونے کو بڑا دخل ہے اسلئے مناسب ہے کہ پہلے مختصر طور پر یہ قصہ بیان کر دیا جاوے۔

قصہ اِفک بہتان صحیحین اور دوسری کتبِ حدیث میں یہ واقعہ غیر معمولی طویل تفصیل کیساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسکا مختصر بیان یہ ہے کہ جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق میں جسکو غزوہ مریسیع بھی کہا جاتا ہے سنہ ۶ ہجری میں تشریف لے گئے تو امہات المؤمنین میں سے حضرت صدیقہ عائشہؓ

ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا اونٹ جس پر اُن کا ہودج (پردہ دار محمل) ہوتا تھا اور چونکہ اُس وقت احکام پردہ کے نازل ہو چکے تھے تو معمول یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ اپنے ہودج میں سوار ہو جاتیں پھر لوگ اُس ہودج کو اُٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ غزوہ سے فراغت اور مدینہ طیبہ کی طرف واپسی میں ایک روز یہ قصہ پیش آیا کہ ایک منزل میں قافلہ ٹھہرا آخر شب میں کوچ سے کچھ پہلے اعلان کیا گیا کہ قافلہ روانہ ہونے والا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر تیار ہو جاویں۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو قضاء حاجت کی ضرورت تھی اُس سے فراغت کے لئے جنگل کی طرف چلی گئیں وہاں اتفاق سے اُن کا ہار ٹوٹ کر گر گیا اس کی تلاش میں اُن کو دیر لگ گئی۔ جب واپس اپنی جگہ پہنچیں تو دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے اُن کے اونٹ کا قصہ یہ ہوا کہ جب کوچ ہونے لگا تو عادت کے مطابق حضرت صدیقہ عائشہؓ کا ہودج یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا گیا کہ حضرت صدیقہؓ اس میں موجود ہیں اُٹھاتے وقت بھی کچھ شبہ اسلئے نہ ہوا کہ اُس وقت حضرت صدیقہؓ کی عمر کم اور بدن میں نحیف تھیں کسی کو یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے چنانچہ اونٹ کو ہانک دیا گیا۔ حضرت صدیقہؓ نے اپنی جگہ واپس آ کر قافلہ کو نہ پایا تو بڑی دانشمندی اور وقار و استقلال سے کام لیا کہ قافلہ کے پیچھے دوڑنے یا ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بجائے اپنی جگہ چادر اوڑھ کر بیٹھ رہیں اور خیال کیا کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور رفقاء کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو مجھے تلاش کرنے کیلئے یہاں پہنچیں گے، اگر میں ادھر اُدھر کہیں اور گئی تو اُن کو تلاش میں مشکل ہوگی اسلئے اپنی جگہ پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ رہیں۔ آخر رات کا وقت تھا نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ کر آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف قدرت نے یہ سامان کیا کہ حضرت صفوان بن معطل صحابیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خدمت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں اور قافلہ روانہ ہونے کے بعد گری پڑی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اسکو اُٹھا کر محفوظ کر لیں۔ وہ صبح کے وقت اس جگہ پہنچے، ابھی روشنی پوری نہ تھی اتنا دیکھا کہ کوئی آدمی پڑا سو رہا ہے۔ قریب آئے تو حضرت صدیقہ عائشہؓ کو پہچان لیا کیونکہ انھوں نے پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے اُن کو دیکھا تھا۔ پہچاننے کے بعد انتہائی افسوس کے ساتھ اُن کی زبان سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ نکلا، یہ کلمہ صدیقہؓ کے کان میں پڑا تو آنکھ کھل گئی اور چہرہ ڈھانپ لیا۔ حضرت صفوانؓ نے اپنا اونٹ قریب لا کر بٹھا دیا حضرت صدیقہؓ اس پر سوار ہو گئیں اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلنے لگے یہاں تک کہ قافلہ میں مل گئے۔

عبداللہ بن اُبی بڑا خبیث منافق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اسکو ایک بات ہاتھ لگ گئی اور کم بخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی سنی سنائی اسکا تذکرہ کرنے لگے۔ جیسے حضرت حسانؓ، حضرت مسطحؓ مردوں میں سے اور حضرت حمنہؓ عورتوں میں سے

تفسیر دُرِّ منثور میں بحوالہ ابنِ مردویہ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اعانہ ای عبداللّٰہ ابن اُبَی حسان و مسطح و حمنۃ۔

جب اس منافق کے بہتان کا چرچا ہوا تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ صدیقہ عائشہؓ کو تو انتہائی صدمہ پہنچنا ظاہر ہی ہے عام مسلمانوں کو بھی اس سے سخت رنج و افسوس ہوا۔ ایک مہینہ تک یہی قصہ چلتا رہا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیقہؓ کی برارت اور بہتان باندھنے یا اسمیں شریک ہونے والوں کی مذمت میں مذکورہ بالاآیات نازل فرمادیں جن کی تفسیر آگے آتی ہے۔ قرآنی ضابطہ کے مطابق جسکا ذکر ابھی حدِ قذف کے تحت میں آچکا ہے تہمت لگانے والوں سے شہادت کا مطالبہ کیا گیا وہ تو ایک بالکل ہی بے بنیاد خبر تھی گواہ کہاں سے آتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والوں پر شرعی ضابطہ کے مطابق حدِ قذف جاری کی، ہر ایک کو اسی اسی کوڑے لگائے۔ بزار اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اسوقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تین مسلمانوں پر حدِ قذف جاری فرمائی مِسطَحؓ حَمنۃؓ حسانؓ۔ اور طبرانی نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر عبداللہ بن اُبَی منافق جس نے اصل تہمت گھڑی تھی اس پر دوہری حد جاری فرمائی پھر مؤمنین نے توبہ کرلی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے (بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو! تم جو صدیقہ عائشہؓ کے متعلق جھوٹی تہمت کی شہرت سے رنجیدہ ہوا ہو اسمیں خود صدیقہؓ بھی داخل ہیں تو تم زیادہ غم نہ کرو کیونکہ) جن لوگوں نے یہ طوفان (حضرت صدیقہ عائشہؓ کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمہارے میں کا ایک (چھوٹا سا) گروہ ہے (کیونکہ تہمت لگانے والے کل چار تھے، ایک بالذات اور جھوٹی تہمت گھڑنے والا یعنی عبداللہ ابن اُبَی منافق، اور تین بالواسطہ جو اسکی خبر سے متاثر ہوگئے یعنی حسان، مِسطَحؓ، حَمنۃؓ جو مؤمن مخلص تھے ان سب کو قرآن نے (منکم) میں داخل کیا یعنی مسلمانوں میں، حالانکہ عبداللہ ابن اُبَی منافق تھا اسکی وجہ انکا ظاہری دعوائے اسلام تھا۔ مطلب آیت کا تسلی دینا ہے کہ زیادہ غم نہ کرو، اوّل تو خبر جھوٹی، پھر ناقل بھی کل چار ہی آدمی، اور زیادہ آدمی تو اسکے مخالف ہی ہیں پس عُرفاً بھی یہ موجب زیادہ غم کا نہ ہونا چاہیئے، آگے ایک اور طریقہ پر تسلی ہے کہ) تم اس (بہتان بندی) کو اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو (گو ظاہر میں غم کی بات ہے مگر واقع میں اس سے تمہارا ضرر نہیں) بلکہ یہ (باعتبار انجام کے) تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ اس غم سے تم کو صبر کا ثواب ملا، تمہارے درجے

بڑھے۔ خصوصاً متہم حضرات کی براءۃ کے لئے نصِ قطعی آئی اور آئندہ بھی مسلمانوں کے حق میں خیر ہے کہ ایسے مصیبت زدہ اس واقعہ سے تسلی حاصل کیا کریں گے پس تمہارا انکو کوئی ضرر نہ ہوا البتہ ان چرچا کرنے والوں کا ضرر ہوا کہ) ان میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا گناہ ہوا (مثلاً زبان سے کہنے والوں کو زیادہ گناہ اور سُن کر خاموش رہ جانے والوں کو یا دل سے بدگمانی کرنے والوں کو اس کے موافق گناہ ہوا) اور ان میں جس نے اس (بہتان) میں سب سے بڑا حصہ لیا (کہ اسکو اختراع کیا مُراد اس سے عبداللہ بن اُبی منافق ہے) اس کو (سب سے بڑھ کر) سخت سزا ہوگی (مراد اس سے جہنم ہے جس کا استحقاق پہلے سے بوجہ کفر و نفاق و عداوتِ رسُول کے بھی تھا اب اور زیادہ سزا کا مستحق ہوگیا، یہ تو غم زدوں کے ضرر کی نفی اور بہتان باندھنے والوں کے ضرر کا اثبات تھا آگے انہیں جو مؤمنین تھے اُن کو ناصحانہ ملامت ہے کہ) جب تم لوگوں نے یہ بات سُنی تھی تو مسلمان مردوں (جن میں حسانؓ و مسطحؓ بھی آگئے) اور مسلمان عورتوں نے (جن میں حمنہؓ بھی آگئیں) اپنے آپس والوں کیساتھ (یعنی حضرت صدیقہؓ اور ان صحابی کے ساتھ دل سے) گمان نیک کیوں نہ کیا اور (زبان سے) یہ کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے جیسا کہ درمنثور میں ابو ایوبؓ اور ان کی زوجہ کا یہی قول مروی ہے اس میں بہتان باندھنے والوں کے ساتھ وہ بھی شامل ہیں جو سنکر خاموش رہے یا شک میں پڑگئے ان سب پر بھی ملامت ہے جن میں عام مؤمنین و مؤمنات بھی داخل ہوگئے۔ آگے اس تہمت کو رد کرنے اور نیک گمان رکھنے کے وجوب کی وجہ ارشاد ہے کہ) یہ (بہتان لگانے والے) لوگ اس (اپنے قول) پر چار گواہ کیوں نہ لائے (جو کہ اثبات زنا کے لئے شرط ہے) سو جس حالت میں یہ لوگ گواہ (موافق قاعدہ کے) نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک (جو قانون ہے اس کے اعتبار سے) یہ جھوٹے ہیں (آگے بہتان لگانے والوں میں جو مؤمن تھے اُن پر بھی رحمت کا ذکر ہے) اور اگر (اے حسانؓ و مسطحؓ و حمنہؓ) تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا دُنیا میں (بھی کہ توبہ کی مہلت دی) اور آخرت میں (بھی کہ توبہ کی توفیق دی اور اس کو قبول بھی کرلیا اگر یہ نہ ہوتا) تو جس شغل میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا (جیسا عبداللہ بن اُبی کو بوجہ عدم توبہ کے ہوگا گو اسوقت مہلت دُنیا میں اسکو بھی دیدی گئی مگر مجموعہ دارین میں رحمت نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوگیا کہ صحابہؓ مقبول التوبہ اور پاک ہو کر آخرت میں مرحوم ہیں اور علیکم میں خطاب مؤمنین کو ہونے کا قرینہ اولاً اوپر کی آیت میں یہ ارشاد ہے ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ ثانیاً فِي الْآخِرَةِ فرمانا کہ منافق تو آخرت میں جہنم کے درکِ اسفل یعنی نچلے طبقہ کا مستحق ہے وہ یقیناً مرحوم فی الآخرۃ نہیں ہوسکتا۔ ثالثاً آگے يَعِظُكُمُ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ میں طبرانی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے یرید مسطحاً وحمنۃ وحسّاناً۔ کذا فی الدر المنثور یعنی لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ کے مخاطب یہ تین مومن ہیں۔ یعنی

مسطحؓ، حمنہؓ، حسانؓ۔ آگے اسکا بیان ہے کہ مؤمنین پر اگر اللہ کا خاص فضل نہ ہوتا کہ انکو توبہ کی توفیق دی اور توبہ بھی کرلی تو جو کام اُنھوں نے کیا تھا وہ اپنی ذات میں عذاب عظیم کا موجب تھا فرمایا) جبکہ تم اس (جھوٹ بات) کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو (کسی دلیل سے) مطلق خبر نہیں (اور ایسی خبر کے ناقل کا کاذب ہونا فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ میں بیان ہو چکا ہے) اور تم اسکو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات (یعنی موجب گناہ عظیم) تھی (اول تو کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت خود بڑی معصیت ہے پھر وہ بھی کون، ازواج مطہرات میں سے کہ اُن پر تہمت لگانا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذار کا سبب بنا۔ پس اسمیں بہت سے اسباب معصیت کے جمع تھے) اور تم نے جب اس (بات) کو (اول) سنا تھا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ایسی بات منہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ یہ تو بڑا بہتان ہے (جیسا کہ بعض صحابہ نے اسی طرح کہا تھا جیسا کہ سعد بن معاذ و زید بن حارثہ و ابی ایوب سے اسی طرح کا قول منقول ہے اور زائد کی نفی نہیں ہے ممکن ہے اور بہتوں نے کہا ہو۔ مطلب یہ کہ قاذفین اور ساکتین سب کو یہی کہنا چاہئے تھا۔ یہاں تک تو ماضی پر ملامت تھی اب مستقبل کے لئے نصیحت ہے جو کہ اصل مقصود ہے ملامت کا پس ارشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت مت کرنا اگر تم ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے (جسمیں نصیحت اور حد قذف اور قبول توبہ جو اوپر مذکور ہو چکے ہیں سب داخل ہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (تمہارے دل کی ندامت کا حال بھی اس کو معلوم ہے اس لئے توبہ قبول کرلی اور سیاست کی حکمت بھی خوب جانتا ہے اس لئے تمہیں سیاستہ دنیا میں سزا دی گئی ہذا فسرہ ابن عباسؓ رواہ فی الدر۔ یہاں تک نزول براءۃ سے قبل تہمت کا تذکرہ کرنے والوں کا ذکر تھا۔ آگے ان کا ذکر ہے جو قرآن میں نزول براءۃ کے بعد بھی باز نہ آویں اور ظاہر ہے ایسا شخص بے ایمان ہی ہوگا پس ارشاد ہے) جو لوگ (بعد نزول ان آیات کے بھی) چاہتے ہیں (یعنی اسکی کوشش عملی کرتے ہیں) کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو (یعنی یہ خبر شائع ہو کہ ان مسلمانوں میں بے حیائی کی بات ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ جو لوگ ان حضرات مقدسین کیطرف زنا کی نسبت کرتے ہیں) اُن کے لئے دنیا و آخرت میں سزائے دردناک (مقرر) ہے اور (اس امر پر سزا کا تعجب مت کرو کیونکہ) اللہ تعالیٰ جانتا ہے (کہ کون معصیت کس درجہ کی ہے) اور تم (اسکی حقیقت پوری) نہیں جانتے (رواہ فی الدر عن ابن عباسؓ، آگے ان لوگوں کو خطاب ہے جنھوں نے توبہ کرلی اور اس پر آخرت کے عذاب عظیم سے محفوظ ہو گئے) اور (اے تائبین) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے (جس نے تم کو توفیق توبہ کی دی) اور

یہ کہ اللہ بڑا شفیق بڑا رحیم ہے (جس نے تمہاری توبہ قبول کرلی) تو تم بھی (اس وعید سے) نہ بچتے (آگے مسلمانوں کو اپنی رحمت سے بلا تخصیص اس معصیت مذکورہ کے تمام معاصی سے احتراز رکھنے کا امر اور تزکیہ بالتوبہ کی تصریح ہے جو اہتمام کے واسطے بعنوانات مختلفہ مکرر ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی اس کے اغوار واضلال پر عمل مت کرو) اور جو شخص شیطان کے قدم بقدم چلتا ہے تو وہ (ہمیشہ ہر شخص کو) بے حیائی اور نامعقول ہی کام کرنے کو کہے گا (جیسا اس واقعۂ افک میں تم نے دیکھ لیا) اور (شیطان کے قدم بقدم چل چلنے کے اور گناہ سمیٹ لینے کے بعد اس کے وبال ومضرت سے جو کہ ثابت ہونے ہی کا تھا نجات دیدینا یہ بھی ہمارا ہی فضل تھا ورنہ) اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا (یا تو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوتی جیسا منافقین کو نہ ہوئی اور یا توبہ قبول نہ کی جاتی، کیونکہ ہم پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں) ولیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک صاف کردیتا ہے (اور بعد توبہ کے اپنے فضل سے وعدہ قبولیت کا بھی فرمالیا ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (پس تمہاری توبہ سن لی اور تمہاری ندامت جان لی اس لئے فضل فرما دیا۔ آگے اس کا بیان ہے کہ بعد نزول آیات براءۃ کے بعض صحابہ نے (جن میں ابوبکر صدیق بھی ہیں، رواہ البخاری اور دوسرے صحابہ بھی ہیں۔ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) شدت غیظ سے قسم کھالی کہ جن جن نے یہ چرچا کیا ہے جن میں حاجتمند بھی تھے ان کو اب سے کسی قسم کی مالی امداد نہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عفو وتقصیر اور امداد جاری کردینے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں) اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں (یعنی اس قسم کے مقتضیٰ پر قائم نہ رہیں بلکہ توڑ ڈالیں یہ مطلب ہے ورنہ قسم تو ہو ہی چکی تھی، یعنی ان صفات کا مقتضیٰ ہے امداد کرنا خصوصاً جس میں کوئی سبب امداد کرنے کا ہو جیسے حضرت مسطحؓ کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک کے رشتہ دار بھی ہیں اور مسکین اور مہاجر بھی ہیں، آگے ترغیب کے لئے فرماتے ہیں کہ) اور چاہئے کہ یہ معاف کردیں اور درگزر کریں کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کردے (سو تم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کردو) بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (سو تم کو بھی تخلق باخلاق الٰہیہ چاہئے آگے منافقین کی وعید کی تفصیل ہے جس کا اوپر اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ الخ میں اجمالاً ذکر تھا یعنی) جو لوگ (بعد نزول آیات کے بدکاری کی) تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاکدامن ہیں (اور) ایسی باتوں (کے کرنے اور اس کے ارادے) سے (بھی محض) بے خبر ہیں (اور) ایمان والیاں ہیں (اور جن کی براءۃ نص قرآن سے ثابت ہوچکی ہے اور جمع لانا اس لئے ہے کہ سب ازواج مطہرات کو شامل ہوجاوے کہ الطیبات سے سب کی طہارت ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو ایسی مطہرات کو متہم کریں کافر اور

منافق ہی ہو سکتے ہیں) ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ سے دارین میں بوجہ کفر کے دُور ہونگے) اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا جس روز ان کیخلاف ان کی زبانیں گواہی دیں گی اور اُن کے ہاتھ اور ان کے پاؤں بھی (گواہی دیں گے) ان کاموں کی جو کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے (مثلاً زبان کہے گی کہ اس نے میرے ذریعہ سے فلاں فلاں کفر کی بات بکی۔ اور ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ اس نے ترویج کفریات کے لئے یوں بھاگ دوڑ کی،) اس روز اللہ تعالیٰ اُن کو اُنکا واجبی بدلہ پُورا پُورا دیگا اور (اس روز ٹھیک ٹھیک) ان کو معلوم ہوگا کہ اللہ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا (اور) بات (کی حقیقت) کو کھول دینے والا ہے (یعنی اب تو بوجہ کفر کے اس بات کا اعتقاد اُنکو کما حقہٗ نہیں مگر قیامت کے روز معلوم ہو جاویگا اور یہ معلوم کر کے بالکل نجات سے مایوس ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے مناسب فیصلہ عذاب ابدی ہے یہ آیتیں غیر تائبین کے بارے میں ہیں جو نزول آیات برأت کے بعد بھی اعتقاد تہمت سے باز نہیں آئے۔ تائبین کو فَضْلُ اللّٰهِ وَرَحْمَتُهٗ میں مرحوم دارین فرمایا اور غیر تائبین کو لُعِنُوْا میں ملعون دارین فرمایا۔ تائبین کو لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں عذاب سے محفوظ بتلایا تھا اور غیر تائبین کو لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں نیز اس سے قبل وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ الخ میں مبتلا ئے عذاب بتلایا۔ تائبین کے لئے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں بشارت عفو و غفران یعنی ستر معصیت کی فرمائی تھی اور غیر تائبین کے لئے تَشْهَدُ اور يُوَفِّيْهِمُ میں وعید عدم عفو اور فضیحت کی فرمائی۔ تائبین کو مَا زَكٰى مِنْكُمْ الخ میں طاہر بتلایا تھا غیر تائبین کو اگلی آیت میں خبیث فرمایا جس میں مضمون برأت پر استدلال کر کے قصہ کو ختم فرمایا ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں) اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں (ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ ضروریا سے ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو چیز آپ کے لائق اور مناسب ہی دی گئی ہے اور وہ ستھری ہی چیزیں ہیں تو ضرور اس مقدمہ ضروریہ کے اعتبار سے آپ کی بی بی بھی ستھری ہیں اور اُن کے ستھرے ہونے سے اس تہمت خاص سے حضرت صفوانؓ کا منزہ ہونا بھی لازم آیا اسی لئے آگے فرماتے ہیں کہ) یہ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں ان (حضرات) کے لئے (آخرت میں) مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے۔

معارف و مسائل

حضرت صدیقہ عائشہؓ کے خصوصی فضائل کمالات اور قصہ افک کا کچھ بقیہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے آپ کے خلاف اپنی ساری ہی تدبیریں صرف کر ڈالیں اور آپؐ کو ایذا پہنچانے کی

جو جو صورتیں کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں وہ سبھی جمع کی گئیں۔ کفار کیطرف سے جو ایذائیں آپکو پہنچی ہیں اُن میں شاید یہ آخری سخت اور روحانی ایذا تھی کہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ عالم فاضل اور مقدس ترین اُم المومنین صدیقہ عائشہؓ پر اور اُن کے ساتھ حضرت صفوان بن معطلؓ جیسے مقدس صحابی پر عبداللہ ابن اُبَیّ منافق نے تہمت گھڑی منافقین نے اس کو رنگ دیئے اور پھیلایا۔ اسمیں سب سے زیادہ رنج دہ یہ بات ہوئی کہ چند سیدھے سادے مسلمان بھی اُن کی سازش سے متاثر ہوکر تہمت کے تذکرے کرنے لگے۔ اس بے اصل و بے دلیل ہوائی تہمت کی چند روز میں خود ہی حقیقت کھُل جاتی مگر اُم المومنینؓ کو اور خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اس تہمت سے رُوحانی ایذا پہنچی تھی حق تعالیٰ نے اُسکے ازالہ اور صدیقہؓ کی برات کے لئے وحی البنی کے کسی اشارہ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قرآن کے تقریباً دو رکوع ان کی برارت میں نازل فرمائے۔ اور جن لوگوں نے یہ تہمت گھڑی یا جن لوگوں نے اسکے تذکرے میں حصہ لیا ان سب پر عذاب دنیا و آخرت کی ایسی وعیدیں بیان فرمائیں کہ شاید اور کسی موقع پر ایسی وعیدیں نہیں آئیں۔

درحقیقت اس واقعہ افک نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی عفت و تقدس کے ساتھ اُن کی اعلیٰ عقل و فہم کے کمالات کو بھی روشن کر دیا۔ اسی لئے اس واقعہ میں جو آیات اُوپر مذکور ہوئیں اُنمیں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس حادثہ کو اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لئے خیر ہے اس سے بڑی خیر کیا ہوگی کہ اللہ تعالےٰ نے دس آیات میں اُن کی پاکی اور نزاہت کی شہادت دی جو قیامت تک تلاوت کی جائے گی۔ خود صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنی جگہ یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالےٰ بذریعہ وحی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر میری صفائی اور برارت ظاہر فرما دیں گے مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں قرآن کی آیات نازل ہو جاویں گی جو ہمیشہ پڑھی جاویں گی۔ اس جگہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل جان لینا بھی آیات کے سمجھنے میں معین ہوگا اسلئے اسکو مختصراً لکھا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد حضرت صدیقہؓ اپنے گھریلو کاموں میں مشغول ہوگئیں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ منافقین نے اُن کے بارے میں کیا خبریں اُڑائی ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت صدیقہؓ کا بیان یہ ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد کچھ میری طبیعت خراب ہوگئی اور سب سے بڑی وجہ طبیعت خراب ہونے کی یہ ہوگئی کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم اپنے ساتھ نہ دیکھتی تھی جو ہمیشہ سے معمول تھا بلکہ اس عرصہ میں آپؐ کا معاملہ یہ رہا کہ گھر میں تشریف لاتے اور سلام کرتے پھر پُوچھ لیتے کیا حال ہے اور واپس تشریف لیجاتے تھے۔ مجھے چونکہ اسکی کچھ خبر نہ تھی کہ میرے بارے میں کیا خبر مشہور کیجا رہی ہے اس لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

کے اس طرز عمل کا راز مجھ پر نہ کھلتا تھا۔ میں اسی غم میں گھُلنے لگی۔ ایک روز اپنی کمزوری کی وجہ سے مسطحؓ صحابی کی والدہ اُمّ مسطحؓ کو ساتھ لیکر میں نے قضاء حاجت کے لئے باہر جانیکا ارادہ کیا کیونکہ اُسوقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا۔ جب میں قضاء حاجت سے فارغ ہو کر گھر کیطرف آنے لگی تو اُمّ مسطحؓ کا پاؤں اُن کی بڑی چادر میں الجھا اور یہ گر پڑیں۔ اسوقت انکی زبان سے یہ کلمہ نکلا تَعِسَ مِسْطَحٌ یہ ایسا کلمہ ہے جو عرب میں بددُعا کے لئے استعمال ہوتا ہے اسمیں ماں کی زبان سے اپنے بیٹے مسطح کے لئے بددُعا کا کلمہ سُن کر صدیقہ عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ ان سے فرمایا کہ یہ بہت بُری بات ہے تم ایک نیک آدمی کو بُرا کہتی ہو جو غزوۂ بدر کا شریک تھا یعنی ان کا بیٹا مسطحؓ۔ اس پر اُمّ مسطحؓ نے تعجب سے کہا کہ بیٹی کیا تم کو خبر نہیں کہ مسطحؓ میرا بیٹا کیا کہتا پھرتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے تب اُن کی والدہ نے مجھے یہ سارا واقعہ اہلِ افک کی چلائی ہوئی تہمت کا اور مسطح کا اسمیں شریک ہونا بیان کیا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُنکر میرا مرض دوگنا ہو گیا۔ جب میں گھر میں واپس آئی اور حسبِ معمول رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے سلام کیا اور مزاج پُرسی فرمائی تو صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ آپؐ نے اجازت دیدی۔ منشاء یہ تھا کہ والدین سے اس معاملہ کی تحقیق کریں۔ میں نے جا کر والدہ سے پُوچھا، اُنھوں نے تسلی دی کہ تم جیسی عورتوں کے دشمن ہوا کرتے ہیں اور ایسی چیزیں مشہور کیا کرتے ہیں تم اسکے غم میں نہ پڑو خود بخود معاملہ صاف ہو جاویگا۔ میں نے کہا، سُبحان اللہ! لوگوں میں اسکا چرچا ہو چکا میں اس پر کیسے صبر کروں۔ میں ساری رات روتی رہی، نہ میرا آنسو تھما نہ آنکھ لگی۔ دوسری طرف رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اس خبر کے پھیلنے سے سخت غمگین تھے اور اس عرصہ میں اس معاملے کے متعلق کوئی وحی بھی آپ پر نہ آئی تھی اسلئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اُسامہ بن زیدؓ جو دونوں گھر کے ہی آدمی تھے ان سے مشورہ لیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے تو کھُل کر عرض کیا کہ جہانتک ہمارا علم ہے ہمیں عائشہؓ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں۔ انکی کوئی بات ایسی نہیں جس سے بدگمانی کی راہ پیدا ہو۔ آپ ان افواہوں کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (آپؐ کو غم واضطراب سے بچانے کے لئے) یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کچھ تنگی نہیں فرمائی اگر افواہوں کی بناء پر عائشہؓ کیطرف سے کچھ تکدرِ طبعی ہو گیا ہے تو عورتیں اور بہت ہیں۔ اور آپ کا یہ تکدر اسطرح بھی رفع ہو سکتا ہے کہ بریرہؓ جو صدیقہ عائشہؓ کی کنیز ہیں اُن سے انکے حالات کی تحقیق فرمالیجئے۔ چنانچہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے پُوچھ گچھ فرمائی بریرہؓ نے عرض کیا کہ اور تو کوئی بات عیب کی مجھے ان میں نظر نہیں آئی بجز اسکے کہ نوعمر لڑکی ہیں بعض اوقات آٹا گوندھ کر رکھدیتی ہیں خود سو جاتی ہیں بکری آکر آٹا

کہا جاتی ہے (اسکے بعد حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ دینا اور برسرِ منبر تہمت گھڑنے والوں اور افواہ پھیلانے والوں کی شکایت کا ذکر فرمانا اور طویل قصہ مذکور ہے۔ آگے کا مختصر قصہ یہ ہے کہ) صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ سارا دن پھر دوسری رات بھی مسلسل روتے ہوئے گزر گئی میرے والدین بھی میرے پاس آگئے تھے وہ ڈر رہے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔ میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے اور جب سے یہ قصہ چلا تھا اس سے پہلے آپ میرے پاس آکر نہ بیٹھے تھے پھر آپ نے ایک مختصر خطبہ شہادت پڑھا اور فرمایا اے عائشہ مجھے تمھارے بارمیں یہ باتیں پہنچی ہیں اگر تم بری ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمھیں بری کر دینگے (یعنی برات کا اظہار بذریعہ وحی فرمادینگے) اور اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اللہ سے توبہ استغفار کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کرکے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرمالیتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا کلام پورا فرمالیا تو میرے آنسو بالکل خشک ہوگئے۔ میری آنکھوں میں ایک قطرہ نہ رہا۔ میں نے اپنے والد ابوبکر صدیق رضؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ ابوبکر رضؓ نے عذر کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ جواب دیجئے انھوں نے بھی عذر کردیا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب مجبور ہوکر مجھے ہی بولنا پڑا، میں ایک کم عمر لڑکی تھی اب تک قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی تھی۔ اسوقت اس رنج وغم اور انتہائی صدمہ کی حالت میں جبکہ اچھے اچھے عقلاء کو بھی کوئی معقول کلام کرنا آسان نہیں ہوتا حضرت صدیقہ رضؓ نے جو کچھ فرمایا وہ ایک عجیب وغریب عاقلانہ فاضلانہ کلام ہے اسکے الفاظ بعینہ لکھے جاتے ہیں۔

واللہ لقد عرفت لقد سمعتم ھذا الحدیث حتیٰ استقر فی انفسکم وصدقتم بہٖ ولئن قلت لکم انی بریئۃ واللہ یعلم انی بریئۃ لا تصدقونی ولئن اعترفت لکم بامرٍ واللہ یعلم انی منہ بریئۃ لتصدقونی واللہ لا اجد لی ولکم مثلا الا کما قال ابو یوسف فصبرٌ جمیلٌ واللہ المستعان علیٰ ما تصفون

بخدا مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ نے اس بات کو سنا اور سنتے رہے یہانتک کہ آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے اسکی (عملاً) تصدیق کردی۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں جیساکہ اللہ جانتا ہے کہ واقع میں بری ہوں تو آپ میری تصدیق نہ کرینگے اور اگر میں ایسے کام کا اعتراف کرلوں جس سے میرا بری ہونا اللہ تعالیٰ جانتا ہے تو آپ میری بات مان لیں گے۔ واللہ اب میں اپنے اور آپکے معاملہ کی کوئی مثال بجز اسکے نہیں پاتی جو یوسف علیہ السلام کے والد یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی غلط باتیں سنکر فرمائی تھی کہ میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور اللہ سے اس معاملہ میں مدد طلب کرتا ہوں جو تم بیان کر رہے ہو۔

صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اتنی بات کر کے میں الگ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی اور فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ جیسا کہ میں فی الواقع بری ہوں اللہ تعالیٰ میری برارت کا اظہار بذریعہ وحی ضرور فرما دیں گے لیکن یہ وہم و خیال بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں قرآن کی آیات نازل ہونگی جو ہمیشہ تلاوت کی جاویگی کیونکہ میں اپنا مقام اس سے بہت کم محسوس کرتی تھی۔ ہاں یہ خیال تھا کہ غالباً آپ کو خواب میں میری برارت ظاہر کر دیجاوے گی۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابھی اس مجلس سے ابھی نہیں اُٹھے تھے اور گھر والوں میں بھی کوئی نہیں اُٹھا تھا کہ آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی جس سے سخت سردی کے زمانے میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ پھوٹنے لگتا تھا جب یہ کیفیت رفع ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہنستے ہوئے اُٹھے اور سب سے پہلا کلمہ جو فرمایا وہ یہ تھا ابشری یا عائشۃ اما اللہ فقد ابرأک یعنی اے عائشہؓ خوشخبری سنو اللہ تعالیٰ نے تو تمہیں بری کر دیا۔ میری والدہ نے کہا کہ کھڑی ہو جاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو میں نے کہا کہ نہ میں اس معاملہ میں اللہ کے سوا کسی کا احسان مانتی ہوں نہ کھڑی ہوں گی میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ اُسی نے مجھے بری فرمایا۔

حضرت صدیقہؓ کی چند خصوصیات امام بغویؒ نے انہیں آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو ان کے علاوہ کسی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہوئیں اور صدیقہ عائشہؓ بھی (بطور تحدیث بالنعمۃ) ان چیزوں کو فخر کے ساتھ بیان فرمایا کرتی تھیں ایک یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبرئیل امین ایک ریشمی کپڑے میں میری تصویر لیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ تمہاری زوجہ ہے (رواہ الترمذی عن عائشۃؓ) اور بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امینؑ اپنی ہتھیلی میں یہ صورت لیکر تشریف لائے تھے۔

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوا کسی کنواری لڑکی سے نکاح نہیں کیا۔ **تیسری** یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات انکی گود میں ہوئی۔ **چوتھی** یہ کہ بیتِ عائشہؓ ہی میں آپ مدفون ہوئے۔ **پانچویں** یہ کہ آپ پر اُسوقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جبکہ آپ حضرت صدیقہؓ کے ساتھ ایک لحاف میں ہوتے تھے دوسری کسی بی بی کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ **چھٹی** یہ کہ آسمان سے اُن کی برارت نازل ہوئی۔ **ساتویں** یہ کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں اور صدیقہ ہیں اور اُن میں سے ہیں جن سے دُنیا ہی میں مغفرت کا اور رزقِ کریم کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرما لیا ہے (مظہری)

حضرت صدیقہؓ کی فقیہانہ اور عالمانہ تحقیقات اور فاضلانہ تقریر کو دیکھکر حضرت موسیٰ بن طلحہؓ نے فرمایا کہ میں نے صدیقہ عائشہؓ سے زیادہ فصیح و بلیغ نہیں دیکھا۔ (رواہ الترمذی)

تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو گویائی دیکر اُس کی شہادت سے اُن کی برات ظاہر فرمائی اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُنکے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے اُن کو بَری کیا اور حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دس آیات نازل کر کے اُن کی برات کا اعلان کیا، جس نے اُن کے فضل و عزت کو اور بڑھا دیا۔

آیاتِ مذکورہ کی اجمالی تفسیر خلاصہ تفسیر کے عنوان میں آچکی ہے، اب آیات کے خاص خاص جملوں سے متعلق کچھ مباحث ہیں وہ دیکھئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، اِفک کے اصلی لغوی معنے پلٹ دینے اور بدل دینے کے ہیں۔ بدترین قسم کا جھوٹ جو حق کو باطل سے اور باطل کو حق سے بدلدے پاکباز متقی کو فاسق، فاسق کو متقی پرہیزگار بنا دے اس جھوٹ کو بھی افک کہتے ہیں۔ عُصْبَة کے معنے جماعت کے ہیں جو دس سے چالیس تک ہو، اس سے کم و بیش کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے مِنْکُمْ سے مُراد مؤمنین ہیں۔ اس تہمت کا اصل گھڑنے والا اگرچہ مسلمان نہ تھا بلکہ منافق عبداللہ ابن اُبَیّ تھا جو مؤمنین میں داخل نہیں مگر منافقین جو دعویٰ اسلام کا کرتے تھے اُن پر بھی ظاہری احکام مؤمنین کے جاری ہوتے تھے اسلئے مِنکُمْ کے لفظ میں اسکو بھی شامل کر لیا گیا۔ مسلمانوں میں سے دو مرد اور ایک عورت اسمیں مبتلا ہوئے جن پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آیات نازل ہونے کے بعد حدِ قذف جاری فرمائی۔ کما مرّ سابقاً۔ مگر مؤمنین سب تائب ہوگئے اور اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اُنہیں سے حضرت حسانؓ اور مسطحؓ دونوں شرکائے بدر میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مغفرت کا اعلان فرما دیا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے سامنے کوئی حضرت حسانؓ کی بُرائی کرتا تو وہ پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ یہی اُن دو مردوں میں شامل تھے جن پر حدِ قذف لگائی گئی تھی اور صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ حسانؓ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف سے کفار کا شاعرانہ مقابلہ خوب کیا ہے اسلئے ان کو بُرا نہیں کہنا چاہئے، اور وہ جب صدیقہ عائشہؓ کے پاس حاضر ہوتے تو اُن کو تعظیم تکریم کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ (مظہری وغیرہ)

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ، یہ خطاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صدیقہ عائشہؓ اور صفوانؓ اور تمام مؤمنین کو ہے جن کو اس افواہ کی اشاعت سے صدمہ پہنچا۔ اور معنے یہ ہیں کہ اس واقعہ کو آپ بُرا نہ سمجھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں برات نازل فرما کر ان کا اعزاز اور بڑھا دیا اور جن لوگوں نے یہ حرکات کی تھیں اُن کی وعید شدید نازل فرما دی جو قیامت تک محرابوں میں پڑھی جائے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ، یعنی جن لوگوں نے اس بہتان میں جتنا حصہ لیا اُسی مقدار سے اسکا گناہ لکھا گیا ہے اور اُسی تناسب سے اُس کو عذاب ہوگا، جس نے یہ خبر گھڑی اور چلتی کی جسکا ذکر آگے آتا ہے وہ سب سے زیادہ عذاب کا مستحق ہے، جس نے خبر سُنکر تائید کی وہ اُس سے کم، جس نے سُنکر سکوت کیا وہ اُس سے کم۔

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ، لفظ کِبر بکسر الکاف کے معنے بڑے کے ہیں مُراد یہ ہے جس نے اس تہمت میں بڑا کام کیا یعنی اسکو گھڑا اور چلتا کیا اسکے لئے عذاب عظیم ہے، مُراد اس سے عبداللہ بن اُبی منافق ہے (رواہ البغوی وغیرہ)

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس تہمت کی خبر سُنی تھی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اپنے بارے میں یعنی اپنے مسلمان بھائی بہن کے بارے میں نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے۔ اس آیت میں کئی چیزیں قابل غور ہیں اوّل یہ کہ بِاَنْفُسِهِمْ کے لفظ سے قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو بدنام و رُسوا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو رُسوا کرتا ہے کیونکہ اسلام کے رشتہ نے سب کو ایک بنا دیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے تمام مواقع میں یہ اشارہ استعمال فرمایا ہے جیسا ایک جگہ فرمایا وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی عیب نہ لگاؤ اپنے آپ کو۔ مُراد اس سے یہ ہے کہ کسی بھائی مسلمان مرد یا عورت کو۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ، اپنے آپ کو قتل نہ کرو مُراد یہی ہے کہ کسی بھائی مسلمان کو قتل نہ کرو۔ تیسری جگہ فرمایا وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ، یعنی نہ نکالو اپنے آپ کو اپنے گھروں سے۔ یہاں بھی کسی مسلمان بھائی کو اسکے گھر سے نکالنا مُراد ہے۔ چوتھی جگہ فرمایا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ ، یعنی اپنے آپکو سلام کرو۔ مُراد وہی بھائی مسلمان کو سلام کرنا ہے۔ یہ سب آیات قرآن یہ ضمنی ہدایت دیتی ہیں کہ ایک مسلمان جو دوسرے کسی بھی مسلمان پر عیب لگاتا یا اسکو ایذا و نقصان پہنچاتا ہے حقیقت کے اعتبار سے خود اپنے کو عیب دار کرتا ہے اور خود نقصان و تکلیف اُٹھاتا ہے کیونکہ اس کا انجام پُوری قوم کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے بقول سعدی ؎

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ٭ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قرآن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب مسلمان اُبھرے تو پوری قوم کے ساتھ اُبھرے، اُن کا ہر فرد اُبھرا۔ اور اسی کے چھوڑنے کا نتیجہ آج آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ سب گرے اور ہر فرد گرا۔

دوسری بات اس آیت میں یہ قابل نظر ہے کہ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَنْتُمْ بِاَنْفُسِكُمْ خَیْرًا بصیغہ خطاب کہا جاتا جیسا کہ شروع میں سمعتموہ بصیغہ خطاب آیا ہے مگر

قرآن کریم نے اس مختصر جملے کو چھوڑ کر اس جگہ طرز بدلا کہ صیغہ خطاب یعنی ظَنَنْتُمْ کے بجائے ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ فرمایا۔ اسمیں ہلکا سا اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ یہ فعل جن لوگوں سے سرزد ہوا وہ اس فعل کی حد تک مؤمنون کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے حسن ظن قائم رکھتا۔

تیسری بات یہ قابل نظر ہے کہ اس آیت کے آخری جملے وَقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تقاضا ایمان کا یہ تھا کہ مسلمان اس خبر کو سُنتے ہی کہدیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کے بارے میں جب تک کسی گناہ یا عیب کا علم کسی دلیل شرعی سے نہ ہو جائے اُسوقت تک اُس کے ساتھ نیک گمان رکھنا اور بلا کسی دلیل کے عیب و گناہ کی بات اُس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دینا عین تقاضائے ایمان ہے۔

مسئلہ ۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اچھا گمان رکھنا واجب ہے جب تک کسی دلیل شرعی سے اسکے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ اور جو شخص بلا دلیل شرعی کے اُس پر الزام لگاتا ہے اُس کی بات کو رد کرنا اور جھوٹا قرار دینا بھی واجب ہے کیونکہ وہ محض ایک غیبت اور مسلمان کو بلا وجہ رُسوا کرنا ہے (مظہری)

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ، اس آیت کے پہلے جملہ میں تو اسکی تلقین ہے کہ ایسی خبر مشہور کرنیوالوں کے بارہ میں مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ اُن کی بات کو چلتا کرنے کے بجائے اُن سے مطالبہ دلیل کا کرتے اور چونکہ تہمت زنا کے معاملے میں دلیل شرعی چار گواہوں کے بغیر قائم نہیں ہوتی اسلئے اُن سے مطالبہ یہ کرنا چاہئے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُس پر چار گواہ پیش کرو یا زبان بند کرو۔ دوسرے جملے میں فرمایا کہ جب وہ چار گواہ نہیں لاسکے تو اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص نے اپنی آنکھ سے ایک واقعہ دیکھا مگر اُسکو اس پر دوسرے گواہ نہیں ملے تو اگر یہ شخص اپنے چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے خصوصاً اللہ کے نزدیک جھوٹا کہنا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب واقعات کے حقائق معلوم ہیں اور یہ واقعہ وجود میں آنا بھی معلوم ہے تو وہ عند اللہ جھوٹ بولنے والا کیسے قرار پایا۔ اس کے دو جواب ہیں اول یہ کہ یہاں عند اللہ سے مُراد حکم اللہ اور قانون الٰہی ہے یعنی یہ شخص قانونِ الٰہی اور حکمِ خداوندی کی رو سے جھوٹا قرار دیا جائیگا اور اسپر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ حکمِ ربانی یہ تھا کہ جب چار گواہ نہ ہوں تو واقعہ دیکھنے کے باوجود اس کو بیان نہ کرو اور جو بغیر چار گواہوں کے بیان کرے گا وہ

قانوناً اور حکماً جھوٹا قرار پاکر سزا پائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ کوئی کام فضول نہ کرے جسکا کوئی فائدہ نتیجہ نہ ہو خصوصاً ایسا کام جسمیں دوسرے مسلمان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہو تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی عیب و گناہ کی شہادت صرف اس نیت سے دے سکتا ہے کہ جرم و گناہ کا انسداد مقصود ہو کسی کو رُسوا کرنا یا ایذا دینا مقصود نہ ہو۔ تو جس شخص نے چار گواہوں کے بغیر اس قسم کی شہادت زبان سے نکالی گویا اُسکا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کلام اصلاح خلق اور معاشرہ کو بُرائی سے بچانے اور انسداد جرائم کی نیت سے کر رہا ہوں۔ مگر جب شریعت کا قانون اسکو معلوم ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ایسی شہادت دینے سے نہ اُس شخص پر کوئی حد و سزا جاری ہوگی اور نہ ثبوت بہم پہنچے گا بلکہ اُلٹی جھوٹ بولنے کی سزا کا مستحق ہو جاؤنگا تو اسوقت وہ عنداللہ اپنی اس نیت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ میں اصلاحِ خلق اور انسداد جرائم کی نیت سے یہ شہادت دے رہا ہوں کیونکہ شرعی ضابطہ کے مطابق شہادت نہونے کی صورت میں یہ نیت ہو ہی نہیں سکتی۔ **(مظہری)**

ایک اہم اور ضروری تنبیہ | مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے حُسن ظن رکھنے کی ہدایت اور اسکے خلاف بے دلیل باتوں کی تردید کو واجب قرار دیا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے اس خبر کے غلط ہونے پر یقین کیوں نہ فرمایا اور اس خبر کی تردید کیوں نہ کر دی اور ایک مہینہ تک تردد کی حالت میں کیوں رہے یہانتک کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو توبہ کر لینا چاہیئے (کما رواہ البخاری)

وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حُسن ظن رکھنے کا جو حکم ہے وہ اس تردد کے منافی نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ کیونکہ آپ نے اس خبر کی نہ تصدیق فرمائی اور نہ اسکے مقتضے پر کوئی عمل فرمایا نہ اسکا چرچا کرنا پسند فرمایا بلکہ صحابہ کرام کے مجمع میں یہی فرمایا کہ ما علمت علی اهلی الا خیرا۔ رواہ البخاری۔ یعنی میں اپنی اہلیہ کے بارہ میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ سب انھیں آیاتِ مذکورہ کے مقتضیٰ پر عمل اور حُسن ظن رکھنے کے شواہد ہیں۔ البتہ قطعی اور یقینی علم جس سے طبعی تردد بھی رفع ہو جاوے وہ اُسوقت ہوا جب آیات برات نازل ہوگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دل میں کوئی شک و تردد پیدا ہو جانا اور احتیاطی تدابیر استعمال کرنا جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حُسنِ ظن بالمؤمنین کے منافی نہیں تھا جبکہ اُسکے مقتضیٰ پر کوئی عمل نہ کیا گیا ہو۔ جن مسلمانوں پر اس معاملے میں حد قذف کی سزا جاری کی گئی اور ان دو آیتوں میں ان پر عتاب کیا گیا اُنھوں نے اس خبر کے مقتضیٰ پر عمل کیا تھا کہ اُسکا چرچا کیا اور پھیلایا وہ نزولِ آیات سے پہلے بھی ناجائز و موجب سزا تھا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ - یہ آیت اُن مومنین کے بارے میں نازل ہوئی جو غلطی سے اس تہمت میں کسی قسم کی شرکت کر بیٹھے تھے پھر توبہ کرلی اور بعض پر سزا بھی جاری ہوئی۔ ان سب کو اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جو جرم تم سے سرزد ہوا وہ بہت بڑا جرم تھا اُس پر دُنیا میں بھی عذاب آسکتا تھا جیسے پچھلی قوموں کے مجرموں پر آیا ہے اور آخرت میں بھی اُسپر عذاب شدید ہوتا مگر اللہ تعالےٰ کا معاملہ تم مومنین کیساتھ فضل و رحمت کا ہے، دُنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اسلئے یہ عذاب تم سے ٹل گیا۔ دُنیا میں اللہ کے فضل و رحمت کے مظاہر یہ ہوئے کہ اوّل اسلام و ایمان کی توفیق بخشی پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا فرمایا جو کہ نزولِ عذاب سے مانع ہے۔ اور پھر جو گناہ ہو گیا تھا اُس سے سچی توبہ کی توفیق بخشی پھر اُس توبہ کو قبول فرمالیا۔ اور آخرت میں اللہ کے فضل و رحمت کا اثر یہ ہے کہ تم سے عفو و درگزر اور مغفرت کا وعدہ فرمالیا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ، تَلَقِّی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بات پوچھے اور نقل کرے، یہاں بات کو سُنکر بے دلیل اور بلا تحقیق آگے چلتی کر دینا مُراد ہے۔

وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ، یعنی تم تو اس کو معمولی بات خیال کرتے تھے کہ ہم نے جیسا سُنا ویسا دوسرے سے نقل کر دیا مگر وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا کہ بے دلیل اور بے تحقیق ایسی بات کو چلتا کر دیا جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ایذا ہو، اُس کی رُسوائی ہو اور اُسکے لئے زندگی دوبھر ہو جائے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سُنی تھی تو یوں کہدیتے کہ ہمارے لئے ایسی بات زبان سے نکالنا جائز نہیں۔ پاک ہے اللہ، یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اس آیت میں مکرر وہی ہدایت ہے جو اس سے پہلی ایک آیت میں آچکی ہے۔ اسمیں یہ مزید وضاحت ہے کہ مسلمانوں کو ایسی خبر سُننے کے وقت کیا عمل کرنا چاہیئے وہ یہ کہ صاف کہدیں کہ ایسی بات بدون کسی دلیل کے زبان سے نکالنا بھی ہمارے لئے جائز نہیں یہ تو بہتان عظیم ہے۔

ایک شبہ اور جواب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جیسے کسی واقعہ کا صدق بغیر دلیل کے معلوم نہیں ہوتا اس لئے اُسکا زبان سے نکالنا اور چرچا کرنا ناجائز قرار پایا اسی طرح کسی کلام کا کاذب ہونا بھی تو بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا کہ اسکو بہتانِ عظیم کہدیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو گناہوں سے پاک صاف سمجھنا اصل شرعی ہے جو دلیل سے ثابت ہے اسکے خلاف جو بات بغیر دلیل کے کہی جائے اُسکو جھوٹا سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ ایک مومن مسلمان

پر بغیر کسی دلیلِ شرعی کے الزام لگایا گیا ہے لہٰذا یہ بہتان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، اس آیت میں پھر اُن لوگوں کی مذمت اور اُن پر دُنیا و آخرت کے عذاب کی وعید ہے جنھوں نے اس تہمت میں کسی طرح کا حصہ لیا۔ اس آیت میں یہ بات زیادہ ہے کہ جو لوگ ایسی خبریں مشہور کرتے ہیں گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری اور فواحش پھیل جائیں۔

انسدادِ فواحش کا قرآنی نظام اور ایک اہم تدبیر جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ آج کل فواحش کی کثرت ہے۔

قرآنِ حکیم نے فواحش کے انسداد کا یہ خاص نظام بنایا ہے کہ اوّل تو اس قسم کی خبر کہیں مشہور نہ ہونے پاوے اور شہرت ہو تو ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہو تاکہ اُس شہرت کیساتھ ہی مجمع عام میں حدِ زنا اُس پر جاری کر کے اُس شہرت ہی کو سبب انسداد بنا دیا جائے۔ اور جہاں ثبوتِ شرعی نہ ہو وہاں اس طرح کی بے حیائی کی خبروں کو چلتا کر دینا اور شہرت دینا جبکہ اسکے ساتھ کوئی سزا نہیں طبعی طور پر لوگوں کے دلوں سے بے حیائی اور فواحش کی نفرت کم کر دینے اور جرائم پر اقدام کرنے اور شائع کرنے کا موجب ہوتی ہے جسکا مشاہدہ آجکل کے اخبارات میں روزانہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں ہر روز ہر اخبار میں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں اُن کو دیکھتے رہتے ہیں روزانہ ایسی خبروں کے سامنے آنے اور اُس پر کسی خاص سزا کے مرتب نہ ہونے کا لازمی اور طبعی اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ فعلِ خبیث نظروں میں ہلکا نظر آنے لگتا ہے اور پھر نفس میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے ایسی خبروں کی تشہیر کی اجازت صرف اُس صورت میں دی ہے جبکہ وہ ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہو اسکے نتیجہ میں خبر کے ساتھ ہی اس بے حیائی کی ہولناک پاداش بھی دیکھنے سننے والوں کے سامنے آجائے۔ اور جہاں ثبوت اور سزا نہ ہو تو ایسی خبروں کی اشاعت کو قرآن نے مسلمانوں میں فواحش پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر غور کریں۔ اس آیت میں ایسی خبریں بلا ثبوت مشہور کرنے والوں پر دُنیا و آخرت دونوں میں عذابِ الیم ہونیکا ذکر ہے۔ آخرت کا عذاب تو ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد ہوگا جسکا یہاں مشاہدہ نہیں ہوسکتا مگر دُنیا کا عذاب تو مشاہدہ میں آنا چاہیئے سو جن لوگوں پر حدِ قذف (تہمت کی سزا) جاری کر دی گئی اُن پر تو دُنیا کا عذاب آہی گیا۔ اور اگر کوئی شخص شرائط اجراء حد موجود نہ ہونے کی وجہ سے حدِ قذف سے بچ نکلا تو وہ دُنیا میں بھی فی الجملہ مستحق عذاب تو ٹھہرا آیت کے مصداق کیلئے یہی کافی ہے۔

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

صحابہ کرام کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم | وَلَا يَأْتَلِ ، اِئْتِلَاء کے معنے قسم کھانے کے ہیں۔ حضرت صدیقہؓ پر تہمت کے واقعہ میں مسلمانوں میں سے مسطح رضؓ اور حسانؓ مبتلا ہو گئے تھے جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نزولِ آیاتِ برارت کے بعد حدِ قذف جاری فرمائی۔ مسطحؓ اور حسانؓ دونوں ہی جلیل القدر صحابی غزوۂ بدر کے شرکا میں سے ہیں مگر ایک لغزش ہو گئی جس سے توبہ صادقہ نصیب ہوئی اور حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت صدیقہ کی برات نازل فرمادی اسی طرح ان مومنین کی توبہ قبول کرنے اور معاف کرنے کا بھی اعلان فرمادیا۔

مسطح رضؓ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عزیز بھی تھے اور مفلس بھی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ اُن کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے۔ جب واقعہ افک میں اُن کی گونہ شرکت ثابت ہوئی تو صدیقہؓ کے والد کی شفقتِ پدری اور بیٹی کو ایسا سخت صدمہ پہنچانے کی وجہ سے طبعی طور پر مسطحؓ سے رنج پیدا ہو گیا اور قسم کھا بیٹھے کہ آئندہ ان کی کوئی مالی مدد نہیں کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاص فقیر کی مالی مدد کرنا کسی خاص مسلمان پر علی التعیین واجب نہیں، اور جس کی مالی مدد کوئی کرتا ہے اگر وہ اُس کو روک لے تو گناہ کی کوئی وجہ نہیں مگر صحابہ کرام کی جماعت کو حق تعالیٰ دُنیا کے لئے ایک مثالی معاشرہ بنانے والے تھے اس لئے ایک طرف جن لوگوں سے لغزش ہوئی ان کو سچی توبہ اور آئندہ اصلاحِ حال کی نعمت سے نوازا۔ دوسری طرف جن بزرگوں نے طبعی رنج و ملال کے سبب ایسے غریب فقیر کی مدد ترک کرنے کی قسم کھالی اُن کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم اس آیت میں دی گئی کہ اُن کو یہ قسم توڑ دینا اور اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ اُنکی مالی امداد سے دستکش ہو جانا اُن کے مقامِ بلند کے مناسب نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف کر دیا اُن کو بھی عفو و درگزر سے کام لینا چاہیئے۔

چونکہ حضرت مسطحؓ کی مالی امداد کرنا کوئی شرعی واجب حضرت صدیقؓ کے ذمہ نہیں تھا اسی لئے قرآنِ کریم نے عنوان یہ اختیار فرمایا کہ اہلِ علم و فضل جن کو اللہ نے دینی کمالات عطا فرمائے ہیں اور جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی وسعت و گنجائش بھی ہے انکو ایسی قسم نہیں کھانی چاہیئے۔ آیت میں دو لفظ اولوا الفضل اور والسعۃ اسی معنے کے لئے آئے ہیں۔

اس آیت کے آخری جملے میں جو ارشاد ہوا کہ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ، یعنی کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ معاف فرمادے تو صدیقِ اکبرؓ نے فوراً کہا۔ واللہ انی احب ان یغفر اللہ لی (رواہ الشیخان) یعنی بخدا میں ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے اور فوراً حضرت مسطحؓ کی مالی امداد جاری فرمادی اور یہ بھی فرمایا اب کبھی یہ امداد بند نہ ہوگی (بخاری و مسلم)

یہ وہ مکارمِ اخلاق ہیں جن سے صحابہ کرام کی تربیت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا۔ (از مظہری)

یعنی صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو رشتہ داروں کے صرف احسان کا بدلہ کر دے بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ رشتہ داروں کے قطع تعلق کرنے کے باوجود یہ تعلق قائم رکھے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۪ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ، اس آیت میں بظاہر مکرر وہ مضمون بیان ہوا ہے جو اس سے پہلے آیاتِ قذف میں آچکا ہے وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّ لَا تَقۡبَلُوۡا لَہُمۡ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۚ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ، لیکن درحقیقت ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ کیونکہ آیاتِ حدِ قذف کے آخر میں توبہ کرنے والوں کا استثناء اور اُنکے لئے مغفرت کا وعدہ ہے۔ اس آیت میں ایسا نہیں بلکہ دُنیا و آخرت کی لعنت اور عذابِ عظیم بلا استثناء مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جنھوں نے حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی اور پھر اس سے توبہ نہیں کی، یہاں تک کہ قرآن میں اُن کی برأت نازل ہونیکے بعد بھی وہ اپنے اس افترار پر قائم اور تہمت کا چرچا کرنے میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان سے ممکن نہیں۔ اور جو مسلمان بھی نصوصِ قرآن کا ایسا خلاف کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا اس لئے یہ مضمون اُن منافقین کے بارے میں آیا ہے جنھوں نے آیاتِ برأتِ صدیقہ نازل ہونے کے بعد بھی اس مشغلہ تہمت کو نہیں چھوڑا اُن کے کافر منافق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تائبین کیلئے اللہ تعالیٰ نے فضل اللہ و رحمتہٗ فرماکر مرحوم دارین قرار دیا اور جنھوں نے توبہ نہیں کی اُن کو اس آیت میں ملعون دُنیا و آخرت فرمایا۔ تائبین کو عذاب سے نجات کی بشارت دی اور غیر تائبین کے لئے عذابِ عظیم کی وعید فرمائی۔ تائبین کو اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ فرماکر مغفرت کی بشارت دی اور غیر تائبین کو اگلی آیت یَوۡمَ تَشۡہَدُ عَلَیۡہِمۡ میں معافی نہ ہونے کی وعید فرمائی (کذا ذکرہ سیدی فی بیان القرآن)

ایک اہم تنبیہ حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت کے قضیہ میں جو بعض مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے یہ قضیہ اس وقت کا تھا جب تک آیاتِ برأت قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ آیاتِ برأت نازل ہونے کے بعد جو شخص حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائے وہ بلا شبہ کافر منکرِ قرآن ہے جیسا کہ شیعوں کے بعض فرقے اور بعض افراد اس میں مبتلا پائے جاتے ہیں اُن کے کافر ہونے میں کوئی شک و شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں وہ باجماعِ اُمّت کافر ہیں۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ، یعنی اس روز جبکہ اُن کے خلاف خود اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور اُن کے جرائم کی شہادت دینگے جیساکہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جو گنہگار اپنے گناہ کا اعتراف کریگا تو اللہ تعالیٰ اسکو معاف فرمادیں گے اور محشر کے مجمع عام کی نظروں سے اُسکے گناہ کو چھپادیں گے اور جو وہاں بھی انکار کریگا کہ میں نے تو یہ کام نہیں کیا، نگراں فرشتوں نے غلط میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا ہے تو اسوقت اُن کے منہ بند کر دیئے جاویں گے اور ہاتھ پاؤں سے گواہی لی جاوے گی وہ بولیں گے اور شہادت دیں گے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ میں اسی کا بیان ہے۔ اس آیت میں یہ فرمایا کہ اُن کے مونہوں پر مہر لگا دی جاوے گی مگر آیتِ مذکورہ میں یہ ہے کہ خود اُن کی زبانیں شہادت دیں گی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض اسلئے نہیں کہ وہ اپنی زبان کو اپنے اختیار سے استعمال نہ کرسکیں گے کہ اُسوقت جو چاہیں جھوٹی یا سچی بات کہدیں جیسے دنیا میں اسکا اختیار ہے بلکہ اُن کی زبان اُن کے ارادہ اور قصد کے خلاف حق بات کا اعتراف کرے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں منہ اور زبان بالکل بند کر دی جاویں پھر خود زبان کو بھی حکم ہو کہ سچی بات بولے۔ واللہ اعلم

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ، یعنی گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور پاک صاف عورتیں پاک صاف مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور پاک صاف مرد پاک صاف عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔

اس آخری آیت میں اوّل تو عام ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبائع میں طبعی طور پر جوڑ رکھا ہے۔ گندی اور بدکار عورتیں بدکار مردوں کی طرف اور گندے بدکار مرد گندی بدکار عورتوں کیطرف رغبت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح پاک صاف عورتوں کی رغبت پاک صاف مردوں کی طرف ہوتی ہے اور پاک صاف مردوں کی رغبت پاک صاف عورتوں کیطرف ہوا کرتی ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی رغبت کیمطابق اپنا جوڑ تلاش کرتا ہے اور قدرۃً اُسکو وہی ملجاتا ہے۔

اس عام عادتِ کلیہ اور ضابطہ سے واضح ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام جو دُنیا میں پاکی اور صفائی ظاہری و باطنی میں مثالی شخصیت ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اُن کو ازواج بھی اُنکے مناسب عطا فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء کے سردار ہیں اُن کو ازواج مطہرات بھی اللہ تعالیٰ نے پاکی اور صفائی ظاہری اور اخلاقی برتری میں آپ ہی

کی مناسب شان عطا فرمائی ہیں۔ اور صدیقہ عائشہؓ اُن سب میں ممتاز ہیں۔ اُن کے بارے میں شک وشبہ وہی کرسکتا ہے جس کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو۔ اور حضرت نوحؑ حضرت لوطؑ علیہما السلام کی بیبیوں کے بارے میں جو قرآن کریم میں اُن کا کافر ہونا مذکور ہے تو اُنکے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ کافر ہونے کے باوجود فسق وفجور میں مبتلا نہیں تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ما بغت امرأۃ نبی قط، یعنی کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا (ذکر فی الدر المنثور) اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بیوی کافر ہوجائے اسکا تو امکان ہے مگر بدکار فاحشہ ہوجائے یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بدکاری طبعی طور پر موجب نفرتِ عوام ہے کفر طبعی نفرت کا موجب نہیں (بیان القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھر کے سوائے جب تک بول چال نہ کر لو

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور سلام کر لو اُن گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو،

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ

پھر اگر نہ پاؤ اسمیں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو اور

اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ اسمیں خوب ستھرائی ہے تمہارے لئے اور اللہ جو تم کرتے ہو اُس کو

عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ

جانتا ہے نہیں گناہ تم پر اسمیں کہ جاؤ اُن گھروں میں جہاں کوئی نہیں بستا،

فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

اس میں کچھ چیز ہو تمہاری اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

خلاصۂ تفسیر

حکم پنجم استیذان اور آداب ملاقات باہمی کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنا

سورۂ نور کے شروع ہی سے فواحش اور بےحیائی کی روک تھام کے لئے اُن سے متعلقہ جرائم کی سزاؤں کا ذکر اور بے دلیل کسی پر تہمت لگانے کی مذمت کا بیان تھا آگے اُنہی فواحش کے انسداد اور عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں جہاں سے بےحیائی کو راستہ ملے اِنہی احکام میں سے استیذان کے مسائل و احکام ہیں کہ کسی شخص کے مکان میں بغیر اُس کی اجازت

کے داخل ہونا یا اندر جھانکنا ممنوع کر دیا گیا جسمیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر نہ پڑے۔
آیات مذکورہ میں مختلف قسم کے مکانات کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں۔

مکانات کی چار قسمیں ہیں۔ ایک خاص اپنے رہنے کا مکان جسمیں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہیں۔ دوسرے وہ مکان جسمیں کوئی اور بھی رہتا ہو خواہ وہ اپنے محارم ہی کیوں نہ ہوں یا کسی اور کے اسمیں آجانے کا احتمال ہو۔ تیسری قسم وہ مکان جسمیں کسی کا بالفعل رہنا یا نہ رہنا دونوں کا احتمال ہو۔ چوتھی قسم وہ مکان جو کسی خاص شخص کی رہائش کے لئے مخصوص نہ ہو جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ عام لوگوں کے انتفاع اور آمد و رفت کی جگہیں۔ انمیں قسم اول کا حکم تو ظاہر تھا کہ اسمیں جانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اسلئے اسکا ذکر ان آیات میں صراحۃً نہیں کیا گیا باقی تین قسموں کے مکانات کے احکام اگلی آیتوں میں بیان فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں (جنمیں دوسرے لوگ رہتے ہوں خواہ وہ اُن کی ملک ہوں یا کسی سے عاریۃً رہنے کو لے لئے ہوں یا کرایہ پر لئے ہوں) داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے) اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (یعنی اول باہر سے سلام کر کے پھر اُن سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے اور بغیر اجازت لئے ویسے ہی مت گھس جاؤ۔ اور اگرچہ بعض لوگ اجازت لینے کو اپنی شان کے خلاف سمجھیں لیکن واقع میں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے (کہ اجازت لیکر جاؤ اور یہ بات تم کو اس لئے بتائی) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ یہ حکم ہوا مکانات کی قسم دوم کا) پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو (خواہ واقع میں وہاں کوئی ہو یا نہ ہو، تو (بھی) ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے (کیونکہ اول تو یہ احتمال ہے کہ اُس میں کوئی آدمی موجود ہو اگرچہ تمہیں معلوم نہیں۔ اور واقع میں کوئی موجود نہ ہو تو دوسرے کے خالی مکان میں بھی بلا اجازت گھس جانا، دوسرے کی ملک میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرّف کرنا ہے جو ناجائز ہے۔ یہ حکم ہوا قسم سوم کا) اور اگر (اجازت طلب کرنے کے وقت) تم سے یہ کہدیا جاوے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے (اس بات سے کہ وہیں جم جاؤ کہ کبھی تو باہر نکلیں گے کیونکہ اسمیں اپنی ذلت اور دوسرے پر بلاوجہ دباؤ ڈال کر تکلیف پہنچانا ہے اور کسی مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے (اگر خلاف حکم کرو گے سزا پاؤ گے اور یہی حکم اُس صورت کا ہے کہ گھر والوں نے اگرچہ لوٹ جانے کو کہا نہیں مگر کوئی بولا بھی نہیں۔ ایسی حالت میں تین مرتبہ استیذان اس احتیاط

پر کرلیا جاوے کہ شاید سُنا نہ ہو۔ تین مرتبہ تک جب کوئی جواب نہ آوے تو لوٹ آنا چاہیئے جیسا کہ حدیث میں اسکی تصریح موجود ہے) اور تم کو ایسے مکانات میں (بغیر خاص اجازت کے) چلے جانے میں گناہ نہ ہوگا جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو (اور) اُن میں تمھاری برت ہو (یعنی ان مکانات کے برتنے اور استعمال کرنے کا تمھیں حق ہو، یہ حکم ہے قسم چہارم کا جو رفاہ عام کے مکانات ہیں اور جن سے عام لوگوں کے منافع متعلق ہیں۔ تو وہاں جانے کی عادۃً عام اجازت ہوتی ہے) اور تم جو کچھ علانیہ کرتے ہو یا پوشیدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔ (اس لئے ہر حال میں تقویٰ اور خوفِ خدا لازم ہے)۔

معارف و مسائل

قرآنی آدابِ معاشرت کا ایک اہم باب کسی کی ملاقات کو جاؤ تو پہلے اجازت لو بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہو

افسوس ہے کہ شریعتِ اسلام نے جس قدر اس معاملے کا اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم میں اس کے مفصّل احکام نازل ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس کی بڑی تاکید فرمائی اُتنا ہی آجکل مسلمان اس سے غافل ہوگئے۔ لکھے پڑھے نیک لوگ بھی نہ اس کو کوئی گناہ سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ دُنیا کی دوسری مہذب قوموں نے اس کو اختیار کر کے اپنے معاشرہ کو درست کرلیا مگر مسلمان ہی اسمیں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی احکام میں سب سے پہلے سُستی اسی حکم میں شروع ہوئی بہرحال استیذان قرآن کریم کا وہ واجب التعمیل حکم ہے کہ اسمیں ذرا سی سستی اور تبدیلی کو بھی حضرت ابن عباسؓ انکار آیت قرآن کے شدید الفاظ سے تعبیر فرمارہے ہیں اور اب تو لوگوں نے واقعی ان احکام کو ایسا نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُن کے نزدیک یہ قرآن کے احکام ہی نہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

استیذان کی حکمتیں اور مصالح مہمہ حق تعالیٰ جل شانہ نے ہر انسان کو جو اسکے رہنے کی جگہ عطا فرمائی خواہ مالکانہ ہو یا کرایہ وغیرہ پر بہرحال اُسکا گھر اُسکا مسکن ہے اور مسکن کی اصل غرض سکون و راحت ہے قرآن عزیز نے جہاں اپنی اس نعمت گرانمایہ کا ذکر فرمایا ہے اسمیں بھی اس طرف اشارہ ہے فرمایا جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا، یعنی اللہ نے تمھارے گھروں سے تمھارے لئے سکون و راحت کا سامان دیا۔ اور یہ سکون و راحت جبھی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان دوسرے کسی شخص کی مداخلت کے بغیر اپنے گھر میں اپنی ضرورت کے مطابق آزادی سے کام اور آرام کرسکے۔ اسکی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی اس مصلحت کو فوت کرنا ہے جو بڑی ایذا اور تکلیف ہے۔ اسلام نے کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ استیذان کے احکام

ہیں ایک بڑی مصلحت لوگوں کی آزادی میں خلل ڈالنے اور اُن کی ایذا رسانی سے بچنا ہے جو ہر شریف انسان کا عقلی فریضہ بھی ہے۔ دوسری مصلحت خود اس شخص کی ہے جو کسی کی ملاقات کے لئے اُسکے پاس گیا ہے کہ جب وہ اجازت لیکر شائستہ انسان کی طرح ملیگا تو مخاطب بھی اسکی بات قدر و منزلت سے سُنے گا اور اگر اسکی کوئی حاجت ہے تو اُسکے پورا کرنے کا داعیہ اُسکے دل میں پیدا ہوگا۔ بخلاف اسکے کہ وحشیانہ طرز سے کسی شخص پر بغیر اسکی اجازت کے مسلط ہوگیا تو مخاطب اسکو ایک بلائے ناگہانی سمجھ کر دفع الوقتی سے کام لیگا خیر خواہی کا داعیہ اگر ہوا بھی تو مضمحل ہوجائیگا اور اسکو ایذائے مسلم کا گناہ الگ ہوگا۔

تیسری مصلحت فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے کہ بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہوجانے سے یہ بھی احتمال ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر پڑے اور شیطان دل میں کوئی مرض پیدا کردے اور اسی مصلحت سے احکام استیذان کو قرآن کریم میں حدِ زنا۔ حدِ قذف وغیرہ احکام کے متصل لایا گیا ہے۔

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جس پر دوسروں کو اطلاع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے گھر میں آجائے تو وہ جس چیز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اُس پر مطلع ہوجائیگا۔ کسی کے پوشیدہ راز کو زبردستی معلوم کرنیکی فکر بھی گناہ اور دوسروں کے لئے موجب ایذا ہے۔ استیذان کے کچھ مسائل تو خود آیاتِ مذکورہ میں آگئے ہیں پہلے اُن کی تفصیل و تشریح دیکھئے باقی متعلق مسائل بعد میں لکھے جاویں گے۔

مسئلہ: ان آیات میں يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکامِ قرآنیہ اسی طرح مردوں کو مخاطب کرکے آتے ہیں عورتیں بھی اُسمیں شامل ہوتی ہیں بجز مخصوص مسائل کے جنکی خصوصیت عورتوں کیساتھ بیان کردی جاتی ہے۔ چنانچہ نساءِ صحابہ کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جاویں تو پہلے اُن سے استیذان کریں۔ حضرت اُمِّ ایاسؓ فرماتی ہیں کہ ہم چار عورتیں اکثر حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے اُن سے استیذان کرتی تھیں جب وہ اجازت دیتی تو اندر جاتی تھیں (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

مسئلہ: اسی آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس، سب کو استیذان کرنا واجب ہے اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذان کرنا چاہئیے۔ امام مالکؒ نے موطا میں مرسلاً عطاء بن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ کیا میں اپنی والدہ کے پاس جانے وقت بھی استیذان کروں آپنے فرمایا ہاں استیذان کرو۔ اس شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو اپنی والدہ ہی کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں

نہ جاؤ۔ اُسنے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتا ہوں آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگی دیکھو اسنے کہا کہ نہیں۔ فرمایا اسی لئے استیذان کرنا چاہیئے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہوں (مظہری)

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو غَيْرَ بُيُوتِكُمْ آیا ہے اسمیں بیوتکم سے مراد وہ بیت اور گھر ہیں جن میں انسان تنہا خود ہی رہتا ہو۔ والدین، بہن بھائی وغیرہ اُس میں نہ ہوں

مسئلہ جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اُسمیں داخل ہونے کے لئے اگرچہ استیذان واجب نہیں مگر مستحب اور طریق سنت یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بلکہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے باخبر کردے پھر داخل ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب کبھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو دروازہ میں کھنکار کر پہلے اپنے آنے سے باخبر کردیتے تھے تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو انکو پسند نہ ہو (ابن کثیر بحوالہ ابن جریر وقال اسنادہ صحیح) اور اس صورت میں استیذان کا واجب نہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاءؒ سے دریافت کیا کہ کیا ایک شخص کو اپنی بیوی کے پاس جانے کے وقت بھی استیذان ضروری ہے انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ واجب نہیں لیکن مستحب اور اَولیٰ وہاں بھی ہے۔

استیذان کا مسنون طریقہ آیت میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ ہے حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا یعنی کسی کے گھر میں اسوقت تک داخل نہ ہو جبتک دو کام نہ کرلو، اوّل استیناس، اسکے لفظی معنی طلب اُنس کے ہیں۔ مراد اس سے جمہور مفسرین کے نزدیک استیذان یعنی اجازت حاصل کرنا ہے۔ استیذان کو بلفظ استیناس ذکر کرنے میں اشارہ اسطرف ہے کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنے میں مخاطب مانوس ہوتا ہے اسکو وحشت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر والوں کو سلام کرو۔ اسکا مفہوم بعض حضرات مفسرین نے تو یہ لیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں پہلے استیذان کیا جائے جب اجازت مل جائے اور گھر میں جائیں تو سلام کریں۔ اور اسی کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث کا مقتضیٰ قرار دیا ہے۔ اور ماوردی نے اسمیں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر میں جائے تو سلام کرے مگر عام روایاتِ حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے السلام علیکم اسکے بعد اپنا نام لیکر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا کہ جو شخص سلام سے پہلے استیذان کرے اسکو اجازت نہ دو (کیونکہ اُسنے مسنون طریقہ کو چھوڑ دیا) (روح المعانی) اور ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسطرح استیذان کیا کہ باہر سے کہا أألج کیا میں گھس جاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا باہر جاکر اسکو طریقہ سکھلاؤ کہ یُوں کہے السلام علیکم أأدخل یعنی کیا میں داخل ہو سکتا ہوں۔ ابھی یہ خادم باہر نہیں گیا تھا کہ اُسنے خود حضور کے کلمات سُن لئے اور اسطرح کہا السلام علیکم أأدخل۔ تو آپ نے اندر آنے کی اجازت دیدی (ابن کثیر) اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تأذنوا لمن لم یبدأ بالسلام یعنی جو شخص پہلے سلام نہ کرے اسکو اندر آنے کی اجازت نہ دو (مظہری) اس واقعہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو اصلاحیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ پہلے سلام کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے أأدخل کے بجائے أألج کا لفظ استعمال کیا تھا یہ نامناسب تھا کیونکہ الج ولوج سے مشتق ہے جسکے معنے کسی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں یہ تہذیبِ الفاظ کے خلاف تھا۔ بہرحال ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو سلام کرنے کا ارشاد ہے یہ سلام استیذان ہے جو اجازت حاصل کرنے کے لئے باہر سے کیا جاتا ہے تاکہ اندر جو شخص ہے وہ متوجہ ہو جائے اور جو الفاظ اجازت طلب کرنے کے لئے کہے گا وہ سُن لے۔ گھر میں داخل ہونے کے وقت حسبِ معمول دوبارہ سلام کرے۔

مسئلہ: پہلے سلام اور پھر داخل ہونے کی اجازت لینے کا جو بیان اوپر احادیث سے ثابت ہوا اسمیں بہتر یہ ہے کہ اجازت لینے والا خود اپنا نام لیکر اجازت طلب کرے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم کا عمل تھا کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر آکر یہ الفاظ کہے۔ السلام علی رسول اللّٰہ السلام علیکم أیدخل عمر یعنی سلام کے بعد کہا کہ کیا عمر داخل ہو سکتا ہے (رواہ قاسم بن اصبغ وابن عبدالبر فی التمہید عن ابن عباس عن عمرؓ۔ ابن کثیر) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو استیذان کے لئے یہ الفاظ فرمائے۔ السلام علیکم ھذا ابو موسیٰ السلام علیکم ھذا الاشعری (قرطبی) اسمیں بھی پہلے اپنا نام ابو موسیٰ بتلایا پھر مزید وضاحت کے لئے اشعری کا ذکر کیا۔ اور یہ اسلئے کہ جب تک آدمی اجازت لینے والے کو پہچانے نہیں تو جواب دینے میں تشویش ہوگی۔ اس تشویش سے بھی مخاطب کو بچانا چاہیئے۔

مسئلہ: اور اس معاملہ میں سب سے بُرا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اندر سے مخاطب نے پُوچھا کون صاحب ہیں

تو جواب میں یہ کہدیا کہ میں ہوں، کیونکہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں، جس نے اوّل آواز سے نہیں پہچانا وہ میں کے لفظ سے کیا پہچانے گا۔

خطیب بغدادی نے اپنے جامع میں علی بن عاصم واسطی سے نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ گئے تو حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ دروازہ پر دستک دی۔ حضرت مغیرہؓ نے اندر سے پوچھا کون ہے تو جواب دیا أنا (یعنی میں ہوں) تو حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جسکا نام أنا ہو پھر باہر تشریف لائے اور اُن کو حدیث سنائی کہ ایک روز حضرت جابر بن عبداللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت لینے کے لئے دروازہ پر دستک دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پوچھا کون صاحب ہیں؟ تو جابرؓ نے یہی لفظ کہدیا أنا یعنی میں ہوں۔ آپ نے بطور زجر و تنبیہ کے فرمایا أنا أنا یعنی أنا أنا کہنے سے کیا حاصل ہے اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔

مسئلہ: اس سے بھی زیادہ بُرا یہ طریقہ ہے جو آجکل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ پر دستک دی جب اندر سے پوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب کو تشویش میں ڈالنے اور ایذا پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: روایات مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ استیذان کا یہ طریقہ بھی جائز ہے کہ دروازہ پر دستک دیدی جائے بشرطیکہ ساتھ ہی اپنا نام بھی ظاہر کر کے بتا دیا جائے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

مسئلہ: لیکن اگر دستک ہو تو اتنی زور سے نہ دے کہ جس سے سُننے والا گھبرا اُٹھے بلکہ متوسط انداز سے دے جس سے اندر تک آواز تو چلی جائے لیکن کوئی سختی ظاہر نہ ہو۔ جو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دستک دیتے تھے تو اُن کی عادت یہ تھی کہ ناخنوں سے دروازہ پر دستک دیتے تاکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو (رواہ الخطیب فی جامعہ۔ قرطبی) جو شخص استیذان کے مقصد کو سمجھ لے کہ اصل اُس سے استیناس ہے یعنی مخاطب کو مانوس کر کے اجازت حاصل کرنا وہ خود بخود ان سب چیزوں کی رعایت کو ضروری سمجھے گا جن چیزوں سے مخاطب کو تکلیف ہو اُس سے بچیگا۔ اپنا نام ظاہر کرے اور دستک دے تو متوسط انداز سے دے یہ سب چیزیں اُس میں شامل ہیں۔

تنبیہ ضروری آجکل اکثر لوگوں کو تو استیذان کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہیں رہی جو صریح ترک واجب کا گناہ ہے اور جو لوگ استیذان کرنا چاہیں اور مسنون طریقہ کے مطابق باہر سے پہلے سلام کریں پھر اپنا نام بتلا کر اجازت لیں۔ اُن کے لئے اس زمانے میں بعض دشواریاں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت لینا ہے وہ دروازہ سے دُور ہے۔ وہاں

تک سلام کی آواز اور اجازت لینے کے الفاظ پہنچنا مشکل ہیں اسلئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اجازت لینے کے طریقے ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف ہوسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازوں پر گھنٹی لگا لیتے ہیں اُس گھنٹی کا بجا دینا بھی واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے بشرطیکہ گھنٹی کے بعد اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کردے جس کو مخاطب سُن لے۔ اسکے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اسکا استعمال کرلینا بھی جائز ہے آجکل جو شناختی کارڈ کا رواج یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہلِ یورپ نے جاری کی مگر مقصد استیذان اسمیں بہت اچھی طرح پورا ہوجاتا ہے کہ اجازت دینے والے کو اجازت چاہنے والے کا پورا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہوجاتا ہے اس لئے اسکو اختیار کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص سے استیذان کیا اور اُسنے جواب میں کہدیا کہ اسوقت ملاقات نہیں ہوسکتی لوٹ جایئے تو اس سے بُرا نہ ماننا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کے حالات اور اسکے مقتضیات مختلف ہوتے ہیں بعض وقت وہ مجبور ہوتا ہے باہر نہیں آسکتا نہ آپکو اندر بلاسکتا ہے تو ایسی حالت میں اُسکے عذر کو قبول کرنا چاہیئے۔ آیت مذکورہ میں یہی ہدایت ہے وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ یعنی جب آپ سے کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جائیں تو آپ کو خوشدلی سے لوٹ آنا چاہیئے اس سے بُرا ماننا یا وہیں جم کر بیٹھ جانا دونوں چیزیں درست نہیں بعض حضرات سلف سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر اس تمنا میں رہا کہ کسی کے پاس جاکر استیذان کروں اور وہ مجھے یہ جواب دے کہ لوٹ جاؤ تو میں اس حکم قرآن کی تعمیل کا ثواب حاصل کروں مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کبھی یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔

مسئلہ: شریعتِ اسلام نے حُسن معاشرت کے آداب سکھانے اور سب کو ایذا و تکلیف سے بچانے کا دو طرفہ معتدل نظام قائم فرمایا ہے اس آیت میں جس طرح آنیوالے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر استیذان کرنے پر آپ کو اجازت نہ ملے اور کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جاؤ تو کہنے والے کو معذور سمجھو اور خوشدلی کیساتھ واپس لوٹ جاؤ بُرا نہ مانو اسی طرح ایک حدیث میں اسکا دوسرا رُخ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لزورك علیك حقا یعنی جو شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے اُسکا بھی آپ پر حق ہے یعنی اسکا یہ حق ہے کہ اسکو اپنے پاس بلاؤ یا باہر آکر اُس سے ملو اسکا اکرام کرو بات سنو بلا کسی شدید مجبوری اور عذر کے ملاقات سے انکار نہ کرو۔

مسئلہ: اگر کسی کے دروازے پر جاکر استیذان کیا اور اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سُنت

یہ ہے کہ دوبارہ پھر استیذان کرے اور پھر بھی جواب نہ آوے تو تیسری مرتبہ کرے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آوے تو اسکا حکم وہی ہے جو ارجعوا کا ہے۔ یعنی لوٹ جانا چاہئیے کیونکہ تین مرتبہ کہنے سے تقریباً یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ آواز سن لی مگر یا تو وہ شخص ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کر رہا ہے اور یا پھر اسکو اسوقت ملنا منظور نہیں دونوں حالتوں میں وہیں جمے رہنا اور مسلسل دستک وغیرہ دیتے رہنا بھی موجب ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے، اور استیذان کا اصل مقصد ہی ایذا سے بچنا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا استأذن احدکم ثلاثاً فلم یؤذن لہ فلیرجع۔ یعنی جب کوئی آدمی تین مرتبہ استیذان کرے اور کوئی جواب نہ آوے تو اسکو لوٹ جانا چاہئیے (ابن کثیر بحوالہ صحیح بخاری) اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور سنت کے مطابق باہر سے استیذان کیلئے سلام کیا السلام علیکم حضرت سعد بن عبادہ نے سلام کا جواب تو دیا مگر آہستہ کہ حضور نہ سنیں، آپ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ سلام کیا حضرت سعد رضی اللہ عنہ سنتے اور آہستہ جواب دیتے رہے۔ تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد آپ لوٹ گئے جب سعد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اب آواز نہیں آرہی تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور یہ عذر پیش کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ہر مرتبہ آپ کی آواز سنی اور جواب بھی دیا مگر آہستہ دیا تاکہ زبان مبارک سے زیادہ سے زیادہ سلام کے الفاظ میرے بارے میں نکلیں وہ میرے لئے موجب برکت ہوگا (آپ نے ان کو طریقہ سنت بتلا دیا کہ تین مرتبہ جواب نہ آنے پر لوٹ جانا چاہئیے) اس کے بعد حضرت سعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر ساتھ لے گئے انھوں نے کچھ مہمانی کی آپ نے اسکو قبول فرمایا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ عمل غلبہ عشق و محبت کا اثر تھا کہ اسوقت ذہن اسطرف نہ گیا کہ سرور دو عالم دروازے پر تشریف فرما ہیں مجھے فوراً جا کر انکے قدم چوم لینے چاہئیں بلکہ ذہن اسطرف متوجہ ہو گیا کہ آپ کی زبان مبارک سے السلام علیکم جتنی مرتبہ زیادہ نکلے گا میرے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ بہرحال اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد جواب نہ آوے تو سنت یہ ہے کہ لوٹ جائے وہیں جم کر بیٹھ جانا خلاف سنت اور مخاطب کے لئے موجب ایذا ہے کہ اسکو دباؤ ڈالکر نکلنے پر مجبور کرنا ہے۔

مسئلہ: یہ حکم اسوقت ہے جبکہ سلام یا دستک وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کر لی ہو کہ اب وہاں جم کر بیٹھ جانا موجب ایذا ہے لیکن اگر کوئی کسی عالم یا بزرگ کے دروازہ پر بغیر استیذان کئے ہوئے اور بغیر ان کو اطلاع دئیے ہوئے انتظار میں بیٹھ رہے کہ جب اپنی فرصت

کے مطابق باہر تشریف لاوینگے تو ملاقات ہو جائیگی یہ ہیں داخل نہیں بلکہ عین ادب ہے، خود قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوں تو اُن کو آواز دیکر بُلانا ادب کے خلاف ہے بلکہ لوگوں کو چاہیئے کہ انتظار کریں جس وقت آپ اپنی ضرورت کے مطابق باہر تشریف لاویں اُس وقت ملاقات کریں۔ آیت یہ ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں بعض اوقات کسی انصاری صحابی کے دروازہ پر پورے دوپہر انتظار کرتا رہتا ہوں کہ جب وہ باہر تشریف لاویں تو ان سے کسی حدیث کی تحقیق کروں اور اگر میں اُن سے ملنے کے لئے اجازت مانگتا تو وہ ضرور مجھے اجازت دیدیتے مگر میں اسکو خلافِ ادب سمجھتا تھا اسلئے انتظار کی مشقت گوارا کرتا تھا۔ (صحیح بخاری)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ، لفظ متاع کے لغوی معنی کسی چیز کے برتنے استعمال کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے ہیں اور جس چیز سے فائدہ اُٹھایا جائے اسکو بھی متاع کہا جاتا ہے اس آیت میں متاع کے لغوی معنی ہی مراد ہیں جسکا ترجمہ برتنے سے کیا گیا ہے یعنی برتنے کا استحقاق۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ جب استیذان کی آیات مذکورہ نازل ہوئیں جنہیں بغیر اجازت کے کسی مکان میں داخل ہونیکی ممانعت ہے تو صدیق اکبرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، اس ممانعت کے بعد قریش کے تجارت پیشہ لوگ کیا کرینگے کیونکہ مکہ اور مدینہ سے ملک شام تک اُنکے تجارتی سفر ہوتے ہیں اور اس راستہ میں جابجا انکے مسافر خانے بنے ہوتے ہیں جنمیں دورانِ سفر وہ لوگ قیام کرتے ہیں۔ انمیں کوئی مستقل بسنے والا نہیں ہوتا تو وہاں استیذان کی کیا صورت ہوگی اجازت کس سے حاصل کیجائیگی۔ اسپر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری) اس شانِ نزول کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ آیت میں بیوت غیر مسکونہ سے مُراد وہ مکانات اور مقامات ہیں جو کسی خاص فرد یا قوم کے لئے خصوصی طور پر رہائش گاہ نہیں بلکہ افرادِ قوم کو عام اجازت وہاں جانے ٹھہرنے اور استعمال کرنے کی ہے جیسے وہ مسافر خانے جو شہروں اور جنگلوں میں اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہوں اور باشتراکِ علت عام مسجدیں، خانقاہیں، دینی مدارس، ہسپتال، ڈاکخانہ، ریلوے اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے مستقر اور قومی تفریحات کیلئے جو مکانات بنائے گئے ہوں غرض رفاہِ عام کے سب ادارے اسی حکم میں ہیں کہ وہاں ہر شخص بلا اجازت جا سکتا ہے۔

مسئلہ: رفاہِ عام کے اداروں میں جس مقام پر اسکے مالکان یا متولیان کیطرف سے داخلہ کے لئے کچھ شرائط اور پابندیاں ہوں انکی پابندی شرعاً واجب ہے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اگر بغیر پلیٹ فارم کے جانے کی اجازت نہیں ہو تو پلیٹ فارم ٹکٹ حاصل کرنا ضروری ہے اسکی خلاف ورزی ناجائز ہے ایروڈرم (ہوائی اڈے) کے جس حصہ میں جانیکی محکمہ کیطرف سے اجازت نہ ہو وہاں بغیر اجازت

کے جانا شرعاً جائز نہیں۔
مسئلہ: اسی طرح مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں وغیرہ میں جو کمرے وہاں کے منتظمین یا دوسرے لوگوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہوں جیسے مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے خاص حجرے یا ریلوے، ایرڈروم اور ہسپتالوں کے دفاتر اور مخصوص کمرے جو مریضوں یا دوسرے لوگوں کی رہائش گاہ ہیں وہ بیوت غیر مسکونہ کے حکم میں نہیں، بلکہ مسکونہ کے حکم میں ہیں انہیں بغیر اجازت جانا شرعاً ممنوع اور گناہ ہے۔

استیذان سے متعلق چند دوسرے مسائل

جبکہ یہ معلوم ہوچکا کہ استیذان کے احکام شرعیہ کا اصل مقصد لوگوں کی ایذارسانی سے بچنا اور حسن معاشرت کے آداب سکھانا ہے تو اشتراک علت سے مسائل ذیل کا حکم بھی معلوم ہوگیا۔

ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل | مسئلہ: کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادۃً اُس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونیکا وقت ہو بلاضرورت شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اسمیں بھی وہی ایذارسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اُس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔
مسئلہ: جس شخص سے ٹیلیفون پر بات چیت اکثر کرنا ہو تو مناسب یہ ہے کہ اُس سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ٹیلیفون پر بات کرنے میں کس وقت سہولت ہوتی ہے پھر اُس کی پابندی کرے۔ مسئلہ: ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہو تو پہلے مخاطب سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ذرا سی فرصت ہو تو میں اپنی بات عرض کروں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی آنے پر آدمی طبعاً مجبور ہوتا ہے کہ فوراً معلوم کرے کہ کون کیا کہنا چاہتا ہے اور اس ضرورت سے وہ کسی بھی حال میں اور اپنے ضروری کام میں ہو تو اُسکو چھوڑ کر ٹیلیفون اُٹھاتا ہے۔ کوئی بے رحم آدمی اُسوقت لمبی بات کرنے لگے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔
مسئلہ: بعض لوگ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی پروا نہیں کرتے نہ پُوچھتے ہیں کہ کون ہے کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف اور بات کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے ان لزورك عليك حقا یعنی جو شخص آپ کی ملاقات کو آئے اُس کا تم پر حق ہے کہ اس سے بات کرو اور بلاضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو اسی طرح جو آدمی ٹیلیفون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اسکا حق ہے کہ آپ اسکو جواب دیں۔
مسئلہ: کسی کے مکان پر ملاقات کے لئے جاؤ اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے

ہو تو گھر کے اندر نہ جھانکو کیونکہ استیذان کی مصلحت تو یہی ہے کہ دوسرا آدمی جو چیز آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا آپکو اسکی اطلاع نہونی چاہئے اگر پہلے ہی گھر میں جھانک کر دیکھ لیا تو یہ مصلحت فوت ہوجاوےگی حدیث میں اسکی سخت ممانعت آئی ہے (رواہ البخاری ومسلم عن سہل بن سعد الساعدی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریف یہ تھی کہ کسی کے پاس جاتے اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے ہونے کے بجائے داہیں یا بائیں کھڑے ہو کر استیذان فرماتے تھے دروازہ کے بالمقابل کھڑے ہونے سے اسلئے اجتناب فرماتے کہ اول تو اُس زمانے میں دروازوں پر پردے بہت کم تھے اور پردہ بھی ہو تو ہوا سے کھل جانیکا احتمال بہر حال ہے۔ (مظہری)

مسئلہ: جن مکانوں میں داخل ہونا آیاتِ مذکورہ میں بغیر اجازت کے ممنوع قرار دیا ہے یہ عام حالات میں ہے اگر اتفاقاً کوئی حادثہ آگ لگنے یا مکان منہدم ہونیکا پیش آجائے تو اجازت لئے بغیر اسمیں جاسکتے ہیں اور امداد کے لئے جانا چاہئے۔ (مظہری)

مسئلہ: جس شخص کو کسی نے بُلا کر بھیجا ہے اگر وہ اسکے قاصد کیساتھ ہی آگیا تو اب اسکو اجازت لینے کی ضرورت نہیں قاصد کا آنا ہی اجازت ہے۔ ہاں اگر اسوقت نہ آیا کچھ دیر کے بعد پہنچا تو اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا دعی احدکم فجاء مع الرسول فان ذلک لہ اذن، یعنی جو آدمی بلایا جائے اور وہ قاصد کیساتھ ہی آجاوے تو یہی اسکے لئے اندر آنیکی اجازت ہے (رواہ ابوداود مظہری)

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ

کہدے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذری اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اس میں

اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ

خوب ستھرائی ہے اُن کے لئے، بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں اور کہدے ایمان والیوں کو

يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠

مگر جو کھلی چیز ہے اسمیں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے

اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ

یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے

أَوْ بَنِيٓ أَخَوٰتِهِنَّ أَوْ نِسَآئِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُنَّ أَوِ التّٰبِعِينَ

یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا اپنے ہاتھ کے مال کے یا کاروبار کرنے والوں کے

غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلٰى

جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ

کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کہ جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے

زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوٓا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۱﴾

سنگار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر اے ایمان والو تاکہ تم بھلائی پاؤ

خلاصۂ تفسیر

حکم ششم عورتوں کے پردہ کے احکام | آپ مسلمان مردوں سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اُس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اسکو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ اُن کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے (اور اسکے خلاف میں آلودگی ہے زنا یا مقدمۂ زنا میں) بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں (پس خلاف کرنے والے سزایابی کے مستحق ہونگے) اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اسکو بالکل نہ دیکھیں اور جسکو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا و سحاق سب داخل ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں (زینت سے مُراد زیور جیسے کنگن، چوڑی، خلخال، بازو بند طوق، جھومر، پٹی، بالیاں وغیرہ اور ان کے مواقع سے مُراد ہاتھ، پنڈلی، بازو، گردن، سر، سینہ کان، یعنی ان سب مواقع کو سب سے چھپائے رکھیں بلحاظ ان دو استثناؤں کے جو آگے آتے ہیں اور جب ان مواقع کو اجانب سے پوشیدہ رکھنا واجب ہے جن کا ظاہر کرنا محارم کے روبرو جائز ہے جیسا آگے آتا ہے تو اور مواقع و اعضاء، جو بدن کے رہ گئے جیسے پشت و شکم وغیرہ جنکا کھولنا محارم کے روبرو بھی جائز نہیں ان کا پوشیدہ رکھنا بدلالۃ النص واجب ہوگیا۔ حاصل یہ ہوا کہ سر سے پاؤں تک تمام بدن اپنا پوشیدہ رکھیں۔ دو استثنا جن کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں سے پہلا استثناء مواقع ضرورت کے لحاظ سے ہے کہ روزمرہ کے کام کاج میں جن اعضاء کے کھولنے کی ضرورت

ہوتی ہے اُن کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اُس کی تفصیل یہ ہے) مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا (ہی) رہتا ہے (جس کے چھپانے میں ہر وقت حرج ہے مراد اس موقع زینت سے چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں اور صحیح قول کے مطابق دونوں قدم بھی کیونکہ چہرہ تو قدرتی طور پر مجمع زینت ہے اور بعض زینتیں قصداً بھی اسمیں کی جاتی ہیں مثل سُرمہ وغیرہ اور ہتھیلیاں اور انگلیاں انگوٹھی چھلے مہندی کا موقع ہے اور قدمین بھی چھلّوں اور مہندی کا موقع ہے پس ان مواقع کو اس ضرورت سے مستثنیٰ فرمایا ہے کہ ان کو کھولے بغیر کام کاج نہیں ہوسکتا اور ما ظہر کی تفسیر وجہ اور کفین کیساتھ حدیث میں آئی ہے اور قدمین کو فقہاء نے اس پر قیاس کرکے اس حکم میں شامل قرار دیا ہے) اور (خصوصاً سر اور سینہ ڈھکنے کا بہت اہتمام کریں اور) اپنے دوپٹے (جو سر ڈھانکنے کے لئے ہیں) اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں (گو سینہ قمیص سے ڈھک جاتا ہے لیکن اکثر قمیص میں سامنے سے گریبان کھلا رہتا ہے اور سینہ کی ہیئت قمیص کے باوجود ظاہر ہوتی ہے اسلئے اہتمام کی ضرورت ہوئی آگے دوسرا استثناء بیان کیا جاتا ہے جن میں محرم مردوں وغیرہ کو پردہ کے حکم مذکور سے مستثنیٰ کیا گیا ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی وعلاتی واخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد ماموں زاد وغیرہ بھائیوں پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی وعلاتی واخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر (نہ کہ چچازاد خالہ زاد بہنوں کی اولاد پر) یا اپنی (یعنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر کیونکہ کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے روح المعانی عن طاؤس ومجاہد وعطاء وسعید بن المسیب وابراہیم) یا اپنی لونڈیوں پر (مطلقاً گو وہ کافرہی ہوں کیونکہ مرد غلام کا حکم ابو حنیفہؒ کے نزدیک مثل اجنبی مرد کے ہے اُس سے بھی پردہ واجب ہے روح فی الدر عن طاؤس ومجاہد وعطاء وسعید بن المسیب ابراہیم) یا اُن مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (بوجہ حواس درست نہ ہونے کے عورتوں کیطرف) ذرا توجہ نہ ہو (تابعین کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس وقت ایسے ہی لوگ موجود تھے کذا فی الدر عن ابن عباس اور اسی حکم میں ہے ہر مسلوب العقل بس مدار حکم کا سلب حواس پر ہے نہ کہ تابع اور طفیلی ہونے پر مگر اس وقت وہ تابع ایسے ہی تھے اس لئے تابع کا ذکر کردیا گیا لقول ابن عباس رضؓ فی الدر مغفل فے عقلہ احمق لایکترث للنساء اور جو سمجھ رکھتا ہو تو وہ بہر حال اجنبی مرد ہے گو بوڑھا یا خصی یا مجبوب ہی کیوں نہ ہو اُس سے پردہ واجب ہے) یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے (مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب نہیں پہنچے اور انھیں شہوت

کی کچھ خبر نہیں پس ان سب کے سامنے وجہ و کفین و قدمین کے علاوہ زینت کے مواقع مذکورہ کا ظاہر کرنا بھی جائز ہے یعنی سر اور سینہ اور شوہر کے روبرو کسی جگہ کا بھی اخفار واجب نہیں گو خاص بدن کو دیکھنا خلاف اولیٰ ہے۔ قالت سیدتنا ام المؤمنین عائشۃ رضی اللہ عنہا ما رأیتہ منہ ولا رأی منی ذلک الموضع اوردہ فی المشکوۃ وروی بقی بن مخلد وابن عدی عن ابن عباس مرفوعا اذا جامع احدکم زوجتہ او جاریتہ فلا ینظر الی فرجہا فان ذلک یورث العمیٰ قال ابن صلاح جید الاسناد کذا فی الجامع الصغیر) اور (پردے کا یہاں تک اہتمام رکھیں کہ چلنے میں) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جاوے (یعنی زیور کی آواز غیر محرموں کے کان تک پہنچے) اور مسلمانو (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہو گئی ہو تو) تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (ورنہ معصیت مانع فلاح کامل ہو جاتی ہے)

معارف و مسائل

انسدادِ فواحش اور حفاظتِ عصمت کا ایک اہم باب پردۂ نسواں

عورتوں کے لئے حجاب اور پردہ کے احکام کی پہلی آیات وہ ہیں جو سورۂ احزاب میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آنے کے وقت نازل ہوئیں جس کی تاریخ بعض حضرات نے ۳ھ ہجری اور بعض نے ۵ھ ہجری بتائی ہے تفسیر ابن کثیر اور نیل الاوطار میں ۵ھ ہجری کو ترجیح دی ہے اور روح المعانی میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ذی قعدہ ۵ھ ہجری میں یہ عقد ہوا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی آیت حجاب اسی موقع پر نازل ہوئی۔ اور سورۂ نور کی یہ آیات قصہ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں جو غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا یہ غزوہ ۶ھ ہجری میں ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کی آیات پردہ و حجاب نزول کے اعتبار سے بعد میں آئی ہیں سورۂ احزاب کی چار آیتیں متعلقہ حجاب نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں اور شرعی پردہ کے احکام اسی وقت سے شروع ہوئے جبکہ سورۂ احزاب کی آیات نازل ہوئیں اسلئے حجاب اور پردہ کی پوری بحث تو انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں آوے گی یہاں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی جاتی ہے جو سورۂ نور میں آئی ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ، یغضوا ، غض سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنے اور پست کرنے کے ہیں (راغب) نگاہ پست اور نیچی رکھنے سے مراد نگاہ کو ان چیزوں سے پھیر لینا ہے

جن کی طرف دیکھنا شرعاً ممنوع دنا جائز ہے۔ ابن کثیر۔ ابن حبان نے یہی تفسیر فرمائی ہے اس میں غیر محرم عورت کیطرف بُری نیت سے دیکھنا تحریماً اور بغیر کسی نیت کے دیکھنا کراہۃً داخل ہے اور کسی عورت یا مرد کے ستر شرعی پر نظر ڈالنا بھی اسمیں داخل ہے (مواضع ضرورت جیسے علاج معالجہ وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں) کسی کا راز معلوم کرنے کے لئے اُس کے گھر میں جھانکنا اور تمام وہ کام جن میں نگاہ کے استعمال کرنے کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اسمیں داخل ہیں۔

وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ، شرمگاہوں کی حفاظت سے مُراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں اُن سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں۔ اسمیں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہو جائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز و حرام چیزیں داخل ہیں۔ مراد اس آیت کی ناجائز و حرام شہوت رانی اور اُس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتدا اور انتہا کو تصریحاً بیان فرما دیا باقی درمیانی مقدمات سب اسمیں داخل ہو گئے۔ فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے ان دونوں کو صراحۃً ذکر کر کے حرام کر دیا گیا اُن کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سُننا۔ ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آگئے۔

ابن کثیر نے حضرت عبیدہؓ سے نقل کیا ہے کہ کل ما عصی اللہ بہ فھو کبیرۃ وقد ذکر الطرفین یعنی جس چیز سے بھی اللہ کے حکم کی مخالفت ہوتی ہو سب کبیرہ ہی ہیں لیکن آیت میں اُن کے دو طرف ابتدا و انتہا، کو ذکر کر دیا گیا۔ ابتدا نظر اُٹھا کر دیکھنا اور انتہا زنا ہے۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

النظر سھم من سھام ابلیس مسموم من ترکھا مخافتی ابدلتہ ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ (از ابن کثیر)

نظر ایک زہر یلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیرے تو میں اسکے بدلے اسکو ایسا پختہ ایمان دونگا جسکی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اگر بلا ارادہ اچانک کسی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی نظر اُسطرف سے پھیر لو (ابن کثیر)، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے، اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلی نظر جو بلا ارادہ اچانک پڑ جائے وہ غیر اختیاری ہونے کے سبب معاف ہے ورنہ بالقصد پہلی نظر بھی معاف نہیں۔

بے ریش لڑکوں کیطرف قصداً نظر کرنا بھی اسی حکم میں ہے

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ بہت سے اسلافِ اُمت کسی امرد (بے ریش) لڑکے کیطرف دیکھتے رہنے سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے اور بہت سے علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے (غالباً یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بُری نیت اور نفس کی خواہش کے ساتھ نظر کیجائے واللہ اعلم۔ ش)

غیر محرم کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس کی تفصیل

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ الآیۃ، اس طویل آیت کے ابتدائی حصّہ میں تو وہی حکم ہے جو اس سے پہلی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں پست رکھیں یعنی نگاہ پھیر لیں۔ مردوں کے حکم میں عورتیں بھی داخل تھیں مگر اُن کا ذکر علیحدہ تاکید کے لئے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے محارم کے سوا کسی مرد کو دیکھنا حرام ہے بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لئے مطلقاً حرام ہے خواہ شہوت اور بُری نیت سے دیکھے یا بغیر کسی نیت و شہوت کے، دونوں صورتیں حرام ہیں اور اس پر حضرت اُم سلمہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک روز اُم سلمہ اور میمونہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں اچانک عبداللہ ابن اُم مکتوم نابینا صحابی آگئے اور یہ واقعہ حکم حجاب نازل ہونے کے بعد پیش آیا تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو حکم دیا کہ ان سے پردہ کرو۔ اُم سلمہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو، تم تو اُن کو دیکھ رہی ہو (رواہ ابوداؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح) اور دوسرے بعض فقہاء نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لئے مضائقہ نہیں۔ ان کا استدلال صدیقہ عائشہؓ کی اُس حدیث سے ہے جس میں مذکور ہے کہ مسجد نبوی کے احاطہ میں کچھ حبشی نوجوان عید کے روز اپنا سپاہیانہ کھیل دکھا رہے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکو دیکھنے لگے اور صدیقہ عائشہؓ نے آپ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اُن کا کھیل دیکھا اور اُسوقت تک دیکھتی رہیں جب تک کہ خود ہی اُس سے اکتا گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نظرِ شہوت تو حرام ہے اور بلا شہوت نظر کرنا بھی خلافِ اولیٰ ہے اور ایک عورت کو دوسری عورت کے مواضعِ ستر کو دیکھنا بغیر خاص ضرورتوں کے یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے کیونکہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مواضعِ ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کا کل بدن بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے۔ یہ مواضعِ ستر ہیں اُن کا چھپانا سب سے[1] فرض ہے نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجہ اولیٰ حرام ہے اور یہ آیت مذکورہ کے حکم غضِ بصر کے

---

[1] یعنی تمام نامحرموں سے، محرم کا حکم آگے آرہا ہے (محمد تقی عثمانی ۱۳۹۰ھ)

خلاف ہے کیونکہ آیت کا مطلب، جو اوپر بیان ہو چکا ہے، اس میں ہر ایسی چیز سے نظر پست رکھنا اور ہٹا لینا مراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرع میں ممنوع کیا گیا ہے، اسی میں عورت کے لئے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ الآیۃ، زینت لغوی معنے کے اعتبار سے اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مزین اور خوش منظر بنائے۔ وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی۔ یہ چیزیں جبکہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علیحدہ ہوں تو باتفاق اُمت اُن کا دیکھنا مردوں کے لئے حلال ہے جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ اُن کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے جمہور مفسرین نے اس آیت میں زینت سے مراد محلِ زینت یعنی وہ اعضاء جن میں زینت کی چیزیں زیور وغیرہ پہنی جاتی ہیں وہ مراد لئے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زینت یعنی مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کریں (کذا فی الروح) اس آیت میں جو عورت کے لئے اظہارِ زینت کو حرام قرار دیا ہے آگے اس حکم سے دو استثناء بیان فرمائے گئے ایک منظور کے اعتبار سے ہے یعنی جس کی طرف دیکھا جائے دوسرا ناظر یعنی دیکھنے والوں کے اعتبار سے۔

احکام پردہ سے استثناء پہلا استثناء، مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا ہے یعنی عورت کے لئے اپنی زینت کی کسی چیز کو مردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن چیزوں کے جو خود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں یعنی کام کاج اور نقل و حرکت کے وقت جو چیزیں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں اور عادۃً اُنکا چھپانا مشکل ہے وہ مستثنیٰ ہیں اُن کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں (ابن کثیر) مراد اس سے کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کی تفسیریں مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں جیسے برقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے یہ کپڑے زینت کے کپڑوں کو چھپانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن اوپر کے کپڑوں کے جنکا چھپانا بضرورت باہر نکلنے کے وقت ممکن نہیں جیسے برقع وغیرہ۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو نقل و حرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کے مطابق تو غیر محرم مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنا بھی جائز نہیں صرف اوپر کے کپڑے برقع وغیرہ کا اظہار بضرورت مستثنیٰ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے اس لئے فقہاء اُمت

میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ اور اُن کا غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے یا نہیں، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو اُن کا دیکھنا بھی جائز نہیں اور عورت کو اُن کا کھولنا بھی جائز نہیں اسیطرح اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ ستر عورت جو نماز میں اجماعاً اور خارج نماز علی الاصح فرض ہے اُس سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں اگر انکو کھول کر نماز پڑھی تو نماز باتفاق صحیح و درست ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے بجز اُسکے جو نقل و حرکت اور کام کاج کرنے میں عادۃً کھُل ہی جاتی ہیں انہیں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی کہ جب عورت کسی مجبوری اور ضرورت سے باہر نکلتی ہے تو برقع چادر وغیرہ کا ظاہر ہونا تو متعین ہی ہے لین دین کی ضرورت میں بعض اوقات چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں بھی کھُل جاتی ہیں تو وہ بھی معاف ہیں گناہ نہیں۔ لیکن اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ مردوں کو چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا بھی بلا ضرورت جائز ہے بلکہ مردوں کا تو وہی حکم ہے کہ نگاہ پست رکھیں اگر عورت کہیں چہرہ اور ہاتھ کھولنے پر مجبور ہو جائے تو مردوں کو لازم ہے کہ بلا عذر شرعی اور بلا ضرورت کے اسکی طرف نہ دیکھیں۔ اس توجیہ میں دونوں روایتیں اور تفسیریں جمع ہو جاتی ہیں۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ غیر محرم عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر کرنا بھی بغیر ضرورت صحیحہ کے جائز نہیں۔ اور زواجر میں ابن حجر مکی شافعیؒ نے امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے کہ اگرچہ عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں سترِ عورت کے فرض میں داخل نہیں ان کو کھول کر بھی نماز ہو جاتی ہے مگر غیر محرم مردوں کو ان کا دیکھنا بلا ضرورتِ شرعیہ جائز نہیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جن فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے وہ بھی اسپر متفق ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حُسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ ہے اور زمانہ فتنہ و فساد اور غلبۂ ہوی اور غفلت کا ہے اس لئے بجز مخصوص ضرورتوں کے مثلاً علاج معالجہ یا کوئی خطرہ شدیدہ وغیرہ عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے اور مردوں کو اُس کیطرف قصداً نظر کرنا بھی بغیر ضرورت شرعیہ کے جائز نہیں۔

آیت مذکورہ میں زینتِ ظاہرہ کے استثناء کے بعد ارشاد ہے وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ یعنی آنچل مار لیا کریں اپنے دوپٹوں کا اپنے سینوں پر۔ خُمُر، خمار کی جمع ہے اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورت سر پر استعمال کرے اور اُس سے گلا اور سینہ بھی چھپ جائے۔ جیوب جیب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گریبان۔ چونکہ زمانہ قدیم سے گریبان سینہ ہی پر ہونے کا معمول ہے

اس لئے جیوب کے چھپانے سے مراد سینہ کا چھپانا ہے۔ مذکورہ آیت میں اظہارِ زینت کی ممانعت تھی اس جملہ میں اخفاءِ زینت کی تاکید اور اس کی ایک صورت کا بیان ہے جسکی اصل وجہ ایک رسمِ جاہلیت کا مٹانا ہے زمانہ جاہلیت میں عورتیں دوپٹہ سر پر ڈال کر اسکے دونوں کنارے پُشت پر چھوڑ دیتی تھیں جس سے گریبان اور گلا اور سینہ اور کان کھلے رہتے تھے اس لئے مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ دوپٹے کے دونوں پلّے ایک دوسرے پر اُلٹ لیں تاکہ یہ سب اعضاء چھپ جائیں (رواہ ابن ابی حاتم عن ابن جبیر۔ روح) آگے دوسرا استثناء اُن مردوں کا بیان کیا گیا ہے جن سے شرعاً پردہ نہیں جس کے دو سبب ہیں اوّل تو ان مردوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اُن سے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں وہ محارم ہیں جن کی طبائع کو حق تعالیٰ نے خلقۃً ایسا بنایا ہے کہ وہ ان عورتوں کی عصمت کے محافظ ہوتے ہیں اُن سے خود کوئی فتنہ کا احتمال نہیں۔ دوسرے ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے کی ضرورت بھی سہولت پیدا کرنے کی مقتضی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے سوا دوسرے محارم کو جو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ احکامِ حجاب پردہ سے استثناء ہے۔ سترِ عورت سے استثنا نہیں عورت کا جو بدن ستر میں داخل ہے جسکا کھولنا نماز میں جائز نہیں اُس کا دیکھنا محارم کے لئے بھی جائز نہیں۔[1]

اس آیت میں آٹھ قسم کے محرم مردوں کا اور چار دوسری اقسام کا پردہ سے استثناء کیا گیا ہے اور سورۂ احزاب کی آیت جو نزول میں اس سے مقدم ہے اسمیں صرف سات اقسام کا ذکر ہے پانچ کا اضافہ سُورۂ نور کی آیت میں کیا گیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تنبیہ | یاد رہے کہ اس جگہ لفظ محرم عام معنی میں استعمال ہوا ہے جو شوہر پر بھی مشتمل ہے فقہاء کی اصطلاح میں محرم کی جو خاص تفسیر ہے کہ جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو وہ یہاں مراد نہیں۔ تفصیل ان بارہ مستثنیات کی جو سورۂ نور کی مذکورہ آیت میں ہے یہ ہے۔ سب سے پہلے شوہر ہے جس سے بیوی کے کسی عضو کا پردہ نہیں، اگرچہ اعضاءِ مخصوصہ کو بلا ضرورت دیکھنا خلافِ اَولیٰ ہے حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا ما نظرت منہ ولا رأی منی۔ یعنی نہ آپ نے میرے جسم کے عضوِ مخصوص کو دیکھا نہ میں نے آپ کے۔

دوسرے اپنے باپ ہیں، جس میں دادا، پردادا سب داخل ہیں تیسرے شوہر کا باپ ہے اسمیں بھی دادا، پردادا سب داخل ہیں۔ چوتھے اپنے لڑکے جو اپنی اولاد ہیں۔ پانچویں شوہر کے لڑکے جو کسی دوسری بیوی سے ہوں۔ چھٹے اپنے بھائی، اسمیں حقیقی بھی داخل ہیں اور باپ شریک یعنی علاتی اور ماں شریک یعنی اخیافی بھی۔ لیکن ماموں، خالہ یا چچا، تایا اور پھوپی کے لڑکے جن کو عام عرف میں بھائی کہا جاتا ہے وہ اسمیں داخل نہیں وہ غیر محرم ہیں۔ ساتویں بھائیوں کے لڑکے، یہاں بھی صرف حقیقی یا علاتی یا اخیافی بھائی کے لڑکے مراد ہیں دوسرے عرفی بھائیوں کے لڑکے شامل نہیں۔ آٹھویں بہنوں کے لڑکے۔ اسمیں بھی بہنوں سے حقیقی اور علاتی اخیافی بہنیں

---

[1] یہاں مسئلے میں تھوڑی سی تفصیل ہے جو بیان ہونے سے رہ گئی ہے۔ وہ تفصیل یہ ہے کہ عورت کے ستر کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جو ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہے یعنی پیٹ اور کمر، محرم کے لئے بھی دیکھنا جائز [illegible] اس کے علاوہ بدن کے دوسرے حصے، مثلاً سر، کلائیاں، پنڈلی وغیرہ محرم کے سامنے کھولی جا سکتی ہے، [illegible] زمانہ خوف فتنہ کا ہے۔ اس لئے بلا ضرورت کھولنے کی عادت ڈالنا مناسب نہیں۔ شاید اسی وجہ سے حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible] ستر ہی کو محرم کا ستر قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم (محمد تقی عثمانی ۱۳۹۱ھ)

مراد ہیں۔ ماموں زاد چچا زاد بہنیں داخل نہیں یہ آٹھ قسمیں تو محارم کی ہیں۔

نویں قسم اَوْ نِسَآئِہِنَّ یعنی اپنی عورتیں جس سے مراد مسلمان عورتیں ہیں کہ اُن کے سامنے بھی وہ تمام اعضاء کھولنا جائز ہے جو اپنے باپ بیٹوں کے سامنے کھولے جا سکتے ہیں اور یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ استثناء احکام حجاب و پردہ سے ہے، احکام ستر سے نہیں۔ اس لئے جو اعضاء ایک عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے نہیں کھول سکتی اُن کا کھولنا کسی مسلمان عورت کے سامنے بھی جائز نہیں۔ علاج معالجہ وغیرہ کی ضرورتیں مستثنیٰ ہیں۔

نِسَآئِہِنَّ، مسلمان عورتوں کی قید سے یہ معلوم ہوا کہ کافر مشرک عورتوں سے بھی پردہ واجب ہے وہ غیر محرم مردوں کے حکم میں ہیں۔ ابن کثیر نے حضرت مجاہدؒ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ کسی کافر عورت کے سامنے اپنے اعضاء کھولے لیکن احادیث صحیحہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں کافر عورتوں کا ازواج مطہرات کے پاس جانا ثابت ہے اسلئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے بعض نے کافر عورتوں کو مثل غیر محرم مرد کے قرار دیا ہے بعض نے اس معاملہ میں مسلمان اور کافر دونوں قسم کی عورتوں کا ایک ہی حکم رکھا ہے کہ اُن سے پردہ نہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ نِسَآئِہِنَّ میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور سلف صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہیں۔ روح المعانی میں مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ نے اسی قول کو اختیار فرما کر کہا ہے۔

ھذا القول اوفق بالناس الیوم فانہ لا یکاد یمکن احتجاب المسلمات عن الذمیات (روح المعانی)	یہی قول آجکل لوگوں کے مناسب حال ہے کیونکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کا کافر عورتوں سے پردہ تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

دسویں قسم اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُنَّ ہے یعنی وہ جو ان عورتوں کے مملوک ہوں۔ ان الفاظ کے عموم میں تو غلام اور لونڈیاں دونوں داخل ہیں لیکن اکثر ائمہ فقہاء کے نزدیک اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، غلام مرد اس میں داخل نہیں۔ اُن سے عام محارم کی طرح پردہ واجب ہے۔ حضرت سعید بن مسیبؒ نے اپنے آخری قول میں فرمایا لا یغرنکم اٰیۃ النور فانہ فی الاناث دون الذکور یعنی تم لوگ کہیں سورۂ نور کی اس آیت سے مغالطہ میں نہ پڑ جاؤ کہ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُنَّ کے الفاظ عام ہیں۔ مرد غلاموں کو بھی شامل ہیں لیکن واقعہ ایسا نہیں یہ آیت صرف عورتوں یعنی کنیزوں کے حق میں ہے مرد غلام اسمیں داخل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ غلام مرد کے لئے اپنی آقا عورت کے بال دیکھنا جائز نہیں (روح المعانی) باقی رہا یہ سوال کہ جب لفظ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُنَّ سے صرف عورتیں لونڈیاں ہی مُراد ہیں تو وہ اس سے

پہلے لفظ نسائہن میں داخل ہیں ان کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی اسکا جواب جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ لفظ نسائہن اپنے ظاہر کے اعتبار سے صرف مسلمان عورتوں کے لئے ہے۔ اور مملوکہ باندیوں میں اگر کافر بھی ہوں تو اُن کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یہ لفظ علیحدہ لایا گیا ہے۔

گیارھویں قسم اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد وہ مغفل اور بدحواس قسم کے لوگ ہیں جن کو عورتوں کی طرف کوئی رغبت و دلچسپی ہی نہ ہو (ابن کثیر) اور یہی مضمون ابن جریر نے ابوعبداللہؒ، ابن جُبیرؒ، ابن عطیہؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے اسلئے اس سے مراد وہ مرد ہیں جو عورتوں کیطرف نہ کوئی رغبت و شہوت رکھتے ہوں، نہ اُن کے اوصافِ حُسن اور حالات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بیان کردیں بخلاف مخنث قسم کے لوگوں کے جو عورتوں کے اوصافِ خاص سے تعلق رکھتے ہوں اُن سے بھی پردہ واجب ہے جیسا کہ صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک مخنث ازواج مطہرات کے پاس آیا کرتا تھا اور اُمہات المؤمنین اسکو غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ جو اس آیت میں مذکور ہے داخل سمجھ کر اُس کے سامنے آجاتی تھیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اُس کو دیکھا اور اُس کی باتیں سُنیں تو گھروں میں داخل ہونے سے اسکو روک دیا (رواہ مسلم)

اسی لئے ابن حجر مکیؒ نے شرح منہاج میں فرمایا ہے کہ مرد اگرچہ عنین (نامرد) یا مجبوب (مقطوع العضو) یا بہت بوڑھا ہو وہ اس غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ میں داخل نہیں ان سب سے پردہ واجب ہے۔ اس میں غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ کیساتھ جو التّٰبِعِيْنَ کا لفظ مذکور ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مغفل بدحواس لوگ جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں چلے جائیں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اسکا ذکر صرف اسلئے کیا گیا کہ اسوقت ایسے مغفل قسم کے کچھ مرد ایسے ہی تھے جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں چلے جاتے تھے اصل مدار حکم کا ان کے مغفل بدحواس ہونے پر ہے تابع اور طفیلی ہونے پر نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

بارھویں قسم اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ ہے۔ اس سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب بھی نہیں پہنچے اور عورتوں کے مخصوص حالات و صفات اور حرکات و سکنات سے بالکل بے خبر ہوں۔ اور جو لڑکا ان اُمور سے دلچسپی لیتا ہو وہ مراہق یعنی قریب البلوغ ہے اُس سے پردہ واجب ہے (ابن کثیر) امام جصاص رحمہ نے فرمایا کہ یہاں طفل سے مراد وہ بچے ہیں جو مخصوص معاملات کے لحاظ سے عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے ہوں (ذکرہ عن المجاہد) پردہ سے مستثنیات کا بیان ختم ہوا۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ یعنی عورتوں پر لازم ہو

کہ اپنے پاؤں اتنی زور سے نہ رکھیں جس سے زیور کی آواز نکلے اور انکی مخفی زینت مردوں پر ظاہر ہو۔

زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا جائز نہیں

شروع آیت میں عورتوں کو اپنی زینت غیر مردوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا، آخر میں اسکی مزید تاکید ہے کہ مواضع زینت سر اور سینہ وغیرہ کا چھپانا تو واجب تھا ہی۔ اپنی مخفی زینت کا اظہار خواہ کسی ذریعہ سے ہو وہ بھی جائز نہیں۔ زیور کے اندر خود کوئی چیز ایسی ڈالی جائے جس سے وہ بجنے لگے یا ایک زیور دوسرے زیور سے ٹکرا کر بجے یا پاؤں زمین پر اس طرح مارے جس سے زیور کی آواز نکلے اور غیر محرم مرد سُنیں یہ سب چیزیں اس آیت کی رُو سے ناجائز ہیں۔ اور اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا اس آیت سے ناجائز ثابت ہوا تو خود عورت کی آواز کا سُنانا اُس سے بھی زیادہ سخت اور بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔ اس لئے عورت کی آواز کو بھی ان حضرات نے ستر میں داخل قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نوازل میں فرمایا کہ عورتوں کو جہاں تک ممکن ہو قرآن کی تعلیم بھی عورتوں ہی سے لینا چاہئے۔ مردوں سے تعلیم لینا بدرجۂ مجبوری جائز ہے۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نماز میں اگر کوئی سامنے سے گزرنے لگے تو مرد کو چاہئے کہ بلند آواز سے سُبحان اللہ کہہ کر گزرنے والے کو متنبہ کر دے مگر عورت آواز نہ نکالے بلکہ اپنی ایک ہتھیلی کی پُشت پر دوسرا ہاتھ مار کر اس کو متنبہ کرے۔

عورت کی آواز کا مسئلہ

کیا عورت کی آواز فی نفسہٖ ستر میں داخل ہے اور غیر محرم کو آواز سُنانا جائز ہے؟ اس معاملے میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کی کتب میں عورت کی آواز کو ستر میں داخل نہیں کیا گیا۔ حنفیہ کے نزدیک بھی مختلف قول ہیں۔ ابن ہمام نے نوازل کی روایت کی بناء پر ستر میں داخل قرار دیا ہے اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عورت کی اذان مکروہ ہے لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات نزول حجاب کے بعد بھی پسِ پردہ غیر محارم سے بات کرتی تھیں اس مجموعہ سے راجح اور صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس موقع اور جس محل میں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونیکا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے جہاں یہ نہو جائز ہے (جصاص) اور احتیاط اسی میں ہے کہ بلا ضرورت عورتیں پس پردہ بھی غیر محرموں سے گفتگو نہ کریں واللہ اعلم

خوشبو لگا کر باہر نکلنا

اسی حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو خوشبو لگا کر نہ نکلے کیونکہ وہ بھی اس کی مخفی زینت ہے غیر محرم تک یہ خوشبو پہنچے تو ناجائز ہے ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے جس میں خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کو بُرا کہا گیا ہے۔

مزین برقع پہن کر نکلنا بھی ناجائز ہے

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز تک کو

قرآن نے اظہارِ زینت میں دخیل قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزین رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اسلئے اسکا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے الا بضرورت (جصاص)

وَتُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ، یعنی توبہ کرو اللہ سے تم سب کے سب اے مومن بندو۔ اس آیت میں اول مردوں کو نظریں پست رکھنے کا حکم پھر عورتوں کو ایسا ہی حکم پھر عورتوں کو غیر محرموں سے پردہ کرنے کا حکم الگ الگ دینے کے بعد اس جملہ میں سب مرد و عورت کو شامل کر کے ہدایت کی گئی ہے کہ شہوتِ نفسانی کا معاملہ دقیق ہے دوسروں کو اس پر اطلاع ہونا مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ پر ہر ہر چھپا ہوا اور کھلا ہوا یکساں ظاہر ہے اسلئے اگر کسی سے احکامِ مذکورہ میں کسی وقت کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اس پر لازم ہے کہ اس سے توبہ کرے گزشتہ پر ندامت کے ساتھ اللہ سے مغفرت مانگے اور آئندہ اُسکے پاس نہ جانے کا عزم مصمم کرے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ
اور نکاح کر دو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
اگر وہ ہوں گے مفلس اللہ اُن کو غنی کر دے گا اپنے فضل سے اور اللہ سمائی والا ہے

عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى
سب کچھ جانتا ہے، اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا جب تک کہ

يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ
مقدور دے اُن کو اللہ اپنے فضل سے

خلاصۂ تفسیر

(احرار میں سے) جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور بے نکاح ہونا بھی عام ہے خواہ ابھی تک نکاح ہوا ہی نہ ہو یا ہونے کے بعد بیوی کی موت یا طلاق کے سبب بے نکاح رہ گئے) تم اُن کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس (نکاح) کے لائق ہوں (یعنی حقوقِ نکاح ادا کر سکتے ہوں) ان کا بھی (نکاح کر دیا کرو محض اپنی مصلحت سے اُن کی خواہشِ نکاح کی مصلحت کو فوت نہ کیا کرو اور احرار کے نکاح پیغام

دینے والے کے فقر و افلاس پر نظر کر کے انکار نہ کر دیا کرو جبکہ اُسمیں کسب معاش کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ) اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالدار نہ ہونے کیوجہ سے نکاح سے انکار کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ نکاح ہو گیا تو خرچ بڑھ جائے گا جو موجودہ حالت میں غنی و مالدار ہے وہ بھی نکاح کرنے سے محتاج و مفلس ہو جائے گا کیونکہ رزق کا مدار اصل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے وہ کسی مالدار کو بغیر نکاح کے بھی فقیر و محتاج کر سکتا ہے ، اور کسی غریب نکاح والے کو نکاح کے باوجود فقر و افلاس سے نکال سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے (جس کو چاہے مالدار کر دے اور سب کا حال) خوب جاننے والا ہے (جس کو غنی کرنا مقتضائے حکمت و مصلحت ہو گا اسکو غنی کر دیا جاوے گا اور جس کے محتاج و فقیر رہنے ہی میں اسکی مصلحت ہے اُس کو فقیر رکھا جائے گا) اور (اگر کسی کو اپنے فقر و افلاس کیوجہ سے نکاح کا سامان میسر نہ ہو تو) ایسے لوگوں کو کہ جنکو نکاح کا مقدور نہیں اُن کو چاہئے کہ (اپنے نفس کو) قابو میں رکھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (اگر چاہے تو) انکو اپنے فضل سے غنی کر دے (اُسوقت نکاح کر لیں) ۔

معارف و مسائل

بعض احکام نکاح پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق عفت و عصمت کی حفاظت اور فواحش و بے حیائی کی روک تھام سے ہے ۔ اس سلسلہ میں زنا اور اُسکے متعلقات کی شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا پھر استیذان کا، پھر عورتوں کے پردے کا ۔ شریعت اسلام چونکہ ایک معتدل شریعت ہے جس کے احکام سب ہی اعتدال پر اور انسان کے فطری جذبات و خواہشات کی رعایت کیساتھ تعدی اور حد سے نکلنے کی ممانعت کے اصول پر دائر ہیں اسلئے جب ایک طرف انسان کو ناجائز شہوت رانی سے سختی کیساتھ روکا گیا تو ضروری تھا کہ فطری جذبات و خواہشات کی رعایت سے اسکا کوئی جائز اور صحیح طریقہ بھی بتلایا جائے ۔ اسکے علاوہ بقاءِ نسل کا عقلی اور شرعی تقاضا بھی یہی ہے کہ کچھ حدود کے اندر رہ کر مرد و عورت کے اختلاط کی کوئی صورت تجویز کی جائے ۔ اسی کا نام قرآن و سنت کی اصطلاح میں نکاح ہے ۔ آیتِ مذکورہ میں اسکے متعلق آزاد عورتوں کے اولیاء اور کنیزوں غلاموں کے آقاؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ اُن کا نکاح کر دیا کریں ۔ وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ الآیۃ

اَیَامٰی ، اَیِّم کی جمع ہے جو ہر اُس مرد و عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکا نکاح موجود نہ ہو ۔ خواہ اوّل ہی سے نکاح نہ کیا ہو یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت سے یا طلاق

سے نکاح ختم ہو چکا ہو۔ ایسے مردوں و عورتوں کے نکاح کے لئے اُن کے اولیار کو حکم دیا گیا ہے
کہ وہ اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔

آیتِ مذکورہ کے طرزِ خطاب سے اتنی بات تو باتفاق ائمہ فقہار ثابت ہے کہ نکاح کا
مسنون اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ خود اپنا نکاح کرنے کے لئے کوئی مرد یا عورت بلا واسطہ
اقدام کے بجائے اپنے اولیار کے واسطے سے یہ کام انجام دے۔ اسمیں دین و دُنیا کے بہت
سے مصالح اور فوائد ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملہ میں کہ لڑکیاں اپنے نکاح کا معاملہ خود طے
کریں، یہ ایک قسم کی بے حیائی بھی ہے اور اسمیں فواحش کے راستے کُھل جانے کا خطرہ بھی۔ اسی لئے
بعض روایاتِ حدیث میں عورتوں کو خود اپنا نکاح بلا واسطہ ولی کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ حکم ایک خاص سنّت اور شرعی ہدایت
کی حیثیت میں ہے اگر کوئی بالغ لڑکی اپنا نکاح بغیر اجازت ولی کے اپنے کفو میں کرے تو نکاح صحیح
ہو جائے گا اگرچہ خلاف سُنّت کرنے کیوجہ سے وہ موجبِ ملامت ہوگی جبکہ اُسنے کسی مجبوری سے
اس پر اقدام نہ کیا ہو۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اُسکا نکاح ہی باطل کالعدم ہوگا جب تک
ولی کے واسطہ سے نہ ہو۔ یہ جگہ اختلافی مسائل کی مکمل تحقیق اور دونوں فقہار کے دلائل بیان کرنے
کی نہیں لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ مذکورہ آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح میں
اولیار کا واسطہ ہونا چاہئیے باقی یہ صورت کہ کوئی بلا واسطہ اولیار نکاح کرے تو اُس کا کیا حکم ہوگا
یہ آیتِ قرآن اُس سے ساکت ہے۔ خصوصاً اسوجہ سے بھی کہ لفظ ایامیٰ میں بالغان مرد و عورت
دونوں داخل ہیں اور بالغ لڑکوں کا نکاح بلا واسطہ ولی سب کے نزدیک صحیح ہو جاتا ہے اسکو کوئی
باطل نہیں کہتا۔ اسی طرح ظاہر یہ ہے کہ لڑکی بالغ اگر اپنا نکاح خود کرے تو وہ بھی صحیح اور منعقد
ہو جائے۔ ہاں خلافِ سنت کام کرنے پر ملامت دونوں کو کی جائے گی۔

نکاح واجب ہے یا سنت یا مختلف حالات میں حکم مختلف ہے

اس پر ائمہ مجتہدین تقریباً سبھی متفق ہیں کہ جس شخص کو نکاح نہ کرنے
کی صورت میں غالب گمان یہ ہو کہ وہ حدودِ شریعت پر قائم نہیں
رہ سکے گا گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اور نکاح کرنے پر اُس کو قدرت بھی ہو کہ اُسکے وسائل
موجود ہوں تو ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض یا واجب ہے جب تک نکاح نہ کریگا گنہگار رہے گا۔
ہاں اگر نکاح کے وسائل موجود نہیں کہ کوئی مناسب عورت میسر نہیں یا اسکے لئے مہر معجل وغیرہ کی
حد تک ضروری خرچ اُسکے پاس نہیں تو اسکا حکم اگلی آیت میں آیا ہے کہ اسکو چاہئیے کہ وسائل
کی فراہمی کی کوشش کرتا رہے اور جب تک وہ میسر نہ ہوں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور صبر

کرنے کی کوشش کرے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ مُسلسل روزے رکھے۔ اس سے غلبۂ شہوت کو سکون ہو جاتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عکاف رضی سے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے پوچھا کہ کیا تمہاری زوجہ ہے انھوں نے عرض کیا نہیں۔ پھر پوچھا کوئی شرعی لونڈی ہے کہا کہ نہیں پھر آپ نے دریافت کیا کہ تم صاحبِ وسعت ہو یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ صاحبِ وسعت ہوں۔ مُراد یہ تھی کہ کیا تم نکاح کے لئے ضروری نفقات کا انتظام کر سکتے ہو جس کے جواب میں اُنھوں نے اقرار کیا۔ اس پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ پھر تو تم شیطان کے بھائی ہو اور فرمایا کہ ہماری سُنّت نکاح کرنا ہے۔ تم میں بدترین آدمی وہ ہیں جو بے نکاح ہوں اور تمھارے مُردوں میں سب سے رذیل وہ ہیں جو بے نکاح مرگئے (مظہری)

اس روایت کو بھی جمہور فقہار نے اُسی حالت پر محمول فرمایا ہے جبکہ نکاح نہ کرنیکی صُورتمیں گناہ کا خطرہ غالب ہو۔ عکاف رضی کا حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کو معلوم ہوگا کہ وہ صبر نہیں کر سکتے اسی طرح مسند احمد میں حضرت انس رضی سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے نکاح کرنے کا حکم دیا اور تبتّل یعنی بے نکاح رہنے سے سختی کیساتھ منع فرمایا (مظہری) اسی طرح کی اور بھی روایاتِ حدیث ہیں۔ ان سب کا محمل جمہور فقہار کے نزدیک وہی صورت ہے کہ نکاح نہ کرنے میں ابتلارِ معصیت کا خطرہ غالب ہو۔ اسی طرح اس پر بھی تقریباً سبھی فقہار کا اتفاق ہے کہ جس شخص کو بظنِ غالب یہ معلوم ہو کہ وہ نکاح کرنے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے گا مثلاً بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قدرت نہیں اُس پر ظلم کا مرتکب ہوگا یا اسکے لئے نکاح کرنے کی صورت میں کوئی دوسرا گناہ یقینی طور پر لازم آجائیگا ایسے شخص کو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔

اب اُس شخص کا حکم باقی رہا جو حالت اعتدال میں ہے کہ نہ تو ترکِ نکاح سے گناہ کا خطرہ قوی ہے اور نہ نکاح کی صورت میں کسی گناہ کا اندیشہ غالب ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں فقہار کے اقوال مختلف ہیں کہ اسکو نکاح کرنا افضل ہے یا ترکِ نکاح کرکے نفلی عبادات میں مشغول ہونا افضل ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک نفلی عبادات میں لگنے سے افضل نکاح کرنا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اشتغالِ عبادت افضل ہے۔ وجہ اس اختلاف کی اصل میں یہ ہے کہ نکاح اپنی ذات کے اعتبار سے تو ایک مباح ہے جیسے کھانا، پینا، سونا وغیرہ ضروریاتِ زندگی سب مباح ہیں اسمیں عبادت کا پہلو اس نیت سے آجاتا ہے کہ اسکے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو گناہ سے بچاسکے گا اور اولاد صالح پیدا ہوگی تو اسکا بھی ثواب ملے گا۔ اور ایسی نیک نیت سے جو مباح کام بھی انسان کرتا ہے وہ اُس کے لئے بالواسطہ عبادت بنجاتی ہے کھانا پینا اور سونا بھی اسی

نیت سے عبادت ہوجاتا ہے اور اشتغال بالعبادت اپنی ذات میں عبادت ہے۔ اسلئے امام شافعیؒ عبادت کے لئے خلوت گزینی کو نکاح سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک نکاح میں عبادت کا پہلو بہ نسبت دوسرے مباحات کے غالب ہے احادیث صحیحہ میں اُس کو سُنّت المرسلین اور اپنی سنّت قرار دے کر تاکیدات بکثرت آئی ہیں۔ اُن روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے اتنا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نکاح عام مباحات کی طرح مُباح نہیں بلکہ سُنّت انبیار ہے جس کی تاکیدات بھی حدیث میں آئی ہیں صرف نیت کی وجہ سے عبادت کی حیثیت اسمیں نہیں بلکہ سُنّتِ انبیار ہونے کی حیثیت سے بھی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس طرح تو کھانا پینا سونا بھی سُنّتِ انبیار ہے کہ سبنے ایسا کیا ہے مگر جواب واضح ہے کہ ان چیزوں پر سب انبیار کا عمل ہونے کے باوجود یہ کسی نے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں آیا کہ کھانا پینا اور سونا سُنّتِ انبیار ہے بلکہ اس کو عام انسانی عادت کے تابع انبیار کا عمل قرار دیا ہے بخلاف نکاح کے کہ اسکو صراحۃً سُنّت المرسلین اور اپنی سُنّت فرمایا ہے۔

تفسیر مظہری میں اس موقع پر ایک معتدل بات یہ کہی ہے کہ جو شخص حالتِ اعتدال میں ہو کہ نہ غلبۂ شہوت سے مجبور و مغلوب ہو اور نہ نکاح کرنے سے کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ یہ شخص اگر یہ محسوس کرے کہ نکاح کرنے کے باوجود نکاح اور اہل و عیال کی مشغولیت میرے لئے کثرتِ ذکراللہ اور توجہ الی اللہ سے مانع نہیں ہوگی تو اُسکے لئے نکاح افضل ہے اور انبیاء علیہم السلام اور صلحارِ اُمت کا عام حال یہی تھا۔ اور اگر اسکا اندازہ یہ ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کے مشاغل اسکو دینی ترقی، کثرتِ ذکر وغیرہ سے روکدیں گے تو بحالتِ اعتدال اُسکے لئے عبادت کے لئے خلوت گزینی اور ترکِ نکاح افضل ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس کی تطبیق پر شاہد ہیں اُن میں ایک یہ ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اسمیں یہی ہدایت ہے کہ انسان کے مال و اولاد اُس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کردینے کا سبب نہ بننے چاہئیں۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ، یعنی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صالح ہوں اُن کے نکاح کرادیا کرو۔ یہ خطاب اُن کے آقاؤں اور مالکوں کو ہے اس جگہ صالحین کا لفظ اپنے لُغوی معنے میں آیا ہے یعنی انمیں جو شخص نکاح کی صلاحیت و استطاعت رکھتا ہو اسکا نکاح کرادینے کا حکم انکے آقاؤں کو دیا گیا ہے مُراد اس صلاحیت سے وہی ہے کہ بیوی کے حقوقِ زوجیت اور نفقہ و مہر معجل ادا کرنے کے قابل ہوں۔ اور اگر صالحین کو معروف یعنی نیک لوگوں کے معنے میں لیا جائے تو پھر انکی تخصیص بالذکر اسوجہ سے ہوگی کہ نکاح کا اصل مقصد حرام سے بچنے کا وہ صالحین ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہرحال اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صلاحیت نکاح کی رکھنے والے ہوں اُنکے نکاح

کا حکم اُن کے آقاؤں کو دیا گیا ہے اور مُراد اس سے یہ ہے کہ اگر وہ اپنی نکاح کی ضرورت ظاہر کریں اور خواہش کریں کہ اُن کا نکاح کر دیا جائے تو آقاؤں پر بعض فقہاء کے نزدیک واجب ہوگا کہ انکے نکاح کر دیں اور جمہور فقہاء کے نزدیک اُن پر لازم ہے کہ انکے نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالیں بلکہ اجازت دیدیں کیونکہ مملوک غلاموں اور کنیزوں کا نکاح بغیر مالکوں کی اجازت کے نہیں ہو سکتا۔ تو یہ حکم ایسا ہی ہوگا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ یعنی عورتوں کے اولیاء پر لازم ہے کہ اپنی زیر ولایت عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں اور جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص منگنی لیکر آوے اور اخلاق آپکو پسند ہوں تو ضرور نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ اور وسیع پیمانے کا فساد پیدا ہو جائے گا۔ (رواہ الترمذی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حکم آقاؤں کو اس لئے دیا گیا کہ وہ اجازت نکاح دینے میں کوتاہی نہ کریں، خود نکاح کرانا انکے ذمہ واجب ہو یہ ضروری نہیں۔ واللہ اعلم

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں اُن غریب فقیر مسلمانوں کیلئے بشارت ہے جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وسائل مالیہ انکے پاس نہیں کہ جب وہ اپنے دین کی حفاظت اور سُنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی نیت صالحہ سے نکاح کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کو مالی غنا بھی عطا فرما دیں گے اور اسمیں اُن لوگوں کو بھی ہدایت ہے جن کے پاس ایسے غریب لوگ منگنی لیکر جائیں کہ وہ محض انکے فی الحال غریب فقیر ہونیکی وجہ سے رشتہ سے انکار نہ کر دیں۔ مال آنے جانے والی چیز ہے اصل چیز صلاحیت عمل ہے اگر وہ انمیں موجود ہے تو اُن کے نکاح سے انکار نہ کریں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو نکاح کرنیکی ترغیب دی ہے اسمیں آزاد اور غلام سب کو داخل فرمایا ہے اور نکاح کرنے پر اُن سے غنا کا وعدہ فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) اور ابن ابی حاتم نے حضرت صدیق اکبرؓ سے نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم نکاح کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو تو اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ غناء عطا فرمانے کا کیا ہے وہ پورا فرما دیں گے پھر یہ آیت پڑھی۔ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم غنی ہونا چاہتے ہو تو نکاح کر لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ (رواہ ابن جریر و ذکر البغوی عن عمرؓ نحوہ۔ ابن کثیر)

تنبیہ تفسیر مظہری میں ہے کہ مگر یہ یاد رہے کہ نکاح کرنیوالے کو غنی اور مال عطا فرمانیکا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی حال میں ہے جبکہ نکاح کرنے والے کی نیت اپنی عفت کی حفاظت اور سُنّت پر عمل ہو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد ہو اسکی دلیل اگلی آیت کے یہ الفاظ ہیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ یعنی جو لوگ مال و اسباب کے لحاظ سے نکاح پر قدرت نہیں رکھتے، اور نکاح کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بیوی کے حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو جائیں گے اُن کو چاہیے کہ عفت اور صبر کیساتھ اسکا انتظار کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے۔ اور اس صبر کے لئے ایک تدبیر بھی حدیث میں یہ بتلا دی گئی ہے کہ کثرت سے روزے رکھا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو اتنے مالی وسائل عطا فرمائیں گے جن سے نکاح پر قدرت ہو جائے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ
اور جو لوگ چاہیں لکھت آزادی کی مال دے کر اُن میں سے کہ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں تو اُنکو لکھ کر دے دو
عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا
اگر سمجھو ان میں کچھ نیکی اور دو اُن کو اللہ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے اور نہ
تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ
زبردستی کرو اپنی چھوکریوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا کہ تم کمانا چاہو اسباب دُنیا کی
الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۳)
زندگانی کا اور جو کوئی اُن پر زبردستی کرے گا تو اللہ اُن کی بے بسی کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اور تمہارے مملوکوں میں سے (غلام ہوں یا لونڈیاں) جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو (بہتر ہے کہ) اُن کو مکاتب بنا دیا کرو اگر اُن میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور اللہ کے (دیئے ہوئے) مال میں سے اُن کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے (تاکہ جلدی آزاد ہو سکیں) اور اپنی مملوکہ لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو (بالخصوص) جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں (اور تمہاری یہ ذلیل حرکت) محض اسلئے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (یعنی مال) تم کو حاصل ہو جائے اور جو شخص اُن کو مجبور کریگا (اور وہ بچنا چاہیں گی) تو اللہ تعالیٰ اُن کے مجبور کئے جانے کے بعد (اُن کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مملوک غلاموں اور لونڈیوں کو گر نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو آقاؤں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اُن کو نکاح کی اجازت دینی چاہیے اپنی مصلحت کے لئے اُن کے طبعی مصالح کو موخر

نہ کریں یہ اُن کے لئے افضل اور بہتر ہے۔ خلاصہ اس ہدایت کا اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کیساتھ حسن معاملہ اور اُن کو تکلیف سے بچانا ہے۔ اسکی مناسبت سے آیتِ مذکورہ میں ایک دوسری ہدایت انکے آقاؤں کے لئے یہ دی گئی ہے کہ اگر یہ مملوک غلام یا لونڈی آقاؤں سے معاملہ مکاتبت کا کرنا چاہیں تو ان کی اس خواہش کو پورا کر دینا بھی آقاؤں کے لئے افضل اور مستحب موجب ثواب ہے۔ صاحبِ ہدایہ اور عامۂ فقہاء نے اس حکم کو حکم استحباب ہی قرار دیا ہے یعنی آقا کے ذمہ واجب تو نہیں کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنا دے لیکن مستحب اور افضل ہے۔ اور معاملہ مکاتبت کی صورت یہ ہے کہ کوئی مملوک اپنے آقا سے کہے کہ آپ مجھ پر کچھ رقم مقرر کر دیں کہ وہ رقم میں اپنی محنت و کسب سے حاصل کر کے آپکو ادا کر دوں تو میں آزاد ہو جاؤں اور آقا اسکو قبول کرے، یا معاملہ برعکس ہو کہ آقا چاہے کہ اُس کا غلام کچھ معینہ رقم اسکو دیدے تو آزاد ہو جائے اور غلام اسکو قبول کرلے۔ اگر آقا اور مملوک کے درمیان ایجاب و قبول کے ذریعہ یہ معاملہ مکاتبت کا طے ہو جاتا ہے تو وہ شرعاً لازم ہو جاتا ہے آقا کو اسکے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا جسوقت بھی غلام معینہ رقم کما کر اسکو دیدیگا خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

یہ رقم جو بدلِ کتابت کہلاتی ہیں شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی خواہ غلام کی قیمت کی برابر ہو یا اُس سے کم یا زیادہ جس پر فریقین میں بات طے ہو جائے وہ بدل کتابت ٹھہرے گا۔ اپنے مملوک غلام یا لونڈی کو مکاتب بنا دینے کی ہدایت اور اسکو مستحب اور افضل قرار دینا شریعتِ اسلام کے اُن ہی احکام میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو لوگ شرعی حیثیت سے غلام ہیں اُن کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ راستے کھولے جائیں تمام کفارات میں اُن کے آزاد کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں۔ ویسے بھی غلام آزاد کرنے میں بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے مکاتبت کا معاملہ بھی اسی کا ایک راستہ ہے اس لئے اُس کی ترغیب دی گئی۔ البتہ اُس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی کہ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡهِمۡ خَیۡرًا، یعنی مکاتب بنانا جب درست ہوگا جبکہ تم اُن میں بہتری کے آثار دیکھو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور اکثر حضرات ائمہ نے اس بہتری سے مراد قوتِ کسب بتلائی ہے یعنی جس شخص میں یہ دیکھو کہ اگر اس کو مکاتب بنا دیا تو کما کر معینہ رقم جمع کر لیگا اُس کو مکاتب بناؤ ورنہ جو اس قابل نہ ہو اُس کو مکاتب بنا دینے سے غلام کی محنت بھی ضائع ہوگی آقا کا نقصان بھی ہوگا۔ اور صاحب ہدایہ نے فرمایا کہ خیر اور بہتری سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ اُسکے آزاد ہونے سے مسلمانوں کو کسی نقصان کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو مثلاً یہ کہ وہ کافر ہو اور اپنے کافر بھائیوں کی مدد کرتا ہو۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ لفظ خیر اس جگہ دونوں چیزوں پر حاوی ہے کہ غلام میں قوتِ کسب بھی ہو اور اُس کی آزادی سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ (مظہری)

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ، یعنی بخشش کرو ان پر اُس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو عموماً اور آقاؤں کو خصوصاً کیا گیا ہے کہ جب اس غلام کی آزادی ایک معینہ رقم جمع کر کے آقا کو دینے پر موقوف ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسمیں اُس کی مدد کریں زکوٰۃ کا مال بھی اُن کو دے سکتے ہیں اور آقاؤں کو اسکی ترغیب ہے کہ خود بھی انکی مالی امداد کریں یا بدلِ کتابت میں سے کچھ کم کر دیں۔ صحابہ کرام کا معمول اسی لئے یہ رہا ہے کہ بدل کتابت میں جو رقم اُس پر لگائی جاتی تھی اُسمیں سے تہائی چوتھائی یا اس سے کم حسبِ استطاعت کم کر دیا کرتے تھے۔ (مظہری)

فنِ معاشیات کا ایک اہم مسئلہ اور اُس میں قرآنی فیصلہ

آجکل دُنیا میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ ساری دُنیا معاد و آخرت کو بُھلا کر صرف معاش کے جال میں پھنس گئی ہے اُن کی علمی تحقیقات اور غور و فکر کا دائرہ صرف معاشیات ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اسمیں بحث و تحقیق کے زور نے ایک ایک معمولی مسئلہ کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے۔ ان فنون میں سب سے بڑا فن معاشیات کا ہے۔

اس معاملہ میں آجکل عقلاءِ دُنیا کے دو نظریئے زیادہ معروف و مشہور ہیں اور دونوں ہی باہم متصادم ہیں اُن کے تصادم نے اقوامِ دُنیا میں تصادم اور جنگ و جدل کے ایسے دروازے کھول دیے ہیں کہ ساری **دُنیا امن و اطمینان سے محروم ہوگئی۔**

ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے جس کو اصطلاح میں کیپٹل ازم کہا جاتا ہے دوسرا نظام اشتراکیت کا ہے جس کو کمیونزم یا سوشل ازم کہا جاتا ہے۔ اتنی بات تو مشاہدہ کی ہے جسکا دونوں نظاموں میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دُنیا میں انسان اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ کماتا اور پیدا کرتا ہے اُس سب کی اصل بنیاد قدرتی وسائل پیداوار زمین، پانی اور معادن میں پیدا ہونے والی قدرتی اشیاء پر ہے۔ انسان اپنے غور و فکر اور محنت و مشقت کے ذریعہ انہیں وسائل پیداوار میں جوڑ توڑ اور تحلیل و ترکیب کے ذریعہ اپنی ضرورت کی لاکھوں اشیاء پیدا کرتا اور بناتا ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ دونوں نظام پہلے یہ سوچتے کہ یہ قدرتی وسائل خود تو پیدا نہیں ہوگئے ان کا کوئی پیدا کرنیوالا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کا اصل مالک بھی وہی ہوگا جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہم ان وسائل پر قبضہ کرنے اور اُن کے مالک بننے یا استعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ اصل مالک و خالق نے اگر کچھ ہدایات دی ہیں تو اُن کے تابع چلنا ہمارا فرض ہے۔ مگر مادہ پرستی کے جنون نے ان سبھی کو اصل خالق و مالک کے تصور ہی سے غافل کر دیا۔ اُن کے نزدیک اب بحث صرف یہ رہ گئی کہ وسائل پیداوار پر قبضہ کر کے اُن سے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے والا اُن سب چیزوں کا خود بخود آزاد مالک و مختار ہو جاتا ہے، یا یہ سب چیزیں وقفِ عام اور مشترک ہیں ہر ایک کو اُن سے نفع اُٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے ؟

پہلا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جو انسان کو ان چیزوں پر آزاد ملکیت کا حق دیتا ہے۔

کہ جس طرح چاہے اسکو حاصل کرے اور جہاں چاہے اسکو خرچ کرے اسمیں اُس پر کوئی روک ٹوک برداشت نہیں۔ یہی نظریہ قدیم زمانے کے مشرکین و کفار کا تھا جنھوں نے حضرت شعیب علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ مال ہمارے ہیں ہم ان کے مالک ہیں آپ کو کیا حق ہے کہ ہم پر پابندی لگائیں کہ فلاں کام میں خرچ کرنا جائز اور فلاں میں حرام ہے۔ آیتِ قرآن اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا یہی مطلب ہے۔ اور دوسرا نظریہ اشتراکیت کا ہے جو کسی کو کسی چیز پر ملکیت کا حق نہیں دیتا بلکہ ہر چیز کو تمام انسانوں میں مشترک اور سب کو اُس سے فائدہ اُٹھانے کا یکساں حقدار قرار دیتا ہے اور اصل نظریۂ اشتراکیت کی بنیاد یہی ہے۔ مگر پھر جب دیکھا کہ یہ ناقابلِ عمل تصور ہے اس پر کوئی نظام نہیں چلایا جاسکتا تو پھر کچھ اشیاء کو ملکیت کے لئے مستثنیٰ بھی کردیا ہے۔

قرآن کریم نے ان دونوں بیہودہ نظریوں پر رد کرکے اُصول یہ بنایا کہ کائنات کی ہر چیز دراصل اللہ تعالیٰ کی ملک ہے جو اُن کا خالق ہے۔ پھر اُس نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو ایک خاص قانون کے تحت ملکیت عطا فرمائی ہے جن چیزوں کا اس قانون کی رُو سے وہ مالک بنادیا گیا ہے اسمیں دوسروں کے تصرف کو بغیر اسکی اجازت کے حرام قرار دیا مگر مالک بننے کے بعد بھی اسکو آزاد ملکیت نہیں دی کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں طرف ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون رکھا ہے کہ فلاں طریقہ کمانے کا حلال ہے فلاں حرام اور فلاں جگہ خرچ کرنا حلال ہے اور فلاں حرام۔ اور یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں دی ہے اُس میں کچھ اور لوگوں کے حقوق بھی لگا دیئے ہیں جن کو ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

آیتِ مذکورہ اگرچہ ایک اور مضمون کے لئے آئی ہے مگر اسکے ضمن میں اسی اہم معاشی مسئلہ کے چند اُصول بھی آگئے ہیں الفاظ آیت پر نظر کیجئے وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ یعنی دو ان حاجتمند لوگوں کو اللہ کے اُس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دیدیا ہے اسمیں تین باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اصل مالک مال اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسی نے اپنے فضل سے اسکے ایک حصّہ کا تمھیں مالک بنادیا ہے تیسرے یہ کہ جس چیز کا تم کو مالک بنایا ہے اُس پر کچھ پابندیاں بھی اُسنے لگائی ہیں۔ بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو ممنوع قرار دیا اور بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو لازم و واجب اور بعض میں مستحب اور افضل قرار دیا ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

دوسرا حکم اس آیت میں ایک جاہلیت کی رسم مٹانے اور زنا و فواحش کے انسداد کے لئے یہ دیا گیا ہے وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ، یعنی اپنی لونڈیوں کو اس پر مجبور نہ کرو کہ وہ زناکاری کے ذریعہ مال کما کر تمھیں دیا کریں۔ جاہلیت میں بہت سے لوگ لونڈیوں کو اسی کام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے جب زنا پر سخت سزائیں جاری کیں، آزاد اور غلام

سب کو اسکا پابند کیا تو ضروری تھا کہ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانے کے لئے خاص احکام دے۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا، یعنی جبکہ وہ لونڈیاں زنا سے بچنے اور پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں تو تمہارا اُن کو مجبور کرنا بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ یہ الفاظ اگرچہ بصورت شرط آئے ہیں مگر باجماع اُمت درحقیقت مراد اس سے شرط نہیں کہ لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو اُن کو زنا پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ مجبور کرنا جائز ہے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے لونڈیوں میں حیا اور پاکدامنی زمانہ جاہلیت میں نابود تھی۔ اسلام کے احکام کے بعد اُنھوں نے توبہ کی۔ اُنکے آقاؤں نے مجبور کرنا چاہا تو اسپر یہ احکام آئے کہ جب وہ زنا سے بچنا چاہتی ہیں تو تم مجبور نہ کرو۔ اسمیں انکے آقاؤں کو زجر و تنبیہ و تشنیع کرنا ہے کہ بڑی بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے کہ لونڈیاں تو پاک رہنے کا ارادہ کریں اور تم اُنھیں زنا پر مجبور کرو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا حرام ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا اور وہ آقا کے جبر و اکراہ سے مغلوب ہو کر زنا میں مبتلا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ کو معاف فرما دیں گے اور اسکا سارا گناہ مجبور کرنیوالے پر ہوگا۔ (مظہری) واللہ اعلم

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

اور ہم نے اُتاریں تمہاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ حال اُن کا جو ہو چکے تم سے

قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٤﴾ ع اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ

پہلے اور نصیحت ڈرنے والوں کو اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اُسکی

نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا

روشنی کی جیسے ایک طاق اسمیں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں وہ شیشہ ہے جیسے

كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا

ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اسمیں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ

غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ

مغرب کی طرف، قریب ہے اُسکا تیل کہ روشن ہو جائے اگرچہ نہ لگی ہو اسمیں آگ روشنی پر روشنی

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ

اللہ راہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی کی جسکو چاہے اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٣٥﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا

سب چیز کو جانتا ہے ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا اُن کو بلند کرنے کا اور وہاں اُسکا نام

ع ۱۰

اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ

پڑھنے کا یاد کرتے ہیں اس کی وہاں صبح اور شام وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں

وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا

اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے

تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا

جسمیں اُلٹ جائیں گے دل اور آنکھیں تاکہ بدلہ دے اُن کو اللہ انکے بہتر سے بہتر کاموں کا

وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

اور زیادتی دے اُن کو اپنے فضل سے اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۗ حَتّٰٓى اِذَا

اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اسکو پانی یہاں تک کہ جب

جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ

پہنچا اُس پر اس کو کچھ نہ پایا، اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اسکو پورا پہنچا دیا اسکا لکھا، اور اللہ جلد لینے

الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ

والا ہے حساب یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اسپر ایک لہر اس پر ایک اور لہر

مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۗ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ

اس کے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب نکالے اپنا ہاتھ لگتا نہیں

يَكَدْ يَرٰىهَا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

کہ اسکو وہ سوجھے اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اُس کے واسطے کہیں نہیں روشنی

ع ۵

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس سورت میں یا قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے) تمھارے پاس کھُلے کھُلے احکام (علمیہ و عملیہ) بھیجے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں اُن کی (یا اُن جیسے لوگوں کی) بعض حکایات اور (خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے نصیحت کی باتیں (بھیجی ہیں) اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں (میں رہنے والوں) کا اور زمین (میں رہنے والوں) کا (یعنی اہلِ آسمان و زمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے اور مُراد آسمان و زمین سے کُل عالم ہے پس جو مخلوقات آسمان و زمین سے باہر ہے وہ بھی داخل ہوگئی جیسے حاملانِ عرش) اُس کے نور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہو

(اور) اُس میں ایک چراغ (رکھا) ہے (اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف ہے) جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پُورب رُخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھم رُخ ہے۔ (یعنی نہ اس کی جانبِ شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانبِ غربی میں کوئی آڑ پہاڑ ہے کہ آخر دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھُلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اسکا تیل (اسقدر صاف اور سُلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھُوے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نُورٌ علیٰ نُور ہے (یعنی ایک تو اسمیں خود قابلیت نُور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اُوپر سے فاعل یعنی آگ کیساتھ اجتماع ہوگیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کیساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو صاف روشنی اور دھواں کم ہونے میں مشہور ہے تو اسقدر تیز روشنی ہوگی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں اسی کو نُورٌ علیٰ نُور فرمایا۔ یہاں مثال ختم ہوگئی۔ پس اسی طرح مومن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اسی کا انشراح قبولِ حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گو بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مومن بھی علم احکام سے پہلے ہی اُن پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اُس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کیساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے جس سے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے پس عمل و علم جمع ہو کر نُورٌ علیٰ نُور صادق آجاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ علم احکام کے بعد اسکو کچھ تامل و تردد ہو کہ اگر موافق نفس کے پایا تو قبول کر لیا ورنہ رد کر دیا۔ اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھولدیا تو وہ اپنے رب کیطرف سے ایک نُور پر ہوتا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ غرض نورِ ہدایت الٰہیہ کی یہ مثال ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے (اور پہنچا دیتا ہے) اور (ہدایت کی جو یہ مثال دی گئی اسی طرح قرآن میں بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں تو اس

سے بھی لوگوں کی ہدایت ہی مقصود ہے اس لئے) اللہ تعالیٰ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ مضامین عقلیہ محسوس چیزوں کی طرح قریب الی الفہم ہوجاویں) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (اسلئے جو مثال افادہ مقصود کیلئے کافی ہو اور جسمیں اغراض مثال کے پورے مرعی ہوں اُسی کو اختیار کرتا ہے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ مثال نہایت مناسب ہوتی ہے تاکہ خوب ہدایت ہو۔ آگے اہل ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) وہ ایسے گھروں میں (جاکر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُن کا ادب کیا جاوے اور اُن میں اللہ کا نام لیا جاوے (مراد اُن گھروں سے مسجدیں ہیں اور انکا ادب یہ کہ اُن میں جُنُب و حائض داخل نہ ہوں اور اُنمیں کوئی نجس چیز داخل نہ کیجاوے، وہاں غُل نہ مچایا جاوے۔ دُنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں۔ بدبو کی چیز کھاکر اُنمیں نہ جاویں وغیر ذلک، غرض) اُن (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد (یعنی بجاآوری احکام) سے (جو وقت کے متعلق جو حکم ہو) اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (کہ یہ احکام فرعیہ میں سب سے اہم ہیں) نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور باوجود اطاعت و عبادت کے اُن کی خشیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن (کی دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ جاویں گی (جیسا دوسری آیت میں ہے يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ، یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اسکے باوجود اُن کے دل قیامت کی باز پُرس سے ڈرتے رہتے ہیں اور مقصود اس سے اہلِ نور ہدایت کے اوصاف و اعمال کا بیان فرمانا ہے اور آگے ان کے انجام کا ذکر ہے کہ) انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دیگا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دیگا (جزا وہ جسکا وعدہ مفصل مذکور ہے اور زیادہ وہ جسکا مفصل وعدہ نہیں گو مجمل عنوانوں سے ہوا ہو۔) اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بیشمار (یعنی بہت کثرت سے) دے دیتا ہے (پس ان لوگوں کو جنت میں اسیطرح بیشمار دیگا۔ یہانتک تو ہدایت اور اہلِ ہدایت کا بیان تھا آگے ضلالت اور اہلِ ضلالت کا ذکر ہے یعنی) اور جو لوگ کافر (اور اہلِ ضلال اور نورِ ہدایت سے دُور) ہیں اُن کے اعمال (بوجہ کافروں کی دو قسمیں ہونے کے دو مثالوں کے مشابہ ہیں کیونکہ ایک قسم تو وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے قائل ہیں اور اپنے بعض اعمال پر یعنی جو اُن کے گمان کے مطابق کارِ ثواب اور حسنات ہیں توقع جزائے آخرت کی رکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے منکر ہیں قسم اول کفار کے اعمال تو) ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی) اسکو (دُور سے)

پانی خیال کرتا ہے (اور اُس کی طرف دوڑتا ہے) یہاں تک کہ جب اسکے پاس آیا تو اُسکو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور (غایت پیاس، پھر نہایت یاس سے جو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا اور اُس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تو یوں کہنا چاہیئے کہ بجائے پانی کے) قضاء الٰہی یعنی موت کو پایا سو اللہ تعالیٰ نے اُس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا (اور بیباق کر دیا یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ (جس چیز کی میعاد آجاتی ہے اسکا) دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے (اُس کو کچھ بکھیڑا نہیں کرنا پڑتا کہ دیر لگے اور میعاد سے کچھ بھی توقف ہو جاوے بس یہ مضمون ایسا ہے جیسا دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ وقولہ لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا۔ حاصل اس مثال کا یہ ہوا کہ جیسے پیاسا ریت کو ظاہری چمک سے پانی سمجھا اسی طرح یہ کافر اپنے اعمال کو ظاہری صورت سے مقبول اور نافع آخرت سمجھا اور جیسا وہ پانی نہیں اسی طرح یہ اعمال شرط قبول یعنی ایمان نہ ہونے کے سبب مقبول اور نافع نہیں ہیں اور جب وہاں جاکر اُس پیاسے کو حقیقت معلوم ہوئی اسی طرح اُس کو آخرت میں پہنچکر حقیقت معلوم ہوگی اور جس طرح یہ پیاسا اپنی توقع کے غلط ہونے سے حسرت و افسوس میں نابہ ہو کر مر گیا اسی طرح یہ کافر بھی اپنی توقع کے غلط ہونے پر اسوقت حسرت میں اور ہلاکت ابدی یعنی عقاب جہنم میں مبتلا ہوگا۔ ایک قسم کی مثال تو یہ ہوئی۔ آگے دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال ہے یعنی) یا وہ (اعمال باعتبار خصوصیت منکرین قیامت کے) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے (جنکا ایک سبب دریا کی گہرائی ہے اور پھر یہ) کہ اُس (سمندر کے اصلی سطح) کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو (پھر وہ موج بھی اکیلی نہیں بلکہ) اُس (موج) کے اوپر دوسری موج (ہو پھر) اُس کے اوپر بادل (ہو جس سے ستارہ وغیرہ کی روشنی بھی نہ پہنچتی ہو غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (ایسی حالت میں کوئی آدمی دریا کی تہ میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور اس کو دیکھنا چاہے) تو (دیکھنا تو درکنار) دیکھنے کا احتمال بھی نہیں (اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر جو آخرت اور قیامت کے اور اسمیں جزاء و سزا ہی کے منکر ہیں اُن کے پاس وہمی نور بھی نہیں جیسے قسم اول کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نور تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے بعض نیک اعمال کو اپنی آخرت کا سامان سمجھا تھا مگر وہ شرط ایمان نہ ہونے کے سبب حقیقی نور نہ تھا ایک وہمی نور تھا۔ یہ لوگ جو منکر آخرت ہیں انھوں نے اپنے اعتقاد و خیال کے مطابق بھی کوئی کام آخرت کے لئے کیا ہی نہیں جس کے نور کا ان کو وہم و خیال ہو۔ غرض انکے پاس ظلمت ہی ظلمت ہے نور کا وہم و خیال بھی نہیں ہو سکتا جیسا کہ تہ دریا کی مثال میں ہے۔ اور نظر نہ آنے میں ہاتھ کی تخصیص شاید اسلئے کہ انسانی اعضاء و جوارح میں ہاتھ نزدیک تر ہے پھر اس کو جتنا نزدیک کرنا چاہو نزدیک آجاتا ہے اور جب ہاتھ ہی نظر نہ آیا تو دوسرے اعضاء

کا معاملہ ظاہر ہی) اور (آگے ان کفار کے اندھیرے میں رہنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اُس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آسکتا)

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ کو اہلِ علم آیتِ نور کہتے ہیں کیونکہ اسمیں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

نور کی تعریف امام غزالیؒ نے یہ فرمائی الظاھر بنفسہ والمظھر لغیرہ، یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔ اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نُور درصل اُس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی قوتِ باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اُسکے ذریعہ اُن تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں اُن کے مقابل اجسامِ کثیفہ پر پڑ کر اوّل اُس چیز کو روشن کردیتی ہیں پھر اُس سے شعاعیں منعکس ہو کر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنے کے اعتبار سے حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کی ذات پر اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بَری اور وراء الوریٰ ہے۔ اسلئے آیتِ مذکورہ میں جو حق تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اسکے معنے باتفاق ائمہ تفسیر مُنوّر یعنی روشن کرنے والے کے ہیں یا پھر صیغۂ مُبالغہ کی طرح صاحبِ نور کو نور سے تعبیر کردیا گیا جیسے صاحبِ کرم کو کرم اور صاحبِ عدل کو عدل کہدیا جاتا ہے۔ اور معنے آیت کے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں آسمان وزمین کو اور اسمیں بسنے والی سب مخلوق کو۔ اور مراد اس نُور سے نورِ ہدایت ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اسکی تفسیر میں نقل کیا ہے اللہ ھادی اھل السمٰوٰت والارض

نورِ مؤمن مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ، اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں آتا ہے۔ یہ اُس کی ایک عجیب مثال ہے جیساکہ ابن جریر نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے ھو المؤمن الذی جعل اللہ الایمان والقرآن فی صدرہٖ فضرب اللہ مثلہ فقال اللہ نور السمٰوٰت والارض فبدأ بنور نفسہ ثم ذکر نور المؤمن فقال مثل نور من اٰمن بہ فکان اُبی بن کعب یقرأھا مثل نور من اٰمن بہ (ابن کثیر)

یعنی یہ مثال اُس مومن کی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کا نورِ ہدایت ڈالدیا ہے اس آیت میں پہلے تو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نور کا ذکر فرمایا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ پھر قلبِ مؤمن کے نور کا ذکر فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ۔ اور اس آیت کی قرأت بھی حضرت ابی ابن کعب

کی مثلِ نورہٖ کے بجائے مثل نور من اٰمن بہٖ کی ہے اور سعید بن جبیرؒ نے یہی قرأت اور آیت کا یہی مفہوم حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِہٖ کی ضمیر کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کا نورِ ہدایت جو مومن کے قلب میں فطرۃً رکھا گیا ہے اُس کی مثال یہ ہے کَمِشْکوٰۃٍ الخ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ہی مومن کیطرف راجع ہو جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ مومن کا سینہ ایک طاق کی مثال ہے اسمیں اسکا دل ایک قندیل کی مثال ہے اسمیں نہایت شفاف روغن زیتون فطری نورِ ہدایت کی مثال ہے جو مومن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ جسکا خاصہ خود بخود بھی قبولِ حق کا ہے پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے اسی طرح فطری نورِ ہدایت جو قلبِ مومن میں رکھا گیا ہے جب وحیِ الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اُسکا اتصال ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے اور حضرات صحابہ و تابعین نے جو اس مثال کو قلبِ مومن کیساتھ مخصوص فرمایا وہ بھی غالباً اسلئے ہے کہ فائدہ اس نور کا صرف مومن ہی اُٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ فطری نورِ ہدایت جو ابتدا تخلیق کے وقت انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے وہ مومن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں وہ نورِ ہدایت رکھا جاتا ہے اسی کا یہ اثر دُنیا کی ہر قوم ہر خطہ ہر مذہب و مشرب کے لوگوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو اور اُس کی عظیم قدرت کو فطرۃً مانتا ہے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کے تصور اور تعبیر میں خواہ کیسی ہی غلطیاں کرتا ہو مگر اللہ تعالیٰ کے نفسِ وجود کا ہر انسان فطرۃً قائل ہوتا ہے بجز چند مادہ پرست افراد کے جن کی فطرت مسخ ہو گئی ہے کہ وہ خدا ہی کے وجود کے منکر ہیں۔

ایک صحیح حدیث سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے جسمیں یہ ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ، یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے ماں باپ اسکو فطرت کے تقاضوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس فطرت سے مُراد ہدایت ایمان ہے۔ یہ ہدایتِ ایمان اور اسکا نور ہر انسان کی پیدائش کے وقت اُسمیں رکھا جاتا ہے اور اسی نورِ ہدایت کی وجہ سے اُسمیں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب انبیاء اور اُنکے نائبوں کے ذریعہ وحیِ الٰہی کا علم اُن کو پہنچتا ہے تو وہ اسکو بسہولت قبول کر لیتے ہیں بجز اُن ممسوخ الفطرت لوگوں کے جنھوں نے اُس فطری نور کو اپنی حرکتوں سے مٹا ہی ڈالا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو عطاء نور کو عام بیان فرمایا ہے جو تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو شامل ہے مومن کافر کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اور آخر آیت میں یہ فرمایا یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَاۗءُ

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور کیطرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے یہاں مشیتِ الٰہی کی قید اُس نورِ فطرت کے لیے نہیں جو ہر انسان میں رکھا ہے بلکہ نورِ قرآن کے لئے ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بجز اُس خوش نصیب کے جس کو اللہ تعالیٰ کیطرف سے توفیق نصیب ہو۔ ورنہ انسان کی کوشش بھی بلاتوفیقِ الٰہی بیکار بلکہ بعض اوقات مضر بھی پڑ جاتی ہے ؎

اذا لم یکن عون من اللّٰہ للفتیٰ　　فاوّل ما یجنی علیہ اجتھادہٗ

یعنی اگر اللہ کی طرف سے بندہ کی مدد نہ ہو تو اُس کی کوشش ہی اُس کو اُلٹا نقصان پہنچا دیتی ہے۔

نورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امام بغویؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے کعب احبار سے پوچھا کہ اس آیت کی تفسیر میں آپ کیا کہتے ہیں مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ الآیۃ کعب احبار جو تورات و انجیل کے بڑے عالم مسلمان تھے اُنھوں نے فرمایا کہ یہ مثال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بیان کی گئی ہے۔ مشکوٰۃ آپکا سینہ اور زجاجہ (قندیل) آپ کا قلبِ مبارک، اور مصباح (چراغ) نبوّت ہے۔ اور اس نورِ نبوت کا خاصہ یہ ہے کہ نبوّت کے اظہار و اعلان سے پہلے ہی اسمیں لوگوں کے لئے روشنی کا سامان ہے پھر وحیِ الٰہی اور اسکے اعلان کا اس کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے تو یہ ایسا نور ہوتا ہے کہ سارے عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت و بعثت بلکہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے جو بہت سے **عجیب و غریب واقعات** عالم میں ایسے پیش آئے جو آپ کی نبوت کی بشارت دینے والے تھے انکو اصطلاح محدثین میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔ کیونکہ معجزات کا لفظ تو اس قسم کے اُن واقعات کے لئے مخصوص ہے، جو دعوائے نبوت کی تصدیق کے لئے اللہ تعالیٰ کیطرف سے کسی پیغمبر کے ہاتھ پر جاری کئے جاتے ہیں۔ اور دعوائے نبوت سے پہلے جو اس قسم کے واقعات دُنیا میں ظاہر ہوں ان کو ارہاصات کا نام دیا جاتا ہے، اس طرح کے بہت سے واقعات عجیبہ صحیح روایات سے ثابت ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے خصائص کبریٰ میں اور ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں اور دوسرے علماء نے بھی اپنی مستقل کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ اسکا ایک کافی حصّہ اس جگہ تفسیر مظہری میں بھی نقل کر دیا ہے۔

روغنِ زیتون کی برکات شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ، اس سے زیتون اور اسکے درخت کا مبارک اور نافع و مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسمیں بیشمار منافع اور فوائد رکھے ہیں۔ اس کو چراغوں میں روشنی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی ہر تیل کی روشنی سے زیادہ صاف شفاف ہوتی ہے اس کو روٹی کے ساتھ سالن کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پھل کو بطور تفکہ کے کھایا بھی جاتا ہے اور یہ ایسا تیل ہے جس کے نکالنے کیلئے کسی مشین یا چرخی وغیرہ کی ضرورت نہیں خود بخود اسکے پھل سے نکل آتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ روغن زیتون کو کھاؤ بھی اور بدن پر مالش بھی کرو کیونکہ یہ شجرہ مبارکہ ہے (رواہ البغوی والترمذی عن عمرؓ مرفوعاً۔ مظہری)

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ الآیۃ، سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے قلب مؤمن میں اپنا نور ہدایت ڈالدینے کی ایک خاص مثال بیان فرمائی تھی اور آخر میں یہ فرمایا تھا کہ اس نور سے فائدہ وہی لوگ اُٹھاتے ہیں جنکو اللہ چاہتا اور توفیق دیتا ہے۔ اس آیت میں ایسے مومنین کا مستقر اور محل بیان فرمایا گیا کہ ایسے مومنین کا اصل مقام و مستقر جہاں وہ اکثر اوقات خصوصاً پانچ نمازوں کے اوقات میں دیکھے جاتے ہیں وہ بیوت یعنی مکانات ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اُن کو بلند و بالا رکھا جائے اور اُن میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور ان بیوت و مکانات کی شان یہ ہے کہ اُن میں اللہ کے نام کی تسبیح و تقدیس صبح شام یعنی تمام اوقات میں ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں جن کی خاص صفات کا بیان آگے آتا ہے۔

اس تقریر کی بنا اس پر ہے کہ نحوی ترکیب میں فِیْ بُیُوْتٍ کا تعلق آیت کے جملہ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ کے ساتھ ہو (کما یستفاد من ابن کثیر وغیرہ من المفسرین) بعض حضرات نے اسکا تعلق لفظ یُسَبِّحُ محذوف کے ساتھ کیا ہے جس پر آگے آنیوالا لفظ یُسَبِّحُ دلالت کرتا ہے مگر پہلا احتمال نسق کلام کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مثال سابق میں اللہ تعالیٰ نے جس نور ہدایت کا ذکر ہوا ہے اُس کے ملنے کی جگہ وہ بیوت و مکانات ہیں جہاں صبح شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک ان بیوت سے مراد مساجد ہیں۔

مساجد اللہ کے گھر ہیں انکی تعظیم واجب ہے قرطبی نے اسی کو ترجیح دی اور استدلال میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احب اللّٰہ عزّ وجلّ فلیحبّنی ومن احبّنی فلیحبّ اصحابی ومن احبّ اصحابی فلیحبّ القراٰن ومن احبّ القراٰن فلیحبّ المساجد فانّھا افنیۃ اللّٰہ اذن اللّٰہ فی رفعھا وبارک فیھا میمونۃ میمون اھلھا محفوظۃ محفوظ اھلھا ھم فی صلاتھم واللّٰہ عزّ وجلّ فی حوائجھم

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اسکو چاہیے کہ مجھ سے محبت کرے۔ اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ میرے صحابہ سے محبت کرے۔ اور جو صحابہ سے محبت رکھنا چاہے اسکو چاہیے کہ قرآن سے محبت کرے اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اسکو چاہیے کہ مسجدوں سے محبت کرے کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں۔ اللہ نے ان کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور اُن میں برکت رکھی ہے وہ بھی بابرکت ہیں اور اُن کے رہنے والے بھی بابرکت۔ وہ بھی اللہ کی حفاظت میں ہیں

اور اُن کے رہنے والے بھی حفاظت میں۔ وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُنکے پیچھے اُن کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں (قرطبی)	هم فی المساجد واللّٰه من وراۓهم (قرطبی)

رفع مساجد کے معنے | اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ، اَذِنَ، اِذْنٌ سے مشتق ہے جس کے معنی اجازت دینے کے ہیں اور تُرفع، رفع سے مشتق ہے جس کے معنے بلند کرنے اور تعظیم کرنے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے مسجدوں کو بلند کرنے کی۔ اجازت دینے سے مراد اُس کا حکم کرنا ہے اور بلند کرنے سے مُراد اُن کی تعظیم کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلند کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں میں لغو کام کرنے اور لغو کلام کرنے سے منع فرمایا ہے (ابن کثیر)

عکرمہ مجاہد امام تفسیر نے فرمایا کہ رفع سے مراد مسجد کا بنانا ہے جیسے بناء کعبہ کے متعلق قرآن میں آیا ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ کہ اسمیں رفع قواعد سے مُراد بناء قواعد ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رفع مساجد سے مراد مساجد کی تعظیم و احترام اور اُن کو نجاستوں اور گندی چیزوں سے پاک کرنا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسجد میں جب کوئی نجاست لائی جائے تو مسجد اُس سے اس طرح سمٹتی ہے جیسے انسان کی کھال آگ سے۔ حضرت ابوسعید خدری رضؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے مسجد میں سے ناپاکی اور گندگی اور ایذا کی چیز کو نکال دیا اللہ تعالیٰ اُسکے لئے جنت میں گھر بنا دیں گے۔ رواہ ابن ماجہ۔ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنے گھروں میں (بھی) مسجدیں (یعنی نماز پڑھنے کی مخصوص جگہیں) بنائیں اور اُن کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کریں۔ (قرطبی)

اور اصل بات یہ ہے کہ لفظ تُرفع میں مسجدوں کا بنانا بھی داخل ہے اور اُن کی تعظیم و تکریم اور پاک صاف رکھنا بھی۔ پاک صاف رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر نجاست اور گندگی سے پاک کریں۔ اور یہ بھی داخل ہے کہ اُن کو ہر بدبو کی چیز سے پاک کریں۔ اسی لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لہسن یا پیاز کھا کر بغیر منہ صاف کئے ہوئے مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے جو عام کتب حدیث میں معروف ہے۔ سگرٹ، حقہ، پان کا تمباکو کھا کر مسجد میں جانا بھی اسی حکم میں ہے۔ مسجد میں مٹی کا تیل جلانا جسمیں بدبو ہوتی ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت فاروق اعظم رضؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس شخص کے منہ سے لہسن یا پیاز کی بدبو محسوس فرماتے تھے اسکو مسجد سے نکال کر بقیع میں بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جسکو لہسن پیاز کھانا ہی ہو تو اُسکو خوب اچھی طرح پکا کر کھائے کہ اُن کی بدبو ماری جائے حضرات فقہاء نے اس حدیث سے استدلال کر کے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہو کہ اُسکے پاس کھڑے

ہونے والوں کو اُس سے تکلیف پہنچے اُس کو بھی مسجد سے ہٹایا جا سکتا ہے اُس کو خود چاہیئے کہ جب تک ایسی بیماری میں ہے نماز گھر میں پڑھے۔

رفع مساجد کا مفہوم جمہور صحابہؓ و تابعین کے نزدیک یہی ہے کہ مسجدیں بنائی جائیں اور اُن کو ہر بُری چیز سے پاک صاف رکھا جائے۔ بعض حضرات نے مسجدوں کی ظاہری شان و شوکت اور تعمیری بُلندی کو بھی داخل قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر سال کی لکڑی سے شاندار بنائی تھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد نبوی میں نقش و نگار اور تعمیری خوبصورتی کا کافی اہتمام فرمایا تھا اور یہ زمانہ اجلۂ صحابہ کا تھا کسی نے اُن کے اس فعل پر انکار نہیں کیا اور بعد کے بادشاہوں نے تو مسجدوں کی تعمیرات میں بڑے اموال خرچ کئے ہیں۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانہ خلافت میں دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر و تزئین پر پورے ملک شام کی سالانہ آمدنی سے تین گنا زیادہ مال خرچ کیا تھا اُن کی بنائی ہوئی یہ مسجد آج تک قائم ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر نام و نمود اور شہرت کیلئے نہ ہو اللہ کے نام اور اللہ کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص مسجد کی تعمیر شاندار بلند و مستحکم خوبصورت بنائے تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ اُمید ثواب کی ہے۔

بعض فضائل مساجد ابو داؤد نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے فرض نماز کے لئے مسجد کیطرف نکلا اسکا ثواب اُس شخص جیسا ہے جو احرام باندھ کر گھر سے حج کے لئے نکلا ہو اور جو شخص نماز اشراق کے لئے اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد کیطرف گیا تو اسکا ثواب عمرہ کرنے والے جیسا ہے۔ اور ایک نماز کے بعد دوسری بشرطیکہ ان دونوں کے درمیان کوئی کام یا کلام نہ کرے، علیین میں لکھی جاتی ہے۔ اور حضرت بریدہ رضہ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اندھیرے میں مساجد کو جاتے ہیں اُن کو قیامت کے روز مکمل نُور کی بشارت سُنا دیجئے (رواہ مسلم)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، گھر میں یا دُکان میں نماز پڑھنے کی نسبت بیس سے زائد درجہ افضل ہے اور یہ اسلئے کہ جب کوئی شخص وضو کرے اور اچھی طرح (سنت کے مطابق) وضو کرے پھر مسجد کو صرف نماز کی نیت سے چلے اور کوئی غرض نہ ہو تو ہر قدم پر اسکا مرتبہ ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے اور ایک گناہ معاف ہو جاتا، یہانتک کہ وہ مسجد میں پہنچ جائے۔ پھر جب تک جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہے گا اسکو نماز ہی کا ثواب ملتا رہے گا اور فرشتے اسکے لئے یہ دُعا کرتے رہیں گے کہ یا اللہ، اسپر رحمت نازل فرما اور اسکی مغفرت فرما، جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے اور اسکا وضو نہ ٹوٹے۔ اور حضرت حکم بن عُمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں مہمانوں کی طرح رہو اور مسجدوں کو اپنا

گھر بناؤ اور اپنے دِل کو رقت کی عادت ڈالو (یعنی رقیق القلب نرم دل بنو) اور (اللہ کی نعمتوں میں) کثرت سے تفکر و غور کیا کرو اور بکثرت (اللہ کے خوف سے) رویا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خواہشاتِ دُنیا تمھیں اس حال سے مختلف کر دیں کہ تم گھروں کی فضول تعمیرات میں لگ جاؤ جنہیں رہنا بھی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے کی فکر میں لگ جاؤ اور مستقبل کے لئے ایسی فضول تمناؤں میں مبتلا ہو جاؤ جو پا نہ سکو۔ اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ تمھارا گھر مسجد ہونا چاہیئے کیونکہ میں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مساجد متقی لوگوں کے گھر ہیں جس شخص نے مساجد کو (کثرتِ ذکر کے ذریعہ) اپنا گھر بنالیا، اللہ تعالیٰ اُسکے لئے راحت و سکون اور پُل صراط پر آسانی سے گزرنے کا ضامن ہوگیا۔ اور ابوصادق ازدی نے شعیب بن الحجاب کو خط لکھا کہ مسجدوں کو لازم پکڑو کیونکہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ مساجد ہی انبیاء کی مجالس تھیں۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانے میں ایسے لوگ ہونگے جو مسجدوں میں آکر جگہ جگہ حلقے بنا کر بیٹھ جاویں گے اور وہاں دُنیا ہی کی اور اُسکی محبت کی باتیں کرینگے تم ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے مسجد میں آنے والوں کی ضرورت نہیں۔

اور حضرت سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں بیٹھا گویا وہ اپنے رب کی مجلس میں بیٹھا ہے اس لئے اُسکے ذمہ ہے کہ زبان سے سوائے کلمۂ خیر کے اور کوئی کلمہ نہ نکالے۔ (قرطبی)

مساجد کے پندرہ آداب علماء نے آدابِ مساجد میں پندرہ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اوّل یہ کہ مسجد میں پہنچنے پر اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو اُن کو سلام کرے اور کوئی نہ ہو تو السّلام علینا و علیٰ عباد اللہ الصالحین کہے (لیکن یہ اُس صورت میں ہے جبکہ مسجد کے حاضرین نفلی نماز یا تلاوت و تسبیح وغیرہ میں مشغول نہ ہوں ورنہ اسکو سلام کرنا درست نہیں۔ش) دوسرے یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد کی پڑھے (یہ بھی جب ہے کہ اسوقت نماز پڑھنا مکروہ نہ ہو، مثلاً عین آفتاب کے طلوع یا غروب یا استواء نصف النہار کا وقت نہو۔۱۲ش) تیسرے یہ کہ مسجد میں خرید و فروخت نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ وہاں تیر تلوار نہ نکالے۔ پانچویں یہ کہ مسجد میں اپنی گمشدہ چیز تلاش کرنے کا اعلان نہ کرے۔ چھٹے یہ کہ مسجد میں آواز بلند نہ کرے۔ ساتویں یہ کہ وہاں دُنیا کی باتیں نہ کرے آٹھویں یہ کہ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ نویں یہ کہ جہاں صف میں پوری جگہ نہ ہو وہاں گھُس کر لوگوں پر تنگی پیدا نہ کرے۔ دسویں یہ کہ کسی نماز پڑھنے والے کے آگے سے نہ گزرے گیارھویں کہ مسجد میں تھوکنے ناک صاف کرنے سے پرہیز کرے۔ بارھویں اپنی انگلیاں نہ چٹخائے تیرھویں یہ کہ اپنے بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرے۔ چودھویں نجاسات سے پاک صاف رہے اور کسی چھوٹے بچے یا مجنون کو ساتھ نہ لے جائے۔ پندرھویں یہ کہ وہاں کثرت سے ذکر اللہ میں مشغول رہے۔

قرطبی نے یہ پندرہ آداب لکھنے کے بعد فرمایا ہے کہ جس نے یہ کام کرلئے اُس نے مسجد کا حق ادا کردیا اور مسجد اُسکے لئے حرز وامان کی جگہ بن گئی۔

احقر نے مساجد کے آداب واحکام ایک مستقل رسالہ بنام آدابُ المساجد میں جمع کردیئے ہیں جن کو ضرورت ہو اُسکا مطالعہ فرمائیں۔

جو مکانات، ذکر اللہ، تعلیم قرآن تعلیم دین کے لئے مخصوص ہوں وہ بھی مساجد کے حکم میں ہیں۔

تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے فرمایا کہ فِیْ بُیُوْتٍ کا لفظ قرآن میں عام ہے جس طرح مساجد اسمیں داخل ہیں اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیم قرآن تعلیم دین یا وعظ ونصیحت یا ذکر وشغل کے لئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں اُن کا بھی ادب احترام لازم ہے۔

اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ میں لفظ اذن کی خاص حکمت

علماء تفسیر کا اتفاق ہے کہ اس جگہ اَذِنَ بمعنے اَمر وحکم ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر لفظ اذن کے اس جگہ لانے میں کیا مصلحت ہے روح المعانی میں ایک لطیف مصلحت یہ بیان کی ہے کہ اسمیں مؤمنین صالحین کو اس ادب کی تعلیم وترغیب دینا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے کے ہر کام کے لئے ایسے مستعد اور تیار ہونے چاہئیں کہ حکم کی ضرورت نہ پڑے صرف اسکے منتظر ہوں کہ کب ہمیں اس کام کی اجازت ملے تو ہم یہ سعادت حاصل کریں۔

یُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ، یہاں اللہ کا نام ذکر کرنے میں ہر قسم کا ذکر شامل ہے۔ تسبیح وتحمید وغیرہ بھی نفلی نماز بھی تلاوتِ قرآن وعظ ونصیحت تعلیم علمِ دین، اور علوم دینیہ کے سب مشاغل اسمیں داخل ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اسمیں اُن مؤمنین کی خاص صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت کے خاص مورد اور مسجدوں کو آباد رکھنے والے ہیں اسمیں لفظ رِجَالٌ کی تعبیر میں اسطرف اشارہ ہے کہ مساجد کی حاضری دراصل مردوں کے لئے ہے عورتوں کی نماز اُن کے گھروں میں افضل ہے۔

مسند احمد اور بیہقی میں حضرت اُم سلمہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، یعنی عورتوں کی بہترین مساجد اُنکے گھروں کے تنگ وتاریک گوشے ہیں۔ اس آیت میں مؤمنین صالحین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان کو تجارت اور بیع کا مشغلہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ لفظ تجارت میں چونکہ بیع بھی داخل ہے اسلئے بعض مفسرین نے مقابلہ کیوجہ سے اس جگہ تجارت سے مراد خریداری اور بیع سے مراد فروخت کرنا لیا ہے اور بعض نے تجارت کو اپنے مفہوم عام میں رکھا ہے یعنی لین دین خرید وفروخت کے معاملات، پھر بیع کو الگ کرکے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ معاملات تجارت تو ایک وسیع مفہوم ہے جس کے فوائد ومنافع کبھی مدتوں میں وصول ہوتے ہیں اور کسی چیز کو فروخت کردینے اور قیمت مع نفع کے نقد وصول کرلینے کا فائدہ فوری اور

نقد ہے اُسکو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے مقابلہ میں وہ کسی بڑے سے بڑے دُنیوی فائدہ کا بھی خیال نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت بازار والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اُنکے صاحبزادے حضرت سالمؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گزرے تو نماز کا وقت ہوگیا تھا لوگوں کو دیکھا کہ دُکانیں بند کرکے مسجد کیطرف جا رہے ہیں تو فرمایا کہ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

اور عہد رسالت میں دو صحابی تھے ایک تجارت کرتے تھے دوسرے صنعت و حرفت یعنی لوہار کا کام کرتے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے۔ پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ دوسرے بزرگ کا یہ عالم تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں آواز اذان کی آگئی تو اگر ہتھوڑا مونڈھے پر اُٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چل دیتے تھے اُٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ اُن کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی)

صحابہ کرام اکثر تجارت پیشہ تھے | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام زیادہ تر تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ تھے جو کام کہ بازاروں سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ تجارت و بیع کا مانع ذکر اللہ نہ ہونا انہی لوگوں کا وصف ہو سکتا ہے جن کا مشغلہ تجارت و بیع کا ہو ورنہ یہ بیان فضول ہو جاتا (رواہ الطبرانی عن ابن عباس۔ روح)

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ، یہ ان مومنین کا ذکر جو اوپر آیت میں آیا ہے انکا آخری وصف ہے جسمیں بتلایا ہے کہ یہ حضرات ہر وقت ذکر اللہ اور طاعات و عبادات میں مشغول رہنے کے باوجود بےفکر اور بےڈر بھی نہیں ہو جاتے بلکہ قیامت کے حساب کا خوف اُن پر مسلط رہتا ہے۔ اور یہ اُسی نور ہدایت کا کمال ہے جو اللہ تعالیٰ کیطرف سے اُن کو عطا ہوا ہے جسکا ذکر اوپر آیت میں يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ میں فرمایا۔ آخر میں ایسے حضرات کی جزا کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُنکے عمل کی بہترین جزا عطا فرمادیں گے اور پھر فرمایا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ، یعنی صرف جزاء عمل دینے پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ اپنی طرف سے مزید انعامات بھی اُن کو ملیں گے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نہ کسی قانون کا پابند ہے نہ اُسکے خزانے میں کبھی کمی آتی ہے وہ جس کو چاہے بےحساب رزق دیدیتا ہے۔ یہاں تک مومنین صالحین جن کے سینے نور ہدایت کے مشکوٰۃ ہوتے ہیں اور جو نورِ ہدایت کو خاص طور سے قبول کرتے ہیں اُن کا ذکر تھا۔ آگے اُن کفار کا ذکر ہے جن کی فطرت میں تو اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت کا مادہ رکھا تھا مگر جب اس مادہ کو روشن کرنے والی وحی الٰہی اُن کو پہنچی تو اس سے روگردانی اور انکار کرکے نُور سے محروم ہوگئے اور اندھیرے ہی اندھیرے میں رہ گئے اور ان میں چونکہ

کافر و منکر دو قسم کے تھے اس لئے ان کی دو مثالیں بیان کی گئیں جن کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے۔ دونوں مثالیں بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ، یہ جملہ کفار کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا مؤمنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا تھا يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ کفار کے لئے اس جملہ میں نورِ ہدایت سے محرومی کا ذکر ہے کہ انہوں نے احکامِ الٰہیہ سے انحراف کر کے اپنا فطری نور بھی فنا کر لیا اب جبکہ اللہ کے نورِ ہدایت سے محروم ہو گئے تو نور کہاں سے آئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص محض اسباب علم و بصیرت جمع ہونے سے عالم بصیر نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بالکل ناواقف بے خبر سمجھے جاتے ہیں آخرت کے معاملہ میں وہ بڑے بصیر عقلمند ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بڑے ماہر اور بصیر محقق مانے جاتے ہیں مگر آخرت کے معاملہ میں بڑے بے وقوف جاہل ثابت ہوتے ہیں (مظہری)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان و زمین میں اور اڑتے جانور پر کھولے ہوئے

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں اور اللہ کی

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ

حکومت ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہی تک پھر جانا ہے تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک

يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ

لاتا ہے بادل کو پھر ان کو ملا دیتا ہے پھر ان کو رکھتا ہے تہ بر تہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس

مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ

کے بیچ سے اور اتارتا ہے آسمان سے اس میں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے جس

مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس سے چاہے ابھی اس کی بجلی کی کوندے جائے آنکھوں کو

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو اس میں دھیان کرنے کی جگہ ہے آنکھ والوں کو

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ

اور اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے کو ایک پانی سے پھر کوئی ہے کہ چلتا ہے اپنے پیٹ پر اور

مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ

کوئی ہے کہ چلتا ہے دو پاؤں پر اور کوئی ہے کہ چلتا ہے چار پر بناتا ہے

اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۵

اللہ جو چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو (دلائل اور مشاہدہ سے) معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ قالاً جو بعض مخلوقات میں مشاہد بھی ہے خواہ حالاً جو کُل مخلوقات میں بدلالت عقل معلوم ہے) اور (بالخصوص) پرند (بھی) جو پر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں (کہ ان کی دلالت علیٰ وجود الصانع اور زیادہ عجیب ہے کہ باوجود اُن کے ثقیل اجسام کے پھر فضا میں رُکے ہوئے ہیں اور) سب (پرندوں) کو اپنی اپنی دُعا (اور التجاء اللہ سے) اور اپنی تسبیح (وتقدیس کہ تابع الہام ہے) معلوم ہے اور (باوجود ان دلائل کے پھر بھی لوگ توحید کو نہیں مانتے تو) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے (اس انکار و اعراض پر ان کو سزا دیگا) اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (اب بھی) اور (انتہا میں) اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے (اس وقت بھی حاکمانہ تصرف اُسی کا ہوگا چنانچہ حکومت کا ایک اثر بیان کیا جاتا ہے) کیا (اے مخاطب) تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اُس بادل (کے مجموعہ) کو باہم ملا دیتا ہے پھر اسکو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اُس (بادل) کے بیچ میں سے نکل (نکل کر) آتی ہے اور اس بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصوں میں سے اولے برساتا ہے پھر اُن کو جس (کی جان یا مال) پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے (کہ اسکا نقصان ہو جاتا ہے) اور جس سے چاہتا ہے اُس کو ہٹا دیتا ہے (اور اُس کے جان و مال کو بچا لیتا ہے اور اُس بادل میں سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے اور ایسی چمکدار کہ اس بادل) کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس نے اب بینائی کو اُچک لیا (یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے تصرفات میں سے ہے اور) اللہ تعالیٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے (یہ بھی منجملہ تصرفات الٰہیہ کے ہے) اس (سب مجموعہ) میں اہل دانش کے لئے استدلال (کا موقع) ہے (جس سے مضمون توحید اور مضمون لہ ملک السموات والارض پر استدلال کرتے ہیں) اور اللہ (ہی کا یہ تصرف بھی ہے کہ اُس) نے ہر چلنے والے جاندار کو (بری ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے پھر اُن (جانوروں) میں بعضے تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جیسے سانپ مچھلی) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو دو

پیروں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرندے جبکہ ہوا میں نہ ہوں) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں (جیسے مواشی، اسی طرح بعضے زیادہ پر بھی اصل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے (اُس کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ، شروع آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر مخلوق اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے میں مشغول ہے۔ اس تسبیح کا مفہوم حضرت سفیان رہ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہر چیز آسمان، زمین آفتاب ماہتاب اور کل سیارے اور ستارے اور زمین کے عناصر آگ پانی، مٹی، ہوا سب کو خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے اور جس کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا ہے وہ برابر اُسی پر لگا ہوا ہے اُس سے سر مو خلاف نہیں کرتا۔ اسی اطاعت و انقیاد کو ان چیزوں کی تسبیح فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اُن کی تسبیح حالی ہے مقالی نہیں۔ اُن کی زبانِ حال بول رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پاک و برتر سمجھ کر اُسکی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

زمخشری اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کے اندر اتنا فہم و شعور رکھا ہو جس سے وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ انکو کسی خاص قسم کی گویائی عطا فرمائی ہو اور خاص قسم کی تسبیح و عبادت اُن کو سکھا دی ہو جسمیں وہ مشغول رہتے ہوں آخری جملے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ میں اسی مضمون کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور نماز میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے مگر ہر ایک کی نماز اور تسبیح کا طریقہ اور صورت مختلف ہے۔ فرشتوں کا اور طریقہ، انسان کا دوسرا، اور نباتات کسی اور طرح سے عبادت نماز و تسبیح ادا کرتے ہیں جمادات کسی اور طریق سے۔ قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسکو ہدایت دی۔ وہ ہدایت یہی ہے کہ وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی اطاعت میں لگی ہوئی اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورا کر رہی ہے اس کے علاوہ اسکی اپنی ضروریاتِ زندگی کے متعلق بھی اسکو ایسی ہدایت دیدی ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اپنے رہنے بسنے کے لئے کیسے کیسے گھونسلے اور بِل وغیرہ بناتے ہیں اور اپنی غذا وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتے ہیں۔

مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا ، یہاں سماء سے مُراد بادل ہے اور جبال سے مُراد بڑے بڑے بادل ہیں اور بَرَدٌ اولے کو کہا جاتا ہے۔

لَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے اُتاری ہیں آیتیں کھول کھول کر بتلانے والی، اور اللہ چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ پر

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم

اور لوگ کہتے ہیں ہم نے مانا اللہ کو اور رسول کو اور حکم میں آگئے پھر پھر جاتا ہے ایک فرقہ اُنمیں سے

مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۷﴾ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ

اس کے پیچھے اور وہ لوگ نہیں ماننے والے اور جب اُن کو بلائیے اللہ اور

وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ﴿۴۸﴾ وَإِن يَكُن

رسول کی طرف کہ انمیں تصفیہ کرے تبھی ایک فرقہ اُن میں منہ موڑتے ہیں اور اگر اُن کو

لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿۴۹﴾ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ

کچھ پہنچتا ہو تو چلے آئیں اُس کی طرف قبول کر کر کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا

ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ

دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے گا اُن پر اللہ اور اُس کا رسول کچھ نہیں وہی لوگ

هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۵۰﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَ

بے انصاف ہیں ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلائیے اُن کو اللہ اور

رَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۱﴾

رسول کی طرف فیصلہ کرنے کو ان میں تو کہیں ہم نے سن لیا اور حکم مان لیا اور وہ لوگ کہ انہی کا بھلا ہے

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۵۲﴾

اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اسکے رسول کے اور ڈرتا ہے اللہ سے اور بچکر چلے اُس سے سو وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچنے والے

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُل لَّا

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ قسمیں

تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ مَّعْرُوفَةٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۵۳﴾ قُلْ

نہ کھاؤ حکمبرداری چاہیئے جو دستور ہے، البتہ اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو تو کہہ

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو اسکا ذمہ ہے جو بوجھ اُس پر رکھا

وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ

اور تمہارا ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا اور اگر اُس کا کہا مانو تو راہ پاؤ، اور پیغام لانے والے کا ذمہ نہیں

ع ۱۲

اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٥٤﴾
مگر پہنچا دینا کھول کر

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (حق کے) سمجھانے والے دلائل (ہدایت عام کے لئے) نازل فرمائے ہیں اور (ان عام میں سے) جس کو اللہ چاہتا ہے راہ راست کیطرف (خاص ہدایت فرماتا ہے (کہ وہ اُلوہیت کے حقوق علمیہ یعنی عقائد صحیحہ اور حقوقِ عملیہ یعنی طاعت کو بجالاتا ہے ورنہ بہت سے محروم ہی رہتے ہیں) اور یہ منافق لوگ (زبان سے) دعوٰی تو کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لے آئے اور (خدا اور رسول کا) حکم (دل سے) مانا پھر اسکے بعد (جب عمل کرکے اپنا دعوٰی ثابت کرنیکا وقت آیا تو) انہیں کا ایک گروہ (جو بہت زیادہ شریر ہے خدا اور رسول کے حکم سے) سرتابی کرتا ہے (اس وقت سے مراد یہ ہے کہ جب انکے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہو اور صاحبِ حق اس منافق سے درخواست کرے کہ چلو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے چلیں اس موقع پر یہ سرتابی کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ آپکے اجلاس میں جب حق ثابت ہوجاویگا تو اسی کے موافق آپ فیصلہ کریں گے جیسا عنقریب آیت وَاِذَا دُعُوْٓا میں اس موقع کا یہی بیان آتا ہے اور تخصیص ایک فریق کی باوجودیکہ تمام منافقین ایسے ہی تھے اسلئے ہے کہ غریب غربا کو باوجود کراہت قلبی کے صاف انکار کرنے کی جرأت وہمت نہیں ہوا کرتی یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جنکو کچھ وجاہت اور قوت حاصل ہو) اور یہ لوگ بالکل ایمان نہیں رکھتے (یعنی دل میں تو کسی منافق کے بھی ایمان نہیں مگر ان کا تو وہ ظاہری ملمع شدہ ایمان بھی نہ رہا جیسا اس آیت میں ہے وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور اس آیت میں ہے فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اور بیان اس حکم عدولی کا یہ ہے کہ) یہ لوگ جب اللہ اور اسکے رسول کیطرف اس غرض سے بلائے جاتے ہیں کہ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) انکے (اور ان کے خصوم کے) درمیان میں فیصلہ کردیں تو ان میں کا ایک گروہ (وہاں حاضر ہونے سے) پہلوتہی کرتا ہے (اور ٹالتا ہے اور یہ بلانا اگرچہ رسول ہی کیطرف ہے مگر چونکہ آپ کا فیصلہ حکم خداوندی کی بنا پر ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کیطرف بھی نسبت کردی گئی غرض جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہے تب تو انکی یہ حالت ہوتی ہے) اور اگر (اتفاق سے) ان کا حق (کسی دوسرے کے ذمہ ہو) تو سرتسلیم خم کئے ہوئے (بے تکلف آپکے بلانے پر) آپ کے پاس چلے آتے ہیں (کیونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں حق کا فیصلہ ہوگا اسمیں ہمارا فائدہ ہے۔ آگے ان لوگوں کے اعراض اور حاضر نہ ہونے کی وجہ اسباب چند حتملات کے طور پر بیان کرکے اور سب احتمالات کی نفی اور ایک احتمال کا اثبات ہے) آیا (اس اعراض کا سبب یہ ہے کہ) انکے دلوں میں (کفر

یقینی کا) مرض ہے (یعنی ان کو اسکا یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسُول نہیں) یا یہ (نبوت کی طرف سے) شک میں پڑے ہیں (کہ رسُول نہونے کا یقین تو نہیں مگر رسُول ہونیکا بھی یقین نہیں) یا انکو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اسکا رسُول ان پر ظلم کرنے لگیں (اور ان کے ذمہ جو حق ہے اس سے زائد دلادیں، سو واقعہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے کوئی بھی سبب) نہیں (ہے) بلکہ (اصلی سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ (ان مقدمات میں) بر سرِ ظلم (ہوتے) ہیں (اسلئے حضور نبوی میں مقدمہ لانا پسند نہیں کرتے کہ ہم بار جاد گے اور باقی اسباب سابقہ سب منفی ہیں) مسلمانوں (کی شان اور ان) کا قول تو جب انکو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اسکے رسُول کیطرف بُلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہدیتے ہیں کہ ہمنے (تمھارا کلام) سُن لیا اور (اس کو) مان لیا (اور پھر فوراً چلے جاتے ہیں یہ ہے علامت اس کی ایسوں کا آمنا اور اطعنا کہنا دُنیا میں بھی صادق ہے) اور ایسے (ہی) لوگ (آخرت میں بھی) فلاح پائیں گے اور (ہمارے یہاں کا تو قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور اسکے رسُول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اسکی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے اور (نیز ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ) وہ لوگ بڑا زور لگا کر قسمیں کھایا کرتے ہیں کہ واللہ (ہم ایسے فرمانبردار ہیں کہ) اگر آپ انکو (یعنی ہمکو) حکم دیں (کہ گھر بار سب چھوڑ دو) تو وہ (یعنی ہم) ابھی (سب چھوڑ چھاڑ) نکل کھڑے ہوں آپ (ان سے) کہدیجیے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمھاری) فرمانبرداری کی حقیقت معلوم ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس نے مجھ کو بتلا دیا ہے۔ جیساکہ دوسری جگہ ارشاد ہے قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ اور) آپ (ان سے) کہیے کہ (باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا کام کرو یعنی) اللہ کی اطاعت کرو اور رسُول کی اطاعت کرو (آگے اللہ تعالیٰ اہتمام شانِ مضمون کے واسطے خود ان لوگوں کو خطاب فرماتا ہے کہ رسُول کے اس کہنے کے اور تبلیغ کے بعد) پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کروگے تو سمجھ رکھو کہ (رسول کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) رسُول کے ذمہ وہی تبلیغ (کا کام) ہے جسکا ان پر بار رکھا گیا ہے (جس کو وہ کر چکے اور سبکدوش ہوگئے) اور تمھارے ذمہ وہ (اطاعت کا کام) ہے جسکا تم پر بار رکھا گیا ہے (جس کو تم نہیں بجالائے پس تمھارا ہی ضرر ہوگا) اور اگر (روگردانی نہ کی بلکہ) تمنے ان کی اطاعت کرلی (جو عین اطاعت اللہ ہی کی ہے) تو راہ پر جالگوگے اور (بہرحال) رسُول کے ذمہ صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے (آگے تم سے بازپرس ہوگی کہ قبول کیا یا نہیں)۔

معارف ومسائل

یہ آیات ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ طبری وغیرہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ منافقین

میں سے ایک شخص بشر نامی تھا اسکے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین کے متعلق جھگڑا اور خصومت تھی۔ یہودی نے اسکو کہا کہ چلو تمھارے ہی رسُول سے ہم فیصلہ کرالیں مگر بشر منافق ناحق پر تھا یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ گیا تو آپ حق کے موافق فیصلہ کریں گے اور میں ہار جاؤنگا۔ اسنے اس سے انکار کیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بجائے کعب بن اشرف یہودی کے پاس مقدمہ لیجانے کو کہا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور آیت اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ الآیۃ میں جو ان کے دلوں میں کفر یقینی کا مرض یا نبوت میں شک ہونے کی نفی کی گئی ہے اس کی مُراد یہ ہے کہ یہ کفر یقینی یا شک ان کے دربار نبوی میں مقدمہ لانے سے گریز کرنیکا سبب نہیں اگرچہ کفر و شک کا ہونا منافقین میں ثابت اور واضح ہے مگر مقدمہ نہ لانا اصل میں اس سبب سے ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کا فیصلہ ہوگا تو ہم ہار جائیں گے۔

فوز و فلاح کے لئے چار شرطیں | وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

اس آیت میں چار چیزیں بیان کرکے فرمایا ہے کہ جو ان چار چیزوں کے پابند ہیں وہی بامراد اور دین و دُنیا میں کامیاب ہیں۔

ایک واقعہ عجیبہ | تفسیر قرطبی میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت فاروق اعظم رضؓ کا نقل کیا جس سے ان چاروں چیزوں کے مفہوم کا فرق اور وضاحت ہو جاتی ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ ایک روز مسجد نبوی میں کھڑے تھے اچانک ایک رومی دہقانی آدمی بالکل آپکے برابر آکر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا انا اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا رسول اللّٰہ، حضرت فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کیا بات ہے تو کہا میں اللہ کے لئے مسلمان ہوگیا ہوں۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کیا اسکا کوئی سبب ہے اس نے کہا ہاں۔ بات یہ ہے کہ میں نے تورات، انجیل، زبور اور انبیاء سابقین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مگر حال میں ایک مسلمان قیدی قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا وہ سُنی تو معلوم ہوا کہ اس چھوٹی سی آیت نے تمام کتب قدیمہ کو اپنے اندر سمو لیا ہے تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ فاروق اعظم رضؓ نے پُوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے تو اس رومی دہقان نے یہی آیت مذکورہ تلاوت کی اور اسکے ساتھ اسکی تفسیر بھی عجیب و غریب اس طرح بیان کی کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائضِ الٰہیہ کے متعلق ہے۔ وَرَسُوْلَهٗ سُنتِ نبوی کے متعلق ہے وَيَخْشَ اللّٰهَ گزشتہ عمر کے متعلق ہے وَيَتَّقْهِ آئندہ باقی عمر کے متعلق ہے۔ جب انسان ان چار چیزوں کا عامل ہو جائے تو اسکو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کی بشارت ہے اور فائز وہ شخص ہے جو جہنم سے نجات پائے اور جنت میں اُس کو ٹھکانا ملے۔ فاروق اعظم رضؓ نے یہ سُنکر فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم (کے کلام میں اسکی تصدیق موجود ہے آپ) نے فرمایا ہے اوتیت جوامع الکلم یعنی اللہ تعالٰے نے مجھے ایسے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں جن کے الفاظ مختصر اور معانی نہایت وسیع ہیں۔ (قرطبی)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

وعدہ کر لیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں اُنھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کر دیگا اُن کو

الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ

مُلک میں جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو اور جما دیگا اُن کے لئے دین اُن کا

الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ

جو پسند کر دیا اُن کے واسطے اور دیدے گا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے میں امن، میری بندگی کریں گے

لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

شریک نہ کریں گے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اسکے پیچھے سو وہی لوگ ہیں نافرمان

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو رسول کے تاکہ تم پر رحم ہو

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ

نہ خیال کر کہ یہ جو کافر ہیں تھکا دیں گے بھاگ کر مُلک میں اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے

وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

اور وہ بُری جگہ ہے پھر جانے کی

ع ۱۳

خلاصۂ تفسیر

(اے مجموعہ اُمت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نورِ ہدایت کا کامل اتباع کریں) اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرما دیگا جیسا اُن سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی (مثلاً بنی اسرائیل کو فرعون اور اُس کی قوم قبطیوں پر غالب کیا پھر مُلک شام میں عمالقہ جیسی بہادر قوم پر اُن کو غلبہ عطا فرمایا اور مصر و شام کی حکومت کا ان کو وارث بنایا) اور (مقصود اس حکومت دینے سے یہ ہوگا کہ) جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) اُن کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام جیسا کہ دوسری آیت میں ہے رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) اُس کو اُن کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دیگا اور (اُن کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے) اُن کے اس خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دیگا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (نہ جلی نہ خفی جس کو ریا کہتے ہیں یعنی یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کا مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کیساتھ۔ اور یہ وعدہ تو دُنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر جو جزائے عظیم اور دائمی راحت کا وعدہ ہے وہ اسکے علاوہ ہے) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ)

کے ناشکری کریگا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کریگا) تو (ایسے شخص کے لئے یہ وعدہ نہیں کیونکہ) یہ لوگ نافرمان ہیں (اور وعدہ تھا فرمانبرداروں کے لئے اسلئے اُن سے دُنیا میں بھی وعدہ حکومت دینے کا نہیں ہے اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ ہے) اور (اے مسلمانوں جب ایمان اور عمل صالح کے دُنیوی اور دینی فوائد سُن لئے تو تم کو چاہئے کہ خوب) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسُول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے (آگے کفر و معصیت کا انجام ذکر کیا گیا ہے کہ اے مخاطب) کافروں کی نسبت یہ خیال مت کرنا کہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ جاویں گے اور ہم کو) ہرا دینگے (اور ہمارے قہر سے بچ جاوینگے نہیں بلکہ وہ خود ہاریں گے اور مقہور و مغلوب ہوں گے۔ یہ تو نتیجہ دُنیا میں ہے) اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول قرطبی نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور اعلانِ نبوت کے بعد دس سال مکہ مکرمہ میں رہے تو ہر وقت کفار و مشرکین کے خوف میں رہے پھر ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو یہاں بھی مشرکین کے حملوں سے ہر وقت کے خطرہ میں رہے کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسُول اللہ کبھی ہم پر ایسا وقت بھی آئیگا کہ ہم ہتھیار کھول کر امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت جلد ایسا وقت آنے والا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں (قرطبی و بحر) حضرت عبداللہ بن عباس رضی نے فرمایا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو اُس نے اُمتِ محمدیہ سے اُنکے وجود میں آنے سے پہلے ہی تورات و انجیل میں فرمایا تھا۔ (بحر محیط)

اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا کہ آپکی اُمت کو زمین کے خلفاء اور حکمراں بنایا جائیگا اور اللہ کے پسندیدہ دینِ اسلام کو غالب کیا جائیگا اور مسلمانوں کو اتنی قوت و شوکت دی جائے گی کہ اُن کو دشمنوں کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پُورا فرما دیا کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مکہ، خیبر، بحرین اور پورا جزیرۃ العرب اور پورا ملک یمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ فتح ہوا اور ہجر کے مجوسیوں سے اور ملک شام کے بعض اطراف سے آپ نے جزیہ وصول فرمایا۔ اور شاہِ روم ہرقل نے اور شاہ مصر و اسکندریہ مقوقس اور شاہانِ عمان اور بادشاہ حبشہ نجاشی وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایا بھیجے اور آپ کی تعظیم و تکریم کی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو وفات کے بعد جو کچھ فتنے پیدا ہو گئے تھے اُن کو ختم کیا اور بلادِ فارس اور بلادِ شام

و مصر کیطرف اسلامی لشکر بھیجے اور بُصری اور دمشق آپ ہی کے زمانے میں فتح ہوئے اور دوسرے ملکوں کے بھی بعض حصّے فتح ہوئے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنانیکا الہام فرمایا۔ عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے نظامِ خلافت ایسا سنبھالا کہ آسمان نے انبیا علیہم السلام کے بعد ایسا نظام کہیں نہ دیکھا تھا۔ اُن کے زمانے میں ملک شام پورا فتح ہوگیا اسی طرح پورا ملک مصر اور ملک فارس کا اکثر حصّہ۔ انھیں کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کی قیصری اور کسریٰ کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد خلافت عثمانؓ کا وقت آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ مشارق و مغارب تک وسیع ہوگیا۔ بلادِ مغرب، اندلس اور قبرص تک اور مشرق اقصیٰ میں بلادِ چین تک اور عراق، خراسان، اہواز سب آپکے زمانے میں فتح ہوئے۔ اور صحیح حدیث میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے پوری زمین کے مشارق و مغارب سمیٹ کر دکھائے گئے ہیں اور میری اُمّت کی حکومت اُن تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ خلافتِ عثمانیہ کے دَور ہی میں پُورا فرما دیا (یہ سب مضمون تفسیر ابن کثیر سے لیا گیا ہے)۔

اور ایک حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی اس کی مُراد خلافتِ راشدہ ہے جو بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر قائم رہی وہ حضرت علیؓ مرتضیٰ تک چلی کیونکہ یہ تیس سال کی مدت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے تک پوری ہوئی۔

ابن کثیرؒ نے اس جگہ صحیح مُسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت کا کام چلتا رہیگا جب تک بارہ خلیفہ رہیں گے۔ ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ حدیث بارہ خلیفہ عادل اس اُمّت میں ہونے کی خبر دے رہی ہے جسکا وقوع ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب مُسلسل اور متصل ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ وقفوں کے بعد ہوں۔ انمیں سے چار تو یکے بعد دیگرے ہو چکے جو خلفاء راشدین تھے پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عمرؒ بن عبد العزیز ہوئے اُن کے بعد بھی مختلف زمانوں میں ایسے خلیفہ ہوتے رہے اور تا قیامت رہیں گے آخری خلیفہ حضرت مہدی ہونگے۔ روافض نے جن بارہ خلفاء کو متعین کیا ہے اس کی کوئی دلیل حدیث میں نہیں بلکہ انمیں سے بعض تو وہ ہیں جنکا خلافت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سب کے درجات برابر ہوں اور سب کے زمانے میں امن و سکون دُنیا کا یکساں ہو۔ بلکہ اس وعدہ کا مدار ایمان و عمل صالح پر استقامت اور مکمل اتباع پر ہے اسکے درجات کے اختلاف سے حکومت کی نوعیت و قوت میں بھی فرق و اختلاف لازمی ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں

جب اور جہاں کوئی مسلمان عادل اور صالح بادشاہ ہوا ہے اس کو اپنے عمل و صلاح کے پیمانے پر اس وعدۂ الٰہیہ کا حصہ ملا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ یعنی اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

آیتِ مذکورہ سے خلفاء راشدین کی خلافت اور مقبولیت عنداللہ کا ثبوت

یہ آیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل بھی ہے کیونکہ جو پیش گوئی اس آیت میں فرمائی گئی تھی وہ بالکل اُسی طرح پوری ہوئی۔ اسی طرح یہ آیت حضرات خلفاء راشدین کی خلافت کے حق و صحیح اور مقبول عنداللہ ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے رسول اور اسکی اُمت سے فرمایا تھا اُس کا پُورا پُورا ظہور انھیں حضرات کے زمانے میں ہوا۔ اگر ان حضرات کی خلافت کو حق و صحیح نہ مانا جائے جیسے روافض کا خیال ہے تو پھر قرآن کا یہ وعدہ ہی کہیں پُورا نہیں ہوا۔ اور روافض کا یہ کہنا کہ یہ وعدہ حضرت مہدی کے زمانے میں پورا ہوگا ایک مضحکہ خیز چیز ہے اسکا حاصل تو یہ ہوا کہ چودہ سو برس تو پوری اُمت ذلت و خواری میں رہے گی اور قرب قیامت میں جو چند روز کے لئے اُن کو حکومت ملے گی وہی حکومت اس وعدہ سے مراد ہے معاذاللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے جن شرائط ایمان عمل صالح کی بنیاد پر کیا تھا وہ شرائط بھی انھیں حضرات میں سب سے زیادہ کامل و مکمل تھیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پُورا پُورا انھیں کے عہد میں پورا ہوا اُنکے بعد نہ ایمان و عمل کا وہ درجہ قائم رہا نہ خلافت و حکومت کا وہ وقار کبھی قائم ہوا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، لفظ کفر کے لغوی معنے ناشکری کے اور اصطلاحی معنے ایمان کی ضد ہیں۔ یہاں لفظی معنے بھی مُراد ہوسکتے ہیں اور اصطلاحی بھی۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ اپنا یہ وعدہ پُورا کردے، مسلمانوں کو حکومت قوت اور امن و اطمینان اور دین کو استحکام حاصل ہوجائے اسکے بعد بھی اگر کوئی شخص کفر کرے یعنی اسلام سے پھر جائے یا ناشکری کرے کہ اس اسلامی حکومت کی اطاعت سے گریز کرے تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان ہی سے نکل گئے اور دوسری صورت میں اطاعت سے نکل گئے۔ کفر اور ناشکری ہر وقت ہر حال میں گناہ عظیم ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کی قوت و شوکت اور حکومت قائم ہونیکے بعد یہ چیزیں دوہرے جُرم ہو جاتی ہیں اسلئے بَعْدَ ذٰلِكَ سے مؤکد فرمایا گیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ علماء تفسیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اس جملے کے سب سے پہلے مصداق وہ لوگ ہوئے جنھوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان غنی رضؓ کو قتل کیا اور جب وہ اس جُرم عظیم کے مُرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے مذکورہ انعامات میں بھی کمی آگئی آپس کے قتل و قتال سے خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئے اور بعد اسکے کہ سب

آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام کا یہ خطبہ نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کے خلاف ہنگامہ کے وقت دیا تھا۔ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں

" اللہ کے فرشتے تمہارے شہر کے گرد احاطہ کئے ہوئے حفاظت میں اُسوقت سے مشغول تھے جب سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرمائے اور آج تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ خدا کی قسم اگر تم نے عثمان کو قتل کر دیا تو یہ فرشتے واپس چلے جاویں گے اور پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص ان کو قتل کردیگا وہ اللہ کے سامنے دست بریدہ حاضر ہوگا اُس کے ہاتھ نہ ہوں گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کی تلوار ابتک میان میں تھی، خدا کی قسم اگر وہ تلوار میان سے نکل آئی تو پھر کبھی میان میں نہ جاویگی۔ کیونکہ جب کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اُس کے بدلے میں ستر ہزار آدمی مارے جاتے ہیں اور جب کسی خلیفہ کو قتل کیا جاتا ہے تو پینتیس ہزار آدمی مارے جاتے ہیں" **(مظہری)**

چنانچہ قتل عثمان غنی رضؓ سے جو باہمی خونریزی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُمت میں چلتا ہی رہا ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی نعمتِ استخلاف اور استحکامِ دین کی مخالفت اور ناشکری قاتلانِ عثمان نے کی تھی اُن کے بعد روافض اور خوارج کی جماعتوں نے خلفاء راشدین کی مخالفت میں گروہ بنالئے۔ اسی سلسلے میں حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کا عظیم حادثہ پیش آیا۔ نسأل اللہ الھدایۃ وشکر نعمتہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ

اے ایمان والو اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں اور جو کہ نہیں

يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ

پہنچے تم میں عقل کی حد کو تین بار فجر کی نماز سے پہلے اور جب

تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڜ ثَلٰثُ

اُتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز سے پیچھے یہ تین وقت

عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ

بدن کھلنے کے ہیں تمہارے، کچھ تنگی نہیں تم پر اور نہ اُن پر ان وقتوں کے پیچھے، پھرا ہی کرتے ہو

عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ

ایک دوسرے کے پاس یوں کھولتا ہے اللہ تمہارے آگے باتیں اور اللہ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ۵۸ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل کی حد کو تو اُن کو ویسی ہی

كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

اجازت لینی چاہیئے جیسے لیتے رہے ہیں اُن سے اگلے، یوں کھول کر سناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتیں جنکو توقع نہیں رہی

نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ

نکاح کی اُن پر گناہ نہیں کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں

بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے ان کیلئے اور اللہ سب باتیں سنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمہارے پاس آنے کے لئے) تمہارے مملوکوں کو اور جو تم میں حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے اُن کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہیئے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب دوپہر کو (سونے لیٹنے کیلئے) اپنے (زائد) کپڑے اُتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں (یعنی یہ اوقات چونکہ عام عادت کے مطابق تخلیہ اور آرام کے ہیں، جسمیں آدمی بے تکلفی سے رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کسی وقت اعضائے مستورہ بھی کھل جاتے ہیں، یا کسی ضرورت سے کھولے جاتے ہیں اسلئے اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کو اور اپنے نابالغ بچوں کو سمجھا دو کہ بے اطلاع اور بغیر اجازت لئے ہوئے ان اوقات میں تمہارے پاس نہ آیا کریں اور) ان اوقات کے علاوہ نہ (تو بلا اجازت آنے دینے اور منع نہ کرنے میں) تم پر کوئی الزام ہے اور نہ (بلا اجازت چلے آنے میں) اُن پر کچھ الزام ہے (کیونکہ) وہ بکثرت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس (پس ہر وقت اجازت لینے میں تکلیف ہے اور چونکہ یہ وقت پردے کے نہیں ہیں اسلئے ان میں اپنے اعضاء مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے اور جس وقت تم میں کے (یعنی احرار میں کے) وہ لڑکے (جن کا اوپر حکم آیا ہے) حدِ بلوغ کو پہنچیں (یعنی بالغ یا قریب بلوغ ہو جاویں) تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہیئے جیسا ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے) لوگ اجازت لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (ایک بات یہ جاننا چاہیئے کہ پردہ کے احکام میں شدت فتنہ کے خوف پر مبنی ہے جہاں فتنہ کا عادۃً احتمال نہو مثلاً جو) بڑی بوڑھی عورتیں جنکو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی امید نہ رہی ہو (یعنی وہ محلِ رغبت

نہیں رہیں یہ تفسیر ہے بڑی بوڑھی ہونے کی) اُن کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے غیر محرم کے روبرو بھی) اُتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں (جن کا ظاہر کرنا غیر محرم کے سامنے بالکل ناجائز ہے پس مُراد اس سے چہرہ ہتھیلیاں اور بقول بعض دونوں قدم بھی، بخلاف جوان عورت کے کہ بوجہ احتمال فتنہ اسکے چہرہ وغیرہ کا بھی پردہ ضروری ہے) اور (اگرچہ بڑی بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے لیکن) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو انکے لئے اور زیادہ بہتر ہے (کیونکہ اوّل تو "ہر گندہ پیرے راگندہ خورے" مثل مشہور ہے دوسرے بالکل ہی بے پردگی کا سدِ باب مقصود ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سُنتا سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور کے بیشتر احکام بے حیائی اور فواحش کے انسداد کے لئے آئے ہیں اور انہیں کی مناسبت سے کچھ احکام آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پھر عورتوں کے پردے کے احکام بیان کئے گئے۔

اقارب و محارم کے لئے خاص اوقات میں استیذان کا حکم

آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے آداب اس سے پہلے اسی سورت کی آیت ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹ میں احکام استیذان کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں کہ کسی سے ملاقات کو جاؤ تو بغیر اجازت لئے اُسکے گھر میں داخل نہ ہو۔ گھر زنانہ ہو یا مردانہ آنے والا مرد ہو یا عورت سب کے لئے کسی کے گھر میں جانے سے پہلے اجازت کو واجب قرار دیا گیا ہے مگر یہ احکام استیذان اجانب کے لئے تھے جو باہر سے ملاقات کے لئے آئے ہوں۔

آیاتِ مذکورہ میں ایک دوسرے استیذان کے احکام کا بیان ہے جنکا تعلق اُن اقارب و محارم سے ہے جو عموماً ایک گھر میں رہتے اور ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اُن سے عورتوں کا پردہ بھی نہیں ایسے لوگوں کے لئے بھی اگرچہ گھر میں داخل ہونے کے وقت اسکا حکم ہے کہ اطلاع کرکے یا کم از کم قدموں کی آہٹ کو ذرا تیز کرکے یا کھانس کھنکار کر گھر میں داخل ہوں اور یہ استیذان ایسے اقارب کے لئے واجب نہیں مستحب ہے جس کو ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے تفسیر مظہری میں ہے فمن اراد الدخول فی بیت نفسہ وفیہ محرمانہ یکرہ لہ الدخول فیہ من غیر استیذان تنزیھا لاحتمال رؤیتہ واحدۃ منھن عریانۃ وھو احتمال ضعیف ومقتضاہ التنزہ (مظہری) یہ حکم تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے کا تھا لیکن گھر میں داخل ہو کر پھر یہ سب ایک جگہ ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اُن کے لئے تین خاص اوقات میں جو انسان کے خلوت

میں رہنے کے اوقات ہیں ایک اور استیذان کا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے وہ تین اوقات صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو آرام کرنے کے وقت اور عشاء کی نماز کے بعد کے اوقات ہیں ان میں محارم اور اقارب کو یہاں تک کہ سمجھدار نابالغ بچوں اور مملوکہ لونڈیوں کو بھی اس استیذان کا پابند کیا گیا ہے کہ ان تین اوقاتِ خلوت میں انمیں سے بھی کوئی کسی کی خلوتگاہ میں بغیر اجازت کے نہ جائے کیونکہ ایسے اوقات میں ہر انسان آزاد بے تکلف رہنا چاہتا ہے زائد کپڑے بھی اتار دیتا ہے اور کبھی اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف اختلاط میں مشغول ہوتا ہے ان اوقات میں کوئی ہوشیار بچہ یا گھر کی کوئی عورت یا اپنی اولاد میں سے کوئی بغیر اجازت کے اندر آجائے تو بسا اوقات وہ ایسی حالت میں پائیگا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرماتا ہے اسکو سخت تکلیف پہنچے گی اور کم از کم اسکی بے تکلفی اور آرام میں خلل پڑنا تو ظاہر ہی ہے اس لئے آیاتِ مذکورہ میں اُن کے لئے خصوصی استیذان کے احکام آئے ہیں کہ ان تین وقتوں میں کوئی کسی کے پاس بغیر اجازت کے نہ جائے۔ ان احکام کے بعد پھر یہ بھی فرمایا کہ

لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ ، یعنی ان وقتوں کے علاوہ کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک دوسرے کے پاس بلا اجازت جایا کریں کیونکہ وہ اوقات عموماً ہر شخص کے کام کاج میں مشغول ہونے اور اعضائے مستورہ کو چھپائے رہنے کے ہیں جنہیں عادۃً آدمی بیوی کیساتھ اختلاط بھی نہیں کرتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد و عورت کو استیذان کا حکم دینا تو ظاہر ہے مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلف نہیں انکو بھی اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اُصول کے خلاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ اسکے مخاطب دراصل بالغ مرد و عورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پُوچھے اندر نہ آیا کرو۔ جیسے حدیث میں ہے کہ بچوں کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں تو نماز سکھاؤ اور پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کے بعد اُن کو سختی سے نماز کا پابند کرو نہ مانیں تو مار کر نماز پڑھاؤ۔ اسی طرح اس استیذان کا اصل حکم بالغ مرد و عورت کو ہے۔ اور مذکورہ جملے میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ان وقتوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں نہ تم پر جُناح ہے کہ اُن کو بلا اجازت آنے دو اور نہ ان پر کوئی جُناح ہے کہ وہ بلا اجازت آجایا کریں اگرچہ لفظ جُناح آیا ہے جو عموماً گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی مطلقاً حرج اور مضائقہ کے معنے میں بھی آتا ہے یہاں لَاجُنَاحَ کے معنی یہی ہیں کہ کوئی مضائقہ اور تنگی نہیں ہے اس سے بچوں کے مکلف اور گناہگار ہونے کا شبہ ختم ہوگیا۔ (بیان القرآن)

مسئلہ: آیتِ مذکورہ میں جو اَلَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے مملوک

غلام اور لونڈی دونوں پر حاوی ہیں۔ انمیں مملوک غلام جو بالغ ہو وہ تو شرعاً اجنبی غیر محرم کے حکم میں ہے۔ اس کی آقا اور مالک عورت کو بھی اس سے پردہ کرنا واجب ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اس لفظ سے مُراد لونڈیاں یا مملوک غلام جو بالغ نہ ہو وہ ہے جو ہر وقت گھر میں آنے جانے کے عادی ہیں۔

مسئلہ: اسمیں علماء و فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ خاص استیذان اقارب کے لئے واجب ہے یا استحبابی حکم ہے اور یہ کہ یہ حکم اب بھی جاری ہے یا منسوخ ہو گیا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ آیت محکم غیر منسوخ ہے اور حکم وجوب کے لئے ہے مَردوں کے واسطے بھی عورتوں کے واسطے بھی (قرطبی) لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسکے وجوب کی علت اور وجہ وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ان تین اوقات میں عام آدمی خلوت چاہتا ہے اور اسمیں بسا اوقات اپنی بیوی کیساتھ بھی مشغول ہوتا ہے بعض اوقات اعضائے مستورہ بھی کھلے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ اسکی احتیاط کرلیں کہ ان اوقات میں بھی اعضائے مستورہ کو چھپانے کی عادت ڈالیں اور بیوی سے اختلاط بھی بجز اُس صورت کے نہ کریں کہ کسی کے آنیکا احتمال نہ ہے جیسے عموماً یہی عادت بن گئی ہے تو اس صورت میں ان پر یہ بھی واجب نہیں رہتا کہ اپنے اقارب اور بچوں کو استیذان کا پابند کریں، اور نہ اقارب پر واجب رہتا ہے۔ البتہ اسکا مستحسن اور مستحب ہونا ہر حال میں ہے۔ مگر عام طور پر عمل اس پر زمانہ دراز سے متروک سا ہو گیا ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں تو اس پر بڑی شدت کے الفاظ استعمال فرمائے اور ایک روایت میں عمل نہ کرنے والے لوگوں کا کچھ عذر بیان کر دیا۔

پہلی روایت ابن کثیرؒ نے بسند ابن ابی حاتم یہ نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتیں ایسی ہیں جن پر لوگوں نے عمل کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ ایک یہی آیت استیذان یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ جسمیں اقارب اور نابالغ بچوں کو بھی استیذان کی تعلیم ہے۔ دوسری آیت وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی ہے جسمیں تقسیم میراث کے وقت وارثوں کو اسکی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر مال وراثت تقسیم کرنے کے وقت کچھ ایسے رشتہ دار بھی موجود ہو جاویں جنکا ضابطۂ میراث سے کوئی حصہ نہیں ہے تو اُن کو بھی کچھ دیدیا کرو کہ اُن کی دلشکنی نہ ہو۔ تیسری آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہے جسمیں بتلایا ہے کہ سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور آجکل لوگ معزز مکرم اسکو سمجھتے ہیں جس کے پاس پیسہ بہت ہو جسکا مکان کوٹھی بنگلہ شاندار ہو۔ بعض روایات کے الفاظ اسمیں یہ بھی ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتوں کے معاملہ میں لوگوں پر شیطان غالب آگیا ہے اور پھر فرمایا کہ میں نے تو اپنی لونڈی کو بھی اسکا پابند کر رکھا ہے کہ ان تین وقتوں میں بغیر اجازت میرے پاس نہ آیا کرے۔

دوسری روایت ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ سے یہ منقول ہے کہ دو شخصوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اس استیذانِ اقارب کے متعلق سوال کیا کہ اس پر لوگ عمل نہیں کرتے تو ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ سِتِّیرٌ یُحِبُّ السَّتْرَ، یعنی اللہ بہت ستر رکھنے والا ہے اور ستر کی حفاظت کو پسند فرماتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاشرت بہت سادہ تھی نہ لوگوں کے دروازوں پر پردے تھے نہ گھر کے اندر پردہ دار مسہریاں تھیں اُس وقت کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آدمی کا نوکر یا بیٹا بیٹی اچانک آجاتے اور یہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ مشغول ہوتا، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے ان آیات میں تین وقتوں میں استیذان کی پابندی لگا دی تھی۔ اور اب چونکہ دروازوں پر پردے اور گھر میں پردہ دار مسہریاں ہونے لگیں اس لئے لوگوں نے یوں سمجھ لیا کہ بس یہ پردہ کافی ہے اب استیذان کی ضرورت نہیں (ابن کثیر نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا ہے ھذا اسناد صحیح الی ابن عباس)۔ بہرحال حضرت ابن عباسؓ کی اس دوسری روایت سے اتنی بات نکلتی ہے کہ جب اسطرح کے واقعات کا اندیشہ نہ ہو کہ آدمی بیوی کیساتھ مشغول یا اعضائے مستورہ کھولے ہوئے ہو اور کسی کے آنیکا احتمال ہو ایسے حالات میں کچھ مساہلت ہے۔ لیکن

قرآن نے پاکیزہ معاشرت کی تعلیم دی ہے

کہ کوئی کسی کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو سب آرام و راحت سے رہیں جو لوگ اس طرح کے استیذان کا گھر والوں کو پابند نہیں بناتے وہ خود تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں، اپنی ضرورت و خواہش کا کام کرنے میں تنگی برتتے ہیں۔

عورتوں کے احکام پردہ کی تاکید اور اُسمیں سے ایک اور استثنار

اس سے پہلے عورتوں کے حجاب اور پردہ کے احکام دو آیتوں میں مفصل آچکے ہیں اور اُن میں دو استثنا بھی ذکر کیے گئے۔ ایک استثنا ناظر یعنی دیکھنے والے کے اعتبار سے، دوسرا استثنا منظور یعنی جس کو دیکھا جائے اُسکے اعتبار سے۔ ناظر کے اعتبار سے تو محارم کو اور اپنی مملوکہ کنیزوں نابالغ بچوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اور منظور یعنی جس چیز کو نظروں سے چھپانا مقصود ہے اُسکے اعتبار سے زینت ظاھرہ کو مستثنیٰ کیا گیا جسمیں اُوپر کے کپڑے برقع یا بڑی چادر بالاتفاق مراد ہیں اور بعض کے نزدیک عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی اس استثنار میں داخل ہیں۔

یہاں اگلی آیت میں ایک تیسرا استثنار عورت کے شخصی حال کے اعتبار سے یہ کیا گیا کہ جو عورت بڑی بوڑھی ایسی ہوجاوے کہ نہ اُس کیطرف کسی کو رغبت ہو اور نہ وہ نکاح کے قابل ہو تو اُسکے لئے پردہ کے احکام میں یہ سہولت دیدی گئی ہے کہ اجانب بھی اسکے حق میں مثل محارم کے ہوجاتے ہیں جن اعضار کا چھپانا اپنے محرموں سے ضروری نہیں ہے اس بوڑھی عورت کے لئے غیر مردوں غیر محرموں سے بھی اُن کا چھپانا ضروری نہیں۔ اسلئے فرمایا وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ، الآیۃ جسکی

مختصر تفسیر اوپر گزر چکی ہے مگر ایسی بڑی بوڑھی عورت کے لئے بھی ایک قید تو یہ ہے کہ جو اعضاء محرم کے سامنے کھولے جائیں یہ عورت غیر محرم کے سامنے بھی کھول سکتی ہے بشرطیکہ بن سنور کر زینت کر کے نہ بیٹھے۔ دوسری بات آخر میں یہ فرمائی وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ، یعنی اگر وہ غیر محرموں کے سامنے آنے سے بالکل ہی بچیں تو یہ اُن کے لئے بہتر ہے۔

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی
نہیں ہے اندھے پر کچھ تکلیف اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار

الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ
پر تکلیف اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا

بُیُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ
اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے یا اپنے بھائی کے گھر سے یا اپنی

اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ
بہن کے گھر سے یا اپنے چچا کے گھر سے یا اپنی پھوپھی کے گھر سے یا اپنے ماموں کے گھر سے

اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ لَیْسَ عَلَیْكُمْ
یا اپنی خالہ کے گھر سے یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، نہیں گناہ تم پر

جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤی
کہ کھاؤ آپس میں مل کر یا جدا ہو کر پھر جب کبھی جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے

اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ
لوگوں پر نیک دعا ہے اللہ کے یہاں سے برکت والی ستھری یوں کھولتا ہے

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾
اللہ تمہارے آگے اپنی باتیں تاکہ تم سمجھ لو

ع ۱۴

خلاصۂ تفسیر

(اگر تم کسی اندھے لنگڑے بیمار غریب کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کے گھر لیجا کر کچھ کھلا پلا دو، یا خود کھا پی لو تو جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ عزیز ملاقاتی ہمارے کھانے اور کھلانے پر راضی ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو ان صورتوں میں) نہ تو اندھے آدمی کے لئے کوئی مضائقہ ہے اور نہ لنگڑے آدمی کے لئے اور نہ بیمار آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے، اور نہ خود تمہارے لئے اس بات میں (کچھ مضائقہ ہے)

کہ تم (خواہ خود یا تم مع اُن معذورین کے سب) اپنے گھروں سے (جن میں بی بی۔ اولاد کے گھر بھی آگئے) کھانا کھالو یا (اُن گھروں میں جنکا ذکر آگے آتا ہے کھالو، یعنی نہ تم کو خود کھانے میں گناہ ہے اور نہ اُن معذورین کو کھلانے میں۔ اسی طرح تمھارے کھلا دینے سے اُن معذورین کو بھی کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں اور وہ گھر یہ ہیں۔ مثلاً) اپنے باپ کے گھر سے (کھالو کھلا دو) یا اپنی ماؤں کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اُن گھروں سے جنکی کنجیاں تمھارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (پھر اُسمیں بھی) کہ سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر (یہ بھی معلوم کر رکھو کہ) جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو مسلمان ہوں اُنکو) سلام کر لیا کرو (جو کہ) دُعا کے طور پر ہے اور) جو خدا کی طرف سے مقرر ہے اور (بوجہ اسپر ثواب ملنے کے) برکت والی (اور بوجہ مخاطب کا دل خوش کرنے کے) عمدہ چیز ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف و مسائل

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کے بعض احکام اور آدابِ معاشرت

پچھلی آیتوں میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استیذان کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس آیت میں وہ احکام و آداب مذکور ہیں جو اجازت ملنے پر گھر میں جانے کے بعد مستحب یا واجب ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اور اسمیں مذکورہ احکام کو سمجھنے کے لئے پہلے اُن حالات کو معلوم کر لینا مناسب ہے جن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

قرآن کریم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عام تعلیمات میں حقوق العباد کی حفاظت و رعایت کے لئے جتنی تاکیدات آئی ہیں اُن سے کوئی مسلمان بے خبر نہیں۔ کسی دوسرے کے مال میں بغیر اُسکی اجازت کے کوئی تصرف کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسے خوش نصیب لوگوں کو چن لیا تھا کہ وہ اللہ و رسولؐ کے فرمان پر ہر وقت گوش برآواز رہتے اور ہر حکم کی تعمیل میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے تھے قرآنی تعلیمات پر عمل اور اُسکے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی تھی کہ فرشتے بھی اُن پر فخر کرتے ہیں۔ دوسروں کے مال میں اُن کی مرضی و اجازت کے بغیر ادنیٰ قسم کا تصرف گوارا نہ ہونا کسی کو ادنیٰ سی تکلیف پہنچانے سے پرہیز کرنا اور اسمیں تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر قائم ہونا سبھی صحابہ کا وصف تھا۔ اسی سلسلے کے چند واقعات عہدِ رسالت میں پیش آئے جن کی وجہ سے آیتِ مذکورہ کے احکام نازل ہوئے۔ حضرات مفسرین نے یہ سب واقعات

لکھے ہیں کسی نے اُنمیں سے کسی کو شانِ نزول قرار دیا کسی نے کسی دوسرے واقعہ کو مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، یہ مجموعہ واقعات ہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ واقعات یہ ہیں۔

(۱) امام بغوی نے حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے کہ دُنیا کی عرف عام اور اکثر لوگوں کی طبائع کا حال یہ ہے کہ لنگڑے لُولے اندھے اور بیمار آدمی کیساتھ بیٹھ کر کھانے سے گھن کرتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں حضرات صحابہ میں سے جو ایسے معذور تھے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہم کسی کیساتھ کھانے میں شریک ہونگے تو شاید اسکو تکلیف ہو اسلئے یہ لوگ تندرست آدمیوں کیساتھ کھانے میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ نیز نابینا آدمی کو یہ بھی فکر ہوئی کہ جب چند آدمی کھانے میں شریک ہوں تو تقاضائے عدل و مروت یہ ہے کہ کوئی شریک دوسرے سے زیادہ نہ کھائے سب کو برابر حصہ ملے اور میں نابینا ہونے کی وجہ سے اسکا اندازہ نہیں کر سکتا ممکن ہے کہ میں دوسروں سے زیادہ کھالوں اسمیں دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ لنگڑے آدمی نے خیال کیا کہ عام تندرست لوگوں کی طرح بیٹھ نہیں سکتا دو آدمی کی جگہ لیتا ہوں، کھانے پر دوسروں کیساتھ بیٹھونگا تو ممکن ہے اُنکو تنگی اور تکلیف پیش آئے، انکی اس غایت احتیاط میں ظاہر ہے کہ خود انکو تنگی اور تکلیف پیش آتی تھی اسلئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کو دوسروں کیساتھ ملکر کھانے کی اجازت اور ایسی دقیق احتیاط کو چھوڑنے کی تلقین فرمائی جس سے تنگی میں پڑ جائیں۔ اور بغوی نے بروایت ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے جو واقعہ مذکورہ کا دوسرا رُخ ہے وہ یہ کہ قرآن کریم کی جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر۔ تو لوگوں کو اندھے، لنگڑے بیمار لوگوں کے ساتھ ملکر کھانے میں یہ تردد پیش آنے لگا کہ بیمار تو عادۃً کم کھاتا ہے، نابینا کو کھانے کی چیزوں میں یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ کونسی چیز عمدہ ہے لنگڑے کو اپنی نشست ہموار نہ ہونے کے سبب کھانے میں تکلف ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ لوگ کم کھائیں ہمارے پاس زیادہ آجائے تو ان کی حق تلفی ہو گی کیونکہ مشترک کھانے میں سب کا حصہ مساوی ہونا چاہئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جسمیں اس تعمق اور تکلف میں پڑنے سے اُن کو آزاد کر دیا گیا کہ سب ملکر کھاؤ معمولی کمی بیشی کی فکر نہ کرو۔ اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ مسلمان جب کسی جہاد وغزوہ کے لئے جاتے تو اپنے گھروں کی کنجیاں ان معذوروں کے سپرد کر دیتے تھے اور یہ کہدیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ تم لوگ کھا پی سکتے ہو۔ مگر یہ لوگ اس احتیاط کی بنا پر اُن کے گھروں میں سے کچھ نہ کھاتے کہ شاید اُن کی منشا کیخلاف خرچ ہو جائے۔ اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ مسند بزار میں بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مضمون نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لیجاتے تو عام صحابہؓ کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ سب آپکی رفاقت میں شریکِ جہاد ہوں اور اپنے مکانوں کی کنجیاں ان غریب معذورین کے سپرد کر دیتے تھے اور اُن کو اجازت دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے آپ ہمارے گھروں میں جو کچھ ہے

کھا پی سکتے ہو مگر یہ لوگ غایت تقویٰ سے اس اندیشہ پر کہ شاید اُن کی یہ اجازت بطیبِ خاطر نہ ہو اس سے پرہیز کرتے تھے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں جو لفظ صدیقکم کا آیا ہے یعنی اپنے دوست کے گھر سے بھی کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ حارث بن عمروؓ کے واقعہ میں نازل ہوا کہ وہ کسی جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور اپنے دوست مالک بن زیدؓ کو اپنے گھر اور گھر والوں کی نگرانی سپرد کر دی، جب حارثؓ واپس آئے تو دیکھا کہ مالک بن زیدؓ بہت ضعیف کمزور ہو رہے ہیں وجہ دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ میں نے آپکے گھر سے کچھ کھانا آپکے پیچھے مناسب نہیں سمجھا (یہ سب روایات تفسیر مظہری میں ہیں) اور صاف بات یہی ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہوئے ہیں۔

مسئلہ: جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جن گھروں میں سے بغیر اجازت خاص کے کھانے پینے کی اجازت اس آیت میں دی گئی ہے اسکی بنا اس پر ہے کہ عرب کی عام عادت کیمطابق ایسے قریبی رشتہ داروں میں کوئی تکلف بالکل نہ تھا ایک دوسرے کے گھر سے کچھ کھاتے پیتے تو گھر والے کو کسی قسم کی تکلیف یا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ اس سے خوش ہوتا تھا۔ اسی طرح اس سے بھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی معذور بیمار مسکین کو بھی کھلادے۔ ان سب چیزوں کی گو صراحۃً اجازت نہ دی ہو مگر عادۃً اجازت تھی اس علتِ جواز سے ثابت ہوا کہ جس زمانے یا جس مقام میں ایسا رواج نہ ہو اور مالک کی اجازت مشکوک ہو وہاں بغیر صریح اجازت مالک کے کھانا پینا حرام ہے۔ جیسا کہ آجکل عام طور پر نہ یہ عادت رہی نہ کوئی اسکو گوارہ کرتا ہے کہ کوئی عزیز قریب اُسکے گھر میں جو چاہے کھائے پیئے یا دوسروں کو کھلائے پلائے اسلئے آجکل عام طور پر اس اجازت پر عمل کرنا جائز نہیں بجز اسکے کہ کسی دوست عزیز کے متعلق کسی کو یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اسکے کھانے پینے یا دوسروں کو کھلانے پلانے سے کوئی تکلیف یا ناگواری محسوس نہ کریگا بلکہ خوش ہوگا تو خاص اسکے گھر سے کھانے پینے میں اس آیت کے مقتضیٰ پر عمل جائز ہے۔

مسئلہ: مذکورہ بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ حکم ابتداءِ اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا بلکہ حکم اوّل سے آج تک جاری ہے البتہ شرط اسکی مالک کی اجازت کا یقین ہے جب یہ نہ ہو تو وہ مقتضائے آیت میں داخل ہی نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ: اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ حکم صرف ان مخصوص رشتہ داروں ہی میں منحصر نہیں بلکہ دوسرے شخص کے بارے میں اگر یہ یقین ہو کہ اُسکی طرف سے ہمارے کھانے پینے اور کھلانے پلانے کی اجازت ہے وہ اس سے خوش ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی تو اسکا بھی یہی حکم ہے (مظہری)

احکامِ مذکورہ کا تعلق اُن کاموں سے ہے جو کسی کے گھر میں باجازت داخل ہونے کے بعد جائز یا مستحب ہیں ان کاموں میں بڑا مسئلہ کھانے پینے کا تھا اُس کو پہلے ذکر فرما دیا۔

دوسرا مسئلہ گھر میں داخل ہونے کے آداب کا یہ ہے کہ جب گھر میں باجازت داخل ہو تو گھر میں جو مسلمان ہوں اُن کو سلام کرو۔ آیت عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ سے یہی مُراد ہے کیونکہ مسلمان سب ایک جماعت متحدہ ہیں۔ احادیث کثیرہ صحیحہ میں مسلمان کے باہم ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اسکے رسُول پر اور جب ہوتے ہیں اسکے ساتھ کسی

جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ

جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے جبتک اس سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہی ہیں

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ

جو مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسُول کو پھر جب اجازت مانگیں تجھ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت

لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾ لَا

دے جس کو ان میں سے تو چاہے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے مت

تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ

کر لو بلانا رسُول کا اپنے اندر برابر اُسکے جو بلاتا ہے تم میں ایک دوسرے کو اللہ جانتا ہے

الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ

اُن لوگوں کو تم میں سے جو سٹک جاتے ہیں آنکھ بچا کر سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں

عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَاۤ

اُسکے حکم کا اس سے کہ آ پڑے اُن پر کچھ خرابی یا پہنچے اُن کو عذاب دردناک سنتے ہو

اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اُس کو معلوم ہے جس حال پر تم ہو

وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ

اور جس دن پھیرے جائیں گے اُس کی طرف تو بتائے گا اُن کو جو کچھ اُنھوں نے کیا، اور اللہ ہر ایک

شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

چیز کو جانتا ہے

ع ۹ / ۲ / ۱۵

خلاصۂ تفسیر

بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اُسکے رسُول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسُول کے پاس

کسی ایسے کام پر جمع ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے) تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں (اور آپ اس پر اجازت نہ دیدیں مجلس سے اٹھ کر) نہیں جاتے (اے پیغمبر) جو لوگ آپ سے (ایسے موقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان رکھتے ہیں (آگے ایسے لوگوں کو اجازت دینے کا بیان ہے) تو جب یہ (اہل ایمان) لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی کام کے لئے آپ سے (جانے کی) اجازت طلب کریں تو ان میں آپ جس کے لئے (مناسب سمجھیں اور اجازت دینا) چاہیں اجازت دیدیا کریں (اور جس کو مناسب نہ سمجھیں اجازت نہ دیں کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے اُس کام کو ضروری سمجھتے ہوں جس کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں اور وہ واقع میں ضروری نہ ہو یا ضروری بھی ہو مگر اسکے جانے سے اُس سے بڑا کوئی ضرر پیدا ہونے کا خطرہ ہو اس لئے اجازت و عدم اجازت کا فیصلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا) اور (اجازت دیکر بھی) آپ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کیجئے (کیونکہ اُن کا یہ رخصت چاہنا گرچہ کسی عذر ہی کی وجہ سے ہو مگر اسمیں دنیا کو دین پر مقدم رکھنے کی صورت تو لازم آتی ہے جسمیں ایک کوتاہی کا شائبہ ہے اسلئے آپ کی دعاءِ مغفرت درکار ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت چاہنے والے نے جس عذر و ضرورت کو قوی سمجھ کر اجازت لی ہے اسمیں اُس سے خطاءِ اجتہادی ہوگئی ہو کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھ لیا اور یہ خطاءِ اجتہادی ایسی ہو کہ ذرا غور و تأمل سے رفع ہو سکتی ہو تو اسی صورت میں غور و فکر کی کمی بھی ایک کوتاہی ہے اس سے استغفار کی ضرورت ہوئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (چونکہ اُن کی نیت اچھی تھی اسلئے ایسے دقائق پر مواخذہ نہیں فرماتا) تم لوگ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو (جب وہ کسی اسلامی ضرورت کے لئے تمکو جمع کریں) ایسا (معمولی بلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا (کہ چاہے آیا یا نہ آیا پھر آکر بھی جب تک چاہا بیٹھا جب چاہا اُٹھ کر بے اجازت چلدیا رسول کا بلانا ایسا نہیں بلکہ اُنکے اس حکم کی تعمیل واجب ہے اور بے اجازت واپس جانا حرام اور اگر کوئی بلا اجازت چلا گیا تو یہ تو ممکن ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اُسکا جانا مخفی رہ جاوے لیکن یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہو کر تم میں سے (مجلس نبوی سے) کھسک جاتے ہیں تو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو بواسطہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پہنچا ہی) مخالفت کرتے ہیں اُن کو اس سے ڈرنا چاہیئے کہ ان پر (دنیا میں) کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے (اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں عذاب ہو اور یہ بھی) یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اللہ تعالیٰ اُس حالت کو بھی جانتا ہے جس پر تم (اب) ہو اور اُس دن کو بھی جس میں سب اُسکے پاس (دوبارہ زندہ کر کے)

لائے جاویں گے تو وہ اُن کو سب جتلا دیگا جو کچھ اُنھوں نے کیا تھا (اور تمھاری موجودہ حالت اور روزِ قیامت ہی کی کچھ تخصیص نہیں) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے خصوصاً اور عام معاشرت کے بعض آداب و احکام آیاتِ مذکورہ میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی دینی جہاد وغیرہ کے لئے جمع کریں تو مقتضائے ایمان یہ ہے کہ سب جمع ہو جاویں اور بغیر آپ کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے نہ جاویں۔ کوئی ضرورت پیش آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرلیں اور اسمیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ کوئی خاص حرج اور ضرورت نہ ہو تو اجازت دیدیا کریں۔ اسی ضمن میں اُن منافقین کی مذمت ہے جو اس تقاضائے ایمان کے خلاف بدنامی سے بچنے کے لئے حاضر تو ہو جاتے ہیں مگر پھر کسی کی آڑ لیکر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

یہ آیت غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مشرکین عرب اور دوسری جماعتوں کے متحدہ محاذ نے یکبارگی مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ صحابہ اُن کے حملے سے بچاؤ کیلئے خندق کھودی تھی اسی لئے اس جہاد کو غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے یہ غزوہ شوال ۵ھ ہجری میں ہوا ہے (قرطبی) بیہقی اور ابنِ اسحاق کی روایت میں ہے کہ اسوقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اور تمام صحابہ خندق کھودنے میں مصروفِ کار تھے مگر منافقین اول تو آنے میں سستی کرتے اور پھر آکر بھی معمولی سا کام دکھانے کو کرلیتے اور پھر چپکے سے غائب ہوجاتے تھے اسکے خلاف مومنین سب کے سب محنت کیساتھ لگے رہتے اور کوئی مجبوری اور ضرورت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر جاتے تھے اسپر یہ آیت نازل ہوئی (مظہری)

ایک سوال و جواب اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپکی اجازت کے چلا جانا حرام ہے حالانکہ صحابۂ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جنمیں وہ آپکی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں بلکہ اسوقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو جیسا کہ واقعہ خندق میں ہوا تھا۔ اس تخصیص کیطرف خود آیت کے لفظ عَلٰٓی اَمۡرٍ جَامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

امرِ جامع سے کیا مُراد ہے اسمیں اقوال مختلف ہیں مگر واضح بات یہ ہے کہ اَمرِ جامع سے مراد وہ کام ہے جس کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جمع کرنا ضروری سمجھیں اور کسی خاص کام کے لئے جمع فرمادیں جیسے غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا (قرطبی۔ مظہری)

یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص ہے یا عام باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہوسکتی ہیں اسلئے آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام و امیر جس کے قبضہ میں زمام حکومت ہو اُسکا اور اسکی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونیکا حکم دیں تو اسکی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے (قرطبی مظہری۔ بیان القرآن) اور یہ ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لئے یہ حکم زیادہ مؤکد اور اسکی مخالفت کھلی شقاوت ہے جیسے منافقین سے صادر ہوئی۔ اور اسلامی آداب معاشرت کے لحاظ سے یہ حکم باہمی اجتماعات اور عام مجلسوں کے لئے بھی کم از کم مستحب اور مستحسن ضرور ہے کہ جب مسلمان کسی مجلس میں کسی اجتماعی معاملہ میں غور کرنے یا عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں تو جب جانا ہو میر مجلس سے اجازت لیکر جائیں۔

دوسرا حکم آخری آیت میں یہ دیا گیا ہے لَا تَجْعَلُوا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ الآیۃ اسکی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے اضافت الی الفاعل ہے) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اسکو عام لوگوں کے بلانے کیطرح نہ سمجھو کہ اسمیں آنے نہ آنے کا اختیار رہتا ہے بلکہ اسوقت آنا فرض ہو جاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہو جاتا ہے۔ آیت کے سیاق و سباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی ہے اسی لئے مظہری اور بیان القرآن میں اسکو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی ایک دوسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ نے یہ نقل کی ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوْلِ سے مراد لوگوں کا رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بلانا ہے (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی)۔

اس تفسیر کی بناء پر معنی آیت کے یہ ہونگے کہ جب تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپکا نام لیکر یا محمدؐ نہ کہو کہ بے ادبی ہے بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ یا رَسُوْلَ اللّٰہِ یا نَبِیَّ اللّٰہِ وغیرہ کہا کرو۔ اسکا حاصل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا ہے جو ادب کے خلاف ہو یا جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے۔ یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سورۂ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں مثلاً لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو، ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے باتیں نہ کرو جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور مثلاً یہ کہ جب آپ گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دیکر نہ بلاؤ بلکہ آپکے باہر تشریف لانیکا انتظار کرو اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ میں اسی کا بیان ہے۔

تنبیہ: اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو اُن کا نام لے کر پکارنا اور بلانا بے ادبی ہے تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہیئے۔

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝

بڑی برکت ہے اُس کی جس نے اُتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندہ پر تاکہ رہے جہان والوں کے لیے ڈرانے والا

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ

وہ کہ جس کی ہے سلطنت آسمان اور زمین میں اور نہیں پکڑا اُس نے بیٹا اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝

کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اُس کو ماپ کر

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ

اور لوگوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے کتنے حاکم جو نہیں بناتے کچھ چیز اور وہ خود بنائے گئے ہیں

وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا

اور نہیں مالک اپنے حق میں بُرے کے اور نہ بھلے کے اور نہیں مالک مرنے کے

وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝

اور نہ جینے کے اور نہ جی اُٹھنے کے

خلاصۂ تفسیر

بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام دُنیا جہان والوں کے لئے (ایمان نہ لانے کی صورت میں عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا ہو، ایسی ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو (اپنی) اولاد

قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اُسکا شریک ہے حکومت میں اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا (کہ کسی چیز کے آثار و خواص کچھ ہیں کسی کے کچھ ہیں) اور ان مشرکین نے خدا کو چھوڑ کر اور ایسے معبود قرار دے لئے ہیں جو (کسی طرح معبود ہونے کے قابل نہیں کیونکہ وہ) کسی چیز کے خالق نہیں اور بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان (کے رفع کرنے) کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور نہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں (کہ کسی جاندار کی جان نکال سکیں) اور نہ کسی کے جینے کا (اختیار رکھتے ہیں کہ کسی بے جان میں جان ڈال دیں) اور نہ کسی کو (قیامت میں) دوبارہ زندہ کرنیکا (اختیار رکھتے ہیں۔ اور جو شخص ان چیزوں پر قدرت نہیں رکھتا وہ معبود نہیں ہو سکتا)

معارف و مسائل

خصوصیات سُورت یہ پُوری سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ و قتادہ نے تین آیتوں کے متعلق بیان فرمایا کہ یہ مکی نہیں، مدنی ہیں۔ باقی سورت مکی ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ سُورت مدنی ہے اور اسمیں کچھ آیات مکی ہیں (قرطبی) اور خلاصہ اس سورت کے مضامین کا قرآنِ کریم کی عظمت اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی حقانیت کا بیان اور دشمنوں کیطرف سے اسپر جو اعتراضات تھے اُن کا جواب ہے۔

تَبٰرَكَ، برکت سے مشتق ہے۔ برکت کے معنے خیر کی کثرت کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر خیر و برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ فُرقان، قرآن کریم کا لقب ہے لغوی معنے اسکے تمیز اور فرق کرنے کے ہیں۔ قرآن چونکہ اپنے واضح ارشادات کے ذریعہ حق و باطل میں تمیز اور فرق بتلاتا ہے اور معجزہ کے ذریعہ اہلِ حق و اہلِ باطل میں امتیاز کر دیتا ہے اسلئے اس کو فرقان کہا جاتا ہے۔

لِلْعٰلَمِیْنَ، اس سے ثابت ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت سارے عالم کیلئے ہے بخلاف پچھلے انبیاء کے کہ اُن کی نبوت و رسالت کسی مخصوص جماعت یا مخصوص مقام کے لئے ہوتی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے چھ خصوصی فضائل کا ذکر فرمایا ہے انمیں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت سارے جہان کے لئے عام ہے۔

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا، تخلیق کے بعد تقدیر کا ذکر فرمایا گیا۔ تخلیق کے معنی تو اتنے ہیں کہ بغیر کسی سابق مادہ وغیرہ کے ایک چیز کو عدم سے وجود میں لایا جائے وہ کیسی بھی ہو۔

مخلوقات میں سے ہر ایک چیز میں خاص خاص حکمتیں اور تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اسکے اجزاء کی ساخت اور شکل و صورت اور آثار و خواص بڑی حکمت کیساتھ اُس کام کے مناسب پیدا کئے جس کام کے لئے اس چیز کو پیدا کیا گیا ہے آسمان کی ساخت اُسکے اجزاء ترکیبی اُنکی

ہیئت اُس کام کے مناسب ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی تخلیق میں وہ چیزیں رکھی گئیں جو اُن کے منشاء وجود کے مناسب ہیں۔ زمین اور اسکے پیٹ میں پیدا ہونیوالی ہر چیز جس پر نظر ڈالو ہر ایک کی ساخت، شکل و صورت، نرمی سختی اُس کام کے مناسب بنائی گئی ہے جس کام کے لئے قدرت نے اسکو پیدا کیا ہے۔ زمین کو نہ اتنا رقیق مادہ پانی کی طرح بنایا کہ جو کچھ اُس پر رکھا جائے وہ اسکے اندر ڈوب جائے، نہ اتنا سخت پتھر اور لوہے کی طرح بنایا کہ اسکو کھود نہ سکیں کیونکہ اُس سے یہی ضرورتیں متعلق تھیں کہ اسکو کھود کر پانی بھی نکالا جا سکے۔ اِس میں بنیادیں کھود کر بڑی اُونچی عمارتیں اِس پر کھڑی کی جاسکیں۔ پانی کو سیال بنایا جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں۔ ہوا بھی سیال ہی ہے مگر پانی سے مختلف، پانی ہر جگہ خود بخود نہیں پہنچتا اُسمیں انسان کو کچھ محنت بھی کرنا پڑتی ہے ہوا کو قدرت نے اپنا جبری انعام بنایا کہ وہ بغیر کسی محنت و عمل کے ہر جگہ پہنچ جاتی ہے بلکہ کوئی شخص ہوا سے بچنا چاہے تو اُس کو اسکے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ جگہ مخلوقاتِ الٰہیہ کی حکمتوں کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں۔ ایک ایک مخلوق کو دیکھو انمیں سے ہر ایک قدرتِ حکمت کا شاہکار ہے۔ امام غزالی رح نے اپنی ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے بنام الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ۔

آن ایات میں شروع ہی سے قرآن کی عظمت اور جس ذاتِ گرامی پر وہ نازل ہوا ہے اُس کو عَبۡدِہٖ کا خطاب دیکر اُس کی عزت و عظمت کا عجیب غریب بیان ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق کے لئے اس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہوسکتا کہ خالق اُسکو یہ کہدے کہ یہ میرا ہے ؎

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ توام ؛ تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡكُ ۨافۡتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ

اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں ہے یہ مگر طوفان باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے

عَلَيۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ‌ۛۚ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّزُوۡرًا ۚ‏ ﴿۴﴾ وَقَالُوۡۤا

اُسکا اس میں اور لوگوں نے سو آ گئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے

اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا‏ ﴿۵﴾

یہ نقلیں ہیں پہلوں کی جن کو اُس نے لکھ رکھا ہے سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اسکے پاس صبح اور شام

قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِىۡ يَعۡلَمُ السِّرَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ

تو کہہ اسکو اُتارا ہے اُسنے جو جانتا ہے چھپے ہوئے بھید آسمانوں میں اور زمین میں بیشک وہ

غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا‏ ﴿۶﴾ وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ

بخشنے والا مہربان ہے اور کہنے لگے یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا

مغ عند المتأخرین

وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ﴿٧﴾

اور پھرتا ہے بازاروں میں کیوں نہ اُترا اس کی طرف کوئی فرشتہ کہ رہتا اس کے ساتھ ڈرانے کو

أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ

یا آپڑتا اس کے پاس خزانہ یا ہو جاتا اسکے لئے ایک باغ کہ کھایا کرتا اسمیں سے، اور کہنے لگے بے انصاف

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا ﴿٨﴾ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ

تم پیروی کرتے ہو اس ایک مرد جادو مارے کی دیکھ کیسی بٹھلاتے ہیں تجھ پر

الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ﴿٩﴾

مثلیں سو بہک گئے اب پا نہیں سکتے راستہ

ع ۹ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ (قرآن کے بارے میں) یُوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ (ہی جھوٹ) ہے جس کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس (گھڑنے) میں اس کی مدد کی ہے (مُراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے یا آپ کی خدمت میں ویسے ہی حاضر ہوا کرتے تھے) سو (ایسی بات کہنے سے) یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (اسکا ظلم اور جھوٹ ہونا آگے بیان میں آئے گا) اور یہ (کافر) لوگ (اپنے اسی اعتراض کی تائید میں) یُوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بے سند باتیں ہیں جو اگلے لوگوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (پیغمبر) نے (عمدہ عبارت میں سوچ سوچ کر اپنے صحابہ کے ہاتھ سے) لکھوا لیا ہے (تاکہ محفوظ رہے) پھر (یہی مضامین) اس کو صبح شام پڑھ کر سُنائے جاتے ہیں (تاکہ یاد رہیں، پھر وہی یاد کئے ہوئے مضامین مجمع میں بیان کر کے خدا کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں) آپ (اسکے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اس (قرآن) کو تو اُس ذات (پاک) نے اُتارا ہے جس کو سب چھپی باتوں کی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں ہوں خبر ہے (خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ اس کلام کا اعجاز اس کی کھُلی دلیل ہے کہ کفار کا یہ اعتراض غلط اور جھوٹ اور ظلم ہے کیونکہ اگر قرآن اساطیر الاولین، یعنی پُرانے لوگوں کی کہانیاں ہوتا یا کسی دوسرے کی مدد سے تصنیف کیا گیا ہوتا تو ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز کیوں ہوتی) واقعی اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (اس لئے ایسے ایسے جھوٹ اور ظلم پر فوری سزا نہیں دیتا)۔

اور یہ کافر لوگ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسُول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا (بھی) کھاتا ہے اور (انتظامِ معاش کے لئے ہماری ہی طرح) بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ رسول و پیغمبر انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہیئے جو کھانے

پینے وغیرہ کی ضروریات سے مستغنی ہو اور کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ رسول اگر خود فرشتہ نہیں ہے تو اسکا مصاحب مشیر کوئی فرشتہ ہونا چاہیئے اسلئے کہا کہ) اس (رسول) کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اسکے ساتھ رہ کر (لوگوں کو عذاب الٰہی سے) ڈراتا (اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم رسول کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات سے تو بے فکری ہوتی اس طرح) کہ اسکے پاس (غیب سے) کوئی خزانہ آپڑتا یا اسکے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھایا پیا کرتا۔ اور (مسلمانوں سے) یہ ظالم یوں (بھی) کہتے ہیں کہ (جب انکے پاس نہ کوئی فرشتہ ہے نہ خزانہ نہ باغ، اور پھر بھی یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل میں فتور ہے اسلئے) تم لوگ ایک مسلوب العقل آدمی کی راہ پر چل رہے ہو۔ (اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کر رہے ہیں سو (ان خرافات سے) وہ (بالکل) گمراہ ہوگئے پھر وہ راہ نہیں پاسکتے۔

معارف و مسائل

کفار و مشرکین جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن پر اعتراضات کیا کرتے تھے یہاں سے اُن کے اعتراضات اور پھر جوابات کا سلسلہ شروع ہو کر کچھ دُور تک چلا ہے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ قرآن کوئی اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام نہیں بلکہ آپ نے اس کو خود ہی جھوٹ گھڑ لیا ہے یا پچھلے لوگوں کے قصّے یہود و نصاریٰ وغیرہ سے سُن کر اپنے صحابہؓ سے لکھوا لیتے ہیں اور چونکہ خود اُمّی ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا اسلئے ان لکھے ہوئے قصوں کو صبح شام سُنتے رہتے ہیں تاکہ وہ یاد ہو جاویں پھر لوگوں کے سامنے جا کر یہ کہہ دیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس اعتراض کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا قُلۡ اَنۡزَلَہُ الَّذِیۡ یَعۡلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ کلام خود اسکا شاہد ہے کہ اس کی نازل کرنیوالی وہ ذات پاک حق تعالیٰ کی ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب خفیہ رازوں سے واقف و باخبر ہے۔ اسی لئے قرآن کو ایک کلام معجز بنایا اور ساری دُنیا کو چیلنج کیا کہ اگر اسکو تم خدا کا کلام نہیں مانتے کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک سورۃ بلکہ ایک آیت ہی بنا کر دکھلا دو۔ اور یہ چیلنج جسکا جواب دینا عرب کے فصیح و بلیغ لوگوں کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں مگر اُنھوں نے اس سے اعراض اختیار کی۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کی ایک آیت کے مقابلہ میں اُس جیسی دوسری آیت لکھ لائے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اپنا مال و متاع بلکہ اپنی اولاد اور اپنی جان تک خرچ کرنے کو تیار ہوگئے۔ یہ مختصر سی بات نہ کر سکے کہ قرآن کی مثل ایک سورت لکھ لاتے

یہ دلیل واضح اس امر کی ہے کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں، ورنہ دوسرے انسان بھی ایسا کلام لکھ سکتے، صرف اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہی کا ہے۔ علاوہ فصاحت و بلاغت کے اسکے تمام معانی و مضامین بھی ایسے علوم پر مشتمل ہیں جو اُس ذات کی طرف سے ہو سکتے ہیں جو ہر ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے (اس مضمون کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں اعجاز قرآن پر مکمل بحث کی صورت میں بیان ہو چکی ہے اس کو معارف القرآن جلد اول میں دیکھ سکتے ہیں)۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ رسُول ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں بلکہ فرشتوں کی طرح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی اور الگ ہوتے اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم انکے پاس اللہ کیطرف سے اتنا خزانہ یا باغات ہوتے کہ ان کو اپنے معاش کی فکر نہ کرنا پڑتی، بازاروں میں چلنا پھرنا نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ ان کا اللہ کیطرف سے رسُول ہونا ہم کیسے مان لیں کہ اول تو یہ فرشتہ نہیں، دوسرے کوئی فرشتہ بھی انکے ساتھ نہیں رہتا جو انکے ساتھ اُن کے کلام کی تصدیق کیا کرتا، اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس سے ان کا دماغ چل گیا اور یہ ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ اسکا اجمالی جواب تو اس آیت میں دیا گیا، اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا، یعنی دیکھو تو یہ لوگ آپ کی شان میں کیسی کیسی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب گمراہ ہو گئے اور اب ان کو راہ ملنے کی کوئی صورت نہ رہی تفصیلی جواب اگلی آیات میں آیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

بڑی برکت ہے اُس کی جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ کہ نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا

بہتی ہیں اُن کے نہریں اور کر دے تیرے واسطے محل بلکہ نہیں وہ جھٹلاتے ہیں

بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ

قیامت کو اور ہم نے تیار کی ہے اسکے واسطے کہ جھٹلاتا ہے قیامت کو آگ، جب وہ دیکھے گی انکو

مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا

دُور کی جگہ سے سُنیں گے اس کا جھنجھلانا اور چلّانا اور جب ڈالے جائیں گے

مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا

اسکے اندر ایک جگہ تنگ میں ایک زنجیر میں کئی کئی بندھے ہوئے پکاریں گے اُس جگہ موت کو مت پکارو

الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ

آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو تو کہہ بھلا یہ چیز

خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ

بہتر ہے یا باغ ہمیشہ رہنے کا جسکا وعدہ ہو چکا پرہیزگاروں سے وہ ہوگا ان کا بدلہ اور پھر جانے

مَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا

کی جگہ ان کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں رہا کریں ہمیشہ ہو چکا تیرے رب کے ذمہ وعدہ

مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

مانگا ملتا اور جس دن جمع کر بلائے گا اُن کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے پھر ان سے کہے گا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا

کیا تم نے بہکایا میرے ان بندوں کو یا وہ آپ بہکے راہ سے بولیں گے

سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ

تو پاک ہے ہم سے بن نہ آتا تھا کہ پکڑ لیں کسی کو تیرے بغیر

اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا

رفیق لیکن تو اُن کو فائدہ پہنچاتا رہا اور ان کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بھلا بیٹھے تیری یاد اور

قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ

یہ تھے لوگ تباہ ہونے والے، سو وہ تو جھٹلا چکے تم کو تمہاری بات میں اب نہ تم لوٹا سکتے ہو

صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾

اور نہ مدد کر سکتے ہو اور جو کوئی تم میں گنہگار ہے اُس کو ہم چکھائیں گے بڑا عذاب

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے رسول سب کھاتے تھے کھانا

الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ

اور پھرتے تھے بازاروں میں اور ہم نے رکھا ہے تم میں ایک دوسرے کے

فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع

جانچنے کو، دیکھیں ثابت بھی رہتے ہو اور تیرا رب سب کچھ دیکھتا ہے

ع ۲ / ۱۱ / ۱۴

خلاصۂ تفسیر

وہ ذات بڑی عالی شان ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کو (کفار کی) اس (فرمائش) سے (بھی) اچھی چیز دیدے یعنی بہت سے (غیبی) باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں (بہتر اس لئے کہا کہ وہ تو مطلق باغ کی فرمائش کرتے تھے گو ایک ہی ہو اور متعدد باغ کا ایک سے بہتر ہونا ظاہر ہے) اور

(بلکہ ان باغوں کیساتھ اور بھی مناسب چیزیں دیدے جن کی اُنھوں نے فرمائش بھی نہیں کی یعنی) آپ کو بہت سے محل دیدے (جو ان باغوں میں بنے ہوں یا باہر ہی ہوں جس سے اُن کی فرمائش اور بھی زیادہ نعمتوں کیساتھ پوری ہو جاوے۔ مطلب یہ کہ جو جنت میں ملے گا اگر اللہ چاہے تو آپ کو دُنیا ہی میں دیدے لیکن بعض حکمتوں سے نہیں چاہا اور فی نفسہٖ ضروری تھا نہیں پس شبہ محض بیہودہ ہے ان کفار کے ان شبہاتِ مذکورہ کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کو حق کی طلب و فکر ہوئی ہے اور اس دوران میں قبل تحقیق ایسے شبہات واقع ہو گئے ہوں بلکہ وجہ اعتراضات کی محض شرارت اور طلبِ حق سے بیفکری ہے اور اس بیفکری اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں (اس لئے فکرِ انجام نہیں ہے اور جو جی میں آتا ہے کر لیتے ہیں بک دیتے ہیں) اور (انجام اسکا یہ ہوگا کہ) ہم نے ایسے شخص (کی سزا) کے لئے جو کہ قیامت کو جھوٹا سمجھے دوزخ تیار کر رکھی ہے (کیونکہ قیامت کی تکذیب سے اللہ و رسُول کی تکذیب لازم آتی ہے جو اصل سبب ہے دوزخ میں جانے کا اور اس دوزخ کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (دوزخ) ان کو دُور سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی غضبناک کر اسقدر جوش مارے گی کہ) وہ لوگ (دُور ہی سے) اسکا جوش و خروش سُنیں گے اور (پھر) جب وہ اس (دوزخ) کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈالدیئے جاویں گے تو وہاں موت ہی موت پکاریں گے (جیسا مصیبت میں عادت ہے کہ موت کو بُلاتے اور اسکی تمنا کرتے ہیں، اسوقت ان سے کہا جاویگا کہ) ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو (کیونکہ موت کے پکارنے کی علت مصیبت ہے اور تمھاری مصیبت غیر متناہی ہے اور ہر مصیبت کا مقتضا موت کا پکارنا ہے تو پکارنا بھی کثیر ہوا اور اسی کی کثرت کو موت کی کثرت کہا گیا) آپ (ان کو یہ مصیبت سُنا کر) کہیئے کہ (یہ بتلاؤ کہ) کیا یہ (مصیبت کی) حالت اچھی ہے (جو کہ مقتضیٰ ہے تمھارے کفر و انکار کا) یا وہ ہمیشہ کے رہنے کی جنت (اچھی ہے) جسکا خدا سے ڈرنے والوں سے (یعنی اہلِ ایمان سے) وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لئے (ان کی اطاعت کا) صلہ ہے اور ان کا (آخری) ٹھکانا (اور) ان کو وہاں وہ سب چیزیں ملیں گی جو کچھ وہ چاہیں گے (اور) وہ (اسمیں) ہمیشہ رہیں گے (اے پیغمبر) یہ ایک وعدہ ہی جو (بطور فضل و عنایت کے) آپ کے رب کے ذمہ ہے اور قابلِ درخواست ہے (اور ظاہر ہے کہ جنت الخلد ہی بہتر ہے سو اسمیں ترہیب کے بعد ترغیب ایمان کی ہوگئی) اور (وہ دن ان کو یاد دلایئے کہ) جس روز اللہ تعالیٰ ان (کافر) لوگوں کو اور جن کو وہ لوگ خدا کے سوا پُوجتے تھے (جنہوں نے اپنے اختیار سے کسی کو گمراہ نہیں کیا خواہ صرف بُت مراد ہوں یا ملٰئکہ وغیرہم بھی) ان (سب) کو جمع کریگا پھر (ان معبودین سے ان عابدین کی رُسوائی کے لئے) فرماویگا کیا تم نے میرے ان بندوں کو (راہِ حق سے) گمراہ کیا تھا یا یہ (خود ہی) راہ (حق) سے گمراہ ہو گئے تھے (مطلب یہ کہ

اُنھوں نے تمھاری عبادت جو واقع میں گمراہی ہے تمھارے امر و رضا سے کی تھی جیسا ان لوگوں کا زعم تھا کہ یہ معبودین ہماری اس عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور خوش ہو کر اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے یا اپنی رائے فاسد سے اختراع کرلی تھی) وہ (معبودین) عرض کریں گے کہ معاذ اللہ ہماری کیا مجال تھی کہ ہم آپ کے سوا اور کارسازوں کو (اپنے اعتقاد میں) تجویز کریں (عام اس سے کہ وہ کارساز ہم ہوں یا ہمارے سوا اور کوئی ہو۔ مطلب یہ کہ جب خدائی کو آپ میں منحصر سمجھتے ہیں تو ہم شرک کرنے کا ان کو امر یا اس پر رضامندی کیوں ظاہر کرتے) ولیکن (یہ خود ہی گمراہ ہوئے اور گمراہ بھی ایسے نامعقول طور پر ہوئے کہ اسباب شکر کو انھوں نے اسباب کفر بنا یا چنانچہ) آپ نے (تو) ان کو اور ان کے بڑوں کو (خوب) آسودگی دی (جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ نعمت دینے والے کو پہچانتے اور اس کا شکر و اطاعت کرتے مگر یہ لوگ) یہاں تک (شہوات و تلذذات میں منہمک ہوئے) کہ (آپ کی) یاد (ہی) کو بھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی برباد ہوئے (مطلب جواب کا ظاہر ہے کہ دونوں شقوں میں سے اس شق کو اختیار کیا کہ یہ خود ہی گمراہ ہوئے ہم نے نہیں کیا۔ اور ان کی گمراہی کو اللہ کی بڑی نعمتیں ان پر مبذول ہونے کا ذکر کر کے۔ اور زیادہ واضح کردیا۔ اسوقت اللہ تعالیٰ ان عابدین کو لاجواب کرنے کے لئے جو اصل مقصود تھا سوال مذکور سے یہ فرمادیگا) تو تمھارے ان معبودوں نے تو تم کو تمھاری (سب) باتوں میں جھوٹا (ہی) ٹھہرا دیا (اور انھوں نے بھی تمھارا ساتھ نہ دیا اور جرم پُورے طور پر قائم ہوگیا) سو (اب) تم نہ تو خود (عذاب کو اپنے اوپر سے) ٹال سکتے ہو اور نہ (کسی دوسرے کیطرف سے) مدد دیئے جاسکتے ہو (حتیٰ کہ جن پر پورا بھروسہ تھا وہ بھی صاف جواب دے رہے ہیں اور تمھاری صریح مخالفت کر رہے ہیں) اور جو (جو) تم میں ظالم (یعنی مشرک) ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے (اور گو اسوقت مخاطبین سب مشرک ہی ہونگے مگر اس طرح فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ ظلم کا مقتضیٰ عذاب ہونا بیان فرمانا مقصود ہے) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے (مطلب یہ کہ نبوت و اکلِ طعام وغیرہ میں تنافی نہیں چنانچہ جن کی نبوت دلائل سے ثابت ہے گو معترضین اعتراف نہ کریں، ان سب سے اسکا صدور ہوا ہے پس آپ پر بھی یہ اعتراض غلط ہے) اور (اے پیغمبر اور اے تابعین پیغمبر ان کفار کے ایسے بیہودہ اقوال سے غمگین مت ہو کیونکہ) ہم نے تم (مجموعہ مکلفین) میں ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے (پس اسی عادت مستمرہ کے موافق انبیاء کو ایسی حالت پر بنایا کہ اُمت کی آزمائش ہو کہ کون انکے حالاتِ بشریہ پر نظر کر کے تکذیب کرتا ہے اور کون اُن کے کمالاتِ نبوت پر نظر کر کے تصدیق کرتا ہے سو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو) کیا تم (اب بھی) صبر کروگے (یعنی صبر کرنا چاہیئے) اور (یہ بات یقینی ہے کہ) آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے (تو وقت موعود پر ان کو

سزا دے گا، پھر آپ کیوں ہم و غم میں واقع ہوں)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جو شبہات پیش کئے گئے تھے اور وہاں اُن کا اجمالی جواب دیا گیا تھا ان آیات میں اس کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حقیقت شناسی سے دُوری کی وجہ سے ایک بات یہ کہی ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسُول ہوتے تو اُن کے پاس بہت دولت کے خزانے ہوتے بہت بڑی جائیداد اور باغات ہوتے تاکہ یہ کسبِ معاش سے مستغنی رہتے اسکا جواب یہ دیا گیا کہ ایسا کر دینا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اپنے رسُول کو دولت کے خزانے دیدیں، بلکہ بڑی سے بڑی حکومت و سلطنت کا مالک بنا دیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو ایسی دولت اور پُوری دُنیا پر بے مثال حکومت عطا فرما کر اپنی اس قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے، مگر عامۂ خلق کی مصلحت اور بیشمار حکمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ گروہِ انبیاء کو مادّی اور دنیوی مال و دولت سے الگ ہی رکھا جائے۔ خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ وہ عام غریب مسلمانوں کی صفوف میں اور اُنہی جیسے حالات میں رہیں اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اسی حالت کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ مُسند احمد و ترمذی میں حضرت ابو اُمامہ رضہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے لئے پورے بطحاء مکہ اور اسکے پہاڑوں کو سونا بنا دیتا ہوں، تو میں نے عرض کیا نہیں، اے میرے پروردگار مجھے تو یہ پسند ہے کہ مجھے ایک روز پیٹ بھر کر کھانا ملے (جس پر اللہ کا شکر ادا کروں) اور ایک روز بھوکا رہوں (اُس پر صبر کروں) اور حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ پھرا کرتے (مظہری)

خلاصہ اسکا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عام طور پر فقر و فاقہ میں رہنا اللہ تعالیٰ کی ہزاروں حکمتوں اور عام انسانوں کی مصالح کی بناء پر ہے اور اسمیں بھی وہ اس حالت پر مجبور نہیں ہوتے اگر وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو بڑا مالدار صاحبِ جائیداد بنا سکتے ہیں مگر اُن کی ذات کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ مال و دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے، فقر و فاقہ ہی کو پسند کرتے ہیں۔

دوسری بات کفار نے یہ کہی تھی کہ یہ پیغمبر ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں، اور کسبِ معاش کے لئے بازاروں میں نہ پھرتے اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ کفار کا یہ خیال ہے کہ اللہ کا رسُول انسان نہیں ہو سکتا، فرشتہ ہی رسُول ہو سکتا ہے۔ جسکا جواب قرآن کریم میں جا بجا آیا ہے

اور یہاں اسکا یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء کو تم بھی نبی و رسول مانتے ہو وہ بھی تو انسان ہی تھے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے بازاروں میں پھرتے تھے جس سے تمہیں یہ نتیجہ نکال لینا چاہئے تھا کہ کھانا پینا اور بازار میں پھرنا منصب نبوت و رسالت کے خلاف نہیں۔ آیات مذکورہ میں وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ الآیۃ میں اسی مضمون کا بیان ہے۔

مخلوق میں معاشی مساوات کا نہ ہونا بڑی حکمت پر مبنی ہے وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً، اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ کو قدرت تو سب کچھ تھی وہ سارے انسانوں کو یکساں مالدار بنا دیتے، سب کو تندرست رکھتے، کوئی بیمار نہ ہوتا، سب کو عزت و جاہ کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیتے کوئی ادنیٰ یا کم رتبہ نہ رہ جاتا مگر نظام عالم میں اسکی وجہ سے بڑے رخنے پیدا ہوتے اسلئے حق تعالیٰ نے کسی کو مالدار بنایا، کسی کو غریب مفلس۔ کسی کو قوی، کسی کو ضعیف۔ کسی کو تندرست، کسی کو بیمار کسی کو صاحب عزت و جاہ، کسی کو گمنام۔ اس اختلاف انواع و اصناف اور اختلاف احوال میں ہر طبقے کا امتحان اور آزمائش ہے۔ غنی کے شکر کا غریب کے صبر کا امتحان ہے اسی طرح بیمار و تندرست کا حال ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب تمہاری نظر کسی ایسے شخص پر پڑے جو مال و دولت میں تم سے زیادہ ہے یا صحت و قوت اور عزت و جاہ میں تم سے بڑا ہے تو تم فوراً ایسے لوگوں پر نظر کرو جو ان چیزوں میں تم سے کم حیثیت رکھتے ہیں (تاکہ تم حسد کے گناہ سے بھی بچ جاؤ اور اپنی موجودہ حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے کی توفیق ہو۔ (رواہ البخاری و مسلم) مظہری

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ
اور بولے وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے کہ ہم سے ملیں گے کیوں نہ اترے ہم پر فرشتے یا ہم

نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ
دیکھ لیتے اپنے رب کو، بہت بڑائی رکھتے ہیں اپنے جی میں اور سر چڑھ رہے ہیں بڑی شرارت میں جس دن

يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾
دیکھیں گے فرشتوں کو کچھ خوشخبری نہیں اسدن گنہگاروں کو اور کہیں گے کہیں روک دی جائے کوئی آڑ

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (کیونکہ وہ قیامت اور اس کی پیشی اور حساب کے منکر ہیں) وہ (انکار رسالت کے لئے) یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں

آتے (کہ اگر فرشتے آکر ہم سے کہیں کہ یہ رسول ہیں) یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں (اور وہ خود ہم سے کہدے کہ یہ رسول ہیں جب ہم تصدیق کریں۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (کہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے آکر ان سے خطاب کریں یا خود حق تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوں) اور (بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دنیا میں دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کی فرمائش میں تو) یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دور نکل گئے ہیں (کیونکہ ملائکہ اور انسان کی تو بعض چیزوں میں شرکت بھی ہے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں تو کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں۔ اور یہ لوگ خدا کو دیکھنے کے اہل تو کیا ہوتے مگر فرشتے ان کو ایک روز دکھلائی دیں گے مگر جس طرح یہ چاہتے ہیں طرح نہیں بلکہ ان کے عذاب، مصیبت اور پریشانی لیکر) چنانچہ جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (اور وہ دن قیامت کا ہے) اس روز مجرموں (یعنی کافروں) کے لئے کوئی خوشی کی بات (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو جب سامان عذاب کیساتھ آتا دیکھیں گے تو گھبراکر) کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا، لفظ رجا کے عام معنے کسی محبوب و مرغوب چیز کی اُمید کے آتے ہیں اور کبھی یہ لفظ بمعنے خوف بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ابن انباری نے کتاب الاضداد میں لکھا ہے اس جگہ بھی یہی معنے خوف کے زیادہ مناسب ہیں یعنی وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ اسمیں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دور از کار و جاہلانہ سوالات اور فرمائشوں کی جرأت اُسی شخص کو ہو سکتی ہے جو آخرت کا بالکل منکر ہو۔ آخرت کے قائل پر آخرت کی فکر ایسی غالب ہوتی ہے کہ اس کو ایسے سوال و جواب کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آجکل جو تعلیم جدید کے اثر سے اسلام اور اسکے احکام کے بارے میں بہت سے لوگ شبہات و بحث و مباحثہ میں مشغول نظر آتے ہیں یہ بھی علامت اسکی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ دل میں آخرت کا پکا یقین نہیں ہے۔ ورنہ یہ ہوتا تو اس قسم کے فضول سوالات دل میں پیدا ہی نہ ہوتے۔

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا، حجر کے لفظی معنے محفوظ جگہ کے ہیں اور محجورًا اُس کی تاکید ہے۔ یہ لفظ عام عرب میں اُس وقت بولا جاتا تھا جب کوئی مصیبت سامنے ہو اُس سے بچنے کے لئے لوگوں سے کہتے تھے کہ پناہ ہے پناہ، یعنی ہمیں اس مصیبت سے پناہ دو تو قیامت کے روز بھی جب کفار فرشتوں کو سامان عذاب لاتا ہوا دیکھیں گے دنیا کی عادت کے مطابق یہ لفظ کہیں گے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس لفظ کے یہ معنے منقول ہیں حَرَامًا مُّحَرَّمًا، اور مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز جب یہ لوگ فرشتوں کو

عذاب کے ساتھ دیکھیں گے اور اُن سے معاف کرنے اور جنت میں جانیکی درخواست کریں گے یا تمنا ظاہر کرینگے تو فرشتے اُنکے جواب میں کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی جنت نافرموں پر حرام اور ممنوع ہے (مظہری)

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ

اور ہم پہنچے اُن کے کاموں پر جو انھوں نے کئے تھے پھر ہم نے کر ڈالا اسکو خاک اُڑتی ہوئی بہشت کے

الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ

لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی اور جس دن پھٹ جائے

السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ

آسمان بادل سے اور اُتارے جائیں فرشتے تار لگا کر بادشاہی اس دن

نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ

یہی ہے رحمٰن کی اور ہے وہ دن منکروں پر مشکل اور جس دن

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ

کاٹ کاٹ کھائیگا گنہگار اپنے ہاتھوں کو کہے گا اے کاش میں نے پکڑا ہوتا رسول کے ساتھ

سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ

رستہ اے خرابی میری کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست اُسنے تو بہکا دیا

عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے پیچھے، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو

مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ

جھک جھک اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن گنہگاروں میں سے

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

اور کافی ہے تیرا رب راہ دکھلانے کو اور مدد کرنے کو

خلاصۂ تفسیر

اور ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو (علانیہ طور پر) ایسا (بیکار) کردیں گے جیسے پریشان غبار

(کہ کسی کام نہیں آتا، اسی طرح ان کفار کے اعمال پر کچھ ثواب نہ ہوگا البتہ) اہلِ جنت اس روز قیامگاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرامگاہ میں بھی خوب اچھے ہونگے (مراد مستقر اور مقیل سے جنت ہے یعنی جنت اُن کے لئے جائے قیام اور جائے آرام ہوگی اور اچھا ہونا اسکا ظاہر ہے) اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور (اُس بدلی کے ساتھ آسمان سے) فرشتے (زمین پر) بکثرت اُتارے جائیں گے (اور اسی وقت حق تعالیٰ حساب و کتاب کے لئے تجلی فرما دیں گے اور) اس روز حقیقی حکومت (حضرت) رحمان (ہی) کی ہوگی (یعنی حساب و کتاب جزا و سزا میں کسی کو دخل نہ ہوگا جیسا دُنیا میں ظاہری تصرف تھوڑا بہت دوسروں کے لئے بھی حاصل ہے) اور وہ (دن) کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا (کیونکہ اُنکے حساب کا انجام جہنم ہی ہے) اور جس روز ظالم (یعنی کافر آدمی نہایت حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھاوے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسُول کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا اُس (کمبخت) نے مجھ کو نصیحت آئے پیچھے اس سے بہکا دیا (اور ہٹا دیا) اور شیطان تو انسان کو (عین وقت پر) امداد کرنے سے جواب دیدیتا ہے (چنانچہ اُس کافر کی اس حسرت کے وقت اُس نے کوئی ہمدردی نہ کی، گو کرنے سے بھی کچھ نہ ہوتا صرف دُنیا ہی میں بہکانے کو تھا) اور (اس دن) رسول (صلے اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے کافروں کی شکایت کے طور پر) کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری (اس قوم) نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا (اور التفات ہی نہ کرتے تھے عمل تو درکنار مطلب یہ کہ خود کفار بھی اپنی ضلالت کا اقرار کریں گے اور رسول بھی شہادت دیں گے۔ کقولہ تعالیٰ وَجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا اور ثبوتِ جرم کی یہی دو صورتیں متعاد ہیں، اقرار اور شہادت اور دونوں کے اجتماع سے یہ ثبوت اور بھی مؤکد ہو جاویگا اور سزایاب ہونگے) اور ہم اسی طرح مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہتے ہیں (یعنی یہ لوگ جو انکار قرآن کر کے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں جسکا غم کیا جاوے) اور (جس کو ہدایت دینا منظور ہو اُس کی) ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم ہے اُسکے مقابلہ میں آپ کی) مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے۔

معارف و مسائل

خَيۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّاَحۡسَنُ مَقِيۡلًا، مُستقر، مستقل جائے قیام کو کہا جاتا ہے اور مَقِیۡل قیلولہ سے مشتق ہے دو پہر کو آرام کرنے کی جگہ کو مقیل کہتے ہیں اس جگہ مقیل کا ذکر خصوصیت سے شاید اسلئے بھی ہوا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ نصف النہار کے

وقت ساری مخلوقات کے حساب کتاب سے فارغ ہو جاویں گے اور دوپہر کے سونے کے وقت اہل جنت جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں (قرطبی)

تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ ، ای عن الغمام ۔ قرطبی۔ معنے یہ ہیں کہ آسمان شق ہو کر اس میں سے ایک تیق بادل اُترے گا جس میں فرشتے ہوں گے۔ یہ ابر بشکل سایبان آسمان سے آویگا اور اس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اُسکے گرداگرد ملائکہ ہوں گے۔ یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اُسوقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا یہ وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ نفخہ صور کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کے لئے ہوگا کیونکہ یہ نزول غمام جسکا ذکر آیت میں ہے نفخہ ثانیہ کے بعد ہے جبکہ سب زمین و آسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے (بیان القرآن)

يَقُولُ يٰلَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۔ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے مگر حکم عام ہے واقعہ یہ تھا کہ عقبہ ابن ابی معیط مکہ کے مشرک سرداروں میں سے تھا اس کی عادت تھی کہ جب کسی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معززوں کی دعوت کرتا تھا اور اکثر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ملا کرتا تھا ایک مرتبہ حسب عادت اُس نے معززین شہر کی دعوت کی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا۔ جب اُسنے آپ کے سامنے کھانا رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہارا کھانا اُس وقت تک نہیں کھا سکتا جب تک تم اس کی گواہی نہ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اُسکا کوئی شریک عبادت میں نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ عقبہ نے یہ کلمہ پڑھ لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شرط کے مطابق کھانا تناول فرمایا۔

عقبہ کا ایک گہرا دوست اُبَیّ بن خلف تھا جب اُس کو خبر لگی کہ عقبہ مسلمان ہوگیا تو یہ بہت برہم ہوا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معزز مہمان محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میرے گھر پر آئے ہوئے تھے اگر وہ بغیر کھانا کھائے میرے گھر سے چلے جاتے تو میرے لئے بڑی رُسوائی تھی اس لئے میں نے انکی خاطر سے یہ کلمہ کہہ لیا۔ اُبی بن خلف نے کہا کہ میں تیری ایسی باتوں کو قبول نہیں کرونگا جب تک تو جا کر اُن کے منھ پر نہ تھوکے۔ یہ کمبخت بدنصیب دوست کے کہنے سے اس گستاخی پر آمادہ ہوگیا اور کر گزرا اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بھی ان دونوں کو ذلیل کیا کہ غزوہ بدر میں دونوں مارے گئے (بغوی) اور آخرت میں اُنکے عذاب کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ جب آخرت کا عذاب سامنے دیکھیگا تو اسوقت ندامت و افسوس سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے گا اور کہیگا کاش میں فلاں یعنی اُبی بن خلف کو دوست نہ بناتا (مظہری و قرطبی)

غلط کار اور بے دین دوستوں کی دوستی قیامت کے روز حسرت و ندامت کا باعث ہوگی

تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ آیات اگرچہ خاص عقبہ کے واقعہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ الفاظ آیت کے عام ہیں حکم بھی عام ہے اور شاید اس جگہ اُس دوست کے نام کے بجائے قرآن میں فلاناً کا لفظ اسی عموم کی طرف اشارہ کرنے کے

لئے اختیار کیا گیا ہے۔ ان آیات نے یہ بتلایا ہے کہ جو دو دوست کسی معصیت اور گناہ پر جمع ہوں اور خلاف شرع اُمور میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے کہ قیامت کے روز اس گہرے دوست کی دوستی پر روئیں گے۔ مُسند احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا تصحب الا مؤمنا ولا یاکل مالک الا تقی (مظہری) کسی غیر مسلم کو اپنا ساتھی نہ بناؤ، اور تمہارا مال (بطور دوستی کے) صرف متقی آدمی کھائے یعنی غیر متقی سے دوستی نہ کرو، اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المرء علیٰ دین خلیلہ فلینظر من یخالل (رواہ البخاری)

ہر انسان (عادۃً) اپنے دوست کے دین اور طریق پر ہوتا ہے دوست بنانے سے پہلے خوب غور کرلیا کرو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے مجلسی دوستوں میں کون لوگ بہتر ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔

من ذکرکم باللہ رؤیتہ وزاد فی علمکم منطقہ وذکرکم بالاٰخرۃ عملہ رواہ البزار (قرطبی)

وہ شخص جس کو دیکھ کر خدا یاد آئے اور جس کی گفتگو سے تمہارا علم بڑھے اور جس کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی یاد تازہ ہو۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ یعنی کہیں گے رسُول (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو مہجور و متروک کر دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شکایت بارگاہِ حق تعالیٰ میں قیامت کے روز ہوگی یا اسی دُنیا میں آپؐ نے یہ شکایت فرمائی؟ ائمہ تفسیر اس میں مختلف ہیں، احتمال دونوں ہیں۔ اگلی آیت بظاہر قرینہ اسکا ہے کہ یہ شکایت آپؐ نے دُنیا ہی میں پیش فرمائی تھی جس کے جواب میں آپؐ کو تسلی دینے کیلئے اگلی آیت میں فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ، یعنی اگر آپ کے دشمن قرآن کو نہیں مانتے تو آپؐ کو اس پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ سُنت اللہ ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہر نبی کے کچھ مجرم لوگ دشمن ہوا کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اس پر صبر کرتے رہے ہیں۔

قرآن کو عملاً ترک کر دینا بھی گناہِ عظیم ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہے کہ قرآن کو مہجور و متروک کردینے سے مُراد قرآن کا انکار ہے جو کفار ہی کا کام ہے۔ مگر بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر نہ اسکی تلاوت کی پابندی کرتے ہیں نہ اُس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

من تعلّم القراٰن وعلّق مصحفہ لم یتعاھدہ ولم ینظر فیہ جاء یوم القیٰمۃ متعلقا بہ یقول یا رب العٰلمین ان عبدک ھذا اتخذنی مھجورا فاقض بینی و بینہ۔ ذکرہ الثعلبی (قرطبی)

جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اسکو بند کر کے گھر میں معلق کر دیا، اسکی تلاوت کی پابندی کی نہ اسکے احکام میں غور کیا، قیامت کے روز قرآن اُسکے گلے میں پڑا ہوا آئیگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کریگا کہ آپکے اس بندہ نے مجھے چھوڑ دیا تھا اب آپ میرے اور اسکے معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اُترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہوکر

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اسی طرح اُتارا تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اسکو ٹھہر ٹھہر کر

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا (مقصود اس اعتراض سے یہ ہے کہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو بتدریج نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بتدریج نازل کرنے سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم خود ہی سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں آگے اس اعتراض کا جواب ہے کہ) اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اُتارا ہے (چنانچہ تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ پُورا ہوا)۔

معارف و مسائل

یہ وہی سلسلہ کفار و مشرکین کے اعتراضات و جوابات کا ہے جو شروع سورت سے چلا آرہا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی ایک حکمت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھنا مقصود ہے۔ نزول تدریجی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویتِ قلب کی چند وجوہ ہیں اوّل یہ کہ یاد رکھنا آسان ہوگیا، ایک ضخیم کتاب بیک وقت نازل ہو جاتی تو یہ آسانی نہ رہتی اور آسانی کے ساتھ یاد ہوتے رہنے سے دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی۔ دُوسرے جب کفار آپ پر کوئی اعتراض یا آپکے ساتھ کوئی ناگوار معاملہ کرتے تو اُسی وقت آپ کی تسلّی کے لئے قرآن میں آیت نازل ہو جاتی، اور اگر پُورا قرآن ایک دفعہ آگیا ہوتا اور اس خاص واقعہ پر تسلّی کا ذکر بھی نازل ہو گیا ہوتا تو بہر حال اس کو قرآن میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی اور ذہن کا اُسطرف متوجہ ہو جانا بھی عادۃً ضروری نہیں تھا تیسرے پیغامِ خداوندی آنا تازہ شہادت ہے معیتِ خداوندی کی جو مدار اعظم ہے قوتِ قلب کا۔ اور اس جگہ جو حکمت تقویتِ قلب کی بتلائی گئی ہے نزولِ تدریجی کی حکمت اسمیں منحصر نہیں دوسری حکمتیں بھی ہیں جنمیں سے بعض سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ میں پہلے آچکی ہے۔ (بیان القرآن)

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ

اور نہیں لاتے تیرے پاس کوئی مثل کہ ہم نہیں پہنچا دیتے تجھ کو ٹھیک بات اور اس سے بہتر کھول کر جو لوگ کہ

يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ وَ

گھیر کر لائے جائیں گے اوندھے پڑے ہوئے اپنے منہ پر دوزخ کی طرف، اُنہی کا بُرا درجہ ہے اور بہت بہکے ہوئے ہیں راہ سے　اور

لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا

ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اُس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا پھر کہا ہم نے

اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾

تم دونوں جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اُکھاڑ کر

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم (اُس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں (تاکہ آپ مخالفین کو جواب دے سکیں۔ یہ بظاہر بیان اُس تقویتِ قلب کا ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہوا ہے کہ تدریجاً نازل کرنے میں ایک حکمت آپ کی دلجمعی اور تقویتِ قلب ہے کہ جب کفار کی طرف سے کوئی اعتراض آئے تو اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب نازل کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف لیجائے جاویں گے (یعنی گھسیٹ کر) یہ لوگ جگہ میں بھی بدتر ہیں اور طریقہ میں بھی بہت گمراہ ہیں۔ (یہاں تک انکارِ رسالت پر وعید اور قرآن پر اعتراضات کے جواب تھے، آگے اس کی تائید میں زمانہ ماضی کے بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں منکرینِ رسالت کا انجام اور عبرت انگیز حالات مذکور ہیں اور اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور تقویتِ قلب کا سامان ہے کہ پچھلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدد فرمائی اور دشمنوں پر غالب فرمایا وہ آپ کے لئے بھی ہونے والا ہے۔ ایس میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ) اور تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات) دی تھی اور (اس کتاب ملنے سے پہلے) ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (اُن کا) معین (و مددگار) بنایا تھا پھر ہم نے (دونوں کو) حکم دیا کہ دونوں آدمی اُن لوگوں کے پاس (ہدایت کرنے کے لئے) جاؤ جنھوں نے ہماری (توحید کی) دلیلوں کو جھٹلایا ہے (مراد اس سے فرعون اور اس کی قوم ہے چنانچہ یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور سمجھایا مگر انھوں نے نہ مانا) سو ہم نے اُن کو (اپنے قہر سے) بالکل ہی غارت کر دیا (یعنی دریا میں غرق کئے گئے)۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا، اس میں قوم فرعون کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ اس وقت تک تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس تکذیبِ آیات سے تورات کی تکذیب تو مراد نہیں ہو سکتی، بلکہ مراد آیات سے یا تو توحید کے دلائل عقلیہ ہیں

جو ہر انسان کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ میں آسکتے ہیں اُن میں غور نہ کرنے کو تکذیب آیات فرمایا اور یا یہ کہ انبیاء سابقین کی روایات جو کچھ نہ کچھ ہر قوم میں نقل ہوتی آئی ہیں اُن کا انکار مراد ہے جیسے قرآن کریم میں فرمایا وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ، اس میں انبیاء سابقین کی تعلیم کا ان لوگوں تک منقول چلا آنا بتلایا گیا ہے۔ (بیان القرآن)

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ

اور نوح کی قوم کو جب اُنھوں نے جھٹلایا پیغام لانے والوں کو ہم نے انکو ڈبا دیا اور کیا اُن کو لوگوں کے حق میں نشانی

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣٧﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے گنہگاروں کے واسطے عذاب دردناک اور عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں

الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَ

والوں کو اور اسکے بیچ میں بہت سی جماعتوں کو اور سب کو کہہ سنائیں ہم نے مثالیں اور

كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ

سب کو کھو دیا ہم نے غارت کر کر اور یہ لوگ ہو آئے ہیں اُس بستی کے پاس جن پر برسا بُرا

السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿٤٠﴾ وَاِذَا

برساؤ کیا دیکھتے نہ تھے اس کو؟ نہیں پر اُمید نہیں رکھتے جی اُٹھنے کی اور جہاں

رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿٤١﴾

تجھ کو دیکھیں کچھ کام نہیں اُن کو تجھ سے مگر ٹھٹھے کرنے کیا یہی ہے جس کو بھیجا اللہ نے پیغام دے کر

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

یہ تو ہم کو بچلا ہی دیتا ہمارے معبودوں سے اگر ہم نہ جمے رہتے اُن پر اور آگے جان لیں گے

حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٤٢﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ

جس وقت دیکھیں گے عذاب کو کہ کون بہت بچلا ہوا ہے راہ سے بھلا دیکھ تو اس شخص کو جس نے پوجنا اختیار کیا

هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ

اپنی خواہش کا، کہیں تو لے سکتا ہے اسکا ذمہ یا تو خیال رکھتا ہے کہ بہت سے ان میں سنتے

اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٤٤﴾ ع

یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے

ع ۱۰ ۲

خلاصۂ تفسیر

اور قوم نوح کو بھی (ان کے زمانہ میں) ہم ہلاک کر چکے ہیں (جن کی ہلاکت اور سبب ہلاکت کا بیان

یہ ہے کہ) جب اُنھوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (طوفان سے) غرق کر دیا اور ہم نے ان (کے واقعہ) کو لوگوں (کی عبرت) کے لئے نشان بنا دیا (یہ تو دُنیا میں سزا ہوئی) اور (آخرت میں) ہم نے (اُن) ظالموں کے لئے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور اُن کے بیچ بیچ میں بہت سی اُمتوں کو ہلاک کیا اور ہم نے (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی موثر اور بلیغ) مضامین بیان کئے اور (جب نہ مانا تو) ہم نے سب کو بالکل ہی برباد کر دیا۔ اور یہ (کفار مکہ شام کے سفر میں) اس بستی پر ہو کر گزرتے ہیں جس پر بُری طرح پتھر برسائے گئے تھے (مراد قریہ قوم لوط کا ہے) سو کیا یہ لوگ اس کو دیکھتے نہیں رہتے (پھر بھی عبرت نہیں پکڑتے کہ کفر و تکذیب کو چھوڑ دیں جس کی بدولت قوم لوط کو سزا ہوئی سو بات یہ ہے کہ عبرت نہ پکڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس قریہ کو دیکھتے نہ ہوں) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ مر کر جی اُٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے (یعنی آخرت کے منکر ہیں اس لئے کفر کو موجب سزا ہی قرار نہیں دیتے اور اسلئے اُن کی ہلاکت کو کفر کا وبال نہیں سمجھتے بلکہ اُمور اتفاقیہ میں سے سمجھتے ہیں یہ وجہ عبرت نہ پکڑنے کی ہے) اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ کیا یہی (بزرگ) ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا غریب آدمی رسول نہ ہونا چاہئے۔ اگر رسالت کوئی چیز ہے تو کوئی رئیس مالدار ہونا چاہئے تھا پس یہ رسول نہیں البتہ اس شخص (کی جادو بیانی اس غضب کی ہے کہ اس) نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم اُن پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے (یعنی ہم تو ہدایت پر ہیں اور یہ ہم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اب تو اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ہمارے پیغمبر کو گمراہ بتلا رہے ہیں) اور (مرنے کے بعد) جلدی ہی ان کو معلوم ہو جاوے گا جب عذاب کا معائنہ کریں گے کہ کون شخص گمراہ تھا (آیا وہ خود یا نعوذ باللہ پیغمبر، آگے میں اُن کے بیہودہ اعتراض کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبوت اور مالداری میں کوئی جوڑ نہیں مالدار نہ ہونے کے سبب نبوت سے انکار جہالت و گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دُنیا میں جو چاہیں خیال پکالیں مگر قیامت میں سب حقیقت کھل جاوے گی) اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اُس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں (مطلب یہ کہ آپ ان کی ہدایت نہ ہونے سے مغموم نہ ہو جیے کیونکہ آپ ان پر مسلط نہیں کہ خواہی نخواہی ان کو راہ پر لا دیں اور نہ ہدایت کی ان سے توقع کیجئے کیونکہ نہ یہ حق بات کو سُنتے ہیں نہ عقل سے کہ غور کریں) یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سُنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ یہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ وہ احکامِ دین کے مکلف نہیں تو ان کا نہ سمجھنا مذموم نہیں اور یہ مکلف ہیں پھر بھی نہیں سمجھتے پھر یہ کہ وہ اگر معتقد ان ضروریاتِ دین کے نہیں ہیں تو منکر بھی تو نہیں اور یہ تو منکر ہیں اور اس میں ان کی گمراہی کا منشاء بھی بیان کر دیا کہ کسی شبہ و دلیل سے ان کو اشتباہ نہیں ہوا بلکہ اتباع ہویٰ اس کا سبب ہے

معارف و مسائل

قوم نوح علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد کہ اُنھوں نے رسُولوں کو جھٹلایا حالانکہ پہلے رسُول نہ اُن کے زمانے میں تھے نہ اُنھوں نے جُھٹلایا، تو منشاء اسکا یہ ہے کہ اُنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اور چونکہ اُصول دین سب انبیاء کے مشترک ہیں اسلئے ایک کو جھٹلانا سبھی کے جھٹلانے کے حکم میں ہے۔

اَصْحٰبَ الرَّسِّ، رس، لُغت میں کچے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث میں ان لوگوں کے تفصیلی حالات مذکور نہیں۔ اسرائیلی روایات مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ قوم ثمود کے کچھ باقیماندہ لوگ تھے جو کسی کنوئیں پر آباد تھے (کذا فی القاموس والدر عن ابن عباسؓ) ان کے عذاب کی کیفیت بھی قرآن میں منصوص اور کسی صحیح حدیث میں بھی مذکور نہیں (بیان القرآن)

خلاف شرع خواہشات کی پیروی ایک قسم کی بُت پرستی ہے۔ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ، اس آیت میں اُس شخص کو جو اسلام شریعت کیخلاف اپنی خواہشات کا پیرو ہو یہ کہا گیا ہے کہ اُس نے اپنی خواہشات کو معبود بنالیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خلاف شرع خواہشات نفسانی بھی ایک بُت ہے جس کی پرستش کیجاتی ہے پھر استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (قرطبی)

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کیطرف کیسے دراز کیا سایہ کو اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا پھر ہم نے مقرر کیا

الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِىْ
سورج کو اسکا راہ بتلانے والا پھر کھینچ لیا ہم نے سکو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر اور وہی ہے جس نے

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَ
بنا دیا تمہارے واسطے رات کو اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن کو بنا دیا اُٹھ نکلنے کے لئے اور

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ
وہی ہے جس نے چلائیں ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی رحمت سے آگے اور اُتارا ہم نے

السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ
آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کا کہ زندہ کردیں اُس سے مرے ہوئے دیس کو اور پلائیں اُسکو اپنے پیدا کئے ہوئے

اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ
بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو اور طرح طرح سے تقسیم کیا ہم نے اسکو انکے بیچ میں تا دھیان رکھیں

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ
پھر بھی نہیں رہتے بہت لوگ بدون ناشکری کئے اور اگر ہم چاہتے تو اُٹھاتے ہر بستی میں

نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ

کوئی ڈرانے والا، سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کا اس کے ساتھ بڑے زور سے اور وہی ہے جس نے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا

ملے ہوئے چلائے دو دریا یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھ ان دونوں کے بیچ پردہ

وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ

اور آڑ روکی ہوئی اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اس کے لئے جد اور سسرال

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ

اور تیرا رب سب کچھ کر سکتا ہے اور پوجتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ چیز جو نہ بھلا کرے ان کا نہ برا

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿٥٥﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٥٦﴾ قُلْ

اور ہے کافر اپنے رب کی طرف سے پیٹھ پھیر رہا اور تجھ کو ہم نے بھیجا یہی خوشی اور ڈر سنانے کے لئے تو کہہ

مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٥٧﴾ وَ

میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے کہ پکڑے اپنے رب کی طرف راہ اور

تَوَكَّلْ عَلَي الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ

بھروسہ کر اوپر اس زندہ کے جو نہیں مرتا اور یاد کر اس کی خوبیاں اور وہ کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے

خَبِيْرَۨا ﴿٥٨﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

خبردار جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں پھر

اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔـلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿٥٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا

قائم ہوا عرش پر وہ بڑی رحمت والا سو پوچھ اس سے جو اس کی خبر رکھتا ہو اور جب کہئے ان سے سجدہ کرو

لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿٦٠﴾ ۞

رحمٰن کو کہیں رحمٰن کیا ہے کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرمائے اور بڑھ جاتا ہے ان کا بدکنا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾

بڑی برکت ہے اس کی جس نے بنائے آسمان میں برج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند اجالا کرنے والا

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا

مع

ع ۵
السجدة

خلاصۂ تفسیر

اے مخاطب کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ اس نے (جب آفتاب افق

سے طلوع کرتا ہے اسوقت کھڑی ہوئی چیزوں کے) سایہ کو کیونکر (دُور تک) پھیلایا ہے (کیونکہ طلوع کے وقت ہر چیز کا سایہ لمبا ہوتا ہے) اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرا ہوا رکھتا (یعنی آفتاب کے بلند ہونے سے بھی نہ گھٹتا اس طرح پر کہ اتنی دُور تک آفتاب کی شعاعوں کو نہ آنے دیتا کیونکہ آفتاب کی شعاعوں کا زمین کے حصوں پر پہنچنا بارادۂ حق ہے نہ کہ بالاضطرار مگر ہم نے اپنی حکمت سے اسکو ایک حالت پر نہیں رکھا بلکہ اس کو پھیلا ہوا بنا کر) پھر ہمنے آفتاب کو (یعنی اُسکے اُفق کے قریب ہونے اور پھر اُفق سے بلند ہونے کو) اس (سایہ کی درازی و کوتاہی) پر (ایک ظاہری) علامت مقرر کیا (مطلب یہ کہ اگرچہ روشنی اور سایہ اور انکے گھٹنے بڑھنے کی اصل علت حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، آفتاب یا کوئی دوسری چیز مؤثر حقیقی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے کچھ ظاہری اسباب بنا دیئے ہیں اور اسباب کیساتھ اُن کے مسببات کا ایسا رابطہ قایم کردیا کہ سبب کے تغیر سے مسبب میں تغیر ہوتا ہے) پھر (اس تعلق ظاہری کی وجہ سے) ہمنے اس (سایہ) کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا (یعنی جوں جوں آفتاب اونچا ہوا وہ سایہ زائل اور معدوم ہوتا گیا اور چونکہ اسکا غائب ہونا محض قدرتِ الٰہیہ سے بلا شرکتِ غیرے ہے اور عام لوگوں کی رؤیت سے غائب ہونے کے باوجود علم الٰہی سے غائب نہیں ہے اسلئے یہ فرمایا گیا کہ اپنی طرف سمیٹ لیا) اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو (اس اعتبار سے کہ سونا مشابہ موت کے ہے اور دن کا وقت جاگنے کا ہے گویا) زندہ ہونے کا وقت بنایا اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی اُمید دلاکر دل کو) خوش کر دیتی ہیں اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین میں جان ڈالدیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چارپایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں اور ہم اُس (پانی) کو (بقدر مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں (کہ یہ تصرفات کسی بڑے قادر کے ہیں کہ وہی مستحق عبادت ہے) سو چاہیئے تھا کہ غور کر کے اسکا حق ادا کرتے لیکن) اکثر لوگ بغیر ناشکری کئے نہ رہے (جس میں سب سے بڑھ کر کفر و شرک ہے لیکن آپ ان کی اور بالخصوص اکثر کی ناشکری سُنکر یا دیکھ کر سعی فی التبلیغ سے ہمت نہ ہار دیجئے کہ میں تنہا ان سب سے کیسے عہدہ برآ ہونگا بلکہ آپ تنہا ہی اپنا کام کئے جایئے کیونکہ آپ کو تنہا نبی بنانے سے خود ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ کا اجر اور قرب بڑھے) اور اگر ہم چاہتے تو (آپ کے علاوہ اسی زمانہ میں) ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیج دیتے (اور تنہا آپ پر تمام کام نہ ڈالتے لیکن چونکہ آپ کا اجر بڑھانا مقصود ہے اسلئے ہم نے ایسا نہیں کیا تو اس طور پر اتنا کام آپکے سپرد کرنا خدا تعالےٰ کی نعمت ہے) سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافرو

اس سے خوش ہوں گے کہ تبلیغ نہ ہو یا کمی ہو جاوے اور ان کی آزادی سے تعرض نہ کیا جاوے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر دلائل توحید کے ارشاد ہوئے ہیں اُن) سے اُن کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت و تبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہئے اور بار بار کہئے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہتے ہیں اس پر قائم رہئے۔ آگے پھر بیان ہے دلائل توحید کا، اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا جن میں ایک (کا پانی) تو شیریں تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ ہے اور (باوجود اختلاط صوری کے حقیقۃً) اُن کے درمیان میں (اپنی قدرت سے) ایک حجاب اور (اختلاط حقیقی سے) ایک مانع قوی رکھ دیا (جو خود تو غیر محسوس ہے مگر اُس کا اثر یعنی امتیاز دونوں پانی کے مزہ میں محسوس اور مشاہد ہے۔ مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آکر گرتی ہیں وہاں باوجودیکہ اوپر سے دونوں کا سطح ایک معلوم ہوتا ہے لیکن قدرتِ الٰہیہ سے ان میں ایک ایسی حد فاصل ہے کہ ملتقی کے ایک جانب سے پانی لیا جاوے تو شیریں اور دوسری جانب سے جو کہ جانب اوّل سے بالکل قریب ہے پانی لیا جائے تو تلخ۔ دُنیا میں جہاں جس جگہ شیریں پانی کی نہریں چشمے سمندر کے پانی میں گرتے ہیں وہاں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ میلوں دُور تک میٹھا اور کھاری پانی الگ الگ چلتے ہیں، داہنی طرف میٹھا بائیں طرف تلخ کھاری یا اوپر نیچے شیریں اور تلخ پانی الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کے تحت لکھا کہ بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علما کی شہادت نقل کی ہے کہ ارکان سے چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبین بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں ایک کا پانی سفید ہے اور ایک کا سیاہ، سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقیٰ ہے لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا۔ اھ۔ اور مجھ سے باریسال کے بعض طلبا نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں دو ندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آجکل مقیم ہے (ڈابھیل ملک ضلع سورت) سمندر وہاں سے تقریباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ادھر کی ندیوں میں برابر مد و جزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے۔ اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا، جزر کے وقت اوپر سے کھاری اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں میٹھا باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے

سے ممتاز رہتے ہیں) اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اُس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا (چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں، نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں پھر شادی کے بعد سسرالی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں یہ دلیل قدرت بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھا پھر اس کو کیسا بنا دیا کہ وہ اتنی جلد خون والا ہو گیا اور نعمت بھی ہے کہ ان تعلقات پر تمدن اور امداد باہمی کی تعمیر قائم ہے) اور (اے مخاطب) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے اور (باوجود اسکے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں ایسا کامل ہے جیسا بیان ہوا اور یہ کمالات مقتضی ہیں کہ اسی کی عبادت کی جاوے مگر) یہ (مشرک لوگ (ایسے) خدا کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں (جو عبادت کرنے پر) نہ اُن کو کچھ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ (درصورت عبادت نہ کرنے کے) اُن کو کچھ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور کافر تو اپنے رب کا مخالف ہے (کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے اور کفار کی مخالفت معلوم کر کے آپ نہ تو اُن کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوں کیونکہ) ہم نے آپ کو صرف اسلئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں۔ (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا کیا نقصان ہے، پھر آپ کیوں غم کریں اور نہ آپ اُس مخالفت کو معلوم کر کے فکر میں پڑیں کہ جب یہ حق تعالیٰ کے مخالف ہیں تو میں جو حق تعالیٰ کیطرف دعوت کرتا ہوں اس دعوت کو یہ لوگ خیر خواہی کب سمجھیں گے بلکہ میری خود غرضی پر محمول کر کے التفات بھی نہ کریں گے تو اُن کے گمان کی کہ بیکر اصلاح کیا دیتے تاکہ مانع مرتفع ہو سو اگر آپ کو اُن کا یہ خیال قرینہ سے یا زبانی گفتگو سے معلوم ہو تو) آپ (جواب میں اتنا) کہہ دیجئے (اور بےفکر ہو جائے) کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا ہاں جو شخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرلے (تو البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں چاہے اس کو معاوضہ کہو یا نہ کہو) اور (نہ اُس مخالفت کو دریافت کر کے اُن کی ضرر رسانی سے اندیشہ کیجئے بلکہ تبلیغ میں) اُس حی لایموت پر توکل رکھئے اور (اطمینان کے ساتھ) اُس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہیے اور (نہ مخالفت سن کر تعجیل عقوبت کی اس خیال سے تمنا کیجئے کہ ان کا ضرر دوسروں کو نہ پہنچ جاوے کیونکہ) وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے (وہ جب مناسب سمجھے گا سزا دیدے گا۔ پس ان جملوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حزن و فکر اور خوف کو زائل فرمایا ہے آگے پھر توحید کا بیان ہے) وہ ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اُس کی شان کے لائق ہے جسکا بیان سورۂ اعراف کے رکوع ہفتم کے شروع آیت میں گزر چکا) وہ بڑا مہربان ہے سو اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیے (کہ وہ کیسا ہے کافر مشرک کیا

جانیں اور اس معرفت صحیحہ کے نہونے سے شرک کرتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ وما قدروا اللہ حق قدرہ) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو (بوجہ جہل وعناد کے) کہتے ہیں کہ رحمن کیا چیز ہے (جس کے سامنے ہم کو سجدہ کرنے کو کہتے ہو) کیا ہم اُس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے اُن کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے (لفظ رحمن ان میں کم مشہور تھا مگر یہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں مگر اسلامی تعلیم سے جو مخالفت بڑھی ہوئی تھی تو محاورات اور بول چال میں بھی مخالفت کو نباہتے تھے۔ قرآن میں جو یہ لفظ بکثرت آیا وہ اس کی بھی مخالفت کر بیٹھے) وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اُن ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ بخش ستارے بنائے یعنی) اُس (آسمان) میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا (شاید آفتاب کو سراج بوجہ تیزی کے کہا) اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے) اُس شخص کے (سمجھنے کے) لئے (ہیں) جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (کہ اس میں سمجھنے والے کی نظر میں استدلالات ہیں اور شکر گزاری کرنے والے کی نظر میں انعامات ہیں) ورنہ ؎

اگر صد باب حکمت پیش ناداں ✤ بخوانی آیدش بازیچہ در گوش

معارف ومسائل

مخلوقات الٰہیہ میں اسباب و مسببات کا رشتہ اور ان سب کا قدرت حق کا تابع ہونا

مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بندوں پر اسکے انعامات و احسانات کا ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت میں اُسکے ساتھ کسی کا شریک نہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۔ دھوپ اور چھاؤں دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ اُن کے بغیر انسانی زندگی اور اسکے کاروبار نہیں چل سکتے۔ ہر وقت ہر جگہ دھوپ ہی دھوپ ہو جائے تو انسان اور ہر جاندار کے لئے کیسی مصیبت ہو جائے یہ تو ظاہر ہے اور سایہ کا بھی یہی حال ہے کہ اگر ہر جگہ ہر وقت سایہ ہی رہے کبھی دھوپ نہ آوے تو انسان کی صحت وتندرستی نہیں رہ سکتی، اور بھی ہزاروں کاموں میں خلل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمائیں اور انسانوں کے لئے ان کو موجب راحت، و سکون بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے اس دنیا میں پیدا ہونے والی تمام اشیاء کو خاص خاص اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ جب وہ اسباب موجود ہوتے ہیں تو یہ چیزیں موجود ہو جاتی ہیں جب نہیں ہوتے تو یہ چیزیں بھی نہیں رہتیں۔ اسباب قوی یا زیادہ ہوتے ہیں تو اُن کے مسببات کا وجود قوی اور زیادہ ہو جاتا ہے، وہ کمزور یا کم ہوتے ہیں تو

مُسببات بھی کمزور یا کم ہو جاتے ہیں۔ غلہ اور گھاس اُگانے کا سبب زمین اور پانی اور ہوا کو بنا رکھا ہے روشنی کا سبب آفتاب ماہتاب کو بنا رکھا ہے۔ بارش کا سبب بادل اور ہواؤں کو بنا رکھا ہے۔ اور ان اسباب اور اُن پر مرتب ہونے والے اثرات میں ایسا مستحکم اور مضبوط ربط قایم فرما دیا ہے کہ ہزاروں سال سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے چل رہے ہیں۔ آفتاب اور اس کی حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے دن رات اور دھوپ چھاؤں پر نظر ڈالو تو ایسا مستحکم نظام ہے کہ صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ نہ کبھی آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی مشینری میں کوئی کمزوری آتی ہے، نہ کبھی ان کو اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے جب سے دُنیا وجود میں آئی ایک انداز ایک رفتار سے چل رہے ہیں حساب لگا کر ہزار سال بعد تک کی چیزوں کا وقت بتلایا جا سکتا ہے۔

سبب اور مُسبب کا یہ مستحکم نظام جو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا عجیب و غریب شاہکار اور اُس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بُرہان قطعی ہے اسکے استحکام ہی نے لوگوں کو غفلت میں ڈال دیا کہ اُن کی نظروں میں صرف یہ اسبابِ ظاہرہ ہی رہ گئے اور انہی اسباب کو تمام چیزوں اور تاثیرات کا خالق و مالک سمجھنے لگے۔ مسبب الاسباب کی اصلی قوت جو ان اسباب کی پیدا کرنے والی ہے وہ اسباب کے پردوں میں مستور ہو گئی۔ اسلئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں انسان کو بار بار اس پر تنبیہ کرتی ہیں کہ ذرا نظر کو بلند اور تیز کرو، اسباب کے پردوں کے پیچھے دیکھو کون اس نظام کو چلا رہا ہے تاکہ حقیقت تک راہ پاؤ۔ اسی سلسلے کے یہ ارشادات ہیں جو آیات مذکورہ میں آئے۔ آیت اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ میں غافل انسان کو اس پر تنبیہ کیا گیا ہے کہ تو روزانہ دیکھتا ہے کہ صبح کو ہر چیز کا سایہ جانبِ غرب دراز ہوتا ہے، پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ نصف النہار کے وقت معدوم یا کالعدم ہو جاتا ہے پھر زوال کے بعد یہی سایہ اسی تدریجی رفتار کے ساتھ مشرق کی جانب میں پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ ہر انسان اس دھوپ اور چھاؤں کے فوائد ہر روز حاصل کرتا ہے اور اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع ہونے پھر بلند ہونے پھر غروب کی طرف مائل ہونے کے لازمی نتائج و ثمرات ہیں، لیکن آفتاب کے کرہ کی تخلیق پھر اُسکے ایک خاص نظام کے تحت باقی رکھنے کا کام کس نے کیا، یہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا اس کیلئے دل کی آنکھیں اور بصیرت درکار ہے۔

آیتِ مذکورہ میں یہی بصیرت انسان کو دینا مقصود ہے کہ یہ سایوں کا بڑھنا گھٹنا اگرچہ تمہاری نظروں میں آفتاب سے متعلق ہے مگر اس پر بھی تو غور کرو کہ آفتاب کو اس شان کیساتھ کس نے پیدا کیا اور اسکی حرکت کو ایک خاص نظام کے اندر کس نے باقی رکھا جس کی قدرتِ کاملہ نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ ہی درحقیقت اس دھوپ چھاؤں کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اگر وہ

چاہتا تو اس دھوپ چھاؤں کو ایک حالت پر قائم کر دیتا جہاں دھوپ ہے وہاں ہمیشہ دھوپ رہتی، جہاں چھاؤں ہے ہمیشہ چھاؤں رہتی مگر اس کی حکمت نے انسانی ضروریات و فوائد پر نظر کر کے ایسا نہیں کیا۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا کا یہی مطلب ہے۔

انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے سایہ کے واپس لوٹنے اور گھٹنے کو آیت مذکورہ میں اس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے کہ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا یعنی پھر سایہ کو ہم نے اپنی طرف سمیٹ لیا، یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور جہت اور سمت سے بالاتر ہے، اسکی طرف سایہ کا سمٹنا، اسکا مفہوم یہی ہے کہ اُس کی قدرت کاملہ سے یہ سب کام ہوا۔

رات میں نیند اور دن میں کام کی تخصیص بھی بڑی حکمت پر مبنی ہے

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا، اس آیت میں رات کو لباس کے لفظ سے تعبیر فرمایا کہ جس طرح لباس انسان کے پورے بدن کا ساتر ہے اسی طرح رات ایک قدرتی پردہ کی چادر ہے جو پوری کائنات پر ڈالدی جاتی ہے۔ سُبَاتًا، سبت سے مشتق ہے جس کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں۔ سُبَات وہ چیز ہے جس سے کسی دوسری چیز کو قطع کیا جائے۔

نیند کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ دن بھر کی محنتوں کا تکان اور کمزوری اس سے قطع ہو جاتی ہے۔ افکار و خیالات منقطع ہو کر دماغ کو آرام ملتا ہے اسلئے سُبَات کا ترجمہ راحت کا کیا جاتا ہے معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ہم نے رات کو ایک چھپانے والی چیز بنایا پھر اسمیں انسان اور سارے جانداروں پر نیند مسلط کر دی جو اُن کے آرام و راحت کا سامان ہے۔

یہاں کئی چیزیں قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ نیند کا راحت ہونا بلکہ راحت کی جان ہونا تو ہر شخص جانتا ہے مگر انسانی فطرت یہ ہے کہ روشنی میں نیند آنا مشکل ہوتا ہے اور آ بھی جائے تو جلد آنکھ کھل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے نیند کے مناسب رات کو تاریک بھی بنایا اور ٹھنڈا بھی، اسطرح رات خود ایک نعمت ہے اور نیند دوسری نعمت، اور تیسری نعمت یہ ہے کہ سارے جہان کے انسانوں جانوروں کی نیند ایک ہی وقت رات میں جبری کر دی۔ ورنہ اگر ہر انسان کی نیند کے اوقات دوسرے انسان سے مختلف ہوتے تو جس وقت کچھ لوگ سونا چاہتے دوسرے لوگ کاموں میں مصروف اور شور وشغب کا سبب بنے رہتے۔ اسی طرح جب دوسروں کے سونے کی باری آتی تو اس وقت کام کرنے والے چلنے پھرنے والے ان کی نیند میں خلل انداز ہوتے۔ اس کے علاوہ ہر انسان کی ہزاروں حاجتیں دوسرے انسانوں سے وابستہ ہوتی ہیں باہمی تعاون و تناصر اور کاموں میں بھی شدید حرج ہوتا کہ جس شخص سے آپ کو کام ہے اُسکے سونے کا وقت ہے اور جب اُسکے جاگنے کا وقت آئیگا تو آپکا سونے کا وقت ہوگا۔

اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بین الاقوامی معاہدہ سے کام لیا جاتا کہ سب لوگ اپنے سونے کا

وقت ایک ہی مقرر کرلیں، اوّل تو ایسا معاہدہ اربوں کروڑوں انسانوں میں ہونا آسان نہ تھا پھر اُس پر کاربند رکھنے کے لئے ہزاروں محکمے کھولنے پڑتے اس کے باوجود عام قانونی اور معاہداتی طریقوں سے طے ہونیوالی چیزوں میں جو خلل ہر جگہ رشوت، رعایت وغیرہ کے سبب پایا جاتا ہے وہ پھر بھی باقی رہتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے نیند کا ایک وقت جبری طور پر مقرر کردیا ہے کہ ہر انسان اور ہر جانور کو اُسی وقت نیند آتی ہے کبھی کسی ضرورت سے جاگنا بھی چاہے تو اُس کے لئے مشکل سے انتظام کرنا پاتا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی طرح وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا، میں دن کو نشور یعنی زندگی فرمایا کیونکہ اسکا مقابل یعنی نیند ایک قسم کی موت ہے اور اس زندگی کے وقت کو بھی سارے انسانوں میں جبری طور پر ایک کردیا ہے ورنہ کچھ کارخانے اور دُکانیں دن کو بند رہتیں، رات کو کُھلتیں، اور جب وہ کُھلتیں تو دوسری بند ہوجاتیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں کاروباری مشکلات پیش آتیں۔

جس طرح رات کو نیند کے لئے مخصوص فرما کر ایک بڑا انعام حق تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح دوسری ضروریاتِ زندگی جو باہم اشتراک چاہتی ہیں اُن کے لئے بھی تقریبی طور پر ایسے ہی متحد اور مشترک وقت مقرر کردیئے۔ مثلاً بھوک اور کھانے کی ضرورت صبح شام ایک امر مشترک ہے سب کو ان اوقات میں اسکی فکر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں سب ضروریات کی فراہمی ہر ایک کے لئے آسان ہوجاتی ہے کھانے کے ہوٹل اور دُکانیں ان وقتوں میں تیار کھانے سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر گھر میں یہ اوقات کھانے کی مصروفیت کے لئے متعین ہیں۔ یہ تعیین کی بڑی نعمت ہے جو حق تعالیٰ ہی کی حکمت بالغہ نے فطری طور پر انسان کی طبیعت میں رکھدی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا، طہور کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طہور اُس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیزوں کو بھی اُس سے پاک کیا جاسکے۔ حق تعالیٰ نے پانی کو یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جیسے وہ خود پاک ہے اُس سے دوسری ہر قسم کی نجاست حقیقی و معنوی کو بھی دُور کیا جاسکتا ہے۔ اور جس پانی کو آدمی استعمال کرتے ہیں وہ عموماً وہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے کبھی بارش کی صورت میں کبھی برف اور اولے کی صورت میں، پھر وہ ہی پانی پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ قدرتی پائپ لائن کی صورت میں ساری زمین پر پھیلتا ہے جو کہیں خود بخود چشموں کی صورت میں نکل کر زمین پر بہنے لگتا ہے۔ کہیں زمین کھود کر کنوئیں کی صورت میں نکالا جاتا ہے یہ سب پانی اپنی ذات سے پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنیوالا ہے اس پر قرآن و سُنت کی نصوص بھی ناطق ہیں اور اُمت کا اجماع بھی۔

یہ پانی جب تک کثیر مقدار میں ہو، جیسے تالاب، حوض، نہر کا پانی اس میں کوئی نجاست بھی گر جائے

تو ناپاک نہیں ہوتا اس پر بھی سب کا اتفاق ہے بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو اور اسکا رنگ ذائقہ بُو متغیر نہ ہو، لیکن تھوڑا پانی ہو اور اسمیں نجاست گر جائے تو اسکا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے اسی طرح پانی کی کثیر و قلیل کی مقدار معین کرنے میں اقوال مختلف ہیں تفسیر مظہری اور قرطبی میں اس جگہ پانی سے متعلق تمام مسائل تفصیل کیساتھ لکھے ہیں اور یہ مسائل عام کتب فقہ میں بھی مذکور ہیں اس لئے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا، اناسی، انسی کی جمع ہے اور بعض نے فرمایا کہ انسان کی جمع ہے۔ آیت میں یہ بتلایا ہے کہ آسمان سے نازل کردہ پانی سے اللہ تعالیٰ زمین کو بھی سیراب کرتا ہے اور جانوروں کو بھی اور بہت سے انسانوں کو بھی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح جانور سب کے سب اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی سبھی اس پانی سے فائدہ اٹھاتے اور سیراب ہوتے ہیں پھر انمیں یہ تخصیص کہ بہت سے انسانوں کو سیراب کیا اس کو تو یہ لازم آتا ہے کہ بہت سے انسان اس سیرابی سے محروم اور الگ ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں بہت سے انسانوں سے وہ جنگل کے رہنے والے لوگ مراد ہیں جنکا عموماً گزارہ بارش کے پانی پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی والے تو نہروں کے کناروں پر کنوؤں کے قریب آباد ہوتے ہیں بارش کے منتظر نہیں رہتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ، مطلب آیت کا یہ ہے کہ بارش کو ہم بدلتے اور پھیرتے رہتے ہیں کبھی ایک شہر میں کبھی دوسرے میں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جو لوگوں میں شہرت ہوتی ہے کہ اس سال بارش زیادہ ہے اس سال کم ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں بلکہ بارش کا پانی تو ہر سال اللہ تعالیٰ کیطرف سے یکساں نازل ہوتا ہے البتہ بحکم الٰہی یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کی مقدار کسی شہر بستی میں زیادہ کر دی کسی میں کم کر دی۔ بعض اوقات کمی کر کے کسی بستی کے لوگوں کو سزا دینا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادتی بھی عذاب بن جاتی ہے۔ تو یہی پانی جو خالص رحمت ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کرتے ہیں اُن کے لئے اسی کو عذاب اور سزا بنا دیا جاتا ہے۔

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہاد کبیر ہے

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا، یہ آیت مکی ہے جبکہ احکام کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے اسی لئے یہاں جہاد کو بِہٖ کے ساتھ مقید کیا گیا۔ بِہٖ کی ضمیر قرآن کیطرف راجع ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد، قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اسکے احکام کی تبلیغ اور خلق خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے اس سب کو یہاں جہاد کبیر فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا، لفظ مَرَجَ آزاد چھوڑ دینے کے معنے میں آتا ہے اسی وجہ سے مَرج چراگاہ

کو کہتے ہیں جہاں جانور آزادی سے چلیں پھریں اور چریں۔ عَذْبٌ میٹھے پانی کو کہا جاتا ہے۔ فُرَاتٌ خوش ذائقہ اور خوشگوار مِلْحٌ نمکین اُجَاجٌ تیز و تلخ۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل اور حکمتِ بالغہ سے دنیا میں دو طرح کے دریا پیدا فرمائے ہیں۔ ایک سب سے بڑا بحرِ محیط جس کو سمندر کہتے ہیں اور زمین کے سب اطراف اسمیں گھرے ہوئے ہیں ایک چوتھائی کے قریب حصہ ہے جو اس سے کھلا ہوا ہے اسمیں ساری دُنیا آباد ہے۔ یہ سب سے بڑا دریا بتقاضائے حکمت سخت نمکین تلخ اور بدمزہ ہے۔ زمین کے آباد حصے پر آسمان سے اُتارے ہوئے پانی کے چشمے، ندیاں نہریں اور بڑے بڑے دریا ہیں یہ سب میٹھے خوشگوار اور خوش ذائقہ ہیں۔ انسان کو اپنے پینے اور پیاس بجھانے اور روزمرہ کے استعمال میں ایسے ہی شیریں پانی کی ضرورت ہے جو حق تعالیٰ نے زمین کے آباد حصہ میں مختلف صورتوں میں مہیا فرما دیا ہے۔ لیکن بحرِ محیط سمندر اگر میٹھا ہوتا تو میٹھے پانی کا خاصہ ہے کہ بہت جلد سڑ جاتا ہے۔ خصوصاً سمندر جسمیں خشکی کی آبادی سے زیادہ دریائی انسانوں جانوروں کی آبادی بھی ہے جو اسمیں مرتے ہیں وہیں سڑتے اور مٹی ہوجاتے ہیں اور پوری زمین کے پانی اور اُس میں بہنے والی ساری گندگیاں بھی بالآخر سمندر میں جاکر پڑتی ہیں۔ اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو دو چار دن میں ہی سڑ جاتا۔ اور یہ سڑتا تو اس کی بدبو سے زمین والوں کو زمین پر رہنا مصیبت ہوجاتا۔ اسلئے حکمتِ خداوندی نے اس کو اتنا سخت نمکین اور کڑوا اور تیز بنا دیا کہ دُنیا بھر کی گندگیاں اسمیں جاکر بھسم ہوجاتی ہیں اور خود اسمیں رہنے والی مخلوق بھی جو اسی میں مرتی ہے وہ بھی سڑنے نہیں پاتی۔

آیتِ مذکورہ میں ایک تو اس انعام و احسان کا ذکر ہے کہ انسان کی ضرورت کا لحاظ فرما کر دو قسم کے دریا پیدا فرمائے۔ دوسرے اس قدرتِ کاملہ کا کہ جس جگہ میٹھے پانی کا دریا یا نہر سمندر میں جاکر گرتے ہیں اور میٹھا اور کڑوا دونوں پانی یکجا ہوجاتے ہیں وہاں یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دونوں پانی میلوں دُور تک اسطرح ساتھ لگے ہوئے چلتے ہیں کہ ایک طرف میٹھا، دوسری طرف کڑوا اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی آڑ حائل نہیں ہوتی۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا، نسب اس رشتہ اور قرابت کو کہا جاتا ہے جو باپ یا ماں کیطرف سے ہو۔ اور صِهر وہ رشتہ و تعلق ہے جو بیوی کیطرف سے ہو جس کو عرف میں سُسرال بولتے ہیں۔ یہ سب تعلقات اور قرابتیں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی خوشگوار زندگی کے لئے لازمی ہیں، اکیلا آدمی کوئی کام بھی نہیں کرسکتا۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا، یعنی تمھیں ایمان کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے اور دُنیا و آخرت میں تمھارے لئے فلاح کی کوشش کرنے میں میرا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں۔ میں اپنی اس محنت کا تم سے کوئی اجر و معاوضہ

نہیں مانگتا، میرا فائدہ اسکے سوا نہیں کہ جسکا جی چاہے اللہ کا راستہ اختیار کر لے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص راہ پر آجاوے تو فائدہ اُسی کا ہے اس کو اپنا فائدہ قرار دینا پیغمبرانہ شفقت کیطرف اشارہ ہے کہ میں تمھارے فائدہ ہی کو اپنا فائدہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی بوڑھا ضعیف باپ اولاد کو کہے کہ تم کھاؤ پیو اور خوش رہو، یہی میرا کھانا پینا اور خوش رہنا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسکو اپنا فائدہ اس لحاظ سے فرمایا ہو کہ اسکا ثواب آپ کو ملے گا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا ہے اور وہ اسکے کہنے کے مطابق نیک عمل کرے تو اسکے عمل کا ثواب خود کرنے والے کو بھی پورا پورا ملے گا اور اتنا ہی ثواب ہدایت کرنے والے شخص کو بھی ملے گا (مظہری)

فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا، یعنی آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنا پھر اپنی شان کے مطابق اُن پر جلوہ افروز ہونا سب اللہ رحمٰن کا کام ہے اس کی تصدیق و تحقیق مطلوب ہو تو کسی باخبر سے پوچھئے۔ باخبر سے مراد حق تعالیٰ یا جبرئیل امین ہیں اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مُراد کتبِ سابقہ کے علماء ہوں جن کو اپنے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس معاملہ کی اطلاع ملی ہے۔ (مظہری)

قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ لفظ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی سب عرب جانتے تھے مگر یہ لفظ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ بولتے تھے اسی لئے یہاں یہ سوال کیا کہ رحمٰن کون اور کیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

مقصود ان آیات سے انسان کو یہ بتلانا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے اور شمس و قمر اور اُنکے ذریعہ رات دن کا انقلاب اور اُنکی تاریکی اور روشنی اور زمین و آسمان کی تمام کائنات اسلئے پیدا کئے ہیں کہ غور و فکر کرنیوالے کو اسمیں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور توحید کے دلائل فراہم ہوں۔ اور شکرگزار کے لئے شکر کے مواقع ملیں تو جس شخص کا وقت دُنیا میں ان دونوں چیزوں سے خالی گزر گیا اسکا وقت ضائع ہوگیا اور اسکا راس المال بھی فنا ہوگیا اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الذّٰکِرِیْنَ الشّٰاکِرِیْنَ۔

ابن عربی فرماتے ہیں کہ میں نے شہید اکبر سے سُنا ہے کہ بڑے غبن اور خسارہ میں ہے وہ آدمی جسکی عمر ساٹھ سال ہوئی۔ اسمیں سے آدھا وقت تیس سال رات کو سونے میں گزر گئے اور چھٹا حصہ یعنی دس سال دن کو آرام کرنے میں گزر گیا تو ساٹھ میں سے صرف بیس سال کام میں لگے۔ قرآنِ حکیم نے اس جگہ بڑے بڑے ستاروں اور سیاروں اور فلکیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن ان چیزوں کا ذکر بار بار اسلئے کرتا ہے کہ تم ان کی تخلیق اور ان کی حرکات اُن سے پیدا ہونے والے آثار میں غور کر کے اُن کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کو پہچانو اور شکرگزاری کیساتھ اُسے یاد کرتے رہو۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اجرام سماویہ اور فلکیات کی حقیقت اور ہیئت کیا ہے یہ آسمانوں کے جرم کے اندر سمائے ہوئے ہیں یا اُن سے باہر کی فضائی آسمانی میں ہیں۔ انسان کے معاش یا معاد کا کوئی مسئلہ اس سے وابستہ نہیں اور ان کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے

لئے آسان بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کی ہیں انکے اقرار سے ثابت ہے کہ وہ بھی کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کر سکے اور جو فیصلے کئے وہ بھی خود دوسرے حکماء کی مخالف تحقیقات نے مخدوش مجروح کر دیئے، اس لئے تفسیر قرآن میں اس سے زیادہ کسی بحث میں پڑنا بھی کوئی قرآن کی ضروری خدمت نہیں۔ لیکن اس زمانے کے ماہرین سائنس نے مصنوعی سیارات اڑانے اور چاند تک پہنچ جانے اور وہاں کی مٹی پتھر، غاروں، پہاڑوں کے فوٹو فراہم کرنے میں بلاشبہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے مگر افسوس ہے کہ قرآن حکیم ان چیزوں سے انسان کو جس حقیقت شناسی کا سبق دینا چاہتا ہے یہ لوگ اپنی تحقیقی کاوشوں کے غرور میں مست ہو کر اُس سے اور زیادہ دُور ہو گئے اور عام لوگوں کے ذہنوں کو بھی بُری طرح اُلجھا دیا، کوئی ان چیزوں کو قرآن کے خلاف سمجھ کر مشاہدات کا ہی انکار کر دیتا ہے کوئی قرآن کریم میں تاویلات کرنے لگتا ہے اسلئے ضروری معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو واضح کر دیا جائے۔ سورۂ حجر کی آیت وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا کے تحت اسکا وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ سورۂ فرقان میں اسکی تفصیل لکھی جاویگی وہ حسب ذیل ہے وَاللّٰہُ الموفق

ستارے اور سیارے آسمانوں کے اندر ہیں یا باہر قدیم وجدید علم ہیئت کے نظریات اور قرآن کریم کے ارشادات

جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بُروج یعنی سیارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح سُورۂ نوح میں ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا اس میں فِيْهِنَّ کی ضمیر سبع سمٰوات کی طرف راجع ہے جس سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں کے اندر ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ اول تو یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم و گمان سے زائد وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جسمیں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں جو خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اُس پر بھی بولا جاتا ہے۔ آسمان زمین کے درمیان کی فضاء اور اُس سے آگے جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا، اور اسیطرح کی دوسری آیتیں جنمیں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنی پر محمول فرمایا ہے کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش ان بادلوں سے برستی ہے جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اور خود قرآن کریم نے بھی دوسری آیات میں بادلوں سے پانی برسانے کی تصریح فرمائی ہے ارشاد ہے ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ اس میں مزن، مزنۃ کی جمع ہے جس کے معنی سفید بادل کے آتے ہیں معنی یہ ہیں کہ کیا بارش کو سفید بادلوں

سے تم نے اُتارا ہے یا ہم نے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا، اس میں معصرات کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے ہی پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔ قرآن مجید کی ان واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بناء پر جن آیاتِ قرآن میں بارش کا آسمان سے برسنا مذکور ہے اُن میں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنی لئے ہیں یعنی فضاءِ آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لغت کی تصریحات کیمطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرمِ آسمان کیلئے بھی۔ تو ایسی صورتمیں جن آیات میں کواکب اور سیارات کیلئے فِی السَّمَآءِ کا لفظ استعمال ہوا ہے اُسکے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں۔ اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کیطرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اُن سے باہر فضائے آسمانی میں۔ بلکہ الفاظ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہو جائے قرآن کی کوئی تصریح اسکے منافی نہیں ہے۔

حقائقِ کونیہ اور قرآن یہاں ایک بات اُصولی طور پر سمجھ لینی ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جسکا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اسکے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور اُنکے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے اُنمیں غور و فکر کیطرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اسکے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اسکے دینی اور دنیوی منافع اُن سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور اُن کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحبِ قدرت و قوت ہے۔ اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور اُن کی اصلی ہیئت و صورت اور ان کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اسکے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جسکو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس و قمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب و غریب نظام سے جسمیں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب اُمور سے

ایک ادنیٰ عقل و بصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا کوئی اسکو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اسکی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اُسی حد تک ان چیزوں میں غور و فکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسُولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنیکا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ اُنکے حقائق اور ہیئات اور اُن کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکا اہتمام نہ فرماتے، خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ دُنیا میں اُسوقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے فیثاغورس کا اور اُسکے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دُنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اُس زمانے کے حالات کے مناسب آلاتِ رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے مگر جس ذاتِ قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام نے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا اُنھوں نے کبھی اسطرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا وہ منشاء ہرگز نہ تھا جو آجکل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور اُس کی تحقیقات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ و زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کیطرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ اُن سے بحث کرتا ہے اور نہ اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول اسلوب کائنات و مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے فقط اُسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جسقدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اُس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے۔ فلسفیانہ دور دراز کی بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں اُلجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزلِ مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات و مخلوقات سے آگے اپنے خالق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پُورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے خلا سفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے

اکتشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضاء، ابر و باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم و فنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآن حکیم صرف اُن کی رُوح اور مشاہداتی حصہ کو اسقدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دُنیوی ضرورت متعلق ہے، دور از کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت بھی پائی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار

علماء اہل حق قدیم و جدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآن کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے، اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اُس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں، اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا، البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنے کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیتِ قرآن کو بھی اُسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے اسی آیت جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارہ میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں۔ آجکل جبکہ خلائی تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان سیارات تک پہنچا جا سکتا ہے تو اس سے فیثاغورسی نظریہ کی تائید ہو گئی کہ ستارے آسمانوں میں پیوست نہیں کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صریحہ کی تصریحات کی رُو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جسمیں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے اُن میں ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس مشاہدے اور تجربے کی بناء پر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ کواکب کو فضائے آسمانی میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔

لیکن اگر کوئی سرے سے آسمانوں کے وجود کا انکار کرے جیسے بعض ہیئت جدید والے کہتے ہیں یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ آسمانوں کے اندر داخلہ ہو سکتا ہے تو از روئے قرآن اُس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں یہ بات واضح طور پر بتلائی ہے کہ آسمانوں میں دروازے ہیں اور وہ دروازے خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلط ہے۔ آسمانوں میں داخلہ ہر شخص کا جب چاہے نہیں ہو سکتا، اس دعوے کی وجہ سے اُن آیات میں کوئی تاویل نہیں کیجائیگی اور اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح جبکہ قرآن کریم کی آیت كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائیگا جس کی رُو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع اُن کی حرکت ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگ جو فلکیات کے متعلق بطلیموسی نظریے کے معتقد تھے انھوں نے اُن آیاتِ قرآنی میں تاویلات سے کام لیا جن سے بطلیموسی نظریہ کیخلاف کوئی چیز سمجھی جاتی تھی اسی طرح آج کے بعض مصنفین جن آیات کو جدید ہیئت کے نظریات سے مختلف سمجھتے ہیں انہیں تاویلات کرکے اُسکے مطابق بنانے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں درست نہیں سلف صالحین کے طریقے کیخلاف اور قابلِ تردید ہے۔ البتہ واقعہ یہی ہے کہ اسوقت تک ہیئتِ جدیدہ نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اُن میں آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن و سُنت کیخلاف نہیں، بعض لوگ اپنے قصور علم سے اُن کو قرآن یا سنت کیخلاف سمجھ کر تاویلات کے درپے ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے سب سے بڑے مفسر قرآن سید محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماءِ سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ اور عرب و عجم مشرق و مغرب میں مقبول و مستند تفسیر ہے۔ موصوف جسطرح قرآن و سُنت کے متبحر عالم ہیں اسی طرح فلسفہ و ہیئت قدیم و جدید کے بھی بڑے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تفسیر میں تحقیقاتِ فلسفیہ کے متعلق یہی اُصول قرار دیا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے پوتے علامہ سید محمود شکری آلوسی نے ان مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے ما دل علیہ القرآن مما یعضد الھیئۃ الجدیدۃ القویمۃ البرھان جسمیں ہیئت جدیدہ کے نظریات کی تائید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے مگر دوسرے محتاط علماء کی طرح قرآنی آیات میں کسی قسم کی تاویل کو روا نہیں رکھا۔ اُن کے چند جملے اس جگہ نقل کر دینا کافی ہیں جو ہیئتِ جدیدہ کی تائید میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں:

رأیت کثیرا من قواعدھا لا یعارض النصوص الواردۃ فی الکتاب والسنۃ علی انھا لو خالفت شیئا من ذلک لم یلتفت الیھا ولم نؤول النصوص لاجلھا والتاویل فیھا لیس من مذاھب السلف الحریۃ بالقبول بل لا بد ان نقول ان المخالف لھا مشتمل علی خلل فیہ فان العقل الصریح لا یخالف النقل الصحیح بل کل منھما یصدق الآخر ویؤیدہ (ما دل علیہ القرآن)

میں نے ہیئتِ جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے وہ قرآن و سنت کی نصوص کیخلاف نہیں۔ اور اسکے باوجود اگر وہ قرآن و سُنت کی کسی نص کیخلاف ہو تو ہم اسکی طرف رُخ نہ کرینگے اور قرآن و سنت کی نصوص میں اس کیوجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے مذہب مقبول میں نہیں ہے بلکہ ہم اُسوقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن و سنت کیخلاف ہے اس ہی میں کوئی خلل ہے کیونکہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایکدوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فلکیات اور ستاروں سیاروں کی حرکات اور ہیئات کے متعلق بحث و تحقیق کوئی نیا فن نہیں، ہزاروں سال پہلے سے ان مسائل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مصر، شام، ہند

چین وغیرہ میں ان فنون کا چرچا قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے اس فن کا بڑا معلم فیثاغورس گزرا ہے جو اطالیہ کے مدرسہ کروتونا میں باقاعدہ اس کی تعلیم دیتا تھا، اس کے بعد میلاد مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایکسو چالیس سال پہلے اس فن کا دوسرا محقق بطلیموس روڈی آیا اور اسی زمانے میں ایک دوسرے فلاسفر ہیپرخوس کی شہرت ہوئی جسنے زاویئے ناپنے کے آلات ایجاد کئے۔

فیثاغورس اور بطلیموس کے نظریات ہیئت، افلاک کے متعلق بالکل ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ بطلیموس کو اپنے زمانے کی حکومت اور عوام کا تعاون حاصل ہوا۔ اسکا نظریہ اتنا پھیلا کہ فیثاغورس کا نظریہ گوشۂ گمنامی میں جا پڑا۔ اور جب یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو یہی بطلیموسی نظریہ ان کتابوں میں منتقل ہوا اور اہل علم میں عام طور سے یہی نظریہ جانا پہچانا گیا۔ بہت سے مفسرین نے آیات قرآنیہ کی تفسیر میں بھی یہی نظریہ سامنے رکھکر کلام کیا۔ گیارہویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی جسمیں اقوام یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا اور یورپین محققین نے ان مسائل پر کام کرنا شروع کیا جن میں سب سے پہلے کوپرنک پھر جرمنی میں کیپلر اور اطالیہ میں گلیلیو وغیرہ کے نام آتے ہیں انہوں نے از سر نو ان مباحث کا جائزہ لیا یہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ ہیئت افلاک کے متعلق بطلیموسی نظریہ غلط اور فیثاغورس کا نظریہ صحیح ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری میں اسحٰق نیوٹن کی شہرت ہوئی۔ اس کی تحقیقات و ایجادات نے اس کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس نے یہ تحقیق کی کہ وزنی چیزیں اگر ہوا میں چھوڑی جائیں تو اُنکے زمین پر آگرنے کا سبب وہ نہیں جو بطلیموسی نظریہ میں بتلایا گیا ہے کہ زمین کے وسط میں مرکز عالم ہے اور تمام وزنی چیزیں مرکز کی طرف فطرۃً رجوع کرتی ہیں بلکہ اُسنے بتلایا کہ جتنے ستارے اور سیارات ہیں سب میں ایک جذب وکشش کا مادہ ہے زمین بھی اسی طرح کا ایک سیارہ ہے اسمیں بھی کشش ہے جس حد تک زمین کی کشش کا اثر رہتا ہے وہاں سے ہر وزنی چیز زمین پر آ دیگی لیکن اگر کوئی چیز اسکی کشش کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو وہ پھر نیچے نہیں آئے گی۔

حال میں روسی اور امریکی ماہرین نے قدیم اسلامی فلاسفر ابوریحان بیرونی کی تحقیقات کی امداد سے راکٹ وغیرہ ایجاد کر کے اسکا عملی تجربہ اور مشاہدہ کر لیا کہ راکٹ جب اپنی شدید قوت اور تیز رفتاری کے سبب زمین کی کشش کو توڑ کر اسکے دائرہ سے باہر نکل گیا تو پھر یہ نیچے نہیں آتا بلکہ ایک مصنوعی سیارے کی صورت اختیار کر لیتا اور اپنے مدار پر چکر لگاتا ہے۔ پھر ان مصنوعی سیاروں کا تجربہ کرتے کرتے اسکے ماہرین نے سیارات تک پہنچنے کی تدبیریں شروع کیں اور بالآخر چاند پر پہنچ گئے جس کی تصدیق اس زمانے کے تمام ماہرین فن موافق و مخالف نے کی اور اب تک چاند پر بار بار جانے، وہاں کے پتھر، خاک وغیرہ لانے اور اسکے فوٹو مہیا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے سیارات تک

پہنچنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں اور خلانوردی خلا پیمائی کی مشقیں جاری ہیں۔
ان میں سے امریکن خلانورد جان گلین جو کامیابی کے ساتھ خلا کا سفر کر کے واپس آیا اور اسکی کامیابی پر اسکے موافق و مخالف سبھی نے اعتماد کیا، اسکا ایک بیان امریکہ کے مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ میں اور اسکا اُردو ترجمہ امریکہ کے اُردو ماہنامہ سیر بین میں مفصل شائع ہوا ہے، یہاں اسکے اہم اقتباسات ماہنامہ سیر بین سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے زیر بحث مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے جان گلین نے اپنے طویل مقالہ میں خلا کے عجائب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہی وہ ایک واحد شئ ہے جو خلاء میں خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اور یہ کہ کوئی طاقت ہے جو ان سب کو مرکز و محور سے وابستہ رکھتی ہے"

آگے لکھا ہے کہ:

"اس کے باوجود خلا میں پہلے ہی سے جو عمل جاری ہے اسکو دیکھتے ہوئے ہماری کوششیں انتہائی حقیر ہیں۔ سائنسی اصطلاحات و پیمانوں میں خلائی پیمائش ناممکن ہے"

آگے ہوائی جہاز کی مشینی قوت کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ:

"لیکن ایک یقینی اور غیر محسوس قوت کے بغیر اسکا استعمال بھی محدود اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے کہ جہاز کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تعیین رُخ کی حاجت ہوتی ہے اور یہ کام قطب نما سے لیا جاتا ہے۔ وہ قوت جو قطب نما کو متحرک رکھتی ہے ہمارے تمام حواس خمسہ کے لئے ایک کھُلا چیلنج ہے اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں نہ چھُو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں حالانکہ نتائج کا ظہور اسپر واضح دلالت کر رہا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پوشیدہ قوت ضرور موجود ہے"

آگے سب سیر و سفر کے نتیجہ کے طور پر لکھتا ہے:

"عیسائیت کے اُصول و نظریات کی حقیقت بھی ٹھیک یہی کچھ ہے۔ اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنائیں تو باوجودیکہ ہمارے حواس ان کے ادراک سے عاجز ہوتے ہیں لیکن اس رہنما قوت کے نتائج و تاثرات اپنے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی زندگیوں میں کھُلی آنکھوں دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور اس بنا پر کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک رہنما قوت موجود ہے"

یہ ہیں خلاء کے مسافروں اور سیارات پر کمند پھینکنے والوں کی کمائی کے حاصلات جو آپنے امریکی خلانورد کے بیان میں پڑھ لیں کہ اس تمام تگ و دَو کے نتیجہ میں رازِ کائنات اور اس کی حقیقت تک رسائی تو کیا ہوتی بے حد و بے حساب سیارات و نجوم کی گردشوں کا ادراک ہو کر اور حیرانی بڑھ گئی۔

سائنسی آلات سے اُنکی پیمائش کے ناممکن ہونے اور اپنی سب کوششوں کی اس کے مقابلہ میں حقارت کا اقرار و اعتراف کرنا پڑا۔ بس حاصل اتنی بات ہوئی کہ یہ سب نظام کائنات اور نجوم و سیارات خود بخود نہیں، بلکہ کسی عظیم اور غیر محسوس طاقت کے زیر فرمان چل رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جسکو انبیاء علیہم السلام نے پہلے قدم پر عام انسانوں کو بتلا دیا تھا اور قرآن کریم کی بیشمار آیات میں اسی چیز کا یقین دلانے کے لئے آسمان و زمین، نجوم و سیارات وغیرہ کے حالات پر غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح زمین میں بیٹھ کر آسمانی فضاؤں اور نجوم و سیارات کی تحقیقات و ہیئات پر فلسفیانہ بحثیں کرنے والے ان چیزوں کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے اور بالآخر اپنے عجز و بے بسی کا اعتراف کیا۔ اسی طرح یہ زمین سے لاکھوں میل اُوپر کا سفر کرنیوالے اور چاند کے پتھر اور مٹی اور وہاں کے فوٹو لانے والے بھی حقیقت شناسی کے میدان میں کچھ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ان تحقیقات نے انسان اور انسانیت کو کیا بخشا جہانتک انسانی جد و جہد اور فکری ارتقاء اور اُنکی محیر العقول اور حیرت انگیز انکشافات کا معاملہ ہے وہ اپنی جگہ درست اور عام نظروں کے اعتبار سے قابلِ تحسین بھی ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ بے مصرف شعبدہ گری اور تماشبینی جس سے انسان اور انسانیت کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو وہ حکماء و عقلاء کا کام نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس پچاس سال کی جدوجہد اور اربوں کھربوں روپیہ جو بہت سے انسانوں کے مصائب دُور کرنے کے لئے کافی ہوتا اُس کو آگ کی نذر کر دینے اور چاند تک پہنچ کر وہاں کی خاک اور پتھر سمیٹ لانے سے انسان اور انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ انسان کی بڑی بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بھوک سے مرتے ہیں اُن کو لباس اور سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں، کیا اس جد و جہد نے انکے افلاس و مصیبت کا کوئی حل نکالا، یا انکے امراض و آفات سے صحت و عافیت کا کوئی انتظام کیا یا انکے لئے قلبی سکون و راحت کا کوئی سامان فراہم کیا، تو یقین ہے کہ کسی کے پاس اسکا جواب بجز نفی کے نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و سُنت انسان کو ایسے لا یعنی مشغلے میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور کائناتِ عالم میں غور و فکر اور تدبیر کی دعوت صرف دو حیثیتوں سے دیتے ہیں۔ پہلی حیثیت جو اصل مقصود ہے یہ ہے کہ ان آثار عجیبہ کو دیکھ کر مؤثر حقیقی اور اُس غیر محسوس قوت کا یقین کر لیں جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے، اُسی کا نام خدا ہے۔ دوسرے ان زمینی اور آسمانی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے ہر ضرورت کی چیز ودیعت فرما دی ہے انسان کا کام یہ ہے کہ اپنی عقل و شعور اور جد و جہد سے کام لیکر اُن چیزوں کو زمین کے خزائن سے نکالنے اور استعمال کرنے کے طریقے سیکھ لے۔ پہلی حیثیت اصل مقصود ہے اور دوسری حیثیت ثانوی

رفع ضرورت کے لئے ہے اس لئے ضرورت سے زائد اسمیں انہماک پسندیدہ نہیں اور کائنات عالم میں غور و فکر اور تدبر کی دونوں حیثیتیں انسان کے لئے آسان بھی ہیں نتیجہ خیز بھی ۔ اور ان دونوں حیثیتوں کے نتائج میں قدیم و جدید فلاسفہ کا کوئی اختلاف بھی نہیں ۔ ان کے سب اختلافات افلاک اور سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہیں جن کو قرآن نے بے ضرورت اور ناقابلِ حصول قرار دیکر نظر انداز کر دیا ہے ۔ علامہ بخیت مفتیٔ مصر نے اپنی کتاب **توفیق الرحمٰن** میں علم ہیئت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ وصفی ہے جو اجرامِ سماویہ کی حرکات اور حسابات سے متعلق ہے ۔ دوسرا عملی جو ان حسابات کو معلوم کرنے کے لئے آلاتِ قدیمہ و جدیدہ سے متعلق ہے ۔ تیسرا طبعی ، جو افلاک سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ پہلی دونوں قسموں میں ماہرین قدیم و جدید میں اختلاف کالعدم ہے ۔ آلات ادراک میں بہت بڑا اختلاف ہونے کے باوجود نتائج پر اکثر اُمور میں سب کا اتفاق ہے ان کا شدید اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے ۔

غور کیجئے تو انسانی ضرورت کے متعلق بھی یہی پہلی دو قسمیں ہیں تیسری قسم دوراز کار بھی ہے اور مشکل بھی ۔ اسی لئے قرآن و سنت اور عام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نے انسان کو اس تیسری بحث میں نہیں اُلجھایا ، اور بزرگانِ سلف نے یہ نصیحت فرمائی ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ٭ نینگیختن علّت از کارِ تو

مہندس بسے جوید از رازِ شاں ٭ نداند کہ چوں کردی آغازِ شاں

صوفیائے کرام جو نظر کشفی سے ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کا فیصلہ بھی انجام کار وہی ہے جو شیخ **سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ؎**

چہ شبہا نشستم دریں سیر گُم ٭ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم

حافظ شیرازی نے اپنی لَے میں فرمایا ؎

سخن از مطرب و مَی گوی راز دہر کمتر جو ٭ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک و فضاء اور کائنات ارضی میں غور و فکر اس حیثیت سے کہ اُن سے پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم و قدرت پر استدلال کیا جاسکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اسکی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشار قرآنی ہے اور قرآن اسکی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کیساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اسمیں انہماک نہ کرے بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کیطرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اسکے مطابق اسمیں مشغول ہو ۔ اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اسکا حصول بھی

مشکل ہے اُس میں عمرِ عزیز صرف کرنے سے گریز کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات و تحقیقات کو عین منشا، قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسند علماء نے لکھا ہے اور قرآن کو اُن کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اسکا موضوع بحث ہے نہ انسان کے لیے اُن کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اسکا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے تجربات و مشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اُٹھانا وغیرہ سب اسمیں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اسکے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہو خوا مخواہ اسکے تصورات باندھنا اور اسمیں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سُبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ[1]

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں اور جب بات کرنے لگیں

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾

اُن سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا

اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رب ہٹا ہم سے دوزخ کا عذاب بیشک اسکا عذاب

كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ

چمٹنے والا ہے وہ بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بُری جگہ رہنے کی اور وہ لوگ کہ جب

اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَ

خرچ کرنے لگیں نہ بے جا اُڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی گذران اور

الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ

وہ لوگ کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو منع کردی

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ

اللہ نے مگر جہاں چاہیے اور بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں دونا ہوگا

[1] یہاں یہ عنوان اس لئے قائم کر دیا گیا ہے کہ اس کو مستقل رسالہ کی صورت میں اس نام سے شائع کیا جا سکتا ہے اور جب ایسا کیا جائے تو اسکے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھدی جاوے ۔ محمد شفیع

لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ

اس کو عذاب قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اس میں خوار ہو کر مگر جس نے توبہ کی اور

اٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ

یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک سو اُن کو بدل دیگا اللہ برائیوں کی جگہ بھلائیاں

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ

اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان اور جو کوئی توبہ کرے اور کرے کام نیک سو وہ

يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا

پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں

بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا

کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ اور وہ لوگ کہ جب اُن کو سمجھائیے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں

عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا

اُن پر بہرے اندھے ہو کر اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب دے ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے

وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ

اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک اور کر ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا ان کو بدلہ ملے گا

الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ

کوٹھوں کے جھروکے اسلئے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لینے آئیں گے ان کو وہاں دعا اور سلام کہتے ہوئے سدا رہا کریں

فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ

اُن میں خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ رہنے کی تو کہہ پرواہ نہیں رکھتا میرا رب تمہاری

لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

اگر تم اس کو نہ پکارا کرو سو تم تو جھٹلا چکے اب آگے کو ہوتی ہے مٹھ بھیڑ

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام اُمور میں، اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور خاص چال کی ہیئت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ دماغ داری کے ساتھ نرم رفتاری موجب مدح نہیں اور یہ تواضع تو ان کا طرز خاص اپنے اعمال میں ہے) اور (دوسروں کے ساتھ ان کا طرز یہ ہے کہ) جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات (چیت) کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں

(مطلب یہ کہ اپنے نفس کے لئے انتقامِ قولی یا فعلی نہیں لیتے اور جو خشونت تادیب و اصلاح
سیاستِ شرعیہ یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے ہو اس کی نفی مقصود نہیں) اور جو (اللہ کے ساتھ اپنا یہ طرز
رکھتے ہیں کہ) راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں اور جو (باوجود
ادائے حقوق اللہ و حقوق العباد کے اللہ تعالیٰ سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ) دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے
ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کے عذاب کو دُور رکھئے کیونکہ اسکا عذاب پوری تباہی ہے، بیشک وہ
جہنم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے (یہ تو ان کی حالت طاعات بدنیہ میں ہے) اور (طاعاتِ مالیہ میں انکا
یہ طریقہ ہے کہ) وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں (کہ معصیت میں صرف کرنے
لگیں) اور نہ تنگی کرتے ہیں (کہ طاعت ضروریہ میں بھی خرچ کی کوتاہی کریں، اور اسراف میں وہ خرچ
بھی آگیا کہ بلا ضرورت استطاعت سے زیادہ مباحات میں یا طاعاتِ غیر ضروریہ میں خرچ کریں جسکا
انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو کیونکہ یہ اُمور معصیت ہیں اور جو چیز معصیت کا سبب بنے
وہ بھی معصیت ہے اس لئے وہ بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا انجام کار ہوگیا۔ اسی طرح طاعاتِ ضروریہ
میں بالکل خرچ نہ کرنے کی مذمت لَمْ یَقْتُرُوْا سے مفہوم ہوگئی کیونکہ جب خرچ میں کمی کرنا جائز نہیں تو
عدم انفاق تو بدرجۂ اَولیٰ ناجائز ہوگا پس یہ شبہ نہ رہا کہ خرچ میں کمی کرنے کی تو نفی اور نہی ہوگئی لیکن
عدم الانفاق بالکلیہ کی نفی اور نہی نہ ہوئی۔ غرض وہ انفاق میں افراط و تفریط دونوں سے مبرا ہیں) اور
ان کا خرچ کرنا اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (اور یہ حالت مذکورہ تو طاعات کی ادائیگی
سے متعلق تھی) اور جو (گناہ سے بچنے میں یہ شان رکھتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی اور معبود کی پرستش
نہیں کرتے (جو معصیت متعلق عقائد کے ہے) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے (قواعد
شرعیہ کی رو سے) حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر (یعنی جب قتل کے وجوب یا
اباحت کا کوئی سبب شرعی پایا جاوے اسوقت اور بات ہے) اور وہ زنا نہیں کرتے (کہ یہ قتل و زنا
اعمال کے متعلقہ گناہوں میں سے ہیں) اور جو شخص ایسے کام کریگا (کہ شرک کرے یا شرک کیساتھ قتل
ناحق بھی کرے یا زنا بھی کرے جیسے مشرکین کرتے تھے) تو سزا سے اس کو سابقہ پڑیگا کہ قیامت کے
روز اسکا عذاب بڑھتا چلا جائیگا (جیسا کفار کے حق میں دوسری آیات میں آیا ہے زِدْنٰهُمْ عَذَابًا
فَوْقَ الْعَذَابِ) اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل (و خوار) ہو کر رہے گا (تاکہ عذاب
جسمانی کے ساتھ ذلت کا عذاب روحانی بھی ہو اور شدتِ عذاب یعنی تضاعف کیساتھ مقدار کی زیادتی
یعنی خلود بھی ہو اور مراد اس وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ سے کفار و مشرکین ہیں بقرینہ یضاعف و یخلد و مہانا
وآمن کیونکہ مؤمن گنا ہگار کے لئے عذاب میں زیادتی اور خلود نہ ہوگا بلکہ اسکا عذاب اس کو پاک
صاف کرنے کے لئے ہوگا نہ کہ اہانت کے لئے، اور اس کے لئے تجدید ایمان کی ضرورت نہیں صرف توبہ

کافی ہے جسکا آگے بیان ہے وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ الخ نیز قرائن مذکورہ کے سوا صحیحین میں ابن عباسؓ سے شان
نزول بھی اسکا یہی منقول ہے کہ مشرکین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ
کرلے اور (اس توبہ کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ) ایمان (بھی) لے آوے اور نیک کام کرتا رہے (یعنی
ضروری طاعات کو بجالاتا رہے) تو (اس کو جہنم میں خلود تو کیا ہوتا جہنم سے ذرا بھی مَس نہ ہوگا بلکہ) اللہ تعالیٰ
ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں (کو محو کرکے ان) کی جگہ (آئندہ) نیکیاں عنایت فرمائیگا (یعنی چونکہ گزشتہ
کفر و گناہ زمانہ کفر کے بعد اسلام کی برکت سے معاف ہوجاویں گے اور آئندہ بوجہ اعمال صالحہ کے حسنات
لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر ثواب ملیگا اس لئے جہنم سے ان کا کچھ تعلق نہ ہوگا، پس اِلَّا استثناء منقطع ہے اور
مَنْ تَابَ کی خبر فَاُولٰٓئِكَ الخ ہے اور مقصود بالحکم تبدیل سیئات بالحسنات ہے جو مجموعہ ایمان و توبہ و عمل
صالح پر مرتب ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا اسکا لازمی اثر ہے اور جہنم میں دخول ہی نہیں تو خلود
نہ ہونا ظاہر ہے، یا استثناء متصل ہو اور عدم خلود کے لئے مجموعہ ایمان و توبہ و عمل صالح شرط نہ ہو مگر
مجموعہ کے ساتھ عدم خلود کا پایا جانا اس آیت میں مذکور ہوا اور صرف ایمان پر عدم خلود کا مرتب ہونا
دوسرے دلائل سے ثابت ہو) اور (یہ محو سیئات و ثبت حسنات اسلئے ہوا کہ) اللہ تعالیٰ غفور ہے
(اسلئے سیئات کو محو کردیا اور) رحیم ہے (اسلئے حسنات کو قائم فرمایا۔ یہ تو تائب عن الکفر کا بیان تھا)
اور (آگے اُس مؤمن کا ذکر ہے جو گناہ سے توبہ کرے تاکہ مضمون توبہ کا پورا ہوجائے، نیز مقبول بندوں
کے بقیہ اوصاف کا بیان ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ طاعات کے پابند اور سیئات سے پرہیز کے عادی رہتے
ہیں لیکن اگر احیاناً صدور معصیت ہوجائے تو توبہ کرلیتے ہیں اس لئے تائبین کا حال ارشاد فرمایا یعنی)
جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (یعنی آئندہ معصیت سے بچتا ہے) تو
وہ (بھی عذاب سے بچا رہیگا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کیطرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے (یعنی خوف و
اخلاص کیساتھ کہ شرط توبہ ہی ہے آگے پھر عباد رحمٰن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں یعنی) اور (ان میں یہ بات ہے کہ)
وہ بیہودہ باتوں میں (جیسے لہو و لعب خلاف شرع) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلاقصد)
بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہوکر گزریں تو سنجیدگی (و شرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی
طرف مشغول ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے گناہگاروں کی تحقیر اور اپنا ترفع اور تکبر ظاہر ہوتا ہے)
اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے
اندھے ہوکر نہیں گرتے (جس طرح کافر قرآن پر ایک نئی بات سمجھ کر تماشے کے طور پر اور نیز اسمیں اعتراضات
پیدا کرنے کے لئے اسکے حقائق و معارف سے اندھے بہرے ہوکر اندھا دھند بے ترتیب ہجوم کرلیتے تھے
جیساکہ دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (علیٰ بعض التفاسیر) سو عباد مذکورین
ایسا نہیں کرتے، بلکہ عقل و فہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ اور اُس کیطرف دوڑتے ہیں جسکا ثمرہ زیادہ ایمان

وعمل بالاحکام ہے پس مقصود آیت میں اندھے بہرے ہونے کی نفی کرنا ہے نہ کہ قرآن کیطرف شوق کے ساتھ متوجہ ہونے اُس پر گرنے کی، کیونکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اور اس سے کفار کے لئے بھی قرآن پر گرنا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ مخالفت اور مزاحمت کے طور پر اور اندھے بہروں کی طرح تھا اسلئے وہ مذموم ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ (خود جیسے دین کے عاشق ہیں اسی طرح اپنے اہل وعیال کے لئے بھی اسکے ساعی اور داعی ہیں، چنانچہ عملی کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے بھی) دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما (یعنی ان کو دیندار بنادے اور ہم کو ہماری اس سعی دینداری میں کامیاب فرما کہ ان کو دینداری کی حالت میں دیکھکر راحت اور سرور ہو) اور (تو نے ہم کو ہمارے خاندان کا افسر تو بنایا ہی ہے مگر ہماری دُعایہ ہے کہ ان سب کو متقی کر کے) ہم کو متقیوں کا افسر بنادے (تو اصل مقصود افسری مانگنا نہیں ہے گو اسمیں بھی قباحت نہیں مگر مقام دلالت نہیں کرتا بلکہ اصل مقصود اپنے خاندان کے متقی ہونے کی درخواست ہے یعنی بجائے اس کے کہ ہم صرف خاندان کے افسر ہیں ہمکو متقی خاندان کا افسر بنادیجئے، یہانتک عباد رحمان کے اوصاف کا بیان تھا آگے ان کی جزا ہے یعنی) ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالاخانے ملیں گے بوجہ انکے (دین و طاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقار کی دُعا اور سلام ملیگا (اور) اس (بہشت) میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے (جیسا جہنم کے بارے میں ساءت مستقرًا و مقامًا فرمایا ہے، اے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہدیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروانہ کریگا اگر تم عبادت نہ کروگے سو (اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اے کفار) تم تو (احکام الٰہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا تمہارے لئے) وبال (جان) ہو (کررہے) گا، (خواہ دُنیا میں جیسے واقعہ بدر میں کفار پر مصیبت آئی یا آخرت میں اور وہ ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

سُورۂ فرقان کے بیشتر مضامین رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ثبوت اور کفار و مشرکین جو اس پر اعتراض کرتے تھے اُنکے جوابات پر مشتمل تھے اور اسمیں کفار و مشرکین اور احکام کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب و سزا کا بھی ذکر تھا۔ آخر سورت میں اپنے اُن مخصوص اور مقبول بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جنکا رسالت پر ایمان بھی مکمل ہے اور اُن کے عقائد، اعمال، اخلاق، عادات سب اللہ و رسُول کی مرضی کے تابع اور احکام شرعیہ کے مطابق ہیں۔

قرآن کریم نے ایسے مخصوص بندوں کو عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ کا لقب عطا فرمایا جو اُن کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یُوں تو ساری ہی مخلوق تکوینی اور جبری طور پر اللہ کی بندگی اور اسکی مشیت وارادہ

کے تابع ہے اُسکے ارادے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ مگر یہاں بندگی سے مُراد تشریعی اور اختیاری بندگی یعنی اپنے اختیار سے اپنے وجود اور اپنی تمام خواہشات اور تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنا دینا ایسے مخصوص بندے جن کو حق تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہہ کر عزت بخشی ہے اُنکے اوصاف آخر سورت تک بیان کئے گئے ہیں درمیان میں کفر و معصیت سے توبہ اور اسکے اثرات کا ذکر آیا ہے۔

یہاں ان مخصوص بندوں کو اپنا بندہ فرماکر انکو اعزازی لقب دینا تھا مگر اپنی طرف نسبت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سب اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے اس جگہ لفظ رحمٰن کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا کہ مقبولین کی عادات و صفات اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی ترجمان اور مظہر ہونا چاہئیں اس کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات و علامات

آیاتِ مذکورہ میں اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی تیرہ صفات و علامات کا ذکر آیا ہے جن میں عقائد کی درستی اور اپنے ذاتی اعمال میں خواہ وہ بدن سے متعلق ہوں یا مال سے، سب میں اللہ و رسول کے احکام اور مرضی کی پابندی۔ دوسرے انسان کے ساتھ معاشرت اور تعلقات کی نوعیت، رات دن کی عبادت گزاری کے ساتھ خوف خدا۔ تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اپنے ساتھ اپنی اولاد و ازواج کی اصلاح کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا سب سے پہلا وصف عباد ہونا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اسکا وجود اور اسکے تمام اختیارات و اعمال آقا کے حکم و مرضی پر دائر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے عقائد و خیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت و سکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجالاؤں۔

دوسری صفت: يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا، یعنی چلتے ہیں وہ زمین پر تواضع کیساتھ لفظ ہَوْن کا مفہوم اس جگہ سکینت و وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مُراد نہیں کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلافِ سنت ہے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائلِ نبویہ میں منقول ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے کانما الارض تطوی لہٗ، یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپکے لئے سمٹتی ہے (ابن کثیر) اسی لئے سلف صالحین نے بتکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامتِ تکبر و تصنع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پُوچھا: کیا تم بیمار ہو۔ اُسنے کہا نہیں، تو آپ نے اُس پر دُرّہ اُٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کیساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)

حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کی تفسیر میں فرمایا کہ مؤمنین مخلصین کے تمام اعضاء و جوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل و عاجز ہوتے ہیں ناواقف اُن کو دیکھ کر معذور، عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگر اُن پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ اُن کو دُنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسکی ساری فکر دُنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دُنیا تو ساری ملتی نہیں اور آخرت میں اُسنے حصہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اُس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اُس کیلئے تیار ہے۔ (از ابن کثیر ملخصاً)

تیسری صفت: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، یعنی جب جہالت والے اُنسے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام۔ یہاں جاہلون کا ترجمہ جہالت والوں سے کرکے یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ مُراد اس سے بے علم آدمی نہیں بلکہ وہ جو جہالت کے کام اور جاہلانہ باتیں کرے خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔ اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں بلکہ سلامتی کی بات ہے۔ قرطبی نے نحاس سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سلام تسلیم سے مشتق نہیں بلکہ تسلّم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سلامت رہنا۔ مُراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں جس سے دوسرے کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گناہگار نہ ہو۔ یہی تفسیر حضرت مجاہد، مقاتل وغیرہ سے منقول ہے (مظہری) حاصل یہ ہے کہ بے وقوف جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے بلکہ اُن سے درگزر کرتے ہیں۔

چوتھی صفت: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا، یعنی وہ رات گزارتے ہیں اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔ عبادت میں شب بیداری کا ذکر خصوصیت سے اسلئے کیا گیا کہ یہ وقت سونے آرام کرنے کا ہے اسمیں نماز و عبادت کے لئے کھڑا ہونا خاص مشقت بھی ہے اور اسمیں ریاء و نمود کے خطرات بھی نہیں ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ ان کا لیل و نہار اللہ کی طاعت میں مشغول ہے دن کو تعلیم و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے کام ہیں رات کو اللہ کے سامنے عبادت گزاری کرنا ہے۔ تہجد کی نماز کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابُوامامہؓ سے روایت کیا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیام اللّیل، تہجد کی پابندی کرو کیونکہ وہ تم سے پہلے بھی سب نیک بندوں کی عادت رہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے تم کو قریب کرنے والی اور سیئات کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (مظہری)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھ لیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہے کہ بات للہ ساجدا و قائما (مظہری از بغوی) اور حضرت عثمان غنی رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشاء کی نماز جماعت کیساتھ ادا کر لی تو آدھی رات عبادت میں گزارنے کے حکم میں ہو گیا اور جس نے صبح کی نماز جماعت سے ادا کر لی وہ باقی آدھی رات بھی عبادت میں گزارنے والا سمجھا جائیگا (رواہ احمد ومسلم فی صحیحہما مظہری)

پانچویں صفت: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ الآیہ یعنی یہ مقبولین بارگاہ شب و روز عبادت وطاعت میں مصروف رہنے کے باوجود بے خوف ہو کر نہیں بیٹھ رہتے بلکہ ہر وقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہیں جس کے لئے عملی کوشش بھی جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی۔

چھٹی صفت: وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا الآیہ، یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل و کوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ آیت میں اسراف اور اسکے بالمقابل اِقتار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اسراف کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، ابن جریجؒ کے نزدیک اللہ کی معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اگرچہ ایک پیسہ ہی ہو، اور بعض حضرات نے فرمایا، جائز اور مباح کاموں میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا جو تبذیر یعنی فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے وہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کیونکہ تبذیر یعنی فضول خرچی بنص قرآن حرام و معصیت ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ اس لحاظ سے اس تفسیر کا حاصل بھی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی مذکورہ تفسیر ہو گیا یعنی معصیت و گناہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔ (مظہری)

اور اِقتار کے معنے خرچ میں تنگی اور بخل کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اسکے معنے یہ ہیں کہ جن کاموں میں اللہ و رسول نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اُن میں خرچ کرنے میں تنگی برتنا (اور بالکل خرچ نہ کرنا بدرجہ اولیٰ اسمیں داخل ہے)۔ یہ تفسیر بھی حضرت ابن عباسؓ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے (مظہری) آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کے مقبول بندوں کی صفت مال خرچ کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ اسراف اور اقتار کے درمیان اعتدال اور میانہ روی پر عمل کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِيْ مَعِيْشَتِهٖ، یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرے (نہ اسراف میں مبتلا ہو نہ بخل میں)۔ (رواہ الامام احمد عن ابی الدرداء۔ ابن کثیر)

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ماعال من اقتصد، یعنی جو شخص خرچ میں میانہ روی اور اعتدال پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر و محتاج نہیں ہوتا (رواہ الامام احمد - ابن کثیر)

سا تویں صفت : وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ، پہلی چھ صفات میں طاعت و فرمانبرداری کے اُصول آگئے ہیں اب معصیت و نافرمانی کے اُصولِ مہمہ کا بیان ہے جنمیں پہلی چیز عقیدہ سے متعلق ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک نہیں کرتے جس سے شرک کا سب سے بڑا گناہ ہونا معلوم ہوا۔

آٹھویں اور نویں صفت : لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الآیہ ، یہ عملی گناہوں میں سے بڑے بڑے اور سخت گناہوں کا بیان ہے کہ اللہ کے مقبول بندے ان کے پاس نہیں جاتے ، کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا کے پاس نہیں جاتے ۔ یہ تین عقیدہ اور عمل کے بڑے گناہ بیان فرمانے کے بعد آیت میں ارشاد ہے وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ، یعنی جو شخص ان مذکورہ گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ اسکی سزا پائے گا۔ ابو عبیدہ نے اس جگہ لفظ اثام کی تفسیر سزائے گناہ سے کی ہے ۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جو سخت و شدید عذابوں سے پُر ہے ۔ بعض روایاتِ حدیث بھی اسکی شہادت میں لکھی ہیں (تفسیر مظہری)

آگے اُس عذاب کا بیان ہے جو جرائم مذکورہ کے کرنے والوں پر ہوگا اور آیات کے سباق و سیاق سے یہ بات متعین ہے کہ یہ عذاب کفار کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے شرک کفر بھی کیا اور اسکے ساتھ قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے کیونکہ اول تو یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ کے الفاظ مسلمان گناہگاروں کے لئے نہیں ہوسکتے کیونکہ اُنکے ایک گناہ پر ایک ہی سزا کا وعدہ قرآن و سُنت میں منصوص ہے ۔ سزا میں تضاعف یعنی کیفیت یا کمیت میں زیادتی مؤمنین کے لئے نہیں ہوگی ۔ یہ کفار کی خصوصیت ہے کہ کفر پر جو عذاب ہونا تھا اگر کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کئے تو عذاب دوہرا ہو جاویگا ۔ دوسرے اس عذاب میں یہ بھی مذکور ہے وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُہَانًا ، یعنی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس عذاب میں ذلیل و خوار ہوکر ۔ کوئی مؤمن ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں نہیں رہے گا ، کتنا ہی بڑا گناہگار ہو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جاویگا ۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شرک کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور قتل و زنا میں بھی ، اُن کا عذاب مضاعف یعنی دوہرا ، شدید بھی ہوگا اور پھر یہ عذاب دائمی بھی رہے گا ۔ آگے یہ بیان ہے کہ ایسے سخت مجرم جنکا عذاب یہاں مذکور ہوا ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ انکے سیئات کو حسنات سے یعنی بُرائیوں کو بھلائیوں سے تبدیل کر دیں گے ۔ مطلب یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد انکے اعمال نامہ میں حسنات ہی حسنات رہ جائیں گی کیونکہ شرک کفر سے توبہ کرنے پر

اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ بحالتِ شرک و کفر جتنے گناہ کئے ہوں اسلام و ایمان قبول کر لینے سے وہ پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اسلئے پچھلے زمانے میں جوان کا نامۂ اعمال سیئات اور معاصی ہی سے لبریز تھا اب ایمان لانے سے وہ تو سب معاف ہو گئے آگے ان معاصی اور سیئات کی جگہ ایمان اور اُسکے بعد کے اعمالِ صالحہ نے لے لی۔ سیئات کو حسنات میں تبدیل کرنے کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ حسن بصریؒ، سعید بن جبیر، مجاہد وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے (مظہری)

ابن کثیرؒ نے اسکی ایک دوسری تفسیر یہ بھی نقل کی ہے کہ اُنھوں نے جتنے گناہ زمانۂ کفر و جاہلیت میں کئے تھے، ایمان لانے کے بعد اُن سب گناہوں کے بجائے نیکیاں لکھدی جاویں گی۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کبھی ان لوگوں کو اپنے پچھلے گناہ یاد آویں گے تو اُن پر نادم ہوں گے اور توبہ کی تجدید کریں گے ان کے اس عمل سے وہ گناہ نیکیوں میں تبدیل ہو جاویں گے، اس کی دلیل میں بعض روایاتِ حدیث بھی پیش فرمائی ہیں۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا، بظاہر یہ اسی مضمون کا تکرار ہے جو اس سے پہلے آیت میں آیا ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ اور قرطبی نے قفال سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف اور الگ ہے کیونکہ پہلا معاملہ کفار و مشرکین کا تھا جو قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے تھے، پھر ایمان لے آئے تو اُن کی سیئات حسنات سے بدل دی گئیں، اور یہاں مسلمان گناہگاروں کی توبہ کا ذکر ہے اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ وَاٰمَنَ یعنی اسکے ایمان لانے کا ذکر تھا، اس دوسری توبہ میں وہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توبہ اُن لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے سے مومن ہی تھے مگر غفلت سے قتل و زنا میں مبتلا ہو گئے تو انکے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنالیں تو اُن کا توبہ کرنا صحیح اور درست سمجھا جائیگا۔ اسی لئے بطور شرط کے توبہ کر لینے کے ابتدائی حال ذکر کرنے کے بعد اسکی جزا میں پھر یتوب کا ذکر کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ شرط میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ صرف زبانی توبہ ہے اور جزاء میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ عمل صالح پر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہو گیا کہ جس نے توبہ کر لی پھر اپنے عمل سے بھی اُس توبہ کا ثبوت دیا تو وہ صحیح طور پر اللہ کیطرف رجوع کرنے والا سمجھا جائیگا بخلاف اُسکے جس نے پچھلے گناہ سے توبہ تو کی مگر آئندہ عمل میں اسکا کوئی ثبوت نہ فراہم کیا تو اُس کی توبہ گویا توبہ ہی نہیں۔ خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہو گیا کہ جو مسلمان غفلت سے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر توبہ کر لی اور اس توبہ کے بعد اپنے عمل کی بھی ایسی اصلاح کر لی کہ اسکے عمل سے توبہ کا ثبوت ملنے لگا تو یہ توبہ بھی عند اللہ مقبول ہو گی اور بظاہر اسکا فائدہ بھی وہی ہو گا جو پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ اسکے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی خاص صفات کا بیان اوپر سے ہو رہا تھا، درمیان میں گناہ کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا بیان آیا اسکے بعد باقی صفات کا بیان ہے۔

دسویں صفت: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ، یعنی یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے، سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے اُسکے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ایسی مجلسوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضہ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ٹھیلے ہیں۔ حضرت مجاہد اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ عمرو بن قیس نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مُراد ہیں۔ زہری، امام مالک نے فرمایا کہ شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں (ابن کثیر) اور حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ساری ہی مجلسیں مجلسِ زُور کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ لغو و باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے (مظہری) اور بعض حضرات مفسرین نے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں یشہدون کو شہادت بمعنے گواہی سے لیا ہے اور معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی کا گناہِ کبیرہ اور وبالِ عظیم ہونا قرآن و سنت میں معروف و مشہور ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انس رضہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضہ نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اُسنے جھوٹی شہادت دی ہے تو اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے اور اسکا منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جائے اور رُسوا کیا جائے پھر طویل زمانے تک قید میں رکھا جائے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ و عبدالرزاق۔ مظہری)

گیارھویں صفت: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا، یعنی اگر لغو اور بیہودہ مجلسوں پر کبھی ان کا گزر اتفاقاً ہو جائے تو وہ سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں یہ لوگ جس طرح بقصد و ارادہ شریک نہیں ہوتے اسی طرح اگر کہیں اتفاقی طور پر ان کا کسی ایسی مجلس پر گزر ہو جاوے تو اس فسق و فجور اور گناہ کی مجلس پر سے شرافت کیساتھ گزرے چلے جاتے ہیں۔ یعنی اُن کے اس فعل کو بُرا اور قابلِ نفرت جانتے ہوئے، نہ گناہوں میں مبتلا لوگوں کی تحقیر کرتے ہیں اور نہ خود اپنے آپ کو اُن سے افضل و بہتر سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضہ کا اتفاق سے ایک روز کسی بیہودہ لغو مجلس پر گزر ہو گیا تو وہاں ٹھہرے نہیں گزرے چلے گئے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ابن مسعود کریم ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی جسمیں بیہودہ مجلس سے کریموں شریفوں کی طرح گزر جانے کا حکم ہے (ابن کثیر)

بارھویں صفت: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا
یعنی ان مقبول بندوں کی یہ شان ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات اور آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے تو وہ ان آیات کیطرف اندھے بہروں کی طرح متوجہ نہیں ہوتے بلکہ سمیع و بصیر انسان کی طرح ان میں غور کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ غافل اور مغفل لوگوں کی طرح ایسا معاملہ نہیں کرتے کہ انھوں نے سنا ہی نہیں یا دیکھا ہی نہیں۔ اس آیت میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک آیاتِ الٰہیہ پر گر پڑنا یعنی اہتمام کے ساتھ متوجہ ہونا یہ تو امر محمود و مقصود اور بہت بڑی نیکی ہے۔ دوسرے اندھے بہروں کی طرح گرنا کہ قرآن کی آیات پر توجہ تو دیں مگر یا تو اُس پر عمل کرنے میں معاملہ ایسا کریں کہ گویا انھوں نے سنا اور دیکھا ہی نہیں اور یا آیاتِ قرآن پر عمل بھی کریں مگر اُن کو اصولِ صحیحہ اور تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ کے خلاف اپنی رائے یا سُنی سُنائی باتوں کے تابع کر کے غلط عمل کریں یہ بھی ایک طرح سے اندھے بہرے ہو کر ہی گرنے کے حکم میں ہے۔

احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے

آیاتِ مذکورہ میں جس طرح اس امر کی سخت مذمت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ ہی نہ دیں، اندھے بہروں کا سا معاملہ کریں، اسی طرح اس کی بھی مذمت ہے کہ توجہ تو دیں اور عمل بھی کریں مگر بے سمجھے بے بصیرتی کیساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔ ابن کثیرؒ نے ابن عون سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت شعبیؒ سے پوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں پہنچوں جہاں لوگ سجدہ میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے تو کیا میں بھی انکے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جاؤں حضرت شعبیؒ نے فرمایا نہیں۔ مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اُس پر لازم ہے کہ بصیرت کیساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سُنی جس کی بنا پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں اور تمھیں انکے سجدہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح انکے ساتھ سجدہ میں شریک ہونا جائز نہیں۔

اس زمانے میں یہ بات تو قابلِ شکر ہے کہ نوجوان اور نو تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور اسکے سمجھنے کی طرف کچھ توجہ پیدا ہوئی ہے اور اسکے تحت وہ بطور خود قرآن کا ترجمہ یا کسی کی تفسیر دیکھ کر قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ کوشش بالکل بے اصول ہے اسلئے قرآن کو صحیح سمجھنے کے بجائے بہت سے مغالطوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اصول کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی معمولی سے معمولی فن بھی نری کتاب کے مطالعہ سے کسی کو معتد بہ نہیں حاصل ہو سکتا جبتک اسکو کسی استاد سے نہ پڑھے معلوم نہیں قرآن اور علوم قرآن ہی کو کیوں ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ جسکا جی چاہے خود ترجمہ دیکھکر جو چاہے اسکی مراد متعین کرے۔ یہ بے اصول مطالعہ جسمیں کسی ماہر استاد کی رہنمائی شامل نہ ہو یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنیکے مفہوم میں شامل ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم

کی توفیق بخشیں۔

تیرہویں صفت: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا، اس میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ اُن کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصریؒ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ اُن کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے یہی ایک انسان کیلئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے اور اگر اولاد و ازواج کی ظاہری صحت و عافیت اور خوشحالی بھی اسمیں شامل کیجائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں اس دُعا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کر لیتے بلکہ اپنی اولاد اور بیبیوں کی بھی اصلاحِ اعمال و اخلاق کی فکر کرتے ہیں اور اسکے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتا رہے۔ اس آیت کے اگلے جملے میں دُعا کا یہ جز بھی ہے وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا، یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دے، اسمیں بظاہر اپنے لئے جاہ و منصب اور بڑائی حاصل کرنے کی دُعا ہے جو دوسری نصوصِ قرآن کی رُو سے ممنوع ہے جیسے قرآن کا ارشاد ہے تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا، یعنی ہم نے دارِ آخرت کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا عُلُوّ اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کا قدرتی طور پر امام و پیشوا ہوتا ہی ہے اسلئے اس دُعا کا حاصل یہ ہو گیا کہ ہمارے اولاد اور اہل و عیال کو متقی بنا دیجئے اور جب وہ متقی ہو جاویں گے تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام و پیشوا کہلائیگا جسکا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دُعا نہیں بلکہ اولاد و ازواج کے متقی بنانے کی دُعا ہے۔ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ اس دُعا میں اپنے لئے کوئی ریاست و امامت اور پیشوائی طلب کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اس دُعا کا یہ ہے کہ ہمیں ایسا بنا دیجئے کہ لوگ دین و عمل میں ہماری اقتدار کیا کریں اور ہمارے علم و عمل سے اُن کو نفع پہنچے تاکہ اسکا ثواب ہمیں حاصل ہو۔ اور حضرت مکحول شامیؒ نے فرمایا کہ دُعا کا مقصود اپنے لئے تقویٰ کا ایسا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ دُنیا کے متقی لوگوں کو بھی ہمارے عمل سے فائدہ پہنچے۔ قرطبی نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ریاست و امامت کی طلب جو دین کے لئے اور آخرت کے فائدہ کے لئے ہو وہ مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اور آیت لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا میں اس ریاست و اقتدار کی خواہش کی مذمت ہے جو دُنیوی عزت و جاہ کے لئے ہو۔ واللہ اعلم۔ یہاں تک عِبَادُ الرَّحْمٰنِ، یعنی مؤمنین کاملین کی اہم صفات کا بیان پورا ہو گیا، آگے اُن کی جزاء اور آخرت کے درجات کا ذکر ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ، غرفہ کے لغوی معنی بالاخانہ کے ہیں۔ جنت میں مقربین خاص کے لئے ایسے غرفات ہونگے جو عام اہل جنت کو ایسے نظر آئیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ (رواہ البخاری ومسلم وغیرھما۔ مظہری) مسند احمد، بیہقی، ترمذی، حاکم میں حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایسے غرفے ہونگے جنکا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے نظر آتا ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، یہ غرفے کن لوگوں کے لئے ہیں، آپؐ نے فرمایا، جو شخص اپنے کلام کو نرم اور پاک رکھے اور ہر مسلمان کو سلام کرے اور لوگوں کو کھانا کھلائے، اور رات کو اسوقت تہجد کی نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں (مظہری)

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ، یعنی جنت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے اُن کو مبارکباد دیں گے اور سلام کریں گے۔ یہانتک مؤمنین مخلصین کی خصوصی عادات و اعمال اور اُن کی جزاء و ثواب کا ذکر تھا، آخری آیت میں پھر کفار و مشرکین کو عذاب سے ڈراکر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ، اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں زیادہ واضح اور سہل وہ ہے جسکو خلاصہ تفسیر میں اوپر لکھا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمھاری کوئی وقعت حیثیت نہ ہوتی اگر تمھاری طرف سے اللہ کو پکارنا اور اسکی عبادت کرنا نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا منشاء ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے جیسے دوسری آیت میں ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ، یعنی میں نے انسان اور جن کو اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا بجز اسکے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ تو ایک عام ضابطہ بیان ہوا کہ بغیر عبادت کے انسان کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت و حیثیت نہیں ہے اسکے بعد کفار و مشرکین جو رسالت اور عبادت ہی کے منکر ہیں اُن کو خطاب ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ، یعنی تم نے تو سب چیزوں کو جھٹلا ہی دیا ہے اب تمھاری کوئی وقعت اللہ کے نزدیک نہیں فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ، یعنی اب یہ تکذیب کفر تمھارے گلے کا ہار بن چکے ہیں اور تمھارے ساتھ لگے رہیں گے یہانتک کہ جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کرکے چھوڑیں گے۔ ونعوذ باللہ من حال اہل النار۔

تم بحمد اللہ سبحانہ تفسیر سورۃ الفرقان یوم الاحد لثالث عشر من صفر المظفر سنہ ۱۳۹۱ھ و بإتمامه تم بعون اللہ و کرمه الحزب الرابع من الاحزاب السبعة القرآنية واللہ سبحانه و تعالیٰ ارجو واسأل اتمام الباقی وما ذلك على اللہ بعزيز ؞

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسَبْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاِحْدٰى عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ شعراء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو ستائیس آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ

بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے اگر ہم چاہیں اتاریں ان پر آسمان سے ایک

اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿٤﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ

نشانی پھر رہ جائیں ان کی گردنیں اس کے آگے نیچی اور نہیں پہنچتی ان کے پاس کوئی نصیحت

مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا

رحمٰن سے نئی جس سے منہ نہیں موڑتے سو یہ تو جھٹلا چکے

فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى

اب پہنچے گی ان پر حقیقت اس بات کی جس پر ٹھٹھے کرتے تھے کیا نہیں دیکھتے وہ

الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿٧﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

زمین کو کتنی اگائیں ہم نے اس میں ہر ایک قسم کی خاصی چیزیں اس میں البتہ نشانی ہے

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٩﴾

ع ۱ ۵

اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر نازل ہوتے ہیں) کتاب

واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (اور یہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے تو آپ اتنا غم کیوں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (تاسف کرتے کرتے) اپنی جان دے دیدینگے (اصل یہ ہے کہ یہ عالم ابتلاء ہے اس میں حق کے اثبات پر وہی دلائل قائم کئے جاتے ہیں جن کے بعد بھی ایمان لانا بندہ کے اختیار میں رہتا ہے ورنہ) اگر ہم (جبراً و اضطراراً ان کو مومن کرنا) چاہیں تو اُن پر آسمان سے ایک (ایسی) بڑی نشانی نازل کر دیں (کہ ان کا اختیار ہی بالکل سلب ہو جاوے) پھر اُن کی گردنیں اس نشانی (کے آنے) سے پست ہو جاویں (اور بالاضطرار مومن بنجاویں لیکن ایسا کرنے سے آزمایش باقی نہ رہے گی اسلئے ایسا نہیں کیا جاتا اور معاملہ جبر و اختیار کے درمیان رہتا ہے) اور (اُن کی یہ حالت ہے کہ) اُن کے پاس کوئی تازہ فہمایش (حضرت) رحمان (جل شانہٗ) کیطرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رُخی نہ کرتے ہوں سو (اس بے رُخی کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ) انھوں نے (دین حق کو) جھوٹا بتلا دیا (جو اعراض کا انتہائی درجہ ہے اور صرف اسکے ابتدائی درجہ یعنی بے التفاتی پر اکتفاء نہیں کیا اور پھر تکذیب بھی خالی نہیں بلکہ استہزار کے ساتھ) سو اب عنقریب انکو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جاویگی جس کے ساتھ یہ استہزار کیا کرتے تھے (یعنی جب عذاب الٰہی کا موت کے وقت یا قیامت میں معائنہ ہوگا، اسوقت قرآن کے اور مافی القرآن یعنی عذاب وغیرہ کے حق ہونے کا انکشاف ہو جاویگا) کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا (جو اُن سے بہت قریب اور ہر وقت پیشِ نظر ہے) کہ ہمنے اس میں کسقدر عمدہ عمدہ قسم قسم کی بُوٹیاں اُگائی ہیں (جو مثل جمیع مصنوعات کے اپنے بنانے والے کے وجود اور اُس کی یکتائی اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں کہ) اس میں (توحید ذاتی و صفاتی و افعالی کی) ایک بڑی نشانی (عقلی) ہے (اور یہ مسئلہ بھی عقلی ہے کہ خدائی کے لئے کمال ذاتی و صفاتی شرط ہے اور کمال مذکور کے لوازم میں سے ہے کہ وہ خدائی میں اکیلا ہو) اور (باوجود اسکے) ان میں کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (اور شرک کرتے ہیں، غرض شرک کرنا انکارِ نبوت سے بھی بڑھ کر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے عناد نے ان کی فطرت کو بالکل مختل کر دیا پھر ایسوں کے پیچھے کیوں جان کھوئی جاوے) اور (اگر ان کو شرک کے مذموم عند اللہ ہونے میں یہ شبہ ہو کہ ہم پر عذاب فوراً کیوں نہیں آجاتا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ آپ کا رب (باوجود اس کے کہ غالب (اور کامل القدرت) ہے (مگر اسکے ساتھ ہی) رحیم (بھی) ہے (اور اسکی رحمت عامۂ دنیا میں کفار سے بھی متعلق ہے اسکا اثر یہ ہے کہ ان کو مہلت دے رکھی ہے ورنہ کفر یقیناً مذموم اور عذاب کا مقتضی ہے)

معارف و مسائل

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیۃ، باخع بخع سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذبح کرتے کرتے

بخاع تک پہنچ جائے جو گردن کی ایک رگ ہے۔ اور اس جگہ باخعؔ سے مُراد اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈالنا ہے۔ علامہ عسکری نے فرمایا کہ اس جیسے مقامات میں اگرچہ صورت جملہ خبریہ کی ہے مگر حقیقۃً اس سے مُراد نہی اور ممانعت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر، اپنی قوم کے کفر اور اسلام سے انحراف کے سبب اتنا رنج نہ کیجئے کہ جان نکلنے لگے۔ اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کسی کافر کے بارے میں اگر یہ معلوم بھی ہوجائے کہ اس کی تقدیر میں ایمان لانا نہیں ہے تب بھی اس کو تبلیغ کرنے سے رُکنا نہیں چاہئے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ شفقت میں اعتدال چاہئے اور جو شخص ہدایت نہ پائے **اُس پر زیادہ حزن وغم نہ کیا جائے۔**

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ، علامہ زمخشری نے فرمایا کہ اصل کلام فظلّوا لھا خاضعین ہے یعنی کفار اس بڑی نشانی کو دیکھ کر تابع ہو جاویں اور جھک جائیں لیکن یہاں اعناق کا لفظ یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ موضع خضوع ظاہر ہو جائے کیونکہ جھکنا وغیرہ اور عاجزی کرنا سب سے پہلے گردن پر ظاہر ہوتا ہے۔ مضمون اس آیت کا یہ ہے کہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنی توحید اور قدرتِ کاملہ کی کوئی نشانی ظاہر کر دیں جس سے احکام شرعیہ اور حقائق الٰہیہ بدیہی ہو کر سامنے آجائیں اور کسی کو مجال انکار نہ رہے مگر حکمت کا مقتضاء یہ ہے کہ یہ احکام و معارف بدیہی نہ ہوں بلکہ نظری رہیں کہ غور وفکر پر موقوف رہیں اور یہی غور وفکر انسان کی آزمائش ہے اسی پر ثواب و عذاب مرتب ہے۔ بدیہی چیزوں کا اقرار تو ایک طبعی اور ضروری امر ہے اسمیں تعبد اور اطاعت کی شان نہیں (قرطبی)

زَوْجٍ كَرِيْمٍ، زَوج کے لفظی معنے جوڑے کے ہیں اسی لئے مرد و عورت، نر و مادہ کو زوج کہا جاتا ہے بہت سے درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں ان کو اس مناسبت سے بھی زوج کہا جاسکتا ہے اور کبھی لفظ زَوج ایک خاص نوع اور صنف کے معنی میں بھی آتا ہے اس معنے کے لحاظ سے درختوں کی ہر نوع کو زوج کہا جاسکتا ہے اور کریم کے معنی ہیں عمدہ اور پسندیدہ چیز۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ط

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس قوم فرعون کے پاس

اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ ط وَيَضِيْقُ

کیا وہ ڈرتے نہیں بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلاویں اور رُک جاتا ہے

صَدْرِىْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَىَّ

میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو اور اُن کو مجھ پر ہے

ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ ج قَالَ كَلَّا ج فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا

ایک گناہ کا دعوٰی، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں فرمایا کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم

مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

ساتھ تمہارے سنتے ہیں سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا

یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا

وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ

اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس اور کر گیا تو اپنی وہ کرتوت جو

فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

کر گیا اور تو ہے ناشکر کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ

پھر بھاگا میں تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رب نے حکم اور ٹھہرایا مجھ کو پیغام

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ

پہنچانے والا اور کیا وہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی

اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

اسرائیل کو بولا فرعون کیا معنی پروردگار عالم کا کہا پروردگار آسمان اور

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ

زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو بولا اپنے گرد والوں سے

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ

کیا تم نہیں سنتے ہو کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا بولا

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ

تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے کہا پروردگار

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ

مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو بولا

لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ

اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوائے تو مقرر ڈالوں گا تجھ کو قید میں کہا

اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ

اور اگر لے آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی بولا تو وہ چیز لا اگر تو

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ

سچ کہتا ہے پھر ڈال دیا اپنا عصا، سو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح اور اندر سے

يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ ع

نکالا اپنا ہاتھ، سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے

خلاصۂ تفسیر

اور (ان لوگوں سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت عجیب اور شنیع ہے اسلئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے) انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار، (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو نبوت عطا فرما دیجئے کہ اگر میری تکذیب کی جاوے تو وہ تصدیق کرنے لگیں تاکہ دل شگفتہ اور زبان رواں رہے اور اگر میری زبان کسی وقت بند ہو جاوے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور ہر چند کہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی مگر عطائے نبوت میں اور زیادہ باکمل وجوہ پوری ہوگی، اور (ایک امر یہ قابل عرض ہے کہ) میرے ذمہ اُن لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہوگیا تھا جسکا قصہ سورۂ قصص میں آویگا) سو (اسلئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کر سکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرما دیجئے)، ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جو ایسا کر سکیں اور ہم نے ہارون کو بھی پیغمبری دی، اب تبلیغ کے دونوں مانع مرتفع ہوگئے) سو (اب) تم دونوں میرے احکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہوگئے اور) ہم (نصرت و امداد سے) تمہارے ساتھ ہیں (اور جو گفتگو تمہاری اور ان لوگوں کی ہوگی اُس کو) سُنتے ہیں سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملک شام کی طرف) ہمارے ساتھ جانے دے (خلاصہ اس دعوت کا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و تعدی کا ترک کرنا ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہدیئے) فرعون (یہ سب باتیں سُن کر اوّل موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (آیا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور

پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہیئے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دب کر رہتے) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اسوقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہوگئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اُس کی ظالمانہ رَوِش سے اس کو روکنا مقصود تھا اتفاق سے وہ مرگیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے ہاں سے مفرور ہوگیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کر دیا (اور وہ دانشمندی اسی نبوت کے لوازم سے ہے۔ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور پیغمبری اس واقعہ قتلِ خطاء کے منافی نہیں کیونکہ یہ قتل خطاءً سادر ہوا تھا جو نبوت کی اہلیت وصلاحیت کے منافی نہیں۔

یہ تو جواب ہے اعتراضِ قتل کا) اور (رہا احسان جتلانا پرورش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا (کہ اُنکے لڑکوں کو قتل کرتا تھا جس کے خوف سے میں صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا گیا اور تیرے ہاتھ لگ گیا اور تیری پرورش میں رہا تو اس پرورش کی اصلی وجہ تو تیرا ظلم ہی ہے تو ایسی پرورش کا کیا احسان جتلاتا ہے بلکہ اس سے تو تجھے اپنی ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے شرمانا چاہیئے) فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا اور گفتگو کا پہلو بدل کر اُس) نے کہا کہ (جس کو تم) رَبُّ العالمین (کہتے ہو لقولہ تعالیٰ اِنَّ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ (مخلوقات) ان کے درمیان میں ہے اس (سب) کا اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ اس کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کر سکتا اس لئے جب ان کا سوال ہو تو صفات ہی سے جواب ملیگا) فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں مکرر تنبیہ ہے اس مطلب پر کو دیکر) فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمہارا رسول جو (بزعم خود) تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسکا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر مجبور ہو کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈالدی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا (اور دوسرا معجزہ دکھلانے کے لیئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہوگیا (کہ اس کو بھی سب نے نظرِ حِسّی سے دیکھا)۔

معارف و مسائل

اطاعت کے لئے معاون اسباب کی طلب بہانہ جوئی نہیں

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ کسی حکم کے بجالانے میں کچھ ایسی چیزوں کی درخواست کرنا جو تعمیلِ حکم میں مددگار ثابت ہوں کوئی بہانہ جوئی نہیں ہے بلکہ جائز ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی پاکر اُس کی بجاآوری کو سہل اور مفید کرنے کے لئے خدائے ذوالجلال سے درخواست کی۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی کو بلا توقف بسر و چشم قبول کیوں نہ کیا؟ اور توقف کیوں فرمایا؟ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا، تعمیلِ حکم ہی کے سلسلہ میں کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ ضلال کا مفہوم

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ فرعون کے اس سوال پر کہ تم نے اے موسیٰ ایک قبطی کو قتل کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا کہ ہاں میں نے قتل ضرور کیا تھا لیکن وہ قتل ارادۃً اور قصداً نہ تھا بلکہ اُس قبطی کو اُس کی خطا پر متنبہ کرنے کے لئے گھونسہ مارا جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے منافی قتل عمد ہے اور یہ قتل بلا ارادہ ہوا تھا جو منافی نبوت نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ یہاں "ضلال" کا مطلب "بے خبری" ہے اور اس سے مراد قبطی کا بلا ارادہ قتل ہوجانا ہے۔ اس معنی کی تائید حضرت قتادہ اور ابن زید کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ دراصل عربی میں ضلال کے کئی معنی آتے ہیں، اور ہر جگہ اس کا مطلب گمراہی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ "گمراہ" کرنا درست نہیں۔

خدائے ذوالجلال کی ذات و حقیقت کا علم انسان کے لئے ناممکن ہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ خدائے ذوالجلال کی کنہ و حقیقت کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ فرعون کا سوال خدا تعالیٰ کی حقیقت، ماہیت کے متعلق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے ماہیتِ باری تعالیٰ بتلانے کے خدا تعالیٰ کے اوصاف بیان فرمائے جس سے اشارہ فرما دیا کہ خدا تعالیٰ کی کنہ اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور ایسا سوال ہی کرنا بیجا ہے۔ (کذا فی الروح)

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ، بنی اسرائیل ملک شام کے باشندے تھے، وہاں جانا چاہتے تو فرعون ان کو جانے نہ دیتا تھا اس طرح چار سو سال سے وہ اس کی قید میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی تعداد اس وقت چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغامِ حق پہنچانے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر جو ظلم اس نے کر رکھا تھا اُس سے باز آنے اور اُن کو آزاد چھوڑ دینے کی ہدایت فرمائی۔ (قرطبی)

پیغمبرانہ مناظرہ کا ایک نمونہ مناظرے کے مؤثر آداب

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث و مباحثہ جسکو اصطلاح میں مناظرہ کہا جاتا ہے، زمانۂ قدیم سے رائج ہے مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگوں کی نظر میں مناظرہ کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اُس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کیلئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے۔ اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہر حال رد ہی کرنا اور اسکی تردید میں پوری توانائی صرف کرنا ہے۔ اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے اُسکے اصول و قواعد اور حدود متعین کر کے اسکو ایک مفید و مؤثر آلۂ تبلیغ و اصلاح بنایا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں اسکا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبار خدائی کے مدعی کو اُس کے دربار میں دعوتِ حق پہنچائی تو اُسنے مخالفانہ بحث کا آغاز اول دو ایسی باتوں سے کیا جنکا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا۔ جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تاکہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اُس کی ہوا اُکھڑ جائے۔ یہاں بھی فرعون نے دو باتیں کہیں۔ اوّل تو یہ کہ تم ہمارے پروردہ ہمارے گھر میں پلکر جوان ہوئے ہو۔ ہم نے تم پر احسانات کئے ہیں۔ تمہاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلا وجہ قتل کر ڈالا ہے جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اُسی کے آدمی کو مار ڈالا۔ اسکے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ جواب دیکھئے کہ اوّل تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا یعنی قبطی کے قتل کا قصہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا اُسکا جواب پہلے آیا۔ اور خانہ پروردہ ہونے کے احسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا اُسکا جواب بعد میں۔ اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعۂ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی آجکل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو ٹال دیا جاتا ہے اور دوسری باتوں کی طرف توجہ پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے رسُول نے اُسی کے جواب کو اولیت دی۔ اور جواب بھی فی الجملہ اعتراف کمزوری کے ساتھ دیا۔ اسکی قطعاً پروانہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے جواب میں اسکا تو اعتراف کر لیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہو گئی مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی ایک صحیح اقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا اسی قصد سے اُس کو ایک ضرب لگائی تھی اتفاقاً وہ اسی سے مر گیا اسلئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملہ یعنی نبوت کے دعوے اور اُس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ مجھے اس غلطی پر تنبیہ ہوا اور قانونی گرفت

کے خوف سے شہر سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوت و رسالت سے سرفراز فرمادیا۔

غور کیجئے کہ اسوقت دشمن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کا سیدھا صاف جواب یہ تھا کہ مقتول قبطی کو واجب القتل ثابت کرتے، اسپر ایسے الزامات لگاتے جس سے اُس کا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا۔ کوئی دوسرا آدمی تکذیب کرنے والا بھی وہاں موجود نہ تھا جس سے تردید کا اندیشہ ہوتا، اور اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اسکا جواب اسکے سوا کچھ نہ ہوتا مگر وہاں تو خدا تعالیٰ کا ایک اولوالعزم رسول صدقِ مجسّم تھا جو حق و صدق اور حقیقت کے اظہار ہی کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔ دشمن کے بھرے دربار میں اپنی خطا کا اعتراف بھی کرلیا اور اُس سے جو نبوت و رسالت پر شبہہ ہوسکتا تھا اسکا جواب بھی دیدیا۔ اسکے بعد پہلی بات یعنی خانہ پرورده ہونیکے احسان جتلانے کے جواب کیطرف تو یہ فرمائی تو اسکے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کیطرف توجہ دلادی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربارِ فرعون کہاں؟ میری پرورش تمہارے گھر میں ہونیکے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلافِ انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ انکے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کردیتے تھے، بظاہر تو تمہارے اس ظلم و ستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تم نے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتقام اور تمہارے ظلم کی عملی سزا تھی کہ جس بچے کے خطرہ سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچے قتل کر ڈالے تھے قدرت نے اُس بچے کو تمہارے ہی ہاتھوں پلوایا۔ اب سوچو کہ یہ میری پرورش تمہارا کیا احسان تھا۔ اسی پیغمبرانہ طرزِ جواب کا یہ اثر تو طبعی اور عقلی طور پر حاضرین پر ہونا ہی تھا کہ یہ بزرگ کوئی بات بنانے والے نہیں، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے، اسکے بعد جب معجزات دیکھے تو اور زیادہ اُنکی تصدیق ہوگئی۔ اور گو اقرار نہیں کیا مگر مرعوب اتنا ہوگیا کہ یہ صرف دو آدمی جن کے آگے پیچھے کوئی تیسرا مددگار نہیں، دربار سارا اُسکا، شہر اور ملک اسکا، مگر یہ خوف اس پر طاری ہے کہ یہ دو آدمی ہمیں اپنے اس ملک و مملکت سے نکالدیں گے۔

یہ ہوتا ہے خدا داد رُعب اور صدق و حق اور سچائی کی ہیبت۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے مجادلات و مناظرات بھی صدق و سچائی اور مخاطب کی دینی خیر خواہی کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہی دلوں میں گھر کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو رام کرلیتے ہیں۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ

بولا اپنے گرد کے سرداروں سے یہ تو کوئی جادوگر ہے پڑھا ہوا۔ چاہتا ہے کہ نکالدے تم کو تمہارے

مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ

دیس سے اپنے جادو کے زور سے، سو اب کیا حکم دیتے ہو۔ بولے ڈھیل دے اسکو اور اسکے بھائی کو

وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَأْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

اور بھیج شہروں میں نقیب لے آئیں تیرے پاس جو بڑا جادوگر ہو پڑھا ہوا

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ

پھر اکٹھے کئے جادوگر وعدہ پر ایک مقرر دن کے اور کہدیا لوگوں کو کیا تم بھی

مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا

اکٹھے ہوگے شاید ہم راہ قبول کرلیں جادوگروں کی اگر ہو اُن کو غلبہ پھر جب

جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

آئے جادوگر کہنے لگے فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا

بولا البتہ اور تم اس وقت مقربوں میں ہوگے کہا اُن کو موسیٰ نے ڈالو جو

مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

تم ڈالتے ہو پھر ڈالیں اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور بولے فرعون کے اقبال سے

اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا

ہماری ہی فتح ہے پھر ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا پھر تبھی وہ نگلنے لگا جو سانگ انہوں

يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

نے بنایا تھا پھر اوندھے گرے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے جہان کے رب کو

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ

جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا بولا تم نے اُس کو مان لیا ابھی میں نے حکم نہیں دیا تم کو

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ

مقرر وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھلایا جادو سو اب معلوم کرو گے البتہ کاٹوں گا

اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا

بولے کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخشدے ہمکو رب

رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

ہمارا تقصیریں ہماری اس واسطے کہ ہم ہوئے پہلے قبول کرنے والے

خُلاصۂ تفسیر

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات ظاہر ہوئے تو) فرعون نے اہل دربار سے جو اسکے آس پاس (بیٹھے) تھے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے اسکا (اصل) مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے (خود رئیس ہو جاوے اور) تم کو تمھاری زمین سے باہر کردے (تاکہ بلا مزاحمت غیرے اپنی قوم کو لے کر ریاست کرے) سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا کہ آپ انکو اور ان کے بھائی کو (چندے) مہلت دیجئے اور (اپنے ملک کے حدود کے) شہروں میں (گرداوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکمنامے دیکر) بھیجد بیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کرکے) آپ کے پاس لاکر حاضر کردیں، غرض وہ جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کرلئے گئے (معین دن سے مراد یوم الزینت ہے اور خاص وقت سے مراد وقت چاشت ہے جیسے سورۂ طٰہٰ کے رکوع سوم میں مذکور ہے، یعنی اسوقت کے قریب تک سب لوگ جمع کرلئے گئے اور فرعون کو جمع ہونے کی اطلاع دیدی گئی) اور (فرعون کی جانب سے بطور اعلان عام کے) لوگوں کو یہ اشتہار دیا گیا کہ کیا تم لوگ (فلاں موقع پر واقعہ دیکھنے کے لئے) جمع ہوگے (یعنی جمع ہو جاؤ) تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں (جیسا کہ غالب توقع ہے) تو ہم انہیں کی راہ پر رہیں (یعنی وہی راہ جس پر فرعون تھا اور دوسروں کو بھی اس پر رکھنا چاہتا تھا۔ مطلب یہ کہ جمع ہو کر دیکھو، اُمید ہے کہ جادوگر غالب رہیں گے تو ہم لوگوں کے طریق کا حق ہونا حجت سے ثابت ہو جائیگا) پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی پیشی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر (موسیٰ علیہ السلام) پر ہم غالب آگئے تو کیا ہمکو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں (انعام مالی بھی بڑا ملیگا) اور (مزید برآں یہ مرتبہ ملیگا کہ) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض اس گفتگو کے بعد عین موقعہ مقابلہ پر آئے اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور مقابلہ شروع ہوا اور ساحروں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنا عصا پہلے ڈالئے گا یا ہم ڈالیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا (منظور) ہو (میدان میں) ڈالو، سو اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں (جو جادو کے اثر سے سانپ معلوم ہوتے تھے) اور کہنے لگے کہ فرعون کے نصیب کی قسم بے شک ہم ہی غالب آویں گے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے (بحکم خداوندی) اپنا عصا ڈالا، ڈالتے کیساتھ ہی (اژدہا بن کر) اُنکے تمامتر بنے بنائے دھندے کو نگلنا شروع کردیا سو (یہ دیکھ کر) جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سب سجدہ میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے، (فرعون بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری

رعایا ہی مسلمان ہو جاوے تو ایک مضمون گھڑ کر بصورت عتاب سا تردد سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بغیر اسکے کہ میں تم کو اجازت دوں ضرور (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جادو میں، تم سب کا) اُستاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے (اور تم اسکے شاگرد ہو اسلئے باہم خفیہ سازش کرلی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یُوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے تاکہ قبطیوں سے سلطنت لیکر بفراغ خاطر خود ریاست کرو کقولہ تعالیٰ (اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا) سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمھارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سُولی پر ٹانگ دُونگا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) اُنھوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے پھر ایسے مرنے سے نقصان ہی کیا اور) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اس وجہ سے کہ ہم (اس موقع پر حاضرین میں سے) سب سے پہلے ایمان لائے (پس اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے بعض ایمان لا چکے تھے جیسے آسیہ اور مومن آل فرعون اور بنی اسرائیل)

معارف و مسائل

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ آپ جو کچھ جادو دکھانا چاہتے ہو وہ دکھاؤ۔ اس پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کو جادو کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جادو دکھانے کا حکم نہیں تھا بلکہ جو کچھ وہ کرنے والے تھے اسکا ابطال مقصود تھا لیکن اسکا باطل ہونا بغیر اسکے ظاہر کرنے کے ناممکن تھا اسلئے آپ نے ان کو اظہار جادو کا حکم دیا جیسے کہ ایک زندیق کو کہا جائے کہ تم اپنے زندقہ اور بے دینی کے دلائل پیش کرو تاکہ میں ان کو باطل ثابت کرسکوں ظاہر ہے کہ اسے کفر پر رضامندی نہیں کہا جا سکتا۔

بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ، یہ کلمہ ان جادوگروں کے لئے بمنزلہ قسم ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اب ایسی قسمیں رائج ہوگئی ہیں جو اس سے زیادہ شنیع اور قبیح ہیں مثلاً بادشاہ کی قسم، تیرے سر کی قسم، تیری ڈاڑھی کی قسم یا تیرے باپ کی قبر کی قسم، اس قسم کی قسمیں کھانا شرعاً جائز نہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جو گناہ عظیم ہے ان ناموں کی سچی قسم بھی گناہ میں اُس سے کم نہیں (کما فی الروح)

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ، یعنی جب فرعون نے جادوگروں کو قبولِ ایمان پر قتل کی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سُولی چڑھانے کی دھمکی دی تو جادوگروں نے بڑی بے پروائی سے یہ جواب

دیا کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم قتل بھی ہونگے تو اپنے رب کے پاس چلے جائینگے جہاں آرام ہی آرام ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ جادوگر جو عمر بھر جادوگری کے کفر میں مبتلا، اس پر فرعون کے دعوائے خدائی کو ماننے والے اور اس کی پرستش کرنے والے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر اپنی پوری قوم کے خلاف فرعون جیسے ظالم جابر بادشاہ کے خلاف ایمان کا اعلان کر دینا ہی ایک حیرت انگیز چیز تھی مگر یہاں تو صرف ایمان کا اعلان ہی نہیں بلکہ ایمان کا وہ گہرا رنگ چڑھ جانے کا مظاہرہ ہے کہ قیامت و آخرت گویا انکے سامنے نظر آنے لگی۔ آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہونے لگا جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر سزا اور مصیبت سے بے نیاز ہو کر (فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ) کہدیا یعنی جو تیرا جی چاہے کر لے ہم تو ایمان سے پھرنے والے نہیں۔ یہ بھی درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کا معجزہ ہے جو معجزۂ عصا اور ید بیضا سے کم نہیں، اسی طرح کے بہت سے واقعات ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں کہ ایک منٹ میں ستر برس کے کافر میں ایسا انقلاب آگیا کہ صرف مومن ہی نہیں ہو گیا بلکہ غازی بن کر شہید ہونے کی تمنا کرنے لگا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ

پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب یہ لوگ جو ہیں سو کم جماعت ہے

قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

تھوڑی سی اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے اُن سے خطرہ رکھتے ہیں

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

پھر نکال باہر کیا ہم نے اُن کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے

كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے انکے سورج نکلنے کے وقت

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ

پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ ہم تو پکڑے گئے کہا

كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ

ہرگز نہیں، میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتادیگا پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار اپنے

بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَ

عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور

أَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾ وَأَنْجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾

پاس پہنچا دیا ہم نے اُسی جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اسکے ساتھ سب کو

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿٦٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ

پھر ڈبا دیا ہم نے اُن دوسروں کو اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت لوگ اُن میں

مُؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٨﴾

ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون کو اس واقعہ سے بھی ہدایت نہ ہوئی اور اُس نے بنی اسرائیل کی آزار دہی نہ چھوڑی تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم بھیجا کہ میرے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) شباشب (مصر سے باہر) نکال لے جاؤ (اور فرعون کی جانب سے) تم لوگوں کا تعاقب (بھی) کیا جاوے گا (چنانچہ وہ موافق حکم کے بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلدیئے صبح یہ خبر مشہور ہوئی تو) فرعون نے (تعاقب کی تدبیر کرنے کیلئے جا بجا آس پاس کے) شہروں میں چپراسی دوڑا دیئے (اور یہ کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل ہماری نسبت) تھوڑی سی جماعت ہے (ان کے مقابلہ سے کوئی اندیشہ نہ کرے) اور انھوں نے (اپنی کارروائی سے) ہم کو بہت غصہ دلایا ہے (وہ کارروائی یہ ہے کہ خفیہ چالاکی سے نکل گئے یا یہ کہ زیور بھی ہمارا بہت سا عاریت کے بہانے سے لے گئے غرض ہم کو احمق بنا کر گئے ضرور ان کا تدارک کرنا چاہیئے) اور ہم سب ایک مسلح جماعت (اور باقاعدہ فوج) ہیں، غرض (دو چار روز میں جب سامان اور فوج سے درست ہو گیا تو لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا اور یہ خبر نہ تھی کہ اب لوٹنا نصیب نہ ہوگا تو اس حساب سے گویا) ہم نے اُن کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا (ہم نے انکے ساتھ تو) یوں کیا اور اُن کے بعد بنی اسرائیل کو اُن کا مالک بنا دیا (یہ جملہ معترضہ تھا آگے قصہ ہے) غرض (ایک روز) سورج نکلنے کے وقت اُن کو پیچھے سے جا لیا (یعنی قریب پہنچ گئے اسوقت بنی اسرائیل دریائے قلزم سے اُترنے کی فکر میں تھے کہ کیا سامان کریں) پھر جب دونوں جماعتیں (باہم ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے کہ (اے موسیٰ) بس ہم تو اُن کے ہاتھ آ گئے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی (دریا سے نکلنے کا) رستہ بتلا دیگا (کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو

اور سورۂ اعراف کی آیت میں اَلَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا کے الفاظ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارض شام مراد ہے کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں بٰرَکْنَا وغیرہ کے الفاظ اکثر ارض شام ہی کے بارے میں آئے ہیں اس لئے حضرت قتادہؒ کا قول یہ ہے کہ بلا ضرورت آیاتِ قرآن کو ایسے محمل پر محمول کرنا جو تاریخ عالم سے متصادم ہو درست نہیں ——— خلاصہ یہ ہے کہ اگر واقعات سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہلاکِ فرعون کے بعد کسی وقت بھی بنی اسرائیل اجتماعی صورت سے مصر پر قابض نہیں ہوئے تو حضرت قتادہؒ کی تفسیر کے مطابق ان تمام آیات میں ارض شام اور اس کے باغات و خزائن کا وارث ہونا مراد لیا جا سکتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم،

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ اس وقت جبکہ فرعونی لشکر جو ان کے تعاقب میں تھا جب بالکل سامنے آگیا تو پوری قوم بنی اسرائیل چلا اٹھی کہ ہم تو پکڑے گئے اور پکڑے جانے میں شبہ اور دیر ہی کیا تھی کہ پیچھے یہ لشکر جرار اور آگے دریا حائل یہ صورت حال موسیٰ علیہ السلام سے بھی غائب نہ تھی مگر وہ کوہِ استقامت اللہ کے وعدہ پر یقین کئے ہوئے اس وقت بھی بڑی زور سے کہتے ہیں کَلَّا ہرگز نہیں پکڑے جا سکتے اور وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے جو مجھے راستہ دیگا۔ ایمان کا امتحان ایسے ہی مواقع میں ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ذرا ہراس نہیں تھا، وہ گویا راستہ بچنے کا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح کا بعینہ واقعہ ہجرت کے وقت غار ثور میں چھپنے کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا کہ دشمن جو آپ کی تلاش میں تھے اس غار کے دہانے پر آکھڑے ہوئے، ذرا نیچے نظر کریں تو آپ ان کے سامنے آجائیں اس وقت صدیق اکبرؓ کو گھبراہٹ ہوئی تو آپ نے بعینہٖ یہی جواب دیا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان دونوں واقعات میں ایک بات یہ بھی قابل نظر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینے کے لئے کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ "میرے ساتھ میرا رب ہے" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مَعَنَا فرمایا کہ ہم دونوں کے ساتھ ہمارا رب ہے، یہ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اس کے افراد بھی اپنے رسول کیساتھ معیتِ الٰہیہ سے سرفراز ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا

اور سنا دے اُن کو خبر ابراہیم کی　جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو　وہ بولے

نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾

ہم پوجتے ہیں مورتوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو،

اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ

یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا بُرا،　بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے اگلے

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ

سو وہ میرے دشمن ہیں　مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے　اور وہ جو مجھ کو

هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ

کھلاتا ہے اور پلاتا ہے　اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے　اور وہ جو مجھ کو مارے گا اور

ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ

پھر جِلائے گا　اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن　اے رب

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي

دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں اور رکھ میرا بول سچا

الْآخِرِينَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِي مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ

پچھلوں میں اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ تھا

مِنَ الضَّالِّينَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۸﴾

راہ بھولے ہوؤں میں اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۹﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ

مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا اور پاس لائیں بہشت کو واسطے ڈر والوں کے اور نکالیں دوزخ

الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ ﴿۹۱﴾ وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿۹۲﴾ مِن دُونِ اللَّهِ

کو سامنے بے راہوں کے اور کہیں ان کو کہاں ہیں جن کو تم پوجتے تھے اللہ کے سوائے

هَلْ يَنصُرُونَكُمْ أَوْ يَنتَصِرُونَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُودُ

کیا کچھ مدد کرتے ہیں تمہاری یا بدلہ لے سکتے ہیں پھر اوندھے ڈالے اس میں ان کو اور سب بے راہوں کو، اور ابلیس

إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ ﴿۹۵﴾ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا يَخْتَصِمُونَ ﴿۹۶﴾ تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ

کے لشکر کو سبھوں کو کہیں گے جب وہ وہاں باہم جھگڑنے لگیں قسم اللہ کی ہم تھے صریح غلطی

مُّبِينٍ ﴿۹۷﴾ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۹۸﴾ وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ﴿۹۹﴾

میں جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگار عالم کے اور ہم کو راہ سے بہکایا سو ان گنہگاروں نے

فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً

پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا سو کسی طرح ہم کو پھر جانا ملے

فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰۲﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم

تو ہم ہوں ایمان والوں میں اس بات میں نشانی ہے اور بہت لوگ ان میں

مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۰۳﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰۴﴾

نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان لوگوں کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجئے (تاکہ ان کو شرک کی مذمت کے دلائل معلوم ہوں، خصوص ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہو کر، کیونکہ یہ مشرکین عرب اپنے کو ملت ابراہیمیہ پر بتلاتے ہیں اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو، انھوں نے کہا ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم انہی (کی عبادت) پر جمے

پر جمے بیٹھے رہتے ہیں (ابراہیم علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم انکو (اپنی عرض حاجت کیوقت) پکارا کرتے ہو یا (تم جو ان کی عبادت کرتے ہو تو کیا) یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں یا (اگر تم انکی عبادت ترک کردو تو کیا) یہ تمکو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں (یعنی استحقاق الوہیت کیلئے علم اور قدرت کاملہ تو ضروری ہے) ان لوگوں نے کہا نہیں (یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتے ہوں یا نفع و ضرر پہنچا سکتے ہوں اور انکی عبادت کرنیکی یہ وجہ نہیں) بلکہ ہمنے اپنے بڑوں کو اسیطرح کرتے دیکھا ہے (اس لئے ہم بھی وہی کرتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تمنے ان (کی حالت) کو (غور سے) دیکھا بھی جنکی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمھارے پرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (یعنی تمھارے لئے) باعث ضرر ہیں (یعنی اگر انکی عبادت کیجاوے خواہ نعوذ باللہ میں کروں یا تم کرو تو بجز ضرر کے اور کوئی نتیجہ نہیں) مگر ہاں رب العالمین (ایسا ہے کہ وہ اپنے عابدین کا دوست ہے اور اسکی عبادت سراسر نافع ہے) جسنے مجھکو (اور اسیطرح سب کو) پیدا کیا، پھر وہی مجھکو (میری مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (یعنی عقل و فہم دیتا ہے جس سے نفع و ضرر کو سمجھتا ہوں) اور جو مجھکو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں (جسکے بعد شفا ہوجاتی ہے) تو وہی مجھکو شفا دیتا ہے اور جو مجھکو (وقت پر) موت دیگا پھر (قیامت کے روز) مجھکو زندہ کریگا اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف کردیگا (یہ تمام صفات اسلئے سنائیں کہ قوم کو خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت ہو پھر صفات کمال بیان فرماتے فرماتے غلبۂ حضور سے حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے کہ) اے میرے پروردگار مجھکو حکمت (یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں زیادہ کمال) عطا فرما (کیونکہ نفس حکمت تو وقت دعا کے بھی حاصل ہے) اور (مراتب قرب میں) مجھکو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما (مراد انبیاء عالیشان ہیں) اور میرا ذکر آئندہ آنیوالوں میں جاری رکھ (تاکہ میرے طریقہ پر چلیں جس میں مجھ کو زیادہ ثواب ملے) اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر اور میرے باپ (کو توفیق ایمان کی دیکر اس) کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے اور جس روز سب زندہ ہو کر اٹھیں گے اس روز مجھ کو رسوا نہ کرنا (آگے اس دن کے بعض واقعات ہائلہ کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ قوم سنے اور ڈرے یعنی وہ ایسا دن ہوگا) جس دن میں کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آویگا نہ اولاد مگر ہاں (اسکو نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک دل لے کر آویگا اور (اس روز) خدا ترسوں (یعنی ایمان والوں) کے لئے جنت نزدیک کر دیجاویگی (کہ اس کو دیکھیں اور یہ معلوم کرکے کہ ہم اسمیں جاویں گے خوش ہوں) اور ان گمراہوں (یعنی کافروں) کے لئے دوزخ سامنے ظاہر کیجاویگی (کہ اس کو دیکھ کر غمزدہ ہوں کہ ہم اسمیں جاوینگے) اور (اس روز) ان (گمراہوں) سے کہا جاویگا کہ وہ معبود کہاں گئے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے کیا (اسوقت) وہ تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں یا اپنا ہی بچاؤ کر سکتے ہیں پھر (یہ کہکر) وہ (عابدین) اور گمراہ لوگ اور ابلیس کا لشکر سب کے سب دوزخ میں اوندھے منہ ڈالدیئے جاوینگے (بس وہ بت اور شیاطین نہ اپنے کو بچا سکے نہ اپنے عابدین کو) وہ کفار اس دوزخ میں گفتگو کرتے ہوئے (ان معبودین سے) کہیں گے کہ بخدا بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو (عبادت میں)

رب العالمین کے برابر کرتے تھے اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے (جو کہ بانی ضلالت تھے) گمراہ کیا سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے (کہ چھڑا لے) اور نہ کوئی مخلص دوست (کہ خالی دلسوزی ہی کرلے) سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو (دُنیا میں) پھر واپس جانا ملتا کہ ہم مسلمان ہو جاتے (یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہو گئی آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) بیشک اس واقعہ (مناظرہ ابراہیمیہ نیز واقعہ قیامت) میں (بھی طالبانِ حق اور انجام اندیشوں کے لئے) ایک عبرت ہے (کہ مضامین مناظرہ میں غور کر کے توحید کا اعتقاد کریں اور واقعاتِ قیامت سے ڈریں اور ایمان لادیں) اور (باوجود اس کے) ان (مشرکین مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے بیشک آپ کا رب بڑا زبردست رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

قیامت تک انسانوں میں ذکرِ خیر رکھنے کی دُعا | وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ، اس آیۃ مبارکہ میں "لسان" سے مراد ذکر ہے اور "لی" کا لام نفع کے لئے ہے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدایا مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک پیروی کریں، اور مجھے ذکر خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں (ابن کثیر و روح المعانی) خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دُعا قبول فرمائی۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ سب ملت ابراہیمی سے محبت و الفت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگرچہ ان کا طریقہ ملت ابراہیمی کے خلاف کفر و شرک ہے مگر وہ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور اُمتِ محمدیہ تو بجا طور پر بھی ملت ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔

حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کیساتھ جائز ہے | حُبِّ جاہ یعنی لوگوں سے اپنی عزت کرنے اور مدح کرنے کی خواہش شرعاً مذموم ہے قرآن کریم نے دار آخرت کی نعمتوں کو حُبِّ جاہ کے ترک پر موقوف قرار دیا ہے (قال تعالیٰ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا) اور جگہ آیت (وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا کہ آنیوالی نسلوں میں میری تعریف و ثنا ہوا کرے بظاہر حبِّ جاہ میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ اس دُعا کا اصل مقصد حبِّ جاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے اسکی دُعا ہے کہ ایسے نیک اعمال کی توفیق بخشیں جو میری آخرت کا سامان بنیں اور اس کو دیکھکر دوسرے لوگوں کو بھی اعمال صالحہ کی رغبت ہو اور میرے بعد بھی لوگ اعمال صالحہ میں میری پیروی کرتے رہیں، جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے کوئی دنیاوی وجاہت کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہی نہیں،

جس کو حُبِ جاہ کہا جاسکے۔ قرآن و حدیث میں جہاں طلبِ جاہ کو ممنوع اور مذموم قرار دیا ہے اسکی مراد دینی دُنیوی وجاہت اور اُس سے دُنیوی منافع حاصل کرنا ہے۔

امام ترمذی و نسائی نے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کے گلّے میں چھوڑ دیئے جاویں وہ بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دو خصلتیں انسان کے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ایک مال کی محبت دوسرے اپنی عزت وجاہ کی طلب (رواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدریؓ والبزار عن ابی ھریرۃؓ) اور حضرت ابن عباسؓ سے بسند ضعیف دیلمی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہ و ثنا کی محبت انسان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ ان تمام روایات سے مراد وہ حُبِ جاہ اور طلبِ ثناء ہے جو دُنیوی مقاصد کے لئے مطلوب ہو یا جس کی خاطر دین میں مداہنت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے اور جب یہ صورت نہ ہو تو طلبِ جاہ مذموم نہیں۔ حدیث میں خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے (اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا) یعنی یا اللہ مجھے خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا اور حقیر بنا دیجئے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دیجئے۔ یہاں بھی لوگوں کی نظر میں بڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال میں میری پیروی کریں۔ اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص واقع میں صالح اور نیک ہو، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے لئے ریاکاری نہ کرے اسکے لئے لوگوں کیطرف سے مدح و ثنا کی محبت مذموم نہیں

ابن عربی نے فرمایا کہ آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جس نیک عمل سے لوگوں میں تعریف ہوتی ہو اُس نیک عمل کی طلب خواہش جائز ہے۔ اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ دُنیا میں عزت وجاہ کی محبت تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اوّل یہ کہ اس سے مقصود اپنے آپ کو بڑا اور اُسکے بالمقابل دوسرے کو چھوٹا یا حقیر قرار دینا نہ ہو بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے ہو کہ لوگ میرے معتقد ہو کر نیک اعمال میں میرا اتباع کریں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹی ثنا خوانی مقصود نہ ہو کہ جو صفت اپنے اندر نہیں ہے لوگوں سے اسکی خواہش رکھے کہ وہ اس صفت میں اُسکی تعریف کریں۔ تیسرے یہ کہ اسکے حاصل کرنے کے لئے کسی گناہ یا دین کے معاملے میں مُداہنت اختیار نہ کرنی پڑے۔

مشرکین کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ، قرآن مجید کے اس فرمان کے بعد (مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ) اب کسی ایسے شخص کے لئے جسکا کفر پر مرنا یقینی ہو استغفار اور دُعائے مغفرت طلب کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ آیتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ کسی نبی اور ایمانداروں کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ اسکے رشتہ دار اور قریبی ہی کیوں نہ ہوں جبکہ اُن کا جہنمی ہونا بالکل واضح ہو چکا ہو۔

ایک سوال وجواب اب یہاں یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ اس نہی اور ممانعت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے کیوں دعائے مغفرت مانگی۔ اسکا جواب خود اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں دیدیا کہ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ)

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے انکی زندگی میں استغفار کی نیت اور خیال سے کی تھی کہ اللہ رب العزت ان کو ایمان لانے کی توفیق دے جس کے بعد مغفرت یقینی ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال تھا کہ میرا باپ خفیہ طور پر ایمان لے آیا ہے اگرچہ اسکا اظہار اور اعلان نہیں کیا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ میرا باپ تو کفر پر مرا ہے تو انھوں نے اپنی پوری بیزاری اور براءت کا اظہار فرمایا۔ (فائدہ) اس بات کی تحقیق کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ کا کفر اور شرک اپنے باپ کی زندگی میں معلوم ہوگیا تھا یا مرنے کے بعد یا قیامت کے روز ہوگا، اس کی پوری تفصیل سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ یعنی قیامت کے اس دن میں جس میں نہ کوئی مال کسی کو فائدہ دیگا نہ اس کی نرینہ اولاد بجز اس شخص کے جو اللہ کے پاس قلب سلیم لیکر پہنچے۔ اس آیت کی تفسیر بعض حضرات نے استثناء کو استثناء منقطع قرار دیکر یہ کی ہے کہ اُس روز کسی کو نہ اسکا مال کام آدیگا نہ اولاد، ہاں کام آئیگا تو صرف اپنا قلب سلیم جس میں شرک و کفر نہ ہو۔ اور اس جملہ کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص زید کے متعلق کسی سے پوچھے کہ کیا زید کے پاس مال اور اولاد بھی ہے وہ اسکے جواب میں کہے اسکا مال و اولاد تو اسکا قلب سلیم ہے جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال و اولاد تو کچھ نہیں مگر ان سب کے بدلے اسکے پاس اپنا قلب سلیم موجود ہے۔ خلاصہ مضمون آیت کا اس تفسیر پر یہ ہوتا ہے کہ مال یا اولاد تو اس روز کچھ کام نہ آئیں گے، کام صرف اپنا ایمان اور عمل صالح آئیگا جس کو قلب سلیم سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور مشہور تفسیر اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ استثناء متصل ہے اور معنے یہ ہیں کہ مال اور اولاد قیامت کے روز کسی شخص کے کام نہ آئیں گے بجز اس شخص کے جسکا قلب سلیم ہے یعنی وہ مؤمن ہے اسکا حاصل یہ ہوا کہ یہ سب چیزیں قیامت میں بھی مفید و نافع ہوسکتی ہیں مگر صرف مؤمن کے لئے نفع بخش ہونگی کافر کو کچھ نفع نہ دیں گی۔ یہاں ایک بات یہ قابل نظر ہے کہ اس جگہ قرآن کریم نے وَلَا بَنُوْنَ فرمایا جس کے معنے نرینہ اولاد کے ہیں عام اولاد کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ آڑے وقت میں کام آنے کی توقع دنیا میں بھی نرینہ اولاد یعنی لڑکوں ہی سے ہوسکتی ہے لڑکیوں سے کسی مصیبت کے وقت امداد ملنے کا تو یہاں بھی احتمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اسلئے قیامت میں بالتخصیص لڑکوں کے غیر نافع ہونیکا ذکر کیا گیا جن سے دنیا میں توقع نفع کی رکھی جاتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قلب سلیم کے لفظی معنے تندرست دل کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جو کلمہ توحید کی گواہی دے اور شرک سے پاک ہو، یہی مضمون مجاہد حسن بصری سعید بن مسیب سے بعنوان مختلف منقول ہے۔ سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ تندرست دل صرف مومن کا ہو سکتا ہے کافر کا دل بیمار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ۔

مال اولاد اور خاندانی تعلقات آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع پہنچا سکتے ہیں۔ آیت مذکورہ کی مشہور تفسیر کے مطابق معلوم ہوا کہ انسان کا مال قیامت کے روز بھی اس کے کام آسکتا ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جس شخص نے دنیا میں اپنا مال اللہ کی راہ اور نیک کاموں میں خرچ کیا تھا یا کوئی صدقہ جاریہ کر کے چھوڑا تھا، اگر اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا حشر میں مؤمنین کی فہرست میں داخل ہوا تو یہاں کا خرچ کیا ہوا مال اور صدقۂ جاریہ کا ثواب اس کو میدانِ حشر اور میزانِ حساب میں بھی کام آویگا۔ اور اگر یہ شخص مسلمان نہیں تھا یا خدانخواستہ مرنے سے پہلے ایمان سے نکل گیا تو اب دنیا میں کیا ہوا کوئی نیک عمل اس کے کام نہ آویگا اور اولاد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اگر یہ شخص مسلمان ہے تو آخرت میں بھی اس کو اولاد کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس طرح سے کہ اس کے بعد اس کی اولاد اس کے لئے دعائے مغفرت کرے یا ایصالِ ثواب کرے، اور اس طرح بھی کہ اُس نے اولاد کو نیک بنانے کی کوشش کی تھی اسلئے ان کے نیک عمل کا ثواب اس کو بھی خود بخود ملتا رہا اور اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہا۔ اور اس طرح بھی کہ اولاد محشر میں اس کی شفاعت کر کے بخشوالے جیسا کہ بعض روایات حدیث میں ایسی شفاعت کرنا اور اس کا قبول ہونا ثابت ہے خصوصاً نابالغ اولاد کا۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ سے بھی آخرت میں بشرط ایمان یہ نفع پہنچے گا کہ اگر یہ مسلمان ہوئے مگر اُن کے اعمال صالحہ ماں باپ کے درجے کو نہیں پہنچے تو اللہ تعالیٰ اُن کے باپ دادا کی رعایت کر کے ان کو بھی اُسی مقام بلند میں پہنچا دیں گے جو اُن کے باپ دادا کا مقام ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح اس طرح مذکور ہے وَاَلۡحَقۡنَا بِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ، یعنی ہم ملا دیں گے اپنے نیک بندوں کے ساتھ اُن کی ذرّیت کو بھی۔ اس آیت کی مذکور الصدر مشہور تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث میں جہاں کہیں یہ مذکور ہے کہ قیامت میں خاندانی تعلق کچھ کام نہ آویگا اس کی مُراد یہ ہے کہ غیر مؤمن کو کام نہ آوے گا، یہاں تک کہ پیغمبر کی اولاد اور بیوی بھی اگر مؤمن نہیں تو ان کی پیغمبری سے ان کو قیامت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور لوط علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کا معاملہ ہے۔ آیاتِ قرآن فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ اور یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیۡہِ) اور لَا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِہٖ) ان سب آیات کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا

جھٹلایا نوح کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم کو

تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾

ڈر نہیں میں تمہارے واسطے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٩﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿١١١﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کمینے

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي

کہا مجھ کو کیا خبر ہے اس کی جو کام وہ کر رہے ہیں ان کا حساب پوچھنا میرے رب ہی کا کام ہے

لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ

اگر تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ہانکنے والا نہیں ایمان لانے والوں کو میں تو بس یہی ڈر سنا دینے والا

مُبِينٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾

ہوں کھول کر بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَ

کہا اے رب میری قوم نے تو مجھ کو جھٹلایا سو فیصلہ کر دے میرے ان کے بیچ میں کسی طرح کا فیصلہ اور

نَجِّنِي وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي

بچا لے مجھ کو اور جو میرے ساتھ ہیں ایمان والے پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے

الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ﴿١٢٠﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

اس لدی ہوئی کشتی میں پھر ڈبا دیا اس کے پیچھے ان باقی رہے ہوؤں کو البتہ اس بات میں

لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾

نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب سے سب کی تکذیب لازم آتی ہے) جبکہ اُن سے اُنکی برادری کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں (کہ بعینہٖ پیغام خداوندی بلا کمی بیشی پہنچا دیتا ہوں) سو

(اسکا مقتضیٰ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور (نیز) میں تم سے کوئی (دُنیوی) صلہ (بھی) نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے سو (میری اس بے غرضی کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ) تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے، حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں (جن کی موافقت سے شرفاء کو عار آتی ہے اور نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کا مقصد کسی کے ساتھ لگنے سے کچھ مال یا جاہ حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کا دعوائے ایمان بھی قابلِ اعتبار نہیں۔) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ان کے (پیشہ درانہ) کام سے مجھ کو کیا بحث (خواہ شریف ہوں یا رذیل ہوں دین میں اس تفاوت کا کیا اثر رہا؟ یہ احتمال کہ انکا ایمان دل سے نہیں سو اس پر) ان سے حساب کتاب لینا بس خدا کا کام ہے۔ کیا خوب ہو کہ تم اس کو سمجھو اور (رذالت پیشہ لوگوں کو اپنے ایمان کا مانع قرار دینے سے جو اشارۃً یہ درخواست نکلتی ہے کہ میں ان کو اپنے پاس سے دُور کر دوں تو) میں ایمانداروں کو دُور کرنے والا نہیں ہوں (خواہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صاف طور پر ایک ڈرانے والا ہوں (اور تبلیغ سے میرا فرضِ منصبی پُورا ہو جاتا ہے، آگے اپنا نفع و نقصان تم لوگ دیکھ لو) وہ لوگ کہنے لگے اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے (غرض جب سالہا سال اسطرح گزر گئے تب) نوح (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میری قوم مجھ کو (برابر) جھٹلا رہی ہے سو آپ میرے اور ان کے درمیان ایک (عملی) فیصلہ کر دیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے) اور مجھ کو اور جو ایماندار میرے ساتھ ہیں ان کو (اس ہلاکت سے) نجات دیجئے تو ہم نے (ان کی دُعا قبول کی اور) ان کو اور جو اُن کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے اُن کو نجات دی پھر اسکے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفارِ مکہ) میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے (کہ باوجود عذاب پر قادر ہونے کے اُن کو مہلت دیئے ہوئے ہے)۔

معارف و مسائل

طاعات پر اُجرت لینے کا حکم | وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبلیغ پر اُجرت لینا درست نہیں ہے اسلئے سلف صالحین نے اُجرت لینے کو حرام کہا ہے لیکن متاخرین نے اس کو بحالتِ مجبوری جائز قرار دیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل آیت لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کے تحت میں بیان ہو چکی ہے۔

فائدہ - اس جگہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کی آیت دو دفعہ تاکید کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے

لائی گئی ہے کہ اطاعتِ رسُول اور خدا تعالیٰ سے ڈرنے کے لئے صرف رسُول کی امانت و دیانت یا صرف تبلیغ و تعلیم پر اُجرت نہ طلب کرنا ہی کافی تھا لیکن جس رسُول میں یہ سب صفتیں پائی جائیں اُس کی اطاعت اور اس کے خدا سے ڈرنا تو اور لازمی ہو جاتا ہے۔

شرافت و رذالت اعمال و اخلاق سے ہے نہ کہ خاندان اور جاہ و حشم سے

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس آیت میں اول مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ آپ کے ماننے والے سارے رذیل لوگ ہیں ہم عزت دار شریف اُن میں کیسے مل جائیں؟ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ مجھے اُن کے اعمال کا حال معلوم نہیں۔ اس میں اشارہ فرما دیا کہ تم لوگ جو خاندانی شرافت یا مال و دولت اور عزت و جاہ کو شرافت کی بنیاد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ مدارِ عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا دراصل اعمال و اخلاق پر ہے۔ تم نے جن پر یہ حکم لگا دیا کہ یہ سب رذیل ہیں، یہ تمہاری جہالت ہے چونکہ ہم ہر شخص کے اعمال و اخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں اسلئے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ حقیقۃً کون رذیل ہے کون شریف۔ (قرطبی)

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

جھٹلایا عاد نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی ہُود نے کیا تم کو ڈر نہیں

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ

میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ

سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے مالک پر کیا بناتے ہو ہر اونچی

رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

زمین پر ایک نشان کھیلنے کو اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَ

اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور

اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے

وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا

اور باغ اور چشمے میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے بولے

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ

ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ بنے تو نصیحت کرنے والا اور کچھ نہیں

اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ

یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی اور ہم پر آفت نہیں آنے والی پھر اس کو جھٹلانے

فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

لگے تو ہمنے ان کو غارت کر دیا، اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾ ع ۱۸ / ۱۱

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خُلاصۂ تفسیر

قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کی (برادری کے) بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تم (خدا سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے، کیا تم (علاوہ شرک کے تکبر و تفاخر میں بھی اس درجہ مصروف ہو کہ) ہر اونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو (تاکہ خوب اونچی نظر آوے) جس کو محض فضول (بلا ضرورت) بناتے ہو اور (اس کے علاوہ جو رہنے کے مکان ہیں جن کی ایک درجہ ضرورت بھی ہے اُن میں بھی یہ غلو ہے) کہ بڑے بڑے محل بناتے ہو (حالانکہ اس سے کم میں آرام مل سکتا ہے) جیسے دنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے (یعنی توسیع مکانات اور ایسے بلند محل اور ایسی مضبوطی اور ایسی یادگار تعمیرات اسوقت مناسب تھیں جبکہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا، تو یہ خیال ہوتا کہ فراخ مکان بناؤ تاکہ آئندہ نسل میں تنگی نہ ہو کیونکہ ہم بھی رہیں گے اور وہ بھی رہیں گے اور بلند بھی بناؤ تاکہ نیچے جگہ نہ رہے تو ادھر رہنے لگیں گے اور مضبوط بناؤ تاکہ ہماری عمر طویل کے لئے کافی ہو اور یادگاریں بناؤ تاکہ ہمارے زندہ رہنے سے ہمارا ذکر زندہ رہے اور اب تو سب فضول ہے۔ بڑی بڑی یادگاریں بنی ہیں اور بنانیوالے کا نام تک نہیں موت نے سب کا نام مٹا دیا کسی کا جلدی اور کسی کا دیر میں) اور (اس تکبر کے سبب طبیعت میں سختی اور بے رحمی اس درجہ رکھتے ہو کہ) جب کسی پر دار و گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر دار و گیر کرتے ہو (ان بُرے اخلاق کا اسلئے بیان کیا گیا کہ یہ بُرے اخلاق اکثر ایمان اور اطاعت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں) سو (چونکہ شرک اور گزشتہ بُرے اخلاق خدا تعالیٰ کی ناخوشی اور عذاب کا سبب ہیں اسلئے) تم (کو چاہیئے کہ) اللہ سے ڈرو اور (چونکہ میں رسول ہوں اسلئے) میری اطاعت کرو اور اس (اللہ) سے ڈرو (یعنی جس سے ڈرنے کو میں کہتا ہوں وہ

ایسا ہے) جس نے تمھاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) چوپائے اور بیٹیں اور باغوں اور چشموں سے تمھاری امداد کی (تو منعم ہونے کا تقتضا یہ ہے کہ اسکے احکام کی بالکل مخالفت نہ کی جاوے) مجھ کو تمھارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ ترہیب ہے اور اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ الخ میں ترغیب تھی) وہ لوگ بولے کہ ہمارے نزدیک تو دونوں باتیں برابر ہیں خواہ تم نصیحت کرو اور خواہ ناصح نہ بنو (یعنی ہم دونوں حالتوں میں اپنے کردار سے باز نہ آوینگے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو) یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک (معمولی) عادت (ہے اور رسم) ہے (کہ ہر زمانہ میں لوگ مدعی نبوت ہو کر لوگوں کو یوں ہی کہتے سنتے رہے) اور (تم جو ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو تو) ہمکو ہرگز عذاب نہ ہوگا غرض ان لوگوں نے ہود (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (سخت آندھی کے عذاب سے) ہلاک کر دیا، بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے (کہ احکام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا) اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب زبردست اور مہربان ہے (کہ عذاب دینے پر قادر بھی ہے اور رحمت سے مہلت بھی دے رکھی ہے)

معارف و مسائل

چند مشکل الفاظ کی تشریح اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ ○ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ○ (الریع) ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ سے نقل فرمایا ہے کہ ریع دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے اور جمہور سے منقول ہے کہ ریع بلند جگہ کو کہتے ہیں اور اسی سے ریع النبات نکلا ہے یعنی بڑھنے اور چڑھنے والی نباتات، (اٰیَةً) اسکے اصل معنی علامت کے ہیں اس جگہ بلند محل مراد ہے۔ (تَعۡبَثُوۡنَ) یہ عبث سے ہے اور عبث اس کو کہتے ہیں جس میں نہ حقیقۃً کوئی فائدہ ہو اور نہ حکماً۔ اس جگہ معنی یہ ہونگے کہ وہ بیفائدہ بلند بلند محلات بناتے تھے جن کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی صرف فخریہ بناتے تھے۔ (مصانع) مصنع کی جمع ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مصانع سے پانی کے حوض مراد ہیں لیکن حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس سے مضبوط محل مراد ہیں۔ (لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں بیان فرمایا کہ اس آیت میں لعلّ تشبیہ کے لئے ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ یہ فرمایا کَاَنَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ یعنی گویا تم ہمیشہ رہوگے (کمافی الروح)

بلاضرورت عمارت بنانا مذموم ہے اس آیت سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کے مکان بنانا اور تعمیرات کرنا شرعاً برا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے جو امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ النفقۃ کلھا فی سبیل اللہ الا البناء فلا خیر فیہ، یعنی وہ عمارت جو ضرورت سے زائد بنائی گئی ہو اس میں کوئی بہتری اور بھلائی نہیں۔ اور اس معنی کی تصدیق حضرت انسؓ کی دوسری

روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا الا مالا یعنی الا ما لابن منہ (ابوداؤد)
یعنی ہر تعمیر صاحبِ تعمیر کے لئے مصیبت ہے مگر وہ عمارت جو ضروری ہو وہ وبال نہیں ہے روح المعانی میں
فرمایا کہ بغیر غرض صحیح کے بلند عمارت بنانا شریعتِ محمدیہ میں بھی مذموم اور بُرا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۴۱﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا

جھٹلایا　ثمود نے پیغام لانے والوں کو　جب کہا اُن کو اُن کے بھائی صالح نے　کیا

تَتَّقُونَ ﴿۱۴۲﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۴۴﴾

تم ڈرتے نہیں　میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر　سو ڈرو اللہ سے　اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۴۵﴾

اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ　میرا بدلہ ہے　اسی جہان کے پالنے والے پر

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ﴿۱۴۶﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۴۷﴾ وَزُرُوعٍ

کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے　باغوں میں　چشموں میں　اور کھیتوں میں

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ﴿۱۴۹﴾

اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے　اور تراشتے ہو　پہاڑوں کے گھر　تکلف کے

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۵۱﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو　اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ

جو خرابی کرتے ہیں　ملک میں　اور اصلاح نہیں کرتے　بولے تجھ پر تو کسی

مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿۱۵۳﴾ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ

نے جادو کیا ہے　تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم　سو لے آ کچھ نشانی

كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ

اگر تو سچا ہے　کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لئے

يَوْمٍ مَعْلُومٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ

باری ایک دن کی مقرر　اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑے تم کو آفت ایک بڑے

عَظِيمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿۱۵۷﴾ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ

دن کی　پھر کاٹ ڈالا اس اونٹنی کو پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے　پھر آ پکڑا اُن کو عذاب نے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۵۸﴾ وَإِنَّ

البتہ اس بات میں نشانی ہے　اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے　اور تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٥٩﴾

رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا

خلاصۂ تفسیر

قوم ثمود نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے، میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے (اور تم جو خوشحالی کی وجہ سے اس درجہ اللہ سے غافل ہو تو) کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بے فکری سے رہنے دیا جاوے گا جو یہاں (دُنیا میں) موجود ہیں، یعنی باغوں میں اور چشموں میں اور ان کھجوروں میں جن کے گچھے خوب گوندے ہوئے ہیں (یعنی ان کھجوروں میں خوب کثرت سے پھل آتا ہے) اور کیا (اسی غفلت کی وجہ سے) تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکانات بناتے ہو سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اُن حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سرزمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور (کبھی) اصلاح (کی بات) نہیں کرتے (مراد رؤسا کفار ہیں جو گمراہی پر لوگوں کو آمادہ کرتے تھے اور فساد اور عدم اصلاح سے یہی مُراد ہے) ان لوگوں نے کہا کہ تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل میں خرابی آگئی ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہو حالانکہ) تم بس ہماری طرح کے ایک (معمولی) آدمی ہو۔ (اور آدمی نبی ہوتا نہیں) سو کوئی معجزہ پیش کرو اگر تم (دعویٰ نبوت میں) سچے ہو، صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ ایک اونٹنی ہے (جو بوجہ خلافِ عادت پیدا ہونے کے معجزہ ہے جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ختم کے قریب گزرا اور علاوہ اسکے کہ یہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اسکے بھی کچھ حقوق ہیں چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پانی پینے کے لئے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری (یعنی تمہارے مواشی کی) اور (ایک یہ ہے کہ) اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آپکڑے سو انھوں نے (نہ رسالت کی تصدیق کی نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو مار ڈالا، پھر (جب عذاب کے نشان ظاہر ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے (مگر اول تو عذاب دیکھ لینے کے وقت پشیمانی بیکار، دوسرے خالی طبعی پشیمانی سے کیا ہوتا ہے جب تک اختیاری تدارک یعنی توبہ وایمان نہ ہو) پھر (آخر) عذاب نے ان کو آلیا، بیشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ، حضرت ابن عباسؓ سے فارھین کی تفسیر بطرین منقول ہے یعنی اترانے اور تکبر کرنے والے، لیکن ابو صالح نے فرمایا، اور یہی امام راغب نے تفسیر کی ہے کہ فارھین کے معنی حاذقین ہے یعنی ماہرین کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ نعمت فرمائی کہ تم کو ایسی صنعت کاری سکھلا دی کہ پہاڑوں کو مکانات بنانا تمہارے لئے آسان کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو اور زمین پر فساد نہ کرو۔

مفید پیشے خدائی انعامات ہیں بشرطیکہ ان کو بُرے کاموں میں استعمال نہ کریں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عمدہ پیشے خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ان سے نفع اٹھانا جائز ہے لیکن اگر ان سے کوئی گناہ یا حرام فعل یا بلا ضرورت ان میں انہماک لازم آتا ہو تو پھر وہ پیشہ اختیار کرنا ناجائز ہے جیسے کہ ابھی اس سے پہلی آیتوں میں بلا ضرورت عمارت کی بلندی کی مذمت گزری ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا

جھٹلایا لوطؑ کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی لوط نے کیا تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾

ڈرتے نہیں میں تمہارے لئے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اُسی پروردگار عالم پر

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ

کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے بنا دی ہیں

رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ

تمہارے رب نے تمہاری جوروئیں بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے بولے اگر نہ چھوڑے گا

تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ

تو اے لوط تو تُو نکال دیا جائے گا کہا میں تمہارے کام سے

مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ

البتہ بیزار ہوں اے رب خلاص کر مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں پھر بچا دیا ہم نے

وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا

اسکو اور اسکے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں پھر اٹھا مارا ہم نے

الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾

اُن دوسروں کو　اور برسایا اُن پر　ایک برساؤ　سو کیا بُرا برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ

البتہ اس بات میں نشانی ہے　اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے　ماننے والے　اور　تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

رب　وہی ہے　زبردست　رحم والا

خُلاصۂ تفسیر

قوم لُوط نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے ان کے بھائی لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمّہ ہے، کیا تمام دُنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مَردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے ربّ نے جو تمہارے لئے بیبیاں پیدا کی ہیں ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو (یعنی اور کوئی آدمی تمہارے سوا یہ حرکت نہیں کرتا اور یہ نہیں ہے کہ اس کے قبیح ہونے میں کچھ شبہ ہے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم حد (انسانیت) سے گزر جانے والے لوگ ہو، وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لُوط، اگر تم (ہمارے کہنے سُننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے، لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں اس دھمکی پر اپنے کہنے سے نہ رکونگا کیونکہ) میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں (تو کہنا کیسے چھوڑ دونگا، جب کسی طرح اُن لوگوں نے نہ مانا اور عذاب آتا ہوا معلوم ہوا تو) لُوط (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو اور میرے (خاص) متعلقین کو ان کے اس کام (کے وبال) سے (جو ان پر آنیوالا ہے) نجات دے، سو ہم نے ان کو اور اُنکے متعلقین کو سب کو نجات دی سوائے ایک بڑھیا کے (مُراد اس سے زوجہ ہے لُوط علیہ السلام کی) کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لُوطؑ اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (یعنی پتھروں کا) مینہ برسایا، سو کیا بُرا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (عذاب الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفّارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا تھا مگر ابھی نہیں دیا)۔

معارف و مسائل

غیر فطری فعل اپنی بیوی سے بھی حرام ہے وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ، لفظ مِنْ اَزْوَاجِکُم میں حرف مِن اصطلاحی الفاظ میں بیانیہ بھی ہو سکتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ تمھاری خواہش نفسانی کے لئے جو اللہ نے بیویاں پیدا فرمائی ہیں تم ان کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس مردوں کو اپنی شہوت نفس کا نشانہ بناتے ہو جو خباثت نفس کی دلیل ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرف مِن کو تبعیض کے لئے قرار دیں تو اشارہ اس طرف ہوگا کہ تمھاری بیبیوں کا جو مقام تمھارے لئے بنایا گیا اور جو امر فطری ہے اس کو چھوڑ کر بیویوں سے خلاف فطرت عمل کرتے ہو جو کہ قطعاً حرام ہے۔ غرض اس دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ اپنی زوجہ سے خلاف فطرت عمل حرام ہے، حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے نعوذ باللہ منہ (کذا فی الروح)

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ، عجوز سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو کہ قوم لوط کے اس فعل سے راضی تھی اور کافرہ تھی۔ لوط علیہ السلام کی یہ کافر بیوی اگر واقع میں بڑھیا تھی تو اسکے لئے لفظ عجوز استعمال کرنا ظاہر ہی ہے اور اگر یہ عمر کے لحاظ سے بڑھیا نہ تھی تو اس کو عجوز کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا کہ پیغمبر کی بیوی امت کے لئے ماں کی جگہ ہوتی ہے بصورت کثیر الاولاد ہو اس کو بڑھیا کہہ دینا کچھ مستبعد نہیں۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ، اس آیت سے ثابت ہوا کہ لوطی پر دیوار گرانے یا بلند مقام سے نیچے پھینکنے کی تعزیر جائز ہے جیسے حنفیہ کا مسلک ہے کیونکہ قوم لوط اسی طرح ہلاک کی گئی تھی کہ ان کی بستیوں کو اوپر اٹھا کر الٹا زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ (شامی کتاب الحدود)

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾

جھٹلایا بن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو شعیب نے کیا تم ڈرتے نہیں

اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ

میں تم کو پیغام پہنچانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ

تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر پورا بھر کر دو ماپ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾

اور مت ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿١٨٣﴾

اور مت گھٹا دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں خرابی ڈالتے ہوئے

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٨٤﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ

اور ڈرو اُس سے جس نے بنایا تم کو اور اگلی خلقت کو بولے تجھ پر تو کسی نے

الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٨٥﴾ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿١٨٦﴾

جادو کر دیا ہے اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم اور ہمارے خیال میں تو تُو جھوٹا ہے

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ

سو گرا دے ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان کا اگر تو سچا ہے کہا

رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ

میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو پھر اُس کو جھٹلایا پھر پکڑ لیا اُن کو آفت نے سائبان والے دن کی

إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٨٩﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ

بیشک وہ تھا عذاب بڑے دن کا البتہ اس بات میں نشانی ہے اور اُن میں بہت

أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٠﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٩١﴾

لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

اصحابُ الایکہ نے (بھی جن کا ذکر سورۂ حجر کے اخیر میں گزر چکا ہے) پیغمبروں کو جھٹلایا، جبکہ اُن سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحب حق کا) نقصان مت کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) سیدھی ترازو سے تولا کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو نہ باٹوں میں فرق کیا کرو) اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور سرزمین میں فساد مت مچایا کرو اور اس (خدائے قادر) سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام اگلی مخلوقات کو پیدا کیا وہ لوگ کہنے لگے کہ بس تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل مختل ہوگئی اور نبوت کا دعویٰ کرنے لگے) اور تم تو محض ہماری طرح (کے) ایک (معمولی) آدمی ہو اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں، سو اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو (تاکہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ واقعی تم نبی تھے تمہاری تکذیب سے ہم کو یہ سزا ہوئی) شعیب (علیہ السلام) بولے کہ (میں عذاب کا لانے والا یا اسکی کیفیت کی تعیین کرنے والا کون ہوں، تمہارے اعمال کو میرا رب (ہی)

خوب جانتا ہے (اور اس عمل کا جو مقتضاء ہے کہ کیا عذاب ہو اور کب ہو اس کو بھی وہی جانتا ہے اسکو اختیار ہے) سو وہ لوگ (برابر) ان کو جھٹلاتے رہے پھر ان کو سائبان کے واقعہ عذاب نے آپکڑا بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا اور) اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفارِ مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب نازل کر سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ، قسطاس کو بعض حضرات نے رومی لفظ قرار دیا جس کے معنے عدل وانصاف کے ہیں، بعض نے عربی لفظ قسط سے ماخوذ قرار دیا ہے، قسط کے معنے بھی انصاف کے ہیں مراد یہ ہے کہ ترازو اور اسی طرح دوسرے ناپنے تولنے کے وسائل کو مستقیم اور سیدھے طور پر استعمال کرو جس میں کمی کا خطرہ نہ رہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ یعنی نہ کمی کرو لوگوں کی اپنی چیزوں میں۔ مراد یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق جتنا کسی کا حق ہے اُس سے کمی کرنا حرام ہے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا کوئی دوسری۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ملازم مزدور اگر اپنے مقررہ وقت میں چوری کرتا ہے وقت کم لگاتا ہے وہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز عصر میں شریک نہیں ہوا، وجہ پوچھی تو اس نے کچھ عذر کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا طففت یعنی تو نے تولنے میں کمی کر دی۔ چونکہ نماز کوئی تولنے کی چیز نہیں اسلئے یہ حدیث نقل فرما کر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وفاء و تطفیف یعنی حق سے زیادہ کرنا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یعنی صرف ناپ تول ہی کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ کسی کے حق میں کمی کرنا خواہ کسی صورت سے ہو وہ تطفیف میں داخل ہے جس کا حرام ہونا وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ سے بیان فرمایا گیا ہے۔

خدا کا مجرم اپنے پاؤں چلکر آتا ہے اُسے وارنٹ کی ضرورت نہیں

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ، عذاب یوم الظلہ، جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اسکا واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کی قوم پر سخت گرمی مسلط فرمائی کہ نہ مکان کے اندر چین آتا نہ باہر، پھر انکے قریبی جنگل میں ایک گہرا بادل بھیجدیا جسکے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی، ساری قوم گرمی سے پریشان تھی سب دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئے جب ساری قوم بادل کے نیچے آگئی تو اس بادل نے ان پر پانی کے بجائے آگ برسادی جس سے سب بھسم ہو کر رہ گئے۔ (کذا روی عن ابن عباس۔ روح)

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى

اور یہ قرآن ہے اُتارا ہوا پروردگار عالم کا لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر تیرے

قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ

دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں اور

اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا

یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں کیا ان کے واسطے نشانی نہیں یہ بات کہ اس کی خبر رکھتے ہیں

بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ

پڑھے لوگ بنی اسرائیل کے اور اگر اتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر اور وہ اسکو

عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ

پڑھ کر سناتا تو بھی اس پر یقین نہ لاتے اسی طرح گھسا دیا ہم نے اس انکار کو گنہگاروں

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾

کے دل میں وہ نہ مانیں گے اسکو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ

پھر آئے اُن پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو پھر کہنے لگیں کچھ بھی ہم کو

مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ

فرصت ملے گی کیا ہمارے عذاب کو جلد مانگتے ہیں بھلا دیکھ تو اگر فائدہ پہنچاتے رہیں ہم

سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ

اُن کو برسوں پھر پہنچے اُن پر جس چیز کا اُن سے وعدہ تھا تو کیا کام آئے گا اُن کے

مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

جو کچھ فائدہ اٹھاتے رہے اور کوئی بستی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر سنا دینے والے

ذِكْرٰى ۚ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا

یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ظلم کرنا اور اس قرآن کو نہیں لے کر اترے شیطان اور نہ

يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا

ان سے بن آئے اور نہ وہ کر سکیں اُن کو تو سُننے کی جگہ سے دُور کر دیا ہے سو

تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ

تو مت پکار اللہ کے ساتھ دوسرا معبود پھر تو پڑے عذاب میں اور ڈر سنا دے

عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ

اپنے قریب کے رشتہ داروں کو اور اپنے بازو نیچے رکھ اُن کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾

ایمان والے پھر اگر تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں بیزار ہوں تمہارے کام سے

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ وَ

اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر جو دیکھتا ہے تجھ کو جب اٹھتا ہے اور

تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٢٠﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى

تیرا پھرنا نمازیوں میں بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا میں بتلاؤں تم کو کس پر

مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ

اُترتے ہیں شیطان اُترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات

وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ أَلَمْ تَرَ

اور بہت ان میں جھوٹے ہیں اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں تو نے نہیں دیکھا

أَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾

کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ

مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور کام کئے اچھے اور یاد کی اللہ کی بہت اور بدلہ لیا اُس کے

بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۚ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿٢٢٧﴾

پیچھے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اب معلوم کر لیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ اُلٹتے ہیں

ع ۱۶ / ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہو جاویں (یعنی جس طرح اور پیغمبروں نے اپنی اُمت کو احکام الٰہیہ پہنچائے آپ بھی پہنچائیں) اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی اُمتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے (کہ ایک ایسی شان کا پیغمبر ہوگا اور اُس پر ایسا کلام نازل ہوگا چنانچہ تفسیر حقانی کے اس مقام کے حواشی میں چند بشارتیں کتب سابقہ تورات و انجیل کی نقل کی ہیں۔ آگے اس مضمون وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ کی توضیح ہے یعنی) کیا ان لوگوں کے لئے (اس پر) یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس (پیشین گوئی) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں (چنانچہ ان میں جو لوگ اسلام لے آئے ہیں وہ تو علی الاعلان اسکا اعتراف کرتے ہیں اور جو اسلام نہیں لائے وہ بھی خاص خاص لوگوں کے سامنے اسکا اقرار کرتے تھے جیسے کہ پارہ اول کے ربع پر آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کی تفسیر میں اسکا بیان آچکا ہے اور ان

اقرار کرنے والوں کی تعداد اور کثرت اس وقت اگر خبر واحد تک بھی مان لیجائے تاہم قرائن کی وجہ سے معنوی تواتر حاصل تھا، اور یہ دلیل قائم کرنا ان پڑھ عربیوں کے لئے ہے ورنہ لکھے پڑھے لوگ خود اصل کتاب سے دیکھ سکتے تھے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کتب سابقہ میں تحریف نہیں ہوئی، کیونکہ باوجود تحریف کے ایسے مضامین کا باقی رہ جانا اور زیادہ حجت ہے اور یہ احتمال کہ یہ مضامین ہی تحریف کا نتیجہ ہوں اسلئے غلط ہے کہ اپنے نقصان کے لئے کوئی تحریف نہیں کیا کرتا۔ یہ مضامین تو تحریف کرنے والوں کے لئے نقصان دہ ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہاں تک تو دعویٰ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائی ہیں یعنی پہلی کتابوں میں ذکر اور بنی اسرائیل کا جاننا۔ ان میں بھی ثانی نقل کی دلیل ہے اور آگے انکار کرنے والوں کے عناد کے بیان کے ضمن میں، اسی دعوے کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے یعنی اعجاز قرآن، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے معاند ہیں کہ) اگر (بالفرض) ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کر دیتے پھر وہ (عجمی) ان کے سامنے اس کو پڑھ بھی دیتا (اسکا معجزہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جس پر نازل ہوا اس کو عربی زبان پر بالکل قدرت نہ ہوتی، لیکن) یہ لوگ (بوجہ انتہائی ضد کے) تب بھی اس کو نہ مانتے (آگے حضور کی تسلی کے واسطے ان کے ایمان لانے سے ناامیدی دلاتے ہیں یعنی) ہم نے اسی طرح (شدت و اصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو ان نافرمانوں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے (یعنی کفر میں، اور اس پر مصر ہیں اور اس شدت و اصرار کی وجہ سے) یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے جو اچانک ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہوگی پھر (اسوقت جان کو بنے گی تو) کہیں گے کہ کیا (کسی طور پر) ہم کو (کچھ) مہلت مل سکتی ہے (لیکن وہ وقت نہ مہلت کا ہے نہ قبول ایمان کا اور وہ کفار ایسے مضامین وعید و عذاب کے سنکر براہ انکار عذاب کا تقاضا کیا کرتے تھے مثلاً کہتے تھے رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا اور وَاِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً، یعنی اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا اور مہلت کو، جو درحقیقت ڈھیل ہی عذاب نہ واقع ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے، آگے اسکا جواب ہے کہ) کیا (ہماری وعیدوں کو سنکر) یہ لوگ ہمارے عذاب کی تعجیل چاہتے ہیں (جسکا منشاء انکار ہے یعنی باوجود قیام دلیل یعنی ایک سچے بزرگ کی خبر کے پھر بھی انکار کرتے ہیں؟ رہا مہلت کو بناء انکار قرار دینا سو یہ سخت غلطی ہے کیونکہ) اے مخاطب ذرا بتلاؤ تو اگر ہم ان کو (چند سال تک) عیش میں رہنے دیں پھر جس (عذاب) کا ان سے وعدہ ہے وہ ان کے سر آ پڑے تو ان کا وہ عیش کس کام آ سکتا ہے (یعنی یہ عیش کی جو مہلت دی گئی اس سے انکے عذاب میں کوئی خفت یا کمی نہیں ہو سکتی) اور (مہلت دینا حکمت کی وجہ سے چندروز تک خواہ کم یا زیادہ کچھ ان ہی کیساتھ خاص نہیں بلکہ امم سابقہ کو بھی مہلتیں ملی ہیں چنانچہ) جتنی بستیاں

(منکرین کی) ہم نے (عذاب سے) غارت کی ہیں سب میں نصیحت کے واسطے ڈرانے والے (پیغمبر) آئے (جب نہ مانے تو عذاب نازل ہوا) اور ہم (صورۃً بھی) ظالم نہیں ہیں (مطلب یہ کہ مہلت دینے سے جو مقصود ہے یعنی حجت پورا کرنا اور عذر کو ختم کرنا وہ سب کے لئے رہا۔ پیغمبروں کا آنا سمجھانا خود یہ بھی ایک مہلت ہی دینا ہے مگر پھر بھی ہلاکت کا عذاب آکر رہا۔ ان واقعات سے مہلت دینے کی حکمت بھی معلوم ہوگئی اور مہلت دینے اور عذاب میں تضاد نہ ہونا بھی ثابت ہوگیا اور صورۃً اس لئے کہا گیا کہ حقیقۃً تو کسی حالت میں بھی ظلم نہ ہوتا۔ آگے پھر مقصود اوّل یعنی مضمون وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ الخ کی طرف رجوع ہے۔ اور درمیان میں یہ مضامین منکرین کی حالت کے مناسب ہونے کیوجہ سے مذکور ہوئے تھے اور حاصل مضمون آئندہ آیات کا ان شبہات کا دفع کرنا ہے جو قرآن کی حقانیت کے متعلق تھے پس ایک شبہ تو قرآن کے اللہ کا کلام اور کی طرف سے بھیجا ہوا ماننے پر اسلئے تھا کہ عرب میں پہلے سے کاہن ہوتے آئے تھے وہ بھی کچھ مختلف قسم کے جملے بولا کرتے تھے نعوذ باللہ آپ کی نسبت بھی بعض کفار یہی کہتے تھے (کما فی الدر عن ابن زید) اور بخاری میں ایک عورت کا قول نقل کیا ہے جس زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے میں کچھ دیر ہوئی تو اس عورت نے کہا کہ آپ کو آپکے شیطان نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ کاہنوں کو شیطان ہی کی تعلیم و تلقین سے کچھ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اسکا جواب ہے کہ یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے) اور اسکو شیاطین (جو کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے) لے کر نہیں آئے (کیونکہ اسکے دو مانع توی موجود ہیں ایک اسکی سنت شیطنت جس کے سبب) یہ (قرآن) ان (کی حالت) کے مناسب ہی نہیں (کیونکہ قرآن سب کا سب ہدایت اور شیطان سب کا سب گمراہی ہے نہ ان کو ایسے مضامین کی آمد ہو سکتی ہے اور نہ ایسے مضامین شائع کرنے سے ان کی غرض یعنی مخلوق کو گمراہ کرنا پورا ہو سکتا ہے ایک مانع تو یہ ہوا) اور (دوسرا مانع یہ کہ وہ) اس پر قادر بھی نہیں کیونکہ وہ شیاطین (وحی آسمانی) سننے سے روک دیئے گئے ہیں (چنانچہ کاہنوں اور مشرکوں سے انکے جنات نے اپنی ناکامی کا خود اعتراف کیا جس کی اُنھوں نے اوروں کو بھی خبر دی۔ چنانچہ بخاری میں ایسے قصے باب اسلام عمرؓ میں مذکور ہیں پس شیطانوں کی تلقین کا کسی طرح احتمال نہ رہا۔ اور اس جواب کا پورا ہونا اور ایک دوسرے شبہ کا جواب ختم سورت کے قریب آویگا۔ درمیان میں تنزیل من اللہ ہونے پر بطور تفریع کے ایک مضمون ہے یعنی جب اسکا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو اس کی تعلیم واجب العمل ہوئی اور منجملہ اُس کے اہم امر اور اعظم توحید ہے) سو (اے پیغمبر ہم اسکے وجوب کی ایک خاص طریق سے تاکید کرتے ہیں کہ ہم آپ کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ) تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے (حالانکہ آپ میں نعوذ باللہ نہ احتمال شرک کا ہے نہ تعذیب کا مگر لوگوں کو یہ بات جتلانا مقصود ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت پر آپ کے لئے بھی سزا کا حکم ہے تو اور بیچارے تو کس شمار میں ہیں؟ شرک سے ان کو کیسے منع نہ کیا جاوے اور شرک کر کے عذاب سے کیونکر بچیں گے) اور

(اسی مضمون سے) آپ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیے (چنانچہ آپ نے سب کو پکار کر جمع کیا اور شرک پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا حدیثوں میں ہے) اور (آگے انذار یعنی دعوتِ نبوت کو قبول کرنے والے اور رَدّ کرنے والوں کے ساتھ معاملہ کا طرز بتلاتے ہیں یعنی) ان لوگوں کے ساتھ (تو شفقتانہ) فروتنی سے پیش آئیے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں (خواہ کنبہ کے ہوں یا غیر کنبہ کے) اور اگر یہ لوگ (جن کو آپ نے ڈرایا ہے) آپ کا کہنا نہ مانیں (اور کفر پر اڑے رہیں) تو آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے افعال سے بیزار ہوں (ان دونوں امر یعنی خفض و قل الخ میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی پوری تعلیم ہے اور کبھی ان مخالفین کی طرف سے ایذا اور نقصان دینے کا خطرہ نہ لائیے) اور خدائے رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت کہ آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں اور (نیز نماز شروع کرنے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے (اور نماز کے علاوہ بھی وہ دیکھتا بھالتا ہے کیونکہ) وہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (پس جب اسکو علم بھی کامل ہے جیسے یراک اور سمیع، علیم اس پر دال ہیں اور وہ آپ پر مہربان بھی ہے، جیسا الرحیم اس پر دال ہے اور اس کو سب قدرت ہے جیسا العزیز سے مفہوم ہوتا ہے تو ضرور وہ لائق توکل ہے وہ آپ کو ضرر حقیقی سے بچا دیگا اور جو متوکل کو ضرر پہنچتا ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ضرر ہوتا ہے جس کے تحت میں ہزاروں منافع ہوتے ہیں جن کا کبھی دنیا میں کبھی آخرت میں ظہور ہوتا ہے آگے کہانت کے شبہ کے جواب کا تتمہ ہے کہ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) کیا میں تم کو بتلاؤں کس پر شیطان اُترا کرتے ہیں (سنو) ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو (پہلے سے) دروغ گفتار بڑے بدکردار ہوں اور جو (اخبارِ شیاطین کے وقت اُن شیطانوں کی طرف) کان لگا دیتے ہیں اور (لوگوں سے اُن چیزوں کے بیان کرنے کے وقت) وہ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں (چنانچہ سفلی عاملوں کو اب بھی اسی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ فائدہ لینے والے اور فائدہ دینے والے کے درمیان مناسبت ضروری ہے تو شیطان کا شاگرد بھی وہ ہوگا جو جھوٹا اور گنہگار ہوگا، نیز شیطان کی طرف قلب سے متوجہ بھی ہو کہ بغیر توجہ کے استفادہ نہیں ہوتا اور چونکہ اکثر یہ علوم شیطانی ناتمام ہوتے ہیں اس لئے ان کو رنگین اور باوقعت کرنے کیلئے کچھ حاشیہ بھی ظن و تخمین سے چڑھانا پڑتا ہے جو کہ کہانت کے لئے عادۃً ضروری ہیں اور یہ ساری باتیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں ہونیکا کوئی دُور کا بھی احتمال نہیں کیونکہ آپ کا سچا ہونا سب کو معلوم ہے۔ آپ کا پرہیزگار ہونا اور شیاطین سے بغض رکھنے والا ہونا دشمن کو بھی مسلّم تھا اور مشہور و معروف تھا تو پھر کہانت کا احتمال کہاں رہا) اور (آگے شبہ شاعریت کا جواب ہے کہ آپ شاعر بھی نہیں ہیں جیسا کفار کہتے تھے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ یعنی ان کے مضامین خیالی غیر واقعی ہیں گو منظوم نہ ہوں سو یہ احتمال اسلئے غلط ہے کہ) شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں (مراد راہ سے شعر گوئی ہے

یعنی مضامین خیالی شاعرانہ نثر میں یا نظم میں کہنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو مسلک تحقیق سے دُور ہوں آگے اس دعویٰ کی وضاحت ہے کہ) اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر، لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران (ٹکریں مارتے تلاش مضامین میں) پھرا کرتے ہیں اور (جب مضمون بن جاتا ہے تو چونکہ اکثر خلافِ واقعہ ہوتا ہے اسلئے) زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں چنانچہ شاعروں کی گپوں کا ایک نمونہ لکھا جاتا ہے ؎

اے رشکِ مسیحا تری رفتار کے قرباں ❊ ٹھوکر سے مری لاش کئی بار جلادی

اے بادِ صبا ہم تجھے کیا یاد کریں گے ❊ اُس گل کی خبر تو نے کبھی ہم کو نہ لادی

؎ صبا نے اسکے کوچہ سے اُڑا کر ❊ خدا جانے ہماری خاک کیا کی، وغیرہ وغیرہ، حتیٰ کہ کبھی کفریات بکنے لگتے ہیں۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ مضامین شعریہ کے لئے خیالی اور غیر محقق ہونا لازمی ہے اور مضامین قرآنیہ جس باب سے بھی متعلق ہیں سب کے سب تحقیقی، غیر خیالی ہیں اسلئے آپ کو شاعر کہنا سوائے جنونِ شاعرانہ کے اور کیا ہی، حتیٰ کہ اکثر چونکہ نظم میں ایسے ہی مضامین ہوا کرتے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نظم پر قدرت بھی نہیں دی اور اور پر چونکہ شعراء کی مذمت ارشاد ہوئی ہے جس کے عموم میں بظاہر سب نظم کہنے والے آگئے، گو ان کے مضامین عین حکمت اور تحقیق ہوں اسلئے آگے ان کا استثناء فرماتے ہیں کہ) ہاں مگر جو لوگ (ان شاعروں میں سے) ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے (یعنی شرع کیخلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل، یعنی اُن کے اشعار میں بیہودہ مضامین نہیں ہیں) اور اُنھوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا (یعنی تائید دین اور اشاعت علم میں ان کے اشعار ہیں کہ یہ سب ذکراللہ میں داخل ہیں) اور (اگر کسی شعر میں بظاہر کوئی نامناسب مضمون بھی ہے جیسے کسی کی ہجو اور مذمت جو بظاہر اخلاقِ حسنہ کے خلاف ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ) اُنھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اسکا) بدلہ لیا (ہے یعنی کفار یا فساق نے اول ان کو زبانی تکلیف پہنچائی۔ مثلاً ان کی ہجو کی یا دین کی توہین کی جو اپنی ہجو سے بھی بڑھ کر تکلیف کا سبب ہے، یا ان کے مال کو یا جان کو ضرر پہنچایا، یعنی یہ لوگ مستثنیٰ ہیں کیونکہ انتقامی طور پر جو شعر کہے گئے ہیں اُن میں بعض تو مُباح ہیں اور بعضے اطاعت وکارِ ثواب ہیں) اور (یہاں تک رسالت کے متعلق شبہات کے جوابات پورے ہوئے اور اس سے پہلے رسالت دلائل سے ثابت ہو چکی تھی اب آگے ان لوگوں کی وعید ہے جو اس کے باوجود منکر نبوت رہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی) عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جاوے گا جنھوں نے (حقوق اللہ، حقوق الرسول یا حقوق العباد میں) ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی (بُری اور مصیبت کی) جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے (مُراد اس سے جہنم ہے)۔

معارف و مسائل

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝
وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝

قرآن اُسکے الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے

آیاتِ مذکورہ میں بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صرف وہ ہے جو عربی زبان میں ہو کسی مضمون قرآن کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں ہو وہ قرآن نہیں کہلائے گا، اور اِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ کے الفاظ سے بظاہر اسکے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بھی ہوں وہ بھی قرآن ہیں، کیونکہ اِنَّهُ کی ضمیر ظاہر یہ ہے کہ قرآن کیطرف راجع ہے اور زُبُر، زبور کی جمع ہے جس کے معنے ہیں کتاب۔ معنے آیت کے یہ ہوئے کہ قرآن کریم سابقہ کتابوں میں بھی ہے اور یہ ظاہر ہے پچھلی کتابیں تورات انجیل زبور وغیرہ عربی زبان میں نہیں تھیں تو صرف معانی قرآن کے اُنمیں مذکور ہونے کو اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور حقیقت جس پر جمہور اُمت کا عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صرف مضامینِ قرآن کو بھی بعض اوقات توسعاً قرآن کہدیا جاتا ہے کیونکہ اصل مقصود کسی کتاب کا اسکے مضامین ہی ہوتے ہیں۔ کتبِ اولین میں قرآن کا مذکور ہونا بھی اسی حیثیت سے ہے کہ بعض مضامینِ قرآنیہ اُن میں بھی مذکور ہیں، اسکی تائید بہت سی روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

مستدرکِ حاکم میں حضرت معقل بن یسار رضؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ بقرہ ذکرِ اول سے دی گئی ہے اور سورۂ طٰہٰ اور طواسین یعنی جتنی سورتیں طٰسٓ سے شروع ہوتی ہیں اور حوامیم یعنی جو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہیں یہ سب سورتیں الواحِ موسیٰ میں سے دی گئی ہیں اور سورۂ فاتحہ مجھے تحت عرش سے دی گئی ہے۔ اور طبرانی، حاکم، بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ ملک تورات میں موجود ہے۔ حدیث۔ اور سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى میں تو خود قرآن کی تصریح یہ ہے اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ، یعنی یہ مضامین سورت حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی ہیں، لیکن تمام آیات و روایات کا حاصل یہی ہو کہ بہت سے مضامینِ قرآن کتبِ سابقہ میں بھی موجود تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان مضامین کی وجہ سے کتبِ سابقہ کے اُن حصوں کو جن میں یہ مضامینِ قرآن آئے ہیں قرآن کا نام دیدیا جائے۔ نہ اُمت میں کوئی اسکا قائل ہے کہ اُن صحیفوں اور کتابوں کو جن میں مضامین قرآن مذکور ہیں قرآن کہا جائے۔ بلکہ عقیدہ جمہور اُمت کا یہی ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے نہ صرف معانی قرآن کا۔ اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چُن کر ایک عبارت بنا دے مثلاً کوئی یہ عبارت بنالے الحمد للہ العزیز الرحیم۔ الذی لہ ملک السمٰوٰت وھو رب العلمین خالق کل شئ وھو المستعان

یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح صرف معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بیان کئے جائیں وہ بھی قرآن نہیں۔

نماز میں ترجمہ قرآن پڑھنا باجماع اُمت ناجائز ہے

اسی وجہ سے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں فرض تلاوت کی جگہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کسی زبان فارسی، اُردو، انگریزی میں پڑھ لینا بدون اضطرار کے کافی نہیں۔ بعض ائمہ سے جو اسمیں توسع کا قول منقول ہے اُن سے بھی اپنے اس قول سے رجوع ثابت ہے۔

قرآن کے اُردو ترجمہ کو اُردو قرآن کہنا جائز نہیں

اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے تو اسکو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں۔ جیسے آجکل بہت سے لوگ صرف اُردو ترجمہ قرآن کو اُردو کا قرآن اور انگریزی کو انگریزی کا قرآن کہدیتے ہیں یہ ناجائز اور بے ادبی ہے۔ قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اسکی خرید و فروخت سب ناجائز ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ "تحذیر الاخوان عن تغییر رسم القرآن" میں مذکور ہے۔

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ، اس آیت میں اشارہ ہے کہ دنیا میں کسی کو عمر دراز ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے لیکن جو لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں ایمان نہ لائیں اُن کو عمر دراز کی فرصت و مہلت کچھ کام نہ آئے گی۔ امام زہری رح نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رح روز صبح کو اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے نفس کو خطاب کرکے یہ آیت پڑھا کرتے تھے اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ الآیۃ اسکے بعد ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور یہ اشعار پڑھتے تھے، نھارک یا مغرور سھو وغفلۃ، ولیلک نوم والردیٰ لک لازم۔ فلا انت فی الایقاظ یقظان حازم، ولا انت فی النوام ناج وسالم۔ وتسعیٰ الیٰ ما سوف تکرہ غبہٗ، کذلک فی الدنیا تعیش البھائم (ترجمہ) اے فریب خوردہ تیرا سارا دن غفلت میں اور رات نیند میں صرف ہوتی ہے حالانکہ موت تیرے لئے لازمی ہے۔ نہ تو بیدار لوگوں میں ہوشیار بیدار ہے اور نہ سونے والوں میں اپنی نجات پر مطمئن ہے۔ تیری کوشش ایسے کاموں میں ہے جسکا انجام عنقریب ناگوار صورت میں سامنے آئیگا، دنیا میں چوپائے جانور ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ، عشیرہ کے معنے کنبہ اور خاندان اقربین کی قید سے انمیں سے بھی قریبی رشتہ دار مراد ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ رسالت اور انذار پوری اُمت کے لئے فرض ہے اس جگہ خاندان کے لوگوں کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟ غور کیا جائے تو اسمیں تبلیغ دعوت کے آسان اور مؤثر بنانے کا ایک خاص طریقہ بتلایا گیا ہے جس کے آثار دور رس ہیں۔ وہ یہ کہ اپنے کنبہ اور خاندان کے لوگ اپنے سے قریب ہونے کی بنا پر اسکے حقدار بھی ہیں

کہ ہر خیر اور اچھے کام میں اُن کو دوسروں سے مقدم کیا جائے اور باہمی تعلقات اور ذاتی واقفیت کی بناء پر ان میں کوئی جھوٹا دعویدار نہیں کھپ سکتا اور جس کی سچائی اور اخلاقی برتری خاندان کے لوگوں میں معروف ہے اسکی سچی دعوت قبول کرلینا انکے لئے آسان بھی ہے۔ اور قریبی رشتہ دار جب کسی اچھی تحریک کے حامی بن گئے تو ان کی اخوت و امداد بھی پختہ بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ خاندان جمعیت کے اعتبار سے بھی انکی تائید و اخوت پر مجبور ہوتے ہیں اور جب قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کا ایک ماحول حق و صداقت کی بنیادوں پر تیار ہوگیا تو روزمرہ کی زندگی میں ہر ایک کو دین کے احکام پر عمل کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے اور پھر ایک مختصر سی طاقت تیار ہو کر دوسروں تک دعوت و تبلیغ کے پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ اس میں اہل و عیال کے جہنم سے بچانے کی ذمہ داری خاندان کے ہر ہر فرد پر ڈالدی گئی ہے جو اصلاحِ اعمال و اخلاق کا آسان اور سیدھا راستہ ہے اور غور کیا جائے تو کسی انسان کا خود اعمال و اخلاقِ صالحہ کا پابند ہونا اور پھر اس پر قائم رہنا اسوقت تک عادۃً ممکن نہیں ہوتا جبتک اسکا ماحول اسکے لئے سازگار نہ ہو، سارے گھر میں اگر ایک آدمی نماز کی پوری پابندی کرنا چاہے تو اس پکے نمازی کو بھی اپنے حق کی ادائگی میں مشکلات حائل ہونگی آجکل جو حرام چیزوں سے بچنا دشوار ہوگیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فی الواقع اسکا چھوڑنا کوئی بڑا مشکل کام ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ سارا ماحول ساری برادری جب ایک گناہ میں مبتلا ہے تو اکیلے ایک آدمی کو بچنا دشوار ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپنے تمام خاندان کے لوگوں کو جمع فرماکر پیغامِ حق سُنایا اسوقت اگرچہ لوگوں نے قبولِ حق سے انکار کیا مگر رفتہ رفتہ خاندان کے لوگوں میں اسلام و ایمان داخل ہونا شروع ہوگیا اور آپکے چچا حضرت حمزہؓ کے اسلام لانیسے اسلام کو ایک بڑی قوت حاصل ہوگئی۔

شعر کی تعریف | وَالشُّعَرَاۗءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ، اصل لغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی مضامین بیان کئے گئے ہوں جس میں کوئی بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کچھ شرط نہیں، فنِ منطق میں بھی ایسے ہی مضامین کو ادلہ شعریہ اور قضایا شعریہ کہا جاتا ہے اصطلاحی شعر و غزل میں بھی چونکہ عموماً خیالات کا ہی غلبہ ہوتا ہے اسلئے اصطلاحِ شعراء میں کلام موزوں مقفّٰی کو شعر کہنے لگے۔ بعض مفسرین نے آیاتِ قرآن بَلْ هُوَ شَاعِرٌ، شَاعِرٌ مَّجْنُوْنٌ، شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ وغیرہ میں شعر اصطلاحی کے معنی میں مراد لے کر کہا کہ کفار مکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وزن دار، قافیہ دار کلام لانے والے کہتے تھے لیکن بعض نے کہا کہ کفار کا مقصد یہ نہ تھا، اسلئے کہ وہ شعر کے طرز و طریق سے واقف تھے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اشعار کا مجموعہ نہیں اسکا قائل تو ایک عجمی بھی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ فصیح و بلیغ عرب، بلکہ کفار آپ کو شاعر شعر کے اصلی معنے یعنی خیالی مضامین کے لحاظ سے کہتے تھے مقصد ان کا در اصل آپکو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا تھا کیونکہ شعر بمعنی کذب بھی استعمال ہوتا ہے اور شاعر کاذب کو کہا جاتا ہے اسلئے ادلہ کاذبہ

کو ادلہ شعریہ کہا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ جیسے موزوں اور مقفیٰ کلام کو شعر کہتے ہیں اسی طرح ظنی اور تخمینی کلام کو بھی شعر کہتے ہیں جو اہل منطق کی اصطلاح ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اس آیت میں شعر کے اصطلاحی اور معروف معنے ہی مراد ہیں۔ یعنی موزوں و مقفیٰ کلام کہنے والے اس کی تائید فتح الباری کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ جو شعراء صحابہ میں مشہور ہیں روتے ہوئے سرکار دو عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدائے ذوالجلال نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور ہم بھی شعر کہتے ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آیت کے آخری حصّہ کو پڑھو مقصد یہ تھا کہ تمہارے اشعار بیہودہ اور غلط مقصد کے لئے نہیں ہوتے اسلئے تم اس استثناء میں داخل ہو جو آخر آیت میں مذکور ہے اسلئے مفسرینؒ نے فرمایا کہ ابتدائی آیت میں مشرکین شعراء مراد ہیں کیونکہ گمراہ لوگ سرکش شیطان اور نافرمان جن ان ہی کے اشعار کی اتباع کرتے تھے اور روایت کرتے تھے (کذا فی فتح الباری)

شریعتِ اسلام میں شعر و شاعری کا درجہ آیاتِ مذکورہ کے شروع سے شعر و شاعری کی سخت مذمت اور اسکا عنداللہ مبغوض ہونا معلوم ہوتا ہے مگر آخر سورت میں جو استثناء مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ شعر مطلقاً بُرا نہیں بلکہ جب جس شعر میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی یا اللہ کے ذکر سے روکنا یا جھوٹ ناحق کسی انسان کی مذمت اور توہین ہو یا فحش کلام اور فواحش کے لئے محرک ہو وہ مذموم و مکروہ ہے۔ اور جو اشعار ان معاصی اور مکروہات سے پاک ہوں ان کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ کے ذریعہ مستثنیٰ فرما دیا ہے اور بعض اشعار تو حکیمانہ مضامین اور وعظ و نصیحت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے طاعت و ثواب میں داخل ہیں جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَةً، یعنی بعض شعر حکمت ہوتے ہیں (رواہ البخاری) حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد سچی بات ہے جو حق کے مطابق ہو۔ ابن بطال نے فرمایا جس شعر میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت، اسکا ذکر، اسلام سے اُلفت کا بیان ہو وہ شعر مرغوب و محمود ہے اور حدیث مذکور میں ایسا ہی شعر مراد ہے اور جس شعر میں جھوٹ اور فحش بیان ہو وہ مذموم ہے اس کی مزید تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے (۱) عمر بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے اُمیہ بن ابی الصلت کے سو قافیہ تک اشعار سُنے۔ (۲) مطرف فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ سے بصرہ تک حضرت عمران بن حصینؓ کے ساتھ سفر کیا اور ہر منزل پر وہ شعر سُناتے تھے۔ (۳) طبری نے کبار صحابہ اور کبار تابعین کے متعلق کہا کہ وہ شعر کہتے تھے سنتے تھے اور سُناتے تھے۔ (۴) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ شعر کہا کرتی تھیں۔ (۵) ابو یعلی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ شعر ایک کلام ہے اگر اسکا مضمون اچھا اور مفید ہے تو شعر اچھا ہے اور مضمون بُرا یا گناہ کا ہے تو شعر بُرا ہے (فتح الباری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ مدینہ منورہ کے فقہاء عشرہ جو اپنے علم و فضل میں معروف ہیں اُن میں سے عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود رہ مشہور قادر کلام شاعر تھے اور قاضی زبیر بن بکار کے اشعار ایک مستقل کتاب میں جمع تھے۔ پھر قرطبی نے لکھا کہ ابو عمرو نے فرمایا ہے کہ اچھے مضامین پر مشتمل اشعار کو اہل علم اور اہل عقل میں سے کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اکابر صحابہ جو دین کے مقتدا ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے خود شعر نہ کہے ہوں یا دوسروں کے اشعار نہ پڑھے یا سُنے ہوں اور پسند کیا ہو۔

جن روایات میں شعر شاعری کی مذمت مذکور ہے ان سے مقصود یہ ہے کہ شعر میں اتنا مصروف اور منہمک ہو جائے کہ ذکر اللہ عبادت اور قرآن سے غافل ہو جائے۔ امام بخاری نے اسکو ایک مستقل باب میں بیان فرمایا ہے اور اس باب میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ (لَأَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيهِ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا) یعنی کوئی آدمی پیپ سے اپنا پیٹ بھرے یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے پیٹ بھرے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسکے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ اور قرآن اور علم کے اشتغال پر غالب آجائے۔ اور اگر شعر مغلوب ہے تو پھر بُرا نہیں ہے اسی طرح وہ اشعار جو فحش مضامین یا لوگوں پر طعن و تشنیع یا دوسرے خلاف شرع مضامین پر مشتمل ہوں وہ باجماع اُمت حرام ناجائز ہیں اور یہ کچھ شعر کیساتھ مخصوص نہیں جو نثر کلام ایسا ہو اسکا بھی یہی حکم ہے۔ (قرطبی)

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گورنر عدی بن نضلہ کو اُن کے عہدہ سے اسلئے برخاست کر دیا کہ وہ فحش اشعار کہتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمرو بن ربیعہ اور ابو الاحوص کو اسی جرم میں جلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ عمرو بن ربیعہ نے توبہ کر لی وہ قبول کی گئی۔ (قرطبی)

خدا و آخرت سے غافل کردینے والا ہر علم اور فن مذموم ہے

ابن ابی جمرہ نے فرمایا کہ بہت قافیہ بازی اور ہر ایسا علم و فن جو دلوں کو سخت کر دے اور خدا تعالیٰ کے ذکر سے انحراف و اعراض کا سبب بنے اور اعتقادات میں شکوک و شبہات اور روحانی بیماریاں پیدا کرے اسکا بھی وہی حکم ہے جو مذموم اشعار کا حکم ہے۔

اکثر اتباع کرنے والوں کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت ہوتی ہے

الشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ، اس آیت میں شعراء پر یہ عیب لگایا گیا ہے کہ اُنکے متبعین گمراہ ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ تو ہوئے متبعین اُن کے فعل کا الزام متبوعین یعنی شعراء پر کیسے عائد ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ عموماً اتباع کرنے والوں کی گمراہی علامت اور نشانی ہوتی ہے متبوع کی گمراہی کی لیکن سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حکم اسوقت ہے جب تابع کی گمراہی میں اس متبوع کے اتباع کا دخل ہو مثلاً متبوع کو جھوٹ اور غیبت سے بچنے بچانے کا اہتمام نہیں ہے اس کی مجلس میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ روک ٹوک نہیں کرتا اس سے تابع کو بھی جھوٹ اور غیبت کی عادت پڑ گئی تو یہ تابع کا گناہ خود متبوع کے گناہ کی علامت قرار دیا جائیگا لیکن اگر گمراہی متبوع کی ایک وجہ

سے اور اتباع کسی دوسری وجہ سے ہو تو یہ تابع کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص عقائد و مسائل میں کسی عالم کا اتباع کرتا ہے اور اُن میں کوئی گمراہی نہیں، اعمال و اخلاق میں اس عالم کا اتباع نہیں کرتا اُنھیں میں یہ گمراہ ہے تو اس کی عملی اور اخلاقی گمراہی اس عالم کی گمراہی پر دلیل نہیں ہوگی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ؂

تمت سورۃ الشعراء بعون اللہ وفضلہ لنصف الربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

یوم الخمیس و یتلوھا ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ النمل

سُوْرَةُ النَّمْلِ

سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

(سورۂ نمل مکہ میں اُتری اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ① هُدًى وَّبُشْرٰى

یہ آیتیں ہیں قرآن اور کھلی کتاب کی راہ بتانے والی اور خوشخبری

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

ایمان والوں کے واسطے جو قائم رکھتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور ان کو

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

آخرت پر یقین ہے جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ

اچھے دکھلائے ہم نے انکی نظروں میں انکے کام سو وہ بہکے پھرتے ہیں وہی ہیں جن کے واسطے بُری

سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَاِنَّكَ

طرح کا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں خراب اور تجھ کو تو

لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥

قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

خُلاصۂ تفسیر

طٰسٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں) آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی (یعنی اس میں دو صفتیں ہیں قرآن ہونا اور کتاب مبین ہونا) یہ (آیتیں) ایمان والوں کے لئے (موجب) ہدایت اور (اس ہدایت پر جزائے نیک کا) مژدہ سُنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ (عملاً بھی ہدایت پر چلتے ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں (جو کہ عبادات بدنیہ میں سب سے بڑی ہی

الثلثة

اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ عباداتِ مالیہ میں سب سے بڑی ہے) اور (عقیدہ کے لحاظ سے بھی ہدایت یافتہ ہیں چنانچہ) وہ آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے ان کے اعمال (بد) انکی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے جہل مرکب میں حق سے دور) بھٹکتے پھرتے ہیں (چنانچہ نہ انکے عقائد درست ہیں نہ اعمال اسلئے وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے تو جیسے قرآن اہل ایمان کو بشارت سناتا تھا منکروں کو وعید بھی سناتا ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے (دنیا میں مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب (ہونیوالا) ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارہ میں ہیں (کہ کبھی نجات ہی نہ ہوگی) اور (گو یہ منکر قرآن کو نہ مانیں مگر) آپکو بالیقین ایک بڑی حکمت والے علم والے کیطرف سے قرآن دیا جا رہا ہے (آپ اس نعمت کے سرور میں ان کے انکار سے غمگین نہ ہوجئے)۔

معارف ومسائل

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے انکے اعمالِ بد انکی نظروں میں مزین کر دیئے ہیں۔ اسلئے وہ انہی کو بہتر سمجھ کر گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں اور بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اعمالھم سے مراد نیک اعمال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک اعمال کو مزین کر کے انکے سامنے رکھدیا تھا مگر ان ظالموں نے انکی طرف التفات نہ کیا بلکہ کفر و شرک میں مبتلا رہے اس لئے گمراہی میں بھٹکنے لگے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، اول تو اسلئے کہ مزین کرنے کے الفاظ عموماً اعمالِ بد کے لئے استعمال ہوئے ہیں جیسے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ، زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ الخ اور اچھے اعمال کے لئے اس لفظ کا استعمال بہت کم ہے جیسے حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ الآیۃ دوسرے آیت میں اعمالھم (ان کے اعمال) کا لفظ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مراد اعمالِ بد ہیں نہ کہ اعمالِ صالحہ۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں

آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ

سے کچھ خبر یا لاتا ہوں انگارا سلگا کر شاید تم سینکو پھر جب پہنچا اسکے پاس آواز ہوئی

أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾

کہ برکت ہے اس پر جو کوئی کہ آگ میں ہے اور جو اسکے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب سارے جہان کا

يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا

اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب

وَّ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ

دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی شکل لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا اے موسیٰ مت ڈر

اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ۖ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا

میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی

بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ

برائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا مہربان ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے

بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

سفید ہو کر کسی برائی سے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لیکر جا فرعون اور اسکی قوم کی طرف بیشک وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

لوگ نافرمان پھر جب پہنچیں انکے پاس ہماری نشانیاں سمجھانے کو بولے یہ جادو ہے صریح

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ

اور ان کا انکار کیا اور ان کا یقین کر چکے تھے اپنے جی میں بے انصافی اور غرور سے، سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

انجام خرابی کرنے والوں کا

ع ۱ ۱۳ ۱۶

خلاصۂ تفسیر

(اسوقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ (مدین سے آتے ہوئے کوہ طور کے قریب رات کو سردی کے وقت پہنچے اور مصر کی راہ بھی بھول گئے تھے تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے (طور کی طرف) آگ دیکھی ہے میں ابھی (جاکر) وہاں سے (یا تو راستہ کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس (وہاں سے) آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں تاکہ تم سینک لو سو جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو ان کو (منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں (یعنی فرشتے) ان پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس ہے (یعنی موسیٰ) اس پر بھی (برکت ہو، یہ دعا بطور تحیۃ و سلام کے ہے جیسے ملاقاتی آپس میں سلام کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام جانتے نہ تھے کہ یہ نور انوار الٰہیہ سے ہے اسلئے خود سلام نہیں کر سکے تو منجانب اللہ ان کے اُنس کے لئے سلام ارشاد ہوا اور فرشتوں کو ملا لینا شاید اس لئے ہو کہ جس طرح فرشتوں کو سلام حق تعالیٰ کے قرب خاص کی علامت ہوتی ہے یہ سلام بھی موسیٰ علیہ السلام کو قرب خاص کی بشارت ہوگیا) اور (اس امر کے بتلانے کے لئے کہ یہ نور جو بشکل نار ہے خود حق تعالیٰ کی ذات نہیں ارشاد فرمادیا کہ) اللہ رب العالمین (رنگ،

جہات، مقدار اور حد بندی وغیرہ سے) پاک ہے (اور اس نور میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، پس یہ نور ذاتِ خداوندی نہیں اور موسیٰ علیہ السلام اگر اس مسئلہ سے خالی الذہن ہوں تو اسکی تعلیم ہے اور اگر دلائلِ عقلیہ اور فطرتِ صحیحہ کی بنا پر ان کو پہلے سے معلوم ہو تو زیادہ سمجھانا ہے اسکے بعد ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ بات یہ ہے کہ میں (جو کہ بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا اور (اے موسیٰ) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈالدو (چنانچہ انھوں نے ڈالدیا تو وہ اژدہا بن کر لہرانے لگا) سو جب انھوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ ڈرو نہیں (کیونکہ ہم نے تم کو پیغمبری دی ہے) اور ہمارے حضور میں (یعنی پیغمبری کا اعزاز عطا ہونے کے وقت) پیغمبر (ایسی چیزوں سے جو کہ خود اسکی پیغمبری کی دلیل یعنی معجزات ہوں) نہیں ڈرا کرتے (یعنی تم کو بھی ڈرنا نہ چاہیئے) ہاں مگر جس سے کوئی قصور (لغزش سرزد) ہو جاوے (اور وہ اس لغزش کو یاد کر کے ڈرے تو مضائقہ نہیں لیکن اس کی نسبت بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر قصور ہو جاوے اور) پھر برائی (ہو جانے) کے بعد برائی کی جگہ نیک کام کرے (توبہ کرے) تو میں (اسکو بھی معاف کر دیتا ہوں کیونکہ میں) مغفرت والا رحمت والا ہوں (یہ اسلئے فرمایا کہ عصا کے معجزہ سے مطمئن ہو جانے کے بعد کبھی اپنا قصہ قبطی کو قتل کرنے کا یاد کر کے پریشان ہوں اس لئے اس سے بھی مطمئن فرما دیا تاکہ وحشت جاتی رہے) اور (اے موسیٰ اس معجزۂ عصا کے سوا ایک معجزہ اور بھی عطا ہوتا ہے وہ یہ کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاؤ (اور پھر نکالو تو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بغیر کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا (اور یہ دونوں معجزے اُن) نو معجزوں میں (سے ہیں جن کے ساتھ تم کو) فرعون اور اسکی قوم کی طرف (بھیجا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے حد سے نکل جانے والے لوگ ہیں غرض جب اُن لوگوں کے پاس ہمارے (دیئے ہوئے) معجزے پہنچے (جو نہایت واضح تھے (یعنی ابتدائے دعوت میں دو معجزے دکھلائے گئے پھر وقتاً فوقتاً باقی دکھلائے جاتے رہے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے اور (غضب تھا کہ ظلم) اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ (اندر سے) انکے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا سو دیکھئے کیسا (برا) انجام ہوا ان مفسدوں کا (دنیا میں غرق ہوئے اور آخرت میں جلنے کی سزا پائی)

معارف و مسائل

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ

انسان کو اپنی ضروریات کے لئے اسباب طبعیہ کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جگہ دو ضرورتیں پیش آئیں ایک راستہ پوچھنا جو آپ بھول گئے تھے، دوسرا آگ سے گرمی

حاصل کرنا کہ سردی کی رات تھی اس کے لئے آپ نے کوہِ طور کی طرف جانے کی سعی و کوشش کی لیکن اسکے ساتھ ہی اس مقصد میں کامیابی پر یقین اور دعویٰ کرنے کے بجائے ایسے الفاظ اختیار فرمائے جس میں اپنی بندگی اور حق تعالیٰ سے اُمید ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ضروریات کے حصول کے لئے جدوجہد توکل کے منافی نہیں۔ لیکن بھروسہ اپنی کوشش کے بجائے اللہ پر ہونا چاہیئے اور آگ آپ کو دکھلانے جانے میں بھی شاید یہی حکمت ہو کہ اس سے آپ کے دونوں مقصود پورے ہو سکتے تھے، راستہ کا مل جانا اور آگ سے گرمی حاصل کرنا۔ (کما فی الروح)

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اٰتِیْکُمْ اور تَصْطَلُوْنَ جمع کے صیغے بولے حالانکہ آپکے ساتھ صرف آپ کی بیوی یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں انکے لئے لفظ جمع استعمال فرمانا بطور اکرام کے ہوا جیسے معزز لوگوں میں کسی ایک فرد سے بھی خطاب ہوتا ہے تو صیغہ جمع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنی ازواج مطہرات کے لئے صیغہ جمع استعمال فرمانا روایاتِ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

تخصیص کیساتھ بیوی کا ذکر عام مجالس میں نہ کرنا بلکہ کنایہ سے کام لینا بہتر ہے۔ آیتِ مذکورہ میں قَالَ لِاَھْلِہٖٓ فرمایا گیا ہے لفظ اھل عام ہے جس میں بیوی اور گھر کے دوسرے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس مقام میں اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تنہا اہلیہ محترمہ ہی تھیں، کوئی دوسرا نہ تھا مگر تعبیر میں یہ عام لفظ استعمال کرنے سے اسطرف اشارہ پایا گیا کہ مجالس میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا ذکر کرے تو عام لفظوں سے کرنا بہتر ہے جیسے ہمارے عرف میں کہا جاتا ہے میرے گھر والوں نے یہ کہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَھَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ یٰمُوْسٰۤی اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگ دیکھنے اور آگ کے اندر سے ایک ندا سُننے کی تحقیق۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سی سورتوں میں مختلف عنوانات کے ساتھ آیا ہے سورۂ نمل کی مذکورہ آیات میں اس سلسلے کے دو جملے غور طلب ہیں۔ اول (بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ) دوسرا (اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ) اور سورۂ طٰہٰ میں جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے اس واقعہ سے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں (اٰنَسْتُ نَارًا۔ الیٰ قولہ تعالیٰ نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ) ان آیات میں بھی دو جملے خاص طور سے غور طلب ہیں (اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ) اور (اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ الخ) اور سورۂ قصص میں اس واقعہ کے یہ الفاظ ہیں (نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی

إِنِّيٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) ان تینوں مواقع میں عنوانِ تعبیر اگرچہ مختلف ہے مگر مضمون تقریباً ایک ہی ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس رات میں کسی وجہ سے آگ کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے انکو کوہِ طور کے ایک درخت پر آگ دکھلائی۔ اُس آگ یا درخت سے یہ آواز سُنی گئی إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ ، إِنَّهٗٓ أَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ، إِنَّنِيٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا ، إِنِّيٓ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ، یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ندا بار بار ہوئی ہو کبھی ایک لفظ سے کبھی دوسرے لفظ سے۔ اور آواز سُننے کی جو کیفیت تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اور روح المعانی میں آلوسی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی جس کی کوئی جہت متعین نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سُننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کان نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام اعضائے بدن اسکو سُن رہے تھے جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ایک غیبی آواز تھی جو بلا کیف و بلا سمت سنی جا رہی تھی لیکن مبدا اسکا وہ آگ یا درخت تھا جس سے آگ کی شکل اُن کو دکھائی گئی۔ ایسے ہی مواقع عام طور پر لوگوں کے لئے مغالطے اور بُت پرستی کا سبب بنجاتے ہیں اسلئے ہر عنوان میں مضمون توحید کیطرف ہدایت اور تنبیہ ساتھ ساتھ کی گئی ہے زیر بحث آیت میں لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ اسی تنبیہ کے لئے بڑھایا گیا۔ سورۂ طٰہٰ میں لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا اور سورۂ قصص میں أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اسی مضمون کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ آگ کی شکل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسلئے دکھلائی گئی تھی کہ وہ اسوقت آگ اور روشنی کے حاجتمند تھے ورنہ اس کلامِ ربانی اور ذاتِ ربانی کا آگ سے یا شجرِ طور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آگ اللہ تعالیٰ کی عام مخلوقات کی طرح ایک مخلوق تھی اسی لئے زیر بحث آیات میں جو یہ ارشاد ہے أَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی مبارک ہے وہ جو آگ کے اندر ہے اور وہ جو اسکے آس پاس ہے۔ اسکی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں جنکی تفصیل تفسیر روح المعانی میں ہے۔ ایک قول حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، عکرمہ سے منقول ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ آگ کوئی حقیقی آگ، تو تھی نہیں جب بقعہ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے تھے وہ دُور سے پورا آگ معلوم ہوتا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے اندر ہوئے اور مَنْ حَوْلَهَا سے مراد فرشتے ہیں جو آس پاس وہاں موجود تھے اور بعض حضرات نے اسکے برعکس یہ فرمایا کہ مَنْ فِي النَّارِ سے فرشتے اور مَنْ حَوْلَهَا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ تفسیر بیان القرآن کے خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آیاتِ مذکورہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اور حسن بصری کی ایک روایت اور اُس کی تحقیق

یہاں ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ اور سعید بن جُبیرؓ سے مَنْ فِي النَّارِ کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے خود ذاتِ حق سُبحانہٗ و تعالیٰ مراد ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ

آگ ایک مخلوق ہے اور کسی مخلوق میں خالق کا حلول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس روایت کا یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا کہ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے آگ کے اندر حلول فرمایا تھا جیسا کہ بہت سے بُت پرست مشرکین بتوں کے وجود میں ذاتِ حق کے حلول کے قائل ہیں اور یہ توحید کے قطعاً خلاف ہے بلکہ مراد ظہور ہے جیسا آئینہ میں جس چیز کو دیکھا جاتا ہے وہ آئینہ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہوتی اس سے الگ اور خارج ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ظہور جس کو تجلّی بھی کہا جاتا ہے خود ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلی نہیں تھی ورنہ اگر ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ موسیٰ علیہ السلام نے کر لیا ہوتا تو بعد میں انکے اس سوال کی کوئی وجہ نہیں رہتی رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (یعنی اے میرے پروردگار مجھے اپنی ذات پاک دکھا کہ میں دیکھ سکوں) اور اسکے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے لَنْ تَرٰىنِیْ کا ارشاد بھی پھر کوئی معنے نہ رکھتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ظہور مراد ہے یعنی تجلّی جو آگ کی صورت میں ہوئی یہ جس طرح حلول نہیں تھا اسی طرح تجلّی ذات بھی نہیں تھی بلکہ لَنْ تَرٰىنِیْ الآیۃ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالمِ دُنیا میں تجلّی ذاتی کا کوئی شخص مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس ظہور و تجلّی کا کیا مفہوم ہوگا اسکا جواب یہ ہے کہ یہ تجلی مثالی تھی جو حضرات صوفیہ کرام میں معروف ہے اس کی حقیقت کا سمجھنا تو انسان کے لئے مشکل ہے۔ بقدرِ ضرورت تقریب الی الفہم کے لئے احقر نے اپنی کتاب احکام القرآن زبان عربی سورۂ قصص میں اسکی کچھ تفصیل لکھی ہے اہلِ علم اسمیں دیکھ سکتے ہیں عوام کی ضرورت کی چیز نہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اس سے پہلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کا ذکر ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عصا جب سانپ بن گیا تو موسیٰؑ خود بھی اُس سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ آگے بھی موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزہ ید بیضاء کا بیان ہے درمیان میں اس استثناء کا ذکر کس لئے کیا گیا اور یہ استثناء منقطع ہے یا متصل؟ اسمیں حضرات مفسرینؒ کے اقوال مختلف ہیں بعض حضرات نے استثناء کو منقطع قرار دیا ہے تو مضمون آیت کا یہ ہوگا کہ پہلی آیت میں انبیاء علیہم السّلام پر خوف نہ ہونیکا ذکر تھا بسبیل تذکرہ اُن لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جن پر خوف طاری ہونا چاہیئے یعنی وہ لوگ جن سے کوئی خطا سرزد ہوئی پھر توبہ کر کے نیک عمل اختیار کر لئے ایسے حضرات کی اگرچہ اللہ تعالیٰ خطا معاف کر دیتے ہیں مگر معافی کے بعد بھی گناہ کے بعض آثار باقی رہنے کا احتمال ہے اس سے یہ حضرات ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اور اس استثناء کو متصل قرار دیں تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ اللہ کے رسول ڈرا نہیں کرتے بجز اُن کے جن سے کوئی خطا یعنی گناہ صغیرہ سرزد ہو گیا ہو پھر اُس سے بھی توبہ کر لی ہو، تو اس توبہ سے یہ صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے اور صحیح تر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ درحقیقت گناہ ہی نہ تھے نہ صغیرہ نہ کبیرہ، البتہ صورت گناہ کی تھی اور درحقیقت وہ اجتہادی خطائیں تھیں۔ اس مضمون میں اشارہ اس طرف پایا گیا کہ حضرت موسیٰؑ

سے جو ایک لغزش قبطی کے قتل کی ہوگئی وہ، گرچہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی مگر اسکا یہ اثر اب بھی رہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہوگیا، اگر یہ لغزش نہ ہوتی تو یہ وقتی خوف بھی نہ ہوتا۔ (قرطبی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ
اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو

فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ
بزرگی دی اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر اور قائم مقام ہوا سلیمان

دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ
داؤد کا اور بولا اے لوگو ہم کو سکھائی ہے بولی اُڑتے جانوروں کی اور دیا ہم کو ہر چیز

كُلِّ شَىْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ
میں سے بیشک یہی ہے فضیلت صریح اور جمع کئے گئے سلیمان کے پاس

جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ
اس کے لشکر جن اور انسان اور اڑتے جانور پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں یہاں تک کہ جب

اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا
پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے

مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾
گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اسکی فوجیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِىْۤ اَنْ اَشْكُرَ
پھر مسکراکر ہنس پڑا اس کی بات سے اور بولا اے میرے رب میری قسمت میں دے کہ شکر

نِعْمَتَكَ الَّتِىْۤ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا
کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا مجھ پر اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں کام نیک

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِىْ بِرَحْمَتِكَ فِىْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾
جو تو پسند کرے اور ملالے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا اور اُن دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو

اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی) اور انھوں نے (اظہار شکر کیلئے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامانِ سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے فوج، لشکر، مال، اور آلاتِ جنگ وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامانِ سلطنت بھی عجیب و غریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا جا (یا کر) تا تھا (تاکہ متفرق نہ ہو جاویں پیچھے والے بھی پہنچ جاویں یہ بات عادۃً نہایت کثرت میں ہوتی ہے کیونکہ تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں اگلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی اسلئے اسکا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایکبار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیو، اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور) اُس کی بات سے (متعجب ہو کر کہ اس چھوٹے وجود پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک نعمت عظیمہ ہے اور نعمتیں بھی یاد آگئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رب مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی اُن نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور علم سب کو اور نبوت خود کو اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اس پر بھی ہمیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول ہو کیونکہ اگر حقیقت میں عمل نیک ہو اور آداب و شرائط کی کمی کی وجہ سے مقبول نہ ہو وہ مقصود نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بُعد میں تبدیل نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا، ظاہر ہے کہ اس سے مُراد علوم انبیاء ہیں جو نبوت و رسالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسکے عموم میں دوسرے علوم و فنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز یہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت

بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمتِ علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نعمتِ علم تمام دوسری نعمتوں سے فائق اور بالاتر ہے (قرطبی)

انبیاء میں مال کی وراثت نہیں ہوتی | وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ، وَرِثَ سے وراثتِ علم اور نبوت مراد ہے وراثتِ مال نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ) یعنی انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ مورث، حضرت ابو الدرداءؓ سے ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے۔ العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا ولکن ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، لیکن انبیاء میں وراثت علم اور نبوت کی ہوتی ہے مال کی نہیں ہوتی۔ حضرت ابوعبداللہ (جعفر صادق) کی روایت اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور سرور دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ (روح عن الکلینی) عقلی طور پر بھی یہاں وراثت مال مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے وقت آپ کی اولاد میں اُنیس بیٹوں کا ذکر آتا ہے اگر وراثتِ مال مراد ہو تو یہ بیٹے سب کے سب وارث ٹھہریں گے پھر وراثت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وراثت وہ مُراد ہے جس میں بھائی شریک نہ تھے بلکہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام وارث بنے اور وہ صرف علم اور نبوت کی وراثت ہی ہو سکتی ہے اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ملک و سلطنت بھی حضرت سلیمان کو عطا فرما دیا اور اسمیں مزید اضافہ اسکا کر دیا کہ آپ کی حکومت جنات اور وحوش و طیور تک عام کر دی، ہوا کو آپکے لئے مسخر کر دیا۔ ان دلائل کے بعد طبرسی کی وہ روایت غلط ہو جائیگی جس میں انھوں نے بعض ائمہ اہل بیت کے حوالے سے مال کی وراثت مراد لی ہے۔ (روح)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا فاصلہ ہے اور یہود یہ فاصلہ ایک ہزار چار سو سال کا بتلاتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر ہوئی ہے (قرطبی)

اپنے لئے جمع کا صیغہ بولنا جائز ہے بشرطیکہ تکبر نہ ہو | عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا الخ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے باوجود خود اکیلے ہونے کے اپنے لئے جمع کا صیغہ شاہانہ محاورہ کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ رعایا پر رُعب پڑے اور رعایا اطاعتِ خداوندی اور اطاعت سلیمان علیہ السلام میں سُستی نہ کریں۔ اسی طرح امراء، حکام اور افسران کو اپنی رعایا کی موجودگی میں اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں جبکہ وہ سیاسۃ اور اظہارِ نعمت کی غرض سے ہو تکبر و تعلّی کے لئے نہ ہو۔

پرندوں اور چوپاؤں میں بھی عقل و شعور ہے | اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پرندے، چرندے اور تمام حیوانات

میں بھی عقل و شعور کسی درجہ میں موجود ہے۔ البتہ ان کی عقول اس درجہ کی نہیں کہ ان کو احکام شرع کا مکلف بنایا جاتا اور انسان اور جنات کو عقل و شعور کا وہ کامل درجہ عطا ہوا ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہو سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے ابن عطیہ نے فرمایا کہ چیونٹی ذہین عقلمند جانور ہے اس کی قوت شامہ بڑی تیز ہے جو کوئی دانہ اس کے قبضہ میں آتا ہے اسکے دو ٹکڑے کر دیتی ہے تاکہ اگنے نہیں اور سردی کے زمانے کے لئے اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ (قرطبی)

فائدہ:- آیت میں منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولی کی تخصیص ہُدہُد کے واقعہ کی وجہ سے ہے جو پرندہ ہے ورنہ حضرت سلیمانؑ کو پرندے، چرندے اور تمام حشرات الارض کی بولیاں سکھائی گئی تھیں جیسا کہ اگلی آیت میں چیونٹی کی بولی سمجھنے کا ذکر موجود ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس مقام پر مختلف پرندوں کی بولیاں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس پر یہ فرمانا کہ یہ پرندہ یہ بات کہہ رہا ہے تفصیل سے نقل کیا ہے اور تقریباً **ہر پرندہ کی بولی کوئی نصیحت کا جملہ ہے۔**

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، لفظ کل اصل لغت کے اعتبار سے تمام افراد جنس کو عام ہوتا ہے مگر بسا اوقات عموم کلی مراد نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کی حد تک عموم مراد ہوتا ہے جیسا یہاں مراد اُن اشیاء کا عموم ہے جن کی سلطنت و حکومت میں ضرورت ہوتی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز، موٹر، ریل وغیرہ اُن کے پاس نہ تھے۔ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ، وزع سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے روکنے کے ہیں۔ مطلب اس جگہ یہ ہے کہ مجھے اس کی توفیق دیدیجئے کہ میں شکر نعمت کو ہر وقت ساتھ رکھوں اُس سے کسی وقت جدا نہ ہوں، جس کا حاصل مداومت اور پابندی ہے۔ اس سے پہلی آیت میں فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ، سے معنی میں آیا ہے کہ لشکر کو کثرت کی **وجہ سے انتشار سے بچانے کے لئے روکا جاتا تھا۔**

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ، یہاں رضا بمعنے قبول ہے۔ معنے یہ ہیں کہ یا اللہ مجھے ایسے عمل صالح کی توفیق دیجئے جو آپ کے نزدیک مقبول ہو۔ روح المعانی میں اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عمل صالح کے لئے قبولیت لازم نہیں ہے بلکہ قبولیت کچھ شرائط پر موقوف ہوتی ہے۔ اور فرمایا کہ صالح اور مقبول ہونے میں نہ عقلاً کوئی لزوم ہے نہ شرعاً۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے کہ اپنے اعمال صالحہ کے مقبول ہونے کی بھی دُعا کرتے تھے جیسے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت دُعا فرمائی، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل نیک ہے صرف اس کو کر کے بے فکر ہونا نہیں چاہئے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا **کرے کہ اس کو قبول فرما دے۔**

عمل صالح اور مقبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا بغیر فضل خداوندی کے نہیں ہوگا

وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ، عمل صالح اور اسکے قبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا خدا تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ

پر جنت میں داخل نہیں ہو سکتا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ بھی، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی، لیکن مجھے میرے خدا کی رحمت اور فضل گھیرے ہوئے ہے۔ (مرتبہ ۔ از قرطبی)

حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ان کلمات میں دخول جنت کے لئے فضل ربی کی دعا فرما رہے ہیں یعنی اے اللہ، مجھے وہ فضل بھی عطا فرما جس سے جنت کا مستحق ہو جاؤں۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ

اور خبر لی اڑتے جانوروں کی تو کہا کیا ہے، جو میں نہیں دیکھتا ہدہد کو یا ہے وہ

الْغَآئِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَاذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي

غائب اس کو سزا دوں گا سخت سزا یا ذبح کر ڈالوں گا یا لائے میرے پاس

بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَ

کوئی سند صریح پھر بہت دیر نہ کی کہ آکر کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ تجھ کو اسکی

جِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ﴿٢٢﴾ إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَ

خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لیکر تحقیقی میں نے پایا ایک عورت کو جو ان پر بادشاہی کرتی ہے

أُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا

اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہے اور اس کا ایک تخت ہے بڑا میں نے پایا کہ وہ اور اسکی قوم

يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ

سجدہ کرتے ہیں سورج کو اللہ کے سوائے اور بھلا دکھلا رکھے ہیں ان کو شیطان نے انکے کام

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٢٤﴾ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ

پھر روک دیا ہے ان کو رستہ سے سو وہ راہ نہیں پاتے کیوں نہ سجدہ کریں اللہ کو

الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَ

جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو چھپاتے ہو اور

مَا تُعْلِنُونَ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿٢٦﴾ قَالَ

ظاہر کرتے ہو اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوائے پروردگار تخت بڑے کا سلیمان نے کہا

السجدة

سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ ﴿٢٧﴾ اذْهَب بِّكِتَٰبِي

ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے لے جا میرا یہ خط

هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾

اور ڈال دے ان کی طرف پھر ان کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

(اور ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی تو (ہُدہُد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے (اور جب معلوم ہوا کہ واقع میں غائب ہے تو فرمانے لگے کہ) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کرے (تو خیر چھوڑ دوں گا) تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور سلیمان (علیہ السلام سے) کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ) میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں (جس کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے (اور مذہبی حالت اُن کی یہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے (ان) اعمال (کفر) کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمال بد کو مزین کرنے کے سبب) ان کو راہ (حق) سے روک رکھا ہے اسلئے وہ راہ (حق) پر نہیں چلتے کہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اسلئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سُن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اس کو اُن کے پاس ڈال دینا پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اُس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جاوے گا)۔

معارف و مسائل

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ، تَفَقُّدْ کے لفظی معنے کسی مجمع کے متعلق حاضر و غیر حاضر کی تحقیق کرنے کے ہیں اسلئے اس کا ترجمہ خبر گیری اور نگہبانی سے کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے علاوہ جنات اور وحوش و طیور پر حکومت عطا فرمائی تھی اور جیسا کہ حکمرانی کا اصول ہے رعایا کے ہر طبقہ کی نگرانی اور خبر گیری حاکم کے فرائض میں سے ہے اسکے مطابق اس آیت میں بیان فرمایا تَفَقَّدَ الطَّيْرَ یعنی سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے کون

غیر حاضر۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت شریفہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کے حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے جو شخص غیر حاضر ہوتا اگر بیمار ہے تو عیادت کے لئے تشریف لیجاتے تھے تیمارداری کرتے اور کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اسکے لئے تدبیر فرماتے تھے۔

حاکم کو اپنی رعیت کی اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کی خبر گیری ضروری ہے آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور انکے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہدہد جو طیور میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دنیا میں بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہدہد کے متعلق جو سوال آپنے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زمرۂ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اسلئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔ صحابۂ کرام میں حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس سنت انبیاء کو پوری طرح جاری کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے تھے کہ سب لوگوں کے حالات سے باخبر رہیں۔ جس شخص کو کسی مصیبت و تکلیف میں گرفتار پاتے اُس کی امداد فرماتے تھے جس کے بہت سے واقعات اُنکی سیرت میں مذکور ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر دریائے فرات کے کنارہ پر کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کے بچے کو پھاڑ ڈالا تو اسکا بھی عمر سے سوال ہوگا۔ (قرطبی)

یہ تھے وہ اصول جہانبانی وحکمرانی جو انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو سکھائے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن کو عملاً جاری کر کے دکھلایا اور جس کے نتیجہ میں پوری مسلم وغیر مسلم رعایا امن واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی، اور اُن کے بعد زمین و آسمان نے ایسے عدل و انصاف اور عام دنیا کے امن وسکون اور اطمینان کا یہ منظر نہیں دیکھا۔

مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ، سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں ہدہد کو مجمع میں نہیں دیکھتا۔

اپنے نفس کا محاسبہ یہاں موقع تو یہ فرمانے کا تھا کہ ہدہد کو کیا ہو گیا کہ وہ مجمع میں حاضر نہیں عنوان شاید اسلئے بدلا کہ ہدہد اور تمام طیور کا مسخر ہونا حق تعالیٰ کا ایک انعام خاص تھا۔ ہدہد کی غیر حاضری پر ابتداءً میں یہ خوف دل میں پیدا ہوا کہ شاید میرے کسی قصور سے اس نعمت میں کمی آئی کہ ایک صنف طیور کی یعنی ہدہد غائب ہو گیا اسلئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا معمول ہے کہ جب اُن کو کسی نعمت میں کمی آئے یا کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہو تو وہ اسکے ازالہ کیلئے مادی اسباب کیطرف توجہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے حق شکر میں کونسی کوتاہی ہوئی جس کے سبب یہ نعمت ہم سے لے لی گئی۔ قرطبی نے اس جگہ بحوالہ ابن عربی ان بزرگوں کا یہ حال نقل کیا ہے۔

اذا فقدوا ما لهم تفقدوا اعمالهم

یعنی ان حضرات کو جب اپنی مراد میں کامیابی نہیں ہوتی تو وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا۔

اس ابتدائی محاسبۂ نفس اور غور و فکر کے بعد فرمایا اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ اس جگہ حرف اَمْ بمعنے بَلْ ہے (قرطبی) معنے یہ ہیں کہ یہ بات نہیں کہ ہُدہُد کے دیکھنے میں میری نظر نے خطا کی بلکہ وہ حاضر ہی نہیں یہ

ہُدہُد کی تخصیص کی وجہ اور ایک اہم عبرت

طیور میں سے ہُدہُد کی تخصیص۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ تمام پرندوں میں ہدہد کی تفتیش کی کیا وجہ پیش آئی تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کسی ایسے مقام میں قیام فرمایا جہاں پانی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہُدہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ ہُدہُد سے یہ معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مل سکتا ہے۔ ہُدہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دیدیتے کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔ ہُدہُد اپنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

قف یا وقاف کیف یری الهدهد باطن الارض وهو لا یری الفخ حین یقع فیه (قرطبی)

جاننے والے اس حقیقت کو بھی جانو کہ ہدہد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا مگر زمین کے اوپر پھیلا ہوا جال اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیر الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور و زر کی طاقت کے ذریعہ اس سے نہیں بچ سکتا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗ، ابتدائی غور و فکر کے بعد یہ حاکمانہ سیاست کا مظاہرہ ہے کہ غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے۔

جو جانور کام میں سستی کرے اسکو معتدل سزا دینا جائز ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے حق تعالیٰ نے جانوروں کو ایسی سزائیں دینا حلال کر دیا تھا جیسا عام اُمتوں کے لئے جانوروں کو ذبح کر کے انکے گوشت پوست وغیرہ سے فائدہ اٹھانا اب بھی حلال ہے۔ اسی طرح پالتو جانور گائے بیل، گدھا گھوڑا، اونٹ وغیرہ اپنے کام میں سستی کرے اُس کو تادیب کے لئے بقدرِ ضرورت مارنے کی معتدل سزا اب بھی جائز ہے۔ دوسرے جانوروں کو سزا دینا ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ (قرطبی)

اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ، یعنی اگر ہُدہُد نے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر واضح پیش کر دیا تو وہ اس سزا سے محفوظ رہے گا۔ اسمیں اشارہ ہے کہ حاکم کو چاہیئے کہ جن لوگوں سے کوئی قصور عمل میں سرزد ہو جائے اُن کو عذر پیش کرنے کا موقع دے، عذر صحیح ثابت ہو تو سزا کو معاف کر دے۔

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ، یعنی ہُدہُد نے اپنا عذر بتلاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چیز معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں، یعنی میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔

انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے
امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے جس سے اُن کو ہر چیز کا علم ہو سکے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ، سَبَا، یمن کا ایک مشہور شہر جس کا ایک نام مآرب بھی ہے، اُسکے اور یمن کے دارالحکومت صنعاء کے درمیان تین دن کی مسافت تھی۔

کیا چھوٹے آدمی کو یہ حق ہے کہ اپنے بڑوں سے کہے کہ مجھے آپ سے زیادہ علم ہے
ہُدہُد کی مذکورہ گفتگو سے بعض لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد سے یا غیر عالم عالم سے کہہ سکتا ہی کہ اس مسئلہ کا علم مجھے آپ سے زیادہ ہے بشرطیکہ اس کو اس مسئلہ کا واقعی طور پر مکمل علم دوسروں سے زائد ہو۔ مگر روح المعانی میں فرمایا کہ یہ طرز گفتگو اپنے مشائخ اور بڑوں کے سامنے خلافِ ادب ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور ہُدہُد کے قول سے اس پر استدلال اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اُسنے یہ بات اپنے آپ کو سزا سے بچانے اور عُذر کے قوی ہونے کے لئے کہی ہے تاکہ اسکی غیر حاضری کا عُذر پوری طرح حضرت سلیمانؑ کے سامنے آجائے ایسی ضرورت میں ادب کی رعایت رکھتے ہوئے کوئی بات کیجائے تو مضائقہ نہیں۔

اِنِّىْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ، یعنی میں نے ایک عورت کو پایا جو قوم سبا کی مالک ہے یعنی اُن پر حکومت کرتی ہی۔ اس عورت یعنی ملکہ سبا کا نام تاریخ میں بلقیس بنت شراحیل بتلایا گیا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی والدہ جنات میں سے تھی جس کا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے (رواہ دبیب بن جریر عن الخلیل ابن احمد۔ قرطبی) اور اُن کا دادا ہُداہد پورے ملک یمن کا ایک عظیم الشان بادشاہ تھا جس کی اولاد میں چالیس لڑکے ہوئے سب کے سب مُلوک اور بادشاہ بنے۔ ان کے والد سراح نے ایک جنیہ عورت سے نکاح کرلیا تھا اُسی کے بطن سے بلقیس پیدا ہوئی۔ جنیہ سے نکاح کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اپنی حکومت و سلطنت کے غرور میں لوگوں سے کہتا تھا کہ تم میں کوئی میرا کفو نہیں اسلئے میں نکاح ہی نہ کرونگا کیونکہ غیر کفو میں نکاح مجھے پسند نہیں، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسکا نکاح ایک جنیہ عورت سے کرا دیا (قرطبی) شاید یہ اُسی فخر و غرور کا نتیجہ تھا کہ اسنے انسانوں کو جو در حقیقت کفو تھے حقیر و ذلیل سمجھا اور اپنا کفو تسلیم نہ کیا تو قدرت نے اسکا نکاح ایک ایسی عورت سے مقدر کر دیا جو نہ اس کی کفو تھی نہ اس کی جنس و قوم سے تھی۔

کیا انسان کا نکاح جنی عورت سے ہو سکتا ہی
اس معاملہ میں بعض لوگوں نے تو اس لئے شبہ کیا ہی کہ جنات کو انسان کی طرح توالد و تناسل کا اہل نہیں سمجھا۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہ خیال باطل ہے۔ احادیث صحیحہ سے جنات میں توالد و تناسل اور مرد و عورت کی تمام وہ خصوصیات جو انسانوں میں ہیں

جنات میں بھی موجود ہونا ثابت ہے۔

دوسرا سوال شرعی حیثیت سے یہ ہے کہ کیا عورت جنیہ کسی انسان مرد کے لئے نکاح کر کے حلال ہو سکتی ہے؟ اسمیں فقہاء کا اختلاف ہے بہت حضرات نے جائز قرار دیا ہے، بعض نے غیر جنس مثل جانوروں کے ہونے کی بناء پر حرام فرمایا ہے اس مسئلہ کی تفصیل "آکام المرجان فی احکام الجان" میں مذکور ہے اسمیں بعض ایسے واقعات بھی ذکر کئے ہیں کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اُس سے اولاد بھی ہوئی۔ یہاں یہ مسئلہ اسلئے زیادہ قابل بحث نہیں کہ نکاح کرنے والا بلقیس کا والد مسلمان ہی نہ تھا اسکے عمل سے کوئی استدلال جواز یا عدم جواز پر نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ شرع اسلام میں اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے اور بلقیس کے والد انسان تھے اسلئے بلقیس انسان ہی قرار پائے گی۔ اسلئے بعض روایات میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بلقیس سے نکاح کرنا مذکور ہے، اگر وہ روایت صحیح ہو تو بھی اس سے نکاح جنیہ کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ بلقیس خود جنیہ نہ تھیں اگرچہ اُن کی والدہ جنیہ ہو۔ واللہ اعلم اور نکاح سلیمان علیہ السلام کے متعلق مزید بیان آگے آئیگا۔

کیا کسی عورت کا بادشاہ ہونا یا کسی قوم کا امیر و امام ہونا جائز ہے؟ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپ نے فرمایا لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً، یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔ اسی لئے علماءِ اُمت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت و خلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کیا جا سکتی، بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامتِ کبریٰ بھی صرف مردوں کو سزاوار ہے۔ رہا بلقیس کا ملکہ سبا ہونا تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح کیا اور پھر اسکو حکومت و سلطنت پر برقرار رکھا، اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکام شرعیہ میں اعتماد کیا جا سکے۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، مراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ و امیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہو سکتا ہے موجود تھا جو چیزیں اُس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں اُن کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ، عرش کے لفظی معنے تختِ سلطنت کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ عرشِ بلقیس کا طول اسّی ہاتھ اور عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی جس پر موتی اور یاقوت احمر زبرجد اخضر کا کام تھا اور اسکے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم اور حریر کے اندر باہر یکے بعد دیگر سات مقفل عمارتوں میں محفوظ تھا۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ، معلوم ہوا کہ اس کی قوم نجوم پرست تھی آفتاب کی عبادت کرتی تھی، بعض نے فرمایا کہ مجوس میں سے تھی جو آگ اور ہر روشنی کی پرستش کرتے ہیں۔ (قرطبی)

اَلَّا يَسْجُدُوْا کا تعلق زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ یا فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ سے ہے یعنی شیطان نے اُن کے ذہنوں میں یہی بٹھلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں یا یہ کہ اُن کو حق کے راستہ سے اس طرح روک دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں۔

تحریر اور خط بھی عام معاملات میں حجتِ شرعیہ ہے اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام خط بھیجنے کو اس پر اتمام حجت کے لئے کافی سمجھا اور اسی پر عمل فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ عام معاملات میں تحریر و خط قابلِ اعتبار ثبوت ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے صرف اُن مواقع میں خط کو کافی نہیں سمجھا جہاں شہادت شرعیہ کی ضرورت ہے کیونکہ خط اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ شہادت نہیں لیجا سکتی۔ شہادت کا مدار شاہد کا عدالت کے سامنے آ کر بیان دینے پر رکھا گیا جسمیں بڑی حکمتیں مضمر ہیں یہی وجہ ہے کہ آجکل بھی دنیا کی کسی عدالت میں خط اور ٹیلیفون پر شہادت لینے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

مشرکین کو خط لکھنا اور اُن کے پاس بھیجنا جائز ہے دوسرا مسئلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط سے یہ ثابت ہوا کہ تبلیغ دین اور دعوتِ اسلام کے لئے مشرکین اور کفار کو خطوط لکھنا جائز ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی مختلف کفار کو خطوط بھیجنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

انسانی اخلاق کی رعایت ہر مجلس میں چاہئے اگرچہ وہ مجلس کفار ہی کی ہو فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے نامہ بری کا کام لیا تو اس کو یہ ادبِ مجلس بھی سکھایا کہ خط ملکہ سبا کو پہنچا کر دہیں سر پر سوار نہ رہے بلکہ وہاں سے ذرا ہٹ جائے جو عام شاہی مجلسوں کا طریقہ ہے۔ اسمیں آدابِ معاشرت اور انسانی اخلاق کا عام مخلوقات کے ساتھ مطلوب ہونا معلوم ہوا۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ

کہنے لگی اے دربار والو میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا وہ خط ہے سلیمان

سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ

کی طرف سے اور وہ یہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے کہ زور نہ کرو میرے مقابلہ میں

وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ

اور چلے آؤ میرے سامنے حکمبردار ہو کر کہنے لگی اے دربار والو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں

مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ

میں طے نہیں کرتی کوئی کام تمہارے حاضر ہونے تک وہ بولے ہم لوگ زور آور ہیں

وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۥ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

زور سخت لڑائی والے اور کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ

کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں

اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ

کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کریں گے اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف کچھ تحفہ

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ

پھر دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر پھرتے ہیں بھیجے ہوئے پھر جب پہنچا سلیمان کے پاس بولا کیا تم میری اعانت

بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

کرتے ہو مال سے، سو جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے بہتر ہے اس سے جو تم کو دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش رہو

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ

پھر جا اُن کے پاس اب ہم پہنچتے ہیں اُن پر ساتھ لشکروں کے جن کا مقابلہ نہ ہو سکے اُن سے اور نکال دیں گے اُنکو وہاں سے

اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

بے عزت کر کر اور وہ خوار ہوں گے

خُلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے اور ہُدہُد کے حوالہ کیا وہ اسکو چونچ میں لیکر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈالدیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہل دربار میرے پاس ایک خط (جس کا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہے) ڈالا گیا ہے (باوقعت اسلئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کیطرف سے ہے اور اسمیں یہ (مضمون) ہے (اوّل) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اور اسکے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکانِ بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ۔ (مقصود تمام کو دعوت دینا ہے اور یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا یا تو پہلے حال سُن چکے ہونگے گو سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہی کہ بڑے چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں، اور یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا اور خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہل دربار تم مجھ کو میرے

اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک و مشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جاوے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کرکے) حکم دینا ہو۔ بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں (کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اس کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اُسکے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو (اُن کا زور گھٹانے کیلئے) ذلیل (و خوار) کیا کرتے ہیں اور (اُن سے لڑائی کیجاوے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بے ضرورت پریشانی میں پڑنا خلافِ مصلحت ہے لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جاوے) اور (سر دست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ) بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اسوقت دوبارہ غور کیا جاویگا۔ چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا اور قاصد اسکو لیکر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کرنا (چاہ) تے ہو (اسلئے ہدیئے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمہارے پاس صرف دُنیا ہے اور میرے پاس دین بھی اور دُنیا بھی تم سے زیادہ، لہٰذا میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں تم ہی اپنے ہدیے پر فخر کرتے ہوگے (لہٰذا یہ ہدیئے ہم نہ لیں گے) تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آویں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہوسکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ (ذلت کیساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جاویں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جاویں کہ جہاں چاہیں چلے جاویں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ، کریم کے لفظی معنی معزز مکرم کے ہیں اور محاورہ میں کسی خط کو کریم جب کہا جاتا ہے جبکہ وہ مہر لگی ہوئی ہو۔ اسی لئے اس آیت میں کتاب کریم کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، زہیرؒ وغیرہ نے کتاب مختوم سے کی ہے جس

سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر اپنی مہر ثبت فرمائی تھی۔ ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ملوکِ عجم کی یہ عادت معلوم ہوئی کہ جس خط پر مہر نہ ہو اُس کو نہیں پڑھتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کے خطوط کے لئے مہر بنوائی اور قیصر و کسریٰ وغیرہ کو جو خطوط تحریر فرمائے اُن پر مہر ثبت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خط پر مہر لگانا مکتوب الیہ کا بھی اکرام ہے اور اپنے خط کا بھی۔ آجکل عادت خط کو لفافہ میں بند کر کے بھیجنے کی ہوگئی ہے یہ بھی مہر کے قائم مقام ہے۔ جس جگہ مکتوب الیہ کا اکرام منظور ہو، کھلا خط بھیجنے کے بجائے لفافہ میں بند کر کے بھیجنا اقرب الی السنۃ ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا | حضرت سلیمان علیہ السلام گو عربی نہ تھے لیکن عربی زبان جاننا اور سمجھنا آپ سے کوئی بعید بھی نہیں۔ جبکہ آپ پرندوں تک کی زبان جانتے تھے اور عربی زبان تو تمام زبانوں سے افضل واشرف ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط عربی زبان میں لکھا ہو کیونکہ مکتوب الیہ (بلقیس) عربی النسل تھی اس نے خط کو پڑھا بھی اور سمجھا بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط اپنی ہی زبان میں تحریر فرمایا ہو اور بلقیس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کا ترجمان ہو جس نے پڑھ کر خط سُنایا اور سمجھایا ہو۔ (روح)

خط نویسی کے چند آداب | إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایات نہ دی ہوں۔ خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پُورا کا پُورا نقل فرمایا گیا۔ یہ ایک پیغمبر و رسول کا خط ہے اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اسلئے اس خط میں جو ہدایات خط و کتابت کے معاملے میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اتباع ہیں۔

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا | سب سے پہلی ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا۔ مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ میں وہ مذکور نہیں۔ مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لئے سُنّتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اُسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے۔ مخاطب کو یہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں اُن سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ (من محمد عبداللہ ورسولہ) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اسمیں تو اپنے

نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں، لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، اُستاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اُسمیں اپنے نام کو مقدم کرنا کیا اسکے ادب کے خلاف نہ ہوگا اور اس کو ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اس معاملے میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے اکثر حضرات نے تو اتباعِ سُنتِ نبوی کو ادب پر مقدم رکھکر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی اپنے نام کو مقدم لکھا ہے۔ رُوح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما کان احد اعظم حرمۃ من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وکان اصحابہ اذا کتبوا الیہ کتبًا بدأوا بانفسھم قلت وکتاب علاء الحضرمی یشھد لہ علی ما روی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابلِ تعظیم نہیں، مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھدے تو یہ بھی جائز ہے۔ فقیہ ابو اللیث کی بُستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے شروع کردے تو اسکے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ اُمت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی (رُوح المعانی و قرطبی)

خط کا جواب دینا بھی سُنتِ انبیاء ہے تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اُس کے لئے مناسب ہے کہ اسکا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے! اسی لئے حضرت ابن عباس رضہ سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے (قرطبی)

خطوط میں بسم اللہ لکھنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم، اسکے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے۔ اور قرآن کریم میں جو حضرت سُلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اسکے ظاہر سے جواز اسکا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من سلیمان بن داؤد الی بلقیس ابنۃ ذی شرح وقومھا۔ ان لا تعلوا الخ بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سُنایا تو اُسنے قوم کی آگاہی کے لئے سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا، قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدم تھی یا سلیمان علیہ السلام کا نام۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

سلیمان علیہ السلام کا نام لفافہ کے اُوپر لکھا ہوا اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو، بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سُنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ: خط نویسی کی اصل سُنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے، لیکن قرآن و سُنت کے نصوص و اشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اُس جگہ اُس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈالدیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آجکل جو عموماً ایک دوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں انکا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سُنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیتِ قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے: یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اسوقت بھیجا ہے جبکہ وہ مُسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوکِ عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، اُن میں بھی بعض آیاتِ قرآن لکھی ہیں۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اسلئے اسکا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی (عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر، جامع، بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہئے: حضرت سُلیمان علیہ السلام کے اس والانامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے۔ کافر کے مقابلے میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے۔ اسکے ساتھ حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفع و تکبر کی مذمت بھی۔ درحقیقت یہ خط بھی اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہ ہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔ (روح المعانی)

اہم اُمور میں مشورہ کرنا سُنت ہے اسمیں دوسروں کی رائے سے فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور لوگوں کی دلجوئی بھی ہوتی ہے: قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ، افتونی، فتویٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی خاص مسئلہ کا جواب دینا۔ یہاں مشورہ دینا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مُراد ہے۔ ملکہ بلقیس کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پہنچا تو اُسنے اپنے ارکانِ حکومت کو جمع کر کے اس واقعہ کا اظہار کیا اور اُن سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے کیا کرنا

چاہیئے۔ اس نے ان کی رائے دریافت کرنے سے پہلے اُن کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لیے یہ بھی کہا کہ "میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی" اسی کا نتیجہ تھا کہ فوج اور وزراء نے اسکے جواب میں اپنی مستعدی کے ساتھ تعمیلِ حکم کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کر دی (نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ) حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ہم سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ بلقیس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان تین سو تیرہ تھے اور انہیں سے ہر ایک آدمی دس ہزار آدمیوں کا امیر اور نمائندہ تھا۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ اہم اُمور میں مشورہ لینے کا دستور پُرانا ہے۔ اسلام نے مشورہ کو خاص اہمیت دی اور عمالِ حکومت کو مشورہ کا پابند کیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو وحیِ الٰہی کے مورد تھے۔ اور آسمانی ہدایات آپ کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے آپ کو کسی رائے مشورہ کی درحقیقت ضرورت نہ تھی، مگر اُمت کے لیے سُنت قائم کرنے کے واسطے آپ کو بھی حکم دیا گیا (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ) یعنی آپ اہم اُمور میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا کریں۔ اسمیں صحابہ کرام کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہے اور آئندہ آنے والے عمالِ حکومت کو اسکی تاکید بھی کہ مشورہ سے کام کیا کریں۔

مکتوبِ سُلیمانی کے جواب میں ملکہ بلقیس کا ردعمل ارباب حکومت کو مشورہ میں شریک کر کے ان کا تعاون حاصل کر لینے کے بعد ملکہ بلقیس نے خود ہی ایک رائے قائم کی جسکا حاصل یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کا امتحان لے اور تحقیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور جو کچھ حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہے یا وہ ایک ملک گیری کے خواہشمند بادشاہ ہیں، اس امتحان سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی وہ نبی و رسول ہیں تو انکے حکم کا اتباع کیا جائے اور مخالفت کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے اور اگر بادشاہ ہیں اور ملک گیری کی ہوس میں ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تو پھر غور کیا جائیگا کہ انکا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس امتحان کا طریقہ اُس نے یہ تجویز کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس کچھ ہدیے تحفے بھیجے اگر وہ ہدیئے تحفے لیکر راضی ہوگئے تو علامت اس کی ہوگی کہ وہ ایک بادشاہ ہی ہیں، اور اگر وہ واقع میں نبی و رسول ہیں تو وہ اسلام و ایمان کے بغیر کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے، یہ مضمون ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ابن جُریجؒ، ابن وہبؒ سے نقل کیا ہے اسی کا بیان اس آیت میں ہے۔

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ، یعنی میں حضرت سلیمان اور اُن کے ارکان دولت کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ جو قاصد یہ ہدیہ لیکر جائیں گے وہ واپس آکر کیا صورتِ حال بیان کرتے ہیں۔

بلقیس کے قاصدوں کی دربارِ سلیمانی میں حاضری تاریخی اسرائیلی روایات میں بلقیس کی طرف سے آنیوالے قاصدوں اور تحفوں کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ اتنی بات پر سب روایات متفق ہیں کہ تحفہ میں

کچھ سونے کی اینٹیں تھیں کچھ جواہرات اور ایک سو غلام اور ایک سو کنیزیں تھیں مگر کنیزوں کو مردانہ لباس میں اور غلاموں کو زنانہ لباس میں بھیجا تھا اور ساتھ ہی بلقیس کا ایک خط بھی تھا جس میں سلیمانؑ کے امتحان کے لئے کچھ سوالات بھی تھے، تحفوں کے انتخاب میں بھی ان کا امتحان مطلوب تھا۔ حضرت سلیمانؑ کو حق تعالیٰ نے اسکے تحفوں کی تفصیلات اُن کے پہنچنے سے پہلے بتلا دی تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا کہ دربار سے نو فرسخ تقریباً تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دو طرفہ عجیب الخلقت جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے جن کا بول و براز بھی سونے چاندی کے فرش پر ہو۔ اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزین فرمایا۔ دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کرسیاں ایک طرف علماء کے لئے، دوسری طرف وزراء اور عمال سلطنت کے لئے بچھائی گئیں۔ جواہرات سے پورا ہال مزین کیا گیا۔ بلقیس کے قاصدوں نے جب سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفہ سے شرما گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سونے کی اینٹیں وہیں ڈال دیں۔ پھر جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دو طرفہ وحوش و طیور کی صفیں دیکھیں، پھر جنات کی صفیں دیکھیں تو بے حد مرعوب ہو گئے مگر جب دربار تک پہنچے اور حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اُن کی مہمانی کا اکرام کیا مگر اُن کے تحفے واپس کر دیئے اور بلقیس کے سب سوالات کے جوابات دیئے (ملخصاً از تفسیر قرطبی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدیۂ بلقیس کی واپسی

قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ، یعنی جب بلقیس کے قاصد اس کے ہدایا اور تحفے لیکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے قاصدوں سے فرمایا کہ کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے وہ تمہارے مال و سامان سے کہیں زیادہ بہتر ہے اسلئے میں یہ مال کا ہدیہ قبول نہیں کرتا اس کو واپس لیجاؤ اور اپنے ہدیہ پر تم ہی خوش رہو۔

کسی کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اس کی تفصیل و تحقیق

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں یا بہتر نہیں۔ اور تحقیق اس مسئلے میں یہ ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں اگر اپنی یا مسلمانوں کی کسی مصلحت میں خلل آتا ہو یا انکے حق میں رائے کی کمزوری پیدا ہوتی ہو تو انکا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں۔ (روح المعانی) ہاں اگر کوئی دینی مصلحت اس ہدیہ کے قبول کرنے کی داعی ہو، مثلاً اسکے ذریعہ کافر کے مانوس ہو کر اسلام سے قریب آنے پھر مسلمان ہونے کی اُمید ہو یا اسکے کسی شر و فساد کو اس کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہو تو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملے میں یہی رہی ہے کہ بعض کفار کا ہدیہ قبول فرمالیا، بعض کا رد کر دیا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب الہبۃ میں اور شرح سیر کبیر میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ براء کا بھائی عامر بن ملک مدینہ طیبہ میں کسی ضرورت سے پہنچا

جبکہ وہ مشرک کافر تھا! اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو گھوڑے اور دو جوڑے کپڑے کا ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے اسکا ہدیہ یہ فرما کر واپس کر دیا کہ ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ اور عیاض بن حمار مجاشعی نے آپ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اُس سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہو؟ اُسنے کہا کہ نہیں آپ نے ان کا ہدیہ بھی یہ کہہ کر رَد فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عطایا لینے سے منع فرمایا ہے اس کے بالمقابل یہ روایات بھی موجود ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین کے ہدایا قبول فرمائے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابو سفیان نے بحالتِ شرک آپ کو ایک چمڑا ہدیہ میں بھیجا آپ نے قبول فرما لیا اور ایک نصرانی نے ایک ریشمی حریر کا بہت چمکتا ہوا کپڑا ہدیہ میں پیش کیا۔ آپ نے قبول فرما لیا۔

شمس الائمہ اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کا ہدیہ رَد کر دینے میں اُسکے اسلام کی طرف مائل ہونے کی اُمید تھی وہاں رَد کر دیا اور بعض کا ہدیہ قبول کرنے میں اسکے مسلمان ہو جانے کی اُمید تھی تو قبول کر لیا۔ (از عمدۃ القاری کتاب الہبۃ)

اور بلقیس نے جو رد ہدیہ کو نبی ہونے کی علامت قرار دیا اسکا سبب یہ نہ تھا کہ نبی کے لئے ہدیہ قبول کرنا مشرک کا جائز نہیں بلکہ سبب یہ تھا کہ اُسنے اپنا ہدیہ درحقیقت ایک رشوت کی حیثیت سے بھیجا تھا کہ اسکے ذریعہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حملے سے محفوظ رہے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس اسکا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکم بردار ہو کر

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

بولا ایک دیو جنوں میں سے میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اٹھے اپنی جگہ سے

وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور میں اس پر زور آور ہوں معتبر بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا

میں لائے دیتا ہوں تیرے پاس اسکو پہلے اس سے کہ پھر آئے تیری طرف تیری آنکھ پھر جب دیکھا اسکو دھرا ہوا

عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ

اپنے پاس کہا یہ میرے رب کا فضل ہے میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو

شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ

کوئی شکر کرے سو شکر کرے اپنے واسطے اور جو کوئی ناشکری کرے سو میرا رب بے پروا ہے کرم والا کہا

نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اسکے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں

خُلاصۂ تفسیر

(غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سب واقعہ بلقیس سے بیان کیا تو حالات سے اسکو حضرت سُلیمان علیہ السّلام کے علم اور نبوّت کے کمالات کا یقین ہوگیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی) سلیمان (علیہ السّلام کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اسکا چلنا معلوم ہوا تو انھوں) نے (اپنے درباروالوں سے) فرمایا کہ اے درباروالو تم میں کوئی ایسا ہے جو اس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آویں حاضر کردے (مسلمین کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آرہے تھے تخت کا منگانا غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اسکا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آجانا کہ اطلاع تک نہ ہو عادت بشریہ سے باہر ہے اگر جنوں کی تسخیر یعنی تابع ہونے سے ہو تب بھی جنوں کا خود بخود تابع ہو جانا بھی ایک معجزہ ہی ہے اور اگر کسی ولی اُمت کی کرامت کے ذریعہ ہے تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور اگر بغیر کسی واسطہ کے ہے تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہے۔ بہرحال ہر طور پر یہ معجزہ اور نبوت کی دلیل ہے لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ اندرونی کمالات کیساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تاکہ ایمان واطمینان زیادہ ہو) ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اُٹھیں اور (گو وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور گو بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزین ہے مگر میں) امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کرونگا) جسکے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور وحی کی ہوئی کسی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کی تاثیرات ہوں اُس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس سے خود سلیمان علیہ السلام مُراد ہیں غرض) اُس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لاکر کھڑا کرسکتا ہوں (کیونکہ معجزہ کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالےٰ سے دُعا کی ویسے ہی یا کسی اسم الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آموجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہو کر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میرا رب غنی ہے کریم ہے (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے

لئے اسکے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اسکا پتہ لگتا ہے یا اُسکا انھیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ امید ہے اور اسکے حق کو پہچاننے کا اثر دُور تک بھی پہنچیگا اور دوسری صورت میں اس سے حق پہچاننے کی اُمید کم ہے)۔

معارف و مسائل

بلقیس کی حاضری دربارِ سلیمانی میں قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلقیس کے قاصد خود بھی مرعوب و مبہوت ہو کر واپس ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعلانِ جنگ سنا دیا تو بلقیس نے اپنی قوم سے کہا کہ پہلے بھی میرا یہی خیال تھا کہ سلیمان دُنیا کے بادشاہوں کی طرح بادشاہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے کوئی خاص منصب بھی ان کو ملا ہے اور اللہ کے نبی و رسول سے لڑنا اللہ کا مقابلہ ہے، جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کی تیاری شروع کر دی۔ بارہ ہزار سرداروں کو اپنے ساتھ لیا جن کے تحت ایک ایک لاکھ افواج تھیں[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا کہ اُن کی مجلس میں کوئی ابتداءً گفتگو کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے دُور سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا تو حاضرین سے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: اے نبی اللہ! ملکہ بلقیس اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ رہی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اسوقت وہ دربارِ سلیمانی سے ایک فرسخ یعنی تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اُسوقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے جنود و عساکر کو مخاطب کر کے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ، حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بلقیس ان کی دعوت سے متاثر ہونے کی بناء پر مطیع بن کر آ رہی ہے۔ تو ارادہ فرمایا کہ وہ شاہانہ قوت و شوکت کے ساتھ ایک پیغمبرانہ معجزہ بھی دیکھ لے تو اُس کے ایمان لانے کے لئے زیادہ معین ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تسخیر جنات کا عام معجزہ عطا فرمایا ہوا تھا شاید حق تعالیٰ کی طرف سے اشارہ پا کر انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ کسی طرح بلقیس کا تخت شاہی اُسکے یہاں پہنچنے سے پہلے حاضر ہو جائے۔ اسلئے حاضرین کو جن میں جنات بھی تھے خطاب فرما کر یہ تخت لانے کیلئے فرمادیا اور اسکے تمام اموال و دولت میں تخت شاہی کا انتخاب بھی شاید اسلئے کیا گیا کہ وہ اسکی سب سے زیادہ محفوظ چیز تھی جس کو سات محلات شاہی کے وسط میں ایک محفوظ محل کے اندر مقفل کر کے رکھا تھا کہ اسکے اپنے آدمیوں کا بھی وہاں تک گزر نہ تھا۔ اُس کا بغیر دروازہ یا قفل توڑے ہوئے منتقل ہو جانا اور اتنی مسافتِ بعیدہ پر پہنچ جانا حق تعالیٰ

[1] حضرت مصنف رحمۃ اللہ نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، خاص طور سے یہ روایت بعید از عقل ہے۔ علامہ آلوسیؒ کے فرمانے کے مطابق جھوٹ سے زیادہ قریب ہے۔ محمد تقی ۱۰ / ۱ / ۲۳ [illegible]

شانہٗ کی ہی قدرتِ کاملہ سے ہوسکتا ہے یہ اس کو حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرتِ عظیمہ پر یقین کا سب سے بڑا ذریعہ ہوسکتا تھا اُس کیساتھ اس پر بھی یقین لازم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی خاص منصب حاصل ہے کہ انکے ہاتھ پر ایسی خوارق العادت چیزیں ظاہر ہوجاتی ہیں (ذکرہ واختارہ ابن جریر)

قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ، مُسْلِمِیْنَ ، مُسْلِمٌ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مطیع و فرمانبردار کے ہیں ۔ اصطلاحِ شرع میں مومن کو مسلم کہا جاتا ہے یہاں بقول ابن عباسؓ اسکے لغوی معنے مراد ہیں ، یعنی مطیع و فرمانبردار ۔ کیونکہ ملکہ بلقیس کا اسلام لانا اسوقت ثابت نہیں بلکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے اور کچھ گفتگو کرنے کے بعد مسلمان ہوئی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم کے آنیوالے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے ۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ ، یعنی کہا اُس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب میں سے یہ کون شخص تھا ؟ اسکے متعلق ایک احتمال تو وہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم انھیں کو حاصل تھا ۔ اس صورت میں یہ سارا معاملہ بطور معجزہ کے تھا اور یہی مقصود تھا کہ بلقیس کو پیغمبرانہ اعجاز کا مشاہدہ ہوجائے اور کوئی اشکال اس معاملے میں نہ رہے ۔ مگر اکثر ائمۂ تفسیر قتادہ وغیرہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے اور قرطبی نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے کہ یہ کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا ۔ ابن اسحٰق نے اسکا نام آصف بن برخیا بتلایا ہے اور یہ کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دوست تھا ۔ اور بعض روایات کے اعتبار سے اُن کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جس کو اسم اعظم کا علم تھا جسکا خاصہ یہ ہے کہ اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا کیجائے قبول ہوتی ہے اور جو کچھ مانگا جائے اللہ کیطرف سے عطا کردیا جاتا ہے ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسم اعظم کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصلحت اسمیں دیکھی ہو کہ یہ عظیم کارنامہ ان کی اُمت کے کسی آدمی کے ذریعہ ظاہر ہو جس سے بلقیس پر اور زیادہ اثر پڑے اسلئے بجائے خود یہ عمل کرنے کے اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ (کذا فی فصوص الحکم) اس صورت میں یہ واقعہ آصف بن برخیا کی کرامت ہوگی ۔

معجزہ اور کرامت میں فرق حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ، اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہوجاتا ہے ۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے ۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے غیر نبی کے ذریعہ اسکا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے آصف

بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ اُن کی کرامت کہلائے گی اور ہر ولی کے کمالات چونکہ انکے رسول و پیغمبر کے کمالات کا عکس اور اُنہی سے مستفاد ہوتے ہیں اسلئے اُمت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

تخت بلقیس کا واقعہ کرامت تھی یا تصرف: شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اسکو آصف بن برخیا کا تصرف قرار دیا ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال و نظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام صادر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے لئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے صوفیائے کرام نے اصلاحِ مریدین کے لئے کبھی کبھی اس کو استعمال کیا ہے۔ ابنِ عربی نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اسلئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیا سے لیا۔ مگر قرآن کریم نے اس تصرف کو عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کا نتیجہ بتلایا ہے اس سے ترجیح اسکو ہی ہوتی ہے کہ یہ کسی دُعا یا اسم اعظم کا اثر تھا جسکا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں، وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ان کا یہ کہنا کہ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ، یعنی میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لادونگا۔ یہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اُن کے قصد و اختیار سے ہوا جو علامت تصرف کی ہے کیونکہ کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی تو اسکا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطلاع کردی ہو کہ تم ارادہ کرو گے تو ہم یہ کام اتنی جلدی کردیں گے۔ یہ تقریر حضرت سیدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو احکام القرآن میں سورۂ نمل کی تفسیر لکھنے کے وقت حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور تصرف کی حقیقت اور اُسکے احکام پر حضرتؒ کا ایک مستقل رسالہ بنام التصرف عربی زبان میں تھا جسکا اُردو ترجمہ احقر نے لکھا تھا وہ جداگانہ شائع ہوچکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِیْنَا
پھر جب وہ آپہنچی کسی نے کہا کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت بولی گویا یہ وہی ہے اور ہم کو معلوم

الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ
ہوچکا پہلے سے اور ہم ہوچکے حکم بردار اور روک دیا اس کو ان چیزوں سے جو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ﴿۴۳﴾ قِیْلَ لَهَا
پوجتی تھی اللہ کے سوائے البتہ وہ تھی منکر لوگوں میں کسی نے کہا اس

ادْخُلِی الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا ؕ
عورت کو اندر چل محل میں پھر جب دیکھا اس کو خیال کیا کہ وہ پانی ہے گہرا اور کھولیں اپنی پنڈلیاں

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ
کہا یہ تو ایک محل ہے جڑے ہوئے ہیں اسمیں شیشے بولی اے رب میں نے بُرا کیا ہے

نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾

اپنی جان کا اور میں حکم بردار ہوئی ساتھ سلیمان کے اللہ کے آگے جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھا کر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو ویسا ہی (بلقیس سے اس طور پر اسلئے سوال کیا کہ ہیئت تو بدل دی گئی تھی اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی تخت تھا اور صورت وہ نہ تھی۔ اسلئے یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے بلکہ یہ کہا کہ ایسا ہی تمہارا تخت ہے اور بلقیس اسکو پہچان گئی اور اسکے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اسلئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی) اور (چونکہ اس معجزہ سے قبل تصدیق و اعتقاد کر لینا کمالِ عقل کی دلیل ہے اسلئے اللہ تعالیٰ اسکے عاقل ہونے کی تقریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھدار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اسکی یہ ہے کہ) اس کو (ایمان لانے سے) غیر اللہ کی عبادت نے (جسکی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (اور وہ عادت اسلئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عاقل تھی اسلئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی۔ اسکے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ علاوہ اعجاز و شانِ نبوت دکھلانے کے اس کو ظاہری شانِ سلطنت بھی دکھلا دی جائے تاکہ اپنے کو دنیا کے اعتبار سے بھی عظیم نہ سمجھے اسلئے ایک شیش محل بنوا کر اسکے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اسکو شیشہ سے پاٹ دیا۔ اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ ظاہر نظر میں نظر نہ آتا تھا اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانیوالے کو لامحالہ اُس پر سے عبور کرنا پڑے۔ چنانچہ اس تمام سامان کے بعد) بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی محل قیام کے لئے تجویز کیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اسکا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اسکے اندر گھسنے کے لئے دامن اُٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اسوقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے۔ دامن اُٹھانے کی ضرورت نہیں اسوقت) بلقیس (کو معلوم ہو گیا کہ یہاں پر دُنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے نہیں دیکھے تو اُن کے دل میں

ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے میرے پروردگار میں نے (اب تک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہو کر رب العالمین پر ایمان لائی۔

معارف و مسائل

کیا بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی تھیں

آیاتِ مذکورہ میں بلقیس کا واقعہ اسی پر ختم ہو گیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گئی۔ اسکے بعد کیا حالات پیش آئے؟ قرآن کریم نے اس سے سکوت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے جب عبداللہ ابن عُیینہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ اسکا معاملہ اس پر ختم ہو گیا اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ مطلب یہ تھا کہ قرآن نے یہیں تک اسکا حال بیان کیا ہے اسکے بعد کا حال بتلانا قرآن نے چھوڑ دیا تو ہمیں بھی اسکی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اسکے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی اور اسکو اسکے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیج دیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لیجاتے اور تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسکے لئے یمن میں تین عمدہ محلات ایسے تیار کرا دیئے تھے جس کی مثال و نظیر نہیں تھی۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُنکے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو

فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ

فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو بُرائی کو پہلے

الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا

بھلائی سے کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے بولے ہم نے منحوس

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو، کہا تمہاری بُری قسمت اللہ کے پاس ہے، کچھ نہیں تم لوگ جانچے جاتے ہو

وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا

اور تھے اُس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور

يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ

اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اس پر اور اسکے گھر پر پھر کہہ دیں گے

لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا
اسکے دعویٰ کرنے والے کو، ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اسکا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں　اور انھوں نے بنایا ایک

وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
فریب اور ہم نے بنایا ایک فریب اور ان کو خبر نہ ہوئی　پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام　ان کے

مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ
فریب کا　کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے اُن کو اور اُن کی قوم کو سب کو　سو یہ پڑے ہیں اُن کے گھر

خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ
ڈھیر ہوئے بسبب اُن کے انکار کے　البتہ اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں　اور

اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾
بچادیا ہم نے اُن کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس انکے (برادری کے) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (یہ پیغام دیکر) کہ تم (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی عبادت کرو (چاہیئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لے آتے مگر خلاف توقع) اچانک ان میں دو فریق ہوگئے جو دین کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (یعنی ایک فرقہ تو ایمان لایا اور ایک نہ لایا اور ان میں جو جھگڑا اور کلام ہوا بعض اس میں کا سورۂ اعراف میں مذکور ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا اور بعض بیچ کا آگے مذکور ہے قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ الخ اور جب ان لوگوں نے کفر پر اصرار کیا تو صالح علیہ السلام نے موافق عادت انبیاء علیہم السلام کے ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسا سورۂ اعراف میں ہے فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ، تو انھوں نے کہا کہ لاؤ وہ عذاب کہاں ہے جیسا سورۂ اعراف میں ہے قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اس پر) صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ارے بھائیو تم نیک کام (یعنی توبہ و ایمان) سے پہلے عذاب کیوں جلدی مانگتے ہو (یعنی چاہیئے تو یہ تھا کہ عذاب کی وعید سُن کر ایمان لے آتے نہ یہ کہ ایمان تو نہ لائے اور بالعکس اس عذاب ہی کی درخواست کرنے لگے بڑی بیباکی کی بات ہے۔ بجائے اس استعجال عذاب کے) تم لوگ اللہ کے سامنے (کفر سے) معافی کیوں نہیں چاہتے جس سے توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جاوے (یعنی عذاب سے محفوظ رہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو اور تمھارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں (کہ جب سے تمنے یہ مذہب نکالا ہے اور تمھاری یہ جماعت پیدا ہوئی ہے قوم میں نااتفاقی ہوگئی اور نااتفاقی کی جو مضرتیں اور خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب مرتب ہونے لگیں پس سبب ان تمام خرابیوں کے تم لوگ ہو) صالح (علیہ السلام)

نے (جواب میں) فرمایا کہ تمہاری (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی تمہارے اعمال کفریہ اللہ کو معلوم ہیں یہ خرابیاں ان ہی اعمال پر مرتب ہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ ناتفاقی مذموم وہی ہے جو حق کے خلاف کرنے سے ہو تو اسکا الزام ایمان والوں پر نہیں ہو سکتا بلکہ اہل کفر پر ہوگا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ ان پر قحط ہوا تھا اور تمہارے کفر کی مضرت کچھ ان شرور ہی تک ختم نہیں ہوئی) بلکہ تم وہ لوگ ہو کہ (اس کفر کی بدولت) عذاب میں مبتلا ہو گئے اور (یوں تو کافر اس قوم میں بہت تھے لیکن سرغنہ) اس بستی (یعنی حجر) میں نو شخص تھے جو سرزمین (یعنی بستی سے باہر تک بھی) فساد کیا کرتے تھے اور (ذرا) اصلاح نہ کرتے تھے (یعنی بعضے مفسد ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ فساد کیا کچھ اصلاح کرلی مگر وہ ایسے نہ تھے بلکہ خالص مفسد تھے چنانچہ ایک بار یہ فساد کیا کہ) انھوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ آپس میں سب (اس پر) اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم شب کے وقت صالح اور ان کے متعلقین (یعنی ایمان والوں) کو جا ماریں گے پھر (اگر تحقیق کی نوبت آئی تو) ہم اُن کے وارث سے (جو خون کا دعویٰ کریگا) کہدیں گے کہ ان کے متعلقین کے (اور خود ان کے) مارے جانے میں موجود (بھی) نہ تھے (مارنا تو درکنار) اور (تاکید کے لئے یہ بھی کہدیں گے کہ) ہم بالکل سچے ہیں۔ (اور گواہ کوئی معائنہ کا ہوگا نہیں۔ بس بات دب دبا جاوے گی) اور (یہ مشورہ کرکے) انھوں نے ایک خفیہ تدبیر کی (کہ شب کے وقت اس کارروائی کے لئے چلے) اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی (وہ یہ کہ ایک پہاڑ پر سے ایک پتھر اُن پر لڑھک آیا اور وہ سب وہاں ہی کھیت رہے یعنی ہلاک ہوئے۔ کذا فی الدر المنثور) سو دیکھیے انکی شرارت کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو (بطریق مذکور) اور (بچے [illegible] کی (باقی) قوم کو (آسمانی عذاب سے) سب کو غارت کر دیا (جسکا قصہ دوسری آیات میں ہے فَعَقَرُوا النَّاقَةَ الخ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ) سو یہ انکے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں انکے کفر کے سبب سے (جو اہل مکہ کو ملک شام کے سفر میں ملتے ہیں) بلاشبہ اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے دانشمندوں کے لئے اور ہم نے ایمان اور تقویٰ والوں کو (اس قتل سے بھی جسکا مشورہ ہوا تھا اور عذاب قہری سے بھی) نجات دی۔

معارف و مسائل

تِسْعَةُ رَهْطٍ لفظ رھط، جماعت کے معنے میں آتا ہے، یہاں نو اشخاص میں سے ہر شخص کو رھط کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مال و دولت اور جاہ و حشم کے سبب قوم کے بڑے مانے جاتے تھے اور ہر ایک کیساتھ الگ الگ جماعتیں تھیں اس لئے ان نو آدمیوں کو نو جماعتیں فرمایا۔ یہ لوگ قوم صالح علیہ السلام کی بستی یعنی حجر کے بڑے مانے جاتے تھے۔ حجر ملک شام میں معروف مقام ہے۔ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ،

مطلب یہ تھا کہ ہم سب مل کر رات کے اندھیرے میں ان پر اور ان کے متعلقین پر چھاپہ ماریں، سب کو ہلاک کر دیں، پھر انکے خون کا دعویدار وارث تحقیق و تفتیش کے لئے کھڑا ہوگا تو ہم یہ کہدیں گے کہ ہم نے تو فلاں آدمی کو نہ مارا، نہ مارتے کسی کو دیکھا۔ اور ہم اپنے اس قول میں اسلئے سچے ہونگے کہ رات کے اندھیرے میں یہ تعیین کہ کس نے کس کو مارا ہمیں معلوم نہیں ہوگی۔

اس میں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ یہ کفار اور ان میں سے بھی چیدہ بدمعاش جو فساد میں معروف تھے یہ سارے کام شرک کفر اور قتل و غارتگری کے کر رہے ہیں اور کوئی فکر نہیں، مگر ان کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہم جھوٹ نہ بولیں یا جھوٹے قرار نہ دیئے جاویں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جھوٹ کیسا بڑا گناہ ہے، کہ سارے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب بھی اپنی شرافتِ نفس اور عزت کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے پر اقدام نہ کرتے تھے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ غور ہے کہ جس شخص کو ان لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا ولی قرار دیا ہے وہ تو انہی اہلِ صالح میں شامل تھا اس کو قتل کے ارادہ سے کیوں چھوڑ دیا۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ ولی خاندانی اعتبار سے ولی ہو مگر کافر ہو کافروں کیساتھ ملا ہوا ہو صالح علیہ السلام اور ان کے متعلقین کے قتل کے بعد وہ ان کے خون کا دعویٰ اپنے نسبی تعلق کی بناء پر کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہی ہو مگر کوئی بڑا آدمی ہو جس کے قتل کرنے سے اپنی قوم میں اختلاف و انتشار کا خطرہ ہو اسلئے اسکو چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو بے حیائی اور تم دیکھتے ہو

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر للچا کر عورتوں کو چھوڑ کر کوئی نہیں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا

بے سمجھ ہو پھر اور کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہتے تھے نکال دو

اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ

لوط کے گھر کو اپنے شہر سے یہ لوگ ہیں ستھرے رہا چاہتے پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور

اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ

اسکے گھر والوں کو، مگر اس کی عورت مقرر کر دیا تھا ہم نے اسکو رہ جانے والوں میں اور برسا دیا ہم نے ان پر

مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ

برساؤ پھر کیا برا برساؤ تھا ان ڈرائے ہوؤں کا تو کہہ تعریف ہے اللہ کو اور سلام ہے

ع ۴
۱۶

عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۗ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اس کے بندوں پر جن کو اُس نے پسند کیا بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک کرتے ہیں

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (پیغمبر کر کے اُن کی قوم کے پاس) بھیجا تھا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کیا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ سمجھدار ہو (کیا اس کی بُرائی نہیں سمجھتے، آگے اُس بے حیائی کا بیان ہے یعنی) کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اس کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی) بلکہ (اس معاملہ میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو (اس تقریر کا) اُن کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اسکے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو (یعنی ان پر ایمان لانیوالوں کو مع ان کے) تم اپنی بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں سو (جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی تو) ہمنے (اُس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (اس عذاب سے) بچالیا بجز اُن کی بیوی کے کہ اس کو (بوجہ ایمان نہ لانیکے) ہمنے انہیں لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو اُن پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے اُن پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو اُن لوگوں کا کیسا بُرا مینہ تھا جو (اول عذاب خدا سے) ڈرائے گئے تھے (جس پر انہوں نے التفات نہ کیا، آپ ربیت توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے (یعنی انبیاء وغیرہ۔ آگے مضمون ہماری طرف سے بیان کیجئے وہ یہ کہ لوگو بتلاؤ کہ ایک کمالات و احسانات میں) اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں (بہتر ہیں) جن کو (الوہیت میں) شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی ظاہر اور مسلّم ہے کہ اللہ ہی بہتر ہے پس مستحق عبادت بھی وہی ہوگا)۔

معارف و مسائل

اس قصے کے متعلق قرآن میں متعدد جگہ خصوصاً سورۂ اعراف میں ضروری مضامین بیان ہو چکے ہیں وہاں دیکھ لئے جاویں۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، انبیاء سابقین اور اُن کی اُمتوں کے کچھ حالات اور اُن پر عذاب آنے کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ آپ کی اُمت کو دُنیا کے عذاب عام سے مامون کر دیا گیا ہے۔ اور انبیاء سابقین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجئے، جمہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے اس کا مخاطب بھی حضرت لوط علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ اصْطَفٰى کے الفاظ سے ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مراد ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے صحابۂ کرام ہیں، سفیان ثوری نے اسی کو اختیار کیا ہے (اخرجہ عبد بن حمید والبزار وابن جریر وغیرہم)

اگر آیت میں اَلَّذِیْنَ اصْطَفٰی سے مراد صحابۂ کرام لئے جائیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے تو اس آیت سے غیر انبیاء پر سلام بھیجنے کے لئے اُنھیں علیہ السلام کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق سورۂ احزاب میں آیت صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا کی تفسیر میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ: اس آیت سے خطبہ کے آداب بھی ثابت ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور انبیاء علیہم السلام پر درود و سلام سے شروع ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تمام خطبات میں یہی معمول رہا ہے بلکہ ہر اہم کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام مسنون و مستحب ہے۔ (کذا فی الروح)

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا

بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اُتار دیا تمہارے لئے آسمان سے پانی پھر اُگائے ہم نے

بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ

اس سے باغ رونق والے تمہارا کام نہ تھا کہ اُگاتے اُن کے درخت اب کوئی اور

مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا

حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کے لائق

وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ

اور بنائیں اس کے بیچ میں ندیاں اور رکھے اس کے ٹھہرانے کو بوجھ اور رکھا دو

الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

دریا میں پردہ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

بھلا کون پہنچتا ہے بے کس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور دُور کر دیتا ہے سختی اور کرتا ہے تم کو نائب

خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَمَّنْ

اگلوں کا زمین پر اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تم بہت کم دھیان کرتے ہو بھلا کون

يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ

راہ بتاتا ہے تم کو اندھیروں میں جنگل کے اور دریا کے اور کون چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اس کی

يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَمَّنْ

رحمت سے پہلے اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ اللہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو شریک بتلاتے ہیں بھلا

يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۗ

کون سرے سے بناتا ہے پھر اس کو دہرائے گا اور کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تو کہہ لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو

خلاصۂ تفسیر

(پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ یعنی کیا اللہ بہتر ہے یا وہ بُت وغیرہ جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، یہ مشرکین کی بے وقوفی بلکہ کج فہمی پر نکیر تھی، آگے توحید کے دلائل کا بیان ہے، اے لوگو یہ بتلاؤ کہ) وہ ذات (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اُس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اسکے ذریعہ ہم نے رونق دار باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم اُن (باغوں) کے درختوں کو اُگا سکو (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں کو خدا کی برابر ٹھہراتے ہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کی) قرارگاہ بنایا اور اسکے درمیان درمیان نہریں بنائیں اور اس (زمین) کے (ٹھہرانے کے) لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حدِ فاصل بنائی (جیسا سورۂ فرقان میں مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ آچکا ہے یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (خدائی کا شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ اُن میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی دُعا سنتا ہے جب وہ اُس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سُوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو (بارش کی اُمید دلاکر دلوں کو خوش کر دیتی ہیں (یہ سُنکر اب بتلاؤ) کیا اللہ کے ساتھ شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے برتر ہے (اچھا پھر دوسرے کمالات و احسانات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو مخلوقات کو اوّل بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دیگا اور جو آسمان اور زمین سے (پانی برساکر اور نباتات نکالکر) تم کو رزق دیتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (اور اگر وہ یہ سُنکر بھی کہیں کہ ہاں اور معبود بھی مستحقِ عبادت ہیں تو) آپ کہیئے کہ (اچھا) تم (اُن کے استحقاقِ عبادت پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعوٰی میں) سچے ہو۔

معارف و مسائل

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ، المُضْطَرّ، اضطرار سے مشتق ہے کسی ضرورت سے مجبور و بے قرار ہونے کو اضطرار کہا جاتا ہے اور وہ جبھی ہوتا ہے جب اسکا کوئی یار و مددگار اور سہارا نہ ہو۔ اسلئے مضطر وہ شخص ہے جو سب دُنیا کے سہاروں سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو فریاد رس سمجھ کر اسکی طرف متوجہ ہو۔ مضطر کی یہ تفسیر سُدی، ذو النون مصری، سہل بن عبداللہ وغیرہ سے منقول ہے (قرطبی) رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ان الفاظ سے دُعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِیْٓ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ (ترجمہ) یا اللہ میں تیری رحمت کا اُمید وار ہوں اسلئے مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی میرے اپنے نفس کے حوالہ نہ کیجئے اور آپ ہی میرے سب کاموں کو درست کر دیجئے آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (قرطبی)

مضطر کی دُعا اخلاص کی بنا پر ضرور قبول ہوتی ہے | امام قرطبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دُعا قبول کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور اس آیت میں اس کا اعلان بھی فرما دیا ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے سب سہاروں سے مایوس اور علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھ کر دعا کرنا سرمایۂ اخلاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا بڑا درجہ ہے وہ جس کسی بندہ سے پایا جائے وہ مومن ہو یا کافر، اور متقی ہو یا فاسق فاجر اسکے اخلاص کی برکت سے اسکی طرف رحمت حق متوجہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے کفار کا حال ذکر فرمایا ہے کہ جب یہ لوگ دریا میں ہوتے ہیں اور کشتی سب طرف سے موجوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور یہ گویا آنکھوں کے سامنے اپنی موت کو کھڑا دیکھ لیتے ہیں اسوقت یہ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے آپ نجات دیدیں تو ہم شکر گزار ہونگے لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کی دُعا قبول کر کے خشکی پر لے آتے ہیں تو یہ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (الیٰ قولہ) فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ، ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین دُعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، ایک مظلوم کی دُعا، دوسرے مسافر کی دُعا، تیسرے باپ جو اپنی اولاد کے لئے بد دُعا کرے۔ قرطبی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا کہ ان تینوں دُعاؤں میں بھی وہی صورت ہے جو دُعائے مضطر میں اوپر لکھی گئی ہے کہ جب کوئی مظلوم دُنیا کے سہاروں اور مددگاروں سے مایوس ہو کر دفع ظلم کے لئے اللہ کو پکارتا ہے وہ بھی مضطر ہی ہوتا ہے اسی طرح مسافر حالتِ سفر میں اپنے خویش و عزیز اور ہمدردوں غمگساروں سے الگ بے سہارا ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ اولاد کے لئے اپنی فطرت اور پدری شفقت کی بنا پر کبھی بد دعا نہیں کر سکتا بجز اسکے کہ اسکا

دل بالکل ٹوٹ جائے اور اپنے آپ کو مصیبت سے بچانے کے لئے اللہ کو پکارے۔ امام حدیث آجری نے حضرت ابوذر رضؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ میں مظلوم کی دعا کو کبھی رد نہیں کرونگا اگرچہ وہ کسی کافر کے منہ سے ہو (قرطبی) اگر کسی مضطر یا مظلوم یا مسافر وغیرہ کو کبھی یہ محسوس ہو کہ اسکی دعا قبول نہیں ہوئی تو بدگمان اور مایوس نہ ہو بعض اوقات دعا قبول تو ہوجاتی ہے مگر کسی حکمت و مصلحت ربانی سے اسکا ظہور دیر میں ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اپنے نفس کو ٹٹولے کہ اسکے اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کمی کوتاہی رہی ہے۔ واللہ اعلم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَ

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ اور

مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

اُن کو خبر نہیں کب جلائے جائیں گے بلکہ تھک کر گر گیا اُن کا فکر آخرت کے بارے میں

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۡ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں اور بولے وہ لوگ جو

كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ

منکر ہیں کیا جب ہم ہو جائیں مٹی اور ہمارے باپ دادے کیا ہم کو زمین سے نکالیں گے وعدہ

وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ

پہنچ چکا ہے اسکا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اگلوں کی تو کہدے پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام کار

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا

گناہگاروں کا اور غم نہ کر ان پر اور نہ خفا ہو ان کے فریب

يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾

بنانے سے اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ

تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہو بعضی وہ چیز جس کی جلدی کر رہے ہو اور

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

تیرا رب تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر پر اُن میں بہت لوگ شکر نہیں کرتے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَمَا مِنْ
اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے اُن کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز
غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾
نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں

خلاصۂ تفسیر

ربط آیات اُوپر نبوّت کے بعد توحید کا ذکر ہو چکا، آگے معاد یعنی قیامت اور آخرت کا ذکر ہے جس کی طرف دلائل توحید میں اس قول سے اجمالی اشارہ بھی ہوا ہے (ثُمَّ يُعِيْدُهٗ) اور چونکہ کفار اس کی تکذیب کی ایک وجہ یہ بھی قرار دیتے تھے کہ قیامت کا معین وقت پُوچھنے پر بھی نہیں بتلایا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یعنی وہ عدم تعیین کو عدم وقوع کی دلیل بناتے تھے اسلئے اس مضمون کو اس بات سے شروع کیا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے فرمایا قُلْ لَّا يَعْلَمُ الخ (جس میں اُن کے شبہ کا جواب بھی ہو گیا) قیامت کی تعیین کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر ان کے شک و انکار پر تشنیع ہے (بَلِ ادّٰرَكَ) پھر اُن کے ایک انکاری قول کی نقل ہے (وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا) پھر اس انکار پر تہدید ہے (قُلْ سِيْرُوْا) پھر اس انکار پر آپ کی تسلی ہے وَلَا تَحْزَنْ پھر اس تہدید کے متعلق انکے ایک شبہ کا جواب ہے (وَيَقُوْلُوْنَ الخ) پھر تہدید کی تاکید ہے وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ الخ جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہو گا۔

(یہ لوگ جو قیامت کا وقت نہ بتلانے سے اسکے عدم وقوع پر استدلال کرتے ہیں اسکے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا لازم آیا کہ مجھ سے اور تم سے اس تعیین کا علم غائب رہا سو اس میں اسی کی کیا تخصیص ہے غیب کی نسبت تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین (یعنی عالم) میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور (اسی وجہ سے) ان (مخلوقات) کو یہ خبر (بھی) نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جاویں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کو تو بے تبلائے سب معلوم ہے اور کسی کو بے بتلائے کچھ بھی معلوم نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے اُمور جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا واقع ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حکمت سے بعض علوم کا پردہ غیب میں رکھنا منظور ہے قیامت کی تعیین بھی انہی اُمور میں ہے اسی لئے مخلوق کو اسکا علم نہیں دیا گیا مگر اس سے عدم وقوع کیسے لازم آگیا اور یہ عدم علم بالتعیین تو سب میں امر مشترک ہے لیکن ان کفار منکرین میں صرف یہی نہیں کہ وہ بالتعیین قیامت

کو نہیں مانتے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ) آخرت کے بارے میں (خود) ان کا (نفس) علم (بالوقوع ہی) نیست ہوگیا (یعنی خود اس کے وقوع ہی کا علم نہیں جو تعیین کے علم نہ ہونے سے بھی اشد ہے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ لوگ اس (کے وقوع) سے شک میں ہیں، بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (یعنی جیسے اندھے کو راستہ نظر نہیں آتا اسلئے مقصود تک پہنچنا مستبعد ہے اسی طرح تصدیق بالآخرت کا جو ذریعہ ہے یعنی دلائل صحیحہ یہ لوگ انتہائی عناد کی وجہ سے ان دلائل میں غور و تامل ہی نہیں کرتے اس لئے وہ دلائل ان کو نظر نہیں آتے جس سے مطلوب تک پہنچ جانے کی اُمید ہوتی۔ پس یہ شک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ شک والا بعض اوقات دلائل میں نظر کر کے رفع شک کر لیتا ہے اور یہ نظر بھی نہیں کرتے) اور (اس تشنیع علی الکفار کے بعد آگے ان کا ایک انکاری قول نقل فرماتے ہیں کہ) یہ کافر یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم لوگ جب (مر کر) خاک ہوگئے اور (اسی طرح) ہمارے بڑے بھی تو کیا (پھر) ہم (زندہ کر کے قبروں سے) نکالے جاویں گے اسکا تو ہم سے اور ہمارے بڑوں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) پہلے سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے (کیونکہ تمام انبیاء کا یہ قول مشہور ہے لیکن نہ آج تک ہوا اور نہ کسی نے بتلایا کہ کب ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں آپ کہدیجئے کہ (جب اس کے امکان پر دلائل عقلیہ اور وقوع پر دلائل نقلیہ جابجا بار بار تم کو سُنا دیئے گئے ہیں تو تم کو تکذیب سے باز آنا چاہئے ورنہ جو اور مکذبین کا حال ہوا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہوئے وہی تمہارا حال ہوگا۔ اگر ان کی حالت میں کچھ شبہ ہو تو) تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا (کیونکہ اُن کے ہلاک ہونے اور عذاب آنے کے آثار اب تک باقی تھے) اور (اگر باوجود ان مواعظ بلیغہ کے پھر مخالفت پر کمربستہ رہیں تو) آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہوجئے (کہ اور انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے) اور (قُلْ سِيرُوا الخ میں اور اسکے امثال دوسری آیات میں جو ان کو وعید عذاب سُنائی جاتی ہے تو چونکہ دل میں تصدیق نہیں اسلئے) یہ لوگ (بے باکانہ) یُوں کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (عذاب و قہر کا) کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہدیجئے کہ عجب نہیں کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہی آ لگا ہو اور (اب تک جو دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے (اس رحمتِ عامہ کی وجہ سے قدرے مہلت دے رکھی ہے) ولیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے (کہ تاخیر کو غنیمت سمجھیں اور اس مہلت میں حق کی طلب کریں اور اس کو قبول کرلیں کہ عذاب سے نجات ابدی حاصل ہو بلکہ بالعکس انکار اور بطور استہزاء کے جلد بازی کرتے ہیں) اور (یہ تاخیر جو نکہ بمصلحت ہے اس لئے یہ نہ سمجھیں کہ ان افعال کی کبھی سزا ہی نہ ہوگی کیونکہ) آپ

کے رب کو سب خبر ہے جو کچھ ان کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں اور (یہ صرف علم خداوندی ہی نہیں بلکہ دفتر خداوندی میں لکھا ہوا ہے جس میں کچھ ان ہی کے افعال کی تخصیص نہیں بلکہ) آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو (اور دفتر خداوندی یہی لوح محفوظ ہے اور جب مخفی چیزیں جن کو کوئی نہیں جانتا اس میں موجود ہیں تو ظاہر چیزیں تو بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔ غرض انکا عمل حق تعالیٰ کو خبر ہے اور آسمانی دفتر میں بھی محفوظ ہیں اور وہ اعمال خود سزا کے مقتضی بھی ہیں اور سزا کے واقع ہونے پر سب انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اخبار صادقہ بھی متفق ہیں۔ پھر یہ سمجھنے کی کیا گنجائش ہے کہ سزا نہ ہوگی، البتہ دیر ہونا ممکن ہے چنانچہ بعض سزائیں ان منکرین کو دنیا میں بھی ہوئیں جیسے قحط، قتل، قید وغیرہ اور کچھ قبر و برزخ میں ہوں گی جو کچھ دور نہیں، اور کچھ آخرت میں ہوں گی)۔

معارف و مسائل

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ جتنی مخلوق آسمانوں میں ہے جیسے فرشتے اور جتنی مخلوق زمین میں ہے جیسے بنی آدم اور جنات وغیرہ ان میں سے کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔ آیت مذکورہ نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی فرشتہ یا نبی و رسول بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کی ضروری تفصیل سورۂ انعام کی آیت نمبر ۵۹ کے تحت صفحہ ۳۵۲ جلد ۳ پر آ چکی ہے۔ اسکے علاوہ اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ بنام کشف الریب عن علم الغیب احکام القرآن (۶ بی) کا جزء بنکر شائع ہو چکا ہے۔ اہل علم اس کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ، لفظ ادّٰرک میں قرائتیں بھی مختلف ہیں اور اس کے معنی میں بھی کئی قول ہیں۔ اہل علم اس کی تفصیل تفاسیر میں دیکھ سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ادّٰرک کے معنے بعض مفسرین نے تکامل کے کئے ہیں اور فی الاخرۃ کو ادّٰرک سے متعلق کر کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ آخرت میں ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہو جائیگا کیونکہ اسوقت ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی مگر اسوقت علم ہونا ان کے کچھ کام نہ آئے گا کیونکہ دنیا میں وہ آخرت کی تکذیب کرتے رہے تھے۔ اور بعض مفسرین نے لفظ ادّٰرک کے معنے ضلّ و غاب کے لئے اور فی الاٰخرۃ کو علمہم سے متعلق کیا کہ آخرت کے معاملہ میں ان کا علم غائب ہو گیا اس کو نہ سمجھ سکے۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ
یہ قرآن سُناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جس میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٧٦﴾ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾ إِنَّ
وہ جھگڑ رہے ہیں اور بیشک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے تیرا

رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُم بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى
رب اُن میں فیصلہ کریگا اپنی حکومت سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا سو تو بھروسہ کر

اللَّهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿٧٩﴾
اللہ پر بیشک تو ہے صحیح کھلے رستہ پر

خُلاصۂ تفسیر

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر اُن باتوں (کی حقیقت) کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمانداروں کے لئے (خاص) ہدایت اور (خاص) رحمت ہے (ہدایت باعتبار طاعات واعمال کے اور رحمت باعتبار ثمرات و نتائج کے) بالیقین آپ کا رب اُن کے درمیان اپنے حکم سے (وہ عملی) فیصلہ (قیامت کے دن) کر یگا (اُس وقت معلوم ہو جاویگا کہ دینِ حق کیا تھا اور باطل کیا، تو ایسے لوگوں پر کیا افسوس کیا جائے) اور وہ زبردست علم والا ہے (بدون اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا) تو آپ اللہ پر توکل رکھئے (اللہ کی مدد ضرور ہوگی کیونکہ) آپ صریح حق پر ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو مختلف مثالوں سے ثابت کر کے یہ بات ثابت کردی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع اور اُسمیں مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن ہے اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں۔ عقلی امکان کے ساتھ اسکا ضرور واقع ہونا یہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی نقل سے ثابت ہے اور کسی خبر کا صحیح اور ثابت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اسکا ناقل مخبر اور روایت کرنے والا صادق اور سچا ہو۔ اسلئے اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اسکا مخبر قرآن ہے اور اُسکا مخبر صادق ہونا ناقابلِ انکار ہے۔ یہانتک کہ علماء بنی اسرائیل جن مسائل میں باہم سخت اختلافات رکھتے تھے اور وہ حل نہ ہوتے تھے. قرآن حکیم نے اُن مسائل میں محاکمہ کر کے صحیح فیصلوں کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے اختلاف میں محاکمہ اور فیصلہ کرنے والا ان سب علماء سے اعلم اور اعلیٰ ہونا ضروری ہے اسلئے قرآن کا مخبر صادق

ہونا واضح ہوگیا، اسکے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کی مخالفت سے تنگدل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود آپ کا فیصلہ کرنے والا ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حق کے ساتھ ہے اور آپ کا طریق حق پر ہونا یقینی ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾

البتہ تو نہیں سنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سُنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ بیٹھ پھیر کر

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ

اور نہ تو دکھلا سکے اندھوں کو جب وہ راہ سے بچلیں تو تو سُناتا ہے اُس کو جو یقین رکھتا ہو

بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

ہماری باتوں پر، سو وہ حکمبردار ہیں

خلاصۂ تفسیر

آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سُنا سکتے ہیں (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلدیں اور نہ آپ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے (بچاکر) رستہ دکھانے والے ہیں، آپ تو صرف اُن ہی کو سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں۔

معارف و مسائل

ہمارے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے ساتھ جو شفقت و ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اُسکا تقاضا تھا کہ سب کو اللہ کا پیغام سُناکر جہنم سے بچالیں جو لوگ اس پیغام کو قبول نہ کرتے تو آپکو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور آپ ایسے غمگین ہوتے تھے جیسے کسی کی اولاد اسکے کہنے کے خلاف آگ میں جا رہی ہو۔ اسلئے قرآن نے جابجا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے مختلف عنوانات اختیار فرمائے ہیں۔ سابقہ آیات میں وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِىْ ضَيْقٍ، اسی سلسلہ کا ایک عنوان تھا۔ مذکور الصدر آیت میں بھی تسلی کا مضمون دوسرے انداز سے بیان فرمایا ہے کہ آپ کا کام پیغام حق کو پہنچا دینے کا وہ آپ پورا کر چکے ہیں جن لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا اسمیں آپ کا کوئی قصور اور کوتاہی نہیں جس پر آپ غم کریں بلکہ وہ اپنی صلاحیت قبول ہی کو کھو چکے ہیں۔ ان کے گم کردہ صلاحیت ہونے کو اس آیت میں قرآن کریم نے تین مثالوں میں ثابت کیا ہے۔ اول یہ کہ یہ لوگ قبولِ حق کے معاملہ میں بالکل مُردہ لاش کی طرح ہیں جو کسی کی بات سُن کر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ان کی مثال اُس بہرے آدمی کی ہے جو

بہرا ہونے کے ساتھ بات سننا بھی نہیں چاہتا بلکہ جب کوئی سنانا چاہے تو اُس سے پیٹھ موڑ کر بھاگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی مثال اندھوں کی سی ہے کہ کوئی ان کو راستہ دکھانا بھی چاہے تو وہ نہیں دیکھ سکتے۔ ان تین مثالوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ، یعنی آپ تو صرف ایسے ہی لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں اور اطاعت قبول کریں۔ اس پورے مضمون میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس جگہ سُننے سُنانے سے مراد محض کانوں میں آواز پہنچنا نہیں بلکہ مراد اس سے وہ سماع اور سُننا ہے جو نفع بخش ہو۔ جو سماع نافع نہ ہو اس کو قرآن نے مقصد کے اعتبار سے عدم سماع سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آخر آیت میں یہ ارشاد کہ آپ تو صرف اُن لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ایمان لائیں۔ اگر اسمیں سُنانے سے مراد محض اُن کے کان تک آواز پہنچانا ہوتا تو قرآن کا یہ ارشاد خلاف مشاہدہ اور خلاف واقع ہو جاتا کیونکہ کافروں کے کانوں تک آواز پہنچانے اور اُن کے سُننے جواب دینے کی شہادتیں بے شمار ہیں کوئی بھی اسکا انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوا کہ سُنانے سے مراد سماع نافع ہے انکو مُردہ لاش سے تشبیہ دیکر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اس کے معنے بھی یہی ہوئے کہ جیسے مُردے اگر کوئی بات حق کی سُن بھی لیں اور اسوقت وہ حق کو قبول کرنا بھی چاہیں تو یہ انکے لئے نافع نہیں، کیونکہ وہ دُنیا کے دار العمل سے گزر چکے ہیں جہاں ایمان و عمل نافع ہو سکتا تھا مرنے کے بعد برزخ یا محشر میں تو سبھی کافر منکر ایمان و عمل صالح کی تمنائیں کریں گے مگر وہ وقت ایمان و عمل کے قبول ہونیکا وقت نہیں۔ اس لئے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مُردے کوئی کلام کسی کا سُن ہی نہیں سکتے اسلئے سماع اموات کے مسئلہ سے درحقیقت یہ آیت ساکت ہے یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ نظر ہے کہ مُردے کسی کلام کو سُن سکتے ہیں یا نہیں؛

مسئلہ سماع اموات یہ مسئلہ کہ مُردے کوئی کلام سُن سکتے ہیں یا نہیں اُن مسائل میں سے ہے جنمیں خود صحابہ کرام کا باہم اختلاف رہا ہے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سماع موتی کو ثابت قرار دیتے ہیں اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہؓ اس کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لئے دوسرے صحابہ و تابعین میں بھی دو گروہ ہو گئے بعض اثبات کے قائل ہیں بعض نفی کے۔ اور قرآن کریم میں یہ مضمون ایک تو اسی موقع پر سورۂ نمل میں آیا ہی دوسرے سورۂ روم میں تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ دوسری آیت آئی ہے اور سورۂ فاطر میں یہ مضمون ان الفاظ سے آیا ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ، یعنی آپ اُن لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ مُردے سُن نہیں سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سُنا سکتے۔ تینوں آیتوں میں اس تعبیر عنوان کو اختیار کرنے سے اسطرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مُردوں میں سُننے کی صلاحیت تو ہو سکتی ہی

مگر ہم باختیار خود اُن کو نہیں سُنا سکتے۔

ان تینوں آیتوں کے بالمقابل ایک چوتھی آیت جو شہدا کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شہدار کو اپنی قبروں میں ایک خاص قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے اور اس زندگی کے مطابق رزق بھی انکو ملتا ہے اور اپنے پسماندہ متعلقین کے متعلق بھی منجانب اللہ ان کو بشارت سُنائی جاتی ہے۔ آیت یہ ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ، یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد بھی روحِ انسانی میں شعور و ادراک باقی رہ سکتا ہے بلکہ شہدار کے معاملہ میں اسکے وقوع کی شہادت بھی یہ آیت دے رہی ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ یہ حکم تو شہیدوں کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اموات کے لئے نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوگیا کہ مرنے کے بعد بھی روحِ انسانی میں شعور و ادراک اور اس دُنیا کیساتھ علاقہ باقی رہ سکتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہدار کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُن کی ارواح کا تعلق انکے اجساد اور قبور کے ساتھ قائم رہتا ہے اسی طرح جب اللہ تعالیٰ چاہیں تو دوسرے اموات کو یہ موقع دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو سماعِ اموات کے قائل ہیں انکا یہ قول بھی ایک صحیح حدیث کی بنار پر ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سندِ صحیح کے ساتھ منقول ہے وہ یہ ہے۔

ما من احد یمر بقبر اخیه المسلم کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیه الا رد اللہ علیه روحه حتی یرد علیه السلام (ذکرہ ابن کثیر فی تفسیرہ مصححا عن ابن عمرؓ)

جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر گذرتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا اور وہ اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اُس مردہ کی روح اس میں واپس بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ سلام کا جواب دے۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص اپنے مُردہ مسلمان بھائی کی قبر پر جاکر سلام کرتا ہے تو وہ مردہ اسکے سلام کو سُنتا ہے اور جواب دیتا ہے اور اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت اس کی رُوح اس دُنیا میں واپس بھیجدیتے ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ مُردے سُن سکتے ہیں دوسرے یہ کہ اُن کا سننا اور ہمارا سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں سُنا دیں، جب نہ چاہیں نہ سُنائیں۔ مسلمان کے سلام کرنے کے وقت تو اس حدیث نے بتلا دیا کہ حق تعالیٰ مُردہ کی روح واپس لاکر اسکو سلام سُنا دیتے ہیں اور اس کو سلام کا جواب دینے کی بھی قدرت دیتے ہیں۔ باقی حالات و کلمات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ مُردہ ان کو سُنے گا یا نہیں۔ اسی لئے امام غزالی اور علامہ سبکی وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ اتنی بات تو احادیثِ صحیحہ اور قرآن کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات میں مُردے زندوں کا کلام سُنتے ہیں لیکن یہ ثابت نہیں کہ ہر مُردہ

ہر حال میں ہر شخص کے کلام کو ضرور سنتا ہے اس طرح آیات و روایات کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مردے ایک وقت میں احیاء کے کلام کو سن سکیں دوسرے وقت نہ سن سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کلام کو سنیں بعض کے کلام کو نہ سنیں، یا بعض مردے سنیں بعض نہ سنیں، کیونکہ سورۂ نمل، سورۂ روم، سورۂ فاطر کی آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مردوں کو سنانا ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سنا دیتے ہیں اس لئے جن مواقع میں حدیث کی روایات صحیحہ سے سننا ثابت ہے وہاں سننے پر عقیدہ رکھا جائے اور جہاں ثابت نہیں وہاں دونوں احتمال ہیں اسلئے نہ قطعی اثبات کی گنجائش ہے نہ قطعی نفی کی ۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اس مسئلہ کی مکمل تحقیق میں احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام تکمیل الحبور بسماع اہل القبور لکھا ہے جو احکام القرآن سورۂ روم حزب خامس میں بزبان عربی شائع ہوا ہے جس میں آیات و روایات اور اقوال سلف و خلف اور شرح الصدور وغیرہ سے بہت سے واقعات دنیا اہل قبور کے نقل کئے گئے ہیں۔ اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے یہاں اسکا ضروری خلاصہ لکھا گیا ہے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ	
اور جب پڑ چکے گی اُن پر بات نکالیں گے ہم اُن کے آگے ایک جانور زمین سے اُن سے باتیں کرے گا	
أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾	
اسواسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے	

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان (لوگوں) پر پورا ہونے کو ہوگا (یعنی قیامت کا زمانہ قریب آپہنچیگا) تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ ان سے باتیں کریگا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر (خصوصاً ان آیتوں پر جو قیامت کے متعلق ہیں) یقین نہیں لاتے تھے (مگر اب قیامت آپہنچی اس کی علامتوں میں ایک علامت میرا ظہور بھی ہے)۔

معارف و مسائل

دابۃ الارض کیا ہے اور کہاں اور کب نکلے گا

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (۱) آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہونا (۲) دخان (۳) دابہ (۴)

خروج یاجوج ماجوج (۵) نزول عیسیٰ علیہ السلام (۶) دجال (۷، ۸، ۹) تین خسوف، ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جزیرۃ العرب میں ہوگا (۱۰) ایک آگ جو قعر عدن سے نکلے گی اور سب لوگوں کو ہنکا کر میدانِ حشر کی طرف لے آئیگی جس مقام پر لوگ رات گزارنے کے لئے ٹھہرینگے یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی پھر اُن کو لے چلے گی (ہکذا رواہ مسلم واہل السنن من طرق وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

اس حدیث سے قربِ قیامت میں زمین سے ایک ایسے جانور کا نکلنا ثابت ہوا جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور لفظ دابۃ کی تنوین میں اس جانور کے عجیب الخلقت ہونے کی طرف بھی اشارہ پایا گیا، اور یہ بھی کہ یہ جانور عام جانوروں کی طرح توالد و تناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا اور یہ بات بھی اسی حدیث سے سمجھ میں آتی ہے کہ دابۃ الارض کا خروج بالکل آخری علامات میں سے ہوگا جس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی۔ ابنِ کثیر نے بحوالہ ابوداؤد طیالسی حضرت طلحہ بن عمرؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ یہ دابۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائیگا لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے ایک جماعت رہ جائے گی یہ دابہ اُن کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کردے گا۔ اسکے بعد وہ زمین کی طرف نکلے گا، ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگادے گا۔ کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا یہ ہر مومن و کافر کو پہچانے گا (ابن کثیر) اور مسلم بن حجاج نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی جس کو میں کبھی بھولتا نہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دابۃ الارض نکلے گا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہوجائے اسکے فوراً بعد قیامت آجائے گی۔ (ابن کثیر)

شیخ جلال الدین محلی نے فرمایا کہ خروج دابہ کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام منقطع ہوجائیں گے اور اسکے بعد کوئی کافر اسلام قبول نہ کرے گا۔ یہ مضمون بہت سی احادیث و آثار سے مستنبط ہوتا ہے (مظہری) ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ دابۃ الارض کی ہیئت اور کیفیات و حالات کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں جنمیں سے اکثر قابلِ اعتماد نہیں اسلئے جتنی بات قرآن کی آیات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ عجیب الخلقت جانور ہوگا۔ بغیر توالد و تناسل کے زمین سے نکلے گا۔ اسکا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا پھر ساری دنیا میں پھرے گا۔ یہ کافر و مومن کو پہچانے گا۔ اور اُن سے کلام کریگا۔ بس اتنی بات پر عقیدہ رکھا جائے، زائد کیفیات و حالات کی تحقیق و تفتیش نہ ضروری ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ دابۃ الارض لوگوں سے کلام کرے گا اسکا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ

اُسکا کلام یہی ہوگا جو قرآن میں مذکور ہے اِنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ، یہ کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو سُنائے گا، بہت سے لوگ آج سے پہلے ہماری آیتوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اُن سب کو یقین ہو جائے گا مگر اسوقت کا یقین شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔ اور حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ سے منقول ہے اور ایک روایت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی ہے کہ یہ دابۃ لوگوں سے خطاب اور کلام کرے گا جس طرح عام کلام ہوتا ہے (ابن کثیر)

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿٨٣﴾

اور جس دن گھیر بلائیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو پھر اُنکی جماعت بندی ہوگی

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا

یہاں تک کہ جب حاضر ہو جائیں فرمایا کیوں جھٹلایا تم نے میری باتوں کو اور نہ آ چکیں تمہاری سمجھ میں یا کیا

ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾

کیا کرتے تھے اور پڑ چکی اُن پر بات اس واسطے کہ انھوں نے شرارت کی تھی اب وہ کچھ نہیں بول سکتے

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنائی رات کہ اسمیں چین حاصل کریں اور دن بنایا دیکھنے کو البتہ اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں اور جس دن پھونکی جائے گی صور تو گھبرا جائے

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ

جو کوئی ہے آسمان میں اور جو کوئی ہے زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے اور سب

اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ

چلے آئیں اسکے آگے عاجزی سے اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھے کہ وہ جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے

السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٨٨﴾

چلے بادل کاریگری اللہ کی جس نے درست کیا ہے ہر چیز کو اس کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ

جو کوئی لے کر آیا بھلائی تو اُس کو ملے اُس سے بہتر اور ان کو گھبراہٹ سے اس دن

اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ

امن ہے اور جو کوئی لے کر آیا برائی سو اوندھے ڈالیں اُن کے منہ آگ میں

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٠﴾

وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

جس دن (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ہم ہر امت میں سے (یعنی امم سابقہ میں سے بھی اور اس امت میں سے بھی) ایک ایک گروہ ان لوگوں کا (حساب کے لئے) جمع کریں گے جو میری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے (پھر ان کو موقف کی طرف حساب کے لئے روانہ کیا جائیگا اور چونکہ یہ کثرت سے ہونگے اسلئے) ان کو (چلنے میں پچھلوں سے آملنے کے واسطے) روکا جائے گا تاکہ آگے پیچھے نہ رہیں سب ساتھ ہو کر موقف حساب کی طرف چلیں۔ مراد اس سے کثرت کا بیان ہے کیونکہ بڑے مجمع میں عادۃً ایسا ہوتا ہے خواہ روک ٹوک ہو یا نہ ہو) یہاں تک کہ جب (چلتے چلتے موقف میں) حاضر ہو جاویں گے تو (حساب شروع ہوگا اور) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماویگا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم ان کو اپنے احاطہ علمی میں بھی نہیں لاتے (جسکے بعد غور کرنے کا موقع ملتا اور غور کر کے اس پر کچھ رائے قائم کرتے، مطلب یہ کہ سنتے ہی بلا تدبر و تفکر، ان کی تکذیب کر دی اور تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ (یاد تو کرو اسکے علاوہ) اور بھی کیا کیا کام کرتے رہے (مثلاً انبیاء کو اور اہل ایمان کو ایذائیں دیں جو تکذیب سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اور عقائد کفریہ اور فسق و فجور میں مبتلا رہے) اور (اب وہ وقت ہے کہ) ان پر (بوجہ قائم ہو جانے جرم کے) وعدہ (عذاب کا) پورا ہو گیا (یعنی سزا کا استحقاق ثابت ہو گیا) بوجہ اس کے کہ (دنیا میں) انھوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں (جن کا آج ظہور ثابت ہو گیا) سو (چونکہ ثبوت قوی ہے اسلئے) وہ لوگ (عذر وغیرہ کے متعلق) بات بھی نہ کر سکیں گے (اور بعض آیات میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ ابتدا میں ہوگا پھر بعد اقامت حجت کوئی بات نہ کہہ سکیں گے۔ اور یہ لوگ جو اثبات قیامت کے منکر ہیں تو حماقت محضہ ہے کیونکہ علاوہ دلائل نقلیہ صادقہ کے اس پر دلیل عقلی بھی تو قائم ہے مثلاً) کیا انھوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں (اور یہ آرام مشابہ موت کے ہے) اور دن بنایا جس میں دیکھیں بھالیں (جو کہ موقوف ہے بیداری پر اور وہ مشابہ حیات بعد الموت کے ہے پس) بلاشبہ اس (روزانہ خواب و بیداری) میں (امکان بعث پر اور ان آیات کے حق ہونے پر جو اس پر دال ہیں) بڑی دلیلیں ہیں (کیونکہ موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم سے زائل ہو جائے اور حیات ثانیہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلق پھر عود کر آئے، اور نیند بھی ایک حیثیت سے زوال ہے اس تعلق کا، کیونکہ نیند میں یہ تعلق ضعیف ہو جاتا ہے اور ضعف بھی ہوتا ہے جبکہ اسکے مراتب وجود میں کوئی مرتبہ زائل ہو جائے، اور بیداری اس زائل شدہ مرتبہ وجود کے عود کا نام ہے اس لئے دونوں میں تشابہ تام ہو گیا۔ اور نیند کے بعد بیداری پر اللہ تعالیٰ کی قدرت روزانہ مشاہدہ میں آتی ہے تو موت کے بعد زندگی بھی اس کی نظیر ہے وہ کیوں اللہ کی قدرت سے خارج ہوگا، اور

یہ دلیل عقلی ہر شخص کے لئے عام ہے مگر باعتبار انتفاع کے) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہے) جو ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، اور دوسرے تدبر نہیں کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نظر و فکر ضروری ہے اسلئے دوسرے اس سے منتفع نہیں ہوتے) اور (ایک واقعہ ہولناک اس حشر مذکور سے پہلے ہوگا جسکا آگے ذکر ہے اُس کی ہیبت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن صور میں پھونک ماری جاوے گی (یہ نفخہ اولی ہے اور حشر مذکور نفخہ ثانیہ کے بعد تھا) سو جتنے آسمان اور زمین میں (فرشتے اور آدمی وغیرہ) ہیں سب گھبرا جاویں گے (اور پھر مر جاویں گے اور جو مر چکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہو جاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس گھبراہٹ سے اور موت سے محفوظ رہے گا۔ مراد ان سے حسب حدیث مرفوع جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و ملک الموت و حاملان عرش ہیں پھر ان سب کی بھی بدون اثر نفخہ وفات ہو جاوے گی۔ کذا فی الدر المنثور۔ سورۃ الزمر) اور (دُنیا میں جیسے عادت ہے کہ جس سے گھبراہٹ اور ڈر ہوتا ہے اس سے بھاگ جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھاگ نہ سکے گا بلکہ) سب کے سب اُسی کے سامنے دبے جھکے حاضر رہیں گے (یہاں تک کہ زندہ آدمی مُردہ اور مُردے بیہوش ہو جاویں گے) اور (نفخہ کی یہ تغییر و تاثیر جانداروں میں ہوگی اور آگے بے جان چیزوں میں جو تاثیر ہوگی اسکا بیان ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) تو (اسوقت) پہاڑوں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا ہے جس سے (ان کے ظاہری استحکام کے سبب بادی النظر میں) تجھ کو خیال ہوتا ہے کہ یہ (ہمیشہ یوں ہی رہیں گے اور کبھی اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ (اسوقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ بادلوں کی طرح (متخلخل اور خفیف اور اجزاءِ منتشرہ ہو کر فضائے آسمانی میں) اُڑے اُڑے پھریں گے (کقولہ تعالیٰ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا، اور اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایسی ثقیل اور سخت چیز کا یہ حال کیسے ہو جاویگا، وجہ یہ کہ) یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) بنا رکھا ہے (اور ابتداء میں کسی شئی میں کوئی مضبوطی نہ تھی کیونکہ خود اس شئے کی ذات ہی نہ تھی، پس مضبوطی کی صفت تو بدرجۂ اولیٰ نہ تھی سو جیسے اس نے معدوم سے موجود اور ضعیف سے قوی بنایا اسی طرح اسکا عکس بھی کر سکتا ہے کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کی نسبت تمام مقدورات کے ساتھ یکساں ہے، بالخصوص جو چیزیں ایک دوسرے کی نظیر اور مشابہ ہیں ان میں تو زیادہ واضح ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات تو یہ آسمان و زمین وغیرہ میں تغیر عظیم ہونا دوسری آیات میں مذکور ہے وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ الخ پھر اسکے بعد نفخہ ثانیہ ہوگا جس سے ارواح ہوش میں آ کر اپنے ابدان سے متعلق ہو جاویں گی اور پورا عالم نئے سرے سے درست ہو جاویگا اور اوپر جو حشر کا ذکر تھا وہ اسی نفخہ ثانیہ کے بعد ہوگا۔ آگے اصل مقصود یعنی قیامت میں جزاء و سزا کا بیان ہے۔ پس اوّل اسکی تمہید کے طور پر ارشاد ہے کہ) یہ یقینی بات ہے

کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے (جو جزاء و سزا کی پہلی شرط ہے اور دوسری شرائط بھی مثل قدرت وغیرہا مستقل دلائل سے ثابت ہیں، پس مجازات کا ممکن ہونا تو اس سے ظاہر ہے اور پھر حکمت مقتضی ہے وقوع مجازات کو، اس سے جزاء و سزا کا واقع ہونا ثابت ہوگیا، تمہید کے بعد آگے اس کا وقوع مع اس کے قانون اور طریقہ کے بیان فرماتے ہیں کہ) جو شخص نیکی (یعنی ایمان) لاویگا سو (وہ ایمان لانے پر جس اجر کا مستحق ہے) اس شخص کو اس (نیکی کے اجر مذکور) سے بہتر (اجر) ملے گا اور وہ لوگ بڑی گھبراہٹ سے اس روز امن میں رہیں گے (جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ الآیۃ) اور جو شخص بدی (یعنی کفر و شرک) لاویگا تو وہ لوگ اوندھے منھ آگ میں ڈالدیئے جاویں گے (اور ان سے کہا جاویگا کہ) تم کو تو انہی اعمال کی سزا دیجارہی ہے جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے (یہ عذاب بے وجہ نہیں)۔

معارف و مسائل

فَهُمْ يُوزَعُونَ، وزع سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگلا حصہ کو روکا جائیگا تاکہ پیچھے رہے ہوئے لوگ ساتھ ہو جاویں اور بعض حضرات نے وزع کے معنی یہاں دفع کے لئے ہیں یعنی ان کو دھکے دے کر موقف کی طرف لایا جائیگا۔ وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا، اسمیں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب خود ایک بڑا جرم و گناہ ہے خصوصاً جبکہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی طرف توجہ کئے بغیر ہی تکذیب کرنے لگیں تو یہ جرم دوہرا ہوجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ غور و فکر کرنے کے باوجود حق کو نہ پاسکیں کہ ان کی نظر و فکر ہی گمراہی کی طرف لے جائے تو ان کا جرم کسی قدر ہلکا ہوجاتا ہے اگرچہ اللہ کے وجود اور توحید وغیرہ کی تکذیب پھر بھی کفر و ضلال اور دائمی عذاب سے نہیں بچائے گی کیونکہ یہ ایسے بدیہی امور ہیں جن میں نظر و فکر کی غلطی معاف نہیں۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ، فزع کے معنے گھبرانے اور پریشان ہونے کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اس جگہ فزع کے بجائے صعق آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اگر یہ دونوں آیتیں پہلے نفخۂ صور کے متعلق قرار دی جائیں تو ان دونوں لفظوں کا حاصل یہ ہوگا کہ صور پھونکنے کے وقت اول تو سب گھبرائیں گے اور پریشان ہونگے پھر بیہوش ہوجائیں گے بالآخر مرجائیں گے اور قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس آیت کو نفخۂ ثانیہ کے متعلق قرار دیا ہے جس سے سب مُردے دوبارہ زندہ ہوجائیں گے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ سب زندہ ہونے کے وقت گھبراتے ہوئے اٹھیں گے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا جس سے سب پریشانی گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا ہو جائیں گے دوسرا نفخہ صعق ہوگا جس سے سب مرجائیں گے، تیسرا نفخہ نفخۂ حشر و نشر ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہو جاویں گے پھر

آیاتِ قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثبوت دو ہی نفخوں کا ملتا ہے (قرطبی و ابن کثیر) ابن مبارک نے حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ (قرطبی)

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ، یہ استثناء فزع سے ہے جس کے معنے گھبراہٹ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے جن پر کوئی گھبراہٹ حشر کے وقت نہیں ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی کی ایک حدیث میں ہے کہ یہ لوگ شہداء ہونگے حشر کی دوبارہ زندگی کے وقت ان پر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی (صحح الحدیث ابن العربی (قرطبی) سعید بن جبیرؒ نے بھی یہی فرمایا کہ مُراد اس سے شہداء ہیں جو حشر کے وقت اپنی تلواریں باندھے ہوئے عرش کے گرد جمع ہونگے اور قشیری نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ان میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں کیونکہ انکو مقامِ شہادت بھی حاصل ہے اور مقام نبوت مزید براں ہے۔ (قرطبی)

اور سورۂ زمر میں آگے آیت ہے وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ، اس میں فزع کے بجائے صعق کا لفظ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں اور مراد اس جگہ بیہوش ہونا پھر مرجانا ہے اور اسمیں بھی اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ کا استثناء ہے اور اس استثناء سے مراد مرفوع حدیث کے مطابق چھ فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حملۃ العرش ہیں کہ یہ نفخۂ صُور سے نہ مریں گے، بعد میں حسب تصریحِ حدیث ان سب کو بھی موت آئے گی۔ بعض حضرات مفسرین نے فزع اور صعق کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ انھوں نے سورۂ زمر کی طرح یہاں بھی استثناء سے مراد مخصوص فرشتے لئے ہیں خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا اور جنھوں نے فزع اور صعق کو الگ الگ مانا ہے انکے نزدیک فزع سے مستثنیٰ شہداء ہیں جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا۔

وَتَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِیَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ مراد یہ ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر اس طرح چلیں گے جیسے بادل کہ دیکھنے والا اس کو اپنی جگہ جامد سمجھتا ہے حالانکہ وہ تیزی سے چل رہے ہیں۔ تمام بڑے اجسام جن کی ابتدا و انتہا، انسان کی نظر کے سامنے نہیں ہوتی جب وہ کسی ایک سمت کی طرف حرکت کریں تو خواہ حرکت کتنی بھی تیز ہو دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جسکا مشاہدہ سب کو گہرے بادل اور دُور تک چھائی ہوئی گھٹا سے ہوتا ہے کہ یہ بادل اپنی جگہ جمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوتے ہیں مگر ان کی حرکت دیکھنے والوں کو اسوقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اتنی دُور چلے جائیں کہ افق کا کنارہ اس سے کھُل جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا جامد ہونا دیکھنے والے کی نظر کے اعتبار سے ہے اور اسکا حرکت کرنا حقیقت کے اعتبار سے۔ عامۂ مفسرین نے آیت کا مطلب یہی قرار دیا ہے اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ دو حال دو وقتوں کے ہیں۔ جامد ہونا اسوقت کے اعتبار سے جسکو دیکھ کر

ہر دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے، اور تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ قیامت کے دن کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن کریم میں قیامت کے روز پہاڑوں کے حالات مختلف بیان ہوئے ہیں۔ پہلا حال اندکاک اور زلزلہ ہے جو پوری زمین کے پہاڑوں کو محیط ہوگا۔ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا اور اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا، دوسرا حال انکی بڑی بڑی چٹانوں کا دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جانا ہے وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ اور یہ اسوقت ہوگا جب اوپر سے آسمان بھی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا زمین سے پہاڑ روئی کی طرح اوپر جائیں گے اوپر سے آسمان نیچے آئیں گے اور دونوں مل جائیں گے یَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاۗءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ۔ تیسرا حال یہ ہے کہ وہ دھنکی ہوئی روئی کے ایک جسم متصل کے بجائے ریزہ ریزہ اور ذرہ ذرہ ہو جائے۔ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاۗءً مُّنْۢبَثًّا۔ چوتھا حال یہ ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر پھیل جائے فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا۔ پانچواں حال یہ ہے کہ یہ پہاڑ جو ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح زمین پر پھیل گئے ہیں ان کو ہوائیں اوپر اٹھا کر لیجائیں اور چونکہ یہ غبار ساری زمین پر چھایا ہوگا تو اگرچہ یہ بادل کی طرح تیز حرکت کرتا ہوگا مگر دیکھنے والا اسکو اپنی جگہ جما ہوا دیکھے گا تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ان میں سے بعض حالات صور کے نفخہ اولیٰ کے وقت ہونگے اور بعض نفخہ ثانیہ کے بعد اسوقت جبکہ زمین کو ایک سطح مستوی بنا دیا جائیگا کہ نہ اسمیں کوئی غار رہے گا نہ پہاڑ نہ کوئی عمارت نہ درخت۔ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (از قرطبی وروح المعانی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ، صُنع بمعنے صنعت ہے اور اتقن، اتقان سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے آتے ہیں۔ بظاہر یہ جملہ تمام مضامین سابقہ کے ساتھ متعلق ہے جن میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کا ذکر ہے جس میں لیل و نہار کا انقلاب بھی ہے اور نفخ صور سے لیکر حشر و نشر تک کے سب حالات بھی اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں کچھ حیرت اور تعجب کی نہیں کیونکہ ان کا صانع کوئی محدود علم و قدرت والا انسان یا فرشتہ نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ اور اگر اسکا تعلق قریبی جملے تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً الآیۃ سے کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہاڑوں کی یہ حال کہ دیکھنے والے ان کو جما ہوا دیکھیں اور وہ واقع میں چل رہے اور حرکت کر رہے ہوں کچھ مستبعد اور باعث تعجب نہیں کیونکہ یہ صنعت اللہ رب العزت کی ہے۔ جس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا، یہ حشر و نشر اور حساب کتاب کے بعد پیش آنے والے انجام کا ذکر ہے اور حسنہ سے مراد کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے (کما قال ابراہیم) یا اخلاص ہے (کما قال قتادہ) اور بعض حضرات نے مطلق طاعت کو اسمیں داخل قرار دیا ہے۔ معنے یہ ہیں کہ جو شخص نیک عمل کرے گا

اور نیک عمل اُسی وقت نیک کہلانے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اس کی پہلی شرط ایمان موجود ہو تو اس کو اپنے عمل سے بہتر چیز ملے گی مراد اس سے جنت کی لازوال نعمتیں اور عذاب اور ہر تکلیف سے دائمی نجات ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ خیر سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گی۔ (مظہری)

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ، فزع سے مراد ہر بڑی مصیبت اور پریشانی اور گھبراہٹ ہے مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ہر متقی پرہیزگار بھی انجام سے ڈرتا ہی رہتا ہے اور ڈرنا ہی چاہئے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ، یعنی رب کا عذاب ایسا نہیں کہ اُس سے کوئی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ و اولیاء اُمت ہمیشہ خائف و لرزاں رہتے تھے مگر اس روز جبکہ حساب کتاب سے فراغت ہو چکے گی تو حسنہ لانے والے نیک لوگ ہر خوف و غم سے بے فکر اور مطمئن ہوں گے۔ واللہ اعلم

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی

كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩١﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا
کی ہے ہر ایک چیز اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں حکم برداروں میں اور یہ کہ سنا دوں

الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
قرآن پھر جو کوئی راہ پر آیا سو راہ پر آئے گا اپنے ہی بھلے کو اور جو کوئی بھکا رہا

فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ
تو کہدے کہ میں تو یہی ہوں ڈر سنا دینے والا اور کہہ تعریف ہے سب اللہ کو آگے دکھائیگا تم کو

اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾
اپنے نمونے تو ان کو پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو

خلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک (حقیقی) کی عبادت کیا کروں جس نے اس (شہر) کو محترم بنایا ہے (کہ حرم ہونا اسی احترام پر مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کروں) اور (اسی کی عبادت کیوں نہ کیجاوے جبکہ سب چیزیں اسی کی (ملک) میں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ میں (عقائد و اعمال سب میں) فرمانبردار رہوں

(یہ تو توحید کا حکم ہوا) اور (مجھ کو) یہ (بھی حکم ملا ہے) کہ میں (تم کو) قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں (یعنی احکام الٰہیہ کی تبلیغ کروں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے) سو (میری تبلیغ کے بعد) جو شخص راہ پر آویگا وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آویگا (یعنی اسکو عذاب سے نجات اور جنت کی لازوال نعمتیں ملیں گی، میرا اس سے کسی اپنے مالی یا جاہی نفع کا خواہاں نہیں) اور جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ (میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صرف ڈرانیوالے (یعنی حکم سنانیوالے) پیغمبروں میں سے ہوں (یعنی میرا کام تو حکم پہنچا دینا ہے، اسکے بعد میری ذمہ داری ختم ہے نہ مانوگے تو وبال تمھیں ہی بھگتنا پڑیگا) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم جو قیامت کے آنے میں دیر کو اسکے نہ ہونے کی دلیل سمجھ کر انکار کرتے ہو یہ تمہاری بیوقوفی ہے کسی چیز کے واقع ہونے میں دیر لگنا اسکی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ کبھی واقع ہو ہی گی نہیں۔ اسکے علاوہ تم جو مجھ سے کہتے ہو کہ میں جلد قیامت لے آؤں یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ قیامت کا واقع کرنا میرے اختیار میں ہے بلکہ) سب خوبیاں خالص اللہ ہی کیلئے ثابت ہیں (قدرت بھی، علم بھی، حکمت بھی۔ وہ جب اسکی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت کو واقع کر دیگا۔ ہاں اتنی بات تمہیں بھی بتلا دی گئی ہے کہ قیامت میں زیادہ دیر نہیں بلکہ) وہ تم کو عنقریب اپنی نشانیاں (یعنی قیامت کے واقعات) دکھلا دیگا سو تم (وقوع کے وقت) انکو پہچانوگے (جبکہ پہچاننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا) اور (صرف یہ علامات دکھلانے پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ اپنے برے اعمال کی سزا بھی بھگتنا پڑیگی کیونکہ) آپکا رب ان کاموں سے بے خبر نہیں جو تم سب لوگ کر رہے ہو۔

معارف و مسائل

رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ، بلدہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک مکہ مکرمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رب العالمین اور رب السموات والارض ہے مکہ مکرمہ کی تخصیص اس جگہ اسکی عظمت شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم و محترم ہونے کا اظہار ہے۔ لفظ حرم تحریم سے مشتق ہے اسکے معنے مطلق احترام و اکرام کے بھی ہیں اور اس احترام و اکرام کی وجہ سے جو خاص احکام شرعیہ مکہ مکرمہ اور ارض حرم سے متعلق ہیں وہ بھی اسمیں داخل ہیں مثلاً جو شخص حرم میں پناہ لے وہ مامون ہو جاتا ہے۔ حرم میں کسی دشمن سے انتقام لینا اور قتل کرنا جائز نہیں اور ارض حرم میں شکار کو قتل کرنا بھی جائز نہیں، درختوں کا کاٹنا جائز نہیں ان احکام کا بیان آیت وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کے تحت میں اور کچھ سورۂ مائدہ کے شروع میں اور کچھ آیت لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے تحت پہلے بیان ہو چکا ہے۔

(الحمد للہ سورۂ نمل کی تفسیر آج شب دوشنبہ ۲۴ شوال ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی جبکہ ۱۴ شوال سے ہندوستان کے ہندوؤں نے مغربی پاکستان پر بھرپور حملے میدانی اور بحری ... شروع کر دیئے ہیں، کراچی خاص طور سے اسکا نشانہ ہے ہر رات بمباری ہوتی ہے، شہری آبادی پر بھی بم گرتے ہیں، رات کو مکمل اندھیرا رکھنا پڑتا ہے اور بموں کے دھماکے سے مکان لرزتے ہیں، مگر اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اُسنے ان حالات میں بھی سلسلہ اس تفسیر کا جاری رکھا، اور اس جنگ کے دس روز میں بھی تفسیر کے تقریباً چالیس صفحات لکھے گئے۔)

سُوْرَةُ الْقَصَصِ

سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ قصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی ہم سناتے ہیں تجھ کو کچھ احوال موسیٰ

وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ

اور فرعون کا تحقیقی ان لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ

اور کر رکھا تھا وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو ان میں ذبح کرتا تھا ان کے بیٹوں کو

وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④ وَنُرِيْدُ اَنْ

اور زندہ رکھتا تھا انکی عورتوں کو بیشک وہ تھا خرابی ڈالنے والا اور ہم چاہتے ہیں کہ

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ

احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور کر دیں اُن کو سردار اور

نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ⑤ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ

کردیں اُن کو قائم مقام اور جما دیں اُن کو ملک میں اور دکھا دیں فرعون

وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ⑥ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى

اور ہامان کو اور انکے لشکروں کو انکے ہاتھ سے جس چیز کا اُن کو خطرہ تھا اور ہم نے حکم بھیجا

اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ

موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اسکا تو ڈالدے اس کو دریا میں اور

لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ⑦

نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اسکو تیری طرف اور کر دیں گے اُس کو رسولوں سے

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ

پھر اُٹھا لیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور

هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـــِٕيْنَ ۝۸ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ

ہامان اور اُن کے لشکر تھے چوکنے والے اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی

عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا

ٹھنڈک ہے میرے لئے اور تیرے لئے اسکو مت مارو، کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اسکو کرلیں بیٹا

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ

اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا قریب تھی کہ

لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰

ظاہر کردے بیقراری کو، اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اس کے دل پر اس واسطے کہ رہے یقین کرنے والوں میں

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱

اور کہہ دیا اسکی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہوکر اور اُن کو خبر نہ ہوئی

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي

اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی میں بتلاؤں تم کو ایک

اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝۱۲ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ

گھر والے کہ اس کو پال دیں تمہارے لئے اور وہ اس کا بھلا چاہنے والے ہیں پھر پہنچا دیا ہم نے اسکو اس کی ماں

كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ

کیطرف کہ ٹھنڈی رہے اسکی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پر

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

بہت لوگ نہیں جانتے

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر وحی کئے جاتے ہیں) کتاب واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جن میں اس مقام پر) ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کرکے) سناتے ہیں ان لوگوں کے (نفع کے) لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ مقاصد قصص کے یعنی عبرت اور ان سے نبوت پر استدلال وغیرہ یہ مومنین ہی کے ساتھ خاص ہیں خواہ اسوقت مومن ہوں یا ایمان کا ارادہ رکھتے ہوں اور اجمال تو اس قصہ کا یہ ہے کہ) فرعون

سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا (اس طرح کہ قبطیوں یعنی مصری لوگوں کو معزز بنا رکھا تھا اور سبطیوں یعنی بنی اسرائیل کو پست اور خوار کر رکھا تھا جسکا آگے بیان ہے) کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا (اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو (جو نئے پیدا ہوتے تھے جلادوں کے ہاتھوں) ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا (تاکہ ان سے خدمت لیجاوے و نیز ان سے اندیشہ بھی نہ تھا) واقعی وہ بڑا مفسد تھا (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دنیوی و دینی) احسان کریں اور وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں) پیشوا بنا دیں اور (دنیا میں) ان کو (اس ملک کا) مالک بنائیں اور (مالک ہونے کے ساتھ) انکو (ملک بھی بنائیں یعنی) زمین میں ان کو حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل) کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے (مراد اس سے زوال سلطنت و ہلاکت ہے کہ اسی سے بچاؤ کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کو ایک تعبیر خواب کی بناء پر جو فرعون نے دیکھا تھا اور نجومیوں نے تعبیر دی تھی قتل کر رہا تھا (کذا فی الدر المنثور) پس ہمارے قضاء و قدر کے سامنے ان لوگوں کی تدبیر کچھ کام نہ آئی، یہ اجمال قصہ کا ہوا) اور (تفصیل اس کی اول سے یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اسی پرآشوب زمانہ میں پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو الہام کیا کہ (جب تک ان کا اخفا ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف و خطر) ان کو (صندوق میں رکھ کر) دریا (یعنی نیل) میں ڈالدینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو پھر تمہارے ہی پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنا دیں گے (غرض وہ اسی طرح دودھ پلاتی رہیں۔ پھر جب افشائے راز کا خوف ہوا تو صندوق میں بند کر کے اللہ کے نام پر نیل میں چھوڑ دیا، اسکی کوئی شاخ فرعون کے محل میں جاتی تھی یا تفریحاً فرعون کے متعلقین دریا کی سیر کو نکلے تھے۔ غرض وہ صندوق کنارے پر لگا) تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی مع صندوق کے) اٹھالیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنیں، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارہ میں) بہت چوکے (کہ اپنے دشمن کو اپنی بغل میں پالا) اور (جب وہ صندوق سے نکال کر فرعون کے سامنے لائے گئے تو) فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) نے (فرعون) سے کہا کہ یہ (بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی اس کو دیکھ کر جی خوش ہوا کرے گا تو) اس کو قتل مت کرو عجب نہیں کہ (بڑا ہو کر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچادے یا ہم اس کو (اپنا) بیٹا ہی بنالیں اور ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی (کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت غارت ہوگی)

اور (ادھر یہ قصہ ہوا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (خیالات مختلفہ کے ہجوم سے) بیقرار ہوگیا (اور بیقراری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ ایسی سخت بیقراری کہ) قریب تھا کہ (غایت بیقراری سے) وہ موسیٰ (علیہ السلام) کا حال (سب پر) ظاہر کر دیتیں اگر ہم ان کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہیں کہ یہ (ہمارے وعدہ پر) یقین کئے (بیٹھی) رہیں (غرض بمشکل انھوں نے دل کو سنبھالا اور تدبیر شروع کی وہ یہ کہ) انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن (یعنی اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سراغ تو لگا سو (وہ چلیں اور یہ معلوم کر کے کہ صندوق محل میں کھلا ہے محل میں پہنچیں، یا تو ان کی آمد ورفت ہوگی یا کسی حیلہ سے پہنچیں، اور) انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ ان کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں) اور ہم نے پہلے ہی سے (یعنی جب سے صندوق سے نکلے تھے) موسیٰ (علیہ السلام) پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (اس حال کو دیکھ کر موقع پاکر) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتادوں جو تمھارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ (اپنی جبلت کے موافق دل سے) اس کی خیر خواہی کریں (ان لوگوں نے ایسے وقت میں کہ دودھ پلانے کی مشکل پڑ رہی تھی اس مشورہ کو غنیمت سمجھا اور ایسے گھرانے کا پتہ پوچھا انھوں نے اپنی والدہ کا پتہ بتادیا چنانچہ وہ بلائی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام انکی گود میں دیئے گئے۔ جاتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا اور ان لوگوں کی اجازت سے جبین سے اپنے گھر لے آئیں اور گاہ بگاہے لے جاکر ان کو دکھلا آتیں) غرض ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو اس طرح) انکی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ (اپنی اولاد کو دیکھ کر) انکی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ (فراق کے) غم میں نہ رہیں اور تاکہ (مرتبہ معائنہ میں) اس بات کو (اور زیادہ یقین کے ساتھ) جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے لیکن (افسوس کی بات ہے کہ) اکثر لوگ (اس کا) یقین نہیں رکھتے (یہ تعریض ہے کفار پر)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص مکی سورتوں میں سب سے آخری سورت ہے جو ہجرت کے وقت مکہ مکرمہ اور جحفہ (رابغ) کے درمیان نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ سفر ہجرت میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جحفہ یعنی رابغ کے قریب پہنچے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو آپ کا وطن جس میں آپ پیدا ہوئے یاد آتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں ضرور یاد آتا ہے۔ اس پر جبرئیل امین نے یہ سورت قرآن سنائی جس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت ہے کہ انجام کار مکہ مکرمہ فتح ہو کر آپکے قبضہ میں آئے۔ وہ آیت یہ ہے اِنَّ

اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ، سورہ قصص میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہلے اجمال کے ساتھ پھر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ نصف سورت تک موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ اور آخر سورت میں قارون کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پورے قرآن میں کہیں مختصر کہیں مفصل بار بار آیا ہے سورہ کہف میں تو انکے اُس قصہ کی تفصیل آئی ہے جو خضر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، پھر سورہ طٰہٰ میں پورے قصہ کی تفصیل ہے اور یہی تفصیل سورہ نمل میں بھی کچھ آئی ہے پھر سورہ قصص میں اسکا اعادہ ہوا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کے لئے ارشاد ربانی یہ آیا ہے کہ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔ حضرات محدثین امام نسائی وغیرہ نے اس پورے قصے کی مکمل تفصیل وہاں لکھی ہے احقر نے بھی ابن کثیر کے حوالہ سے یہ مکمل تفصیل سورہ طٰہٰ میں بیان کردی ہے۔ اس قصہ کے متعلقہ اجزاء کی تمام بحثیں اور ضروری مسائل اور فوائد کچھ سورہ کہف میں باقی سورہ طٰہٰ میں ذکر کردیئے گئے ہیں۔ مسائل و مباحث کے لئے اُن کو دیکھنا کافی ہوگا یہاں صرف الفاظ آیات کی مختصر تفسیر پر اکتفا کیا جائے گا۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً الآیۃ، اس آیت میں تدبیر فرعونی کا مقابلہ تقدیر الٰہی کے نہ صرف خائب و ناسر ہونا بلکہ فرعون اور اسکے سب اہل دربار کو انتہائی بے وقوف بلکہ اندھا بنانے کا ذکر ہے کہ جس لڑکے کے متعلق خواب اور تعبیر خواب کی بناء پر فرعون کو خطرہ لاحق ہوا تھا اور جس کی بناء پر بنی اسرائیل کے لاتعداد نوزائیدہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا قانون جاری کیا تھا اس کو حق تعالیٰ نے اسی فرعون کے گھر میں اسی کے ہاتھوں پرورش کرایا اور والدہ کے اطمینان کے لئے اُنہی کی گود میں حیرت انگیز طریقہ پر پہنچادیا اور فرعون سے رضاعت کا خرچ جو بعض روایات میں ایک دینار روزانہ بتلایا گیا ہے مزید وصول کیا گیا۔ اور دودھ پلانے کا یہ معاوضہ چونکہ ایک کافر حربی سے اسکی رضامندی کے ساتھ لیا گیا ہے اسلئے اسکے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور بالآخر جس خطرہ کے دُور کرنے کے لئے ساری قوم پر یہ مظالم ڈھائے تھے وہ اُسی کے گھر کے اندر سے ایک شدید لاوا بن کر پھوٹا اور خواب کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اُس کو آنکھوں سے دکھادی وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ اِلٰی مَا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ کا یہی حاصل ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی، وحی کا لفظ اس جگہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، وحی نبوت مراد نہیں اسکی تحقیق سورہ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی

اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا دی ہم نے اسکو حکمت اور سمجھ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں

الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا

نیکی والوں کو　اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ

پھر پائے اس میں دو مرد　لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اسکے دشمنوں میں

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ

پھر فریاد کی اُس سے اُسنے جو تھا اسکے رفیقوں میں اسکی جو تھا اسکے دشمنوں میں　پھر مکا مارا

مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ

اسکو موسیٰ نے پھر اس کو تمام کر دیا بولا یہ ہوا　شیطان کے کام سے　بیشک وہ دشمن ہے

مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي

بہکانے والا صریح　بولا اے میرے رب میں نے برا کیا اپنی جان کا، سو بخش مجھ کو

فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ

پھر اسکو بخش دیا　بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان　بولا اے رب جیسا تو نے فضل

عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿۱۷﴾ فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ

کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہونگا مددگار گنہگاروں کا　پھر صبح کو اُٹھا اس شہر میں

خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ ۚ

ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں جس نے کل مدد مانگی تھی اُس سے　آج پھر فریاد کرتا ہے اُس سے

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَن يَبْطِشَ

کہا موسیٰ نے بیشک　تو بے راہ ہے　صریح　پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اُس پر

بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يَا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِي كَمَا

جو دشمن تھا ان دونوں کا　بول اُٹھا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے

قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ ۖ إِن تُرِيدُ إِلَّا أَن تَكُونَ جَبَّارًا فِي

خون کر چکا ہے کل ایک جان کا　تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے

الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ﴿۱۹﴾ وَجَاءَ رَجُلٌ

ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو　صلح کرا دینے والا　اور آیا شہر کے

مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ

پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا　کہا اے موسیٰ دربار والے مشورہ کرتے ہیں تجھ پر

لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا

کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں　پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا

يَتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾ ع

راہ دیکھتا بولا اے رب بچالے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے

خُلاصۂ تفسیر

اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ وعقلیہ سے) درست ہوگئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا (یعنی نبوت سے پہلے ہی فہم سلیم و عقل مستقیم جس سے حسن و قبح میں امتیاز کرسکیں عنایت فرمائی) اور ہم نیکو کاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی عمل صالح سے فیضان علمی میں ترقی ہوتی ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ فرعون کے مشرب کو موسیٰ علیہ السلام نے کبھی اختیار نہ کیا تھا بلکہ اس سے نفور رہے) اور (اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایکبار) موسیٰ (علیہ السلام، شہر میں (یعنی مصر میں کذا فی الروح عن ابن اسحٰق کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سورہے) تھے (اکثر روایات سے یہ وقت دوپہر کا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے کچھ رات گئے کا وقت معلوم ہوتا ہے کذا فی الدر المنثور) تو انھوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ایک تو ان کی برادری (یعنی بنی اسرائیل) میں کا تھا اور دوسرا ان کے مخالفین (یعنی فرعون کے متعلقین ملازمین) میں سے تھا (دونوں کسی بات پر الجھ رہے تھے اور زیادتی اس فرعونی کی تھی) سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے (جو، موسیٰ (علیہ السلام کو دیکھا تو ان) سے اسکے مقابلہ میں جو کہ انکے مخالفین میں سے تھا، مدد چاہی (موسیٰ علیہ السلام نے اول اسکو سمجھایا جب اس پر بھی وہ باز نہ آیا) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے (تادیباً دفع ظلم کیلئے) اس کو (ایک) گھونسا مارا اسو اسکا کام بھی تمام کردیا (یعنی اتفاق سے وہ مر ہی گیا) موسیٰ (علیہ السلام اس خلاف توقع نتیجہ سے بہت پچھتائے اور) کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی بیشک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے کسی غلطی میں ڈالدیتا ہے (اور نادم ہوکر حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ سے قصور ہوگیا آپ معاف کردیجئے سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا، بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے (گو ظہور اور علم اس معافی کا قطعی طور پر وقت عطاء نبوت کے ہوا کما فی النمل اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اور اس وقت خواہ الہام سے معلوم ہوگیا ہو یا بالکل نہ معلوم ہوا ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (توبہ عن الماضی کے ساتھ مستقبل کے متعلق یہ بھی) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار چونکہ آپ نے مجھ پر (بڑے بڑے) انعامات فرمائے ہیں (جنکا ذکر طٰہٰ میں ہے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّۃً اُخْرٰٓی اِلٰی قولہ وَلَا تَحْزَنْ) سو کبھی میں مجرموں کی مدد نہ کرونگا (یہاں مجرمین سے مراد وہ ہیں جو دوسروں سے گناہ کا کام کرانا چاہیں، کیونکہ گناہ کرانا کسی سے یہ بھی جرم ہے پس اسمیں شیطان بھی داخل ہوگیا

کہ وہ گناہ کراتا ہے اور گناہ کرنیوالا اسکی مدد کرتا ہے خواہ عمداً یا خطاءً جیسے اس آیت میں ہے وکان الکافر علیٰ ربہ ظہیراً ای للشیطان، مطلب یہ ہوا کہ میں شیطان کا کہنا کبھی نہ مانوں گا یعنی مواقع محتملہ خطاء میں احتیاط و تیقظ سے کام لونگا اور اصل مقصود اتنا ہی ہے مگر شمول حکم کے لئے مجرمین جمع کا صیغہ لایا گیا کہ اوروں کو بھی عام ہو جاوے، غرض اس اثناء میں اسکا چرچا ہو گیا مگر بجز اسرائیلی کے کوئی واقف راز نہ تھا اور چونکہ اسی کی حمایت میں یہ واقعہ ہوا تھا اس لئے اس نے اظہار نہیں کیا اسوجہ سے کسی کو اطلاع نہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ رہا، یہاں تک رات گزری) پھر موسیٰ (علیہ السلام) کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور وحشت کی حالت میں کہ اچانک (دیکھتے کیا ہیں کہ) وہی شخص جس نے کل گزشتہ میں ان سے امداد چاہی تھی وہ پھر ان کو (مدد کے لئے) پکار رہا ہے (کہ کسی اور سے الجھ پڑا تھا) موسیٰ (علیہ السلام یہ دیکھ کر اور کل کی حالت یاد کر کے اس پر ناخوش ہوئے اور) اس سے فرمانے لگے بیشک تو صریح بدراہ (آدمی) ہے کہ روز لوگوں سے لڑا کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام کو قرائن سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس کی طرف سے بھی کوئی غلطی ہوا ہے لیکن زیادتی فرعونی کی دیکھ کر اس کو روکنے کا ارادہ کیا) سو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اسپر ہاتھ بڑھایا جو دونوں کا مخالف تھا (مراد فرعونی ہے کہ وہ اسرائیلی کا بھی مخالف تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں اور وہ لوگ سب بنی اسرائیل کے مخالف تھے گویا بالتعیین موسیٰ علیہ السلام کو اسرائیلی نہ سمجھا ہو اور یا موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے طریقہ سے نفور تھے یہ امر مشہور ہو گیا ہو اسلئے فرعون والے ان کے مخالف ہو گئے ہوں۔ بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی پر ہاتھ لپکایا اور اس سے پہلے اسرائیلی پر خفا ہو چکے تھے تو اس سے اس اسرائیلی کو شبہ ہوا کہ شاید آج مجھ پر دار و گیر کرینگے تو گھبرا کر) وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ کیا (آج) مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو جیسا کہ کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو (معلوم ہوتا ہے کہ) بس تم دنیا میں اپنا زور بٹھلانا چاہتے ہو اور صلح (اور ملاپ) کروانا نہیں چاہتے (یہ کلمہ اس فرعونی نے سُنا، قاتل کی تلاش ہو رہی تھی اتنا سُراغ لگ جانا بہت ہے فوراً فرعون کو خبر پہنچا دی۔ فرعون اپنے آدمی کے مارے جانے سے برہم تھا یہ سُن کر آشفتہ ہوا اور شاید اس سے اسکا وہ خواب کا اندیشہ قوی ہو گیا ہو کہ کہیں وہ شخص یہی نہ ہو، خصوصاً اگر موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی طریقہ کو ناپسند کرنا بھی فرعون کو معلوم ہو تو کچھ عداوت اس سبب سے ہوگی اس پر یہ مزید ہوا بہرحال اس نے اپنے درباریوں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور اخیر رائے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرار پائی) اور (اس مجمع میں) ایک شخص (موسیٰ علیہ السلام کے محب اور خیر خواہ تھے وہ) شہر کے (اس) کنارے سے (جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا موسیٰ علیہ السلام کے پاس نزدیک کی گلیوں سے) دوڑتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے کہ اے موسیٰ

اہلِ دربار آپکے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ (یہاں سے) چلد یجئے میں آپ کی خیر خواہی کر رہا ہوں پس (یہ سُن کر) موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے (کسی طرف کو) نکل گئے، خوف اور وحشت کی حالت میں (اور چونکہ راستہ معلوم نہ تھا دُعا کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا لیجئے (اور امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى، اَشُدَّ کے لفظی معنے قوت و شدت کی انتہا پر پہنچنا ہے یعنی انسان بچپن کے ضعف سے تدریجاً قوت و شدت کی طرف بڑھتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسکے وجود میں جتنی قوت و شدت آسکتی تھی وہ پوری ہو جائے اسوقت کو اَشُدّ کہا جاتا ہے اور یہ زمین کے مختلف خطوں اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کسی کا اشُد کا زمانہ جلد آجاتا ہے کسی کا دیر میں۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے بروایت عبدابن حُمَید یہ منقول ہے کہ اشُد عمر کے تینتیس سال میں ہوتا ہے اسی کو سنِ کمال یا سنِ وقوف کہا جاتا ہے جسمیں بدن کا نشو و نما ایک حد پر پہنچکر رُک جاتا ہے، اسکے بعد چالیس کی عمر تک توقف کا زمانہ ہے اسی کو استوٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے چالیس سال کے بعد انحطاط اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا اشُد تینتیس سال کی عمر سے شروع ہو کر چالیس سال تک رہتا ہے۔ (روح و قرطبی)

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، حکم سے مراد نبوت و رسالت ہے اور علم سے مراد احکام الٰہیہ شرعیہ کا علم ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا، المدینۃ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک شہر مصر ہے۔ اسمیں داخل ہونے کے لفظ سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے باہر کہیں گئے ہوئے تھے پھر ایک روز اس شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جو عام لوگوں کی غفلت کا وقت تھا۔ آگے قتل قبطی کے قصہ میں اسکا بھی تذکرہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت و رسالت کا اور دینِ حق کا اظہار شروع کر دیا تھا اسی کے نتیجہ میں کچھ لوگ اُنکے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے جو اُنکے متبعین کہلاتے تھے مِنْ شِيْعَتِهٖ کا لفظ اس پر شاہد ہے۔ ان تمام قرائن سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے جو ابن اسحٰق اور ابن زید سے منقول ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہوش سنبھالا اور دینِ حق کی کچھ باتیں لوگوں سے کہنے لگے تو فرعون ان کا مخالف ہو گیا اور قتل کا ارادہ کیا مگر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی درخواست پر اُنکے قتل سے باز آیا مگر اُن کو شہر سے نکالنے کا حکم دیدیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں کسی جگہ رہنے لگے اور کبھی کبھی چھپ کر مصر شہر میں آتے تھے، اور عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک دوپہر کا وقت ہے جبکہ لوگ قیلولہ میں تھے۔ (قرطبی)

فَوَكَزَهُ مُوْسٰى، وکز کے معنے مُکّا مارنے کے ہیں فَقَضٰى عَلَيْهِ، قضاء اور قضٰی علیہ کا محاورہ اُسوقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا بالکل کام تمام کردے اور فارغ ہو جائے۔ اسی لئے یہاں اسکے معنی قتل کردینے کے ہیں۔ (مظہری)

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ، اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس قبطی کافر کا قتل جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا ارادہ صادر ہوگیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اسکو بھی اپنے منصب نبوت و رسالت اور پیغمبرانہ عظمتِ شان کے لحاظ سے اپنا گناہ قرار دیکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جسکا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا کیونکہ نہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمی تھا نہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکا کوئی معاہدہ تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اسکو عملِ شیطان اور گناہ کیوں قرار دیا؟ اسکا قتل تو بظاہر موجبِ اجر ہونا چاہیئے تھا کہ ایک مسلمان پر ظلم کر رہا تھا اسکو بچانے کے لیے یہ قتل واقع ہوا۔

جواب یہ ہے کہ معاہدہ جیسے قولی اور تحریری ہوتا ہے جیسے عموماً اسلامی حکومتوں میں اہلِ ذمہ سے معاہدہ یا کسی غیر مسلم حکومت سے صلح کا معاہدہ اور یہ معاہدہ باتفاق واجب العمل اور اسکی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی کے سبب حرام ہوتی ہے اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے اس کی بھی پابندی لازمی اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مرادف ہے۔

معاہدہ عملی کی صورت یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم کسی دوسری حکومت میں باہمی امن و اطمینان کے ساتھ رہتے بستے ہوں، ایک دوسرے پر حملہ کرنا یا لوٹ مار کرنا طرفین سے غداری سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کی معاشرت اور معاملات بھی ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتے ہیں انکی خلاف ورزی جائز نہیں اسکی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی وہ طویل حدیث ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الشروط میں مفصل روایت کیا ہے اور واقعہ اسکا یہ تھا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ قبل از اسلام اپنے زمانۂ جاہلیت میں ایک جماعت کفار کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے پھر انکو قتل کر کے انکے اموال پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے اور جو مال ان لوگوں کا لیا تھا وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اس پر آپ نے ارشاد فرمایا، اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ فی شیئ اور ابو داؤد کی روایت میں اسکے الفاظ یہ ہیں، اما المال فمال غدر لا حاجۃ لنا فیہ، یعنی آپ کا اسلام تو ہم نے قبول کر لیا اور اب آپ مسلمان ہیں مگر یہ مال ایسا مال ہے جو غدر اور عہد شکنی سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہمیں اس مال کی کوئی حاجت نہیں۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر نے شرح میں فرمایا کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کفار کا مال حالتِ امن میں لوٹ لینا حلال نہیں کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے یا ایک ساتھ کام کرنے والے

ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھتے ہیں اُن کا یہ عملی معاہدہ بھی ایک امانت ہے جسکا صاحبِ امانت کو ادا کرنا فرض ہے چاہے وہ کافر ہو یا مسلم۔ اور کفار کے اموال جو مسلمانوں کے لئے حلال ہوتے ہیں تو وہ صرف محاربہ اور مغالبہ کی صورت میں حلال ہوتے ہیں، حالتِ امن وامان میں جبکہ ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھ رہا ہو کسی کافر کا مال لُوٹ لینا جائز نہیں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں فرمایا

ان اموال المشرکین ان کانت مغنومۃ عند القھر فلا یحل اخذھا عند الامن فاذا کان الانسان مصاحبا لھم فقد امن کل واحد منھم صاحبہ فسفک الدماء اخذ المال مع ذلک عذر حرام الا ان ینبذ الیھم عھدھم علی سواء

بیشک مشرکین کے اموال جنگ اور جہاد کے وقت مغنوم و مباح ہیں لیکن امن کی حالت میں حلال نہیں اسلئے جو مسلمان کفار کے ساتھ رہتا سہتا ہو کہ عملی طور پر ایک دوسرے سے مامون ہو تو ایسی حالت میں کسی کافر کا خون بہانا یا مال زبردستی لینا غدر حرام ہے جب تک کہ اُن کے اس عملی معاہدہ سے دست برداری کا اعلان نہ کردے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبطی کا قتل اس عملی معاہدہ کی بنا پر اگر بالقصد ہوتا تو جائز نہیں تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اسرائیلی شخص کو اسکے ظلم سے بچانے کے لئے ہاتھ کی ضرب لگائی جو عادۃً سبب قتل نہیں ہوتی مگر قبطی اس ضرب سے مرگیا تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اسکو دفع کرنے کے لئے اس ضرب سے کم درجہ بھی کافی تھا یہ زیادتی میرے لئے درست نہ تھی۔ اسی لئے اسکو عمل شیطان قرار دے کر اُس سے مغفرت طلب فرمائی۔

فائدہ یہ تحقیق حکیم الامۃ مجدد الملۃ سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ہے جو آپ نے بزبانِ عربی احکام القرآن سورہ قصص لکھتے وقت ارشاد فرمائی تھی اور یہ آخری علمی تحقیق ہے جس کا استفادہ احقر نے حضرت رح سے کیا کیونکہ آپ نے یہ ارشاد ۲ رجب ۱۳۶۲ھ میں فرمایا تھا اس کے بعد مرض کی شدت بڑھی اور ۱۶ رجب کو یہ آفتاب عالم غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ قبطی کا قتل مباح تھا مگر انبیاء علیہم السلام مباحات میں بھی اہم معاملات میں اسوقت تک اقدام نہیں کرتے جب تک خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے اجازت واشارہ نہ ملے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خصوصی اجازت کا انتظار کئے بغیر یہ اقدام فرمایا تھا اسلئے اپنی شان کے مطابق اس کو گناہ قرار دے کر استغفار کیا (کذا فی الروح وغیرہ واللہ اعلم)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس لغزش کو جب حق تعالیٰ نے معاف فرمادیا تو آپ نے اس نعمت کے شکر میں یہ عرض کیا کہ میں آئندہ کسی مجرم کی مدد نہ کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس اسرائیلی کی مدد کے لئے یہ اقدام کیا تھا دوسرے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ وہ خود ہی جھگڑالو ہے، جھگڑا لڑائی اسکی عادت ہے

اسلئے اس کو مجرم قرار دے کر آئندہ کسی ایسے شخص کی مدد نہ کرنے کا عہد فرمایا۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ مجرمین کی تفسیر کافرین کے ساتھ منقول ہے اور قتادہؒ نے بھی تقریباً ایسا ہی فرمایا ہے اس تفسیر کی بنا پر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلی جس کی امداد موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی یہ بھی مسلمان نہ تھا مگر اُس کو مظلوم سمجھ کر امداد فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے۔

مسئلہ اوّل یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو اُس کی امداد کرنا چاہئے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ علماء نے اس آیت سے استدلال فرما کر ظالم حکام کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ظلم کے شریک سمجھے جاویں گے اور اس پر سلف صالحین سے متعدد روایات نقل کی ہیں (کما فی روح المعانی) کفار یا ظالموں کی امداد و اعانت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے احکام کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی اسی آیت کے ذیل میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح لکھ دی ہے اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا امید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی

السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ
راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی

يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا
پانی پلاتے ہوئے، اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمہارا

خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ سکتۃ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ
کیا حال ہے بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے

كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ
بڑی عمر کا پھر اُس نے پانی پلا دیا انکے جانوروں کو پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے رب تو جو چیز

اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى
اُتارے میری طرف اچھی میں اُسی کا محتاج ہوں پھر آئی اسکے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی

اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ
شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اسکا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں

لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۪ وقف لازم نَجَوْتَ
کو پھر جب پہنچا اسکے پاس اور بیان کیا اُس سے احوال، کہا مت ڈر بچ آیا تو

مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ

اس قوم بے انصاف سے بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿٢٦﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ

البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانتدار کہا میں چاہتا ہوں کہ

اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ

بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ

حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ

برس پھر اگر تو پورے کردے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر

اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ

تکلیف ڈالوں، تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا

ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ

یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کردوں، سو زیادتی نہ ہو مجھ پر

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٢٨﴾

اور اللہ پر بھروسہ اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام یہ دُعا کرکے ایک سمت کو توکلاً علی اللہ چلے اور بتائید غیبی) مدین کی طرف ہو لئے (چونکہ راستہ معلوم نہ تھا اسلئے تقویت و توکل اور نفس کو تسکین دینے کے لئے آپ ہی آپ) کہنے لگے کہ اُمید ہے کہ میرا رب مجھ کو (کسی مقام امن کا) سیدھا رستہ چلا دیگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدین جا پہنچے) اور جب مدین کے پانی (یعنی کنویں) پر پہنچے تو اس پر (مختلف) آدمیوں کا ایک مجمع دیکھا جو (اس کنویں سے کھینچ کھینچ کر اپنے مواشی کو) پانی پلا رہے تھے اور ان لوگوں سے ایک طرف (الگ) دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنی بکریاں) روکے کھڑی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان سے) پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے وہ دونوں بولیں کہ (ہمارا معمول یہ ہے کہ) ہم (اپنے جانوروں کو) اسوقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک کہ یہ چرواہے (جو کنویں پر پانی پلا رہے ہیں) پانی پلا کر (جانوروں کو) ہٹا کر نہ لے جاویں (ایک تو حیا کے سبب، دوسرے مردوں سے مزاحمت ناتوانوں سے کب ہوسکتی ہے) اور (اس حالت میں ہم آتے بھی نہیں مگر) ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور گھر پر اور کوئی کام کرنے والا ہی نہیں اور کام ضروری ہے، اس مجبوری کو ہم کو آنا پڑتا ہے) پس (یہ سُن کر)

موسیٰ (علیہ السلام کو رحم آیا اور انھوں نے) ان کے لئے پانی (کھینچ کر انکے جانوروں کو) پلایا (اور ان کو انتظار اور پانی کھینچنے کی تکلیف سے بچایا) پھر (وہاں سے) ہٹ کر (ایک) سایہ (کی جگہ) میں جا بیٹھے (خواہ کسی پہاڑ کا سایہ ہو یا کسی درخت کا) پھر (جناب باری میں) دُعا کی کہ اے میرے پروردگار (اس وقت) جو نعمت بھی (قلیل یا کثیر) آپ مجھ کو بھیج دیں میں اسکا (سخت) حاجتمند ہوں (کیونکہ اس سفر میں کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا۔ حق تعالیٰ نے اسکا یہ سامان کیا کہ وہ دونوں بیبیاں اپنے گھر لوٹ کر گئیں تو باپ نے معمول سے جلدی آجانے کی وجہ دریافت کی، انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ بیان کیا انھوں نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ اُن کو بلا لاؤ) موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لڑکی آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی (جو کہ اہل شرف کی طبعی حالت ہے اور آکر) کہنے لگی کہ میرے والد تمکو بلاتے ہیں تاکہ تم کو اسکا صلہ دیں جو تمنے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلادیا تھا (یہ ان صاحبزادی کو اپنے والد کی عادت سے معلوم ہوا ہوگا کہ احسان کی مکافات کیا کرتے ہونگے۔ موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہولئے گو مقصود موسیٰ علیہ السلام کا بالیقین اپنی خدمت کا معاوضہ لینا نہ تھا، لیکن مقام امن اور کسی رفیق شفیق کے ضرور باقتضائے وقت جویاں تھے، اور اگر بھوک کی شدت بھی اس جانے کا ایک جزو علت ہو تو مضائقہ نہیں، وہ اس کو اجرت سے کچھ تعلق نہیں اور ضیافت کی تواضع بھی بالخصوص حاجت کے وقت اور خصوصاً کریم و شریف آدمی سے کچھ ذلت نہیں جبکہ دوسرے کی استدعا پر ضیافت کا قبول کر لینا، راہ میں موسیٰ علیہ السلام نے ان بی بی سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ میں اولاد ابراہیم سے ہوں، اجنبیہ کو بے وجہ بے قصد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، غرض اسی طرح ان بزرگ کے پاس پہنچے) سو جب اُن کے پاس پہنچے اور ان سے تمام حال بیان کیا تو انھوں نے (تسلی دی اور) کہا کہ (اب) اندیشہ نہ کرو تم ظالم لوگوں سے بچ آئے (کیونکہ اس مقام پر فرعون کی عملداری نہ تھی کذا فی الروح، پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے اور ہم سیانی ہوگئیں اب گھر میں رہنا مناسب ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، چنانچہ قوت انکے پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ سے خصوصاً راہ میں عورت کو پیچھے کر دینے سے ظاہر ہوتی تھی اور اپنے باپ سے بھی بیان کیا تھا اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمھارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا بدلہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے) پھر اگر تم دس سال پورے کردو تو یہ تمھاری طرف سے (احسان) ہے (یعنی میری طرف سے جبر نہیں) اور میں (اس معاملہ میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (یعنی

کام لینے اور وقت کی پابندی وغیرہ معاملہ کی فروعات میں آسانی برتوں گا اور) تم مجھ کو انشاء اللہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے موسیٰ (علیہ السلام رضامند ہو گئے اور) کہنے لگے کہ (بس تو) یہ بات میرے اور آپکے درمیان (پکی) ہو چکی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جس (مدت) کو بھی پورا کر دوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہو گا اور ہم جو (معاملہ) کی بات چیت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسکا گواہ (کافی) ہے (اسکو حاضر ناظر سمجھ کر عہد پورا کرنا چاہیئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ، مَدْيَنَ ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے جو مدین بن ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ فرعونی حکومت سے خارج تھا۔ مصر سے مدین کی مسافت آٹھ منزل کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعونی سپاہیوں کے تعاقب کا طبعی خوف پیش آیا، جو نہ نبوت و معرفت کے منافی ہے نہ توکل کے، تو مصر سے ہجرت کا ارادہ کیا اور مدین کی سمت شاید اسلئے متعین کی کہ مدین بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام کی بستی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کی اولاد میں تھے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل بے سروسامانی کے ساتھ اسطرح مصر سے نکلے کہ نہ کوئی توشہ ساتھ تھا نہ کوئی سامان اور نہ راستہ معلوم، اسی اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کیطرف متوجہ ہوئے اور فرمایا عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ، یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی۔ مفسرین کا بیان ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غذا صرف درختوں کے پتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سب سے پہلا ابتلاء اور امتحان تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ابتلاءات اور امتحانات کی تفصیل سُورۂ طٰہٰ میں ایک طویل حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ، مَآءَ مَدْيَنَ سے مُراد وہ کنواں ہے جس سے اس بستی کے لوگ اپنے مواشی کو پانی پلاتے تھے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ، یعنی دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی کیطرف جانے سے روک رہی تھیں تاکہ اُن کی بکریاں دوسرے لوگوں کی بکریوں میں رل نہ جائیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ، لفظ خطب شان اور حال کے معنے میں جبکہ وہ کوئی مہم کام ہو۔ معنے یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں سے پُوچھا کہ تمھارا کیا حال ہے کہ تم اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہو دوسرے لوگوں کی طرح کنوئیں کے پاس لاکر پانی نہیں پلاتیں؟ ان دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہماری عادت یہی ہے کہ ہم مردوں

کے ساتھ اختلاط سے بچنے کے لئے اسوقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ کنویں پر رہتے ہیں، جب یہ چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں درا سمیں جو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا تمھارا کوئی مرد نہیں جو عورتوں کو اس کام کے لئے نکالا؟ اسکا جواب بھی ان عورتوں نے ساتھ ہی دیدیا کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف العمر ہیں وہ یہ کام نہیں کر سکتے اسلئے ہم مجبور ہوئے

اس واقعہ سے چند اہم فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ ضعیفوں کی امداد انبیا کی سنت ہے، حضرت موسٰی علیہ السلام نے دو عورتوں کو دیکھا کہ بکریوں کو پانی پلانے کے لئے لائی ہیں مگر اُن کو لوگوں کے ہجوم کے سبب موقع نہیں مل رہا تو ان سے حال دریافت کیا۔ دوسرا یہ کہ اجنبی عورت سے بوقت ضرورت بات کرنے میں مضائقہ نہیں جب تک کہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہو۔ تیسرا یہ کہ اگرچہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جبکہ عورتوں پر پردہ لازم نہیں تھا جسکا سلسلہ اسلام کے بھی ابتدائی زمانہ تک جاری رہا، ہجرت مدینہ کے بعد عورتوں کے لئے پردہ کے احکام نازل ہوئے، لیکن اسوقت بھی پردہ کا جو اصل مقصد ہے وہ طبعی شرافت اور حیا کے سبب عورتوں میں موجود تھا کہ ضرورت کے باوجود مردوں کے ساتھ اختلاط گوارا نہ کیا اور تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔ چوتھا یہ کہ عورتوں کا اس طرح کے کاموں کے لئے باہر نکلنا اسوقت بھی پسندیدہ نہیں تھا اسی لئے اُنھوں نے اپنے والد کے معذور ہونے کا عذر بیان کیا۔

فَسَقٰى لَهُمَا، یعنی موسٰی علیہ السلام نے ان عورتوں پر رحم کھا کر کنویں سے پانی نکال کر ان کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ چرواہوں کی عادت یہ تھی کہ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے بند کر دیتے تھے اور یہ عورتیں اپنی بکریوں کے لئے بچے کھچے پانی پر اکتفا کرتی تھیں۔ یہ بھاری پتھر ایسا تھا جس کو دس آدمی مل کر اُٹھاتے تھے مگر موسٰی ؑ نے اس کو تنہا اُٹھا کر الگ کر دیا اور کنویں سے پانی نکالا۔ شاید اسی وجہ سے ان عورتوں میں سے ایک نے موسٰی علیہ السلام کے متعلق اپنے والد سے یہ کہا کہ یہ قوی ہیں۔ (قرطبی)

ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ، حضرت موسٰی علیہ السلام نے سات روز سے کوئی غذا نہیں چکھی تھی، اسوقت ایک درخت کے سائے میں آکر اللہ تعالٰی کے سامنے اپنی حالت اور حاجت پیش کی جو دُعا کرنے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔ لفظ خیر کبھی مال کے معنے میں آتا ہے جیسا اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ میں ہے، کبھی قوت کے معنے میں آتا ہے جیسے اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ میں کبھی کھانے کے معنے میں بھی آتا ہے جو اس جگہ مراد ہے (قرطبی)

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ، قرآنی اسلوب کے مطابق یہاں قصہ کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ پورا واقعہ یہ ہوا کہ یہ عورتیں اپنے مقررہ وقت سے پہلے جلدی سے گھر پہنچ گئیں تو انکے والد نے وجہ دریافت کی، لڑکیوں نے واقعہ بتلایا۔ والد نے چاہا کہ اس شخص نے احسان کیا ہے

اسکی مکافات کرنا چاہیئے اسلئے انھیں لڑکیوں میں سے ایک کو ان کے بلانے کے لئے بھیجا۔ یہ حیا کے ساتھ چلتی ہوئی پہنچی۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ باوجود پردہ کے باقاعدہ احکام نازل نہ ہونے کے نیک عورتیں مردوں سے بے محابا خطاب نہ کرتی تھیں ضرورت کی بنا پر یہ وہاں پہنچی تو حیا کے ساتھ بات کی جسکی صورت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے چہرہ کو آستین سے چھپا کر گفتگو کی۔ روایات تفسیر یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اسکے ساتھ چلنے لگے تو لڑکی سے کہا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ اور زبان سے مجھے راستہ بتاتی رہو۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی نظر لڑکی پر نہ پڑے شاید اسی سبب سے لڑکی نے اپنے والد سے ان کے متعلق انکے امین ہونے کا ذکر کیا۔ ان لڑکیوں کے والد کون تھے اسمیں مفسرین نے اختلاف نقل کیا ہے مگر آیاتِ قرآن سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے جیسا کہ قرآن میں ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (قرطبی)

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی خود ہی اپنی طرف سے ان کو دعوت دیتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے والد کا پیغام سنایا کیونکہ کسی اجنبی مرد کو خود دعوت دینا حیا کے خلاف تھا۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کو گھر کے کاموں کے لئے ملازم کی ضرورت ہے آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ ملازم میں دو صفتیں ہونا چاہئیں ایک کام کی قوت وصلاحیت دوسرے امانتداری۔ ہمیں ان کے پتھر اٹھا کر پانی پلانے سے ان کی قوت وقدرت کا، اور راستہ میں لڑکی کو اپنے پیچھے کر دینے سے امانتداری کا تجربہ ہو چکا ہے۔

کوئی ملازمت یا عہدہ سپرد کرنے کے لئے اہم شرطیں دو ہیں

حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی۔ آجکل سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کے لئے کام کی صلاحیت اور ڈگریوں کو تو دیکھا جاتا ہے مگر دیانت و امانت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اسکا نتیجہ ہے کہ عام دفتروں اور عہدوں کی کارروائی میں پوری کامیابی کے بجائے رشوت خوری، اقربا پروری وغیرہ کی وجہ سے قانون معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش لوگ اس قرآنی ہدایت کی قدر کریں تو سارا نظام درست ہو جائے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ ھٰتَیْنِ، یعنی لڑکیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے خود ہی اپنی طرف سے اپنی لڑکی کو ان کے نکاح میں دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے ولی کو چاہیئے کہ کوئی مرد صالح ملے تو اسکا انتظار نہ کرے کہ اسی کی طرف سے نکاح کے معاملہ کی تحریک ہو بلکہ خود بھی پیشکش کر دینا سنتِ انبیاء ہے جیسا کہ عمر بن خطابؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد از خود ہی صدیق اکبرؓ اور عثمان غنیؓ سے ان کے نکاح کی پیشکش کی تھی۔ (قرطبی)

اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ، حضرت شعیب علیہ السلام نے دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو متعین کرکے گفتگو نہیں فرمائی بلکہ اس کو مبہم رکھا کہ انمیں سے کسی ایک کو آپکے نکاح میں دینے کا ارادہ ہے مگر چونکہ یہ گفتگو باقاعدہ عقدِ نکاح کی گفتگو نہ تھی جسمیں ایجاب و قبول گواہوں کے سامنے ہونا شرط ہے بلکہ معاملہ کی گفتگو تھی کہ آپ کو آٹھ سال کی نوکری اس نکاح کے عوض میں منظور ہو تو ہم نکاح کر دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر معاہدہ کرلیا۔ آگے یہ خود بخود ظاہر ہے کہ باقاعدہ نکاح کیا گیا ہوگا۔ اور قرآن کریم عموماً قصہ کے اُن اجزاء کو ذکر نہیں کرتا جن کا وقوع سیاق و سباق سے ظاہر اور یقینی ہو۔ اس تحقیق کی بناء پر یہاں یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ زوجہ منکوحہ کو متعین کئے بغیر نکاح کیسے ہوگیا یا گواہوں کے بغیر کیسے ہوگیا (کذا فی الروح و بیان القرآن)

عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ، یہ آٹھ سال کی ملازمت و خدمت نکاح کا مہر قرار دیا گیا اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی خدمت و ملازمت کو اسکا مہر قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی مکمل تحقیق مع دلائل کے بزبان عربی احکام القرآن سورۂ قصص میں مفصل لکھدی گئی ہے اہلِ علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ معاملہ مہر کا شریعتِ محمدیہ کے لحاظ سے درست نہ ہو تو ہوسکتا ہے کہ شریعتِ شعیب علیہ السلام میں درست ہو اور شرائع انبیاء میں ایسے فروعی فرق ہونا نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ظاہر الروایت میں یہی صورت منقول ہے کہ خدمتِ زوجہ کو مہر نہیں بنایا جاسکتا مگر ایک روایت جس پر علماء متاخرین نے فتویٰ دیا ہے یہ ہے کہ خود بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم و احترام کے خلاف ہے مگر بیوی کا کوئی ایسا کام جو گھر سے باہر کیا جاتا ہے جیسے مواشی چرانا یا کوئی تجارت کرنا اگر اسمیں شرائط اجارہ کے مطابق مدت معین کردی گئی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں آٹھ سال کی مدت معین ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس مدت کی ملازمت کی تنخواہ جو بیوی کے ذمہ لازم ہو تو اس تنخواہ کو مہر قرار دینا جائز ہے (ذکرہ فی البدائع عن نوادر ابن سماعہ)

ہاں ایک دوسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ مہر تو بیوی کا حق ہے بیوی کے باپ یا کسی عزیز کو بغیر اجازتِ زوجہ مہر کی رقم نقد بھی دے دی جائے تو مہر ادا نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں اَنْ تَاْجُرَنِيْ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ والد نے ان کو اپنے کام کے لئے ملازم رکھا تو ملازمت کا جو معاوضہ ہے وہ والد کو ملا، تو یہ زوجہ کا مہر کیسے بن گیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بکریاں لڑکیوں ہی کی ملک ہوں اور یہ ملازمت کا فائدہ اس حیثیت سے خود لڑکی کو پہنچا۔ دوسرے اگر باپ ہی کا کام انجام دیا اور اس کی تنخواہ والد کے ذمہ لازم ہوئی تو یہ زرِ مہر لڑکی کا ہوگیا لڑکی کی اجازت سے والد کو بھی اسکا استعمال درست ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کی اجازت سے ہوا ہے۔

مسئلہ لفظ اُنۡكِحَكَ سے ثابت ہوا کہ نکاح کا معاملہ والد نے کیا ہے، جماع فقہاء ایسا ہی ہونا چاہئے کہ لڑکی کا ولی اُسکے نکاح کے معاملہ کی کفالت کرے، لڑکی خود اپنا نکاح نہ کرے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی لڑکی نے خود اپنا نکاح کسی ضرورت و مجبوری سے کر لیا تو وہ منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور یہ آیت اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیتی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوۡسَى الۡاَجَلَ وَسَارَ بِاَهۡلِهٖۤ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ

پھر جب پوری کر چکا موسیٰ وہ مدت اور لیکر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک

نَارًا ۚ قَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا

آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں

بِخَبَرٍ اَوۡ جَذۡوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰٮهَا

کی کچھ خبر یا انگارا آگ کا تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اسکے

نُوۡدِىَ مِنۡ شَاطِیٴِ الۡوَادِ الۡاَيۡمَنِ فِى الۡبُقۡعَةِ الۡمُبٰرَكَةِ مِنَ

پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے تختہ میں ایک

الشَّجَرَةِ اَنۡ يّٰمُوۡسٰۤى اِنِّىۡۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ‏ ﴿۳۰﴾ وَاَنۡ اَلۡقِ

درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب اور یہ کہ ڈالدے

عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهۡتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدۡبِرًا وَّلَمۡ يُعَقِّبۡ ؕ

اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی پھنک اُلٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر

يٰمُوۡسٰۤى اَقۡبِلۡ وَلَا تَخَفۡ اِنَّكَ مِنَ الۡاٰمِنِيۡنَ‏ ﴿۳۱﴾ اُسۡلُكۡ يَدَكَ

اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں ڈال اپنا ہاتھ اپنے

فِىۡ جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ وَّاضۡمُمۡ اِلَيۡكَ جَنَاحَكَ مِنَ

گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی برائی سے اور ملا لے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے

الرَّهۡبِ فَذٰنِكَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا

سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اسکے سرداروں پر بیشک وہ تھے

قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ‏ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ

لوگ نافرمان بولا اے رب میں نے خون کیا ہے اُن میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو

يَّقۡتُلُوۡنِ‏ ﴿۳۳﴾ وَاَخِىۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّىۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِىَ

مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اسکی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ

رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ

مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں فرمایا ہم مضبوط کر دیں گے تیرے بازو کو

بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ

تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے

اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے

خُلاصۂ تفسیر

غرض جب موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو پورا کر چکے اور (باجازت شعیب علیہ السلام کے) اپنی بی بی کو لے کر (مصر کو یا شام کو) روانہ ہوئے تو (ایک شب میں ایسا اتفاق ہوا کہ سردی بھی تھی اور راہ بھی بھول گئے اسوقت) ان کو کوہ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھلائی دی، اُنھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں تمہارے پاس وہاں سے (رستہ کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی آگ کا (دہکتا ہوا) انگارا لے آؤں تاکہ تم سینک لو، سو وہ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنا عصا ڈال دو (چنانچہ انھوں نے ڈال دیا اور وہ سانپ بن کر چلنے لگا) سو انھوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت (ہر طرح امن میں ہو (اور یہ کوئی ڈر کی بات نہیں بلکہ تمہارا معجزہ ہے اور دوسرا معجزہ اور عنایت ہوتا ہے کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا اور (اگر مثل انقلاب عصا کے اس معجزہ سے بھی طبعاً خوف اور حیرت پیدا ہو تو) خوف (رفع کرنے) کے واسطے اپنا (وہ) ہاتھ (پھر) اپنے گریبان اور بغل) سے (بدستور سابق) ملا لینا (تاکہ وہ پھر اصلی حالت پر ہو جائے اور پھر طبعی خوف بھی نہ ہوا کرے) سو یہ (تمہاری نبوت کی) دو سندیں (اور دلیلیں) ہیں تمہارے رب کیطرف سے فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس جانے کے واسطے (جس کا تم کو حکم کیا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب (میں جانے کے لئے حاضر ہوں مگر آپ کی خاص امداد کی ضرورت ہے کیونکہ) میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ (کہیں پہلے ہی) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں (تبلیغ بھی نہ ہونے پاوے)

اور (دوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو اُن کو بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ رسالت دیدیجئے کہ (وہ میری تقریر کی تائید اور) تصدیق (مفصل اور مکمل طور سے) کریں گے (کیونکہ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اسکے درباری) میری تکذیب کریں (تو اسوقت مناظرہ کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرہ کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہے جو رواں زبان ہو) ارشاد ہوا کہ (بہتر ہے) ہم ابھی تمہارے بھائی کو تمہارا قوت بازو بنائے دیتے ہیں (ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی) اور (دوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ) ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت (و ہیبت) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی (بس ہمارے معجزے لیکر جاؤ تم دونوں اور جو تمہارا پیرو ہوگا (اُن لوگوں پر) غالب رہوگے۔

معارف و مسائل

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَى الْاَجَلَ ، یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدتِ معینہ ملازمت کی پوری کردی جو آٹھ سال لازمی اور دو سال اختیاری تھی سو یہاں سوال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف آٹھ سال پورے کئے یا دس سال۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اُنھوں نے زیادہ مدت یعنی دس سال پورے کئے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہی شان ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت شریفہ تھی کہ حقدار کو اسکے حق سے زائد ادا فرماتے تھے اور اُمت کو اسی کی ہدایت فرمائی ہے کہ ملازمت، اُجرت اور خرید و فروخت میں مساہلت اور ایثار سے کام لیا جائے۔

نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ (الیٰ) اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ، یہ مضمون تضمین قصہ موسیٰ علیہ السلام سورہ طٰہٰ اور سورہ نمل میں گزرا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ اور سورۂ نمل میں ہے نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ اور اس سورت میں ہے اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ یہ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر معنی تقریباً ایک ہی ہیں، واقعہ کی حکایت ہر مقام کے مناسب الفاظ سے کی گئی ہے (کذا قال الامام) اور یہ تجلّی بشکلِ نار تجلّی مثالی تھی کیونکہ تجلّی ذاتی کا مشاہدہ اس دُنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتا اور خود موسیٰ علیہ السلام کو اس تجلّی ذاتی کے اعتبار سے لَنْ تَرٰىنِيْ فرمایا گیا ہے یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے مراد مشاہدۂ ذاتِ حق ہے۔

نیک عمل سے جگہ بھی متبرک ہو جاتی ہے

فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ ، کوہِ طور کے اس مقام کو قرآن کریم نے بُقعہ مبارکہ فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اسکے مبارک ہونے کا سبب یہ تجلّی خداوندی ہے جو اس مقام پر بشکلِ نار دکھائی دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مقام میں کوئی نیک عمل اہم واقع

ہوتا ہے وہ مقام بھی متبرک ہو جاتا ہے۔

وعظ میں اچھی خطابت اور فصاحت مطلوب ہے | هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا، اس سے معلوم ہوا کہ وعظ و تبلیغ میں فصاحتِ کلام اور مقبول طرزِ خطابت محمود اور مطلوب ہے۔ اسکی تحصیل میں کوشش بھی مذموم نہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ

پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ لے کر ہماری نشانیاں کھلی ہوئی بولے اور کچھ نہیں یہ جادو ہے

مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ

باندھا ہوا اور ہم نے سنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں اور کہا

مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ

موسیٰ نے میرا رب تو خوب جانتا ہے جو کوئی لایا ہے ہدایت کی بات اُس کے پاس سے اور جس کو

تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ

ملے گا آخرت کا گھر بیشک بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا اور بولا

فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ

فرعون اے دربار والو مجھ کو تو معلوم نہیں تمہارا کوئی حاکم جو میرے سوا سو آگ دے اے

يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ

ہامان میرے واسطے گارے کو پھر بنا میرے واسطے ایک محل تاکہ میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ

مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ

کے رب کو اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے اور بڑائی کرنے لگے وہ اور

جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا

اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ

يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ

آئیں گے پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو، پھر پھینک دیا ہم نے ان کو دریا میں سو دیکھ لے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ

کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ

اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ

کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی اور پیچھے رکھدی ہم نے ان پر اس

الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾ ع ۱۴

دُنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن اُن پر بُرائی ہے

خلاصۂ تفسیر

غرض جب ان لوگوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری صریح دلیلیں لے کر آئے تو ان لوگوں نے (معجزات دیکھ کر) کہا کہ یہ تو محض ایک جادو ہے کہ (خواہ مخواہ خدا تعالیٰ پر) افترا کیا جاتا ہے (کہ یہ اس کی جانب سے معجزات اور دلیلِ رسالت ہیں) اور ہم نے ایسی بات کبھی نہیں سنی کہ ہمارے اگلے باپ دادوں کے وقت میں بھی ہوئی ہو اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (اسکے جواب میں) فرمایا کہ (جب باوجود دلائل صحیحہ قائم ہونے کے اور اسمیں کوئی شبہ معقول نہ نکال سکنے کے بعد بھی نہیں مانتے تو یہ ہٹ دھرمی ہے اور اسکا اخیر جواب یہی ہے کہ) میرا پروردگار اس شخص کو خوب جانتا ہے جو صحیح دین اسکے پاس سے لے کر آیا ہے اور جسکا انجام (یعنی خاتمہ) اس عالم (دُنیا) سے اچھا ہونے والا ہے (اور) بالیقین ظالم لوگ (جو کہ ہدایت اور دین صحیح پر نہ ہوں) کبھی فلاح نہ پاویں گے (کیونکہ ان کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ خدا کو خوب معلوم ہے کہ ہم میں اور تم میں کون اہلِ ہُدیٰ ہے اور کون ظالم اور کون محمود العاقبت ہے اور کون محروم عن الفلاح بس ہر ایک کی حالت اور ثمرہ کا جلد ہی مرنے کے ساتھ ہی ظہور ہو جاوے گا اب نہیں مانتے تم جانو) اور (دلائل موسویہ دیکھ کر اور سُن کر) فرعون (کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے معتقدین ان کی طرف مائل نہ ہو جاویں تو لوگوں کو جمع کر کے) کہنے لگا اے اہلِ دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا (اسکے بعد تلبیس کے واسطے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر اس سے ان لوگوں کا اطمینان نہ ہو تو) اے ہامان تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر اُن) کو آگ میں پزاوہ لگا کر پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تاکہ (میں اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعویٰ میں کہ کوئی اور خدا ہے) موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور فرعون اور اسکے تابعین نے ناحق دُنیا میں سر اُٹھا رکھا تھا اور یوں سمجھ رہے تھے کہ انکو ہمارے پاس لوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (اس تکبر کی سزا میں) اس کو اور اسکے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا انجام کیسا ہوا (اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کا ظہور ہو گیا مَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ) اور ہم نے ان لوگوں کو ایسا رئیس بنایا تھا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے رہے اور (اسی واسطے) قیامت کے روز (ایسے بے کس رہ جاویں گے کہ) انکا کوئی ساتھ نہ دے گا اور (یہ لوگ دونوں عالم میں خاب و خاسر ہوئے چنانچہ) دنیا میں بھی ہم نے انکے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی بدحال لوگوں میں سے ہونگے۔

معارف و مسائل

فَاَوۡقِدۡ لِىۡ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيۡنِ، فرعون نے بہت اونچا بلند محل تیار کرنے کا ارادہ کیا

تو اپنے وزیر ہامان کو اسکی تیاری کے لئے پہلے یہ حکم دیا کہ مٹی کی اینٹوں کو پکا کر پختہ کیا جائے کیونکہ کچی اینٹوں پر کوئی بڑی اور اونچی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرعون کے اس واقعہ سے پہلے پختہ اینٹوں کی تعمیر کا رواج نہ تھا سب سے پہلے فرعون نے یہ ایجاد کرائی۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کیلئے پچاس ہزار معمار جمع کئے مزدور اور لکڑی لوہے کا کام کرنے والے انکے علاوہ تھے اور محل کو اتنا اونچا بنایا کہ اُس زمانے میں اس سے زیادہ بلند کوئی تعمیر نہیں تھی۔ پھر جب یہ تیاری مکمل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا، اُنھوں نے یک ضرب میں اس محل کے تین ٹکڑے کر کے گرا دیا جس میں فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے (قرطبی)

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ، یعنی فرعون کے درباریوں کو اللہ تعالیٰ نے انکی قوم کا پیشوا بنا دیا تھا مگر یہ غلط کار پیشوا اپنی قوم کو آگ یعنی جہنم کی طرف دعوت دے رہے تھے یہاں اکثر مفسرین نے آگ کیطرف دعوت دینے کو ایک استعارہ اور مجاز قرار دیا ہے کہ مراد آگ سے وہ اعمال کفریہ ہیں جنکا نتیجہ جہنم کی آگ میں جانا تھا مگر اُستاذِ محترم نادرہ روزگار حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی تحقیق تبعاً لابن عربی یہ تھی کہ آخرت کی جزا عین عمل ہے۔ انسان کے اعمال جو وہ دُنیا میں کرتا ہے برزخ پھر محشر میں اپنی شکلیں بدلیں گے اور جوہری صورتوں میں نیک اعمال گل و گلزار بن کر جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور اعمال کفر و ظلم آگ اور سانپ، بچھوؤں اور طرح طرح کے عذابوں کی شکل اختیار کریں گے اسلئے جو شخص اس دُنیا میں کسی کو کفر و ظلم کیطرف بلا رہا ہے وہ حقیقۃً اس کو آگ ہی کیطرف بلا رہا ہے۔ اگرچہ اس دُنیا میں اسکی شکل آگ کی نہیں مگر حقیقت اسکی آگ ہی ہے۔ اسی طرح آیت میں کوئی مجاز یا استعارہ نہیں، اپنی حقیقت پر محمول ہے۔ یہ تحقیق اختیار کیجائے تو قرآن کی بے شمار آیات میں مجاز و استعارہ کا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ مثلاً وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا اور مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وغیرہ

وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ، مَقْبُوْحِیْنَ، مقبوح کی جمع ہے جس کے معنے ہیں بگاڑا ہوا۔ مُراد یہ ہے کہ قیامت کے روز انکے چہرے مسخ ہو کر سیاہ اور آنکھیں نیلی ہو جائیں گی۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کر چکے پہلی جماعتوں کو

بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳) وَمَا

سجھانے والی لوگوں کو اور راہ بتانے والی اور رحمت تاکہ وہ یاد رکھیں اور تو نہ

كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ

تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا

مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ

تو دیکھنے والا   لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں   پھر دراز ہوئی اُن پر مدت

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا

اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ اُن کو سناتا ہماری آیتیں پر ہم رہے ہیں

كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ

رسول بھیجتے   اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی   لیکن

رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ

یہ انعام ہے تیرے رب کا تاکہ تو ڈر سنا دے اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا

تاکہ وہ یاد رکھیں   اور اتنی بات کے لئے کہ کبھی آن پڑے اُن پر آفت اُن

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ

کاموں کی وجہ سے جن کو بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ، تو کہنے لگیں اے رب ہمارے کیوں نہ بھیجا ہمارے پاس کسی کو پیغام دے کر

اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ

تو ہم چلتے تیری باتوں پر اور ہوتے ایمان والوں میں   پھر جب پہنچی اُن کو ٹھیک بات ہمارے

عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا

پاس سے کہنے لگے کیوں نہ ملا اس رسول کو جیسا ملا تھا موسیٰ کو کیا ابھی منکر نہیں ہو چکے

بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا

اس سے جو موسیٰ کو ملا تھا اس سے پہلے   کہنے لگے دونوں جادو ہیں آپس میں موافق اور کہنے لگے

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى

ہم دونوں کو نہیں مانتے   تو کہہ اب تم لاؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس کی جو ان دونوں سے

مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ

بہتر ہو کہ میں اس پر چلوں، اگر تم سچے ہو   پھر اگر نہ کر لائیں تیرا کہا

فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ

تو جان لے کہ وہ چلتے ہیں نری اپنی خواہشوں پر اور اس سے گمراہ زیادہ کون جو چلے اپنی خواہش پر بدون

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ

راہ بتلائے اللہ کے   بیشک اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو   اور ہم پے در پے

ع ۸

وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾

بھیجتے رہے ہیں اُن کو اپنے کلام تاکہ وہ دھیان میں لائیں

خلاصۂ تفسیر

اور (رسالت کا سلسلہ خلق کے محتاج اصلاح ہونے کے سبب ہمیشہ سے چلا آیا ہے چنانچہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (جن کا قصہ ابھی پڑھ چکے ہو) اگلی اُمتوں (یعنی قوم نوح و عاد و ثمود) کے ہلاک ہونے کے پیچھے (جبکہ ان زمانوں کے انبیاء کی تعلیمات نایاب ہوگئی تھیں اور لوگ ہدایت کے سخت حاجتمند تھے) کتاب (یعنی تورات) دی تھی جو لوگوں کے (یعنی بنی اسرائیل کے) لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں (طالبِ حق کی اوّل فہم درست ہوتی ہے یہ بصیرت ہے، پھر احکام قبول کرتا ہے یہ ہدایت ہے، پھر ہدایت کا ثمرہ یعنی قرب و قبول عنایت ہوتا ہے یہ رحمت ہے) اور (اسی طرح جب یہ دورہ بھی ختم ہوچکا اور لوگ پھر محتاج تجدید ہدایت ہوئے تو اپنی سُنتِ مستمرہ کے موافق ہم نے آپ کو رسُول بنایا جس کے دلائل میں سے ایک یہی واقعہ وسویہ کی یقینی خبر دینا ہے کیونکہ قطعی خبر دینے کے لئے کوئی طریق علم کا ضروری ہے اور وہ طرق منحصر ہے چار میں، اُمورِ عقلیہ میں عقل ۱، سو یہ واقعہ اُمورِ عقلیہ میں سے تو ہے نہیں، اور اُمورِ نقلیہ میں یا سماع ۲ اہلِ علم سے جو کہ دوسرا طریق ہے سو یہ بھی بوجہ عدم مخالطت و عدم مدارست اہلِ اخبار کے منتفی ہے اور یا اپنا مشاہدہ ۳ جو کہ تیسرا طریق ہے سو اس کی نفی نہایت ہی اظہر ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ (طُور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو احکام دیئے تھے (یعنی توراۃ دی تھی) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے (پس احتمال مشاہدہ کا بھی نہ رہا) ولیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا (جس سے پھر علوم صحیحہ نایاب ہوگئے اور پھر لوگ محتاجِ ہدایت ہوئے اور گو درمیان درمیان انبیاء علیہم السلام آیا کئے مگر ان کے علوم بھی اس طرح نایاب ہوئے اسلئے ہماری رحمت مقتضی ہوئی کہ ہم نے آپ کو وحی و رسالت سے مشرف فرمایا جو کہ چوتھا طریق ہے خبر یقینی کا اور دوسرے طُرق علم ظنی کے ہیں جو بحث ہی سے خارج ہے کیونکہ آپ کی یہ خبریں بالکل یقینی اور قطعی ہیں حاصل یہ کہ علم یقینی کے چار طریقے ہیں اور تین منتفی پس چوتھا متعین اور یہی مطلوب ہے) اور (جیسے آپ نے عطاء توراۃ کا مشاہدہ نہیں کیا اور صحیح و یقینی خبر دے رہے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قیام مدین کا مشاہدہ نہیں فرمایا چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ اہلِ مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سُنا رہے ہوں ولیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر یہ واقعات وحی سے بتلا دیئے) اور (اسی طرح)

آپ طور کی جانب (غربی مذکور) میں اسوقت بھی موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) پکارا تھا (کہ "یٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاکَ" جو کہ ان کو نبوت عطا ہونے کا وقت تھا) ولیکن (اسکا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا، کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کرلیں (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین بلکہ انکے آباء اقربین نے بھی کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا گو بعض شرائع بالخصوص توحید بواسطہ ان تک بھی پہنچی تھی پس وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا سے تعارض نہ رہا) اور (اگر یہ لوگ ذرا تامل کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ پیغمبر بھیجنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان ہی لوگوں کا فائدہ ہے کہ یہ لوگ حُسن و قبح پر مطلع ہوکر عقوبت سے بچ سکتے ہیں ورنہ جن امور کا قبح عقل سے دریافت ہوسکتا ہے اس پر عذاب بلا ارسال رسول بھی ہونا ممکن تھا لیکن اسوقت انکو ایک گونہ حسرت ہوتی کہ ہائے اگر رسول آجاتا تو ہمکو زیادہ تنبیہ ہوجاتا اور اس مصیبت میں نہ پڑتے اسلئے رسُول بھی بھیجدیا تاکہ اس حسرت سے بچنا ان کو آسان ہو ورنہ احتمال تھا کہ) ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب (جو عقلاً قبیح ہیں) کوئی مصیبت (دُنیا یا آخرت میں) نازل ہوتی (جس کی نسبت ان کو عقل کے یا فرشتے کے ذریعہ سے یقین ہوجاتا کہ یہ سزائے اعمال ہے) تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم آپکے احکام کا اتباع کرتے اور (ان احکام اور رسُول پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوتے سو (اس امر کا مقتضا تو یہ تھا کہ رسول کے آنے کو غنیمت سمجھتے اور اسکے دینِ حق کو قبول کرتے لیکن ان کی یہ حالت ہوئی کہ) جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امرِ حق (یعنی رسول حق اور دینِ حق) پہنچا تو (اس میں شبہ نکالنے کے لئے یُوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی (یعنی قرآن واحدۃً مثل توراۃ کے کیوں نہ نازل ہوا، آگے جواب ہے کہ) کیا جو کتاب موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی اسکے قبل یہ لوگ اسکے منکر نہیں ہوئے (چنانچہ ظاہر ہے کہ مشرکین موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو بھی نہ مانتے تھے کیونکہ وہ سرے سے اصل نبوت ہی کے منکر تھے) یہ لوگ تو (قرآن اور توراۃ دونوں کی نسبت) یُوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں (یہ اسلئے کہا کہ اُصول شرائع میں دونوں متفق ہیں) اور یُوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو نہیں مانتے (خواہ یہی عبارت ان کا مقولہ ہو اور خواہ انکے اقوال سے لازم آتا ہو اور خواہ ایکسہی ساتھ دونوں کا انکار کیا ہو یا مختلف قول جمع کئے گئے ہوں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا منشار قصد ایمان بالقرآن بصورت تماثل توراۃ کے نہیں بلکہ یہ بھی ایک حیلہ اور شرارت ہے آگے اس کا جواب ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) آپ کہدیجئے کہ اچھا تو (علاوہ توراۃ و قرآن کے) تم کوئی اور کتاب اللہ

کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (کہ سِحْرَانِ تَظَاهَرَا، جس سے مقصود ان دونوں کتابوں کا نعوذ باللہ مفتری اور غلط ہونا ہے۔ یعنی مقصود تو اتباع حق کا ہے پس اگر کتب الٰہیہ کو حق مانتے ہو تو ان کی پیروی کرو، قرآن کی تو مطلقاً اور توراۃ کی توحید و بشارات محمدیہ میں اور اگر ان کو حق نہیں مانتے تو تم کوئی حق پیش کرو اور اس کا حق ہونا ثابت کرو جس کا ادنیٰ ہونے سے اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ مقصود حق سے اسکا وسیلۂ ہدایت ہونا ہے۔ اگر فرضاً ثابت کر دوگے تو میں اسکی پیروی کرلوں گا، غرض یہ کہ میں حق ثابت کردوں تو تم اسکا اتباع کرو، اور اگر تم حق ثابت کر دو تو میں اتباع کے لئے آمادہ ہوں اور چونکہ قضیہ شرطیہ میں محض حکم اتصال کا ہوتا ہے اسلئے اتباع غیر کتب الٰہیہ کا اشکال لازم نہیں آتا) پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا یہ) کہنا (کہ فَأْتُوا بِكِتَابٍ الخ) نہ کرسکیں (اور ظاہر ہے کہ نہ کرسکیں گے لقولہ تعالیٰ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا اور پھر بھی آپ کا اتباع نہ کریں) تو آپ سمجھ لیجئے کہ (ان سوالات کا منشار کوئی اشتباہ و تردد و حق جوئی نہیں ہے بلکہ) یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں (ان کا نفس کہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے انکار ہی کرنا چاہیے، بس یہ ایسا ہی کر رہے ہیں گو حق بھی واضح ہوجاوے) اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدون اسکے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل (اسکے پاس) ہو (اور) اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو (جو کہ وضوح حق کے بعد بدون کسی متمسک صحیح کے بھی اپنی گمراہی سے باز نہ آویں) ہدایت نہیں کیا کرتا (جسکا سبب اس شخص کا خود قصد کرنا ہے اپنے گمراہ رہنے کا اور قصد کے بعد خلق فعل عادت ہے اللہ تعالیٰ کی اسلئے ایسا شخص ہمیشہ گمراہ رہتا ہے، یہاں تک تو جواب الزامی تھا انکے اس قول کا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ) اور (آگے تحقیقی جواب ہے جسمیں قرآن کے دفعۃً واحدۃً نازل نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کیلئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تاکہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو دفعۃً واحدۃً بھیجنے پر بھی قادر ہیں مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ،

قرونِ اُولیٰ سے اقوام نوح و ہود و صالح و لوط علیہم السلام مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی تھیں، اور بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے لفظی معنے تو دانش و

بینش کے ہیں۔ مراد اس سے وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کے قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جن سے وہ حقائق اشیاء کو دیکھ سکیں اور حق و باطل کا امتیاز کر سکیں۔ (مظہری)

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ میں اگر لفظ ناس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہے تو بات صاف ہے اُس اُمت کے لئے کتاب توراۃ ہی مجموعۂ بصائر تھی۔ اور اگر لفظ ناس سے تمام انسان مراد ہیں جن میں امتِ محمدیہ بھی داخل ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ اُمتِ محمدیہ کے زمانے میں جو تورات موجود ہے وہ تحریفات کے ذریعہ مسخ ہو چکی ہے تو ان کے لئے اسکا بصائر کہنا کیسے درست ہوگا، اور یہ کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی تورات سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے حالانکہ حدیث میں یہ واقعہ معروف ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی اجازت طلب کی کہ وہ تورات میں جو نصائح وغیرہ ہیں انکو پڑھیں تاکہ انکے علم میں ترقی ہو، اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر اسوقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا (جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف میری تعلیمات کو دیکھنا چاہیئے، تورات و انجیل کا دیکھنا آپکے لئے درست نہیں) مگر اسکے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تورات کا جو اسوقت اہل کتاب کے پاس نسخہ تھا وہ تحریف شدہ تھا اور زمانہ ابتداء اسلام کا تھا جس میں نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اسوقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی مکمل حفاظت کے پیشِ نظر ابھی احادیث لکھنے سے بھی بعض حضرات کو روک دیا تھا کہ ایسا نہ ہو لوگ قرآن کے ساتھ احادیث کو جوڑ دیں، ان حالات میں کسی دوسری منسوخ شدہ آسمانی کتاب کا پڑھنا پڑھانا ظاہر ہے کہ احتیاط کے خلاف تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً تورات و انجیل کے مطالعے اور پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ان کتابوں کے وہ حصے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ہیں انکا مطالعہ کرنا اور نقل کرنا صحابہ کرام سے ثابت اور معروف و مشہور ہے حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اس معاملہ میں سب سے زیادہ معروف ہیں، دوسرے صحابہ کرام نے بھی ان پر نکیر نہیں کیا۔ اسلئے حاصل آیت کا یہ ہو جائے گا کہ تورات و انجیل میں جو غیر محرف مضامین اب بھی موجود ہیں اور بلا شبہ بصائر ہیں، ان سے استفادہ درست ہے مگر ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ صرف ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو محرّف اور غیر محرّف میں فرق کر سکیں اور صحیح و غلط کو پہچان سکیں وہ علماء ماہرین ہی ہو سکتے ہیں، عوام کو بے شک اس سے اجتناب اسلئے ضروری ہے کہ وہ کسی مغالطہ میں نہ پڑ جائیں، یہی حکم اُن تمام کتابوں کا ہے جسمیں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے کہ عوام کو انکے مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہیئے علماء ماہرین دیکھیں تو مضائقہ نہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، یہاں اس قوم سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور انکے بعد سے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک انمیں کوئی پیغمبر

مبعوث نہ ہوا تھا یہی مضمون سورۂ یٰسٓ میں بھی آنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری جگہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں اللہ کا کوئی پیغمبر نہ آیا ہو، اس آیت کے منافی نہیں کیونکہ مراد اس آیت کی یہ ہے کہ زمانہ دراز سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد انہیں کوئی نبی نہیں آیا مگر نبی و رسول کے آنے سے بالکل خالی یہ اُمت کبھی نہیں رہی۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ، وصّلنا، توصیل سے مشتق ہے جس کے اصلی لغوی معنے رسّی کے تاروں میں اور تار ملا کر اسکے مضبوط کرنے کے ہیں مُراد یہ ہے کہ قرآن حکیم میں حق تعالےٰ نے لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رکھا اور بہت سے نصیحت کے مضامین کا بار بار تکرار بھی کیا گیا تاکہ سُننے والے متاثر ہوں۔

تبلیغ و دعوت کے بعض آداب | اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ حق بات کو مسلسل کہتے اور پہنچاتے ہی رہتے تھے۔ لوگوں کا انکار و تکذیب اُن کے اپنے عمل اور اپنی لگن میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ حق کو اگر ایک مرتبہ نہ مانا گیا تو دوسری مرتبہ، پھر بھی نہ مانا گیا تو تیسری چوتھی مرتبہ برابر پیش کرتے ہی رہتے تھے۔ کسی کے دل میں ڈال دینا تو کسی ناصح، ہمدرد کے بس میں نہیں مگر اپنی کوشش کو بغیر کسی تکان اور اکتاہٹ کے جاری رکھنا جو ان کے قبضہ میں تھا اسکو مسلسل انجام دیتے۔ آج بھی تبلیغ و دعوت کے کام کرنے والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى

جن کو ہم نے دی ہے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب اُن کو

عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ

سُنائیے تو کہیں ہم یقین لائے اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا ہم ہیں اس سے پہلے

مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ

کے حکمبردار وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دوہرا اس بات پر کہ قائم رہے اور

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا

بھلائی کرتے ہیں بُرائی کے جواب میں اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب

سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

سُنیں نکمی باتیں اس سے کنارہ کریں اور کہیں ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمھارے کام،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

سلامت رہو ہم کو نہیں چاہییں بے سمجھ لوگ

خلاصۂ تفسیر

(اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اُن بشارتوں سے بھی ثابت ہے جن کی اُن علماء نے تصدیق کی ہے جن کو تورات و انجیل میں ان بشارتوں کا علم ہے۔ چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے (آسمانی) کتابیں دی ہیں (اُن میں جو منصف ہیں) وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب قرآن اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بے شک یہ حق ہے (جو) ہمارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اور) ہم تو اس (کے آنے) سے پہلے بھی (اپنی کتابوں کی بشارتوں کی بنا پر) مانتے تھے (اب نزول کے بعد تجدید عہد کرتے ہیں۔ یعنی ہم ان لوگوں کی طرح نہیں جو نزولِ قرآن سے پہلے تو اسکی تصدیق کرتے تھے بلکہ اسکے آنے کے منتظر اور شائق تھے مگر جب قرآن آیا تو اسکے منکر ہوگئے (فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ) اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تورات و انجیل کی بشارتوں کے مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی تھے جیسا کہ سورۂ شعراء کے آخر میں فرمایا ہے اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ یہاں تک رسالتِ محمدیہ پر علماء بنی اسرائیل کی شہادت کا بیان ہوا آگے مومنین اہلِ کتاب کی فضیلت کا بیان ہے کہ) اُن لوگوں کو اُن کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا (کیونکہ وہ پہلی کتاب پر ایمان رکھنے کے ضمن میں بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور بعد نزول کے بھی اس پر قائم رہے اور اس کی تجدید کی، یہ تو انکے اعتقاد اور جزاء کا بیان تھا آگے اعمال و اخلاق کا ذکر ہے کہ) اور وہ لوگ نیکی (اور تحمل) سے بدی (اور ایذاء) کا دفعیہ کر دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور (جس طرح یہ لوگ عملی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اسی طرح) جب کسی سے (اپنے متعلق) کوئی لغو بات سنتے ہیں (جو قولی ایذاء ہے) تو اس کو (بھی) ٹال جاتے ہیں اور (سلامت روی کے طور پر) کہدیتے ہیں کہ (ہم کچھ جواب نہیں دیتے) ہمارا عمل ہمارے سامنے آوے گا اور تمھارا عمل تمھارے سامنے (بھائی) ہم تو تم کو سلام کرتے ہیں (ہم کو جھگڑے سے معاف رکھو) ہم بے سمجھ لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، اس آیت میں اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اور نزولِ قرآن سے پہلے ہی تورات و انجیل کی دی ہوئی بشارتوں کی بنا پر نزولِ قرآن اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر یقین رکھتے تھے۔ پھر آپ مبعوث ہوئے تو اپنے سابق یقین کی بنا پر ایمان لے آئے۔ حضرت ابن عباس کی روایت سے

کہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے درباریوں میں سے چالیس آدمی مدینہ طیبہ میں اسوقت حاضر ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر میں مشغول تھے یہ لوگ بھی جہاد میں شریک ہوگئے، بعض کو کچھ زخم بھی لگے مگر ان میں سے کوئی مقتول نہیں ہوا۔ انھوں نے جب صحابۂ کرام کی معاشی تنگی کا حال دیکھا تو آپ سے درخواست کی کہ ہم اللہ کے فضل سے مالدار اصحاب جائداد ہیں ہم اپنے ملک واپس جا کر صحابۂ کرام کے لئے مال فراہم کرکے لائیں آپ اجازت دے دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (الی قولہ) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اخرجہ ابن مردویہ والطبرانی فی الاوسط۔ مظہری) اور حضرت سعید بن جبیرؓ کی روایت ہے کہ حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب ہجرت مدینہ سے پہلے حبشہ گئے تھے اور نجاشی کے دربار میں اسلام کی تعلیمات پیش کیں تو نجاشی اور اسکے اہل دربار جو اہل کتاب تھے اور تورات وانجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور علامتیں دیکھے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اسی وقت اللہ نے ایمان ڈالدیا۔ (مظہری)

لفظ مسلمین اُمتِ محمدیہ کا مخصوص لقب ہے یا تمام اُمتوں کے لئے عام ہے

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ، یعنی ان حضرات اہل کتاب نے کہا کہ ہم تو قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے یہاں لفظ مسلم اگر اپنے لغوی معنے میں لیا جائے یعنی مطیع و فرمانبردار تو بات صاف ہے کہ ان کو جو یقین قرآن اور نبی آخر الزماں پر اپنی کتابوں کی وجہ سے حاصل تھا اس یقین کو لفظ اسلام اور مسلمین سے تعبیر فرمایا کہ ہم تو پہلے ہی سے اس کو مانتے تھے۔ اور اگر لفظ مسلمین اس جگہ اُس معنے میں لیا جائے جس کے لحاظ سے اُمتِ محمدیہ کا لقب مسلمین ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام اور مسلمین کا لفظ صرف اُمتِ محمدیہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلمین ہی تھے مگر قرآن کریم کی بعض آیات سے اسلام اور مسلمین کا اس اُمت کے لئے مخصوص لقب ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ، اور علامہ سیوطی اسی خصوصیت کے قائل ہیں اور اس مضمون پر اُن کا ایک مستقل رسالہ ہے انکے نزدیک اس آیت میں مسلمین سے مراد یہ ہے کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک نام بھی ہو اور اس اُمت کے لئے مخصوص لقب بھی۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے معنی وصفی کے اعتبار سے سب میں مشترک ہو مگر مُسلم کا لقب صرف اس اُمت کے لئے مخصوص ہو جیسے صدیق اور فاروق وغیرہ کے القاب ہیں جنکا مصداق خاص اس اُمت میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، حالانکہ اپنے معنے وصفی کے اعتبار سے دوسرے حضرات بھی صدیق اور فاروق ہوسکتے ہیں۔

(ہذا ما سنح لی واللہ اعلم)

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ، یعنی مؤمنین اہلِ کتاب کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اسی طرح کا وعدہ ازواج مطہرات کے متعلق بھی آیا ہے وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین شخصوں کے لئے دوہرے اجر کا ذکر فرمایا ہے ایک وہ اہلِ کتاب جو پہلے اپنے سابق نبی پر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر، دوسرا وہ شخص جو کسی کا مملوک غلام ہو اور وہ اپنے آقا کی بھی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہو اور اللہ اور اسکے رسول کی بھی، تیسرا وہ شخص جس کی ملک میں کوئی کنیز تھی جس سے بلا نکاح صحبت اسکے لئے حلال تھی اس نے اس کو اپنی غلامی سے آزاد کردیا پھر اس کو منکوحہ زوجہ بنالیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ان چند قسموں کو دو مرتبہ اجر دینے کی علت کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ان دونوں کے دو عمل اس دوہرے اجر کا سبب ہیں کیونکہ مؤمنین اہلِ کتاب کے دو عمل یہ ہیں کہ پہلے ایک نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لائے پھر دوسرے نبی اور اس کی کتاب پر، اور ازواج مطہرات کے دو عمل یہ ہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت بحیثیت رسول بھی کرتی ہیں اور بحیثیت شوہر بھی، اور مملوک غلام کے دو عمل اسکی دوہری اطاعت و فرمانبرداری ہے، اللہ و رسول کی بھی اور آقا کی بھی؛ اور کنیز کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے والے کا ایک عمل صالح اسکو آزاد کرنا دوسرا اسکو منکوحہ زوجہ بنالینا ہے۔ مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو عمل کے دو اجر ہونا تو مقتضائے عدل و انصاف ہونے کی وجہ سے سب کے لئے عام ہے اسمیں مؤمنین اہلِ کتاب یا ازواج مطہرات وغیرہ کی کیا خصوصیت ہے جو شخص بھی دو عمل کرے گا دو اجر پائے گا؟ اس سوال کے جواب کی مکمل تحقیق احقر نے احکام القرآن سورۂ قصص میں لکھی ہے اسمیں جو بات خود الفاظِ قرآن کی دلالت سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام اقسام میں مراد صرف دو اجر نہیں، کیونکہ وہ تو ہر عمل کرنے والے کے لئے عام ضابطہ قرآنیہ ہے لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ جتنے نیک عمل کرے گا اُسی کے حساب سے اجر پائے گا۔ بلکہ ان اقسام مذکورہ میں دو اجر سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کے ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا۔ ہر نماز پر اسکا دوہرا، ہر روزہ پر اسکا دوہرا، ہر صدقہ اور حج و عمرہ پر اسکا دوہرا ثواب پا دیں گے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کریں تو دو اجر دینے کے لئے مختصر لفظ اجرین کا تھا مگر قرآن نے اسکو چھوڑ کر اجر مرتین کا لفظ اختیار کیا جس میں صاف اشارہ اسکا پایا جاتا ہے کہ اجر مرتین سے مراد یہ ہے کہ ان کا ہر عمل مکرر لکھا جائے گا اور ہر عمل پر دوہرا ثواب ملے گا۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی اتنی بڑی فضیلت اور خصوصیت کا سبب کیا ہے تو اس کا

واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ کسی خاص عمل کو دوسرے اعمال سے افضل قرار دیدے اور اسکا اجر بڑھا دے، کسی کو اس سوال کا حق نہیں ہے کہ روزہ کا ثواب اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ کیوں کر دیا، زکوٰۃ و صدقہ کا کیوں ایسا نہ کیا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اعمال جنکا ذکر آیات مذکور اور حدیث بخاری میں ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ دوسرے اعمال سے ایک حیثیت میں بڑھا ہوا ہو اس پر یہ انعام فرمایا۔ اور بعض اکابر علماء نے جو اسکا سبب ان لوگوں کی دوہری مشقت کو قرار دیا ہے وہ بھی اپنی جگہ محتمل ہے اور اسی آیت کے آخر میں لفظ بِمَا صَبَرُوْا سے اس پر استدلال ہو سکتا ہے کہ علت اس دوہرے اجر کی اُن کا مشقت پر صبر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ، یعنی یہ لوگ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دور کرتے ہیں۔ اس برائی اور بھلائی کی تعبیر میں ائمۂ تفسیر کے بہت سے اقوال ہیں بعض نے فرمایا کہ بھلائی سے طاعت اور برائی سے معصیت مراد ہے کیونکہ نیکی بدی کو مٹا دیتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا أَتْبِعِ الْحَسَنَةَ السَّيِّئَةَ تَمْحُهَا، یعنی بدی اور گناہ کے بعد نیکی کرو تو وہ گناہ کو مٹا دے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا حسنہ سے مراد علم و حلم اور سیئہ سے مراد جہل و غفلت ہے یعنی یہ لوگ دوسروں کی جہالت کا جواب جہالت کے بجائے حلم و بردباری سے دیتے ہیں اور درحقیقت ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ لفظ حسنہ اور سیئہ یعنی بھلائی اور برائی کے الفاظ ان سب چیزوں کو شامل ہیں۔

اس آیت میں دو اہم ہدایتیں ہیں اول یہ کہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ خطاء سرزد ہو جائے تو اسکا علاج یہ ہے کہ اسکے بعد نیک عمل کی فکر کرے تو نیک عمل اُس گناہ کا کفارہ ہو جائے گا جیسا کہ حدیث معاذ کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کسی کے ساتھ ظلم اور برائی سے پیش آئے اگرچہ قانون شرع کی رو سے اسکو اپنا انتقام لے لینے جائز ہے بشرطیکہ انتقام برابر سرابر ہو کہ جتنا نقصان یا تکلیف اسکو پہنچائی ہے اتنا ہی یہ اپنے حریف کو پہنچا دے مگر اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ انتقام کے بجائے برائی کے بدلہ میں بھلائی اور ظلم کے بدلہ میں احسان کرے کہ یہ اعلیٰ درجہ مکارم اخلاق کا ہے اور دنیا و آخرت میں اسکے منافع بیشمار ہیں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں یہ ہدایت بہت واضح الفاظ میں اس طرح آئی ہے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، یعنی برائی اور ظلم کو ایسے طریقہ سے دفع کرو جو کہ بہتر ہے۔ (یعنی ظلم کے بدلہ میں احسان کرو) تو جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ، یعنی ان لوگوں کی ایک عمدہ خصلت یہ ہے کہ جب

یہ کسی جاہل دشمن سے لغویات سنتے ہیں تو اسکا جواب دینے کے بجائے یہ کہدیتے ہیں کہ ہمارا سلام لو ہم جاہل لوگوں سے اُلجھنا پسند نہیں کرتے۔ امام جصاصؒ نے فرمایا کہ سلام کی دو قسمیں ہیں، ایک سلام تحیہ جو مسلمان باہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں، دوسرا سلام مسالمت و متارکت یعنی اپنے حریف کو یہ کہدینا کہ ہم تمہاری لغویات کا کوئی انتقام تم سے نہیں لیتے، یہاں سلام سے یہی دوسرے معنے مراد ہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے پر اللہ راہ پر لائے جس کو

يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

چاہے اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے

خلاصۂ تفسیر

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے (اور ہدایت کرنے کی قدرت تو کسی کو کیا ہوتی اللہ کے سوا کسی کو اس کا علم تک بھی نہیں کہ کون کون ہدایت پانے والا ہے بلکہ) ہدایت پانے والوں کا علم اُسی کو ہے۔

معارف و مسائل

لفظ ہدایت کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنے صرف راستہ دکھا دینے کے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ جس کو راستہ دکھایا گیا وہ منزل مقصود پر پہنچے اور ایک معنی ہدایت کے یہ بھی آتے ہیں کہ کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا جائے۔ پہلے معنے کے اعتبار سے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کا ہادی ہونا اور یہ ہدایت اُن کے اختیار میں ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ ہدایت ہی اُن کا فرض منصبی ہے اگر اس کی اُن کو قدرت نہ ہو تو فریضہ رسالت و نبوت کیسے ادا کریں۔ اس آیت میں جو آپ کا ہدایت پر قادر نہ ہونا بیان فرمایا ہے اس سے مراد دوسرے معنے کی ہدایت ہے، یعنی مقصود پر پہنچا دینا۔ اور مطلب یہ ہے کہ اپنی تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ آپ کسی کے دل میں ایمان ڈالدیں اس کو مؤمن بنادیں یہ آپ کا کام نہیں یہ تو براہِ راست حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہدایت کے معنی اور اُس کی اقسام کی مکمل تحقیق سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ آپ کی بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ کسی طرح ایمان قبول کرلیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا گیا

کسی کو مومن بنا دینا آپ کی قدرت میں نہیں۔ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ ابو طالب کے ایمان و کفر کے مسئلے میں بے ضرورت گفتگو اور بحث و مباحثہ سے اور اُن کو بُرا کہنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی ایذاء کا احتمال ہے۔ واللہ اعلم

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ
اور کہنے لگے اگر ہم راہ پر آئیں تیرے ساتھ اُچک لیے جائیں اپنے ملک سے کیا ہم نے
نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ
جگہ نہیں دی اُن کو حرمت والے پناہ کے مکان میں کھنچے چلے آتے ہیں اس کی طرف میوے ہر چیز کے روزی ہماری
لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ
طرف سے پر بہت ان میں سمجھ نہیں رکھتے اور کتنی غارت کر دیں ہم نے بستیاں
بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ
جو اترا چلی تھیں اپنی گزران میں اب یہ ہیں ان کے گھر آباد نہیں ہوئے ان کے پیچھے
اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ
مگر تھوڑے اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے اور تیرا رب نہیں غارت کرنے والا
الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا
بستیوں کو جب تک نہ بھیج لے ان کی بڑی بستی میں کسی کو رسول جو سنائے ان کو ہماری باتیں اور ہم ہرگز نہیں
مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ
غارت کرنے والے بستیوں کو مگر جبکہ وہاں کے لوگ گنہگار ہوں اور جو تم کو ملی ہے کوئی چیز
فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ
سو فائدہ اٹھا لینا ہے دنیا کی زندگی میں اور یہاں کی رونق ہے اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے اور باقی رہنے والا
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾
کیا تم کو سمجھ نہیں

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر دُور سے کفار کے ایمان نہ لانے کا ذکر چلا آ رہا ہے ان آیات میں ان موانع کا دفعیہ ہے جو کفار کو ایمان لانے کی راہ میں حائل سمجھے جاتے تھے، مثلاً ایک مانع کا بیان ہے کہ) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے

جاویں (کہ بے وطنی کی بھی مضرت ہو اور معاش کی پریشانی الگ ہو لیکن اس عذر کا بطلان ہی بالکل ظاہر ہے) کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں (پس حرم ہونے کی وجہ سے جس کا سب احترام کرتے ہیں مضرت کا بھی اندیشہ نہیں اور اس مضرت کے منتفی ہونے کی وجہ سے احتمال فوت منفعت رزق کا بھی نہیں، پس ان کو چاہئے تھا کہ اس حالت کو غنیمت سمجھتے اور اسکو نعمت سمجھ کر قدر کرتے اور ایمان لے آتے) ولیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے (یعنی اسکا خیال نہیں کرتے) اور (ایک سبب ان کے ایمان نہ لانے کا یہ ہے کہ یہ اپنی خوش عیشی پر نازاں ہیں لیکن یہ بھی حماقت ہے کیونکہ) ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھے، سو (دیکھ لو) یہ انکے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے) ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کسی مسافر وارد وصادر کا ادھر کو اتفاقاً گزر ہو جاوے اور وہ تھوڑی دیر وہاں سستانے کو یا تماشا دیکھنے کو بیٹھ جاوے یا شب کو رہ جاوے) اور آخر کار (انکے ان سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے (کوئی ظاہری وارث بھی ان کا نہ رہا) اور (ایک شبہ انکو یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کی ہلاکت بسبب کفر کے ہے تو ہم مدت سے کفر کرتے آرہے ہیں ہمکو کیوں نہ ہلاک کیا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ الخ اور اس شبہ کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے سو اسکا حل یہ ہے کہ) آپکا رب بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا جبتک کہ (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے اور (پیغمبر کو بھیجنے کے بعد بھی فوراً) ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اسی حالت میں کہ وہاں کے باشندے بہت ہی شرارت کرنے لگیں (یعنی ایک مدت معتد بہ تک بار بار کی تذکیر سے تذکر حاصل کریں تو اس وقت ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جن بستیوں کی ہلاکت کا اوپر ذکر تھا وہ بھی اسی قانون کے موافق ہلاک ہوئیں سو اسی قانون کے موافق تمہارے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے اسلئے نہ رسول سے پہلے ہلاک کیا اور نہ بعد رسول کے ابھی تک ہلاک کیا مگر چند روز گزرنے دو۔ اگر تمہارا یہی عناد رہا تو سزا ہو ہی گی چنانچہ بدر وغیرہ میں ہوئی) اور (ایک وجہ ایمان نہ لانے کی یہ ہے کہ دنیا نقد ہے اسلئے مرغوب ہے اور آخرت اُدھار ہے اسلئے غیر مرغوب ہے، پس دُنیا کی رغبت سے دل خالی نہیں ہوتا کہ اسمیں آخرت کی رغبت سماوے پھر اس کی تحصیل کا طریقہ تلاش کیا جاوے جو کہ ایمان ہے سو اسکی نسبت یہ سُن رکھو کہ) جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دُنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے (کہ خاتمہ عمر کے ساتھ اسکا بھی خاتمہ ہو جائیگا) اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیۃً بھی) بہتر ہے اور (کمیۃً بھی) زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے سو کیا تم لوگ (اس تفاوت کو یا اس تفاوت کے اقتضاء کو) نہیں سمجھتے (غرض تمہارے اعذار اور اسباب پر

اصرار علی الکفر سب محض بے بنیاد اور لغو ہیں سمجھو او ر مانو)

معارف و مسائل

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ، یعنی کفار مکہ حارث بن عثمان وغیرہ نے اپنے ایمان نہ لانے کی یک وجہ یہ بیان کی کہ اگرچہ ہم آپ کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں مگر ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم آپ کی ہدایات پر عمل کر کے آپ کے ساتھ ہو جاویں تو سارا عرب ہمارا دشمن ہو جائے گا اور ہمیں ہماری زمین مکہ سے اُچک لے گا (اخرجہ النسائی وغیرہ) قرآن کریم نے ان کے اس عذرِ لنگ کے تین جواب دیئے اول یہ کہ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ، یعنی ان کا یہ عذر اسلئے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اہلِ مکہ کی حفاظت کا ایک قدرتی سامان پہلے سے یہ کر رکھا ہے کہ ارضِ مکہ کو حرم بنا دیا اور پورے عرب کے قبائل کفر و شرک اور باہمی عداوتوں کے باوجود اس پر متفق تھے کہ زمین حرم مکہ میں قتل و قتال سخت حرام ہے۔ حرم میں باپ کا قاتل بیٹے کو ملتا تو انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ حرم کے اندر اپنے دشمن کو قتل کر دے یا اُس سے کوئی انتقام لے لے۔ اسلئے ایمان لانے میں اُن کو یہ خطرہ محسوس کرنا انتہائی جہالت ہے کہ جس مالک نے اپنے رحم و کرم سے اُنکے کفر و شرک کے باوجود اس زمین میں امن دے رکھا ہے تو ایمان لانے کی صورت میں وہ اُن کو کیسے ہلاک ہونے دے گا۔ یحییٰ بن سلام نے فرمایا کہ معنے آیت کے یہ ہیں کہ تم حرم کی وجہ سے مامون و محفوظ تھے، میرا دیا ہوا رزق فراخی کے ساتھ کھا رہے تھے اور عبادت میرے سوا دوسروں کی کرتے تھے اپنی اس حالت سے تو تمہیں خوف نہ ہوا الٹا خوف اللہ پر ایمان لانے سے ہوا (قرطبی) آیتِ مذکورہ میں حرم مکہ کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ وہ جائے امن ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں اطرافِ دُنیا سے ہر چیز کے ثمرات لائے جاتے ہیں تاکہ مکہ کے باشندے اپنی تمام ضروریات آسانی سے پوری کر سکیں۔

حرم مکہ میں ہر چیز کے ثمرات کا جمع ہونا خاص آیاتِ قدرت میں سے ہے

مکہ مکرمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کے لئے ساری دُنیا میں سے منتخب فرمایا ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں دُنیا کی معیشت کی کوئی چیز آسانی سے نہ ملنا چاہیئے کیونکہ گیہوں، چنا، چاول وغیرہ جو عام انسانی غذا ہے، ان چیزوں کی پیداوار بھی وہاں نہ ہونے کے حکم میں تھی۔ پھل اور ترکاریوں وغیرہ کا تو کہنا کیا ہے مگر یہ سب چیزیں جس افراط کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں عقل حیران رہ جاتی ہے کہ موسم حج کے موقع پر مکہ کی دو تین لاکھ کی آبادی یہ بہ ... [illegible] ... ہو جاتا ہے جو اوسطاً دو ڈھائی مہینے تک رہتا ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی دن کسی

زمانے میں غذائی ضروریات نہ ملی ہوں بلکہ رات دن کے تمام اوقات میں تیار شدہ غذا ہر وقت ملتے رہنے کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کے لفظ (ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ) میں غور کریں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرفِ عام کے اعتبار سے ثمرات کا تعلق درختوں کے ساتھ ہے مقام اسکا تھا کہ ثمرات كُلِّ شجر فرمایا جاتا، اسکے بجائے ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ فرماتے ہیں بعید نہیں کہ اشارہ اس طرف ہو کہ لفظ ثمرات یہاں صرف پھلوں کے معنے میں نہیں بلکہ مطلقاً حاصل اور پیداوار کے معنی میں ہے ملوں اور کارخانوں کی مصنوعات بھی اُنکے ثمرات ہیں، اس طرح حاصل اس آیت کا یہ ہوگا کہ حرم مکہ میں صرف کھانے پینے ہی کی چیزیں جمع نہیں ہوں گی بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی جمع کر دی جائیں گی جسکا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو رہا ہے کہ شاید دنیا کے کسی بھی ملک میں یہ بات نہو کہ ہر ملک اور ہر خطے کی غذائیں اور وہاں کی مصنوعات اس افراط کے ساتھ وہاں ملتی ہوں جیسی مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں۔ یہ تو کفارِ مکہ کے عذر کا ایک جواب ہوا کہ جس مالک نے تمھاری حالتِ کفر و شرک میں تم پر یہ انعامات برسائے کہ تمھاری زمین کو ہر خطرہ سے مامون و محفوظ کر دیا اور باوجودیکہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، ساری دُنیا کی پیداوار یہاں لاکر جمع کر دی تو تمھارا یہ خطرہ کیسی بڑی جہالت ہے کہ خالقِ کائنات پر ایمان لانے کی صورت میں تم سے یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی۔

اس کے بعد دوسرا جواب اس عذر کا یہ ہے وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا، جسمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کافر قوموں کے حالات پر نظر ڈالو کہ اُن کے کفر و شرک کے وبال سے کس طرح اُن کی بستیاں تباہ ہوئیں اور مضبوط و مستحکم قلعے اور حفاظتی سامان سب خاک میں مل گئے تو اصل خوف کی چیز کفر و شرک ہے جو تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ تم کیسے بے خبر بے وقوف ہو کہ کفر و شرک سے خطرہ محسوس نہیں کرتے ایمان سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔

تیسرا جواب اس آیت میں دیا گیا وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا الآیۃ جس میں یہ بتلایا کہ اگر بالفرض ایمان لانے کے نتیجہ میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچ ہی جائے تو وہ چند روزہ ہے اور جس طرح دُنیا کی عیش و عشرت مال و دولت سب چند روزہ متاع ہے کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح یہاں کی تکلیف بھی چند روزہ ہے جلد ختم ہو جانے والی ہے اسلئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ فکر اُس تکلیف و راحت کی کرے جو پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی ہے ہمیشہ رہنے والی دولت و نعمت کیخاطر چند روزہ تکلیف و مشقت برداشت کر لینا ہی عقلمندی کی دلیل ہے۔

لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا، یعنی پچھلی قوموں کی جن بستیوں کو عذابِ الٰہی سے برباد کیا گیا تھا، اب تک بھی اُن میں آبادی نہیں ہوئی بجز قدرِ قلیل کے۔ اس قدرِ قلیل سے مراد اگر مساکن اور مقامات قلیلہ لئے جاویں جیسا کہ زجاج کا قول ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان تباہ شدہ

بستیوں میں کوئی مقام اور کوئی مکان پھر آباد نہیں ہو سکا بجز عدد قلیل کے کہ وہ آباد ہوئے مگر حضرت ابن عباس سے آیت کی یہ تفسیر منقول ہے کہ قدر قلیل سے مقامات اور مکانات قلیلہ کا استثناء نہیں بلکہ زمانِ سکونت کا استثناء مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان بستیوں میں کوئی رہتا بھی ہے تو بہت تھوڑی دیر کے لئے جیسے کوئی راہگیر مسافر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائے جسکو بستیوں کی آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا، لفظ اُمّ کے مشہور معنے والدہ اور ماں کے ہیں اور ماں چونکہ تخلیق انسانی کی بنیاد ہے اسلئے لفظ اُمّ اصل اور اساس کے معنے میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اُمّھا کی ضمیر قریٰ کی طرف راجع ہے اُمّھا سے مراد اُم القریٰ ہے یعنی بستیوں کی اصل اور مدار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُسوقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک اُس قوم کے بڑے شہروں میں اپنے کسی رسُول کے ذریعہ پیغام حق نہ پہنچا دے، جب دعوتِ حق پہنچ جائے اور لوگ اُس کو قبول نہ کریں اُسوقت ان بستیوں پر عذاب آتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے انبیاء اور رُسل عموماً بڑے شہروں میں مبعوث ہوتے ہیں وہ چھوٹے قصبات و دیہات میں نہیں آتے کیونکہ ایسے قصبات و دیہات عادۃً شہر کے تابع ہوتے ہیں اپنی معاشی ضروریات میں بھی اور تعلیمی ضروریات میں بھی۔ اور شہر میں جو بات پھیل جائے اس کا تذکرہ ملحقہ قصبات و دیہات میں خود بخود پھیل جاتا ہے اسی لئے جب کسی بڑے شہر میں رسُول مبعوث ہوا اور اُس نے دعوتِ حق پیش کردی تو یہ دعوت ان قصبات و دیہات میں بھی عادۃً پہنچ جاتی ہے اس طرح ان سب پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور انکار و تکذیب کیا جائے تو سب پر عذاب آتا ہے۔

احکام و قوانین میں قصبات و دیہات شہروں کے تابع ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے معاشی ضروریات میں چھوٹی بستیاں بڑے شہر کے تابع ہوتی ہیں وہیں سے اُن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اسی طرح جب کسی حکم کا اعلان شہر میں کر دیا جائے تو اس حکم کی تعمیل اس کی ملحقہ بستیوں پر بھی لازم ہو جاتی ہے، نہ جاننے یا نہ سُننے کا عذر مسموع نہیں ہوتا۔

ہلالِ رمضان و عید کے مسئلے میں بھی فقہاء نے یہی فرمایا ہے کہ ایک شہر میں اگر شہادتِ شرعیہ کے ساتھ قاضی شہر کے حکم سے چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے تو ملحقہ بستیوں کو بھی اُس پر عمل کرنا لازم ہے۔ لیکن دوسرے شہر والوں پر اُسوقت تک لازم نہیں ہوگا جبتک خود اس شہر کا قاضی شہادت کو تسلیم کر کے اسکا حکم نہ دے۔ (کذا فی الفتاوی الغیاثیہ)

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، یعنی دنیا کا مال و متاع اور عیش و عشرت سب فانی ہے اور یہاں کے اعمال کا جو بدلہ آخرت میں ملنے والا ہے وہ یہاں کے مال و اسباب اور عیش و

عشرت سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی راحت و لذت بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی اور پھر وہ ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہے بخلاف متاعِ دُنیا کے کہ وہ کتنا ہی بہتر ہو مگر بالآخر فانی اور زائل ہونے والا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے عیش کو جو کم درجہ بھی ہو اور چند روزہ بھی اُس عیش و آرام پر ترجیح نہیں دے سکتا جو راحت و لذت میں اس سے زیادہ بھی ہو اور ہمیشہ رہنے والا بھی ہو۔

عقلمند کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا کے دھندوں میں زیادہ منہمک نہ ہو بلکہ آخرت کی فکر میں رہے

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال و جائیداد کے متعلق یہ وصیت کر کے مرجائے کہ میرا مال اُس شخص کو دیا جائے جو سب سے زیادہ عقلمند ہو تو اس مال کے مصرف شرعی وہ لوگ ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں مشغول ہوں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہی ہے اور دُنیا داروں میں سے سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے۔ یہی مسئلہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار باب الوصیت میں بھی مذکور ہے۔

أَفَمَن وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَن مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعَ

بھلا ایک شخص جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ سو وہ اُس کو ملنے والا ہے برابر ہے اسکی جس کو ہم نے فائدہ

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٦١﴾ وَيَوْمَ

دیا دُنیا کی زندگی کا پھر وہ قیامت کے دن پکڑا ہوا آیا اور جس دن

يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾

اُن کو پکارے گا تو کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ج

بولے جن پر ثابت ہو چکی بات اے رب یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا

أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾

اُن کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے ہم منکر ہوئے تیرے آگے وہ ہم کو نہ پوجتے تھے

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَ

اور کہیں گے پکارو اپنے شریکوں کو پھر پکاریں گے اُن کو تو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور

رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿٦٤﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ

دیکھیں گے عذاب کسی طرح وہ راہ پائے ہوئے ہوتے اور جس دن اُن کو پکارے گا

فَيَقُولُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ
تو فرمائے گا کیا جواب دیا تھا تم نے پیغام پہنچانے والوں کو　پھر بند ہو جائیں گی اُن پر　باتیں

يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ
اُس دن　سو وہ آپس میں بھی نہ پوچھیں گے　سو جس نے کہ توبہ کی اور یقین لایا　اور

عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾
عمل کئے اچھے　سو اُمید ہے کہ ہو　چھوٹنے　والوں میں

خُلاصۂ تفسیر

بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دُنیوی زندگی کا چند روزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہوگا جو گرفتار کر کے لائیں جائیں گے (مراد پہلے شخص سے مومن ہے جس سے جنت کا وعدہ ہے اور دوسرے سے مراد کافر ہے جو مجرم ہو کر آوے گا اور چونکہ متاعِ دُنیا ہی ان لوگوں کی بھول کا سبب ہے اسلئے اسکی تصریح فرما دی، ورنہ ان دونوں کا برابر نہ ہونا تو در اصل اسوجہ سے ہے کہ وہ گرفتار کر کے حاضر کئے جاویں گے یہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہونگے) اور (آگے اس تفاوت اور کیفیت احضار کی تفصیل ہے کہ وہ دن قابل یاد کرنے کے ہے) جس دن خدا تعالیٰ ان کافروں کو (بطور سزا کے) پکار کر کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو تم (ہمارا شریک) سمجھ رہے تھے (مراد اس سے شیاطین ہیں کہ اُنہی کی اطاعت مطلقہ سے شرک کرتے تھے اس لئے ان کو شرکاء کہا، اسکو سنکر شیاطین) جن پر (لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے) خدا کا فرمودہ (یعنی استحقاق عذاب اس قول سے کہ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) ثابت ہو چکا ہوگا وہ (بطور عذر کے) بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار بیشک یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا (یہ جواب کی تمہید ہے اس حکایت کی تصریح اسلئے فرمائی گئی کہ جن کی شفاعت کی ان کو اُمید ہے وہ برعکس انکے خلاف شہادت دیں گے اور آگے جواب ہے کہ ہم نے بہکایا تو ضرور لیکن) ہم نے اُن کو ویسا ہی (بلا جبر و اکراہ) بہکایا جیسا ہم خود (بلا جبر و اکراہ) بہکے تھے (یعنی جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا، اسی طرح ہمکو اُن پر جابرانہ تسلط نہ تھا ہمارا کام صرف بہکانا تھا پھر اسکو انھوں نے اپنی رائے اور اختیار سے قبول کر لیا جیسا سورۂ ابراہیم میں ہے وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ الآیۃ، مطلب یہ ہے کہ ہم بھی مجرم ہیں مگر یہ بھی بری نہیں) اور ہم آپکی پیشی میں انکے (تعلقات) سے دست برداری کرتے ہیں (اور) یہ لوگ (درحقیقت صرف) ہم کو (ہی) نہ پوجتے تھے (یعنی

جب یہ اپنے اختیار سے بہکے ہیں تو یہ خود خواہش پرست ہوئے نہ کہ صرف شیطان پرست، مقصود اس سب حکایت سے یہ ہے کہ جن کے بہکانے سے بہکے ہیں وہ قیامت کے روز ان سے دست بردار ہوجائیں گے اور (جب وہ شیاطین اس طرح ان سے بیزاری و بے رخی کریں گے تو اس وقت ان مشرکین سے) کہا جائیگا کہ (اب) اپنے ان شریکوں کو بلاؤ چنانچہ وہ (فرط حیرت سے بالاضطرار) ان کو پکاریں گے سو وہ جواب بھی نہ دیں گے اور (اس وقت) یہ لوگ (اپنی آنکھوں سے) عذاب کو دیکھ لیں گے، اے کاش یہ لوگ دنیا میں راہ راست پر ہوتے (تو یہ مصیبت نہ دیکھتے) اور جس دن ان کافروں سے پکار کر پوچھے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا سو اس روز ان (کے ذہن) سے سارے مضامین گم ہوجائیں گے تو وہ (خود بھی نہ سمجھ سکیں گے اور) آپس میں پوچھ پاچھ بھی نہ کرسکیں گے البتہ جو شخص (کفر و شرک سے دنیا میں) توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ امید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانے والوں سے ہونگے (اور ان آفات سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف و مسائل

آیت میں کفار و مشرکین سے پہلا سوال شرک کے متعلق ہوگا کہ جن شیاطین وغیرہ کو تم ہمارا شریک کیا کرتے تھے اور ان کا کہا مانتے تھے آج وہ کہاں ہیں، کیا وہ تمہاری کچھ مدد کرسکتے ہیں؟ اسکے جواب میں ظاہر ہے کہ مشرکین یہ جواب دیں گے کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، ہم نے از خود شرک نہیں کیا بلکہ ہمیں تو ان شیاطین نے بہکایا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ خود ان شیاطین کی زبانوں سے کہلوا دیں گے کہ ہم نے بہکایا ضرور تھا مگر مجبور تو ہم نے نہیں کیا۔ اس لئے ہم بھی مجرم ہیں مگر تم جرم سے بری یہ بھی نہیں ہوسکتے جس طرح ہم نے ان کو بہکایا تھا اس کے بالمقابل انبیاء علیہم السلام اور اُن کے نائبوں نے انکو ہدایت بھی تو کی تھی اور دلائل کے ساتھ ان پر حق واضح کردیا تھا، انہوں نے اپنے اختیار سے انبیاء کی بات نہ مانی ہماری مان لی تو یہ کیسے بری ہوسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے سامنے حق کے دلائل واضحہ موجود ہوں اور وہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے بجائے گمراہ کرنے والوں کی بات مان کر گمراہی میں پڑ جائے تو یہ کوئی عذر معتبر نہیں۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ

اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے اُن کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا، اللہ

اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ

نرالا ہے اور بہت اوپر ہے اس چیز سے کہ شریک بتلاتے ہیں، اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے انکے سینوں میں

وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ

اور جو کچھ کہ ظاہر میں کرتے ہیں، اور وہی اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی کی تعریف ہے دنیا اور

وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ

آخرت میں اور اسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس پھیرے جاؤ گے۔ تو کہہ دیکھو تو اگر اللہ

اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ

رکھ دے تم پر رات ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے

يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿٧١﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ

کہ لائے تم کو کہیں سے روشنی، پھر کیا تم سنتے نہیں تو کہہ دیکھو تو اگر رکھ دے اللہ

عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ

تم پر دن ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو

بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٧٢﴾ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ

رات جس میں آرام کرو، پھر کیا تم نہیں دیکھتے اور اپنی مہربانی سے بنا دیئے تمہارے واسطے

اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

رات اور دن کہ اس میں چین بھی کرو اور تلاش بھی کرو کچھ اس کا فضل اور تاکہ تم شکر کرو

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رب (بالانفراد صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے چنانچہ وہ) جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (تو تکوینی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے (اور انبیاء کے ذریعہ سے نازل فرماتا ہے پس تشریعی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا کوئی حق (حاصل) نہیں (کہ جو حکم چاہیں تجویز کرلیں جیسے یہ مشرک اپنی طرف سے شرک کو جائز تجویز کر رہے ہیں اور اس خصوصی اختیار سے ثابت ہو گیا کہ) اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (کیونکہ جب تکویناً و تشریعاً خالق اور مختار ہونے میں وہ منفرد ہے تو عبادت کا بھی تنہا وہی مستحق ہے کیونکہ معبود بنانا صرف اسی کا حق ہے جو تکوینی اور تشریعی دونوں اختیار رکھتا ہو) اور آپ کا رب (علم ایسا کامل رکھتا ہے کہ وہ) سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (اور کسی کا ایسا علم بھی نہیں اس سے بھی انفراد ثابت ہوا) اور (آگے اس کی تصریح ہے کہ) اللہ وہی (ذات کامل الصفات) ہے اس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں حمد (و ثناء) کے لائق دنیا و آخرت میں وہی ہے (کیونکہ اس کے تصرفات دونوں عالم میں ایسے ہیں جو اس کے جامع کمالات اور مستحق حمد

ہونے پر شاہد ہیں) اور (اختیارات سلطنت اسکے ایسے ہیں کہ) حکومت بھی (قیامت میں) اسی کی ہوگی اور (قوت و وسعت سلطنت اسکی ایسی ہے) کہ تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (یہ نہیں کہ بچ جاؤ یا اور کہیں جاکر پناہ لے لو اور اسکے اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان لوگوں سے) کہیے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آئے (پس قدرت میں بھی وہی منفرد ہے) تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں (اور اسی اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان سے اسکے عکس کی نسبت بھی) کہیے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آوے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم (اس شاہد قدرت کو) دیکھتے نہیں (قدرت میں اسکا منفرد ہونا بھی اس کو مقتضی ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو) اور (وہ منعم ایسا ہے کہ) اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم رات میں آرام کرو اور تاکہ دن میں اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان دونوں نعمتوں پر) تم (اللہ کا) شکر کرو (تو انعام و احسان میں بھی وہی منفرد ہے یہ بھی اسکی دلیل ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو)۔

معارف و مسائل

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ، اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لیا گیا کہ یختار سے مراد اختیار احکام ہے کہ حق تعالیٰ جیسا کہ تخلیق کائنات میں منفرد ہے کوئی اسکا شریک نہیں تو اجرائے احکام میں بھی منفرد ہے جو چاہے اپنی مخلوق میں حکم نافذ فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اختیار تکوینی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اسی طرح اختیار تشریعی میں بھی کوئی شریک نہیں اور اسکا ایک دوسرا مفہوم وہ ہے جو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ اس اختیار سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں اپنے اکرام و اعزاز کے لئے انتخاب فرما لیتے ہیں اور بقول بغوی یہ جواب ہے مشرکین مکہ کے اس قول کا کہ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ، یعنی یہ قرآن اللہ کو نازل ہی کرنا تھا تو عرب کے دو بڑے شہروں مکہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل فرماتا کہ اسکی قدر و منزلت پہچانی جاتی، ایک یتیم مسکین پر نازل فرمانے میں کیا حکمت تھی؟ اسکے جواب میں فرمایا کہ جس مالک نے تمام مخلوقات کو بغیر کسی شریک کی امداد کے پیدا فرمایا ہے یہ اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے کہ اپنے کسی خاص اعزاز کے لئے اپنی مخلوق میں سے کس کو منتخب کرے اسمیں وہ تمہاری تجویزوں کا کیوں پابند ہو کہ فلاں اسکا مستحق ہے فلاں نہیں۔

ایک چیز کو دوسری چیز پر یا ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت کا معیار صحیح اختیار خداوندی ہے

حافظ ابن قیم نے اس آیت سے ایک عظیم الشان ضابطہ اخذ کیا ہے کہ دُنیا میں جو ایک جگہ کو دوسری جگہ پر یا ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے یہ اُس چیز کے کسب عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بلا واسطہ خالق کائنات کے انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اُس نے سات آسمان پیدا کئے اُنمیں سے سماءِ عُلیا کو دوسروں پر فضیلت دیدی حالانکہ مادہ ساتوں آسمانوں کا ایک ہی تھا، پھر اُس نے جنّت الفردوس کو دوسری سب جنتوں پر اور جبرئیل و میکائیل و اسرافیل وغیرہ خاص فرشتوں کو دوسرے فرشتوں پر، اور انبیاء علیہم السلام کو دوسرے سارے بنی آدم پر اور اُن میں سے اولوالعزم رسولوں کو دوسرے انبیاء پر اور اپنے خلیل ابراہیم اور حبیب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسرے سب اولوالعزم رسُولوں پر، پھر اولاد اسماعیل علیہ السلام کو دوسری ساری دُنیا کے لوگوں پر پھر قریش کو اُن سب پر اور بنی ہاشم کو سب قریش پر اور سید ولد آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب بنی ہاشم پر پھر اسی طرح صحابہ کرام اور دوسرے اسلافِ اُمت کو دوسروں پر فضیلت دینا یہ سب حق تعالیٰ جل شانہ کے **انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہے۔**

اسی طرح زمین کے بہت سے مقامات کو دوسرے مقامات پر اور بہت دنوں اور راتوں کو دوسرے دنوں اور راتوں پر فضیلت دینا یہ سب اُسی اختیار اور انتخاب حق جل شانہ کا اثر ہے۔ غرض افضلیت و مفضولیت کا اصل معیار تمام کائنات میں یہی انتخاب و اختیار ہے البتہ افضلیت کا ایک دوسرا سبب انسانی اعمال و افعال بھی ہوتے ہیں اور جن مقامات میں نیک اعمال کئے جاویں وہ مقامات بھی ان اعمال صالحہ یا صالحین عباد کی سکونت سے متبرک ہو جاتے ہیں۔ یہ فضیلت کسب و اختیار اور عمل صالح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں مدار فضیلت دو چیزیں ہیں ایک غیر اختیاری ہے جو صرف حق تعالیٰ کا انتخاب ہے دوسرا اختیاری جو اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اس موضوع پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور آخر میں صحابہ کرام میں سے خلفاء راشدین کو تمام دوسرے صحابہ پر اور خلفاء راشدین میں صدیق اکبر انکے بعد عمر بن خطاب ان کے بعد عثمان غنی انکے بعد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی ترتیب کو ان دونوں معیاروں سے ثابت کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک مستقل رسالہ فارسی زبان میں اس موضوع پر ہے جسکا اُردو ترجمہ احقر نے بنام بعض التفصیل لمسئلۃ التفضیل شائع کر دیا ہے اور احکام القرآن سورۂ قصص میں بھی اس کو بزبان عربی مفصّل لکھدیا ہے۔ اہل علم کے ذوق کی چیز ہے وہاں مطالعہ فرمائیں۔

أَرَءَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۝ الی قولہ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ اس

آیت میں حق تعالیٰ نے رات کے ساتھ تو اسکا ایک فائدہ ذکر فرمایا، یعنی تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ، یعنی رات میں انسان کو سکون ملتا ہے اسکے بالمقابل دن کے ذکر میں ضیاء کے ساتھ کوئی فائدہ ذکر نہیں فرمایا سبب ظاہر ہے کہ دن کی روشنی اپنی ذات میں افضل ہے اور ظلمت سے روشنی کا بہتر ہونا معلوم معروف ہے۔ روشنی کے بیشمار فوائد اتنے معروف ہیں کہ اُن کے بیان کی ضرورت نہیں، بخلاف رات کے کہ وہ ظلمت اور اندھیری ہے جو اپنی ذات میں کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ اسکی فضیلت لوگوں کے سکون و آرام کے سبب سے ہے اسلئے اسکو بیان فرما دیا۔ اور اسی لئے دن کے معاملہ کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا: اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ اور رات کا معاملہ ذکر کر کے فرمایا اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اسمیں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ دن کے فضائل و برکات اور اسکے فوائد و ثمرات بیشمار ہیں جو احاطۂ بصر میں نہیں آسکتے البتہ سُنے جا سکتے ہیں اسلئے اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ فرمایا۔ کیونکہ انسانی علم و ادراک کا بڑا ذخیرہ کانوں ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، آنکھوں سے دیکھی ہوئی اشیاء ہمیشہ کانوں سے سُنی ہوئی اشیاء سے بہت کم ہوتی ہیں اور رات کے فوائد بہ نسبت دن کے فوائد کے کم ہیں وہ دیکھے بھی جا سکتے ہیں اسلئے یہاں اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کا کلمہ اختیار فرمایا۔ (مظہری)

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور جس دن اُن کو پکارے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ

اور جدا کر دیں گے ہم ہر فرقے میں سے ایک احوال بتلانے والا، پھر کہیں گے لاؤ اپنی سند تب جان لیں گے کہ

الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

سچ بات ہے اللہ کی اور کھوئی جائیں گی اُن سے جو باتیں وہ جوڑتے تھے

ع ۱۵ ۱۰

خُلاصۂ تفسیر

اور جس دن اللہ تعالیٰ اُن کو پکار کر فرماوے گا (تاکہ سب لوگ اُن کی رُسوائی سُن لیں) کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے وہ کہاں گئے اور (اگرچہ حجت تمام کرنے کے لئے خود اسکا اقرار کافی تھا مگر مزید تاکید کے لئے ان پر شہادت بھی قائم کر دی جاوے گی اس طرح کہ) ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ (بھی) نکال کر لائیں گے (مراد اس سے انبیاء ہیں جو اُنکے کفر کی گواہی دیں گے) پھر ہم (ان مشرکین سے) کہیں گے کہ (اب) اپنی کوئی دلیل (شرک کے دعوے کی صحت پر) پیش کرو سو (اُس وقت) اُن کو (بعین الیقین) معلوم ہو جاوے گا کہ سچی بات خدا کی تھی (جو انبیاء کے ذریعہ بتلائی گئی تھی

اور شرک کا دعویٰ جھوٹا تھا) اور (دُنیا میں) جو کچھ باتیں گھڑا کرتے تھے (آج) کسی کا پتہ نہ رہے گا۔ (کیونکہ انکشافِ حق کے لئے باطل کا غائب ہو جانا لازم ہے)۔

فائدہ اس سے پہلی آیت میں جو سوال مَاذَآ أَجَبْتُمُ میں کیا گیا اس میں کفار سے انبیاء کو جواب دینے کے متعلق باز پرس تھی اور یہاں خود انبیاء علیہم السلام سے شہادت دلانا مقصود ہے اسلئے سوال میں کوئی تکرار نہیں۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ

قارون جو تھا سو موسیٰ کی قوم سے پھر شرارت کرنے لگا ان پر اور ہم نے دیئے تھے اسکو خزانے

مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ

اتنے کہ اسکی کنجیاں اُٹھانے سے تھک جاتے کئی مرد زور آور جب کہا اس کو اسکی قوم نے

لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ

اِترا مت اللہ کو نہیں بھاتے اِترانے والے اور جو تجھ کو اللہ نے

اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا

دیا ہے اُس سے کمالے پچھلا گھر اور نہ بھول اپنا حصہ دُنیا سے اور بھلائی کر جیسے

أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور مت چاہ خرابی ڈالنی ملک میں اللہ کو بھاتے نہیں

الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ

خرابی ڈالنے والے بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے کیا اُس نے یہ نہ جانا

أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً

کہ اللہ غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں جو اس سے زیادہ رکھتی تھیں زور

وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٧٨﴾ فَخَرَجَ عَلَىٰ

اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع، اور پوچھے نہ جائیں گنہگاروں سے اُن کے گناہ پھر نکلا اپنی

قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ

قوم کے سامنے اپنے ٹھاٹھ سے، کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دُنیا کی زندگی کے اے کاش

لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾ وَقَالَ الَّذِينَ

ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون کو بیشک اسکی بڑی قسمت ہے اور بولے جن کو

أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ

ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے اُنکے واسطے جو یقین لائے اور کام کیا بھلا

وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ

اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں، پھر دھنسا دیا ہم نے اسکو اور اسکے گھر کو زمین میں

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ وَمَا كَانَ

پھر نہ ہوئی اس کی کوئی جماعت جو مدد کرتی اس کی اللہ کے سوائے اور نہ وہ

مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ

خود مدد لا سکا اور صبح کو لگے کہنے جو کل شام آرزو کرتے تھے اُس کا سا

يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ

درجہ اے خرابی یہ تو اللہ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کر دیتا ہے

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۱۱

اگر نہ احسان کرتا ہم پر اللہ تو ہمکو بھی دھنسا دیتا، اے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر

خلاصۂ تفسیر

قارون (کا حال دیکھو کہ کفر و خلاف کرنے سے اس کو کیا ضرر پہنچا اور اسکا مال و متاع کچھ کام نہ آیا بلکہ اسکے ساتھ اسکا مال و متاع بھی برباد ہو گیا. مختصر اسکا قصہ یہ ہے کہ وہ) موسیٰ (علیہ السلام کی برادری میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے بلکہ ان کا چچازاد بھائی) تھا کذا فی الدر) سو وہ کثرتِ مال کی وجہ سے) ان لوگوں کے مقابلہ میں تکبر کرنے لگا اور (مال کی اسکے پاس یہ کثرت تھی کہ) ہم نے اس کو اسقدر خزانے دیئے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں (یعنی اُن سے بتکلف اُٹھتی تھیں تو جب کنجیاں اس کثرت سے تھیں تو ظاہر ہے کہ خزانے بہت ہی ہونگے اور یہ تکبر اسوقت کیا تھا) جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تو (اس مال و حشمت پر) اترا مت واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور (یہ بھی کہا کہ) تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دُنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش مت کر اور (مطلب اِبْتَغِ وَلَا تَنْسَ کا یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور (خدا کی نافرمانی اور حقوق واجبہ ضائع کر کے) دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو (یعنی گناہ کرنے سے دُنیا میں فساد ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ بالخصوص متعدی گناہ) بیشک اللہ تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا (یہ سب نصیحت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی غالباً یہ مضامین موسیٰ علیہ السلام نے اوّل فرمائے ہونگے پھر مکرر دوسرے مسلمانوں نے ان کا اعادہ کیا ہوگا) قارون (یہ سُن کر) کہنے لگا کہ

مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنر مندی سے ملا ہے (یعنی میں وجوہ و تدابیر معاش کی خوب جانتا ہوں اس سے میں نے یہ سب جمع کیا ہے پھر میرا تفوق بیجا نہیں اور نہ اس کو غیبی احسان کہا جا سکتا ہے اور نہ کسی کا اسمیں کچھ استحقاق ہو سکتا ہے آگے اللہ تعالیٰ اسکے اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) کیا اُس (قارون) نے (اخبار متواترہ سے) یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اُمتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی اس سے) اُن کا زیادہ تھا اور (صرف یہی نہیں کہ بس ہلاک ہو کر چھوٹ گئے ہوں بلکہ بوجہ اُن کے ارتکاب جرم کفر اور اللہ تعالیٰ کو یہ جرم معلوم ہونے کے قیامت میں بھی معذب ہونگے جیسا وہاں کا قاعدہ ہے کہ) اہلِ جُرم سے اُن کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ سب معلوم ہے گو زجر و تنبیہ کے لئے سوال ہو لقولہ تعالیٰ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ، مطلب یہ کہ اگر قارون اس مضمون پر نظر کرتا تو ایسی جہالت کی بات نہ کہتا کیونکہ پچھلی قوموں کے حالاتِ عذاب سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور مؤاخذۂ اخرویہ سے اُسیکا احکم الحاکمین ہونا ظاہر ہے، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی نعمت کو اپنی ہنر مندی کا نتیجہ بتلائے اور حقوق واجبہ سے انکار کرے) پھر (ایکبار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اُس کی برادری میں) دُنیا کے طالب تھے (گو مؤمن ہوں جیسا اُن کے اگلے قول وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الخ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے وہ لوگ) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحبِ نصیب ہے، (یہ تمنا حرص کی تھی، اس سے کافر ہونا لازم نہیں آتا، جیسا اب بھی بعضے آدمی باوجود مسلمان ہونے کے شب و روز دوسری قوموں کی ترقیاں دیکھ کر للچاتے ہیں اور اسکی فکر میں لگے رہتے ہیں) اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ (ان حریصوں سے) کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو (تم اس دُنیا پر کیا جاتے ہو) اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب (اس دُنیوی کر و فر سے) ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر ایمان و عمل صالح والوں میں سے بھی) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص و طمع سے) صبر کرنے والے ہیں (پس تم لوگ ایمان کی تکمیل اور عمل صالح کی تحصیل میں لگو اور حد شرعی کے اندر دنیا حاصل کر کے زائد کی حرص و طمع سے صبر کرو) پھر ہمنے اس قارون کو اور اسکے محل سرائے کو (اس کی شرارت بڑھ جانے سے) زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ (کے عذاب) سے بچا لیتی (گو وہ بڑی جماعت والا تھا) اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا اور کل (یعنی پچھلے قریب زمانہ میں) جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج اسکے خسف کو دیکھ کر) کہنے لگے بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ (رزق کی فراخی

اور تنگی کا مدار خوش نصیبی یا بد نصیبی پر نہیں ہے بلکہ یہ تو محض حکمتِ تکوینیہ سے اللہ ہی کے قبضہ میں ہے بس) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے اور (جس کو چاہے) تنگی سے دینے لگتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ اس کو خوش نصیبی سمجھتے تھے ہماری توبہ ہے اور واقعی) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا (کیونکہ حرص اور حُبِّ دُنیا کی معصیت کے ہم بھی مرتکب ہوئے تھے) بس جی معلوم ہو کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام بجز خسران ہے بس فلاح معتدبہ اہلِ ایمان ہی کے ساتھ مخصوص ہے)۔

مَعَارف و مَسَائل

سورۂ قصص کے شروع سے یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ مذکور تھا جو اُن کو فرعون اور آلِ فرعون کے ساتھ پیش آیا، یہاں اُنکا دوسرا قصہ بیان ہوتا ہے جو اپنی برادری کے آدمی قارون کے ساتھ پیش آیا اور مناسبت اسکی سابقہ آیتوں سے یہ ہے کہ پچھلی آیت میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ دُنیا کی دولت و مال جو تمھیں دیا جاتا ہے وہ چند روزہ متاع ہے اس کی محبت میں لگ جانا دانشمندی نہیں۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، الآیۃ، قارون کے قصہ میں یہ بتلایا گیا کہ اپنے مال و دولت حاصل ہونے کے بعد اس نصیحت کو بھلا دیا اسکے نشہ میں مست ہو کر اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی کی اور مال پر جو حقوق واجبہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے فرض ہیں اُنکی ادائگی سے منکر بھی ہو گیا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے خزانوں سمیت زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔

قارون ایک عجمی لفظ غالباً عبرانی زبان کا ہے اسکے متعلق اتنی بات تو خود الفاظِ قرآن سے ثابت ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری بنی اسرائیل ہی میں سے تھا۔ باقی یہ کہ اسکا رشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی کی ایک روایت میں اسکو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی قرار دیا ہے اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ (قرطبی و روح)

رُوح المعانی میں محمد بن اسحٰق کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قارون تورات کا حافظ تھا اور دوسرے بنی اسرائیل سے زیادہ اس کو تورات یاد تھی مگر سامری کی طرح منافق ثابت ہوا اور اسکی منافقت کا سبب دُنیا کے جاہ و عزّت کی بیجا حرص تھی۔ پورے بنی اسرائیل کی سیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی اور اُنکے بھائی ہارون اُنکے وزیر اور شریکِ نبوت تھے اس کو یہ حسد ہوا کہ میں بھی تو ان کی برادری کا بھائی اور قریبی رشتہ دار ہوں میرا اس سیادت و قیادت میں کوئی حصہ کیوں نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکی شکایت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مجھے اسمیں کچھ دخل نہیں مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوا اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے حسد رکھنے لگا۔

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ، لفظ بغی چند معانی کے لئے آتا ہے مشہور معنے ظلم کے ہیں، یہاں یہ معنی بھی مُراد ہوسکتے ہیں کہ اس نے اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم کرنا شروع کیا۔ یحییٰ بن سلام اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ قارون سرمایہ دار آدمی تھا، فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کی نگرانی پر مامور تھا، اس امارت کے عہدے میں اُس نے بنی اسرائیل کو ستایا۔ (قرطبی)

اور دوسرے معنے تکبر کے بھی آتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس جگہ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ اسنے مال و دولت کے نشہ میں بنی اسرائیل پر تکبر شروع کیا اور اُن کو حقیر و ذلیل قرار دیا۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ، کنوز، کنز کی جمع ہے، مدفون خزانہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاحِ شرع میں کنز وہ خزانہ ہے جس کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہو۔ حضرت عطار سے روایت ہے کہ اسکو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان مدفون خزانہ مل گیا تھا۔ (مرح)

لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ، ناءَ کا لفظ بوجھ سے جُھکا دینے کے معنی میں آتا ہے اور عصبہ کے معنی جماعت کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اسکے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ اُن کی کنجیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ایک قوی جماعت بھی ان کو اُٹھائے تو بوجھ سے جُھک جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قفل کی کنجی بہت ہلکے وزن کی رکھی جاتی ہے جس کا اُٹھانا اور پاس رکھنا مشکل نہ ہو مگر کثرتِ عدد کے سبب یہ اتنی ہوگئی تھیں کہ ان کا وزن ایک قوی جماعت بھی آسانی سے نہ اُٹھا سکے۔ (مرح)

لَا تَفْرَحْ، فرح کے لفظی معنے اُس خوشی کے ہیں جو انسان کو کسی لذتِ عاجلہ کے سبب حاصل ہو۔ قرآن کریم نے بہت سی آیات میں فَرح کو مذموم قرار دیا جیسا کہ ایک اسی آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ اور ایک آیت میں لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ اور ایک آیت میں ہے فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور بعض آیات میں فرح کی اجازت بلکہ ایک طرح کا امر بھی وارد ہوا ہے جیسے يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ میں اور آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا میں ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیات کے مجموعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ فرح ہے جو اترانے اور تکبر کرنے کی حد تک پہنچ جائے اور وہ جبھی ہوسکتا ہے کہ اس لذت و خوشی کو وہ اپنا ذاتی کمال اور ذاتی حق سمجھے اللہ تعالیٰ کا انعام و احسان نہ سمجھے۔ اور جو خوشی اس حد تک نہ پہنچے وہ ممنوع نہیں بلکہ ایک حیثیت سے مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی شکر گزاری ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا، یعنی مسلمانوں نے قارون کو یہ نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت تجھے عطا فرمایا ہے اسکے ذریعہ آخرت کا سامان فراہم کر، اور دُنیا میں جو تیرا حصہ ہے اُس کو نہ بھول۔

دُنیا کا حصہ کیا ہے اس کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد دُنیا کی عمر اور اُس میں کئے ہوئے وہ اعمال ہیں جو اُس کو آخرت میں کام آویں جس میں صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور دوسرے اعمالِ صالحہ بھی۔ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسرین سے یہی معنے منقول ہیں (کمافی القرطبی) اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید و تائید ہوگی۔ پہلے جملے میں جو کہا گیا کہ جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے یعنی مال و دولت اور عمر و قوت و صحت وغیرہ، ان سب سے وہ کام لے جو دارِ آخرت میں تیرے کام آئے اور در حقیقت دُنیا کا یہی حصہ تیرا ہے جو آخرت کا سامان بن جائے باقی دُنیا تو دوسرے وارثوں کا حصہ ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ دوسرے جملہ کا مطلب یہ کہ جو کچھ اللہ نے تمھیں دیا ہے اُس سے اپنی آخرت کا سامان بھی کرو مگر اپنی ضروریاتِ دُنیا کو بھی نہ بھلاؤ کہ سب صدقہ خیرات کر کے کنگال بن جاؤ بلکہ بقدرِ ضرورت اپنے لئے بھی رکھو۔ اس تفسیر پر نصیبِ دُنیا سے مراد اُس کی معاشی ضروریات ہونگی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ط، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں علم سے مراد علمِ تورات ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ قارون تورات کا حافظ اور عالم تھا اور اُن ستر اصحاب میں سے تھا جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب فرمایا تھا مگر اس کو اپنے اس علم پر ناز و غرور پیدا ہو گیا اسکو اپنا ذاتی کمال سمجھ بیٹھا اور اسکے اس کلام کا مطلب یہی تھا کہ مجھے جو کچھ مال و دولت ملا ہے میرے اپنے ذاتی کمالِ علمی کے سبب ملا ہے اسلئے میں اسکا خود حقدار ہوں اس میں مجھ پر کسی کا احسان نہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں علم سے مُراد معاشی تدبیروں کا علم ہی ہے مثلاً تجارت صنعت وغیرہ کا جن سے مال حاصل ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو مال مجھے حاصل ہوا اسمیں اللہ تعالیٰ کے احسان کا کیا دخل ہے یہ تو میں نے اپنی ہوشیاری اور کارگزاری کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور جاہل نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ہوشیاری اور کارگزاری اور صنعت یا تجارت کا تجربہ اور علم بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا تھا اسکا کوئی ذاتی کمال نہ تھا۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ، قارون کے اس قول کا کہ میرا مال و دولت میرے ذاتی علم و ہنر سے حاصل کردہ ہے اصل جواب تو وہ تھا جو اُوپر لکھا گیا ہے کہ اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ اسکا سبب کوئی خاص علم و ہنر تھا تو بھی اللہ تعالیٰ کے احسان سے کیسے بری ہوا کیونکہ یہ علم و ہنر اور قوتِ کسب بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے مگر اسکا جواب بوجہ غایت ظہور کے نظر انداز فرما کر قرآن نے یہ بتلایا کہ یہ مال و دولت فرض کرو کہ اس کو اپنے ہی ذاتی کمال سے حاصل ہوا ہو مگر خود اس مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں، مال کی فراوانی کسی انسان کے لئے نہ کوئی کمال اور فضیلت ہے اور نہ وہ ہر حال میں اسکے کام آتا ہے اسکے ثبوت میں پچھلی اُمتوں کے بڑے سرمایہ داروں

کی مثال پیش فرمائی کہ جب اُنھوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو اچانک پکڑ لیا مال و دولت اُن کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ الآیۃ، اس آیت میں، اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی علماء کا مقابلہ اَلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے کیا گیا ہے جس میں واضح اشارہ اس طرف ہے کہ متاعِ دُنیا کا ارادہ اور اس کو مقصود بنانا اہلِ علم کا کام نہیں اہلِ علم کی نظر ہمیشہ آخرت کے دائمی فائدہ پر رہتی ہے، متاعِ دُنیا کو بقدرِ ضرورت حاصل کرتے ہیں اور اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ

وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی ملک میں

وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ

اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھلی ہے ڈرنے والوں کی جو لے کر آیا بھلائی اسکو ملنا ہے اس سے

مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ

بہتر اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو بُرائیاں کرنے والے اُن کو وہی سزا ملے گی

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

جو کچھ وہ کرتے تھے

خُلاصۂ تفسیر

یہ عالمِ آخرت (جس کے ثواب کا مقصود ہونا اُوپر (ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ) میں بیان ہوا ہے) ہم اُنہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (یعنی نہ تکبر کرتے ہیں جو باطنی گناہ ہے اور نہ کوئی ظاہری گناہ ایسا کرتے ہیں جس سے زمین میں فساد برپا ہو) اور صرف ان باطنی اور ظاہری بُرائیوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ) نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے، (جو بُرائیوں سے اجتناب کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہوں اور کیفیت اعمال پر جزا و سزا کی یہ ہوگی کہ) جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اُس کو اُس (کے مقتضا) سے بہتر (بدلہ) ملے گا (کیونکہ نیک عمل کا اصل مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اُس کی حیثیت کے موافق عوض ملے مگر وہاں اُس سے زیادہ دیا جائے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گنا ہے) اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اُتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (یعنی اسکے مقتضیٰ سے زیادہ بدلہ سزا کا نہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

لِلَّذِیۡنَ لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فَسَادًا ۚ اس آیت میں دار آخرت کی نجات و فلاح کو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے جو زمین میں عُلُو اور فساد کا ارادہ نہ کریں۔ عُلُو سے مراد تکبر ہے یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا بنانے اور دوسروں کو حقیر کرنے کی فکر۔ اور فساد سے مراد لوگوں پر ظلم کرنا ہے (سفیان ثوری) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر معصیت فساد فی الارض ہے کیونکہ گناہ کے وبال سے دُنیا کی برکت میں کمی آتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تکبر اور ظلم کا یا مطلق معصیت کا ارادہ کریں اُن کا آخرت میں حصہ نہیں۔

فائدہ تکبر جس کی حُرمت اور وبال اس آیت میں ذکر کیا گیا وہ وہی ہے کہ لوگوں پر تفاخر اور انکی تحقیر مقصود ہو، ورنہ اپنے لئے اچھے لباس اچھی غذا اچھے مکان کا انتظام جب وہ دوسروں کے تفاخر کے لئے نہ ہو مذموم نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

معصیت کا پختہ عزم بھی معصیت ہے اس آیت میں علو اور فساد کے ارادہ پر دار آخرت سے محروم ہونے کی وعید ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت کا پختہ ارادہ جو عزم مصمم کے درجہ میں آجائے وہ بھی معصیت ہی ہے (کما فی الروح) البتہ اگر پھر وہ خدا کے خوف سے اس ارادہ کو ترک کر دے تو گناہ کی جگہ ثواب اُسکے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے اور اگر کسی غیر اختیاری سبب سے اُس گناہ پر قدرت نہ ہوئی اور عمل نہ کیا مگر اپنی کوشش گناہ کے لئے پوری کی تو وہ بھی معصیت اور گناہ لکھا جائیگا (کما ذکرہ الغزالی رح) آخر آیت میں فرمایا وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ اسکا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی نجات اور فلاح کے لئے دو چیزوں عُلُو اور فساد سے اجتناب بھی لازم ہے اور تقویٰ یعنی اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی۔ صرف ان دو چیزوں سے پرہیز کر لینا کافی نہیں بلکہ جو اعمال از روئے شرع فرض و واجب ہیں اُن پر عمل کرنا بھی نجاتِ آخرت کی شرط ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ، تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے

مَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی وَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۸۵﴾ وَ مَا کُنۡتَ

کون لایا ہے راہ کی سُوجھ اور کون پڑا ہے صریح گمراہی میں اور تو توقع

تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡکَ الۡکِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ فَلَا

نہ رکھتا تھا کہ اُتاری جائے تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیرے رب کی سو تو

تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِينَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
مت ہو مددگار کافروں کا اور نہ ہو کہ وہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے

بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ
بعد اسکے کہ اُتر چکے تیری طرف اور بُلا اپنے رب کی طرف اور مت ہو شریک

الْمُشْرِكِينَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
والوں میں اور مت پکار اللہ کے سوائے دوسرا حاکم، کسی کی بندگی نہیں اسکے سوا

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۸﴾
ہر چیز فنا ہے مگر اسکا منہ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کیطرف پھر جاؤ گے

خُلاصۂ تفسیر

(اور آپکے ان مخالفین نے جو آپ کو پریشان کر کے ترکِ وطن پر مجبور کیا ہے جسکی اضطراری مفارقت کا آپ کو صدمہ ہے تو آپ تسلی رکھیں) جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے (جو مجموعاً دلیل ہے آپکی نبوت کی) وہ آپکو (آپکے اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچائے گا (اور اس وقت آپ آزاد اور غالب اور صاحبِ سلطنت ہونگے، اور ایسی حالت میں اگر دوسری جگہ قیام کے لئے تجویز کیجاتی ہے بمصلحت و باختیار ہوتی ہے جس سے رنج نہیں ہوتا، اور باوجود آپکے حقِ نبوت کے جو یہ لوگ آپ کو غلطی پر اور اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں تو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون سچا دین لیکر (منجانب اللہ) آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں (مبتلا) ہے (یعنی میرے حق پر ہونے اور تمہارے باطل پر ہونے کے دلائل قطعیہ موجود ہیں مگر جب ان سے کام نہیں لیتے تو اخیر جواب یہی ہے کہ خیر، خدا کو معلوم ہے وہ بتلا دے گا) اور (آپ کی یہ دولتِ نبوت محض خدا داد ہے حتی کہ خود) آپ کو (نبی ہونے سے قبل) یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جاوے گی مگر محض آپکے رب کی مہربانی سے اسکا نزول ہوا سو آپ (ان لوگوں کی خرافات کیطرف توجہ نہ کیجئے اور جس طرح ابتک ان سے الگ تھلگ رہتے آئندہ بھی اسی طرح) ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجئے، اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہو چکے تو ایسا نہ ہونے پاوے (جیسا ابتک کبھی نہیں ہونے پایا) کہ یہ لوگ آپکو ان احکام سے روک دیں اور آپ (بدستور) اپنے رب (کے دین) کی طرف (لوگوں کو) بلاتے رہیئے اور (جس طرح ابتک مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اسی طرح آئندہ ہمیشہ) ان مشرکوں میں شامل نہ ہوجیئے اور (جس طرح ابتک شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا (ان آیتوں میں کفار و مشرکین کو آپ کی درخواستوں سے نا امید کرنا ہے اور روئے سخن انہی کی طرف ہے کہ تم جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دین میں

موافق ہونے کی درخواست کرتے ہوا سمیں کامیابی کا کبھی احتمال نہیں، مگر عادت ہے کہ جس شخص پر زیادہ غصہ ہوتا ہے اُس سے بات نہیں کیا کرتے اپنے محبوب سے باتیں کرکے اُس شخص کو سنایا کرتے ہیں۔ معالم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ خطاب ظاہر میں آپؐ کو ہے اور مقصود آپ نہیں۔ یہاں تک رسالت کے متعلق مضمون قصداً تھا، گو توحید کا بھی ضمناً آگیا، آگے توحید کا مضمون قصداً ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اسلئے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اسکی ذات کے بس اُسکے سوا کوئی مستحق عبادت نہ ٹھہرا، یہ مضمون توحید کا ہوگیا، آگے معاد کا مضمون ہے کہ) اُسی کی حکومت ہے (جسکا ظہور کامل قیامت میں ہے) اور اُسی کے پاس تم سب کو جانا ہے (پس سب کو اُن کے کئے کی جزا دیگا۔ یہ معاد کا مضمون بھی ختم ہوگیا)۔

معارف و مسائل

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ، آخر سورت میں یہ آیات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اپنے فریضۂ رسالت و نبوت پر پوری طرح قائم رہنے کی تاکید کے لئے ہیں، اور مناسبت اسکی سابقہ آیات سورت سے یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصہ فرعون اور اسکی قوم کی دشمنی اور اُس سے خوف کا، پھر اپنے فضل سے انکو قوم فرعون پر غالب کرنے کا ذکر فرمایا تو آخر سورت میں خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی حالات کا خلاصہ بیان فرمایا کہ کفار مکہ نے آپکو پریشان کیا، قتل کے منصوبے بنائے، مسلمانوں کی زندگی مکہ میں اجیرن کردی مگر حق تعالیٰ نے اپنی عادتِ قدیمہ کے مطابق آپ کو سب پر فتح اور غلبہ نصیب فرمایا اور مکہ مکرمہ جہاں سے کفار نے آپ کو نکالا تھا وہ پھر مکمل طور پر آپکے قبضہ میں آیا۔ اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ، جس ذات پاک نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے یعنی اُسکی تلاوت اور تبلیغ اور اس پر عمل آپ پر فرض فرمایا ہے وہ ہی ذات آپ کو پھر معاد پر لوٹائے گی۔ معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے معاد کی یہ تفسیر منقول ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چند روز کے لئے آپ کو اپنا وطن عزیز خصوصاً حرم اور بیت اللہ چھوڑنا پڑا مگر قرآن کا نازل کرنے والا اور اُسپر عمل کو فرض کرنے والا خدا تعالیٰ آخر کار آپ کو پھر مکہ میں لوٹا کر لائیگا۔ ائمہ تفسیر میں سے مقاتل کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور سے رات کے وقت نکلے اور مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے سفر کیا کیونکہ دشمن تعاقب میں تھے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ طیبہ کے راستہ کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے اور وہاں سے وہ مکہ سے مدینہ کا معروف راستہ ملجاتا ہے اسوقت مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد

آیا، اسی وقت جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے جس میں آپ کو بشارت دی گئی ہے کہ مکہ مکرمہ سے یہ جُدائی چند روزہ ہے اور بالآخر آپ کو پھر مکہ مکرمہ پہنچا دیا جائیگا جو فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت جحفہ میں نازل ہوئی ہے نہ مکی ہے نہ مدنی (قرطبی)

قرآن دشمنوں پر فتح اور مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ ہے

اس آیت میں آپ کو دوبارہ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ واپسی کی بشارت اس عنوان سے دی گئی ہے کہ جس ذاتِ حق نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے آپ کو دشمنوں پر غالب کر کے دوبارہ مکہ مکرمہ لوٹائے گا، اسمیں اشارہ اسطرف بھی ہے کہ قرآن کی تلاوت اور اُس پر عمل ہی اس نصرتِ خداوندی اور فتح مبین کا سبب ہوگی۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ اس آیت میں وجہہ سے مراد ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور معنے یہ ہیں ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک و فنا ہونے والی ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ وجہہ سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص کے ساتھ کیا جائے وہ ہی باقی رہنے والا ہے باقی سب فانی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

الحمد للہ سورۂ قصص آج ۹ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ کو ایسے حالات میں تمام ہوئی کہ پاکستان پر ہندوستان اور دوسری بڑی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے شدید حملہ ہوا اور چودہ روز کراچی پر روزانہ بمباری ہوتی رہی، شہری آبادی کو جا بجا سخت نقصان پہنچا، سیکڑوں مسلمان شہید اور مکانات منہدم ہوئے، اور چودہ دن کی جنگ اس حادثہ جانکاہ پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان پاکستان سے کٹ گیا اور تقریباً نوے ہزار پاکستانی فوج نے وہاں محصور ہو کر ہتھیار ڈالدیئے اور اسوقت تک وہاں مسلمانوں کا قتلِ عام جاری ہے، ہر مسلمان کا دل اس صدمہ سے پاش پاش اور دماغ ماؤف ہے، فانا للہ وانا الیہ راجعون

والیہ المشتکی ولا ملجأ ولا منجا من اللہ الا الیہ

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَسِتُّونَ آيَةً وَسَبْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی اس کی انہتر آیتیں ہیں اور سات رکوع ۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الٓمّٓ ۝١ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ

کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو

لَا يُفْتَنُونَ ۝٢ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ

جانچ نہ لیں گے ، اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے سو البتہ معلوم کرے گا اللہ

الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝٣ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ

جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو ، کیا یہ سمجھتے ہیں جو لوگ

يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝٤ مَنْ

کہ کرتے ہیں برائیاں کہ ہم سے بچ جائیں ، بری بات طے کرتے ہیں ، جو کوئی

كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝٥

توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ آرہا ہے ، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا ،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝٦

اور جو کوئی محنت اٹھائے سو اٹھاتا ہے اپنے ہی واسطے اللہ کو پروا نہیں جہان والوں کی ،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ

اور جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام ہم اُتار دیں گے اُن پر سے برائیاں انکی اور

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

بدلہ دیں گے ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ، اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے میں چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو (انواع مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا (یعنی ایسا نہ ہوگا بلکہ اس قسم کے امتحانات بھی پیش آئیں گے) اور ہم تو ایسے ہی واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گذرے ہیں (یعنی دوسری امتوں کے مسلمانوں پر بھی یہ معاملے گذری ہیں) سو اسی طرح ان کی آزمائش بھی کی جاوے گی اور اس آزمائش میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعویٰ میں) سچے تھے، اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا (چنانچہ جو صدق و اعتقاد سے مسلمان ہوتے ہیں وہ ان امتحانات میں ثابت رہتے ہیں بلکہ اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جو دفع الوقتی کے لئے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ ایسے وقت میں اسلام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یہی یہ ایک حکمت ہے امتحان کی کیونکہ مخلص اور غیر مخلص کے خلط ملط میں بہت سی مضرتیں ہوتی ہیں، خصوص ابتدائی حالات میں۔ یہ مضمون تو مسلمانوں کے متعلق ہوا آگے ان ایذا دینے والے کفار کی نسبت فرماتے ہیں کہ) ہاں کیا جو لوگ بُرے بُرے کام کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے، ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے (یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا جس میں کفار کی بدانجامی سنا کر مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی کر دی کہ ان ایذاؤں کا ان سے بدلہ لیا جاوے گا، آگے پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ) جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو (اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان ہونا ہی نہ چاہئے کیونکہ) اللہ (کے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے (جس سے سارے غم غلط ہو جائیں گے، کقولہ تعالیٰ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ) اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (نہ کوئی قول اس سے مخفی نہ کوئی فعل بس لقاء کے وقت تمہاری سب طاعات قولیہ و فعلیہ کا صلہ دے کر سب غم دُور کر دے گا) اور (یاد رکھو کہ ہم جو تم کو ترغیب دے رہے ہیں مشقتوں کے برداشت کرنے کی، سو اس میں ظاہر

اور مسلّم ہے کہ ہماری کوئی منفعت نہیں بلکہ) جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لئے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں (اس میں بھی ترغیب ہے تحمل مشاق کی کیونکہ اپنے نفع پر متنبہ ہونے سے وہ فعل زیادہ آسان ہو جاتا ہے اور (وہ نفع جو طاعت سے پہنچتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے (جس میں بعض گناہ جیسے کفر و شرک تو ایمان سے زائل ہو جاتے ہیں، اور بعض گناہ توبہ سے کہ اعمالِ صالحہ میں داخل ہے اور بعضے گناہ صرف حسنات سے اور بعضے گناہ محض فضل سے معاف ہو جائیں گے اور کوئی گناہ بعد قدرے سزا کے یہاں تکفیر سب کو عام ہے) اور ان کو ان کے (ان) اعمال (ایمان و اعمالِ صالحہ) کا (استحقاق سے) زیادہ اچھا بدلہ دیں گے، (پس اتنی ترغیبات پر طاعت اور مجاہدہ پر استقامت کا اہتمام ضروری ہے) ؛

معارف و مسائل

وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ، فتنہ سے مشتق ہے جس کے معنی آزمائش کے ہیں، اہلِ ایمان خصوصاً انبیاء و صلحاء کو دنیا میں مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذرنا ہوتا ہے پھر انجام کار فتح اور کامیابی ان کی ہوتی ہے، یہ آزمائشیں مخالفین کبھی کفار و فجار کی دشمنی اور ان کی طرف سے ایذاؤں کے ذریعہ ہوتی ہیں، جیسا کہ اکثر انبیاء اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر پیش آیا ہے، جس کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، اور کبھی یہ آزمائش امراض اور دوسری قسم کی تکلیفوں کے ذریعہ ہوتی ہے جیسے حضرت ایوب علیہ السلام کو پیش آیا، اور بعض کے لئے یہ سب قسمیں جمع بھی کر دی جاتی ہیں۔

شانِ نزول اس آیت کا، گرچہ از روئے روایت وہ صحابہ ہیں جو ہجرتِ مدینہ کے وقت کفار کے ہاتھوں ستائے گئے، مگر مراد عام ہے ہر زمانے کے علماء و صلحاء اور اولیاء امت کو مختلف قسم کی آزمائشیں پیش آتی ہیں، اور آتی رہیں گی۔ (قرطبی)

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا، یعنی ان امتحانات اور شدائد کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص اور نیک و بد میں ضرور امتیاز کریں گے۔ کیونکہ مخلصین کے ساتھ منافقین کا خلط ملط بعض اوقات بڑے نقصانات پہنچا دیتا ہے، مقصد اس آیت کا نیک و بد اور مخلص و غیر مخلص کا امتیاز واضح کر دینا ہے، جس کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے گا صادقین کو اور کاذبین کو، اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے، امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو

دوسروں پر بھی ظاہر فرمادیں گے۔

اور حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے شیخ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی توجیہ یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ بعض اوقات عوام کے درجۂ علم پر تنزل کر کے بھی کلام کیا جاتا ہے، عام انسان مخلص اور منافق میں فرق آزمایش ہی کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں، ان کے مذاق کے مطابق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف قسم کے امتحانات کے ذریعہ ہم یہ جان کر رہیں گے کہ کون مخلص ہے کون نہیں، حالانکہ اس کے علم میں یہ سب کچھ ازل سے ہے۔ واللہ اعلم

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ

اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شریک کرے

بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ

میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان، مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلادوں گا تم کو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۸﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

جو کچھ تم کرتے تھے، اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کئے

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿۹﴾

ہم ان کو داخل کریں گے نیک لوگوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح) دلیل تیرے پاس نہیں ہے، (اور ہر چیز ایسی ہی ہے کہ کل اشیاء کے ناقابل عبادت ہونے پر دلائل قائم ہیں) تو (اس باب میں) ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے سو میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلادوں گا اور (تم میں) جو لوگ ایمان لائے ہوں گے ہم ان کو نیک بندوں (کے درجہ) میں (جو کہ بہشت ہے) داخل کر دیں گے (اور اسی طرح اعمالِ بد پر ان کے مناسب سزا دیں گے، پس اسی بناء پر جس نے والدین کی اطاعت کو ہماری اطاعت پر مقدم رکھا ہوگا

وہ سزا پائے گا، اور جس نے اس سے عکس کیا ہوگا نیک جزا پائے گا، حاصل یہ ہوا کہ واقعہ بالا میں ماں باپ کی نافرمانی سے وسوسہ گناہ کا نہ کیا جائے)۔

معارف و مسائل

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ، وصیت کہتے ہیں کسی شخص کو کسی عمل کی طرف بلانے کو جبکہ وہ بلانا نصیحت و خیر خواہی پر مبنی ہو (مظہری)

بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا، لفظ حُسن مصدر ہو بمعنی خوبی. اس جگہ خوبی والے طرزِ عمل کو مبالغہ کے لئے حُسن سے تعبیر کیا ہے۔ مراد واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ وصیت فرمائی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ، یعنی والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے حکم کی اطاعت اسی حد تک کی جائے کہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہو، وہ اگر اولاد کو کفر و شرک پر مجبور کریں تو اس میں ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ، (رواہ احمد والحاکم وصححہ) یعنی خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحابہ کرام میں سے اُن دس حضرات میں شامل ہیں جن کو آپ نے بیک وقت جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی والدہ کے بہت فرمانبردار اور ان کی راحت رسانی میں بڑے مستعد تھے۔ ان کی والدہ حمنہ بنت ابی سفیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے سعدؓ مسلمان ہوگئے تو انھوں نے بیٹے کو تنبیہ کی اور قسم کھالی کہ میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی جب تک کہ تم پھر اپنے آبائی دین پر واپس آجاؤ یا میں اسی طرح بھوک پیاس سے مرجاؤں، اور ساری دنیا میں ہمیشہ کے لئے یہ رسوائی تمھارے سر رہے کہ تم اپنی ماں کے قاتل ہو۔ (مسلم، ترمذی) اس آیت قرآن نے حضرت سعدؓ کو ان کی بات ماننے سے روک دیا۔

بغوی کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ ایک دن رات اور بعض اقوال کے مطابق تین دن تین رات اپنی قسم کے مطابق بھوکی پیاسی رہی۔ حضرت سعدؓ حاضر ہوئے، ماں کی محبت و اطاعت اپنی جگہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے کچھ نہ تھی، اس لئے والدہ کو خطاب کرکے کہا کہ اماں جان اگر تمھارے بدن میں سو روحیں ہوتیں اور ایک ایک کرکے نکلتی رہتی میں اس کو دیکھ کر بھی کبھی اپنا دین نہ چھوڑتا، اب تم چاہو کھاؤ پیو یا مرجاؤ، بہرحال

اپنے دین سے نہیں ہٹ سکتا، ماں نے ان کی اس گفتگو سے مایوس ہو کر کھانا کھایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ کہتے ہیں یقین لائے ہم اللہ پر پھر جب اس کو ایذا پہنچے اللہ کی راہ میں کرنے

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ

لگے لوگوں کے ستانے کو برابر اللہ کے عذاب کی اور اگر آپہنچے مدد تیرے رب کی طرف سے

لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ

تو کہنے لگیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، کیا یہ نہیں کہ اللہ خوب خبردار ہے جو کچھ سینوں میں ہے

الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱

جہان والوں کے۔ اور البتہ معلوم کرے گا اللہ ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اور البتہ معلوم کر کے گا جو لوگ دغاباز ہیں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو تم چلو ہماری راہ اور ہم اٹھالیں گے

خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ

تمہارے گناہ، اور وہ کچھ نہ اٹھائیں گے ان کے گناہ بے شک وہ

لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۲ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ

جھوٹے ہیں، اور البتہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھ کے،

وَلَيُسْـَٔــلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳

اور البتہ ان سے پوچھ ہوگی قیامت کے دن جو باتیں کہ جھوٹ بناتے تھے۔

ع ۱۳ / ۱۲

خُلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہِ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ بیٹھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب (جس سے آدمی بالکل ہی مجبور ہو جائے) حالانکہ کسی مخلوق کو ایسے عذاب پر قدرت ہی نہیں

اب تو ان کا یہ حال ہے) اور اگر (کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رب کی طرف سے آپہنچتی ہے (مثلاً جہاد ہوا اور اس میں ایسے لوگ ہاتھ آجائیں) تو (اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین اور عقیدہ میں) تمہارے ساتھ تھے (یعنی مسلمان ہی تھے گو کفار کے اکراہ اور زبردستی کی وجہ سے کفار کے ساتھ ہو گئے تھے، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ) کیا اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دلوں کی باتیں معلوم نہیں ہیں (یعنی انکے دل ہی میں ایمان نہ تھا) اور (یہ واقعات اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو معلوم کر کے رہیگا، اور منافقوں کو بھی معلوم کر کے رہیگا

اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ چلو اور (قیامت میں) تمہارے گناہ (جو کفر و معاصی سے ہوں گے) ہمارے ذمہ (اور تم سبکدوش) حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی (اس طور پر کہ وہ سبکدوش ہو جائیں) نہیں لے سکتے یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں اور (البتہ یہ تو ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ (پورے پورے) اپنے اوپر لادے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور بھی (لادے ہوں گے اور یہ گناہ وہ ہیں جن کے لئے یہ سبب بنتے تھے، اور یہ گناہ ان پر لادنے سے اصل گناہگار سبکدوش نہیں ہوں گے، غرض دوسرے تو ہلکے نہ ہوئے مگر یہ لوگ ان کو گمراہ کرنے کے سبب اور زیادہ بھاری ہو گئے) اور یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے تھے قیامت میں ان سے باز پرس (اور پھر اس پر سزا) ضرور ہو گی:

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا ، کفار کی طرف سے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیریں مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہیں، کبھی زور و زر کی نمائش سے کبھی شکوک و شبہات پیدا کرنے سے۔ اس آیت میں بھی ان کی ایک ایسی ہی تدبیر مذکور ہے، کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم لوگ بلا وجہ عذاب آخرت کے خوف سے ہمارے طریقہ پر نہیں چلتے، لو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر تمہاری ہی بات سچی ہوئی کہ اس طریقہ پر چلنے کی وجہ سے آخرت میں عذاب ہوگا تو تمہارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھالیں گے جو کچھ عذاب، تکلیف پہونچے گی ہمیں پہونچے گی تم پر آنچ نہ آئے گی۔

اسی طرح کا ایک شخص کا واقعہ سورۂ نجم کے آخری رکوع میں ذکر کیا گیا ہے آخر آیت الَّذِي تَوَلَّىٰ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ، جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص کو اس کے کافر ساتھیوں نے یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ تم ہمیں کچھ مال یہاں دیدو تو ہم قیامت اور آخرت کے دن تمہارے عذاب کو اپنے ذمہ لے کر تمہیں بچا دیں گے، اس نے کچھ دینا بھی شروع کر دیا پھر بند کر دیا۔

اس کی بے وقوفی اور اس کے عمل کے لغو ہونے کا بیان سورۂ نجم میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اسی طرح کا ایک قول کفار کا عام مسلمانوں سے یہاں مذکور ہے، یہاں حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ایک تو یہ فرمایا کہ ایسا کہنے والے بالکل جھوٹے ہیں، یہ قیامت میں ان لوگوں کے گناہوں کا کوئی بوجھ نہ اٹھائیں گے، وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، یعنی وہاں کے ہولناک عذاب کو دیکھ کر ان کو ہمت نہ ہوگی کہ اس کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں، اس لئے یہ وعدہ ان کا جھوٹا ہے۔ اور سورۂ نجم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ کچھ بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس کا اختیار نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے کہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ ان لوگوں کا یہ کہنا تو غلط اور جھوٹ ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر تمہیں سبکدوش کر دیں گے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ تمہارا بہکانا اور تمہیں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرنا خود ایک بڑا گناہ ہے جو ان کے اپنے اعمال کے عذاب کے علاوہ اُن پر لاد دیا جائے گا۔ اس طرح اُن پر اپنے اعمال کا بھی وبال ہوگا اور جن کو بہکایا تھا اُن کا بھی۔

گناہ کی دعوت دینے والا بھی گناہگار ہے، گناہ کرنے والے کو جو عذاب ہوگا وہی اس کو بھی ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا کرنے کی تحریک کرے یا گناہ میں اس کی مدد کرے وہ بھی ایسا ہی مجرم ہے جیسا یہ گناہ کرنے والا۔ ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت کی گئی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہدایت کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو جتنے لوگ اس کی دعوت کی وجہ سے ہدایت پر عمل کریں گے ان سب کے عمل کا ثواب اس داعی کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی اور گناہ کی طرف دعوت دے تو جتنے لوگ اس کے کہنے سے اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے ان سب کا گناہ اور وبال اس شخص پر بھی پڑے گا بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے وبال و عذاب میں کوئی کمی ہو (مسلم عن ابی ہریرۃ وابن ماجہ عن انس، قرطبی)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس پھر رہا ان میں ہزار برس پچاس

خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

برس کم پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گنہگار تھے، پھر بچا دیا ہم نے اس کو

وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ

اور جہاز والوں کو اور رکھی ہم نے جہاز کو نشانی جہان والوں کے واسطے، اور ابراہیم کو جب کہا

لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اس نے اپنی قوم کو بندگی کرو اللہ کی اور ڈرتے رہو اس سے یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ

تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں، بے شک

الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے وہ مالک نہیں تمہاری روزی کے

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ

سو تم ڈھونڈو اللہ کے یہاں روزی اور اس کی بندگی کرو، ور اس کا حق مانو اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ

پھر جاؤ گے۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں بہت فرقے تم سے پہلے،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

اور رسول کا ذمہ تو بس یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے (اور قوم کو سمجھاتے رہے) پھر (جب اس پر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو) ان کو طوفان نے آدبایا اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے (کہ اتنی مدت دراز کی فہمائش سے بھی متاثر نہ ہوئے) پھر (اس طوفان آنے کے بعد) ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو (جو ان کے ساتھ سوار تھے اس طوفان سے) بچالیا اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے (جن کو تواتر کے ساتھ خبر پہنچی) موجب عبرت بنایا (کہ غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ مخالفتِ حق کا کیا انجام ہے) اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے (جو کہ بُت پرست تھے) فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمہارے لئے بہتر ہے

اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (بخلاف طریقۂ شرک کے کہ محض بے وقوفی ہے کیونکہ) تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو (جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں) پوج رہے ہو اور (اس کے متعلق) جھوٹی باتیں تراشتے ہو، (کہ ان سے ہماری روزی روزگار کی کاربرآری ہوتی ہے، اور یہ محض جھوٹ ہی کیونکہ) تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو، (یعنی اس سے مانگو، مالکِ رزق وہی ہے) اور (جب مالکِ رزق وہی ہو تو) اسی کی عبادت کرو اور (چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو) اسی کا شکر کرو (ایک تو سبب وجوب عبادت کا یہ ہو کہ وہ مالکِ نفع کا ہے) اور (دوسرا سبب یہ ہو کہ وہ مالک ضرر کا بھی ہو چنانچہ) تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (اس وقت کفر پر تم کو سزا دے گا) اور اگر تم (ان باتوں میں) مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (یاد رکھو کہ میرا کوئی ضرر نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (مگر ان پیغمبروں کا کوئی ضرر نہیں ہوا) اور (وجہ اس کی یہ ہو کہ) پیغمبر کے ذمہ تو صرف (بات کا) صاف طور پر پہنچا دینا ہے (منوانا اس کا کام نہیں پس سب انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہو گئے۔ اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ البتہ ماننا تمہارے ذمہ واجب تھا اس کے ترک سے تمہارا ضرر ضرور ہوا)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں کفار کی مخالفت اور ان کی ایذاؤں کا بیان تھا جو مسلمانوں کو پہونچتی رہتی ہیں، آیاتِ صدر میں اس طرح کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات کا بیان ہے، کہ قدیم سے یہ سلسلہ اہلِ ہدایت کو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا جاری ہے۔ مگر ان تکلیفوں کی وجہ سے انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، اس لئے آپ بھی ایذاءِ کفار کی پرواہ نہ کریں، اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں مضبوطی سے کام کرتے رہیں۔

انبیاءِ سابقین میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، اوّل تو اس وجہ سے کہ وہ ہی سب سے پہلے پیغمبر ہیں جن کو کفر و شرک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ جتنی ایذائیں اپنی قوم سے ان کو پہونچیں وہ کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں پہونچیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل دینے کا خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اور ساری عمر کفار کی ایذاؤں میں بسر ہوئی۔ ان کی عمر قرآن کریم میں جو نو سو پچاس سال مذکور ہے، وہ تو قطعی اور یقینی ہے ہی، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ عمر زمانہ تبلیغ و دعوت کی ہے اور اس سے پہلے اور طوفان کے بعد مزید عمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم

بہرحال اتنی غیر معمولی طویل عمر مسلسل دعوت و تبلیغ میں صرف کرنا اور ہر تبلیغ و دعوت کے وقت کفار کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں مار پیٹ اور گلا گھونٹنے کی سہتے رہنا اور ان سب کے باوجود کسی وقت ہمت نہ ہارنا یہ سب خصوصیات حضرت نوح علیہ السلام کی ہیں۔

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو بڑے بڑے سخت امتحانات سے گذرے ہیں، آتش نمرود، پھر ملک شام سے ہجرت کر کے ایک لق و دق جنگل بے آب و گیاہ کا قیام، پھر صاحبزادے کے ذبح کرنے کا واقعہ وغیرہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے قصہ کے ضمن میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی امت کے واقعات اور آخر سورۃ تک دوسرے بعض انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کے حالات کا سلسلہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کی تسلی کے لئے اور ان کو دین کے کام پر ثابت قدم رکھنے کے لئے بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى

کیا دیکھتے نہیں کیوں کر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دہرائے گا، یہ اللہ پر آسان

اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ

ہے، تو کہہ ملک میں پھرو پھر دیکھو کیوں کر شروع کیا ہے پیدائش

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

کو پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا

قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ

ہے، دکھ دے گا جس کو چاہے اور رحم کرے گا جس پر چاہے، اور اسی کی طرف پھر

تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ؗ

جاؤ گے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں،

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ

ع ۲ ۹ ۱۴

اور کوئی نہیں تمہارا اللہ سے ورے حمایتی اور نہ مددگار، اور جو لوگ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ

منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے اور اس کے ملنے سے وہ ناامید ہوئے میری رحمت سے

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾	
اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔	

خلاصۂ تفسیر

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے، (عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے (بلکہ ابتدائی نظر میں دوبارہ پیدا کرنا اوّل آفرینش سے زیادہ سہل ہو، گو قدرت ذاتیہ کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں، اور یہ لوگ امراول یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق کائنات ہونے کا تو اعتراف کرتے تھے، لقولہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ اور امر ثانی یعنی دوبارہ پیدا کرنا اسی کے مماثل ہو، اس کا داخل قدرت ہونا اور زیادہ واضح ہے، اس لئے اَوَلَمْ یَرَوْا اس سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور زیادہ اہتمام کے لئے آگے پھر یہی مضمون قدرے تفاوت عنوان سے سُنانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (پہلے عنوان میں ایک عقلی استدلال ہے اور دوسرے عنوان میں حسّی، جس کا تعلق احوال کائنات کے مشاہدہ سے ہے، یہ تو قیامت کا اثبات تھا آگے جزا کا بیان ہے کہ بعد بعث کے) جس کو چاہے گا عذاب دے گا (یعنی جو اس کا مستحق ہوگا) اور جس پر چاہے رحمت فرما دے گا، (یعنی جو اس کا اہل ہوگا) اور (اس تعذیب و رحمت میں اور کسی کا دخل نہ ہوگا، کیونکہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، (نہ کہ اور کسی کے پاس) اور (اس کی تعذیب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے) تم نہ زمین میں (چھپ کر خدا کو) ہرا سکتے ہو (کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ) اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار (پس نہ اپنی تدبیر سے بچ سکے نہ دوسرے کی حمایت سے) اور (اوپر جو ہم نے کہا تھا یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ، اب قاعدہ کلیہ سے اس کا مصداق بتلاتے ہیں کہ) جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے ناامید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہو جائے گا کہ ہم محل رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ
پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے اس کو مار ڈالو یا جلا دو پھر اس کو بچا دیا

اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ
اللہ نے آگ سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین لاتے ہیں، اور ابراہیم بولا

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ
جو ٹھہرائے تم نے اللہ کے سوائے بتوں کے تھان سو دوستی کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی

الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ
میں، پھر دن قیامت کے منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے

بَعْضُكُمْ بَعْضًا ؗ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۵﴾
ایک کو ایک، اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ
پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف بیشک وہی ہے زبردست

الْحَكِیْمُ ﴿۲۶﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ
حکمت والا، اور دیا ہم نے اس کو اسحٰق اور یعقوب اور رکھ دی اس کی اولاد میں

النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی
پیغمبری اور کتاب اور دیا ہم نے اس کو اس کا ثواب دنیا میں، اور وہ

الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾
آخرت میں البتہ نیکوں سے ہے۔

رکوع ۱۸

خلاصۂ تفسیر

سو (ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر دلپذیر کے بعد) ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان کو یا تو قتل کر ڈالو یا ان کو جلا دو (چنانچہ جلانے کا سامان کیا) سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچا لیا (جس کا قصہ سورۂ انبیاء میں گذر چکا ہے)

بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں (یعنی یہ واقعہ کئی چیزوں کی دلیل ہے، اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر و شرک کا باطل ہونا، اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہوگئی) اور ابراہیم (علیہ السلام) نے (وعظ میں یہ بھی) فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے (چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریق پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، اور حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جاویں گے) پھر قیامت میں (تمہارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جاوے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا (جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے لَعَنَتْ أُخْتَهَا اور سورۂ سبا میں ہے يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ اور سورۂ بقرہ میں ہے إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا الخ خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب و اقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمہارے دشمن بن جائیں گے) اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا سو (اتنے وعظ و پند پر بھی ان کی قوم نے نہ مانا) صرف لوط (علیہ السلام) نے ان کی تصدیق فرمائی اور ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (تم لوگوں میں نہیں رہتا، بلکہ) اپنے پروردگار کی (بتلائی ہوئی جگہ کی) طرف (ترک وطن کر کے) چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے (وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو اس کا ثمرہ دے گا) اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی (بڑے درجہ کے) نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ میں مراد قرب و قبول ہے، کقولہ تعالیٰ فی البقرۃ لَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا الخ)۔

معارف و مسائل

فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي حضرت لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے، آتش نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے تصدیق کی، اور آپ کی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ کی چچازاد بہن بھی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں ان دونوں کو ساتھ لے کر ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا، ان کا وطن مقام کوثا تھا، جو کوفہ کی ایک بستی ہے، اور فرمایا إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي، یعنی میں وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مقام کی طرف جاؤں گا جہاں رب کی عبادت میں رکاوٹ نہ ہو

حضرت نخعیؒ اور قتادہؒ نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کا قائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ تو یقیناً انہی کا حال ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اِنِّیْ مُهَاجِرٌ کو حضرت لوط علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے، خلاصہ تفسیر کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے، مگر سیاقِ کلام سے پہلی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اگرچہ اس ہجرت میں شریک ضرور تھے مگر جیسا حضرت سارہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھیں اسی طرح لوط علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر مستقلاً نہ ہونا کچھ بعید نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلی ہجرت
حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو دین کے لئے ترکِ وطن اور ہجرت اختیار کرنا پڑی، ان کی یہ ہجرت پچھتر سال کی عمر میں ہوئی (یہ سب بیان قرطبی سے لیا گیا ہے)۔

بعض اعمال کی جزاء دنیا میں بھی مل جاتی ہے
وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کی راہ میں قربانیوں اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی جزاء دنیا میں بھی دیدی کہ ان کو تمام مخلوق میں مقبول امام بنادیا، یہودی، نصرانی، بت پرست سبھی ان کی عزت کرتے ہیں، اور اپنا مقتداء مانتے ہیں، اور آخرت میں وہ صالحین اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی مگر اس کا کچھ حصہ دنیا میں بھی نقد دیا جاتا ہے، جیسا کہ احادیث معتبرہ میں بہت سے اچھے اعمال کے دنیوی فوائد اور برے اعمال کے دنیوی مفاسد کا بیان آیا ہے، ایسے اعمال کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مستقل رسالہ "جزاء الاعمال" میں جمع فرمادیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ

اور بھیجا لوط کو جب کہا اپنی قوم کو تم آتے ہو بےحیائی کے کام پر تم سے پہلے نہیں کیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ

وہ کسی نے جہان میں، کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر اور تم راہ

السَّبِيْلَ ڏ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ

مارتے ہو اور کرتے ہو اپنی مجلس میں برا کام، پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا

اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

مگر یہی کہ بولے لے آ ہم پر عذاب اللہ کا اگر تو ہے سچا،

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٠﴾ وَلَمَّا جَاءَتْ

بولا اے رب میری مدد کر ان شریر لوگوں پر، اور جب پہنچے ہمارے

رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُو أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ

بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر، بولے ہم کو غارت کرنا ہے اس بستی والوں کو

إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا ۚ قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ

بیشک اس بستی کے لوگ ہو رہے ہیں گنہگار، بولا اس میں تو لوط بھی ہے، وہ بولے ہم کو خوب معلوم ہے

بِمَنْ فِيهَا ۖ لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٣٢﴾

جو کوئی اس میں ہے، ہم بچا لیں گے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ رہ جائے گی رہ جانے والوں میں

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالُوا

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس ناخوش ہوا ان کو دیکھ کر اور تنگ ہوا دل میں اور وہ بولے

لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۖ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ

مت ڈر اور غم نہ کھا، ہم بچا دیں گے تجھ کو اور تیرے گھر کو مگر عورت تیری

كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ

رہ گئی رہ جانے والوں میں، ہم کو اتارنی ہے اس بستی والوں پر

رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٣٤﴾ وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا

ایک آفت آسمان سے اس بات پر کہ وہ نافرمان ہو رہے تھے، اور چھوڑ رکھا ہم نے اس کا نشان

آيَةً بَيِّنَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٣٥﴾

نظر آتا ہوا سمجھ دار لوگوں کے واسطے،

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا کیا تم مردوں سے برا فعل کرتے ہو (وہ بے حیائی کا کام یہی ہے) اور اس کے علاوہ دوسری

نامعقول حرکتیں بھی کرتے ہو، مثلاً یہ کہ، تم ڈاکہ ڈالتے ہو کذا فی الدر عن ابن زید) اور (غضب یہ ہے کہ) اپنی بھری مجلس میں نامعقول حرکت کرتے ہو (اور معصیت کا اعلان یہ خود ایک معصیت و قبح عقلی ہے) سو ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو (کہ یہ افعال موجب عذاب ہیں) لوط (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو ان مفسد لوگوں پر غالب (اور ان کو عذاب سے ہلاک) کردے اور (ان کی دعا قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبر دینے کے لئے فرشتے معین فرمائے، اور دوسرا کام ان فرشتوں کو یہ بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام کے تولد کی بشارت دیں چنانچہ) ہمارے (وہ) بھیجے ہوئے فرشتے جب ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (ان کے فرزند اسحٰق کے تولد کی) بشارت لے کر آئے تو (اثنائے گفتگو میں جس کا مفصل بیان دوسرے موقع پر ہے قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ الخ) ان فرشتوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو (جس میں قوم لوط آباد ہے) ہلاک کرنے والے ہیں (کیونکہ) وہاں کے باشندے بڑے شریر ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہاں تو لوط (علیہ السلام بھی موجود) ہیں (وہاں عذاب نہ بھیجا جائے کہ ان کو گزند پہنچے گا) فرشتوں نے کہا کہ جو جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین کو (یعنی ان کے خاندان والوں کو اور جو مؤمن ہوں اس عذاب سے) بچالیں گے (اس طرح سے کہ نزول عذاب کے قبل ان کو بستی سے باہر نکال لے جائیں گے) بجز ان کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہوگی (جس کا ذکر سورۃ ہود اور سورۃ حجر میں گذر چکا ہے، یہ گفتگو تو ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی) اور (پھر وہاں سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرستادے لوط (علیہ السلام) کے پاس پہونچے تو لوط (علیہ السلام) ان (کے آنے) کی وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان (کے آنے) کے سبب تنگ دل ہوئے اور (فرشتوں نے جو یہ حال دیکھا تو) وہ فرشتے کہنے لگے (آپ کسی بات کا) اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں (ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ عذاب کے فرشتے ہیں، کقولہ تعالیٰ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اور اس عذاب سے) ہم آپ کو اور آپ کے خاص متعلقین کو بچالیں گے بجز آپ کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی (اور آپ کو مع متعلقین کے اس سے بچا کر) ہم اس بستی کے (بقیہ) باشندوں پر ایک آسمانی عذاب (یعنی اسباب طبعیہ غیر ارضیہ سے) ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں (چنانچہ وہ بستی اُلٹ دی گئی، اور غیبی پتھروں سے سنگباری کی گئی)

اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان (اب تک) رہنے دیئے ہیں ان لوگوں (کی عبرت) کے لئے جو عقل رکھتے ہیں (چنانچہ اہل مکہ سفر شام میں ان ویران مقامات کو دیکھتے تھے اور جو اہل عقل تھے وہ منتفع بھی ہوتے تھے کہ ڈر کر ایمان لے آتے تھے)۔

معارف و مسائل

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ، اس جگہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کے تین سخت گناہوں کا ذکر کیا ہے، اول مرد کی مرد کے ساتھ بدفعلی، دوسرے قطع طریق یعنی مسافروں پر ڈکیتی، تیسرے اپنی مجلسوں میں اعلانیہ سب کے سامنے گندہ کرنا۔ قرآن کریم نے اس تیسرے گناہ کی تعیین نہیں فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ جو اپنی ذات میں گناہ ہے اگر اس کو علانیہ بے پروائی سے کیا جائے تو یہ دوسرا مستقل گناہ ہو جاتا ہے وہ کوئی بھی گناہ ہو، بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ ان گناہوں کو شمار کیا ہے جو یہ بے حیا اپنی مجلسوں میں سب کے سامنے کیا کرتے تھے، مثلاً راستہ چلتے لوگوں کو پتھر مارنا اور ان کا استہزاء کرنا جیسا کہ اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جو بے حیائی ان کی مشہور تھی اس کو وہ کہیں چھپ کر نہیں کھلی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے۔ **العیاذ باللہ۔**

جن تین گناہوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان سب میں اشد پہلا گناہ ہے، جو ان سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا، اور جنگل کے جانور بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باتفاقِ اُمت یہ گناہ زنا سے زیادہ شدید ہے **(کذا فی الروح)**

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ

اور بھیجا مدین کے پاس اس کے بھائی شعیب کو پھر بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی اور

ارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾

توقع رکھو پچھلے دن کی اور مت پھرو زمین میں خرابی مچاتے،

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ

پھر اس کو جھٹلایا تو پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

جٰثِمِيْنَ ﴿٣٧﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫

اوندھے پڑے، اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم پر حال کھل چکا ہے ان کے گھروں سے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ

اور فریفتہ کیا ان کو شیطان نے ان کے کاموں پر پھر روک دیا ان کو راہ سے اور

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿٣٨﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ وَلَقَدْ

وہ تھے ہوشیار، اور ہلاک کیا قارون اور فرعون اور ہامان کو اور ان کے

جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا

پاس پہنچا موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر، پھر بڑائی کرنے لگے ملک میں اور نہیں تھے

سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ

ہم سے جیت جانے والے، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کوئی تھا کہ اس پر ہم نے بھیجا

حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا

پتھراؤ ہوا سے اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑا چنگھاڑ نے، اور کوئی تھا کہ اس کو دھنسا دیا

بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ

ہم نے زمین میں، اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبا دیا ہم نے، اور اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٠﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا

پر تھے وہ اپنا آپ ہی برا کرتے، مثال ان لوگوں کی جنہوں نے پکڑے اللہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ

کو چھوڑ کر اور حمایتی جیسے مکڑی کی مثال بنا لیا اس نے ایک

بَيْتًا ۖ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو

يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ

سمجھ ہوتی، اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں اس کے سوائے کوئی

وقف لازم

شَیۡءٍ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴۲﴾ وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا

چیز ہو، اور وہ زبردست ہر حکمتوں والا، اور یہ مثالیں بٹھلاتے ہیں ہم لوگوں کے

لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعۡقِلُہَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ

واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے، اللہ نے بنائے آسمان

وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً

اور زمین جیسے چاہئیں، اس میں نشانی ہے یقین لانے

لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾

والوں کے لئے۔

ع ۱۶

خُلاصۂ تفسیر

اور مدین والوں کے پاس ہم نے ان (کی برادری) کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا سو انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو (اور شرک چھوڑ دو) اور روز قیامت سے ڈرو (اور اس کے انکار سے باز آؤ) اور سرزمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی حقوق اللہ وحقوق العباد کو ضائع مت کرو، کیونکہ یہ لوگ کفر و شرک کے ساتھ کم ناپنے کم تولنے کے بھی خوگر تھے، جس سے فساد پھیلتا نہ رہے) سو ان لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس زلزلہ نے ان کو آپکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں گھر کر رہ گئے۔ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی (ان کے عناد و خلاف کی وجہ سے) ہلاک کیا، اور یہ ہلاک ہونا تم کو ان کے رہنے کے مقامات سے نظر آرہا ہے (کہ ان کی ویران بستیوں کے کھنڈرات ملک شام کو جاتے ہوئے تمہارے راستہ پر ملتے ہیں) اور حالت ان کی یہ تھی کہ) شیطان نے ان کے اعمال (بد) کو ان کی نظر میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس ذریعہ سے) ان کو راہ (حق) سے روک رکھا تھا اور وہ لوگ (ویسے) ہوشیار تھے (مجنون و بیوقوف نہ تھے، مگر اس جگہ انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا) اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور (ان تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق کی) لے کر آئے تھے، پھر ان لوگوں نے زمین میں سرکشی کی اور (ہمارے عذاب سے) بھاگ نہ سکے تو ہم نے (ان پانچوں میں سے) ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا، سو ان میں بعضوں پر تو ہم نے سخت ہوا بھیجی (مراد اس سے قوم عاد)

اور ان میں بعضوں کو ہولناک آواز نے آدبایا (مراد اس سے قوم ثمود ہے لقولہ تعالیٰ فی سورۃ ہود، وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ) اور ان میں بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (مراد اس سے قارون ہے) اور ان میں بعض کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا (مراد اس سے فرعون و ہامان ہے) اور (ان لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے تو) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا (یعنی بلا وجہ سزا دیتا جو ظاہراً مشابہ ظلم کے ہے گو واقع میں بوجہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کے یہ بھی ظلم نہ تھا) لیکن یہی لوگ (شرارتیں کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے (کہ اپنے کو مستحق عذاب بنایا، اور غارت ہوئے تو اپنا ضرر خود کیا) جن لوگوں نے خدا کے سوا، اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ معبودات باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقتِ حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) ان سب چیزوں (کی حقیقت اور ضعف) کو جانتا ہے جس جس کو وہ لوگ خدا کے سوا پوج رہے ہیں (پس وہ چیزیں تو نہایت ضعیف ہیں) اور وہ (خود یعنی اللہ تعالیٰ) زبردست حکمت والا ہے (جس کا حاصل قوت علمیہ و عملیہ میں کامل ہونا ہے) اور (چونکہ ہم ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اسی لئے) ہم ان (قرآنی) مثالوں کو (جن میں سے ایک مثال اس مقام پر مذکور ہے) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں، اور (ان مثالوں سے چاہئے تھا کہ ان لوگوں کا جہل علم سے بدل جاتا مگر) ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں (خواہ بالفعل عالم ہوں یا انجام کے اعتبار سے یعنی علم اور حق کے طالب ہوں اور یہ لوگ عالم بھی نہیں طالب بھی نہیں، اس لئے جہل میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن ان کے جہل سے حق حق ہی رہے گا جسکو خدا جانتا ہے، اور اپنے بیان سے ظاہر فرماتا ہے، پس غیر اللہ کا مستحق عبادت نہ ہونا تو ثابت ہوا۔ آگے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے، (چنانچہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں) ایمان والوں کے لئے اس میں (اس کے استحقاقِ عبادت کی) بڑی دلیل ہے ؞

معارف و مسائل

ان آیات میں جن انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں مفصل آچکے ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کا قصہ سورہ اعراف اور ہود میں، اسی طرح عاد و ثمود کا قصہ بھی اعراف اور ہود میں گذر چکا ہے، اور قارون، فرعون، ہامان کا قصہ سورہ قصص میں ابھی گذرا ہے۔

وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ، استبصار سے مشتق ہے، جو بصیرت کے معنی میں ہے، اور مستبصر بمعنی مبصر۔ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو کفر و شرک پر اصرار کر کے عذاب میں اور ہلاکت میں مبتلا ہوئے کچھ بیوقوف یا دیوانے نہ تھے، دنیا کے کاموں میں بڑے مبصر اور ہوشیار تھے، مگر ان کی عقل اور ہوشیاری اسی مادی دنیا میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ نہ پہچانا کہ نیک و بد کی جزاء و سزا کا کوئی دن آنا چاہئے، جس میں مکمل انصاف ہو۔ کیونکہ دنیا میں تو اکثر مجرم ظالم دندناتے پھرتے ہیں اور مظلوم و مصیبت زدہ مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی انصاف کے دن کا نام قیامت اور آخرت ہے، اس کے معاملہ میں ان کی عقل ماری گئی۔

یہی مضمون سورۂ روم میں بھی آگے آنے والا ہے، يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے کاموں کو تو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ کے معنی یہ بتلائے کہ یہ لوگ ایمان اور آخرت پر بھی دل میں تو یقین رکھتے تھے اور اس کا حق ہونا خوب سمجھتے تھے، مگر دنیوی اغراض نے ان کو انکار پر مجبور کر رکھا تھا۔

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، لفظ ہر دہ یہاں مراد نہیں، بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلق رہتی ہے۔ اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہے جو کہ نہایت کمزور ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

مسئلہ: مکڑی کو مارنے، اور اس کے جالے صاف کر دینے کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ جانور بوقت ہجرت غار ثور کے دہانے پر جالا تان دینے کی وجہ سے قابل احترام ہوگیا، جیسا کہ خطیب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کے قتل کی ممانعت نقل کی ہے۔ مگر ثعلبی نے اور ابن عطیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے طَهِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ مِّنْ نَّسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فَإِنَّ تَرْكَهٗ يُوْرِثُ الْفَقْرَ، یعنی مکڑی کے جالوں سے اپنے مکانات کو صاف رکھا کرو، کیونکہ اس کے چھوڑ دینے سے فقر وفاقہ پیدا ہوتا ہے، سنداً ان دونوں روایتوں کی قابل اعتماد نہیں، اور دوسری روایت کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں مکانات اور فناء دار کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (روح المعانی)

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ، مشرکین کے خداؤں کی کمزوری کی مثال مکڑی کے جالے سے دینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ہم ایسی ایسی واضح مثالوں سے توحید کی حقیقت کا بیان کرتے ہیں، مگر ان مثالوں سے بھی سمجھ بوجھ صرف علماء دین ہی حاصل کرتے ہیں، دوسرے لوگ تدبر اور غور وفکر ہی نہیں کرتے، کہ حق ان پر واضح ہو جائے۔

اللہ کے نزدیک عالم کون ہے؟ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور وفکر کرے، اور اس کی طاعت پر عمل کرے، اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا، جب تک قرآن میں تدبر، و غور وفکر کی عادت نہ ڈالے، اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔

مسند احمد میں حضرت عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار امثال سیکھی ہیں، ابن کثیر اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن عاص کی بہت بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مذکورہ میں عالم انہی کو فرمایا ہے جو اللہ ورسول کی بیان کردہ امثال کو سمجھیں۔

اور حضرت عمرو بن مرۃ نے فرمایا کہ جب میں قرآن کی کسی آیت پر پہونچتا ہوں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (ابن کثیر)

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ	
تو پڑھ جو اُتری تیری طرف کتاب اور قائم رکھ نماز	
اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ	
بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے اور اللہ کی یاد ہے	
اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾	
سب سے بڑی اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔	

خُلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے) اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور تبلیغ قولی کے ساتھ تبلیغ عملی بھی کیجئے کہ دین کے کام ان کو عمل کرکے بھی بتلایئے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (کیونکہ تمام اعمال میں نماز اعظم عبادت بھی ہے اور اس کے اثرات بھی دور رس ہیں کہ) بیشک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے، (یعنی بزبانِ حال کہتی ہے کہ تو جس معبود کی انتہائی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے، فحشاء اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بے ادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے سوا جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب قولاً یا فعلاً اللہ کی یاد ہیں) اور اللہ کی یاد (بہت) بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سُن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ، سابقہ آیات میں چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر تھا، جن میں چند بڑے بڑے سرکش کفار اور ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنینِ امت کے لئے تسلی بھی ہے کہ انبیاء سابقین نے مخالفین کی کیسی کیسی ایذاؤں پر صبر کیا، اور اس کی تلقین بھی کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں کسی حال میں ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔

اصلاحِ خلق کا مختصر جامع نسخہ

مذکور الصدر آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا ایک مختصر جامع نسخہ بتلایا گیا ہے، جس پر عمل کرنے سے پورے دین پر عمل کرنے کے راستے کھل جاتے ہیں، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں عادۃً پیش آتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں، اس نسخہ اکسیر کے دو جزء ہیں، ایک تلاوتِ قرآن، دوسرے نماز کی اقامت۔ اور اس جگہ اصل مقصود تو یہی ہے کہ لوگوں کو ان دونوں چیزوں کا پابند کیا جائے، لیکن ترغیب و تاکید کے لئے ان دونوں چیزوں کا حکم اوّل خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، تاکہ امت کو اس پر عمل کرنے کی زیادہ رغبت ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تعلیم سے ان کو خود عمل کرنا بھی آسان ہو جائے۔

ان میں تلاوتِ قرآن تو سب کاموں کی روح اور اصل بنیاد ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے، جس کو تمام دوسرے فرائض اور اعمال سے ممتاز کر کے بیان کرنے کی یہ حکمت بھی بیان فرما دی کہ نماز خود اپنی ذات میں بھی بہت بڑی اہم عبادت اور دین کا عمود ہے، اس کے ساتھ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص نماز کی اقامت کرے تو نماز اس کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور ایسی واضح ہو کہ ہر عقل والا مؤمن ہو یا کافر اس کو بُرا سمجھے، جیسے زنا، قتلِ ناحق، چوری، ڈاکہ وغیرہ، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو، اس لئے ائمہ فقہاء کے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا۔

فحشاء اور منکر کے دو لفظوں میں تمام جرائم اور ظاہری و باطنی گناہ آگئے، جو خود بھی فساد ہی فساد ہیں اور اعمالِ صالحہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔

نماز کا تمام گناہوں سے روکنے کا مطلب

متعدد مستند احادیث کی رُو سے یہ مطلب ہے، کہ اقامتِ صلوٰۃ میں بالخاصہ تاثیر ہے کہ جو اس کو ادا کرتا ہے اس سے گناہ چھوٹ جاتے ہیں بشرطیکہ صرف نماز پڑھنا نہ ہو، بلکہ الفاظِ قرآن کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ ہو۔ اقامت کے لفظی معنی سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہوا کہ نماز کے تمام ظاہری اور باطنی آداب اُس طرح ادا کرے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر ادا کر کے بتلایا، اور عمر بھر ان کی زبانی تلقین بھی فرماتے رہے کہ بدن اور کپڑے اور جائے نماز کی مکمل طہارت بھی ہو، پھر نمازِ جماعت کا پورا اہتمام بھی ہو اور نماز کے تمام اعمال کو سنت کے مطابق بنانا بھی، یہ تو ظاہری آداب ہوئے۔ باطنی یہ کہ مکمل خشوع خضوع سے اس طرح اللہ کے سامنے کھڑا ہو کہ گویا وہ حق تعالیٰ سے عرض و معروض کر رہا ہے۔ اس طرح

اقامت صلوٰۃ کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود توفیق اعمالِ صالحہ کی بھی ہوتی ہے، اور ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی بھی، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود گناہوں سے نہ بچا تو سمجھ لے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا مَنْ لَّمْ تَنْھَہٗ صَلٰوتُہٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ فَلَا صَلٰوۃَ لَہٗ (رواہ ابن ابی حاتم بسندہ عن عمران بن حُصَین والطبرانی من حدیث ابی معاویۃ) یعنی جس شخص کو اس کی نماز نے فحشاء اور منکر سے نہ روکا اس کی نماز کچھ نہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یُطِعِ الصَّلٰوۃَ (رواہ ابن جریر بسندہ) یعنی اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے اپنی نماز کی اطاعت نہ کی اور نماز کی اطاعت یہی ہے کہ فحشاء اور منکر سے باز آجائے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کی نماز نے اس کو اعمالِ صالحہ پر عمل اور منکرات سے پرہیز پر آمادہ نہیں کیا تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ان تینوں روایتوں کو نقل کر کے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ احادیث مرفوعہ نہیں، بلکہ عمران بن حُصَین اور عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں جو ان حضرات نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمائے ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فلاں آدمی رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہو جاتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی۔ (ابن کثیر) بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد وہ اپنے گناہ سے تائب ہو گیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ نماز کے پابند ہونے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں جو بظاہر اس آیت کے ارشاد کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نماز نمازی کو گناہوں سے منع کرتی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس کو کسی کام سے منع کیا جائے وہ اس سے باز بھی آجائے۔ آخر قرآن و حدیث سب لوگوں کو گناہ سے منع کرتے ہیں،

مگر بہت سے لوگ اس منع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، اور گناہ سے باز نہیں آتے۔
خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہی توجیہ لی گئی ہے۔

مگر اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نماز کے منع کرنے کا مفہوم صرف حکم دینا نہیں بلکہ نماز میں بالخاصہ یہ اثر بھی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہو جاتی ہے، اور جس کو توفیق نہ ہو تو غور کرنے سے ثابت ہو جائے گا کہ اس کی نماز میں کوئی خلل تھا، اور اقامت صلوٰۃ کا حق اس نے ادا نہیں کیا، احادیث مذکورہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ، یعنی اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے، اور وہ تمہارے سب اعمال کو خوب جانتا ہے" یہاں ذکر اللہ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بندے جو اللہ کا ذکر نماز یا خارج نماز میں کرتے ہیں وہ بڑی چیز ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بندے جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذاکر بندوں کا ذکر فرشتوں کے مجمع میں کرتے ہیں (فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ) اور یہ عبد زمند، بندوں کو اللہ کا یاد کرنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ بہت سے صحابہ و تابعین سے اس جگہ ذکر اللہ کا یہی دوسرا مفہوم منقول ہے۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے، اور اس مفہوم کے لحاظ سے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ نماز پڑھنے میں گناہوں سے نجات کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کا ذکر فرشتوں میں کرتے ہیں اور اس کی برکت سے اس کو گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو اُن میں

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو اور اترا تم کو

وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ

اور بندگی ہماری اور تمہاری ایک ہی کو ہے اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں، اور ویسی ہی

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ

ہم نے اتاری تجھ پر کتاب سو جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو مانتے

بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

ہیں اور ان (مکہ والوں) میں بھی بعضے ہیں کہ اس کو مانتے ہیں اور منکر وہی ہیں ہماری باتوں سے جو نافرمان ہیں

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے تب تو

لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ

البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے ، بلکہ یہ (قرآن) تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ

ملی ہے سمجھ ، اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں ، اور کہتے ہیں کیوں

اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ

نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رب سے تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے اور میں تو بس

اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

سنا دینے والا ہوں کھول کر ، کیا ان کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر اتاری کتاب کہ ان پر

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

پڑھی جاتی ہے ، بیشک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا ان لوگوں کو جو مانتے ہیں ،

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

تو کہہ کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے بیچ گواہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین

الْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ

میں اور جو لوگ یقین لاتے ہیں جھوٹ پر اور منکر ہوئے اللہ سے وہی ہیں

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ

نقصان پانے والے ، اور جلدی مانگتے ہیں تجھ سے آفت ، اور اگر نہ ہوتا ایک

مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

وعدہ مقرر تو آ پہنچتی ان پر آفت ، اور البتہ آئے گی ان پر اچانک اور ان کو خبر

ع ۵

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ

نہ ہوگی، جلدی مانگتے ہیں تجھ سے عذاب اور دوزخ گھیر رہی ہے

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ

منکروں کو، جس دن گھیرے گا ان کو عذاب ان کے اوپر سے اور

تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

پاؤں کے نیچے سے اور کہے گا چکھو جیسا کچھ تم کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہو تو اے مسلمانوں منکرین رسالت میں سے جو اہل کتاب ہیں ہم ان سے طریقہ گفتگو بتلاتے ہیں اور یہ تخصیص اس لئے کہ اول تو وہ بوجہ اہل علم ہونے کے بات کو سنتے ہیں اور مشرکین تو بات سننے سے پہلے ہی ایذاء کے درپے ہو جاتے ہیں، دوسرا اہل علم کے ایمان لے آنے سے عوام کا ایمان زیادہ متوقع ہو جاتا ہے اور وہ طریقہ یہ ہو کہ) تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو، ہاں جو ان میں زیادتی کریں (تو ان کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کا مضائقہ نہیں، گو افضل جب بھی طریقہ احسن ہی) اور (وہ مہذب طریقہ یہ ہو کہ مثلاً ان سے) یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو تم پر نازل ہوئیں، (کیونکہ مدار ایمان کا منزل من اللہ ہونا ہے، پس جب ہماری کتاب کا منزل من اللہ ہونا تمہاری کتب سے بھی ثابت ہے، پھر تم کو قرآن پر بھی ایمان لانا چاہئے) اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ) ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے (کقولہ تعالیٰ اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا الخ جب توحید متفق علیہ ہے اور اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کی وجہ سے نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لانا سلاف توحید ہے، تو تم کو ہمارے نبی پر ایمان لانا چاہئے، کقولہ تعالیٰ وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا الخ) اور (اس گفتگو کے ساتھ اپنا مسلمان ہونا تنبیہ کے لئے سنا دو کہ) ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں (اس میں عقائد و اعمال سب آ گئے یعنی اسی طرح تم کو بھی چاہئے جب کہ مقتضی موجود ہے کقولہ تعالیٰ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ) اور (جس طرح ہم نے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی (جس کی بناء پر مجادلہ بالاحسن کی تعلیم کی گئی) سو جن لوگوں کو ہم نے کتاب (کی نافع سمجھ) دی ہے وہ اس

(آپ والی کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (اور ان سے مجادلہ کی بھی نوبت شاذ و نادر آتی ہے) اور ان (اہل عرب مشرک) لوگوں میں بھی بعض ایسے (منصف) ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (خواہ خود سمجھ کر یا اہل علم کے ایمان سے استدلال کر کے) اور (وضوح دلائل کے بعد) ہماری (اس کتاب کی) آیتوں سے بجز (ضدی) کافروں کے اور کوئی منکر نہیں ہوتا (اور یہ مجادلہ کی تقریر دلیل نقلی تھی جس سے خاص اہل نقل کو تخاطب تھا آگے دلیل عقلی ہے جس میں عام تخاطب ہے یعنی) اور (جو لوگ آپ کی نبوت کے منکر ہیں، ان کے پاس کوئی منشاء اشتباہ بھی تو نہیں، کیونکہ) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے (ایسی حالت میں) یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے (کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں آسمانی کتابیں دیکھ بھال کر ان کی مدد سے مضامین سوچ کر فرصت میں بیٹھ کر لکھ لئے اور یاد کر کے ہم لوگوں کو سنا دیئے یعنی اگر ایسا ہوتا تو کچھ تو منشاء اشتباہ کا ہوتا، گو جب بھی یہ شبہ کرنے والے مبطل ہوتے، کیونکہ اعجاز قرآنی پھر بھی دلالت علی النبوۃ کے لئے کافی تھا، لیکن اب تو اتنا منشاء اشتباہ بھی نہیں اس لئے یہ کتاب محل ارتیاب نہیں) بلکہ یہ کتاب (باوجود واحد ہونے کے چونکہ ہر حصہ اس کا معجزہ ہے، اور حصص کثیر ہیں، اس لئے وہ تنہا گویا) خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور (باوجود ظہور اعجاز کے) ہماری آیتوں سے بس ضدی لوگ انکار کئے جاتے ہیں (ورنہ منصف کو تو ذرا شبہ نہیں رہنا چاہئے) اور یہ لوگ (باوجود حصار معجزہ قرآن کے محض براہ تعنت و عناد) یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر ان کے رب کے پاس سے (ہماری فرمائشی) نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوئیں، آپ یوں کہہ دیجئے کہ وہ نشانیاں تو خدا کے قبضہ (قدرت) میں ہیں اور (میرے اختیار کی چیزیں نہیں) میں تو صرف ایک صاف صاف (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) ہوں (اور رسول ہونے پر صحیح دلیلیں رکھتا ہوں جن میں سب سے بڑی دلیل قرآن ہے۔ پھر خاص دلیل کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اس کے واقع نہ ہونے میں حکمت بھی ہو۔ آگے قرآن کا اعظم فی الدلالۃ ہونا فرماتے ہیں، کیا (دلالت علی النبوۃ میں) ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب (معجز) نازل فرمائی ہے جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی رہتی ہے، (کہ اگر ایک بار سننے سے اعجاز ظاہر نہ ہو تو دوسری بار میں ہو جائے یا اس کے بعد ہو جائے، اور دوسرے معجزات میں تو یہ بات بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس کا خارق ہونا دائمی نہ ہوتا جیسا ظاہر ہے اور ایک ترجیح اس معجزہ میں یہ ہے کہ) بلاشبہ اس کتاب میں (معجزہ ہونے کے ساتھ) ایمان لانے والے لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے (رحمت یہ کہ تعلیم احکام کی ہے جو نفع محض ہے اور نصیحت

ترغیب و ترہیب سے ہے، اور یہ بات دوسرے معجزات میں کب ہوتی، پس ان ترجیحات سے تو اس کو غنیمت سمجھتے اور ایمان لے آتے، اور اگر اس وضوح دلائل کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو آخری جواب کے طور پر) آپ کہہ دیجئے کہ (خیر بھائی مت مانو، بس) میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کا) اللہ گواہ بس ہے، اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور (جب میری رسالت اور اللہ کا علم محیط ثابت ہوا تو) جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ (کی باتوں) کے منکر ہیں (جن میں رسالت بھی داخل ہے) تو وہ لوگ بڑے زیاں کار ہیں (یعنی جب اللہ کے ارشاد سے میری رسالت ثابت ہے تو اس کا انکار کفر باللہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے تو اس کو اس انکار و کفر کی بھی خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر پر سزائے خسارہ دیتے ہیں، پس لامحالہ ایسے لوگ خاسر ہوں گے) اور یہ لوگ آپ سے عذاب (واقع ہونے کا) تقاضا کرتے ہیں (اور فوراً عذاب نہ آنے سے آپ کی نبوت و رسالت میں شبہ و انکار کرتے ہیں)، اور اگر (علم الٰہی میں عذاب آنے کے لئے) میعاد معین نہ ہوتی تو (ان کے تقاضے کے ساتھ ہی) ان پر عذاب آچکا ہوتا اور (جب وہ میعاد آجاوے گی تو وہ عذاب ان پر دفعۃً آپہونچے گا، اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی (آگے ان لوگوں کی جہالت کے اظہار کے لئے ان کی جلدبازی کو مکرر ذکر کرکے عذاب کی میعاد معین اور اس میں پیش آنے والے عذاب کا ذکر کرتے ہیں کہ) یہ لوگ آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور (عذاب کی صورت یہ ہوگی کہ) اس میں کچھ شک نہیں کہ جہنم ان کافروں کو (چاروں طرف سے) گھیرے گا جس دن ان پر عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے گھیرے گا اور (اس وقت ان سے) حق تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کچھ (دنیا میں) کرتے رہے ہو (اب اس کا مزہ) چکھو۔

معارف ومسائل

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، یعنی اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کی نوبت آوے تو مجادلہ بھی ایسے طریقہ سے کرو جو بہتر ہو مثلاً سخت بات کا جواب نرم الفاظ سے، غصہ کا جواب بردباری سے، جاہلانہ شور و شغب کا جواب باوقار گفتگو سے، اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، مگر وہ لوگ جنھوں نے تم پر ظلم کیا کہ تمہاری باوقار نرم گفتگو اور دلائل واضحہ کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ اس احسان کے مستحق نہیں رہے، بلکہ ایسے لوگوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے تو جائز ہے، اگرچہ اولیٰ اور بہتر اس وقت بھی یہی ہے کہ ان کی بدخوئی کا جواب بدخوئی سے اور ظلم کا جواب ظلم سے نہ دیں۔

بلکہ کج خلقی کے جواب میں خوش خلقی کا اور ظلم کے جواب میں انصاف کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآن میں اس کی تصریح ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۔ یعنی اگر ظلم و جور کا بدلہ تم ان سے برابر سرابر لے لو تو تمہیں اس کا حق ہے، لیکن صبر کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب سے مجادلہ میں جو ہدایت طریقۂ حسنہ کے ساتھ کرنے کی دی گئی ہے یہی سورۂ نحل میں مشرکین کے متعلق بھی ہے۔ اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص اس کلام کی وجہ سے ہے جو بعد میں آرہا ہے، کہ ہمارے اور تمہارے دین میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں تم غور کرو تو ایمان اور اسلام کے قبول کرنے میں تمہیں کوئی مانع نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ ارشاد فرمایا قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔ یعنی تم اہل کتاب سے مجادلہ کے وقت ان کو اپنے قریب کرنے کے لئے یہ کہو کہ ہم مسلمان تو اس وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف بواسطہ ہمارے رسول کے بھیجی گئی ہے، اور اس وحی پر بھی جو تمہاری طرف تمہارے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی گئی ہے، اس لئے تم سے مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔

کیا اس آیت میں موجودہ تورات و انجیل کے مضامین کی تصدیق کا حکم ہے

اس آیت میں اہل کتاب کی طرف آنے والی کتابوں تورات و انجیل پر مسلمانوں کے ایمان کا تذکرہ جس عنوان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں، یعنی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ تورات و انجیل کے سب مضامین پر ہمارا ایمان ہو، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی بہت تحریفات ہو چکی تھیں اور اس وقت سے اب تک ان میں تحریف کا سلسلہ جاری ہی رہا ہے۔ ایمان صرف ان مضامینِ تورات و انجیل پر ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئے تھے، تحریف شدہ مضامین اس سے خارج ہیں۔

موجودہ تورات و انجیل کی نہ مطلقاً تصدیق کی جائے نہ مطلقاً تکذیب

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اہل کتاب تورات و انجیل کو ان کی اصلی زبان عبرانی میں پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو ان کا ترجمہ عربی زبان میں سناتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔ یعنی ہم اجمالاً اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تمہارے انبیاء پر نازل ہوئی ہے، اور جو تفصیلات تم بتلاتے ہو وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد نہیں۔ اس لئے ہم اس کی تصدیق و تکذیب سے اجتناب کرتے ہیں۔

تفسیروں میں جو عام مفسرین نے اہل کتاب کی روایات نقل کی ہیں ان کا بھی یہی درجہ ہے۔ اور نقل کرنے کا منشاء بھی صرف اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنا ہے، احکام حلال حرام کا ان سے استنباط نہیں کیا جا سکتا، مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ، یعنی نزول قرآن سے پہلے نہ آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ کچھ لکھ سکتے تھے بلکہ آپ اُمّی تھے، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ لکھے پڑھے ہوتے تو اہل باطل کے لئے شک و شبہ کی گنجائش نکل آتی کہ یہ الزام لگاتے کہ آپ نے پچھلی کتابیں تورات و انجیل پڑھی ہیں یا نقل کی ہیں آپ جو کچھ قرآن میں فرماتے ہیں وہ انہی پچھلی کتابوں کا اقتباس ہے، کوئی وحی اور نبوت و رسالت نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کی بڑی فضیلت اور بڑا معجزہ ہے

حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جس طرح بہت سے واضح اور کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرمائے انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو پہلے سے اُمّی رکھا، نہ کچھ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ خود کچھ لکھ سکتے تھے، اور عمر کے چالیس سال اسی حال میں تمام اہل مکہ کے سامنے گذرے۔ آپ کا اختلاط اہل کتاب سے بھی کبھی نہیں ہوا کہ ان سے کچھ سُن لیتے۔ کیونکہ مکہ میں اہل کتاب تھے ہی نہیں، چالیس سال ہونے پر یکایک آپ کی زبانِ مبارک سے ایسا کلام جاری ہونے لگا جو اپنے مضامین اور معانی کے اعتبار سے بھی معجزہ تھا، اور لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی۔

بعض علماء نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آپ کا اُمّی ہونا ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا اور اس کی دلیل میں واقعہ حدیبیہ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ جب معاہدۂ صلح لکھا گیا تو اس میں مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اوّل لکھا تھا، اس پر مشرکین مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لکھنے والے حضرت علی مرتضیٰؓ تھے، آپ نے ان کو فرمایا کہ یہ لفظ مٹا دو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ادب سے مجبور ہو کر ایسا کرنے سے انکار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ لفظ مٹا کر یہ لکھ دیا، مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ۔

اس روایت میں لکھنے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے جس سے کچھ حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ لکھنا جانتے تھے، مگر صحیح بات یہی ہے کہ کسی دوسرے سے لکھوانے کو بھی عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ "اس نے لکھا" جیسا کہ محاورات میں عام

ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس واقعہ میں بطور معجزہ آپ کے نام مبارک بھی اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا، اس کے علاوہ صرف اپنے نام کے چند حروف لکھ دینے سے کوئی آدمی لکھا پڑھا نہیں کہلا سکتا، اس کو ان پڑھ اور اُمّی ہی کہا جائے گا، جب لکھنے کی عادت نہ ہو اور بلا دلیل کتابت کا آپ کی طرف منسوب کرنا آپ کی فضیلت کا اثبات نہیں، غور کریں تو بڑی فضیلت اُمّی ہونے میں ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے بندو میرے جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو مجھ ہی کی بندگی کرو

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ

جو جی ہے سو چکھے گا موت پھر ہماری طرف پھر آؤ گے، اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ

یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کو ہم جگہ دیں گے بہشت میں جھروکے نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾

بہتی ہیں ان کے نہریں سدا رہیں ان میں، خوب ثواب ملا کام والوں کو

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ

جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ رکھا، اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں

لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ

رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو بھی، اور وہی ہے سننے والا

الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

جاننے والا، اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان اور زمین کو

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں اللہ نے، پھر کہاں سے اُلٹے جاتے ہیں،

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ

اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اپنے بندوں میں اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۶۲﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ
بیشک اللہ ہر چیز سے خبردار ہے اور جو تو پوچھے اُن سے کس نے اُتارا آسمان

السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ
سے پانی پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد تو کہیں

اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾
اللہ نے تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خُلاصۂ تفسیر

اے میرے ایمان دار بندو (جب یہ لوگ غایتِ عداوت وعناد سے تم کو اقامتِ شرائع واختیار دین پر ایذاء پہونچاتے ہیں تو یہاں رہنا کیا ضرور) میری زمین فراخ ہے، سو (اگر یہاں رہ کر عبادت نہیں کرسکتے تو اور کہیں چلے جاؤ اور وہاں جاکر) خاص میری ہی عبادت کرو (کیونکہ یہاں اہل شرک کا زور ہے، تو ایسی عبادت جو توحید محض پر مبنی ہو اور شرک سے خالی ہو، یہاں مشکل ہے، البتہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی بھی عبادت ہو یہ ممکن ہے مگر وہ عبادت ہی نہیں اور اگر تم کو ہجرت میں احباب واوطان کی مفارقت شاق معلوم ہو تو یہ سمجھ لو کہ ایک نہ ایک روز یہ تو ہونا ہی ہے، کیونکہ) ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا (ضرور) ہے (آخر اس وقت سب چھوٹیں گے اور) پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے (اور نافرمان ہوکر آنے میں خوف سزا کا ہے) اور (یہ مفارقت اگر ہماری رضا کے واسطے ہو تو ہمارے پاس پہنچنے کے بعد اس وعدہ کے مستحق ہوجاؤ اور وہ وعدہ یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (جن پر عمل کرنا بعض اوقات ہجرت پر موقوف ہوتا ہے تو ایسے وقت میں ہجرت بھی کی) ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے، جنھوں نے (واقع شدہ سختیوں پر جن میں ہجرت کی سختی بھی داخل ہوگئی) صبر کیا، اور (دوسرے ملک یا شہر میں جاکر جو تکالیف کا اور گذارے کی مشکلات کا اندیشہ تھا اس میں) وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے اور (اگر ہجرت میں تم کو یہ وسوسہ ہو کہ پردیس میں کھانے کو کہاں سے

ملے گا تو یہ سمجھ لو کہ) بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے (یعنی جمع نہیں کرتے گو بعضے جمع بھی کرتے ہیں، مگر بہت سے نہیں بھی کرتے) اللہ ہی ان کو (مقدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی (مقدر روزی پہنچاتا ہے خواہ تم کہیں ہو پھر ایسا وسوسہ مت لاؤ، بلکہ دل قوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو) اور (وہ بھروسہ کے لائق ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (اسی طرح دوسری صفات میں کامل ہے اور جو ایسا کامل الصفات ہو وہ ضرور بھروسہ کے قابل ہے) اور (توحید فی الالوہیت کا جو مبنیٰ ہے یعنی توحید فی التخلیق وہ تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ (بھلا) وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر (جب توحید فی التخلیق کو مانتے ہیں تو توحید فی الالوہیت کے بارے میں) کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں (اور جیسا خالق اللہ ہی ہے اسی طرح اللہ ہی رازق بھی ہے چنانچہ) وہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہی سب چیز کے حال سے واقف ہے (جیسی مصلحت دیکھتا ہے ویسی ہی روزی دیتا ہے غرض رازق وہی ٹھہرا، اس لئے رزق کا اندیشہ ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے) اور (جیسا کہ تخلیق کائنات میں اللہ کی توحید ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے، اسی طرح کائنات کے باقی رکھنے اور ان کا نظام چلانے میں بھی توحید کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک (نا قابل نبات) پڑی تھی تر و تازہ (قابل نبات) کر دیا تو (جواب میں) وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے آپ کہئے کہ الحمد للہ (اتنا تو اقرار کیا جس سے توحید فی الالوہیت پر استدلال بھی بدیہی ہے، مگر یہ لوگ مانتے نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (نہ اس وجہ سے کہ عقل نہیں، بلکہ عقل سے کام نہیں لیتے اور غور نہیں کرتے، اس لئے بدیہی بھی خفی رہتا ہے)۔

معارف و مسائل

شروع سورت سے یہاں تک مسلمانوں کے ساتھ کفار کی عداوت اور توحید و رسالت سے مسلسل انکار اور حق اور اہل حق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹوں کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کے لئے ان کے شر سے بچنے اور حق کو شائع کرنے اور حق و انصاف

کو دنیا میں قائم کرنے کی ایک تدبیر کا بیان ہے جس کا اصطلاحی نام ہجرت ہے، یعنی وہ وطن اور ملک چھوڑ دینا جس میں انسان خلافِ حق بولنے اور کرنے پر مجبور کیا جائے۔

ہجرت کے احکام اور اس کی راہ میں پیش آنے والے شکوک و شبہات کا ازالہ

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اس لئے کسی کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں کہ فلاں شہر یا فلاں ملک میں کفار غالب تھے، اس لئے ہم اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے مجبور رہے۔ ان کو چاہئے کہ اس سرزمین کو جہاں وہ کفر و معصیت پر مجبور کئے جائیں اللہ کے لئے چھوڑ دیں، اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں آزادی سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود بھی عمل کر سکیں اور دوسروں کو بھی تلقین کر سکیں۔ اسی کا نام ہجرت ہے۔

وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانے میں دو قسم کے خطرات انسان کو عادۃً پیش آیا کرتے ہیں، جو اس کو ہجرت سے روکتے ہیں۔ پہلا خطرہ اپنی جان کا ہے کہ جب اس وطن کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے تو یہاں کے کفار اور ظالم لوگ راہ میں حائل ہوں گے، اور مقابلہ و مقاتلہ کے لئے آمادہ ہوں گے۔ نیز راستہ میں ممکن ہے کہ دوسرے کفار سے بھی مقابلہ کرنا پڑے جس میں جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں یہ دیا گیا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر ایک جان چکھنے والی ہے مزہ موت کا، جس سے کسی کو کسی جگہ کسی حال مفر نہیں۔ اس لئے موت سے خوف اور گھبراہٹ مؤمن کا کام نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تو ہر شخص کو ہر حال میں پیش آئیگی۔ اپنی جگہ میں کیسے ہی حفاظت کے سامان کرکے رہے، پھر بھی آئیگی۔ اور مؤمن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی اس لئے اپنی جگہ رہنے یا ہجرت کرکے دوسری جگہ جانے میں موت کا خوف حائل نہ ہونا چاہئے، خصوصاً جبکہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کرتے ہوئے موت آجانا دائمی راحتوں اور نعمتوں کا ذریعہ ہے جو ان کو آخرت میں ملیں گی جس کا ذکر بعد کی دو آیتوں میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا الآیة۔

دوسرا خطرہ ہجرت کی راہ میں یہ پیش آتا ہے کہ دوسرے وطن دوسرے ملک میں جاکر رزق کا کیا سامان ہوگا؟ اپنی جگہ تو کچھ آبائی میراث سے کچھ اپنی کمائی سے آدمی کو کوئی زمین جائداد یا صنعت و حرفت و تجارت وغیرہ کے سامان کئے رہتا ہے، ہجرت کے وقت یہ سب تو یہیں چھوٹ جائیں گے، آگے گذارہ کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب بعد کی تین آیتوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تم ان حاصل کردہ سامانوں کو رزق کی علت اور کافی سبب قرار

دیتے ہوئے تمہاری بھول ہے، رزق دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ جب چاہتا ہے تو بغیر کسی ظاہری سامان کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے، اور وہ نہ چاہے تو سب سامان واسباب کے ہوتے ہوئے بھی انسان رزق سے محروم ہو سکتا ہے۔ اس کے بیان کے لئے پہلے تو یہ فرمایا:

وَكَأَيِّنْ مِّن دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ۔ یعنی اس پر غور کرو کہ زمین پر چلنے والے کتنے ہزاروں قسم کے جانور ہیں جو اپنے رزق جمع کرنے اور رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے نہ تحصیلِ رزق کے اسباب جمع کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزانہ اپنے فضل سے رزق مہیا کرتے ہیں۔ علماء نے فرمایا ہے کہ عام جانور ایسے ہی ہیں۔ ان میں صرف چیونٹی اور چوہا تو ایسے جانور ہیں جو اپنی غذا کیلئے اپنے بلوں میں جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ چیونٹی سردی کی موسم میں باہر نہیں آتی اس لئے گرمی کے ایام میں کھانے کا سامان اپنے بل میں جمع کرتی ہے۔ اور مشہور ہے کہ پرندہ جانوروں میں سے عقعق (کوا) بھی اپنی غذا اپنے گھونسلے میں جمع کرتا ہے مگر وہ رکھ کر بھول جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام جانور جن کی انواع واصناف کا شمار بھی انسان سے مشکل ہے، وہ بیشتر وہی ہیں جو آج اپنی غذا حاصل کرنے کے بعد کل کے لئے نہ غذا مہیا کرتے ہیں نہ اس کے اسباب ان کے پاس ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ پرندے جانور صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔ نہ ان کی کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کوئی جائداد و زمین، نہ یہ کسی کارخانے یا دفتر کے ملازم ہیں جہاں سے اپنا رزق حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ کی کھلی زمین میں نکلتے ہیں اور سب کو پیٹ بھرائی رزق ملتا ہے۔ اور یہ ایک دن کا معاملہ نہیں، جب تک وہ زندہ ہیں یہی سلسلہ جاری ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں رزق کا اصلی ذریعہ بتلایا ہے جو حق تعالیٰ کی عطاء ہے، اور فرمایا ہے کہ خود ان منکروں کافروں سے سوال کرو کہ آسمان زمین کس نے پیدا کئے؟ اور شمس وقمر کس کے تابع فرمان چل رہے ہیں؟ بارش کون برساتا ہے؟ پھر اس بارش کے ذریعہ زمین سے نباتات کون اگاتا ہے؟ تو مشرکین بھی اس کا اقرار کریں گے کہ یہ سب کام ایک ذات حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ تو ان سے کہئے کہ پھر تم اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا پاٹ اور ان کو اپنا کارساز کیسے سمجھتے ہو۔ اگلی آیات وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ سے آخر رکوع تک اسی کا بیان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے روکنے والی دوسری فکر معاش کی ہے، وہ بھی انسان کی بھول ہے۔ معاش کا مہیا کرنا اس کے یا اس کے جمع کردہ اسباب و سامان کے

قبضہ میں نہیں، وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ اسی نے اس وطن میں یہ سامان جمع فرما دیئے تھے وہ دوسری جگہ بھی سامانِ معاش دے سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے بھی ضروریات معاش فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرا خطرہ بھی ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے۔

ہجرت کب فرض یا واجب ہوتی ہے۔ ہجرت کے معنی اور تعریف اور اس کے فضائل و برکات سورۂ نساء کی آیات نمبر ۹۷ تا ۱۰۰ میں اور شرعی احکام میں تبدیلی اسی سورت کی آیت نمبر ۸۹ کے تحت میں معارف القرآن کی جلد دوم صفحہ ۵۲۵ تا ۵۲۹ اور کچھ صفحہ ۵۱۰ میں بیان ہو چکے ہیں، ایک مضمون وہاں بیان کرنے سے رہ گیا تھا وہ یہاں لکھا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بامرِ الٰہی مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی، اور سب مسلمانوں کو بشرطِ قدرت ہجرت کا حکم فرمایا اس وقت مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا فرضِ عین تھا جس سے کوئی مرد و عورت مستثنیٰ نہیں تھا، بجز ان لوگوں کے جو ہجرت پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔

اور اس زمانے میں ہجرت صرف فرض ہی نہیں، بلکہ مسلمان ہونے کی علامت اور شرط بھی سمجھی جاتی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے، اس کو مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا تھا جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا بیان سورۂ نساء کی آیت نمبر ۸۹ میں ہے، حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اس وقت ہجرت کا مقام اسلام میں وہ تھا جو کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ کا ہے، کہ یہ شہادت خود بھی فرض ہے اور مسلمان ہونے کی شرط اور علامت بھی کہ جو شخص باوجود قدرت کے زبان سے ایمان کا اقرار اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہ دے اگرچہ دل میں یقین اور تصدیق رکھتا ہو وہ مسلمان نہیں سمجھا جاتا۔ عاجز جس کو اس کلمہ کے بولنے پر قدرت نہ ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہجرت پر قدرت نہ تھی وہ مستثنیٰ سمجھے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۸ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ میں آیا ہے، اور جو لوگ باوجود ہجرت پر قادر ہونے کے مکہ میں مقیم رہے، ان کیلئے جہنم کی سخت وعید آیت نمبر ۹۷ ــــــ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (اِلٰى) فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ، میں مذکور ہے۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت مکہ خود دارالاسلام بن گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حکم جاری فرما دیا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، یعنی فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت

نہیں، مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فرض ہونا پھر منسوخ ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہو گیا، جو ایک واقعہ جزئیہ تھا۔ فقہاء امت نے اس واقعہ سے یہ مسائل مستنبط کئے:۔

مسئلہ: جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر و شرک یا احکام شرعیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہو وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کر سکے وہ شرعاً معذور ہے۔

مسئلہ: جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض و واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام آلٰہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ وہاں کے حکمران کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو۔

یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تحریر فرمائی ہے اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں۔ اور مسند احمد کی ایک روایت جو حضرت ابو یحییٰ مولیٰ زبیر ابن عوامؓ سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْبِلَادُ بِلَادُ اللّٰہِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰہِ حَیْثُمَا اَصَبْتَ خَیْرًا فَاَقِمْ (ابن کثیر)	"یعنی سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو"

اور ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس شہر میں معاصی اور فواحش عام ہوں اس کو چھوڑ دو۔ اور امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ جب تمہیں کسی شہر میں معاصی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہو۔ (ابن جریر طبری فی التفسیر)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ

اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے اور پچھلا گھر جو

الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی

ہے سو وہی ہے زندہ رہنا اگر ان کو سمجھ ہوتی، پھر جب سوار ہوتے

الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ

کشتی میں پکارنے لگے اللہ کو خالص اسی پر رکھ کر اعتقاد پھر جب بچا لایا ان کو

اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚۙ

زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک بنانے، تاکہ مکرتے رہیں ہمارے دیئے ہوئے سے

وَ لِیَتَمَتَّعُوْا ۫ۗ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا

اور مزے اڑاتے رہیں، سو عنقریب جان لیں گے، کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رکھ دی ہے

حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ

پناہ کی جگہ امن کی، اور لوگ اچکے جاتے ہیں ان کے آس پاس سے کیا جھوٹ پر یقین

یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

رکھتے ہیں اور اللہ کا احسان نہیں مانتے، اور اس سے زیادہ بے انصاف کون

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ

جو باندھے اللہ پر جھوٹ یا جھٹلائے سچی بات کو جب اس تک پہنچے، کیا دوزخ

فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۸﴾ وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا

میں بسنے کی جگہ نہیں منکروں کے لئے، اور جنھوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۶۹﴾

سجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں، اور بیشک اللہ ساتھ ہے نیکی والوں کے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وجہ ان کے غور نہ کرنے کی اہتمام ہے مشاغل دنیا میں حالانکہ) یہ دنیوی زندگی (جس کے یہ تمام تر اشغال ہیں فی نفسہٖ) بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت (کی) ہے (چنانچہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے

سے یہ دونوں مضمون ظاہر ہیں، پس فانی میں اس قدر انہماک کہ باقی کو بھول میں ڈال کر اس سے محروم ہو جاوے خود یہ بے عقلی کی بات ہے) اگر ان کو اس کا (کافی) علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہو کر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے ... اور ایمان لے آتے جیسا کہ خود ان کو یہ تسلیم ہے کہ تخلیقِ کائنات اور اس کے باقی رکھنے میں خدا کا کوئی شریک نہیں) پھر (جیسا کہ ان کے اس اقرار و تسلیم کا مقتضی ہے کہ خدائی اور عبادت میں اسی کو منفرد مانتے اور اس کا بھی کبھی اظہار و اقرار کرتے چنانچہ) جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ کشتی زیر و زبر ہونے لگتی ہے) تو (اس وقت) خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ ہٰذِہٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ای الموحدین جس میں خدائی اختیارات اور معبودیت میں بھی توحید کا اقرار ہے، مگر یہ حالت بوجہ انہماک فی الدنیا کے دیرپا نہیں ہوتی، چنانچہ اس وقت تو سب قول و اقرار توحید کے ہو چکے ہیں مگر) پھر جب ان کو (اس آفت سے) نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو نعمت (نجات وغیرہ) ان کو دی ہے اس کی ناقدری کرتے ہیں اور یہ لوگ (عقائد شرکیہ و اعمالِ فسقیہ میں ہوائے نفسانی کا اتباع کر کے) چندے اور حظ حاصل کر لیں پھر قریب ہی ان کو سب خبر ہوئی جاتی ہے، (اور اب اس انہماک فی الدنیا کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا، سو ایک مانع تو ان کو توحید سے یہ انہماک ہے۔ اور دوسرا ایک اور نامعقول حیلہ مانعہ نکالا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہمیں عرب کے لوگ مار دیں گے۔ حالانکہ مشاہدہ سے ان کو خود لغویت اس کی معلوم ہو سکتی ہے) کیا ان لوگوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم نے (ان کے شہر مکہ کو) امن والا حرم بنایا ہے اور ان کے گرد و پیش (کے مقامات) میں (جو خارج حرم ہیں) لوگوں کو (مار دھاڑ کر ان کے گھر دں سے) نکالا جا رہا ہے (بخلاف ان کے کہ امن سے بیٹھے ہیں اور یہ بات خود محسوسات میں سے ہے تو بدیہیات سے گذر کر محسوسات میں بھی خلاف کرتے اور خوفِ ہلاکت کو ایمان لانے میں عذر مانع بناتے ہیں اور) پھر (وضوحِ حق کے بعد اس حماقت اور ضد کا) کیا (ٹھکانا ہے کہ) یہ لوگ جھوٹے معبود (وں) پر تو ایمان لاتے ہیں (جس پر ایمان لانے کا کوئی مقتضی نہیں اور موانع بہت سے ہیں) اور (اللہ (جس پر ایمان لانے کے بہت سے مقتضی اور دلائل صحیحہ ہیں اس کی) نعمتوں کی ناشکری (یعنی اللہ کے ساتھ شرک) کرتے ہیں (کیونکہ شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں کہ نعمتِ تخلیق و ترزیق و ابقاء و تدبیر وغیرہ تو وہ عطا فرماوے اور عبادت

جو کہ ان نعمتوں کا شکر ہے دوسرے کے لئے تجویز کی جاوے) اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اس شخص سے زیادہ کون ناانصاف ہوگا جو (بلا دلیل) اللہ پر جھوٹ افتراء کرے (کہ وہ شریک رکھتا ہے) اور جب سچی بات اس کے پاس (دلیل کے ساتھ) پہنچے وہ اس کو جھٹلا دے (بے انصافی ظاہر ہے کہ بلا دلیل بات کی تو تصدیق کرے اور دلیل والی بات کی تکذیب) کیا ایسے کافروں کا (جو اس قدر ناانصافی کریں) جہنم میں ٹھکانا نہ ہوگا (یعنی ضرور ہے۔ کیونکہ سزا مناسب جرم کے ہوتی ہے۔ پس جیسا جرم عظیم ہے ایسی ہی سزا بھی عظیم ہے۔ اور یہ حال تھا جواہل کفر اور نفس پرست ہوں) اور (اب انکے اضداد کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے (قرب و ثواب یعنی جنت) کے راستے ضرور دکھادیں گے (جس سے وہ جنت میں جا پہنچیں گے کقولہ تعالیٰ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا الآیۃ) اور بیشک اللہ تعالیٰ (کی رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کا یہ حال مذکور ہوا ہے کہ آسمان و زمین کی پیدائش، شمس و قمر کا نظام، بارش نازل کرنے اور اس سے نباتات اگانے کا سارا نظام یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں اسمیں کسی بت وغیرہ کی شرکت نہیں مانتے، مگر پھر بھی وہ خدائی میں بتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (یعنی انمیں بکثرت لوگ وہ ہیں جو سمجھتے نہیں)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجنون دیوانے تو نہیں ہوشیار سمجھدار ہیں، دنیا کے بڑے بڑے کام خوب کرتے ہیں پھر ان کے بے سمجھ ہو جانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں یہ دیا گیا کہ ان کو دنیا اور اس کی مادی اور فانی لذات و خواہشات کی محبت نے آخرت اور انجام میں غور و فکر کرنے سے اندھا اور بے سمجھ بنا دیا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی لہو و لعب یعنی وقت گذاری کا مشغلہ اور کھیل کے سوا کچھ نہیں، اور اصلی زندگی جو جاودانی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، اس جگہ حیوان کا لفظ بمعنی حیات مصدری معنی میں ہے۔ (قرطبی)

اس میں حیاتِ دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے کھیلوں کا کوئی ثبات و قرار نہیں اور کوئی بڑا مقصد ان سے حل نہیں ہوتا، تھوڑی دیر کے بعد سب تماشہ ختم ہو جاتا ہے یہی حال اس دنیا کا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکین کا ایک اور برا حال یہ بتلایا گیا کہ جیسے یہ لوگ تخلیقِ کائنات میں اللہ تعالیٰ کو منفرد ماننے کے باوجود اس جہالت کے شکار ہیں کہ بتوں کو خدائی کا ساجھی بتاتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجب یہ ہے کہ جب ان پر کوئی بڑی مصیبت

آپڑتی ہے تو اس مصیبت کے وقت بھی ان کو یہ یقین اور اقرار ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بُت ہمارا مددگار نہیں بن سکتا، مصیبت سے رہائی صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اس کے لئے بطور مثال کے فرمایا کہ یہ لوگ جب دریا کے سفر میں ہوتے ہیں اور ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اس خطرہ کو ٹالنے کے لئے کسی بُت کو پکارنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کے مضطر اور بیقرار ہونے اور وقتی طور پر دنیا کے سارے سہارے منقطع ہونے کی بنا پر ان کی دعا قبول کر کے ان کو دنیا کے مہلکے سے نجات دے دیتا ہے۔ مگر یہ ظالم جب خشکی پر پہونچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں تو پھر بتوں کو خدا کا شریک کہنے لگتے ہیں۔ آیت فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر بھی جس وقت اپنے آپ کو بے سہارا جان کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اور اس وقت یہ یقین کرتا ہے کہ خدا کے سوا مجھے اس مصیبت سے کوئی نہیں چھڑا سکتا، تو اللہ تعالیٰ کافر کی بھی دعا قبول فرما لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ مضطر ہے اور اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے (قرطبی وغیرہ)

اور ایک آیت میں جو یہ ارشاد آیا ہے وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کی دعا ناقابل قبول ہے، یہ حال آخرت کا ہے، کہ وہاں کافر عذاب سے رہائی کی دعا کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا الآیۃ اوپر کی آیات میں مشرکین مکہ کی جاہلانہ حرکتوں کا ذکر تھا کہ سب چیزوں کا خالق و مالک خدا تعالیٰ کو یقین کرنے کے باوجود پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کو اس کی خدائی کا شریک بتاتے ہیں، اور صرف تخلیق کائنات ہی کا خدا تعالیٰ کو مالک نہیں سمجھتے بلکہ آڑے وقت میں مصیبت سے نجات دینا بھی اسی کے اختیار میں جانتے ہیں مگر نجات کے بعد پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کفر و شرک کا ایک عذر بعض مشرکین مکہ کی طرف سے یہ بھی پیش کیا جاتا تھا کہ ہم آپ کے دین کو تو حق و درست مانتے ہیں لیکن اس کی پیروی کرنے اور مسلمان ہو جانے میں ہم اپنی جانوں کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ سارا عرب اسلام کے خلاف ہے، ہم اگر مسلمان ہو گئے تو باقی عرب ہمیں اُچک لے جائیں گے اور مار ڈالیں گے (کما روی عن ابن عباسؓ، روح)

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ عذر بھی لغو ہے۔ کیونکہ اہل مکہ کو تو حق تعالیٰ نے بیت اللہ کی وجہ سے وہ شرف اور بزرگی دی ہے جو دنیا میں کسی مقام کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ ہم نے مکہ کی پوری زمین کو حرم بنا دیا ہے۔ عرب کے باشندے

مؤمن ہوں یا کافر سب کے سب حرم کا احترام کرتے ہیں۔ اس میں قتل و قتال کو حرام سمجھتے ہیں، حرم میں انسان تو انسان وہاں کے شکار کو قتل کرنا اور وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی کوئی جائز نہیں سمجھتا، باہر کا کوئی آدمی حرم میں داخل ہو جائے تو وہ بھی قتل سے مامون ہو جاتا ہے۔ تو مکہ مکرمہ کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے سے اپنی جانوں کا خطرہ بتلانا بھی ایک عذرِ لنگ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جہاد کے اصلی معنی دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں، اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار و فجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ و مقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے، اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنی راستوں کو ہدایت کر دیتے ہیں۔ یعنی جن مواقع میں خیر و شر یا حق و باطل یا نفع و ضرر میں التباس ہوتا ہے عقلمند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح، سیدھی، بے خطر راہ بتا دیتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب کو اُسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لئے خیر و برکت ہو۔

علم پر عمل کرنے سے علم میں زیادتی

اور حضرت ابو الدرداءؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو علم لوگوں کو دیا گیا ہے جو لوگ اپنے علم پر عمل کرنے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان پر دوسرے علوم بھی منکشف کر دیتے ہیں جو اب تک حاصل نہیں۔ اور فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ جو لوگ طلبِ علم میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے عمل بھی آسان کر دیتے ہیں۔ (مظہری) واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

تمت سورۃ العنکبوت

سُورَةُ الرُّومِ

سُورَةُ الرُّومِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ

مغلوب ہوگئے ہیں رومی ، ملتے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب

بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ

ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند برسوں میں ۔ اللہ کے ہاتھ ہیں

مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾

سب کام پہلے اور پچھلے اور اس دن خوش ہوں گے مسلمان ،

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾

اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی زبردست رحم والا ،

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

اللہ کا وعدہ ہو چکا ، خلاف نہ کریگا اللہ اپنا وعدہ لیکن بہت لوگ

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ

نہیں جانتے ، جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾

اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے ۔

خُلاصۂ تفسیر

الٓـمّٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) اہلِ روم ایک قریب کے موقع میں (یعنی ارضِ روم کے ایسے مقام میں جو بہ نسبت فارس کے عرب سے قریب تر ہے، مراد اس سے اذرعات و بصریٰ ہے، جو ملکِ شام میں دو شہر ہیں۔ کذا فی القاموس، اور حکومتِ روم کے تحت میں ہونے سے ارضِ روم میں داخل ہیں۔ اس موقع پر اہلِ روم اہلِ فارس کے مقابلہ میں) مغلوب ہوگئے (جس سے مشرکین خوش ہوئے) اور وہ (رومی) اپنے (اس) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب (اہلِ فارس پر دوسرے مقابلہ میں) تین سال سے لے کر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے (اور یہ مغلوب اور غالب ہونا سب خدا کی طرف سے ہے، کیونکہ مغلوب ہونے سے) پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا (جس سے مغلوب کر دیا تھا) اور (مغلوب ہونے سے) پیچھے بھی (اللہ ہی کو اختیار ہے جس سے غالب کر دے گا) اور اس روز (یعنی جب اہلِ روم غالب آئیں گے) مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے (اس امداد سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے قول میں سچا اور غالب فرما دے گا۔ کیونکہ اس پیشینگوئی کو مسلمانوں نے کفار پر ظاہر کیا اور انھوں نے تکذیب کی تو اس کے وقوع سے مسلمانوں کی جیت ہو جائیگی۔ اور یا یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو مقاتلہ میں بھی غالب کر دے گا۔ چنانچہ وہ وقت جنگِ بدر میں منصور ہونے کا تھا، اور ہر حال میں نصرت کا محل اہلِ اسلام ہی ہیں، اور مسلمانوں کی حالت ظاہری مغلوبیت کی دیکھ کر یہ بات مستبعد نہ سمجھی جاوے کہ یہ مغلوب مسلمان مقابلہ کے وقت کفار پر غالب آجائیں گے، کیونکہ نصرت اللہ کے قبضے میں ہے) وہ جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے اور وہ زبردست ہے (کفار کو جب چاہے قولاً یا فعلاً مغلوب کرا دے اور) رحیم (بھی) ہے (مسلمانوں کو جب چاہے غالب کر دے) اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا (اس واسطے یہ پیشینگوئی ضرور واقع ہوگی) ولیکن اکثر لوگ (اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو) نہیں جانتے (بلکہ صرف ظاہری اسباب کو دیکھ کر ان اسباب پر حکم لگا دیتے ہیں، اس لئے اس پیشینگوئی میں استبعاد کرتے ہیں حالانکہ مسبب الاسباب اور مالکِ اسباب حق تعالیٰ ہے، اس کو اسباب بدلنا بھی آسان ہے اور اسباب کے خلاف مسبب کا واقع کرنا بھی آسان۔

اور جس طرح پیشینگوئی کے واقع ہونے سے پہلے اسباب ظاہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اسی طرح پیشین گوئی کو پورا ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اس کو ایک اتفاقی

امر قرار دیتے ہیں، وعدۂ الٰہیہ کا ظہور نہیں سمجھتے اس لئے لفظ لَا یَعْلَمُوْنَ میں یہ دونوں چیزیں آگئیں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ اور نبوت سے غافل وجاہل رہنا اس سبب سے ہے کہ) یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لئے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)۔

معارف و مسائل

قصہ نزول سورت روم اور فارس کی جنگ

سورۂ عنکبوت اس آیت پر ختم ہوئی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد و مجاہدہ کرنے والوں کے لئے اپنے راستے کھول دینے اور ان کے لئے مقاصد میں کامیابی کی بشارت دی تھی۔ سورۂ رُوم کی ابتدا جس قصہ سے ہوئی ہے وہ اسی نصرتِ الٰہیہ کا ایک مظہر ہے، اس سورت میں جو واقعہ رُوم اور فارس کی جنگ کا مذکور ہے یہ دونوں کفار ہی تھے، ان میں سے کسی کی فتح کسی کی شکست بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، مگر ان دونوں کفار میں اہلِ فارس مشرکین آتش پرست تھے اور روم ونصاریٰ اہلِ کتاب۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے کفار میں اہلِ کتاب مسلمانوں سے نسبتاً قریب ہیں، کیونکہ بہت سے اصولِ دین آخرت پر ایمان، رسالت اور وحی پر ایمان، ان کے ساتھ قدر مشترک ہے۔ اسی قدر مشترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مکتوب میں کام لیا جو روم کے بادشاہ کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ الآیۃ، اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا ایک گونہ قرب ہی اس کا سبب بنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکہ مکرمہ کے زمانہ میں فارس نے روم پر حملہ کیا۔ حافظ ابن حجر وغیرہ کے قول کے مطابق ان کی یہ جنگ ملکِ شام کے مقام اذرعات اور بصریٰ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران میں مشرکینِ مکہ یہ چاہتے تھے کہ فارس غالب آجائے، کیونکہ وہ بھی شرک وبت پرستی میں ان کے شریک تھے۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ روم غالب آئیں، کیونکہ وہ دین ومذہب کے اعتبار سے اسلام کے قریب تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اس وقت فارس روم پر غالب آگئے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ بھی فتح کرلیا، اور وہاں اپنی عبادت کے لئے ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ اور یہ فتح کسریٰ پرویز کی آخری فتح تھی، اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا، اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا (از قرطبی)

اس واقعہ پر مشرکین مکہ نے خوشیاں منائیں اور مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم جس کو چاہتے تھے وہ ہار گیا، اور جیسا کہ روم اہل کتاب کو بمقابلہ فارس شکست ہوئی ہمارے مقابلہ میں تم کو شکست ہوگی، اس سے مسلمانوں کو رنج ہوا (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

قرآن میں سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جن میں یہ پیشین گوئی اور بشارت دی گئی ہے کہ چند سال بعد پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یہ آیات سنیں تو مکہ کے اطراف اور مشرکین کے مجامع اور بازار میں جا کر اس کا اعلان کیا کہ تمہارے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ چند سال میں پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے، مشرکین مکہ میں سے اُبی بن خلف نے مقابلہ کیا، اور کہنے لگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ خدا کے دشمن تو ہی جھوٹا ہے، اور میں تو اس واقعہ پر شرط کرنے کو تیار ہوں کہ اگر تین سال کے اندر روم غالب آگئے تو دس اونٹنیاں میں تمہیں دونگا اور وہ غالب آگئے تو دس اونٹنیاں تمہیں دینا پڑیگی (یہ معاملہ قمار کا تھا مگر اس وقت قمار حرام نہیں تھا) یہ کہہ کر صدیق اکبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تین سال کی مدت متعین نہیں کی تھی۔ کیونکہ قرآن میں اس کے لئے لفظ بِضْعِ سِنِيْنَ مذکور ہے، جس کا اطلاق تین سے نو سال تک ہو سکتا ہے، تم جاؤ اور جس سے یہ معاہدہ ہوا ہے اس سے کہدو کہ میں دس اونٹنیوں کے بجائے سَو کی شرط کرتا ہوں، مگر مدت تین سال کے بجائے نو سال اور بعض روایات کی رُو سے سات سال) مقرر کرتا ہوں۔ صدیق اکبرؓ نے حکم کی تعمیل کی، اور اُبی بن خلف اس نئے معاہدہ پر راضی ہوگیا (ابن جریر بسندہ عن مجاہد وروی القصتہ الترمذی عن ابی سعید الخدری و دینار بن مکرم الاسلمی بتغیر یسیر)

روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا کر اور پورے سات سال ہونے پر غزوۂ بدر کے وقت روم دوبارہ فارس پر غالب آگئے اس وقت اُبی بن خلف مر چکا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے اس کے وارثوں سے اپنی شرط کے مطابق سَو اونٹنیوں کا مطالبہ کیا، انھوں نے اونٹنیاں دے دیں۔

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت سے پہلے اُبی بن خلف کو جب اندیشہ ہوا کہ ابوبکرؓ بھی شاید ہجرت کر کے چلے جائیں تو اس نے کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپ کوئی کفیل پیش نہ کریں، کہ میعاد معین تک روم غالب نہ آئے تو سَو اونٹنیاں وہ مجھے دیدے گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمن کو اس کا کفیل بنادیا تھا۔

جب شرط کے مطابق صدیق اکبرؓ جیت گئے اور سَو اونٹنیاں اُن کو ہاتھ آئیں تو وہ سب لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ ان اونٹنیوں کو صدقہ کر دو۔ اور ابو یعلیٰ، ابن عساکر میں حضرت براء بن عازب کی روایت سے اس میں یہ الفاظ منقول ہیں ھٰذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِهٖ، یہ تو حرام ہے اس کو صدقہ کر دو (روح المعانی)

مسئلہ قمار قمار یعنی جوا از روئے نصوص قرآن حرام قطعی ہے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد جس وقت شراب حرام کی گئی اسی کے ساتھ قمار بھی حرام کر دیا گیا، اور اس کو شیطانی عمل قرار دیا۔ آیت اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ میں میسر اور ازلام جوئے (قمار) ہی کی صورتیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور یہ دو طرفہ لین دین اور ہار جیت کی شرط جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُبی بن خلف کے ساتھ ٹھہرائی یہ بھی ایک قسم کا جُوا اور قمار ہی تھا، مگر یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے جب قمار حرام نہیں تھا۔ اس لئے اس واقعہ میں جب یہ قمار کا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو کوئی مال حرام نہیں تھا۔

اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے صدقہ کر دینے کا حکم کیوں فرمایا، خصوصاً دوسری روایت میں جو اس کے متعلق لفظ سُحت آیا ہے جس کے مشہور معنی حرام کے ہیں یہ کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب حضرات فقہاء نے یہ دیا ہے کہ یہ مال اگرچہ اس وقت حلال تھا مگر قمار کے ذریعہ اکتسابِ مال اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا، اس لئے صدیق اکبرؓ کی شان کے مناسب نہ سمجھ کر ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے شراب حلال ہونے کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی۔

اور لفظ سُحت جو بعض روایات میں آیا ہے اوّل تو اس روایت کو محدثین نے صحیح تسلیم نہیں کیا، اور اگر صحیح بھی مانا جائے تو یہ لفظ بھی کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بمعنے حرام مشہور ہے، دوسرے معنی اس کے مکروہ و ناپسندیدہ کے بھی آتے ہیں۔ جیسا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کَسْبُ الْحَجَّامِ سُحْتٌ یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی سُحت ہے۔ یہاں جمہور فقہاء نے اس کے معنی ناپسندیدہ اور مکروہ کے لئے ہیں۔ اور امام راغب اصفہانی نے مفرداتُ القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں لفظ سُحت کے یہ مختلف معانی محاوراتِ عرب اور احادیث نبویہ سے ثابت کئے ہیں۔

حضرات فقہاء کا یہ کلام اس لئے بھی واجب القبول ہے کہ اگر واقع میں یہ مال حرام تھا تو شرعی اصول کے مطابق یہ مال اسی شخص کو واپس کرنا لازم تھا جس سے لیا گیا ہے، مالِ حرام کو صدقہ کرنے کا حکم صرف اُن صورتوں میں ہوتا ہے جبکہ اس کا مالک معلوم نہ ہو یا اس کو پہنچانا مشکل ہو، یا اس کو واپس کرنے میں کوئی اور شرعی قباحت ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ، یعنی اس روز (جبکہ روم فارس پر غالب آئیں گے) مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ نظمِ عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہاں نصر اور مدد سے رومیوں کی نصرت و امداد ہے، وہ اگرچہ کافر تھے مگر دوسرے کے مقابل کافروں کے اعتبار سے کفر میں ہلکے تھے، اس لئے ان کی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا کوئی امر مستبعد نہیں، خصوصاً جبکہ ان کی نصرت سے مسلمانوں کو بھی خوشی حاصل ہو اور کفار کے مقابلہ میں ان کی جیت بھی ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ نصرت سے مراد یہاں مسلمانوں کی نصرت ہو جو دو وجہ سے ہو سکتی ہے، اوّل تو یہی کہ مسلمانوں نے رومیوں کے غلبہ کو قرآن کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا تھا، اس لئے رومیوں کا غلبہ درحقیقت مسلمانوں کی نصرت تھی، دوسری وجہ نصرت مسلمین کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں کفار کی بڑی طاقتیں بھی دو فارس اور روم تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو باہم بھڑا کر دونوں کو کمزور کر دیا، جو آئندہ مسلمانوں کی فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ (کذا فی الروح)

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں، کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں، اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامانِ عیش و عشرت کیا کیا مہیا کریں۔ لیکن اسی حیاتِ دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے کہ دنیا کا چند روزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے، انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لئے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لئے یہاں سے سامانِ راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے، اور وہ سامانِ راحت ایمان اور عمل صالح ہے، اس دوسرے رُخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ یَعْلَمُوْنَ کے ساتھ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

فرمایا ہے، جس میں لفظ ظاہر آ کو تنوین کے ساتھ نکرہ لا کر قواعد عربیت کی رُو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیاتِ ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رُخ کو جانتے ہیں دوسرے رُخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔

دنیا کے فنونِ معاش اگر آخرت سے غفلت کے ساتھ حاصل ہوں تو وہ کوئی دانشمندی نہیں

قرآن کریم اقوامِ دنیا کے عبرتناک قصّوں سے بھرا ہوا ہے، جو مکاسبِ دنیا اور عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے میں بڑے نام آور تھے، پھران کا انجام یہ بھی دنیا ہی میں لوگوں کے سامنے آیا، اور آخرت کا دائمی عذاب ان کا حصّہ بنا، اس لئے ان کو کوئی سمجھدار آدمی عقلاء یا حکماء نہیں کہہ سکتا۔ افسوس ہے کہ آجکل عقل و حکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے اور اپنی عیش و عشرت کا سامان سب سے بہتر بنالے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے، اگرچہ اخلاقِ انسانیت سے بھی کورا ہو۔ عقل و شرع کی رُو سے اس کو عقلمند کہنا عقل کی توہین ہے، قرآن کریم کی زبان میں عقل والے صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اور آخرت کو پہچانیں، اس کے لئے عمل کریں۔ دنیا کی ضروریات کو بقدرِ ضرورت رکھیں، اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ آیتِ قرآن اِنَّ فِیْ ...... لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا الآیۃ کا یہی مفہوم ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

کیا دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں کہ اللہ نے جو بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ

اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک سادھ کر اور وعدہ مقرر پر اور

كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا

بہت لوگ اپنے رب کا ملنا نہیں مانتے، کیا انھوں نے سیر نہیں کی

فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ

ملک کی جو دیکھیں انجام کیسا ہوا ان سے پہلوں کا،

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا

ان سے زیادہ تھے زور میں اور جوتا انھوں نے زمین کو اور بسایا اس کو

أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ

ان کے بسانے سے زیادہ اور پہنچے ان کے پاس رسول ان کے کھلے حکم لے کر سو اللہ نہ

اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ ثُمَّ

تھا ان پر ظلم کرنے والا لیکن وہ اپنا آپ برا کرتے تھے۔ پھر

كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ

ہوا انجام برا کرنے والوں کا برا اس واسطے کہ جھٹلاتے تھے اللہ کی

اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾

باتیں اور ان پر ٹھٹھے کرتے تھے۔

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

کیا (دلائل وقوعِ آخرت کے سن کر بھی ان کی نظر دنیا ہی پر مقصور رہی اور) انھوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (جیسا اس نے آیات میں خبر دی ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت جزاء وسزا کی ہے۔ اور میعاد معین قیامت ہے۔ اگر اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان واقعات کا امکان عقل سے اور ان کا وقوع نقل یعنی قرآن سے اور اس نقل کا صدق صفتِ اعجاز سے منکشف ہو جاتا، اور آخرت کے منکر نہ ہوتے، مگر غور نہ کرنے سے منکر ہو رہے ہیں)۔ اور (یہی کیا اور) بہت سے آدمی اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں کیا یہ لوگ (کبھی گھر سے نہیں نکلے اور) زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا (آخری) انجام کیا ہوا (کیفیت ان کی یہ تھی کہ) وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے زمین کو بھی (ان سے زیادہ) بویا تھا اور جتنا انھوں نے (سامان اور مکان سے) اس کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے (جن کو انھوں نے نہیں مانا اور عذاب سے ہلاک ہوئے جن کی ہلاکت کے آثار ان کے ویران مکانات سے جو طریقِ شام میں ملتے ہیں نمودار ہیں) سو (اس ہلاکت میں) خدا تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ ان پر

ظلم کرتا وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (کہ انکار پیغمبروں کا کر کے مستحق ہلاکت ہوئے یہ تو ان کی حالت دنیا میں ہوئی اور) پھر (آخرت میں) ایسے لوگوں کا انجام جنھوں نے (ایسا) برا کام (یعنی رسل کا انکار) کیا تھا بُرا ہی ہوا (محض) اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو (یعنی احکام و اخبار کو) جھٹلایا تھا اور (تکذیب سے بڑھ کر یہ کہ) ان کی ہنسی اڑاتے تھے (وہ انجام سزائے دوزخ ہے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر دونوں آیتیں مضمون سابق کا تکملہ اور اس پر بطور شہادت کے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی چند روزہ چمک دمک اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہو گئے کہ اس کارخانہ کی حقیقت اور انجام سے بالکل غافل ہو گئے، اگر یہ خود بھی ذرا اپنے دل میں سوچتے اور غور کرتے تو ان پر یہ راز کائنات منکشف ہو جاتا کہ خالق کائنات نے یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان کی مخلوقات کو فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا۔ ان کی تخلیق کا کوئی بڑا مقصد اور بڑی حکمت ہے، اور وہ یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کے ذریعہ ان کے پیدا کرنے والے کو بھی پہچانیں، اور اس کی تلاش میں لگ جائیں کہ وہ کن کاموں سے راضی ہوتا ہے کن سے ناراض، تاکہ اس کی رضا جوئی کا سامان کریں، اور ناراضی کے کاموں سے بچیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے کاموں کی کچھ جزاء و سزاء بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ نیک و بد کو ایک ہی پلّے میں رکھنا عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے جس میں انسان کو اس کے اچھے یا بُرے عمل کی پوری جزاء ضرور مل ہی جائے، بلکہ یہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ آدمی خوش خرّم اور بامراد نظر آتا ہے، اور بُرے کاموں سے پرہیز کرنے والا مصائب اور تنگی کا شکار دیکھا جاتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جب یہ سب کارخانہ ختم ہو اور اچھے بُرے اعمال کا حساب ہو، اور ان پر جزاء و سزا مرتب ہو، جس کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اگر غور و فکر کرتے تو یہی آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات اس کی شہادت دے دیتیں کہ یہ چیزیں دائمی نہیں، کچھ مدت کے لئے ہیں، اور ان کے بعد دوسرا عالم آنے والا ہے جو دائمی ہوگا۔ مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا یہی حاصل ہے۔ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ الآیہ، یہ مضمون تو ایک عقلی استدلال کا ہے۔ اگلی آیت

میں دنیا کی محسوسات و مشاہدات اور تجربات کو اس کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے، اور اہل مکہ کو خطاب کرکے فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ اہل مکہ تو ایک ایسی زمین کے باشندے ہیں جہاں نہ زراعت ہے نہ صنعت نہ تجارت کے مواقع اور نہ بلند و بالا حسین تعمیرات، مگر ملک شام اور یمن کے سفر ان لوگوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے پیش آتے ہیں، کیا ان سفروں میں ان لوگوں نے اپنے سے پہلی اقوام دنیا کے انجام کا مشاہدہ نہیں کیا جنکو اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑے بڑے تصرفات کرنے کا سلیقہ دیا تھا کہ زمین کو کھود کر اس سے پانی نکالنا اور اس سے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنا اور چھپے ہوئے معادن سے سونا چاندی اور دوسری قسم کی معدنی دھاتیں نکالنا اور ان سے انسانی فوائد کے لئے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کرنا ان کا وظیفہ زندگی تھا اور یہ اپنے زمانے کی متمدن قومیں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے اسی مادی اور فانی عیش و عشرت میں مست ہو کر اللہ کو اور آخرت کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلانے کے لئے اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجیں، مگر انھوں نے کسی کی طرف التفات نہیں کیا، اور بالآخر دنیا میں بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ جس پر ان کی بستیوں کے ویران کھنڈرات اس وقت تک شہادت دے رہے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ غور کرو کہ کیا اس عذاب میں ان پر اللہ کی طرف سے کوئی ظلم ہوا ہے یا انھوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ اسبابِ عذاب جمع کرلئے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

اللہ بناتا ہے پہلی بار پھر اس کو دہرائے گا پھر اسی کی طرف پھر جاؤ گے،

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ

اور جس دن برپا ہوگی قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے گنہگار، اور نہ ہوں گے

لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

ان کے شریکوں میں کوئی ان کے سفارش کرنے والے اور وہ ہو جائیں گے اپنے شریکوں سے منکر

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن لوگ ہوں گے قسم قسم، سو جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

یقین لائے اور کئے بھلے کام سو باغ میں ہوں گے ان کی آؤ بھگت ہوگی،

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗئِ الْاٰخِرَةِ

اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں اور ملنا پچھلے گھر کا

فَاُولٰۗئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ

سو وہ عذاب میں پکڑے آئیں گے، سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام

تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ

کرو اور جب صبح کرو، اور اسی کی خوبی ہے آسمان میں

وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ

اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب دوپہر ہو، نکالتا ہے زندہ کو

مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ

مُردے سے اور نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس کے مرنے کے پیچھے، اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے

ع ۵ / ۹ / ۵

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ خلق کو اوّل بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا پھر (پیدا ہونے کے بعد) اس کے پاس (حساب کتاب کے لئے) لائے جاؤ گے اور جس روز قیامت قائم ہوگی (جس میں اعادہ مذکور ہونے والا ہے) اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگ (بازپرس کے وقت) حیرت زدہ رہ جائیں گے (یعنی کوئی معقول بات ان سے نہ بن پڑے گی) اور ان کے (تراشے ہوئے) شریکوں میں سے (جن کو شریکِ عبادت بناتے تھے) ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور (اس وقت خود) یہ لوگ (بھی) اپنے شریکوں سے منکر ہوجاوینگے (کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (علاوہ واقعۂ مذکورہ کے ایک واقعہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف طریقوں کے) سب آدمی جدا جدا ہوجائیں گے

یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو (بہشت کے) باغ میں مسرور ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا، اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے (یہ معنی ہیں جدا جدا ہونے کے، جب ایمان و عمل صالح کی فضیلت تم کو معلوم ہوگئی) سو تم اللہ کی تسبیح (اعتقاداً و قلباً بھی جس میں ایمان آگیا اور قولاً و لساناً بھی جس میں اقرار و دیگر اذکار آگئے اور عملاً و ارکاناً بھی جس میں تمام عبادتیں عموماً اور نماز خصوصاً آگئیں، غرض تم اللہ کی تسبیح ہر وقت کیا کرو (اور خصوصاً) شام کے وقت اور صبح کے وقت اور (اللہ کی تسبیح کرنے کا جو حکم ہوا ہے تو وہ واقع میں اس کا مستحق بھی ہے، کیونکہ) تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہو (یعنی آسمان میں فرشتے اور زمین میں بعض اختیاراً اور بعض اضطراراً اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ کقولہ تعالیٰ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، پس جب وہ ایسا محمود الصفات کامل الذات ہے تو تم کو بھی ضرور اس کی تسبیح کرنی چاہئے) اور بعد زوال (بھی تسبیح کیا کرو) اور ظہر کے وقت (بھی تسبیح کیا کرو کہ یہ اوقات تجدد نعمت و زیادت ظہور آثار قدرت کے ہیں ان میں تجدید تسبیح کی مناسب ہی بالخصوص نماز کے لئے یہی اوقات مقرر ہیں، چنانچہ مسا میں مغرب و عشاء آگئی اور عشی میں ظہر اور عصر دونوں داخل تھے، مگر ظہر صراحۃً مذکور ہے، اس لئے صرف عصر مراد رہ گئی، اور صبح بھی تصریحاً مذکور ہے، اور اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، کیونکہ اس کی ایسی قدرت ہو کہ) وہ جاندار کو بے جان سے باہر لاتا ہو اور بے جان کو جاندار سے باہر لاتا ہے (مثلاً نطفہ و بیضہ سے انسان اور بچہ اور انسان اور پرندہ سے نطفہ اور بیضہ) اور زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد زندہ (یعنی تازہ و شاداب) کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ (قیامت کے روز) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔

معارف و مسائل

فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ، يُحْبَرُوْنَ، حبور سے مشتق ہے، جس کے معنی سرور اور خوشی کے ہیں۔ اور اس لفظ کے عموم میں ہر طرح کا سرور داخل ہے جو نعمائے جنت سے اہل جنت کو حاصل ہوگا۔ قرآن کریم میں اس کو یہاں بھی عام رکھا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ یہ ارشاد ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ، یعنی کسی شخص کو دنیا میں معلوم نہیں کہ اس کے لئے جنت میں آنکھوں کی ٹھنڈک (اور راحت و سرور)

کے کیا کیا سامان جمع ہیں۔ بعض مفسرین نے جو خاص خاص سرد کی چیزوں کو اس آیت کے تحت میں ذکر کیا ہے وہ سب اسی اجمال میں داخل ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ مصدر ہے، اس کا فعل محذوف ہے یعنی سَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا، حِيْنَ تُمْسُوْنَ، یعنی جب تم شام کے وقت میں داخل ہو، اور وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ، یعنی جب تم پر صبح کا وقت آئے، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ جملہ درمیان میں بطور دلیل کے لایا گیا ہے کہ صبح شام اللہ کی تسبیح اس لئے ضروری ہے کہ آسمان و زمین میں صرف وہی مستحق حمد ہے اور تمام آسمان و زمین والے اس کی حمد کرنے میں مشغول ہیں۔ اور جس طرح شروع آیت میں صبح شام کی تسبیح کا حکم ہے، آخر آیت میں عَشِيًّا اور حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ سے اور دو وقتوں میں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک وقت عشی جو دن کے آخری حصہ کو کہا جاتا ہے، جو عصر کا وقت ہے۔ دوسرا وقت ظہر یعنی بعد زوالِ آفتاب کے۔

اور ترتیب بیان میں جس طرح شام کو صبح سے مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح دن کے آخری حصہ کو ظہر پر مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، شام یعنی رات کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ میں رات مقدم ہوتی ہے، اور تاریخ غروب آفتاب سے بدلتی ہے۔ اور عشی یعنی وقتِ عصر کو ظہر سے مقدم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عصر کا وقت عموماً کاروبار کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے، اس میں کوئی دعاء، تسبیح یا نماز عادۃً مشکل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں صلوٰۃ وسطیٰ جس کی تفسیر جمہور کے نزدیک نماز عصر ہے، اس کی خصوصی تاکید آئی ہے۔ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔

آیت مذکورہ کے الفاظ میں نماز یا صلوٰۃ کی تصریح نہیں۔ اس لئے ہر قسم کے ذکر اللہ قولی اور عملی کو شامل ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں چونکہ نماز سب سے اعلیٰ اور افضل ہے، اس لئے وہ اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا مع ان کے اوقات کے ذکر آ گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر صریح ہے؟ تو فرمایا ہاں! اور استدلال میں یہی آیت پیش کر کے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب اور حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ میں نماز فجر اور عَشِيًّا میں نماز عصر اور

حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ میں نماز ظہر کا ذکر صریح موجود ہے۔ اب صرف ایک نماز عشاء رہی، اس کے ثبوت میں دوسری آیت کا جملہ ارشاد فرمایا مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب و عشاء دونوں داخل ہیں۔

فائدہ عظیمہ یہ آیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعاء ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم نے ان کو وفاء عہد کا خطاب دیا ہے، ارشاد فرمایا وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کلمات صبح شام پڑھا کرتے تھے۔ جیسا کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف وفاء عہد سے کرنے کا سبب اُن کی یہ دُعا تھی۔

اور ابوداؤد، طبرانی، ابن سنی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ، ان دو آیتوں کے متعلق فرمایا کہ جس شخص نے صبح کو یہ کلمات پڑھ لئے تو دن بھر میں اس کے عمل میں جو کوتاہی ہوگی وہ ان کلمات کی برکت سے پوری کر دی جائے گی، اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو اس کے رات کے اعمال کی کوتاہی اس کے ذریعے پوری کر دی جائے گی۔ (روح)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو

تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

زمین میں پھیلے پڑے، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے

اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ

جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ

اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ
آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ ،

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ
اس میں بہت نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کو ، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
سونا رات اور دن میں اور تلاش کرنا اس کے فضل سے اس میں بہت

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ
پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں ، اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ دکھلاتا ہے تم کو بجلی

خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ
ڈر اور امید کے لئے اور اُتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ
مرگئے پیچھے اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو سوچتے ہیں ، اور اس کی

اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ
نشانیوں سے یہ ہے کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے پھر جب پکارے گا تم کو

دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ
ایک بار زمین میں سے اسی وقت تم نکل پڑو گے ۔ اور اسی کا ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
کوئی ہے آسمان اور زمین میں سب اس کے حکم کے تابع ہیں ، اور وہی ہے جو

يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ
پہلی بار بناتا ہے پھر اس کو دُہرائے گا اور وہ آسان ہے اس پر اور اس کی شان

الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾
سب سے اوپر ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۔

خلاصۂ تفسیر

اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (امر) ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے جو مشتمل تھے تمام ذریت پر اور یا اس طرح کہ نطفہ کی اصل غذا ہے اور اس کی اصل عناصر ہیں جس میں جزو غالب مٹی ہے) پھر تھوڑے ہی روز بعد (کیا ہوا کہ) تم آدمی بن کر (زمین پر) پھیلے ہوئے پھرتے (نظر آتے) ہو اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ اس نے تمہارے (فائدے کے) واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں (اور وہ فائدہ یہ ہے کہ) تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بی بی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (کیونکہ استدلال کے لئے فکر کی ضرورت ہے اور نشانیاں جمع اس لئے فرمایا کہ امر مذکور کئی امر پر مشتمل ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب و لہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے (لب و لہجہ سے مراد یا لغات ہوں یا آواز و طرز گفت گو) اس (امر مذکور) میں (بھی) دانشمندوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں (یہاں بھی صیغۂ جمع لانے کی وہی توجیہہ مذکور ہو سکتی ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں (گو رات کو زیادہ اور دن کو کم ہو) اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے (دن کو زیادہ اور رات کو کم، اسی لئے دوسری آیات میں نیند کو رات کے ساتھ اور تلاشِ معاش کو دن کے ساتھ خاص کر کے بیان کیا گیا ہے) اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو (دلیل کو توجہ سے) سنتے ہیں اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ وہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ (یعنی تر و تازہ) کر دیتا ہے اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو عقل (نافع رکھتے ہیں) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم (یعنی ارادہ) سے قائم ہیں (اس میں بیان ہے ان کے ابقاء کا، اور اوپر خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ذکر تھا ان کی ابتداء آفرینش کا اور یہ تمام نظامِ عالم جو مذکور ہوا، یعنی تمہارا سلسلہ توالد و تناسل کا جاری ہونا اور

باہم ازدواج ہونا اور آسمان و زمین کا ہیئت کذائیہ موجود و قائم ہونا اور زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف اور لیل و نہار کے انقلاب میں خاص مصلحتوں کا ہونا اور بارش کا نزول اور اس کے مبادی و آثار کا ظہور وہ سب اسی وقت تک باقی ہیں جب تک دنیا کو باقی رکھنا مقصود ہے اور ایک روز یہ سب ختم ہوجائے گا) پھر (اس وقت یہ ہوگا کہ) جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلاوے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے (اور دوسرا نظام شروع ہوجائے گا جو مقصود مقام ہے) اور (اوپر دلائل قدرت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ) جتنے (فرشتے اور انسان وغیرہ) آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں (اور) سب اسی کے تابع (یعنی مسخر قدرت) ہیں اور (اس ثبوت واختصاص قدرت کاملہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ) وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے (چنانچہ یہ مخاطبین کے نزدیک بھی مسلم تھا) پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا (جیسا کہ دلائل مذکورہ کے ساتھ خبر صادق کے مل جانے سے معلوم ہوا) اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے نزدیک (باعتبار مخاطبین کے بادی النظر کے بہ نسبت اوّل بار پیدا کرنے کے) زیادہ آسان ہے (جیسا قدرت بشریہ کے اعتبار سے عادت غالبہ یہی ہے کہ کسی چیز کو پہلی بار کے بنانے سے دوسری بار بنانا سہل تر ہوتا ہے) اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے (یعنی نہ آسمانوں میں کوئی ایسا بڑا ہے اور نہ زمین میں کقولہ تعالیٰ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) اور وہ (بڑا) زبردست (یعنی قادر مطلق اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اوپر کے تصرفات سے قدرت اور حکمت دونوں ظاہر ہیں، پس وہ اپنی قدرت سے اعادہ کرے گا، اور اس اعادہ تخلیق میں جتنا توقف ہو رہا ہے اس میں حکمت و مصلحت ہے، پس قدرت و حکمت کے ثبوت کے بعد فی الحال واقع نہ ہونے سے انکار کرنا جہل ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ روم کے شروع میں روم و فارس کی جنگ کا ایک واقعہ سنانے کے بعد منکرین اور کفار کی گمراہی اور حق بات کے سننے سمجھنے سے بے پروائی کا سبب ان کا صرف دنیا کی فانی زندگی کو اپنا مقصد حیات بنالینا اور آخرت کی طرف کوئی توجہ نہ دینا قرار دیا گیا تھا، اس کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب کتاب اور جزاء و سزا کے واقع ہونے پر جو سطحی نظر والوں کو استبعاد ہوسکتا ہے، اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا گیا ہے، پہلے خود اپنے نفس میں غور و فکر کی پھر گردو پیش میں گذرنے والی اقوام

کے حالات اور ان کے انجام میں نظر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پھر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ مطلقہ کا ذکر فرمایا جس میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں، ان سب شواہد و دلائل کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستحقِ عبادت صرف اس کی یکتا ذات کو قرار دیا جائے۔ اور اس نے جو اپنے انبیاء کے ذریعہ قیامت قائم ہونے اور تمام اولین و آخرین کے دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں جانے کی خبر دی ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ مذکور الصدر آیات میں اسی قدرت کاملہ اور اس کے ساتھ حکمت بالغہ کے چھ مظاہر آیاتِ قدرت کے عنوان سے بیان فرمائے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں۔

پہلی آیتِ قدرت: انسان جیسے اشرف المخلوقات اور حاکم کائنات کو مٹی سے پیدا کرنا ہے جو اس دنیا کے عناصر ترکیبیہ میں سب سے زیادہ ادنیٰ درجہ کا عنصر ہے جس میں حس و حرکت اور شعور و ادراک کا کوئی شمہ نظر نہیں آتا، کیونکہ مشہور چار عناصر آگ، پانی، ہوا، اور مٹی، میں سے مٹی کے سوا اور سب عناصر میں کچھ نہ کچھ حرکت تو ہے مٹی اس سے بھی محروم ہے، قدرت نے تخلیقِ انسانی کے لئے اس کو منتخب فرمایا۔ ابلیس کی گمراہی کا سبب یہی بنا کہ اس نے آگ کے عنصر کو مٹی سے اشرف و اعلیٰ سمجھ کر تکبر اختیار کیا، اور یہ نہ سمجھا کہ شرافت اور بزرگی خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے بڑا بنا سکتا ہے۔

اور انسان کی تخلیق کا مادہ مٹی ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے اعتبار سے ظاہر ہی ہے۔ اور وہ چونکہ تمام بنی آدم کے وجود کی اصل بنیاد ہیں اس لئے دوسرے انسانوں کی تخلیق بالواسطہ اُن ہی کی طرف منسوب کرنا کچھ بعید نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام انسان جو توالد و تناسل کے سلسلہ سے نطفہ کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی نطفہ جن اجزاء سے مرکب ہوتا ہے ان میں مٹی کا جزو غالب ہے۔

دوسری آیتِ قدرت: یہ ہے کہ انسان ہی کی جنس میں اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کر دیں جو مردوں کی بیبیاں بنیں، ایک ہی مادہ سے ایک ہی جگہ میں ایک ہی غذا سے پیدا ہونے والے بچوں میں یہ دو مختلف قسمیں پیدا فرما دیں جن کے اعضاء و جوارح، صورت و سیرت، عادات و اخلاق میں نمایاں تفاوت و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت و حکمت کے لئے یہ تخلیق ہی کافی نشانی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کی اس خاص نوع کی تخلیق کی حکمت و مصلحت یہ بیان فرمائی لِّتَسْكُنُوٓا۟ إِلَيْهَا، یعنی ان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ان کے پاس پہونچ کر سکون ملے۔ مرد کی جتنی ضروریات عورت سے متعلق ہیں ان سب میں غور کیجئے تو سب کا حاصل سکونِ قلب اور راحت و

اطمینان نکلے گا، قرآن کریم نے ایک لفظ میں ان سب کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ازدواجی زندگی کے تمام کاروبار کا خلاصہ سکون و راحتِ قلب ہی، جس گھر میں یہ موجود ہے وہ اپنی تخلیق کے مقصد میں کامیاب ہی، جہاں قلبی سکون نہ ہو اور جا ہے سب کچھ ہو وہ ازدواجی زندگی کے لحاظ سے ناکام و نامراد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ باہمی سکونِ قلب صرف اسی صورت سے ممکن ہی کہ مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد شرعی نکاح اور ازدواج پر ہو، جن ممالک اور جن لوگوں نے اس کے خلاف کی حرام صورتوں کو رواج دیا اگر تفتیش کی جائے تو ان کی زندگی کو کہیں پر سکون نہ پائیں گے، جانوروں کی طرح وقتی خواہش پوری کر لینے کا نام سکون نہیں ہو سکتا۔

ازدواجی زندگی کا مقصد سکون ہی جس کے لئے باہمی الفت و محبت اور رحمت ضروری ہے

اس آیت نے مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کا مقصد سکونِ قلب قرار دیا ہے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ طرفین ایک دوسرے کا حق پہچانیں اور ادا کریں، ورنہ حق طلبی کے جھگڑے خانگی سکون کو برباد کر دیں گے۔ اس ادائے حقوق کے لئے ایک صورت تو یہ بھی کہ اس کے قوانین بنا دینے اور احکام نافذ کر دینے پر اکتفا کیا جاتا، جیسے دوسرے لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں ایسا ہی کیا گیا ہے، کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کو حرام کر کے اس پر سخت وعیدیں سنائی گئیں سزائیں مقرر کی گئیں، ایثار و ہمدردی کی نصیحت کی گئی۔ لیکن تجربہ شاہد ہی کہ صرف قانون کے ذریعہ کوئی قوم اعتدال پر نہیں لائی جا سکتی جب تک اس کے ساتھ خدا کا خوف نہ ہو، اسی لئے معاشرتی معاملات میں احکامِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ پورے قرآن میں ہر جگہ اِتَّقُوا اللّٰہَ، وَاخْشَوْا وغیرہ کے کلمات بطور تکملہ کے لائے گئے ہیں۔

مرد و عورت کے باہمی معاملات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے حقوق باہمی پورے ادا کرانے پر نہ کوئی قانون حاوی ہو سکتا ہے نہ کوئی عدالت ان کا پورا انصاف کر سکتی ہی۔ اسی لئے خطبۂ نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی وہ آیات انتخاب فرمائی ہیں جن میں تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت کی تلقین ہے کہ وہی درحقیقت زوجین کے باہمی حقوق کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اس پر ایک مزید انعام حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ازدواجی حقوق کو صرف شرعی اور قانونی نہیں رکھا بلکہ طبعی اور نفسانی بنا دیا۔ جس طرح ماں باپ اور اولاد کے باہمی حقوق کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، کہ ان کے قلوب میں فطرۃً ایک ایسی محبت پیدا فرما دی کہ ماں باپ اپنی جان سے زیادہ اولاد کی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی

طرح اولاد کے قلوب میں بھی ایک فطری محبت ماں باپ کی رکھ دی گئی ہے۔ یہی معاملہ زوجین کے متعلق بھی فرمایا گیا۔ اس کے لئے ارشاد فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، یعنی اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان صرف شرعی اور قانونی تعلق نہیں رکھا بلکہ ان کے دلوں میں مودت اور رحمت پیوست کر دی۔ وُدّ اور مَوَدَّت کے لفظی معنی چاہنے کے ہیں، جس کا ثمرہ محبت و الفت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو لفظ اختیار فرمائے، ایک مودت دوسرے رحمت۔ ممکن ہے اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ مودت کا تعلق جوانی کے اس زمانے سے ہو جس میں طرفین کی خواہشات ایک دوسرے سے محبت و الفت پر مجبور کرتی ہیں، اور بڑھاپے میں جب یہ جذبات ختم ہو جاتے ہیں تو باہمی رحمت و ترحم طبعی ہو جاتا ہے (کما ذکرہ القرطبی عن البعض)

اس کے بعد فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں، یہاں ذکر تو ایک نشانی کا کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں اس کو آیات اور نشانیاں فرمایا، وجہ یہ ہے کہ ازدواجی تعلق جس کا ذکر اس میں کیا گیا اس کے مختلف پہلوؤں پر اور ان سے حاصل ہونے والے دینی اور دنیوی فوائد پر نظر کی جائے تو یہ ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تیسری آیت قدرت: آسمان و زمین کی تخلیق اور انسانوں کے مختلف طبقات کی زبانیں اور لب و لہجہ کا مختلف ہونا اور مختلف طبقات کے رنگوں میں امتیاز ہونا ہے، کہ بعض سفید ہیں بعض سیاہ بعض سرخ بعض زرد۔ اس میں آسمان و زمین کی تخلیق تو قدرت کا عظیم شاہکار ہے ہی، انسانوں کی زبانیں مختلف ہونا بھی ایک عجیب کرشمۂ قدرت ہے۔ زبانوں کے اختلاف میں لغات کا اختلاف بھی داخل ہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ کتنی مختلف زبانیں ہیں، جو مختلف خطوں میں رائج ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بعض تو ایسی مختلف ہیں کہ کوئی باہمی ربط و مناسبت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس اختلافِ السنہ میں لب و لہجہ کا اختلاف بھی شامل ہے کہ قدرتِ حق نے ہر فرد انسان مرد، عورت، بچے، بوڑھے کی آواز میں ایسا امتیاز پیدا فرمایا ہے کہ ایک فرد کی آواز کسی دوسرے فرد سے ایک صنف کی آواز دوسری صنف سے پوری طرح نہیں ملتی، کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رہتا ہے۔ حالانکہ اس آواز کے آلات زبان، ہونٹ، تالو، حلق، سب میں مشترک اور یکساں ہیں۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی طرح الوان کا اختلاف ہے۔ کہ ایک ہی ماں باپ سے ایک ہی قسم کے

حالات میں دو بچے مختلف رنگ کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو تخلیق و صنعت گری کا کمال تھا، آگے زبانیں اور لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے رنگ مختلف ہونے میں کیا کیا حکمتیں مستور ہیں، ان کا بیان طویل ہے۔ اور بہت سی حکمتوں کا معمولی غور و فکر سے سمجھ لینا مشکل بھی نہیں۔

اس آیتِ قدرت میں متعدد چیزیں آسمان، زمین، اختلافِ السنہ، اختلافِ الوان، اور ان کے ضمن میں اور بہت سی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں، اور وہ ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ کسی مزید غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں، ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے، اس لئے اس کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

چوتھی آیت قدرت: انسانوں کا سونا رات میں اور دن میں، اسی طرح ان کی تلاش معاش ہے رات میں اور دن میں۔ اس آیت میں تو نیند کو بھی رات دونوں میں بیان فرمایا کر اور تلاشِ معاش کو بھی، اور بعض دوسری آیات میں نیند کو صرف رات میں اور تلاش معاش کو دن میں بتلایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رات میں اصل کام نیند کا ہے، اور کچھ تلاش معاش کا بھی چلتا ہے، اور دن میں اس کے برعکس اصل کام تلاش معاش کا ہے، اور کچھ سونے آرام کرنے کا بھی وقت ملتا ہے۔ اس لئے دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں بعض مفسرین نے تاویل کرکے اس آیت میں بھی نیند کو رات کے ساتھ اور تلاش معاش کو دن کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

سونا اور تلاش معاش زہد و توکل کے منافی نہیں

اس آیت سے ثابت ہو کہ سونے کے وقت سونا اور جاگنے کے وقت تلاش معاش انسان کی فطرت بنائی گئی ہے، اور ان دونوں چیزوں کا حاصل کرنا انسانی اسباب و کمالات کے تابع نہیں بلکہ درحقیقت یہ دونوں چیزیں خاص عطاءِ حق ہیں۔ جیسا کہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات نیند اور آرام کے سارے بہتر سے بہتر سامان جمع ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی، بعض اوقات ڈاکٹری گولیاں بھی نیند لانے میں فیل ہو جاتی ہیں، اور جس کو مالک چاہتا ہے کھلی زمین پر دھوپ اور گرمی میں نیند عطا فرما دیتا ہے۔

یہی حال تحصیل معاش کا رات دن مشاہدہ میں آتا ہے کہ دو شخص یکساں علم و عقل والے برابر کے مال والے، برابر کی محنت والے تحصیلِ معاش کا یکساں ہی کام لے کر بیٹھتے ہیں ایک ترقی کر جاتا ہے دوسرا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عالمِ اسباب بڑی حکمت و مصلحت سے بنایا ہے۔ اس لئے تلاشِ معاش اسباب ہی کے ذریعہ کرنا

لازم ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ حقیقت شناسی سے دور نہ ہو ان اسباب کو اسباب ہی سمجھے اور اصل رازق اسباب کے بنانے والے کو سمجھے۔

اس آیت قدرت کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو بات کو دھیان دے کر سنتے ہیں، اس میں سننے پر مدار رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ دیکھنے میں تو نیند خود بخود آجاتی ہے جب آدمی ذرا آرام کی جگہ کر کے لیٹ جائے۔ اسی طرح معاش کا حصول محنت مزدوری تجارت وغیرہ سے ہوجاتا ہے۔ اس لئے دستِ قدرت کی کارسازی ظاہری نظروں سے مخفی رہتی ہے، وہ اللہ کا پیام لانے والے انبیاء بتلاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ نشانیاں انہی کو کارآمد ہوتی ہیں جو بات کو دھیان دے کر سنیں، اور جب سمجھ میں آجائے تو تسلیم کر لیں، ہٹ دھرمی اور ضد نہ کریں۔

پانچویں آیت قدرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بجلی کا کوندنا دکھاتے ہیں جس میں اس کے گرنے اور نقصان پہونچانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے پیچھے بارش کی امید بھی اور پھر بارش نازل فرماتے ہیں۔ اور اس خشک بے جان زمین کو زندہ تر و تازہ کر کے اس میں طرح طرح کے درخت اور پھل پھول اگاتے ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، کیونکہ برق و باراں اور ان کے ذریعہ حاصل ہونے والی نباتات اور ان کے پھل پھول کی تخلیق منجانب اللہ ہونا یہ عقل و حکمت ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

چھٹی آیت قدرت یہ ہے کہ آسمان و زمین کا قیام اللہ ہی کے امر سے ہے، اور جب اس کا امر یہ ہوگا کہ یہ نظام توڑ پھوڑ دیا جائے تو یہ سب مضبوط مستحکم چیزیں جن میں ہزاروں سال چل کر بھی کہیں کوئی نقصان یا خلل نہیں آتا، دم کے دم میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہوجائیں گی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے دوبارہ سب مُردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہوجائیں گے۔

یہ چھٹی آیت قدرت درحقیقت پہلی سب آیات کا ماحصل اور مقصد ہے، اسی کے سمجھانے کے لئے اس سے پہلی پانچ آیتیں بیان فرمائی ہیں، اور اس کے بعد کئی آیات تک اسی مضمون کا ذکر فرمایا ہے۔

لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى، لفظ مَثَل بفتح میم و ثاء، ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دوسرے سے کچھ مماثلت اور مناسبت رکھتی ہو بالکل اس جیسی ہونا اس کے مفہوم میں

داخل نہیں، اسی لئے حق تعالیٰ کے لئے مثل جو قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، ایک نہیں، دوسرے فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ، لیکن مثل اور مثال سے حق تعالیٰ کی ذات پاک اور وراء الوراء ہے۔ واللہ اعلم

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ

بتلائی تم کو ایک مثل تمہارے اندر سے دیکھو جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں

اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ

ان میں ہیں کوئی ساجھی تمہارے ہماری دی ہوئی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر ہو

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

خطرہ رکھو ان کا جیسے خطرہ رکھو اپنوں کا، یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں

لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ

ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں، بلکہ چلتے ہیں یہ بے انصاف اپنی خواہشوں پر

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ

بن سمجھے، سو کون سمجھائے جن کو اللہ نے بھٹکایا اور کوئی نہیں ان کا

نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ

مددگار، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہو کر، وہی تراش اللہ کی

الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ

جس پر تراشا لوگوں کو، بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو، یہی ہے

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

دین سیدھا، و لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے،

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا

سب رجوع ہو کر اس کی طرف اور اس سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو نماز اور مت ہو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ

شرک کرنے والوں میں، جنہوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہوگئے ان میں بہت فرقے

كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ

ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر فریفتہ ہے۔ اور جب پہنچے لوگوں کو کچھ سختی

دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً

تو پکاریں اپنے رب کو اس کی طرف رجوع ہو کر پھر جب چکھا دے ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ

اسی وقت ایک جماعت ان میں اپنے رب کا شریک لگی بتانے، کہ منکر ہو جائیں ہمارے دیے ہوئے کے

فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا

سو مزے اڑا لو اب آگے جان لوگے۔ کیا ہم نے ان پر اتاری ہے کوئی سند

فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ

سو وہ بول رہی ہے جو یہ شریک بتاتے ہیں۔ اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو

رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ

کچھ مہربانی اس پر پھولے نہیں سماتے، اور اگر آپڑے ان پر کچھ برائی اپنے ہاتھوں کے

اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ

بھیجے ہوئے پر تو آس توڑ بیٹھیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ پھیلا دیتا ہے

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

روزی جس پر چاہے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو

يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ

جو یقین رکھتے ہیں، سو تو دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور

السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَ

مسافر کو، یہ بہتر ہے ان کے لئے جو چاہتے ہیں اللہ کا منہ اور

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٨﴾ وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي

وہی ہیں جن کا بھلا ہے۔ اور جو دیتے ہو بیاج پر کہ بڑھتا رہے لوگوں

أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ

کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں، اور جو دیتے ہو پاک دل سے

تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾ اللَّهُ

چاہ کر رضامندی اللہ کی سو یہ وہی ہیں جن کے دونے ہوئے۔ اللہ

الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۖ

وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی پھر تم کو مارتا ہے پھر تم کو جلائے گا،

هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَفْعَلُ مِن ذَٰلِكُم مِّن شَيْءٍ ۚ سُبْحَانَهُ

کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو کر سکے ان کاموں میں سے ایک کام، وہ نرالا ہے

وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٠﴾

اور بہت اوپر ہے اس سے کہ شریک بناتے ہیں۔

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ شرک کو مذموم و باطل ثابت کرنے کے لئے تم سے ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان فرماتے ہیں وہ یہ کہ غور کرو، کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ (باعتبار اختیارات کے) اس میں برابر ہوں جن کا تم (تصرفات کے وقت) ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے ہمسر (کے شریک و سہیم آزاد خود مختار) کا خیال کیا کرتے ہو (اور ان سے اجازت لے کر تصرف کیا کرتے ہو یا کم از کم اندیشہ مخالفت ہی ان سے رہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ غلام اس طرح شریک نہیں ہوتا۔ پس جب تمہارا غلام جو نوع بشر اور بہت سی چیزوں میں تمہارا شریک ہے اور تمہیں جیسا ہے، فرق صرف ایک چیز میں ہے کہ تم مال و دولت کے مالک ہو وہ نہیں اس کے باوجود جب وہ تمہارے خاص حق تصرف میں تمہارا شریک نہیں ہو سکتا تو تمہارے قرار دیئے ہوئے معبودات باطلہ جو کہ حق تعالیٰ کے مملوک ہیں اور کسی کمال ذاتی یا وصفی میں

خدا تعالیٰ کے مماثل نہیں، بلکہ جنس تو ان میں سے مخلوقاتِ الٰہیہ کے مصنوع ہیں، یہ معبودین حق تعالیٰ
کے خاص حق معبودیت میں کس طرح اس کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں) اور ہم نے جس طرح یہ
دلیل شافی کافی لبطلان شرک کی بیان فرمائی، ہم اسی طرح سمجھداروں کے لئے دلائل صاف
صاف بیان کرتے رہتے ہیں (اور مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ لوگ حق کا اتباع اختیار کر لیتے اور شرک
چھوڑ دیتے مگر وہ حق کا اتباع نہیں کرتے) بلکہ ان ظالموں نے بلا کسی صحیح دلیل (کے محض)
اپنے خیالات (فاسدہ) کا اتباع کر رکھا ہے سو جس کو (اس کی ہٹ دھرمی اور عناد و
اصرار علی الباطل کی وجہ سے، خدا ہی گمراہ کرے اس کو کون راہ پر لا دے (اس کا مقصد یہ نہیں
کہ وہ معذور ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ غم نہ کریں آپ کا جو کام
تھا وہ آپ کر چکے، اور جب ان گمراہوں کو عذاب ہونے لگے گا تو) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (اور
جب اوپر کے مضمون سے توحید کی حقیقت واضح ہو گئی) تو (مخاطبین میں سے ہر ہر شخص سے
کہا جاتا ہے کہ) تم (ادیانِ باطلہ سے) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین (حق) کی طرف رکھو (اور
سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا
کیا ہے (مطلب فطرۃ اللہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں فطرۃً یہ استعداد رکھی ہے
کہ اگر حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو وہ سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے
کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے، اور اس کے مقتضا پر عمل کرے غرض اس فطرت
کا اتباع چاہئے اور) اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو
پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے بس سیدھا راستہ (دین) یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس کو
بوجہ عدمِ تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے اس کا اتباع نہیں کرتے غرض تم خدا کی طرف
رجوع ہو کر فطرتِ الٰہیہ کا اتباع کرو) اور اس (کی مخالفت اور مخالفت کے عذاب) سے
ڈرو اور (اسلام قبول کر کے) نماز کی پابندی کرو (جو توحید کا عملی اظہار ہے) اور شرک
کرنے والوں میں سے مت رہو جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا (یعنی
حق تو یہ ایک تھا اور باطل بہت ہیں انھوں نے حق کو چھوڑ دیا اور باطل کی مختلف راہیں
اختیار کر لیں، یہ ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے کہ ایک نے ایک راہ لے لی دوسرے نے دوسری)
اور بہت سے (مختلف) گروہ ہو گئے (اور اگر حق پر رہتے تو ایک گروہ ہوتے اور باوجود
اس کے کہ ان حق کے چھوڑنے والوں میں سب کے طریقے باطل ہیں، مگر پھر بھی غایت جہل سے
ان میں) ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہیں جو ان کے پاس ہے اور (جس توحید کی طرف
ہم بلاتے ہیں باوجود اس کے انکار اور خلاف کرنے کے اضطرار کے وقت عام طور پر

لوگوں کے حال و قال سے اس کا اظہار و اقرار بھی ہونے لگتا ہے جس سے مضمون توحید کے فطری ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے (اس وقت بے قرار ہو کر) اپنے رب (حقیقی) کی اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتے ہیں (اور سب معبودین کو چھوڑ دیتے ہیں مگر) پھر (قریب ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) جب اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو بس ان میں سے بعض لوگ (پھر) اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو (آرام و عیش) ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہیں (جو عقلاً بھی قبیح ہے) سو (خیر) چند روز اور حظ حاصل کر لو پھر جلدی تم (حقیقت) معلوم کر لو گے (اور یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خصوصاً اقرار توحید کے بعد تو ان سے کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے) کیا ہم نے ان پر کوئی سند (یعنی کوئی کتاب) نازل کی ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہو (یعنی ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نقلی بھی نہیں اور عقلاً بداہتِ عقل کے خلاف ہونا خود ان کی تسلیم سے حالتِ اضطرار میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس سرتاسر باطل ٹھہرا) اور (آگے مضمون بالا کا تتمہ ہے اور وہ یہ کہ) ہم جب (ان) لوگوں کو کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس سے (اس طرح) خوش ہوتے ہیں (کہ خوشی میں مست ہو کر شرک کرنے لگتے ہیں جیسا اوپر ذکر آیا) اور اگر ان کے، عمل (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں (اس مقام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تتمہ میں اصل مقصود پہلا جملہ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ ہے کہ اس میں ان کے مبتلائے شرک ہونے کا سبب بدمست اور غافل ہونا مذکور ہے، دوسرا جملہ محض تقابل کی مناسبت سے ذکر کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں حالتوں میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم اور ضعیف ہے، ذرا ذرا سی چیز اس تعلق کو فراموش کر دیتی ہے۔ آگے اسی کی دوسری دلیل ہے کہ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں تو) کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے، اور جس کو چاہے کم دیتا ہے (اور مشرکین کے نزدیک یہ مسلم بھی تھا کہ روزی کا گھٹانا بڑھانا اصل میں خدا ہی کا کام ہے، لقولہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) اس (امر) میں (بھی توحید کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (یعنی وہ سمجھتے ہیں اور دوسرے بھی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ جو شخص ایسا قادر ہو گا مستحق عبادت کا وہی ہو گا) پھر (جب دلائل توحید میں معلوم ہوا کہ رزق میں

بسط و قبض اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ بخل کرنا مذموم ہے، کیونکہ بخل کرنے سے جتنا رزق مقدر ہے اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، اس لئے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے بخل نہ کیا کرو بلکہ قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور اسی طرح مسکین اور مسافر کو بھی (ان کے حقوق دیا کرو جن کی تفصیل دلائل شرعیہ سے معلوم ہے) یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (ہم نے جو یہ قید لگائی کہ یہ مضمون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہوں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مطلق مال خرچ کر دینا موجب فلاح نہیں ہے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو چیز تم (دنیا کی) غرض سے خرچ کرو گے مثلاً کوئی چیز اس غرض سے کسی کو) دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں (شامل ہو کر یعنی ان کے ملک و قبضہ میں) پہنچ کر (تمہارے لئے) زیادہ ہو (کر آ) جاوے (جیسا نوتہ وغیرہ رسوم دنیویہ میں اکثر اسی غرض سے دیا جاتا ہے کہ یہ شخص ہمارے موقع پر کچھ اور زائد شامل کر کے دے گا) تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (کیونکہ خدا کے نزدیک پہونچنے اور بڑھنا اس مال کے ساتھ خاص ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جاوے جیسا آگے آتا ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ ایک تمرہ مقبولہ اُحُد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اس میں نیت تھی نہیں، لہٰذا نہ مقبول ہو نہ زائد ہوا) اور جو زکوٰۃ (وغیرہ) دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ (اپنے دیئے ہوئے کو خدا تعالیٰ کے پاس) بڑھاتے رہیں گے (جیسا ابھی حدیث کا مضمون گذرا اور یہ مضمون اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاق پر دلالت کرنے کی وجہ سے توحید کی تائید کا ذریعہ ہے اس لئے یہ تبعاً آ گیا، اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اسی لئے آگے پھر اسی توحید کا ذکر ہے)۔

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دیتا ہے پھر (قیامت میں) تم کو جِلاوے گا (ان میں بعض امور تو مخاطبین کے اقرار سے ثابت ہیں اور بعض دلائل سے، غرض کہ وہ ایسا قادر ہے، اب یہ بتلاؤ کہ) تمہارے شرکاء میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے (اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ) وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی اس کا کوئی شریک نہیں)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں مضمون توحید کو مختلف شواہد و دلائل اور مختلف عنوانات میں بتلایا گیا ہے جو ہر انسان کے دل میں اتر جانے والے ہیں۔ پہلے ایک مثال سے سمجھایا کہ تمہارے غلام و نوکر جو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں شکل و صورت، ہاتھ پاؤں، تمام صفات بشریہ سب چیزوں میں تمہارے شریک ہیں، مگر تم ان کو اپنے اقتدار و اختیار میں اپنی برابر نہیں بناتے کہ وہ بھی تمہاری طرح جو چاہیں کیا کریں جو چاہیں خرچ کریں، بالکل اپنی برابر تو کیا بناتے ان کو اپنے مال و اختیار میں ادنیٰ سی شرکت کا بھی حق نہیں دیتے، جیسے کسی حصہ داری اور معمولی شرکت سے آپ ڈرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف کریا تو وہ اعتراض کرے گا، غلام و نوکروں کو یہ درجہ بھی نہیں دیتے، تو غور کرو کہ تمام مخلوقات جن میں فرشتے، انسان اور دوسری کائنات سبھی داخل ہیں، یہ سب کے سب اللہ کی مخلوق اور اسی کے بندے اور غلام ہیں ان کو تم اللہ کے برابر یا اس کا شریک کیسے یقین کرتے ہو۔

دوسری آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ بات توحید کی اور صاف ہے مگر ظالم لوگ اپنی اہواء نفسانی کے تابع ہو کر کوئی علم و حکمت کی بات نہیں مانتے۔

تیسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر مخاطب کو حکم دیا ہے کہ جب شرک کا نامعقول اور ظلم عظیم ہونا ثابت ہو گیا تو آپ سب خیالات مشرکانہ کو چھوڑ کر اپنا رخ صرف دین اسلام کی طرف پھیر لیجئے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔

اس کے بعد اس دین اسلام کا مطابق و مقتضائے فطرت ہونا اس طرح بیان فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یہ جملہ پہلے جملے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا کی توضیح اور دین حنیف جس کے اتباع کا حکم پہلے جملے میں دیا گیا ہے اس کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے کہ وہ دین فطرت ہے۔ اور فطرۃ اللہ کی ترکیب نحوی میں منصوب ہونے کی وجہ مفسرین نے مختلف لکھی ہیں کہ لفظ اِتَّبِعْ یہاں محذوف ہے، یا لفظ اَعْنِیْ، بہرحال یہ متعین ہے کہ دین حنیف جس کا اتباع کا پہلے جملے میں حکم دیا گیا ہے اس کو اس جملے میں فطرۃ اللہ قرار دیا ہے اور معنی اس کے خود اگلے جملے میں یہ بتلائے کہ اللہ کی فطرت سے مراد یہ ہے کہ جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

فطرت سے کیا مراد ہے؟ اس معاملے میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں دو زیادہ مشہور ہیں

اول یہ کہ فطرت سے مراد اسلام ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اپنی فطرت و جبلت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے۔ اگر اس کو گرد و پیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا خراب نہ کردے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا۔ مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں، جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے۔ قرطبی نے اسی قول کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فطرت سے مراد استعداد ہے۔ یعنی تخلیق انسانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔

مگر پہلے قول پر متعدد اشکالات ہیں، اول یہ کہ خود اسی آیت میں یہ بھی آگے مذکور ہے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اور یہاں خلق اللہ سے مراد وہی فطرۃ اللہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ اللہ کی اس فطرت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، حالانکہ حدیث صحیحین میں خود یہ آیا ہے کہ پھر ماں باپ بعض اوقات بچے کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اگر فطرت کے معنی خود اسلام کے لئے جائیں جس میں تبدیلی نہ ہونا خود اسی آیت میں مذکور ہے تو حدیث مذکور میں یہودی، نصرانی بنانے کی تبدیلی کیسے صحیح ہوگی، اور یہ تبدیلی تو عام مشاہدہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں سے زیادہ کافر ملتے ہیں، اگر اسلام ایسی فطرت ہے جس میں تبدیلی نہ ہو سکے تو پھر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں؟

دوسرے حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا، اس لئے خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہو۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھ دیا گیا ہے جس کی تبدیلی پر بھی اس کو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا پھر اس پر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری عمل پر ملتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کے مطابق فقہاء امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائے گا۔ اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائے گی۔

یہ سب شبہات امام تورپشتی نے شرح مصابیح میں بیان کئے ہیں۔ اور اسی بنا پر

انھوں نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس خلقی استعداد کے متعلق یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، جو شخص ماں باپ یا کسی دوسرے کے گمراہ کرنے سے کافر ہو گیا اس میں استعداد اور قابلیتِ حق یعنی اسلام کی حقانیت کے پہچاننے کی ختم نہیں ہوتی۔ غلام خضر کے واقعہ میں اس کے کفر پر پیدا ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں حق کو سمجھنے کی استعداد ہی نہ رہی تھی، اور چونکہ اس خداداد استعداد و قابلیت کا صحیح استعمال انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے، اس لئے اس پر ثواب عظیم کا مرتب ہونا بھی واضح ہو گیا، اور حدیث صحیحین میں جو یہ مذکور ہے کہ بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں اس کا مفہوم بھی اس دوسرے معنی کے اعتبار سے واضح اور صاف ہو گیا، کہ اگرچہ اس میں استعداد اور قابلیت فطری ہے جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی تھی وہ اسلام ہی کی طرف لے جانے والی تھی، مگر عوارض اور موانع حائل ہو گئے اور اس طرف نہ جانے دیا۔ اور حضرات سلف سے جو پہلا قول منقول ہے بظاہر اس کی مراد بھی اصل اسلام نہیں، بلکہ یہی استعدادِ اسلام اور اس کی قابلیت و صلاحیت ہے۔ محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں جمہور کے قول کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

اور اسی کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بے شمار قسم کی مخلوقات مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہیں، ہر مخلوق کی فطرت اور جبلت میں ایک خاص مادہ رکھ دیا ہے، جس سے وہ مخلوق اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کرے، قرآن کریم میں أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو خالق کائنات نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اس مقصد کے لئے ہدایت بھی دے دی ہے، وہ ہدایت یہی مادہ اور استعداد ہے۔ شہد کی مکھی میں یہ مادہ رکھ دیا کہ وہ درختوں اور پھولوں کو پہچانے اور انتخاب کرے پھر اس کے رس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کر کے اپنے چھتے میں لا کر جمع کرے، اسی طرح انسان کی فطرت و جبلت میں ایسا مادہ اور استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کی شکر گذاری اور اطاعت شعاری کرے، اسی کا نام اسلام ہے۔

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ، مذکورہ صدر تقریر سے اس جملے کا مطلب بھی واضح ہو گیا کہ اللہ کی دی ہوئی فطرت یعنی حق کو پہچاننے کی صلاحیت و استعداد میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کو غلط ماحول کافر تو بنا سکتا ہے مگر اس کی استعدادِ قبولِ حق کو بالکل فنا

نہیں کرسکتا۔

اور اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، یعنی ہم نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا بجز اس کے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں ہم نے عبادت کی رغبت اور استعداد رکھ دی ہے، اگر وہ اس استعداد سے کام لیں تو بجز عبادت کے کوئی دوسرا کام اس کے خلاف ہرگز سرزد نہ ہو۔

اہل باطل کی صحبت اور غلط ماحول سے الگ رہنا فرض ہے

آیت مذکورہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا جملہ اگرچہ بصورت خبر ہے یعنی اللہ کی اس فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اس میں ایک معنی امر کے بھی ہیں، کہ بدلنا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس جملے سے یہ حکم بھی مستفاد ہوا کہ انسان کو ایسے اسباب سے بہت پرہیز کرنا چاہئے جو اس قبولِ حق کی استعداد کو معطل یا کمزور کردیں۔ اور وہ اسباب بیشتر غلط ماحول اور بری صحبت ہے، یا اہل باطل کی کتابیں دیکھنا جب کہ خود اپنے مذہب اسلام کا پورا علم اور بصیرت نہ ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، پچھلی آیت میں انسان کی فطرت کو قبولِ حق کے قابل و مستعد بنانے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اول قبولِ حق کی صورت یہ بتلائی گئی کہ نماز قائم کریں کہ وہ عملی طور پر ایمان و اسلام اور اطاعتِ حق کا اظہار ہے، اس کے بعد فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنی فطرت و قبولِ حق کی استعداد سے کام نہ لیا۔ آگے ان کی گمراہی کا ذکر ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا، یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دینِ فطرت اور دینِ حق میں تفریق پیدا کردی، یا یہ کہ دینِ فطرت سے مفارق اور الگ ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے۔ شِيَعًا، شیعہ کی جمع ہے۔ ایسی جماعت جو کسی مقتدا کی پیرو ہو، اس کو شیعہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ فطرت تو توحید تھا جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب انسان اس کو اختیار کرکے ایک ہی قوم ایک ہی جماعت بنتے مگر انھوں نے اس توحید کو چھوڑا، اور مختلف لوگوں کے خیالات کے تابع ہوگئے اور انسانی خیالات اور رایوں میں اختلاف ایک طبعی امر ہے، اس لئے ہر ایک نے اپنا اپنا ایک مذہب بنالیا، عوام ان کے سبب مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے، اور شیطان نے ان کو اپنے اپنے خیالات و معتقدات کو حق قرار دینے میں ایسا لگا دیا کہ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ، یعنی ان کی ہر پارٹی اپنے اپنے اعتقادات و خیالات پر مگن اور خوش ہے اور

دوسروں کو غلطی پر بتاتی ہے، حالانکہ یہ سب کے سب گمراہی کے غلط راستوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۔ اس سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ رزق کا معاملہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو پھیلا دیتا ہے اور زیادہ کر دیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے رزق سمیٹ کر تنگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اس کے مصارف میں خرچ کرتا ہے تو اس سے اس میں کمی نہیں آتی، اور اگر کوئی خرچ کرنے میں بخل کرے اور جو کچھ اپنے پاس ہے اس کو جمع کر کے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اس سے مال میں وسعت نہیں ہوتی۔

اس مضمون کی مناسبت سے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بقول حسن بصری ہر مخاطب انسان کو جس کو اللہ نے مال میں وسعت دی ہو یہ ہدایت دیگئی ہے کہ جو مال اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں بخل نہ کرو بلکہ اس کو ان کے مصارف میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اس سے تمہارے مال اور رزق میں کمی نہیں آئے گی۔ اور اس حکم کے ساتھ اس آیت میں مال کے چند مصارف بھی بیان کر دیئے۔ اول ذوی القربیٰ دوسرے مساکین تیسرے مسافر، کہ خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے مال میں سے ان لوگوں کو دو اور ان پر خرچ کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ نے تمہارے مال میں شامل کر دیا ہے اس لئے ان کو دینے کے وقت ان پر کوئی احسان نہ جتلاؤ، کیونکہ حق والے کا حق ادا کرنا مقتضائے عدل و انصاف ہے کوئی احسان و انعام نہیں ہے۔

اور ذوی القربیٰ سے مراد ظاہر یہ ہے کہ عام رشتہ دار ہیں، خواہ ذو رحم محرم ہوں یا دوسرے رکما ہو قول الجمہور من المفسرین، اور حق سے مراد بھی عام ہے خواہ حقوق واجبہ ہوں جیسے ماں باپ، اولاد اور دوسرے ذوی الارحام کے حقوق یا محض تبرع و احسان ہو جو رشتہ داروں کے ساتھ بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے ذوی الارحام رشتہ دار محتاج ہوں وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں پر صدقہ کرے تو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اور ذوی القربیٰ کا حق صرف مالی امداد ہی نہیں ان کی خبر گیری، جسمانی خدمت اور کچھ نہ کر سکے تو کم از کم زبانی ہمدردی اور تسلی وغیرہ جیسا کہ حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ذوی القربیٰ کا حق اس شخص کے لئے جس کو مالی وسعت حاصل ہو یہ ہے کہ مال سے ان کی امداد کرے اور جس کو یہ وسعت حاصل

نہ ہو اس کے لئے جسمانی خدمت اور زبانی ہمدردی ہے (قرطبی)۔

ذوی القربیٰ کے بعد مسکین اور مسافر کا حق بتلایا گیا ہے یہ بھی اسی طرح عام ہے، وسعت ہو تو مالی امداد، نہ ہو تو اچھا سلوک۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ اس آیت میں ایک بُری رسم کی اصلاح کی گئی ہے، جو عام خاندانوں اور اہل قرابت میں چلتی ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے جس کو عرف میں نوتہ کہتے ہیں۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہل قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ اُن پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے۔ اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادتی لے کر واپس آئے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآن کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربوٰ سے تعبیر کر کے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی

مسئلہ: ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے، اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے۔ (کذا روی عن عائشہ رضؓ، قرطبی) ہاں اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ

پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے

لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ

چکھانا چاہیے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا تاکہ وہ پھر آئیں، تو کہہ

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن

پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام پہلوں

قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ

کا بہت ان میں تھے شرک کرنے والے سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی

الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ

راہ پر اس سے پہلے کہ آپہنچے وہ دن جس کو پھرنا نہیں اللہ کی طرف سے اس دن

يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

لوگ جدا جدا ہوں گے، جو منکر ہوا سو اس پر پڑے اس کا منکر ہونا اور جو کوئی کرے بھلے کام

فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

سو وہ اپنی راہ سنوارتے ہیں، تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کام کئے

الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾

بھلے اپنے فضل سے بے شک اس کو نہیں بھاتے انکار والے

خلاصۂ تفسیر

(شرک و معصیت ایسی بری چیز ہے کہ) خشکی اور تری (یعنی تمام دنیا) میں لوگوں کے (برے) اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط و وبا، و طوفان) تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال (کی سزا) کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ (اپنے ان اعمال سے) باز آجائیں (جیسا دوسری آیت میں ہے وَمَآ أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ اور بعض اعمال کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب اعمال پر یہ عقوبتیں مرتب ہوں تو ایک دم زندہ نہ رہیں، کقولہ تعالیٰ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ اسی معنی سے آیت بالا میں وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ فرمایا ہے، یعنی بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں، بعض ہی اعمال کی سزا دیتے ہیں۔ غرض جب اعمالِ بد مطلقاً سبب وبال ہیں تو شرک و کفر تو سب سے بڑھ کر موجب عذاب ہوگا اور اگر مشرکین کو اس کے ماننے میں تردد ہو تو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ملک میں چلو

پھر دیکھو کہ جو (کافر د مشرک) لوگ پہلے ہو گذرے ہیں ان کا اخیر کیسا ہوا ان میں اکثر مشرک ہی تھے (سو دیکھ لو وہ عذاب آسمانی سے کس طرح ہلاک ہوئے جس سے صاف واضح ہوا کہ شرک کا بڑا وبال ہے اور بعضے کفر کی دوسری انواع میں مبتلا تھے، جیسے قوم لوط اور قارون اور جو لوگ مسخ ہو کر بندر اور خنازیر ہو گئے تھے، کیونکہ آیات کی تکذیب اور نہی کی مخالفت کر کے مبتلائے کفر و لعن ہوئے۔ اور شاید شرک کا بالتخصیص ذکر اس لئے ہو کہ کفار مکہ کی خاص اور مشہور حالت یہی تھی اور جب شرک کا موجب وبال ہونا محقق ہو گیا) سو (اے مخاطب) تم اپنا رُخ اس دین راست (یعنی توحید اسلامی) کی طرف رکھو قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جس کے واسطے پھر خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جیسے دنیا میں خاص عذاب کے وقت کو اللہ تعالیٰ قیامت کے وعدہ پر ہٹاتا جاتا ہے، جب وہ موعود دن آجائے گا پھر اس کو نہ ہٹائے گا اور توقف و امہال نہ ہوگا۔ اس جملہ میں شرک کے وبالِ اخروی کا ذکر ہو گیا جیسا اوپر ظَہَرَ الْفَسَادُ الخ اور کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الخ میں وبالِ دنیوی مذکور تھا اور) اس دن یہ ہو گا کہ) سب (عمل کرنے والے) لوگ (باعتبار جزاء کے) جدا جدا ہو جائیں گے (اس طور پر کہ) جو شخص کفر کر رہا ہے اس پر تو اس کا (وبال) کفر پڑے گا اور جو نیک عمل کر رہا ہے سو یہ لوگ اپنے (نفع کے) لئے سامان کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل سے (نیک) جزا دے گا جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کئے (اور اس سے کفار محروم رہیں گے جیسا اوپر فَعَلَیْہِ کُفْرُہٗ سے معلوم ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا (بلکہ ان کے کفر پر ان سے ناخوش ہے)۔

معارف و مسائل

ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ، یعنی خشکی اور دریا میں سارے جہان میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے " تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فساد سے مراد قحط اور وبائی امراض اور آگ لگنے اور پانی میں ڈوبنے کے واقعات کی کثرت اور ہر چیز کی برکت کا مٹ جانا، نفع بخش چیزوں کا نفع کم نقصان زیادہ ہو جانا وغیرہ آفات ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان دنیوی آفات کا سبب انسانوں کے گناہ اور اعمالِ بد ہوتے ہیں جن میں شرک و کفر سب سے زیادہ اشد ہیں، اس کے بعد دوسرے گناہ ہیں۔

اور یہی مضمون دوسری ایک آیت میں اس طرح آیا ہے وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ

مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ، یعنی تمہیں جو بھی مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے ہے۔ یعنی ان معاصی کے سبب جو تم کرتے رہتے ہو اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مصائب اور آفات تم پر آتی ہیں ان کا حقیقی سبب تمہارے گناہ ہوتے ہیں، اگرچہ دنیا میں نہ ان گناہوں کا پورا بدلہ دیا جاتا ہے اور نہ ہر گناہ پر مصیبت و آفت آتی ہے، بلکہ بہت سے گناہوں کو تو معاف کر دیا جاتا ہے، بعض بعض گناہوں پر ہی گرفت ہوتی اور آفت و مصیبت بھیج دی جاتی ہے۔ اگر ہر گناہ پر دنیا میں مصیبت آیا کرتی، تو ایک انسان بھی زمین پر زندہ نہ رہتا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کو تو حق تعالیٰ معاف ہی فرما دیتے ہیں اور جو معاف نہیں ہوتے ان کا بھی پورا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا، بلکہ تھوڑا سا مزہ چکھایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں فرمایا لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا، یعنی تاکہ چکھا دے اللہ تعالیٰ کچھ حصہ ان کے بُرے اعمال کا۔ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اعمالِ بد اور گناہوں کی وجہ سے جو مصیبت و آفت دنیا میں بھیجدی جاتی ہے وہ بھی غور کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہی ہے۔ کیونکہ مقصود اس دنیا کی مصیبت سے یہ ہوتا ہے کہ غافل انسان کو تنبیہ ہو جائے اور وہ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں سے باز آجائے جو انجام کار اس کے لئے مفید اور بڑی نعمت ہے، جیسا کہ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

دنیا کی بڑی بڑی آفتیں اور مصائب انسانوں کے گناہوں کے سبب سے آتے ہیں

اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ جو انسان کوئی گناہ کرتا ہے وہ ساری دنیا کے انسانوں چوپایوں اور چرندے و پرندے جانوروں پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے گناہوں کے وبال سے جو بارش کا قحط اور دوسرے مصائب دنیا میں آتے ہیں اس سے سب ہی جاندار متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز یہ سب بھی گناہگار انسان کے خلاف دعویٰ کریں گے۔

اور شقیق زاہد نے فرمایا کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے وہ صرف اس پر ظلم نہیں کرتا جس سے یہ مال ناجائز طور پر حاصل کیا ہے، بلکہ پورے انسانوں پر ظلم کرتا ہے (روح) کیونکہ اول تو ایک کے ظلم سے دوسرے لوگوں میں ظلم کرنے کی رسم پڑتی ہے، اور یہ سلسلہ ساری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس کے ظلم کی وجہ سے دنیا میں آفتیں اور مصائب آتے ہیں جس سے سب ہی انسان متاثر ہوتے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب احادیث صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی موجود ہیں کہ دنیا مؤمن کے لئے جیل خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے، اور یہ کہ کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں بصورتِ مال و دولت وصحت دے دیا جاتا ہے، اور مؤمن کے اعمال کا بدلہ آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے، اور یہ کہ مؤمن کی مثال دنیا میں ایک نازک شاخ کی سی ہے، کہ ہوائیں اس کو کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھکا دیتی ہیں، کبھی سیدھا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اور یہ کہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ، یعنی دنیا میں بلائیں سب سے زیادہ انبیاء پر آتی ہیں پھر جو اُن کے قریب ہو پھر جو اُن کے قریب ہو"

یہ تمام احادیث صحیحہ بظاہر اس آیت کے مضمون سے مختلف ہیں۔ اور عام دنیا کے مشاہدات بھی یہی بتلاتے ہیں کہ دنیا میں عام طور پر مؤمن مسلمان تنگی اور تکلیف میں اور کفار فجار عیش وعشرت میں رہتے ہیں۔ اگر آیت مذکورہ کے مطابق دنیا کے مصائب اور تکلیفیں گناہوں کے سبب سے ہوتیں تو معاملہ برعکس ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں گناہوں کو مصائب کا سبب ضرور بتلایا ہے مگر علتِ تامہ نہیں فرمایا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آئے تو گناہ ہی کے سبب سے ہوگی۔ جس پر کوئی مصیبت آئے اس کا گناہگار ہونا ضروری ہو بلکہ عام اسباب کا جو دنیا میں دستور ہے کہ سبب واقع ہونے کے بعد اس کا مسبب اکثر واقع ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی دوسرا سبب اس کے اثر کے ظاہر ہونے سے مانع ہو جاتا ہے تو اس سبب کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے کوئی مسہل یا مُلیّن دوا، کے متعلق یہ کہے کہ اس سے اسہال ہوں گے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر بعض اوقات کسی دوسری دوا، غذا، یا ہوا وغیرہ کے اثر سے اسہال نہیں ہوتے، جو دوائیں بخار اُتارنے کی ہیں بعض اوقات ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں کہ اُن دواؤں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں ہر وقت مشاہدہ کی جاتی ہیں۔

اس لئے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اصل خاصہ گناہوں کا یہ ہے کہ ان سے مصائب و آفات آئیں، لیکن بعض اوقات دوسرے کچھ اسباب اس کے منافی جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے مصائب کا ظہور نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں بغیر کسی گناہ کے کوئی آفت و مصیبت آجانا بھی اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ بغیر گناہ کے کوئی تکلیف و مصیبت کسی کو پیش نہیں آتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو کوئی مصیبت و

آفت کسی دوسرے سبب سے پیش آجائے جیسے انبیاء و اولیاء کو جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا سبب کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش اور آزمائش کے ذریعہ ان کے درجات کی ترقی اس کا سبب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے جن آفات و مصائب کو گناہوں کے سبب سے قرار دیا ہے اس سے مراد وہ آفات و مصائب ہیں جو پوری دنیا پر یا پورے شہر یا بستی پر عام ہوجائیں، عام انسان اور جانور ان کے اثر سے نہ بچ سکیں۔ ایسی مصائب و آفات کا سبب عموماً لوگوں میں گناہوں کی کثرت خصوصاً علانیہ گناہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ شخصی اور انفرادی تکلیف و مصیبت میں یہ ضابطہ نہیں بلکہ وہ کبھی کسی انسان کی آزمائش کرنے کے لئے بھی بھیجی جاتی ہے، اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے تو اس کے درجات آخرت بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مصیبت درحقیقت اس کے لئے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔ اس لئے انفرادی طور پر کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بہت گناہگار ہے۔ اسی طرح کسی کو خوش عیش بعافیت دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بڑا نیک صالح بزرگ ہے۔ البتہ عام مصائب و آفات جیسے قحط، طوفان، وبائی امراض، گرانی اشیاءِ ضرورت، چیزوں کی برکت مٹ جانا وغیرہ اس کا اکثر اور بڑا سبب لوگوں کے علانیہ گناہ اور سرکشی ہوتی ہے۔

فائدہ: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ اس دنیا میں خیر و شر یا مصیبت و راحت، مشقت و سہولت کے اسباب دو طرح کے ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرے باطنی، ظاہری اسباب تو وہی مادی اسباب ہیں جو عام دنیا کی نظر میں اسباب سمجھے جاتے ہیں۔ اور باطنی اسباب انسانی اعمال اور ان کی بناء پر فرشتوں کی امداد و نصرت یا اُن کی لعنت و نفرت ہیں۔ جیسے دنیا میں بارش کے اسباب اہلِ فلسفہ و اہلِ تجربہ کی نظر میں سمندر سے اُٹھنے والے بخارات (مان سون) اور پھر اوپر کی ہوا میں پہونچ کر ان کا منجمد ہونا، پھر آفتاب کی شعاعوں سے پگھل کر برس جانا ہیں، مگر روایاتِ حدیث میں ان چیزوں کو فرشتوں کا عمل بتلایا گیا ہے۔ درحقیقت ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایک چیز کے اسباب متعدد ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ظاہری اسباب یہی ہوں، اور باطنی سبب فرشتوں کا تصرف ہو۔ یہ دونوں طرح کے اسباب جمع ہوجائیں تو بارش امید اور ضرورت کے مطابق ہو اور جہاں یہ دونوں اسباب جمع نہ ہوں وہاں بارش کے وقوع میں اختلال رہے۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح دنیا کے مصائب و آفات کے کچھ اسباب طبعیہ مادیہ ہیں جو نیک و بد کو نہیں پہچانتے۔ آگ جلانے کے لئے ہے وہ بلا امتیاز متقی اور فاجر کے سب کو جلائے ہی گی بجز اس کے کسی خاص فرمان کے ذریعہ اس کو اس عمل سے روک دیا جائے، جیسے نار نمرود ابراہیم علیہ السلام کے لئے "برد و سلام بنا دی گئی" پانی وزنی چیزوں کو غرق کرنے کے لئے ہے وہ یہی کام کرے گا، اسی طرح دوسرے عناصر جو خاص خاص کاموں کے لئے بنے وہ اپنی مفوضہ خدمت میں لگے ہوئے ہیں، یہ اسباب طبعیہ کسی انسان کے لئے راحت و سہولت کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں، اور کسی کے لئے مصیبت و آفت بھی بن جاتے ہیں۔

انہی اسباب ظاہرہ کی طرح مصائب و آفات اور راحت و سہولت میں مؤثر انسان کے اپنے اعمال خیر و شر بھی ہیں۔ جب دونوں ظاہری اور باطنی اسباب کسی فرد یا جماعت کی راحت و آرام اور سہولت و خوش عیشی پر جمع ہو جاتے ہیں تو اس فرد یا جماعت کو دنیا میں عیش و راحت مکمل طور پر حاصل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس فرد یا جماعت کے لئے اسباب طبعیہ مادیہ بھی مصیبت و آفت لا رہے ہوں اور اس کے اعمال بھی مصیبت و آفت کے مقتضی ہوں تو اس کی مصیبت و آفت بھی مکمل ہوتی ہے جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب طبعیہ مادیہ تو مصیبت و آفت پر مجتمع ہیں، مگر اس کے اعمال حسنہ باطنی طور پر راحت و سکون کے مقتضی ہیں ایسی صورت میں یہ اسباب باطنہ اس کی ظاہری آفتوں کو دور کرنے یا کم کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں اس کی عیش و راحت مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات اسباب مادیہ عیش و آرام کے مقتضی ہوتے ہیں مگر اسباب باطنیہ یعنی اس کے اعمال برے ہونے کی وجہ سے ان کا تقاضا مصیبت و آفت لانے کا ہوتا ہے، تو ان متضاد تقاضوں کی وجہ سے نہ عیش و راحت مکمل ہوتی ہے اور نہ بہت زیادہ مصیبت و آفت ان کو گھیرتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مادی اسباب طبعیہ کو کسی بڑے درجہ کے نبی و رسول اور ولی و مقبول کے لئے ناساز گار بنا کر اس کی آزمائش و امتحان کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس تفصیل کو سمجھ لیا جائے تو آیات قرآن اور مذکورہ احادیث کا باہم ارتباط اور اتفاق واضح ہو جاتا ہے تعارض و تضاد کے شبہات رفع ہو جاتے ہیں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مصائب کے وقت ابتلاء و امتحان یا سزاء و عذاب میں فرق۔ مصائب و آفات کے ذریعہ جن لوگوں کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا دی جاتی ہے، اور جن نیک لوگوں کو رفع درجات یا کفارۂ سیئات کے لئے بطور امتحان مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، ظاہری صورت ابتلاء کی ایک ہی سی ہوتی ہے، ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ اس کی پہچان حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھی ہے کہ جو نیک لوگ بطور ابتلاء و امتحان کے گرفتار مصائب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو مطمئن کر دیتے ہیں، اور وہ ان مصائب و آفات پر ایسے ہی راضی ہوتے ہیں جیسے بیمار کڑوی دوا، یا آپریشن پر باوجود تکلیف محسوس کرنے کے راضی ہوتا ہے، بلکہ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتا ہے، سفارشیں مہیا کرتا ہے۔ بخلاف اُن گنہگاروں کے جو بطور سزاء مبتلاء کئے جاتے ہیں ان کی پریشانی اور جزع و فزع کی حد نہیں رہتی، بعض اوقات ناشکری بلکہ کلماتِ کفر تک پہونچ جاتے ہیں۔

سیدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے ایک پہچان یہ بتلائی کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اپنے گناہوں پر تنبہ اور توبہ و استغفار کی رغبت زیادہ ہو جائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے، اور جس کو یہ صورت نہ بنے بلکہ جزع و فزع اور معاصی میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے وہ علامت قہر الٰہی اور عذاب کی ہے۔ واللہ اعلم

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی اور تاکہ چکھائے تم کو کچھ مزہ

مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

اپنی مہربانی کا اور تاکہ چلیں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا

اور تاکہ تم حق مانو، اور ہم بھیج چکے ہیں تجھ سے پہلے کتنے رسول

اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ

اپنی اپنی قوم کے پاس سو پہنچے ان کے پاس نشانیاں لے کر پھر بدلہ لیا ہم نے ان سے جو

أَجْرَمُوا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾ اللَّهُ الَّذِي

گنہگار تھے اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی، اللہ ہے جو

يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ

چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے

وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ

اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھے مینھ کو نکلتا ہے اس کے بیچ میں سے پھر جب اس کو پہنچاتا

بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِنْ

ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں تب ہی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے، اور پہلے سے

كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ﴿٤٩﴾

ہو رہے تھے اس کے اترنے سے پہلے ہی نا امید

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ

سو دیکھ لے اللہ کی مہربانی کی نشانیاں کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مر گئے پیچھے،

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ

بیشک وہی ہے مُردوں کو زندہ کرنے والا اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور اگر ہم

أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ﴿٥١﴾

بھیجیں ایک ہوا پھر دیکھیں وہ کھیتی کو کہ زرد پڑ گئی تو لگیں اس کے پیچھے ناشکری کرنے

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا

سو تو سنا نہیں سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو پکارنا جب کہ پھیریں

مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ

پیٹھ دے کر، اور نہ تو راہ سجھائے اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے، تُو تو سنائے

إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾

اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوتے ہیں

ع ۵ / ۱۳ / ۸

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت و وحدت و نعمت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی) خوش خبری دیتی ہیں (پس ان کا بھیجنا ایک تو جی خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے) اور (نیز اس واسطے) تاکہ (اس کے بعد بارش ہو اور) تم کو اپنی (اس) رحمت (بارش) کا مزہ چکھادے (یعنی بارش کے فوائد عنایت فرمادے) اور (نیز اس واسطے ہوا بھیجتا ہے) تاکہ (اس کے ذریعے سے بادبانی) کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ (اس ہوا کے ذریعہ سے بواسطۂ کشتی دریا کے سفر سے) تم اس کی روزی تلاش کرو (یعنی کشتیوں کا چلنا اور روزی تلاش کرنا، دونوں ارسال ریاح سے حاصل ہوتے ہیں اول بلا واسطہ اور ثانی بواسطۂ کشتی کے) اور تاکہ تم شکر کرو اور (ان دلائل باہرہ اور نعم سابغہ پر بھی یہ مشرکین حق تعالیٰ کی ناشکریاں کرتے ہیں، یعنی شرک اور مخالفتِ رسولؐ اور ایذاءِ مؤمنین وغیرہ، تو آپ اس پر غمگین نہ ہوں، کیونکہ ہم عنقریب ان سے انتقام لینے والے اور اس میں ان کو مغلوب اور اہلِ حق کو غالب کرنے والے ہیں جیساکہ پہلے بھی ہوا ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبران کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل (ثبوتِ حق کے) لے کر آئے (جس پر بعضے ایمان لائے اور بعضے نہ لائے) سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم کے ہوئے تھے (اور وہ جرائم تکذیبِ حق و مخالفتِ اہلِ حق ہیں اور اس انتقام میں ہم نے ان کو مغلوب اور اہلِ ایمان کو غالب کیا) اور اہلِ ایمان کو غالب کرنا (حسب وعدہ وعادت) ہمارے ذمہ تھا (وہ انتقام عذابِ الٰہی تھا اور اس میں کفار کا ہلاک ہونا یا ان کا مغلوب ہونا ہے اور مسلمانوں کا بچ جانا انکا غالب آنا ہے غرض اسی طرح ان کفار سے انتقام لیا جائے گا، خواہ دنیا میں خواہ بعد موت اور یہ مضمون تسلّی کا بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے ارسال ریاح کے بعضے آثار مذکورہ بالاجمال کی تفصیل ہے کہ) اللہ ایسا (قادر و حکیم و منعم) ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو (جو کہ کبھی ان ہواؤں سے پہلے بخارات اٹھ کر بادل بن چکے ہیں اور کبھی وہ بخارات انہی ہواؤں سے بلند ہو کر بادل بن جاتے ہیں پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے یعنی فضائے آسمانی سے یا زمین سے) اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس (بادل) کو (کبھی تو) جس طرح چاہتا ہے آسمان (یعنی فضائے آسمانی) میں پھیلا دیتا ہے، اور (کبھی) اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے (بسط کا مطلب یہ ہے کہ مجتمع کر کے دور تک پھیلا دیتا ہے اور کیف یشاءُ کا

مطلب یہ ہے کہ کبھی تھوڑی دور تک کبھی بہت دور تک ور کِسَفًا کا مطلب یہ کہ مجتمع نہیں ہوتا متفرق رہتا ہے) پھر (دونوں حالت میں) تم مینہ کو دیکھتے ہو کہ اس (بادل) کے اندر سے نکلتا ہے (مجتمع بادل سے برسنا تو بکثرت ہے اور بعض موسموں میں اکثر بارش متفرق بدلیوں سے بھی ہوتی ہے) پھر (بادل سے نکلنے کے بعد) جب وہ (مینہ) اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہونچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کے خوش ہونے سے پہلے اُن پر برسے (بالکل ہی) ناامید (ہو رہے) تھے (یعنی ابھی ابھی ناامید تھے اور ابھی خوش ہوگئے۔ اور ایسا ہی مشاہدہ بھی ہے کہ انسان کی کیفیت ایسی حالت میں بہت جلدی جلدی بدل جاتی ہے) سو (ذرا) رحمت الٰہی (یعنی بارش) کے آثار (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (اس کے ذریعہ سے) زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد کس طرح زندہ (یعنی تر و تازہ) کرتا ہے (اور یہ بات نعمت اور دلیلِ وحدت ہونے کے علاوہ اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر پوری قدرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا) کچھ شک نہیں کہ وہی (خدا) مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے (پس عقلاً ممکن ہونے میں دونوں برابر اور قدرت ذاتی دونوں کے ساتھ برابر اور مشاہدہ میں دونوں کاموں کا یکساں ہونا یہ سب چیزیں اس استبعاد کو دفع کرنے والی ہیں کہ مرنے کے بعد پھر کیسے زندہ ہوں گے) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (یہ مضمون احیاءِ موتیٰ کا بمناسبت حیاتِ ارض کے جملہ معترضہ تھا) اور (آگے پھر بارش و ریاح سے متعلق مضمون ہے جس میں اہلِ غفلت کی ناشکری کا بیان ہے۔ یعنی اہلِ غفلت ایسے حق ناشناس و ناسپاس ہیں کہ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد) اگر ہم ان پر اور (قسم کی) ہوا چلا دیں پھر (اس ہوا سے) یہ لوگ کھیتی کو (خشک اور) زرد دیکھیں (کہ اس کی سبزی اور شادابی جاتی رہی) تو یہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں (اور پچھلی نعمتیں سب طاقِ نسیاں میں رکھ دیں) سو (جب ان کی غفلت اور ناشکری پر اقدام اس درجہ میں ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی بے حس ہیں تو ان کے عدم ایمان و عدم تدبر پر غم بھی بے کار ہے کیونکہ) آپ مُردوں کو (تو) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو (بھی) آواز نہیں سنا سکتے (خصوصاً) جب کہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (کہ اشارہ کو بھی نہ دیکھیں) اور (اسی طرح) آپ (ایسے) اندھوں کو (جو کہ بصیر کا اتباع نہ کریں) اُن کی بے راہی سے راہ پر نہیں لا سکتے (یعنی یہ تو ماؤفُ الحواس والحیٰوۃ کے مشابہ ہیں) آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (اور جب یہ لوگ مُردوں بہروں اندھوں کے مشابہ ہیں پھر ان سے توقع ایمان کی نہ رکھیے اور غم نہ کیجیے

معارف و مسائل

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"ہم نے مجرموں کافروں سے انتقام لے لیا اور ہمارے ذمہ تھا کہ ہم مومنین کی مدد کرتے"۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں کبھی شکست نہ ہو، حالانکہ بہت سے واقعات اس کے خلاف بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے کہ مومنین سے مراد وہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے کفار سے جنگ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ہی انتقام اللہ تعالیٰ مجرمین سے لیتے ہیں اور ان کو غالب کرتے ہیں جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی صورت پیش آتی ہے وہاں عموماً مجاہدین کی کوئی لغزش ان کی شکست کا سبب بنتی ہے جیسے غزوۂ احد کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا "یعنی شیطان نے ان لوگوں کو لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کی غلطی کے سبب" اور ایسے حالات میں بھی انجام کار اللہ تعالیٰ پھر انہی کو غلبہ اور فتح عطا فرما دیتے ہیں، جبکہ ان کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو جائے جیسا غزوۂ احد میں ہوا۔ اور جو لوگ محض اپنا نام مومن مسلمان رکھ لیں، احکام خداوندی سے غفلت و سرکشی کے عادی ہوں، اور غلبہ کفار کے وقت بھی اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں وہ اس وعدہ میں شامل نہیں، وہ نصرت الٰہیہ کے مستحق نہیں ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بغیر کسی استحقاق کے بھی نصرت و غلبہ عطا فرما دیتے ہیں، اس کی امید رکھنا اور اس سے دعاء مانگنا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے رہا یہ معاملہ کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور کیا مُردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کی مختصر تحقیق معارف القرآن سورۂ نمل کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور مکمل تحقیق احقر کے مستقل رسالہ بزبانِ عربی میں ہے جس کا نام "تکمیل الحبور بسماع اہل القبور" ہے، اور جو احکام القرآن بزبان عربی کے حزب خامس کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً

اللہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ

پھر دے گا زور کے پیچھے کمزوری اور سفید بال بناتا ہے جو کچھ چاہے اور وہ

الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬

ہے سب کچھ جانتا کرسکتا اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسمیں کھائیں گنہگار،

مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ

کہ ہم نہیں رہے تھے ایک گھڑی سے زیادہ اسی طرح تھے الٹے جاتے، اور کہیں گے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ

ملی ہے سمجھ اور یقین تمہارا ٹھہرنا تھا اللہ کی کتاب میں جی اٹھنے کے

الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

دن تک سو یہ ہے اٹھنے کا دن پر تم نہیں تھے جانتے،

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ

اس دن کام نہ آئے گا ان گنہگاروں کو تقصیر بخشوانا اور نہ ان سے

یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

کوئی منانا چاہے، اور ہم نے بٹھلائی ہے آدمیوں کے واسطے اس قرآن میں

مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا

ہر ایک طرح کی مثل، اور جو تو لائے ان کے پاس کوئی آیت تو ضرور کہیں وہ منکر

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا

تم سب جھوٹ بناتے ہو، یوں مہر لگا دیتا ہے اللہ ان کے دلوں پر جو سمجھ

یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

نہیں رکھتے، سو تو قائم رہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور کھاڑنہ دیں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے

خُلاصۂ تفسیر

اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا (مراد اس سے ابتدائی حالت بچپن کی ہے) پھر (اس) ناتوانی کے بعد توانائی (یعنی جوانی عطا کی پھر (اس) توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا (اور) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ (ہر تصرف کو) جاننے والا (اور اس تصرف کے نافذ کرنے پر) قدرت رکھنے والا ہے (پس جو ایسا قادر ہو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ یہ تو بیان تھا بعث کے امکان کا) اور (آگے اس کے وقوع کا بیان ہے یعنی) جس روز قیامت ہوگی مجرم (یعنی کافر) لوگ (وہاں کی ہول وہیبت پریشانی کو دیکھ کر قیامت کی آمد کو غایت درجہ ناگوار سمجھ کر) قسم کھا بیٹھیں گے کہ (قیامت بہت جلدی آگئی اور) وہ لوگ (یعنی ہم لوگ عالم برزخ میں) ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے (یعنی جو میعاد قیامت کے آنے کی مقرر تھی وہ بھی پوری نہ ہونے پائی کہ قیامت آپہنچی جیسا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھانسی والے کی میعاد ایک ماہ مقرر کی جاتے تو جب مہینہ گذر چکے گا تو اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مہینہ نہیں گذرا اور مصیبت جلدی آگئی، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) اسی طرح یہ لوگ (دنیا میں) الٹے چلا کرتے تھے (یعنی جس طرح یہاں آخرت میں قیامت کے قبل از وقت آجانے پر قسمیں کھانے لگے، اسی طرح دنیا میں قیامت کے وجود ہی کے منکر تھے اور نہ آنے پر قسمیں کھایا کرتے تھے) اور جن لوگوں کو ایمان اور علم عطا ہوا ہے (مراد اہل ایمان ہیں کہ اخبار شرعیہ کا علم ان کو حاصل ہے) وہ (ان مجرمین کے جواب میں) کہیں گے کہ (تم برزخ میں میعاد سے کم تو نہیں رہے، تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ) تم تو (میعاد) نوشتہ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے، سو قیامت کا دن یہی ہے، (جو میعاد مقرر تھی برزخ میں رہنے کی) ولیکن (وجہ اس بات کی کہ قیامت کو میعاد سے پہلے آیا ہوا سمجھتے ہو یہ ہے کہ) تم (دنیا میں قیامت کے وقوع کا) یقین (اور اعتقاد) نہ کرتے تھے (بلکہ تکذیب و انکار کیا کرتے تھے اس انکار کے وبال میں آج پریشانی کا سامنا ہوا اس وجہ سے گھبرا کر یہ خیال ہوا کہ ابھی تو میعاد پوری بھی نہیں ہوئی اور اگر تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے تو اس کے وقوع کو جلدی نہ سمجھتے بلکہ یوں چاہتے کہ اس سے بھی جلدی آجاوے، کیونکہ انسان جب اس سے کسی راحت و آرام کا وعدہ ہو تو طبعی طور پر اس کا جلدی آنا چاہتا ہے اور انتظار شاق اور اس کی مدت طویل معلوم ہوا کرتی ہے۔ جیسا حدیث میں بھی ہے

کہ کافر قبر میں کہتا ہے رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ اور مومن کہتا ہے رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ، اور مومنین کے اس جواب سے بھی جو یہاں مذکور ہے کہ مقام برزخ کو انھوں نے بہت سمجھا ہے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مشتاق تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ جلد آجاوے) غرض اس روز ظالموں (یعنی کافروں کی پریشانی اور مصیبت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان) کو ان کا (کسی قسم کا جھوٹا سچا) عذر کرنا نفع نہ دے گا، اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا (یعنی اس کا موقع نہ دیا جائے گا کہ توبہ کر کے خدا کو راضی کرلیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے اس قرآن (کے مجموعہ یا اس کے اس خاص جزو یعنی اس سورۃ) میں ہر طرح کے عمدہ (اور عجیب) مضامین (ضروریہ) بیان کئے ہیں (جو بوجہ بلاغت اور کمال کی وجہ سے مقتضی اس کو ہیں کہ ان کافروں کو ہدایت ہو جاتی، مگر ان لوگوں نے غایت عناد سے اس کو قبول نہ کیا اور اس سے منتفع نہ ہوئے) اور (قرآن کی کیا تخصیص ہے ان لوگوں کا عناد اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ) اگر (قرآن کے علاوہ ان معجزات سے جن کی یہ خود فرمائش کیا کرتے ہیں) آپ ان کے پاس کوئی نشان لے آئیں تب بھی یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین جو آیات تشریعیہ تکوینیہ کی تصدیق کرتے ہیں) نرے اہل باطل ہو (پیغمبر کو سحر کی تہمت لگا کر صاحب باطل کہیں اور مسلمانوں کو سحر کی تصدیق کرنے سے اہل باطل کہیں اور ان لوگوں کے اس عناد کے بارے میں اصل بات یہ ہے کہ) جو لوگ (باوجود مکرر نشانیاں اور دلائل حق ظاہر ہونے کے) یقین نہیں کرتے (اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر یوں ہی مہر کر دیا کرتا ہے (جیسا کہ ان کے دلوں پر ہو رہی ہے، یعنی روزانہ استعداد قبول حق کی مضمحل وضعیف ہوتی جاتی ہے، اس لئے انقیاد میں ضعف اور عناد میں قوت بڑھتی جاتی ہے) سو (جب یہ ایسے معاندین ہیں تو ان کی مخالفت اور ایذا رسانی اور بدکلامی وغیرہ پر) آپ صبر کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ (کہ آخر میں یہ ناکام اور اہل حق کامیاب ہوں گے) سچا ہے (وہ وعدہ ضرور واقع ہوگا پس صبر و تحمل تھوڑے ہی دن کرنا پڑتا ہے) اور یہ بد یقین لوگ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں (یعنی ان کی طرف سے خواہ کیسی ہی بات پیش آئے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ برداشت نہ کریں)۔

معارف و مسائل

اس سورت کا بڑا حصہ منکرینِ قیامت کے شبہات کے ازالہ سے متعلق ہے جس کے لئے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بہت سی آیات اور نشانیاں دکھلا کر غافل انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں ایک نئے انداز سے اسی مضمون کا اثبات ہے وہ یہ کہ انسان اپنی طبیعت سے جلد باز واقع ہوا ہے اور سامنے کی چیزوں میں لگ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینے کا عادی ہے، اور اس کی یہی عادت اس کو بہت سی مہلک غلطیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ جس وقت انسان جوان ہوتا ہے اس کی قوت اپنے شباب پر ہوتی ہے، یہ اپنی قوت کے نشہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، حدود پر قائم رہنا اس کو دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو متنبہ کرنے کے لئے اس آیت میں قوت و ضعف کے اعتبار سے انسانی وجود کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں دکھلایا ہے کہ انسان کی ابتداء بھی کمزور ہے، اور انتہا بھی، درمیان میں بہت تھوڑے دنوں کے لئے اس کو ایک قوت ملتی ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس چند روزہ قوت کے زمانہ میں اپنی پہلی کمزوری اور آنے والی کمزوری سے کبھی غافل نہ ہو، بلکہ اپنی اس کمزوری کے مختلف درجات کو ہمیشہ سامنے رکھے جن سے گذر کر یہ قوت و شباب تک پہنچی ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ میں انسان کو یہی سبق دیا گیا کہ اپنی اصل بنیاد کو دیکھ کہ کس قدر ضعیف بلکہ عین ضعف ہے کہ ایک قطرۂ بے جان، بے شعور، ناپاک، گھناؤنی چیز ہے۔ اس میں غور کر کہ کس کی قدرت و حکمت نے اس گھناؤنے قطرہ کو ایک خونِ منجمد کی صورت میں پھر خون کو گوشت کی صورت میں پھر اس گوشت کے اندر ہڈیاں پیوست کرنے میں تبدیلیاں کیں۔ پھر اس کے اعضاء و جوارح کی نازک نازک مشینیں بنائیں کہ یہ ایک چھوٹا سا وجود ایک چلتی پھرتی فیکٹری بن گیا، جس میں سیکڑوں عجیب و غریب خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ اور زیادہ غور سے کام لو تو ایک فیکٹری نہیں بلکہ ایک عالمِ اصغر ہے کہ پورے جہان کے نمونے اس کے وجود میں شامل ہیں۔ اس کی تخلیق و تکوین بھی کسی بڑے ورکشاپ میں نہیں، بلکہ بطنِ مادر کی تین اندھیریوں میں ہوئی۔ اور نو مہینے اسی تنگ و تاریک جگہ میں بطنِ مادر کے خون اور آلائشوں سے غذا پاتے ہوئے حضرتِ انسان کا وجود تیار ہوا۔

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور کے لئے راستہ آسان فرما دیا اس عالم میں آئے تو ان کی شان یہ تھی کہ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ

شَیْئًا، یعنی تمہیں شکمِ مادر سے اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اب قدرت نے تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلا ہنر رونے کا سکھلایا جس سے ماں باپ متوجہ ہو کر اس کی بھوک پیاس اور ہر تکلیف کو دور کرنے پر لگ جائیں۔ پھر ہونٹوں، مسوڑوں کو دبا کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ نکال لینے کا ہنر سکھلایا جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرے۔ کس کی مجال تھی جو اس لایعقل بچے کو یہ دونوں ہنر سکھادے جو اس کی موجودہ ساری ضرورتوں کی کفالت کرتے ہیں، بجز اس قدرت کے جو اس کی تخلیق کی مالک ہے۔ اب ضعیف بچہ ہے ذرا ہوا لگ جائے تو پژمردہ ہو جائے، ذرا سردی یا گرمی لگ جائے تو بیمار ہو جائے نہ اپنی کسی ضرورت کو مانگ سکتا ہے، نہ کسی تکلیف کو دور کر سکتا ہے۔ یہاں سے چلئے اور جوانی کے عالم تک اس کی تدریجی منازل تک غور کرتے جائیے تو قدرتِ حق جل شانہٗ کا ایسا عظیم شاہکار سامنے آئے گا کہ عقل حیران رہ جائے گی۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً، اب یہ قوت کی منزل میں پہونچے تو زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے، چاند اور مریخ پر کمند پھینکنے لگے، بحر و بر اپنے قبضے جاننے لگے، اپنے ماضی و مستقبل سے غافل ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ کون قوی ہو سکتا ہے) کے نعرے لگانے لگے۔ یہاں تک کہ اسی قوت کے نشہ میں اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے اور اس کے احکام کی پیروی کو بھی۔ مگر قدرت نے اس کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا: ثُمَّ جَعَلَ مِنۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً، کہ غافل! خوب سمجھ لے کہ یہ قوت تیری چند روزہ ہے۔ پھر اسی ضعف کے عالم کی طرف لوٹنا ہے، اور اسی تدریج سے ضعف بڑھنا شروع ہوگا جس کا اثر ایک وقت کے بعد شَيْبَة بالوں کی سفیدی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور پھر سب ہی اعضاء و جوارح کی شکل و صورت میں تبدیلیاں لائے گا۔ دنیا کی تاریخ اور دوسری کتابیں نہیں خود اپنے وجود میں لکھی ہوئی اس مخفی تحریر کو پڑھ لو تو اس یقین کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ، کہ یہ سب کارسازی اس رب العزت کی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور علم میں بھی سب سے بڑا ہے اور قدرت میں بھی۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کچھ شبہ کی گنجائش رہ گئی، کہ وہ جب چاہے مُردوں کو دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔

آگے پھر منکرینِ قیامت کی لغو گوئی اور ان کی جہالت کا بیان ہے، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۔ یعنی جس روز قیامت قائم ہوگی تو یہ منکرینِ قیامت اس وقت کے ہولناک مناظر سے مدہوش ہو کر یہ قسمیں کھانے لگیں گے

کہ ہمارا قیام تو ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہا۔ مراد اس قیام سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کا قیام ہو کیونکہ ان کی دنیا آرام وعیش سے گذری تھی اور اب مصائب شدیدہ سامنے آئے تو جیسے انسان کی طبعی عادت ہے کہ راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھا کرتا ہے اس لئے قسمیں کھا جائیں گے کہ دنیا میں تو ہمارا قیام بہت ہی مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس قیام سے مراد قبر اور برزخ کا قیام ہو، اور مطلب یہ ہو کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ قبر یعنی عالم برزخ میں قیام بہت طویل ہوگا اور قیامت بہت زمانہ کے بعد آئے گی، مگر معاملہ برعکس ہو گیا کہ ہم برزخ میں تھوڑے ہی دیر ٹھہرنے پائے تھے کہ قیامت آ گئی۔ اور یہ جلدی آنا ان کو اس بناء پر محسوس ہوگا کہ قیامت میں ان کے لئے کوئی خوشی و راحت کی چیز تو تھی نہیں، مصیبت ہی مصیبت تھی۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ مصیبت آنے کے وقت پچھلی راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھنے لگتا ہے اور کافروں کو اگرچہ قبر و برزخ میں بھی عذاب ہوگا مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ بھی راحت محسوس ہونے لگے گا، اور اس زمانے کو مختصر سمجھ کر قسم کھائیں گے کہ قبر میں ہمارا قیام بہت مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

کیا محشر میں اللہ کے سامنے کوئی جھوٹ بول سکے گا؟ اس آیت سے معلوم ہوا کہ محشر میں کفار قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو دنیا میں یا قبر میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں مشرکین کا یہ قول مذکور ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ وجہ یہ ہے کہ محشر میں رب العالمین کی عدالت قائم ہوگی وہ سب کو آزادی دیں گے کہ جو چاہے بیان دے، جھوٹ بولے یا سچ بولے۔ کیونکہ رب العزت کو ذاتی علم بھی پورا پورا ہے، اور عدالتی تحقیقات کے لئے وہ ان کے اقرار کرنے نہ کرنے کا محتاج نہیں، جب انسان جھوٹ بولے گا تو اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں اور کھال و بال سے شہادت لی جاوے گی وہ سچ سچ سارا واقعہ بیان کر دیں گے، جس کے بعد اس کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی، اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ الآیۃ کا یہی مطلب ہے۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں مختلف مواقف ہوں گے، ہر موقف کے حالات الگ ہیں۔ ایک موقف وہ بھی ہوگا جس میں بغیر اذنِ الٰہی کسی کو بولنے کا اختیار نہ ہوگا اور وہ صرف سچ اور صحیح بات ہی بول سکے گا، جھوٹ پر قدرت نہ ہوگی، جیسا ارشاد ہے: لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ

صوابًا۔

قبر میں کوئی جھوٹ نہ بول سکے گا

اس کے برخلاف قبر کے سوال و جواب میں احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ جب کافر سے پوچھا جائے گا کہ تیرا رب کون ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ تو وہ کہے گا، ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِیْ، یعنی ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر وہاں جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو کیا مشکل تھا، کہہ دیتا کہ میرا رب اللہ ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ کافر لوگ اللہ کے سامنے تو جھوٹ بولنے پر قادر ہوں اور فرشتوں کے سامنے جھوٹ نہ بول سکیں۔ مگر غور کیا جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں، وجہ یہ ہے کہ فرشتے نہ تو عالم الغیب ہیں، نہ ان کو یہ اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کی گواہی لے کر اس پر حجت تمام کر دیں، اگر ان کے سامنے جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو سب کافر فاجر عذاب قبر سے بے فکر ہو جاتے، بخلاف اللہ جل شانہٗ کے کہ وہ دلوں کے حال سے بھی واقف ہیں۔ اور اعضاء و جوارح کی شہادت سے اس کا جھوٹ کھول دینے پر قادر بھی ہیں۔ اس لئے محشر میں یہ آزادی دے دینا عدالتی انصاف میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم :

تمت

سورۃ الروم بحمد اللہ فی یوم السبت ۲۸ ذلقعدہ ۱۳۹۱ھ

معارف القرآن

جلد

۷

لقمان، الم سجدہ، احزاب، سبا، فاطر، یٰسٓ، صٰفّٰت، ص، زمر
مومن، حٰمٓ سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف
پارہ ۲۱ رکوع ۱۰ تا پارہ ۲۶ رکوع ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق شتی

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچی

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* ادارۃ المعارف کراچی
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبۂ معارف القرآن کراچی
فون 5031565 - 5031566

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد ہفتم

تمت

سُورَةُ لُقۡمٰن

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ لقمٰن مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چونتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً

یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی ۔ ہدایت ہے اور مہربانی

لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

نیکی کرنے والوں کیلئے ۔ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ

اور وہ ہیں جو آخرت پر ان کو یقین ہے ۔ انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی

رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

طرف سے اور وہی مراد کو پہنچے ۔ اور ایک وہ لوگ ہیں کہ

يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے ،

وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۶﴾ وَاِذَا

اور ٹھہرائیں اس کو ہنسی ۔ وہ جو ہیں ان کو ذلت کا عذاب ہے ۔ اور جب

تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ

سُنائے اس کو ہماری آیتیں پیچھے دے جائے غرور سے گویا ان کو سنا ہی نہیں گویا اس کے دونوں

اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

کان بہرے ہیں سو خوشخبری دے اس کو دردناک عذاب کی جو لوگ یقین

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝ خٰلِدِيْنَ

لائے اور کئے بھلے کام ان کے واسطے ہیں نعمت کے باغ ہمیشہ رہا کریں

فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ان میں وعدہ ہو چکا اللہ کا سچا، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو اس سورۃ یا قرآن میں مذکور ہیں) آیتیں ہیں ایک پُر حکمت کتاب (یعنی قرآن) کی جو کہ ہدایت اور رحمت (کا سبب) ہے، نیک کاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں (سو) یہ لوگ (اس قرآن کے، عقیدہ اور عمل کی بدولت) اپنے رب کے سیدھے رستہ پر ہیں اور یہی لوگ (اس ہدایت کی بدولت) فلاح پانے والے ہیں (پس قرآن اس طرح ان کے لئے ہدایت اور رحمت کا جس کا اثر فلاح ہو سبب ہو گیا، پس بعضے آدمی تو ایسے ہیں جیسا بیان کیا گیا) اور (برخلاف ان کے) بعضا آدمی ایسا بھی ہے جو (قرآن سے اعراض کر کے) ان باتوں کا خریدار بنتا ہے (یعنی ایسی باتیں اختیار کرتا ہے) جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں (سو اول تو لہو کا اختیار کرنا جب کہ اس کے ساتھ آیاتِ الٰہیہ سے اعراض بھی ہو خود ہی کفر اور ضلال ہے، پھر خاص کر جب کہ اس کو اس غرض سے اختیار کیا جائے) تاکہ (اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین حق) سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور (اسی گمراہ کرنے کے ساتھ) اس (راہ حق) کی ہنسی اڑا دے (تاکہ دوسروں کے دل سے بالکل اس کی وقعت اور تاثیر نکل جاوے، تب تو کفر بر کفر، اور ضلال کے ساتھ اضلال بھی ہے اور) ایسے لوگوں کیلئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونے والا) ہے (جیسا کہ ان کے اضداد کے لئے فلاح کا

ہونا معلوم ہوا) اور (اس شخص مذکور کے اعراض کی یہ حالت ہے کہ) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ شخص تکبر کرتا ہوا ایسی بے التفاتی سے) منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہیں، جیسے اس کے کانوں میں ثقل ہے (یعنی جیسے بہرا ہے) سو اس (شخص) کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے (یہ تو اعراض کرنے والے کی سزا کا بیان ہوا آگے اہلِ ہدیٰ کی جزا کا بیان ہے جو کہ فلاح موعود کی تفصیل ہے یعنی) البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے عیش کی جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ نے سچا وعدہ فرمایا ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے (پس کمالِ قدرت سے وعدہ اور وعید کو واقع کر سکتا ہے اور حکمت سے اس کو حسبِ وعدہ واقع کرے گا)۔

معارف و مسائل

یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ، اس آیت میں زکوٰۃ کا حکم ہے، حالانکہ آیت مکی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ ہی میں ہجرت سے پہلے آچکا تھا۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ زکوٰۃ کا حکم ہجرت کے دوسرے سال میں نافذ ہوا اس سے مراد نصابوں کا تقرر اور مقدارِ واجب کی تفصیلات اور حکومتِ اسلامیہ کی طرف سے اس کی وصول یابی اور مصرف پر خرچ کرنے کا انتظام ہے، یہ ہجرت کے دوسرے سال میں ہوا ہے۔

ابن کثیرؒ نے سورۂ مزمل کی آیت اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کے تحت میں یہی تحقیق فرمائی ہے، کیونکہ سورۂ مزمل تو مکی سورتوں میں بالکل ابتداءِ نزولِ قرآن کے زمانے میں نازل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم کی آیات میں اکثر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے، اس کی فرضیت بھی ساتھ ساتھ ہی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لفظ اشتراء کے لغوی معنی خریدنے کے ہیں، اور بعض اوقات ایک کام کے بدلے دوسرے کام کو اختیار کرنے کے لئے بھی لفظ اشتراء استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اَلَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وغیرہ آیاتِ قرآن میں یہی معنی اشتراء کے مراد ہیں۔

اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص واقعہ ہے کہ نضر بن حارث مشرکینِ مکہ میں سے ایک بڑا تاجر تھا، اور تجارت کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کرتا تھا۔ وہ ملکِ فارس سے شاہانِ عجم کسریٰ وغیرہ کے تاریخی قصے خرید کر لایا اور مکہ کے مشرکین سے کہا کہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قوم عاد و ثمود وغیرہ کے واقعات سناتے ہیں، میں تمہیں ان سے بہرام، رستم اور اسفندیار، اور دوسرے شاہان فارس کے قصے سناتا ہوں۔ یہ لوگ اس کے قصہ کو شوق و رغبت سے سننے لگے۔ کیونکہ ان میں کوئی تعلیم تو تھی نہیں جس پر عمل کرنے کی محنت اٹھانی پڑے صرف لذیذ قسم کی کہانیاں تھیں۔ ان کی وجہ سے بہت سے مشرکین جو اس سے پہلے کلام الٰہی کے اعجاز و لذت کی وجہ سے اس کو سننے کی رغبت رکھتے اور چوری چوری سن بھی کرتے تھے، ان لوگوں کو قرآن سے اعراض کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ (ذکرہ فی روح عن اسباب النزول للواحدی عن مقاتل و ذکر نحوہ فی الدر المنثور بروایۃ البیہقی)

اور درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مذکور الصدر تاجر باہر سے ایک گانے والی کنیز (لونڈی) خرید کر لایا تھا اور اس کے ذریعہ اس نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنے کی یہ صورت نکالی کہ جو لوگ قرآن سننے کا ارادہ کریں اپنی اس کنیز سے ان کو گانا سنواتا تھا اور کہتا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو قرآن سنا کر کہتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو اور اپنی جان دو جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، آؤ تم یہ گانا سنو اور جشنِ طرب مناؤ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت اسی واقعہ پر نازل ہوئی، اور اس میں اشترا ء لہو الحدیث سے وہ قصے کہانیاں شاہان عجم کی یا یہ لونڈی گانے والی مراد ہے واقعہ نزول کے اعتبار سے لفظ اشترا اپنے حقیقی معنی میں خریدنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اور لہو الحدیث کے جو عام معنی آگے بیان ہو رہے ہیں ان کے اعتبار سے لفظ اشترا بھی اس جگہ عام ہے۔ یعنی ایک کام کے بدلے میں دوسرے کو اختیار کرنا، اس میں سامانِ لہو کی خریداری بھی داخل ہے۔

اور لہو الحدیث میں لفظ "حدیث" تو باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور لہو کے لفظی معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں۔ جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈالیں وہ لہو کہلاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی لہو کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، محض وقت گذاری کا مشغلہ یا دل بہلانے کا سامان ہو۔

آیت مذکورہ میں لہو الحدیث کے معنے اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گانے بجانے سے کی گئی ہے (رواہ الحاکم وصححہ والبیہقی فی الشعب وغیرہ)

اور جمہور صحابہ و تابعین اور عامہ مفسرین کے نزدیک لہو الحدیث عام ہے تمام

ان چیزوں کے لئے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے، اس میں غنا، مزامیر بھی داخل ہے اور بیہودہ قصے کہانیاں بھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الادب المفرد میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں لہو الحدیث کی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ هُوَ الْغِنَاءُ وَاَشْبَاهُهٗ، یعنی لہو الحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں (یعنی جو اللہ کی عبادت سے غافل کردیں) اور سنن بیہقی میں ہے کہ اشتراء لہو الحدیث سے مراد گانے بجانے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی بیہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں۔ ابن جریر نے بھی اسی عام معنی کو اختیار فرمایا ہے (روح ملخصاً) اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو، اور پھر فرمایا وفی مثل ھذا انزلت ھذہ الآیۃ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ الخ

لہو ولعب اور اس کے سامان کے شرعی احکام

ان احکام کی پوری تفصیل قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ احقر کے مستقل رسالہ "السعی الحثیث فی تفسیر لہو الحدیث" میں مذکور ہے۔ جس میں غناء و مزامیر پر بھی مفصل کلام قرآن و حدیث سے پھر فقہاء امت اور صوفیائے کرام کے اقوال سے مذکور ہے۔ یہ رسالہ بزبان عربی احکام القرآن حزب خامس میں شائع ہوچکا ہے۔ اہل علم اس کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ عوام کے لئے اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

پہلی بات قابل نظر یہ ہے کہ قرآن کریم نے جتنے مواقع میں لہو و لعب کا ذکر کیا ہے وہ مذمت اور برائی ہی کے مواقع ہیں، جس کا ادنیٰ درجہ کراہت ہے (روح المعانی و کشاف) اور آیت مذکورہ لہو کی مذمت میں بالکل واضح اور صریح ہے۔

اور مستدرک حاکم کتاب الجہاد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ لَّهْوِ الدُّنْيَا بَاطِلٌ اِلَّا ثَلٰثَةً اِنْتِضَالُكَ بِقَوْسِكَ وَتَاْدِيْبُكَ لِفَرَسِكَ وَمُلَاعَبَتُكَ لِاَهْلِكَ فَاِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ

"یعنی دنیا کا ہر لہو (کھیل) باطل ہے مگر تین چیزیں، ایک یہ کہ تم تیر کمان سے کھیلو، دوسرے اپنے گھوڑے کو سدھانے کے لئے کھیلو، تیسرے اپنی بی بی کے ساتھ کھیل کرو۔"

(حاکم نے اس حدیث کو صحیح علیٰ شرط مسلم کہا ہے، مگر ذہبی وغیرہ نے اس کی سند کے متصل

اسند ہونے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حدیث مرسل کہا ہے، مگر جمہور محدثین کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے)

اس حدیث میں ہر لہو کو باطل قرار دیا ہے اور جن تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے در حقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، کیونکہ لہو تو اس کام کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی دینی و دنیوی فائدہ معتد بہا نہ ہو۔ اور یہ تینوں چیزیں مفید کام ہیں جن سے بہت سے دینی اور دنیوی فوائد وابستہ ہیں۔ تیراندازی اور گھوڑے کو سدھانا تو جہاد کی تیاری میں داخل ہیں، اور بیوی کے ساتھ ملاعبت تو الدو تناسل کے مقصد کی تکمیل ہے۔ ان کو صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے لہو کہہ دیا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے لہو میں داخل ہی نہیں۔ اسی طرح ان تین چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے کام ہیں جن سے دینی یا دنیوی فوائد متعلق ہیں اور صورت کے اعتبار سے وہ لہو (کھیل) سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی دوسری روایات حدیث میں جائز بلکہ بعض کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آجائیگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام حقیقۃً لہو ہوں، یعنی جن میں نہ کوئی دینی فائدہ ہو نہ دنیوی، وہ سب کے سب مذموم اور مکروہ تو ضرور ہی ہیں، پھر ان میں تفصیل ہے۔ بعض تو کفر کی حد تک پہونچ جاتے ہیں، بعض حرام صریح ہیں اور کم سے کم درجہ مکروہ تنزیہی، یعنی خلاف اولیٰ ہونے کا ہے، جس سے کوئی لہو جو درحقیقت لہو ہو مستثنیٰ نہیں۔ اور جن کھیلوں کو احادیث میں مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ حقیقۃً لہو میں داخل ہی نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں خود اس کی تصریح موجود ہے۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت کتاب الجہاد میں ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں لَيْسَ مِنَ اللَّهْوِ ثَلَاثٌ تَأْدِيبُ الرَّجُلِ فَرَسَهُ وَمُلَاعَبَتُهُ أَهْلَهُ وَرَمْيُهُ بِقَوْسِهِ وَنَبْلِهِ الحديث، (نصب الرایہ ص ۲۷۳، ج ۴) اس حدیث نے خود یہ تصریح کر دی کہ یہ تین چیزیں جو مستثنیٰ کی گئی ہیں درحقیقت وہ لہو میں داخل ہی نہیں، اور جو حقیقۃً لہو ہے وہ باطل اور مذموم ہے، آگے اس کے مذموم ہونے کے مختلف درجات ہیں۔

۱۔ جو کھیل دین سے گمراہ ہونے یا دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنے وہ کفر ہے۔ جیسا کہ آیت مذکور الصدر وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ میں اس کا کفر وضلال ہونا بیان فرمایا گیا، اور اس کی سزا عذاب مہین قرار دی ہے جو کفار کی سزا ہے کیونکہ یہ آیت نضر بن حارث کے جس واقعہ پر نازل ہوئی ہے اس میں اس لہو کو اس نے اسلام کے خلاف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس لئے یہ لہو حرام

ہونے کے ساتھ کفر تک پہونچ گیا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی لہو لوگوں کو اسلامی عقائد سے تو گمراہ نہیں کرتا مگر ان کو کسی حرام اور معصیت میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ کفر تو نہیں مگر حرام اور سخت گناہ ہے جیسے وہ تمام کھیل جن میں قمار اور جوا ہو یعنی ہار جیت پر مال کا لین دین ہو، یا جو انسان کو ادائے فرائض نماز روزہ وغیرہ سے مانع ہوں۔

فحش اور فضول ناول یا فحش اشعار اور اہل باطل کی کتابیں بھی دیکھنا ناجائز ہیں | اس زمانے میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ سب چیزیں اسی قسم لہو حرام میں داخل ہیں اسی طرح گمراہ اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ بھی عوام کے لئے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، راسخ العلم علماء ان کے جواب کے لئے دیکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ اور جن کھیلوں میں نہ کفر ہے نہ کوئی کھلی ہوئی معصیت، وہ مکروہ ہیں کہ ایک بے فائدہ کام میں اپنی توانائی اور وقت کو ضائع کرنا ہے۔

کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت | مذکورہ تفصیل سے کھیلوں کے سامان کی خرید و فروخت کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ جو سامان کفر و ضلال یا حرام و معصیت ہی کے کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ اور جو لہو مکروہ میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی مکروہ ہے۔ اور جو سامان جائز اور مستثنیٰ کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی تجارت بھی جائز ہے۔ اور جس سامان کو جائز اور ناجائز دونوں طرح کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس کی تجارت جائز ہے۔

مباح اور جائز کھیل | اوپر یہ بات تفصیل سے آ چکی ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ لہو اور کھیل ہے جس میں کوئی دینی دنیوی فائدہ نہیں۔ جو کھیل بدن کی ورزش، صحت اور تندرستی باقی رکھنے کے لئے یا کسی دوسری دینی و دنیوی ضرورت کے لئے یا کم از کم طبیعت کا تکان دور کرنے کے لئے ہوں اور ان میں غلو نہ کیا جائے کہ انہی کو مشغلہ بنا لیا جائے اور ضروری کاموں میں ان سے حرج پڑنے لگے تو ایسے کھیل شرعاً مباح اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو ثواب بھی ہیں۔

مذکورہ حدیث میں تین کھیلوں کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنا اوپر گذر چکا ہے۔ تیر اندازی، گھوڑے کی سواری، اپنے اہل کے ساتھ ملاعبت۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے: خیر لھو المؤمن السباحۃ وخیر لھو المرأۃ

المغزل (جامع صغیر برمز ابن عدی باسناد ضعیف) "یعنی مؤمن کا اچھا کھیل تیراکی ہے اور عورت کا اچھا کھیل چرخہ ہے۔"

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت سلمہ ابن اکوع رض کی روایت ہے کہ انصار مدینہ میں ایک صاحب دوڑ میں بڑے ماہر تھے، کوئی ان سے سبقت نہ لے جا سکتا تھا، انھوں نے ایک روز اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ میں مقابلہ کروں، آپ نے اجازت دیدی تو میں مقابلہ میں آگے بڑھ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ پیدل دوڑ کی مشق کرنا بھی جائز ہے۔

ایک مشہور پہلوان رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی ٹھہرائی تو آپ نے اس کو کشتی میں پچھاڑ دیا (ابوداؤد فی المراسیل)

حبشہ کے کچھ نوجوان مدینہ طیبہ میں فن سپہ گری کی مشق کرنے کے لئے نیزوں وغیرہ سے کھیلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کھیل حضرت عائشہ رض کو اپنی پشت کے پیچھے کھڑا کر کے دکھلایا اور ان لوگوں کو فرمایا کہ الْهُوْا وَالْعَبُوْا "یعنی کھیل کود کرتے رہو" (رواہ البیہقی فی الشعب کذا فی الکنز من باب اللہو) اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی آئے ہیں اِنِّیْ اَکْرَهُ اَنْ یُّرٰی فِیْ دِیْنِکُمْ غِلْظَةٌ "یعنی میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تمہارے دین میں خشکی اور شدت دیکھی جائے۔"

اسی طرح بعض صحابہ کرام سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن و حدیث کے مشاغل میں تھک جاتے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے (ذکرہ عن ابن عباس رض فی کف الرعاع)

ایک حدیث میں ارشاد ہے: رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَسَاعَةً اخرجہ ابوداؤد فی مراسیلہ عن ابن شہاب مرسلاً "یعنی تم اپنے قلوب کو کبھی کبھی آرام دیا کرو" جس سے قلب و دماغ کی تفریح اور اس کے لئے کچھ وقت نکالنے کا جواز ثابت ہوا۔

شرط ان سب چیزوں میں یہ ہے کہ نیت ان مقاصد صحیحہ کی ہو جو ان کھیلوں میں پائے جاتے ہیں، محض برائے کھیل مقصد نہ ہو اور وہ بھی بقدر ضرورت ہو، اس میں توسع اور غلو نہ ہو۔ اور وجہ ان سب کھیلوں کے جواز کی وہی ہے کہ درحقیقت یہ جب اپنی حد کے اندر ہوں تو لہو کی تعریف میں داخل ہی نہیں۔

بعض کھیل جو صراحۃً ممنوع کئے گئے

اس کے ساتھ بعض کھیل ایسے بھی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر منع فرما دیا ہے، اگرچہ ان میں کچھ فوائد

بھی مبتلا ہو جاویں، مثلاً شطرنج، چوسر وغیرہ اگر ان کے ساتھ ہار جیت اور مال کا لین دین ہو تو یہ جوا ہے اور قطعی حرام ہیں، اور یہ نہ ہو محض دل بہلانے کے لئے کھیلے جاویں تب بھی حدیث میں ان کو منع فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر یعنی چوسر کھیلتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے خون میں رنگے ہوں۔ اسی طرح ایک روایت میں شطرنج کھیلنے والے پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں (عقیلی فی الضعفاء عن ابی ہریرۃ کذا فی نصب الرایہ)

اسی طرح کبوتر بازی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز قرار دیا (ابوداؤد فی المراسیل عن شریح کذا فی الکنز) ان کی ممانعت کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ عموماً ان میں مشغولیت ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو ضروری کام یہاں تک کہ نماز اور دوسری عبادت سے بھی غافل کر دیتی ہے۔

غناء و مزامیر کے احکام

آیت مذکورہ میں چند صحابہ کرام نے تو لَہْوَ الْحَدِيثِ کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے، اور دوسرے حضرات نے اگرچہ تفسیر عام قرار دی ہے، ہر ایسے کھیل کو جو اللہ سے غافل کرے لَہْوَ الْحَدِيثِ فرمایا ہے، مگر ان کے نزدیک بھی گانا بجانا اس میں داخل ہے۔

اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ میں امام ابوحنیفہ اور مجاہد اور محمد بن الحنفیہ وغیرہ نے زُور کی تفسیر غناء (گانے بجانے) سے کی ہے۔

اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے سنن میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّونَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا يُعْزَفُ عَلَى رُءُوسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ، يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْأَرْضَ وَيَجْعَلُ اللّٰهُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ

"میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پئیں گے ان کے سامنے معازف و مزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خسف کر دے گا، اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا۔"

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوے اور طبلہ و سارنگی کو حرام کیا ہے، اور فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔ (رواہ امام احمد و ابوداؤد و ابن حبان)

روی عن ابی ھُریرۃَ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتخذ الفیئ دولاً والامانۃ مغنمًا والزکوٰۃ مغرمًا وتعلم لغیر الدین واطاع الرجل امرأتہ وعق اُمّہ وادنی صدیقہ واقصی اباہ وظھرت الاصوات فی المساجد وساد القبیلۃ فاسقھم وکان زعیم القوم ارذلھم واُکرِمَ الرّجل مخافۃ شرّہ وظھرت القیان والمعازف وشربت الخمور ولعن آخر ھٰذہ الامّۃ اوّلھا فلیرتقبوا عند ذٰلک ریحًا حمراء وزلزلۃ وخسفًا ومسخًا وقذفًا واٰیات تتابع کنظام بال قطع سلکہ فتتابع بعضہ بعضًا (رواہ الترمذی وقال ھٰذا حدیث حسن غریب)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مالِ غنیمت کو شخصی دولت بنالیا جائے اور جب لوگوں کی امانت کو مالِ غنیمت سمجھ لیا جائے اور جب زکوٰۃ کو ایک تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم دین کو دنیا طلبی کے لئے سیکھا جانے لگے اور جب مرد اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور رکھے، اور مسجدوں میں شور وغل ہونے لگے اور قبیلہ کا سرداران کا فاسق بدکار بن جائے اور جب قوم کا سرداران میں ارذل بدترین آدمی ہو جائے، اور جب شریر آدمیوں کی عزت ان کے شر کے خوف سے کی جانے لگے، اور جب گانے والی عورتوں اور باجوں گاجوں کا رواج عام ہو جائے، اور جب شرابیں پی جانے لگیں اور اس امت کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں تو اس وقت تم انتظار کرو ایک سُرخ آندھی کا اور زلزلہ کا اور زمین خسف ہو جانے اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور قیامت کی ایسی نشانیوں کا جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے دانے بیک وقت بکھر جاتے ہیں۔"

تنبیہِ ضروری اس حدیث کے الفاظ کو بار بار پڑھیے اور دیکھیے کہ اس وقت کی دنیا کا پورا پورا نقشہ ہے، اور وہ گناہ جو مسلمانوں میں عام ہو چکے ہیں اور بڑھتے جارہے ہیں، ان کی خبر چودہ سو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی ہے۔ مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ایسے حالات سے باخبر رہیں، اور گناہوں سے بچنے بچانے کا پورا اہتمام کریں۔ ورنہ جب یہ گناہ عام ہو جائیں گے تو ایسے گناہ کرنے والوں پر آسمانی عذاب نازل ہوں گے، اور پھر قیامت کی آخری علامات سامنے آجائیں گی۔ ان گناہوں میں سے عورتوں کا گانا اور گانے بجانے کے آلات

طبلہ سارنگی وغیرہ بھی ہیں، اس جگہ اس روایت کو اسی مناسبت سے نقل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی مستند احادیث ہیں جن میں گانے بجانے کو حرام و ناجائز فرمایا ہے اور اس پر وعید شدید ہے۔ ان تمام روایات کو احقر نے اپنے رسالہ کشف الغناء عن وصف الغناء میں لکھ دیا ہے۔ یہ رسالہ بھی بزبانِ عربی احکام القرآن حزب خامس میں شائع ہو چکا ہے، یہاں ان میں سے چند نقل کی گئی ہیں۔

خوش آوازی کے ساتھ بغیر مزامیر کے مفید اشعار کا پڑھنا ممنوع نہیں

اس کے مقابل بعض روایات سے غنا یعنی گانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے، یہ روایات بھی رسالہ مذکورہ میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تطبیق ان دونوں میں اس طرح ہے کہ جو گانا اجنبی عورت کا ہو یا اس کے ساتھ طبلہ سارنگی وغیرہ مزامیر ہوں وہ حرام ہے۔ جیسا کہ مذکور الصدر آیاتِ قرآن اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا، اور اگر محض خوش آوازی کے ساتھ کچھ اشعار پڑھے جائیں اور پڑھنے والی عورت یا امرد نہ ہوں، اور اشعار کے مضامین بھی فحش یا کسی دوسرے گناہ پر مشتمل نہ ہوں تو جائز ہے۔

بعض صوفیائے کرام سے جو سماعِ غنا منقول ہے وہ اسی قسم کے جائز غنا پر محمول ہے۔ کیونکہ ان کا اتباعِ شریعت اور طاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب کی طرح یقینی ہے، ان سے ایسے گناہ کے ارتکاب کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ محققین صوفیائے کرام نے خود اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اس معاملہ میں مذاہب اربعہ کے فقہاء اور صوفیائے کرام کے اقوال مذکور الصدر رسالہ میں تفصیل سے جمع کر دیئے گئے ہیں، یہاں اسی اختصار پر اکتفا کیا گیا۔ واللہ المستعان

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ

بنائے آسمان بغیر ستونوں کے تم اس کو دیکھتے ہو اور رکھ دیئے زمین پر

رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا

پہاڑ کہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے اور بکھیر دیئے اس میں سب طرح کے جانور اور اتارا ہم نے

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾

آسمان سے پانی پھر اگائے زمین میں ہر قسم کے جوڑے خاصے،

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ

یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھلاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں

بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۱﴾ ع

کچھ نہیں پر بے انصاف صریح بھٹک رہے ہیں۔

ع ۱۱ | ۱

خُلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلا ستون بنایا (چنانچہ) تم ان کو دیکھ رہے ہو اور زمین میں (بھاری بھاری) پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈانواڈول نہ ہونے لگے اور اس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام (نباتات کے) اگائے (اور ان لوگوں سے جو کہ شرک کرتے ہیں کہئے کہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں (سو اگر تم دوسروں کو شریک الوہیت قرار دیتے ہو تو) اب تم لوگ مجھ کو دکھاؤ کہ اس کے سوا جو (معبود تم نے بنا رکھے) ہیں انھوں نے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں (تاکہ ان کا استحقاق الوہیت ثابت ہو، اور اس دلیل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ لوگ ہدایت پر آجاتے، مگر انھوں نے ہدایت کو قبول نہیں کیا) بلکہ یہ ظالم لوگ (بدستور) صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

معارف ومسائل

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ رعد کے شروع میں گذر چکی ہے، اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس عبارت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

ایک یہ کہ تَرَوْنَهَا کو عَمَدٍ کی صفت قرار دیا جائے اور اس کی ضمیر عَمَدٍ کی طرف راجع کی جائے تو معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو، یعنی اگر ستون ہوتے تم ان کو دیکھتے، جب ستون نظر نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ یہ آسمان کی عظیم الشان چھت بغیر ستونوں کے بنائی گئی ہے، یہ تفسیر حضرت حسنؒ اور قتادہ سے منقول ہے۔ (ابن کثیر)

دوسری صورت یہ ہے کہ تَرَوْنَهَا کی ضمیر سمٰوٰت کی طرف راجع ہو، اور یہ جملہ

مستقل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا کیا، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اور پہلی ترکیب کی صورت میں ایک معنی یہ بھی کئے جاسکتے ہیں کہ آسمان ستونوں پر قائم ہیں ان کو تم دیکھ نہیں سکتے وہ غیر مرئی ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہؒ اور مجاہدؒ سے منقول ہے (ابن کثیر)

بہرصورت اس آیت نے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی یہ نشانی بتلائی کہ آسمان کی اتنی وسیع و عریض اور اتنی بلند عظیم الشان چھت کو ایسا بنایا ہے کہ اس میں کوئی عمود اور ستون نہیں دیکھا جاتا ہے۔

ایک سوال و جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آسمان جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ ایک کرہ یعنی گول چیز ہے، اور ایسے گول کرہ میں وہ جہاں بھی ہو عادۃً عمود و ستون نہیں ہوتے، تو آسمان کی کیا خصوصیت ہے؟

اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے اکثر مواقع میں زمین کو فراش فرمایا، جو گول اور کرہ ہونے کے بظاہر منافی ہے، مگر اس کی وسعت کی وجہ سے وہ عام نظروں میں ایک سطح کی طرح دیکھی جاتی ہے، اسی عوامی تخیل کی بناء پر قرآن کریم نے اس کو فراش فرمایا، اسی طرح آسمان ایک چھت کی طرح نظر آتا ہے جس کے لئے عادۃً ستونوں اور عماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عام خیال کے مناسب اس کا بلا ستون ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ اور درحقیقت قدرت کاملہ کے ثبوت کے لئے اتنے بڑے عظیم الشان کرہ کی تخلیق ہی کافی ہے۔ اور بعض مفسرین ابن کثیر وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا مکمل کرہ ہونا قرآن و سنت کی رو سے ثابت نہیں، بلکہ بعض آیات و روایات سے اس کا ایک قبہ کی شکل میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک صحیح حدیث میں جو ہر روز آفتاب کا تحت العرش پہونچ کر سجدہ کرنا مذکور ہے وہ اسی صورت پر ہو سکتا ہے کہ آسمان مکمل کرہ نہ ہو، اسی صورت میں اس میں فوق و تحت یعنی اوپر نیچے کی جہت متعین ہو سکتی ہے، مکمل کرہ میں کسی جہت و سمت کو اوپر یا نیچے نہیں کہہ سکتے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ

اور ہم نے دی لقمان کو عقلمندی کہ حق مان اللہ کا، اور جو کوئی حق مانے اللہ کا

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

تو مانے گا اپنے بھلے کو اور جو کوئی منکر ہوگا تو اللہ بے پرواہ ہے سب تعریفوں والا

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ

اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو جب اس کو سمجھانے لگا اے بیٹے شریک نہ ٹھہرائیو اللہ کا،

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ

بیشک شریک بنانا بھاری بے انصافی ہے، اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ

پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اس کا دو برس میں کہ

اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ

حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا آخر مجھی تک آنا ہے، اور اگر وہ دونوں تجھ سے

عَلٰي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ

اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور

صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ

ساتھ دے ان کا دنیا میں دستور کے موافق اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری

اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

طرف، پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا پھر میں جتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ

اے بیٹے اگر کوئی چیز ہو برابر رائی کے دانہ کی پھر وہ ہو کسی پتھر میں

اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ

یا آسمانوں میں یا زمین میں لا حاضر کرے اس کو اللہ بیشک اللہ جانتا ہے چھپی ہوئی

خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ

چیزوں کو، خبردار ہے، اے بیٹے قائم رکھ نماز کو اور سکھلا بھلی بات اور منع کر

عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۷)

برائی سے اور تحمل کر جو تجھ پر پڑے بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ

اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف اور مت چل زمین پر اترا کر بے شک

اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸) وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ

اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا بڑائیاں کرنے والا، اور چل بیچ کی چال اور نیچی کر

مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (۱۹)

آواز اپنی، بے شک بری سے بری آواز گدھے کی آواز ہے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لقمان کو دانشمندی (جس کی حقیقت علم مع العمل ہے) عطا فرمائی (اور ساتھ ہی یہ حکم دیا) کہ (سب نعمتوں پر عموماً اور اس نعمت حکمت پر کہ افضل النعم ہے خصوصاً) اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (یعنی اسی کا نفع ہے کہ اس سے نعمت میں ترقی ہوتی ہے کما قال تعالیٰ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ، دینی نعمت میں تو ترقی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی، دنیا میں تو شکر نعمت سے علم بڑھتا ہے اور توفیق عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں ثواب عظیم ملتا ہے، اور دنیوی میں آخرت کی ترقی یعنی ثواب میں اضافہ تو یقینی ہے اور کبھی دنیا میں شکر کرنے سے نعمت بڑھ جاتی ہے) اور جو ناشکری کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بے نیاز (اور سب) خوبیوں والا ہے (یعنی چونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے جو مدلول ہے حمید کا اس لئے وہ غنی ہے، اس کو کسی کے شکر و ثنا کی احتیاج نہیں، کہ اس میں استکمال بالغیر لازم آتا ہے اور چونکہ لقمان موصوف ہیں حکمت یعنی علم و عمل کے ساتھ، اس سے مفہوم ہوا کہ انہوں نے تعلیم شکر پر بھی شکر کیا ہوگا پس وہ شاکر بھی تھے اور شاکر ہونے سے ان کی حکمت میں ترقی بھی ہوئی ہوگی پس وہ اعلیٰ درجہ کے حکیم ہوئے) اور (ایسے حکیم کی تعلیم ضرور قابل عمل ہونا چاہئے سو ان کی تعلیمات ان لوگوں کے سامنے ذکر کیجئے) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے

برابر (مقدار میں) ہو اور پھر (فرض کرو کہ) وہ کسی پتھر کے اندر (چھپا رکھا) ہو (جو کہ ایسا حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا دشوار ہے اور بدون رفع کسی کو اس کے اندر کا علم نہیں ہوتا) یا وہ آسمانوں کے اندر ہو (جو کہ عام خلائق سے مکاناً بہت بعید ہے) یا وہ زمین کے اندر ہو (جہاں خوب ظلمت رہتی ہے، اور یہی اسباب ہیں عام مخلوق کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کے، کیونکہ کبھی کوئی چیز چھوٹی اور باریک ہوتی ہے کہ نظر میں نہیں آتی اور کبھی کوئی شدید حجاب حائل ہونے سے کبھی مکان کے بعید ہونے سے کبھی ظلمت سے، لیکن حق تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر یہ اسباب بھی چھپنے کے مجتمع ہوں) تب بھی (قیامت کے روز حساب کے وقت) اس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا (جس سے علم اور قدرت دونوں ثابت ہوئی) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بیں (اور) باخبر ہے (اور اعمال کے باب میں یہ نصیحت کی کہ) بیٹا نماز پڑھا کرو (کہ بعد تصحیح عقائد کے اعلیٰ درجہ کا عمل ہے) اور (جیسا تصحیح عقائد و اعمال سے اپنی تکمیل کی ہے اسی طرح دوسروں کی تکمیل کی بھی کوشش کرنا چاہئے، پس لوگوں کو) اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور بُرے کاموں سے منع کیا کر اور (اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالخصوص اور ہر حالت میں بالعموم) تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر یہ (صبر کرنا) ہمت کے کاموں سے ہے اور (اخلاق و عادات کے باب میں یہ نصیحت کی کہ بیٹا) لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر (نہ بہت دوڑ کر چل کہ وقار کے خلاف ہے، نیز گر جانے کا بھی احتمال ہے، اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ وضع متکبرین کی ہے، بلکہ بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع و سادگی کی چال اختیار کر، جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ذکر کیا ہے یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا) اور (بولنے میں) اپنی آواز کو پست کر (یعنی بہت غل مت مچا، اور یہ مطلب نہیں کہ اتنی پستی کر کہ دوسرا سے بھی نہیں آگے غل مچانے سے نفرت دلاتے ہیں کہ) بیشک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز (ہوتی) ہے (تو آدمی ہو کر گدھوں کی طرح چیخنا اور چلانا کیا مناسب ہے، نیز چیخ چلانے سے بعض اوقات دوسروں کو وحشت و اذیت بھی ہوتی ہے) ؛

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ، حضرت لقمان علیہ السلام، وہب بن منبہؒ کی روایت کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، اور مقاتلؒ نے ان کا خالہ زاد بھائی بتلایا ہے۔ اور تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ ان کی عمر دراز ہوئی، یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا یہ بات دوسری روایات سے بھی ثابت ہے کہ لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوئے ہیں۔

اور تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ لقمان ایک حبشی غلام تھے، نجاری کا کام کرتے تھے (اخرجہ ابن ابی شیبہ واحمد فی الزہد وابن جریر وابن المنذر وغیرہ) اور حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ان کے حالات دریافت کئے گئے تو فرمایا کہ پست قد پست ناک کے حبشی تھے، اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ حبشی غلام موٹے ہونٹ والے پھٹے ہوئے قدموں والے تھے (ابن کثیر)

ایک سیاہ رنگ حبشی حضرت سعید بن مسیبؒ کے پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا تو حضرت سعیدؒ نے اس کی تسلی کے لئے فرمایا کہ تم اپنے کالے ہونے پر غم نہ کرو، کیونکہ کالے لوگوں میں تین بزرگ ایسے ہیں جو لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔ حضرت بلال حبشیؓ، اور مہجعؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام اور حضرت لقمان علیہ السلام۔

لقمان علیہ السلام جمہور سلف کے نزدیک نبی نہیں بلکہ ولی اور حکیم تھے

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ جمہور سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، صرف حضرت عکرمہؒ سے ان کا نبی ہونا نقل کیا جاتا ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ اور امام بغویؒ نے فرمایا کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ فقیہ اور حکیم تھے نبی نہیں تھے۔ (مظہری)

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ حضرت قتادہؓ سے ان کے بارے میں ایک عجیب روایت یہ منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت لقمان کو اختیار دیا تھا کہ نبوت لے لو یا حکمت، انھوں نے حکمت کو اختیار کر لیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان کو نبوت کا اختیار دیا گیا تھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ اگر اس کے قبول کرنے کا حکم ہے تو میرے سر آنکھوں پر ورنہ مجھے معاف فرمایا جائے۔

اور حضرت قتادہؓ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ لقمان علیہ السلام سے کسی نے

پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر کیوں ترجیح دی جبکہ آپ کو دونوں کا اختیار دیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ نبوت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے، اگر وہ مجھے بغیر میرے اختیار کے دے دیا جاتا تو حق تعالیٰ خود اس کی کفالت فرماتے کہ میں اس کے فرائض ادا کر سکوں اور اگر میں اپنے اختیار سے اس کو طلب کرتا تو ذمہ داری مجھ پر ہوتی (ابن کثیر)

اور جبکہ لقمان علیہ السلام کا نبی نہ ہونا جمہور کے نزدیک مسلّم ہے، تو پھر ان کو وہ حکم جو قرآن میں مذکور ہے اَنِ اشْكُرْ لِيْ یہ بذریعہ الہام ہو سکتا ہے جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے شرعی مسائل میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے، جب داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا کہ اب میری ضرورت نہیں رہی، بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام سے کلمات حکمت بہت منقول ہیں۔ وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت لقمان علیہ السلام کی حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت لقمان ایک روز ایک بڑی مجلس میں لوگوں کو حکمت کی باتیں سنا رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا تم وہی نہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے؟ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں میں وہی ہوں، اس شخص نے پوچھا کہ پھر آپ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ خلق خدا آپ کی تعظیم کرتی ہے اور آپ کے کلمات سننے کے لئے دور دور سے جمع ہوتی ہے۔ لقمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا سبب میرے دو کام ہیں ایک ہمیشہ سچ بولنا، دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت لقمان نے فرمایا کہ چند کام ایسے ہیں جنھوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا، اگر تم اختیار کر لو تو تمہیں بھی یہی درجہ اور مقام حاصل ہو جائے گا۔ وہ کام یہ ہیں: اپنی نگاہ کو پست رکھنا اور زبان کو بند رکھنا، حلال روزی پر قناعت کرنا، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، بات میں سچائی پر قائم رہنا، عہد کو پورا کرنا، مہمان کا اکرام کرنا، پڑوسی کی حفاظت کرنا، اور فضول کام اور کلام کو چھوڑ دینا۔ (ابن کثیر)

حکمت جو لقمان علیہ السلام کو دی گئی اس سے کیا مراد ہے؟

لفظ حکمت قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ علم، عقل، حلم و بردباری، نبوت، اصابت رائے۔

ابوحیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور ان کے دلوں میں مؤثر ہو اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہونچائیں۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل و فہم اور ذہانت ہے۔ اور بعض حضرات

نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے، اور درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں، یہ سبھی چیزیں حکمت میں داخل ہیں۔ اوپر خلاصہ تفسیر میں حکمت کا ترجمہ دانشمندی سے اور اس کی تفسیر علم یا عمل سے کی گئی ہے یہ بہت جامع اور واضح ہے۔

آیت مذکورہ میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت عطا کرنے کا ذکر فرما کر آگے فرمایا ہے اَنِ اشْكُرْ لِيْ، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہاں قُلْنَا محذوف مانا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی اور یہ حکم دیا کہ میرا شکر ادا کیا کرو، اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اَنِ اشْكُرْ لِيْ خود حکمت کی تفسیر ہے، یعنی وہ حکمت جو لقمان کو دی گئی یہ تھی کہ ہم نے اس کو شکر کا حکم دیا جس کی انھوں نے تعمیل کی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرگذار رہنا سب سے بڑی حکمت ہے۔ اس کے بعد یہ جتلا دیا کہ یہ شکرگذاری کا حکم ہم نے کچھ اپنے فائدہ کے لئے نہیں دیا ہمیں کسی کے شکر کی حاجت نہیں، بلکہ یہ خود انہی کے فائدے کے لئے دیا ہے کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکر ادا کرتا ہے ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد لقمان علیہ السلام کے کچھ کلماتِ حکمت کا ذکر فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے، وہ کلمات حکمت قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

ان کلمات حکمت میں سب سے اول تو عقائد کی درستی ہے، اور ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک بلا شرکت غیرے یقین کرے۔ اس کے ساتھ کسی غیر اللہ کو شریک عبادت نہ کرے کہ اس دنیا میں اس سے بڑا بھاری ظلم کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کی کسی مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرائے، اس لئے فرمایا يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ، آگے حضرت لقمان کی دوسری نصائح اور کلمات حکمت آتے ہیں جو اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرماتے تھے۔ درمیان میں حق تعالیٰ نے شرک کے ظلم عظیم ہونے اور کسی حال اس کے پاس نہ جانے کی ہدایات کے لئے ایک اور حکم ارشاد فرمایا:

والدین کی شکرگذاری اور طاعت فرض ہے، مگر حکم الٰہی کے خلاف کسی کی طاعت جائز نہیں

کہ اگرچہ ہم نے اولاد کو اپنے ماں باپ کی اطاعت اور شکرگذاری کی بڑی تاکید کی ہے، اور اپنی شکرگذاری و اطاعت کے ساتھ ساتھ والدین کی شکرگذاری اور اطاعت کا حکم دیا ہے، لیکن شرک ایسا ظلم عظیم اور سنگین جرم ہے کہ وہ ماں باپ کے کہنے سے اور مجبور کرنے سے بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا، اگر کسی کو اس کے والدین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو

شریک قرار دینے پر مجبور کرنے لگیں تو اس معاملہ میں والدین کا کہنا بھی ماننا جائز نہیں۔

اور یہاں جبکہ والدین کے حقوق اور ان کی شکرگذاری کا حکم دیا گیا تو اس کی حکمت یہ بتلادی کہ اس کی ماں نے اس کے وجود و بقاء میں بڑی محنت برداشت کی ہے، کہ نو مہینے تو اس کو اپنے شکم میں رکھ کر اس کی حفاظت کی اور اس کی وجہ سے جو روز بروز اس کو ضعف پر ضعف اور تکلیف پر تکلیف بڑھتی گئی۔۔۔ اس کو برداشت کیا، پھر اس کے پیدا ہونے کے بعد بھی دو سال تک اس کو دودھ پلانے کی زحمت برداشت کی جس میں ماں کو خاصی محنت بھی شب و روز اٹھانی پڑتی ہے، اور اس کا ضعف بھی اس سے بڑھتا ہے، اور چونکہ بچے کی پرورش میں محنت و مشقت زیادہ ماں اٹھاتی ہے، اس لئے شریعت میں ماں کا حق باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے، وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ کا یہی مطلب ہے اور اس کے بعد وَاِنْ جَاهَدَاكَ میں یہ بتلایا ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کے معاملہ میں والدین کی اطاعت بھی حرام ہے۔

اسلام کا بے نظیر قانونِ عدل | اور ایسی صورت میں کہ ماں باپ اس کو شرک و کفر پر مجبور کریں اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہو کہ ان کی بات نہ مانو، تو طبعی طور پر انسان حد پر قائم نہیں رہتا، اس پر عمل کرنے میں اس کا امکان تھا کہ بیٹا والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخوئی سے پیش آئے ان کی توہین کرے۔ اسلام ایک قانونِ عدل ہے، ہر چیز کی ایک حد ہے، اس لئے شرک میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیدیا کہ:

صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا، یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو، مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ اس میں کمی نہ ہونے دو، بلکہ دنیوی معاملات میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو ان کی بے ادبی نہ کرو انکی بات کا جواب ایسا نہ دو جس سے بلاضرورت دلآزاری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے شرک و کفر کے معاملہ میں نہ ماننے سے جو اُن کی دل آزاری ہوگی وہ تو مجبوری کے لئے برداشت کرو، مگر ضرورت کو ضرورت کی حد میں رکھو، دوسرے معاملات میں ان کی دل آزاری سے پرہیز کرتے رہو۔

فائدہ :۔ اس آیت میں جو بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے، یہ عام عادت کے مطابق ہے۔ اس میں اس کی کوئی تشریح و تصریح نہیں کہ اس سے زیادہ مدت تک دودھ پلایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس مسئلہ کی تشریح سورۂ احقاف کی آیت وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا کے تحت میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

دوسری وصیتِ لقمانی متعلقہ عقائد

یہ ہے کہ اس کا عقیدہ جازم رکھا جائے کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرہ پر اللہ تعالیٰ کا علم بھی محیط اور وسیع ہے اور سب پر اس کی قدرت بھی کامل ہے۔ کوئی چیز کتنی ہی چھوٹی سے چھوٹی ہو جو عام نظروں میں نہ آسکتی ہو اسی طرح کوئی چیز کتنی ہی دور دراز ہو اسی طرح کوئی چیز کتنے ہی اندھیروں اور پردوں میں ہو اللہ تعالیٰ کے علم و نظر سے نہیں چھپ سکتی، اور وہ جس کو جب چاہیں جہاں چاہیں حاضر کرسکتے ہیں۔ یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ الآیۃ کا یہی مطلب ہے۔ اور حق تعالیٰ کے علم و قدرت کا ہر چیز پر محیط ہونا خود بھی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور عقیدۂ توحید کی بہت بڑی دلیل ہے۔

تیسری وصیتِ لقمانی متعلقہ اصلاحِ عمل

اعمالِ واجبہ تو بہت ہیں مگر ان سب میں سب سے بڑا اور اہم عمل نماز ہے، اور خود اہم ہونے کے ساتھ وہ دوسرے اعمال کی درستی کا ذریعہ بھی ہے۔ جیسا کہ نماز کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، اس لئے اعمالِ صالحہ واجبہ میں سے نماز کے ذکر پر اکتفاء فرمایا یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ یعنی اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرو۔ اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کے تمام ارکان و آداب کو پوری طرح بجا لانا، اس کے اوقات کی پابندی کرنا اور اس پر مداومت کرنا سب اقامتِ صلوٰۃ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

چوتھی وصیتِ لقمانی متعلقہ اصلاحِ خلق

اسلام ایک اجتماعی دین ہے فرد کی اصلاح کے ساتھ جماعت کی اصلاح اس کے نظام کا اہم جزو ہے اس لئے نماز جیسے اہم فریضہ کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ذکر فرمایا گیا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دو اور بُرے کاموں سے روکو وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ دو فرض ہیں ایک اپنی اصلاح اور دوسرا عام مخلوق کی اصلاح۔ دونوں ایسے ہیں کہ دونوں کی پابندی میں خاصی مشقت و محنت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں، خصوصاً اصلاحِ خلق کے لئے امر بالمعروف کی خدمت کا صلہ دنیا میں ہمیشہ عداوتوں اور مخالفتوں سے ملا کرتا ہے۔ اس لئے اس وصیت کے ساتھ ہی یہ وصیت بھی فرمائی کہ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، یعنی ان کاموں میں تمہیں جو کچھ تکلیف پیش آئے اس پر صبر و ثبات سے کام لو۔

پانچویں وصیتِ لقمانی متعلقہ آدابِ معاشرت

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ، لاتصعر، صعر سے مشتق ہے جو اونٹ کی ایک بیماری ہے جس سے اس کی گردن مڑ جاتی ہے، جیسے

انسانوں میں لقوہ معروف بیماری ہے جس سے چہرہ ٹیڑھا ہوجاتا ہے، مراد اس سے رُخ پھیر لینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملاقات اور گفتگو میں ان سے مُنہ پھیر کر گفتگو نہ کرو جو اُن سے اعراض کرنے اور تکبر کرنے کی علامت ہے اور خوقِ شریفانہ کے خلاف ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا، مرح اکڑکر، اترا کر چلنا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے سارے عنصر سے پست افتادہ بنایا ہے تم اسی سے پیدا ہوئے اسی پر چلتے پھرتے ہو اپنی حقیقت کو پہچانو اترا کر نہ چلو جو متکبرین کا طریقہ ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ، "یعنی اللہ نہیں پسند کرتا کسی متکبر فخر کرنے والے کو۔

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ، یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، نہ بہت دوڑ بھاگ کر چلو، کہ وہ وقار کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلنے میں بہت جلدی کرنا مومن کی رونق ضائع کر دیتا ہے۔ (جامع صغیر عن ابی ہریرةؓ) اور اس طرح چلنے میں خود اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو تکلیف بھی پہونچنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور نہ بہت آہستہ چلو، جو یا تو اُن متکبر اور تصنّع کرنے والوں کی عادت ہے جو لوگوں پر اپنا امتیاز جتانا چاہتے ہیں، یا عورتوں کی عادت ہے جو شرم و حیاء کی وجہ سے تیز نہیں چلتیں، یا پھر بیماروں کی عادت ہے جو اس پر مجبور ہیں۔ پہلی صورت حرام اور دوسری بھی اگر عورتوں کی مشابہت پیدا کرنے کے قصد سے ہو تو ناجائز ہے اور یہ قصد نہ ہو تو پھر مردوں کے لئے ایک عیب ہے۔ اور تیسری صورت میں اللہ کی ناشکری ہے، کہ تندرستی کے باوجود بیماروں کی ہیئت بنائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کو یہود کی طرح دوڑنے سے بھی منع کیا جاتا تھا، اور نصاریٰ کی طرح بہت آہستہ چلنے سے بھی۔ اور حکم یہ تھا کہ ان دونوں چالوں کی درمیانی چال اختیار کرو۔

حضرت عائشہؓ نے کسی شخص کو بہت آہستہ چلتے دیکھا جیسے ابھی مرجائے گا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایسے کیوں چلتا ہے، لوگوں نے بتلایا کہ یہ قُرّاء میں سے ہے۔ قُرّاء، قاری کی جمع ہے، اس زمانے میں قاری اس کو بھی کہا جاتا تھا جو تلاوتِ قرآن کی صحت و آداب کے ساتھ قرآن کا عالم بھی ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی بڑا قاری عالم ہے، اس لئے ایسا چلتا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ عمر بن خطابؓ اس سے زیادہ قاری تھے، مگر ان کی عادت یہ تھی کہ جب چلتے تو تیز چلتے تھے (مراد وہ تیزی نہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ اس کے بالمقابل تیزی ہے) اور جب وہ کلام کرتے تھے تو اس طرح کہ لوگ اچھی طرح سُن لیں (ایسی پست آواز نہ ہوتی تھی کہ سننے والوں کو پوچھنا پڑے کہ کیا فرمایا)۔

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ، "یعنی آواز کو پست کرو"، مراد پست کرنے سے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ بلند آواز نہ نکالو، اور شور نہ کرو۔ جیسا کہ ابھی حضرت فاروق اعظمؓ کے متعلق گذرا کہ کلام ایسا کرتے تھے کہ حاضرین سن لیں، انھیں سننے میں تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ "یعنی چوپاؤں میں سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی ہے جو بہت شور کرتا ہے"۔

یہاں آدابِ معاشرت میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں: اوّل لوگوں سے گفتگو اور ملاقات میں متکبرانہ انداز سے رُخ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت، دوسرے زمین پر اترا کر چلنے کی ممانعت، تیسرے درمیانی چال چلنے کی ہدایت، چوتھے بہت زور سے شور مچا کر بولنے کی ممانعت۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات وشمائل میں یہ سب چیزیں جمع تھیں۔ شمائلِ ترمذی میں حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد علی مرتضیٰ رضؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو آپس میں آپ کا کیا طرز ہوتا تھا؟ انھوں نے فرمایا:

كان دائم البشر سهل الخلق لين الجانب ليس بفظٍ ولا غليظ ولا صخاب في الاسواق ولا فحّاش ولا عيّاب ولا مُشاحٍ يتغافل عمّا لا يشتهي ولا يؤيس منه ولا يجيب فيه قد ترك نفسه من ثلاث المراء والاكبار وما لا يعنيه،

"کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ خوش و خرم معلوم ہوتے تھے آپ کے اخلاق میں نرمی اور برتاؤ میں سہولت مندی تھی، آپ کی طبیعت سخت نہ تھی، بات بھی درشت نہ تھی، آپ نہ شور مچانے والے تھے نہ فحش گو تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے، نہ بخل کرتے تھے، جو چیز دل کو نہ بھاتی اس کی جانب سے غفلت برتتے تھے دیگر، دوسرے کو اس کی طرف سے ناامید بھی نہ کرتے تھے، (اگر حلال ہو اور اس کی رغبت ہو) اور جو چیز اپنی مرغوب نہ ہو دوسرے کے حق میں اس کی کاٹ نہ کرتے تھے، (بلکہ خاموشی اختیار فرماتے تھے) تین چیزیں آپؐ نے بالکل چھوڑ رکھی تھیں، (۱) جھگڑنا (۲) تکبر کرنا (۳) جو چیز کام کی نہ ہو اس میں مشغول ہونا"۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگا دیے تمھارے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی، اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں

يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا

جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ اور نہ روشن کتاب۔ اور جب

قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

ان کو کہیے چلو اس حکم پر جو اتارا اللہ نے کہیں نہیں ہم تو چلیں گے اس پر جس پر پایا ہم نے

اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

اپنے باپ دادوں کو بھلا اور جو شیطان بلاتا ہو ان کو دوزخ کی طرف تو بھی

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

اور جو کوئی تابع کرے اپنا منہ اللہ کی طرف اور وہ ہو نیکی پر سو اس نے پکڑ لیا

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ

مضبوط کڑا۔ اور اللہ کی طرف ہے آخر ہر کام کا۔ اور جو کوئی منکر ہوا

فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ

تو تو غم نہ کھا اس کے انکار سے ہماری طرف پھر آنا ہے ان کو پھر ہم جتلا دیں گے ان کو جو انہوں نے کیا ہے

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ

البتہ اللہ جانتا ہے جو بات ہے دلوں میں۔ کام چلا دیں گے ہم ان کا تھوڑے دنوں پھر

نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ

پکڑ بلائیں گے ان کو گاڑھے عذاب میں۔ اور اگر تو پوچھے ان سے کس نے بنائے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ

آسمان اور زمین تو کہیں اللہ تعالیٰ نے، تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے پر وہ بہت

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں بیشک اللہ وہی ہے

الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ

بے پروا سب خوبیوں والا۔ اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں

وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ

اور سمندر ہو اس کی سیاہی اس کے پیچھے سات سمندر نہ تمام ہوں باتیں اللہ کی

اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ

بے شک اللہ زبردست ہے حکمتوں والا۔ تم سب کا بنانا اور مرے پیچھے جلانا ایسا ہی ہے جیسا

وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ

ایک جی کا، بیشک اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے

الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ

رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو

كُلٌّ یَّجْرِیْۤ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۹﴾

ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت تک اور یہ کہ اللہ خبر رکھتا ہے اس کی جو تم کرتے ہو۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ

یہ اس لئے (کہا) کہ اللہ وہی ہے ٹھیک اور جس کسی کو پکارتے ہیں سوائے اس کے سو وہی جھوٹ ہے،

وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ

اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا۔ تو نے نہ دیکھا کہ جہاز چلتے ہیں سمندر

فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ

میں اللہ کی نعمت لے کر تاکہ دکھلائے تم کو کچھ اپنی قدرتیں البتہ اس میں نشانیاں

لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا

ہیں ہر ایک تحمل کرنے والے احسان ماننے والے کے واسطے، اور جب سر پر آئے ان کے موج جیسے بادل

اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْهُمْ

پکارنے لگیں اللہ کو خالص کر کر اسی کے لئے بندگی، پھر جب بچا دیا ان کو جنگل کی طرف تو کوئی ہوتا ہے ان میں

ع ۱۱
۱۲

مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

بیچ کی چال پر، اور منکر وہی ہوتے ہیں ہماری قدرتوں سے جو قول کے جھوٹے ہیں حق نہ ماننے والے۔

خُلاصۂ تفسیر

کیا تم لوگوں کو (مشاہدہ و دلائل سے) یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو (بواسطہ یا بلاواسطہ) تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں (موجود) ہیں اور جو کچھ زمین میں (موجود) ہیں اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں (ظاہری وہ کہ آنکھ کان وغیرہ سے معلوم ہوں اور باطنی وہ جو کہ عقل سے سمجھی جائیں، اور مراد نعمتوں سے وہ نعمتیں ہیں جو تسخیر سمٰوٰت و ارض پر مرتب ہوتی ہیں پس اس کے سبب مخاطبین کا مشرف باسلام ہونا لازم تھا، اور باوجودیکہ (اس دلیل سے توحید ثابت ہوتی ہے مگر) بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلال عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلال نقلی) کے جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے (یعنی حق کو ثابت کرنے والے دلائل میں غور کر کے ان کا اتباع کرو) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ (ہم اس کا اتباع) نہیں (کرتے) ہم (تو) اسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے۔ (آگے ان پر رد ہے کہ) کیا اگر شیطان ان کے بڑوں کو عذاب دوزخ کی طرف (یعنی گمراہی کی طرف جو کہ سبب ہے عذاب دوزخ کا) بلاتا رہا ہو تب بھی (انہی کا اتباع کریں گے، مطلب یہ کہ ایسے معاند ہیں کہ باوجود اس کے کہ ان کو دلیل کی طرف بلایا جاتا ہے مگر پھر بھی بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل محض گمراہ باپ دادا کی راہ پر چلتے ہیں یہ حالت تو اہل ضلالت کی ہوئی) اور جو شخص (حق کا اتباع کر کے) اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی اعمال میں بھی، مراد اسلام و توحید ہے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (یعنی محض ظاہری اسلام نہ ہو) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا (یعنی وہ اس شخص کے مشابہ ہو گیا جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں تھام کر گرنے سے مامون رہتا ہے، اسی طرح یہ شخص ہلاکت و خسران سے محفوظ ہو گیا) اور آخر سب کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف پہنچے گا (پس یہ اعمال یعنی اتباع باطل و اتباع حق بھی اسی کے حضور میں پیش

ہوں گے، پس وہ ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا دے گا، اور جو شخص (حق کو ثابت کرنے والے دلائل کے باوجود) کفر کرے سو آپ کے لئے اس کا کفر باعثِ غم نہ ہونا چاہئے، (یعنی آپ غم نہ کریں) ان سب کو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے سو ہم ان سب کو جتلا دیں گے جو جو کچھ وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تو) دلوں کی باتیں (تک) خوب معلوم ہیں (تو ظاہری اعمال کا معلوم ہونا تو ظاہر ہے پس ہم سے کوئی امر مخفی نہیں سب جتلا دیں گے اور مناسب سزا دیں گے، اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں اور یہ لوگ اگر محض چند روزہ عیش پر بھول رہے ہیں تو ان کی بڑی غلطی ہے کیونکہ یہ دائمی نہیں بلکہ) ہم ان کو چند روزہ عیش دیئے ہوئے ہیں پھر ان کو کشاں کشاں ایک سخت عذاب کی طرف لے آویں گے (پس اس پر ناز کرنا جہالت ہے) اور (ہم جس توحید کی طرف ان کو بلا رہے ہیں اس کے مقدمات کو خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر اس سے صحیح نتیجہ تک پہونچنے کا کام نہیں لیتے چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (اس پر) آپ کہئے کہ الحمد للہ (جو مقدمہ مہتم بالشان تھا وہ تو تمہارے اعتراف سے ثابت ہوا اور دوسرا مقدمہ نہایت ہی ظاہر ہے کہ جو خود مخلوق و مصنوع ہو وہ مستحق عبادت نہیں بس مطلوب ثابت ہوگیا، مگر یہ لوگ مطلوب کو نہیں مانتے، بلکہ ان میں اکثر (تو مجموعۂ مقدمات کو بھی) نہیں جانتے (چنانچہ دوسرے مقدمہ جلیہ کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے کہ معبود ہونا صرف خالق کا حق ہے اور اللہ کی وہ شان ہے کہ) جو کچھ آسمان و زمین میں موجود ہے سب اللہ ہی کا (مملوک) ہے (پس سلطنت تو ان کی ایسی) اور بیشک اللہ تعالیٰ (خود اپنی ذات میں بھی) بے نیاز (اور) سب خوبیوں والا ہے (پس سزاوارِ الوہیت وہی ہے) اور (اس کی خوبیاں اس کثرت سے ہیں کہ) جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں (یعنی متعارف قلم کے برابر ان کے اجزاء کے قلم بنالئے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ایک ایک درخت میں ہزاروں قلم تیار ہوں) اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر (روشنائی کی جگہ) اس میں اور شامل ہو جائیں (اور پھر ان قلموں اور اس روشنائی سے حق تعالیٰ کے کمالات لکھنا شروع کریں) تو (سب قلم روشنائی ختم ہو جائیں اور) اللہ کی باتیں (یعنی وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی حکایت ہوتی ہو) ختم نہ ہوں، بیشک خدا تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے (کہ وہ قدرت میں بھی کامل ہے اور علم میں بھی اور یہ دونوں صفتیں چونکہ تمام صفات و افعال سے تعلق رکھتی ہیں، شاید اس لئے بعد عموم کے ان کو خصوصاً بیان فرما دیا، اور اس کمالِ صفتِ قدرت کی ایک فرع عالم

آخرت بھی ہے، جس کو بدفہم دشوار سمجھ رہے ہیں، حالانکہ وہ ایسا ہی ہے جیسا (کہ) تم سب کا (پہلی بار) پیدا کرنا اور (دوسری بار) زندہ کرنا (اس کے نزدیک) بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کو (پیدا کرنا اور زندہ کرنا۔ گو یہاں مقصود قرینہ مقام سے بعث کا ذکر فرمانا ہے، لیکن ذکر خلق سے استدلال اور قوی ہو گیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ (پس جو لوگ باوجود ان دلائل کے قیامت کا انکار کر رہے ہیں اور اس جرأت پر فسق و فجور کرتے ہیں ان سب کو سن رہا ہے دیکھ رہا ہے ان کو سزا دے گا، آگے پھر توحید کا بیان ہے کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک (یعنی قیامت تک) چلتا رہے گا اور (کیا تجھ کو) یہ (معلوم نہیں) کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب عملوں کی پوری خبر رکھتا ہے (پس اس کمال علمی و عقلی کا مقتضیٰ یہ ہے کہ شرک چھوڑ دیا جائے، اور اوپر جو ان افعال مذکورہ کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے) یہ (اختصاص) اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی ہستی میں کامل (اور واجب الوجود) ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں بالکل ہی لچر ہیں اور اللہ ہی عالی شان اور (سب سے) بڑا ہے (اس لئے یہ سب تصرفات اسی کے لئے مختص ہیں، البتہ اگر دوسرے موجودات باطل اور فانی اور ممکن نہ ہوتے، بلکہ نعوذ باللہ کوئی اور بھی واجب الوجود ہوتا تو پھر یہ تصرفات حق تعالیٰ کے ساتھ مختص نہ ہوتے، چنانچہ ظاہر ہے)۔

اے مخاطب کیا تجھ کو (توحید کی) یہ (دلیل) معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے، تاکہ تم کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھلائے (چنانچہ ہر ممکن کا وجود اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی دلیل ہے، اسی طور پر) اس میں (بھی قدرت کی) نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر و شاکر ہو (مراد اس سے مؤمن ہے کہ صبر و شکر میں کامل ہونا اسی کی صفت ہے، نیز صبر و شکر محرک ہے تذکر و تدبر عالم کو اور استدلال کے لئے تذکر و تفکر ضروری ہے، اسی لئے یہ دونوں وصف یہاں مناسب ہوئے بالخصوص کشتی کی حالت کے اعتبار سے کہ موجوں کا اٹھنا محل صبر ہے، اور بسلامت کنارہ پر جا لگنا محل شکر ہے، پس جو لوگ ان سب واقعات میں فکر کرتے رہتے ہیں استدلال کی توفیق انہی کو ہوتی ہے) اور (جیسا اوپر آیت وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ میں مقدمات دلیل کا اعتراف ان کفار کی طرف سے ثابت ہے، بعض اوقات خود نتیجہ دلیل یعنی توحید کا بھی

اعتراف کرتے ہیں جس سے توحید خوب ہی واضح ہوگئی، چنانچہ) جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں (یعنی بادلوں) کی طرح (محیط ہو کر) گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، سو بعضے تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں (یعنی کجی شرک کو چھوڑ کر توحید کو جو کہ اعدل الطرق ہے اختیار کر لیتے ہیں) اور (بعضے پھر ہماری آیتوں کے منکر ہو جاتے ہیں اور) ہماری آیتوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بدعہد اور ناشکرے ہیں (کہ کشتی میں جو عہد توحید کا کیا تھا اس کو توڑ دیا اور خشکی میں آنے کا مقتضیٰ تھا شکر کرنا اس کو چھوڑ دیا)۔

معارف و مسائل

شروع سورۃ میں کفار و مشرکین کو اس پر تنبیہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت مطلقہ کے مظاہر دیکھنے کے باوجود یہ لوگ اپنے کفر و شرک پر مصر ہیں، اور ان کے بالمقابل اطاعت شعار مؤمنین کی مدح اور ان کے انجام خیر کا ذکر تھا۔ درمیان میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیتوں کا ذکر بھی ایک حیثیت سے انہی مضامین کی تکمیل تھی۔ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور مخلوق پر اس کے انعامات و احسانات کو ذکر کر کے پھر توحید کی طرف دعوت ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، یعنی مسخر کر دیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ مسخر کرنے کے مشہور معنی کسی چیز کو کسی کے تابع فرمان بنا دینے کے ہیں۔ یہاں اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو زمین کی سب چیزیں بھی انسان کے تابع فرمان نہیں۔ بلکہ بہت سی چیزیں اس کے مزاج کے خلاف کام کرتی ہیں خصوصاً جو چیزیں آسمانوں میں ہیں ان میں تو انسان کے تابع فرمان ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دراصل تسخیر کے معنی کسی چیز کو زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینا اور اس پر مجبور کر دینا ہے۔ آسمان و زمین کی سب مخلوقات کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام مخلوقات کو انسان کی خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا۔ ان میں بہت سی چیزوں کو تو اس طرح خدمت میں لگا دیا کہ ان کو انسان کا تابع فرمان بھی بنا دیا وہ جس وقت جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان کے کام میں تو لگا دیا گیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں، مگر

بتقاضائے حکمتِ ربانی ان کو انسان کے تابع نہیں بنایا گیا جیسا کہ آسمانی مخلوق اور سیارات اور برق و باراں وغیرہ، کہ ان کو انسان کے حکم کا تابع بنا دیا جاتا تو انسانوں کی طبائع اور مزاجوں اور حالات کے اختلافات کا ان پر اثر پڑتا۔ ایک انسان چاہتا کہ آفتاب جلدی طلوع ہو جائے دوسرے کی ضرورت اس پر موقوف ہوتی کہ اس میں دیر لگے، ایک شخص بارش مانگتا دوسرا سفر میں ہے کھلے میدان میں ہے وہ چاہتا کہ بارش نہ ہو۔ تو یہ متضاد تقاضے آسمانی کائنات کے عمل میں تضاد اور خلل پیدا کرتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا مگر اس کا تابع حکم نہیں بنایا، یہ بھی ایک قسم کی تسخیر ہی ہے۔ واللہ علم

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً، اسباغ کے معنی مکمل کرنے کے ہیں معنی یہ ہیں کہ مکمل کر دیا اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی ظاہری نعمتوں کو اور باطنی نعمتوں کو ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو انسان اپنے حواس خمسہ سے محسوس اور معلوم کر لیتا ہے، مثلاً حسنِ صورت، اعضائے انسانی کا اعتدال اور ہر عضو کو ایسے تناسب سے بنانا جو انسان کے عمل میں زیادہ سے زیادہ معین بھی ہو اور اس کی شکل و صورت کو بھی نہ بگاڑے۔ اسی طرح رزق، مال و دولت، اسبابِ معیشت، تندرستی اور عافیت یہ سب ظاہری نعمتیں اور محسوس نعمتیں ہیں۔ اسی طرح دینِ اسلام کو سہل کر دینا اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی توفیق ہونا اور اسلام کا دوسرے ادیان پر غالب آنا اور دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد ہونا بھی انہی نعمائے ظاہرہ میں داخل ہیں۔ اور باطنی نعمتیں وہ ہیں جو انسان کے قلب سے متعلق ہوں، جیسے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور علم و عقل، حسنِ اخلاق، گناہوں کی پردہ پوشی، اور جرائم پر فوری سزا نہ ملنا وغیرہ ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی معلومات اور اپنی قدرت کے تصرفات اور اپنی نعمتوں کی ایک مثال دی ہے کہ وہ غیر متناہی ہیں۔ نہ کسی زبان سے وہ سب ادا ہو سکتے ہیں نہ کسی قلم سے سب کو لکھا جا سکتا ہے۔ مثال یہ فرمائی کہ ساری زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان کی سب شاخوں کے قلم بنا لئے جاویں اور ان کے لکھنے کے لئے سمندر کو روشنائی بنا دیا جائے اور یہ سب قلم حق تعالیٰ کی معلومات اور تصرفاتِ قدرت کو لکھنا شروع کریں تو سمندر ختم ہو جائے گا اور معلومات و تصرفات ختم نہ ہوں گے۔ اور ایک سمندر نہیں اس جیسے سات سمندر اور بھی شامل کر دیئے جائیں، جب بھی سب سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ کلمات اللہ سے مراد اس کے علم و حکمت کے کلمات ہیں (روح و مظہری) اور شیونِ قدرت اور

نعماتے آلہیہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اور سات سمندر سے مطلب یہ نہیں کہ کہیں سات سمندر موجود ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک سمندر کے ساتھ فرض کرلو اور سات سمندر مل جائیں جب بھی ان سب سے سب کلمات اللہ کو ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ اور سات کا عدد بھی بطور مثال ہے، حصر مقصود نہیں۔ اور دلیل اس کی دوسری آیتِ قرآن ہے جس میں فرمایا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا، یعنی اگر سمندر کو کلمات اللہ کو لکھنے کے لئے روشنائی بنالیا جائے تو سمندر ختم ہوجائے گا اور کلمات اللہ ختم نہ ہوں گے، اور صرف یہی سمندر نہیں اسی جیسے اور سمندر کو بھی شامل کردیں تب بھی بات یہی رہے گی۔ اس آیت میں بِمِثْلِهٖ فرما کر اشارہ کردیا کہ یہ سلسلہ دور تک چلایا جائے کہ اس سمندر کے مثل دوسرا سمندر مل گیا پھر اس کی مثل تیسرا چوتھا، غرض سمندروں کی کتنی ہی مقدار فرض کرلو۔ ان کی روشنائی کلمات اللہ کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ عقلی طور پر وجہ ظاہر ہے کہ سمندر سات نہیں سات ہزار بھی ہوں وہ بہرحال محدود اور متناہی ہیں اور کلمات اللہ یعنی معلومات اللہ غیر متناہی ہیں، کوئی متناہی چیز غیر متناہی کا احاطہ کیسے کرسکتی ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت احبار یہود کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی وجہ یہ تھی کہ قرآن کی آیت ہے وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا، یعنی تمہیں نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا علم۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو چند احبار یہود حاضر ہوئے اور اس آیت کے بارے میں معارضہ کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ تمہیں تھوڑا علم دیا گیا، یہ آپ نے اپنی قوم کا حال ذکر کیا ہے، یا اس میں آپ نے ہمیں بھی داخل کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مراد سب ہیں، یعنی ہماری قوم بھی اور یہود و نصاریٰ بھی تو انہوں نے یہ معارضہ کیا کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی ہے، جس کی شان تِبْيَانٌ لِّكُلِّ شَيْءٍ، یعنی ہر چیز کا بیان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بھی علم الٰہی کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔ پھر تورات میں جتنا علم ہے اس کا بھی تمہیں پورا علم نہیں، بقدر کفایت ہی ہے۔ اس لئے علم الٰہی کے مقابلہ میں ساری آسمانی کتابوں اور سب انبیاء کے علوم کا مجموعہ بھی قلیل ہی ہے۔ اسی کلام کی تائید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ، الآیۃ (ابن کثیر)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ

اے لوگو! بچتے رہو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی باپ اپنے

وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔـا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ

بیٹے کے بدلے اور نہ کوئی بیٹا ہو جو کام آئے اپنے باپ کی جگہ کچھ بھی، بیشک اللہ کا وعدہ

حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ

ٹھیک ہے، سو تم کو نہ بہکائے دنیا کی زندگانی اور نہ دھوکا دے تم کو اللہ کے نام

الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ

سے وہ دغاباز۔ بیشک اللہ کے پاس ہے قیامت کی خبر اور اتارتا ہے مینہ

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ

اور جانتا ہے جو کچھ ہے ماں کے پیٹ میں اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ کل کو کیا کرے گا

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا، تحقیق اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو (اور کفر و شرک چھوڑ دو) اور اس دن سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہو کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کردے (اور یہ دن آنے والا ضرور ہے کیونکہ اس کی نسبت اللہ کا وعدہ ہے اور) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے سو تم کو دنیوی زندگانی دھوکہ میں نہ ڈالے (کہ اس میں منہمک ہو کر اس دن سے غافل رہو) اور نہ تم کو وہ دھوکہ باز (یعنی شیطان) اللہ سے دھوکہ میں ڈالے (کہ تم اس کے بہکانے میں آجاؤ کہ اللہ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہا کرتے تھے وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى) بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی (اپنے علم کے موافق) مینہ برساتا ہے (اس کا علم اور قدرت بھی اسی کے ساتھ خاص ہے) اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا یا لڑکی حاملہ کے) رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے)۔

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے اور انہی چیزوں کی کیا تخصیص ہے جتنے غیوب ہیں) بیشک اللہ (ہی ان) سب باتوں کو جاننے والا (اور ان سے) باخبر ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں)۔

معارف ومسائل

مذکور الصدر دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں مومن و کافر عام لوگوں کو خطاب فرما کر اللہ تعالیٰ اور قیامت کے حساب کتاب سے ڈرا کر اس کے لئے تیاری کی ہدایت کی گئی ہے، یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ یعنی اے لوگو ڈرو اپنے پروردگار سے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے نام یا کسی دوسری صفت کے بجائے صفتِ رب کے انتخاب کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کا جو حکم ہے یہ وہ خوف نہیں جو کسی درندہ یا دشمن سے عادةً ہوا کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمہارا رب اور پالنے والا ہے، اس سے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ خوف سے مراد اس جگہ وہ خوف ہے جو اپنے بڑوں اور بزرگوں کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہونا لازم ہے، جیسے بیٹا اپنے باپ سے، شاگرد استاد سے ڈرتا ہے، وہ کوئی اس کے دشمن یا ضرر پہونچانے والے نہیں، مگر ان کی عظمت و ہیبت دلوں میں ہوتی ہے، وہی ان کو باپ و استاذ کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت تمہارے قلوب پر حاوی ہونا چاہئے تاکہ تم اس کی مکمل اطاعت آسانی سے کر سکو۔

وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْــًٔا، یعنی اس روز سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع پہونچا سکے گا، **اور نہ بیٹا باپ کو نفع پہونچانے والا ہوگا،**

مراد اس سے وہ باپ اور بیٹے ہیں جن میں ایک مومن ہو دوسرا کافر، کیونکہ مومن باپ نہ اپنے کافر بیٹے کے عذاب میں کوئی کمی کر سکے گا نہ اس کو کوئی نفع پہنچ سکے گا، اسی طرح مومن بیٹا اپنے کافر باپ کے کچھ کام نہ آسکے گا۔

وجہ اس تخصیص کی قرآن کریم کی ___ دوسری آیات اور روایات حدیث ہیں جن میں اس کی تصریح ہے کہ قیامت کے روز ماں باپ اولاد کی اور اولاد ماں باپ کی شفاعت کریں گے، اور اس شفاعت کی وجہ سے ان کو کامیابی بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ

کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۔ یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا، کہ کس سال کس تاریخ میں آئے گی، اور وہی بارش کو اتارتا ہے اور وہی جانتا ہے جو شکم مادر میں ہے (کہ لڑکی ہے یا لڑکا اور کس شکل و صورت کا ہے) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کمائے گا (دینی خیر و شر میں سے کیا حاصل کرے گا) اور کوئی **نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔**

پہلی تین چیزوں میں اگرچہ یہ تصریح نہیں کی گئی کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، مگر کلام ایسے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس سے ان چیزوں کے علم کا انحصار علم الٰہی میں معلوم ہوتا ہے، اور پچھلی دو چیزوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ انہی پانچ چیزوں کو سورۂ انعام کی آیت میں مفاتح الغیب فرمایا گیا ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، یعنی صرف اللہ ہی کے پاس ہے علم مفاتح غیب کا، کوئی نہیں جانتا ان کو بجز اللہ تعالیٰ کے۔ حدیث میں اس کو مفاتح الغیب فرمایا گیا، مفاتح اور مفاتیح مفتاح کی جمع ہے، کنجی یا چابی کو کہتے ہیں جس سے قفل کھلتے ہیں۔۔۔۔ مراد اس سے امور الغیب ہیں جن سے معلومات غیب کھلتے ہیں۔

مسئلہ علم غیب: اس مسئلہ کی تفصیل بقدر ضرورت سورۂ نمل کی آیت قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، کے تحت میں گذر چکی ہے۔

اس آیت میں مطلق علم غیب کا حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہونا صراحۃً بیان فرمایا گیا ہے اور یہی پوری امت کا عقیدہ سلفاً و خلفاً رہا ہے۔ آیت زیر بحث میں جو صرف پانچ چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کا علم کسی مخلوق کو نہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کو جانتا ہے، یہ کوئی تخصیص کے لئے نہیں، ورنہ سورۂ نمل کی آیت سے تضاد ہو جائے گا بلکہ ان پانچ چیزوں کا خاص اہتمام بتلانے کے لئے یہاں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اور وجہ تخصیص و اہتمام کی یہ ہے کہ عام طور پر جن غیب کی چیزوں کو انسان معلوم کرنے کا شائق ہوتا ہے وہ یہی پانچ چیزیں ہیں، نیز علم غیب کا دعویٰ کرنے والے نجومی وغیرہ جن چیزوں کی خبریں لوگوں کو بتا کر اپنا عالم الغیب ہونا ثابت کرتے ہیں وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی پانچ چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ان پانچوں کے علم کا اللہ تعالےٰ

کے ساتھ مخصوص ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ (روح)

اور حدیث میں جو بروایت ابن عمرؓ و ابن مسعودؓ یہ ارشاد آیا ہے کہ اُوْتِيْتُ مَفَاتِيْحَ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّا الْخَمْسَ (اخرجه الامام احمد، ابن کثیر) اس میں لفظ اُوْتِيْتُ نے خود یہ بات واضح کردی کہ ان پانچ چیزوں کے علاوہ جن غیبات کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور وحی دیا گیا تھا، اس لئے وہ علم غیب کی تعریف میں شامل نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی ______ اور اولیاء کو بذریعہ الہام جو غیب کی چیزوں کی خبریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیدی جاتی ہیں وہ حقیقت کے اعتبار سے علم غیب نہیں جس کی بناء پر ان کو عالم الغیب کہا جائے بلکہ وہ انباء الغیب یعنی غیب کی خبریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اپنے فرشتوں اور رسولوں اور مقبول بندوں کو عطا فرما دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ان کو انباء الغیب فرمایا گیا ہے مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ۔

اس لئے مطلب حدیث کا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ ایسا مخصوص فرمایا ہے کہ بطور انباء غیب کے بھی فرشتے اور رسول کو اس کا علم نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری مغیبات کا علم بہت کچھ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی دیدیا جاتا ہے۔

اس تقریر سے بھی ایک اور وجہ ان پانچ چیزوں کے خصوصی ذکر کی معلوم ہوگئی۔

ایک شبہ اور جواب مذکورہ آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مطلق علم غیب جو حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے اس میں بھی خاص طور سے پانچ مذکورہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا علم کسی پیغمبر کو بذریعہ وحی بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ چیزیں کسی کو کبھی معلوم نہ ہوں، حالانکہ امت کے بہت سے اولیاء اللہ سے ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں کہ انھوں نے کہیں بارش کی خبر دی یا کسی حمل کے متعلق کوئی خبر دی، کسی کے متعلق آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی خبر دی، کسی کے مرنے کی جگہ متعین کرکے بتلا دی، اور پھر یہ پیشنگوئی مشاہدہ سے صحیح بھی ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض نجومی یا جفر و رمل وغیرہ کا فن جاننے والے ان چیزوں کے متعلق بعض خبریں دیدیتے ہیں، اور بعض اوقات وہ صحیح بھی ہو جاتی ہیں، تو پھر ان پانچ چیزوں کی خصوصیت علم الٰہی کے ساتھ کس طرح رہی۔

اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو سورۂ نمل میں تفصیل سے آچکا ہے، اور اختصاراً

کے ساتھ اوپر مذکور ہوا ہے کہ علم غیب درحقیقت اس علم کو کہا جاتا ہے جو اسباب طبعیہ کے واسطہ سے نہ ہو، بلا واسطہ خود بخود ہو۔ یہ چیزیں اگر انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی و الہام یا اولیاء کو بذریعہ الہام اور نجومیوں وغیرہ کو اپنے حسابات و اسباب طبعیہ کے ذریعہ حاصل ہو جائیں تو وہ علم غیب نہیں بلکہ انباء الغیب ہیں۔ اور کسی جزئی و شخصی معاملہ میں کسی مخلوق کو حاصل ہو جانا آیت مذکورہ کے منافی نہیں کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کا کلی علم جو تمام مخلوقات اور تمام حالات پر حاوی ہو وہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بذریعہ وحی یا الہام نہیں دیا کسی ایک آدھ واقعہ میں کوئی جزئی علم بذریعہ الہام حاصل ہو جانا اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ علم سے مراد علم قطعی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، الہام کے ذریعہ جو علم کسی ولی کو حاصل ہوتا ہے وہ قطعی نہیں ہوتا، اس میں مغالطوں کے بہت احتمال رہتے ہیں اور نجومیوں وغیرہ کی خبروں میں تو روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دس جھوٹ میں ایک صحیح ہو کبھی یہ تناسب نہیں ہوتا، اس کو علم قطعی کیسے کہہ سکتے ہیں

ایک فائدہ مہمہ
مسئلہ علم غیب کے متعلق استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے فوائد تفسیر میں ایک مختصر جامع بات فرمائی ہے جس سے مذکورہ قسم کے سب اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک احکام غیبیہ ہیں جیسے احکام شرعیہ جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم بھی داخل ہے جس کو علم عقائد کہا جاتا ہے۔ اور وہ تمام احکام شرعیہ بھی جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سے کام پسند ہیں کون سے ناپسند، یہ سب چیزیں غیب ہی کی ہیں

دوسری قسم اکوان غیبیہ یعنی دنیا میں پیش آنے والے واقعات کا علم۔ پہلی قسم کے غائبات کا علم حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو عطا فرمایا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتے بجز اس رسول کے جس کو اللہ تعالیٰ اس کام کے لئے پسند فرمالیں۔

اور دوسری قسم یعنی اکوان غیبیہ ان کا علم کلی تو حق تعالیٰ کسی کو عطا نہیں فرماتے وہ بالکل ذات حق کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر علم جزئی خاص خاص واقعات کا جب چاہتا ہے جس قدر چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ اس طرح اصل علم غیب تو سب کا سب حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر وہ اپنے علم غیب میں سے احکام غیب کا علم تو عادۃً انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتے ہی ہیں، اور یہی علم ان کی بعثت کا مقصد ہے۔

اکوانِ غیب کا علم جزئی کبھی انبیاء و اولیاء کو بذریعہ وحی یا الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرما دیتا ہے، جو منجانب اللہ عطا کیا ہوا علم ہے۔ اس کو حقیقی معنی کے اعتبار سے علم الغیب نہیں کہا جا سکتا، بلکہ غیب کی خبریں (انباء الغیب) کہا جاتا ہے۔

فوائد متعلقہ الفاظ آیت: اس آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ایک خاص اہتمام کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے جس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ ایک ہی عنوان سے پانچ چیزوں کو شمار کر کے یہ بتایا جاتا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو ان کا علم نہیں دیا گیا۔ مگر آیت مذکورہ میں ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ابتدائی تین چیزوں کے علم کو تو مثبت طور پر اللہ کے لئے خاص ہونے کا ذکر فرمایا اور دو چیزوں میں غیر اللہ سے علم کی نفی فرمائی۔ اور پہلی تین چیزوں میں بھی علم ساعت یعنی قیامت کا ذکر تو اس طرح فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا۔ اور دوسری چیز کا ذکر عنوان بدل کر جملہ فعلیہ میں اس طرح ذکر فرمایا وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ یعنی اللہ تعالیٰ اتارتا ہے بارش، اس میں بارش کے علم کا ذکر ہی نہیں، بلکہ اس میں اتارنے کا ذکر ہے تیسری چیز کا ذکر پھر عنوان بدل کر اس طرح فرمایا کہ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ، اس تبدیلِ عنوان کو بلاغت کلام کا ایک تفنن بھی کہا جا سکتا ہے اور غور کرنے سے اس میں کچھ اور حکمتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، جو بیان القرآن میں حضرت نے بیان فرمائی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخری دو چیزیں یعنی آئندہ کل میں انسان کیا کمائے گا، اور یہ کہ وہ کس زمین میں مرے گا خود انسان کی ذات کے متعلق حالات ہیں ان میں احتمال ہو سکتا تھا کہ انسان ان کا علم حاصل کر لے اس لئے ان دونوں میں خصوصیت سے غیر اللہ کے علم کو منفی کر کے بیان فرمایا گیا، جس سے پہلی تین چیزوں کا علم غیر اللہ کے لئے نہ ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا کہ جب انسان خود اپنے اعمال اور کسب کو اور ان کی انتہا یعنی موت اور اس کی جگہ نہیں جانتا تو آسمان اور نزولِ مطر اور شکمِ مادر کی اندھیریوں میں مخفی چیز کو کیا جانے گا؟ اور آخری چیز میں صرف مکانِ موت کا علم انسان کو نہ ہونا بیان فرمایا ہے حالانکہ مکانِ موت کی طرح زمانِ موت بھی انسان کے علم میں نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مکانِ موت اگرچہ متعین طور پر معلوم نہ ہو مگر ظاہری حالات کے اعتبار سے انسان کچھ سمجھ سکتا ہے، کہ جہاں رہتا بستا ہے وہیں مرے گا اور کم از کم وہ مکان جس میں اس کو مرنا ہے دنیا میں موجود تو ہے، بخلاف زمانِ موت کے جو زمانہ مستقبل ہے، ابھی وجود میں بھی نہیں آیا، تو جو شخص مکانِ موت کو موجود بالفعل ہونے کے باوجود نہیں جان سکتا اس کے متعلق

یہ تصور کیسے کیا جائے کہ زمانِ موت جس کا اس وقت وجود ہی نہیں اس کو جان لے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ایک چیز کی نفی سے خودبخود دوسری چیزوں کی نفی بدرجۂ اولیٰ معلوم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کو منفی عنوان سے بیان فرمایا۔ اور پہلی تین چیزیں تو انسانی دسترس سے ظاہر حالات میں خود ہی خارج ہیں، ان میں انسان کے علم کا دخل نہ ہونا واضح ہے۔ اس لئے ان میں مثبت عنوان اختیار کر کے ان کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کردیا گیا۔

اور ان میں سے پہلے جملے کو جملۂ اسمیہ سے اور بعد کے دونوں جملوں کو فعلیہ کے عنوان سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ قیامت تو ایک امر متعین ہے اس میں تجدد نہیں بخلاف نزولِ مطر اور حمل کے کہ ان کے حالات میں تجدد ہوتا رہتا ہے، اور جملۂ فعلیہ تجدد پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں وہ استعمال کیا گیا، اور ان دونوں میں بھی حمل کے حالات میں تو علمِ الٰہی کا ذکر فرمایا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، اور نزولِ بارش میں علم کا ذکر ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش نازل کرنے کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتلادیا کہ بارش جس سے انسان کے ہزاروں منافع وابستہ ہیں وہ اللہ ہی کے کرنے سے آتی ہے، اور کسی کے تصرف میں نہیں، اور اس کا علمی اختصاص تو سیاقِ کلام ہی سے ثابت ہوجاتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمّت

سورۃ لقمٰن بحمد اللہ وسبحانہ
فی ۵ ذی الحجۃ ۱۳۹۱ھ یوم الاثنین

سُورَةُ السَّجْدَةِ

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّ ثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورہ سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اس کی تیس آیتیں ہیں اور تین رکوع ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الٓمّٓ ⓵ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⓶

اتارنا کتاب کا اس میں کچھ دھوکا نہیں پروردگار عالم کی طرف سے ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا

کیا کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ باندھ لایا ہے کوئی نہیں وہ ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو ڈر سنائے ان لوگوں

مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ⓷

کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرنے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ راہ پر آئیں ۔

خُلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، (اور) اس میں کچھ شبہ نہیں (اور) یہ رب العالمین کی طرف سے ہے (جیسا کہ اس کتاب کا اعجاز خود اس کی دلیل ہے) کیا یہ (منکر) لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا لیا ہے (یعنی یہ کہنا محض لغو اور جھوٹ ہے یہ بنایا ہوا نہیں، بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے (آئی ہے) تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) ایسے لوگوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں۔

معارف و مسائل

مَآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، نذیر سے مراد اس جگہ رسول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی دعوت بھی ان کو اب تک نہ پہونچی تھی، کیونکہ دوسری آیت قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ، یعنی کوئی امت اور جماعت دنیا میں ایسی نہیں جس میں کوئی اللہ سے ڈرانے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا نہ آیا ہو۔

اس آیت میں لفظ نذیر اپنے عام لغوی معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والا، خواہ رسول اور پیغمبر ہو یا ان کا کوئی نائب خلیفہ یا عالم دین۔ تو اس آیت سے تمام امتوں اور جماعتوں تک توحید کی دعوت پہونچ جانا معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح و درست اور حق تعالیٰ کی رحمت عامہ کا مقتضا ہے، جیسا کہ ابوحیان نے فرمایا کہ توحید اور ایمان کی دعوت کسی زمانے اور کسی مکان اور کسی قوم میں کبھی منقطع نہیں ہوئی، اور جب کہیں نبوت پر زمانہ دراز تک گذر جانے کے بعد اس نبوت کا علم رکھنے والے علماء بہت کم رہ گئے تو کوئی دوسرا نبی و رسول مبعوث ہو گیا، اس کا مقتضی یہ ہے کہ قوم عرب میں بھی بقدر ضرورت توحید کی دعوت پہلے سے ضرور پہونچی ہوگی، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دعوت خود کوئی نبی و رسول لے کر آیا ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے نائبین علماء کے ذریعہ پہونچ گئی ہو۔ اس لئے اس سورۃ اور سورۂ یٰسٓ وغیرہ کی وہ آیتیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریش عرب میں آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تھا، ضروری ہے کہ اس میں نذیر سے مراد اصطلاحی معنی کے اعتبار سے رسول و نبی ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ اس قوم کے اندر آپ سے پہلے کوئی نبی و رسول نہیں آیا تھا، اگرچہ دعوتِ ایمان و توحید دوسرے ذرائع سے یہاں بھی پہونچ چکی ہو۔

زمانہ فترت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت سے حضرات کے متعلق یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام پر قائم تھے، توحید پر ان کا ایمان تھا، بت پرستی اور بتوں کے لئے قربانی دینے سے متنفر تھے۔

روح المعانی میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت سے پہلے آپ سے ملے بھی تھے، مگر نبوت سے پہلے ان کا انتقال اس سال میں ہو گیا جس میں قریش نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی اور یہ واقعہ آپ کی نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے، ان کا حال موسیٰ بن عقبہ نے یہ نقل کیا ہے

الرَّحِيمُ ﴿٦﴾ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ

رحم والا ۔ جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش

مِنْ طِينٍ ﴿٧﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ﴿٨﴾

ایک گارے سے ۔ پھر بنائی اس کی اولاد نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے ۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنا دیئے تمھارے لئے کان اور

الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ﴿٩﴾

آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں (موجود) ہے چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے وہ ایسا عظیم ہے کہ) بدون اس (کی رضا و اذن) کے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا (البتہ اذن سے شفاعت ہو جائے گی اور نصرت کے ساتھ اذن ہی متعلق نہ ہوگا) سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو (کہ ایسی ذات کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور) وہ (ایسا ہے کہ) آسمان سے لیکر زمین تک (جتنے امور ہیں) ہر امر کی (وہی) تدبیر (اور انتظام) کرتا ہے، پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہونچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی (یعنی قیامت میں سب امور اور ان کے متعلقات اس کے حضور میں پیش ہوں گے کقولہ تعالیٰ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ) وہی ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا زبردست رحمت والا جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (یعنی جس مصلحت کے لئے اس کو بنایا اس کے مناسب بنایا) اور انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اُس (انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصۂ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ سے جو فضلہ ہے ہضم رابع غذا کا جس میں چار خلط خون، بلغم، سوداء، صفرا بنتے ہیں) بنایا پھر (ماں کے رحم میں) اس کے اعضاء درست کئے اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی

اور (بعد تولد) تم کو کان اور آنکھیں اور دل (یعنی ادراکات ظاہرہ و باطنہ) دیئے (اور ان سب باتوں کا جو کہ دال علی القدرۃ والانعام ہیں مقتضا یہ تھا کہ خدا کا شکر کرتے جس کی فرد اعظم توحید ہے مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (یعنی نہیں کرتے) ۔

معارف و مسائل

روزِ قیامت کا طول | فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ، یعنی اس دن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی ہوگی" اور سورۂ معارج کی آیت میں ہے فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ "یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی"

اس کا ایک سیدھا سا جواب تو وہ ہے جو بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن کے ہولناک ہونے کے سبب یہ ان لوگوں کو بہت دراز محسوس ہوگا۔ اور یہ درازی بمقدار اپنے ایمان و اعمال کے ہوگی۔ جو بڑے مجرم ہیں ان کو زیادہ جو کم ہیں ان کو کم محسوس ہوگی۔ یہاں تک کہ جو دن بعض کو ایک ہزار سال کا معلوم ہوگا وہ دوسروں کے نزدیک **پچاس ہزار سال کا ہوگا۔**

تفسیر روح المعانی میں اور بھی متعدد توجیہات علماء اور صوفیہ کرام سے نقل کی گئی ہیں، مگر وہ سب کے سب قیاسات ہی ہیں۔ ایسی چیز جس کو قرآن کا مدلول کہا جا سکے یا جس پر یقین کیا جا سکے کوئی نہیں۔ اس لئے اسلم وہی طریقہ ہے جو سلفِ صالحین صحابہ و تابعین نے اختیار کیا، کہ اس ایک پچاس کے فرق کو علمِ الٰہی کے حوالہ کیا اور خود اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہمیں معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کے متعلق فرمایا هُمَا یَوْمَانِ ذَکَرَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِهِمَا وَاَکْرَهُ اَنْ اَقُوْلَ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ مَالَا اَعْلَمُ (اخرجه عبد الرزاق والحاکم وصححه) "یعنی یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی اُن کی حقیقت کو جانتا ہے، اور میں اس کو بُرا سمجھتا ہوں کہ قرآن میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں حسن اور اچھی ہے، بُرائی اس کے غلط استعمال سے آتی ہے | اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ، یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کو حسین اور بہتر بنایا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا وہ حکمت اور مصالحِ عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے۔ اس لئے ہر چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ایک حُسن رکھتی ہے۔

هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ

وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں۔ تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا جو

وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝١١ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ

تم پر مقرر ہے پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر

نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ

سر ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے، اے رب ہمارے ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دے کہ ہم

صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝١٢ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا

کریں بھلے کام ہم کو یقین آگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو سجھا دیتے ہر جی کو اس کی راہ

وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے

اَجْمَعِيْنَ ۝١٣ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا

اکٹھے۔ سو اب چکھو مزہ جیسے تم نے بھلا دیا تھا اس اپنے دن کے ملنے کو، ہم نے بھی

نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝١٤

بھلا دیا تم کو اور چکھو عذاب سدا کا بدلہ اپنے کئے کا۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا

ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں کہ جب ان کو سمجھائے ان سے گر پڑیں سجدہ کر کر

وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝١٥ ۩ تَتَجَافٰى

اور پاک ذات کو یاد کریں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ جدا رہتی ہیں

جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؗ وَّ

ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے، پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ

دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہے ان کے واسطے

مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ أَفَمَن كَانَ

آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو کرتے تھے۔ بھلا ایک جو ہے

مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا ۚ لَّا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

ایمان پر کیا برابر ہے اس کے جو نافرمان ہے نہیں برابر ہوتے، سو وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے

الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾

کام بھلے تو ان کے لئے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو کرتے تھے

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن

اور وہ لوگ جو نافرمان ہوئے سو ان کا گھر ہے آگ، جب چاہیں کہ نکل پڑیں اس

يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ

میں سے الٹ دیئے جائیں پھر اسی میں اور کہیں ان کو چکھو آگ کا عذاب

الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ

جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے اور البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا

الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾

عذاب ورے اس بڑے عذاب کے تاکہ وہ پھر آئیں

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا

اور کون بے انصاف زیادہ اس سے جس کو سمجھایا گیا اس کے رب کی باتوں سے پھر ان سے منہ موڑ گیا ہم کو

مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾

ان گنہگاروں سے بدلہ لینا ہے

وقف غفران

ع ۱۱ / ۱۵

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب زمین میں رل مل کر نیست و نابود ہوگئے تو کیا ہم پھر (قیامت میں) نئے جنم میں آویں گے، اور یہ لوگ اس بعث و نشر پر صرف متعجب ہی نہیں ہیں جیسا کہ ظاہر ان کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ در حقیقت وہ لوگ اپنے

رب سے ملنے کے منکر ہی ہیں، اور یہ استفہام ان کا انکاری ہے) آپ (جواب میں) فرمادیجئے
کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر (اللہ کی طرف سے) متعین ہے، پھر تم
اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے (جواب میں اصل مقصود تو یہی تُرْجَعُوْنَ ہے، اور
يَتَوَفّٰىكُمْ بیچ میں بڑھا دینا تخویف کے لئے ہے کہ موت بھی فرشتہ کے ذریعہ سے آئے گی
جو جان نکلنے کے وقت تم کو مارے دھاڑے گا بھی جیسا دوسری آیت میں ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ
يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ الخ پس مرجانے
کا انجام صرف خاک ہی میں مل جانا نہ ہوگا جیسا تمہارا قول ءَاِذَا ضَلَلْنَا الخ سے معلوم ہوتا
ہے) اور (اس رجوع کے وقت جس پر تُرْجَعُوْنَ دال ہے) اگر آپ (ان لوگوں کا حال)
دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جبکہ یہ مجرم لوگ نہایت شرمندگی سے اپنے رب کے سامنے سر جھکائے (کھڑے)
ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) کہ اے ہمارے پروردگار بس (اب) ہماری آنکھیں اور کان
کھل گئے (اور معلوم ہوگیا کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا سب حق تھا) سو ہم کو (دنیا میں) پھر
بھیج دیجئے ہم (اب کے جاکر خوب) نیک کام کیا کریں گے (اب) ہم کو پورا یقین آگیا، اور
(یہ کہنا ان کا بے کار محض ہوگا اس لئے کہ) اگر ہم کو (یہ) منظور ہوتا (کہ یہ ضرور ہی راہ پر
آئیں) تو ہم ہر شخص کو اس کی نجات کا راستہ (مقصود تک پہنچا دینے کے درجہ
میں ضرور) عطا فرماتے (جیسا کہ ہدایت بمعنی مطلوب کا راستہ دکھانا ان کو عطا
فرمائی ہے) ولیکن میری (تو) یہ (ازلی تقدیری) بات (بہت سی حکمتوں سے) محقق
ہوچکی ہے کہ میں جہنم کو جنات وانسان دونوں (میں جو کافر ہوں گے ان) سے ضرور بھردوں گا
(اور بیان بعض حکمتوں کا سورۂ ہود کے اخیر میں ذٰلِكَ ہی آیت کی تفسیر میں گذرا ہے)
تو (ان سے کہا جائے گا کہ اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھولے
رہے، ہم نے تم کو بھلا دیا (یعنی رحمت سے محروم کردیا جس کو بھلانا مجازاً کہہ دیا) اور
(ہم جو کہتے ہیں کہ مزہ چکھو، تو ایک دو روز کا نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اپنے اعمال
(بد) کی بدولت ابدی عذاب کا مزہ چکھو (یہ تو کفار کا حال اور ان کا مآل ہوا، آگے مؤمنین
کا حال و مآل مذکور ہے یعنی) بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب
ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں (جس کی تحقیق سورۂ مریم
کے رکوع چہارم میں ہوئی ہے) اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ
(ایمان سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کفار کا حال آیا ہے وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا یہ تو ان کی تصدیق
واقرار واخلاق کا حال تھا اور اعمال کا حال یہ ہے کہ شب کو) ان کے پہلو خوابگاہوں سے

علیحدہ ہوتے ہیں (خواہ فرض عشاء کے لئے یا تہجد کے لئے بھی اور اس سے سب روایتیں جمع ہوگئیں اور خالی علیحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس طور پر علیحدہ ہوتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنے رب کو (ثواب کی) امید سے اور (عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں (اس میں نماز اور دعاء و ذکر سب آگیا) اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (مطلب یہ کہ ایمان لانے والوں کی یہ صفت ہیں جن میں بعض تو نفس ایمان کا موقوف علیہ ہیں اور بعض کمال ایمان کا) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے اعمال (نیک) کا صلہ ملا ہے (اور جب فریقین کا حال اور مآل معلوم ہوگیا) تو (اب بتلاؤ) جو شخص مومن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم (یعنی کافر) ہو (نہیں) وہ آپس میں (نہ حالاً نہ مآلاً) برابر نہیں ہو سکتے (چنانچہ معلوم بھی ہوا ہے، اور خاص مآل میں برابر نہ ہونے کی تفصیل تاکید کے لئے پھر بھی سن لو کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں، جو ان کے اعمال (نیک) کے بدلے میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں (یعنی مثل مہمان کے ان کو یہ چیزیں اکرام سے ملیں گی نہ کہ سائل محتاج کی طرح بے قدری اور بے وقعتی کے ساتھ) اور جو لوگ بے حکم تھے سو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے وہ لوگ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (اور کنارہ کی طرف کو بڑھیں گے گو بوجہ گہرائی کے اور دروازوں کے قفل ہونے کے نکل نہ سکیں گے، مگر ایسے وقت میں یہ حرکت طبعی ہوتی ہے، تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جاویں گے اور ان کو کہا جاوے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، (اور یہ عذاب موعود تو آخرت میں ہوگا) اور ہم ان کو قریب کا (یعنی دنیا میں آنے والا) عذاب بھی اس بڑے عذاب (موعود فی الآخرۃ) سے پہلے چکھا دیں گے (جیسے امراض و اسقام و مصائب کذا فی الدر مرفوعاً و موقوفاً، کیونکہ امراض و آفات حسب تصریح قرآن اکثر اعمال بد کے سبب آتے ہیں، تاکہ یہ لوگ (متاثر ہو کر کفر سے) باز آئیں (کقولہ تعالیٰ ظَهَرَ الْفَسَادُ (الیٰ) يَرْجِعُوْنَ، پھر جو باز نہ آوے اس کے لئے عذاب کبریٰ ہے، اور (ایسے لوگوں پر عذاب ہونے سے کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ) اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں پھر وہ ان سے اعراض کرے (تو اس کے استحقاق عذاب میں کیا شبہ ہے، اس لئے) ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے ؕ

معارف ومسائل

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ، اس سے پہلی آیت میں منکرین قیامت کو تنبیہ اور ان کے اس تعجب کا جواب تھا کہ مرنے اور مٹی ہوجانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے؟ اس آیت میں اس کا بیان ہے کہ اپنی موت پر دھیان دو اور غور کرو تو وہ خود حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک بڑا مظہر ہے، تم اپنی غفلت و جہل سے سمجھتے ہو کہ انسان کی موت خود بخود آجاتی ہے، بات یہ نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک تمہاری موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اس کے لئے فرشتوں کا ایک خاص نظام ہے جن میں بڑے عزرائیل علیہ السلام ہیں کہ ساری دنیا کی موت ان کے تنفیذ میں دی گئی ہے۔ جس شخص کی جس وقت جس جگہ موت مقدر ہو ٹھیک اسی وقت وہ اس کی رُوح قبض کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔ اور اس میں ملک الموت بلفظ مفرد ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اس میں ملائکہ بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

قبض رُوح اور ملک الموت کے متعلق بعض تفصیلات

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کسی انسان کے سامنے ایک طشت میں دانے پڑے ہوں، وہ جس کو چاہے اٹھا لے۔ یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے (ذکرہ القرطبی فی التذکرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی کے سرہانے ملک الموت کو دیکھا تو فرمایا کہ میرے صحابی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔ ملک الموت نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں، میں ہر مؤمن کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں اور فرمایا کہ جتنے آدمی شہروں میں یا دیہات اور جنگلوں پہاڑوں میں یا دریا میں آباد ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کو دن میں پانچ مرتبہ دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں ان کے ہر چھوٹے بڑے سے بلا واسطہ واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے ہے ورنہ میں اگر ایک مچھر کی روح بھی قبض کرنا چاہوں تو مجھے اس پر قدرت نہیں، جب تک **اللہ تعالیٰ ہی کا امر اس کے لئے نہ آجائے۔**

کیا جانوروں کی رُوح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں؟

مذکورہ روایت حدیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ مچھر کی روح بھی باذنِ خداوندی ملک الموت ہی قبض کرتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے ایک سوال کے جواب میں یہی فرمایا ہے، مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ قبضِ روح انسان کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی شرافت و کرامت کے لئے باقی جانور باذنِ خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجاتے ہیں گے (ذکرہ ابن عطیہ از قرطبی)

یہی مضمون ابوالشیخ، عقیلی، دیلمی وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہائم اور حشرات الارض سب کے سب اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں (یہی ان کی زندگی ہے) جب ان کی تسبیح ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی روح قبض فرما لیتا ہے، جانوروں کی موت ملک الموت کے سپرد نہیں۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمرؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ (مظہری)

اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام کے سپرد ساری دنیا کی موت کا معاملہ کیا تو انہوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار آپ نے مجھے ایسی خدمت سپرد کی کہ ساری دنیا اور سب بنی آدم مجھے برا کہیں گے، اور جب میرا ذکر آئے گا برائی سے کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تدارک اس طرح کر دیا ہے کہ دنیا میں موت کے کچھ ظاہری اسباب اور امراض رکھ دیتے ہیں جن کے سبب لوگ موت کو ان اسباب و امراض کی طرف منسوب کریں گے آپ ان کی بدگوئی سے محفوظ رہیں گے۔ (قرطبی فی التفسیر والتذکرہ)

اور امام بغوی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے امراض اور درد و زخم وغیرہ ہیں وہ سب موت کے قاصد ہیں، انسان کو اس کی موت یاد دلاتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ملک الموت مرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے بندۂ خدا میں نے اپنے آنے سے پہلے کتنی خبریں کتنے قاصد یکے بعد دیگرے تجھے خبردار کرنے اور موت کی تیاری کرنے کے لئے بصورت امراض و حوادث بھیجے ہیں، اب میں آپہونچا جس کے بعد کوئی اور خبر دینے والا یا کوئی قاصد نہیں آئے گا اب تم اپنے رب کے حکم کو لامحالہ مانو گے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے (مظہری)

مسئلہ: ملک الموت کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا، جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کر لو (اخرجہ احمد و ابن ابی الدنیا عن معمر، مظہری)

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا، سابقہ آیات میں کفار و مشرکین و منکرین قیامت کو تنبیہات تھیں۔ اس کے بعد اِنَّمَا يُؤْمِنُ

بِاٰيٰتِنَا) سے مؤمنین مخلصین کی خاص صفات اور ان کے بڑے درجات عظیمہ کا ذکر ہے۔ ان مؤمنین کی ایک صفت آیت مذکورہ میں یہ بتلائی گئی ہے کہ ان کے پہلو اپنے بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اور بستروں سے اُٹھ کر اللہ کے ذکر اور دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کی ناراضی اور عذاب سے ڈرتے ہیں، اور اس کی رحمت اور ثواب کے امیدوار رہتے ہیں یہی امید و بیم کی ملی جلی حالت ان کو ذکر و دعا کیلئے مضطرب رکھتی ہے۔

نمازِ تہجد

بستروں سے اُٹھ کر ذکر و دعا میں مشغول ہو جانے سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک نماز تہجد و نوافل ہیں جو سو کر اُٹھنے کے بعد پڑھی جاتی ہیں (ہو قول الحسن و مجاہد و مالک والاوزاعی) اور روایت حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسند احمد، ترمذی، نسائی وغیرہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھا۔ ایک روز میں دوران سفر میں صبح کے وقت آپ کے قریب ہوا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرے، اور جہنم سے دور کر دے۔ آپؐ نے فرمایا تم نے ایک بڑی چیز کا سوال کیا، مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کر دے اس کو وہ آسان ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا کہ وہ عمل یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو اور پھر فرمایا کہ لو اب میں تمہیں خیر یعنی نیکی کے ابواب بتلا دیتا ہوں (وہ یہ ہیں کہ) روزہ ڈھال ہے جو عذاب سے بچاتا ہے) اور صدقہ آدمی کے گناہوں کی آگ بجھا دیتا ہے، اسی طرح آدمی کی نماز درمیان شب میں۔ اور یہ فرما کر قرآن مجید کی آیت مذکورہ تلاوت فرمائی تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ

حضرت ابو الدرداءؓ اور قتادہؒ اور ضحاکؒ نے فرمایا ہے کہ پہلوؤں کے بستروں سے الگ ہو جانے کی یہ صفت ان لوگوں پر بھی صادق ہے جو عشاء کی نماز جماعت سے ادا کریں پھر صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ اور ترمذی میں بسند صحیح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سونے اور جماعتِ عشاء کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل پڑھتے ہیں۔ (رواہ محمد بن نصر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ جب آنکھ کھلے اللہ کا ذکر کریں لیٹے، بیٹھے اور کروٹ پر وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

ابن کثیر اور دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت ان سب کو شامل ہے، اور آخر شب کی نماز ان سب میں اعلیٰ و افضل ہے، بیان القرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اوّلین و آخرین کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی کھڑا ہوگا جس کی آواز تمام مخلوقات سنیں گی وہ ندا دے گا کہ اہل محشر آج جان لیں گے کہ اللہ کے نزدیک کون لوگ عزت و اکرام کے مستحق ہیں۔ پھر وہ فرشتہ ندا دے گا کہ اہل محشر میں سے وہ لوگ کھڑے ہوں جن کی صفت یہ تھی تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یعنی ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اس آواز پر یہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی تعداد قلیل ہوگی (ابن کثیر) اور اسی روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ یہ لوگ بغیر حساب کے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسرے تمام لوگ کھڑے ہوں گے، ان سے حساب لیا جائے گا (مظہری)

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، ادنیٰ بمعنی اقرب ہے، اور عذاب ادنیٰ سے مراد دنیا کے مصائب و آفات، اور امراض وغیرہ ہیں، اور عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

دنیا کے مصائب اُن لوگوں کے لئے رحمت ہیں جو اللہ کی طرف رجوع کریں :

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو ان کے گناہوں پر متنبہ کرنے کے لئے دنیا میں اُن پر امراض اور مصائب و آفات مسلط کر دیتے ہیں، تاکہ یہ متنبہ ہو کر اپنے گناہوں سے باز آجائیں، اور آخرت کے عذاب اکبر سے نجات پائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے لئے دنیا کے مصائب و آفات اور امراض و تکالیف بھی ایک قسم کی رحمت ہی ہیں کہ غفلت سے باز آکر عذاب آخرت سے بچ جائیں۔ البتہ جو لوگ آفات پر بھی اللہ کی طرف رجوع نہ ہوں ان کے لئے یہ دوہرا عذاب ہو جاتا ہے، ایک یہی دنیا میں نقد اور دوسرا آخرت کا عذاب اکبر۔ اور انبیاء و اولیاء اللہ پر جو آفات و مصائب آتے ہیں ان کا معاملہ ان سب سے الگ ہے، وہ ان کے امتحان اور امتحان کے ذریعہ رفع درجات کے لئے ہوتے ہیں، اور پہچان اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں کو امراض و آفات کے وقت بھی ایک قسم کا قلبی سکون و اطمینان اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بعض جرائم کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے | اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ، بظاہر لفظ مجرمین میں ہر قسم کے مجرم شامل ہیں، اور انتقام بھی عام ہے خواہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں، مگر ابن جریر کی روایت حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے، ایک حق کے خلاف جھنڈے اور نعروں کے ساتھ اعلانیہ کوشش کرنا، دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے ظالم کی امداد۔ (رواہ ابن جریر عن معاذ بن جبل)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗىِٕهٖ وَ

اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور

جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً

کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے۔ اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو

يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڜ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ

تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف

يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ

کرتے تھے۔ کیا ان کو راہ نہ سوجھی اس بات سے کہ کتنی غارت کر ڈالیں ہم نے ان سے

الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا

پہلے جماعتیں کہ پھرتے ہیں یہ ان کے گھروں میں اس میں بہت نشانیاں ہیں، کیا وہ

يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَاۗءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ

سنتے نہیں، کیا دیکھتے نہیں انھوں نے کہ ہم ہانک دیتے ہیں پانی کو ایک زمین چٹیل کی طرف

فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی کہ کھاتے ہیں اس میں سے ان کے چوپائے اور خود وہ بھی، پھر کیا دیکھتے نہیں۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ فیصلہ اگر تم سچے ہو تو کہہ کہ فیصلہ کے دن

لَا يَنفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ

کام نہ آوے گا منکروں کو ان کا ایمان لانا اور نہ ان کو ڈھیل ملے گی۔ سو تو خیال چھوڑ

عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾

ان کا اور منتظر رہ وہ بھی منتظر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (آپ ہی کی طرح) کتاب دی تھی جس کی اشاعت میں ان کو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، ایک تسلی تو یہ ہوئی، پھر اسی طرح آپ کو بھی کتاب دی، سو آپ (اپنی) اس (کتاب) کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے (کقولہ تعالیٰ: اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ) مطلب یہ کہ آپ صاحب کتاب صاحب خطاب ہیں پس جب آپ اللہ کے نزدیک ایسے مقبول ہیں تو اگر چند احمق آپ کو قبول نہ کریں تو کوئی غم کی بات نہیں، ایک تسلی کی بات یہ ہوئی، اور ہم نے اس (کتاب موسیٰ) کو بنی اسرائیل کے لئے موجب ہدایت بنایا تھا (اسی طرح آپ کی کتاب سے بہتوں کو ہدایت ہوگی، آپ خوش رہئے، ایک تسلی یہ ہوئی) اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دین کے) پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کئے رہے، اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور خلق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، یہ تسلی ہے مومنین کو کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم صاحب یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو صبر ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی ائمہ دین بنا دیں گے یہ تو تسلی دنیا کے اعتبار سے ہے، اور ایک تسلی آخرت کے اعتبار سے تم کو رکھنا چاہئے اور وہ امر موجب تسلی یہ ہے کہ) آپ کا رب قیامت کے روز ان سب کے آپس میں (عملی) فیصلہ ان امور میں کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے تھے (یعنی مومن کو جنت میں اور کفار کو دوزخ میں ڈال دیگا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، اس سے بھی تسلی حاصل کرنا چاہئے، اور اس مضمون کو سن کر کفار دو شبہے کر سکتے تھے، ایک یہ کہ ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا

کفر ناپسند ہو جیسا تفصیل سے مفہوم ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ ہم قیامت ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں، آگے دونوں کے دفع کے لئے دو مضمون ہیں، اوّل یہ کہ ان کو جو کفر کے مبغوض ہونے میں شبہ ہے تو کیا ان کو یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہو کہ ہم ان سے پہلے (ان کے کفر و شرک ہی کے سبب) کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں (کہ ان کے طریق ہلاکت سے وتیز نبی کی پیشینگوئی کے بعد بطور خرقِ عادت کے واقع ہونے سے خدا کا غضب ٹپکتا تھا جس سے مبغوض ہونا کفر کا صاف واضح ہوتا ہے) جن کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ (اثنائے سفر شام میں) آتے جاتے (گذرتے) ہیں اس (امر) میں (تو) صاف نشانیاں (مبغوضیت کفر کی موجود) ہیں کیا یہ لوگ (ان گذشتہ امم کے قصص) سنتے نہیں ہیں (کہ مشہور ہیں اور زبانوں پر مذکور ہیں) دوسرا مضمون یہ کہ ان کو جو قیامت میں شبہ عدم امکان کا ہے تو) کیا انھوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم (بادلوں یا نہروں وغیرہ کے ذریعہ سے) خشک زمین کی طرف پانی پہونچاتے ہیں پھر اس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا (اس بات کو شب و روز) دیکھتے نہیں ہیں (یہ صاف نمونہ ہے مر کر زندہ ہونے کا، جیسا کئی جگہ اس کی تقریر گذری ہے، پس دونوں شبہے دفع ہو گئے، اور یہ لوگ (قیامت اور فیصلہ کا ذکر سن کر بطور مستعجل و استہزاء کے یوں) کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو تو (بتلاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ (تم عبث اس کا تقاضا کرتے ہو تمہارے لئے تو وہ بڑی مصیبت کا دن ہے، کیونکہ) اس فیصلہ کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا (بالکل) نفع نہ دے گا (اور یہی ایک صورت ان کے بچاؤ کی تھی وہ وہی مفقود ہے) اور (نفع نجات تو کیا ہوتا) ان کو مہلت بھی (تو) نہ ملے گی سو (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے (جن کے خیال سے غم ہوتا ہے) اور آپ (فیصلہ موعود کے) منتظر رہئے یہ بھی (اپنے زعم میں آپ کے ضرر کے) منتظر ہیں (کقولہم نتربص بہ ریب المنون، مگر معلوم ہو جائے گا کس کا انتظار مطابق واقع کے ہے اور کس کا نہیں، کقولہ تعالیٰ فی جوابہم قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ) ؁

مَعارف ومَسَائل

فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ، لقاء کے معنی ملاقات کے ہیں، اس آیت میں کس کی ملاقات کس سے مراد ہے؟ اس میں اہل تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے، کہ لِقَآئِهٖ کی ضمیر کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع

قرار دے کر مطلب یہ لیا گیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کتاب دی آپ بھی اپنی کتاب کے آنے میں کوئی شک نہ کریں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں قرآن کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ

اور حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ سے اس کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ لِقَآئِہٖ کی ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ اس میں شک نہ کریں کہ آپؐ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے ہوگی چنانچہ ایک ملاقات شبِ معراج میں ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، پھر قیامت میں ملاقات ہونا بھی ثابت ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی گئی اور لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کو ستایا۔ آپؐ بھی یقین رکھیں کہ یہ سب چیزیں آپ کو بھی پیش آئیں گی۔ اس لئے آپ کفار کی ایذاؤں سے دلگیر نہ ہوں، بلکہ اس کو سنتِ انبیاء سمجھ کر برداشت کریں۔

کسی قوم کا مقتدا و امام بننے کے لئے دو شرطیں

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ، "یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا و مقتدا بنا دیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذنِ ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، جبکہ انھوں نے صبر کیا، اور جبکہ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں"۔

اس آیت میں علماء بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرمانے کے دو سبب ذکر فرمائے ہیں اوّل صبر کرنا، دوسرے آیاتِ الٰہیہ پر یقین کرنا۔ صبر کرنے کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے۔ اس کے لفظی معنی باندھنے اور ثابت رہنے کے ہیں۔ اس جگہ صبر سے مراد احکامِ الٰہیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے اپنے نفس کو روکنا ہے۔ جس میں تمام احکامِ شریعت کی پابندی آجاتی ہے، اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔ دوسرا سبب ان کا آیاتِ الٰہیہ پر یقین رکھنا ہے۔ اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا پھر سمجھ کر اس پر یقین کرنا دونوں داخل ہیں، یہ بہت بڑا کمال علمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امامت و پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی، اور یہاں عملی کمال کو علمی کمال سے مقدم بیان فرمایا کہ

کہ ترتیب طبعی میں علم عمل سے مقدم ہوتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ علم قابل اعتبار ہی نہیں جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

ابن کثیر نے بعض علماء کا قول اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ بِالصَّبْرِ وَالْيَقِينِ تُنَالُ الْإِمَامَةُ فِي الدِّينِ۔ "یعنی صبر اور یقین ہی کے ذریعہ دین میں کسی کو امامت کا درجہ مل سکتا ہے"

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا، یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی کو (بعض مواقع میں) زمین پر چلا کر لے جاتے ہیں جس سے ان کی کھیتیاں اُگتی ہیں"۔ جُرُز خشک زمین کو کہتے ہیں جس میں درخت نہیں اُگتے۔

زمین کی آبپاشی کا ایک خاص حکیمانہ نظام

خشک زمین کو سیراب کرنے اور اس میں نباتات اُگانے کا ذکر قرآن کریم میں جابجا اس طرح آیا ہے کہ اس زمین پر بارش برستی ہے، اس سے زمین تروتازہ ہو کر اُگانے کے قابل ہو جاتی ہے۔ مگر اس آیت میں بارش کے بجائے پانی کو زمین پر چلا کر خشک زمین کی طرف لے جانے اور اس سے درخت اُگانے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی بارش کسی دوسری زمین پر نازل کی جاتی ہے وہاں سے ندی نالوں کے ذریعہ زمین پر چلا کر پانی کو خشک زمین کی طرف لے جایا جاتا ہے جہاں بارش نہیں ہوتی۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ بعض زمینیں ایسی خام اور نرم ہوتی ہیں جو بارش کی متحمل نہیں ہوتیں، اگر وہاں پوری بارش برسائی جائے تو عمارتیں منہدم ہو جائیں، درخت اُکھڑ جائیں۔ اس لئے قدرت نے ایسی زمینوں کے لئے یہ نظام بنایا ہے کہ بارش تو اس زمین پر نازل کی جاتی ہے جو اس کی متحمل ہے، پھر یہاں سے پانی بہا کر ایسی زمینوں کی طرف لے جایا جاتا ہے جو بارش کی متحمل نہیں، جیسے مصر کی زمین ہے۔ اور بعض مفسرین نے یمن اور شام کی بعض زمینوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے (کما روی عن ابن عباس والحسن)

اور صحیح یہ ہے کہ یہ مضمون ایسی تمام زمینوں کو شامل ہے اور مصر کی زمین خصوصیت سے اس میں شامل ہے، جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ مگر بلادِ حبشہ افریقہ کی بارشوں کا پانی دریائے نیل کے ذریعہ مصر میں آتا ہے، اور وہاں کی سرخ مٹی ساتھ لاتا ہے جس میں انبات کا مادّہ زیادہ ہے۔ اس لئے مصر کے لوگ اپنے ملک میں بارش نہ ہونے کے باوجود ہر سال نئے پانی اور نئی مٹی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ "یعنی کفار یہ کہتے ہیں کہ وہ فتح کب ہوگی، جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کہ مومنین کو کفار پر غلبہ ہوگا، ہمیں تو کہیں اس کے آثار نظر نہیں آتے،

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خائف ہیں، چھپتے پھرتے ہیں۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ، "یعنی آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم ہماری فتح کا دن ہم سے کیا پوچھتے ہو وہ دن تو تمہاری مصیبت کا ہوگا۔ کیونکہ جس وقت ہماری فتح ہوگی تو اس وقت تم عذاب میں گرفتار ہو چکے ہو گے، خواہ دنیا میں جیسے غزوۂ بدر میں ہوا یا آخرت میں۔ اور جب اللہ کا عذاب کسی کو پکڑ لیتا ہے پھر اس کا ایمان قبول نہیں ہوتا۔ کذا ذکرہ ابن کثیر

اور بعض حضرات نے اس جگہ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ کے معنی روز قیامت کے کئے ہیں۔ اوپر خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ؛

تمت

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ بِحَمْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ
فِيْ لَيْلَةِ عَرَفَةَ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ سَنَة ١٣٩١ھ

سُورَةُ الأَحْزَاب

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ احزاب مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تہتر آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اے نبی ڈر اللہ سے اور کہنا نہ مان منکروں کا اور دغابازوں کا مقرر اللہ ہے

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ① وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ

سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا۔ اور چل اس پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف سے، بیشک

اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ② وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى

اللہ تمھارے کام کی خبر رکھتا ہے۔ اور بھروسہ رکھ اللہ پر اور اللہ

بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ③

کافی ہے کام بنانے والا

خلاصۂ تفسیر

اے نبی اللہ سے ڈرتے رہیے (اور کسی سے نہ ڈریئے اور ان کی دھمکیوں کی ذرا پروا نہ کیجئے) اور کافروں کا (جو کھلم کھلا دین کے خلاف مشورے دیتے ہیں) اور منافقوں کا (جو در پردہ ان کے ساتھ متفق ہیں) کہنا نہ مانئے (بلکہ اللہ ہی کا کہنا کیجئے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا علم والا

بڑی حکمت والا ہے (اس کا ہر حکم فوائد اور مصالح پر مشتمل ہوتا ہے) اور (اللہ کا کہنا ماننا یہ ہے کہ) آپ کے پروردگار کی طرف سے جو حکم آپ پر وحی کیا جاتا ہے اس پر چلئے (اور اے لوگو) بیشک تم لوگوں کے سب اعمال کی اللہ تعالیٰ پوری خبر رکھتا ہے (تم میں سے جو ہمارے پیغمبر کی مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہیں ہم سب کو سمجھیں گے) اور (اے نبیؐ آپ ان لوگوں کی دھمکیوں کے معاملہ میں) اللہ پر بھروسہ رکھئے اور اللہ کافی کارساز ہے (اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی، اس لئے کچھ فکر نہ کیجئے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی ابتلاء کو مقتضی ہو اور اس کی وجہ سے کوئی عارضی تکلیف پہونچ جائے تو وہ ضرر نہیں بلکہ عین منفعت ہے)۔

معارف و مسائل

یہ مدنی سورۃ ہے اس کے بیشتر مضامین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت اور خصوصیت عند اللہ پر مشتمل ہیں، جس میں آپ کی تعظیم کا واجب ہونا اور آپ کی ایذا رسانی کا حرام ہونا مختلف عنوانات سے بیان ہوا ہے۔ دوسرے مضامین سورۃ بھی انہی کی تکمیل و اتمام سے مناسبت رکھتے ہیں۔

شانِ نزول اس سورۃ کے سبب نزول میں چند روایات منقول ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے، تو مدینہ کے آس پاس یہود کے قبائل، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع وغیرہ آباد تھے۔ رحمۃ للعالمین کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اتفاق ان یہودیوں میں سے چند آدمی آپ کی خدمت میں آنے لگے، اور منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے، دلوں میں ایمان نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو غنیمت سمجھا، کہ کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں تو دوسروں کو دعوت دینا آسان ہو جائے گا۔ اس لئے آپ ان لوگوں کے ساتھ خاص مدارات کا معاملہ فرماتے، اور ان کے چھوٹے بڑے آنے والوں کا اکرام کرتے تھے، اور کوئی بُری بات بھی ان سے صادر ہوتی تو دینی مصلحت سمجھ کر اس سے چشم پوشی فرماتے تھے۔ اس واقعہ پر سورۂ احزاب کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی)

ایک دوسرا واقعہ ابن جریرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ہجرت کے بعد کفارِ مکہ میں سے ولید بن مغیرہ اور شیبہ ابن ربیعہ مدینہ طیبہ آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ پیشکش کی کہ ہم سب قریش مکہ کے آدھے اموال آپ کو دیدیں گے اگر آپ اپنے دعوے کو چھوڑ دیں۔ اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہود نے آپ کو یہ

دھمکی دی کہ اگر آپ نے اپنا دعویٰ اور دعوت سے رجوع نہ کیا تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔
اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح)

تیسرا ایک واقعہ ثعلبی اور واحدی نے بغیر سند یہ نقل کیا ہے کہ ابو سفیان اور عکرمہ ابن ابی جہل اور ابوالاعور سلمی اس زمانے میں جب واقعہ حدیبیہ میں کفار مکہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ترکِ جنگ پر معاہدہ ہو گیا تھا تو یہ لوگ مدینہ طیبہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہمارے معبودوں کا برائی سے ذکر کرنا چھوڑ دیں، صرف اتنا کہہ دیں کہ یہ بھی شفاعت کریں گے اور نفع پہنچائیں گے۔ آپ اتنا کر لیں تو ہم آپ کو اور آپ کے رب کو چھوڑ دیں گے، جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

ان کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوئی مسلمانوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے معاہدہ صلح کر چکا ہوں اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (روح) یہ روایات اگرچہ مختلف ہیں مگر درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں یہ واقعات بھی آیت مذکورہ کے نزول کا سبب ہو سکتے ہیں۔

ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے: پہلا اتَّقِ اللّٰهَ یعنی اللہ سے ڈرو، دوسرا لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی کافروں کا کہنا نہ مانو۔ اللہ سے ڈرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان لوگوں کو قتل کرنا عہد شکنی ہے جو حرام ہے۔ اور کفار کی بات نہ ماننے کا حکم اس لئے کہ ان تمام واقعات میں کفار کی جو فرمائشیں ہیں وہ ماننے کے قابل نہیں۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز و اکرام ہے کہ پورے قرآن میں کہیں آپ کو نام لے کر خطاب نہیں کیا گیا، جیسا کہ دوسرے انبیاء کے خطابات میں یٰاٰدَمُ، یٰنُوْحُ، یٰاِبْرٰهِیْمُ، یٰمُوْسٰی وغیرہ بار بار آیا ہے، بلکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے قرآن میں جہاں خطاب کیا گیا وہ کسی لقب نبی یا رسول وغیرہ سے خطاب کیا گیا۔ صرف چار مواقع جن میں یہی بتلانا منظور تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ان میں آپ کا نام ذکر کیا گیا ہے جو ضروری تھا۔

اس خطاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو حکم دیئے گئے۔ ایک خدا تعالیٰ سے ڈرنے کا، کہ مشرکین مکہ سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اس کی خلاف ورزی نہ ہونی چاہئے، دوسرے مشرکین اور منافقین و یہود کی بات نہ ماننے کا۔ یہاں جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر گناہ سے معصوم ہیں، عہد شکنی بھی گناہ کبیرہ ہے، اور کفار و مشرکین کی وہ باتیں جو شان نزول میں اوپر بیان کی گئیں، ان کا ماننا بھی گناہ عظیم ہے تو آپ خود ہی اس سے محفوظ تھے۔ پھر اس حکم کی ضرورت کیا پیش آئی؟ روح المعانی میں ہے کہ مراد ان احکام سے آئندہ بھی ان پر قائم رہنے کی ہدایت ہے جیسا کہ اس واقعہ میں آپ اُن پر قائم رہے اور اتق اللہ کے حکم کو اس لئے مقدم کیا کہ مسلمانوں نے ان مشرکین مکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جن سے معاہدہ صلح ہو چکا تھا، اس سے عہد شکنی سے بچنے کی ہدایت لفظ اتق اللہ کے ذریعہ مقدم کی گئی۔ بخلاف اطاعتِ کفار و مشرکین کے کہ اس کا کسی نے ارادہ بھی نہ کیا تھا اس لئے اس کو مؤخر کیا گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت کو سُنانا ہے، آپ تو معصوم تھے، احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کا آپ سے کوئی احتمال نہ تھا۔ مگر قانون پوری امت کے لئے ہے، ان کو سنانے کا عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا جس سے حکم کی اہمیت بہت بڑھ گئی، کہ جب اللہ کے رسول بھی اس کے مخاطب ہیں تو امت کا کوئی فرد اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔

اور ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں کفار و مشرکین کی اطاعت سے منع کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ ان سے مشورے نہ کریں، ان کو زیادہ مجالست کا موقع نہ دیں کیونکہ ایسے مشورے اور باہمی روابط بسا وقت اس کا سبب بن جایا کرتے ہیں کہ ان کی بات مان لی جائے تو اگرچہ ان کی بات مان لینے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی احتمال نہ تھا، مگر ان کے ساتھ ایسے روابط رکھنے اور ان کو اپنے مشوروں میں شریک کرنے سے بھی آپ کو روک دیا گیا، اور اس کو اطاعت کے لفظ سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ ایسے مشورے اور باہمی روابط عادۃً مانے کا سبب بن جایا کرتے ہیں۔ تو یہاں درحقیقت آپ کو اسباب اطاعت سے منع کیا گیا ہے، نفس اطاعت کا تو آپ سے احتمال ہی نہ تھا۔

رہا یہ سوال کہ آیت مذکورہ میں کافروں کی طرف سے خلافِ شرع اور خلافِ حق باتوں کا اظہار تو کوئی بعید نہیں، ان کی اطاعت سے منع کرنا بھی ظاہر ہے۔ مگر منافقین نے اگر اسلام کے خلاف کوئی بات آپ سے کہی تو پھر وہ منافقین نہ رہے، کھلے کافر ہو گئے ان کو الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ منافقین نے بالکل کھول کر تو کوئی بات خلاف اسلام نہ کہی ہو، مگر دوسرے کفار کی تائید اور حمایت میں کوئی کلمہ کہا ہو۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار و منافقین کے مشوروں پر عمل نہ کرنے اور وحی پر عمل کرنے کی ہدایت ہے۔ آیات مذکورہ میں کفار میں چلی ہوئی تین رسموں اور باطل خیالات کی تردید ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب لوگ ایسے شخص کو جو زیادہ ذہین ہو یہ کہا کرتے تھے کہ اس کے سینے میں دو دل ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں اپنی ازواج کے متعلق یہ رسم تھی کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ یا دوسرے کسی عضو سے تشبیہ دی اور کہہ دیا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ اس کو ان کے محاورہ میں ظہار کہا جاتا تھا، جو ظہر سے مشتق ہے، ظہر کے معنی ہیں پیٹھ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوگئی۔

تیسرے یہ کہ ان میں ایک رسم یہ تھی کہ ایک آدمی کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیتے تھے اور وہ اس طرح بیٹا بنتا تھا کہ لڑکا اسی کا بیٹا مشہور ہو جاتا، اور اسی کا بیٹا کہہ کر پکارا جاتا تھا، اور ان کے نزدیک یہ منہ بولا بیٹا تمام احکام میں اصلی بیٹے کی طرح مانا جاتا تھا، شرکت میراث میں بھی اس کی اولاد کے ساتھ مثل حقیقی اولاد کے شریک ہوتا تھا اور نسبی رشتہ سے جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہوتا ہے، یہ منہ بولے بیٹے کے رشتہ کو بھی ایسا ہی قرار دیتے تھے، مثلاً جیسے اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی سے اس کے طلاق دینے کے بعد بھی نکاح حرام رہتا ہے یہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو بھی بعد طلاق اس شخص کے لئے حرام سمجھتے تھے۔

زمانہ جاہلیت کے یہ تین باطل خیالات و رسوم تھے جن میں سے پہلی بات اگرچہ مذہبی عقیدے یا عمل سے متعلق نہیں تھی۔ اس لئے شریعت اسلام کو اس کی تردید کی ضرورت نہیں تھی، یہ محض فن تشریح و طب کا معاملہ تھا کہ انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہوتا ہے یا دو بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا ظاہر البطلان ہونا سبھی کو معلوم تھا اس لئے شاید اس کے بطلان کے ذکر کو بھی باقی دو مسئلوں کی تائید و تمہید کے طور پر بیان کر دیا گیا۔ کہ جس طرح اہل جاہلیت کا یہ کہنا باطل ہے کہ کسی ایک انسان کے سینہ میں دو دل ہو سکتے ہیں اور اس کے بطلان کو عام و خاص سبھی جانتے ہیں اسی طرح ظہار اور متبنیٰ کے مسائل میں بھی ان کے خیالات باطل ہیں۔

باقی دو مسئلے ایک ظہار دوسرے متبنیٰ بیٹے کے احکام یہ اُن معاشرتی اور عائلی

مسائل میں سے ہیں جن کی اسلام میں خاص اہمیت ہے، یہاں تک کہ ان کی جزئیات اور تفصیلات بھی حق تعالیٰ نے قرآن میں خود ہی بیان فرمائی ہیں، دوسرے معاملات کی طرح صرف اصول بیان کر کے تفصیل بیان کو پیغمبر کے حوالہ نہیں فرمایا۔ ان دونوں مسئلوں میں اہل جاہلیت نے اپنی بے بنیاد توہمات سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے خود ساختہ قوانین بنا رکھے تھے۔ دین حق کا فرض تھا کہ وہ ان باطل رسوم و خیالات کا ابطال کر کے حقائق واضح کرے، اس لئے بیان فرمایا وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی نے بیوی کو ماں کی برابر یا مثل کہہ دیا تو وہ حقیقی ماں کی طرح ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوگئی، تمہارے کہنے سے بیوی حقیقۃً ماں نہیں ہو جاتی، تمہاری ماں تو وہی ہے جس سے تم پیدا ہوئے ہو۔ اس آیت نے اہل جاہلیت کے اس خیال کو تو باطل کر دیا کہ ظہار کرنے سے حرمت مؤبدہ نہیں ہوتی آگے یہ بات کہ ایسا کہنے پر کوئی شرعی نتیجہ مرتب ہوتا ہے یا نہیں، اس کا حکم مستقلاً سورۂ مجادلہ میں بتلایا گیا ہے، کہ ایسا کہنا گناہ ہے، اس سے پرہیز واجب ہے، اور ایسا کہنے والا اگر کفارہ ظہار ادا کردے تو بیوی اس کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ کفارۂ ظہار کی تفصیل سورۂ مجادلہ میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ متبنّٰی بیٹے کا تھا، اس کے متعلق فرمایا وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاۗءَكُمْ اَبْنَاۗءَكُمْ، اَدْعِیَاء، دعیّ کی جمع ہے، دعیّ وہ لڑکا ہے جس کو منہ بولا بیٹا کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے، اور جس طرح بیوی کو ماں کے مثل کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی، اسی طرح منہ بولا بیٹا تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا، یعنی دوسرے بیٹوں کے ساتھ وہ میراث میں شریک ہوگا اور نہ حرمت نکاح کے مسائل اس پر عائد ہوں گے کہ بیٹے کی مطلقہ بیوی باپ پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے تو متبنّٰی کی بیوی بھی حرام ہو۔

اور چونکہ اس آخری معاملے کا اثر بہت سے معاملات پر پڑتا ہے اس لئے یہ حکم نافذ کردیا گیا کہ متبنّٰی بیٹے کو جب پکارو یا اس کا ذکر کرو تو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کر کے ذکر کرو۔ جس نے بیٹا بنا لیا ہے اس کا بیٹا کہہ کر خطاب نہ کرو، کیونکہ اس سے بہت سے معاملات میں اشتباہ اور التباس پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہا کرتے تھے (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

نے ان کو متبنّیٰ بنا لیا تھا، اس آیت کے نزول کے بعد ہم نے یہ عادت چھوڑ دی۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اکثر آدمی جو دوسرے لوگوں کے بچوں کو بیٹا کہہ کر پکار دیتے ہیں جب کہ محض شفقت کی وجہ سے ہو، تبنّی قرار دینے کی وجہ سے نہ ہو تو یہ اگرچہ جائز ہے مگر پھر بھی بہتر نہیں کہ صورۃً ممانعت میں داخل ہے (کذا فی الروح عن الخفاجی علی البیضاوی)

اور یہی وہ معاملہ ہے جس نے قریش عرب کو مغالطے میں ڈال کر ایک بہت بڑے گناہ عظیم کا مرتکب بنا دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگانے لگے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا، حالانکہ وہ آپ کے بیٹے نہ تھے بلکہ متبنّیٰ تھے، جس کا ذکر اسی سورۃ میں آگے آنے والا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّہٰتُہُمْ ط

نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے، اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں،

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُہُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ مِنَ

اور قرابت والے ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں اللہ کے حکم میں

الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُہٰجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِکُمْ

زیادہ سب ایمان والوں اور ہجرت کرنے والوں سے مگر یہ کہ کرنا چاہو اپنے رفیقوں سے

مَّعْرُوْفًا ط کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۶)

احسان، یہ ہے کتاب میں لکھا ہوا

خلاصۂ تفسیر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں (کیونکہ انسان کا نفس تو کبھی اس کو نفع پہونچاتا ہے کبھی نقصان، کیونکہ اگر نفس اچھا ہے، اچھے کاموں کی طرف چلتا ہے تو نفع ہے اور برے کاموں کی طرف چلنے لگے تو خود اپنا نفس ہی اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیم نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر ہے۔ اور اپنا نفس اگر اچھا بھی ہو اور نیکی ہی کی

کی طرف چلنے دیا جائے بھر بھی اس کا نفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفع کی برابر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اپنے نفس کو تو خیر و شر اور مصلحت و مضرت میں مغالطہ بھی ہو سکتا ہے، اور اس کو مصالح و مضار کا پورا علم بھی نہیں، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیمات میں کسی مغالطہ کا خطرہ نہیں۔ اور جب نفع رسانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جان اور ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہیں تو ان کا حق ہم پر ہماری جان سے زیادہ ہے، اور وہ حق یہ ہے کہ آپ کی ہر کام میں اطاعت کریں اور آپ کی تعظیم و تکریم تمام مخلوقات سے زیادہ کریں) اور آپ کی بیبیاں اُن (مومنین) کی مائیں ہیں (مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے لئے روحانی باپ ہیں جو اُن کی اپنی ذات سے بھی زیادہ اُن پر شفیق و مہربان ہیں، اسی نسبت سے آپ کی ازواج مطہراتؓ امت کی مائیں ہو گئیں جو تعظیم و تکریم میں ان کے حق ماؤں کی طرح ہے۔

اس آیت نے ازواج مطہراتؓ کو صراحۃً امت کی مائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارۃً امت کے روحانی باپ قرار دیدیا، تو اس سے بھی اسی طرح کا ایک التباس اور شبہ ہو سکتا تھا جس طرح کا شبہ متبنّیٰ کو اس کے غیر حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنے میں ہوتا تھا، جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا تھا کہ امت کے مسلمان سب آپس میں حقیقی بھائی بہن ہو جائیں تو ان کے آپس میں نکاح کا تعلق حرام ہو جائے، اور میراث کے حکم میں بھی ہر مسلمان دوسرے کا وارث قرار دیا جائے، اس التباس کو دور کرنے کے لئے آخر آیت میں فرما دیا وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ یعنی) رشتہ دار کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی) میں ایک دوسرے سے (میراث کا) زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مومنین و مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے (ان) دوستوں سے (بطور وصیت کے) کچھ سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے، یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے۔ (کہ ابتداء ہجرت میں ایمانی اخوت کی بناء پر مہاجرین کو انصار کی میراث کا حق دار بنا دیا گیا تھا مگر بالآخر تقسیم میراث رشتہ داری اور ارحام کی بنیاد پر رہے گی)۔

معارف ومسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے سورۂ احزاب میں بیشتر مضامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور آپ کی ایذاء رسانی کے حرام ہونے سے متعلق ہیں۔ شروع سورۃ میں مشرکین و منافقین کی ایذاؤں کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات دی گئی

تھیں۔ اس کے بعد جاہلیت کی تین رسموں کا ابطال کیا گیا جن میں آخری رسم کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا، کیونکہ کفار نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بی بی زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے وقت اپنی جاہلانہ رسم متبنّیٰ کی بناء پر آپؐ پر یہ الزام لگایا کہ آپؐ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح شروع سورۃ سے یہاں تک ایذاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مضمون تھا، اس آیتِ مذکورہ میں آپؐ کی تعظیم و اطاعت تمام مخلوق سے زیادہ واجب ہونا بیان کیا گیا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ، اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ کا جو مطلب خلاصۂ تفسیر میں بیان کیا گیا ہے وہ ابن عطیہ وغیرہ کا قول ہے جس کو قرطبی اور دوسرے مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپؐ کا حکم ہر مسلمان کے لئے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ واجب التعمیل ہے۔ اگر ماں باپ آپؐ کے کسی حکم کے خلاف کہیں ان کا کہنا ماننا جائز نہیں، اسی طرح خود اپنے نفس کی تمام خواہشات پر بھی آپ کے حکم کی تعمیل مقدم ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ اِلَّا وَاَنَا اَوْلٰی النَّاسِ بِهٖ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔

"یعنی کوئی مومن ایسا نہیں جس کیلئے میں دنیا و آخرت میں سارے انسانوں سے زیادہ اَولیٰ اور اقرب نہ ہوں، اگر تمہارا دل چاہے تو اس کی تصدیق کے لئے قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ میں ہر مومن مسلمان پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق و مہربان ہوں"

اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ ہر مومن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہو، جیسا کہ حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (بخاری و مسلم، مظہری)

"یعنی تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے دل میں میری محبت اپنے باپ، بیٹے اور سب انسانوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔"

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ، ازواج مطہرات کو اُمت کی مائیں فرمانے سے مراد تعظیم و تکریم کے اعتبار سے مائیں ہونا ہے۔ ماں اور اولاد کے دوسرے احکام حرمت

نکاح اور مؤمن ہونے کی وجہ سے باہم پردہ نہ ہونا، وراثت میں حصہ دار ہونا وغیرہ، یہ احکام
اس سے متعلق نہیں جیسا کہ آخر آیت میں اس کو کھول دیا گیا ہے۔ اور ازواج مطہرات
سے کسی امتی کا نکاح حرام ہونا وہ ایک مستقل آیت میں علیحدہ فرمایا گیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری
نہیں کہ یہ حرمت نکاح بھی ماں ہونے کی وجہ سے ہو۔

مسئلہ: آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ ازواج مطہرات میں سے کسی کی شان
میں کوئی ادنیٰ بے ادبی اس لئے بھی حرام ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں، اور اس لئے بھی کہ
ان کی ایذاء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچے گی جو اشد درجہ کا حرام ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ، اولوا الارحام کے لفظی معنی سب
رشتہ داروں اور قرابت داروں کو شامل ہیں، خواہ وہ لوگ ہوں جن کو فقہاء عصبات
کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، یا وہ جن کو خاص اصطلاح کے اعتبار سے عصبات کے
بالمقابل ذوی الارحام کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ فقہی اصطلاح جو بعد میں اختیار کی گئی ہے
مراد نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ اور آپ کی ازواج کا تعلق مؤمنین امت سے اگرچہ
اس درجہ ہے کہ ماں باپ سے بھی مقدم ہے، مگر میراث کے احکام میں اس کا کوئی
دخل نہیں بلکہ میراث نسبی اور قرابتی رشتوں کی بنیاد پر ہی تقسیم کی جائے گی۔

میراث کی حصہ داری شروع اسلام میں ایمانی اور روحانی رشتہ کی بنیاد پر تھی،
بعد میں اس کو منسوخ کر کے قرابتی رشتوں کی بنیاد پر کر دی گئی جس کی تفصیل قرآن کریم
نے خود بتلادی ہے۔ پوری تفصیل ناسخ و منسوخ آیتوں کی سورۂ انفال میں گذر چکی
ہے، اور من المؤمنین کے بعد والمہاجرین کا ذکر اس صورت میں ان کا اختصاص امتیاز
بتلانے کے لئے ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں مؤمنین سے مراد انصار اور مہاجرین سے مراد
قریش ہیں، مہاجرین کے تقابل سے مؤمنین کا لفظ انصار کے لئے ہونا معلوم ہو گیا۔ اس صورت
میں یہ آیت توارث بالہجرۃ کے لئے ناسخ ہوگی، کیونکہ ابتداء ہجرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کرا کر ان کے باہم وراثت جاری ہونے کا بھی
حکم دیا تھا، اس آیت نے اس توارث بالہجرۃ کو بھی منسوخ کر دیا (قرطبی)

اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا، یعنی وراثت تو صرف رشتہ داری کے
تعلق سے ملے گی، غیر رشتہ دار وارث نہیں ہوگا، مگر ایمانی اخوت کی بنا پر جن لوگوں سے

مذکورہ دونوں آیتوں میں یہی دو مضمون بیان ہوئے ہیں، یعنی صاحب وحی کو اپنی وحی کا اتباع اور غیر صاحب وحی کو صاحب وحی کا اتباع کرنا واجب ہے۔

میثاق انبیاء: آیت مذکورہ میں جو انبیاء علیہم السلام سے عہد و اقرار لینے کا ذکر ہے وہ اس اقرار عام کے علاوہ ہے جو ساری مخلوق سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ میں بروایت ... مرفوعاً آیا ہے کہ خُصُّوْا بِمِیْثَاقِ الرِّسَالَۃِ وَالنُّبُوَّۃِ وَھُوَ قَوْلُہٗ تَعَالٰی وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ الاٰیۃ

یہ عہد انبیاء علیہم السلام سے نبوت و رسالت کے فرائض ادا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی تصدیق اور مدد کرنے کا عہد تھا۔ جیسا کہ ابن جریر، ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ عہد انبیاء میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ سب اس کا بھی اعلان کریں کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

اور یہ میثاق انبیاء بھی ازل میں اسی وقت لیا گیا جبکہ عام مخلوق سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا عہد لیا گیا تھا (روح و مظہری)

وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ الاٰیۃ۔ انبیاء علیہم السلام کا عام ذکر کرنے کے بعد ان میں سے پانچ انبیاء کا خصوصی ذکر ان کے خاص امتیاز و شرف کی بنا پر کیا گیا، جو ان کو زمرۂ انبیاء میں حاصل ہے۔ اور ان میں بھی لفظ مِنْکَ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اوروں سے مقدم کیا گیا، اگرچہ آپ کی بعثت سب کے بعد ہے، وجہ اس کی خود حدیث میں یہ بیان فرمائی ہے:

كُنْتُ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ وَاٰخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ، رواہ ابن سعد وابو نعیم فی الحلیۃ عن میسرۃ (و) الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس (مظہری)	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تخلیق و تکوین میں سارے نبیوں سے پہلا ہوں اور بعثت و نبوت میں سب سے آخر۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاۗءَتْكُمْ

اے ایمان والو یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب چڑھ آئیں تم پر

جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ

فوجیں پھر ہم نے بھیج دی ان پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں، اور ہے

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾ إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ

اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ۔ جب چڑھ آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور

أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ

نیچے سے اور جب بدلنے لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گلوں

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ﴿١٠﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ

تک اور اٹکل کرنے لگے تم اللہ پر طرح طرح کی اٹکلیں ۔ وہاں جانچے گئے ایمان والے

وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴿١١﴾ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ

اور جھڑجھڑائے گئے زور کا جھڑجھڑانا ۔ اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢﴾

دلوں میں روگ ہے جو وعدہ دیا تھا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے سب فریب تھا

وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ

اور جب کہنے لگی ایک جماعت ان میں اے یثرب والو تم کو ٹھکانا نہیں

فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ

سو پھر چلو ۔ اور رخصت مانگنے لگا ایک فرقہ ان میں نبی سے کہنے لگے ہمارے گھر

بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾

کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں پڑے ان کی کوئی غرض نہیں مگر بھاگ جانا

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا

اور اگر شہر میں کوئی گھس آوے ان پر اس کے کناروں سے پھر ان سے چاہے دین سے بچلنا تو مان لیں

وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن

اور دیر نہ کریں اس میں مگر تھوڑی ۔ اور اقرار کر چکے تھے اللہ سے

قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ﴿١٥﴾ قُل

پہلے کہ نہ پھیریں گے پیٹھ ۔ اور اللہ کے قرار کی پوچھ ہوتی ہے ۔ تو کہہ

لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا

کچھ کام نہ آوے گا تم کو بھاگنا اگر بھاگو گے مرنے سے یا مارے جانے سے اور پھر بھی

تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

پھل نہ پاؤ گے مگر تھوڑے دنوں۔ تو کہہ کون ہے کہ تم کو بچاوے اللہ سے

اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ

اگر چاہے تم پر برائی یا چاہے تم پر مہربانی، اور نہ پاویں گے اپنے واسطے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ

اللہ کے سوائے کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اللہ کو خوب معلوم ہیں جو اٹکانے والے ہیں

مِنْكُمْ وَالْقَاۗىِٕلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ

تم میں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو چلے آؤ ہمارے پاس، اور لڑائی میں نہیں آتے

اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ښ فَاِذَا جَاۗءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ

مگر کبھی۔ دریغ رکھتے ہیں تم سے، پھر جب آئے ڈر کا وقت تو تو دیکھے ان کو

يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ

تکتے ہیں تیری طرف پھرتی ہیں آنکھیں ان کی جیسے کسی پر آئے بے ہوشی

الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً

موت کی، پھر جب جاتا رہے ڈر کا وقت چڑھ چڑھ بولیں تم پر تیز تیز زبانوں سے ڈھلے

عَلَي الْخَيْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ

پڑتے ہیں مال پر، وہ لوگ یقین نہیں لائے پھر اکارت کر ڈالے اللہ نے ان کے کام، اور یہ ہی ہے

ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَ

اللہ پر آسان۔ سمجھتے ہیں کہ فوجیں کفار کی نہیں پھر گئیں، اور

اِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ

اگر آجاویں وہ فوجیں تو آرزو کریں کسی طرح ہم باہر نکلے ہوتے ہوں گاؤں میں

يَسْـَٔلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲۰

پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں، اور اگر ہوں تم میں لڑائی نہ کریں مگر بہت تھوڑی۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ

تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال اس کے لئے جو کوئی امید

يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱ وَلَمَّا رَاَ

رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا۔ اور جب دیکھیں

الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

مسلمانوں نے فوجیں، بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝۲۲ۭ

اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ

ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ڮ وَمَا بَدَّلُوْا

پھر کوئی تو ان میں پورا کر چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے ان میں راہ دیکھ رہا، اور بدلا نہیں

تَبْدِيْلًا ۝۲۳ۙ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ

ایک ذرہ۔ تاکہ بدلہ دے اللہ سچوں کو ان کے سچ کا اور عذاب کرے

الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاۗءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

منافقوں پر اگر چاہے یا توبہ ڈالے ان کے دل پر، بیشک اللہ ہے

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۲۴ۚ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ

بخشنے والا مہربان۔ اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہوئے

لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی، اور اپنے اوپر لے لی اللہ نے مسلمانوں کی لڑائی، اور ہے اللہ

ایسی کیفیت میں (وہ بولا میں کہ تم بھی یہاں ہی چلے آؤ) اور وہاں کی بزدلی اور حرص و بخل کی یہ کیفیت ہے کہ) لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں (جس میں ذرا نام ہو جائے یہ تو ان کی بزدلی ہے اور آتے بھی ہیں تو) تمھارے حق میں بخیلی لئے ہوئے (یعنی آنے میں بڑی نیت یہ ہوتی ہے کہ سب غنیمت مسلمانوں کو نہ مل جائے برائے نام شریک ہونے سے استحقاق غنیمت کا دعویٰ تو کسی درجہ میں کر سکیں گے) سو (جب ان کا جُبن اور بخل دونوں امر ثابت ہو گئے ہیں تو اس مجموعہ کا اثر یہ ہے کہ) جب کوئی خوف (کا موقع) پیش آتا ہے تو اُن کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو (یہ تو بزدلی کا اثر ہوا) پھر جب وہ خوف دور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں مال (غنیمت) پر حرص لئے ہوئے (یعنی مال غنیمت لینے کے لئے دل خراش باتیں کرتے ہیں کہ کیوں ہم شریک نہ تھے ہماری ہی مدد سے تم کو یہ فتح میسر نہیں ہوئی یہ اثر بخل و حرص کا ہے۔ یہ معاملہ ان کا تم سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہے کہ) یہ لوگ (پہلے ہی سے) ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال (نیک پہلے ہی سے) بیکار کر رکھے ہیں (آخرت میں کچھ ثواب نہ ملے گا) اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے (کوئی اس سے مزاحمت نہیں کر سکتا کہ ہم ان اعمال کا صلہ دیں گے اور یہ حالت تو ان کی اجتماع احزاب کے وقت تھی مگر ان کا جُبن یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ احزاب کے چلے جانے کے بعد بھی ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ (ابھی تک) یہ لشکر گئے نہیں اور غایت بزدلی سے ان کی یہ حالت ہے کہ، اگر (بالفرض) یہ لشکر گئے ہوئے (لشکر پھر لوٹ کر) آجائیں تو (پھر تو) یہ لوگ (اپنے لئے) یہی پسند کریں کہ کاش ہم (کہیں) دیہاتوں میں باہر جا رہیں کہ (وہاں ہی بیٹھے بیٹھے آنے جانے والوں سے) تمھاری خبریں پوچھتے رہیں (اور وہ جگر دوز معرکہ اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں) اور اگر (اتفاق سے کل یا بعض دیہات میں نہ جا سکیں) بلکہ تم ہی میں رہیں تب بھی (اس وقت کی لے دے سن کر بھی کبھی غیرت نہ آئے اور محض نام کرنے کو) کچھ یوں ہی سا لڑیں (آگے ثبات فی الحرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداء و اتباع کا مقتضائے ایمان ہونا بیان فرماتے ہیں تاکہ منافقین کو عار دلائی جائے کہ باوجود دعویٰ ایمان اس کے مقتضاء سے تخلف کیا، اور مخلصین کو بشارت ملے کہ یہ لوگ البتہ مصداق لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ الخ کے ہیں پس ارشاد فرماتے ہیں کہ) تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو (یعنی مومن کامل ہو اس کے لئے)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا (کہ جب آپؐ ہی شریک رہے تو آپ سے زیادہ کون پیارا ہے کہ وہ اقتداء نہ کرے اور اپنی جان بچائے پھرے) اور (آگے منافقین کے مقابلہ میں مؤمنین مخلصین کا ذکر ہے) جب ایمان داروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی (موقع) ہے جس کی ہم کو اللہ، رسولؐ نے خبر دی تھی (چنانچہ اس آیت بقرہ میں اس کا اشارہ قریب بصراحت موجود ہے، اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (الیٰ قولہ) وَزُلْزِلُوْا کیونکہ سورۂ بقرہ نزول میں سورۂ احزاب سے مقدم ہے، کذا فی الاتقان) اور اللہ، رسولؐ نے سچ فرمایا تھا اور اس (احزاب کے دیکھنے) سے (جو کہ مصداق پیشینگوئی ہے) ان کے ایمان اور طاعت میں ترقی ہوگئی (یہ وصف تو سب مؤمنین میں مشترک ہے اور بعض اوصاف بعض مؤمنین میں خاص بھی ہیں جس کا بیان یہ ہے کہ) ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے (اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعضے مسلمانوں نے عہد کیا اور سچے نہیں اترے بلکہ یہ تقسیم اس بنا پر ہے کہ بعض نے عہد ہی نہیں کیا تھا اور بلا عہد ہی ثابت قدم رہے۔ ان معاہدین کے ذکر کی تصریح بمقابلہ آیت بالا کے ہے جو منافقین کے حق میں ہے، وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ الخ اور مراد ان معاہدین سے حضرت انس بن النضر اور ان کے رفقاء ہیں۔ یہ حضرات اتفاق سے غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہونے پائے تھے تو ان کو افسوس ہوا اور عہد کیا کہ اگر اب کے کوئی جہاد ہو تو اس میں ہماری جان توڑ کوشش دیکھ لی جاوے گی۔ مطلب یہ تھا کہ منہ نہ موڑیں گے گو مارے جاویں) پھر ان (معاہدین) میں (دو قسمیں ہوگئیں) بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے، (مراد وہ عہد ہے جو مثل نذر کے واجب الایقاع ہے۔ مطلب یہ کہ شہید ہو چکے اور اخیر دم تک منہ نہیں موڑا۔ چنانچہ حضرت انس بن نضر احد میں شہید ہوگئے تھے، اسی طرح حضرت مصعب) اور بعضے ان میں (اس کے ایفاء کے آخری اثر یعنی شہادت کے) مشتاق ہیں (ابھی شہید نہیں ہوئے) اور (اب تک) انھوں نے (اس میں) ذرا تغیر تبدل نہیں کیا (یعنی اپنے عزم پر قائم ہیں، پس مجموعہ قوم کا دو قسم پر ہے، ایک منافق جن کا اوپر بیان ہوا، دوسرے مؤمنین۔ پھر مؤمنین کی دو قسم ہیں، معاہد اور غیر معاہد اور ثبات میں دونوں مشترک ہیں۔ لقولہ تعالیٰ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ پھر معاہد دو قسم پر ہیں شہید اور منتظر شہادت، کل چار قسمیں ان آیات میں مذکور ہیں۔ آگے اس غزوہ کی ایک حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) یہ واقعہ اس لئے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ

سچے مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے اُن کو توفیق دے، توبہ کی توفیق دے (کیونکہ ایسے مصائب و حوادث میں مخلص اور متصنع متمیز ہو جاتا ہے اور احیاناً ملامت سے بعض متصنعین بھی متاثر ہو کر مخلص ہو جاتے ہیں اور اپنے بحالہ بھی رہتے ہیں) بیشک اللہ غفور رحیم ہے (اس سے توبہ کا قبول ہو جانا مستبعد نہیں، اس میں ترغیب ہے توبہ کی) اور (یہاں تک اس مجمع اسلام کے اقسام مختلفہ کے حالات تھے، آگے کفار مخالفین کی حالت کا ذکر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (یعنی مشرکین کو) ان کے غصہ میں بھرا ہوا (مدینہ سے) ہٹا دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی (اور ان کا غصہ بھرا ہوا تھا) اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا (یعنی کفار کو قتال متعارف کی نوبت بھی نہ آئی کہ پہلے ہی دفع ہو گئے اور خفیف سی لڑائی متفرق طور پر منفی نہیں ہے) اور (اس طرح کافروں کا ہٹا دینا کچھ عجیب نہ سمجھو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے (اس کو کچھ دشوار نہیں، یہ تو مشرکین کا حال ہوا) اور (دوسرا گروہ مخالفین میں یہود بنی قریظہ کا تھا آگے ان کا ذکر ہے، جن اہل کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محصور تھے) نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا (جس سے وہ اُتر آئے اور پھر) بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا، اور ایسی زمین کا بھی (تم کو اپنے علم ازلی میں مالک بنا رکھا ہے) جس پر تم نے (ابھی) قدم (تک) نہیں رکھا (اس میں بشارت ہے فتوحات مستقبلہ کی عموماً یا فتح خیبر کی خصوصاً جو اس سے کچھ بعید ہوا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے (اس لئے یہ امور کچھ بعید نہیں ہیں) ؛

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور مسلمانوں کو آپ کے مکمل اتباع و اطاعت کی ہدایت تھی۔ اسی کی مناسبت سے یہ پورے دو رکوع قرآن کے غزوۂ احزاب کے واقعہ سے متعلق نازل ہوئے ہیں، جس میں کفار و مشرکین کی بہت سی جماعتوں کا مسلمانوں پر یکبارگی حملہ اور سخت نرغہ کے بعد مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد معجزات کا ذکر ہے۔ اور اس کے ضمن میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بہت سی ہدایات اور احکام ہیں۔ انہی بے بہا ہدایات کی وجہ سے اکابر مفسرین نے اس جگہ واقعہ احزاب کو خاص تفصیل سے لکھا ہے خصوصاً

قرطبی اور مظہری وغیرہ نے اس سے واقعۂ احزاب کی کچھ تفصیل مع ان ہدایات کے لکھی جاتی ہے جس کا اکثر حصہ قرطبی اور مظہری سے لیا گیا ہے جو کسی دوسری کتاب سے لیا ہے، اس کا حوالہ لکھ دیا گیا ہے۔

واقعہ غزوۂ احزاب

احزاب، حزب کی جمع ہے جس کے معنی پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں۔ اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا معاہدہ کر کے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں اسی لئے اس غزوہ کا نام غزوۂ احزاب رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستہ پر بامر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودی گئی تھی اس لئے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔ غزوۂ بنو قریظہ بھی جو غزوۂ احزاب کے فوراً بعد ہوا اور مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر ہے وہ بھی درحقیقت غزوۂ احزاب ہی کا ایک جز تھا، جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس سال مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے، اس کے دوسرے ہی سال میں غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ تیسرے سال میں غزوۂ احد پیش آیا۔ چوتھے سال میں یہ غزوۂ احزاب واقع ہوا۔ اور بعض روایات میں اس کو پانچویں سال کا واقعہ قرار دیا ہے۔ بہرحال ابتداء ہجرت سے اس وقت تک کفار کے حملے مسلمانوں پر مسلسل جاری تھے غزوۂ احزاب کا حملہ بڑی بھرپور طاقت و قوت اور پختہ عزم اور عہد و میثاق کے ساتھ کیا گیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر یہ غزوہ سب دوسرے غزوات سے زیادہ اشد تھا۔ کیونکہ اس میں حملہ آور احزاب کفار کی تعداد بارہ ہزار سے پندرہ ہزار تک بتلائی گئی ہے، اور اس طرف سے مسلمان کل تین ہزار وہ بھی بے سرو سامان، اور زمانہ سخت سردی کا۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کی شدت بڑی ہولناک صورت میں یہ بیان فرمائی ہے، زَاغَتِ الْاَبْصَارُ (آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں) بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (کلیجے منہ کو آنے لگے)، وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (سخت زلزلہ میں ڈالے گئے)۔

مگر جیسا کہ یہ وقت مسلمانوں پر سب سے زیادہ سخت تھا، ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد سے اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ایسی عظیم فتح و کامیابی کی صورت میں سامنے آیا، کہ اس نے تمام مخالف گروہوں مشرکین، یہود اور منافقین کی کمریں توڑ دیں،

اور آگے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ مسلمانوں پر کسی حملے کا ارادہ کر سکیں۔ اس لحاظ سے یہ غزوہ کفر و اسلام کا آخری معرکہ تھا، جو مدینہ منورہ کی زمین پر ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال میں لڑا گیا۔

اس واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ یہود کے قبیلہ بنی نضیر اور قبیلہ بنی وائل کے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے مکہ مکرمہ پہنچے، اور قریشی سرداروں سے ملاقات کر کے ان کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ قریشی سردار سمجھتے تھے کہ جس طرح مسلمان ہماری بت پرستی کو کفر کہتے ہیں اور اس لئے ہمارے مذہب کو برا سمجھتے ہیں یہود کا بھی یہی خیال ہے، تو ان سے موافقت و اتحاد کی کیا توقع رکھی جائے۔ اس لئے ان لوگوں نے یہود سے سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دین و مذہب کا اختلاف ہے اور آپ لوگ اہل کتاب اور اہل علم ہیں، پہلے ہمیں یہ بات بتلائیے کہ آپ کے نزدیک ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔

سیاست کے اکھاڑے میں جھوٹ کوئی نئی چیز نہیں

ان یہودیوں نے اپنے علم و ضمیر کے بالکل خلاف ان کو یہ جواب دیا کہ تمہارا دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین سے بہتر ہے۔ اس پر یہ لوگ کچھ مطمئن ہوئے، مگر اس پر بھی معاملہ یہ ٹھہرا کہ بیس آدمی یہ آنے والے اور پچاس آدمی قریشی سرداروں کے مسجد حرام میں جا کر بیت اللہ کی دیواروں سے سینے لگا کر اللہ کے سامنے یہ عہد کریں کہ ہم میں سے جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہے گا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حلم و کرم کا ایک اعجوبہ!!!

اللہ کے گھر میں اللہ کے بیت سے چمٹ کر اللہ کے دشمن اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑنے کا معاہدہ کر رہے ہیں، اور مطمئن ہو کر جنگ کا نیا جذبہ لے کر لوٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حلم و کرم کا عجیب منظر ہے۔ پھر ان کے اس معاہدہ کا حشر بھی آخر قصہ میں معلوم ہوگا کہ سب کے سب اس جنگ سے منہ موڑ کر بھاگے۔

یہ یہودی قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد عرب کے ایک بڑے اور جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس پہونچے اور ان کو بتلایا کہ ہم اور قریش مکہ اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس نئے دین (اسلام) کے پھیلانے والوں کا ایک مرتبہ سب مل کر استیصال کر دیں۔ آپ بھی اس پر ہم سے معاہدہ کریں۔ اور ان کو یہ رشوت بھی پیش کی کہ خیبر میں جس قدر کھجور ایک سال میں پیدا ہوگی وہ اور بعض روایات میں اس کا نصف قبیلہ غطفان کو دیا جانے کا وعدہ کیا۔ قبیلہ غطفان کے سردار عُیینہ بن حصن نے اس شرط کے ساتھ ان سے

شرکت کو منظور کرلیا اور یہ لوگ بھی جنگ میں شامل ہوگئے۔

دو باہمی قرارداد کے مطابق مکہ سے قریشیوں کا لشکر چار ہزار جوانوں اور تین سو گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹوں کے سامان کے ساتھ ابوسفیان کی قیادت میں مکہ مکرمہ سے نکلا اور مرالظہران میں قیام کیا یہاں قبیلۂ اسلم اور قبیلۂ اشجع اور بنو مرّہ، بنو کنانہ اور فزارہ اور غطفان کے سب قبائل شامل ہوگئے جن کی مجموعی تعداد بعض روایات میں دس بعض میں بارہ ہزار اور بعض میں پندرہ ہزار بیان کی گئی ہے۔

مدینہ منورہ پر سب سے بڑا حملہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے مقابل آنے والا لشکر ایک ہزار کا تھا، پھر غزوۂ احد میں حملہ کرنے والا لشکر تین ہزار کا تھا۔ اس مرتبہ لشکر کی تعداد بھی ہر پہلی مرتبہ سے زائد تھی، اور سامان بھی اور تمام قبائل عرب و یہود کی اتحادی طاقت بھی۔

مسلمانوں کی جنگی تیاری (۱) اللہ پر توکل (۲) باہمی مشورہ (۳) بقدر وسعت مادی وسائل کی فراہمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس متحدہ محاذ کے حرکت میں آنے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے کلمہ جو زبانِ مبارک پر آیا یہ تھا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ "یعنی ہمیں اللہ کافی اور وہی ہمارا بہتر کارساز ہے" اس کے بعد مہاجرین و انصار کے اہل حلّ و عقد کو جمع کر کے آپ نے مشورہ لیا۔ اگرچہ صاحبِ وحی کو درحقیقت مشورہ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ براہِ راست حق تعالیٰ کے اذن و اجازت سے کام کرتے ہیں مگر مشورے میں دو فائدے تھے۔ ایک امت کے لئے مشورہ کی سنت جاری کرنا، دوسرے قلوبِ مومنین میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید اور تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرنا۔ اس کے بعد دفاع اور جنگ کے مادی وسائل پر غور ہوا۔ مجلسِ مشورہ میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی شامل تھے جو ابھی حال میں ایک یہودی کی مصنوعی غلامی سے نجات حاصل کر کے اسلامی خدمات کے لئے تیار ہوئے تھے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے بلاد فارس کے بادشاہ ایسے حالات میں دشمن کا حملہ روکنے کے لئے خندق کھود کر ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیدیا۔ اور بنفسِ نفیس خود بھی اس کام میں شریک ہوتے۔

خندق کی کھدائی یہ خندق جبلِ سلع کے پیچھے اس پورے راستہ کی لمبائی پر کھودنا طے ہوا جس سے مدینہ کے شمال کی طرف سے آنے والے دشمن آسکتے تھے، اس خندق کے طول و عرض کا خط خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچا۔ یہ خندق قلعۂ شیخین سے شروع ہو کر جبلِ سلع کے مغربی گوشہ تک آئی اور بعد میں اسے بڑھا کر وادیِ بطحان اور وادیِ راتونا کے مقامِ اتصال تک پہونچا دیا گیا۔ اس خندق کی کل لمبائی تقریباً ساڑھے تین میل تھی، چوڑائی اور گہرائی

کی صحیح مقدار کسی روایت سے معلوم نہیں ہوئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ چوڑائی اور گہرائی بھی خاصی ہوگی جس کو عبور کرنا دشمن کے لئے آسان نہ ہو۔

حضرت سلمانؓ کے خندق کھودنے کے واقعہ میں یہ آیا ہے کہ وہ روزانہ پانچ گز لمبی اور پانچ گز گہری خندق کھودتے تھے (مظہری) اس سے خندق کی گہرائی پانچ گز کہی جاسکتی ہے۔

اسلامی لشکر کی تعداد — اس وقت مسلمانوں کی جمعیت کُل تین ہزار تھی، اور کُل چھتیس گھوڑے تھے۔

بلوغ کی عمر پندرہ سال قرار دی گئی — اسلامی لشکر میں کچھ نابالغ بچے بھی اپنے جوشِ ایمانی سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن بچوں کو واپس کر دیا جو پندرہ سال سے کم عمر والے تھے، پندرہ سالہ نوعمر لے لئے گئے۔ جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری، براء ابن عازب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جس وقت یہ اسلامی لشکر مقابلہ کے لئے روانہ ہونے لگا تو جو منافقین مسلمانوں میں رلے ملے رہتے تھے انہوں نے سرکنا شروع کیا۔ کچھ چھپ کر نکل گئے، کچھ لوگوں نے جھوٹے اعذار پیش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کی اجازت لینی چاہی۔ یہ اپنے اندر سے ایک نئی آفت پھوٹی۔ مذکور الصدر آیات میں انہی منافقین کے متعلق چند آیات نازل ہوئی ہیں (قرطبی)

قبائلی اور نسبی قومیتوں کا انتظامی معاشرتی امتیاز اسلامی وحدت اور اسلامی قومیت کے منافی نہیں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کے لئے مہاجرین کا جھنڈا حضرت زید بن حارثہؓ کے سپرد فرمایا اور حضرات انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کے سپرد فرمایا۔ اس وقت مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات (بھائی چارے) کے تعلقات بڑی مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم تھے، اور سب بھائی بھائی تھے۔ مگر انتظامی سہولت کے لئے مہاجرین کی قیادت الگ اور انصار کی الگ کر دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قومیت اور اسلامی وحدت انتظامی اور معاشرتی تقسیم کے منافی نہیں بلکہ ہر جماعت پر ذمہ داری کا بوجھ ڈال دینے سے باہمی اعتماد اور تعاون و تناصر کے جذبہ کی تقویت ہوتی تھی۔ اور اس جنگ کے سب سے پہلے کام یعنی خندق کھودنے میں اس تعاون و تناصر کا اس طرح مشاہدہ ہوا کہ:۔

خندق کی کھدائی کی تقسیم پورے لشکر پر کی گئی — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر کے مہاجرین و انصار کو دس دس آدمیوں کی جماعت میں تقسیم کر کے ہر دس آدمیوں کو چالیس گز خندق کھودنے کا ذمہ دار بنایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ چونکہ خندق کھودنے کا

مشورہ دینے والے اور کام سے واقف اور مضبوط آدمی تھے، اور نہ انصار میں شامل تھے نہ مہاجرین میں اُن کے متعلق انصار و مہاجرین میں ایک مسابقت کی فضا پیدا ہوگئی انصار ان کو اپنے میں شامل کرنا چاہتے تھے، مہاجرین اپنے میں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفع نزاع کے لئے مداخلت کرنے کی نوبت آئی اور آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ، یعنی سلمان ہمارے اہل بیت میں شامل ہیں۔

صلاحیت کار میں ملکی غیر ملکی، مقامی اور بیرونی کا امتیاز

آج تو دنیا میں غیر ملکی باشندے اور غیر مقامی کو اپنی برابر کا درجہ دینا لوگ پسند نہیں کرتے وہاں ہر فریق اہل صلاحیت کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اہل بیت میں خود داخل فرما کر نزاع کو ختم کیا اور عملی طور پر چند انصار اور چند مہاجرین شامل کر کے ان کے دس کی جماعت بنائی جس میں حضرت عمرو بن عوفؓ اور حذیفہؓ وغیرہ مہاجرین میں سے تھے۔

ایک عظیم معجزہ

اتفاق سے جو حصہ خندق کا حضرت سلمانؓ وغیرہ کے سپرد تھا اس میں ایک سخت اور چکنے پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی۔ حضرت سلمانؓ کے ساتھی عمرو بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ اس چٹان نے ہمارے اوزار توڑ دیئے اور ہم اس کے کاٹنے سے عاجز ہو گئے۔ تو میں نے سلمانؓ سے کہا کہ گرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس جگہ سے کچھ ہٹ کر خندق کھودیں، اور ذرا سی کجی کے ساتھ اس کو اصل خندق سے ملا دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھینچے ہوئے خط سے انحراف ہمیں اپنی رائے سے نہیں کرنا چاہئے، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کر کے حکم حاصل کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

قدرت کی تنبیہات

اس ساڑھے تین میل کے میدان میں خندق کھودنے والوں میں کسی کو رکاوٹ پیش نہ آئی جو عاجز کردے۔ پیش آئی تو حضرت سلمانؓ کو پیش آئی، جنہوں نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کو قبول کر کے یہ سلسلہ جاری ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھلا دیا کہ خندق کھودنے اور بنانے میں بھی اللہ کی طرف رجوع کے سوا چارہ نہیں، آلات اوزار سب جواب دے چکے۔ جس میں ان حضرات کو تعلیم تھی کہ مادی اسباب کو بقدر وسعت طاقت جمع کرنا فرض ہے، مگر ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔ مؤمن کا بھروسہ تمام اسباب مادیہ کو جمع کر لینے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے۔

حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بتلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے حصہ کی خندق میں کام کر رہے تھے، خندق

کی مٹی کو اس جگہ سے منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ کے جسم مبارک کو غبار نے ایسا ڈھانپ لیا تھا کہ پیٹ اور پیٹھ کی کھال نظر نہ آتی تھی۔ ان کو کوئی مشورہ یا حکم دینے کے بجائے خود ان کے ساتھ موقع پر تشریف لائے اور دس حضرات صحابہؓ مع سلمانؓ کے جو اس کے کھودنے میں مصروف تھے خندق کے اندر اتر کر آپؐ بھی ان میں شامل ہوگئے۔ اور کدال اپنے دست مبارک میں لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی۔ اور یہ آیت پڑھی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا (یعنی پوری ہوگئی نعمت آپ کے رب کی سچائی کے ساتھ) اس ایک ہی ضرب سے چٹان کا ایک تہائی حصہ کٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک روشنی پتھر کی چٹان سے برآمد ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے دوسری ضرب لگائی اور آیت مذکورہ کو آخر تک پڑھا، یعنی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا، اس دوسری ضرب سے ایک تہائی چٹان اور کٹ گئی، اور اسی طرح پتھر سے ایک روشنی نکلی۔ تیسری مرتبہ پھر وہی آیت پوری پڑھ کر تیسری ضرب لگائی، تو باقی چٹان بھی کٹ کر ختم ہوگئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے باہر تشریف لائے۔ اور اپنی چادر جو خندق کے کنارہ پر رکھ دی تھی اٹھا لی اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے جتنی مرتبہ اس پتھر پر ضرب لگائی میں نے ہر مرتبہ پتھر سے ایک روشنی نکلتی دیکھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ کیا واقعی تم نے یہ روشنی دیکھی ہے؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میری آنکھوں نے اس **کا مشاہدہ کیا ہے۔**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی ضرب میں جو روشنی نکلی میں نے اس روشنی میں یمن اور کسریٰ کے شہروں کے محلات دیکھے، اور جبرئیل امین نے مجھے بتلایا کہ آپ کی امت ان شہروں کو فتح کرے گی۔ اور جب میں نے دوسری ضرب لگائی تو مجھے رومیوں کے سرخ محلات دکھائے گئے، اور جبرئیل امین نے یہ خوش خبری دیدی کہ آپ کی امت ان شہروں کو بھی فتح کرے گی۔ یہ ارشاد سن کر سب مسلمان مطمئن ہوئے، اور آئندہ **عظیم الشان فتوحات پر یقین ہوگیا۔**

منافقین کی طعنہ زنی اور مسلمانوں کا بے نظیر یقین ایمانی

اس وقت جو منافقین خندق کی کھدائی میں شامل تھے، وہ کہنے لگے کہ تمھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات پر حیرت و تعجب نہیں ہوتا۔ وہ تمھیں کیسے باطل اور بے بنیاد وعدے سنا رہے ہیں کہ یثرب میں خندق کی گہرائی کے اندر انھیں حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات نظر آرہے ہیں، اور

یہ کہ تم لوگ ان کو فتح کرو گے۔ ذرا اپنے حال کو تو دیکھو کہ تمہیں اپنے تن بدن کا تو ہوش نہیں، پیشاب پاخانے کی ضرورت پوری کرنے کی مہلت نہیں، تم ہو جو کسریٰ وغیرہ کے ملک کو فتح کرو گے۔ اسی واقعہ پر آیات مذکورۃ الصدر میں یہ نازل ہوا اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا، اس آیت میں اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ میں بھی انہی منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے دلوں میں نفاق کا مرض چھپا ہوا تھا۔

غور کیجئے کہ اس وقت مسلمانوں کے ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر پورے یقین کا کیسا سخت امتحان تھا کہ ہر طرف سے کفار کے نرغہ اور خطرے میں ہیں، خندق کھودنے کے لئے مزدور اور خادم نہیں، خود ہی یہ محنت ایسی حالت میں برداشت کر رہے ہیں کہ سخت سردی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے، ہر طرف سے خوف ہی خوف ہے۔ بظاہر اسباب اپنے بچاؤ اور بقاء پر یقین کرنا بھی آسان نہیں، دنیا کی عظیم سلطنت روم و کسریٰ کی فتوحات کی خوشخبری پر یقین کس طرح ہو؟ مگر ایمان کی قیمت سب اعمال سے زیادہ اسی بناء پر ہے کہ اسباب و حالات کے سراسر خلاف ہونے کے وقت بھی ان کو رسول ؐ کے ارشاد میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا۔

واقعہ مذکورہ میں امت کے لئے خاص ہدایت کہ بڑوں کو چھوٹوں کی ہر تکلیف و مشقت میں شامل ہونا چاہئے

یہ کس کو معلوم نہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے جاں نثار خادم تھے جو کسی حال بھی یہ نہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس مزدوری کی محنتِ شاقہ میں ان کے شریک ہوں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی دل جوئی اور امت کی تعلیم کے لئے اس محنت و مزدوری میں برابر کا حصہ لیا۔ صحابہ کرام کی جاں نثاری، آپ کے اوصاف کمال اور نبوت و رسالت کی بنیاد پر تو تھی ہی، مگر ظاہری اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ہر محنت و مشقت اور تنگی و تکلیف میں آپ سب عوام کی طرح ان میں شریک ہوتے تھے۔ حاکم و محکوم، بادشاہ و رعیت اور صاحبِ اقتدار و عوام کی تفریق کا کوئی تصور وہاں نہ پیدا ہوتا۔ اور جب سے ملوکِ اسلام نے اس سنت کو ترک کیا اسی وقت سے یہ تفرقے پھوٹے، اور طرح طرح کے فتنے اپنے دامن میں لائے۔

مشکلات پر عبور حاصل کرنے کا نسخہ

واقعہ مذکورہ میں اس ناقابل تسخیر چٹان پر ضرب لگانے کے ساتھ آیتِ قرآن تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ___ تلاوت فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مشکل کو حل کرلے کے لئے اس آیت کی تلاوت ایک مجرب نسخہ ہے۔

صحابہ کرام کا ایثار اور تعاون و تناصر

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ خندق کی کھدائی کے لئے ہر چالیس

گز پر دس آدمی مامور تھے، مگر ظاہر ہے کہ بعض لوگ قوی اور جلد کام کرلینے والے ہوتے ہیں۔ صحابۂ کرام میں سے جن حضرات کا اپنا حصہ کھدائی کا پورا ہوجاتا تو یہ سمجھ کر خالی نہ بیٹھتے تھے کہ ہماری ڈیوٹی پوری ہوگئی، بلکہ دوسرے صحابہ جن کا حصہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا ان کی مدد کرتے تھے (قرطبی، مظہری)

ساڑھے تین میل لمبی خندق چھ دن میں مکمل ہوگئی

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جد و جہد اور کوشش کا نتیجہ چھ روز میں سامنے آگیا، کہ اتنی طویل اور چوڑی اور گہری خندق کی چھ روز میں تکمیل ہوگئی (مظہری)

حضرت جابرؓ کی دعوت میں ایک کھلا ہوا معجزہ

اسی خندق کی کھدائی کے دوران وہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ ایک روز حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر محسوس کیا کہ بھوک کے سبب آپ متاثر ہو رہے ہیں اپنی اہلیہ سے جاکر کہا کہ تمہارے پاس کچھ ہو تو پکاؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھوک کا اثر دیکھا نہیں جاتا۔ اہلیہ نے بتلایا کہ ہمارے گھر میں ایک صاع بھر جو رکھے ہیں میں ان کو پیس کر آٹا بناتی ہوں۔ ایک صاع ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔ اہلیہ پیسنے پکانے میں لگی، گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کرکے گوشت تیار کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کے لئے چلے۔ تو اہلیہ نے پکار کر کہا کہ دیکھئے حضورؐ کے ساتھ بہت بڑا مجمع صحابہ کا ہے، صرف حضورؐ کو کسی طرح تنہا بلا لائیں، مجھے رسوا نہ کیجئے کہ صحابۂ کرامؓ کا بڑا مجمع چلا آئے۔ حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری حقیقتِ حال عرض کردی کہ صرف اتنا کھانا ہے۔ مگر آپؐ نے پورے لشکر میں اعلان فرما دیا کہ چلو جابر کے گھر دعوت ہے۔ حضرت جابرؓ حیران تھے گھر پہونچے تو اہلیہ نے سخت پریشانی کا اظہار کیا، اور پوچھا کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حقیقت اور کھانے کی مقدار بتلادی تھی؟ جابرؓ نے فرمایا کہ ہاں وہ میں بتلا چکا ہوں تو اہلیہ محترمہ مطمئن ہوئیں کہ پھر ہمیں کچھ فکر نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مالک ہیں جس طرح چاہیں کریں۔

واقعہ کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے، اتنا نتیجہ معلوم کرلینا کافی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے روٹی اور سالن سب کو دینے اور کھلانے کا اہتمام فرمایا، اور پورے مجمع نے شکم سیر ہوکر کھایا۔ اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سب مجمع کے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ ہماری ہنڈیا میں سے کچھ گوشت کم نظر آتا تھا اور نہ گوندھے ہوئے آٹے میں کوئی کمی معلوم ہوتی تھی۔ ہم سب گھر والوں نے بھی شکم سیر

ہو کر کھایا باقی بڑوسیوں میں تقسیم کر دیا۔

اس طرح چھ روز میں جب خندق سے فراغت ہوگئی تو احزاب کا لشکر آپہونچا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے جبلِ سلع کو اپنی پشت کی طرف رکھ کر فوج کی صف بندی کر دی۔

یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور احزاب کے ساتھ شرکت

اس وقت دس بارہ ہزار کے باسامان لشکر کے ساتھ تین ہزار بے سر و سامان لوگوں کا مقابلہ بھی عقل و قیاس میں آنے کی چیز نہ تھی اس پر ایک اور نیا اضافہ ہوا کہ احزاب میں قبیلہ بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب نے جس نے سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی دشمنی پر جمع کرنے میں بڑا کام کیا تھا، مدینہ پہونچ کر یہود کے قبیلہ بنو قریظہ کو بھی اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ بنو قریظہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ایک صلح نامہ پر دستخط ہو چکے تھے اور معاہدہ مکمل ہو کر ایک دوسرے سے بے فکر تھے۔ بنو قریظہ کا سردار کعب بن اسد تھا۔ حیی بن اخطب اس کے پاس پہونچا۔ جب کعب کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا، کہ حیی اس تک نہ پہونچ سکے۔ مگر حیی بن اخطب نے آوازیں دیں اور دروازہ کھولنے پر اصرار کیا۔ کعب نے اندر ہی سے جواب دیدیا کہ ہم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صلح کر چکے ہیں، اور ہم نے آج تک ان کی طرف سے معاہدہ کی پابندی اور صدق و سچائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، اس لئے ہم اس معاہدہ کے پابند ہیں، آپ کے ساتھ نہیں آسکتے۔ دیر تک حیی بن اخطب دروازہ کھولنے اور کعب سے باتیں کرنے پر اصرار کرتا رہا، وہ یہ اندر سے ہی انکار کرتا رہا۔ مگر بالآخر جب کعب کو بہت عار دلایا تو اس نے دروازہ کھول کر حیی کو بلایا اس نے بنو قریظہ کو وہ سبز باغ دکھائے کہ بالآخر کعب اس کی باتوں میں آگیا، اور احزاب میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ اور کعب نے جب اپنے قبیلہ کے دوسرے سرداروں کو یہ بات بتلائی تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ تم نے غضب کیا کہ مسلمانوں سے بلاوجہ عہد شکنی کی اور ان کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کعب بھی ان کی بات سے متاثر ہوا اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا۔ مگر اب بات اس کے قبضہ سے نکل چکی تھی، اور بالآخر یہی عہد شکنی بنو قریظہ کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت میں اُن کی عہد شکنی سے سخت صدمہ پہنچا، اور بہت بڑی فکر اس کی لاحق ہوگئی کہ احزاب کے راستہ پر تو خندق کھود دی گئی تھی، مگر یہ لوگ تو مدینہ کے اندر تھے، ان سے بچاؤ کیسے ہو۔ قرآن کریم

ہیں جو اس جملہ کے متعلق فرمایا ہے کہ لشکر احزاب کے کفار تم پر چڑھ آئے تھے مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ اس کی تفسیر میں بعض ائمہ تفسیر نے یہی فرمایا ہے کہ فوق کی جانب سے مراد بنو قریظہ ہیں اور اسفل سے آنے والے باقی احزاب ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہد شکنی کی حقیقت اور صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لئے انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ اور قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کو بصورت وفد کعب کے پاس بھیجا کہ اس سے گفتگو کریں اور یہ ہدایت دیدی کہ اگر عہد شکنی کا واقعہ غلط ثابت ہو تو سب صحابہ کے سامنے کھل کر بیان کردینا اور صحیح ثابت ہو تو آکر گول مول بات کہنا جس سے ہم سمجھ لیں اور عام صحابہ کرام میں سراسیمگی پیدا نہ ہو۔

یہ دونوں بزرگ سعد نامی وہاں پہونچے تو عہد شکنی کے سامان کھلے دیکھے۔ ان کے اور کعب کے درمیان سخت کلامی بھی ہوئی، واپس آکر حسب ہدایت گول مول بات کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد شکنی کا واقعہ صحیح ہونے سے باخبر کردیا۔

اس وقت جب کہ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا وہ بھی برسر جنگ آگیا تو جو نفاق کے ساتھ مسلمانوں میں شامل تھے ان کا نفاق بھی کھلنے لگا۔ بعض نے تو کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باتیں کہنا شروع کردیں۔ جیسا کہ اوپر گذرا اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ، اور بعض نے حیلے بہانے بنا کر میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی، جس کا ذکر آیات مذکورہ (اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ) میں آیا ہے۔

اب محاذِ جنگ کی یہ صورت تھی کہ خندق کی وجہ سے احزاب کا لشکر اندر نہ آسکتا تھا۔ اس کے دوسرے کنارہ پر مسلمانوں کا لشکر تھا۔ دونوں میں ہر وقت تیراندازی کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی حال میں تقریباً ایک مہینہ ہوگیا کہ نہ کھل کر کوئی فیصلہ کن جنگ ہوتی تھی اور نہ کسی وقت بے فکری، دن رات صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے کنارے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بنفسِ نفیس اس محنت و مشقت میں شریک تھے، مگر آپ پر یہ بات بہت شاق تھی کہ صحابہ کرام سب کے سب سخت اضطراب اور بے چینی میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنگی تدبیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قبیلہ غطفان کے رئیس نے ان یہودیوں کے ساتھ شرکت خیبر کے پھل

اور کھجور کی طمع میں کی ہے۔ آپ نے غطفان کے دو سردار عُیَیْنَہ بن حصن اور ابوالحارث بن عمرو کے پاس قاصد بھیجا کہ ہم تمہیں مدینہ طیبہ کا ایک تہائی پھل دیں گے، اگر تم اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے واپس چلے جاؤ۔ یہ گفتگو درمیان میں تھی اور دونوں سردار راضی ہو چکے تھے قریب تھا کہ معاہدہ صلح پر دستخط ہو جائیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت ارادہ کیا کہ صحابہ کرام سے اس معاملہ میں مشورہ لیں۔ قبیلہ اوس و خزرج کے دو بزرگ سعدین یعنی سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ کو بلا کر ان سے مشورہ لیا۔

حضرت سعدؓ کی غیرت ایمانی اور عزم شدید

دونوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر آپ کو اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے تو ہمارے کچھ کہنے کی مجال نہیں ہم قبول کریں گے ورنہ یہ محض آپ کی طبعی رائے ہے یا آپ نے ہمیں مشقت و تکلیف سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ امر الٰہی اس کا ہے، اور نہ میری اپنی طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ صرف تمہاری مصیبت و تکلیف کو دیکھ کر یہ صورت اختیار کی ہے، کیونکہ تم لوگ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہو میں نے چاہا فریق مقابل کی قوت کو اس طرح فوراً توڑ دیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جس وقت بتوں کو پوجتے تھے اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتے تھے نہ اس کی عبادت کرتے تھے، اُس وقت ان لوگوں کو ہمارے شہر کے پھلوں میں سے ایک دانہ کی طمع رکھنے کی ہمت نہیں تھی، بجز اس کے کہ وہ ہمارے مہمان ہوں، اور مہمانی کے طور پر ہم ان کو کھلائیں یا پھر ہم سے خرید کر لے جائیں۔ آج جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی معرفت عطا فرمائی اور اسلام کا اعزاز عطا فرمایا، کیا آج ہم ان لوگوں کو اپنا پھل اور اپنے اموال دیدیں گے ہمیں ان کی مصالحت کی کوئی حاجت نہیں، ہم تو ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ فرما دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ کی اولوالعزمی اور غیرت ایمانی کو دیکھ کر اپنا ارادہ چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ سعدؓ نے صلحنامہ کا کاغذان کے ہاتھوں سے لے کر تحریر مٹا دی کیونکہ ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ غطفان کے سردار عُیینہ و حارث جو خود اس صلح کے لئے تیار ہو کر مجلس میں موجود تھے، صحابہ کرامؓ کی یہ قوت و شدت دیکھ کر خود بھی اپنے دلوں میں متزلزل ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذؓ کا زخمی ہونا اور ان کی دعاء

ادھر خندق کے دونوں طرفوں سے تیراندازی اور پتھراؤ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت سعد بن معاذؓ بنی حارثہ کے قلعہ میں جہاں

عورتوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا، اپنی والدہ کے پاس گئے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں بھی اس وقت اسی قلعہ میں تھی، اور عورتوں کو پردے کے احکام اس وقت تک آئے نہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ سعد بن معاذؓ ایک چھوٹی زرہ پہنے ہوئے ہیں جس میں سے ان کے ہاتھ نکل رہے تھے، اور ان کی والدہ اُن سے کہہ رہی ہیں کہ جاؤ جلدی کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شکر میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کے لئے کوئی بڑی زرہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مجھے ان کے ہاتھ پاؤں کا خطرہ ہے، جو زرہ سے نکلے ہوتے ہیں۔ والدہ نے کہا کچھ مضائقہ نہیں **اللہ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔**

حضرت سعد بن معاذؓ لشکر میں پہنچے تو ان کو تیر لگا جس نے ان کی رگ اکحل کو کاٹ ڈالا۔ اس وقت حضرت سعدؓ نے یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر آئندہ بھی قریش کا کوئی حملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر ہونا مقدر ہے تو مجھے اس کے لئے زندہ رکھئے، کیونکہ اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں کہ میں اس قوم سے مقابلہ کروں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچائیں، وطن سے نکالا اور آپ کی تکذیب کی۔ اور اگر آئندہ آپ کے علم میں یہ جنگ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہو تو آپ مجھے موتِ شہادت عطا فرمائیں، مگر اس وقت تک مجھے موت نہ آئے جب تک کہ بنی قریظہ سے ان کی غداری کا انتقام لے کر میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔

حق تعالیٰ نے آپ کی یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ اس واقعہ احزاب کو کفار کا آخری حملہ بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ پہلے خیبر پھر مکہ مکرمہ اور پھر دوسرے بلاد فتح ہوئے۔ اور بنو قریظہ کا واقعہ آگے آتا ہے کہ وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ ہی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے جوان قتل کئے گئے اور عورتیں بچے قید کر لئے گئے۔

اس واقعہ احزاب میں صحابہ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات بھر خندق کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی، اگر کسی وقت آرام کے لئے لیٹے بھی تو ذرا کسی طرف سے شور و شغب کی آواز آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلحہ باندھ کر میدان میں جاتے تھے حضرت ام سلمہ ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں کئی کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ آپ ذرا آرام کرنے کے لئے تشریف لائے اور کوئی آواز سنی تو فوراً باہر تشریف لے گئے پھر آرام کے لئے ذرا کمر لگائی اور پھر کوئی آواز سنی تو باہر تشریف لے گئے۔

اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں بہت سے غزوات غزوہ مریسیع،

خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ، غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہی ہوں، آپ پر کسی غزوہ میں ایسی شدت اور مشقت نہیں ہوئی جیسی غزوہ خندق میں پیش آئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو زخم بھی بہت لگے، سردی کی شدت سے بھی تکلیف اٹھائی، اس کے ساتھ کھانے پینے کی ضروریات میں بھی تنگی تھی۔ (مظہری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں اس جہاد میں قضا ہوئیں

ایک روز مقابل کفار نے یہ طے کیا کہ سب مل کر یکبارگی حملہ کرو اور کسی طرح خندق کو عبور کر کے آگے پہنچو۔ یہ طے کر کے بڑی بے جگری سے مسلمانوں کے مقابلہ میں آگئے اور سخت تیراندازی کی، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو دن بھر ایسا مشغول رہنا پڑا کہ نماز کے لئے بھی ذرا سی مہلت نہ ملی، چار نمازیں عشاء کے وقت میں پڑھی گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء

جب مسلمانوں پر شدت کی انتہا ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کفار کے لئے بددعاء کی، اور تین روز پیر، منگل، بدھ میں مسجد فتح کے اندر مسلسل احزاب کی شکست اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعاء کرتے رہے۔ تیسرے روز بدھ کے دن ظہر و عصر کے درمیان دعا قبول ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاداں و فرحاں صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے، فتح کی بشارت سنائی۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ اس وقت کے بعد کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی۔ (مظہری)

شکست کے اور فتح کے اسباب کا آغاز

دشمنوں کی صفوف میں قبیلہ غطفان ایک بڑی طاقت تھی، حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے انہی میں سے ایک شخص نعیم ابن مسعودؓ کے دل میں ایمان ڈال دیا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا، اور بتلایا کہ ابھی تک میری قوم میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، اب مجھے فرمائیں کہ میں اسلام کی کیا خدمت کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اکیلے آدمی یہاں کوئی خاص کام نہ کر سکو گے، اپنی قوم میں واپس جا کر انہی میں مل کر اسلام سے مدافعت کا کوئی کام کر سکو تو کرو۔ نعیم ابن مسعودؓ ذہین سمجھدار آدمی تھے، ایک منصوبہ دل میں بنا لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ میں ان لوگوں میں جا کر جو مصلحت دیکھوں کہوں، آپ نے اجازت دیدی۔

نعیم بن مسعودؓ یہاں سے بنو قریظہ کے پاس گئے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں ان کے قدیم تعلقات تھے، ان سے کہا کہ اے بنو قریظہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارا قدیم دوست ہوں، انہوں نے اقرار کیا کہ ہمیں آپ کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں، اس کے بعد

جب تک تم دونوں قبیلوں کے چند سردار ہمارے پاس بطور رہن یرغمال کے نہ پہونچ جائیں
عکرمہ اور ورقہ نے یہ خبر ابوسفیان کو پہنچا دی تو قریش و غطفان کے سرداروں نے یقین
کرلیا کہ نعیم بن مسعودؓ نے جو خبر دی تھی وہ صحیح ہے۔ اور بنو قریظہ سے کہہ بھیجا کہ ہم ایک
آدمی بھی اپنا آپ کو نہیں دیں گے، پھر آپ کا دل چاہے تو ہمارے ساتھ جنگ میں شرکت کریں
ورنہ چاہیں نہ کریں۔ بنو قریظہ کو یہ حال دیکھ کر اس بات پر جو نعیم ابن مسعودؓ نے کہی تھی اور
زیادہ یقین ہوگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دشمن گروہ میں سے ایک شخص کے ذریعہ ان کے
آپس میں پھوٹ ڈال دی، اور ان لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اس کے ساتھ دوسری آسمانی افتاد ان پر یہ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سخت اور
برفانی ہوا ان پر مسلط کر دی جس نے ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے، ہنڈیاں چولھوں سے اٹھا دیں
یہ تو ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ نے ان کے پاؤں اکھاڑنے کے لئے پیدا فرما دیئے تھے
اس پر مزید یہ فرشتے بھیج دیئے جو باطنی طور پر ان کے دلوں پر رعب طاری کر دیں، ان
دونوں باتوں کا ذکر آیت مذکورہ کے شروع میں بھی اس طرح فرمایا گیا ہے فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا یعنی ہم نے بھیج دی ان کے اوپر ایک تند و سخت
ہوا اور بھیج دیئے فرشتوں کے لشکر۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ان لوگوں کے لئے بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

حضرت حذیفہؓ کا دشمن کے لشکر میں جانے اور خبر لانے کا واقعہ

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نعیم ابن مسعودؓ کی کارگذاری اور احزاب کے درمیان پھوٹ کے واقعات کی خبر ملی تو ارادہ فرمایا کہ اپنا کوئی آدمی جا کر دشمن کے لشکر اور ان کے ارادوں کا پتہ لائے۔ مگر وہ سخت برفانی ہوا جو دشمن پر بھیجی گئی تھی بہرحال پورے مدینہ پر حاوی ہوئی، اور مسلمان بھی اس سخت سردی سے متاثر ہوئے۔ رات کا وقت تھا، صحابہ کرام دن بھر کی محنت و مقابلہ سے چور چور، سخت سردی کے سبب سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو مخاطب کرکے فرمایا کہ کون ہے جو کھڑا ہو اور دشمن کے لشکر میں جا کر ان کی خبر لائے، اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے جاں نثار صحابہ کا مجمع تھا مگر حالات نے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ کوئی کھڑا نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہوگئے، اور کچھ دیر نماز میں مشغول رہنے کے بعد پھر مجمع کو خطاب کرکے فرمایا کہ ہے کوئی شخص جو دشمن کے لشکر کی مجھے خبر لا دے اور اس کے عوض میں جنت حاصل کرے۔ اس مرتبہ بھی پورے مجمع میں سناٹا رہا،

کوئی نہیں اٹھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد پھر تیسری مرتبہ وہی خطاب فرمایا کہ جو ایسا کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ مگر پوری قوم دن بھر کی سخت محنت اور کئی وقت کے فاقے اور بھوک سے اور دوسرے سردی کی شدت سے ایسی بے بس ہو رہی تھی کہ پھر بھی کوئی نہ اٹھا۔

حضرت حذیفہ جو اس واقعہ کی حدیث کے راوی ہیں فرماتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام لے کر فرمایا کہ حذیفہ تم جاؤ۔ حالانکہ میری بھی سب جیسی حالت تھی، مگر نام لے کر حکم دینے پر تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور سردی سے میرا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ آپ نے اپنا دست مبارک میرے سر و چہرے پر پھیرا اور فرمایا کہ دشمن کے لشکر میں جاؤ اور مجھے صرف خبر لا کر دو، وہاں سے واپس آنے سے پہلے کوئی کام نہ کرو۔ اور پھر آپ نے میری حفاظت کے لئے دعا فرمائی۔ میں نے اپنی تیر کمان اٹھایا اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ کر ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب یہاں سے روانہ ہوا تو عجیب ماجرا یہ دیکھا کہ خیمے کے اندر بیٹھے ہوئے جو سردی سے بیکلی طاری تھی وہ ختم ہو گئی اور میں اس طرح چل رہا تھا جیسے کوئی گرم حمام کے اندر ہو، یہاں تک کہ میں ان کے لشکر میں پہونچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوا کے طوفان نے ان کے خیمے اکھاڑ دیئے تھے اور ہانڈیاں الٹ دی تھیں۔ ابو سفیان آگ کے پاس بیٹھ کر سینک رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنا تیر کمان میں تھام لیا، اور ابو سفیان پر تیر پھینکنے ہی والا تھا کہ مجھے حضور کا یہ فرمان یاد آگیا کہ کوئی کام وہاں سے واپس آنے تک نہ کرنا۔ ابو سفیان بالکل میری زد میں تھے، مگر اس فرمان کی بنا پر میں نے اپنا تیر الگ کر لیا۔

ابو سفیان حالات سے پریشان ہو کر واپسی کا اعلان کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ قوم کے ذمہ داروں سے بات کریں۔ رات کی تاریکی میں اور سناٹے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی جاسوس موجود ہو اور ان کی بات سن لے۔ اس لئے ابو سفیان نے یہ ہوشیاری کی کہ بات کرنے سے پہلے سارے مجمع کو کہا کہ ہر شخص اپنے برابر والے آدمی کو پہچان لے، تاکہ کوئی غیر آدمی ہماری بات نہ سن سکے۔

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ اب مجھے خطرہ ہوا کہ میرے برابر کا آدمی جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ تو میرا راز کھل جائے گا۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری اور دلیری سے خود مسابقت کر کے اپنے برابر والے آدمی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا تعجب ہے تم مجھے نہیں جانتے، میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ وہ قبیلہ ہوازن کا آدمی

دوسری صورت یہ ہے کہ تم اپنی عورتوں اور بچوں کو پہلے خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دو اور
پھر لڑو کہ حفاظت سے فکر نہ رہے یہاں تک کہ تم بھی سب قتل ہو جاؤ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آج یوم السبت (ہفتہ) کے دن ہم مسلمانوں پر بے خبری میں حملہ کر دو،
کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یوم السبت میں قتل حرام ہے، اس لیے وہ ہماری
جانب سے اس دن میں بے فکر ہوں گے۔ ہم اگر اس روز ان پر حملہ کریں تو ممکن ہے کامیاب ہو جائیں۔

کعب بن اسد کی قوم کی تینوں تجویزیں سن کر قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ پہلی بات یعنی مسلمان
ہو جانا یہ تو ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے کیونکہ ہم تورات کو چھوڑ کر دوسری کتاب کو نہ مانیں گے۔ رہی
دوسری بات تو عورتوں بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم ان کو قتل کر دیں۔ باقی تیسری بات خود
حکم تورات اور ہمارے مذہب کے خلاف ہے، یہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار
ڈال دیں اور آپ ان کے بارے میں جو فیصلہ فرما دیں اس پر راضی ہو جائیں۔ انصاری صحابہ کرام
میں جو لوگ قبیلہ اوس سے متعلق تھے ان کے اور بنو قریظہ کے درمیان قدیم زمانے میں معاہدہ
رہا تھا تو ان ہی صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کو
ہمارے حوالے کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ میں ان کا
معاملہ تم ہی میں سے کسی ایک سردار کے سپرد کر دوں، یہ لوگ اس پر راضی ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تمہارے سردار سعد بن معاذ ہیں، اس کا فیصلہ میں ان کے سپرد کرتا ہوں
اس پر سب لوگ راضی ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ کو واقعہ خندق میں تیر کا زخم شدید پہنچا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان کی تیمارداری کے لیے مسجد کے احاطہ میں ایک خیمہ لگوا کر اس میں ٹھہرا دیا
تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بنو قریظہ کے قیدیوں کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیا
گیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں سے جو جنگ کرنے والے جوان ہیں وہ قتل کر دیے جائیں
اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا معاملہ کیا جائے جو اسلام میں معروف
ہے۔ یہی فیصلہ نافذ کر دیا گیا، اور اس فیصلے کے فوراً بعد ہی حضرت سعد بن معاذ کے زخم
سے خون بہہ پڑا اور اسی میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں
ایک یہ کہ آئندہ قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ نہ ہوگا، دوسرے بنو قریظہ
کی غداری کی سزا ان کو مل جائے وہ اللہ نے انہی کے ذریعہ دلوا دی۔

جن کو قتل کرنا تجویز ہوا تھا ان میں سے بعض مسلمان ہو جانے کی وجہ سے آزاد کر دیے

عطیہ قرظی جو صحابہ کرام میں معروف ہیں انہی لوگوں میں سے ہیں۔ انہی لوگوں میں زبیر بن باطا بھی تھے۔ ان کو حضرت ثابت بن قیس بن شماس صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرکے آزاد کرا دیا جس کا سبب یہ تھا کہ زبیر بن باطا نے ان پر زمانۂ جاہلیت میں ایک احسان کیا تھا، وہ یہ کہ جاہلیت کے زمانے کی جنگ بعاث میں ثابت بن قیس قید ہو کر زبیر بن باطا کے قبضہ میں آ گئے تھے، زبیر بن باطا نے ان کے سر کے بال کاٹ کر ان کو آزاد کر دیا قتل نہیں کیا تھا۔ احسان کے بدلے اور غیرت کے حضرت ثابت بن قیس زبیر بن باطا کی رہائی کا حکم حاصل کرکے ان کے قومی کے دو عجیب نمونے پاس گئے اور کہا کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تمہارے اس احسان کا بدلہ کر دوں، جو تم نے جنگ بعاث میں مجھ پر کیا تھا۔ زبیر بن باطا نے کہا کہ بے شک شریف آدمی دوسرے شریف کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرتا ہے۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ وہ آدمی زندہ رہ کر کیا کرے گا جس کے اہل و عیال نہ رہے ہوں۔ یہ سن کر ثابت بن قیس حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کے اہل و عیال کی بھی جان بخشی کر دی جائے، آپ نے قبول فرما لیا۔ زبیر بن باطا کو اس کی اطلاع دی، تو یہ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ کہ ثابت یہ تو بتلاؤ کہ کوئی انسان مع اہل و عیال کیسے زندہ رہے گا جب اس کے پاس کوئی مال نہ ہو۔ ثابت بن قیس پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کا مال بھی ان کو دلوا دیا۔ یہاں تک تو ایک مومن کی شرافت اور احسان شناسی کا قصہ تھا جو حضرت ثابت بن قیس کی طرف سے ہوا۔

اب دوسرا رخ سنئے کہ زبیر بن باطا کو جب اپنے اور اپنے اہل و عیال کی آزادی اور اپنے مال و متاع سب واپس مل جانے کا اطمینان ہو چکا تو اس نے حضرت ثابت بن قیس سے قبائل یہود کے سرداروں کے متعلق سوال کیا، اور پوچھا کہ ابن ابی الحقیق کا کیا ہوا جس کا چہرہ چینی آئینہ جیسا تھا انھوں نے بتلایا کہ وہ قتل کر دیا گیا۔ پھر پوچھا کہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا انجام ہوا؟ انھوں نے بتلایا کہ یہ دونوں بھی قتل کر دیئے گئے پھر دو جماعتوں کے متعلق سوال کیا اس کے جواب میں ان کو خبر دی گئی کہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔

یہ سن کر زبیر بن باطا نے حضرت ثابت بن قیس سے کہا کہ آپ نے اپنے احسان کا بدلہ پورا کر دیا، اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا، مگر میں اب اپنی زمین جائداد کو ان لوگوں کے بعد آباد نہیں کروں گا، مجھے بھی انہی لوگوں کے ساتھ شامل کر دو، یعنی قتل کر ڈالو۔ ثابت بن قیسؓ نے اس کو قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس کے اصرار پر کسی دوسرے مسلمان نے اس کو

جَمِيلًا ﴿٢٨﴾ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ

سے رخصت کرنا ۔ اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو

فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ

تو اللہ نے رکھ چھوڑا ہے ان کے لئے جو تم میں نیکی پر ہیں بڑا ثواب اے نبی کی عورتو!

مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ

جو کوئی کر لائے تم میں کام بے حیائی کا صریح دونا ہو اس کو عذاب

ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ وَمَنْ يَقْنُتْ

دوہرا اور ہے یہ اللہ پر آسان ۔ اور جو کوئی تم میں اطاعت

مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ

کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے بھلے دیویں ہم اس کو اس کا ثواب دوبار

وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ

اور رکھی ہے ہم نے اس کے واسطے روزی عزت کی اے نبی کی عورتو! تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی

مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي

عورتیں اگر تم ڈر رکھو سو تم دب کر بات نہ کرو پھر لالچ کرے کوئی جس کے

فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ﴿٣٢﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ

دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول ۔ اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَ

اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں اور قائم رکھو نماز اور

آتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ

دیتی رہو زکوٰۃ اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ یہی چاہتا ہے کہ

لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کر دے تم کو ایک

تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَ

ستھرائی سے۔ اور یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور

الْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿٣٤﴾

عقلمندی کی باتیں۔ بیشک اللہ ہے بھید جاننے والا خبردار۔

خلاصۂ تفسیر

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی بیبیوں سے فرما دیجئے (تم سے دو ٹوک بات کہی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے قصہ یک طرف ہو جاوے بات یہ ہے کہ) تم اگر دنیوی زندگی (کی عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو (یعنی لینے کے لئے متوجہ ہو) آؤ میں تم کو کچھ (مال و) متاع (دنیوی) دے دوں (مراد اس سے وہ جوڑا ہے جو مطلقہ مدخولہ کو بوقت طلاق دینا مستحب ہے یا مراد نان نفقہ عدت کا ہے یا دونوں کو شامل ہے) اور (متاع دے کر) تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں (یعنی موافق سنت کے طلاق دے دوں تاکہ جہاں چاہو جا کر دنیا حاصل کرو) اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور (مطلب اللہ کو چاہنے کا اس جگہ یہ ہے کہ) اس کے رسول کو (چاہتی ہو یعنی فقر و فاقہ کی موجودہ حالت کے ساتھ رسول کے نکاح میں رہنا چاہتی ہو) اور عالم آخرت (کے درجات عالیہ) کو چاہتی ہو (جو کہ زوجیت رسول پر مرتب ہونے والے ہیں) تو (یہ تمہاری نیک کرداری ہے اور) تم میں نیک کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے (آخرت میں) اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے (یعنی وہ ثواب جو مخصوص ہے ازواج نبی کے لئے کہ اور نیک بیبیوں کے اجر سے وہ عظیم ہے۔ اور جس سے زوجیت نبی کو اختیار نہ کرنے کی صورت میں محرومی ہوگی، گو عموم دلائل سے مطلق ایمان و اعمال صالحہ کے ثمرات اس صورت میں بھی حاصل ہوں گے۔ یہاں تک تو مضمون تخییر کا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ازواج کو اختیار دیا گیا کہ موجودہ حالت پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہنا پسند کریں یا پھر آپ سے طلاق حاصل کریں آگے حق تعالیٰ ان کو خود خطاب کر کے وہ احکام فرماتے ہیں جو بصورت اختیار زوجیت واجب الاہتمام ہوں گے۔ ارشاد ہے کہ) اے نبی کی بیبیو! جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بیہودگی کرے گی (مراد اس سے وہ معاملہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ و پریشان ہوں تو) اس کو (اس پر آخرت میں) دوہری سزا دی جاوے گی (یعنی دوسرے

بنو قریظہ کی فتوحات اور اموالِ غنیمت کی تقسیم نے عام مسلمانوں میں یک گونہ خوش حالی پیدا کردی تھی۔ ازواج مطہرات کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ان اموالِ غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا حصہ لیا ہوگا، اس لئے انہوں نے جمع ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کسریٰ و قیصر کی بیبیاں طرح طرح کے زیورات اور قیمتی لباسوں میں ملبوس ہیں، اور ان کی خدمت کیلئے کنیزیں ہیں، اور ہمارا حال فقر و فاقہ کا آپ دیکھتے ہیں، اس لئے اب کچھ توسع سے کام لیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے یہ مطالبہ سُنا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور دنیاداروں میں ہوتا ہے تو آپ کو اس سے بہت رنج ہوا کہ انہوں نے بیت نبوت کی قدر نہ پہچانی۔ ازواج مطہرات کو خیال نہ تھا کہ اس سے آپ کو ایذا پہنچے گی، عام مسلمانوں میں مالی وسعت دیکھ کر اپنے لئے بھی وسعت کا خیال دل میں آگیا تھا۔ ابن حیان نے فرمایا کہ اس واقعہ کو غزوہ احزاب کے واقعہ کے بعد بیان کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ازواج کا یہ مطالبہ ہی تخییر طلاق کا سبب بنا۔ بعض روایات حدیث میں حضرت زینب کے گھر میں شہد پینے کا واقعہ جو آگے سورۂ تحریم میں آئے گا مفصل آئے گا اس میں ازواج کی باہمی غیرت کے سبب جو صورت پیش آئی وہ اس تخییر طلاق کی سبب بنی۔ اگر یہ دونوں چیزیں قریبی زمانے میں پیش آئی ہوں تو یہ بھی بعید نہیں کہ دونوں ہی سبب ہوں، لیکن آیت تخییر کے الفاظ سے زیادہ تائید اسی کی ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کی طرف سے کوئی مالی مطالبہ اس کا سبب بنا۔ کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا الآیۃ

اس آیت نے سب ازواج مطہرات کو اختیار دیدیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ حالت یعنی عسرت و تنگی کے ساتھ آپ کی زوجیت میں رہنا قبول کریں یا پھر آپ سے طلاق کے ساتھ آزادی حاصل کرلیں۔ پہلی صورت میں ان کو عام عورتوں کی نسبت سے بہت زیادہ اجر عظیم اور آخرت کے خاص درجات عالیہ عطا ہوں گے، اور دوسری صورت یعنی طلاق لینے میں بھی ان کو دنیا کے لوگوں کی طرح کسی تلخی و تکلیف کی نوبت نہیں آئے گی، بلکہ سنت کے مطابق کپڑوں کا جوڑا وغیرہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ترمذی نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت تخییر

دے کر عزّت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ الآية،

ان دو آیتوں میں ازواج مطہرات کی یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ اگر وہ کوئی گناہ کا کام کریں گی تو ان کو دوسری عورتوں کی نسبت سے دوگنا عذاب دیا جائے گا یعنی ان کا ایک گناہ دو کے قائم مقام قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر وہ نیک عمل کریں تو دوسری عورتوں کی نسبت ان کو ثواب بھی دوہرا دیا جائے گا، ان کا ایک نیک عمل دو کے قائم مقام ہوگا،

یہ بات ایک حیثیت سے ازواج مطہرات کے لئے ان کے اس عمل کی جزاء ہے جو انہوں نے آیت تخییر نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت پر دنیوی ذخائر کو قربان کر دیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے نیک عمل کو دوگنا درجہ دیدیا، اور گناہ کی صورت میں دوہرا عذاب بھی ان کی خصوصی فضیلت اور امتیازی شرافت کی وجہ سے ہوا کیونکہ یہ بات عقلی بھی ہے اور نقلی بھی، کہ جتنا کسی کا اعزاز و احترام ہوتا ہے اتنا ہی اس کی طرف سے غفلت و سرکشی کی سزا بھی بڑھ جاتی ہے۔

ازواج مطہرات پر حق تعالیٰ کے انعامات بڑے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زوجیت کے لئے انتخاب فرمایا۔ ان کے گھروں میں وحی الٰہی نازل ہوتی رہی تو ان کی ادنیٰ غفلت کی قیمت بھی بڑی ہوگی۔ اگر دوسروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچے تو اس سے کہیں زیادہ اشد ہوگا کہ ان سے کوئی بات ایذا کی صادر ہو، قرآن کریم کے ان الفاظ میں خود اس سبب کی طرف اشارہ ہے وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔

فائدہ: ازواج مطہرات کی یہ خصوصیت کہ ان کے عمل کا دوہرا ثواب ملے عام امت کے اعتبار سے ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امت میں کسی فرد یا جماعت کو کسی خصوصیت سے ایسا انعام نہ بخشا جائے کہ ان کو دوہرا ثواب ملے، چنانچہ اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہوگئے ان کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے اُولٰۗىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ۔

اور قیصر روم کے نام جو نامہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا اس میں اسی ارشاد قرآنی کی وجہ سے آپ نے قیصر روم کو یہ لکھا کہ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ۔ اہل کتاب جو اسلام لے آئیں ان کے متعلق تو خود قرآن میں اجر مرتین کی تصریح ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی جس میں تین آدمیوں کے لئے اسی طرح دوہرا اجر مذکور ہے اس کی تفصیل سورۂ قصص میں آیت يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ کے تحت میں لکھی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے مطالبات کرنے سے روکا گیا ہے جن کو پورا کرنا آپ کے لئے دشوار ہو یا جو آپ کی شان کے مناسب نہ ہوں۔ اور جب انھوں نے اس کو اختیار کرلیا تو ان کا درجہ عام عورتوں سے بڑھا دیا گیا کہ ان کے ایک عمل کو دو کے قائم مقام بنادیا۔ آگے ان کو اصلاح عمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و زوجیت کے مناسب بننے کے لئے چند ہدایات دی گئی ہیں یہ سب ہدایات گرچہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام مسلمان عورتیں ان کی مامور ہیں، مگر یہاں ازواج مطہرات کو خصوصی خطاب کرکے اس پر متوجہ کیا ہے کہ یہ اعمال و احکام جو سب مسلمان عورتوں کے لئے لازم و واجب ہیں آپ کو ان کا اہتمام دوسروں سے زیادہ کرنا چاہئے اور لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ سے یہی خصوصیت مراد ہے۔

کیا ازواج مطہرات سارے عالم کی عورتوں سے افضل ہیں: آیت کے ان الفاظ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات تمام دنیا کی عورتوں سے افضل ہیں۔ مگر قرآن کریم کی آیت حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ اس سے حضرت مریم کا سارے جہاں کی عورتوں سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کافی ہیں تم کو ساری دنیا کی عورتوں میں سے مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ام المومنین، اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور آسیہ زوجہ فرعون۔ اس حدیث میں حضرت مریم کی ساتھ اور تین عورتوں کو سارے عالمین سے افضل فرمایا ہے۔

اس لئے اس آیت میں جو ازواج مطہرات کی فضیلت اور فوقیت بیان کی گئی ہے وہ ایک خاص حیثیت یعنی ازواج النبیؐ اور نساء النبیؐ ہونے کی ہے، جس میں وہ تمام عالم کی عورتوں سے بلاشبہ افضل ہیں۔ اس سے عام فضیلت مطلقہ ثابت نہیں ہوتی جو دوسری نصوص کے خلاف ہو (مظہری)

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ کے بعد اِنِ اتَّقَيْتُنَّ یہ شرط اس فضیلت کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو نساء النبیؐ ہونے کی وجہ سے بخشی ہے۔ مقصود اس سے اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ فقط اس نسبت و تعلق پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جائیں کہ ہم ازواج رسول ہیں، بلکہ تقویٰ اور اطاعت احکام الٰہیہ پر فضیلت کی شرط ہے (قرطبی و مظہری)

اس کے بعد چند ہدایات ازواج مطہراتؓ کو دی گئیں:

پہلی ہدایت عورتوں کے پردہ سے متعلق آواز اور کلام پر پابندی ہے:-

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ یعنی کسی غیر محرم سے پس پردہ بات کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے تو کلام میں اس نزاکت اور سلاست کے جو سے پرہیز کیا جائے جو فطرۃً عورتوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ مطلب اس نرمی اور نزاکت سے وہ نرمی ہے جو مخاطب کے دل میں میلان پیدا کرے جیسا کہ اس کے بعد فرمایا فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ یعنی ایسی نرم گفتگو نہ کرو جس سے ایسے آدمی کو طمع اور میلان پیدا ہونے لگے جس کے دل میں مرض ہے۔ مرض سے مراد نفاق ہے یا اس کا کوئی شعبہ کیونکہ اصلی منافق سے تو ایسی بات سرزد ہونا مستبعد ہے۔ لیکن جو آدمی مومن مخلص ہونے کے باوجود کسی حرام کی طرف مائل ہوتا ہے وہ منافق نہیں مگر ضعیف الایمان ضرور ہے۔ اور یہ ضعف ایمان جو حرام کی طرف مائل کرتا ہے درحقیقت ایک شعبہ نفاق ہی کا ہے۔ ایمان خالص جس میں شبہ نفاق کا نہ ہو اس کے ہوتے ہوئے کوئی حرام کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ (مظہری)

مقصد اس ہدایت کا عورتوں کے لئے اجنبی مردوں سے اجتناب اور پردہ کا وہ اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ جس سے کسی ضعیف الایمان کے دل میں کوئی طمع یا میلان پیدا ہونے کا اس کے پاس بھی نہ جائیں۔ پردہ نسواں کی مفصل بحث اسی سورۃ میں آگے آنے والی آیات کے تحت میں بیان ہوگی۔ یہاں ازواج مطہرات کے مخصوص ہدایات کے ضمن میں جو کچھ آیا ہے صرف اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ کلام کے متعلق جو ہدایت دی گئی ہے اس کو سننے کے بعد بعض امہات المومنین اس آیت کے نزول کے بعد اگر غیر محرم سے کلام کرتیں تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتیں تاکہ آواز بدل جائے۔ اسی سے حضرت عمرو بن العاص کی ایک حدیث میں ہے
اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ تُکَلِّمَ النِّسَاءُ اِلَّا بِاِذْنِ اَزْوَاجِھِنَّ،
(رواہ الطبرانی بسند حسن۔ مظہری)

مسئلہ: اس آیت اور حدیث مذکور سے اتنا تو ثابت ہوا کہ عورت کی آواز ستر میں داخل نہیں۔ لیکن اس پر بھی احتیاطی پابندی یہاں بھی لگا دی اور تمام عبادات اور احکام میں اس کی رعایت کی گئی ہے کہ عورتوں کا کلام جہری نہ ہو جو مرد سنیں۔ امام کوئی غلطی کرے تو مقتدیوں کو لقمہ زبان سے دینے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو زبان سے لقمہ دینے کے بجائے یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے ہاتھ کی پشت پر دوسرا ہاتھ مار کر تالی بجائیں جس سے امام متنبہ ہو جائے زبان سے کچھ نہ کہیں۔

دوسری ہدایت: بعمل پردہ کرنے کی ہے وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى، یعنی ٹھہرو اپنے گھروں میں اور زمانہ قدیم کی جاہلیت اولیٰ کی طرح نہ پھرو"، یہاں جاہلیت اولیٰ سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے دنیا میں

پھیلی ہوئی تھی، اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کے بعد دوسری بھی کوئی جاہلیت آنے والی ہے، جس میں اسی طرح کی بے حیائی و بے پردگی پھیل جائے گی، وہ شاید اس زمانہ کی جاہلیت ہے، جس کا اب مشاہدہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔

اس آیت میں پردہ کے متعلق اصلی حکم یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں (یعنی بلا ضرورت شرعیہ باہر نہ نکلیں، اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی عورتیں علانیہ بے پردہ پھرتی تھیں ایسے نہ پھرو لفظ تبرج کے اصلی معنی ظاہر کرنے ہیں اور اس جگہ مراد اس سے اپنی زینت کا اظہار ہے غیر مردوں پر، جیسا کہ دوسری آیت میں غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ آیا ہے۔

عورتوں کے پردہ کی پوری بحث اور مفصل احکام آگے اسی سورت میں آئیں گے یہاں صرف آیت مذکورہ کی تشریح لکھی جاتی ہے۔ اس آیت سے پردہ کے متعلق دو باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ اصل مطلوب عند اللہ عورتوں کے لئے یہ ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں، ان کی تخلیق گھریلو کاموں کے لئے ہوئی ہے ان میں مشغول رہیں۔ اور اصل پردہ جو شرعاً مطلوب ہے وہ حجاب بالبیوت ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر بضرورت کبھی عورت کو گھر سے نکلنا ہی پڑے تو زینت کے اظہار کے ساتھ نہ نکلے، بلکہ برقع یا جلباب جس میں پورا بدن ڈھک جائے وہ پہن کر نکلے۔ جیسا کہ آگے اسی سورۃ احزاب کی آیت يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

قرار بیوت سے مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ میں عورتوں پر قرار فی البیوت واجب کیا گیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا مطلقاً ممنوع اور حرام ہو۔ مگر اوّل تو خود اسی آیت وَلَا تَبَرَّجْنَ سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ مطلقاً خروج بضرورت ممنوع نہیں بلکہ وہ خروج ممنوع ہے جس میں زینت کا اظہار ہو۔ دوسرے سورۃ احزاب کی آیت جو آگے آ رہی ہے، اس میں خود يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کا حکم یہ بتلا رہا ہے کہ کسی درجہ میں عورتوں کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت بھی ہے بشرطیکہ **برقع وغیرہ کے پردہ کے ساتھ نکلیں۔**

اس کے علاوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواضع ضرورت کا اس حکم سے مستثنیٰ ہونا ایک حدیث میں واضح فرمایا۔ جس میں ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا قَدْ اُذِنَ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ (رواہ مسلم) یعنی تمہارے لئے اس کی اجازت

ہو کہ اپنی ضرورت کے لئے گھر سے نکلو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل آیت حجاب نازل ہونے کے بعد اس پر شاہد ہے کہ ضرورت کے مواقع میں عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی اجازت ہے، جیسا کہ حج و عمرہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات کا جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اسی طرح بہت سے غزوات میں ساتھ جانا ثابت ہے۔ اور بہت سی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ازواج مطہرات اپنے والدین وغیرہ کی ملاقات کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں، عزیزوں کی بیمار پرسی اور تعزیت وغیرہ میں شرکت کرتی تھیں، اور عہد نبوی میں ان کو مسجد میں جانے کی بھی اجازت تھی۔

اور صرف یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا آپ کے زمانے ہی میں ایسا ہوا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی حضرت سودہؓ اور زینب بنت جحش وغیرہ کے علاوہ سب ازواج مطہرات کا حج و عمرہ کے لئے جانا ثابت ہے جس پر صحابہ کرام میں سے کسی نے نکیر نہیں کی، بلکہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات کو خود اپنے اہتمام سے حج کے لئے بھیجا اور حضرت عثمان غنیؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ کو ان کے ساتھ نگرانی و انتظام کے لئے بھیجا۔ اور ام المومنین حضرت سودہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ کا بعد وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج و عمرہ کے لئے نہ جانا اس آیت کی بناء پر نہیں بلکہ ایک حدیث کی بناء پر تھا۔ وہ یہ کہ حجۃ الوداع میں سب ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ساتھ حج کرایا تو واپسی کے وقت فرمایا هٰذِهٖ ثُمَّ لُزُوْمُ الْحُصُرِ، ہذہ کا اشارہ اس حج کی طرف ہے اور حُصُر حصیر کی جمع ہے، جس کے معنی بوریے کے ہیں۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ تمہارا نکلنا صرف اس حج کے لئے تھا، اس کے بعد اپنے گھروں کے بوریوں کو لازم پکڑو ان سے نہ نکلو۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور زینب بنت جحشؓ نے اس حدیث کا یہ مفہوم قرار دیا کہ ہمارا خروج صرف اسی حجۃ الوداع کے لئے جائز تھا، آگے جائز نہیں۔ باقی ازواج مطہرات جن میں صدیقہ عائشہ جیسی فقیہہ بھی داخل تھیں سب نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا کہ جس طرح کا یہ سفر تھا کہ ایک شرعی عبادت کی ادائیگی کے لئے ہو بس اسی طرح کا خروج جائز ہے، ورنہ اپنے گھروں میں رہنا لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کے مفہوم سے باشارات قرآن اور بعمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم و باجماع صحابہ مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں، جن میں عبادات حج و عمرہ بھی داخل ہیں، اور ضروریات طبعیہ والدین اور اپنے محارم کی زیارت، عیادت

کہ شیعہ حضرات بھی مانتے ہیں، نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کے بعض اصحاب رفقاء نے خود کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو سزا دیدیں جنھوں نے عثمان غنیؓ پر حملہ کیا تو بہتر ہوگا۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میں ان باتوں سے بے خبر نہیں جو تم کہتے ہو، مگر یہ کام کیسے ہو جبکہ مدینہ پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں، دیکھتے نہیں کہ تمہارے غلام اور آس پاس کے اعراب بھی ان کے ساتھ لگ گئے ہیں، ایسی حالت میں ان کی سزا کے احکام جاری کردوں تو نہ معلوم کس طرح ہونگے۔

حضرت صدیقہؓ کو ایک طرف حضرت علیؓ کی مجبوری کا اندازہ تھا، دوسری طرف یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے مسلمانوں کے قلوب زخمی ہیں، اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینے میں تاخیر جو امیر المؤمنین علیؓ کی طرف سے مجبوری دیکھی جا رہی تھی اور مزید یہ کہ قاتلین عثمانؓ امیر المؤمنین کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے، جو لوگ حضرت امیر المؤمنینؓ کی مجبوری سے واقف نہ تھے، ان کو اس معاملہ میں ان سے بھی شکایت پیدا ہو رہی تھی، ممکن تھا کہ یہ شکایت کسی دوسرے فتنے کا آغاز بن جائے۔ اس لئے لوگوں کو فہمائش کرکے صبر کرنے اور امیر المؤمنینؓ کو قوت دینے پر نظم مملکت کو مستحکم کرنے اور باہمی شکوہ و شکایت کو رفع کرکے اصلاح بین الناس کے قصد سے بصرہ کا سفر اختیار کرلیا جس میں ان کے محرم بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ ان کے ساتھ تھے اپنے اس سفر کا مقصد خود ام المؤمنینؓ نے حضرت قعقاعؓ کے سامنے بیان فرمایا تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور ایسے شدید فتنہ کے وقت اصلاح بین المؤمنین کا کام جس قدر اہم دینی خدمت تھی وہ بھی ظاہر ہے۔ اس کے لئے ام المؤمنینؓ نے بصرہ کا سفر محارم کے ساتھ اور پردہ کے آہنی ہودج میں اختیار فرما لیا تو اس کو جو شیعہ اور روافض نے ایک عنوان بنا کر پیش کیا ہے کہ ام المؤمنینؓ نے احکامِ قرآن کی خلاف ورزی کی **اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔**

آگے منافقین اور مفسدین کی شرارت نے جو صورت جنگ باہمی کی پیدا کردی اس کا خیال کبھی صدیقہؓ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس آیت کی تفسیر کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ آگے واقعہ جنگِ جمل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مگر اختصار کے ساتھ حقیقت واضح **کرنے کے لئے چند سطور لکھی جاتی ہیں۔**

باہمی فتنوں اور جھگڑوں کے وقت جو صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں ان سے کوئی اہل بصیرت و تجربہ غافل نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی صورت یہ پیش آئی کہ مدینہ سے آئے ہوئے صحابہ کرام کی جمعیت میں حضرت صدیقہؓ کے سفرِ بصرہ کو منافقین اور مفسدین نے

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ کے سامنے صورت حال واضح کر کے صلح پیش کی جائے، یہ سب اس لئے بصرہ جا رہے ہیں کہ وہاں سے لشکر لے کر آپ کا مقابلہ کریں، اگر آپ اس وقت یہیں رک گئے تو فرض ہو کہ اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے پہلے وہیں ختم کر دیں، حضرت حسن و حسین و عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام نے اس رائے سے اختلاف کیا اور مشورہ یہ دیا کہ آپ ان کے تعاقب پر لشکر کشی اس وقت تک نہ کریں جب تک صحیح حال معلوم نہ ہو جائے، مگر کثرت دوسری طرف رائے دینے والوں کی تھی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرف مائل ہو کر لشکر کے ساتھ نکل آئے، اور یہ شریر اہل فتنہ و فساد بھی آپ کے ساتھ لگ گئے۔

جب یہ حضرات بصرہ کے قریب پہونچے تو حضرت قعقاعؓ کو ام المؤمنینؓ کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا، انھوں نے عرض کیا کہ اے ام المؤمنینؓ آپ کے یہاں تشریف لانے کا کیا سبب ہوا؟ تو صدیقہؓ نے فرمایا کہ ای بنی الاصلاح بین الناس، یعنی اے بیٹے، میں اصلاح بین الناس کے ارادے سے یہاں آئی ہوں، پھر حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کو بھی قعقاعؓ کی مجلس میں بلا لیا، قعقاعؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ قاتلین عثمانؓ پر حد شرعی جاری کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے۔ حضرت قعقاعؓ نے سمجھایا کہ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی جماعت منظم اور مستحکم نہ ہو جائے، اس لئے آپ حضرات پر لازم ہے کہ اس وقت آپ مصالحت کی صورت اختیار کر لیں۔

ان بزرگوں نے اس کو تسلیم کیا۔ حضرت قعقاعؓ نے جا کر امیر المؤمنینؓ کو اس کی اطلاع دی، وہ بھی بہت مسرور ہوئے، اور مطمئن ہو گئے، اور سب لوگوں نے واپسی کا قصد کر لیا، اور تین روز اس میدان میں قیام اس حال پر رہا کہ کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ اب دونوں فریقوں میں مصالحت کا اعلان ہو جائے گا، اور چوتھے دن صبح کو یہ اعلان ہونے والا تھا، اور حضرت امیر المؤمنینؓ کی ملاقات حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ ہونے والی تھی جس میں یہ قاتلین عثمان غنیؓ شریک نہیں تھے۔ یہ چیز ان لوگوں پر سخت گراں گذری، اور انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ تم اول حضرت عائشہؓ کی جماعت میں پہونچ کر قتل و غارتگری شروع کر دو، تاکہ وہ اور ان کے ساتھی یہ سمجھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے عہد شکنی ہوئی، اور یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو کر حضرت علیؓ کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں۔ ان کی یہ شیطانی چال چل گئی، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شامل ہونے والے مفسدین کی طرف سے جب حضرت صدیقہؓ کی جماعت پر حملہ ہو گیا تو

وہ یہ سمجھنے میں معذور تھے کہ یہ حملہ امیر المومنینؓ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے، اس کی جوابی کارروائی شروع ہوگئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ ماجرا دیکھا تو قتال کے سوا چارہ نہ رہا، اور جو حادثہ باہمی قتل و قتال کا پیش آنا تھا آگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ ٹھیک اسی طرح طبری اور دوسرے ثقات مورخین نے حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے نقل کیا ہے (روح المعانی)

غرض مفسدین و مجرمین کی شرارت اور فتنہ انگیزی کے نتیجہ میں ان دونوں مقدس گروہوں میں غیر شعوری طور پر قتال کا واقعہ پیش آگیا، اور جب فتنہ فرو ہوا تو دونوں ہی حضرات اس پر سخت غمگین ہوئے۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو یہ واقعہ یاد آجاتا تو اتنا روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؓ کو بھی اس واقعہ پر سخت صدمہ پیش آیا، فتنہ فرو ہونے کے بعد مقتولین کی لاشوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تو اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر یہ فرماتے تھے کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر کر نسیاً منسیاً ہوگیا ہوتا اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت ام المومنینؓ جب قرآن میں یہ آیت پڑھتیں وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ تو رونے لگتیں، یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

(رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد الزہد و ابن المنذر و ابن ابی شیبۃ عن مسروق، روح)

آیت مذکورہ پڑھنے پر رونا اس لئے نہ تھا کہ قرار فی البیوت کی خلاف ورزی ان کے نزدیک گناہ تھی یا سفر ممنوع تھا بلکہ گھر سے نکلنے پر جو واقعہ ناگوار اور حادثہ شدیدہ پیش آگیا، اس پر طبعی رنج و غم اس کا سبب تھا۔ (یہ سب روایات اور پورا مضمون تفسیر روح المعانی سے لیا گیا ہے)۔

ازواج مطہرات کو قرآن کی تیسری، چوتھی اور پانچویں ہدایت

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ دو ہدایتیں تفصیل کے ساتھ پہلے گذر چکی ہیں، یعنی غیر مردوں سے کلام میں نرمی و نزاکت سے اجتناب اور گھروں سے بلا ضرورت نہ نکلنا۔ تین ہدایتیں اس میں آگئیں۔ یہ کل پانچ ہدایات ہیں جو عورتوں کے لئے مہمات دین میں سے ہیں۔

یہ پانچوں ہدایات سب مسلمانوں کیلئے عام ہیں

مذکورہ ہدایات میں آخری ہدایات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ ازواج مطہراتؓ کے ساتھ مخصوص ہوں، نماز، زکوٰۃ اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت سے کونسا مسلمان مرد و عورت مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ باقی پہلی دو ہدایتیں جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہیں ذرا غور کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لئے یہی حکم ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ ان ہدایات کے ذکر سے پہلے قرآن نے یہ فرمایا ہے لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ یعنی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں اگر وہ تقویٰ اختیار کریں۔ اس سے بظاہر تخصیص معلوم ہوتی ہے۔ تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تخصیص احکام کی نہیں، بلکہ ان پر عمل کے اہتمام کی ہے۔ یعنی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں، بلکہ ان کی شان سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ اس لئے جو احکام تمام مسلمان عورتوں پر فرض ہیں ان کا اہتمام ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا، آیاتِ سابقہ میں جو ہدایات ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے دی گئی ہیں، وہ اگرچہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ تھیں بلکہ پوری امت ان احکام کی مکلف ہے۔ مگر ازواج مطہرات کو خصوصی خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ اپنی شان اور بیتِ نبوت کے مناسب ان اعمال کا زیادہ اہتمام کریں۔ اس آیت میں اس خصوصی خطاب کی حکمت مذکور ہے کہ اصلاحِ اعمال کی خاص ہدایت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اہل بیتِ رسولؐ کو **رجس (گندگی) سے پاک کر دے۔**

لفظ رجس قرآن میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ رجس بتوں کے معنی میں آیا ہے۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ اور کبھی لفظ رجس مطلق گناہ کے معنی میں، کبھی عذاب کے معنی میں، کبھی نجاست اور گندگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو شرعاً یا طبعاً قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہو وہ رجس ہے۔ اس آیت میں **یہی عام معنی مراد ہیں (بحر محیط)**

آیت میں اہل بیت سے کیا مراد ہے؟

اوپر کی آیت میں نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب تھا، اس لئے بصیغہ تانیث خطاب کیا گیا، یہاں اہل البیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ ان کی اولاد و آباء بھی داخل ہیں، اس لئے بصیغہ مذکر فرمایا عَنكُمُ، وَيُطَهِّرَكُمْ اور بعض ائمہ تفسیر نے اہل بیت سے مراد صرف ازواج مطہرات کو قرار دیا ہے۔ حضرت عکرمہ ومقاتل نے یہی فرمایا ہے اور سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات کو قرار دیا۔ اور استدلال میں اگلی آیت پیش فرمائی وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ (رواہ ابن ابی حاتم وابن جریر)۔ اور سابقہ آیت میں نِسَاءَ النَّبِيِّ کے الفاظ سے خطاب بھی

اس کی قرینہ ہی حضرت عکرمہ تو بازار میں منادی کرتے تھے، کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کیونکہ یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور فرماتے تھے کہ میں **اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔**

لیکن حدیث کی متعدد روایات جن کو ابن کثیرؒ نے اس جگہ نقل کیا ہے اس پر شاہد ہیں کہ اہل بیت میں حضرت فاطمہؓ و علیؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ بھی شامل ہیں، جیسے صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپ ایک سیاہ رومی چادر اوڑھے ہوئے تھے، حسن بن علیؓ آگئے تو ان کو اس چادر میں لے لیا، پھر حسینؓ آگئے، ان کو بھی اسی طرح چادر کے اندر داخل فرما لیا، اس کے بعد حضرت فاطمہؓ پھر علی مرتضیٰؓ آگئے، ان کو بھی چادر میں داخل فرما لیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا اَللّٰهُمَّ هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْلُ بَيْتِيْ (رواہ ابن جریر)

ابن کثیرؒ نے اس مضمون کی متعدد حدیث معتبرہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ درحقیقت ان دونوں اقوال میں جو ائمہ تفسیر سے منقول ہیں کوئی تضاد نہیں۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کی شان میں نازل ہوئی اور اہل بیت سے وہی مراد ہیں یہ اس کے منافی نہیں کہ دوسرے حضرات بھی اہل بیت میں شامل ہوں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ لفظ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی داخل ہیں، کیونکہ شان نزول اس آیت کا وہی ہیں، اور شان نزول کا مصداق آیت میں داخل ہونا کسی شبہ کا محتمل نہیں۔ اور حضرت فاطمہ و علی و حسن و حسین رضی اللہ عنہم بھی ارشاد نبوی علیہ السلام کے مطابق اہل بیت میں شامل ہیں۔

اور اس آیت سے پہلے اور بعد میں دونوں جگہ نساء النبی کے عنوان سے خطاب اور ان کے لئے صیغے مؤنث کے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سابقہ آیات میں فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ سے آخر تک سب صیغے مؤنث کے استعمال ہوئے ہیں، اور آگے پھر وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى میں بصیغہ تانیث خطاب ہوا ہے۔ اس درمیانی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر بصیغہ مذکر عَنْكُمُ اور يُطَهِّرَكُمْ فرمانا بھی اس پر شاہد قوی ہے کہ اس میں صرف ازواج ہی داخل **نہیں کچھ رجال بھی ہیں۔**

آیت مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان ہدایات کے ذریعہ اغواءِ

شیطانی اور نفسانی اور قبائح سے حق تعالیٰ اہل بیت کو محفوظ رکھے گا، اور پاک کر دے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تطہیر تشریعی مراد ہے، تکوینی تطہیر جو خاصہ انبیاء ہے، وہ مراد نہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سب معصوم ہوں اور ان سے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی گناہ سرزد ہونا ممکن نہ ہو، جو تکوینی تطہیر کا خاصہ ہے۔ اہل تشیع نے اس آیت میں جمہور امت سے انحراف کر کے اول تو لفظ اہل بیت کا صرف اولاد و عصبات رسول کے ساتھ مخصوص ہونے اور ازواج مطہرات کے ان سے خارج ہونے کا دعویٰ کیا۔ دوسرے آیت مذکورہ میں تطہیر سے مراد ان کی عصمت قرار دے کر اہل بیت کو انبیاء کی طرح معصوم کہا۔ اس کا جواب اور مسئلہ کی مفصل بحث احقر نے احکام القرآن سورۂ احزاب میں لکھی ہے، اس میں عصمت کی تعریف اور اس کا انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور ان کے سوا کسی کا معصوم نہ ہونا دلائل شرعیہ سے واضح کر دیا ہے، اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں، عوام کو اس کی ضرورت نہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ، آیات اللہ سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و سنت رسول ہے جیسا کہ عامہ مفسرین نے حکمت کی تفسیر اس جگہ سنت سے کی ہے۔ اور لفظ اذکرن کے دو مفہوم ہوتے ہیں: ایک یہ کہ ان چیزوں کو خود یاد رکھو جس کا نتیجہ ان پر عمل کرنا ہے، دوسرے یہ کہ جو کچھ قرآن ان کے گھروں میں ان کے سامنے نازل ہوا یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیں اس کا ذکر امت کے دوسرے لوگوں سے کریں اور ان کو پہنچائیں۔

فائدہ:- ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی آیت قرآن یا حدیث سنے اس پر لازم ہے کہ وہ امت کو پہنچائے۔ یہاں تک کہ ازواج مطہرات پر بھی لازم کیا گیا کہ جو آیات قرآن ان کے گھروں میں نازل ہوں یا جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو حاصل ہوں اس کا ذکر امت کے دوسرے افراد سے کریں، اور یہ اللہ کی امانت ان کو پہنچائیں۔

قرآن کی طرح حدیث کی حفاظت

اس آیت میں جس طرح آیات قرآن کی تبلیغ و تعلیم امت پر لازم کی گئی ہے اسی طرح لفظ حکمت فرما کر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ و تعلیم کو بھی لازم کیا گیا ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ہر حال میں کی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت معاذؓ کا یہ واقعہ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی، لیکن اس کو عام لوگوں کے سامنے اس لئے بیان نہیں کیا کہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کو اس کے درجہ میں نہ رکھیں، اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں،

لیکن جب ان کی وفات کا وقت آیا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ حدیث سنا دی اور فرمایا کہ میں نے اس وقت تک دینی مصلحت سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا مگر اب موت کا وقت قریب ہے اس لئے امت کی یہ امانت ان کو پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں فاخبر بہا معاذ عند موتہ تأثماً۔ "یعنی حضرت معاذؓ نے یہ حدیث لوگوں کو وفات کے وقت اس لئے سنا دی کہ وہ گنہگار نہ ہوں کہ حدیث رسول امت کو نہیں پہنچائی۔"

یہ واقعہ بھی اسی پر شاہد ہے کہ اس حکم قرآنی کی تعمیل سب صحابہ کرام واجب و ضروری سمجھتے تھے، اور صحابہ کرام نے حدیث کو احتیاط کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام فرمایا تھا تو حدیث کی حفاظت بھی ایک درجہ میں قرآن کی حفاظت کے قریب قریب ہوگئی، اس معاملہ میں شبہات نکالنا درحقیقت قرآن میں شبہات نکالنا ہے۔ واللہ اعلم

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَ

تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور

الْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ

بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد

وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ

اور محنت جھیلنے والی عورتیں اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں

وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور حفاظت کرنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ کو اور حفاظت کرنے والی عورتیں

وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم

اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنے والی عورتیں رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے

مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾

معافی اور ثواب بڑا۔

خلاصۂ تفسیر

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور

ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں (مسلمین ومسلمات کی اس تفسیر پر اسلام سے مراد اعمال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ہوئے اور مؤمنین ومؤمنات میں ایمان سے مراد حقائق ہوں گے جیسا صحیح بخاری ومسلم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام وایمان کے متعلق یہی جواب دینا منقول ہے) اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں (اس راست بازی میں صادق القول ہونا بھی داخل ہے صادق العمل ہونا بھی، اور ایمان اور نیت میں صادق ہونا بھی یعنی اُن کے کلام میں کوئی جھوٹ ہو نہ عمل میں کم ہمتی وسستی اور نہ ریاکاری یا نفاق) اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں (اس میں صبر کی سب قسمیں آگئیں یعنی طاعات وعبادات پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے اپنے نفس کو روکنا اور مصائب پر صبر کرنا) اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں (لفظ خشوع میں نماز وعبادات کا خشوع بھی داخل ہے کہ قلب سے بھی عبادت کی طرف متوجہ ہو اور اپنے اعضاء وجوارح کو بھی اس کے مناسب رکھے اور اس میں عام تواضع بھی داخل ہے جو تکبر کے بالمقابل ہے یعنی یہ لوگ تکبر اور اپنی بڑائی سے بھی پاک ہیں، اور نماز وغیرہ عبادات میں بھی خشوع وخضوع ان کا وظیفہ ہے) اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں (اس میں زکوٰۃ اور صدقات نافلہ سب داخل ہیں) اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (یعنی جو اذکار فرض کے علاوہ نفلی اذکار کو بھی ادا کرتے ہیں) ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

معارف ومسائل

قرآن کے عام خطابات مردوں کو ہیں عورتیں ضمناً شامل ہیں اس کی حکمت

قرآن کریم کے عام احکام میں اگرچہ مرد وعورت دونوں ہی شامل ہیں، مگر عموماً خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، عورتیں اس میں ضمناً شامل ہیں، ہر جگہ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے لفظ استعمال فرما کر عورتوں کو ان کے ضمن میں مخاطب کیا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عورتوں کے سب معاملات تستر اور پردہ پوشی پر مبنی ہیں، اس میں ان کا اکرام واعزاز ہے۔ خصوصاً پورے قرآن میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت مریم بنت عمران کے سوا کسی عورت کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا، بلکہ ذکر آیا تو مردوں کی نسبت کے ساتھ امرأۃ فرعون، امرأۃ نوح، امرأۃ لوط کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت مریم کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کسی باپ کی طرف نہ ہوسکتی تھی، اس لئے ماں کی طرف نسبت کرنا تھا اس نسبت کے لئے ان کا نام ظاہر کیا گیا۔ واللہ اعلم

قرآن کریم کا یہ اسلوب اگرچہ خود ایک بڑی حکمت و مصلحت پر مبنی تھا، مگر عورتوں کو اس کا خیال گذرنا ایک طبعی امر تھا۔ اسی لئے کتب حدیث میں ایسی متعدد روایات آئی ہیں کہ عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ مردوں ہی کا ذکر قرآن میں فرماتے ہیں، انہی کو خطاب فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہم عورتوں میں کوئی خیر ہی نہیں، ہمیں ڈر ہے کہ ہماری عبادت بھی قبول نہ ہو۔ رواہ البغوی عن ازواج مطہرات۔ اور ترمذی میں بسند حسن حضرت ام عمارہ انصاریہؓ سے اور بعض روایات میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے اسی طرح کی عرض داشت پیش کرنا منقول ہے۔ اور ان سب روایات میں آیت مذکورۃ الصدر کا سبب نزول اسی عرض داشت کو قرار دیا ہے۔

آیت مذکورہ میں عورتوں کی دلجوئی اور ان کے اعمال کی مقبولیت کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے جس میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت اور فضیلت کا مدار اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اس میں مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں۔

ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اور اس کی حکمت

اسلام کے ارکان پانچ عبادتیں ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، لیکن پورے قرآن میں ان میں سے کسی عبادت کو کثرت کے ساتھ کرنے کا حکم نہیں، مگر ذکر اللہ کے متعلق قرآن کریم کی متعدد آیات میں بکثرت کرنے کا ارشاد ہے۔ سورۃ انفال، سورۃ جمعہ میں اور اس سورت میں وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ فرمایا

اس کی حکمت ایک یہ ہے کہ اول تو ذکر اللہ تمام عبادات کی اصل روح ہے جیسا کہ حضرت معاذ بن انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجاہدین میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کس کا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر پوچھا کہ روزہ داروں میں کس کا ثواب سب سے زیادہ ہے؟ فرمایا جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ پھر اسی طرح نماز، زکوٰۃ اور حج و صدقہ کے متعلق سوالات کئے، ہر مرتبہ آپ نے یہی فرمایا کہ جو اللہ کا ذکر زیادہ کرے، وہی زیادہ مستحق اجر ہے۔ رواہ احمد (ابن کثیر)

دوسرے یہ سب عبادات میں سب سے زیادہ سہل ہے۔ شریعت نے بھی اس کے لئے کوئی شرط نہیں رکھی، وضو، بے وضو، لیٹے، بیٹھے، چلتے پھرتے، ہر وقت میں ذکر اللہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ انسان سے کوئی محنت لیتا ہے، نہ کسی فرصت کو مقتضی ہے۔

عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللَّهِ فِي

کچھ مضائقہ نہیں اس بات میں جو مقرر کر دی اللہ نے اس کے واسطے جیسے دستور رہا ہے اللہ کا

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ﴿٣٨﴾

ان لوگوں میں جو گذر چکے پہلے اور ہے حکم اللہ کا مقرر ٹھہر چکا

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ

وہ لوگ جو پہنچاتے ہیں پیغام اللہ کے اور ڈرتے ہیں اس سے اور نہیں ڈرتے

أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٣٩﴾

کسی سے سوائے اللہ کے اور بس ہے اللہ کفایت کرنے والا

خلاصۂ تفسیر

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا (گو وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو وجوباً) حکم دیدیں کہ (پھر) ان (مؤمنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں بلکہ عمل ہی کرنا واجب ہو جاتا ہے) اور جو شخص (بعد حکم وجوبی کے) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا، اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ (بطور فہمائش و مشورہ کے طور سے) اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا (کہ اسلام کی توفیق دی جو نعمت دینی ہے، اور غلامی سے چھڑایا کہ نعمت دنیویہ ہے) اور آپ نے بھی انعام کیا (تعلیم دین فرمائی، اور آزاد کیا، اور پھوپھی زاد بہن سے نکاح کرایا مراد حضرت زیدؓ ہیں کہ آپ ان کو سمجھا رہے تھے) کہ اپنی بی بی (زینبؓ) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے (اور اس کی معمولی خطاؤں پر نظر نہ کر کہ گاہے اس سے ناموافقت ہو جاتی ہے) اور خدا سے ڈر (اور اس کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کر کہ کبھی اس سے ناموافقت پیدا ہو جاتی ہے، اور (جب شکایتیں حد سے تجاوز ہو گئیں اور قرائن سے اصلاح و توافق کی امید نہ رہی تو اس وقت فہمائش کے ساتھ) آپ اپنے دل میں وہ بات (بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا (مراد اس سے آپ کا نکاح ہے حضرت زینبؓ سے جبکہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں جس کو حق تعالیٰ نے زَوَّجْنٰكَهَا میں قولاً اور

خود نکاح کردینے سے فعلاً ظاہر فرمایا (اور اس مشروط اور معلق ارادہ کے ساتھ ہی)
آپ لوگوں (کے طعن) سے (بھی) اندیشہ کرتے تھے (کیونکہ اس وقت اس نکاح میں کسی
اہم مصلحت دینیہ کا ہونا ذہن مبارک میں نہ آیا ہوگا، محض دنیوی مصلحت خاص حضرت
زینبؓ کی، خیال میں ہوگی اور امور دنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا منافی تقویٰ نہیں، بلکہ بعض
حیثیتوں سے مطلوب ہے جبکہ اعتراض سے دوسروں کی دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو
اس سے بچانا مقصود ہو،) اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے (لیکن چونکہ
واقع میں اس میں دینی مصلحت ہے، جیسا آگے لکی لا یکون الخ میں مذکور ہے، اس لئے
خلق سے اندیشہ نہ کیجئے۔ چنانچہ بعد اطلاع مصلحت دینیہ کے پھر اندیشہ آپ نے نہیں کیا
اور ارادہ نکاح میں تو کیا اندیشہ ہوتا خود نکاح کے بعد بھی اندیشہ **نہیں کیا**، جس کا قصہ
آگے ہے کہ) پھر جب زید کا اس (زینبؓ) سے جی بھر گیا (یعنی طلاق دیدی اور عدت
بھی گذر گئی) تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں
کی بیبیوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے
اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دیدیں، مطلب یہ کہ اس تشریع کا اظہار مقصود تھا) اور
خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی (کیونکہ حکمت اس کو مقتضی تھی۔ آگے طعن کا جواب ہے کہ)
ان پیغمبر کے لئے خدا تعالیٰ نے جو بات (تکوینیاً یا تشریعاً) مقرر کردی تھی اس میں
نبی پر کوئی الزام (اور طعن کی بات) نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان (پیغمبروں) کے حق میں (بھی)
یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہو گذرے ہیں (کہ ان کو جس امر کی اجازت ہوتی ہے
بے تکلف وہ اس کو کرتے رہتے ہیں اور محل طعن نہیں بنے، ایسے ہی یہ نبی بھی محل
اعتراض نہیں، اور (ان پیغمبروں کے بھی اس قسم کے جتنے کام ہوتے ہیں ان سب
کے بارے میں بھی) اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے (اور اسی کے موافق پھر
ان کو حکم ہوتا ہے اور وہ عمل کرتے ہیں۔ شاید آپ کے قصہ میں اس مضمون کو لانا اور
پھر انبیاء کے تذکرہ میں اس کو مکرر لانا اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے امور مثل تمام
امور تکوینیہ کے ایسے متضمن حکمت ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے علم الٰہی میں تجویز ہو چکے
ہیں، پھر نبی پر طعن کرنا اللہ پر طعن کرنا ہے۔ بخلاف ان امور کے جن پر خود حق تعالیٰ
ملامت فرمادیں گو وہ مقدر ہونے کی وجہ سے متضمن حکمت ہوں مگر محل ملامت ہونا
دلیل ہے اس کے متضمن مفاسد کی۔ اس لئے ان مفاسد کے اعتبار سے ان پر
نکیر جائز ہے۔ آگے ایک مدح خاص ہے ان پیغمبروں کی تاکہ آپ کو تسلی ہو یعنی)

یہ سب (پیغمبرانِ گذشتہ) ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے (اگر تبلیغ قولی کے مامور ہوئے تو قولاً اور اگر تبلیغ فعلی کے مامور ہوئے تو فعلاً) اور (اس باب میں) اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے (پس آپ کو بھی جب تک معلوم نہ تھا کہ یہ نکاح تبلیغ فعلی ہے اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، لیکن آپ کو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو آپ بھی اندیشہ نہ کیجئے جیسا کہ مقتضا ہے شانِ رسالت کا۔ چنانچہ اس کے انکشاف کے بعد پھر آپ نے اندیشہ نہیں کیا، اور باوجودیکہ خود آپ کو تبلیغ رسالت میں کبھی خوف نہیں ہوا نہ اس کا احتمال تھا پھر بھی انبیاء کا قصہ سنانا زیادہ تقویت قلب کے لئے ہے) اور (آپ کی زیادہ تسلی کے لئے فرماتے ہیں کہ) اللہ (اعمال کا) حساب لینے کے لئے کافی ہے (پھر کسی سے کاہے کا ڈر ہے نیز آپ پر طعن کرنے والوں کو بھی سزا دے گا آپ طعن سے مغموم نہ ہوجئے)۔

معارف و مسائل

یہ بات پہلے کئی مرتبہ معلوم ہوچکی ہے کہ سورۃ احزاب میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت اور مکمل اطاعت سے یا آپ کو کسی قسم کی ایذاء و تکلیف پہونچانے کی ممانعت سے ہے۔ آیات مذکورۃ الصدر بھی اسی سلسلے کے چند واقعات سے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضؓ کسی شخص کے غلام تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بازار عکاظ سے خرید لیا تھا، ابھی عمر بھی کم تھی۔ آپؐ نے خریدنے کے بعد ان کو آزاد کرکے یہ شرف بخشا کہ عرب کے عام رواج کے مطابق ان کو اپنا منھ بولا بیٹا بنا لیا اور ان کی پرورش فرمائی۔ مکہ مکرمہ میں ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کو جاہلیت کی رسمِ غلط قرار دے کر اس کی ممانعت کردی کہ منھ بولے بیٹے کو اس شخص کا بیٹا کہکر پکارا جائے، اور حکم دیا کہ اس کو اس کے اصلی باپ کی طرف منسوب کیا جائے اسی سلسلے میں وہ آیات نازل ہوئیں جو اسی سورۃ میں پہلے آچکی ہیں اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ الآیہ ان احکام کے نازل ہونے کے بعد صحابۂ کرام نے ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا چھوڑ دیا اور ان کے والد حارثہ کی طرف منسوب کرنے لگے۔

ایک لطیفہ پورے قرآن میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی بڑے سے بڑے

صحابی کا بھی نام ذکر نہیں کیا گیا بجز حضرت زید بن حارثہؓ کے، اس کی حکمت بعض حضرات نے یہی بیان کی ہے کہ ان کی نسبت ولدیت کو بحکم قرآنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطع کیا گیا تو ان کے لئے ایک بہت بڑے اعزاز سے محرومی ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے اس کا بدل اس طرح کر دیا کہ قرآن میں ان کا نام لے کر ذکر فرما دیا۔ اور لفظ زید قرآن کا ایک لفظ ہونے کی حیثیت سے اس کے ہر لفظ پر حسب وعدۂ حدیث دس نیکیاں نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں ان کا نام جب قرآن میں پڑھا جاتا ہے تو صرف ان کا نام لینے پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا اکرام فرماتے تھے، حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے جب کبھی کسی لشکر میں ان کو بھیجا ہے تو امیر لشکر انہی کو بنایا ہے (ابن کثیر)

تنبیہ: یہ تھی اسلام میں غلامی کی حقیقت کہ ان کو تعلیم و تربیت دے کر جو صاحب صلاحیت ثابت ہو اس کو مقتدا کا درجہ دیا۔

زید بن حارثہؓ جوان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کے لئے اپنی پھوپھی کی لڑکی حضرت زینبؓ بنت جحش کا انتخاب فرما کر پیغام نکاح دیا۔ حضرت زیدؓ پر چونکہ یہ عرفی عیب لگا ہوا تھا کہ آزاد کردہ غلام تھے، حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحشؓ نے اس رشتہ سے انکار کر دیا کہ ہم باعتبار خاندان و نسب کے ان سے اشرف ہیں۔

اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ الآیہ، جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو کسی کام کا حکم بطور وجوب دیدیں تو اس پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے، اس کو نہ کرنے کا اختیار شرعاً نہیں رہتا اگرچہ فی نفسہ وہ کام شرعاً واجب و ضروری نہ ہو، مگر جس کو آپؐ نے حکم دیدیا اس کے ذمہ لازم و واجب ہو جاتا ہے، اور جو ایسا نہ کرے آخر آیت میں اس کو کھلی گمراہی فرمایا ہے۔

اس آیت کو حضرت زینبؓ بنت جحشؓ اور ان کے بھائی نے سنا تو اپنے انکار سے باز آ گئے، اور نکاح پر راضی ہو گئے، چنانچہ یہ نکاح کر دیا گیا۔ ان کا مہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے ادا کیا، جو دس دینار سرخ (جو پونے چار تولہ سونا ہوتا ہے) اور ساٹھ درہم (جس کی پونے سولہ تولہ چاندی ہوتی ہے) اور ایک بار برداری کا جانور اور پورا زنانہ جوڑا اور پچاس مد آٹا (یعنی تقریباً تینتالیس سیر) اور دس مد (ساڑھے آٹھ سیر تین ماشہ) کھجور تھا (ابن کثیر) اس آیت کے نزول کا مشہور واقعہ جمہور مفسرین کے نزدیک یہی حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کے نکاح کا قصہ ہے (ابن کثیرؒ، قرطبیؒ، مظہریؒ)

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اسی طرح کے دو واقعے اور بھی نقل کئے ہیں۔ اُن میں بھی یہ مذکور ہے کہ آیت مذکورہ ان واقعات کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت جُلَیبیبؓ کا واقعہ ہے کہ ان کا رشتہ ایک انصاری صحابی کی لڑکی سے کرنا چاہا تو اس انصاری اور ان کے گھر والوں نے اس رشتہ اور نکاح سے انکار کر دیا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب راضی ہوگئے اور نکاح کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے وسعت رزق کی دُعا فرمائی۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ اللہ نے ان کے گھر میں ایسی برکت دی تھی کہ مدینہ طیبہ کے گھروں میں سب سے زیادہ اُجلا اور بڑا خرچ اس گھر کا تھا، بعد میں حضرت جُلَیبیبؓ ایک جہاد میں شہید ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجہیز و تکفین اپنے دستِ مبارک سے فرمائی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ روایاتِ حدیث میں اُمِّ کلثومؓ بنت عقبہ بن ابی معیط کا منقول ہے (ابن کثیر، قرطبی)، اور ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے متعدد واقعات ہی نزولِ آیت کا سبب بنے ہوں۔

نکاح میں نسبی کفوکی رعایت کا حکم اور درجہ

نکاح مذکور میں حضرت زینب بنتِ جحشؓ اور ان کے بھائی عبد اللہؓ نے جو زید بن حارثہؓ سے نکاح کو ابتداء میں نامنظور کیا تھا، اس کی وجہ ان دونوں میں خاندانی و نسبی کفاءت و مماثلت کا نہ ہونا تھا۔ اور یہ وجہ شرعاً خود مطلوب ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے کفو میں کرنا چاہئے (جس کی تحقیق آگے آئے گی) اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی کا عذر کیوں قبول نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ دینی اعتبار سے کفاءت و مماثلت زوجین کی تو لازم و ضروری ہے، کسی مسلمان لڑکی کا نکاح کسی کافر سے باجماعِ امت حلال نہیں، اگرچہ لڑکی اس پر راضی ہو۔ کیونکہ یہ صرف عورت کا حق نہیں جو اس کی رضامندی سے ساقط ہو جائے بلکہ حق اللہ اور فریضۂ الٰہیہ ہے بخلاف نسبی و مالی کفاءت کے کہ وہ لڑکی کا حق ہے، اور خاندانی کفاءت کے حق میں لڑکی کے ساتھ اس کے اولیاء بھی شریک ہیں۔ اگر عاقلہ بالغہ لڑکی مالدار خاندان سے ہونے کے باوجود کسی غریب فقیر سے نکاح پر راضی ہو کر اپنا حق ساقط کر دے تو اس کو اختیار ہے۔ اور خاندانی کفاءت میں لڑکی اور اس کے اولیاء سب اس حق کو کسی دوسری اہم مصلحت کی خاطر چھوڑ کر کسی ایسے شخص سے نکاح پر راضی ہو جائیں جو نسب اور خاندان کے اعتبار سے ان سے کم درجہ ہے تو ان کو اس کا

حق ہے۔ بلکہ مصالح دینیہ کے پیش نظر اس حق کو چھوڑ دینا محمود و مطلوب ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع میں اس حق کو نظر انداز کرنے اور مصالح دینیہ کی وجہ سے نکاح کر دینے کا مشورہ دیا۔

اور قرآن کریم کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق اپنی امت کے مرد و زن پر سب سے زیادہ ہے، بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق مؤمنین پر ان کے اپنے نفوس سے بھی زیادہ ہے"، اس لئے حضرت زینبؓ اور عبداللہؓ کے معاملہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نسبی کفاءت کے حق کو نظر انداز کر کے زید بن حارثہؓ سے نکاح منظور کر لینے کا حکم دیدیا تو ان کا فرض تھا کہ اس حکم کے سامنے اپنی رائے اور اپنے نفس کے حقوق کو ترک کر دیتے، اس لئے ان کے انکار پر قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہوا۔

رہا یہ معاملہ کہ جب نسبی کفاءت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابل رعایت ہے تو خود آپؐ نے اس کی رعایت کیوں نہ فرمائی؟ تو اس کا جواب بھی مذکورہ تقریر سے واضح ہو گیا کہ یہ رعایت دوسری دینی مصالح کے بالمقابل قابل ترک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں متعدد نکاح اسی طرح غیر کفو میں اسی قسم کی دینی مصالح کی بنا پر کئے گئے، اس سے اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مسئلہ کفاءت

نکاح ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اگر زوجین کی طبائع میں موافقت نہ ہو تو مقاصدِ نکاح میں خلل آتا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں خلل آتا ہے، باہمی جھگڑے نزاع پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے شریعت میں کفاءت یعنی باہمی مماثلت کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا آدمی اپنے سے کم خاندان والے آدمی کو رذیل یا ذلیل سمجھے۔ ذلت و عزت کا اصل مدار اسلام میں تقویٰ اور دینداری ہے، جس میں یہ چیز نہیں اس کو خاندانی شرافت کتنی بھی حاصل ہو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں، صرف انتظامی معاملات کو استوار رکھنے کیلئے نکاح میں کفاءت کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لڑکیوں کا نکاح ان کے اولیاء ہی کے ذریعہ ہونا چاہئے (یعنی بالغ لڑکی کو بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کرے، حیاء کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام اس کے والدین اور اولیاء

کریں، اور فرمایا کہ لڑکیوں کا نکاح اپنے کفو ہی میں کرنا چاہئے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، مگر صحابہ کرام کے آثار و اقوال سے اس کی تائید ہو کر حدیث قابل استدلال ہو جاتی ہے۔ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں یہ حکم جاری کر دوں گا کہ کسی بڑے اونچے معروف خاندان کی لڑکی کا نکاح دوسرے کم درجہ والے سے نہ کیا جائے۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت انسؓ نے بھی اس کی تاکید فرمائی کہ نکاح میں کفاءت کی رعایت کی جائے، جو متعدد اسانید سے منقول ہے۔ امام ابن ہمام نے بھی فتح القدیر میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نکاح میں کفاءت و مماثلت کی رعایت کرنا دین میں مطلوب ہے تاکہ زوجین میں موافقت رہے، لیکن کوئی دوسری اہم مصلحت اس کفاءت سے بڑھ کر سامنے آجائے تو عورت اور اس کے اولیاء کو اپنا یہ حق چھوڑ کر غیر کفو میں نکاح کر لینا بھی جائز ہے۔ خصوصاً جب کہ کوئی دینی مصلحت پیش نظر ہو تو ایسا کرنا افضل و بہتر ہے جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان واقعات سے اصل مسئلہ کفاءت کی نفی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

دوسرا واقعہ

حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ ہو گیا، مگر دونوں کی طبیعتوں میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زیدؓ ان کی تیز زبانی اور نسبی شرافت کی بنا پر اپنے کو اونچا سمجھنے اور اطاعت میں کوتاہی کرنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بتلا دیا گیا تھا کہ زیدؓ ان کو طلاق دیں گے، اس کے بعد زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ ایک روز حضرت زیدؓ نے یہی شکایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ ان کو طلاق دیدیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ منجانب اللہ یہ علم ہو گیا تھا کہ واقعہ یونہی پیش آنے والا ہے، کہ زیدؓ ان کو طلاق دیدیں گے، پھر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی، لیکن دو وجہ سے آپؐ نے حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکا۔ اول یہ کہ طلاق دینا اگرچہ شریعت اسلام میں جائز ہے مگر پسندیدہ نہیں بلکہ ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و مکروہ ہے، اور تکوینی طور پر کسی کام کا وقوع تشریعی حکم کو متاثر نہیں کرتا دوسرے قلب مبارک میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اگر انھوں نے طلاق دیدی اور پھر زینبؓ کا نکاح آپؐ سے ہوا تو عرب اپنے دستور جاہلیت کے مطابق یہ طعنے دیں گے کہ اپنے

بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اگرچہ قرآن نے اس دستورِ جاہلیت کو سورۂ احزاب کی ہی سابقہ آیات میں ختم کر دیا ہے، اس کے بعد کسی مؤمن کے لئے تو اس کے وسوسہ کا بھی خطرہ نہ تھا مگر کفار جو قرآن ہی کو نہیں مانتے وہ اپنی جاہلانہ رسم یعنی منہ بولے بیٹے کو تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کی بنا پر زبانِ طعن دراز کریں گے۔ یہ اندیشہ بھی حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے منع کرنے کا سبب بنا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے محبوبانہ عتاب قرآن کی ان آیات میں نازل ہوا: وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ، یعنی آپ اس وقت کو یاد کریں جبکہ آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا، مراد اس شخص سے حضرت زیدؓ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے پہلا انعام تو یہ فرمایا کہ ان کو مشرف باسلام کر دیا دوسرے آپ کی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپؐ نے ان پر ایک انعام تو یہ کیا کہ ان کو غلامی سے آزاد کر دیا، دوسرا یہ کہ اُن کی تربیت فرما کر ایسا بنا دیا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ آگے وہ قول نقل کیا جو آپؐ نے زیدؓ سے فرمایا أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ، یعنی اپنی بی بی کو آپ اپنے نکاح میں روکیں، طلاق نہ دیں، اور خدا سے ڈریں۔ خدا سے ڈرنے کا حکم اس جگہ اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ طلاق ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے اس سے اجتناب کریں، اور اس معنی سے بھی ہو سکتا ہے کہ نکاح میں روکنے کے بعد طبعی منافرت کی وجہ سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ آپ کا یہ فرمانا اپنی جگہ صحیح و درست تھا، مگر منجانب اللہ ہونے والے واقعہ کا علم ہو جانے اور دل میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا ارادہ پیدا ہو جانے کے بعد زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی نصیحت ایک طرح کی رسمی اظہار خیر خواہی کے درجہ میں تھی، جو شانِ رسالت کے مناسب نہ تھی، خصوصاً اس لئے کہ اس کے ساتھ لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ بھی شامل تھا اس لئے آیت مذکورہ میں عتاب ان الفاظ میں نازل ہوا کہ آپ دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ جب منجانب اللہ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کی خبر مل چکی، اور آپؐ کے دل میں ارادۂ نکاح پیدا ہو چکا تو اس ارادہ کو چھپا کر ایسی رسمی گفتگو جو آپؐ کی شان کے مناسب نہیں تھی کی۔ اور لوگوں کے طعنوں کے اندیشہ پر فرمایا کہ آپؐ لوگوں سے ڈرنے لگے، حالانکہ ڈرنا تو آپؐ کو اللہ ہی سے سزاوار ہے۔ یعنی جب آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والا ہے،

اس کی ناراضی کا اس میں کوئی خوف و خطر نہیں تو پھر محض لوگوں کے طعنوں سے گھبرا کر آپؐ کے لئے یہ گفتگو مناسب نہیں تھی۔

اس واقعہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، یہ سب تفسیر ابن کثیرؒ اور قرطبیؒ اور روح المعانی سے لی گئی ہے، اور آیت تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ کی یہ تفسیر کہ وہ چیز جس کو آپ نے دل میں چھپایا تھا وہ یہ ارادہ تھا کہ زیدؓ نے طلاق دیدی تو حکمِ الٰہی کے مطابق آپؐ ان سے نکاح کرلیں گے، یہ تفسیر حکیم ترمذی اور ابن ابی حاتم وغیرہ محدثین نے حضرت علی بن حسین زین العابدینؒ کی روایت سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

أَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى إِلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ زَيْنَبَ سَيُطَلِّقُهَا زَيْدٌ وَيَتَزَوَّجُهَا بَعْدَهٗ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ (روح از حکیم ترمذی)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دیدی تھی کہ حضرت زینبؓ کو زیدؓ طلاق دیدیں گے اور اس کے بعد وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔"

اور ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

إِنَّ اللّٰهَ أَعْلَمَ نَبِيَّهٗ أَنَّهَا سَتَكُوْنُ مِنْ أَزْوَاجِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّتَزَوَّجَهَا فَلَمَّا أَتَاهُ زَيْدٌ يَشْكُوْهَا إِلَيْهِ قَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَأَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ فَقَالَ أَخْبَرْتُكَ إِنِّيْ مُزَوِّجُكَهَا وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ،

"یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ حضرت زینبؓ بھی ازواج مطہرات میں داخل ہو جائیں گی، پھر جب حضرت زیدؓ ان کی شکایت لیکر آپ کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو بتلا دیا تھا کہ میں آپ کا نکاح کرادونگا اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپائے ہوئے تھے"

جمہور مفسرین زہری، بکر بن العلاء، قشیری، قاضی ابوبکر بن العربی نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ جس چیز کے دل میں چھپانے کا ذکر کیا گیا وہ بوحی الٰہی ارادۂ نکاح تھا، اس کے خلاف جن روایات میں مَا فِيْ نَفْسِكَ کی تفسیر محبت زینبؓ سے منقول ہے، اس کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ ہم نے ان روایات کو ذکر کرنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔

اور خود الفاظ قرآن سے تائید اسی تفسیر کی ہوتی ہے جو حضرت زین العابدینؒ کی

روایت سے اوپر بیان ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود بتلا دیا کہ دل میں چھپی ہوئی چیز وہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو اگلی آیت میں ظاہر فرمایا وہ نکاح ہے حضرت زینبؓ کے ساتھ جیسا کہ فرمایا زَوَّجْنٰكَهَا (روح)

لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا محمود ہے جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کا اخفاء کیوں فرمایا جو سبب عتاب بنا۔ جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل ضابطہ جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کی نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال و حرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہ محمود ہو۔ اس کی نظیر حدیث و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ زمانہ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کر دی گئی ہیں اول تو کچھ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دوسرے بناء ابراہیمی میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں دوسرا مغربی جانب میں، جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہل جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کر دیا اور مشرقی دروازہ جو سطح زمین سے متصل تھا اس کو اتنا اونچا کر دیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہو سکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ جس کو اجازت دیں صرف وہ اندر جا سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دیتا۔ یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کر دیا، اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عند اللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہو گیا، مگر یہ معاملہ بیت اللہ کو بناء ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو یا جس سے احکام حلال و حرام متعلق ہوں۔

بخلاف واقعۂ نکاح زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے۔ کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو۔ حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا۔ اس تقریر سے بنا بر خشیت اللہ کے ترک اور نکاح زینبؓ پر بارشاد خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قولی تبلیغ جو سورۂ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم و ارادہ کے اس کو چھپایا۔ اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا، یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے، کہ منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کر سکیں۔

اور زَوَّجْنٰكَهَا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا نکاح آپؐ سے کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو یہ امتیاز بخشا کہ خود ہی نکاح کر دیا جو عام شرائط نکاح سے مستثنیٰ رہا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ہم نے اس نکاح کا حکم دیدیا اب آپؐ شرعی قواعد و شرائط کے مطابق ان سے نکاح کر لیں۔ حضرات مفسرین میں بعض نے پہلے احتمال کو ترجیح دی، بعض نے دوسرے احتمال کو۔

اور حضرت زینبؓ کا دوسری عورتوں کے سامنے یہ فرمانا کہ تمھارا نکاح تو تمھارے والدین نے کیا میرا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کیا، جیسا کہ روایات میں آیا ہے، یہ دونوں صورتوں میں صادق ہے۔ پہلی صورت میں زیادہ واضح ہے اور دوسری صورت ... بھی اس کے منافی نہیں۔

شبہات و اعتراضات کے جواب کی تمہید

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا، یہ تمہید ہے اس نکاح پر پیش آنے والے شکوک و شبہات کی کہ دوسری ازواج کے ہوتے ہوئے اس نکاح کا اہتمام کس لئے کیا گیا۔ ارشاد فرمایا کہ یہ سنت ہے اللہ کی جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، آپؐ سے پہلے انبیاء میں بھی جاری رہی ہے، کہ بمصالح دینیہ بہت سی عورتوں سے نکاح کی اجازت

دی گئی، جن میں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زیادہ معروف ہیں کہ داؤد علیہ السلام کے نکاح میں سو اور سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں تین سو بیبیاں تھیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دینی مصالح سے متعدد نکاح کی اجازت ہوئی اور یہ نکاح بھی ان میں شامل ہے تو کوئی وجہ استبعاد نہیں، نہ یہ شانِ نبوت و رسالت کے منافی ہے نہ زہد و تقویٰ کے۔ آخری جملے میں یہ بھی فرما دیا کہ نکاح کا معاملہ بھی عام رزق کی طرح منجانب اللہ طے شدہ ہے کہ کس کا نکاح کس سے ہوگا، تقدیر ازلی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس قصہ میں حضرت زیدؓ اور زینبؓ کے درمیان اختلاف طبائع اور زیدؓ کی ناراضی پھر طلاق دینے کا عزم یہ سب اسی تکوینی اور تقدیری امر کی کڑیاں تھیں۔

آگے ان انبیاء علیہم السلام کی خاص صفت کا ذکر ہے جن کے لئے پچھلے زمانے میں متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت اوپر معلوم ہوئی ہے، فرمایا اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ یعنی یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سبھی اللہ تعالیٰ کے پیغامات اپنی اپنی امتوں کو پہونچاتے ہیں۔

ایک حکمت

شاید اس میں انبیاء علیہم السلام کی کثرتِ ازدواج کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان کے تمام اعمال و اقوال امت کو پہونچانا ضروری ہیں، اور مردوں کا ایک بڑا حصہ وقت کا اپنے زنانے مکان میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گزرتا ہے، اس وقت میں جو کوئی وحی نازل ہو یا خود پیغمبر کوئی حکم صادر فرما دیں یا کوئی عمل کریں، یہ سب امت کی امانت ہے جس کو ازواج ہی کے ذریعہ سے بآسانی امت تک پہونچایا جا سکتا ہے۔ دوسری صورتیں مشکلات سے خالی نہیں، اس لئے انبیاء کے لئے اگر بیبیاں زیادہ ہوں تو ان کی خانگی زندگی کے افعال و اقوال اور ان کی خانگی سیرت عام امت تک پہونچنا سہل ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

دوسری صفت انبیاء علیہم السلام کی یہ بیان کی گئی کہ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ، یعنی یہ حضرات اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مصالح دینیہ اگر ان کو کسی کام کی عمل تبلیغ کا مامور کیا جاتا ہے وہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اگرچہ کچھ لوگ اس پر طعنہ کریں تو اس سے نہیں ڈرتے۔

ایک اشکال اور جواب

یہاں جبکہ تمام زمرۂ انبیاء کا یہ حال بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو اس سے پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ تَخْشَی النَّاسَ (یعنی آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں)

یہ کس طرح درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں انبیاء کا غیر اللہ سے نہ ڈرنا تبلیغ رسالت کے معاملے میں بیان ہوا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ رسالت سے اس کا تعلق نہ تھا، پھر جب آیت مذکورہ سے آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ نکاح بھی عملی تبلیغ رسالت کا ایک جزء ہے تو اس کے بعد آپ کو بھی کسی کا خوفِ طعن و تشنیع مانعِ عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں دیا گیا، اگرچہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ

محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا

وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

اور مہر سب نبیوں پر اور ہے اللہ سب چیزوں کا جاننے والا

ع ۵ ۲

خلاصۂ تفسیر

پہلی آیت میں نکاح زینبؓ کا تبلیغ عملی ہونے اور سنتِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے محمود ہونا بتلایا گیا تھا، آگے ان معترضین کا جواب ہے جو اس نکاح کو مذموم سمجھ کر طعنہ زنی کرتے تھے، (یعنی) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علاقۂ اولاد نہیں رکھتے، جیسا کہ اس آیت میں عام صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا رِجَالِكُمْ یعنی تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں۔ اس میں نسبت عام لوگوں کی طرف کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت قطع کی گئی۔ اس لئے اپنے خاندان کے افراد میں سے کسی مرد کا باپ ہونا اس کے منافی نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ عام امت کے لوگوں کے ساتھ آپ کو ایسی اُبوّت حاصل نہیں جو کسی دلیل صحیح سے ان کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح حرام ہونے کا موجب ہو) لیکن (ہاں ایک دوسری قسم کی اُبوّت روحانی ضرور حاصل ہے، چنانچہ) اللہ کے رسول ہیں (اور ہر رسول روحانی مربی ہونے کی وجہ سے امت کا روحانی باپ ہوتا ہے) اور (اس اُبوّتِ روحانیہ میں اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے افضل و اکمل

ہیں، چنانچہ آپؐ) سب نبیوں کے ختم پر ہیں (اور جو نبی ایسا ہوگا وہ ابوتِ روحانیہ میں سب سے بڑھ کر ہوگا، کیونکہ آپؐ کی اُبوتِ روحانیہ کا سلسلہ قیامت تک چلے گا، جس کے نتیجہ میں آپؐ کی روحانی اولاد سب سے زیادہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ اُمت کے لئے آپؐ کی اُبوت جسمانی اور نسبی نہیں ہے، جس سے حرمتِ نکاح متعلق ہوتی ہے بلکہ اُبوتِ روحانی ہے، اس لئے متبنّیٰ بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کوئی قابلِ اعتراض نہیں، بلکہ اس روحانی اُبوت کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ آپؐ پر مکمل اعتماد و اعتقاد رکھیں، آپؐ کے کسی قول و فعل پر شک و شبہ نہ کریں) اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ یہ نکاح ناجائز تو نہیں تھا، لیکن اگر نہ ہوتا تو بہتر ہوتا تاکہ لوگوں کو اعتراض اور طعن کا موقع ہی نہ ملتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز (کے وجود یا عدم کی مصلحت) کو خوب جانتا ہے ؞

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ میں ان لوگوں کے خیال کا رد ہے جو اپنی رسم جاہلیت کے مطابق زیدؓ بن حارثہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہتے تھے، اور ان کی طلاق کے بعد حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح پر طعن کرتے تھے، کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا۔ اس کے رد کے لئے یہ کہدینا کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ کے باپ نہیں بلکہ زید کے باپ حارثہؓ ہیں، مگر اس میں مبالغہ اور تاکید کے لئے ارشاد فرمایا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ بھی نہیں، تو ایسے شخص پر جس کی اولاد میں کوئی بھی مرد نہ ہو یہ طعن دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، اور اس کی مطلقہ بیوی آپؐ کے بیٹے کی بیوی ہونے کی وجہ سے آپؐ پر حرام ہے۔

اس مضمون کے بیان کے لئے مختصر الفاظ یہ تھے کہ (اَبَآ اَحَدٍ مِّنْكُمْ) کہا جاتا، اس کے بجائے قرآن حکیم نے لفظ رِجَال کا اضافہ کرکے اس شبہ کو دور کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چار فرزندوں کے والد ہیں، تین فرزند حضرت خدیجہؓ سے قاسمؓ، طیبؓ، طاہرؓ ہیں، اور ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ابراہیمؓ، کیونکہ یہ سب بچپن ہی میں وفات پاگئے ہیں ان میں سے کوئی بھی رجال کی حد میں داخل نہیں ہوا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپؐ کا کوئی فرزند نہ تھا۔ قاسمؓ، طیبؓ اور طاہرؓ کی وفات ہوگئی تھی، اور ابراہیمؓ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

مخالفین کے اعتراض اور طعن کا جواب اسی جملہ سے ہوگیا تھا، مگر آگے دوسرے شبہات کے ازالہ کے لئے فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ، حرف لٰکِن عربی زبان میں اس کام کے لئے آتا ہے کہ پچھلے کلام میں جو کوئی شبہ ہو سکتا تھا اس کو دُور کیا جائے۔ یہاں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ آپ امت کے مردوں میں کسی کے باپ نہیں تو اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ہر نبی و رسول اپنی امت کا باپ ہوتا ہے، اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے سبھی مردوں کے بلکہ ہر مرد و عورت کے باپ ہیں آپ سے اُبوّت کی نفی گویا نبوت کی نفی ہے۔

اس کا جواب لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ کے لفظ سے یہ دیا گیا کہ حقیقی اور نسبی باپ ہونا اور چیز ہے جس پر نکاح کے حلال و حرام کے احکام عائد ہوتے ہیں اور بحیثیت نبوت امت کا روحانی باپ ہونا دوسری چیز ہے جس سے یہ احکام متعلق نہیں ہوتے، تو گویا مطلب اس پورے جملے کا یہ ہوگیا کہ آپ اُمت کے مردوں میں سے کسی کے بھی نسبی باپ نہیں، **لیکن رُوحانی باپ سب کے ہیں۔**

اس میں ایک دوسرے طعن کا جواب بھی ہوگیا، جو بعض مشرکین نے کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ابتر (یعنی مقطوع النسل) ہیں۔ یعنی کوئی نرینہ اولاد آپ کی نہیں ہے جس سے نسب چلے اور آپ کا پیغام آگے بڑھے، چند روز کے بعد ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ الفاظ مذکورہ نے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ نسبی اولاد نرینہ آپ کی نہیں لیکن آپ کی رسالت و نبوت کے پیغام کو پھیلانے اور قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے نسبی اولاد کی ضرورت نہیں، اس کے لئے روحانی اولاد کام کیا کرتی ہے۔ اور چونکہ آپ رسول اللہ ہیں، اور رسول امت کا روحانی باپ ہوتا ہے، اس لئے آپ پوری اُمت کے رُوحانی باپ ہونے کی حیثیت سے تم سب سے زیادہ کثیر الاولاد ہیں۔

یہاں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا ذکر آیا، اور اس منصب نبوت میں آپ تمام دوسرے انبیاء سے خاص امتیازی فضیلت رکھتے ہیں تو آگے آپ کی مخصوص شان، اور تمام انبیاء علیہم السلام پر آپ کا فائق ہونا اس لفظ سے واضح کیا گیا وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ لفظ خاتم میں دو قراءتیں ہیں، امام حسنؒ اور عاصمؒ کی قراءت خاتَم بفتح تاء ہے اور دوسرے ائمہ قراءت خاتِم بکسر تاء پڑھتے ہیں۔ حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے، کیونکہ خاتم خواہ بکسر التاء ہو یا بفتح التاء، دونوں کے معنی آخر کے بھی آتے ہیں، اور مُہر کے معنی میں بھی

خاتم النبیین نے یہ بھی بتلا دیا کہ آپؐ کے بعد قیامت تک آنے والی سب نسلیں اور قومیں آپ ہی کی امت میں شامل ہوں گی۔ اس وجہ سے آپؐ کی امت کی تعداد بھی دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی اور آپ کی روحانی اولاد دوسرے انبیاء کی نسبت سے بھی زیادہ ہوگی۔

صفت خاتم النبیین نے یہ بھی بتلا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اپنی اولاد روحانی یعنی پوری امت پر دوسرے تمام انبیاء سے زائد ہوگی، اور آپؐ قیامت تک پیش آنے والی ضروریات کو واضح کرنے کا پورا اہتمام فرمائیں گے۔ کیونکہ آپؐ کے بعد کوئی نبی اور کوئی وحی دنیا میں آنے والی نہیں۔ بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان کو اس کی فکر نہ تھی وہ جانتے تھے کہ جب قوم میں گمراہی پھیلے گی تو ہمارے بعد دوسرے انبیاء آ کر اس کی اصلاح کر دیں گے۔ مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر بھی تھی کہ قیامت تک امت کو جن حوادث سے سابقہ پڑے گا ان سب حالات کے متعلق ہدایات امت کو دے کر جائیں، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث شاہد ہیں کہ آپؐ کے بعد جتنے لوگ قابل اقتداء آنے والے تھے کثرت سے ان کے نام لے کر بتلا دیا ہے۔ اسی طرح جتنے گمراہی کے علمبردار ہیں ان کے حالات اور پتے ایسے کھول کر بتلا دیئے ہیں کہ ذرا غور کرنے والے کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِنِّیْ تَرَکْتُکُمْ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ بَیْضَآءَ لَیْلُھَا وَنَھَارُھَا سَوَآءٌ۔ یعنی میں نے تم کو ایسے روشن راستے پر چھوڑا ہے جس میں رات دن برابر ہیں کسی وقت بھی گمراہی کا خطرہ نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بصفت رسول آیا ہے، اس کے لئے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے "خاتم الرسل" یا "خاتم المرسلین" کا لفظ استعمال ہوتا، مگر قرآن حکیم نے اس کے بجائے "خاتم النبیین" کا لفظ اختیار فرمایا۔

وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ اصلاح خلق کے لئے مخاطب فرمائیں، اور اپنی وحی سے مشرف فرمائیں، خواہ اس کے لئے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں، یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے۔

اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لئے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب و شریعت

دی گئی ہو۔ اس طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہے، تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ انبیاء کے ختم کرنے والے اور سب سے آخر میں ہیں خواہ وہ صاحب شریعت نبی ہوں یا صرف پچھلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قسمیں شرع کے نزدیک ہو سکتی ہیں وہ سب آپ پر ختم ہوگئیں، آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا

فَهٰذِهِ الْاٰيَةُ فِيْ اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَاِذَا كَانَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ فَلَا رَسُوْلَ بِالطَّرِيْقِ الْاَوْلٰى وَالْاَحْرٰى لِاَنَّ مَقَامَ الرِّسَالَةِ اَخَصُّ مِنْ مَقَامِ النُّبُوَّةِ فَاِنَّ كُلَّ رَسُوْلٍ نَبِيٌّ وَلَا يَنْعَكِسُ بِذٰلِكَ وَرَدَتِ الْاَحَادِيْثُ الْمُتَوَاتِرَةُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَدِيْثِ جَمَاعَةٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ

"یعنی یہ آیت نص صریح ہے اس عقیدہ کے لئے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولیٰ رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام اور لفظ رسول خاص ہے، اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں جو صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں"

اس آیت کی تفسیری تشریح میں کسی قدر تفصیل سے اس لئے کام لیا گیا کہ ہمارے ملک میں مرزا قادیانی مدعی نبوت نے اس آیت کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر اس کی تفسیر میں طرح طرح کی تحریفات اور احتمالات پیدا کئے ہیں، مذکور الصدر تقریر سے الحمدللہ ان سب کا جواب ہو جاتا ہے۔

مسئلہ ختم نبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا اور آپ کا آخری پیغمبر ہونا، آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا اور ہر مدعی نبوت کا کاذب و کافر ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرام سے لے کر آج تک ہر دور کے مسلمانوں کا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے، لیکن قادیانی فرقہ نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے بڑا زور لگایا ہے، سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر کے کم علم لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے احقر نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل ایک مستقل کتاب "ختم نبوت" میں لکھ دی ہے، جس میں ایک سو آیات اور

دو سو سے زائد احادیث اور سینکڑوں اقوال و آثار سلف و خلف سے اس مسئلہ کو پورا واضح کر دیا ہے، اور قادیانی دجال کے شبہ کا مفصل جواب دیا ہے، یہاں اس میں سے چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں۔

آپ کا خاتم النبیین ہونا آخر زمانہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے منافی نہیں

چونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ قیامت سے پہلے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں تشریف لائیں گے، اور دجال اعظم کو قتل کریں گے، اور اس وقت ہر گمراہی کو ختم کریں گے جس کی تفصیل احقر کے رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" میں مذکور ہے۔

• قادیانی نے عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان میں اٹھایا جانا اور پھر آخر زمانے میں تشریف لانا جو قرآن و سنت کی بے شمار نصوص سے ثابت ہیں ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہوگا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی شخص عہدۂ نبوت پر فائز نہ ہوگا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے اُن کی نبوت سلب ہو جائے گی، یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آسکتا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو بھی آپ کی اُمت میں اصلاح و تبلیغ کے لئے آئے گا وہ اپنے منصب نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اس امت میں اصلاح کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کے تابع انجام دے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:-

والمراد بكونه عليه السلام خاتمهم انقطاع حدوث وصف النبوة في احد من الثقلين بعد تحليته عليه السلام بها في هذه النشأة ولا يقدح في ذلك ما اجمعت عليه الامة

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے یہ مراد ہے کہ وصف نبوت آپ کے بعد منقطع ہوگیا، اب کسی کو یہ وصف و منصب نہیں ملے گا، اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جس

واشتهرت فيه الاخبار وحدها بلغت مبلغ التواتر المعنوي ونطق به الكتاب على قول ووجب الايمان به واكفر منكره كالفلاسفة من نزول عيسى عليه السلام آخر الزمان لانه كان نبيا قبل تحلي نبينا صلى الله عليه وسلم بالنبوة في هذه النشاة

سنت کا مجموعہ ثابت اور قرآن سے بعض سب اور حدیث ایسی ہیں جو تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہوں گے کیونکہ ان کو نبوت اس دنیا میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مل چکی تھی۔

نبوت کے مفہوم کی تحریف ظلی اور بروزی نبوت کی ایجاد

اس مدعیٔ نبوت نے دعویٔ نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی جس کا قرآن و سنت میں کوئی وجود و ثبوت نہیں اور پھر کہا کہ یہ قسم نبوت کی ختم قرآنی ختم نبوت کے منافی نہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں معروف ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے جنم میں دوسرے کے روپ میں آسکتا ہے، اور پھر یہ کہ کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کی وجہ سے آپ کا ہم رنگ ہوگیا ہو اس کا آنا گویا خود آپ ہی کا آنا ہے، وہ درحقیقت آپ ہی کا ظل اور بروز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دعوے سے عقیدۂ ختم نبوت متاثر نہیں ہوتا۔

مگر اول تو خود یہ نوایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلامیہ کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا واضح کردیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی۔ اس جواب کی پوری تفصیل تو احقر کی کتاب ختم نبوت ہی میں دیکھی جاسکتی ہے، یہاں چند چیزیں بقدر ضرورت پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں تمام کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً

”میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے

فاحسنه واجمله الا موضع لبنة من زاوية فجعل الناس يطوفون به ويعجبون له ويقولون هلّا وضعت هذه اللبنة وانا خاتم النبيين، رواه احمد والنسائی والترمذی وفی بعض الفاظه فکنت انا سددت موضع اللبنة وختم بی البنیان

ایک مکان بنایا ہو اور اس کو خوب مضبوط اور مزین کیا ہو مگر اس کے ایک گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے اس میں چلیں پھریں اور تعمیر کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل مکمل ہو جاتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قصر نبوت کی وہ آخری اینٹ میں ہوں، اور بعض الفاظ حدیث میں ہے کہ میں نے اس خالی جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کو مکمل کر دیا۔

اس تمثیل بلیغ کا حاصل یہ ہے کہ نبوت ایک عالی شان محل کی طرح ہے، جس کے ارکان انبیاء علیہم السلام ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ محل بالکل تیار ہو چکا تھا اور اس میں صرف ایک اینٹ کے سوا کسی اور قسم کی گنجائش تعمیر میں باقی نہیں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پُر کر کے قصر نبوت کی تکمیل فرما دی، اب اس میں نہ کسی نبوت کی گنجائش ہے نہ رسالت کی، اگر نبوت یا رسالت کی کچھ اقسام مان لی جائیں تو اب ان میں سے کسی قسم کی گنجائش قصر نبوت میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء كلما هلك نبی خلفه نبی وانه لا نبی بعدی وسيكون خلفاء فيكثرون الحديث

"بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا، جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا تھا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے خلیفہ ہوں گے جو بہت ہوں گے"

اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، تو اُمت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟

اس کے متعلق فرمایا کہ آپؐ کے بعد امت کی تعلیم و ہدایت کا انتظام آپؐ کے خلفاء کے ذریعے سے ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصد نبوت کو پورا کریں گے۔ اگر ظلی بروزی کوئی نبوت کی قسم ہوتی یا غیر تشریعی نبوت باقی ہوتی، تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوت ختم ہو چکی مگر فلاں قسم کی نبوت باقی ہے جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔

اس حدیث میں صاف واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ نبوت کی کوئی قسم آپؐ کے بعد باقی نہیں، اور ہدایت خلق کا کام جو پچھلی اُمتوں میں انبیاء بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا، وہ اس اُمت میں آپؐ کے خلفاء سے لیا جائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث مرفوع ہے:

لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ،

"یعنی نبوت میں سے کچھ باقی نہیں، بجز مبشرات کے"

مسند احمد وغیرہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ اور ام کرز کعبیہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا يبقى بعدي من النبوة شيء الا المبشرات قالوا يا رسول الله وما المبشرات قال الرؤيا الصالحة يراها المسلم او ترى له (ذہبی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے کذا فی کنز)

"میرے بعد نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا بجز مبشرات کے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ مبشرات کیا چیز ہے، فرمایا سچے خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے متعلق کوئی دوسرا دیکھے"

اس حدیث نے کس قدر وضاحت سے بتلا دیا کہ نبوت کی کوئی قسم تشریعی یا غیر تشریعی اور بقول مرزا قادیانی ظلی یا بروزی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں، صرف مبشرات یعنی سچے خواب لوگوں کو آئیں گے جن سے کچھ معلومات ہو جائیں گی۔

اور مسند احمد اور ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدي ولا نبي. رواه الترمذي و

"بیشک رسالت اور نبوت میرے بعد منقطع ہو چکی ہے، میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی"

(وقال هذا حديث صحيح)

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر تشریعی نبوت بھی آپ کے بعد باقی نہیں، اور ظلی بروزی تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔

اس جگہ مسئلہ ختم نبوت کی احادیث جمع کرنا مقصود نہیں، وہ تو دو سو سے زیادہ رسالہ ختم نبوت میں جمع کر دی گئی ہیں، صرف چند احادیث سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ مرزائی قادیانی نے جو اقسام نبوت کے ظلی اور بروزی کا عنوان ایجاد کیا ہے، اول تو اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں، اور بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیث مذکورہ نے واضح طور پر یہ بتلا دیا کہ آپ کے بعد نبوت کی کوئی قسم کسی طرح کی باقی نہیں ہے۔

اسی لئے صحابہ کرام سے لے کر آج تک امت مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا، جو دعویٰ کرے وہ کذاب، منکر قرآن اور کافر ہے۔ اور صحابہ کرام کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رو سے مسیلمہ کذاب مدعی نبوت سے خلیفہ اول صدیق اکبر کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا۔

ائمہ سلف اور علماء امت کے اقوال و تصریحات بھی اس معاملہ میں رسالہ "ختم نبوت" کے تیسرے حصہ میں بڑی تفصیل سے لکھ دیئے گئے ہیں، اس جگہ چند کلمات نقل کئے جاتے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے:

اخبر الله تعالیٰ فی کتابه و رسول الله صلی الله علیه وسلم فی السنة المتواترة عنه انه لا نبی بعده لیعلموا ان کل من ادعی هذا المقام بعده فهو کذاب افاك دجال ضال مضل ولو تحرق وشعبذ واتی بانواع السحر والطلاسم والنیرنجیات فکلها محال وضلال عند

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث متواترہ میں خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ آپ کے بعد جو شخص اس مقام نبوت کا دعویٰ کرے وہ کذاب، مفتری، دجال، گمراہ، گمراہ کرنے والا ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی شعبدہ بازی کرے اور قسم قسم کے جادو اور طلسم اور نیرنگیاں دکھلائے کہ سب محال اور

اولی الالباب کما اجری اللہ، سبحانہ علی ید الاسود العنسی بالیمن ومسیلمۃ الکذاب بالیمامۃ من الاحوال الفاسدۃ والاقوال الباردۃ ما علم کل ذی لب وفہم وحجی انہما کاذبان ضالان لعنہما اللہ تعالیٰ وکذلک کل مدع لذلک الی یوم القیمۃ حتی یختموا بالمسیح الدجال

(ابن کثیر)

ور گذری ہیں عقل والوں کے نزدیک جیسا کہ حق تعالیٰ نے اسود عنسی (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمن میں اور مسیلمہ کذاب (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمامہ میں اس طرح کے حالاتِ فاسدہ اور بیہودہ اقوال ظاہر کرائے، جن کو دیکھ کر ہر عقل وفہم والے نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں کاذب اور گمراہ ہیں، اللہ ان پر لعنت فرمائے، اسی طرح جو شخص بھی قیامت تک نبوت کا دعویٰ کرے وہ کاذب وکافر ہے، یہاں تک کہ مدعیانِ نبوت کا یہ سلسلہ مسیح دجال پر ختم ہوگا۔

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں آیتِ مذکورہ کی تفسیر اور عقیدۂ ختم نبوت کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:-

اِنَّ الْاُمَّۃَ فَہِمَتْ بِالْاِجْمَاعِ مِنْ ہٰذَا اللَّفْظِ وَمِنْ قَرَائِنِ اَحْوَالِہٖ اَنَّہٗ فَہِمَ عَدَمَ نَبِیٍّ بَعْدَہٗ اَبَدًا وَعَدَمَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَبَدًا وَاَنَّہٗ لَیْسَ فِیْہِ تَاْوِیْلٌ وَلَا تَخْصِیْصٌ۔

(الاقتصاد طبع مصر ص ...)

"بیشک امت نے اس لفظ (یعنی خاتم النبیین ولا نبی بعدی) سے اور قرائنِ احوال سے باجماع یہی سمجھا ہے کہ آپؐ کے بعد ابد تک نہ کوئی نبی ہوگا، اور نہ کوئی رسول، اور یہ کہ نہ اس میں کوئی تاویل چل سکتی ہے نہ تخصیص۔"

اور قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب شفا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والے کو کافر، کذاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والا اور آیتِ مذکورہ کا منکر کہہ کر یہ الفاظ لکھے ہیں:-

واجمعت الامۃ علی حمل ہذا الکلام علی ظاہرہ وان مفہومہ المراد بہ دون تاویل ولا

"امت نے اجماع کیا ہے کہ اس کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور یہ کہ اس آیت کا نفس مفہوم ہی مراد ہے

تخصیص فلا شك فی كفر هؤلاء الطوائف كلها قطعًا اجماعًا وسمعًا	(بغیر کسی تاویل یا تخصیص کے اس لئے ان تمام فرقوں کے کفر میں کوئی شک نہیں (جو کسی مدعی نبوت کی پیروی کریں)

ان کا کفر قطعی طور سے جمع امت و نقل بھی کتاب و سنت سے ثابت ہے۔"

رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصہ میں ائمہ دین اور ہر طبقے کے اکابر علماء کے بہت سے اقوال جمع کر دیئے گئے ہیں، اور جو یہاں نقل کئے گئے ہیں ایک مسلمان کے لئے وہ بھی کافی ہیں واللہ اعلم

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ

اے ایمان والو یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد، اور اس کی پاکی بولتے رہو

بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ ٱلَّذِى يُصَلِّى عَلَيْكُمْ وَمَلَٰٓئِكَتُهُۥ

صبح اور شام۔ وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے

لِيُخْرِجَكُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ ۚ وَكَانَ بِٱلْمُؤْمِنِينَ

تاکہ نکالے تم کو اندھیروں سے اُجالے میں، اور ہے ایمان والوں پر

رَحِيمًا ﴿٤٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُۥ سَلَٰمٌ ۚ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا

مہربان۔ دعا ان کی جس دن اس سے ملیں گے سلام ہے، اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے

كَرِيمًا ﴿٤٤﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا

ثواب عزت کا۔ اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا اور خوشخبری سنانے والا

وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿٤٦﴾

اور ڈرانے والا، اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ

وَبَشِّرِ ٱلْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ

اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو کہ ان کے لئے ہے اللہ کی طرف سے بڑی بزرگی، اور کہا مت مان

ٱلْكَٰفِرِينَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَدَعْ أَذَىٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ﴿٤٨﴾

منکروں کا اور دغابازوں کا اور چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ بس ہے کام بنانے والا

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم (احسانات الٰہیہ کو عموماً اور ایسے اکمل رسل کی بعثت کے احسان کو خصوصاً یاد کر کے اس کا یہ شکر ادا کرو کہ) اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو (اس میں سب طاعات آ گئیں) اور (اس ذکر و طاعت پر دوام رکھو یعنی) صبح و شام (یعنی علی الدوام) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے رہو (یعنی دل سے بھی اور اعضاء سے بھی، اور زبان سے بھی پس جملہ اُولیٰ سے عموم اعمال و طاعات کا اور جملہ ثانیہ میں عموم ازمنہ و اوقات کا حاصل ہو گیا یعنی نہ تو ایسا کرو کہ کوئی حکم بجا لائے اور کوئی نہ بجا لائے، اور نہ ایسا کرو کہ کسی دن کوئی کام کر لیا کسی دن نہ کیا، اور جیسے اس نے تم پر بہت احسان کئے ہیں اور آئندہ بھی کرتا رہتا ہے پس بالضرورۃ مستحق ذکر و شکر ہے، چنانچہ) وہ ایسا (رحیم) ہے کہ وہ (خود بھی) اور (اس کے حکم سے) اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں (اس کا رحمت بھیجنا تو رحمت کرنا ہے اور فرشتوں کا رحمت بھیجنا رحمت کی دعا کرنا ہے کما قال اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ والی قولہ) وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ، اور یہ رحمت بھیجنا اس لئے ہے) تا کہ حق تعالیٰ (ببرکت اس رحمت کے) تم کو (جہالت و ضلالت کی) تاریکیوں سے (علم اور ہدایت کے) نور کی طرف لے آئے (یعنی خدائی رحمت اور دعاء ملائکہ کی برکت ہے کہ تم کو علم اور ہدایت کی توفیق اور اس پر ثبات حاصل ہے کہ یہ ہر وقت متجدد ہوتی رہتی ہے) اور (اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ مؤمنین پر بہت مہربان ہے (اور یہ رحمت تو مؤمنین کے حال پر دنیا میں ہے اور آخرت میں بھی وہ موردِ رحمت ہوں گے، چنانچہ) وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ (اللہ تعالیٰ خود ان سے ارشاد فرمائے گا) اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ (کہ اولاً خود سلام ہی علامت اعزاز کی ہے، پھر جب کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہو کما قال سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اہل جنت سے فرمائے گا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ رواہ ابن ماجہ وغیرہ اور یہ سلام تو روحانی انعام ہے جس کا حاصل اکرام ہے) اور (آگے جسمانی انعام کی خبر بعنوانِ عام ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے اُن (مؤمنین کے لئے) عمدہ صلہ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے (کہ ان کے جانے کی دیر ہے، یہ گئے اور وہ ملا، آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ) اے نبی (آپ مٹھی بھر چند معترضین کے طعن سے مغموم نہ ہوں، اگر یہ سفہاء آپ کو نہ جانیں تو کیا ہوا ہم نے تو ان بڑی بڑی

نعمتوں اور رحمتوں کو جو کہ حضرات مؤمنین میں مذکور ہوئی ہیں، آپ ہی کو واسطہ بنایا ہے) اور آپ
کے مخالفین کی سزا کے لئے خود آپ کا بیان کافی قرار دیا گیا ہے کہ اُن کے مقابلہ میں آپ سے
ثبوت نہ لیا جائے گا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ ہمارے نزدیک کس درجہ محبوب و مقبول
ہیں یعنی) ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ (قیامت کے
روز امت کے متعلق) گواہ ہوں گے کہ اگر وہ منکر ہوں گے تو آپ کے بیان کے موافق اُن کا فیصلہ
ہوگا کما قال إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ اور ظاہر ہے کہ خود صاحب معاملہ کو
دوسرے فریق کے معاملہ کے مقابلہ میں گواہ قرار دینا اعلیٰ درجہ کا اکرام اور علامت ترجیح دینا (عزت)
کے روز ظہور ہوگا) اور دنیا میں جو آپ کی صفاتِ کمال ظاہر ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ (مومنین
کو) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کو) ڈرانے والے ہیں اور (عام طور پر سب کو
اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں (اور یہ تبشیر و انذار و دعوت تبلیغاً ہی
اور یوں خود اپنی ذات و صفات و کمالات و عبادات و عادات وغیرہ مجموعی حالات
کے اعتبار سے) آپ (سراپا نمونہ ہدایت ہونے میں بمنزلہ) ایک روشن چراغ (کے) ہیں
(کہ آپ کی ہر حالت طالبانِ انوار کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے، پس قیامت میں ان مؤمنین
پر جو کچھ رحمت ہوگی وہ آپ ہی کی ان صفات بشیر و نذیر و داعی و سراج منیر کے واسطے
ہی سے) پس آپ اس غم و پریشانی کو الگ کیجئے) اور اپنے منصبی کام میں لگئے یعنی) مؤمنین
کو بشارت دیجئے کہ ان پر اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہونے والا ہے اور (اسی طرح
کافروں اور منافقوں کو ڈراتے رہئے جس کو ایک خاص عنوان سے تعبیر کیا ہے وہ یہ کہ)
کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ کیجئے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تو امکان
ہی نہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کے کہنے سے تبلیغ و دعوت چھوڑ دیں، لیکن لوگوں کی
طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے ممکن تھا کہ آپ اس عمل تبلیغ میں جو نکاح زینب کے
ذریعہ مقصود تھی کوئی سستی کریں اس کو کفار کا کہنا ماننے سے تعبیر کر دیا گیا) اور ان
(کافروں اور منافقوں) کی طرف سے جو کوئی) ایذا پہونچے (جیسا اس نکاح میں کہ تبلیغ
فعلی ہے ایذا قولی پہونچی) اس کا خیال نہ کیجئے اور (فعلی ایذا کا بھی اندیشہ نہ کیجئے،
اور اگر اس کا وسوسہ آئے تو) اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کافی کارساز ہے،
(وہ آپ کو ہر ضرر سے بچائے گا اور اگر تبلیغ میں کوئی ظاہری ضرر پہونچتا ہے وہ باطنی
نفع ہوتا ہے، وہ وعدۂ کفایت و وکالت کے منافی نہیں)۔

مقابلہ ہو تم اُن کی گردنیں مارو وہ تمہاری، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کونسی چیز اور کونسا عمل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذِکْرُ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ "یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد (ابن کثیر)

نیز امام احمدؒ اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دعا سُنی ہے جس کو میں کبھی نہیں چھوڑتا، وہ یہ ہے :

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اُعْظِمُ شُکْرَکَ وَاَتَّبِعُ نَصِیْحَتَکَ وَاُکْثِرُ ذِکْرَکَ وَاَحْفَظُ وَصِیَّتَکَ (ابن کثیر)	"یا اللہ مجھے ایسا بنا دے کہ میں تیرا شکر بہت کروں اور تیری نصیحت کا تابع رہوں اور تیرا ذکر کثرت سے کیا کروں اور تیری وصیت کو محفوظ رکھوں"۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کی کہ ذکر اللہ کی کثرت کی توفیق عطا ہو۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اسلام کے اعمال فرائض و واجبات تو بہت ہیں آپ مجھے کوئی ایسی مختصر جامع بات بتلا دیں کہ میں اس کو مضبوطی سے اختیار کروں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی (مسند احمد ابن کثیر)	"یعنی تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رہنی چاہیے"۔

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اُذْکُرُوا اللّٰہَ تَعَالٰی حَتّٰی یَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ (ابن کثیر بسند احمد)	"یعنی تم اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ دیکھنے والے تمہیں دیوانہ کہنے لگیں"۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں جس میں اللہ کا ذکر نہ آئے تو قیامت کے روز یہ مجلس ان کے لئے حسرت ثابت ہوگی۔ (رواہ احمد ابن کثیر)

وَسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا، یعنی اللہ کی پاکی بیان کرو صبح و شام۔ صبح و شام سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں، یا پھر صبح و شام کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان اوقات

میں ذکر اللہ کی تاکید بھی زیادہ ہے اور برکت بھی۔ ورنہ ذکر اللہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ، یعنی جب تم ذکر اللہ کی کثرت کے عادی ہوگئے اور صبح و شام کی تسبیح پر مداومت کرنے لگے تو اس کا اعزاز و اکرام اللہ کے نزدیک یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے گا اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعاء کریں گے۔

آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور فرشتوں کے لئے بھی، لیکن مصداق صلوٰۃ کا الگ الگ ہے۔ اللہ کی صلوٰۃ تو یہ ہے کہ وہ رحمت نازل فرمائے، اور فرشتے خود تو کسی کام پر قادر نہیں ان کی صلوٰۃ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نزولِ رحمت کی دعاء مانگیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صلوٰۃ اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے استغفار یعنی دعاءِ مغفرت، اور باہم ایک دوسرے کی طرف سے دعاء، لفظ صلوٰۃ ان تینوں معنی کے لئے شامل ہے جو عموم مشترک جائز قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ لفظ معنی میں مشترک ہے، اور تینوں مراد ہیں جو عموم مشترک کو قواعد عربیہ کی رو سے جائز نہیں سمجھتے وہ بطور عموم مجاز کے ان سب معنوں پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق قرار دیں گے۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ، یہ اسی صلوٰۃ کی توضیح و تفسیر ہے جو اللہ کی طرف سے مؤمن بندوں پر ہوتی ہے، یعنی جس روز یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اس کی طرف سے ان کا اعزازی خطاب سلام سے کیا جائے گا یعنی اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہا جائے گا۔ اللہ سے ملنے کا دن کونسا ہوگا؟ امام راغب وغیرہ نے فرمایا کہ مراد اس سے روزِ قیامت ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ جنت میں داخلہ کا وقت مراد ہے، جہاں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام پہونچے گا اور سب فرشتے بھی سلام کریں گے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اللہ سے ملنے کا دن موت کا دن قرار دیا ہے کہ وہ دن سارے عالم سے چھوٹ کر صرف ایک اللہ کے سامنے حاضری کا دن ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ملک الموت جب کسی مؤمن کی روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو اول اس کو یہ پیام پہونچاتا ہے کہ تیرے رب نے تجھے سلام کہا ہے۔

اور لفظ بقدرِ تینوں حالات پر صادق ہے اس لئے ان اقوال میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام تینوں حالات میں ہوتا ہو۔ (روح المعانی)

مسئلہ: اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے باہم ایک دوسرے کا تحیہ لفظ السلام علیکم ہونا چاہئے خواہ بڑے کی طرف سے چھوٹے کے لئے ہو یا چھوٹے کی طرف سے بڑے کے لئے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات | يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ پھر عود ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفاتِ کمال اور مناقب کی طرف، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر۔ شاہد سے مراد یہ ہے کہ آپ قیامت کے روز امت کے لئے شہادت دیں گے جیسا کہ صحیح بخاری، نسائی، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی جس کے بعض الفاظ یہ ہیں کہ قیامت کے روز نوح علیہ السلام پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ نے ہمارا پیغام اپنی امت کو پہنچا دیا تھا وہ عرض کریں گے کہ ہاں پہنچا دیا، پھر ان کی امت پیش ہوگی، وہ اس سے انکار کرے گی کہ ان کو اللہ کا کوئی پیغام پہنچا ہو۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ آپ جو پیغام پہنچانے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر کوئی آپ کا شاہد بھی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت گواہ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ اس وقت امت محمدیہ کو پیش کریں گے، یہ امت ان کے حق میں گواہی دے گی، تو امت نوح علیہ السلام ان پر یہ جرح کرے گی کہ یہ ہمارے معاملہ میں کیسے گواہ ہو سکتے ہیں، یہ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ہمارے زمانے سے بہت طویل زمانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اس جرح کا جواب امت محمدیہ سے پوچھا جائے گا، وہ یہ جواب دے گی کہ بیشک ہم اس وقت موجود نہیں تھے مگر ہم نے اس کی خبر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی جس پر ہمارا ایمان و اعتقاد ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی امت کے اس قول کی تصدیق کے لئے شہادت لی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت کے ذریعہ اپنی امت کی تصدیق و توثیق فرمائیں گے کہ بیشک میں نے ان کو یہ اطلاع دی تھی۔

اور امت پر شاہد ہونے کا ایک مفہوم عام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وہ ادا کر دے اور دیا ہوا واپس نہ لے، زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صفات کمال اور آپ کی خصوصی شان کا ذکر تھا، آگے بھی آپ کی ان خصوصیات کا ذکر آنے والا ہے، جو نکاح و طلاق کے معاملات میں آپ کے ساتھ ایک گونہ خصوصیت رکھتی ہیں، اور عام امت کی نسبت آپ کو ان میں ایک امتیاز خاص ہے اس سے پہلے بطور تمہید کے ایک عام حکم متعلقہ طلاق ذکر کیا گیا ہے، جو سب مسلمانوں کے لئے عام ہے۔

آیت مذکورہ میں اس کے متعلق تین احکام بیان کئے گئے ہیں:۔

پہلا حکم: یہ کہ کسی عورت سے نکاح کر لینے کے بعد خلوت صحیحہ سے پہلے ہی کسی وجہ سے طلاق کی نوبت آجائے، تو مطلقہ عورت پر کوئی عدت واجب نہیں، وہ فوراً ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ آیت مذکورہ میں ہاتھ لگانے سے مراد صحبت اور صحبت کا حقیقی یا حکمی ہونا، اور دونوں کا ایک حکم ہونا خلاصہ تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اور صحبت حکمی خلوت صحیحہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا حکم: یہ کہ مطلقہ عورت کو شرافت اور حسن خلق کے ساتھ کچھ سامان دے کر رخصت کیا جائے، کچھ سامان دے کر رخصت دینا ہر مطلقہ کے لئے مستحب و مسنون ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہے جس کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے اور سورۂ بقرہ کی آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ کے تحت میں گذر چکی ہے، اور ان الفاظ قرآن میں لفظ متاع اختیار فرمانا شاید اس حکمت سے ہو کہ یہ لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، ہر اس چیز کے لئے جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس میں عورت کے حقوق واجبہ مہر وغیرہ بھی شامل ہیں کہ اگر اب تک مہر نہ دیا گیا ہو تو طلاق کے وقت خوش دلی سے ادا کر دیں، اور غیر واجب حقوق مثلاً مطلقہ کو رخصت کے وقت کپڑوں کا ایک جوڑا دے کر رخصت کرنا یہ بھی داخل ہے جو ہر مطلقہ عورت کو دینا مستحب ہے (کذا فی البحر المحیط، روح) اس لحاظ سے .... مَتِّعُوهُنَّ کا صیغہ امر، ترغیب کے لئے ہے جس میں واجب اور غیر واجب دونوں قسمیں شامل ہیں (روح)

امام حدیث عبد بن حمیدؒ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ متعہ یعنی متاع

سامان دینا ہر مطلقہ کے لئے ہے خواہ اس کے ساتھ خلوت صحیحہ ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور اس کا مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔

طلاق کے وقت متعہ یعنی لباس کی تفصیل بدائع میں ہے کہ متعہ طلاق سے مراد وہ لباس ہے جو عورت گھر سے نکلنے کے وقت عادۃً استعمال کرتی ہے۔ اس میں پاجامہ، کرتہ، اوڑھنی اور ایک بڑی چادر جو سر سے پاؤں تک بدن کو چھپا سکے شامل ہے۔ اور چونکہ لباس قیمت کے اعتبار سے اعلیٰ، ادنیٰ، اوسط ہر طرح کا ہو سکتا ہے اس لئے فقہاء نے اس کی یہ تفصیل فرمائی کہ اگر شوہر بیوی دونوں مالدار گھرانوں کے ہیں تو کپڑے اعلیٰ قسم کے دیئے جائیں، اور دونوں غریب ہیں تو کپڑے ادنیٰ درجہ کے دیئے جائیں، اور ایک غریب دوسرا مالدار ہے تو اوسط درجہ کا لباس دیا جاتا ہے۔ (کذا فی احکام الجصاص فی النفقات)

اسلام میں حسن معاشرت کی بے نظیر تعلیم دنیا میں حقوق کی ادائیگی عام طور پر صرف دوستوں عزیزوں تک اور زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک محدود رہتی ہے، حسن اخلاق حسن معاشرت کا سلسلہ صرف یہیں تک خرچ ہوتا ہے، اپنے مخالف اور دشمن کے بھی حقوق پہچاننا، اس کے لئے قوانین وضع کرنا صرف شریعت اسلام ہی کا کام ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ حقوق انسانیت کی حفاظت کیلئے دنیا میں بہت سے مستقل ادارے قائم کئے گئے ہیں، اور اس کے لئے کچھ ضابطے قاعدے بھی بنائے ہوئے ہیں، اس مقصد کے لئے اقوام عالم سے لاکھوں روپیہ کا سرمایہ بھی جمع کیا جاتا ہے، مگر ان تمام اداروں پر سیاسی مقاصد چھائے ہوئے ہیں، جو کچھ مصیبت زدگان کی امداد کی جاتی ہے وہ بھی بے غرض اور ہر جگہ نہیں، بلکہ جہاں اپنے سیاسی مقاصد پورے ہوتے ہیں، اور بالفرض یہ ادارے بالکل صحیح طور پر بھی خدمت خلق انجام دیں تو ان کی زیادہ سے زیادہ اس وقت پہونچ ہو سکتی ہے جب کسی خطۂ زمین میں کوئی عام حادثہ طوفان، وبائی امراض وغیرہ کا پیش آجائے۔ افراد و آحاد کی مصیبت و تکلیف کی کس کو خبر ہوتی ہے، کون مدد کو پہونچ سکتا ہے، شریعت اسلام کی حکیمانہ تعلیم دیکھئے کہ طلاق کا معاملہ ظاہر ہے کہ باہمی مخالفت غصے اور ناراضی سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو تعلق انتہائی یگانگت اور محبت والفت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا وہ اب اس کی نقیض بن کر نفرت، دشمنی، انتقامی جذبات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات نے عین طلاق کے موقع پر جو مسلمان کو ہدایات دی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ان میں حسن خلق اور حسن معاشرت کا پورا امتحان ہوتا ہے۔ نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ جس عورت نے

ہمیں ستایا اذیت دی یہاں تک کہ قطع تعلق پر مجبوری ہوئی اس کو خوب ذلیل کر کے نکال دیجئے اور جو انتقام اس سے لیا جا سکتا ہے لے لیا جائے۔

مگر قرآن کریم نے عام مطلقہ عورتوں کے لئے تو ایک بڑی پابندی عدت کی اور ایام عدت کو شوہر کے مکان میں گذارنے کی لگادی۔ طلاق دینے والے پر فرض کر دیا کہ اس مدت کے اندر عورت کو اپنے گھر سے نہ نکالے، اور اس کو بھی پابند کر دیا کہ ایام عدت میں اس گھر سے نہ نکلے۔ دوسرے شوہر پر فرض کر دیا کہ طلاق دینے کے باوجود اس زمانہ عدت کا نفقہ بدستور جاری رکھے تیسرے شوہر کے لئے مستحب کیا کہ عدت پوری ہونے کے بعد بھی جب اس کو رخصت کرے تو متاع یعنی لباس دے کر عزت کے ساتھ رخصت کرے، صرف وہ عورتیں جن کے ساتھ صرف نکاح کا بول پڑھا گیا ہے رخصتی اور خلوت وصحبت کی نوبت نہیں آئی وہ عدت سے مستثنیٰ قرار دی گئیں، لیکن ان کے متاع کی تاکید بہ نسبت دوسری عورتوں کے زیادہ کر دی گئی۔ اسی کے ساتھ تعلیم اور حکم دیا گیا کہ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا، یعنی ان کو رخصت کرو خوبی کے ساتھ، جس میں یہ پابندی لگا دی گئی کہ زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہیں، طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کریں۔

مخالفت کے وقت مخالف کے حقوق کی رعایت وہی کر سکتا ہے جو اپنے نفس کے جذبات پر قابو رکھے، اسلام کی ساری تعلیمات میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ

اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے مہر تو دے چکا ہے

وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ

اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو ہاتھ لگا دے تیرے اللہ اور تیرے چچا کی بیٹیاں

وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ

اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن

مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ

چھوڑا تیرے ساتھ اور جو عورت ہو مسلمان اگر بخش دے اپنی جان نبی کو اگر نبی

النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۗ

[illegible] سوائے سب مسلمانوں کے

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ

[illegible]

لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

[illegible] اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ وَمَنِ

[illegible]

ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ

[illegible]

أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۚ وَاللَّهُ

[illegible]

يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ۝ لَا يَحِلُّ

جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا تحمل والا حلال نہیں

لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ

تجھ کو عورتیں اس کے بعد اور نہ یہ کہ ان کے بدلے کرلے اور عورتیں

وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۗ وَكَانَ

اگرچہ خوش لگے تجھ کو ان کی صورت مگر جو مال ہو تیرے ہاتھ کا اور ہے

اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ۝٥٢

اللہ ہر چیز پر نگہبان

خلاصۂ تفسیر

اے نبی بعض احکام آپ کے ساتھ مخصوص ہیں جن سے آپ کا اختصاص اور شرف

سہولت کی رعایت فرماتے ہیں، اور بعض احکام میں بیبیوں کی موجب نفع پر احسان منظور
فرماتے ہیں تو دلیل غایت رحمت کی ہے جو سبب ہے سہولت و عدم حرج کی۔ یہ تو
بیان تھا ان عورتوں کی قسم کا جو آپ کے لئے حلال کی گئیں، آگے اس کا بیان ہے کہ جو
اقسام حلال کی گئی ہیں ان میں سے جتنی جس وقت آپ کے پاس ہوں ان کے بارے
میں آپ کو ارشاد ہے کہ ان میں سے آپ جس کو چاہیں اور جب تک چاہیں
اپنے سے دور رکھیں (یعنی اس کو باری نہ دیں) اور جس کو چاہیں اور جب تک چاہیں
اپنے نزدیک رکھیں (یعنی اس کو باری دیں) اور جن کو دور کر رکھا تھا ان میں سے پھر
کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں (مطلب یہ ہوا کہ ازواج میں شب باشی
کی باری وغیرہ کی رعایت آپ پر واجب نہیں اور اس میں ایک بڑی ضروری مصلحت
ہے وہ یہ کہ) اس امر میں زیادہ توقع ہے کہ ان بیبیوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور
غمگین نہ ہوں گی اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ ان کو دیں گے اس پر سب کی
سب راضی رہیں گی (کیونکہ رنج کی عادۃً وجہ دعویٰ استحقاق کا ہوتا ہے، اور جب معلوم
ہو جائے کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ تبرع محض ہے ہمارا حق واجب نہیں ہے
تو کسی کو کوئی شکایت نہ رہے گی، اور بیبیوں کا حق باری میں نہ ہونا سب ہی کو
معلوم ہے) اور (اے مسلمانو یہ احکام مختصہ سن کر دل میں یہ خیال مت پکا لینا
کہ یہ احکام عام کیوں نہ ہوئے اگر ایسا کرو گے تو) خدا تعالیٰ تم لوگوں کے دلوں کی سب باتیں معلوم
ہیں، ایسا خیال نہ لانا چاہئے ورنہ تم کو سزا دے گا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہے، جو موجب تعذیب ہے) اور اللہ تعالیٰ (یہی کیا) سب کچھ
جاننے والا ہے (اور معترضین کو جو عاجلاً سزا نہیں ہوتی تو اس سے نفی علم لازم نہیں آتی
بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) بردبار (بھی) ہے (اس لئے کبھی سزا میں ڈھیل دیتا ہے)
آگے بقیہ احکام مختصہ بحضرت رسالت ارشاد فرماتے ہیں جن میں بعضے تو احکام سابقہ
کا تتمہ ہیں اور بعضے جدید ہیں پس ارشاد ہے کہ اوپر جو حکم سوم و پنجم میں مذکور ہوا
میں ہجرت اور ایمان کی قید لگائی گئی ہے سو) ان کے علاوہ اور عورتیں (جن میں یہ قید
نہ ہو) آپ کے لئے حلال نہیں ہیں (یعنی اہل قرابت میں سے غیر مہاجرات حلال نہیں
اور دوسری عورتوں میں سے غیر مؤمنات حلال نہیں یہ تو تتمہ ہو حکم بالا کا) اور
(آگے حکم ہفتم جدید ہے کہ) نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیبیوں کی جگہ
دوسری بیبیاں کر لیں (اس طرح سے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دیدیں اور بجائے

ان کی دوسری کرلیں اور یوں بدون ان کے طلاق دیئے ہوئے اگر کسی سے نکاح کرلیں تو اس کی ممانعت نہیں اسی طرح اگر بلا قصد تبدل کسی کو طلاق دیدیں تو اس کی بھی ممانعت ثابت نہیں، بلکہ لفظ تبدل اس مجموعہ کی ممانعت پر دال ہے، بس یہ تبدل ممنوع ہے، گو چاہے آپ کو ان دوسریوں کا حسن اچھا معلوم ہو، مگر جو آپ کی مملوکہ ہو تو وہ حکم تحریم و ممانعت دونوں سے مستثنیٰ ہے یعنی وہ تعدد ہونے پر بھی حلال ہے اور اس میں تبدل بھی درست ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت اور انجام و مصالح کا پورا نگران ہے (اس لئے ان سب احکام میں مصلحتیں و حکمتیں ہیں گو عام مخاطبین کو وہ تعیین نہ بتلائی جائیں، اس وجہ سے کسی کو سوال یا اعتراض کا منصب و استحقاق نہیں)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق ان خاص احکامات کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں، اور یہ خصوصیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی شان اور خصوصی اعزاز کی علامت ہیں، ان میں سے بعض احکام تو ایسے ہیں کہ ان کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بالکل واضح اور جلی ہے اور بعض ایسے ہیں جو اگرچہ سب مسلمانوں کے لئے عام ہیں مگر ان میں کچھ قیدیں شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہیں، اب ان کی تفصیل دیکھئے۔

پہلا حکم اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ، یعنی ہم نے حلال کردیا آپ کے لئے آپ کی سب موجودہ ازواج کو جن کے مہر آپ نے ادا کردیئے ہیں۔ یہ حکم بظاہر سبھی مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر اس میں وجہ خصوصیت یہ ہے کہ نزولِ آیت کے وقت آپ کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں موجود تھیں اور عام مسلمانوں کے لئے چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں، تو یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں رکھنا آپ کے لئے حلال کردیا گیا۔

اور اس آیت میں جو الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ فرمایا ہے یہ کوئی قید احترازی یا شرط حلت نہیں بلکہ واقعہ کا اظہار ہے کہ جتنی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں آپ نے سب کا مہر نقد ادا کردیا، اُدھار نہیں رکھا۔ آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جس چیز کا دینا آپ کے ذمہ عائد ہو اس کو فوراً دیکر سبکدوش ہوجاتے تھے۔

بلا ضرورت تاخیر فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے ظاہر میں عام مسلمانوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب ہے۔

دوسرا حکم وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ، یعنی آپ کے لئے حلال کر دیا ان عورتوں کو جو آپ کی ملک میں ہوں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا مالک بنا دیا ہو۔ اس آیت میں لفظ افاء، فیٔ سے مشتق ہے۔ اصطلاح قرآن میں فیٔ اس مال کو کہتے ہیں جو کفار سے بغیر جنگ کے یا بطور مصالحت کے حاصل ہو جائے، اور کبھی مطلق مال غنیمت کو بھی لفظ فیٔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اس کا ذکر کسی شرط کے طور پر نہیں کہ آپ کے لئے صرف وہ کنیز حلال ہوگی جو مال فیٔ یا غنیمت میں آپ کے حصہ میں آئی ہو، بلکہ جس کو آپ نے قیمت دے کر خرید لیا ہو وہ بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

لیکن اس حکم میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خصوص و امتیاز نہیں، پوری امت کے لئے یہ حکم ہے، جو کنیز مال غنیمت سے حصہ میں آئے یا اس کی قیمت دے کر خرید لیں وہ ان کے لئے حلال ہے، مگر سیاق و سباق ان تمام آیات کا یہ ہے کہ ان میں جو احکام آئے ہیں وہ کچھ نہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہوں، اسی لئے ازواج مطہرات کی طرح کنیزوں کی حلت کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کا نکاح کسی امتی سے حلال نہیں۔

اسی طرح جو کنیز آپ کے لئے حلال کی گئی ہے آپ کے بعد وہ کسی کے لئے حلال نہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہ جن کو مقوقس بادشاہ روم نے آپ کے لئے بطور ہدیہ بھیجا تھا، تو جس طرح آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کا نکاح کسی سے جائز نہیں تھا اس کا بھی نکاح کسی سے جائز نہیں رہ گیا۔ اس لحاظ سے مملوکہ کنیز کے حلال ہونے میں بھی آپ کی ایک خصوصیت ثابت ہوگئی۔

اور سیدی حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ نے دو اور خصوصیتیں بیان القرآن میں بیان فرمائی ہیں، جو مذکورہ خصوصیت سے زیادہ واضح ہیں۔

اول یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار خصوصی دیا گیا تھا کہ مال غنیمت کو تقسیم کرنے سے پہلے آپ اس میں سے کسی چیز کو اپنے لئے انتخاب فرمالیں تو وہ آپ کی ملک خاص ہو جاتی تھی۔ اس خاص چیز کو اصطلاح میں صفی النبی کہا جاتا تھا، جیسا کہ غزوہ خیبر کی غنیمت میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت صفیہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا تو ملک یمین کے مسئلہ میں یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دار الحرب کے کسی غیر مسلم کی طرف سے اگر کوئی ہدیہ مسلمانوں کے امیر المؤمنین کے نام پر آئے تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کا مالک امیر المؤمنین نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال شرعی کی ملک قرار دیا جاتا ہے، بخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ایسا ہدیہ آپ کے لئے خصوصیت سے حلال کر دیا گیا جیسا ماریہ قبطیہؓ کا معاملہ ہے کہ مقوقس نے ان کو بطور ہدیہ و تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، تو یہ آپ ہی کی ملک قرار پائیں۔ واللہ اعلم

تیسرا حکم۔ بَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ الآیۃ، اس آیت میں عم اور خال کو مفرد اور عمات اور خالات کو جمع لانے کی توجیہات علماء نے بہت لکھی ہیں، تفسیر روح المعانی نے ابوحیان کی اس توجیہ کو اختیار کیا ہے کہ محاورہ عرب کا اسی طرح ہے، اشعار عرب اس پر شاہد ہیں کہ عم کی جمع مستعمل نہیں کرتے مفرد ہی مستعمل ہوتا ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ آپ کے لئے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں اور ماموں خالہ کی لڑکیاں حلال کر دی گئیں، چچا پھوپھی میں باپ کے خاندان کی سب لڑکیاں اور ماموں خالہ میں ماں کے خاندان کی سب لڑکیاں شامل ہیں، اور ان سے نکاح کا حلال ہونا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، سب مسلمانوں کا یہی حکم ہے۔ لیکن ان پر یہ قید کہ انھوں نے آپ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کی ہو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ عام امت کے لئے تو باپ اور ماں کے خاندان کی یہ لڑکیاں بغیر کسی شرط کے حلال ہیں، خواہ انھوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان میں سے صرف وہ حلال ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ ساتھ ہجرت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سفر میں آپ کی معیت رہی ہو یا ایک ہی وقت میں ہجرت کی ہو، بلکہ مراد نفس ہجرت میں معیت و موافقت ہے۔ ان میں سے جس نے کسی وجہ سے ہجرت نہیں کی اس سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا، جیسا کہ آپ کے چچا ابوطالب کی بیٹی اُمِ ہانیؓ نے فرمایا کہ مجھ سے آپ کا نکاح اس لئے حلال نہیں تھا کہ میں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ میرا شمار طلقاء میں تھا، طلقاء اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا تھا نہ قتل کیا نہ غلام بنایا۔ (روح و جصاص)

اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور وہ بڑے علم والا بڑے حلم والا ہے۔

آیات مذکورہ میں اوپر سے یہاں تک ان احکام کا ذکر چلا آتا ہے جو دربارہ ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرح کی خصوصیت رکھتے ہیں، آگے بھی ایسے ہی بعض احکام کا بیان ہے، درمیان میں یہ آیت کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کا حال جانتا ہے اور علیم و حلیم ہے، بظاہر ما قبل اور ما بعد سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ روح المعانی میں فرمایا کہ احکام مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چار سے زیادہ ازواج کی اجازت اور بلا مہر کے نکاح کی اجازت سے کسی کے دل میں شیطانی وساوس پیدا ہو سکتے تھے، اس لئے درمیان میں اس آیت نے یہ ہدایت دیدی کہ مسلمان اپنے دلوں کی ایسے وساوس سے حفاظت کریں، اور اس کا یقین رکھیں کہ یہ سب خصوصیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جو بہت سی حکمتوں اور مصالح پر مبنی ہیں، نفسانی خواہشات کی تکمیل کا یہاں گذر نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی اجازت کے ساتھ تعدد ازواج کا مسئلہ

اعدائے اسلام نے ہمیشہ مسئلہ تعدد ازواج اور خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج کو اسلام کی مخالفت میں موضوع بحث بنایا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی شیطان کو بھی شان رسالت کے خلاف اس معاملہ میں بدگمانی کرنے کی گنجائش نہیں رہتی، جس سے ثابت ہے کہ آپ نے سب سے پہلا نکاح پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے کیا، جو بیوہ سن رسیدہ صاحب اولاد اور دو شوہروں کے نکاح میں رہنے کے بعد آئی تھیں، اور پچاس سال کی عمر تک صرف اسی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ شباب کا پورا زمانہ گذرا۔ یہ پچاس سالہ دور عمر مکہ کے لوگوں کے سامنے گذرا، چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت کے بعد شہر میں آپ کی مخالفت شروع ہوئی، اور مخالفین نے آپ کے ستانے اور آپ پر عیب لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ساحر کہا، شاعر کہا، مجنون کہا، مگر کبھی کسی دشمن کو بھی آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں مل سکا، جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے۔

پچاس سال عمر شریف کے گذرنے اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ نکاح میں آئیں یہ بھی بیوہ تھیں۔

ہجرت مدینہ اور عمر شریف چون سال ہو جانے کے بعد سنہ ۲ ہجری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ کی رخصتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہؓ سے اور کچھ دنوں کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہ سے نکاح ہوا۔

حضرت زینبؓ چند روزہ کے بعد وفات پا گئیں۔ سنہ ۴ ہجری میں حضرت ام سلمہؓ جو صاحب اولاد بیوہ تھیں آپ کے نکاح میں آئیں۔ سنہ ۵ ہجری میں حضرت زینبؓ بنت جحش سے بحکم خداوندی نکاح ہوا جس کا ذکر سورۂ احزاب کے شروع میں آ چکا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون سال تھی۔ آخری پانچ سال میں باقی ازواج مطہراتؓ آپ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ پیغمبر کی خانگی زندگی اور گھریلو معاملات سے متعلق احکام دین کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ ان نو ازواج مطہرات سے جس قدر دین کی اشاعت ہوئی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف حضرت صدیقہ عائشہؓ سے دو ہزار دو سو دس احادیث اور حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اڑسٹھ احادیث کی روایت معتبر کتب حدیث میں جمع ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جو احکام و فتاویٰ لوگوں کو بتلائے ان کے متعلق حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جاتی ہے۔ دو سو سے زیادہ حضرات صحابہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کے شاگرد ہیں، جنہوں نے حدیث اور فقہ و فتاویٰ ان سے سیکھے ہیں۔

اور بہت سی ازواج کو حرمِ نبوی میں داخل کرنے میں ان کے خاندان کو اسلام کی طرف لانے کی حکمت بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس اجمالی نقشہ کو سامنے رکھیں تو کیا کسی کو یہ کہنے کی گنجائش رہ سکتی ہے کہ یہ تعدد اور کثرت ازدواج معاذ اللہ کسی نفسانی اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہوا تھا۔ اگر یہ ہوتا تو ساری عمر تجرد یا ایک بیوہ کے ساتھ گذارنے کے بعد عمر کے آخری حصہ کو اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا جاتا۔ یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ نیز اصل مسئلہ تعدد ازدواج پر شرعی اور عقلی فطری و اقتصادی حیثیت سے مکمل بحث معارف القرآن جلد دوم سورۂ نساء کی تیسری آیت کے تحت میں آ چکی ہے وہاں دیکھی جائے (معارف جلد دوم، ص ۲۸۵ تا ۲۹۲)

ساتواں حکم: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ، یعنی اس کے بعد آپ کے لئے دوسری عورتوں سے نکاح حلال نہیں، اور یہ بھی حلال نہیں کہ موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بدلیں۔

اس آیت میں لفظ مِنْ بَعْدُ کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ مِنْ بَعْدُ سے مراد یہ ہے کہ بجز ان نو عورتوں کے جو اس وقت آپ کے نکاح میں ہیں، اور کسی سے آپ کا نکاح حلال نہیں، بعض صحابہ اور ائمہ تفسیر سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، جیسا کہ حضرت انسؓ نے

فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ دنیا طلبی کے لئے آپؐ سے جدائی اختیار کرلیں یا پھر تنگی و فراخی جو کچھ پیش آئے اس پر قناعت کرکے آپؐ کی زوجیت میں رہیں تو سب ازواج مطہرات نے اپنے نفقہ کی زیادتی کے مطالبہ کو چھوڑ کر اسی حال میں زوجیت کے اندر رہنا اختیار کیا تو اس پر بطور انعام کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ذات گرامی کو بھی ان ہی ازواج کے لئے مخصوص کردیا، ان کے سوا کسی سے نکاح جائز نہ رہا (رواہ البیہقی فی سننہ کذا فی الروح)

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آپؐ کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ کے بعد بھی وہ کسی سے نکاح نہیں کرسکتیں، اسی طرح آپؐ کو بھی ان کے لئے مخصوص فرما دیا کہ آپ ان کے علاوہ اور کوئی نکاح نہیں کرسکتے۔ حضرت عکرمہؓ سے بھی ایک روایت میں یہی تفسیر منقول ہے۔

اور حضرت عکرمہؓ، ابن عباسؓ اور مجاہد ائمہ تفسیر سے ایک روایت میں لفظ مِنْۢ بَعْدُ کی یہ تفسیر نقل کی گئی ہے کہ مِنْۢ بَعْدِ الْاَصْنَافِ الْمَذْكُوْرَةِ یعنی شروع آیت میں آپ کے لئے جتنی اقسام عورتوں کی حلال کی گئی ہیں، اس کے بعد یعنی ان کے سوا کسی اور قسم کی عورتوں سے آپؐ کا نکاح حلال نہیں۔ مثلاً شروع آیت میں اپنے خاندان کی عورتوں میں سے صرف وہ حلال کی گئیں جنھوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے میں آپؐ کی موافقت کی تھی، خاندان کی عورتوں میں غیر مہاجرات سے آپؐ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح مؤمنہ کی قید لگا کر آپؐ کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ناجائز قرار دیدیا گیا۔ تو آیت کے جملہ مِنْۢ بَعْدُ کا مطلب یہ ہے کہ جتنی قسمیں آپؐ کے لئے حلال کردی گئی ہیں صرف انہی میں سے آپؐ کا نکاح ہوسکتا ہے، عام عورتوں میں تو مسلمان ہونا ہی شرط ہے اور خاندان کی عورتوں میں مسلمان ہونے کے ساتھ مہاجرہ ہونا بھی شرط ہے۔ جن میں یہ دو شرطیں موجود نہ ہوں، ان سے آپؐ کا نکاح حلال نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ کوئی نیا حکم نہیں، بلکہ پہلے ہی حکم کی تاکید و توضیح ہے جو شروع آیت میں بیان ہوا ہے۔ اور اس آیت کی وجہ سے نو کے بعد کسی اور عورت سے نکاح حرام نہیں کیا گیا، بلکہ غیر مؤمنہ اور خاندان کی غیر مہاجرہ سے نکاح ممنوع ہوا ہے، جو پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے۔ باقی عورتوں سے مزید نکاح آپؐ کے اختیار میں رہا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک روایت سے بھی اس دوسری تفسیر کی تائید ہوتی ہے، کہ آپؐ کیلئے مزید نکاح کرنے کی اجازت رہی ہے۔ واللہ اعلم

وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ، آیت مذکورہ کی اگر دوسری تفسیر اختیار کی جائے تو اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ اگرچہ آپ کو موجودہ ازواج کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح بشرائط مذکورہ جائز ہے، مگر یہ جائز نہیں کہ کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری کو بدلیں یعنی خالص تبدیلی کی نیت سے کوئی نکاح جائز نہیں، بغیر لحاظ و نیت تبدیلی کے جتنے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔

اور اگر آیت مذکورہ کی پہلی تفسیر لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ نہ کسی عورت کا نہ موجودہ ازواج سے آپ نکاح کر سکتے ہیں، اور نہ کسی کی تبدیلی کر سکتے ہیں کہ اس کو طلاق دے کر اس کے قائم مقام کسی اور عورت سے نکاح کر لیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ

اے ایمان والو مت جاؤ نبی کے گھروں میں مگر جو تم کو حکم

لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا

ہو کھانے کے واسطے نہ راہ دیکھنے والے اس کے پکنے کی، لیکن جب تم کو بلائے تب جاؤ

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ

پھر جب کھا چکو تو آپ اپنے گھر جاؤ اور نہ جی لگا کر بیٹھو باتوں میں، اس بات سے تمہاری

كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ

تکلیف تھی نبی کو پھر تم سے شرماتا ہے اور اللہ شرماتا نہیں ٹھیک بات بتلانے میں، اور جب مانگنے جاؤ

مَتَاعًا فَسْـَٔــلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ

بیبیوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردے کے باہر سے، اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے دل کو

وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ

اور ان کے دل کو، اور تم کو نہیں پہنچتا کہ تکلیف دو اللہ کے رسول کو اور نہ یہ کہ نکاح

تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ

کرو اس کی عورتوں سے اس کے پیچھے کبھی، البتہ یہ تمہاری بات اللہ کے یہاں بڑا

عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ إِن تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ

گناہ ہے۔ اگر کھول کر کہو تم کسی چیز کو یا اس کو چھپاؤ سو اللہ ہے ہر چیز کو

شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٥٤﴾ لَّا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي آبَائِهِنَّ وَلَا أَبْنَائِهِنَّ

جاننے والا۔ گناہ نہیں ان عورتوں کو سامنے ہونے کا اپنے باپوں سے اور نہ اپنے بیٹوں سے

وَلَا إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَبْنَاءِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَبْنَاءِ أَخَوَاتِهِنَّ

اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے اور نہ اپنے بہن کے بیٹوں سے،

وَلَا نِسَائِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ ۗ وَاتَّقِينَ اللَّهَ ۚ إِنَّ

اور نہ اپنی عورتوں سے اور نہ اپنے ہاتھ کے مال سے اور ڈرتی رہو اللہ سے بیشک

اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٥٥﴾

اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں (بے بلائے) مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے (آنے کی) اجازت دی جائے (تو جانا مضائقہ نہیں مگر تب بھی) ایسے طور پر (جاؤ) کہ اس کھانے کی تیاری کے منتظر نہ رہو (یعنی بے دعوت تو جاؤ مت اور دعوت ہو تب بھی بہت پہلے سے مت جا بیٹھو) لیکن جب تم کو بلایا جاوے (کہ اب چلو کھانا تیار ہے) تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو (کیونکہ) اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں (اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ) اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے (کسی کا) لحاظ نہیں کرتا (اس لئے صاف صاف کہہ دیا گیا) اور (اب سے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ حضرت کی بیبیاں تم سے پردہ کیا کریں گی تو اب سے) جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر (کھڑے ہو کر وہاں) سے مانگا کرو (یعنی بے ضرورت تو پردہ کے پاس جانا اور بات کرنا بھی نہ چاہئے، لیکن ضرورت میں کلام کا مضائقہ نہیں، مگر رویت نہ ہونا چاہئے) یہ بات (ہمیشہ کے لئے) تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے (یعنی جیسے اب تک جانبین کے دل

سکتی ہیں اس سے آئندہ بھی احتمال عدم طہارت کا مندفع ہو گیا جو کہ غیر معصوم کے اعتبار سے فی نفسہ محتمل ہو سکتا تھا) اور (حرمت ایذاء نبوی صرف فضول جم کر بیٹھ جانے ہی کی صورت میں منحصر نہیں بلکہ علی الاطلاق حکم ہے کہ) تم کو (کسی امر میں) جائز نہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کلفت پہونچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیبیوں سے کبھی بھی نکاح کرو یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری (معصیت کی) بات ہے (اور جس طرح یہ نکاح ناجائز ہے ایسے ہی اس کا زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا سب گناہ ہے سو) اگر تم (اس کے متعلق) کسی چیز کو زبان سے ظاہر کرو گے یا اس (کے ارادہ) کو (دل میں) پوشیدہ رکھو گے تو اللہ تعالیٰ (کو دونوں کی خبر ہوگی، کیونکہ وہ) ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (پس تم کو اس پر سزا دیں گے اور ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے اس سے بعضے مستثنیٰ بھی ہیں جن کا بیان یہ ہے کہ) پیغمبر کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے (سامنے ہونے کے) بارہ میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے (یعنی جس کے بیٹا ہو) اور نہ اپنے بھائیوں کے، اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی (دین شریک) عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور (اے پیغمبر کی بیبیو! ان احکام مذکورہ کی تعمیل میں) خدا سے ڈرتی رہو (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پائے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر (وناظر) ہے (یعنی اس سے کوئی چیز مخفی نہیں جو اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا سے ڈرنا چاہئے)۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں اسلامی معاشرت کے چند آداب واحکام کا بیان ہے جس کا تعلق سابقہ آیات سے یہ ہے کہ جو آداب ان آیات میں تلقین کئے گئے وہ ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان اور آپ کی ازواج کے بارے میں نازل ہوئے ہیں، اگرچہ حکم ان کا آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پہلا حکم، دعوتِ طعام اور مہمان کے بعض آداب

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ،

اس میں دعوتِ طعام اور مہمانی کے متعلق تین احکام کا بیان ہے اور حکم اگرچہ سب مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر سببِ نزول چونکہ خاص واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے مکان میں ہوا اس لئے عنوان میں بیوت النبی کا ذکر فرما دیا گیا۔ پہلا یہ ہے کہ نبی کے مکانات میں بغیر اجازت داخل نہ ہو، لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ

دوسرا ادب یہ کہ جب داخل ہونے کی اجازت بلکہ کھانے کی دعوت بھی ہو تو وقت سے پہلے آکر کھانا تیار ہونے کے انتظار میں نہ بیٹھ جاؤ، غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ، ناظر کے معنی اس جگہ منتظر کے ہیں اور لفظ إنا بکسر ہمزہ کھانا پکنے کو کہتے ہیں، آیت میں لَا تَدْخُلُوا سے ایک استثناء تو إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ کا بلفظ إلّا کیا گیا ہے، یہ دوسرا استثناء بلفظ غیر ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ نہ بلا اجازت داخل ہو اور نہ وقت سے پہلے آکر کھانا پکنے کا انتظار کرو، بلکہ وقت پر جب بلایا جائے اس وقت مکان میں داخل ہو، وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا

تیسرا ادب یہ کہ کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے اپنے کاموں میں منتشر ہو جاؤ، دعوت کے گھر میں باہم باتیں کرنے کے لئے جم کر نہ بیٹھو، فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ

مسئلہ: یہ عام عادت میں ہے جہاں عادةً مہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لئے باعث کلفت ہو، خواہ اس لئے کہ وہ فارغ ہو کر اپنے دوسرے کاموں میں لگنا چاہتا ہے یا اس لئے کہ ان کو فارغ کر کے دوسرے مہمانوں کو کھلانا مقصود ہے۔ اور جہاں حالات اور عادت سے یہ معلوم ہو کہ کھانے کے بعد مہمانوں کا دیر تک باہمی باتوں میں مشغول رہنا میزبان کے لئے موجب کلفت نہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ آجکل کی پارٹیوں اور دعوتوں میں رواج ہو گیا ہے۔ دیں اس کی آیت کا آخر جملہ ہے جس میں ارشاد ہے إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ یعنی کھانے کے بعد باتوں میں مشغول ہونے کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہونچتی تھی۔ کیونکہ مہمانوں کے کھانے کا انتظام زنانہ مکان میں ہوتا تھا، وہاں مہمانوں کا دیر تک ٹھہرنا گھر والوں کے لئے موجب کلفت ہونا ظاہر ہے۔

آیت میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ مہمانوں کے اس طرزِ عمل سے تکلیف پہونچتی ہے مگر چونکہ خود اپنے گھر کے مہمان ہیں اس حالت میں ان کو ادب سکھانے سے حیاء مانع ہوتی ہے، مگر حق بات کے اظہار میں اللہ تعالیٰ حیاء نہیں کرتا۔

مسئلہ: اس جملے سے مہمانوں کے اکرام اور خاطر داری کا کتنا بڑا اہتمام معلوم ہوا کہ اگرچہ مہمانی کے آداب سکھانا آپ کے فرائض میں تھا، مگر اپنا مہمان ہونے کی حالت میں آپ نے اس کو بھی مؤخر کیا، یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ ادب

سکھانے کا اہتمام فرمایا۔

دوسرا حکم عورتوں کا پردہ

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ، اس میں بھی اگرچہ سبب نزول کے خاص واقعہ کی بنا پر بیان اور تعبیر میں خاص ازواج مطہرات کا ذکر ہے، مگر حکم ساری اُمت کے لئے عام ہے۔ خلاصہ حکم کا یہ ہے کہ عورتوں سے اگر دوسرے مردوں کو کوئی استعمالی چیز برتن، کپڑا وغیرہ لینا ضروری ہو تو سامنے آکر نہ لیں، بلکہ پردہ کے پیچھے سے مانگیں، اور فرمایا کہ یہ پردہ کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے دلوں کو نفسانی وساوس سے پاک رکھنے کے لئے دیا گیا ہے۔

پردۂ نسواں کی خاص اہمیت

اس جگہ یہ بات قابل نظر ہے کہ یہ پردے کے احکام جن عورتوں مردوں کو دیئے گئے ہیں ان میں عورتیں تو ازواج مطہراتؓ ہیں، جن کے دلوں کو پاک صاف رکھنے کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ لے لیا ہے، جس کا ذکر اس سے پہلی آیت لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ میں مفصل آ چکا ہے۔ دوسری طرف جو مرد مخاطب ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں، جن میں بہت سے حضرات کا مقام فرشتوں سے بھی آگے ہے۔

لیکن ان سب امور کے ہوتے ہوئے بھی ان کی طہارت قلب اور نفسانی وساوس سے بچنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مرد و عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے، آج کون ہے جو اپنے نفس کو صحابہ کرام کے نفوسِ پاک سے اور اپنی عورتوں کے نفوس کو ازواج مطہرات کے نفوس سے زیادہ پاک ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور یہ سمجھے کہ ہمارا اختلاط عورتوں کے ساتھ کسی خرابی کا موجب نہیں ہے؟

آیاتِ مذکورہ کے سبب نزول

ان آیات کے سبب نزول میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں، جن میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ مجموعہ واقعات نزول آیت کا سبب نزول ہو۔ شروع آیت میں جو مہمانی کے آداب بیان ہوئے کہ بغیر بلائے کھانے کے لئے نہ جائیں، اور کھانے کے انتظار میں نہ بیٹھیں اس کا سبب نزول ابن ابی حاتم نے سلیمان بن ارقم سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان ثقلاء اور بوجھل لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بغیر دعوت کے کسی کے مکان میں جا بیٹھیں اور کھانے کا انتظار کریں۔

اور امام عبد بن حمید نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ان بعض لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو انتظار میں رہتے اور کھانے کے وقت سے پہلے رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں جا کر بیٹھ جاتے اور باہمی باتوں میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ کھانا تیار ہو جاتا تو اس میں شریک ہو جاتے تھے، ایسے لوگوں کے لئے یہ ہدایات جاری ہوئیں جو شروع آیت میں مذکور ہیں۔ یہ واقعات پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کے ہیں، جب عام مرد زنانہ مکان میں آتے جاتے رہتے تھے۔

دوسرا حکم جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہے اس کے شان نزول میں امام بخاری کی دو روایتیں ہیں، ایک روایت حضرت انسؓ سے یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس نیک و بد ہر طرح کے آدمی آتے جاتے ہیں، اگر آپ ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیدیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے، **اس پر یہ آیت حجاب نازل ہوئی۔**

صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول منقول ہے کہ انھوں نے **فرمایا:**

وافقت ربی فی ثلث قلت یا رسول اللہ لو اتخذت فی مقام ابراہیم مصلّی فانزل اللہ تعالیٰ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى وقلت یا رسول اللہ ان نساءک یدخل علیھن البر والفاجر فلو حجبتھن فانزل اللہ آیۃ الحجاب وقلت لازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما تمالأن علیہ فی الغیرۃ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ فنزلت کذلک

"میں نے موافقت کی اپنے رب کے تین چیزوں میں، ایک یہ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مقام ابراہیم کو اپنی جائے نماز بنالیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى، دوسرے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی ازواج مطہرات کے سامنے ہر نیک و بد انسان آتا ہے، بہتر ہو کہ آپ ان کو پردہ کرائیں، اس پر آیت حجاب نازل ہوگئی۔ اور جب ازواج مطہرات میں باہمی غیرت و رشک بڑھنے لگا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں طلاق دیدیں تو بعید نہیں کہ اللہ آپ کو تم سے بہتر ازواج عطا فرما دیں، چنانچہ ٹھیک انہی الفاظ کے ساتھ قرآن نازل ہوگیا۔"

فائدہ: حضرت فاروق اعظمؓ کا اپنے کلام میں ادب قابل نظر ہے کہ بظاہر کہنا یہ تھا کہ تین چیزوں میں میرے رب نے میری موافقت فرمائی۔

ایک دوسرا واقعہ حضرت انسؓ ہی کی روایت سے صحیح بخاری میں یہ آیا کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ آیت حجاب کی حقیقت سے میں سب سے زیادہ واقف ہوں، کیونکہ میں اس واقعہ میں حاضر تھا جب کہ حضرت زینب بنت جحشؓ نکاح کے بعد رخصت ہو کر حرم نبوی میں داخل ہوئیں، اور مکان میں آپ کے ساتھ موجود تھیں، آپ نے ولیمہ کے لئے کچھ کھانا پکوایا اور لوگوں کو دعوت دی، کھانے کے بعد کچھ لوگ وہیں جم کر آپس میں باتیں کرنے کے لئے بیٹھ گئے، ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں تشریف رکھتے تھے، اور ام المؤمنین زینبؓ بھی اسی جگہ موجود تھیں جو حیاء کی وجہ سے دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں، ان لوگوں کے اس طرح دیر تک بیٹھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی، آپ گھر سے باہر تشریف لائے اور دوسری ازواج مطہراتؓ کے پاس ملاقات وسلام کے لئے تشریف لے گئے، جب آپ پھر گھر میں واپس آئے تو یہ لوگ وہیں موجود تھے، آپ کے لوٹنے کے بعد ان لوگوں کو احساس ہوا تو منتشر ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکان کے اندر تشریف لائے تو تھوڑا سا وقت گذرا تھا کہ آپ پھر باہر تشریف لائے میں وہاں موجود تھا آپ نے یہ آیت حجاب جو اسی وقت نازل ہوئی تھی پڑھ کر سنائی، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ الآیۃ،

حضرت انسؓ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ میں ان آیات کے نزول میں سب سے زیادہ قریب ہوں، کہ میرے سامنے ہی نازل ہوئی ہیں (الترمذی کتاب التفسیر)

آیت حجاب کے نزول کے اسباب میں یہ تین واقعات روایات حدیث میں مذکور ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں، ہو سکتا ہے کہ تینوں واقعات کا مجموعہ ہی ان آیات کے نزول کا سبب بنا ہو۔

تیسرا حکم ازواج مطہراتؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی سے نکاح جائز نہیں، وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا، اس کے پہلے جملے میں تو عام الفاظ میں ایسے ہر قول و فعل کو حرام کر دیا گیا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء و تکلیف پہونچے، اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ آپ کی ازواج مطہراتؓ سے آپ کی وفات کے بعد کسی کا نکاح حلال نہیں۔

آیتِ مذکورہ میں اوپر جتنے احکام آئے ہیں ان میں اگرچہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہرات کو ہوا ہے، مگر حکم عام ہے ساری اُمت کے لئے، بجز اس آخری حکم کے کہ عام اُمت کے لئے قانون یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد جب عدت گذر جائے تو اس کی بیوی دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لئے یہ خصوصی حکم ہے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح نہیں کر سکتیں۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بنصِ قرآن امہات المومنین ہیں، اور اگرچہ اُن کے اُمہات ہونے کا اثر ان کی اولادِ رُوحانی پر نہیں پڑتا کہ وہ سب بہن بھائی ہو کر باہم نکاح نہ کر سکیں، مگر ان کی اپنی ذات کی حد تک امتناعِ نکاح کا حکم دیا گیا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، آپ کی وفات کا درجہ ایسا ہے جیسا کوئی زندہ شوہر گھر سے غائب ہو، اسی لئے آپ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اسی بنا پر آپ کی ازواج کا وہ حال نہیں جو عام شوہروں کی وفات پر ان کی ازواج کا ہوتا ہے۔

یہ حکمت بھی ہے کہ شرعی قاعدے سے جنت میں ہر عورت اپنے آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔ حضرت حذیفہؓ نے اپنی زوجہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم جنت میں میری بیوی رہو تو میرے بعد کوئی دوسرا نکاح نہ کرنا، کیونکہ جنت میں عورت اپنے آخری شوہر کو ملے گی (قرطبی)

اس لئے ازواجِ مطہرات کو جو شرف حق تعالیٰ نے دنیا میں آپ کی زوجیت کا عطا فرمایا ہے اس کو آخرت اور جنت میں بھی باقی رکھنے کے لئے ان کا نکاح کسی دوسرے سے حرام کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ طبعی طور پر کوئی شوہر اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے، مگر اس طبعی خواہش کا پورا کرنا عام لوگوں کے لئے شرعاً ضروری نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طبعی خواہش کا بھی حق تعالیٰ نے احترام فرمایا، یہ آپ کا خصوصی اعزاز ہے۔

مسئلہ: اس پر تو امت کا اتفاق ہے کہ جو ازواجِ مطہراتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے حرم میں رہیں اُن سب کا یہی حکم ہے، لیکن جن کو آپ نے طلاق دیدی، یا کسی دوسری وجہ سے وہ آپ کی زوجیت سے علیحدہ ہو گئیں اُن کے بارے میں فقہاءِ اُمت کے مختلف اقوال ہیں، جن کو قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح سے ایذاء و تکلیف پہونچانا آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کرنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا، آخر آیت میں پھر اس مضمون کو دُہرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے ارادوں اور خیالات سے بھی واقف ہے، تم کسی چیز کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ کے سامنے سب ظاہر ہی ہے۔ اس میں تاکید ہے کہ مذکور الصدر احکام میں کسی قسم کا شک و شبہ یا وسوسہ دل میں پیدا نہ ہونے دیں، اور احکام مذکورہ کی مخالفت سے بچنے کا پورا اہتمام کریں۔

آیت مذکورہ میں تین احکام بیان کئے گئے ہیں، ان میں عورتوں کے پردہ کا مسئلہ کئی وجہ سے تفصیل طلب ہے، اس لئے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے:۔

احکامِ حجاب

انسدادِ فواحش کا اسلامی نظام

فواحش، بدکاری، زنا اور اس کے مقدمات دنیا کی اُن مہلک برائیوں میں سے ہیں جن کے مہلک اثرات صرف اشخاص و افراد کو نہیں بلکہ قبائل اور خاندانوں کو اور بعض اوقات بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کردیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے قتل و غارت گری کے واقعات ہوتے جاتے ہیں اگر صحیح تحقیق کی جائے تو کثر واقعات کے پس منظر میں کوئی عورت اور شہوانی جذبات کا جال نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس میں کوئی قوم کوئی مذہب، کوئی خطہ ایسا نہیں جو اس کی برائی اور مہلک عیب ہونے پر متفق نہ ہو۔

دنیا کے اس آخری دور میں یوروپین اقوام نے اپنی مذہبی حدود اور قدیم قومی روایات سب کو توڑ کر اگرچہ زنا کو اپنی ذات میں کوئی جرم ہی نہیں رکھا، اور تہذیب و معاشرت کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جن میں ہر قدم پر جنسی انارکی اور فواحش کو دعوت عام ہی، مگر ان کے ثمرات و نتائج کو وہ بھی جرائم سے خارج نہ کرسکے۔ عصمت فروشی، زنا بالجبر، منظرِ عام پر فحش حرکات کو تعزیری جرم قرار دینا پڑا، جس کی مثال اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی شخص آگ لگانے کے لئے سوختہ کا ذخیرہ جمع کرے پھر اس پر تیل چھڑکے، پھر اس میں آگ لگائے، اور جب اس کے شعلے بھڑکنے لگیں تو ان شعلوں پر پابندی لگانے

اور روکنے کی فکر کرے، ہنڈیا پکنے کے لئے اس کے نیچے آگ جلائے بجائے اس کے اُبال اور جوش کو روکنا چاہے۔

اس کے خلاف اسلام نے جن چیزوں کو جرم اور انسانیت کے لئے مضر قرار دیکر قابل سزا جرم کہا ہے، اس کے مقدمات پر بھی پابندیاں عائد کیں، اور ان کو ممنوع قرار دیا۔ اس معاملے میں مقصود اصلی زنا، اور بدکاری سے بچانا تھا تو اس کو نظر نیچی رکھنے کے حکم سے شروع کیا، عورتوں مردوں کے بے محابا اختلاط کو روکا، عورتوں کو گھروں کی چار دیواری میں محدود رکھنے کی ہدایت کی اور ضرورت کے وقت باہر نکلنے کے لئے بھی برقع یا لمبی چادر سے پورا بدن چھپا کر نکلنے اور سڑک کے کنارے چلنے کی ہدایت کی خوشبو لگا کر یا بجنے والا زیور پہن کر نکلنے کی ممانعت کی۔ پھر جو شخص ان سب حدود و قیود اور پابندیوں کے حصار کو پھاند کر باہر نکل جائے اس پر ایسی سخت عبرت آموز سزا جاری کی کہ ایک مرتبہ کسی بدکردار پر جاری کر دی جائے تو پوری قوم کو مکمل سبق مل جائے۔

اہل یورپ اور ان کے مقلدین نے اپنی فحاشی کے جواز میں عورتوں کے پردہ کو عورتوں کی صحت اور اقتصادی اور معاشی حیثیت سے معاشرہ کے لئے مضر ثابت کرنے اور بے پردہ رہنے کے فوائد پر بحثیں کی ہیں۔ ان کا مفصل جواب بہت سے علمائے اہل عصر نے مفصل کتابوں میں لکھ دیا ہے اس کے متعلق یہاں تو سمجھ لینا بھی کافی ہے کہ فائدہ اور نفع سے تو کوئی جرم و گناہ بھی خالی نہیں۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب ایک اعتبار سے بڑا نفع بخش کاروبار ہے، مگر جب اس کے ثمرات و نتائج میں آنے والی مہلک مضرتیں سامنے آتی ہیں تو کوئی شخص ان کو نافع کاروبار کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بے پردگی میں اگر کچھ معاشی فوائد بھی ہوں مگر جب پورے ملک و قوم کو ہزاروں فتنہ و فساد میں مبتلا کر دے تو پھر اس کو نافع کہنا کسی دانشمند کا کام نہیں ہوسکتا۔

انسدادِ جرائم کے لئے اسلام میں سدِّ ذرائع کا بہترین اصول، اور اس میں راہِ اعتدال:

جس طرح اصول عقائد، توحید، رسالت، آخرت، تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں اسی طرح عام معاصی اور فواحش و منکرات ہر شریعت و مذہب میں حرام قرار دیئے گئے ہیں، لیکن شرائع سابقہ میں ان کے اسباب و ذرائع کو مطلقاً حرام نہیں کیا گیا تھا جب تک کہ ان کے ذریعہ کوئی جرم واقع نہ ہو جائے۔ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام چونکہ قیامت تک رہنے والی شریعت تھی، اس لئے اس کی حفاظت کا منجانب اللہ خاص اہتمام یہ کیا گیا کہ جرائم و معاصی تو حرام تھے ہی

ان اسباب و ذرائع کو بھی حرام قرار دیدیا گیا جو عادتِ غالبہ کے طور پر ان جرائم تک پہونچنے والے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی کو حرام کیا گیا تو شراب کے بنانے، بیچنے، خریدنے اور کسی کو دینے کو بھی حرام قرار دیدیا گیا۔ سود کو حرام کرنا تھا تو سود سے ملتے جلتے معاملات کو بھی ناجائز کر دیا گیا۔ اسی لئے حضرات فقہاء نے تمام معاملات فاسدہ سے حاصل ہونے والے نفع کو سود کی طرح مالِ خبیث قرار دیا۔ شرک و بت پرستی کو قرآن نے ظلم عظیم اور ناقابل معافی جرم قرار دیا۔ تو اس کے اسباب و ذرائع پر بھی کڑی پابندی لگادی آفتاب کے طلوع، غروب، اور وسط میں ہونے کے اوقات میں چونکہ مشرکین آفتاب کی پرستش کرتے تھے، ان اوقات میں نماز پڑھی جاتی تو آفتاب پرستوں کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت ہوجاتی، پھر یہ مشابہت کسی وقت خود شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتی تھی، اس لئے شریعت نے ان اوقات میں نماز اور سجدہ کو بھی حرام قرار دیا۔ بتوں کے مجسمات اور تصویریں چونکہ بت پرستی کا قریب ذریعہ تھیں، اس لئے بت تراشی اور تصویر سازی کو حرام اور ان کے استعمال کو ناجائز کر دیا گیا۔

اسی طرح جبکہ شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا تو اس کے تمام اسباب قریبہ و ذرائع کو بھی محرمات میں داخل کر دیا، کسی اجنبی عورت یا امرد پر شہوت سے نظر ڈالنے کو آنکھوں کا زنا قرار دیا، اس کا کلام سننے کو کانوں کا، اس کے چھونے کو ہاتھوں کا، اس کے لئے جدوجہد میں چلنے کو پاؤں کا زنا فرمایا، جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔ اسی حرام سے بچانے کے لئے عورتوں کے واسطے پردہ کے احکام نازل ہوئے۔

مگر اسباب و ذرائع کا قریب و بعید ایک طویل سلسلہ ہے، اگر دور تک اس سب کو روکا جائے تو زندگی دشوار ہوجائے، اور عمل میں بڑی تنگی پیش آجائے، جو اس شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کا اس کے بارے میں کھلا ہوا اعلان یہ ہے کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ یعنی دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی گئی اس لئے اسباب و ذرائع کے معاملے میں حکیمانہ فیصلہ کیا گیا کہ جو افعال و اعمال کسی معصیت کا ایسا سبب قریب ہوں کہ عام عادت کے اعتبار سے اس کا ارتکاب کرنے والا اس معصیت میں ضرور مبتلا ہو جاتا ہے، ایسے اسباب قریبہ کو شریعتِ اسلام نے اصل معصیت کے ساتھ ملحق کر کے ان کو بھی حرام کر دیا، اور جو اسباب بعیدہ ہیں کہ ان کے عمل میں لانے سے معصیت میں مبتلا ہونا عادۃً لازم و ضروری تو نہیں، مگر کچھ نہ کچھ دخل معصیت میں ضرور ہے ایسے اسباب و ذرائع کو مکروہ قرار دیا۔

اور جو اسباب ان سے بھی زیادہ بعید ہیں کہ معصیت میں ان کا دخل شاذ و نادر ہے ان کو نظر انداز کر کے مباحات میں داخل کر دیا۔

پہلے مسئلہ کی مثال شراب فروشی ہے کہ یہ شراب نوشی کا سبب قریب ہے اس کو بھی شریعت نے اسی طرح حرام کر دیا جس طرح شراب نوشی حرام ہے کسی غیر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا اگرچہ عین زنا نہیں، مگر اس کا سبب قریب ہے شریعت نے اس کو اسی کی طرح حرام قرار دیدیا۔

اور دوسرے مسئلے کی مثال یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ انگور فروخت کرنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اس سے شراب ہی بناتا ہے، اس کا پیشہ یہی ہے یا اس نے صراحۃً کہہ دیا ہے کہ میں اس کام کے لئے خرید رہا ہوں، یہ اگرچہ شراب فروشی کے درجہ میں حرام تو نہیں مگر مکروہ و ناجائز یہ بھی ہے۔ یہی حکم سینما گھر یا سودی بینک چلانے کے لئے زمین مکان کرایہ پر دینے کا ہے کہ معاملہ کے وقت جب معلوم ہے کہ یہ اس مکان کو ناجائز کام کے لئے لے رہا ہے تو کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔

تیسرے درجہ کی مثال یہ ہے کہ عام لوگوں کے ہاتھ انگور فروخت کئے جائیں جن میں یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شراب کشید کرے مگر نہ اس نے اس کا اظہار کیا نہ ہمارے علم میں وہ ایسا شخص ہے جو شراب کشید کرتا ہو تو شرعاً اس طرح کی بیع شراء مباح و جائز قرار دی۔

تنبیہ ضروری یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے جس چیز کو گناہ کا سبب قریب درجہ اول کا قرار دے کر حرام کر دیا، اس کی حرمت کے بعد وہ سب کے لئے مطلقاً حرام ہے، خواہ ابتلاء گناہ کا سبب بنے یا نہ بنے اب وہ خود ایک حکم شرعی ہے جس کی مخالفت حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ عورتوں کا پردہ بھی شرعاً اسی قاعدہ کی بنا پر مبنی ہے کہ ترک پردہ سبب ہے معصیت میں مبتلا ہونے کا۔ اس میں بھی اسباب کی مذکورہ تینوں قسموں کے احکام جاری ہوں گے۔ مثلاً کسی جوان مرد کے سامنے جوان عورت کا اپنا بدن کھولنا ابتلاء گناہ کا ایسا سبب قریب ہے کہ عادت اکثریہ کے اعتبار سے اس پر گناہ کا مرتب ہونا لازمی جیسا ہے، اس لئے یہ تو شرعاً زنا کی طرح حرام ہوگیا، کیونکہ شرعاً اس عمل کو حکم فاحشہ کا دیدیا گیا ہے، اب وہ مطلقاً حرام ہے اگرچہ معاملہ کسی معصوم کے ساتھ ہو یا کوئی شخص اپنے نفس پر مکمل قابو رکھنے کی وجہ

نزولِ حجاب کی تاریخ

عورتوں اور مردوں میں بے محابا اختلاط تو دنیا کی پوری تاریخ میں آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی زمانے میں درست نہیں سمجھا گیا، اور صرف اہل شرائع ہی نہیں دنیا کے عام شریف خاندانوں میں ایسے اختلاط کو روا نہیں رکھا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفرِ مدین کے وقت جن عورتوں کا اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے الگ رکے ہوئے کھڑے ہونے کا ذکر ہے اس کی وجہ یہی بتلائی گئی ہے کہ ان عورتوں نے مردوں کے ہجوم میں گھسنا پسند نہ کیا، سب کے بعد بچے ہوئے پانی پر قناعت کی۔ حضرت زینب بنت جحشؓ جن کے نکاح کے وقت پہلی آیت حجاب نازل ہوئی ہے اس کے نازل ہونے سے پہلے بھی جامع ترمذی کی روایت میں ان کی نشست کی یہ صورت بیان کی ہے وَهِيَ مُوَلِّيَةٌ وَجْهَهَا إِلَى الْحَائِطِ، یعنی وہ اپنا رُخ دیوار کی طرف پھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نزول حجاب سے پہلے بھی عورتوں مردوں میں بے محابا اختلاط اور بے تکلف ملاقات وگفتگو کا رواج شریف و نیک لوگوں میں کہیں نہ تھا۔ قرآن کریم میں جس جاہلیتِ اُولیٰ اور اس میں عورتوں کے تبرج وظہور کا ذکر ہے وہ بھی عرب کے شریف خاندانوں میں نہیں بلکہ لونڈیوں اور آوارہ عورتوں میں تھا عرب کے شریف خاندان اس کو معیوب سمجھتے تھے۔ عرب کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے۔ ہندوستان میں ہندو، بدھ مت، اور دوسرے مشرکانہ مذاہب والوں میں عورتوں مردوں کے درمیان بے محابا اختلاط گوارا نہ تھا۔ یہ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے دعوے اور بازاروں اور سڑکوں پر پریڈ کرنے اور تعلیم سے لے کر ہر شعبۂ زندگی میں مرد وزن کے بے تکلف اختلاط ضیافتوں اور کلبوں میں بے تکلف ملاقاتوں کا سلسلہ صرف یورپین اقوام کی بے حیائی اور فحاشی کی پیداوار ہے، جس میں یہ اقوام بھی اپنے ماضی سے ہٹ جانے کے بعد مبتلا ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں ان کی بھی یہ صورت نہ تھی۔ حق تعالیٰ نے جس طرح عورت کی جسمانی تخلیق کو مردوں سے ممتاز رکھا ہے اسی طرح ان کی طبیعتوں میں ایک فطری حیاء کا جوہر بھی رکھا ہے، جو ان کو فطری طور پر عام مردوں سے الگ تھلگ رہنے اور تستر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ فطری و طبعی حیاء کا پردہ عورتوں مردوں

کے درمیان ابتداءِ آفرینش سے حائل رہا ہے، ابتداءِ اسلام میں بھی باہمی پردہ کی یہی نوعیت تھی۔
پردۂ نسواں کی یہ خاص نوعیت کہ عورتوں کا اصل مقام گھروں کی چار دیواری ہو، اور جب کسی شرعی ضرورت سے باہر نکلنا ہو تو پورے بدن کو چھپا کر نکلیں، یہ ہجرت مدینہ کے بعد ۵ھ ہجری میں جاری ہوا ہے۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ باتفاق علمائے امت اس پردہ کے متعلق پہلی آیت وہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ، اور یہ آیت حضرت زینب بنت جحشؓ کے نکاح اور حرم نبوی میں داخلہ کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس نکاح کی تاریخ میں حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اور ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں دو قول نقل کئے ہیں کہ ۳ھ ہجری میں ہوا یا ۵ھ ہجری میں، ابن کثیرؒ نے ۵ھ ہجری کو ترجیح دی، ابن سعدؒ نے حضرت انسؓ سے بھی ۵ھ ہجری نقل کیا ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ کی بعض روایات سے بھی اسی کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

آیت مذکورہ میں عورتوں کو پس پردہ رہنے کا حکم دیا اور مردوں کو حکم یہ ملا کہ اگر ان سے کوئی چیز مانگنا ہے تو پردہ کے پیچھے سے مانگیں۔ اس میں پردہ کی خاص تاکید پائی گئی کہ بلاضرورت تو مردوں عورتوں کو الگ ہی رہنا ہے، ضرورت کے وقت ان سے بات کرنا ہو تو پس پردہ کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں پردۂ نسواں اور اس کی تفصیلات کے متعلق سات آیتیں نازل ہوئی ہیں، چار سورۂ احزاب میں، اور تین سورۂ نور میں گذر چکی ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پردہ کے متعلق سب سے پہلے نازل ہونے والی یہی آیت ہے لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ الآیۃ، سورۂ نور کی تینوں آیتیں اور سورۂ احزاب کے شروع کی آیت جس میں ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھیں، وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ، یہ سب اگرچہ ترتیب قرآن میں پہلے ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہیں۔ سورۂ احزاب کی پہلی آیت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا ہے جب کہ ازواج مطہرات کو منجانب اللہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر دنیا کی وسعت چاہتی ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق لے لیں، اور آخرت کو ترجیح دے کر دنیا کی معیشت میں موجودہ حالت پر قناعت کریں تو نکاح میں رہیں

اس واقعہ تخییر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جن ازواج کو یہ اختیار دیا گیا تھا ان میں حضرت زینب بنت جحشؓ بھی شامل تھیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نکاح اس

آیت سے پہلے ہو چکا تھا، یہ آیت بعد میں نازل ہوئی ہے، اسی طرح سورۂ نور کی آیتیں جن میں پردہ کے متعلق تفصیلات ہیں، یہ اگرچہ ترتیب قرآنی میں مقدم ہیں مگر نزول کے اعتبار سے وہ بھی اس کے بعد قصۂ افک کے ساتھ نازل ہوئی ہیں، جو غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا تھا، یہ غزوہ سنہ ۶ ہجری میں ہوا ہے، اور پردہ شرعی کے احکام اس وقت سے جاری ہوئے ہیں جبکہ حضرت زینبؓ کے نکاح میں آیت پردہ نازل ہوئی، سورۂ نور کی آیات متعلقہ حجاب سورۂ نور میں گزر چکی ہیں۔

ستر عورت کے احکام اور حجاب مستورات میں فرق

مرد و عورت کا وہ حصہ بدن جس کو عربی میں عورت اور اردو فارسی میں ستر کہتے ہیں جس کو سب سے چھپانا شرعی، طبعی اور عقلی طور پر فرض ہے اور ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض جس پر عمل ضروری ہے، وہ ستر عورت یعنی اعضاء **مستورہ کا چھپانا ہے۔ یہ فریضہ تو ابتداء** آفرینش سے فرض ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فرض رہا ہے، بلکہ شرائع کے وجود سے بھی پہلے جب جنت میں شجر ممنوعہ کھا لینے کے سبب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور ستر کھل گیا تو وہاں بھی آدم علیہ السلام نے ستر کھلا رکھنے کو جائز نہیں سمجھا۔ **اسی لئے آدم و حوا** دونوں نے جنت کے پتے اپنے ستر پر باندھ لئے طفقا یخصفان علیہما من ورق الجنۃ کا یہی مطلب ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر دین کی شریعت میں ستر چھپانا فرض رہا ہے، اعضاء مستورہ کی تعیین اور تحدید میں اختلاف ہو سکتا ہے، کہ ستر کہاں سے کہاں تک ہے، مگر اصل فرضیت ستر عورت کی تمام شرائع انبیاء میں مسلّم ہے، اور یہ فرض ہر انسان مرد و عورت پر اپنی ذات پر عائد ہے، کوئی دوسرا دیکھنے والا ہو یا نہ ہو، اسی لئے اگر کوئی شخص اندھیری رات میں ننگا نماز پڑھے حالانکہ ستر چھپانے کے قابل کپڑا اس کے پاس موجود ہو، تو یہ نماز بالاتفاق ناجائز ہے، حالانکہ اس کو ننگا کسی نے دیکھا نہیں (بحرالرائق)۔ اسی طرح نماز اگر کسی ایسی جگہ پڑھی جہاں کوئی دوسرا آدمی دیکھنے والا نہیں اس وقت بھی اگر نماز میں ستر کھل گیا تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ (کما فی عامۃ کتب الفقہ)

خارج نماز لوگوں کے سامنے ستر پوشی کے فرض ہونے میں تو کسی کا اختلاف ہی نہیں، لیکن خلوت میں جہاں کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود نہ ہو، اس میں بھی صحیح قول یہی ہے کہ خارج نماز بھی بلا ضرورت شرعیہ یا طبعیہ کے ستر کھول کر ننگا بیٹھنا جائز نہیں۔ (کما فی البحر عن شرح المنیہ)

یہ حکم تو سترِ عورت کا تھا، جو اولِ اسلام سے بلکہ اولِ آفرینش سے تمام شرائعِ انبیاء میں فرض رہا ہے، جس میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، خلوت و جلوت میں بھی برابر ہیں جیسے لوگوں کے سامنے ننگا ہونا جائز نہیں، ایسے ہی خلوت و تنہائی میں بھی بلا ضرورت ننگا رہنا جائز نہیں۔

دوسرا مسئلہ حجاب اور پردہ کا ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے پردہ کریں۔ اس مسئلہ میں بھی اتنی بات تو انبیاء و صلحاء اور شرفاء میں ہمیشہ سے رہی ہے کہ اجنبی مردوں کے ساتھ عورتوں کا بے محابا اختلاط نہ ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی دو لڑکیوں کا قصہ جو قرآن کریم میں پ ۲۰ میں آیا ہے، اس میں لڑکیاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے بستی کے کنویں پر گئیں جہاں لوگوں کا ہجوم تھا وہ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے تو قرآن کریم میں ہے کہ یہ لڑکیاں ایک طرف الگ کھڑی ہوگئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا اس وقت اتفاقی طور پر مسافرانہ انداز میں وہاں گذر ہوا تو ان لڑکیوں کو علیحدہ کھڑے دیکھ کر سبب پوچھا تو لڑکیوں نے دو باتیں بتلائیں۔ اوّل یہ کہ اس وقت یہاں مردوں کا ہجوم ہے ہم اپنے جانوروں کو پانی اس وقت پلائیں گے جب یہ لوگ فارغ ہو کر چلے جائیں گے۔ دوسری بات یہ بھی بتلائی کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف ہیں جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جانوروں کو پانی پلانے کے لئے نکلنا یہ عرف و عادت کے اعتبار سے عورتوں کا کام نہیں تھا، مگر والد کے ضعف و مجبوری اور کسی دوسرے آدمی کے موجود نہ ہونے کے سبب یہ کام ہمیں کرنا پڑ گیا۔ یہ حال قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکیوں کا بتلایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے اور ان کی شریعت میں بھی عورتوں مردوں کا دوش بدوش چلنا اور بے محابا اختلاط پسند نہیں تھا، اور ایسے کام جن میں مردوں کے ساتھ اختلاط ہو وہ عورتوں کے سپرد ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ بہرحال اس مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو باقاعدہ پردہ میں رہنے کا حکم اس وقت نہیں تھا، اسی طرح ابتداء اسلام میں بھی یہی صورت جاری رہی۔ سنہ ۳ھ یا سنہ ۵ھ میں عورتوں پر اجنبی مردوں سے پردہ کرنا فرض کر دیا گیا، جس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ سترِ عورت، اور حجابِ نساء یہ دو مسئلے الگ الگ ہیں، سترِ عورت ہمیشہ سے فرض ہے، حجابِ نساء سنہ ۵ ہجری میں فرض ہوا۔ سترِ عورت

مرد و عورت دونوں پر فرض ہے اور حجاب صرف عورتوں پر، ستر عورت لوگوں کے سامنے اور خلوت دونوں میں فرض ہے حجاب صرف اجنبی کی موجودگی میں۔ یہ تفصیل اس لئے لکھی گئی کہ ان دونوں مسئلوں کو خلط ملط کر دینے سے بہت سے شبہات مسائل اور احکام قرآن کے سمجھنے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت سے باجماع مستثنیٰ ہیں، اسی لئے نماز میں چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں تو نماز بالاتفاق و باجماع جائز ہے۔ چہرہ اور ہتھیلیاں تو از روئے نص مستثنیٰ ہیں، قدمین کو فقہاء نے ان پر قیاس کر کے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

لیکن اجنبی مردوں سے پردہ میں بھی چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں یا نہیں، اس میں اختلاف ہے جس کی تفصیل سورۂ نور کی آیت لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے تحت گذر چکی ہے جس کا خلاصہ آگے آتا ہے۔

حجاب شرعی کے درجات اور ان کے احکام کی تفصیل پردہ نسواں کے متعلق قرآن مجید کی سات آیات اور حدیث کی ستر روایات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مطلوب شرعی حجاب اشخاص ہے، یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل و حرکت مردوں کی نظروں سے مستور ہو، جو گھروں کی چار دیواری یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے اس کے سوا جتنی صورتیں حجاب کی منقول ہیں وہ سب ضرورت کی بنا پر وقتِ ضرورت اور قدرِ ضرورت کے ساتھ مقید و مشروط ہیں۔

اس طرح پردہ کا پہلا درجہ جو اصل مطلوب شرعی ہے وہ حجاب اشخاص ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں رہیں، لیکن شریعت اسلامیہ ایک جامع اور مکمل نظام ہے جس میں انسان کی تمام ضروریات کی رعایت پوری کی گئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ وہ کسی وقت گھروں سے نکلیں اس کے لئے پردہ کا دوسرا درجہ قرآن و سنت کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لانبی چادر میں پورے بدن کو چھپا کر نکلیں۔ رستہ دیکھنے کے لئے چادر میں سے صرف ایک آنکھ کھولیں، یا برقع میں جو جالی آنکھوں کے سامنے استعمال کی جاتی ہے وہ لگا لیں، ضرورت کے مواقع میں پردہ کا دوسرا درجہ بھی پہلے کی طرح سب علماء و فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

ایک تیسرا درجہ بھی بعض روایات سے مفہوم ہوتا ہے، جس میں صحابہ و تابعین اور فقہاء اُمت کی رائیں مختلف ہیں۔ وہ یہ کہ عورتیں جب بضرورت گھروں سے باہر نکلیں تو

وہ اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہیں بشرطیکہ سارا بدن مستور ہو، پردۂ شرعی کے ان تینوں درجوں کی تفصیل یہ ہے کہ :

پہلا درجہ حجاب اشخاص بالبیوت

قرآن و سنت کی رُو سے اصل مطلوب یہی درجہ ہے، سورۂ احزاب کی زیر بحث آیت وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اس کی واضح دلیل اور اس سے زیادہ واضح سورۂ احزاب ہی کے شروع کی آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ ہے۔ ان آیتوں پر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اس سے اور زیادہ اس کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پردۂ نسواں کے متعلق پہلی آیت حضرت زینب رض کے نکاح کے وقت نازل ہوئی۔ روایت حدیث میں حضرت انس رض نے فرمایا کہ میں اس واقعہ حجاب کو سب سے زیادہ اس لئے جانتا ہوں کہ میں اس وقت حضور ص کی خدمت میں موجود تھا جب پردہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے مردوں کے سامنے ایک چادر وغیرہ کا پردہ ڈال کر حضرت زینب رض کو اندر مستور کر دیا۔ یہ نہیں کیا کہ ان کو برقع یا چادر میں مستور کر دیتے، شانِ نزول میں جو واقعہ حضرت عمر بن خطاب رض کا اوپر گذر چکا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رض کا مقصود یہ تھا کہ امہات المومنین رض مردوں کی نظر سے الگ اندر رہیں جیسا کہ ان کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے یَدْخُلُ عَلَیْكَ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ

صحیح بخاری باب غزوۂ موتہ میں حضرت صدیقہ عائشہ رض کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید بن حارثہ رض اور جعفر رض اور عبداللہ بن رواحہ رض کی شہادت کی خبر ملی تو آپ مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے، آپ کے چہرۂ مبارک پر سخت غم و صدمہ کے آثار تھے، میں حجرہ کے اندر دروازہ کی ایک شق (دراڑ) سے یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔

اس سے ثابت ہوا کہ اُم المومنین رض اس حادثہ کے وقت بھی باہر آکر برقع کے ساتھ مجمع میں شامل نہیں ہوئیں بلکہ دروازہ کی شق سے اس جلسہ کا مشاہدہ کیا۔

اور صحیح بخاری کتاب المغازی عمرۃ القضاء کے باب میں ہے کہ حضرت عروہ ابن زبیر صدیقہ عائشہ رض کے بھانجے اور عبداللہ بن عمر رض مسجد نبوی میں حضرت صدیقہ عائشہ رض کے حجرے کے باہر متصل تشریف رکھتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے۔ ابن عمر رض فرماتے ہیں، کہ اسی درمیان میں ہم نے حضرت صدیقہ رض کی مسواک کرنے اور حلق صاف کرنے کی آواز حجرہ کے اندر سے سُنی۔ آگے واقعہ میں

حضرت نبیؐ کا ذکر ہے۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ آیتِ حجاب نازل ہونے کے بعد ازواجِ مطہرات کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ گھروں میں رہ کر پردہ کرتی تھیں۔

اسی طرح صحیح بخاری باب غزوۃ طائف میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پانی کے برتن میں کلی کر کے حضرت ابوموسیٰ اور بلالؓ کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں اور اپنے چہرے پر مل لیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ پردہ کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں انھوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی امّ سلمہؓ کے لئے چھوڑ دینا۔

یہ حدیث بھی شاہد ہے کہ نزولِ حجاب کے بعد ازواجِ مطہراتؓ گھروں اور پردوں کے اندر رہتی تھیں۔

فائدہ: اس روایت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی ایسی ہی شائق تھیں جیسے دوسرے مسلمان۔ یہ بھی آپ کی ذاتِ اقدس ہی کی خصوصیت تھی ورنہ بیوی سے جو بے تکلف تعلق شوہر کا ہوتا ہے اس کے ساتھ اس کے تقدس و تعظیم کا یہ درجہ قائم رہنا عادۃً ناممکن ہے۔

اور صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور ابوطلحہؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہیں جا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے۔ آپؐ کے ساتھ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ بھی سوار تھیں۔ راستہ میں اچانک اونٹ نے ٹھوکر کھائی، اور ابوطلحہ کے بیان کے مطابق آپؐ اور حضرت صفیہؓ اونٹ سے گر گئے تو ابوطلحہؓ آپؐ کے پاس حاضر ہوئے، اور عرض کیا اللہ تعالیٰ مجھے آپؐ پر قربان کر دے آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، تم عورت کی خبر لو۔ ابوطلحہؓ نے پہلے تو اپنا چہرہ کپڑے میں چھپایا، پھر حضرت صفیہؓ کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر کپڑا ڈال دیا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ پھر اسی طرح پردہ میں مستور ان کو اُن کی سواری پر سوار کیا۔

اس واقعہ میں بھی جو ایک حادثہ کی صورت میں اچانک پیش آیا، صحابہ کرام اور ازواجِ مطہراتؓ کا ——— پردہ کے معاملہ میں اتنا اہتمام اس کی بڑی اہمیت کا شاہد ہے۔

اور جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا خَرَجَتِ الْمَرْأَةُ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطٰنُ (قال الترمذی ھٰذا حدیث حسن صحیح غریب) معنی یہ ہیں کہ "عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تکتا ہے" (یعنی اس کو مسلمانوں میں برائی پھیلانے کا ذریعہ بناتا ہے)۔

اور ابن خزیمہ و ابن حبان نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں : وَ اَقْرَبُ مَا تَكُوْنُ مِنْ وَجْهِ رَبِّهَا وَهِيَ فِيْ قَعْرِ بَيْتِهَا ۔ ” یعنی عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور رہو “ ۔

اس حدیث میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ اصل عورتوں کے لئے یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھیں باہر نہ نکلیں (ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں) ۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ فِي الْخُرُوْجِ اِلَّا مُضْطَرَّةً ، رواہ الطبرانی کذا فی الکنز ص ۲۶۳ ج ۸ ” یعنی عورتوں کا باہر نکلنے کے لئے کوئی حصہ نہیں بجز اس کے کہ باہر نکلنے کے لئے کوئی اضطراری صورت پیش آجائے “ ۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا ، آپ نے صحابہ کرام ؓ سے سوال فرمایا اَيُّ شَيْءٍ خَيْرٌ لِّلْمَرْاَةِ (عورت کے لئے کیا چیز بہتر ہے) صحابہ کرام خاموش رہے ، کوئی جواب نہیں دیا ، پھر جب میں گھر میں گیا اور فاطمہ ؓ سے میں نے یہی سوال کیا تو انھوں نے فرمایا اَلَّا يَرَيْنَ الرِّجَالَ وَلَا يَرَوْنَهُنَّ ، یعنی عورتوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ نہ وہ مردوں کو دیکھیں اور نہ مرد اُن کو دیکھیں ۔ میں نے ان کا یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کیا ، تو آپ نے فرمایا صَدَقَتْ اِنَّهَا بِضْعَةٌ مِّنِّيْ ” انھوں نے درست کہا بیشک وہ میرا ایک جزء ہیں “ ۔

واقعہ افک میں جو سبب حضرت صدیقہ ؓ کے جنگل میں رہ جانے کا پیش آیا وہ یہی تھا کہ ازواج مطہرات ؓ کا پردہ صرف برقع چادر ہی کا نہیں تھا بلکہ وہ سفر میں بھی اپنے ہودج (شغدف) میں رہتی تھیں ، یہ شغدف ہی اونٹ کے اوپر سوار کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اتارا جاتا تھا ، شغدف مسافر کا مثل مکان کے ہوتا ہے ۔ اس واقعہ میں جب قافلہ چلنے لگا تو حسب عادت خادموں نے شغدف کو یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا کہ ام المومنین اس کے اندر موجود ہیں ، اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس میں نہیں تھیں ، بلکہ طبعی ضرورت کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں ۔ اس مغالطہ میں قافلہ روانہ ہوگیا اور ام المومنین جنگل میں تنہا رہ گئیں ۔

یہ واقعہ بھی اس بات کا قوی شاہد ہے کہ حجاب شرعی کا مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات ؓ نے یہی سمجھا تھا کہ عورتیں اپنے مکانوں میں ، سفر میں ہوں تو اپنے شغدف میں رہیں ، ان کا وجود مردوں کے سامنے نہ آئے ، اور جب سفر کی حالت میں حجاب اشخاص کا یہ اہتمام تھا تو حضر میں کتنا اہتمام ہوگا ؟

دوسرا درجہ حجاب بالبرقع

ضرورت کے مواقع میں جب عورت کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلنے کا حکم ہے، جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، یہ سورۂ احزاب کی اس آیت سے ثابت ہے جو آگے آرہی ہے، یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ، ”یعنی اے نبی آپ اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلباب استعمال کریں“، جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے (روی ذلک عن ابن عباسؓ)

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے استعمال جلباب کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپٹی ہوئی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو، صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لئے کھلی ہو، اس آیت کی پوری تفسیر آگے آتی ہے، یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس کو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو، چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو۔

یہ صورت بھی باتفاق فقہاء امت ضرورت کے وقت جائز ہے، مگر احادیث صحیحہ میں اس صورت کے اختیار کرنے پر بھی چند پابندیاں عائد کی ہیں، کہ خوشبو نہ لگائے ہوئے ہو، بجنے والا کوئی زیور نہ پہنا ہو، راستہ کے کنارے پر چلے، مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو وغیرہ۔

تیسرا درجہ پردۂ شرعی کا جس میں فقہاء کا اختلاف ہے

یہ کہ سر سے پیر تک سارا بدن مستور ہو، مگر چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں، جن حضرات نے اِلَّا مَا ظَهَرَ کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی ہے، ان کے نزدیک چونکہ چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب سے مستثنیٰ ہوگئیں، اس لئے ان کو کھلا رکھنا جائز ہوگیا۔ (کما روی عن ابن عباسؓ) اور جن حضرات نے مَا ظَهَرَ سے برقع، جلباب وغیرہ مراد لی ہے وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ (کما روی عن ابن مسعودؓ) جنھوں نے جائز کہا ہے اُن کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اس کا چہرہ ہے، اس لئے اس کو کھولنے میں فتنہ کا خطرہ نہ ہونا شاذ و نادر ہے، اس لئے انجام کار عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کھولنا جائز نہیں۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ تین اماموں نے تو پہلا مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی، خواہ فتنہ کا خوف ہو یا

نہ ہو، امام اعظم ابو حنیفہ نے اگرچہ دوسرا مسلک اختیار فرمایا مگر خوفِ فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا، اور چونکہ عادۃً یہ شرط مفقود ہے، اس لئے فقہاء حنفیہ نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

مذاہب ائمہ اربعہ کی رد بتیں ان مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالہ سے رسالہ تفصیل التحصب جزو احکام القرآن میں مفصل بیان کر دی گئی ہیں، حنفیہ کا اصل مذہب چونکہ چہرے اور ہتھیلیوں کو حجاب سے مستثنیٰ ہونے کا ہے اس لئے اس جگہ مذہب حنفیہ کی چند روایات نقل کی جاتی ہیں جن میں بوجہ خوفِ فتنہ ممانعت کرنے کا حکم مذکور ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّهٗ لَامُلَازَمَةَ بَيْنَ كَوْنِهٖ لَيْسَ عَوْرَةً وَّجَوَازِ النَّظَرِ اِلَيْهِ فَحِلُّ النَّظَرِ مَنُوْطٌ بِعَدَمِ خَشْيَةِ الشَّهْوَةِ مَعَ انْتِفَاءِ الْعَوْرَةِ وَلِذَا حَرُمَ النَّظَرُ اِلٰى وَجْهِهَا وَوَجْهِ الْاَمْرَدِ اِذَا شَكَّ فِى الشَّهْوَةِ وَلَا عَوْرَةَ ،

(فتح القدیر ص ۱۳، ج ۸)

"سمجھ لو کہ کسی عضو کے ستر میں داخل نہ ہونے اور اس کی طرف نظر کے جائز ہونے میں کوئی تلازم نہیں، کیونکہ نظر کا جواز تو اس پر موقوف ہے کہ شہوت کا خطرہ نہ ہو، حالانکہ وہ عضو ستر میں داخل نہیں اسی وجہ سے اجنبی عورت کا چہرہ یا کسی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف نظر کرنا حرام ہے، جب کہ شہوت پیدا ہونے میں شک ہو حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں"

فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے خطرۂ شہوت کی یہ تفسیر بھی معلوم ہو گئی کہ اگرچہ بالفعل کوئی شہوانی نیت نہ ہو مگر ایسا خیال پیدا ہو جانے کا شک ہو۔ جب ایسا شک ہو تو نہ صرف اجنبی عورتوں کے بلکہ بے ریش لڑکوں کے چہرے کو دیکھنا بھی حرام ہے، اور خیالِ شہوت پیدا ہونے کی تشریح جامع الرموز میں یہ کی ہے کہ نفس میں اس کے قریب ہونے کا میلان پیدا ہو جائے، اور یہ ظاہر ہے کہ نفس میں اتنا میلان بھی پیدا نہ ہو، یہ چیز تو سلف کے زمانے میں بھی شاذ تھی۔ حدیث میں حضرت فضل کو ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے دوسری طرف پھیر دینا اس کی واضح دلیل ہے تو اس زمانۂ فساد میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے سے خالی ہے۔

اور شمس الائمہ سرخسی نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کے بعد لکھا ہے:

وَهٰذَا كُلُّهٗ اِذَا لَمْ يَكُنِ النَّظَرُ

"یہ چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف نظر کا

عَنْ شَهْوَةٍ فَإِنْ كَانَ يَعْلَمُ أَنَّهُ إِنْ نَظَرَ اشْتَهَى لَمْ يَحِلَّ لَهُ النَّظَرُ إِلَى شَيْءٍ مِّنْهَا

(مبسوط، ص ۱۵۲، ج ۱۰)

جائز ہونا صرف اس صورت میں ہے جبکہ یہ نظر شہوت سے نہ ہو اور اگر دیکھنے والا جانتا ہے کہ چہرہ دیکھنے سے بُرے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کو عورت کی کسی چیز کی طرف بھی نظر کرنا حلال نہیں۔"

اور علامہ شامیؒ نے ردالمحتار کتاب الکراہیۃ میں فرمایا ہے:۔

فَإِنْ خَافَ الشَّهْوَةَ أَوْ شَكَّ امْتَنَعَ النَّظَرُ إِلَى وَجْهِهَا فَحِلُّ النَّظَرِ مُقَيَّدٌ بِعَدَمِ الشَّهْوَةِ وَإِلَّا فَحَرَامٌ وَهٰذَا فِي زَمَانِهِمْ وَأَمَّا فِي زَمَانِنَا فَمُنِعَ مِنَ الشَّابَّةِ إِلَّا النَّظَرَ لِحَاجَةٍ كَقَاضٍ وَشَاهِدٍ يَحْكُمُ وَيَشْهَدُ وَأَيْضًا قَالَ فِي شُرُوطِ الصَّلٰوةِ وَتُمْنَعُ الشَّابَّةُ مِنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ رِجَالٍ لَا لِأَنَّهُ عَوْرَةٌ بَلْ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ

"اگر شہوت کا خطرہ یا شک ہو تو عورت کے چہرے کی طرف نظر ممنوع ہوگی، کیونکہ نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے اور جب یہ شرط نہ ہو تو حرام ہے، اور یہ بات سلف کے زمانے میں تھی لیکن ہمارے زمانے میں تو مطلقاً عورت کی طرف نظر ممنوع ہے مگر یہ کہ کسی حاجتِ شرعیہ کی وجہ سے نظر کرنا پڑے، جیسے قاضی یا شاہد جن کو کسی معاملہ میں اس عورت کے متعلق شہادت یا فیصلہ دینا پڑے (در شروطِ صلوٰۃ میں فرمایا کہ جوان عورت کو جنبی

[illegible]

خلاصہ اس بحث و اختلافِ فقہاء کا یہ ہے کہ امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے نوجوان عورت کی طرف نظر کرنے کو عادتِ عامہ کی بناء پر سببِ فتنہ قرار دے کر اس کو مطلقاً منع کر دیا، خواہ واقع میں فتنہ ہو یا نہ ہو، جیسے شریعت کے بہت سے احکام میں اس کی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً سفر چونکہ عادۃً مشقت و محنت کا سبب ہوتا ہے، اس لئے خود سفر ہی کو مشقت کا حکم دے کر تمام احکام رخصت کے سفر متحقق ہونے پر دائر کر دیئے خواہ کسی شخص کو سفر میں کوئی بھی مشقت نہ ہو، بلکہ اپنے گھر سے زیادہ آرام ملے، مگر قصرِ نماز اور رخصتِ روزہ وغیرہ کے احکام اس کو بھی شامل ہیں۔ اسی طرح نیند کی حالت میں چونکہ انسان بے خبر ہوتا ہے اور عادۃً ریح خارج ہو جاتی ہیں، اس لئے خود نیند ہی کو

خروج ریح کے قائم مقام قرار دے کر نیند سے وضو ٹوٹ جانے کا حکم دیدیا خواہ واقع میں ریح خارج ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

مگر امام اعظم ابو حنیفہ نے عورت کے چہرے اور ہتھیلیاں کھولنے کو یہ درجہ نہیں دیا کہ چہرہ کھولنے ہی کو فتنہ کا قائم مقام قرار دیدیں، بلکہ حکم اس پر دائر رکھا کہ جہاں فتنہ یعنی عورت کی طرف قریب ہونے کے میلان کا خطرہ یا احتمال ہو وہاں ممنوع ہے اور جہاں یہ احتمال نہ ہو جائز ہے۔ مگر اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ایسا احتمال نہ ہو بالکل شاذ و نادر ہے اس لئے متاخرین فقہاء حنفیہ نے بھی بالآخر وہی حکم دیدیا جو ائمہ ثلاثہ نے دیا تھا، کہ جوان عورت کے چہرے یا ہتھیلیوں کی طرف بھی نظر ممنوع ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اب باتفاق ائمہ اربعہ یہ تیسرا درجہ پردہ کا ممنوع ہو گیا کہ عورت برقع چادر وغیرہ میں پورے بدن کو چھپا کر صرف چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھول کر مردوں کے سامنے آئے، اس لئے اب پردے کے صرف پہلے ہی دو درجے رہ گئے، ایک اصل مقصود یعنی عورتوں کا گھروں کے اندر رہنا بلا ضرورت باہر نہ نکلنا، اور دوسرے یعنی برقع وغیرہ کے ساتھ نکلنا ضرورت کی بناء پر بوقت ضرورت و بقدر ضرورت۔

مسئلہ: پردہ کے احکام مذکورہ میں بعض صورتیں مستثنیٰ بھی ہیں، مثلاً بعض مرد یعنی محرم پردہ سے مستثنیٰ ہیں اور بعض عورتیں مثلاً بہت بوڑھی وہ بھی پردے کے عام حکم سے کسی قدر مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تفصیل کچھ تو سورۂ نور میں گذر چکی ہے کچھ آگے سورۂ احزاب کی ان آیات میں آئے گی جن میں یہ استثناء مذکور ہے۔

پردہ کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اپنے رسالہ تفصیل الخطاب فی احکام الحجاب کا کچھ خلاصہ یہاں لکھ دیا ہے جو عوام کے لئے کافی ہے، پوری تحقیق مطلوب ہو تو رسالہ مذکورہ میں دیکھی جا سکتی ہے، یہ رسالہ احکام القرآن تفسیر سورۂ احزاب میں شائع ہو چکا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	
اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان	والو!
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾	
رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر	

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ کا حق عظمت جو تمہارے ذمہ ہے ادا ہو جاوے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خصوصیات و امتیازات کا ذکر تھا، جن کے ضمن میں ازواج مطہرات کے پردہ کا حکم آیا تھا، اور آگے بھی کچھ احکام پردے کے آئیں گے، درمیان میں اس چیز کا حکم دیا گیا جس کے لئے یہ سب خصوصیات و امتیازات رکھے گئے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا اظہار اور آپ کی عظمت و محبت اور اطاعت کی ترغیب ہے۔

اصل مقصود آیت کا مسلمانوں کو یہ حکم دینا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کریں، مگر اس کی تعبیر و بیان میں اس طرح فرمایا کہ پہلے حق تعالیٰ نے خود اپنا اور اپنے فرشتوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عمل صلوٰۃ کا ذکر فرمایا، اس کے بعد عام مؤمنین کو اس کا حکم دیا، جس میں آپ کے شرف اور عظمت کو اتنا بلند فرما دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جس کام کا حکم مسلمانوں کو دیا جاتا ہے وہ کام ایسا ہے کہ خود حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی وہ کام کرتے ہیں تو عام مؤمنین جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بے شمار ہیں ان کو تو اس عمل کا بڑا اہتمام کرنا چاہئے۔ اور ایک فائدہ اس تعبیر میں یہ بھی ہے کہ اس سے درود و سلام بھیجنے والے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام میں شریک فرما لیا جو کام حق تعالیٰ خود بھی کرتے ہیں اور اس کے فرشتے بھی۔

صلوٰۃ و سلام کے معنی لفظ صلوٰۃ عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، رحمت، دعاء، مدح و ثناء، آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے، اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ ان کا آپ کے لئے دعاء کرنا ہے، اور عام مؤمنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دعاء اور مدح و ثناء کا مجموعہ ہے۔ عامۂ مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے

ابو العالیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے مراد آپؐ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے مدح و ثناء ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپؐ کو بلند مرتبہ عطا فرمایا کہ اکثر مواقع اذان و اقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپؐ کا ذکر شامل کر دیا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلا دیا، اور غالب کیا، اور آپؐ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا، اس کے ساتھ آپؐ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا، اور آخرت میں آپؐ کی تعظیم یہ ہے کہ آپؐ کا مقام تمام خلائق سے بلند و بالا کیا، اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی اس حال میں آپؐ کو مقام شفاعت عطا فرمایا، جس کو مقام محمود کہا جاتا ہے۔

اس معنی پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں تو روایاتِ حدیث کے مطابق آپؐ کے ساتھ آپؐ کے آل و اصحاب کو بھی شامل کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور مدح و ثناء میں آپؐ کے سوا کسی کو کیسے شریک کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب روح المعانی وغیرہ میں یہ دیا گیا ہے کہ تعظیم اور مدح و ثناء وغیرہ کے درجات بہت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، اور ایک درجہ میں آل و اصحاب اور عام مؤمنین بھی شامل ہیں۔

ایک شبہ کا جواب اور ایک لفظ صلوٰۃ سے بیک وقت متعدد معنی رحمت، دعاء، تعظیم و ثناء مراد لینا جو اصطلاح میں عمومِ مشترک کہلاتا ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک وہ جائز نہیں، اس لئے اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے اس جگہ ایک ہی معنی لئے جائیں، یعنی آپ کی تعظیم اور مدح و ثناء اور خیر خواہی، پھر یہ معنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا حاصل رحمت ہوگا، اور فرشتوں کی طرف منسوب ہوں تو دعاء و استغفار ہوگا، عام مؤمنین کی طرف منسوب کیا جائے تو دعاء اور مدح و ثناء و تعظیم کا مجموعہ ہوگا۔

اور لفظ سلام مصدر بمعنی السلامۃ ہے، جیسے ملام بمعنی ملامت مستعمل ہوتا ہے، اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے۔ اور السلام علیک کے معنی یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے۔ اور عربی زبان کے قاعدے سے یہاں حرف علیٰ کا موقع نہیں، مگر چونکہ لفظ سلام معنی ثناء کو متضمن ہے، اس لئے حرف علیٰ کے ساتھ عَلَیْکَ یا عَلَیْکُمْ کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہاں لفظ سلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے۔

کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے تو مراد السّلامُ علیکَ کی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت و رعایت پر متولی اور کفیل ہے۔

صلوٰۃ وسلام کا طریقہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ سب کتب حدیث میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت کعب بن عجرہؓ نے فرمایا کہ (جب یہ آیت نازل ہوئی تو) ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ (آیت میں ہمیں دو چیزوں کا حکم ہے صلوٰۃ اور سلام) سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے (کہ السّلامُ علیکَ ایُّھا النّبیُّ کہتے ہیں) صلوٰۃ کا طریقہ بھی بتلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ الفاظ کہا کرو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔ دوسری روایت میں اس میں کچھ کلمات اور بھی منقول ہیں۔

اور صحابہ کرام کے سوال کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کو سلام کرنے کا طریقہ تو تشہد (یعنی التحیات) میں پہلے سکھایا جا چکا تھا کہ السّلامُ علیکَ ایُّھا النّبیُّ ورحمۃُ اللہِ وبرکاتُہٗ کہا جائے۔ اس لئے لفظ صلوٰۃ میں انہوں نے اپنی طرف سے الفاظ مقرر کرنا پسند نہیں کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے الفاظ صلوٰۃ متعین کرا لیے۔ اسی لئے نماز میں عام طور پر انہی الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ کو اختیار کیا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی ایسا تعین نہیں جس میں تبدیلی ممنوع ہو، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ یعنی درود شریف کے بہت سے مختلف صیغے منقول و ماثور ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کے حکم کی تعمیل ہر اس صیغہ سے ہو سکتی ہے جس میں صلوٰۃ وسلام کے لفظ ہوں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعینہٖ منقول بھی ہوں، بلکہ جس عبارت سے بھی صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ادا کئے جائیں اس حکم کی تعمیل اور درود شریف کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں وہ زیادہ بابرکت اور زیادہ ثواب کے موجب ہیں، اسی لئے صحابہ کرامؓ نے الفاظ صلوٰۃ آپ سے **متعین کرانے کا سوال فرمایا تھا۔**

مسئلہ: قعدۂ نماز میں تو قیامت تک الفاظ صلوٰۃ وسلام اسی طرح کہنا مسنون ہے، جس طرح اوپر منقول ہوئے ہیں اور خارج نماز میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مخاطب ہوں جیسا کہ آپ کے عہد مبارک میں وہاں تو وہی الفاظ الصّلوٰۃ والسّلامُ علیکَ کے اختیار کئے جائیں۔ آپ کی وفات کے بعد روضۂ اقدس کے سامنے

جب سلام عرض کیا جائے تو اس میں بھی صیغۂ السلام علیک کا اختیار کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ جہاں غائبانہ صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے تو صحابہ و تابعین اور ائمہ امت سے صیغۂ غائب کا استعمال کرنا منقول ہے، مثلاً صلی اللہ علیہ وسلم" جیسا کہ عام محدثین کی کتابیں اس سے لبریز ہیں۔

صلوٰۃ و سلام کے مذکورہ طریقہ کی حکمت

جو طریقہ صلوٰۃ و سلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور آپ کے عمل سے ثابت ہوا اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم سب مسلمان آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے رحمت و سلامتی کی دعا کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقصود آیت کا تو یہ تھا کہ ہم آپ کی تعظیم و تکریم کا حق خود ادا کریں، مگر طریقہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعظیم و اطاعت پورا ادا کرنا ہمارے کسی کے بس میں نہیں، اس لئے ہم پر یہ لازم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں (روح)

صلوٰۃ و سلام کے احکام

نماز کے قعدۂ اخیرہ میں صلوٰۃ (درود شریف) سنت مؤکدہ تو سب کے نزدیک ہے، امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک واجب ہے، جس کے ترک سے نماز واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: اس پر بھی جمہور فقہاء کا اتفاق ہے جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے یا سنے تو اس پر درود شریف واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں آپ کے ذکر مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وعید آئی ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ "یعنی ذلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (قال الترمذی حدیث حسن ورواہ ابن السنی باسناد جید)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے اَلْبَخِيْلُ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ "یعنی بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے" (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

مسئلہ: اگر ایک مجلس میں آپ کا ذکر مبارک بار بار آئے تو صرف ایک مرتبہ درود پڑھنے سے واجب ادا ہو جاتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکر مبارک خود کرے یا کسی سے سنے ہر مرتبہ درود شریف پڑھے۔ حضرات محدثین سے زیادہ کون آپ کا ذکر کر سکتا ہے کہ ان کا ہر وقت کا مشغلہ ہی حدیث رسولؐ ہے، جس میں ہر وقت بار بار آپ کا

ذکر آتا ہے تمام محدثین کا دستور یہی رہا ہے کہ ہر مرتبہ درود و سلام پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ تمام کتب حدیث اس پر شاہد ہیں۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ اس تکرار صلوٰۃ وسلام سے کتاب کی ضخامت کافی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اکثر تو چھوٹی چھوٹی حدیثیں آتی ہیں جن میں یک دو سطر کے بعد نام مبارک آتا ہے، اور بعض جگہ تو ایک سطر میں ایک سے زیادہ مرتبہ نام مبارک مذکور ہوتا ہے، حضرات محدثین کہیں صلوٰۃ وسلام ترک نہیں کرتے۔

مسئلہ: جس طرح زبان سے ذکر مبارک کے وقت زبانی صلوٰۃ وسلام واجب ہے اسی طرح قلم سے لکھنے کے وقت صلوٰۃ وسلام کا قلم سے لکھنا بھی واجب ہے، اور اس میں جو لوگ حروف کا اختصار کر کے "صلعم" لکھ دیتے ہیں یہ کافی نہیں پورا صلوٰۃ وسلام لکھنا چاہئے۔

مسئلہ: ذکر مبارک کے وقت افضل و اعلیٰ اور مستحب تو یہی ہے کہ صلوٰۃ اور سلام دونوں پڑھے اور لکھے جائیں، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے ایک یعنی صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفا کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔ شیخ الاسلام نووی وغیرہ نے دونوں میں سے صرف ایک پر اکتفا کرنے کو مکروہ فرمایا ہے۔ ابن حجر ہیثمی نے فرمایا کہ ان کی مراد کراہت سے خلاف اولیٰ ہونا ہے جس کو اصطلاح میں مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے۔ اور سلف امت کا مسلسل عمل اس پر شاہد ہے کہ وہ دونوں ہی کو جمع کرتے ہیں، اور بعض اوقات ایک پر بھی اکتفاء کر لیتے ہیں۔

مسئلہ: لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے لئے استعمال کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ امام بیہقی نے اپنے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے:۔ لَا یُصَلِّیْ عَلٰی اَحَدٍ اِلَّا عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ یُدْعٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ بِالْاِسْتِغْفَارِ

امام شافعیؒ کے نزدیک غیر نبی کے لئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال مستقلاً مکروہ ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے، البتہ تبعاً جائز ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کے ساتھ آل و اصحاب یا تمام مؤمنین کو شریک کر لے اس میں مضائقہ نہیں۔

اور امام جوینیؒ نے فرمایا کہ جو حکم لفظ صلوٰۃ کا ہے وہی لفظ سلام کا بھی ہے کہ غیر نبی کے لئے اس کا استعمال درست نہیں، بجز اس کے کہ کسی کو خطاب کرنے کے وقت بطور تحیۃ کے السلام علیکم کہے، یہ جائز و مسنون ہے۔ مگر کسی غائب کے نام کے ساتھ

کی ایذاء سے روکنا اور اس پر وعید کرنا مقصود ہے۔ مگر آیت میں ایذاء رسول کو ایذاء حق تعالیٰ کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا، یعنی جب آپ کو ایذاء پہونچی تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو ایذاء پہنچانا ہے جیسا کہ حدیث میں آگے آتا ہے۔ اور قرآن کے سیاق و سباق سے بھی ترجیح اسی دوسرے قول کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پہلے بھی ایذاء رسول کا بیان تھا اور آگے بھی اسی کا بیان آرہا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا اللہ تعالیٰ کے لئے ایذاء ہونا حضرت عبدالرحمٰن بن مغفل مزنی رضؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ:-

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ وَمَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَمَنْ اٰذَى اللّٰهَ يُوْشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ (ترمذی)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو ان کو میرے بعد اپنے اعتراضات و تنقیدات کا نشانہ نہ بناؤ، کیونکہ ان سے جس نے محبت کی میری محبت کی وجہ سے کی اور جس نے بغض رکھا میرے بغض کی وجہ سے رکھا، اور جس نے ان کو ایذاء پہونچائی اس نے مجھے ایذاء دی اور جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ کو ایذاء دی اور جس نے اللہ کو ایذاء دی تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو گرفت میں لے لے۔"

اس حدیث سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء سے اللہ تعالیٰ کی ایذاء ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو ایذاء پہونچانا یا ان کی شان میں گستاخی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء ہے۔

اس آیت کے شان نزول کے متعلق متعدد روایات ہیں بعض میں ہے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہؓ پر بہتان لگانے کے متعلق نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جس زمانہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ پر بہتان باندھا گیا تو عبداللہ بن ابی منافق کے گھر میں کچھ لوگ جمع ہوتے اور اس بہتان کو پھیلانے چلتا کرنے کی باتیں کرتے تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے اس کی شکایت فرمائی کہ یہ شخص مجھے ایذاء پہنچاتا ہے (مظہری)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت صفیہؓ سے نکاح کے وقت کچھ منافقین نے طعن کیا اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت ہر ایسے معاملہ کے متعلق

نازل ہوئی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہونچے، اس میں صدیقہ عائشہ پر بہتان بھی داخل ہے اور حضرت صفیہؓ اور زینبؓ کے نکاحوں پر طعن وتشنیع بھی شامل ہے دوسرے صحابہ کرام کو بُرا کہنا، ان پر تبرّا کرنا بھی داخل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہنچانا کفر ہے

مسئلہ: جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح کی ایذا پہنچائے، آپ کی ذات یا صفات میں کوئی عیب نکالے خواہ صراحۃً ہو یا کنایۃً وہ کافر ہوگیا، اور اس آیت کی رُو سے اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت دنیا میں بھی ہوگی اور آخرت میں بھی (کذا قال القاضی ثناء اللہ فی التفسیر المظہری)

دوسری آیت میں عام مومنین کو ایذا پہونچانے کے حرام اور بہتان عظیم ہونے کو بیان کیا ہے جبکہ وہ شرعاً اس کے مستحق نہ ہوں۔ عام مومنین میں یہ قید اس لئے لگائی کہ ان میں دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کے بدلے میں اس کو ایذاء دینا شرعاً جائز ہے، اور پہلی آیت میں چونکہ معاملہ اللہ و رسول کی ایذاء کا تھا اس میں کوئی قید نہیں لگائی اس لئے کہ وہاں جائز ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔

کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی دُکھ پہونچانا حرام ہے

مذکورہ آیت میں اَلَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ سے اِثْمًا مُّبِيْنًا تک سے کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی کے کسی قسم کی ایذاء اور دُکھ پہنچانے کی حرمت ثابت ہوئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

”مسلمان تو صرف وہ آدمی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ ہوں، کسی کو تکلیف نہ پہونچے، اور مؤمن تو صرف وہی ہے جس سے لوگ اپنے خون اور مال کے معاملہ میں محفوظ و مامون ہوں“	اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اٰمَنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَآئِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ رضی (مظہری)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ

اے نبی کہدے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ

نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو

فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ

تو ان کو کوئی نہ ستائے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان اگر باز نہ آئے

الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي

منافق اور جن کے دل میں روگ ہے اور جھوٹی خبریں اڑانے والے

الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٠﴾

مدینہ میں تو ہم تجھ کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر نہ رہنے پائیں گے تیرے ساتھ اس شہر میں مگر تھوڑے دن

مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ

پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے جان سے دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا

فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾

ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے ہیں اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی چال بدلتی

خُلاصۂ تفسیر

اے پیغمبر اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ نیچی کر لیا کریں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کریں گی (یعنی کسی ضرورت سے باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور چہرہ بھی چھپایا جائے جیسا کہ سورۂ نور کے ختم کے قریب غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ میں اس کی تفسیر روایت سے گذر چکی ہے، چونکہ کنیزوں کے لئے فی نفسہ داخل ستر نہیں، اور چہرہ کھولنے میں ان کو آزاد عورتوں سے زیادہ رخصت ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہیں، اس لئے کام کاج کے لئے ان کو باہر نکلنے اور چہرہ وغیرہ کھولنے کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے بخلاف آزاد عورتوں کے کہ وہ اتنی مجبور نہیں، اور چونکہ اوباش لوگ آزاد عورتوں کو چھیڑنے کی ہمت ان کی خاندانی وجاہت وغیرہ کی وجہ سے نہ کرتے تھے، کنیزوں کو چھیڑتے تھے، بعض اوقات کنیزوں کے دھوکے میں آزاد عورتوں کو بھی چھیڑنے لگتے تھے، اس لئے اس آیت نے آزاد عورتوں کو کنیزوں سے ممتاز کرنے کے لئے بھی اور اس لئے بھی کہ سر اور گردن وغیرہ ان کا ستر میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج و بنات اور عام مسلمانوں کی بیبیوں کو یہ حکم دیکر

اپنا یہی دستور (جاری) رکھا ہے جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں (کہ ان کو آسمانی سزا یا انبیاء کے ہاتھ سے جہاد کے ذریعہ سزائیں دلوائی ہیں، پس اگر پہلے ایسا نہ ہوتا تو ایسی سزا میں کچھ استبعاد ہو سکتا تھا، اور اب تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں) اور آپ اللہ تعالیٰ کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) ردوبدل نہ پاویں گے (کہ خدا تو کوئی حکم جاری کرنا چاہے اور کوئی اس کو روک سکے، لفظ سنۃ اللہ میں تو اس کا اظہار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا، اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا، میں یہ بتلا دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کو ایذا پہونچانے کا حرام اور گناہ کبیرہ ہونا، اور خصوصاً سید المؤمنین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا کفر موجب لعنت ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ منافقین کی طرف سے دو طرح کی ایذائیں سب مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچتی تھیں، آیاتِ مذکورہ میں ان ایذاؤں کے انسداد کا انتظام ہے، اور اس کے ضمن میں عورتوں کے پردے کے کچھ مزید احکام کا بیان ایک مناسبت سے آیا ہے جو آگے معلوم ہو جائے گی۔ ان دونوں ایذاؤں میں ایک یہ تھی کہ منافقین کے عوام اور آوارہ قسم کے لوگ مسلمانوں کی باندیوں کنیزوں کو جب وہ کام کاج کے لئے باہر نکلتیں چھیڑا کرتے تھے، اور کبھی کنیزوں کے شبہ میں حرائر کو ستاتے تھے، جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہونچتی تھی۔

دوسری ایذاء یہ تھی کہ یہ لوگ ہمیشہ ایسی جھوٹی خبریں اڑاتے تھے کہ اب فلاں غنیم مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے وہ سب کو ختم کر دے گا۔ آیات مذکورہ میں پہلی ایذاء سے حرائر (آزاد بیبیوں) کو بچانے کا فوری اور سہل انتظام یہ ہو سکتا تھا کہ ان کو یہ لوگ ان کے خاندان کی وجاہت اور حمایت کی وجہ سے بالقصد چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے تھے، کبھی کنیزوں کے شبہ میں یہ بھی ان کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آجاتی تھیں، اگر ان کی پہچان ہو جاتی تو یہ نوبت نہ آتی، اس لئے ضرورت پیش آئی کہ حرائر کا کوئی خاص امتیاز ہو جائے تاکہ آسانی کے ساتھ خود بخود ہی کم از کم حرائر تو ان شریروں کے فساد سے فوری طور پر محفوظ ہو جائیں اور کنیزوں کا دوسرا انتظام کیا جائے۔

دوسری طرف شریعتِ اسلام نے حرائر اور کنیزوں کے پردۂ شرعی میں بضرورت

ایک فرق بھی رکھا ہے کہ کنیزوں کا شرعی پردہ وہ ہے جو حرائر کا اپنے محرموں کے سامنے ہوتا ہے کہ مثلاً چہرہ وغیرہ کھولنا جو حرائر کے لئے اپنے محرموں کے سامنے جائز ہے، کنیزوں کے لئے باہر بھی اس کی اجازت اس لئے دی گئی کہ ان کا کام ہی اپنے آقا اور اس کے گھر کی خدمت ہے جس میں ان کو باہر بھی بار بار نکلنا پڑتا ہے، اور چہرہ و ہاتھ مستور رکھنا مشکل ہوتا ہے، بخلاف حرائر کے کہ ان کو کسی ضرورت سے باہر نکلنا بھی پڑے تو کبھی کبھی ہوگا جس میں پورے پردے کی رعایت مشکل نہیں، اس لئے حرائر کو یہ حکم دیدیا گیا کہ وہ لمبی چادر جس میں مستور ہو کر نکلتی ہیں اس کو اپنے سر پر سے چہرے کے سامنے لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہ آئے اس سے ان کا پردہ بھی مکمل ہوگیا، اور باندیوں کنیزوں سے امتیاز خاص بھی ہوگیا، جس کے سبب وہ شریر لوگوں کی چھیڑ چھاڑ سے خود بخود مامون ہوگئیں۔ اور کنیزوں کی حفاظت کا انتظام ان منافقین کو سزا کی وعید سنا کر کیا گیا کہ اس سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی اپنے نبی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوائیں گے۔

آیت مذکورہ میں حرہ (آزاد) عورتوں کے پردہ کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ، اس میں یُدْنِیْنَ، اِدْنَاءٌ سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی قریب کرنے کے ہیں اور لفظ عَلَیْهِنَّ کے معنی اپنے اوپر اور جلابیب جمع جلباب کی ہے وہ ایک خاص لمبی چادر کو کہا جاتا ہے، اس چادر کی ہیئت کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ چادر ہے جو دوپٹہ کے اوپر اوڑھی جاتی ہے (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی ہیئت یہ بیان فرمائی ہے:۔

أَمَرَ اللّٰهُ نِسَاءَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا خَرَجْنَ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ فِيْ حَاجَةٍ أَنْ يُّغَطِّيْنَ وُجُوْهَهُنَّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِنَّ بِالْجَلَابِيْبِ وَيُبْدِيْنَ عَيْنًا وَّاحِدَةً (ابن کثیر)

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپالیں اور صرف ایک آنکھ (راستہ دیکھنے کے لئے) کھلی رکھیں"

اور امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانیؒ سے اس آیت کا مطلب اور جلباب کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے سر کے اوپر سے چادر چہرہ پر لٹکا کر چہرہ چھپا لیا، اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھ کر اِدْنَاء و جلباب کی تفسیر عملاً بیان فرمائی۔

سر کے اوپر سے چہرہ پر چادر لٹکانا جو حضرت ابن عباسؓ اور عبیدہ سلمانی کے بیان میں آیا ہے یہ لفظ یُدْنِیْنَ کی تفسیر ہے کہ اپنے اوپر چادر کو قریب کرنے کا مطلب چادر کو سر کے اوپر سے چہرہ پر لٹکانا ہے۔

اس آیت نے بصراحت چہرہ کے چھپانے کا حکم دیا ہے جس سے اس مضمون کی کامل تائید ہوگئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے، کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی نفسہ ستر میں داخل نہیں مگر بوجہ خوفِ فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

تنبیہ ضروری اس آیت میں حرہ عورتوں کو ایک خاص طرح کے پردہ کی ہدایت فرمائی کہ چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرے کو چھپا لیں، تاکہ عام کنیزوں سے ان کا امتیاز ہو جائے اور یہ شریر لوگوں کے فتنہ سے محفوظ ہو جائیں۔ مذکور الصدر بیان میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام نے عصمت عفت کی حفاظت میں حرائر اور کنیزوں کے درمیان کوئی فرق کر دیا کہ حرائر کی حفاظت کرائی، کنیزوں کو چھوڑ دیا، بلکہ درحقیقت یہ فرق اوباش شریر لوگوں نے خود کر رکھا تھا، کہ حرائر پر دست اندازی کی تو جرأت و ہمت نہیں کرتے تھے، مگر اماء یعنی کنیزوں کو چھیڑتے تھے، شریعت اسلام نے ان کے اختیار کردہ اس فرق سے یہ فائدہ اٹھایا کہ عورتوں کی اکثریت تو خود انہی کے مسلمہ عمل کے ذریعہ خود بخود محفوظ ہو جاتی ہے، باقی رہا کنیزوں کا معاملہ سو ان کی عصمت کی حفاظت بھی اسلام میں ایسی ہی فرض و ضروری ہے جیسی حرائر کی۔ مگر اس کے لئے قانونی تشدد اختیار کئے بغیر چارہ نہیں، تو اگلی آیت میں اس کا قانون بتلا دیا کہ جو لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئیں گے ان کو کسی طرح معاف نہ کیا جائے گا، بلکہ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے، اور قتل کر دیئے جائیں گے اس نے کنیزوں کی عصمت کو بھی حرائر کی طرح محفوظ کر دیا۔

اس سے واضح ہو گیا کہ علامہ ابن حزم وغیرہ نے جو مذکورہ شبہ سے بچنے کے لئے آیت کی تفسیر جمہور علماء سے مختلف کرنے کی تاویل کی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، یہ شبہ تو جب ہوتا جبکہ کنیزوں کی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا ہوتا۔

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جائے اس کی سزا قتل ہے آیت مذکورہ میں منافقین کی دو شرارتوں کا ذکر کر کے ان کے باز نہ آنے کی صورت میں جس سزا کا ذکر کیا گیا ہے کہ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا، یعنی یہ لوگ جہاں رہیں گے لعنت

اور پھٹکار ان کے ساتھ ہوگی، اور جہاں ملیں گے گرفتار کئے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے، یہ سزا عام کفار کی نہیں، بے شمار نصوص قرآن و سنت اس پر شاہد ہیں کہ عام کفار کے لئے شریعتِ اسلام میں یہ قانون نہیں ہے، بلکہ قانون یہ ہے کہ اول ان کو دعوتِ اسلام دی جائے ان کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اس پر بھی وہ اسلام نہ لائیں تو مسلمانوں کے تابع ذمی بن کر رہنے کا حکم دیا جائے، اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی طرح فرض ہو جاتی ہے، ہاں جو اس کو بھی قبول نہ کریں اور جنگ ہی پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے کا حکم ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو مطلقاً قید و قتل کی سزا سنائی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاملہ منافقین کا تھا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور جب کوئی مسلمان احکامِ اسلام کی کھلی مخالفت اور انکار کرنے لگے تو وہ اصطلاحِ شرع میں مرتد کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ شریعتِ اسلام میں کوئی مصالحت نہیں، بجز اس کے کہ وہ تائب ہو کر پھر مسلمان ہو جائے، اور احکامِ اسلام کو قول و عمل تسلیم کرے ورنہ پھر اس کو قتل کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور صحابہ کرام کے اجماعی تعامل سے ثابت ہے۔ مسیلمہ کذاب اور اس کی جماعت کے خلاف باجماع صحابہ جنگ و جہاد اور مسیلمہ کا قتل اس کی کافی شہادت ہے، اور آخر آیت میں اس کو اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت و دستور قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء سابقین کی شرائع میں بھی مرتد کی سزا قتل ہی تھی۔

مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں ان سزاؤں کو عام کفار کے ضابطہ میں لانے کے لئے جو توجیہ کی گئی ہے اس تقریر سے اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

چند مسائل | اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ :-

(۱) عورتوں کو جب کسی ضرورت کی بناء پر گھر سے نکلنا پڑے تو لمبی چادر سے تمام بدن چھپا کر نکلیں، اور اس چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرہ بھی چھپا کر چلیں، مروجہ برقع بھی اس کے قائم مقام ہے۔

(۲) مسلمانوں میں ایسی افواہیں پھیلانا حرام ہے جن سے ان کو تشویش اور پریشانی ہو اور نقصان پہونچے۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَا

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو، تو کہہ اس کی خبر ہے اللہ ہی کے پاس اور تو کیا

يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿٦٣﴾ إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ

جانے شاید وہ گھڑی پاس ہی ہو۔ بے شک اللہ نے پھٹکار دیا ہے منکروں کو

وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ﴿٦٤﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا

اور رکھی ہے ان کے واسطے دہکتی آگ۔ رہا کریں اسی میں ہمیشہ نہ پائیں کوئی حمایتی

وَلَا نَصِيرًا ﴿٦٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ

اور نہ مددگار۔ جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے ان کے منہ آگ میں کہیں گے

يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا

کیا اچھا ہوتا جو ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔ اور کہیں گے اے رب ہم نے

أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَا آتِهِمْ

کہا مانا اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا پھر انھوں نے چوکا دیا ہم کو راہ سے۔ اے رب اُن کو دے

ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٨﴾ ع

دُونا عذاب اور پھٹکار ان کو بڑی پھٹکار۔

خلاصۂ تفسیر

یہ (منکر) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق (منکرانہ) سوال کرتے ہیں (کہ کب ہوگی) آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے کہ اس (کے وقت) کی خبر بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور آپ کو کیا خبر (کہ کب ہے، البتہ اجمالاً ان لوگوں کو جان رکھنا چاہئے کہ) عجب نہیں کہ قیامت ابھی واقع ہو جائے (کیونکہ جب کوئی وقت معین نہیں تو قریب زمانے میں اُس کے وقوع ہو جانے کا بھی احتمال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ انجام سے ڈرتے اور اس کی تیاری میں لگتے، منکرانہ سوالات اور استہزاء سے بچتے۔

اور قیامت کو قریب فرمانے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قیامت ہر روز قریب ہی ہوتی جا رہی ہے، اور جو چیز سامنے سے آ رہی ہو اس کو قریب ہی سمجھنا دانشمندی ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی قیامت کو قریب کہا جا سکتا ہے کہ قیامت کے ہولناک واقعات اور اشتداد کے پیش نظر یہ ساری دنیا کی عمر بھی قلیل نظر آوے گی، اور ہزاروں سال کی یہ مدت چند روز

کی برابر محسوس ہوگی)، بے شک اللہ تعالیٰ نے کافروں کو رحمت سے دور کر رکھا ہے، اور ان کے لئے آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، (اور) نہ کوئی یار پائیں گے اور نہ کوئی مددگار، جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے (یعنی چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے کبھی چہرے کی اس کروٹ پر کبھی دوسری کروٹ پر اور اس وقت غایت حسرت سے) یوں کہیں گے اے کاش ہم نے (دنیا میں) اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی (تو آج اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے) اور (حسرت کے ساتھ اپنے گمراہ کرنے والوں پر غصہ آئے گا تو) یوں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں کا، (یعنی اہل حکومت کا) اور اپنے بڑوں کا (جن میں کسی دوسری وجہ سے یہ صفت پائی جاتی تھی ان کی بات ماننا اور اتباع کرنا ہمارے ذمے ضروری تھا) کہنا مانا تھا سو انہوں نے ہم کو (سیدھے) رستے سے گمراہ کیا تھا اے ہمارے رب ان کو دوہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت کیجئے (یہ ایسا مضمون ہے جیسا سورۂ اعراف کے چوتھے رکوع میں پہلے آچکا ہے، رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ جس کا جواب اسی آیت میں یہ بیان فرمایا ہے لِكُلٍّ ضِعْفٌ)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں لعنت و عذاب کی وعید سنائی گئی تھی، اور کفار کے بہت سے فرقے خود قیامت اور آخرت ہی کے منکر تھے اور انکار کی وجہ سے بطور استہزاء کے پوچھا کرتے تھے کہ وہ قیامت کب آئے گی؟ آخر سورۃ میں ان کا جواب مذکورہ آیات میں دیا گیا ہے، جن کی تفسیر اوپر آچکی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ

اے ایمان والو تم مت ہو ان جیسے جنہوں نے ستایا موسیٰ کو پھر بے عیب دکھلایا

اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اس کو اللہ نے ان کے کہنے سے اور تھا اللہ کے یہاں آبرو والا۔ اے ایمان والو

اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ

ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی، کہ سنوار دے تمہارے واسطے

أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

تمہارے کام اور بخش دے تم کو تمہارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾

تو اس نے پائی بڑی مراد۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے (ایک تہمت تراش کر) موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذا دی تھی سو ان کو خدا تعالیٰ نے بری ثابت کر دیا اس چیز سے جو وہ کہتے تھے (یعنی ان کو کچھ نقصان نہ پہنچا تہمت لگانے والے ہی کذاب اور مستحق سزا ٹھہرے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اللہ کے نزدیک بڑے معزز (پیغمبر) تھے (اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت ظاہر فرما دی) جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے اس طرح کی تہمتوں سے برأت معلوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسول کی مخالفت کر کے ان کو ایذا مت دینا کیونکہ ان کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے ورنہ اس کے نتیجہ میں تم خود اپنا ہی نقصان کرو گے اس لئے ہر کام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنا جس کا حکم آگے آتا ہے کہ) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور (بالخصوص کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کرو) راستی کی بات کہو (جس میں عدل و اعتدال سے تجاوز نہ ہو) اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا (کچھ ان اعمال کی برکت سے کچھ توبہ کی برکت سے جو تقویٰ اور قول سدید میں داخل ہے) اور (یہ ثمرات اطاعت کے ہیں اور طاعت ایسی چیز ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں اللہ و رسول کی ایذا کا مہلک اور خطرناک ہونا بیان کیا گیا تھا اس آیت میں خاص طور سے مسلمانوں کو اللہ و رسول کی مخالفت سے بچنے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ مخالفت ان کی ایذا کا سبب ہے۔

پہلی آیت میں ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جس میں ان کی قوم نے ان کو ایذا پہنچائی تھی ذکر کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ اس کے لئے یہ ضروری

نہیں کہ مسلمانوں سے کوئی ایسا کام سرزد ہوا ہو بجز منافقین کے تمام کے طور پر ان کو یہ قصہ سُن کر بدبیت کی گئی ہے۔ اور ایک روایت میں جو قصہ بعض صحابہ کا منقول ہے اس کا محمل یہی ہے کہ ان کو اس وقت اس طرف توجہ نہ ہوئی ہوگی کہ یہ کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا موجب ہے۔ بالقصد ایذاء پہونچانے کا کسی صحابی سے امکان نہیں، جتنے قصے بالقصد ایذاء کے ہیں وہ سب منافقین کے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما کر اس آیت کی تفسیر بیان فرما دی ہے جس کو امام بخاری نے کتاب التفسیر اور کتاب الانبیاء میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حیاء کرنے والے اور اپنے بدن کو چھپانے والے تھے۔ ان کے بدن کو کوئی نہ دیکھتا تھا جب غسل کی ضرورت ہوتی تو پردہ کے اندر غسل کرتے تھے۔ ان کی قوم بنی اسرائیل میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ مرد سب کے سامنے ننگے ہو کر نہاتے تھے، تو بعض بنی اسرائیل کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام جو سب کے سامنے نہیں نہاتے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے، یا تو برص ہے یا خصیتیں بہت بڑھے ہوئے ہیں، یا کوئی اور آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس طرح کے عیوب سے براءت کا اظہار فرما دیں۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام نے خلوت میں غسل کرنے کے لئے اپنے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے، جب غسل سے فارغ ہو کر اپنے کپڑے لینا چاہا تو یہ پتھر بحکم خداوندی حرکت میں آ گیا، اور کپڑے لے کر بھاگنے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی اٹھا کر پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے ثوبی حجر ثوبی حجر، یعنی اے پتھر میرے کپڑے، اے پتھر میرے کپڑے، مگر پتھر چلتا رہا یہاں تک کہ یہ پتھر ایسی جگہ جا کر ٹھہرا جہاں بنی اسرائیل کا ایک مجمع تھا، اس وقت بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو سر سے پاؤں تک ننگا دیکھا تو بہترین صحیح وسالم بدن دیکھا، جس میں ان کا منسوب کیا ہوا کوئی عیب نہ تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی براءت ان عیوب سے سب کے سامنے ظاہر فرما دی۔ پتھر یہاں پہنچ کر ٹھہر گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے اٹھا کر پہن لئے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو لاٹھی سے مارنا شروع کیا۔ خدا کی قسم اس پتھر میں موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے تین یا چار یا پانچ اثر قائم ہو گئے۔

یہ واقعہ بیان فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ یعنی آیت مذکورہ کا اٰذَوْا مُوْسٰى کا آیت مذکورہ میں

موسیٰ علیہ السلام کی جس ایذا کا ذکر ہے اس کی تفسیر اس قصہ میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ بعض صحابہ کرام سے ایذاء موسیٰ علیہ السلام کا ایک قصہ اور بھی مشہور ہے وہ بھی اس کے ساتھ جزو ملحق ہے، مگر تفسیر آیت وہی راجح ہے جو مرفوع حدیث میں موجود ہے۔

وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا یعنی تھے موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک صاحب جاہ و عزت" اللہ کے نزدیک کسی کی وجاہت و جاہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعاء کو قبول فرمائیں اس کی خواہش کو رد نہ کریں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مستجاب الدعوات ہونا قرآن میں ان واقعات کثیرہ سے ثابت ہے جن میں انھوں نے کسی چیز کی دعاء مانگی اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرمایا، ان میں سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام کو پیغمبر بنانے کی دعاء کی اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شریک رسالت بنا دیا، حالانکہ منصب نبوت کسی کو کسی کی سفارش پر نہیں دیا جاتا۔ (ابن کثیر)

عادۃ اللہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس دنیا میں قوم کے عیب لگانے پر اس سے برأت کا حق تعالیٰ ایسے جسمانی عیوب سے بھی بری رکھتے ہیں ... نے تو یہ اہتمام فرمایا کہ بطور معجزہ پتھر کپڑے لے کر بھاگ جاتا ہے جو موجب نفرت ہوں | اور موسیٰ علیہ السلام اضطراراً لوگوں کے سامنے ننگے گئے یہ اہتمام اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء کے اجسام کو بھی ظاہری نفرت انگیز عیوب سے عموماً پاک اور بری رکھتے ہیں، جیسا کہ حدیث بخاری سے یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء سب کے سب عالی نسب میں پیدا کئے جاتے ہیں، کیونکہ عرفاً جس نسب اور خاندان کو لوگ حقیر سمجھتے ہوں اس کی بات سننے ماننے کے لئے تیار ہونا مشکل ہے، اسی طرح تاریخ انبیاء میں کسی پیغمبر کا نابینا، بہرا، گونگا یا ہاتھ پاؤں سے معذور ہونا ثابت نہیں، اور حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ سے اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا، کہ وہ حکمت خداوندی ایک خاص ابتلاء و امتحان کے لئے چند روزہ تکلیف تھی پھر ختم کر دی گئی۔ واللہ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، قول سدید کی تفسیر حضرات مفسرین میں سے بعض نے صادق، بعض نے مستقیم، بعض نے صواب وغیرہ کی، ابن کثیر نے سب کو نقل کر کے فرمایا کہ سب حق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ صادق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا، کیونکہ لفظ سدید ان تمام ____ اوصاف کا جامع ہے۔ اسی لئے کاشفی نے روح البیان میں فرمایا کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطاء کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو، ہزل یعنی مذاق و دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو دلخراش نہ ہو۔

اس کی فکر چاہئے کہ اس نے کل یعنی روز محشر کے لئے کیا سامان بھیجا ہے؟ جس کا خلاصہ فکر آخرت ہی، اور یہ فکر تقویٰ کے تمام ارکان کو آسان کر دینے والی چیز ہے۔

زبان و کلام کی درستی دین و دنیا دونوں کے کام درست کر دیتی ہے

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ترجمہ اس آیت کا کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو سیدھی بات کا عادی ہونے پر صلاحِ اعمال کا وعدہ ہے وہ صرف دینی عمل ہی نہیں بلکہ دنیا کے سب کام بھی اس میں داخل ہیں جو شخص قولِ سدید کا عادی ہو جائے یعنی کبھی جھوٹ نہ بولے، سوچ سمجھ کر کلام کرے جو خطا و لغزش سے پاک ہو، کسی کو فریب نہ دے، دل خراش بات نہ کرے، اس کے اعمالِ آخرت بھی درست ہو جائیں گے، اور دنیا کے کام بھی بن جائیں گے۔ حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ یہ ہے کہ (کہو بات سیدھی کہ سنوار دے تم کو تمہارے کام)۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ

ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو

فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ

پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ

یہ ہے بڑا بے ترس نادان۔ تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں کو

وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى

اور عورتوں کو اور شرک کرنے والے مردوں کو اور عورتوں کو اور معاف کرے اللہ

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿٧٣﴾ ع

ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصۂ تفسیر

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی (یعنی ان میں کچھ شعور پیدا کر کے جو کہ اب بھی ہے ان کے روبرو اپنے احکام اور بصورت ماننے کے اس پر انعام و اکرام اور بصورت نہ ماننے کے

اس پر تعذیب و لوازم پیش کر کے ان کو لینے نہ لینے کا اختیار دیا۔ اور حاصل اس پیش کرنے کا یہ تھا کہ اگر تم ان احکام کو اپنے ذمہ رکھتے ہو تو ان کے موافق عمل کرنے کی صورت میں تم کو ثواب ملے گا اور خلاف کرنے کی صورت میں عذاب ہوگا، اور اگر نہیں لیتے تو مکلّف نہ بنائے جاؤ گے، اور ثواب و عذاب کے بھی مستحق نہ ہوگے، تم کو دونوں اختیار ہیں، کہ اس کو نہ لینے سے نافرمان نہ ہوگے جس قدر ان کو شعور تھا وہ اجمالاً اس قدر مضمون سمجھ لینے کے لئے کافی تھا، چونکہ ان کو اختیار بھی دیا گیا تھا) سو انہوں نے (خوف عذاب کے سبب احتمالِ ثواب سے بھی دست برداری کی اور) اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس (کی ذمہ داری) سے ڈر گئے (کہ خدا جانے کیا انجام ہو، اور اگر وہ اپنے ذمہ رکھ لیتے تو مثل انسان کے ان کو بھی عقل عطا کی جاتی، جو تفصیل احکام و مثوبات و عقوبات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے، چونکہ اس کو نہیں منظور کیا، اس لئے عقل کی بھی ضرورت نہ ہوئی، غرض انہوں نے تو عذر کر دیا) اور (جب ان سمٰوٰت و ارض و جبال کے بعد انسان کو پیدا کر کے اس سے بھی بات پوچھی گئی تو) انسان نے (بوجہ اس کے کہ علم الٰہی میں اس کا خلیفہ ہونا مقرر تھا) اس کو اپنے ذمہ لے لیا (غالباً اُس وقت تک اس میں بھی اتنا ہی ضرورت کے قدر شعور ہوگا اور غالباً یہ پیش کرنا اخذ میثاق سے مقدم ہے، اور وہ میثاق اسی حمل امانت کی فرع ہے اور اس میثاق کے وقت اس میں عقل عطا کی گئی ہوگی، اور یہ کسی خاص انسان سے مثل آدم علیہ السلام کے نہیں پوچھا گیا، بلکہ مثل اخذ میثاق کے یہ عرض بھی عام ہوگا اور التزام بھی عام تھا۔ پس سمٰوٰت و ارض و جبال مکلّف نہ ہوئے اور یہ مکلّف بنا دیئے گئے۔ آیت میں اس کا یاد دلانا غالباً اسی حکمت سے ہے جیسا کہ میثاق یاد دلایا، یعنی ان احکام کا تم نے از خود التزام کیا ہے تو پھر نباہنا چاہئے۔ اور چونکہ مکلّف جن بھی ہے اس لئے غالباً وہ اس عرض اور حمل میں شریک ہے، مگر تخصیص ذکر انسان کی صرف اس لئے ہے کہ اس مقام میں کلام اسی سے ہو رہا ہے، پھر اس التزام کے بعد انسان کی حالت باعتبار اکثر افراد کے یہ ہوئی کہ) وہ (انسان عملیات میں) ظالم ہے (اور علمیات میں) جاہل ہے (یعنی دونوں امر میں اعمال میں بھی اور عقائد میں بھی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہ تو حالت باعتبار اکثر افراد کے ہے، باقی مجموعہ کے اعتبار سے اس ذمہ داری کا) انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو (کہ یہ لوگ احکام کے ضائع کرنے والے ہیں) سزا دے گا اور مؤمنین و مؤمنات پر توجہ (اور رحمت) فرمائے گا، اور (بعد مخالفت بھی اگر کوئی باز آجائے تو پھر اس کو بھی مؤمنین و مؤمنات کے زمرہ میں شامل کر لیا جائے گا

آیت اِنَّا عَرَضْنَا کو بھی اسی طرح کی تمثیل و مجاز قرار دیدیا۔

مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ صحیح نہیں، کیونکہ جس آیت سے تمثیل پر استدلال کیا گیا ہے وہاں تو قرآن کریم نے حرف لَوْ کے ساتھ بیان کر کے اس کا قضیہ فرضیہ ہونا خود واضح کر دیا ہے، اور آیت اِنَّا عَرَضْنَا میں ایک واقعہ کا اثبات ہے جس کو مجاز و تمثیل پر محمول کرنا بغیر کسی دلیل کے جائز نہیں، اور اگر دلیل میں یہ کہا جائے کہ یہ چیزیں بے حس و بے شعور ہیں، ان سے جواب سوال نہیں ہو سکتا، تو یہ قرآن کی دوسری تصریحات سے مردود ہے، کیونکہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے، وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا اور اس کو خالق و مالک اور سب سے اعلیٰ و برتر جان کر اس کی تسبیح کرنا بغیر ادراک و شعور کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس آیت سے ثابت ہوا کہ ادراک و شعور تمام مخلوقات میں یہاں تک کہ جمادات میں بھی موجود ہے، اسی ادراک و شعور کی بنا پر ان کو مخاطب بھی بنایا جا سکتا ہے اور وہ جواب بھی دے سکتے ہیں، جواب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، الفاظ و حروف کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے اور اس میں عقلی امتناع نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان جمادات آسمان زمین اور پہاڑوں کو نطق و گویائی عطا فرما دیں۔ اس لئے جمہور امت کے نزدیک آسمان زمین اور پہاڑوں پر عرض امانت حقیقی طور پر کیا گیا اور انہوں نے حقیقی طور پر ہی اپنا اس بار سے عاجز ہونا ظاہر کیا، اس میں کوئی تمثیل یا مجاز نہیں۔

عرض امانت اختیاری تھا جبری نہیں: یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے آسمان زمین وغیرہ پر اس امانت کو خود پیش فرمایا تو ان کو مجال انکار کیسے ہوئی، حکم الٰہی سے روگردانی کی تھی تو ان کو نیست و نابود ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ آسمان و زمین کا مطیع و تابع فرمان ہونا قرآن کریم کی آیت اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ سے بھی ثابت ہے، یعنی جب حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ ہمارے حکم کی تعمیل کے لئے آجاؤ خواہ اپنی خوشی سے یا زبردستی سے، تو دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہم تعمیل حکم کے لئے خوشی سے حاضر ہیں۔

جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ان کو ایک حاکمانہ پابندی کا حکم دیدیا گیا تھا جس میں یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس حکم پر دل سے راضی ہو یا نہ ہو بہرحال یہ حکم ماننا پڑے گا، بخلاف اس آیت عرض امانت کے کہ اس میں امانت کو پیش کر کے ان کو اختیار دیا گیا تھا کہ قبول کریں یا نہ کریں۔

ابن کثیر نے متعدد سندوں کے ساتھ متعدد صحابہ و تابعین ابن عباسؓ، حسن بصری،

مجاہدؒ وغیرہ سے عرضِ امانت کی یہ تفصیل نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول آسمان پر پھر زمین پر پھر پہاڑوں پر اختیاری صورت میں یہ پیش کیا کہ ہماری امانت (یعنی طاعت احکام) کا بار اٹھالو اس معاوضہ کے ساتھ جو اس کے لئے مقرر ہے۔ ہر ایک نے سوال کیا کہ معاوضہ کیا ہے تو بتلایا گیا کہ امانت (یعنی طاعتِ احکام) تم نے پوری طرح کی تو تمہیں جزاء و ثواب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعزاز خاص ملے گا اور اگر تعمیلِ احکام نہ کی یا اس میں کوتاہی کی تو عذاب و سزا ملے گی۔ ان سب بڑے بڑے اجسام نے یہ سن کر جواب دیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم اب بھی آپ کے تابعِ فرمان چل رہے ہیں، لیکن جب ہمیں اختیار دیا گیا تو ہم اس بار کو اٹھانے سے اپنے کو عاجز پاتے ہیں، ہم نہ ثواب چاہتے ہیں نہ عذاب کے متحمل ہیں۔

اور تفسیر قرطبی میں حکیم ترمذی کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (آسمان زمین وغیرہ پر عرض امانت اور ان کے جواب کے بعد) حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب فرمایا اور فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت آسمان زمین کے سامنے پیش کی تو وہ اس کا بار اٹھانے سے عاجز ہوگئے تو آپ اس بارِ امانت کو اٹھائیں گے مع اس چیز کے جو اس کے ساتھ ہے۔ آدم علیہ السلام نے سوال کیا کہ اے پروردگار وہ چیز جو اس کے ساتھ ہے کیا ہے؟ جواب ملا کہ اگر حمل امانت میں پورے اترے (یعنی اطاعت مکمل کی) تو آپ کو جزاء ملے گی (جو اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی صورت میں ہوگی) اور اگر اس امانت کو ضائع کیا تو سزا ملے گی۔ آدم علیہ السلام نے (اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا میں ترقی ہونے کے شوق میں) اس کو اٹھا لیا، یہاں تک کہ بارِ امانت اٹھانے پر اتنا وقت بھی نہ گذرا تھا جتنا ظہر سے عصر تک ہوتا ہے کہ اس میں شیطان نے ان کو مشہور لغزش میں مبتلا کر دیا، اور جنت سے نکالے گئے۔

عرضِ امانت کا واقعہ کس زمانے میں ہوا؟ ابھی جو روایت حضرت ابن عباسؓ کی اوپر گذری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرضِ امانت آسمان، زمین وغیرہ پر تخلیق آدم سے پہلے ہوا تھا، پھر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کے سامنے یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ آپ سے پہلے آسمان زمین پر بھی یہ امانت پیش کی جا چکی ہے، جس کی ان کو طاقت نہ تھی، اس لئے عذر کر دیا۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عرضِ امانت کا واقعہ میثاقِ ازل یعنی عہدِ اَلَسْتُ سے پہلے کا ہے کیونکہ عہدِ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ اسی بارِ امانت کی پہلی کڑی اور اپنے منصب کا حلف اٹھانے کے قائم مقام ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ ظلوم وجہول اس جگہ بھولے بھالے کے معنی میں بطور محبانہ خطاب کے ہے کہ اس نے اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے مقام قرب کی جستجو میں اور کسی انجام کو نہیں سوچا۔ اسی طرح یہ لفظ پوری بنی نوع کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ تفسیر مظہری میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دوسرے صوفیائے کرام سے اسی طرح کا مضمون منقول ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ الخ "یعنی تا آنکہ عذاب دے گا اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو، اور مشرکین مردوں اور عورتوں کو، اور رحمت و مغفرت سے نوازے گا مومنین و مومنات کو"، لِيُعَذِّبَ میں حرف لام بیان علت وغرض کے لئے نہیں بلکہ اصطلاح عربیت کے لحاظ سے لام عاقبت ہے۔ یعنی جو کسی چیز کا انجام بیان کرے جیسے ایک عربی شعر میں ہے ؎ لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ "یعنی پیدا ہو موت کے لئے اور تعمیر کرو ویران ہونے کے لئے"۔ مراد یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے کا انجام موت اور ہر تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

اس جملے کا تعلق حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ سے ہے، یعنی انسان کے بار امانت اٹھانے کا انجام یہ ہوگا کہ نوع انسانی میں دو فریق ہو جائیں گے، ایک کفار ومنافق وغیرہ جو اطاعت الٰہیہ سے سرکش ہو کر امانت کے ضائع کرنے والے ہو گئے، ان کو عذاب دیا جائے گا، دوسرے مومنین و مومنات جو اطاعت احکام شرعیہ کے ذریعہ حق امانت ادا کر چکے، ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوگا۔

اس آخری جملے میں بھی ظلوم وجہول کے الفاظ کی اس تفسیر کی تائید ہوئی جو اکثر ائمہ تفسیر سے اوپر نقل کی گئی ہے، کہ یہ تمام نوع انسانی کے لئے نہیں بلکہ خاص اُن افراد کے لئے ہے جنھوں نے امانت الٰہیہ کو ضائع کیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمّت

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ بِعَوْنِهٖ تَعَالٰى وَحَمْدِهٖ
لِعَشْرٍ بَقِيْنَ مِنْ مُحَرَّمِ الْحَرَامِ ۱۳۹۱ھ
يَوْمَ الثُّلٰثَاءِ

سُوْرَةُ السَّبَا

سُوْرَةُ السَّبَا مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ سبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چون آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

سب خوبی اللہ کی ہے جس کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ① يَعْلَمُ

اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں اور وہی ہے حکمتوں والا سب کچھ جاننے والا۔ جانتا ہے

مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ

جو کچھ کہ اندر گھستا ہے زمین کے اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو اترتا ہے آسمان سے

وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ②

اور جو چڑھتا ہے اس میں اور وہی ہے رحم والا بخشنے والا۔

خُلاصۂ تفسیر

تمام تر حمد (وثنا) اسی اللہ کو سزاوار ہے جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور (جس طرح وہ فی الحال مستحق حمد ہے اسی طرح) اسی کو حمد (وثنا) آخرت میں (بھی) سزاوار ہے (اس کا ظہور اس طرح ہوگا کہ اہل جنت جنت میں داخل

ہو جیسے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد ان الفاظ سے کریں گے، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ، وغیرہ) اور وہ حکمت والا ہے (کہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو بے شمار مصالح اور منافع پر مشتمل بنایا ہے، اور وہ) خبردار (بھی) ہے (کہ ان مصالح و منافع کو پیدا کرنے سے پہلے سے جانتا ہے، یہ چیزیں مصالح اور منافع بڑی حکمت کے ساتھ رکھ دیتے اور وہ ایسا خبیر ہے کہ) وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش کا پانی) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً درخت اور عام نباتات) اور جو چیز آسمان سے اُترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً فرشتے جو آسمان سے اُترتے ہیں اور چڑھتے رہتے ہیں، اور مثلاً احکام شرعیہ جو آسمان سے آتا ہے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ جو آسمان میں لے جائے جاتے ہیں) اور (چونکہ ان سب چیزوں میں جسمانی یا روحانی منافع ہیں جن کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سب لوگ پورا شکر ادا کریں، اور جو کوتاہی کرے وہ مستحق سزا ہو، لیکن) وہ (اللہ) رحیم (اور) غفور (بھی) ہے، (اور اپنی رحمت سے صغیرہ گناہ کو نیک اعمال سے اور کبیرہ کو توبہ سے، اور کبھی دونوں قسم کے گناہوں کو محض اپنے فضل سے معاف فرما دیتا ہے۔ اور جو گناہ کفر و شرک کی حد تک پہونچ جائے اس کو ایمان لانے سے معاف کر دیتا ہے)۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ

اور کہنے لگے منکر نہ آئے گی ہم پر قیامت، تو کہہ کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی

لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي

البتہ آئے گی تم پر اس عالم الغیب کی، غائب نہیں ہو سکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا

میں اور نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی جو

فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ

نہیں لکھی کتاب میں۔ تاکہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کئے بھلے کام۔

اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ

وہ لوگ جو ہیں ان کیلئے ہے معافی اور عزت کی روزی۔ اور جو لوگ دوڑے ہماری

حاصل یہ ہوا کہ قیامت کے روز اسی قیامت کی تکذیب پر بھی سزا ہوگی، اور (آگے بھی قیامت
کا اثبات ہے یعنی) یہ کافر (باہم) کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو
یہ عجیب خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت کو)
تم ضرور ایک نئے جنم میں آؤ گے معلوم نہیں اس شخص نے خدا پر (قصداً) جھوٹ بہتان
باندھا ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے (کہ بلا قصد جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ یہ امر تو محال
ہے تو اس کے وقوع کی خبر ضرور غلط ہے، خواہ قصداً ہو یا فساد تخیل سے ہو، حق تعالیٰ
ان دونوں شقوں کو رد فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی نہ مفتری ہیں نہ مجنون کچھ بھی نہیں، بلکہ جو
لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے (وہی) عذاب اور دور دراز گمراہی میں مبتلا ہیں،
(اس گمراہی کا حالی ثمرہ یہ ہے کہ سچے بھی مفتری اور مجنون نظر آتے ہیں، اور مآلی ثمرہ یہ
کہ عذاب بھگتنا پڑے گا، اور یہ جاہل جو اس جمع و احیاء اجزاء متفرقہ و جمادیہ کو بعید
از قدرت سمجھ رہے ہیں) تو کیا انھوں نے (دلائل عظمت قدرت الٰہیہ میں سے) آسمان اور
زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے (بھی) اور ان کے پیچھے (بھی) موجود ہیں (اور جب
دیکھیں وہ نظر آتے ہیں، پس ان اجرام عظیمہ کا ابتداءً پیدا کرنے والا کیا اجسام صغیرہ کے ثانیاً
پیدا کرنے پر قادر نہیں، کما قال اللہ تعالیٰ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ۔
اور باوجود وضوح دلائل حق کے جو پھر بھی انکار و عناد کرنے کی وجہ سے یہ ہیں تو اس قابل کہ ان کو
ابھی سزا دی جائے اور سزا بھی ایسی کہ یہ دلائل قدرت آسمان و زمین جو ان کے لئے نعمت
عظیمہ بھی ہیں، انہی کو ان کے لئے آلۂ تعذیب بنا دیا جائے کہ جس نعمت کا کفران ہوا اسی نعمت
کو نقمت یعنی عذاب بنانے سے حسرت بڑھتی ہے، اور ہم اس سزا پر بھی قادر ہیں
چنانچہ) اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا اگر چاہیں تو ان پر آسمان کے ٹکڑے
گرا دیں (لیکن حکمت مقتضی ہے تاخیر کو اس لئے مہلت دے رکھی ہے، غرض ان لوگوں
کو دفع توہم استحالہ کے لئے آسمان و زمین پر نظر کرنا چاہئے کیونکہ) اس (دلیل مذکور)
میں (قدرت الٰہیہ کی) پوری دلیل ہے (مگر) ہر بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) متوجہ
(بھی) ہو (اور حق کی طلب ہو یعنی دلیل تو کافی ہے مگر ان کی طرف سے طلب نہیں اس لئے
محروم ہیں)۔

معارف و مسائل

عَالِمِ الْغَيْبِ، یہ صفت رب کی ہے جس کی اوپر قسم کھائی گئی ہے

کی تمام صفات میں سے اس جگہ صفتِ علم غیب وعلم محیط کو شاید اس لئے خاص کیا گیا کہ کلام منکرین قیامت کے معاملہ میں ہے، اور قیامت کے انکار کا بڑا سبب کفار کے لئے یہ تھا کہ جب سب انسان مرکر مٹی ہو جائیں گے اور اس مٹی کے ذرات بھی دنیا میں منتشر ہو جائیں گے تو سارے جہان میں پھیلے ہوئے ذرات کو جمع کرنا پھر ہر ایک انسان کے ذرات کو دوسرے انسانوں کے ذرات سے الگ کرکے ہر ایک کے ذرات اسی کے وجود میں پیوست کرنا کیسے ممکن ہے؟ اور اس کو ناممکن سمجھنا اسی بناء پر تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کو اپنے علم وقدرت پر قیاس کر رکھا تھا۔ حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم سارے عالم پر ایسا محیط ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے اس کو سب معلوم ہے، ذرہ ذرہ بھی معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے، کوئی ذرہ مخلوقات کا اس کے علم سے باہر نہیں، اور یہ علم محیط حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے کسی مخلوق کو خواہ فرشتہ ہو یا پیغمبر ایسا علم محیط کہ کوئی ذرہ جہان کا اس سے خارج نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس ذات کو ایسا علم محیط حاصل ہو اس کے لئے ایک انسان کے ذرات کو الگ الگ سارے جہان میں سے جمع کر لینا اور اس سے ان کے اجسام کو دوبارہ مرکب کر دینا کیا مشکل ہے۔

لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اس جملہ کا تعلق اس سے پہلے جملے لَتَاْتِیَنَّکُمْ سے ہے، یعنی قیامت ضرور آئے گی، اور قیامت آنے کا مقصد یہ ہوگا کہ ایمان والوں کو جزاء اور بہترین رزق جنت کا دیا جائے اور ان کے مقابل اَلَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات پر اعتراض کئے اور لوگوں کو ان کے ماننے سے روکنے کی کوشش کی۔

مُعٰجِزِیْنَ یعنی ان کی یہ کوشش گویا اس لئے تھی کہ وہ ہمیں گرفت سے عاجز کر دیں گے اور قیامت کی حاضری سے چھوٹ جائیں گے۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ، یعنی ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہوگا رِجْزٍ اَلِیْمٍ کا جس کے معنی سخت عذاب کے ہیں جو دردناک ہو۔

وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ، یہ منکرین قیامت کے بالمقابل ان مؤمنین کا ذکر ہے جو قیامت پر ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا وہ اس علم سے مستفید ہوئے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ، یہ کفار منکرین قیامت کا قول نقل کیا گیا ہے، جو بطور تحقیر و استہزاء کے یوں کہا کرتے تھے کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسے عجیب شخص کا پتہ دیں جو یوں

کہتا ہے کہ جب تم پوری طرح ریزہ ریزہ ہوجاؤ گے، اس کے بعد پھر تمہیں نئی پیدائش دی جائے گی، اور پھر تم اسی شکل وصورت میں تیار کر کے زندہ کردیئے جاؤ گے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس شخص سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو قیامت اور اس میں سب مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دیتے اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی تاکید کرتے تھے، اور یہ سب لوگ آپ کو پوری طرح جانتے تھے، مگر یہاں اس انداز سے ذکر کیا کہ گویا یہ آپ کے متعلق اور کچھ نہیں جانتے، بجز اس کے کہ آپ قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کی خبر دیتے ہیں، یہ طرز کلام استہزاء و تحقیر کے لئے اختیار کیا تھا۔

اور ممزق، تمزیق سے مشتق ہے، جس کے معنی چیرنے پھاڑنے اور ٹکڑے کرنے کے ہیں اور کل ممزق سے مراد بدن انسانی کا ریزہ ریزہ ہو کر مٹی ہوجانا ہے۔ آگے آپ کے خلاف اور ذکر قیامت کے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ، مطلب یہ کہ جسم کے ریزہ ریزہ ہوجانے کے بعد سب ذرات کا جمع ہو کر پھر بدن انسانی بن جانا اور زندہ ہونا تو ایسی نامعقول بات ہے جس کو تسلیم کرنے اور ماننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے ان کا یہ قول یا تو جان بوجھ کر خدا تعالیٰ پر افترا و بہتان باندھنا ہے یا پھر یہ کوئی مجنون ہے جس کے کلام کی کوئی بنیاد صحیح نہیں ہوتی۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ الآیۃ، جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے معلوم ہو چکا ہے اس آیت میں تو قیامت کے دلائل بھی ہیں کہ آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور کرنے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرنے سے وہ استبعاد رفع ہوجاتا ہے جو منکرین قیامت کو اس کی تسلیم سے مانع تھا، اور ساتھ ہی منکرین کے لئے تنبیہ و دھمکی بھی ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات خصوصاً جو تمہارے لئے بڑی نعمتیں ہیں ان کے مشاہدہ کے بعد بھی تم تکذیب و انکار پر جمے رہے تو اللہ کی قدرت میں یہ بھی ہے کہ انہی نعمتوں کو تمہارے لئے عذاب بنادے کہ زمین تمہیں نگل جائے یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تم پر گر پڑے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ

اور ہم نے دی ہے داؤد کو اپنی طرف سے بڑائی، اے پہاڑو خوش آوازی سے پڑھو اس کے ساتھ اور اے اڑنے والے جانورو

أَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ ۝ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ

نرم کر دیا ہم نے اس کے آگے لوہا کہ بنا زرہیں کشادہ اور اندازے سے جوڑ کڑیاں

وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ

اور کرو تم سب کام بھلا میں جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہوں اور سلیمان کے آگے ہوا کو

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ

صبح کی منزل اس کی ایک مہینہ کی اور شام کی منزل ایک مہینہ کی اور بہا دیا ہم نے اس کے واسطے چشمہ پگھلے ہوئے تانبے کا

الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ

اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے اور جو کوئی پھرے ان میں سے

عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا

ہمارے حکم سے چکھاویں ہم اس کو آگ کا عذاب بناتے اس کے واسطے جو کچھ

يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ

چاہتا قلعے اور تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں

رَاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ

چولہوں پر جمی ہوئی کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر اور تھوڑے ہیں میرے بندوں میں

الشَّكُورُ ۝ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ

احسان ماننے والے پھر جب مقرر کی ہم نے اس پر موت نہ جتلایا ان کو اس کا مرنا

إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ

مگر کیڑے نے گھن کے کھاتا رہا اس کا عصا پھر جب وہ گر پڑا معلوم کیا جنوں نے

أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝

کہ اگر خبر رکھتے ہوتے غیب کی نہ رہتے ذلت کی تکلیف میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی تھی (چنانچہ

میں کسی کی فضیلت وخصوصیت سے کیا تعلق ہے وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو بازگشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی لوٹتی ہے۔

وَالطَّيْرَ، یہ لفظ نحوی ترکیب میں سَخَّرْنَا محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ ہم نے پرندوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ مراد اس تسخیر سے یہ ہے کہ پرندے بھی آپ کی آواز پر ہوا میں جمع ہو جاتے۔ اور آپ کے ساتھ پہاڑوں کی طرح تسبیح کرتے تھے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤد علیہ السلام کا مسخر کر دیا تھا کہ صبح شام ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ، یہ دوسرا معجزہ ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا تھا۔ حسن بصری، قتادہ، اعمش وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ کے لوہے کو ان کیلئے موم کی طرح نرم بنا دیا تھا کہ اس سے کوئی چیز بنانے میں نہ ان کو آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ کسی ہتھوڑے یا دوسرے آلات کی۔ آگے آیت میں اس کا بیان ہے کہ لوہے کو ان کے لئے نرم اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ لوہے کی زرہ آسانی سے بنا سکیں۔ اور ایک دوسری آیت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زرہ سازی کی صنعت آپ کو خود سکھائی تھی وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ یعنی ہم نے سکھائی ان کو صنعت زرہ بنانے کی۔ اور اس آیت میں بھی آگے جو قَدِّرْ فِي السَّرْدِ آیا ہے، یہ بھی اس صنعت کے سکھانے کی تکمیل ہے۔ لفظ قَدِّرْ تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنی ایک اندازے پر بنانے کے ہیں۔ اور سرد کے لفظی معنی بُننے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زرہ کے بنانے میں اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب بنائیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ وہ مضبوط بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو۔ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے (ابن کثیر)

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کی رعایت بھی پسندیدہ چیز ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص ہدایت فرمائی۔

فائدہ دوم: بعض حضرات نے قَدِّرْ فِي السَّرْدِ کی تفسیر میں تقدیر سے یہ مراد لیا ہے کہ اس صنعت کے لئے ایک مقدار وقت کی معین کرنی چاہئے۔ سارے اوقات اس میں صرف نہ ہو جائیں، تاکہ عبادت اور امور سلطنت میں اس کی وجہ سے خلل نہ آئے۔ اس تفسیر پر

معلوم ہوا کہ صنعت کار اور محنت کش لوگوں کو بھی یہ چاہئے کہ عبادت اور اپنی معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے کام سے کچھ وقت بچایا کریں اور وقت کا انضباط رکھیں۔ (روح المعانی)

صنعت وحرفت کی بڑی فضیلت ہے۔ آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اشیاء ضرورت کی ایجاد و صنعت ایسی اہم چیز ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اس کی تعلیم دینے کا اہتمام فرمایا، اور اپنے عظیم الشان پیغمبروں کو سکھلایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھلانا اسی آیت سے ثابت ہوا، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کی صنعت اسی طرح سکھلائی گئی، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا "یعنی ہمارے سامنے کشتی بناؤ" اس کشتی بنانے کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح ہم بتلاتے ہیں اسی طرح بناؤ۔ اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی مختلف صنعتیں سکھلانا بعض روایات سے ثابت ہے۔ الطب النبوی کے نام سے ایک کتاب امام حدیث حافظ شمس الدین ذہبی کی طرف نسبت کے ساتھ چھپی ہے، اس میں تو ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً مکان بنانا، کپڑا بُننا، درخت بونا اور اُگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل ونقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ یہ سب ضروری صنعتیں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے انبیاء علیہم السلام کو سکھلائی تھیں۔

صنعت پیشہ لوگوں کو حقیر سمجھنا گناہ ہے۔ عرب میں مختلف آدمی مختلف صنعتیں اختیار کرتے تھے، کسی صنعت کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور پیشہ و صنعت کی بنیاد پر کسی شخص کو کم یا زیادہ نہ سمجھا جاتا تھا، نہ پیشوں کی بنیاد پر کوئی برادری بنتی تھی۔ پیشوں کی بنیاد پر برادریاں بنانا اور بعض پیشوں کو بحیثیت پیشہ حقیر و ذلیل سمجھنا یہ ہندوستان میں ہندوؤں کی پیداوار ہے۔ ان کے ساتھ رہنے سہنے سے مسلمانوں میں بھی یہ اثرات قائم ہوگئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو صنعت زرہ سازی کی حکمت تفسیر ابن کثیر میں امام حدیث حافظ ابن عساکر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خلافت و سلطنت کے زمانہ میں بھیس بدل کر بازاروں وغیرہ میں جاتے، اور مختلف اطراف سے آنے والے لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت میں عدل وانصاف عام تھا، اور سب انسان آرام وعیش کے ساتھ گذارہ کرتے تھے، کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی، اس لئے جس سے سوال کرتے وہ داؤد علیہ السلام کی مدح وثناء اور عدل وانصاف پر اظہار شکر کرتا تھا۔

حق تعالیٰ نے ان کی تعلیم کے لئے اپنے ایک فرشتے کو بشکل انسان بھیج دیا، جب

داؤد علیہ السلام اس کام کے لئے نکلے تو یہ فرشتہ ان سے ملا، حسب عادت اس سے بھی وہی سوال کیا، فرشتے نے جواب دیا کہ داؤد بہت اچھا آدمی ہے اور سب آدمیوں سے وہ اپنے نفس کے لئے بھی اور اپنی امت و رعیت کے لئے بھی بہتر ہے، اگر اس میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا۔ داؤد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت ہے؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنے اہل و عیال کا گذارہ مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال میں سے لیتے ہیں۔

یہ بات سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف الحاح و زاری اور دعاء کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی ایسا کام سکھا دیں جو میں اپنے ہاتھ کی مزدوری سے پورا کروں، اور اس کی اجرت سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گذارہ کروں اور مسلمانوں کی خدمت اور سلطنت کے تمام کام بلا معاوضہ کروں۔ ان کی دعاء کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا، ان کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی، اور پیغمبرانہ اعزاز یہ دیا کہ لوہے کو ان کے لئے موم بنا دیا تاکہ یہ صنعت بہت آسان ہو جائے، اور تھوڑے وقت میں اپنا گذارہ پیدا کر کے باقی وقت عبادت اور امور سلطنت میں لگا سکیں۔

مسئلہ: خلیفہ وقت یا سلطان کو جو اپنا پورا وقت امور سلطنت کی انجام دہی میں صرف کرتا ہے شرعاً یہ جائز ہے کہ اپنا متوسط گذارہ بیت المال سے لے لے، لیکن کوئی دوسری صورت گذارہ کی ہو سکے تو وہ زیادہ پسند ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے خزانے کھول دیئے تھے، اور زر و جواہرات اور تمام اشیاء ضرورت کی بڑی فراوانی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بیت المال کے مال میں حسب منشاء ہر تصرف کی اجازت بھی دیدی گئی تھی۔ آیت فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ میں یہ بھی اطمینان دیدیا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں آپ کے ذمہ حساب دینا نہیں ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ جس مقام بلند پر رکھنا چاہتے ہیں اس کے تقاضے سے یہ واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اتنی بڑی سلطنت کے ہوتے ہوئے اپنی مزدوری سے اپنا گذارہ پیدا کرتے اور اسی پر قناعت کرتے تھے۔

علماء جو تعلیم و تبلیغ کی خدمت مفت انجام دیتے ہوں، اور تمام وقت دینی خدمت میں مشغول ہوں یا لوگوں کے کام میں اپنا وقت صرف کرتے ہوں اُن کا بھی یہی حکم ہے کہ بیت المال سے اپنا خرچ لے سکتے ہیں، مگر کوئی دوسری صورت گذارہ کی ہو جو دینی خدمت میں خلل انداز بھی نہ ہو تو

وہ بہتر ہے۔

فائدہ: حضرت داؤد علیہ السلام کے اس طرز عمل سے کہ اپنے عمال و عادات کے متعلق لوگوں کی رائیں بے تکلف آزادانہ معلوم کرنے کا اہتمام فرماتے تھے یہ ثابت ہوا کہ اپنے عیوب چونکہ آدمی کو خود معلوم نہیں ہوتے، اس لئے دوسروں سے تحقیق کرنا چاہئے۔ حضرت امام مالکؒ بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ عام لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ، حضرت داؤد علیہ السلام کے خصوصی فضائل و انعامات کے ذکر کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا، اسی طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا تھا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کو جس پر وہ مع اپنے اہل دربار کے بڑی تعداد میں سوار ہوتے تھے، ہوا ان کے حکم کے تابع جہاں وہ چاہتے لے جاتی تھی۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ تسخیر ہوا کا معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس عمل کے صلہ میں عطا ہوا تھا کہ ایک روز وہ اپنے گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول تھے، اس میں ایسی مشغولیت ہوئی کہ عصر کی نماز قضا ہوگئی چونکہ گھوڑے اس غفلت کا سبب ہوئے تھے، اس سبب غفلت کو ختم کرنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو ذبح کر کے قربان کر دیا (کیونکہ سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گائے بیل کی طرح گھوڑے کی قربانی بھی جائز تھی، اور یہ گھوڑے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملک میں تھے، اس لئے بیت المال کے نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور قربانی کی وجہ سے اپنا مال ضائع کرنے کا اشکال بھی نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ صٓ میں آئے گی)، چونکہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی سواری کے جانور قربان کر دیئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر سواری عطا فرما دی۔ (قرطبی)

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ، غُدُوّ کے معنی صبح کو چلنے اور رَوَاح کے معنی شام کو چلنے کے ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہوا کہ صبح سے دوپہر تک یہ تخت سلیمانی ہوا کے کاندھوں پر ایک مہینہ کی مسافت طے کر لیتا تھا، اور پھر شام سے رات تک ایک مہینہ کی، اس طرح دو مہینے کی مسافت ایک دن میں طے کرتا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح کو بیت المقدس سے

روانہ ہوتے تو دوپہر کو اصطخر میں جا کر قیام فرماتے، اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے، پھر یہاں سے بعد ظہر واپس چلتے تو کابل میں جا کر رات ہوتی تھی، اور بیت المقدس اور اصطخر کے درمیان اتنی مسافت ہے جو تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے، اسی طرح اصطخر سے کابل تک کی مسافت بھی تیز سواری پر چلنے والا ایک ماہ میں طے کر سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ، یعنی بہا دیا ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے چشمہ تانبے کا یعنی تانبے جیسی سخت دھات کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے پانی کی طرح بہنے والی سیال بنا دیا، جو پانی کے چشمہ کی طرح جاری تھا اور گرم بھی نہ تھا، تاکہ آسانی کے ساتھ اس کے برتن اور دوسری ضروریات بنا سکیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ چشمہ اتنی دور تک جاری ہوا جس کی مسافت تین دن تین رات میں طے ہو سکے، اور یہ ارض یمن میں تھا۔ اور مجاہد کی روایت میں ہے کہ یہ چشمہ صنعاء یمن سے شروع ہوا اور تین دن تین رات کی مسافت تک پانی کے چشمہ کی طرح جاری رہا، خلیل نحوی نے فرمایا کہ لفظ قطر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے۔ (قرطبی)

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ، یہ جملہ بھی سَخَّرْنَا محذوف سے متعلق ہے معنی یہ ہیں کہ مسخر کر دیا ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات میں سے ایسے لوگوں کو جو ان کے سامنے ان کے کام انجام دیں اپنے رب کے حکم کے موافق، بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی ان کے سامنے کے الفاظ بڑھانے سے شاید یہ بتلانا ہو کہ سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کی تسخیر اس طرح کی نہیں جس طرح چاند سورج وغیرہ کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا ارشاد قرآن میں آیا ہے، بلکہ یہ تسخیر ایسی تھی کہ جنات نوکروں چاکروں کی طرح ان کے سامنے مفوضہ خدمات میں لگے رہتے تھے۔

تسخیر جنّات کا مسئلہ

جنّات کی تسخیر جو اس جگہ مذکور ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اس میں تو کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور بعض صحابہ کرام کے متعلق جو روایات میں آیا ہے کہ جنّات ان کے مسخر اور تابع تھے، تو یہ تسخیر بھی اسی قسم کی تسخیر باذن اللہ تھی جو بطور کرامت ان حضرات کو عطا کی گئی تھی اس میں کسی عمل و وظیفہ کا کوئی دخل نہیں تھا، جیسا کہ علامہ شربینی نے تفسیر سراج المنیر میں اس آیت کے تحت میں حضرت ابوہریرہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، عمر بن خطاب، ابو ایوب انصاری، زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات ایسے لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنّات ان کی اطاعت و خدمت کرتے تھے۔ مگر یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی طرح کچھ جنات کو ان حضرات کا مسخر بنادیا، لیکن جو تسخیر عملیات کے ذریعہ عاملوں میں مشہور ہے وہ قابل غور ہے، کہ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ قاضی بدرالدین شبلی حنفی جو آٹھویں صدی کے علماء میں سے ہیں انھوں نے جنات کے احکام پر ایک مستقل کتاب آکام المرجان فی احکام الجان لکھی ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ جنات سے خدمت لینے کا کام سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذن اللہ بطور معجزہ کے کیا ہے، اور اہل فارس جمشید بن اونجہان کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہ انھوں نے جنات سے خدمت لی ہے۔ اسی طرح آصف بن برخیا وغیرہ جن کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام سے رہا ہے، ان کے متعلق بھی تسخیر جن کے واقعات مشہور ہیں، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ شہرت ابو نصر احمد بن ہلال بکیل اور ہلال بن وصیف کی ہے جن سے تسخیر جنات کے عجیب عجیب واقعات مذکور ہیں۔ ہلال بن وصیف نے ایک مستقل کتاب میں جنات کے کلمات جو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کئے اور جو عہد و میثاق سلیمان علیہ السلام نے ان سے لئے ان کو جمع کر دیا۔

قاضی بدرالدین نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ عام طور سے تسخیر جنات کا عمل کرنیوالے عاملین کلمات کفریہ شیطانیہ اور سحر سے کام لیتے ہیں، جن کو کافر جنات و شیاطین پسند کرتے ہیں، اور ان کے مسخر و تابع ہونے کا راز صرف یہ ہے کہ وہ ان کے اعمال کفریہ شرکیہ سے خوش ہو کر بطور رشوت کے ان کے کچھ کام بھی کر دیتے ہیں، اور اسی لئے بکثرت ان عملیات میں قرآن کریم کو نجاست یا خون وغیرہ سے لکھتے ہیں، جس سے کفار جن اور شیاطین راضی ہو کر اُن کے کام کر دیتے ہیں۔ البتہ ایک شخص ابن الامام کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خلیفہ معتضد باللہ کے زمانہ میں تھا، جنات کو اس نے اسماء الٰہیہ کے ذریعہ سے مسخر کیا تھا، اس میں کوئی بات خلاف شرع نہیں تھی۔ (آکام المرجان، ص ۱۰۰)

خلاصہ یہ ہے کہ جنات کی تسخیر اگر کسی کے لئے بغیر قصد و عمل کے محض منجانب اللہ ہو جائے جیسے کہ سلیمان علیہ السلام اور بعض صحابہ کرام کے متعلق ثابت ہے وہ تو معجزہ یا کرامت میں داخل ہے، اور جو تسخیر عملیات کے ذریعہ کی جاتی ہے اس میں اگر کلمات کفریہ یا اعمال کفریہ ہوں تو کفر، اور صرف معصیت پر مشتمل ہوں تو گناہ کبیرہ ہے، اور جن عملیات میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معنی معلوم نہیں ان کو بھی فقہاء نے اس بناء پر ناجائز کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کلمات میں کفر و شرک یا معصیت پر مشتمل کلمات ہوں قاضی بدرالدین نے آکام المرجان میں ایسے نامعلوم المعنی کلمات کے استعمال کو بھی ناجائز لکھا ہے۔

اور اگر یہ عمل تسخیر اسماء الٰہیہ یا آیات قرآنیہ کے ذریعہ ہو اور اس میں نجاست وغیرہ کے استعمال جیسی کوئی معصیت بھی نہ ہو تو وہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مقصود اس سے جنات کی ایذاء سے خود بچنا یا دوسرے مسلمانوں کو بچانا ہو، یعنی دفع مضرت مقصود ہو، جلب منفعت مقصود نہ ہو، کیونکہ اگر اس کو کسب مال کا پیشہ بنا لیا گیا تو اس لئے جائز نہیں کہ اس میں استرقاقِ حُر یعنی آزاد کو اپنا غلام بنانا اور بلا حق شرعی اس سے بیگار لینا ہے، جو حرام ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ، یعنی ہم نے جنات کو سلیمان علیہ السلام کی خدمت و اطاعت کا جو حکم دیا ہے اگر ان میں کوئی فرد اس اطاعت سے انحراف کرے گا تو اس کو آگ کا عذاب دیا جائے گا۔ اکثر مفسرین نے اس سے آخرت کا عذاب جہنم مراد لیا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک فرشتہ کو مسلط کر دیا تھا کہ جو جن سلیمان علیہ السلام کی اطاعت میں کوتاہی کرے اس کو آتشیں کوڑے مار کر کام کرنے پر مجبور کرتا تھا (قرطبی) اور اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جنات تو خود آگ سے بنے ہوئے ہیں، آگ اُن پر کیا اثر کرے گی، کیونکہ جنات کے آگ سے بننے کا مطلب وہی ہے جو انسان کے مٹی سے بننے کا مطلب ہے، یعنی عنصر غالب انسان کے وجود کا مٹی ہے، مگر اس کو مٹی پتھر سے مار دیا جائے تو تکلیف پہونچتی ہے اسی طرح جنات کا عنصر غالب آگ ہے، مگر خالص اور تیز آگ سے وہ بھی جل جاتے ہیں۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ، اس آیت میں اُن کاموں کی کچھ تفصیل ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے لیتے تھے۔ مَحَارِيْب، محراب کی جمع ہے جو مکان کے اشرف و اعلیٰ حصّہ کو کے لئے بولا جاتا ہے۔ بادشاہ اور بڑے لوگ جو اپنے لئے حکومت کا کمرہ بنائیں اس کو بھی محراب کہا جاتا ہے۔ اور لفظ محراب حرب بمعنی جنگ سے مشتق ہے، کوئی آدمی جو اپنا حکومت کدہ خاص بناتا ہے اس کو دوسروں کی رسائی سے محفوظ رکھتا ہے، اس میں کوئی دست اندازی کرے تو اس کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے مکان کے مخصوص حصّہ کو محراب کہتے ہیں۔ مساجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو بھی اسی امتیاز کی بناء پر محراب کہتے ہیں، اور کبھی خود مسجد کو محاریب کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں محاریبِ بنی اسرائیل اور اسلام میں محاریبِ صحابہ سے ان کی مساجد مراد ہوتی ہیں۔

مساجد میں محراب کے لئے مستقل مکان بنانے کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ور خلفائے راشدین کے عہد تک امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ایک علیحدہ مکان کی حیثیت سے بنانے کا رواج نہیں تھا، قرونِ اُولیٰ کے بعد سلاطین نے اس کا رواج اپنے تحفظ کے لئے دیا۔ اور عام مسلمانوں میں اس کا رواج اس مصلحت سے بھی ہوا کہ امام جس جگہ کھڑا ہوتا ہے وہ پوری صف خالی رہتی ہے۔ نمازیوں کی کثرت اور مساجد کی تنگی کے پیش نظر صرف امام کے کھڑے ہونے کی جگہ دیوارِ قبلہ میں گہری کر کے بنا دی جاتی ہے، تاکہ اس کے پیچھے پوری صفوف کھڑی ہو سکیں۔ چونکہ یہ طریقہ قرونِ اُولیٰ میں نہ تھا، اس لئے بعض علماء نے اس کو بدعت کہہ دیا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے اس مسئلہ پر مستقل رسالہ بنام اعلام الاریب فی بدعۃ المحاریب لکھا ہے۔ اور تحقیق اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر اس طرح کی محرابیں نمازیوں کی سہولت اور مسجد کے مصالح کے پیش نظر بنائی جائیں اور ان کو سنتِ مقصودہ نہ سمجھا جائے تو ان کو بدعت کہنے کی کوئی وجہ نہیں، ہاں اس کو سنتِ مقصودہ بنا لیا جائے اس کے خلاف کرنے والے پر نکیر ہونے لگے تو اس غلو سے یہ عمل بدعت میں داخل ہو سکتا ہے۔

مسئلہ: جن مساجد میں محرابِ امام ایک مستقل مکان کی صورت میں بنائی جاتی ہے وہاں امام پر لازم ہے کہ اس محراب سے کسی قدر باہر اس طرح کھڑا ہو کہ اس کے قدم محراب سے باہر نمازیوں کی طرف رہیں، تاکہ امام اور مقتدیوں کا مکان ایک شمار ہو سکے، ورنہ یہ صورت مکروہ و ناجائز ہے کہ امام الگ مکان میں تنہا کھڑا ہو، اور سب مقتدی دوسرے مکان میں۔ بعض مساجد محراب اتنی وسیع و عریض بنائی جاتی ہے کہ ایک مختصر سی صف مقتدیوں کی بھی اس میں آجائے، ایسی محراب میں اگر ایک صف مقتدیوں کی بھی محراب میں کھڑی ہو اور امام ان کے آگے پورا محراب میں کھڑا ہو تو امام و مقتدیوں کے مکان کا اشتراک ہو جانے کی وجہ سے کراہت نہیں رہے گی۔

تماثیل، تمثال کی جمع ہے۔ قاموس میں ہے کہ تمثال بفتح التاء مصدر ہے اور بکسر التاء تمثال تصویر کو کہا جاتا ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ تمثال یعنی تصویر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک ذی روح جاندار چیزوں کی تصویر، دوسرے غیر ذی روح بے جان چیزوں کی۔ پھر بے جان چیزوں میں دو قسمیں ہیں، ایک جماد جس میں زیادتی اور نمو نہیں ہوتا جیسے پتھر مٹی وغیرہ، دوسرے نامی جس میں نمو اور زیادتی ہوتی رہتی ہے، جیسے درخت اور کھیتی وغیرہ۔ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ان سب قسم کی چیزوں کی تصویریں بناتے تھے۔ اول تو لفظ تماثیل کے عموم ہی سے

یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ یہ تصاویر کسی نوع قسم کی نہیں، بلکہ ہر قسم کے لئے عام تھیں۔ دوسرے تاریخی روایات میں تخت سلیمان پر پرندوں کی تصاویر ہونا بھی مذکور ہے۔

شرع اسلام میں جاندار کی تصویر بنانے و استعمال کرنے کی ممانعت

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں جاندار کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا حرام نہیں تھا، مگر چونکہ پچھلی امتوں میں اس کا مشاہدہ ہوا کہ لوگوں کی تصاویر ان کی یادگار کے طور پر بنائیں اور ان کو اپنے عبادت خانوں میں اس غرض کے لئے رکھا کہ ان کو دیکھ کر ان کی عبادت گذاری کا نقشہ سامنے آئے تو خود ہمیں بھی عبادت کی توفیق ہو جایا کرے مگر رفتہ رفتہ ان لوگوں نے انہی تصویروں کو اپنا معبود بنا لیا، اور بت پرستی شروع ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی امتوں میں جانداروں کی تصاویر بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں۔ شریعت اسلام کے لئے چونکہ قیامت تک قائم و باقی رکھنا تقدیر الٰہی ہے، اس لئے اس میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جس طرح اصل حرام چیزوں اور معاصی کو حرام وممنوع کیا گیا ہے، اسی طرح ان کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی اصل معاصی کے ساتھ ملحق کر کے حرام کر دیا گیا ہے۔ اصل جرم عظیم شرک و بت پرستی ہے، اس کی ممانعت ہوئی تو جن راستوں سے بت پرستی آسکتی تھی ان راستوں پر بھی شرعی پہرہ بٹھا دیا گیا اور بت پرستی کے ذرائع اور اسباب قریبہ کو بھی حرام کر دیا گیا۔ ذی روح کی تصاویر کا بنانا اور استعمال کرنا اسی اصول کی بنا پر حرام کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ ومتواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

اسی طرح شراب حرام کی گئی تو اس کی خرید، فروخت، اس کو لانے لے جانے کی مزدوری اس کی صنعت سب حرام کر دی گئی جو شراب نوشی کے ذرائع ہیں، چوری حرام کی گئی تو کسی کے مکان میں بلا اجازت داخل ہونا بلکہ باہر سے جھانکنا بھی ممنوع کر دیا گیا زنا حرام کیا گیا تو غیر محرم کی طرف بالقصد نظر کرنے کو بھی حرام کر دیا گیا۔ شریعت اسلام میں اس کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔

حرمت تصویر پر ایک عام شبہ اور اس کا جواب

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تصاویر کو جس حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا وہ ذریعہ بت پرستی بن سکتی تھی، لیکن آجکل تصویر سے جس طرح کے کام لئے جاتے ہیں، ملزموں کی شناخت، تجارتوں کے خاص مارک، دوستوں عزیزوں سے ملاقات، واقعات و حالات کی تحقیق میں امداد وغیرہ جس کی وجہ سے وہ ضروریات زندگی میں داخل کر لی گئی ہے

اس میں بت پرستی اور عبادت کا کوئی تصور دور دور نہیں، تو یہ ممانعت جو بت پرستی کے خطرہ سے کی گئی تھی اب مرتفع ہو جانی چاہئے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ آجکل تصویر ذریعۂ بت پرستی نہیں رہی، آج بھی کتنے فرقے اور گروہ ہیں جو اپنے پیر دل کی تصویر کی پوجا پاٹ کرتے ہیں، اور جو حکم کسی علت پر دائر ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر فرد میں پایا جائے۔ اس کے علاوہ تصویر کی ممانعت کا سبب صرف ایک یہی نہیں کہ وہ بت پرستی کا ذریعہ ہے، بلکہ احادیث صحیحہ میں اس کی حرمت کی دوسری وجوہ بھی مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ تصویر سازی حق تعالیٰ کی صفت خاص کی نقالی ہے، مصوّر حق تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اور صورت گری درحقیقت اسی کے لئے سزاوار اور اسی کی قدرت میں ہے کہ مخلوقات کی ہزاروں اجناس اور انواع اور ہر نوع میں اس کے کروڑوں افراد ہوتے ہیں، ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی، انسان ہی کو لو تو مرد کی صورت اور عورت کی صورت میں نمایاں امتیاز، پھر عورتوں اور مردوں کے کروڑوں افراد میں دو فرد بالکل یکساں نہیں ہوتے۔ ایسے کھلے ہوئے امتیاز ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو کسی تامل اور غور و فکر کے بغیر ہی امتیاز واضح ہو جاتا ہے، یہ صورت گری اللہ رب العزت کے سوا کس کی قدرت میں ہے، جو انسان کسی جاندار کا مجسمہ یا نقش اور رنگ سے اس کی تصویر بناتا ہے وہ گویا عملی طور پر اس کا مدعی ہے کہ وہ بھی صورت گری کر سکتا ہے، اسی لئے صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ قیامت کے روز تصویریں بنانے والوں کو کہا جائے گا کہ جب تم نے ہماری نقل اتاری تو اس کو مکمل کر کے دکھلاؤ، اگر تمہارے بس میں ہو کہ ہم نے تو صرف صورت ہی نہیں بنائی اس میں روح بھی ڈالی ہے، اگر تمہیں اس تخلیق کا دعویٰ ہے تو اپنی بنائی ہوئی صورت میں روح بھی ڈال کر دکھلاؤ۔

ایک سبب تصویر کی ممانعت کا احادیث صحیحہ میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے فرشتوں کو تصویر اور کتے سے نفرت ہے جس گھر میں یہ چیزیں ہوتی ہیں، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، جس کے سبب اس گھر کی برکت اور نورانیت مٹ جاتی ہے، گھر میں بسنے والوں کو عبادت و طاعت کی توفیق گھٹ جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ مشہور مقولہ بھی غلط نہیں کہ "خانۂ خالی را دیو می گیرد" یعنی خالی گھر پر جن بھوت قبضہ کر لیتے ہیں جب کوئی گھر رحمت کے فرشتوں سے خالی ہوگا تو شیاطین اس کو گھیر لیں گے وہاں کے بسنے والوں کے دلوں میں گناہوں کے وسوسے اور برے ارادے پیدا کرتے رہیں گے۔

ایک سبب بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ صورت بنانے میں اللہ کی صفت تخلیق کی نقل ہے اور اس زمانے میں جس طرح تصاویر سے بہت سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں ہزاروں جرائم اور فحاشی بھی انہی تصاویر سے جنم لیتے ہیں، غرض شریعت اسلام نے صرف ایک وجہ سے نہیں بہت سے اسباب پر نظر کر کے جاندار کی تصویر بنانے اور اس کے استعمال کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اب اگر کسی خاص فرد میں فرض کرلیں کہ وہ اسباب اتفاق سے موجود نہ ہوں تو اس اتفاقی واقعہ سے قانونِ شرعی نہیں بدل سکتا۔

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت عبداللہ بن مسعودؓ یہ حدیث آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ یعنی سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن تصویر بنانے والے ہوں گے۔

اور بعض روایات حدیث میں تصویر بنانے والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے، اور صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُلُّ مُصَوِّرٍ فِی النَّارِ یعنی ہر مصور جہنم میں جائے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق روایات حدیث اور تعامل سلف کے شواہد تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے رسالہ "التصویر لاحکام التصویر" میں جمع کر دیئے ہیں، اور لوگوں کے شبہات کے جوابات بھی اس میں مفصل ہیں، ضرورت ہو تو اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

فوٹو کی تصویر بھی تصویر ہی ہے

بعض لوگوں کا یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ فوٹو تصویر سے خارج ہے، کیونکہ وہ تو ظل اور عکس ہے، جیسے آئینہ اور پانی وغیرہ میں آ جاتا ہے تو جس طرح آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا جائز ہے ایسے ہی فوٹو کی تصویر بھی جائز ہے۔ جواب واضح ہے کہ عکس اور ظل اس وقت تک عکس ہے جب تک وہ کسی ذریعہ سے قائم و پائدار نہ بنا لیا جائے، جیسے آئینہ یا پانی میں اپنا عکس جس وقت پانی کے مقابلے سے آپ ہٹ جائیں گے ختم ہو جائے گا، اگر آئینہ کے اوپر کسی مسالہ وغیرہ کے ذریعہ اس صورت کے عکس کو پائدار بنا دیا جائے تو یہی تصویر ہو جائے گی، جس کی حرمت و لعنت احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ فوٹو کی مفصل بحث بھی رسالہ مذکورہ التصویر میں لکھ دی گئی ہے۔

جِفَانٍ، جَفْنَة کی جمع ہے، جو پانی کے بڑے برتن جیسے تسلا، ٹب وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ کَالْجَوَابِ، جابیہ کی جمع ہے چھوٹے حوض کو جابیہ کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پانی کے لیے بڑے بڑے برتن ایسے بناتے تھے جس میں چھوٹے حوض کے برابر پانی آتا ہے۔ قُدُوْرٍ قدر بکسر القاف کی جمع ہے، ہنڈیا کو کہا جاتا ہے۔

راسیات، اپنی جگہ ٹھہری ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ اتنی وزنی اور بڑی دیگیں بناتے تھے جو ہلائے نہ ہلیں، اور ممکن ہے کہ یہ دیگیں پتھر سے تراش کر پتھر ہی کے چولھوں پر لگی ہوئی بنتے ہوں جو نا قابل حمل و نقل ہوں، امام تفسیر ضحاک نے قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ کی یہی تفسیر کی ہے۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ، حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے نوازا اور مخصوص نعمات عطا فرمائے، ان کا بیان فرمانے کے بعد ان کو مع ان کے اہل و عیال کے شکر گذاری کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔

شکر کی حقیقت اور اس کے احکام

قرطبی نے فرمایا کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ نعمت فلاں منعم نے دی ہے، اور پھر اس کو اس کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال کرے، اور کسی کی دی ہوئی نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر جس طرح زبان سے ہوتا ہے، اسی طرح عمل سے بھی شکر ہوتا ہے، اور عملی شکر اس نعمت کا منعم کی طاعت و مرضی کے مطابق استعمال ہے ... ، اور ابو عبدالرحمن السلمی نے فرمایا کہ نماز شکر ہے، روزہ شکر ہے اور ہر نیک کام شکر ہے، اور محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ شکر تقویٰ اور عمل صالح کا نام ہے (ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے حکم شکر کے لئے مختصر لفظ اُشْكُرُوْا لِيْ کے بجائے اِعْمَلُوْٓا شُكْرًا استعمال فرما کر شاید اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ آلِ داؤد سے مطلوب شکر عملی ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام اور ان کے خاندان نے قول و عمل دونوں سے اس طرح کی کہ ان کے گھر میں کوئی وقت ایسا نہ گذرتا تھا جس میں گھر کا کوئی فرد اللہ کی عبادت میں نہ لگا ہوا ہو۔ افرادِ خاندان پر وقت تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کا مصلیٰ کسی وقت نماز پڑھنے والے سے خالی نہ رہتا تھا (ابن کثیر)

بخاری و مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز دل میں اللہ کے نزدیک محبوب تر نماز داؤد علیہ السلام کی ہے، وہ نصف رات سوتے تھے پھر ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے تھے، پھر آخری چھٹے حصہ میں سوتے تھے اور سب روزوں میں محبوب تر اللہ کے نزدیک صیام داؤد علیہ السلام ہیں کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے (ابن کثیر)

حضرت فضیلؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ حکم شکر نازل ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اے میرے پروردگار میں آپ کا شکر کس طرح پورا کرسکتا ہوں جب کہ میرا شکر قولی ہو یا عملی وہ بھی آپ ہی کی عطا کردہ نعمت ہے، اس پر بھی مستقل شکر واجب ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْاٰنَ شَكَرْتَنِيْ يَا دَاوٗدُ، یعنی اے داؤد اب آپ نے شکر ادا کردیا کیونکہ حقِ شکر ادا کرنے سے اپنے عجز و قصور کو سمجھ لیا، اور اعتراف کرلیا۔

حکیم ترمذی اور امام ابوبکر جصاص نے حضرت عطاء بن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور اس آیت کو تلاوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو پورا کرلے تو جو فضیلت آلِ داؤد کو عطا کی گئی تھی وہ اس کو بھی مل جائے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ وہ تین کام کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ رضا اور غضب کی دونوں حالتوں میں انصاف پر قائم رہنا، اور غنا اور فقر کی دونوں حالتوں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا، اور خفیہ اور علانیہ دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرتا رہنا۔ (احکام القرآن، جصاص)

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ، شکر کے حکم اور تاکید کے بعد اس واقعہ کا بھی اظہار فرما دیا کہ میرے بندوں میں شکرگزار کم ہی ہوں گے۔ اس میں بھی مومن کے لئے تنبیہ اور تحریض ہے شکر پر۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ الآية، آیت میں لفظ منسأۃ عصا اور لاٹھی کے معنی میں ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے بمعنی عصا، اور بعض نے فرمایا کہ عربی لفظ ہے۔ نسأ کے معنی ہٹانے اور مؤخر کرنے کے ہیں، لاٹھی کے ذریعے انسان مضر چیزوں کو ہٹاتا ہے، اس لئے اس کو منسأۃ کہا گیا، یعنی ہٹانے کا آلہ۔ اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا واقعہ عجیبہ بیان فرما کر بہت سی عبرتوں اور ہدایتوں کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا عجیب واقعہ

اس واقعہ میں بہت سی ہدایات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن کو ایسی بے مثل حکومت و سلطنت حاصل تھی کہ صرف ساری دنیا پر ہی نہیں بلکہ جنات اور طیور وغیرہ پر بھی ان کی حکومت تھی، مگر ان سب سامانوں کے باوجود موت سے ان کو بھی نجات نہ تھی۔ اور یہ کہ موت

تو مقررہ وقت پر آ گئی تھی بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام نے شروع کی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تکمیل فرمائی، اس میں کچھ کام تعمیر کا باقی تھا، اور یہ تعمیر کا کام جنات کے سپرد تھا جن کی طبیعت میں سرکشی غالب تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے کام کرتے تھے، ان کی وفات کا جنات کو علم ہو جائے تو فوراً کام چھوڑ بیٹھیں، اور تعمیر رہ جائے۔ اس کا انتظام حضرت سلیمان علیہ السلام نے باذنِ ربانی یہ کیا کہ جب موت کا وقت آیا، تو موت کی تیاری کر کے اپنی محراب میں داخل ہو گئے، جو شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھی باہر سے اندر کی سب چیزیں نظر آتی تھیں، اور اپنے معمول کے مطابق عبادت کے لئے ایک سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ روح پرواز کرنے کے بعد بھی جسم اس عصا کے سہارے اپنی جگہ جما رہے۔ سلیمان علیہ السلام کی روح وقت مقرر پر قبض کر لی گئی، مگر وہ اپنے عصا کے سہارے اپنی جگہ جمے ہوئے باہر سے ایسے نظر آتے تھے کہ عبادت میں مشغول ہیں، جنات کی یہ مجال نہ تھی کہ پاس آ کر دیکھ سکتے، حضرت سلیمان علیہ السلام کو زندہ سمجھ کر کام میں مشغول رہے، یہاں تک کہ سال بھر گذر گیا، اور تعمیر بیت المقدس کا بقیہ کام پورا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے گھن کے کیڑے کو جس کو فارسی میں دیوک اور اردو میں دیمک کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم نے اس کو دابۃ الارض کے نام سے موسوم کیا ہے، عصائے سلیمانی پر مسلط کر دیا۔ دیمک نے عصا کی لکڑی کو اندر سے کھا کر کمزور کر دیا، عصا کا سہارا ختم ہوا تو سلیمان علیہ السلام گر گئے، اس وقت جنات کو ان کی موت کی خبر ہوئی۔

جنات کو حق تعالیٰ نے دور دراز کی مسافت چند لمحات میں قطع کر لینے کی قوت عطا فرمائی ہے وہ بہت سے ایسے حوادث و واقعات سے واقف ہوتے تھے جن کو انسان نہیں جانتے، جب وہ انسانوں کو ان واقعات کی خبر دیتے تو انسان یہ سمجھتے تھے کہ یہ غیب کی خبر ہے اور جنات کو بھی علم غیب حاصل ہے، خود جنات کو بھی علم غیب کا دعویٰ ہو تو بعید نہیں، موت کے اس عجیب واقعہ نے ان کی بھی حقیقت کھول دی، خود جنات کو بھی پتہ چل گیا اور سب انسانوں کو بھی کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں کیونکہ اگر ان کو غیب کا علم ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے ایک سال پہلے ہی باخبر ہو جاتے۔ اور یہ سال بھر کی محنت و مشقت جو ان کو زندہ سمجھ کر برداشت کرتے رہے اس سے بچ جاتے۔ آیت کے آخری جملے میں اسی کا بیان ہے فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ، اس میں عذاب مہین سے مراد وہ محنت مشقت کا کام ہے جس پر تعمیر بیت المقدس کی تکمیل کے لئے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگا دیا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کی

موت کا یہ عجیب واقعہ کچھ تو خود قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے، باقی تفصیل حضرت ابن عباس وغیرہ ائمہ تفسیر سے منقول ہے جو ابن کثیر وغیرہ سب تفاسیر میں نقل کی گئی ہے۔

اس عجیب واقعہ سے یہ عبرت بھی حاصل ہوئی کہ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا ہوتا ہے اس کا جس طرح چاہیں انتظام کر سکتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں ہوا کہ موت کے بعد جسد سلیمان علیہ السلام کو سال بھر تک اپنی جگہ قائم رکھ کر جنات سے کام پورا کرالیا۔ اور یہ بھی کہ دنیا کے سارے اسباب و آلات اسی وقت تک اپنا کام کرتے ہیں جب تک منظور حق ہوتا ہے جب منظور نہیں ہوتا تو آلات و اسباب جواب دیدیتے ہیں، جیسے یہاں عصا کا سہارا دیمک کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد خطرہ تھا کہ لوگ جنات کے حیرت انگیز عمل اور کارناموں اور بظاہر غیب کی چیزوں سے ان کے باخبر ہونے وغیرہ کے اعمال عجیبہ کو دیکھ کر کہیں انہی کو اپنا معبود نہ بنا بیٹھیں، اس خطرہ کو بھی اس واقعہ موت نے ختم کر دیا، سب کو جنات کی بے خبری اور بے بسی معلوم ہوگئی۔

تقریر مذکور سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سلیمان علیہ السلام نے موت کے وقت اس خاص طریقہ کو دو وجہ سے اختیار کیا تھا، اول یہ کہ تعمیر بیت المقدس کا باقی ماندہ کام پورا ہو جائے، دوسرے یہ کہ ان لوگوں پر جنات کی بے خبری اور بے بسی واضح ہو جائے تاکہ ان کی عبادت کا سلسلہ نہ رہے۔ (قرطبی)

امام نسائی نے باسناد صحیح حضرت عبداللہ بن عمرو سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے چند دعائیں کیں، جو مقبول ہوئیں۔ ان میں سے ایک دعا یہ تھی کہ جو شخص اس مسجد میں صرف نماز کی نیت سے داخل ہو اور کوئی دنیوی غرض نہ ہو، اس مسجد سے نکلنے سے پہلے اس کو تمام گناہوں سے ایسا پاک کر دے جیسا کہ اس وقت تھا جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اور سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور شکرانہ کے بارہ ہزار گائے بیل اور بیس ہزار بکریوں کی قربانی کر کے لوگوں کو دعوت عام دی، اور اس دن کی خوشی منائی، اور صخرہ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگیں کہ "یا اللہ آپ نے ہی مجھے یہ قوت اور وسائل عطا فرمائے، جن سے تعمیر بیت المقدس مکمل ہوئی تو یا اللہ مجھے اس کی

بھی توفیق دیجئے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں اور مجھے اپنے دین پر وفات دیجئے اور ہدایت کے بعد میرے قلب میں کوئی زیغ اور کجی نہ ڈالئے۔ اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار جو شخص اس مسجد میں داخل ہو میں اس کے لئے آپ سے پانچ چیزیں مانگتا ہوں۔ ایک یہ کہ جو گناہگار توبہ کرنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کی توبہ قبول فرمالیں اور اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں۔ دوسرے یہ کہ جو آدمی کسی خوف وخطرہ سے بچنے کے لئے اس مسجد میں داخل ہو تو آپ اس کو امن دیدیں، اور خطرات سے نجات عطا فرمادیں۔ تیسرے یہ کہ جو بیمار آدمی اس میں داخل ہو اس کو شفا عطا فرمادیں۔ چوتھے یہ کہ جو فقیر آدمی اس میں داخل ہو اس کو غنی کردیں۔ پانچویں یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اپنی نظر عنایت ورحمت اس پر رکھیں بجز اس شخص کے جو کسی ظلم یا بے دینی کے کام میں مشغول ہو۔ (قرطبی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا کام حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں مکمل ہوچکا تھا، مگر جو واقعہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ کچھ اس کے منافی نہیں کہ اصل تعمیر مکمل ہونے کے بعد بڑی تعمیرات میں کچھ کام رہا کرتے ہیں وہ باقی ہوں ان کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مذکورہ تدبیر اختیار کی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ موت کے بعد عصا کے سہارے حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال کھڑے رہے۔ (قرطبی) اور بعض روایات میں ہے کہ جب جنات کو یہ معلوم ہو کہ سلیمان علیہ السلام کی موت کو عرصہ ہوگیا ہم بے خبر رہے تو مدت موت معلوم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک لکڑی پر دیمک چھوڑ دی، ایک دن رات میں جتنی لکڑی دیمک نے کھائی اس سے حساب لگا لیا کہ عصائے سلیمانی پر ایک سال اس طرح گذرا ہے۔

فائدہ: بغوی نے علماء تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل ترپن سال کی ہوئی، اور ان کی سلطنت وحکومت چالیس سال رہی تیرہ سال کی عمر میں سلطنت کا کام سنبھال لیا تھا، اور بیت المقدس کی تعمیر اپنی سلطنت کے چوتھے سال میں شروع کی تھی (مظہری، قرطبی)

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ

تحقیق قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی، دو باغ داہنے اور بائیں،

كُلُوا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

کھاؤ روزی اپنے رب کی اور اس کا شکر کرو، شہر ہے پاکیزہ اور رب ہے گناہ بخشنے والا۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ

سو دھیان میں نہ لائے پھر چھوڑ دیا ہم نے ان پر ایک نالہ زور کا اور دیئے ہم نے ان کو بدلے ان دو

جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ

باغوں کے دو اور باغ جن میں کچھ میوہ کسیلا تھا اور جھاؤ اور کچھ بیر تھوڑے سے ۔ یہ بدلہ

جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾ وَجَعَلْنَا

دیا ہم نے ان کو اس پر کہ ناشکری کی اور ہم یہ بدلہ اسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو۔ اور رکھی تھیں ہم نے

بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا

ان میں اور ان بستیوں میں جہاں ہم نے برکت رکھی ہے بستیاں جو راہ پر نظر آتی تھیں اور مقرر

فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا

کر دیں ہم نے انہیں آنے جانے کی منزلیں پھرو ان میں راتوں کو اور دنوں کو امن سے۔ پھر کہنے لگے اے رب

بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ

دراز کر دے ہمارے سفروں کو اور اپنا برا کیا پھر کر ڈالا ہم نے ان کو کہانیاں

وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

اور کر ڈالا چیر کر ٹکڑے ٹکڑے اس میں پتے کی باتیں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گذار کو۔

خلاصۂ تفسیر

سبا کے لوگوں کے لئے (خود) ان کے وطن (کی مجموعی حالت) میں (وجوب اطاعت خداوندی کی) نشانیاں موجود تھیں (ان میں سے ایک نشانی) دو قطاریں تھیں باغ کی (ان کی سڑک کے) داہنے اور بائیں (یعنی ان کے تمام علاقہ میں دو طرفہ متصل باغات چلے گئے تھے کہ جس میں آمدنی بھی وافر پھل بھی اس قدر کہ ختم کئے ختم نہ ہوں، سایہ بھی رونق بھی اور ہم نے انبیاء علیہم السلام و ناصحین کی معرفت ان کو حکم دیا کہ) اپنے رب کا رزق (دیا ہوا)

رزق کھاؤ اور اس کا شکر کرو (یعنی اطاعت کرو کہ دو قسم کی نعمتیں مقتضی طاعت ہیں،
ایک دنیوی کہ رہنے کو عمدہ شہر اور ایک اُخروی کہ در صورت ایمان و اطاعت کے اگر کچھ کوتاہی
ہو جاوے تو گناہ بخشنے کو بخشنے والا پروردگار ہے، پس سے مقتضی پر مقتضا کا ترتب ضرور ہونا چاہئے
سو اس پر بھی انھوں نے اس حکم سے سرتابی کی (شاید یہ لوگ آفتاب پرست بھی ہوں جیسے
بعض کی نسبت سورۂ نمل میں ہے وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ) تو ہم نے (اُن پر اپنا قہر
اس طرح نازل کیا کہ) ان پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا (یعنی جو سیلاب بند سے رُکا رہتا تھا بند
ٹوٹ کر اس سیلاب کا پانی چڑھ آیا جس سے اُن کے وہ دو رویہ باغات سب غارت ہو گئے)
اور ہم نے ان کے ان دو رویہ باغوں کے بدلے اور دو باغ دیدیئے جن میں یہ چیزیں رہ گئیں
بدمزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل بیری (اور وہ بھی شہری نہیں جنگلی خودرو جس میں
کانٹے بہت اور پھل میں لطافت ندارد) ان کو یہ سزا ہم نے اُن کی ناسپاسی کے سبب
دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں، ورنہ معمولی خطاؤں پر تو ہم درگذر
ہی کرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کفر سے بڑھ کر کیا ناسپاسی ہوگی جس میں وہ مبتلا تھے)۔
اور (اس نعمت مذکورہ عامہ لمساکن کے علاوہ ایک اور نعمت خاص متعلق سفر کے
تھی وہ یہ کہ) ہم نے ان کے اور اُن بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے (باعتبار
پیداوار وغیرہ کے) برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو (سڑک پر سے)
نظر آتے تھے (کہ مسافر کو سفر میں کبھی وحشت نہ ہو اور کہیں ٹھہرنا چاہے تو وہاں جانے
میں تکلف و تردد بھی نہ ہو) اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص
اندازہ رکھا تھا (یعنی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چلنے کے حساب سے ایسا مناسب
فاصلہ رکھا تھا کہ دوران سفر میں عادت کے مطابق آرام کرے، وقت پر کوئی نہ کوئی
گاؤں مل جاتا جہاں کھا پی سکے آرام کر سکے، کہ بے خوف و خطر اُن میں چلو، راتوں کو
اور دنوں کو بھی (یعنی نہ خطرہ رہزن کا کہ پاس پاس گاؤں تھے نہ خطرۂ آب و دانہ
و زادِ راہ کے میسر نہ ہونے کا کہ ہر جگہ ہر سامان مل سکتا تھا) سو ان نعمتوں کی انھوں نے جیسے
اصلی شکرگذاری یعنی طاعت الٰہیہ نہیں کی، ایسے ہی ظاہری شکرگذاری یعنی نعمتِ الٰہیہ
کو غنیمت سمجھنا اور اس کی قدر کرنا ہے وہ بھی نہیں کی چنانچہ) وہ کہنے لگے اے ہمارے
پروردگار (ایسے پاس پاس دیہات ہونے سے سفر کا لطف نہیں آتا، لطف تو اسی میں
ہے کہ کہیں زادِ راہ ختم ہو گیا کہیں پیاس ہے اور پانی نہیں ملتا، اشتیاق ہے انتظار ہے
کہیں چوروں کا اندیشہ ہے، نوکر پہرہ دے رہے ہیں، ہتھیار بندھے ہوئے ہیں، جیسے

بنی اسرائیل مَنّ و سَلْویٰ سے اُکتا گئے تھے اور بقل وقثّاء (ترکاری و ککڑی کھیرے) کی
درخواست کی تھی) نیز اس حالت موجودہ میں ہم کو بیچ کی مدت کے انتظار کا موقع بھی نہیں
ملتا، امیر غریب سب یکساں سفر کرتے ہیں، اس لئے یوں جی چاہتا ہے کہ) ہمارے سفروں
میں درازی (اور فاصلہ) کردے (یعنی بیچ کے دیہات اجاڑ دے کہ منزلوں میں خوب فاصلہ
ہوجائے) اور (علاوہ اس ناشکری کے) انہوں نے (دوسری بھی نافرمانیاں کرکے) اپنی جانوں
پر ظلم کیا سو ہم نے ان کو افسانہ بنادیا اور ان کو بالکل تتر بتر کردیا (یعنی اس طرح کہ بعض کو ہلاک
کردیا کہ ان کے قصے ہی رہ گئے اور بعض کو پریشان کردیا اور بحیثیت اس حالت تنعم کے
سب ہی افسانہ ہوگئے، یعنی وہ سامان تنعم سب کا جاتا رہا اور یا یہ معنی کہ ان کی حالت
کو عبرت بنادیا اَیْ جَعَلْنٰھُمْ ذَاتَ حِکَایَاتٍ یُعْتَبَرُ بِھَا غرض خود ان کے مساکن و باغات
بھی اور ان کی وہ متصل بستیاں بھی سب ویران ہوگئے) بے شک اس (قصہ) میں ہر صابر شاکر
(یعنی مومن) کے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

معارف و مسائل

منکرین نبوت و رسالت اور منکرین قیامت کو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر متنبہ کرنے اور انبیاء سابقین کے ہاتھوں فوق القیاس حیرت انگیز واقعات و معجزات کے صدور کے سلسلے میں پہلے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا ذکر فرمایا، اب اسی سلسلہ میں قوم سبا پر حق تعالیٰ کے بے حساب انعامات کا پھر ان کی ناشکری کی وجہ سے ان پر عذاب آنے کا ذکر آیات مذکورہ میں کیا گیا۔

قوم سبا اور ان پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات ابن کثیر نے فرمایا کہ سبا یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے باشندوں کا لقب ہے۔ تبابعہ جو اس ملک کے مقتدا و پیشوا تھے وہ بھی اسی قوم سبا میں سے تھے، اور ملکہ بلقیس جن کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ سورۂ نمل میں گذر چکا ہے وہ بھی اسی قوم میں سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دیئے تھے، اور ان کے شہر میں آرام و عیش کے تمام اسباب مہیا کردیئے تھے، اور اپنے انبیاء کے ذریعے ان کو اللہ کی توحید اور اس کے احکام کی اطاعت کے ذریعہ نعمتوں کے شکر کا حکم دیا گیا تھا۔ ایک مدت تک یہ لوگ اس حال پر قائم اور ہر طرح کی راحت و عیش سے مالامال رہے، پھر ان میں عیش و عشرت میں انہماک کے خدا تعالیٰ سے غفلت بلکہ انکار تک نوبت پہونچ گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ کے لئے اپنے تیرہ انبیاء بھیجے

جنھوں نے ان کی فہمائش اور راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ لوگ اپنی غفلت بے ہوشی سے باز نہ آئے تو ان پر ایک سیلاب کا عذاب بھیجا گیا جس نے ان کے شہر اور باغات سب کو ویران و برباد کر دیا۔ رواہ محمد بن اسحق۔ ابن کثیر)

امام احمد حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سبا جس کا قرآن میں ذکر ہے یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا زمین کے کسی حصہ کا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے، جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے، جن میں سے چھ یمن میں آباد رہے، اور چار شام میں چلے گئے یمن میں رہنے والوں کے نام یہ ہیں، مذحج، کندہ، ازد، اشعری، انمار، حمیر۔ (ان چھ لڑکوں سے چھ قبیلے پیدا ہوئے، جو انہی مذکورہ ناموں سے معروف ہیں)۔

اور شام میں بسنے والوں کے نام یہ ہیں لخم، جذام، عاملہ، غسان، (ان کی نسل کے قبائل انہی ناموں سے مشہور ہوتے)۔ یہ روایت حافظ امام ابن عبدالبر نے بھی اپنی کتاب (القصد والامم بمعرفۃ انساب العرب والعجم) میں نقل کی ہے۔

ابن کثیر کی تحقیق بحوالہ علماء نسب یہ ہے کہ یہ دس لڑکے سبا کے صلبی اور بلاواسطہ بیٹے نہیں تھے، بلکہ سبا کی دوسری تیسری یا چوتھی نسل میں یہ لوگ ہوئے ہیں پھر ان کے قبیلے شام ویمن میں پھیلے، اور انہی کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ اور سبا کا اصل نام عبد شمس تھا۔ سبا، عبد شمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان سے ان کا نسب نامہ واضح ہوجاتا ہے۔ اور اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سبا عبد شمس نے اپنے زمانے میں نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی تھی، ممکن ہے کہ ان کو اس کا علم کتب قدیمہ تورات او انجیل سے ہوا ہو، یا نجومیوں کاہنوں کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس نے چند عربی اشعار بھی کہے ہیں جن میں آپ کی بعثت کا ذکر کر کے یہ تمنا کی ہے کہ کاش میں ان کے زمانے میں ہوتا تو میں ان کی مدد کرتا، اور اپنی قوم کو ان پر ایمان لانے اور مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔

اور حدیث مذکور میں جو یہ مذکور ہے کہ سبا کے دس لڑکوں میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے، چار شام کی طرف چلے گئے، یہ واقعہ ان پر سیلاب کا عذاب آنے کے بعد کا ہے، کہ سیلاب آنے کے وقت یہ لوگ مختلف سمتوں اور شہروں میں منتشر ہوگئے (ابن کثیر) قرطبی نے بحوالہ قشیری قوم سبا کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانۂ فترت نقل کیا ہے۔

سیلِ عرم اور سدِ مآرب

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ، لفظ عرم کے عربی لغت کے اعتبار سے کئی معنی معروف ہیں، اور ائمہ تفسیر نے ہر معنی کے اعتبار سے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے، مگر ان میں سیاق قرآن کے مناسب وہ معنی ہیں جو قاموس اور صحاح جوہری وغیرہ کتب لغت میں ہیں کہ عرم کے معنی سد یعنی بند کے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے جو آجکل ڈیم کے نام سے معروف ہے، حضرت ابن عباسؓ نے بھی عرم کے معنی مسنّاۃ یعنی بند کے بیان فرماتے ہیں (قرطبی)

واقعہ اس بند (ڈیم) کا حسب بیان ابن کثیرؒ یہ ہے کہ ملک یمن میں دارالحکومت صنعاء سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک شہر مآرب تھا، جس میں قوم سبا آباد تھی، دو پہاڑوں کے درمیان وادی میں شہر آباد تھا، دونوں پہاڑوں کے درمیان سے اور پہاڑوں کے اوپر سے بارش کا سیلاب آتا تھا، یہ شہر ہمیشہ ان سیلابوں کی زد میں رہتا تھا، یہاں شہر کے بادشاہوں نے جن میں ملکہ بلقیس کا نام خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے، ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک بند (ڈیم) نہایت مستحکم مضبوط تعمیر کیا، جس میں پانی اتنا رک سکے، اس بند نے پہاڑوں کے درمیان سے آنے والے سیلابوں کو روک کر پانی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بنا دیا، پہاڑوں کی بارش کا پانی بھی اس میں جمع ہونے لگا، اس بند کے اندر اوپر نیچے پانی نکالنے کے لئے تین دروازے رکھے گئے تاکہ پانی کا یہ ذخیرہ انتظام کے ساتھ شہر کے لوگوں کے اور ان کی زمین و باغ کی آب پاشی کے کام آئے، پہلے اوپر کا دروازہ کھول کر اس سے پانی لیا جاتا تھا، جب اوپر کا پانی ختم ہوجاتا تو اس سے نیچے کا اور اس کے بعد سب سے نیچے کا تیسرا دروازہ کھولا جاتا تھا، یہاں تک کہ دوسرے سال کی بارشوں کا زمانہ آجاتا پھر پانی اوپر تک بھر جاتا، بند کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کیا گیا تھا، جس میں پانی کے بارہ راستے بنا کر بارہ نہریں شہر کے مختلف اطراف میں پہونچائی گئی تھیں، اور سب نہروں میں پانی یکساں انداز میں چلتا اور شہر کی ضرورتوں میں کام آتا تھا (مظہری)۔

شہر کے داہنے بائیں جو دو پہاڑ تھے ان کے کناروں پر باغات لگائے گئے تھے جن میں پانی کی نہریں جاری تھیں، یہ باغات ایک دوسرے کے متصل مسلسل دو رویہ پہاڑوں کے کناروں پر تھے، یہ باغات اگرچہ تعداد میں بہت تھے مگر قرآن کریم نے ان کو جنّتان یعنی دو باغ کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ ایک رُخ کے تمام باغوں کو بوجہ اتصال کے ایک باغ اور دوسرے رُخ کے تمام باغوں کو دوسرا باغ قرار دیا ہے۔

ان باغوں میں ہر طرح کے درخت اور ہر قسم کے پھل اس کثرت سے پیدا ہوتے تھے

کہ ائمہ سلف قتادہ وغیرہ کے بیان کے مطابق ان باغوں میں ایک عورت اپنے سر پر خالی ٹوکری لے کر چلتی تو درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے پھلوں سے خود بخود بھر جاتی تھی، اس کو ہاتھ بھی لگانا نہ پڑتا تھا (ابن کثیر)

كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ، حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ ان کو یہ حکم دیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس رزق وسیع کو استعمال کرو اور اس کی شکر گذاری اعمال صالحہ اور اطاعتِ احکامِ الٰہیہ کے ساتھ کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس شہر کو بلدہ طیبہ بنایا ہے، جس میں سردی گرمی کا بھی اعتدال تھا اور آب و ہوا ایسی صحت بخش لطیف ولطیف تھی کہ ان کے پورے شہر میں مچھر، مکھی، پسو اور سانپ بچھو جیسے موذی جانوروں کا نام ونشان نہ تھا، بلکہ باہر سے آنے والے مسافر جب اس شہر میں پہونچتے تو اگر ان کے کپڑوں میں جوئیں یا دوسرے موذی حشرات ہوتے تھے وہ یہاں پہونچکر خود بخود مر جاتے تھے (ابن کثیر)

بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ کے ساتھ وَرَبٌّ غَفُورٌ، فرما کر اپنی نعمت کو اس طرح مکمل کر دیا کہ یہ عیش و راحت صرف دنیا کی زندگی تک نہیں، بلکہ اگر تم شکر گذاری پر قائم رہے تو آخرت میں اس سے بڑی اور دائمی نعمتوں کا بھی وعدہ ہے، کیونکہ ان تمام نعمتوں کا خالق و مالک اور تمہیں پالنے والا غفور ہے، کہ اگر کبھی اتفاقی طور پر شکر گذاری میں کمی یا غفلت کوتاہی بھی ہوگئی تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی وسیع نعمتوں اور انبیاء علیہم السلام کی تنبیہات کے باوجود جب قوم سبا کے لوگوں نے اللہ کے احکام سے سرکشی اور روگردانی کی تو ہم نے اُن پر سَيْلِ عَرِم چھوڑ دیا۔ عرم کے معنی وہ بڑے بند کے ہیں اس سیلاب کو عرم کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ جو عرم ان کی حفاظت اور خوش حالی کا ذریعہ تھا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آفت و مصیبت بنا دیا۔ واقعہ اس کا حضرت ابن عباسؓ وہب بن منبہ، قتادہ ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو سزا دینے کے لئے سدِ مآرب یعنی عرم کو توڑ کر سیلاب سے تباہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس پانی کے عظیم الشان بند پر اندھے چوہے مسلط کر دیئے جنھوں نے اس کی بنیاد کو کھوکھلا اور کمزور کر دیا۔ جب بارش اور سیلاب کا وقت آیا تو پانی کے دباؤ نے اس کمزور بنیاد کو توڑ کر رخنے پیدا کر دیئے، اور بالآخر اس بند کے پیچھے جمع شدہ پانی اس پوری وادی میں پھیل گیا جس میں یہ شہر مآرب واقع تھا۔ تمام مکانات منہدم اور درخت تباہ ہوگئے، اور دو طرفہ پہاڑوں پر

جو باغات تھے ان کا پانی خشک ہوگیا۔

وہب بن منبہؒ کی روایت میں ہے کہ ان لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی چلی آتی تھی کہ اس بند کی خرابی و تباہی چوہوں کے ذریعہ ہوگی، جب لوگوں نے اس بند کے قریب چوہوں کو دیکھا تو خطرہ پیدا ہوگیا، اس کی تدبیر یہ کی گئی کہ بند کے نیچے بہت سی بلیاں پال دی گئیں جو چوہوں کو بند کے قریب نہ آنے دیں، مگر جب تقدیر الٰہی نافذ ہوئی تو یہ چوہے بلیوں پر غالب آگئے اور بند کی بنیاد میں داخل ہوگئے (ابن کثیر)

اور تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ ہوشیار دور اندیش لوگوں نے چوہوں کو دیکھتے ہی یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف منتقل ہوجانے کا قصد کرلیا اور تدریجاً انتظام کرکے نکل گئے، باقی لوگ وہاں رہے، مگر جب سیلاب شروع ہوا اس وقت منتقل ہوگئے، اور بہت سے وہیں سیلاب کی نذر ہوگئے۔ غرض یہ پورا شہر تباہ و برباد ہوگیا، شہر کے کچھ باشندے جو دوسرے ملکوں میں شہروں کی طرف چلے گئے، اُن کی کچھ تفصیل مسند احمد کی حدیث میں جو اوپر گذر چکی ہے مذکور ہے کہ چھ قبیلے ان کے یمن میں پھیلے اور چار شام میں، مدینہ طیبہ کی آبادی بھی انہی قبائل میں سے بعض سے شروع ہوئی جس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ سیلاب آنے اور شہر تباہ ہونے کے بعد ان دو باغات کا جو حال ہو وہ آگے اس طرح ذکر فرمایا کہ:

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے قیمتی پھلوں اور میووں کے درختوں کے بدلے ان پر ایسے درخت اُگا دیئے، جن کے پھل بدمزہ خراب تھے۔ لفظ خمط کے معنی اکثر حضرات مفسرین نے درخت اراک کے کئے ہیں، اور جوہری نحوی نے لکھا ہے کہ درخت اراک کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس پر کچھ پھل ہوتا ہے اور کھایا جاتا ہے، مگر اس درخت کے پھل بھی بدمزہ تھے۔ اور ابوعبیدہؒ نے فرمایا کہ خمط ہر ایسے درخت کو کہا جاتا ہے جو خاردار بھی ہو کڑوا بھی۔ اور لفظ اثل جمہور مفسرین کے نزدیک ایک قسم طرفاء کی ہے، جس کو اردو میں جھاؤ کہا جاتا ہے۔ اس پر کوئی پھل کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ اثل بمعنی سمر یعنی ببول اور کیکر کا درخت جو خاردار ہوتا ہے جس کا پھل بکریوں کو کھلایا جاتا ہے۔

سدر کے معنی بیری کے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو باغات میں اہتمام سے لگائی جاتی ہے۔ اس کا پھل شیریں خوش ذائقہ ہوتا ہے، اس کے درخت میں کانٹے کم اور پھل زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری قسم جنگلی بیری کی ہے جو جنگلوں میں خودرو اور خاردار جھاڑیاں ہوتی ہیں ان میں کانٹے زیادہ اور پھل کم ہوتا ہے، اور پھل بھی ترش ہوتا ہے۔ آیت مذکورہ میں

بسدر کے ساتھ قلیل کے لفظ سے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ بیری بھی جنگلی خودرو تھی جس پر پھل کم اور ترش ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا، یعنی یہ سزا ہم نے ان کو اس لئے دی کہ انھوں نے کفر کیا۔ کفر کے معنی ناشکری کے بھی آتے ہیں، اور دین حق سے انکار کے بھی آتے ہیں۔ یہاں دونوں معنی ہو سکتے ہیں، کیونکہ انھوں نے ناشکری بھی کی، اور جو تیرہ انبیاء اُن کی طرف بھیجے گئے تھے ان کی تکذیب بھی کی۔

فائدہ: اس واقعہ میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے تیرہ پیغمبر بھیجے تھے، اور اس کے ساتھ یہ بھی اوپر گذر گیا ہے کہ اس قوم اور سیل عرم کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے درمیانی زمانے میں تھا جس کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے، اور جمہور علماء کے نزدیک اس زمانے میں کوئی نبی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا، اسی لئے اس کو فترت کے زمانے سے تعبیر کرتے ہیں، تو یہ تیرہ انبیاء کی بعثت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ روح المعانی میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ واقعہ سیل عرم کا فترت کے زمانے میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ انبیاء بھی اسی زمانے میں آئے ہوں، ہو سکتا ہے کہ انبیاء کی بعثت اس قوم کی طرف زمانۂ فترت سے پہلے ہو اور ان کی سرکشی اور کفر زمانۂ فترت میں بڑھی ہو جس پر سیل عرم کا عذاب زمانۂ فترت میں اُن پر بھیجا گیا ہو واللہ اعلم

وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ، کفور، کافر کا صیغہ مبالغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت کفر کرنے والا اور آیت کے معنی یہ ہوئے کہ "ہم بہت کفر کرنے والے کے سوا کسی کو سزا نہیں دیتے"، یہ بظاہر اُن تمام آیات قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن سے ثابت ہے کہ مسلمان گناہگاروں کو بھی جہنم کی سزا اُن کے عمل کے مطابق دی جائے گی، اگرچہ آخرکار سزا بھگتنے کے بعد وہ ایمان کی وجہ سے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس اشکال کے جواب میں بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد یہاں مطلق عذاب نہیں، بلکہ ایسا عذاب عام جیسا کہ قوم سبا پر بھیجا گیا یہ کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان گناہگاروں پر ایسا عذاب نہیں آتا (روح)

اس کی تائید ایک تابعی ابن خیرہؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا جَزَاءُ الْمَعْصِيَةِ الْوَهْنُ فِي الْعِبَادَةِ وَالضِّيْقُ فِي الْمَعِيْشَةِ وَالتَّعْسُرُ فِي اللَّذَّةِ قَالَ لَا يُصَادِفُ لَذَّةً حَلَالًا اِلَّا جَاءَهُ مَنْ يُنَغِّصُهُ اِيَّاهَا، یعنی معصیت کی سزا یہ ہے کہ عبادت میں سستی پیدا ہو جائے، معیشت میں تنگی پیدا ہو جائے، اور لذت میں تعسر یعنی

دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا مطلب ابن خیرہ نے یہ بیان فرمایا کہ جب اس کو کوئی حلال لذت نصیب ـــ ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے جو اس لذت کو مکدر کر دیتا ہے۔" (ابن کثیر) معلوم ہوا کہ مومن گناہگار کی سزائیں دنیا میں اس قسم کی ہوتی ہیں، اس پر آسمان سے یا زمین سے کوئی کھلا عذاب نہیں آتا، یہ کفر ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور حضرت حسن بصری نے فرمایا:۔ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ لَا يُعَاقَبُ بِمِثْلِ فِعْلِهٖ اِلَّا الْكَفُوْرُ، یعنی اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ بُرے عمل کی سزا اس کے برابر بجز کفور کے کسی کو نہیں دی جاتی۔ (ابن کثیر) کیونکہ غیر کفور یعنی مومن کو اس کے گناہوں میں بھی کچھ چھوٹ دی جاتی ہے۔

اور روح المعانی میں بحوالہ کشف اس آیت کے مفہوم کی توجیہ یہ کی ہے کہ کلام میں حقیقت پر ذکر سزا بعنوان سزا کے تو صرف کافر کو دی جاتی ہے اور مومن گناہگار کو جو تکلیف آگ وغیرہ کی دی جاتی ہے وہ صرف صورت سزا کی ہوتی ہے، درحقیقت اس کو گناہ سے پاک کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے سونے کو بھٹی میں ڈال کر تپانے سے اس کا میل دور کرنا مقصود ہوتا ہے اسی طرح مومن کو بھی اگر کسی گناہ کی پاداش میں جہنم میں ڈالا گیا تو اس لئے کہ اس کے بدن کے وہ اجزاء جل جائیں جو حرام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب یہ ہو چکتا ہے تو وہ جنت میں جانے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ، الآیۃ۔ اس آیت میں اہل سبا پر اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت کا اور اس پر اہل سبا کی ناشکری اور نادانی کا ذکر ہے کہ انھوں نے خود اس نعمت کو بدل کر شقت کی دعا اور تمنا کی۔ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا سے مراد بقول جمہور ملک شام کے دیہات ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا ذکر متعدد آیتوں میں ملک شام ہی کے لئے آیا ہے۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے صاحب برکت بنایا تھا یعنی ملک شام کی بستیاں اور ان لوگوں کو اپنی تجارت وغیرہ کے لئے ملک شام کا سفر اکثر کرنا پڑتا تھا جو عام دنیا کے حالات کے مطابق شہر مآرب سے ملک شام کا طویل فاصلہ ہے۔ راستے ہموار نہیں اللہ تعالیٰ نے قوم سبا پر یہ انعام فرمایا کہ ان کے شہر مآرب سے لے کر ملک شام تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بستیاں بنادی تھیں، یہ بستیاں لب سڑک تھیں۔ اس لئے ان کو قُرًى ظَاهِرَةً فرمایا۔ ان مسلسل بستیوں کا فائدہ یہ تھا کہ ان کا مسافر گھر سے نکل کر دوپہر میں آرام کرنا یا کھانا کھانا چاہتا تو آسانی سے کسی بستی میں پہونچ کر معمول کے مطابق

کھانا کھا کر آرام کرتے تھے۔ پھر اسی طرح ظہر کے بعد روانہ ہو کر آفتاب کے غروب ہونے تک اگلی بستی میں پہونچ کر رات گذارتے تھے، قَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ؕ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بستیاں ایسے متوازن و مساوی فاصلوں پر بنائی گئی تھیں کہ ایک مقررہ وقت کے اندر ایک بستی سے دوسری بستی تک پہونچ جاتے۔

سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ۔ یہ ایک تیسری نعمت کا ذکر ہے جو قوم سبا پر مبذول ہوئی تھی کہ اس کی بستیاں ایسے مساوی اور متوازن فاصلوں پر تھیں کہ قطع مسافت میں کمی بیشی نہ ہوتی تھی اور راستے سب مامون تھے، کسی چور ڈاکو کا وہاں گذر نہ تھا، رات دن میں ہر وقت بے فکر سفر کیا جا سکتا تھا۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۔ یعنی ان ظالموں نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی کہ سفر کی تکلیف ہی نہ رہے ناقدری اور ناشکری کر کے خود یہ دعا مانگی کہ ہمارے سفر میں بُعد پیدا کر دے قریب قریب گاؤں نہ ہوں، جنگل بیابان ہوں جس میں کچھ محنت مشقت بھی اُٹھانی پڑے۔ اُن کی مثال وہی ہے جو بنی اسرائیل کی تھی کہ بے محنت بہترین رزق من و سلویٰ ان کو ملتا تھا، اس سے تنگ آ کر دعا کرنے لگے کہ اس کے بجائے ہمیں سبزی ترکاری دیدیجئے، حق تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور نعمت کی بے قدری پر وہ سزا جاری فرمائی جو اوپر سَيْلَ الْعَرِمِ کے عنوان سے مذکور ہوئی ہے۔ اسی کا آخری نتیجہ اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ان کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ دنیا میں ان کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت کے قصے ہی رہ گئے، اور یہ لوگ افسانہ بن گئے۔

مَزَّقْنَاهُمْ تمزیق سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس مقام شہر مآرب کے بسنے والے کچھ ہلاک ہو گئے، کچھ ایسے منتشر ہو گئے کہ اُن کے ٹکڑے مختلف ملکوں میں پھیل گئے، عرب میں قوم سبا کی تباہی اور منتشر ہونا ایک ضرب المثل بن گیا، ایسے مواقع میں عرب کا محاورہ ہے تَفَرَّقُوا أَيَادِيَ سَبَا، یعنی یہ لوگ ایسے منتشر ہوئے جیسے قوم سبا کے نعمت پروردہ لوگ منتشر ہو گئے تھے۔

ابن کثیر وغیرہ مفسرین نے اس جگہ طویل قصہ ایک کاہن کا نقل کیا ہے کہ سیلاب کے عذاب آنے سے کچھ پہلے اس کاہن کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک عجیب تدبیر کے ذریعہ پہلے تو اپنی زمین جائداد مکان وغیرہ سب فروخت کر دیا، جب رقم اس کے ہاتھ آ گئی تو اس نے اپنی قوم کو آنے والے سیلاب و عذاب سے باخبر کیا، اور کہا کہ جس کو اپنی جان سلامت رکھنا ہو وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ اس نے لوگوں کو یہ بھی بتلایا کہ تم میں جو لوگ سفر بعید

اختیار کرکے محفوظ مقام کا ارادہ کریں، وہ عمان چلے جائیں اور جو لوگ شراب اور خمیری روٹی دیکھیں وغیرہ چاہیں وہ ملک شام کے مقام بُصریٰ میں چلے جائیں، اور جو لوگ ایسی سواریاں چاہیں جو کیچڑ میں ثابت قدم رہیں، اور قحط کے زمانے میں کام آئیں، اور جلدی سفر کی ضرورت کے وقت ساتھ دیں تو وہ یثرب (مدینہ منورہ) چلے جائیں جس میں کھجور کثرت سے ہے۔ اس کی قوم نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ قبیلہ ازد عمان کی طرف چلے گئے اور غسان بُصریٰ ملک شام کی طرف اور اوس و خزرج اور بنو عثمان یثرب ذات النخل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ بطن مرّ کے مقام پر پہنچ کر بنو عثمان نے تو اسی جگہ کو پسند کرلیا اور یہیں رہ پڑے، اور اسی انقطاع کی وجہ سے بنو عثمان کا لقب خزاعہ ہوگیا، یہ بطن مرّ میں جو مکہ مکرمہ کے قریب ہے رہ پڑے، اور اوس و خزرج یثرب پہنچ کر مقیم ہوگئے۔ ابن کثیر میں اس قصہ کے بعد لوگوں کے متفرق مقامات میں منتشر ہوجانے کی یہی تفصیل بسند سعید عن قتادہ عن الشعبی نقل کرکے فرمایا کہ اس طرح یہ قوم سبا ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، جس کا ذکر مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ میں آیا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ، یعنی قوم سبا کے عروج و زوال اور ان کے احوال کے انقلاب میں بڑی نشانی اور عبرت ہے، اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔ یعنی کوئی مصیبت و تکلیف پیش آئے تو اس پر صبر کرے، اور کوئی نعمت و راحت حاصل ہو تو اس پر اللہ کا شکر کرے، اس طرح وہ زندگی کے ہر حال میں نفع ہی نفع کماتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حال عجیب ہے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی تقدیری حکم نافذ فرماتے ہیں سب خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہوتا ہے، کہ اگر اس کو کوئی نعمت راحت اور اس کی خوشی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو یہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اس کی آخرت کے لئے خیر و نفع بن جاتا ہے اور اگر کوئی تکلیف و مصیبت پیش آجاتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے جس کا اس کو بہت بڑا اجر و ثواب ملتا ہے، اس طرح یہ مصیبت بھی اس کے لئے خیر اور نفع بن جاتی ہے۔ (از ابن کثیر)

اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ صبّار کو صبر کے عام معنی میں لیا ہے جس میں طاعات پر ثابت قدم رہنا اور معاصی سے پرہیز کرنا بھی داخل ہے، اس تفسیر پر مومن ہر حال میں صبر و شکر کا جامع رہتا ہے اور ہر صبر شکر ہے اور ہر شکر صبر بھی ہے۔ واللہ اعلم

اور کارفرما اور خدائی کا شریک سمجھتے تھے، اُن کے رد کے لئے تو آیت کے پہلے جملے آئے، (لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ) اور بعض لوگ اتنا تو نہیں کہتے تھے مگر یہ عقیدہ رکھتے کہ یہ بُت خدا تعالیٰ کے کاموں میں اس کے مددگار ہیں، اُن کے رد کے لئے یہ فرمایا (وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ) اور کچھ ایسے سمجھدار تھے کہ ان بے جان بتوں کو کسی چیز کا خالق یا مالک یا مددگار تو نہیں مانتے تھے، مگر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں یہ جس کی سفارش کر دیں اس کا کام بن جاتا ہے، جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے (هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ) ان کے رد کے لئے فرمایا (وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ) جس کا حاصل یہ ہے کہ ان بتوں میں کسی قابلیت کے تو تم بھی قائل نہیں مگر تم اس دھوکہ میں ہو کہ ان کو اللہ کے نزدیک مقبولیت حاصل ہے، یہ محض تمہارا خیال بے بنیاد ہے، نہ ان میں کوئی قابلیت اور نہ اللہ کے نزدیک مقبولیت۔ آگے یہ ارشاد فرمایا کہ ان میں تو نہ کوئی قابلیت ہے نہ مقبولیت، جن میں قابلیت بھی موجود ہو اور مقبولیت بھی جیسے اللہ کے فرشتے وہ بھی کسی کی سفارش کرنے میں خود مختار نہیں بلکہ ان کے لئے شفاعت کا قانون یہ ہے کہ جس شخص کے لئے سفارش کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے صرف اس کی سفارش کر سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی مشکل سے، کیونکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال سے مغلوب ہیں جب ان کو کوئی حکم دیا جاتا ہے یا کسی کے لئے سفارش کا حکم ملتا ہے تو وہ حکم سننے کے وقت ہیبت سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ جب یہ ہیبت کی کیفیت رفع ہو جاتی ہے اس وقت حکم پر غور کرتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ کر تحقیق کرتے ہیں کہ ہم نے جو حکم سُنا ہے وہ کیا ہے، اس تحقیق کے بعد وہ حکم کی تعمیل کرتے ہیں جس میں کسی کی سفارش کا حکم بھی داخل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ کے فرشتے جو قابلیت بھی رکھتے ہیں، مقبولیت عند اللہ بھی، وہ بھی کسی کی سفارش از خود بلا اجازت نہیں کر سکتے، اور جب کسی کے لئے اجازت ملتی بھی ہے تو خود ہیبت سے مدہوش جیسے ہو جاتے ہیں، اس کے بعد جب ہوش درست ہوتا ہے تو سفارش کرتے ہیں، تو یہ پتھروں کے خود تراشیدہ بُت جن میں نہ کسی طرح کی قابلیت ہے نہ مقبولیت، وہ کیسے کسی کی سفارش کر سکتے ہیں؟ فرشتوں کے مدہوش ہو جانے وغیرہ کا ذکر آگے آیت میں اس طرح آیا ہے کہ) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ (جو حکم سننے کے وقت طاری ہوئی تھی) دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا وہ کہتے ہیں کہ (فلاں) حق بات

یہ حکم فرمایا، جیسے طالب علم سبق پڑھنے کے بعد استاد کی تقریر کو صحیح کرنے اور یاد کرنے کے لئے باہم اس کا اعادہ کیا کرتے ہیں، یہ فرشتے بھی اپنے سُنے ہوئے حکم کی باہم ایک دوسرے سے تحقیق و تصدیق کرتے ہیں، اس کے بعد حکم کی تعمیل کرتے ہیں، اور (اس کے روبرو فرشتوں کا ایسا حال ہو جانا کیا بعید ہے،) وہ عالی شان سب سے بڑا ہے۔

(اور آپ ان سے تحقیق توحید کے لئے یہ بھی) پوچھئے کہ تم کو آسمان و زمین سے (پانی برساکر اور نباتات نکال کر) کون روزی دیتا ہے (چونکہ اس کا جواب ان کے نزدیک بھی متعین ہے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ روزی دیتا ہے، اور یہ بھی کہئے کہ (اس مسئلہ توحید میں) بیشک ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں (یعنی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ دو متضاد چیزیں توحید و شرک دونوں صحیح اور حق ہوں، اور دونوں طرح کے عقیدے رکھنے والے اہل حق ہوں، بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے ایک صحیح دوسرا غلط ہو، تو صحیح عقیدے کے رکھنے والے ہدایت پر اور غلط کا عقیدہ رکھنے والے گمراہی پر ہوں گے۔ اب تم خود غور کرلو کہ ان میں سے کونسا عقیدہ صحیح ہے اور کون حق و ہدایت پر ہے کون گمراہی پر) آپ (ان سے اس بحث و مناظرہ میں یہ بھی) فرما دیجئے کہ ہم نے کھول کر حق و باطل کو واضح طور پر بیان کردیا ہے، اب تم اور ہم ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے، تم سے ہمارے جرم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی اور آپ ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (ایک وقت ضرور آنے والا ہے جس میں) ہمارا رب سب کو ایک جگہ جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ (عملی) کردے گا، اور وہ بڑا فیصلہ کرنے والا اور (سب کا حال) جاننے والا ہے، آپ (یہ بھی) کہئے کہ (تم نے اللہ تعالیٰ کی شان عالی اور قدرت کاملہ کے دلائل سن لئے اور اپنے بتوں کی بے بسی بھی دیکھ لی) مجھ کو ذرا وہ تو دکھلاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر (استحقاق عبادت میں) خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز (اس کا کوئی شریک) نہیں بلکہ (واقع میں) وہی ہے اللہ (یعنی معبود برحق) زبردست حکمت والا۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں حکم ربانی کے نزول کے وقت جو فرشتوں کا مدہوش ہوجانا پھر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ پاچھ کرنے کا ذکر ہے، اس کا بیان صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اس طرح آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم نافذ فرماتے ہیں تو سب فرشتے خشوع و خضوع سے اپنے پر مارنے لگتے ہیں (اور مدہوش جیسے ہوجاتے ہیں

جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ اور ہیبت وجلال کا اثر دور ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ دوسرے کہتے ہیں کہ فلاں حکم حق ارشاد فرمایا ہے۔ بحدیث

اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کسی صحابی سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا رب تبارک اسمہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو عرش کے اٹھانیوالے فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں، ان کی تسبیح کو سن کر ان کے قریب والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، پھر ان کی تسبیح کو سن کر اس سے نیچے والے آسمان کے فرشتے تسبیح پڑھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ یہ نوبت سماء دنیا (نیچے کے آسمان) تک پہونچ جاتی ہے اور سب آسمانوں کے فرشتے تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے جو حاملِ عرش کے قریب ہیں ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے رب نے کیا فرمایا وہ بتلا دیتے ہیں، پھر اسی طرح ان سے نیچے کے آسمان والے اوپر والوں سے یہی سوال کرتے ہیں، یہاں تک کہ سوال وجواب کا یہ سلسلہ سماء دنیا تک پہونچ جاتا ہے۔ (الحدیث، مظہری)

بحث ومناظرہ میں مخاطب کی نفسیات کی رعایت اور اشتعال انگیزی سے پرہیز: وَإِنَّآ أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ، یہ مشرکین کفار کے ساتھ خطاب ہے۔ دلائل واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق ومالک ہونا اور قادر ومطلق ہونا واضح کر دیا گیا، بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کرا دیا گیا، ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کر کے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو۔ مگر قرآن حکیم نے اس جگہ حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا وہ دعوت وتبلیغ اور مخالفینِ اسلام اور اہلِ باطل سے بحث ومناظرہ کرنے والوں کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ ہے کہ اس آیت میں ان کو کافر گمراہ کہنے کی بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائل واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھدار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید وشرک دونوں باتیں حق ہیں، اور اہلِ توحید اور مشرک دونوں حق پرست ہیں، بلکہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پر دوسرا گمراہی پر ہے۔ اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کر لو کہ ہم حق پر ہیں یا تم۔ مخاطب کو خود کافر گمراہ کہنے سے اس کو اشتعال ہوتا، اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگدل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہو جائے (از قرطبی وبیان القرآن)

یہ پیغمبرانہ دعوت وموعظت اور مجادلہ بالتی ھی احسن کا طریقہ جو علماء کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت وتبلیغ اور بحث ومناظرہ بے اثر بلکہ مضر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مخالفین ضد پر آجاتے ہیں ان کی گمراہی اور پختہ ہو جاتی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ
اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سب لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو لیکن

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾
بہت لوگ نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے (خواہ جن ہوں یا انسان، عرب ہوں یا عجم موجود ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں سب کے لئے) پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (ایمان لانے پر ان کو ہماری رضا و ثواب کی) خوش خبری سنانے والا اور (ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب و عذاب سے) ڈرانے والا، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (جہالت یا عناد کی وجہ سے انکار و تکذیب میں لگ جاتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں توحید اور حق تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں رسالت کا اور بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تمام اقوام عالم موجودہ و آئندہ کے لئے عام ہونا بیان کیا گیا ہے۔

كَآفَّةً لِّلنَّاسِ لفظ كَآفَّةً، عربی محاورہ میں کسی چیز کے سب کو عام و شامل ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں کوئی مستثنیٰ نہ ہو، اصل عبارت ترکیبی کا تقاضہ یہ تھا کہ لِلنَّاسِ كَآفَّةً کہا جاتا، کیونکہ لفظ کافہ حال ہے ناس کا، مگر عموم بعثت بیان کرنے کا اہتمام واضح کرنے کے لئے لفظ کافہ کو مقدم کر دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ہیں، ان کی رسالت و نبوت کسی خاص قوم اور خاص خطۂ زمین کے لئے تھی۔ یہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی فضیلت ہے کہ آپ کی نبوت ساری دنیا کے لئے عام ہے۔ وہ صرف انسان ہی نہیں جنات کے لئے بھی ہے اور صرف اُن لوگوں کے لئے نہیں جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے بلکہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں کے لئے عام ہے۔ اور آپ کی نبوت و رسالت کا تا قیامت باقی اور مسلسل رہنا ہی اس کا مقتضی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہوں آپ کے

بعد کوئی نبی مبعوث نہ ہو کیونکہ دوسرا نبی اس وقت مبعوث ہوتا ہے جب پہلے کی شریعت اور تعلیمات مسخ و محرّف ہو جائیں، تو دوسرا نبی اصلاحِ خلق کے مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور آپ کی کتاب قرآن کی حفاظت کا تا قیامت خود ذمہ لے لیا ہے، اس لئے وہ قیامت تک اپنی اصلی حالت میں قائم رہے گی اور کسی اور نبی کے مبعوث ہونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ایک یہ کہ میری مدد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا رعب دے کر فرمائی کہ ایک مہینہ کی مسافت تک کے لوگوں پر میرا رعب چھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے لئے پوری زمین کو مسجد اور طہور قرار دیدیا گیا ہے۔ (پچھلے انبیاء کی شریعتوں میں ان کی عبادت خاص عبادت گاہوں ہی میں ہوتی تھی، ان کی مساجد سے باہر میدان یا گھر میں عبادت نہ ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کے لئے پوری زمین کو اس معنی میں مسجد بنا دیا کہ ہر جگہ نماز ادا ہو سکتی ہے، اور زمین کی مٹی کو پانی نہ ملنے یا پانی کا استعمال مضر ہونے کی صورت میں طہور یعنی پاک کرنے والا بنا دیا کہ اس سے تیمم کر لیا جائے تو وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے)، تیسرے یہ کہ میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا، مجھ سے پہلے کسی امت کے لئے یہ مال حلال نہیں تھا، بلکہ حکم یہ تھا کہ جنگ میں جو مال کفار کا ہاتھ آتا اس کو جمع کر کے ایک جگہ رکھ دیں، وہاں ایک آسمانی آگ بجلی وغیرہ آکر اس کو جلا دے گی اور یہ جلا دینا ہی اس جہاد کی مقبولیت کی علامت ہوگی۔ امتِ محمدیہ کے لئے مالِ غنیمت کو قرآن کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق تقسیم کر لینا اور اپنی ضروریات میں صرف کرنا جائز کر دیا گیا) چوتھے یہ کہ مجھے شفاعتِ کبریٰ کا مقام دیا گیا (یعنی حشر کے میدان میں جس وقت کوئی پیغمبر شفاعت کی ہمت نہ کرے گا، مجھے اس وقت شفاعت کا موقع دیا جائے گا) پانچویں یہ کہ مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، مجھے تمام اقوامِ عالم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے (ابن کثیر)

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قُل لَّكُم

اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ تو کہہ تمہارے

مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٠﴾

لئے وعدہ ہے ایک دن کا نہ دیر کرو گے اس سے ایک گھڑی نہ جلدی

ع ۹/۳

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي
اور کہنے لگے منکر ہم ہرگز نہ مانیں گے اس قرآن کو اور نہ اس سے
بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ
اگلے کو، اور کبھی تو دیکھے جب کہ گنہگار کھڑے کئے جاتے ہیں اپنے رب کے پاس،
يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا
ایک دوسرے پر ڈالتا ہے بات کو، کہتے ہیں وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے
لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ
بڑائی کرنے والوں کو اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان دار ہوتے کہنے لگے
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ
بڑائی کرنے والے ان سے جو کہ کمزور ہوگئے تھے کیا ہم نے روکا تم کو
الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ
حق بات سے تمہارے پاس پہنچ چکنے کے بعد کوئی نہیں تم ہی تھے گنہگار۔ اور کہنے لگے
اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ
وہ لوگ جو کمزور گنے گئے تھے بڑائی کرنے والوں کو کوئی نہیں پر فریب سے رات دن کے جب
تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا
تم ہم کو حکم کیا کرتے کہ ہم نہ مانیں اللہ کو اور ٹھہرائیں اس کے ساتھ برابر کے اور چھپے چھپے
النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ
پچھتانے لگے جب دیکھ لیا عذاب، اور ہم نے ڈالے ہیں طوق گردنوں میں
الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾
منکروں کے، وہی بدلہ پاتے ہیں جو عمل کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ (قیامت کے متعلق مضامین یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ الخ سنکر) کہتے ہیں

کہ یہ وعدہ کب واقع ہوگا اگر تم (یعنی نبی اور آپ کے متبعین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے واسطے ایک خاص دن کا وعدہ (مقرر) ہے اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو (یعنی گو ہم وقت نہ بتلائیں گے جو تم پوچھ رہے ہو مگر آنے کی ضرور جس کا اس پوچھنے سے انکار کرنا تمہارا مقصود ہے) اور یہ کفار (دنیا میں تو خوب باتیں بناتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلی کتابوں پر اور قیامت میں یہ ساری بڑی بڑی باتیں ختم ہوجائیں گی چنانچہ) اگر آپ (ان کی) اس وقت کی حالت دیکھیں (تو ایک ہولناک منظر نظر آئے) جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جاویں گے ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا (جیسا کوئی کام بگڑ جانے کے وقت عادت ہوتی ہے چنانچہ) ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی متبعین) بڑے لوگوں سے (یعنی اپنے مقتداؤں سے) کہیں گے کہ ہم تو تمہارے سبب برباد ہوئے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے (اس پر) یہ بڑے لوگ ان ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت (پر عمل کرنے) سے (زبردستی) روکا تھا بعد اس کے کہ وہ (ہدایت) تم کو پہونچ چکی تھی نہیں بلکہ تم ہی قصوروار ہو (کہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کو قبول نہ کیا، اب ہمارے سر دھرتے ہو) اور (اس کے جواب میں) یہ کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ (ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے زبردستی کی تھی) نہیں بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا جب تم ہم سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لئے شریک قرار دیں (تدبیروں سے مراد ترغیب و ترہیب ہے، یعنی رات دن کی ان تعلیمات اور ان تدبیرات کا اثر ہوگیا، اور تباہ و برباد ہوئے۔ بس ہم کو تم ہی نے خراب کیا) اور (اس گفتگو میں تو ہر شخص دوسرے پر الزام دے گا، مگر دل میں اپنا اپنا قصور بھی سمجھیں گے۔ مضلین سمجھیں گے کہ واقعی ہم نے ایسا کیا تو تھا اور ضالین سمجھیں گے کہ گو انھوں نے ہم کو غلط راستہ بتلایا تھا، لیکن آخر ہم بھی تو اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے تھے، ضرور ہمارا بھی بلکہ زیادہ ہمارا ہی قصور ہے لیکن) وہ لوگ (اپنی اس) پشیمانی کو (ایک دوسرے سے) مخفی رکھیں گے جبکہ (اپنے عمل پر) عذاب (ہوتا ہوا) دیکھیں گے (تاکہ نقصان کے ساتھ شماتت ہمسایہ نہ ہو لیکن آخر میں شدتِ عذاب سے وہ تحمل جاتا رہے گا) اور (ان سب کو مشترک یہ عذاب دیا جاتے گا کہ) ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے (اور ہاتھ پاؤں میں زنجیر پھر مشکیں کسا ہوا جہنم میں جھونک دیا جائے گا) جیسا کرتے تھے ویسا ہی تو بھرا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر کہنے لگے وہاں کے آسودہ لوگ جو تمہارے ہاتھ بھیجا گیا

بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ

ہم اس کو نہیں مانتے۔ اور کہنے لگے ہم زیادہ ہیں مال اور اولاد میں، اور ہم پر آفت

بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ

نہیں آنے والی، تو کہہ میرا رب ہے جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اور ماپ کر دیتا ہے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ

لیکن بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد

اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ

وہ نہیں کہ نزدیک کر دیں ہمارے پاس تمہارا درجہ پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا

صَالِحًا ۡ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي

کام کیا سو ان کے لئے ہے بدلہ دونا ان کے کئے کام کا اور وہ جھروکوں

الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ

میں بیٹھے ہیں دل جمعی سے، اور جو لوگ دوڑتے ہیں ہماری آیتوں کے ہرانے کو

اُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

وہ عذاب میں پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے اقوالِ ضلالت و اقوالِ جہالت سے آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ یہ معاملہ انوکھا آپ ہی کے ساتھ نہیں ہو بلکہ) ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈر سنانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا، مگر وہاں کے خوش حال لوگوں نے (ان کفار معاصرین کی طرح) یہی کہا کہ ہم تو ان احکام کے منکر ہیں جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے، اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں، (کما قال فِی الکہف اَنَا اَکْثَرُ

مِنْكُمْ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا) اور (یہ دلیل ہے ہمارے مکرم و مقبول عند اللہ ہونے کی پس) ہم کو کبھی عذاب نہ ہوگا (اور یہی بات کفار مکہ کہتے ہیں کما قال تعالیٰ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا ، پس غم نہ کیجئے ، البتہ ان کے قول کو رد کیجئے اور ان سے یوں) کہہ دیجئے کہ (وسعتِ رزق کا مدار قبول عند اللہ نہیں ہے ، بلکہ محض مشیت ہے ، چنانچہ) میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے (اور اس میں حکمتیں ہوتی ہیں) ولیکن اکثر لوگ (اس سے) واقف نہیں (کہ مدار اس کا دوسری مصلحتوں پر ہے قبولیت عند اللہ پر نہیں ہے) اور (اے کفار یہ بھی سن رکھو کہ جس طرح تمہارے اموال و اولاد دلیل و علامت قرب عند اللہ کے نہیں اسی طرح) تمہارے اموال و اولاد ایسی چیزیں نہیں جو تم کو درجہ میں ہمارا مقرب بنا دے (یعنی مؤثر و علت قرب کی بھی نہیں پس نہ اموال و اولاد قبولیت پر مرتب ہیں ، اور نہ اموال و اولاد پر قبولیت مرتب ہے) ہاں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سببِ قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دونا صلہ ہے (یعنی عمل سے زیادہ خواہ دونے سے بھی زیادہ لقولہ تعالیٰ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا) اور وہ (بہشت کے) بالاخانوں میں چین سے (بیٹھے) ہوں گے اور جو لوگ (ان کے خلاف محض اموال و اولاد پر مغرور ہیں اور ایمان و عمل صالح کو اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ) ہماری آیتوں کے متعلق (ان کے ابطال کی) کوشش کر رہے ہیں (نبی کو) ہرانے کے لئے ایسے لوگ عذاب میں لائے جائیں گے۔

معارف و مسائل

دنیا کی دولت و عزت کو مقبولیت عند اللہ کی دلیل سمجھنے کا قدیم شیطانی فریب

ابتداء دنیا سے دنیا کی دولت اور عیش و عشرت کے نشہ میں مخمور ہونے والوں نے ہمیشہ حق کی آواز کی مخالفت اور انبیاء و صلحاء سے عداوت کا طریقہ اختیار کیا ہے ، اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہ ، اس پر طرہ یہ کہ وہ اہلِ حق کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت پر مگن اور مطمئن ہونے کی یہ دلیل بھی دیتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال و عادات اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہمیں دنیا کی دولت عزت سے حکومت کیوں دیتے ؟ قرآن کریم نے اس کا جواب متعدد آیات میں مختلف عنوانات سے دیا ہے۔ آیاتِ مذکورہ کا نزول بھی اسی طرح کے ایک واقعہ سے متعلق اور اس لغو دلیل کا جواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں دو شخص ایک کاروبار میں شریک تھے ،

پھر ان میں سے ایک یہ جگہ چھوڑ کر کسی ساحلی علاقہ میں چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے آپ کی نبوت و رسالت کا چرچا ہوا تو ساحلی ساتھی نے شامی ساتھی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ ان کے دعویٰ نبوت کا تم لوگوں نے کیا اثر لیا؟ اس پر شامی ساتھی نے جواب لکھا کہ قریش میں سے تو کوئی بھی ان کا تابع نہیں ہوا، صرف غریب مسکین بے حیثیت لوگ انکے پیچھے لگے ہیں۔ ساحلی ساتھی وہاں کی اپنی تجارت چھوڑ کر مکہ مکرمہ آیا، اور اپنے ساتھی سے کہا کہ مجھے اس کا پتہ بتلاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ساحلی ساتھی کچھ کتب قدیمہ تورات و انجیل وغیرہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے اپنی دعوت اسلام کے اہم اجزاء کا ذکر فرمایا، دعوت اسلام کو آپ کی زبان مبارک سے سنتے ہی اس نے کہا اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ آپ کی دعوت کا حق ہونا تو عقل سے سمجھا اور اس کی علامت یہ دیکھی کہ جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے آئے ہیں سب کے ماننے والے ابتداء میں قوم کے غریب و فقیر دنیا میں کم حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی مَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا (ابن کثیر و مظہری)۔ مُتْرَف، تَرَف سے مشتق ہے، جس کے معنی ناز و نعمت کی فراوانی کے آتے ہیں۔ مترفین سے مراد اغنیاء اور مالدار اور قوم کے سردار ہیں۔ قرآن کریم نے مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ جب کبھی ہم نے کوئی رسول بھیجا، تو مال و دولت کے نشہ اور ناز و نعمت میں پلے ہوئے لوگوں نے اس کا مقابلہ کفر و انکار ہی سے کیا ہے۔

دوسری آیت میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ، "یعنی ہم تم سے مال و دولت میں بھی زیادہ اولاد میں بھی زیادہ، اس لئے ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہو سکتے"۔ بظاہر اُن کے قول کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم قابل عذاب ہوتے تو ہمیں اتنی دولت و عزت کیوں دیتا، قرآن کریم نے تیسری اور چوتھی آیت میں اُن کا یہ جواب دیا ہے قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ اور وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ الآیہ۔ خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ دنیا میں مال و دولت یا عزت و جاہ کی کمی بیشی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ تکوینی مصالح کے پیش نظر دنیا میں تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مال و دولت فراوانی کے ساتھ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، جس کی تکوینی حکمت

کو وسی جانتا ہے، مگر مال و اولاد کی بہتات کو اللہ کے نزدیک مقبولیت کی دلیل سمجھنا جہالت ہے، کیونکہ اس کے نزدیک مقبولیت کا مدار صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے جس کو یہ حاصل نہیں مال و اولاد کتنا ہی زیادہ ہو وہ اس کو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں بنا سکتا۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (یعنی کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مال اور اولاد کی بہتات سے ان کی امداد کرتے ہیں یہ کچھ ان کے لئے انجام و آخرت کے اعتبار سے خیر ہے (ہرگز نہیں، بلکہ یہ لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں (کہ جو مال و اولاد انسان کو **اللہ سے غافل کرے وہ اس کے لئے وبال ہے)۔**

دوسری آیت میں فرمایا فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ "یعنی ان کافروں کے مال و اولاد سے آپ تعجب نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کو اسی مال و اولاد کے ذریعے دنیا میں مبتلائے عذاب کر دے، اور انجام کار ان کی جان اسی حالتِ کفر میں نکل جائے، جس کا نتیجہ آخرت کا دائمی عذاب ہو۔ مال و اولاد کے ذریعہ دنیا میں عذاب دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں مال و دولت کی محبت میں ایسے مبتلا ہو جائیں کہ اپنے انجام اور خدا و آخرت کی طرف کبھی التفات نہ ہو جس کا انجام دائمی عذاب ہے، اور بہت سے مال و اولاد والوں کو اس دنیا میں بھی مال و اولاد ہی کی خاطر بلکہ انہی کے ذریعہ ہزاروں مصائب و تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں، ان کی سزا و عذاب تو اسی عالم سے شروع ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا، وہ تو تمہارے دلوں کو اور اعمال کو **دیکھتا ہے (رواہ احمد، ابن کثیر)**

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ، یہ ایمان و عمل صالح والوں کا حال بتلایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول یہی لوگ ہیں، دنیا میں کوئی ان کی قدر پہچانے یا نہ پہچانے، آخرت میں اُن کو جزائے ضِعف ملے گی۔ ضِعف بکسر ضاد مصدر ہے جس کے معنی ایک شے کے مثل یا امثال کے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں دولت والے اپنی دولت کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی جزاء کو آخرت میں بڑھا دیں گے، کہ ایک عمل کی جزاء اس کے دس امثال ہوں گے، اور اس میں بھی منحصر نہیں اس کے اخلاص عمل اور دوسرے اسباب سے ایک عمل کی جزا اس کے سات سو گنا تک ملنا

بھی احادیث صحیحہ میں ثابت ہیں۔ اور اس میں بھی حصر نہیں، اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ جنت کے غرفوں میں، مومن، در ہمیشہ کے لئے ہر رنج و غم سے محفوظ رہیں گے۔ غرفات غرفہ کی جمع ہے، مکان کا جو حصہ دوسرے حصوں سے ممتاز و اعلیٰ سمجھا جائے اس کو غرفہ کہتے ہیں (مظہری)

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ وَمَا

تو کہہ میرا رب ہے جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور ناپ کر دیتا ہے اور

أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۳۹)

جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہتر ہے روزی دینے والا۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (مومنین سے) یہ فرما دیجئے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی دیتا ہے اور (خرچ میں امساک اور بخل سے رزق بڑھ نہیں سکتا، اور شریعت کے مطابق خرچ کرنے سے گھٹ نہیں سکتا، اس لئے تم مال سے دل نہ لگاؤ بلکہ جہاں جہاں اللہ کے حقوق اور اپنے عیال کے حقوق اور فقراء و مساکین وغیرہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے بے دھڑک خرچ کرتے رہو، کہ اس سے رزق مقسوم و مقدر میں تو کچھ کمی کا ضرر نہ ہوگا اور آخرت میں اس سے نفع حاصل ہوگا، کیونکہ) جو چیز تم (حکم خداوندی کے مواقع میں) خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کا (آخرت میں تو ضرور اور اکثر دنیا میں بھی) بدلہ دیگا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ آیت تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ اوپر گذری ہے (قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ) یہاں بظاہر یہی مضمون مکرر آیا ہے مگر ایک فرق کے ساتھ کہ اس جگہ مَنْ يَشَاءُ کے بعد مِنْ عِبَادِهِ اور يَقْدِرُ کے بعد لَهُ کا اضافہ ہے۔ مِنْ عِبَادِهِ کے لفظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم اپنے مخصوص بندوں یعنی مومنین کے لئے ارشاد ہوا ہے، اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ایمان والے مال کی محبت میں ایسے نہ لگیں کہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے حقوق و مواقع

میں خرچ کرنے سے دل تنگ ہونے لگیں اور اس سے پہلی جو آیت اسی مضمون کی آئی ہے اس کا خطاب کفار و مشرکین کو تھا جو دنیا کے مال و اولاد پر فخر کرتے اور ان کو ہی آخرت کی فلاح کی دلیل بناتے تھے، اس طرح مخاطب اور مقصود کلام کے اعتبار سے تکرار نہ رہا، خلاصہ تفسیر میں جو شروع آیت کی تفسیر میں مومنین کا لفظ بڑھایا ہے یہ اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور بعض حضرات نے ان دونوں آیتوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ پہلی آیت میں تو مختلف انسانوں میں تقسیم رزق کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصالح عامہ کے پیش نظر کسی کو مال زیادہ کسی کو کم دیتے ہیں، اور اس آیت میں ایک ہی شخص کے مختلف احوال کا ذکر ہے کہ ایک شخص کو کبھی مال کی فراخی اور وسعت عطا ہوتی ہے، کبھی اسی کو تنگی اور تنگ دستی پیش آتی ہے۔ لفظ لہ جو اس آیت میں یقدر کے بعد آیا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے، اس تقریر کے مطابق بھی تکرار نہ رہا، بلکہ پہلی آیت مختلف افراد کے متعلق اور یہ آیت ایک ہی فرد کے مختلف احوال کے متعلق ہوگئی۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ۔ اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے تمہیں اس کا بدل دیدیتے ہیں، کبھی دنیا میں اور کبھی آخرت میں اور کبھی دونوں میں۔ کائنات عالم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے انسان اور جانور اس کو بے دھڑک خرچ کرتے رہتے ہیں، کھیتوں اور درختوں کو سیراب کرتے ہیں وہ پانی ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا اس کی جگہ اور نازل ہو جاتا ہے، اسی طرح زمین سے کنواں کھود کر جو پانی نکالا جاتا ہے اس کو جتنا نکال کر خرچ کرتے ہیں اس کی جگہ دوسرا پانی قدرت کی طرف سے جمع ہو جاتا ہے، انسان غذا کھا کر بظاہر ختم کر لیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسری غذا مہیا کر دیتے ہیں، بدن کی نقل و حرکت اور محنت سے جو اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں ان کی جگہ دوسرے اجزاء بدل ما یتحلل بن جاتے ہیں، غرض انسان دنیا میں جو چیز خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی عام عادت یہ ہے کہ اس کے قائم مقام اسی جیسی دوسری چیز دیدیتے ہیں، کبھی کسی کو سزا دینے کے لئے یا کسی دوسری تکوینی مصلحت سے اس کے خلاف ہو جانا اس ضابطہ الٰہیہ کے منافی نہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر روز جب لوگ صبح میں داخل ہوتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور یہ دعاء کرتے ہیں اللّٰھم اعط منفقا خلفا واعط ممسکا تلفا۔ یعنی یا اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور بخل کرنے والے کا مال ضائع کر دے" اور ایک دوسری حدیث میں ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ لوگوں پر خرچ کریں میں آپ پر خرچ کروں گا۔

جو خرچ شریعت کے مطابق نہ ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک کام صدقہ ہے، اور کوئی آدمی جو اپنے نفس پر اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے وہ بھی صدقہ کے حکم میں ہے موجب ثواب ہے، اور جو شخص کچھ خرچ کر کے اپنی آبرو بچائے وہ بھی صدقہ ہے، اور جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق کچھ خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ اس کا بدل اس کو دے گا، مگر وہ خرچ جو فضول زائد از ضرورت) تعمیر میں یا کسی گناہ کے کام میں کیا ہو اس کے بدل کا وعدہ نہیں۔

حضرت جابرؓ کے شاگرد ابن المنکدر نے یہ حدیث سن کر ان سے پوچھا کہ آبرو بچانے کے لئے خرچ کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق یہ خیال ہو کہ نہیں دیں گے تو عیب جوئی کرے گا، برا کہتا پھرے گا، یا بدگوئی کرے گا اس کو اپنی آبرو بچانے کے لئے دینا مراد ہے (رواہ الدارقطنی قرطبی)

جس چیز کا خرچ گھٹ جاتا ہے اس کی پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے

اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیاء صرف انسان اور حیوانات کے لئے پیدا فرمائی ہیں جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے، جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں۔ جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے، اور شرعی قربانیوں اور کفارات و جنایات میں ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ ان کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہے، کتے بلی کی تعداد اتنی نہیں، حالانکہ کتے بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہئے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں گائے بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے دیتی ہے، گائے بکری ہر وقت ذبح ہوتی رہتی ہے، کتے بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر یہ مشاہدہ ناقابل انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بہ نسبت کتے بلی کے زیادہ ہے۔ جب سے ہندوستان میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگی ہے اس وقت سے وہاں گائے کی پیداوار اسی نسبت سے گھٹ گئی ہے، ورنہ ہر بستی اور ہر گھر گایوں سے بھرا ہوا ہوتا جو ذبح نہ ہونے کے سبب بچی رہیں۔

عرب نے جب سے سواری اور باربرداری میں اونٹوں سے کام لینا کم کر دیا وہاں

دونوں کی پیداوار بھی گھٹ گئی۔ اس سے اس ملحدانہ شبہ کا ازالہ ہو گیا جو احکام قربانی کے مقابلہ میں اقتصادی اور معاشی تنگی کا اندیشہ پیش کر کے کیا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَائِكَةِ أَهَؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ

اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو پھر کہے گا فرشتوں کو کیا یہ لوگ تم کو پوجا

كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۖ

کرتے تھے ؟ وہ کہیں گے پاک ذات ہے تیری ہم تیری طرف ہیں ان کی طرف نہیں

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ فَالْيَوْمَ

پر پوجتے تھے جنوں کو یہ اکثر انہی پر عقیدہ رکھتے تھے سو آج

لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا

مالک نہیں ایک دوسرے کے بھلے کے نہ برے کے، اور کہیں گے ہم ان گنہگاروں کو

ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿٤٢﴾

چکھو تکلیف اس آگ کی جس کو تم جھوٹ بتلاتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ دن قابل ذکر ہے) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (میدان قیامت میں) جمع فرمائے گا، پھر فرشتوں سے ارشاد فرمائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے (ملائکہ سے یہ سوال مشرکین کو لاجواب کرنے کے لئے ہوگا، جو ملائکہ وغیرہ ملائکہ کو اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ راضی ہو کر ہماری شفاعت کریں گے، جیسے ایک آیت میں اسی طرح کا سوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا ہے، ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ۔ مطلب سوال کا یہ ہے کہ کیا تمہاری رضا سے تمہاری عبادت کیا کرتے تھے، اور نیز جواب میں بھی اسی قید کا قرینہ ہے جیسا کہ جواب سے معلوم ہوگا) وہ (اول حق تعالیٰ کا شریک سے بالاتر اور پاک ہونا ظاہر کرنے کے لئے) عرض کریں گے کہ آپ (شریک سے) پاک ہیں (یہ جواب پہلے اس لئے کہہ دیا کہ ان کی طرف جو نسبت الی الشریک کی حکایت ..... کی گئی ہے اس سے گھبرا کر پہلے یہ جملے عرض کر دیں گے اس سوال کا جواب یہ دیں گے کہ) ہمارا تو محض آپ سے تعلق ہے نہ کہ ان سے (اس سے

إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۚ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا

جھوٹ تو بنایا ہوا، اور کہتے ہیں منکر حق بات کو جب پہنچے اُن تک اور کچھ نہیں یہ

إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾ وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَا

مگر ایک جادو ہے صریح۔ اور ہم نے دی نہیں ان کو کچھ کتابیں کہ جن کو وہ پڑھتے ہوں اور

أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ﴿٤٤﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن

بھیجا نہیں ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔ اور جھٹلایا ہے ان سے

قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ

اگلوں نے اور یہ نہیں پہنچے دسویں حصہ کو اس کے جو ہم نے ان کو دیا تھا پھر جھٹلایا انہوں نے میرے بھیجے ہوؤں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا ع ۶

تو کیسا ہوا میرا انکار۔ تو کہہ میں تو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں تم کو کہ اُٹھ کھڑے ہو

لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ

اللہ کے نام پر دو دو اور ایک ایک پھر دھیان کرو کہ اس تمہارے رفیق کو کچھ سودا نہیں

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿٤٦﴾

یہ تو ایک ڈرانے والا ہے تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے

قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى

تو کہہ جو میں نے تم سے مانگا ہو کچھ بدلہ سو وہ تم ہی رکھو میرا بدلہ ہے اسی

اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٤٧﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ

اللہ پر اور اس کے سامنے ہے ہر چیز۔ تو کہہ میرا رب پھینکتا ہے سچا دین

عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٤٨﴾ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿٤٩﴾

وہ جاننے والا ہے چھپی چیزیں۔ تو کہہ آیا دین سچا اور جھوٹ تو کسی چیز کو پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے۔

قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ

تو کہہ اگر میں بہکا ہوں تو بہکوں گا اپنے ہی نقصان کو اور اگر ہوں سیدھے رستہ پر

فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ﴿٥٠﴾

تو اس سبب سے کہ وحی بھیجتا ہے مجھ کو میرا رب بیشک وہ سب کچھ سنتا ہے نزدیک ہے

خُلاصۂ تفسیر

اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں جو کہ (حق اور) واضح ہونے کی صفت میں، صاف صاف ہیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ لوگ (پڑھنے والے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص ایک ایسا شخص ہے جو یوں چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں (کی عبادت) سے باز رکھے جن کو تمہارے بڑے پوجتے (آرہے) تھے (اور ان سے باز رکھ کر اپنا تابع بنانا چاہتا ہے، مقصود ان کمبختوں کا یہ تھا کہ یہ نبی نہیں اور ان کو دعوت دینے میں بجز اس میں خود ان کی ذاتی غرض یعنی ریاست کی ہے) اور (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ محض ایک تراشا ہوا جھوٹ ہے (یعنی خدا کی طرف اس کی نسبت کرنا محض تراشی ہوئی بات ہے) اور یہ کافر اس امر حق (یعنی قرآن) کی نسبت جبکہ وہ ان کے پاس پہونچا (اس اعتراض کے بعد یہ) کہتے ہیں کہ (اگر یہ سحر نہیں تو بہت سے عقلاء اس کا اتباع کیوں کرتے ہیں اور یہ پیارا کیوں معلوم ہوتا ہے، پس) یہ محض ایک صریح جادو ہے (جس سے اس کو سن کر لوگ مغلوب العقل اور فریفتہ ہو جاتے ہیں) اور ان کو تو قرآن کی اور نبی کی بڑی قدر کرنا چاہئے تھی کیونکہ ان کے لئے تو یہ محض غیر مترقبہ نعمتیں تھیں اس سبب سے کہ ہم نے (اس قرآن سے پہلے) ان کو کبھی آسمانی کتابیں نہیں دی تھیں کہ ان کو پڑھتے پڑھاتے ہوں (جیسے بنی اسرائیل کے پاس کتابیں تھیں تو ان کے حق میں تو قرآن بالکل ایک نئی چیز تھی، اس سے اس کی قدر کرنا چاہئے تھی) اور (اسی طرح) ہم نے آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا تھا، تو ان کے حق میں نبی بھی ایک نئی دولت تھی، اس لئے ان کی بھی قدر کرنا چاہئے تھی خصوصاً جبکہ علاوہ نعمت جدیدہ ہونے کے خود ان کی تمنا بھی تھی کہ ان کے پاس کوئی نبی آئے تو ہم اس کا اتباع کریں جیسا اس آیت میں ہے وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ، مگر ان لوگوں نے کچھ بھی قدر نہ کی، کما قال تعالیٰ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا، بلکہ تکذیب کی) اور یہ لوگ تکذیب کر کے بے فکر نہ ہو بیٹھیں کیونکہ تکذیب کا وبال بڑا سخت ہے چنانچہ ان سے پہلے جو کافر لوگ تھے انہوں نے (بھی انبیاء اور وحی کی) تکذیب کی تھی اور یہ (مشرکین مکہ) تو اس سامان کے جو ہم نے ان کو دے رکھا تھا دسویں

سے کو بھی نہیں پہنچے (یعنی اُن کی سی قوت اُن کی سی عمریں اُن کی سی ثروت ان کو نہیں ملی جو کہ سرمایۂ غرور اور سبب افتخار ہوتا ہے، کما قال تعالیٰ كَانُوٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا) غرض ان لوگوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی سو (دیکھو) میرا (ان پر) کیسا عذاب ہوا (سو یہ بیچارے تو کیا چیز ہیں کہ ان کے پاس تو اتنا سامان بھی نہیں جب اس قدر ثروت ودولت کی مقاومت نہ ہو سکی تو یہ کس دھوکہ میں ہیں، دوسرے جب اُن کے پاس سامان کم ہے جو سبب غرور ہوتا ہے، تو ان کا جرم بھی سخت ہے، دیکھئے یہ کیسے بچے جاتے ہیں گے۔ یہاں تک انکار نبوت پر کفار کو تہدید فرماکر آگے ان کو تصدیق نبوت کا ایک طریقہ بتلاتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے یہ کہئے کہ میں تم کو صرف ایک بات (مختصر) سمجھاتا ہوں (اُس سے واضح ہوجاوے گا بس اس کو کرلو) وہ یہ کہ تم (محض) خدا کے واسطے (جس میں نفسانیت وتعصب نہ ہو) کھڑے (یعنی مستعد) ہوجاؤ دو دو اور ایک ایک (یعنی چونکہ مقصود غور و فکر ہے جیسا آگے آتا ہے، اور فکر کا قاعدہ ہے کہ بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے دو کے ملنے سے ہر شخص کی فکر کو دوسرے سے تقویت ملتی ہے، اور بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے تنہا خوب فکر جاری ہوتی ہے، اور بہت زیادہ مجمع میں اکثر قوت فکریہ مشوش ہوجاتی ہے، اس لئے اسی پر اکتفا فرمایا، غرض اس طرح مستعد ہوجاؤ) پھر (خوب) سوچو (کہ جیسے دعوے میں کرتا ہوں مثلاً یہ کہ قرآن کا مثل ممکن نہیں جیسے کہ مکی سورتوں میں یہ مضمون ہے ایسے دعوے دو ہی شخص کرسکتے ہیں یا تو وہ جس کے دماغ میں خلل ہو کہ انجام کی خبر نہ ہو، دوسرے وہ کہ جو نبی ہو جس کو پورا اعتماد اس دعوے کے صدق و من اللہ ہونے کا ہو ورنہ اگر نبی نہ ہو اور عاقل بھی ہو تو وہ اپنے دعوے کے وقت میں رسوائی سے اندیشہ کرے گا، اگر اس کا مقابل بن جاوے گا تو میری کیا عزت رہ جاوے گی۔ اس تردید حاصر کے بعد میرے مجموعی احوال میں غور کرکے یہ سوچو کہ آیا مجھ کو جنون ہے یا نہیں، سو یہ امر مشاہدہ سے معلوم ہوجاوے گا) کہ تمہارے اس ساتھی کو (جو ہر وقت تمہارے سامنے رہتا ہے اور جس کے تمام حالات تم مشاہدہ کیا کرتے ہو یعنی مجھ کو) جنون ذرا بھی نہیں ہے (جب حصر کی دو شقوں میں سے ایک شق باطل ہوگئی تو دوسری شق متعین ہوگئی کہ) وہ (تمہارا ساتھی پیغمبر ہے اور بحیثیت پیغمبری تم کو ایک سخت عذاب آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے (پس اس طریق سے نبوت کا ثبوت اور اس کی تصدیق بہت آسان ہے۔ اور دوسری جگہ بھی اس کے قریب قریب مضمون ہے کما قال اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ الخ، اب آگے اثبات نبوت کے بعد کفار کے اس شبہ کا جواب ہے کہ یہ رسول نہیں بلکہ اپنی ریاست واقتدار کے طالب ہیں۔ فرماتے ہیں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا (یعنی تم اپنے ہی پاس رکھو یہ محاورہ نفی سے طلب اجر کی بطریق مبالغہ، میرا معاوضہ تو بس (حسب وعدہ وفضل) اللہ ہی کے ذمہ ہے اور وہی ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے (پس وہ آپ ہی میرے حال کے لائق مجھ کو جزا دیں گے معاوضہ میں مال اور جاہ یعنی ریاست سب آگیا کیونکہ اعیان و اعراض دونوں میں اجر بننے کی صلاحیت ہے، مطلب یہ کہ میں تم سے کسی غرض کا طالب نہیں ہوں جو شبہ ریاست کا کیا جائے، رہا دعوت میں لوگوں کے معاملات اور حالات کی اصلاح کرتا ہوں، مجرم کو سزا دیتا ہوں، باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرتا ہوں تو یہ موجب شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں میری کوئی غرض نہیں، چنانچہ آپ کے طرز معاشرت اور معیشت سے صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں سے آپ نے کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ خود قوم ہی کا نفع تھا کہ ان کی جان، مال، آبرو محفوظ رہتے تھے، باپ جو اپنے چھوٹے بچوں کی حفاظت اور ان کی تادیب محض خیر خواہی سے کرتا ہے اس کو خود غرضی اور طلب ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، جب نبوت بھی ثابت ہو چکی اور شبہ مقامیہ بھی دفع ہو گیا آگے اس کی نقیض سے ابطال کو اس کے ثبوت پر متفرع فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق بات کو (یعنی ایمان اور ثبوت ایمانیات کو باطل (یعنی کفر اور ابطال ایمانیات) غالب کر رہا ہے (محاجہ و مکالمہ سے بھی، چنانچہ ابھی دیکھا اور مقاتلہ اور مصارعہ کا بھی سامان کرنے والا ہے، غرض ہر طرح حق غالب ہوگا اور) وہ علام الغیوب ہے (اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حق غالب ہوگا اور دوسروں کو تو اب وقوع کے بعد معلوم ہوا اور بہت سوں کو معلوم ہو کہ آئندہ غلبہ بڑھے گا چنانچہ فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اگلی آیت پڑھنا کما رواہ ابن کثیر عن الشیخین وغیرہما قرینہ ہے کہ اس مضمون میں جو غلبہ کی خبر دی گئی ہے اس میں غلبہ بالسیف بھی داخل ہے) آگے اسی مضمون کی زیادہ توضیح کے لئے ارشاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ (دین) حق آگیا اور (دین) باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا (یعنی محض گیا گذرا ہوا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل کو کبھی شوکت و قوت حاصل نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس دین حق کے آنے سے پہلے کبھی باطل پر شبہ حق ہونے کا ہو جایا کرتا تھا اب باطل اس صفت کی حیثیت سے بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ یعنی اس کا بطلان خوب ظاہر ہو گیا، اور ہمیشہ قرب قیامت تک یوں ہی ظاہر رہے گا، آگے حق بات کے ثابت اور واضح ہو جانے کے بعد نجات کا اس کے اتباع میں منحصر ہونا بیان فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جب اس دین کا حق ہونا ثابت ہو گیا

تو اس سے یہ بھی لازم آگیا کہ) اگر (بالفرض) میں (اس حق کو چھوڑ کر) گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی کو وبال ہوگی (دوسروں کا کیا ضرر ہے) اور اگر میں (اس حق کا اتباع کر کے) راہ (راست) پر رہوں تو یہ بدولت اس قرآن (اور دین) کے ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے (اور اصل مقصود مخاطبین کو سنانا ہے کہ باوجود وضوح کے اگر تم نے حق کا اتباع نہ کیا تو تم بھگتو گے میرا کیا بگڑے گا اور اگر راہ پر آگئے تو یہ دولت اسی دین حق کے اتباع کی بدولت ہوگا پس تم کو چاہئے کہ راہ راست پر آنے کے لئے اس دین کو اختیار کرو اور گمراہ ہونا کسی کا یا راہ پر آنا خالی نہ جائے گا کہ بے فکری کی گنجائش ہو، بلکہ ہر ایک کا حال اللہ کو معلوم ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا (اور) بہت نزدیک ہے (تو وہ ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے گا)۔

معارف و مسائل

وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ، لفظ معشار بعض نے بمعنی عشر کہا ہے یعنی دسواں حصہ اور بعض علماء نے عشر العشر یعنی سوواں حصہ اور بعض نے عشر العشیر یعنی ہزارویں حصہ کو معشار کہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں بہ نسبت عشر کے مبالغہ ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی ثروت و دولت و حکومت اور عمر طویل اور صحت قوت وغیرہ جو پچھلی امتوں کو دی گئی تھی اہل مکہ کو اس کا دسواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی حاصل نہیں، اس لئے ان کو چاہئے کہ ان پچھلی اقوام کے حالات اور انجام بد سے عبرت حاصل کریں کہ وہ لوگ رسولوں کی تکذیب کر کے خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوئے اور وہ عذاب آگیا تو ان کی قوت و شجاعت اور مال و دولت اور محفوظ قلعے کچھ کام نہ آسکے۔

کفار مکہ کو دعوت

إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ، اس میں اہل مکہ پر حجت تمام کرنے کے لئے ان کو تحقیق حق کا ایک مختصر راستہ بتلایا گیا ہے کہ صرف ایک کام کر لو کہ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو اور ایک ایک اللہ کے لئے کھڑے ہو جانے سے جسمی کھڑا ہونا نہیں کہ بیٹھے یا لیٹے ہوئے سے کھڑے ہو جاتے، بلکہ اس سے مراد محاورہ کے مطابق کام کا پورا اہتمام کرنا ہے۔ اور یہاں قیام کے ساتھ لفظ للہ بڑھا کر یہ بتلانا منظور ہے کہ خالص اللہ کے راضی کرنے کے لئے پچھلے خیالات و عقائد سے خالی الذہن ہو کر حق کی تلاش میں لگو تاکہ پچھلے خیالات اور اعمال قبول حق کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اور دو دو یا ایک ایک میں کوئی عدد خاص مقصود نہیں، مطلب یہ ہے کہ غور کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں، ایک خلوت و تنہائی میں خود غور کرنا، دوسرا اپنے احباب و اکابر سے مشورہ اور باہم بحث تمحیص کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ ان دونوں طریقوں کو یا ان میں سے جو پسند ہو اس کو اختیار کرو۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا، اس جملہ کا عطف اَنْ تَقُوْمُوْا پر ہے جس میں قیام کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے کہ سب خیالات سے خالی الذہن ہو کر خالص اللہ کے لئے اس کام کے واسطے تیار ہو جاؤ کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں غور وفکر سے کام لو کہ حق ہے یا نہیں خواہ یہ غور وفکر تنہا تنہا کرو یا دوسروں کے ساتھ مشورہ اور بحث وتمحیص کے ساتھ۔

آگے اس غور وفکر کی ایک واضح راہ بتلائی گئی، وہ یہ کہ ایک ایسا آدمی جس کے ساتھ نہ کوئی طاقت وجتھا اور جماعت ہے نہ مال و دولت کی بہتات وہ اپنی پوری قوم بلکہ پوری دنیا کے خلاف کسی ایسے عقیدہ کا اعلان کرے جو صدیوں سے ان میں راسخ ہو چکا ہے اور وہ سب اس پر متفق ہیں، ایسا اعلان صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ کہنے والا بالکل مجنون دیوانہ ہو جو اپنے نفع نقصان کو نہ سوچے اور پوری قوم کو اپنا دشمن بنا کر مصائب کو دعوت دے، دوسرے یہ کہ اس کی وہ بات سچی ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے، اس کے حکم کی تعمیل میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔

اب تم خالی الذہن ہو کر اس میں غور کرو کہ ان دونوں باتوں میں کونسی بات واقع میں ہے۔ اس طریقے سے غور کرو گے تو تمہیں اس یقین کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ یہ دیوانے اور مجنون نہیں ہو سکتے ان کی عقل و دانش اور کردار و عمل سے سارا مکہ اور سب قریش واقف ہیں۔ ان کی عمر کے چالیس سال اپنی قوم کے درمیان گذرے، بچپن سے جوانی تک کے سارے حالات ان کے سامنے ہیں، کبھی کسی نے ان کے کسی قول وفعل کو عقل و دانش اور سنجیدگی و شرافت کے خلاف نہیں پایا، اور صرف ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ جس کی یہ دعوت دیتے ہیں اس کے سوا آج بھی کسی کو ان کے کسی قول وفعل پر یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ عقل و دانش کے خلاف ہے، ان حالات میں یہ تو ظاہر ہو گیا کہ یہ مجنون نہیں ہو سکتے، اسی کا اظہار آیت کے اگلے جملے میں اس طرح فرمایا: مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ، اس میں لفظ صَاحِبِكُمْ سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ کوئی اجنبی مسافر باہر سے آجائے جس کے حالات معلوم نہ ہوں اس کی کوئی بات پوری قوم کے خلاف سنیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دیوانہ ہے، لیکن یہ تو تمہارے شہر کے رہنے والے تمہاری برادری کے اور دن رات کے تمہارے ساتھی ہیں، جن کی کوئی حالت وکیفیت تم سے مخفی نہیں، اور تم نے بھی کبھی اس سے پہلے ان پر اس طرح کا کوئی شبہ نہیں کیا۔

اور جب پہلی صورت کا نہ ہونا واضح ہو گیا تو دوسری صورت متعین ہو گئی جس کا ذکر آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے، اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، یعنی آپ کا حال اس کے سوا نہیں کہ وہ لوگوں کو قیامت کے آنے والے عذاب شدید سے بچانے

کے لئے اس سے ڈرانے والے ہیں۔

إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوبِ، یعنی میرا پروردگار جو علام الغیوب ہے وہ حق کو باطل پر دے مارتا ہے (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل پاش پاش ہو جاتا ہے، کما قال تعالیٰ فاذا ہو زاہق، لفظ قذف کے لغوی معنی پھینک مارنے کے ہیں، یہاں باطل کے مقابلہ میں حق کو پیش کرنا مراد ہے، اور لفظ یقذف سے تعبیر کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ باطل پر حق کی ضرب لگانے کا اثر بتلانا مقصود ہو، یہ ایک تمثیل ہے کہ جس طرح کوئی بھاری چیز کسی نازک چیز پر پھینک دی جائے تو وہ چیز پاش پاش ہو جاتی ہے، اسی طرح حق کے مقابلہ میں باطل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ، یعنی حق کے مقابلہ میں باطل ایسا پست و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کی ابتداء کرنے کے قابل نہیں رہتا نہ دوبارہ لوٹانے کے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٥١﴾

اور کبھی تو دیکھے جب یہ گھبرائیں پھر نہ بچیں بھاگ کر اور پکڑے ہوئے آئیں نزدیک جگہ سے

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٢﴾ وَقَدْ

اور کہنے لگیں ہم نے اس کو یقین کیا اور اب کہاں ان کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے دور جگہ سے اور اس سے

كَفَرُوا بِهِ مِن قَبْلُ ۖ وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٥٣﴾

منکر رہے پہلے سے، اور پھینکتے رہے بن دیکھے نشانے پر دور کی جگہ سے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن

اور رکاوٹ پڑ گئی ان میں اور ان کی آرزو میں جیسا کہ کیا گیا ہے ان کے طریقہ والوں کے ساتھ

قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴿٥٤﴾

اس سے پہلے، وہ لوگ تھے ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے

ع ۹
۱۲

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ وہ وقت ملاحظہ کریں (تو آپ کو حیرت ہو)

جب یہ کفار (قیامت میں) گھبرائے ہوں (ہیبت سے) گھبرائے پھریں گے پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور پاس کے پاس ہی سے (یعنی فوراً) پکڑ لئے جاویں گے (اور اس وقت) کہیں گے کہ ہم اس حق پر ایمان لے آئے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اس میں جتنی دیر ہوگئی ہے سب کو مان لیا اس لئے اب اس کو قبول سمجھا جاوے (کیونکہ) دنیا میں سمجھ کر ایمان لانے کی جگہ بہت دور رہ گئی، آگے (آخرت) یہاں ایمان لانے کی جگہ یعنی دارالعمل ہونے کی جگہ تھی دنیا، وہ بہت دور ہوگئی اب آخرت کا عالم ہے جو دارالعمل نہیں دار جزا ہے۔ اس لئے اس میں ایمان مقبول نہیں کیونکہ اب جو ایمان ہوگا وہ ایمان بالغیب نہیں بلکہ مشاہدہ کے بعد ہے، مشاہدہ کے بعد کسی چیز کا اقرار کرنا تو طبعی امر ہے، اس میں اطاعت حکم کا کوئی پہلو نہیں) حالانکہ پہلے سے (دنیا میں) یہ لوگ اس حق کا انکار کرتے رہے اور (ان کا انکار بھی ایسا جس کا کوئی صحیح منشاء نہ تھا بلکہ) بے تحقیق باتیں دور ہی دور سے پھینکا کرتے تھے (دور کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق سے دور رہتے تھے یعنی دنیا میں تو کفر کرتے رہے اب ایمان سوجھا ہے، اور اس کے مقبول ہونے کی آرزو ہے) اور (چونکہ آخرت دارالعمل نہیں ہے، اس لئے) ان میں اور ان کے (قبولِ ایمان کی) آرزو میں ایک آڑ کر دی جائے گی (یعنی ان کی آرزو پوری نہ ہوگی) جیسا کہ ان کے ہم مشربوں کے ساتھ (بھی) یہی برتاؤ کیا جائے گا جو ان سے پہلے (کفر کرچکے) تھے، یہ سب بڑے شک میں تھے جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا تھا۔

معارف و مسائل

وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ حال روز حشر کا ہے کہ کفار و فجار گھبرا کر بھاگنا چاہیں گے تو چھوٹ نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی نہ ہوگا جیسے دنیا میں کوئی مجرم بھاگ جائے تو اس کو تلاش کرنا پڑتا ہے، بلکہ سب کے سب اپنی ہی جگہ میں گرفتار کرلئے جاویں گے کسی کو بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملے گا۔ بعض حضرات نے اس کو وقت نزع اور موت کا حال قرار دیا ہے، کہ جب موت کا وقت آجائے گا اور ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی تو فرشتوں کے ہاتھ سے چھوٹ نہ سکیں گے، اور وہیں اپنی جگہ سے روح قبض کرکے پکڑ لئے جائیں گے۔

وَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ، تناوش کے معنی ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو اٹھا لینے کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ہاتھ بڑھا کر وہی چیز اٹھائی جاسکتی ہے جو بہت دور نہ ہو ہاتھ وہاں تک پہونچ سکے۔ مضمون آیت کا یہ ہے کہ کفار و منکرین قیامت کے روز حقیقت سامنے آجانے کے بعد کہیں گے ہم قرآن پر یا رسولؐ پر ایمان لے آئے، مگر ان کو معلوم نہیں کہ ایمان کا مقام اُن سے بہت دور ہو چکا ہے۔ کیونکہ ایمان صرف دنیا کی

زندگی کا مقبول ہو، آخرت دار العمل نہیں، وہاں کا کوئی عمل حساب میں نہیں آسکتا، اس لئے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ دولت ایمان کو ہاتھ بڑھا کر اٹھالیں۔

وَقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ، قذف کے معنی کوئی چیز پھینک کر مارنے کے آتے ہیں۔ عرب کا محاورہ ہے کہ جو شخص بلا دلیل محض اپنے خیال سے باتیں کرتا ہے اس کو رجم بالغیب اور قذف بالغیب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا کوئی نشانہ نہیں ہوتا، اور یہاں مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ان کے دلوں سے دور ہوتا ہے دل میں اس کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ، یعنی ان لوگوں کو جو چیز محبوب اور مقصود تھی ان کے اور اس چیز کے درمیان پردہ حائل کر کے ان کو محروم کر دیا گیا۔ یہ مضمون قیامت کے حال پر بھی صادق ہے کہ قیامت میں یہ لوگ نجات و جنت کے طالب ہوں گے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے اور دنیا میں وقت موت پر بھی صادق ہے کہ دنیا میں ان کو یہاں کی دولت و سامان مقصود تھا موت نے ان کے اس مطلوب کے درمیان حائل ہو کر ان کو اس سے جدا کر دیا۔

كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ، اشیاع شیعہ کی جمع ہے، کسی شخص کے تابع اور ہمخیال کو اس کا شیعہ کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو عذاب ان کو دیا گیا کہ اپنے مطلوب و محبوب سے محروم کر دیئے گئے، یہی عذاب اس سے پہلے انہی جیسے اعمال کفر کرنے والوں کو دیا جا چکا ہے۔ کیونکہ یہ سب لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ان کو یقین و ایمان نہیں تھا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت سورۃ سبا بحمد اللہ

لآخر یوم من المحرم الحرام سنہ ۱۳۹۲ھ

سُوْرَۃُ فَاطِر

سُوْرَۃُ فَاطِرٍ مَّکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً وَّخَمْسُ رُکُوْعَاتٍ

سورہ فاطر مکہ میں نازل ہوئی اس میں پینتالیس آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ

سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو

رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ

پیغام لانے والے جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار، بڑھا دیتا ہے پیدائش میں

مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ

جو چاہے، بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔ جو کچھ کہ کھول دے اللہ لوگوں پر

مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا ۚ وَمَا یُمْسِکْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ

رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا اور جو کچھ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا

مِنْۢ بَعْدِہٖ ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۲ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوْا

اس کے سوائے اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا۔ اے لوگو یاد کرو

نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ ؕ ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ

احسان اللہ کا اپنے اوپر، کیا کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوائے روزی دیتا تم کو

مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۡ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ۳

آسمان سے اور زمین سے کوئی حاکم نہیں مگر وہ پھر کہاں الٹے جاتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

تمام تر حمد (وثنا) اسی اللہ کو لائق ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں (پیغام سے مراد انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی لانا ہے خواہ وہ شرائع احکام سے متعلق ہو یا محض بشارت وغیرہ ہو، اور بازوؤں کی تعداد کچھ چار ہی میں منحصر نہیں بلکہ) وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے (چنانچہ بعض فرشتوں کے چھ سو بازو پیدا کئے ہیں جیسے حدیث میں حضرت جبرئیل کے متعلق آیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (اور قادر بھی ایسا جس کا کوئی مزاحم نہیں کیونکہ) اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے (مثلاً بارش، نباتات اور عام رزق) تو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے تو اس کے (بند کرنے کے) بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں (البتہ وہ خود ہی بندوکشاد کر سکتا ہے) اور وہی غالب (یعنی قادر اور) حکمت والا ہے (یعنی کھولنے اور بند کرنے پر قادر بھی ہے اور بندوکشاد ہمیشہ حکمت کے ساتھ ہوتی ہے) اے لوگو! (جیسے اس کی قدرت کامل ہے اسی طرح اس کی نعمت بھی کامل ہے، اس کی نعمتوں کی کوئی شمار نہیں اس لئے) تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد کرو اور ان کا شکر ادا کرو اور وہ شکر یہ ہے کہ توحید اختیار کرو شرک چھوڑو (کم از کم اس کی دو بڑی نعمتوں میں غور کرو جو مخلوقات کی ایجاد پھر ان کو باقی و قائم رکھنا ہے) کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان و زمین سے رزق پہنچاتا ہو (یعنی اس کے سوا نہ کوئی تخلیق و ایجاد کر سکتا ہے اور نہ کوئی ایجاد کردہ کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے رزق پہنچانے کا کام کر سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر طرح کامل ہے تو یقیناً) اس کے سوا کوئی لائق عبادت (بھی) نہیں تو (جب معبود ہونا اسی کا حق ہے تو) تم (شرک کرکے) کہاں اُلٹے جا رہے ہو۔

معارف و مسائل

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا، فرشتوں کو رسول یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغام اور احکام پہونچانے والا بنانے کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ ان کو انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ کا قاصد و رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے وہ اللہ کی وحی اور احکام ان کو پہونچاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول سے مراد اس جگہ واسطہ ہو اللہ تعالیٰ اور اس کی عام مخلوقات کے درمیان

جن میں انبیاء علیہم السلام سب سے افضل داخل ہیں، ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بھی وحی کا واسطہ بنتے ہیں اور عام مخلوقات تک اللہ تعالیٰ کی رحمت یا عذاب پہنچانے کا بھی واسطہ فرشتے ہی ہوتے ہیں۔

اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پروالے بازو عطا فرمائے ہیں، جن سے وہ اُڑ سکتے ہیں، حکمت اس کی ظاہر ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک کی مسافت بار بار طے کرتے ہیں، یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو سرعتِ سیر کی قوت عطا کی جائے اور وہ اُڑنے ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔

اور لفظ مثنیٰ وثلاث ورباع، ظاہر یہ ہے کہ اَجْنِحَةٍ کی صفت ہے کہ فرشتوں کے پر مختلف تعداد پر مشتمل ہیں، بعض کے صرف دو دو پر ہیں بعض کے تین تین بعض کے چار چار اور اس میں کوئی حصر نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث سے جبرئیل علیہ السلام کے چھ سو پر ہونا ثابت ہوتا ہے، بطور تمثیل کے چار تک ذکر کر دیا گیا ہے (قرطبی، ابن کثیر)

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مثنیٰ وثلث رُسُلاً کی صفت ہو یعنی یہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالات دنیا میں پہونچاتے ہیں کبھی دو دو آتے ہیں کبھی تین تین، چار چار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی چار کا عدد حصر کے لئے نہیں محض تمثیل کے طور پر ہے، کیونکہ اس سے بہت ـــ زیادہ مقدار میں فرشتوں کا نزول خود قرآن کریم سے ثابت ہے (ابوحیان فی البحر المحیط)

یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے کہ اپنی مخلوقات کی تخلیق میں جتنی چاہے اور جس قسم کی چاہے زیادتی کرے، اس کا تعلق بظاہر تو اجنحہ ہی کے ساتھ ہے کہ فرشتوں کے پر و بازو کچھ دو چار میں منحصر نہیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، اکثر مفسرین کا قول یہی ہے، اور زہری، قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس زیادتِ خلق سے عام معنی مراد ہیں، جس میں فرشتوں کے پر و بازو کی زیادتی بھی شامل ہے، اور مختلف انسانوں کی تخلیق میں خاص خاص صفت کی زیادتی بھی، جس میں حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت، حُسنِ صوت وغیرہ سب داخل ہیں، ابوحیان نے بحر محیط میں اسی کو اختیار کر کے فرمایا ہے کہ اس زیادتِ خلق میں حُسنِ خُلق، حُسنِ صوت اور حُسنِ خط اور حُسنِ صورت کمالِ عقل و علم، شیریں کلامی وغیرہ سب داخل ہیں، اس دوسری تفسیر سے ثابت ہوا کہ کسی چیز کا بھی حسن و کمال جو انسان کو حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور نعمت ہے، اس کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا، یہاں لفظ رحمت عام ہے اس میں دینی اور اُخروی نعمتیں داخل ہیں، جیسے ایمان اور علم اور عمل صالح اور نبوت و

ولایت وغیرہ اور دنیوی نعمتیں بھی، جیسے رزق اور اسباب اور آرام و راحت اور صحت و تندرستی اور مال و عزت وغیرہ۔ معنی آیت کے ظاہر ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کے لئے اپنی رحمت کھولنے کا ارادہ کرے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اسی طرح دوسرا جملہ وَمَا يُمْسِكْ کا مفہوم عام ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ روکتا ہے، اس کو کوئی کھول نہیں سکتا۔ اس میں دنیا کے مصائب و آلام بھی داخل ہیں، کہ جب اللہ ان کو اپنے کسی بندے سے روکنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ ان کو کوئی گزند مصیبت پہنچا سکے اور اس میں رحمت بھی داخل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی کسی حکمت سے کسی شخص کو رحمت سے محروم کرنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ اس کو دے سکے (ابو حیان)

اسی مضمون آیت کے متعلق ایک حدیث اس طرح آئی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے عامل کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو خط لکھا کہ مجھے کوئی حدیث لکھ کر بھیجو جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے اپنے میر منشی وراد کو بلا کر لکھوایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت جبکہ آپ نماز سے فارغ ہوئے یہ کلمات سنے ہیں: اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ (یعنی یا اللہ جو چیز آپ کسی کو عطا فرما دیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں، اور جس کو آپ روک دیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، آپ کے ارادے کے خلاف کسی کوشش کرنے والے کی کوشش نہیں چلتی) (ابن کثیر از مسند احمد)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت یہ ہے کہ یہ کلمہ آپ نے رکوع سے اٹھنے کے وقت فرمایا اور اس کلمہ سے پہلے فرمایا اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، (یعنی یہ کلمہ ان تمام کلمات میں جو کوئی بندہ کہہ سکتا ہے سب سے زیادہ احق اور مقدم و اعلیٰ ہے) اس آیت اور حدیث مذکور نے انسان کو جو سبق دیا ہے کہ غیر اللہ سے نفع و ضرر کی مصائب سے نجات ہے۔ کی امید و خوف نہ رکھے، صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نظر رکھے۔ دین و دنیا کی درستی اور دائمی راحت کا نسخہ کیمیا ہے، اور انسان کو ہزاروں غموں اور فکروں سے نجات دینے والا ہے (روح)

حضرت عامر بن عبد قیسؒ نے فرمایا کہ جب میں صبح کو چار آیتیں قرآن کریم کی پڑھ لوں تو مجھے یہ فکر نہیں رہتی کہ صبح کو کیا ہوگا شام کو کیا، وہ آیتیں یہ ہیں۔ ایک یہی آیت مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ دوسری آیت سورۂ یونس کی یہ ہے اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ ...

اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ، تیسری آیت سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا، چوتھی وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (اخرجہ ابن المنذر، روح)

اور حضرت ابوہریرہؓ جب بارش ہوتے دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے مُطِرْنَا بِنَوْءِ الْفَتْحِ اور پھر آیت مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ پڑھتے تھے۔ یہ عرب کے باطل خیالات کی تردید ہے، جو بارش کو خاص خاص ستاروں کی طرف منسوب کرکے کہا کرتے کہ ہمیں یہ بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ملی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ بارش آیت فتح سے ملی ہے۔ مراد آیت فتح سے یہی مذکورہ آیت ہے جس کو وہ ایسے وقت تلاوت فرمایا کرتے (رواہ مالک فی موطا)

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو جھٹلائے گئے کتنے رسول تجھ سے پہلے اور اللہ تک پہنچتے ہیں

الْاُمُوْرُ ④ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ

سب کام۔ اے لوگو! بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو نہ بہکائے تم کو

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۫ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

دنیا کی زندگانی اور نہ دغا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغاباز تحقیق شیطان

لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا

تمہارا دشمن ہے سو تم بھی سمجھ رکھو اس کو دشمن۔ وہ تو بلاتا ہے اپنے گروہ کو اسی واسطے کہ ہوں

مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑥ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ

دوزخ والوں میں، جو منکر ہوئے اُن کو سخت عذاب ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑦

اور جو یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کے لئے ہے معافی اور بڑا ثواب۔

ع ۱۴

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ

بھلا ایک شخص کہ بھلی سمجھائی گئی اس کو اس کے کام کی برائی پھر دیکھا اس نے اس کو بھلا کیونکہ اللہ بھٹکاتا ہے

مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ

جسکو چاہے اور سجھاتا ہے جسکو چاہے، سو تیرا جی نہ جاتا رہے

عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ⑧

ان پر پچھتا پچھتا کر، اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ (درباره توحید و رسالت وغیرہ) آپ کو جھٹلائیں تو آپ غم نہ کریں کیونکہ آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جاچکے ہیں، (ایک تو اس سے تسلی حاصل کیجئے) اور (دوسری بات یہ کہ) سب امور اللہ ہی کے روبرو پیش کئے جاویں گے (وہ خود سب سے سمجھ لے گا آپ کیوں فکر میں پڑے آگے عام لوگوں کو خطاب ہے کہ) اے لوگو (اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ جس میں قیامت کی خبر ہے اس کو سن کر تعجب و استبعاد مت کرنا) اللہ تعالیٰ کا (یہ) وعدہ ضرور سچا ہے، سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے (کہ اس میں منہمک ہو کر اس یوم موعود سے غافل رہو) اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے (کہ تم اس کے اس بہکانے میں نہ آجاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہ کہا کرتے تھے وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى اور) یہ شیطان (جس کے دھوکہ کا اوپر ذکر ہے) بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اس کو (اپنا) دشمن (ہی) سمجھتے رہو وہ تو اپنے گروہ کو (یعنی اپنے متبعین کو، محض اس لئے (باطل کی طرف) بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جاویں (پس) جو لوگ کافر ہو گئے (اور اس کی دعوت وغرور میں پھنس گئے) ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے (اور اس کی دعوت وغرور میں نہیں پھنسے) ان کے لئے (معاصی کی) بخشش اور (ایمان وعمل صالح پر) بڑا اجر ہے (اور جب کافر کا عذاب شدید اور مؤمن کا انجام مغفرت واجر کبیر ہے، تو کیا (دونوں مساوی ہو سکتے ہیں یعنی) ایسا شخص جس کو اس کا عمل بد اچھا کر کے دکھلایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا (اور ایسا شخص جو بُرے کو بُرا سمجھتا ہے کہیں برابر ہو سکتے ہیں؟ پہلے شخص سے مراد کافر ہے جو اغواء شیطان سے باطل کو حق اور مضر کو نافع سمجھتا ہے، اور دوسرے شخص سے مراد مؤمن ہے جو اتباع انبیاء و مخالفت شیطان سے باطل کو باطل حق کو حق، ضرر کو ضرر، نافع کو نافع جانتا ہے۔ یعنی دونوں برابر کہاں ہوتے بلکہ ایک جہنمی اور دوسرا جنتی ہے۔ پس شیطان کے دھوکہ میں آنے والے اور اس کو دشمن سمجھنے والوں میں یہ تفاوت ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں لَا يَغُرَّنَّكُمْ اور اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ، اور اگر اس پر تعجب ہو کہ عاقل آدمی بد کو نیک کیسے سمجھ لیتا ہے) سو اس کی وجہ

يَمْكُرُونَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولٰٓئِكَ

داؤ میں ہیں برائیوں کے اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا داؤ ہے

هُوَ يَبُورُ ﴿١٠﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ

ٹوٹے کا اور اللہ نے تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند پانی سے پھر

جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهٖ ۚ

بنایا تم کو جوڑے جوڑے اور نہ پیٹ رہتا ہے کسی مادہ کو اور نہ وہ جنتی ہے بدون خبر اس کے

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ إِلَّا فِي كِتٰبٍ ۚ

اور نہ عمر پاتا ہے کوئی بڑی عمر والا اور نہ گھٹتی ہے کسی کی عمر مگر لکھا ہے کتاب میں

إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴿١١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ

بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ اور برابر نہیں دو دریا، یہ میٹھا ہے

فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ

پیاس بجھاتا ہے خوشگوار اور یہ کھارا کڑوا ہے اور دونوں میں سے

تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى

کھاتے ہو گوشت تازہ اور نکالتے ہو گہنا جس کو پہنتے ہو اور تو دیکھے

الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾

جہازوں کو اس میں چلتے ہیں پانی کو پھاڑتے تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو

يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

رات گھساتا ہے دن میں اور دن گھساتا ہے رات میں اور کام میں لگا دیا سورج

وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ

اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک مقررہ وعدہ تک، یہ اللہ ہے رب تمہارا اسی کے لئے

الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ

بادشاہی ہے اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوائے وہ مالک نہیں کھجور کی گٹھلی کے

قِطْمِيرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا
ایک چھلکے کے، اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار اور اگر سنیں پہنچیں

مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۗ
نہیں تمہارے کام پر اور قیامت کے دن منکر ہوں گے تمہارے شریک ٹھہرانے سے

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝
اور کوئی نہ بتلائے گا تجھ کو جیسا بتلائے گا خبر رکھنے والا

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ ایسا (قادر) ہے جو بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو اٹھاتی ہیں جس کی کیفیت سورۂ روم کے رکوع پنجم آیت اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ کی تفسیر میں گذری ہے، پھر ہم اس بادل کو خشک قطعۂ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں (جس سے وہاں بارش ہوتی ہے) پھر ہم اس کے ذریعہ سے (یعنی اس بادل کے پانی کے ذریعہ سے) زمین کو (نباتات سے) زندہ کرتے ہیں اس کے خشک ہونے کے بعد (اور جس طرح زمین کے مناسب اس کو حیات عطا فرمائی) اسی طرح (قیامت میں آدمیوں کا) جی اٹھنا ہے (کہ ان کے مناسب حیات ان کو عطا ہوگی وجہ تشبیہ ظاہر ہے کہ دونوں میں ایک زائل شدہ صفت کا احداث و اعادہ ہے۔ گو زمین میں صرف ایک امر عرضی یعنی نشو و نما متعلق ہوا ہے، اور حشر میں ایک امر جوہری یعنی روح کا، یہ مضمون حشر و نشر کا دلیل توحید کے ضمن میں تبعاً آ گیا ہے۔ پھر اس نشور کی مناسبت سے ایک اور مضمون ارشاد ہے کہ جب قیامت میں زندہ ہونا ہے تو وہاں کی ذلت و خواری سے بچنے کی فکر کرنا ضروری ہے۔ اس بات میں مشرکین نے اپنے خود ساختہ معبودوں کو شیطان کے فریب میں آ کر حصول عزت کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا، وہ کہتے تھے ہٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ یعنی یہ ہمارے علی الاطلاق شفیع ہیں دنیوی حوائج میں بھی اور اگر قیامت کوئی چیز ہو تو نجات اخروی کے لئے بھی جیسا حق تعالیٰ نے سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا ہے وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ، جو شخص (آخرت میں) عزت حاصل

کی پوری خبر رکھنے والے ہیں اور اسے مخاطب، تجھ کو خبر رکھنے والے کی برابر کوئی نہیں بتلائے گا، (پس ہمارا بتلانا سب سے زیادہ صحیح ہے)۔

معارف و مسائل

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ، اس سے پہلی آیت میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص عزت و قوت کا طلبگار ہو تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ جن چیزوں کو انہوں نے عزت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے یا جن سے عزت کی توقع باندھ رکھی ہے وہ کسی کو عزت نہیں دے سکتے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے عزت و قوت حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے، جس کے دو جز ہیں، ایک کلم طیب، یعنی کلمہ توحید اور اللہ کی ذات و صفات کا علم، دوسرے عمل صالح یعنی دل سے ایمان لانے کے بعد اس کے مقتضیٰ کے موافق تابع شریعت عمل کرنا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں فرمایا کہ حصول عزت کا یہ نسخہ بالکل صحیح و مجرب ہے، شرط یہ ہے کہ ذکر اللہ اور عمل صالح پر مداومت ہو، یہ مداومت ایک حد تک پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کرنے والے کو وہ روزافزوں عزت دنیا و آخرت میں نصیب فرماتے ہیں جس کی قید نہیں۔

آیت مذکورہ میں ان دونوں جزوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ اچھا کلام اللہ کی طرف چڑھتا اور پہنچتا ہے، اور عمل صالح اس کو اٹھاتا ہے، اور پہنچاتا ہے۔ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ کی ترکیب نحوی میں چند احتمال ہیں، ہر احتمال کے اعتبار سے جملے کے معنی الگ ہو جاتے ہیں۔ ائمہ تفسیر نے ان احتمالوں کے مطابق تفسیریں اپنی اپنی صواب دید کے مطابق کی ہیں۔ پہلا احتمال تو وہی ہے جس کے مطابق خلاصہ تفسیر میں ترجمہ کیا گیا ہے کہ یرفعہ کی ضمیر فاعل عمل صالح کی طرف راجع ہو، اور ضمیر مفعول کلم طیب کی طرف، اور معنی یہ ہوں کہ کلم طیب اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں، مگر ان کے چڑھنے کا ذریعہ عمل صالح ہوتا ہے۔ جمہور ائمہ تفسیر ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، ابن جبیرؓ، مجاہد، ضحاک، شہر بن حوشب وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور اللہ کی طرف چڑھنے اور چڑھانے سے مراد اللہ کے نزدیک مقبول ہونا ہے۔ اس لئے خلاصہ اس جملے کا یہ ہوگا کہ کلم طیب خواہ کلمہ توحید ہو یا دوسرے اذکار تسبیح و تحمید وغیرہ، ان میں سے کوئی چیز بغیر عمل صالح کے عند اللہ مقبول نہیں ہوتی۔ اس میں عمل صالح کا اہم جز تصدیق قلبی ہے یعنی دل سے اللہ پر اور اس کی توحید پر ایمان لانا، یہ تو مطلقاً قبولیتِ اعمال کی شرط لازم ہے، اس کے بغیر نہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مقبول ہے نہ کوئی دوسرا ذکر۔

اور عمل صالح کے دوسرے اجزاء نماز، روزہ وغیرہ اعمالِ صالحہ اور محرمات و مکروہات سے پرہیز ہے، یہ اگرچہ مطلق قبولیت کی شرط نہیں، مگر قبولیت تامہ کی شرط یہ اعمال بھی ہیں۔ تو اگر ایک شخص دل میں ایمان و تصدیق ہی نہیں رکھتا تو وہ کتنا بھی زبان سے کلمہ توحید پڑھے اور تسبیح و تحمید کرے اللہ کے نزدیک اس کو کوئی حصہ قبولیت کا حاصل نہ ہوگا، اور جو تصدیق و ایمان تو رکھتا ہے مگر دوسرے اعمالِ صالحہ نہیں کرتا یا ان میں کوتاہی کرتا ہے اس کا ذکر اللہ اور کلمہ توحید بالکل ضائع تو نہیں ہوگا صرف اتنا کام دے گا کہ ہمیشہ کے عذاب سے اس کو نجات مل جائے گی مگر مکمل قبولیت اس کو حاصل نہیں ہوگی جس کا یہ اثر ہوگا کہ بقدر اپنے ترکِ عمل کے اور کوتاہی کے عذاب بھگتے گا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قول کو بغیر عمل کے اور کسی قول و عمل کو بغیر نیت کے اور کسی قول و عمل اور نیت کو بغیر مطابقت سنت کے قبول نہیں کرتا (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ مکمل قبولیت کی شرط سنت کے مطابق ہونا ہے، اگر قول بھی عمل بھی اور نیت بھی، یہ سب درست بھی ہوں مگر طریقہ عمل سنت کے مطابق نہ ہو تو قبولیت تامہ حاصل نہیں ہوگی۔

اور بعض مفسرین نے اس جملہ کی ترکیب نحوی یہ قرار دی ہے کہ یَرْفَعُہٗ کی ضمیر فاعل کلم طیب کی طرف اور ضمیر مفعول عمل صالح کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں معنی پہلے سے بالکل مختلف یہ ہوگئے کہ کلم طیب یعنی ذکر اللہ عمل صالح کو چڑھاتا اور اٹھاتا ہے، یعنی قابلِ قبول بناتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کے ساتھ ذکر اللہ بھی بکثرت کرتا ہے تو یہ ذکر اللہ اس کے عمل کو مزین اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ جس طرح صرف کلمہ توحید اور تسبیحات بغیر عمل صالح کے کافی نہیں اسی طرح عمل صالح اوامر و نواہی کی پابندی بھی بغیر کثرت ذکر اللہ کے بے رونق رہتی ہے، ذکر اللہ کی کثرت ہی اعمالِ صالحہ کو مزین کر کے قابلِ قبول بناتی ہے۔

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ۔ اس آیت کا مفہوم جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو عمر طویل عطا فرماتے ہیں وہ پہلے ہی لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اسی طرح جس کی عمر کم رکھی جاتی ہے وہ بھی سب لوح محفوظ میں پہلے ہی درج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں عمر کا طول اور نقص فرد واحد کے متعلق مراد نہیں، بلکہ کلام نوع انسانی کے متعلق ہے کہ اس کے کسی فرد کو عمر طویل دی جاتی ہے

کسی کو اس سے کم۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے ابن کثیر نے نقل کی ہے جیسا کہ حسن بصری اور ضحاک کا بھی قول نقل کیا ہے، اسی لئے ابن جریر، ابن کثیر، روح المعانی وغیرہ عام تفاسیر میں اسی کو جمہور کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عمر کی کمی زیادتی کو ایک ہی شخص کے متعلق کہا جائے تو عمر میں کمی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص کی جو عمر اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے وہ یقینی ہے اور جو دن گذرتا ہے اس مقررہ مدت عمر میں سے ایک دن کی کمی کر دیتا ہے، دو دن گذرتے ہیں تو دو کم ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہر دن بلکہ ہر سانس اس کی عمر کو گھٹاتا رہتا ہے۔ یہ تفسیر شعبی، ابن جبیر، ابو مالک، ابن عطیہ اور سدی سے منقول قرار دی ہے،

اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، ؎

حَیَاتُکَ أَنْفَاسٌ تُعَدُّ فَکُلَّمَا ... مَضٰی نَفَسٌ مِّنْکَ انْتَقَصْتَ بِہٖ جُزْءًا

یعنی تیری زندگی چند گنے ہوئے سانسوں کا نام ہے، تو جب بھی ایک سانس گذرتا ہے تیری عمر کا ایک جز گھٹ جاتا ہے۔

امام نسائی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَیُنْسَأَ فِیْ اَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد نے بھی یہ حدیث یونس بن یزید ایلی کی روایت سے نقل کی ہے۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے ذی رحم رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی سے عمر بڑھ جاتی ہے، مگر اس کا مطلب ایک دوسری حدیث نے خود واضح کر دیا ہے وہ یہ ہے:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس (مضمون کا ذکر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آپ نے فرمایا کہ (عمر تو اللہ کے نزدیک ایک ہی مقرر اور مقدر ہے) جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو کسی شخص کو ذرا بھی مہلت نہیں دی جاتی۔ بلکہ زیادت عمر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اولاد صالح عطا فرما دیتا ہے وہ اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، یہ شخص نہیں ہوتا ہے اور ان لوگوں کی دعائیں اس کو قبر میں ملتی رہتی ہیں (یعنی مرنے کے بعد بھی اس کو وہ فائدہ پہونچتا رہتا ہے جو خود زندہ رہنے سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح گویا اس کی عمر بڑھ گئی۔ یہ دونوں روایتیں ابن کثیر نے نقل کی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جن احادیث میں بعض اعمال کے متعلق یہ آیا ہے کہ ان سے عمر بڑھ جاتی ہے، اس سے مراد عمر کی برکت کا بڑھ جانا ہے۔

وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا، یعنی دریائے شور و شیریں دونوں سے تمھیں تازہ گوشت کھانے کو ملتا ہے، مراد اس سے مچھلی ہے۔ اس آیت میں مچھلی کو گوشت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ مچھلی خود بخود حلال گوشت ہے اس کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ بخلاف دوسرے بڑی جانوروں کے کہ جب تک ان کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کرو وہ حلال نہیں۔ مچھلی میں یہ شرط نہیں اس لئے وہ بنا بنایا گوشت ہے۔ اور حلیۃ کے معنی زیور کے ہیں مراد اس سے موتی ہیں۔ آیت سے معلوم ہوا کہ موتی جس طرح دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں شیریں دریاؤں میں بھی ہوتے ہیں جو عام شہرت کے خلاف ہے، کیونکہ معروف و مشہور یہی بات ہے کہ موتی دریائے شور (سمندر) میں پیدا ہوتے ہیں، اور حقیقت یہی ہے جو قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دونوں میں موتی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ شیریں دریاؤں میں بہت کم اور سمندر میں بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ زیادتی کی وجہ سے یہ شہرت ہوگئی کہ موتی صرف دریائے شور سے نکلتے ہیں۔

اور تَلْبَسُوْنَهَا میں صیغہ مذکر استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ موتیوں کا استعمال مردوں کے لئے بھی جائز ہے بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کا بطور زیور استعمال کرنا مردوں کے لئے جائز نہیں (روح)

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ، یعنی یہ بت یا بعض انبیاء یا فرشتے جن کو تم خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہو اگر ان کو مصیبت کے وقت پکارو گے تو اول تو یہ تمھاری بات سن ہی نہ سکیں گے، کیونکہ بتوں میں تو سننے کی صلاحیت ہے ہی نہیں، انبیاء اور فرشتوں میں اگرچہ صلاحیت ہے مگر نہ وہ ہر جگہ موجود ہیں نہ ہر ایک کے کلام کو سنتے ہیں۔ آگے فرمایا کہ اگر بفرض وہ سن بھی لیں جیسے فرشتے اور انبیاء، تو پھر بھی وہ تمھاری درخواست پوری نہ کریں گے۔ کیونکہ ان کو خود قدرت نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس سے کسی کی سفارش نہیں کرسکتے۔

سماع موتیٰ کا مسئلہ جو پہلے گذر چکا ہے اس آیت سے نہ اس کا اثبات ثابت ہوتا ہے نہ نفی، اس بحث کے دلائل دوسرے ہیں جن کا ذکر سورۂ روم میں مفصل آچکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿١٥﴾

اے لوگو! تم ہو محتاج اللہ کی طرف، اور اللہ وہی ہے بے پروا سب تعریفوں والا

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ

اگر چاہے تم کو لے جائے اور لے آئے ایک نئی خلقت ، اور یہ بات اللہ پر

بِعَزِيزٍ ﴿١٧﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ

مشکل نہیں ، اور نہ اٹھائیگا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا اور اگر پکارے کوئی بوجھل اپنا بوجھ

حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ

بٹانے کو کوئی نہ اٹھائے اس میں سے ذرا بھی اگرچہ ہو قرابتی ، تو تو ڈر سنا دیتا ہے ان کو

يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا

جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز ، اور جو کوئی سنوریگا تو یہی ہے کہ

يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ

سنوریگا اپنے فائدہ کو اور اللہ کی طرف ہے سب کو پھر جانا ، اور برابر نہیں اندھا

وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا

اور دیکھتا ، اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا ، اور نہ سایہ اور

الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

نہ لو ، اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے ، اللہ

يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ إِنْ

سناتا ہے جس کو چاہے اور تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو ، تو تو بس

أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ

ڈر کی خبر پہنچانے والا ہے ، ہم نے بھیجا ہے تجھ کو سچا دین دیکر خوشی اور ڈر سنانے والا ،

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ

اور کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہو چکا کوئی ڈر سنانے والا ، اور اگر وہ تجھ کو جھٹلائیں تو آگے

كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ

جھٹلا چکے ہیں جو لوگ کہ ان سے پہلے تھے ، پہنچے ان کے پاس رسول ان کے لیکر کھلی باتیں ،

وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
اور صحیفے اور روشن کتاب۔ پھر پکڑا میں نے منکروں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ ع
سو کیسا ہوا انکار میرا۔

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو تم (ہی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) خوبیوں والا ہے (پس تمہاری احتیاج دیکھ کر تمہارے لئے توحید وغیرہ کی تعلیم کی گئی ہے، اگر تم نہیں مانو گے تو تم اپنا ضرر کرو گے، باقی حق تعالیٰ کو تو بوجہ غنائے ذاتی وکمال ذاتی کے تمہاری یا تمہارے عمل کی کوئی حاجت ہی نہیں کہ اس کے ضرر کا احتمال ہو اور کفر پر جو ضرر ہونے والا ہے خدا تعالیٰ اس کے فی الحال ایقاع پر بھی قادر ہے چنانچہ) اگر وہ چاہے تو (تمہارے کفر کی سزا میں) تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے (جو تمہاری طرح کفر و انکار نہ کریں) اور یہ بات خدا کو کچھ مشکل نہیں، (لیکن بمصلحت مہلت دے رکھی ہے۔ غرض یہاں تو وہ ضرر محض محتمل الوقوع ہے، لیکن قیامت میں وہ ضرور واقع ہو جاوے گا) اور (اس وقت یہ حالت ہوگی کہ) کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا اور (خود تو کوئی کسی کی کیا رعایت کرتا یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی بوجھ کا لدا ہوا (یعنی کوئی گنہگار) کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کیلئے بلاوے گا (بھی) تب بھی اس میں سے کچھ بھی بوجھ نہ ہٹایا جاوے گا، اگرچہ وہ شخص (جس کو اس نے بلایا تھا اس کا) قرابت دار ہی (کیوں نہ) ہو (پس اس وقت یہ ضرر اس کفر و بدعملی کا خود ہی بھگتنا پڑے گا، یہ تو تحذیر منکرین کی ہوگئی۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلیہ ہے، کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے انکار پر جس کی سزا یہ ایک دن ضرور بھگتیں گے اس قدر غم و افسوس کیوں کرتے ہیں، آپ تو (ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو) صرف ایسے لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں (مراد اس الذین سے مومنین ہیں، یعنی آپ کے انذار سے صرف مومنین منتفع ہوتے ہیں فی الحال ہوں یا باعتبار آئندہ کے اور امر مشترک دونوں میں طلبِ حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طالب حق کو نفع ہوا کرتا ہے یہ لوگ طالب حق ہیں ہی نہیں ان سے امید نہ رکھئے) اور (آپ ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر فکر کیوں کرتے ہیں) جو شخص (ایمان لا کر شرک و کفر سے) پاک ہوتا ہے وہ اپنے

(نفع کے لئے) پاک ہوتا ہے اور جو نہیں ایمان لاتا وہاں بھگتے گا، کیونکہ سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر
جانا ہے (پس نفع ہے تو ان کا، آپ کیوں غم کرتے ہیں) اور ان لوگوں سے کیا توقع رکھی جاتی ہے کہ ان
کا علم و ادراک مثل ادراک مومنین کے ہو اور مومنین کی طرح یہ بھی حق کو قبول کرلیں اور قبول
حق کے ثمرات دینی میں بھی یہ لوگ شریک ہوجاتے، کیونکہ مومنین کی مثال حق بینی میں بینا آدمی
کی سی اور ان کی مثال عدم ادراک حق میں اندھے آدمی کی سی ہے، اور اسی طرح مومن نے ادراک
حق کے ذریعہ سے جس طریق ہدایت کو اختیار کیا ہے اس طریق حق کی مثال نور کی سی ہے، اور کافر نے
عدم ادراک حق سے جس طریقہ کو اختیار کیا ہے اس کی مثال ظلمت کی سی ہے کما قال تعالیٰ وَجَعَلْنَا
لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، اور اسی طرح جو
ثمرہ جنت وغیرہ اس طریق پر مرتب ہوگا اس کی مثال ظل بارد کی سی ہے، اور جو ثمرہ جہنم وغیرہ
طریق باطل پر مرتب ہوگا اس کی مثال جلتی دھوپ کی سی ہے، کما قال تعالیٰ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ وقال تعالیٰ
فِيْ سَمُوْمٍ اور ظاہر ہے کہ) اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور
دھوپ (پس نہ ان کا اور مومنین کا علم و ادراک برابر ہوگا اور نہ ان کا طریقہ اور نہ اس طریقہ کا ثمرہ
اور (مومن اور کافر میں) جو تفاوت بینا و نابینا کا سا کہا گیا ہے تو اس سے مقصود نفی کمی کی ہے
نہ کہ زیادتی کی کیونکہ ان میں تفاوت مردہ اور زندہ کا سا ہے، پس ان کی برابری کی نفی کیلئے
یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مُردے برابر نہیں ہوسکتے (اور جب یہ مُردے ہیں تو ان
کو زندہ کرنا تو خدا کی قدرت میں ہے، بندہ کی قدرت میں نہیں، پس اگر خدا ہی ان کو ہدایت کردے
تب تو اور بات ہے، کیونکہ) اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے (باقی آپ کی کوشش سے یہ
لوگ حق کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ ان کی مثال تو مُردوں کی آپ نے سُن لی) اور آپ ان
لوگوں کو نہیں سُنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں۔ (لیکن اگر یہ نہ مانیں تو آپ غم میں نہ پڑیئے
کیونکہ) آپ تو (کافروں کے حق میں) صرف ڈرانے والے ہیں (آپ کے ذمہ یہ نہیں کہ وہ کافر
ڈر کر مان بھی جاویں۔ اور یہ ڈرانا آپ کا اپنی طرف سے نہیں جیسا منکرین نبوت کہتے تھے بلکہ
ہماری طرف سے ہے کیونکہ) ہم ہی نے آپ کو (دین) حق دے کر (مسلمانوں کو) خوش خبری
سُنانے والا اور (کافروں کو) ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور (یہ بھیجنا کوئی انوکھی بات
نہیں جیسا کافر کہتے تھے بلکہ) کوئی ایسی امت نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا (یعنی پیغمبر)
نہ گذرا ہو اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو (آپ ان گذشتہ پیغمبروں کا جن کا ابھی اجمالاً
ذکر ہوا ہے اور تفصیلاً دوسری آیات میں ذکر ہے، کافروں کے ساتھ معاملہ یاد کرکے اپنے دل کو
سمجھا لیجئے، کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں انھوں نے بھی (اپنے وقت کے پیغمبروں کو

فر یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ، یعنی اس روز انسان بھاگے گا اپنے بھائی اور ماں باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اولاد سے، بھاگنے کا حاصل یہی ہے وہ ڈرے گا کہ کہیں یہ اپنا گناہ مجھ پر ڈالنے کی یا میری کسی نیکی کو لینے کی فرمائش نہ کریں (ابن کثیر)۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ، اس آیت کے شروع میں کفار کی مثال مُردوں سے اور مومنین کی زندوں سے دی گئی ہے۔ اسی کی مناسبت سے یہاں من فی القبور سے مراد کفار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے ان زندہ کافروں کو بھی نہیں سُنا سکتے۔

اس آیت نے خود یہ بات واضح کر دی کہ یہاں سُنانے سے مراد وہ سُنانا ہے جو مفید مؤثر اور نافع ہو، ورنہ مطلق سننا تو کفار کو ہمیشہ ہوتا ہی رہا، اور مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ ان کو تبلیغ کرتے اور وہ سنتے تھے۔ اس لئے مراد اس آیت کی یہ ہے کہ جس طرح آپ مُردوں کو کلمہ حق سنا کر راہِ حق پر نہیں لا سکتے کیونکہ وہ دنیا کے دار العمل سے آخرت کے دار الجزاء میں منتقل ہو چکے ہیں وہاں اگر وہ ایمان کا اقرار بھی کرلیں تو معتبر نہیں، اسی طرح کافر زندوں کا حال ہے کہ ان کے سننے کی جو نفی اس آیت میں کی گئی ہے اس سے مراد خاص وہ سماع ہے جو نافع ہے جس کی وجہ سے سننے والا باطل کو چھوڑ کر حق پر آجائے۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسئلہ سماع موتی سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں، وہ مسئلہ اپنی جگہ مستقل ہے کہ مُردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں، اس کی مفصل تحقیق سورۂ روم میں اور سورۂ نمل میں گذر چکی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی پھر ہم نے نکالے اس سے میوے

مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۭ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ

طرح طرح کے ان کے رنگ، اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح کے

اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَاۗبِّ وَالْاَنْعَامِ

ان کے رنگ اور بھجنگ کالے، اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپایوں میں

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰۗؤُا ۭ

کتنے رنگ ہیں اسی طرح، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے،

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۲۸)
تحقیق اللہ زبردست ہے بخشنے والا

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ مختلف رنگتوں کے پھل نکالے (خواہ اس طرح کہ ان کی انواع و اقسام ہی الگ الگ ہوں یا ایک ہی نوع اور ایک ہی قسم کے پھل مختلف رنگتوں کے ہوں) اور (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں (یعنی) سفید اور (بعضے) سرخ کہ (پھر خود ان) سفید سرخ کی بھی رنگتیں مختلف ہیں (کہ بعض بہت سفید اور بہت سرخ، بعض کم سفید اور ہلکے سرخ) اور (بعض نہ سفید نہ سرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں (کہ بعض اوقات اختلاف قسم و اصناف کے ساتھ یہ اختلاف رنگ ہوتا ہے، اور بعض اوقات ایک ہی قسم میں مختلف رنگ ہوتے ہیں، تو جو لوگ دلائل قدرت میں غور کرتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ کی عظمت کا علم ہوتا ہے، اور) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں (اگر علم عظمت کا محض اعتقادی اور عقلی ہے تو یہ خشیت بھی اعتقادی عقلی ہی رہے گی اور اگر علم بدرجہ حال تک پہونچ گیا تو خشیت بھی درجہ حال کی ہوگی کہ اس کے خلاف سے طبعی نفرت و بعد ہونے لگے گی) واقعی اللہ تعالیٰ زبردست (اور) غفور ہے (اس کا خوف بھی ضروری ہے کیونکہ وہ زبردست ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے، اور اپنے مطلب کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ وہ ڈرنے والوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے۔

معارف و مسائل

ربط آیات | بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان آیات میں توحید کے مضمون کو بیان فرمایا ہے جس کو دلائل قدرت سے مدلل کیا گیا ہے۔ اور بعض نے فرمایا ہے کہ سابقہ آیات میں لوگوں کے احوال کا مختلف ہونا اور اس کی تمثیلات بیان فرمائی ہیں، وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ، یہ اسی کا مزید بیان و توضیح ہے کہ مخلوقات الٰہیہ میں باہمی تفاوت ایک خلقی اور طبعی امر ہے۔ اور نباتات و جمادات تک میں موجود ہے، اور یہ اختلاف صرف صورت و رنگ ہی میں نہیں بلکہ طبائع میں بھی ہے۔

ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا، ثمرات میں اختلافِ الوان کو ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال بنا کر مُخْتَلِفًا منصوب ذکر فرمایا ہے۔ اور آگے پہاڑوں میں رنگتوں کا اختلاف اسی طرح انسانوں اور چوپایوں وغیرہ میں یہ اختلاف بصورت صفت بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے مُخْتَلِفٌ مرفوع لایا گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ ثمرات کا اختلافِ الوان تو ایک حال پر نہیں وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بدلتا رہتا ہے، بخلاف پہاڑوں کے اور انسانوں اور جانوروں کے کہ ان کے جو رنگ ہیں وہ عموماً قائم رہنے والے ہیں بدلتے نہیں۔

اور پہاڑوں میں جُدَدٌ فرمایا، یہ جُدَّۃ کی جمع ہے جس کے معروف معنی اس چھوٹے سے راستہ کے ہیں جس کو جادہ بھی کہا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے جُدَّۃ بمعنے قطعہ و حصہ قرار دیا۔ مطلب دونوں صورتوں میں پہاڑوں کے اجزاء کا مختلف الوان ہونا ہے، جن میں سب سے پہلے سفید کا اور آخر میں سیاہ کا ذکر فرمایا، درمیان میں حُمر یعنی سُرخ کے ذکر کے ساتھ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا فرمایا اس میں اس طرف اشارہ نکل سکتا ہے کہ اصل رنگ دنیا میں دو ہی ہیں، سفید سیاہ، اور باقی رنگ اسی سفیدی و سیاہی کے مختلف درجوں سے مرکب ہوتے ہیں۔

كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا، اس جگہ لفظ کذٰلک پر جمہور کے نزدیک وقف ہے، جو اس کی علامت ہے کہ یہ لفظ پچھلے مضمون کے ساتھ متعلق ہے۔ یعنی مخلوقات کو مختلف انواع و اقسام اور مختلف الوان پر بڑی حکمت کے ساتھ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و **حکمت کی خاص نشانی ہے۔**

اور بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس لفظ کا تعلق اگلے جملے سے ہے۔ یعنی جس طرح ثمرات، پہاڑ، حیوانات اور انسان مختلف رنگوں پر منقسم ہیں اسی طرح خشیت اللہ میں بھی لوگوں کے درجات مختلف ہیں کسی کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے، کسی کو کم، اور مدار اس کا علم پر ہے جس درجہ کا علم ہو اسی درجہ کی خشیت بھی ہے (روح)

سابقہ آیت میں ارشاد فرمایا تھا اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے فرمایا تھا کہ آپ کے انذار و تبلیغ کا فائدہ تو صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو غائبانہ اللہ تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں اس کی مناسبت سے آیت اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی خشیت حاصل ہے۔ اور جیسا پہلے کفار و منکرین کا اور ان کے حال کا ذکر آیا ہے، اس میں ... خواص اولیاء اللہ کا ذکر ہے۔ لفظ اِنَّمَا عربی زبان میں حصر بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے اس جملے کے معنی بظاہر یہ ہیں کہ صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں

نہیں بلکہ ان کے اجر و ثواب ان کو پورے پورے ملیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے مطلوبہ اجر و ثواب سے بھی کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے۔

اس فضل و زیادتی میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی شامل ہے کہ مومن کے عمل کا اجر حق تعالیٰ چند در چند کر کے عطا فرماتے ہیں جس کی ادنیٰ مقدار عمل کا دس گنا اور زیادہ سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، اور دوسرے گناہگاروں کے حق میں ان کی سفارش قبول کرنا اس فضل میں شامل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فضل کی تفسیر یہ روایت کی ہے کہ ان لوگوں پر دنیا میں جس نے احسان کیا تھا یہ لوگ اس کی سفارش کریں گے تو باوجود ان کے جہنم کے مستحق ہونے کے ان کی سفارش سے ان کو نجات ہو جائے گی (تفسیر مظہری بحوالہ ابن ابی حاتم) اور یہ ظاہر ہے کہ شفاعت صرف اہل ایمان کے لئے ہو سکے گی، کافر کی شفاعت کی کسی کو اجازت نہ ہوگی، اسی طرح جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار بھی اس فضل کا جزءِ اعظم ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، حرف ثُمَّ عطف کے لئے آتا ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس حرف سے پہلے اور بعد کی دونوں چیزیں اس وصف میں مشترک ہونے کے باوجود تقدیم و تاخیر رکھتی ہیں، پہلی چیز مقدم اور بعد کی چیز مؤخر ہوتی ہے، پھر یہ تقدیم و تاخیر کبھی زمانے کے اعتبار سے ہوتی ہے، کبھی رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے۔ اس آیت میں حرف ثُمَّ عطف ہے اس سے پہلی آیت کے لفظ اَوْحَيْنَا پر، معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ کتاب یعنی قرآن جو خالص حق ہی ہے، اور تمام پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے پہلے بطور وحی آپ کے پاس بھیجی، اس کے بعد ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے منتخب اور پسند کر لیا ہے اپنے بندوں میں سے، یہ اول و آخر اور مقدم و مؤخر ہونا رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے تو ظاہر ہے ہی کہ قرآن کا بذریعہ وحی آپ کے پاس بھیجنا رتبہ اور درجہ میں مقدم ہے اور امتِ محمدیہ کو عطا فرمانا اس سے مؤخر ہے۔ اور اگر امت کو وارثِ قرآن بنانے کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے اپنے بعد کے لئے امت کے واسطے زر و زمین کی وراثت چھوڑنے کے بجائے اللہ کی کتاب بطور وراثت چھوڑی، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی شہادت موجود ہے کہ انبیاء درہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑا کرتے، وہ وراثت میں علم چھوڑتے ہیں، اور ایک دوسری حدیث میں علماء کو وارثِ انبیاء فرمایا ہے، تو اس لحاظ سے یہ تقدیم و تاخیر زمانی بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نے یہ کتاب آپ کو عنایت فرمائی ہے پھر آپ نے اس کو امت کے لئے بطور وراثت چھوڑا۔ وارث بنانے اور عطا کرنے، اس عطا کو بلفظ میراث تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح وارث کو میراث کا حصہ بغیر کسی عمل

کوشش کے مل جاتی ہے، قرآن کریم کی یہ دولت بھی ان منتخب بندوں کو اسی طرح بغیر کسی محنت و مشقت کے دیدی گئی ہے۔

اُمتِ محمدیہ کی ایک اہم فضیلت و خصوصیت

اُمتِ محمدیہ خصوصاً اس کے علماء، الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا، یعنی جن کو ہم نے منتخب و پسندیدہ قرار دیدیا اپنے بندوں میں سے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس مراد اُمتِ محمدیہ ہے، اس کے علماء بلا واسطہ اور دوسرے لوگ بواسطہ علماء۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا سے مراد اُمتِ محمدیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر اس کتاب کا وارث بنایا ہے جو اس نے اُتاری ہے، (یعنی قرآن سب کتبِ سابقہ کی تصدیق و حفاظت کرنے والی کتاب ہونے کی حیثیت سے تمام آسمانی کتابوں کے مضامین کی جامع ہے، اس کا وارث بننا گویا سب آسمانی کتابوں کا وارث بننا ہے) پھر فرمایا فَظَالِمُهُمْ يُغْفَرُ لَهُ وَمُقْتَصِدُهُمْ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا وَسَابِقُهُمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ، یعنی اس اُمت کا ظالم بھی بخشا جائے گا اور میانہ روی کرنے والے سے آسان حساب لیا جائے گا، اور سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا (ابن کثیر)

اس آیت میں لفظ اصْطَفَيْنَا سے اُمتِ محمدیہ کی سب سے بڑی عظیم فضیلت ظاہر ہوئی۔ کیونکہ لفظ اصطفاء قرآن کریم میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے لئے آیا ہے، اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ، اور ایک آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کو اصطفاء یعنی انتخاب میں انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ شریک فرما دیا، اگرچہ اصطفاء کے درجے مختلف ہیں، انبیاء و ملائکہ کا اصطفاء اعلیٰ درجہ میں اور اُمتِ محمدیہ کا بعد کے درجہ میں ہے۔

اُمتِ محمدیہ کی تین قسمیں

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ، یہ جملہ پہلے جملے کی تفسیر و توضیح ہے۔ یعنی ہم نے جن بندوں کو منتخب اور پسند فرما کر ان کو قرآن کا وارث بنایا ہے، ان کی تین قسمیں ہیں، ظالم، مقتصد، سابق۔

ان تینوں قسموں کی تفسیر امام ابن کثیرؒ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے، اور مقتصد (یعنی درمیانی چال چلنے والا) وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے، مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سابق بالخیرات وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے، اور تمام محرمات و مکروہات سے بچتا ہے، اور بعض مباح

کو مشغول عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

اور اکابر صحابہ و تابعین سے اور دوسرے مفسرین نے ان تینوں قسموں کی تفسیر میں بہت مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ روح المعانی میں بحوالہ تحریر تینتیس اقوال کا ذکر کیا ہے، مگر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر کا حاصل وہی ہے جو اوپر آیت کے تحت سے بیان کیا گیا ہے۔

اب تحریر ہو چکا مذکورہ تفسیر سے یہ ثابت ہوا کہ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا سے مراد امت محمدیہ ہے اور اس کی یہ تین قسمیں ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پہلی قسم یعنی ظالم بھی الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا یعنی اللہ کے منتخب بندوں میں شامل ہے، اس کو بظاہر مستبعد سمجھ کر بعض لوگوں نے کہا کہ یہ امت محمدیہ اور مصطفین سے خارج ہے مگر بہت سی احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ یہ تینوں قسمیں امت محمدیہ کی ہیں اور اصطفینا کے وصف سے خارج نہیں۔ یہ امت محمدیہ کے مومن بندوں کی انتہائی خصوصیت اور فضیلت ہے کہ ان میں جو عملی طور پر ناقص بھی ہیں وہ بھی اس شرف میں داخل ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اس جگہ وہ سب روایات حدیث جمع کر دی ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت مذکورہ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا کی تینوں قسموں کے متعلق فرمایا کہ یہ سب ایک ہی مرتبے میں ہیں اور سب جنت میں ہیں۔ (رواہ احمد، ابن کثیر) ایک مرتبہ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب کی مغفرت ہو جائے گی اور سب جنت میں جائیں گے، یہ مطلب نہیں کہ درجات کے اعتبار سے ان میں تفاضل نہ ہوگا۔

اور حضرت ابو الدرداء سے باسانید متعددہ ایک حدیث منقول ہے، ابن کثیر نے ان سب کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو ابن جریر نے ابو ثابتؓ سے نقل کی ہے کہ وہ ایک روز مسجد میں گئے تو وہاں ابو الدرداءؓ پہلے سے بیٹھے تھے، ابو ثابتؓ ان کے برابر جا بیٹھ گئے اور یہ دعا کرنے لگے، اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتِيْ وَارْحَمْ غُرْبَتِيْ وَيَسِّرْ لِيْ جَلِيْسًا صَالِحًا، "یعنی یا اللہ میری تنہائی وحشت و پریشانی کو دور فرما، اور میری حالت مسافرت پر رحم فرما، اور مجھے کوئی جلیس (ہمنشین) صالح نصیب فرما دے" (یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلف صالحین میں جلیس صالح کی طلب و تلاش کا یہ درجہ تھا کہ اس کو اہم مقصد اور سب پریشانیوں کا علاج سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کی دعائیں مانگتے تھے) ابو الدرداءؓ نے یہ دعا سنی تو فرمایا کہ اگر آپ اپنی اس دعا میں صادق ہیں تو میں اس معاملہ میں آپ سے زیادہ خوش نصیب ہوں، (مطلب یہ ہے کہ مجھے اللہ نے آپ جیسا جلیس صالح بے مانگے دیدیا) اور فرمایا کہ

اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جو ہمارے بندوں میں منتخب اور برگزیدہ ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کتاب اللہ اور علوم نبوت کے بلا واسطہ وارث حضرات علماء ہیں، جیسا کہ حدیث میں بھی ارشاد ہے اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کے علوم کا مشغلہ اخلاص کے ساتھ نصیب فرمایا یہ اس کی علامت ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ اولیاء ہیں، جیسا کہ حضرت ثعلبہ بن الحکم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز علماء امت سے خطاب فرما کر کہیں گے کہ میں نے تمہارے سینوں میں اپنا علم و حکمت صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میرا ارادہ یہ تھا کہ تمہاری مغفرت کردوں عمل تمہارے کیسے بھی ہوں (اور یہ معلوم ہوچکا ہے کہ جس شخص میں خشیت اور خوف خدا نہیں وہ علماء کی فہرست ہی سے خارج ہے۔ اس لئے یہ خطاب انہی لوگوں کو ہوگا جو خشیۃ اللہ میں رنگے ہوئے ہوں ان سے یہ ممکن ہی نہیں ہوگا کہ بے فکری سے گناہوں میں ملوث رہیں، ہاں طبیعت بشریہ کے تقاضوں سے کبھی کبھی لغزش اُن سے بھی ہوتی ہے۔ اسی کو اس حدیث میں فرمایا کہ عمل تمہارے کیسے بھی ہوں تمہارے لئے مغفرت مقدر ہے)۔

یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں، اور آخری حدیث جو حضرت ثعلبہؓ سے روایت کی گئی ہے اس کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، جس کی سند کے سب رجال ثقات ہیں۔ (تفسیر مظہری) اور تفسیر مظہری میں بحوالہ ابن عساکر حدیث مذکور کا یہی مضمون ابو عمر صنعانی سے بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں اللہ اپنے سب بندوں کو جمع فرما دیں گے پھر ان میں سے علماء کو ایک ممتاز مقام پر جمع کرکے فرما دیں گے:

اِنِّیْ لَمْ اَضَعْ عِلْمِیْ فِیْکُمْ اِلَّا لِعِلْمِیْ بِکُمْ وَلَمْ اَضَعْ عِلْمِیْ فِیْکُمْ لِاُعَذِّبَکُمْ اِنْطَلِقُوْا فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ

"یعنی میں نے اپنا علم تمہارے قلوب میں اسی لئے رکھا تھا کہ میں تم سے واقف تھا (کہ تم اس امانت علم کا حق ادا کروگے) میں نے اپنا علم تمہارے سینوں میں اس لئے نہیں رکھا تھا کہ تمہیں عذاب دوں جاؤ میں نے تمہاری مغفرت کردی (مظہری)

فائدہ:۔ اس آیت میں سب سے پہلے ظالم کو پھر مقتصد کو آخر میں سابق بالخیرات کو ذکر فرمایا ہے۔ اس ترتیب کا سبب شاید یہ ہو کہ تعداد کے اعتبار سے ظالم نفسہ سب سے زیادہ ہیں ان سے کم مقتصد اور ان سے کم سابق بالخیرات ہیں، جن کی تعداد زیادہ تھی ان کو مقدم کیا گیا۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ، شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ منتخب لوگوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں، پھر فرمایا ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ یعنی ان تینوں کو برگزیدہ بندوں میں شمار کرنا یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ آگے ان کی جزاء کا بیان ہے کہ یہ جنت میں جائیں گے، ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں کے زیور پہنائے جائیں گے، اور لباس ان کا ریشمی ہوگا۔

دنیا میں مردوں کے لئے سونے کا زیور پہننا بھی حرام ہے اور ریشمی لباس بھی، اس کے عوض میں ان کو جنت میں یہ سب چیزیں دی جائیں گی۔ اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زیور پہننا تو عورتوں کا کام ہے، مردوں کے شایان شان نہیں، کیونکہ آخرت اور جنت کے حالات کو دنیا کے حالات پر قیاس کرنا بے عقلی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اہل جنت کے سروں پر تاج موتیوں سے مرصع ہوں گے، ان کے ادنیٰ موتی کی روشنی ایسی ہوگی کہ مشرق سے مغرب تک پورے عالم کو روشن کردے گی۔ (رواہ الترمذی والحاکم وصححہ والبیہقی، از مظہری)

امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ ہر جنتی کے ہاتھ میں کنگن پہنائے جائیں گے، ایک سونے کا ایک چاندی کا ایک موتیوں کا۔ جنتی کنگن کے متعلق ایک آیت میں چاندی کے اور دوسری میں سونے کے مذکور ہیں۔ اس تفسیر سے ان دونوں آیتوں میں تطبیق بھی ہوگئی۔

جو شخص دنیا میں سونے چاندی کے برتن اور ریشمی لباس استعمال کرے گا جنت میں ان سے محروم ہوگا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ریشمی لباس نہ پہنو، اور سونے چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو، اور نہ ان کو پلیٹ کھانے میں استعمال کرو، کیونکہ یہ چیزیں دنیا میں کفار کے لئے ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں (بخاری و مسلم)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس مرد نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہنا وہ آخرت میں نہ پہن سکے گا۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت ابوسعید خدری کی ایک روایت میں ہے کہ دنیا میں ریشمی لباس پہننے والا مرد آخرت میں اس سے محروم ہوگا، اگرچہ جنت میں چلا بھی جائے (مظہری)

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ، یعنی اہل جنت جنت میں داخل ہونے کے وقت کہیں گے، شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کردیا۔ اس غم سے کیا مراد

أَعْمَارُ أُمَّتِيْ مَا بَيْنَ السِّتِّيْنَ إِلَى السَّبْعِيْنَ وَأَقَلُّهُمْ مَنْ يَّجُوْزُ ذٰلِكَ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ، ابن کثیر)

"یعنی میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر سال تک ہوں گی، کم لوگ ہوں گے جو اس سے تجاوز کریں گے۔"

آخر آیت میں فرمایا وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کو عمر بلوغ کے وقت سے اتنی عقل و تمیز منجانب اللہ عطا ہو جاتی ہے کہ کم از کم اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اس کی رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے۔ اس کام کے لئے خود انسانی عقل بھی کافی تھی، مگر اللہ جل شانہٗ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس عقل کی امداد کے لئے نذیر بھی بھیجے۔ نذیر کے معنی اردو میں ڈرانے والے کے کئے جاتے ہیں، درحقیقت نذیر وہ شخص ہے جو اپنی رحمت و شفقت کے سبب اپنے لوگوں کو ایسی چیزوں سے بچنے کی ہدایت کرے جو اس کو ہلاکت یا مضرت میں ڈالنے والی ہیں اور ان چیزوں سے لوگوں کو ڈرائے۔ مراد اس سے معروف معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء ہیں۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ ہم نے حق و باطل کو پہچاننے کے لئے عقل بھی دی، اس کے ساتھ اپنے پیغمبر بھی بھیجے جو حق کی طرف ہدایت کریں باطل سے بچائیں۔

اور حضرت ابن عباس، عکرمہ، اور امام جعفر باقر سے منقول ہے کہ نذیر سے مراد بڑھاپے کے سفید بال ہیں کہ جب وہ ظاہر ہو جائیں تو وہ انسان کو اس کی ہدایت کرتے ہیں کہ اب رخصت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ یہ قول بھی پہلے قول سے متعارض نہیں کہ سفید بال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر ہوں اور انبیاء و علماء بھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کو بالغ ہونے کے بعد سے جتنے حالات پیش آتے ہیں اس کے اپنے وجود اور گرد و پیش میں جو تغیرات و انقلابات آتے ہیں، وہ سب ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر اور انسان کو متنبہ کرنے والے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ

اللہ بھید جاننے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے

الصُّدُوْرِ ۝ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ

دلوں میں۔ وہی ہے جس نے کیا تم کو قائم مقام زمین میں، پھر کوئی

كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

ناشکری کرے تو اس پر پڑے اس کی ناشکری، اور منکروں کو نہ بڑھے گی ان کے انکار سے ان کے رب کے آگے

اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ۝ قُلْ

مگر بیزاری، اور منکروں کو نہ بڑھے گی ان کے انکار سے مگر نقصان۔ تو کہہ بھلا

اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَرُوْنِيْ

دیکھو تو اپنے شریکوں کو جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ

کیا بنایا انہوں نے زمین میں یا ان کا کچھ ساجھا ہے آسمانوں میں یا ہم نے

اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰي بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ

دی ہے ان کو کوئی کتاب سو یہ سند رکھتے ہیں اس کی، کوئی نہیں پر جو وعدہ بتلاتے ہیں گنہگار

بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ

ایک دوسرے کو سب فریب ہے۔ تحقیق اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور

الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ڬ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ

زمین کو کہ ٹل نہ جائیں، اور اگر ٹل جائیں تو کوئی نہ تھام سکے ان کو

مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

اس کے سوائے وہ ہے تحمل والا بخشنے والا

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ ہی جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا، بیشک وہی جاننے والا ہے دل کی باتوں کا، یہ کمال علمی تو اس کا ایسا ہے، اور کمال عملی جو کہ قدرت و نعمت دونوں پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ وہی ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا، اور ان دلائل و احسانات کا مقتضا یہ تھا کہ سب لوگ شکر توحید و اطاعت اختیار کرلیتے مگر بعضے اس کے خلاف کفر و عداوت پر مصر ہیں سو کسی دوسرے کا کیا بگڑتا ہے، بلکہ جو شخص کفر کرے گا

جو ہم نے پچھلی قوموں کے بعد ان کے خلیفہ کی حیثیت سے تم کو مالک و متصرف بنایا ہے، لہٰذا تمھارا فرض ہے کہ اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرو، عمر کے قیمتی لمحات **کو غفلت میں نہ گذارو۔**

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ، آسمانوں کو روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی حرکت بند کر دی بلکہ مراد اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور ٹل جانا ہے، جیسا کہ لفظ اَنْ تَزُوْلَا اس پر شاہد ہے، اس لئے اس آیت میں آسمان کے متحرک یا ساکن ہونے میں سے کسی جانب پر کوئی دلیل نہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ

اور قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید کی قسمیں کہ اگر آئے گا ان کے پاس کوئی ڈر سنانے والا البتہ بہتر

اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ

راہ چلیں گے ہر ایک امت سے پھر جب آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا اور زیادہ ہو گیا

اِلَّا نُفُوْرًا ۙ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ

ان کا بدکنا غرور کرنا ملک میں اور داؤ کرنا برے کام کا اور برا داؤ الٹے گا

الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ

انہیں داؤ والوں پر پھر اب وہی راہ دیکھتے ہیں پہلوں کے دستور کی

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۴۳)

سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ

کیا پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھیں کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو

مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ

ان سے پہلے تھے اور تھے ان سے بہت سخت زور میں اور اللہ وہ نہیں جس کو تھکائے

مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (۴۴)

کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہی ہے سب کچھ جانتا کر سکتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ

اور اگر پکڑ کرے اللہ لوگوں کی اُن کی کمائی پر نہ چھوڑے زمین کی پیٹھ پر ایک بھی

دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ

ہلنے چلنے والا پر اُن کو ڈھیل دیتا ہے ایک مقرر وعدہ تک، پھر جب آئے گا ان کا وعدہ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

تو اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے سب بندے

خُلاصۂ تفسیر

اور ان کفار (قریش) نے (قبل بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بڑی زور دار قسم
کھائی تھی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) آئے تو وہ (یعنی ہم)
ہر ہر امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں (یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کی طرح ہم تکذیب
نہ کریں گے سو پہلے سے تو یہ قسمیں کھایا کرتے تھے) پھر جب اُن کے پاس ایک پیغمبر (یعنی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم) آپہونچے تو بس ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوئی دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے
اور (صرف نفرت ہی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ) ان کی بُری تدبیروں کو (بھی ترقی ہوئی یعنی تکبر
کی وجہ سے آپ کے اتباع سے عار تو ہوئی ہی تھی، مگر یہ بھی نہ کیا کہ نہ اتباع ہوتا اور نہ درپے آزار
ہوتے، بلکہ آپ کی ایذا رسانی کی فکر میں لگ گئے چنانچہ ہر وقت اُن کا اسی میں لگا رہنا معروف
و مشہور ہے) اور یہ جو کچھ ہمارے رسول کے لئے بُری بُری تدبیریں کر رہے ہیں خود اپنی ہی شامت
کر رہے ہیں کیونکہ بُری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے (گو ظاہر میں
کبھی اس شخص کو بھی ضرر پہونچ جاوے جس کو ضرر پہونچانا چاہا ہے، لیکن وہ ضرر دنیوی ہے
بخلاف ظالم ضرر رساں کے کہ اُس پر اخروی ضرر وبال پڑے گا اور دنیوی ضرر اخروی ضرر
کے سامنے لاشے ہے، پس اس ضرر حقیقی کے اعتبار سے حصر بالکل واقعی ہے، سو اگر یہ جو
آپ کی عداوت اور ضرر رسانی پر مصر ہیں تو) کیا یہ (اپنے ساتھ بھی) حق تعالیٰ کے اسی دستور
کے منتظر ہیں جو اگلے (کافر) لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے (یعنی عذاب و ہلاکت، سو (واقعی
ان کے لئے بھی یہی ہونا ہے کیونکہ) آپ خدا کے (اس) دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پاویں گے (کہ
ان پر بجائے عذاب کے عنایت ہونے لگے) اور (اسی طرح) آپ خدا کے (اس) دستور
کو بھی منتقل ہوتا ہوا نہ پاویں گے (کہ ان کی جگہ دوسروں کو جو ایسے نہ ہوں عذاب ہونے لگے

مطلب یہ کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ کافروں کو عذاب ہوگا، خواہ دنیا میں بھی خواہ صرف
آخرت میں، اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ پس نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو
اور نہ یہ احتمال ہے کہ وہ دوسرے بے گناہوں کو عذاب ہونے لگے، مقصود اس تقریر سے تاکید ہے
وقوع عذاب کی، اور اگر یہ جو سمجھتے ہیں کہ کفر موجب تعذیب نہیں ہے تو ان کی بڑی غلطی ہے)
کیا یہ لوگ زمین میں (مثلاً شام و یمن کے سفروں میں عاد و ثمود و قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں
میں) چلے پھرے نہیں جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہوگذرے ہیں
ان کا (آخری) انجام (اسی تکذیب کے سبب) کیا ہوا کہ معذب ہوئے، حالانکہ وہ قوت
میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور (کسی میں خواہ کیسی ہی قوت ہو لیکن) خدا ایسا نہیں ہے
کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو ہرا دے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم
والا (اور) بڑی قدرت والا ہے (پس علم سے اپنے ہر ارادہ کے نافذ کرنے کا طریقہ جانتا ہے
اور اپنی قدرت سے اس کو نافذ کرسکتا ہے، اور دوسرا کوئی ایسا ہے نہیں۔ پھر اس کو کون
چیز ہرا سکتی ہے، اور اگر یہ اس دھوکہ میں ہوں کہ اگر ہم کو عذاب ہونا ہوتا تو ہو چکتا، اور
اس سے اپنے شرک و کفر کے اچھے ہونے پر استدلال کریں تو یہ بھی اُن کی غلطی ہے، کیونکہ
بمقتضائے حکمت ان کے لئے فوری عذاب تجویز نہیں کیا گیا ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں
پر اُن کے اعمال کفریہ کے سبب (فوراً) داروگیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک متنفس
کو نہ چھوڑتا (کیونکہ کفار تو کفر سے ہلاک ہوجاتے اور اہل ایمان بوجہ قلت کے دنیا میں نہ رکھے
جاتے کیونکہ نظام عالم بمقتضائے حکمت مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ
اسی عذاب سے ہلاک ہوتے اور دوسری مخلوقات اس لئے کہ مقصود ان کی تخلیق کا انتفاع
بنی آدم ہے، جب یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ رہتے) لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین یعنی
قیامت تک مہلت دے رہا ہے، سو جب ان کی وہ میعاد آپہنچے گی (اس وقت) اللہ تعالیٰ
اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا (یعنی ان میں جو کفار ہوں گے اُن کو سزا دے لے گا)۔

معارف و مسائل

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ، لَا يَحِيقُ کے معنی لَا يُحِيطُ یا لَا يُصِيبُ کے
ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بُری تدبیر کا وبال اور کسی پر نہیں پڑتا، بلکہ خود ایسی تدبیر کرنے والے
ہی پر پڑتا ہے۔ یعنی جو شخص دوسروں کا بُرا چاہتا ہے وہ خود بُرائی کا شکار ہوجاتا ہے۔
اس پر جو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دنیا میں تو بہت مرتبہ یہ بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ بُری

تدبیر کرنے والے کی تدبیر چل جاتی ہے اور جس کو نقصان پہونچانا ہوتا ہے اس کو نقصان پہنچ جاتا ہے؟ اس کا ایک جواب تو خلاصہ تفسیر میں آ گیا ہے کہ اس کو جو تکلیف یا نقصان پہنچا وہ تو دنیا کا نقصان ہے، اور ایسی بری تدبیر کرنے والے کا نقصان آخرت کا عذاب ہے جو اشد بھی ہے اور دائمی بھی، اس کے مقابلہ میں اس کا دنیوی نقصان کالعدم ہے۔

دوسرا جواب بعض حضرات نے یہ بھی دیا ہے کہ کسی بے گناہ کے خلاف تدبیر کرنے اور اس پر ظلم کرنے کا وبال ظالم پر اکثر دنیا میں بھی پڑجاتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں جن کا کرنے والا دنیا میں بھی وبال و عذاب سے نہیں بچتا، ایک کسی بے گناہ کے حق میں بری تدبیر کر کے اس کو ایذا پہونچانا، دوسرے عام ظلم، تیسرے عہد شکنی (ابن کثیر) خصوصاً جو کسی ایسے شخص پر کیا جائے جو بے کس بے بس ہو، انتقام پر قدرت نہ رکھتا ہو یا باوجود قدرت انتقام کے صبر کرے، اس پر ظلم کے وبال سے دنیا میں بھی کسی کو بچتے نہیں دیکھا ہے

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات ✻ با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

اس کا حاصل یہ ہوگا کہ آیت میں جو حصر بیان کیا گیا ہے وہ اکثری قاعدہ کے اعتبار سے ہے کلی نہیں۔ واللہ اعلم ؀

تمّت

سُوْرَةُ الْفَاطِرِ بِحَمْدِ اللّٰہِ

فِی تِسْعِ صَفَر سَنَۃ ۱۳۹۲ھ یَوْمَ السَّبْتِ

سُوْرَۃُ یٰسٓ

سُوْرَۃُ یٰسٓ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَلٰثٌ وَّثَمٰنُوْنَ اٰیَۃً وَّخَمْسُ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ یٰسٓ مکہ میں نازل ہوئی اس میں تراسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾

قسم ہے اس پکے قرآن کی، تو تحقیق ہے بھیجے ہوؤں میں سے

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ

اوپر سیدھی راہ کے، اتارا زبردست رحم والے نے، تاکہ تو ڈرائے

قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ

ایک قوم کو کہ ڈر نہیں سنا ان کے باپ دادوں نے سو ان کو خبر نہیں، ثابت ہو چکی ہے بات

عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ

ان میں بہتوں پر سو وہ نہ مانیں گے، ہم نے ڈالے ہیں ان کی گردنوں میں

ؑ آج جبکہ میں سورۂ یٰسٓ کی تفسیر شروع کر رہا ہوں ماہ صفر کی نویں تاریخ ہے، ۹ صفر ۱۳۵۵ھ میں اسی تاریخ کو میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تھی، اس سورۃ کے ساتھ نام میں شرکت اور تاریخ وفات نے ان کی یاد کو تازہ کر دیا، مطالعہ کرنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ احقر اور میرے والدین کے لئے دعاءِ مغفرت فرما دیں اور کوئی ہمت کرے اور سورۂ یٰسٓ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرے تو سبحان اللہ۔ منہ

أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ

طوق سو وہ ہیں ٹھوڑیوں تک پھر ان کے سر الل رہے ہیں، اور بنائی ہم نے

بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ

ان کے آگے دیوار اور پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا سو ان کو

لَا يُبْصِرُونَ ﴿٩﴾ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

کچھ نہیں سوجھتا ۔ اور برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾ إِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ

یقین نہیں کریں گے ۔ تو تو ڈر سنا دے اس کو جو چلے سمجھانے پر اور ڈرے رحمٰن سے

بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ﴿١١﴾ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ

بن دیکھے سو اس کو خوشخبری دے معافی کی اور عزت کے ثواب کی ۔ ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں مُردوں

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ

کو اور لکھتے ہیں جو آگے بھیج چکے اور جو نشان ان کے پیچھے رہے اور ہر چیز گن لی ہم نے ایک

مُبِينٍ ﴿١٢﴾ ع

کھلی اصل میں ۔

وقف غفران ع ۱۲ - ۱۸

خلاصۂ تفسیر

یٰسٓ (اس کی مراد اللہ ہی کو معلوم ہے) قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بیشک آپ منجملہ پیغمبروں کے ہیں (اور) سیدھے رستہ پر ہیں (کہ اس میں جو آپ کی پیروی کرے خدا تک پہونچ جائے نہ کہ جیسا کفار کہتے ہیں لَسْتَ مُرْسَلًا، یعنی آپ رسول نہیں، یا کہتے تھے بَلِ افْتَرَاہُ یعنی آپ نے خود گھڑ لیا ہے، جس کے لئے گمراہ ہونا لازم ہے اور قرآن تعلیم ہدایت کے ساتھ آپ کی رسالت و نبوت کی دلیل بھی ہے کیونکہ) یہ قرآن خدائے زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے (اور آپ پیغمبر اس لئے بنائے گئے ہیں) تاکہ آپ (اوّلاً) ایسے لوگوں کو (عذاب خداوندی سے) ڈرا دیں جن کے باپ دادے (قریب کے کسی رسول کے ذریعہ سے) نہیں ڈرائے گئے تھے، سو اسی سے یہ بے خبر ہیں (کیونکہ گو عرب میں بعض مضامین شرائع رسل سابقہ کے

منقول بھی تھے جیسا اس آیت میں ہے اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ (یعنی کیا قرآن ان کے پاس کوئی ایسی چیز لایا ہے جو ان کے آباء کے پاس نہیں آئی تھی، یعنی دعوتِ توحید کوئی نئی چیز نہیں، یہ ہمیشہ ان کے آباء و اجداد میں بھی جاری رہی ہے، مگر پھر بھی نبی کے آنے سے جس قدر تنبہ ہوتا ہے محض اس کے بعض احکام و اخبار نقل ہو کر پہنچنے سے جبکہ وہ ناتمام اور متغیر بھی ہو گئے ہوں ویسا تنبہ نہیں ہوتا، اور اول اول انذار آپ کا قریش کو تھا، اس لئے اس جگہ انہی کا ذکر فرمایا، پھر عام لوگوں کو بھی آپ نے دعوت فرمائی، کیونکہ بعثت آپ کی عام ہے اور باوجود آپ کی صحتِ رسالت و صدقِ قرآن کے، یہ لوگ جو نہیں مانتے آپ اس کا غم نہ کیجئے، کیونکہ) ان میں اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہو چکی ہے (وہ بات یہی کہ یہ ہدایت کے رستہ پر نہ آئیں گے) سو یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاویں گے (یہ حال ان کے اکثر کا تھا اور بعض کی قسمت میں ایمان بھی تھا وہ ایمان بھی لے آئے اور ان لوگوں کی مثال ایمان سے دوری میں ایسی ہو گئی کہ گویا) ہم نے ان کی گردنوں میں (بھاری بھاری) طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک (اَڑ گئے) ہیں جس سے ان کے سر اوپر کو اُلل گئے (یعنی اُٹھے رہ گئے، نیچے کو نہیں ہو سکتے، خواہ اس وجہ سے کہ طوق میں جو موقع تحت ذقن رہنے کا ہے وہاں کوئی میخ وغیرہ ایسی ہو جو ذقن میں جا کر اَڑ جاوے، اور یا طوق کا چکلا ایسا ہو کہ اس کی گدّ ذقن میں اَڑ جاوے، بہرحال دونوں طرح یہ راہ دیکھنے سے محروم رہے اور نیز ان کی مثال بُعد عن الدین میں ایسی ہو گئی کہ گویا) ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کر دی جس سے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں میں) گھیر دیا سو وہ (اس احاطۂ حجابات کی وجہ سے کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے، اور (دونوں تمثیلوں سے حاصل یہ ہے کہ) ان کے حق میں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، یہ (کسی حالت میں بھی) ایمان نہیں لائیں گے (اس لئے آپ ان سے مایوس ہو کر راحت حاصل کیجئے) بس آپ تو (ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو) صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور خدا سے بے دیکھے ڈرے (کہ ڈر ہی سے طلب حق ہوتی ہے اور طلب سے وصول اور یہ ڈرتے ہی نہیں) سو (جو ایسا شخص ہو) آپ اس کو (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعت پر) عمدہ عوض کی خوشخبری سنا دیجئے (اور اسی سے اس پر بھی دلالت ہو گئی کہ جو ضلالت اور اعراض کا مرتکب ہو وہ مغفرت اور اجر سے محروم اور مستحق عذاب ہے، اور گو دنیا میں اس جزا و سزا کا ظہور لازم نہیں، لیکن) بیشک ہم (ایک روز) مُردوں کو زندہ کریں گے (اس وقت ان سب کا ظہور ہو جاوے گا) اور (جن اعمال پر جزا و سزا ہو گی) ہم (ان کو برابر) لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال

بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جنکو پیچھے چھوڑے جاتے ہیں (نقش قدم سے مراد جو کام اپنے ہاتھ سے کیا اور آثار سے مراد وہ، نتیجہ اس کام کے سبب پیدا ہوا اور بعد موت بھی باقی رہا، مثلاً کسی نے کوئی نیک کام کیا اور وہ سبب ہوگیا دوسروں کی بھی ہدایت کا یا کسی نے کوئی برا کام کیا اور وہ سبب ہوگیا دوسروں کی بھی گمراہی کا، غرض یہ سب لکھے جا رہے ہیں اور نامۂ اعمال ان سب پر جزا و سزا مرتب ہوجائے گی) اور (ہمارا علم تو ایسا وسیع ہے کہ ہم اس کتابت کے بھی محتاج نہیں جو بعد الوقوع ہوتی ہے کیونکہ) ہم نے (تو) ہر چیز کو (جو دنیا تک ہوگا وقوع سے پہلے ہی) ایک واضح کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں ضبط کر دیا تھا (محض بعض حکمتوں سے اعمال کی کتابت ہوتی ہے۔ پس جب قبل وقوع ہم کو سب چیزوں کا علم ہے تو بعد وقوع تو کیوں نہ ہوتا، اس لئے کسی عمل کے کرنے یا پوشیدہ رکھنے کی گنجائش نہیں، ضرور سزا ہوگی اور لوحِ محفوظ کو واضح بہ اعتبار تفصیلِ اشیاء کے کہا گیا ہے۔

معارف و مسائل

فضائل سورۂ یٰسٓ حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یٰسٓ قلبُ القرآن، یعنی سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں ہے کہ جو شخص سورۂ یٰسٓ کو خالص اللہ اور آخرت کے لئے پڑھتا ہے اس کی مغفرت ہوجاتی ہے اس کو اپنے مُردوں پر پڑھا کرو (رواہ احمد و ابوداؤد والنسائی و ابن حبان والحاکم وغیرہم، کذا فی الروح والمظہری)

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ سورۂ یٰسٓ کو قلبِ قرآن فرمانے کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ اس سورۃ میں قیامت اور حشر و نشر کے مضامین خاص تفصیل اور بلاغت کے ساتھ آئے ہیں اور اصولِ ایمان میں سے عقیدۂ آخرت وہ چیز ہے جس پر انسان کے اعمال کی صحت موقوف ہے۔ خوفِ آخرت ہی انسان کو عملِ صالح کے لئے مستعد کرتا ہے اور وہی اس کو ناجائز خواہشات اور حرام سے روکتا ہے۔ تو جس طرح بدن کی صحت قلب کی صحت پر موقوف ہے اسی طرح ایمان کی صحت فکرِ آخرت پر موقوف ہے (روح) اور اس سورۃ کا نام جیسے سورۂ یٰسٓ معروف ہے اسی طرح ایک حدیث میں اس کا نام عظیمہ بھی آیا ہے (اخرجہ ابونصر سجزی عن عائشہ رضؓ) اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سورۃ کا نام تورات میں مُعِمَّہ آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے کے لئے دنیا و آخرت کی خیرات و برکات عام کرنے والی۔ اور اس کے پڑھنے والے کا نام شریف آیا ہے اور فرمایا کہ قیامت کے روز اس کی

شفاعت قبیلہ ربیعہ کے لوگوں سے زیادہ کے لئے قبول ہوگی۔ (رواہ سعید بن منصور والبیہقی عن حسان بن عطیہ) اور بعض روایات میں اس کا نام مدافعہ بھی آیا ہے، یعنی اپنے پڑھنے والے سے برائی کو دفع کرنے والی، اور بعض میں اس کا نام قاضیہ بھی مذکور ہے، یعنی حاجت کو پورا کرنے والی (روح المعانی)

اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ جس مرنے والے کے پاس سورہ یٰسٓ پڑھی جائے تو اس کی موت کے وقت آسانی ہوجاتی ہے (رواہ الدیلمی و ابن حبان، مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ جو شخص سورۃ یٰسٓ کو اپنی حاجت کے آگے کرلے تو اس کی حاجت پوری ہوجاتی ہے (اخرجہ المحاملی فی امالیہ، مظہری)

اور یحیٰی بن کثیرؒ نے فرمایا کہ جو شخص صبح کو سورۃ یٰسٓ پڑھ لے وہ شام تک خوشی اور آرام سے رہے گا، اور جو شام کو پڑھ لے تو صبح تک خوشی میں رہے گا۔ اور فرمایا کہ مجھے یہ بات ایسے شخص نے بتلائی ہے جس نے اس کا تجربہ کیا ہے (اخرجہ ابن الضریس، مظہری)

یٰسٓ، اس لفظ کے متعلق مشہور قول تو وہی ہے جس کو اوپر خلاصہ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ حروف مقطعات میں سے ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے عام بندوں کو نہیں دیا۔ اور ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ امام مالکؒ نے فرمایا یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت یہی ہے کہ اسماء الہیہ میں سے ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "اے انسان" اور مراد انسان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور حضرت ابن جبیرؒ کے کلام سے یہ مستفاد ہے کہ لفظ یٰسٓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان دو عظیم الشان حرفوں سے رکھنا، یعنی یا اور سین اس میں بڑا راز ہے۔

یٰسٓ کسی کا نام رکھنا کیسا ہے | امام مالکؒ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ ان کے نزدیک یہ اسماء الہیہ میں سے ہے اور اس کے صحیح معنی معلوم نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ کوئی ایسے معنی ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے خالق، رازق وغیرہ۔ البتہ اس لفظ کو یاسین کے رسم الخط سے لکھا جائے تو یہ کسی انسان کا نام رکھنا جائز ہے کیونکہ قرآن کریم میں آیا ہے سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ (ابن عربی) آیت مذکورہ کی معروف قراءت اِلْ یَاسِیْنَ ہے مگر بعض قراءتوں میں آلِ یاسین بھی آیا ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ، مراد اس سے عرب ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے آباء و اجداد میں کوئی نذیر یعنی پیغمبر عرصہ دراز سے نہیں آیا۔ اور آباء و اجداد سے مراد قریبی

آباء و اجداد ہیں، ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کتنی صدیوں سے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، اگرچہ دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کا سلسلہ برابر جاری رہا جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت میں بھی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں آ چکی ہے اور آیت اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ کا بھی یہی مقتضیٰ ہے، کہ رحمتِ خداوندی نے کسی قوم و ملت کو دعوت و انذار سے کسی زمانے و کسی خطہ میں محروم نہیں رکھا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی تعلیمات ان کے نائبوں کے ذریعہ پہونچنا وہ اثر نہیں رکھتا جو خود نبی یا پیغمبر کی دعوت و تعلیم کا ہوتا ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں عربوں کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ ان میں کوئی نذیر نہیں آیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ عرب میں عام طور پر پڑھنے پڑھانے اور تعلیم کا کوئی مستحکم نظام نہیں تھا، اسی وجہ سے ان کا لقب اُمّیّین ہوا۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ، اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا الآیۃ مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کفر و ایمان اور جنت و دوزخ کے دونوں راستے انسان کے سامنے کر دیئے، اور ایمان کی دعوت کے لئے انبیاء اور کتابیں بھی بھیج دیں، پھر انسان کو اتنا اختیار بھی دیدیا کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو پہچان کر کوئی راستہ اختیار کرے۔ جو بدنصیب نہ غور و فکر سے کام لے نہ دلائلِ قدرت میں غور کرے، نہ انبیاء کی دعوت پر کان دھرے نہ اللہ کی کتاب میں غور و تدبر کرے تو اس نے اپنے اختیار سے جو راہ اختیار کی تو حق تعالیٰ ... اسی کے سامان اس کے لئے جمع فرما دیتے ہیں، جو کفر میں لگ گیا پھر اس کے واسطے کفر پر جمے ہی کے سامان ہوتے رہتے ہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا، لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ، یعنی ان میں سے بیشتر لوگوں پر تو ان کے سوءِ اختیار کی بناء پر یہ قولِ حق جاری ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔

آگے ان کے حال کی ایک تمثیل بیان فرمائی ہے، کہ ان کی مثال ایسی ہے کہ جس کی گردن میں ایسے طوق ڈال دیئے گئے ہوں کہ اس کا چہرہ اور آنکھیں اوپر اُٹھ جائیں، نیچے راستہ کی طرف دیکھ ہی نہ سکے۔ تو ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو کسی کھڈ میں گرنے سے نہیں بچا سکتا۔ دوسری مثال یہ دی کہ جیسے کسی شخص کے چاروں طرف دیوار حائل کر دی گئی ہو وہ اس چاردیواری میں محصور ہو کر باہر کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہے، ان کافروں کے گرد بھی انکی جہالت اور اس پر عناد و ہٹ دھرمی نے محاصرہ کر لیا ہے، کہ باہر کی حق باتیں ان تک گویا پہنچتی ہی نہیں۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ نظر سے مانع دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مانع تو ایسا ہوتا ہے

کہ خود اپنے وجود کو بھی نہ دیکھ سکے، دوسرے یہ کہ آگے پیچھے گرد و پیش کو نہ دیکھ سکے۔ ان کفار کیلئے حق بینی سے دونوں قسم کے مانع موجود تھے اس لئے پہلی مثال پہلے مانع کی کہ جس کی گردن نیچے کو جھک نہ سکے وہ اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھ سکتا، اور دوسری مثال دوسرے مانع کی کہ گرد و پیش کو نہیں دیکھ سکتا (روح)

جمہور مفسرین نے آیت مذکورہ کو ان کے کفر و عناد کی تمثیل ہی قرار دیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کو بعض روایات کی بناء پر ایک واقعہ کا بیان قرار دیا ہے، کہ ابوجہل اور بعض دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے یا ایذاء پہونچانے کا پختہ عزم کر کے آپ کی طرف بڑھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا عاجز ہو کر واپس آ گئے۔ اسی طرح کے متعدد واقعات کتب تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، قرطبی، مظہری وغیرہ میں منقول ہیں، مگر وہ بیشتر روایات ضعیف ہیں اس پر مدار آیت کی تفسیر کا نہیں رکھا جا سکتا۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ، یعنی ہم لکھیں گے ان اعمال کو جو انھوں نے آگے بھیجے ہیں۔ عمل کرنے کو آگے بھیجنے سے تعبیر کر کے یہ بتلا دیا کہ جو اعمال اچھے یا برے اس دنیا میں کئے ہیں وہ یہیں ختم نہیں ہو گئے، بلکہ وہ تمھارا سامان بن کر آگے پہونچ گئے ہیں جن سے اگلی زندگی میں سابقہ پڑنا ہے، اچھے عمل ہیں تو جنت کی باغ و بہار بنیں گے برے ہیں تو جہنم کے انگارے۔ اور ان اعمال کو لکھنے سے اصل مقصود ان کو محفوظ رکھنا ہے، لکھنا بھی اس کا ایک ذریعہ ہے کہ خطاء و نسیان اور زیادت و نقصان کا احتمال نہ رہے

اعمال کی طرح اعمال کے ثمرات بھی لکھے جاتے ہیں۔

وَآثَارَهُمْ، یعنی جس طرح ان کے کئے ہوئے اعمال لکھے جاتے ہیں اسی طرح ان کے آثار بھی لکھے جاتے ہیں۔ آثار سے مراد اعمال کے وہ ثمرات و نتائج ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے اور باقی رہتے ہیں، مثلاً کسی نے لوگوں کو دین کی تعلیم دی، دینی احکام بتلائے، یا اس کے لئے کوئی کتاب تصنیف کی جس سے لوگوں نے دین کا نفع اٹھایا یا کوئی وقف کر دیا، جس سے لوگوں کو اس کے بعد نفع پہونچا، یا اور کوئی ایسا کام کیا جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچا، تو جہاں تک اس کے اس عمل خیر کے آثار پہونچیں گے اور جب تک پہونچتے رہیں گے وہ سب اس کے اعمال نامہ میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اسی طرح برے اعمال جن کے برے ثمرات و آثار دنیا میں باقی رہیں، مثلاً ظالمانہ قوانین جاری کر دیئے، ایسے ادارے قائم کر دیئے جو انسانوں کے اعمال و اخلاق کو خراب کر دیتے ہیں، یا لوگوں کو کسی غلط اور برے راستہ پر ڈال دیا۔ تو جہاں تک اور جب تک اس کے عمل کے برے نتائج اور مفاسد وجود میں آتے رہیں گے، اس کے نامۂ عمل میں لکھے جاتے رہیں گے، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ ثُمَّ تَلَا وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَآثَارَهُمْ۔ (ابن کثیر عن ابن ابی حاتم)

"جس شخص نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اس کا بھی ثواب ملے گا اور جتنے آدمی اس طریقہ پر عمل کریں گے ان کا بھی ثواب اس کو ملے گا بغیر اس کے کہ ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی آئے، اور جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کو اس کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے آدمی جب تک اس برے طریقہ پر عمل کرتے رہیں گے ان کا گناہ بھی اس کو ہوتا رہے گا بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کمی آوے"۔

آثار میں نشان قدم بھی آتے ہیں، حدیث میں ہے کہ انسان جب نماز کے لئے مسجد کی طرف جاتا ہے تو اس کے ہر قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے۔ بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں آثار سے مراد یہی نشان قدم ہیں جس طرح نماز کا ثواب لکھا جاتا ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے میں جتنے قدم پڑتے ہیں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ ابن کثیر نے ان روایات کو اس جگہ جمع کردیا ہے جن میں یہ مذکور ہے کہ مدینہ طیبہ میں جن لوگوں کے مکانات مسجد نبوی سے دور تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ مسجد کے قریب مکان بنالیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ جہاں رہتے ہو وہیں رہو، دور سے چل کر آؤ گے تو ہر وقت بھی نشان قدم لکھے جائیں گے، جتنے قدم زیادہ ہوں گے اتنا ہی تمہارا ثواب بڑھے گا۔

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے، اور یہ واقعہ ان احادیث میں مذکور ہے وہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ اس کا جواب یہ درست ہے کہ آیت تو اپنے عام معنی میں ہر کے اعمال کے آثار کو بھی شامل ہے جس میں وہ آیت مکہ ہی میں نازل ہوئی ہو، پھر مدینہ طیبہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ نے بطور استدلال کے اس آیت کا ذکر فرمایا اور نشان قدم کو بھی ان آثار باقیہ میں شامل فرمایا ہے جن کے لکھے جانے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔ اس طرح ان دونوں تفسیروں کا ظاہری تضاد بھی رفع ہوجاتا ہے (کما صرح بہ ابن کثیر واختارہ)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور بیان کر ان کے واسطے ایک مثل اس گاؤں کے لوگوں کی جب آئے اس میں بھیجے ہوئے

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا

جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو تو ان کو جھٹلایا پھر ہم نے قوت دی تیسرے سے تب کہا انہوں نے

اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ

ہم تمہاری طرف آئے ہیں بھیجے ہوئے، وہ بولے تم تو یہی آدمی ہو جیسے ہم، اور

اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا

رحمٰن نے کچھ نہیں اتارا، تم سب جھوٹ کہتے ہو، وہ بولے

رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ

ہمارا رب جانتا ہے ہم بیشک تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا ذمہ یہی ہے پہنچا دینا

الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا

کھول کر، وہ بولے ہم نے نامبارک دیکھا تم کو، اگر تم باز نہ آؤ گے تو

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا

ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو پہنچے گی ہمارے ہاتھ سے عذاب دردناک، وہ کہنے لگے

طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

تمہاری نامبارکی تمہارے ساتھ ہے، کیا اتنی بات پر کہ تم کو سمجھایا، کوئی نہیں پر تم لوگ ہو کہ

مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ

حد پر نہیں رہتے، اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد

يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا

دوڑتا ہوا بولا اے قوم چلو راہ پر بھیجے ہوؤں کی، چلو راہ پر ایسے شخص کی جو تم

يَسْــَٔـلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

سے بدلہ نہیں چاہتے اور وہ ٹھیک راہ پر ہیں۔

وَمَا لِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۲﴾
اور مجھ کو کیا ہے کہ میں بندگی نہ کروں اس کی جس نے مجھ کو بنایا اور اسی کی طرف سب پھر جاؤ گے

ءَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِۦٓ ءَالِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ
بھلا میں پکڑوں اس کے سوائے اوروں کو پوجنا کہ اگر مجھ پر چاہے رحمٰن تکلیف تو کچھ کام نہ آئے

عَنِّي شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَلَا يُنقِذُونِ ﴿۲۳﴾ إِنِّيٓ إِذًا لَّفِي ضَلَٰلٍ
مجھ کو ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو چھڑائیں۔ تو تو میں بھٹکتا رہوں

مُّبِينٍ ﴿۲۴﴾ إِنِّيٓ ءَامَنتُ بِرَبِّكُمْ فَٱسْمَعُونِ ﴿۲۵﴾ قِيلَ
صریح میں یقین لایا تمہارے رب پر مجھ سے سن لو۔ حکم ہوا

ٱدْخُلِ ٱلْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَٰلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِي
چلا جا بہشت میں، بولا کسی طرح میری قوم معلوم کر لیں، کہ بخشا مجھ کو

رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ ٱلْمُكْرَمِينَ ﴿۲۷﴾ ۞ وَمَآ أَنزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِۦ
میرے رب نے اور کیا مجھ کو عزت والوں میں۔ اور نہیں اتاری ہم نے اس کی قوم پر

مِنۢ بَعْدِهِۦ مِن جُندٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنزِلِينَ ﴿۲۸﴾
اس کے پیچھے کوئی فوج آسمان سے اور ہم (فوج) نہیں اتارا کرتے

إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَٰحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَٰمِدُونَ ﴿۲۹﴾ يَٰحَسْرَةً
بس یہی تھی ایک چنگھاڑ پھر اسی دم وہ سب بجھ گئے۔ کیا افسوس ہے

عَلَى ٱلْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا۟ بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۰﴾
بندوں پر کوئی رسول نہیں آیا ان کے پاس جس سے ٹھٹھا نہیں کرتے۔

أَلَمْ يَرَوْا۟ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ ٱلْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا
کیا نہیں دیکھتے کتنی غارت کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ وہ ان کے پاس پھر کر

يَرْجِعُونَ ﴿۳۱﴾ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۳۲﴾
نہیں آئیں گی اور ان سب میں کوئی نہیں جو اکٹھے ہو کر آئیں ہمارے پاس پکڑے ہوئے

وقف غفران

ع ۲

کوئی واقعہ منقول نہیں کہ کسی وقت اس کے سارے باشندے ہلاک کردیئے گئے ہوں۔ اس لئے ابن کثیر کی رائے میں یہ ہے کہ اس آیت میں جس قریہ کا ذکر ہے وہ انطاکیہ کے علاوہ کوئی اور بستی ہے یا پھر انطاکیہ نام ہی کی کوئی دوسری بستی ہے جو مشہور شہر انطاکیہ نہیں ہے۔

صاحب فتح المنان نے ابن کثیر کے ان اشکالات کے جوابات بھی دیئے ہیں، مگر سہل اور بےغبار بات وہی ہے جس کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے بیان القرآن میں اختیار فرمایا ہے، کہ آیات قرآن کا مضمون سمجھنے کے لئے اس بستی کی تعیین ضروری نہیں، اور قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھا ہے، تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس کی تعیین پر اتنا زور خرچ کیا جائے۔ سلف صالحین کا یہ ارشاد کہ اَبْهِمُوْا مَآ اَبْهَمَهُ اللّٰهُ، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم ہی رہنے دو، اس کا مقتضی بھی یہی ہے۔

اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ، مذکورہ بستی میں تین رسول بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بیان اجمالی اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ میں فرمایا، اس کے بعد اس کی یہ تفصیل دی گئی کہ پہلے دو رسول بھیجے گئے تھے، بستی والوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کی بات نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید و تقویت کے لئے ایک تیسرا رسول بھیج دیا۔ پھر ان تینوں رسولوں نے بستی والوں کو خطاب کیا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ یعنی ہم تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

اس بستی میں جو رسول بھیجے گئے ان سے کیا مراد ہے اور وہ کون حضرات تھے

لفظ رسول اور مرسل قرآن کریم میں عام طور پر اللہ کے نبی پیغمبر کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں ان کے بھیجنے کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، یہ بھی علامت اس کی ہے کہ اس سے مراد انبیاء و مرسلین ہیں۔ ابن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ، کعب احبارؓ اور وہب بن منبہؒ کی روایت سے یہی نقل کی ہے کہ یہ تینوں بزرگ جن کا اس قریہ میں بھیجنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، ان کے نام اس روایت میں صادق، صدوق اور شلوم مذکور ہیں، اور ایک روایت میں تیسرے کا نام شمعون آیا ہے (ابن کثیر)

اور حضرت قتادہؒ سے یہ منقول ہے کہ یہاں لفظ مُرْسَلُوْنَ اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ قاصد کے معنی میں ہے، اور یہ تین بزرگ جو اس قریہ کی طرف بھیجے گئے خود پیغمبر نہیں تھے، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین میں سے تھے۔ انہی کے حکم سے یہ اس قریہ کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے (ابن کثیر) اور چونکہ ان کے بھیجنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، ان کا بھیجنا بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کا بھیجنا تھا اس لئے آیت میں

ان کے ارسال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مفسرین میں سے ابن کثیر نے پہلے قول کو اور قرطبی وغیرہ نے دوسرے کو اختیار کیا ہے۔ ظاہر قرآن سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے۔ واللہ اعلم

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ، تطیّر کے معنی بدفالی لینے اور کسی کو منحوس کہنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اللہ کے ان فرستادوں کی بات نہ مانی، اور یہ کہنے لگے کہ تم لوگ منحوس ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کی نافرمانی اور رسولوں کی بات نہ ماننے کے سبب اس بستی میں قحط پڑ گیا تھا، اس لئے بستی والوں نے ان کو منحوس کہا، یا اور کوئی تکلیف پہونچی ہوگی تو جیسے کفار کی عام عادت یہی ہے کہ کوئی مصیبت آئے تو اس کو ہدایت کرنے والے انبیاء و صلحاء کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں، اس کو بھی ان حضرات کی طرف منسوب کر دیا۔ جیسا کہ قوم موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ، اسی طرح قوم صالح علیہ السلام نے کہا تھا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ۔ یعنی تمہاری نحوست تمہارے ہی ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، طائر کا لفظ اصل میں بدفالی کے لئے بولا جاتا ہے، اور کبھی بدفالی کے اثر یعنی نحوست کے معنی میں بھی آتا ہے یہاں یہی مراد ہے (ابن کثیر، قرطبی)

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى، پہلی آیت میں اس مقام کو جس میں قصہ پیش آیا لفظ قریہ سے تعبیر کیا گیا، جو عربی زبان کے اعتبار سے صرف چھوٹے گاؤں کو نہیں بلکہ مطلق بستی کو کہتے ہیں، چھوٹی بستی ہو یا بڑا شہر، اور اس آیت میں اس مقام کو لفظ مدینہ سے تعبیر کیا، جو صرف بڑے شہر ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس بستی میں یہ واقعہ ہوا ہے وہ کوئی بڑا شہر تھا، اس سے بھی اُس قول کی تائید ہوتی ہے جس میں اس کو انطاکیہ قرار دیا ہے۔ اقصی المدینہ سے مراد شہر کے کسی گوشہ سے آنا ہے رَجُلٌ يَّسْعٰى، لفظ یسعیٰ سعی سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی دوڑ کر چلنے کے ہیں۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ شہر کے کسی دور گوشہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، اور کبھی لفظ سعی اہتمام کے ساتھ چلنے کے معنے میں بھی آتا ہے چاہے دوڑ کر نہ چلے۔ جیسے سورۂ جمعہ میں فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ میں یہی معنی مراد ہیں۔

گوشۂ شہر سے آنے والے شخص کا واقعہ: قرآن کریم نے اس کو بھی مبہم رکھا ہے، اس شخص کا نام اور حال ذکر نہیں فرمایا۔ تاریخی روایات میں ابن اسحٰق نے حضرت ابن عباسؓ

اور کعب احبار اور وہب بن منبہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اس شخص کا نام حبیب تھا، اس کے پیشہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں، ان میں مشہور یہ ہے کہ نجار تھا لکڑی کا کام کرتا تھا۔ (ابن کثیر)

اور تاریخی روایات۔ جو حضرات مفسرین نے اس جگہ نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی شروع میں بت پرست تھا، دونوں رسول جو پہلے اس شہر میں آئے اس کی ملاقات ان سے ہوئی ان کی تعلیم سے اور بعض روایات کے اعتبار سے ان کا معجزہ یا کرامت دیکھ کر اس کے دل میں ایمان پیدا ہوا، بت پرستی سے تائب ہو کر مسلمان ہوگیا اور کسی غار میں بیٹھ کر عبادات میں مشغول ہوگیا۔ جب اس کو یہ خبر ملی کہ شہر کے لوگ ان رسولوں کی تعلیم و ہدایت کو جھٹلا کر ان کے درپے آزار ہوگئے، اور قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں، تو یہ اپنی قوم کی خیر خواہی اور ان رسولوں کی ہمدردی کے ملے جلے جذبے سے جلدی کر کے اپنی قوم میں آیا اور ان کو رسولوں کا اتباع کرنے کی نصیحت کی، اور پھر اپنے مومن ہونے کا اعلان کر دیا کہ اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ یعنی میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں تم سن لو۔ اس کا مخاطب اس کی قوم بھی ہو سکتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کو ان کا رب کہنا اظہار حقیقت کے لئے تھا، اگرچہ وہ اس کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب رسولوں کو ہو، اور فاسمعون کہنے کا مقصد یہ ہو کہ آپ سن لیں اور اللہ کے سامنے میرے ایمان کی شہادت دیں۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ الآیۃ، یعنی اس شخص کو جو گوشہ شہر سے رسولوں پر ایمان لانے کی تلقین کے لئے آیا تھا اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب کسی فرشتے کے ذریعہ ہوا ہے، کہ جنت میں چلے جاؤ۔ اور مراد جنت میں داخل ہونے سے یہ خوشخبری دینا ہے کہ جنت تمہارا مقام متعین ہو چکا ہے جو اپنے وقت پر حشر و نشر کے بعد حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان کو ان کا مقام جنت اس وقت دکھلا دیا گیا ہو، اس کے علاوہ برزخ میں بھی اہل جنت کو جنت کے پھل پھول اور راحت کی چیزیں ملتی ہیں، اس لئے ان کا عالم برزخ میں پہونچنا ایک حیثیت سے جنت ہی میں داخل ہونا ہے۔

قرآن کریم کے اس لفظ سے کہ اس کو کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس شخص کو شہید کر دیا گیا تھا، کیونکہ دخول جنت یا آثار جنت کا مشاہدہ بعد موت ہی ہو سکتا ہے۔

تاریخی روایات میں حضرت ابن عباس، مقاتل، مجاہد ائمہ تفسیر سے منقول ہے کہ یہ شخص حبیب ابن اسمٰعیل نجار تھا، اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

پر آپ کی بعثت سے چھ سو سال پہلے ایمان لایا تھا۔ جیسا کہ تُبّع اکبر کے متعلق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کتب سابقہ میں پڑھ کر آپ کی ولادت سے بہت پہلے آپ پر ایمان لایا تھا، تیسرے وہ آدمی جو آپ پر آپ کی بعثت اور دعوت سے پہلے ایمان لائے ورقہ ابن نوفل ہیں جن کا ذکر صحیح بخاری کی حدیث ابتداء وحی کے واقعات میں آیا ہے۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کی ولادت وبعثت سے پہلے آپ پر یہ تین آدمی ایمان لے آئے تھے یہ معاملہ کسی اور رسول ونبی کے ساتھ نہیں ہوا۔

وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ یہ شخص جذامی تھا، اور ان کا مکان شہر کے سب سے آخری دروازہ پر تھا، اپنے مفروضہ معبودوں سے دعاء کرتا تھا کہ مجھے تندرست کر دیں اسی پر ستر سال گذر چکے تھے۔ یہ رسول شہر انطاکیہ میں اتفاقاً اسی دروازے سے داخل ہوئے تو اس شخص سے پہلے انہیں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس کو بت پرستی سے باز آنے اور ایک خدا تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دی۔ اس نے کہا کہ آپ کے پاس آپ کے دعویٰ کی کوئی دلیل وعلامتِ صحت بھی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں ہے۔ اس نے اپنی جذام کی بیماری بتلا کر پوچھا کہ آپ یہ بیماری دور کر سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں ہم اپنے رب سے دعاء کریں گے، وہ تمہیں تندرست کر دے گا۔ اس نے کہا کہ کیا عجیب بات کہتے ہو، میں ستر سال تک اپنے معبودوں سے دعاء مانگتا رہا کچھ فائدہ نہیں ہوا، تمہارا رب کیسے ایک دن میں میری حالت بدل دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہمارا رب ہر چیز پر قادر ہے، اور جن کو تم نے خدا بنا رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں، یہ کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ سن کر یہ شخص ایمان لے آیا، اور ان بزرگوں نے اس کے لئے دعاء کی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا تندرست کر دیا کہ بیماری کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ اب تو اس کا ایمان پختہ ہو گیا، اور اس نے عہد کیا کہ دن بھر میں جو کچھ کمائے گا اس کا آدھا اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا۔ جب ان رسولوں پر شہر کے لوگوں کی یلغار کی خبر پائی تو یہ دوڑ کر آیا، اور اپنی قوم کو سمجھایا اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا، پوری قوم اس کی دشمن ہو گئی اور سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ لاتوں اور ٹھوکروں سے سب نے مل کر اس کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس پر پتھر برسائے، اور اس وقت بھی ان سب کی بے تحاشا مار پڑنے کے وقت وہ کہتا جاتا تھا رَبِّ اهْدِ قَوْمِي "اے میرے پروردگار! میری قوم کو ہدایت کر دے"۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں نے تینوں رسولوں کو بھی شہید کر دیا مگر کسی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ ان کا کیا حال رہا، بظاہر وہ مقتول نہیں ہوئے (قرطبی)۔

يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝

یہ بزرگ چونکہ بڑی بہادری کے ساتھ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ خاص اکرام و انعام کا معاملہ فرمایا اور جنت میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس نے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ کیا، تو پھر اپنی قوم یاد آئی، اور تمنا کی کہ کاش میری قوم کو یہ حال معلوم ہو جاتا کہ رسولوں پر ایمان لانے کی جزا میں مجھے اعزاز و اکرام اور دائمی نعمتیں دی گئیں تو شاید ان کو بھی ایمان کی توفیق ہو جاتی۔ اس تمنا کا اظہار مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے۔

دعوت و تبلیغ کے طریقہ میں اہم ہدایات اس بستی کی طرف جو تین رسول بھیجے گئے، انھوں نے مشرکین و منکرین سے جس طرح خطاب کیا اور ان کی سخت و تلخ باتوں اور دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا، اسی طرح ان کی دعوت سے مسلمان ہونے والے حبیب نجار نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا ان سب چیزوں کو ذرا مکرر دیکھئے، تو اس میں تبلیغ دین اور اصلاح خلق کی خدمت انجام دینے والوں کے لئے بڑے سبق ہیں۔

ان رسولوں کی دعوت و تبلیغ و تلقین کے جواب میں مشرکین نے تین باتیں کہیں:-

(۱) تم تو ہمیں جیسے انسان ہو ہم تمھاری بات کیوں مانیں؟

(۲) اللہ رحمٰن نے کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اتاری۔

(۳) **تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔**

آپ غور کیجئے کہ یہ مخاطبانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز گفتگو کیسی دل آزار چیز تھی، مگر ان رسولوں نے کیا جواب دیا، صرف یہ کہ رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ یعنی ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں، اور وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ یعنی ہمارا جو کام تھا وہ کر چکے کہ تمہیں اللہ کا پیغام واضح کرکے پہونچا دیا، آگے تمہیں اختیار ہے، مانو یا نہ مانو۔ دیکھئے ان کے کسی لفظ میں کیا ان کی اشتعال انگیزی کا **کوئی تاثر ہے؟ کیسا مشفقانہ جواب دیا۔**

پھر ان لوگوں نے اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم لوگ منحوس ہو، تمہاری وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے۔ اس کا متعین جواب یہ تھا کہ منحوس تم خود ہو، تمہارے اعمال کی شامت تمہارے گلے میں آ رہی ہے۔ مگر ان رسولوں نے اس بات کو ایسے مجمل الفاظ میں ادا کیا جس میں ان کے منحوس ہونے کی تصریح نہیں فرمائی، بلکہ یہ فرمایا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ یعنی تمہاری بدفالی تمہارے ساتھ ہے۔ اور پھر وہی مشفقانہ خطاب کیا، اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ یعنی تم یہ تو سوچو کہ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، ہم نے تو صرف تمہیں خیرخواہانہ نصیحت کی ہے

بس سب سے بھاری جملہ جو بولا تو یہ کہ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ "یعنی تم لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہو، بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔

یہ تو ان رسولوں کا مکالمہ تھا، اب وہ مکالمہ دیکھئے جو ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے والے نومسلم نے کیا۔ اس نے پہلے تو اپنی قوم کو دو باتیں بتا کر رسولوں کی بات ماننے کی دعوت دی۔ اول یہ کہ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ لوگ دور سے چل کر تمہیں نصیحت کرنے آئے ہیں، سفر کی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم سے کچھ مانگتے نہیں، یہ بات خود انسان کو غور کی دعوت دیتی ہے کہ یہ بے غرض لوگ ہیں اُن کی بات میں غور تو کرلیں۔ دوسرے یہ کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ عقل و انصاف اور ہدایت کی بات ہے۔ اس کے بعد قوم کو ان کی غلطی اور گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے پیدا کرنے والے قادر مطلق کو چھوڑ کر تم لوگ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ بیٹھے ہو، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ خود تمہارا کوئی کام بنا سکتے ہیں، اور نہ اللہ کے یہاں ان کا کوئی مقام اور درجہ ہے کہ اس سے سفارش کرکے تمہارا کام کرادیں۔

مگر حبیب نجار نے یہ ساری باتیں ان کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنے کا عنوان اختیار کیا کہ میں ایسا کروں تو بڑی گمراہی کی بات ہوگی، وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ الآیۃ یہ سب اس لئے کہ مخاطب کو اشتعال نہ ہو، بات میں ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ پھر جب اس کی قوم نے اس کی شفقت و حکمت کا بھی کچھ اثر نہ لیا، اور اس کو قتل کرنے کے لئے ان پر پل پڑی تو اس وقت بھی اُن کی زبان پر کوئی بددعا کا کلمہ نہ آیا بلکہ یہی کہتے ہوئے جان دیدی کہ رَبِّ اھْدِ قَوْمِیْ "یعنی میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت فرمادے"۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قوم کے اس ظلم و ستم سے شہید ہونے والے کو جب اللہ کی طرف سے انعام و اکرام اور جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوا تو اس وقت بھی اپنی یہی ظالم قوم یاد آئی، اور اس کی خیرخواہی و ہمدردی سے یہ تمنا کی کہ کاش میری قوم میرے حالات انعام و اکرام سے واقف ہوجاتی، تو شاید وہ بھی اپنی گمراہی سے باز آکر ان نعمتوں کی شریک بن جاتی۔ سبحان اللہ خلق اللہ کی خیرخواہی ان کے مظالم کے باوجود کس طرح ان حضرات کی رگ رگ میں پیوست ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قوموں کی کایا پلٹ دی ہے، کفر و ضلالت سے نکال کر وہ مقام بخشا ہے کہ فرشتے بھی اُن پر رشک کرتے ہیں۔

آجکل کے مبلغین اور خدمتِ دعوت و اصلاح کے انجام دینے والوں نے عموماً اس پیغمبرانہ اسوہ کو چھوڑ دیا ہے، اسی لئے ان کی دعوت و تبلیغ بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ تقریر و خطاب میں غصہ کا اظہار، مخالف پر فقرے چست کرنا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے،

جو مخالف کو اور زیادہ ضد و عناد کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اللہم اجعلنا متبعین لسنن انبیائک ووفقنا لما تحب وترضاہ

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝ یہ اس قوم پر آسمانی عذاب کا ذکر ہے جس نے رسولوں کی تکذیب کی اور حبیب نجار کو مار کر شہید کر دیا تھا۔ اور عذاب کی تمہید میں یہ فرمایا کہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کے لئے ہمیں آسمان سے کوئی فرشتوں کا لشکر بھیجنا نہیں پڑا، ورنہ ایسے لشکر بھیجنا ہمارا دستور ہے، کیونکہ اللہ کا تو ایک ہی فرشتہ بڑی بڑی قوی بہادر قوموں کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کو فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر ان پر آنے والے عذاب کو یوں فرمایا کہ بس اتنا ہوا کہ فرشتے نے ایک زور کی آواز لگائی جس سے یہ سب کے سب ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔

روایات میں ہے کہ جبرئیل امین نے شہر کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ایک سخت ہیبتناک آواز لگائی جس کے صدمہ کو کسی کی روح برداشت نہ کر سکی سب کے سب مرے رہ گئے، اُن کے مر جانے کو قرآن نے خامِدُون کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خمود آگ بجھ جانے کے معنی میں آتا ہے، جاندار کی حیات حرارتِ غریزی پر موقوف ہے، جب یہ حرارت ختم ہو جائے تو اسی کا نام موت ہے۔ خامِدُون یعنی بجھنے والے ٹھنڈے ہو جانے والے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا

اور ایک نشانی ہے ان کے واسطے زمین مُردہ اس کو ہم نے زندہ کر دیا اور نکالا اس میں سے اناج

فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ

سو اسی میں سے کھاتے ہیں۔ اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے اور انگور کے

وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ

اور بہا دیئے اس میں بعضے چشمے، کہ کھائیں اس کے میووں سے اور اس کو بنایا نہیں

اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ

ان کے ہاتھوں نے پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ پاک ذات ہے جس نے بنائے جوڑے

كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ وَ

سب چیزیں اس قسم سے جو اگتی ہے زمین میں سے اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں سے جن کی ان کو خبر نہیں

آيَةٌ لَهُمُ اللَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُمْ مُظْلِمُونَ ﴿٣٧﴾ وَ

اور ایک نشانی ہے ان کے واسطے رات، کھینچ لیتے ہیں ہم اس پر سے دن کو تو تبھی رہ جاتے ہیں اندھیرے میں، اور

الشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٣٨﴾

سورج چلا جاتا ہے اپنے ٹھہرے ہوئے رستہ پر، یہ سادھا ہوا ہے اس زبردست باخبر کا

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿٣٩﴾

اور چاند کو ہم نے بانٹ دی ہیں منزلیں یہاں تک کہ پھر آ رہا جیسے ٹہنی پرانی،

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ

نہ سورج سے ہو سکے کہ پکڑ لے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن

النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٤٠﴾ وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا

سے، اور ہر کوئی ایک چکر میں پھرتے ہیں اور ایک نشانی ہے ان کے واسطے کہ ہم نے اٹھا لیا

ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ

ان کی نسل کو اس بھری ہوئی کشتی میں، اور بنا دیا ہم نے ان کے واسطے کشتی جیسی

مَا يَرْكَبُونَ ﴿٤٢﴾ وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ

چیزیں جن پر سوار ہوتے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو ان کو ڈبو دیں پھر کوئی نہ پہنچے ان کی فریاد کو اور نہ وہ

يُنْقَذُونَ ﴿٤٣﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٤٤﴾

چھڑائے جائیں، مگر ہم اپنی مہربانی سے اور ان کا کام چلانے کو ایک وقت تک۔

خلاصۂ تفسیر

(اور قدرت کی نشانیاں اور عظیم الشان نعمتیں جو توحید کے دلائل بھی ہیں، ان میں سے) ایک نشانی ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے مردہ زمین ہے (اور اس میں نشانی کی بات یہ ہے کہ) ہم نے اس کو (بارش سے) زندہ کیا اور ہم نے اس (زمین) سے (مختلف) غلے نکالے

نہ رات میں جبکہ وہ منور ہو، جا پکڑے یعنی قبل از وقت خود طلوع ہو کر اس کو دبا سکے یعنی رات کو ہٹا کر دن نکال دے جیسا کہ قمر بھی اسی طرح آفتاب کو اس کے ظہور نور کے وقت میں نہیں پکڑ سکتا کہ دن کو ہٹا کر رات بنا دے اور اس میں قمر کی نورانیت ظاہر ہو جاوے) اور نہ اسی طرح رات دن (کے زمانہ مقررہ کے ختم ہونے) سے پہلے آسکتی ہے (جیسے دن بھی رات کے زمانہ مقررہ کے ختم ہونے سے پہلے نہیں آسکتا) اور (چاند اور سورج) دونوں ایک ایک خاص دائرہ میں (حساب سے اس طرح چل رہے ہیں جیسے گویا) تیر رہے ہیں (اور حساب سے باہر نہیں ہو سکتے کہ رات دن کے حساب میں خلل واقع ہو سکے) اور (آگے آیت آفاقیہ نفسیہ میں سے ایک خاص نشانی سفر و سواری وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں، یعنی) ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا (اپنی اولاد کو اکثر لوگ تجارت کے لئے سفر میں بھیجتے تھے، پس اس تعبیر میں تین نعمتوں کی طرف اشارہ ہو گیا، اول بھری ہوئی کشتی کو جو بوجھل ہونے کی وجہ سے پانی میں غرق ہونے والی چیز ہے سطح آب پر رواں کرنا، دوسرے ان لوگوں کو اولاد عطا فرمانا، تیسرے رزق و سامان دینا جس سے خود گھر بیٹھے اپنی اولاد کو کارندہ بنا کر بھیجیں، اور (سفر خشکی کے لئے) ہم نے ان کے لئے کشتی ہی جیسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں (مراد اس سے اونٹ وغیرہ ہیں اور تشبیہ کشتی کے ساتھ اس خاص وصف کے اعتبار سے ہے کہ اس پر بھی سواری اور بار برداری کی دور دراز مسافت کی جاتی ہے اور اس تشبیہ کا حسن اس سے بڑھ گیا کہ عرب میں اونٹ کو سفینۃ البر یعنی خشکی کی کشتی کہنے کا محاورہ شائع تھا، آگے کشتی کے ذکر کی مناسبت سے غرق کے لئے ایک وعید عذاب کی بیان فرمائی کہ) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو جن کو وہ پکارتے ہیں ان میں سے، نہ کوئی فریاد رس ہو (جو غرق سے بچا لے) اور نہ یہ (بعد غرق کے موت سے) خلاصی دیئے جائیں (یعنی نہ کوئی موت سے چھڑا سکے) مگر یہ ہماری ہی مہربانی ہے اور ان کو ایک وقت معین تک (دنیاوی زندگی سے) فائدہ دینا (منظور) ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف ومسائل

سورۂ یٰسٓ میں زیادہ تر مضامین آیات قدرت اور اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات بیان کر کے آخرت پر استدلال اور حشر و نشر کے عقیدے پر پختہ کرنے سے متعلق ہیں۔ مذکور الصدر آیات میں قدرت الٰہیہ کی ایسی ہی نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو ایک طرف

اس کی قدرت کاملہ کے دلائل واضحہ ہیں اور دوسری طرف انسان اور عام مخلوقات پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات واحسانات اور ان میں عجیب وغریب حکمتوں کا اثبات ہے۔

پہلی آیت میں زمین کی ایک مثال پیش فرمائی ہے جو ہر وقت ہر انسان کے سامنے ہے کہ خشک زمین پر آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین میں ایک قسم کی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کے آثار اس میں پیدا ہونے والی نباتات اور اشجار اور ان کے ثمرات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان درختوں کے ابھارنے اور باقی رکھنے کے لئے زیر زمین اور سطح زمین پر چشموں کا جاری کرنا ذکر فرمایا، لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖ یعنی ہواؤں بادلوں اور زمین کی ساری قوتوں کو کام میں لگانے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ان کے پھل کھائیں۔ یہ سب چیزیں تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہیں جن کو ہر انسان دیکھتا جانتا ہے آگے انسان کو اس چیز پر متنبہ کیا گیا جس کے لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ فرمایا

نباتات کی پیداوار میں انسان کے عمل کا دخل نہیں

وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ جمہور مفسرین نے اس میں حرف ما کو نفی کے لئے قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے کہ نہیں بنایا ان پھلوں کو ان لوگوں کے ہاتھوں نے۔ اس میں غافل انسان کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ ذرا اپنے کام اور محنت میں غور کر کہ تیرا کام اس باغ و بہار میں اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے زمین میں بیج ڈال دیا، اس پر پانی ڈال دیا، زمین کو نرم کر دیا، کہ نازک کونپل نکلنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، مگر اس بیج میں سے درخت اگانا، درخت پر پتے اور شاخیں نکالنا پھر اس پر طرح طرح کے پھل پیدا **کرنا ان سب چیزوں میں تیرا کیا دخل ہے۔**

یہ تو خالص قادر مطلق حکیم ودانا ہی کا فعل ہو سکتا ہے۔ اس لئے تیرا فرض ہے کہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کے خالق ومالک کو فراموش نہ کرے۔ اسی کی نظیر سورۂ واقعہ کی آیت اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ یعنی دیکھو تو جو بیج تم بوتے ہو اس کو نشوونما دے کر درخت تم نے بنایا ہے یا ہم نے؟ خلاصہ یہ ہوا کہ اگرچہ ان پھلوں کے بنانے میں انسان کا کوئی دخل نہیں، مگر ہم نے اپنے فضل سے ان کو پیدا بھی کیا اور انسان کو ان کا مالک بھی بنا دیا اور اس کو اس کے کھانے اور فائدہ اٹھانے کا **سلیقہ بھی سکھا دیا۔**

انسانی غذا اور حیوانات [illegible] کی غذا میں خاص فرق

بعض مفسرین نے وَمَا عَمِلَتْهُ میں لفظ ما کو نفی کے لئے نہیں بلکہ اسم موصول بمعنی الَّذِیْ قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے کہ یہ سب چیزیں اس نے پیدا کی ہیں کہ لوگ ان کے پھل کھاویں، اور ان چیزوں کو بھی کھاویں جو ان نباتات اور پھلوں سے خود انسان اپنے ہاتھوں کے کسب وعمل سے تیار کرتا ہے مثلاً

اس تفسیر پر معنی آیت کے یہ ہیں کہ آفتاب اپنے مدار پر ایسے محکم اور مضبوط نظام کے ساتھ حرکت کر رہا ہے جس میں کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ ہزارہا سال اس روش پر گذر چکے ہیں مگر یہ سب دائمی نہیں، اس کا ایک خاص مستقر ہے، جہاں پہونچ کر یہ نظام شمسی اور حرکت بند اور ختم ہو جائے گی، اور وہ قیامت کا دن ہے۔ یہ تفسیر حضرت قتادہؒ سے منقول ہے (ابن کثیر)۔

اور قرآن کریم کی سورۂ زمر کی ایک آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مستقر سے مراد مستقر زمانی یعنی روز قیامت ہے۔ آیت سورۂ زمر کی یہ ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔ اس آیت میں بھی تقریباً وہی بیان ہے جو سورۂ یٰسٓ کی آیت مذکورہ کا ہے کہ لیل و نہار کے انقلاب کو عوامی نظر کے مطابق ایک تمثیل سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے، اور دن کو رات پر، گویا رات اور دن کو دو غلافوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ رات کا غلاف دن پر چڑھا دیا جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور دن کا غلاف رات پر چڑھا دیا جاتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ شمس و قمر دونوں اللہ تعالیٰ کے مسخر اور تابع فرمان ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک خاص میعاد کے لئے چل رہا ہے۔ یہاں اَجَلٌ مُّسَمًّى کے الفاظ ہیں جس کے معنی میعاد معین کے ہیں۔ تو معنی آیت کے یہ ہیں کہ شمس و قمر دونوں کی حرکت دائمی نہیں، ایک میعاد معین یعنی روز قیامت پر پہونچ کر ختم اور منقطع ہو جائے گی۔ سورۂ یٰسٓ کی آیت مذکورہ میں بھی ظاہر یہی ہے کہ لفظ مستقر سے یہی میعاد معین یعنی مستقر زمانی مراد ہے۔ اس تفسیر میں نہ آیت کے مفہوم و مراد میں کوئی اشکال ہے، نہ تو علم ہیئت و ریاضی کا کوئی اعتراض۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس سے مراد مستقر مکانی لیا جس کی بنا ایک حدیث پر ہے جو صحیحین بخاری و مسلم وغیرہ میں متعدد صحابہ سے متعدد اسانید کے ساتھ منقول ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ وہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غروب آفتاب کے وقت مسجد میں حاضر تھے، آپ نے ان کو خطاب کر کے سوال کیا کہ ابوذر! تم جانتے ہو کہ آفتاب کہاں غروب ہوتا ہے؟ ابوذر فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ آفتاب چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے، پھر فرمایا کہ اس آیت میں مستقر سے یہی مراد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا

حضرت ابوذرؓ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کی تفسیر دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا

مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ۔ بخاری نے اس روایت کو متعدد مقامات پر نقل کیا ہے اور
ابن ماجہ کے علاوہ تمام کتب ستہ میں یہ روایت موجود ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیث منقول ہے اس میں کچھ زیادتی
ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ روزانہ آفتاب تحت عرش پہونچ کر سجدہ کرتا ہے اور نئے دورے کی
اجازت طلب کرتا ہے، اجازت پا کر نیا دورہ شروع کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا
جب اس کو نیا دورہ کرنے کی اجازت نہیں ملے گی، بلکہ یہ حکم ہوگا کہ جس طرف سے آیا ہے اسی طرف
لوٹ جا۔ یعنی مغرب کی طرف سے زمین کے نیچے جا کر مغرب ہی کی طرف سے لوٹ کر مغرب سے
طلوع ہو جا۔ جس روز ایسا ہوگا تو یہ قیامت کے بالکل قریب ہونے کی علامت ہوگی، اور
اس وقت توبہ کرنے اور ایمان لانے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا، اس وقت کسی مبتلائے گناہ
کی گناہ سے اور مبتلائے شرک و کفر کی کفر سے توبہ قبول نہ ہوگی (ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق)

سجود شمس یعنی آفتاب کے ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد مکانی مستقر ہے
زیر عرش سجدہ کرنے کی تحقیق: یعنی وہ جگہ جہاں آفتاب کی حرکت کا ایک دورہ پورا ہو جاتا ہے، اور یہ بھی
معلوم ہوا کہ وہ جگہ تحت العرش ہے، اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر روز آفتاب ایک
اپنے مستقر کی طرف چلتا ہے، پھر وہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے
کی اجازت مانگتا ہے، اجازت ملنے پر دوسرا دورہ شروع کرتا ہے۔

لیکن واقعات و مشاہدات اور ہیئت و فلکیات کے بیان کردہ اصول کی بنا پر اس میں
متعدد قوی اشکالات ہیں۔

اوّل یہ کہ عرش رحمٰن کی جو کیفیت قرآن و سنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں
اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے، یہ زمین اور سب آسمان اور سیارات و نجوم سب کے سب عرش
کے اندر محصور ہیں، اور عرش رحمٰن ان تمام کائنات سماویہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اس لحاظ
سے آفتاب تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت ہی زیر عرش ہے، پھر غروب کے بعد زیر عرش جانے
کا کیا مطلب ہوگا؟

دوسرے یہ کہ مشاہدہ عام ہے کہ آفتاب جب کسی ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو
دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اس لئے طلوع و غروب اس کا ہر وقت ہر حال میں جاری ہے، پھر
بعد الغروب تحت العرش جانے اور سجدہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟

تیسرے یہ کہ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر پر پہنچ کر
وقفہ کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لیتا ہے، حالانکہ

آفتاب کی حرکت میں کسی وقت بھی انقطاع نہ ہونا کھلا ہوا مشاہدہ ہے، اور یہ چونکہ طلوع و غروب آفتاب کا مختلف مقامات کے اعتبار سے ہر وقت ہی ہوتا رہتا ہے، تو یہ وقفہ اور سکون بھی ہر وقت ہونا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آفتاب کو کسی وقت بھی حرکت نہ ہو؟

یہ اشکالات صرف قواعد ہیئت و فلکیات ہی کے نہیں، مشاہدات و واقعات کے ہیں جن سے صرف نظر نہیں ہو سکتا، اور فنی اعتبار سے فلکیات کے قواعد آفتاب کی یومیہ حرکت اور آفتاب کا نیچے آسمان میں مرکوز ہونا جو بطلیموسی نظریہ ہے، جس کے خلاف اس سے پہلے بھی فیثا غورث نے اس نظریہ کی مخالفت کی تھی، اور آجکل کی نئی تحقیقات نے بطلیموسی نظریہ کی غلطی اور فیثا غورث کے نظریہ کی صحت کو قریب بہ یقین کر دیا ہے، اور حالیہ خلائی سفروں اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے تو یہ بات تقریباً یقینی کر دی ہے کہ تمام سیارات آسمان سے نیچے کی فضا میں ہیں، آسمانوں کے اندر مرکوز نہیں۔ قرآن کریم کی آیت جو عنقریب آرہی ہے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ، اس سے بھی اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے، اس نظریہ میں یہ بھی ہے کہ یہ روزانہ کا طلوع و غروب آفتاب کی حرکت سے نہیں بلکہ زمین کی حرکت سے ہے اس فنی نظریہ کے اعتبار سے حدیث مذکور میں ایک اور اشکال بڑھ جاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ جہاں تک آیت مذکورہ کی تصریح ہے اس پر مذکورہ بالا ہیئت و مشاہدات میں سے قرآن پر کوئی بھی اشکال نہیں ہوتا، اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ آفتاب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسی منظم اور مستحکم حرکت پر لگایا ہوا ہے کہ وہ اپنے مستقر کی طرف برابر ایک حالت پر چلتا رہتا ہے، اگر اس مستقر سے مراد تفسیر قتادہ کے مطابق مستقر زمانی لیا جائے یعنی روز قیامت، تو معنی اس کے یہ ہیں کہ آفتاب کی یہ حرکت قیامت تک دائمی ایک حال پر چلتی رہے گی، اُس روز ختم ہو جائے گی۔ اور اگر مستقر مکانی مراد لیں تو بھی اس کا مستقر مدار شمسی کے اس نقطہ کو کہہ سکتے ہیں جہاں سے اول تخلیق کے وقت آفتاب نے حرکت شروع کی، اسی نقطہ پر پہونچ کر اس کا شب و روز کا ایک دورہ مکمل ہوتا ہے کیونکہ یہی نقطہ اس کا انتہائے سفر ہے، اس پر پہونچ کر نئے دورہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اس تعیین دائرہ کا وہ نقطہ کون اور کہاں ہے جہاں سے آفتاب کی حرکت ابتداء آفرینش میں شروع ہوئی، قرآن حکیم اس قسم کی فضول بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا جس کا تعلق اس کے کسی دینی یا دنیوی ضرورت سے نہ ہو، یہ اسی قسم کی بحث ہے، اس لئے اس کو چھوڑ کر قرآن کریم نے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی۔ اور وہ مقصد حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کاملہ کے نشان مظاہر کا بیان ہے کہ اس جہان میں سب سے بڑا اور سب سے روشن ترین کرہ آفتاب کا ہے،

وہ بھی نہ خود بخود بن گیا ہے ورنہ خود بخود اس کی کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، وہ یہی اس شب و روز کی حرکت میں ہر وقت حق تعالیٰ کی اجازت و مشیت کے تابع چلتا ہے۔

جتنے اشکالات اوپر لکھے گئے ہیں آیت مذکورہ کے بیان میں ان میں سے کوئی بھی شبہ اور اشکال نہیں، البتہ حدیث مذکور جس میں یہ آیا ہے کہ وہ غروب کے بعد زیر عرش پہونچ کر سجدہ کرتا ہے اور اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے یہ سب اشکالات اس سے متعلق ہیں، اور اس آیت کے ذیل میں یہ بحث اسی نے چھیڑی کہ حدیث کے بعض الفاظ میں اس آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اس کے جوابات محدثین و مفسرین حضرات نے مختلف دیئے ہیں، ظاہر الفاظ کے اعتبار سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آفتاب کا یہ سجدہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ بعد غروب ہوتا ہے، جن حضرات نے حدیث کو اسی ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے انہوں نے غروب کے متعلق تین احتمال بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ معظم معمورہ کا غروب مراد ہو، یعنی اس مقام کا جہاں کے غروب پر اکثر دنیا کی آبادی میں غروب ہو جاتا ہے، یا خط استواء کا غروب، یا افق مدینہ کا غروب۔ اس طرح یہ اشکال نہیں رہتا کہ آفتاب کا غروب و طلوع تو ہر وقت ہر آن ہوتا رہتا ہے کیونکہ اس حدیث میں ایک خاص افق کے غروب پر کلام کیا گیا ہے، لیکن صاف اور بے غبار جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو حضرت استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے "سجود شمس" میں تحریر فرمایا ہے، اور متقدمین ائمہ تفسیر کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے سمجھنے سے پہلے پیغمبرانہ تعلیمات و تعبیرات کے متعلق یہ اصولی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ آسمانی کتابیں اور ان کے لانے والے انبیاء علیہم السلام خلق خدا کو آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور و فکر اور تدبر کی طرف بکثرت دعوت دیتے ہیں، اور ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود و توحید، علم و قدرت پر استدلال کرتے ہیں، مگر ان چیزوں میں تدبر اسی حد تک مطلوب شرعی ہے جس حد تک اس کا تعلق انسان کی دنیوی و معاشرتی ضرورت سے یا دینی اور اخروی ضرورت سے ہو۔ اس سے زائد فلسفیانہ تدقیق اور حقائق اشیاء کی کھوج لگانے کی فکر میں عام خلق اللہ کو نہیں ڈالا جاتا۔ کیونکہ اول تو حقائق اشیاء کا مکمل حقیقی علم خود بڑے بڑے فلاسفہ کو بھی باوجود عمریں صرف کرنے کے نہیں ہو سکا، بیچارے عوام تو کس شمار میں ہیں، پھر اگر وہ حاصل بھی ہو جائے اور اس سے نہ ان کی کوئی دینی ضرورت پوری ہو اور نہ کوئی صحیح مقصد دنیوی اس سے حاصل ہو تو اس لا یعنی اور فضول بحث میں داخل دینا اضاعت عمر اور اضاعت مال کے سوا کیا ہے۔

قرآن اور انبیاء کا استدلال آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان کے تغیرات و انقلابات

سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جو ہر انسان کو مشاہدہ اور ادنیٰ غور و فکر سے حاصل ہو سکے ہیئت اور ریاضی کی فنی تدقیقات جو صرف حکماء و علماء ہی کر سکتے ہیں نہ ان پر استدلال کا مدار رکھا جاتا ہے نہ ان میں غور و خوض کی ترغیب دی جاتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغام پر عمل ہر انسان کا فرض ہے، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، کسی پہاڑ و جزیرہ میں رہتا ہو یا کسی متمدن شہر میں، اس لئے پیغمبرانہ تعلیمات عوام کی نظر اور ان کی عقل و فہم کے مطابق ہوتی ہیں جن میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو۔

نماز کے اوقات کی پہچان، سمتِ قبلہ کا متعین کرنا، مہینوں اور سالوں اور تاریخوں کا ادراک، ان سب چیزوں کا علم ریاضی کے حسابات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر شریعتِ اسلام نے ان میں سے کسی چیز کا مدار ریاضی کی فنی تحقیقات پر رکھنے کے بجائے عام مشاہدات پر رکھا ہے۔ مہینے اور سال اور ان کی تاریخیں قمری حساب سے رکھیں اور چاند کے ہونے نہ ہونے کا مدار صرف رویتِ ہلال اور مشاہدہ پر رکھا۔ روزے اور حج کے ایام اسی بنیاد سے متعین کئے گئے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے چھپنے اور پھر طلوع ہونے کا راز بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، یعنی آپ کہہ دیں کہ چاند کے یہ سب تغیرات اس مقصد کے لئے ہیں کہ تم ان سے مہینے کا شروع اور ختم اور اس کی تاریخیں معلوم کر کے حج وغیرہ کے دن متعین کر سکو۔ اس جواب نے ان کو اس پر تنبیہ فرما دی کہ تمہارا سوال لایعنی اور فضول ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے پر تمہارا کوئی کام دین یا دنیا کا اٹکا ہوا نہیں، اس لئے سوال اس چیز کا کرو جس کا تعلق تمہاری دینی یا دنیوی ضرورت سے ہو۔

اس تمہید کے بعد اصل معاملہ پر غور کیجئے کہ آیاتِ مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے چند مظاہر کا ذکر کر کے انسان کو اللہ کی توحید اور علم و قدرت کاملہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اس میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا، جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ، پھر اس پر پانی برسا کر درخت و نباتات اگانے کا ذکر کیا، جو ہر انسان دیکھتا اور جانتا ہے، أَحْيَيْنَاهَا الآية، اس کے بعد آسمان اور فضائے آسمانی سے متعلق چیزوں کا ذکر شروع کر کے پہلے لیل و نہار کے روزانہ انقلاب کا ذکر فرمایا وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ الآية، اس کے بعد سورج اور چاند جو سیارات و انجم میں سب سے بڑے ستارے ہیں ان کا ذکر فرمایا۔ ان میں پہلے آفتاب کے متعلق فرمایا وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ، اس میں غور کیجئے کہ مقصد اس کا یہ بتلانا ہے کہ آفتاب

خود بخود اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے نہیں چل رہا، بلکہ یہ ایک عزیز و علیم یعنی قدرت والے اور جاننے والے کے مقرر کردہ نظم کے تابع چل رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب کے قریب حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک سوال و جواب کے ذریعہ اسی حقیقت پر متنبہ ہونے کی ہدایت فرمائی، جس میں بتلایا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور پھر اگلا دورہ شروع کرنے کی اجازت مانگتا ہے، جب اجازت مل جاتی ہے تو حسب دستور آگے چلتا ہے، اور صبح کو جانب مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اس کا حاصل اس سے زائد نہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت عالم دنیا میں ایک نیا انقلاب آتا ہے، جس کا مدار آفتاب پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انقلابی وقت کو انسانی تنبیہ کے لئے موزوں سمجھ کر یہ تعبیر فرمائی کہ آفتاب کو خود مختار اپنی قدرت سے چلنے والا نہ سمجھو، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے تابع چل رہا ہے، اس کا ہر طلوع و غروب اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے، یہ اس کی اجازت کے تابع ہے، اس کے تابع فرمان حرکت کرنے ہی کو اس کا سجدہ قرار دیا گیا، کیونکہ سجدہ ہر چیز کا اس کے مناسب حال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمادی ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ یعنی ساری مخلوق اللہ کی عبادت اور تسبیح میں مشغول ہے، مگر ہر ایک کی عبادت و تسبیح کا طریقہ الگ الگ ہے، اور ہر مخلوق کو اس کی عبادت و تسبیح کا طریقہ سکھلا دیا جاتا ہے۔ جیسے انسان کو اس کی نماز و تسبیح کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے۔ اس لئے آفتاب کے سجدہ کے یہ معنی سمجھنا کہ وہ انسان کے سجدہ کی طرح زمین پر ماتھا ٹیکنے ہی سے ہوگا صحیح نہیں۔

اور جبکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق عرش خداوندی تمام آسمانوں سیاروں اور زمینوں پر محیط ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ آفتاب ہر وقت ہر جگہ زیر عرش ہی ہے۔ اور جبکہ تجربہ شاہد ہے کہ آفتاب جس وقت ایک جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ہر لمحہ طلوع و غروب سے خالی نہیں، تو آفتاب کا زیر عرش رہنا بھی دائمی ہر حال میں ہے، اور غروب و طلوع ہونا بھی ہر حال میں ہے۔ اس سے حاصل مضمون حدیث کا یہ ہوا کہ آفتاب اپنے پورے دورے میں زیر عرش اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے، یعنی اس کی اجازت اور فرمان کے تابع حرکت کرتا ہے، اور یہ سلسلہ اسی طرح قرب قیامت تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کی بالکل قریبی علامت ظاہر کرنے کا وقت آجائے گا، تو آفتاب کو اپنے مدار پر اگلا دورہ شروع کرنے کے بجائے پیچھے لوٹ جانے کا حکم ہو جائے گا، اور وہ پھر مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے گا۔ اس وقت دروازہ توبہ کا بند ہو جائے گا، کسی کا ایمان و توبہ اس وقت مقبول نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کی تخصیص اور اس کے بعد زیر عرش جانے اور وہاں سجدہ کرنے اور اگلے دورہ کی اجازت مانگنے کے جو واقعات اس روایت میں بتلائے گئے ہیں وہ پیغمبرانہ مؤثر تعلیم کے مناسب بالکل عوامی نظر کے اعتبار سے ایک تمثیل ہے، نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ انسان کی طرح زمین پر سجدہ کرے، اور نہ سجدہ کرنے کے وقت آفتاب کی حرکت میں کچھ وقفہ ہونا لازم آتا ہے، اور نہ یہ مراد ہے کہ وہ دن رات میں صرف ایک ہی سجدہ کسی خاص جگہ جا کر کرتا ہے، اور نہ یہ کہ وہ صرف غروب کے بعد تحت العرش جاتا ہے، مگر اس انقلابی وقت میں جبکہ سب عوام یہ دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہم سے غائب ہو رہا ہے اس وقت بطور تمثیل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا، جو یہاں مذکور ہے وہ درحقیقت آفتاب کے زیر عرش تابع فرمان چلتے رہنے سے ظاہر ہے، آفتاب خود کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا، تو جس طرح اس وقت اہل مدینہ اس جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب آفتاب سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت مانگے گا اسی طرح جہاں جہاں وہ غروب ہوتا جائے گا سب کے لئے یہی سبق حاصل کرنے کی تلقین ہو اور حقیقت معاملہ یہ ہے کہ آفتاب اپنے مدار پر حرکت کے درمیان ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ بھی کرتا ہے اور آگے چلنے کی اجازت بھی مانگتا رہتا ہے، اور اس سجدہ اور اجازت کے لئے اس کو کسی سکون اور وقفہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس تقریر پر حدیث مذکورہ میں نہ مشاہدہ کی رو سے کوئی شبہ ہوتا ہے نہ قواعد ہیئت و ریاضی کے اعتبار سے، اور نظام شمسی اور حرکت سیارات میں بطلیموسی تحقیق صحیح ہو یا فیثاغورث والی تحقیق جو آجکل نئی تحقیقات سے مؤید ہوگئی ہے، دونوں صورتوں میں حدیث مذکور پر کوئی شبہ اور اشکال باقی نہیں رہتا۔

رہا یہ سوال کہ حدیث مذکور میں جو آفتاب کا سجدہ کرنا اور اگلے دورے کی اجازت طلب کرنا مذکور ہے، یہ کام تو ذی حیات و ذی عقل کا ہے، آفتاب و ماہتاب بے جان بے شعور مخلوقات ہیں، ان سے یہ افعال کیسے صادر ہوئے؟ تو اس کا جواب قرآن کی آیت وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ کے تحت میں آچکا ہے کہ ہم جن چیزوں کو بے جان اور بے عقل و بے شعور سمجھتے ہیں، وہ بھی درحقیقت روح اور جان اور عقل و شعور کا ایک خاص حصہ رکھتے ہیں، البتہ ان کی حیات اور عقل و شعور انسان و حیوان کے مقابلہ میں کم اور اتنی کم ہے کہ عام حساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے، مگر اس کی نفی پر بھی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں، اور قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کا ذی حیات اور ذی عقل و شعور ہونا ثابت کر دیا ہے، اور نئی تحقیقات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

فائدہ۔ قرآن و حدیث کی مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ شمس و قمر دونوں متحرک ہیں ایک میعاد کے لئے چل رہے ہیں اس سے اس نئے نظریہ کی نفی ہوتی ہے جو آفتاب کی حرکت کو تسلیم نہیں کرتا، اور جدید ترین تحقیقات نے خود بھی اس کو غلط ثابت کر دیا۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ، عرجون، کھجور کے درخت کی خشک شاخ کو کہا جاتا ہے جو مڑ کر کمان جیسی ہو جاتی ہے۔

منازلِ قمر منازل، منزل کی جمع ہے، جائے نزول کو منزل کہا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے چاند اور سورج دونوں کی رفتار کے لئے خاص حدود مقرر فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک کو منزل کہا جاتا ہے۔ چاند چونکہ اپنا دورہ ایک مہینہ میں پورا کر لیتا ہے اس لئے اس کی منزلیں تیس یا انتیس ہوتی ہیں، مگر چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے، اس لئے عموماً اس کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں۔ اہل ہیئت و ریاضی نے ان منزلوں کے خاص خاص نام اُن ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے ہیں جو اُن منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں۔ جاہلیت عرب میں بھی انہی ناموں سے منزلوں کی تعیین کی جاتی تھی۔ قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو چاند خاص خاص دنوں میں طے کرتا ہے۔

سورۂ یونس میں اس کی تفسیر گذر چکی ہے، جو معارف القرآن جلد چہارم کے صفحہ ۵۰۵ و ۵۰۶ میں بیان ہوئی ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔ سورۂ یونس کی آیت میں شمس و قمر دونوں کی منزلوں کا ذکر ہے۔ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ الآیۃ فرق اتنا ہے کہ چاند کی منزلیں مشاہدہ سے پہچانی جاتی ہیں اور آفتاب کی منزلیں ریاضی کے حسابات سے۔ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ میں چاند کی کیفیت آخر مہینہ کی بتلائی ہے جب وہ مکمل بدر ہونے کے بعد گھٹتا گھٹتا ایک قوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے، عربوں کے ماحول کے مناسب اس کی مثال کھجور کی خشک شاخ سے دی گئی ہے جو ہلالی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ، یعنی آفتاب و ماہتاب دونوں اپنے اپنے مدار میں تیرتے رہتے ہیں۔ فلک کے لفظی معنی آسمان کے نہیں، بلکہ اس دائرہ کے ہیں جس میں کوئی سیارہ حرکت کرتا ہے۔ یہ آیت سورۂ انبیاء میں بھی گذر چکی ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ چاند کسی آسمان کے اندر مرکوز نہیں، جیسا کہ بطلیموسی نظریۂ ہیئت میں ہے، بلکہ وہ آسمان کے نیچے ایک خاص مدار میں حرکت کرتا ہے، اور آجکل کی نئی تحقیقات اور چاند تک انسان کی رسائی کے واقعات نے اس کو بالکل یقینی بنا دیا ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ

مِنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ، پچھلی آیات میں زمینی مخلوقات کی پھر آسمانی کا بیان اور ان میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی حکمت و قدرت کے مظاہر کا بیان آچکا ہے۔ اس آیت میں بحر اور اس سے متعلقہ اشیاء میں مظاہر قدرت کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں کو خود وزنی بوجھ سے بھری ہوئی ہونے کے باوجود پانی کی سطح پر چلنے کے قابل بنادیا کہ پانی ان کو غرق کرنے کے بجائے دور ملکوں تک پہونچاتا ہے۔ اور آیت میں ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو کشتیوں میں سوار کیا، حالانکہ سوار ہونے والے خود یہ لوگ تھے۔ ذریت کا ذکر شاید اس لئے کیا کہ انسان کا بڑا بوجھ اس کی اولاد و ذریت ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ تم خود ان کشتیوں میں سوار ہو سکو بلکہ چھوٹے بچے اور ضعیف آدمی اور ان کے سب سامان یہ کشتیاں اٹھاتی ہیں۔ اور خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی سواری اور باربرداری کے لئے صرف کشتی ہی نہیں بلکہ کشتی کی مثل اور بھی سواری بنائی ہے۔ اس سے اہل عرب نے اپنی عادت کے مطابق اونٹ کی سواری مراد لی ہے، کیونکہ اونٹ باربرداری میں سب جانوروں سے زیادہ ہے، بڑے بڑے بوجھ کے لادے کر ملکوں کا سفر کرتا ہے، اسی لئے عرب اونٹ کو سفینۃ البر یعنی خشکی کی کشتی کہا کرتے تھے۔

قرآن میں ہوائی جہاز کا ذکر: مگر یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے اس جگہ اونٹ یا کسی خاص سواری کا نام نہیں لیا، بلکہ مبہم چھوڑا ہے جس میں ہر ایسی سواری داخل ہے جو انسان اور اس کے اسباب و سامان کو زیادہ سے زیادہ اٹھا کر منزل مقصود پر پہونچا دے۔ اس زمانے کی نئی ایجاد ہوائی جہازوں نے یہ واضح کر دیا کہ مِنْ مِّثْلِهٖ کا سب سے بڑا مصداق ہوائی جہاز ہیں، اور کشتی کے ساتھ اس کی تمثیل بھی اس کی زیادہ مؤید ہے، کہ جس طرح پانی کا جہاز پانی پر تیرتا ہے پانی اس کو غرق نہیں کرتا، ہوائی جہاز ہوا پر تیرتا ہے ہوا اس کو نیچے نہیں گراتی، اور عجب نہیں کہ قرآن حکیم نے اسی لئے مِنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ کو مبہم رکھا ہو تاکہ قیامت تک ایجاد ہونے والی سب سواریاں اس میں شامل ہو جائیں۔ واللہ اعلم

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ

اور جب کہئے ان کو بچو اس سے جو تمہارے سامنے آتا ہے اور جو پیچھے چھوڑتے ہو شاید کہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا

رحم ہو۔ اور کوئی حکم نہیں پہنچتا ان کو اپنے رب کے حکموں سے جس کو

كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ

وہ ٹلاتے نہ ہوں ۔ اور جب کہئے ان کو خرچ کرو کچھ اللہ کا

اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ

دیا، کہتے ہیں منکر ایمان والوں کو ہم کیوں کھلائیں ایسوں کو کہ اللہ

اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٤٧﴾

چاہتا تو اس کو کھلا دیتا، تم لوگ تو بالکل بہک رہے ہو صریح

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان لوگوں سے (دلائل توحید اور اس کے نہ ماننے پر عذاب کی وعید سنا کر) کہا جاتا ہے کہ تم لوگ اس عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے (یعنی دنیا میں آسکتا) ہے (جیسے اوپر کی آیت وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ میں بیان فرمایا کہ کشتی کا صحیح سالم منزل پر پہنچنا اللہ کی قدرت و مشیت سے ہے، وہ چاہے تو غرق کرسکتا ہے۔ غرض دنیا میں غرق کا عذاب بھی آسکتا ہے اور دوسرے عذاب بھی) اور جو تمہارے (مرنے کے) پیچھے (یعنی آخرت میں یقینی آنے والا) ہے (مطلب یہ ہے کہ انکار توحید کی وجہ سے جو عذاب تم پر آنے والا ہے، خواہ صرف آخرت میں یا دنیا میں بھی، تم اس عذاب سے ڈرو اور ایمان لے آؤ) تاکہ تم پر رحمت کی جائے (تو وہ اس ترغیب اور عذاب سے ڈرانے کی ذرا پرواہ نہیں کرتے) اور (اسی بات کے نہ ماننے کی کیا تخصیص ہے وہ تو ایسے سنگدل ہوگئے ہیں کہ) ان کے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ان کے پاس ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رخی نہ کرتے ہوں اور (جس طرح وعید عذاب سے وہ متاثر نہیں ہوتے اسی طرح ثواب اور جنت کی ترغیب بھی ان کو نافع نہیں ہوتی چنانچہ) جب ان کو نعمتیں یاد دلا کر ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں فقیروں مسکینوں پر خرچ کرو تو (شرارت اور استہزاء کے طور پر) یہ کفار ان مسلمانوں سے جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہا تھا یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دیدے، تم صریح غلطی میں (پڑے) ہو۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت و حکمت، زمین، آسمان وغیرہ میں بیان کر کے خدا شناسی اور توحید کی دعوت دی گئی تھی، اور اس کے قبول کرنے پر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ تھا، اور نہ ماننے پر عذاب شدید کی وعید۔ آیات مذکورہ اور ان کے بعد آنے والی آیات میں کفار اہل مکہ جو اس کے بلا واسطہ مخاطب تھے اُن کی کج روی کا بیان ہے، کہ نہ اُن پر ترغیبِ ثواب کا اثر ہوتا ہے، نہ ترہیب عذاب کا۔

اس سلسلے میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے دو مکالمے ذکر کئے گئے ہیں کہ جب مسلمان ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے دنیا میں بھی آسکتا ہے، اور تمہارے مرنے کے بعد آخرت میں تو آنا ہی ہے، اگر تم نے اس عذاب سے ڈر کر ایمان قبول کر لیا، تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ مگر یہ سُن کر بھی اعراض کرتے ہیں۔ الفاظِ قرآن میں اس جگہ ان کے اعراض کا ذکر صراحۃً اس آیت میں نہیں کیا، کیونکہ اگلی آیت میں جو اعراض کا ذکر ہے اس سے خود بخود یہاں بھی اعراض کرنا ثابت ہو جاتا ہے۔ اور نحوی قاعدہ سے اِذَا قِيْلَ لَهُمْ کی شرط کی جزاء اَعْرَضُوْا محذوف ہے، جس کے محذوف ہونے پر اگلی آیت کے الفاظ شاہد ہیں، کہ اُن کے پاس اُن کے رب کی جو بھی آیت آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔

اللہ کا رزق بعض کو بالواسطہ ملنے کی حکمت

دوسرا مکالمہ یہ ہے کہ جب مسلمان کفار کو غریبوں فقیروں کی امداد کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کے لئے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو تمہیں دیا ہے تم اس میں سے محتاجوں کو دیا کرو، تو یہ لوگ بطور استہزاء کے کہتے ہیں کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ رازق سب مخلوق کا اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے ان کو نہیں دیا، تو ہم کیوں دیں تم جو ہمیں نصیحت کرتے ہو کہ ہم ان کو رزق دے کریں یہ تو تمہاری گمراہی ہے کہ ہمیں رازق بنانا چاہتے ہو۔ یہ کفار بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے رزق ہونے کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاۤءِ مَاۤءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "یعنی اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان سے پانی کس نے نازل کیا جس سے زمین میں حیاتِ نباتی پیدا ہوئی، اور طرح طرح کے پھل پھول نکلے، تو وہ اقرار کریں گے کہ یہ پانی اللہ ہی نے نازل کیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی رزاق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے، مگر مسلمانوں کے جواب میں بطور استہزاء کے یہ کہہ کہ جب خدا تعالیٰ رازق ہے تو وہی غریبوں کو بھی دے گا

ہم کیوں دیں۔ گویا ان احمقوں نے صدقہ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور غریبوں کو دینے کو اللہ کی رازقیت کے منافی سمجھا، اور یہ نہ سمجھا کہ رزاقِ مطلق کا قانون حکیمانہ یہ ہے کہ ایک انسان کو دے کر اس کو دوسروں کے لئے واسطہ بناتا ہے، اور بالواسطہ دوسروں کو دیتا ہے، اگرچہ وہ اس پر بھی یقیناً قادر ہے کہ سب کو خود ہی بلاواسطہ رزق پہنچا دے، جیسا کہ حیوانات میں عموماً اسی طرح ہر کیڑے مکوڑے اور درندے پرندے کو بلاواسطہ رزق ملتا ہے۔ ان میں کوئی مالدار کوئی غریب نہیں، کوئی کسی کو نہیں دیتا، سب کے سب قدرتی دسترخوان سے کھاتے ہیں۔ مگر انسانوں میں نظامِ معیشت اور باہمی تعاون و تناصر کی روح پیدا کرنے کے لئے رزق پہونچنے میں بعض کو بعض کے لئے واسطہ بنا دیا، تاکہ خرچ کرنے والے کو ثواب ملے اور جس کو دیا جائے وہ اس کا احسان مند ہو۔ کیونکہ انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر جس پر سارا نظامِ عالم قائم ہے، یہ جبھی باقی رہ سکتا ہے جبکہ ہر ایک کو دوسرے کی حاجت ہو، غریب کو مالدار کے پیسے کی حاجت ہے اور مالدار کو غریب کی محنت کی ضرورت، ان میں سے کوئی کسی سے بے نیاز نہیں۔ اور غور کریں تو کسی کا کسی پر احسان بھی نہیں، ہر شخص جو کچھ کسی کو دیتا ہے وہ اپنے مطلب کے لئے دیتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے کفار کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم کس بنا پر دیا جبکہ ان کا ایمان ہی اللہ پر نہیں اور بتصریح فقہاء وہ احکامِ فرعیہ کے مخاطب بھی نہیں۔ سو اس کا جواب واضح ہے کہ مسلمانوں کا یہ کہنا کسی شرعی حکم کی تعمیل کرانے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ انسانی **ہمدردی اور شرافت کے مروّجہ اصول کی بنا پر تھا۔**

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنْظُرُونَ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو۔ یہ تو راہ دیکھتے ہیں

إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ

ایک چنگھاڑ کی جو ان کو آپکڑے گی جب آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے، پھر نہ کر سکیں گے

تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ

کہ کچھ کہہ ہی مریں اور نہ اپنے گھر کو پھر کر جا سکیں گے۔ اور پھونکی جائے صور پھر تب ہی وہ

مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿٥١﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا

قبروں سے اپنے رب کی طرف پھیل پڑیں گے۔ کہیں گے اے خرابی ہماری کس نے اٹھا دیا

ع ۳ ۸

مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٢﴾

ہماری نیند کی جگہ سے یہ وہ ہے جو وعدہ کیا تھا رحمٰن نے اور سچ کہا تھا پیغام لانے والوں نے

إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾

بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر اسی دم وہ سارے ہمارے پاس پکڑے چلے آئیں

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾

پھر آج کے دن ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ذرا اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کرتے تھے

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک شغل میں ہیں باتیں کرتے وہ اور ان کی عورتیں

فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُم مَّا

سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہیں تکیہ لگائے ان کے لئے وہاں ہے میوہ اور ان کے لئے

يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ

ہے جو کچھ مانگیں سلام بولنا ہے رب مہربان سے اور تم الگ ہو جاؤ آج

أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا

اے گنہگارو میں نے نہ کہہ رکھا تھا تم کو اے آدم کی اولاد کہ

تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ

نہ پوجیو شیطان کو وہ کھلا دشمن ہے تمہارا اور یہ کہ پوجو مجھ کو

هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ

یہ راہ ہے سیدھی اور وہ بہکا لے گیا تم میں سے بہت خلقت کو پھر کیا

تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾

تم کو سمجھ نہ تھی یہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ تھا

اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ

جا پڑو اس میں آج کے دن بدلہ اپنے کفر کا آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے

أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾

منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلاویں گے اُن کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ

اور اگر ہم چاہیں مٹادیں ان کی آنکھیں پھر دوڑیں رستہ پانے کو پھر کہاں سے

يُبْصِرُونَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا

سُوجھے۔ اور اگر ہم چاہیں صورت مسخ کردیں ان کی جہاں کی تہاں پھر نہ آگے

اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٧﴾ وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ

چل سکیں اور نہ وہ اُلٹے پھر سکیں۔ اور جس کو ہم بوڑھا کریں اوندھا کریں

فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

اس کی پیدائش میں پھر کیا ان کو سمجھ نہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سے بطور انکار) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (قیامت کا جو اس آیت میں مذکور ہے اور ویسے بھی کثرت سے اس کی خبر دیتے رہتے ہو) کب ہوگا اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (تو بتلاؤ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو اس کو بعید سمجھ رہے ہیں تو گویا) یہ لوگ بس ایک آواز سخت (یعنی نفخہ اولیٰ) کے منتظر ہیں جو ان کو (دفعۃً) آ پکڑے گی اور وہ سب (اس وقت) باہم (اپنے معمول کے مطابق اپنے معاملات میں) لڑ جھگڑ رہے ہوں گے سو (اس آواز کے ساتھ دفعۃً اس طرح فنا ہو جاویں گے کہ) نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی، اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جا سکیں گے (بلکہ جو جس حال میں ہوگا مر کر رہ جائے گا) اور (پھر دوبارہ) صور پھونکا جاوے گا تو وہ سب یکایک قبروں سے (نکل نکل کر) اپنے رب کی طرف (یعنی جہاں حساب ہوگا) جلدی جلدی چلنے لگیں گے (اور وہاں کی ہول و ہیبت دیکھ کر) کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھا دیا، (کہ یہاں کی نسبت سے تو وہاں ہی راحت میں تھے فرشتے جواب دیں گے کہ) یہ وہی (قیامت) ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبر سچ کہتے تھے (مگر تم نے نہ مانا تھا، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) وہ (نفخہ ثانیہ صور کا) بس ایک زور کی آواز ہوگی (جیسے نفخہ اولیٰ بھی صیحہ واحدہ تھا، کما قال تعالیٰ

مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً، اسی طرح یہ بھی ایک آواز ہوگی) جس سے یکایک سب
جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیئے جائیں گے (پہلے موقف کی طرف چلنا مذکور تھا، اور یہاں پہنچ
جانا اور یہ چلنا اور پہونچنا جبراً و قہراً ہوگا۔ قرآن کریم کے لفظ مُحْضَرُوْنَ اور جابجا آیات کی جنس
[illegible] سے معلوم ہوتا ہے) پھر اُس دن کسی شخص پر ذرا ظلم نہ ہوگا اور تم کو بس انہی کاموں
کا بدلہ ملے گا جو تم (دنیا میں کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے (یہ تو اہل جہنم کا حال ہوا اور) اہل جنت
(کا حال یہ ہے کہ وہ) بیشک اس روز اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے وہ اور ان کی بیبیاں
سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے لئے وہاں (ہر طرح کے) میوے
ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا (اور) ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام
فرمایا جائے گا (یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ، اور وہ دن ناجی [illegible]
پھر تم سے تفرقہ اصحاب جہنم کا کہ ان کو موقف میں حکم ہوگا کہ) اے کفر کے ارتکاب کرنے والے
مجرمو آج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ (کیونکہ اُن کو جنت میں بھیجنا ہے اور تم کو دوزخ میں
اور اُس وقت اُن سے ملامت کے طور پر یہ فرمایا جائے گا کہ) اے اولاد آدم (اور اسی عتاب میں جن
سے بھی خطاب ہوگا، دلیل علیہ قولہ تعالیٰ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ الخ) کیا میں نے تم کو تاکید نہیں
کردی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور یہ کہ میری (ہی) عبادت
کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (مراد عبادت سے طاعت مطلقہ ہے بدلیل قولہ تعالیٰ لَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ، وَلَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ) اور (نیز تم کو شیطان کی نسبت یہ بات بھی معلوم کرا دی
تھی کہ) وہ تم میں (یعنی تمہاری ہی نوع میں) ایک کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا ہے (جن کی گمراہی
کا وبال بھی پچھلی قوموں کے واقعات عذاب کے سلسلے میں بتلا دیا گیا تھا) سو کیا تم (اتنا)
نہیں سمجھتے تھے (کہ اگر ہم اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاویں گے تو ہم بھی اسی طرح مستحق
عذاب ہوں گے تو اب) یہ جہنم ہے جس کا تم سے (کفر کی تقدیر پر) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔ آج
اپنے کفر کے بدلے اس میں داخل ہو آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے (جس سے جھوٹے
عذر پیش نہ کر سکیں، جیسا شروع شروع میں کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ) اور ان
کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے،
(یہ عذاب تو آخرت میں ہوگا) اور اگر ہم چاہتے تو (دنیا ہی میں ان کے کفر کی سزا میں) ان کی
آنکھوں کو ملیامیٹ کر دیتے (خواہ آنکھ کی بینائی کو یا خود آنکھ کے عضو ہی کو) پھر یہ رستے کی
طرف (چلنے کے لئے) دوڑتے پھرتے سو اُن کو کہاں نظر آتا (جیسا قوم لوط پر ایسا ہی عذاب
آیا تھا، کما قال تعالیٰ فَطَمَسْنَآ) اور (اس سے بڑھ کر) اگر ہم چاہتے تو ان کی [illegible]

اور یہی معاملات کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہوں گے سب کے سب اسی حال میں مر کر رہ جائیں گے
حدیث میں ہے کہ دو آدمی ایک کپڑے کی خرید و فروخت میں لگے ہوئے ہوں گے، کپڑا پھیلایا ہوا ہوگا، کہ اچانک قیامت آجائے گی، اور وہ کپڑا لپیٹ نہ کر پائیں گے، کوئی آدمی اپنے حوض کو مٹی سے لیپ کر درست کر رہا ہوگا، کہ اسی حال میں مر کر رہ جائے گا (رواہ ابو نعیم عن ابی ہریرۃ۔ قرطبی)

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ، یعنی اس وقت جو لوگ مجتمع ہوں گے وہ آپس میں کسی کو کسی کام کی وصیت کرنے کی مہلت نہیں پائیں گے اور جو گھروں سے باہر ہوں گے وہ اپنے گھروں میں واپس آنے کی بھی مہلت نہیں پائیں گے، اسی جگہ مرے کے مرے رہ جائیں گے۔ یہ بیان قیامت کے نفخۂ اولیٰ کا ہے، جس سے سارا عالم زمین و آسمان تباہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ، اجداث جدث کی جمع ہے بمعنی قبر، اور ینسلون نسلان سے مشتق ہے جس کے معنی تیز چلنے کے ہیں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا، آیا ہے کہ یہ لوگ اپنی قبروں سے جلدی کرتے ہوئے نکلیں گے۔ اور ایک آیت میں جو ارشاد ہے فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ یعنی نفخہ کے وقت لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر کھڑے دیکھتے رہیں گے، یہ اس کے منافی نہیں کیونکہ ابتداء حیرت سے کھڑے ہو کر دیکھنے کا واقعہ ہو اور بعد میں تیزی سے محشر کی طرف دوڑنا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جیسا کہ آیات قرآن سے ثابت ہے کہ فرشتے ان سب کو ہانک کر میدان حشر میں لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی حاضری محشر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ جبری طور پر ہوگی اور فرشتوں کے پکارنے کی وجہ سے دوڑتے ہوئے محشر میں آجائیں گے۔

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ، کفار اگرچہ قبروں میں بھی عذاب قبر میں مبتلا تھے، وہاں کچھ آرام نہ تھا، مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ پہلا عذاب کالعدم معلوم ہوگا اس لئے کہیں گے کہ ہمیں کس نے قبروں سے نکال لیا، وہیں رہتے تو اچھا ہوتا، اس پر فرشتے یا عام مومنین جواب دیں گے:-

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ، یعنی یہ وہی قیامت ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا، اور اس کے رسولوں نے اس کی سچی خبر تم کو سنائی تھی، تم نے توجہ نہ کی۔ اس مقام پر اللہ کی صفات میں سے لفظ رحمن اختیار کرنے میں اشارہ ہے کہ اس نے تو اپنی رحمت سے تمہارے لئے اس عذاب سے بچنے کے بہت سامان کئے تھے، اور قبل از وقت اس کا

پیچھے راضی ہوا، اگرچہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوا، ایسے شخص کو حدیث میں عبدالدرہم و عبدالزوجہ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض صوفیائے کرام کے کلمات میں جو اپنے نفس کے لئے بت پرستی کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد نفس کی خواہشات کا اتباع کرنا ہے، کفر و شرک مراد نہیں، جیسے کہ بعض نے فرمایا

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دینِ مسلمانی نہم

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ، محشر میں حساب کتاب کے لئے پیشی میں اول تو ہر شخص کو آزادی دی جاوے گی جو چاہے عذر پیش کرے، مگر مشرکین وہاں قسمیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے مکر جائیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔

اور بعض یہ بھی کہیں گے کہ فرشتوں نے ہمارے نامۂ اعمال میں جو کچھ لکھ دیا ہے ہم تو اس سے بری ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے کہ بول نہ سکیں، اور ان کے مقابلہ میں خود ان ہی کے ہاتھ پاؤں اور اعضاء کو سرکاری گواہ بنا کر ان کو بولنے کی صلاحیت دیدی جائے گی وہ ان کے تمام اعمال کی گواہی دیں گے، آیتِ مذکورہ میں تو ہاتھ پاؤں کا بولنا ذکر کیا گیا ہے دوسری آیت میں انسان کے کان، آنکھ اور کھال کا بولنا مذکور ہے، شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ، اور ایک جگہ ہے تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ، یعنی خود ان کی زبانیں گواہی دیں گی۔ یہ اس کے منافی نہیں کہ ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی، کیونکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہ بول سکیں گے، ان کی زبان ان کی مرضی کے خلاف چلے گی، اور شہادت دے گی۔

رہا یہ شبہ کہ ان اعضاء میں گویائی کیسے پیدا ہوگی تو اس کا جواب خود قرآن نے دیدیا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ، یعنی یہ اعضاء کہیں گے جس اللہ نے ہر گویائی والے کو گویا کیا ہے، اس نے ہمیں بھی گویائی دیدی۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ، نُعَمِّرْ، تعمیر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمر دراز دینے کے، اور نُنَكِّسْهُ تنکیس سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اوندھا اُلٹ کر دینے کے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے ایک اور مظہر کا بیان فرمایا ہے کہ ہر انسان و حیوان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیرِ تصرف ہے، قدرت کا عمل اس میں مسلسل جاری ہے، ایک گندے اور بے جان قطرہ سے اس کا وجود شروع ہوا، بطنِ مادر کی تین اندھیریوں میں اس خلاصۂ کائنات اور عالمِ اصغر کی تخلیق ہوئی، کیسی کیسی نازک

مشینیں اس کے وجود میں پیوست کی گئیں اور روح ڈال کر زندہ کیا گیا، تو پہلے بطن مادر کے اندر اس کی تربیت و نشوونما ہوتی رہی، پھر انسان بن کر اس دنیا میں آیا۔ تو مکمل ہونے کے باوجود اس کی ہر چیز ضعیف و کمزور ہے۔ قدرت نے اس کے مزاج کے مناسب غذا ماں کی چھاتیوں میں پیدا کر دی جس سے اس کو تدریجی توانائی ملی اور اس وقت سے جوانی تک کتنے مراحل سے گذر کر اس کے سب قویٰ مضبوط ہوئے، قوت و شجاعت کے دعوے ہونے لگے، ہر مقابل کو شکست دینے کے حوصلے پیدا ہوئے۔

پھر جب اس نشوونما کا منتہا ہوا تو اب ان سب طاقتوں قوتوں میں کمی شروع ہوئی، کمی بھی بے شمار مراحل سے گذرتے ہوئے بالآخر بڑھاپے کی آخری عمر تک پہونچی جہاں پہونچ کر گویا پھر وہ اس منزل میں پہونچ گیا جس سے بچپن میں گذر رہا تھا، ساری عادتیں خصلتیں بدلنے لگیں، جو چیزیں سب سے زیادہ محبوب تھیں وہ مبغوض نظر آنے لگیں، جن سے راحت ملتی تھی اب وہ موجب کلفت بن گئی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے تنکیس یعنی اوندھا کر دینے سے تعبیر فرمایا ہے، ونعم قال ؎

مَنْ عاش اخلقت الایام جدّته ؛ وخانه ثقتاه السمع والبصر

"یعنی جو شخص زندہ رہے گا تو زمانہ اس کی جدت وشدت کو بوسیدہ اور پرانا کر دے گا، اور اس کے سب سے بڑے دو قابل اعتماد دوست یعنی شنوائی اور بینائی کی طاقتیں بھی اس سے خیانت کر کے الگ ہو جائیں گی"

یعنی انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد اپنی آنکھ سے دیکھی یا کان سے سنی ہوئی چیز پر ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آخر عمر میں یہ بھی قابل اعتماد نہیں، گراں گوشی کے سبب بات پوری سمجھنا مشکل، ضعف بینائی کے سبب صحیح صحیح دیکھنا مشکل۔ متنبی نے اسی مضمون کو کہا ہے ؎

ومن صحب الدنیا طویلا تقلبت ؛ علی عینه حتّٰی یری صدقها کذبا

"یعنی جو شخص دنیا میں زیادہ زندہ رہے گا دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی پلٹ جائیگی یہاں تک کہ جس چیز کو پہلے سچ جانتا تھا وہ جھوٹ معلوم ہونے لگے گی"

انسان کے وجود میں یہ انقلابات قدرت حق تعالیٰ شانہ کا عجیب وغریب مظہر تو ہے ہی، اس میں انسان پر ایک عظیم احسان بھی ہے کہ خالق کائنات نے جتنی طاقتیں انسان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہیں وہ درحقیقت سرکاری مشینیں ہیں، جو اس کو دیدی گئی ہیں، اور یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ یہ تیری ملک نہیں، اور دائمی بھی نہیں، بالآخر تجھ سے واپس لی جائیں گی۔ اس کا تقاضا ظاہری یہ تھا کہ جب وقت مقدر آجاتا سب طاقتیں بیک وقت واپس لے لی جاتیں

مگر مولائے کریم نے ان کی واپسی کی بھی بڑی طویل قسطیں کر دی ہیں اور تدریجی طور پر واپس لیا ہے تاکہ انسان متنبہ ہو کر سفر آخرت کا سامان کر لے۔ واللہ اعلم

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ

اور ہم نے نہیں سکھلایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں یہ تو خالص نصیحت ہے اور قرآن ہے

مُّبِیْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۰﴾

صاف۔ تاکہ ڈر سنا دے اس کو جس میں جان ہو اور ثابت ہو الزام منکروں پر۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ

کیا اور نہیں دیکھتے وہ کہ ہم نے بنا دیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے

لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾

پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ اور عاجز کر دیا ان کو ان کے آگے پھر ان میں کوئی ہے ان کی سواری اور کسی کو کھاتے ہیں۔

وَ لَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اتَّخَذُوْا

اور ان کے واسطے چوپایوں میں فائدے ہیں اور پینے کے گھاٹ پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔ اور پکڑتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ

اللہ کے سوائے اور حاکم کہ شاید ان کی مدد کریں۔ نہ کر سکیں گے

نَصْرَهُمْ ۙ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

ان کی مدد اور یہ ان کی فوج ہو کر پکڑے آئیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ کفار جو نبوت کی نفی کرنے کے لئے آپ کو شاعر کہتے ہیں یہ محض باطل ہے کیونکہ) ہم نے آپ کو شاعری (یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا) کا علم نہیں دیا اور وہ (شاعری) آپ کے شایانِ شان بھی نہیں وہ (یعنی آپ کو عطا کیا ہوا علم جس کو یہ لوگ شاعری کہتے ہیں وہ) تو محض نصیحت (کا مضمون) اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے تاکہ (بیانِ احکام کے اثر سے) ایسے شخص کو (نفع کا) ڈرا دے جو (حیات قلبیہ کے اعتبار سے) زندہ ہو

تاکہ کافروں پر عذاب کی حجت ثابت ہو جاوے۔ کیا ان (مشرک) لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لئے اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کئے اور (ہمارے مالک بنانے سے) یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں اور (آگے اس نفع کی کچھ تفصیل ہے کہ) ہم نے ان مواشی کو ان کا تابع بنا دیا سو ان کے کام میں طرح طرح سے کام دیتے ہیں چنانچہ ان میں بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کے لئے اور بھی نفع ہیں (جیسے بال کھال، ہڈی وغیرہ مختلف طریقوں سے مستعمل ہوتے ہیں) اور (ان میں ان لوگوں کے) پینے کی چیزیں بھی ہیں (یعنی دودھ) سو کیا (اس پر بھی) یہ لوگ شکر نہیں کرتے، اور شکر کا سب سے مقدم اور اہم درجہ توحید پر ایمان ہے اور انھوں نے (بجائے شکر اور توحید کے کفر و شرک اختیار کر رکھا ہے چنانچہ) خدا کے سوا اور معبود قرار دے رکھے ہیں اس امید پر کہ ان کو ان معبودوں کی طرف سے امداد ملے (لیکن) وہ اُن کی کچھ مدد کر ہی نہیں سکتے اور (مدد تو کیا کرتے اور اُلٹے) وہ (معبودین) ان لوگوں کے حق میں ایک فریق (مخالف) ہو جاویں گے جو (موقف حساب میں بصورت مجرم) حاضر کئے جاویں گے (اور وہاں حاضر ہو کر ان کی مخالفت کا اظہار کریں گے کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا، وقال تعالیٰ فی سورۃ یونس وَقَالَ شُرَكَاۤؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ وغیر ذٰلک من الاٰیات۔

معارف و مسائل

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ، چونکہ منکرین نبوت و رسالت قرآن کی تاثیرِ عجیبہ اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی کیفیت کا جو مشاہدہ میں تھی انکار نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کبھی تو اس کلام قرآن کو سحر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہتے تھے اور کبھی اس کلام کو شعر اور آپ کو شاعر کہہ کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ تاثیرِ عجیبہ کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ یا تو یہ جادو کے کلمات ہیں جو دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یا شاعرانہ کلام ہے وہ بھی عام دلوں پر اثر انداز ہوا کرتا ہے۔

حق تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں فرمایا کہ ہم نے نبی کو شعر و شاعری نہیں سکھلائی اور نہ ان کی شان کے مناسب تھی، آپ کو شاعر کہنا باطل اور غلط ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب تو وہ قوم ہے جس کی فطرت میں شعر و شاعری پڑی ہوئی ہے، عورتیں بچے بے ساختہ شعر کہتے ہیں، وہ شعر کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں، انھوں نے قرآن کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کس اعتبار سے کہا کیونکہ نہ تو قرآن

وزن شعری کا پابند ہے نہ کہیں ردیف قافیہ کا۔ اس کو تو جاہل شعر و شاعری سے ناواقف بھی شعر نہیں کہہ سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شعر در اصل خیالی خودساختہ مضامین کو کہا جاتا ہے خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں ان کا مقصد قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے سے یہ تھا کہ آپ جو کلام لائے ہیں وہ محض خیالی فسانے ہیں یا پھر شعر کے معنی معروف کے اعتبار سے شاعر کہا تو اس مناسبت سے کہ جس طرح نظم اور شعر خاص اثر رکھتا ہے اس کا اثر بھی ایسا ہی ہے۔

امام جصاص نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی شعر پڑھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ ایک شعر ابن طرفہ کا آپ نے پڑھا تھا ؎

ستبدی لک الایام ماکنت جاھلاً ۔۔ ویاتیک بالاخبار من لم تزود

اس کو آپ نے وزن شعری کو توڑ کر من لم تزود بالاخبار پڑھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ شعر اس طرح نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں اور نہ میرے لئے شعر و شاعری مناسب ہے۔

یہ روایت ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے، اور ترمذی، نسائی، امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود کوئی شعر تصنیف کرنا تو کیا آپ دوسروں کے اشعار بھی پڑھنے کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اور بعض روایات میں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وزن شعری کے مطابق کچھ کلمات منقول ہیں وہ بقصد شعر نہیں، اتفاقی ہیں اور ایسے اتفاق کوئی ایک دو شعر موزوں ہو جانے سے کوئی آدمی شاعر نہیں کہلاتا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فطری مناسبت بڑی حکمتوں پر مبنی تھا، یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً شعر گوئی مذموم ہے جیسا کہ شعر و شاعری کے احکام کی تفصیل سورۂ شعراء کے آخری رکوع میں گذر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ

اس آیت میں چوپائے جانوروں کی تخلیق میں انسانی منافع اور ان میں قدرت کی عجیب و غریب صنعتکاری کا ذکر فرمانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ایک دوسرے احسان عظیم کو بتلایا گیا ہے کہ یہ چوپائے جانور جن کی تخلیق میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں خالص دست قدرت کے بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ انسان کو ان چوپاؤں سے نفع اٹھانے کا موقع ملا اور اجازت دیدی بلکہ اس کو ان کا مالک بنا دیا کہ وہ ان میں ہر طرح کے مالکانہ تصرفات کر سکتے ہیں، خود نفع اٹھائیں

یا ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ملکیتِ اشیاء کی اصل علت عطائے حق ہے نہ سرمایہ نہ محنت

آجکل نئے نئے معاشی نظریوں اور نظریات میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں سرمایہ اور دولت اصل ہے یا محنت؟ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے قائل دولت و سرمایہ کو اصل قرار دیتے ہیں اور سوشلزم اور کمیونزم والے محنت کو علتِ تخلیق و ملکیت کی قرار دیتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس فیصلے نے بتلا دیا کہ تخلیقِ اشیاء اور ان کی ملکیت میں دونوں کا کوئی دخل نہیں، تخلیق کسی چیز کی انسان کے قبضہ میں نہیں وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور عقل کا تقاضا ہے کہ جو کسی چیز کو پیدا کرے وہی اس کا مالک بھی ہو۔ اس طرح اصل اور حقیقی ملکیت اشیائے عالم میں حق تعالیٰ کی ہے، انسان کی ملکیت کسی بھی چیز میں صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی اثباتِ ملکیت اور انتقالِ ملکیت کا قانون اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نازل فرما دیا ہے، اس قانون کے **خلاف کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔**

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ اس میں ایک اور احسان و انعام کی طرف اشارہ فرمایا کہ اکثر جانور اونٹ، گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ اگر دیکھو تو طاقت میں انسان سے بہت زیادہ ہیں، انسان ان کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان جانوروں پر قابو نہ پا سکتا، مگر حق تعالیٰ نے جیسے ان جانوروں کی تخلیق کا انعام انسان کو بخشا اسی طرح یہ بھی فطرت بنا دی کہ ان مست جانوروں کو انسان کے سامنے مسخر و تابع بنا دیا۔ ایک لڑکا ایک قوی گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال دیتا ہے اور پھر اس کی پشت پر سوار ہو کر جہاں چاہے لئے پھرتا ہے یہ بات بھی انسان کا کوئی اپنا کمال نہیں صرف حق تعالیٰ کی عطا اور بخشش ہے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ جُند سے مراد فریقِ مخالف لیا جائے، اور مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن چیزوں کو انھوں نے دنیا میں معبود بنا رکھا ہے، یہی قیامت کے روز ان کے مخالف ہو کر ان کے **خلاف گواہی دیں گے۔**

اور حضرت حسنؒ و قتادہؒ سے اس کی تفسیر یہ منقول ہے کہ ان لوگوں نے بتوں کو خدا تو اس لئے بنایا تھا کہ یہ ان کی مدد کریں گے، اور ہو یہ رہا ہے کہ وہ تو ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں خود یہی لوگ جو ان کی عبادت کرتے ہیں ان کے خدام اور ان کے سپاہی بنے ہوئے ہیں ان کی حفاظت کرتے ہیں کوئی ان کے خلاف کام کرے تو یہ ان کی طرف سے لڑتے ہیں (قرطبی)

کی باتیں (کہ توحید درست نہیں) آپ کے لئے آزردگی کا باعث نہ ہونا چاہئے کیونکہ
آزردگی ہوتی ہے وہ اس لئے کہ امید ہوتی ہے مخاطب کے عقل و انصاف سے اور ان لوگوں میں نہ عقل ہے
نہ انصاف تو ان سے کسی چیز کی امید ہی نہیں ہو سکتی پھر غم کیوں ہو آگے دوسرے طریقہ سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے) بیشک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ (زبان
سے) ظاہر کرتے ہیں (اس لئے وقت معین پر ان کو ان کے عمل کی سزا مل جاوے گی آگے ان آدمیوں کا رد ہے جو
قیامت کا انکار کرتے ہیں) کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو (ایک حقیر) نطفہ سے پیدا کیا (جس کا تقاضا
یہ تھا کہ اپنی ابتدائی حالت کو یاد کر کے اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کو دیکھ کر خود سرکشی اور گستاخی
کی جرأت نہ کرتا دوسرے خود اپنے حالات سے اس پر استدلال کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا
اس کی قدرت سے کیا بعید ہے) سو (اس نے ایسا نہ کیا بلکہ اقتضائے مذکور کے خلاف) وہ علانیہ
اعتراض کرنے لگا اور (وہ اعتراض یہ کہ) اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا
(عجیب اس لئے کہ اس سے ہماری قدرت کا عجز لازم آتا ہے) اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ ہم نے اس
کو نطفہ حقیر سے ایک کامل انسان بنایا) کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ
کر دے گا آپ جواب دیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا ہے
(کہ پہلی تخلیق کے وقت ان ہڈیوں کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور اب تو ایک مرتبہ ان میں
حیات پیدا ہو کر ایک قسم کا تعلق حیات سے ہو چکا ہے اب ان میں حیات پیدا کرنا کیا مشکل ہے)
اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے (یعنی ابتداءً کسی چیز کو پیدا کر دینا یا پیدا شدہ کو فنا کر کے
دوبارہ پیدا کر دینا) وہ ایسا (قادر مطلق) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لئے آگ
پیدا کر دیتا ہے، پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو (جیسا کہ عرب میں ایک درخت تھا مرخ
دوسرا عفار ان دونوں درختوں سے چقماق کا کام لیتے تھے، دونوں کے ملانے سے آگ پیدا
ہو جاتی تھی، تو جس قادر نے ہرے درخت کے پانی میں آگ پیدا فرما دی تو دوسرے جمادات میں
حیات پیدا کر دینا اس کے لئے کیا مشکل ہے) اور جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں کیا وہ اس
پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے، ضرور قادر ہے اور وہ بڑا پیدا کرنے
والا خوب جاننے والا ہے (اور اس کی قدرت ایسی ہے کہ) جب وہ کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ
کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو (ان سب
مقدمات سے ثابت ہو گیا کہ) اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور (یہ
سب شبہات سے سالم رہ گئی کہ) تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (یعنی قیامت کے روز)

معارف ومسائل

اَوَلَمۡ يَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ نُّطۡفَةٍ، سورۂ یٰسٓ کی یہ آخری پانچ آیتیں ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں جو بعض روایت میں اُبَی بن خلف کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بعض میں عاص بن وائل کی طرف۔ اور اس میں بھی کوئی بُعد نہیں کہ دونوں سے ایسا واقعہ پیش آیا ہو۔ پہلی روایت بیہقی نے شعب الایمان میں اور دوسری روایت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ عاص بن وائل نے بطحاء مکہ سے ایک بوسیدہ ہڈی اٹھائی، اور اس کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر ریزہ ریزہ کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا اللہ اس ہڈی کو زندہ کرے گا، جس کا حال یہ دیکھ رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ تجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا پھر تجھ کو جہنم میں داخل کرے گا (ابن کثیر)

خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ یعنی یہ نطفہ حقیر سے پیدا کیا ہوا انسان کیسا کھل کر مقابلہ پر آنے لگا کہ اللہ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے۔

ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا یہاں ضرب مثل سے مراد اس کا یہ واقعہ ہے کہ بوسیدہ ہڈی کو ہاتھ سے ریزہ ریزہ کرتے ہوئے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کو محال یا مستبعد سمجھا۔ اس کے بعد فرمایا وَنَسِيَ خَلۡقَهٗ یعنی اس مثال کے بیان کرنے کے وقت وہ خود اپنی پیدائش کو بھول گیا کہ ایک حقیر اور ناپاک قطرہ بے جان میں جان ڈال کر اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنی اس اصل کو نہ بھولتا تو ایسی مثالیں پیش کر کے قدرتِ الٰہیہ کے انکار کی جرأت نہ کرتا۔

جَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا عرب میں دو درخت معروف تھے۔ ایک مرخ دوسرا عفار۔ عرب لوگ ان دونوں درختوں کی دو شاخیں مثل مسواک کے کاٹ لیتے تھے جو بالکل ہری تازہ پانی سے بھری ہوتی تھی، ایک کو دوسری پر رگڑنے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی۔ ہرے درخت سے آگ پیدا کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (قرطبی) اور اگر درختوں کے آخری انجام کو دیکھا جائے تو ہر درخت شروع میں ہرا بھرا ہونے کے بعد آخر میں خشک ہو کر آگ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ہر درخت بھی اس کا مصداق ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں بظاہر یہی مراد ہے اَفَرَءَيۡتُمُ النَّارَ الَّتِيۡ تُوۡرُوۡنَ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ، یعنی کیا تم اس آگ کو نہیں دیکھتے جس کو تم سلگا کر اپنے کام میں لیتے ہو کیا اس آگ سے شعلہ بننے والے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے؟

لیکن آیت مذکورہ میں چونکہ شجر کے ساتھ اخضر کی صفت بھی ذکر کی گئی ہے اس لئے

یہاں ظاہر یہی ہے کہ وہ خاص درخت مراد ہیں جن سے ہرے بھرے ہونے کے باوجود آگ پیدا ہوتی ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہیں تو انسانی مصنوعات کی طرح ان کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ پہلے مواد جمع فرمائیں پھر اس کے لئے کاریگر بلائیں، پھر ایک مدت تک کام کرکے وہ چیز تیار ہو بلکہ وہ جب اور جس وقت جس چیز کو پیدا فرمانا چاہیں ان کو صرف حکم دیدینا کافی ہوتا ہے کہ "پیدا ہو جا"۔ تو جس چیز کو یہ حکم ملتا ہے وہ فوراً اس کے حکم کے مطابق وجود میں آجاتی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کی تخلیق دفعی اور فوری ہی ہو، بلکہ حکمت خلق کے تابع جس چیز کا فوری طور پر پیدا ہونا مصلحت ہو وہ فوری، ورنہ بتدریج و بمہلت پیدا ہو جاتی ہے، اور جس چیز کا پیدا ہونا کسی حکمت و مصلحت کی بناء پر تدریجاً مناسب سمجھا گیا وہ اسی تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ اس کو پہلے ہی حکم میں خاص تدریج کے ساتھ پیدا ہونا بتلا دیا گیا ہو یا ہر مرحلہ پر اس کو جداگانہ حکم کُن کا خطاب ہوتا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

قد تمت سورة يٰس بحمد الله وعونه لثماني وعشرين
من شهر صفر سنة ۱۳۹۲ھ يوم الخميس وبتمامه
تم بحمد الله الحزب الخامس من
الاحزاب السبعة القرآنية والحمد
لله اولاً وآخراً وظاهراً
وباطناً

سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ

سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّاثْنَتَانِ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّخَمْسُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ صٰفّٰت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بیاسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳

قسم ہے صف باندھنے والوں کی قطار ہو کر، پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر، پھر پڑھنے والوں کی یاد کر کر،

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

بیشک حاکم تمہارا ایک ہے، رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِۨ الْكَوَاكِبِ ۝۶

اور رب مشرقوں کا، ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ

اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے، سن نہیں سکتے اوپر کی مجلس

الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ

تک اور پھینکے جاتے ہیں ان پر ہر طرف سے بھگانے کو اور ان پر مار ہے

وَّاصِبٌ ۝۹ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰

ہمیشہ کو، مگر جو کوئی اچک لایا جھپٹ سے پھر پیچھے لگا اس کے انگارا چمکتا۔

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے ان فرشتوں کی جو عبادت میں یا حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں (جیسا اسی سورت میں آگے آئے گا وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّاۗفُّوْنَ) پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو شہاب ثاقب کے ذریعہ آسمانی خبریں لانے سے شیاطین کی بندش کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں عنقریب آرہا ہے) پھر قسم ہے ان فرشتوں کی جو ذکر الٰہی تسبیح وغیرہ کی تلاوت کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں آئے گا، وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ، غرض ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں) کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہے (اور اس توحید کی دلیل یہ ہے کہ) وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے (یعنی ان کا مالک اور متصرف) اور پروردگار ہے (سب ستاروں کے) طلوع کرنے کے مواقع کا (اور) ہم ہی نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ اور (انہی ستاروں کے ساتھ اس آسمان کی یعنی اس کی خبروں کی) حفاظت بھی کی ہے ہر شریر شیطان سے (جس کا طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس حفاظت کے انتظام کی وجہ سے) وہ شیاطین عالم بالا (یعنی ملائکہ) کی (باتوں کی طرف) کان بھی نہیں لگا سکتے (یعنی اکثر تو مار کھانے کے ڈر سے دور ہی دور رہتے ہیں، اور اگر کبھی اتفاقاً سننے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو) وہ ہر طرف سے (یعنی جس طرف بھی جو شیطان جاتا ہے) مار کر دھکے دیے جاتے ہیں (یہ عذاب اور ذلت تو انہیں فی الحال ملتی ہے) اور پھر آخرت میں ان کے لئے جہنم کا دائمی عذاب ہوگا (غرض کوئی آسمانی خبر سننے سے پہلے ہی انھیں مار بھگایا جاتا ہے وہ سننے کا ارادہ کیا کرتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں) مگر جو شیطان کچھ خبر لے ہی بھاگے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے (اور اس کو جلا کر پھونک دیتا ہے، لہٰذا جو کچھ سنتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات و تصرفات توحید خداوندی پر دلالت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

سورت کے مضامین | یہ سورت مکی ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع بھی ایمانیات ہیں اور اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مشرکین کے عقائد کی تردید بھی ہے، اور آخرت میں جنت و دوزخ کے حالات کی منظر کشی بھی۔ جو عقائد تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں شامل رہے ہیں ان کو مدلل کرنے اور کفار کے شبہات و اعتراضات کو دور کرنے کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ماضی میں

جن لوگوں نے ان عقائد کو تسلیم کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا رہا؟ اور جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی ان کو کیا انجام ہوا؟ چنانچہ اس ضمن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، اور ان کے صاحبزادگان، حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔

مشرکینِ مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، آخر میں اس عقیدے کی مفصل تردید کی گئی ہے۔ اور سورت کے مجموعی طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں شرک کی اس خاص قسم (یعنی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے) کی تردید بطورِ خاص پیشِ نظر رہی ہے۔ اسی لئے سورت کو فرشتوں کی قسم کھا کر اور ان کے اوصافِ بندگی کو ذکر کر کے شروع کیا گیا ہے واللہ سبحانہ اعلم۔

پہلا مضمون توحید سورت کو عقیدۂ توحید کے بیان سے شروع کیا گیا ہے، اور پہلی چار آیتوں کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (بلاشبہ تمہارا معبود ایک ہی ہے) لیکن اس بات کو بیان کرنے سے پہلے تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان قسموں کا ٹھیٹھ لفظی ترجمہ یہ ہے:

"قسم صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی، پھر قسم بندش کرنے والوں کی، پھر قسم ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی"

یہ "صف باندھ کر کھڑے ہونے والے"، "بندش کرنے والے" اور "ذکر کی تلاوت کرنے والے" کون ہیں؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس لئے اس کی تفسیر میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے وہ غازی ہیں جو صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، تا کہ باطل کی قوتوں پر "بندش" لگائیں، اور صف آرا ہوتے وقت "ذکر" و تسبیح اور تلاوتِ قرآن میں بھی مشغول رہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ ان سے مراد وہ نمازی ہیں جو مسجد میں صف باندھ کر شیطانی افکار و اعمال پر "بندش" عائد کرتے ہیں، اور اپنا پورا دھیان "ذکر و تلاوت" پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر و قرطبی) اور اس کے علاوہ بھی بعض تفسیریں بیان کی گئی ہیں، جو الفاظِ قرآن کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

لیکن جمہور مفسرین کے یہاں جس تفسیر کو سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں، اور یہاں اُن کی تین صفات بیان کی گئی ہیں:

پہلی صفت اَلصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ہے۔ یہ لفظ "صف" سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں "کسی جمعیت کو ایک خط پر استوار کرنا" (قرطبی) لہٰذا اس کے معنی ہوئے "صف باندھ کر کھڑے ہونے والے"۔

فرشتوں کی صف بندی کا ذکر اسی سورت میں آگے چل کر بھی آیا ہے۔ فرشتے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ "اور بے شبہ ہم سب صف باندھے کھڑے رہتے ہیں"۔ یہ صف بندی کب ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں بعض حضرات مفسرین مثلاً حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے یہ فرمایا کہ فرشتے ہمیشہ فضا میں صف باندھے اللہ کے حکم کے لئے گوش بر آواز رہتے ہیں، اور جب کوئی حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں (مظہری) اور بعض حضرات نے اسے عبادت کے وقت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، یعنی جب فرشتے عبادت اور ذکر و تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں تو صف باندھ لیتے ہیں (تفسیر کبیر)

نظم و ضبط دین میں مطلوب ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر کام میں نظم و ضبط اور ترتیب و سلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں محبوب اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منتظم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بدنظمی کے بجائے انہیں صف بندی کی توفیق دی گئی اور اس آیت میں ان کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

نماز میں صفوں کی درستی اور اس کی اہمیت چنانچہ انسانوں کو بھی عبادت کے دوران اس صف بندی کی ترغیب و تاکید کی گئی ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: "تم (نماز میں) اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں"؟ صحابہؓ نے پوچھا: "فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا: "وہ صفوں کو پورا کرتے ہیں، اور صف میں پیوستہ ہو کر کھڑے ہوتے ہیں (یعنی بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے)"۔ (تفسیر مظہری)

نماز میں صفوں کو پورا کرنے اور سیدھا رکھنے کی تاکید میں اتنی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان سے ایک پورا رسالہ بن سکتا ہے۔ حضرت ابو مسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے: "سیدھے رہو، آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا" (جمع الفوائد بحوالہ مسلم ونسائی ص ۹۲ ج ۱)

فرشتوں کی دوسری صفت فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا بیان کی گئی ہے۔ یہ لفظ "زجر" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "روکنا"، "ڈانٹنا"، "جھڑکنا"۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ "بندش کرنے والے" سے کیا ہے جو لفظ کے ہر ممکن مفہوم کو جامع ہے۔ فرشتے کس چیز پر بندش عائد کرتے ہیں؟ قرآن کریم کے سیاق کے پیش نظر زیادہ تر مفسرین نے اس کا

یہ جواب دیا ہے کہ یہاں "بندش عائد کرنے سے" مراد فرشتوں کا وہ عمل ہے جس کے ذریعہ وہ شیاطین کو عالمِ بالا تک پہنچنے سے روکتے ہیں اور جس کا تفصیلی ذکر خود قرآن کریم میں آگے آرہا ہے۔

تیسری صفت فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ہے۔ یعنی یہ فرشتے "ذکر" کی تلاوت کرنے والے ہیں "ذکر" کا مفہوم "نصیحت کی بات" بھی ہے اور "یادِ خدا" بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کے ذریعہ جو نصیحت کی باتیں نازل کی ہیں یہ ان کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ اور یہ تلاوت حصولِ برکت اور عبادت کے طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وحی لانے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کتب نصیحت کی تلاوت کر کے انھیں اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں جبکہ "ذکر" سے مراد یادِ خداوندی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہردم اُن کلمات کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں، جو اللہ کی تسبیح و تقدیس پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے فرشتوں کی یہ تین صفات ذکر کر کے بندگی کے تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے، یعنی عبادت کے لئے صف بستہ رہنا، طاغوتی طاقتوں کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا، اور اللہ کے احکام و مواعظ کو خود پڑھنا، اور دوسروں تک پہنچانا۔ اور ظاہر ہے۔ بندگی کا کوئی عمل ان تین شعبوں سے خالی نہیں ہو سکتا، لہٰذا چاروں آیتوں کا مفہوم یہ ہو گیا کہ "جو فرشتے تمام اوصافِ بندگی کے حامل ہیں ان کی قسم، تمہارا معبودِ برحق ایک ہی ہے"۔

فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی؟

اس سورت میں خاص طور پر فرشتوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ــــ اس سورت کا مرکزی موضوع شرک کی اس خاص قسم کی تردید ہے جس کے تحت اہلِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ سورت کی ابتداء ہی میں فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے وہ اوصاف بیان کر دیئے گئے جن سے ان کی مکمل بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے ان اوصافِ بندگی پر غور کرو گے تو وہ خود تمہارے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ باپ بیٹی کا نہیں، بلکہ بندہ و آقا کا ہے۔

حق تعالیٰ کی قسم کھانا اور اس کے متعلق احکام اور سوال و جواب

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ایمان و عقائد کے بہت سے اصولی مسائل کی تاکید کے لئے مختلف طرح کی قسم کھائی ہے، کبھی اپنی ذات کی، کبھی اپنی مخلوقات میں سے خاص خاص اشیاء کی۔ اس کے متعلق بہت سے سوالات ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف کی تفسیر میں یہ ایک مستقل اصولی مسئلہ بن گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اس پر ایک مستقل کتاب "التبیان فی اقسام القرآن" لکھی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی

اصولِ تفسیر کی کتاب "اتقان" میں مباحث کی سرسٹھویں نوع اس کو قرار دے کر مفصل کلام کیا ہے۔ یہاں کچھ ضروری اجزاء لکھے جاتے ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ غنی دعنیا ہیں، ان کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو یقین دلانے کے لئے قسم کھائیں؟

اتقان میں ابوالقاسم قشیری سے اس سوال کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ حق تعالیٰ کو تو کوئی ضرورت قسم کھانے کی نہ تھی، مگر اس کو جو شفقت و رحمت اپنی مخلوق پر ہے وہ اس کی داعی ہوئی کہ کسی طرح یہ لوگ حق کو قبول کریں اور عذاب سے بچ جائیں۔ ایک اعرابی نے جب آیت وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ سنی تو کہنے لگا کہ اللہ جیسی عظیم الشان ہستی کو کس نے ناراض کیا ہے کہ اس کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شفقت علی الخلق اس کا داعی ہے کہ جس طرح دنیا کے جھگڑے چکانے اور اختلافات مٹانے کا معروف طریقہ یہ ہے کہ دعوے پر شہادت پیش کی جائے شہادت نہ ہو تو قسم کھائی جائے، اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کے اس مانوس طریقہ کو اختیار فرمایا، کہیں تو شہادت کے الفاظ سے مضمون کی تاکید فرمائی جیسے شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الآیۃ، اور کہیں قسم کے الفاظ سے جیسے إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وغیرہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ قسم اپنے سے بہت بڑے کی کھائی جاتی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم کھائی جو ہر حیثیت سے کمتر ہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ سے بڑی کوئی ذات نہ ہے نہ ہو سکتی ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی قسم عام مخلوق کی قسم کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حق سبحانہ وتعالیٰ نے کہیں اپنی ذات پاک کی قسم کھائی ہے جیسے إِي وَرَبِّي اور اس طرح ذات حق کی قسمیں قرآن میں سات جگہ آئی ہیں اور کہیں اپنے افعال و صفات کی اور قرآن کی قسم کھائی ہے، جیسے وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا، وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا، وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا وغیرہ، اور بیشتر قسمیں اپنے مفعول و مخلوق کی استعمال ہوئی ہیں، جو معرفت کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اسی کی ذات کی طرف راجع ہو جاتی ہیں (کذا ذکرہ ابن قیم)

مخلوقات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، کہیں تو اس سے اس چیز کی عظمت و فضیلت کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے کہ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آئی ہے لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق اور کوئی چیز دنیا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے زیادہ معزز اور مکرم نہیں پیدا کی یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی و رسول کی ذات کی قسم نہیں آئی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آیت مذکورہ میں آئی ہے۔ اسی طرح (وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ) کی قسم بھی طور اور کتاب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے آئی ہے۔

اور بعض اوقات کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ وہ کثیر المنافع ہے، جیسے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ اور بعض جگہ کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا مظہر اور معرفت صانع عالم کا اہم ذریعہ ہے۔ اور عموماً جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کو اس مضمون کے ثبوت میں کچھ دخل ضرور ہوتا ہے جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے، جو ہر جگہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ کہ شریعت کا مشہور حکم عام انسانوں کے لئے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے خود مخلوقات کی قسم کھانا کیا اس کی دلیل نہیں کہ دوسروں کے لئے بھی غیر اللہ کی قسم جائز ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللہَ یقسم بما شاء من خلقہ ولیس لاحد ان یقسم الا باللہ (رواہ ابن ابی حاتم ازمظہری)	"اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے وہ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہے قسم کھائے، مگر کسی دوسرے کے لئے اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ جل شانہٗ پر قیاس کرنا غلط اور باطل ہے، جب شریعت الٰہیہ میں عام انسانوں کے لئے غیر اللہ کی قسم ممنوع کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ذاتی فعل سے اس کے خلاف استدلال کرنا باطل ہے۔

اس کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر پر غور فرمائیے۔

پہلی چار آیتوں میں فرشتوں کی قسم کھا کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم سب کا معبود برحق ایک ہے۔ اگرچہ قسم کے دوران فرشتوں کی صفات بھی وہ ذکر کی گئی ہیں جن پر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جائے تو وہ عقیدۂ توحید ہی کی دلیل معلوم ہوتی ہیں، لیکن آگے کی چھ آیات میں توحید کی دلیل مستقلاً بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں ان کا اور پروردگار ہے مشرقوں کا) تو

جو ذات اتنی عظیم مخلوقات کی خالق و پروردگار ہو، عبادت کی مستحق بھی وہی ہے، اور یہ ساری کائنات اس کے وجود اور وحدانیت کی دلیل ہے ——— یہاں اَلْمَشَارِق، مشرق کی جمع ہے، اور چونکہ سورج سال کے ہر دن میں ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے اس کی مشرقیں بہت ساری ہیں، **اسی بناء پر یہاں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔**

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ اِۨلْكَوَاكِبِ اس میں السماء الدنیا سے مراد نزدیک ترین آسمان ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس نزدیک والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی ہے، اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ ستارے ٹھیک آسمان کے اندر ہوں، اگر وہ اس سے جدا ہوں تب بھی زمین سے دیکھا جائے تو وہ آسمان ہی پر معلوم ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے آسمان جگمگاتا نظر آتا ہے۔ بتانا صرف اس قدر ہے کہ یہ تاروں بھرا آسمان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ اسے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، اور جو ذات اتنی عظیم الشان چیزوں کو وجود میں لا سکتی ہے اُسے کسی شریک اور ساجھی کی کیا ضرورت ہے؟ نیز جب یہ بات مشرکین کے نزدیک بھی طے شدہ ہے کہ ان تمام فلکی اجسام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ خالق و مالک تو وہ ہو اور عبادت کسی اور کی کی جائے؟

رہا یہ مسئلہ کہ ستارے قرآن کی رُو سے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ نیز قرآن کریم کا علم ہیئت کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اس موضوع پر مفصل بحث سورۂ حِجر میں گذر چکی ہے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (الیٰ قولہ تعالیٰ) فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ، ان آیات میں زینت و آرائش کے علاوہ ستاروں کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ شریر قسم کے شیاطین کو عالم بالا کی باتیں سننے سے روکا جاتا ہے۔ وہ غیبی خبروں کی سن گن لینے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انہیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کوئی شیطان اگر کوئی اِکّا دُکّا بات سن بھاگتا ہے تو اُسے ایک دہکتے ہوئے شعلہ کے ذریعے مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہنچ کر اپنے معتقد کاہنوں اور نجومیوں کو کچھ بتا نہ سکے، اسی دہکتے ہوئے شعلے کو "شہاب ثاقب" کہا گیا ہے۔

"شہاب ثاقب" کی کچھ تفصیل سورۂ حِجر میں گذر چکی ہے، یہاں اتنی تنبیہ ضروری ہے کہ قدیم یونانی فلاسفہ اس بات کے قائل رہے کہ "شہاب ثاقب" دراصل کوئی زمینی مادّہ ہوتا ہے جو بخارات کے ساتھ اوپر چلا جاتا ہے، اور کرۂ نار کے قریب پہنچ کر جل اٹھتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے "شہاب ثاقب" کوئی زمینی مادہ نہیں،

بلکہ عالم بالا ہی میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے۔ قدیم مفسرین اس موقع پر یہ کہتے آئے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کا یہ خیال "کہ شہاب ثاقب" کوئی زمینی مادہ ہے محض قیاس اور تخمینہ پر مبنی ہے، اس لئے اس سے قرآن پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ اگر کوئی زمینی مادہ اوپر جاکر مشتعل ہوجاتا ہو تو قرآن کریم سے اس کی بھی کوئی منافات نہیں۔

لیکن آج کی جدید سائنسی تحقیقات نے یہ سوال ہی ختم کردیا ہے۔ موجودہ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ "شہاب ثاقب" ان گنت ستاروں ہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور عموماً بڑی بڑی اینٹوں کے برابر، اور یہ ان گنت ٹکڑے فضا میں رہتے ہیں۔ انہی کا ایک مجموعہ "اسدیہ" کہلاتا ہے، جو سورج کے گرد ھلیلہ کی شکل میں گردش کرتا رہتا ہے، اور اس کا ایک دورہ ۳۳ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان ٹکڑوں میں روشنی ان کی تیز رفتاری اور خلائی اجرام کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ٹکڑے ۱۰ راگست اور ۲۷ رنومبر کی راتوں میں زیادہ گرتے ہیں، اور ۲۰ راپریل، ۲۸ رنومبر، ۱۸ راکتوبر اور ۶، ۹، ۱۳ ردسمبر کی راتوں میں کم ہوجاتے ہیں۔

(از تفسیر الجواہر للطنطاوی، ص ۱۵، ج ۸)

جدید سائنس کی یہ تحقیق قرآنی اسلوب بیان کے زیادہ مطابق ہے، البتہ جو لوگ "شہاب ثاقب" کے ذریعہ شیطانوں کے مارے جانے کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں ان کے بارے میں طنطاوی مرحوم نے الجواہر میں بڑی اچھی بات لکھی ہے:

"ہمارے آباء واجداد پر کبھی یہ بات گراں محسوس ہوتی تھی کہ قرآن کریم ان کے زمانے کے علم فلکیات کے خلاف کوئی بات کہے، لیکن مفسرین اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ ان کے فلسفیانہ نظریات کو قبول کرکے قرآن کو چھوڑ دیں، اس کے بجائے انہوں نے ان فلسفیانہ نظریات کو چھوڑا اور قرآن کے ساتھ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خود بخود ثابت ہوگیا کہ قدیم یونانی فلاسفہ کا خیال بالکل باطل اور غلط تھا، اب بتائیے کہ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ ستارے شیطانوں کو جلاتے، مارتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس میں کونسی رکاوٹ ہے؟ ہم قرآن کریم کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مستقبل کے انتظار میں ہیں، (جب سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلے گی) ——— (جواہر، ص ۱۴ ج ۸)

مقصدِ اصلی یہاں آسمانوں، ستاروں، اور شہاب ثاقب کا تذکرہ کرنے سے ایک مقصد تو توحید کا اثبات ہے کہ جس ذات نے یکہ وتنہا اتنے زبردست آفاقی انتظام کئے ہوئے ہیں، وہی لائق عبادت بھی ہے۔ دوسرے اسی دلیل میں اُن لوگوں کے خیال

کی تردید بھی کردی گئی ہے جو شیطانوں کو دیوتا یا معبود قرار دیتے ہیں، اور بتا دیا گیا ہے کہ یہ تو ایک مردود و مقہور مخلوق ہیں، ان کو خدائی سے کیا واسطہ؟

اس کے علاوہ اسی مضمون میں اُن لوگوں کی بھی بھرپور تردید موجود ہے جو قرآن کریم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو کاہنوں کی کہانت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں اشارہ کر دیا گیا کہ قرآن کریم تو کاہنوں کی تردید کرتا ہے، اس لئے کہ ان کی معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ شیاطین ہیں، اور قرآن یہ کہتا ہے کہ شیاطین کی عالمِ بالا تک رسائی ممکن نہیں، وہ غیب کی سچی خبریں نہیں لاسکتے۔ جب کہانت کے بارے میں قرآن کریم کا بیان کیا ہوا عقیدہ یہ ہے تو وہ خود کہانت کیسے ہوسکتا ہے؟ اس طرح یہ آیتیں توحید اور رسالت دونوں مضامین کی طرف اشاروں پر مشتمل ہیں، اور آگے انہی آسمانی مخلوقات کے ذریعہ آخرت کے عقیدے کو ثابت کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ

اب پوچھ ان سے کیا یہ بنانے مشکل ہیں یا جتنی خلقت کہ ہم نے بنائی؟ ہم نے ہی ان کو بنایا ہے

مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿١١﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا

ایک چپکتے گارے سے۔ بلکہ تو کرتا ہے تعجب اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے۔ اور جب انکو سمجھائیے

لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿١٤﴾ وَقَالُوْٓا

نہیں سوچتے۔ اور جب دیکھیں کچھ نشانی ہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ

کچھ نہیں یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور

عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿١٦﴾ اَوَاٰبَاۗؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿١٧﴾ قُلْ

ہڈیاں تو کیا ہم کو پھر اٹھنا ہے، کیا اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی؟ تو کہہ کہ

نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿١٨﴾

ہاں اور تم ذلیل ہوگے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب دلائلِ توحید سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم الشان مخلوقات میں ایسے ایسے

عظیم تصرفات پر قادر ہیں اور یہ ساری عظیم مخلوقات اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں) تو آپ ان (آخرت کا انکار کرنے والوں) سے پوچھیے کہ یہ لوگ بناوٹ میں زیادہ سخت ہیں، یا ہماری پیدا کی ہوئی یہ چیزیں (جن کا ابھی ذکر ہوا)؟ حقیقت یہی ہے کہ یہی چیزیں زیادہ سخت ہیں، کیونکہ) ہم نے ان لوگوں کو (تو آدمؑ کی تخلیق کے وقت اسی معمولی) چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے، (جس میں نہ کچھ قوت ہے نہ سختی، اور انسان جو اس سے بنا ہے وہ بھی زیادہ قوی اور سخت نہیں ہے، اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم ایسی قوی اور سخت مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہیں تو انسان جیسی ضعیف مخلوق کو یکبار موت دے کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قدرت نہ ہوگی؟ مگر ایسی واضح دلیل کے باوجود یہ لوگ آخرت کے امکان کے قائل نہیں ہوتے) بلکہ (اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ) آپ تو (ان کے انکار سے) تعجب کرتے ہیں اور یہ لوگ (انکار سے بڑھ کر آخرت کے عقیدے سے) تمسخر کرتے ہیں اور جب ان کو (دلائل عقلیہ سے) سمجھایا جاتا ہے تو یہ سمجھتے نہیں اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں (جو آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو دکھایا جاتا ہے جس سے عقیدۂ آخرت ثابت ہو جاتا ہے) تو (خود) اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ (کیونکہ اگر یہ معجزہ ہو تو اس سے آپ کی نبوت ثابت ہو جائیگی اور آپ کو نبی ماننے کے بعد آپ کا بیان کردہ عقیدۂ آخرت بھی ماننا پڑے گا، حالانکہ ہم آخرت کا عقیدہ نہیں مان سکتے، کیونکہ) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے، تو کیا ہم (پھر) زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے) آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (ضرور زندہ ہوں گے) اور تم ذلیل بھی ہوگے۔

معارف و مسائل

عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کے بعد ان آٹھ آیتوں میں عقیدۂ آخرت کا بیان ہے، اور اس سے متعلق مشرکین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلی آیت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان پر عقلی دلیل پیش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کے جن عظیم اجسام کا ذکر پچھلی آیتوں میں کیا گیا ہے، انسان تو ان کے مقابلہ میں بہت کمزور مخلوق ہے، جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے، چاند، ستارے، سورج اور شہاب ثاقب جیسی مخلوقات اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں، تو اس کے لئے انسان جیسی کمزور مخلوق کو موت دے کر دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے؟ جس طرح تمہیں ابتداء میں چپکتی ہوئی مٹی سے بنا کر تم میں روح پھونک دی تھی اسی طرح جب تم مر کر دوبارہ خاک ہو جاؤ گے اس وقت پھر اللہ تعالیٰ

تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے انھیں چپکتی مٹی سے پیدا کیا" اس سے مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کے جدّ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہر انسان ہو۔ اس لئے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان کی اصل پانی ملی ہوئی مٹی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، نطفہ خون سے بنتا ہے، خون غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا، خواہ کسی شکل میں ہو اس کی اصل نباتات ہیں، اور نباتات مٹی اور پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہرصورت پہلی آیت عقیدۂ آخرت کی عقلی دلیل پر مشتمل ہے، اور اسے خود انہی سے یہ سوال کر کے شروع کیا گیا ہے کہ تم زیادہ سخت مخلوق ہو یا جن مخلوقات کا ذکر ہم نے کیا ہے، وہ زیادہ سخت ہیں؟ جواب ظاہر تھا کہ وہی مخلوقات زیادہ سخت ہیں، اس لئے اس کی تصریح کرنے کے بجائے اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ "ہم نے تو انہیں چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے"۔

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں اس ردّ عمل کا بیان کیا گیا ہے جو آخرت کے دلائل سن کر مشرکین ظاہر کرتے ہیں۔ مشرکین کے سامنے عقیدۂ آخرت کے جو دلائل بیان کئے جاتے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک تو عقلی دلائل جیسے پہلی آیت میں بیان کیا گیا، دوسرے نقلی دلائل یعنی ان کو معجزے دکھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، نبی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، اس کے پاس آسمانی خبریں آتی ہیں، جب آپ یہ خبر دے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی، حشر و نشر ہوگا، انسانوں سے حساب و کتاب لیا جائے گا تو یہ خبر یقیناً سچی ہے، اسے مان لینا چاہئے ـــــ جہاں تک عقلی دلائل پر مشرکین کے ردِّ عمل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝ یعنی آپ کو تو ان لوگوں پر یہ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے واضح دلائل سامنے آنے کے باوجود یہ لوگ نہیں مان رہے، لیکن یہ اُلٹا آپ کے دلائل و عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں، اور انھیں کتنا ہی سمجھاؤ، سمجھ کر نہیں دیتے۔

رہے نقلی دلائل، سو اس کے بارے میں ان کا ردِّ عمل یہ ہے کہ:

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ الخ یعنی جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں جو آپ کی نبوّت اور بالآخر عقیدۂ آخرت پر دلالت کرتا ہے، تو یہ اُسے بھی ٹھٹھوں میں اڑا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور اس سارے تمسخر و استہزاء کی اُن کے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ:

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝

یعنی یہ بات ہمارے تصور میں نہیں آتی کہ ہم یا ہمارے آباء واجداد خاک ہو جانے اور ہڈیاں بن جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کر دیئے جائیں گے؟ اس لئے ہم نہ کوئی عقلی دلیل مانتے ہیں، اور نہ کسی معجزے وغیرہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ آخر میں ارشاد فرمایا:۔ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝ "یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہو گے اور ذلیل و خوار ہو کر زندہ ہو گے"

دیکھنے میں تو یہ ایک حاکمانہ جواب ہے، جیسے ہٹ دھرمی کرنے والوں کو دیا جاتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ ایک پوری دلیل بھی ہے، جس کی تشریح امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اوپر دوبارہ زندہ ہونے کی عقلی دلیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسانوں کا مر کر پھر زندہ ہونا کوئی ناممکن بات نہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بات عقلاً ممکن ہو اس کا واقعۃً وجود میں آجانا کسی سچے خبر دینے والے کی خبر سے ثابت ہو سکتا ہے۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے تو اس کے بعد کسی سچے نبی کا صرف اتنا کہہ دینا کہ "ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہوگے" اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ثبوت

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً الخ میں "آیۃ" کے لغوی معنی نشانی کے ہیں، اور اس سے یہاں مراد معجزہ ہے۔ لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ بھی کچھ معجزات عطا فرمائے تھے، اور اس سے اُن ملحدین کی تردید ہو جاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو حسّی اسباب کے تابع قرار دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپؐ کے دستِ مبارک پر قرآن کریم کے سوا کوئی معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا۔

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا ہے: وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ (جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں) بعض منکرین معجزات کہتے ہیں کہ یہاں "آیۃ" سے مراد معجزہ نہیں، بلکہ عقلی دلائل ہیں۔ لیکن یہ بات اس لئے غلط ہے کہ اگلی آیت میں وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ، یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے" ظاہر ہے کہ کسی دلیل کو کھلا جادو قرار دینے کا کوئی تُک نہیں ہے، یہ بات وہ معجزہ دیکھ کر ہی کہہ سکتے ہیں۔

بعض منکرینِ معجزات یہ بھی کہتے ہیں کہ "آیۃ" سے مراد قرآن کریم کی آیات ہیں کہ یہ لوگ انھیں جادو قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا لفظ "رَاَوْا" (دیکھتے ہیں) اس کی صاف

تردید کر رہا ہے۔ آیاتِ قرآنی کو دیکھا نہیں، سُنا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیتِ قرآنی کا ذکر ہے وہاں اس کے ساتھ سننے کے الفاظ آئے ہیں دیکھنے کے نہیں، اور قرآن کریم میں جگہ جگہ "آیۃ" کا لفظ معجزہ کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

"اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ؀"

"اگر تم کوئی معجزہ لے کر آئے ہو تو لاؤ، اگر سچے ہو"

اسی کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کو سانپ بنانے کا معجزہ دکھلایا تھا۔

رہیں قرآن کریم کی وہ آیات جن میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے کے مطالبہ کو نہیں مانا۔ سو درحقیقت وہاں بار بار معجزات دکھائے جاچکے تھے لیکن وہ ہر روز اپنی مرضی کا ایک نیا معجزہ طلب کرتے تھے، اس کے جواب میں معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا۔ اس لئے کہ اللہ کا نبی اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے۔ اگر کوئی پھر بھی اس کی بات نہ مانے تو ہر روز ایک نیا معجزہ ظاہر کرنا نبی کے وقار کے بھی خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بھی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کو اس کا مطلوبہ معجزہ عطا کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائی، تو عذابِ عام کے ذریعہ اس کو ہلاک کیا گیا امتِ محمدیہ کو چونکہ باقی رکھنا اور عذابِ عام سے بچانا پیش نظر تھا اس لئے اسے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا گیا۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا

سو وہ اٹھانا تو یہی ہے ایک جھڑکی پھر اسی وقت یہ لگیں گے دیکھنے۔ اور کہیں گے

يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ

اے خرابی ہماری یہ آگیا دن جزا کا۔ یہ ہے دن فیصلہ کا جس کو

كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ

تم جھٹلاتے تھے۔ جمع کرو گنہگاروں کو اور ان کے جوڑوں کو

ع ۵ | ۲۱ | ۱

وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٢٢﴾ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ

اور جو کچھ پوجتے تھے ، اللہ کے سوائے پھر چلاؤ ان کو

صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوهُمْ ۖ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ

دوزخ کی راہ پر ، اور کھڑا رکھو ان کو ، ان سے پوچھنا ہے ، کیا ہوا تم کو

لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾

ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ، کوئی نہیں وہ آج اپنے آپ کو پکڑواتے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

پس قیامت تو بس ایک للکار ہوگی (یعنی دوسرا صور) سو (اس سے) سب یکایک (زندہ ہو کر) دیکھنے بھالنے لگیں گے اور (حسرت سے) کہیں گے ہائے ہماری کم بختی یہ تو وہی روزِ جزا (معلوم ہوتا) ہے (ارشاد ہوگا کہ ہاں) یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (آگے قیامت ہی کے بعض واقعات کی تفصیل ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوگا) جمع کر لو ظالموں کو (یعنی جو کفر و شرک کے بانی اور مقتدا تھے) اور ان کے ہم مشربوں کو (یعنی جو اُن کے ساتھ تابع تھے) اور ان معبودوں کو جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (یعنی شیاطین اور بُت) پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ بتلا دو (یعنی ادھر لے جاؤ) اور (پھر یہ حکم ہوگا کہ اچھا) ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا (چنانچہ اُن سے یہ سوال ہوگا) کہ اب تم کو کیا ہوا کہ (عذاب کا حکم سن کر) ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (یعنی کافروں کے بڑے بڑے رہنما انسان ہوں یا شیاطین اپنے تابعین کی مدد نہیں کرتے، جس طرح دنیا میں ان کو بہکایا کرتے تھے ؟ مگر اس سوال کے بعد بھی وہ مدد نہ کر سکیں گے) بلکہ وہ سب کے سب اس روز سرافگندہ (کھڑے) ہوں گے ۔

معارف ومسائل

آخرت کے امکان و ثبوت کے بعد باری تعالیٰ نے ان آیتوں میں حشر و نشر کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں، اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو جو حالات پیش آئیں گے ان کا تذکرہ فرمایا ہے ۔

سب سے پہلی آیت میں مردوں کے زندہ ہونے کا طریق کار بیان فرمایا ہے کہ فَاِنَّمَا ھِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (یعنی قیامت تو بس ایک للکار ہوگی) زَجْرَۃٌ کا لفظ زَجْرٌ کا اسم مرّہ ہے اور اس کے عربی زبان میں کئی معنی آتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہیں "مویشیوں کو چلنے پر آمادہ کرنے کے لئے ایسی آوازیں نکالنا جنھیں سُن کر وہ اُٹھ کھڑے ہوں" یہاں اس سے مراد وہ دوسرا صور ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے پھونکیں گے، اور اسے "زجرۃ" سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح مویشیوں کو اٹھا کر چلانے کے لئے کچھ آوازیں نکالی جاتی ہیں اسی طرح مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے یہ صور پھونکا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

اگرچہ باری تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ صُور پھونکے بغیر مُردوں کو زندہ کردے، لیکن یہ صورِ حشر و نشر کے منظر کو پُرہیبت بنانے کے لئے پھونکا جائے گا (تفسیر کبیر) —— اس صور پھونکنے کا اثر کافروں پر یہ ہوگا کہ فَاِذَا ھُمْ یَنْظُرُوْنَ (بس اچانک وہ دیکھنے بھالنے لگیں گے) یعنی جس طرح دنیا میں وہ دیکھنے پر قادر تھے اسی طرح وہاں بھی دیکھ سکیں گے، اور بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔ (قرطبی)

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَھُمْ (یعنی ان ظالموں کو جنھوں نے شرک کے ظلم عظیم کا ارتکاب کیا اور ان کے ہم مشربوں کو جمع کرو) یہاں ہم مشربوں کے لئے ازواج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں "جوڑ" اور یہ لفظ شوہر اور بیوی کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس کے معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس سے مشرکین کی وہ بیویاں مراد ہیں جو خود بھی مشرک تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں "ازواج" سے مراد ہم مشرب ہی ہے، اور اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ امام بیہقیؒ اور عبدالرزاقؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ یہاں اَزْوَاجَھُمْ سے مراد ہیں ان جیسے دوسرے لوگ، چنانچہ سود خور دوسرے سود خوروں کے ساتھ، زناکار دوسرے زانیوں کے ساتھ، اور شراب پینے والے دوسرے شراب پینے والوں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے۔ (روح المعانی و مظہری)

اس کے علاوہ وَمَا کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ کے الفاظ سے بتادیا گیا کہ مشرکین کے ساتھ ان کے وہ باطل معبود یعنی بُت اور شیاطین بھی جمع کئے جائیں گے جنھیں یہ لوگ دنیا میں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، تاکہ اُس وقت اُن باطل معبودوں کی بے بسی کا اچھی طرح نظارہ کرایا جائے۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝ یعنی ان لوگوں کو جہنم کا راستہ دکھلاؤ، اور جب فرشتے ان لوگوں کو لے چلیں گے تو پل صراط کے قریب پہنچنے کے بعد حکم ہوگا کہ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ، ان کو ٹھہراؤ، ان سے سوال ہوگا۔ چنانچہ اس مقام پر ان سے ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں وہ سوالات کئے جائیں گے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۲۷﴾ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنتُمْ

اور منہ کیا بعضوں نے بعضوں کی طرف لگے پوچھنے۔ بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی

تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿۲۸﴾ قَالُوا بَل لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۲۹﴾ وَمَا

طرف سے۔ وہ بولے کوئی نہیں پر تم ہی نہ تھے یقین والے۔ اور ہمارا

كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا

تم پر کچھ زور نہ تھا، پر تم ہی تھے لوگ حد سے نکل چلنے والے۔ سو ثابت ہو گئی ہم پر

قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿۳۱﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿۳۲﴾

بات ہمارے رب کی بیشک ہم کو مزہ چکھنا ہے، ہم نے تم کو گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ تھے۔

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۳﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ

سو وہ سب اس دن تکلیف میں شریک ہیں۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہگاروں

بِالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۴﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ

کے حق میں۔ وہ تھے کہ اُن سے جب کوئی کہتا کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے،

يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۳۵﴾ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿۳۶﴾

تو غرور کرتے، اور کہتے کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے معبودوں کو کہنے سے ایک شاعر دیوانے کے؟

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۷﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ

کوئی نہیں، وہ لیکر آیا ہے سچا دین اور سچا مانتا ہے سب رسولوں کو، بیشک تم کو چکھنا ہے عذاب

الْأَلِيمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۹﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾

دردناک۔ اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔

خلاصۂ تفسیر

(بجائے اس کے کہ مشرکین ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ان میں اُس وقت اُلٹا جھگڑا ہوگا) اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال (یعنی اختلاف) کرنے لگیں گے (چنانچہ تابعین (اپنے سرداروں سے) کہیں گے کہ (ہم کو تو تم نے گمراہ کیا کیونکہ) ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہوا کرتی تھی (یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے) متبوعین یہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے تھے، (اور ہم پر ناحق الزام لگاتے ہو، کیونکہ) ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا ہی نہیں، بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے سو (جب کفر کے مرتکب ہم بھی تھے اور تم بھی، تو معلوم ہو کہ) ہم سب ہی پر ہمارے رب کی یہ (ازلی) بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم سب کو (عذاب کا) مزہ چکھنا ہے، تو (اس کا سامان یہ ہو گیا کہ) ہم نے تم کو بہکایا (جس سے تم ہمارے جبر و اکراہ کے بغیر خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے اور ادھر) ہم خود بھی (اپنے اختیار سے) گمراہ تھے (پس دونوں کی گمراہی کے اسباب جمع ہو گئے جن میں تمہارا اپنا اختیار بھی اپنی گمراہی کا بڑا سبب ہے، پھر اپنے آپ کو بری کیسے کرنا چاہتے ہو؟ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دونوں فریق کا کفر میں مشترک ہونا ثابت ہے، تو وہ سب کے سب اس روز عذاب میں (بھی) شریک رہیں گے (اور) ہم ایسے مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (آگے ان کے کفر و جرم کا بیان ہے کہ) وہ لوگ ایسے تھے کہ (توحید کے بھی منکر تھے اور رسالت کے بھی چنانچہ) جب ان سے (بواسطۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو (اس کے ماننے سے) تکبر کیا کرتے تھے (اور) کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ (کے کہنے) کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ (پس اس میں توحید اور رسالت دونوں کا انکار ہو گیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہ شاعر ہیں نہ مجنون) بلکہ (پیغمبر ہیں کہ) ایک سچا دین لے کر آئے ہیں اور (اصولِ توحید وغیرہ میں) دوسرے پیغمبروں کی تصدیق (اور موافقت) کرتے ہیں (یعنی ایسے اصول بتلاتے ہیں جس میں سب رسول متفق ہیں۔ پس وہ اصول بے شمار دلائل کی روشنی میں حق ہیں، خیال بندی نہیں اور حق بات کا کہنا جنون نہیں۔ دوسری امتوں نے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ یہاں چونکہ براہِ راست کفارِ عرب مخاطب ہیں، اس لئے صرف اسی اُمت کے کافروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آگے اس بات کا بیان ہے کہ انھیں مشافہۃً اس مشترک عذاب کی وعید سُنائی جائے گی کہ) تم سب (تابع اور متبوع) کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا اور (اس حکم میں تم پر کوئی ظلم نہیں ہوا کیونکہ) تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم

(کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے۔ ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے ہیں (اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنھوں نے حق کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں مقبول اور مخصوص فرمایا ایسے لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف ومسائل

میدانِ حشر میں جمع ہونے کے بعد کافروں کے بڑے بڑے سردار جنھوں نے اپنے چھوٹوں کو بہکایا تھا، اپنے پیرووں کے سامنے آئیں گے تو بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی کوئی مدد کر سکیں، آپس میں بحث وتکرار شروع کر دیں گے۔ ان آیات میں اسی بحث وتکرار کا کچھ نقشہ کھینچ کر فریقین کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصہ تفسیر سے واضح ہے صرف چند مختصر باتیں قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ میں "یمین" کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک معنی قوت وطاقت بھی ہیں۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ کی گئی ہے کہ "ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہوا کرتی تھی" یعنی تم ہم پر رعب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے اور یہی تفسیر زیادہ صاف اور بے غبار ہے۔ اس کے علاوہ یمین کے معنی قسم کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض حضرات نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ: "تم ہمارے پاس قسمیں لے کر آیا کرتے تھے" یعنی قسم کھا کھا کر ہم پر یہ باور کراتے تھے کہ ہمارا مذہب درست ہے اور رسول کی تعلیم (معاذ اللہ) باطل ہے۔ الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے یہ دونوں تفسیریں بے تکلف ممکن ہیں۔

(۲) فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ناجائز کام کی دعوت دے اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے تو اسے دعوتِ گناہ کا عذاب تو بے شک ہوگا، لیکن جس شخص نے اس کی دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کر لیا، وہ بھی اپنے عمل کے گناہ سے بری نہیں ہو سکتا۔ وہ آخرت میں یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں پا سکتا کہ مجھے تو فلاں شخص نے گمراہ کیا تھا، ہاں اگر اس نے گناہ کا ارتکاب اپنے اختیار سے نہ کیا ہو بلکہ جبر واکراہ کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے کر لیا ہو تو ان شاء اللہ اس کی معافی کی امید ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ

وہ لوگ جو ہیں اُن کے واسطے روزی ہے مقرر میوے اور ان کی عزت ہے نعمت کے

النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ

باغوں میں، تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے، لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ

مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا

شراب صاف کا سفید رنگ مزہ دینے والی پینے والوں کو، نہ اس میں سر پھرتا ہے اور نہ وہ

هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ﴿٤٨﴾

اس کو پی کر بہکیں، اور ان کے پاس ہیں عورتیں نیچی نگاہ رکھنے والیاں بڑی آنکھوں والیاں،

كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿٤٩﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٥٠﴾

گویا وہ انڈے ہیں چھپے دھرے۔ پھر منہ کیا ایک نے دوسرے کی طرف لگے پوچھنے،

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ أَئِنَّكَ لَمِنَ

بولا ایک بولنے والا ان میں میرا تھا ایک ساتھی، کہا کرتا کیا تو یقین

الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا

کرتا ہے، کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو

لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي

جزا ملے گی؟ کہنے لگا بھلا تم جھانک کر دیکھو گے؟ پھر جھانکا تو اس کو دیکھا

سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا

بیچوں بیچ دوزخ کے۔ بولا قسم اللہ کی تو تو مجھ کو ڈالنے لگا تھا گڑھے میں، اور اگر نہ ہوتا

نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ﴿٥٨﴾

میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا انہی میں جو پکڑے ہوئے آئے۔ کیا اب ہم کو مرنا نہیں،

إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٥٩﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ

مگر جو پہلی بار مر چکے اور ہم کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بیشک یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ﴿٦١﴾

بڑی مراد ملنی۔ ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

ان (اللہ کے مقبول بندوں) کے واسطے ایسی غذائیں ہیں جن کا حال (دوسری سورتوں میں) معلوم (ہوچکا) ہے یعنی میوے (جن کا ذکر سورۂ یٰسٓ آیت لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ میں اور جن کی صفت سورۂ واقعہ آیت وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ میں ہے کہ قبل نازل ہوچکی ہیں کیونکہ یٰسٓ اور واقعہ سورۂ صٰفٰت سے نزول میں مقدم ہیں کذا فی الاتقان) اور وہ لوگ بڑی عزت سے آرام کے باغوں میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے پاس ایسا جامِ شراب لایا جائے گا (یعنی غلمان لائیں گے) جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس سے شراب کی کثرت اور لطافت معلوم ہوئی اور دیکھنے میں) سفید ہوگی (اور) پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی (اور) نہ اس میں دردِ سر ہوگا (جیسے دنیا کی شراب میں ہوتا ہے جس کو خمار کہتے ہیں) اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی (جن کی رنگت ایسی صاف ہوگی کہ) گویا وہ بیضے ہیں جو (پروں کے نیچے) چھپے ہوئے ہیں (کہ گرد و غبار اور داغ سے بالکل محفوظ ہوتے ہیں تشبیہ محض صفائی میں ہے) پھر (جب سب لوگ ایک جلسہ میں جمع ہوں گے تو) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر بات چیت کریں گے (اس بات چیت کے دوران میں) ان (اہلِ جنت) میں سے ایک کہنے والا (اہل مجلس سے) کہے گا کہ (دنیا میں) میرا ایک ملاقاتی تھا وہ (مجھ سے بطور تعجب) کہا کرتا تھا کہ کیا تو بعث کے معتقدین میں سے ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور زندہ کرکے) جزا سزا دیئے جائیں گے؟ (یعنی وہ آخرت کا منکر تھا اس لئے ضرور وہ دوزخ میں گیا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ (اے اہل جنت) کیا تم جھانک کر (اس کو) دیکھنا چاہتے ہو؟ (اگر چاہو تو تم کو اجازت ہے) سو وہ شخص (جس نے قصہ بیان کیا تھا) جھانکے گا تو اس کو وسطِ جہنم میں (پڑا ہوا) دیکھے گا (اس کو وہاں دیکھ کر) کہے گا کہ خدا کی قسم تُو تو مجھ کو تباہ ہی کرنے کو تھا (یعنی مجھ کو بھی منکرِ آخرت بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا) اور اگر میرے رب کا (مجھ پر) فضل نہ ہوتا (کہ مجھ کو اس نے صحیح عقیدے پر قائم رکھا) تو میں بھی (تیری طرح) ماخوذ لوگوں میں ہوتا، اور اس کے بعد جنتی اہل مجلس سے کہے گا کہ) کیا ہم بجز پہلی بار مرچکنے کے (کہ دنیا میں مرچکے ہیں) اب نہیں مریں گے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا، (یہ ساری باتیں اس جوشِ مسرت میں کہی جائیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے سب آفت اور کلفتوں سے بچالیا اور ہمیشہ کے لئے بے فکر کردیا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنت کی جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اوپر بیان کی گئیں) یہ بیشک بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی

(حاصل کرنے) کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے (یعنی ایمان لانا اور اطاعت کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

اہل دوزخ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اہل جنت کے احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ تذکرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں عام اہل جنت کو جو عیش و آرام حاصل ہوگا، اس کا بیان ہے، اور اس کے بعد کی آیات میں ایک خاص جنتی کا عبرت آموز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں چند باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(۱) أُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ کا لفظی ترجمہ یہ ہے "ان لوگوں کے لئے ایسا رزق ہے جس کا حال معلوم ہے"، مفسرین نے اس کے مختلف مطلب بتائے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس سے جنتی غذاؤں کی ان تفصیلی صفات کی طرف اشارہ ہے جو مختلف سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ خلاصہ تفسیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ رزق معلوم سے مراد یہ ہے کہ اس کے اوقات متعین اور معلوم ہیں، یعنی وہ صبح و شام پابندی کے ساتھ عطا کیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (صبح و شام) کے الفاظ صراحۃً آئے ہیں۔ ایک تیسری تفسیر اور ہے، اور وہ یہ کہ "رزق معلوم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی اور دائمی رزق ہوگا، دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور یہ کسی کو علم ہے کہ جتنا رزق مجھے حاصل ہے وہ کب تک میرے پاس رہے گا، ہر انسان کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ جو نعمتیں مجھے اس وقت حاصل ہیں وہ شاید کل میرے پاس نہ رہیں، جنت میں یہ خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہاں کا رزق یقینی بھی ہوگا اور دائمی بھی (تفسیر قرطبی وغیرہ)

(۲) فَوَاكِهُ، اس لفظ کے ذریعہ قرآن نے جنت کے رزق کی خود تفسیر فرما دی ہے کہ وہ رزق میووں پر مشتمل ہوگا۔ فواکہ، فاکہۃ کی جمع ہے اور عربی میں فاکہۃ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بھوک کی ضرورت رفع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ لذت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے اردو میں اس کا ترجمہ "میوہ" اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ میوہ بھی لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت "فاکہۃ" کا مفہوم میوے کے مفہوم سے زیادہ عام ہے — امام رازیؒ نے اسی "فواکہ" کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت بخشنے کے لئے دی جائیں گی بھوک کی حاجت رفع کرنے کے لئے نہیں، اس لئے کہ جنت میں انسان کو حاجت کسی چیز کی نہیں ہوگی، وہاں اسے اپنی زندگی برقرار رکھنے یا حفظانِ صحت

کے لئے بھی کسی غذا کی ضرورت نہیں ہوگی، ہاں خواہش ہوگی اس خواہش کے پورے ہونے سے لذت حاصل ہوگی، اور جنت کی تمام نعمتوں کا مقصد لذت عطا کرنا ہوگا (تفسیر کبیر، ص ۹۸ ج ۷)

(۳) وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ، کہہ کر بتا دیا گیا کہ اہل جنت کو یہ رزق پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ دیا جائے گا۔ کیونکہ اعزاز و اکرام نہ ہو تو لذیذ سے لذیذ غذا بھی بے حلاوت ہو جاتی ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان کا حق صرف کھانا کھلانے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اعزاز و اکرام بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

(۴) عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ، یہ اہل جنت کی مجلس کا نقشہ ہے کہ وہ "تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے"، کسی کی کسی کی طرف پُشت نہیں ہوگی۔ اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ مجلس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگا کہ کسی کو کسی کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کو ایسی قوتِ بینائی، سماعت اور گویائی عطا فرمائے گا کہ وہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑے آرام کے ساتھ باتیں کر سکیں۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ تخت گھومنے والے ہوں گے، اور جس سے بات کرنی ہو اسی کی طرف گھوم جائیں گے۔ واللہ سبحانہ اعلم

(۵) لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ، "لَذَّةٍ" اصل میں مصدر ہے، جس کے معنی ہیں لذیذ ہونا۔ اسی لئے بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اصل میں "ذَاتِ لَذَّةٍ" تھا، یعنی "لذت والی" لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو اگر "لَذَّة" کو مصدر ہی سمجھا جائے تو مصدر اسم فاعل کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ شراب پینے والوں کے لئے "مجسم لذت" ہوگی۔ اس کے علاوہ "لَذَّةٌ" کا صیغہ صفت لذیذ کے علاوہ "لَذٌّ" بھی آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں لَذَّةٌ اسی لَذٌّ کا مؤنث ہو (تفسیر قرطبی) اس صورت میں معنی ہوں گے "پینے والوں کے لئے لذیذ"

(۶) لَا فِيْهَا غَوْلٌ، "غَوْل" کے معنی کسی نے "دردِ سر" بیان کئے ہیں کسی نے "پیٹ کا درد" کسی نے "بدبو اور گندگی" اور کسی نے "عقل کا بہک جانا" درحقیقت لفظ "غول" ان سبھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اور حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "غَوْل" آفت کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب میں ایسی کوئی آفت نہیں ہوگی جیسی دنیا کی شرابوں میں پائی جاتی ہیں، نہ دردِ سر ہوگا، نہ دردِ شکم، نہ بدبو کا بھبکارہ، نہ عقل کا بہک جانا (تفسیر ابن جریرؒ)

(۷) قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ، یہ جنت کی حوروں کی صفت ہے کہ وہ "نگاہیں نیچی رکھنے والی ہوں گی" مطلب یہ ہے کہ جن شوہروں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیا، وہ

اُن کے علاوہ کسی بھی مرد کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں سے کہیں گی "میرے پروردگار کی عزت کی قسم، جنت میں مجھے تم سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا جس اللہ نے مجھے تمہاری بیوی اور تمہیں میرا شوہر بنایا تمام تعریفیں اسی کی ہیں"۔

"نگاہیں نیچی رکھنے والی" کا ایک اور مطلب علامہ ابن جوزیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہیں نیچی رکھیں گی، یعنی وہ خود اتنی خوب صورت اور وفا شعار ہوں گی کہ ان کے شوہروں کو کسی اور کی طرف نظر اٹھانے کی خواہش ہی نہ ہوگی (تفسیر زاد المسیر لابن جوزیؒ ص ۵۰ ج ۷)

(۸) كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ، اس آیت میں جنت کی حوروں کو "چھپے ہوئے انڈوں" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اہل عرب کے یہاں یہ تشبیہ مشہور و معروف تھی جو انڈا پروں میں چھپا ہوا ہو اس پر بیرونی گرد و غبار کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لئے وہ نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے جو اہل عرب کے یہاں عورتوں کے لئے دلکش ترین رنگ شمار ہوتا تھا، اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں انڈوں سے تشبیہ نہیں ہے، بلکہ انڈوں کی اس جھلّی سے ہے جو چھلکے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں اس جھلّی کی طرح نرم و نازک اور گداز ہوں گی (روح المعانی) واللہ سبحانہٗ اعلم

ایک جنتی اور اس کا کافر ملاقاتی

ابتدائی دس آیتوں میں اہل جنت کے عمومی حالات بیان فرمانے کے بعد ایک جنتی کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، کہ وہ جنت کی مجلس میں پہنچنے کے بعد اپنے ایک کافر دوست کو یاد کرے گا جو دنیا میں آخرت کا منکر تھا اور پھر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اسے جہنم کے اندر جھانک کر اس سے باتیں کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس شخص کا کچھ نام و پتہ نہیں بتایا گیا، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون ہوگا؟ تاہم بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مومن شخص کا نام یہودا اور اس کے کافر ملاقاتی کا نام مطروس ہے۔ اور یہ وہی دو ساتھی ہیں جن کا ذکر سورۂ کہف کی آیت وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ الخ میں گزر چکا ہے (تفسیر مظہری)

اور علامہ سیوطیؒ نے متعدد تابعین سے اس شخص کی تعیین کے لئے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار میں شریک تھے، ان کو آٹھ ہزار دینار کی آمدنی ہوئی، اور دونوں نے چار چار ہزار دینار آپس میں بانٹ لئے۔ ایک شریک نے اپنی رقم میں سے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک زمین خریدی۔ دوسرا ساتھی بہت نیک تھا، اس نے یہ دعا کی کہ "یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک زمین خریدی ہے، میں آپ سے ایک

ہزار دینار کے عوض جنّت میں زمین خریدتا ہوں۔ اور ایک ہزار دینار کا صدقہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنوایا، تو اس شخص نے کہا "یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک گھر تعمیر کیا ہے، میں ایک ہزار دینار میں آپ سے جنّت کا ایک گھر خریدتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے مزید ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ اس کے بعد اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے، تو اس نے کہا "یا اللہ فلاں نے ایک عورت سے شادی کر کے اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے ہیں، اور میں جنّت کی عورتوں میں سے کسی کو پیغام دیتا ہوں اور یہ ایک ہزار دینار نذر کرتا ہوں، یہ کہہ کر وہ ایک ہزار بھی صدقہ کر دیئے۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار میں کچھ غلام اور سامان خریدا تو اس نے پھر ایک ہزار صدقہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے عوض جنّت کے غلام اور جنّت کا سامان طلب کیا۔

اس کے بعد اتفاق سے اس مؤمن بندے کو کوئی شدید حاجت پیش آئی، اسے خیال ہوا کہ میں اپنے سابق شریک کے پاس جاؤں تو شاید وہ نیکی کا برتاؤ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا، ساتھی نے پوچھا، تمہارا مال کیا ہوا؟ اس کے جواب میں اس نے پورا قصّہ سُنا دیا۔ اس پر اس نے حیران ہو کر کہا کہ "کیا واقعی تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم جب مر کر خاک ہو جائیں گے تو ہمیں دوسری زندگی ملے گی، اور وہاں ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا"۔ اس کے بعد دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مذکورہ آیات میں جنّتی سے مراد وہ بندہ ہے جس نے آخرت کی خاطر اپنا سارا مال صدقہ کر دیا تھا، اور اس کا جہنّمی ملاقاتی وہی شریک کاروبار ہے جس نے آخرت کی تصدیق کرنے پر اس کا مذاق اُڑایا تھا (تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر وغیرہ، ص ۱۶۵ ج ۵)

بُری صحبت سے بچنے کی تعلیم بہرکیف، اس سے مراد خواہ کوئی ہو بہرحال اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل منشا لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حلقۂ احباب کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اس میں کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے جو انہیں کشاں کشاں دوزخ کے انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ بُری صحبت سے جو تباہی آسکتی ہے اس کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہو گا، اور اس وقت اس تباہی سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا، اس لئے دنیا ہی میں دوستیاں اور تعلقات بہت دیکھ بھال کر قائم کرنے چاہئیں۔ بسا اوقات کسی کافر یا نافرمان شخص سے تعلقات قائم کرنے کے بعد انسان غیر محسوس طریقے پر اس کے افکار و نظریات اور طرز زندگی سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آخرت کے انجام

کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

موت کے خاتمہ پر تعجب یہاں جنتی شخص کا یہ مقولہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کافر ساتھی کو دیکھنے کے لئے جہنم میں جھانکے گا، اسی کے بعد یہ مذکور ہے کہ وہ جنت کی نعمتوں کو حاصل کر کے فرطِ مسرت سے یہ کہے گا کہ "کیا اب ہم کبھی نہیں مریں گے؟" اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جنت کی جاودانی زندگی کا یقین نہیں ہوگا، بلکہ جب شخص کو مسرتوں کا انتہائی درجہ حاصل ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات ایسی باتیں کرتا ہے جیسے اسے یقین نہیں ہے کہ یہ مسرتیں اسے حاصل ہو گئی ہیں، یہ جملے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

آخر میں قرآن کریم اس واقعہ سے حاصل شدہ سبق کی طرف متوجہ کر کے فرماتا ہے، لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے)

أَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً

بھلا یہ بہتر ہے مہمانی یا درخت سینڈھ کا، ہم نے اس کو رکھا ہے ایک بلا ظالموں

لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ أَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا

کے واسطے۔ وہ ایک درخت ہے کہ نکلتا ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کا خوشہ

كَأَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ

جیسے سر شیطان کے۔ سو وہ کھائیں گے اس میں سے پھر بھریں گے

مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ

اس سے پیٹ، پھر ان کے واسطے اس کے اوپر ملونی ہے جلتے پانی کی۔ پھر ان کو

مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيْمِ ﴿٦٨﴾ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿٦٩﴾

لے جانا ہے آگ کے ڈھیر میں۔ انھوں نے پایا اپنے باپ دادوں کو بہکے ہوئے،

فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ

سو وہ انہی کے قدموں پر دوڑتے ہیں۔ اور بہک چکے ہیں ان سے پہلے بہت لوگ

الْأَوَّلِيْنَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ

اگلے۔ اور ہم نے بھیجے ہیں ان میں ڈر سنانے والے۔ اب دیکھ کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٧٤﴾

انجام ڈرائے ہوؤں کا مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔

خلاصۂ تفسیر

(عذاب اور ثواب دونوں کا موازنہ کرکے اہل ایمان کو ترغیب اور کفار کو ترہیب فرماتے ہیں کہ) بھلا یہ دعوت (جنت کی نعمتوں کی) بہتر ہے (جو اہل ایمان کے لئے ہے) یا زقوم کا درخت (جو کفار کے لئے ہے)، ہم نے اس درخت کو (آخرت کی سزا بنانے کے علاوہ دنیا میں بھی ان) ظالموں کے لئے موجب امتحان بنایا ہے (کہ اس کو سن کر تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب و استہزاء کرتے ہیں چنانچہ کفار تکذیب و استہزاء سے پیش آئے، کہنے لگے کہ زقوم تو مسکہ اور خرما کو کہتے ہیں، وہ تو خوب لذیذ چیز ہے۔ اور کہنے لگے کہ زقوم اگر درخت ہے تو دوزخ میں جو آگ ہی آگ ہے درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ) وہ ایک درخت ہے جو قعرِ دوزخ میں سے نکلتا ہے (یعنی مسکہ اور خرما نہیں ہے، اور چونکہ وہ خود آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے وہاں رہنا بعید نہیں، جیسے سمندر نامی جانور آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں رہتا ہے، اس سے دونوں باتوں کا جواب ہو گیا۔ آگے زقوم کی ایک کیفیت مذکور ہے کہ) اس کے پھل ایسے (بدنما اور بدمنظر) ہیں جیسے سانپ کے پھن (بس ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہوگی) تو وہ لوگ (بھوک کی شدت میں جب اور کچھ نہ ملے گا تو) اس سے کھاویں گے اور (چونکہ بھوک سے بے چین ہوں گے) اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر (جب پیاس سے بے قرار ہو کر پانی مانگیں گے تو) ان کو کھولتا ہوا پانی (غساق یعنی پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا اور (یہ نہیں کہ اس مصیبت کا خاتمہ ہو جاوے بلکہ اس کے بعد) پھر اخیر ٹھکانا ان کا دوزخ ہی کی طرف ہوگا (یعنی اس کے بعد بھی وہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہوگا، اور انھیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ) انھوں نے (ہدایت انبیاء کا اتباع نہیں کیا تھا بلکہ) اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا، پھر یہ بھی انہی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے (یعنی شوق اور رغبت سے ان کی بے راہی پر چلتے تھے) اور ان (موجودہ کفار) سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے سو دیکھ لیجئے ان لوگوں کا کیسا (برا) انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا اور انھوں نے نہ مانا تھا کہ ان پر دنیا ہی میں کیا کیا عذاب نازل ہوا) ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے (یعنی ایمان والے) بندے تھے (وہ اس دنیوی عذاب سے بھی محفوظ رہے)۔

معارف ومسائل

دوزخ اور جنت دونوں کے تھوڑے تھوڑے حالات بیان فرمانے کے بعد باری تعالیٰ نے ہر انسان کو موازنہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ غور کر دان میں سے کونسی دعوت بہتر ہے؟ چنانچہ فرمایا اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ؟ جنت کی جن نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جو دوزخیوں کو کھلایا جائے گا؟

زقوم کی حقیقت: زقوم نام کا ایک درخت جزیرۂ عرب کے علاقہ تہامہ میں پایا جاتا ہے، اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ دوسرے بنجر صحراؤں میں بھی ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں "تھوہڑ" کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایک اور درخت ہندوستان میں "ناگ پھن" کے نام سے معروف ہے۔ بعض حضرات نے اس کو زقوم قرار دیا ہے اور یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اب حضرات مفسرین کی آراء اس میں مختلف ہیں کہ جہنمیوں کو جو درخت کھلایا جائے گا وہ یہی دنیا کا زقوم ہے، یا کوئی اور درخت ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہی دنیا کا زقوم مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ دوزخ کا زقوم بالکل الگ چیز ہے، دنیا کے زقوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں، لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے، اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا، لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کریہہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ، یعنی "ہم نے اس زقوم کے درخت کو ان ظالموں کے لئے فتنہ بنایا ہے"، اس میں فتنہ سے بعض مفسرین کے نزدیک عذاب مراد ہے، یعنی اس درخت کو عذاب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہاں "فتنہ" کا ترجمہ "آزمائش" اور "امتحان" کرنا زیادہ موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس درخت کا تذکرہ کرکے ہم یہ امتحان لینا چاہتے ہیں کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے؟ اور کون اس کا مذاق اڑاتا ہے؟ چنانچہ کفارِ عرب اس امتحان میں ناکام رہے، انھوں نے بجائے اس کے کہ اس عذاب سے ڈر کر ایمان لاتے تمسخر و استہزاء کا طریقہ اختیار کیا۔ روایات میں ہے کہ جب قرآن کریم کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں کافروں کو زقوم کھلانے کا تذکرہ ہے، تو ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "تمہارا دوست (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہے،

حالانکہ آگ تو درخت کو کھاتی ہے، اور خدا کی قسم، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ زقوم کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں، تو آؤ اور یہ کھجور مکھن کھاؤ۔ (درمنثور، ص ۲۷۲، ج ۵) دراصل زقوم بربری زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے تھے، اس لئے اس نے استہزاء کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ باری تعالیٰ نے ایک ہی جملے میں اس کی دونوں باتوں کا جواب دیدیا کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ یعنی زقوم تو جہنم کی تہہ میں اُگنے والا ایک درخت ہے، لہٰذا نہ تو اس سے مراد کھجور اور مکھن ہے اور نہ یہ اعتراض معقول ہے کہ آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ درخت پیدا ہی آگ میں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی خصوصیت رکھ دی ہیں کہ وہ آگ سے جلنے کے بجائے اس سے نشوونما پاتا ہے، نمونے کے طور پر ایسے کئی حیوانات موجود ہیں جو آگ ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں آگ انھیں جلانے کے بجائے اور نشوونما عطا کرتی ہے۔

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ، اس آیت میں زقوم کے پھل کو "شیاطین کے سروں" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہاں "شیاطین" کا ترجمہ "سانپوں" سے کیا ہے، یعنی زقوم کا پھل ایسی شکل کا ہوتا ہے جیسے سانپ کا پھن، اردو میں بھی اُسے "ناگ پھن" اسی لئے کہتے ہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہاں "شیاطین" سے اس کے معروف معنی ہی مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ زقوم کا پھل اپنی بدصورتی میں شیطانوں کے سر کی طرح ہوتا ہے۔ اب یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ شیطان کو تو کسی نے دیکھا نہیں، پھر اس کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ ایک تخیلی تشبیہ ہے، محاورہ میں بدصورت اور بدہیئت اشیاء کو شیطان اور جن بھوت سے تشبیہ دیدی جاتی ہے، اس کا منشاء محض انتہاء درجے کی بدصورتی بیان کرنا ہوتا ہے، یہاں بھی تشبیہ اسی نوعیت کی ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

باقی آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ

اور ہم کو پکارا تھا نوح نے سو کیا خوب پہنچنے والے ہیں ہم پکار پر، اور بچادیا اس کو اور اس کے گھر کو

الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا

اُس بڑی گھبراہٹ سے، اور رکھا اس کی اولاد کو وہی باقی رہنے والے۔ اور باقی رکھا

عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں۔ ہم یوں

نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۰ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۱ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝۸۲

بدلہ دیتے ہیں نیکی والوں کو، وہ ہے ہمارے ایماندار بندوں میں، پھر ڈبادیا ہم نے دوسروں کو۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم کو نوح (علیہ السلام) نے (نصرت کے لئے) پکارا (یعنی دعا کی) سو (ہم نے ان کی فریاد رسی کی اور) ہم خوب فریاد سننے والے ہیں اور ہم نے ان کو اور ان کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے (جو کفار کی تکذیب اور ایذا رسانی سے پیش آیا تھا) نجات دی (کہ طوفان سے کفار کو غرق کردیا اور ان کے تابعین کو بچالیا) اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا (اور کسی کی نسل نہیں چلی) اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات (مدت دراز کے لئے) رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں (یعنی خدا کرے ان پر تمام اہل عالم جن وانس وملائکہ سلام بھیجا کریں) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے، پھر ہم نے دوسرے طریق کے لوگوں کو (یعنی کافروں کو) غرق کردیا۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ ہم نے پہلی امتوں کے پاس بھی ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تھے، لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی اس لئے ان کا انجام بہت برا ہوا۔ اب یہاں سے اسی اجمال کی کچھ تفصیل بیان کی جارہی ہے، اور اس ضمن میں کئی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت نوحؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ یہاں چند باتیں جو خاص طور سے انہی آیات کی تفسیر سے متعلق ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں:۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ہمیں آواز دی تھی۔ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو سورۂ نوح میں مذکور ہے، یعنی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (اے میرے پروردگار، زمین پر کافروں میں سے ایک باشندہ بھی مت چھوڑ) یا جو سورۂ قمر میں مذکور ہے یعنی اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (میں مغلوب ہوں، میری مدد کیجئے) یہ دعا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کے بعد اس وقت کی تھی

جبکہ آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلانے پر اکتفا کرنے کے بجائے اُلٹا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ (اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا)۔ اکثر حضرات مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جو طوفان آیا تھا اس میں دنیا کی اکثر آبادی ہلاک ہوگئی تھی، اور اس کے بعد ساری دنیا کی نسل حضرت نوح علیہ السلام ہی کے تین بیٹوں سے چلی۔ ایک بیٹے کا نام سام تھا، اور ان کی اولاد سے اہل عرب اور اہل فارس وغیرہ کی نسل چلی۔ دوسرے بیٹے حام تھے، اور ان سے افریقی ممالک کی آبادیاں دنیا میں پھیلیں، بعض حضرات نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اسی نسل میں شامل کیا ہے۔ اور تیسرے بیٹے یافث تھے، ان سے ترک، منگول اور یاجوج و ماجوج کی نسلیں نکلی ہیں۔ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے ان میں سے حضرت نوحؑ کے ان تین بیٹوں کے سوا کسی اور سے کوئی نسل نہیں چلی۔

البتہ بعض علماء جن کی تعداد بہت کم ہے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ طوفانِ نوحؑ پوری دنیا میں نہیں، بلکہ صرف ارضِ عرب میں آیا تھا۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ارضِ عرب میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد باقی رہی، اور انہی سے اہل عرب کی نسل چلی، دنیا کے دوسرے خطوں میں دوسروں کی نسل چلنے کی اس آیت سے نفی نہیں ہوتی (بیان القرآن)

مفسرین کا ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ طوفانِ نوحؑ تو پوری دنیا میں آیا تھا، لیکن دنیا کی نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں سے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں سے چلی ہے جو کشتی میں حضرت نوحؑ کے ساتھ سوار تھے۔ یہ گروہ آیت میں حصر کو حصر اضافی قرار دے کر یہ کہتا ہے کہ یہاں اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ڈوبنے والوں کی نسل نہیں چلی (قرطبی)

قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے تیسرا قول بہت کم زور ہے اور پہلا قول سب سے بہتر ہے، اس لئے کہ اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے، جو امام ترمذیؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "سام اہلِ عرب کا باپ ہے، حام اہلِ حبشہ کا باپ ہے، اور یافث اہلِ روم کا" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن اور امام حاکمؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے (روح المعانی، ص ۹۸ ج ۲۳)

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (اور ہم نے اُن کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوحؑ پر سلام ہو عالم والوں میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے اُن کی نظر میں حضرت نوحؑ

کو ایسا معزز و مکرم بنادیا کہ وہ قیامت تک حضرت نوح علیہ السلام کے لئے سلامتی کی دعا کرتے رہیں گے چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ تمام وہ مذاہب جو اپنے آپ کو آسمانی کتابوں سے منسوب کرتے ہیں سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور تقدس کے قائل ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی آپ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

وقف لازم

وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِۦ لَإِبْرَٰهِيمَ ﴿٨٣﴾ إِذْ جَآءَ رَبَّهُۥ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٤﴾

اور اسی کی راہ والوں میں ہے ابراہیم۔ جب آیا اپنے رب کے پاس لیکر دل نروگا

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿٨٥﴾ أَئِفْكًا ءَالِهَةً دُونَ

جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کیا پوجتے ہو۔ کیا جھوٹ بنائے ہوئے حاکموں کو اللہ کے

ٱللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿٨٦﴾ فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٨٧﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً

سوا چاہتے ہو، پھر کیا خیال کیا ہے تم نے پروردگار عالم کو، پھر نگاہ کی ایک بار

فِى ٱلنُّجُومِ ﴿٨٨﴾ فَقَالَ إِنِّى سَقِيمٌ ﴿٨٩﴾ فَتَوَلَّوْا۟ عَنْهُ مُدْبِرِينَ ﴿٩٠﴾

تاروں میں، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں۔ پھر پھر گئے وہ اس سے پیٹھ دے کر

فَرَاغَ إِلَىٰٓ ءَالِهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿٩١﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنطِقُونَ ﴿٩٢﴾

پھر جا گھسا ان کے بتوں میں پھر بولا تم کیوں نہیں کھاتے۔ تم کو کیا ہے کہ نہیں بولتے،

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِٱلْيَمِينِ ﴿٩٣﴾ فَأَقْبَلُوٓا۟ إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ﴿٩٤﴾ قَالَ

پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے۔ پھر لوگ آئے اس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے بولا

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ﴿٩٥﴾ وَٱللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

کیوں پوجتے ہو جو آپ تراشتے ہو؟ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

قَالُوا۟ ٱبْنُوا۟ لَهُۥ بُنْيَٰنًا فَأَلْقُوهُ فِى ٱلْجَحِيمِ ﴿٩٧﴾ فَأَرَادُوا۟ بِهِۦ

بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں۔ پھر چاہنے لگے اس پر

كَيْدًا فَجَعَلْنَٰهُمُ ٱلْأَسْفَلِينَ ﴿٩٨﴾

بڑا داؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) کے طریقہ والوں میں سے (یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولی عقائد میں نوح علیہ السلام کے ساتھ متفق تھے) ابراہیم بھی تھے (ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے) جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے (صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل بدعقیدگی اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس واہیات چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا (معبود بنانا) چاہتے ہو تو تمہارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے، (یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ یعنی اول تو ایسا نہ ہونا چاہئے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے رفع کرو۔ غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی تہوار آیا، قوم نے اُن سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو) سو ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں (اس لئے میلہ میں نہیں جا سکتا) غرض وہ لوگ ان کا یہ عذر سن کر اُن کو چھوڑ کر چلے گئے (کہ ناحق بیماری میں ان کو اور ان کی وجہ سے اوروں کو تکلیف ہوگی) تو یہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) اُن کے بتوں میں جا گھسے اور (استہزاء کے طور پر ان سے) کہنے لگے کیا تم (یہ چڑھاوے جو تمہارے سامنے رکھے ہیں) کھاتے نہیں ہو (اور) تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر اُن پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (اور کلہاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا) سو ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ اُن کے پاس دوڑتے ہوئے (گھبراتے ہوئے غصہ میں) آئے اور (گفتگو شروع ہوئی) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود (اپنے ہاتھ سے) تراشتے ہو (تو جو تمہارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا؟) حالانکہ تم کو اور تمہاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو سب کو، اللہ ہی نے پیدا کیا ہے (سو عبادت اسی کی کرنا چاہئے) وہ لوگ (جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے تو جھنجھلا کر باہم) کہنے لگے کہ ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو اور اس میں آگ دہکا کر ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو، غرض ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ برائی کرنی چاہی تھی (کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا (جس کا قصہ سورۂ انبیاء میں گذر چکا ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعے ذکر کئے ہیں، دونوں واقعے ایسے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اللہ کے واسطے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ جو مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ ہے، اور اس کی تفصیلات سورۂ انبیاء میں گذر چکی ہیں، البتہ یہاں جس انداز میں اس کو بیان کیا گیا ہے اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ، شیعۃ عربی زبان میں اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بنیادی نظریات اور طور طریق میں یکساں ہوں۔ اور یہاں ظاہر یہی ہے کہ شیعتہ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیشرو نبی حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے پر تھے، اور بنیادی اصولِ دین میں دونوں کا مکمل اتفاق تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کی شریعتیں بھی یکساں یا ملتی جلتی ہوں۔ واضح رہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کا وقفہ ہے، اور ان دونوں کے درمیان حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہوا (کشاف، ص ۴۸ ج ۴)

اِذْ جَاۗءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ، اس کے ٹھیٹھ لفظی معنی یہ ہیں: "جبکہ وہ آئے اپنے پروردگار کے پاس صاف دل لے کر"۔ اور پروردگار کے پاس آنے سے مراد ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنا، اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا۔ اس کے ساتھ صاف دل کی قید لگا کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی عبادت اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہے جب تک کہ عبادت کرنے والے کا دل غلط عقیدوں اور بُرے جذبات سے پاک نہ ہو، اگر غلط عقیدے کے ساتھ کوئی عبادت کی جائے تو خواہ عبادت گذار نے اس میں کتنی محنت اٹھائی ہو وہ قابلِ قبول نہیں۔ اسی طرح اگر عبادت کرنے والے کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا ہو یا کوئی مادی منفعت ہو تو وہ عبادت قابلِ تعریف نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ، ان آیتوں کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک خاص دن میں تہوار منایا کرتی تھی، جب وہ دن آیا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت دی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کے لئے چلیں

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جشن میں ساتھ جائیں گے تو شاید ہمارے دین سے متاثر ہو جائیں اور اپنے دین کی دعوت چھوڑ دیں (درمنثور و ابن جریر وغیرہ) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع سے دوسرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب ساری قوم جشن منانے چلی جائے گی تو میں ان کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ ڈالوں گا، تاکہ یہ لوگ واپس آ کر اپنے جھوٹے معبودوں کی بے بسی کا عملی نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ اپنے بتوں کو بے بس دیکھ کر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہو اور وہ شرک سے توبہ کر لے۔ اس غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار فرما دیا لیکن انکار کا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ پہلے ایک نگاہ بھر کر ستاروں کو دیکھا اور پھر کہا کہ "میں بیمار ہوں" قوم والوں نے آپ کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا اور جشن منانے چلے گئے۔

اس واقعے سے متعدد تفسیری اور فقہی مباحث متعلق ہیں، یہاں ان کا خلاصہ بترتیب

ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد: سب سے پہلی بحث تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے سے پہلے جو ستاروں پر نظر ڈالی اس کا مقصد کیا تھا؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی عمل تھا، کسی اہم بات کو سوچتے ہوئے انسان بعض اوقات بے خیال آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے، جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس دعوت کو کس طرح ٹالوں؟ اسی سوچ کے عالم میں آپ نے بے خیال ستاروں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد جواب دیا ستاروں پر نظر ڈالنے کی یہ تشریح اگرچہ بے غبار معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کے پیش نظر اسے درست ماننا مشکل ہے اول تو اس لئے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کے صرف اہم اور ضروری اجزاء کو بیان فرماتا ہے اور غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے خود انہی آیتوں میں واقعے کے کئی اجزاء محذوف ہیں، یہاں تک کہ اس کا پورا پس منظر بھی بیان نہیں کیا گیا، اس لئے یہ بات بڑی ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے واقعے کے پس منظر کو تو طوالت کے خیال سے چھوڑ دیا ہو اور ایک قطعی غیر اختیاری عمل جس کا واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہ تھا اسے پوری ایک آیت میں بیان فرمایا ہو۔ دوسرے اگر ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص حکمت پیش نظر نہیں تھی بلکہ یہ ایک غیر اختیاری عمل تھا تو عربی زبان کے قواعد کی رو سے فَنَظَرَ نَظْرَةً اِلَى النُّجُوْمِ کہنا چاہئے تھا فِى النُّجُوْمِ نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص مصلحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر تھی، اسی لئے قرآن کریم نے اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اب وہ

مصلحت کیا تھی؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ در اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کی بڑی شیدائی تھی، وہ ستاروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کاموں کا تعین کیا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر جو جواب دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم والے یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام — اپنی بیماری کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ ستاروں کے حساب پر غور کر کے کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بذات خود علم نجوم کے قائل نہ ہوں، لیکن جشن کی شرکت سے اپنی مخلصی کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا جو ان کی نظر میں زیادہ قابل اعتماد ہو، اور چونکہ آپ نے زبان سے علم نجوم کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ یہ بتایا کہ ستاروں کو دیکھنے سے میرا مقصد علم نجوم سے مدد لینا ہے، بلکہ صرف نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا، اس لئے اس میں جھوٹ کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوا۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے ان کافروں کی ہمت افزائی ہوئی ہوگی جو نہ صرف علم نجوم کے قائل تھے، بلکہ ستاروں کو دنیا کے واقعات میں مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ہمت افزائی تو تب ہوتی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں انہیں اس حقیقت کے ساتھ ان کی گمراہیوں پر متنبہ نہ فرماتے، یہاں تو یہ ساری تدبیر ہی اس لئے جا رہی تھی کہ انہیں توحید کی دعوت زیادہ سے زیادہ مؤثر انداز میں دی جائے، چنانچہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر بیان فرما دیا، اس لئے محض اس مبہم عمل سے کافروں کی ہمت افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، یہاں اصل مقصد جشن کی شرکت سے اپنی جان چھڑانا تھا، تاکہ دعوت حق کے لئے زیادہ مؤثر فضا پیدا کی جا سکے۔ اس مقصد کے لئے ایہام کا یہ طریقہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

ستاروں کی طرف دیکھنے کی یہ تشریح اکثر مفسرین سے منقول ہے اور حکیم الامت حضرت تھانوی نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

علم نجوم کی شرعی حیثیت | اس آیت کے تحت دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ علم نجوم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہاں اختصار کے ساتھ اس سوال کا جواب عرض کیا جاتا ہے۔

یہ تو ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند سورج اور ستاروں میں کچھ ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خاصیات ایسی ہیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے، مثلاً سورج کے قرب و بُعد سے گرمی اور سردی کا پیدا ہونا، چاند کے اتار چڑھاؤ سے سمندر میں مد و جزر وغیرہ، اب بعض حضرات کا

کیونکہ حق تو یہ ہے کہ ان ستاروں کی خصوصیات صرف اتنی ہی ہیں جتنی مشاہدات سے معلوم ہوتی ہیں، اور بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے علاوہ بھی ستاروں کی گردش کے کچھ ایسے خواص ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کے آئندہ حالات پر اثر ڈالتے ہیں، ایک انسان کے لئے کسی ستارے کا کسی خاص برج میں چلے جانا مسرتوں اور کامیابیوں کا سبب بنتا ہے، اور کسی کے لئے غموں اور ناکامیوں کا، پھر بعض لوگ تو ان ستاروں ہی کو کامیابیوں اور ناکامیوں کے معاملہ میں مؤثر حقیقی مانتے ہیں، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس نے ستاروں کو ایسے خواص عطا کر دیئے ہیں، اس لئے دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح وہ بھی انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک سبب ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ستاروں کو مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ ذاتی تصرفات اور قوت ستاروں ہی کے اندر مانتے ہیں، ستارے ہی دنیا کے تمام واقعات کے فیصلے کرتے ہیں تو بلاشبہ ان کا خیال غلط اور باطل ہے اور یہ عقیدہ انسان کو شرک کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اہل عرب بارش کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خاص ستارہ (جسے "نوء" کہا جاتا تھا) بارش برساتا ہے، اور وہ بارش کے لئے مؤثر حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقیدے کی سخت تردید فرمائی ہے جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔

رہے وہ لوگ جو دنیوی واقعات میں مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اللہ نے ستاروں کو ایسے خواص عطا فرمائے ہیں جو سبب کے درجہ میں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح بارش برسانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کا ظاہری سبب بادل ہیں، اسی طرح تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کی اصل وجہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے، لیکن یہ ستارے ان کامیابیوں اور ناکامیوں کا سبب بن جاتے ہیں، سو یہ خیال ثابت نہیں ہے اور قرآن و حدیث سے اس خیال کی نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تردید۔ لہٰذا یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی گردش اور ان کے طلوع و غروب میں کچھ ایسے اثرات رکھے ہوں، لیکن ان اثرات کی کھوج کرنے کے لئے علم نجوم کی تحصیل اس علم پر اعتماد اور اس کی بناء پر مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنا بہر حال ممنوع اور ناجائز ہے۔ اور احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

اِذَا ذُکِرَ الْقَدَرُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَتِ النُّجُوْمُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَ اَصْحَابِیْ فَاَمْسِکُوْا	جب تقدیر کا ذکر چھڑے تو رک جاؤ (یعنی اس میں زیادہ غور و خوض اور بحث مباحثہ نہ کرو) اور جب ستاروں کا ذکر چھڑے تو

کوشیار دیلمی نے علم نجوم پر اپنی کتاب المجمل فی الاحکام میں لکھا ہے:

"علم نجوم ایک غیر مدلل علم ہے، اور اس میں انسان کے وسوسوں اور گمانوں کے لئے بڑی گنجائش ہے" (روح المعانی، ص ۱۱۶ ج ۲۳)

علامہ آلوسیؒ نے اور بھی مستند علماء نجوم کے اسی قسم کے اقوال نقل فرمائے ہیں، بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں ہے اور اس میں غلطیوں کے بے حساب احتمالات ہوتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس علم کی تحصیل میں لگتے ہیں وہ اسے بالکل قطعی اور یقینی علم کا درجہ دے بیٹھتے ہیں، اسی کی بنا پر مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں، اسی کی وجہ سے دوسروں کے بارے میں بھی بُری رائیں قائم کر لیتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس علم کا جنون بسا اوقات انسان کو علم غیب کے دعووں تک پہنچا دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز بے شمار مفاسد پیدا کرنے والی ہے۔

علم نجوم کی ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمر عزیز کو ایک بے فائدہ کام میں صرف کرنے کے مرادف ہے، جب اس سے کوئی نتیجہ یقینی طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا تو ظاہر ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ علم چنداں مددگار نہیں ہو سکتا۔ اب خواہ مخواہ ایک بے فائدہ چیز کے پیچھے پڑنا اسلامی شریعت کی رُوح اور مزاج کے بالکل خلاف ہے، اس لئے اس کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب

اس آیت سے متعلق تیسرا اشکال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کی دعوت کے جواب میں جو "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" (میں بیمار ہوں) فرمایا تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت واقعی بیمار تھے؟ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت ایسے بیمار نہیں تھے کہ قوم کے ساتھ نہ جا سکیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کیسے ارشاد فرمائی؟

اس کا جواب جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "توریہ" کیا تھا، "توریہ" کا مطلب ہے "کوئی ایسی بات کہنا جو بظاہر واقعہ کے خلاف ہو، لیکن کہنے والے نے اس سے کوئی ایسے دُور کے معنی مراد لئے ہوں جو واقعہ کے مطابق ہوں"۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو جملہ ارشاد فرمایا اس کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ "میں اس وقت بیمار ہوں" لیکن آپ کی اصل مراد یہ نہیں تھی۔ اب اصل مراد کیا تھی؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے آپ کا مقصد وہ طبعی انقباض تھا جو آپ کو اپنی قوم کی مشرکانہ حرکات دیکھ دیکھ کر پیدا

ہو رہا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں "سقیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "مریض" کے مقابلہ میں بہت ہلکا لفظ ہے، اور اس کا مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ "میری طبیعت ناساز ہے"، ظاہر ہے کہ اس جملہ میں صحیح انقباض کے مفہوم کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "انی سقیم" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ "میں بیمار ہونے والا ہوں"، اس لئے کہ عربی زبان میں اسم فاعل کا صیغہ بکثرت زمانۂ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" اس کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "تم بھی مردہ ہو اور وہ بھی مردہ ہیں" لیکن ظاہر ہے کہ یہاں مراد یہ معنی ہیں کہ "تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں" اسی طرح "انی سقیم" کے معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مراد لئے تھے کہ "میں بیمار ہونے والا ہوں" اور یہ اس لئے فرمایا کہ موت سے پہلے پہلے ہر انسان کا بیمار ہونا یقینی امر ہے، اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے ذرا پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔

اور اگر کسی کا دل ان تاویلات پر مطمئن نہ ہو تو سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت اس وقت واقعۃً تھوڑی بہت ناساز تھی، لیکن بیماری ایسی نہ تھی جو جشن میں شرکت سے مانع ہوتی، آپ نے اپنی معمولی ناسازئ طبع کا ذکر ایسے ماحول میں کیا جس سے سننے والے یہ سمجھے کہ آپ کو کوئی بڑی بیماری لاحق ہے، جس کی وجہ سے آپ واقعی ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کی یہ تشریح سب سے زیادہ معقول اور اطمینان بخش ہے۔

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد "انی سقیم" کے لئے جو "کذبۃ" (جھوٹ) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے مراد "توریہ" ہے جس کی ظاہری شکل جھوٹ کی ہوتی ہے، لیکن متکلم کی مراد کے لحاظ سے وہ جھوٹ نہیں ہوتا، خود اسی حدیث کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

مَا مِنْهَا كِذْبَةٌ اِلَّا مَا حَلَّ بِهَا عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ	"ان میں سے کوئی جھوٹ ایسا نہیں جو اللہ کے دین کی مدافعت اور حمایت میں نہ بولا گیا ہو"

ان الفاظ نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں "کذب" اپنے عام معنی سے جدا مفہوم رکھتا ہے، اس حدیث سے متعلق قدرے تفصیلی بحث سورۂ انبیاء میں آیت "قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ" کے تحت

گذر چکی ہے۔

توریہ کا شرعی حکم اسی آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر توریہ کرنا جائز ہے۔ توریہ ایک تو قولی ہوتا ہے یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلاف واقعہ ہو اور باطنی مراد مطابق واقعہ۔ اور ایک توریہ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور درحقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو۔ اسے ایہام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا اکثر مفسرین کے قول کے مطابق ایہام تھا اور اپنے آپ کو بیمار کہنا توریہ۔

ضرورت کے موقع پر توریہ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ جس وقت آپ ہجرت کے لئے تشریف لیجا رہے تھے اور مشرکین آپ کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے تو راستے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ "یہ کون ہیں؟" حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا: ھٰذَا یَھْدِیْنِیْ (وہ میرے رہنما ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہیں) سننے والا یہ سمجھا کہ عام راستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں، اس لئے چھوڑ کر چل دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ دینی اور روحانی رہنما ہیں۔ (روح المعانی)

اسی طرح حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہوسکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی توریہ اور ایہام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے موقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے توریہ ثابت ہے شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا "کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی" وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپ نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جائیں گی ہاں جوان ہو کر جائیں گی۔

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہے، اور واقعہ کی تفسیر سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہیں۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور بولا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔ اے رب بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى
پھر خوشخبری دی ہم نے اس کو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں

فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا
خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے

تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ
تو مجھ کو پائے گا اگر اللہ نے چاہا سہارنے والا پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا

لِلْجَبِيْنِ ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا
اس کو ماتھے کے بل اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم تو نے سچ کر دکھایا خواب ہم یوں

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾
دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو بیشک یہی ہے صریح جانچنا

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾
اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کرنے کو بڑا اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں

سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ﴿١٠٩﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾ اِنَّهٗ
کہ سلام ہے ابراہیم پر ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو وہ ہے ہمارے

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾
ایمان دار بندوں میں اور خوشخبری دی ہم نے اس کو اسحاق کی جو نبی ہوگا نیک بختوں میں

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓي اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ
اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق پر اور دونوں کی اولاد میں نیکی والے ہیں اور بدکار بھی اپنے حق میں

مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾ ع
صریح

ع ۳ / ۳۹ / ۷

خلاصۂ تفسیر

اور ابراہیم علیہ السلام جب ان لوگوں کے یہاں سے روانہ ہوگئے تو کہنے لگے کہ میں تو

تم سے ہجرت کرکے) اپنے رب کی راہ میں کسی طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دیگا،
(چنانچہ ملک شام میں جا پہونچے اور یہ دعا کی کہ) اے میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے سو
ہم نے ان کو ایک حلیم مزاج فرزند کی بشارت دی (اور وہ فرزند پیدا ہوا اور ہوشیار ہوا، سو
جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگا، تو ابراہیم (علیہ السلام)
نے ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، اور یہ ثابت نہیں کہ حلقوم
کٹا ہوا بھی دیکھا یا نہیں، غرض آنکھ کھلی تو اسے اللہ کا حکم سمجھے کیونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے
اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوگئے پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے فرزند کی اس بارے میں کیا رائے
ہو اس کو اطلاع کر دینا ضروری تھا، اس لئے اس سے) فرمایا کہ برخوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو
(بامر الٰہی) ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان (اس میں
مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا ہے تو) آپ کو جو حکم ہوا ہے
آپ (بلا تامل) کیجئے انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے، غرض جب
دونوں نے خدا کے حکم کو تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) کروٹ پر لٹایا
اور چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم (شاباش)
تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا
اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو، غرض ان کو چھوڑ دیا، جان کی جان بچ گئی،
اور بلند درجات (الگ برآں عطا ہوئے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، کہ دونوں جہان کی
راحت انھیں عطا کرتے ہیں) حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان (جس میں بجز مخلص کامل کے دوسرا
برداشت نہیں کر سکتا تو ہم نے ایسے امتحان میں پورا اترنے پر صلہ بھی بڑا بھاری دیا) اور اس
میں جیسا امتحان ابراہیم علیہ السلام کا تھا اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی تھا، تو وہ صلہ میں
شریک ہوں گے، اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا، (کہ ابراہیم علیہ السلام سے وہ
ذبح کرایا گیا) اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو (چنانچہ
ان کے نام کے ساتھ اب تک "علیہ السلام" کہا جاتا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں،
(کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیتے ہیں) بیشک وہ ہمارے ایماندار
بندوں میں سے تھے اور ہم نے (ایک دوسرا انعام ان پر یہ کیا کہ) ان کو اسحاق کی بشارت دی کہ نبی و نیک بختوں
میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحاق پر برکتیں نازل کیں (ان برکتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ان کی نسل بہت
پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوتے رہے) اور (پھر آگے) ان دونوں کی نسل میں بعضے اچھے
بھی ہیں اور بعضے ایسے بھی جو (بدیاں کرکے) صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

معارف و مسائل

بیٹے کی قربانی کا واقعہ: ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا ایک دوسرا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی پیش کی، واقعہ کے بنیادی اجزاء خود ان آیات سے واضح ہو جاتے ہیں، بعض تاریخی تفصیلات آیتوں کی تفسیر کے ذیل میں آجائیں گی:

وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ (اور ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاتا ہوں) یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ اپنے اہلِ وطن سے بالکل مایوس ہو گئے، اور وہاں آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔ "رب کی طرف چلے جانے" سے مراد یہ ہے کہ میں دارالکفر کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کا مجھے اپنے رب کی طرف سے حکم ہوا ہے، اور جہاں میں اپنے پروردگار کی عبادت کر سکوں گا، چنانچہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہؑ اور اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو لے کر سفر پر روانہ ہوئے، اور عراق کے مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے بالآخر شام تشریف لے آئے۔ اس تمام عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لئے آپ نے وہ دعا فرمائی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے، یعنی:

رَبِّ هَبْ لِىْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (اے میرے پروردگار! مجھے ایک نیک فرزند عطا فرما) چنانچہ آپ کی یہ دعا قبول ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند کی بشارت کی خوشخبری سنائی:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (پس ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی)

"حلیم المزاج" فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہ مولود اپنی زندگی میں ایسے صبر و ضبط اور بردباری کا مظاہرہ کرے گا کہ دنیا اس کی مثال نہیں پیش کر سکے گی۔ اس فرزند کی ولادت کا واقعہ یہ ہوا کہ جب حضرت سارہؑ نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تو وہ سمجھیں کہ میں بانجھ ہو چکی ہوں، اُدھر فرعونِ مصر نے حضرت سارہؑ کو ایک باندی جن کا نام ہاجرہؑ تھا، خدمت گزاری کے لئے دیدی تھی، حضرت سارہؑ نے یہی ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کر دیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کر لیا، انہی ہاجرہؑ کے بطن سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے اور ان کا نام اسمٰعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىْ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْ اَذْبَحُكَ (سو جب وہ فرزند ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیمؑ نے فرمایا: برخوردار میں خواب

میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین رات متواتر دکھایا گیا (قرطبی) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اس لئے اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دو۔ یوں یہ حکم براہ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعہ بھی نازل کیا جا سکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی حکمت بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعہ دیئے ہوئے حکم میں انسانی نفس کے لئے تاویلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاویلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا (تفسیر کبیر)

اس کے علاوہ یہاں باری تعالیٰ کا اصل مقصد نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرانا تھا نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ انھیں ذبح کر ہی ڈالو، بلکہ منشاء یہ حکم دینا تھا کہ اپنی طرف سے انھیں ذبح کرنے کے سارے سامان کر کے اُن کے ذبح کا اقدام کر گذرو، اب یہ حکم اگر زبانی دیا جاتا تو اس میں آزمائش نہ ہوتی، اس لئے انھیں خواب میں دکھلایا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ذبح کا حکم ہوا ہے، اور وہ پوری طرح ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس طرح آزمائش بھی پوری ہو گئی اور خواب بھی سچا ہو گیا، یہ بات زبانی حکم کے ذریعہ ہوتی تو یا آزمائش نہ ہوتی، یا حکم کو بعد میں منسوخ کرنا پڑتا۔ یہ امتحان کس قدر سخت تھا؟ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ کے الفاظ بڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا، اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوت بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو، مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے (تفسیر مظہری)

فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (سو تم بھی سوچ لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکم الٰہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا، بلکہ ایک تو وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اترتا ہے؟ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی اطاعت کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن اطاعت کے لئے ہمیشہ راستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور حتی المقدور سہولت پر مبنی ہو، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر

کسی معاملے میں اپنے اوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو لیکن اُسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور و تکبر ٹپکتا ہو، اگر کہیں ایسی کوئی بات کہنے کی ضرورت ہو تو الفاظ میں اس کی رعایت ہونی چاہئے کہ ان میں اپنے بجائے اللہ پر بھروسہ کا اظہار ہو، اور جس حد تک ممکن ہو **تواضع کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔**

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (پس جب وہ دونوں جھک گئے) اَسْلَمَ کے معنی ہیں جھک جانا، مطیع ہو جانا، رام ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے، یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہو جانے کا ارادہ کر لیا، یہاں لَمَّآ (جب) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آچکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدام فداکاری اس قدر عجیب و غریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کر ہی نہیں سکتے۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی، ہر بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ آج تک منیٰ کے تین جمرات پر اسی محبوب عمل کی یاد کنکریاں مار کر منائی جاتی ہے، بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ انوکھی عبادت انجام دینے کے لئے قربان گاہ پر پہنچے تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان مجھے خوب اچھی طرح باندھ دیجئے، تاکہ میں زیادہ تڑپ نہ سکوں، اور اپنے کپڑوں کو بھی مجھ سے بچائیے، ایسا نہ ہو کہ ان پر میرے خون کی چھینٹیں پڑیں، تو میرا ثواب گھٹ جائے، اس کے علاوہ میری والدہ خون دیکھیں گی تو انھیں غم زیادہ ہوگا، اور اپنی چھری بھی تیز کر لیجئے، اور اسے میرے حلق پر ذرا جلدی جلدی پھیریئے گا، تاکہ آسانی سے میرا دم نکل سکے، کیونکہ موت بڑی سخت چیز ہے، اور جب آپ میری والدہ کے پاس جائیں تو ان سے میرا سلام کہہ دیجئے گا، اور اگر آپ میرا قمیص والدہ کے پاس لے جانا چاہیں تو لے جائیں، شاید اس سے انہیں کچھ تسلی ہو۔ اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایک باپ کے دل پر کیا گذر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ: "بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مددگار ہو"! یہ کہکر انھوں نے بیٹے کو بوسہ دیا، پُر نم آنکھوں سے انھیں باندھا۔ (مظہری) اور ا۔

وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (انھیں پیشانی کے بل خاک پر لٹا دیا) حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ اُنھیں اس طرح کروٹ پر لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا (مظہری)۔ لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے۔ اس لئے کہ جَبِیْنٌ عربی زبان میں پیشانی کی

دونوں کروٹوں کو کہتے ہیں، اور پیشانی کا درمیانی حصہ جَبْهَة کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کروٹ پر لٹانے سے کیا ہے، لیکن بعض دوسرے حضرات مفسرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اوندھے منہ زمین پر لٹا دیا۔ بہرصورت تاریخی روایات میں اس طرح لٹانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری چلانے لگے تو بار بار چلانے کے باوجود گلا کٹتا نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیتل کا ایک ٹکڑا بیچ میں حائل کر دیا تھا۔ اس موقع پر بیٹے نے خود یہ فرمائش کی کہ ابا جان! مجھے چہرے کے بل کروٹ سے لٹا دیجئے، اس لئے کہ جب آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے تو شفقتِ پدری جوش مارنے لگتی ہے، اور گلا پوری طرح کٹ نہیں پاتا، اس کے علاوہ چھری مجھے نظر آتی ہے تو مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اسی طرح لٹا کر چھری چلانی شروع کی

(تفسیر مظہری وغیرہ) واللہ اعلم

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ (اور ہم نے انہیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمہارے کرنے کا تھا اس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (خواب میں بھی غالباً صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں ذبح کرنے کے لئے چھری چلا رہے ہیں، اب یہ آزمائش پوری ہو چکی اس لئے اب انہیں چھوڑ دو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اپنے تمام جذبات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو ہم بالآخر اسے دنیوی تکلیف سے بھی بچا لیتے ہیں، اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا)۔ روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آسمانی آواز سن کر اوپر کی طرف دیکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک مینڈھا لئے کھڑے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیلؑ نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم

بہرحال یہ جنتی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا، اور انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کے بجائے اس کو قربان کیا۔ اس ذبیحہ کو 'عظیم' اس لئے کہا گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کی قربانی کے مقبول ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

(تفسیر مظہری وغیرہ)

ہے انھیں موت نہیں آسکتی ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ یہ کوئی بڑا امتحان ہوتا، اور نہ حضرت ابراہیمؑ اس کی انجام دہی میں کسی تعریف کے مستحق ہوتے، امتحان تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طرح یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ میرا بیٹا ذبح کرنے سے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ ذبح کرنے کا اقدام کریں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زندہ رہنے اور نبی بننے کی کوئی پیشگوئی نہیں فرمائی تھی۔

(۳) قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بچہ تھا، اس لئے کہ انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت ایک بیٹے کی دعا کی تھی، اسی دعا کے جواب میں انھیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے یہاں ایک حلیم لڑکا پیدا ہوگا، اور پھر اسی لڑکے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارا سلسلہ واقعات بتا رہا ہے کہ وہ لڑکا حضرت ابراہیمؑ کا پہلا بیٹا تھا، ادھر یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔

(۴) یہ بات بھی تقریباً طے شدہ ہے کہ بیٹے کی قربانی کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا ہے، اسی لئے اہل عرب میں برابر حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کے فدیہ میں جو مینڈھا جنت سے بھیجا گیا اس کے سینگ سالہا سال تک کعبہ شریف کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تائید میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، اور حضرت عامر شعبیؒ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ "میں نے اس مینڈھے کے سینگ کعبہ میں خود دیکھے ہیں" (ابن کثیر، ص ۸، ج ۴) اور حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ "اس مینڈھے کے سینگ مسلسل کعبہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب حجاج بن یوسف کے زمانے میں کعبۃ اللہ میں آتشزدگی ہوئی تو یہ سینگ بھی جل گئے" (ایضاً ص ۱۷، ج ۲) اب ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تشریف فرما رہے ہیں، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ذبح کا حکم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے۔

رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہؓ و تابعینؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام کو قرار دیا، سو ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

لکھا ہے کہ:-

اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن بظاہر یہ سب باتیں کعب الاحبارؓ سے ماخوذ ہیں، کیونکہ جب وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو حضرت عمرؓ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سنانے لگے، بعض اوقات حضرت عمرؓ ان کی باتیں سن لیتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی، اور انہوں نے بھی ان کی روایات سن کر انہیں نقل کرنا شروع کر دیا، ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(تفسیر ابن کثیرؒ، ص ۱۷، ج ۴)

حافظ ابن کثیرؒ کی یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی بنیاد اسرائیلی روایات ہی پر ہے، اسی لئے یہود و نصاریٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں موجودہ بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام! اس نے کہا میں حاضر ہوں تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا"

(پیدائش ۲۲: ۱ و ۲)

اس میں ذبیح کا مصداق حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اگر انصاف اور تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر تورات کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ کتاب پیدائش کی مذکورہ عبارت ہی میں "جو تیرا اکلوتا ہے" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، اسی باب میں آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ:-

"تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا" (پیدائش ۲۲: ۱۲)

اس جملے میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا تھا، ادھر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے اکلوتے بیٹے نہ تھے، "اکلوتے" کا اطلاق اگر کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، خود کتاب پیدائش ہی کی دوسری کئی عبارتیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش حضرت اسحٰق علیہ السلام

سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ملاحظہ فرمایئے:

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس کی ایک مصری لونڈی تھی، جس کا نام ہاجرہ تھا، اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی... اور خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا"

(پیدائش باب ۱۶ آیات ۱ و ۴ و ۱۰ و ۱۶)

نیز اگلے باب میں لکھا ہے:

"اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے... اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا... تب ابرہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی؟ اور ابرہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے، تب خدا نے فرمایا کہ بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا، تو اس کا نام اضحاق رکھنا۔ (پیدائش ۱۷: ۱۵ تا ۲۰)

اس کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے:

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔ (پیدائش

ان بیانات سے صاف واضح ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چودہ سال چھوٹے تھے، اور اس چودہ سال کے عرصہ میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے، اس کے برعکس حضرت اسحٰق علیہ السلام پر ایسا کوئی وقت نہیں گذرا جس میں وہ اپنے والد کے اکلوتے ہوں، اب اس کے بعد جب کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں بیٹے کی قربانی کا ذکر آتا ہے، تو اس میں "اکلوتا" کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے کہ اس سے مراد اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور کسی یہودی نے اس کے ساتھ "اضحاق" کا لفظ محض اس لئے بڑھا دیا ہے تاکہ یہ فضیلت بنو اسمٰعیل کے بجائے بنو اسحٰق کو حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بائبل کی اسی کتاب پیدائش میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی ہے وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ:

"یقیناً میں اسے (یعنی حضرت اسحٰقؑ کو) برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی" (پیدائش ۱۷: ۱۶)

اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ خبر دی جا چکی ہو کہ وہ صاحب اولاد ہوگا، اور "قومیں اس کی نسل سے ہوں گی" اس کو قربان کرنے کا حکم

کیا جاسکتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حضرت اسحٰق علیہ السلام سے متعلق نہیں تھا، **بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق تھا۔**

بائبل کی ان عبارتوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ کا یہ خیال کس قدر صحیح ہے کہ:

"یہودیوں کی کتب مقدسہ میں تصریح ہے کہ جب اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی، اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر سو سال تھی، اور انہی کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم دیا تھا، اور ایک اور نسخے میں "اکلوتے" کے بجائے "پہلوٹھے" کا لفظ ہے، پس یہودیوں نے یہاں "اسحٰق" کا لفظ اپنی طرف سے بہتاناً بڑھا دیا اور اس کو درست قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں کی تصریحات کے خلاف ہے، اور یہ لفظ انہوں نے اس لئے بڑھایا کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے جدِ امجد ہیں، اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عربوں کے، پس یہودیوں نے حسد کی وجہ سے یہ لفظ بڑھا دیا اور اب "اکلوتے" کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ وہ "بیٹا جس کے سوا اس وقت کوئی اور تمہارے پاس موجود نہیں ہے"، کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ اس وقت وہاں نہیں تھیں، اس لئے حضرت اسحٰقؑ کو اس معنی میں اکلوتا کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ بالکل غلط تاویل ہے اور باطل تحریف ہے، اس لئے کہ "اکلوتا" اس بیٹے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اس کے سوا کوئی بیٹا نہ ہو" (تفسیر ابن کثیر، ص ۱۴، ج ۴)

حافظ ابن کثیرؒ ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء یہود میں سے ایک شخص حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس سے پوچھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کون سے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا؟ تو اس نے کہا کہ "خدا کی قسم! امیر المؤمنین! وہ اسمٰعیل علیہ السلام تھے، یہودی اس بات کو خوب جانتے ہیں، لیکن وہ آپ عرب لوگوں سے حسد کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں"۔ (ص ۱۸ ج ۴)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے

بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ اس آیت کے ذریعہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید کر دی گئی ہے کہ ان حضرت انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہونا ہی ان کی فضیلت و نجات کے لئے کافی ہے۔ اس آیت نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ کسی نیک انسان سے نسبی تعلق نجات کے لئے کافی نہیں، اصل مدار انسان کے اپنے عقیدہ و عمل پر ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ
اور ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر اور بچا دیا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو
الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا
اس بڑی گھبراہٹ سے اور ان کی مدد کی تو رہے وہی غالب اور دی ہم نے ان کو
الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا
کتاب واضح اور سمجھائی ان کو سیدھی راہ اور باقی رکھا
عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
ان پر پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر ہم یوں دیتے ہیں
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٢﴾
بدلہ نیکی کرنے والوں کو تحقیق وہ دونوں ہیں ہمارے ایماندار بندوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) پر بھی احسان کیا (کہ ان کو نبوت اور دیگر کمالات عطا فرمائے) اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو بڑے غم سے (یعنی فرعون کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکالیف سے) نجات دی اور ہم نے ان سب کی (فرعون کے مقابلے میں) مدد کی، سو (آخر میں) یہی لوگ غالب آگئے (کہ فرعون کو غرق کر دیا گیا اور یہ صاحب حکومت ہوگئے) اور ہم نے (فرعون کے غرق ہونے کے بعد ان دونوں صاحبوں) کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام کو بالاصالۃ اور ہارون علیہ السلام کو تبعاً) واضح کتاب دی (مراد تورات ہے کہ اس میں احکام واضح طور پر مذکور تھے) اور ہم نے ان کو سیدھے رستہ پر قائم رکھا، (جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انہیں نبی معصوم بنایا) اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں

(مدت ہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام (چنانچہ دونوں حضرات کے ناموں کے ساتھ آج تک علیہ السلام کہا جاتا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، (کہ ان کو ثنا اور دعا کا مستحق بنا دیتے ہیں) بیشک وہ دونوں ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے (اس لئے صلہ بھی کامل عطا ہوا)۔

معارف ومسائل

ان آیتوں میں تیسرا واقعہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا بیان کیا گیا ہے، یہ واقعہ متعدد مقامات پر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے یہاں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اسے ذکر کرنے سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت شعار بندوں کی کس طرح مدد فرماتے ہیں، اور انھیں کیسے کیسے انعامات سے نوازتے ہیں چنانچہ یہاں حضرت موسیٰ و ہارون پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے، انعامات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک مثبت انعامات، یعنی فائدے پہنچانا، وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ میں اسی قسم کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے منفی انعامات، یعنی نقصان سے بچانا، اگلی آیات میں اسی قسم کی تفصیل ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور بیشک الیاس ہے رسولوں میں۔ جب اس نے کہا اپنی قوم کو کیا تم کو ڈر نہیں،

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ

کیا تم پکارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو۔ جو اللہ ہے رب تمہارا

وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا، پھر اس کو جھٹلایا سو وہ آنے والے ہیں پکڑے ہوئے،

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾

مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے۔ اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں کہ

سَلٰمٌ عَلٰٓي اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

سلام ہے الیاسین پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۲﴾

وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور الیاس (علیہ السلام) بھی (بنی اسرائیل کے) پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جبکہ انھوں نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے (کہ وہ بت پرستی میں مبتلا تھی) فرمایا کہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم بعل کو (جو ایک بت کا نام تھا) پوجتے ہو اور اس (کی عبادت) کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے (کیونکہ اور لوگ تو صرف بعض اشیاء کی تحسین و ترکیب پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ بھی عرضی، اور وہ تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے، پھر کوئی دوسرا جان نہیں ڈال سکتا اور وہ جان ڈالتا ہے اور وہ) معبود برحق ہے (اور) تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے، سو ان لوگوں نے اس (توحید کے دعوے میں) اُن کو جھٹلایا، سو (اس جھٹلانے کی شامت میں) وہ لوگ (عذاب آخرت میں) پکڑے جاویں گے، مگر جو اللہ کے خاص بندے (یعنی ایمان والے) تھے (وہ ثواب واجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (مدتہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر (کہ یہ بھی الیاس علیہ السلام کا نام ہے) سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بناتے ہیں) بیشک وہ ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت الیاس علیہ السلام ان آیات میں چوتھا واقعہ حضرت الیاس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ آیات کی تفسیر سے قبل حضرت الیاس علیہ السلام سے متعلق چند معلومات درج ذیل ہیں:۔

قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر صرف دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۂ انعام میں اور دوسرے سورۂ صافات کی انہی آیتوں میں۔ سورۂ انعام میں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں آپ کا اسم گرامی شمار کرایا گیا ہے اور کوئی واقعہ مذکور نہیں، البتہ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی دعوت و تبلیغ کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔

چونکہ قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کے حالات تفصیل سے مذکور نہیں ہیں،

اور نہ مستند احادیث میں آپ کے حالات آئے ہیں۔ اس لئے آپ کے بارے میں کتب تفسیر کے اندر مختلف اقوال اور متفرق روایات ملتی ہیں جن میں سے بیشتر بنی اسرائیل کی روایات سے ماخوذ ہیں۔

متقدمین میں سے ایک مختصر گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "الیاس" حضرت ادریس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، اور ان دونوں شخصیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں ہے (در منثور ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۵) لیکن محققین نے ان اقوال کی تردید کی ہے۔ قرآن کریم نے بھی حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کا اس طرح جداجدا تذکرہ فرمایا ہے، کہ دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، اسی لئے حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ دونوں الگ الگ رسول ہیں (البدایہ والنہایہ ص ۳۳۹ ج ۱)

بعثت کا زمانہ اور مقام قرآن و حدیث سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کب اور کہاں مبعوث ہوئے تھے، لیکن تاریخی اور اسرائیلی روایات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ آپ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جانشینوں کی بدعملی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی، ایک حصہ یہوداہ یا یہودیہ کہلاتا تھا، اور اس کا مرکز بیت المقدس تھا، اور دوسرا حصہ اسرائیل کہلاتا تھا اور اس کا پایۂ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام اردن کے علاقہ جلعاد میں پیدا ہوئے تھے، اُس وقت اسرائیل کے ملک میں جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام بائبل میں اخی اب اور عربی تواریخ و تفاسیر میں اجب یا اخب مذکور ہے۔ اس کی بیوی ایزبل بعل نامی ایک بُت کی پرستار تھی، اور اسی نے اسرائیل میں بعل کے نام پر ایک بڑی قربان گاہ تعمیر کر کے تمام بنو اسرائیل کو بُت پرستی کے راستہ پر لگا دیا تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اس خطے میں جا کر توحید کی تعلیم دیں، اور اسرائیلیوں کو بُت پرستی سے روکیں (ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر ص ۵۳، ج ۲۳ و ابن کثیر ص ۹ ج ۴ و تفسیر مظہری ص ۴۲ ج ۸ اور بائبل کی کتاب سلاطین اول ۱۶: ۲۹ تا ۳۳ و ۱۷: ۱)

قوم کے ساتھ کشمکش دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کے ساتھ شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ قرآن کریم چونکہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس لئے اس نے اس کشمکش کا مفصل حال بیان کرنے کے بجائے صرف اتنی بات بیان فرمائی ہے جو عبرت و موعظت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی، یعنی یہ کہ ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا، اور چند مخلص بندوں کے سوا کسی نے حضرت الیاس

علیہ السلام کی بات نہ مانی اس لئے آخرت میں انہیں ہولناک نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بعض مفسرین نے یہاں اس کشمکش کے مفصل حالات بیان فرمائے ہیں، مروجہ تفسیروں میں حضرت الیاس علیہ السلام کا سب سے مبسوط تذکرہ تفسیر مظہری میں علامہ بغوی کے حوالے سے کیا گیا ہے، اس میں جو واقعات مذکور ہیں وہ تقریباً تمام تر بائبل سے ماخوذ ہیں، دوسری تفسیروں میں بھی ان واقعات کے بعض اجزاء حضرت وہب بن منبہ اور کعب احبار وغیرہ کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں جو عموماً اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں۔

ان تمام روایات سے خلاصہ کے طور پر جو قدر مشترک نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب اور اس کی رعایا کو بعل نامی بت کی پرستش سے روک کر توحید کی دعوت دی، مگر دو ایک حق پسند افراد کے سوا کسی نے آپ کی بات نہیں مانی، بلکہ آپ کو طرح طرح پریشان کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اخی اب اور اس کی بیوی ایزبل نے آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے۔ آپ نے ایک دور دراز غار میں پناہ لی، اور عرصہ دراز تک وہیں مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ نے دعا فرمائی کہ اسرائیل کے لوگ قحط سالی کا شکار ہو جائیں، تاکہ اس قحط سالی کو دور کرنے کے لئے آپ اُن کو معجزات دکھائیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں، چنانچہ انھیں شدید قحط میں مبتلا کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اخی اب سے ملے، اور اس سے کہا کہ یہ عذاب اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہے، اور اگر تم اب بھی باز آجاؤ تو یہ عذاب دور ہو سکتا ہے۔ میری سچائی کے امتحان کا بھی یہ بہترین موقع ہے، تم کہتے ہو کہ اسرائیل میں تمہارے بعل کے ساڑھے چار سو نبی ہیں، تم ایک دن اُن سب کو میرے سامنے جمع کرو، وہ بعل کے نام پر قربانی پیش کریں، اور میں اللہ کے نام پر قربانی کروں گا، جس کی قربانی کو آسمانی آگ آکر بھسم کر دے گی، اس کا دین سچا ہوگا، سب نے اس تجویز کو خوشی سے مان لیا۔

چنانچہ کوہ کرمل کے مقام پر یہ اجتماع ہوا، بعل کے جھوٹے نبیوں نے اپنی قربانی پیش کی، اور صبح سے دوپہر تک بعل سے التجائیں کرتے رہے، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی، اس پر آسمان سے آگ نازل ہوئی، اور اس نے حضرت الیاس علیہ السلام کی قربانی کو بھسم کر دیا، یہ دیکھ کر بہت سے لوگ سجدے میں گر گئے، اور اُن پر حق واضح ہو گیا، لیکن بعل کے جھوٹے نبی اب بھی نہ مانے، اس لئے حضرت الیاس علیہ السلام نے ان کو وادیِ قیشون میں قتل کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد موسلادھار بارش بھی ہوئی، اور پورا خطہ پانی سے نہال ہو گیا، لیکن

اخی اب کی بیوی ایزبل کی اب بھی آنکھ نہ کھلی وہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لانے کے بجائے الٹی ان کی دشمن ہوگئی، اور اس نے آپ کو قتل کرنے کی تدبیریں شروع کردیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام یہ سن کر پھر سامریہ سے روپوش ہوگئے، اور کچھ عرصہ کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے ملک یہودیہ میں تبلیغ شروع کردی، کیونکہ رفتہ رفتہ بعل پرستی کی وبا وہاں بھی پھیل چکی تھی۔ وہاں کے بادشاہ یہورام نے بھی آپ کی بات نہ سنی، یہاں تک کہ وہ حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق تباہ و برباد ہوا۔ چند سال بعد آپ دوبارہ اسرائیل تشریف لائے اور یہاں پھر اخی اب اور اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی، مگر وہ بدستور اپنی بدعملیوں میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ انہیں بیرونی حملوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بنادیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو واپس بلالیا۔

کیا حضرت الیاس علیہ السلام حیات ہیں؟

مؤرخین اور مفسرین کے درمیان یہاں یہ مستقل بحث آئی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے؟ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے جو طویل روایت بیان کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک آتشیں گھوڑے پر سوار کرکے آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا تھا، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں (مظہری ص [illegible] ج ۸)۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی ابن عساکرؒ اور حاکمؒ وغیرہ کے حوالہ سے کئی روایات ایسی نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کعب الاحبارؒ سے منقول ہے کہ چار انبیاء علیہم السلام اب تک زندہ ہیں، دو زمین میں، حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ اور دو آسمان میں، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ادریس علیہم السلام (درمنثور ص ۲۸۵ و ۲۸۶ ج ۵) یہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام ہر سال رمضان کے مہینہ میں بیت المقدس میں جمع ہوتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں (تفسیر قرطبی، ص ۱۱۶ ج ۱۵)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح قرار نہیں دیا۔ وہ ان جیسی روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:-

وهو من الإسرائيليات التي لا تصدق ولا تكذب بل الظاهر أن صحتها بعيدة، (البداية والنهاية، ص ۳۳۸ ج ۱)

"یہ ان اسرائیلی روایتوں میں سے ہے جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی صحت بعید ہے۔"

نیز فرماتے ہیں:-

"ابن عساکر نے کئی روایتیں ان لوگوں کی نقل کی ہیں جو حضرت الیاس علیہ السلام سے ملے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قابل اطمینان نہیں، یا تو اس لئے کہ ان کی

سند ضعیف ہیں یا اس لئے کہ جن اشخاص کی طرف یہ روایات منسوب کی گئی ہیں وہ مجہول ہیں" (البدایۃ والنہایۃ، ص ۳۳۹ ج ۱)

ظاہر یہی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے رفع آسمانی کا نظریہ اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے، بائبل میں لکھا ہے کہ :-

"اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا" (۲۔ سلاطین ۲ : ۱۱)

اسی وجہ سے یہودیوں میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ حضرت الیاس علیہ السلام دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، چنانچہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے اُن پر الیاس علیہ السلام ہونے کا شبہ ظاہر کیا، انجیل یوحنا میں ہے :

"انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں"
(یوحنا ۱ : ۲۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب احبارؒ اور وہب بن منبہؒ جیسے علماء نے جو اہل کتاب کے علوم کے ماہر تھے یہی روایتیں مسلمانوں کے سامنے بیان کی ہوں گی جن سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی کا نظریہ بعض مسلمانوں میں بھی پھیل گیا، ورنہ قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی یا آپ کا آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہوتا ہو، صرف ایک روایت مستدرک حاکمؒ میں ملتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ تبوک کے راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت الیاس علیہ السلام سے ہوئی۔ لیکن یہ روایت بتصریح محدثین موضوع ہے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں :-

بل ھو موضوع قبّح اللہ من وضعہ وماکنت احسب ولا أجوّز ان الجھل یبلغ بالحاکم الی ان یصحّح ھٰذا
(درمنثور، ص ۲۸۶ ج ۵)

"بلکہ یہ حدیث موضوع ہے، خدا برا کرے اس شخص کا جس نے یہ حدیث وضع کی، اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ امام حاکم کی بے خبری اس حد تک پہنچ سکتی ہے کہ وہ اس حدیث کو صحیح قرار دیں"

خلاصہ یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا زندہ ہونا کسی معتبر اسلامی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کیا جائے اور

لے واضح رہے کہ بائبل میں حضرت الیاس علیہ السلام کا نام ایلیاہ مذکور ہے۔

اسرائیلی روایات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کیا جائے کہ "نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب" کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر اور عبرت و موعظت کا مقصد اس کے بغیر بھی پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے:۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا (کیا تم بعل کو پوجتے ہو) بعل کے لغوی معنی شوہر اور مالک وغیرہ ہیں لیکن یہ اس بت کا نام تھا جسے حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔ بعل کی پرستش کی تاریخ بہت قدیم ہے شام کے علاقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی پرستش ہوتی تھی، اور یہ اُن کا سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے موسوم ہوا، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ حجاز کا مشہور بُت ہُبَل بھی یہی بعل ہے۔

(قصص القرآن، ص ۲۸ ج ۲)

وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ (اور اس کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے) اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور "احسن الخالقین" سب سے اچھا خالق کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ کوئی دوسرا بھی خالق ہو سکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن جھوٹے معبودوں کو تم نے خالق قرار دیا ہوا ہے وہ ان سب سے اونچی شان والا ہے۔ (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں "خالق" "صانع" (بنانے والا) کے معنے میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے، اس لئے کہ دوسرے صناع صرف اتنا ہی تو کرتے ہیں کہ مختلف اجزاء کو جوڑ کر کوئی چیز تیار کر لیتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ان کے بس سے باہر ہے، اور اللہ تعالیٰ معدوم اشیاء کو وجود بخشنے پر قدرتِ ذاتی رکھتا ہے (بیان القرآن)

غیر اللہ کی طرف تخلیق کی نسبت کا مطلب: یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ "خلق" کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، جس کا مطلب ہے کسی شے کو عدم محض سے قدرتِ ذاتی کے بل پر وجود میں لانا۔ اس لئے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں، لہٰذا ہمارے زمانے میں جو رواج چل پڑا ہے کہ اہلِ قلم کے مضامین شاعروں کے شعر اور مصوروں کی تصویروں کو اُن کی "تخلیقات" کہہ دیا جاتا ہے وہ بالکل جائز نہیں اور نہ اہلِ قلم کو ان مضامین کا خالق کہنا درست ہے۔ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُن کے رشحاتِ قلم کو "کاوش" یا "مضمون" وغیرہ کہنا چاہئے "تخلیق" نہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (سو اُن لوگوں نے اُن کو جھٹلایا سو وہ پکڑے جائیں گے) مطلب یہ ہے کہ انہیں اللہ کے سچے رسول کو جھٹلانے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ اس سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا کا انجام بد بھی۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی

تکذیب کے نتیجے میں یہوداہ اور اسرائیل دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اس تباہی کی تفصیل تفسیر مظہری میں اور بائبل کی کتاب سلاطین اوّل باب ۲۲ سلاطین دوم باب اوّل اور تواریخ دوم باب ۲۱ میں موجود ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ، یہاں "مخلصین" لام کے زبر کے ساتھ ہے، کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "خالص کئے ہوئے لوگ" یعنی وہ لوگ جنھیں اللہ نے اپنی طاعت اور اجر و ثواب کے لئے خالص کرلیا ہو، لہٰذا اس کا ترجمہ "مخلص" کے بجائے "برگزیدہ" زیادہ مناسب ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ "الیاسین" بھی الیاس علیہ السلام ہی کا ایک نام ہے، اہل عرب اکثر عجمی ناموں کے ساتھ یاء اور نون بڑھا دیتے ہیں، جیسے "سینا" سے "سینین" اسی طرح یہاں بھی دو حرف بڑھا دیئے گئے ہیں۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور تحقیق لوط ہے رسولوں میں سے ۔ جب بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے سارے گھر والوں کو

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ

مگر ایک بڑھیا کہ رہ گئی رہ جانے والوں میں ۔ پھر جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہم نے دوسروں کو ۔ اور تم گذرتے ہو

لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ان پر صبح کے وقت ۔ اور رات کو بھی، پھر کیا نہیں سمجھتے ؟

خلاصۂ تفسیر

اور بیشک لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ قابل ذکر ہے) جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا (یعنی ان کی بیوی) کے کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کردیا (جن کا قصہ کئی جگہ آچکا ہے) اور (اے اہل مکہ) تم تو ان کے (دیار و مساکن پر سفر شام میں کبھی) صبح ہوتے اور (کبھی) رات میں گزر کرتے ہو (اور آثار بربادی دیکھتے ہو) تو کیا (اس کو دیکھ کر) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو (کہ کفر کا کیسا انجام ہوا، اور جو آئندہ کفر کرے گا اس کے لئے بھی یہی اندیشہ ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں پانچواں واقعہ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ واقعہ پیچھے کئی مقامات پر گذر چکا ہے، اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اہل مکہ کو خاص طور پر یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تم شام کے تجارتی سفر میں سدوم کے اس علاقہ سے دن رات گذرتے ہو، جہاں یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ صبح اور رات کا ذکر خاص طور سے اس لئے فرمایا گیا کہ اہل عرب عموماً انہی اوقات میں یہاں سے گذرا کرتے تھے۔ اور قاضی ابو السعودؒ فرماتے ہیں کہ شاید سدوم کا یہ علاقہ راستے کی ایسی منزل پر واقع تھا کہ یہاں سے کوچ کرنے والے صبح کے وقت روانہ ہوتے تھے اور آنے والے شام کے وقت آتے تھے (تفسیر ابی السعود)

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۳۹﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿۱۴۰﴾

اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے۔ جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ

پھر قرعہ ڈلوایا تو نکلا خطا وار۔ پھر لقمہ کیا اس کو مچھلی نے اور وہ

مُلِيمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ

الزام کھایا ہوا تھا پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو۔ تو رہتا اسی کے پیٹ میں جس

إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَأَنْبَتْنَا

دن تک کہ مُردے زندہ ہوں۔ پھر ڈال دیا ہم نے اس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا۔ اور اُگایا ہم نے

عَلَيْهِ شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ ﴿۱۴۶﴾ وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ

اس پر ایک درخت بیل والا۔ اور بھیجا اس کو لاکھ آدمیوں پر یا

يَزِيدُونَ ﴿۱۴۷﴾ فَآمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۴۸﴾

اس سے زیادہ۔ پھر وہ یقین لائے پھر ہم نے زندہ رکھا ان کو ایک وقت تک

خلاصۂ تفسیر

اور بیشک یونس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ

(دیکھئے) جبکہ (انھوں نے اپنی قوم سے ایمان نہ لانے پر بحکم الٰہی عذاب کی پیشینگوئی کی، اور خود وہاں سے چلے گئے اور جب متعین وقت پر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم کو ایمان لانے کی غرض سے یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی، جب وہ نہ ملے تو سب نے متفق ہوکر حق تعالیٰ سے گریہ و زاری کی اور اجمالی طور پر ایمان لے آئے، اور وہ عذاب ٹل گیا، یونس علیہ السلام کو کسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی تو شرمندگی کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کرکے اپنی جگہ سے) بھاگ کر چلے (راہ میں دریا تھا، اس میں مسافروں سے بھری ہوئی کشتی تھی، پس) بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (کشتی میں سوار ہوگئے، کشتی والے کہنے لگے کہ ہم میں کوئی قصوروار ہے، اس کو کشتی سے علیحدہ کردینا چاہئے، اس شخص کو متعین کرنے کے سبب کا اتفاق اس پر ہوا کہ قرعہ ڈالا جاوے) سو یونس (علیہ السلام) بھی شریک قرعہ ہوئے تو (قرعہ میں) یہی ملزم ٹھہرے (یعنی انہی کا نام نکلا، پس انھوں نے اپنے کو دریا میں ڈال دیا، شاید کنارہ قریب ہوگا، شناوری کرکے کنارہ پر جا پہنچنے کا ارادہ ہوگا، پس شبہ خودکشی کا لازم نہیں آتا) پھر (جب دریا میں گرے تو ہمارے حکم سے) ان کو مچھلی نے (ثابت) نگل لیا اور یہ (اس وقت) اپنے کو (اس اجتہادی غلطی پر) ملامت کر رہے تھے (یہ تو دل سے توبہ ہوئی اور زبان سے بھی توحید و تسبیح کے ساتھ استغفار کر رہے تھے، جیسا دوسری آیت میں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ سو اگر وہ (اس وقت) تسبیح (اور استغفار) کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے (مطلب یہ کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ اسی کی غذا بنا دیئے جاتے، سو (چونکہ انھوں نے تسبیح اور توبہ کی اس لئے) ہم نے ان کو اس سے محفوظ رکھا اور مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) ان کو ایک میدان میں ڈال دیا (یعنی مچھلی کو حکم دیا کہ کنارہ پر اگل دے) اور وہ اس وقت مضمحل تھے (کیونکہ مچھلی کے پیٹ میں کافی ہوا اور غذا نہ پہونچی تھی) اور ہم نے (دھوپ سے بچانے کے لئے) اُن پر ایک بیلدار درخت بھی اگا دیا تھا (اور کوئی پہاڑی بکری انھیں دودھ پلا جاتی تھی) اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف (شہر نینوا میں موصل کے قریب) پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تھے (آثار عذاب دیکھ کر اجمالاً اور مچھلی کے واقعہ کے بعد حضرت یونس علیہ السلام وہاں دوبارہ تشریف لے گئے اس وقت تفصیلاً) تو ایمان کی برکت سے، ہم نے اُن کو ایک زمانہ تک (یعنی مدت عمر تک خیر و خوبی سے) عیش دیا۔

معارف و مسائل

اس سورۃ میں آخری واقعہ حضرت یونس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اور

اس کی متعلقہ تفصیلات سورۂ یونس کے آخر میں گذر چکی ہیں (دیکھئے معارف القرآن ص ۵۵۰، ج ۴) اور ان کا خلاصہ اوپر خلاصۂ تفسیر میں بھی آ گیا ہے، اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ خاص ان آیتوں کے بارے میں چند ضروری باتیں درج ذیل ہیں:

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ، بعض مفسرین اور مؤرخین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے پہلے ہی رسول بنا دیئے گئے تھے یا بعد میں بنائے گئے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مچھلی کے واقعہ کے بعد آپ رسول بنائے گئے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری اسلوب اور بیشتر روایات سے اس کو ترجیح ہے کہ آپ کو پہلے ہی منصب رسالت پر فائز کر دیا گیا تھا، مچھلی کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، (جب کہ وہ بھاگ گئے بھری ہوئی کشتی کی طرف) لفظ اَبَقَ اباق سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے اس وجہ سے استعمال فرمایا کہ وہ اپنے پروردگار کی اجازت سے وحی کا انتظار کئے بغیر روانہ ہو گئے تھے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اور ان کی معمولی سی لغزش بھی بڑی گرفت کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے یہ سخت لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَسَاهَمَ (پس وہ شریک قرعہ اندازی ہوئے) یہ قرعہ اندازی اس وقت کی گئی جب کشتی بیچ دریا کے پہنچ کر طوفان میں گھر گئی اور وزن کی زیادتی سے اس کے ڈوبنے کا اندیشہ ہو گیا، اور طے یہ پایا کہ ایک شخص کو دریا میں پھینک دیا جائے، قرعہ یہ متعین کرنے کے لئے ڈالا گیا کہ وہ شخص کون ہے؟

قرعہ اندازی کا حکم یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ نہ کسی کا حق ثابت کیا جا سکتا ہے نہ کسی کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرعہ کے ذریعہ کسی کو چور ثابت نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اگر دو آدمیوں میں یہ اختلاف ہو کہ فلاں جائیداد کس کی ملکیت ہے تو قرعہ کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، ہاں قرعہ اندازی اس موقع پر جائز بلکہ بہتر ہے جہاں ایک شخص کو شرعاً مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ چند جائز راستوں میں سے کسی بھی راستے کو اختیار کر لے، اب وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ متعین کرنے کے بجائے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرے، مثلاً جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اسے سفر میں جاتے وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس بیوی کو چاہے ساتھ لے جائے، اب وہ اپنی مرضی سے ایسا کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کر لے تو بہتر ہے، تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرعہ اندازی سے کسی کو مجرم ثابت کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ پوری کشتی کو بچانے کے لئے کسی کو بھی دریا میں ڈالا جا سکتا تھا، قرعہ سے

کے ذریعہ اس کی تعیین کی گئی۔

فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (پس وہ مغلوب ہوگئے) ادحاض کے لغوی معنی ہیں کسی کو ناکام بنا دینا، مطلب یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں انہی کا نام نکل آیا اور انھوں نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ اس پر خودکشی کا شبہ نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ ہوسکتا ہے ساحل قریب ہو اور وہ تیر کر وہاں تک پہونچنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ الخ، اس آیت سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام تسبیح نہ کرتے تو وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مچھلی کے پیٹ ہی کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا دیا جاتا۔

تسبیح و استغفار سے مصائب دور ہوتے ہیں | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصائب اور آفتوں کو دور کرنے میں تسبیح اور استغفار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سورۂ انبیاء میں گذر چکا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے تو یہ کلمہ خاص طور سے پڑھتے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، اللہ تعالیٰ نے اسی کلمہ کی برکت سے انھیں اس آزمائش سے نجات عطا فرمائی، اور وہ مچھلی کے پیٹ سے صحیح سالم نکل آئے۔ اسی لئے بزرگوں سے یہ منقول چلا آتا ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی مصیبت کے وقت یہ کلمہ سوا لاکھ مرتبہ پڑھتے ہیں، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔

ابو داؤد میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت یونس علیہ السلام نے جو دعا مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، اسے جو مسلمان بھی کسی مقصد کے لئے پڑھے گا اس کی دعا قبول ہوگی" (تفسیر قرطبی)

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ، (پس ہم نے ان کو میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت مضمحل تھے) العراء کے معنی ہیں کھلا میدان جس میں کوئی درخت نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے نہایت کمزور ہوگئے تھے، اور جسم پر بال بھی باقی نہ رہے تھے۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی اگا دیا تھا) یقطین ہر اس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔ روایات میں ہے کہ یہ کدو کی بیل تھی۔ اس درخت کو اگانے کا منشاء یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو سایہ حاصل ہو۔ یہاں شجرۃ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یا تو اس کدو کی بیل کو اللہ نے معجزہ کے طور پر تنہ دار بنا دیا تھا،

یا کوئی اور درخت تھا جس پر وہ بیل چڑھا دی تھی تاکہ اس سے گھنا سایہ مل سکے، ورنہ بیل سے سایہ ملنا مشکل تھا۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا) یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہیں، ان کو اس شک کے اظہار کی کیا ضرورت ہے کہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمی تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ عام لوگوں کی مناسبت سے کہا گیا ہے، یعنی ایک عام آدمی انہیں دیکھتا تو یہ کہتا کہ ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے کچھ اوپر ہے (مظہری) اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہاں شک کا اظہار مقصود ہی نہیں ہے، بلکہ انہیں ایک لاکھ بھی کہا جا سکتا ہے، اور اس سے زیادہ بھی، وہ اس طرح کہ اگر کسر کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، اور اگر کسر کو بھی شمار کیا جائے تو ایک لاکھ سے زیادہ (بیان القرآن)

یہ جملہ چونکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد آیا ہے اس لئے اس سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بعثت اس واقعہ کے بعد ہوئی تھی، اور علامہ بغویؒ نے یہاں تک فرما دیا کہ اس آیت میں نینوی کی طرف بعثت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انہیں ایک دوسری امت کی طرف بھیجا گیا جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن قرآن کریم اور روایات سے ان کے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے شروع ہی میں آپ کی رسالت کا تذکرہ صاف بتا رہا ہے کہ مچھلی کا واقعہ رسول بننے کے بعد پیش آیا ہے، اس کے بعد یہاں اس جملے کو دوبارہ اس لئے لایا گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی تندرستی کے بعد انہیں دوبارہ وہیں بھیجا گیا تھا، یہاں یہ واضح کر دیا کہ وہ لوگ معدودے چند افراد نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد لاکھ سے بھی اوپر تھی۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (پھر وہ ایمان لے آئے، سو ہم نے ان کو ایک زمانہ تک عیش دیا) "ایک زمانہ تک" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا نہیں ہوئے ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔

مرزا قادیانی کی تلبیس کا جواب

یہ بات سورۂ یونس کی تفسیر میں بھی واضح کی جا چکی ہے، اور اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر سے جو عذاب ٹالا گیا وہ اس لئے کہ آپ کی قوم بروقت ایمان لے آئی تھی۔ اس سے پنجاب کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اس تلبیس کا قلع قمع ہو جاتا ہے کہ جب اس نے اپنے مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک عذاب الٰہی آجائے گا، لیکن مخالفین کی

مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّاۗفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

ایک ٹھکانا ہے مقرر، اور ہم ہی ہیں صف باندھنے والے، اور ہم ہی ہیں پاکی بیان کرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

(توحید کے دلائل تو اوپر بیان ہوچکے اب ان کے بعد) ان لوگوں سے (جو ملائکہ اور جنات کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں اس طرح کہ ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں اور جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو ان فرشتوں کی مائیں قرار دیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے نسبی رشتہ ہے اور جنات سے زوجیت کا تعلق ہے، سو ان سے) پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں (ہوں) اور تمہارے لئے بیٹے (ہوں، یعنی جب اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو تو عقیدۂ مذکورہ میں خدا کے لئے بیٹیاں کیسے تجویز کرتے ہو۔ اس عقیدے میں ایک خرابی تو یہ ہے اور) ہاں (دوسری بات سنو کہ) کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کے بننے کے وقت) دیکھ رہے تھے (یعنی ایک دوسری برائی یہ ہے کہ فرشتوں پر بلا دلیل مؤنث ہونے کی تہمت رکھتے ہیں، خوب سن لو کہ یہ لوگ دلیل کچھ نہیں رکھتے، بلکہ محض) اپنی تراشی سے کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً بالکل جھوٹے ہیں (پس اس عقیدے میں تیسری برائی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف ولادت کی نسبت لازم آتی ہے، ان میں سے پہلی برائی کا قبیح عرف سے دوسری کا نقل سے اور تیسری کا عقل سے ثابت ہے، اور چونکہ جاہلوں کے لئے عرفی برائی کا اثبات زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لئے پہلی برائی کو دوسرے عنوان سے مکرر فرماتے ہیں کہ ہاں) کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں؟ تم کو کیا ہوگیا تم کیسا (بیہودہ) حکم لگاتے ہو؟ (جس کو عرفاً خود بھی برا سمجھتے ہو، پھر علاوہ عرف کے) کیا تم عقل (دلائل) سے کام نہیں لیتے ہو (کہ یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے، اور اگر دلیل عقلی نہیں تو) کیا تمہارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے (اس سے مراد نقلی دلیل ہے) سو تم اگر (اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو اور (عقیدۂ مذکورہ میں ملائکہ کو اولاد قرار دینے کے علاوہ) ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے (جس کا بطلان اور بھی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ بیوی جس کام کے لئے ہوتی ہے اس سے حق تعالیٰ پاک ہے، اور جب زوجیت محال ہے تو سسرالی رشتے جو اسی سے نکلتے ہیں وہ بھی محال ہوں گے، اور (جس جس کو یہ لوگ خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو) جنات

نہیں ہے کہ فرشتوں کا مؤنث ہونا معلوم ہو سکتا، بلکہ مشاہدہ کی کوئی دلیل تو تمہارے پاس ہے نہیں (اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ کا یہی مطلب ہے) اب رہی نقلی دلیل سو وہ بھی تمہارے پاس نہیں، اس لئے کہ قول ان لوگوں کا معتبر ہوتا ہے جن کی سچائی مسلّم ہو، اس کے برخلاف جو لوگ اس عقیدے کے قائل ہیں وہ جھوٹے لوگ ہیں، ان کی بات کوئی حجت نہیں ہو سکتی (اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ کا یہی مطلب ہے) رہی عقلی دلیل سو وہ بھی تمہاری تائید نہیں کرتی، اس لئے کہ خود تمہارے خیال کے مطابق بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں کم رتبہ رکھتی ہیں، اب جو ذات تمام کائنات سے افضل ہے وہ اپنے لئے کم رتبہ والی چیز کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟ (اَصْطَفَى الْبَنٰتِ عَلَى الْبَنِيْنَ کا یہی مطلب ہے) اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ تمہارے پاس کوئی آسمانی کتاب آئی ہو اور اس میں بذریعہ وحی تمہیں اس عقیدے کی تعلیم دی گئی ہو سو اگر ایسا ہے تو دکھاؤ وہ وحی اور وہ کتاب کہاں ہے؟ (اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ. فَأْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کا یہی مفہوم ہے)۔

ہٹ دھرمی کرنے والوں کے لئے ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہوں ان کے لئے الزامی جواب زیادہ مناسب ہے، ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔ الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے دعوے کو خود اسی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے لیکن مخالف کو سمجھانے کے لئے اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔ یہاں باری تعالیٰ نے ان کے عقیدہ کی تردید کے لئے خود انہی کے اس نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود باعث ننگ و عار ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیاں باعث ننگ ہیں، نہ یہ مطلب ہے کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا، بلکہ یہ ایک الزامی جواب ہے جس کا مقصد خود انہی کے معتقدات سے ان کے عقیدے کی تردید کرنا ہے، ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، نہ اسے کسی اولاد کی ضرورت ہے، اور نہ اس کی رفعت شان کے یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان نسبی تعلق قرار دیا ہے)، اس جملے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کے اس عقیدے کا بیان ہے کہ جنات کی سردار زادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں، گویا معاذ اللہ جنات کی سردار زادیوں سے اللہ تعالیٰ کا زوجیت کا تعلق ہے، اور اسی تعلق کے نتیجے میں فرشتے

دیکھتے رہئے (یعنی منتظر رہئے) سو عنقریب یہ بھی دیکھیں گے (یعنی آپ کو تو پہلے کہنے سے یقین ہے ہی، آنکھوں سے دیکھ کر انھیں بھی یقین آجائے گا)۔

معارف ومسائل

اسلام کے بنیادی عقائد کو دلائل وشواہد سے ثابت کرنے کے بعد ان آیتوں میں کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تمنا کیا کرتے تھے کہ اللہ کا کوئی پیغمبر آتا تو ہم اس کی پیروی کریں، لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو انھوں نے ضد اور عناد کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کی بد زبانیوں سے رنجیدہ نہ ہوں، عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ آپ غالب اور فتح یاب ہوں گے اور یہ مغلوب اور مستحق عذاب۔ آخرت میں تو اس کا مکمل مظاہرہ ہوگا ہی، دنیا میں بھی اللہ نے دکھا دیا، غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر جہاد میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظفرمند کیا، اور آپ کے مخالفین ذلیل وخوار ہوئے۔

اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا (الیٰ قولہ تعالیٰ) وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ، ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے یہ بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کہ ہمارے خاص بندے یعنی پیغمبر ہی غالب ہوتے ہیں۔ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کو دنیا میں غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معلوم پیغمبروں میں اکثریت تو ایسے ہی حضرات کی ہے جن کی قومیں انھیں جھٹلا کر عذاب میں مبتلا ہوئیں، اور ان حضرات کو عذاب سے محفوظ رکھا، صرف چند انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جنھیں دنیا میں آخر وقت تک بظاہر مادی طور پر غلبہ نہ مل سکا، لیکن دلیل وحجت کے میدان میں ہمیشہ وہی سربلند رہے، اور نظریاتی فتح ہمیشہ انہی کو حاصل ہوئی، ہاں اس سربلندی کے مادی آثار کسی خاص حکمت مثلاً آزمائش وغیرہ کی وجہ سے آخرت تک مؤخر کر دیئے گئے۔ لہٰذا بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ذلیل رہزن کسی بڑے حاکم افسر کے ساتھ سفر کی حالت میں لوٹ مار کرنے لگے، مگر وہ حاکم اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل رہزن کی خوشامد نہیں کرے گا، حتیٰ کہ جب وہ حاکم اپنے دار الحکومت میں پہنچے گا اس رہزن کو گرفتار کر کے سزا دے گا۔ لہٰذا اس عارضی غلبہ کی وجہ سے نہ اس رہزن کو حاکم کہہ سکتے ہیں، اور نہ اس افسر کو محکوم بلکہ اصلی حالت کے اعتبار سے وہ رہزن اس غلبہ میں بھی محکوم ہے، اور وہ افسر اس مغلوبیت میں بھی

سُورَةُ صٓ

سُورَةُ صٓ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانٍ وَّثَمَانُونَ اٰيَةً وَّخَمْسُ رُكُوعَاتٍ
سورۃ صٓ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اٹھاسی آیتیں اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝١ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ

قسم ہے اس قرآن سمجھانے والے کی ۔ بلکہ جو لوگ منکر ہیں غرور میں ہیں اور

شِقَاقٍ ۝٢ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ

مخالفت میں ۔ بہت غارت کر دیں ہم نے ان سے پہلے جماعتیں پھر لگے پکارنے اور وقت نہ رہا تھا

مَنَاصٍ ۝٣ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ

خلاصی کا ۔ اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ایک ڈر سنانے والا انہی میں سے

هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝٤ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ

اور کہنے لگے منکر یہ جادوگر ہے جھوٹا ۔ کیا اس نے کر دی اتنوں کی بندگی کے بدلے ایک ہی کی بندگی

هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝٥ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا

یہ بھی ہے بڑے تعجب کی بات ۔ اور چل کھڑے ہوئے کئی پنچ ان میں سے کہ چلو اور

وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝٦ مَا سَمِعْنَا

جمے رہو اپنے معبودوں پر ۔ بیشک اس بات میں کوئی غرض ہے ۔ نہیں سنا

بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝٧ ءَاُنْزِلَ

ہم نے اس کو پچھلے دین میں اور کچھ نہیں یہ بنائی ہوئی بات ہے ۔ کیا اسی پر

عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ

اتری نصیحت ہم سب میں سے ۔ کوئی نہیں ان کو دھوکا ہے میری نصیحت میں

ہیں جس میں ایک مرتبہ دودھ دوہنے کے بعد دوبارہ اس کے تھنوں میں دودھ آجائے۔ نیز اس کے معنی "راحت و آرام" کے بھی ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کا صور جب پھونکا جائے گا تو اس قدر مسلسل ہوگا کہ اس میں کوئی وقفہ نہ ہوگا۔ (قرطبی)

عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا۔ "قطّ" اصل میں اس دستاویز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی کو انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہو۔ پھر یہ لفظ مطلق "حصہ" کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں کہ "آخرت کی جزا و سزا سے جو کچھ ہمیں حصہ ملنا ہے وہ یہیں دے دیجئے"۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ
تو تحمل کر اس پر جو وہ کہتے ہیں اور یاد کر ہمارے بندے داؤد قوت والے کو وہ تھا رجوع

اَوَّابٌ ﴿١٧﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ
رہنے والا ہم نے تابع کئے پہاڑ اس کے ساتھ پاکی بولتے تھے شام کو اور

الْاِشْرَاقِ ﴿١٨﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿١٩﴾ وَشَدَدْنَا
صبح کو اور اڑتے جانور جمع ہو کر سب تھے اس کے آگے رجوع رہتے اور قوت دی

مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿٢٠﴾
ہم نے اس کی سلطنت کو اور دی اس کو تدبیر اور فیصلہ کرنا بات کا

خلاصۂ تفسیر

آپ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کیجئے اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کیجئے جو عبادت میں (جس میں تبلیغ بھی داخل ہے) بڑی قوت اور ہمت والے تھے (اور) وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہونے والے تھے اور ہم نے ان کو یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں: ایک یہ کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ (شریک ہو کر) شام اور صبح (کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے یہی اوقات تھے) تسبیح کیا کریں اور اسی طرح پرندوں کو بھی (یہی حکم دے رکھا تھا) جو کہ (تسبیح کے وقت ان کے پاس) جمع ہو جاتے تھے (اور یہ پہاڑ و پرندے وغیرہ) سب ان کی (تسبیح کی) وجہ سے مشغول ذکر رہتے اور دوسری نعمت یہ کہ ہم نے ان کی سلطنت کو نہایت قوت دی تھی اور تیسری نعمت یہ کہ ہم نے ان کو حکمت (یعنی نبوت) اور فیصلہ کرنے والی تقریر (جو نہایت واضح و بلیغ ہو) عطا فرمائی تھی۔

وَهَلْ أَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿٢١﴾ إِذْ دَخَلُوا عَلٰى دَاوُدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾ إِنَّ هٰذَا أَخِي لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۚ فَقَالَ أَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلٰى نِعَاجِهٖ ۖ وَإِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ ﴿٢٤﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٢٥﴾

مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔

خلاصۂ تفسیر

اور بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر بھی پہنچی ہے (جو) داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے جب وہ
لوگ داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ کی دیوار پھاند کر داؤد علیہ السلام کے پاس آئے (کیونکہ دروازے
سے چوکیداروں نے ان کو آنے نہیں دیا، وہ وقت آپ کی عبادت کا تھا، مقدمات کے فیصلے کا نہیں)

عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف نہ تھا۔ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ وہ فخریہ کلمہ جو زبان سے نکل گیا تھا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ اس لئے آپ نے استغفار فرمایا اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباسؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ (احکام القرآن)

ان تمام تشریحات میں یہ بات مشترک طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ مقدمہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی تھا اور صورت مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش یا لغزش سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف بہت مفسرین نے اس کی ایسی تشریح فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مقدمہ کے یہ فریقین انسان نہیں، بلکہ فرشتے تھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ایک فرضی صورت مقدمہ پیش کریں جس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی لغزش پر تنبیہ ہو جائے۔

چنانچہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اوریاہ کو قتل کرنے اور اس کی بیوی سے نکاح کرنے کا جو قصہ ہے وہ تو غلط ہے، لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں کسی شخص سے یہ فرمائش کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ "تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح مجھ سے کر دو" اس زمانے میں اس فرمائش کا عام رواج بھی تھا اور یہ بات خلاف مروت بھی نہ سمجھی جاتی تھی، حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی بنا پر اوریاہ سے یہی فرمائش کی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ دو فرشتے بھیج کر آپ کو تنبیہ فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بات صرف اتنی تھی کہ اوریاہ نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا ہوا تھا حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی عورت کو پیغام دے دیا، اس سے اوریا کو بہت رنج ہوا اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ کے لئے یہ دو فرشتے بھیجے اور ایک لطیف پیرایہ میں اس لغزش پر تنبیہ فرمائی۔ قاضی ابو یعلیٰؒ نے اس توجیہ پر قرآن کے لفظ وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ سے استدلال فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ معاملہ خطبہ (منگنی) کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابھی حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔

(زاد المسیر لابن الجوزی ص ۱۶، ج ۷)

اکثر مفسرین نے ان آخری دو تشریحات کو ترجیح دی ہے اور ان کی تائید بعض آثار صحابہؓ سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو روح المعانی، تفسیر ابی سعود، البحر المحیط، تفسیر کبیر وغیرہ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آزمائش اور لغزش کی تفصیل نہ قرآن کریم سے ثابت ہے، نہ کسی صحیح حدیث سے۔ اس لئے اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ اوریا کو قتل کروانے کا جو قصہ مشہور ہے وہ غلط ہے، لیکن اصل واقعہ کے بارے میں مذکورہ بالا تمام احتمالات موجود ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا سلامتی کی راہ وہی ہے جو حافظ ابن کثیرؒ نے اختیار کی کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مبہم چھوڑا ہے

وَلَا تُشْطِطْ (اور بے انصافی نہ کیجئے) آپ جانتے ہیں یہ انداز خطاب بظاہر بڑا گستاخانہ تھا، اوّل تو دیوار پھاند کر بے وقت آنا، پھر حضرت داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو انصاف کرنے اور ظلم سے بچنے کا درس دینا، یہ سب اشتعال انگیز باتیں تھیں، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سب باتوں پر صبر فرمایا اور انہیں کچھ برا بھلا نہیں کہا۔

بڑے آدمی کو چاہئے کہ اہل حاجت کی غلطیوں پر حتی الوسع صبر کرے

اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی بڑا مرتبہ دیا ہو اور لوگوں کی ضروریات اس سے متعلق ہوں اُسے چاہیے کہ وہ اہل حاجت کی بے تہذیبوں اور نامعقول غلطیوں پر حتی الوسع صبر کرے کیونکہ اسی مرتبہ کا تقاضا ہے۔ خاص طور سے حاکم، قاضی اور مفتی کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ (روح المعانی)

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ، داؤد علیہ السلام نے کہا کہ اس نے جو تیری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کی درخواست کی ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کیا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فقرہ صرف مدعی کی بات سن کر ارشاد فرما دیا، مدعا علیہ کا بیان نہیں سنا۔ اس پر بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ یہ وہ لغزش ہے جس پر آپ نے استغفار فرمایا، یہی لغزش تھی لیکن دوسرے حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ درحقیقت یہاں مقدمہ کی پوری تفصیل بیان نہیں ہوئی، صرف ضروری باتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے یقیناً مدعا علیہ سے اس کا موقف سنا ہوگا لیکن اُسے یہاں اس لئے بیان نہیں کیا گیا کہ فیصلوں کا معروف طریقہ یہی ہے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہاں مدعا علیہ سے پوچھنے کا جزء محذوف ہے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ آنے والوں نے حضرت داؤد علیہ السلام سے عدالتی فیصلہ طلب کیا تھا، لیکن نہ وہ وقت عدالت کا تھا، نہ مجلس قضا کی تھی، نہ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے کے وسائل جمع تھے۔ اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے قاضی کی حیثیت میں نہیں بلکہ مفتی کی حیثیت میں فتویٰ دیا۔ اور مفتی کا کام واقعہ کی تحقیق کرنا نہیں ہوتا، بلکہ جیسا سوال ہو اسی کے مطابق جواب دینا ہوتا ہے۔

کسی قسم کے دباؤ کے ساتھ چندہ یا ہدیہ طلب کرنا غصب ہے

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک شخص کے دنبی مانگنے کو ظلم قرار دیا، حالانکہ بظاہر کسی سے محض کوئی چیز مانگ لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صورت سوال کی تھی، لیکن جس قولی اور عملی دباؤ کے ساتھ یہ سوال کیا جارہا تھا اس کی موجودگی میں اس کی حیثیت غصب کی سی ہوگئی تھی۔

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی سے اس طرح کوئی چیز مانگے کہ مخاطب راضی ہو یا ناراض

لیکن اس کے پاس دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو اس طرح چندہ طلب کرنا بھی غصب میں داخل ہے لہٰذا اگر مانگنے والا کوئی صاحب اقتدار یا ذی وجاہت شخص ہو اور مخاطب اس کی شخصیت کے دباؤ کی وجہ سے انکار نہ کر سکتا ہو تو وہاں صورت چاہے چندہ طلب کرنے کی ہو، لیکن حقیقت میں وہ غصب ہی ہوتا ہے اور مانگنے والے کے لئے اس طرح حاصل کی ہوئی چیز کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے بہت توجہ کرنے کا ہے، جو مدارس و مکاتب، مساجد یا انجمنوں اور جماعتوں کے لئے چندے وصول کرتے ہیں، صرف وہ چندہ حلال طیب ہے جو دینے والے نے اپنے مکمل اختیار اور خوش دلی کے ساتھ دیا ہو۔ اور اگر چندہ کرنے والوں نے اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر، یا ایک وقت آٹھ دس آدمیوں نے کسی ایک شخص کو زچ کر کے چندہ وصول کریں تو یہ صریح ناجائز فعل ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ

کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

معاملات کی شرکت میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ اور بہت سے شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں، اس سے اس بات پر تنبیہ کر دی ہے کہ جب دو انسانوں میں شرکت کا کوئی معاملہ ہو تو اس میں اکثر ایک دوسرے کی حق تلفیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت ایک آدمی ایک کام کو معمولی سمجھ کر کر گزرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ۔ اور داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے، اگر مقدمہ کی صورت حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش کی تمثیل قرار دیا جائے تب تو یہ خیال آنا ظاہر ہی ہے، اور اگر صورت مقدمہ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو تب بھی فریقین کی مجموعی حالت یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ یہ امتحاناً بھیجے گئے ہیں۔ ایک طرف تو ان فریقوں نے مقدمہ کے فیصلہ کے لئے اتنی جلد بازی اور جرأت سے کام لیا کہ دیوار پھاند کر چلے آئے، دوسری طرف جب مقدمہ پیش ہوا، تو مدعا علیہ خاموش بیٹھا رہا، اور قولی یا عملی طور سے مدعی کی بات کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا۔ اگر مدعی کے بیان کردہ واقعہ کو مدعا علیہ تسلیم کرتا تھا تو جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آنے کی ضرورت ہی نہ تھی، ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس صورت میں مدعی کے حق میں ہی فیصلہ کریں گے۔ فریقین کا یہ پراسرار طرز عمل بتا رہا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھانپ لیا کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے

آئے ہیں، اور میرا امتحان مقصود ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ فیصلہ سننے کے بعد وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چلے گئے۔ واللہ اعلم

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ، یعنی انہوں نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے، یہاں در اصل رُکُوْع کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے لغوی معنے جھکنے کے ہیں۔ مگر اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد سجدہ ہے۔ احناف کے نزدیک اس آیت کی تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔

رکوع سے سجدۂ تلاوت ادا ہو جاتا ہے

اور امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے تو رکوع میں سجدہ کی نیت کر لینے سے سجدہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں باری تعالیٰ نے سجدہ کے لئے رکوع کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ رکوع بھی سجدہ کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری مسائل یاد رکھنے چاہئیں۔

سجدہ تلاوت کے بعض مسائل

مسئلہ نماز کے فرض رکوع کے ذریعہ سجدہ صرف اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے جب آیت سجدہ کی تلاوت نماز میں پڑھی گئی ہو، نماز سے باہر تلاوت کرنے میں رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ رکوع صرف نماز میں عبادت ہے، نماز سے باہر تلاوت شدہ رکوع میں ادا نہیں۔ **مسئلہ** رکوع میں سجدہ صرف اس وقت ادا ہوتا جبکہ آیت سجدہ تلاوت کرنے کے فوراً بعد یا زیادہ سے زیادہ دو تین آیتیں مزید تلاوت کر کے رکوع کر لیا ہو، اور اگر آیت سجدہ کے بعد زیادہ طویل قرأت کی ہو تو سجدہ رکوع میں ادا نہیں ہوگا۔ **مسئلہ** اگر سجدہ تلاوت رکوع میں ادا کرنے کا خیال ہو تو رکوع میں جاتے وقت سجدۂ تلاوت کی نیت کر لینی چاہئے، ورنہ اس رکوع سے سجدہ ادا نہیں ہوگا۔ ہاں جب سجدہ میں جانے لگا تو بلا نیت بھی سجدہ ادا ہو جائے گا۔ **مسئلہ** افضل بہر حال یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کو نماز کے فرض رکوع میں ادا کرنے کے بجائے مستقل سجدہ کیا جائے۔ اور سجدہ سے اٹھ کر دو تین آیتیں تلاوت کر کے پھر رکوع میں جائیں۔ (بدائع)

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ، اور بیشک ان کے لئے ہمارے یہاں خاص تقرب اور نیک انجامی ہے، اس آیت پر واقعہ کو ختم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش جو کچھ بھی رہی ہو ان کے استغفار اور انابت کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔

غلطی پر تنبیہ میں حکمت کی رعایت

اس واقعہ سے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش خواہ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو

اس پر متنبہ فرما رہے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مقدمہ بھیج کر تنبیہ کے لئے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ درحقیقت اس طریقہ پر غور کرنے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کرنے میں حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے جس سے متعلقہ شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کرلے اور اسے زبانی تنبیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اور اس کے لئے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ مؤثر ہوتا ہے جن سے کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور ضروری بات بھی واضح ہو جائے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ

اے داؤد ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں

بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ

انصاف سے اور مت چل جی کی خواہش پر پھر وہ تجھ کو بچلا دے اللہ کی راہ سے مقرر

الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا

جو لوگ بہکتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو سخت عذاب ہے اس بات پر

نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶

کہ بھلا دیا انہوں نے دن حساب کا۔

خلاصۂ تفسیر

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، سو (جس طرح اب تک کرتے رہے ہو اسی طرح آئندہ بھی) لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی اسی طرح آئندہ بھی) نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا (اگر ایسا کرو گے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔ (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔

معارف و مسائل

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی تھی، چنانچہ اس آیت میں حکومت و سیاست کے لئے آپ کو ایک بنیادی ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس ہدایت نامہ میں تین بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:-

(۱) ہم نے آپ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔
(۲) اس حیثیت سے آپ کا بنیادی کام حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔
(۳) اور اس کام کے لئے خواہشات نفسانی کی پیروی سے بچنا ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔
جہاں تک زمین میں خلیفہ بنانے کا تعلق ہے، اس کا مفہوم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے (دیکھئے معارف القرآن جلد اول ص۱۶۱) اور اسی سے اسلامی سیاست کا یہ اصل الاصول واضح ہوتا ہے کہ "اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے" زمین کے حکمران اسی کے احکام کے مطابق چلنے کے مجاز ہیں اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ لہٰذا مسلمانوں کا حاکم، شوریٰ یا اسمبلی اسلامی قانون کی تشریح یا تدوین تو کر سکتی ہے، لیکن درحقیقت وہ واضع قانون نہیں بلکہ اللہ کے قانون کو پیش کرنے والے ہیں۔

اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامت حق ہے

دوسری بات یہاں واضح کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی کام اقامت حق ہے۔ حکومت پر لازم ہے کہ وہ اپنے انتظامی معاملات اور تنازعات کے تصفیہ میں حق و انصاف قائم کرے۔

اسلام چونکہ ایک ابدی دین ہے، اس لئے اُس نے سیاست و حکمرانی کے لئے ایسے انتظامی جزئیات کی تعیین نہیں فرمائی، جو حالات اور زمانے کے بدلنے سے قابل تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ کچھ ایسی بنیادی ہدایات عطا فرمادی ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانے کے مطابق انتظامی جزئیات خود طے کی جا سکتی ہیں۔ اسی لئے یہاں یہ بات تو بتا دی گئی ہے کہ حکومت کا اصل کام اقامت حق ہے، لیکن اس کی انتظامی تفصیلات ہر دور کے اہل رائے مسلمانوں پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

عدلیہ اور انتظامیہ کا رشتہ

چنانچہ یہ بات کہ عدلیہ انتظامیہ سے بالکل الگ رہے یا اس کے ساتھ وابستہ؟ اس مسئلہ میں کوئی ایسا متعین حکم نہیں دیا گیا، جو ہر دور میں ناقابل تبدیل ہو۔ اگر کسی زمانہ میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہو تو عدلیہ اور انتظامیہ کی دوئی کو مٹایا جا سکتا ہے۔ اور اگر کسی دور میں حکمرانوں کی امانت و دیانت پر پورا بھروسہ نہ ہو تو عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد بھی رکھا جا سکتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے — ان سے زیادہ امانت و دیانت کا کون دعویٰ کر سکتا تھا؟ اس لئے انہیں بیک وقت انتظامیہ اور عدلیہ دونوں کا سربراہ بنا کر تنازعات کے فیصلے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلفاء راشدین میں بھی یہی طرز رہا کہ امیرالمؤمنین خود ہی قاضی بھی ہوتا تھا۔ بعد کی اسلامی حکومتوں میں اس طریقے کو بدلا گیا اور امیرالمؤمنین کو انتظامیہ کا اور قاضی القضاۃ کو عدلیہ کا سربراہ بنایا گیا۔

تیسری ہدایت جس پر اس آیت میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ خواہشات

نفسانی کی پیروی مت کرو اور روز حساب کو ہر وقت پیش نظر رکھو۔ اس ہدایت پر سب سے زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ چیز اقامت حق کی بنیاد ہے۔ جس حاکم یا قاضی کے دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہو وہی صحیح معنی میں حق و انصاف قائم کر سکتا ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو آپ اچھے سے اچھا قانون بنا لیجئے، نفس انسانی کی ذہنی عیاریاں ہر جگہ فرار کے راستے خود بنا لیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں کوئی بہتر سے بہتر نظام قانون بھی حق و انصاف قائم نہیں کر سکتا۔ دنیا کی تاریخ اور موجودہ زمانے کے حالات اس پر گواہ ہیں۔

ذمہ داری کے عہدوں میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز انسان کا کردار ہے

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کو حاکم، قاضی یا کسی بڑے منصب پر فائز کرنے کے لئے سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہے یا نہیں اور اس کے اخلاق و کردار کی کیا حالت ہے؟ اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے دل پر خوف خدا کے بجائے خواہشات نفسانی کی حکمرانی ہے تو خواہ وہ کیسی علمی ڈگریاں رکھتا ہو، اپنے فن میں کتنا ہی ماہر اور تجربہ کار ہو، اسلام کی نظر میں وہ کسی اونچے منصب کا مستحق نہیں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ
اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو ان کے بیچ میں ہے نکما یہ خیال ہے ان کا

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝۲۷ اَمْ نَجْعَلُ
جو منکر ہیں سو خرابی ہے منکروں کے لئے آگ سے کیا ہم

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ
کر دیں گے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں برابر ان کے جو خرابی ڈالتے ہیں ملک میں

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝۲۸ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ
کیا ہم کر دیں گے ڈرنے والوں کو برابر ڈھیٹھ لوگوں کے ؟ ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے

مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹
تیری طرف برکت کی تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تا سمجھیں عقل والے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت پیدا نہیں کیا (بلکہ بہت سی حکمتیں ہیں جن میں سے سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ ان سے توحید اور آخرت ثابت ہوتی

خود اس کائنات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرے گا؟ یقیناً اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھے اور برے تمام لوگوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے بجائے بدکاروں کو سزا دے اور نیکوکاروں کو انعام عطا فرمائے، یہی اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے اور اس کے روبعمل آنے کے لئے قیامت اور آخرت کا وجود اس کی حکمت کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا بزبان حال یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد اور خالی از حکمت پیدا کر دی گئی ہے، اور اس میں اچھے برے تمام لوگ زندگی گزار کر چلے جائیں اور پھر ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ایمان رکھنے والا اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الیٰ قولہ تعالیٰ) كَالْفُجَّارِ، "کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کاروں کو زمین میں فساد کرنے والوں کے برابر کر دیں گے یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے؟" یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ دونوں کا انجام بالکل مختلف ہوگا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مومن اور کافر کا یہ فرق آخرت کے انجام کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر کو مومن سے بڑھ کر مادی راحتیں مل جائیں۔ نیز اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جا سکتا کہ کافر کے دنیوی حقوق مومن کی برابر نہیں ہو سکتے۔ بلکہ کافر کو مسلمان کے برابر انسانی حقوق دیے جا سکتے ہیں، چنانچہ اسلامی مملکت میں جو غیر مسلم قومیتیں عہد و پیمان کے ساتھ بستی ہوں انھیں تمام انسانی حقوق مسلمانوں کے برابر ہی دیئے جائیں گے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذْ

اور دیا ہم نے داؤد کو سلیمان بہت خوب بندہ وہ ہے رجوع ہونے والا جب

عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ

دکھلانے لائے اس کے سامنے شام کو گھوڑے بہت خاصے تو بولا میں نے

اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ

دوست رکھی مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ چھپ گیا

بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ

اوٹ میں پھیر لاؤ ان کو میرے پاس پھر لگا جھاڑنے پنڈلیاں

وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

اور گردنیں ۔

سورج کی واپسی کا قصہ

بعض حضرات نے یہی تفسیر کو اختیار کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ مذکورہ واقعہ کے ختم ہونے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یا فرشتوں سے یہ درخواست کی کہ سورج کو دوبارہ لوٹا دیا جائے، چنانچہ سورج لوٹا دیا گیا اور آپ نے اپنا معمول پورا کر لیا۔ اس کے بعد دوبارہ سورج غروب ہوا۔ یہ حضرات رُدُّوْهَا کی ضمیر کو سورج کی طرف راجع مانتے ہیں۔

لیکن محقق مفسرین مثلاً علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصے کی تردید کی ہے۔ اور کہا ہے کہ رُدُّوْهَا کی ضمیر گھوڑوں کی طرف راجع ہے نہ کہ سورج کی طرف۔ اس لئے نہیں کہ معاذ اللہ سورج کو دوبارہ لوٹا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ قصہ قرآن و حدیث کی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ (روح المعانی)

خدا کی یاد میں غفلت ہو تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کر دینا غیرت کا تقاضا ہے۔

بہرحال، اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی یاد سے غفلت ہو جائے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اسے کسی فعل مباح سے محروم کر دینا جائز ہے۔ اور حضرات صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے "غیرت" کہا جاتا ہے۔ (بیان القرآن)

کسی نیکی کی عادت ڈالنے کے لئے اپنے نفس پر کسی سزا کو مقرر کرنا اصلاح نفس کا ایک نسخہ ہے اور اس واقعے سے اس کا جواز بلکہ استحباب معلوم ہوتا ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ نے ایک شامی چادر ہدیۃً پیش کی جس پر کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چادر میں نماز پڑھی اور واپس آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یہ چادر ابوجہم کو واپس کر دو، کیونکہ نماز میں میری نگاہ اس کے نقش و نگار پر پڑ گئی، تو قریب تھا کہ یہ نقش و نگار مجھے فتنہ میں ڈال دیں۔

(احکام القرآن بحوالہ موطا امام مالک ؒ)

اسی طرح حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پرندے کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے جس سے نماز کی طرف دھیان نہ رہا، تو بعد میں آپ نے پورا باغ صدقہ کر دیا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس مقصد کے لئے سزا ایسی ہی ہونی چاہئے جو بذات خود جائز ہو، کسی مال کو بلا وجہ ضائع کر دینا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسا کوئی کام درست نہیں جس سے اضاعت مال لازم آتی ہو۔ صوفیاء میں سے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اسی سزا کے طور پر اپنے کپڑے جلا دیئے تھے لیکن محقق صوفیاء مثلاً شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس عمل کو صحیح قرار نہیں دیا۔

(روح المعانی)

امراء کو بذات خود ریاست کے کاموں کی نگرانی کرنی چاہئے۔

اس واقعہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ

مملکت کے ذمہ دار یا اونچے درجہ کے افسر کو چاہئے کہ وہ اپنے ماتحت شعبوں پر بذاتِ خود نگرانی رکھے، اور انہیں اپنے ماتحتوں پر چھوڑ کر فارغ نہ ہو بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ماتحتوں کی کثرت کے باوجود بنفسِ نفیس گھوڑوں کا معائنہ فرمایا۔ خلفائے راشدین اور خاص طور سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ایک عبادت کے وقت دوسری عبادت میں مشغول ہونا غلطی ہے۔

تیسری بات اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ ایک موقت عبادت کے وقت کسی دوسری عبادت میں بھی صرف نہ کرنا چاہئے، ظاہر ہے کہ جہاد کے گھوڑوں کا معائنہ ایک عظیم عبادت تھی، لیکن چونکہ وہ وقت اس عبادت کے بجائے نماز کا تھا، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو بھی غلطی میں شمار کر کے اس کا تدارک فرمایا۔ اسی سے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد جس طرح خرید و فروخت میں مشغولیت جائز نہیں، اسی طرح نماز جمعہ کی تیاری کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول ہونا بھی درست نہیں، خواہ وہ تلاوتِ قرآن یا نفل پڑھنے کی عبادت ہی کیوں نہ ہو۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (۳۴)

اور ہم نے جانچا سلیمان کو اور ڈال دیا اس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ رجوع ہوا

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو (ایک اور طرح سے بھی) امتحان کیا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا، پھر انہوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔

معارف و مسائل

اس آیت میں باری تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس سلسلے میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ اس آزمائش کے دوران کوئی دھڑ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اب وہ دھڑ کیا تھا؟ اس کے کرسی پر ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس سے آزمائش کیونکر ہوئی؟ یہ تفصیلات نہ قرآن کریم میں موجود ہیں، اور نہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہیں۔ اس لئے بعض محقق مفسرین مثلاً حافظ ابن کثیرؒ کا رجحان یہاں بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جس بات کو مجمل چھوڑا ہے اس کی تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس اتنی بات پر ایمان رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی جس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام

کہیں اس بات کی کوئی علامت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا ہو۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ حدیث کتاب الجہاد، کتاب الانبیاء اور کتاب الایمان والنذور وغیرہ میں تو متعدد طریقوں سے نقل کی ہے، لیکن کتاب التفسیر میں سورۂ صٓ کی تفسیر کے تحت اسے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ آیت هَبْ لِیْ مُلْكًا الخ کے تحت ایک دوسری روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ واقعہ آیت زیر بحث کی تفسیر نہیں، بلکہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے دوسرے متعدد واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک جداگانہ واقعہ ہے جس کا کسی آیت کی تفسیر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

ایک تیسری تفسیر امام رازی وغیرہ نے بیان کی ہے، اور وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گئے، اور اس کی وجہ سے نقاہت اس درجہ بڑھ گئی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو ایک بے روح جسم معلوم ہوتے تھے، اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو صحت عطا فرمائی۔ اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے شکر بھی ادا کیا اور مغفرت بھی طلب فرمائی، اور آئندہ کے لئے بے نظیر حکومت کی دعا بھی کی۔

لیکن یہ تفسیر بھی محض قیاسی ہے، قرآن کریم کے الفاظ سے بھی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور کسی روایت سے بھی اس کا ثبوت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی یقینی تفصیلات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں، لہٰذا اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی آزمائش کی تھی جس کے بعد ان میں انابت الی اللہ کا جذبہ پہلے سے زیادہ پیدا ہوا۔ اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل مقصد تمام انسانوں کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ وہ کسی مصیبت یا آزمائش میں مبتلا ہوں تو انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح پہلے سے زیادہ رجوع الی اللہ کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ رہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کی تفصیلات، سو ان کو اللہ کے حوالے کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ

بولا اے رب میرے معاف کر مجھ کو اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ مناسب نہ ہو کسی کو میرے

بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ

پیچھے، بیشک تو ہے سب کچھ بخشنے والا۔ پھر ہم نے تابع کر دیا اس کے ہوا کو

تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿٣٦﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ
چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا اور تابع کئے شیطان سارے عمارت کرنے والے

وَّغَوَّاصٍ ﴿٣٧﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿٣٨﴾ هٰذَا
اور غوطہ لگانے والے اور بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں یہ ہے

عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٩﴾ وَاِنَّ لَهٗ
بخشش ہماری اب تو احسان کر یا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہ ہوگا اور اس کو

عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٠﴾
ہمارے یہاں مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا

ع ۳
۱۲

خلاصۂ تفسیر

(حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی کہ) اے میرے رب میرا (پچھلا) قصور معاف کر اور (آئندہ کے لئے) مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو (خواہ کوئی غیبی عجیب سامان عطا کر دیجئے خواہ سلاطین زمانہ سے بڑھ کر ہو جس کا مقابلہ ہی نہ کر سکیں) اور آپ بڑے دینے والے ہیں (آپ کو اس دعا کا قبول کر لینا کچھ دشوار نہیں) سو (ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی خطا بھی معاف کر دی اور نیز) ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ (جانا) چاہتے نرمی سے چلتی (کہ اس سے کوئی ان کو تکلیف نہ ہوتی) اور جنات کو بھی ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور (دریا میں) غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (غالباً جو خدمات سے گریز یا اس میں کوتاہی کرتے ہوں ان کو قید کی سزا ہوتی ہوگی) اور ہم نے یہ سامان دے کر ارشاد فرمایا کہ یہ ہمارا عطیہ ہے، سو خواہ (کسی کو) دو یا نہ دو تم سے کچھ دارو گیر نہیں (یعنی جتنا سامان ہم نے تم کو دیا ہے اس میں تم کو دوسرے بادشاہوں کی طرح محض خازن اور منتظم ہی نہیں بنایا بلکہ تم کو مالک بھی بنا دیا ہے) اور (علاوہ اس سامان کے جو دنیا میں ان کو عطا ہوا تھا) ان کے لئے ہمارے یہاں (خاص) قرب اور اعلیٰ درجہ کی نیک انجامی ہے (جس کا ثمرہ پورے طور پر آخرت میں ظاہر ہوگا)۔

معارف و مسائل

هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ، مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے بعد کسی کو

میسر نہ ہو۔ اس دعا کا مطلب بعض مفسرین نے تو یہ بتایا ہے کہ میرے زمانے میں مجھ جیسی عظیم الشان سلطنت کسی اور کو میسر نہ ہو، گویا ان کے نزدیک "من بعدی" کا مطلب "میرے سوا" ہے، حضرت تھانوی نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کے نزدیک دعا کا مفہوم یہ ہے کہ میرے بعد بھی کسی کو ایسی عظیم الشان حکومت حاصل نہ ہو، چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جیسی حکومت عطا فرمائی، ویسی بعد میں بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہواؤں کا مسخر ہونا اور جنات کا ایسا تابع ہونا بعد میں کسی کو میسر نہ آسکا۔ بعض لوگ عملیات وغیرہ کے ذریعہ بعض جنات کو جو مسخر کر لیتے ہیں وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر جنات سے اس کو کوئی نسبت نہیں، عملیات کے ماہرین دو ایک یا چند جنات کو تابع بنا لیتے ہیں، لیکن جس طرح کی ہمہ گیر حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حاصل تھی ویسی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

حکومت اور اقتدار کی دعا

یہاں یہ بات بھی دیکھنی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ کی اجازت ہی سے مانگی تھی، اور چونکہ اس کا منشأ محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس سے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمہ حق کو سربلند کرنے کا جذبہ کار فرما تھا، اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام اسی مقصد عالیہ کے لئے کام کریں گے، اور حب جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے، اس لئے انہیں اس دعا کی اجازت بھی دیدی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا۔ لیکن عام لوگوں کے لئے خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حب جاہ و مال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جس انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعۃً اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل نہ کرنا چاہتا ہو، تو اس کے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ۔ (زنجیروں میں جکڑے ہوئے) جنات کی تسخیر اور جو خدمات وہ انجام دیتے تھے ان کی تفصیل سورۂ سبا میں گزر چکی ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سرکش جنات کو حضرت سلیمان نے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اب ان زنجیروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی نظر آنے والی لوہے کی زنجیریں ہوں، ہو سکتا ہے کہ جنات کو جکڑنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا ہو۔ جسے آسانی سے سمجھانے کے لئے یہاں زنجیروں سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ

اور یاد کر ہمارے بندے | ایوب کو | جب اس نے پکارا اپنے رب کو | کہ مجھ کو | لگا دی

اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے) اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے اور اہل عقل کے یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی اہل عقل یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ صابروں کو کیسی جزا دیتا ہے) اور اب ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا، مگر چونکہ ان کی بیوی نے ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی، اور ان سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے لئے ایک تخفیف فرمائی) اور ارشاد فرمایا کہ اے ایوب، تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو (جس میں سو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اس سے مارو اور (اپنی) قسم نہ توڑو (چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آگے ایوب علیہ السلام کی تعریف ہے کہ) بے شک ہم نے ان کو (بڑا) صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہوتے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنے کے لئے لایا گیا ہے، یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انبیاء میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ۔ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام جس بیماری میں مبتلا ہوئے وہ شیطان کے تسلط کی وجہ سے آئی تھی۔ اور ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ فرشتوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی جس پر شیطان کو سخت حسد ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ان کے جسم و مال و اولاد پر ایسا تسلط عطا کر دیا جائے جس سے میں ان کے ساتھ جو چاہوں سو کر ڈالوں۔ اللہ تعالیٰ کو بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی اس لئے شیطان کو یہ حق دے دیا گیا اور اس نے آپ کو اس بیماری میں مبتلا کر دیا۔

لیکن محقق مفسرین نے اس قصے کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انبیاء علیہم السلام پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے آپ کو بیمار ڈال دیا ہو۔

بعض حضرات نے شیطان کے رنج و آزار پہنچانے کی یہ تشریح کی ہے کہ بیماری کی حالت میں شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالا کرتا تھا، اس سے آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوتی تھی، یہاں آپ نے اسی کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اس آیت کی سب سے بہتر تشریح وہ ہے جو حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں اختیار کی ہے، وہ بہ خلاصۂ تفسیر میں اوپر لکھی گئی ہے۔

حضرت ایوبؑ کے مرض کی نوعیت

قرآن کریم میں اتنا تو بتایا گیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک شدید قسم کا مرض لاحق ہو گیا تھا، لیکن اس مرض کی نوعیت نہیں بتائی گئی۔ احادیث میں بھی اس کی کوئی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ البتہ بعض آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جسم کے ہر حصے پر پھوڑے نکل آئے تھے، یہاں تک کہ لوگوں نے گھن کی وجہ سے آپ کو ایک کوڑی پر ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض محقق مفسرین نے ان آثار کو درست تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بیماریاں تو آسکتی ہیں، لیکن انہیں ایسی بیماریوں میں مبتلا نہیں کیا جاتا جن سے لوگ گھن کرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری بھی ایسی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ کوئی عام قسم کی بیماری تھی لہٰذا وہ آثار جن میں حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف پھوڑے پھنسیوں کی نسبت کی گئی ہے یا جن میں کہا گیا ہے کہ آپ کو کوڑی پر ڈال دیا گیا تھا، روایۃً و درایۃً قابل اعتماد نہیں ہیں۔

(ملخص از روح المعانی و احکام القرآن)

خُذْ بِیَدِكَ ضِغْثًا۔ "تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا تنکوں کا لو" اس واقعہ کا پس منظر اوپر خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔ یہاں اس واقعہ سے متعلق چند مسائل درج کئے جاتے ہیں:-

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو سو قمچیاں مارنے کی قسم کھالے اور بعد میں سو قمچیاں الگ الگ مارنے کے بجائے تمام قمچیوں کا ایک گٹھا بنا کر ایک ہی مرتبہ مار دے تو اس سے قسم پوری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہی امام ابو حنیفہ کا مسلک ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ ابن ہمام رح نے لکھا ہے کہ اس کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ اس شخص کے بدن پر ہر قمچی طولاً یا عرضاً ضرور لگ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس سے کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہو، اگر اتنے ہلکے سے قمچیاں بدن کو لگا دی گئیں کہ بالکل تکلیف نہ ہوئی تو قسم پوری نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی رح نے بیان القرآن میں جو لکھا ہے کہ قسم پوری نہیں ہوگی، تو غالباً اس کی مراد یہی ہے کہ تکلیف بالکل نہ ہو یا کوئی قمچی بدن کو لگنے سے رہ جائے، ورنہ فقہائے حنفیہ رح نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ مار دیا جائے تو قسم پوری ہو جاتی ہے۔

(ملاحظہ ہو فتح القدیر۔ ص ۱۳۷، ج ۴)

حیلوں کی شرعی حیثیت

اس آیت سے دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کیلئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ کو پوری سو قمچیاں ماریں، لیکن چونکہ ان کی زوجہ مطہرہ بے گناہ تھیں، اور انھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بے مثال خدمت کی تھی، اسلئے

اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ حیلہ کی تلقین فرمائی اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لئے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں جبکہ انہیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی مستحق کا حق باطل کیا جائے، یا کسی صریح فعل حرام کو اس کی روح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لئے حلال کر لیا جائے تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے۔ مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لئے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دیدیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دیدیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے اس لئے حرام ہے، اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔ (روح المعانی از مبسوط سرخسی)

نامناسب کام پر قسم کھانا

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی نامناسب فعل یا جائز فعل پر قسم کھالے تو قسم منعقد ہو جاتی ہے، اور اس کے توڑنے پر بھی کفارہ واجب ہوتا ہے کہ اگر اس صورت میں کفارہ نہ آتا تو حضرت ایوب علیہ السلام کو حیلہ تلقین نہ فرمایا جاتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی نامناسب کام پر قسم کھالی جائے تو شرعی حکم یہ ہے کہ اسے توڑ کر کفارہ ادا کر دیا جائے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"جو شخص ایک قسم کھالے، پھر بعد میں اس کی رائے یہ ہو کہ اس قسم کے خلاف عمل کرنا زیادہ بہتر ہے تو اسے چاہیے کہ وہ وہی کام کرے جو بہتر ہو، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔"

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي

اور یاد کر ہمارے بندوں کو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب ہاتھوں

الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ

والے اور آنکھوں والے ہم نے امتیاز دیا ان کو ایک چنی ہوئی بات کا وہ

ذِكْرَى الدَّارِ ۝۴۶ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ

یاد اس گھر کی اور وہ سب ہمارے نزدیک چنے ہوئے نیک

الْاَخْيَارِ ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ

لوگوں میں اور یاد کر اسمٰعیل کو اور الیسع اور ذوالکفل کو

وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝۴۸ هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ

اور ہر ایک تھا خوبی والا یہ ایک مذکور ہو چکا اور تحقیق ڈر والوں کے لیے ہے اچھا

مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيۡنَ

ٹھکانا باغ ہیں سدا بسنے کے کھول رکھے ہیں اُن کے واسطے دروازے تکیہ لگائے ہوئے

فِيۡهَا يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَ

بیٹھے ان میں منگواتے ہیں ان میں میوے بہت اور شراب اور

عِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا

ان کے پاس عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں ایک عمر کی یہ وہ ہے جو

تُوۡعَدُوۡنَ لِيَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزۡقُنَا

تم سے وعدہ کیا گیا حساب کے دن پر یہ ہے روزی ہماری دی

مَا لَهٗ مِنۡ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيۡنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾

ہوئی اس کو نہیں نپٹنا یہ سن چکے اور بیشک شریروں کے واسطے ہے برا ٹھکانا

جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلۡيَذُوۡقُوۡهُ

دوزخ جس میں ان کو گرنا ہے سو کیا بری آرام کی جگہ ہے یہ ہے اب اس کو چکھیں

حَمِيۡمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنۡ شَكۡلِهٖۤ اَزۡوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوۡجٌ

گرم پانی اور پیپ اور کچھ اور اسی شکل کی طرح طرح کی چیزیں یہ ایک فوج ہے

مُّقۡتَحِمٌ مَّعَكُمۡ ۚ لَا مَرۡحَبًۢا بِهِمۡ ؕ اِنَّهُمۡ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوۡا

دھنستی چلی آتی ہے تمہارے ساتھ جگہ نہ ملیو ان کو یہ بھی گھسنے والے آگ میں وہ بولے

بَلۡ اَنۡتُمۡ ۟ لَا مَرۡحَبًۢا بِكُمۡ ؕ اَنۡتُمۡ قَدَّمۡتُمُوۡهُ لَنَا ۚ فَبِئۡسَ

بلکہ تم ہی ہو جگہ نہ ملیو تم کو تم ہی پیش لائے ہمارے آگے یہ بلا سو بری ہے ٹھہرنے کی

الۡقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوۡا رَبَّنَا مَنۡ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدۡهُ عَذَابًا

جگہ ہے وہ بولے اے رب ہمارے جو کوئی لایا ہمارے پیش یہ سو بڑھا دے اس کو

ضِعۡفًا فِى النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَقَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا

دونا عذاب آگ میں اور کہیں گے کیا ہے ہم نہیں دیکھتے ان مردوں کو کہ ہم

نَعُدُّهُمۡ مِّنَ الۡاَشۡرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذۡنٰهُمۡ سِخۡرِيًّا اَمۡ زَاغَتۡ عَنۡهُمُ

ان کو شمار کرتے تھے برے لوگوں میں کیا ہم نے ان کو ٹھٹھے میں پکڑا تھا یا چوک گئیں ان سے

الۡاَبۡصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهۡلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ ع

ہماری آنکھیں یہ بات ٹھیک ہونی ہے جھگڑا کرنا آپس میں دوزخیوں کا

مذکور نہیں، بلکہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں صرف آپ کا اسم گرامی شمار کرایا گیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے کہ آپ حضرت الیاس علیہ السلام کے چچا زاد بھائی ہیں اور حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ تھے، انہی کی نیابت میں رہتے تھے۔ ان کے بعد آپ کو نبوت عطا کی گئی۔ بائبل کی کتاب سلاطین اول باب ۱۹ اور سلاطین دوم باب ۲ وغیرہ میں آپ کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں آپ کا اسم گرامی اِلْیَشَعْ بن سافط مذکور ہے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ۔ اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی ہم سن عورتیں ہوں گی، ان سے مراد جنت کی حوریں ہیں، اور "ہم سن" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سب آپس میں ہم عمر ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ عمر میں مساوی ہونگی۔ پہلی صورت میں ان کے ہم عمر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں محبت اُنس اور دوستی کا تعلق ہوگا سوکنوں کا سا بغض اور نفرت نہیں ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز شوہروں کے لئے انتہائی راحت کا موجب ہے۔

زوجین کے درمیان عمر کے تناسب کی رعایت بہتر ہے اور دوسری صورت میں جبکہ "ہم عمر" کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم عمر ہوں گی، اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہم عمری کی وجہ سے طبیعتوں میں زیادہ مناسبت اور توافق ہوگا۔ اور ایک دوسرے کی راحت و دلچسپی کا خیال زیادہ رکھا جاسکے گا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زوجین کے درمیان عمر میں تناسب کی رعایت رکھنی چاہئے، کیونکہ اس سے باہمی اُنس پیدا ہوتا ہے۔ اور رشتۂ نکاح زیادہ خوشگوار اور پائیدار ہو جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾

تو کہہ میں تو یہی ہوں ڈر سنا دینے والا اور حاکم کوئی نہیں مگر اللہ اکیلا دباؤ والا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾

رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے زبردست گناہ بخشنے والا

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾ مَا كَانَ

تو کہہ یہ ایک بڑی خبر ہے کہ تم اس کو دھیان میں نہیں لاتے مجھ کو کچھ

لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ

خبر نہ تھی اوپر کی مجلس کی جب وہ آپس میں تکرار کرتے ہیں مجھ کو تو

يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ

یہی حکم آتا ہے کہ اور کچھ نہیں میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں کھول کر جب کہا تیرے رب نے

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ

نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ

الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ

تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ

الْعَالِيْنَ ۝ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ

رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ

رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ

الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ

مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ

مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا

بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس نے محض حسد و تکبر کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا تھا، اسی طرح مشرکین عرب بھی حسد اور تکبر کی وجہ سے آپ کی بات نہیں مان رہے، اور جو انجام ابلیس کا ہوا وہی ان کا بھی ہونا ہے۔ (تفسیر کبیر)

لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انہیں پیدا کیا۔ جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ "ہاتھوں" سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ایسے ہی ہاتھ ہیں جیسے انسانوں کے ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اعضاء و جوارح کی احتیاج سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اور عربی زبان میں لفظ "ید" بکثرت قدرت کے معنی میں مستعمل ہے، مثلاً ارشاد ہے: بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ ویسے تو کائنات کی ساری چیزیں قدرت خداوندی ہی سے پیدا ہوئی ہیں، لیکن جب باری تعالیٰ کسی چیز کا خصوصی شرف ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اسے خاص طور سے اپنی طرف منسوب فرما دیتے ہیں، جیسے کعبہ کو بیت اللہ، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ یا روح من اللہ کہا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے (قرطبی)

تکلف و تصنع کی مذمت

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔ اور میں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، مطلب یہ ہے کہ میں تکلف اور تصنع کرکے اپنی نبوت و رسالت اور علم و حکمت کا اظہار نہیں کر رہا، بلکہ جو حقیقت ہے وہی تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکلف اور تصنع شرعاً مذموم ہے۔ چنانچہ اس کی مذمت میں بعض احادیث وارد ہوئی ہیں، صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد منقول ہے کہ

"اے لوگو! تم میں سے جس شخص کو کسی بات کا علم ہو وہ تو لوگوں سے کہہ دے، لیکن جس کا علم نہ ہو تو وہ "اللہ اعلم" کہنے پر اکتفا کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے: قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" (روح المعانی)

سُوْرَةُ الزُّمَرِ

سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَمٰنُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچھتّر آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ

اتارنا ہے کتاب کا اللہ سے جو زبردست ہے حکمتوں والا ہم نے اتاری ہے

اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲

تیری طرف کتاب ٹھیک ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کر اسی کے واسطے بندگی

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ

سنتا ہے اللہ ہی کے لیے ہے بندگی خالص اور جنہوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے

اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ

حمایتی کہ ہم تو پوجتے ہیں اُن کو اس واسطے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف قریب کے درجہ میں

اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ

بیشک اللہ فیصلہ کر دے گا اُن میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں البتہ اللہ

لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ

راہ نہیں دیتا اس کو جو ہو جھوٹا حق نہ ماننے والا اگر اللہ چاہتا کہ اولاد

وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ

کر لے تو چن لیتا اپنی مخلوق میں سے جو کچھ چاہتا وہ پاک ہے وہی ہے

اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ

اللہ اکیلا دباؤ والا بنائے آسمان اور زمین ٹھیک

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ

لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر اور کام میں لگا دیا

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ أَلَا هُوَ

سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے ایک ٹھہرے وعدہ تک سن رکھو وہی ہے

الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ﴿٥﴾ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ

زبردست گناہ بخشنے والا بنایا تم کو ایک جی سے پھر بنایا

مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ

اسی سے اس کا جوڑا اور اتار دیئے تمہارے واسطے چوپایوں میں سے آٹھ نر و مادہ

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ

بناتا ہے تم کو ماں کے پیٹ میں ایک طرح پر بعد دوسری طرح کے

فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ

تین اندھیروں کے بیچ وہ اللہ ہے رب تمہارا اسی کا راج ہے کسی کی بندگی نہیں

إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ﴿٦﴾

اس کے سوا پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو

خلاصۂ تفسیر

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (غالب ہونا اس کا مقتضی تھا کہ جو اس کی تکذیب کرے اس کو سزا دیدی جاوے، مگر چونکہ حکیم بھی ہے اور مصلحت میں مہلت دینا ہے اس لئے سزا میں مہلت دے رکھی ہے، اور) ہم نے ٹھیک طور پر اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے سو آپ (اس قرآن کی تعلیم کے موافق) خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہئے (جیسا اب تک کرتے رہے ہیں اور جب آپ پر بھی یہ واجب ہے تو اوروں پر تو کیوں واجب نہیں، پس اے لوگو) یاد رکھو عبادت جو کہ (شرک سے) خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے اور جن لوگوں نے (عبادت خالصہ چھوڑ کر) خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں (یعنی ہمارے حوائج یا عبادات کو خدا کے حضور پیش کر دیں جیسا دنیا میں وزراء اور درباری سلاطین کے اس کام کے ہوتے ہیں) تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلافات کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کر دے گا (کہ اہل توحید کو جنت میں اور اہل شرک کو دوزخ میں داخل کر دے گا

یلہ، یکی شکل کی، دوسری رحم کی تیسری اس تھیلی کی جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے۔ ان مختلف کیفیات سے متعدد پردوں میں تخلیق کمال قدرت کی دلیل ہے اور ظلمات ثلثہ میں پیدا کرنا کمال علم کی دلیل ہے) یہ ہے اللہ تمہارا رب (جس کی صفات ابھی تم نے سنیں) اسی کی سلطنت ہے، اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو (ان دلائل کے بعد) تم کہاں (حق سے) پھرے چلے جا رہے ہو (بلکہ واجب ہے کہ توحید کو قبول کرو اور شرک کو چھوڑ دو)۔

معارف ومسائل

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ لفظ دین کے معنے اس جگہ عبادت و اطاعت کے ہیں جو تمام احکام دینیہ کی پابندی کو عام اور شامل ہے۔ اس پہلے جملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت و طاعت کو خالص اسی کے لئے کریں جس میں کسی غیر اللہ کے شرک یا ریاء و نمود کا شائبہ نہ ہو۔ دوسرا جملہ اسی کی تاکید کے لئے ہے کہ اخلاص دین صرف اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔ اُس کے سوا کوئی مستحق نہیں۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بعض اوقات کوئی صدقہ خیرات کرتا ہوں یا کسی پر احسان کرتا ہوں جس میں میری نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی بھی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ لوگ میری تعریف و ثنا کریں گے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں فرماتے جس میں کسی غیر کو شریک کیا گیا ہو۔ پھر آپ نے آیت مذکورہ بطور استدلال کے تلاوت فرمائی۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ (قرطبی)

اعمال کی مقبولیت عند اللہ بقدر اخلاص ہے۔ متعدد آیات قرآنی اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمال کا حساب گنتی سے نہیں بلکہ وزن سے ہوتا ہے۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور آیات مذکورہ نے بتا دیا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کی قدر اور وزن بقدر اخلاص ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کمال اخلاص بدون کمال ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاص کامل یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نفع و ضرر کا مالک سمجھے نہ اپنے کاموں میں کسی غیر اللہ کو متصرف خیال کرے، نہ کسی طاعت و عبادت میں غیر اللہ کے تصور سے دھیان آنے دے۔ غیر اختیاری وساوس کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

صحابہ کرام جو مسلمانوں کی صف اول ہیں ان کے اعمال و ریاضات کی تعداد کچھ زیادہ نظر نہ آئے گی، مگر اس کے باوجود ان کا ایک ادنیٰ عمل باقی امت کے بڑے بڑے اعمال سے فائق ہونے کی وجہ ان کا

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۔ ان لوگوں پر رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی اولاد کہتے تھے ان کے اس خیال باطل اور محال کو بطور فرض محال کے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے معاذ اللہ کوئی اولاد ہوتی تو وہ بغیر اس کے کہ وہ فرشتے ہوتے ہوتی ہے کہ زبردستی اولاد اس پر مسلط نہیں ہوسکتی بہر حال بفرض اُس کا ارادہ ہوتا تو اُسکی ذات کے سوا سب اُسکی مخلوقات ہی ہیں انہی میں سے کسی کو اولاد بناتے۔ اور اولاد کا اپنے والد کی ہم جنس ہونا لازم ہے اور مخلوق خالق کی ہم جنس ہو نہیں سکتی۔ اس لئے مخلوق کو اولاد بنانے کا ارادہ کرنا محال ہوگیا۔

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ ۔ تکویر کے معنے ایک چیز کو دوسری پر ڈال کر اس کو چھپا دینے کے ہیں۔ قرآن کریم نے دن رات کے انقلاب کو یہاں عام نظروں کے اعتبار سے بلفظ تکویر تعبیر کیا ہے کہ رات آتی ہے تو گویا دن کی روشنی پر ایک پردہ ڈال دیا اور دن آتا ہے تو رات کی اندھیری پردہ میں چلی جاتی ہے۔

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شمس و قمر دونوں حرکت کرتے

چاند سورج دونوں متحرک ہیں

ہیں۔ فلکیات و ریاضیات کی مادی تحقیقات قرآن پاک یا کسی آسمانی کتاب کا موضوع بحث نہیں ہوتیں۔ مگر اس معاملہ میں جتنی بات کہیں ضمناً آجاتی ہے اُس پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ فلسفہ کی قدیم و جدید تحقیقات تو موم کی ناک ہیں روز بدلتی رہتی ہیں۔ قرآنی حقائق غیر متبدل ہیں۔ آیت مذکورہ نے جتنی بات بتلائی کہ چاند اور سورج دونوں حرکت کرتے ہیں اس پر یقین رکھنا فرض ہے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ ہمارے سامنے آفتاب کا طلوع و غروب زمین کی حرکت سے ہے یا خود ان سیاروں کی حرکت سے قرآن پاک نہ اس کا اثبات کرتا ہے نہ نفی۔ تجربہ سے جو کچھ معلوم ہوا اس کے ماننے میں حرج نہیں۔

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۔ چوپاؤں کی تخلیق کو اس آیت میں انزال یعنی آسمان سے اتارنے کے ساتھ تعبیر فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اُن کی تخلیق میں بڑا دخل اس پانی کا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی گویا آسمان سے نازل ہوئے۔ قرآن کریم نے انسانی لباس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ۔ اور بعض معدنی چیزوں مثلاً لوہے کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ۔ ان سب کا حاصل ان چیزوں کا اپنی قدرت سے پیدا کرنا اور انسان کو عطا کرنا ہے۔ (قرطبی)

خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۔ اس میں قدرت خداوندی کے اُن رموز و اسرار کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی تخلیق میں کار فرما ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ بچے کو ماں کے پیٹ میں بیک وقت مکمل پیدا کر دیتے مگر بہ مقتضائے حکمت و مصلحت ایسا نہیں بلکہ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ تدریجی تخلیق کی کہ عورت جس کے پیٹ میں عالم اصغر بن رہا ہے وہ آہستہ آہستہ اس کا بوجھ

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ

جنھوں نے نیکی کی اس دنیا میں ان کے لئے ہے بھلائی اور زمین اللہ کی

وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

کشادہ ہے صبر کرنے والوں ہی کو ملتا ہے ان کا ثواب بے شمار

خلاصۂ تفسیر

(اے لوگو تم نے کفر و شرک کا نقصان سُن لیا اس کے بعد) اگر تم کفر کرو گے (جس میں شرک بھی داخل ہے) تو خدا تعالیٰ (کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ) تمہارا (اور تمہاری عبادت کا) حاجتمند نہیں (کہ تمہارے عبادت و توحید اختیار نہ کرنے سے کچھ اُس کو ضرر پہنچے، اور یہ بات ضرور ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا (کیونکہ کفر سے بندوں کو ضرر پہنچتا ہے) اور اگر تم شکر کرو گے (جس کی فرد اعظم ایمان ہے، تو اُس کو کوئی نفع نہیں بلکہ چونکہ تمہارا نفع ہے اس لئے وہ) اس کو تمہارے لئے پسند کرتا ہے اور (چونکہ ہمارے یہاں قاعدہ مقرر ہے کہ) کوئی کسی کا بوجھ (گناہ کا) نہیں اُٹھاتا (اس لئے کفر کر کے یوں بھی نہ سمجھنا کہ ہمارا کفر دوسرے کے نامۂ اعمال میں کسی وجہ سے درج ہو جاوے گا اور ہم بری ہو جاویں گے خواہ اس وجہ سے کہ ہم دوسروں کے متبع ہیں معاصرین کے یا آبا و اجداد کے خواہ اس وجہ سے کہ دوسرے وعدہ اس بوجھ کے اٹھا لینے کا کرتے ہیں جیسا بعض کفار کہا کرتے تھے۔ وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ۔ غرض یہ نہ ہوگا بلکہ تمہارا کفر تمہارے جرائم میں لکھا جاوے گا) پھر اپنے پروردگار کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہوگا سو وہ تم کو تمہارے سب اعمال جتلا دے گا (اور سزا دے گا اور یہ گمان بھی غلط ہے کہ ان کے اعمال کی پیشی کا وقت نہ آوے گا، اور) وہ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے (سو یہ گمان بھی مت کرنا کہ ہمارے کفر کی شاید اس کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ بعض لوگوں میں گفتگو ہوئی کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے یا نہیں کسی نے کچھ جواب دیا کسی نے کچھ جواب دیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ الخ، اور (مشرک) آدمی (کی حالت یہ ہے کہ اُس) کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتا ہے (اور سب معبودوں کو بھول جاتا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس سے نعمت (امن و آسائش کی) عطا فرما دیتا ہے تو جس (تکلیف کے دفع کرنے) کے لئے پہلے سے (خدا کو) پکار رہا تھا اُس کو بھول جاتا ہے اور خدا کے شریک بنانے لگتا ہے جس کا اثر (علاوہ اپنے گمراہ ہونے کے) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے دوسروں کو (بھی) گمراہ کرتا ہے (اور اگر اس مصیبت کو پیش نظر رکھے تو توحید میں اخلاص کو قائم رکھتا، یہ شرک کی مذمت ہو گئی، آگے عذاب سے ڈرانا ہے کہ) آپ ایسے

شخص سے کہہ دیجئے کہ اپنے کفر کی بہار تھوڑے دنوں اور لوٹ لے (پھر آخر کار) تو دوزخیوں میں سے ہونے والا ہے (آگے اہل توحید کی مدح و بشارت ہے یعنی) بھلا جو شخص (برعکس حال مشرک مذکور کے) اوقات شب میں (جو عموماً غفلت کا وقت ہوتا ہے) سجدہ و قیام (یعنی نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو (یہ تو اس کا ظاہر ہے اور باطن یہ ہو کہ) آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی اُمید بھی کر رہا ہو (کیا ایسا شخص اور مشرک مذکور برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ قانت جو عبادت پر مداومت کرنے والا اور اللہ سے ڈرنے والا بھی ہے اور اس سے اُمید عفو و کرم رکھنے والا بھی یہ محمود ہے اور مشرک جو مطلب نکال لینے کے بعد اخلاص کو چھوڑ دیتا ہے مذموم ہے اور چونکہ ان عبادات کے ترک کو کفار مذموم نہ سمجھتے تھے اس لئے اس تفاوت کی بنا پر محمودیت و مذمومیت کے حکم میں ان کو شبہ ہو سکتا تھا اس لئے آگے اس سے زیادہ واضح اور مسلّم عنوان سے اس حکم کا اثبات فرماتے ہیں یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ (ان سے بایں عنوان) کہیے کہ علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں (چونکہ جہل کو ہر شخص برا سمجھتا ہے اس کے جواب میں اُن کی طرف سے بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اہل جہل مذموم ہیں آگے یہ ثابت کرنا رہ جاوے گا کہ صاحب عمل صاحب علم ہے اور عمل سے اعراض کرنے والا صاحب جہل ہے سو یہ امر ذرا تامل سے ثابت ہے اور ہر چند کہ اس بیان سے کفر و اہل کفر کا مذموم اور ایمان و اہل ایمان کا محمود ہونا ثابت ہو گیا لیکن پھر بھی) وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں اور (جب اہل اطاعت کا عند اللہ محمود ہونا معلوم ہو گیا تو طاعت کی ترغیب دینے کے لئے آپ (مومنین کو میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے ایمان والے بندو تم اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو (یعنی مداوم علی الطاعات و محترز عن المعاصی رہو کیونکہ) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک صلہ ہے (آخرت میں تو ضرور اور دنیا میں بھی باطنی راحت تو ضرور اور کبھی ظاہری بھی) اور (اگر وطن میں کوئی نیکی کرنے سے مانع ہو تو ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ کیونکہ) اللہ کی زمین فراخ ہے اور (اگر ترک وطن میں کچھ تکلیف پہنچے تو استقلال رکھو کیونکہ دین میں) مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا (پس اس سے ترغیب اطاعت کی ہو گئی)۔

معارف و مسائل

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۔ یعنی نہ تمہارے ایمان سے اللہ تعالیٰ کا اپنا کوئی فائدہ نہ تمہارے کفر سے کوئی نقصان۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے میرے بندو

آنَاۤءَ الَّیۡلِ کے معنی ساعات لیل کے ہیں، جس میں رات کا شروع حصہ اور درمیانی اور آخر سب داخل ہے۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ محشر کے موقف حساب میں اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماویں، اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی اندھیری میں سجدہ و قیام کی حالت میں پائے۔ اس طرح کہ اس کو آخرت کی فکر بھی ہو اور رحمت کی اُمید بھی۔ بعض حضرات نے مغرب و عشاء کے درمیان کے وقت کو بھی اناء اللیل کہا ہے (قرطبی)۔

وَاَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ، اس سے پہلے جو عمل صالح کا حکم ہے۔ اس میں کوئی یہ عذر کر سکتا تھا کہ میں جس شہر یا ملک میں رہتا ہوں یا جس ماحول میں پھنسا ہوا ہوں اس کا ماحول مجھے اعمال صالحہ سے روکتا ہے۔ اس کا جواب اس جملے میں دیدیا گیا کہ اگر کسی خاص ملک و شہر یا خاص ماحول میں رہتے ہوئے احکام شرعیہ کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کو چھوڑ دو، اللہ کی زمین بہت وسیع ہے کسی ایسی جگہ اور ایسے ماحول میں جا کر رہو جو اطاعت احکام الٰہیہ کے لئے سازگار ہو۔ اس میں ترغیب ہے ایسی جگہ سے ہجرت کی جس میں رہتے ہوئے انسان احکام دین کی پابندی نہ کر سکے۔ ہجرت کے مفصل احکام سورۂ نساء میں آچکے ہیں۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ، یعنی صبر کرنے والوں کا ثواب کسی مقرر اندازے اور پیمانے سے نہیں، بلکہ بے اندازہ و بے حساب دیا جائے گا، جیسا کہ روایت حدیث میں آگے آتا ہے۔ اور بعض حضرات نے بغیر حساب کے معنی درخواست و مطالبہ کے لئے ہیں یعنی دنیا میں کسی کا کوئی حق کسی کے ذمہ ہو تو اسے اپنے حق کا خود مطالبہ کرنا پڑتا ہے لیکن آخرت میں صابروں کو درخواست اور مطالبہ کے بغیر ہی ان کا ثواب عطا کیا جائے گا۔

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ حضرت انس رضؓ نے حدیث سُنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز میزان عدل قائم کی جائیگی، اہل صدقہ آئیں گے تو ان کے صدقات کو تول کر اس کے حساب سے پورا پورا اجر دیدیا جائے گا۔ اسی طرح نماز اور حج وغیرہ عبادات والوں کی عبادات کو تول کر اس کے حساب سے ان کا اجر پورا دیدیا جائے گا۔ پھر جب بلاء اور مصیبت میں صبر کرنے والے آئیں گے تو ان کے لئے کوئی کیل اور وزن نہیں ہوگا۔ بلکہ بغیر حساب و اندازہ کے ان کی طرف اجر و ثواب بہا دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی عافیت میں گذری تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قینچیوں کے ذریعہ کاٹے گئے ہوتے تو ہمیں بھی صبر کا ایسا ہی صلہ ملتا۔

حضرت امام مالکؒ نے اس آیت میں صابرین سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جو دنیا کی مصائب اور رنج و غم پر صبر کرنے والے ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاصی سے

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر چلایا وہ پانی چشموں میں

فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ

زمین کے پھر نکالتا ہے اس سے کھیتی کئی کئی رنگ بدلتی اس پر پھر آئے تیاری پر

مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ

پھر تو دیکھے اس کا رنگ زرد ہو گیا پھر کر ڈالتا ہے اس کو چورا چورا بیشک اس میں نصیحت ہے

لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٢١﴾ أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

عقلمندوں کے واسطے بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے

فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن

سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٢٢﴾ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ

یاد سے وہ پڑے پھرتے ہیں صریح بھٹکتے میں اللہ نے اتاری بہتر

الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ

بات کتاب کی آپس میں ملتی دہرائی ہوئی بال کھڑے ہوتے ہیں اس سے کھال پر

يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ

ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی

ذِكْرِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ ۚ

یاد پر یہ ہے راہ دینا اللہ کا اس طرح راہ دیتا ہے جس کو چاہے

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾

اور جس کو راہ بھلائے اللہ اس کو کوئی نہیں سمجھانے والا

خلاصۂ تفسیر

اے مخاطب کیا تو نے اس (بات) پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتوں میں (یعنی ان قطعات میں جہاں سے پانی نکل کر کنوؤں اور چشموں کے ذریعہ نکلتا ہے) داخل کر دیتا ہے، پھر (جب وہ نکلتا ہے تو) اس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی بالکل خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو چورا چورا کر دیتا

ہے اس (نمونہ) میں اہل عقل کے لئے بڑی عبرت ہے کہ یہی حالت بعینہٖ انسان کی دنیوی حیات کی ہے آخر فنا ہو جاتا ہے تو اس میں منہمک ہو کر ابدی راحت سے محروم رہنا اور ابدی مصیبت کو سر پر لینا نہایت حماقت ہے (آگے ارشاد ہے کہ) یہ ہدایت بالغ ہے مگر پھر بھی سب سننے والے باہم متفاوت ہیں، سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کھول دیا (یعنی اسلام کی حقیت اس کو یقین آ گیا) اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کئے ہوئے) نور (یعنی ہدایت کے مقتضا) پر (چل رہا) ہے (یعنی یقین کر کے اس کے موافق عمل کرنے لگا) کیا وہ شخص اور اہل قساوت برابر ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے، سو جن لوگوں کے دل خدا کے ذکر سے (اس میں احکام و مواعید سب آ گئے) متاثر نہیں ہوتے (یعنی ایمان نہیں لاتے) ان کے لئے (قیامت میں) بڑی خرابی ہے (اور دنیا میں) یہ لوگ کھلی گمراہی میں (گرفتار) ہیں (آگے اس نور اور ذکر کا بیان ہے یعنی) اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ (باعتبار اعجاز نظم و صحت معانی کے) باہم ملتی جلتی ہے اور جس میں سمجھانے کے (بعض بعض ضروری بات) بار بار دہرائی گئی ہے (کقولہ تعالیٰ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ) جس میں باوجود فائدہ تاکید و تجدید مدعا کے جگہ جگہ خاص خاص لطف کا بھی لحاظ ہوتا ہے جس سے خالی تکرار نہیں رہتا اور متشابہ ہونا یعنی بار بار دہرایا جانا دلیل ہے ہدایت پر مشتمل ہونے کی) جس سے ان لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں (لیکن یہ ہے خوف سے کو تعب جی میں رہے بدن پر اثر نہ آوے اور گو وہ خوف عقلی و ایمانی ہو طبعی و حالی نہ ہو) پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر (یعنی کتاب اللہ پر عمل کرنے) کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں (یعنی ذکر اعمال جوارح و اعمال قلب کو انقیاد و توجہ سے بجا لاتے ہیں) اور یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے (جیسا خاشعین کا حال ابھی سنایا گیا) اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں (جیسا قاسین یعنی سخت دل کافروں کا حال ابھی سنایا گیا)

معارف و مسائل

فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ۔ ینابیع ینبوع کی جمع ہے جس کے معنی زمین سے پھوٹنے والے چشمے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی نازل کر دینا ہی ایک عظیم الشان نعمت ہے مگر اس نعمت کو اگر زمین کے اندر محفوظ کر دینے کا انتظام نہ کیا جاتا تو انسان اس سے صرف بارش کے وقت یا اس کے متصل چند دن تک فائدہ اٹھا سکتا۔ حالانکہ پانی اس کی زندگی کا مدار اور ایسی ضرورت ہے جس سے وہ ایک دن بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے صرف اس نعمت کے نازل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا

بلکہ اُس کے محفوظ رکھنے کے عجیب عجیب سامان فرمادیئے، کچھ تو زمین کے گڑھوں، حوضوں اور تالابوں میں محفوظ ہوجاتا ہے اور بہت بڑا ذخیرہ برف بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا جاتا ہے، جس سے اس کے سڑنے اور خراب ہونے کا امکان نہیں رہتا، پھر وہ برف آہستہ آہستہ پگھل کر پہاڑی رگوں کے ساتھ زمین میں اُتر جاتا ہے اور جا بجا اُبلنے والے چشموں کی صورت میں خود بخود بغیر کسی انسانی عمل کے پہونچ جاتا ہے اور ندیوں کی شکل میں زمین میں بہنے لگتا ہے اور باقی پانی پوری زمین کی رگوں میں چلتا رہتا ہے جس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم میں اس نظام آبپاشی کی پوری تفصیل کو سورۂ مومنون میں آیت فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰي ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ یعنی کھیتی کے اُگنے کے وقت اور پکنے کے وقت اُس پر مختلف رنگ آتے جاتے رہتے ہیں اور چونکہ ان رنگوں میں انقلاب و تجدد ہے اس لئے مُخْتَلِفًا کو ترکیب نحوی میں حال بنا کر منصوب کیا گیا ہے جو تجدد پر دلالت کرتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ یعنی پانی اُتارنے اور اس کو محفوظ کرکے انسان کے کام میں لانے، پھر اس سے قسم قسم کی نباتات اور درخت اگانے اور ان درختوں پر مختلف رنگ آنے کے بعد آخر میں زرد خشک ہو کر چورا ہو جانے میں بڑی نصیحت ہے عقل والوں کے لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت و حکمت کے دلائل ہیں جن کو دیکھ کر انسان اپنی تخلیق کے معاملہ کی حقیقت بھی پہچان سکتا ہے جو ذریعہ ہو جاتی ہے اپنے خالق و مالک کے پہچاننے کا۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ شرح کے لفظی معنے کھولنے، پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں، شرح صدر کے معنی وسعت قلب کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ قلب میں اس کی استعداد موجود ہو کہ وہ مخلوقات الٰہیہ آسمان و زمین اور خود اپنی پیدائش وغیرہ میں غور کرکے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اسی طرح آیات الٰہیہ بصورت کتاب و احکام نازل کی جاتی ہیں ان میں غور کرکے استفادہ کرسکے۔ اس کا مقابل دل تنگی اور قساوت قلب ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا اور اس جگہ اگلی آیت فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ اسی شرح صدر کے بمقابل آیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ تلاوت فرمائی تو ہم نے آپ سے شرح صدر کا مطلب پوچھا آپ نے فرمایا کہ جب نور ایمان انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس کا قلب وسیع ہو جاتا ہے (جس سے احکام الٰہیہ کا سمجھنا اور عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے)۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (شرح صدر) کی

علامت کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

الانابۃ الی دار الخلود والتجافی عن دار الغرور والتاھب للموت قبل نزولہ۔

رواہ الحاکم فی المستدرک والبیہقی فی شعب الایمان۔ (روح المعانی)

ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف راغب اور مائل ہونا اور دھوکے کے گھر یعنی دنیا کی لذائذ و زینت) سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا۔

آیت مذکورہ کو حرف استفہام اَفَمَنْ سے شروع کیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا ایسا شخص جس کا دل اسلام کے لئے کھول دیا گیا ہو اور وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے یعنی اس کی روشنی میں سب کام کرتا ہے — اور وہ آدمی جو دل تنگ و سخت دل ہو کہیں برابر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بالمقابل سخت دل کا ذکر اگلی آیت میں عذاب ویل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ۔ قاسیہ قساوت سے مشتق ہے جس کے معنی سخت دل ہونا جس کو کسی پر رحم نہ آوے اور تو اللہ کے ذکر اور اس کے احکام سے کوئی اثر قبول نہ کرے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ اس سے پہلی آیت میں اللہ کے مقبول بندوں کا یہ حال ذکر کیا گیا تھا کہ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اس آیت میں بتلا دیا کہ قرآن ہی احسن الحدیث ہے۔ حدیث کے لغوی معنی ہر اس قصے کے ہیں جو بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن کو احسن الحدیث فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہوتا ہے اس سب میں احسن کلام قرآن ہے۔ آگے قرآن کی چند صفات ذکر فرمائی ہیں۔ ایک کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا متشابہ سے مراد اس جگہ متماثل ہے۔ یعنی مضامین قرآنیہ ایک دوسرے سے مربوط اور مماثل ہیں۔ ایک آیت کی تشریح و تصدیق دوسری آیت سے ہو جاتی ہے۔ اس کلام میں تضاد و تعارض کا نام نہیں ہے۔ دوسری صفت مثانی ہے جو مثنیٰ کی جمع ہے جس کے معنی مکرر کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لئے بار بار دہرایا جاتا ہے تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ۔ یعنی اللہ کی عظمت سے متاثر ہو کر ڈرنے والوں کا قرآن پڑھ کر خشیت و ہیبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ یعنی تلاوت قرآن کا اثر کبھی عذاب کی وعید سُن کر یہ ہوتا ہے کہ بدن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی رحمت و مغفرت کی آیات سُن کر یہ حال ہوتا ہے کہ بدن اور قلب سب اللہ کی یاد میں نرم ہو جاتے ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا عام حال یہی تھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور بدن پر بال کھڑے ہو جاتے۔ (قرطبی)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندے کے بدن پر اللہ کے خوف سے بال کھڑے ہو جاویں تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن کو آگ پر حرام کر دیتے ہیں (قرطبی)

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٢٤﴾ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾ قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٢٨﴾

خلاصۂ تفسیر

بھلا جو شخص اپنے منہ کو قیامت کے روز سخت عذاب کی سپر بنا دے گا اور ایسے ظالموں کو حکم ہوگا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے (اب اس کا مزہ چکھو تو کیا یہ گرفتارِ عذاب) اور جو ایسا نہ ہو برابر ہو سکتے ہیں (اور کفار ان عذابوں کو سن کر غافل نہ رہیں کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا سو ان پر عذاب ایسے طور پر آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا سو اللہ تعالیٰ نے

ان کو اسی دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا (کہ زمین میں دھنس جانے اور چہرہ بگڑ جانے اور آسمان سے پتھر برسنے وغیرہ کے عذاب سے دنیا میں بدنام ہوئے) اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ جاتے (اوپر کی آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ میں یہ بیان ہوا تھا کہ قرآن سن کر بعض لوگ متاثر ہوتے ہیں بعض نہیں ہوتے۔ آگے آیت میں یہ بیان ہے کہ بعض لوگوں کا اس سے متاثر نہ ہونا انکی اپنی قابلیت وصلاحیت کی کمی کی وجہ سے ہے، ورنہ قرآن فی نفسہ سب کے لئے اثر برابر رکھتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تفاوت قابلیت کے تفاوت سے ہے، فاعل میں کوئی نقص اور کمی نہیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری، عمدہ) مضامین بیان کئے ہیں تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا بھی کجی نہیں (اور یہ مضامین اسلئے لائے گئے) تاکہ یہ لوگ (ان سچے اور صاف مضامین کو سن کر) ڈریں (معلوم ہوا کہ قرآن پاک کے کتاب الہدایۃ ہونے میں جن صفات کی ضرورت تھی وہ سب اس میں جمع ہیں کہ اس کے مضامین بھی سب سچے اور صاف واضح ہیں اور زبان بھی عربی ہے جس کو موجودہ مخاطب بلا واسطہ سمجھ سکتے ہیں، پھر ان کے ذریعہ سے دوسروں کو سمجھا لینا بھی آسان ہو سکتا ہے۔ غرض اس کتاب ہدایت میں تو کوئی کمی نہیں کسی میں قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔)

مَعارف ومَسائل

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ۔ اس میں جہنم کے سخت ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ انسان کی عادت دنیا میں یہ ہے کہ کوئی تکلیف کی چیز سامنے آجائے تو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو چہرہ بچانے کے لئے ڈھال بنا کر دفع کرتا ہے۔ مگر خدا کی پناہ اہل جہنم کو یہ ہاتھ پاؤں سے مدافعت بھی نصیب نہیں ہوگی، ان پر جو عذاب آئے گا وہ براہ راست ان کے چہروں پر پڑے گا۔ وہ مدافعت بھی کرنا چاہے تو چہرہ ہی کو ڈھال بنا سکے گا کیونکہ جہنم میں اس کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈالا جائے گا۔ نعوذ باللہ منہ۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت عطاء ابن زید نے فرمایا کہ جہنمی کو جہنم میں ہاتھ پاؤں باندھ کر گھسیٹ کر ڈالا جائے گا۔ (قرطبی)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ

اللہ نے | بتلائی | ایک مثل | ایک مرد ہے | کہ اس میں شریک ہیں | کئی ضدی

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ
اور ایک مرد ہے پورا ایک شخص کا کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ
سب خوبی اللہ کے لئے ہے پر وہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے بے شک تو بھی مرتا ہے

وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ
اور وہ بھی مرتے ہیں پھر مقرر تم قیامت کے دن اپنے رب کے آگے

تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ
جھگڑو گے پھر اس سے زیادہ ظالم کون جس نے جھوٹ بولا اللہ پر

ع ۱۷ ۳

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَاۗءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ
اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس کیا نہیں دوزخ میں

مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ
ٹھکانا منکروں کا اور جو لے کر آیا سچی بات اور سچ مانا

بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ
جس نے اس کو وہی لوگ ہیں ڈر والے ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے

رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
رب کے پاس یہ ہے بدلا نیکی والوں کا تاکہ اتار دے اللہ ان پر سے

اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾
برے کام جو انہوں نے کئے تھے اور بدلے میں دے ان کو ثواب بہتر کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے موحد و مشرک کے بارے میں، ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص (غلام) ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضد اضدی (بھی) ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے (تو) کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ (ظاہر ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں، پہلا شخص تکلیف میں ہے کہ ہمیشہ متحیر رہتا ہے کہ کس کا کہنا مانوں کس کا نہ مانوں۔ دوسرا آرام میں ہے کہ ایک ہی شخص سے تعلق ہے۔ پس پہلی مثال مشرک کی ہے کہ ہمیشہ ڈانوا ڈول رہتا ہے۔ کبھی غیر اللہ کی طرف دوڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف پھر غیر اللہ میں بھی ایک پر اطمینان نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے، کبھی کسی کی طرف۔

اس سوال کا جواب اہلِ فہم بھی اس کے سوا نہیں دے سکتے، تو مشرک بڑی مصیبت میں رہتا ہے اس لئے ان پر حجت تمام ہوگئی۔ اس تمام تحقیق پر فرمایا الحمد للہ حق ثابت ہوگیا۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ قبول نہیں کرتے۔ بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر لوگ سمجھتے بھی نہیں (کیونکہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔ آگے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے جو آخری فیصلہ ہوگا جس سے کوئی بھاگ نہیں سکے گا اور فیصلہ قیامت سے پہلے موت کی خبر دیتے ہیں۔ کیونکہ موت ہی مقدمہ اور طریقہ ہے آخرت تک پہنچنے کا اس لئے فرمایا اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ اگر دنیا میں کسی عقلی اور نقلی فیصلہ کو نہیں مانتے تو آپ غم نہ کیجئے، کیونکہ دنیا سے آپ کو بھی مرجانا ہے اور ان کو بھی مرجانا ہے، پھر قیامت کے روز تم (دونوں فریق اپنے اپنے) مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے۔ اس وقت عملی فیصلہ ہو جاوے گا جس کے ظہور کا بیان آگے آتا ہے فَمَنْ اَظْلَمُ، سو (اس مخاصمت اور عدالت میں مقدمات پیش ہونے کے وقت فیصلہ یہ ہوگا کہ باطل پرستوں کو عذاب جہنم ہوگا اور حق پرستوں کو اجر عظیم ملے گا اور ظاہر ہے کہ) اس شخص سے زیادہ بے انصاف (اور ناحق پرست) کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (یعنی خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کہے کہ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں) اور سچی بات کو (یعنی قرآن کو) جبکہ وہ اس کے پاس (رسول کے ذریعہ) پہنچی جھٹلا دے (تو ایسے شخص کا بڑا ظالم ہونا بھی ظاہر ہے اور ظالم کا مستحق ہونا بڑے عذاب کا بھی ظاہر ہے اور بڑا عذاب جہنم ہے تو) کیا (قیامت کے دن) جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانا نہ ہوگا (یہ فیصلہ تو باطل پرستوں کا ہوا) اور (برخلاف ان کے) جو لوگ سچی بات لے کر (خدا کی طرف سے یا رسول کی طرف سے لوگوں کے پاس) آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا (یعنی یہ لوگ صادق بھی ہیں اور مصدق بھی جیسا کہ پہلے لوگ کاذب بھی تھے اور مکذب بھی) تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں (ان کا فیصلہ یہ ہوگا کہ) وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے پروردگار کے پاس سب کچھ ہے یہ صلہ ہے نیکوکاروں کا (اور یہ صلہ ان کے لئے اس واسطے تجویز کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے برے عملوں کو دور کرے اور نیک کاموں کے عوض ان کو ان کا ثواب دے۔

معارف ومسائل

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ - لفظ مَیّت بتشدید الیاء اس کو کہتے ہیں جو زمانہ مستقبل میں مرنے والا ہو اور مَیْت بسکون الیاء اس کو کہتے ہیں جو مر چکا ہو۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور آپ کے

دشمن اور احباب بھی سب مرنے والے ہیں، مقصد اس کے بیان کرنے سے سب کو فکر آخرت کی طرف متوجہ کرنا و عمل آخرت میں لگنے کی ترغیب دینا ہے اور ضمناً یہ بھی بتلا دینا ہے کہ افضل الخلائق اور سید الرسل ہونے کے باوجود موت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مستثنیٰ نہیں، تاکہ آپ کی وفات کے بعد لوگوں میں اس پر اختلاف پیدا نہ ہو۔ (از قرطبی)

محشر کی عدالت میں مظلوم کا حق ظالم سے وصول کرنے کی صورت

ثم انکم یوم القیمۃ عند ربکم تختصمون۔ حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ انکم میں مومن و کافر اور مسلمان، ظالم و مظلوم سب داخل ہیں، یہ سب اپنے اپنے مقدمات اپنے رب کی عدالت میں پیش کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ظالم سے مظلوم کا حق دلوائیں گے وہ کافر ہو یا مومن۔ اور صورت اس ادائیگی حقوق کی وہ ہوگی جو صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہے اس کو چاہئے کہ دنیا ہی میں اس کو ادا یا معاف کرا کر حلال ہو جائے، کیونکہ آخرت میں درہم و دینار تو ہوں گے نہیں، اگر ظالم کے پاس کچھ اعمال صالحہ ہیں تو بقدر ظلم یہ اعمال اس سے لیکر مظلوم کو دیدیئے جاویں گے، اور اگر اس کے پاس حسنات نہیں ہیں تو مظلوم کی سیئات اور گناہ ہوں گے اس سے لیکر ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز صحابہ کرام سے سوال کیا کہ آپ جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو مفلس اس کو سمجھتے ہیں جس کے پاس نہ کوئی نقد رقم ہو نہ ضروریات کا سامان۔ آپ نے فرمایا کہ اصلی اور حقیقی مفلس میری امت میں وہ شخص ہے جو قیامت میں بہت سے نیک عمل، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ لیکر آئے گا مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت باندھی، کسی کا مال ناجائز طور پر کھا گیا، کسی کو قتل کرا دیا، کسی کو مار پیٹ سے ستایا، تو یہ سب مظلوم اللہ کے سامنے اپنے مظالم کا مطالبہ کریں گے اور اس کی حسنات ان میں تقسیم کر دی جائیں گی، پھر جب یہ حسنات ختم ہو جائیں گی اور مظلوموں کے حقوق ابھی باقی ہوں گے تو مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جاویں گے اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جاوے گا۔ (تو یہ شخص سب کچھ سامان ہونے کے باوجود قیامت میں مفلس رہ گیا، یہی اصلی مفلس ہے)

اور طبرانی نے ایک معتبر سند کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا وہ مرد اور اس کی بیوی کا ہوگا اور بخدا کہ وہاں زبان نہیں بولے گی، بلکہ عورت کے ہاتھ پاؤں گواہی دینگے کہ وہ اپنے شوہر پر کیا کیا عیب لگایا کرتی تھی اور اسی طرح مرد کے ہاتھ پاؤں اس پر گواہی دیں گے کہ وہ کس طرح اپنی بیوی کو تکلیف و ایذا پہنچاتا تھا۔ اس کے بعد ہر آدمی کے سامنے اس کے نوکر چاکر لائے

جائیں گے ان کی شکایات کا فیصلہ کیا جائے گا، مثلاً بازار کے لوگ جن سے اس کے معاملات رہتے تھے وہ پیش ہوں گے اگر اس نے ان میں سے کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کا حق دلوایا جائے گا۔

سارے اعمال مظالم اور حقوق کے بدلے میں دیئے جاویں گے مگر ایمان نہیں دیا جائے گا۔

تفسیر مظہری میں مذکورہ سب روایات حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مظلوموں کے حقوق میں ظالم کے اعمال دیئے جانے کا جو ذکر آیا ہے، اس سے مراد ایمان کے علاوہ دوسرے اعمال ہیں، کیونکہ جتنے مظالم ہیں وہ سب عملی گناہ ہیں، کفر نہیں ہیں، اور عملی گناہوں کی سزا محدود ہوگی بخلاف ایمان کے کہ وہ ایک غیر محدود عمل ہے، اس کی جزا بھی غیر محدود یعنی ہمیشہ جنت میں رہنا ہے، اگرچہ وہ گناہوں کی سزا بھگتنے اور کچھ عرصہ جہنم میں رہنے کے بعد ہو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب ظالم کے اعمال بجز ایمان کے سب مظلوموں کو دے کر ختم ہو جائیں گے، صرف ایمان رہ جائے گا تو ایمان اس سے سلب نہیں کیا جائے گا، بلکہ مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال کر حقوق کی ادائیگی کی جائے گی، جس کے نتیجہ میں یہ گناہوں کا عذاب بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل ہوگا اور پھر یہ حال اس کا دائمی ہوگا، صاحب تفسیر مظہری نے فرمایا کہ امام بیہقی نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

كَذَّبَ بِالصِّدْقِ اور وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ میں صدق سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، خواہ قرآن ہو یا قرآن کے علاوہ دوسری تعلیمات احادیث، اور صَدَّقَ بِهٖ میں سب مومنین داخل ہیں جو اس کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ

کیا اللہ بس نہیں اپنے بندہ کو اور تجھ کو ڈراتے ہیں ان سے جو اس کے سوا ہیں

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ

اور جس کو راہ بھلائے اللہ تو کوئی نہیں اس کو راہ دینے والا اور جس کو راہ سمجھائے اللہ

فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾

تو کوئی نہیں اس کو بھلانے والا کیا نہیں ہے اللہ زبردست بدلہ لینے والا

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ

اور جو تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں

اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ

اللہ نے تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوائے اگر

أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ

چاہے اللہ مجھ پر کچھ تکلیف تو وہ ایسے ہیں کھول دیں تکلیف اس کی ڈالی ہوئی یا وہ چاہے مجھ پر

هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ ۚ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ ۖ عَلَيْهِ

مہربانی تو وہ ایسی ہیں کہ روک دیں اس کی مہربانی کو تو کہہ مجھ کو بس ہے اللہ اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں

يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ

بھروسہ رکھنے والے تو کہہ اے قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ پر

إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ

میں بھی کام کرتا ہوں اب آگے جان لوگے کس پر آتی ہے آفت کہ رسوا کرے

يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَنْزَلْنَا

رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب سدا رہنے والا ہم نے اتاری

عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ

تجھ پر کتاب لوگوں کے واسطے سچے دین کے ساتھ پھر جو کوئی راہ پر آیا سو اپنے بھلے کو اور جو

ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ﴿٤١﴾

کوئی بہکا سو یہی بات ہے کہ بہکا اپنے برے کو اور تو نہیں ان کا ذمہ دار

خلاصۂ تفسیر

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت) کے لئے کافی نہیں (یعنی وہ تو سب ہی کی حفاظت کے لئے کافی ہے تو اپنے محبوب خاص بندے کے لئے کیوں کافی نہ ہوگا) اور یہ لوگ (ایسے احمق ہیں کہ حفاظت خداوندی سے تجاہل کرکے) آپ کو اُن (جھوٹے معبودوں) سے ڈراتے ہیں جو خدا کے سوا تجویز کر رکھے ہیں (حالانکہ وہ خود بے جان عاجز ہیں اور اگر وہ ذی جان بھی ہوتے تو خدا کی حفاظت کے مقابلہ میں عاجز ہی ہوتے) اور (اصل بات یہ ہے کہ) جس کو خدا گمراہ کرے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں (آگے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کرکے ان کی حماقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ) کیا خدا تعالیٰ (ان کے نزدیک) زبردست (اور) انتقام لینے (پر قدرت رکھنے) والا نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت نصرت بھی کامل اور بندہ کی صلاحیت منصوریت بھی کامل اور جھوٹے معبودوں کا قدرت و نصرت سے عاجز ہونا بھی ظاہر پھر آپ کو ان باتوں سے ڈرانا حماقت نہیں تو کیا ہے) اور (عجیب بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی

قدرت کاملہ اور شرکت کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (اس لئے) آپ (ان سے) کہئے کہ بھلا (جب تم اللہ کو تخلیق میں منفرد مانتے ہو تو) یہ بتلاؤ کہ خدا کے سوا جن معبودوں کو تم پوجتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو روک سکتے ہیں (آگے ارشاد ہے کہ جب اس تقریر سے اللہ تعالیٰ کا کمال قدرت ثابت ہو جاوے تو آپ کہہ دیجئے کہ (اس سے ثابت ہو گیا کہ) میرے لئے خدا کافی ہے توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں (اسی لئے میں بھی اسی پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہوں اور تمہارے خلاف و عناد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور چونکہ یہ لوگ ان سب باتوں کو سن کر بھی اپنے خیال باطل پر جمے ہوئے تھے اس لئے آپ کو آخری جواب کی تعلیم ہے کہ) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم نہیں مانتے تو) تم جانو تم اپنی حالت پر عمل کئے جاؤ میں بھی (اپنے طرز پر) عمل کر رہا ہوں (یعنی جب تم اپنے طریقہ باطل کو نہیں چھوڑتے تو میں طریقہ حق کو کیسے چھوڑ دوں) سو اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور (مرنے کے بعد) اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا (چنانچہ دنیا میں غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی اس کے بعد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ یہاں تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کے خوف سے تسلی دی گئی۔ آگے آپ کو جو لطف اور عام خلق خدا کے ساتھ شفقت کی بنا پر ان کے کفر و انکار سے غم ہوتا تھا اس پر تسلی دی گئی کہ) ہم نے یہ کتاب آپ پر لوگوں کے (نفع کے) لئے اتاری جو حق کو لئے ہوئے ہے سو (آپ کا کام اس کا پہنچا دینا ہے پھر) جو شخص راہ راست پر آوے گا تو اپنے نفع کے واسطے اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا۔ اور آپ ان پر مسلط (اس طرح) نہیں کئے گئے (کہ ان کی بے راہی کی آپ سے باز پرس ہو تو آپ ان کی گمراہی سے کیوں مغموم ہوتے ہیں)۔

معارف و مسائل

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ اس آیت کا شان نزول یک واقعہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اس سے ڈرایا تھا کہ اگر آپ نے ہمارے بتوں کی بے ادبی کی تو ان بتوں کا اثر بہت سخت ہے اس سے آپ بچ نہ سکیں گے۔ ان کے جواب میں کہا گیا کہ کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں؟ اس لئے بعض مفسرین نے یہاں بندے سے مخصوص بندہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے۔ خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے بندہ سے مراد عام لی ہے اور

آیت کی دوسری قرأت جو عبدہ آئی ہے وہ اس کی مؤید ہے۔ اور مضمون بہر حال عام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے لئے کافی ہے۔

عبرت و نصیحت

وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ، یعنی کفار آپ کو ڈراتے ہیں اپنے جھوٹے معبودوں کے غضب سے۔ اس آیت کو پڑھنے والے عموماً یہ خیال کر کے گذر جاتے ہیں کہ یہ ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے جس کا تعلق کفار کی دھمکیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ہے، اس طرف دھیان نہیں دیتے کہ اس میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے۔ حالانکہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو اس لئے ڈراتا ہے کہ تم نے فلاں کام کیا یا فلاں کام نہ کیا تو فلاں حاکم و افسر یا فلاں شخص تم سے خفا ہو جائیں گے اور مصیبت پہنچائیں گے۔ یہ بھی اسی میں داخل ہے، اگرچہ ڈرانے والا مسلمان ہی ہو اور جس سے ڈرایا جائے وہ بھی مسلمان ہی ہو۔ اور یہ ایسا عام ابتلاء ہے کہ دنیا کی اکثر ملازمتوں میں لوگوں کو پیش آتا ہے کہ احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائیں یا پھر اپنے افسروں کے عتاب و عقاب کے مورد بنیں۔ اس آیت نے ان سب کو یہ ہدایت دی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کے لئے کافی نہیں، تم نے خالص اللہ کے لئے گناہوں کے ارتکاب سے پرہیز کا عزم کر لیا اور احکام خداوندی کے خلاف کسی حاکم و افسر کی پروا نہ کی تو اللہ تعالیٰ کی امداد تمہارے ساتھ ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ملازمت چھوٹ بھی جائے گی تو اللہ تعالیٰ تمہارے رزق کا دوسرا انتظام کر دیں گے۔ اور مومن کا کام تو یہ ہے کہ ایسی ملازمت کو چھوڑنے کی خود ہی کوشش کرتا رہے کہ کوئی دوسری مناسب جگہ مل جائے تو اس کو فوراً چھوڑ دے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ
اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے
مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ
ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مقرر کر دیا مرنا اور بھیج دیتا ہے
الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک اس بات میں پتے ہیں ان لوگوں کو
يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ
جو دھیان کریں کیا انہوں نے پکڑے ہیں اللہ کے سوا کوئی سفارش والے تو کہہ
اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ
اگرچہ ان کو اختیار نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ تو کہہ اللہ کے

تمامتر اللہ ہی کے قبضہ میں ہے اور بدون اس کی اجازت کے کسی فرشتے یا بشر کی مجال نہیں کہ کسی کی سفارش کرسکے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت شفاعت کے لئے دو شرطیں ہیں، ایک شفاعت کرنے والے کا عند اللہ مقبول ہونا، دوسرے جس کی شفاعت کی جائے اس کا قابل مغفرت ہونا۔ اب سمجھ لو کہ مشرکین نے بتوں کو جنکی شکلیں سمجھ کر شفیع کیا ہے، سو وہ جنات و شیاطین ہیں تو دونوں شرطیں مفقود ہیں، نہ شفاعت کرنے والے مقبول عند اللہ ہیں، نہ مشرک قابل مغفرت ہیں اور اگر ان شکلوں کو ملائکہ یا انبیاء کی شکلیں قرار دے، سو جب تو شفاعت کرنے والوں کے مقبول ہونے کی شرط تو موجود ہوئی، مگر دوسری شرط مفقود ہے کہ مشرکین میں صلاحیت مغفرت کی نہیں ہے۔ آگے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ) تمام آسمان و زمین کی سلطنت اسی کی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (اسی لئے سب کو چھوڑ کر اسی سے ڈرو، اسی کی عبادت کرو، اور (توحید کے دلائل واضحہ قائم ہونے کے باوجود کفر و شرک کا ان کے دلوں پر یہ اثر ہے کہ) جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (کہ وہ بلا شرکت غیرے تمام عالم کے سیاہ و سفید کا مالک مختار و متصرف ہے) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر آتا ہے (خواہ صرف انھیں کا ذکر ہو یا اللہ کے ذکر کے ساتھ ان کا بھی ذکر ہو) تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

معارف و مسائل

موت اور نیند کے وقت قبض روح اور دونوں میں فرق کی تفصیل

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔ توفّی کے لفظی معنے لینے اور قبض کرلینے کے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جانداروں کی ارواح ہر حال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہیں، وہ جب چاہے ان کو قبض کرسکتا ہے اور واپس لے سکتا ہے اور اس تصرف خداوندی کا ایک مظاہرہ تو ہر جاندار روزانہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اس کی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے، پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے اور آخرکار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ قبض روح کے معنی اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں، کبھی یہ ظاہراً و باطناً بالکل منقطع کر دیا جاتا ہے، اسی کا نام موت ہے اور کبھی صرف ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے باطناً باقی رہتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف حس اور حرکت ارادیہ جو ظاہری علامت زندگی ہے وہ منقطع کر دی

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۚ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٩﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٥٠﴾ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۚ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَٰؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٥١﴾ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾

لوگوں کے واسطے جو مانتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان کی شدت عناد سے مغموم نہ ہوجئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا میں یوں) کہیے کہ اے اللہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے، باطن اور ظاہر کے جاننے والے آپ ہی (قیامت کے روز) اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرمائیں گے جن میں باہم وہ اختلاف کرتے تھے (یعنی آپ ان معاندین کی فکر میں نہ پڑئیے، بلکہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کیجئے وہ خود عملی فیصلہ کر دیں گے) اور (اس فیصلہ کے وقت یہ حالت ہوگی کہ) اگر ظالموں (یعنی مشرکوں و کافروں) کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (سب کا سب) ان کو دینے لگیں (گو مقبول نہ ہو کما فی المائدۃ، مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ) اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آوے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا (کیونکہ وہ تو آخرت کے منکر

وراحت میں اس کا عمل دخل متناقض و متعارض نہ ہوگا۔)

مَعارف ومَسائل

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الاٰیة۔ صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے صدیقہ عائشہ رضؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (یعنی تہجد) کو کس چیز سے شروع فرماتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ آپ جب تہجد کی نماز کو اٹھتے تھے تو یہ دُعا پڑھتے تھے:۔

اللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِیْلَ وَمِیْکَآئِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

قبولیت دُعا

حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن کریم کی ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اس کو پڑھ کر آدمی جو دُعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے، پھر یہی آیت بتلائی:۔

اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الاٰیة۔ (قرطبی)

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ ہلاکت ہے ریاکاروں کے لئے، ہلاکت ہے ریاکاروں کے لئے۔ یہ آیت انہیں سے متعلق ہے جو دنیا میں نیک کام لوگوں کو دکھلانے کے لئے کرتے تھے۔ دیکھنے میں ان کو نیک سمجھتے تھے وہ خود بھی اس دھوکہ میں تھے کہ یہ اعمال ان کے لئے نجات آخرت کا ذریعہ بنیں گے، مگر چونکہ ان میں اخلاص نہیں تھا اسلئے اللہ کے نزدیک ایسے نیک عمل کا کوئی اجر و ثواب نہیں، اس لئے وہاں اچانک اُن کے گمان کے خلاف عذاب و عقاب ہونے لگے گا۔ (قرطبی)

مشاجرات صحابہ سے متعلق ایک اہم ہدایت

حضرت ربیع بن خثیمؒ سے کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے ایک آہ بھری اور یہ آیت تلاوت فرمائی:۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ الاٰیة۔ اور فرمایا کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کے متعلق جب تمہارے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو یہ آیت پڑھ لیا کرو۔ روح المعانی میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ عظیم الشان تعلیم ادب ہے جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا
مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ
اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٣﴾ وَاَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا
لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٥٤﴾
وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٥٥﴾
اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ
وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿٥٦﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ
هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٥٧﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى
الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾
بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَ
كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٩﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ
كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ
مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ

فاجر کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہئے کہ وہ توبہ کرلے تو اللہ اس کے سب پچھلے گناہ معاف فرما دے گا۔ أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ سے تین آیتوں میں یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ یہاں تک کفر و شرک کو بھی توبہ سے معاف فرما دیتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ توبہ کا وقت مرنے سے پہلے پہلے ہے، مرنے کے بعد قیامت کے روز کوئی توبہ کرے یا اپنے کئے پر حسرت کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

جیسا کہ بعض کفار بھی قیامت کے روز مختلف تمنائیں کریں گے۔ کوئی تو اظہار حسرت کرے گا کہ افسوس میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہیاں کیوں کی تھیں۔ کوئی وہاں بھی اپنا الزام تقدیر پر ڈال کر بچنا چاہتا ہے وہ کہے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت کر دیتا تو میں بھی متقیوں میں داخل ہوتا، مگر خدا نے ہی ہدایت نہ کی تو میں کیا کروں۔ کوئی یہ تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو میں سچا پکا مسلمان بنوں، اور اللہ کے احکام کی پوری اطاعت کروں۔ مگر اس وقت کی یہ حسرتیں اور تمنائیں کسی کے کام نہ آئیں گی۔

یہ تینوں قسم کی تمنائیں ہوسکتا ہے کہ مختلف لوگوں کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں تمنائیں یکے بعد دیگرے ایک ہی جماعت کے کفار کی طرف سے ہوں کیونکہ آخری قول جس میں دوبارہ دنیا میں آنے کی تمنا ہے اس کے ساتھ آیت میں مذکور ہے کہ وہ عذاب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہوگا۔ اس سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول مشاہدہ عذاب سے پہلے کے ہیں کہ قیامت کے روز اول ہی اپنے عمل کی تقصیرات کو یاد کر کے کہیں گے، يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ پھر عذر اور بہانے کے طور پر کہیں گے کہ ہم تو معذور تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کر دیتا تو ہم بھی مطیع و فرمانبردار اور متقی بن جاتے مگر جب اس نے ہدایت ہی نہ کی تو ہمارا کیا قصور ہے، پھر جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو یہ تمنا ہوگی کہ کاش دنیا میں دوبارہ بھیج دیئے جاویں۔ حق تعالیٰ نے ان تینوں آیتوں میں بتلا دیا کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت بہت وسیع ہے، مگر وہ جبھی حاصل ہوسکتی ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لو۔ اس لئے ہم ابھی بتلائے دیتے ہیں ایسا نہ ہو کہ تم مرنے کے بعد پچھتاؤ اور آخرت میں اس طرح کی فضول حسرت و تمنا میں مبتلا ہو۔

بَلٰى قَدْ جَاۗءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا۔ اس آیت میں کفار کی اس بات کا جواب ہے کہ اگر اللہ ہدایت کر دیتا تو ہم متقی ہو جاتے۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے پوری ہدایت کر دی تھی اپنی کتابیں اور آیتیں بھیجی تھیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا غلط و لغو ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت نہیں کی۔ ہاں ہدایت کرنے کے بعد نیکی اور اطاعت پر اللہ نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔ بلکہ بندہ کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ جس راستے حق یا باطل کو اختیار کرنا چاہے کرے یہی بندہ کا امتحان تھا، اس پر اس کی کامیابی یا ناکامی موقوف تھی جس نے اپنے اختیار سے گمراہی کا راستہ اختیار کرلیا وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

ہونا چاہئے اور سزا و جزا کا مدار بھی وہی ہونا چاہئے جو نماد ہے توحید کا، اور چونکہ ان سب مقدمات کو مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے تو ان پر لازم تھا کہ عقیدہ توحید کو بھی تسلیم کریں، اس لئے فرمایا) اور جو لوگ اللہ کی آیتوں کو (جو توحید اور جزا و سزا کے مضمون پر مشتمل ہیں) نہیں مانتے وہ بڑے خسارے میں رہیں گے (اور یہ لوگ خود تو کفر و شرک میں ملوث تھے ہی اب ان کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ آپ کو بھی اپنے طریقہ پر لانے کے لئے فرمائش کرتے ہیں سو) آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو (ایسے دلائل سے توحید کا مکمل ثبوت اور کفر و شرک کا ابطال ہو جانے کے بعد) پھر بھی تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کو کہتے ہو، اور آپ سے کفر و شرک کا صادر ہونا کیسے ممکن ہے جبکہ) آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے گزرے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ (ہر امتی کو سنا دیں کہ) اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا سب غارت ہو جاوے گا اور تو خسارہ میں پڑے گا۔ (اس لئے تو کبھی شرک نہ کرنا) بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرنا اور (اسی کا) شکر گزار رہنا (اور جب انبیاء علیہم السلام مامور ہیں جن میں آپ بھی داخل ہیں تو توحید کا حق ہونا اور کفر و شرک کا باطل ہونا بذریعہ وحی ثابت ہو چکا اور وہ اس پر مامور ہیں کہ دوسروں کو بھی اس عقیدے کی ہدایت کریں تو ان مشرکین کا آپ سے کفر و شرک کی توقع رکھنا بجز حماقت کے اور کیا ہو سکتا ہے، اور افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہئے تھا، حالانکہ ساری زمین اسی کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

معارف و مسائل

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَقَالِيْد، جمع مقلاد یا مقلید کی ہے جو قفل کی کنجی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ اصل یہ لفظ فارسی زبان سے معرب کیا گیا ہے۔ فارسی میں کنجی کو کلید کہتے ہیں، معرب کر کے اس کو اقلید بنا لیا گیا پھر اس کی جمع مقالید لائی گئی (روح) کنجیوں کا کسی کے ہاتھ ہونا اس کے مالک و متصرف ہونے کی علامت ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو خزانے نعمتوں کے مستور ہیں ان سب کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہی ان کا محافظ اور وہی متصرف ہے، جب چاہے جس کو چاہے عطا کر دے اور جس کو چاہے نہ دے۔

اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ کلمات سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کو مقالید السمٰوٰت والارض فرمایا ہے۔

جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ
خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ
كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى
اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَقَالُوا
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ
نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾
وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

خُلاصۂ تفسیر

اور (قیامت کے روز جس کا اوپر ذکر آیا ہے) صور میں پھونک ماری جاوے گی جس سے تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اُڑ جاویں گے (پھر زندہ تو مرجاویں گے اور مُردوں کی رُوحیں بیہوش ہوجاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس بیہوشی اور موت سے محفوظ رہے گا) پھر اُس صُور میں دوبارہ پھونک ماری جاوے گی تو دفعۃً سب کے سب (ہوش میں آکر اور ارواح کا تعلق ابدان سے ہوکر قبروں سے نکل) کھڑے ہوجاویں گے (اور ہر طرف) دیکھنے لگیں گے (جیسا کہ حادثہ عجیبہ کے وقوع کے وقت عادت طبعی ہے) اور (پھر حق تعالیٰ حساب کے لئے زمین پر اپنی شان کے مناسب نزول و تجلی فرماویں گے اور) زمین اپنے رب کے نور (بے کیف) سے روشن ہوجاوے گی اور (سب کا) نامۂ اعمال (ہر ایک کے سامنے) رکھ دیا جاوے گا اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جاویں گے (اور گواہ کا مفہوم عام ہے جس میں پیغمبر بھی داخل ہیں اور فرشتے بھی اور اُمت محمدیہ بھی اور اعضاء و جوارح بھی جس کی تفصیل آگے معارف کے ضمن میں آتی ہے) اور سب (اہل محشر) میں (حسب اعمال) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جاوے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیک عمل جو بشرائطہٖ واقع ہوا ہو چھین لیا جائے یا کوئی بدعمل بڑھا دیا جاوے) اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جاوے گا (اعمال نیک میں بدلہ کے پورا ہونے سے مقصود کمی کی نفی ہے اور اعمال بد میں پورا ہونے سے مقصود زیادتی کی نفی ہے) اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے (پس اس کو ہر ایک کے موافق جزا دینا کچھ مشکل نہیں) اور (بیان اس بدلہ کا جو نتیجہ فیصلہ کا ہے یہ ہے کہ) جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر (دھکے دے کر ذلت و خواری کے ساتھ) ہانکے جاویں گے (گروہ گروہ اس لئے کہ تمام مراتب کفر کے جدا جدا ہیں پس ہر ایک طرح کے کفار کا ایک ایک گروہ ہوگا) یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو (اس وقت) اُس کے دروازے کھول دیئے جاویں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے (جن سے استفادہ تمہارے لئے مشکل نہ تھا) پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے وہ کافر کہیں گے کہ ہاں (رسول بھی آئے تھے اور انہوں نے ڈرایا بھی) لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر (جن میں ہم بھی داخل ہیں) پورا ہو کر رہا (یہ اعتذار نہیں بلکہ حسرت ہے کہ باوجود ابلاغ کے ہم نے فکر نہ کیا اور ہم لوگوں کے لئے جو عذاب موعود تھا وہ ہمارے سامنے آیا واقعی ہم مجرم ہیں) پھر ان سے کہا جاوے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو (اور) ہمیشہ اس میں رہا کرو، غرض اللہ کے احکام سے

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ مؤمن مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پچاسی آیتیں ہیں اور نو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ

اتارنا کتاب کا اللہ سے ہے جو زبردست ہے خبردار گناہ

الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ

بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب دینے والا مقدور والا

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ

کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے اسی کی طرف پھر جانا ہے وہی جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں

اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝

مگر جو منکر ہیں سو تو دھوکا نہ کھا ان کے چلنے پھرنے سے شہروں میں

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے قوم نوح کی اور کتنے فرقے ان کے پیچھے

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا

اور ارادہ کیا ہر امت نے اپنے رسول پر کہ اس کو پکڑ لیں اور لانے لگے

بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ

جھوٹے جھگڑے کہ اس سے ڈگا دیں سچے دین کو پھر میں نے ان کو پکڑ لیا سو کیسا ہوا

سے خفیف ہوں جیسے میدان قیامت کی پریشانیاں اور آپ جس کو اس دن تکلیف سے بچا دیں تو اس پر آپ نے بڑی رحمت فرمائی۔ اور یہ (جو مذکور ہوا مغفرت و حفاظت عذاب اور رحمت اور دخول جنت) بڑی کامیابی ہے (پس اپنے مؤمن بندوں کو اس سے محروم نہ رکھئے)۔

معارف و مسائل

سورۂ مؤمن کی خصوصیات اور فضائل وغیرہ

یہاں سے سورۂ احقاف تک سات سورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں ان کو آل حٰمٓ یا حوامیم کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ آل حٰمٓ دیباج القرآن ہے، اور دیباج ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں، مراد اس سے زینت ہے، اور مسعر بن کدام فرماتے ہیں کہ ان کو عرائس کہا جاتا ہے یعنی دلہنیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہر چیز کا ایک مغز اور خلاصہ ہوتا ہے، قرآن کا خلاصہ آل حٰمٓ ہیں یا فرمایا الحوامیم ہیں۔ یہ سب روایتیں امام عالم ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں لکھی ہیں۔

اور حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ قرآن کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی رہائش کے لئے جگہ کی تلاش میں نکلا، تو کسی سرسبز میدان کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اچانک آگے بڑھا تو روضات دمثات یعنی ایسے باغ نظر پڑے جن کی زمین میں کاشت کا مادہ سب سے زیادہ ہے ان کو دیکھ کہنے لگا میں تو بارش کی پہلی ہی ہریالی کو دیکھ کر تعجب کر رہا تھا یہ تو اس سے بھی عجیب تر ہیں تو اس سے کہا جائے کہ پہلی ہریالی اور سرسبزی کی مثال عام قرآن کی مثال ہے اور روضات دمثات کی مثال قرآن میں سے آل حٰمٓ کی مثال ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب میں تلاوت قرآن کرتے ہوئے آل حٰمٓ پر آجاتا ہوں تو گویا ان میں میری بڑی تفریح ہوتی ہے۔

ہر بلا سے حفاظت

اور مسند بزار میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۂ مومن کی پہلی تین آیتیں حٰمٓ سے اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک پڑھ لیں، وہ اس دن ہر برائی اور تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے جس کی سند میں ایک راوی متکلم فیہ ہے۔

(ابن کثیر ص ۶۹ ج ۴)

دشمن سے حفاظت

ابوداؤد و ترمذی میں باسناد صحیح حضرت مہلب بن ابی صفرہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی کہ جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ

خُلاصۂ تفسیر

جو لوگ کافر ہوئے (وہ جب دوزخ میں جاکر اپنے شرک و کفر اختیار کرنے پر حسرت و افسوس کریں گے اور خود ان کو اپنے سے سخت نفرت ہوگی یہاں تک غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاویں گے۔ جیسا کہ درمنثور میں حضرت حسن سے روایت ہے۔ اس وقت) ان کو پکارا جاوے گا کہ جیسی تم کو (اس وقت) اپنے سے نفرت ہے، اس سے بڑھ کر خدا کو تم سے نفرت تھی جبکہ تم (دنیا میں) ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے پھر (ایمان لانے کے بجائے) تم نہیں مانا کرتے تھے (مقصود اس سے ان کی حسرت و ندامت میں اور زیادتی کرنا ہے) وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار (ہم جو دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کیا کرتے تھے، اب ہم کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی، چنانچہ دیکھ لیا کہ) آپ نے ہم کو دو مرتبہ مردہ رکھا (ایک مرتبہ پیدائش سے پہلے کہ ہم بے جان مادہ کی صورت میں تھے، دوسری مرتبہ اس عالم میں آنے اور زندہ ہونے کے بعد متعارف موت سے مردہ ہوئے) اور دو مرتبہ زندگی دی (ایک دنیا کی زندگی اور دوسری آخرت کی زندگی۔ یہ چار حالتیں ہیں جن میں سے انکار تو صرف ایک یعنی آخرت کی زندگی کا تھا مگر باقی تین حالتوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ وہ یقینی تھیں اور اس ذکر کا مقصد یہ تھا کہ اب چوتھی قسم بھی پہلی تین کی طرح یقینی ہوگئی) سو ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں (اصل مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار تھا، باقی سب اسی کی فروع تھیں، اقرار کرتے ہیں) تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی کوئی صورت ہے (کہ دنیا میں پھر جاکر ان خطاؤں کا تدارک کرلیں۔ جواب میں ارشاد ہوگا کہ تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ یہیں رہنا ہوگا۔ اور) وجہ اس کی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا (یعنی توحید کا ذکر ہوتا تھا) تو تم انکار کیا کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے سو اس لئے یہ فیصلہ اللہ کا کیا ہوا ہے جو عالیشان (اور) بڑے مرتبہ والا ہے (یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے علو و کبریاء کے اعتبار سے یہ جرم عظیم تھا اس لئے فیصلہ میں سزا بھی عظیم ہوئی یعنی دائمی جہنم)۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ ﴿١٣﴾ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ

الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿١٤﴾ رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو

الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ

عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ

الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا ظُلْمَ

الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٧﴾ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ

الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ

مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿١٨﴾ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ

وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴿١٩﴾ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ

السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٢٠﴾ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا

کیسا ہوا انجام جو تھے ان سے پہلے وہ تھے

هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ

ان سے سخت زور میں اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے زمین میں پھر ان کو پکڑا اللہ نے

بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ﴿٢١﴾ ذَٰلِكَ

ان کے گناہوں پر اور نہ ہوا ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا یہ اس لئے کہ

بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا

ان کے پاس آتے تھے ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر پھر منکر ہوگئے

فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٢﴾

تو پکڑا ان کو اللہ نے بیشک وہ زور آور ہے سخت عذاب دینے والا

خلاصۂ تفسیر

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں (قدرت کی) دکھلاتا ہے (تاکہ تم ان سے توحید پر استدلال کرو) اور وہی ہے جو آسمان سے تمہارے لئے رزق بھیجتا ہے (یعنی بارش بھیجتا ہے جس سے رزق پیدا ہوتا ہے یہ بھی منجملہ انہی نشانیوں کے ہے) اور (ان نشانیوں سے) صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے جو (خدا کی) طرف رجوع کرنے کا ارادہ کرتا ہے (کیونکہ ارادہ رجوع سے غور و تامل نصیب ہوتا ہے اس سے حق تک رسائی ہو جاتی ہے) تو (اے لوگو جب توحید پر دلائل قائم ہیں تو) تم لوگ خدا کو خالص اعتقاد کر کے (یعنی توحید کے ساتھ) پکارو (یعنی مسلمان ہو جاؤ) گو کافروں کو ناگوار ہو (تم اس کی پروا نہ کرو کیونکہ) وہ رفیع الدرجات ہے (اور) وہ عرش کا مالک ہے (وہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ وہ (صاحب وحی لوگوں کو) اجتماع کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے موجود ہوں گے کہ ان کی کوئی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جاوے گا، آج (کسی پر) کچھ ظلم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور (اس لئے) آپ ان کو ایک قریب آنے والی مصیبت کے دن (یعنی روز قیامت) سے ڈرائیے جس وقت کلیجے منہ کو آجاویں گے (غم سے) گھٹ گھٹ جاویں گے (اس روز) ظالموں (یعنی کافروں) کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہنا مانا جاوے (اور) وہ (اللہ ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان (باتوں) کو بھی جو

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ) آنکھوں کی خیانت (کو جانتا ہے) ۔ خیانت نظر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں سے چرا کر کسی ایسی چیز پر نظر ڈالے جو اس کے لئے حرام و ناجائز ہو جیسے کسی غیر محرم پر شہوت سے نظر کرے، اور جب کسی کو دیکھے تو نظر ہٹا لے یا اس طرح نظر ڈالے کہ جس کو دیکھنے والے محسوس نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب چیزیں ظاہر ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٢٣﴾ إِلَىٰ
فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٢٤﴾
فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ
الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ
الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي
أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ
أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي
عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ
الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ
إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم

بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ
يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ
الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ
اللّٰهِ اِنْ جَاۗءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى
وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ
يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝
مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ
وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ وَيٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ
يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝
وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ
شَكٍّ مِّمَّا جَاۗءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ

اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ
مُّرْتَابُ ۝ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ
اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ
السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَ
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ
وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ
اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝
مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ
صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ

موسیٰ علیہ السلام اور مومن آل فرعون کی نصیحتوں سے کوئی اثر نہیں لیا اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتے ہیں ہر ایسے شخص کے قلب پر جو متکبر اور جبار ہو (متکبر، تکبر کرنیوالا اور جبار کے معنی ظالم قاتل) جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس میں نور ایمان داخل نہیں ہوتا اور اس کو اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ ایک قرات میں متکبر اور جبار کو قلب کی صفت قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اخلاق و اعمال کا منبع اور سرچشمہ قلب ہی ہے، ہر اچھا برا عمل قلب ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا ہے کہ انسان کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا یعنی دل ایسا ہے جس کے درست ہونے سے سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور اس کے خراب ہونے سے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا۔ صرح کے معنی بلند تعمیر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ ایسی بلند تعمیر بناؤ جو آسمان کے قریب تک چلی جائے جس پر چڑھ کر میں خدا کو جھانک کر دیکھ لوں۔ یہ احمقانہ خیال جو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی نہیں کر سکتا سلطنت مصر کے مالک فرعون کا اگر واقعی ہے تو اس کی انتہائی بے وقوفی و حماقت کی دلیل ہے اور وزیر نے اگر اس کی تعمیل کی تو وزیر بے تدبیر شہ بلائے چنیں کا مصداق ہے۔ مگر کسی بھی والی ملک سے ایسے احمقانہ تصور کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے بعض حضرات مفسرین نے کہا کہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ کتنی ہی بلند تعمیر بنالے وہ آسمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر اپنے لوگوں کو بیوقوف بنانے اور دکھانے کے لئے یہ حرکت کی۔ پھر کسی صحیح اور قوی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ایسا کوئی محل عالیشان بلند تعمیر ہوا یا نہیں۔ قرطبیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ بلند تعمیر کرائی گئی تھی جو بلندی پر پہنچ کر ہی منہدم ہو گئی۔

دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے شاگرد خاص میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب نے اپنے استاذ موصوف سے نقل کر کے فرمایا کہ اس قصہ بلند کے منہدم ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی آسمانی عذاب آیا ہو بلکہ تعمیر کی بلندی اس کی بنیادوں کے تحمل پر موقوف ہوتی ہے اس نے کتنی بھی گہری بنیاد رکھی ہو مگر ایک حد تک ہی گہری ہوگی جب اس کے اوپر تعمیر چڑھاتا ہی چلا گیا تو لازم تھا کہ جب اس کی بنیادوں کے تحمل سے زیادہ ہو جائے تو منہدم ہو جائے اس سے فرعون و ہامان کی دوسری بے وقوفی ثابت ہوئی۔ واللہ اعلم

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۔ یہ مومن آل فرعون کا آخری کلام ہے جو اپنی قوم کو حق کی طرف بلانے کے سلسلے میں کیا گیا جس میں اظہار ہے کہ آج تو تم میری بات نہیں مانتے مگر جب عذاب میں آ پکڑے گا تو اس وقت تم کو میری بات یاد آئے گی۔ مگر اس وقت کا یاد آنا بیکار ہوگا۔ اور اب جبکہ اس طویل مکالمہ اور نصیحت و

وَاِذْ يَتَحَاۗجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰۗؤُا

اور جب آپس میں جھگڑیں گے آگ کے اندر پھر کہیں گے کمزور

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

غرور کرنے والوں کو ہم تھے تمہارے تابع پھر کچھ تم

اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾

ہم پر سے اٹھالو گے حصہ آگ کا

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ

کہیں گے جو غرور کرتے تھے ہم سب ہی پڑے ہوئے ہیں اس میں

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾

بیشک اللہ فیصلہ کر چکا بندوں میں

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ

اور کہیں گے جو لوگ پڑے ہیں آگ میں دوزخ کے داروغوں کو

ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا

مانگو اپنے رب سے کہ ہم پر ہلکا کر دے ایک دن

مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ

تھوڑا عذاب وہ بولے کیا نہ آتے تھے تمہارے پاس

رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ

تمہارے رسول کھلی نشانیاں لے کر کہیں گے کیوں نہیں بولے پھر پکارو

وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ ع

اور کچھ نہیں کافروں کا پکارنا مگر بھٹکنا

ع ۵ ۱۳ ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے) جبکہ کفار دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی متبوعین جن کا وہ دنیا میں اتباع کیا کرتے تھے) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی جزو ہٹا سکتے ہو (یعنی جب دنیا میں تم نے ہمیں اپنا تابع اور پیرو بنا رکھا تھا تو آج تمہیں ہماری مدد کرنا چاہیے) وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں (یعنی ہم اپنا ہی عذاب کم نہیں کر سکتے تو تمہارا کیا کریں گے) اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں کے درمیان (قطعی) فیصلہ کر چکا (اب اس کے خلاف کرنے کی کس کو مجال ہے) اور (اس کے بعد) جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے (یعنی بڑے اور چھوٹے تابع و متبوع سب مل کر) جہنم کے موکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کر دے (یعنی عذاب کے بالکل ہٹ جانے یا ہمیشہ کے لئے کم ہو جانے کی اُمید تو نہیں، کم از کم ایک روز کی تو کچھ چھٹی مل جایا کرے) فرشتے کہیں گے کہ (یہ بتلاؤ) کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزات لے کر نہیں آتے رہے (اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ نہیں بتلاتے رہے تھے) دوزخی کہیں گے ہاں آتے تو رہے تھے (مگر ہم نے ان کا کہنا نہ مانا، قالوا بلیٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا) فرشتے کہیں گے کہ تو پھر (ہم تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتے کیونکہ کافروں کے لئے دعا کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے، تم ہی (اگر جی چاہے تو خود) دعا کر لو اور (تمہاری دعا کا بھی کچھ نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ) کافروں کی دعا (آخرت میں) محض بے اثر ہے (کیونکہ آخرت میں کوئی دعا بغیر ایمان کے قبول نہیں ہو سکتی اور ایمان کا موقع دنیا ہی تھا وہ ختم ہو چکا اور یہ جو کہا کہ آخرت میں، اس سے فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں تو کافروں کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے، جیسا کہ سب سے بڑے کافر ابلیس کی سب سے بڑی دعا قیامت تک زندہ رہنے کی قبول کر لی گئی)۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ
يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ
وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا
مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ﴿٥٣﴾
هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٥٤﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ
وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ
فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ
إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ
مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾
وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾

یارب کہہ کر اپنی حاجت مانگتے ہیں مگر ان کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام، ان کو حرام ہی سے غذا دی گئی تو ان کی دعا کہاں قبول ہوگی۔ (رواہ مسلم)

اسی طرح غفلت و بےپروائی کے ساتھ بغیر دھیان دئے دعا کے کلمات پڑھیں تو حدیث میں اس کے متعلق بھی آیا ہے کہ ایسی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ (ترمذی عن ابی ہریرۃ مرفوعاً)

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّھَارَ مُبْصِرًا ؕ
اللہ ہے جس نے بنا دی تمہارے واسطے رات کہ اس میں چین پکڑو اور دن دیا دیکھنے کو

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ
اللہ تو فضل والا ہے لوگوں پر اور لیکن بہت لوگ

لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ۘ
حق نہیں مانتے وہ اللہ ہے رب تمہارا ہر چیز بنانے والا

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ﴿۶۲﴾ کَذٰلِکَ یُؤْفَکُ الَّذِیْنَ
کسی کی بندگی نہیں اس کے سوائے پھر کہاں سے الٹے جاتے ہو اسی طرح الٹے جاتے ہیں جو لوگ

کَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ
کہ اللہ کی باتوں سے منکر ہوتے رہتے ہیں اللہ ہے جس نے بنا دی تمہارے

لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ
لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو عمارت اور صورت بنائی تمہاری تو اچھی

صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚۖ
بنائیں صورتیں تمہاری اور روزی دی تم کو ستھری چیزوں سے وہ اللہ ہے رب تمہارا

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۴﴾ ھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ
سو بڑی برکت ہے اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا وہ ہے زندہ رہنے والا کسی کی بندگی نہیں سوائے

فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ
اس کے سو اس کو پکارو خالص کر کر اس کی بندگی سب خوبی اللہ کو جو رب ہے

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۵﴾ قُلْ اِنِّیْ نُھِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ
سارے جہان کا تو کہہ مجھ کو منع کر دیا کہ پوجوں ان کو جن کو تم پکارتے ہو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٦٨﴾

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن
کو دیکھنے کے لئے روشن بنایا تاکہ اس میں معاش حاصل کرو بے شک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا
ہی فضل ہے کہ ان کی مصلحتوں کی کیسی کیسی رعایت فرمائی لیکن اکثر آدمی ان نعمتوں کا شکر
نہیں کرتے بلکہ الٹا شرک کرتے ہیں، یہ ہے اللہ تمہارا رب جس کا ذکر ہوا وہ ہر چیز
کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو بعد اثبات توحید کے تم لوگ باطل
کی طرف کہاں الٹے چلے جا رہے ہو اور مخاطبین کی کیا تخصیص ہے جس طرح یہ تعصب و عناد سے الٹے جا رہے
ہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی الٹے چلا کرتے تھے جو اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے
اللہ ہی ہے جس نے زمین کو مخلوق کا قرار گاہ بنایا اور آسمان کو اوپر سے مثل چھت کے بنایا اور
تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ بنایا چنانچہ انسان کے اعضا کی برابر کسی حیوان کے اعضا میں تناسب

عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُوا مِن قَبْلُ شَيْئًا ۚ كَذَٰلِكَ

يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ﴿٧٤﴾ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ

فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ ﴿٧٥﴾

ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ

مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٧٦﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ

فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ

مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ

نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٧٨﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان لوگوں کی حالت کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں (حق سے) کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب یعنی قرآن کو جھٹلایا اور

چیز کو بھی جھٹلایا، جو ہم نے اپنے پیغمبروں کو دیکر بھیجا تھا (اس میں کتب و احکام و معجزات سب داخل ہوگئے کیونکہ مشرکین عرب اور کسی پیغمبر کو بھی نہیں مانتے تھے) سو ان کو ابھی (یعنی قیامت میں کہ قریب ہے) معلوم ہوا جاتا ہے جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور (ان طوقوں میں) زنجیریں پڑی ہوئی ہوں گی جن کا دوسرا سرا فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا اور ان زنجیروں سے ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے پانی میں پہنچائیں گے۔ پھر یہ آگ میں جھونک دیئے جاویں گے پھر ان سے پوچھا جاوے گا کہ وہ معبود غیر اللہ کہاں گئے جن کو تم شریک (خدائی) ٹھہراتے تھے (یعنی تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے) وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے غائب ہوگئے بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم اس کے قبل (دنیا میں) جو بتوں کو پوجتے تھے تو اب معلوم ہوا کہ کسی کو بھی نہیں پوجتے تھے (یعنی معلوم ہوا کہ وہ لاشئ محض تھے ایسی بات غلطی ظاہر ہونے کے وقت کہی جاتی ہے جیسے کوئی شخص تجارت میں خسارہ اٹھائے اور اس سے پوچھا جاوے کہ تم فلاں مال کی تجارت کیا کرتے ہو اور وہ کہے کہ میں تو کسی کی بھی تجارت نہیں کرتا یعنی جب اس کا فائدہ حاصل نہ ہو تو یوں سمجھنا چاہئے کہ گویا وہ عمل ہی نہیں ہوا) آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کو غلطی میں پھنسائے رکھتا ہے (کہ ایسی چیزیں لاشی وغیر نافع ہونے کا وہاں وہ خود اقرار کریں گے آج یہاں ان کی عبادت میں مشغول ہیں ارشاد ہوگا کہ) یہ (سزا) اس کے بدلہ میں ہے کہ تم دنیا میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور اس کے بدلہ میں ہے کہ تم اتراتے تھے (اور اس کے قبل ان کو حکم ہوگا کہ) جہنم کے دروازوں میں گھسو (اور) ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہو سو متکبرین (عن آیات اللہ) کا وہ برا ٹھکانا ہے۔ (اور جب ان سے اس طرح انتقام لیا جاوے گا) تو آپ (چندے) صبر کیجئے بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے پھر جس (عذاب) کا (مطلقاً) ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں (کہ کفر موجب عذاب ہے) اس میں سے کچھ تھوڑا سا عذاب اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات ہی میں ان پر اس کا نزول ہوجاوے) یا (اس کے نزول سے قبل ہی) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر خواہ بعد میں نزول ہو یا نہ ہو، سو ان دونوں احتمال میں کوئی شق ضروری نہیں لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہوگا (اور اس وقت بالیقین ان پر عذاب واقع ہوگا) اور (اس بات کو یاد کرکے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً یا تفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعضے وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (تمام) سب میں مشترک ہے کہ کسی رسول سے یہ نہ ہوسکا کہ کوئی معجزہ بدون اذن الٰہی کے ظاہر ہوسکے (اور امت کی ہر فرمائش پوری کرسکے سو بعضے اس لئے بھی ان کی تکذیب کرتے رہے، اسی طرح یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ تسلی رکھئے اور صبر کیجئے) پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول عذاب کے لئے) آوے گا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۔ یعنی بہت خوش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور دوسرا درجہ فرح کا یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور راحتوں کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھ کر ان پر خوشی و مسرت کا اظہار کرے، یہ جائز بلکہ مستحب و مامور ہے۔ ایسی فرح کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا۔ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ یعنی اس پر خوش ہونا چاہئے۔ آیت مذکورہ میں فرح کے ساتھ کوئی قید نہیں مطلقاً سبب عذاب بنا اور فرح کے ساتھ بغیر الحق کی قید لگا کر بتلا دیا کہ ناحق اور ناجائز لذتوں پر خوش ہونا حرام اور حق و جائز نعمتوں پر بطور شکر کے خوش ہونا عبادت اور ثواب ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ الآیۃ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کے ساتھ اس کے منتظر تھے کہ ان کافروں کو عذاب ہو۔ اس لئے آپ کی تسلی کے لئے اس آیت میں یہ فرمایا کہ آپ ذرا صبر کریں، اللہ نے جو وعدہ ان کے لئے عذاب کا کیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ خواہ آپ کی حیات ہی میں یا آپ کی وفات کے بعد۔ کافروں کے عذاب کا انتظار بظاہر شانِ رحمۃ للعالمین کے منافی ہے۔ لیکن جبکہ مجرمین کو سزا دینے سے مقصد غیر مجرم مؤمنین کو جن پر ظلم کیا گیا تھا تسلی دینا ہو تو مجرموں کو سزا، شفقت و رحمت کے منافی نہیں۔ کسی مجرم کو سزا دینا کسی کے نزدیک بھی رحمت کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا

اللہ ہے جس نے بنا دیئے تمہارے واسطے چوپائے تاکہ سواری کرو بعضوں پر

وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا

اور بعضوں کو کھاتے ہو اور ان میں تم کو بہت فائدے ہیں اور تاکہ پہنچو

عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ

ان پر چڑھ کر کسی کام تک جو تمہارے جی میں ہو اور ان پر اور کشتیوں پر

تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ

لدے پھرتے ہو اور دکھلاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں پھر کون کون سی نشانیوں کو اللہ کی

تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا

نہ مانو گے کیا پھرے نہیں وہ ملک میں کہ دیکھ لیتے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَكْثَرَ

کیسا انجام ہوا ان سے پہلوں کا وہ تھے ان سے

مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ

زیادہ اور زور میں سخت اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے ہیں زمین پر پھر کام نہ آیا

عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم

ان کے جو وہ کماتے تھے پھر جب پہنچے ان کے پاس رسول ان کے

بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ

کھلی نشانیاں لے کر اترانے لگے اس پر جو ان کے پاس تھی خبر اور الٹ پڑی

بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْا

ان پر وہ چیز جس پر ٹھٹھا کرتے تھے پھر جب دیکھ لیا

بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ

ہماری آفت کو بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر اور ہم نے چھوڑ دیں وہ چیزیں جن کو

مُشْرِكِينَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا

شریک بتاتے تھے پھر نہ ہوا کہ کام آئے ان کو یقین لانا ان کا جس وقت

رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ

دیکھ چکے ہمارا عذاب رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آئی ہے اس کے بندوں میں

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

اور خراب ہوئے اس جگہ منکر

ع ۹ / ۱۲

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے مویشی بنائے تاکہ ان میں بعض سے سواری لو اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ ان کو کھاتے بھی ہو اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اون کام آتی ہے) اور اس لئے بنائے) تاکہ تم ان پر سوار ہو کر اپنے مطلب تک پہنچو جو تمہارے دل میں ہے (جیسے کسی سے ملنے کے لئے جانا تجارت کے لئے جانا وغیرہ وغیرہ، اور سواری کچھ انہی کی تخصیص نہیں بلکہ) ان پر بھی اور کشتی پر بھی لدے لدے پھرتے ہو اور ان کے علاوہ (اور بھی) تم کو اپنی (قدرت کی) اور نشانیاں دکھلاتا رہتا ہے (چنانچہ ہر مصنوع اس کی صنعت پر ایک نشان ہے) سو تم

فرمایا ہے يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۔ یعنی لوگ دنیا کی ظاہری زندگی اور اس کے منافع حاصل کرنے کو تو کچھ جانتے سمجھتے ہیں، مگر آخرت جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جہاں کی راحت و کلفت دائمی ہے اس سے بالکل جاہل و غافل ہیں۔ اس آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منازل وہاں کی راحت و کلفت سے جاہل و غافل ہیں۔ اسی لئے اپنے سطحی ظاہری ہنر پر خوش و مطمئن ہو کر انبیاء کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ (مظہری)

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ ۔ یعنی عذاب سامنے آنے کے بعد یہ لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر اس وقت کا ایمان اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں۔ حدیث میں ہے کہ یقبل اللہ توبۃ العبد مالم یغرغر (ابن کثیر) یعنی اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اس وقت سے پہلے پہلے قبول کرتے ہیں جب تک نزع روح اور غرغرۂ موت سامنے آجائے۔ اسی طرح عذاب آسمانی کے سامنے آجانے کے بعد کسی کی توبہ اور ایمان قبول نہیں ہوتا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالرَّاحَةَ قَبْلَ الْمَوْتِ واليسر والمعافاة عند الموت والمغفرة والرحمة بعد الموت ببركة الحلم وصلى الله تعالى على النبي الكريم ۔

تمت سورۃ المومن بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ

للثالث عشر من ربیع الآخر سنہ ۱۳۹۲ھ یوم السبت

فلہ الحمد اولہ وآخرہ وظاہرہ وباطنہ

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ حٰم سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چون آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَکْثَرُھُمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝۴ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْہِ وَاسْتَغْفِرُوْہُ

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ

وَهُم بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

خلاصۂ تفسیر

اے ابوالولید! آپ نے سن لیا جو کچھ سنا، اب آپ کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ عتبہ یہاں سے اٹھ کر اپنی مجلس کی طرف چلا تو یہ لوگ دور سے عتبہ کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ خدا کی قسم ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ اب اس کا وہ چہرہ نہیں جس کو لے کر یہاں سے گئے تھے۔ جب عتبہ اپنی مجلس میں پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہو ابوالولید کیا خبر لائے۔ عتبہ ابوالولید نے کہا کہ میری خبر یہ ہے کہ

إني سمعت قولاً والله ما سمعت مثله قط والله ما هو بالسحر ولا بالشعر ولا بالكهانة يا معشر قريش أطيعوني واجعلوها لي خلوا بين الرجل وبين ما هو فيه فاعتزلوه فوالله ليكونن لقوله الذي سمعت نبأ فإن تصبه العرب فقد كفيتموه بغيركم وإن يظهر على العرب فملكه ملككم وعزه عزكم وكنتم أسعد الناس به
(ابن کثیر ص۹۱ ج ۴)

میں نے ایسا کلام سنا کہ خدا کی قسم اس سے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں سنا تھا، خدا کی قسم نہ تو یہ جادو کا کلام ہے نہ شعر یا کاہنوں کا کلام ہے (جو وہ شیاطین سے حاصل کرتے ہیں) اے قریش تم میری بات مانو، اور اس معاملہ کو میرے حوالے کر دو، میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ اور ایذا سے باز آجاؤ اور ان کو ان کے کام پر چھوڑ دو کیونکہ ان کے اس کلام کی ضرور ایک خاص شان ہونیوالی ہے۔ تم ابھی انتظار کرو، باقی عرب کے لوگوں کا معاملہ دیکھو۔ اگر قریش کے علاوہ باقی عرب لوگوں نے انکو شکست دیدی تو تمھارا مطلب بغیر تمھاری کسی کوشش کے حاصل ہوگیا اور اگر وہ عرب پر غالب آگئے تو ان کی حکومت تمھاری حکومت ہوگی، ان کی عزت سے تمھاری عزت ہوگی اور اس وقت تم ان کی کامیابی کے شریک ہوگے۔

اس کے ساتھی قریشیوں نے جب یہ کلام سنا تو کہنے لگے کہ اے ابوالولید تجھ پر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے کہا میری رائے تو یہی ہے، جو میں نے بتلا دی آگے تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ۔ اس جگہ کفار قریش کے تین قول نقل کئے گئے، اول یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ آپ کے کلام سے ہمارے کان بہرے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان پردے حائل ہیں۔ قرآن

کیا کفار فروعِ اعمال کے مکلف و مخاطب ہیں یا نہیں

دوسرا اشکال یہ ہے کہ اکثر حضرات فقہاء کے نزدیک کفار مخاطب بالفروع نہیں ہوتے، یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام ان پر عائد نہیں ہوتے ان پر عائد صرف یہ ہے کہ وہ پہلے ایمان قبول کریں، ایمان کے بعد فرائض عائد ہوتے ہیں تو جب ان پر زکوٰۃ کا فرض عائد ہی نہیں، تو اس کے ترک پر عذاب کیسا؟

جواب یہ ہے کہ جن حضرات فقہاء کے نزدیک تو کفار بھی مخاطب بالفروع ہیں ان کے لئے تو یہ اشکال ہی نہیں ہوتا، اور جو لوگ کفار کو مخاطب بالفروع نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ترک زکوٰۃ پر اصل مذمت نہیں بلکہ ان کا ترک زکوٰۃ چونکہ کفر کی بنا پر تھا اور ترک زکوٰۃ اس کی علامت تھی اس لئے ان کو عتاب کرنے کا حاصل یہ ہوا کہ تم مومن ہوتے تو زکوٰۃ کی پابندی کرتے۔ مقصود ایمان دلانا ہے (بیان القرآن) اور کفار کے مخاطب بالفروع ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق احکام القرآن، حزب خامس میں بزبان عربی شائع ہوئی ہے۔

تیسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ ارکانِ اسلام میں سب سے مقدم تو نماز ہے اس کا ذکر نہیں کیا گیا، زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب قرطبی وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ قریش عرب مالدار لوگ تھے اور صدقہ خیرات غریبوں کی امداد ان کا خاص وصف تھا، مگر جو لوگ مسلمان ہوجاتے یہ لوگ ان کو اس رشتہ کی تمدنی اور معاشرتی امداد سے بھی محروم کردیتے تھے۔ اس کی مذمت کرنا مقصود ہے اس لئے زکوٰۃ کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ واللہ اعلم

لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ، لفظ ممنون کے معنے مقطوع کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے پابند لوگوں کو آخرت میں جو اجر دیا جائے گا وہ دائمی غیر منقطع ہوگا۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ مومن جن اعمال صالحہ کا عادی ہوتا ہے، اگر کسی بیماری یا سفر یا دوسرے عذر سے کسی وقت یہ عمل بھی ترک ہوجائے تو بھی اس عمل کا اجر قطع نہیں کیا جاتا، بلکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ جو عمل اپنی تندرستی اور فرصت کے اوقات میں پابندی سے کیا کرتا تھا اس کے عذر کی حالت میں بھی وہ اعمال بغیر کئے ہوئے اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے رہیں۔ اس مضمون کی حدیثیں صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے اور شرح السنۃ بغوی میں حضرت ابن عمرؓ اور انسؓ سے اور رزین نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کی ہیں۔ (مظہری)

مَعارف ومَسائل

ان آیات میں اصل مقصود منکرین توحید مشرکین کو ان کے کفر و شرک پر ایک بلیغ انداز میں تنبیہ کرنا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی صفت تخلیق اور آسمان و زمین کی عظیم مخلوقات کو خاص خاص حکمتوں پر مبنی پیدا کرنے کی تفصیل دے کر ان کو بطور زجر خطاب کیا گیا ہے کہ کیا تم ایسے بے عقل ہو کہ ایسے عظیم خالق و مالک کے ساتھ دوسروں کو شریک خدائی قرار دیتے ہو۔ اسی قسم کی تنبیہ و تفصیل سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع میں آ چکی ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ سورۂ بقرہ کی آیات میں ایام تخلیق کی تعیین اور تفصیل کا ذکر نہیں، سورۂ فصلت کی مذکورہ آیات میں اس کا بھی ذکر ہے۔

آسمان و زمین کی تخلیق میں ترتیب اور ایام تخلیق کی تعیین

بیان القرآن میں حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ یوں تو زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر مختصر و مفصل قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ آیا ہے مگر ان میں ترتیب کا بیان کہ پہلے کیا بنا پھر کیا بنا، صرف تین ہی آیتوں میں آیا ہے۔ ایک یہ آیت حٰمٓ سجدۃ کی اور دوسری سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت، تیسری سورۂ نازعات کی یہ آیات ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاۗءُ ۭ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَاۗءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ اور دوسری نظر میں ان سب مضامین میں کچھ اختلاف سا بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ اور سورۂ حٰم سجدہ کی آیت سے زمین کی تخلیق آسمان سے مقدم ہونا معلوم ہوتا ہے اور سورۂ نازعات کی آیات سے اس کے برعکس یعنی زمین کی تخلیق آسمان کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت رحمہ نے فرمایا کہ سب آیات میں غور کرنے سے میرے خیال میں یوں آتا ہے کہ یوں کہا جاوے کہ اول زمین کا مادہ بنا اور ہنوز اس کی موجودہ ہیئت نہ بنی تھی کہ اسی حالت میں آسمان کا مادہ بنا جو دخان یعنی دھوئیں کی شکل میں تھا، اس کے بعد زمین ہیئت موجودہ پر پھیلا دی گئی، پھر اس پر پہاڑ اور درخت وغیرہ پیدا کئے گئے، پھر آسمان کے مادہ دخانیہ سیالہ کے سات آسمان بنا دیئے۔ امید ہے کہ سب آیتیں اس تقریر پر منطبق ہو جاویں گی۔ آگے حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہیں (بیان القرآن، سورۂ بقرہ رکوع ۳)۔

ابو عبیدہ (زاد المسیر لابن جوزی)۔

اور حضرت حسنؒ اور سدیؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ہر حصہ میں اس کے
بسنے رہنے والوں کی مصالح کے مناسب رزق اور روزی مقدر فرمادی (مقدر فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ حکم
جاری کردیا کہ اس حصہ زمین میں فلاں فلاں چیزیں اتنی اتنی مقدار سے پیدا ہوجائیں) اسی تقدیر الٰہی سے
ہر حصہ زمین کی کچھ خصوصیات ہوگئیں، ہر جگہ مختلف قسم کی معدنیات و مختلف قسم کی نباتات و درخت
اور جانور اس خطہ کی ضروریات ان کے مزاج و رغبات کے مطابق پیدا فرمادئیے۔

اسی سے ہر خطہ کی مصنوعات و معمولات مختلف ہوتی ہیں، یمن میں عصب، سابور میں سابری
رے میں طیالسہ، کسی خطہ میں گندم، کسی میں چاول اور دوسرے غلات، کسی جگہ میں روئی، کسی میں
جوٹ، کسی میں سیب انگور اور کسی میں آم، اس اختلاف اشیاء میں بشر کے باہمی روابط کی مناسبت
بھی ہے اور عکرمہؒ اور ضحاکؒ کے قول کے مطابق یہ فائدہ بھی ہے کہ دنیا کے سب خطوں اور ملکوں میں
باہمی تجارت اور تعاون کی راہیں کھلیں، کوئی خطہ دوسرے خطہ سے مستغنی نہ ہو، باہمی احتیاج کی
بنا پر باہمی تعاون کی مضبوط تعمیر ہوسکتی ہے۔ عکرمہؒ نے فرمایا کہ بعض خطوں میں نمک کو سونے کی برابر
تول کر فروخت کیا جاتا ہے۔

کہ زمین کو حق تعالیٰ نے اس پر بسنے والے انسانوں اور جانوروں کی تمام ضروریات غذا،
مسکن اور لباس وغیرہ کا ایک ایسا عظیم الشان گودام بنا دیا ہے، جس میں قیامت تک آنے اور بسنے
والے اربوں اور کھربوں انسانوں اور لاتعداد جانوروں کی سب ضروریات رکھ دی ہیں، وہ زمین سے
پیدا ہوتی، بڑھتی اور حسب ضرورت قیامت تک نکلتی رہیں گی۔ انسان کا کام صرف یہ رہ گیا کہ اپنی ضرورت
کی چیزیں ضرورت کے مطابق استعمال کرتا رہے۔ آیت میں فرمایا سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ، اس لفظ کا تعلق اَرْبَعَةِ
اَيَّامٍ سے ہے، اربعۃ ایام کے ساتھ قرار دیا ہے، معنی یہ ہیں کہ سب تخلیقات مذکورہ ٹھیک چار دن میں
ہوئی ہیں۔ اور چار دن میں جس کو چار کہہ دیا جاتا ہے، وہ کبھی چار سے کچھ کم کبھی کچھ زیادہ بھی ہوتا
ہے، مگر کسر کو حذف کر کے اس کو چار ہی کہہ دیتے ہیں۔ آیت میں اس جگہ لفظ سَوَآءً بڑھا کر اس
احتمال کو قطع کر کے یہ بتا دیا کہ یہ کام پورے چار دن میں ٹھیک ہوا ہے۔ اور لِلسَّآئِلِيْنَ فرمانے
کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ آسمان زمین کی تخلیق کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں جیسا کہ یہود نے
سوال کیا، تفسیر ابن جریر اور درمنثور میں منقول ہے، ان سوالات کرنے والوں کو یہ بتا دیا
گیا ہے کہ یہ سب تخلیق ٹھیک چار دن میں ہوئی ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی، روح)

اور بعض مفسرین ابن زید وغیرہ نے لِلسَّآئِلِيْنَ کا تعلق جملہ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا کے
ساتھ قرار دیا ہے، اور سائلین کے معنی طالبین و محتاجین کے لئے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے

کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے جو مختلف اجناس و اقسام کی قوت و ضروریات پیدا فرمائی ہیں یہ اُن لوگوں کے فائدے کیلئے ہیں جو ان کے طالب اور حاجتمند ہیں اور چونکہ طالب محتاج عادتاً سوال کیا کرتا ہے اس لئے اس کو سائلین کے لفظ سے تعبیر کر دیا (بحر محیط)

اور ابن کثیرؒ نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ سب چیزیں عطا فرمائیں جو تم نے مانگیں کیونکہ یہاں بھی مانگنے سے مراد اُن کا حاجتمند ہونا ہے۔ سوال کرنا شرط نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ چیزیں نہ مانگنے والوں کو بھی عطا فرمائی ہیں۔

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ۔ یہ آسمان و زمین کو خطاب اور ان کی طرف سے اطاعت و فرمانبرداری کا جواب دینا بعض حضرات کے نزدیک مجازی ہے کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہو کر کام کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر ابن عطیہ اور دوسرے محققین ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس میں کوئی مجاز نہیں سب اپنی حقیقت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین میں شعور و ادراک خطاب کے سمجھنے کا بھی پیدا فرما دیا تھا اور ان کو بولنے کی طاقت بھی جواب دینے کے لئے عطا فرما دی تھی۔ تفسیر بحر محیط میں اس کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہی تفسیر احسن ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس کو نقل کر کے بعض کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ زمین کی طرف سے یہ جواب اُس حصہ زمین نے دیا تھا جہاں بیت اللہ کی تعمیر ہوئی اور آسمان کے اُس حصہ نے جو بیت اللہ کے بالمقابل ہے (جس کو بیت المعمور کہا جاتا ہے)۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ

پھر اگر وہ ٹلا دیں تو تو کہہ میں نے خبر سنا دی تم کو ایک سخت عذاب کی جیسے عذاب آیا

عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ

عاد اور ثمود پر جب آئے ان کے پاس رسول آگے سے

اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ

اور پیچھے سے کہ نہ پوجو کسی کو سوائے اللہ کے

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ

کہنے لگے اگر ہمارا رب چاہتا تو بھیجتا فرشتے سو ہم تمہارا لایا ہوا

بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ

الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا

يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ

اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ

الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى

فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا

يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاۗءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَاۗءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ

وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ

شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

بھی خسارے میں رہے۔

معارف ومسائل

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾

ع ۱۸

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب (حقیقی) صرف اللہ ہے (مطلب یہ کہ شرک

بڑا صاحب نصیب ہے۔ اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے (غصہ میں) کچھ وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ سے پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (البتہ اگر سلامت طبع کی تدبیر سے خدشہ دور ہو گیا کہ بعض اوقات شریر آدمی پر نرمی کرنے کا الٹا اثر ہوتا ہے کیونکہ یہ صرف ایسے لوگوں سے متعلق ہے جو نئی سلامت طبع کھو بیٹھے ہیں اور وہ شاذ و نادر ہوتے ہیں)۔

معارف و مسائل

شروع سورت سے یہاں تک منکرین قرآن اور منکرین رسالت و توحید سے خطاب ہے۔ ان کو حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں پیش نظر کرکے توحید کی دعوت دی اور انکار کرنے والوں کا انجام اور عذاب آخرت و دوزخ کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے مومنین و کاملین کے حالات اور دنیا و آخرت میں ان کے اعزاز و اکرام کا بیان اور ان کے لئے خاص ہدایات کا ذکر ہے۔ مومنین و کاملین وہی ہوتے ہیں جو خود بھی اپنے اعمال و اخلاق میں مستقیم اور ایسے کہ وہ سب بالکل شریعت کے مطابق ہوں، اور دوسروں کو بھی اللہ کی طرف دعوت دیں اور دین کی صداقت کی ندا کریں۔ اسی سلسلہ میں داعیان اسلام کے لئے صبر اور برائی کے بدلے میں بھلائی کرنے کی ہدایت ہے۔

استقامت کے معنی | پہلی آیت کا لفظ استقامت سے تعبیر فرما کر ارشاد ہوا اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا، یعنی جن لوگوں نے سچے دل سے حق تعالیٰ کو اپنا رب یقین کر لیا اور اس کا اقرار بھی کر لیا، یہ تو اصل ایمان ہوا، آگے اس پر مستقیم بھی رہے یہ عمل صالح ہوا۔ اس طرح ایمان اور عمل صالح کے جامع ہوگئے۔ لفظ استقامت کا جو مفہوم مذکور الصدر تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ایمان و توحید پر قائم رہے اس کو چھوڑا نہیں، یہ تفسیر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اور تقریباً یہی مضمون حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جنہوں نے استقامت کی تفسیر اخلاص عمل سے فرمائی ہے

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

الاستقامة ان تستقيم على الامر والنهي ولا تروغ روغان الثعالب (مظہری)	استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام اور اوامر و نواہی پر سیدھے جمے رہو، اس سے ادھر ادھر راہ فرار لومڑی کی طرح نہ نکالو۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ استقامت تو ایک لفظ مختصر ہے مگر تمام شرائع اسلامیہ کو جامع ہے جس میں تمام احکام الٰہیہ پر عمل اور تمام محرمات و مکروہات سے اجتناب دائمی طور پر شامل ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ انسان کا رَبُّنَا اللّٰهُ کہنا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ دل سے یقین کرے کہ میں

جو تم مانگو۔ اس کا حاصل تو یہ ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے گی، خواہ تم مانگو یا نہ مانگو۔ آگے نُزُلًا بمعنی مہمانی فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ بہت سی وہ نعمتیں بھی ملیں گی جن کی تمنا بھی تمہارے دماغ میں پیدا نہیں ہوئی، جیسا کہ مہمان کے سامنے بہت سی وہ چیزیں بھی آتی ہیں جن کا پہلے سے کوئی تصور نہیں ہوتا خصوصاً جبکہ کسی بڑے کا مہمان ہو۔ (مظہری)

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں کسی پرندے کو اڑتا ہوا دیکھو گے، تمہارے دل میں اس کا گوشت کھانے کی خواہش پیدا ہوگی تو وہ اسی وقت بھنا بھنایا تمہارے سامنے گر جائے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ایسا پکا ہوا ہوگا کہ نہ دھوئیں سے، خود بخود آپ کے سامنے پہنچے گا۔ (رواہ البزار والبیہقی عن ابن مسعودؓ۔ مظہری)

اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو جنت میں اگر اپنے گھر میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش ہوگی تو اس کا حمل اور وضع حمل پھر اس کا دودھ چھڑانا پھر جوان ہونا سب ایک ساعت میں ہو جائے گا۔ (ترمذی وبیہقی وغیرہ۔ مظہری)

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ، یہ مومنین کاملین کا دوسرا اعلیٰ حال ہے کہ وہ صرف خود ہی اپنے ایمان و عمل پر قناعت نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں اور فرمایا کہ اس سے اچھا کس کا قول ہو سکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے۔ معلوم ہوا کہ انسان کے کلام میں سب سے افضل و احسن وہ کلام ہے جس میں دوسروں کو دعوتِ حق دی گئی ہو۔ اس میں دعوت الی اللہ کی سب صورتیں داخل ہیں۔ زبان سے، تحریر سے یا کسی اور عنوان سے، اذان دینے والا بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ دوسروں کو نماز کی طرف بلاتا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہ نے فرمایا کہ یہ آیت مؤذنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس دَعَآ اِلَى اللّٰهِ کے بعد عَمِلَ صَالِحًا آیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھ لے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان و اقامت کے درمیان جو دعا کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی عن انسؓ۔ مظہری)

اذان اور جوابِ اذان کے فضائل و برکات احادیث صحیحہ میں بہت بڑے ہیں۔ بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے اذان دے، اجرت و معاوضہ پیش نظر نہ ہو۔ یہ احادیث اس جگہ تفسیر مظہری میں جمع کر دی ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، یہاں سے دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کو خاص ہدایات دی گئی ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بلکہ صبر اور احسان سے کام لیں اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی داعیانِ حق کی خصلت یہ ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کی برائی کو

سننے اور وہ کمی یہی ہے، اور اسی کمی کی وجہ سے، وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے (قلت تدبر وقلت انصاف سے تعصب میں قوت رہتی ہے اور تعصب ہدایت قبول کرنے سے مانع بلکہ زیادہ گمراہی کا سبب ہوجاتا ہے، تو نابینائی کا سبب ہونے کی وجہ سے جیسے آفتاب عالم کو روشنی دیتا ہے چمگادڑ کو اندھا کردیتا ہے اور) یہ لوگ (حق بات سننے کے باوجود نفع سے محروم رہنے میں) ایسے ہیں کہ گویا کسی دور جگہ سے پکارے جارہے ہیں کہ آواز سنتے ہوں مگر سمجھتے نہ ہوں، اور (آپ کی تسلی کے لئے جیسا دوسرے مجملاً رسولوں کا ذکر تھا اب خاص موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف ہوا کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، یہ کوئی نئی بات آپ کے ساتھ نہیں ہوئی، پس آپ مغموم نہ ہوں، اور یہ منکرین گو مستحق عذاب ہیں لیکن اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب ان کو آخرت میں دوں گا تو ان کا قطعی) فیصلہ (دنیا ہی میں) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (باوجود قیام براہین کے) ابھی تک اس (فیصلہ یعنی عذاب موعود) کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ اس عذاب کا یقین ہی نہیں، آگے اس فیصلہ کا ضرور واقع ہونا اور اس فیصلہ کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے (یعنی وہاں اس کا نفع اور ثواب پاوے گا) اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال (یعنی ضرر و عذاب) اسی پر پڑے گا اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (کہ کوئی نیکی جو شرط کے مطابق عمل میں لائی گئی ہو اس کو شمار نہ کرے یا کسی بدی کو زائد شمار کرے)۔

معارف و مسائل

کفر کی ایک خاص قسم الحاد ہے اس کی تعریف اور احکام

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۔ اس سے پہلی آیات میں ان منکرین توحید و رسالت کو زجر و تنبیہ اور ان کے عذاب کا ذکر تھا جو رسالت و توحید کا کھلم کھلا انکار کرتے تھے۔ یہاں سے انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام الحاد ہے۔ لحد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں۔ قبر کی لحد کو بھی اسی لئے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف مائل ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول و انحراف کو الحاد کہتے ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے کہ کھلے طور پر انکار و انحراف کرے یا تاویلات فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن و اس کی آیات پر ایمان و تصدیق کا دعوٰے

مِنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا

مِنْ شَهِيدٍ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ

قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُمْ مِنْ مَحِيصٍ ﴿۴۸﴾ لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ

مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ﴿۴۹﴾ وَ

لَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ

لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ

رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ

الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ

منکروں کو جو انھوں نے کیا ہے

غَلِيظٍ ﴿۵۰﴾ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ

بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ﴿۵۱﴾

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ

مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِيهِمْ

اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝

گھیر رہا ہے ہر چیز کو

خلاصۂ تفسیر

(اوپر چونکہ قیامت کا ذکر ہے کہ اس میں ان کو جزا ملے گی اس لئے) قیامت کے علم کا حوالہ خدا ہی کی طرف دیا جاتا ہے (یعنی اس سوال کے جواب میں کہ قیامت کب آوے گی جیسا کہ کفار بعض دفعہ ایسا سوال کیا کرتے تھے یہی کہا جاوے گا کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے، مخلوق کو اس کا علم نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا) اور (قیامت ہی کی کیا تخصیص ہے اس کا علم ہر شے کو محیط ہے چنانچہ) کوئی پھل اپنے خول میں سے نہیں نکلتا اور نہ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے مگر یہ سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے اور اس اطلاع کی وجہ اس کی صفت علم کا ذاتی ہونا ہے جو دلیل الوہیت و وحدت کی ہے، پس یہ دلیل توحید بھی ہے اور دلیل علم قیامت کی بھی ہے پس اس سے دونوں مضمونوں کی تائید ہوگئی) اور (آگے اس قیامت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس سے اثبات توحید و ابطال شرک بھی ہوتا ہے یعنی) جس روز اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کو پکارے گا اور کہے گا کہ جن کو تم نے میرا شریک قرار دے رکھا تھا وہ میرے شریک اب کہاں ہیں (ان کو بلاؤ کہ تم کو اس مصیبت سے بچاویں) وہ کہیں گے کہ اب تو ہم آپ سے یہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی (اس عقیدہ کا) مدعی نہیں (یعنی اپنی غلطی کے معترف ہیں چونکہ وہاں حقائق منکشف ہو جاویں گے پس یہ اقرار تو اضطراری ہے یا اس لئے ہے کہ اس سے کچھ توقع نجات کی ہو) اور جن جن کو یہ لوگ پہلے سے (یعنی دنیا میں) پوجا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جاویں گے اور (جب یہ حالت دیکھیں گے تو) یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں (اس وقت جھوٹے خداؤں کا بے بس ہونا اور اللہ تعالیٰ کا حق ہونا معلوم ہو جاوے گا، آگے کفر کا ایک برا اثر طبیعت انسانی پر بیان فرماتے ہیں کہ جو شخص توحید و ایمان سے بے

لیکن اس جگہ اس کافر انسان کی جو مذمت کی گئی ہے وہ درحقیقت طولِ دعا پر نہیں بلکہ اسکی اس مجموعی مذموم خصلت پر ہے کہ جب اس پر اللہ تعالیٰ نعمت کی فراوانی فرمادیں تو تکبر و غرور میں مدہوش ہوجاوے اور جب مصیبت آئے تو اپنی پریشانی کو بار بار بیان کرتا رہتا پھرے جیسا غافل لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اللہ سے دعا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنا دکھڑا رونا اور لوگوں سے کہتے رہنا مقصود ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ ۔ یعنی اپنی قدرت کاملہ اور وحدانیت کی نشانیاں ان لوگوں کو دکھاتے ہیں آفاق میں بھی اور خود ان کے اپنے تن بدن میں بھی۔ آفاق اُفق کی جمع ہے، آسمان کے نیچے کنارے کو کہا جاتا ہے۔ مراد آفاق سے اطرافِ عالم ہیں یعنی سارے عالم کی بڑی چھوٹی مصنوعات و مخلوقات آسمان و زمین اور ان کے درمیانی مخلوقات میں سے ہر چیز کو دیکھو تو وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے علم و قدرت کے محیط ہونے اور اس کے یکتا ہونے کی شہادت دیتی ہیں اور اس سے زیادہ قریب کی چیز خود انسان کی اپنی جان اور جسم ہے۔ اس کے ایک ایک عضو اور اس میں کام کرنے والی باریک اور نازک مشینوں کو دیکھئے کہ ان میں انسان کی راحت و سہولت کے کیسے کیسے انتظام رکھے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر ان نازک مشینوں کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ ستر اسی سال تک وہ گھستی نہیں۔ انسان کے عام جوڑوں میں جو اسپرنگ لگے ہوئے ہیں اگر انسانی صنعت ہوتی تو فولادی اسپرنگ بھی گھس کر ختم ہوجاتے۔ پھر ہاتھوں کی کھال اور اس پر لکھی ہوئی لکیریں اور خطوط بھی ساری عمر نہیں گھستے۔ جس میں کوئی ادنیٰ عقل و شعور کا آدمی بھی غور کرے تو اس یقین پر مجبور ہوگا کہ اس کی پیدا کرنے والی اور قائم رکھنے والی کوئی ایسی ذات ہے جس کے علم و قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا مثل کوئی نہیں ہوسکتا۔

فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ؕ

تمت سورة حٰمٓ السجدة بعون الله وحده للعشرين

من الربيع الثاني سنة ١٣٩٢ھ يوم السبت

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّخَمْسُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں ترپن آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ۝١ عٓسٓقٓ ۝٢ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ

اسی طرح وحی بھیجتا ہے تیری طرف اور تجھ سے پہلوں

مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

کی طرف اللہ زبردست حکمتوں والا اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝٤ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ

اور زمین میں اور وہی ہے سب سے اوپر بڑا قریب ہے کہ آسمان

يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ

پھٹ پڑیں اوپر سے اور فرشتے پاکی بولتے ہیں خوبیاں اپنے

رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ

رب کی اور گناہ بخشواتے ہیں زمین والوں کے سنتا ہے وہی

اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝٥ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ

ہے اللہ معاف کرنے والا مہربان اور جنہوں نے پکڑے ہیں اس کے

دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ

سوائے رفیق اللہ کو وہ سب یاد ہیں اور تجھ پر نہیں ان کا

بِوَكِيْلٍ ۝٦ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ

ذمہ اور اسی طرح اتارا ہم نے تجھ پر قرآن عربی زبان کا کہ تو ڈر سنائے

معارف و مسائل

یَتَفَطَّرْنَ۔ اس میں بحوالہ حدیث اوپر بیان ہوا ہے کہ فرشتوں کے بوجھ سے آسمان میں آواز پیدا ہوتی جیسی کسی چیز پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دینے سے ہوا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں ثقل اور بوجھ ہے۔ اور اس میں کوئی استبعاد نہیں، کیونکہ یہ بات تو مسلّم ہے کہ فرشتے بھی اجسام ہیں اگرچہ اجسام لطیفہ ہوں۔ اور اجسام لطیفہ جب بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں تو ان کا بوجھ پڑ جانا کوئی مستبعد نہیں۔ (بیان القرآن)

لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى۔ ام القریٰ کے معنی ہیں ساری بستیوں اور شہروں کی اصل اور بنیاد، مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا نام ام القریٰ اس لئے رکھا گیا کہ یہ شہر ساری دنیا کے شہروں اور بستیوں سے اور ساری زمین سے اللہ کے نزدیک اشرف و افضل ہے۔ جیسا کہ امام احمدؒ نے مسند میں حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراء زہریؓ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سنا جب آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر رہے تھے اور بازار مکہ کے مقام حزورہ پر تھے کہ آپ نے مکہ مکرمہ کو خطاب کرکے فرمایا۔

اما انک لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولولا انی اُخرجت منک لما خرجت۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وقال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

تو میرے نزدیک اللہ کی ساری زمین سے بہتر ہے اور ساری زمین سے زیادہ محبوب ہے اگر مجھے اس زمین سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو میں اپنی مرضی سے کبھی اس زمین کو نہ چھوڑتا۔

وَمَنْ حَوْلَهَا۔ یعنی مکہ مکرمہ کے آس پاس، اس سے مراد آس پاس کے عرب ممالک بھی ہو سکتے ہیں اور پوری زمین کی مشرق و مغرب بھی۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ

اور جس بات میں جھگڑا کرتے ہو تم لوگ کوئی چیز ہو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے وہ اللہ

اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ⑩ فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ

ہے رب میرا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں بنا نکالنے والا آسمانوں کا

وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ

اور زمین کا بنا دیئے تمہارے واسطے تم ہی میں سے جوڑے اور چوپایوں

فضول ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان اب کوئی بحث نہیں۔ قولہ تعالیٰ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا یعنی قیامت کے روز ہم سب کو اللہ تعالیٰ جمع فرما دیں گے اور ہر ایک عمل کا بدلہ دیں گے۔ قولہ تعالیٰ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ یعنی ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ

اور جو لوگ جھگڑے ڈالتے ہیں اللہ کی بات میں جب لوگ اس کو مان چکے ان کا

حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ

جھگڑا باطل ہے ان کے رب کے یہاں اور ان پر غصہ ہے

وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۱۶) اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

اور ان کو سخت عذاب ہے اللہ وہی ہے جس نے اتاری کتاب سچے دین پر

وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (۱۷) يَسْتَعْجِلُ

اور ترازو بھی اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید وہ گھڑی پاس ہو جلدی کرتے ہیں

بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ

اس کی وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے اس پر اور جو یقین رکھتے ہیں ان کو ڈر ہے

مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ

اس کا اور جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے سنتا ہے جو لوگ جھگڑتے ہیں اس گھڑی کے

فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۱۸)

بارے میں وہ بہک کر دور جا پڑے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کے بارے میں (مسلمانوں سے) جھگڑے نکالتے ہیں بعد اس کے کہ وہ مان لیا گیا (یعنی بہت سے سمجھدار ذی عقل آدمی مسلمان ہو کر اس کو مان چکے ہیں، اور حجت واضح ہو جانے کے بعد مجادلہ اور زیادہ مذموم ہے سو) ان لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر (اللہ کی طرف سے) غضب (نازل ہونے والا) ہے اور ان کے لئے (قیامت میں) سخت عذاب (ہونے والا) ہے (اور اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کو اور اس کے دین کو مانو یعنی اس کی کتاب جو

معیشت کا کسی کو دوسری نوع و قسم کا، جس کی وجہ سے ہر انسان دوسرے کا محتاج بھی رہتا ہے اور یہی احتیاج ان کو باہمی تعاون و تناصر پر آمادہ کرتی ہے جس پر تمدن انسانی کی بنیاد ہے۔

حضرت جعفر بن محمدؒ نے فرمایا کہ رزق کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی بندوں پر دو طرح کی ہے، اول تو یہ کہ ہر ایک ذی روح کو اس کے مناسب حال غذا اور ضروریات عطا فرماتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ کسی کو اس کا پورا رزق عمر بھر کا بیک وقت نہیں دے دیتا، ورنہ اول تو اس کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا، اور کتنی بھی حفاظت کرتا وہ پھر بھی سڑنے اور خراب ہونے سے نہ بچتا۔
(مظہری و مفصل عن قرطبی)

ایک عجیب عمل مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری نے فرمایا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جو شخص صبح کو ستر مرتبہ پابندی سے یہ آیت پڑھا کرے وہ رزق کی تنگی سے محفوظ رہے گا، اور فرمایا کہ بہت مجرب عمل ہے۔ آیت یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

اَللّٰہُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاۗءُ ۚ وَہُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ

اَمْ لَہُمْ شُرَکٰۗؤُا شَرَعُوْا لَہُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ

کیا ان کے لئے اور شریک ہیں کہ راہ ڈالی ہے انہوں نے ان کے واسطے دین کی کہ جس کا حکم نہیں دیا

بِہِ اللّٰہُ ۭ وَلَوْلَا کَلِمَۃُ الْفَصْلِ لَقُضِیَ بَیْنَہُمْ ۭ وَاِنَّ

اللہ نے اور اگر نہ مقرر ہو چکی ہوتی ایک بات فیصلہ کی تو فیصلہ ہو جاتا ان میں اور بیشک

الظّٰلِمِیْنَ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۲۱ تَرَی الظّٰلِمِیْنَ

جو گنہگار ہیں ان کو عذاب ہے دردناک تو دیکھے گا گنہگاروں کو کہ ڈرتے

مُشْفِقِیْنَ مِمَّا کَسَبُوْا وَہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمْ ۭ وَالَّذِیْنَ

ہوں گے اپنی کمائی سے اور وہ پڑ کر رہے گا ان پر اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَہُمْ

یقین لائے اور بھلے کام کئے باغوں میں ہیں جنتوں کے ان کے

مَّا یَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّہِمْ ۭ ذٰلِکَ ہُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ ۝۲۲

لئے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس یہی ہے بڑی بزرگی

ذٰلِکَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

یہ ہے جو خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے ایمان والے بندوں کو جو کرتے ہیں

بات سُن لو اور اس کو عقل اور دلیل شرعی کی میزان سے جانچو، اگر معقول ہو تو قبول کر لو، اور اگر کچھ شُبہ ہو تو صاف کہو، اور اپنا شبہ سامنے رکھ دو مجھ کو سمجھا دو، غرض جو بات ہو تم اس سے بے پروائی نہیں کرو تو یہ بڑی بری حرکت ہے، آگے مومنین کے لئے بشارت کا تتمہ ہے یعنی، جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس کی نیکی میں اور خوبی زیادہ کر دیں گے (یعنی اس خوبی کا مقتضا فی نفسہ جس قدر ثواب ہے ہم اس سے زیادہ ثواب دیں گے) بے شک اللہ اطاعت کرنے والے بندوں کے گناہوں کا بڑا بخشنے والا اور ان کی نیکیوں کا بڑا قدردان (اور ثواب عطا کرنے والا) ہے۔

معارف و مسائل

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۔ اس آیت کی جو تفسیر مذکور الصدر خلاصہ میں آچکی ہے یہی جمہور مفسرین سے منقول و ماثور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میرا اصل حق تم سب پر تو یہ تھا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تم اس کا اعتراف کرو اور اپنی فلاح و نجات کے لئے میری اطاعت کرو، مگر میری نبوت و رسالت کو تم تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی مگر میرا ایک انسانی اور خاندانی حق بھی تو ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارے اکثر قبائل میں میری رشتہ داری اور قرابتیں ہیں، قرابت کے حقوق اور صلہ رحمی کی ضرورت سے تمہیں بھی انکار نہیں، تو میں تم سے اپنی اس محنت کا جو تمہاری تعلیم و تبلیغ اور اصلاح اعمال و احوال کے لئے کرتا ہوں، کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ رشتہ داری کے حقوق کا تو خیال کرو۔ بات کا ماننا یا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے، مگر عداوت اور دشمنی سے تو کم از کم نسب و قرابت کا تعلق مانع ہونا چاہئے۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ رشتہ داری کے حقوق کی رعایت یہ خود ان کا اپنا فرض تھا، اس کو کسی خدمت تعلیمی تبلیغی کا معاوضہ نہیں کہا جا سکتا۔ آیت مذکورہ میں جو اس کو بلفظ استثناء ذکر فرمایا ہے تو یہ یا تو اصطلاحی الفاظ میں استثناء منقطع ہے جس میں مستثنیٰ اس مجموعہ مستثنیٰ منہ کا جز نہیں ہوتا، یا پھر اس کو مجازاً اجر اور معاوضہ قرار دیا گیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ میں تم سے صرف اتنی بات چاہتا ہوں جو درحقیقت کوئی معاوضہ نہیں، تم اس کو معاوضہ سمجھو تو یہ تمہاری ہی غلطی ہے، اس کی نظیر عرب و عجم کی زبانوں میں بہت ہیں۔ متنبی شاعر نے ایک قوم کی شجاعت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ ان کی تلواروں میں کثرت حرب و ضرب کی وجہ سے دندانے پڑ گئے ہیں، ظاہر ہے کہ تلوار کے دندانے ہونا کوئی عیب نہیں، بلکہ ہنر ہے، اس کا عربی شعر یہ ہے ؎

خلاصۂ تفسیر

کیا یہ لوگ آپ کی نسبت (نعوذ باللہ) یوں کہتے ہیں کہ انہوں نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھ رکھا ہے (کہ نبوت اور وحی کا خلاف واقع دعویٰ کیا ہے) سو (ان کا یہ قول خود غلط ہے اس لئے کہ آپ کی زبان حق ترجمان سے اللہ کا یہ معجزہ کلام جاری ہو رہا ہے جو سچے نبی کے سوا کسی کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا۔ اگر معاذ اللہ آپ اپنے دعوے رسالت میں سچے نہ ہوتے تو اللہ یہ کلام آپ پر جاری نہیں کر سکتا تھا چنانچہ) خدا کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کے دل پر بند لگا دے (اور یہ کلام آپ کے قلب پر نہ رہنے دے بلکہ سب محو ہو جائے اور آپ بالکل بھول جائیں) اور (اس صورت میں ظاہر ہے کہ زبان سے اس کا صدور ہو ہی نہیں سکتا) اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ وہ نبوت کے باطل دعوے کو مٹایا کرتا ہے (چلنے نہیں دیتا یعنی ایسے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں ہوتے) اور (نبوت کے) حق (دعوے) کو اپنے احکام سے ثابت (و غالب) کیا کرتا ہے (پس آپ صادق اور وہ کاذب ہیں) وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) دلوں تک کی باتیں جانتا ہے (چہ جائیکہ زبان کے اقوال اور جوارح کے افعال پس اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے عقائد، اقوال اور اعمال سب کی خبر ہے، ان سب پر خوب سزا دے گا، ہاں جو لوگ اپنے کفر اور برائیوں سے توبہ کریں انہیں معاف کر دے گا کیونکہ یہ اس کا قانون ہے) اور وہ ایسا (کریم) ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ (بشرط الشروط) قبول کرتا ہے اور وہ (اس توبہ کی برکت سے) تمام (گذشتہ) گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سب کو جانتا ہے (پس اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ توبہ اخلاص کی ہے یا غیر مخلص، اور اگر اب کوئی شخص کفر سے توبہ کر کے مسلمان ہو گیا تو اس کی جو عبادتیں پہلے قبول نہ ہوتی تھیں اب قبول ہونے لگیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ) ان لوگوں کی عبادت (بشرطیکہ ریاء سے نہ ہو) قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے (اور وہ عبادتیں بھی نیک عمل ہیں اور ان کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ثواب دیتا ہے) اور (علاوہ اس ثواب کے جو فی نفسہ اس عمل کا مقتضیٰ ہے) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (ثواب) دیتا ہے (یہ تو ایمان والوں کے لئے ہوا) اور جو لوگ کفر پر اصرار کر رہے ہیں (اور ایمان نہیں لائے) اُن کے لئے سخت عذاب (مقرر) ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور قرآن کو غلط و خود ساختہ افترا کہنے والوں کو اپنا ایک عام ضابطہ بتلا کر جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے کام جو عادۃً انسان نہیں کر سکتے، جن کو خرق عادت یا معجزہ کہا جاتا ہے، اگرچہ بعض ساحر اور جادوگر بھی اپنے سحر سے ایسے کام کر دکھاتے ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بغیر اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے کچھ نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ ہی اپنے فضل سے انبیاء کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو معجزات عطا فرماتے ہیں جن میں پیغمبر کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح جادوگروں کے جادو کو بھی اپنی حکمت، امتحان و آزمائش کی بنا پر چلنے دیتے ہیں۔ مگر سحر اور معجزہ میں فرق اور نبی و ساحر میں امتیاز کے لئے اس نے یہ ضابطہ جاری کر رکھا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ جھوٹا کرے تو اس کے ہاتھ سے کوئی سحر یا جادو کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ مدعی نبوت نہ ہو سحر چل جاتا ہے۔ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے بعد اس کا سحر اللہ تعالیٰ نہیں چلنے دیتے۔

اور جن کو اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت عطا فرماتے ہیں، ان کو معجزات بھی عطا فرماتے ہیں اور ان کے معجزات کا صدور روشن کرتے ہیں۔ اس طرح تکوینی اور تقدیری طور پر ان کی نبوت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ دوسرے اپنے کلام کی آیات میں اُن کی تصدیق نازل فرما دیتے ہیں۔

جب یہ ضابطہ معلوم ہو گیا تو اب یہ دیکھو کہ قرآن کریم ایک معجزہ ہے کہ تمام دنیا کے جن و بشر اس کی ایک آیت کی مثال بنانے سے عاجز ہیں جس کا معجزہ زمانہ نبوت میں ثابت ہو چکا اور آج تک ثابت ہے۔ پس کھلا ہوا معجزہ کسی جھوٹے مدعی نبوت سے حسب ضابطہ مذکورہ صادر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ کا دعوائے نبوت و رسالت صحیح اور حق ہے، اس کو غلط اور افترا کہنے والے گمراہ مفتری ہیں۔

دوسری آیت میں منکرین و معاندین کو نصیحت کی گئی ہے کہ اب بھی کفر و انکار سے باز آ جائیں اور توبہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرما لیتا ہے اور ان کی خطاؤں کو بخش دیتا ہے۔

توبہ کی حقیقت توبہ کے لفظی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں کسی گناہ سے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں۔ اور اس کے صحیح و معتبر ہونے کے لئے تین شرائط ہیں۔

ایک یہ جس گناہ میں فی الحال مبتلا ہے اس کو فوراً ترک کردے۔ دوسرے یہ کہ ماضی میں جو گناہ ہوا اس پر نادم ہو، تیسرے یہ کہ آئندہ اُس کے ترک کرنے کا پختہ عزم کرے، اور کوئی شرعی فریضہ چھوڑا ہوا ہے تو اسے ادا یا قضا کرنے میں لگ جائے، اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ کسی کا مال اپنے اوپر واجب ہے اور وہ شخص زندہ ہے تو یا اسے وہ مال لوٹائے یا اس سے معاف کرائے اور اگر وہ زندہ نہیں اور اس کے ورثہ موجود ہیں تو ان کو لوٹائے، اگر ورثہ بھی نہیں ہیں تو بیت المال میں داخل کرائے، بیت المال بھی نہیں ہے یا اس کا انتظام صحیح نہیں ہے تو اس کی طرف سے صدقہ کردے، اور اگر کوئی غیر مالی حق کسی کا اپنے ذمہ واجب ہے مثلاً کسی کو ناحق ستایا ہے، برا کہا ہے، یا اس کی غیبت کی ہے تو اسے جس طرح ممکن ہو **راضی کرکے اس سے معافی حاصل کرے۔**

اور یہ تو ہر قسم کی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ گناہ کا ترک کرنا اللہ کے لئے ہو، اپنے کسی جسمانی ضعف یا مجبوری کی بنا پر نہ ہو۔ اور شریعت میں اصل مطلوب تو یہ ہے کہ توبہ سارے ہی گناہوں سے کی جائے، لیکن اگر صرف کسی خاص گناہ سے توبہ کی گئی تو اہل سنت کے مسلک کے مطابق اس گناہ کی حد تک تو معافی ہو جائیگی، دوسرے گناہوں کا وبال سر پر رہے گا۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ
اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھا دیں ملک میں

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ
ولیکن اتارتا ہے ماپ کر جتنی چاہتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے

بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ
دیکھتا ہے اور وہی ہے جو اتارتا ہے مینہ بعد اس کے کہ آس

مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾
توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت اور وہی ہے کام بنانے والا سب تعریفوں کے لائق

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ

اور ایک اس کی نشانی ہے بنانا آسمانوں کا اور زمین کا اور جس قدر

فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ

بکھیرے ہیں ان میں جانور اور وہ جب چاہے ان سب کو اکٹھا کر سکتا

قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ

ہے اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا

اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ

تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت سے گناہ اور تم تھکا دینے والے نہیں بھاگ کر

فِي الْاَرْضِ ښ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

زمین میں اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوائے کام بنانے والا اور نہ

نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

مددگار اور ایک اس کی نشانی ہے کہ جہاز چلتے ہیں دریا میں جیسے پہاڑ

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰي ظَهْرِهٖ ۭ

اگر چاہے تھما دے ہوا کو پھر رہیں سارے دن ٹھہرے ہوئے اس کی پیٹھ پر

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ

مقرر اس بات میں پتے ہیں ہر ٹھہرنے والے کو جو احسان مانے یا تباہ کر دے ان کو

بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

بسبب ان کی کمائی کے اور معاف بھی کرے بہتوں کو اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو

يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

جھگڑتے ہیں ہماری قدرتوں میں کہ نہیں ان کے لیے بھاگنے کی جگہ ۔

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت کے آثار میں سے یہ ہے کہ اس نے سب آدمیوں کو زیادہ مال نہیں دیا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لیے اموال موجودہ جیسی ان کی طبیعتیں میں

روزی فراخ کردیتا تو وہ دنیا میں (بالعموم) شرارت کرنے لگتے (کیونکہ جب سارے انسان مالدار ہوتے اور کوئی کسی کا مطلق محتاج نہ ہوتا تو کوئی بھی کسی سے نہ دبتا) لیکن (یہ بھی نہیں کیا کہ بالکل ہی کسی کو کچھ نہ دیا ہو، بلکہ) جتنا رزق چاہتا ہے اندازہ (مناسب) سے (ہر ایک کے لئے) اتارتا ہے، (کیونکہ) وہ اپنے بندوں (کے مصالح) کو جاننے والا (اور ان کا حال) دیکھنے والا ہے اور وہ ایسا (رحیم) ہے جو (بسا اوقات) لوگوں کے ناامید ہوجانے کے بعد مینہہ برساتا ہے اور اپنی رحمت (کے آثار دنیا میں) پھیلاتا ہے (آثار سے مراد نباتات اور پھل پھول ہیں) اور وہ (سب کا) کارساز (اور اس کارسازی پر) قابل حمد و ثنا ہے اور منجملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جانداروں کا جو اس نے زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور وہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرکے) ان (مخلوقات) کے جمع کرلینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے اور (وہ انتقام لینے والا مگر ساتھ ہی معاف کرنے والا بھی ہے چنانچہ) تم کو (اے گناہگارو) جو کچھ مصیبت (حقیقتاً) پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے اور وہ بھی ہر گناہ پر نہیں، بلکہ بعض بعض گناہوں پر) اور بہت (سے گناہوں) سے درگذر ہی کردیتا ہے (خواہ دونوں جہان میں یا صرف دنیا میں، اور اگر وہ سب پر مواخذہ کرنے لگے تو) تم زمین (کے کسی حصہ) میں (پناہ لیکر اس کو) ہرا نہیں سکتے اور (ایسے وقت میں) خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی و مددگار نہیں (ہوسکتا) اور منجملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ (مراد یہ ہے کہ ان کا سمندر میں چلنا دلیل ہے حق تعالیٰ کی عجیب صناعی کی اور قدرت کی) اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں (اسی کا کام ہے کہ ہوا کو چلاتا ہے اور اس سے وہ جہاز چلتے ہیں) بے شک اس میں (قدرت پر دلالت کرنے والی) نشانیاں ہیں ہر صابر و شاکر (یعنی مومن) کے لئے (اس کی تشریح سورۂ لقمان کے آخری رکوع میں اسی قسم کے جملہ کے تحت گزر چکی۔ غرض اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کرکے جہازوں کو کھڑا کردے) یا (اگر وہ چاہے زور کی ہوا چلاکر) ان جہازوں (کے سواروں) کو ان کے اعمال (بد کفر وغیرہ) کے سبب تباہ کردے اور (ان میں) بہت سے آدمیوں سے درگزر کر جاوے (یعنی اس وقت غرق نہ ہوں، گو آخرت میں سزایاب ہوں) اور (اس تباہی کے وقت) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں معلوم ہوجاوے کہ (اب) ان کے لئے کہیں بچاؤ (کی صورت) نہیں (کیونکہ ایسے اوقات میں وہ بھی اپنے مزعومہ شرکاء کو عاجز سمجھتے تھے)۔

معارف و مسائل

ربط اور شان نزول

ان آیات میں باری تعالیٰ نے عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کے لیے اپنی اس حکمت بالغہ کا تذکرہ فرمایا ہے جس کے ذریعہ اس نے کائنات کو ایک مستحکم نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ کائنات کا یہ مستحکم نظام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کوئی حکیم و خبیر ذات اسے چلا رہی ہے۔

اس مضمون کی ابتدا باری تعالیٰ نے ہے اس نظام معیشت کی طرف اشارہ فرما کر کی ہے جو اُس نے اپنی حکمت سے دنیا میں جاری فرمایا ہے۔ اور یہ مضمون پچھلی آیات سے اس طرح مربوط ہے کہ گزشتہ آیتوں میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی عبادت کو قبول فرماتا ہے جس میں اُن کی دعاؤں کی قبولیت بھی داخل ہے۔ اب یہاں یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ یہ بات بکثرت مشاہدہ میں آتی ہے کہ مسلمان اپنے کسی دنیوی مقصد کے لئے دعا کرتا ہے، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس اشکال کا جواب مذکورہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں دیا گیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی خواہش ہوئی ہو بسا اوقات خود انسان کی انفرادی یا اجتماعی مصلحت کے خلاف ہوتی ہے، لہٰذا اگر کسی وقت کسی انسان کی کوئی دعا بظاہر قبول نہ ہو تو اس کے پیچھے کائنات کی وہ عظیم مصلحتیں ہوتی ہیں جن کی تفصیلات علیم و حکیم مطلق کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگر دنیا میں ہر انسان کی ہر تمنا پوری ہو جایا کرتی تو دنیا کا نظام حکمت کے تحت نہیں رہ سکتا تھا (تفسیر کبیر)

چنانچہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ آیت ان مومنین کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو کافروں کی مال و دولت دیکھ کر تمنا کیا کرتے تھے کہ یہ وسعت و فراخی ہمیں بھی حاصل ہو جائے۔ امام بغوی رح نے حضرت خباب بن ارت رض کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم نے بنو قریظہ، بنو نضیر، اور بنو قینقاع کے مال و دولت کو دیکھا تو ہمارے دلوں میں بھی مالداری کی تمنا پیدا ہوئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت عمرو بن حریث رض فرماتے ہیں کہ اصحاب صُفّہ میں سے بعض حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مالدار بنا دے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی وغیرہ)۔

دنیا میں دولت کی عام فراوانی فساد کا سبب ہے

بہرکیف! آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر دنیا کے ہر فرد پر ہر قسم کے رزق اور ہر قسم کی نعمت کی فراوانی کر دی جاتی تو انسانوں کا ایک دوسرے کے خلاف بغی و فساد حد سے بڑھ جاتا۔ اس لئے کہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا اور نہ کوئی کسی سے دبتا، دوسری طرف

کے تحت آئے گی۔

جنت اور دنیا کا فرق

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جنت میں تو تمام انسانوں پر ہر قسم کی نعمتوں کی فراوانی کردی جائے گی، وہاں یہ چیز فساد کا سبب کیوں نہیں ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں فساد کا سبب مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ حرص و ہوس کے وہ جذبات ہیں جو دولت مندی کے ساتھ ساتھ عموماً بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف جنت میں نعمتوں کی عام بارش تو ہوگی لیکن حرص و ہوس اور سرکشی کے یہ جذبات ختم کردیئے جائیں گے چنانچہ وہاں یہ فساد رونما نہیں ہوگا حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلاصۂ تفسیر میں "حالت موجودہ" کے الفاظ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے بڑھائے ہیں۔ (بیان القرآن)

اب یہاں یہ اعتراض قطعی فضول ہے کہ دنیا میں بھی مال و دولت کی فراوانی کرکے حرص و ہوس کے جذبات کیوں نہ ختم کردیئے گئے؟ کیونکہ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہی ایک ایسا جہان پیدا کرنا ہے جو خیر و شر دونوں کی قوتوں سے مرکب ہو۔ اس کے بغیر انسانوں کی وہ آزمائش ممکن ہی نہیں ہے جو تخلیق عالم کا اصل منشا ہے۔ لہٰذا اگر یہاں انسانوں میں سے یہ جذبات ختم کردیئے جاتے تو دنیا کی پیدائش کا مقصد اصلی ہی فوت ہو جاتا۔ اس کے برخلاف جنت خالص خیر پر مشتمل ہوگی اس لئے وہاں یہ جذبات ختم کردیئے جائیں گے۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا ۔ "اور وہ ایسا ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے"، یوں تو اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ جب زمین کو پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے، بارش برسا دیتے ہیں، لیکن یہاں "ناامید ہو جانے کے بعد" فرما کر اس طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ کبھی کبھی باری تعالیٰ مینہ برسانے میں معمول عادت کے خلاف اتنی تاخیر کردیتے ہیں جس سے لوگ ناامید ہونے لگیں۔ اس سے آزمائش کے علاوہ اس بات پر تنبیہ مقصود ہوتی ہے کہ بارش اور تمام اسباب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جب چاہتا ہے لوگوں کی بداعمالیوں وغیرہ کی بنا پر بارش روک لیتا ہے تاکہ لوگ اس کی رحمت کی طرف متوجہ ہو کر اس کے سامنے عجز و نیاز کا مظاہرہ کریں، ورنہ اگر بارش کا بھی کوئی ایک بندھا وقت ہوتا جس سے کبھی سرمو انحراف نہ ہو تو لوگ اسے خالص ظاہری اسباب کا تابع سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بے توجہ ہو جاتے اور یہاں "ناامید" ہونے سے مراد اپنی تدبیروں سے ناامید ہونا ہے، ورنہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ ۔ "دَابَّةٌ" اصل لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے اختیار سے چلنے اور حرکت کرنے والی ہو، بعد میں یہ لفظ صرف جانوروں کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس آیت میں آسمان اور زمین دونوں کی طرف نسبت کرکے یہ کہا گیا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے

بہت سی چلنے والی مخلوقات پیدا کی ہیں۔ زمین پر چلنے والی مخلوقات تو ظاہر ہیں، آسمان میں ان سے مراد ملائکہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں میں کچھ ایسے جانور موجود ہوں جو ابھی تک انسان کے علم میں نہیں آسکے۔

بہرکیف، مقصد یہ ہے کہ گو نظام عالم کی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مال و دولت میں وسعت عطا نہیں کی، بلکہ ایک حکیمانہ انداز سے رزق کی تقسیم فرمائی ہے، لیکن وہ نعمات کی جو نعمتیں عمومی فائدے کی ہیں، اُن سے ہر شخص کو بہرہ اندوز کیا ہے۔ بارش، بادل، زمین، آسمان، اور ان کی مخلوقات سب انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ کا یہی مطلب ہے۔ حضرت حسن رضؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جس شخص کو کسی لکڑی سے کوئی خراش لگتی ہے، یا کوئی رگ دھڑکتی ہے یا قدم کو لغزش ہوتی ہے، یہ سب اس کے گناہوں کے باعث ہوتا ہے اور ہر گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نہیں دیتے بلکہ جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جن پر کوئی سزا دیجاتی ہے۔ حضرت اشرف التھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح جسمانی اذیتیں اور تکلیفیں گناہوں کے سبب آتی ہیں اسی طرح باطنی مرض بھی کسی گناہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آدمی سے کوئی ایک گناہ سرزد ہو گیا تو وہ سبب بن جاتا ہے دوسرے گناہوں میں مبتلا ہونے کا، جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے الدواء الشافی میں لکھا ہے کہ گناہ کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی طرح نیکی کی ایک نقد جزا یہ ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔

بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ یہ آیت اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے معصوم ہیں، یا نابالغ بچے اور مجنون جن سے کوئی گناہ نہیں ہوتا، ان کو جو تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے وہ اس حکم میں داخل نہیں۔ اس کے دوسرے اسباب و حکمتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً رفع درجات اور درحقیقت ان کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کر سکتا (واللہ اعلم)۔

فائدہ: بعض روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ جن گناہوں پر کوئی سزا دنیا میں دیدی جاتی ہے مومن کے لئے اس سے آخرت میں معافی ہو جاتی ہے جیسا کہ حاکمؒ نے مستدرک میں اور بغویؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ (مظہری)

فَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ

اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٣٦﴾

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا

غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ

وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا

رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ

هُمْ يَنتَصِرُونَ ﴿٣٩﴾ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۖ فَمَنْ

عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٤٠﴾

وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن

سَبِيلٍ ﴿٤١﴾ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ

وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

أَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾

اور البتہ جس نے سہا اور معاف کیا بیشک یہ

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ بھی سن رکھو کہ طالب دنیا کی ہر دنیوی تمنا پوری نہیں ہوتی اور آخرت سے محروم رہتا ہے اور طالب آخرت کو ترقی ہوتی ہے۔ نیز سن رکھو کہ زیادہ متاع دنیا کا انجام اچھا نہیں، کیونکہ اس سے اعمال فخر و غرور پیدا ہوتے ہیں، سو اس سے ثابت ہوا کہ مطلوب بنانے کے قابل دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہے۔ اور باقی دنیا کی چیزوں میں سے) جو چیز تم کو دی دلائی گئی ہے وہ محض چند روزہ (دنیوی) زندگی کے برتنے کے لئے ہے (کہ عمر کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر و ثواب) آخرت میں اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیت کے اعتبار سے بھی) بہتر ہے اور (کمیت کے لحاظ سے بھی) زیادہ پائیدار (یعنی ہمیشہ رہنے والا) ہے، پس دنیا کی طلب چھوڑ کر آخرت کی طلب کرو، مگر آخرت کے حصول کے لئے کم سے کم شرط تو ایمان لانا اور کفر کو چھوڑنا ہے، اور آخرت کے مکمل درجات ملنے کے لئے تمام واجبات و فرائض کو اختیار کرنا اور تمام گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے، اور قرب کے درجات حاصل کرنے کے لئے نفلی طاعات کو اختیار کرنا اور غفلت والی مباحات کو ترک کرنا بھی مطلوب ہے، چنانچہ وہ ثواب جس کی تفصیل اوپر گذری) ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور جو کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا ہر اہم کام (جس میں اللہ کی طرف سے کوئی معین حکم نہ ہو) آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو ایسے (منصف) ہیں کہ جب ان پر کسی طرف سے کچھ (تعدی) واقع ہوتا ہے تو وہ (اس کا) بدلہ لیتے ہیں تو برابر بدلہ لیتے ہیں زیادتی نہیں کرتے، (اور یہ مطلب نہیں کہ معاف نہیں کرتے) اور (برابر بدلہ لینے کے لئے ہم نے جو اجازت دے رکھی ہے کہ) برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی (البتہ یہ فعل بذات خود گناہ نہ ہو، بلکہ اس انتقام کی اجازت کے باوجود) جو شخص معاف کر دے اور (باہمی معاملہ کی) اصلاح کر لے (جس سے عداوت جاتی رہے اور دوستی ہو جاوے) تو اس کا ثواب (حسب وعدہ) اللہ کے ذمہ ہے (اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے لگے تو یہ سن رکھے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو (زیادتی نہ کرے بلکہ) اپنے اوپر ظلم ہو چکنے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے، سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (خواہ ابتداءً یا انتقام کے وقت) اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر) کیا کرتے ہیں (اور یہی ظلم کا سبب ہوتا ہے، اور ناحق اس لئے کہا کہ سرکشی اور تکبر ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔ آگے اس الزام کا بیان ہے کہ) ایسوں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے اور جو شخص (دوسرے

کے ظلم پر) صبر کرے اور معاف کر دے، یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے (یعنی ایسا کرنا بہتر اور اولوالعزمی کا تقاضا ہے) ۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں دنیا کی نعمتوں کا ناقص ہونا اور وقتی ہونا اور اس کے مقابل آخرت کی نعمتوں کا کامل بھی ہونا اور دائمی ہونا بیان فرمایا ہے۔ اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لئے سب سے اہم اور بڑی شرط تو ایمان ہے کہ اس کے بغیر وہ نعمتیں وہاں کسی کو نہ ملیں گی۔ لیکن ایمان کے ساتھ اگر اعمال صالحہ کا بھی پورا اہتمام کر لیا تو آخرت کی یہ نعمتیں اوّل ہی مل جائیں گی ورنہ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اس لئے آیات مذکورہ میں سب سے پہلی شرط تو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بیان فرمائی۔ اس کے بعد خاص خاص اعمال کا ذکر فرمایا گیا جن کے بغیر ضابطہ کے مطابق آخرت کی نعمتیں شروع سے نہ ملیں گی بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد ملیں گی۔ اور ضابطے کے مطابق اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب گناہوں کو معاف فرما کر اوّل ہی آخرت کی نعمتیں بڑے سے بڑے فاسق کو دے سکتے ہیں وہ کسی قانون کے پابند نہیں۔ اب وہ اعمال و صفات دیکھئے جن کو اس جگہ اہمیت سے ذکر فرمایا ہے۔

پہلی صفت: عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ یعنی ہر کام اور ہر حال میں اپنے رب پر بھروسہ رکھیں اس کے سوا کسی کو حقیقی کارساز نہ سمجھیں ۔۔۔ دوسری صفت: اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ۔ یعنی جو کبیرہ گناہوں سے خصوصاً بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرنے والے ہیں۔ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ اس کی تفصیل سورۂ نساء وغیرہ میں پہلے بیان ہو چکی اور احقر نے ایک مختصر رسالہ میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی پوری فہرست بھی لکھ دی ہے۔ جو "گناہ بے لذت" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سبھی گناہ داخل تھے، ان میں سے فواحش کو الگ کر کے بیان فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ فواحش کا گناہ عام کبیرہ گناہوں سے زیادہ سخت بھی ہیں اور وہ ایک متعدی بیماری ہیں، جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں فواحش کا لفظ ان کاموں کے لئے بولا جاتا ہے جن میں بے حیائی ہو جیسے زنا اور اس کے مقدمات۔ نیز وہ اعمال بد جو ڈھٹائی کے ساتھ علانیہ کئے جاویں وہ بھی فواحش کہلاتے ہیں کہ ان کا وبال بھی نہایت شدید اور پورے انسانی معاشرہ کو خراب کرنے والا ہے۔

مواخذہ فرمادیں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے مشورہ کی اہمیت واضح ہوگئی اور یہ کہ ہم اس پر مامور ہیں کہ ہمیشہ اور صاحب امور میں جلد بازی اور خود رائی سے کام نہ کریں، اہل عقل و بصیرت سے مشورہ لیکر قدم اٹھائیں۔

مشورہ کی اہمیت اور اُس کا طریقہ — خطیب بغدادیؒ نے حضرت علی مرتضیٰؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس میں قرآن نے کوئی فیصلہ نہیں کیا اور آپ سے بھی اس کا کوئی حکم نہیں سنا تو ہم کیسے عمل کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اجمعوا له العابدين من امتی و اجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقضوا برأی واحد (روح المعانی۔ بحوالہ خطیب)	اس کے لئے میری اُمّت کے عبادت گذاروں کو جمع کرو اور آپس میں مشورہ کر کے طے کرو کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس روایت کے بعض الفاظ میں فقہاء و عابدین کا لفظ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مشورہ اُن لوگوں سے لینا چاہئے جو فقیہ یعنی دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے اور عبادت گذار ہوں۔

صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ جو مشورہ اس درجہ پر نہیں بلکہ بے علم بے دین لوگوں کی رائے پر ہو اس کا فساد اس کی صلاح پر غالب رہے گا۔

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کام کا ارادہ کیا اور اس میں مشورہ لے کر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو انسب امور کی طرف ہدایت فرمادے گا یعنی اس کو وہی بات کہہ دے گا جو اس کے لئے انجام کار خیر و بہتر ہو۔ اسی طرح کی ایک حدیث بخاری نے ادب مفرد میں اور عبد بن حمید نے مسند میں حضرت حسن بصریؒ سے بھی نقل کی ہے جس میں آپ نے آیت مذکورہ پڑھ کر یہ فرمایا ہے۔

ماتشاور قوم قط الا هدوا لارشد امرهم۔	جب کوئی قوم مشورہ سے کام کرتی ہے تو ضرور ان کو صحیح راستہ کی طرف ہدایت کردی جاتی ہے۔

حدیث: ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تمہارے اُمراء اور حکام وہ لوگ ہوں جو تم سب میں بہتر ہیں اور تمہارے مالدار لوگ سخی ہوں کہ اللہ کی راہ میں اور غرباء پر خرچ کریں، اور تمہارے کام باہمی مشورہ سے طے ہوا کریں۔ اسوقت تک تمہارے لئے زمین کے اوپر رہنا یعنی زندہ رہنا بہتر ہے اور جب تمہارے امراء و حکام تمہاری قوم کے بُرے لوگ ہو جاویں اور تمہارے مالدار بخیل ہو جاویں اور تمہارے کام عورتوں کے سپرد ہو جاویں کہ

اُس شخص کا دنیا میں بھی کوئی چارہ ساز نہیں کہ اس کو دیر لگا دے، اور آخرت میں بھی برا حال ہوگا چنانچہ اُس روز آپ ان ظالموں کو دیکھیں گے جس وقت کہ ان کو عذاب کا معائنہ ہوگا تو (نہایت حسرت سے) کہتے ہوں گے کیا دنیا میں واپس جانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، تاکہ پھر اچھے عمل کر کے آئیں، اور نیز آپ ان کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ وہ دوزخ کے روبرو لائے جاویں گے مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہوں گے اور (وہ اُس کو) شکستہ (شکستہ) نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جیسے خوف زدہ آدمی دیکھا کرتا ہے اور ایک دوسری آیت میں جو اندھا ہونے کی خبر دی ہے وہ حشر کے وقت ہے اور یہ اس کے بعد کا وقت ہے، چنانچہ وہاں لفظ نحشرہ (واقع ہوا) ہے، اور اس وقت ایمان والے اپنے بچنے پر شکر کرنے کے لئے اور ان پر ملامت کرنے کے لئے کہیں گے کہ پورے خسارہ والے وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے آج قیامت کے روز خسارہ میں پڑ گئے (اس کی تفسیر سورۂ زمر کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) یاد رکھو کہ ظالم یعنی مشرک و کافر، لوگ عذاب دائمی میں گرفتار رہیں گے اور وہاں ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو خدا سے الگ ہو کر ان کی مدد کریں، اور جس کو خدا گمراہ کر دے اس (کی نجات) کے لئے کوئی رستہ ہی نہیں (یعنی نہ معذرت نہ کسی کی مدد نہ کچھ اور، آگے کافروں سے خطاب ہے کہ اے کافرو جب تم نے قیامت کے یہ ہولناک حالات سن لئے تو) تم اپنے رب کا حکم (ایمان وغیرہ کا) مان لو قبل اس کے کہ ایسا دن آ پہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جس طرح دنیا میں عذاب ٹلتا جاتا ہے آخرت میں ایسی کوئی صورت نہ ہوگی اور) نہ تم کو اس روز کوئی پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے کہ اتنا ہی پوچھ لے کہ ان کا یہ حال کیوں بنایا گیا اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو یہ سنا دیجئے) **پھر اگر یہ لوگ** (یہ سن کر بھی) اعراض کریں (اور ایمان نہ لائیں) تو (آپ فکر اور غم میں نہ پڑیں کیونکہ) ہم نے آپ کو ان پر نگران کر کے نہیں بھیجا (جس سے بازپرس کا احتمال ہو کہ آپ کی نگرانی میں اُن سے یہ امور کیوں صادر ہوئے بلکہ) آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے (جس کو آپ کر رہے ہیں پھر آپ اس سے زیادہ فکر کیوں کریں) اور ان کے حق سے اعراض کرنے کا سبب تعلق مع اللہ کی کمزوری ہے جس کی علامت یہ ہے کہ، ہم جب اس قسم کے آدمی کو کچھ اپنی عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس پر اترا کر خوش ہو جاتا ہے اور منعم پر نگاہ کر کے شکر نہیں کرتا، اور اگر ان ایسے لوگوں پر ان کے ان اعمال بد کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو ایسا آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے

اور ایسا نہیں کرتا کہ گناہوں سے توبہ و استغفار کرکے عبادت و اطاعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو، اور یہ دونوں حالتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اس کا تعلق اپنی نفسانی لذتوں کے ساتھ زیادہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معدوم یا کمزور ہے اور اسی سے وہ کفر میں مبتلا ہوا ہے، اور چونکہ یہ حالت ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، اس لئے ان سے آپ ایمان کی توقع ہی کیوں رکھیں جو موجب غم ہو۔ آگے پھر توحید کا بیان ہے کہ، اللہ ہی کی ہے (سب) سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چنانچہ) جس کو چاہتا بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا ان کو جس کے لئے چاہتا ہے جمع کردیتا ہے (کہ) بیٹے بھی دیتا ہے اور بیٹیاں بھی، اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی ابتدائی آیات میں ان لوگوں کا انجام مذکور ہے جو مومنین صالحین کے بالمقابل بجائے فکر آخرت کے صرف دنیا کی لذت و راحت کے طلبگار رہے۔ اس کے بعد اسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُمْ میں ان کو نصیحت کی گئی ہے کہ قیامت کا وقت آنے سے پہلے توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کی بار بار تبلیغ اور کوشش کے باوجود اگر یہ لوگ ہدایت میں نہ آویں تو آپ غم نہ کریں۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا۔ کا یہی مطلب ہے۔

آخری آیت میں لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ سے تخلیق کائنات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا مشاہدہ ہوتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں، ان کو بیان کرکے توحید کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر فرمانے کے بعد ایک ضابطہ قدرت بیان فرمایا کہ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ۔ یعنی وہ ہر بڑی چھوٹی چیز کے بنانے پر قادر ہے وہ جب چاہے جو چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اسی سلسلہ میں تخلیق انسانی کا ذکر فرمایا يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝

یعنی انسان کی تخلیق میں کسی کے ارادہ و اختیار بلکہ علم و خبر کو بھی کوئی دخل نہیں اور کسی کا دخل تو کیا ہوتا، انسان کے ماں باپ جو اس کی تخلیق کا ظاہری سبب بنتے ہیں خود ان کے ارادے و

کلام سُنا دے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سُنا تھا، یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو حکم منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بڑا عالیشان ہے (اس لئے جب تک وہ خود ملتفت نہ ہو دوسرے کوئی ہمکلام نہیں ہو سکتا، مگر اس کے ساتھ) بڑی حکمت والا (بھی) ہے (اسی لئے بندوں کی مصلحت سے اس نے کلام کے تین مذکورہ طریقے مقرر فرما دیئے ہیں) اور (جس طرح انبیاء کے ساتھ ہمارے ہمکلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) اسی طرح (یعنی اس قاعدے کے مطابق) ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور آپ کو نبی بنایا ہے، اور یہ وحی ایسا ہدایت نامہ ہے کہ آپ کے اپنے علوم میں اسی کی بدولت ترقی ہوئی، چنانچہ اس سے پہلے آپ نہ یہ جانتے تھے کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کا مکمل ترین درجہ جو اب حاصل ہے) کیا چیز ہے (اگرچہ نفس ایمان نبی کو نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے)، ولیکن ہم نے (آپ کو نبوت اور قرآن دیا اور) اس قرآن کو (آپ کے لئے اولاً اور دوسروں کے لئے ثانیاً) ایک نور بنایا (جس سے آپ کو یہ عظیم علوم اور بلند مرتبے حاصل ہوئے اور) جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں (اس کے نورِ عظیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اب جو اندھا ہی ہو وہ اس نور کے نفع سے محروم رہے یا اس کا منکر ہو، جیسے یہ معترضین، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے رستہ کی ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے رستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (آگے ان احکام کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا کا ذکر ہے کہ) یاد رکھو سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (پس وہ سب کو جزا و سزا دے گا)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت یہود کے ایک معاندانہ مطالبہ کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ بغویؒ اور قرطبیؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لے آئیں جبکہ آپ نہ خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور نہ اس سے بالمشافہ کلام کرتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کلام کرتے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالمشافہ کلام کرنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی

مشافہۃً کلام نہیں سنتا بلکہ پس پردہ حرف آواز سنی۔

اس آیت میں یہ بتلا دیا گیا کہ کسی بشر سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وَحْيًا یعنی کسی مضمون کو قلب میں ڈال دینا، یہ جاگتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے اور نیند میں بصورت خواب بھی، جیسا کہ بہت سی احادیث میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اُلْقِيَ فِيْ رُوْعِيْ۔ یعنی یہ بات میرے دل میں القاء کی گئی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ ان میں شیطانی تصرف نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں عموماً الفاظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہوتے۔ صرف ایک مضمون قلب میں آتا ہے جس کو وہ اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔

دوسری صورت۔ مِنْ وَّرَاۗئِ حِجَابٍ ہے، یعنی ہمکلام ہوتے ہوئے کوئی کلام پس پردہ سے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر پیش آیا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا مگر زیارت نہیں ہوئی اسی لئے زیارت کی درخواست کی رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ، جس کا جواب نفی میں دیا گیا لَنْ تَرٰىنِيْ۔

اور یہ حجاب جو انسان کو دنیا میں حق تعالیٰ کی زیارت سے مانع ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو حق تعالیٰ کو چھپا سکے۔ کیونکہ اس کے نور محیط کو کوئی شے چھپا نہیں سکتی۔ بلکہ انسان کی قوت بینائی کا ضعف ہی اس کے لئے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے۔ اسی لئے جنت میں جبکہ اس کی بینائی قوی کر دی جائے گی تو وہاں جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

یہ قانون جو آیت مذکورہ میں ارشاد ہے، دنیا کے متعلق ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ سے ہمکلام مشافہۃً یعنی بے حجاب نہیں کر سکتا۔ اور انسان کی تخصیص کلام میں اس لئے ہے کہ گفتگو انسان ہی کے متعلق تھی۔ ورنہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہۃ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبرئیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تعالیٰ سے بالمشافہہ کلام اگر ثابت ہو جائے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے تو وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ وہ کلام اس عالم میں نہیں تھا، عالم سموات میں تھا۔ واللہ اعلم۔

تیسری صورت، اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا ہے۔ یعنی کسی فرشتہ جبرئیل وغیرہ کو اپنا کلام دے کر بھیجے جو وہ رسول کو پڑھ کر سنا دے۔ اور یہی طریقہ عام رہا ہے، قرآن مجید پورا اسی طرح بواسطہ ملائکہ نازل ہوا ہے۔ مذکورہ تفصیل میں لفظ وحی کو صرف القاء فی القلب کے معنی میں لیا گیا ہے

سُوْرَةُ الزُّخْرُف

سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ زخرف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی نواسی آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ

قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے رکھا اس کو قرآن عربی زبان کا تاکہ تم

تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ اَفَنَضْرِبُ

سمجھو اور تحقیق یہ قرآن لوح محفوظ میں ہمارے پاس ہے برتر مستحکم کیا پھیر دیں گے

عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝ وَكَمْ اَرْسَلْنَا

ہم تمہاری طرف سے یہ کتاب موڑ کر اس سبب سے کہ تم ہو ایسے لوگ کہ حد پر نہیں رہتے اور بہت بھیجے ہیں ہم نے

مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا

نبی پہلوں میں اور نہیں آتا لوگوں کے پاس کوئی پیغام لانے والا جس سے

بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ

ٹھٹھا نہیں کرتے پھر برباد کر ڈالے ہم نے اُن سے سخت زور والے اور

مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

چلی آئی ہے مثال پہلوں کی

خُلاصۂ تفسیر

حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم (ہے) اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اسکو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ (اے عرب) تم (آسانی سے) سمجھ لو اور وہ ہمارے پاس لوحِ محفوظ میں بڑے رتبہ کی اور حکمت بھری کتاب ہے (پس جب وہ سمجھنے میں آسان اور ناصح ہماری زیرِ حفاظت

اور اعجاز کی وجہ سے بڑے رتبے والی اور حکیمانہ مضامین پر مشتمل ہے تو ایسی کتاب کو ضرور ماننا چاہئے
لیکن اگر تم نہ مانو تب بھی ہم اپنی حکمت کے مقتضا سے اسکا بھیجنا اور تم کو اسکا مخاطب بنانا نہ چھوڑیں گے
چنانچہ ارشاد ہے کہ) کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو محض اس بات پر ہٹالیں گے کہ تم حد (اطاعت)
سے گزرنے والے ہو (اور اس کو نہیں مانتے، یعنی خواہ تم مانو یا نہ مانو مگر نصیحت تو برابر کی جائے گی
اور یہ تبلیغ کامل ہوا کرے گا تاکہ اس سے مومنین کو نفع ہو اور تم پر حجت قائم ہو، اور ہم پہلے لوگوں میں
(باوجود ان کی تکذیب کے) بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں (یہ نہیں ہوا کہ ان کے جھٹلانے کی وجہ سے
سلسلہ نبوت بند ہو جاتا) اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، جیسے ہم نے اُن کی تکذیب کی پروا نہیں
کی اسی طرح آپ بھی کچھ پروا اور غم نہ کیجئے، کیونکہ) اُن (پہلے لوگوں) کا بھی یہی حال تھا کہ
اُن کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا ہو، پھر ہم نے ان لوگوں
کو جو کہ ان (اہل مکہ) سے زیادہ زور آور تھے (تکذیب اور استہزاء کی سزا میں) غارت کر ڈالا،
اور پہلے لوگوں کی یہ حالت ہو چکی ہے (پس نہ آپ غم کریں کہ ان کا بھی ایسا ہی حال ہونا ہے
(جیسا کہ بدر وغیرہ میں ہوا اور نہ یہ بے فکر ہوں کہ نمونہ موجود ہے)

معارف و مسائل

یہ سورت مکی ہے، البتہ حضرت مقاتل کا قول ہے کہ آیت وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مدنی ہے، اور
ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ سورت معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئی (روح المعانی) واللہ اعلم
وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ، (قسم ہے کتاب واضح کی) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ جب
کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو عموماً وہ چیز بعد کے دعوے کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ یہاں قرآن کریم کی
قسم کھا کر اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے۔ قرآن بذاتِ خود اپنے اعجاز کی وجہ سے اپنی حقانیت
کی دلیل ہے اور قرآن کو واضح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکے وعظ و نصیحت پر مشتمل مضامین با آسانی
سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن جہاں تک اس سے احکام شرعیہ کے استنباط کا تعلق ہے وہ بلا شبہ ایک
مشکل کام ہے اجتہاد کی پوری صلاحیت کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا چنانچہ دوسری جگہ یہ بات
واضح کر دی گئی ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (اور بلا شبہ ہم نے
قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟)
اسمیں فرما دیا گیا ہے کہ قرآن نصیحت اندوزی کیلئے آسان ہے لہٰذا اس سے اجتہاد و استنباط کا آسان
ہونا لازم نہیں آتا بلکہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اس کام کے لئے متعلقہ علوم میں پوری مہارت
شرط ہے۔

ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَ

رحمٰن کے نام اٹھایا تو سارے دن رہے منہ اس کا سیاہ اور وہ دل میں گھٹ رہا ہے کیا

مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا

ایسا شخص کہ پرورش پاتا ہے زیور میں اور وہ جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے اور ٹھہرایا انہوں نے

الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ

فرشتوں کو جو بندے ہیں رحمٰن کے عورتیں کیا دیکھتے تھے ان کا بنانا

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا

اب لکھ رکھیں گے ان کی گواہی اور ان سے پوچھ ہوگی اور کہتے ہیں اگر چاہتا رحمٰن تو ہم

عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾

نہ پوجتے ان کو کچھ خبر نہیں ان کو اس کی یہ سب اٹکلیں دوڑاتے ہیں

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا

کیا ہم نے کوئی کتاب دی ہے ان کو اس سے پہلے سو انہوں نے اس کو مضبوط پکڑ رکھا ہے کوئی نہیں پر کہتے ہیں ہم نے

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ

پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر ہیں راہ پائے ہوئے اور اسی طرح

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ

جس کسی کو بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے ڈر سنانے والا کسی گاؤں میں سو کہنے لگے وہاں کے خوشحال لوگ

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾

ہم نے تو پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر چلتے ہیں وہ بولا

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا

اور جو میں لا دوں تم کو اس سے زیادہ سوجھ کی راہ جس پر تم نے پایا اپنے باپ دادوں کو تو بولے

اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ

ہم تمہارا لایا ہوا نہیں مانیں گے پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

انجام جھٹلانے والوں کا

ع ۲ المنزل ۶

خلاصۂ تفسیر

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ

اُن کو زبردست جاننے والے (خدا) نے پیدا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ جس ذات نے نہایت عظیم مخلوقات
پیدا کی ہوں عبادت بھی تنہا اسی کی کرنی چاہئے، لہٰذا توحید خود اُن کے اعتراف سے ثابت ہوگئی، آگے
اللہ تعالیٰ توحید کو مزید مدلل کرنے کے لئے اپنے وہ افعال بیان فرماتے ہیں جو توحید پر دلالت کرنے والے ہیں
یعنی یہ زمین و آسمان اس نے پیدا کیا ہے، جس نے تمہارے (آرام کے) لئے زمین کو (مثل) فرش (کے)
بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اُس (زمین) میں اُس نے تمہارے (منزل مقصود تک پہنچنے کے) لئے
رستے بنائے تاکہ (اُن راستوں پر چل کر) تم منزل مقصود تک پہنچ سکو اور جس نے آسمان سے پانی ایک
اندازہ (خاص) سے (اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق) برسایا پھر ہم نے اس (پانی) سے خشک زمین کو
(اُس کے مناسب) زندہ کیا (اور اس سے توحید پر دلالت کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ) اسی طرح
تم (بھی اپنی قبروں سے) نکالے جاؤ گے اور جس نے (مختلف اجناس و انواع میں) تمام (مختلف)
اقسام (یعنی اصناف) بنائیں اور تمہاری وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم
اُن (کشتیوں اور چارپایوں) کی (سطح اور) پیٹھ پر جم کر (اطمینان سے) بیٹھو پھر جب اس پر بیٹھ چکو
تو اپنے رب کی (اس) نعمت کو دل سے یاد کرو اور (زبان سے استحباباً) یوں کہو کہ اُس کی ذات پاک ہے
جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے (طاقتور اور ہنرمند) نہ تھے جو اُن کو قابو
میں کر لیتے (کیونکہ جانور سے زیادہ طاقت نہیں، اور الہام حق کے بغیر کشتی بنانے کی تدبیر سے واقف
نہیں، دونوں کے متعلق حق تعالیٰ نے تدبیر سکھا دی) اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس لئے ہم
ان پر سوار ہو کر اُس سے غفلت یا تکبر نہیں کرتے) اور (باوجود دلائل توحید کے واضح ہونے کے) ان لوگوں
نے (شرک اختیار کر رکھا ہے اور وہ بھی کیسا قبیح کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں اور اُن کی عبادت کرتے ہیں
پس ایک خرابی تو یہ ہوئی کہ) انھوں نے خدا کے بندوں میں سے (جو مخلوق ہوتے ہیں) خدا کا جزو ٹھہرایا،
(حالانکہ خدا کا کوئی جزو ہونا عقلاً محال ہے) واقعی (ایسا) انسان صریح ناشکرا ہے (کہ حق تعالیٰ کیساتھ
ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ اُسکو صاحب جزو قرار دیتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا معاذ اللہ حادث ہونا لازم آتا ہے
غرض ایک خرابی تو یہ ہوئی اور دوسری خرابی یہ کہ یہ لوگ لڑکی کو ناقص سمجھتے ہیں اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں
مانتے ہیں تو) کیا خدا نے اپنی مخلوق میں سے (تمہارے زعم میں اپنے لئے تو) بیٹیاں پسند کیں اور تم کو بیٹوں
کے ساتھ مخصوص کیا حالانکہ (تم بیٹیوں کو اتنا برا سمجھتے ہو کہ) جب اُن میں کسی کو اُس چیز کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے
جس کو خدائے رحمان کا نمونہ (یعنی اولاد) بنا رکھا ہے (مراد بیٹی ہے) تو (اسقدر ناراض ہوتا ہے کہ) سارے دن
اُس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (تو حیرت ہے کہ خدا کی طرف نقص کی نسبت
کرتے ہو، یہاں تک ان کے فاسد عقیدے کی الزامی تردید تھی جس کی تشریح سورۂ صافات میں گزر چکی ہے۔
آگے اسی عقیدے کی تحقیقی تردید کی جاتی ہے کہ اگرچہ لڑکی ہونا بذات خود کوئی ذلت یا عار کی بات نہیں ہے

کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے (اولاً اور متبعین نے ثانیاً) یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں (اس پر ان کے (اس) پیغمبر نے (ان سے) کہا کہ کیا (آبائی رسوم ہی کا اتباع کئے جاؤ گے) اگرچہ میں اس سے اچھا (منزل مقصود پر پہنچا دینے والا) طریقہ تمہارے پاس لایا ہوں کہ جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، وہ (براہ عناد) کہنے لگے کہ ہم تو اس (دین) کو مانتے ہی نہیں جس کو (بزعم تمہارے) تم کو دے کر بھیجا گیا ہے سو (جب عناد حد سے بڑھ گیا اس وقت) ہم نے ان سے انتقام لیا، سو دیکھئے تکذیب کرنے والوں کا کیسا (برا) انجام ہوا۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا (تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا) مطلب یہ ہے کہ زمین کی ظاہری صورت اور اس کا آرام فرش کا سا ہے، لہٰذا یہ زمین کے گول ہونے کے منافی نہیں۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (اور تمہارے لئے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہو) انسان کی سواریاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ سواریاں جنھیں انسان اپنی صنعت و حرفت کے ذریعہ خود بناتا ہے اور دوسرے وہ حیوانات جن کی تخلیق میں انسانی صنعت کا کوئی دخل نہیں، "کشتیاں" بول کر سواریوں کی پہلی قسم مراد ہے اور "چوپائے" سے دوسری قسم۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ انسانی استعمال کی تمام سواریاں، خواہ ان کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہیں، چوپایوں کا نعمت ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ وہ انسان سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں انسان کے آگے ایسا رام کر دیا ہے کہ ایک بچہ بھی ان کے نتھنوں میں نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے انھیں لیجاتا ہے۔ اسی طرح وہ سواریاں بھی اللہ کی بڑی نعمت ہیں جن کی تیاری میں انسانی صنعت کو دخل ہے، ہوائی جہاز سے لیکر معمولی سائیکل تک یہ ساری سواریاں اگرچہ بظاہر انسان نے خود بنائی ہیں لیکن ان کی صنعت کے طریقے سمجھانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟ یہ وہ قادر مطلق ہی تو ہے جس نے انسانی دماغ کو وہ طاقت عطا کی ہے جو لوہے کو موم بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی صنعت میں جو خام مواد استعمال ہوتا ہے وہ اور اس کے خواص و آثار، تو براہ راست اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہیں۔

ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ (اور تاکہ تم یاد کرو اپنے پروردگار کی نعمت کو) اس سے اشارہ فرمادیا گیا کہ ایک صاحب عقل و ہوش انسان کا کام یہ ہے کہ وہ منعم حقیقی کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہوئے غفلت، بے پروائی اور استغنار کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس بات پر دھیان دے کہ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے لہٰذا مجھ پر اس کے شکر کی ادائیگی اور عجز و نیاز کا اظہار واجب ہے۔ ایک کافر

اور مؤمن میں درحقیقت یہی فرق ہے کہ کائنات کی نعمتوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں لیکن کافر انھیں غفلت اور بے پروائی سے استعمال کرتا ہے اور مؤمن ان کے انعامات کو مستحضر کرکے اپنا سر نیاز ان کے حضور جھکا دیتا ہے۔ اسی مقصد سے قرآن و حدیث میں مختلف کاموں کی انجام دہی کے وقت صبر و شکر کے مضامین پر مشتمل دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ اور اگر انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ان دعاؤں کو اپنا معمول بنالے تو اس کا ہر مباح کام بھی عبادت بن جاتا ہے۔ یہ دعائیں علامہ جزری کی کتاب "حصن حصین" اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی "مناجات مقبول" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سفر کے وقت کی دعائیں سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا الخ (پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے بس میں کر دیا) سواری پر بیٹھ کر پڑھنے کی دعا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ آپ سواری پر بیٹھتے وقت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور سوار ہونے کا پورا مستحب طریقہ حضرت علیؓ سے یہ منقول ہے کہ سواری پر پاؤں رکھتے وقت "بسم اللہ" کہے، پھر سوار ہو جانے کے بعد الحمدللہ، اور اس کے بعد یہ کلمات سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا سے لَمُنْقَلِبُوْنَ تک (قرطبی) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر آپ کسی سفر پر جا رہے ہوتے تو مذکورہ کلمات کے بعد یہ دعا بھی پڑھتے تھے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ (قرطبی)

وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے) یہ بات مشینی سواریوں پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح جانوروں اور چوپایوں پر، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ان کا خام مواد پیدا نہ کرتا، یا اس میں وہ خواص و آثار نہ رکھتا یا انسانی دماغ کو ان خواص کے دریافت کرنے کی طاقت نہ بخشتا تو ساری کائنات مل کر بھی ایسی سواریاں پیدا نہ کر سکتی تھی۔

وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (اور بلا شبہ ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) ان الفاظ کے ذریعہ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ انسان کو اپنے ہر دنیوی سفر کے وقت آخرت کا وہ کٹھن سفر یاد کرنا چاہئے جو بہر حال میں پیش آکر رہے گا اور اسے سہولت کیساتھ طے کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ کے سوا کوئی سواری نہیں ہوگی۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (اور اُنھوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا جزو ٹھہرایا) یہاں جزء سے مراد اولاد ہے کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اور "اولاد" کے بجائے "جزء" کا لفظ اختیار کر کے مشرکین کے اس دعوائے باطل کی عقلی تردید کیطرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کے کوئی اولاد ہو تو وہ اس کی جزو ہوگی کیونکہ بیٹا باپ کا جزو ہوتا ہے، اور یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ ہر کُل اپنے وجود میں جزو کا محتاج ہوتا ہے تو اس سے لازم آیا کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ بھی اپنی اولاد کا محتاج ہو، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی احتیاج شانِ خداوندی کے بالکل منافی ہے،

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ الخ (یعنی جو آرائش میں نشوونما پائے) اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے زیور کا استعمال اور موافقِ شرع آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے۔ چنانچہ اس پر اجماع ہے لیکن ساتھ ہی پیرایۂ بیان یہ بتا رہا ہے کہ آرائش میں اتنا انہماک کہ صبح و شام بناؤ سنگھار ہی میں لگی رہے یہ مناسب نہیں بلکہ یہ ضعفِ عقل کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ، (اور وہ مباحثہ میں قوتِ بیان بھی نہ رکھے) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ ما فی الضمیر کو قوت اور وضاحت کیساتھ بیان کرنے پر مردوں کے برابر قادر نہیں ہوتیں اسی لئے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے دلائل کو رد کرنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا اگر کچھ عورتیں ملکۂ تقریر کی مالک ہوں اور اس معاملہ میں مردوں سے بھی بڑھ جائیں تو وہ آیت کے منافی نہیں، کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا

اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو میں الگ ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو مگر

الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ

جس نے مجھ کو بنایا سو وہ مجھ کو راہ سجھائے گا اور یہی بات پیچھے چھوڑ گیا اپنی

عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى

اولاد میں تاکہ وہ رجوع رہیں کوئی نہیں پر میں نے برتنے دیا ان کو اور ان کے باپ دادوں کو

جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا

یہاں تک کہ پہنچا ان کے پاس دین سچا اور رسول کھول کر سنا دینے والا اور جب پہنچا ان کے پاس سچا دین کہنے لگے

هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہ مانیں گے

خُلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے

عقیدے اور عمل کا درست کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ اس گروہ کے عقائد و اعمال سے اپنی براءت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے عقائد و اعمال کو مشرکین سے عملاً ممتاز کر لیا، بلکہ زبان سے بھی براءت کا برملا اظہار فرمایا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِىْ عَقِبِهٖ (اور وہ اس کو پیچھی اولاد میں ایک قائم رہنے والی بات کر گئے) مطلب یہ ہے کہ اپنے عقیدۂ توحید کو انھوں نے اپنی ذات ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اپنی اولاد کو بھی اسی عقیدے پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں ایک بڑی تعداد موحدین کی ہوئی اور خود مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک ایسے بہت سے حضرات موجود تھے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصلی دین ہی پر قائم رہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے علاوہ اپنی اولاد کو دینِ صحیح پر کاربند رکھنے اور رکھنے کی فکر بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے، انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں بھی قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انھوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو دینِ صحیح پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی، لہٰذا جس صورت سے ممکن ہو اولاد کے اعمال و اخلاق کی اصلاح میں اپنی پوری کوشش صرف کر دینا ضروری بھی ہے اور انبیاء کی سنت بھی۔ اور یوں تو اولاد کی اصلاح کے بہت سے طریقے ہیں جنھیں حسبِ موقع اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لطائف المنن والاخلاق میں لکھا ہے کہ اولاد کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ کارگر عمل یہ ہے کہ والدین ان کی دینی اصلاح کے لئے دعا کا اہتمام کریں۔ افسوس ہے کہ اس آسان تدبیر سے آجکل غفلت عام ہوتی جا رہی ہے اور اس کے انجامِ بد کا مشاہدہ خود والدین کرتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اور کہتے ہیں کیوں نہ اترا یہ قرآن کسی بڑے مرد پر ان دونوں بستیوں میں کے

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي

کیا وہ بانٹتے ہیں تیرے رب کی رحمت کو ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی ان کی

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ

دنیا کی زندگانی میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے

بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾

ایک دوسرے کو خدمتگار اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے اُن چیزوں سے جو سمیٹتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو کافروں نے قرآن کے بارے میں کہا) اور (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الٰہی ہے اور بحیثیت رسالت آیا ہے تو) ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا (یعنی رسول کیلئے عظیم الشان ہونا ضروری ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مال اور ریاست نہیں رکھتے تو یہ پیغمبر نہیں ہو سکتے، باری تعالیٰ انکے اس شبہ کی تردید فرماتے ہیں کہ) کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاص یعنی نبوت) کو (خود) تقسیم کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ چاہنا کہ نبوت ہماری رائے کے مطابق لوگوں کو ملنی چاہئے گویا خود تقسیم کرنے کی ہوس کرنا ہے کہ یہ تقسیم ہمارے سپرد ہو حالانکہ یہ ہوس نری نادانی ہے کیونکہ) دنیوی زندگی میں تو ان کی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ (اس سے یہ مصلحت حاصل ہو کہ) ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور (تمام اور یقینی بات ہے کہ) آپ کے رب کی رحمت (خاص یعنی نبوت) بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع اور جاہ و منصب) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں (پس جب دنیوی معیشت کی تقسیم ہم نے اُن کی رائے پر نہیں رکھی، حالانکہ وہ ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، تو نبوت جو خود بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اور اسکے مصالح بھی نہایت عظیم درجہ کے ہیں وہ کیونکر ان کی رائے پر تقسیم کی جاتی)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے مشرکین عرب کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیا کرتے تھے۔ دراصل مشرکین تو وہ یہ باور کرنے پر ہی تیار نہ تھے کہ اللہ کا کوئی رسول انسان ہو سکتا ہے، چنانچہ اُن کا یہ اعتراض قرآن کریم نے جا بجا ذکر فرمایا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم رسول کیسے مان لیں جبکہ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے ہیں۔ لیکن جب متعدد آیات قرآنی کے ذریعہ یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے ہیں وہ سب انسان ہی تھے، تو اب انھوں نے یہ نیا اعتراض کیا کہ اگر کسی انسان ہی کو نبوت سونپنی تھی تو حضورؐ مالی اعتبار سے کوئی بڑے صاحب حیثیت نہیں ہیں، یہ منصب حضورؐ کے بجائے مکہ اور طائف کے کسی بڑے دولتمند اور صاحب جاہ و منصب انسان کو کیوں نہیں دیا گیا؟ روایات میں ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے مکہ مکرمہ سے ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی حبیب بن عمرو ثقفی یا کنانہ بن عبد یالیل کے نام پیش کئے تھے (روح المعانی)

دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ معاشی مساوات (اس معنی میں کہ دنیا کے تمام افراد کی آمدنی بالکل برابر ہو) نہ مطلوب ہے نہ ممکن العمل۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر رکن پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور کچھ حقوق دیئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت سے یہ تناسب رکھا ہے کہ جس کے ذمہ جتنے فرائض ہیں اس کے اتنے ہی حقوق ہیں۔ انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کے ذمہ چونکہ فرائض سب سے کم ہیں کہ وہ شرعاً حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے مکلف نہیں ہیں اسلئے اُن کے حقوق بھی سب سے کم ہیں چنانچہ انسان کو ان کے معاملہ میں وسیع آزادی عطا کی گئی ہے کہ وہ ان سے چند معمولی سی پابندیوں کے ساتھ جس طرح چاہے نفع اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض حیوانات کو وہ کاٹ کر کھاتا ہے بعض پر سواری کرتا ہے، بعض مخلوقات کو پامال کرتا ہے مگر اسے ان مخلوقات کی حق تلفی نہیں سمجھا جاتا۔ اسلئے کہ ان مخلوقات پر چونکہ فرائض کم ہیں اسلئے اُن کے حقوق بھی بہت کم ہیں۔ پھر کائنات میں سب سے زیادہ فرائض انسان اور جنات پر عائد کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو آخرت کے عذاب کے مستحق ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کو حقوق بھی دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عطا کئے ہیں۔ پھر انسانوں میں بھی یہ لحاظ ہے کہ جس کی ذمہ داری اور فرائض دوسروں سے زیادہ ہیں، اسکے حقوق بھی زائد ہیں۔ انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی ہے، چنانچہ ان کو بہت سے حقوق بھی دوسروں سے زائد عطا کئے گئے ہیں۔

نظام معیشت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی رعایت رکھی ہے کہ ہر شخص کو اتنے معاشی حقوق دیئے جائیں جتنے فرائض کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے، اور ظاہر ہے کہ فرائض میں یکسانیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن اور ان میں تفاوت ناگزیر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہر شخص کے معاشی وظائف و فرائض دوسروں سے بالکل مساوی ہوں اسلئے کہ معاشی وظائف و فرائض انسانوں کی فطری صلاحیتوں پر موقوف ہیں جنہیں جسمانی طاقت، صحت، دماغی قویٰ اور عمر، ذہنی معیار، جستی اور پھرتی جیسی چیزیں داخل ہیں اور یہ بات ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ ان اوصاف کے اعتبار سے انسانوں میں یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اشتراکی حکومت کے بس میں بھی نہیں، جب انسانوں کی صلاحیتوں میں تفاوت ناگزیر ہے تو ان کے فرائض میں بھی لازماً تفاوت ہوگا اور معاشی حقوق چونکہ انہی فرائض پر موقوف ہیں اسلئے معاشی حقوق یعنی آمدنی میں بھی تفاوت ناگزیر ہے کیونکہ اگر سب کی آمدنی بالکل مساوی کر دی جائے اور فرائض میں تفاوت رہے تو اس سے کبھی عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اس صورت میں بعض لوگوں کی آمدنی ان کے فرائض سے زیادہ اور بعض کی ان کے فرائض سے کم ہو جائے گی جو صریح ناانصافی ہے۔ **اس سے واضح ہو گیا کہ آمدنی میں مکمل مساوات**

کسی بھی دور میں قرینِ انصاف نہیں ہو سکتی لہٰذا اشتراکیت اپنی ترقی کے انتہائی دور[1] (مکمل کمیونزم) میں کُلی مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں نہ قابلِ عمل ہے اور نہ قرینِ عدل و انصاف۔ البتہ یہ طے کرنا کہ کس کے فرائض زیادہ اور کس کے کم ہیں، اور ان کی مناسبت سے اسے کتنے حقوق ملنے چاہییں ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے اور انسان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور تجربہ کار انجینئر نے ایک گھنٹہ میں اتنی آمدنی حاصل کرلی ہے جو ایک غیر ہنر مند مزدور نے دن بھر منوں مٹی ڈھو کر بھی حاصل نہیں کی، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قطع نظر اس سے کہ مزدور کی دن بھر کی آزاد محنت ذمہ داری کے اس بوجھ کے برابر نہیں ہو سکتی جو انجینئر نے اٹھا رکھا ہے، انجینئر کی یہ آمدنی صرف اس ایک گھنٹے کی محنت کا صلہ نہیں بلکہ اس میں سالہا سال کی اس دماغ سوزی، عرق ریزی اور جانفشانی کے صلے کا ایک حصہ بھی شامل ہے جو اس نے انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت اور پھر اس میں تجربہ و مہارت حاصل کرنے میں برداشت کی ہے۔ اشتراکیت نے اپنے ابتدائی دور میں آمدنی کے اس تفاوت کو تسلیم تو کرلیا ہے چنانچہ تمام اشتراکی ممالک میں آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان تنخواہوں کا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ٹھوکر یہاں کھائی ہے کہ تمام وسائلِ پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے کر وسائل کے لئے فرائض کا تعین اور پھر ان کی مناسبت سے ان پر آمدنی کی تقسیم بھی تمام تر حکومت ہی کے حوالہ کردی ہے۔ حالانکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا فرائض اور حقوق کے درمیان تناسب باقی رکھنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے چنانچہ اشتراکیت کے طریق کار کے تحت ملک بھر کے انسانوں کی روزی کا تعین حکومت کے چند کارندوں کے ہاتھ میں آگیا ہے اور انھیں یہ اختیار مل گیا ہے کہ جس شخص کو جتنا چاہیں دیں، جتنا چاہیں روک لیں۔ اوّل تو اس میں بد دیانتیوں اور اقربا نوازیوں کو ایک بڑا میدان مل جاتا ہے جس کے سہارے افسر شاہی پھلتی پھولتی ہے، دوسرے اگر حکومت کے تمام کارندوں کو فرشتہ بھی تصور کرلیا جائے اور وہ فی الواقعہ یہی چاہیں کہ ملک میں آمدنی کی تقسیم حق و انصاف کی بنیاد پر ہو تو ان کے پاس آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور کے فرائض میں کتنا تفاوت ہے، اور اس کی نسبت سے ان کی آمدنیوں میں کتنا تفاوت قرینِ انصاف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ انسانی عقل کے ادراک سے قطعی ماوراء ہے اسی لئے اسے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ آیتِ زیرِ بحث وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

---

[1] اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ فی الحال تو آمدنی کی مکمل مساوات ممکن نہیں لیکن اگر اشتراکیت کے ابتدائی دور ہی پر عمل کیا جاتا ہے تو ایک وقت ایسا آئیگا جب آمدنی میں مکمل مساوات ہوگی اور ملک میں مکمل اشتراک پیدا ہو جائیگا اور یہ مکمل کمیونزم کا دور ہوگا۔

میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس تفاوت کا تعین ہم نے انسانوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ دُنیا میں ہر شخص کی ضروریات دوسرے کے ساتھ وابستہ کر کے نظام ایسا بنا دیا ہے کہ ہر شخص اپنی حاجت پُوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔ یہاں بھی باہمی احتیاج پر مبنی طلب و رسد کا نظام ہر شخص کی آمدنی کا تعین کرتا ہے، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض میں نے اپنے ذمہ لئے ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو اور یہ زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے، لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا کا یہی مطلب ہے کہ ہم نے آمدنی میں تفاوت اس لئے رکھا ہے تاکہ ایک شخص دوسرے سے کام لے سکے ورنہ سب کی آمدنی برابر ہوتی تو کوئی کسی کے کام نہ آتا۔

ہاں البتہ بعض غیر معمولی حالات میں بڑے بڑے سرمایہ دار طلب و رسد کے اس قدرتی نظام سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر غریبوں کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی استحقاق سے کم اُجرت پر کام کریں۔ اسلام نے اوّل تو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے وسیع احکام کے ذریعہ نیز اخلاقی ہدایات اور تصوّرِ آخرت کے ذریعہ ایسی صورتِ حال کو پیدا ہونے سے روکا ہے، اور اگر کبھی کسی مقام پر یہ صورت پیدا ہو جائے تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیدیا ہے کہ ان غیر معمولی حالات کی حد تک وہ اُجرتوں کا تعین کر سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف غیر معمولی حالات کے لئے ہے اسلئے اس مقصد کے لئے تمام وسائل پیداوار کو حکومت کے حوالہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ **اسکے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔**

اسلامی مساوات کا مطلب مذکورہ بالا اشارات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آمدنی میں مکمل مساوات نہ عدل و انصاف کا تقاضہ ہے، نہ عملاً کہیں قائم ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے، اور نہ یہ اسلام کو مطلوب ہے البتہ اسلام نے جس مُساوات کو قائم کیا ہے وہ قانون، معاشرت اور ادائے حقوق کی مساوات ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قدرتی طریق کار کے تحت جس شخص کے جتنے حقوق متعین ہو جائیں انھیں حاصل کرنے کے قانونی، تمدنی اور معاشرتی حق میں سب برابر ہیں اس بات کے کوئی معنے نہیں ہیں کہ ایک امیر یا صاحبِ جاہ و منصب انسان اپنا حق عزت کیساتھ بآسانی حاصل کرلے اور غریب کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور ذلیل و حقیر ہونا پڑے، قانون، امیر کے حقوق کی حفاظت کرے اور غریب کو بے یار و مددگار چھوڑ دے، اسی کو حضرت ابوصدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

واللہ ما عندی اقوی من الضعیف حتی اٰخذ الحق لہ ولا عندی اضعف من

الذی حتی آخذ الحق منہ" خدا کی قسم میرے نزدیک ایک کمزور آدمی سے زیادہ قوی کوئی نہیں تاوقتیکہ میں اسکا حق اسے دلوا دوں اور میرے نزدیک ایک قوی آدمی سے زیادہ کمزور کوئی نہیں، جبتک کہ میں اس سے (کمزور کا) حق وصول نہ کرلوں۔"

اسی طرح معیشت کے نقطۂ نظر سے اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر شخص کو کمائی کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور اسلام اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ چند بڑے بڑے دولتمند مال و دولت کے دہانوں پر قابض ہو کر اپنی اجارہ داریاں قائم کرلیں اور چھوٹے تاجروں کے لئے بازار میں بیٹھنا دوبھر بنا دیں۔ چنانچہ سود، سٹہ، قمار، ذخیرہ اندوزی اور اجارہ دارانہ تجارتی معاہدوں کو ممنوع قرار دیکر، نیز زکوٰۃ، عشر، خراج، نفقات، صدقات اور دوسرے واجبات عائد کرکے ایسا ماحول پیدا کردیا گیا ہے جس میں ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیت محنت اور سرمایہ کے تناسب سے کمائی کے مواقع حاصل کرسکتا ہے اور اس سے ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ اسکے باوجود آمدنی کا جو تفاوت باقی رہے وہ درحقیقت ناگزیر ہے اور جس طرح انسانوں کے درمیان حسن وجمال، قوت وصحت، عقل وذہانت اور آل و اولاد کے تفاوت کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح اس تفاوت کو بھی مٹایا نہیں جاسکتا۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ہو جائیں ایک دین پر تو ہم دیتے ان لوگوں کو جو منکر ہیں رحمٰن سے

لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ

ان کے گھروں کے واسطے چھت چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر چڑھیں اور ان کے گھروں کے

اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــُٔوْنَ ﴿٣٤﴾ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا

واسطے دروازے اور تخت جن پر تکیہ لگا کر بیٹھیں اور سونے کے اور یہ سب کچھ نہیں ہے مگر

مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٥﴾

برتنا دنیا کی زندگی کا اور آخرت تیرے رب کے یہاں انہی کے لئے ہے جو ڈرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ کافر لوگ مال و دولت کی زیادتی کو نبوت کی صلاحیت کی شرط سمجھتے ہیں حالانکہ نبوت ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے اس کی صلاحیت کی شرط بھی عظیم الشان ہونی چاہئے) اور (دنیا کی دولت و جاہ ہمارے نزدیک اسقدر حقیر ہے کہ) اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب

قریب) تمام آدمی ایک ہی طریقہ کے ہو جاویں گے (یعنی کافر ہو جاویں گے) تو جو لوگ خدا کیساتھ کفر کرتے ہیں (اور خدا کے نزدیک سخت مبغوض ہیں) ہم اُن (سب) کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر چڑھا (اُترا) کرتے اور اُن کے گھروں کے کواڑ بھی (چاندی کے کر دیتے) اور تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی (کر دیتے، یعنی کچھ چاندی کی کچھ سونے کی۔ مگر یہ سامان سب کفار کو اس لئے نہیں دیا کہ اکثر انسانوں کی طبیعت میں مال و متاع کی حرص غالب ہے اور اس مفروضہ صورت میں کفر اس مال و متاع کے حصول کا یقینی سبب بن جاتا، پس چند تھوڑے سے آدمیوں کو چھوڑ کر قریب قریب سبھی کفر اختیار کر لیتے اس لئے ہم نے تمام کافروں کو مال و دولت کی یہ وسعت نہیں دی، ورنہ اگر مصلحت ہوتی تو ہم ایسا ہی کرتے اور ظاہر ہے کہ دشمن کو قدر و وسعت کی چیز نہیں دیا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُنیوی مال و متاع حقیقت میں کوئی عظیم الشان چیز نہیں، پس وہ نبوت جیسے منصب عظیم کے لئے صلاحیت کی شرط بھی نہیں ہو سکتی بجائے نبوت کی شرط وہ اعلیٰ درجہ کے کمالات ہیں جو اللہ کی طرف سے انبیاء کو عطا ہوتے ہیں اور یہ کمالات محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح جمع ہیں، پس نبوت انہی کے لئے زیبا تھی نہ کہ مکہ اور طائف کے رئیسوں کے لئے) اور (حقارت دُنیا کی ایک بالکل ظاہر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ سب (ساز و سامان جس کا اوپر ذکر ہوا) کچھ بھی نہیں، صرف دُنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے (پھر فنا آفرینی) اور آخرت (جو ابدی ہے اور اس لئے اس سے بہتر ہے وہ) آپکے پروردگار کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔

معارف و مسائل

مال و دولت کی زیادتی فضیلت کا سبب نہیں ہے: کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے مالدار کو نبی کیوں نہ بنا دیا گیا؟ ان آیات میں اسکا دوسرا جواب دیا گیا ہے اور اسکا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک نبوت کے لئے کچھ شرائط صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے لیکن مال و دولت کی زیادتی کی بنا پر کسی کو نبوت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ مال و دولت ہماری نگاہ میں اتنی حقیر چیز ہے کہ اگر تمام لوگوں کے کافر بنجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم سب کافروں پر سونے چاندی کی بارش کر دیتے اور صحیح ترمذی کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو کانت الدنیا تعدل عند اللہ جناح بعوضۃ ما سقی کافرا منہا شربۃ ماء (یعنی اگر دُنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی درجہ رکھتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا) اس سے معلوم ہوا کہ نہ مال و دولت کی زیادتی کوئی فضیلت کی چیز ہے نہ اس کی کمی انسان کے کم رتبہ ہونے کی علامت ہے۔ البتہ نبوت کے لئے کچھ اعلیٰ درجے کے اوصاف ضروری ہیں وہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، اسلئے یہ اعتراض بالکل لغو اور باطل ہے۔

اور مذکورہ آیات میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر کافروں پر مال و دولت کی اتنی فراوانی کر دی جاتی تو سب لوگ کافر ہو جاتے، اس میں مراد لوگوں کی بھاری اکثریت ہے ورنہ اللہ کے کچھ نیک بندے آج بھی ایسے موجود ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ کفر اختیار کر کے وہ مال و دولت سے نہال ہو سکتے ہیں، لیکن وہ مال و دولت کی خاطر کفر کو اختیار نہیں کرتے ایسے کچھ لوگ شاید اُس وقت بھی ایمان پر قائم رہ جاتے لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمٰن کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہ رہے اس کا ساتھی

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور وہ اُن کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ

یہاں تک کہ جب آئے ہمارے پاس کہے کسی طرح مجھ میں اور تجھ میں فرق ہو مشرق مغرب کا سا

فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ

کہ کیا بُرا ساتھی ہے اور کچھ فائدہ نہیں تم کو آج کے دن جبکہ تم ظالم ٹھہر چکے

فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى

کہ تم عذاب میں شامل ہو سو کیا تو سنائے گا بہروں کو یا راہ سجھائے گا

الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ

اندھوں کو اور صریح غلطی میں بھٹکتوں کو پھر اگر کبھی ہم تجھ کو یہاں سے

فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِىْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا

لے جاویں تو ہم کو اُن سے بدلہ لینا ہے یا تجھ کو دکھلا دیں جو اُن سے وعدہ ٹھہرایا ہے تو ہم

عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِىْۤ اُوْحِىَ اِلَيْكَ ۚ

ہمارے بس میں ہیں سو تو مضبوط پکڑے رہ اُس کو جو حکم تجھ کو پہنچا

اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ

تو بیشک ہے سیدھی راہ پر اور یہ مذکور رہے گا تیرا اور تیری قوم کا اور آگے تم سے

تُسْئَلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا

پوچھ ہوگی اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے ٹھہرائے ہیں

مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

رحمٰن کے سوائے اور حاکم کہ پوجے جائیں

ع ۱۰

ہونا تمہارے لئے چنداں فائدہ مند نہیں ہوگا۔ دنیا میں بیشک ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصیبت میں چند آدمی شریک ہوجائیں تو ہر ایک کا غم ہلکا ہوجاتا ہے لیکن وہاں چونکہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی اور کوئی کسی کا دکھ نہیں بٹا سکے گا اسلئے اس اشتراک سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اس صورت میں انکم ینفعکم کا فاعل ہوگا۔

نیک شہرت بھی دین میں پسندیدہ ہے

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (اور یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے) "ذکر" سے یہاں مراد نیک ناموری ہے، اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم آپ کے اور آپ کی قوم کے لئے شرف عظیم اور نیک شہرت کا باعث ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ نیک شہرت ایک قابل رغبت چیز ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اسکو ایک احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (تفسیر کبیر) لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نیک شہرت اسوقت مستحسن ہے جب وہ مقصد زندگی بنائے بغیر انسان کے اعمال صالحہ سے خود بخود حاصل ہوجائے اور اگر انسان دنیا میں صرف اسی مقصد سے کام کرے کہ اس سے دنیا میں نام ہوگا تو یہ "ریا" ہے جس سے نیکیوں کا سارا ثواب ضائع ہوجاتا ہے اور الٹا گناہ لازم ہوجاتا ہے۔ اس آیت میں "آپ کی قوم" سے مراد بعض مفسرین نے صرف قبیلہ قریش کو قرار دیا ہے اور اس سے قریش کی فضیلت ثابت کی ہے لیکن علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد آپ کی پوری امت ہے خواہ کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتی ہو قرآن کریم ان سب کے لئے عظمت و شرف اور نیک ناموری کا باعث ہے (قرطبی)

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ (آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام تو وفات پاچکے، ان سے پوچھنے کا حکم کیسے دیا جارہا ہے؟ اسکا جواب بعض مفسرین نے تو یہ دیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی معجزہ کے طور پر سابقہ انبیاء علیہم السلام سے آپ کی ملاقات کرادے تو اسوقت ان سے یہ بات پوچھ لیجئے چنانچہ شب معراج میں آپ کی ملاقات تمام انبیاء سے ہوئی اور علامہ قرطبی نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنے کے بعد ان سے یہی بات پوچھی تھی لیکن ان روایات کی سند معلوم نہیں ہوسکی چنانچہ اکثر مفسرین نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام سے پوچھنا مراد نہیں بلکہ ان پر نازل ہونیوالے صحیفوں سے تحقیق کرنا اور ان کی امتوں کے علماء سے پوچھنا مراد ہے۔ چنانچہ انبیاء بنی اسرائیل کے جو صحیفے اب موجود ہیں ان میں بہت سی تحریفات کے باوجود توحید کی تعلیم اور شرک سے بیزاری کی تعلیم آجتک شامل ہے مثال کے طور پر موجودہ بائبل کی درج ذیل عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔

تُبْصِرُونَ ﴿٥١﴾ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۙ وَلَا يَكَادُ

نہیں دیکھتے بھلا میں بہتر ہوں اس شخص سے جس کو کچھ عزت نہیں اور صاف نہیں

يُبِينُ ﴿٥٢﴾ فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ

بول سکتا پھر کیوں نہ آپڑے اس پر کنگن سونے کے یا آتے اس کے ساتھ فرشتے

مُقْتَرِنِينَ ﴿٥٣﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا

پرا باندھ کر پھر عقل کھودی اپنی قوم کی، پھر اسی کا کہنا مانا مقرر وہ تھے لوگ

فَاسِقِينَ ﴿٥٤﴾ فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٥﴾

نافرمان پھر جب ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا، پھر ڈبو دیا ان سب کو

فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ﴿٥٦﴾

پھر کر ڈالا ان کو گئے گزرے اور ایک نظیر پچھلوں کے واسطے

ع ۱۱ ۵

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (یعنی معجزات عصا اور ید بیضا) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس بھیجا تھا، سو انھوں نے (ان لوگوں کے پاس آکر) فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے لئے) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں (مگر فرعون و اہل فرعون نے نہ مانا) پھر (اپنے دوسرے دلائل سزاؤں کے رنگ میں اُن کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ظاہر کئے یعنی قحط سالی وغیرہ مگر اُن لوگوں کی پھر بھی یہی حالت رہی کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) ان کے پاس ہماری (وہ) نشانیاں لے کر آئے (جو آیات تسعہ کہلاتی ہیں) تو وہ یکایک اُن (معجزات) پر لگے ہنسنے (کہ یہ کیا اچھے معجزے ہیں، محض معمولی واقعات و حوادث ہیں کیونکہ قحط وغیرہ ویسے بھی ہو جاتا ہے مگر یہ اُن کی حماقت تھی کیونکہ دوسرے قرائن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعات غیر معمولی ہیں اور معجزہ کے طور پر ہو رہے ہیں، اسی لئے اُنھوں نے ان پر جادو کی تہمت لگا دی تھی جیسا کہ سورۂ اعراف میں لِتَسْحَرَنَا بِهَا کے الفاظ اس پر شاہد ہیں) اور (ان نشانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ) ہم ان کو جو نشانی دکھلاتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی (مطلب یہ کہ نشانیاں بڑی بڑی تھیں اور یہ مطلب نہیں کہ ہر نشانی ہر نشانی سے بڑی تھی، یہ ایک محاورہ ہے، جب کئی چیزوں کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں تو یوں ہی بولتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعۃً بھی ہر آنے والی نشانیاں پچھلی نشانی سے کچھ فضیلت رکھتی ہو) اور ہم نے (ان نشانیوں کے واقع کرنے سے) ان لوگوں کو عذاب میں پکڑا تھا تاکہ وہ (اپنے کفر سے) باز آجاویں (یعنی وہ نشانیاں نبوت کی دلیلیں بھی تھیں اور اُن کے لیے سزا بھی تھیں، مگر وہ لوگ باز نہ آئے، باوجودیکہ ہر نشانی کے وقوع

(اسکا چند بار عہد بھی کیا) اور انھوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے ہر نشانی پر یہ) کہا کہ اے جادوگر (یہ لفظ حسب عادت سابقہ غالباً بدحواسی سے ان کے منہ سے نکل جاتا ہوگا، ورنہ ایسی عاجزانہ درخواست کے موقع پر یہ شرارت کا لفظ بولنا مستبعد معلوم ہوتا ہے، بہرحال مطلب یہ تھا کہ اے موسیٰ) ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (اور وہ بات ہے بلائے باز آجانے پر قہر کا دور کر دینا) ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ اس عذاب کو دور کرا دیں تو ہم ضرور راہ پر آجاویں گے، پھر (جب) ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹا دیا تب ہی انھوں نے (اپنا) عہد توڑ دیا (ان نشانیوں کا بیان سورۂ اعراف میں آچکا ہے) اور فرعون نے (غالباً اس خیال سے کہ کہیں معجزات دیکھ کر عام لوگ مسلمان نہ ہو جاویں) اپنی قوم میں منادی کرائی (اور اس منادی میں) یہ بات کہی (یعنی کہلوائی) کہ اے میری قوم کیا مصر (مع توابع کی سلطنت) میری نہیں ہے اور (دیکھو) یہ نہریں میرے (محل کے) نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم (یہ چیزیں) دیکھتے نہیں ہو (اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس کچھ بھی سامان نہیں تو بتاؤ میں افضل و قابل اتباع ہوں یا موسیٰ علیہ السلام) بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام سے) جو کہ (باعتبار مال و جاہ کے) کم قدر (آدمی) ہے اور قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتا (اور اگر یہ شخص اپنے آپ کو پیغمبر بتاتا ہے) تو اس کے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے (جیسے شاہانِ دنیا کی عادت ہے کہ جب کسی پر خاص عنایت کرتے ہیں تو اسکو عام دربار میں سونے کے کنگن پہناتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر اس شخص کو نبوت عطا ہوتی تو خدا کی طرف سے اسکے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوتے) یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے (جیسا کہ خاص امراء شاہی کا جلوس اسی طرح نکلتا ہے) غرض اس نے (ایسی باتیں کرکے) اپنی قوم کو مغلوب (العقل) کر دیا اور وہ اسکے کہنے میں آگئے (اور) وہ لوگ (کچھ پہلے ہی) شرارت سے بھرے تھے (اس وجہ سے فرعون کی باتوں کا ان پر زیادہ اثر ہوا) پھر جب ان لوگوں نے (ہر بار ضد و عناد پر اصرار کرکے) ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو ڈبو دیا اور ہم نے ان کو آئندہ آنے والوں کے لئے خاص طور کے متقدمین اور نمونۂ (عبرت) بنا دیا (خاص طور کے متقدمین بنانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ان کا قصہ یاد کرکے عبرت دلاتے ہیں کہ دیکھو متقدمین میں ایسے ایسے ہوئے ہیں اور ان کا ایسا ایسا حال ہوا)۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پیچھے بار بار گزر چکا ہے اور ان آیات میں انکے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تفصیل کیساتھ سورۂ اعراف میں آئے ہیں، یہاں ان کا دوبارہ ذکر لانے سے مقصد یہ ہے کہ کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر آپ کے مالدار نہ ہونے سے جو شبہ کر رہے ہیں یہ کوئی نیا شبہ

نہیں بلکہ فرعون اور اُس کی قوم نے یہی شبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر کیا تھا۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ میں ملک مصر کا مالک ہوں اور میرے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہیں اسلئے میں موسیٰ علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل ہوں، پھر میرے مقابلے میں انھیں نبوت کیونکر مل سکتی ہے؟ لیکن جس طرح اسکا یہ شبہ اسکے کچھ کام نہ آسکا اور وہ اپنی قوم سمیت غرق ہو کر رہا، اسی طرح کفار مکہ کا یہ اعتراض بھی انھیں دُنیا و آخرت کے وبال سے نہ بچا سکے گا۔

وَلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (اور جو قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتا) اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کی لکنت دُور کر دی تھی لیکن فرعون کو ان کا پہلا منظر ہی یاد تھا اس لئے اُس نے حضرت موسیٰؑ پر یہ عیب لگایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں "قوت بیانیہ" سے مراد زبان کی روانی کے بجائے دلائل کی قوت و وضاحت ہو اور فرعون کا مطلب یہ ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے پاس ایسے کافی دلائل نہیں ہیں جو مجھے مطمئن کر سکیں۔ حالانکہ یہ فرعون کا نرا اتہام تھا، ورنہ حضرت موسیٰؑ نے دلائل و براہین کے مقابلے میں فرعون کو قطعی لاجواب کر دیا تھا (تفسیر کبیر و روح المعانی)

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ، اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "فرعون نے اپنی قوم کو آسانی سے اپنا تابع بنا لیا" (طلب منهم الخفة في مطاوعته) اور دوسرے یہ کہ "اُس نے اپنی قوم کو بیوقوف پایا" (وجدهم خفيفة احلامهم) (روح المعانی)

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا، یہ أَسَفٌ سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں افسوس، لہٰذا اس جملے کے لفظی معنی ہوئے "پس جب انھوں نے ہمیں افسوس دلایا" اور افسوس بکثرت غصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے اسکا بامحاورہ ترجمہ عموماً اس طرح کیا جاتا ہے کہ "جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا" اور چونکہ باری تعالیٰ افسوس اور غصہ کی انفعالی کیفیات سے پاک ہے اسلئے اسکا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کام ایسے کئے جن سے ہم نے انھیں سزا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (روح)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اُس سے چلانے لگتے ہیں

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ

اور کہنے لگے ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو بلکہ یہ لوگ

قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا

ہیں جھگڑالو وہ کیا ہے ایک بندہ ہے کہ ہم نے اُس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو

لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي

بنی اسرائیل کے واسطے اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے رہیں

الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ

زمین میں تمہاری جگہ ۔ اور وہ نشان ہے قیامت کا سو اس میں شک مت کرو اور

اتَّبِعُونِ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ

میرا کہا مانو یہ ایک سیدھی راہ ہے ۔ اور نہ روک دے تم کو شیطان وہ

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم

تمہارا دشمن ہے صریح ۔ اور جب آیا عیسیٰ نشانیاں لے کر بولا میں لایا ہوں تمہارے پاس

بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ

پکی باتیں اور بتلانے کو بعضی وہ چیز جس میں تم جھگڑ رہے تھے سو ڈرو اللہ سے

وَأَطِيعُونِ ﴿٦٣﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ

اور میرا کہا مانو ۔ بیشک اللہ جو ہے وہی ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اسی کی بندگی کرو یہ ہے راہ سیدھی

مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦٤﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ

پھر پھٹ گئے کتنے فرقے ان کے بیچ سے سو خرابی ہے

ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿٦٥﴾

گنہگاروں کو آفت سے دکھ والے دن کی

خلاصۂ تفسیر

(ایک مرتبہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں سے کسی میں کوئی خیر نہیں، اس پر قریش کے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ نصرانی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں آپ بھی مانتے ہیں کہ ان میں خیر ہی خیر تھی اسکے جواب میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں) اور جب (عیسیٰ) ابن مریم (علیہ السلام) کے متعلق (ایک معترض کی طرف سے) ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا (عجیب اس لئے کہ سرسری نظر ہی سے اس کا بطلان خود ان کو معلوم ہو سکتا تھا، پس عقل رکھ کر ایسا اعتراض کرنا بہت عجیب تھا، غرض جب یہ اعتراض کیا گیا) تو یکایک آپ کی قوم کے لوگ اس (اعتراض کے سننے) سے (مارے خوشی کے) چلانے لگے اور (اس معترض کے ساتھ متفق ہو کر) کہنے لگے کہ (بتلائیے آپ کے نزدیک) ہمارے معبود زیادہ بہتر ہیں یا عیسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے جو یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا جن جن کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں کوئی خیر نہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بالکل بھلائی نہ ہو اس سے ایک تو آپکا یہ قول (معاذ

درست نہیں رہا۔ دوسرے معلوم ہو کہ جن کو آپ خیر کہتے ہیں خود ان کی بھی عبادت ہوتی ہے اس لئے
اس سے شرک کی صحت ثابت ہوگئی۔ آگے اس اعتراض کا جواب ہے، پہلے اجمالاً پھر تفصیلاً، اجمالاً تو یہ
کہ ان لوگوں نے جو یہ (عجیب اعتراض) آپ سے بیان کیا ہے تو محض جھگڑے کی غرض سے (نہ کہ طلب حق
کے لئے، ورنہ خود ان پر اس اعتراض کی لغویت پوشیدہ نہ رہتی اور ان لوگوں کا جھگڑنا کچھ اسی اعتراض
کے ساتھ مخصوص نہیں) بلکہ یہ لوگ (اپنی عادت سے) ہیں ہی جھگڑالو (کہ اکثر حق باتوں میں جھگڑے
نکالتے ہیں۔ آگے تفصیلی جواب ہے یعنی) عیسیٰ (علیہ السلام) تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (مقبولیت
اور کمالاتِ نبوت دیکر اپنا) فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے (اولاً اور دوسروں کیلئے بھی ثانیاً)
ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کو اس طرح بغیر باپ کے
پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس سے ان کے دونوں اعتراضات کا جواب نکل آیا جیسی تشریح معارف و مسائل
میں آئے گی) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب و غریب امور پر قادر ہیں، چنانچہ) اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں
کو پیدا کر دیتے (جس طرح تم سے تمھارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (انسان کی طرح) یکے بعد
دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی۔ پس بغیر باپ کے پیدا ہونے
سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے زیر قدرت نہیں ہیں، لہٰذا یہ امر
حضرت عیسیٰؑ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں مقصود تھیں جن میں سے
ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انھیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ) وہ (یعنی
عیسیٰ علیہ السلام اس طرح پیدا ہونے میں امکانِ قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں (اس طرح کہ قیامت
میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بُعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلافِ عادت ہے اور
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے ہونے سے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ خلافِ عادت امور
کے صادر کرنے پر قادر ہے۔ پس اس سے قیامت و آخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہوگیا
اور جب تم نے عقیدۂ آخرت کی یہ دلیل سُن لی) تو تم لوگ اُس (کی صحت) میں شک مت کرو اور
(توحید اور آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ (مجموعہ جس کی طرف میں تمکو بلاتا ہوں)
سیدھا رستہ ہے اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پاوے وہ بیشک تمھارا صریح دشمن ہے اور
(یہاں تک تو کفار کے مذکورہ اعتراض کا جواب تھا، آگے خود عیسیٰ علیہ السلام کے مضمون دعوت سے
توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی تائید ہے یعنی) جب عیسیٰ (علیہ السلام کھلے کھلے) معجزے لیکر
آئے تو انھوں نے (لوگوں سے) کہا کہ میں تمھارے پاس سمجھ کی باتیں لیکر آیا ہوں (تاکہ تمھارے عقائد کی
اصلاح کروں) اور تاکہ بعض باتیں (منجملہ اعمالِ حلال و حرام کے) جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان
کر دوں (جس سے اختلاف و اشتباہ رفع ہو جاوے، جب میں اس طرح آیا ہوں) تو تم لوگ اللہ سے

ڈرو (اور میری نبوت کا انکار نہ کرو، کیونکہ یہ خدا کی مخالفت ہے) اور میرا کہا مانو (کیونکہ نبوت کی تصدیق کے لئے یہ ضروری ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ) بیشک اللہ تو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (توحید) سیدھا رستہ ہے سو (باوجود عیسیٰ علیہ السلام کے اس واشگاف بیان توحید کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال لیا (یعنی توحید کے خلاف طرح طرح کے مذاہب ایجاد کرلئے، چنانچہ توحید میں نصاریٰ وغیرہ نصاریٰ کا اختلاف بھی معلوم ہے) سو ان ظالموں (یعنی مشرکین اہل کتاب و غیر اہل کتاب) کیلئے ایک پُر درد دن کے عذاب سے بڑی خرابی (ہونیوالی) ہے (پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت سے خود توحید کی تائید ہوگئی لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ناحق عبادت سے شرک کی صحت پر استدلال مدعی سست گواہ چست کی مثال ہے)

معارف و مسائل

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ، ان آیات کے شان نزول میں مفسرین نے تین روایتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، "یا معشر قریش لاخیر فی احد یعبد من دون اللہ" یعنی اے قریش کے لوگو! اللہ کے سوا جس کی عبادت کی جاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں، اس پر مشرکین نے کہا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں لیکن آپ خود مانتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک بندے اور اس کے نبی تھے۔ ان کے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (قرطبی) دوسری روایت یہ ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (بلاشبہ اے مشرکو! تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے) نازل ہوئی تو اس پر عبداللہ بن الزبعری نے جو اس وقت کافر تھے، یہ کہا کہ اس آیت کا تو میرے پاس بہترین جواب موجود ہے اور وہ یہ کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کی، تو کیا یہ دونوں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے؟ یہ بات سن کر قریش کے مشرکین بہت خوش ہوئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ آیت نازل فرمائی کہ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ، اور دوسرے سورہ زخرف کی مذکورہ بالا آیات (ابن کثیر وغیرہ)

تیسری روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین مکہ نے یہ بیہودہ خیال ظاہر کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائی کا دعویٰ کرنا چاہتے ہیں، ان کی مرضی یہ ہے کہ جس طرح نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو پوجتے ہیں، اسی طرح ہم بھی ان کی عبادت کیا کریں، اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ اور درحقیقت تینوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں، کفار نے تینوں ہی باتیں کہی ہونگی جن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات

نازل فرمادیں جن سے انکے تینوں اعتراضات کا جواب ہوگیا۔ اس آخری اعتراض کا جواب تو مذکورہ آیات سے بالکل واضح ہے کہ جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت شروع کردی ہے انھوں نے کسی خدائی حکم سے ایسا کیا، نہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ خواہش تھی اور نہ قرآن اُن کی تائید کرتا ہے انھیں تو حضرت عیسیٰؑ کے باپ کے بغیر پیدا ہونے سے مغالطہ لگا تھا اور قرآن اس مغالطہ کی تردید کرتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) عیسائیوں کی دیکھا دیکھی اپنی **خُدائی کا دعویٰ کر بیٹھیں۔**

اور پہلی اور دوسری روایتوں میں کفار کے اعتراض کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔ اُن کا جواب مذکورہ آیات سے اس طرح نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کو لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ جہنم کا ایندھن ہونگے، یا حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ ان میں خیر نہیں اس سے مراد وہ معبود تھے جو یا تو بے جان ہوں جیسے پتھر کے بُت، یا جاندار ہوں مگر خود اپنی عبادت کا حکم دیتے یا اُسے پسند کرتے ہوں جیسے شیاطین، فرعون اور نمرود وغیرہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنی عبادت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نصاریٰ انکی کسی ہدایت کی بناء پر اُن کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ اُنھیں ہم نے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا کر بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تاکہ لوگوں پر یہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیق میں اسباب کے کسی واسطے کی ضرورت نہیں لیکن نصاریٰ نے اسکا غلط مطلب لیکر اُنھیں معبود بنالیا، حالانکہ ان کا یہ معبود بنانا عقلاً بھی غلط تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بالکل خلاف تھا۔ کیونکہ انھوں نے ہمیشہ توحید کی تعلیم دی تھی۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی عبادت سے بیزار ہونا اس بات سے مانع ہے کہ اُنھیں دوسرے باطل معبودوں کی صف میں شامل کیا جائے۔

اس سے کفار کا یہ اعتراض بھی ختم ہوگیا جسکا ذکر خلاصۂ تفسیر میں آیا ہے کہ جن کو آپ خود خیر کہتے ہیں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ان کی بھی عبادت ہوئی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی عبادت کچھ بُری بات نہیں۔ مذکورہ آیات میں اسکا جواب واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو عبادت ہوئی وہ اللہ کی مرضی کے بھی خلاف تھی اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی لہٰذا اس سے شرک کی صحت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ، یہ نصاریٰ کے اُس مغالطہ کا جواب ہے جس کی بناء پر انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے اُن کی خدائی پر استدلال کیا تھا۔ باری تعالےٰ ان کی تردید میں فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ہماری قدرت کا ایک مظاہرہ تھا، اور ہم تو اس سے بھی بڑھ کر

خلاف عادت کاموں پر قادر ہیں۔ بغیر باپ کے پیدا ہونا تو کوئی بہت زیادہ خلاف عادت نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے، اگر ہم چاہیں تو ایسے کام بھی کر سکتے ہیں جس کی اب تک کوئی نظیر نہیں اور وہ یہ کہ انسانوں سے فرشتے پیدا کر دیں۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کا یقین کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہیں) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوئی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلاف عادت بغیر باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے بھی لوگوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہو کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔ چنانچہ آپکا آخری زمانے میں دوبارہ تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ اس مسئلہ کی کچھ تفصیل سورۂ آل عمران میں آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ میں ص۷۵ ج ۲ پر اور کچھ سورۂ مائدہ میں ص۲۷۹ ج ۳ پر گزر چکی ہے مزید تفصیلات کے لئے احقر کے رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" اور "مسیح موعود کی پہچان" وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

وَلِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ (اور تاکہ میں بیان کر دوں تم سے بعض وہ باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو) چونکہ بنی اسرائیل میں عناد اور ہٹ دھرمی کا غلبہ تھا اسلئے انہوں نے بعض احکام شرعیہ میں تحریف کر دی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسکی حقیقت واضح فرما دی، اور بعض باتیں ایسی فرمایا کہ بعض امور خالص دنیوی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں اختلاف رفع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی (بیان القرآن)

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾

اب یہی جو راہ دیکھتے ہیں قیامت کی کہ آکھڑی ہو ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۷﴾ یٰعِبَادِ

جتنے دوست ہیں اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر جو لوگ ہیں ڈر والے، اے بندو میرے

ع ۱۱ / ۱۲

لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا

نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہو گے جو یقین لائے ہماری باتوں پر

وَكَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور رہے حکمبردار چلے جاؤ بہشت میں تم اور تمہاری عورتیں کہ تمہاری عزت کریں

یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ

لے پھریں گے ان کے پاس رکابیاں سونے کی اور آبخورے اور وہاں ہے جو دل

الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ

جی چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں اور تم اُن میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہی

الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا

بہشت ہے جو میراث پائی تم نے بدلے میں ان کاموں کے جو کرتے تھے تمہارے واسطے وہاں

فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ

بہت میوے ہیں ان میں سے کھاتے رہو البتہ جو لوگ گنہگار ہیں وہ دوزخ کے

جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾

عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں نہ ہلکا ہوتا ہے ان پر سے اور وہ اسی میں پڑے رہیں آس توڑے

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ

اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن تھے وہی بے انصاف اور پکاریں گے اے مالک

لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

کہیں ہم پر فیصلہ کر چکے تیرا رب وہ کہے گا تم کو ہمیشہ رہنا ہے

خُلاصۂ تفسیر

یہ لوگ (حق واضح ہونے کے باوجود باطل پر اصرار کر رہے ہیں تو) بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر دفعۃً آ پڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو (انکار کے باوجود انتظار سے مراد یہ ہے کہ انکار دلائل کو نہ ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مشاہدہ کا منتظر ہو کہ جب آنکھوں سے دیکھ لوں گا تب مانوں گا، اور اُس روز قیامت کے واقعات یہ ہیں کہ) تمام (دُنیا کے) دوست اُس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جاویں گے، بجز خدا سے ڈرنے والوں (یعنی اہلِ ایمان) کے (کیونکہ اُس روز باطل کی دوستی کا نقصان محسوس ہوگا تو لامحالہ اُس سے کراہت اور دوستوں سے نفرت ہوگی کہ یہ لوگ نقصان کا سبب تھے اور حق کی دوستی کا نفع اور ثواب محسوس ہوگا اس لئے وہ باقی رہے گی۔ اور ان مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوگی) اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں، اور نہ تم غمگین ہوگے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور (علماً وعملاً ہمارے) فرمانبردار تھے، تم اور تمہاری (ایماندار) بیبیاں خوش بخوش جنت میں داخل ہو جاؤ (اور جنت میں جانے کے بعد اُن کے لئے یہ ہوگا کہ) اُن کے پاس سونے کی رکابیاں (کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی) اور گلاس (مشروبات سے بھرے ہوئے یا اور کسی چیز کے) لائے جاویں گے (یعنی غلمان لائیں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور (اُن سے کہا جائیگا کہ) تم یہاں ہمیشہ رہو گے

اس کے برخلاف جب دو کافر دوستوں میں سے ایک کا انتقال ہوگا اور اسے بتایا جائیگا کہ اسکو جہنم میں ڈالا جائے گا تو اسے بھی اپنا دوست یاد آئے گا اُسوقت وہ یہ دُعا کریگا کہ یا اللہ! میرا فلاں دوست مجھے آپ کی اور آپکے رسول کی نافرمانی کرنے کا حکم دیتا تھا، بُرائی کی تاکید کرتا اور بھلائی سے روکتا تھا، اور مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی آپ کے حضور حاضر نہ ہونگا، لہٰذا یا اللہ! اس کو میرے بعد ہدایت نہ دیجئے گا، تاکہ وہ بھی (دوزخ کے) وہ مناظر دیکھے جو آپنے مجھے دکھائے ہیں۔ اور آپ جس طرح مجھ سے ناراض ہوئے ہیں اُسی طرح اُس سے بھی ناراض ہوں۔ اسکے بعد دوسرے دوست کا بھی انتقال ہو جائیگا تو دونوں کی رُوحیں جمع کیجائیں گی اور ان سے کہا جائیگا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ساتھی کی تعریف کرے، تو اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں کہیگا کہ یہ بدترین بھائی بدترین ساتھی اور بدترین دوست ہے۔ (ابن کثیر ص ۱۳۴ ج ۴) اسی لئے دُنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہترین دوستی وہ ہے جو اللہ کے لئے ہو۔ جن دو مسلمانوں میں صرف اللہ کے لئے محبت ہو اُن کے بڑے فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میدان حشر میں یہ لوگ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہونگے۔ اور اللہ کے لئے محبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے سے اس بنا پر تعلق ہو کہ وہ اللہ کے دین کا سچا پیرو ہے۔ چنانچہ علوم دین کے استاذ، شیخ و مرشد، علماء اور اہل اللہ سے نیز عالم اسلام کے تمام مسلمانوں سے بے لوث محبت اسمیں داخل ہے۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ

ہم لائے ہیں تمہارے پاس سچا دین پر تم بہت لوگ سچی بات سے بُرا مانتے ہو کیا

اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ

انہوں نے ٹھہرا لی ہے ایک بات تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں کیا خیال رکھتے ہیں کہ ہم نہیں سنتے ان کا بھید

وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ

اور ان کا مشورہ، کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں تو کہہ اگر ہو رحمٰن کے واسطے

وَلَدٌ ڰ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اولاد تو میں سب سے پہلے پوجوں پاک ذات ہے وہ رب آسمانوں کا اور زمین کا

رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى

صاحب عرش کا ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اب چھوڑ دے ان کو بک بک کریں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ

يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاۗءِ اِلٰهٌ

ملیں اپنے اُس دن سے جس کا اُن کو وعدہ دیا ہے اور وہی ہے جس کی بندگی ہے آسمان میں اور

وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ

اُسی کی بندگی ہے زمین میں اور وہی ہے حکمت والا سب سے خبردار اور بڑی برکت ہے اُس کی جس کا راج ہے

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ

آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے اور اُسی کے پاس ہے خبر قیامت کی اور اُسی تک

تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ

پھر جاؤ گے اور اختیار نہیں رکھتے وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا

إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ

مگر جس نے گواہی دی سچی اور اُن کو خبر تھی اور اگر تو اُن سے پوچھے اُن کو

خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾ وَقِيلِهِ يَا رَبِّ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ

کس نے بنایا تو کہیں گے اللہ نے پھر کہاں سے اُلٹے جاتے ہیں قسم ہے رسول کے اس کہنے کی کہ اے رب یہ

قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾

لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے سو تو منہ پھیر لے اُن کی طرف سے اور کہہ سلام ہے اب آخر کو معلوم کر لیں گے

خلاصۂ تفسیر

(اور اوپر جن سزاؤں کا بیان ہوا اُن کی وجہ یہ ہے کہ) ہم نے سچا دین (جس کا رکن اعظم توحید و رسالت کا اعتقاد ہے) تمہارے پاس پہنچایا لیکن تم میں اکثر آدمی سچے دین سے نفرت رکھتے ہیں (اکثر آدمی یا تو اس لئے کہا کہ بعض لوگ آئندہ ایمان لانے والے تھے، اور یا اس لئے کہ نفرت تو سب میں بعض ہی کو تھی، دوسرے بعض محض تقلیداً راہِ حق کو چھوڑے ہوئے تھے، اور یہ نفرت شامل ہے رسول کی مخالفت اور توحید کی مخالفت دونوں کو۔ آگے دونوں کی تفصیل ہے کہ) ہاں کیا انہوں نے (رسول کو نقصان پہنچانے کے بارے میں) کوئی انتظام درست کیا ہے، سو ہم نے بھی ایک انتظام درست کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدائی انتظام کے سامنے اُن کا انتظام نہیں چل سکتا، چنانچہ آپ محفوظ رہے اور وہ لوگ ناکام، اور آخر کو بدر میں ہلاک ہوئے، اس کا مفصل ذکر سورۂ انفال رکوع چہارم آیت وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا الخ میں ہے) ہاں (یہ لوگ جو آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے خفیہ تدبیریں کرتے ہیں) کیا اِن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم اُن کی چپکے چپکے (کہی ہوئی) باتوں کو اور اُن کے (خفیہ) مشوروں کو نہیں سنتے (ورنہ اگر ہم کو سننے والا سمجھتے ہیں تو پھر ایسی جرأت کیوں کرتے ہیں؟ آگے اُن کے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں کہ) ہم ضرور سنتے ہیں اور (اس کے علاوہ) ہمارے فرشتے (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) اُن کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہ

کے دوام کس قدر سخت ہیں لہذا سزا بھی یقیناً سخت ہوگی۔ اور آگے اُن کی سختی کو اور زیادہ مؤکد کرنے کے لئے آپ اور بات کا بیان فرماتے ہیں کہ جس خدا تعالیٰ کو قیامت کی خبر ہے (وہ حق) اُس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ (باوجود میری اس درجہ فہمائش کے) ایمان نہیں لاتے (اس سے سزا کی سختی اور بڑھ گئی کہ جرائم تو سخت تھے ہی ان کیساتھ رسول کی نالش بھی موجود ہے، اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ بہت سخت عذاب ہوگا۔ اور جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ان کا انجام یہ ہونے والا ہے) تو آپ اُن سے بے رخ رہئے (یعنی ان کے ایمان کی ایسی اُمید نہ رکھئے جو باعث غم و تعب رنج ہو) اور (اگر وہ آپ سے مخالفت اور جہالت کی بات کریں تو آپ رفع شر کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم کو سلام کرتا ہوں اور کچھ نہیں کہتا اور نہ کچھ واسطہ رکھتا ہوں) آگے حق تعالیٰ تسلی کیلئے فرماتے ہیں کہ آپ رنج نہ کیجئے، سو ان کو ابھی (مرتے ہی) معلوم ہو جاوے گا۔

معارف و مسائل

اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (اگر خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی اولاد ہونے کا کوئی بھی احتمال یا کوئی امکان ہے، بلکہ مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ میں تمہارے عقائد کا انکار کسی عناد یا ہٹ دھرمی سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ دلائل کی وجہ سے کر رہا ہوں، اگر صحیح دلائل سے خدا کی اولاد کا وجود ثابت ہو جاتا تو میں اُسے ضرور مان لیتا، لیکن عقل و نقل کی ہر دلیل اس کی تردید کرتی ہے، اسلئے ماننے کا کوئی سوال نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کیساتھ مباحثہ کے وقت اپنی حق پسندی بتلانے کے لئے یہ کہنا جائز اور مناسب ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ صحیح دلائل کیساتھ ثابت ہوتا تو میں اُسے تسلیم کر لیتا، کیونکہ بعض اوقات اس انداز کلام سے مخالف کے دل میں ایسی نرمی پیدا ہو سکتی ہے جو اُسے قبولِ حق پر آمادہ کر دے۔

وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ، یہ جملہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ ان کافروں پر غضب خداوندی نازل ہونے کے لئے شدید اسباب موجود ہیں۔ ایک طرف تو ان کے جرائم فی نفسہٖ سخت ہیں، دوسری طرف وہ رسول جو رحمۃ للعالمین اور شفیع المذنبین بن کر بھیجے گئے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جب خود ان لوگوں کی شکایت کریں اور یہ فرمائیں کہ یہ لوگ بار بار فہمائش کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر اذیت پہنچائی ہوگی، ورنہ معمولی تکلیف پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ایسی پُردرد شکایت نہ فرماتے۔ اس تفسیر کے مطابق وَقِیْلِهٖ ایک آیت پہلے کے لفظ السَّاعَةِ پر معطوف ہے، اس

آیت کی اور بھی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ یہاں واوٗ عطف کی نہیں بلکہ قسم کی ہے۔ یٰرَبِّ "قیل" کا مقولہ ہے اور اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ الخ جوابِ قسم ہے۔ ان تفسیروں کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

وَقُلْ سَلٰمٌ۔ آخر میں وہی تلقین کی گئی ہے جو ہر داعیٔ حق کو ہمیشہ کی گئی کہ مخالفین کے دلائل وشبہات کا جواب تو دیدو، لیکن وہ جو جہالت وحماقت یا دشنام طرازی کی بات کریں، اسکا جواب انہی کی زبان میں دینے کے بجائے سکوت اختیار کرو۔ اور یہ جو فرمایا کہ کہدو تم کو سلام کرتا ہوں، اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں السّلام علیکم کہا جائے، کیونکہ کسی غیر مسلم کو ان الفاظ سے سلام کرنا جائز نہیں، بلکہ یہ ایک محاورہ ہے کہ جب کسی شخص سے قطع تعلق کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ میری طرف سے سلام، یا تمہیں سلام کرتا ہوں۔ اس سے حقیقی طور پر سلام کرنا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں خوبصورتی کے ساتھ تم سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا جن حضرات نے اس آیت سے استدلال کرکے کافروں کو السّلام علیکم یا سلامٌ کہنا جائز قرار دیا ہے ان کا قول مرجوح ہے (روح المعانی)

الحمدللہ آج بتاریخ ۳ رجب بروز دوشنبہ بوقت عشار سورہ زخرف کی تفسیر مع تفسیرات روزبین مکمل ہوئی۔

والحمد للہ اولہ وآخرہ وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

بچا لینے کے لئے خیر و شر پر مطلع کر دیں، یہ قرآن کو نازل کرنے کا مقصد تھا۔ آگے اُس شب کے برکات و منافع کا بیان ہے کہ) اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم (صادر) ہو کر طے کیا جاتا ہے (یعنی سال بھر کے معاملات جو سارے کے سارے ہی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جس طرح انجام دینے اللہ کو منظور ہوتے ہیں اس طریقہ کو متعین کر کے ان کی اطلاع متعلقہ فرشتوں کو کر کے اُن کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، چونکہ وہ رات ایسی ہے اور نزول قرآن سب سے زیادہ حکمت والا کام تھا اسلئے اس کے لئے بھی یہی رات تجویز کی گئی اور یہ قرآن اسلئے نازل کیا گیا کہ) ہم بوجہ رحمت کے جو آپکے رب کیطرف سے ہوتی ہے آپ کو پیغمبر بنانے والے تھے (تاکہ آپ کی معرفت اپنے بندوں کو آگاہ کر دیں) بیشک وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے (اسلئے بندوں کی رعایت کرتا ہے۔ اور وہ ایسا ہے) جو کہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو (مخلوق) ان دونوں کے درمیان میں ہے اسکا بھی، اگر تم یقین لانا چاہو (تو یہ توحید کے دلائل یقین لانے کے لئے کافی موجود ہیں، آگے توحید کی تصریح ہے کہ) اسکے سوا کوئی لائق عبادت کے نہیں، وہی جان ڈالتا ہے وہی جان نکالتا ہے۔ وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی پروردگار ہے (اور اس تصریح و توضیح کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ مان لیتے مگر یہ لوگ پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ وہ (توحید جیسے حقائق کیطرف سے) شک میں (پڑے) ہیں (اور دُنیا کے کھیل (کود) میں مصروف ہیں (آخرت کی فکر نہیں جو حق کو طلب کریں اور غور سے کام لیں)۔

معارف و مسائل

فضیلت سورت | حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی رات میں سورۂ دُخان پڑھے تو صبح کو اسکے گناہ معاف ہو چکے ہونگے۔ اور حضرت امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کی رات یا دن میں سورۂ دُخان پڑھ لی اللہ تعالیٰ اسکے لئے جنت میں گھر بنائیں گے (قرطبی بروایت ثعلبی)

آیات مذکورہ میں قرآن کی عظمت اور بعض خاص صفات کا بیان ہے وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یعنی واضح کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ اسکو ہم نے ایک مبارک رات میں نازل فرمایا جسکا مقصد غافل انسانوں کو بیدار کرنا ہے۔ اسی طرح کی قسم انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ زخرف کی شرح میں بھی گزر چکی ہے وہاں اسکا بیان آچکا ہے۔

لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے جو رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ اس رات کو مبارک فرمانا اس لئے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شب قدر میں نازل ہونا

قرآن کی سورۃ قدر میں تصریح کے ساتھ آیا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، اس سے ظاہر ہوگیا کہ یہاں بھی لیلۂ مبارکہ سے مراد شب قدر ہی ہے۔ اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں ابتداء دنیا سے آخر تک اپنے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی ہیں وہ سب کی سب ماہ رمضان المبارک ہی کی مختلف تاریخوں میں نازل ہوئی ہیں حضرت قتادہ نے بروایت واثلہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان کی پہلی تاریخ میں اور تورات رمضان کی چھٹی تاریخ میں، زبور بارھویں میں انجیل اٹھارویں میں، اور قرآن چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد یعنی پچیسویں شب میں نازل ہوا (قرطبی)

قرآن کے شب قدر میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے پورا قرآن سماء دنیا پر اسی رات میں نازل کردیا گیا تھا پھر تیئیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل ہونا مقدر ہوتا تھا اتنا ہی شب قدر میں لوح محفوظ سے سماء دنیا پر نازل کردیا جاتا تھا (قرطبی)

اور بعض مفسرین عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس آیت میں لیلۂ مبارکہ سے مراد شب برات یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے مگر اس رات میں نزول قرآن دوسری تمام نصوص قرآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ جیسی کھلی نصوص کے ہوتے ہوئے بغیر کسی قوی دلیل کے نہیں کہا جاسکتا کہ نزول قرآن شب برات میں ہوا۔ البتہ شعبان کی پندرھویں شب کو بعض روایات حدیث میں شب برات یا لیلۃ الصک کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس رات کا مبارک ہونا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ بعض روایات میں یہ مضمون بھی آیا ہے جو اس جگہ لیلۂ مبارکہ کی صفت میں بیان فرمایا ہے یعنی فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا یعنی اس رات میں ہر حکمت والے معاملہ کا فیصلہ ہماری طرف سے کیا جاتا ہے جس کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ یہ رات جس میں نزول قرآن ہوا یعنی شب قدر، اسی میں مخلوقات کے متعلق تمام اہم امور جن کے فیصلے اس سال میں اگلی شب قدر تک واقع ہونے والے ہیں طے کئے جاتے ہیں کہ کون کون اس سال میں پیدا ہونگے، کون کون آدمی اس میں مریں گے، کس کو کس قدر رزق اس سال میں دیا جائے گا۔ یہی تفسیر دوسرے ائمہ تفسیر حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ، حسنؒ وغیرہم سے بھی منقول ہے اور مہدوی نے فرمایا کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ یہ تمام فیصلے جو تقدیر الٰہی میں پہلے ہی سے طے شدہ تھے اس رات میں متعلقہ فرشتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، کیونکہ قرآن و سنت کی دوسری نصوص اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلے انسان کی پیدائش سے بھی پہلے ازل ہی میں لکھ دیئے تھے۔ تو

اس رات میں ان کے لکھے ہوئے کا حاصل یہ ہو سکتا ہے کہ تقدیر کی تنفیذ جن فرشتوں کے ذریعہ ہوتی ہے اس رات میں یہ سال بھر کے احکام ان کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں (قرطبی)

چونکہ بعض روایات حدیث میں شب برات یعنی شعبان کی پندرہویں شب کے متعلق بھی یہ آیا ہے کہ اس میں آجال و ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں، اس لئے بعض حضرات نے آیت مذکورہ میں لیلۂ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البراءت سے کر دی ہے مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ یہاں اس رات میں نزول قرآن کا ذکر سب سے پہلے ہے اور اس کا رمضان میں ہونا قرآن کی نصوص سے متعین ہے۔ اور شب برات کے متعلق جو یہ مضمون بعض روایات میں آیا ہے کہ اس میں ارزاق وغیرہ کے فیصلے ہوتے ہیں اول تو ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ روایت مرسل ہے اور ایسی روایت نصوص صریحہ کے مقابلہ میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابل اعتماد روایت ایسی نہیں جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت و حیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ اس رات کی فضیلت میں بھی کوئی قابل اعتماد حدیث نہیں آئی۔ لیکن روح المعانی میں ایک بلا سند روایت حضرت ابن عباسؓ سے اس مضمون کی نقل کی ہے کہ رزق اور موت و حیات وغیرہ کے فیصلے نصف شعبان کی رات میں لکھے جاتے ہیں اور شب قدر میں فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ روایت ثابت ہو تو اس طرح دونوں قول میں تطبیق ہو سکتی ہے ورنہ اصل بات جو ظاہر قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے وہ یہی ہے کہ سورۂ دخان کی آیت میں لیلۂ مبارکہ اور فیہا یُفرق وغیرہ کے سب الفاظ شب قدر ہی کے متعلق ہیں۔ رہا شب برات کی فضیلت کا معاملہ، سو وہ ایک مستقل معاملہ ہے جو بعض روایات حدیث میں منقول ہے مگر وہ اکثر ضعیف ہیں اس لئے قاضی ابوبکر بن عربی نے اس رات کی کسی فضیلت سے انکار کیا ہے لیکن شب برات کی فضیلت کی روایات اگرچہ باعتبار سند کے ضعف سے کوئی خالی نہیں لیکن تعدد طرق اور تعدد روایات سے ان کو ایک طرح کی قوت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے بہت سے مشائخ نے ان کو قبول کیا ہے کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف روایات پر عمل کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴿۱۰﴾ يَغْشَى النَّاسَ ۖ

سو تو انتظار کر اس دن کا کہ لائے آسمان دھواں صریح جو گھیر لیوے لوگوں کو

هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱﴾ رَّبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿۱۲﴾

یہ ہے عذاب دردناک اے رب کھول دے ہم پر سے یہ آفت ہم یقین لاتے ہیں

أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا

کہاں ملے ان کو سمجھنا اور آچکا ان کے پاس رسول کھول کر سنانے والا پھر اس سے پیٹھ پھیری اور کہنے لگے

مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝۱۵

سکھایا ہوا ہے باؤلا ہم کھولے دیتے ہیں عذاب تھوڑی مدت تک تم پھر وہی کرو گے

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝۱۶

جس دن پکڑیں گے ہم بڑی پکڑ تحقیق ہم بدلہ لینے والے ہیں

خلاصۂ تفسیر

(اور جب یہ لوگ حق کے ظاہر ہونے کے باوجود نہیں مانتے) سو آپ (ان کے لئے) اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف سے ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو ان سب لوگوں پر عام ہو جاوے یہ (بھی) ایک دردناک سزا ہے (جو ان کو ہوگی، اس سے مراد وہ قحط ہے جس میں اہل مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے مبتلا ہوگئے تھے، اور یہ بددعا ایک مرتبہ مکہ میں ہوئی تھی اور ایک بار مدینہ میں، اور قاعدہ ہے کہ بھوک کی شدت اور خشکی میں آسمان و زمین کے درمیان آنکھوں کے سامنے دھواں سا نظر آیا کرتا ہے۔ غرض اہل مکہ تنگ آگئے اور لگے عاجزی کرنے، چنانچہ پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس وقت جناب باری میں عرض کریں گے کہ) اے ہمارے رب ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آویں گے (چنانچہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ ابوسفیان اور دیگر قریش نے آپ کو لکھا بھی اور آئے بھی کہ آپ دعا کریں اور ثمامہ رئیس یمامہ کو جنہوں نے غلہ بند کر دیا تھا سمجھا دیں، اور صاحب روح نے ابوسفیان کا وعدہ ایمان بھی نقل کیا ہے، آگے ان کے اس وعدہ کا سچا نہ ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ) ان کو (اس سے) کب نصیحت ہوتی ہے (جس سے ان کے ایمان کی توقع کی جاوے) حالانکہ (اس کے قبل) ان کے پاس ظاہر شان کا پیغمبر آیا (یعنی جس کی شان نبوت ظاہر تھی) پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھلایا ہوا ہے (اور) دیوانہ ہے (پس جب ایسے کھلے ہوئے رسول کے آنے پر جس کے دلائل رسالت میں کوئی تاویل ہی نہیں ہو سکتی، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو قحط کے ہونے پر جس میں بے انصاف آدمی یہ بھی احتمال نکال سکتا ہے کہ یہ ایک معمولی واقعہ ہے جو طبعی اسباب کے تحت ہوا ہے اور کفر کی سزا نہیں ہے کب ایمان لانے کی امید ہے، ان کا یہ کہنا محض دفع الوقتی ہے مگر خیر) ہم (حجت تمام کرنے کے لئے) چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے (مگر) تم پھر اپنی اسی (پہلی حالت پر) آ جاؤ گے (چنانچہ یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ آپ نے دعا فرمائی بارش ہوئی اور ثمامہ کو بھی خط لکھا کہ غلہ آنے دیں، اور اہل مکہ کو فارغ البالی میسر ہوئی مگر ایمان تو کیا لاتے وہ نرمی اور شکستگی بھی باقی نہ رہی، پھر وہی زور اور وہی شور اور "چندے" اس لئے فرمایا کہ اس عذاب

کہ ان کی مدت صرف دنیوی زندگی تک ہے پھر مرنے کے بعد جو مصیبت آوے گی اس کا کہیں خاتمہ نہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ) جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے (اس روز) ہم (پورا) بدلہ لیں گے (یعنی آخرت میں پوری سزا ہوگی)

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں جس دُخانِ مبین کا ذکر بطور پیشین گوئی کے آیا ہے کہ آپ انتظار کیجئے اس واضح دھوئیں کا جو آسمان پر ہوگا اور لوگوں پر چھا جائے گا اس کے متعلق حضرات صحابہ و تابعین سے تین قول منقول ہیں۔ اول یہ کہ یہ علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے جو قیامت کے بالکل قریب واقع ہوگی۔ یہ قول حضرت علی مرتضیٰؓ اور ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابوہریرہؓ اور زید بن علی اور حسن بصری اور ابن ابی ملیکہ وغیرہ کا ہے۔ اور حضرت ابو سعید خدریؓ اور حذیفہ بن اسید غفاریؓ سے یہ قول مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پیشین گوئی واقع ہو چکی ہے اور اس کا مصداق مکہ مکرمہ کا وہ قحط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے ان پر مسلط ہوا تھا وہ بھوکوں مرنے لگے، مردار جانور تک کھانے لگے، آسمان پر بجائے بادل کے ان کو دھواں نظر آتا تھا۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس دخان سے مراد وہ گرد و غبار ہے جو فتح مکہ کے روز مکہ مکرمہ کے آسمان پر چھا گیا تھا۔ یہ قول عبدالرحمٰن اعرج وغیرہ کا ہے۔ (قرطبی) زیادہ معروف پہلے ہی دو قول ہیں۔ تیسرے قول کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا: ہذا القول غریب جداً بل منکر۔ باقی دونوں کا ذکر احادیث صحیحہ میں آیا ہے۔ روح المعانی نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور مذکور الصدر خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ ابن کثیرؒ اور قرطبیؒ سے پہلے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔ دونوں اقوال کی روایات حسب ذیل ہیں:

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بالاخانہ سے ہم پر نظر فرمائی، ہم آپس میں علامات قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے، آپ نے فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع ہونا، اور دخان اور دابہ اور یاجوج ماجوج کا خروج۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور دجال کا خروج اور تین خسف یعنی زمین میں دھنس جانا۔ ایک خسف مشرق میں دوسرا مغرب میں تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اور آگ جو قعر عدن سے نکلے گی لوگوں کو ہنکا کر لے چلے گی جہاں رات کو لوگ سونے کے لئے ٹھہریں گے رک جاوے گی جہاں دوپہر کو آرام کیلئے رکیں گے یہ بھی رک جائے گی (ابن کثیر)

ابن جریر نے ابو مالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں

تمہیں تین چیزوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک دخان (یعنی دھواں) جو مومن کے لئے صرف ایک طرح کا زکام پیدا کر دیگا اور کافر کے تمام بدن میں بھر جائے گا یہاں تک کہ اسکے ہر مسمع اور مسام سے نکلنے لگے گا اور دوسری چیز دابۃ (یعنی دابۃ الارض کوئی عجیب قسم کا جانور زمین سے نکلے گا) اور تیسرے دجال۔ اس روایت کو ابن کثیر نے نقل کرکے فرمایا (ہذا اسناد جید) اسی مضمون کی ایک روایت بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت ابو سعید خدری سے بھی ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ اور بحوالہ ابن ابی حاتم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ دخان کی پیشین گوئی گزری نہیں (بلکہ قرب قیامت میں) یہ دھواں مومن کے لئے ایک طرح کا زکام پیدا کردیگا اور کافر کے اندر بھر جائیگا یہاں تک کہ اسکے ہر منفذ سے نکلنے لگے گا اسی طرح کا مضمون بحوالہ ابن جریر حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے جس کو نقل کرکے ابن کثیرؒ نے فرمایا:

هذا اسناد صحيح الى ابن عباس رض حبر الامة وترجمان القرآن وهكذا قول من وافقه من الصحابة والتابعين رض مع الاحاديث المرفوعة من الصحاح والحسان وغيرهما التي اوردوها مما فيه مقنع ودلالة ظاهرة على ان الدخان من الآيات المنتظرة مع انه ظاهر القرآن (فارتقب يوم تأتي السماء بدخان مبين) وعلى ما فسره ابن مسعود انما هو خيال رأوه في اعينهم من شدة الجوع والجهد وهكذا قوله تعالى (يغشى الناس) اى يتغشاهم ويعمهم ولو كان امرا خياليا يخص اهل مكة المشركين ما قيل فيه يغشى الناس

حضرت ابن عباس حبر امت اور ترجمان القرآن تک اسناد صحیح ہے اور یہی قول دوسرے حضرات صحابہ و تابعین کا ہے جنھوں نے ابن عباس رض کی موافقت فرمائی ہے اسکے ساتھ وہ احادیث مرفوعہ جن میں بعض صحیح بعض حسن ہیں وہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ دخان اُن علامات قیامت میں سے ہے جن کا انتظار ہے ابھی آئی نہیں، خصوصاً جبکہ ظاہر الفاظ قرآن بھی اس پر شاہد ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر مشہور میں جس دھویں کا ذکر ہے وہ تو ایک خیالی دھواں تھا جو بھوک کی شدت سے اُن کی آنکھوں کو محسوس ہوتا تھا اسکے لئے لفظ یغشی الناس بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ خیالی دھواں تو اہل مکہ کے لئے مخصوص تھا اور یغشی الناس کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سب لوگوں پر محیط ہو کر چھا جائے گا۔

اور پہلے یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول کی روایت صحیحین اور مسند احمد اور ترمذی نسائی وغیرہ میں اس طرح آئی ہے کہ حضرت مسروق نے روایت کیا ہے کہ ایک روز ہم کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے جو ابواب کندہ کے قریب ہے وہاں دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کو وعظ سنا رہا ہے اور آیت یعنی یَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ کے متعلق اُس نے مخاطبین سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ اس دخان سے کیا مراد ہے پھر فرمایا کہ یہ ایک دھواں ہوگا جو قیامت کے روز نکلے گا

جو منافقین کے کانوں اور آنکھوں کو لے لیگا اور مؤمن کو اس سے صرف زکام کی سی کیفیت پیدا ہوگی۔ مسروقؒ کہتے ہیں کہ واعظ کی یہ بات سُن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے اُن سے اس کا ذکر کیا وہ لیٹے ہوئے تھے گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ، یعنی میں تم سے تمہاری خدمت تعلیم و تبلیغ کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور نہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو تکلف کوئی بات بنائیں۔ اسلئے علم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا صاف کہدے کہ میں نہیں جانتا اس کا علم اللہ ہی کو ہے (تکلف سے بات نہ بناوے) پھر فرمایا کہ اب تمہیں اس آیت کی تفسیر کا ایک واقعہ سناتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار اور اپنے کفر پر اصرار کیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لئے بد دُعا فرمائی کہ یا اللہ ان پر ایسا قحط ڈال دے جیسا کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ڈالا تھا۔ اس بد دُعا کا اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ شدید قحط میں مبتلا ہوگئے یہاں تک کہ ہڈیاں اور مُردار جانور تک کھانے لگے۔ یہ لوگ آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے تھے تو دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان کا کوئی آدمی آسمان کی طرف نظر اُٹھاتا تو بھوک کی شدت سے اس کو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اسکے بعد عبداللہ ابن مسعودؓ نے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ۔ جب واقعہ پیش آیا تو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اپنے قبیلہ مُضر کے لئے اللہ سے بارش کی دُعا کریں ورنہ وہ سب ہلاک ہو جاویں گے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی تو اللہ نے بارش دیدی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ، یعنی ہم تمہارے اس عذاب کو چند روز کے لئے ہٹائے لیتے ہیں (مگر جب تم مصیبت سے نکل جاؤ گے) تو پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا پھر وہ اپنے پچھلے حال کی طرف لوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ، یعنی جس دن ہم سخت پکڑ پکڑیں گے اُس دن سے ڈرو، پھر ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ بطشہ کبریٰ یعنی بڑی سخت پکڑ غزوہ بدر میں ہو چکی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ پانچ چیزیں گزر چکی ہیں، یعنی دخان، روم، قمر، بطشہ، لزام (از ابن کثیر) دخان سے مراد اس تفسیر پر مکہ کا قحط ہے، اور روم سے مراد وہ پیشگوئی ہے جو سورہ روم میں انکے غلبہ کے متعلق آئی ہے وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ، اور قمر سے انشقاق قمر مراد ہے جسکا ذکر اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ میں ہے، اور بطشہ تفسیر مذکور کے مطابق غزوہ بدر میں کفار قریش کا انجام ہے۔ اور لزام سے اشارہ اس آیت کی طرف ہے فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آگے قیامت میں اس سے بڑی پکڑ نہ ہو، اور اسمیں بھی کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کریم نے کفار مکہ کو ایک آنیوالے عذاب سے ان آیات میں ڈرایا ہے، اسکے بعد جو بھی عذاب ان پر آیا اس کو کسی درجہ میں اسکا مصداق سمجھ کر صحابہ کرامؓ نے ان آیات کا ذکر فرما دیا ہو جس سے اس کے علامات قیامت میں سے ہونے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ روح المعانی میں علامہ سفارینی کی کتاب البحور الزاخرہ کے حوالے سے خود حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

هما دخانان مضى واحد والذي بقي يملأ ما بين السماء والارض ولا يصيب المؤمن الا بالزكمة واما الكافر فيثقب مسامعه فيبعث الله تعالى عند ذلك الريح الجنوب من اليمن فتقبض روح كل مؤمن ويبقى شرار الناس (روح)

دخان دو ہیں، ایک گزر چکا (یعنی قحط مکہ کے وقت) اور دوسرا جو باقی ہے وہ آسمان اور زمین کی درمیانی فضا کو بھر دیگا اور مومن کو اس سے صرف زکام کی کیفیت پیدا ہوگی اور کافر کے تمام منافذ کو چھید ڈالیگا اسوقت اللہ تعالیٰ یمن کی طرف سے جنوبی ہوا بھیجیں گے جو ہر مومن کی روح قبض کرلے گی اور صرف کفار شرار الناس باقی رہ جائیں گے۔

اگرچہ صاحب روح المعانی نے اپنی مختار تفسیر کے مطابق اس روایت کی صحت کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا ہے مگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو ظواہر قرآن اور روایت مرفوعہ میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿۱۷﴾ أَنْ أَدُّوٓا

اور جانچ چکے ہیں ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان کے پاس رسول عزت والا کہ حوالے کرو

إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۸﴾ وَأَنْ لَّا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ

میرے بندے خدا کے، میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر اور یہ کہ چڑھے نہ جاؤ اللہ کے مقابل

إِنِّيٓ ءَاتِيكُم بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ﴿۱۹﴾ وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَن

میں لاتا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس

تَرْجُمُونِ ﴿۲۰﴾ وَإِن لَّمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهُۥٓ أَنَّ

بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، اور اگر تم یقین نہیں کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ پھر دعا کی اپنے رب سے کہ

هَٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ﴿۲۲﴾ فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ﴿۲۳﴾

یہ لوگ گنہگار ہیں پھر لے نکل رات سے میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوا مِن

اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں بہت سے چھوڑ گئے

جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿۲۵﴾ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿۲۶﴾ وَنَعْمَةٍ كَانُوا

باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر خاصے اور آرام کا سامان جس میں

الثلثۃ

فِيهَا فَاكِهِينَ (٢٧) كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (٢٨) فَمَا بَكَتْ
باتیں بنا کرتے تھے — یونہی ہوا — اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم کے — پھر نہ رویا

عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ (٢٩) وَلَقَدْ نَجَّيْنَا
ان پر — آسمان — اور زمین — اور نہ ملی ان کو ڈھیل — اور ہم نے بچا نکالا

بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ (٣٠) مِن فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُ
بنی اسرائیل کو — ذلت کی مصیبت سے — جو فرعون کی طرف سے تھی بیشک

كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ (٣١) وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى
وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا — اور ان کو ہم نے پسند کیا جان بوجھ کر جہان کے

الْعَالَمِينَ (٣٢) وَآتَيْنَاهُم مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ (٣٣)
لوگوں سے — اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح

ع ۱۴

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزمایا تھا اور (وہ آزمائش یہ تھی کہ) ان کے پاس ایک معزز پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آئے تھے (پیغمبر کے آنے سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا) اور انہوں نے آکر فرعون اور فرعون کی قوم سے فرمایا کہ ان اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو (جن کو تم نے طرح طرح کی تکالیف میں پھنسا رکھا ہے) میرے حوالے کر دو (اور ان سے دست بردار ہو جاؤ کہ میں جہاں اور جس طرح مناسب ہو ان کو آزاد کر سکوں) میں تمہاری طرف (خدا کا) فرستادہ (ہو کر آیا) ہوں (اور) دیانتدار ہوں (کوئی بات وحی سے کمی بیشی نہیں کرتا ہوں جو حکم ہوتا ہے پہنچاتا ہوں، پس تم کو ماننا چاہئے) اور یہ (بھی فرمایا) کہ تم خدا سے سرکشی مت کرو (اول حق العباد کا امر تھا اور یہاں حق اللہ کا) میں تمہارے سامنے ایک واضح دلیل (اپنی نبوت کی) پیش کرتا ہوں (مراد اس سے معجزہ عصا و ید بیضا ہے) اور (جب فرعون واہل فرعون نے نہ مانا بلکہ باہم مشورہ آپ کے قتل کا ہوا سو وقت آپ نے سن کر فرمایا کہ) میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم لوگ مجھ کو پتھر (وغیرہ) سے قتل کرو اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم مجھ سے الگ ہی رہو (یعنی مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے مت ہو کیونکہ مجھ کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، مجھ سے اللہ کا وعدہ ہے فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا الخ لیکن تمہارا جرم اور شدید ہو جائے گا، اس لئے خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ ایسا مت کرو، مگر وہ کب باز آنے تھے) تب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں (کہ جرائم سے باز نہیں آتے، اب ان کا فیصلہ کر دیجئے، ارشاد ہوا

بھی آتے ہیں اور کسی کو گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے کے بھی، یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن راجح یہ ہے کہ یہاں سنگسار کرنے کے معنی مراد ہیں کیونکہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل وغیرہ کی دھمکیاں دے رہی ہوگی۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (اور دریا کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا) "رَهْوًا" کے معنی ہیں "ساکن" دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے رفقاء کے پار ہو جانے کے بعد اُن کی خواہش طبعی طور پر یہ ہونی چاہئے تھی کہ دریا دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آجائے تاکہ فرعون کا لشکر پار نہ ہو سکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی تنبیہ فرما دی کہ خود پار ہونے کے بعد سمندر کو اسی ہیئت پر ساکن ہی چھوڑ دینا، اور دوبارہ پانی کے جاری ہونے کی فکر مت کرنا، تاکہ فرعون خشک راستہ بنا ہوا دیکھ کر دریا کے بیچوں بیچ پہنچ جائے، اُس وقت ہم دریا کو جاری کر دیں گے اور یہ لشکر ڈوب جائے گا (ابن کثیرؒ)

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (اور ہم نے ان کا وارث ایک دوسری قوم کو بنا دیا) سورۂ شعراء میں تصریح ہے کہ اس "دوسری قوم" سے مراد بنی اسرائیل ہیں، اور اس پر جو مشہور اشکال ہوتا ہے کہ مشہور تواریخ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بنی اسرائیل دوبارہ مصر میں آباد ہوئے، اس کا جواب بھی سورۂ شعراء کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

زمین و آسمان کا رونا: فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ (پس اُن پر آسمان و زمین کو رونا نہ آیا) مطلب یہ ہے کہ انھوں نے زمین پر کوئی ایسا عملِ صالح نہیں کیا تھا کہ اُن کے جانے سے زمین روئے، اور نہ اُن کا کوئی نیک عمل آسمان تک پہنچا تھا کہ اُن کو آسمان روئے۔ اور یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہے کہ کسی نیک بندے کی موت پر آسمان و زمین روتے ہیں۔ حافظ ابو یعلیٰؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آسمان میں ہر بندے کے لئے دو دروازے مقرر ہیں، ایک سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے دوسرے سے اس کا عمل اور اس کی گفتگو اوپر چڑھتی ہے۔ چنانچہ جب وہ بندہ مرتا ہے تو یہ دروازے اُسے یاد کر کے روتے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے (بطور استشہاد) یہی آیت تلاوت فرمائی کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ، حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی قسم کی روایات مروی ہیں (ابن کثیرؒ) ایک اور حدیث میں جو حضرت شریح بن عبید حضرمیؒ سے مروی ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مومن کبھی ایسی غریب الوطنی کی حالت میں مرتا ہے کہ اس پر کوئی رونے والا نہ ہو تو اس پر آسمان و زمین روتے ہیں،" اس پر بھی آپؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ یہ زمین و آسمان کسی کافر پر نہیں روتے (ابن جریرؒ) حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے نیک آدمی کے مرنے پر آسمان و زمین کے رونے کا ذکر فرمایا (ابن کثیرؒ)

اور بعض حضرات نے آیت کے الفاظ کو مجاز و استعارہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ آسمان و زمین کا حقیقۃً رونا مراد نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اُن کا وجود ایسا ناقابلِ التفات تھا کہ اُسکے ختم ہو جانے

پر کسی کو افسوس نہیں ہوا۔ لیکن مذکورہ روایات کی روشنی میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آسمان و زمین کا حقیقۃً رونا مراد ہے کیونکہ جب آیت کے حقیقی معنی ممکن ہیں اور روایات سے بھی اُن کی تائید ہوتی ہے تو خواہ مخواہ اسے مجاز و استعارہ پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہا یہ شبہ کہ آسمان و زمین میں شعور کہاں جو وہ رو سکیں؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق میں کچھ نہ کچھ شعور ضرور موجود ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ سے معلوم ہوتا ہے، اور اب رفتہ رفتہ سائنس بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہی ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ آسمان و زمین کا رونا ویسا ہی ہو جیسے انسانوں کا رونا ہوتا ہے، اُنکے رونے کی کیفیت یقیناً مختلف ہوگی جس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رو سے دنیا جہان والوں پر فوقیت دی) اس سے بنی اسرائیل کا اُمّتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام پر فائق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس سے مراد اُس زمانے کے دنیا جہان والے ہیں اور اُس وقت بلاشبہ وہ تمام اقوام سے افضل تھے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مریم کو سیدۃ نساء العالمین، پر فضیلت کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص پہلو سے بنی اسرائیل کو تمام دنیا اور ہر زمانے کے لوگوں پر جزوی فضیلت حاصل ہو لیکن مجموعی حیثیت سے افضلیت اُمّتِ محمدیہ ہی کو حاصل ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن کثیر وغیرہ) اور عَلٰی عِلْمٍ (اپنے علم کی رو سے) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے یوں انکو فوقیت دینا بھی ہمارے علم میں حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا اسلئے ہم نے اُن کو فوقیت دیدی۔

وَاٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ (اور ہم نے اُن کو ایسی نشانیاں دیں جنمیں صریح انعام تھا) نشانیوں سے مراد عصا اور ید بیضاء وغیرہ کے معجزات ہیں۔ اور بلاء کے دو معنی آتے ہیں، ایک انعام اور دوسرے آزمائش، یہاں دونوں معنی بلا تکلف ممکن ہیں۔ (روح)

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَیَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ

یہ لوگ کہتے ہیں اور کچھ نہیں ہمارا یہی مرنا ہے پہلا اور ہم کو

بِمُنْشَرِیْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَیْرٌ

پھر اُٹھنا نہیں بھلا لے آؤ ہمارے باپ دادوں کو اگر تم سچے ہو بھلا یہ بہتر ہیں

اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَکْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ کَانُوْا

یا تبع کی قوم اور جو اُن سے پہلے تھے ہم نے اُن کو غارت کر دیا بیشک وہ تھے

مُجْرِمِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿۳۸﴾

گنہگار اور ہم نے جو بنایا آسمان اور زمین اور جو انکے بیچ ہے کھیل نہیں بنایا

معارف ومسائل

فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لا موجود کرو) قرآن کریم نے اُن کے اس اعتراض کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ بالکل ظاہر تھا اور وہ یہ کہ تمام انسانوں کی دوبارہ زندگی کا دعویٰ آخرت میں کیا جا رہا ہے، اُس وقت اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کریگا، دُنیا میں موت و حیات قدرت کے مخصوص قوانین اور مصالح کی پابند ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت کسی کو دوسری زندگی عطا نہیں فرما رہا تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن گئی کہ آخرت میں بھی وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا، منطقی اصطلاح میں اس جواب کو یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ مقید کا عدم وقوع مطلق کے عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو سکتا (بیان القرآن)

قومِ تُبّع کا واقعہ: أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (کیا یہ لوگ شان و شوکت کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں یا تُبّع کی قوم)، قرآن کریم میں قوم تُبّع کا ذکر دو جگہ آیا ہے، ایک یہاں اور دوسرے سورۂ قٓ میں، لیکن دونوں مقامات پر اس کا صرف نام ہی مذکور ہے کوئی مفصل واقعہ مذکور نہیں، اس لئے اس بارے میں مفسرین نے طویل بحثیں کی ہیں کہ اس سے کون مراد ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ تُبّع کسی فردِ معین کا نام نہیں، بلکہ یہ یمن کے ان حمیری بادشاہوں کا متواتر لقب رہا ہے جنہوں نے ایک عرصہ دراز تک یمن کے مغربی حصہ کو دار السلطنت قرار دیکر عرب، شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر حکومت کی۔ اسی لئے تُبّع کی جمع تبابعہ آتی ہے اور ان بادشاہوں کو تبابعۂ یمن کہا جاتا ہے۔

یہاں ان تبابعہ میں سے کونسا تُبّع مراد ہے؟ اس بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کی تحقیق زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد تُبّع اوسط ہے جس کا نام اسعد ابو کریب بن ملیکرب یمانی ہے یہ بادشاہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کم از کم سات سو سال پہلے گذرا ہے اور حمیری بادشاہوں میں اس کی مدت سلطنت سب سے زیادہ رہی ہے، اس نے اپنے عہد حکومت میں بہت سے علاقے فتح کئے یہاں تک کہ سمرقند تک پہنچ گیا۔ محمد بن اسحاقؒ کی روایت ہے کہ انہی فتوحات کے دوران وہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی بستی سے گذرا اور اس پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دن کے وقت اس سے جنگ کرتے اور رات کو اس کی مہمانی کرتے، اس سے اس کو شرم آئی اور اسنے مدینہ والوں سے لڑائی کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اسی دوران وہاں کے دو یہودی عالموں نے اُسے تنبیہ کی کہ اس شہر پر اسکا بس نہیں چل سکتا اسلئے کہ یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہجرت ہے۔ چنانچہ وہ ان یہودیوں کو ساتھ لے کر یمن چلا آیا، اور ان یہودیوں کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر اسنے دینِ موسوی کو قبول کر لیا جو اس وقت دینِ برحق تھا، پھر اس کی

مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ

میں ہیں چین کے باغوں میں اور چشموں میں پہنتے ہیں پوشاک ریشمی پتلی اور

اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾

گاڑھی ایک دوسرے کے سامنے اسی طرح ہوگا اور بیاہ دیں ہم ان کو گوریاں بڑی آنکھوں والیاں

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

منگوائیں گے وہاں ہر میوہ دلجمعی سے نہ چکھیں گے وہاں موت

اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ

مگر جو پہلے آچکی اور بچایا ان کو دوزخ کے عذاب سے فضل سے تیرے رب کے

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ

یہی ہے بڑی مراد ملنی سو یہ قرآن آسان کیا ہم نے تیری بولی میں تاکہ

يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

وہ یاد رکھیں اب تو راہ دیکھ وہ بھی راہ تکتے ہیں

ع ۳ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

بیشک زقوم کا درخت (جس کی تحقیق سورۂ صافات کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے) بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (صورت میں مکروہ ہونے کے علاوہ) تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا (اور) وہ پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ، پھر اس کے سر کے اوپر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو (اور اس سے بطور استہزاء کہا جائے گا کہ) لے چکھ! تو بڑا معزز مکرم ہے (یہ تیری تعظیم ہو رہی ہے جیسا تو دنیا میں اپنے آپ کو معظم و مکرم سمجھ کر ہمارے احکام سے عار کیا کرتا تھا اور دوزخیوں سے کہا جائیگا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک (و انکار) کیا کرتے تھے (یہ تو کافر دوزخیوں کا حال ہوا آگے اہل ایمان کا ذکر ہے کہ) بیشک خدا سے ڈرنے والے امن (چین) کی جگہ میں ہوں گے یعنی باغوں میں اور نہروں میں (اور) وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا، آمنے سامنے بیٹھے ہونگے (اور یہ) بات اسی طرح ہے اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کر دیں گے (اور) وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہونگے (اور) وہاں وہ بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے (یعنی مریں گے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے عذاب سے (بھی) بچالے گا (اور) یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا، بڑی کامیابی

بنی ہے (اور اے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم آپ کا کام اتنا ہے کہ آپ ان کو کہتے رہئیے) سو (اسی غرض سے) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ یہ (اس کو سمجھ کر اس سے) نصیحت قبول کریں تو (اگر یہ لوگ نہ مانیں تو) آپ (ان پر مصائب کے نزول کے) منتظر رہئیے، یہ لوگ بھی (آپ پر مصائب کے زوال کے) منتظر ہیں (پس آپ تبلیغ سے زیادہ فکر میں نہ پڑئیے، نہ مخالفت پر رنج کیجئے، ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے صبر کیجئے، وہ خود سمجھ لے گا)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں آخرت کے کچھ احوال بیان کئے گئے ہیں، اور عادت کے مطابق یہاں بھی قرآن کریم نے دوزخ اور جنّت دونوں ہی کے احوال یکے بعد دیگرے بیان فرمائے ہیں۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ، زقوم کی حقیقت سے متعلق کچھ ضروری باتیں سورۂ صافات کی تفسیر میں لکھی جا چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرمالی جائیں۔ یہاں اتنی بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفار کو زقوم دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھلایا جائے گا کیونکہ یہاں زقوم کھلانے کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ "اسے گھسیٹ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لیجاؤ" اسکے علاوہ سورۂ واقعہ کی آیت هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ سے بھی بعض حضرات نے یہی سمجھا ہے، کیونکہ "نزل" اسکے نزدیک اصلاً مہمان کی اس خاطر و اضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے، بعد کے کھانے کو "ضیافۃ" یا "مأدبۃ" کہتے ہیں۔ لیکن قرآنی الفاظ میں احتمال اسکا بھی ہے کہ زقوم کا کھلانا دخولِ جہنم کے بعد ہو، اس صورت میں "نُزُل" کا استعمال دعوت کے اصل کھانے کے معنی میں توسعاً ہوگا، اور آیت زیرِ تفسیر میں جو اسکے بعد جہنم کی طرف گھسیٹ لیجانے کا ذکر ہے اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تھا تو پہلے بھی جہنم ہی میں، لیکن زقوم کھانے کے بعد اسے مزید تذلیل اور ایذا رسانی کے لئے دوزخ کے وسط میں لیجایا جائے گا۔ واللہ اعلم (ملخص از بیان القرآن)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ، ان آیات کے ذریعہ جنت کی سرمدی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نعمت کی تقریباً تمام اصناف کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی چیزیں عموماً یہ ہوتی ہیں: عمدہ رہائش گاہ، عمدہ لباس، بہتر شریکِ زندگی، عمدہ ماکولات، پھر ان سب نعمتوں کے باقی رہنے کی ضمانت اور رنج و تکلیف سے کُلّی طور پر مامون رہنے کا یقین۔ یہاں ان چھ کی چھ باتوں کو اہلِ جنت کے لئے ثابت کر دیا گیا ہے جیسا کہ ان چھ آیتوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں اہلِ جنت کی قیام گاہ کو "امین" (پُرامن) کہہ کر اسطرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ انسانی رہائش گاہ کی سب سے قابلِ تعریف صفت اسکا پُرامن یعنی خطرات سے محفوظ ہونا ہے۔

سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ، یہ دونوں ریشمی کپڑوں کے نام ہیں، سُندس رقیق ریشم کا کپڑا ہے اور استبرق دبیز ریشم کا۔

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ، تزویج کے معنی اصل میں ہیں "کسی کو کسی کا جوڑ قرار دیدینا" بعد میں یہ لفظ نکاح کرانے کے معنی میں بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔ اس جگہ اسکے دونوں معنی ہوسکتے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جنتی مردوں کا حورعین سے باقاعدہ عقدِ نکاح کرادیا جائے گا، اور اگرچہ جنت میں کوئی شخص احکام کا مکلف نہیں ہوگا لیکن یہ عقدِ نکاح بطور اعزاز و اکرام کے ہوگا اسلئے کوئی اشکال نہیں، اور اگر پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ حور عین کو جنتی مردوں کا جوڑا قرار دیدیا جائے گا، اور وہ جنتی عورتیں بطور ہبہ انھیں عطا کردی جائیں گی اور اس کے لئے دُنیا کی طرح عقدِ نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى، مطلب یہ ہے کہ جو موت ایک مرتبہ آچکی بس وہ آچکی، اسکے بعد کوئی موت ان پر نہیں آئے گی۔ اور یہ بات اگرچہ اہلِ جہنم کو بھی حاصل ہوگی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ ان کے لئے اور زیادہ تکلیف کا سبب ہوگی اور اہلِ جنت کیلئے سرور و کیف میں اضافے کا باعث۔ کیونکہ نعمت خواہ کتنی بڑی ہو اسکے زوال کا تصور لازماً کدورت کا سبب ہوتا ہے اور اہلِ جنت جب یہ تصور کریں گے کہ یہ نعمتیں کبھی ہم سے نہیں چھینیں گی تو اس سے ان کی مسرتوں میں اضافہ ہوگا۔

الحمد للہ کہ آج بتاریخ ۶ رجب ۱۳۹۲ھ بروز پنجشنبہ بوقت نماز عشا سُورۂ دُخان کی تفسیر مکمل ہوئی

وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

سُوْرَةُ الجَاثِيَة

سُوْرَةُ الجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ جاثیہ مکہ میں نازل ہوئی اس میں سینتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي

اُتارنا کتاب کا ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمتوں والا بیشک

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا

آسمانوں میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں ماننے والوں کے واسطے اور تمہارے بنانے میں اور

يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ

جس قدر بکھیرتا ہے جانور نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں اور بدلنے میں رات

وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ

دن کے اور وہ جو اُتاری اللہ نے آسمان سے روزی پھر زندہ کر دیا

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾

اُس سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد اور بدلنے میں ہواؤں کے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ

یہ باتیں ہیں اللہ کی ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک پھر کونسی بات کو اللہ اور

اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۷﴾ يَّسْمَعُ

اُس کی باتوں کو چھوڑ کر مانیں گے خرابی ہے ہر جھوٹے گنہگار کے لیے کہ سنتا ہے

اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ

باتیں اللہ کی کہ اس کے پاس پڑھی جاتی ہیں، پھر ضد کرتا ہے غرور سے گویا سنی ہی نہیں، سو خوشخبری سنا دے

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۸﴾ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا اِتَّخَذَھَا ھُزُوًا ؕ
اس کو ایک عذاب دردناک کی۔ اور جب خبر پاوے ہماری باتوں میں سے کسی کی، اس کو ٹھہراوے ٹھٹھا

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآئِھِمْ جَھَنَّمُ ۚ وَلَا یُغْنِیْ
ایسوں کو ذلت کا عذاب ہے۔ پرے ان کے دوزخ ہے اور کام نہ آوے گا

عَنْھُمْ مَّا کَسَبُوْا شَیْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ ۚ
ان کے جو کمایا تھا ذرا بھی اور نہ وہ جن کو پکڑا تھا اللہ کے سوا رفیق

وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰﴾ ھٰذَا ھُدًی ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ
اور ان کے واسطے بڑا عذاب ہے۔ یہ سمجھا دیا ہے۔ اور جو منکر ہیں اپنے رب کی باتوں سے

لَھُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ ع ۱۲
ان کے لئے عذاب ہے ایک بلا کا دردناک

خلاصۂ تفسیر

حٰمٓ، یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (اور جب یہ ایسی کتاب ہے تو اس کے مضامین کو خوب توجہ سے سننا چاہئے، چنانچہ اس مقام پر ایک مضمون تو توحید کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے) لئے بہت سے دلائل (قدرت اور توحید کے) ہیں اور (اسی طرح) خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو زمین پر پھیلا رکھا ہے (نیز) دلائل (قدرت و توحید) ہیں ان لوگوں کے (سمجھنے کے) لئے جو یقین رکھتے ہیں اور (اسی طرح) یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور (اسی طرح) اس (مادہ) رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا (مراد بارش ہے) پھر اس (بارش) سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں (باعتبار سمت اور کیفیت کے کہ کبھی پُروا ہے کبھی پچھوا۔ کبھی گرم ہے، کبھی سرد۔ غرض ان سب چیزوں میں) دلائل (قدرت و توحید موجود) ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں (اس سے توحید پر استدلال کا طریقہ پارہ دوم اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ میں گزر چکا ہے اور دوسرا مضمون نبوت کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں (جس سے نبوت ثابت ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی دلیل معجزہ کے باوجود بھی اگر یہ لوگ نہیں مانتے) تو پھر اللہ اور اس کی (ایسی) آیتوں کے بعد اور کونسی بات (اس سے بڑھ کر ہوگی جس) پر یہ لوگ ایمان لاویں گے (اور تیسرا مضمون آخرت کا ہے جس میں ان مخالفینِ حق کو سزا بھی ہوگی جس کا بیان یہ ہے کہ) بڑی خرابی ہوگی ہر ایسے شخص کے

لئے جو (عقائد سے متعلق اقوال میں) جھوٹا ہو (اور اعمال میں) نافرمان ہو جو (باوجودیکہ) خدا کی آیتوں کو سنتا بھی ہے جبکہ وہ اس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں (اور) پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا (اپنے کفر پر) اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اس نے ان آیتوں کو سنا ہی نہیں، سو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے (اور اس شخص کی شرارت کا یہ حال ہے کہ) جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے ایسے لوگوں کیلئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونیوالا) ہے (مطلب یہ کہ جن آیتوں کو تلاوت میں سنتا ہے ان کی بھی تکذیب کرتا ہے اور جن آیتوں کی ویسے ہی خبر سن لیتا ہے ان کی بھی تکذیب کرتا ہے غرض تکذیب آیات میں بہت بڑھا ہوا ہے، آگے اس عذاب کی تعیین ہے یعنی) ان کے آگے جہنم (آرہا) ہے اور (اس وقت) نہ تو ان کے وہ چیزیں ذرا کام آویں گی جو (دنیا میں) کما گئے تھے (اس میں اموال اور اعمال سب آگئے) اور نہ وہ (کام آویں گے) جن کو انہوں نے اللہ کے سوا کارساز (اور معبود) بنا رکھا تھا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا (اور وجہ اس عذاب کی یہ ہے کہ) یہ قرآن سرتاسر ہدایت (اور واجب التسلیم) ہے اور (اس کا مقتضا یہ ہے کہ) جو لوگ اپنے رب کی (ان) آیتوں کو نہیں مانتے ان کیلئے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔

معارف و مسائل

یہ پوری سورت مکی ہے، صرف ایک قول یہ ہے کہ آیت قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ مدنی ہے اور باقی مکی، لیکن جمہور کے قول کے مطابق پوری سورت قبل الہجرۃ ہی نازل ہوئی ہے اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی مضمون عقائد ہی کی اصلاح ہے چنانچہ اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد ہی کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے، خاص طور سے آخرت کے اثبات کے دلائل، منکرین کے شبہات اور دعووں کی تردید اس میں زیادہ تفصیل سے آئی ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، ان آیات سے توحید کا اثبات مقصود ہے۔ اس سے ملتی جلتی آیتیں دوسرے پارے کے رکوع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں گزر چکی ہیں، وہیں ان کی مفصل تفسیر مذکور ہے اور یہ بھی کہ ان چیزوں سے توحید کیونکر ثابت ہوتی ہے دونوں مقامات کے عنوان کا جو تھوڑا تھوڑا فرق ہے اس سے متعلق نکات اہل علم امام رازی کی تفسیر کبیر میں دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہاں کائنات کی مختلف نشانیاں بیان فرما کر ایک جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اس میں "ایمان لانے والوں کے لئے" نشانیاں ہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "یقین کرنے والوں کے لئے" نشانیاں ہیں، اور تیسری جگہ ارشاد ہے کہ "عقل رکھنے والوں کے لئے" نشانیاں ہیں، اس میں اسلوب کے تنوع کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ان نشانیوں سے پورا فائدہ تو وہی اٹھا سکتے ہیں جو ایمان لے آئیں، دوسرے نمبر پر یہ ان لوگوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں جو خواہ فوراً

فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

سو اپنے حق میں، پھر اپنے رب کی طرف پھیرے جاؤ گے

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے دریا کو مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ (ان کشتیوں میں سفر کرکے) تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (وہ روزی حاصل کرکے) تم شکر کرو اور (اسی طرح) جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے (یعنی اپنے حکم اور فضل سے) مسخر (قدرت) بنایا (تاکہ تمہارے منافع کا سبب ہو) بیشک ان باتوں میں ان لوگوں کے لئے دلائل (قدرت) ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں (اور کفار کی شرارتوں پر بعض اوقات مسلمانوں کو غصہ آجایا کرتا تھا، آگے ان کو درگزر کرنے کا حکم ہے) آپ ایمان والوں سے فرما دیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات (یعنی آخرت کی جزاء سزا) کا یقین نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو (یعنی مسلمانوں کو) ان کے (اس) عمل (نیک) کا (اچھا) صلہ دے (کیونکہ وہاں کا قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص نیک کام کرتا ہے سو اپنے ذاتی نفع (و ثواب) کے لئے (کرتا ہے) اور جو شخص برا کام کرتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے پھر (سب نیک و بد کام کرنے کے بعد) تم کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے (پس وہاں تم کو تمہارے اچھے اعمال و اخلاق کا بہترین صلہ اور تمہارے مخالفین کو ان کے کفر و معاصی پر بدترین سزا دی جاوے گی لہٰذا تم کو یہاں درگزر ہی مناسب ہے)۔

معارف و مسائل

اَللّٰهُ الَّذِىْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (تا) وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ، قرآن کریم میں فضل تلاش کرنے سے مراد عموماً کسب معاش کی جد و جہد ہوتی ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں سمندر میں کشتی رانی پر اس لئے قدرت دی گئی تاکہ اس کے ذریعہ تم تجارت کر سکو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فضل تلاش کرنے کا کشتی رانی سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تسخیر بحر کی ایک مستقل قسم ہو، اور مطلب یہ ہو کہ سمندر میں بہت سی نفع بخش چیزیں پیدا کرکے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم انہیں تلاش کرکے نفع اٹھاؤ۔ چنانچہ جدید سائنس کی رو سے یہ معلوم ہے کہ سمندر میں اس قدر معدنی ذخائر اور زمین کی پوشیدہ دولتیں ہیں کہ اتنی خشکی میں بھی نہیں ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ، (آپ ایمان والوں سے

ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں (اس طرح کہ میدان تیہ میں من وسلویٰ نازل کیا اور ان کو ملک شام کا مالک بنایا جو برکات ارضیہ کا معدن ہے) اور ہم نے (بعض امور میں مثلاً سمندر کو چیر دینا، ابر کا سایہ کرنا وغیرہ میں ان کو) دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں (یعنی ان کو بڑے بڑے معجزات دکھلائے، غرض حسی، معنوی، علمی ہر طرح کی نعمتیں دیں) سو (چاہئے تو یہ تھا کہ خوب اطاعت کرتے مگر) انھوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا اور یہ آپس کی ضد ضدی سے (جیسا بیان پارہ دوم رکوع سیقول میں بنی اسرائیل میں ہو چکا ہے مطلب یہ ہے کہ جو علم اختلاف ختم کرنے کا سبب ہونا چاہئے تھا انھوں نے نفسانیت کی وجہ سے الٹا اسے اختلاف کا موجب بنا لیا، سو) آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں (عملی) فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے، پھر (بنی اسرائیل میں دور نبوت ختم ہونے کے بعد) ہم نے آپ کو (نبوت دی اور آپ کو) دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا، سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے (یعنی عمل میں بھی اور تبلیغ میں بھی) اور ان جاہلوں کی خواہشوں پر نہ چلئے (یعنی ان کی خواہش تو یہ ہے کہ آپ تبلیغ ترک کر دیں اور اسی لئے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں کہ آپ تنگ ہو کر تبلیغ چھوڑ دیں، سو آپ سے گو یہ احتمال نہیں، مگر تبلیغ کے اہتمام کے لئے آپ کو ایسا حکم ہوتا ہے، آگے اسی طرز پر حکم کی علت فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے (پس ان کا اتباع نہ ہونا چاہئے) اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں (اور ایک دوسرے کا کہنا مانتے ہیں) اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا (اور اہل تقویٰ اس کا کہنا مانتے ہیں، سو جب آپ ظالم نہیں ہیں بلکہ سردار متقین ہیں تو آپ کو ان اتباع سے کیا نسبت؟ البتہ احکام الٰہی کی اتباع سے خاص نسبت ہے، غرض آپ صاحب نبوت شریعت حقہ ہیں اور) یہ قرآن (جو آپ کو ملا ہے یہ) عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین (یعنی ایمان) لانے والوں کے لئے بڑی رحمت (کا سبب) ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے، اور اسی ضمن میں کفار کی ایذا رسانیوں پر آپ کی تسلی بھی فرمائی گئی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ الخ یہاں تک کے مضمون آیات سے دو باتیں مستفاد ہوتی ہیں، ایک تو بنی اسرائیل کو کتاب و نبوت دینے سے آپ کی نبوت کی تائید، دوسرے آپ کی تسلی کہ بنی اسرائیل کو اختلاف کی جو وجہ پیش آئی تھی وہی آپ کی قوم کو آپ کے ساتھ اختلاف کرنے میں پیش آئی ہے یعنی حب دنیا اور حسد و نفسانیت۔ یہ نہیں کہ

آپ کے دلائل میں کچھ کمی ہو تو آپ غم نہ کریں۔ (بیان القرآن)

پچھلی اُمتوں کی شریعتوں کا حکم ہمارے لئے | ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا) یہاں یہ بات ذہن نشین کرنی چاہئے کہ دین اسلام کے کچھ تو اصولی عقائد ہیں مثلاً توحید و آخرت وغیرہ اور کچھ عملی زندگی سے متعلق احکام ہیں۔ جہاں تک اصولی عقائد کا تعلق ہے وہ تو ہر نبی کی اُمت میں یکساں رہے ہیں اور ان میں کبھی ترمیم و تبدیلی نہیں ہوئی، لیکن عملی احکام مختلف انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں، آیت مذکورہ میں انہی دوسری قسم کے احکام کو "دین کے ایک خاص طریقے" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے فقہاء نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُمت محمدیہ کے لئے صرف شریعت محمدیہ ہی کے احکام واجب العمل ہیں۔ پچھلی اُمتوں کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ ہمارے لئے اُس وقت تک واجب العمل نہیں ہیں جب تک قرآن و سنت سے اُن کی تائید نہ ہو۔ اس تائید کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں صراحۃً یہ فرمایا گیا ہو کہ فلاں نبی کی اُمت کا یہ حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پچھلی اُمت کا کوئی حکم بطور تحسین و مدح بیان فرمائیں اور اس کے بارے میں یہ نہ فرمائیں کہ یہ حکم ہمارے لئے منسوخ ہوگیا ہے، اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی باقی ہے اور درحقیقت اس حکم کا واجب العمل ہونا بھی اس صورت میں شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام ہی سے ہوتا ہے۔ یہاں اتنی بات [illegible] سمجھنے کے لئے کافی ہے، تفصیل [illegible] اصول فقہ کی کتابوں میں

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ
کیا خیال رکھتے ہیں جنہوں نے کمائی ہیں برائیاں کہ ہم کر دیں ان کو برابر ان لوگوں کے جو
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا
یقین لائے اور کئے بھلے کام ایک سا ہے ان کا جینا اور مرنا برے دعوے ہیں
يَحْكُمُوْنَ ﴿٢١﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى
جو کرتے ہیں اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہئیں اور تاکہ بدلا پائے
كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾
ہر کوئی اپنی کمائی کا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا

ع ۲ / ۱۸

خلاصۂ تفسیر

یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ جو برے برے کام (کفر و شرک و ظلم و معصیت) کرتے

(رہتے) ہیں، کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں کے برابر رکھیں گے جنھوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے (یعنی مؤمنین کا مرنا جینا بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جس طرح زندگی میں لذتوں سے بہرہ اندوز نہ ہوئے اسی طرح موت کے بعد بھی محروم رہیں۔ اور اسی طرح کافروں کا مرنا جینا بھی بایں معنی یکساں ہو جائے کہ جیسے اس زندگی میں عذاب اور تکلیفوں سے بچے رہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی عذاب سے مامون رہیں۔ مطلب یہ کہ انکار معاد سے یہ لازم آتا ہے کہ اطاعت شعار بندوں کو کہیں اطاعت کا پھل نہ ملے اور مخالفین پر کبھی مخالفت کا وبال نہ پڑے،) یہ برا حکم لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا (ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان عظیم الشان مخلوقات کی تخلیق پر قدرت مشاہدہ میں آجانے سے ہر ذی عقل یہ بھی سمجھ لے گا کہ جو پہلی مرتبہ ان چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے وہ اُن کو فنا کر کے دوبارہ بھی اسی طرح موجود کر سکتا ہے جس سے قیامت و آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے) اور (دوسری حکمت یہ ہے کہ) تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں پورا بدلہ نہیں ملتا اسلئے آخرت کا ہونا ضروری ہو گیا) اور (اس بدلے میں) اُن پر ظلم نہ کیا جاوے گا۔

معارف و مسائل

عالم آخرت اور اس میں جزا و سزا کا نفاذ ضروری ہے | مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا حاصل ایک عقلی استدلال ہے روز جزا کے ضروری ہونے پر۔ وہ یہ ہے کہ یہ بات تو ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ دنیا میں اچھے بُرے اعمال کا بدلہ پورا نہیں ملتا، بلکہ عام طور سے کفار، فجار، دولت دنیا اور عیش و عشرت میں زندگی گزارتے ہیں اور اللہ کے اطاعت شعار بندے فقر و فاقہ اور مصائب و آفات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اول تو دنیا میں بدکردار مجرموں کے جرم کا علم ہی اکثر نہیں ہوتا، علم بھی ہو گیا تو اکثر پکڑے نہیں جاتے، کبھی پکڑے بھی گئے تو حلال حرام جھوٹ سچ کی پرواہ نہ کرنے والے اس سے بچنے کے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور سینکڑوں میں کسی ایک کو سزا ہو بھی گئی تو وہ بھی اس کے عمل کی پوری سزا نہیں ہوتی۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے باغی اپنی خواہشات کے پیرو اس دنیا کی زندگی میں دندناتے پھرتے رہتے ہیں اور بیچارے مؤمن پابند شریعت بہت سی دولت اور لذتوں کو تو حرام کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں اور مصائب و آفات سے بچنے کے لئے بھی صرف جائز طریقے اختیار کرتے ہیں اسلئے دنیا میں اُن کا بڑی راحتوں اور لذتوں سے محروم رہنا ظاہر ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس دنیا میں اعمال کی پوری جزا نہیں ملتی تو اب اگر اس دنیا کے بعد دوسرا عالم آخرت اور اس میں دوبارہ زندگی و جزا و سزا کا نفاذ نہ ہو تو پھر دنیا میں کسی چوری، ڈاکے، زنا، قتل وغیرہ کو جرم کہنا حماقت کے سوا کیا ہے۔ یہ لوگ تو اکثر دنیا میں بڑی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ ایک چور ڈاکو رات بھر میں اتنی دولت

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

تو کہہ اللہ ہی جِلاتا ہے تم کو پھر مارتا ہے تم کو پھر اکٹھا کرے گا تم کو قیامت کے دن تک

لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ ع

اس میں کچھ شک نہیں پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصۂ تفسیر

سو کیا (توحید و آخرت کے ان واضح بیانات کے بعد) آپ نے اُس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ جو دل میں آتا ہے اُسی کے پیچھے چلتا رہتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے (کہ حق کو سنا اور سمجھا بھی مگر نفسانی خواہش کی پیروی سے گمراہ ہو گیا) اور (خدا تعالیٰ نے) اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے (یعنی نفس پرستی کی بدولت قبول حق کی صلاحیت نہایت کمزور ہو گئی) سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے (یہیں تسلی بھی ہے آگے ان منکرین کو زجر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) کیا تم (ان بیانات کو سنکر) پھر بھی نہیں سمجھتے (یعنی ایسا سمجھنا جو نافع ہو، اگرچہ عام معنی کے اعتبار سے سمجھتے تھے) اور یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور کوئی زندگی (آخرت میں) نہیں ہے ہم (یہیں ایک مرتبہ) مرتے ہیں اور (یہیں ایک دفعہ) جیتے ہیں (مقصود یہ کہ موت کی طرح زندگی بھی دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے) اور ہم کو صرف زمانہ (کی گردش) سے موت آ جاتی ہے (مطلب یہ کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی قوتیں کمزور ہوتی رہتی ہیں اور ان اسباب طبعیہ سے موت آ جاتی ہے اور اسی طرح حیات کا سبب بھی امور طبعیہ ہیں پس جب موت و حیات اسباب طبعیہ کے تابع ہیں اور اسباب طبعیہ آخرت کی زندگی کا تقاضا نہیں کرتے تو آخرت کی زندگی نہ ہوگی) اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں (یعنی اُخروی زندگی کی نفی پر کوئی دلیل نہیں) اور (نہ اہل حق کی دلیل کا وہ کچھ جواب دے سکتے ہیں چنانچہ) جس وقت (اس بارہ میں) اُن کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جو مطلوب ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں) تو ان کا (اس پر) بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کر کے) سامنے لے آؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (اور اس جواب کے سوا کوئی اور جواب نہیں دے سکتے مثلاً یہ کہ کسی دلیل عقلی سے اس کا محال ہونا ثابت کر دیتے) آپ (ان کے جواب میں) یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو (جب تک چاہتا ہے) زندہ رکھتا ہے پھر (جب چاہے گا) تم کو موت دیگا، پھر قیامت کے دن جس (کے وقوع) میں ذرا

شک نہیں (تم کو زندہ کرکے) جمع کر لیگا (پس دعوی اس روز میں زندہ کرنے کا ہے اور دنیا میں مُردوں کو زندہ نہ کرنے سے اس روز میں زندہ کرنے کی نفی لازم نہیں آتی) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (اور بلا دلیل حق کا انکار کرتے ہیں)

معارف و مسائل

مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ یعنی وہ شخص جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کافر بھی اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدا یا معبود نہیں کہتا مگر قرآن کریم کی اس آیت نے یہ بتلایا کہ عبادت درحقیقت اطاعت کا نام ہے جو شخص خدا کی اطاعت کے مقابلے میں کسی دوسرے کی اطاعت اختیار کرے وہی اس کا معبود کہلائیگا۔ تو جس شخص کو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پروا نہ ہو جو خدا تعالیٰ نے جسکو حرام کہا ہے وہ اسمیں خدا کا حکم ماننے کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کرے تو گو وہ اپنے نفس کو زبان سے اپنا معبود نہ کہے مگر حقیقۃً وہی اسکا معبود ہوا۔ اسی مضمون کو کسی عارف نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

سودہ گشت از سجدہ راہ بتاں پیشانیم ٭ چند برخود تہمت دینِ مسلمانی نہم

اس میں خواہشات نفسانی کو بتوں سے تعبیر کیا ہے جس نے اپنی خواہشات کو ہی امام و مقتدا بنا لیا اور انکے پیچھے چلنے لگا تو گویا یہ خواہشات ہی اسکے بت ہیں۔ حضرت ابو امامہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ زیر آسمان دنیا میں جتنے معبودوں کی عبادت کی جاتی ہے ان میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کے نزدیک ہویٰ ہے یعنی خواہشِ نفسانی۔ حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دانشمند وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور ما بعد الموت کے لئے عمل کرے اور فاجر وہ ہے جو اپنے نفس کو اس کی خواہش کے پیچھے چھوڑ دے اور اسکے باوجود اللہ سے آخرت کی بھلائی کی تمنا کرتا ہے۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا کہ تمہاری بیماری تمہاری نفسانی خواہشات ہیں۔ ہاں اگر تم ان کی مخالفت کرو تو یہ بیماری ہی تمہاری دوا بھی ہے (یہ سب روایات قرطبی سے لی گئی ہیں)۔

وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ، لفظ دہر دراصل اس تمام مدت کے مجموعہ کا نام ہے جو اس عالم کی ابتدا سے انتہا تک ہو، اور کبھی بہت بڑی مدت کو بھی دہر کہا جاتا ہے۔ کفار نے یہ قول بطور دلیل کے پیش کیا ہے کہ ہماری موت و حیات کا خدا کے حکم و مشیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسباب طبعیہ کے تابع ہے جسکا مشاہدہ موت کے متعلق تو سب کرتے ہیں کہ اعضاء انسانی اور اسکی قوتیں استعمال کے سبب گھٹتی رہتی ہیں اور ایک مدت دراز گزر جانے کے بعد وہ بالکل معطل ہو جاتی ہیں اسی کا نام موت ہے، اسی پر حیات کو بھی قیاس کر لو کہ وہ بھی کسی خدا کے حکم سے نہیں بلکہ مادہ کی طبعی حرکتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ احقاف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پینتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ

اُتارنا کتاب کا ہے اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے ہم نے جو بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ

اور زمین اور جو اُن کے بیچ میں ہے سو ٹھیک کام پر اور ایک ٹھہرے وعدہ پر اور جو منکر ہیں وہ

اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ

ڈر کی بات سنائی گئی منہ پھیر لیتے ہیں تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوائے دکھلاؤ تو مجھ کو

مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ

انہوں نے کیا بنایا زمین میں یا اُن کا کچھ ساجھا ہے آسمانوں میں لاؤ میرے پاس کوئی کتاب

مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَنْ

اس سے پہلے کی یا کوئی علم جو چلا آتا ہو اگر ہو تم سچے اور اس سے

اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ

زیادہ گمراہ کون جو پکارے اللہ کے سوائے ایسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت

الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا

تک اور اُن کو خبر نہیں اُن کے پکارنے کی اور جب لوگ جمع ہوں گے وہ ہوں

لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۶﴾

انکے دشمن اور ہونگے اُن کے پوجنے سے منکر

كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۖ اِنْ

میں کوئی نیا رسول نہیں آیا اور مجھ کو معلوم نہیں کیا ہونا ہے مجھ سے اور تم سے میں

اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰٓى اِلَىَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

اسی پر چلتا ہوں جو حکم آتا ہے مجھ کو اور میرا کام تو یہی ہے ڈر سنا دینا کھول کر تو کہہ بھلا دیکھو تو

اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اگر یہ آیا ہو اللہ کے یہاں سے اور تم نے اس کو نہیں مانا اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل کا

عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

ایک ایسی کتاب کی پھر وہ یقین لایا اور تم نے غرور کیا بیشک اللہ راہ نہیں دیتا گنہگاروں کو

خلاصۂ تفسیر

اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں (جو کہ معجزہ ہونے کے باعث رسالت کی دلیل ہیں) ان (منکر رسالت) لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ منکر لوگ اس سچی بات کی نسبت جبکہ وہ ان تک پہنچی ہے یوں کہتے ہیں کہ یہ صریح جادو ہے (حالانکہ جادو کی نظیر کا ممکن ہونا اور اسکی نظیر کا ممکن نہ ہونا اس قول کے بطلان کی صریح دلیل ہے اور اس سے بڑھ کر اور سنو) کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنی آپ نے نعوذ باللہ) اس (قرآن) کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے (اور خدا کی طرف منسوب کر دیا، آگے اس قول کا جواب ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہوگا (اور خدا کے ذمہ لگا دیا ہوگا) تو (خدا تعالیٰ اپنی عادت کے موافق لوگوں کو دھوکہ سے بچانے کے لئے مجھ کو نبوت کے جھوٹے دعوے پر جلد ہی ہلاک کر دے گا) پھر (جب وہ مجھ کو ہلاک کرنے لگے گا تو) تم (یا اور) لوگ مجھ کو خدا (کے عذاب) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے (مطلب یہ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے پر عذاب کا ہونا ایسا لازمی ہے کہ میرا کوئی حامی و مددگار بھی اسے نہیں روک سکتا، مگر مجھ کو عذاب نہیں ہوا، یہ دلیل ہے اس کی کہ میں اپنے دعوئ نبوت میں جھوٹا نہیں، اور جب میں جھوٹا نہیں تو یہ سمجھ رکھو کہ) وہ خوب جانتا ہے تم قرآن میں جو جو باتیں بنا رہے ہو (اسلئے تمکو سزا ہوگی غرض یہ کہ) میرے اور تمھارے درمیان (صدق و کذب کا فیصلہ کرنے کے لئے) وہ کافی گواہ (یعنی باخبر) ہے (لہٰذا اگر میں جھوٹا ہوں گا مجھ کو فوراً عذاب دے گا، اور اگر تم جھوٹے ہوگے تو تم کو جلد یا بدیر عذاب دے گا) اور (اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ ہماری باتوں سے واقف ہے اور پھر بھی ہم پر عذاب نہیں آیا تو جس طرح مدعی نبوت پر عذاب نہ آنا اس کی سچائی کی دلیل ہے اسی طرح ہم منکروں پر عذاب نہ آنا ہماری سچائی کی دلیل بن سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) وہ بڑی مغفرت والا ہے (اسلئے مغفرت کی بعض اقسام مثلاً دنیا میں

معاندوں پر عذاب نہ آنا بھی واقع کر دیتا ہے اور بڑی رحمت والا ہے (اس لئے رحمت کی جنس تام بھی
جس کو رحمتِ عامہ کہتے ہیں کفار کے لئے بھی واقع کر دیتا ہے۔ لہٰذا منکرین کے انکار پر دنیا میں
عذاب نہ آنا ان کے صدق کی دلیل نہیں، بخلاف مدعی نبوت کے کہ وہاں جھوٹا دعویٰ اور عذاب کا
نزول دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کو دنیا میں عذاب نہ دینا لوگوں
کی گمراہی کا سبب بن سکتا ہے بخلاف دوسرے مجرموں کے۔ آگے اثبات نبوت کی تائید ہے یعنی) آپ
کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں (کہ تمہارے لئے باعثِ تعجب ہو کیونکہ مجھ سے پہلے بہت
سے پیغمبر آ چکے ہیں جن کی خبر تواتر سے تم نے بھی سُنی ہے) اور (اسی طرح کسی اور عجیب بات کا بھی
میں دعویٰ نہیں کرتا جیسا کہ مثلاً علم غیب ہے چنانچہ میں خود کہتا ہوں کہ مجھ کو غیب کی باتوں میں سے
صرف وہ معلوم ہیں جو وحی سے مجھے بتا دی گئی ہیں، غیب کی اور کسی بات کی خبر مجھے نہیں حتی کہ)
میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ معلوم کہ) تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔
لہٰذا جب اپنے اور تمہارے آئندہ حالات کے علم کا میں مدعی نہیں ہوں تو دُور کی غیبی باتوں کے بارے
میں تو کیا دعویٰ کرتا البتہ جن اُمور کا علم وحی سے ہو گیا ہے خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا غیر کے اور
خواہ دُنیا کے حالات ہوں یا آخرت کے ان کا علم یقیناً حاصل ہے چنانچہ آگے ارشاد ہے کہ) میں تو (علم
و عمل میں) صرف اُسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے آتا ہے اور (اسی کی تبلیغ
بھی کرتا ہوں اور اگر تم اسکو نہیں مانتے تو میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تو صرف صاف صاف
ڈرانے والا ہوں (جس کو عقلی دلائل سے ثابت کر چکا ہوں اور اوپر جو الزام افترا کی تردید هُوَ أَعْلَمُ بِمَا
تُفِيضُونَ فِيهِ سے اجمالاً کی گئی تھی آگے اس کی تفصیل کے طور پر ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ تم مجھ کو
یہ بتلاؤ کہ اگر یہ قرآن منجانب اللہ ہو اور (پھر) تم اس کے منکر ہو اور (کسی دلیل سے اس کے منجانب اللہ
ہونے کی مزید تائید بھی، جیسے مثلاً اسی دلیل سے کہ) بنی اسرائیل (کے علماء) میں سے کوئی (معتبر) گواہ (جو علم
دیانت کے اعتبار سے مسلم و معتبر ہو اور ایک ہو یا زیادہ، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں) اس جیسی
کتاب (یعنی اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے) پر گواہی دے کر ایمان لے آئے اور تم (باوجود بے علم ہونے کے اس کتاب
پر ایمان لانے سے) تکبر ہی میں رہو تو اس صورت میں تم سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا اور بے انصاف لوگوں کی یہ
حالت ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو (ان کے عناد کے باعث) ہدایت نہیں کیا کرتا
(بلکہ ہمیشہ گمراہی میں رہتے ہیں اور گمراہی کا انجام آگ ہے)۔

معارف و مسائل

وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ، اس آیت میں

إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١١﴾ وَمِن

ہم سے پہلے اور جب راہ پر نہیں آئے اس کے بتلانے سے تو اب کہیں گے یہ جھوٹ ہے بہت پرانا اور اس

قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ

سے پہلے کتاب موسیٰ کی تھی راہ ڈالنے والی اور رحمت اور یہ کتاب ہے اس کی تصدیق کرتی

لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢﴾

عربی زبان میں تاکہ ڈر سنائے گنہگاروں کو اور خوشخبری نیکی والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور یہ کافر ایمان والوں (کے ایمان لانے) کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن (جس پر یہ لوگ ایمان لائے ہیں) کوئی اچھی (یعنی سچی) چیز ہوتا تو یہ (کم درجہ کے) لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے (یعنی ہم لوگ زیادہ عاقل ہیں اور یہ لوگ کم عقل ہیں، اور حق بات کو عاقل پہلے قبول کرتا ہے تو اگر یہ حق ہوتا تو ہم پہلے مانتے جب ہم نے نہیں مانا تو یہ حق نہیں یہ لوگ بے عقلی سے اُدھر دوڑنے لگے ہیں۔ کافروں کا یہ قول انکے انتہائی تکبر کی دلیل ہے جس کا ذکر اوپر استکبرتم میں آیا ہے) اور جب (عناد و تکبر کے باعث) ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو (اپنے عناد اور ضد کی بنا پر) یہی کہیں گے کہ یہ (یعنی قرآن) قدیمی (جھوٹے مضامین کے ایک) جھوٹ (مضمون) ہے اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (نازل ہو چکی) ہے جو (موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کیلئے بالعموم) رہنما (تھی) اور (اہل ایمان کے لئے بالخصوص) رحمت تھی (اور جس طرح توریت میں آپ کی پیشین گوئی ہے) یہ (اسی طرح کی) ایک کتاب ہے جو اس کی پیشین گوئی کو سچا کرتی ہے (اور) عربی زبان میں ہے (بے انصافوں) کو ڈرانے کے لئے اور نیک لوگوں کو بشارت دینے کے لئے (نازل ہوئی ہے)۔

معارف و مسائل

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ، تکبر و غرور انسان کی عقل کو بھی مسخ کر دیتا ہے متکبر آدمی اپنی عقل اور اپنے عمل کو معیار حسن و قبح و خیر و شر سمجھنے لگتا ہے جو چیز اسکو پسند نہ ہو خواہ دوسرے لوگ اسکو کتنا ہی اچھا سمجھیں، یہ اُن سب کو بیوقوف سمجھتا ہے حالانکہ خود بیوقوف ہے۔ کفار کے اسی درجہ غرور و تکبر کا اس آیت میں بیان ہے کہ اسلام و ایمان چونکہ اُن کو پسند نہیں تھا تو دوسرے لوگ جو ایمان کے دلدادہ تھے ان کو یہ کہتے تھے کہ اگر یہ ایمان کوئی اچھی چیز ہوتی تو سب سے پہلے ہمیں پسند آتی، ان دوسرے غریب حقیر لوگوں کی پسند کا کیا اعتبار۔

نکالا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی امتیں گزر گئیں (جن کو ہر زمانے میں انکے پیغمبر یونہی خبریں دیتے چلے آئے مگر آج تک کسی بات کا ظہور نہ ہوا اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں بے بنیاد ہیں) اور وہ دونوں (غریب ماں باپ اسکے اس انکار سے کہ جو کفر عظیم ہے گھبرا کر) اللہ سے فریاد کر رہے ہیں (اور نہایت درد مندی سے اس سے کہتے ہیں) کہ ارے تیرا ناس ہو ایمان لا (اور قیامت کو بھی برحق سمجھ) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ (اس پر بھی) کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (مطلب یہ کہ ایسا بدنصیب ہے کہ خود ماں باپ سے بدسلوکی دونوں کا مرتکب ہے، اور بدسلوکی بھی اس درجہ کی ماں باپ کی خدمت کے ساتھ ان سے کلام میں بھی بدتمیزی کرتا ہے۔ آگے ان اعمال کا نتیجہ فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی وعدہ عذاب) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور انسان (کفار) ہو گزرے ہیں بیشک یہ (سب) خسارہ میں رہے۔ اور (آگے دونوں فریق کی تفصیل ہوئی جو اجمال کے طور پر فرماتے ہیں کہ مذکورہ دونوں فریقوں میں سے) ہر ایک (فریق) کے لئے ان کے (مختلف) اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے (کسی کو جنت کے کسی کو دوزخ کے) ملیں گے اور (مختلف درجے اس لئے ملیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال (کی جزا) پوری کر دے اور ان پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہوگا اور (اوپر چونکہ مومنین کی جزا میں تو جنت کو متعین طور سے بیان کر دیا گیا تھا مگر ظالمین کا عذاب متعین کر کے نہیں بتایا گیا تھا اجمالاً فرما دیا تھا حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ اور كَانُوْا خٰسِرِيْنَ اس لئے آگے عذاب کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہ ہوگی) اور انکو خوب برت چکے (تو ان میں پڑ کر ہم کو بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (چنانچہ سزا کے لئے آگ ہے اور ذلت ان کی ملامت اور پھٹکار ہے) اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے (تکبر سے مراد ایسا تکبر ہے جو ایمان سے باز رکھے کیونکہ دائمی عذاب اسی کے ساتھ خاص ہے) اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے (اس میں کفر فسق ظلم اور انکی تمام صورتیں داخل ہوگئیں)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر آیات میں پہلی دو آیتیں تو پچھلے ہی کلام کا تکملہ ہے جو اس سے پہلی آیات میں آیا ہے کہ ظالموں کے لئے وعید عذاب اور مومنین صالحین کے لئے فوز و فلاح کی خوشخبری تھی۔ پہلی آیت یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں بڑی بلاغت کے ساتھ پورے اسلام و ایمان اور اعمال صالحہ سب کو جمع کر دیا گیا۔ رَبُّنَا اللّٰهُ کا اقرار پورا ایمان ہے اور اسپر استقامت

میں بیان ہے کہ دین حق پر قائم رہنا بھی شامل ہے اور اسکے مقتضیات پر پورا پورا عمل بھی۔ لفظ استقامت اور اسکی اہمیت کی تشریح و تفصیل سورۂ حٰمٓ سجدہ میں بیان ہو چکی ہے۔ آیت مذکورہ میں اہلِ استقامت سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ آئندہ کسی تکلیف و پریشانی کا خوف ہوگا نہ ماضی کی تکلیف پر رنج و افسوس ہوگا۔ بعد کی آیت میں ان کے لئے راحت کے دائمی اور غیر منقطع ہونے کی بشارت دی گئی ہے اسکے بعد کی چار آیتوں میں انسان کو اسکے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی ہدایت اور اسکے خلاف کرنے کی مذمت اور ضمن میں انسان پر اسکے ماں باپ کے احسانات کا اور اولاد کے لئے محنت و مشقت برداشت کرنے کا تذکرہ اور بڑی عمر کو پہنچنے کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت کی خاص تلقین فرمائی گئی ہے۔ سابقہ آیات سے اسکی مناسبت اور ربط بقول ابن کثیر یہ ہے کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ جہاں انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی طرف دعوت دیتا ہے تو ساتھ ساتھ ہی والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اور خدمت و اطاعت کے احکام بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات مختلف سورتوں میں اسپر شاہد ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں بھی اللہ کی توحید کی دعوت کے ساتھ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذکر کیا گیا۔ اور قرطبی نے بواسطہ قشیری وجہ ربط یہ بیان کی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا پہلو ہے کہ آپ ایمان و توحید کی دعوت دیتے رہیں کوئی قبول کرے گا کوئی نہ کرے گا اس سے مغموم نہ ہوں کیونکہ انسان کا حال یہی ہے کہ وہ سب اپنے والدین کے ساتھ بھی یکساں نہیں رہتے بعض اچھا سلوک کرتے ہیں اور **بعض انکے ساتھ بھی بدسلوکی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم**

بہرحال ان چار آیتوں میں اصل مضمون انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تلقین کرنا ہے اور ضمناً دوسری تعلیمات آئی ہیں۔ اگرچہ بعض روایاتِ حدیث سے ان آیات کا حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور اسی بنا پر تفسیر مظہری نے "وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ" میں الانسان کے الف لام کو عہد قرار دے کر اس سے مراد صدیق اکبر کو قرار دیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی آیت قرآن کا سببِ نزول کوئی خاص فرد یا خاص واقعہ ہو تو پھر بھی حکم سب کے لئے عام ہی ہوتا ہے۔ شانِ نزول خاص صدیق اکبرؓ ہوں اور تخصیصات مندرجہ آیات انہیں کی صفات ہوں جب بھی مقصود آیات کا تعلیم عام ہی ہے۔ اور اگر اصل آیات کو عام تعلیم قرار دیا جائے، اسمیں بھی صدیق اکبر اس تعلیم کے پہلے مصداق قرار پائیں گے۔ جوان ہونے اور چالیس سال عمر ہونے کے بعد کی جو تخصیصات ان آیات میں مذکور ہیں وہ تخصیصات بطور تمثیل کے ہونگی اب آیاتِ مذکورہ کے خاص خاص الفاظ کی تشریح دیکھئے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ، لفظ وصیت تاکیدی حکم کے معنی میں آتا ہے اور احسان بمعنے حسن سلوک ہے جس میں ان کی خدمت و اطاعت بھی داخل ہے اور تعظیم و تکریم بھی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا، لفظ كُرْهًا بضم کاف اس مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی وجہ سے برداشت کرنا پڑے اور کَرہا بفتح کاف اس محنت و مشقت کا نام ہے جس پر اس کو کوئی دوسرا آدمی مجبور کرے، اسی سے اکراہ مشتق ہے۔ پہلے جملے میں جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے یہ دوسرا جملہ اُسی کی تاکید کے لئے ہے کہ والدین کی خدمت و اطاعت ضروری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمہاری پیدائش سے لیکر جوانی تک تمہارے لئے بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، خصوصاً ماں کی محنت و مشقت بہت ہی نمایاں ہے اسلئے یہاں بیان صرف ماں کی مشقت کا کیا گیا ہے کہ اُس نے ایک طویل مدت تو خود اپنے پیٹ میں تم کو اٹھائے رکھا جس میں اسکو طرح طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں، پھر ولادت کے وقت سخت درد اور تکلیف کے ساتھ تمہارا وجود اس دنیا میں آیا۔

ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے: شروع آیت میں حسن سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لئے ہے مگر اس جگہ صرف ماں کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ماں کی محنت و مشقت لازمی اور ضروری ہے، حمل کے زمانے کی تکلیفیں، پھر وضع حمل اور درد زہ کی تکالیف ہر حال ہر بچے کے لئے لازمی ہے جو صرف ماں ہی کی محنت ہے، باپ کے لئے پرورش پر محنت اٹھانا اتنا لازمی ضروری نہیں ہوتا ہے کہ کسی باپ کو اولاد کی تربیت میں کوئی بھی محنت مشقت اٹھانی پڑے جبکہ وہ مالدار صاحب حشم و خدم ہو، دوسروں سے اولاد کی خدمت لے یا وہ کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور خرچ بھیجتا رہا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد پر ماں کے حق کو سب سے زیادہ رکھا ہے ایک حدیث میں ارشاد ہے صِلْ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ فَاَدْنَاكَ (مظہری) یعنی صلہ رحمی اور خدمت کرو اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی، اسکے بعد اپنے باپ کی اور اسکے بعد جو قریب تر رشتہ دار ہو اسکی، پھر جو اسکے بعد ہو۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا، اس جملہ میں بھی ماں کی محنت و مشقت ہی کا بیان ہے کہ پیٹ میں حمل اور وضع حمل کی مشقت کے بعد بھی ماں کو محنت سے فراغت نہیں ملتی کیونکہ اسکے بعد بچے کی غذا بھی قدرت نے ماں کی چھاتیوں میں اتاری ہے وہ اسکو دودھ پلاتی ہے۔ آیت میں ارشاد فرمایا کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال فرمایا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ کی ہے کیونکہ قرآن کریم نے اکثر مدت رضاع تو دو سال کامل متعین فرما دیے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ، اور یہاں حمل اور رضاع دونوں کی مدت تیس ماہ قرار دی گئی

تو مدتِ رضاعت کے دو سال یعنی چوبیس مہینے نکلنے کے بعد چھ ماہ ہی باقی رہ جاتے ہیں جس کو سب سے کم مدت حمل قرار دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں ایک عورت کے بطن سے چھ ماہ ہو جانے پر بچہ پیدا ہو گیا جبکہ عام عادت نو مہینے میں اور کم سے کم سات مہینے میں بچہ پیدا ہونے کی ہے۔ عثمان غنیؓ نے اسکو حمل ناجائز قرار دیکر سزا کا حکم دیدیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو اس سزا سے منع کیا اور فرمایا کہ قرآن میں حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت تیس ماہ ہے پھر رضاعت کی مدت کا چوبیس ماہ ہونا دوسری جگہ متعین کر دیا ہے اسلئے باقیماندہ مدت چھ ماہ ہی حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ عثمان غنیؓ نے ان کے استدلال کو قبول کر کے اپنا حکم واپس لے لیا (قرطبی)

اسی لئے کم سے کم مدت حمل کے بارے میں تمام امت کے ائمہ متفق ہیں کہ وہ چھ ماہ ہو سکتی ہے اکثر مدت حمل کتنی ہے اس میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں، قرآن نے اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

فائدہ اس آیت میں حمل کی تو اقل مدت کا بیان لیا گیا اور رضاعت کی اکثر مدت کا اس میں اشارہ ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ متعین ہے اس سے کم میں صحیح سالم بچہ پیدا نہیں ہو سکتا اور زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ بچہ حمل میں رہ سکتا ہے اس میں عادتیں مختلف ہیں یہ متعین نہیں۔ اسی طرح رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین ہے کہ دو سال تک دودھ پلایا جا سکتا ہے کم سے کم مدت کچھ متعین نہیں۔ بعض عورتوں کے دودھ ہوتا ہی نہیں، بعض کا دودھ چند مہینوں میں خشک ہو جاتا ہے، بعض بچے ماں کا دودھ زیادہ نہیں پیتے یا ان کو مضر ہوتا ہے تو دوسرا دودھ پلانا پڑتا ہے۔

اکثر مدت حمل اور اکثر مدت رضاع میں فقہائے امت کا اختلاف اکثر مدت حمل امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دو سال ہیں، امام مالکؒ سے مختلف روایات منقول ہیں۔ چار سال، پانچ سال، سات سال۔ امام شافعیؒ کے نزدیک چار سال، امام احمدؒ کی بھی مشہور روایت چار ہی سال کی ہے (مظہری) اور اکثر مدتِ رضاعت جس کے ساتھ مدت رضاعت کے احکام متعلق ہوتے ہیں جمہور فقہاء کے نزدیک دو سال ہیں۔ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ائمہ حنفیہ میں سے ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سب اس پر متفق ہیں۔ اور صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ و ابن عباسؓ کا بھی یہ قول ہے (رواہ الدارقطنی) علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی ارشاد ہے (اخرجہ ابن ابی شیبہ) صرف امام اعظم ابوحنیفہؒ سے یہ منقول ہے کہ ڈھائی سال تک بچہ کو دودھ پلایا جا سکتا ہے جسکا حاصل جمہور حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچہ کمزور ہو، ماں کے دودھ کے سوا کوئی غذا دو سال تک بھی نہ لیتا ہو تو مزید چھ ماہ دودھ پلانے کی اجازت ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مدت رضاعت

پورے ہونے کے بعد ماں کا دودھ بچے کو پلانا حرام ہے مگر فتویٰ فقہائے حنفیہ کا بھی جمہور ائمہ کے مسلک پر ہے کہ دو سال کی مدت کے بعد اگر دودھ پلا دیا گیا تو اس سے حرمت رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہونگے۔ سیدی حضرت حکیم الامت نے بیان القرآن میں فرمایا کہ اگرچہ فتویٰ جمہور کے قول پر ہے مگر عمل میں احتیاط کرنا بہتر ہے کہ ڈھائی سال کی مدت کے اندر جس بچے کو دودھ پلا دیا گیا ہے اس سے نکاح کرنے میں احتیاط برتی جائے۔ بعض حضرات نے آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا سے امام اعظمؒ کے قول کے مطابق اکثر مدت رضاعت ڈھائی سال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تفسیر مظہری میں فرمایا کہ یہ درست نہیں کیونکہ صحابہ کرامؓ کی جماعت علی مرتضیٰؓ، عثمان غنیؓ نے آیت کی تفسیر یہ متعین کر دی ہے کہ اس میں چھ ماہ اقل مدت حمل کے اور چوبیس ماہ مدت رضاعت کے مراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم نے حمل اور رضاعت کی مشترک مدت تیس ماہ بتلائی ہے ہر ایک کی الگ الگ حد نہیں بتلائی اسکا سبب یہ ہے کہ عادت عامہ یوں ہے کہ بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پورے نو ماہ میں پیدا ہو تو ماں کا دودھ پلانے کی ضرورت صرف اکیس ماہ رہ جاتی ہے اور اگر بچہ سات مہینے میں پیدا ہو جائے تو تیئیس ماہ دودھ پلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو بچہ چھ ماہ میں پیدا ہو جائے تو چوبیس ماہ یعنی پورے دو سال دودھ پلانے کی ضرورت ہوگی (مظہری)

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۔ لفظ اشد کے لغوی معنی قوت کے ہیں۔ سورہ انعام میں حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ کے تحت میں اس کی تفسیر بلوغ سے کی گئی ہے یعنی جب بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلوغ اَشُد سے مراد اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنا ہے۔ مذکور الصدر آیت میں بھی بعض حضرات نے بلغ اشدہ کے معنی یہی کئے ہیں کہ بچہ سن بلوغ کو پہنچ جائے اور اسکے بعد بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کو ایک مستقل منزل عمر قرار دیا ہے۔ یہ قول شعبیؒ اور ابن زیدؒ کا ہے اور حسن بصریؒ نے بلوغ اشد اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ دونوں کو ہم معنی اور بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ کو بَلَغَ اَشُدَّهٗ کی تفسیر و تاکید قرار دیا ہے۔ (قرطبی)

اور تقدیر عبارت یوں ہے کہ اول بچے کے حمل کا پھر وضع حمل کا پھر دودھ پینے کے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ وعاش واستمرت حیاتہ حتی اذا اکتہل واستحکم قوتہ وعقلہ (روح) یعنی دودھ چھوٹنے کے بعد بچہ زندہ رہا اور عمر پائی یہاں تک کہ وہ بالغ اور قوی ہو گیا اور اس کی قوت اور عقل مکمل ہو گئی تو اب اسکو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ یوں دعائیں مانگنے لگا کہ،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ، یعنی

اے میرے پالنے والے مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر مبذول فرمائی
اور جو میرے والدین پر مبذول فرمائی اور مجھے یہ توفیق دے کہ میں وہ عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے
اور میرے لئے میری اولاد کی بھی اصلاح فرما دے، میں تیری طرف رجوع ہوتا ہوں اور میں تیرے تابع
فرمان مسلمانوں میں سے ہوں۔ قرآن نے اس جگہ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ سے لیکر مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ تک سب
صیغے ماضی کے استعمال فرمائے ہیں، اس سے ظاہر یہ ہے کہ یہ بیان کسی خاص واقعہ اور خاص شخص کا ہے جو
نزول آیت کے وقت ہو چکا ہے۔ اسی لئے تفسیر مظہری نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ یہ سب حالات حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں اور انہی کا بیان ہے نام کا ابہام اس حکمت سے کیا گیا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی
ترغیب ہو کہ وہ بھی اس کا اتباع کیا کریں اور ایسی دعا کریں اور روایت ہے جو قرطبی نے بروایت عطاء حضرت
ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے
مال سے تجارت کا قصد فرمایا اور ملک شام کا سفر کیا تو اس سفر میں ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ تھے اسوقت
ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی جو مصداق ہے بَلَغَ اَشُدَّهٗ کا۔ پھر اس سفر میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے ایسے حالات دیکھے کہ وہ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ سفر سے واپسی کے بعد ہر وقت آپ کے ساتھ
رہنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہو گئی اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و
رسالت کا شرف عطا فرمایا اسوقت ابوبکرؓ کی عمر اڑتیس سال تھی، مردوں میں سب سے پہلے انہوں
نے اسلام قبول کیا پھر جب ان کی عمر چالیس سال کی ہوگئی اسوقت یہ دعا مانگی جو اوپر آیت میں
مذکور ہے رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ، اور یہی مصداق ہے بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً کا اور جب یہ دعا مانگی اَنْ
اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ تو اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی، ان کو نو ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی توفیق
بخشی جو مسلمان ہو گئے تھے اور ان کے مالک ان کو اسلام لانے پر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔ اسی
طرح ان کی دعا وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ بھی قبول ہوئی، ان کی اولاد میں کوئی ایسا نہ رہا جو ایمان نہ
لایا ہو۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ میں یہ خصوصیت حق تعالیٰ نے صدیق اکبرؓ ہی کو عطا فرمائی کہ وہ خود بھی
مسلمان ہوئے، والدین بھی، اولاد بھی اور سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا
اور تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ مہاجرین و
انصار میں اسوقت یہ خصوصیت صرف صدیق اکبرؓ کی ہی تھی کہ وہ خود بھی مسلمان ہوئے اور ان کے
والدین بھی مسلمان ہو گئے۔ رہا یہ سوال کہ صدیق اکبرؓ کے والد ابو قحافہؓ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں
اور یہ سورت پوری مکی ہے اسلئے یہ آیات بھی مکہ میں نازل ہوئیں اسوقت والدین پر نعمت الٰہی
مبذول ہونے کا ذکر کیسے مناسب ہوگا؟ سو اسکا جواب یہ ہے کہ بعض حضرات نے ان آیات کو
مدنی کہا ہے اس پر تو کوئی اشکال نہیں رہتا اور اگر مکی بھی ہوں تو مراد نعمت اسلام سے مشرف

ہونے کی دعا ہوگی (رح) اس تفسیر کی رو سے اگرچہ یہ سب حالات صدیق اکبرؓ کے بیان ہوئے مگر حکم عام ہے سب مسلمانوں کو اس کی ہدایت کرنا مقصود ہے کہ آدمی کی عمر جب چالیس سال کے قریب ہو جائے تو اس کو آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہئے۔ پچھلے گناہوں سے توبہ کی تجدید کرے اور آئندہ کے لئے ان سے بچنے کا پورا اہتمام کرے کیونکہ عادت اور تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں جو اخلاق و عادات کسی شخص کی ہو جاتی ہیں پھر ان کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ مومن جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب آسان فرما دیتے ہیں اور جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو اس کو اپنی طرف رجوع و انابت نصیب فرما دیتے ہیں، اور جب ستر سال کی عمر کو پہنچ جائے تو تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات کو قائم فرما دیتے ہیں اور اس کے سیئات کو مٹا دیتے ہیں، اور جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہل بیت کے متعلق شفاعت کرنے کا حق دیدیتے ہیں اور آسمان میں اس کے نام کے ساتھ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ اسیر اللہ فی الارض ہے یعنی زمین میں اللہ کی طرف سے قیدی ہے (ذکرہ ابن کثیر عن ابی یعلیٰ و مسند احمد وغیرہ) اور یہ ظاہر ہے کہ مراد اس سے وہ ہی بندہ مومن ہے جس نے اپنی زندگی احکام شرع کے تابع ہو کر تقویٰ کے ساتھ گزاری ہے۔ ابن کثیرؒ نے چونکہ پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے یعنی مراد عام انسان تو جو الفاظ خصوصیت کے اس میں آئے ہیں جیسے حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً الخ وہ سب بطور تمثیل کے ہیں جن میں یہ ہدایت دینا مقصود ہے کہ انسان جب چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کو اپنی اصلاح اور اپنے اہل و عیال کی اصلاح اور آخرت کی فکر غالب ہو جانی چاہئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ یعنی ایسے مومن مسلمان جن کے یہ حالات ہوں جو اوپر گزرے ہیں ان کی حسنات قبول کر لی جاتی ہیں اور گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ حکم بھی عام ہے، اگرچہ سبب نزول صدیق اکبرؓ ہوں تو وہ اس کے پہلے مصداق ہوں گے۔ حضرت علیؓ کے ارشاد ذیل سے بھی آیت کے مفہوم کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ محمد بن حاطبؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں ایک روز امیر المومنین حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت ان کے پاس کچھ دوسرے حضرات بھی موجود تھے جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ پر کچھ عیب لگائے اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

کان عثمان رضی اللہ عنہ من الذین قال اللہ تعالیٰ فیھم اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا	عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ

وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ، قال واللہ عثمان واصحاب عثمان رضی اللہ عنہم، قالہا ثلاثا (ابن کثیرؒ)

عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ۔ یعنی اس آیت کے مصداق حضرت عثمانؓ اور انکے ساتھی ہیں۔ یہ بات حضرت علیؓ نے تین مرتبہ فرمائی۔

وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَّكُمَا، سابقہ آیت میں والدین کی خدمت واطاعت کے احکام تھے اس آیت میں اس شخص کا عذاب سزا مذکور ہے جو اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی، بدزبانی سے پیش آئے خصوصاً جبکہ والدین اسکو اسلام اور اعمال صالحہ کیطرف دعوت دیتے ہوں اسکی بات نہ ماننا دوہرا گناہ ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ مفہوم آیت کا عام ہے جو شخص بھی اپنے والدین کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئے وہ اسکا مصداق ہے۔ مروان نے جو اس آیت کا مصداق حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو اپنے کسی خطبہ میں کہا تھا اسکی تکذیب صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ مفہوم آیت کا عام ہے کسی صحیح روایت میں کسی فرد کا مصداق آیت ہونا منقول نہیں۔

أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا، یعنی **کفار کو خطاب کرکے یہ کہا جائیگا کہ تم نے اگر کچھ اچھے کام دنیا میں کئے تھے تو ان کا بدلہ بھی تمہیں دنیوی نعمتوں اور عیش و عشرت کی صورت میں دیا** جاچکا ہے اب آخرت میں تمہارا کچھ حصہ باقی نہیں رہا۔ یہ خطاب کفار کو ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نیک اعمال جو ایمان نہ لانے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک مقبول نہیں آخرت میں تو انکی کوئی قیمت نہیں مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ انکا بدلہ انکو دیدیتے ہیں۔ کفار فجار کو مال و دولت اور عزت و جاہت وغیرہ جو دنیا میں ملتا ہے وہ انکے نیک اعمال سخاوت، ہمدردی، سچائی وغیرہ کا بدلہ ہوتا ہے۔ مومنین کیلئے یہ حکم نہیں ہے کہ اگر انکو دنیا میں کوئی نعمت مال و دولت وغیرہ مل جائیں تو آخرت کے حق سے محروم ہوجائیں

لذائذ دنیا اور تنعم سے پرہیز کی ترغیب | اس آیت میں کفار کو عتاب و عقاب انکے دنیوی لذتوں میں منہمک رہنے کی بنا پر کیا گیا۔ اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ نے لذائذ دنیا کو ترک کرنے کی عادت بنالی جیسا کہ انکی سیرت اسپر شاہد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ وصیت فرمائی تھی کہ دنیا کے تنعم سے پرہیز کرتے رہنا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑا رزق لینے پر راضی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ بھی اسکے تھوڑے عمل پر راضی ہوجاتے ہیں (مظہری عن البغویؒ)

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ

اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے

مِنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهِۦٓ أَلَّا تَعۡبُدُوٓاْ إِلَّا ٱللَّهَ إِنِّيٓ أَخَافُ

عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٖ ﴿٢١﴾ قَالُوٓاْ أَجِئۡتَنَا لِتَأۡفِكَنَا عَنۡ ءَالِهَتِنَا فَأۡتِنَا

بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٢٢﴾ قَالَ إِنَّمَا ٱلۡعِلۡمُ عِندَ ٱللَّهِ

وَأُبَلِّغُكُم مَّآ أُرۡسِلۡتُ بِهِۦ وَلَٰكِنِّيٓ أَرَىٰكُمۡ قَوۡمٗا تَجۡهَلُونَ ﴿٢٣﴾ فَلَمَّا

رَأَوۡهُ عَارِضٗا مُّسۡتَقۡبِلَ أَوۡدِيَتِهِمۡ قَالُواْ هَٰذَا عَارِضٞ مُّمۡطِرُنَاۚ

بَلۡ هُوَ مَا ٱسۡتَعۡجَلۡتُم بِهِۦۖ رِيحٞ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٢٤﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ

شَيۡءِۭ بِأَمۡرِ رَبِّهَا فَأَصۡبَحُواْ لَا يُرَىٰٓ إِلَّا مَسَٰكِنُهُمۡۚ كَذَٰلِكَ نَجۡزِي

ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡمُجۡرِمِينَ ﴿٢٥﴾ وَلَقَدۡ مَكَّنَّٰهُمۡ فِيمَآ إِن مَّكَّنَّٰكُمۡ فِيهِ وَجَعَلۡنَا

لَهُمۡ سَمۡعٗا وَأَبۡصَٰرٗا وَأَفۡـِٔدَةٗ فَمَآ أَغۡنَىٰ عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَآ

أَبۡصَٰرُهُمۡ وَلَآ أَفۡـِٔدَتُهُم مِّن شَيۡءٍ إِذۡ كَانُواْ يَجۡحَدُونَ بِـَٔايَٰتِ

ٱللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُواْ بِهِۦ يَسۡتَهۡزِءُونَ ﴿٢٦﴾

کے اور الٹ پڑی ان پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور آپ قوم عاد کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام) کا (ان سے) ذکر کیجئے جبکہ انھوں نے اپنی قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ریگ کے مستطیل خمدار تودے تھے (یہ مقام کی نشان دہی اس لئے کی گئی کہ دیکھنے والوں کے ذہن میں استحضار ہوجائے) اس (بات) پر (عذاب الٰہی سے)

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ

اور ہم غارت کر چکے ہیں جتنی تمہارے آس پاس ہیں بستیاں اور طرح طرح سے پھیر کر سنائیں ان کو باتیں تاکہ وہ

يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا

لوٹ آئیں پھر کیوں نہ مدد پہنچی ان کو ان لوگوں کی طرف سے جن کو پکڑا تھا اللہ سے ورے معبود

اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

درجہ پانے کو، کوئی نہیں گم ہو گئے ان سے اور یہ جھوٹ تھا ان کا اور جو اپنے جی سے باندھتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات اوپر قوم عاد کا قصہ تفصیلاً مذکور تھا، آگے دوسری ایسی ہی قوموں کا ذکر ہے جن پر کفر اور مخالفت انبیاء کی وجہ سے عذاب آئے اور ہلاک ہوئے اُن کی اُجڑی ہوئی بستیاں بھی اہلِ مکہ کے سفروں کے وقت راستے میں آتی تھیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے لئے ان کا اجمالی حال آیاتِ مذکورہ میں آیا ہے۔

اور ہم نے تمہارے آس پاس کی اور بستیاں بھی (اس کفر و شرک کے سبب) غارت کی ہیں (جیسے ثمود و قوم لوط کہ ملک شام کو جاتے ہوئے ان بستیوں سے گزرتے تھے اور چونکہ مکہ سے ایک طرف یمن ہے دوسری جہت میں شام ہے اس لئے مَا حَوْلَكُمْ فرما دیا) اور ہم نے (ہلاک کرنے سے پہلے ان کی فہمائش کیلئے) بار بار اپنی نشانیاں (اُن کو) بتلا دی تھیں تاکہ وہ (کفر و شرک سے) باز آئیں (مگر باز نہ آئے اور ہلاک ہوئے) سو خدا کے سوا جن جن چیزوں کو اُنھوں نے خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنا معبود بنا رکھا تھا (کہ یہ مصیبت میں ہمارے کام آویں گے ہلاکت و عذاب کے وقت) اُنھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی بلکہ وہ سب اُن سے غائب ہو گئے اور وہ (معبود اور شفیع سمجھنا) محض اُن کی تراشی ہوئی اور گھڑی ہوئی بات ہے (اور کہیں واقع میں وہ شفیع یا معبود تھوڑا ہی تھے)۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ

اور جس وقت متوجہ کر دیئے ہم نے تیری طرف کتنے ایک لوگ جنوں میں سے سننے لگے قرآن پھر جب وہاں پہنچ گئے

قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا

بولے چپ رہو پھر جب ختم ہوا اُلٹے پھرے اپنی قوم کو ڈر سناتے ہوئے بولے

يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

اے قوم ہماری ہم نے سنی ایک کتاب جو اُتری ہے موسیٰ کے بعد سچا کرنے والی سب اگلی

يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا

کتابوں کو سمجھاتی ہے سچا دین اور ایک راہ سیدھی اے قوم ہماری مانو اللہ کے

دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ

بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ کہ بخشے تم کو کچھ تمہارے گناہ اور بچا دے تم کو ایک عذاب دردناک

اَلِیْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰہِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ

سے اور جو کوئی نہ مانے گا اللہ کے بلانے والے کو تو وہ نہ تھکا سکے گا بھاگ کر زمین میں اور

لَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِہٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۲﴾

کوئی نہیں اسکا اس کے سوائے مددگار وہ لوگ بھٹکتے ہیں صریح

خلاصۂ تفسیر

اور (اُن سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو (اخیر میں یہاں پہنچ کر) قرآن سننے لگے تھے غرض جب وہ لوگ قرآن (کے پڑھے جانے کے وقت) آپ کے پاس آپہنچے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو (اور اس کلام کو سنو) پھر جب قرآن پڑھا جا چکا (یعنی جتنا اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پڑھنا تھا ختم ہو چکا) تو وہ لوگ (آپ پر ایمان لے آئے اور) اپنی قوم کے پاس (اس کی) خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے (اور جا کر اُن سے) کہنے لگے کہ اے بھائیو ہم ایک (عجیب) کتاب سُنکر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے (اور) دین حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے (یہ تو دین اسلام کی حقانیت کا اثبات و اظہار ہے، آگے امر ہے اس کے قبول کرنے کا اول ترغیباً پھر ترہیباً یعنی) اے بھائیو تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو (مراد داعی سے قرآن یا نبی ذیشان ہیں) اور (کہنا ماننا یہ ہے کہ) اُس پر ایمان لے آؤ (اسمیں اشارہ ہوگیا کہ وہ ایمان لانے کی طرف داعی ہے نہ کہ اور کسی دُنیوی غرض کی طرف ہیں) اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا اور جو شخص اللہ کی طرف بُلانے والے کا کہنا نہ مانے گا تو وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر خدا کو) ہرا نہیں سکتا (یعنی اس طرح کہ ہاتھ نہ آئے) اور (جیسے وہ خود نہیں بچ سکتا اسی طرح) خدا کے سوا اور کوئی اس کا حامی بھی نہ ہوگا (کہ وہ اس کو بچا سکے اور) ایسے لوگ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں (کہ باوجود قیام دلائل کے داعی کے حق ہونے پر پھر بھی اُس کی اجابت نہ کریں)۔

معارف و مسائل

کفار مکہ کو سُنانے کے لئے اس سے پہلی آیات میں کفر اور استکبار کی مذمت اور اُن کا مہلک ہونا بیان ہوا ہے۔ مذکور الصدر آیات میں اہل مکہ کو عار دلانے کے لئے جنات کے ایمان لانے کا واقعہ بیان

معارف القرآن

جلد

۸

سورۂ محمد سے آخرِ قرآن تک

پارہ ۲۶ رکوع ۵ تا آخرِ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴
احاطہ دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰
فون ۵۰۴۹۷۳۳، ۵۰۳۲۰۲۰

باہتمام : محمد مشتاق سنی
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* ادارۃ المعارف کراچی
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین معارف القرآن جلد ہشتم

تمت

کریں، کما قال تعالیٰ فَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً (نخ) اور (ان کے خلاف ان کے) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور (ان کے ایمان کی کیفیت تفصیلی یہ ہے کہ) وہ اس سب پر ایمان لائے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے اور وہ (جو نازل کیا گیا سب وہ) ان کے رب کے پاس سے (آیا ہوا) امر واقعی (بھی) ہے (جس کا ماننا بھی ضروری ہے) اللہ تعالیٰ ان کے گناہ ان پر سے اتار دیگا (یعنی معاف کر دیگا) اور (دونوں جہان میں) ان کی حالت درست رکھے گا (دنیا میں تو اس طرح کہ ان کو اعمالِ صالحہ کی توفیق بڑھتی جاوے گی اور آخرت میں اس طرح کہ ان کو عذاب سے نجات اور جنت میں داخلہ ملے گا اور) یہ (جو مومنین کی خوشحالی اور کفار کی بدحالی بیان کی گئی) اس وجہ سے ہے کہ کافر تو غلط راستہ پر چلے اور اہلِ ایمان صحیح راستہ پر چلے جو ان کے رب کی طرف سے (آیا) ہے، (اور غلط راستہ کا موجب ناکامی ہونا اور صحیح راستہ کا سبب کامیابی ہونا ظاہر ہے اسلئے وہ ناکام ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ اور اگر اسلام کے صحیح راستہ ہونے میں کوئی شبہ ہو تو من ربہم سے اس کا جواب ہو گیا کہ دلیل اس کی صحیح ہونے کی یہ ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے اور من جانب اللہ ہونا تمام معجزات نبویہ سے بالخصوص اعجاز قرآنی سے ثابت ہے اور) اللہ تعالیٰ اسی طرح (جیسے یہ حالت بیان فرمائی) لوگوں کے (نفع و ہدایت کے) لئے ان (مذکورین) کے حالات بیان فرماتا ہے (تاکہ ترغیب و ترہیب کے دونوں طریقوں سے ہدایت کی جائے)

مَعارف ومسَائِل

سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی ہے کیونکہ جہاد و قتال کے احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے فوراً بعد ہی یہ سورت نازل ہوئی یہاں تک کہ اس کی ایک آیت كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ وہ مکی آیت ہے کیونکہ اس کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ آپؐ ہجرت کی نیت سے مکہ معظمہ سے نکلے اور مکہ مکرمہ کی بستی اور بیت اللہ پر نظر کر کے آپ نے فرمایا کہ ساری دنیا کے شہروں میں مجھے تو ہی محبوب ہے، اگر اہلِ مکہ مجھے یہاں سے نہ نکالتے تو میں خود اپنے اختیار سے مکہ مکرمہ کو نہ چھوڑتا۔ اور اصطلاحِ مفسرین کے مطابق جو آیات سفر ہجرت مدینہ کے دوران میں نازل ہوئی ہیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت مدینہ کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے اور یہیں پہنچکر کفار سے جہاد و قتال کے احکام نازل ہوئے ہیں۔

صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ میں ان کفار کے وہ اعمال مراد ہیں جو فی نفسہٖ نیک کام ہیں جیسے مساکین کی امداد و اعانت، پڑوسی کی حمایت و حفاظت، سخاوت اور صدقہ خیرات وغیرہ کہ یہ اعمال اگرچہ اپنی ذات میں نیک اور اچھے عمل ہیں

لیکن آخرت میں ان کا فائدہ ایمان ہونے کیساتھ مشروط ہے، بغیر ایمان کے یہ نیک اعمال آخرت میں انکے کچھ کام نہ آئیں گے البتہ دنیا میں ہی ان کو انکا بدلہ دیدیا جاتا ہے۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ، اگرچہ پہلے بھی ایمان کا ذکر آ گیا ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر نازل ہونے والی وحی بھی شامل تھی، مگر اس جگہ خصوصیت سے اسکو بالتصریح ذکر کرنے میں یہ بتلانا منظور ہے کہ ایمان کی تکمیل بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کو صدق دل سے قبول کیا جائے۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ، لفظ بال کبھی شان اور حال کے معنی میں آتا ہے اور کبھی قلب کے معنی میں یہاں دونوں معنے لئے جا سکتے ہیں، پہلے معنی لئے جاویں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حال کو یعنی دنیا و آخرت کے تمام کاموں کو درست کر دیا اور دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے انکے قلوب کو درست کر دیا تو حاصل اسکا بھی وہی ہوگا کہ تمام کام درست کر دیئے کیونکہ کاموں کی درستی قلب کی درستی کیساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ

سو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو ان کو

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ

تو مضبوط باندھ لو قید پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو جب تک کہ رکھ دے

الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛۚ

لڑائی اپنے ہتھیار

خلاصۂ تفسیر

(اوپر کی آیت میں اہل ایمان کا مصلح ہونا اور کفار کا مفسد ہونا بیان ہوا ہے اسکی مناسبت سے کفر و کفار کا فساد رفع کرنے کے لئے اس آیت میں احکام جہاد کا ذکر ہے) سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو جائے تو اُن کی گردنیں مارو، یہاں تک کہ جب تم اُن کی خوب خونریزی کر چکو (جس کی حد یہ ہے کہ کفار کی شوکت و قوت ٹوٹ جائے اور قتال بند کرنے سے مسلمانوں کی مضرت یا کفار کے غلبہ کا خوف نہ رہے) تو (اسوقت کفار کو قید کر کے) خوب مضبوط باندھ لو پھر اسکے بعد (تم کو دو باتوں کا اختیار ہے) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لیکر چھوڑ دینا اور یہ قید اور قتل کا حکم اُسوقت تک ہے) جبتک کہ لڑنے والے (دشمن) اپنے ہتھیار نہ رکھدیں (مراد اس

سے اُترے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے خبر پاکر قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زندہ گرفتار کر لیا پھر بلا معاوضہ آزاد کر دیا۔ اسی پر سورۂ فتح کی یہ آیت نازل ہوئی وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور مذہب اُن کی ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لیکر آزاد کرنا جائز نہیں اسی لئے علماء حنفیہ نے سورۂ محمد کی آیت مذکورہ کو امام اعظمؒ کے نزدیک منسوخ اور سورۂ انفال کی آیت کو ناسخ قرار دیا ہے مگر تفسیر مظہری نے یہ تحقیق کر دیا کہ سورۂ انفال کی آیت پہلے اور سورۂ محمد کی آیت بعد میں نازل ہوئی ہے اسلئے وہی ناسخ اور انفال کی آیت منسوخ ہے اور امام اعظمؒ کا مختار مذہب بھی جمہور ہی کے موافق رہا یعنی آزاد کر دینے کے جواز کا نقل کیا ہے جبکہ مسلمانوں کی مصلحت اسی میں ہو، اور فرمایا کہ یہی اصح اور مختار ہے علمائے حنفیہ میں سے علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں اسی طرف مائل ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قدوری اور ہدایہ کی روایت کے مطابق امام اعظمؒ کے نزدیک قیدیوں کو فدیہ لیکر آزاد نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک روایت ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے، مگر اُنہی سے دوسری روایت سیر کبیر میں جمہور کے قول کے مطابق جواز کی منقول ہے اور یہی ان دونوں روایتوں میں اظہر ہے اور امام طحاوی نے معانی الآثار میں اسی کو ابوحنیفہؒ کا مذہب قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ محمد اور سورۂ انفال کی دونوں آیتیں جمہور صحابہ و ائمہ کے نزدیک منسوخ نہیں، مسلمانوں کے حالات اور ضرورت کے تابع امام المسلمین کو اختیار ہے کہ ان میں جس صورت کو مناسب سمجھے اختیار کر لے۔ قرطبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو کبھی قتل کیا گیا ہے اور کبھی غلام بنایا گیا اور کبھی فدیہ لے کر چھوڑا گیا اور کبھی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا گیا۔ فدیہ لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے بدلے میں مسلمان قیدی آزاد کرائے جائیں اور یہ بھی کہ اُن سے کچھ مال لیکر چھوڑ دیا جائے، دونوں قسم کی صورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت ہیں اس تفصیل کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں جن آیتوں کو ناسخ منسوخ کہا گیا درحقیقت وہ سب محکم ہیں ان میں سے کوئی منسوخ نہیں، اسلئے کہ جب کفار قید ہو کر ہمارے قبضے میں آئیں تو امام المسلمین کو چار چیزوں کا اختیار ہے کہ مناسب سمجھے تو قتل کر دے اور مصلحت مسلمانوں کی سمجھے تو ان کو غلام اور لونڈی بنالے اور فدیہ لیکر چھوڑنے میں مصلحت ہو تو فدیہ مال کا یا مسلمان قیدیوں کا لیکر چھوڑ دے یا بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دے۔ قرطبی نے تفصیل نقل کر کے لکھا ہے وهذا القول يروى عن أهل المدينة والشافعي وأبي عبيد وحكاه الطحاوي مذهبا

عن ابی حنیفۃ والمشہور ما قدمناہ، یعنی علمائے مدینہ کا یہی قول ہے اور یہی قول امام شافعیؒ اور ابوعبیدؒ کا ہے اور امام طحاویؒ نے ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اگرچہ مشہور مذہب ان کا اسکے خلاف ہے (قرطبی ص ۲۲۸ ج ۱۶)

جنگی قیدیوں کے متعلق امام المسلمین کو چار اختیار مذکور الصدر تقریر سے واضح ہوگیا کہ جنگی قیدیوں کے قتل اور استرقاق یعنی غلام بنالینے کا جو امام المسلمین کو اختیار ہے اس پر تو تمام اُمت کا اجماع ہے اور فدیہ لے کر یا بلا معاوضہ آزاد کرنے میں اگرچہ کچھ اختلافات ہیں مگر جمہور کے نزدیک یہ دونوں صورتیں بھی جائز ہیں۔

اسلام میں غلامی کی بحث یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دینے یا فدیہ لینے میں تو فقہاء کا کچھ اختلاف ہے بھی، قتل کرنے اور غلام بنانے کی اجازت میں کوئی اختلاف نہیں سب کا اجماع ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، پھر قرآن کریم میں ان دو صورتوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اور صرف آزاد چھوڑنے کی دو صورتوں ہی کا بیان کیوں کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں یہ دیا ہے کہ یہاں صرف اُن دو صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت جائز ہوں، غلام بنانا ذکر اسلئے نہیں کیا گیا کہ عرب کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے اور قتل بھی اپاہجوں وغیرہ کا جائز نہیں اسکے علاوہ قتل کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے (تفسیر کبیر ص [illegible] ج ۷)

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک قتل کرنے اور غلام بنانے کا تعلق ہے اسکا جواز بہت دنوں سے مشہور تھا، سب کو معلوم تھا کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اسکے برخلاف آزاد چھوڑ دینے کو غزوۂ بدر کے موقع پر ممنوع کر دیا گیا تھا، اب اس مقام پر آزاد چھوڑنے کی اجازت دینا ہی مقصود تھا اسلئے اسی کی دو صورتوں یعنی منّ اور فداء کا ذکر کر دیا گیا، وہ جو صورتیں پہلے سے جائز چلی آتی تھیں، اس موقع پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اسلئے ان آیات میں اُن سے سکوت اختیار کیا گیا، لہٰذا ان آیات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد قتل یا غلام بنانے کی اجازت منسوخ کر دی گئی ہے، ورنہ اگر غلام بنانے کا حکم منسوخ ہوگیا ہوتا تو قرآن و حدیث میں کہیں یک جگہ تو اس کی ممانعت مذکور ہوتی، اور اگر یہ آیت ہی ممانعت کے قائم مقام تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد قرآن و حدیث پر جان دینے والے صحابہ کرامؓ نے بے شمار غزوات میں جنگی قیدیوں کو غلام کیوں بنایا؟ روایاتِ حدیث و تاریخ میں غلام بنانے کا ذکر اس کثرت اور معنوی تواتر کیساتھ آیا ہے کہ اسکا انکار مکابرہ کے سوا کچھ نہیں۔

رہا یہ اشکال کہ اسلام، جو حقوقِ انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہے، اُس نے غلامی کی اجازت کیوں دی؟ سو درحقیقت یہ اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی جائز

اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى

ڈالی اللہ نے اُن پر، اور منکروں کو ملنی ہیں ایسی ہی باتیں یہ اس لئے کہ اللہ رفیق ہے اُن کا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾

جو یقین لائے اور یہ کہ جو منکر ہیں اُن کا رفیق نہیں کوئی

خلاصۂ تفسیر

یہ حکم (جہاد کا جو مذکور ہوا) بجائے خود (جو بعض صورتوں میں کفار سے انتقام لینے کیلئے طریقہ جہاد کا مقرر کیا) یہ خاص حکمت کی وجہ سے ہے ورنہ اگر اللہ چاہتا تو ان سے (خود ہی آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ) انتقام لے لیتا (جیسے پچھلی امتوں سے اسی طرح انتقام لیا گیا کہ کسی پر پتھر برسے کسی پر ہوا کا طوفان آیا کسی کو غرق کیا گیا، اگر ایسا ہوتا تو تم کو جہاد نہ کرنا پڑتا) لیکن (تم کو جہاد کا یہ حکم اسلئے دیا) تاکہ تمہارا ایک دوسرے کے ذریعہ امتحان کرے (مسلمانوں کا امتحان یہ کہ کون حکم الٰہی پر اپنی جان کو ترجیح دیتا ہے، اور کفار کا امتحان یہ کہ قتال و جہاد کی سختی سے متنبہ ہوکر کون حق کو قبول کرتا ہے) اور (جہاد میں جیسے کفار کا قاتل ہونا کامیابی ہے اسی طرح مقتول ہونا بھی ناکامی نہیں کیونکہ) جو لوگ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں مارے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کو (جن میں یہ عمل جہاد بھی داخل ہے) ہرگز ضائع نہ کریگا (جیسا کوئی یہ نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب وہ کافروں پر غالب نہ آیا بلکہ خود مقتول ہوگیا تو گویا اس کا عمل بیکار گیا مگر واقعہ یوں نہیں کیونکہ اسکے اس عمل پر دوسرا نتیجہ جو دنیوی کامیابی سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اس کو حاصل ہوگیا وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ اُن کو (منزل مقصود تک (جس کا بیان آگے آتا ہے) پہنچا دیگا اور اُن کی حالت (قبر اور حشر اور پل صراط اور تمام مواقع آخرت میں) درست رکھے گا (کہیں کوئی خرابی اور مضرت اُن کو نہ پہنچے گی) اور (اس منزل مقصود تک پہنچنے کا بیان یہ ہے کہ) اُن کو جنت میں داخل کریگا جس کی اُن کو پہچان کرا دیگا (کہ ہر جنتی اپنے مقر و مکان پر بغیر کسی تلاش و تفتیش کے بے تکلف جا پہنچے گا اس سے ثابت ہوا کہ جہاد میں ظاہری ناکامی یعنی خود مقتول ہو جانا بھی بڑی کامیابی ہے۔ آگے جہاد کے دُنیوی فوائد و فضائل کا ذکر کرکے اسکی ترغیب ہے کہ) اے ایمان والو اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کریگا (جس کا نتیجہ دنیا میں بھی دشمنوں پر غالب آنا ہے خواہ ابتداءً ہی یا کچھ عرصہ کے بعد انجام کار میں، اور بعض مؤمنین کا مقتول ہو جانا یا کسی معرکہ میں وقتی طور پر مغلوب ہو جانا اسکے منافی نہیں) اور (اسی طرح دشمنوں کے مقابلہ میں) تمہارے قدم

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اور جو لوگ کافر ہیں وہ (دنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور اس طرح (آخرت سے بے فکر ہو کر) کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں (کہ وہ نہیں سوچتے کہ ہم کو کیوں کھلایا پلایا جاتا ہے اور ہمارے ذمہ اس کا کیا حق واجب ہے) اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانا ہے (اور اوپر جو کفار کے دنیا میں عیش کرنے کا ذکر ہوا اُس سے آپ کے مخالفین کو دھوکا نہ کھانا چاہئے اور نہ آپ کو اُن کی اس غفلت پر کچھ حزن و ملال ہونا چاہئے جو اُن کی مخالفت کا سبب بنی ہوئی ہے یہاں تک کہ انھوں نے آپ کو تنگ کر کے مکہ میں سے نکلنے پر مجبور کر دیا کیونکہ) بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت (یعنی مال و جاہ) میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا ہم نے ان کو (عذاب سے) ہلاک کر دیا سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا (تو یہ بیچارے کیا چیز ہیں ان کو مغرور نہ ہونا چاہئے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں ان کو [illegible] سکتے ہیں اور آپ ان کے چند روزہ عیش سے مغموم نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر وقت پر ان کو بھی سزا دینے والے ہیں) تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح (ثابت بالدلیل) راستہ پر ہوں کیا وہ ان شخصوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہوں (یعنی جب ان دونوں فریق کے اعمال میں تفاوت ہے تو ان کے مآل اور انجام میں بھی تفاوت ضروری ہے، اہل حق ثواب کے اور اہل باطل عقاب و عذاب کے مستحق ہیں جس کا بیان یہ ہے) جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا (نہ بو میں نہ رنگ میں نہ مزے میں) اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوگی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل (میل کچیل سے پاک) صاف ہوگا اور ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (اس میں داخل ہونے سے پہلے) ان کے رب کی طرف سے (ان کی) بخشش ہوگی، کیا ایسے لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور کھولتا ہوا پانی ان کو پینے کو دیا جاوے گا تو وہ ان کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

معارف و مسائل

چونکہ دنیا کا پانی کبھی رنگ میں کبھی بو میں کبھی ذائقہ میں متغیر ہو جاتا ہے اسی طرح دنیا کا

اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اور (انہی کی قوم میں سے) جو لوگ راہ پر ہیں (یعنی مسلمان ہو چکے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو (احکام سُننے کے وقت) اور زیادہ ہدایت دیتا ہے (کہ وہ ان احکام جدیدہ پر بھی ایمان لاتے ہیں یعنی ان کی ایمانیات کی تعداد بڑھ گئی یا یہ کہ ان کے ایمان کو اور زیادہ قوی اور پختہ کر دیتے ہیں جو عمل صالح کا خاصہ ہے کہ اس سے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے) اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دیتا ہے (آگے ان منافقین کے لئے وعید ہے کہ یہ جو قرآن اور احکام الٰہیہ سن کر بھی متاثر نہیں ہوتے) سو (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر دفعۃً آپڑے (یہ بطور زجر و توبیخ کے فرمایا کہ اب بھی متاثر نہیں ہوتے تو کیا قیامت میں تذکر اور ہدایت حاصل کریں گے) سو (یاد رکھو کہ قیامت بھی نزدیک ہے چنانچہ) اس کی (متعدد) علامتیں تو آ چکی ہیں (چنانچہ از روئے حدیث خود خاتم النبیین کی بعثت و نبوت بھی علامات قیامت میں سے ہے اور شق قمر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہونے کے علاوہ قیامت کی علامات میں سے بھی ہے، یہ سب علامات زمانہ نزول قرآن میں موجود ہو چکی تھیں، آگے اس کا بیان ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پانے میں قیامت کا انتظار کرنا محض جہالت ہے کیونکہ وہ وقت سمجھنے اور عمل کرنے کا نہیں ہوگا۔ فرماتے ہیں) تو جب قیامت ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس وقت ان کو سمجھنا کہاں میسر ہوگا (یعنی مفید نہیں ہوگا)۔

معارف و مسائل

اشراط، شرط کے معنے علامات کے ہیں اور علامات قیامت کی ابتدا خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہو جاتی ہے کیونکہ ختم نبوت بھی قرب قیامت کی علامت ہے۔ اسی طرح شق قمر کے معجزہ کو بھی قرآن میں اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ کے ساتھ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ بھی علامات قیامت میں سے ہے۔ یہ تو علامات ابتدائیہ ہیں جو خود نزولِ قرآن کے وقت میں ظاہر ہو چکی تھیں دوسری علامات قریبہ احادیث صحیحہ میں ثابت ہیں ان میں سے ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ علاماتِ قیامت یہ ہیں۔

علم اُٹھ جائیگا، جہل بڑھ جائیگا، زنا کی کثرت ہوگی، شراب خوری کی کثرت ہوگی، مرد کم رہ جائیں گے، عورتیں بڑھ جائیں گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا متکفل ایک مرد ہوگا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ علم گھٹ جائے گا اور جہل پھیل جائے گا (بخاری و مسلم)

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مالِ غنیمت کو شخصی دولت سمجھ لیا جائے اور امانت کو مالِ غنیمت قرار دے لیا جائے (کہ حلال

سمجھا جاتا ہے، اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے (یعنی اس کی ادائیگی میں دل تنگی محسوس ہو) اور علم اغراض دنیوی کے لئے حاصل کیا جانے لگے، اور مرد اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، اور دوست کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور کرے، اور مساجد میں شور و شغب ہونے لگے اور قوم کا سردار اُن سب میں کا فاسق بدکار آدمی ہو جائے، اور قوم کا نمائندہ ان سب میں کا رذیل ہو جائے، اور شریر آدمی کا اکرام صرف اس لئے کرنا پڑے کہ اس کے شر سے بچیں، اور گانے والی عورتوں کا عام رواج ہو جائے، اور شرابیں پی جانے لگیں، اور اس امت کے آخری لوگ اپنے اسلاف پر لعنت کرنے لگیں تو اس وقت تم لوگ انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا اور زلزلہ کا اور لوگوں کے زمین میں دھنس جانے کا اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور آسمان سے پتھر برسنے کا اور دوسری علامات قیامت کا جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے موتیوں کی لڑی کو کاٹ دیا جائے اور موتی یک ایک کر کے نیچے گرتے ہیں۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ

سو تو جان لے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایماندار مردوں

وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَاكُمْ

اور عورتوں کے لئے، اور اللہ کو معلوم ہے بازگشت تمہاری اور ٹھکانا تمہارا۔

خلاصۂ تفسیر

(جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے مطیع و نافرمان بندوں اور ان دونوں کا حال و مآل سن چکے) تو آپ اس کا (اکمل طریقہ پر) یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے کوئی قابل عبادت نہیں (اس میں دین کے تمام اصول و فروع آگئے کیونکہ علم سے مراد علم کامل ہے اور علم کامل وہ ہے جس کے بعد تمام احکام الٰہیہ پر عمل ہو، حاصل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ پر مداومت رکھئے) اور (اگر کبھی کوئی خطا صادر ہو جائے جو آپ کی عصمت نبوت کی بنا پر درحقیقت گناہ نہیں بلکہ صرف ترک افضل ہی ہوگا مگر آپ کی شان رفیع کے اعتبار سے صورۃً خطا ہے اس لئے) آپ اپنی اس خطا کی معافی مانگتے رہئے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی (بخشش کی دعا) مانگتے رہئے، اور (یہ بھی یاد رہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی (یعنی سب حالات و احوال کی) خبر رکھتا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو ہر مومن مسلمان کو بھی حاصل ہے سیدالانبیاء کو کیوں حاصل نہ ہوتا پھر اس علم کے حاصل کرنے کا حکم دینا یا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے اور یا اسکے مقتضیات پر عمل کرنا مراد ہے جیسا کہ قرطبی نے نقل کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ سے کسی نے علم کی فضیلت کا سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کیا تم نے قرآن کا ارشاد نہیں سنا، فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ، کہ اسمیں علم کے بعد عمل کا حکم دیا ہے اسی طرح دوسری جگہ فرمایا اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ اور پھر فرمایا سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اسی طرح انفال میں فرمایا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اور تغابن میں فرمایا فَاحْذَرُوْهُمْ، ان سب مقامات میں اول علم پھر اس کے مقتضا پر عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے یہاں آیت مذکورہ میں بھی اگرچہ یہ علم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے حاصل تھا مگر مقصود اس سے اس کے مقتضیٰ پر عمل ہے اسی لئے اسکے بعد وَاسْتَغْفِرْ کا حکم دیا گیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بوجہ عصمت نبوت کے اسکے خلاف کرنیکا اگرچہ احتمال نہیں تھا مگر انبیاء علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے اور اجتہادی خطا قانون شرع میں گناہ نہیں بلکہ اُس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کو اس خطا پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے اور ان کی شانِ عالی کے اعتبار سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ عبس میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک قسم کا عتاب نازل ہوا وہ بھی اسی خطاء اجتہادی کی ایک مثال تھی جس کی تفصیل سورۂ عبس میں آئے گی کہ وہ اجتہادی خطا اگرچہ کوئی گناہ نہ تھا بلکہ ایک اجر اسپر بھی ملنے کا وعدہ تھا مگر آپ کی شانِ عالی کے لئے اس کو پسند نہیں کیا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا آیتِ مذکورہ میں اسی طرح کا ذنب مراد ہو سکتا ہے۔

فائدہ حضرت صدیق اکبرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ اور استغفار کی کثرت کیا کرو کیونکہ ابلیس کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں میں مبتلا کر کے ہلاک کیا تو انھوں نے مجھے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر ہلاک کر دیا، جب میں نے دیکھا تو میں نے ان کو ایسے خیالات باطلہ کے پیچھے لگا دیا جن کو وہ نیکی سمجھ کر کرتے ہیں جیسے عام بدعات کا یہی حال ہے۔ اس سے اُن کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ، متقلّب کے لفظی معنی لوٹ پوٹ ہونے یا اُلٹ پلٹ ہونے

کے اور مثویٰ کے معنی جائے قرار کے ہیں، اس کی مراد میں مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں اسی لئے حضرات مفسرین نے مختلف معنی بیان کئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ہر انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں، ایک وہ جن میں عارضی اور وقتی طور پر اشتغال ہوتا ہے دوسرے وہ جن کو وہ مستقل اپنا مشغلہ سمجھتا ہے، اسی طرح بعض کائنات میں انسان کا قیام عارضی ہوتا ہے بعض میں مستقل، تو آیت میں عارضی کو متقلب کے لفظ سے اور مستقل کو مثویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس طرح تمام احوال کا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہونا اس آیت کا مفہوم ہے

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ

اور کہتے ہیں ایمان والے کیوں نہ اتری ایک سورت پھر جب اتری ایک سورت

مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ

جانچی ہوئی اور ذکر ہوا اس میں لڑائی کا تو تو دیکھتا ہے ان کو جن کے دل میں روگ ہے

يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٠﴾

تکتے ہیں تیری طرف جیسے تکتا ہے کوئی بیہوش پڑا ہوا مرنے کے وقت سو خرابی ہے ان کی

طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ

حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنا پھر جب تاکید ہو کام کی تو اگر سچے رہیں اللہ سے

لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي

تو ان کا بھلا ہے پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو

الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ

ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں ایسے لوگ ہیں جن پر لعنت کی اللہ نے پھر کر دیا ان کو بہرا

وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ

اور اندھی کر دیں ان کی آنکھیں کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں

أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

ان کے قفل بیشک جو لوگ الٹے پھر گئے اپنی پیٹھ پر بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکی

لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿٢٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

ان پر سیدھی راہ شیطان نے بات بنائی ان کے دل میں اور دیر کے وعدے کئے یہ اس واسطے کہ انہوں

قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ

نے کہا ان لوگوں سے جو بیزار ہیں اللہ کی اتاری کتاب سے ہم تمہاری بات بھی مانیں گے بعضے کاموں میں اور اللہ

سامان (لڑائی کا) تیار ہی ہوجاتا ہے تو (اُس وقت بھی) اگر یہ لوگ (دعوی ایمان باللہ میں) اللہ
سے سچے رہتے (یعنی دعوٰی ایمان کے مقتضا پر عمل کرتے جس میں تمام احکام شرعیہ عموماً اور
حکم جہاد خصوصاً شامل ہے اور صدق دل سے جہاد کرتے) تو اُن کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا (یعنی
ابتدا میں اگر منافق تھے تو اخیر ہی میں نفاق سے تائب ہوجاتے تب بھی ایمان مقبول ہوجاتا اور
انتہا کو اس میں مضر نہ سمجھا جاوے کیونکہ وقت موت تک صدق دل سے توبہ مقبول ہے آگے جہاد
کی تاکید اور اُس سے پیچھے رہنے والوں کو خطاب کرکے ترک جہاد پر بیان فرماتے ہیں کہ تم لوگ جو جہاد
سے کراہت کرتے ہو) سو (اس میں ایک دُنیوی مضرت بھی ہے چنانچہ) اگر تم (اور اسی طرح
سب جہاد سے) کنارہ کش رہو تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے (یعنی ہونا چاہئے) کہ تم (یعنی تمام
آدمی) دنیا میں فساد مچادو اور آپس میں قطع قرابت کردو (یعنی جہاد سے بڑا فائدہ اقامت عدل و اصلاح
و امن کا ہے اگر اس کو چھوڑ دیا جاوے تو مفسدین کا غلبہ ہوجاوے اور کوئی انتظام جس میں تمام دُنیوی
مصالح کی حفاظت ہو نہ رہے اور ایسے انتظام نہ ہونے کے لئے فساد عام اور اضاعت حقوق لازم ہے
پس جس جہاد میں دُنیوی منفعت بھی ہو اُس سے پیچھے ہٹنا اور بھی عجیب ہے، آگے ان منافقین و مرتدین
کی تقبیح ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دور کردیا (اس لئے ان کو احکام پر
عمل کی توفیق نہ ہوئی) پھر (رحمت سے بعید کرنے پر یہ امر مرتب ہوا کہ) اُن کو (گوش قبول احکام
الٰہیہ سننے سے) بہرا کردیا اور (راہِ حق کے دیکھنے سے) اُن کی (باطنی) آنکھوں کو اندھا کردیا (آگے
ان پر توبیخ ہے کہ باوجودیکہ قرآن میں جہاد اور دیگر احکام کا وجوب مع دلائل حقانیت قرآن کے
اور ان احکام کے مصالح و منافع اخرویہ لازماً اور دنیویہ بھی احیاناً اور ان احکام کی مخالفت پر
وعیدیں مذکور ہیں پھر جو یہ لوگ اُس طرف التفات نہیں کرتے) تو کیا یہ لوگ قرآن (کے اعجاز
اور مضامین) میں غور نہیں کرتے (اس لئے ان کو انکشاف نہیں ہوتا) یا (غور کرتے ہیں مگر) دلوں
پر (غیبی) قفل لگ رہے ہیں (یہ منع الخلو ہے، یعنی ان دونوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری
اور دونوں جمع ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے، اور واقع میں یہاں دونوں باتیں مجتمع ہیں، اول اُن کی طرف سے
ایک فعل ہوا یعنی انکار کی وجہ سے قرآن میں غور نہ کرنا پھر اُن کے دلوں پر قفل لگ گیا جس کو طبع اور
ختم (یعنی مہر لگادینا) بھی کہا گیا ہے اور دلیل اس ترتیب کی یہ آیت ہے ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اٰمَنُوْا
ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور اس مجموعہ پر فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ مرتب ہے، آگے اس عدم تدبر
کی وجہ فرماتے ہیں کہ) جو لوگ (حق سے) پشت پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا راستہ اُن کو
(دلائل عقلیہ مثل اعجاز قرآن اور دلائل نقلیہ مثل پیشین گوئی کتب سابقہ سے) صاف معلوم ہوگیا
شیطان نے ان کو چکمہ دیا ہے اور اُن کو دُور دُور کی سوجھائی ہے (کہ ایمان لانے میں فلاں فلاں مصلحت

موجود ہیں یا جو آئندہ متوقع ہیں فوت ہو جاویں گی، حاصل یہ ہوا کہ اس عدم تدبر کی وجہ عناد ہے وہ ہدایت کے واضح ثبوت کے بعد پھر یہ اُلٹے پاؤں لوٹے جا رہے اور اس عناد کے بعد تسویل شیطانی ہوئی یعنی شیطان نے ان کی نظروں میں اس غلط اور مہلک عمل کو مزین کر کے دکھلایا اور اس تسویل سے عدم تدبر ہوا اور عدم تدبر سے ختم اور طبع یعنی دلوں پر مہر ہوئی پھر) یہ (ہدایت سامنے آجانے کے باوجود اس سے لوٹنا اور دور ہونا) اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اتارے ہوئے احکام کو (حسداً) ناپسند کرتے ہیں (مراد اس سے یہود ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرتے تھے اور باوجود معرفت حق کے اتباع سے عار رکھتے تھے۔ حاصل یہ کہ ان منافقین نے ان یہود سے) یہ کہا کہ بعضی باتوں میں ہم تمہارا کہنا مان لیں گے (یعنی تم جو ہم کو اتباع محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہو اس کے دو درجے ہیں ایک عدم اتباع ظاہراً دوسرا عدم اتباع باطناً سو درجہ اول میں تو ہم بمصلحت تمہارا کہنا نہیں مان سکتے لیکن درجہ ثانی میں مان لیں گے کیونکہ عقائد میں ہم تمہارے ساتھ ہیں، کما قالوا اِنَّا مَعَكُمْ، مطلب یہ ہوا کہ حق سے پھرنے کا سبب قومی تعصب اور کورانہ تقلید ہے، غرض ابتدا سلسلہ کی اس سے ہے اور انتہا ختم و طبع پر) اور (گو اس قسم کی باتیں یہ منافقین خفیہ کرتے ہیں مگر) اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ باتیں کرنے کو (خوب) جانتا ہے (اور بعض امور پر وحی سے آپ کو مطلع کر دیتا ہے۔ آگے وعید ہے، وکلہ اولیٰ بہ کی تفسیر کے طور پر ہو سکتی ہے یعنی یہ جو ایسی حرکتیں کر رہے ہیں) سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہوں گے اور ان کے مونہوں پر اور پشتوں پر مارتے جاتے ہوں گے (اور) یہ (سزا) اس سبب سے (ہوگی) کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اسی پر چلے اور اس کی رضا (یعنی اعمال موجب رضا) سے نفرت کیا کئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سب اعمال (نیک ابتداء ہی سے) کالعدم کر دیئے (پس اس سزا کے مستحق ہوگئے اور کسی کے پاس کوئی عمل مقبول ہوتا تو اس کی برکت سے عقوبت میں کچھ تو کمی ہو جاتی ہے آگے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ کے مضمون کی شرح کے طور پر ہے کہ) جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے (اور وہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں) کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا (یعنی یہ ان کو کیسے اطمینان ہو گیا جبکہ حق تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا ثابت اور مسلم ہے) اور ہم (تو) اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتلا دیتے سو آپ ان کو ان کے حلیہ سے پہچان لیتے (پورے پتہ کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک کا پورا حلیہ بتا دیتے) اور (گو بمصلحت ہم نے اس طرح نہیں بتلایا لیکن) آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے (کیونکہ ان کا کلام صدق پر مبنی نہیں اور آپ کو نور فراست سے اللہ تعالیٰ نے صدق و کذب کی پہچان دی تھی کہ صدق کا اثر قلب پر اور ہوتا تھا اور کذب

کا، اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صدق اطمینان بخش ہوتا ہے اور جھوٹ دل میں شک پیدا کرتا ہے)
اور (آگے مومنین و منافقین سب کو خطاب ہے جو ایک طور ترغیب و ترہیب کے فرماتے ہیں کہ)
اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (پس مسلمانوں کو ان کے خلوص پر جزا اور منافقین کو
ان کے نفاق اور دھوکہ پر سزا دیگا) اور (آگے احکام شاقہ مثل جہاد وغیرہ کی ایک حکیمانہ حکمت
ارشاد ہے جیسا اوپر قبل عسیتم کے بھی ایک حکیمانہ حکمت ارشاد فرمائی تھی یعنی) ہم (ایسے
امور شاقہ کا حکم دے کر) ضرور تمہاری سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم (ظاہری طور پر
بھی) ان دونوں کو معلوم (اور ممتاز) کرلیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو (جہاد میں)
ثابت قدم رہنے والے ہیں، اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کرلیں (یہ اسلئے بڑھا دیا کہ
علاوہ حکم جہاد کے اور احکام بھی داخل ہوجاویں اور علاوہ حالت مجاہدہ و صبر کے دوسرے
حالات بھی داخل ہوجاویں)

معارف و مسائل

سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ، محکمہ کے لفظی معنی منضبط و مستحکم کے ہیں اس لغوی معنی کے اعتبار سے
تو قرآن کی ہر سورت محکمہ ہے لیکن اصطلاح شرع میں محکم بمقابلہ منسوخ استعمال ہوتا ہے، یہاں
سورت کے ساتھ محکمہ کی قید کا اضافہ اسلئے ہے کہ عمل کا شوق تو جبھی پورا ہو سکتا ہے جبکہ وہ سورت
منسوخ نہ ہو۔ اور قتادہ نے فرمایا کہ جتنی سورتوں میں قتال و جہاد کے احکام آئے ہیں وہ سب
محکمہ ہیں۔ یہاں چونکہ اصل مقصود حکم جہاد اور اس پر عمل ہے اسلئے سورت کیساتھ محکمہ کا لفظ
بڑھا کر جہاد کی طرف اشارہ کر دیا جس کی آگے تصریح آرہی ہے۔ (قرطبی)

أَوْلَىٰ لَهُمْ، اس کے معنی اصمعی کے قول کے مطابق یہ ہیں فَاَدْنَاهُ مَا يُهْلِكُهُ یعنی ان کی ہلاکت
کے اسباب قریب آچکے ہیں (قرطبی)

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ
لفظ تولی کے لغت کے اعتبار سے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک اعراض دوسرے کسی قوم و جماعت
پر اقتدار و حکومت۔ اس آیت میں بعض حضرات مفسرین نے پہلے معنی لئے ہیں جسکو اوپر خلاصہ
تفسیر میں لکھا گیا ہے۔ ابوحیان نے بحر محیط میں اسی کو ترجیح دی ہے اس معنے کے اعتبار سے
مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر تم نے احکام شرعیہ الٰہیہ سے روگردانی کی جن میں حکم جہاد بھی شامل ہے
تو اسکا اثر یہ ہوگا کہ تم جاہلیت کے قدیم طریقوں پر پڑ جاؤ گے جسکا لازمی نتیجہ زمین میں فساد
اور قطع ارحام ہے جیسا کہ جاہلیت کے ایام میں اسکا مشاہدہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ

دوسرے قبیلہ پر چڑھائی اور قتل و غارت کرتا تھا، اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اسلام نے ان تمام رسوم جاہلیت کو مٹایا اور ان کے مٹانے کے لئے حکم جہاد جاری فرمایا جو اگرچہ ظاہر میں خونریزی ہے مگر درحقیقت اس کا حاصل سڑے ہوئے عضو کو جسم سے الگ کر دینا ہے تاکہ باقی جسم سالم رہے۔ جہاد کے ذریعہ عدل و انصاف اور قرابتوں اور رشتوں کا احترام قائم ہوتا ہے۔ اور روح المعانی قرطبی وغیرہ میں اس جگہ تولّی کے معنی حکومت و امارت کے لئے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمہارے حالات جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اُن کا تقاضا یہ ہے کہ اگر تمہاری مراد پوری ہو، یعنی اسی حالت میں تمہیں ملک و قوم کی ولایت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو نتیجہ اس کے سوا نہیں ہوگا کہ تم زمین میں فساد پھیلاؤ گے اور رشتوں قرابتوں **کو توڑ ڈالوگے۔**

صلہ رحمی کی سخت تاکید اور لفظ ارحام رحم کی جمع ہے جو ماں کے پیٹ میں انسان کی تخلیق کا مقام ہے۔ چونکہ عام رشتوں قرابتوں کی بنیاد وہیں سے چلتی ہے اسلئے محاورات میں رحم بمعنی قرابت اور رشتہ کے استعمال کیا جاتا ہے تفسیر روح المعانی میں اس جگہ اسکی تفصیلی بحث کی ہے کہ ذوی الارحام اور ارحام کا لفظ کن کن قرابتوں پر حاوی ہے۔ اسلام نے رشتہ داری اور قرابت کے حقوق پورے کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور دوسرے دو اصحاب سے اس مضمون کی حدیث نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص صلہ رحمی کریگا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے قریب کرینگے اور جو رشتہ قرابت قطع کریگا اللہ تعالیٰ اسکو قطع کر دینگے جس سے معلوم ہوا کہ اقرباء اور رشتہ داروں کے ساتھ اقوال و افعال اور مال کے ذریعہ نیک احسان کا سلوک کرنے کا تاکیدی حکم ہے حدیث مذکور میں حضرت ابوہریرہؓ نے اس آیت قرآن کا حوالہ بھی دیا کہ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کوئی ایسا گناہ جس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں اس کے علاوہ، ظلم اور قطع رحمی کے برابر نہیں (رواہ ابوداؤد والترمذی، ابن کثیر)۔ اور حضرت ثوبانؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور رزق میں برکت ہو اسکو چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔ احادیث صحیحہ میں یہ بھی ہے کہ قرابت کے حق کے معاملہ میں دوسری طرف سے برابری کا خیال نہ کرنا چاہیئے اگر دوسرا بھائی قطع تعلق اور ناروا سلوک بھی کرتا ہے جب بھی تمہیں حسن سلوک کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ صحیح بخاری میں ہے

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو صرف برابر کا بدلہ دے بلکہ صلہ رحمی کرنیوالا وہ ہے کہ

اُن کے بارے میں نازل ہوا کہ یہ لوگ اللہ رب العالمین کو عالم الغیب جانتے ہوئے اس بات سے کیوں بے فکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ انکے باطنی راز اور دشمنی عداوت کو لوگوں پر ظاہر کردیں۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ برأت میں انکے ایسے اعمال و افعال اور حرکتوں کا پتہ دیدیا جن سے منافقین کے نفاق کا پتہ چل جائے اور وہ پہچانے جائیں، اسی لئے سورۂ برأت کو فاضحہ بھی کہا جاتا ہے یعنی رسوا کرنے والی کیونکہ اسنے منافقین کی خاص خاص علامتیں ظاہر کردی ہیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ، یعنی اگر ہم چاہیں تو آپ کو بالتعیین منافقین کو دکھلادیں اور ان کا ایسا حلیہ بتلادیں جس سے آپ ہر ایک منافق کو شخصی طور پر پہچان لیں، قرآن نے اس مضمون کو حرف لَو سے بیان کیا ہے جس کا استعمال اُنہی شرطوں کے لئے ہوتا ہے جن کا وقوع نہ ہوا ہو، اسلئے آیت کے معنے یہ ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر منافق کو آپ کو شخصی طور پر متعین کرکے بتلادیتے مگر ہم نے بحکمت و مصلحت اپنے حلم و بردباری سے ان کو اس طرح رسوا کرنا پسند نہیں کیا تاکہ ضابطہ یہ قائم رہے کہ تمام اُمور کو ظاہر پر محمول کیا جائے اور باطنی حالات اور قلبی مضمرات کو صرف علیم و خبیر اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے، البتہ آپ کو ایسی بصیرت ہم نے دیدی کہ آپ منافق کو خود انہیں کے کلام سے پہچان لیں، وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ کا یہی مفہوم ہے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز اپنے دل میں چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کے چہرے سے اور سبقت لسانی سے ظاہر کردیتے ہیں یعنی وہ اس گفتگو میں سے کچھ ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے اسکا دلی راز ظاہر ہوجائے۔ اسی ہی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے دل میں کوئی بات چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے وجود پر اس چیز کی چادر اُڑھا دیتے ہیں۔ اگر وہ چیز کوئی اچھی بھلی ہے تو وہ ظاہر ہوکر رہتی ہے اور بری ہے تو وہ ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ اور بعض روایات حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کا آپ کو شخصی طور پر بھی علم دیدیا گیا تھا جیسا کہ مسند احمد میں عقبہ ابن عمروؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں خاص خاص منافقین کے نام لیکر ان کو مجلس سے اُٹھا دیا اسمیں چھتیس آدمیوں کے نام شمار کیے گئے ہیں (ابن کثیرؒ)۔

حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ، اللہ تعالیٰ کو تو ازل سے ہر شخص کے اعمال و افعال کا علم محیط ازلی ابدی ہے، یہاں علم سے مراد ظہور و وقوع ہے، یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھی اسکا وقوع و ظہور ہو کر واقعاتی علم ہوجائے (ابن کثیرؒ)، واللہ اعلم

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکا انھوں نے اللہ کی راہ سے اور مخالف ہوگئے رسول سے

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ

اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

ان کے سب کام

وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ

اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَ

تَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ

اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ

تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا

فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ

لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا

يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا

يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾

تو بدل لے گا اور لوگ تمہارے سوائے پھر وہ نہ ہوں گے تمہاری طرح کے

خلاصۂ تفسیر

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے (اوروں کو بھی) اللہ کے رستہ (یعنی دین حق) سے روکا اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان کو (دین کا) رستہ (دلائلِ عقلیہ سے مشرکین کے لئے اور نقلیہ سے بھی اہلِ کتاب کے لئے) نظر آچکا تھا یہ لوگ

(کے دین) کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے (بلکہ یہ دین ہر حال میں پورا ہو کر رہنے کا چنانچہ ہوا)
اور اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو (جو دین حق کے مٹانے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں) مٹا دے گا
اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور (چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ ہی کا حکم بتلاتے ہیں
خواہ خاص طور پر وحی الٰہی میں اسکا حکم ہوا ہو یا وحی الٰہی میں کوئی ضابطہ بیان فرمایا گیا ہو اور
اس خاص حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضابطہ میں داخل ہونے کی بنا پر حکم دیا ہو اس
لئے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (بھی) اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ و رسول کی مخالفت
کرکے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو (اس کی تفصیل معارف و مسائل میں آئے گی) بیشک
جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے رستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر (بھی) گئے سو
خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا (عدم مغفرت کے لئے کفر کے ساتھ صد عن سبیل اللہ شرط
نہیں بلکہ صرف کفر الی الموت تک کا ہی اثر ہے مگر زیادت تشنیع کے لئے یہ قید واقعی
بڑھا دی کہ اس وقت کے رؤسائے کفار میں یہ امر بھی متحقق تھا آگے مومنین کے ہدایت اور کفار
کے قبائح پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب معلوم ہو گیا کہ مسلمان خدا کے محبوب اور کفار مبغوض
ہیں) تو (اے مسلمانو، تم کفار کے مقابلہ میں) ہمت مت ہارو اور (ہمت ہار کر ان کو صلح
کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے (اور وہ مغلوب ہونگے کہ تم محبوب ہو اور وہ مبغوض ہیں)
اور اللہ تمہارے ساتھ ہے (یہ تو تم کو دنیا کی کامیابی ہوئی اور (آخرت میں یہ کامیابی ہوگی
کہ اللہ تعالیٰ) تمہارے اعمال (کے ثواب) میں ہرگز کمی نہ کرے گا (یہ تو ہمت افزائی کرکے جہاد
کی ترغیب تھی آگے دنیا کے فانی ہونے کا ذکر کرکے جہاد کی ترغیب اور انفاق فی سبیل اللہ کی
تمہید ہے کہ) یہ دنیوی زندگی تو محض ایک لہو و لعب ہے (اگر اس میں جان اور مال کو اپنے
فائدہ کے لئے بچانا چاہے تو وہ فائدہ ہی کتنے دن کا ہے اور دین کا حاصل) اور اگر تم ایمان
اور تقویٰ اختیار کرو (جس میں جہاد بالنفس والمال بھی آ گیا) تو (تم کو تو اپنے پاس سے نفع پہنچا دیگا
اس طرح کہ) تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور (تم سے کسی نفع کا طالب نہ ہوگا چنانچہ) تم سے
تمہارے مال (تک بھی جو کہ جان سے کم ہیں سب اپنے نفع کے لئے) طلب نہیں کرے گا (جب تم
سے ایسی چیز نہیں طلب کرتا جس کا دینا آسان ہے تو جان جس کا دینا مشکل ہے وہ تو کیوں
طلب کرے گا چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارے جان و مال کے خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع
نہیں اور نہ یہ ممکن ہے وہذا کقولہ تعالیٰ وَيُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ چنانچہ) اگر (امتحاناً) تم سے تمہارے
مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے (یعنی سب مال طلب کرنے لگے)
تو تم (یعنی تم میں سے اکثر) بخل کرنے لگو (یعنی دینا گوارا نہ کرو) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ

تمہاری ناگواری ظاہر کردے (یعنی نہ دینے سے کہ فعل ظاہری ہے باطنی ناگواری نکل جاوے اس لئے یہ فرد ممکن بھی واقع نہیں کی گئی اور) ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں (جس کا نفع تمہاری طرف عائد ہونا یقینی ہے تھوڑا سا حصہ مال کا) خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے (اور بقیہ اکثر تمہارے قبضہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے) سو اس پر بھی) بعضے تم میں سے وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور (آگے اس فرد واقع پر بخل کی مذمت ہے کہ) جو شخص (ایسی جگہ خرچ کرنے میں) بخل کرتا ہے تو وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے (یعنی اپنے ہی کو اس کے نفع دائمی سے محروم رکھتا ہے) اور (غنیمت تو) اللہ تو کسی کا محتاج نہیں (تاکہ احتمال اسکے ضرر کا ہو) اور (بلکہ) تم سب (اسکے) محتاج ہو (اور تمہاری اس احتیاج کی رعایت سے تم کو انفاق کا حکم کیا گیا کیونکہ آخرت میں تم کو ثواب کی حاجت ہوگی اور واقع اس کا یہی اعمال ہیں اور) اگر تم (ہمارے احکام سے) روگردانی کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا (اور) پھر وہ تم جیسے (روگردانی کرنے والے) نہ ہوں گے (بلکہ نہایت فرمانبردار ہوں گے یہ کام ان سے لیا جاوے گا اور اس طرح وہ حکمت پوری ہو جاوے گی)

معارف و مسائل

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ، یہ آیت بھی منافقین اور یہود بنی قریظہ و بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ ان منافقین کے متعلق ہے جنہوں نے غزوہ بدر کے موقع پر کفار قریش کی امداد اس طرح کی کہ انہیں سے بارہ آدمیوں نے انکے پورے لشکر کا کھانا اپنے ذمہ لیا تھا، ہر روز ان میں سے ایک آدمی لشکر کفار کے کھانے کا انتظام کرتا تھا۔

وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ، یہاں حبط اعمال سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انکی اسلام کے خلاف کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دے بلکہ اکارت کردے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ انکے کفر و نفاق کی وجہ سے انکے نیک عمل مثل صدقات وغیرہ کے سب اکارت ہو جاتے قابل قبول نہ ہونگے۔ لَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ، قرآن کریم نے اس جگہ حبط اعمال کے بجائے ابطال اعمال کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا مفہوم بہت عام ہے کیونکہ ابطال کی ایک تو وہ صورت ہے جو کفر کی وجہ سے پیش آتی ہے جس کو اوپر آیت میں حبط اعمال کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ کافر اصلی کا تو کوئی عمل بوجہ کفر کے قبول ہی نہیں اور جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا تو زمانہ اسلام کے اعمال اگرچہ لائق قبول تھے مگر اسکے کفر و ارتداد نے ان سب اعمال کو بھی اکارت کر دیا۔

دوسری صورت ابطال اعمال کی یہ بھی ہے کہ بعض اعمال صالحہ کے لئے کچھ دوسرے اعمال

وَلَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ، اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرتا مگر پورے قرآن میں زکوٰۃ و صدقات کے احکام اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے بیشمار مواقع آئے ہیں اور خود اسکے بعد ہی دوسری آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید آرہی ہے اسلئے بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے اسلئے بعض حضرات نے لَا یَسْئَلْکُمْ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اموال تم سے کسی اپنے نفع کے لئے نہیں مانگتا بلکہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے مانگتا ہے جسکا ذکر اسی آیت میں یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ کے الفاظ سے کر دیا گیا ہے کہ تم سے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے کہا گیا وہ اس لئے ہے کہ آخرت میں جہاں تمہیں سب سے زیادہ ضرورت نیکیوں کی ہوگی اسوقت یہ خرچ کرنا تمہارے کام آئے وہاں تمہیں اسکا اجر ملے۔ مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں اسی مفہوم کو اختیار کیا گیا ہے۔ اسکی نظیر یہ آیت مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے اپنے لئے کوئی رزق نہیں لیتے نہ اسکی ہمیں حاجت ہے اور بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ لَا یَسْئَلْکُمْ سے مراد پورا مال طلب کرلینا ہے (یہ قول ابن عیینہ کا ہے) اسکا قرینہ اگلی آیت ہے جس میں فرمایا ہے اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْهَا فَیُحْفِکُمْ کیونکہ یحف احفاء سے مشتق ہے جسکے معنی مبالغہ اور کسی کام میں انتہا تک پہنچ جانے کے ہیں۔ اس دوسری آیت کا مفہوم سب کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے اموال پورے طلب کرتا تو تم بخل کرنے لگتے اور اس حکم کی تعمیل مشکل ہوتی یہاں تک کہ ادائیگی کے وقت تمہاری یہ ناگواری ظاہر ہو جاتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں لَا یَسْئَلْکُمْ سے مراد وہی ہے جو دوسری آیت میں فَیُحْفِکُمْ کی قید کیساتھ آیا ہے تو مطلب دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مالی فرائض زکوٰۃ وغیرہ تم پر عائد کئے ہیں اول تو وہ خود تمہارے ہی فائدہ کیلئے ہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی اپنا فائدہ نہیں، دوسرے یہ کہ اُن فرائض میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے مال کا اتنا تھوڑا سا جزو فرض کیا ہے جو کسی پر بار خاطر نہ ہونا چاہئے زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ زمین کی پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصہ، سو بکریوں میں سے ایک بکری، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پورے اموال تو طلب نہیں کئے جنکا دینا ناگوار اور بار خاطر طبعاً ہوتا بلکہ اسکا قلیل حصہ طلب فرمایا ہے اسلئے تمہارا فرض ہے کہ اسکو خوشدلی کیساتھ ادا کیا کرو اور اس دوسری آیت میں جو ارشاد ہے یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ اسمیں اضغان جمع ضغن کی ہے جس کے معنی مخفی کینہ اور مخفی کراہت کے ہیں اس جگہ بھی مخفی کراہت و ناگواری مراد ہے یعنی طبعی طور پر انسان کو اپنا پورا مال بخشش کر دینا ناگوار ہوتا ہے جسکو وہ ظاہر بھی نہ کرنا چاہے تو ادائیگی کے وقت ٹال مٹول وغیرہ سے یہ ناگواری کھل ہی جاتی ہے تو حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے پورے اموال کا مطالبہ کرلیتا تو تم بخل کرنے لگتے اور بخل کیوجہ سے جو ناگواری اور کراہت تمہارے دلوں میں ہوتی

وہ اس کا اظہار ہو جاتی، اس لئے اس نے تمہارے اموال میں سے ایک قلیل مقدار پر فرض
کیا ہے، مگر اس میں بھی بخل کرنے لگے اسی کا بیان آخری آیت میں اس طرح فرمایا ہے کہ
ھٰۤاَنۡتُمۡ ہٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ یعنی تم کو تمہارے اموال کا
کچھ حصہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی طرف دعوت دیجاتی ہے تو تم میں سے بعض آدمی بخل کرنے لگتے ہیں
اسکے بعد فرمایا، وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ یعنی جو شخص بھی بخل کرتا ہے وہ کچھ
اللہ کا نقصان نہیں کرتا بلکہ خود اپنی جان کا نقصان اس بخل کے ذریعہ کرتا ہے کہ آخرت کے ثواب سے
محرومی اور اسکے غضب کا وبال ہے، پھر اسی بات کو زیادہ وضاحت سے فرمایا وَاللّٰہُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ
الۡفُقَرَآءُ ۚ یعنی اللہ تو غنی ہے تم ہی محتاج ہو، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خود تمہاری حاجت کا پورا کرنا ہے
وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ، اس آیت میں حق تعالیٰ
کے غنی الاغنیاء ہونے کو اس طرح واضح کیا ہے کہ اللہ کو تمہارے اموال کی تو کیا خود تمہارے وجود کی
بھی کوئی ضرورت نہیں، اگر تم سب کے سب ہمارے احکام کی تعمیل چھوڑ دو تو جب تک ہمیں دنیا کو اور
انمیں اسلام کو باقی رکھنا ہے ہم اپنے دین حق کی حفاظت اور اپنے احکام کی تعمیل کیلئے دوسری کوئی
قوم پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح احکام شرعیہ سے گریز اور اعراض نہ کریگی بلکہ ہماری مکمل اطاعت
کریگی، حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ مراد اس سے عجمی لوگ ہیں، اور حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اس
سے مراد فارس اور روم ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
اس آیت کی تلاوت صحابہ کرامؓ کے سامنے فرمائی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ ایسی
کونسی قوم ہے کہ اگر ہم (خدانخواستہ) احکام دین سے روگردانی کرنے لگیں تو وہ ہمارے بدلے میں لائی
جائیگی اور پھر وہ ہماری طرح احکام سے روگردانی نہیں کریگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
سلمان فارسیؓ (جو مجلس میں موجود تھے) کی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ اور اسکی قوم، اور اگر (بالفرض)
دین حق ثریا ستارے پر بھی ہوتا جہاں لوگوں کی رسائی مشکل ہوتی، تو فارس کے یہ لوگ وہاں
بھی پہنچ کر دین کو حاصل کرتے اور اسپر عمل کرتے (رواہ الترمذی والحاکم وصححہ وابن حبان، مظہری)
شیخ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب جو ابوحنیفہؒ کے مناقب میں لکھی ہے اس میں فرمایا ہے کہ
اس سے مراد ابوحنیفہ اور انکے اصحاب ہیں کیونکہ ابنائے فارس میں کوئی جماعت علم کے اس مرتبہ پر
نہیں پہنچی جس پر ابوحنیفہ اور انکے اصحاب پہنچے ہیں (حاشیہ تفسیر مظہری)

تمت بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ سورۃ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) لرابع عشر من
شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ یوم السبت بعد العصر

سُوْرَةُ الْفَتْحِ

سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ
سورۂ فتح مدینہ میں نازل ہوئی اسکی اُنتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ
ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے

ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾
گناہ اور جو پیچھے رہے اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾
اور مدد کرے تیری اللہ زبردست مدد

خُلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے (اس صلح حدیبیہ سے) آپ کو ایک کُھلم کُھلا فتح دی (یعنی صُلح حدیبیہ سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ سبب ہوگئی ایک فتح مطلوب یعنی فتح مکہ کا، اس لحاظ سے یہ صُلح ہی فتح ہوگئی۔ اور فتح مکہ فتح مبین اسلئے کہا گیا کہ فتح سے مقصود شریعت اسلام میں کوئی حکمرانی نہیں بلکہ دین اسلام کا غلبہ مقصود ہوتا ہے، اور فتح مکہ سے یہ مقصود بڑی حد تک حاصل ہوگیا، کیونکہ تمام قبائل عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آگئے تو ہم بھی اطاعت کرلیں گے جب مکہ فتح ہوا تو چاروں طرف سے عرب کے قبائل اُمنڈ پڑے اور خود یا بواسطہ اپنے وفود کے اسلام لانا شروع کیا (رواہ البخاری عن عمرو بن سلمہ) چونکہ غلبۂ اسلام کے بڑے آثار فتح مکہ سے نمایاں ہوئے ہیں اسلئے اس کو فتح مبین فرمایا گیا، اور صلح حدیبیہ

اس فتح مکہ کا سبب اور ذریعہ اس طرح ہوگئی کہ اہلِ مکہ سے آئے دن لڑائی رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی قوت اور سامان بڑھانے کی مہلت و فرصت نہ ملتی تھی۔ حدیبیہ کے واقعہ میں جو صلح ہوگئی تو اطمینان کیساتھ مسلمانوں نے کوشش کی جس سے بہت سے نئے آدمی مسلمان ہوگئے اور مجمع مسلمانوں کا بڑھ گیا اور فتح خیبر وغیرہ سے سامان بھی درست ہوگیا اور ایسے ہوگئے کہ دوسروں پر دباؤ پڑ سکے، پھر قریش کی طرف سے عہد شکنی ہوئی تو آپ دس ہزار صحابہ کرام کیساتھ مقابلہ کیلئے چلے۔ اہل مکہ اسقدر مرعوب ہوئے کہ زیادہ لڑائی بھی نہیں ہوئی اور اطاعت قبول کرلی اور جو لڑائی ہوئی بھی تو اتنی کم اور خفیف کہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہوگیا کہ مکہ مکرمہ صلح کیساتھ فتح ہوا یا جنگ سے، غرض اس طرح یہ صلح سبب فتح ہوگئی اسلئے مجازی طور پر اس صلح کو بھی فتح فرما دیا گیا جس میں فتح مکہ کی پیشین گوئی بھی ہے۔ آگے اس فتح کے دینی اور دنیوی ثمرات و برکات کا بیان ہے کہ یہ فتح اسلئے میسر ہوئی تاکہ (تبلیغ دین اور دعوت حق میں آپ کی کوششوں کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں اور اس سے آپ کا اجر بہت بڑھ جائے اور کثرتِ اجر و قُرب کی برکت سے) اللہ تعالیٰ آپکی سب اگلی پچھلی (صوری) خطائیں معاف فرما دے اور آپ پر (جو اللہ تعالیٰ نے احسانات (کرتا آتا ہے مثلاً آپ کو نبوت دی، قرآن دیا، بہت سے علوم دیئے بہت سے اعمال کا ثواب دیا، اُن احسانات کی اور زیادہ) تکمیل کر دے (اس طرح کہ آپکے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں جس سے آپکا اجر اور مقام قرب اور بلند ہو یہ دو نعمتیں تو آخرت سے متعلق ہیں) اور (دو نعمتیں دُنیوی ہیں ایک یہ کہ) آپ کو بغیر کسی روک ٹوک کے دین کے، سیدھے راستہ پر لے چلے (اور اگرچہ آپکا صراط مستقیم پر چلنا پہلے سے متحقق ہے مگر اس میں کفار کی مزاحمت ہوتی تھی اب یہ مزاحمت نہیں رہے گی) اور (دوسری دُنیوی نعمت یہ ہے کہ) اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو (یعنی جس کے بعد آپکو کبھی کسی سے دبنا نہ پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تمام جزیرۃ العرب پر آپ کا تسلط ہوگیا)

معارف و مسائل

جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر کے نزدیک سورۂ فتح سنہ ۶ ہجری میں اُس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ بقصد عمرہ مکہ مکرمہ مع جماعت صحابہ کے تشریف لے گئے اور حرم مکہ کے قریب مقام حدیبیہ تک پہنچ کر قیام فرمایا مگر قریشِ مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے منع کیا پھر اس پر صلح کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ اس سال تو آپ واپس چلے جائیں اگلے سال اس عمرہ کی قضا کر لیں۔ بہت سے صحابہ کرام خصوصاً فاروقِ اعظمؓ اس طرح کی صلح سے ناراض تھے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بشارت ربانی اس صلح کو انجام کار مسلمانوں کے لئے ذریعہ کامیابی سمجھ کر قبول فرمایا جس کی تفصیل آگے آتی ہے

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا احرام عمرہ کھول دیا اور حدیبیہ سے واپس روانہ ہوئے تو راستہ میں یہ سورت پوری نازل ہوئی جس میں بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا ہے ضرور واقع ہوگا مگر اس کا یہ وقت نہیں بعد میں فتح مکہ کے وقت ہوگا اور اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا کیونکہ یہی صلح ہی درحقیقت فتح مکہ کا سبب بنی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے فرمایا ہے کہ تم لوگ تو فتح مکہ کو فتح کہتے ہو اور ہم صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جابرؓ نے فرمایا کہ ہم صلح حدیبیہ ہی کو فتح سمجھتے ہیں اور حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ تم لوگ تو فتح مکہ ہی کو فتح سمجھتے ہو اور کوئی شک نہیں کہ وہ فتح ہے لیکن ہم تو واقعہ حدیبیہ کے وقت بیعت رضوان کو اصلی فتح سمجھتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین صحابہ جن کی تعداد چودہ سو تھی ایک درخت کے نیچے جہاد کرنے پر بیعت لی تھی جیسا کہ اسی سورت میں اس بیعت کا ذکر بھی آگے آرہا ہے (نقل از ابن کثیر) اور جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سورت واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے اور اس واقعہ کے بہت سے اجزاء کا خود اس سورت میں تذکرہ بھی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو پہلے ذکر کر دیا جائے۔ تفسیر ابن کثیر میں اس کی پوری تفصیل ہے اور اس سے زیادہ تفسیر مظہری میں اس جگہ چودہ صفحات میں یہ قصہ اول سے آخر تک مفصل اور مرتب مستند کتب حدیث کے حوالہ سے بیان کیا ہے جو بہت سے معجزات اور انعامات اور علمی و دینی سیاسی فوائد و حکم پر مشتمل ہے۔ یہاں اس قصہ کے صرف وہ اجزاء لکھے جاتے ہیں جن کا ذکر خود اس سورت میں کیا گیا ہے یا جن سے اس کا کوئی تعلق ہے تاکہ آگے ان آیتوں کی تفسیر سمجھنا آسان ہوجائے جو اس قصہ سے متعلق ہیں اور یہ سب بیان تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے اور کہیں کسی دوسری تفسیر سے لیا ہے اس کا حوالہ دیدیا ہے۔

واقعہ حدیبیہ حدیبیہ ایک مقام مکہ مکرمہ سے باہر حدود حرم کے بالکل قریب ہے جس کو آج کل شمیسہ کہا جاتا ہے یہ واقعہ اسی مقام پر پیش آیا ہے۔

جزو اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اس واقعہ کا ایک جزو بروایت عبد بن حمید و ابن جریر و بیہقی وغیرہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپ مکہ مکرمہ میں مع صحابہ کرام کے امن و اطمینان کے ساتھ داخل ہوئے اور احرام سے فارغ ہو کر کچھ لوگوں نے حسب قاعدہ سر منڈایا، بعض نے بال کٹوائے اور یہ کہ آپ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کی کنجی آپ کے ہاتھ آئی۔ یہ اس واقعہ کا ایک جزو ہے جس کا ذکر اسی سورت میں آنے والا ہے (انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اس لئے اس صورت کا واقع ہونا یقینی ہوگیا) مگر خواب میں اس واقعہ کے لئے کوئی سال یا مہینہ متعین نہیں کیا گیا، اور درحقیقت یہ خواب فتح مکہ کے وقت پورا ہونے والا تھا مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو خواب سنایا تو

کہ سب مکہ مکرمہ جانے اور بیت اللہ کا طواف کرنے وغیرہ کے ایسے مشتاق تھے کہ ان حضرات نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی اور جب صحابہ کرام کا ایک مجمع تیار ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارادہ فرمالیا کیونکہ خواب میں کوئی خاص سال یا مہینہ متعین نہیں تھا تو احتمال یہ بھی تھا کہ اسی وقت یہ مقصد حاصل ہوجائے۔ کذا فی بیان القرآن بحوالہ روح المعانی۔

جزو دوم، آپ کا صحابہ کرام اور دیہات والوں کو ساتھ چلنے کیلئے بلانا، ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو آپ کو یہ خطرہ سامنے تھا کہ قریش اور بعض کا اقدام کریں۔ ____ مکہ ممکن ہے کہ ہمیں عمرہ کرنے سے روکیں اور ممکن ہے کہ مدافعت کے لئے جنگ کی صورت پیش آجائے اس لئے آپ نے مدینہ طیبہ کے قریبی دیہات میں اعلان کر کے ان لوگوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دی، ان میں سے بہت سے اعراب (دیہات) نے ساتھ چلنے سے عذر کر دیا اور کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب ہمیں قریش مکہ سے لڑوانا چاہتے ہیں جو سازوسامان والے اور طاقتور ہیں ان کا انجام تو یہ ہونا ہے کہ یہ اس سفر سے زندہ واپس نہ لوٹیں گے (مظہری)

جزو سوم، مکہ کی طرف روانگی، امام احمد، بخاری، ابوداؤد و نسائی وغیرہ کی روایت کے مطابق روانگی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا اور نیا لباس زیب تن فرمایا اور اپنی ناقہ قصوی پر سوار ہوئے، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو ساتھ لیا اور آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار اور دیہات کے آنے والوں کا بڑا مجمع تھا جن کی تعداد اکثر روایات میں چودہ سو بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی وجہ سے ان میں کسی کو شک نہیں تھا کہ اسی وقت فتح ہوجائے گا، حالانکہ جنگ تو درکنار ان کے ساتھ اور کچھ اسلحہ نہ تھا۔ آپ مع صحابہ کرام کے شروع ماہ ذیقعدہ میں پیر کے دن روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ میں پہنچکر احرام باندھا (مظہری ملخصاً)

جزو چہارم، اہل مکہ کی مقابلے کیلئے تیاری، دوسری طرف جب اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بڑی جماعت صحابہ کیساتھ مکہ کے لئے روانہ ہونے کی خبر ملی تو جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کیساتھ عمرہ کے لئے آ رہے ہیں اگر ہمنے ان کو مکہ میں آنے دیا تو تمام عرب میں یہ شہرت ہو جائے گی کہ وہ ہم پر غلبہ پاکر مکہ مکرمہ پہنچ گئے حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی جنگیں ہو چکی ہیں سب نے عہد کیا کہ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے اور آپ کو روکنے کے لئے خالد بن ولید (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک جماعت کو مکہ سے باہر مقام کراع الغمیم پر بھیجا اور آس پاس کے دیہات والوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور طائف کا قبیلہ بنو ثقیف بھی ان کے ساتھ ہو گیا، انھوں نے مقام بلدح پر اپنا پڑاؤ ڈال لیا، ان سب نے یہ عہد کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل ہونے سے روکیں گے اور آپ کے مقابلے میں جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

خبر رسانی کا ایک بہت سادہ طریقہ: ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مقام بلدح سے لیکر اس مقام تک جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے تھے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کچھ آدمی بٹھا دیئے تاکہ آپ کے پورے حالات دیکھ کر اپنے متصل پہاڑ والا باآواز بلند دوسرے پہاڑ والے تک وہ تیسرے تک وہ چوتھے تک پہنچادے اس طرح چند منٹوں میں آپ کی نقل و حرکت کا بلدح والوں کو علم ہو جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاسوس: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشر ابن سفیان کو آگے مکہ کو بھیجدیا تھا کہ وہ خفیہ اہل مکہ کے حالات باخبر دیکھیں اور آپ کو اطلاع کریں۔ وہ مکہ سے واپس آئے تو اہل مکہ کی ان جنگی تیاریوں اور مکمل مزاحمت کے دعوت کی خبر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس ہے قریش پر کہ جنگ و جدال نے ان کو کھالیا ہے پھر بھی وہ جنگ سے باز نہیں آتے۔ ان کے لئے تو اچھا موقع تھا کہ وہ مجھے اور دوسرے اہل عرب کو آزاد چھوڑ دیتے اگر یہ عرب لوگ مجھ پر غالب آجاتے تو ان کی مراد بغیر کسی محنت کے حاصل ہو جاتی اور میں ان پر غالب آجاتا تو یا تو پھر وہ بھی اسلام میں داخل ہو جاتے اور اگر یہ نہ کرتے اور جنگ ہی کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ تازہ دم اور قوی ہوتے اور پھر وہ میرے مقابلہ پر آجاتے۔ معلوم نہیں کہ یہ قریش کیا سمجھ رہے ہیں قسم ہے اللہ کی کہ میں اس کام پر جو اللہ نے مجھے دیکر بھیجا ہے ہمیشہ انکے خلاف جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ تنہا میری گردن رہ جائے۔

جہاد و عمرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کا راستہ میں بیٹھ جانا: اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا اور مشورہ لیا کہ اب ہمیں یہیں سے ان عربوں کے خلاف جہاد شروع کر دینا چاہئے یا ہم بیت اللہ کی طرف بڑھیں، پھر جو ہمیں روکے اس سے قتال کریں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ نے مشورہ دیا کہ آپ بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں کسی سے جنگ کے لئے نہیں نکلے اسلئے آپ اپنے قصد پر رہیں، ہاں اگر کوئی ہمیں مکہ سے روکے گا تو ہم اس سے قتال کرینگے۔ اسکے بعد حضرت مقداد بن اسودؓ اٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ، ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ آپ سے یہ کہدیں اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا (یعنی جائیے آپ اور آپکا رب اور لڑیئے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) بلکہ ہم ہر حال میں آپکے ساتھ قتال کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر فرمایا، بس اب اللہ کے نام پر مکہ کی طرف چلو۔ جب آپ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے اور خالد بن ولید اور ان کے ساتھیوں نے آپ کو مکہ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے لشکر کی صفوف بجانب قبلہ صف قائم کرکے کھڑا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباد بن بشر کو ایک دستہ فوج کا امیر بنا کر آگے کیا، انھوں نے خالد بن ولید کے لشکر کے بالمقابل صفوف بنالیں۔ اسی حالت میں نماز ظہر کا وقت آگیا حضرت بلالؓ نے اذان کہی اور

کیونکہ ان کو میری عداوت و شدت کا حال معلوم ہے اور میرے قبیلہ کا کوئی آدمی ایسا مکہ میں نہیں جو میری حمایت کرے اسلئے میں آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں اپنے قبیلہ وغیرہ کی وجہ سے خاص قوت و عزت رکھتے ہیں یعنی عثمان بن عفانؓ، آپ نے حضرت عثمانؓ کو اس کام کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا اور یہ بھی فرمایا کہ جو ضعفاء مسلمین مرد و عورتیں مکہ مکرمہ سے ہجرت نہیں کرسکے اور مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں انکے پاس جا کر تسلی کردیں کہ پریشان نہ ہوں انشاء اللہ مکہ مکرمہ فتح ہو کر تمہاری شدت کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ پہلے ان لوگوں کے پاس پہنچے جو مقام بلدح میں حضورؐ کا راستہ روکنے اور مقابلے کے لئے جمع ہوئے تھے ان سے جاکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وہی بات سنادی جو آپ نے بدیل اور عروہ ابن مسعود وغیرہ کے سامنے کہی تھی، ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے پیغام سن لیا آپ جا کر اپنے بزرگ سے کہدو کہ یہ بات ہرگز نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کا جواب سُن کر آپ جب مکہ مکرمہ کے اندر جانے لگے تو ابان بن سعید کی (جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے) ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے حضرت عثمانؓ کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنی پناہ میں لیکر ان سے کہا کہ مکہ میں اپنا پیغام لیکر جہاں چاہیں جاسکتے ہیں انھیں آپ کوئی فکر نہ کریں پھر اپنے گھوڑے پر حضرت عثمانؓ کو سوار کرکے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کیونکہ ان کا قبیلہ بنو سعید مکہ مکرمہ میں بڑی قوت اور عزت والا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں قریش کے ایک ایک سردار کے پاس پہنچے اور حضورؐ کا پیغام پہنچایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے نہیں آئے عمرہ کرکے واپس جائینگے ہمارے پاس کوئی ہمارا راستہ روکنے کا تو لڑیں گے اور قریش خود جنگوں سے نیم جان ہوچکے ہیں انکے لئے مناسب یہ ہے کہ ہمیں اور دوسرے اہل عرب کو چھوڑ دیں قریش ہمارے مقابلہ پر نہ آئیں پھر دیکھیں اگر عرب ہم پر غالب آگئے تو ان کی مراد پوری ہوجائے گی اور ہم غالب آئے تو انھیں پھر بھی اختیار باقی ہوگا اسوقت قتال کرسکتے ہیں اور اس عرصہ میں انکو اپنی طاقت بڑھانے اور محفوظ رکھنے کا موقع بھی ملجائے گا مگر ان سب نے آپ کی بات کو رد کردیا۔ پھر عثمان غنیؓ ضعفاء مسلمین سے ملے انکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا وہ بہت خوش ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام بھیجا۔ جب حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغامات پہنچانے سے فارغ ہوئے تو ان لوگوں نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طواف کرسکتے ہیں۔ عثمان غنیؓ نے کہا میں اسوقت تک طواف نہیں کرونگا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں، عثمان غنیؓ مکہ میں تین رات رہے اور رؤسا قریش کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات ماننے کیطرف دعوت دیتے رہے۔

جب دونوں اہل مکہ اور مسلمانوں میں آمد و رفت اور اہل مکہ کے ساتھ آدمیوں کی آمد و رفت رہی

کی صلح میں قریش نے اپنے پچاس آدمی اس کام پر لگائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر موقع

کریں اور موقع ملنے پر (معاذ اللہ) آپ کا قصہ ختم کردیں۔ یہ لوگ اسی تاک میں تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و نگرانی پر مامور حضرت محمد بن سلمہؓ نے ان سب کو گرفتار کرلیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قید کرکے حاضر کردیا، دوسری طرف حضرت عثمانؓ جو مکہ میں تھے اور انکے ساتھ تقریباً دس مسلمان اور مکہ مکرمہ میں پہنچ گئے تھے۔ قریش نے جب اپنے پچاس آدمیوں کی گرفتاری کا حال سُنا تو حضرت عثمانؓ سمیت ان سب مسلمانوں کو روک لیا اور قریش کی ایک جماعت مسلمانوں کے لشکر کی طرف نکلی اور مسلمانوں کی جماعت پر تیر اور پتھر پھینکے اسمیں مسلمانوں میں سے ایک صحابی ابن زنیمؓ شہید ہوگئے، مسلمانوں نے ان قریشیوں سے دس سواروں کو گرفتار کرلیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی نے یہ خبر پہنچائی کہ حضرت عثمانؓ قتل کردیئے گئے۔

جزو دہم، بیعت رضوان کا واقعہ | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سن کر صحابۂ کرام کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا کہ سب جمع ہوکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کیلئے بیعت کریں، سب صحابہ کرام نے آپکے ہاتھ پر بیعت کی جس کا ذکر آگے اس سورت میں آنے والا ہے احادیث صحیحہ میں ان لوگوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جو اس بیعت میں شریک تھے، اور حضرت عثمان غنیؓ چونکہ اُس وقت مکہ گئے ہوئے تھے اسلئے اُن کی طرف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر فرمایا کہ عثمانؓ کی بیعت ہے یہ خصوصی فضیلت حضرت عثمانؓ کی تھی کہ آپ نے اپنے ہی ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیکر اُن کی طرف سے بیعت کرلی۔

جزو یازدہم، صلح حدیبیہ کا واقعہ | دوسری طرف اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا رعب مسلط کردیا اور خود مصالحت پر آمادہ ہوکر انھوں نے اپنے تین آدمی سہیل بن عمروؓ اور حویطب بن العزیٰ اور مکرز بن حفص کو عذر معذرت کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اُن میں سے پہلے دو حضرات بعد میں مسلمان بھی ہوگئے، سہیل بن عمرو نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ تک جو خبر پہنچی ہے کہ عثمان غنیؓ اور انکے ساتھی قتل کردیئے یہ بالکل غلط ہے، ہم اُن کو آپکے پاس بھیجتے ہیں ہمارے قیدیوں کو آزاد کر دیجئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کردیا، مسند احمد و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ اس سورت میں جو آیت اِنَّهٗ هُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ، ہے اسی واقعہ سے متعلق ہے اب سہیل اور انکے ساتھیوں نے جاکر بیعت رضوان میں صحابہ کرام کی مسارعت اور جاں نثاری کے عجیب و غریب منظر کا حال قریش کے سامنے بیان کیا تو قریش کے صاحب رائے لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ ہم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے اس بات پر صلح کرلیں کہ وہ اس سال تو واپس چلے جائیں تاکہ پورے عرب میں یہ شہرت نہ ہوجائے کہ ہمنے ان کو روکنا چاہا وہ زبردستی مکہ میں داخل ہوگئے، اور اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں اور تین روز

کرنے سے نہ روکا جائے۔ سہیل نے کہا کہ بخدا یہ نہیں ہوسکتا، آپ نے اسکو بھی قبول فرما لیا اسکے بعد سہیل نے
اپنی ایک شرط لکھی کہ جو شخص مکہ والوں میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آپکے پاس جائیگا اسکو واپس کردیں گے
اگرچہ وہ آپ ہی کے دین پر ہو، اور مسلمانوں میں سے جو کوئی دشمن کے پاس مکہ چلا جاوے اسکو ہم واپس نہ کریں گے۔
اس پر عام مسلمانوں کی آواز اٹھی سبحان اللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم سے مسلمان بھائی کو مشرکین کے حوالے لوٹا دیں
مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بھی قبول فرمایا اور فرمایا کہ ہم میں سے کوئی آدمی اگر ان کے پاس جائیگا تو اللہ نے اسکو
ہم سے دور کردیا، ہم کیوں فکر کریں اور ان میں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آیا اور ہم نے لوٹا بھی دیا
تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے راستہ سہولت کا نکالدیں گے۔ حضرت براءؓ نے اس صلحنامہ کا خلاصہ تین شرطیں
بیان کیا ہے، ایک یہ کہ ان کا جو آدمی ہمارے پاس آجائیگا تو ہم اسکو واپس کردیں گے، دوسرے
یہ کہ ہمارا کوئی آدمی انکے پاس چلا جائیگا تو وہ واپس نہ کرینگے۔ تیسرے یہ کہ اب آئندہ سال
عمرہ کیلئے آئیں گے اور تین روز مکہ میں قیام کریں گے اور زیادہ ہتھیار لیکر نہیں آئیں گے، اور
آخر میں لکھا گیا کہ یہ عہد نامہ اہل مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک محفوظ دستاویز ہے
جس کی کوئی خلاف ورزی نہ کریگا اور باقی سب عرب آزاد ہیں جو چاہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کے عہد میں داخل ہو جائے اور جو کوئی چاہے قریش کے عہد میں داخل ہو جائے۔ یہ سنکر قبیلہ
خزاعہ اچھل پڑا اور کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں داخل ہیں اور بنو بکر نے اٹھکر
کہا کہ ہم قریش کے عقد و عہد میں داخل ہیں۔

شرائط صلح سے عام صحابہ کرام کی ناراضی اور رنج جب یہ شرائط صلح طے ہوگئیں تو عمر بن خطابؓ سے نہ رہا گیا اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ کیا آپ اللہ کے نبی برحق نہیں
ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کیا ہم حق پر اور وہ لوگ باطل پر نہیں ہیں؟
آپ نے فرمایا کیوں نہیں، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کیا ہمارے مقتولین جنت اور ان کے
مقتولین جہنم میں نہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا تو پھر ہم کیوں
اس ذلت کو قبول کریں کہ بغیر عمرہ کئے واپس چلے جائیں جب تک کہ ابھی اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ
نہ کردیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں میں اسکے
حکم کے خلاف نہیں کرونگا اور اللہ تعالیٰ مجھے ضائع نہ فرمائیگا وہ میرا مددگار ہے۔ حضرت عمرؓ
نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور
طواف کریں گے، آپ نے فرمایا کہ بیشک یہ کہا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کام اسی سال
ہوگا؟ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا تھا تو آپ نے فرمایا کہ بس یہ واقعہ جیسا کہ میں نے
کہا تھا ہو کر رہے گا کہ آپ بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے۔

بدیل ابن ورقاء اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے الگ ہوگئے، پھر عروہ ابن مسعود اپنی جماعت کو لیکر الگ ہوگئے۔ دوسرے صحابہ کرام کی بے نظیر جاں نثاری اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بے مثال اطاعت و محبت و عظمت دیکھ کر قریش مکہ کا مرعوب ہوجانا اور صلح کی طرف مائل ہوجانا، کہ اُن کے لئے مسلمانوں کا صفایا کر دینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا کیونکہ وہ اپنے گھر وطن میں تھے، مسلمان مسافرت کی حالت میں تھے قریش نے پانی کی جگہوں پر قبضہ کیا ہوا تھا، بے آب و دانہ جنگل میں تھے، اُن کی پوری قوت موجود تھی مسلمانوں کے پاس کچھ زیادہ اسلحہ بھی نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں میں رعب ڈالا اور ان کی جماعت کے بہت سے افراد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور اختلاط کے مواقع ملکر اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام و ایمان راسخ ہوگیا اور ابھی سے مسلمان ہوگئے۔ تیسرے صلح و امان کی وجہ سے راستے مامون ہوگئے دعوتِ اسلام کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واسطے راستے کھل گئے، عرب کے وفود کو آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے گوشہ گوشہ میں دعوتِ اسلام کو پھیلایا، دنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے خطوط بھیجے گئے ان میں سے بعض بڑے بڑے بادشاہ متاثر ہوئے جسکا حاصل یہ نکلا کہ واقعہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عام اور سب کو عمرہ کے لئے نکلنے کی تاکید کے باوجود ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسلمان نہ تھے اور صلح حدیبیہ کے بعد جوق جوق لوگ اسلام میں داخل ہوئے، اسی سال محرم سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کو سامان بڑی مقدار میں مل گیا اور ان کی مادی قوت مستحکم ہو گئی اور اس صلح پر دو سال گزرنے نہ پائے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی جو اس سے پہلے تمام پچھلی مدت میں نہیں تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قریش مکہ نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے معاہدہ توڑ ڈالا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرنے کی خفیہ تیاری شروع کی تو اس صلحنامہ پر صرف بیس مہینے گذرے تھے کہ فتح مکہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جانے والے جاں نثار سپاہی دس ہزار تھے قریش مکہ کو خبر لگی تو گھبرا کر ابوسفیان کو عذر معذرت کر کے تجدید معاہدہ پر آمادہ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا آپ نے معاہدہ کی تجدید نہ کی اور بالآخر دس ہزار کے اس حزب اللہ کے ساتھ آپ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے کفار قریش ایسے مغلوب و مرعوب ہوچکے تھے کہ مکہ مکرمہ میں کچھ زیادہ لڑائی کی بھی نوبت نہیں آئی کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ سیاست نے جنگ نہ ہونے کا یہ انتظام کردیا کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ مامون ہے جو مسجد میں داخل ہوجائے وہ مامون جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے وہ مامون ہے اس طرح سب لوگوں کو اپنی اپنی

فکر پڑ گئی اور قتل و قتال کی زیادہ نوبت نہیں آئی اسی لئے ائمہ فقہاء میں یہ اختلاف ہو گیا کہ مکہ صلح سے فتح ہوا یا جنگ سے، بہر حال بڑی سہولت کے ساتھ مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب واقعہ بن کر سب کے سامنے آگیا، صحابہ کرام نے بے خطر ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا، حلق و قصر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بیت اللہ میں داخل ہوئے، بیت اللہ کی کنجی آپ کے ہاتھ آئی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب کو بلوایا اور سب صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ ہے وہ واقعہ جو میں نے آپ سے کہا تھا، پھر حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تھا وہ واقعہ جو میں نے تم سے کہا تھا۔ حضرت فاروق اعظم نے فرمایا بیشک کوئی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ بہتر و اعظم نہیں ہے۔ صدیق اکبر تو پہلے سے فرماتے تھے کہ اسلام میں کوئی فتح صلح حدیبیہ سے بڑی نہیں ہے لیکن لوگوں کی رائے اور بصیرت وہاں تک نہ پہنچی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان ایک طے شدہ حقیقت تھی، یہ لوگ جلد بازی کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جلد بازی سے متاثر ہو کر جلدی نہیں کرتا بلکہ حکمت و مصلحت کیساتھ ہر کام اپنے صحیح وقت پر انجام پاتا ہے اس لئے سورہ فتح میں حق تعالیٰ نے واقعہ حدیبیہ کو فتح مبین فرمایا۔ یہ واقعہ حدیبیہ کے اہم اجزاء تھے جن سے اگلی آیات کے سمجھنے میں سہولت ملیگی اب آیات کی تفسیر دیکھئے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، اس میں لیغفر کا لام اگر تعلیل یعنی بیان علت کے لئے لیا جائے تو حاصل اسکا یہ ہے کہ یہ فتح مبین آپ کو اس لئے دی گئی تاکہ آپ کو تین کمالات حاصل ہو جائیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، ان میں پہلی چیز تمام اگلی پچھلی لغزشوں اور خطاؤں کی معافی ہے۔ سورہ محمد میں پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں ان کی طرف قرآن میں جہاں کہیں ذنب یا عصیان وغیرہ کے الفاظ منسوب کئے گئے وہ انکے مقام عالی کی مناسبت سے ایسے کاموں کے لئے استعمال کئے گئے جو خلاف اولیٰ تھے بجز نبوت کے مقام بلند کے اعتبار سے غیر افضل پر عمل کرنا بھی ایسی لغزش ہے جسکو قرآن نے بطور تہدید کے ذنب و گناہ سے تعبیر کیا ہے اور ما تقدم سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو نبوت سے پہلے ہوئیں اور ما تأخر سے مراد وہ لغزشیں جو رسالت و نبوت کے بعد صادر ہوئیں (مظہری) اور فتح مبین کا اس مغفرت کے لئے سبب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس فتح مبین سے بہت لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوں گے اور اسلام کی دعوت کا عام ہو جانا آپکی زندگی کا مقصد عظیم اور آپکے اجر و ثواب کو بہت بڑھانے والا ہے اور اجر و ثواب کی زیادتی سبب ہوتی ہے کفارہ سیئات کی (بیان القرآن)

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا، یہ دوسری نعمت ہے جو اس فتح مبین پر مرتب ہوئی، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر تو آپ اول ہی سے ہیں اور نہ صرف خود صراط مستقیم پر ہیں بلکہ

وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ

اور لعنت کی اُن کو اور تیار کی اُن کے واسطے دوزخ، اور بُری جگہ پہنچے اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے

وَالْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

اور زمین کے اور ہے اللہ زبردست حکمت والا

خلاصۂ تفسیر

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا (جسکے دو اثر ہیں، ایک جیت جہاد کے وقت اسکی طرف مسابقت اور عزم و ہمت جیسا کہ بیعت رضوان کے واقعہ میں اوپر ذکر آ چکا ہے اور دوسرا اثر کفار کی بیجا ضد کے وقت اپنے جوش اور غیظ و غضب کو قابو میں رکھنا جسکا ذکر اس واقعہ کے جزو دوم میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے اور آگے بھی فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلٰى رَسُولِهٖ میں آئے گا، تاکہ اُن کے پہلے ایمان کیساتھ اُن کا ایمان اور زیادہ ہو (کیونکہ درصل اطاعت رسول ذریعہ ہے نور ایمان میں زیادتی کا اور اس واقعہ میں ہر جہلوت مکمل اطاعت رسول کا امتحان ہو گیا کہ جب رسول نے دعوت جہاد کے لئے بلایا اور بیعت لی تو بڑی خوشدلی اور مسابقت کے ساتھ سب نے بیعت کی اور جہاد کے لیے تیار ہوگئے اور جب حکمت و مصلحت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال سے روکا اور سب صحابہ جوش جہاد میں قتال کے لئے بیقرار تھے مگر اطاعت رسول میں سر تسلیم خم کر دیا اور قتال سے باز رہے۔) اور آسمان و زمین کے سب لشکر (جیسے ملائکہ اور سب مخلوقات) اللہ ہی کے (لشکر) ہیں (اسلئے کفار کی شکست اور دین اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ تعالیٰ تمھارے قتال و جہاد کا محتاج نہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے فرشتوں کے لشکر بھیجدیں جیسا کہ بدر، احزاب، حنین کے غزوات میں اسکا مشاہدہ ہو چکا، اور یہ لشکر بھیجنا بھی مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہے ورنہ ایک فرشتہ بھی سب کیلئے کافی ہے اسلئے تم لوگوں کو نہ تو کفار کی کثرت دیکھکر جہاد و قتال میں کوئی تردد ہونا چاہیئے اور نہ جسوقت اللہ و رسول کا حکم ترک قتال کا ہو اسوقت ترک قتال میں کبھی کوئی تردد ہونا چاہئیے کہ افسوس صلح ہو گئی اور کفار بچ گئے ان کو سزا نہ ہوئی اور قتال یا ترک قتال کے نتائج اور عواقب کو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کا) بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (جب قتال میں حکمت ہوتی ہے اسکا حکم دیتا ہے اور جب ترک قتال میں مصلحت ہوتی ہے اُسکا حکم فرماتا ہے اسلئے مسلمانوں کو چاہئیے کہ دونوں حالتوں میں اپنے جذبات کو امر رسول کے تابع رکھیں جو سبب ہے زیادت ایمان کا۔ آگے زیادتی ایمان کے ثمرہ کا بیان ہے یعنی) تاکہ اللہ تعالیٰ

(اس اطاعت کی بدولت) مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی بہشتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور تاکہ (اس اطاعت کی بدولت) اُن کے گناہ دُور کردے (کیونکہ اطاعتِ رسُول میں گناہوں سے توبہ اور اعمالِ صالحہ سب داخل ہیں جو تمام سیئات و گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں) اور یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے (اس آیت میں اول قلوبِ مؤمنین پر سکینت اور تحمل نازل کرنے کا انعام ذکر فرمایا پھر یہ انعام ایمان کی زیادتی کا بذریعہ اطاعتِ رسُول سبب بنا اور اطاعت رسول دخول جنت کا سبب بنی سلئے یہ سب اُمور مؤمنین کے قلوب میں نزولِ سکینت پر مرتب ہوئے، آگے اسی سکینت پر مرتب کرکے منافقین کی اس سے محرومی) اور (اس محرومی کے سبب سے گرفتارِ عذاب ہونا بیان فرماتے ہیں یعنی یہ سکینت مسلمانوں کے قلوب پر نازل فرمائی اور کفار کے قلوب پر نہیں فرمائی) تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو (بوجہ ان کے کفر کے) عذاب دے جو کہ اللہ کے ساتھ بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں (اس بُرے گمان سے مراد باعتبار سیاق کلام کے اُن لوگوں کا گمان ہے جن کو عمرہ کے لئے حدیبیہ کے سفر کی دعوت دی گئی اور انھوں نے انکار کردیا اور باہم یہ کہا کہ یہ لوگ اہل مکہ سے نہیں لڑانا چاہتے ہیں ان کو جانے دو یہ انکے ہاتھ سے بچ کر نہیں آویں گے ایسا کہنے والے لوگ منافقین ہی ہوسکتے ہیں، اور اپنے عمومِ عام کے اعتبار سے سارے عقائد کفریہ بھی اسی گمانِ بد میں داخل ہیں ان سب کے لئے وعید ہے کہ دُنیا میں) ان پر بُرا وقت پڑنے والا ہے (چنانچہ چند ہی روز کے بعد مقتول اور محبوس ہوئے اور منافقین کی تمام عمر حسرت و پریشانی میں کٹی کہ اسلام بڑھتا تھا اور وہ گھٹتے جاتے تھے یہ تو دُنیا میں ہوا) اور (آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن پر غضبناک ہوگا اور اُن کو رحمت سے دُور کردیگا اور اُن کے لئے اس نے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے اور (آگے اس وعید کی تاکید ہے کہ) آسمان اور زمین کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست (یعنی پوری قدرت والا) ہے اگر چاہتا اپنے کسی بھی لشکر سے ان سب کی ایک دم صفائی کردیتا کہ یہ اسکے مستحق ہیں لیکن چونکہ وہ) حکمت والا ہے (اس لئے بمصلحت سزا میں مہلت دیتا ہے۔)

معارف و مسائل

شروع سورت کی تین آیتوں میں اُن خاص انعامات کا ذکر ہے جو اس فتح مبین میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے۔ بعض صحابہ جو سفرِ حدیبیہ میں ساتھ تھے انھوں نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ یہ انعامات تو آپکے لئے ہیں اللہ آپ کو مبارک فرمائے ہمارے لئے کیا ہے

جن پر یہ آیات نازل ہوئیں ان میں اصالۃً حاضرینِ حدیبیہ در بیعتِ رضوان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر ہے اور چونکہ وہ انعامات ایمان اور اطاعتِ رسول کے سبب ملے اس حیثیت سے سب مومنین کو بھی شامل ہے کہ جو بھی ایمان اور اطاعت میں کامل ہوگا وہ ان انعامات کا مستحق ہوگا

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ

ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سنانے والا تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور

رَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۹

اس کے رسول پر اور اس کی مدد کرو اور اس کی عظمت رکھو اور اس کی پاکی بولتے رہو صبح اور شام

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ

جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے اللہ کا ہاتھ ہے اوپر ان کے

اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى

ہاتھ کے پھر جو کوئی قول توڑے سو توڑتا ہے اپنے نقصان کو اور جو کوئی پورا کرے

بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰ۧ

اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دے گا بدلہ بہت بڑا

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو (اعمالِ امت پر قیامت کے دن) گواہی دینے والا (عموماً) اور (دنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لئے) بشارت دینے والا اور (کافروں کے لئے) ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے (اور اے مسلمانو، ہم نے ان کو اسلئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (کے دین) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو (عقیدۃً بھی کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کمالات کیساتھ موصوف اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک سمجھو اور عملاً بھی کہ اس کی اطاعت کرو) اور صبح و شام اس کی تسبیح (و تقدیس میں لگے رہو (اگر اس تسبیح کی تفسیر نماز سے کیجائے تو صبح شام کی فرض نمازیں مراد ہونگی ورنہ مطلق ذکر اگرچہ مستحب ہی ہو مراد ہوگا۔ آگے بعض حقوقِ خاصہ کے متعلق ارشاد ہے کہ) جو لوگ آپ سے (حدیبیہ کے روز اس بات پر) بیعت کر رہے ہیں (یعنی بیعت کر چکے ہیں کہ جہاد سے بھاگیں گے نہیں) تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں (کیونکہ مقصود آپ سے اس پر بیعت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لاوینگے اور جب یہ بات ہے تو گویا) خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد

توڑنے کا (یعنی بیعت اطاعت کے خلاف کریگا) تو اُسکے عہد توڑنے کا وبال اُسی پر پڑیگا اور جو شخص اس بات کو پورا کریگا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا اُس کو بڑا اجر دیگا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن انعامات کا ذکر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت پر خصوصاً بیعت رضوان کے شرکاء پر مبذول ہوئے، اور چونکہ ان انعامات کا عطا کرنے والا اللہ اور واسطہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اسکی مناسبت سے آیات مذکورہ میں ان کے حقوق اور تعظیم و تکریم کا ذکر ہے۔ اوّل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کی تین صفات بیان فرمائیں۔ شاہد، مبشر، نذیر۔ شاہد کے معنی گواہ کے ہیں مراد اس کی وہی ہے جو سورۂ نساء کی آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۴۱۹ میں گذر چکی ہے کہ ہر نبی اپنی اُمت کی بابت اس بات کی گواہی دیگا کہ اللہ کا پیغام اُمت کو پہنچا دیا، پھر کسی نے اطاعت کی کسی نے نافرمانی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے متعلق گواہی دیں گے۔ سورۂ نساء کی آیت کی تفسیر میں قرطبی نے لکھا ہے کہ انبیاء کی یہ گواہی اپنے زمانے کے موجود لوگوں کے متعلق ہوگی کہ ان کی دعوت حق کو کس نے قبول کیا اور کس نے نافرمانی کی، اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ گواہی اپنے زمانے کے لوگوں کے متعلق ہوگی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ گواہی تمام اُمت کے اعمال طاعات سیات پر ہوگی کیونکہ بعض روایات کے مطابق اُمت کے اعمال صبح شام رسول اللہ کے سامنے فرشتے پیش کرتے ہیں اسلئے آپ تمام اُمت کے اعمال سے باخبر ہونگے (ذکرہ القرطبی عن سعید بن المسیب رض) اور مبشر کے معنی بشارت دینے والا، نذیر کے معنی ڈرانے والا۔ مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کے مومنین اور اطاعت کرنے والوں کو جنت کی بشارت دینے والے ہیں اور کفار فجار کو عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ آگے رسول کو بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ تم لوگ اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور ایمان کے ساتھ مزید تین اوصاف کا ذکر فرمایا ہے جو مومنین میں ہونے چاہئیں تُعَزِّرُوْهُ، تُوَقِّرُوْهُ اور تُسَبِّحُوْهُ۔ تُعَزِّرُوْهُ، تعزیر سے مشتق ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور سزا کو جو تعزیر کہا جاتا ہے وہ بھی اسلئے کہ مجرم کی مدد حقیقی اسی میں ہے کہ اس پر سزا جاری کیجائے (مفردات القرآن راغب) اور تُوَقِّرُوْهُ، توقیر سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں تعظیم، اور تُسَبِّحُوْهُ، تسبیح سے مشتق ہے جس کے معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں، ان میں آخری لفظ تو متعین ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہوسکتا ہے اسلئے تسبحوہ کی ضمیر میں بجز اس کے کوئی احتمال نہیں کہ حق تعالیٰ کیطرف راجع ہو، اسی لئے اکثر حضرات نے پہلے دونوں کلموں کی ضمیر بھی اللہ تعالیٰ کیطرف راجع کر کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ایمان لاؤ اور اللہ کی یعنی اسکے دین اور رسول

کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور اس کی تسبیح کرو۔ اور بعض حضرات نے پہلے دو جملوں کی ضمیر رسول کیطرف راجع کرکے مطلب یہ قرار دیا کہ رسول کی مدد کرو اور تعظیم کرو اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو مگر بعض مفسرین نے فرمایا کہ اسمیں انتشار ضمائر لازم آتا ہے جو بلاغت کے خلاف ہے واللہ اعلم۔ اسکے بعد اس بیعت کا ذکر ہے جس کا واقعہ قصہ حدیبیہ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اس بیعت کے متعلق حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ بیعت کی چونکہ مقصود اس سے اللہ کے حکم کی تعمیل اور رضاجوئی ہے اسلئے گویا خود اللہ تعالیٰ سے بیعت کی اور جب انھوں نے رسول کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اللہ کا ہاتھ متشابہات میں سے ہے جس کی کیفیت اور حقیقت کسی کو معلوم نہیں نہ معلوم کرنے کی فکر میں رہنا درست ہے۔ اس بیعت کی فضیلت آگے بھی آرہی ہے

لفظ بیعت دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے اسکا قدیم اور مسنون طریقہ باہم عہد کرنے والوں کا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے اگرچہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا شرط اور ضروری نہیں۔ بہرحال جس کام کا کسی سے عہد کیا جائے اسکی پابندی شرعاً واجب ضروری ہے اور خلاف ورزی حرام ہے اسی لئے آگے فرمایا کہ جو شخص اس عہد بیعت کو توڑیگا تو کچھ اپنا ہی نقصان کریگا اللہ اور اسکے رسول کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچیگا اور جو اس عہد کو پورا کریگا تو اس کو اللہ تعالیٰ بڑا اجر دینے والے ہیں۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا

اب کہیں گے تجھ سے پیچھے رہ جانے والے گنوار ہم کام میں لگے رہ گئے اپنے مالوں کے اور گھر والوں کے

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ

سو ہمارا گناہ بخشوا وہ کہتے ہیں اپنی زبان سے جو ان کے دل میں نہیں تو کہہ

فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ

کس کا کچھ بس چلتا ہے اللہ سے تمہارے واسطے اگر وہ چاہے تمہارا نقصان یا چاہے تمہارا

نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ⑪ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ

فائدہ بلکہ اللہ ہے تمہارے سب کاموں سے خبردار کوئی نہیں تم نے تو خیال

لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ

کیا تھا کہ پھر کر نہ آئے گا رسول اور مسلمان اپنے گھر کبھی اور کھب گیا

ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ښ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ⑫ وَ

یہی تمہارے دل میں یہ خیال اور اٹکل کی تم نے بُری اٹکلیں اور تم لوگ تھے تباہ ہونے والے اور

مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ⑬

جو کوئی یقین نہ لائے اللہ پر اور اسکے رسول پر تو ہم نے تیار رکھی ہے منکروں کے واسطے دہکتی آگ

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ

اور اللہ کے لئے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا بخشے جس کو چاہے اور عذاب میں ڈالے

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑭

جس کو چاہے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصۂ تفسیر

جو دیہاتی (اس سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے (شریک سفر نہیں ہوئے) وہ عنقریب (جبکہ آپ مدینہ پہنچیں گے) آپ سے (بات بنانے کے طور پر) کہیں گے کہ (ہم جو آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے وجہ اس کی یہ ہوئی کہ) ہم کو ہمارے مال اور عیال نے فرصت نہ لینے دی (یعنی ان کی ضروریات میں مشغول رہے) تو ہمارے لئے (اس کوتاہی کی) معافی کی دعا کر دیجئے (آگے حق تعالیٰ اُن کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہیں (آگے آپ کو تلقین ہے کہ یہ لوگ جب آپ سے یہ عذر پیش کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اول تو یہ عذر اگر سچا بھی ہوتا تو بمقابلہ اللہ و رسول کے حکم قطعی کے نفس عذر غلط اور باطل ہوتا سو (ہم پوچھتے ہیں کہ) وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے نفع و نقصان میں کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے (یعنی تمہاری ذات یا تمہارے مال اور عیال میں جو نفع یا نقصان تقدیر الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے اس کے خلاف کرنا کسی کو اختیار نہیں۔ البتہ شریعتِ اسلام نے بہت سے مواقع پر اس طرح کے حالات کا عذر قبول کر کے رخصت دیدی ہے بشرطیکہ وہ عذر واقعی ہو، اور جہاں شریعت نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور رخصت نہیں دی بلکہ حکم قطعی کر دیا جیسا کہ مسئلہ زیرِ بحث میں ہے کہ سفرِ حدیبیہ کے لئے اللہ و رسول نے گھر بار کے مشاغل کو قابلِ قبول عذر قرار نہیں دیا، اگرچہ وہ واقعی ہو۔ دوسرے یہ عذر جو تم کر رہے ہو واقعی اور سچا بھی نہیں جیسا کہ آگے آتا ہے اور تم سمجھتے ہوگے کہ مجھ کو اس جھوٹ کی خبر نہیں ہوئی بلکہ الحقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (نے جو کہ) تمہارے سب اعمال پر مطلع ہے (مجھ کو بذریعہ وحی اطلاع کر دی کہ تمہاری غیر حاضری کی وجہ وہ نہیں جو تم بیان کرتے ہو) بلکہ (اصل وجہ یہ ہے کہ) تم نے یہ سمجھا کہ رسول اور مؤمنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آویں گے (بلکہ مشرکین سب کی صفائی کر دیں گے) اور یہ بات تمہارے دلوں میں اچھی بھی معلوم ہوتی تھی (بوجہ اللہ و رسول کی عداوت کے تمہاری دلی تمنا بھی تھی) اور تم نے بُرے بُرے گمان کئے اور تم (ان بُرے گمانوں کی وجہ سے جو کہ خیالاتِ کفریہ ہیں) برباد ہونے والے لوگ ہو گئے، اور (اگر ان وعیدوں کو سن کر تم اب بھی دل سے ایمان لے آؤ تو خیر ورنہ) جو شخص اللہ پر

اور اس کے رسول پر ایمان نہ لاوے گا تو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور اس مومن وغیر مومن کے لئے مذکورہ قانون مقرر کرنے سے تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ تمام آسمان و زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جس کو چاہے بخشدے اور جس کو چاہے سزا دے اور (کافر اگرچہ مستحق عذاب ہوتا ہے لیکن) اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے (کہ وہ بھی سچے دل سے ایمان لے آوے تو اُس کو بھی بخشدیتا ہے)۔

معارف و مسائل

یہ مضمون جو اوپر مذکور ہوا اُن اعراب کے متعلق ہے جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سفر حدیبیہ میں ساتھ چلنے کا حکم کیا تھا مگر انھوں نے بہانہ بازی سے کام لیا جس کا بیان قصہ حدیبیہ کے جزو اول میں ہوچکا ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بعض لوگ بعد میں تائب مخلص ہوگئے تھے

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا
اب کہیں گے پیچھے رہ گئے ہوئے جب تم چلو گے غنیمتیں لینے کو چھوڑو ہم بھی

نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا
ہمارے ساتھ چلیں چاہتے ہیں کہ بدلیں اللہ کا کلام تو کہہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہ چلو گے

كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ
یوں ہی کہہ دیا اللہ نے پہلے سے تو اب کہیں گے نہیں تم تو جلتے ہو ہمارے سے کوئی نہیں

كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥﴾ قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ
پر وہ نہیں سمجھتے ہیں مگر تھوڑا سا کہہ دے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے

سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ
آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہوں گے

فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ
پھر اگر حکم مانو گے دے گا تم کو اللہ بدلہ اچھا اور اگر پلٹ جاؤ گے جیسے پلٹ گئے تھے

مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ
پہلی بار دیگا تم کو ایک عذاب دردناک نہ اندھے پر تکلیف نہیں

وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ
اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار پر تکلیف اور جو کوئی

يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا اسکو داخل کرے باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ ع	
اور جو کوئی پلٹ جائے اُس کو عذاب دے گا دردناک	

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے (مطلب یہ ہے کہ خیبر فتح کرنے کے لئے چلو گے جہاں غنیمت ملنے والی ہے تو یہ لوگ تم سے) کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں (وجہ اس درخواست کی مال غنیمت کی طمع تھی جس کا حاصل ہونا قرائن سے ان کو معلوم اور متوقع تھا بخلاف سفر حدیبیہ کے کہ اس میں زحمت بلکہ ہلاکت زیادہ متوقع تھی، اسکے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ) وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو بدل ڈالیں (یعنی حکم اللہ کا یہ تھا کہ اس غزوہ میں صرف وہ لوگ جائیں جو حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک ہوئے انکے سوا کوئی نہ جائے خصوصاً اُن لوگوں میں جنھوں نے سفر حدیبیہ میں تخلف اختیار کیا اور بہانہ بازی کی تو) آپ کہدیجئے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے (یعنی تمہاری یہ درخواست نامنظور ہے کیونکہ اسمیں حکم خداتعالیٰ کی تبدیلی کا گناہ ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یوں ہی فرمادیا ہے (یعنی حدیبیہ سے واپسی ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیدیا تھا کہ غزوہ خیبر میں اہل حدیبیہ کے سوا کوئی نہ جائے گا اور یہ حکم خداوندی الفاظ قرآن میں مذکور نہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم وحی غیر متلو کے ذریعہ آپ کو ملا تھا جو احادیث کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیبیہ سے واپسی میں جو سورت فتح نازل ہوئی اور اسمیں یہ آیت آئی وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا، اس فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہی ہے تو اس آیت نے اشارہ کردیا کہ یہ فتح خیبر اُنہی اہل حدیبیہ کو نصیب ہوگی، اور جب آپ اُن کو یہ جواب دیں گے) تو وہ لوگ کہیں گے (ظاہر یہ ہے کہ آپکے سامنے کہنا مراد نہیں بلکہ اوروں سے کہیں گے کہ ہمارے ساتھ نہ لینے کو جو خدا کا حکم بتلایا جاتا ہے بات یہ نہیں) بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو (اسلئے ہمارا شریک ہونا گوارا نہیں حالانکہ مسلمانوں میں حسد کا کوئی شائبہ نہیں) بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (اگر سمجھ پوری ہوتی تو اللہ کے اس حکم کی حکمت بآسانی سمجھ سکتے تھے کہ حدیبیہ میں ان حضرات نے ایک بہت بڑے خطرہ اور بڑے امتحان کا کام کیا منافقین نے اپنی دنیوی اغراض کو مقدم رکھا یہ وجہ انکی تخصیص اور انکی محرومی کی ہے۔ یہاں تک مضمون خیبر کے متعلق تھا آگے ایک دوسرے واقعہ کے متعلق گفتگو کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے (یہ بھی) کہدیجئے کہ (اگر ایک خیبر میں نہ گئے تو نہ سہی ثواب حاصل کرنے کے اور بھی مواقع آنے والے ہیں چنانچہ)

عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہونگے (مراد اس سے فارس و روم کے غزوات ہیں کذا فی الدر عن ابن عباسؓ) کیونکہ ان کی فوجیں تربیت یافتہ اور باسامان تھیں کہ، یا تو ان سے لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جاویں (خواہ اسلام قبول کر کے یا اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینا قبول کر کے۔ مطلب یہ کہ تم اس کام کے لئے بلائے جاؤ گے) سو (اس وقت) اگر تم اطاعت کرو گے (اور ان سے جہاد کرو گے) تو تم کو اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیگا اور اگر تم (اس وقت بھی) روگردانی کرو گے جیسا اسکے قبل (حدیبیہ وغیرہ میں، روگردانی کر چکے ہو تو وہ دردناک عذاب کی سزا دیگا (البتہ دعوتِ جہاد سے معذور لوگ مستثنیٰ ہیں چنانچہ) نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور (اوپر جو مجاہدین کے لئے جنت و نعمت کے وعدے اور جہاد سے جان چرانے والوں کے لئے وعیدیں مذکور ہیں انمیں کچھ انہی لوگوں کی تخصیص نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مانیگا اسکو ایسی جنتوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو شخص (حکم سے) روگردانی کریگا اس کو دردناک عذاب کی سزا دیگا۔

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد سنہ ہجری میں پیش آیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کا ارادہ فرمایا تو صرف ان لوگوں کو ساتھ لیا جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو خیبر کی فتح اور وہاں سے اموال غنیمت ملنے کا وعدہ فرمایا تھا اسوقت دیہات کے وہ لوگ جو سفر حدیبیہ میں باوجود بلانے کے عذر کر کے پیچھے رہ گئے تھے ان لوگوں نے بھی جہاد خیبر میں ساتھ چلنے کا ارادہ کیا خواہ اس طرح سے کہ اُن کو قرائن سے خیبر کا فتح ہونا اور وہاں مال غنیمت ملنے کی توقع تھی اور یا مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملات اور صلح حدیبیہ کے کچھ برکات دیکھ کر اُن کو جہاد سے پیچھے رہنے پر ندامت ہوئی اور اب شرکت جہاد کا ارادہ کیا۔ ان کے جواب میں قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے کلام یعنی اُسکے حکم کو بدلنا چاہتے ہیں يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ، اور مراد اس حکم سے غزوۂ خیبر اور اسکے غنائم کا صرف اہل حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہونا ہے اور اسکے بعد كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ میں بھی یہی تخصیص اہل حدیبیہ کا قول ہے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو کہیں اس تخصیص کا ذکر ہے نہیں پھر اس تخصیص کے وعدہ کو کلام اللہ اور قال اللہ کہنا کیسے صحیح ہو۔

وحی الٰہی صرف قرآن میں منحصر نہیں، قرآن کے علاوہ بھی بذریعہ وحی احکام آئے ہیں اور احادیث رسول بھی کلام اللہ کے حکم میں ہیں

علماء نے فرمایا کہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اس کا قرآن میں کہیں صراحۃً ذکر نہیں، بلکہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلو کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر حدیبیہ میں فرمایا تھا، اسی کو اس جگہ کلام اللہ اور قال اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ کلام قرآن کے جو احکام احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں وہ بھی حسب تصریح اس آیت کے کلام اللہ اور قول اللہ میں داخل ہیں۔ جو ملحدین احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجت دین نہیں مانتے یہ آیتیں ان کے الحاد کو کھولنے کے لئے کافی ہیں، رہا یہ معاملہ کہ اسی سورت میں جو سفر حدیبیہ کے شروع میں نازل ہوئی ہے یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا اور باتفاق مفسرین یہاں فتح قریب سے فتح خیبر مراد ہے تو اس طرح قرآن میں فتح خیبر کا اور اس کے غنائم اہل حدیبیہ کو ملنے کا وعدہ آ گیا یہی اس لفظ کلام اللہ اور قال اللہ کی مراد ہو سکتی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں غنیمت کا وعدہ تو ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ غنیمت اہل حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہوگی دوسرے اس میں شریک نہ ہو سکیں گے یہ تخصیص تو بالآخر حدیث رسول ہی سے معلوم ہوئی ہے وہی کلام اللہ اور قال اللہ کا مصداق ہے اور بعض حضرات نے جو سورۂ توبہ کی آیت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے یعنی فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ یہ آیات غزوہ تبوک کے متعلق آئی ہیں، اور وہ غزوہ خیبر کے بعد ۹ ہجری میں ہوا ہے (قرطبی وغیرہ)

قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا، اس میں جو تاکیدی طور پر مخلفین حدیبیہ سے یہ فرمایا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتے یہ صرف غزوہ خیبر کے ساتھ مخصوص ہے آگے کسی اور جہاد میں بھی شریک نہ ہو سکیں یہ اس سے لازم نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ ان مخلفین حدیبیہ میں سے قبائل مزینہ اور جہینہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے (کذا فی الروح عن البحر، بیان)

مخلفین حدیبیہ میں سے بعض لوگ بعد میں تائب ہو کر سچے مسلمان ہو گئے تھے

غزوہ خیبر کے وقت جتنے مخلفین حدیبیہ تھے سبھی کو اس جہاد کی شرکت سے روک دیا گیا تھا حالانکہ ان میں سب منافق نہیں، بعض مسلمان بھی تھے اور بعض گو اس وقت منافق تھے مگر بعد میں سچے ایمان کی ان کو توفیق ہو گئی تھی اس لئے ایسے لوگوں کی دلجوئی کے لئے اگلی آیات میں ان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر غزوہ خیبر اللہ کے وعدے کے مطابق اہل حدیبیہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا مگر جو شخص مسلمان ہیں اور دل سے شرکت جہاد چاہتے ہیں ان کے لئے دوسرے مواقع آنے والے ہیں ان مواقع کو قرآن کریم ایک خاص پیشین گوئی کی صورت میں بیان فرماتا ہے جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہونے

والا ہے۔ ارشاد فرمایا، سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ، یعنی ایک ایسا وقت آنے والا ہے جبکہ تمہیں جہاد کی دعوت دی جائے گی اور یہ جہاد ایک بڑی سخت جنگجو قوم کے ساتھ ہوگا اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش نہیں آیا، کیونکہ اولاً تو آپ کا اس کے بعد اعراب کو کسی غزوہ میں دعوت شرکت دینا ثابت نہیں ثانیاً اسکے بعد کسی ایسی قوم سے مقابلہ بھی نہیں ہوا جسکے بہادر اور سخت ہونے کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے کیونکہ غزوۂ تبوک میں اگرچہ مقابلہ ایسی قوم سے تھا مگر نہ اس غزوہ میں اعراب کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ انہیں قتال کی نوبت آئی کیونکہ مقابل آدمیوں پر اللہ نے رعب ڈال دیا وہ مقابلہ پر نہیں آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ بغیر قتال کے واپس آئے اور غزوۂ حنین میں بھی نہ انکو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اسوقت مقابل کوئی ایسی قوم تھی جو سخت اور ساز و سامان والی ہو۔ اسلئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے فارس اور روم یعنی کسریٰ و قیصر کی قومیں ہیں جن کیساتھ جہاد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا ہے، ہو قول ابن عباس رضی اللہ عنہ، وعطاء، و مجاہد و ابن ابی لیلیٰ و قرطبی، اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس قوم سے کونسی قوم مراد ہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں بنو حنیفہ اہل یمامہ یعنی مسیلمہ کذاب کی قوم کیساتھ جہاد کرنے کی دعوت دی اسوقت ہم سمجھے کہ یہی قوم اس آیت میں مراد تھی مگر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد و تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ سبھی قومیں اسمیں داخل ہوں۔

امام قرطبی نے اسکو نقل کرکے فرمایا کہ یہ آیت اسکی دلیل ہے کہ حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی خلافت حق کے مطابق تھی انکی دعوت کا ذکر خود قرآن نے آیت مذکورہ میں فرمایا ہے تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ، حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں أَوْ يُسْلِمُوا بغیر نون کے آیا ہے اس لئے قرطبی نے اسکے مطابق حرف أَوْ کو حتّٰی کے معنی میں لیا ہے یعنی اس قوم سے قتال اسوقت تک ہوتا رہے گا جب تک کہ وہ مطیع فرمانبردار نہ ہوجائیں خواہ اسلام قبول کرکے یا اسلامی حکومت کی اطاعت میں رہنا قبول کرکے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب اوپر کی آیات میں جہاد کی شرکت سے ہٹنے والوں کے لئے عذاب کی وعید آئی إِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا، تو کچھ معذور لوگ جو صحابہ کرام میں تھے ان کو فکر ہوئی کہ ہم تو شرکت جہاد کے قابل نہیں، کہیں ہم بھی اس وعید میں شامل نہ ہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اندھے، لنگڑے اور بیمار کو حکم جہاد سے مستثنیٰ کر دیا گیا (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

خلاصۂ تفسیر

تحقیق اللہ ان مسلمانوں سے (جو آپ کے ہمسفر ہیں) خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے (جہاد میں ثابت قدم رہنے پر) بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ (اخلاص اور عہد کو پورا کرنے کا عزم) تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب میں اطمینان پیدا کر دیا (جس سے ان کو خدا کا حکم ماننے میں ذرا بھی پیش و پیش یا تردد نہیں ہوا یہ تو معنوی نعمتیں ہوئیں) اور (اس کے ساتھ کچھ محسوس نعمتیں بھی دی گئیں جن میں دنیوی نعمتیں بھی شامل تھیں چنانچہ) ان کو ایک لگتے ہاتھ فتح دیدی (مراد اس فتح سے فتح خیبر ہے) اور (اس فتح میں) بہت سی غنیمتیں بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) بڑا حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے جس وقت جس کے لئے مناسب سمجھتا ہے فتح دیدیتا ہے اور یہی فتح خیبر پر بس نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے سو (ان میں سے) سر دست تم کو یہ دیدی ہے اور (اس کے دینے کے لئے خیبر اور نواح خیبر کے) لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے (یعنی سب کے

دلوں پر رعب ڈالدیا کہ اُن کو زیادہ درازدستی کی ہمت نہ ہوئی اور اس سے تمہارا دُنیوی نفع بھی مقصود تھا تاکہ آرام اور فراغت ملے) اور (دینی نفع بھی تھا، تاکہ یہ (واقعہ) اہل ایمان کیلئے (دوسرے وعدوں کے سچے ہونیکا) ایک نمونہ ہوجائے (یعنی خدا کے وعدوں کے سچا ہونے پر اور زیادہ ایمان پختہ ہوجائے) اور تاکہ (اس نمونہ کے ذریعہ) تم کو (آئندہ کے لئے ہر کام میں) ایک سیدھے راستہ پر ڈالدے (مراد اس راستہ سے توکل اور اللہ پر بھروسہ ہے یعنی ہمیشہ کے لئے اس واقعہ کو سوچ کر اللہ پر اعتماد سے کام لیا کرو اس ثانی دینی نفع دو ہوگئے ایک علمی اور اعتقادی جس کو ولتکون سے بیان فرمایا ہے، دوسرا عملی و اخلاقی جس کو یھدیکم کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے) اور ایک فتح اور بھی (موعود) ہے جو (اس وقت تک) تمھارے قابو میں نہیں آئی (مراد اس سے فتح مکہ ہے جو اب تک واقع نہیں ہوئی تھی مگر) خدا تعالےٰ اس کو احاطہ (قدرت) میں لئے ہوئے ہے (جب چاہے گا تم کو عطا کردیگا) اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

معارف و مسائل

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، اس بیعت سے مُراد بیعت حُدیبیہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلے بھی اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ میں آیا ہے یہ آیت بھی اسی سے متعلق اور اس کی تاکید ہے اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس بیعت کے شرکاء سے اپنی رضا کا اعلان فرمادیا ہے اسی لئے اسکو بیعت رضوان بھی کہا جاتا ہے اور مقصود اس سے ان شرکاء بیعت کی مدح اور اُن کو اس عہد کے پُورا کرنے کی تاکید ہے۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن ہماری تعداد چودہ سو نفر کی تھی ہم سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انتم خیر اھل الارض، یعنی تم لوگ تمام روئے زمین کے انسانوں سے بہتر ہو۔ اور صحیح مسلم میں اُم بشرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ لایدخل النار احد ممن بایع تحت الشجرۃ، یعنی جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے بیعت کی ہے اُن میں کوئی جہنم میں نہیں جائیگا (مظہری) اس لئے اس بیعت کے شرکاء کی مثال شرکاء غزوہ بدر کی سی ہے جیسا انکے متعلق قرآن و حدیث میں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارتیں ہیں اسی طرح شرکاء بیعت رضوان کے لئے بھی یہ بشارت آئی ہے۔

یہ بشارتیں اس پر شاہد ہیں کہ ان سب حضرات کا خاتمہ ایمان اور اعمال صالحہ مرضیہ پر ہوگا کیونکہ رضائے الٰہی کا یہ اعلان اسکی ضمانت دے رہا ہے۔

صحابہ کرام پر طعن و تشنیع اور اُن کی لغزشوں میں غور و بحث اس آیت کے خلاف ہے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ جن خیار اُمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا یہ اعلان فرما دیا ہے، اگر اُن سے کوئی لغزش یا گناہ ہوا بھی ہے تو یہ آیت اُس کی معافی کا اعلان ہے، پھر اُنکے ایسے معاملات کو جو تحسن نہیں زیر غور و فکر اور بحث و مباحثہ کا میدان بنانا بدبختی اور ظاہر اس آیت کی مخالفت ہے۔ یہ آیت روافض کے قول کی واضح تردید ہے جو ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے صحابہ پر کفر و نفاق کے الزام لگاتے ہیں

شجرۃ رضوان شجرہ جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے ایک ببول کا درخت تھا اور مشہور یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگ وہاں جا کر جاتے اور اس درخت کے نیچے نمازیں پڑھتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں آنے والے جاہل اسی درخت کی پرستش نہ شروع کر دیں جیسے پچھلی اُمتوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے ہیں اس لئے اس درخت کو کٹوا دیا، مگر صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت طارق بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حج کے لئے گیا تو راستے میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو ایک مقام پر جمع تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے انھوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی تھی۔ میں اسکے بعد حضرت سعید بن مسیبؓ کے پاس حاضر ہوا اور اس واقعہ کی خبر اُن کو دی، انھوں نے فرمایا کہ میرے والد ان لوگوں میں سے تھے جو اس بیعت رضوان میں شریک تھے انھوں نے بتلایا کہ ہم جب اگلے سال مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو ہم نے وہ درخت تلاش کیا ہمیں شبہ ہو گیا، ہم اسے پہچان نہیں سکے، پھر سعید بن مسیب نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جو خود اس بیعت میں شریک تھے اُن کو تو پتہ نہیں لگا تمہیں وہ معلوم ہو گیا عجیب بات ہے کیا تم اُن سے زیادہ واقف ہو (روح المعانی)
اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں لوگوں نے محض اپنے تخمینہ و اندازے سے کسی درخت کو متعین کر لیا اور اس کے نیچے حاضر ہونا اور نمازیں پڑھنا شروع کر دیا، فاروق اعظمؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہ درخت نہیں پھر خطرہ ابتلائے شرک کا لاحق ہو گیا، اسلئے اسکو قطع کرا دیا ہو کیا بعید ہے۔

فتح خیبر خیبر درحقیقت ایک صوبہ کا نام ہے جس میں بہت سی بستیاں اور قلعے اور باغات شامل تھے (مظہری)
وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا، اس فتح قریب سے مراد باتفاق فتح خیبر ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد واقع ہوئی ہے بعض روایات کے مطابق تو حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ کا قیام مدینہ طیبہ میں صرف دس روز اور دوسری روایت کے مطابق بیس روز رہا اسکے بعد خیبر کے لئے روانہ ہو گئے، اور ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق آپ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور محرم سنہ ۷ ہجری میں آپ غزوہ خیبر کے لئے تشریف لے گئے اور ماہ صفر سنہ ۷ ہجری میں یہ فتح ہوا۔ واقدی کے مغازی میں یہی لکھا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہی راجح ہے (تفسیر مظہری)

بہرحال یہ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ فتح خیبر سفر حدیبیہ سے کافی دنوں کے بعد پیش آیا ہے۔ اور سورۂ فتح کا سفر حدیبیہ کے دوران نازل ہونا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ پوری سورت اسی وقت نازل ہوئی یا کچھ آیتیں بعد میں آئیں۔ اگر پہلی صورت راجح ہو تو ان آیتوں میں واقعہ خیبر کا بیان بطور پیشگوئی کے ہو اور اسکو بصیغہ ماضی قطعی اور یقینی ہونے کی بنا پر تعبیر کیا گیا، اور اگر دوسرا قول راجح ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ آیتیں بعد وقوع فتح خیبر کے نازل ہوئی ہوں واللہ اعلم۔

وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا، مراد اس سے خیبر کا مالِ غنیمت ہے جس سے مسلمانوں کو سہولت اور فراغ بالی حاصل ہوئی۔

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ ، اس سے مراد تمام اسلامی فتوحات اور انکے غنائم ہیں جو قیامت تک حاصل ہونے والی ہیں۔ پہلے غنائم اہل حدیبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخصوص کر دیئے گئے تھے یہ سب کے لئے عام ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تخصیص کا حکم ان آیات میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہ جداگانہ وحی کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا ہے۔ آپ نے اُس پر عمل کیا اور صحابہ کرام کو بتلایا۔

وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ ، اس سے مراد کفار اہل خیبر ہیں کہ اُن کو اس جہاد میں کچھ زیادہ زور دکھانے کا موقع اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ قبیلۂ غطفان یہود خیبر کا حلیف تھا جب اس قبیلہ نے خبر سُنی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی ہے تو یہ لوگ یہود کی مدد کے لئے بڑے ساز و سامان سے نکلے مگر اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں میں رعب ڈالدیا اور یہ اس فکر میں پڑ گئے کہ اگر ہم اسطرف گئے تو بعید نہیں کہ مسلمانوں کا کوئی لشکر ہمارے پیچھے ہمارے گھروں پر حملہ کردے اسلئے سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے (مظہری)

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ، اصل ہدایت صراط مستقیم کی تو ان حضرات کو پہلے سے حاصل تھی مگر جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ ہدایت کے درجات بیشمار ہیں یہاں وہ درجہ مراد ہے جو پہلے سے حاصل نہ تھا یعنی اللہ پر بھروسہ اور قوت ایمان کی زیادتی۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اور بہت سی فتوحات کا وعدہ کیا ہے جس پر ابھی اُن کو قدرت نہیں۔ ان فتوحات میں چونکہ سب سے پہلے مکہ مکرمہ کی فتح ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے فتح مکہ مراد لیا ہے مگر الفاظ عام ہیں قیامت تک ہونے والی فتوحات اس میں شامل ہیں (مظہری)۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ
اور اگر لڑتے تم سے کافر تو پھیرتے پیٹھ پھر نہ پاتے کوئی حمایتی اور

لَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ
نہ مددگار رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے اور تو ہرگز نہ دیکھے گا

اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ
اللہ کی رسم کو بدلتے اور وہی ہے جس نے روک رکھے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے

بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بیچ شہر مکہ کے بعد اس کے کہ تمہارے ہاتھ لگا دیا ان کو اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو

بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
دیکھتا وہ وہی لوگ ہیں جو منکر ہوئے اور روکا تم کو مسجد حرام سے

وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ
اور نیاز کی قربانی کو بھی بند پڑی ہوئی اس بات سے کہ پہنچے اپنی جگہ تک اور اگر نہ ہوتے کتنے ایک مرد ایماندار

وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَــُٔـوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ
اور کتنی عورتیں ایمان والیاں جو تم کو معلوم نہیں یہ خطرہ کہ تم ان کو پیس ڈالتے پھر تم پر ان کی وجہ سے

مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا
خرابی پڑ جاتی بے خبری سے کہ اللہ کو داخل کرنا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہے اگر وہ لوگ الگ

لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ
ہو جاتے تو آفت ڈالتے ہم منکروں پر عذاب دردناک کی جب رکھی منکروں

كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ
نے اپنے دلوں میں کد نادانی کی ضد پھر اتارا اللہ نے اپنی طرف کا اطمینان

عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا
اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور قائم رکھا ان کو ادب کی بات پر اور وہی تھے

اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۲۶﴾
اس کے لائق اور اس کام کے اور ہے اللہ ہر چیز سے خبردار

خلاصۂ تفسیر

اور (چونکہ ان کفار کے مغلوب ہونے کے مقتضیات موجود تھے جو آگے آتے ہیں اسلئے)

اگر (تم میں صلح نہ ہوتی بلکہ) تم سے یہ کافر لڑتے تو (اُن مقتضیات کی وجہ سے وہ) ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا نہ مددگار (اور) اللہ تعالیٰ نے (کفار کے لئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے (کہ مقابلہ میں اہل حق غالب اور اہل باطل مغلوب رہتے ہیں اور کبھی کسی وقت کسی حکمت و مصلحت سے اسمیں تاخیر ہونا اسکے منافی نہیں) اور آپ خدا کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) ردوبدل نہ پاویں گے (کہ خدا تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے اور کوئی اسکو نہ ہونے دے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے انکے ہاتھ تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ اُن (کے قتل) سے عین مکہ (کے قریب) میں (یعنی حدیبیہ میں) روک دئیے بعد اسکے کہ تم کو ان پر قابو دیدیا تھا (یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو قصہ حدیبیہ کے جزو دوم میں شروع میں بیان ہوچکا ہے کہ قریش کے پچاس آدمیوں کو صحابہ کرام نے گرفتار کرلیا تھا اور پھر کچھ لوگ بھی گرفتار ہوکر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے اسوقت اگر مسلمان انکو قتل کر دیتے تو دوسری طرف مکہ میں حضرت عثمان غنی اور انکے چند ساتھی روک لئے گئے تھے وہ ان کو شہید کر دیتے اسکا لازمی نتیجہ مکمل طور پر جنگ چھڑ جانا ہوتا اور جیسا مذکور الصدر آیات کی پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر جنگ ہو بھی جاتی تو فتح مسلمانوں ہی کی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلمانوں کی بڑی مصلحت اس میں تھی کہ اسوقت جنگ نہ ہو اس لئے اس طرف مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈالدی کہ اُنکے قیدیوں کو قتل نہ کریں اس طرح مسلمانوں کے ہاتھ انکے قتل سے روک دئیے دوسری طرف قریش کے دلوں پر اللہ نے مسلمانوں کا رعب ڈالدیا کہ اُنہوں نے صلح کی طرف مائل ہوکر سہیل کو آپ کی خدمت میں بھیجا، اس طرح حق تعالیٰ کی حکمت نے دو طرفہ انتظام جنگ نہ ہونے کا کردیا) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو (اسوقت) دیکھ رہا تھا (اور ان کاموں کے نتائج کو جانتا تھا اسلئے ایسا کام نہیں ہونے دیا جس سے جنگ چھڑ جائے۔ آگے اسکا بیان ہے کہ اگر جنگ ہوجاتی تو کفار کی مغلوبیت کس طرح اور کیوں ہوتی) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو (عمرہ کرنے کے لئے) مسجد حرام سے روکا (مراد مسجد حرام اور صفا مروہ کے درمیان کا میدان جہاں سعی ہوتی ہے دونوں ہی ہیں مگر چونکہ طواف اصل اور اول ہے اور وہ مسجد حرام ہی میں ہوتا ہے اسلئے اس سے روکنے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا) اور قربانی کے جانور کو جو (حدیبیہ میں) رُکا ہوا رہ گیا اس کو اس کے موقع میں پہنچنے سے روکا (جانوروں کی قربانی کا موقع منیٰ ہے ان لوگوں نے جانوروں کو منیٰ تک نہیں جانے دیا، یہ ان کے دو جرم) اور حرم محترم میں بیٹھ کر ایسا جرم کرنیکا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دے کر ان کو مغلوب کردیا جاتا، لیکن بعض حکمتیں اس تقاضے کو پورا کرنے سے مانع ہوگئیں ان حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُسوقت مکہ میں بہت

سے مسلمان کفار کے ہاتھوں محبوس اور مظلوم تھے جیسے کہ قصہ حدیبیہ کے جزو دوم میں ان کا ذکر آیا ہے اور ان میں سے ابوجندل کا حضورؐ کی خدمت میں پہنچ کر فریاد کرنا بیان ہو چکا ہے، اگر اس وقت جنگ چھڑ جاتی تو غیر شعوری طور پر ان مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا اور ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ سے بھی وہ قتل ہو جاتے، اور عام مسلمانوں کو پھر اس پر ندامت و افسوس ہوتا اسلئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ جنگ نہ ہو۔ اسی مضمون کو آگے فرمایا ہے کہ) اگر (مکہ میں اس وقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی یعنی ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں (رنج و افسوس کا) ضرر پہنچتا (اگر یہ بات نہ ہوتی) تو سب قصہ طے کر دیا جاتا، لیکن ایسا اسلئے نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے (چنانچہ جنگ نہ ہونے سے ان مسلمانوں کی جان بچی اور تم ان کے قتل کے گناہ اور پھر اس پر رنج و افسوس سے بچے البتہ) اگر یہ (مذکور مسلمان مکہ سے کہیں) ٹل گئے ہوتے تو ان (اہل مکہ) میں جو کافر تھے ہم ان کو (مسلمانوں کے ہاتھ سے) دردناک سزا دیتے (اور ان کفار کے مغلوب و مقتول ہونے کا ایک مقتضی اور بھی تھا) جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی (اس عار سے وہ ضد مراد ہے جو بسم اللہ اور لفظ رسول اللہ کے لکھنے پر انھوں نے مزاحمت کی جیسا کہ اوپر صلحنامہ حدیبیہ کے بیان میں اس کا ذکر آ چکا ہے، سو (اس کا مقتضا یہ تھا کہ مسلمان جوش میں آکر لڑ پڑتے مگر) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور مؤمنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا فرمایا۔ (جس کی وجہ سے انھوں نے اس کلمہ کے لکھنے پر اصرار چھوڑ دیا اور صلح ہو گئی) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا (تقویٰ کی بات سے مراد کلمہ طیبہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار ہے اور مطلب اس پر جمائے رکھنے کا یہ ہے کہ توحید و رسالت کے اعتقاد کا تقاضا اطاعت ہے اللہ اور رسول کی اور مسلمانوں کا یہ صبر و ضبط اپنے جذبات کے خلاف صرف اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضبط و صبر کا حکم فرمایا تھا ایسے سخت معاملہ میں اپنے جذبات کے خلاف رسول کی اطاعت ہی کا نام کلمہ تقویٰ پر جمنا ہے) اور وہ (مسلمان) اس (کلمہ تقویٰ) کے (دنیا میں بھی) زیادہ مستحق ہیں (کیونکہ ان کے قلوب میں طلب حق ہے اور یہ طلب ہی ایمان تک پہنچاتی ہے) اور (آخرت میں بھی) اس (کے ثواب) کے اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

معارف و مسائل

بِبَطْنِ مَكَّةَ، اس لفظ کے اصلی معنی بطن مکہ کے ہیں مگر یہاں اس سے مراد مقام حدیبیہ ہے اس کو مکہ مکرمہ سے بہت متصل ہونے کی بنا پر بطن مکہ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ دراس سے اُس

بات کی تائید ہوتی ہے جو حنفیہ نے اختیار کی ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔ اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محصر عن الحج والعمرہ یعنی جس کو احرام باندھنے کے بعد کسی وجہ سے دخولِ مکہ سے روک دیا گیا ہو اُس پر بالاتفاق یہ تو لازم ہے کہ قربانی کر کے احرام سے حلال ہو لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ قربانی اسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں وہ روک دیا گیا ہے یا دوسری قربانیوں کی طرح اسکے لئے بھی حدود حرم کے اندر ہونا شرط ہے حنفیہ کے نزدیک اسکے لئے بھی حدود حرم شرط ہیں اس آیت سے ان کا استدلال ہے کہ یہاں اس قربانی کے لئے قرآن نے ایک خاص محل قرار دیا ہے جس سے کفار نے مسلمانوں کو روک دیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس قربانی کے لئے حدود حرم میں ہونا شرط ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ خود حنفیہ ہی کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ بعض حصے حرم میں داخل ہیں تو پھر حرم سے روکنا کیسے ثابت ہوا، تو جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس قربانی کا حدود حرم میں کسی بھی جگہ کر دینا شرعاً کافی ہے مگر اس خاص جگہ میں جو منیٰ کے اندر منحر کے نام سے موسوم ہے اسمیں ہونا افضل ہے۔ کفار مکہ نے اسوقت مسلمانوں کو اس افضل مقام تک قربانی کا جانور لیجانے سے روکدیا تھا۔

فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ، لفظ معرہ کے معنی بعض حضرات نے گناہ کے بیان کئے ہیں اور بعض حضرات نے مطلق مضرت کے، اور بعض نے عیب کے بیان کئے ہیں۔ اس مقام پر ظاہر یہی آخری معنی ہیں کہ اگر جنگ چھڑ جاتی اور بے خبری کی حالت میں مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ محبوس مسلمان قتل ہو جاتے تو یہ ایک عیب اور عار کی بات بھی تھی کہ کفار ان کو عار دلاتے کہ اپنے ہی دینی بھائیوں کو مار ڈالا اور مضرت بھی، مقتول مسلمانوں کی مضرت تو ظاہر ہی ہے قاتل مسلمانوں کو بے خبری میں سخت ندامت اور افسوس ہوتا، یہ مضرت عام مسلمانوں کو پہنچتی۔

صحابۂ کرام کو غلطی اور عیب سے بچانے کا قدرتی انتظام

امام قرطبی نے فرمایا کہ بغیر علم کے اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ گناہ تو نہیں مگر ایک عیب اور عار اور ندامت و افسوس کا سبب ضرور ہے اور قتل خطا پر دیت وغیرہ دینے کے بھی احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے صحابہ کی اس سے بھی حفاظت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں مگر عامۃً اُن کو خطاؤں اور عیبوں سے بچانے کا قدرتی انتظام ہو جاتا ہے۔

لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ، یعنی حق تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کے قلوب میں تحمل پیدا کر کے جنگ نہ ہونے کا انتظام اس لئے فرمایا کہ انہیں سے بہت سے لوگوں کا آئندہ اسلام قبول کر لینا اللہ تعالیٰ جانتا تھا اُن پر رحمت کرنے کے لئے نیز جو مسلمان محبوس تھے اُن پر

رحمت کے لئے یہ سارا سامان کیا گیا۔

لَوْ تَزَيَّلُوْا، تزیل کے معنی اصل میں تفرق کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ مکہ میں مجبور مسلمان اور کفار الگ الگ اور ممتاز ہوتے کہ مسلمان اُن کو بچا کر تکلیف سے بچا لیتے تو ان کفار کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اسی وقت ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوا دی جاتی مگر چونکہ محبوس ضعفاء مسلمین مرد اور عورتیں انہی کے اندر مخلوط تھے اگر قتال ہوتا تو ان کو بچانے کی صورت نہ تھی اسلئے **اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو موقوف رکھا۔**

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، کلمہ تقویٰ سے مراد اہل تقویٰ کا کلمہ ہے یعنی کلمہ توحید و رسالت، اس کو کلمہ تقویٰ اسلئے کہا گیا کہ یہ کلمہ ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔ اور صحابہ کرام کو اس کلمہ کا احق اور اہل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی رسوائی واضح کر دی جو ان حضرات پر کفر و نفاق کا الزام لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ان کو کلمہ اسلام کا اہل اور احق **فرمائے اور یہ بدبخت اُن پر تبرا کریں۔**

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ

اللہ نے سچ دکھلایا اپنے رسول کو خواب تحقیقی کہ تم داخل ہو رہو گے مسجد

الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ

حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے

لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا

بے کھٹکے پھر جانا وہ جو تم نہیں جانتے پھر مقرر کر دی اس سے ورے ایک فتح

قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ

نزدیک وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ

تاکہ اوپر رکھے اُس کو ہر دین سے اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا محمد رسول

اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ

اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو

رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ

رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی نشانی اُن کی اُن کے

وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَ

منہ پر ہے سجدے کے اثر سے یہ شان ہے اُن کی تورات میں اور

مَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۚ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ

مثال ان کی انجیل میں جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس کی کمر مضبوط کی پھر موٹا ہوا

فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ

پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو تاکہ جلائے ان سے جی کافروں کا وعدہ کیا ہے اللہ نے

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾

ان سے جو یقین لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام معافی کا اور بڑے ثواب کا

ع ۴ ۱۲

خُلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو مطابق واقعہ کے ہے تم لوگ مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا کوئی بال کتراتا ہوگا تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا (چنانچہ سال آئندہ ایسا ہی ہوا، اور اس سال سے تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ) سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں (اور حکمتیں) معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں (اُن حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ) پھر اس (خواب کے واقع ہونے) سے پہلے تم کو ایک قریبی فتح (خیبر کی) دیدی (تاکہ اس سے مسلمانوں کو قوت اور سامان حاصل ہو جائے اور وہ پورے اطمینان کیساتھ عمرہ ادا کریں جیسا کہ ایسا ہی واقع ہوا)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام دینوں پر غالب کر دے (یہ غلبہ حجت و دلائل کے اعتبار سے تو دائمی اور ہمیشہ ہی رہے گا اور شوکت وسلطنت کے اعتبار سے بھی غلبہ ہوگا مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ اہل دین یعنی مسلمان باصلاحیت ہوں، جب یہ شرط نہیں ہوگی تو غلبہ ظاہری کا وعدہ نہیں اور چونکہ صحابہ کرام میں یہ شرط موجود تھی جیسا کہ اگلی آیات جو صحابہ کے متعلق آرہی ہیں انہیں اس صلاحیت کا ذکر ہے اسلئے اس آیت میں جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی بشارت ہے ایسا ہی صحابہ کرام کے لئے فتوحات کی بشارت ہے جیسا کہ مشاہدہ ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اسلام اور قرآن دنیا کے گوشہ گوشہ میں فاتحانہ طور پر پہنچ گیا، اور (حمیت جاہلیت والے اگر آپکے نام کے ساتھ رسول کا لفظ لکھنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ آپکی رسالت پر) اللہ کافی گواہ ہے (جس نے آپ کی رسالت کو دلائل واضحہ اور کھلے ہوئے معجزات سے ثابت کر دکھایا جس سے ثابت ہو گیا کہ) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں (اس جگہ محمد رسول اللہ کا پورا جملہ لانے سے لطیف اشارہ ہے کہ حمیت جاہلیت والوں نے انکے نام کیساتھ رسول اللہ لکھنا گوارا نہ کیا تو کیا پرواہ ہے اللہ نے یہ کلمہ آپکے نام کیساتھ لکھدیا جو قیامت

تک بڑھا جائے گا، آگے آپ کی متبعین صحابہؓ کے فضائل و بشارات مذکور ہیں کہ) اور جو لوگ آپ کی صحبت یافتہ ہوئے ہیں (یہ لفظ تمام صحابہ کرامؓ کو شامل ہے خواہ اُن کی صحبت طویل میسر ہوئی یا قلیل جو صحابہ حدیبیہ میں آپ کے ساتھ تھے وہ اصالۃً اور خصوصاً اسکے مصداق ہیں، حاصل یہ کہ سب صحابہ کرام ان صفات کمال کیساتھ موصوف ہیں کہ) وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں (اور) آپس میں مہربان ہیں (اور) اے مخاطب تو اُن کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی (یعنی ثواب اور قرب) کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اُن (کی عبدیت) کے آثار (اُنکے) سجدہ کی تاثیر سے اُنکے چہروں پر نمایاں ہیں (مراد ان آثار سے خشوع و خضوع کے انوار ہیں جو مؤمن متقی کے چہرہ میں عموماً مشاہدہ کیئے جاتے ہیں) یہ اُنکے اوصاف (مذکورہ) توراۃ میں ہیں اور انجیل میں اُن کا یہ وصف (مذکور) ہے کہ جیسے کھیتی کہ اُسنے (اول زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اُس نے (مٹی پانی ہوا وغیرہ سے غذا پاکر) اپنی اُس (سوئی) کو قوی کیا (یعنی یہ کھیتی قوی ہوگئی) پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ (اپنے مرتبہ کے بھلے ہونے سے) کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح صحابہ میں اول ضعف تھا پھر روزانہ قوت بڑھتی گئی اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو یہ نشوونما اسلئے دیا) تاکہ اُن (کی اس حالت) سے کافروں کو (حسد میں) جلادے اور (آخرت میں) اللہ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں (گناہوں کی) مغفرت اور ([illegible]) اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے

معارف و مسائل

جب صلح حدیبیہ مکمل ہوگئی اور یہ بات طے ہوگئی کہ اسوقت بغیر دخول مکہ اور بغیر ادائے عمرہ کے واپس مدینہ جانا ہے اور صحابہ کرام کا یہ عزم عمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بنا پر ہوا تھا جو ایک طرح کی وحی تھی۔ اب بظاہر اسکے خلاف ہوتا ہوا دیکھ کر بعض صحابہ کرام کے دلوں میں خود یہ شکوک پیدا ہونے لگے کہ (معاذ اللہ) آپ کا خواب سچا نہ ہوا۔ دوسری طرف کفار و منافقین نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تمہارے رسول کا خواب سچا نہ ہوا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الآیۃ (رواہ البیہقی وغیرہ عن مجاہد)

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ، لفظ صدق بمقابلہ کذب کے اقوال میں استعمال ہوتا ہے۔ جو قول واقعہ کے مطابق ہو اسکو صدق جو مطابق نہ ہو اسکو کذب کہا جاتا ہے اور بعض اوقات یہ لفظ افعال کے لئے بھی بولا جاتا ہے تو اسوقت اسکے معنی کسی فعل کو محقق اور ثابت کرنے کے

لفظ صدق کا پہلا مفعول رسولہ اور دوسرا رؤیا ہے۔ اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول کو اپنے خواب میں سچا کر دکھایا (بیضاوی) اور اگرچہ یہ سچا کر دکھانے کا واقعہ آگے آنے والا تھا مگر اسکو بلفظ ماضی تعبیر کر کے اسکے قطعی اور یقینی ہونے کیطرف اشارہ کر دیا چنانچہ آگے بلفظ مستقبل فرمایا گیا لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ، یعنی آپ نے جو خواب میں دیکھا تھا کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہوئے یہ ضرور ہو کر رہے گا مگر اس سال نہیں بلکہ اس سال کے بعد ہوگا۔ خواب میں اسکا وقت معین نہیں تھا، صحابہ کرام نے اپنے اشتیاق کیوجہ سے اسی سال عزم سفر کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں تھیں جن کا ظہور صلح حدیبیہ کے وقت ہوا جیسا کہ صدیق اکبرؓ نے اول ہی حضرت عمرؓ کے جواب میں فرمایا تھا کہ آپ کو شک میں نہیں پڑنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں کوئی وقت اور سال معین نہیں تھا، اگر اس وقت نہیں تو بعد ہو گا (قرطبی)

آئندہ ہونے والے کاموں کیلئے انشاء اللہ کہنے کی تاکید

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آئندہ ہونے والے دخول مسجد حرام کے ساتھ انشاء اللہ کا لفظ استعمال فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ تو خود اپنی مشیت کے مالک ہیں ان کو اسکے کہنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے رسول اور سب بندوں کو تعلیم دینے کیلئے اس جگہ حق تعالیٰ نے بھی لفظ ان شاء اللہ استعمال فرمایا (قرطبی)

مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ، صحیح بخاری میں ہے کہ اگلے سال عمرہ قضا میں حضرت معاویہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک قینچی سے تراشے تھے۔ یہ واقعہ عمرہ قضا ہی کا ہے کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آپ نے حلق فرمایا ہے (قرطبی)

فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا، یعنی اللہ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ اسی سال تمہیں دخول مسجد حرام اور عمرہ نصیب ہو جاتا مگر اگلے سال تک تاخیر کرنے میں بڑی مصالح تھیں جو اللہ کو معلوم تھیں تم انکو نہ جانتے تھے۔ منجملہ ان مصالح کے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس سے پہلے خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کی قوت اور سامان میں اضافہ ہو جائے اور وہ فراغت و اطمینان کیساتھ عمرہ ادا کریں اسی لئے فرمایا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا۔ دُوۡنَ ذٰلِكَ سے مراد دُوۡنَ الرُّؤۡيَا ہے یعنی اس خواب کے واقع ہونے سے پہلے خیبر کی فتح قریب مسلمانوں کو حاصل ہو جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس فتح قریب سے مراد خود صلح حدیبیہ ہے کہ وہ فتح مکہ اور دوسری تمام فتوحات کا مقدمہ تھی اور بعد میں تو سبھی صحابہ نے اسکو اعظم الفتوحات قرار دیا ہے تو اب مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اس سال تمہارے عزم سفر اور پھر ناکام ہونے اور صلح ہونے میں جو حکمتیں اور مصالح تھیں وہ تمہارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ سب سے واقف تھا وہ چاہتا تھا

کہ تم کو اس خواب کے واقعہ سے پہلے صلح حدیبیہ کے ذریعہ ایک فتح قریب نصیب فرمادے اسی فتح قریب کا یہ نتیجہ سب نے دیکھ لیا کہ صحابہ کرام جن کی تعداد سفر حدیبیہ میں ڈیڑھ ہزار سے زائد تھی اسکے بعد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ (از قرطبی)

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ، سابقہ آیات میں جو فتوحات اور غنائم کے وعدے اور اہل حدیبیہ کے خصوصاً اور تمام صحابہ کے عموماً فضائل اور بشارتیں مذکور ہوئے ہیں اب خاتمہ سورت میں ان مضامین کی تثبیت و تاکید ہے اور چونکہ یہ سب نعمتیں اور بشارتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور تصدیق کی بنا پر ہوئیں اسلئے اس تصدیق و اطاعت کی مزید تاکید کے لئے نیز منکرین رسالت محمدیہ پر رد کرنے کے لئے اور صلح حدیبیہ کے وقت جو بعض مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شکوک پیدا ہوگئے تھے اُن کے ازالہ کے لئے ان آیت میں آپکی رسالت کا اثبات بلکہ تمام دُنیا کے دینوں پر آپکے دین کو غالب کرنے کی بشارت دی گئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، پورے قرآن میں خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لینے کے بجائے عموماً آپ کا ذکر اوصاف والقاب کیساتھ کیا گیا خصوصاً ندا کے موقع پر یٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ، یٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ، یٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ بخلاف دوسرے انبیاء کے کہ انکے نام کیساتھ ندا کی گئی، یا ابراہیم یا موسیٰ یا عیسیٰ۔ پورے قرآن میں صرف چار جگہ آپ کا نام مبارک محمدؐ ذکر فرمایا ہے جہاں اس نام کے ذکر ہی میں کوئی مصلحت تھی۔ اس مقام پر مصلحت یہ تھی کہ حدیبیہ کے صلحنامہ میں آپکے نام کے ساتھ جب حضرت علیؓ نے محمد رسول اللہ لکھا تو کفار قریش نے اس کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے پر اصرار کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بحکم ربانی اس کو منظور کر لینا قبول کیا۔ حق تعالےٰ نے اس مقام پر خصوصیت سے آپکے نام مبارک کیساتھ رسول اللہ کا لفظ قرآن میں لا کر اس کو دائمی بنا دیا جو قیامت تک اسی طرح پڑھا لکھا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ، یہاں سے آپ کے صحابہ کرام کے فضائل کا بیان ہے۔ اگرچہ اس کے پہلے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے لیکن الفاظ کے عموم میں سبھی صحابہ کرام شامل ہیں کیونکہ صحبت و معیت سب کو حاصل ہے۔

صحابہ کرام کے اوصاف وفضائل اور خاص علامات

اس مقام پر حق تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپکے دین کو سب دینوں پر غالب کرنیکا بیان فرما کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوصاف فضائل اور خاص علامات کا ذکر تفصیل کیساتھ فرمایا ہے۔ اسمیں انکے اس سخت امتحان کا انعام بھی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت لیا گیا تھا کہ اُن کے قلبی یقین اور قلبی جذبات کیخلاف صلح ہو کر بغیر دخول مکہ وغیرہ کے ناکام واپسی کے باوجود انکے قدم

متزلزل نہیں ہوئے اور بے نظیر اطاعت رسُول اور قوت ایمانی کا ثبوت دیا، نیز صحابہ کرام کے فضائل اور علامات کی تفصیل بیان فرمانے میں یہ حکمت بھی ہو تو بعید نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی و رسُول تو مبعوث ہونے والا نہیں تھا آپ نے اپنے بعد اُمت کے لئے کتاب اللہ کے ساتھ اپنے اصحاب ہی کو بطور نمونہ کے چھوڑا ہے اور ان کی اقتدار و اتباع کے احکام دیئے ہیں، اسلئے قرآن نے بھی انکے کچھ فضائل اور علامات کا بیان فرما کر مسلمانوں کو ان کے اتباع کی ترغیب و تاکید فرمادی ہے۔ اس مقام پر صحابہ کرام کا سب سے پہلا وصف تو یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ کفار کے مقابلہ میں سخت ہونا اُن کا ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے کہ نسبی رشتے ناتے سب اسلام پر قربان کر دیئے اور حدیبیہ کے موقع پر خصوصیت سے اسکا اظہار ہوا۔ اور آپس میں مہربان اور ایثار پیشہ ہونا صحابہ کرام کا اس وقت خصوصیت سے ظاہر ہوا جبکہ مہاجرین و انصار میں مواخات ہوئی اور انصار نے اپنی سب چیزوں میں مہاجرین کو شریک کرنے کی دعوت دی۔ قرآن نے صحابہ کرام کے اس وصف کو مقدم بیان فرمایا کیونکہ درحقیقت اسکا حاصل یہ ہے کہ اُن کی دوستی اور دشمنی، محبت یا عداوت کوئی چیز اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ اور اسکے رسُول کے لئے ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایمان کامل کا اعلیٰ مقام ہے صحیح بخاری وغیرہ کی حدیث میں ہے من حب للّٰہ و ابغض للّٰہ فقد استکمل ایمانہ یعنی جس شخص نے اپنی محبت اور بغض و عداوت دونوں کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیا اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرام کے کفار کے مقابلہ پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ و رسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں اُن کو اپنے رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہاں تک اُن کے ساتھ رحم و کرم کے معاملہ کا تعلق ہے وہ تو خود قرآن نے اسکا فیصلہ کر دیا ہے کہ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ (الیٰ) اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ، یعنی جو کفار مسلمانوں کے در پئے آزار اور مقاتلہ پر نہیں اُن کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا، چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بیشمار واقعات میں ضعیف و مجبور یا ضرورتمند کفار کے ساتھ احسان و کرم کے معاملات کیے گئے ہیں اور انکے معاملہ میں عدل و انصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے، عین میدان کارزار میں بھی عدل و انصاف کیخلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

دوسرا وصف صحابہ کرام کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُن کا عام حال یہ ہے کہ وہ رکوع و سجدہ اور نماز میں مشغول رہتے ہیں، اُن کو دیکھنے والے اکثر ان کو اسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ پہلا وصف کمال ایمان کی علامت تھی دوسرا وصف کمال عمل کا بیان ہے کیونکہ اعمال میں سب سے افضل

میں اور دوسری انجیل میں ہونا معلوم ہے۔ امام بغوی نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں ہے کہ شروع میں قلیل ہونگے پھر بڑھیں گے اور قوی ہونگے جیسا کہ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ ایک قوم ایسی نکلے گی جو کھیتی کی طرح بڑھے گی اور وہ نیک کاموں کا حکم اور بُرے کاموں سے منع کیا کرے گی (مظہری) موجودہ زمانہ کی تورات و انجیل میں بھی بیشمار تحریفات کے باوجود اس پیشین گوئی کے حسب ذیل الفاظ موجود ہیں۔ تورات باب استثناء ۳۳، ۱ تا ۳ کے یہ الفاظ ہیں۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اسکے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت انکے لئے تھی وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اسکے سارے مقدس تیرے ہاتھوں میں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے میں تیری باتیں مانیں گے"

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فتح مکہ کے وقت صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار تھی جو فاران سے طلوع ہونے والے اس نورانی پیکر کیساتھ شہر خلیل میں داخل ہوئے تھے۔ اسکے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی کے لفظ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں سے محبت کریگا کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مضمون سمجھا جاتا ہے اسکی پوری تفصیل مع دوسرے حوالوں کے اظہار الحق جلد سوم باب ششم صـ۲۵۶ میں ہے یہ کتاب عیسائیت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر کے مقابلہ پر تحریر فرمائی تھی اس کتاب میں انجیل کی تمثیل کا اسطرح ذکر ہے۔ انجیل متی باب ۱۳ آیت ۳۱ میں یہ الفاظ ہیں۔ اس نے ایک اور تمثیل انکے سامنے پیش کرکے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لیکر اپنے کھیت میں بودیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اسکی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ اور انجیل مرقس ۴ : ۲۶ کے یہ الفاظ ہیں جو الفاظِ قرآنی کے زیادہ قریب ہیں۔ "اس نے کہا خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (اظہار الحق جلد ۳) باب ششم صـ۳۱۰ آسمان کی بادشاہی سے مراد نبی آخر الزماں کا ہونا انجیل کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اُن صفاتِ کمال کیساتھ مزین فرمایا اور انکو ضعف کے بعد قوت، قلت کے بعد کثرت بخشی، یہ سب کام اسلئے ہوا تاکہ ان کو دیکھ کر کافروں کو غیظ ہو، اور وہ حسد کی آگ میں جلیں۔ حضرت ابو عروہ زبیریؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت امام مالکؒ کی مجلس میں حاضر تھے ایک شخص نے بعض صحابہ کرام کی تنقیص کے کچھ کلمات کہے تو امام مالکؒ یہ آیت پوری تلاوت کرکے جب لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ پر پہنچے تو فرمایا کہ جس شخص کے دل میں صحابہ کرام میں سے

کسی کے تئیں غیظ ہو تو اس آیت کی وعید اس کو پہنچے گی (قرطبی) حضرت امام مالکؒ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ وہ کافر ہو جاوے گا مگر یہ فرمایا کہ یہ وعید اس کو بھی پہنچے گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں جیسا کام کرنے والا ہو جائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا، مِنْهُم کا حرف مِن اس جگہ باتفاق مفسرین بیانیہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سب صحابہ کرام ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں، دوسرے یہ کہ اُن سب سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے اور یہ مِن بیانیہ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ تو مِنَ الْاَوْثَانِ بیان ہے لفظ رجس کا، اسی طرح یہاں مِنْهُمْ بیان ہے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا۔ اور روافض نے جو اس جگہ حرف مِن کو تبعیض کے لئے کہہ کر مطلب نکالا ہے کہ انہیں سے جو بعض لوگ ایمان و عمل صالح پر ہیں اُن سے یہ وعدہ ہے یہ سراسر سیاق کلام اور اوپر کی آیات کے منافی ہے کیونکہ اس آیت کے مفہوم میں وہ صحابہ کرام تو بلاشبہ داخل، اور آیت کے پہلے مصداق ہیں جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے ان سب کے متعلق اوپر کی آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرما دیا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ اور رضائے الٰہی کا یہ اعلان اس کی ضمانت ہے کہ یہ سب مرتے دم تک ایمان و عمل صالح پر قائم رہیں گے کیونکہ اللہ تو علیم و خبیر ہے اگر کسی کے متعلق اسکو یہ معلوم ہو کہ کسی وقت ایمان سے پھر جانے والا ہے تو اُس سے اپنی رضا کا اعلان نہیں فرما سکتے۔ ابن عبدالبر نے مقدمہ استیعاب میں اسی آیت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ومن رضی اللہ عنہ لم یسخط علیہ ابداً یعنی اللہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس پر کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی بنا پر ارشاد فرمایا کہ بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی آگ میں نہ جائیگا تو یہ وعدہ جو اصالۃً انہی کے لئے کیا گیا ہے انہیں سے بعض کا مستثنیٰ ہونا قطعاً باطل ہے اسی لئے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عادل و ثقہ ہیں۔

صحابہ کرام سب کے سب اہل جنت ہیں اُن کی خطائیں مغفور ہیں اُن کی تنقیص گناہ عظیم ہے

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کی تصریحات ہیں جن میں چند آیات تو اسی سورۃ میں آچکی ہیں لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، ان کے علاوہ اور بہت سی آیات میں یہ مضمون مذکور ہے يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ، وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ اور سورۂ حدید میں حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی یعنی ان سب سے اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے پھر سورۂ انبیاء میں حسنیٰ کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دُور رکھے جائیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (بخاری)

یعنی تمام زمانوں میں میرا زمانہ بہتر ہے اسکے بعد اُس زمانے کے لوگ بہتر ہیں جو میرے زمانے کے متصل ہیں پھر وہ جو اُنکے متصل ہیں۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ (اُن کی قوت ایمان کی وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ) اگر تم میں سے کوئی شخص اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کردے تو وہ اُنکے خرچ کئے ہوئے ایک مُد کی برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ نصف مُد کی برابر۔ مُد عرب کا ایک پیمانہ ہے جو تقریباً ہمارے آدھے سیر کی برابر ہوتا ہے (بخاری)۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کو سارے جہان میں سے پسند فرمایا ہے پھر میرے صحابہ میں میرے لئے چار کو پسند فرمایا ہے۔ ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم (رواہ البزار بسند صحیح) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم ومن اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ ومن اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ (رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن مغفل از جمع الفوائد)

اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے معاملے میں میرے بعد ان کو طعن تشنیع کا نشانہ مت بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کیساتھ ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کیساتھ ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا پہنچائی اُسنے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا دی اُسنے اللہ کو ایذاء پہنچائی اور جو اللہ کو ایذا پہنچانے کا قصد کرے تو قریب ہے کہ اللہ اسکو عذاب میں پکڑے گا۔

آیات و احادیث اسکے متعلق بہت ہیں جن کو احقر نے اپنی کتاب **مقام صحابہ** میں جمع کردیا ہے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ کے عدل و ثقہ ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اور صحابہ کرام کے مابین جو اختلافات جنگ و قتال تک پہنچے انکے متعلق بحث و تمحیص اور تنقید و تحقیق یا سکوت کا مسئلہ بھی اس کتاب میں تفصیل کیساتھ لکھدیا گیا ہے اور اسمیں سے بقدر ضرورت سورۂ محمد کی تفسیر میں آچکا ہے اس کو دیکھ لیا جائے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

تَمَّتْ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ سُوْرَةُ الْفَتْحِ لِلتَّاسِعِ وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ شَعْبَانَ سَنَةَ ۱۳۹۲ھ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهٗ وَاٰخِرُهٗ

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ

سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانِيَ عَشَرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا

اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا

اللہ سے، اللہ سنتا ہے جانتا ہے اے ایمان والو بلند نہ کرو

اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو

بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②

ایک دوسرے پر کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ کے پاس وہی ہیں جن کے

امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ③ اِنَّ

دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے ادب کے واسطے ان کے لئے معافی ہے اور ثواب بڑا جو

الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ④ وَلَوْ

لوگ پکارتے ہیں تجھ کو دیوار کے پیچھے سے وہ اکثر عقل نہیں رکھتے اور اگر

اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤

وہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا ان کی طرف تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

ربط سورت و شانِ نزول اس سے پہلی دو سورتوں میں جہاد کے احکام تھے جن سے اصلاحِ عالم آفاق مقصود ہے۔ اس سورت میں اصلاحِ نفس کے احکام و آداب مذکور ہیں، خصوصاً وہ احکام جو آدابِ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں اور قصہ ان آیتوں کے نزول کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ بات زیرِ غور تھی کہ اس قبیلہ پر حاکم کس کو بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قعقاع ابن معبد کی نسبت رائے دی اور حضرت عمرؓ نے اقرع بن حابس کے متعلق رائے دی، اس معاملہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین آپ کی مجلس میں گفتگو ہوگئی اور گفتگو بڑھ کر دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (روح البخاری)

اے ایمان والو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) (کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو (یعنی جب تک قرائن قویہ سے یا بالتصریح گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو جیسا کہ واقعہ مذکورہ جو سبب نزول ان آیات کا ہوا، اس میں انتظار کرنا چاہئے تھا کہ یا تو آپ خود کچھ فرماتے یا آپ حاضرین مجلس سے پوچھتے بدون انتظار کے از خود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا کیونکہ گفتگو کا جواز اذن شرعی پر موقوف تھا خواہ یہ اذن قطعی ہو یعنی صراحۃً ہو یا ظنی قرائن قویہ کے ذریعہ، غلطی یہ ہوئی کہ انتظار نہیں کیا، اسی پر یہ آیت نازل ہوئی) اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو) سننے والا (اور تمہارے افعال کو) جاننے والا ہے (اور) اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو (یعنی نہ بلند آواز سے بولو جبکہ آپ کے سامنے آپس میں کوئی بات کرنا ہو اور نہ برابر کی آواز سے بولو جبکہ خود آپ سے خطاب کرنا ہو) کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جاویں اور تم کو خبر بھی نہ ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز کا بلند کرنا جو صورۃً بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں یہ ایک قسم کی گستاخی ہے اپنے تابع اور خادم سے اس طرح کی گفتگو ناگوار اور ایذاء دہ ہو سکتی ہے اور اللہ کے رسول کو ایذا پہنچانا تمام اعمالِ خیر کو برباد کر دینے والا ہے۔ البتہ بعض وقت جبکہ طبیعت میں زیادہ انبساط ہو یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اس وقت عدمِ ایذاءِ رسول کی وجہ سے یہ گفتگو حبطِ اعمال کا موجب نہیں ہوگی لیکن متکلم کو یہ معلوم کرنا کہ اس وقت ہماری ایسی گفتگو ناگوارِ خاطر و موجبِ ایذا نہیں ہوگی آسان نہیں، ہو سکتا ہے کہ متکلم تو یہ سمجھ کر کلام کرے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہیں ہوگی مگر واقع میں اس سے ایذاء پہنچ جائے تو گفتگو اس کے اعمال کو حبط اور برباد کر دے گی اگرچہ اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

میری اس گفتگو سے مجھے کتنا بڑا خسارہ ہوگیا، اسلئے آواز بلند کرنے اور جہر بالقول کو مطلقاً ممنوع کر دیا گیا کیونکہ ایسی گفتگو کے بعض افراد اگرچہ موجب ایذا و حبط اعمال نہیں ہونگے مگر اُن کی تعیین مشکل تھی اسلئے مطلقاً جہر بالقول کے تمام افراد کو ترک کر دینا چاہیئے یہاں تک تو آواز بلند کرنے سے ڈرایا گیا۔ آگے آواز پست کرنے کی ترغیب ہے)

بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے (یعنی اُن کے قلوب میں تقویٰ کے خلاف کوئی چیز آتی ہی نہیں، مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ حضرات کمال تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ ترمذی کی حدیث مرفوع میں کمال تقویٰ کا بیان ان الفاظ میں آیا ہے لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا بأس بہ حذرا لما بہ بأس، یعنی بندہ کمال تقویٰ کو اسوقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کچھ ایسی چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جن میں کوئی گناہ نہیں اس احتیاط کی بنا پر چھوڑ دے کہ یہ جائز کام کہیں مجھے کسی ناجائز میں مبتلا نہ کردے۔ مراد وہ مشتبہ امور ہیں جن میں گناہ کا خطرہ اور شبہ ہو۔ جیسا کہ آواز بلند کرنے کی ایک فرد ایسی ہے جس میں گناہ نہیں، یعنی وہ جس میں مخاطب کو ایذا نہ ہو۔ اور ایک فرد وہ ہے جس میں گناہ ہے یعنی جس سے ایذا پہنچے، تو کمال تقویٰ یہی ہے کہ آدمی مطلقاً آواز بلند کرنے کو چھوڑ دے۔ آگے اس عمل کے اُخروی فائدہ کا بیان ہے) اُن لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ (اگلی آیتوں کا قصہ یہ ہے کہ وفد بنو تمیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ باہر تشریف فرما نہ تھے بلکہ ازواج مطہرات کے حجرات میں سے کسی مکان میں تھے۔ یہ لوگ غیر مہذب گاؤں والے تھے باہر ہی سے کھڑے ہو کر آپ کا نام لیکر پکارنے لگے کہ یا محمد اخرج الینا یعنی اے محمد ہمارے لئے باہر آئیے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں (کذا فی الدر المنثور بروایۃ ابن اسحٰق عن ابن عباسؓ) جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں اُن میں اکثروں کو عقل نہیں ہے (کہ عقل ہوتی تو آپ کا ادب کرتے اس طرح نام لیکر باہر سے پکارنے کی جرأت نہ کرتے اور اکثر فرمانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بعض پکارنے والے فی نفسہٖ جری نہ ہوں گے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی لگ گئے اس وقت ان سے بھی یہ غلطی ہوگئی اور یا اگرچہ سب ایک ہی طرح کے ہوں مگر اکثر کا لفظ فرمانے سے کسی کو اشتعال نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ شاید مجھ کو کہنا مقصود نہ ہو۔ وعظ و نصیحت کا یہی طریقہ ہے کہ ایسے کلمات سے احتیاط کیا جائے جن سے مخاطب کو اشتعال پیدا ہو) اور اگر یہ لوگ (ذرا) صبر (اور انتظار) کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معاف ہو جائے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات کے نزول کے متعلق روایاتِ حدیث میں بقول قرطبی چھ واقعات منقول ہیں اور قاضی ابوبکر بن عربی نے فرمایا کہ سب واقعات صحیح ہیں کیونکہ وہ سب واقعات مفہوم آیات کے عموم میں داخل ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بروایت بخاری ذکر کیا گیا ہے۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ، بَیْنَ یَدَیْنِ کے اصل معنے دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں مراد اس سے سامنے کی جہت ہے یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے تقدم اور پیشقدمی نہ کرو کس چیز میں پیشقدمی کو منع فرمایا ہے قرآن کریم نے اسکو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کیطرف ہے کہ کسی قول و فعل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشقدمی نہ کرو بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیتے ہیں ہاں آپ کسی کو جواب کے لئے مامور فرمادیں تو وہ جواب دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ چلے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے مگر یہ کہ آپکی تصریح یا قرائن قویہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ دوسروں کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

علمائے دین اور دینی مقتداؤں کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئے

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء و مشائخ دین کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ وارث انبیاء ہیں اور دلیل اسکی یہ واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوالدرداء کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا و آخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع و غروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر سے بہتر و افضل ہو (روح البیان از کشف الاسرار) اسلئے علماء نے فرمایا کہ اپنے استاد اور مرشد کیساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ، یہ دوسرا ادب مجلس نبوی کا بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا کیا کرتے ہیں ایک قسم کی بے ادبی گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نزول سے صحابہ کرام کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابوبکر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (درمنثور عن البیہقی) اور حضرت عمر اسقدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کذا فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیس طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سنکر وہ بہت

احتمال ہے جو سبب ہے ایذاء رسول کا۔ اگرچہ صحابہ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذا کا سبب بنے لیکن بعض اعمال وافعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا نہ ہوں پھر بھی ان سے ایذا کا احتمال ہے اسی لئے اُن کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبط اعمال کا۔ کسی اپنے دینی مقتدا استاد یا مرشد کی ایذا رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھیریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہو جائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچا دے جس سے تمام اعمال صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصد ایذا کا نہ کیا تھا اسلئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلاء کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہوا سکے ساتھ گستاخی و بے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاع ایمان کو بھی ضائع کردیتی ہے نعوذ باللہ منہ

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَآءِ الْحُجُرَٰتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۔ اس آیت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک تعلیم ادب سکھایا گیا ہے کہ جس وقت آپ اپنے مکان اور آرام گاہ میں تشریف فرما ہوں اس وقت باہر کھڑے ہو کر آپ کو پکارنا خصوصاً گنوار پن کے ساتھ کہ نام لیکر پکارا جائے یہ بے ادبی ہے عقل والوں کے یہ کام نہیں۔ حجرات، حجرہ کی جمع ہے اصل لغت میں حجرہ ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقف عمارت ہو۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات مدینہ طیبہ میں نو تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک حجرہ الگ الگ تھا جن میں آپ باری باری تشریف فرما ہوتے تھے۔

حجرات امہات المؤمنین ابن سعد نے بروایت عطا خراسانی لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں سے بنے ہوئے تھے اور اُن کے دروازوں پر موٹے سیاہ اُون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے میرا گمان یہ ہے کہ حجرہ کے دروازہ سے مسقف بیت تک چھ سات ہاتھ ہوگا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اونچائی سات آٹھ ہاتھ ہوگی۔ یہ حجرات امہات المؤمنین ولید بن عبدالملک کی حکومت میں اُن کے حکم سے مسجد نبوی میں شامل کر دیئے گئے۔ مدینہ میں اس روز لوگوں پر گریہ و بکا طاری تھی۔

سبب نزول امام بغوی نے بروایت قتادہ یہ ذکر کیا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کے لوگ جو آپ کی خدمت

معارف و مسائل

شانِ نزول اس آیت کے نزول کا واقعہ ابن کثیرؒ نے بحوالہ مسند احمد یہ نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار بن ابی ضرار جو کی صاحبزادی حضرت جویریہؓ بنت حارث امہات المؤمنین میں سے ہیں یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، میں نے اسلام کو قبول کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ اب میں اپنی قوم میں جا کر ان کو بھی اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے میں اُن کی زکوٰۃ جمع کروں گا۔ اور آپ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیج دیں تاکہ جو زکوٰۃ کی رقم میرے پاس جمع ہو جائے اس کو سپرد کر دوں، پھر جب حارث نے حسب وعدہ ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کر لی اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حارث کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حارث نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاویں ادھر یہ واقعہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر ولید بن عقبہؓ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیج دیا تھا مگر ولید بن عقبہ کو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلہ کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے قتل کر ڈالیں اس خوف کے سبب وہ راستہ ہی سے واپس ہو گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جا کر یہ کہا کہ اُن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک دستہ مجاہدین کا روانہ کیا، ادھر یہ دستہ مجاہدین کا روانہ ہوا ادھر سے حارث مع اپنے ساتھیوں کے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلے، مدینہ کے قریب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حارث نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہو ان لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ حارث نے سبب پوچھا تو ان کو واقعہ ولید بن عقبہ کے بھیجنے کا اور ان کی واپسی کا بتلایا گیا اور یہ کہ ولید بن عقبہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حارث نے یہ سن کر کہا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بنا کر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ اس کے بعد حارث جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حارث نے کہا کہ ہرگز نہیں، قسم ہے اُس

ذات کی طرف سے پیغام رسانی کو بھیجا ہے نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے انکو دیکھا، پھر جب مقررہ وقت پر آپ کا قاصد نہ پہنچا تو مجھے خطرہ ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا جس پر ناراض ہوئے اس لئے میں حاضر خدمت ہوا۔ حارث فرماتے ہیں کہ اس پر سورہ حجرات کی آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

اور بعض روایات میں ہے کہ ولید بن عقبہؓ جب بنی المصطلق میں پہنچے، اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضور کا قاصد آویگا تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہؓ کو شبہ ہوگیا کہ یہ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں یہیں سے واپس ہوگئے اور جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گمان کے مطابق یہ عرض کر دیا کہ وہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار نہیں بلکہ میرے قتل کے درپے ہوگئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی کہ خوب تحقیق کرلیں اسکے بعد کوئی اقدام کریں۔ خالد بن ولیدؓ نے بستی سے باہر رات کو پہنچ کر قیام کیا اور تحقیق حال کے لئے چند آدمی بطور جاسوس کے خفیہ بھیج دیئے۔ ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام و ایمان پر قائم، نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں اور کوئی بات خلاف اسلام نہیں پائی۔ خالد بن ولیدؓ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یہ **ابن کثیر کی متعدد روایات کا خلاصہ ہے)**

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شریر فاسق آدمی اگر کسی شخص یا قوم کی شکایت کرے اُن پر کوئی الزام لگائے تو اسکی خبر یا شہادت بغیر تحقیق کے عمل کرنا جائز نہیں۔

آیت سے متعلقہ احکام و مسائل امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کر کے اسکا صدق ثابت نہ ہوجائے۔ کیونکہ اس آیت میں ایک قرأت تو فتثبتوا ہے جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو بلکہ ثابت قدم رہو جب تک دوسرے ذرائع سے اسکا صدق ثابت نہ ہوجائے۔ اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا

تو شہادت کو قبول کرنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا کیونکہ شہادت ایک خبر ہی کی جو حلف و قسم کے ساتھ مؤکد کی جاتی ہے اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت شرعاً مقبول نہیں۔ البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کیا جاتا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آیت قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے یعنی اَنْ تُصِيبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ۔ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے اس کی مزید تفصیل کتب فقہ معین الحکام وغیرہ میں ہے

اور احقر نے احکام القرآن عربی میں زیادہ بڑی تفصیل لکھ دی ہے اہل علم اس میں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک اہم سوال و جواب متعلقہ عدالت صحابہ

اس آیت کا ولید بن عقبہؓ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے اور آیت میں اُن کو فاسق کہا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی فاسق بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ اُس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کے خلاف ہے کہ الصحابة کلھم عدول، یعنی صحابہ کرام سب کے سب ثقہ ہیں ان کی کسی خبر و شہادت پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں، اُن سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو فسق ہے اور اُس گناہ کے وقت اُن کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو ان کی خبر و شہادت رد کر دی جائے گی لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعت کا نصوص قرآن و سنت کی بناء پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ الآیۃ، اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی جیسا کہ قاضی ابو یعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گنے چنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو اُن کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے حق تعالیٰ نے اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت اُن کی طبیعت بن گئی تھی۔ خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا اُن کے اعمال صالحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اسکے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی۔ ان بے شمار اعمال صالحہ و فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت و عظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت اُن کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کر دینا کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ، روایات حدیث میں معروف و مشہور ہیں اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے حسب ارشاد قرآن اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ خصوصاً

كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۙ

نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر

فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٨﴾

اللہ کے فضل سے اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا

خلاصۂ تفسیر

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف فرما ہیں (جو خدا کی بڑی نعمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ الخ اور اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ کسی بات میں تم آپ کے خلاف مت کرو خواہ دنیوی ہی کیوں نہ ہو اور اس کا بہت خیال رکھو کہ امور دنیویہ میں خود حضور تمہاری رائے کی موافقت فرمایا کریں کیونکہ) بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ ان میں تمہارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے کیونکہ جو مصلحت کے خلاف ہو تو اس کے موافق عمل کرنے میں مضرت ہو خلاف اس کے کہ آپ کی رائے پر عمل کیا جائے کیونکہ امور دنیویہ ہونے کے باوجود اس میں خلاف مصلحت ہونے کا احتمال گو فی نفسہٖ مستبعد اور خلاف شان نبوت نہیں لیکن اول تو ایسے امور جن میں ایسا احتمال ہو شاذ و نادر ہوں گے پھر اگر ہوں بھی اور ان میں مصلحت فوت ہو بھی جاوے تو کیتی بڑی بات ہے کہ اس مصلحت کا نعم البدل یعنی اجر و ثواب اطاعت رسول کا ضرور ہی میسر ہوگا بخلاف اس کے تمہاری رائے پر عمل ہو کہ گو شاذ و نادر ایسے امور بھی نکلیں گے جن میں مصلحت تمہاری رائے کے موافق ہو لیکن تعین تو یہ نہیں اور پھر بہت ہی کم ہوں گے زیادہ احتمال مضرت ہی کا ہے پھر اس مضرت کا کوئی تدارک نہیں اور اس تقریر سے فائدہ کثیر کی قید کا بھی معلوم ہوگیا، بہرحال اگر آپ تم لوگوں کی موافقت کرتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ نے (تم کو مصیبت سے بچالیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کردیا اور کفر و فسق (یعنی گناہ کبیرہ) اور (مطلق) عصیان (یعنی گناہ صغیرہ) سے تم کو نفرت دیدی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسول کی جستجو رہتی ہے اور جس سے تم ان احکام کو مان لیتے ہو جو رضائے رسول کے موجبات ہیں چنانچہ جب تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ امور دنیویہ میں بھی اطاعت رسول کی واجب ہے اور بدون اطاعت مطلقہ کے ایمان کامل نہیں ہوتا اور ایمان کامل کی تحصیل کی رغبت پہلے سے موجود ہے پس تم نے فوراً اس حکم کو بھی دل سے قبول کرلیا اور قبول کرکے ایمان کی اس تکمیل کرلی) ایسے لوگ (جو کہ تکمیل ایمان کے طالب ہیں) خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہ راست پر ہیں اور اللہ تعالیٰ (نے جو یہ احکام فرمائے ہیں تو وہ ان کی مصلحتوں کو) جاننے والا ہے اور چونکہ حکمت والا ہے (اس لئے ان احکام کو واجب کردیا ہے)

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٩﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا

اللہ کو خوش آتے ہیں انصاف والے — مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں سو ملاپ کرادو

بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾

اپنے دو بھائیوں میں اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم پر رحم ہو

خلاصۂ تفسیر

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو (یعنی جھگڑے کی بنیاد کو رفع کر کے لڑائی موقوف کرادو) پھر اگر (اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) اُن میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے (اور لڑائی بند نہ کرے) تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جاوے (حکم خدا سے مراد لڑائی بند کرنا ہے) پھر اگر (وہ زیادتی کرنے والا فرقہ حکم خدا کی طرف) رجوع ہو جاوے (یعنی لڑائی بند کر دے) تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو (یعنی حدود شرعیہ کے موافق اس معاملہ کو طے کر دو محض لڑائی بند کرنے پر اکتفا نہ کرو کیونکہ اگر صلح و مصالحت نہ ہوئی تو پھر بھی لڑائی کا احتمال رہے گا) اور انصاف کا خیال رکھو (یعنی کسی نفسانی غرض کو غالب نہ ہونے دو) بیشک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے (اور باہمی اصلاح کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ) مسلمان تو سب (دینی اشتراک جو روحانی اور معنوی رشتہ ہے اس رشتہ سے ایک دوسرے کے) بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو (تاکہ یہ اسلامی برادری قائم رہے) اور (اصلاح کے وقت) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (یعنی حدود شرعیہ کی رعایت رکھا کرو) تاکہ تم پر رحمت کی جاوے۔

معارف و مسائل

ربط سابقہ آیات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آداب اور ایسے اعمال سے پرہیز کا بیان تھا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے، آگے عام معاشرت کے آداب و احکام ہیں جن میں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے آداب اور باہمی حقوق کا بیان ہے اور سب میں قدر مشترک ایذا رسانی سے اجتناب ہے۔

سبب نزول ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان فرمائے ہیں جن میں خود مسلمانوں کے دو گروہوں میں باہم تصادم ہوا اور کوئی بعید نہیں کہ یہ سبھی واقعات کا مجموعہ سبب نزول ہوا ہو یا نزول کسی ایک واقعہ میں ہوا، دوسرے واقعات کو اس کے مطابق پاکر انکو بھی سبب

نزول میں شریک کر دیا گیا۔ اس آیت کے اصل مخاطب وہ اولوالامر و ملوک ہیں جن کو قتال و جہاد کے وسائل حاصل ہیں (کذا قال ابو حیان فی البحر واختارہ فی روح المعانی) اور بالواسطہ تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں کہ وہ اس معاملے میں اولوالامر کی اعانت کریں۔ اور جہاں کوئی امام و امیر یا بادشاہ و رئیس نہیں وہاں حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کو فہمائش کر کے ترک قتال پر آمادہ کیا جائے، اور دونوں نہ مانیں تو دونوں لڑنے والے فریقوں سے الگ رہے نہ کسی کی مخالفت کرے نہ موافقت، **کذا فی بیان القرآن**۔

مسائل متعلقہ مسلمانوں کے دو گروہوں کی باہمی لڑائی کی چند صورتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہ دونوں جماعتیں امام المسلمین کے تحت ولایت ہیں یا دونوں نہیں یا ایک ہے ایک نہیں۔ پہلی صورت میں عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ فہمائش کر کے ان کو باہمی جنگ سے روکیں اگر فہمائش سے باز نہ آئیں تو امام المسلمین پر اصلاح کرنا واجب ہے اگر حکومت اسلامیہ کی مداخلت سے دونوں فریق جنگ سے باز آ گئے تو قصاص و دیت کے احکام جاری ہوں گے۔ اور باز نہ آئیں تو دونوں فریق کے ساتھ باغیوں کا سا معاملہ کیا جائے اور ایک باز آ گیا دوسرا ظلم و تعدی پر جما رہا تو دوسرا فریق باغی ہے اس کے ساتھ باغیوں کا معاملہ کیا جائے اور جس نے اطاعت قبول کر لی وہ فریق عادل کہلائے گا۔ اور باغیوں کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے اور مختصر جامع حکم یہ ہے کہ قبل قتال ان کے ہتھیار چھین لئے جاویں اور ان کو گرفتار کر کے توبہ کرنے کے وقت تک قید رکھیں گے اور عین قتال کی حالت میں اور قتال کے بعد ان کی ذریت کو غلام یا لونڈی نہ بنایا جائے اور ان کا مال مال غنیمت نہیں ہوگا البتہ توبہ کرنے تک اموال کو محبوس رکھا جائے گا توبہ کے بعد واپس دیا جائے گا۔ آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا یعنی اگر بغاوت کرنے والا فریق بغاوت و قتال سے باز آ جائے تو صرف جنگ بند کر دینے پر اکتفا نہ کرو بلکہ اسباب جنگ اور باہمی شکایات کے ازالہ کی فکر کرو تاکہ دلوں سے بغض و عداوت نکل جاوے اور ہمیشہ کے لئے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے۔ اور چونکہ یہ لوگ امام المسلمین کے خلاف بھی جنگ کر چکے ہیں اس لئے ہو سکتا تھا کہ ان کے بارے میں پورا انصاف نہ ہو اسلئے قرآن نے تاکید فرمائی کہ دونوں فریق کے حقوق میں عدل و انصاف کی پابندی کی جائے (یہ سب تفصیل بیان القرآن سے لی گئی ہے اور اس میں ہدایہ کے حوالہ سے ہے)

مسئلہ۔ اگر مسلمانوں کی کوئی بڑی طاقتور جماعت امام المسلمین کی اطاعت سے نکل جائے تو امام المسلمین پر لازم ہے کہ اول ان کی شکایات سنے ان کو کوئی شبہ یا غلط فہمی پیش آ گئی ہو تو اس کو دور کرے اور اگر وہ اپنی مخالفت کی ایسی وجوہ پیش کریں جن کی بنا پر کسی امام و امیر کی مخالفت

شرعاً جائز ہے یعنی جن سے خود امام المسلمین کا ظلم و جور ثابت ہو تو عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس جماعت کی مدد کریں تاکہ امام اپنے ظلم سے باز آجائے بشرطیکہ اس کے ظلم کا ثبوت یقینی بلا کسی اشتباہ کے ثابت ہو جائے (کذا قال ابن الہمام مظہری)، اور اگر کوئی ایسی واضح وجہ اپنی بغاوت اور عدم اطاعت کی بیان نہ کریں اور امام المسلمین کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں تو مسلمانوں کو ان سے قتال کرنا حلال ہے اور امام شافعی نے فرمایا کہ جب تک وہ خود قتال شروع نہ کر دیں اس وقت تک مسلمانوں کو ان سے قتال کی ابتداء کرنا جائز نہیں (مظہری)، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس جماعت کا باغی اور ظالم ہونا یقینی اور واضح ہو، اور اگر صورت ایسی ہے کہ دونوں فریق کوئی شرعی حجت رکھتے ہیں اور یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون باغی ہے کون عادل، وہاں جس شخص کو کسی ایک کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو وہ اس کی مدد کر سکتا ہے اور جس کو کسی جانب رجحان نہ ہو وہ دونوں سے الگ رہے جیسا کہ مشاجرات صحابہ کرام کے وقت جنگ جمل اور صفین میں پیش آیا۔

مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین امام ابوبکر بن العربی نے فرمایا کہ یہ آیت قتال بین المسلمین کی تمام صورتوں کو حاوی اور شامل ہے اس میں وہ صورت بھی داخل ہے جس میں دونوں فریق کسی حجت شرعی کے تحت جنگ کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، صحابہ کرام کے مشاجرات اسی قسم میں داخل ہیں، قرطبی نے ابن عربی کا یہ قول نقل کر کے اس جگہ مشاجرات صحابہ جنگ جمل اور صفین وغیرہ کی اصل حقیقت بیان کی ہے اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعد کے آنے والے مسلمانوں کے عمل کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ احقر نے یہ سب مضامین احکام القرآن میں بزبان عربی اور بزبان اردو اپنے رسالہ مقام صحابہ میں تفصیل کے ساتھ لکھ دیئے ہیں یہاں اس کا خلاصہ جو تفسیر قرطبی ص ۳۲۲ ج ۱۶ کے حوالہ سے اس رسالہ میں دیا ہے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اسلئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی، یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کف لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے، اس کے علاوہ متعدد سندوں سے یہ حدیث ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہؓ کے بارے میں فرمایا،

ان طلحۃ شہید یمشی علی وجہ الارض، یعنی طلحہ روئے زمین پر چلنے والے شہید ہیں،

ایسی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کی وہ حضرات آپس کے ان اختلافات کے باوجود ولایت اور نبوت کی حدود سے خارج نہیں ہوئے۔ بالکل یہی معاملہ صحابہؓ کے درمیان پیش آنیوالے واقعات کا بھی ہے؛

اور حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ،

"جہاں تک اس خونریزی کا معاملہ ہے تو اسکے بارے میں ہمارا کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس میں خود صحابہؓ کے درمیان اختلاف تھا؛ اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کے باہمی قتال کے بارے میں پُوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ،

"یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ پورے حالات کو جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے، جس معاملہ پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے ہم اس میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جس معاملہ میں ان کے درمیان اختلاف ہے اس میں سکوت اختیار کرتے ہیں"

حضرت محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے فرمائی، ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جن چیزوں میں دخل دیا ان سے وہ ہم سے کہیں بہتر طریقے پر واقف تھے۔ لہٰذا ہمارا کام یہی ہے کہ جس پر وہ سب حضرات متفق ہوں اس کی پیروی کریں، اور جس میں انکا اختلاف ہو اس میں خاموشی اختیار کریں اور اپنی طرف سے کوئی نئی رائے پیدا نہ کریں، ہمیں یقین ہے کہ ان سب نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی تھی اس لئے کہ دین کے معاملہ میں وہ سب حضرات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا

اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسرے سے شاید وہ بہتر ہوں

مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا

ان سے اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور عیب نہ لگاؤ

اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ

ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے برا نام ہے گنہگاری پیچھے

الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۱)

ایمان کے اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ

قوم کے بالمقابل عورتوں کا ذکر لفظ نساء سے فرمایا اور دونوں میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتا ہے اس کو کیا خبر ہے کہ شاید وہ اللہ کے نزدیک استہزاء کرنے والے سے بہتر ہو۔ اسی طرح جو عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ استہزاء و تمسخر کا معاملہ کرتی ہے اس کو کیا خبر ہے شاید وہی اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ قرآن میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ استہزاء کرنے اور اس کی حرمت کا ذکر فرمایا گیا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اس کے ذکر نہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے۔ بلا اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آوے تو کسی کو اس پر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرات نہ کرنا چاہئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو۔ اس آیت کو سن کر سلف صالحین کا حال یہ ہو گیا تھا کہ عمرو بن شرحبیل نے فرمایا کہ اگر میں کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اس پر مجھے ہنسی آجاوے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ اگر میں کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں (قرطبی)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی صورتوں اور ان کے مال و دولت پر نظر نہیں فرماتا بلکہ اُن کے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے قرطبی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ایک ضابطہ اور مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شخص کے معاملہ میں اس کے ظاہری حال کو دیکھ کر کوئی قطعی حکم لگا دینا درست نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے ظاہری اعمال و افعال کو ہم بہت اچھا سمجھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ جو اس کے باطنی حالات و قلبی کیفیات کو جانتا ہے وہ اس کے نزدیک مذموم ہو اور جس شخص کے ظاہری حالات اور اعمال بُرے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کے باطنی حالات و قلبی کیفیات اس کے اعمال بد کا کفارہ بن جائیں اس لئے جس شخص کو بُری حالت یا بُرے اعمال میں مبتلا دیکھو تو اس کی اس حالت کو تو بُرا سمجھو مگر اس شخص کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری چیز جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے وہ لمز ہے۔ لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں آیت میں ارشاد فرمایا لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔ اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا

بعض القاب کا استثناء: بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہ بُرے ہیں مگر وہ بغیر اس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جن کے ہاتھ نسبتاً زیادہ طویل تھے ذوالیدین کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اسانید حدیث میں بعض ناموں کے ساتھ کچھ ایسے القاب آتے ہیں مثلاً حمید الطویل، سلیمان الاعمش، مروان الاصفر وغیرہ، تو کیا ان القاب کے ساتھ ذکر کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا قصد اس کا عیب بیان کرنے کا نہ ہو بلکہ اس کی پہچان پوری کرنے کا ہو تو جائز ہے (قرطبی)

سنت یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے القاب سے یاد کیا جاوے: حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ ہے کہ اس کا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اس کو زیادہ پسند ہو۔ اسی لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کو کچھ القاب دیئے ہیں۔ صدیق اکبرؓ کو عتیق اور حضرت عمرؓ کو فاروق اور حضرت حمزہؓ کو اسد اللہ اور خالد بن ولیدؓ کو سیف اللہ فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ

اے ایمان والو بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت

الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ

گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بھلا خوش لگتا ہے

اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا

تم میں کسی کو کہ کھاوے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو سو گھن آتی ہے تم کو اس سے اور ڈرتے

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

رہو اللہ سے بیشک اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (اس لئے ظن و گمان کی جتنی قسمیں ہیں ان سب کے، قسموں کے احکام کی تحقیق کر لو کہ کونسا گمان جائز ہے کونسا ناجائز، پھر جائز کی حد تک رہو) اور (کسی کے عیب کا) سراغ نہ لگایا کرو اور کوئی کسی

؎ دیکھئے مجمع الزوائد ص ۲۹۶ ج ۲۔ محمود اشرف عثمانی۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث، یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔ یہاں ظن سے مراد باتفاق کسی مومن کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے اور جو کام ایسے ہیں کہ ان میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اسکے متعلق قرآن و سنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے، جیسے باہمی منازعات و مقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا کیونکہ حاکم اور قاضی جسکی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اُس پر اسکا فیصلہ دینا واجب ضروری ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن و حدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اسکے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان واحتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اسوقت جھوٹ بولا ہو اس سے اسکا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے۔ اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کی جا سکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہو تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جاوے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دیکر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے اور ظن مستحب و مندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کیساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے (جصاص ملخصاً)

قرطبی نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا، میں حسن ظن بالمومنین کی تاکید آئی ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ ان من الحزم سوء الظن یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے اسکا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بدون قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے نہ یہ کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملے میں احتیاط برتے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے ؎

نگہ دارد آں شوخ در کیسہ دُر ؎ کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

دوسری چیز جس سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے تجسس یعنی کسی کے عیب کی تلاش اور سراغ لگانا ہے۔ اس میں قراتیں دو ہیں ایک لَا تَجَسَّسُوْا بالجیم دوسرے لَا تَحَسَّسُوْا بالحاء اور حدیث صحیحین میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے یہ دونوں لفظ آئے ہیں ارشاد ہے لا تجسسوا ولا تحسسوا اور ان دونوں لفظوں کے معنی متقارب ہیں۔ اخفش نے دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ تجسس بالجیم کسی ایسے امر کی جستجو اور تلاش کو کہا جاتا ہے جس کو لوگوں نے آپ سے چھپایا ہو اور

تجسس بالجیم تلاش و تفتیش کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ سورۂ یوسف میں فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ أَخِيْهِ اسی معنی کے لئے آیا ہے۔ اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جو چیز تمہارے سامنے آجائے اس کو پکڑ سکتے ہو اور کسی مسلمان کے جو عیب ظاہر نہ ہوں اس کی تجسس و تفتیش کرنا جائز نہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا تغتابوا المسلمین ولا تتبعوا عوراتہم فإن من اتبع عوراتہم یتبع اللہ عورتہ ومن یتبع اللہ عورتہ یفضحہ فی بیتہ (قرطبی)

مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے عیوب کی تحقیق نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب کی تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے عیب کی تلاش کرتا ہے اور جس کے عیب کی تلاش اللہ تعالیٰ کرے اُس کو اس کے گھر کے اندر بھی رسوا کر دیتا ہے۔

بیان القرآن میں ہے کہ چھپ کر کسی کی باتیں سُننا یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سُننا بھی تجسس میں داخل ہے البتہ اگر کسی سے ضرر پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے ضرر پہنچانے والے کی خفیہ تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرے تو جائز ہے۔ تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے۔ غیبت اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سُنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنج دہ بات کہنا جائز ہے کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا، اس آیت نے کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین و تحقیر کو اس کا گوشت کھانے کی مثل و مشابہ قرار دیا ہے اگر وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کر کے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور آگے آئے گا وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ اور وہ آدمی غائب ہو اس کے پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اُس کی آبرو میں خلل آئے اور اُس کی تحقیر ہو یہ ایسا ہے جیسے کسی مُردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مُردہ کا گوشت کھانے سے مُردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی، مگر جیسے کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خست و دناءت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خست و دناءت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مُردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دیکر اُس کی حرمت اور خست و دناءت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اُس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذا رسانی کی بنا پر حرام ہے مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کر سکتا ہے اور مدافعت کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادۃً زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا، بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کر سکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لئے اس کا سلسلہ بھی عموماً دراز ہوتا ہے اور اس میں ابتلا بھی زیادہ ہے اس لئے غیبت کی حرمت زیادہ مؤکد کی گئی اور عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سُنے وہ اپنے غائب بھائی کی طرف سے بشرط قدرت مدافعت کرے اور مدافعت پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اسکے سُننے سے پرہیز کرے کیونکہ غیبت کا بقصد و اختیار سُننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

غیبت کے متعلق مسائل | حضرت میمون نے فرمایا کہ ایک روز خواب میں میں نے دیکھا کہ ایک زنگی کا مُردہ جسم ہے اور کوئی کہنے والا ان کو مخاطب کرکے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کو کھاؤ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے بندے میں اس کو کیوں کھاؤں تو اس شخص نے کہا کہ اس لئے کہ تو نے فلاں شخص کے زنگی غلام کی غیبت کی ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے تو اسکے متعلق کوئی اچھی بُری بات کی ہی نہیں تو اس شخص نے کہا کہ ہاں، لیکن تو نے اس کی غیبت سُنی تو ہے اور تو اس پر راضی رہا۔ حضرت میمون کا حال اس خواب کے بعد یہ ہوگیا کہ نہ خود کبھی کسی کی غیبت کرتے اور نہ کسی کو اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کرنے دیتے تھے۔

حدیث میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ شب معراج کی حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لیجایا گیا تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوچ رہے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے اور ان کی آبروریزی کرتے تھے (رواہ البغوی۔ مظہری) اور حضرت ابو سعید اور جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، الغیبة اشد من الزنا، یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے تو اسکا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہے (رواہ الترمذی وابو داؤد۔ از مظہری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے

لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱۳)

تاکہ آپس کی پہچان ہو، تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا، اللہ سب کچھ جانتا ہے خبردار

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم و حوا) سے پیدا کیا ہے (اسلئے اس میں تو سب انسان برابر ہیں، اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (یہ محض اسلئے) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو (جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں نہ اسلئے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو کیونکہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے کہ اس کا پورا حال کسی کو معلوم نہیں بلکہ اسکے حال کو محض) اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور پورا خبردار ہے (اسلئے کسی نسب اور قومیت پر فخر نہ کرو)

معارف و مسائل

اوپر کی آیت میں انسانی اور اسلامی حقوق اور آدابِ معاشرت کی تعلیم کے سلسلے میں چھ چیزوں کو حرام و ممنوع کیا گیا ہے جو باہمی منافرت اور عداوت کا سبب ہوتی ہیں۔ اس آیت میں ایک جامع تعلیم انسانی مساوات کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے کو کمتر یا رذیل نہ سمجھے اور اپنے نسب اور خاندان یا مال و دولت وغیرہ کی بنا پر فخر نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں درحقیقت تفاخر کی ہیں نہیں پھر اس تفاخر سے باہمی منافرت اور عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، اور خاندان اور قبائل یا مال و دولت کے اعتبار سے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہے۔

شانِ نزول | یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر اسوقت نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا تو قریشِ مکہ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اُن میں سے ایک نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے والد پہلے ہی وفات پا گئے اُن کو یہ روزِ بد دیکھنا نہیں پڑا، اور حارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کالے کوے کے سوا کوئی آدمی نہیں مِلا کہ جو مسجد حرام میں اذان دے۔ ابوسفیان بولے کہ میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ میں کچھ کہوں گا تو آسمانوں کا مالک ان کو خبر کر دیگا، چنانچہ جبرئیل امین تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تمام گفتگو کی اطلاع دی۔ آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا انھوں نے اقرار کرلیا اُسی پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلایا کہ فخر و عزت کی چیز درحقیقت ایمان اور تقوی ہے جس

تم لوگ خالی اور حضرت بلال آراستہ ہیں اسلئے وہ تم سب سے افضل و اشرف ہیں (مظہری عن البغوی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا (تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں) طواف سے فارغ ہو کر آپ نے یہ خطبہ دیا۔

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وتکبرھا۔ الناس رجلان بر تقی کریم علی اللہ و فاجر شقی ھین علی اللہ ثم تلا یایھا الناس انا خلقنٰکم الآیۃ (ترمذی و بغوی)

شکر ہے اللہ کا جس نے جاہلیت کا عیب اور تکبر تم سے دور کر دیا۔ اب تمام انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک نیک اور متقی وہ اللہ کے نزدیک شریف و مکرم ہے۔ دوسرا فاجر شقی وہ اللہ کے نزدیک ذلیل و حقیر ہے۔ اس کے بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اوپر مذکور ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دنیا کے لوگوں کے نزدیک عزت مال و دولت کا نام ہے اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کا۔

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ، شعوب، شعب کی جمع ہے بہت بڑی جماعت کو شعب کہتے ہیں جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں پھر ان میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں۔ پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اسکے مختلف حصوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں۔ سب سے بڑا حصہ شعب اور سب سے چھوٹا حصہ عشیرہ کہلاتا ہے۔ ابو رواق کا قول ہے کہ شعب اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جن کے انساب محفوظ نہیں اور قبائل عرب کے لوگوں کے لئے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور اسباط بنی اسرائیل کے لئے۔

نسبی اور وطنی یا لسانی امتیازات میں حکمت و مصلحت تعارف کی ہے قرآن کریم نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے مگر پھر اس کی تقسیم مختلف قوموں قبیلوں میں جو حق تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کا تعارف اور شناخت آسان ہو جائے مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے تفاوت سے انہیں امتیاز ہو سکتا ہے اور اس سے دور اور قریب کے رشتوں کا علم ہو سکتا ہے اور نسبی قرب ہی کی مقدار پر ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جاتے ہیں۔ عصبات کا قرب و بعد معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کیلئے استعمال کرو تفاخر کے لئے نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا

کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی

يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ

نہیں گھسا ایمان تمہارے دلوں میں، اور اگر تم حکم پر چلو گے اللہ کے اور اسکے رسول کے کاٹ نہ لے گا

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و شرافت کا مدار تقویٰ پر ہے جو ایک باطنی چیز ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں کسی شخص کے لئے اپنے تقدس کا دعویٰ جائز نہیں۔ مذکور الصدر آیت میں ایک خاص واقعہ کی بنا پر یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان کا اصل مدار قلبی تصدیق پر ہے اس کے بغیر محض زبان سے اپنے کو مؤمن کہنا صحیح نہیں۔ اس پوری سورت میں اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تعظیم و تکریم کا پھر باہمی حقوق اور آداب معاشرت کا ذکر آیا ہے ختم سورت پر یہ بتلایا گیا کہ آخرت میں سب اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان و تصدیق قلبی اور اللہ و رسول کی اطاعت پر ہے۔

شان نزول | واقعہ اس آیت کے نزول کا امام بغوی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ قبیلہ بنی اسد کے چند آدمی مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک قحط شدید کے زمانے میں حاضر ہوئے، یہ لوگ دل سے تو مؤمن تھے نہیں محض صدقات حاصل کرنے کے لئے اپنے اسلام کا اظہار کیا، اور چونکہ واقع میں مؤمن نہ تھے اسلامی احکام و آداب سے بے خبر اور غافل تھے انھوں نے مدینہ کے راستوں پر غلاظت و نجاست پھیلا دی اور بازاروں میں اشیاء ضرورت کی قیمتیں بڑھا دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک تو جھوٹا دعویٰ ایمان کا کیا، دوسرے آپ کو دھوکہ دینا چاہا، تیسرے آپ پر احسان جتلایا کہ دوسرے لوگ تو ایک زمانے تک آپ کے برسرپیکار رہے آپ کے خلاف جنگیں لڑیں پھر مسلمان ہوئے ہم بغیر کسی جنگ کے خود آپ کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوگئے اس لئے ہماری قدر کرنی چاہیے جو شان رسالت میں ایک طرح کی گستاخی بھی تھی کہ اپنے مسلمان ہو جانے کا احسان آپ پر جتلایا، اور مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کے صدقات سے اپنی مفلسی دور کریں۔ اور اگر یہ واقعی اور سچے مسلمان ہی ہو جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا احسان تھا خود اپنا ہی نفع تھا اس پر آیات مذکورہ نازل ہوئیں جن میں اُن کے جھوٹے دعوے کی تکذیب اور احسان جتلانے پر مذمت کی گئی ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، چونکہ ان کے دعوائے ایمان نہ تھا جھوٹا دعویٰ صرف ظاہری اعمال کی بنا پر کرتے تھے اس لئے قرآن نے ان کے ایمان کی نفی اور دعوے ایمان کے غلط ہونے کو بیان کر کے یہ فرمایا کہ تمہارا آمنا کہنا تو جھوٹ ہے تم زیادہ سے زیادہ اسلمنا کہہ سکتے ہو کیونکہ اسلام کے لفظی معنی ظاہری اعمال میں اطاعت کرنے کے ہیں اور یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لئے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے لگے تھے اس لئے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہوگئی اس لئے لُغوی معنی کے اعتبار سے اسلمنا کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اسلام اور ایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟ اوپر کی تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں اصطلاحی معنی مراد ہی نہیں اس لئے اس آیت سے اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا۔ اور اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمال ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی اطاعت کرنے کا لیکن شریعت میں تصدیق قلبی اسوقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک اس کا اثر جوارح کے اعمال و افعال تک نہ پہنچ جائے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرے۔ اسی طرح اسلام اگرچہ اعمال ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اسوقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے ورنہ وہ نفاق ہے۔ اس طرح اسلام و ایمان مبدأ اور منتہیٰ کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہوکر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعال ظاہرہ سے شروع ہوکر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں، اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مؤمن نہ ہو یا مؤمن ہو مسلم نہ ہو مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان و اسلام میں ہے لغوی معنی کے اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو مؤمن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعت احکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مؤمن نہ تھے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ؂

تمت بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ سورۃ الحجرات لثلث من
من شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ یوم الاحد وللہ الحمد ومنۃ

سُوْرَۃُ قٓ

سُوْرَۃُ قٓ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً وَّثَلٰثُ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ ق مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پینتالیس آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ

ق قسم ہے اس قرآن بڑی شان والے کی، بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ آیا اُن کے پاس ڈر سنانے والا انہی میں کا

فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ

تو کہنے لگے منکر یہ تعجب کی چیز ہے، کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی، یہ

رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ

پھر آنا بہت دور ہے، ہم کو معلوم ہے جتنا گھٹاتی ہے زمین اُن میں سے اور ہمارے پاس کتاب ہے جس

حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝

میں سب کچھ محفوظ ہے، کوئی نہیں پر جھٹلانے لگے سچے دین کو جب اُن تک پہنچا سو وہ پڑے ہیں الجھی ہوئی بات میں،

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا

کیا نہیں دیکھتے آسمان کو اپنے اوپر کیسا ہم نے اس کو بنایا اور رونق دی اور اس میں

مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا

نہیں کوئی سوراخ، اور زمین کو پھیلایا اور ڈالے اس میں بوجھ اور اگائی

مرنے کے بعد زندہ ہونے کا امکان ثابت کر کے اُن کے محال کہنے کو رد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کو تم جو غیر ممکن کہتے ہو اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ جن چیزوں کے زندہ ہونے کو کہا جاتا ہے ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، یہ تو مشاہدۃً غلط ہے کیونکہ وہ اس وقت ہمارے سامنے زندہ موجود ہیں، اگر زندگی کی صلاحیت ہی نہ ہوتی تو اس وقت کیسے زندہ ہیں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فاعل یعنی حق تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت اس لئے نہ ہو کہ جو اجزاء میت کے مٹی ہو کر منتشر ہو گئے وہ اس کو معلوم نہ ہوں کہ کہاں بکھرے ہیں تو اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی کھاتی ہے اور کم کرتی ہے اور یہ نہیں کہ آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم تو قدیم ہے، حتیٰ کہ ہم نے قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیئے تھے اور اب تک) ہمارے پاس وہ کتاب (یعنی لوح محفوظ) موجود ہے (اس میں ان اجزاء منتشرہ کا مکان اور وضع اور مقدار اور وصف سب کچھ ہے، سو اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو یوں ہی سمجھ لے کہ وہ دفتر جس میں سب کچھ ہے، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے مگر یہ لوگ کچھ بلاوجہ تعجب ہی پر بس اور صرف تعجب ہی نہیں) بلکہ سچی بات کو (جس میں مسئلہ نبوت اور آخرت کی زندگی بھی ہے) جبکہ وہ اُن کو پہنچی ہے جھٹلاتے ہیں، غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں (کہ کبھی تعجب کبھی تکذیب ہے، یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے تھا، آگے بیان ہے قدرت کا یعنی) کیا ان لوگوں (کو ہماری قدرت کا علم نہیں ہے اور کیا انہوں) نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا (اونچا اور بڑا) بنایا اور (ستاروں سے) اس کو آراستہ کیا اور اس میں (باوجود اس کے استحکام کے) کوئی رخنہ تک نہیں (جیسا کہ اکثر تعمیرات میں زمانہ کے دراز ہونے کے بعد رخنہ پڑ جایا کرتا ہے، یہ تو آسمان میں ہماری قدرت نمایاں ہے) اور زمین (میں یہ قدرت ظاہر ہے کہ اس) کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اُگائیں جو ذریعہ ہے دانائی و بینائی کا (یعنی ہماری قدرت کی معرفت کا) ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے (یعنی ایسے شخص کے لئے جو مصنوعات کو اس نظر سے دیکھے کہ ان کو کس نے بنایا ہے) اور (ہماری قدرت اس سے ظاہر ہے کہ) ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا پھر اس سے بہت سے باغ اُگائے اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے رزق دینے کے لئے اور (دوسری نباتات مثل گھاس وغیرہ کے جمانے کے لئے بھی) اور ہم نے اس (بارش) کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو زندہ کیا (بس) اسی طرح (سمجھ لو کہ مُردوں کا) زمین سے نکلنا ہوگا (کیونکہ قدرت ذاتیہ کے اعتبار سے تمام مقدورات برابر ہیں بلکہ جو ذات بڑی چیزوں پر قادر ہے اس کا چھوٹی چیزوں پر قادر ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، اسی لئے آسمان و زمین کا یہاں ذکر کیا گیا، کہ ان کی تخلیق ایک مُردہ کو دوبارہ زندہ کرنے سے بہت بڑی بات ہے

کردیں تعالیٰ (لخلق السموات والارض اکبر) تو جب ان بڑے بڑے کاموں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ثابت ہوگئی تو مُردوں کو زندہ کر دینے پر کیوں نہ ہوگی، تو معلوم ہوا کہ مُردوں کو زندہ کرنا محال نہیں ممکن ہے اور زندہ کرنے والا ذوالجلال بڑی قدرت والا ہے، پھر اس میں تعجب یا تکذیب کی کیا بات ہے، آگے تکذیب کرنے والوں کو ڈرانے کے لئے پچھلی امتوں کے واقعات بتلا کر وعید کی گئی ہے کہ جس طرح یہ لوگ قیامت اور رسول کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح ان سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور قوم لوط اور اصحاب ایکہ اور قوم تُبّع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا یعنی اپنے اپنے پیغمبر کو توحید اور رسالت اور قیامت کے مقدمہ میں (جھٹلایا) سو میری وعید ان پر متحقق ہو گئی (کہ ان سب پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح ان مکذبین پر عذاب آئے گا، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، وعید کے بعد پھر مضمون اول کی طرف دوسرے طور پر عود ہے کہ) کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ دوبارہ زندہ نہ کر سکیں، اور ایک مانع یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی کام بھی ممکن ہو اور کرنے والے کو قدرت بھی پوری ہو، مگر کوئی عارضی مانع پیش آ جائے جیسے کرنے والا تھک گیا ہو، اس لئے یہ معلوم نہیں کر سکا، اس آیت میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عوارض سے پاک ہے وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، نہ اس کو تکان ہونے کا کوئی امکان ہے، اس سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا دلائل سے ثابت ہو گیا، اور یہ لوگ جو انکار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) شبہ میں (پڑے ہوئے) ہیں (جو دلائل کے سامنے کسی طرح قابل التفات نہیں)۔

معارف و مسائل

سورۂ ق کی خصوصیات: سورۂ ق میں بیشتر مضامین آخرت اور قیامت اور مُردوں کے زندہ ہونے اور حساب و کتاب سے متعلق ہیں اور یہی مناسبت ہے اس کو اس سے پہلی سورۂ حجرات سے کہ اس کے آخر میں انہی مضامین کا ذکر تھا،

سورۂ ق کی ایک خصوصی اہمیت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ ام ہشام بنت حارثہ بن النعمانؓ کہتی ہیں کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب میرا مکان تھا) دو سال تک ہمارا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنور (جس میں روٹی پکتی تھی) ایک ہی تھا، مجھے سورۂ ق پوری اس طرح حفظ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ میں تلاوت فرماتے تھے (رواہ مسلم، ازقرطبی)

اور حضرت عمر بن خطابؓ نے ابو واقد لیثیؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازوں میں کونسی سورت پڑھا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا: قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ

اور حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں بکثرت سورۂ ق تلاوت فرماتے تھے

یہ سورت خاصی بڑی ہے) مگر اس کے باوجود نماز ہلکی ہوتی تھی (قرطبی) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تلاوت کا خاص اثر تھا کہ بڑی سے بڑی سورت اور طویل سے طویل نماز بھی پڑھنے والوں پر ہلکی رہتی تھی،

کہ آسمان صاف ہے، اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَاۗءِ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نظر آتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ یہ نیلگوں رنگ جو نظر آتا ہے یہ جو کا رنگ ہے، مگر اس کی نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہی رنگ آسمان کا بھی ہو، اس کے علاوہ آیت میں نظر سے مراد نظر عقلی بمعنی غور و فکر بھی مراد ہو سکتی ہے (بیان القرآن)

احیاء بعد الموت پر قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ، کفار و مشرکین جو قیامت میں بعث بعد الموت مشبہ منکرین کا جواب (یعنی مُردوں کے زندہ ہونے) کا انکار کرتے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تعجب ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے کل اجزاء جسم مٹی ہو جاتے ہیں، پھر وہ مٹی منتشر ہو کر دنیا میں پھیل جاتی ہے، پانی اور ہوا اس کے ذرات کہاں سے کہاں پہونچا دیتے ہیں، قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء کو معلوم کرنا کہ یہ جزء فلاں کا ہے یہ فلاں کا، اور پھر ہر ایک کے اجزاء کو الگ الگ جمع کر دینا کس کے بس کی بات ہے؟ قرآن کریم نے اس کا جواب دیا کہ انسان اپنے محدود علم و بصیرت پر اللہ تعالیٰ کے غیر محدود و لامتناہی علم کو قیاس کر کے اس گمراہی میں پڑتا ہے، قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ، یعنی اللہ تعالیٰ کا علم تو اتنا وسیع و محیط ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک ایک جزء اس کی نظر میں ہے، وہ جانتا ہے کہ مُردے کے کس کس حصہ کو زمین نے کھا لیا ہے، کیونکہ اس کی کچھ ہڈیاں تو اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں جن کو زمین نہیں کھاتی، اور جس کو زمین نے کھا کر مٹی کر دیا ہے پھر وہ مٹی دنیا جہان کے جس گوشہ میں پہنچی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، جب وہ چاہے گا سب کو ایک جگہ جمع کر دے گا، اور ذرا غور کرو تو اس وقت ہر انسان کا جسم جن اجزاء سے مرکب چلتا پھرتا نظر آتا ہے اس میں بھی تو ساری دنیا کے مختلف گوشوں کے اجزاء جمع ہیں، کوئی غذا کی صورت سے کوئی دوا کی صورت میں سارے عالم کے مختلف شہروں اور جنگلوں کے اجزاء ہی تو ہیں جن سے یہ موجودہ جسم مرکب ہوا ہے، پھر اس کے لئے کیا دشوار ہے کہ دوبارہ ان اجزاء کو دنیا میں منتشر کرنے کے بعد پھر ایک جگہ جمع کر دے، اور صرف یہی نہیں کہ اب مرنے اور مٹی ہونے کے بعد انسان کے یہ اجزاء اس کے علم میں آگئے ہوں، بلکہ انسان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کی زندگی کا ہر مرحلہ اور اس میں پیدا ہونے والے تغیرات اور پھر مرنے کے بعد اس پر کیا کیا حالات پیش آئیں گے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس پہلے سے لکھا ہوا لوح محفوظ میں موجود ہے،

پھر جو علیم و خبیر ہے اور جس کی قدرت اتنی کامل اور سب چیزوں پر حاوی ہے اس کے متعلق یہ تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے، مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ و مجاہدؒ اور جمہور مفسرین سے منقول ہے (بحر محیط)

فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ، لفظ مریج کے معنی لغت میں مختلط کے ہیں جس میں مختلف چیزوں کا اختلاط و التباس ہو

موجب عبرت کے لئے کافی ہیں۔

ثمود: حضرت صالح علیہ السلام کی امت ہیں ان کا قصہ قرآن میں بارہا پہلے گذر چکا ہے۔

عاد: قوم عاد بڑے ڈیل ڈول اور قوت و شجاعت میں ضرب المثل تھی، حضرت ہود علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، ان کو تسلیم نہ کیا، نافرمانی کی، آخرکار ہوا کے طوفان کا عذاب آیا، اور سب فنا ہوگئے۔

فرعون: بہت ہی معروف و مشہور مصر کے بادشاہ کا نام ہے۔

إخوان لوط: حضرت لوط علیہ السلام کی امت ہے، جن کا قصہ کئی مرتبہ پہلے گذر چکا ہے۔

أصحٰب الأيكة: ایکہ گھنے جنگل اور بن کو کہتے ہیں، یہ لوگ ایسے ہی مقام پر رہتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام ان کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے، انھوں نے نافرمانی کی، بالآخر عذاب آسمانی سے تباہ و برباد ہوئے۔

وقوم تبع: تبع یمن کے ایک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی ضروری تحقیق جلد ہفتم میں سورۂ دخان کے تحت گذر چکی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ

اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور ہم اس سے

إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ

نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ، جب لیتے جاتے ہیں دو لینے والے داہنے بیٹھا اور بائیں

قَعِيدٌ ﴿١٧﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿١٨﴾ وَجَاءَتْ

بیٹھا، نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار، اور وہ آئی

سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴿١٩﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ

بیہوشی موت کی تحقیق، یہ وہ ہے جس سے تو ٹلتا رہتا تھا، اور پھونکا گیا صور

ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ﴿٢٠﴾ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ﴿٢١﴾

یہ ہے دن ڈرانے کا، اور آیا ہر ایک جی اس کے ساتھ ہے ایک ہانکنے والا اور ایک احوال بتلانے والا

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

تو بے خبر رہا اس دن سے اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری سو تیری نگاہ آج

حَدِيدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿٢٣﴾ أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ

تیز ہے اور بولا وہ فرشتہ جو اس کے ساتھ ہے یہ ہے جو میرے پاس تھا حاضر ڈال دو تم دونوں دوزخ میں ہر

كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ

ناشکر مخالف کو نیکی سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا شبہ ڈالنے والا جس نے ٹھہرایا اللہ کے ساتھ اور

إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا

کوئی دوسرا معبود سو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں بولا شیطان جو اس کا ساتھی تھا اے رب ہمارے

أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ

میں نے اس کو شرارت میں نہیں ڈالا پر یہ تھا راہ بھولا ہوا دور جا پڑا فرمایا جھگڑا مت کرو میرے پاس

وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا

اور میں پہلے ہی ڈال چکا تھا تم کو عذاب کا ڈر بدلتی نہیں بات میرے پاس اور میں ظلم

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾

نہیں کرتا بندوں پر

٢ ع ١٦

خلاصۂ تفسیر

اور قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کا امکان ثابت ہو چکا ہے آگے اس کے وقوع کا بیان ہے اور وقوع موقوف ہے علم کامل اور قدرت کاملہ پر اس لئے اول ان کو بتلاتے ہیں کہ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے قدرت پر) اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان (تک) کو (بھی) جانتے ہیں (تو جو افعال ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے صادر ہوں ان کو جاننا تو بدرجہ اولیٰ ہے) اور (بلکہ ہم کو تو اس کے احوال کا ایسا علم ہے کہ اس کو خود بھی اپنے حال کا ایسا علم نہیں پس باعتبار علم کے) ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ (جس کے قطع ہونے سے انسان مر جاتا ہے، اور چونکہ لوگوں کی عام عادت میں جانوروں کی روح نکالنے کے لئے گردن کاٹنے ہی کا طریقہ رائج ہے اس لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی، اور یہ گردن کی رگیں ورید اور شریان دونوں کو محتمل ہیں مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے، اور ورید میں بالعکس اور یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے، اور سورۂ حاقہ میں لفظ وتین بمعنی

رگِ دل سے تعبیر کرنا اس کا مؤید ہے کیونکہ جو رگیں دل سے نکلتی ہیں وہ شریانیں ہیں، اور قرآن میں لفظ ورید تو
مگر معنی لغوی میں کے عام ہیں جس میں دل سے نکلنے والی رگیں شریانیں بھی داخل ہیں اور جگر سے نکلنے والی رگیں وریدیں
بھی، پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح و نفس سے بھی نزدیک تر ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے
احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے چنانچہ انسان کو بہت سی حالتوں کا تو علم ہی نہیں
ہوتا، اور جن کا علم ہوتا ہے ان میں بھی بعض اوقات نسیان یعنی ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ میں ان
احتمالات کی گنجائش ہی نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر وقت حاضر ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک
حالت میں ہو زیادہ ہوگا غرض علم الٰہی کا تمام احوال انسانیہ کے ساتھ متعلق ہونا بھی ثابت ہو گیا، آگے
اس کی مزید تاکید کے لئے یہ بیان فرمایا کہ انسان کے عمل و احوال صرف یہی نہیں کہ حق تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہو
بلکہ ظاہری حجت تمام کرنے کے لئے وہ اعمال فرشتوں کے ذریعہ لکھوا کر بھی محفوظ کئے گئے ارشاد ہے) جب دو
اخذ کرنے والے فرشتے (انسان کے عمل کو جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ داہنی
اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں (اور ہر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں، لقولہ تعالیٰ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ
وقولہ تعالیٰ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ، یہاں تک کہ سب اعمال میں خفیف امور کی گفتگو اور
کلام ہے اس کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک
لگانے والا تیار موجود ہوتا ہے، اگر وہ نیکی کا کلام ہے تو داہنے والا اس کو قلمبند و تحریر میں لاتا ہے
اگر بدی کا کلام ہو تو بائیں والا، اور جب زبان سے نکلنے والا ایک ایک کلمہ محفوظ ہوتا ہے تو دوسرے اعمال
کیوں نہ ہوں گے، اور انسان کی آخرت کی زندگی اور اعمال کی جزاء و سزا سب کا مقدمہ موت ہے اس لئے
انسان کو متنبہ کرنے کے لئے آگے اس کا ذکر ہے، کیونکہ قیامت سے انکار در حقیقت موت سے غفلت
ہی کا نتیجہ ہوتا ہے ارشاد ہے کہ تو ہوشیار رہو کہ) موت کی سختی حقیقۃً قریب آپہنچی (یعنی ہر شخص
کی موت قریب آ پہنچی ہے یہ موت وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا اور بھاگتا تھا (موت سے بھاگنا
طبعی طور پر تو ہر نیک و بد میں یکساں ہے، اور کافر و فاجر کا موت سے بھاگنا بوجہ حب دنیا کے اور بھی زیادہ دائم
ہے کسی خاص بندہ پر اللہ سے ملنے کے شوق کا غلبہ ہو کر موت کا لذیذ اور محبوب ہو جانا اس کے منافی نہیں
کیونکہ وہ عام عادات انسانیت سے مافوق حالت ہے) اور اس مقدمہ یعنی ذکر موت کے بعد اب وقوع قیامت
کا بیان ہے جو کہ مقصود تھا یعنی قیامت کے دن دوبارہ صور پھونکا جائے گا (جس سے سب زندہ ہو جائیں گے
یہی دن ہوگا وعید کا (جس سے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا) اور (آگے قیامت کے ہولناک واقعات اور حالات
کا بیان ہے) ہر شخص اس طرح میدان قیامت میں آوے گا کہ اس کے ساتھ دو فرشتے ہوں گے
جن میں) ایک (تو میدان) قیامت کی طرف اس کو اپنے ہمراہ لاوے گا اور ایک اس کے اعمال کا
گواہ ہوگا (حدیث مرفوع میں ہے کہ یہ سائق اور شہید وہی دو فرشتے ہیں جو زندگی میں انسان کے دائیں و

باتیں اس کے اغوا کی لکھتے تھے (رواہ فی الدر) اور اگر یہ حدیث موقوف نزدیک محدثین کے قوی نہ ہو تو احتمال ہے
کہ دو فرشتے اور ہوں جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں مگر اس صورت میں بھی بوجہ موافقت حدیث کے راجح احتمال
اول ہی ہوگا) اور جب وہ میدان قیامت میں جمع ہوں گے تو ان میں جو کافر ہوں گے ان سے خطاب ہوگا کہ
تو اس دن سے بے خبر تھا (یعنی اس کا قائل نہ تھا) سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت) ہٹا دیا (کہ ہر شے
(اور قیامت کا معائنہ کرا دیا) سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے کہ کوئی بات مخفی نہیں (لیکن اگر تو دنیا
میں بھی اس پردہ غفلت کو دور کر دیتا تو آج یہ دن نہ دیکھتا) اور اس کے بعد فرشتہ (کاتب عمل) جو
اس کے ساتھ رہتا تھا اور جب بھی یک قسم کی شہادت رکھتا ہے نامہ عمل حاضر کر کے عرض
کرے گا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے جو میرے پاس تیار ہے، اور تفسیر در منثور میں عن الحسن با ملک ابن جبیح و مقاتل سے نقل ہے
بلیہ بالشیطان (رواہ فی الدر) چنانچہ اس روزنامچہ کے موافق کافروں کے بارے میں دونوں فرشتوں کو خواہ وہ
سائق و شہید مذکورین ہوں یا اور دو فرشتے ہوں حکم ہوگا کہ ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا
ہو اور (حق سے) عناد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبدیت) سے باہر ہو جانے والا ہو اور
(دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کیا ہو سو ایسے شخص کو سخت
عذاب میں ڈال دو (اس سب تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اب نسبت کفر کی میں پڑنے والے ہیں اس وقت اپنے بچاؤ
کے واسطے گمراہ کرنے والوں کے ذمہ الزام رکھیں گے کہ ہم قصوروار نہیں ہیں ان لوگوں نے گمراہ کیا ہے
اور چونکہ ان گمراہ کرنے والوں میں شیاطین بھی داخل ہیں اس لئے فرمایا کہ) وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا
تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اس کو جبراً گمراہ نہیں کیا تھا جیسا کہ اس کے الزام رکھنے سے
مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے قصد کو بالکل دخل نہ ہو، لیکن بات یہ ہے کہ) یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی
میں (باختیار خود) تھا (گو اغوا میں نے بھی کیا جس میں کوئی جبر نہ تھا، اس لئے اس کی گمراہی کا اثر مجھ پر
نہ ہونا چاہئے) ارشاد ہوگا کہ میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے سود ہیں) اور میں تو پہلے ہی
تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا (کہ جو کفر کرے گا خواہ کسی کے اغوا سے اور جو کفر کا حکم کرے گا خواہ اپنی
مرضی سے یا کسی کے جبر سے سب کو جہنم کی سزا (علی تفاوت مراتب) دوں گا سو میرے ہاں وہ بات
(وعید مذکور کی) نہیں بدلی جاوے گی (بلکہ تم سب دوزخ میں بھیجے جاؤ گے) اور میں (اس تجویز میں
بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (بلکہ بندوں نے خود ایسے ناشائستہ کام کئے جس کی سزا آج بھگت
رہے ہیں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں منکرین حشر و نشر اور مُردوں کے زندہ ہونے کو بعید از عقل و قیاس

اللہ نے ان کو اس کا ملکہ دیدیا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ کوئی گناہ کریں تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے

ابن کثیرؒ نے حضرت احنف بن قیس کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان دو فرشتوں میں سے صاحب یمین نیک عمل لکھتا ہے اور وہ صاحب شمال یعنی بائیں جانب کے فرشتے کا بھی نگران و امین ہے، اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو صاحب یمین صاحب شمال سے کہتا ہے کہ ابھی اس کو اپنے صحیفہ میں نہ لکھو اس کو مہلت دو اگر توبہ کرلی تو رہنے دو ورنہ پھر اعمالنامہ میں درج کردو (رواہ ابن ابی حاتم)

اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے: حضرت حسن بصریؒ نے آیت مذکورہ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ تلاوت فرما کر کہا:

"اے ابن آدم تیرے لئے نامہ عمل بچھا دیا گیا ہے، اور تجھ پر دو معزز فرشتے مقرر کر دیئے گئے ہیں، ایک تیری داہنی جانب دوسرا بائیں جانب، داہنی جانب والا تیری حسنات کو لکھتا ہے اور بائیں جانب والا تیری سیئات اور گناہوں کو، اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جو تیرا جی چاہے عمل کر اور کم کر یا زیادہ، یہاں تک کہ جب تو مرے گا تو یہ صحیفہ (نامہ عمل) لپیٹ دیا جائے گا اور تیری گردن میں ڈال دیا جائے گا، جو تیرے ساتھ قبر میں جائے گا اور رہے گا یہاں تک کہ جب تو قیامت کے روز قبر سے نکلے گا تو اس وقت حق تعالیٰ فرمائے گا وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ، اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا، یعنی ہم نے ہر انسان کا عمل نامہ اس کی گردن میں لگا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ اس کو کھلا ہوا پائے گا، اب اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لے تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے"

پھر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اس ذات نے بڑا ہی عدل و انصاف کیا جس نے خود تجھ کو ہی تیرے اعمال کا محاسب بنا دیا۔ (ابن کثیر) یہ ظاہر ہے کہ اعمالنامہ کوئی دنیوی کاغذ تو ہے نہیں جس کے قبر میں ساتھ جانے اور قیامت تک باقی رہنے پر اشکال ہو، ایک معنوی چیز ہے جس کی حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اس لئے اس کا ہر انسان کے گلے کا ہار بننا اور قیامت تک باقی رہنا کوئی تعجب کی چیز نہیں۔

انسان کا ہر قول لکھا جاتا ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ، یعنی انسان کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالتا جس کو یہ نگران فرشتہ محفوظ نہ کرلیتا ہو، حضرت حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ یہ فرشتے اس کا ایک ایک لفظ لکھتے ہیں خواہ اس میں کوئی گناہ یا ثواب ہو یا نہ ہو، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صرف وہ کلمات لکھے جاتے ہیں جن پر کوئی ثواب یا عذاب ہو، ابن کثیرؒ نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آیت قرآن کے عموم سے پہلی ہی بات کی ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ ہر ہر لفظ لکھا جاتا ہے۔

پھر علی بن ابی طلحہؒ کی ایک روایت ابن عباسؓ ہی سے ایسی نقل فرمائی جس میں یہ دونوں قول جمع ہو جاتے ہیں

اور اقرار کرنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ موت وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا اور بچتا تھا،

ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب عام انسان کو ہے، موت سے بدکنا اور بچنا طبعی طور پر پوری نوع انسانی میں پایا جاتا ہے، ہر شخص زندگی کو مرغوب اور موت کو آفت و مصیبت سمجھ کر اس سے بچنے کی تدبیریں کرتا ہے، جو شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں، لیکن آیت میں بتلانا یہ منظور ہے کہ انسان کی یہ طبعی اور فطری خواہش مکمل طور پر ہرگز پوری نہیں ہو سکتی، بالآخر ایک دن تو بہرحال موت آنی ہی ہے، خواہ تم اس سے کتنا ہی بھاگنا چاہو،

اس کے بعد (۲۱) وَجَاۤءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۤئِقٌ وَّشَهِيْدٌ، اس آیت سے اوپر قیامت قائم ہونے لانے والے دو فرشتے کا ذکر ہے، اس آیت میں میدان حشر میں تمام انسانوں کے حاضر ہونے کی ایک خاص کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک سائق ہوگا، سائق کہتے ہیں اس شخص کو جو جانوروں کو یا کسی جماعت کے پیچھے رہ کر اس کو کسی خاص جگہ پر پہونچانا چاہتا ہے، اور شہید کے معنی گواہ کے ہیں، سائق کا فرشتہ ہونا تو باتفاق روایات سے ثابت ہے، شہید کے بارے میں علماء تفسیر کے اقوال مختلف ہیں بعض کے نزدیک وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا، اس طرح سائق اور شہید دو فرشتے ہوگئے، ایک کا کام اس کو میدان حشر میں پہونچانا ہے، دوسرے کا کام یہ ہے کہ جب اس کے اعمال پیش ہوں تو وہ اُن پر گواہی دے، یہ دو فرشتے وہ بھی ہو سکتے ہیں جو انسان کے داہنے اور بائیں اعمال کی کتابت کے لئے ہر وقت دنیا میں ساتھ رہتے ہیں، یعنی کراماً کاتبین، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور دو ہوں۔

اور شہید کے متعلق بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ انسان کا عمل ہوگا، اور بعض نے خود اسی انسان کو شہید فرمایا، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر آیت سے یہی ہے کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی ہوگا جو اس کے اعمال پر شہادت دے گا، حضرت عثمان غنیؓ نے خطبہ میں یہ آیت تلاوت فرما کر یہی تفسیر فرمائی ہے، اور حضرت مجاہد، قتادہ، ابن زید مفسرین سے بھی یہی منقول ہے، ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

مرنے کے بعد آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو زندگی میں نہ دیکھ سکتی تھیں | فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۤءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (یعنی ہم نے تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا آج تمہاری نگاہ بڑی تیز ہے) اس کا مخاطب کون ہے، اس میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر راجح یہی ہے کہ عام انسان مخاطب ہیں، جن میں مومن، کافر، متقی، فاسق سب داخل ہیں، اسی تفسیر کو ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اختیار فرمایا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ دنیا کی مثال خواب کی سی زندگی کی ہے، اور آخرت کی مثال بیداری کی، جیسے خواب میں آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں کچھ نہیں دیکھتا، اسی طرح انسان ان حقائق کو جن کا تعلق عالم آخرت سے ہے دنیا میں آنکھوں سے نہیں دیکھتا، مگر یہ ظاہری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ خواب کا عالم ختم ہو کر بیداری کا عالم آ جاتا ہے جس میں وہ سارے حقائق سامنے آجاتے ہیں اسی لئے بعض علماء نے فرمایا اَلنَّاسُ نِيَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا (یعنی آج کی دنیا کی زندگی میں سب انسان سو رہے ہیں جب مریں گے اس وقت جاگیں گے)

قَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِيْدٌ، یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے رہتا تھا، اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کاتب اعمال دو فرشتے ہوتے ہیں، مگر قیامت میں انسان کی حاضری کے وقت ایک کو سائق دوسرے کو شہید اس سے پہلی آیت میں فرمایا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب اعمال دو فرشتوں کو میدان حشر میں اس کی حاضری کے وقت دو کام سپرد کر دیئے گئے ہیں ایک کے ذمہ اس کے پیچھے رہ کر اس کو میدان حشر میں پہونچانا لگا دیا گیا جس کو آیت میں سائق کا نام دیا گیا، دوسرے کے سپرد اس کے نامۂ اعمال کر دیئے گئے جس کو شہید کے نام سے تعبیر کیا، وہ میدان حشر میں پہونچنے کے بعد نامۂ اعمال پیش کر کے یہ عرض کرے گا هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِيْدٌ یعنی اس کے اعمالنامے یہ ہیں لکھے ہوئے موجود ہیں، اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں لفظ قرین سائق اور شہید دونوں کو شامل ہے۔

اَلْقِيَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ، لفظ اَلْقِیَا تثنیہ کا صیغہ ہے جو دو شخصوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں جن دو فرشتوں کو خطاب ہے وہ کون ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یہی دو فرشتے جن کو پہلے سائق اور شہید کہا گیا ہے اس کے مخاطب ہیں، بعض حضرات مفسرین نے دوسری توجیہات بھی کی ہیں، واللہ اعلم۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ، لفظ قرین کے اصل معنی ساتھ رہنے والے ساتھی کے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے پچھلی آیت میں قرین سے مراد وہ فرشتہ یا فرشتے لئے گئے ہیں جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں اور انسان کے ساتھ جیسے دو فرشتے قرین بنائے گئے ہیں اسی طرح ایک شیطان بھی ہر انسان کے ساتھ رہتا ہے جو اس کو گمراہی اور گناہوں کی طرف بلاتا ہے، اس آیت میں قرین سے یہی شیطان مراد ہے، جب اس شخص کو جہنم میں ڈالنے کا حکم ہو جائے گا تو یہ شیطان اس سے اپنی برأت کا اظہار کرے گا کہ اس کو میں نے گمراہ نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی گمراہ تھا کہ میری بات کو قبول کر لیا ورنہ نیک بات پر کان نہ دھرتا تھا، ظاہر کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنمی جب اُس وقت یہ عذر کرے گا کہ مجھے تو اس شیطان نے بہکایا تھا ورنہ میں نیک کام کرتا، اس کے جواب میں شیطان اپنی برأت ظاہر کرے گا، ان دونوں کے جھگڑے کے جواب میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا،

لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ، یعنی میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں تو پہلے ہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ تمہارے فضول عذر کا جواب دے چکا ہوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ واضح و صریح کر چکا ہوں، یہ فضول عذر تراشی اور جھگڑا کام نہ دے گا۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ، یعنی میرے پاس قول بدلا نہیں کرتا، جو فیصلہ کر دیا ہے وہ نافذ ہوگا، اور ہم نے کوئی کسی پر ظلم نہیں کیا، عین انصاف کا فیصلہ ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ﴿٣٠﴾ وَأُزْلِفَتِ

جس دن ہم کہیں دوزخ کو تو بھر بھی چکی اور وہ بولے کچھ اور بھی ہے اور نزدیک لائی جائے

الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾

بہشت ڈرنیوالوں کے واسطے دور نہیں، یہ ہے جس کا وعدہ ہوا تھا تم سے ہر ایک رجوع رکھنے والے یاد رکھنے والے کو

مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ

جو ڈرا رحمان سے بن دیکھے اور لایا دل جس میں رجوع ہونے والا، چلے جاؤ اس میں سلامت

ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿٣٤﴾ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾

یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا، ان کو ملتا ہے جو چاہیں وہاں اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی۔

خلاصۂ تفسیر

(یہاں سے محشر کے بقیہ واقعات کا بیان ہے کہ وہ دن لوگوں کو یاد دلائیے،) جس دن کہ ہم دوزخ سے (کفار کو اس میں داخل کرنے کے بعد) کہیں گے کہ تو بھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے (یہ پوچھنا شاید کفار کو اور زیادہ ڈرانے کے لئے ہو کہ جواب سن کر ان کے دل میں دوزخ کی اور بھی زیادہ ہول پیدا ہو جاوے کہ ہم کیسے غضب کے ٹھکانے پر پہنچے ہیں جو سب کو کھا جانا چاہتا ہے، اور جہنم کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا جواب بھی غالباً اسی غیظ و غضب کا مظہر ہے جو جہنم کو خدا کے دشمن کفار کے ساتھ ہے جس کا ذکر سورۂ ملک میں ان الفاظ سے آیا ہے تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ، جہنم نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میرا پیٹ نہیں بھرا بلکہ مزید کی فرمائش بوجہ غیظ و غضب کے کی اس لئے قرآن میں دوسری جگہ جو حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (یعنی میں بھر دوں گا جہنم کو جنات اور انسانوں سے) یہ اس کے منافی نہیں، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ سابقہ لأملأن کے لئے جنات اور انسانوں کو جہنم میں ڈالتے جاویں گے اور وہ یہی کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے، اور (جنت کا بیان یہ ہے کہ وہ) جنت متقیوں کے قریب کر دی جاوے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی (اور متقین سے کہا جاوے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (بایں عنوان) وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال و طاعات کی) پابندی کرنے والا ہو (غرض یہ کہ) جو خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہوگا اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آوے گا (ان کو حکم ہوگا کہ) اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لئے حکم ہونے) کا، ان کو بہشت

میں سب کچھ ملے گا جو چاہیں گے اور ہمارے پاس ان کی چاہی ہوئی چیزوں سے زیادہ بھی (نعمت ہے) کہ وہاں تک جنتی کا ذہن بھی نہ پہونچے گا جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی نعمتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ ایسی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال آیا، ان نعمتوں میں سے ایک نعمت حق تعالیٰ کا دیدار ہے۔

معارف و مسائل

اوّاب کون لوگ ہیں؟ | لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ یعنی جنت کا وعدہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو اوّاب اور حفیظ ہو، اوّاب کے معنی رجوع ہونے والے کے ہیں، مراد وہ شخص ہے جو معاصی سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور شعبیؒ و مجاہدؒ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور ان سے استغفار کرے، اور حضرت عبید بن عمیرؒ نے فرمایا کہ اوّاب وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس اور ہر نشست میں اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگے، اور فرمایا کہ ہمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ اوّاب اور حفیظ وہ شخص ہے جو اپنی ہر مجلس سے اٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا اَصَبْتُ فِیْ مَجْلِسِیْ هٰذَا (پاک ہے اللہ اور اسی کی حمد ہے یا اللہ میں آپ سے مغفرت مانگتا ہوں اس برائی سے جو میں نے اس مجلس میں کی ہو)۔

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی مجلس سے اٹھنے کے وقت یہ دعا پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے وہ سب گناہ معاف فرما دیں گے جو اس مجلس میں سرزد ہوئے، دعا یہ ہے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ (یا اللہ تو پاک ہے اور تیری حمد و ثنا ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں)

اور حفیظ کے معنی حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرمائے کہ جو شخص اپنے گناہوں کو یاد رکھے تاکہ ان سے رجوع کرکے تلافی کرے، اور ان سے ایک روایت میں حفیظ کے معنی حافظ لامر اللہ کے بھی منقول ہیں یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد رکھے، اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شروع دن میں چار رکعتیں اشراق کی پڑھے وہ اوّاب اور حفیظ ہے (قرطبی)

وَجَاۗءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ، ابوبکر وراق فرماتے ہیں کہ منیب کی علامت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ادب کو ہر وقت مستحضر رکھے، اور اس کے سامنے تواضع و عاجزی سے رہے، اور اپنے نفس کی خواہشات کو چھوڑ دے۔

جو قوت میں ان سے (کہیں) زیادہ تھے اور دنیا کا سامان بڑھانے کے لئے تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (یعنی قوت کے ساتھ اسباب معیشت میں بھی بڑی ترقی کی تھی، لیکن جب ہمارا عذاب نازل ہوا تو) ان کو کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہ ملی (یعنی کسی طرح بچ نہ سکے) اس (واقعہ مذکور) میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو، یا اگر فہیم نہ ہو تو کم از کم یہ ہو کہ وہ (دل سے متوجہ ہو کر بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سننے کے بعد ہماری حقانیت کا معتقد ہو کر اس بات کو قبول کر لیتا ہو اور اگر قیامت کا انکار اس بنا پر ہے کہ تم اللہ کی قدرت کو اس سے قاصر سمجھتے ہو تو وہ اس سے باطل ہے کہ ہماری قدرت اتنی ہے کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس سب کو چھ دن (کی مقدار) کے موافق زمانہ میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں، (پھر آدمی کا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، وھذا کقولہ تعالیٰ فی الاحقاف اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی اور باوجود ان قاطع شبہ جوابوں کے یہ لوگ پھر انکار ہی پر ڈٹے ہیں سو ان کی باتوں پر صبر کیجئے (رنج نہ کیجئے) اور یہ کہ بدون اس کے کہ کسی طرف دل کو مشغول کیا جاوے وہ غم کی بات دل سے نہیں نکلتی اور بار بار یاد آ کر دل کو محزون کرتی ہے اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے (اس میں نماز بھی داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور اس کے چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر و عصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح (و تحمید) کیا کیجئے (اس میں مغرب و عشاء آگئیں) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی (اس میں نوافل و اوراد آگئے، حاصل یہ ہو کہ ذکر اللہ میں اور اس کی فکر میں لگے رہئے تاکہ ان کے اقوال کفریہ کی طرف دھیان ہی نہ ہو)۔

معارف و مسائل

نَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ، نقبوا، تنقیب سے مشتق ہے، اس کے اصلی معنی سوراخ کرنے اور پھاڑنے کے ہیں، محاورات میں زمین میں دور دراز سفروں تک پھرنے چلنے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے (ذکرہ فی القاموس)

اور محیص کے معنی جائے پناہ کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے کتنی قوموں اور جماعتوں کو ہلاک کر دیا ہے جو قوت و طاقت میں تم سے کہیں زیادہ تھیں، اور جو مختلف ملکوں اور خطوں میں تجارت وغیرہ کے لئے پھرتی رہیں، مگر دیکھو کہ انجام کار ان کو موت آئی اور ہلاک ہو گئیں، کوئی خطۂ زمین یا مکان ان کو موت سے پناہ نہ دے سکا،

حصول علم کے دو طریقے | لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد عقل ہے

چونکہ عقل کا مرکز قلب ہی ہے، اس لئے اس کو قلب سے تعبیر کر دیا گیا، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہاں قلب سے مراد حیات ہے، وہ بھی اسی لئے کہ حیات کا مدار قلب ہے، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اس سورت قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے نصیحت و عبرت کا فائدہ اسی شخص کو پہنچ سکتا ہے جس میں عقل ہو یا زندگی ہو، بے عقل یا مردے کو کیا فائدہ پہنچے گا،

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ القاء سمع کے معنی کسی بات کی طرف کان لگانے کے آتے ہیں، شہید بمعنی حاضر، معنی یہ ہیں کہ آیات مذکورہ کا فائدہ دو شخصوں کو پہنچتا ہے، ایک وہ جو خود عقل رکھتا ہے، یعنی عقل سے ان سب مضامین کی تصدیق کرتا ہے، یا پھر وہ آدمی جو آیات الٰہیہ کو کان لگا کر سنے، اس طرح سے کہ وہ خود حاضر بھی ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ کان تو سن رہے ہیں دل حاضر نہیں ہے، تفسیر مظہری میں فرمایا کہ پہلی قسم کاملین امت کی ہے، اور دوسری ان کے متبعین اور مریدین مخلصین کی جو ان کے اعتقاد سے دین کی باتیں مان لیتے ہیں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ سبح تسبیح سے مشتق ہے، اس کے لغوی معنی اللہ کی تسبیح کرنا یعنی پاکی بیان کرنا ہے، اور زبانی تسبیح کو بھی شامل ہے اور عبادت نماز کو بھی، اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ تسبیح قبل طلوع شمس سے مراد نماز فجر ہے، اور تسبیح قبل الغروب سے مراد نماز عصر ہے، حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک طویل حدیث کے ضمن میں) فرمایا:

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰی صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا، يَعْنِي الْعَصْرَ وَالْفَجْرَ ثُمَّ قَرَاَ جَرِيْرٌ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، بخاری ومسلم ولفظ مسلم	"کوشش کرو کہ تم سے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی نمازیں چھوٹنے نہ پائیں .... یعنی نماز فجر اور عصر، اور اس پر استدلال کرنے کے لئے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔ (قرطبی)

اور آیت کے مفہوم میں وہ عام تسبیحات بھی داخل ہیں جن کے صبح شام پڑھنے کی ترغیب احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت اور شام کے وقت سو سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کرے تو قیامت کے روز کوئی آدمی اس سے بہتر عمل لے کر نہیں آئے گا، بجز اس کے کہ وہ بھی یہ تسبیح اتنی یا اس سے زیادہ پڑھتا ہو، اور صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ جس شخص نے دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ پڑھا اس کے گناہ معاف کر دیئے جاویں گے، اگرچہ وہ سمندر کی موجوں سے بھی زیادہ ہوں (مظہری)

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ حضرت مجاہدؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ سجود سے مراد فرض نمازیں ہیں، اور

پھوٹ کر اُگ آتا ہے، اسی طرح بھی قیامت میں مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت کی طرف اشارہ ہے) جس روز زمین ان (مُردوں) پر سے کھل جاوے گی جبکہ وہ (نکل کر میدانِ قیامت کی طرف) دوڑتے ہوں گے یہ جمع کر لینا ہمارے نزدیک بالکل آسان ہے (غرض دلائل سے قیامت کا امکان اور وقوع سب ثابت ہو چکا، مگر اس پر بھی جو لوگ نہ مانیں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) جو کچھ یہ لوگ (قیامت وغیرہ کے بارے میں) کہہ رہے ہیں ہم خوب جانتے ہیں (ہم خود سمجھ لیں گے) اور آپ ان پر (منجانب اللہ) جبر کرنے والے (کر کے) نہیں (بھیجے گئے) ہیں (کہ آپ کو ان کی فکر ہو بلکہ آپ صرف منذر اور مبلغ ہیں جب یہ بات ہے) تو آپ قرآن کے ذریعہ سے (عام تذکیر سب کو اور خاص تذکیر نافع سے صرف) ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہئے جو میری وعید سے ڈرتا ہو (اس میں مشغول رہئے اور یَّخَافُ کی تقیید سے اشارہ ہو گیا کہ آپ اگرچہ تذکیر و تبلیغ عام کرتے ہیں جیسا مشاہدہ ہے لیکن پھر بھی مَنْ یَّخَافُ وَعِیْد (یعنی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا) کوئی کوئی ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں اور جب آپ کے اختیار میں نہیں پھر بے اختیار بات کی فکر کیوں)۔

معارف و مسائل

یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ، یعنی جس دن ایک پکارنے والا فرشتہ پاس ہی سے پکارے گا، ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ اسرافیل ہوگا جو بیت المقدس کے صخرہ پر کھڑا ہو کر ساری دنیا کے مُردوں کو یہ خطاب کرے گا:

"اے گلی سڑی ہڈیو اور ریزہ ریزہ ہوجانے والی کھالو اور بکھر جانے والے بالو! سن لو! تم کو اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ حساب کے لئے جمع ہو جاؤ" (مظہری)

یہ قیامت کے نفخۂ ثانیہ کا بیان ہے جس سے دوبارہ عالم کو زندہ کیا جائے گا اور مکان قریب سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اس فرشتے کی آواز پاس اور دور کے سب لوگوں کو اس طرح پہونچے گی کہ گویا پاس ہی سے پکار رہا ہے، حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ یہ آواز اس طرح سنی جائے گی جیسے کوئی ہمارے کان میں آواز دے رہا ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مکان قریب سے مراد صخرۂ بیت المقدس ہے، کیونکہ وہ زمین کا وسط ہے، سب طرف سے اس کی مسافت یکساں ہے (قرطبی)

یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْھُمْ سِرَاعًا، یعنی جب زمین پھٹ کر یہ سب مُردے نکل آویں گے، اور دوڑتے ہوں گے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوڑنا ملکِ شام کی طرف ہوگا، جہاں صخرۂ بیت المقدس پر اسرافیل علیہ السلام نداء کرتے ہوں گے،

جامع ترمذی میں حضرت معاویہ بن حیدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک سے ملکِ شام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مِنْ هٰهُنَا اِلٰى هٰهُنَا تُحْشَرُوْنَ رُكْبَانًا وَّمُشَاةً وَّتُجَرُّوْنَ عَلٰى وُجُوْهِكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الحديث (از قرطبی)

"یہاں سے اس طرف (یعنی شام کی طرف) تم سب اٹھائے جاؤ گے کچھ لوگ سوار کچھ پیدل .... اور بعض چہروں کے بل گھسیٹ کر قیامت کے روز اس میدان میں لائے جاؤ گے۔"

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (یعنی آپ تذکیر و نصیحت فرمایئے قرآن سے اس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ آپ کی تبلیغ اور وعظ و نصیحت اگرچہ عام ہی ہوگی جس میں مخلوق اس کی مخاطب اور مکلف ہوگی، مگر اس کا اثر قبول وہی کرے گا جو اللہ کے عذاب اور وعید سے ڈرتا ہے۔

حضرت قتادہؒ اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا مانگتے تھے،

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يَّخَافُ وَعِيْدَكَ وَيَرْجُوْا مَوْعُوْدَكَ يَا بَارُّ يَا رَحِيْمُ۔

"یعنی یا اللہ ہمیں ان لوگوں میں داخل کر دیجئے جو آپ کی وعید عذاب سے ڈرتے ہیں اور آپ کے وعدے کے امیدوار ہیں، اے وعدہ پورے کرنے والے اے رحمت والے۔"

تمت

سُوْرَةُ قٓ بِعَوْنِ اللهِ سُبْحٰنَهٗ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ مِنْ ثَانِيْ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ اِلٰى سَابِعِ عَشَرَ رَبِيْعِ الْاَوَّلِ يَوْمَ الْخَمِيْسِ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ فِيْ تَكْمِيْلِ الْبَاقِيْ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ۔

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ ذاریات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ① فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ② فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ③

قسم ہے ان ہواؤں کی جو بکھیرتی ہیں اڑا کر، پھر اٹھانے والیاں بوجھ کو، پھر چلنے والیاں نرمی سے،

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ④ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ⑤ وَّاِنَّ الدِّيْنَ

پھر بانٹنے والیاں حکم سے، بیشک جو وعدہ کیا ہے تم سے سو سچ ہے، اور بیشک انصاف ہونا

لَوَاقِعٌ ⑥ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ⑦ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ⑧

ضرور ہے، قسم ہے آسمان جالدار کی، تم پڑ رہے ہو ایک جھگڑے کی بات میں،

يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ⑨ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ⑩ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ

اس سے باز رہے وہی جس کو پھیر دیا، مارے گئے اٹکل دوڑانے والے، وہ جو غفلت میں ہیں

غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ⑪ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ⑫ يَوْمَ هُمْ

بھول رہے، پوچھتے ہیں کب ہے دن انصاف کا، جس دن وہ آگ

عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ⑬ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ

پر الٹے سیدھے پڑیں گے، چکھو مزہ اپنی شرارت کا، یہ ہے جس کی تم جلدی

پائے گا کہ شمار کرنا بھی مشکل ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، اس جگہ آیات قدرت کے بیان میں آسمان اور فضائی مخلوقات کا ذکر چھوڑ کر صرف زمین کا ذکر فرمایا ہے جو انسان کے بہت قریب ہے جس پر انسان بستا اور چلتا پھرتا ہے، اس آیت میں اس سے بھی زیادہ قریب یعنی خود انسان کی ذات کی طرف توجہ دلائی کہ زمین اور زمین کی مخلوقات کو بھی چھوڑو خود اپنے وجود اپنے جسم اور اس کے اعضاء و جوارح ہی میں غور کرو تو ایک ایک عضو کو حکمت حق تعالیٰ کا ایک دفتر پاؤ گے اور سمجھو گے کہ سارے عالم میں جو آیات قدرت حق تعالیٰ کی ہیں انسان کے اپنے چھوٹے سے وجود میں وہ سب گویا سمٹ آئی ہیں اسی لئے انسان کے وجود کو عالم صغیر کہا جاتا ہے کہ سارے عالم کی مثالیں انسان کے وجود میں موجود ہیں انسان اگر اپنی ابتداء پیدائش سے لے کر موت تک کے پیش آنے والے حالات میں ہی غور و تدبر کرنے لگے تو اس کو حق تعالیٰ گویا اپنے سامنے نظر آنے لگیں۔

کہ کس طرح ایک انسانی نطفہ دنیا کے مختلف خطوں کی غذاؤں اور دنیا میں بکھرے ہوئے ذرات اور اجزاء کا خلاصہ بن کر رحم میں قرار پایا، پھر کس طرح نطفہ سے ایک جما ہوا خون منعقد بنا، پھر علقہ سے مضغہ گوشت کا ٹکڑا بنا، پھر کس طرح اس میں ہڈیاں بنائی گئیں پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا گیا پھر کس طرح اس بے جان پتلے میں جان ڈالی گئی اور اس کو زندگی کی تکمیل کرکے اس دنیا میں لایا گیا، پھر کس طرح تدریجی ترقی کرکے ایک بے عقل بے شعور بچہ ایک دانشمند فعال انسان بنا دیا گیا اور کس طرح ان کی صورتیں اور شکلیں مختلف بنا دی گئیں کہ اربوں پدموں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، اس چند انچ کے رقبہ میں ایسے امتیازات رکھنا کس کے بس کی بات ہے پھر ان کی طبائع اور مزاجوں میں اختلاف اور اس اختلاف کے باوجود ایک وحدت یہ سب اس قدرت کاملہ کی کرشمہ سازی ہے جو بے مثل و بے مثال ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ہر انسان کہیں باہر اور دور نہیں خود اپنے ہی وجود میں دن رات مشاہدہ کرتا ہے اس کے باوجود بھی اگر وہ اللہ جل شانہ اور اس کی قدرت کاملہ کا اعتراف نہ کرے تو کوئی اندھا ہی ہو سکتا ہے جس کو کچھ نہ سوجھے، اسی لئے آخر میں فرمایا اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، ”یعنی کیا تم دیکھتے نہیں“ اشارہ اس طرف ہے کہ اس میں کچھ زیادہ عقل و سمجھ کا بھی کام نہیں، بینائی ہی درست ہو تو اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ، (یعنی آسمان میں ہے تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) اس کی بے غبار و بے تکلف تفسیر وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں اختیار کی گئی یعنی آسمان میں ہونے سے مراد آسمان میں لوح محفوظ کے اندر لکھا ہونا مراد ہے۔ اور مطلب ظاہر ہے کہ ہر انسان کا رزق اور جو کچھ اس سے وعدے کئے گئے اور اس کو جو کچھ انجام ہونا ہے وہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے مقررہ رزق سے بچنے اور بھاگنے کی بھی کوشش کرے تو رزق اس کے پیچھے پیچھے

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى

بولا پھر کیا مطلب ہے تمہارا اے بھیجے ہوؤ ، وہ بولے ہم کو بھیجا ہے

قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ

ایک گنہگار قوم پر کہ چھوڑیں ان پر پتھر مٹی کے نشان پڑے ہوئے

رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾

تیرے رب کے یہاں حد سے نکل چلنے والوں کے لئے ، پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً

پھر نہ پایا ہم نے اس جگہ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں سے ، اور باقی رکھا ہم نے اس میں

لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ

نشان ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں عذاب دردناک سے ، اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا

اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾

ہم نے اس کو فرعون کے پاس دے کر کھلی سند ، پھر اس نے منہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ

پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اور اس پر الزام لگا ، اور نشانی ہے عاد میں جب

اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا

بھیجی ہم نے ان پر ہوا خیر سے خالی ، نہیں چھوڑتی کسی چیز کو جس پر گذرے کہ

جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾

نہ کر ڈالے اس کو جیسے چورا ، اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو برت لو ایک وقت تک

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا

پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے پھر پکڑا ان کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے ، پھر نہ

اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ

ہو سکا ان سے کہ اٹھیں اور نہ ہوئے کہ بدلا لیں ، اور ہلاک کیا نوح کی قوم کو

اپنے دل میں یہ کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں جن کو ہم نہیں پہچانتے، اور ممکن ہے کہ خود مہمانوں کے سامنے ہی اس کا ذکر بطور استفہام کے کر دیا ہو، اور مقصد ان کا تعارف دریافت کرنا ہو۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ، رَاغَ، روغ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ سے کھسک جانے اور خفیہ طور پر چلے جانے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے گھر میں اس طرح گئے کہ مہمانوں کو ان کے اُٹھ جانے کی خبر نہ ہو، ورنہ وہ کھانا اور مہمانی **لانے سے انکار کرتے۔**

آدابِ مہمانی: ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں مہمان کے لئے چند آداب میزبانی کی تعلیم ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے مہمانوں سے پوچھا نہیں کہ میں آپ کے لئے کھانا لاتا ہوں، بلکہ چپکے سے کھسک گئے، اور ان کی مہمانی کے لئے اپنے پاس جو سب سے بہتر چیز کھانے کی تھی یعنی بچھڑا ذبح کیا، اس کو بھونا اور لے آئے، اور دوسرے یہ کہ لانے کے بعد مہمانوں کو اس کی تکلیف نہیں دی کہ ان کو کھانے کی طرف بلاتے، بلکہ جہاں وہ بیٹھے تھے وہیں لاکر ان کے سامنے پیش کر دیا فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ، تیسرے یہ کہ مہمانی پیش کرنے کے وقت انداز گفتگو میں کھانے پر اصرار نہیں بلکہ فرمایا اَلَا تَاْكُلُوْنَ کیا آپ کھائیں گے نہیں، اشارہ اس طرف ہو کہ اگرچہ آپ کو حاجت کھانے کی نہ ہو، مگر ہماری خاطر سے کچھ کھائیے،

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے ان سے خطرہ محسوس کرنے لگے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت شرفاء کا تعامل تھا کہ مہمان ضرور کچھ مہمانی قبول کرتا، اور کوئی شخص جو مہمانی ذرا بھی قبول نہ کرے اس سے خطرہ ہوتا تھا کہ یہ شاید کوئی دشمن ہے جو تکلیف پہنچانے آیا ہے، اس وقت کے چوروں ڈاکوؤں میں بھی یہ شرافت تھی کہ جس کا کچھ کھا لیں پھر اس کو نقصان نہیں پہونچاتے تھے، اس لئے **نہ کھانا سبب خطرہ کا بنتا تھا۔**

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ، صرۃ کے معنی غیر معمولی آواز کے ہیں صریر قلم سے نکلنے والی آواز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ حضرت سارہ نے جب سُنا کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کو بچے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے ہیں، اور یہ ظاہر تھا کہ بچہ بیوی سے پیدا ہوتا ہے بیوی حضرت سارہ ہی تھیں، تو سمجھیں کہ یہ خوشخبری ہم دونوں ہی کے لئے ہے، تو غیر اختیاری طور پر ان کے منہ سے کچھ الفاظ حیرت و تعجب کے نکلے، اور کہا عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ کہ اول تو میں بڑھیا پھر بانجھ یعنی جوانی میں بھی اولاد کے قابل نہیں تھی اب بڑھاپے میں یہ کیسے ہوگا، جس کے جواب میں فرشتوں نے فرمایا كَذٰلِكِ یعنی اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے، یہ کام یونہی ہوگا، چنانچہ جس وقت اس بشارت کے مطابق حضرت اسحق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت سارہ کی عمر ننانوے سال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی تھی، (قرطبی)

بلکہ وجہ اس اجماع و اتفاق کی یہ ہوئی کہ یہ سب کے سب سرکش لوگ ہیں (یعنی سبب اس قول کا سرکشی ہے چونکہ وہ ان سب میں مشترک ہے اس لئے قول بھی مشترک ہوگیا) سو جب پہلے لوگ بھی ایسے گذرے ہیں اور سبب اس کا معلوم ہوگیا کہ جہل کا طغیان ہے تو آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے (یعنی ان کی تکذیب کی پرواہ اور غم نہ کیجئے) کیونکہ آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں (مقصود دفع تشویش عن صاحب تفہیم ہے) اور (اعراض کے ساتھ اپنے منصبی کام میں لگے رہئے یعنی سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا (جن کی قسمت میں ایمان نہیں ان پر اتمام حجت ہوگا اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان) ایمان لانے والوں کو بھی (اور جو پہلے سے مومن ہیں ان کو بھی) نفع دے گا (بہرحال تذکیر میں منافع اور حکمتیں سب کے اعتبار سے ہیں آپ اس کو کئے جائیے اور کسی کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کیجئے)

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں قیامت و آخرت کا بیان اور اس کے منکرین و مکذبین پر عذاب کا ذکر تھا، ان آیات میں بھی حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے جس سے قیامت اور اس میں مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر جو تعجب منکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے اس کا ازالہ ہے، نیز توحید کا اثبات اور رسالت پر ایمان کی تاکید ہے۔

بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ، لفظ اَید، قوت و قدرت کے معنی میں آتا ہے، اس جگہ حضرت ابن عباسؓ نے اَید کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ، یعنی دوڑو اللہ کی طرف۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے بھاگو اللہ کی طرف توبہ کے ذریعہ۔ ابوبکر وراق اور جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ نفس و شیطان معاصی کی طرف دعوت دینے والے ہیں، اور بہکانے والے ہیں، تم ان سے بھاگ کر اللہ کی طرف پناہ لو تو وہ تمہیں ان کے شر سے بچالیں گے (قرطبی)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ

اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو میں نہیں چاہتا ان سے

رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ

روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلاویں اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور

الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا

مضبوط، سو ان گنہگاروں کا بھی ڈول بھر چکا ہے جیسے ڈول بھرا ان کے ساتھیوں کا اب مجھ سے

انسان کو عبادت کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، اس میں دو اشکال ظاہر نظر میں پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ مخلوق اس کام کو کرے تو عقلاً ضروری ہے، ممکن و محال ہوگا کہ پھر وہ مخلوق اس کام سے انحراف کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت کے خلاف کوئی کام محال ہے، دوسرا اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں انسان و جن کی تخلیق کا مقصد عبادت میں منحصر کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان کی پیدائش میں علاوہ عبادت کے دوسرے فوائد و حکمتیں بھی موجود ہیں۔

پہلے اشکال کے جواب میں بعض حضرات مفسرین نے اس مضمون کو صرف مومنین کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یعنی ہم نے مومن جنات اور مومن انسانوں کو بجز عبادت کے اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا اور مومنین ظاہر ہے کہ عبادت کے کم و بیش پابند ہوتے ہیں یہ قول ضحاک اور سفیان وغیرہ کا ہے، اور حضرت ابن عباس کی ایک قرأت آیت مذکورہ میں لفظ مومنین مذکور بھی ہے، اور قرأت اس طرح ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، اس قرأت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ مضمون صرف مومنین کے حق میں آیا ہے، اور خلاصہ تفسیر میں اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ارادہ الٰہیہ سے مراد ارادہ تکوینی نہیں ہے جس کے خلاف کا وقوع محال ہوتا ہے بلکہ ارادہ تشریعی ہے، یعنی یہ کہ ہم نے اُن کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم ان کو عبادت کے لئے مامور کریں، امر کریں چونکہ انسانی اختیار کے ساتھ مشروط رکھا گیا ہے، اس کے خلاف کا وقوع محال نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو امر عبادت کا سب کو دیا مگر ساتھ ہی اختیار بھی دیا ہے اس لئے کسی نے اپنے خداداد اختیار کو صحیح خرچ کیا، عبادت میں لگ گیا، کسی نے اس اختیار کو غلط استعمال کیا، عبادت سے منحرف ہوگیا، یہ قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغوی نے نقل کیا ہے، اور زیادہ بہتر و بے غبار توجیہ وہ ہے جو تفسیر مظہری میں کی گئی ہے کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ ہم نے ان کی تخلیق اس انداز کی ہے کہ ان میں استعداد اور صلاحیت عبادت کرنے کی ہو، چنانچہ ہر جن و انس کی فطرت میں یہ استعداد قدرتی موجود ہے پھر کوئی اس استعداد کو صحیح مصرف میں خرچ کرکے کامیاب ہوتا ہے، کوئی اس استعداد کو اپنے معاصی و شہوات میں ضائع کر دیتا ہے، اور اس مضمون کی مثال وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ، یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو اس فطرت سے ہٹا کر کوئی یہودی بنا دیتا ہے کوئی مجوسی، فطرت پر پیدا ہونے سے مراد اکثر علماء کے نزدیک دین اسلام پر پیدا ہونا ہے، تو جس طرح اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر انسان میں فطری اور خلقی طور پر اسلام و ایمان کی استعداد و صلاحیت رکھی جاتی ہے، پھر کبھی اس کے ماں باپ اس صلاحیت کو ضائع کرکے کفر کے طریقوں پر ڈال دیتے ہیں، اسی طرح اس آیت میں اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے ہر فرد میں اللہ تعالیٰ نے استعداد اور صلاحیت عبادت کی رکھی ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم،

اور دوسرے اشکال کا جواب خلاصہ تفسیر میں یہ آچکا ہے کہ کسی مخلوق کو عبادت کے لئے پیدا کرنا اس سے **دوسرے منافع اور فوائد کی نفی نہیں کرتا۔**

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ الآیہ یعنی میں جن و انس کو پیدا کر کے ان سے عام انسانوں کی عادت کے مطابق اپنا کوئی نفع نہیں چاہتا، کہ وہ رزق پیدا کریں میرے لئے یا اپنے لئے یا میری دوسری مخلوق کے لئے، اور یا یہ کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں، یہ سب کلام انسان کی عام عادت پر کیا گیا ہے کیونکہ بڑے سے بڑا انسان جو غلام خریدتا اور اس پر خرچ کرتا ہے تو اس کا مقصد ان غلاموں سے اپنے کام لینا، اپنی ضروریات اور کاموں میں مدد لینا اور کمائی کرکے آقا کو دینا ہوتا ہے، حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک اور بالا و برتر ہیں، اس لئے فرمایا **کہ ان کو پیدا کرنے سے میرا اپنا کوئی نفع مقصود نہیں۔**

ذَنُوْبًا، لفظ ذنوب بفتح ذال اصل میں بڑے ڈول کو کہا جاتا ہے، اور بستی کے عام کنوؤں پر پانی بھرنے کے لئے بغرض سہولت بھرنے والوں کے نمبر اور باری مقرر کر دی جاتی ہے ہر ایک پانی بھرنے والا اپنی باری میں پانی بھرتا ہے، اس لئے یہاں لفظ ذنوب کے معنی باری اور حصہ کے لئے گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں کو اپنے اپنے وقت میں عمل کرنے کا موقع اور باری دی گئی، جن لوگوں نے اپنی باری میں کام نہیں کیا وہ ہلاک و برباد اور گرفتار عذاب ہوئے، اسی طرح موجودہ مشرکین کی بھی باری اور وقت مقرر ہے، اگر اس وقت تک یہ اپنے کفر سے باز نہ آئے تو خدا کا عذاب ان کو کبھی تو اسی دنیا میں اور نہیں تو آخرت میں ضرور پکڑے گا، اس لئے ان کو فرما دیجئے کہ اپنی جلد بازی سے باز آجائیں، یعنی یہ کفار جو بطور تکذیب و انکار کے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم واقعی مجرم ہیں اور مجرمین پر عذاب آنا آپ کے قول سے ثابت ہے تو پھر ہم پر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ ان کا جواب یہ ہے کہ عذاب اپنے مقررہ وقت پر اور اپنی باری پر آتا ہے، تمہاری باری بھی آنے والی ہے جلد بازی نہ کرو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

سورۂ ذاریات آج دوشنبہ ۲۱ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ کو پوری ہوگئی

سُورَةُ الطُّورِ

سُورَةُ الطُّورِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورہ طور مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انچاس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالطُّوْرِ ① وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ② فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ③ وَّالْبَيْتِ

قسم ہے طور کی، اور لکھی ہوئی کتاب کی، کشادہ ورق میں، اور آباد

الْمَعْمُوْرِ ④ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ⑤ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ⑥ اِنَّ عَذَابَ

گھر کی، اور اونچی چھت کی، اور ابلتے ہوئے دریا کی، بیشک عذاب

رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ⑦ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ⑧ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ⑨

تیرے رب کا ہو کر رہیگا، اس کو کوئی نہیں ہٹانے والا، جس دن لرزے آسمان کپکپا کر،

وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ⑩ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑪ الَّذِيْنَ هُمْ

اور پھریں پہاڑ چل کر، سو خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کو، جو باتیں بناتے ہیں

فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ⑫ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ⑬ هٰذِهِ

کھیلتے ہوئے، جس دن کہ دھکیلے جائیں دوزخ کی طرف دھکیل کر، یہ ہے وہ

النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ⑭ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ⑮

آگ جس کو تم جھوٹ جانتے تھے، اب بھلا یہ جادو ہے یا تم کو نہیں سوجھتا،

وقف لازم

اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ چھ سو روپے والے سے ایک سو روپے لیکر اس چار سو والے کو دیدئیے جائیں کہ دونوں کے پاس پانچ پانچ سو ہو جائیں اور دوسری صورت جو کریموں کی شان کے لائق ہے یہ ہے کہ چھ سو والے سے کچھ نہ لیا جائے بلکہ اس چار سو والے کو دو سو روپے اپنے پاس سے دیدیں اور دونوں کو برابر کر دیں، پس مطلب یہ ہوا کہ وہاں پہلی صورت واقع نہ ہوگی جس کا اثر یہ ہوتا کہ متبوع کو بوجہ کم ہو جانے اعمال کے اس کے درجہ سے کچھ نیچے لاتے، اور تابع کو کچھ اوپر لے جاتے اور دونوں ایک متوسط درجہ میں رہتے یہ نہ ہوگا بلکہ دوسری ... صورت واقع ہوگی اور متبوع اپنے درجۂ عالیہ میں بدستور رہے گا، اور تابع کو وہاں پہونچ دیا جائے گا اور متبوع اور ذریت میں ایمان کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ ذریت مؤمن نہیں تو آباء مؤمنین کے ساتھ لحاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ کافروں میں سے ہر شخص اپنے اعمال کفریہ میں محبوس (فی النار دوامًا) رہے گا (کقولہ تعالیٰ کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ فسرہ ابن عباس کما فی الدر یعنی نجات کی کوئی صورت نہیں، لہذا ان کا الحاق آباء مؤمنین کے ساتھ متصور نہیں، اس لئے الحاق میں ایمان ذریت شرط ہے) اور آگے پھر متعلق اہل ایمان داخل جنت کے بیان ہے کہ ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا ان کو مرغوب ہو روز افزوں دیتے رہیں گے، اور وہاں آپس میں بطور خوش طبعی کے جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ اس (شراب) میں نہ بک بک لگے گی (کیونکہ نشہ نہ ہوگا) اور نہ کوئی بیہودہ بات (عقل اور متانت کے خلاف) ہوگی اور ان کے پاس (فواکہ وغیرہ دینے کے لئے) ایسے لڑکے آئیں جائیں گے (یہ لڑکے کون ہوں گے اس کی تحقیق تفسیر سورۂ واقعہ میں آئے گی) جو خاص انہی کی خدمت کے لئے ہوں گے، اور غایت حسن و جمال سے ایسے ہوں گے کہ گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں (کہ ان پر ذرا گرد و غبار نہیں ہوتا، اور آب و تاب اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے) اور ان کو روحانی مسرت بھی ہوگی، چنانچہ اس میں سے ایک کا بیان یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اور اثنائے گفتگو میں) یہ بھی کہیں گے کہ (بھائی) ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا) میں (انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیا (اور) ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اسی سے دعائیں مانگا کرتے تھے (کہ ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا دے سو اللہ نے دعا قبول کر لی) واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے (اور اس مضمون سے مسرت ہونا ظاہر ہے، اور چونکہ یہ امر دو حیثیت سے نعمت تھا، ایک فی نفسہ عذاب سے بچانا دوسرے ہم ناکاروں کی ناچیز عرض قبول کر لینا، اس لئے دو عنوانوں سے تعبیر کیا گیا)۔

معارف مسائل

وَالطُّوْرِ، طور کے معنی عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہیں جس پر درخت اُگتے ہوں، یہاں طور سے مراد وہ طور سینین ہے جو ارض مدین میں واقع ہے، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ سے

شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا، بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ دنیا میں چار پہاڑ جنت کے ہیں ان میں سے ایک طور ہے (قرطبی) طور کی قسم کھانے میں اس کی خاص تعظیم و تشریف کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے کچھ کلام اور احکام آتے ہیں جن کی پابندی اُن پر فرض ہے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ، لفظ رق دراصل پتلی باریک کھال کے لئے بولا جاتا ہے جو لکھنے کے واسطے کاغذ کی جگہ بنائی جاتی تھی، مراد اس سے وہ چیز ہے جس پر لکھا گیا ہو، اسی لئے اس کا ترجمہ کاغذ سے کردیا جاتا ہے، اور کتاب مسطور سے مراد یہ انسان کا نامۂ عمل ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد قرآن کریم قرار دیا ہے (قرطبی)

آسمانی کعبہ بیت معمور: وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ، بیت معمور آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے، دنیا کے کعبہ کے بالمقابل ہے، صحیحین کی احادیث میں ثابت ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہونچے تو آپ کو بیت معمور کی طرف لے جایا گیا، جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں، پھر کبھی ان کو دوبارہ یہاں پہونچنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ ہر روز دوسرے نئے فرشتوں کا نمبر ہوتا ہے (ابن کثیر)۔

بیت معمور ساتویں آسمان کے رہنے والے فرشتوں کا کعبہ ہے، اسی لئے شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت معمور پر پہونچے تو دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، چونکہ وہ دنیا کے کعبہ کے بانی تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی جزاء میں آسمانی کعبہ سے بھی ان کا خاص تعلق قائم کردیا (ابن کثیر)

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ، بحر سے مراد سمندر، اور مسجور تسجیر سے مشتق ہے جو کئی معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنی آگ بھڑکانے کے بھی ہیں، بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے کہ قسم ہے سمندر کی جو آگ بنا دیا جائے گا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قیامت کے روز سارا سمندر آگ بن جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے (وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ) یعنی چاروں طرف کے سمندر آگ بن کر میدانِ حشر میں جمع ہونے والے انسانوں کے محیط ہوجائیں گے، یہی معنی حضرت سعید بن مسیب نے حضرت علیؓ سے نقل کئے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن مسیبؒ، مجاہدؒ، عبید اللہ بن عمیرؒ نے بھی یہی تفسیر کی ہے (ابن کثیر)

حضرت علیؓ سے کسی یہودی نے پوچھا کہ جہنم کہاں ہے؟ تو آپ نے فرمایا سمندر ہے، یہودی نے بھی جو کتب سابقہ کا عالم تھا اس کی تصدیق کی (قرطبی) اور حضرت قتادہؒ وغیرہ نے مسجور کے معنی مملوّ کے کئے ہیں، یعنی پانی سے بھرا ہوا، ابن جریر نے اسی معنی کو اختیار کیا ہے (ابن کثیر) یہی معنی خلاصۂ تفسیر میں اوپر بیان ہوئے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (بیشک آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا، اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں) یہ جواب قسم ہے اوپر طور، صحف اعمال، بیت معمور، آسمان، سمندر کی جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے اس کا بیان ہے کہ کفار کے اوپر اللہ کا عذاب ضرور واقع ہوگا۔

واقعہ فاروق اعظمؓ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک روز سورۂ طور پڑھی جب اس آیت پر پہونچے تو ایک آہ سرد بھری جس کے بعد بیس روز تک بیمار رہے، لوگ عیادت کرتے، مگر کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ بیماری کیا ہے (ابن کثیر)

حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے سے پہلے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ اس لئے آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر کے قیدیوں کے متعلق گفتگو کروں، میں پہونچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے اور آواز مسجد سے باہر تک پہونچ رہی تھی جب یہ آیت پڑھی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ تو اچانک میری یہ حالت ہوئی کہ گویا میرا دل خوف سے پھٹ جائے گا، میں نے فوراً اسلام قبول کیا، مجھے اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس جگہ سے ہٹ نہیں سکوں گا، کہ مجھ پر عذاب آجائے گا (قرطبی)

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاۗءُ مَوْرًا، لغت میں مضطربانہ حرکت کو مور کہا جاتا ہے، آسمان کی اضطرابی حرکت جو قیامت کے روز ہوگی اس کا بیان ہے۔

بزرگوں کے ساتھ نسبی تعلق آخرت میں بھی نفع دے گا، بشرط ایمان وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں اُن کے تابع رہی (یعنی مومن ہوئی) تو ہم ان کی اولاد کو بھی جنت میں انہی کے ساتھ ملحق کر دیں گے)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومنین صالحین کی ذریت و اولاد کو بھی ان کے بزرگ آباء کے درجہ میں پہنچا دیں گے، اگرچہ وہ عمل کے اعتبار سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں تاکہ ان بزرگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں (رواہ الحاکم والبیہقی فی سننہ والبزار وابونعیم فی الحلیۃ وابن المنذر وابن جریر وابن ابی حاتم، از مظہری)

اور طبرانی نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا اور میرا گمان یہ ہے کہ انھوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص جنت میں داخل ہوگا تو اپنے ماں باپ اور بیوی اور اولاد کے متعلق پوچھے گا (وہ کہاں ہیں) اس سے کہا جاویگا کہ وہ تمہارے درجہ کو نہیں پہونچے اس لئے ان کا جنت میں الگ مقام ہے، یہ شخص عرض کرے گا اے میرے پروردگار میں نے جو کچھ عمل کیا وہ اپنے لئے اور ان سب کے لئے کیا تھا تو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ان کو بھی اسی درجۂ جنت میں ان کے ساتھ رکھ دیا جائے (ابن کثیر)

حافظ ابن کثیرؒ نے روایات مذکورہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ آخرت میں ان روایات سے تو یہ ثابت ہوا کہ آباء صالحین کی برکت سے ان کی اولاد کو فائدہ پہونچے گا اور عمل میں ان کا درجہ کم ہونے کے باوجود باپ دادا کے درجے میں پہونچا دیئے جاویں گے، اس کا دوسرا رُخ کہ اولاد صالحین کی وجہ سے والدین کو نفع پہونچے یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کا درجہ جنت میں اس کے عمل کی مناسبت سے بہت اونچا کر دیں گے، تو یہ دریافت کرے گا کہ میرے پروردگار مجھے یہ مقام اور درجہ کہاں سے مل گیا (میرا عمل تو اس قابل نہ تھا) تو جواب یہ دیا جائے گا کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لئے استغفار و دعاء کی اس کا یہ اثر ہے (رواہ الامام احمد وقال ابن کثیر اسنادہ صحیح ولم یخرجوہ ولکن لہ شاہد فی صحیح مسلم عن ابی ہریرۃؓ)

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ، اَلَت اور ایلات کے لفظی معنی کم کرنے کے ہیں (قرطبی) معنی آیت کے یہ ہیں کہ صالحین کی اولاد کو ان کے درجۂ عمل سے بڑھا کر صالحین کے ساتھ ملحق کرنے کیلئے ایسا نہیں کیا گیا کہ صالحین کے عمل میں سے کچھ کم کر کے ان کی اولاد کے عمل پورا کیا جاتا بلکہ اپنے فضل سے انکی برابر کر دیا گیا۔

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ، یعنی ہر انسان اپنے عمل میں محبوس ہوگا ایسا نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے کا گناہ اس کے سر ڈال دیا جائے یعنی جس طرح آیت سابقہ میں اولاد صالحین کو صالحین کی خاطر سے درجہ بڑھا دیا گیا یہ عمل حسنات میں تو ہوگا، سیئات میں ایک کے گناہ کا کوئی اثر دوسرے پر نہ پڑیگا (ابن کثیر)

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

سو تو سمجھا دے کہ تو اپنے رب کے فضل سے نہ جنوں سے خبر لینے والا ہے اور نہ دیوانہ، کیا کہتے ہیں

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ

یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے، تو کہہ تم منتظر رہو کہ میں بھی تمہارے

مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ؕ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ

ساتھ منتظر ہوں، کیا ان کی عقلیں یہی سکھلاتی ہیں ان کو یا یہ لوگ سرشرارت پر

طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ۚ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ

ہیں، یا کہتے ہیں یہ قرآن خود بنا لایا کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے، پھر چاہیئے کہ لے آئیں

مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ؕ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ

کوئی بات اسی طرح کی اگر وہ سچے ہیں، کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ یا وہی ہیں

الْخٰلِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿٣٦﴾

بنانے والے، یا انھوں نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ

کیا ان کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے یا وہی داروغہ ہیں، کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے

يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ

جس پر سن آتے ہیں، تو چاہئے کہ لے آئے جو سن آتا ہے ان میں ایک سند کھلی ہوئی، کیا اس کے ہاں بیٹیاں ہیں

وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿٣٩﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٠﴾

اور تمہارے بیٹے، کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ مزدوری سو ان پر تاوان کا بوجھ ہے

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤١﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ

کیا ان کو خبر ہے بھید کی سو وہ لکھ رکھتے ہیں، کیا یہ چاہتے ہیں کچھ داؤ کرنا، سو جو منکر

كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾

ہیں وہی آجاتے ہیں داؤ میں، کیا ان کا کوئی حاکم ہے اللہ کے سوائے وہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿٤٤﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى

اور اگر دیکھیں ایک تختہ آسمان سے گرتا ہوا کہیں یہ بادل ہے گاڑھا، سو تو چھوڑ دے اُن کو یہاں تک کہ

يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿٤٥﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ

دیکھیں اپنا وہ دن جس میں ان پر کڑک پڑے گی، جس دن کام نہ آئے گا ان کو اُن کا داؤ ذرہ بھی اور نہ اُن کو مدد

يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَاصْبِرْ

پہنچے گی، اور ان گنہگاروں کو ہے ایک عذاب اس سے ورے پر بہت ان میں کے نہیں جانتے، اور تو ٹھہرا رہ منتظر

لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٤٨﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿٤٩﴾

اپنے رب کے حکم کا تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں جس وقت تو اٹھتا ہے اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے

خلاصۂ تفسیر

جب آپ پر مضامین واجب التبلیغ کی وحی کی جاتی ہے جیسے اوپر ہی جنت و دوزخ کے مستحقین

کی تفصیل کی گئی ہے، تو آپ (ان مفتریوں سے لوگوں کو) سمجھاتے رہیے کیونکہ آپ بفضلہ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں
اور نہ مجنون ہیں (جیسا مشرکین کا یہ قول سورۂ والضحیٰ کی شانِ نزول میں منقول ہے قد ترکک شیطانک
رواہ البخاری، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کاہن نہیں ہو سکتے کیونکہ کاہن شیاطین سے خبریں حاصل کرتا ہے
اور آپ کا شیطان سے کوئی واسطہ نہیں اور ایک آیت میں ہے وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ الآیۃ اس میں آپ
سے جنون کی نفی کی گئی ہے، مطلب یہ کہ آپ نبی ہیں اور نبی کا کام ہمیشہ نصیحت کرتے رہنا ہے، گو لوگ کچھ ہی
بکیں، ہاں کیا یہ لوگ (علاوہ کاہن اور مجنون کہنے کے آپ کی نسبت یوں بھی) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں
(اور) ہم ان کے بارے میں حادثۂ موت کا انتظار کر رہے ہیں (جیسا درمنثور میں ہے کہ قریش دارالندوہ میں
مجتمع ہوئے اور آپ کے بارے میں یہ مشورہ قرار پایا کہ جیسے اور شعراء مر کر ختم ہو گئے آپ بھی انہی میں کے ایک
ہیں اسی طرح آپ بھی ہلاک ہو جائیں گے تو سارا قصہ ختم ہو جاوے گا) آپ فرما دیجئے کہ (بہتر) تم منتظر
رہو سو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (یعنی تم میرا انجام دیکھو میں تمہارا انجام دیکھتا ہوں، اس میں اشارۃً
پیشین گوئی ہے کہ میرا انجام فلاح و کامیابی ہے اور تمہارا انجام خسارہ اور ناکامی ہے، اور یہ مقصود نہیں کہ
تم مرو گے میں نہ مروں گا، بلکہ ان لوگوں کا جو اس سے مقصود تھا کہ ان کا دین چلے گا نہیں، یہ مر جاویں گے تو
دین مٹ جاوے گا جواب میں اس کا رد مقصود ہے، چنانچہ یوں ہی ہوا اور یہ لوگ جو ایسی ایسی باتیں کرتے
ہیں تو) کیا ان کی عقلیں (جس کے یہ بڑے مدعی ہیں) ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ
ہیں (ان کا مدعی عقل و دانش ہونا ان کے اس قول سے ثابت ہے، لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ، احقاف، اور
معالم کی نقل سے اس کی اور تائید ہوتی ہے کہ عظماء قریش لوگوں میں بڑے عقلمند مشہور تھے، پس اس آیت
میں ان کی عقل کی حالت دکھلائی گئی ہے کہ کیوں صاحب بس یہی عقل ہے جو ایسی تعلیم دے رہی ہے، اور اگر
یہ عقل کی تعلیم نہیں ہے تو نری شرارت اور ضد ہے) ہاں کیا وہ یہ (بھی) کہتے ہیں کہ انہوں نے اس (قرآن)
کو خود گھڑ لیا ہے (سو تحقیقی جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ (یہ بات صرف اس وجہ سے
کہتے ہیں کہ) یہ لوگ (بوجہ عناد کے اس کی) تصدیق نہیں کرتے (اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کی آدمی تصدیق
نہیں کرتا ہزار وہ حق ہو مگر اس کی ہمیشہ نفی ہی کیا کرتا ہے، اور دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا اگر
یہ ان کا بنایا ہوا ہے) تو یہ لوگ (بھی عربی اور بڑے فصیح و بلیغ اور قادر الکلام ہیں) اس طرح کا کوئی
کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعوے میں) سچے ہیں (یہ سب مضامین رسالت کے متعلق ہیں
آگے توحید کے متعلق گفتگو ہے کہ یہ لوگ جو توحید کے منکر ہیں تو) کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے
خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں (یعنی یہ کہ نہ اپنے خالق ہیں اور نہ بلا خالق مخلوق ہوئے ہیں
لیکن) انہوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے (اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت میں شریک ہیں، حاصل
یہ کہ جو شخص صفتِ خالقیت صرف حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے اور خود اپنے آپ کا بھی محتاج خالق

ہونے کا اعتقاد رکھے تو عقلاً اس پر لازم ہے کہ توحید کا بھی قائل ہو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دے، اور
توحید کا انکار وہ شخص کر سکتا ہے جو صفت خالقیت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ جانے یا اپنی مخلوقیت کا منکر
ہو اور چونکہ یہ لوگ اپنے عدم غور و فکر کی وجہ سے یہ نہیں جانتے تھے کہ خالق جب ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی
ہونا لازم ہے اس لئے آگے ان کے اس جہل کی طرف اشارہ ہے کہ واقع میں ایسا نہیں) بلکہ یہ لوگ (بوجہ جہل کے
توحید کا) یقین نہیں لاتے (وجہ جہل یہی ہے کہ اس میں غور نہیں کرتے کہ خالقیت اور معبودیت میں تلازم ہے،
یہ گفتگو توحید کے متعلق ہوئی، آگے رسالت کے متعلق ان کے دوسرے مزعومات کا رد ہے، چنانچہ وہ یہ بھی کہا
کرتے تھے کہ اگر نبوت ہی ملنی تھی تو فلاں فلاں رؤسا مکہ وطائف کو ملتی حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ)
کیا ان لوگوں کے پاس تمہارے رب (کی نعمتوں اور رحمتوں) کے (جن میں نبوت بھی داخل ہے) خزانے ہیں
(کہ جس کو چاہیں نبوت دیدیں، کقولہ تعالیٰ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ) یا یہ لوگ (اس محکمہ نبوت کے) حاکم ہیں
(کہ جسے چاہیں نبوت دلوا دیں یعنی دینے دلانے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ مثلاً خزانہ اپنے قبضہ میں ہو،
دوسری یہ کہ قبضہ میں نہ ہو مگر وہ افسر خزانہ اس کے محکوم ہوں کہ اس کے دستخط دیکھ کر دیتے ہوں، یہاں ان
دونوں کی نفی فرما دی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو رسالت محمدیہ کے منکر ہیں اور مکہ وطائف کے رؤسا کو
رسالت کا مستحق قرار دیتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل عقلی تو ہے نہیں بلکہ خود اس کے عکس پر دلائل عقلیہ
قائم ہیں، اور اسی لئے محض استفہام انکاری پر اکتفا فرمایا اب آگے دلیل نقلی کی نفی فرماتے ہیں یعنی) کیا ان
لوگوں کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر (چڑھ کر آسمان کی) باتیں سن لیا کرتے ہیں (یعنی دلیل نقلی وحی
سماوی ہے اور اس کے علم کے دو طریقے ہیں یا تو وحی کسی شخص پر آسمان سے نازل ہو، یا صاحب وحی آسمان
پر چڑھ جائے اور دونوں کا منتفی ہونا ان لوگوں سے ظاہر ہے، آگے اس کے متعلق ایک احتمال عقلی کا ابطال
فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ لوگ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہم آسمان پر چڑھ جاتے اور وہاں کی باتیں سنتے ہیں) تو انہیں
جو (وہاں کی باتیں) سن آتا ہو وہ (اس دعویٰ پر) کوئی صاف دلیل پیش کرے (جس سے ثابت ہو کہ یہ شخص مشرف
بوحی ہوا ہے، جیسا کہ انبیاء اپنی وحی پر دلائل خارقہ یقینیہ رکھتے ہیں، آگے پھر توحید کے بارے میں ایک
خاص مضمون کے متعلق کلام ہے، یعنی منکرین توحید جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر شرک کرتے ہیں
تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا خدا کے لئے بیٹیاں ... (تجویز کی جاویں) اور تمہارے لئے بیٹے (تجویز ہوں
یعنی اپنے لئے تو وہ چیز پسند کرتے ہو جس کو اعلیٰ درجہ کا سمجھتے ہو اور خدا کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہو
جس کو ادنیٰ درجہ کی سمجھتے ہو، اس کا بیان سورۂ صافات کے اخیر میں مفصل مدلل گذرا ہے، آگے پھر رسالت
کے متعلق کلام ہے کہ ان کو دلائل سے آپ کی حقیت ثابت ہوجانے کے آپ کا اتباع اس قدر ناگوار ہے تو)
کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ (تبلیغ احکام کا) مانگتے ہیں کہ وہ تاوان ان کو گراں معلوم ہوتا ہے،
(وہذا کقولہ تعالیٰ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا الخ، آگے قیامت اور جزاء کے متعلق کلام ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں

کہ اول تو قیامت ہوگی نہیں، اور اگر بفرض ہوئی تو ہم وہاں بھی اچھے رہیں گے، کما فی قولہ تعالیٰ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَاۗىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى، تو ہم اس کے متعلق ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا ان کے پاس غیب کا علم (آ گیا) ہے کہ یہ اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یہ حضرت کے نزدیک تفسیر ہے یکتبون سے کیونکہ کتابت طریقہ ہے حفظ کا، پس حاصل یہ ہوا کہ جس امر کے اثباتاً یا نفیاً کوئی دلیل عقلی قائم نہ ہو وہ غیب محض ہے اس کا دعویٰ اثباتاً یا نفیاً وہ کرے جس کو کسی واسطے سے غیب پر مطلع کیا جاوے اور پھر مطلع ہونے کے بعد وہ اس کو محفوظ بھی رکھے، اس لئے کہ اگر معلوم ہونے کے بعد محفوظ نہ ہو تب بھی حکم اور دعویٰ بلا علم ہوگا، پس تم جو قیامت کی نفی اور اپنے لئے حسنیٰ کے قائل ہو تو کیا تم کو غیب پر کسی واسطہ سے اطلاع دی گئی ہے جیسا کہ ہمارے نبی کو اثبات قیامت اور تمہاری اچھی حالت کی نفی کی خبر غیبی بواسطہ وحی پہنچ گئی ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھ کر اوروں کو پہنچا رہے ہیں، آگے رسالت کے متعلق ایک اور کلام ہے وہ یہ کہ) کیا یہ لوگ (صاحب رسالت کے ساتھ) کچھ برائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (جس کا بیان دوسری آیت میں ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ) سو یہ کافر خود ہی (اس برائی کے) وبال میں گرفتار ہوں گے (چنانچہ اس قصد میں ناکام ہوئے، اور بدر میں مقتول ہوئے، آگے پھر توحید کے متعلق کلام ہے کہ) کیا ان کا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے، اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے (اور آگے پھر رسالت کے متعلق ایک کلام ہے وہ یہ کہ یہ لوگ نفی رسالت کے لئے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کو اس وقت رسول جانیں جب ہم پر ایک آسمان کا ٹکڑا گرا دو، کما قال تعالیٰ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ اِلٰى قولہ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو دعویٰ پر خواہ وہ دعویٰ رسالت ہو یا اور کچھ مطلق دلیل کا بشرطیکہ صحیح ہو قائم کر دینا کافی ہے جو کہ دعویٰ رسالت کے وقت سے بلا کسی قدح وجرح کے قائم ہے اور کسی خاص دلیل کا قائم ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے دعویٰ نبوت میں قدح لازم آتی ہے، تبرعاً کوئی فرمائشی دلیل قائم کی جاوے تو یہ اس وقت ہے جب اس میں کوئی مصلحت ہو، مثلاً درخواست کنندہ طالب حق ہو، تو یہی سمجھا جاوے کہ غالباً اسی ذریعہ سے اس کو ہدایت ہو جاوے گی، اور کوئی معتدبہ حکمت ہو، اور یہاں یہ مصلحت بھی نہیں کیونکہ ان کی یہ فرمائش حق کے لئے نہیں بلکہ محض تعنت وعناد کی وجہ سے ہے، اور وہ ایسے ضدی ہیں کہ) اگر (ان کا یہ فرمائشی معجزہ واقع بھی ہو جاوے، اور) وہ آسمان کے ٹکڑے کو دیکھ (بھی) لیں کہ گرتا ہوا آرہا ہے تو (اس کو بھی) یوں کہہ دیں کہ یہ تو تہ بتہ جما ہوا بادل ہے (کقولہ تعالیٰ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ، پس جب مصلحت بھی نہیں ہے اور دوسری مصلحتوں کی نفی کو بھی ہم کو علم ہے بلکہ ان فرمائشی معجزات کا وقوع خلافِ حکمت ہے، پس جب ضرورت نہیں مصلحت نہیں بلکہ خلافِ مصلحت ہے، پھر کیوں واقع کیا جاوے اور نہ اس کے عدم وقوع سے نبوت کی نفی ہوتی ہے، آگے ان کے غلو فی الکفر پر جو اوپر کی آیتوں سے اور شدت عناد پر جو کہ آخر کی آیت سے معلوم ہوتا ہے بطور تفریع کے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ ایسے عناد و سرکشی میں ہیں تو ان سے
توقع ایمان کر کے ان کے پیچھے نہ پڑیے بلکہ ان کو اسی حالت پر رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے
سابقہ (واقع) ہو جس میں ان کے ہوش اڑ جاویں گے، مراد قیامت کا دن ہے اور اس صعق کی تفسیر سورۃ زمر
کی آخری آیت وَنُفِخَ ... کی تفسیر میں گذری ہے اور یعنی حتی کی تحقیق سورۃ زخرف کے آخر میں حَتّٰی یُلٰقُوْا
کے ذیل میں گذری ہے آگے اس دن کا بیان ہے یعنی جس دن ان کی تدبیریں، جو دنیا میں اسلام کی مخالفت اور اپنی
کامیابی کے بارے میں کیا کرتے تھے) ان کے کچھ بھی کام نہ آویں گی اور نہ کہیں سے ان کو مدد ملے گی (نہ خالق و مخلوق
کی طرف سے کہ اس کا امکان ہی نہیں اور نہ مخلوق کی طرف سے کہ اس کا وقوع نہیں، غرض اس روز ان کو حقیقت
معلوم ہو جاوے گی، باقی اس سے پہلے ایمان لانے والے نہیں) اور (آخرت میں تو یہ مصیبت ان پر آوے ہی گی
لیکن) ان ظالموں کے لئے قبل اس عذاب کے بھی عذاب ہونے والا ہے، یعنی دنیا میں جیسے قحط اور غزوہ بدر
میں قتل ہونا) لیکن ان میں اکثر کو معلوم نہیں (اکثر شاید اس لئے فرمایا ہو کہ بعضوں کے لئے ایمان مقدر تھا اور
ان کا عدم علم بوجہ اس کے کہ علم سے مبدل ہونے والا تھا، اس لئے وہ عدم علم نہیں قرار دیا گیا، اور (جب
آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہم نے ان کی سزا کے لئے ایک وقت معین کر رکھا ہے تو) آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے
بیٹھے رہئے (اور ان لوگوں کیلئے انتقام میں جلدی نہ کیجئے، جس کو آپ مسلمانوں کی خواہش اور اپنی امداد کی حیثیت سے چاہتے تھے، اور نہ اس
خیال سے انتقام میں جلدی کیجئے کہ یہ لوگ مدت مہلت میں آپ کو کوئی ضرر پہنچا سکیں گے سو اس کا بھی اندیشہ نہ کیجئے کیونکہ) آپ ہماری حفاظت
میں ہیں (ہم کا ہرگز ڈر نہیں چنانچہ یونہی واقع ہوا) اور (اگر آپ کے کفر کا غم دل پر آوے تو اس کا علاج یہ ہے کہ توجہ الی اللہ رکھیے، مثلاً
یہ کہ) اٹھتے وقت (یعنی مجلس سے یا سونے سے اٹھتے وقت، مثلاً تہجد میں) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے
اور رات (کے کسی حصہ) میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (مثلاً عشاء کے وقت) اور ستاروں (کے غروب ہونے)
سے پیچھے بھی (مثلاً نماز صبح اور مطلق ذکر بھی اس میں آ گیا اور تخصیص ان اوقات کی بوجہ خاص اہتمام کے لئے
ہے، حاصل یہ کہ اپنے دل کو ادھر مشغول رکھئے پھر فکر و غم کا غلبہ نہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

وَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا، دشمنوں کی دشمنی اور مخالفت و تکذیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے
کے لئے آخر سورت میں پہلے تو یہ فرمایا کہ "آپ ہماری نظروں میں ہیں" یعنی ہماری حفاظت میں ہیں ہم آپ کو
ان کے ہر شر سے بچائیں گے آپ ان کی کسی بات کی پروا نہ کریں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں ارشاد ہے
وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ، اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرما دیں گے۔
اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں لگ جانے کا حکم فرمایا جو اصل مقصد زندگی بھی ہے، اور
ہر مصیبت سے بچنے کا اصلی علاج بھی فرمایا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ، یعنی اللہ کی حمد کی

تسبیح کیا کریں جبکہ آپ کھڑے ہوں، کھڑے ہونے سے مراد سو کر اٹھنا بھی ہو سکتا ہے، ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمدؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص رات کو بیدار ہو اور اس نے یہ کلمات پڑھے تو جو دعا کرے گا قبول کی جائے گی، وہ کلمات یہ ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. پھر اگر اس نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور وضو کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی (ابن کثیر)

کفارۂ مجلس | اور حضرت مجاہد اور ابو الاحوص وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ حِيْنَ تَقُوْمُ سے مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی کسی مجلس سے اٹھے تو یہ کہے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، حضرت عطا بن ابی رباح نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جب تم اپنی مجلس سے اٹھو تو تسبیح و تحمید کرو، اگر تم نے اس مجلس میں کوئی نیک کام کیا ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی اور برکت حاصل ہوگی، اور اگر کوئی غلط کام کیا ہے تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے وہاں اچھی بری باتیں ہوں تو اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اگر وہ یہ کلمات پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سب خطاؤں کو جو اس مجلس میں ہوئی ہیں معاف فرما دیں گے، وہ کلمات یہ ہیں: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ. رواه الترمذی وهذا لفظه والنسائی فی الیوم واللیلة وقال الترمذی حدیث حسن صحیح (از ابن کثیر)

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ یعنی رات میں تسبیح کیجئے، اس میں نماز مغرب و عشاء بھی داخل ہے اور عام تسبیحات بھی۔ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ، یعنی ستاروں کے غائب ہونے کے بعد، مراد اس سے نماز فجر اور اس وقت کی تسبیحات ہیں (ابن کثیر)

تمت

سُوْرَةُ الطُّوْرِ بِحَمْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ عَصْرَ يَوْمِ
الْاَرْبِعَاءِ لِثَلٰثٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنْ رَّبِيْعِ الْاَوَّلِ ١٣٩١
وَاللّٰهُ الْمَسْئُوْلُ لِاِتْمَامِ الْبَاقِيْ بِعَوْنِهٖ وَحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ

سُوْرَةُ النَّجْمِ

سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ نجم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باسٹھ آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ② وَمَا يَنْطِقُ عَنِ

قسم ہے تارے کی جب گرے، بہکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا، اور نہیں بولتا اپنے نفس

الْهَوٰى ③ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ④ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ⑤ ذُوْ مِرَّةٍ ط

کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا، اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے، زور آور نے،

فَاسْتَوٰى ⑥ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ⑦ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ⑧ فَكَانَ قَابَ

پھر سیدھا بیٹھا اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا، پھر رہ گیا فرق

قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ⑨ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ⑩ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا

دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندہ پر جو بھیجا، جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو

رَاٰى ① اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ② وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ③ عِنْدَ

دیکھا، اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو اس نے دیکھا، اور اس کو اس نے دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی،

سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ⑭ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ⑮ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ

سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی، جب چھا رہا تھا اس بیری پر

پہونچی کہ کاہن ہونے کا احتمال ہو بلکہ فرشتہ کے ذریعہ سے آیا ہے اور شدید القویٰ کا ذکر فرمانے میں یہ مقصود ہو کہ اس کا احتمال بھی نہ رہ جائے کہ شاید اصل میں فرشتہ ہی سے گرفت ہو مگر درمیان میں کوئی شیطانی تصرف ہو گیا ہو، اس میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ وہ نہایت شدید القویٰ ہیں شیطان کی مجال نہیں کہ ان کے پاس پھٹک سکے، پھر ختم وحی کے بعد خود حق تعالیٰ نے اس کے بعینہ یاد کرانے کا وعدہ فرمایا ہے، اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ آگے ایک شبہ کا جواب ہے کہ اس وحی دینے والے کا فرشتہ اور جبرئیل ہونا اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب آپ ان کو پہچانتے ہوں اور پوری تحقیق پہچان موقوف ہے اصلی صورت میں دیکھنے پر تو کیا آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ ہاں یہ بھی ہوا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ چند بار تو دوسری صورت میں دیکھا) پھر ایک بار ایسا بھی ہوا کہ وہ فرشتہ اپنی اصلی صورت پر (آپ کے روبرو) نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ آسمان کے بلند کنارہ پر تھا، ایک روایت میں افق شرقی سے اس کی تفسیر آئی ہے کما فی الدر المنثور اور افق میں دکھلا دینے کی غالباً یہ حکمت ہے کہ وسط سماء میں دیکھنے میں اتنی مشقت و تکلیف نہیں اور افق میں غالباً یہ حکمت تھی کہ اس کی نیچے فوق بھی دور تک نظر نہیں آتی اس لئے ذرا اونچے پر نظر آئے اور اس دیکھنے کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے خواہش کی کہ مجھ کو اپنی اصلی صورت دکھلا دو، انہوں نے حراء کے پاس (حسب روایت ترمذی مقام جیاد میں) وعدہ ٹھہرایا، آپ وہاں تشریف لے گئے تو ان کو افق مشرق میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو ہیں اور اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ افق غربی تک گھیر رکھا ہے آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، اس وقت جبرئیل علیہ السلام بصورت بشر ہو کر آپ کے پاس تسکین کے لئے اتر آئے اس کا ذکر ہے کذا فی الجلالین، حاصل یہ کہ وہ فرشتہ اول صورت اصلیہ میں افق اعلیٰ پر نمودار ہوا، پھر (جب آپ بے ہوش ہو گئے تو) وہ فرشتہ آپ کے نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو (قرب کی وجہ سے) دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ (غایت قرب کی وجہ سے) اور بھی کم (فاصلہ رہ گیا، مطلب دو کمانوں کا یہ کہ عرب کی عادت تھی کہ جب دو شخص باہم نہایت درجہ کا اتفاق و اتحاد کرنا چاہتے تھے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں لے کر ان کے چلّے یعنی تانت کو باہم متصل کر دیتے، اور اس صفت میں بھی بعض اجزاء کے اعتبار سے کچھ فصل ضرور ہی رہتا ہے پس اس محاورہ کی وجہ سے یہ کنایہ ہو گیا قرب و اتحاد سے اور چونکہ یہ محض اتفاق صوری کی علامت تھی تو اگر روحانی و قلبی اتفاق بھی ہو تو وہاں اَوْ اَدْنٰی بھی صادق آسکتا ہے، پس اَوْ اَدْنٰی کے بڑھا دینے میں اشارہ ہو گیا کہ مجاورت صوریہ کے علاوہ آپ میں اور جبرئیل علیہ السلام میں روحانی مناسبت بھی تھی جو مدار ہے علم و معرفت تامہ اور حفظ صورت کا غرض یہ کہ ان کی تسکین سے آپ کو تسکین ہوئی اور افاقہ ہوا) پھر (افاقہ کے بعد) اللہ تعالیٰ نے (اس فرشتہ کے ذریعہ سے) اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی (جس کی تعیین بالتخصیص معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہونے کی حاجت اور باوجودیکہ اصل مقصود اس وقت وحی نازل کرنا نہیں بلکہ جبرئیل کو ان کی اصلی صورت

یہاں سے جو اعمال صعود کرتے ہیں وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچتے ہیں پھر وہاں سے اوپر اٹھا لئے جاتے ہیں، دنیا میں اس کی نظیر ڈاکخانہ کی سی ہے کہ آمد و برآمد خطوط وہیں سے ہوتی ہے، اور عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى میں تو مکانِ رویت بتلایا تھا، آگے اس مکان کا شرف بتلاتے ہیں کہ اس (سدرۃ المنتہیٰ) کے قریب جنت الماویٰ ہے (ماویٰ کے معنی رہنے کی جگہ، چونکہ جنت نیک بندوں کے رہنے کی جگہ ہے اس لئے جنت الماویٰ کہتے ہیں، حاصل یہ کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ ایک ممتاز موقع ہے) اب بعد تعیین مکانِ رویت کے رویت کا زمانہ بتلاتے ہیں کہ رویت کب ہوئی، پس فرماتے ہیں کہ جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں (ایک روایت میں ہے کہ سونے کے پروانے تھے، یعنی صورت پروانہ کی سی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ وہ فرشتے تھے، یعنی حقیقت اُن کی یہ تھی، اور ایک روایت میں ہے کہ ملائکہ نے حق تعالیٰ سے اجازت چاہی تھی کہ ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں ان کو اجازت ہوگئی وہ اس سدرہ پر جمع ہوگئے تھے، کذا فی الروح والدر المنثور، اس میں بھی اشارہ ہو سکتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز و مکرم ہونے کی طرف اور بناء وہی تقریر ہے جو تفسیر سابق میں بیان کی گئی، اب ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے پوری طرح ادراک پر قدرت نہیں رہتی پس اس صورت میں جبرئیل علیہ السلام کی صورت کا کیا ادراک ہوگا جب یہ ادراک شانی معتبر نہ ہو تو پھر اس خدشہ مذکورہ کا جو جواب لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى سے دیا گیا ہے وہ کافی نہ ہو، اس احتمال کے رفع کے لئے فرماتے ہیں کہ آپ ان عجائب کو دیکھ کر ذرا نہیں چکرائے اور نہ ... لیکن تیز نہیں ہوئے جن چیزوں کی رویت کا حکم تھا ان کی طرف نظر کرنے سے آپ کی نگاہ نہ تو ہٹی، پس ان چیزوں کو خوب دیکھا اور جن چیزوں کے دیکھنے کا حکم جب تک نہ ہوا ان کی طرف دیکھنے کو آپ کی نگاہ بڑھی یعنی قبل اذن نہیں دیکھا، کذا فی مدارک فی الفرق بین زاغ و طغیٰ، یہ دلیل ہے آپ کے نہایت استقلال کی، کیونکہ عجیب چیزوں میں آدمی یہی دو حرکتیں کیا کرتا ہے جن چیزوں کے دیکھنے کو کہا جاتا ہے ان کو تو دیکھتا نہیں اور جن کے لئے نہیں کہا گیا ان کو تکتا ہے، غرض اس میں اضطراب نہیں رہتا، آگے آپ کے استقلال کی قوت بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ) انھوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے پروردگار کی قدرت کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے (مگر ہر چیز کے دیکھنے میں آپ کی یہی شان رہی کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، وہ عجائبات احادیثِ معراج میں آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا ارواح کو دیکھنا جنت وغیرہ کو دیکھنا، پس ثابت ہوا کہ آپ میں غایت استقلال ہے، پس متحیر ہو جانے کا احتمال نہیں پس خدشہ کا جو جواب لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں مذکور تھا وہ سالم رہا، غرض تمام تر تقریر سے رویت و معرفت جبرئیل علیہ السلام کے متعلق شبہ مندفع ہو کر رسالت ثابت و متحقق ہوگئی جو کہ مقصودِ مقام تھا)

معارف ومسائل

سورۂ نجم کی خصوصیات: سورۂ نجم پہلی سورت ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اعلان فرمایا (رواہ عبداللہ بن مسعودؓ قرطبی) اور یہی سب سے پہلی سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ تلاوت کیا، اور اس سجدہ میں ایک عجیب صورت یہ پیش آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت مجمع عام میں تلاوت فرمائی جس میں مسلمان اور کفار سب شریک تھے جب آپ نے آیت سجدہ پر سجدہ کیا تو مسلمانوں نے تو آپ کے اتباع میں سجدہ کرنا ہی تھا، سب نے سجدہ کیا، تعجب کی چیز یہ پیش آئی کہ جتنے کفار و مشرکین موجود تھے وہ بھی سب سجدہ میں گر گئے، صرف ایک متکبر شخص جس کے نام میں اختلاف ہے ایسا رہا جس نے سجدہ نہیں کیا، مگر زمین سے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر پیشانی سے لگائی اور کہنے لگا کہ بس یہی کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو کفر کی حالت میں مرا ہوا دیکھا ہے (رواہ بخاری و مسلم و اصحاب السنن، ابن کثیر ملخصاً)

اس سورت کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول برحق ہونے اور آپ پر نازل ہونے والی وحی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہونے کا بیان ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، لفظ نجم ستارے کے معنی میں آتا ہے، ہر ایک ستارے کو نجم اور جمع نجوم بولی جاتی ہے اور کبھی یہ لفظ خاص طور سے ثریا ستارے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو چند ستاروں کا مجموعہ ہے، اس آیت میں بھی بعض حضرات نے نجم کی تفسیر ثریا سے کی ہے، فراء اور حضرت حسن بصری نے پہلی تفسیر یعنی مطلق ستارے کو ترجیح دی ہے (قرطبی) اسی کو اوپر خلاصۂ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔

اِذَا هَوٰى لفظ ہَوٰی، ساقط ہونے اور گرنے کے معنی میں آتا ہے، ستارے کا گرنا اس کا غروب ہونا ہے، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا بالکل صحیح اور شکوک سے بالاتر ہونا بیان فرمایا ہے، سورۂ صافات میں مفصل گزر چکا ہے کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ خاص مصالح اور حکمتوں کے لئے اپنی خاص خاص مخلوقات کی قسم کھاتے ہیں دوسروں کو اس کی اجازت نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائے، یہاں حق تعالیٰ نے ستاروں کی قسم کھائی جس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ستارے اندھیری رات میں سمتیں اور راستے بتانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان سے سمت مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے، ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ کے راستے کی طرف ہدایت ہوتی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، یہ جواب قسم ہے یعنی وہ مضمون ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ صراط مستقیم

اور مراد اس مقصود یعنی رضائے حق کا صحیح راستہ ہے، نہ آپ راستہ بھولے ہیں اور نہ غلط راستہ پر چلے ہیں۔
آنحضرت ﷺ کو لفظ صاحبکم اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لے کر یا لفظ رسول و نبی ذکر کرنے کے بجائے
سے تعبیر کرنے کی حکمت آپ کی ذات کو لفظ صاحبکم سے تعبیر کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے نہیں آئے، کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں جن کے صدق و کذب میں تمہیں شبہ رہے بلکہ وہ تمہارے ہر وقت کے ساتھی ہیں، تمہارے وطن میں پیدا ہوئے یہیں بچپن گذرا، یہیں جوان ہوئے ان کی زندگی کا کوئی گوشہ تم سے مخفی نہیں، اور تم نے تجربہ کر لیا ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی غلط یا برے کام میں تم نے ان کو بچپن میں بھی نہیں دیکھا، ان کے اخلاق و عادات، ان کی امانت و دیانت پر تم سب کو اتنا اعتماد تھا کہ سب تم ہی آپ کو امین کہا کرتے تھے، اب دعوائے نبوت کے وقت تم ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنے لگے جس نے انسانوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو غضب ہے کہ اس پر یہ الزام لگانے لگے کہ اس نے خدا تعالیٰ کے معاملے میں جھوٹ بولا ہے اس لئے آگے فرمایا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں، بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے وحی کیا ہوا ہوتا ہے، وحی کی بہت سی قسمیں احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ان میں ایک قسم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، جس کا نام قرآن ہے، دوسری وہ کہ صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کو اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں، اس کا نام حدیث اور سنت ہے، پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملہ کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے، کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے جس سے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے نکالتے اور بیان کرتے ہیں، اس اجتہاد میں اس کا امکان ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو احکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں ان میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے وہ اپنے غلط اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے، بخلاف دوسرے علماء مجتہدین کے کہ ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان کی یہ خطا بھی عند اللہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ دین کے سمجھنے میں جو اپنی پوری توانائی وہ خرچ کرتے ہیں اس پر بھی ان کو ایک ثواب ملتا ہے (کما فی الاحادیث الصحیحۃ المعروفۃ)

اس تقریر سے آیت مذکورہ پر اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب وحی من اللہ ہوتا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ نہ فرماتے، حالانکہ احادیث صحیحہ میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں کہ شروع میں آپ نے کوئی حکم دیا پھر بذریعہ

الَّتِیْ خُلِقَ عَلَیْھَا اِلَّا مَرَّتَیْنِ رَاٰہُ ... منھبطًا مِّنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ سَادًّا عِظَمُ خَلْقِہٖ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث الشعبی (ابن کثیر)

اس آیت کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ جس کے دیکھنے کا آیت میں ذکر ہے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، آیت مذکورہ میں جس رؤیت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جبرئیل امین کو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہوئے دیکھا کہ ان کے جثہ نے زمین آسمان کے درمیان کی فضا کو بھر دیا تھا۔"

صحیح مسلم میں بھی یہ روایت تقریباً انہی الفاظ سے منقول ہے، اور فتح الباری کتاب التفسیر میں حافظ نے ابن مردویہ سے بھی روایت اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے جس میں صدیقہؓ کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَا اَوَّلُ مَنْ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ھٰذَا، فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ؟ فَقَالَ لَا اِنَّمَا رَاَیْتُ جِبْرَئِیْلَ مُنْھَبِطًا (فتح الباری، ص ۴۹۳ ج ۸)

"یعنی صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس آیت کے متعلق سب سے پہلے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے جبرئیلؑ کو اترتے ہوئے دیکھا ہے۔"

اور صحیح بخاری میں شیبانی سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت زرؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا (فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی) انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آیت (مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی) کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو دیکھا اس حالت میں کہ وہ رفرف کے لباس میں تھے، اور زمین و آسمان کی درمیانی فضا کو ان کے وجود نے بھر رکھا تھا۔

ابن کثیر کی تحقیق یہ سب روایات حدیث ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ سورۃ نجم کی آیات مذکورہ میں رؤیت اور قرب سے مراد جبرئیلؑ کی رؤیت اور قرب ہے، یہ قول صحابہ کرام میں سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے، اسی لئے ابن کثیر نے آیات مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:-

"ان آیات میں جس رؤیت اور قرب کا ذکر ہے وہ رؤیت و قرب جبرئیل امین کی مراد ہے جبکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا، پھر دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے قریب دیکھا، اور یہ پہلی رؤیت نبوت کے بالکل

ابتدائی زمانہ میں ہوئی، جبکہ جبرئیل علیہ السلام پہلی مرتبہ سورہ اقرأ کی ابتدائی آیتوں کی وحی لے کر آئے، اس کے بعد وحی میں فترت یعنی وقفہ پیش آیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم اور تکلیف تھی، بار بار یہ خیال دل میں آتے کہ پہاڑ سے گر کر جان دیدیں، مگر جب کبھی ایسی صورت ہوتی تو جبرئیل امین غائبانہ ہوتے آواز دیتے کہ اے محمد آپ اللہ کے رسول برحق ہیں اور میں جبرئیل ہوں، ان کی آواز سے آپ کا دل ٹھیر جاتا اور سکون ہوجاتا تھا، جب کبھی ایسا خیال آتا تو جبرئیل نے اس آواز کے ذریعہ تسلی دی مگر یہ تسلیاں غائبانہ تھیں، یہاں تک کہ ایک روز جبرئیل امین بطحاء مکہ کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ ان کے چھ سو بازو تھے اور پورے افق کو گھیر رکھا تھا، پھر جبرئیل امین آپ کے قریب آئے اور آپ کو وحی الٰہی پہونچائی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرئیل امین کی عظمت اور اللہ کے نزدیک جلالت قدر کی حقیقت روشن ہوئی، (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابن کثیر نے خود تفسیر مرفوع اور صحابہ کرام کے اقوال کی بناء پر سورۂ نجم کی آیات مذکورہ کی تفسیر یہی قرار دی ہے کہ اس میں رویت اور قرب جبرئیل کا مراد ہے، اور یہ پہلی رویت ہے جو اسی عالم میں مکہ مکرمہ کے افق پر ہوئی، بعض روایات میں اس رویت کی یہ تفصیل آئی ہے کہ جبرئیل امین کو پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہوگئی، تو پھر جبرئیل امین آدمی کی صورت میں آپ کے قریب آئے اور بہت قریب آگئے۔

دوسری رویت کا تذکرہ آگے سورۂ نجم ہی کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں آ رہا ہے، جو شب معراج میں ہوئی، مذکور الصدر وجوہ کی بناء پر عام مفسرین حضرات نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، ابن کثیر کا مضمون تو ابھی اوپر گذرا ہے، قرطبی، ابوحیان، امام رازی وغیرہ عموماً اسی تفسیر کو ترجیح دے رہے ہیں، سیدی حضرت حکیم الامت نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر کے عنوان میں بیان ہوچکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں حق تعالیٰ کی رویت کا ذکر نہیں ہے بلکہ رویت جبرئیل علیہ السلام مذکور ہے، نووی نے شرح مسلم میں اور حافظ نے فتح الباری میں بھی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، مرہ کے معنی قوت کے ہیں یہ بھی جبرئیل امین کی دوسری صفت قوت و طاقت کی زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ وحی لانے والے فرشتے کے کام میں کوئی شیطان دخیل ہوسکتا ہے، کیونکہ جبرئیل امین اتنے قوی ہیں کہ شیطان ان کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اور فاستوٰی کے معنی "برابر ہوگئے" مراد یہ ہے کہ اول جب جبرئیل امین کو دیکھا تو وہ آسمان سے اتر رہے تھے، اترنے کے بعد افق بلند پر مستوی ہو کر بیٹھ گئے، افق کے ساتھ اعلیٰ کی قید میں یہ حکمت ہے کہ افق کا وہ حصہ جو زمین کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے وہ عموماً نظروں سے مخفی رہتا ہے اس لئے افق بلند پر جبرئیل امین کو دکھلایا گیا،

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، دنا کے معنی "قریب ہوگیا" اور تدلّٰی کے لفظی معنی "لٹک گیا" مراد جھک کر قریب ہوجانا ہے۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى، قاب کمان کی لکڑی جہاں دستہ پکڑنے کا ہوتا ہے اور اس کے مقابل کمان کی ڈور بندھی ہوتی ہے، ان دونوں کے درمیانی فاصلہ کو قاب کہا جاتا ہے جس کا اندازہ تقریباً ایک ہاتھ سے کیا جاتا ہے، قاب قوسین یعنی دو کمانوں کا قاب فرمانے کی وجہ عرب کی ایک خاص عادت ہے کہ دو آدمی اگر آپس میں معاہدہ صلح اور دوستی کا کرنا چاہتے تو جیسے اس کی ایک علامت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی معروف و مشہور ہے، اسی طرح دوسری علامت جس سے دوستی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا یہ تھی کہ دونوں شخص اپنی اپنی کمان کی لکڑی تو اپنی طرف کرلیتے اور کمان کی ڈور دوسرے کی طرف، اس طرح جب دونوں کمانوں کی ڈوریں آپس میں مل جاتیں تو باہمی قرب و دوستی کا اعلان سمجھا جاتا تھا، اس قرب کے وقت ان دونوں شخصوں کے درمیان دونوں قوسوں کے قاب کا فاصلہ رہتا تھا، یعنی تقریباً دو ہاتھ یا ایک گز، اس کے بعد اَوْ اَدْنٰی کہہ کر یہ بھی بتلا دیا کہ یہ قرب و اتصال عام رسمی اتصال کی طرح نہیں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھا۔

آیت مذکورہ میں جبرئیل کا بغایت قریب ہوجانا اس لئے بیان فرمایا گیا کہ یہ ثابت ہوجائے کہ جو وحی انہوں نے پہنچائی ہے اس کے سننے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور یہ کہ اس قرب و اتصال کی وجہ سے یہ بھی احتمال نہیں رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل امین کو نہ پہچانیں اور کوئی شیطان مداخلت کرسکے۔

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى، اوحٰی کی ضمیر فاعل حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور عبدہ کی ضمیر بھی، معنی یہ ہیں کہ جبرئیل امین کے معلم کی حیثیت میں رسول اللہ صلی اللہ کے بالکل قریب ہونے کے بعد حق تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی نازل فرمائی۔

ایک علمی اشکال: یہاں چونکہ ظاہری شکل میں ایک علمی اشکال یہ محسوس ہوتا ہے کہ اوپر کی آیات میں ضمیریں جمہور مفسرین و ائمہ کا مذہب ہے محدثین نے جبرئیل امین کی طرف راجع کی ہیں فَاسْتَوٰی سے لیکر فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى تک سب ضمیریں جبرئیل ہی کی طرف راجع ہیں، اور اگلی آیت میں بھی بقول جمہور مفسرین جبرئیل علیہ السلام ہی کا ذکر ہے، تو صرف اس آیت میں اوحٰی اور عبدہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کرنا نظم و نسق عبارت کے خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

اس کا جواب سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ نے یہ دیا ہے کہ نہ یہاں نظم کلام میں کوئی اختلال ہے نہ انتشار ضمائر، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سورۂ نجم کی شروع آیت میں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کا ذکر فرما کر جس مضمون کی ابتداء کی گئی ہے اسی کا بہ نہایت منضبط بیان اس طرح کیا گیا کہ وحی بھیجنے والا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں مگر اس وحی کو پہنچانے میں ایک واسطہ جبرئیل کا تھا، چند آیات میں اس واسطہ کی توثیق پوری طرح کرنے کے بعد پھر اصل کی طرف رجوع کر کے فاوحی فرمایا تو یہ ابتدائی کلام کا تکملہ ہے اور اس میں انتشار ضمیر اس لئے نہیں کہ سمجھنے کو اَوْحٰی اور عبدہ کی ضمیروں میں اس کے سوا کوئی احتمال ہی نہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہوں اس لئے یہ

مرجع پہلے سے متعین ہے، اور مَآ اَوْحٰی یعنی جو کچھ وحی فرمانا تھا، اس کو مبہم رکھ کر اس کی عظمت شان کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، صحیح بخاری باب بدء الوحی کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو وحی کی گئی وہ سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں، واللہ اعلم۔

اس پورے نظم کلام سے قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا ٹھیک کلام حق ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح حضرات محدثین احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل بیان کرتے ہیں، ان آیات میں حق تعالیٰ نے قرآن کی سند اس طرح بیان فرمادی کہ اس کا نازل کرنے والا خود حق تعالیٰ ہے، اور معلم و مبلغ جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں جبرئیل امینؑ ہیں، آیات مذکورہ میں جبرئیلؑ کی جلالت شان اور شدید القویٰ ہونا گویا اس واسطہ سند کی تعدیل ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى، فؤاد کے معنی قلب، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا، قلب نے بھی اس کے ادراک میں کوئی غلطی نہیں کی، اسی غلطی اور خطا کو آیت میں لفظ کذب سے تعبیر کیا گیا ہے، مطلب یہ ہوا کہ ادراک میں قلب نے جھوٹ نہیں بولا، یعنی غلطی اور خطا نہیں کی، اور لفظ مَا رَاٰى سے وہ چیز مراد ہے جو کچھ دیکھا، قرآن کے الفاظ نے یہ متعین نہیں کیا کہ کیا دیکھا، اس کی تفسیر میں صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر کے وہی دو قول ہیں جو اوپر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعض کے نزدیک خود حق تعالیٰ کو دیکھنا مراد ہے، یہ قول ابن عباسؓ کا ہے اور بعض کے نزدیک جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنا مراد ہے، اور یہ قول عائشہؓ و ابن مسعود و ابی ہریرۃ و ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہم کا ہے، اس تفسیر کے مطابق لفظ رَاٰى اپنے حقیقی معنی کے مطابق آنکھ سے دیکھنے کے لئے ہو گیا اور دیکھنے کے بعد ادراک و فہم جو قلب کا کام ہے وہ قلب کی طرف منسوب ہوا ہے، رویت کو مجازی طور پر رویت قلبیہ کے معنی میں لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی (ذکرہ القرطبی)۔

رہا یہ سوال کہ آیت میں ادراک کی نسبت قلب کی طرف کی ہے، حالانکہ مشہور حکماء کا قول ہے کہ ادراک کا تعلق عقل یا نفس ناطقہ سے ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و فہم کا اصل مرکز قلب ہے، اس لئے کبھی عقل کو بھی لفظ قلب سے تعبیر کر دیا ہے جیسے آیت لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ، میں قلب سے مراد عقل لی گئی ہے کیونکہ قلب مرکز عقل ہے، آیات قرآنیہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، یہاں بھی رَاٰهُ کی ضمیر میں وہی دو قول ہیں، حق تعالیٰ مراد ہیں یا جبرئیل امین، نَزْلَةً اُخْرٰى کے معنی دوسری مرتبہ کا نزول ہے، راجح تفسیر کے مطابق یہ نزول بھی جبرئیل امین کا ہے اور جیسا کہ پہلی رویت کا مقام قرآن کریم نے اسی عالم دنیا میں مکہ مکرمہ میں افق اعلیٰ بتلایا تھا، اسی طرح اس دوسری رویت کا مقام ساتویں آسمان میں سدرۃ المنتہیٰ بتلایا، اور یہ ظاہر ہے کہ ساتویں آسمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا شب معراج میں ہوا ہے، اس سے اس

دوسری روایت کا وقت بھی تحقیق متعین ہو جاتا ہے، سدرہ لغت میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں اور منتہیٰ کے
معنی انتہا کی جگہ۔ ساتویں آسمان پر عرش رحمٰن کے نیچے یہ بیری کا درخت ہے، مسلم کی روایت میں اس کو چھٹے آسمان پر
بتلایا ہے، اور دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر اور شاخیں ساتویں آسمان
پر پھیلی ہوئی ہیں (قرطبی) اور عام فرشتوں کی رسائی کی یہ آخری حد ہے، اسی لئے اس کو منتہیٰ کہتے ہیں، بعض روایات
میں ہے کہ احکام الٰہیہ اول عرش رحمٰن سے سدرۃ المنتہیٰ پر نازل ہوتے ہیں، یہاں سے متعلقہ فرشتوں کے سپرد
ہوتے ہیں، اور زمین سے آسمان پر جانے والے اعمال نامے وغیرہ بھی فرشتے یہیں تک پہونچاتے ہیں، وہاں سے
حق تعالیٰ کے سامنے پیشی کی اور کوئی صورت ہوتی ہے، مسند احمد میں یہ مضمون حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول
ہے (ابن کثیر)

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى، ماویٰ کے معنی ٹھکانہ اور آرام کی جگہ، جنت کو ماویٰ اس لئے فرمایا کہ انسان کا اصل
ٹھکانہ اور مقام یہی ہے، یہیں آدم و حوا علیہما السلام کی تخلیق ہوئی ہے یہیں سے اُن کو زمین پر اُتارا گیا، اور
پھر یہیں اہل جنت کا مقام ہوگا۔

جنت و دوزخ کا موجودہ مقام: اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جنت اس وقت بھی موجود ہے، جیسا کہ جمہور امت کا عقیدہ یہی ہے
کہ جنت و دوزخ قیامت کے بعد پیدا نہیں کی جائیں گی، یہ دونوں مقام اس وقت بھی
موجود ہیں۔ اس آیت نے جنت کا محل وقوع بھی بتلا دیا کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر عرش رحمٰن کے نیچے
ہے، گویا ساتواں آسمان جنت کی زمین اور عرش رحمٰن اس کی چھت ہے، دوزخ کا محل وقوع کسی آیت
قرآن یا روایتِ حدیث میں صراحۃً نہیں بتلایا، سورۂ طور کی آیت وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ سے بعض مفسرین نے
یہ مفہوم نکالا ہے کہ دوزخ سمندروں کے نیچے زمین کے قعر میں ہے جس پر اس وقت کوئی بھاری اور سخت غلاف
چڑھا ہوا ہے، جو قیامت میں پھٹ جائے گا، اور اس کی آگ پھیل کر پورے سمندر کو آگ میں تبدیل کر دیگی۔

زمانہ حال میں یورپ کے بہت سے ماہرین نے جو زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا
راستہ بنانے کی کوشش سالہا سال جاری رکھی، اور بڑی سے بڑی مشینیں اس کام کے لئے ایجاد کیں، مختلف
جماعتوں نے اس پر محنت خرچ کی سب سے زیادہ جو جماعت کامیاب ہوئی وہ مشینوں کے ذریعہ زمین کی
گہرائی میں چھ میل تک پہونچ سکی، مگر چھ میل کے بعد سخت پتھر نے ان کو عاجز کر دیا، تو پھر دوسری جگہ سے
کھدائی شروع کی، مگر وہاں بھی چھ میل کے بعد سخت پتھر سے سابقہ پڑا، متعدد جگہوں میں اس کا تجربہ کرنے کے بعد
ان کی تحقیق یہ قرار پائی کہ چھ میل کی گہرائی کے بعد کوئی غلاف حجری پوری زمین پر چڑھا ہوا ہے، جس میں کوئی مشین
کام نہیں کر سکتی، زمین کا قطر جو ہزاروں میل کا ہے اس میں سے سائنس کے اس عروج کے زمانہ میں سائنس کی
رسائی صرف چھ میل تک ہو سکی آگے غلاف حجری کا اقرار کر کے ہی کوشش چھوڑنا پڑی، اس واقعہ سے بھی
اس کی تائید ہوتی ہے کہ زمین پوری کسی غلافِ حجری سے بند کی ہوئی ہے، مگر کسی روایتِ صحیحہ سے جہنم کا محل

وقوع اس خلاف کے نہ ہونا ثابت ہو جاوے تو کچھ بعید نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى، یعنی جبکہ ڈھانپ لیا تھا سدرہ کو ڈھانپنے والی چیز نے، صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت ہے کہ اس وقت سدرۃ المنتہیٰ پر سونے کے بنے ہوئے پروانے ہر طرف گر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روز سدرۃ المنتہیٰ کو خاص طور سے سجایا گیا تھا جس میں آنے والے مہمان حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز تھا۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى، زاغ زیغ سے مشتق ہے جس کے معنی ٹیڑھا یا بے راہ ہو جانا، اور طغیٰ طغیان سے مشتق ہے جس کے معنی حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں مراد ان دونوں لفظوں سے یہ بیان کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اس میں نظر نے کوئی خطا یا غلطی نہیں کی، یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ بعض اوقات انسان کی نظر بھی خطا کر جاتی ہے خصوصاً جبکہ وہ کوئی عجیب غیر معمولی واقعہ دیکھ رہا ہو اس شبہ کے جواب میں قرآن کریم نے دو لفظ استعمال فرمائے، کیونکہ نظر کی غلطی دو وجہ سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ جس چیز کو دیکھنا چاہتا تھا نظر اس سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی، لفظ ما زاغ سے اس قسم کی غلطی کی نفی کر دی گئی ہے کہ آپ کی نظر کسی دوسری چیز پر نہیں بلکہ جس کو دیکھنا تھا ٹھیک اسی پر پڑی، دوسری وجہ نظر کی غلطی یہ ہو سکتی ہے کہ نظر پڑی تو اسی چیز پر جس کو دیکھنا مقصود تھا، مگر اس کے ساتھ وہ ادھر اُدھر کی دوسری چیزوں کو بھی دیکھتی رہی اس میں بھی بعض اوقات التباس ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس قسم کی غلطی کے ازالہ کے لئے وما طغیٰ فرمایا۔

جن حضرات نے آیات سابقہ کی تفسیر رویت جبرئیل علیہ السلام سے کی ہے، وہ اس آیت کا بھی یہی مفہوم قرار دیتے ہیں کہ جبرئیل امین کو دیکھنے میں آنکھ نے کوئی غلطی نہیں کی، اس تعیین کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ جبرئیل علیہ السلام واسطۂ وحی ہیں، اگر آپ ان کو صحیح طرح نہ دیکھیں اور نہ پہچانیں تو وحی شبہ سے خالی نہیں رہتی۔

اور جن حضرات نے آیات سابقہ کی تفسیر رویت حق سبحانہ سے کی ہے وہ یہاں بھی یہی فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سبحانہ کے دیدار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں نے کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ صحیح دیکھا، البتہ اس آیت نے اس بات کو اور مزید واضح کر دیا کہ یہ رویت بچشم سر ہوئی ہے، صرف دل کی رویت نہیں تھی۔

آیات مذکورہ کی تفسیر میں نمونۂ اسلاف محدثین حضرت استاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ ایک اور تحقیق مفید جو بر شبہ من زنہ من آیۃ من آیات اللہ، اور حجۃ اللہ فی الارض تھے، ان کے علوم بلاشبہ حافظ ابن حجر و ذہبی جیسے ائمہ حدیث کے علوم کا نمونہ تھے، اور مشکلات القرآن پر آپ کی ایک مستقل تصنیف نہایت دقیق علوم و معارف کا خزانہ ہے، سورۂ نجم کی آیات میں چونکہ صحابہ و تابعین سے لے کر

دوسری بات یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں بجز آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی سے لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی تک سب آیتیں واقعہ معراج سے متعلق ہیں۔

امور مذکورہ کے پیش نظر استاذ محترم حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے کہ:

قرآن کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق سورۂ نجم کی ابتدائی آیتوں میں دو واقعات کا ذکر فرمایا ہے، ایک واقعہ جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں اس وقت دیکھنے کا ہے جب کہ آپ فترت وحی کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں کسی جگہ جا رہے تھے اور یہ واقعہ اسراء و معراج سے پہلے کا ہے۔

دوسرا واقعہ شب معراج کا ہے جس میں جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھنے کے علاوہ دوسرے عجائب اور اللہ تعالیٰ کی آیات کبریٰ کا دیکھنا مذکور ہے، ان آیات کبریٰ میں خود حق تعالیٰ سبحانہ کی **زیارت و رویت کا شامل ہونا بھی محتمل ہے۔**

سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کا اصل مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی وحی میں شبہات نکالنے والوں کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ نے قسم کھا کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشاد امت کو دیتے ہیں، نہ ان میں کسی غیر اختیاری غلطی کا امکان ہے نہ اختیاری غلطی کا، اور یہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اپنی کسی نفسانی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے، پھر چونکہ یہ وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے بھیجی جاتی ہے وہ بحیثیت معلم و مبلغ وحی ہوتے ہیں اس لئے جبرئیل امین کی مخصوص صفات اور عظمت شان کا بیان کی آیات میں ذکر فرمایا، اس میں زیادہ تفصیل کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ مشرکین مکہ اسرافیل، میکائیل فرشتوں سے تو واقف تھے جبرئیل سے واقف نہ تھے، بہرحال جبرئیل امین کی صفت بیان کرنے کے بعد پھر اصل مضمون وحی کو بیان فرمایا فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی، یہاں تک یہ سب گیارہ آیتیں ہیں جن میں وحی و رسالت کی توثیق کے ضمن میں جبرئیل امین کی صفات کا ذکر ہے، اور غور کیا جائے تو یہ سب صفات جبرئیل امین پر بے تکلف صادق آتی ہیں، لیکن اگر ان کو حق تعالیٰ کی صفت قرار دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین نے کیا ہے تو تکلف و تاویلات سے خالی نہیں، مثلاً شَدِیْدُ الْقُوٰی، ذُوْ مِرَّةٍ، دَنٰی فَتَدَلّٰی، فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی، ان کلمات کو تاویل کے ساتھ تو حق تعالیٰ کے لئے کہا جا سکتا ہے مگر بے تاویل بے تکلف ان کا مصداق جبرئیل امین ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے ان ابتدائی آیات میں جس رویت اور قرب و اتصال کا ذکر ہے، وہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی رویت سے متعلق قرار دینا اقرب و اسلم معلوم ہوتا ہے،

اس کے بعد بارہویں آیت مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی، سے لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی تک جو یہ واقعہ اسراء و معراج کا بیان تو ہے، اس میں بھی جبرئیل امین کا دوبارہ بصورت اصلیہ دیکھنا اگرچہ مذکور ہے، مگر دوسری آیات کبریٰ کے ضمن میں سے جن میں رویت باری تعالیٰ کے شامل

ہونے کا احتمال بھی جو مؤید بالاحادیث صحیحہ و اقوال صحابہ و تابعین ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى کی تفسیر یہ ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ سے دیکھا آپ کے قلب مبارک نے اس کی تصدیق کی کہ صحیح دیکھا، اس تصدیق میں قلب مبارک نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اسی کو مَا كَذَبَ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس میں جو کچھ دیکھنے کے عجائب ہیں، ان میں جبرئیل امین کا دیکھنا بھی شامل ہے اور جو کچھ شب معراج میں آپ نے دیکھا وہ سب شامل ہے اور ان میں سب سے اہم خود حق تعالیٰ کی رویت و زیارت ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگلی آیت میں ارشاد ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى، جس میں مشرکین مکہ کو خطاب ہے کہ آپ نے جو کچھ دیکھا یا آئندہ دیکھیں گے وہ جھگڑا اور اختلاف کرنے یا شک شبہ میں پڑنے کی چیز نہیں عین حق و حقیقت ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا قَدْ رَاٰى بلکہ عَلٰى مَا يَرٰى بصیغہ مستقبل فرمایا، جس میں اگلی رویت جو شب معراج میں ہونے والی تھی اس کی طرف اشارہ اور اس کے بعد کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں اس کی تصریح ہے۔ اور اس آیت میں بھی دونوں رویتوں کا احتمال ہے، یعنی رویت جبرئیل علیہ السلام اور رویت حق تعالیٰ، جبرئیل علیہ السلام کی رویت تو ظاہر ہے، اور حق تعالیٰ کی رویت کی طرف اشارہ اس طرح پایا جاتا ہے کہ رویت کے لئے قرب عادۃً ضروری ہے، جیسا کہ حدیث میں حق تعالیٰ کا نزول سماء دنیا کی طرف آخر شب میں مذکور ہے۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت آپ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھے جو مقام قرب ہے حق تعالیٰ کے ساتھ اس وقت دیکھا، اس میں حق تعالیٰ کی زیارت بھی مراد ہونے پر یہ حدیث شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رَاَيْتُ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰى فَغَشِيَتْنِيْ ضَبَابَةٌ خَرَرْتُ لَهٗ سَاجِدًا وَهٰذِهِ الضَّبَابَةُ هِيَ الظُّلَلُ مِنَ الْغَمَامِ الَّتِيْ يَاْتِيْ فِيْهَا اللّٰهُ وَيَتَجَلّٰى،	میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچا تو مجھے بادل کی طرح کی کسی چیز نے گھیر لیا، میں اس کے لئے سجدہ میں گر پڑا، قیامت کے روز محشر میں تجلی کا ظہور قرآن کریم کی ایک آیت میں اسی طرح

مذکور ہے کہ بادلوں کے سایہ کی طرح کی کوئی چیز ہوگی اس میں حق تعالیٰ نزول اجلال فرمائیں گے۔

اسی طرح اگلی آیت مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى کا مفہوم بھی دونوں رویتوں کو شامل ہے، اور اس سے یہ مزید ثابت ہوا کہ یہ رویت حالت بیداری میں آنکھوں سے ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن آیات میں لیلۃ المعراج کا ذکر ہے ان میں رویت کے بارے میں جتنے الفاظ آئے ہیں ان سب میں رویت جبرئیل اور رویت حق سبحانہ دونوں محتمل ہیں، اور بعض حضرات نے ان کی تفسیر رویت حق تعالیٰ سے کی ہے، اس کی گنجائش الفاظ قرآن میں موجود ہے۔

رویتِ باری کا مسئلہ تمام صحابہ و تابعین اور جمہور امت اس پر متفق ہیں کہ آخرت میں اہل جنت

عام مومنین حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی رویت و زیارت کوئی محال نہیں، ممکن ہے، لیکن عالم دنیا میں انسانی نگاہ میں اتنی قوت نہیں جو اس کو برداشت کرسکے اس لئے دنیا میں کسی کو رویت و زیارت حق تعالیٰ کی نہیں ہوسکتی، آخرت کے معاملہ میں خود قرآن کریم کا ارشاد ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ، یعنی آخرت میں انسان کی نگاہ تیز اور قوی کردی جائیگی اور پردے ہٹا دیئے جائیں گے۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس کی نگاہ فانی ہے، اور اللہ تعالیٰ باقی ہے، جب آخرت میں انسان کو غیر فانی نگاہ عطا کردی جائے گی تو حق تعالیٰ کی رویت میں کوئی مانع نہ رہے گا، تقریباً یہی مضمون قاضی عیاض سے بھی منقول ہے، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تقریباً تصریح ہے جس کے الفاظ یہ ہیں وَاعْلَمُوْا اَنَّهُ لَنْ يَّرٰى اَحَدٌ مِّنْكُمْ رَبَّهٗ حَتّٰى يَمُوْتَ (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۸) اس سے ممکن تو اس کا بھی نکل آیا کہ عالم دنیا میں کسی وقت خصوصی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں وہ قوت بخش دی جائے جس سے وہ حق تعالیٰ کی زیارت کرسکیں لیکن اس عالم سے باہر بلکہ شب معراج میں آپ کو آسمانوں اور جنت اور دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی آیات قدرت کا مشاہدہ کرانے ہی کے لئے دنیوی حیثیت سے جدا کیا گیا، اس وقت تو حق تعالیٰ کی زیارت اس ضابطہ سے بھی مستثنیٰ ہے کہ اس وقت آپ اس عالم دنیا میں نہیں ہیں، ثبوت امکان کے بعد مسئلہ رہ گیا یہ کہ آیا وقوع ہوا یا نہیں، اس معاملہ میں روایات حدیث مختلف اور آیات قرآن محتمل ہیں اس لئے صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں یہ مسئلہ ہمیشہ زیر اختلاف ہی رہا، ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رویت حق سبحانہ و تعالیٰ کو ثابت فرماتے ہیں، اور سلف صالحین کی ایک جماعت نے ان کا اتباع کیا ہے، اور صحابہ و تابعین کی بہت سی جماعتوں نے اس سے اختلاف کیا ہے، آگے دونوں جماعتوں کے دلائل وغیرہ بیان کئے ہیں۔

اسی طرح حافظ نے فتح الباری تفسیر سورۂ نجم میں اس اختلاف صحابہ و تابعین کے ذکر کرنے کے بعد بعض اقوال ایسے بھی نقل کئے جن سے ان دونوں مختلف اقوال میں تطبیق ہوسکے، اور علامہ قرطبی نے مفہم میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ ہم اس معاملہ میں کوئی فیصلہ نہ کریں، بلکہ توقف اور سکوت اختیار کریں کیونکہ یہ مسئلہ کوئی عملی مسئلہ نہیں جس کے کسی ایک رُخ پر عمل کرنا ضروری ہو، بلکہ یہ مسئلہ عقیدہ کا ہے جس میں جب تک قطعی ثبوت دلائل نہ ہوں کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا، اور جب تک کسی امر پر قطعی ثبوت نہ معلوم ہو حکم ثبوت اور توقف کا ہے، (فتح الباری ص ۴۶۷ ج ۸) حقیر کے نزدیک یہی مسلم واحوط ہے، اس لئے اس مسئلہ کے دونوں طرف دلائل و وجوہات کو ذکر نہیں کیا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ

بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ کو، اور منات تیسرے پچھلے کو، کیا تم کو تو

الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ﴿٢١﴾ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴿٢٢﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ

بیٹے اور اس کو بیٹیاں، یہ بانٹ تو بہت بھونڈی، یہ سب نام ہیں جو

سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن

رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند، محض

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن

اٹکل پر چلتے ہیں اور جی کی امنگ پر، اور پہنچی ہے ان کو ان کے

رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴿٢٣﴾ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾

رب سے راہ کی سوجھ، کہیں آدمی کو ملتا ہے جو کچھ چاہے، سو اللہ کے ہاتھ ہے سب پہلا اور پچھلا

ع ۵ / ۲۵

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ

اور بہت فرشتے ہیں آسمانوں میں کچھ کام نہیں آتی ان کی سفارش مگر جب حکم

أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴿٢٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ

دے اللہ جس کے واسطے چاہے اور پسند کرے، جو لوگ یقین نہیں رکھتے آخرت کا

لَيُسَمُّونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَىٰ ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن

وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کے زنانے نام، اور ان کو اس کی کچھ خبر نہیں، محض

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾

اٹکل پر چلتے ہیں، اور اٹکل کچھ کام نہ آئے ٹھیک بات میں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مشرکو جب اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناطق بالحق و متبع بالوحی ہونا ثابت ہو گیا اور آپ اس وحی سے توحید کا حکم فرماتے ہیں جو کہ دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہے، اور تم پھر بھی بتوں کی پرستش کرتے ہو تو) بھلا تم نے کبھی ان بتوں کے مثلاً لات اور عزیٰ اور ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی

اولاد قرار دینا کفر ہے کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (جو بہ منزلہ انکار کی وجہ سے کافر ہیں) وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں (اور کفر کی تعبیر بکفر میں آخرت کی تخصیص سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ سب ضلالتیں آخرت کی بے فکری سے پیدا ہوئی ہیں، ورنہ معتقد آخرت کو اپنی نجات کی ضرور فکر رہتی ہے، اور یہاں اُنثیٰ بمعنے دختر کے ہیں، کما فی قولہ تعالیٰ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى اور جب ملائکہ کو خدا کے ساتھ شریک ٹھیرانے کے کفر ہونے کی تصریح فرمادی تو بتوں کے شریک ٹھیرانے کا کفر ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگیا اس لئے صرف اسی پر اکتفا کیا گیا آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کا عقیدہ باطل ہے) حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی وحی کے محفوظ ہونے کے دلائل کا تفصیلی ذکر تھا، ان آیات میں اس کے بالمقابل مشرکین عرب کے اس فعل کی مذمت ہے کہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے مختلف بتوں کو اپنا معبود و کارساز بنا رکھا ہے، اور فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ ان بتوں کو بھی وہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

مشرکین عرب کے بُت جن کی وہ پرستش کرتے تھے بے شمار ہیں، مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں اور اُن کی عبادت پر عرب کے بڑے بڑے قبائل لگے ہوئے تھے، لات، عُزّیٰ، مَنات، لات قبیلہ ثقیف (اہل طائف) کا بُت تھا، عزّیٰ قریش کا اور مَنات بنی ہلال کا، ان بتوں کے مقامات پر مشرکین نے بڑے بڑے شاندار مکانات بنا رکھے تھے، جن کو کعبہ کی حیثیت دیتے تھے، فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو منہدم کرادیا (قرطبی مخلصاً)

قِسْمَةٌ ضِيْزٰى، ضیز سے مشتق ہے، جس کے معنی ظلم کرنے اور حق تلفی کرنے کے ہیں اسی لئے ابن عباسؓ نے قسمۃ ضیزیٰ کے معنی ظالمانہ تقسیم کے کئے ہیں۔

ظن کے مختلف اقسام اور ان کے احکام

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا، لفظ ظن عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک معنی یہ بھی ہیں کہ بے بنیاد خیالات کو ظن کہا جاتا ہے، آیت میں یہی مراد ہے، اور یہی مشرکین مکہ کی بت پرستی کا سبب تھا، اس کے ازالہ کے لئے یہ فرمایا گیا ہے، دوسرے معنی ظن کے وہ ہیں جو یقین کے بالمقابل آتے ہیں، یقین کہا جاتا ہے اس علم قطعی مطابق للواقع کو جس میں کسی شک و شبہ کی راہ نہ ہو، جیسے قرآن کریم یا احادیث متواترہ سے حاصل شدہ علم، اس کے مقابل ظن اس علم کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد خیالات تو نہیں دلیل کی بنیاد پر قائم ہے، مگر یہ دلیل اس درجہ قطعی نہیں جس میں کوئی دوسرا

دنیوی زندگی کے اس کو کوئی اُخروی مطلب مقصود نہ ہو (جس کی وجہ عدم ایمان بالآخرۃ ہے جو لازم شئون بالآخرۃ سے اور بے فہمی ہوا کرتے اور) ان لوگوں کے فہم کی رسائی کی حد بس یہی دنیوی زندگی ہے (جب اُن کی بدفہمی اور بے فکری کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو اُن کی فکر نہ کیجئے اُن کا معاملہ اللہ کے حوالے کیجئے بس) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستے سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہے (اس سے تو اس کا علم ثابت ہوا اور آگے اس سے قدرت ثابت ہے کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے (اور جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے اور اس کے قوانین اور احکام پر عمل کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں گمراہ اور ہدایت پر عمل کرنے والے تو انجام یہ ہے کہ) بُرا کام کرنے والوں کو اُن کے بُرے کام کے عوض میں وہ (خاص طور کی) جزا دے گا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے عوض میں (خاص طور کی) جزا دے گا (اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسی کے حوالہ کیجئے آگے ان لوگوں کا بیان ہے جو نیکوکار محسنین ہیں) وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص) بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ (کبھی کبھی ہو جائیں تو ان نیکوکاری کا یہاں ذکر ہے اس میں اُن سے حرج نہیں اور استثناء کا یہ مطلب ہے کہ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا یعنی محسنین جن کی اس آیت میں مدح کی گئی ہے اور ان کے محبوب عند اللہ ہونے کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مصداق بننے کے لئے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو شرط ہے، لیکن صغائر کا کبھی کبھی صدور اس محبوبیت کے منافی نہیں، البتہ صغیرہ گناہوں میں بھی یہ شرط ہے کہ اُن کی عادت نہ ڈالے اور ان پر اصرار نہ کرے، کبھی اتفاقی طور پر ہو جائے، ورنہ اصرار اور عادت سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اور استثناء کا یہ مطلب نہیں کہ صغائر کی اجازت ہے اور کبائر سے اجتناب کی شرط کا یہ مطلب نہیں کہ محسنین کو ان کے نیک عمل کی جزا ملنا کبائر سے اجتناب پر موقوف ہے، کیونکہ مرتکب کبائر بھی جو حسنہ کرے گا اس کی جزا پاوے گا، لقولہ تعالیٰ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، پس یہ شرط جزا دینے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کو محسن اور محبوب عند اللہ کا لقب دینے کے اعتبار سے ہے جس پر عنوان اَحْسَنُوْا دلالت کرتا ہے خوب سمجھ لو اور اوپر جو بدکاروں کو سزا دینے کا بیان آیا اس سے گناہگاروں کو ناامید کرنے کا وہم ہو سکتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا کہ ایمان و توبہ سے ہمت ہار دیں اور محسنین کو جزائے حسنہ دینے کے وعدہ سے ان کے عجب و غرور میں مبتلا ہونے کا ایہام اور خطرہ تھا آگے ان دونوں ایہاموں کو رد کیا گیا ہے) بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے (گناہگاروں کو تدارکِ گناہ سے ہمت نہ ہار جانا چاہئے، وہ اگر چاہے تو بجز کفر و شرک کے اور سیئات کو محض فضل سے معاف کر دیتا ہے تو تدارک سے کیوں معاف نہ کرے گا، اور اسی طرح محسنین کو عُجب اور فخر نہ کرنا چاہئے، کیونکہ حسنات میں بعض وقت ایسے مخفی نقائص مل جاتے ہیں جس کے سبب وہ قابلِ قبول نہیں رہتے اور عامل کو اس طرف التفات نہ ہونے سے اُن کی اطلاع بھی نہیں ہوتی، اور حق تعالیٰ کو تو علم ہوتا ہے جب وہ حسنہ مقبول نہیں تو ان کا کرنے والا محسن اور محبوب نہیں،

بھی ابن کثیرؒ نے بروایت ابن جریر اور ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے، اور پھر ابن جریر کی دوسری روایات میں یہ
قول بواسطہ عطاء حضرت ابن عباسؓ سے اور بروایت حضرت حسن بصری حضرت ابوہریرہؓ سے بھی نقل کیا ہے، اور
اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نیک آدمی سے کبھی اتفاقاً کوئی گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی تو یہ شخص بھی صالحین و
متقین کی فہرست سے خارج نہیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی ایک آیت میں اسی مضمون کی تصریح آئی ہے، وہ یہ
ہے کہ متقین کی صفات بیان کرنے کے ذیل میں فرمایا وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (یعنی وہ لوگ بھی متقین ہی میں داخل ہیں جن سے کوئی فحش یعنی گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا یا وہ گناہ کر کے
اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تو فوراً ان کو اللہ کی یاد آئی اور اپنے گناہوں سے مغفرت مانگی اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف
بھی کون کر سکتا ہے اور جو گناہ ہو گیا تھا اس پر جمے نہیں رہے)۔ اور یہ بھی جمہور علماء سے روایت نقل کیا ہے کہ
جب صغیرہ گناہ پر اصرار کیا جائے اور اس کی عادت ڈال لی جائے تو وہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اس لئے خلاصۂ تفسیر مذکور
میں لمم کی تفسیر ان صغیرہ گناہوں سے کی گئی ہے جن پر اصرار نہ کیا گیا ہو۔

صغیرہ و کبیرہ گناہ کی تعریف اور مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ
عَنْهُ کی تفسیر میں معارف القرآن جلد دوم ص ۳۸۰ سے ۳۹۰ تک مکمل آ گیا ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ اجنۃ جنین کی جمع ہے، بچہ جب تک ماں
کے پیٹ میں ہے اس کو جنین کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ وہ خود
اپنی جان کا بھی اتنا علم نہیں رکھتا جتنا اس کے خالق کو ہے، کیونکہ ماں کے پیٹ میں جو تخلیق کے مختلف
دور اس پر گذرے ہیں اس وقت وہ کوئی علم و شعور ہی نہ رکھتا تھا، مگر اس کا بنانے والا خوب جانتا تھا جس کی حکمت
تخلیق اس کو بنا رہی تھی، اس میں انسان کو عجز و کم علمی پر متنبہ کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جو بھی کوئی اچھا و
نیک کام کرتا ہے وہ اس کا ذاتی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا انعام ہی ہے کہ کام کرنے کے لئے اعضاء
وجوارح اس نے بنائے، ان میں حرکت کی قوت اس نے بخشی، پھر دل میں نیک کام کرنے کا داعیہ اور پھر
اس پر عزم و عمل اسی کی توفیق سے ہوا تو کسی بڑے سے بڑے نیک صالح اور متقی و پرہیزگار انسان کو بھی
یہ حق نہیں پہونچتا کہ اپنے عمل پر فخر کرے، اور اس عمل کو اپنا کمال قرار دے کر غرور میں مبتلا ہو جائے، اس کے
علاوہ سب چیزوں کا مدار خاتمہ اور انجام پر ہے، ابھی اس کا علم نہیں کہ خاتمہ کس حال پر ہوتا ہے تو
فخر و غرور کرنا کس بات پر، اس ہدایت کو اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو، کیونکہ اس کو
صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون کیسا ہے اور کس درجہ کا ہے، کیونکہ مدار فضیلت تقویٰ پر ہے، ظاہری اعمال پر
نہیں، اور تقویٰ بھی وہ معتبر ہے جو موت تک قائم رہے۔

وَثَمُودَا فَمَآ أَبْقَىٰ ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَ

اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا اور نوح کی قوم کو پہلے اس سے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور

أَطْغَىٰ ﴿٥٢﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ﴿٥٣﴾ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ﴿٥٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ

شریر اور الٹی بستی کو پٹک دیا پھر آپڑا اس پر جو کچھ کہ آپڑا اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب

تَتَمَارَىٰ ﴿٥٥﴾ هَٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ ﴿٥٦﴾ أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ﴿٥٧﴾

کی جھٹلائے گا یہ ایک ڈر سنانے والا ہے پہلے ڈر سنانے والوں میں کا آپہنچی آنے والی

لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴿٥٩﴾

کوئی نہیں اس کو اللہ کے سوائے کھول کر دکھانے والا کیا تم کو اس بات سے تعجب ہوتا ہے

وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ﴿٦٠﴾ وَأَنتُمْ سَامِدُونَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ۩ ﴿٦٢﴾

اور ہنستے ہو اور روتے نہیں اور تم کھلاڑیاں کرتے ہو سو سجدہ کرو اللہ کے آگے اور بندگی

شانِ نزول | درمنثور میں بروایت ابن جریر یہ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص اسلام لے آیا تھا، اس کے کسی ساتھی نے اس کو ملامت کی کہ تو نے اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں وہ بولا کہ تو مجھے کچھ دیدے تو میں آخرت کا تیرا عذاب اپنے سر رکھ لوں گا، تو عذاب سے بچ جائے گا، چنانچہ اس نے کچھ دیدیا، اس نے اور مانگا تو کچھ کشمکش کے بعد کچھ اور بھی دیدیا، اور بقیہ کی دستاویز مع گواہوں کے لکھ دی، روح المعانی میں اس شخص کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے، جس کا اسلام کی طرف میلان ہوگیا تھا، اس کے دوست نے ملامت کی، اور عذاب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

خلاصۂ تفسیر

(آپ نے نیکوں کی صفت تو سن لی) تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے (دینِ حق سے) روگردانی کی (یعنی اسلام سے ہٹ گیا) اور تھوڑا مال دیا اور (پھر) بند کر دیا (یعنی جس شخص سے مال دینے کا وعدہ اپنے مطلب کے واسطے کیا تھا، وہ بھی پورا نہ دیا، اور اسی سے مفہوم ہوا کہ ایسا شخص دوسروں کی نفع رسانی کے لئے کیا خرچ کرے گا جب اپنے ہی مطلب کے لئے پورا خرچ نہ کر سکا، جس کا حاصل اس کا بخیل ہونا ہے) کیا اس شخص کے پاس (کسی صحیح ذریعہ سے) علم غیب ہے کہ اس کو دیکھ رہا ہے (جس کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا کہ فلاں شخص میری طرف سے میرے گناہوں کا عذاب اپنے سر لے کر مجھے عذاب سے بچا دے گا)

رد و انکار کر کے گنہگار ہو، ان مضامین کی تصدیق کر کے منتفع نہ ہوگا، یہ پیغمبر (بھی) اگلے پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں (ان کو مان لو کیونکہ) وہ جلدی آنے والی چیز قریب آپہنچی ہے، مراد قیامت ہے (اور جب وہ آوے گی تو) کوئی غیر اللہ اس کا ہٹانے والا نہیں (پس کسی کے بھروسہ بے فکری کی گنجائش ہی نہیں، سو کیا (ایسی خوف کی باتیں سن کر بھی) تم لوگ اس کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے ہو اور (استہزاءً) ہنستے ہو اور (خوفِ عذاب سے) روتے نہیں؟ اور تم (اطاعت سے) تکبر کرتے ہو سو (اس تکبر و غفلت سے باز آؤ اور حسب تعلیم ان پیغمبر کے) اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کی بلا شرکت) عبادت کرو (تاکہ تم کو نجات ہو)۔

معارف و مسائل

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى، تولّٰی کے لفظی معنی منہ پھیر لینے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے منہ پھیرے۔

وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى، اکدٰی، کُدیہ سے مشتق ہے، کُدیہ اس سخت پتھر کو کہا جاتا ہے جو کوئی کنواں یا بنیاد کھودتے ہوئے زمین میں نکل آوے اور کھدائی کے لئے رکاوٹ بن جاوے، اس لئے اکدٰی کے معنی یہ ہوئے کہ پہلے کچھ دیا پھر دینے سے رک گیا، آیت کے شان نزول میں جو ایک واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے مطابق تو معنی ظاہر ہیں، اور اس سے قطع نظر کی جاوے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جس نے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کیا پھر چھوڑ دیا، یا شروع میں کچھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف مائل ہوا، کچھ کرنے لگا پھر چھوڑ بیٹھا، اس لفظ کی یہ تفسیر حضرت مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے (ابن کثیر)

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى، شان نزول میں جو قصہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آخرت کا تیرا عذاب میں اپنے سر لے کر تجھ کو بچا دوں گا، اس احمق نے اس کا یقین کیسے کر لیا، کیا اس کو علم غیب حاصل ہے؟ جس سے وہ دیکھ رہا ہے کہ بے شک کسی صورت میں وہ جس عذاب کا مستحق ہوگا وہ عذاب یہ ساتھی اپنے سر لے لے گا اور مجھے بچا دے گا، جو ظاہر ہے کہ سراسر دھوکہ ہے نہ اس کو علم غیب ہے نہ کوئی دوسرا آدمی کسی کا عذاب آخرت اپنے سر لے کر اس کو بچا سکتا ہے، اور اگر اس قصہ سے قطع نظر کی جائے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کرتا رک گیا ہے اور خرچ کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ موجودہ مال خرچ کر دوں گا تو پھر کہاں سے آئے گا، اس خیال کی تردید میں فرمایا کہ کیا اس کو غیب کا علم ہے جس کے ذریعہ گویا وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ مال ختم ہو جائے گا اور اس کے بجائے دوسرا مال اس کو نہ مل سکے گا، یہ غلط ہے، کیونکہ نہ اس کو غیب کا علم ہے اور نہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ) یعنی تم جو کچھ خرچ کرتے ہو

اللہ تعالیٰ اس کا بدل تمہیں دیتے ہیں اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والے ہیں۔ اگر انسان غور کرے تو قرآن کا یہ ارشاد صرف مال اور پیسہ کے معاملہ میں نہیں بلکہ ہر قوت و توانائی جو وہ دنیا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدن میں اس کا بدل ما یتحلل پیدا کرتے رہتے ہیں ورنہ انسان کے بدن کا ایک ایک عضو اگر فولاد کا بھی بنا ہوتا تو ساٹھ ستر سال کام لینے سے کبھی کا گھس گھسا کر برابر ہو جاتا، جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کے تمام اعضاء میں جو کچھ محنت سے تحلیل ہو جاتا ہے خود کار مشین کی طرح اس کا بدل اندر سے پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح مال کا بھی حال یہی ہے کہ انسان خرچ کرتا رہتا ہے اس کا بدل آتا رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو فرمایا: اَنْفِقْ یَا بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا، یعنی اے بلال خرچ کرتے رہو اور عرش والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کمی کا خطرہ نہ رکھو کہ وہ تمہیں مفلس کر دے گا، (ابن کثیر)

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ، اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص صفت وفّیٰ بیان فرمائی گئی، وفا کے معنی کسی وعدے یا معاہدے کو پورا کر دینے کے آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی
خاص صفت ایفائے عہد کی | اطاعت کریں گے اور اس کا پیغام مخلوق کو پہنچا دیں گے، انھوں نے اس
کہ تھیں | معاہدہ کو ہر حیثیت سے پورا کر دکھایا جس میں ان کو بہت سخت آزمائشوں سے
بھی گذرنا پڑا، وفّیٰ کی یہی تفسیر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اختیار کی ہے۔

بعض روایات حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاص خاص اعمال کو لفظ وفّیٰ کا سبب بتایا گیا ہے وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ اصل ایفاء عہد عام ہے، تمام احکام الٰہیہ کی تعمیل و اطاعت جس میں اپنے اعمال بھی داخل ہیں، اور فرائض رسالت و نبوت کے ذریعہ عام خلق اللہ کی اصلاح بھی، انھیں اعمال میں یہ عمل بھی ہیں جن کا ذکر ان روایات حدیث میں ہے۔

مثلاً ابن ابی حاتم نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ اور پھر ان سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ وفّیٰ کا مطلب کیا ہے؟ ابوامامہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ان

وَفّٰى عَمَلَ يَوْمِهٖ بِاَرْبَعِ رَكَعَاتٍ فِىْ اَوَّلِ النَّهَارِ (ابن کثیر)	"یعنی انھوں نے اپنے دن کے عمل کی تکمیل اس طرح کر دی کہ شروع دن میں چار رکعت (نماز اشراق کی) پڑھ لیں"

اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ترمذی نے حضرت ابوذر سے روایت کی ہے کہ

نوحہ و بکا کا التزام کیا جائے (منقول) اس صورت میں اس پر عذاب خود اس کے اپنے عمل کا ہوا، دوسروں کے عمل کا نہیں۔

دوسرا حکم ہے وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى، اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح کوئی دوسرے کا عذاب اپنے سر نہیں لے سکتا اسی طرح کسی کو یہ بھی حق نہیں کہ کسی دوسرے کے عمل کے بدلے خود عمل کرلے اور وہ اس عمل سے سبکدوش ہوجائے مثلاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے نماز فرض ادا کرلے یا دوسرے کی طرف سے فرض روزہ رکھ لے اور وہ دوسرا اپنے فرض نماز و روزے سے سبکدوش ہوجائے، یا یہ کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے ایمان قبول کرلے اور اس سے اس کو مؤمن قرار دیا جائے۔

آیت مذکورہ کی اس تفسیر پر کوئی فقہی اشکال و شبہ نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ مسئلہ حج و زکوٰۃ کے مسائل میں یہ ہوسکتا ہے کہ ضرورت کے وقت مثلاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے یا دوسرے کی زکوٰۃ اس کی اجازت سے ادا کرسکتا ہے، مگر غور کیا جائے تو یہ اشکال اس لئے صحیح نہیں کہ کسی کو اپنی جگہ حج کے لئے بھیج دینا اور اس کے مصارف خود ادا کرنا، یا کسی شخص کو اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کردینے کے لئے مامور کردینا یہ بھی درحقیقت اسی شخص کے اپنے عمل و سعی کا جزء ہے اس لئے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے منافی نہیں۔

ایصال ثواب کا مسئلہ: جبکہ اوپر یہ معلوم ہوچکا کہ آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے فرض ایمان و نماز و روزہ کو ادا کرکے دوسرے کو سبکدوش نہیں کرسکتا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک شخص کے نفلی عمل کا کوئی فائدہ اور ثواب دوسرے شخص کو نہ پہونچ سکے، ایک شخص کی دعاء اور صدقہ کا ثواب دوسرے شخص کو پہونچنا نصوص شرعیہ سے ثابت اور تمام امت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے۔ (ابن کثیر)

صرف اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے کہ تلاوت قرآن کا ثواب کسی دوسرے کو بخشا اور پہونچایا جاسکتا ہے یا نہیں، امام شافعیؒ اس کا انکار کرتے ہیں اور آیت مذکورہ کا مفہوم عام لے کر اس سے استدلال فرماتے ہیں، جمہور ائمہ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح دعاء اور صدقہ کا ثواب دوسرے کو پہونچایا جاسکتا ہے اسی طرح تلاوت قرآن اور ہر نفلی عبادت کا ثواب دوسرے شخص کو بخشا جاسکتا ہے اور وہ اس کو ملے گا، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں کہ مؤمن کو دوسرے شخص کی طرف سے عمل صالح کا ثواب پہونچتا ہے۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ ان احادیث کو جمع کردیا ہے جن سے ایصال ثواب کا فائدہ دوسرے کو پہونچنا ثابت ہوتا ہے۔

اوپر صحف موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے حوالے سے جو دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص کے گناہ کا عذاب کسی دوسرے کو نہیں پہونچے گا، اور ایک کے گناہ میں دوسرا کوئی نہ پکڑا جائیگا، دوسرا یہ کہ ہر شخص پر جن اعمال کی شرعی ذمہ داری ہے، اس سے سبکدوشی خود اسی کے اپنے عمل سے ہوگی، دوسرے کا عمل اس کو سبکدوش نہ کرے گا۔

یہ دونوں حکم اگرچہ دوسرے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تھے مگر حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کی تخصیص شاید اس بنا پر کی گئی کہ ان کے زمانہ میں یہ جاہلانہ رسم جاری ہوگئی تھی کہ باپ کے بدلے میں بیٹے کو اور بیٹے کے بدلے میں باپ کو یا بھائی بہن وغیرہ کو قتل کر دیا جاتا تھا، ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات نے اس رسم جاہلیت کو مٹایا تھا۔

وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی، یعنی صرف ہر شخص کا ظاہری سعی کافی نہیں، اللہ تعالیٰ کے دربار میں سعی کی اصل حقیقت بھی دیکھی جائے گی کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے کی ہے یا دکھاوے کی، غرض دیکھنے میں شامل ہیں جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی صرف صورت عمل کافی نہیں، عمل میں نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیل حکم کی ہونا ضروری ہے۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی، مراد یہ ہے کہ آخرکار سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور عمل کا حساب دینا ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ انسانی غور و فکر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے، اس کی ذات و صفات کی حقیقت تک غور و فکر سے حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ اس میں غور و فکر کی اجازت، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرو اس کی ذات میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ اس کو علم کسی کے یہ ذکر کردہ تمہارے بس کا نہیں۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی، یعنی نوع انسان میں خوشی اور غم اور اس کے نتیجہ میں ہنسنے اور رونے کا سلسلہ ہر شخص دیکھتا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو ان کے ظاہری طور پر پیش آنے والے اسباب کی طرف منسوب کرکے معاملہ ختم کر دیتا ہے، یہاں غور و فکر کی دعوت ہے کہ ذرا نظر آگے بڑھاؤ تو دیکھو گے کہ کسی کی خوشی یا غم اور ہنسنا یا رونا خود اس کے یا کسی دوسرے کے قبضہ میں نہیں، یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، وہ اسباب کو پیدا کرتا ہے وہی اسباب میں تاثیر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے تو رونے والوں کو ایک منٹ میں ہنسا دیتا ہے، اور ہنسنے والوں کو ایک منٹ میں رلا دیتا ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست ٭ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی، غنٰی کے معنی مالداری کے معروف ہیں، اغنٰی کے معنی دوسرے کو مالدار بنا دینا، اور اقنٰی قنیہ سے مشتق ہے جس کے معنی محفوظ اور ذخیرہ رکھنے کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کو مالدار اور غنی بناتا ہے وہی جس کو چاہے اتنا سرمایہ دیتا ہے کہ اس کو محفوظ رکھ سکے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی، شِعریٰ عربی میں ایک ستارے کا نام ہے جو جوزا کے پیچھے ہے، عرب کی بعض اقوام اس ستارے کی پرستش کرتی تھیں، اس لئے خصوصیت سے اس کا نام لے کر بتلایا کہ اس ستارے کا مالک اور پروردگار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اگرچہ وہ سارے ہی ستاروں، آسمانوں، زمینوں کا خالق و مالک اور

تعجب کرتے ہو اور بطور استہزاء کے ہنستے ہو اور اپنی معصیت یا عمل میں کوتاہی پر روتے نہیں۔

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ سمود کے لغوی معنی غفلت و بے فکری کے ہیں، سامدون بمعنی غافلون ہے، اور ایک معنی سمود کے گانے بجانے کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں، کما فسرہ بہ بعض الائمہ۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا یعنی پچھلی آیات جو غور کرنے والے انسان کو عبرت و موعظت کا سبق دیتی ہیں اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم سب اللہ کے سامنے خشوع و تواضع کے ساتھ جھکو اور سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سورۂ نجم کی اس آیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ سب مسلمانوں اور مشرکوں نے اور تمام جن و انس نے سجدہ کیا، اور بخاری و مسلم کی دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور اس میں سجدۂ تلاوت ادا کیا، اور آپ کے ساتھ سب حاضرین مجلس، مومنین و مشرکین، نے سجدہ کیا بجز ایک قریشی بوڑھے کے جس نے زمین سے ایک مٹھی خاک اٹھا کر پیشانی سے لگا لی، اور کہا کہ مجھے یہی کافی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ پھر میں نے اس شخص کو حالتِ کفر میں مقتول پڑا ہوا دیکھا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مسلمانوں کو تو سجدہ کرنا تھا ہی، جو مشرکین اُس وقت حاضر تھے اللہ تعالیٰ نے اُن پر بھی کچھ ایسی حالت غالب کر دی کہ سب سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے، گو اس وقت اُن کا سجدہ بوجہ کفر کے کچھ ثواب نہ رکھتا تھا، مگر وہ بھی اپنا ایک اثر چھوڑ گیا کہ بعد میں ان سب کو اسلام و ایمان کی توفیق ہوگئی، صرف ایک آدمی کافر مرا جس نے سجدہ سے گریز کیا تھا۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں جو حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے ہے یہ مذکور ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پوری پڑھی، مگر آپ نے سجدہ نہیں کیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سجدہ واجب یا لازم نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ اس وقت باوضو نہ ہوں، یا کوئی دوسرا عذر سجدہ کرنے سے مانع ہو، ایسی حالت میں فوری سجدہ کرنا ضروری نہیں، بعد میں بھی ہو سکتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت

سُوْرَةُ النَّجْمِ بِعَوْنِهٖ وَحَمْدِهٖ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى
لَیْلَةَ الْجُمُعَةِ لِغُرَّةِ الرَّبِیْعِ الثَّانِیْ سَنَة ۱۳۹۱ھ
فِیْ اُسْبُوْعٍ وَّاحِدٍ وَّیَتْلُوْهُ تَفْسِیْرُ سُوْرَةِ الْقَمَرِ
اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ وَلِیُّ التَّوْفِیْقِ

سُوۡرَةُ الۡقَمَرِ

سُوۡرَةُ الۡقَمَرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمۡسٌ وَّخَمۡسُوۡنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوۡعَاتٍ

سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچپن آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝۱ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا

پاس آلگی قیامت اور پھٹ گیا چاند، اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹلا جاویں اور

وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝۲ وَكَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ وَكُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ۝۳

کہیں یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا، اور جھٹلایا اور چلے اپنی خوشی پر اور ہر کام ٹھہر رہا ہے وقت پر،

وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنَ الۡاَنۡبَآءِ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ ۝۴ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ

اور پہنچ چکے ہیں ان کے پاس احوال جن میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پوری عقل کی بات پھر کام نہیں دیتے

النُّذُرُ ۝۵ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا

ڈر سنانے والے، سو تو ہٹ آ ان کی طرف سے جس دن پکارے پکارنے والا ایک ناخوش چیز کی طرف، آنکھیں

اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۝۷

جھکائے نکل پڑیں قبروں سے جیسے ٹڈی پھیلی ہوئی،

مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ۝۸

دوڑتے جاویں اس پکارنے والے کے پاس، کہتے جاویں منکر یہ دن مشکل آیا،

اس روایت میں ہے کہ یہ معجزہ شق قمر مکہ مکرمہ میں دو دفعہ پیش آیا مگر روایات صحیحہ سے ایک ہی مرتبہ کا ثبوت ملتا ہے (بیان القرآن) اس معاملہ سے متعلق چند روایات حدیث یہ ہیں (جو تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)

(۱) صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

إِنَّ أَهْلَ مَكَّةَ سَأَلُوا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُرِيَهُمْ آيَةً فَأَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّتَيْنِ حَتّٰى رَأَوْا حِرَاءَ بَيْنَهُمَا (بخاری ومسلم)

"یعنی اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اپنی نبوت کے لئے کوئی نشانی (معجزہ) دکھلائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھلا دیا یہاں تک کہ انھوں نے جبل حرا کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا۔"

(۲) صحیح بخاری ومسلم اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شِقَّتَيْنِ حَتّٰى نَظَرُوْا اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوْا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں چاند شق ہوا اور دو ٹکڑے ہوگئے جس کو سب نے صاف طور سے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو"

اور ابن جریر نے بھی اپنی سند سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًى فَانْشَقَّ الْقَمَرُ فَأَخَذَتْ فِرْقَةٌ خَلْفَ الْجَبَلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوْا اشْهَدُوْا (عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اچانک چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گواہی دو، گواہی دو"

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی روایت سے ابو داؤد طیالسی نے اور بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے:

اِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَكَّةَ حَتّٰى صَارَ فِرْقَتَيْنِ فَقَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ اَهْلُ مَكَّةَ هٰذَا سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهِ ابْنُ اَبِيْ كَبْشَةَ اُنْظُرُوا السُّفَّارَ فَاِنْ كَانُوْا رَاَوْا مَا رَاَيْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ وَاِنْ كَانُوْا لَمْ يَرَوْا مِثْلَ مَا رَاَيْتُمْ فَهُوَ سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهٖ فَسُئِلَ السُّفَّارُ قَالَ وَقَدِمُوْا مِنْ كُلِّ جِهَةٍ فَقَالُوْا رَاَيْنَاهُ

"مکہ مکرمہ (کے قیام کے زمانہ) میں چاند شق ہو کر دو ٹکڑے ہوگیا، کفار قریش کہنے لگے کہ یہ جادو ہے ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر جادو کر دیا ہے، اس لئے تم انتظار کرو، باہر سے آنے والے مسافروں کا، اگر انھوں نے بھی یہ دو ٹکڑے چاند کے دیکھے ہیں تو انھوں نے سچ کہا ہے اور اگر باہر کے لوگوں نے ایسا نہیں دیکھا تو پھر یہ بیشک جادو ہی ہوگا، پھر باہر سے

آنے والے مسافروں سے تحقیق کی جو مختلف اطراف سے آئے تھے، سب نے اعتراف کیا کہ ہم نے بھی چاند کو دو ٹکڑے دیکھے ہیں۔"

شق القمر کے واقعہ پر کچھ شبہات اور جواب

اس پر ایک شبہ تو یونانی فلسفہ کے اصول کی بنا پر کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آسمان اور سیارات میں خرق والتیام یعنی شق ہونا اور جڑنا ممکن نہیں، مگر یہ محض ان کا دعویٰ ہے اس پر جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ سب بے جان اور بے بنیاد ہیں اُن کا غیر واضح ہونا متکلمین اسلام نے ثابت واضح کردیا ہے، اور آج تک کسی عقلی دلیل سے شق قمر کا محال اور ناممکن ہونا ثابت نہیں ہو سکا، ہاں ناواقف عوام ہر مستبعد چیز کو ناممکن کہنے لگتے ہیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ معجزہ تو نام ہی اس فعل کا ہے جو عام عادت کے خلاف اور عام لوگوں کی قدرت سے خارج حیرت انگیز و مستبعد ہو، ورنہ معمولی کام جو ہر وقت ہوتے رہتے ہیں اُسے کون معجزہ کہے گا؟

دوسرا عام شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہوتا تو پوری دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ معظمہ میں رات کے وقت پیش آیا، اُس وقت بہت سے ممالک میں تو دن ہوگا وہاں اس واقعہ کے نمایاں و ظاہر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، اور بعض ممالک میں نصف شب اور آخر شب میں ہوگا جس وقت عام دنیا سوتی ہے، اور جاگنے والے بھی تو ہر وقت چاند کو نہیں تکتے رہتے، زمین پر پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کے دو ٹکڑے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جس کی وجہ سے کسی کو اس طرف توجہ ہوتی پھر یہ تھوڑی دیر کا قصہ تھا، روزمرہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی ملک میں چاند گہن ہوتا ہے اور آجکل تو پہلے سے اس کے اعلانات بھی ہوجاتے ہیں اس کے باوجود ہزاروں لاکھوں آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا، تو کیا اس کو اس بات کی دلیل بنایا جا سکتا ہے کہ چاند گہن ہوا ہی نہیں، اس لئے دنیا کی عام تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے اس واقعہ کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی مشہور و مستند "تاریخ فرشتہ" میں اس کا ذکر بھی موجود ہے کہ مالابار میں مہاراجہ مالیبار نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا، اور اپنے روزنامچہ میں لکھوایا، اور یہی واقعہ ان کے مسلمان ہونے کا سبب بنا۔ اور اوپر ابوداؤد طیالسی اور بیہقی کی روایات سے بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مشرکین مکہ نے بھی باہر کے لوگوں سے اس کی تحقیق کی تھی اور مختلف اطراف کے آنے والوں نے یہ واقعہ دیکھنے کی تصدیق کی تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ، مستمر کے مشہور معنی جو اردو میں معروف ہیں، وہ دیر تک اور دائم رہنے کے ہیں، مگر عربی زبان میں یہ لفظ مستمر کبھی گذر جانے اور ختم ہو جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، ائمہ تفسیر میں سے مجاہد اور قتادہ نے اس جگہ یہی معنی بیان کئے ہیں اس پر مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ یہ جادو کا اثر ہے جو دیر تک نہیں چلتا خود ہی گذر جائے گا اور ختم ہو جائے گا

سال قوم کی ایسی ایذاؤں کا جواب دعاؤں سے دے کر گذرنے کے بعد آخر میں عاجز ہو کر بددعا کی، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے جس کے نتیجہ میں پوری قوم غرق کی گئی۔

فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ، یعنی زمین سے ابلنے والا پانی اور آسمان سے برسنے والا پانی دونوں اس انداز سے مل گئے جس سے اللہ تعالیٰ کا مقدر کیا ہوا فیصلہ کہ پوری قوم غرق ہو جائے، نافذ ہو گیا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک بھی کسی کو پناہ نہ ملی۔

ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ، الواح لوح کی جمع ہے بمعنی تختہ، اور دُسُر دِسار کی جمع ہے جس کے معنی میخ اور مسمار کے بھی آتے ہیں اور اس ڈورے یا تار کو بھی کہا جاتا ہے جس سے کشتی کے تختے جوڑے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ، یذکر، ذکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت و عبرت حاصل کرنے کے بھی، یہ دونوں معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں، کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو حفظ کرنے کے لئے آسان کر دیا، یہ بات اس سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی کہ پوری کتاب تورات، انجیل، زبور لوگوں کو زبانی یاد ہو، اور یہ حق تعالیٰ ہی کی تیسیر اور آسانی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پورے قرآن کو ایسا حفظ کر لیتے ہیں کہ ایک زیر زبر کا فرق نہیں آتا، چودہ سو برس سے ہر زمانہ ہر طبقے ہر خطے میں ہزاروں، لاکھوں حافظوں کے سینوں میں یہ اللہ کی کتاب محفوظ ہے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم نے اپنے مضامین عبرت و نصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم ماہر فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح ہر عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت و نصیحت کے مضامین قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔

حفظ کرنے و نصیحت اس آیت میں یسّرنا کے ساتھ للذکر کی قید لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ حاصل کرنے کیلئے قرآن کو کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان آسان کیا گیا ہونا کہ اجتہاد کر دیا گیا ہے، جس سے ہر عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس و استنباط احکام کیلئے | سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل اور احکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماء راسخین کو ہی حصہ ملتا ہے، ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو قرآن کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم اس کے اصول و قواعد حاصل کئے بغیر مجتہد بننا اور اپنی رائے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا ہم نے بھیجی ان پر ہوا سناٹے کی

فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ

نحوست کے دن جو ٹلنے والی نہ تھی اکھاڑ مارا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اکھڑی پڑی پھر کیسا

كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِنَّا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں تو ہم

لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٢٤﴾ أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ

تو غلطی میں پڑے اور سودا میں کیا اتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں بلکہ یہ جھوٹا ہے

أَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿٢٦﴾ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ

بڑائی مارتا اب جان لیں گے کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے

فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ

جانچنے کے واسطے سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ اور سنا دے ان کو کہ پانی کا بانٹ ہے ان میں

كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ

ہر باری پر پہنچنا چاہیے پھر پکارا انہوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا پھر کیسا ہوا

عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ

میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا ہم نے بھیجی ان پر ایک چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ

الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾ كَذَّبَتْ

کانٹوں کی اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا جھٹلایا لوط

قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ

کی قوم نے ڈر سنانے والوں کو ہم نے بھیجی ان پر آندھی پتھر برسانے والی سوائے لوط کے گھر کے ان کو ہم نے بچا دیا

بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ

پچھلی رات سے۔ فضل سے اپنی طرف کے، ہم یوں بدلہ دیتے ہیں اس کو جو حق مانے۔ اور وہ ڈرا چکا تھا

أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ

ان کو ہماری پکڑ سے پھر لگے مکرنے ڈرانے کو۔ اور اس سے لینے لگے اس کے مہمانوں کو پس

فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً

ہم نے مٹا دیں ان کی آنکھیں اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ اور پڑا ان پر صبح کو سویرے

عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ

عذاب جو ٹھہر چکا تھا۔ اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ اور ہم نے آسان کردیا قرآن

لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾

سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا۔ اور پہنچے فرعون والوں کے پاس ڈرانے والے۔

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾

جھٹلائیں انہوں نے ہماری نشانیاں ساری پھر پکڑا ہم نے ان کو پکڑنا زبردست کا قابو میں لے کر۔

خلاصۂ تفسیر

عاد نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی سو (اس کا قصہ سنو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا، (آگے اس قصہ کا بیان ہے کہ) ہم نے اُن پر ایک تند ہوا بھیجی ایک مسلسل نحوست کے دن میں (یعنی وہ دن ان کے حق میں ہمیشہ کے لئے منحوس رہا کہ اس روز جو عذاب آیا وہ عذاب برزخ سے متصل ہوگیا پھر عذاب آخرت سے متصل ہوگیا، جو ان سے کبھی منقطع نہ ہوگا) اور وہ ہوا لوگوں کو اس طرح (ان کی جگہ سے) اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ جڑ سے اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں (یہ تشبیہ میں علاوہ اُن کے پھینکے جانے کے شاید ان کے طول قامت کی طرف بھی ہے) سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا (ہولناک) ہوا اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے سو کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے، ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب مستلزم ہے سب پیغمبروں کی تکذیب کو) اور کہنے لگے کہ کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے اور (حشم وخدم سے) اکیلا ہے (یعنی نہ تو فرشتہ ہوتا تو ہم دین میں اتباع کرتے، یا صاحب خدم وحشم ہوتا تو دنیوی امور میں اتباع کرتے

کا مزہ چکھو، یہ تو ان کا قصہ تھا یعنی اندھے کرنے کا پیش آیا اور پھر صبح سویرے ان پر دائمی عذاب
آپہنچا (اور ارشاد ہوا کہ) میرے ڈرانے اور عذاب کا مزہ چکھو (یہی جو پہلے اندھے ہونے کے عذاب پر کہا گیا تھا
یہاں ہلاکت کے عذاب پر ہے تو اس میں کوئی تکرار نہیں) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان
کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے اور (فرعون اور) فرعون والوں کے پاس بھی ڈرانے کی بہت سی
چیزیں پہنچیں (مراد موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور معجزات ہیں کہ ارشادات سے تشریعی طور پر اور معجزات سے
تکوینی طور پر ان کو ڈرایا گیا مگر) ان لوگوں نے ہماری تمام ان نشانیوں (کو جو ان کے پاس آئی تھیں وہ آیات
تسعہ (نو آیتیں مشہور ہیں) جھٹلایا (یعنی ان کے مدلول ومقتضا توحید الٰہی اور نبوت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا،
ورنہ واقعات کے وقوع کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی) سو ہم نے ان کو زبردست صاحب قدرت کا پکڑنا پکڑا (یعنی
جب ہم نے ان کو قہر اور غضب سے پکڑا تو اس پکڑ کو کوئی دفع نہیں کر سکا پس عزیز مقتدر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے)

معارف ومسائل

بعض لغات کی تشریح: سُعُر، یہ لفظ آیات مذکورہ میں دو جگہ آیا ہے اول قوم ثمود کے ذکر میں ان کا اپنا قول کہ
اس میں سُعُر کا لفظ جنون کے معنی میں آیا ہے، دوسری جگہ یہی لفظ آگے آنے والی آیات میں حق تعالیٰ کی طرف سے
عذاب مجرمین کے ذکر میں آیا ہے، فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ، یہاں سُعُر کے معنی جہنم کی آگ کے ہیں، حسب تصریح اہل لغت
لفظ سُعُر ان دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ، مراودت کے معنی کسی سے اپنی نفسانی شہوت پوری کرنے کے لئے بہلانے پھسلانے کے
ہیں، مراد یہ ہے کہ قوم لوط علیہ السلام چونکہ اپنی خباثت سے لڑکوں کے ساتھ بد فعلی کے خوگر تھے، اور اللہ تعالیٰ
نے ان کے امتحان کے لئے فرشتوں کو حسین لڑکوں کی صورت میں بھیجا تھا یہ شریر ان کو اپنی خواہش
کا نشانہ بنانے کے لئے لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے، لوط علیہ السلام نے دروازہ بند کر لیا تو یہ دروازہ
توڑ کر یا اوپر سے پھلانگ کر اندر آنے لگے، حضرت لوط علیہ السلام پریشان ہوئے تو اس وقت فرشتوں نے
اپنا راز ظاہر کیا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہم اللہ کے فرشتے ان کو عذاب دینے ہی
کے لئے آئے ہیں۔

سورۂ قمر کو قرب قیامت کے ذکر سے شروع کیا گیا تاکہ کفار ومشرکین جو دنیا کی ہوا وہوس میں
مبتلا اور آخرت سے غافل ہیں وہ ہوش میں آئیں، پہلے قیامت کے عذاب کا بیان کیا گیا اس کے بعد دنیا میں
بھی ان کے انجام بد کو بتلانے کے لئے پانچ مشہور عالم اقوام کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت پر
ان کے انجام بد اور دنیا میں بھی طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہونا بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کیونکہ یہی سب سے پہلی دنیا کی قوم ہے جو عذاب سے

روایاتِ حدیث کی بنا پر اس آیت میں قدر سے تقدیر ہی مراد لی ہے۔

مسند احمد، مسلم، ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ مشرکین قریش ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق مخاصمت کرنے لگے تو اس پر یہ آیت قرآن نازل ہوئی، اس معنی کے اعتبار سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہم نے تمام عالم کی ایک ایک چیز کو اپنی تقدیر ازلی کے مطابق بنایا ہے، یعنی ازل میں پیدا ہونے والی چیز اور اس کی مقدار زمانہ و مکان اور اس کے بڑھنے گھٹنے کا پیمانہ عالم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھدیا گیا تھا جو کچھ عالم میں پیدا ہوتا ہے وہ اسی تقدیر ازلی کے مطابق ہوتا ہے۔

تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے اس کا منکر کافر اور جو فرقے تاویلیں کر کے انکار کرتے ہیں وہ فاسق ہیں امام احمد، ابوداؤد، طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر امت میں کچھ لوگ مجوسی ہوتے ہیں، اس امتِ محمدیہ کے مجوسی وہ لوگ ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں ایسے لوگ بیمار پڑیں تو ان کی بیمار پرسی کو نہ جاؤ اور مرجائیں تو ان کے کفن دفن میں شریک نہ ہو (از روح المعانی)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت

بِعَوْنِ اللہِ سُبْحَانَہٗ وَبِحَمْدِہٖ سُوْرَۃُ الْقَمَرِ
یَوْمَ الثُّلَاثَاءِ لِسِتَّۃٍ مِّنَ الرَّبِیْعِ الثَّانِی سنہ ۱۳۹۱ھ
وَیَتْلُوْھَا اِنْ شَاءَ اللہُ تَعَالٰی سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ؛

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ رحمٰن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ⓵ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ⓶ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ⓷ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ⓸

رحمٰن نے سکھایا قرآن بنایا آدمی پھر سکھایا اس کو بات کرنا

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ⓹ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ⓺ وَالسَّمَآءَ

سورج اور چاند کے لئے ایک حساب ہے اور جھاڑ اور درخت مشغول ہیں سجدہ میں اور آسمان کو

رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ⓻ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ⓼ وَاَقِيْمُوا

اونچا کیا اور رکھی ترازو کہ زیادتی نہ کرو ترازو میں اور سیدھی ترازو

الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ⓽ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا

تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو اور زمین کو بچھایا واسطے

لِلْاَنَامِ ⓾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ⑪ وَالْحَبُّ

خلق کے اس میں میوہ ہے اور کھجوریں جن کے میوہ پر غلاف اور اس میں اناج ہے

ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ⑫ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑬ خَلَقَ

جس کے ساتھ بھس ہے اور پھول خوشبودار، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں، بنایا

سو اے جن و انس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت و عظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (مراد اس کی اوپر گذری ہے اور) وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک (حقیقی) ہے (مراد اس سے سورج اور چاند کے طلوع و غروب کا افق ہے، اس میں بھی وجہ نعمت ظاہر ہے کہ لیل و نہار کے فوائد و منافع اس کے ساتھ بہت سے اغراض متعلق ہیں) سو اے جن و انس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت و عظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے، (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں (اور حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان میں ایک حجاب (قدرتی) ہے کہ (اس کی وجہ سے) دونوں (اپنے اپنے موقع سے) بڑھ نہیں سکتے (جس کی شرح سورۂ فرقان کے ختم سے ڈیڑھ رکوع قبل گذری ہے اور آب شور و آب شیریں کے منافع بھی ظاہر ہیں اور دونوں کے ملنے میں نعمت استدلال بھی ہے) سو اے جن و انس (باوجود اس کثرت و عظمت نعم کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور ان دریاؤں کے متعلق ایک یہ نعمت ہے کہ) ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے (موتی مونگے کے منافع اور وجوہ نعمت ہونا ظاہر ہے) سو اے جن و انس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت و عظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی کے (اختیار و ملک میں) ہیں جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (نظر آتے) ہیں (ان کی منفعت بھی ظاہر بلکہ اظہر ہے) سو اے جن و انس (باوجود نعمتوں کی اس کثرت و عظمت کے) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

معارف و مسائل

سورۂ رحمٰن کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے، امام قرطبی نے چند روایات حدیث کی وجہ سے مکی ہونے کو ترجیح دی ہے، ترمذی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے سامنے سورۂ رحمٰن پوری تلاوت فرمائی یہ لوگ سنکر خاموش رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے لیلۃ الجن میں جنات کے سامنے یہ سورت تلاوت کی تو اثر قبول کرنے کے اعتبار سے وہ تم سے بہتر رہے کیونکہ جب میں قرآن کے اس جملے پر پہونچتا تھا (فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ) تو جنات سب کے سب بول اٹھتے تھے (لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ) یعنی اے ہمارے پروردگار، ہم آپ کی کسی بھی نعمت کی تکذیب و ناشکری نہ کریں گے، آپ ہی کے لئے حمد ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سورت مکی ہے کیونکہ لیلۃ الجن وہ رات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو تبلیغ و تعلیم فرمائی مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے۔

اسی طرح کی اور بھی چند روایات قرطبی نے نقل کی ہیں جن سے اس سورت کا مکی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس سورت کو لفظ رحمٰن سے شروع کیا گیا اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ کفار مکہ اللہ تعالیٰ کے

مثلاً کھانا پینا، سردی گرمی سے بچنے کے سامان رہنے سہنے کا انتظام وغیرہ ان نعمتوں میں تو حیوانات انسان اور حیوان شریک ہیں، وہ نعمتیں جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اُن میں سے پہلے تو تعلیم قرآن کا ذکر فرمایا اس کے بعد تعلیم بیان کا کیونکہ تعلیم قرآن کا افادہ و استفادہ بیان پر موقوف ہے۔

اور بیان میں زبانی بیان بھی داخل ہے، تحریر و خط اور فہم و تفہیم کے جتنے ذرائع حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں وہ بیان کے مفہوم میں شامل ہیں اور پھر مختلف خطوں مختلف قوموں کی مختلف زبانیں اور ان کے محاورات سب اسی تعلیم بیان کے اجزاء ہیں جو عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کی عملی تفسیر ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ، انسان کے لئے حق تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں اس آیت میں علویات میں سے شمس و قمر کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ عالم دنیا کا سارا نظام ان دونوں سیاروں کی حرکات اور ان کی شعاعوں سے وابستہ ہے، اور لفظ حُسبان بعض علماء نے فرمایا کہ حساب کے معنے میں مصدر ہے، جیسے غفران، سُبحان، قرآن اور بعض نے فرمایا کہ حساب کی جمع ہے اور مراد آیت کی یہ ہے کہ شمس و قمر کی حرکات جن پر انسانی زندگی کے تمام کاروبار موقوف ہیں، رات دن کا اختلاف، موسموں کی تبدیلی، سالوں اور مہینوں کی تعیین، ان کی تمام حرکات اور دوروں کا نظام محکم ایک خاص حساب و اندازے کے مطابق چل رہا ہے، اور اگر حُسبان کو حساب کی جمع قرار دیا جائے تو معنے یہ ہوں گے کہ ان میں سے ہر ایک کے دورہ کا الگ الگ حساب ہے مختلف قسم کے حسابوں پر یہ نظام شمسی اور قمری چل رہا ہے اور حساب بھی ایسا محکم و مضبوط کہ لاکھوں سال سے اس میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔

یہ زمانہ سائنس کی معراج کا زمانہ کہا جاتا ہے اور اس کی حیرت انگیز نئی ایجادوں نے عقل انسانی کو حیران کر رکھا ہے، لیکن انسانی مصنوعات اور ربانی تخلیقات کا کھلا ہوا فرق ہر دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ انسانی مصنوعات میں ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کا سلسلہ ایک لازمی امر ہے، مشین کوئی کتنی ہی مضبوط و مستحکم ہو کچھ عرصہ کے بعد اس کو مرمت کی اور کم از کم گریس وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس وقت تک کے لئے وہ مشین معطل رہتی ہے، حق تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ عظیم الشان مخلوقات نہ کبھی مرمت کی محتاج ہے نہ کبھی ان کی رفتار میں کوئی فرق آتا ہے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ، نجم اس درخت کو کہا جاتا ہے جس کی بیل پھیلتی ہے تنہ نہیں ہوتا، اور شجر تنہ دار درخت کو کہتے ہیں، یعنی ہر قسم کے درخت خواہ بیل والے ہوں یا تنے والے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، سجدہ کرنا چونکہ انتہائی تعظیم اور اطاعت کی علامت ہے، اس سے مراد یہاں یہ ہے کہ ہر ایک درخت، پودے اور بیلیں اور اس کے پتوں اور پھلوں اور پھولوں کو حق تعالیٰ نے جن خاص خاص کاموں اور انسان کے فوائد کے لئے بنایا ہے، اور گویا ہر ایک کی ایک ڈیوٹی مقرر کر دی ہے، کہ وہ فلاں کام کیا کرے، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگا ہوا ہے اور حکم ربانی کے تابع، اس میں رکھے

جن کے فوائد اور خواص سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، اسی تکوینی اور جبری اطاعت حق کو اس آیت میں سجدہ سے **تعبیر کیا گیا ہے (روح، مظہری)**

وَالسَّمَاۗءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، رفع اور وضع دو متقابل لفظ ہیں، رفع کے معنی اونچا اور بلند کرنے کے ہیں، اور وضع کے معنی نیچے رکھنے اور پست کرنے کے آتے ہیں، اس آیت میں اول آسمان کو بلند کرنے اور رفعت دینے کا ذکر ہے جس میں ظاہری بلندی بھی داخل ہے اور معنوی یعنی درجہ اور رتبہ کی بلندی بھی کہ آسمان کا درجہ زمین کی نسبت بالا و برتر ہے، آسمان کا مقابل زمین سمجھی جاتی ہے، اور پورے قرآن میں اسی تقابل کیساتھ آسمان و زمین کا ذکر کیا گیا ہے، اس آیت میں رفع سماء کا ذکر کر کے اس کے بعد وضع میزان کا ذکر کیا گیا جو آسمان کے تقابل میں نہیں آتا، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی درحقیقت آسمان کے تقابل میں زمین کو لایا گیا ہے جیسا کہ تین آیتوں کے بعد (وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ) آیا ہے، تو دراصل تقابل رفع سماء اور وضع ارض ہی کا ہے، مگر ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز یعنی وضع میزان کا ذکر کسی خاص حکمت سے کیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمت اس میں یہ ہے کہ وضع میزان اور پھر اس کے بعد میزان کے صحیح صحیح استعمال کا حکم جو بعد کی تین آیتوں میں آیا ہے ان سب کا حاصل عدل و انصاف کو قائم کرنا اور آدمی کی حق تلفی اور ظلم و جور سے بچانا ہے، یہاں رفع سماء اور وضع ارض کے درمیان آیات میزان کے ذکر میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق کی اصل غایت و مقصود بھی عالم میں عدل و انصاف کا قیام ہے، اور زمین میں امن و امان بھی عدل و انصاف ہی کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے، ورنہ فساد ہی فساد ہوگا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

لفظ میزان کی تفسیر اس آیت میں حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ، سدی وغیرہ نے عدل سے کی ہے، کیونکہ میزان کا اصل مقصد عدل ہی ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے یہاں میزان کو اپنے معروف معنی میں لیا ہے، اور حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ حقوق میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے، اور میزان کے معنی میں ہر وہ آلہ داخل ہے جس سے کسی چیز کی مقدار معین کی جائے، خواہ وہ دو پلے والی ترازو ہو یا کوئی جدید پیمائش۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، پہلی آیت میں جو میزان پیدا کرنے کا ذکر تھا اس جملے میں اس کے مقصد کو واضح کیا گیا ہے، تَطْغَوْا، طغیان سے مشتق ہے، جس کے معنی بے انصافی و ظلم کے ہیں، مراد یہ ہے کہ میزان کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ تم وزن میں کمی بیشی کر کے ظلم و جور میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ، قسط کے لفظی معنی انصاف کے ہیں، مراد ظاہر ہے کہ وزن کو ٹھیک **ٹھیک قائم کرو انصاف کے ساتھ۔**

وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ، خسر کے معنی وزن میں کمی کرنے کے ہیں، جو بات پہلے جملے اَقِيْمُوا الْوَزْنَ میں مثبت انداز سے بیان کی گئی ہے، یہ اسی کا منفی پہلو ہے کہ وزن میں کم تولنا حرام ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ، انام بالفتح بروزن سحاب، ہر جاندار کو کہا جاتا ہے جو زمین

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ یَسْـَٔلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلَّ

[illegible]

یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّہَ

[illegible]

الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ

[illegible]

اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا

[illegible]

لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ یُرْسَلُ

[illegible]

عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

[illegible]

تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّھَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَیِّ

[illegible]

اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِہٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

[illegible]

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ فَیُؤْخَذُ

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ۔ پہچانے پڑیں گے گنہگار اپنے چہرے سے پھر پکڑا جائے گا

بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ ھٰذِہٖ جَھَنَّمُ الَّتِیْ

پیشانی کے بال سے اور پاؤں سے ۔ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ۔ یہ دوزخ ہے جس کو جھوٹ

یُکَذِّبُ بِھَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ

بتاتے تھے گنہگار ۔ پھریں گے بیچ اس کے اور کھولتے پانی کے ۔ پھر کیا کیا

دیا جانا چاہیے تھا جو اُن کو دیا گیا۔

مُدْهَآمَّتٰنِ، گہری سبزی کی وجہ سے جو سیاہی جھلکنے لگتی ہے اس کو ادہام کہا جاتا ہے، مراد یہی ہے کہ ان دونوں باغوں کی سرسبزی ان کے سیرابی مکمل ہونے کا سبب ہوگی، یہ صفت اگرچہ پہلے دو باغوں میں ذکر نہیں کی گئی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن میں یہ صفت نہ ہو، بلکہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ جو وہاں کی صفت بتلائی ہے، اس میں مُدْهَآمَّتٰن کی صفت بھی شامل ہے۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ، خیرات سے مراد سیرت و کردار کی خوبی اور حسان سے مراد شکل و صورت کی خوبی ہے، اور یہ امر بھی دونوں باغوں کی حوروں میں مشترک ہوگا جس کی طرف اشارہ سابقہ آیت میں موجود ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ، قاموس میں ہے کہ رفرف سبز رنگ کا ریشمی کپڑا ہے جس کے فرش اور تکئے اور دوسرا زینت کا سامان بنایا جاتا ہے، اور صحاح میں ہے کہ اس پر نقش و نگار درختوں اور بیلوں کے ہوتے ہیں، جس کو اردو میں مشجر کہا جاتا ہے، عبقری ہر عمدہ خوب صورت کپڑے کو کہا جاتا ہے، حسان سے اسی کا وصف خوب صورتی بیان کیا گیا ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ، سورۂ رحمٰن میں بیشتر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور انسان پر احسانات کا ذکر ہے، اس کے خاتمہ پر خلاصہ کے طور پر یہ جملہ ارشاد ہوا کہ اُس ذاتِ پاک کا تو کہنا کیا؟ اس کا نام بھی بڑا بابرکت ہے، اس کے نام ہی سے یہ ساری نعمتیں قائم ہیں، واللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

تمّت

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَعَوْنِهٖ

لِلْحَادِيْ عَشَرَ مِنَ الرَّبِيْعِ الثَّانِيْ،

١٣٩١ھ يَوْمَ السَّبْتِ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورہ واقعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھیانوے آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ

جب ہو پڑے ہو پڑنے والی، نہیں ہے اس کے ہو پڑنے میں کچھ جھوٹ، پست کرنے والی ہے اونچا کرنے والی

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً

جب لرزے زمین کپکپا کر، اور ریزہ ریزہ ہوں پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر، پھر ہو جائیں غبار

مُّنْۢبَثًّا ۙ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۭ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ

اڑتا ہوا، اور تم ہو جاؤ تین قسم پر، سو داہنے والے، کیا خوب ہیں

الْمَيْمَنَةِ ۭ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۭ وَالسّٰبِقُوْنَ

داہنے والے، اور بائیں والے کیا برے ہیں بائیں والے، اور اگاڑی والے

السّٰبِقُوْنَ ۚ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۚ ثُلَّةٌ مِّنَ

تو اگاڑی والے، وہ لوگ ہیں مقرب، باغوں میں نعمت کے، انبوہ ہے

الْاَوَّلِيْنَ ۙ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۭ عَلٰي سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ

پہلوں میں سے، اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے، بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر،

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾

بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا

يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾

وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَاَصْحٰبُ

الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ

وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾

فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ

ع ٣٨ ١٤

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ

اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾

کے وقت کے بیان فرمائے ہیں جیسے رُجَّتْ، جیسا شروع سورۂ حج میں آیا ہے اور بُسَّتْ، اور بعض واقعات نفخۂ ثانیہ یعنی دوسرے صور کے وقت کے جیسے خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ، وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا اور بعض مشترک جیسے اِذَا وَقَعَتِ اور لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا، چونکہ نفخۂ اولیٰ سے نفخۂ ثانیہ تک کا تمام وقت ایک وقت کے حکم میں ہے اس لئے ہر جزء وقت کو ہر واقعہ کا وقت کہا جا سکتا ہے، آگے ان تینوں قسموں میں تقسیم بیان کرنے کے بعد تینوں کے احکام الگ الگ ذکر کئے ہیں، اول اجمالاً پھر تفصیلاً کہ تین قسمیں جو مذکور ہیں (سو) ان میں ایک قسم یعنی (جو) داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (مراد اس سے وہ ہیں جن کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور گو یہ مفہوم مقربین میں بھی مشترک ہے لیکن ادنیٰ صفت پر اکتفا کرنے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ ان میں صفت الیمین سے زائد کوئی اور صفت قرب خاص کی نہیں پائی جاتی اس طرح مراد اس سے عوام مؤمنین ہو گئے، اور اس میں اجمالاً ان کی حالت کا اچھا ہونا بتلادیا، آگے فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (دوسری قسم یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں (مراد اس سے جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جاویں گے یعنی کفار، اور اس میں اجمالاً ان کی حالت کا برا ہونا بتلادیا، آگے فِيْ سَمُوْمٍ الخ سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے) اور (تیسری قسم یعنی) جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجہ کے ہی ہیں .... (اور) وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں، (اس میں تمام اعلیٰ درجہ کے بندے داخل ہیں، انبیاء اور اولیاء، وصدیقین و کامل متقی اور اس میں اجمالاً ان کی حالت کا عالی ہونا بتلادیا، آگے فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ سے اس اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے یعنی یہ) مقرب لوگ آرام کے باغوں میں ہوں گے (جن کی مزید تفصیل علیٰ سرر سے آتی ہے اور درمیان میں ان خواص میں بہت سی جماعتوں کا شامل ہونا بتلاتے ہیں کہ) ان (مقربین) کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے (اگلوں سے مراد متقدمین ہیں آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل تک اور پچھلوں سے مراد حضورؐ کے وقت سے لے کر قیامت تک، کذا فی الدر عن جابر مرفوعاً، اور متقدمین میں کثرت سابقین اور متاخرین میں قلت سابقین کی وجہ یہ ہے کہ خواص ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں، اور متقدمین یعنی آدم علیہ السلام سے زمانہ خاتم الانبیاء تک کا زمانہ بہت طویل ہے، بہ نسبت امت محمدیہ کے جو قرب قیامت میں پیدا ہوئی ہے، تو باقتضاء عادت زمانہ اس طویل زمانہ کے خواص بہ نسبت امت محمدیہ کے مختصر زمانے کے خواص کے زیادہ ہوں گے کیونکہ اس طویل زمانہ میں ہزاروں تو انبیاء ہی ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی اور نبی نہیں، اس لئے خواص مقربین کا بڑا گروہ متقدمین کا ہوگا، اور متاخرین یعنی امت محمدیہ میں ان سے کم ہوگا، آگے مقربین خواص کے لئے جو نعمتیں مقرر ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ (مقرب لوگ) سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، (در منثور میں حضرت ابن عباسؓ سے لفظ موضونہ کی یہی تفسیر نقل کی ہے اور) ان کے پاس ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، یہ

مجموعہ سے زیادہ ہوگا اور اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ اصحاب الیمین اس امت میں زیادہ ہوں کیونکہ خواص مقربین کی اکثریت تو متقدمین میں خود آیت بالا سے ثابت ہوچکی ہے اور جب اصحاب الیمین مرتبہ میں مقربین سے کم ہیں تو ان کی جزا بھی کم ہوگی سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ مقربین کی جزا میں وہ سامان عیش زیادہ مذکور ہے جو اہل شہر کو زیادہ مرغوب تر ہے اور اصحاب الیمین کی جزا میں وہ سامان عیش زیادہ مذکور ہے جو دیہات و قصبہ والوں کو مرغوب ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں میں ایسا تفاوت ہوگا جیسا اہل شہر و اہل قصبہ میں ہوا کرتا ہے کذا فی الروح اور آگے کفار کا اور ان کے عقاب و عذاب کا ذکر ہے یعنی اور جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں (آگے ان کے حال کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا (یعنی سایہ سے ایک جسمانی نفع ہوتا ہے راحت و برودت اور ایک روحانی نفع ہوتا ہے لذت و فرحت، وہاں دونوں نہ ہونگے یہ وہی دھواں ہے جس کا ذکر اوپر سورۂ رحمٰن میں بلفظ نحاس آیا ہے، آگے اس عذاب کی وجہ ارشاد ہے کہ) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) بڑی خوشحالی میں رہتے تھے اور (اس خوشحالی کے غرہ میں) بڑے بھاری گناہ (یعنی شرک و کفر) پر اصرار کیا کرتے تھے (مطلب یہ کہ ایمان نہیں لاتے تھے، اور آگے ان کے کفر کا بیان ہے جس کو زیادہ دخل ہے طلب حق نہ ہونے میں یعنی وہ) یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں (ہوکر) رہ گئے تو کیا (اس کے بعد) ہم دوبارہ زندہ کئے جاویں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے، چونکہ منکرین قیامت میں بعض کفار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھے اس لئے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے جمع کئے جاویں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر (پھر جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو درخت زقوم سے کھانا ہوگا پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا (غرض) ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ مہمانی ہوگی۔

معارف ومسائل

سورۂ واقعہ کی خصوصی فضیلت مرضِ وفات میں عبداللہ بن مسعودؓ کی سبق آموز ہدایات

ابن کثیر نے بحوالہ ابن عساکر ابوظبیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مرض وفات میں حضرت عثمان غنیؓ عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا مَا تَشْتَكِي (تمہیں کیا تکلیف ہے)، تو فرمایا ذُنُوبِي (یعنی اپنے گناہوں کی تکلیف ہے)، پھر پوچھا مَا تَشْتَهِي (یعنی آپ کیا چاہتے ہیں) تو فرمایا رَحْمَةَ رَبِّي (یعنی اپنے رب کی رحمت چاہتا ہوں)، پھر حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے کسی طبیب (معالج) کو بلاتا ہوں تو فرمایا اَلطَّبِيبُ اَمْرَضَنِي (یعنی مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے)، پھر حضرت عثمانؓ

نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں هُمَا جَمِيْعًا مِّنْ اُمَّتِيْ، یعنی یہ دونوں اوّلین و آخرین میری ہی امّت میں سے ہوں گے۔

اس تفسیر کے مطابق شروع آیت میں كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً کی مخاطب امّتِ محمدیہ ہی ہوگی، اور یہ **تینوں قسمیں امّتِ محمدیہ ہی کی ہوں گی (روح المعانی)**

تفسیر مظہری میں پہلی تفسیر کو اس لئے بہت بعید قرار دیا ہے کہ آیات قرآن کی واضح دلالت اس پر ہے کہ امّتِ محمدیہ تمام اُمم سابقہ سے افضل ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ کسی امّت کی فضیلت اس کے اندر اعلیٰ طبقہ کی زیادہ تعداد ہی سے ہوتی ہے، اس لئے یہ بات بعید ہے کہ افضل الامم کے اندر سابقین مقربین کی تعداد کم ہو، آیات قرآن كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا سے امّتِ محمدیہ کی فضیلت سب امّتوں پر ثابت ہے، اور ترمذی، ابن ماجہ و دارمی نے حضرت بہز بن حکیمؓ سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ **حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔**

اَنْتُمْ تُتِمُّوْنَ سَبْعِيْنَ اُمَّةً اَنْتُمْ اٰخِرُهَا وَاَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى

"تم ستر امّتوں کا تتمہ ہو گے جن میں تم سب آخری اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ **اکرم و افضل ہو گے**"

اور امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اہل جنت کے چوتھائی تم لوگ ہو جاؤ گے ہم نے عرض کیا کہ بے شک **ہم اس پر راضی ہیں تو آپؐ نے فرمایا:**

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ اَهْلِ الْجَنَّةِ **(از مظہری)**

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے یہ امید ہے کہ تم (یعنی امّتِ محمدیہ) **اہل جنت کے نصف ہو گے**"

اور ترمذی، حاکم و بیہقی نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے، اور ترمذی نے اس کی سند کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے، الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَهْلُ الْجَنَّةِ مِائَةٌ وَّعِشْرُوْنَ صَفًّا ثَمَانُوْنَ مِنْهَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَرْبَعُوْنَ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ **(مظہری)**

"اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں سے اسّی صفیں اس امّت کی ہوں گی باقی چالیس صفوں میں ساری امّتیں شریک **ہوں گی**"

مذکور الصدر روایات میں اس امّت کے اہل جنت کی نسبت دوسری امّتوں کے اہل جنت سے

کہیں چوتھائی کہیں نصف اور اس آخری روایت میں دو تہائی مذکور ہے اس میں کوئی تعارض اس لئے نہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازہ بیان کیا گیا ہے اس اندازہ میں مختلف اوقات میں زیادتی ہوتی رہی واللہ اعلم

عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ، موضونہ کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ نے یہ نقل کیا ہے کہ وہ پلنگ جس پر سونے کے تاروں سے کام بنایا گیا ہو۔

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ یہ لڑکے ہمیشہ اسی حالت میں لڑکے ہی رہیں گے، ان پر کوئی تغیر عمر وغیرہ کا نہ ہوگا، اہل جنت کے غلمان کے متعلق راجح تحقیق یہ ہے کہ حور وں کی طرح یہ بھی جنت ہی میں پیدا ہوئے ہوں گے اور یہ سب اہل جنت کے خادم ہوں گے، روایات حدیث سے ثابت ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس ہزاروں خادم ہوں گے (مظہری)

بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ، اکواب، کوب کی جمع ہے، پانی وغیرہ پینے کے ایسے برتن کو کہتے ہیں جیسے ہمارے عرف میں گلاس ہوتے ہیں، اور اباریق، ابریق کی جمع ہے، ٹونٹی دار لوٹے کو کہتے ہیں، کاس خاص شراب کے پیالے کو کہا جاتا ہے، معین سے مراد یہ ہے کہ یہ شراب ایک چشمہ جاریہ سے لائی گئی ہوگی۔

لَا يُصَدَّعُوْنَ، صداع سے مشتق ہے جس کے معنی دردِ سر کے ہیں، دنیا میں شراب زیادہ پینے سے سر میں درد اور چکر جیسے ہوتے ہیں، جنت کی یہ شراب اس سے پاک ہوگی۔

لَا يُنْزِفُوْنَ، نزف کے اصلی معنی کنویں کا تمام پانی کھینچ لینے کے ہیں، یہاں مراد عقل سے خالی ہوجانا ہے۔

وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ، یعنی پرندوں کا گوشت جیسی ان کی خواہش ہو، حدیث میں ہے کہ اہل جنت جس وقت کسی پرندے کے گوشت کی طرف رغبت کریں گے تو اس کا گوشت جس طرح کھانے کی رغبت دل میں آوے گی کہ کباب ہو یا دوسری طرح کا پکا ہوا، اسی طرح کا فوراً تیار ہوکر اس کے سامنے آجائے گا (مظہری)

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ، اصحاب یمین، در اصل مومنین متقین اور اولیاء اللہ ہیں گناہگار مسلمان بھی اُن کے ساتھ مل جائیں گے، بعض تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعض کسی نبی ولی کی شفاعت سے مغفرت اور معافی ہوجانے کے بعد اور بعض کو عذاب ہوگا، مگر اپنے گناہ کا عذاب بھگتنے کے بعد یہ بھی گناہ سے پاک صاف ہوکر اصحاب الیمین کے گروہ میں شامل ہوجائیں گے، کیونکہ گناہگار مومن کے لئے جہنم کی آگ درحقیقت عذاب نہیں بلکہ کھوٹ سے پاک صاف کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ (مظہری)

میں خود ایک دلالت عورت کی طرف پائی جاتی ہے، اس لئے بھی ضمیر اس طرف راجع ہوسکتی ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے جنت کی عورتوں کی پیدائش و تخلیق ایک خاص انداز سے کی ہے یہ خاص انداز حوران جنت کے لئے تو اس طرح ہے کہ وہ جنت ہی میں بغیر ولادت کے پیدا کی گئی ہیں ....

اور دنیا کی عورتیں جو جنت میں جائیں گی ان کی خاص تخلیق سے مطلب یہ ہوگا کہ جو دنیا میں بدشکل، سیاہ رنگ یا بوڑھی تھی اب اس کو حسین شکل و صورت میں جوان رعنا کر دیا جائے گا، جیسا کہ ترمذی اور بیہقی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ کی تفسیر میں فرمایا کہ جو عورتیں دنیا میں بوڑھی چندھی، سفید بال، بدشکل تھیں انھیں یہ نئی تخلیق حسین نوجوان بنا دے گی، اور بیہقی نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے میرے پاس ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی، آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ میری رشتہ کی ایک خالہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مزاح کے فرمایا لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ۔ یعنی جنت میں کوئی بڑھیا نہ جائے گی، یہ بیچاری سخت غمگین ہوئی، بعض روایت میں ہے کہ رونے لگی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تسلی دی، اور اپنی بات کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ جس وقت یہ جنت میں جائے گی تو بوڑھی نہ ہوگی بلکہ جوان ہو کر داخل ہوگی، اور یہی آیت تلاوت فرمائی (مظہری)

اَبْكَارًا، بکر، بکسر با کی جمع ہے کنواری لڑکی کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ جنت کی عورتوں کی تخلیق اس شان کی ہوگی کہ وہ ہر صحبت و مباشرت کے بعد پھر کنواری جیسی ہو جاویں گی۔

عُرُبًا، بضم عین و را، عروبہ کی جمع ہے، اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر کی عاشق و اس کی من پسند محبوبہ ہو۔

اَتْرَابًا، ترب بکسرتا کی جمع ہے جس کے معنی ہم عمر کے ہیں جو مٹی میں ساتھ کھیلا ہو، جنت میں مرد و عورت سب ہم عمر کر دیئے جاویں گے، بعض روایات حدیث میں ہے کہ سب کی عمر تینتیس ۳۳ سال ہوگی (مظہری)

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ، ثلۃ کے معنی بڑی جماعت، اولین و آخرین کی تفسیر میں حضرات مفسرین کے دو قول اوپر سابقون کے بیان میں مذکور ہو چکے ہیں، اگر اولین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک کے حضرات اور آخرین سے آپؐ کی امت تا قیامت ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا تو اس آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اصحاب الیمین یعنی مومنین متقین کی تعداد پچھلی امتوں کے مجموعہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اور تنہا امت محمدیہ میں ایک بڑی جماعت ہوگی، اس صورت میں اول تو امت محمدیہ کی فضیلت کے لئے یہ بھی کچھ کم نہیں کہ پچھلے لاکھوں انبیاء علیہم السلام کی امتوں کی برابر یہ امت ہو جائے جس کا زمانہ بہت مختصر

ہے، اس کے علاوہ لفظ ثُلَّۃ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ یہ ثلۃ آخرین تعداد میں اولین سے بڑھ جائے گا۔

اور اگر دوسری تفسیر مراد لی جائے کہ اولین و آخرین دونوں اسی امت کے مراد ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے بغوی نے اور حضرت ابوبکرہؓ سے مسدد و طبرانی و ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہما من امتی یعنی یہ اولین و آخرین میری امت ہی کے دو طبقے ہیں، اس معنی کے لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ سابقین اولین صحابہ و تابعین وغیرہ جیسے حضرات سے بھی یہ امت آخر تک بالکل محروم نہ ہوگی اگرچہ آخری زمانے میں ایسے لوگ کم ہوں گے اور مؤمنین متقین داخل اصحاب یمین تو اس پوری امت کے اول و آخر میں کثیر التعداد رہیں گے، اور امت محمدیہ کا کوئی دور کوئی طبقہ اصحاب الیمین سے خالی نہ ہوگا اس کی شہادت اس حدیث سے بھی ملتی ہے جو صحیح بخاری و مسلم میں حضرت معاویہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور ہزاروں مخالفوں کے نرغے میں بھی وہ اپنا رشد و ہدایت کا کام کرتی رہے گی، اس کو کسی کی مخالفت نقصان نہ پہنچا سکے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہونے تک یہ جماعت اپنے کام میں لگی رہے گی۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ

ہم نے تم کو بنایا پھر کیوں نہیں سچ مانتے، بھلا دیکھو تو جو پانی تم ٹپکاتے ہو، اب تم اس کو

تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا

بناتے ہو یا ہم ہیں بنانے والے، ہم نے ٹھہرا دیا ہے تم میں مرنا اور ہم

نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا

عاجز نہیں اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

جہاں تم نہیں جانتے، اور تم جان چکے ہو پہلا اٹھان پھر کیوں نہیں یاد کرتے،

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾

بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو، کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے

لَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا ہوا، پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے، ہم تو قرض دار رہ گئے،

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ

بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے ۔ بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو ۔ کیا تم نے

اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ

اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے ۔ اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو

اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ

کھاری پھر کیوں نہیں احسان مانتے ۔ بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو ۔ کیا تم نے

اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً

پیدا کیا اس کا درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے ۔ ہم نے ہی تو بنایا وہ درخت یاد دلانے

وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

کو اور برتنے کو جنگل والوں کے ۔ سو بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو سب سے بڑا

خلاصۂ تفسیر

ہم نے تم کو (اول بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) تو پھر تم (باعتبار اس کے نعمت ہونے کے توحید کی اور باعتبار اس کے دلیل قدرت علی المعاد ہونے کے قیامت کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے، (آگے اس تخلیق کی کچھ اس کے مناسب بقدر کی تفصیل و تذکیر ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں (ظاہر ہے کہ ہم ہی بناتے ہیں اور) ہم ہی نے تمہارے درمیان میں موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے (مطلب یہ کہ بنانا اور اس بنے ہوئے کو ایک وقت خاص تک باقی رکھنا یہ سب ہمارا ہی کام ہے، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ جیسے انسان کی ذات کا پیدا کرنا اور باقی رکھنا ہمارا فعل ہے، اسی طرح تمہاری موجودہ صورت کو باقی رکھنا بھی ہمارا ہی فعل ہے) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں (یعنی مثلاً آدمی سے جانور کی صورت میں مسخ کر دیں جس کا گمان بھی نہیں اور (آگے تنبیہ ہے اس کی دلیل پر یعنی) تم کو اول پیدائش کا علم حاصل ہے (کہ وہ ہماری قدرت سے ہے) پھر تم کیوں نہیں سمجھتے (کہ سمجھ کر اس نعمت کا شکر ادا کرو اور توحید کا اقرار کرو اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے پر بھی استدلال کرو، آگے ایک دوسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں (یعنی زمین میں بیج ڈالنے میں تو تم کو کچھ دخل ہے بھی، لیکن اس کو زمین سے نکالنا یہ کس کا فعل ہے، آگے یہ

مستحکم قائم فرما دیا ہے کہ جہاں کہیں سبب موجود ہو جاتا ہے تو مسبب اس کے ساتھ وجود میں آجاتا ہے، جس کو دیکھنے والا لازم و ملزوم سمجھتا ہے، اور ظاہر بین نظریں اسی سلسلۂ اسباب میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور تخلیق کائنات کو انہی اسباب کی طرف منسوب کرنے لگتی ہیں، اصل قدرت اور حقیقی قوتِ فاعلہ جو ان اسباب و مسببات کو گردش دینے والی ہے اس کی طرف التفات نہیں رہتا۔

آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اول خود انسان کی تخلیق کی حقیقت کو واضح فرمایا، پھر انسانی ضروریات کی تخلیق کی حقیقت سے پردہ اٹھایا، خود انسان کو مخاطب کرکے سوالات کئے، ان سوالات کے ذریعہ اصل جواب کی طرف رہنمائی فرمائی، کیونکہ سوالات میں ان اسباب کی کمزوری اور ان کا علت تخلیق نہ ہونا واضح فرما دیا۔

آیات مذکورہ میں پہلی آیت نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ ایک دعویٰ ہے، اور اگلی آیات اس کے دلائل ہیں، سب سے پہلے خود انسان کی تخلیق پر بحث سوال کیا گیا، کیونکہ غافل انسان جو کچھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ مرد و عورت کے اختلاط سے حمل قرار پاتا ہے اور پھر وہ حمل درجہ بدرجہ بڑھتا اور تیار ہوتا رہتا ہے، اور نو مہینے کے بعد ایک مکمل انسان کی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے، اس روزمرہ کے مشاہدہ سے غفلت شعار انسان کی نظر بس یہیں تک رہ جاتی ہے کہ مرد و عورت کے باہمی اختلاط ہی کو تخلیق انسانی کی علت حقیقی سمجھنے لگتا ہے، اس لئے سوال یہ کیا گیا اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ، یعنی اے انسان! ذرا غور تو کر کہ بچے کی پیدائش میں تیرا دخل اس کے سوا کیا ہے کہ تو نے ایک قطرۂ منی ایک خاص محل میں پہونچا دیا، اس کے بعد کیا تجھے کچھ خبر ہے کہ اس نطفہ پر کیا کیا دور گذرے، کیا کیا تغیرات آئے، کس کس طرح اس میں ہڈیاں اور گوشت پوست پیدا ہوئے، اور کس کس طرح اس عالمِ اصغر کے وجود میں کیسی کیسی نازک نازک مشینیں غذا حاصل کرنے، خون بنانے اور روح حیوانی پیدا کرنے کی پھر دیکھنے، بولنے سننے، چکھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوت اس کے وجود میں نصب فرمائیں کہ ایک انسان کا وجود ایک متحرک فیکٹری بن گیا، نہ باپ کو خبر ہے نہ ماں کو جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہوا ہے، آخر اگر عقل دنیا میں کوئی چیز ہے تو وہ کیوں نہیں سمجھتی کہ عجیب و غریب حکمتوں پر مشتمل انسانی وجود کیا خود بخود بغیر کسی کے بنائے بن گیا؟ اور اگر کوئی بنانے والا ہے تو وہ کون ہے؟ ماں باپ کو تو خبر بھی نہیں کہ کیا بنا کس طرح بنا؟ ان کو تو وضع حمل تک یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حمل لڑکا ہے یا لڑکی، پھر آخر وہ کونسی قدرت ہے جس نے پیٹ کی پھر رحم کی پھر بچے کے اوپر لپٹی ہوئی جھلی کی تین اندھیریوں میں یہ حسین و جمیل، سمیع و بصیر، سوچنے سمجھنے والا وجود تیار کر دیا، یہاں جو تبارک اللہ احسن الخالقین بول اٹھنے پر مجبور نہ ہو جائے وہ عقل کا اندھا ہی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں یہ بھی بتلا دیا کہ اے انسان! تم پیدا ہو جانے اور چلتا پھرتا فعال آدمی بن جانے کے بعد بھی اپنے وجود و بقاء اور تمام کاروبار میں ہمارے ہی محتاج ہو۔ ہم نے تمہاری موت کا بھی

بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور اس وقت مقرر سے پہلے پہلے جو عمر تمھیں ملی ہے اس میں تم اپنے آپ کو زندہ پاتے ہو، یہ بھی ہمارا مقرر کیا ہوا ہے، ہمیں اس پر بھی قدرت ہے کہ ابھی ابھی تمھیں فنا کر کے تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم پیدا کر دیں اور یہ بھی قدرت ہے کہ تمھیں فنا کرنے کے بجائے کسی دوسری صورت یعنی جمادات میں تمھیں تبدیل کر دیں یہ مضمون آیت کا ہے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ○ عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ موت کے مقدار اور وقت معین ہونے میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ تمہاری بقا میں تمہارا خود دخل نہیں، بلکہ تمہاری بقا ایک معین وقت تک ہے، تمھیں حق تعالیٰ نے ایک خاص قوت و قدرت اور عقل و حکمت کو حاصل بنایا ہے، اس سے کام لے کر تم بہت کچھ کر سکتے ہو، وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے ارادے پر سبقت کرنے والا اور ہماری مشیت پر غالب آنے والا کوئی نہیں، ہم اس وقت بھی دو چیزیں کر سکتے ہیں، ایک أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ یعنی تمھاری جگہ تمھارے مثل کوئی اور قوم لے آئیں، دوسرے وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ، یعنی تمہاری وہ شکل بنا دیں جس کو تم جانتے بھی نہیں، اس کی یہ شکل بھی ہو سکتی ہے کہ تم مٹی ہو جاؤ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی جانور کی شکل میں تبدیل ہو جاؤ جیسے پچھلی امتوں پر صورتیں مسخ ہو کر بندر اور خنزیر بن جانے کا عذاب آچکا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں پتھر اور جمادات کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ تخلیق انسان کے معاملے میں انسان کی غفلت اور اسباب طبعیہ کے پردہ میں چھپ کر اصل خالق و مالک سے بے خبر ہونے کا پردہ چاک کرنے کے بعد اس کی غذا جو اس کی زندگی کا مدار ہے اس کی حقیقت اسی انداز سے ظاہر فرمائی کہ سوال کیا کہ تم جو کچھ زمین میں بیج بوتے ہو ذرا غور تو کرو کہ اس بیج میں سے درخت پیدا کرنے میں تمھارے عمل کا کیا دخل ہے، غور کرو گے تو جواب اس کے سوا نہ ملے گا کہ کاشتکار کا دخل اس میں اس سے زیادہ نہیں کہ اس نے زمین کو ہل چلا کر بیج ڈال کر نرم کر دیا، کہ جو ضعیف کونپل اس دانہ سے پیدا ہو کر اوپر آنا چاہے اس کی راہ میں زمین کی سختی رکاوٹ نہ بنے بیج بونے والے انسان کی ساری کوشش اسی ایک نقطہ کے گرد دائر ہے، اور جب درخت نمودار ہو جائے تو اس کی حفاظت پر یہ کوشش لگ جاتی ہے، لیکن ایک دانہ کے اندر سے درخت نکال دینا نہ اس کے بس کا ہے، نہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے یہ درخت بنا دیا ہے، تو پھر وہی سوال آتا ہے کہ مٹی کے ڈھیر میں پڑے ہوئے دانے کے اندر سے یہ خوب صورت اور ہزاروں فوائد پر مشتمل درخت کس نے بنایا؟ تو جواب اس کے سوا کیا ہے کہ وہی مالک و خالق کائنات کی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ اس کی بنانے والی ہے۔

اس کے بعد اسی طرح پانی جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتے، آگ جس پر اپنا کھانا پکاتے ہیں اور اپنی صنعتوں کو اس سے چلاتے ہیں ان سب کی تخلیق پر ایسے ہی سوال و جواب کا ذکر فرمایا، اور آخر میں سب کو

(اور اس لئے توحید و وقوعِ قیامت کا انکار کرتے ہو، سو (اگر یہ انکار حق ہے تو) جس وقت (مرنے کے قریب کسی شخص کی) روح حلق تک آپہنچتی ہے اور تم اس وقت (بیٹھے حسرت آلودہ نگاہ سے) تکا کرتے ہو اور ہم (اس وقت) اس (مرنے والے) شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں (یعنی تم سے بھی زیادہ اس شخص کے حال سے واقف ہوتے ہیں، کیونکہ تم صرف ظاہری حالت دیکھتے ہو اور ہم اس کی باطنی حالت پر بھی مطلع ہوتے ہیں) لیکن (ہمارے اس قرب علمی کو بوجہ اپنے جہل و کفر کے) تم سمجھتے نہیں ہو تو (فی الواقع) اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے (جیسا تمہارا خیال ہے) تو تم اس روح کو (بدن کی طرف) پھر کیوں نہیں لوٹا لاتے ہو جس کی اس وقت تم کو تمنا بھی ہوا کرتی ہے اگر (اس انکارِ قیامت و حساب میں) تم سچے ہو (مطلب یہ کہ قرآن صادق ہے اور وقوع بعث کا ناطق ہے، پس مقتضی وقوع متحقق ہوا اور مانع کوئی امر نہیں پس وقوع ثابت ہوگیا اور اس پر بھی تمہارا انکار اور نفی کئے چلے جانا بدلالتِ حال اس کو مستلزم ہے کہ گویا تم روح کو اپنے بس میں سمجھتے ہو کہ گو قیامت میں خدا دوبارہ روح ڈالنا چاہے جیسا کہ مقتضیٰ قرآن کا ہے مگر ہم نہ ڈالنے دیں گے اور بعث نہ ہونے دیں گے جب ہی تو ایسے زور سے نفی کرتے ہو، ورنہ جو اپنے کو عاجز جانے وہ دلائل وقوع کے بعد ایسے زور کی بات کیوں کہے، سو اگر تم اپنے بس میں سمجھتے ہو تو ذرا اپنا زور اسی وقت دکھلا دو جبکہ کسی قریب الموت انسان کے بقاءِ حیات کے متمنی بھی ہوتے ہو، اور دیکھ دیکھ کر جسم بھی آتے ہو اور دل گیر بھی ہوتے ہو اور وہ زور دکھلانا یہ کہ اس روح کو نکلنے نہ دو، بدن میں لوٹا دو، جب اس پر بس نہیں کہ روح کو بدن سے نکلنے نہ دو تو اس کو دوبارہ پیدا کرنے سے روکنے پر کیسے تمہارا بس چلے گا، پس ایسے لاطائل دعوے کیوں کرتے ہو اور چونکہ مقام ہے نفی قدرت کا، اور نفی علم مستلزم ہے نفی تعلق قدرت کو، اس لئے نَحْنُ اَقْرَبُ جملہ معترضہ میں ان کے عدم تام کی نفی فرما دی، اور چونکہ یہ دلیل کافی ان کے لئے شافی نہ ہوئی اس لئے لَا تُبْصِرُوْنَ میں توبیخ بھی فرما دی، اور چونکہ اس تقریر سے اثبات قدرت بھی ہوا اس سے بعث کے ساتھ یہ توحید کی بھی دلیل ہے آگے کیفیت مجازات کی ارشاد ہے، یعنی یہ تو ثابت ہو چکا کہ قیامت اپنے وقت پر ضرور ہی آوے گی) پھر (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا (جن کا ذکر اوپر آیا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الخ) اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں، اور آرام کی جنت ہے اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا (جن کا ذکر اوپر آیا ہے وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ الخ) تو اس سے کہا جاوے گا کہ تیرے لئے (ہر آفت اور خطرہ سے) امن و امان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے، (اور یہ کہنا خواہ ابتداءً ہو اگر فضل یا توبہ کے سبب فوری مغفرت ہو جاوے یا انتہاءً ہو اگر بعد سزا کے مغفرت ہو اور یہاں روح و ریحان کا ذکر نہ فرمانا نفی کے لئے نہیں بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سابقین سے ان امور میں کم ہوگا) اور جو شخص جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں میں سے ہوگا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہوگی اور دوزخ میں داخل ہونا ہوگا، بیشک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کے یہ تصرفات ہیں) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (و تحمید) کیجئے (وقد مر نظیرہ)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں عقلی دلائل سے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس دنیاوی تخلیق کے ذریعہ دیا گیا تھا، آگے نقلی دلیل ہے، کہ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے قسم کے ساتھ دی گئی ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ، لفظ لا قسم کے شروع میں ایک عام محاورہ ہے جیسے لا واللہ اور جاہلیت کی قسموں میں لا زیادہ بکثرت مشہور ہے، بعض حضرات نے اس حرف لا کو زائد قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کی توجیہ یہ کی کہ اس موقع میں حرف لا مخاطب کے گمان کی نفی کے لئے ہوتا ہے لا یعنی لیس کما تقول یعنی جیسا تم کہتے اور سمجھتے ہو وہ بات نہیں، بلکہ حقیقت وہ ہے جو آگے قسم کھا کر بتلائی جاتی ہے۔

مواقع، موقع کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ یا وقت، اس آیت میں ستاروں کی قسم کو غروب کے وقت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، جیسے سورۂ نجم میں بھی وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى میں بھی وقت غروب کی قید ہے، اس قید کی حکمت یہ ہے کہ غروب کے وقت ہر ستارے کے عمل کا اس افق سے خاتمہ نظر آتا ہے اور اس کے آثار کی فنا کا مشاہدہ ہوتا ہے، جس سے ان کا حادث اور قدرت الٰہیہ کا محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ، فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ، لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ، سابقہ آیات میں مواقع نجوم کی قسم کھا کر جو مضمون جواب قسم کا بیان کرنا ہے وہ ان آیات میں مذکور ہے، جس کا حاصل قرآن کریم کا مکرم و محفوظ ہونا اور مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا یا معاذ اللہ شیطان کا القاء کیا ہوا کلام ہے۔

کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ کے لفظی معنی چھپی ہوئی مستور کتاب، مراد اس سے لوح محفوظ ہے، لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ، یہاں دو مسئلے غور طلب اور ائمہ تفسیر میں مختلف فیہ ہیں، اول یہ کہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے اس جملے میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ جس کتاب کی ایک صفت مکنون آئی یہ جملہ اسی کتاب کی دوسری صفت ہے، اور ضمیر لَا يَمَسُّهٗ کی اسی کتاب کی طرف راجع ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوتے ہیں کہ کتاب مکنون یعنی لوح محفوظ کو سوائے پاک لوگوں کے اور کوئی نہیں چھو سکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں مطہرون سے مراد صرف فرشتے ہی ہو سکتے ہیں جن کی رسائی لوح محفوظ تک ہو سکے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ مس اپنے حقیقی معنی ہاتھ سے چھونے کے مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا، بلکہ مس کرنے اور چھونے کے مجازی اور لازمی معنی مراد لینے ہوں گے، یعنی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے مضامین پر مطلع ہونا، کیونکہ لوح محفوظ کو ہاتھ سے چھونا کسی مخلوق فرشتے وغیرہ کا کام نہیں (قرطبی) بیان القرآن کے مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں یہی ترکیب اور مفہوم اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔

دوسرا احتمال اس جملے کی ترکیب نحوی میں یہ ہے کہ اس کو قرآن کی صفت بنایا جائے جو اوپر لَقُرْاٰنٌ

ابن عباسؓ کی حدیث جو بخاری و مسلم میں ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث جو مسند احمد میں ہے اس سے بغیر وضو کے تلاوتِ قرآن فرمانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس لئے فقہاء نے بے وضو تلاوت کی اجازت دی ہے (تفسیر مظہری)

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ، مُدْہِنُوْن، اِدْہان سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی تیل کی مالش کرنے کے ہیں، تیل مالش سے اعضاء نرم ہو جاتے ہیں اس سے نرم کرنے اور ناجائز مواقع میں نرمی برتنے کے معنی اور نفاق کے مفہوم میں مستعمل ہونے لگا، آیت مذکورہ میں یہ لفظ آیات الٰہیہ کی تصدیق میں نفاق یا تکذیب کے معنی میں استعمال ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

سابقہ آیات میں پہلے عقلی دلائل سے پھر حق تعالیٰ کی طرف سے ستاروں کی قسم کھا کر اور ان کے غروب اور مغلوب ہونے کی کیفیت کی طرف اشارہ کر کے دو باتیں ثابت کی گئی ہیں، اول یہ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں کسی شیطان و جن وغیرہ کا کوئی تصرف نہیں ہو سکتا جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے۔ دوسرا مسئلہ جو قرآن کے مسائل میں خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ قیامت کا آنا اور سب مُردوں کا زندہ ہو کر رب العزت کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونا ہے، اور اس کے آخر میں منکرین و مکذبین کا ان سب دلائل واضحہ کے خلاف قرآن کی حقانیت اور قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے سے انکار کا ذکر کیا گیا تھا۔

قیامت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے سے انکار یا ان کی طرف سے اس کا دعویٰ ہے کہ ان کی جان اور روح خود ان کے قبضہ میں ہے اور ان کی اپنی زندگی میں ان کا کچھ دخل نہیں ہے، ان کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے آیات مذکورہ میں ایک قریب الموت انسان کا نقشہ دیا ہے کہ جب اس کی روح حلق میں آ پہنچتی ہے اور تمام اس مرنے والے کے عزیز و قریب اور دوست احباب سب اس کے حال کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، اور بتقاضائے محبت و تعلق یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کی روح نہ نکلے یہ زندہ رہے، مگر اس وقت سب کو اپنی بیچارگی اور عاجزی کا احساس و اقرار ہوتا ہے کہ کوئی اس مرنے والے کی جان نہیں بچا سکتا، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت اپنے علم و قدرت کے لحاظ سے ہم تمہاری نسبت اُس مرنے والے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، قریب ہونے سے مراد اس کے اندرونی و ظاہری حالات سے واقفیت اور اس پر پوری قدرت کا ہونا ہے، مگر تم ہمارے اس قرب کو اور مرنے والے کے زیر تصرف ہونے کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے، خلاصہ یہ ہے کہ تم سب مل کر اس کی زندگی اور روح کی حفاظت چاہتے ہو مگر تمہاری بات نہیں چلتی، ہم اپنے علم و قدرت کے اعتبار سے اس کے زیادہ قریب ہیں، وہ ہمارے زیر تصرف اور مشیت و حکم کے تابع ہے جس لمحہ میں اس کی روح نکالنا ہم طے کر چکے ہیں اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اس مثال کو سامنے کر کے ارشاد

ہوتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مرنے کے بعد تمہیں زندہ نہیں کیا جا سکتا، اور تم اتنے قوی اور بہادر ہو کہ خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر ہو تو ذرا اپنی قوت و قدرت کا امتحان یہیں کر دیکھو کہ اس مرنے والے کی روح کو نکلنے سے بچا لو یا نکلنے کے بعد اس میں لوٹا دو، اور جب تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی گرفت سے باہر سمجھنا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے سے انکار کرنا کس قدر بے عقلی کی علامت ہے۔

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ، سابقہ آیات میں مختلف دلائل اور مختلف عنوانات سے یہ واضح کر دیا گیا کہ دنیا کی موجودہ زندگی کا ایک روز ختم ہو جانا اور مرنے کے وقت سب عزیزوں، دوستوں، حبیبوں کا عاجز ہو جانا روز مشاہدہ میں آتا ہے اسی طرح اس کو بھی یقینی سمجھو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے، اور حساب کے بعد جزاء و سزا بھی یقینی ہے، اور جزاء و سزا میں کل مخلوق کا تین گروہوں میں تقسیم ہو جانا اور ہر ایک کی جزاء کا الگ الگ ہونا جو شروع سورت میں بیان ہو چکا ہے اس کا اجمال پھر یہاں ذکر کر دیا گیا کہ مرنے کے بعد اگر یہ شخص مقربین یعنی سابقین کے گروہ میں سے ہے تو راحت ہی راحت آرام ہی آرام ہے، اور اگر سابقین مقربین میں نہیں مگر اصحاب الیمین یعنی عام مومنین صالحین میں سے ہے تو بھی جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہوگا، اور اگر تیسرے گروہ یعنی اصحاب الشمال کفار و مشرکین میں سے ہوا تو جہنم کی آگ اور کھولتے ہوئے پانی سے اس کو سابقہ پڑے گا، آخر میں فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ، یعنی یہ جو کچھ بیان کیا گیا جس کا ذکر اوپر آیا ہے حق اور بالکل یقینی امر ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ، ختم سورت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رب کے نام کی تسبیح پڑھتے رہئے یعنی اس کی پاکی تمام ان چیزوں سے جو اس کے لائق نہیں بیان کرتے رہئے، اس میں نماز کی تسبیحات بھی داخل ہیں اور خارج نماز کی تسبیحات بھی، اور خود نماز کو بھی بعض اوقات تسبیح سے تعبیر کر دیا جاتا ہے تو یہ حکم نماز کے اہتمام کا بھی ہو گیا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت

سورۃ الواقعۃ بحمد اللہ وعونہ
لیلۃ الثلاثاء لعشرین من ربیع الثانی
سنہ ۱۳۹۱ھ ویتلوہ ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ الحدید

سُوْرَةُ الْحَدِيْد

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ حدید مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی انتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ لَهٗ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا، اسی کا

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾

راج ہے آسمانوں کا اور زمین کا، جِلاتا ہے اور مارتا ہے، اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾

وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پیچھے اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا

عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ

تخت پر جانتا ہے جو اندر جاتا ہے زمین کے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ اترتا ہے

مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا

آسمان سے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو اور اللہ جو

(کے اجزاء) کو رات میں داخل کرتا ہے (جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے) اور اس قدرت کے ساتھ اس کا علم ایسا ہے کہ) وہ دل کی باتوں (تک) کو جانتا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ حدید کی ایک خصوصیت: پانچ سورتوں کو حدیث میں مسبّحات سے تعبیر کیا گیا ہے جن کے شروع میں سبّح یا یسبّح آیا ہے، ان میں سے پہلی یہ سورت حدید ہے، دوسری حشر، تیسری صف، چوتھی جمعہ، پانچویں تغابن، ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے پہلے مسبّحات پڑھا کرتے تھے اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں ایک آیت ایسی ہے جو ہزار آیتوں سے افضل ہے، ابن کثیرؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ افضل آیت سورۂ حدید کی یہ آیت ہے (هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ)۔

ان پانچ سورتوں میں سے تین یعنی حدید، حشر، صف میں تو لفظ سَبَّحَ بصیغۂ ماضی آیا ہے، اور آخری دو یعنی جمعہ اور تغابن میں یُسَبِّحُ بصیغۂ مضارع، اس میں اشارہ اس طرف ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذکر ہر زمانے ہر وقت ماضی، مستقبل اور حال میں جاری رہنا چاہئے (مظہری)

وساوس شیطانیہ کا علاج: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر کبھی تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ اور دین حق کے معاملے میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرو: هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (ابن کثیر)

اس آیت کی تفسیر اور اول و آخر، ظاہر و باطن کے معنی میں حضرات مفسرین کے اقوال دس سے زیادہ منقول ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں، سبھی کی گنجائش ہے، لفظ اول کے معنی تو تقریباً متعین ہیں، یعنی وجود کے اعتبار سے تمام موجودات و کائنات سے مقدم اور پہلے ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لئے وہ سب سے اول ہے اور آخر کے معنی بعض حضرات نے یہ کئے ہیں کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، جیسا کہ آیت (كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ) میں اس کی تصریح ہے، اور فنا سے مراد عام ہے خواہ فنا و عدم کا وقوع ہو جائے جیسے قیامت کے روز تمام مخلوقات فنا ہو جاوے گی یا فنا کا وقوع نہ ہو، مگر اس کی فنا و عدم ممکن ہو، وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرہ سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں اس کی مثال جنت و دوزخ اور ان میں داخل ہونے والے، جیسے بڑے انسان ہیں کہ ان کا وجود فنا نہیں ہوگا مگر باوجود وقوع فنا نہ ہونے کے امکان و احتمال فنا سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ بھی اس کا امکان ہے، اس لئے اس کو سب سے آخر کہہ سکتے ہیں۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کے متعلق لیا گیا ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم مومن ہو، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام ان کفار سے ہو رہا ہے جن کے مومن نہ ہونے پر تنبیہ اس سے پہلے آ چکی ہے، وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ، پھر ان کو یہ **کہنا کیسے درست ہوگا کہ "اگر تم مومن ہو"**

جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین بھی اللہ تعالیٰ پر تو ایمان کے مدعی تھے بتوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ہم ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ تم جو اللہ پر ایمان رکھنے کے مدعی ہو اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو پھر ایمان باللہ کی صحیح اور معتبر صورت اختیار کرو جو اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لاؤ۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، میراث اصل میں اُس ملکیت کو کہا جاتا ہے جو پچھلے مالک کے انتقال کے بعد اس کے بعد زندہ رہنے والے وارثوں کو ملا کرتی ہے، اور یہ ملک جبری ہوتی ہے مرنے والا چاہے یا نہ چاہے، جو وارث ہوتا ہے ملکیت اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، یہاں حق تعالیٰ کی ملکیت آسمان و زمین کو میراث کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تم چاہو یا نہ چاہو جس جس چیز کے مالک آج تم سمجھے جاتے ہو وہ سب بالآخر حق تعالیٰ کی ملکیت خاصہ میں منتقل ہو جائے گی، مراد یہ ہے کہ اگرچہ حقیقی مالک تمام اشیاء عالم کا پہلے بھی حق تعالیٰ ہی تھا مگر اس نے اپنے فضل سے کچھ اشیاء کی ملکیت تمہارے نام کر دی تھی، اور اب وہ ظاہری ملکیت بھی تمہاری باقی نہیں رہے گی، بلکہ حقیقۃً اور ظاہراً ہر طرح اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہو جائے گی، اس لئے اس وقت جبکہ تمہیں ظاہری ملکیت حاصل ہے اگر تم اللہ کے نام پر خرچ کر دو گے تو اس کا بدل تمہیں آخرت میں مل جائے گا، اس طرح گویا اللہ کی راہ میں خرچ کی ہوئی چیز کی ملکیت تمہارے لئے دائمی ہو جاتی ہے۔

ترمذی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم نے ایک بکری ذبح کی جس کا اکثر حصہ تقسیم کر دیا، صرف ایک دست گھر کے لئے رکھ لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس بکری کے گوشت میں سے تقسیم کے بعد کیا باقی رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک دست رہ گیا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ساری بکری باقی رہی صرف یہ دست باقی نہیں رہا جس کو تم باقی سمجھ رہی ہو، کیونکہ ساری بکری اللہ کی راہ میں خرچ کر دی گئی، وہ اللہ کے یہاں تمہارے لئے باقی رہے گی اور یہ دست جو اپنے

کھانے کے لئے رکھا ہے، اس کا آخرت میں کوئی معاوضہ نہیں اس لئے یہ یہیں فنا ہو جائے گا، (مظہری)

گذشتہ آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید بیان فرمانے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ جس وقت بھی خرچ کیا جائے ثواب تو ہر ایک پر ہر ایک حال میں ملے گا، لیکن ثواب کے درجات میں ایمان و اخلاص اور مسابقت کے اعتبار سے فرق ہوگا، اس کے لئے فرمایا:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، یعنی مسلمانوں میں فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لے آئے، اور مومن ہو کر اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا، دوسرے وہ جو فتح مکہ کے بعد جہاد میں شریک ہوئے اور فی سبیل اللہ خرچ میں بھی، یہ دونوں قسمیں اللہ کے نزدیک برابر نہیں بلکہ درجات ثواب کے اعتبار سے ان میں تفاضل ہے، فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے اور جہاد کرنے والے اور خرچ کرنے والے درجۂ ثواب کے اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں، دوسری قسم سے یعنی جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد اسلامی خدمت میں شرکت کی،

فتح مکہ کو صحابہ کرام کے درجات متعین کرنے کے لئے حد فاصل قرار دینے کی حکمت

آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے دو طبقے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو کر اسلامی خدمت میں حصہ لیا، دوسرے وہ لوگ جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہ کام کیا، پہلے لوگوں کا درجہ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہونے کا اعلان اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

فتح مکہ میں ان دونوں طبقوں میں حد فاصل قرار دینے کی ایک بڑی حکمت تو یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے پہلے سیاسی حالات اور اسباب ظاہرہ کے اعتبار سے مسلمانوں کی بقاء و فنا اور اسلام کے آگے بڑھنے پیچھے یا بہت سی تحریکات کی طرح فنا ہو جانے کے احتمالات ظاہر بیں نظروں میں یکساں طور سے گردش کرتے رہتے تھے، دنیا کے ہوشیار لوگ کسی ایسی جماعت یا تحریک میں شرکت نہیں کیا کرتے جس کے شکست کھا جانے یا ختم ہو جانے کا خطرہ سامنے ہو، انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں، جب کامیابی کے امکانات روشن ہو جائیں تو شریک ہو جاتے ہیں، اور بعض لوگ اگرچہ اس کو حق و صحیح سمجھتے ہوں لیکن مخالفین کی ایذاؤں کے خوف اور اپنے ضعف کے سبب شرکت کرنے کی ہمت نہیں کرتے، لیکن باعزم و ہمت لوگ جو کسی نظریہ اور عقیدہ کو صحیح اور حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں وہ فتح و شکست اور جماعت کی قلت و کثرت پر نظر کئے بغیر اس کے قبول کی طرف دوڑتے ہیں،

فتح مکہ سے پہلے جو لوگ ایمان لائے ان کے سامنے مسلمانوں کی قلت اور ضعف اور اس کی وجہ سے مشرکین کی ایذاؤں کا سلسلہ تھا، خصوصاً ابتداء اسلام کے وقت کہ اسلام و ایمان کا اظہار کرنا اپنی جان کی بازی لگانے اور اپنے گھر بار کو ہلاکت کے لئے پیش کر دینے کے مرادف تھا، یہ ظاہر ہے کہ

کہ ان حالات میں جنھوں نے اسلام قبول کرکے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور دین کی خدمت میں اپنے جان و مال کو لگایا ان کی قوت، ایمان اور اخلاص عمل کو دوسرے لوگ نہیں پہونچ سکتے۔

رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی گئی، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ فتح ہوکر پورے عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، اس وقت جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا، یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج ہوکر داخل ہوں گے اس کا ظہور ہوا کیونکہ بہت سے لوگ اسلام کی حقانیت پر تو یقین رکھتے تھے، مگر اپنے ضعف اور مخالفین اسلام کی قوت و شوکت اور ان کی ایذاؤں کے خوف سے اسلام و ایمان کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے تھے، اب انکی راہ سے یہ رکاوٹ دور ہوگئی، تو فوج در فوج ہوکر اسلام میں داخل ہوگئے، قرآن کریم کی اس آیت نے ان کا بھی اکرام و احترام کیا ہے اور ان کے لئے بھی مغفرت و رحمت کا وعدہ دیا ہے، لیکن یہ بتلادیا کہ ان کا درجہ اور مقام ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا، جنھوں نے اپنی ہمت و اولوالعزمی اور قوتِ ایمان کے سبب مخالفتوں اور ایذاؤں کے خوف و خطرے سے بالاتر ہوکر اسلام کا اعلان کیا، اور آڑے وقت میں اسلام کے کام آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عزم و ہمت اور قوتِ ایمان کے درجات متعین کرنے کے لئے فتح مکہ سے پہلے اور بعد کے حالات ایک حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ یہ دونوں طبقے برابر نہیں ہوسکتے۔

تمام صحابہ کرام کے لئے مغفرت و رحمت کی بشارت، و صحابہ کا باقی ملت سے امتیاز

آیاتِ مذکورہ میں اگرچہ صحابہ کرام میں باہمی درجات کا تفاضل ذکر کیا گیا ہے لیکن آخر میں فرمایا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، یعنی باوجود باہمی فرق مراتب کے اللہ تعالیٰ نے حُسنیٰ یعنی جنت و مغفرت کا وعدہ سب ہی کے لئے کرلیا ہے، یہ وعدہ صحابہ کرام کے ان دونوں طبقوں کے لئے ہے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے یا بعد میں اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور مخالفینِ اسلام کا مقابلہ کیا، اس میں تقریباً صحابہ کرام کی پوری جماعت شامل ہوجاتی ہے، کیونکہ ایسے افراد تو شاذ و نادر ہی ہوسکتے ہیں جنھوں نے مسلمان ہوجانے کے باوجود اللہ کے لئے کچھ خرچ بھی نہ کیا ہو اور مخالفینِ اسلام کے مقابلہ و مقاتلہ میں بھی شریک نہ ہوئے ہوں، اس لئے قرآن کریم کا یہ اعلانِ مغفرت و رحمت پوری جماعت صحابہ کرام کے لئے عام و شامل ہے۔

ابن حزم نے فرمایا کہ اس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیت سورۃ انبیاء کو ملاؤ جس میں فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ

وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۔ یعنی جن لوگوں کے لئے ہم نے حُسنیٰ کو مقدر کر دیا ہے وہ جہنم سے ایسے دور رہیں گے کہ اس کی ہلکی سی آواز بھی ان کے کانوں تک نہ پہونچے گی، اور اپنی دلخواہ نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیت زیر بحث میں وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى مذکور ہے اور اس آیت میں جن کے لئے حسنیٰ کا وعدہ ہو ان کے لئے جہنم کی آگ سے بہت دور رہنے کا اعلان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی ضمانت دیدی کہ حضرات صحابہ سابقین و آخرین میں سے کسی سے بھی اگر عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا توبہ کر لے گا یا پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت اور دین کی خدمات عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا، اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہو کر وہ صاف و بیباق ہو جائیں، یا دنیا کے مصائب و آفات اور زیادہ سے زیادہ برزخ میں کوئی تکلیف ان کے سیئات کا کفارہ ہو جائے۔

اور جن احادیث میں بعض صحابہ کرام پر موت کے بعد عذاب کا ذکر آیا ہے وہ عذاب آخرت و عذاب جہنم کا نہیں برزخی یعنی قبر کا عذاب ہے، یہ کوئی بعید نہیں ہے کہ صحابہ کرام میں سے اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اتفاقاً توبہ کر کے اس سے پاک ہو جانے کا بھی موقع نہیں ہوا تو ان کو برزخی عذاب کے ذریعہ پاک کر دیا جائے گا تاکہ آخرت کا عذاب ان پر نہ رہے۔

صحابہ کرام کا مقام قرآن و حدیث میں: خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام عام امت کی طرح نہیں وہ رسول اللہ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک واسطہ ہیں، ان کے بغیر امت کو قرآن پہونچنے کا کوئی راستہ ہے، نہ معانی قرآن اور تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اسلام میں ان کو ایک خاص مقام ہے، ان کے مقامات کتب تاریخ کی رطب و یابس روایات سے نہیں پہچانے جاتے، بلکہ قرآن و سنت کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں۔

ان میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش اور غلطی بھی ہوئی ہے تو اکثر وہ اجتہادی خطا ہوتی ہے جس پر کوئی گناہ نہیں، بلکہ حسب تصریح حدیث صحیح ایک اجر ملتا ہے، اور اگر ... فی الواقع کوئی گناہ ہی ہو گیا تو اول وہ ان کے عمر بھر کے اعمال حسنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی نصرت و خدمت کے مقابلہ میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے، پھر ان میں خشیت اور خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے گناہ سے بھی لرز جاتے اور فوراً توبہ کرتے اور اپنے نفس پر اس کی سزا جاری کرنے کے لئے کوشش کرتے تھے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا اور جب تک توبہ قبول ہو جانے کا یقین نہ ہو جائے بندھا کھڑا رہتا تھا، اور پھر ان میں سے ہر ایک کی حسنات اتنی ہیں کہ وہ خود گناہوں کا کفارہ

ہو جاتی ہیں، اُن سب پر مزید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطاؤں کی مغفرت کا عام اعلان اس آیت میں اور دوسری آیات میں فرما دیا، اور صرف مغفرت ہی نہیں بلکہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ فرما کر اپنی رضا کی بھی سند دیدی، اس لئے اُن کے آپس میں جو اختلافات و مشاجرات پیش آئے اُن کی وجہ سے اُن میں سے کسی کو بُرا کہنا یا اُس پر طعن و تشنیع کرنا قطعاً حرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق موجب لعنت اور اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ نعوذ باللہ منہ

آجکل تاریخ کی مجبوری تصحیح، قوی ضعیف روایت کی بناء پر جو بعض لوگوں نے بعض حضرات صحابہ کو مورد طعن و الزام بنایا ہے، اوّل تو اس کی بنیاد جو تاریخی روایات ہیں وہ بنیاد ہی متزلزل ہے، اور اگر کسی درجہ میں اُن روایات کو قابل التفات مان بھی لیا جائے تو قرآن و حدیث کے کھلے ہوئے ارشادات کے خلاف اُن کی کوئی حیثیت نہیں رہتی وہ سب مغفور ہیں۔

صحابہ کرام کے بارے میں پوری امت کا اجماعی عقیدہ

یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام کی تعظیم و تکریم، ان سے محبت رکھنا، ان کی مدح و ثنا کرنا واجب ہے، اور ان کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے اُن کے معاملے میں سکوت کرنا، کسی کو مورد الزام نہ بنانا لازم ہے، عقائد اسلامیہ کی تمام کتابوں میں اس اجماعی عقیدہ کی تصریحات موجود ہیں، امام احمدؒ کا رسالہ جو بروایت اصطخری معروف ہے اس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

لَا یَجُوْزُ لِاَحَدٍ اَنْ یَّذْکُرَ شَیْئًا مِّنْ مَّسَاوِیْھِمْ وَلَا یَطْعَنُ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْھُمْ بِعَیْبٍ وَّلَا نَقْصٍ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ وَجَبَ تَادِیْبُہٗ (شرح العقیدۃ الواسطیۃ معروف بہ الدرۃ المضیۃ، ص ۳۸۹)	"کسی کے لئے جائز نہیں کہ صحابہ کرام کی کسی بُرائی کا ذکر کرے، یا اُن میں سے کسی پر طعن کرے یا کوئی عیب، نقصان ان کی طرف منسوب کرے اور جو ایسا کرے اس کو سزا دینا واجب ہے۔"

اور ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں صحابہ کرام کے متعلق فضائل و خصوصیت کی بہت سی آیات اور روایات حدیث لکھنے کے بعد لکھا ہے:-

وَھٰذَا اَمْرٌ لَّا نَعْلَمُ فِیْہِ خِلَافًا بَیْنَ اَھْلِ الْفِقْہِ وَالْعِلْمِ مِنْ اَصْحٰبِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِیْنَ لَھُمْ بِاِحْسَانٍ وَّسَائِرِ اَھْلِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّھُمْ مُجْمِعُوْنَ عَلٰی اَنَّ الْوَاجِبَ الثَّنَاءُ	"جہاں تک ہمارے علم میں ہے ہم اس معاملے میں علماء، فقہاء، صحابہ و تابعین اور تمام اہل سنت والجماعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پاتے کیونکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ امت پر واجب یہ ہے کہ سب صحابہ کرام کی مدح و ثنا کرے اور ان کے لئے استغفار کرے

عَلَيْهِمْ وَالِاسْتِغْفَارُ لَهُمْ وَالتَّرَحُّمُ عَلَيْهِمْ وَالتَّرَضِّيْ عَنْهُمْ وَاعْتِقَادُ مَحَبَّتِهِمْ وَمُوَالَاتِهِمْ وَعُقُوْبَةُ مَنْ اَسَاءَ فِيْهِمُ الْقَوْلَ

اور ان کو اللہ کی رحمت و رضا کے ساتھ ذکر کرے، اُن کی محبت اور دوستی پر ایمان رکھے، اور جو اُن کے معاملہ میں بے ادبی کرے اس کو سزا دے۔

اور ابن تیمیہؒ نے شرح عقیدۂ واسطیہ میں تمام اُمتِ محمدیہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے مشاجراتِ صحابہ کے متعلق لکھا ہے:-

وَيُمْسِكُوْنَ عَمَّا شَجَرَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ وَيَقُوْلُوْنَ هٰذِهِ الْاٰثَارُ الْمَرْوِيَّةُ فِيْ مَسَاوِيْهِمْ مِنْهَا مَا هُوَ كَذِبٌ وَمِنْهَا مَا زِيْدَ فِيْهِ وَنُقِصَ وَغُيِّرَ وَجْهُهٗ وَالصَّحِيْحُ مِنْهُ هُمْ فِيْهِ مَعْذُوْرُوْنَ اِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُصِيْبُوْنَ وَاِمَّا مُجْتَهِدُوْنَ مُخْطِئُوْنَ، وَهُمْ مَعَ ذٰلِكَ لَا يَعْتَقِدُوْنَ اَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ مَعْصُوْمٌ مِّنْ كَبَائِرِ الْاِثْمِ وَصَغَائِرِهٖ بَلْ يَجُوْزُ عَلَيْهِمُ الذُّنُوْبُ فِي الْجُمْلَةِ وَلَهُمْ مِّنَ الْفَضَائِلِ وَالسَّوَابِقِ مَا يُوْجِبُ مَغْفِرَةَ مَا يَصْدُرُ مِنْهُمْ حَتّٰى اِنَّهُمْ يُغْفَرُ لَهُمْ مِّنَ السَّيِّئَاتِ مَا لَا يُغْفَرُ لِمَنْ بَعْدَهُمْ

"اہل السنۃ والجماعۃ سکوت اختیار کرتے ہیں اُن اختلافی معاملات سے جو صحابہ کرام کے درمیان پیش آئے اور یہ کہتے ہیں کہ جو روایات اُن میں سے کسی پر عیب لگانے والی ہیں اُن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض تو بالکل جھوٹ ہیں، اور بعض میں کمی بیشی کر کے ان کی اصل حقیقت بگاڑ دی گئی ہے، اور جو کچھ صحیح ہے وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ کیا اللہ کے لئے کیا اجتہاد سے کیا، اس اجتہاد میں یا وہ صحیح بات پر تھے (تو دوہرے ثواب کے مستحق تھے) یا خطا پر تھے (تو معذور اور ایک ثواب کے مستحق تھے) ان تمام باتوں کے ساتھ وہ اس کے معتقد نہیں کہ ہر صحابی چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہیں بلکہ ان سے گناہ کا صدور ممکن ہے، مگر ان کے فضائل اور سابقہ اعمال اور خدمات ایسی ہیں جو سبب مغفرت کی مقتضی ہیں یہاں تک کہ ان کی مغفرت و معافی اتنی وسیع ہوگی جو مدت میں دوسروں کے لئے نہ ہوگی۔"

مقام صحابہ و ان کے درجات و فضائل پر مفصل بحث سورۂ فتح کی آیات (وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ الخ) کے تحت گذر چکی ہے، اور احقر نے اس بحث پر ایک مفصل رسالہ "مقام صحابہ" کے نام سے لکھ دیا ہے جو جداگانہ شائع ہو چکا ہے جس میں عدالت صحابہ، مشاجرات صحابہ اور ان کے بارے میں تاریخی روایات کی حیثیت اور درجہ کی مکمل تحقیق ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ
کتاب ملی تھی اس سے پہلے پھر دراز گذری ان پر مدت پھر سخت ہو گئے ان کے دل اور بہت
مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا
ان میں نافرمان ہیں۔ جان رکھو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد ہم نے کھول کر
لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ
سنا دیئے تم کو پتے اگر تم کو سمجھ ہے۔ تحقیق جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد اور عورتیں
وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ
اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھی طرح ان کو ملتا ہے دونا اور ان کو ثواب ہے عزت کا۔ اور جو لوگ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ
یقین لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر وہی ہیں سچے ایمان والے اور لوگوں کا احوال بتلانے والے
رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ
اپنے رب کے پاس ان کے واسطے ہے ان کا ثواب اور ان کی روشنی، اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتوں
اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝
کو وہ ہیں دوزخ کے لوگ۔

ع ۳ (۱۵) ۱۸

خلاصۂ تفسیر

(وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن آپ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا (یعنی پل صراط پر چلنے کے لئے ان کے ہمراہ ہوگا، اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف بھی ہوگا کذا فی الدر المنثور، تو تخصیص داہنی جانب کی شاید اس لئے ہو کہ اس طرف نور زیادہ قوی ہو، اور نکتہ اس تخصیص میں شاید یہ ہو کہ یہ علامت ہو ان کے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جانے کی اور سامنے نور ہونا تو ایسے موقع پر عادت متعارفہ ہے) اور ان سے کہا جاوے گا کہ آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے (ظاہر یہ ہے کہ یہ بات بھی اسی وقت کہی جاوے گی اور اس وقت بطور خبر دینے کے کہی جا رہی ہے، اور بشارت کہنے والے غالب فرشتے ہیں لقولہ تعالیٰ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ (۱)

روایت میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھے گا قیامت کے روز اس کے قدموں سے آسمان کی بلندی تک نور چمکے گا۔

(۴) امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن کی ایک آیت بھی تلاوت کرے گا وہ آیت اس کے لئے قیامت کے روز نور ہوگی۔

(۵) دیلمی نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنا پل صراط پر نور کا سبب بنے گا۔

(۶) طبرانی نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حج و عمرہ کے احرام سے فارغ ہونے کے لئے جو سر منڈایا جاتا ہے تو اس میں جو بال زمین پر گرتا ہے وہ قیامت کے روز نور ہوگا۔

(۷) مسند بزار میں حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ منیٰ میں جمرات کی رمی کرنا قیامت کے روز نور ہوگا۔

(۸) طبرانی نے بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس شخص کے بال حالتِ اسلام میں سفید ہو جاویں وہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

(۹) بزار نے بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد میں ایک تیر بھی پھینکے گا اس کے لئے قیامت میں نور ہوگا۔

(۱۰) بیہقی نے شعب الایمان میں بسند منقطع حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بازار میں اللہ کا ذکر کرنے والے کو اس کے ہر بال کے مقابلے میں قیامت کے روز ایک نور ملے گا۔

(۱۱) طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت و تکلیف کو دور کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے پل صراط پر نور کے دو شعبے بنا دیں گے جس سے ایک جہان روشن ہو جائے گا جس کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

(۱۲) بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے اور مسلم نے حضرت جابرؓ سے اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے اور طبرانی نے ابن زیاد سے روایت کیا ہے کہ ان سب نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اِیَّاکُمْ وَالظُّلْمَ فَاِنَّہٗ ھُوَ الظُّلُمٰتُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ) یعنی تم ظلم سے بہت بچو، کیونکہ ظلم ہی قیامت کے روز ظلمات و اندھیری ہوگی۔

نعوذ باللہ من الظلمات ونسألہ النور التام یوم القیٰمۃ

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ،

یعنی اس روز جب منافق مرد اور منافق عورتیں مومنین سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھالیں۔

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹو جہاں پر نور تقسیم ہوتا
وہیں نور تلاش کرو، یہ بات یا تو مومنین ان کے جواب میں کہیں گے یا فرشتے جواب دیں گے (کما ذکر عن
ابن عباس وقتادۃ قولین)

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ یعنی
مومنین یا فرشتوں کا جواب سن کر منافقین اس جگہ کی طرف لوٹیں گے جہاں نور تقسیم ہوا تھا وہاں کچھ نہ
پائیں گے تو پھر اس طرف آئیں گے، اس وقت یہ مومنین تک پہونچنے نہ پائیں گے بلکہ ان کے اور مومنین کے
درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کے اندر کی طرف جہاں مومنین ہوں گے رحمت ہوگی اور اس طرف
جہاں منافقین ہوں گے عذاب ہوگا۔

روح المعانی میں ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ یہ دیوار اعراف ہوگی جو مومنین و کفار کے درمیان
حائل کر دی جائے گی اور بعض دوسرے مفسرین نے دیوار اعراف کے علاوہ کوئی دوسری دیوار قرار دی
اور اس دیوار میں جو دروازہ رکھا جائے گا وہ اس لئے کہ اس کے راستے سے مومنین و کفار میں باہم گفتگو
ہوگی یا مومنین کے اسی دروازے سے گذرنے کے بعد بند کر دیا جائے گا۔

فائدہ: اس نور کے معاملے میں کفار کا کہیں ذکر نہیں آیا، کیونکہ ان میں نور کا کوئی احتمال
ہی نہ تھا، منافقین کے بارے میں دو روایتیں آئی ہیں کہ شروع ہی سے ان کو نور نہ ملے گا، یا ملنے کے
بعد پل صراط پر چلنے کے وقت بجھ دیا جائے گا، اور ان کے اور مومنین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی
جائے گی۔ اس مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پل صراط کے ذریعہ جہنم کو پار کرنا یہ صرف مومنین کے لئے ہوگا
کفار و مشرکین پل صراط پر نہیں چڑھیں گے، وہ جہنم کے دروازوں کے راستے جہنم میں ڈال دیئے
جاویں گے، اور مومنین پل صراط کے راستے سے گذریں گے، پھر گناہگار مومن جن کے لئے ان کے اعمال
کی سزا مقدر ہے جہنم میں ہے وہ اس پل صراط سے گر کر جہنم میں پہونچیں گے، باقی مومنین صحیح سالم گذر کر
جنت میں داخل ہوں گے۔ (حضرت شاہ عبدالقادر الدہلوی وغیرہ فی الدنیا واللہ اعلم)

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ
کیا اب بھی وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے قلب اللہ کے ذکر کے لئے جھک جائیں
اور نرم ہو جائیں اور اس قرآن کے لئے جو ان پر نازل کیا گیا۔

خشوع قلب سے مراد دل کا نرم ہونا اور وعظ و نصیحت کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے
(ابن کثیر)، قرآن کے لئے خشوع یہ ہے کہ اس کے احکام اوامر و نواہی کی مکمل اطاعت کے لئے تیار
ہو جائے، اور اس پر عمل کرنے میں کسی سستی اور کمزوری کو راہ نہ دے (روح المعانی)

یہ عتاب و تنبیہ مومنین کو ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا

سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی اور دنیا کی زندگانی تو یہی

إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

ہے مال دغا کا، دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف کو اور بہشت کو جس کا پھیلاؤ ہے

كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ

جیسے پھیلاؤ آسمان اور زمین کا، تیار رکھی گئی ہے واسطے ان کے جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، یہ

فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢١﴾

فضل اللہ کا ہے دیوے اس کو جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے

خلاصۂ تفسیر

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات (ہرگز قابل اشتغال نہیں کیونکہ) محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا (قوت و جمال اور دنیوی سامان میں) اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی مقاصد دنیا کے یہ ہیں کہ بچپن میں لہو و لعب کا غلبہ رہتا ہے اور جوانی میں زینت و تفاخر کا اور بڑھاپے میں مال و دولت اور اولاد کو گنانا) اور یہ سب مقاصد فانی و غیر معتد بہا ہیں (اور) اس کی ایسی مثال ہے جیسے مینہ برستا ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیا چند روزہ بہار ہے پھر زوال و اضمحلال، یہ تو دنیا کی حالت ہوئی) اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں ایک تو کفار کے لئے) عذاب شدید ہے اور (دوسری اہل ایمان کے لئے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں پس آخرت تو باقی ہے) اور دنیوی زندگانی محض (ایسی) ہے جیسے فرض کرو کہ ایک دھوکہ کا اسباب ہو کذا ورد فی تفسیرہ فی آل عمران قریبا من ہذا (پس جب متاع دنیا فانی اور دولت آخرت باقی ہے جو ایمان کی بدولت نصیب ہوتی ہے تو تم کو چاہئے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور نیز ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے (یعنی اس سے کم کی نفی ہے، زیادہ کی نفی نہیں اور) وہ ان لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور) یہ (مغفرت و رضوان) اللہ کا فضل ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اور اس میں اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر کوئی مغرور نہ ہو، اور اپنے عمل پر مستحق جنت کا مدعی نہ ہو، یہ محض فضل ہے جس کا مدار ہماری مشیت پر ہے، مگر ہم نے اپنی رحمت سے ان عملوں کے کرنے والوں کے ساتھ مشیت متعلق کرلی، اگر ہم چاہتے تو مشیت نہ کرتے کہ نقدیرہ تتعلق بغیرہم ۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اہل جنت کے اور اہل جہنم کے حالات کا بیان تھا، جو آخرت میں پیش آئے گا اور دائمی ہوگا، اور آخرت کی نعمتوں سے محروم اور عذاب میں گرفتار ہونے کا بڑا سبب انسان کیلئے دنیا کی فانی لذتیں اور ان میں منہمک ہو کر آخرت سے غفلت ہوتا ہے، اس لئے ان آیات میں دنیا فانی کا ناقابل اعتماد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ابتداء عمر سے آخر تک جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اور جس میں دنیا دار منہمک و مشغول اور اسی پر خوش رہتے ہیں اس کا بیان ترتیب کے ساتھ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کا خلاصہ بہ ترتیب چند چیزیں اور چند حالات ہیں، پہلے لعب پھر لہو پھر زینت پھر تفاخر، پھر مال و اولاد کی کثرت پر ناز و فخر۔

لعب وہ کھیل ہے جس میں فائدہ مطلق پیش نظر نہ ہو، جیسے بہت چھوٹے بچوں کی حرکتیں، اور لہو وہ کھیل ہے جس کا اصل مقصد تو تفریح اور دل بہلانا اور وقت گذاری کا مشغلہ ہوتا ہے ضمنی طور پر کوئی ورزش یا دوسرا فائدہ بھی اس میں حاصل ہو جاتا ہے جیسے بڑے بچوں کے کھیل، گیند، شنا وری، نشانہ بازی وغیرہ، حدیث میں نشانہ بازی اور تیرنے کی مشق کو اچھا کھیل فرمایا ہے، زینت بدن اور لباس وغیرہ کی معروف ہے، ہر انسان اس دور سے گذرتا ہے کہ عمر کا بالکل ابتدائی حصہ تو خالص کھیل یعنی لعب میں گذرتا ہے، اس کے بعد لہو شروع ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو اپنے تن بدن اور لباس کی زینت کی فکر ہونے لگتی ہے اس کے بعد ہمعصروں ہم عمروں سے آگے بڑھنے اور ان پر فخر جتلانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

اور انسان پر جتنے دور اس ترتیب سے آتے ہیں غور کرو تو ہر دور میں وہ اپنے اسی حال پر قانع اور اسی کو سب سے بہتر جانتا ہے، جب ایک دور سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو سابقہ دور کی کمزوری اور لغویت سامنے آجاتی ہے، بچے ابتدائی دور میں جن کھیلوں کو اپنا سرمایہ زندگی اور سب سے بڑی دولت جانتے ہیں، کوئی ان سے چھین لے تو ان کو ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے جیسا کہ کسی بڑے آدمی کا مال و اسباب اور کوٹھی بنگلہ چھین لیا جائے، لیکن اس دور سے آگے بڑھنے کے بعد اس کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے اس وقت مقصود زندگی بنایا ہوا تھا وہ کچھ نہ تھیں، سب خرافات تھیں۔ بچپن میں لعب، پھر لہو میں مشغولیت، پھر جوانی میں زینت اور تفاخر کا مشغلہ ایک مقصد بنا رہا، بڑھاپا آیا، اب مشغلہ تکاثر فی الاموال والاولاد کا ہو گیا، کہ اپنے مال و دولت کے اعداد و شمار اور اولاد

حال مؤمنین کا ہے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے۔

یہاں عذاب کا ذکر پہلے کیا گیا کیونکہ دنیا میں مست و مغرور ہونا جو پہلی آیت میں مذکور ہے اس کا نتیجہ بھی عذاب شدید ہے اور عذاب شدید کے مقابلہ میں دو چیزیں ارشاد فرمائیں، مغفرت اور رضوان، جس میں اشارہ ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی ایک نعمت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی عذاب سے بچ جاتا ہے مگر یہاں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عذاب سے بچ کر پھر جنت کی دائمی نعمتوں سے بھی سرفراز ہوتا ہے جس کا سبب **رضوان یعنی حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔**

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو مختصر الفاظ میں بیان فرمایا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ، یعنی ان سب باتوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد ایک عاقل و بصیر انسان کے لئے اس کے سوا کوئی نتیجہ دنیا کے بارے میں نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اصلی سرمایہ نہیں جو آڑے وقت میں کام آئے، پھر آخرت کے عذاب و ثواب اور دنیا کی بے ثباتی بیان فرمانے کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے کہ انسان دنیا کی لذتوں میں منہمک نہ ہو آخرت کی نعمتوں کی فکر زیادہ کرے اس کا بیان اگلی آیت میں اس طرح آیا:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ، یعنی مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کی برابر ہے۔

مسابقت کرنے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ عمر اور صحت و قدرت کا کچھ بھروسہ نہیں، نیک عمل میں تاخیر اور ٹال مٹول نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی بیماری یا عذر آ کر تمہیں اس کام کے قابل نہ چھوڑے یا موت ہی آ جائے تو حاصل مسابقت کا یہ ہے کہ عجز و ضعف اور موت سے مسابقت کرو، ان کے آنے سے پہلے پہلے ایسے اعمال کا ذخیرہ **کرلو جو جنت تک پہونچانے کا ذریعہ بن سکیں۔**

اور مسابقت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ نیک اعمال میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، جیسے کہ حضرت علیؓ نے اپنی نصائح میں فرمایا کہ تم مسجد میں سب سے پہلے جانے والے اور سب سے آخر میں نکلنے والے بنو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جہاد کی صفوف میں سے پہلی صف میں رہنے کے لئے بڑھو، حضرت انسؓ نے فرمایا کہ جماعت نماز میں پہلی تکبیر میں حاضر رہنے کی کوشش کرو۔ (روح)

جنت کی تعریف میں فرمایا کہ اس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہوگا، سورۂ آل عمران میں بھی اسی مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے، اس میں لفظ سموات جمع کے ساتھ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آسمان سے مراد ساتوں آسمان ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت کو ایک جگہ جمع کر لو تو وہ جنت کا عرض ہو، یعنی چوڑائی، اور یہ ظاہر ہے کہ طول ہر چیز کا اس کے عرض سے زائد ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جنت کی وسعت ساتوں آسمانوں اور زمین کی وسعت سے بڑھی ہوئی ہے، اور لفظ عرض کبھی مطلق وسعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس میں طول کا مقابلہ مقصود نہیں ہوتا، دونوں صورتوں میں جنت کی

میں جو کچھ مصیبت یا راحت، خوشی یا غم انسان کو پیش آتا ہے وہ سب حق تعالیٰ نے لوح محفوظ میں انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لکھ رکھا ہے، اس کی اطلاع تمھیں اس لئے دی گئی ہے تاکہ تم دنیا کے اچھے برے حالات پر زیادہ دھیان نہ دو، نہ یہاں کی تکلیف و مصیبت یا نقصان و فقدان کچھ زیادہ حسرت و افسوس کرنے کی چیز ہے، اور نہ یہاں کی راحت و عیش یا مال و متاع کچھ زیادہ خوش و مست ہونے کی چیز ہے جس میں **مشغول ہو کر اللہ کی یاد اور آخرت سے غافل ہو جاؤ۔**

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہر انسان طبعی طور پر بعض چیزوں سے خوش ہوتا ہے بعض سے غمگین، لیکن ہونا یہ چاہئے کہ جس کو کوئی مصیبت پیش آئے وہ اس پر صبر کر کے آخرت کا اجر و ثواب کمائے اور جو کوئی راحت و خوشی پیش آئے وہ اس پر شکر گذار ہو کر اجر و ثواب حاصل کرے (رواہ الحاکم و صححہ، از روح)

اگلی آیت میں راحت و آرام یا مال و دولت پر اترانے والے اور فخر کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ، یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اترانے والے، فخر کرنے والے کو، اور یہ ظاہر ہے جس کو پسند نہیں کرتا اس سے بغض و نفرت رکھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں پر اترانے اور فخر کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں، مگر عنوان تعبیر میں پسند نہ کرنا ذکر کر کے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ عقلمند عاقبت اندیش انسان کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے ہر کام میں اس کی فکر کرے کہ وہ اللہ کے نزدیک پسند ہے یا نہیں، اس لئے یہاں ناپسند ہونے کا ذکر فرمایا گیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ
ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ
تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں

مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ
کے کام چلتے ہیں اور تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے بیشک

اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝
اللہ زور آور ہے زبردست

ع ۳/۱۹

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (اسی اصلاح آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے

ساتھ کتاب کو اور اس کتاب میں بالخصوص انصاف کرنے (کے حکم) کو (جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے) نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ و حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم رہیں (اس میں ساری شریعت آگئی جو معتدل یعنی بین الافراط والتفریط ہے) اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے (تاکہ اس کے ذریعہ سے عالم کا انتظام رہے کہ ڈر سے بہت سی بے انتظامیاں بند ہوجاتی ہیں) اور (اس کے علاوہ) لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں (چنانچہ اکثر آلات لوہے سے بنتے ہیں) اور (اس لئے لوہا پیدا کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہری طور پر) جان لے کہ بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی دین کی) کون مدد کرتا ہے (کیونکہ جہاد دین کی مدد ہے تو یہ بھی اخروی نفع ہوا اور جہاد کا حکم اس لئے نہیں کہ اللہ اس کا محتاج ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (خود) قوی زبردست ہے (بلکہ تمہارے ثواب کے لئے ہے)۔

معارف و مسائل

آسمانی کتابوں اور انبیاء بھیجنے کا اصل مقصد لوگوں کو عدل و انصاف پر قائم کرنا ہے

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ الآية، لفظ بینٰت کے لغوی معنی واضح اور کھلی ہوئی چیزوں کے ہیں، اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واضح احکام ہوں جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں یہی ترجمہ لیا گیا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے معجزات اور نبوت و رسالت پر واضح دلائل مراد ہوں (کما فسرہ ابن کثیر وابن حیان) اور بینٰت کے بعد اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب نازل کرنے کا علیحدہ ذکر بظاہر اسی تفسیر کا مؤید ہے کہ بینٰت سے مراد معجزات و دلائل ہوں اور احکام کی تفصیل کے لئے کتاب نازل کرنے کا ذکر فرمایا۔

کتاب کے ساتھ ایک تیسری چیز میزان نازل کرنے کا بھی ذکر ہے، میزان اصل میں اس آلہ کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، جس کی معروف صورت ترازو ہے، اور ترازو کے علاوہ مختلف چیزوں کے وزن کرنے کے لئے جو دوسرے مختلف قسم کے آلات ایجاد ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی میزان کے مفہوم میں داخل ہیں، جیسے آجکل روشنی، ہوا وغیرہ کے ناپنے کے آلات ہیں۔

اس آیت میں کتاب کی طرح میزان کے لئے بھی نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے، کتاب کا آسمان سے نازل ہونا اور فرشتوں کے ذریعہ پیغمبر تک پہنچنا تو معلوم و معروف ہے، میزان کے نازل کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے متعلق تفسیر روح المعانی، مظہری وغیرہ میں ہے کہ نزول میزان سے مراد ان احکام کا نزول ہے جو ترازو کے استعمال کرنے اور انصاف کرنے کے متعلق نازل ہوئے۔ اور قرطبی نے فرمایا کہ دراصل نزول تو کتاب ہی کا ہوا ہے، ترازو کے وضع کرنے اور ایجاد کرنے کو اس کے ساتھ لگا دیا گیا ہے،

ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا

جو نئی بات نکالی تھی ہم نے نہیں لکھا تھا یہ ان پر مگر کیا چاہنے کو اللہ کی رضامندی پھر نہ نباہا اس کو

حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ

جیسا چاہئے تھا نباہنا پھر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں ایماندار تھے ان کا بدلہ اور بہت ان میں

فَاسِقُونَ ﴿٢٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ

نافرمان ہیں اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر دیوے گا تم کو

كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ

دو حصے اپنی رحمت سے اور رکھ دے گا تم میں روشنی جس کو لئے پھرو اور تم کو معاف کرے گا

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٨﴾ لِئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَلَّا يَقْدِرُونَ

اور اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے تاکہ نہ جانیں کتاب والے کہ پا نہیں سکتے کچھ

عَلَىٰ شَيْءٍ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ

اللہ کے فضل میں سے اور یہ کہ بزرگی اللہ کے ہاتھ ہے دیتا ہے جس کو چاہے

وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (مخلوق کی اسی اصلاحِ آخرت کے لئے) نوح (علیہ السلام) اور ابراہیم (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی (یعنی اُن کی اولاد میں بھی بعضے پیغمبر اور ان میں سے بعضے صاحبِ کتاب بنائے) سو (جن جن لوگوں کے پاس یہ پیغمبر آئے) اُن لوگوں میں بعضے تو ہدایت یافتہ ہوئے اور بہت سے ان میں نافرمان تھے (اور یہ مذکور پیغمبر تو صاحب شریعت مستقلہ تھے، ان میں بعضے صاحب کتاب بھی تھے جیسے موسیٰ علیہ السلام جو حضرت نوح علیہ السلام اور ابراہیم دونوں کی اولاد میں تھے، اور بعض اگرچہ صاحب کتاب نہیں تھے جیسے ہود اور صالح علیہما السلام کہ ان کا صاحب کتاب ہونا منقول نہیں مگر شریعت ان کی مستقل تھی، بہرحال بہت سے نبی تو صاحب شریعت مستقلہ بھیجے) پھر اُن کے بعد اور رسولوں کو (جو کہ صاحب شریعت مستقلہ نہ تھے) یکے بعد دیگرے

اعتبار سے ہے اور تیسں جو ایمان لائے تھے ان کا بیان آخر آیت میں فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ میں بیان فرمایا۔

یہاں تک عیسائیوں میں سے ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں کی دو قسموں کا ذکر تھا، آگے ایمان والوں کا حکم ہے کہ اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور (اس ڈر کے مقتضیٰ پر عمل کرو یعنی) اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے (ثواب کے) دو حصے دے گا (جیسے سورۂ قصص میں اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ آیا ہے) اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے چلتے پھرتے ہوگے (یعنی ایسا ایمان دے گا جو ہر وقت ساتھی ہے کہ یہاں سے پل صراط تک) اور تم کو بخش دے گا (کیونکہ اسلام سے زمانۂ کفر کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں) اور اللہ غفور رحیم ہے (اور یہ دولتیں تم کو اس لئے عنایت کریگا) تاکہ (جس وقت ان عطایا کا ظہور ہو یعنی قیامت کے روز اس وقت) اہل کتاب کو (یعنی جو ایمان نہیں لائے ان کو) یہ بات معلوم ہو جاوے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل کے کسی جزو پر بھی (بغیر ایمان لائے) دسترس نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جاوے) کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے دیدے (چنانچہ اس کی مشیت اس کے فضل کے ساتھ مسلمانوں سے متعلق ہوئی تو انہی کو عنایت فرما دیا) اور اللہ بڑے فضل والا ہے (مطلب یہ کہ ان کا غرور اور زعم ٹوٹ جاوے کہ وہ حالت موجودہ میں بھی اپنے کو فضل کا مورد اور مغفرت کا محل سمجھتے ہیں)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیت میں اس دنیا کی ہدایت اور اس میں قسط یعنی عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے انبیاء و رسول اور ان کے ساتھ کتاب و میزان نازل کرنے کا عمومی ذکر تھا، مذکور الصدر آیت میں ان میں سے خاص خاص انبیاء و رسل کا ذکر ہے، پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا کہ وہ آدم ثانی ہیں اور بعد طوفان نوح کے دنیا میں باقی رہنے والی سب مخلوق ان کی نسل سے ہے، دوسرے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو ابو الانبیاء اور قدوۃ الخلائق ہیں، ان دونوں کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان فرما دیا کہ آئندہ جتنے انبیاء اور آسمانی کتابیں دنیا میں آئیں گی وہ سب انہی دونوں کی ذریت میں ہوں گی، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی وہ شاخ اس فضیلت کے لئے مخصوص کر دی گئی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعد میں جتنے انبیاء مبعوث ہوئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔

ان کے خصوصی ذکر کے بعد پورے سلسلۂ انبیاء کو ایک مختصر جملے میں بیان فرمایا، ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین فرقوں میں سے جس رہبانیت اختیار کرنے والے جنہوں نے رہبانیت کے لوازم کی رعایت کی اور مصائب پر صبر کیا وہ بھی نجات یافتہ لوگوں میں سے ہیں۔

آیت مذکورہ کی اس تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کی رہبانیت ابتداءً اختیار کرنے والوں نے اختیار کی تھی وہ فی نفسہ ذات سے مذموم اور بری چیز نہ تھی البتہ وہ کوئی حکم شرعی بھی نہیں تھا، ان لوگوں نے اپنی مرضی و خوشی سے اس کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا، برائی اور مذمت کا پہلو یہاں سے شروع ہوا کہ اس التزام کے بعد بعض لوگوں نے اس کو نبھایا نہیں، اور چونکہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی زیادہ ہوگئی تھی، اس لئے لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ یعنی اکثریت کے عمل کو کل کی طرف منسوب کر دینا عرف عام ہے، اس قاعدہ کے موافق قرآن نے عام بنی اسرائیل کی طرف یہ منسوب کیا کہ انھوں نے جس رہبانیت کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا اس کو نبھایا نہیں، اور اس کی شرائط کی رعایت نہیں کی، اسی کو فرمایا (فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رہبانیت کے متعلق جو قرآن نے فرمایا اِبْتَدَعُوْهَا یعنی اس کو انھوں نے ایجاد کر لیا، اس میں لفظ ابتداع جو بدعت سے مشتق ہے وہ اس جگہ اپنے لغوی معنی یعنی اختراع و ایجاد کے لئے بولا گیا ہے، شریعت کی اصطلاحی بدعت مراد نہیں ہے جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔"

قرآن کریم کے نسق و نظم میں غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے سب سے پہلے تو اس جملے پر نظر ڈالئے وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةً، جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نعمت کے اظہار کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے ان کے دلوں میں رافت، رحمت، رہبانیت پیدا کر دی، نسق کلام بتلاتا ہے کہ جس طرح رافت و رحمت مذموم نہیں اسی طرح ان کی اختیار کردہ رہبانیت بھی اپنی ذات سے کوئی مذموم چیز نہ تھی ورنہ مقام امتنان میں رافت و رحمت کے ساتھ رہبانیت کا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، یہی وجہ ہے جن حضرات نے مطلقاً رہبانیت کو مذموم و ممنوع قرار دیا ان کو اس جگہ رہبانیت کے عطف میں بخلافِ ظاہر یہ تاویل کرنا پڑی کہ اس کو رافت و رحمت پر عطف نہیں مانا بلکہ ایک مستقل جملہ یہاں محذوف قرار دیا یعنی ابتدعوا (کما فعلہ القرطبی)، لیکن مذکورہ تفسیر پر اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، آگے بھی قرآن کریم نے ان کے اس ابتداع پر کوئی نکیر وارد نہیں فرمایا، بلکہ نکیر اس پر کی گئی کہ انھوں نے اس اختیار کردہ رہبانیت کو نبھایا نہیں، اس کے حقوق و شرائط کی رعایت نہیں کی، یہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے کہ ابتداع کو لغوی معنی میں لیا جائے، شرعی اور اصطلاحی معنی ہوتے تو قرآن خود اس پر بھی نکیر کرتا، کیونکہ بدعت اصطلاحی خود ایک گمراہی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مذکورہ حدیث سے اور بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ رہبانیت اختیار کرنے والی جماعت کو نجات یافتہ جماعتوں میں شمار فرمایا، اگر یہ بدعت اصطلاحی کے مجرم ہوتے تو

نجات یافتہ میں شمار نہ ہوتے بلکہ گمراہوں میں شمار کئے جاتے۔

کیا رہبانیت مطلقاً مذموم و ناجائز ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ لفظ رہبانیت کا عام اطلاق ترک لذات و ترک مباحات کے لئے ہوتا ہے، اس کے چند درجے ہیں، ایک یہ کہ کسی مباح و حلال چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے، یہ تو دین کی تحریف و تغییر ہے، اس معنی کے اعتبار سے رہبانیت قطعاً حرام ہے، اور آیت قرآن (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ) اور اس کی امثال میں اسی کی ممانعت و حرمت کا بیان ہے، اس آیت کا عنوان لَا تُحَرِّمُوْا خود یہ بتلا رہا ہے کہ اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دینا ہے جو حق تعالیٰ کے احکام میں تبدیل و تحریف کے مرادف ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کے کرنے کو اعتقاداً یا عملاً حرام تو قرار نہیں دیتا، مگر کسی دنیوی یا دینی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے، دنیوی ضرورت جیسے کسی بیماری کے خطرہ سے کسی مباح چیز سے پرہیز کرے، اور دینی ضرورت یہ کہ یہ محسوس کرے کہ میں نے اس مباح کو اختیار کیا تو انجام کار میں کسی گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا، جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنے کے لئے کوئی آدمی لوگوں سے اختلاط ہی چھوڑ دے، یا کسی نفسانی رذیلہ کے علاج کے لئے چند روز بعض مباحات کو ترک کردے اور اس ترک کی پابندی بطور علاج و دوا کے اس وقت تک کرے جب تک یہ رذیلہ دور نہ ہو جائے، جیسے صوفیائے کرام مبتدی کو کم کھانے کم سونے، کم اختلاط کی تاکید کرتے ہیں کہ یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے نفس کو اعتدال پر لانے کا، جب نفس پر قابو ہو جاتا ہے کہ ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ نہ رہے تو یہ پرہیز چھوڑ دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت رہبانیت نہیں، تقویٰ ہے جو مطلوب فی الدین اور اسلاف کرام صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے ثابت ہے۔

تیسرا درجہ یہ کہ کسی مباح کو حرام تو قرار نہیں دیتا مگر اس کا استعمال جس طرح سنت سے ثابت ہے اس طرح کے استعمال کو بھی چھوڑنا ثواب اور افضل جان کر اس سے پرہیز کرتا ہے، یہ ایک قسم کا غلو ہے، جس سے احادیث کثیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور جس حدیث میں لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ آیا ہے، یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں، اس سے مراد ایسا ہی ترک مباحات ہے کہ ان کے ترک کو افضل و ثواب سمجھے، بنی اسرائیل میں جو رہبانیت اول شروع ہوئی وہ اگر حفاظتِ دین کی ضرورت سے تھی تو دوسری قسم یعنی تقویٰ میں داخل ہے، لیکن اہل کتاب میں غلو فی الدین کی آفت بہت تھی، وہ اس غلو میں پہلے درجہ میں تحریم حلال تک پہنچے تو حرام کے مرتکب ہوئے اور تیسرے درجہ تک رہے تو بھی ایک مذموم فعل کے مجرم بنے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ

اس آیت میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اہل کتاب ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، قرآن کریم کی عام عادت یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا لفظ صرف مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے یہود و نصاریٰ کیلئے اہل کتاب کا لفظ آتا ہے، کیونکہ صرف حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ان کا ایمان کافی و معتبر نہیں جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں، اس لئے وہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہلانے کے مستحق نہیں، مگر یہاں اس عام عادت کے خلاف یہ لفظ نصاریٰ کے لئے بولا گیا، شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ آگے ان کو حکم کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاؤ، جب یہ ایسا کرلیں تو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب کے مستحق ہوگئے۔

آیت میں ایسے اہل ایمان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو دوہرا اجر و ثواب ملے گا، ایک پہلے نبی حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے اور ان کی شریعت پر عمل کرنے کا اور دوسرا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا اور آپ کی شریعت پر عمل کرنے کا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگرچہ یہود و نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے وقت تک کافر تھے اور کافر کی کوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ پچھلی شریعت پر جو عمل کیا وہ سب اکارت ہوگیا، مگر اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ اہل کتاب کافر جب مسلمان ہوجائے تو زمانہ کفر کے کئے ہوئے نیک عمل بھی بحال کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے دوہرا اجر ہوجاتا ہے۔

لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اس میں لا زائدہ ہے، معنی لِیَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ کے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مذکور الصدر احکام اس لئے بیان کئے گئے تاکہ اہل کتاب سمجھ لیں کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ...... کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں، اس حالت میں وہ اللہ کے کسی فضل کے مستحق نہیں جب تک حضرت خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان نہ لے آئیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت سورۃ الحدید

بحمد اللہ تعالیٰ وعونہ للسادس و عشرین من الربیع الثانی
یوم الاثنین بعد العشاء ویتلوہ ان شاء اللہ سورۃ المجادلۃ!!

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ مجادلہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى

سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی تھی

اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ

اللہ کے آگے اور اللہ سنتا تھا سوال جواب تم دونوں کا بیشک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے جو لوگ

يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ

ماں کہہ بیٹھیں تم میں سے اپنی عورتوں کو وہ نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں

اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ

جنہوں نے ان کو جنا، اور وہ بولتے ہیں ایک ناپسند بات اور جھوٹی، اور اللہ

اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ

معاف کرنیوالا بخشنے والا ہے اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر کرنا

يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ

چاہیں وہی کام جس کو کہہ چکے ہیں تو آزاد کرنا چاہیے ایک بردہ پہلے اس سے کہ آپس میں ہاتھ لگائیں اس سے

تُوعَظُونَ بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْرٌ ③ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ خبر رکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو، پھر جو کوئی نہ پائے تو روزے ہیں

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ

دو مہینے کے لگاتار پہلے اس سے کہ آپس میں چھوئیں، پھر جو کوئی یہ نہ کر سکے تو کھانا دینا ہے

سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۚ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ

ساٹھ محتاجوں کا، یہ حکم اس واسطے کہ تابعدار ہو جاؤ اللہ کے اور اس کے رسول کے، اور یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی،

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور منکروں کے واسطے عذاب ہے دردناک، جو لوگ کہ مخالفت کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ

كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ

خوار ہوئے ہیں جیسے خوار ہوئے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، اور ہم نے اتاری ہیں آیتیں بہت صاف، اور

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ⑤ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا

منکروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا، جس دن کہ اٹھائے گا اللہ ان سب کو پھر جتلائے گا ان کو

عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑥ ع

ان کے کئے کام، اللہ نے وہ سب گن رکھے ہیں اور وہ بھول گئے، اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

ع ۱

سببِ نزول: اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کا سبب ایک خاص واقعہ ہے کہ حضرت اوس بن صامتؓ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ کو یہ کہہ دیا کہ اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ "تو میرے حق میں ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت یعنی حرام ہے"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ ابدی اور دائمی حرمت کے لئے بولے جاتے تھے، جو طلاق مغلظہ سے بھی زیادہ سخت ہے، حضرت خولہؓ یہ واقعہ پیش آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، اس وقت تک اس خاص مسئلے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی اس لئے آپ نے قول مشہور کے موافق ان سے فرمایا مَا اَرَاكِ اِلَّا قَدْ حَرُمْتِ عَلَيْهِ یعنی میری رائے میں تو تم اپنے شوہر پر حرام ہوگئیں، وہ یہ سنکر واویلا کرنے لگیں کہ میری جوانی سب اس شوہر کی خدمت میں ختم ہوگئی، اب بڑھاپے میں انھوں نے مجھ سے یہ معاملہ کیا، میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا گذارہ کیسے ہوگا؟ اور ایک روایت میں ہے کہ خولہ نے یہ عرض کیا کہ مَا ذَكَرَ طَلَاقًا، یعنی میرے شوہر نے طلاق کا

معارف و مسائل

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ الآیۃ، اس آیت کا سبب نزول جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عورت جس کا ذکر اس آیت میں ہے وہ حضرت اوس ابن الصامت کی بیوی خولہ بنت ثعلبہ ہیں، جن کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا، اور یہ اس کی شکایت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

حق تعالیٰ نے اس کو یہ عزت بخشی کہ اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں صرف ظہار کا حکم شرعی اور اس کی تکلیف دور کرنے کا انتظام ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کی دلداری کے لئے شروع کلام میں فرما دیا کہ ہم اس عورت کی باتیں سن رہے تھے، جو اپنے شوہر کے معاملہ میں آپ سے مجادلہ کر رہی تھی، مجادلہ سے مراد وہ جھگڑا ہے جو ایک مرتبہ جواب دیدینے کے باوجود اپنی تکلیف کو بار بار پیش کر کے آپ کو متوجہ کرنا ہے، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو یہ جواب دیا کہ تمہارے معاملہ میں مجھ پر کوئی حکم اللہ کا نازل نہیں ہوا تو اس پر غم زدہ کی زبان سے یہ نکلا کہ یوں تو آپ پر ہر چیز کے حکم نازل ہوتے رہتے ہیں میرے بارے میں یہ وحی بھی رک گئی (قرطبی) اور اللہ تعالیٰ سے فریاد شروع کی [illegible] اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں پاک ہے وہ ذات جس کا سماع تمام آوازوں کو محیط ہے ہر ایک کی آواز سنتا ہے میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھی، جب خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر کی شکایت بیان کر رہی تھیں، مگر اتنے قریب ہونے کے باوجود ان کی بعض باتیں نہ سن سکی تھی، مگر حق تعالیٰ نے ان سب کو سنا اور فرمایا قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ (بخاری، ابن کثیر)

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ، یظاہرون، ظہار بکسر ظاء سے مشتق ہے جو بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی ایک خاص صورت کے لئے بولا جاتا ہے اور زمانۂ اسلام سے پہلے رائج و معروف ہے، وہ صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ دے اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ یعنی تو مجھ پر ایسی حرام ہے جیسے میری ماں کی پشت، اس موقع پر پشت کا ذکر شاید بطور کنایہ کے ہے، کہ اصل مراد تو بطن تھا ذکر پشت کا کر دیا (کما ذکرہ القرطبی)

ظہار کی تعریف اور حکم شرعی

اصطلاح شرع میں ظہار کی تعریف یہ ہے کہ اپنی بیوی کو اپنی محرمات ابدیہ، ماں بہن بیٹی وغیرہ کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دینا جس کو دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں، ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے، زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لئے بولا جاتا تھا، اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا، کیونکہ طلاق کے بعد تو رجعت یا نکاح جدید ہو کر

جب اتنے روزوں پر بھی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے، یعنی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا ساٹھ مسکینوں کو کھلا دے، اور کھانا کھلانے کے قائم مقام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو فی کس ایک فطرہ کی مقدار گندم یا اس کی قیمت دیدے، فطرہ کی مقدار ہمارے موجودہ وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر گندم ہے اس کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے۔

ظہار اور کفارہ ظہار کے مفصل مسائل کتب فقہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ کی داد رسی فرمانے پر جب آیات مذکورہ اور کفارہ ظہار کے احکام نازل ہوئے اور شوہر سے دائمی مفارقت و حرمت سے بچنے کا راستہ نکل آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کو بلایا، دیکھا کہ ضعیف البصر بوڑھے آدمی ہیں، آپ نے اس کو نازل شدہ آیات اور کفارہ کا حکم سنایا کہ ایک غلام یا لونڈی آزاد کردو، اس نے کہا یہ میری قدرت سے باہر ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ پھر دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو، اس نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنایا میری حالت یہ ہے کہ اگر دن میں دو تین مرتبہ کھانا نہ کھاؤں تو میری بینائی جاتی رہتی ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، اس نے عرض کیا کہ یہ بھی میری قدرت میں نہیں بجز اس کے کہ آپ ہی میری مدد کریں، آپ نے اس کو کچھ غلہ عطا فرمایا، پھر کچھ دوسرے لوگوں نے بھی مدد دی اس طرح ساٹھ مسکینوں کو فطرے کی مقدار دے کر کفارہ ادا ہو گیا۔ (ابن کثیر)

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

اس آیت میں لِتُؤْمِنُوْا فرمایا اور مراد ایمان سے شرائع واحکام پر عمل کرنا ہے، اور پھر فرمایا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کہ احکام اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز کرنا حرام ہے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اسلام نے نکاح، طلاق، ظہار اور دوسرے سب معاملات میں جاہلیت کی رسوم کو مٹا کر ان کی جگہ معتدل اور صحیح طریقوں کی تعلیم دی ہے، تم اس پر قائم رہو اور جو لوگ ان حدود شرعیہ کے منکر اور کافر ہیں ان کو دردناک سزا ملے گی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

سابقہ آیت میں حدود اللہ اور شریعت اسلام کے احکام کی پابندی کی تاکید تھی، اس میں ان لوگوں پر وعید ہے جو حدود اللہ کے مخالف و منکر ہیں، اس وعید میں ان کے لئے دنیا میں بھی ذلت و خواری اور ان کے کفر و عناد کی ناکامی کا بیان ہے اور آخرت میں عذاب الیم کا۔

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ میں اس پر تنبیہ ہے کہ غافل انسان دنیا میں گناہ اور فسق و فجور کے کام کرتا رہتا ہے جو اس کو یاد بھی نہیں رہتے اور بھولنے کا سبب دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے ذہن میں بھی نہیں رہتا، وہ سب حق تعالیٰ کے پاس لکھے ہوئے ہیں یہ تو سب بھول گئے، مگر اللہ تعالیٰ کو سب یاد ہیں سب پر محاسبہ اور عذاب ہوگا۔

کے لئے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ (ضرور) داخل ہوں گے سو وہ بُرا ٹھکانا ہے **(آگے ایمان والوں**
کو خطاب ہے جس سے منافقین کے ساتھ مشابہت کرنے سے ان کو بھی ممانعت کی گئی ہے اور منافقین
کو بھی سُنانا منظور ہے کہ تم تو مدعی ایمان کے ہو تو مقتضائے ایمان پر عمل کرو پس ارشاد ہے کہ) اے ایمان
والو جب تم (کسی ضرورت سے) سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں
مت کرو (تفسیر ان الفاظ کی بھی گذری ہے) اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں
کرو (بر عدوان کا مقابل ہے، اس سے مراد وہ نفع ہے جو دوسروں تک پہنچے، اور تقویٰ اثم اور
معصیت الرسول یعنی رسول کی نافرمانی کا مقابل ہے) اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم سب
جمع کئے جاؤ گے، ایسی سرگوشی محض شیطان کی طرف سے ہے (یعنی اس کے بہکانے سے) ہے تاکہ مسلمانوں
کو رنج میں ڈالے (جیسا واقعہ اوپر بیان ہوا) اور (آگے ان مسلمانوں کی تسلی ہے کہ رنجیدہ نہ
ہوا کریں، کیونکہ) وہ (شیطان) بدون خدا کے ارادہ کے ان (مسلمانوں) کو کچھ ضرر نہیں پہونچا سکتا، مطلب
یہ کہ اگر بالفرض وہ شیطان کے بہکانے سے تمہارے خلاف ہی کوئی تدبیر کر رہے ہیں تب بھی وہ بغیر
مشیت الٰہیہ کے تم کو نہیں پہونچا سکتے پھر کیوں فکر میں پڑتے ہو) اور مسلمانوں کو (ہر امر میں) اللہ ہی پر
توکل کرنا چاہئے (آگے واقعہ پنجم کے متعلق حکم ہے، یعنی مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آویں تو ان کے لئے
جگہ کھولنے کا حکم ہے کہ) اے ایمان والو جب تم سے کہا جاوے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماویں یا اولی الامر یا واجب الاطاعت لوگوں میں سے کوئی کہے) کہ مجلس میں جگہ کھول دو (جس میں آنے
والے کو بھی جگہ مل جاوے) تو تم جگہ کھول دیا کرو (اور آنے والے کو جگہ دیدیا کرو) اللہ تعالیٰ تم کو
جنت میں کھلی جگہ دے گا اور جب (کسی ضرورت سے) یہ کہا جاوے کہ (مجلس سے) اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے
ہوا کرو (خواہ اٹھنے کے لئے اس غرض سے کہا جاوے کہ آنے والے کے لئے جگہ کھل جاوے اور خواہ اس وجہ
سے کہا جاوے کہ صدر مجلس کو اس وقت کسی مصلحت، مشورہ خاص یا کسی ضرورت آرام یا عبادت وغیرہ سے
تنہائی کی ضرورت ہو جو بغیر تنہائی کے مصلحت حاصل نہ ہو سکیں یا کامل نہ ہو سکیں، پس صدر مجلس کے کھڑے
ہونے کے حکم سے اٹھ جانا چاہئے، اور یہ حکم غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عام ہے، کذا
فی الروح، پس صاحب مجلس کو ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے کہ کسی شخص کو اٹھ جانے کے لئے
کہہ دے، البتہ آنے والے کو نہ چاہئے کہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھ جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے،
(رواہ الشیخان غرض حکم یہ دیا گیا کہ صدر مجلس کے کہنے سے اٹھ جایا کرو) اللہ تعالیٰ (اس حکم کی
اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم
(دین) عطا ہوا ہے (آخرت کے) درجے بلند کر دے گا (یعنی اس حکم کو بجا لانے والوں کی تین قسمیں ہیں، ایک
کنارہ جو کسی مصلحت دنیویہ سے مانتے ہیں جیسے منافقین وہ تو لفظ منکم کی بنا پر اس وعدہ سے خارج ہیں

معارف و مسائل

آیات مذکورہ اگرچہ خاص واقعات کی بنا پر نازل ہوئی ہیں جن کا ذکر اوپر شانِ نزول میں آچکا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ سبب نزول کچھ بھی ہو ہدایاتِ قرآنی عام ہوتی ہیں، ان میں عقائد و عبادات اور معاملات و معاشرت کے متعلق تمام احکام ہوتے ہیں، ان آیات میں بھی باہمی سرگوشی اور مشورے کے متعلق چند ایسی ہی ہدایات ہیں۔

خفیہ مشوروں کے متعلق ایک ہدایت | خفیہ مشورہ عموماً مخصوص رازدار دوستوں میں ہوتا ہے، جن پر یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ ہمارے راز کو کسی پر ظاہر نہ کریں گے، اس لئے ایسے موقع پر ایسے منصوبے بھی بنائے جاتے ہیں جن میں کسی پر ظلم کرنا ہے کسی کو قتل کرنا ہے، کسی کی املاک پر قبضہ کر لینا ہے، وغیرہ وغیرہ، حق تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ساری کائنات پر حاوی ہے تم کہیں کیسا ہی چھپ کر مشورہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے علم اور سمع و بصر کے اعتبار سے تمہارے پاس موجود ہوتا ہے، اور تمہاری ہر بات کو دیکھتا سنتا اور جانتا ہے، اگر اس میں کوئی گناہ کرو گے تو سزا سے نہ بچو گے، اس میں بتلانا تو یہ ہے کہ تم کتنے ہی کم یا زیادہ آدمی مشورہ اور سرگوشی میں شریک ہو حق تعالیٰ ان میں موجود ہوتا ہے، مثال کے طور پر دو عدد بتلا دیئے گئے، تین اور پانچ، یعنی اگر تم تین آدمی مشورہ کر رہے ہو تو سمجھو کہ چوتھا اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہے، اور پانچ آدمی مشورہ کر رہے ہو تو سمجھو کہ چھٹا حق تعالیٰ موجود ہے، تین اور پانچ کے عدد کی تخصیص میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جماعت کے لئے اللہ کے نزدیک طاق عدد پسند ہے (مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ الآیۃ) کا یہی حاصل ہے۔

سرگوشی اور مشورے کے متعلق ایک ہدایت | اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى، واقعہ شانِ نزول میں بتلایا گیا ہے کہ جس زمانے میں یہود سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح ہو گیا تھا اس وقت وہ کھل کر تو مسلمانوں کے خلاف کوئی کام نہ کر سکتے تھے، مگر اسلام اور مسلمانوں سے دل میں بھرا ہوا بغض نکالنے کا ایک طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب صحابہ کرام میں سے کسی کو اپنے قریب آتے دیکھتے تو باہم سرگوشی اور خفیہ مشورہ کی شکل بنا لیتے، اور آنے والے مسلمانوں کی طرف کچھ اشارے کرتے جس سے ان کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں اور اس سے پریشانی اور رنج ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایسی سرگوشی سے منع فرمایا، نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى میں اسی ممانعت کا بیان ہے۔

اس ممانعت سے یہ حکم مسلمانوں کے لئے بھی نکل آیا کہ وہ بھی آپس میں کوئی سرگوشی اور مشورہ اس طرح نہ کریں جس سے دوسرے کسی مسلمان کو ایذاء پہنچے۔

بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اِذَا كُنْتُمْ ثَلٰثَةً فَلَا يَتَنَاجٰى رَجُلَانِ دُوْنَ الْاٰخَرِ حَتّٰى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ فَاِنَّ ذٰلِكَ يُحْزِنُهٗ. یعنی جس جگہ تم تین آدمی جمع ہو تو دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر باہم سرگوشی اور خفیہ باتیں نہ کیا کرو جب تک دوسرے آدمی نہ آجائیں کیونکہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی کہ وحشت اور اجنبیت کا احساس ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے شبہات پیدا ہو جائیں کہ شاید یہ دونوں کوئی بات میرے خلاف کر رہے ہیں جو مجھ سے چھپاتے ہیں۔ (مظہری)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، سابقہ آیت میں منافقوں کی ناجائز سرگوشی پر تنبیہ کی گئی تھی، اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ اپنی سرگوشیوں اور مشوروں میں اس کا دھیان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے سب حالات اور گفتگو کا علم ہے اور اس استحضار کے ساتھ یہ کوشش کریں کہ ان کے مشورہ اور سرگوشی میں کوئی بات ظلم و گناہ کی یا دوسروں پر ظلم کرنے کی یا رسول کی نافرمانی کی نہ ہو بلکہ جب بھی آپس میں مشورہ کرو نیک کاموں کے لئے کرو۔

کفار کی شرارت پر بھی نرمی اور [illegible] سابقہ آیات کے ضمن میں یہودیوں اور منافقوں کی ایک شرارت یہ بھی زیر شرح [illegible] کی گئی ہے کہ وہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بجائے السلام علیکم کے السام علیکم کہتے تھے، سام کے معنی موت کے ہیں، اور لفظوں میں زیادہ فرق نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کو اس طرف التفات نہ ہوتا تھا، ایک روز ایسا ہی ہوا، صدیقہ عائشہ بھی سن رہی تھیں، جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو السام علیکم کہا تو صدیقہ عائشہ نے جواب دیا السام علیکم ولعنکم اللہ وغضب علیکم یعنی موت تم پر ہو اور خدا کی لعنت و غضب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہؓ کو ایسا کہنے سے روکا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فحش کلام کو پسند نہیں فرماتے، آپ کو سختی اور درشتی سے بچنا اور نرمی اختیار کرنا چاہئے، صدیقہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے نہیں سنا کہ ان لوگوں نے آپ کو کیا کہا ہے، آپ نے فرمایا کہ ہاں سن بھی لیا اور اس کا معتدل بدلہ بھی لے لیا کہ میں نے جواب میں کہہ دیا علیکم یعنی تم پر ہو، اور یقینی بات ہے کہ ان کی دعا قبول ہوگی نہیں، میری دعا قبول ہوگی، اس لئے ان کی شرارت کا بدلہ ہوگیا (رواہ البخاری، از مظہری)

بعض آداب مجلس: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا الاٰیۃ، یہ حکم عام مجالس کا ہے جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہو کہ جب مجلس میں کچھ لوگ بعد میں آئیں تو مسلمان ان کو بیٹھنے جگہ دینے کی کوشش کریں اور سمٹ کر بیٹھ جائیں، ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ وسعت پیدا فرما دیں گے، یہ وسعت آخرت میں تو ظاہر ہی ہے کچھ بعید نہیں کہ دنیوی معیشت میں بھی یہ وسعت حاصل ہو۔

اس آیت میں دوسرا حکم آداب مجلس کے متعلق یہ ہے کہ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یعنی جب تم میں سے کسی سے کہا جائے کہ مجلس سے اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جانا چاہئے، اس آیت میں لفظ قیل مجہول استعمال فرمایا، اس کا ذکر نہیں کہ یہ کہنے والا کون ہو، مگر احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنے والے شخص کو اپنے لئے جگہ کرنے کے واسطے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا جائز نہیں۔

صحیحین و مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَّجْلِسِهٖ فَيَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا یعنی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ سے اُٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھے، بلکہ مجلس میں کشادگی پیدا کرکے **آنے والے کو جگہ دیدیا کرو (ابن کثیر)**

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کے لئے کہنا آنے والے شخص کے لئے تو جائز نہیں اس لئے ظاہر یہ ہے کہ اس کا کہنے والا میر مجلس یا مجلس کا انتظام کرنے والے افراد ہو سکتے ہیں، تو مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اگر میر مجلس یا اس کی طرف سے مقرر کردہ منتظمین کسی کو اس کی جگہ سے اُٹھ جانے کیلئے کہیں تو ادب مجلس یہ ہے کہ اُن سے مزاحمت نہ کرے، اپنی جگہ سے اُٹھ جائے، کیونکہ بعض اوقات خود صاحب مجلس کسی ضرورت سے خلوت اختیار کرنا چاہتا ہے، یا کچھ مخصوص لوگوں سے کوئی راز کی بات کرنا چاہتا ہے، یا بعد میں آنے والے حضرات کے لئے اس کے سوا کوئی انتظام نہیں پاتا کہ بعض بے تکلف لوگوں کو مجلس سے اٹھا دے جن کے متعلق معلوم ہو کہ ان کا کوئی نقصان مجلس سے اُٹھنے میں نہیں ہوگا، یہ دوسرے **وقت میں استفادہ کر سکیں گے۔**

البتہ صاحب مجلس یا منتظمین مجلس کے لئے یہ لازم ہے کہ طریقہ ایسا اختیار کریں کہ اُٹھنے والا اپنی **خفت محسوس نہ کرے، اس کو ایذا نہ پہنچے۔**

اور جس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، یہ جگہ حاضرین سے پُر ہو چکی تھی، بعد میں بعض کبار صحابہ جو شرکاء بدر ہونے کے سبب قابل احترام زیادہ تھے وہ پہونچے، اور جگہ نہ ہونے کے سبب کھڑے رہے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو عام حکم یہ دیا کہ ذرا کھسک کر مجلس میں کشادگی پیدا کرو اور اُن کو جگہ دیدو، اور بعض حضرات صحابہ کو اُٹھ جانے کے لئے بھی فرمایا، جن کو مجلس سے اٹھایا ان میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ہر وقت کے حاضر باش لوگ ہوں جن کے اس وقت کی مجلس سے اُٹھ جانے میں کوئی بڑا نقصان نہیں تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے جب مجلس میں وسعت کرنے اور سمٹ کر بیٹھنے کا حکم دیا تو کچھ لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا، اُن کو تادیباً مجلس سے اُٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔

بہر حال اس آیت اور احادیث واردہ سے آداب مجلس کے متعلق ایک تو یہ بات معلوم ہوئی

کہ اہل مجلس کو چاہئے کہ بعد میں آنے والوں کو جگہ دینے کی کوشش کریں۔ اور دوسری بات آنے والوں کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ کسی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائیں، تیسری بات صاحب مجلس کے لئے یہ ثابت ہوئی کہ وہ ضرورت سمجھے تو بعض لوگوں کو مجلس سے اٹھا دینے کی بھی اس کو گنجائش ہے۔ اور بعض دوسری روایاتِ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والوں کے لئے ادب یہ ہے کہ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں گھسنے کے بجائے کسی کنارے پر بیٹھ جائے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین آنے والے شخصوں کا ذکر ہے ان میں ایک وہ بھی ہے جو مجلس میں جگہ نہ پانے کی وجہ سے ایک گوشہ میں بیٹھ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی تعریف و ثناء فرمائی۔

مسئلہ: مجلس کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان بغیر ان کی اجازت کے داخل نہ ہو کیونکہ بعض اوقات دونوں کے یکجا بیٹھنے میں ان کی کوئی خاص مصلحت ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زید کی روایت ابوداؤد و ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا "یعنی کسی شخص کے لئے حلال نہیں کہ دو شخص جو ملے بیٹھے ہیں ان کے درمیان تفریق پیدا کرے جب تک کہ ان سے ہی اجازت نہ لے" (از ابن کثیر)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ الْاٰيَة، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و اصلاحِ خلق کے کام میں تو شب و روز مشغول رہتے ہی تھے، مجالسِ عامہ میں سب حاضرینِ مجلس آپ کے ارشادات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک صورت یہ بھی تھی کہ بعض لوگ آپ سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہتے اور آپ وقت دیدیتے تھے، یہ ظاہر ہے کہ ایک ایک شخص کو الگ وقت دینا بڑا وقت بھی چاہتا ہے اور محنت بھی، اس میں کچھ منافقین کی شرارت بھی شامل ہوگئی کہ مخلص مسلمانوں کو ایذا پہونچانے کے لئے آپ سے سرگوشی کا وقت مانگتے اور اس میں مجلس کو طویل کر دیتے تھے، بعض ناواقف مسلمان بھی بات لمبی کر کے مجلس طویل کر دیتے تھے، حق تعالیٰ نے آپ سے یہ بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ابتداءً یہ حکم نازل فرمایا کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی میں خفیہ بات کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ کرے، اس صدقہ کی کوئی مقدار قرآن میں منقول نہیں، مگر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر عمل فرمایا، اور ایک دینار صدقہ کر کے آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کا وقت لیا۔

اس آیت پر صرف حضرت علیؓ نے عمل کیا تھا پھر منسوخ ہوگئی اور کسی کو عمل کی نوبت نہیں آئی

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس حکم سے چونکہ بہت سے صحابہ کرام کو تنگی پیش آئی اس لئے بہت جلد ہی منسوخ کر دیا گیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں ایک آیت ایسی ہے جس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا، نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا، ...

تو ظاہر ہے بعد میں خبر ہونا اس سے یہ منسوخ ہوگئی وہ آیت یعنی تقدیم صدقہ کی ہے (ابن کثیر)
یہ حکم اگرچہ منسوخ ہوگیا مگر جس مصلحت کے لئے جاری کیا گیا تھا وہ اس طرح حاصل ہوگئی کہ مسلمان تو اپنی دلی محبت کے تقاضے سے ایسی مجلس طویل کرنے سے بچ گئے اور منافقین اس لئے کہ عام مسلمانوں کے طرز کے خلاف ہم نے ایسا کیا تو ہم پہچان لئے جاویں گے اور نفاق کھل جاوے گا، واللہ اعلم

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم مَّا هُم مِّنكُمْ

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جو دوست ہوئے ہیں اس قوم کے جن پر غصہ ہوا ہے اللہ کا، نہ وہ تم میں ہیں

وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ

اور نہ ان میں، اور قسمیں کھاتے ہیں جھوٹی بات پر اور ان کو خبر ہے تیار رکھا ہے اللہ نے ان کے واسطے

عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ

سخت عذاب، بیشک وہ برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو

جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٦﴾ لَّن تُغْنِيَ

ڈھال پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے تو ان کو ذلت کا عذاب ہے۔ کام نہ آئیں گے

عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

ان کو ان کے مال اور نہ اولاد اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی، وہ لوگ ہیں دوزخ

النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ

کے، وہ اسی میں پڑے رہیں گے، جس دن جمع کرے گا اللہ ان سب کو پھر قسمیں کھائیں گے اس کے

كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ

آگے جیسے کھاتے ہیں تمہارے آگے اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ کچھ بھلی راہ پر ہیں، سنتا ہے وہی ہیں اصل

الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ

جھوٹے، قابو کر لیا ہے ان پر شیطان نے پھر بھلا دی ان کو اللہ کی یاد،

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾

وہ لوگ ہیں گروہ شیطان کا سنتا ہے جو گروہ ہے شیطان کا وہی خراب ہوتے ہیں،

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾

جو لوگ خلاف کرتے ہیں اللہ کا اور اس کے رسول کا وہ لوگ ہیں سب سے بے قدر لوگوں میں،

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ لَا تَجِدُ

اللہ لکھ چکا کہ میں غالب ہوں گا اور میرے رسول، بیشک اللہ زور آور ہے زبردست، تو نہ پائے گا کسی

قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے

وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ

رسول کے خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے، ان کے دلوں میں

كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ

اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان اور ان کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے اور داخل کرے گا ان کو

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، ہمیشہ رہیں ان میں، اللہ ان سے راضی اور

وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ

وہ اس سے راضی، وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا، سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا وہی

الْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾ ع

مراد کو پہنچے۔

ع ۳ / ۲

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا، پہلے لوگوں سے مراد منافقین ہیں اور دوسرے لوگوں سے مراد یہود و جمیع کفار مجاہرین، اور منافقین چونکہ یہودی تھے اس لئے ان کی دوستی یہود سے اور اسی طرح اور کفار سے بھی مشہور و معلوم ہے، یہ منافقین لوگ نہ تو پورے پورے تم میں ہیں اور نہ پورے پورے ان ہی میں ہیں، بلکہ ظاہر میں تو تم سے ملے ہوئے ہیں اور باطناً و عقیدۃً کفار کے ساتھ ہیں، اور جھوٹی بات پر قسمیں کھا جاتے ہیں، وہ جھوٹی بات یہی ہے کہ ہم

میں آپ اُن کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کردیا ہے اور ان (کے قلوب) کو اپنے فیض سے قوت دی ہے (فیض سے مراد نور ہے یعنی مقتضائے ہدایت پر ظاہراً عمل و باطناً سکون قلب کما قال تعالیٰ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، چونکہ یہ نور سبب ہے زیادت حیات معنویہ کا اس لئے اس کو روح سے تعبیر فرمایا، یہ دولت تو ان کو دنیا میں ملی کقولہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ) اور آخرت میں اُن کو یہ نعمت ملے گی کہ اُن کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے (کقولہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، بعد قولہ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ)

معارف و مسائل

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، ان آیات میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی بدحالی اور انجام کار عذاب شدید کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ کے دشمنوں کافروں سے دوستی رکھیں، کفار خواہ مشرکین ہوں یا یہود و نصاریٰ یا دوسری قسم کے کفار کسی مسلمان کے لئے دلی دوستی کسی سے جائز نہیں، اور وہ عقلاً ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ مومن کا اصل سرمایہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، کفار اللہ تعالیٰ کے مخالف اور دشمن ہیں، اور جس شخص کے دل میں کسی شخص کی سچی محبت اور دوستی ہو اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے دشمن سے بھی محبت اور دوستی رکھے، اسی لئے قرآن کریم کی بہت سی آیات میں موالاتِ کفار کی شدید حُرمت و ممانعت کے احکام آئے ہیں، اور جو مسلمان کسی کافر سے دلی دوستی رکھے تو اس کو کفار ہی کے زمرہ میں شامل سمجھے جانے کی وعید آئی ہے، لیکن یہ سب احکام دلی اور قلبی دوستی کے متعلق ہیں۔

کفار کے ساتھ حُسنِ سلوک، ہمدردی، خیرخواہی، اُن پر احسان، حُسنِ اخلاق سے پیش آنا یا تجارتی اور اقتصادی معاملات اُن سے کرنا، دوستی کے مفہوم میں داخل نہیں، یہ سب امور کفار کے ساتھ بھی جائز ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا کھلا ہوا تعامل اس پر شاہد ہے، البتہ ان سب چیزوں میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ ان کے ساتھ ایسے معاملات رکھنا اپنے دین کے لئے مضر نہ ہو، اپنے ایمان اور عمل میں سستی پیدا نہ کرے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی مضر نہ ہو۔

اس مسئلہ میں موالات اور مواسات اور معاملات کے فرق کی پوری تفصیل سورۂ آلِ عمران آیت لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ کے تحت معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۴۵ تا ۴۹ میں

گذر سکتی ہے وہاں مصافحہ کر لیا جائے۔

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ، بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی اور عبداللہ بن نبتل منافق کے بارے میں نازل ہوئی جس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ تشریف رکھتے تھے تو فرمایا کہ اب تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جس کا قلب جبار ہے اور جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس کے بعد ہی عبداللہ بن نبتل منافق داخل ہوا جو نیلگوں چشم، گندم گوں، پست قد، خفیف اللحیہ تھا، آپ نے اس سے فرمایا کہ تم اور تمہارے ساتھی مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو؟ اس نے حلف کر کے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، پھر اپنے ساتھیوں کو بھی بلالیا انہوں نے بھی یہی جھوٹا حلف کر لیا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کے جھوٹ کی خبر دیدی (قرطبی)

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ

مسلمان کی دوستی کسی کافر سے نہیں ہو سکتی الآیۃ، پچھلی آیت میں کفار و مشرکین سے دوستی کرنے والوں پر غضب الٰہی اور عذاب شدید کا ذکر تھا، اس آیت میں مؤمنین مخلصین کا حال اُن کے مقابل بیان فرمایا کہ وہ کسی ایسے شخص سے دوستی اور دلی تعلق نہیں رکھتے جو اللہ کا مخالف یعنی کافر ہے، اگرچہ وہ ان کا باپ یا اولاد یا بھائی اور قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔

صحابہ کرام کا یہی حال تھا، اس جگہ مفسرین نے بہت سے صحابہ کرام کے واقعات ایسے بیان کئے ہیں جن میں باپ بیٹے، بھائی وغیرہ سے جب کوئی بات اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سنی تو سارے تعلقات کو نظر انداز کر کے ان کو سزا دی، بعض کو قتل کیا۔

عبداللہ بن اُبی منافق کے بیٹے عبداللہؓ کے سامنے اس کے منافق باپ نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ کلمہ بولا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ میں اپنے باپ کو قتل کر دوں، آپ نے منع فرما دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اُن کے باپ ابو قحافہ نے حضورؐ کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ کہہ دیا تو صدیق اکبرؓ کو اتنا غصہ آیا کہ زور سے طمانچہ رسید کیا جس سے ابو قحافہ گر پڑے، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کے والد جراح غزوہ احد میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے آئے تو میدان جہاد میں وہ بار بار حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے آتے وہ ان کے سامنے سے ہٹ جاتے، جب انہوں نے مسلسل یہی صورت اختیار کی تو ابو عبیدہؓ نے اُن کو قتل کر دیا، اور اس کے امثال بہت سے واقعات صحابہ کرام کے پیش آئے، ان پر آیات مذکورہ نازل ہوئیں (قرطبی)

مسئلہ: بہت سے حضرات فقہاء نے یہی حکم فساق و فجار اور دین سے عملاً منحرف مسلمانوں کا قرار دیا ہے کہ اُن کے ساتھ دلی دوستی کسی مسلمان کی نہیں ہو سکتی، کام کاج کی ضرورتوں میں شرکت

یا مصاحبت بقدر ضرورت الگ چیز ہے، دل میں دوستی کسی فاسق و فاجر کی اسی وقت ہوگی جبکہ فسق و فجور کے جراثیم خود اس کے اندر موجود ہوں گے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں فرمایا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عَلَیَّ یَدًا، یعنی یا اللہ مجھ پر کسی فاجر آدمی کا احسان نہ آنے دیجئے، کیونکہ شریف نفس انسان اپنے محسن کی محبت پر طبعاً مجبور ہوتا ہے اس لئے فاسق و فاجر کا احسان قبول کرنا جو ذریعہ ان کی محبت کا بنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی پناہ مانگی (قرطبی)

وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ، یہاں روح کی تفسیر بعض حضرات نے نور سے کی ہے جو منجانب اللہ مؤمن کو ملتا ہے اور وہی اس کے عمل صالح کا اور قلب کے سکون و اطمینان کا ذریعہ ہوتا ہے، اور یہ سکون و اطمینان ہی بڑی قوت ہے، اور بعض حضرات نے روح کی تفسیر قرآن اور دلائل قرآن سے کی ہے وہی مؤمن کی اصل طاقت و قوت ہے، (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تَمَّتْ

سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃِ بِحَمْدِہٖ وَعَوْنِہٖ لِغُرَّۃِ
جُمَادَی الْاُوْلٰی سنہ ۱۳۹۱ھ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ
وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَیَتْلُوْہُ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی
تَفْسِیْرُ سُوْرَۃِ الْحَشْرِ،

سُوۡرَةُ الۡحَشۡرِ

سُوۡرَةُ الۡحَشۡرِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرۡبَعٌ وَّعِشۡرُوۡنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوۡعَاتٍ

سورۂ حشر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوبیس آیتیں ہیں اور تین رکوع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ

اللہ کی پاکی بول رہا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست

الۡحَكِيۡمُ ① هُوَ الَّذِيۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ

حکمت والا وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں

مِنۡ دِيَارِهِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؔؕ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا وَظَنُّوۡۤا

ان کے گھروں سے پہلے ہی اجتماع لشکر کے، تم نہ اٹکل کرتے تھے کہ نکلیں گے اور وہ خیال

اَنَّهُمۡ مَّانِعَتُهُمۡ حُصُوۡنُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ حَيۡثُ

کرتے تھے کہ ان کو بچا لیں گے ان کے قلعے اللہ کے ہاتھ سے پھر پہنچا اُن پر اللہ جہاں سے ان کو

لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا ۗ وَقَذَفَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ يُخۡرِبُوۡنَ بُيُوۡتَهُمۡ

خیال نہ تھا اور ڈال دی اُن کے دلوں میں دھاک اُجاڑنے لگے اپنے گھر

بِاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَيۡدِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۗ فَاعۡتَبِرُوۡا يٰۤاُولِى الۡاَبۡصَارِ ②

اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں، سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي

اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ لکھ دیا تھا اللہ نے ان پر جلاوطن ہونا تو ان کو عذاب دیتا دنیا میں اور آخرت

الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَ

میں ان کے لئے ہے آگ کا عذاب — یہ اس لئے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور

مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴﴾ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ

جو کوئی مخالف ہو اللہ سے تو اللہ کا عذاب سخت ہے — جو کاٹ ڈالے تم نے کھجور کے

لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾

درخت یا رہنے دیئے کھڑے اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے اور تاکہ رسوا کرے نافرمانوں کو

ربط سورت اور شانِ نزول

پچھلی سورت میں یہود کی دوستی جو منافقین نے اختیار کر رکھی تھی اس کی مذمت کا بیان تھا، اس سورت میں یہود پر دنیا میں جلاوطنی کی سزا اور آخرت کا عذاب مذکور ہے، اور قصہ ان یہود کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود سے معاہدہ صلح کا ہو گیا تھا، اور ان یہودیوں کے مختلف قبائل میں ایک قبیلہ بنو نضیر کا تھا وہ بھی معاہدہ صلح میں داخل تھا، اور یہ لوگ مدینہ طیبہ سے دو میل پر رہتے تھے، ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہو گئے تھے جن کا خون بہا سب کو مل کر دینا تھا آپ نے اپنے مسلمانوں سے اس کے لئے چندہ حاصل کیا، پھر یہ ارادہ ہوا کہ یہود بھی از روئے معاہدہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں خون بہا کی رقم میں ان کو بھی شریک کیا جائے، اس کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے یہ سازش کی کہ آپ کو قتل کر دینے کا موقع ہمارے ہاتھ آ گیا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھلا دیا، اور کہا کہ ہم خون بہا کی رقم جمع کرنے کا انتظام کرتے ہیں، اور خفیہ مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جس دیوار کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں کوئی شخص اوپر چڑھ کر کوئی بڑا بھاری پتھر آپ کے اوپر چھوڑ دے کہ آپ کا کام تمام ہو جائے، آپ کو فوراً بذریعہ وحی ان کی یہ سازش معلوم ہو گئی، آپ وہاں سے اٹھ کر واپس تشریف لائے اور ان سے کہلا بھیجا کہ تم نے عہد شکنی کر کے صلح توڑ دی اس لئے اب تمہیں دس روز کی مہلت دی جاتی ہے اس میں تم جہاں چاہو چلے جاؤ، اس مدت کے بعد جو شخص یہاں نظر آوے گا اس کی گردن مار دی جاوے گی، انھوں نے چلے جانے کا ارادہ کیا تو عبداللہ ابن اُبی منافق نے ان کو روکا، کہ کہیں نہ جاؤ میرے پاس دو ہزار آدمیوں کی جمعیت ہے جو اپنی جان دیدیں گے، تم پر آنچ نہ آنے دیں گے، اور روح المعانی میں ابن اسحٰق کی روایت سے اس میں عبداللہ

معارف و مسائل

سورۂ حشر کی خصوصیت اور قبیلہ بنو نضیر کی تاریخ: سورۂ حشر پوری یہود کے قبیلہ بنو نضیر کے متعلق نازل ہوئی ہے (قالہ ابن اسحاق) اور حضرت ابن عباسؓ اس سورت کا نام ہی سورۂ بنی نضیر کہا کرتے تھے (ابن کثیر) بنو نضیر یہود کا ایک قبیلہ ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہے، ان کے آباء و اجداد تورات کے عالم تھے جس میں حضرت خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خبر اور آپ کا حلیہ اور علامات مذکور تھے، اور یہ کہ آپ کی ہجرت یثرب (مدینہ) کی طرف ہوگی، یہ خاندان اس طمع میں کہ خاتم الانبیاء کے ساتھ رہیں، شام سے مدینہ طیبہ منتقل ہوا تھا، ان کے موجودہ لوگوں میں بھی کچھ تورات کے عالم تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد علامات دیکھ کر پہچان بھی لیا تھا کہ یہی وہ نبی آخر الانبیاء ہیں، لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ وہ آخری نبی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں اُن کے خاندان میں ہوں گے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے تو اس حسد نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روک دیا، مگر دل میں ان کے اکثر لوگ آپ کے آخر الانبیاء ہونے کو جانتے پہچانتے تھے، اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی حیرت انگیز فتح اور مشرکین کی شکست دیکھ کر ان کا یہ یقین کچھ اور بڑھ بھی تھا، اس کا اقرار ان کی زبانوں سے سُنا بھی گیا، مگر اس ظاہری فتح و شکست کو حق و باطل کے پہچاننے کا معیار بنانا ہی ایک بودی اور کمزور بنیاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جب ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی، کچھ حضرات صحابہ شہید ہوئے تو ان کا یقین متزلزل ہوگیا، اور اس کے بعد سے انھوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ ساز باز شروع کردی۔

اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر حکیمانہ سیاست کے مقتضیٰ پر سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں اور شہر کے آس پاس جو کچھ یہود کے قبائل آباد تھے، ان سے معاہدۂ صلح اس پر کر لیا تھا کہ یہ لوگ نہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے اور نہ کسی جنگ کرنے والے کی امداد کریں گے، اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان ان کی امداد کریں گے، صلح نامہ میں اور بھی بہت سی دفعات تھیں جن کی تفصیل سیرت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے، اسی طرح یہود کے تمام قبائل کی جن میں بنو نضیر بھی داخل تھے، مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلہ پر اُن کی بستی اور مضبوط قلعے اور باغات تھے۔

غزوۂ اُحد تک تو یہ لوگ بظاہر اس صلح نامہ کے پابند نظر آئے، مگر اُحد کے بعد انھوں نے غداری کی اور خفیہ خیانت شروع کر دی، اس غدر و خیانت کی ابتداء اس سے ہوئی کہ بنو نضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف غزوۂ اُحد کے بعد اپنے یہودیوں کے چالیس آدمیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ

میں کامیاب ہوگئے، ان میں سے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کسی طرح نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوگئے، جو بزرگ بھی کفار کی یہ غداری اور خیانت اور اپنے ستر بہترین ساتھیوں کا بیدردی سے قتل دیکھ کر آرہے تھے اُن کا جذبہ کفار کے مقابلہ میں کیا ہوگا ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے، اتفاق یہ ہوا کہ مدینہ طیبہ واپس آنے کے وقت راستہ میں ان کو دو کافروں سے سابقہ پڑا انھوں نے دونوں کو قتل کر دیا، بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں آدمی قبیلہ بنی عامر کے تھے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح تھا۔

مسلمانوں کے معاہدات آجکل کے سیاسی لوگوں کے معاہدات تو ہوتے نہیں کہ پہلے ہی خلاف ورزی اور عہد شکنی کی راہیں تلاش کر لی جاتی ہیں، یہاں تو جو کچھ زبان یا قلم سے نکلتا تھا دین و مذہب اور خدا تعالیٰ کے حکم کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی پابندی لازمی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غلطی کا علم ہوا تو آپ نے اصول شرعیہ کے مطابق ان دونوں مقتولوں کی دیت (خونبہا) ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس کے لئے مسلمانوں سے چندہ کیا، اسی میں بنو نضیر کے پاس بھی چندہ کے سلسلے میں جانا ہوا (ابن کثیر)

بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کے وقت آج کے بڑے بڑے حکمران اور بڑی حکومتیں جو انسانی حقوق کے تحفظ پر بڑے اسلام اور مسلمانوں کی رواداری پر بڑے بڑے لیکچر دیتے ہیں اور اس کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں اور دنیا میں تحفظ **موجودہ سیاست کے لئے سبق آموز واقعہ** حقوق انسانیت کے چودھری کہلاتے ہیں ذرا اس واقعہ پر نظر ڈالیں کہ بنو نضیر کی مسلسل سازشیں خیانتیں، قتل رسول ﷺ کے منصوبے جو آپ کے سامنے آتے رہے اگر آجکل کے کسی حکمران اور کسی سربراہ مملکت کے سامنے آئے ہوتے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا، آجکل تو زندہ لوگوں پر پیٹرول چھڑک کر میدان صاف کر دینا کسی بڑے اقتدار و حکومت کا بھی محتاج نہیں، کچھ غنڈے قریب جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، شاہانہ غیظ و غضب کے کرشمے کچھ اس سے آگے ہی ہوتے ہیں۔

مگر یہ حکومت خدا کی اور اس کے رسول ﷺ کی ہے جب خیانتیں اور غداریں انتہا کو پہونچ گئیں تو اس وقت بھی ان کے قتل عام کا ارادہ نہیں فرمایا، ان کے مال واسباب چھین لینے کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ (۱) اپنا سب سامان لے کر صرف شہر خالی کر دینے کا فیصلہ کیا (۲) اور اس کے لئے بھی دس روز کی مہلت دی کہ آسانی سے اپنا سامان ساتھ لے کر اطمینان سے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جائیں جب اس کی بھی خلاف ورزی کی تو فوجی اقدام کی ضرورت پیش آئی (۳) اس میں بھی کچھ درخت تو جلائے گئے، کچھ کاٹے گئے کہ اُن پر اثر پڑے، مگر قلعہ کو آگ لگا دینے کا یا اُن کے قتل عام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا گیا۔

(۴) پھر جب مجبور ہو کر ان لوگوں نے شہر خالی کر دینا منظور کر لیا تو اس فوجی اقدام کے باوجود ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ ایک اونٹ پر جس قدر سامان ایک آدمی لے جا سکتا ہے لے جائے، اُسی کا

نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے مکانوں کی کڑیاں، تختے، دروازے تک اتار کر لاد لئے۔

(۳) اس ساز و سامان کے ساتھ منتقل ہونے والوں کو کسی مسلمان نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا، امن و عافیت اور پورے اطمینان کے ساتھ سامان لیکر رخصت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معاملات اس وقت کے ہیں جبکہ آپ کو اپنے دشمن سے انتقام پورا پورا لینے کی مکمل قدرت و طاقت حاصل تھی، ان غداروں اور سازشی دشمنوں کے ساتھ اس وقت آپ کا یہ معاملہ اسی کی نظیر ہے جو فتح مکہ کے بعد اپنے قدیمی دشمنوں کے ساتھ آپ نے فرمایا۔

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ، بنو نضیر کی اس جلا وطنی کو قرآن کریم نے اول حشر فرمایا، حشر کے معنی اُٹھ جانے کھڑے ہو جانے کے ہیں، اول حشر کہنے کی ایک وجہ خلاصہ تفسیر میں بیان ہو چکی ہے کہ یہ لوگ زمانہ قدیم میں ایک جگہ آباد تھے، نقل مکانی اور جلا وطنی کا یہ واقعہ ان کو پہلی بار پیش آیا، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کا اصل حکم آگے یہ آنے والا تھا کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلموں سے خالی کرایا جائے، تاکہ وہ اسلام کا ایک مستحکم قلعہ بن سکے، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرا حشر آئندہ انکی جلا وطنی ہونے والا تھا جو عملاً حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ہوا، ان میں سے جو لوگ منتقل ہو کر خیبر میں آباد ہوگئے تھے ان کو جزیرۃ العرب سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا، اس لحاظ سے بنو نضیر کی یہ جلا وطنی پہلا حشر اور دوسری جلا وطنی بعہد عمری دوسرا حشر ہو۔

فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا، اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہو کہ آ گیا ان کے پاس اللہ تعالیٰ اس انداز سے کہ ان کو اس کا گمان بھی نہ تھا، اللہ کے آنے سے مراد اس کے حکم اور حکم بردار فرشتوں کا آنا ہے۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ، ان کا اپنے مکانات کا اپنے ہاتھوں خراب کرنا تو اس طرح ہوا کہ اپنے دروازے اور کڑیاں لے جانے کے لئے اکھاڑے، اور مسلمانوں کے ہاتھوں اس طرح کہ جب یہ قلعہ بند تھے تو قلعے سے باہر مسلمانوں نے ان پر اثر ڈالنے کے لئے درختوں اور مکانات کو ویران کیا۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ، لفظ لِینَہ کھجور کے ہر درخت یا عجوہ کے علاوہ باقی درختوں کے لئے بولا جاتا ہے، بنو نضیر کے باغات کھجور کے تھے جب قلعہ بند ہوگئے تو بعض صحابہ کرامؓ نے ان لوگوں کو غیظ دلانے اور ان پر رعب ڈالنے کے لئے ان کی کھجوروں کے چند درختوں کو کاٹ کر یا جلا کر ختم کر دیا، اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے خیال کیا کہ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی، اور یہ درخت اور باغات مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے تو کیوں ان کو ضائع کیا جائے وہ ان کے کاٹنے جلانے سے باز رہے، یہ ایک رائے کا اختلاف تھا، بعد

پھر جب آپس میں گفتگو ہوئی تو جن حضرات نے کچھ درخت کاٹے یا جلائے تھے اُن کو یہ فکر ہوئی کہ شاید ہم گنہگار ہوگئے کہ جو مال مسلمانوں کو ملنے والا تھا اُس کو نقصان پہونچایا، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے دونوں فریق کے عمل کو جائز و درست فرمایا، اور دونوں کو باذن اللہ میں داخل کر کے حکم الٰہی کی تعمیل قرار دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم درحقیقت اللہ ہی کا حکم ہوتا ہے [illegible]

اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے جلانے یا اُن کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عملوں کو باذن اللہ فرمایا ہے، حالانکہ قرآن کی کسی آیت میں دونوں میں سے کوئی بھی حکم مذکور نہیں، ظاہر تو یہ ہے کہ دونوں حضرات نے جو عمل کیا، وہ اپنے اجتہاد سے کیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی ہو، مگر قرآن نے اس اجازت کو جو کہ ایک حدیث تھی اذن اللہ قرار دے کر واضح کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تشریع احکام کا اختیار دیا گیا ہے اور جو حکم آپ جاری فرما دیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں داخل ہے، اس کی تعمیل قرآنی آیات کی تعمیل کی طرح فرض ہے۔

اجتہادی اختلاف کی دونوں جانبوں میں کسی کو گناہ نہیں کہہ سکتے

دوسرا مسئلہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ اجتہاد شرعی کی صلاحیت رکھتے ہیں، اگر ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں مختلف ہوجائے، ایک فریق ناجائز قرار دے اور دوسرا جائز، تو عند اللہ یہ دونوں حکم درست اور جائز ہوتے ہیں، ان میں سے کسی کو گناہ و معصیت نہیں کہہ سکتے، اور اسی لئے اس پر نہی عن المنکر کا قانون جاری نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے کوئی جانب بھی منکر شرعی نہیں، اور وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ میں درختوں کے کاٹنے یا جلانے والوں کے عمل کی توجیہ بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی فساد میں داخل نہیں بلکہ کفار کو ذلیل کرنے کے قصد سے موجب ثواب ہے۔

مسئلہ: بحالتِ جنگ کفار کے گھروں کو منہدم کرنا یا جلانا اسی طرح درختوں، کھیتوں کو برباد کرنا جائز ہے یا نہیں اس میں ائمہ فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بحالتِ جنگ ان سب کاموں کا جائز ہونا منقول ہے، مگر شیخ ابن ہمامؒ نے فرمایا کہ یہ جواز اس وقت میں ہے جبکہ اس کے بغیر کفار پر غلبہ پانا مشکل ہو، یا اس صورت میں جبکہ مسلمانوں کی فتح کا گمان غالب نہ ہو، تو یہ سب کام اس لئے جائز ہیں کہ ان سے کفار کی طاقت و شوکت کو توڑنا مقصود ہے، یا عدم فتح کی صورت میں اُن کے مال کو ضائع کرنا بھی ان کی قوت کو کمزور کردینے کے لئے اس میں داخل ہے (مظہری)

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ

اور جو مال کہ لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے اور

وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

نہ اونٹ ولیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہے اور اللہ سب چیز

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ

کر سکتا ہے جو مال کہ لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے

لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ

تاکہ نہ آوے لینے دینے میں دولتمندوں کے تم میں سے اور جو دے تم کو رسول

فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ کا

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ

عذاب سخت ہے واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے

دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ

ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی اور مدد

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ

کرنے کو اللہ کی اور اس کے رسول کی، وہ لوگ وہی ہیں سچے اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں

وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ

اور ایمان میں ان سے پہلے سے وہ محبت کرتے ہیں اس سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے

صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ

دل میں تنگی اس چیز سے جو مہاجرین کو دی جائے اور مقدم رکھتے ہیں اُن کو اپنی جان سے اور

كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

اگرچہ ہو اپنے اوپر فاقہ اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں

وقف لازم

الْمُفْلِحُونَ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا

مراد پانے والے ۔ اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے اے رب بخش ہم کو

وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا

اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر

لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٠﴾

ایمان والوں کا اے رب تو ہی ہے نرمی والا مہربان ۔

خلاصۂ تفسیر

(اوپر جو بیان ہوا وہ تو بنی نضیر کی جلاوطنی کے ساتھ متعلق تھا) اور ان کے اموال کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا بیان یہ ہے کہ) جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوا دیا سو (اس میں تم کو کوئی مشقت نہیں پڑی، چنانچہ) تم نے اس پر (یعنی اس کے حاصل کرنے پر) نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، (مطلب یہ کہ نہ سفر کی مشقت ہوئی کیونکہ مدینہ سے دو میل پر ہے اور نہ قتال کی، دوسرے نام جو مقابلہ کیا گیا وہ غیر معتد بہ تھا کما فی الروح، اس لئے اس مال میں تمہارا استحقاق تقسیم و تملیک کا نہیں جس طرح مال غنیمت میں ہوتا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو (اپنے دشمنوں میں سے) جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرما دیتا ہے (یعنی محض رعب سے مغلوب کر دیتا ہے جس میں کسی کو کچھ مشقت اٹھانی نہیں پڑتی چنانچہ اُن رسولوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اموال بنی نضیر پر اسی طرح مسلط فرما دیا، اس لئے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اس میں مالکانہ تصرف کرنے کا مکمل اختیار آپ کو ہی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (پس وہ جس طرح چاہے دشمنوں کو مغلوب کرے اور جس طرح چاہے اپنے رسول کو اختیار اور تصرف دے اور جیسا اموال بنی نضیر کا یہ حکم ہے اسی طرح) جو کچھ اللہ تعالیٰ (اسی طور پر) اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے (کافر) لوگوں سے دلوا دے (جیسا باغ فدک اور ایک جزو خیبر کا اسی طرح ہاتھ آیا) سو (اس میں بھی تمہارا کوئی استحقاق ملکیت کا نہیں بلکہ) وہ (بھی) اللہ کا حق ہے (یعنی وہ جس طرح چاہے اس میں حکم دے جیسا کہ اور سب چیزوں میں اس کا اسی طرح کا حق ہے اور تخصیص حصر کے لئے نہیں) اور رسول کا حق ہے (کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس مال میں مالکانہ تصرفات اپنی صوابدید سے کرنے کا اختیار دیدیا ہے) اور (آپ کے) قرابت داروں کا (حق ہے) اور یتیموں کا (حق ہے) اور غریبوں کا (حق ہے) اور مسافروں کا (حق ہے یعنی یہ سب حسب صوابدید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال کے مصرف ہیں، اور ان میں بھی انحصار نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جس کو اپنی رائے سے دینا چاہیں وہ بھی اس میں شامل ہے اور مذکورہ اقسام کا خاص طور پر ذکر شاید اس لئے کیا گیا کہ ان کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جب شریک جہاد کا اس مال میں حق ہی نہیں تو یہ اقسام جو شریک جہاد بھی نہیں ان کا بھی حق نہیں ہوگا، مگر آیت میں ان کا ذکر خاص اوصاف یتیم، غریب، مسافر وغیرہ کے ساتھ کر کے اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے ان اوصاف کی وجہ سے اس مال کے مصرف بنفس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں جہاد کی شرکت سے اس کا تعلق نہیں، پھر ان اوصاف میں ایک وصف ذوی القربیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں کا بھی ہے، ان کو اس مال میں سے اس لئے دیا جاتا تھا کہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار تھے ہر مشکل کے وقت کام آتے تھے، یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہوگیا جیسا کہ سورۃ انفال میں اس کا بیان آچکا ہے) اور یہ حکم مذکور اس لئے مقرر کر دیا تاکہ وہ (مال فئ) تمہارے مالداروں کے قبضہ میں نہ آجائے جیسا جاہلیت میں سب غنیمت و مال حاصل جنگ سب پر قبضہ کر جاتے تھے اور فقراء بالکل محروم رہ جاتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کی رائے پر رکھا اور مصارف بھی بتلا دیئے کہ آپ باوجود مالک ہونے کے پھر بھی اہل حاجت و مواقع مصلحت عامہ میں صرف فرمادیں گے اور (جب یہ معلوم ہوگیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ہونے میں حکمت ہے تو) رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لیا کرو اور جس چیز کے لینے سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو (اور یہ الفاظ عام ہیں تو تمام افعال و احکام میں بھی) اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے اور (یوں تو فئ میں مطلقاً سب مساکین کا حق ہے لیکن) ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے (جبراً و ظلماً) جدا کر دیئے گئے (یعنی کفار نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے اور اس ہجرت سے) وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں (کسی دنیوی غرض سے ہجرت نہیں کی) اور وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے (دین) کی مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں اور (نیز) ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دارالاسلام (یعنی مدینہ) میں اور ایمان میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں (مراد اس سے انصاری حضرات ہیں، اور مدینہ میں ان کا پہلے قرار پکڑنا تو ظاہر ہے کہ وہ یہیں کے باشندے تھے، اور ایمان میں پہلے قرار پکڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب انصار کا ایمان سب مہاجرین سے مقدم ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ مہاجرین کے مدینہ میں آنے سے پہلے ہی یہ حضرات مشرف باسلام ہو چکے تھے، خواہ اصل ایمان ان کا بعض مہاجرین کے ایمان سے مؤخر ہی ہوا ہو) جو اُن کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ (مال غنیمت وغیرہ میں سے) ملتا ہے اس سے یہ (انصار بوجہ محبت کے) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں

سورۂ انفال کے شروع میں مالِ غنیمت اور فئی کا فرق واضح طور پر بیان ہو چکا ہے، کہ غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو کفار سے جہاد و قتال کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے، اور فئی وہ مال ہے جو بغیر جہاد و قتال کے ان سے حاصل ہو، خواہ اس طرح کہ وہ اپنا مال چھوڑ کر بھاگ گئے، یا رضامندی سے بصورت جزیہ و خراج یا تجارتی ڈیوٹی وغیرہ کے ذریعہ اُن سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی کچھ تفصیل شروع سورۂ انفال میں معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۴۷ میں اور مزید تفصیل سورۂ انفال کی آیت ۴۱ کے تحت معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۳۶ میں لکھی جا چکی ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سورۂ انفال کی آیت ۴۱ میں جو الفاظ خمس غنیمت کے متعلق آئے ہیں تقریباً وہی الفاظ یہاں مال فئی کے بارے میں ہیں، سورۂ انفال میں ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ،

ان دونوں آیتوں میں مال کے حقداروں میں چھ نام ذکر کئے گئے، اللہ، رسول، ذوی القربیٰ، یتیم، مسکین، مسافر، یہ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ تو دنیا و آخرت اور تمام مخلوقات کا مالک حقیقی ہے، اس کا نام مبارک تو حصوں کے بیان میں محض تبرکاً اس فائدہ کے لئے ہے کہ اس سے اس مال کی شرافت و فضیلت اور حلال و طیب ہونے کی طرف اشارہ ہو جائے، حسن بصری، قتادہ، عطاء، ابراہیم، شعبی اور عام مفسرین کا یہی قول ہے (مظہری)

اللہ جل شانہٗ کا نام ذکر کرنے سے اس مال کی فضیلت و شرافت کی طرف اشارہ کس طرح ہوا اس کا تفصیلی بیان سورۂ انفال کی تفسیر میں ہو چکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے لئے مال صدقہ جو مسلمانوں سے حاصل ہوتا ہے وہ بھی حلال نہیں فرمایا، مال غنیمت اور فئی جو کفار سے حاصل ہوا اس پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیسے حلال ہو؟ اس شبہ کا ازالہ اللہ جل شانہٗ کا نام اس جگہ ذکر کر کے اس طرح کیا گیا کہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے اپنے فضل سے ایک خاص قانون کے تحت انسانوں کو حق ملکیت دیا ہے، لیکن جو انسان باغی ہو جائیں ان کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے، اول تو انبیاء علیہم السلام اور آسمانی ہدایات بھیجی گئیں جن سے بھی متاثر نہیں ہوئے ان کو یہ حق دیا گیا کہ کم از کم اسلامی قانون کی اطاعت قبول کریں اور مقررہ جزیہ و خراج اپنے مال میں سے حکومت کو ادا کیا کریں، جن لوگوں نے اس سے بھی بغاوت کی ان کے مقابلہ میں جہاد و قتال کا حکم ہو گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اُن کی جان اور مال قابلِ احترام نہیں، ان کے اموال بحق حکومت الٰہیہ ضبط ہو گئے، اور بذریعہ جہاد و قتال جو مال اُن سے حاصل ہوا وہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں رہا، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ملک میں داخل ہو گیا، اور لفظ فئی میں اس مفہوم کی طرف اشارہ بھی ہے کیونکہ اس کے اصلی معنی لوٹنے ہی کے ہیں، اس مال کو فئی اس لئے کہا گیا کہ یہ اصل مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی طرف لوٹ گیا

اب اس میں کسی انسانی ملکیت کا کوئی دخل نہیں، اس کے بعد جن مستحقین کو اس میں کوئی حصہ دیا جائے گا یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، اس لئے ایسا ہی حلال طیب ہوگا جیسے پانی اور خود اُگنے والی گھاس جو براہِ راست حق تعالیٰ کا عطیہ انسان کے لئے ہے اور حلال طیب ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس جگہ ذکر کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سارا مال دراصل اللہ کا ہے، اس کی طرف سے مستحقین کو دیا جاتا ہے یہ کسی کا صدقہ و خیرات نہیں۔

اب آیت میں اس کے مصارف کل پانچ رہ گئے، رسول، ذوی القربیٰ، یتیم، مساکین، ابن السبیل، یہ پانچ مصارف وہی ہیں جو مالِ غنیمت کے خمس کے ہیں جس کا بیان سورۂ انفال میں آچکا ہے اور یہی مصارف مالِ فئے کے ہیں اور دونوں کا حکم یہ ہے کہ یہ سب اموال درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے حکم و اختیار میں ہوتے ہیں وہ چاہیں تو ان سب اموال کو عام مسلمانوں کے مفاد کے لئے روک لیں اور بیت المال میں جمع کردیں کسی کو کچھ نہ دیں اور چاہیں تقسیم کردیں، البتہ تقسیم کئے جاویں تو ان پانچ قسموں میں دائر رہیں (قرطبی)

خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو مالِ فئے آپ کے اختیار میں تھا، آپ کی صوابدید کے مطابق صرف کیا جاتا تھا، آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے اختیار اور صوابدید پر رہا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ اس مال میں رکھا گیا تھا وہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا ذوی القربیٰ کو اس مال میں سے دینے کی دو وجہ تھیں، ایک نصرتِ رسول یعنی اسلامی کاموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا، اس لحاظ سے اغنیاء ذوی القربیٰ کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ کے لئے مالِ صدقہ حرام کردیا گیا ہے، تو ان کے فقراء و مساکین کو صدقہ کے بدلہ میں مالِ فئے سے حصہ دیا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نصرت و مدد کا سلسلہ ختم ہوگیا، تو یہ وجہ باقی نہ رہی، اس لئے اغنیاء ذوی القربیٰ کا حصہ بھی حصہ رسول کی طرح ختم ہوگیا، البتہ فقراء ذوی القربیٰ کا حصہ بحیثیت فقر و احتیاج کے اس مال میں باقی رہا، اور وہ اس مال میں دوسرے فقراء و مساکین کے مقابلہ میں مقدم رکھے جاویں گے (کذا فی الہدایہ) اس کی پوری تفصیل سورۂ انفال میں آچکی ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ، دُوْلَۃٌ، بضمِ دال اُس مال کو کہا جاتا ہے جس کا آپس میں لین دین کیا جائے (قرطبی) (معنی آیت کے یہ ہیں کہ مالِ فئے کے مستحقین اس لئے متعین کردیئے) تاکہ یہ مال محض مالداروں اور تونگروں میں گردش کرنے والی دولت نہ بن جائے" اس میں اشارہ اس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کی طرف ہے جس میں اس طرح کے تمام اموال پر رئیس خود قابض و مالک ہو جاتا تھا،

غریبوں مسکینوں کے حق کا اس میں کوئی حصہ نہ رہتا تھا۔

اکتناز دولت پر اسلامی قانون کی ضرب کاری: حق تعالیٰ رب العالمین ہے، سب کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے انسانی ضروریات میں تمام انسانوں کا یکساں حق ہے، اس میں مومن و کافر کا بھی فرق نہیں رکھا گیا، خاندانی و طبقاتی امیر و غریب کا کیا امتیاز ہوتا، حق تعالیٰ نے دنیا میں تقسیم دولت کا بہت بڑا حصہ جو انسان کی فطری اور اصلی ضروریات پر مشتمل ہے اس کی تقسیم خود اپنے دست قدرت میں رکھ کر یہ ثابت فرما دی ہے کہ اس سے ہر طبقہ ہر خطہ ہر کمزور و قوی یکساں فائدہ اٹھا سکے، ایسی اشیاء کو حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے عام انسانی دسترس اور قبضہ و تسلط سے مافوق بنا دیا ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ ان پر ذاتی قبضہ کر سکے، ہوا، فضا، آفتاب، ماہتاب اور ستاروں کی روشنی، فضا میں پیدا ہونے والے بادل، ان کی بارش یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے بغیر انسان تھوڑی دیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا، ان سب کو قدرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے ایسا وقف عام بنا دیا کہ کوئی بڑی سے بڑی حکومت و طاقت اس پر قبضہ نہیں جما سکتی، یہ چیزیں اللہ کی خلق کو ہر جگہ یکساں ملتی ہیں۔

انسانی ضرورت کی دوسری قسط زمین سے نکلنے والی غذائی اور کھانے کی چیزیں ہیں، یہ اگرچہ اتنی عام نہیں مگر اسلامی قانون میں پہاڑوں وغیرہ غیر آباد جنگلوں اور قدرتی چشموں کو وقف عام قرار دیا گیا ہے، خاص قانون کے تحت خاص خاص انسانوں کو زمین کے بعض حصوں پر جائز حق ملکیت بھی دیا جاتا ہے اور ناجائز قبضہ و تسلط جمانے والے بھی زمین پر قبضہ جما لیتے ہیں، لیکن قدرتی طور پر زمین کے فوائد کوئی بڑا سرمایہ دار بھی بغیر غریبوں، کسانوں، مزدوروں کو ساتھ لئے حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے ایک گونہ قبضہ کے باوجود وہ اس میں دوسرے کمزور غریبوں کو حصہ دینے پر مجبور ہے۔

تیسری قسط سونا چاندی اور روپیہ پیسہ ہے، جو اصلی اور فطری ضروریات میں داخل نہیں، مگر حق تعالیٰ نے اس کو تمام ضروریات کی تحصیل کا ذریعہ بنا دیا ہے، اور یہ معدنوں سے نکالنے کے بعد خاص قانون کے تحت نکالنے والوں کی ملکیت ہو جاتا ہے، اور ان سے ان کی ملکیت مختلف طریقوں پر دوسروں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے، اور اگر اس کی گردش پورے انسانوں میں خاطر خواہ ہوتی رہے تو کوئی انسان بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، مگر ہوتا یہ ہے کہ اس سے صرف خود ہی فائدہ اٹھائے، دوسروں تک اس کا فائدہ نہ پہونچے، اس بخل و حرص نے دنیا میں اکتناز دولت اور سرمایہ پرستی کے پرانے اور نئے بہت سے طریقے ایجاد کرائے، جن کے ذریعہ اس دولت کی گردش صرف سرمایہ داروں اور بڑے لوگوں کے ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ گئی، عام غریب مساکین محروم کر دیئے گئے، جس کے ردِ عمل نے دنیا میں کمیونزم اور سوشلزم جیسے نامعقول طریقے ایجاد کئے۔

اسلامی قانون نے ایک طرف تو شخصی ملکیت کا اتنا احترام کیا کہ ایک شخص کے مال کو اس کی جان

مشرف باسلام ہونے والوں کے نقش قدم پر چلے جس میں قیامت تک آنے والے مسلمان سب شریک ہیں آگے ان تینوں طبقات کے کچھ فضائل و علامات اور دینی خدمات کا بیان ہے۔

فضائل مہاجرین

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

ان میں مہاجرین کا پہلا وصف یہ بیان فرمایا کہ ان کو اُن کے وطن اور اموال و جائداد سے نکال دیا گیا، یعنی کفار مکہ نے صرف اس جرم میں کہ یہ لوگ مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار ہوگئے تھے ان پر طرح طرح کے مظالم کئے یہاں تک کہ وہ اپنا وطن اور اموال و جائداد چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، بعض لوگ بھوک سے مجبور ہو کر پیٹ کو پتھر باندھ لیتے تھے، اور بعض لوگ سردی کا سامان نہ ہونے کے سبب زمین میں گڑھا کھود کر اس میں سردی سے بچتے تھے (مظہری قرطبی)۔

ایک اہم مسئلہ، مسلمانوں کے اموال پر کفار کے قبضہ کا حکم: اس آیت میں حضرات مہاجرین کو فقراء فرمایا ہے، اور فقیر وہ شخص ہوتا ہے جس کی ملک میں کچھ نہ ہو یا کم از کم بقدر نصاب کوئی چیز نہ ہو، حالانکہ حضرات مہاجرین میں اکثر مکہ مکرمہ میں اصحاب اموال و جائداد تھے اگر ہجرت کے بعد بھی وہ اموال ان کی ملکیت ہوتے تو ان کو فقراء کہنا درست نہ ہوتا، قرآن کریم نے ان کو فقراء فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ہجرت کے بعد ان کی جائداد و اموال جو مکہ میں چھوڑ آئے اور کفار نے ان پر قبضہ کر لیا وہ ان کی ملک سے نکل گئے۔

اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک نے فرمایا کہ اگر مسلمان کسی جگہ ہجرت کر کے چلے آویں اور ان کے مال و جائداد پر کفار قابض ہو جاویں یا خدانخواستہ کسی دار الاسلام پر وہ غالب آکر مسلمانوں کے مال و جائداد چھین لیں تو یہ اموال و جائداد کفار کے بحکم قبضہ مالکانہ ان ہی کی ملک ہو جاتے ہیں، ان کے تصرفات بیع و بخشش وغیرہ ان اموال میں نافذ ہوتے ہیں، روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے تفسیر مظہری میں اس جگہ وہ سب روایات نقل کی ہیں۔

دوسری صفت مہاجرین کی اس آیت میں یہ ذکر فرمائی ہے يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا یعنی ان کے اسلام میں داخل ہونے اور پھر ہجرت کرنے اور وطن کو چھوڑنے کی کوئی دنیوی غرض نہ تھی، بلکہ صرف اللہ کا فضل اور رضا مطلوب تھی جس سے ان کا کمال اخلاص معلوم ہوا، لفظ فضل عموماً دنیوی نعمت کے لئے اور رضوان آخرت کی نعمت کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مفہوم یہ ہوا کہ ان حضرات نے اپنے تمام سابقہ اسباب عیش مکان جائداد وغیرہ کو تو چھوڑ دیا، اب دنیا کی ضروریات بھی اور آخرت کی نعمتیں بھی صرف اسلام کے سایہ میں مطلوب تھیں، دنیا کی ضروریات زندگی بھی اللہ و رسولؐ کی رضا کے تحت حاصل کرنا مقصود تھا۔

تیسرا وصف حضرات مہاجرین کا یہ بیان فرمایا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ یعنی یہ سب کام

انھوں نے اس لئے اختیار کئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کریں، اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے جس میں انھوں نے حیرت انگیز قربانیاں پیش کیں۔

چوتھا وصف اُن کا أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ یعنی یہی لوگ قول و عمل کے سچے ہیں، کلمۂ اسلام پڑھ کر جو عہد اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھا تھا اس میں پورے اترے، اس آیت نے تمام صحابہ مہاجرین کے صادق ہونے کا عام اعلان کردیا، جو شخص ان میں سے کسی کو جھوٹا قرار دے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ اس آیت کا منکر ہے، معاذ اللہ روافض جو ان حضرات کو منافق کہتے ہیں یہ اس آیت کی کھلی تکذیب ہے۔ ان حضرات مہاجرین کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ مقام تھا کہ اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ان فقراء مہاجرین کا وسیلہ دے کر دعا فرماتے تھے (کما فی البغوی، مظہری)

فضائل انصار

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ الآیۃ، تبوّؤ کے معنی ٹھکانا بنانے کے ہیں، اور دار سے مراد دار ہجرت یا دار الایمان یعنی مدینہ طیبہ ہے۔

مدینہ طیبہ کی ایک خاص فضیلت اسی لئے حضرت امام مالک اس حیثیت سے مدینہ طیبہ کو باقی دنیا کے سب شہروں سے افضل قرار دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دنیا کے تمام شہر و ملک جہاں جہاں اسلام پہنچا اور پھیلا ہے سب جہاد کے ذریعہ فتح ہوئے ہیں یہاں تک کہ مکہ مکرمہ بھی، بجز مدینہ طیبہ کے یہ صرف ایمان سے فتح ہوا ہے (قرطبی)

اس آیت میں تبوّؤ کے تحت میں دار کے ساتھ ایمان کا بھی ذکر فرمایا ہے، حالانکہ ٹھکانا پکڑنے کا تعلق کسی مقام اور جگہ سے ہوتا ہے، ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جس میں ٹھکانا پکڑا جائے، اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں ایک لفظ محذوف ہے، یعنی اخلصوا یا تمکنوا، مطلب یہ ہوگا کہ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے دار الہجرت میں ٹھکانا بنایا، اور ایمان میں مخلص اور مضبوط رہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں استعارہ کے طور پر ایمان کو ایک محفوظ مکان سے تشبیہ دے کر اس میں پناہ گزین ہوجانے کو بیان فرمایا ہو، اور لفظ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی مہاجرین سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ انصار مدینہ کی ایک فضیلت یہ ہے کہ جو شہر اللہ کے نزدیک دار الہجرت اور دار الایمان بننے والا تھا اس میں ان لوگوں کا قیام و قرار مہاجرین سے پہلے ہوچکا تھا، اور مہاجرین کے یہاں منتقل ہونے سے پہلے ہی یہ حضرات ایمان قبول کرکے اس میں پختہ ہوچکے تھے۔

دوسری صفت حضرات انصار کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ، یعنی یہ حضرات ان لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کے شہر میں چلے آئے ہیں، جو عام دنیا کے انسانوں کے مزاج کے خلاف ہے، ایسے اُجڑے ہوئے خستہ حال لوگوں کو اپنی بستی میں جگہ دینا کون پسند کرتا ہے، ہر جگہ ملکی اور غیر ملکی کے سوالات کھڑے ہوتے ہیں، مگر ان حضرات انصار نے

صرف یہی نہیں کیا کہ ان کو اپنی بستی میں جگہ دی، بلکہ اپنے مکانوں میں آباد کیا اور اپنے اموال میں حصہ دار بنایا، اور اس طرح عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا کہ ایک ایک مہاجر کو اپنے پاس جگہ دینے کے لئے کئی کئی انصاری حضرات نے درخواست کی یہاں تک کہ قرعہ اندازی کرنی پڑی، قرعہ کے ذریعہ جو مہاجر جس انصاری کے حصہ میں آیا اس کو سپرد کیا گیا (مظہری)

تیسرا وصف حضرات انصار کا یہ بیان فرمایا لَا یَجِدُونَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا اس جملے کا تعلق ایک خاص واقعہ سے ہے جو بنو نضیر کے جلاوطن ہونے اور ان کے باغات و مکانات پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے وقت پیش آیا۔

اموال بنو نضیر کی صورت یہ تھی کہ جب اس آیت میں اموال فئے کی تقسیم مہاجرین و انصار وغیرہ میں کرنے کا تقسیم کا اختیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیا گیا، یہ وہ وقت تھا کہ مہاجرین کے پاس نہ اپنا کوئی مکان تھا نہ جائداد، وہ حضرات انصار کے مکانوں میں رہتے اور انہی کی جائدادوں میں محنت مزدوری کر کے گذارہ کرتے تھے، جب بنو نضیر اور بنو قینقاع کے اموال بطور فئے کے مسلمانوں کو حاصل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کے سردار ثابت بن قیس بن شماسؓ کو بلا کر فرمایا کہ اپنی قوم انصار کو میرے پاس بلا دو، انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ، انصار کے اپنے قبیلہ خزرج کو یا سب انصار کو؟ آپ نے فرمایا سب ہی کو بلانا ہے، یہ حضرات سب جمع ہوگئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا، جس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد انصار مدینہ کی اس بات پر مدح و ثناء فرمائی کہ انہوں نے جو سلوک اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ کیا وہ بڑے عزم و ہمت کا کام تھا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال آپ لوگوں کو دیدیئے ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں ان اموال کو مہاجرین و انصار سب میں تقسیم کردوں اور مہاجرین بدستور سابق آپ کے مکانوں میں رہائش پذیر رہیں، اور آپ چاہیں تو ایسا کیا جائے کہ یہ بے گھر و بے زر لوگ ہیں، یہ اموال صرف ان میں تقسیم کر دیئے جائیں، اور یہ لوگ آپ کے گھروں کو چھوڑ کر الگ اپنے اپنے گھر بسالیں۔

یہ سن کر انصار مدینہ کے دو بڑے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سب اموال بھی صرف مہاجر بھائیوں میں تقسیم فرمادیجئے اور وہ پھر بھی ہمارے مکانوں میں بدستور مقیم رہیں، ان کی بات سن کر تمام حاضرین انصار بول اٹھے کہ ہم اس فیصلے پر راضی اور خوش ہیں، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انصار اور ابنائے انصار کو دعا دی اور ان اموال کو صرف مہاجرین میں تقسیم فرمادیا، انصار میں سے صرف دو حضرات کو جو بہت حاجتمند تھے اس میں سے حصہ عطا فرمایا، یعنی سہل بن حنیفؓ اور ابو دجانہؓ اور سعد بن معاذؓ کو ایک تلوار عطا فرمائی جو ابن ابی الحقیق کی ایک ممتاز تلوار تھی (مظہری بحوالہ سبل الرشاد محمد بن یوسف الصالحی)

آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد فرمایا وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا، اس میں حاجت سے مراد ہر ضرورت کی چیز ہے، اور مِّمَّآ أُوتُوا کی ضمیر مہاجرین کی طرف راجع ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اس تقسیم میں جو کچھ مہاجرین کو دیدیا گیا، انصار مدینہ نے خوشی سے اس کو اس طرح قبول کیا کہ گویا ان کو ان چیزوں کی کوئی حاجت ہی نہیں، ان کو دینے سے برا ماننا یا شکایت کرنا اس کا تو وہاں کوئی امکان ہی نہ تھا، اس کے بالمقابل جب بحرین فتح ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ یہ پورا مال صرف انصار میں تقسیم کر دیا جائے مگر انصار نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ عرض کیا کہ ہم اس وقت تک نہیں لیں گے جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اس میں سے حصہ نہ دیا جائے (رواہ البخاری عن انس بن مالکؓ، از ابن کثیر)

چوتھا وصف: انصار مدینہ رضی اللہ عنہم کا اس آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. خصاصہ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں، اور ایثار کے معنی دوسرے کی خواہش اور حاجت کو اپنی خواہش اور حاجت پر مقدم رکھنے کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ حضرات انصار اپنے اوپر دوسروں کو یعنی مہاجرین کو ترجیح دیتے تھے کہ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے ان کی حاجت کو پورا کرتے تھے، اگرچہ یہ خود حاجتمند اور فقر و فاقہ میں ہوں۔

حضرات صحابہ خصوصاً انصار کے ایثار کے چند واقعات

اگرچہ تفسیر آیت کے لئے بیان واقعات کی ضرورت نہیں، مگر یہ واقعات انسان کو اعلیٰ انسانیت کا سبق دینے والے اور زندگی میں انقلاب لانے والے ہیں، اس لئے حضرات مفسرین نے اس موقع پر ان کو تفصیل سے لکھا ہے، خصوصاً قرطبی نے، اس میں سے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری کے گھر رات کو کوئی مہمان آ گیا، ان کے پاس صرف اتنا کھانا تھا کہ یہ خود اور ان کے بچے کھا سکیں، انہوں نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ بچوں کو تو کسی طرح سلا دو اور گھر کا چراغ گل کر دو، پھر مہمان کے سامنے کھانا رکھ کر برابر بیٹھ جاؤ، کہ مہمان یہ سمجھے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں، مگر ہم نہ کھائیں، تاکہ مہمان بفراغت کھانا کھا سکے، اس پر یہ آیت مذکورہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ نازل ہوئی (قال الترمذی هذا حسن صحیح)

اور ترمذی ہی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسرا واقعہ یہ منقول ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھوک سے پریشان ہوں، آپؐ نے ازواج مطہرات میں سے ایک کے پاس اطلاع بھیجی تو ان کا جواب آیا کہ ہمارے پاس تو اس وقت بجز پانی کے کچھ نہیں، دوسری کے پاس پیغام بھیجا وہاں سے بھی یہی جواب آیا، پھر تیسری چوتھی یہاں تک کہ تمام ازواج مطہرات کے پاس بھیجا اور سب کا ایک ہی جواب آیا کہ پانی کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں، اب آپ نے حاضرین مجلس کو خطاب فرمایا کہ کون ہے جو آج رات اس شخص کی مہمانی کرے؟ ایک انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ میں کروں گا، وہ ان کو لے گئے اور جا کر گھر میں پوچھا کہ کھانے کو کچھ ہے؟ بیوی نے بتلایا کہ صرف بچوں کا قوت ہے

کہ ہمارے بچے کھا رہے ہیں، انصاری بزرگ نے بچوں کو سلا دینے کے لئے فرمایا، اور فرمایا کہ مہمان کے ساتھ کھانا رکھنے اور خود ساتھ بیٹھ جانے کے بعد اٹھ کر چراغ گل کر دینا کہ ہم سے نہ کھانے کا مہمان کو احساس نہ ہو، مہمان نے کھانا کھا لیا جب یہ صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس معاملہ کو جو تم نے گذشتہ رات اپنے مہمان کے ساتھ کیا بہت پسند فرمایا۔

اور مہدوی نے ایک ایسا ہی واقعہ ایک انصاری بزرگ کا حضرت ثابت بن قیسؓ کے ساتھ رات کو چراغ گل کر کے کھانا کھلانے کا ذکر کیا ہے، اور تمام واقعات کے ساتھ روایات میں یہی ہے کہ آیت مذکورہ اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے۔

اور قشیری نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے ایک بزرگ کو کسی شخص نے ایک بکری کا سر بطور ہدیہ پیش کیا، اس بزرگ نے خیال کیا کہ ہمارا فلاں بھائی اور اس کے اہل و عیال ہم سے زیادہ ضرورتمند ہیں، یہ سر ان کے پاس بھیج دیا، اس دوسرے بزرگ کے پاس پہنچا تو اسی طرح انھوں نے تیسرے کے پاس اور تیسرے نے چوتھے کے پاس بھیج دیا، یہاں تک کہ سات گھروں میں پھرنے کے بعد پھر پہلے بزرگ کے پاس واپس آ گیا، اس واقعہ پر آیات مذکورہ نازل ہوئیں، اس واقعہ کو ثعلبی نے حضرت انسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

موطا امام مالکؒ میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مسکین نے اُن سے سوال کیا، ان کے گھر میں صرف ایک روٹی تھی اور ان کا اس روز روزہ تھا، آپ نے اپنی خادمہ سے فرمایا کہ یہ روٹی اس کو دیدو، خادمہ نے کہا کہ اگر یہ دیدی گئی تو شام کو آپ کے افطار کرنے کے لئے کوئی چیز نہ رہے گی، حضرت صدیقہؓ نے فرمایا کہ پھر بھی دیدو، یہ خادمہ کہتی ہیں کہ جب شام ہوئی تو ایک ایسے شخص نے جس کی طرف سے ہدیہ دینے کی کوئی رسم نہ تھی ایک سالم بکری بھنی ہوئی اور اس کے اوپر آٹے میدے کا خول چڑھا ہوا پختہ، جو عرب میں سب سے بہترین کھانا سمجھا جاتا ہے، اُن کے پاس بطور ہدیہ بھیجدیا، حضرت صدیقہؓ نے خادمہ کو بلایا کہ آؤ یہ کھاؤ یہ تمہاری اُس روٹی سے بہتر ہے۔

اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ بیمار تھے، اور انگور کو جی چاہا ان کے لئے ایک درہم میں ایک خوشہ انگور کا خرید کر لایا گیا، اتفاق سے ایک مسکین آ گیا اور سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ خوشہ اس کو دیدو، حاضرین میں سے ایک شخص خفیہ طور پر اس کے پیچھے گیا، اور خوشہ اس مسکین سے خرید کر پھر ابن عمرؓ کو پیش کر دیا، مگر یہ سائل پھر آیا اور سوال کیا تو حضرت ابن عمرؓ نے پھر اس کو دیدیا، پھر کوئی صاحب خفیہ طور پر گئے اور اس مسکین کو ایک درہم دے کر خوشہ خرید لائے، اور حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں پیش کر دیا، وہ سائل پھر آنا چاہتا تھا لوگوں نے منع کر دیا، اور حضرت ابن عمرؓ کو یہ اطلاع ہوتی کہ یہ وہی خوشہ ہے جو انھوں نے صدقہ میں دیدیا تھا، تو ہرگز نہ کھاتے، مگر ان کو یہ

ایک شبہ کا جواب حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات ایثار جو اوپر بیان ہوئے ہیں ان پر ایک شبہ روایت حدیث سے یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مال صدقہ کر ڈالنے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بیضہ کے برابر سونے کا ٹکڑا بغرض صدقہ پیش کیا تو آپ نے اس کو اسی کی طرف پھینک کر مار دیا اور فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کو لے آتے ہیں پھر محتاج ہو کر لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں۔

جواب اس شبہ کا انہی روایات سے یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، ہر حال کا حکم الگ ہے، پورا مال صدقہ کر ڈالنے کی ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے جو بعد میں فقر و فاقہ پر صبر نہ کر سکیں، اور صدقہ کئے ہوئے پر پچھتائیں یا پھر لوگوں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں، اور وہ لوگ جن کے عزم و ہمت اور ثبات و استقلال کا یہ حال ہو کہ سب کچھ خرچ کر ڈالنے کے بعد فقر و فاقہ پر انھیں کوئی پریشانی نہ ہو، بلکہ ہمت کے ساتھ اس پر صبر کر سکتے ہوں ان کے لئے سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک جہاد میں چندہ میں اپنا سارا مال پیش کر دیا تھا، اسی کے نظائر یہ واقعات ہیں جو اس جگہ مذکور ہیں، ایسے حضرات نے اپنے اہل و عیال کو بھی اسی صبر و استقلال کا خوگر بنا رکھا تھا، اس لئے اس میں ان کی بھی کوئی حق تلفی نہ تھی، اگر مال خود اہل و عیال کے قبضہ میں ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ (قرطبی باضافہ اشباہ)

حضرات مہاجرین کی طرف سے انصار کی مکافات دنیا میں کوئی اجتماعی کام یک طرفہ رواداری و ایثار سے قائم نہیں رہتا جب تک دونوں طرف سے اسی طرح کا معاملہ نہ ہو، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا اس کی ترغیب دی کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کریں کہ باہمی محبت بڑھا کرے، اسی طرح جن کو ہدیہ دیا گیا ہے ان کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم بھی ہدیہ دینے والے کے احسان کی مکافات کرو، اگر مالی وسعت اللہ تعالیٰ عطا فرمادے تو مال سے ورنہ دعا ہی سے، اس کی مکافات کرو، بے حسی کے ساتھ کسی کے احسانات کا بار سر پر لیتے رہنا شرافت و اخلاق کے خلاف ہے۔

حضرات مہاجرین کے معاملہ میں حضرات انصار نے بڑے ایثار سے کام لیا، اپنے مکانوں دکانوں کاروبار زمین اور زراعت میں ان کو شریک کر لیا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کو وسعت عطا فرمائی تو انھوں نے بھی حضرات انصار کے احسانات کی مکافات میں کمی نہیں کی۔

قرطبی نے بحوالہ صحیحین حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آئے تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا، اور انصار مدینہ زمین جائداد والے تھے، انصار نے ان حضرات کو ہر چیز نصفا النصف تقسیم کر دی، اپنے باغات کے آدھے پھل سالانہ اُن کو دینے لگے، اور حضرت انسؓ کی والدہ اُم سلیمؓ نے اپنے چند درخت کھجور کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیئے تھے، جو آنحضرتؐ

عبداللہ بن عمروؓ نے یہ تین راتیں اُن کے ساتھ گذاریں، **تو دیکھا کہ رات کو تہجد کے لئے نہیں اٹھے** البتہ جب سونے کے لئے بستر پر جاتے تو کچھ اللہ کا ذکر کرتے تھے پھر صبح کی نماز کے لئے اٹھ جاتے تھے، البتہ اس پورے عرصہ میں میں نے ان کی زبان سے بجز کلمہ خیر کے کوئی کلمہ نہیں سنا، جب تین راتیں گذر گئیں اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی حقارت آجائے تو میں نے اُن پر یہ راز کھول دیا کہ ہمارے گھر کوئی جھگڑا نہیں تھا، لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین روز تک یہ سنتا رہا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے اور اس کے بعد تینوں دن آپ ہی آئے، اس لئے میں نے چاہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھوں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے جس کے سبب یہ فضیلت آپ کو حاصل ہوئی، مگر عجیب بات ہے کہ میں نے آپ کو کوئی بڑا عمل کرتے نہیں دیکھا، تو وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا، انھوں نے کہا میرے پاس تو بجز اس کے کوئی عمل نہیں جو آپ نے دیکھا ہے، میں یہ سُن کر واپس آنے لگا تو مجھے بلا کر کہا، ہاں ایک بات ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ اور برائی نہیں پاتا، اور کسی پر حسد نہیں کرتا جس کو اللہ نے کوئی خیر کی چیز عطا فرمائی ہو، عبداللہ بن عمروؓ نے کہا کہ بس یہی وہ صفت ہے جس نے آپ کو یہ بلند مقام عطا کیا ہے، ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس کو نسائی نے بھی عمل الیوم واللیلہ میں نقل کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح علی شرط الشیخین ہے۔

مہاجرین و انصار کے بعد کی امت کے مسلمان وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ الآیۃ، اس آیت کے مفہوم میں صحابہ کرام مہاجرین و انصار کے بعد پیدا ہونے والے قیامت تک کے مسلمان شامل ہیں، اور اس آیت نے ان سب کو مال فئی میں حقدار قرار دیا ہے، یہی سبب تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے دنیا کے بڑے ممالک عراق، شام، مصر وغیرہ فتح کئے، تو ان کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم نہیں فرمایا بلکہ ان کو آگے آنے والی نسلوں کے لئے وقف عام رکھا، کہ ان کی آمدنی اسلامی بیت المال میں آتی رہے اور اس سے قیامت تک آنے والے مسلمان فائدہ اٹھا سکیں، بعض صحابہ کرام نے جو ان سے مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کا سوال کیا تو انھوں نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا، کہ اگر مجھے بعد میں آنے والی نسلوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں جو ملک فتح کرتا اس کی سب زمینوں کو بھی غانمین میں تقسیم کر دیتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا، اگر یہ ساری زمینیں موجودہ مسلمانوں میں تقسیم ہو گئیں تو آنے والے مسلمانوں کے لئے کیا باقی رہے گا (رواہ مالک، قرطبی)

اُمت کے حق پر ہونے کی پہچان صحابہ کرام کی محبت و عظمت ہے اس مقام میں حق تعالیٰ نے پوری اُمت محمدیہ کے تین طبقے کئے، مہاجرین، انصار اور باقی تمام امت، مہاجرین و انصار کے خاص اوصاف اور

فضائل بھی اس جگہ ذکر فرمائے مگر باقی اُمّت کے فضائل و کمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابہ کرام کی سبقتِ ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہونچنے کا ذریعہ ہونے کو پہچانیں اور سب کے لئے دُعائے مغفرت کریں اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ و نفرت نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے بعد والے جتنے مسلمان ہیں اُن کا ایمان و اسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرام کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں اور ان کے لئے دعا کرتے ہوں، جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اسی لئے حضرت مصعب بن سعدؓ نے فرمایا کہ اُمت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں جن میں سے دو درجے تو گذر چکے یعنی مہاجرین و انصار، اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا ہے، یعنی وہ جو صحابہ کرام سے محبت رکھے ان کی عظمت پہچانے، اب اگر تمہیں اُمت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجہ میں داخل ہوجاؤ۔

حضرت حسینؓ سے کسی نے حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں سوال کیا (جبکہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا) تو انھوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے انکار کیا، پھر پوچھا کہ انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا تو فرمایا بس اب تیسری آیت وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ کی رہ گئی، اگر تم عثمان غنیؓ کی شان میں شک و شبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجہ سے بھی **نکل جاؤ گے۔**

قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کی محبت ہم پر واجب ہے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی صحابی کو بُرا کہے یا اس کے متعلق بُرائی کا اعتقاد رکھے اس کا مسلمانوں کے مالِ فے میں کوئی حصہ نہیں، پھر اسی آیت سے استدلال فرمایا اور چونکہ مالِ فے میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا اس میں **حصہ نہ رہا اس کا اسلام و ایمان ہی مشکوک ہوگیا۔**

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کے آپس میں جنگ و جدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے، (اس سے کسی مسلمان کو مشاجراتِ صحابہ کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں)۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ اُمت اُس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت و ملامت نہ کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی کو بُرا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں سے زیادہ بُرا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ یہ ظاہر ہے کہ زیادہ بُرے صحابہ تو ہو نہیں سکتے یہی ہوگا جو اُن کی بُرائی کر رہا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بُرا کہنا سبب لعنت ہے۔

وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۚ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ
سزا اپنے کام کی اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے، جیسے قصہ شیطان کا جب کہے
لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
انسان کو تو منکر ہو، پھر جب وہ منکر ہوگیا کہا میں الگ ہوں تجھ سے، میں ڈرتا ہوں اللہ سے
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ
جو رب سارے جہان کا، پھر انجام دونوں کا یہی کہ وہ دونوں ہیں آگ میں ہمیشہ رہیں اسی
فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝
میں اور یہی ہے سزا گنہگاروں کی۔

ع ۲ / ۵

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے ان منافقین (یعنی عبداللہ بن ابی وغیرہ) کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے ہم مذہب بھائیوں سے کہ کافر ہیں کتاب میں (یعنی بنی نضیر سے) کہتے ہیں (یعنی کہتے تھے کیونکہ یہ سورت واقعہ جلاء بنی نضیر کے بعد نازل ہوئی ہے، کما فی الروح مستدلاً بحدیث، وہ کہتے تھے) کہ واللہ (ہر حال میں) ہم تمہارے ساتھ ہیں، پس اگر تم (اپنے وطن سے جبراً) نکالے گئے تو ہم (بھی) تمہارے ساتھ (اپنے وطن سے) نکل جاویں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہ مانیں گے (یعنی ہم کو خواہ کوئی کیسا ہی سمجھاوے کہ خروج و قتال میں جو آئندہ مذکور ہے تم ان کا ساتھ نہ دو لیکن ہم نہ مانیں گے، پس یہ لا نطیع سیاق و سباق دونوں سے متعلق ہے) اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں (یہ تو ان کے کاذب ہونے کا اجمالاً بیان ہوا، آگے تفسیر فرماتے ہیں کہ) واللہ اگر اہل کتاب نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر (بالفرض) ان کی مدد بھی کی (اور لڑائی میں شریک ہوئے) تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر (ان کے بھاگ جانے کے بعد) ان (اہل کتاب) کی کوئی مدد نہ ہوگی (یعنی جو ناصر تھے وہ تو بھاگ گئے اور دوسرا بھی کوئی ناصر نہ ہوگا، پس لامحالہ مغلوب و مقہور ہوں گے، غرض منافقین کی جو غرض ہے کہ اپنے ان بھائیوں پر کوئی آفت نہ آنے دیں، اس میں ہر طرح ناکامی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب آخر میں بنی نضیر نکالے گئے تو منافقین ان کے ساتھ نہیں نکلے اور جب اول میں ان کا محاصرہ کیا گیا جس میں احتمال قتال کا تھا تو اس میں بھی کوئی نصرت نہیں کی، اور بعد وقوع واقعہ کے اس طرح فرمانا لَئِنْ اُخْرِجُوْا الخ جو آئندہ وقوع ہونے پر

دوسری غور طلب بات اس آیت میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس میں انسان کو اس پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی کہ قیامت جس کا آنا یقینی بھی ہے اور قریب بھی اس کے لئے تم نے کیا سامان بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا اصل وطن اور مقام آخرت ہے، دنیا میں اس کا مقام ایک مسافر کی طرح ہے، وطن کے دائمی قیام و قرار کے لئے یہیں سے کچھ سامان بھیجنا ضروری ہے اور انسان کے اس سفر کا اصل مقصد بھی یہ ہے کہ یہاں رہ کر کچھ کمائے اور جمع کرے پھر اس کو اپنے وطن آخرت کی طرف بھیجے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں سے دنیا کا سامان اور دولت کوئی وہاں ساتھ نہیں لے جا سکتا تو بھیجنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف مال منتقل کرنے کا جو طریقہ دنیا میں رائج ہے کہ یہاں کی حکومت کے بینک میں جمع کرکے دوسرے ملک کی کرنسی حاصل کرلے جو وہاں چلتی ہے، یہی صورت آخرت کے معاملہ میں ہے کہ جو کچھ یہاں اللہ کی راہ میں اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں خرچ کیا جاتا ہے وہ آسمانی حکومت کے بینک اور سٹیٹ بینک میں جمع ہو جاتا ہے، وہاں کی کرنسی ثواب کی صورت میں اس کے لئے نقد کردی جاتی ہے، اور وہاں پہنچ کر بغیر کسی دعوے اور مطالبہ کے اس کے حوالہ کردی جاتی ہے۔

اور لفظ ما قدمت لغد عام ہے نیک عمل اور بد عمل دونوں کے لئے جس نے نیک اعمال آگے بھیجے ہیں اس کو ثواب کی صورت میں آخرت کی نقد کرنسی مل جائے گی، اور جس نے برے اعمال آگے بھیجے ہیں وہاں اس پر فرد جرم عائد ہوگی، اس کے بعد لفظ اتَّقُوا اللہ کا اعادہ کیا گیا، یہ تاکید کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ہو سکتی ہے جو بعض حضرات سے تفسیر میں بیان ہوئی ہے کہ پہلے اتَّقُوا اللہ سے ادائے واجبات و فرائض کی ادائیگی کا اہتمام سکھایا گیا ہے، اور دوسرے اتَّقُوا اللہ سے گناہوں سے بچنے کا اہتمام بتلایا گیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے اتَّقُوا اللہ سے اعمال و احکام خداوندی کی تعمیل کرکے آخرت کے لئے کچھ سامان بھیجنے کا حکم ہو، اور دوسرے اتَّقُوا اللہ سے اس طرف ہدایت ہو کہ دیکھو جو سامان وہاں بھیجتے ہو اس کو دیکھ لو کہ وہ کوئی کھوٹا خراب سامان نہ ہو جو وہاں کام نہ آئے، کھوٹا سامان وہاں کے لئے وہ ہے کہ جس کی صورت تو عمل صالح کی ہو مگر اس میں اخلاص اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو بلکہ نام و نمود یا کوئی غرض نفسانی شامل ہو، یا وہ عمل جو صورت میں تو عبادت ہے مگر دین میں اس کا کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بدعت و گمراہی ہے، تو اس دوسرے اتَّقُوا اللہ کا خلاصہ یہ ہو کہ آخرت کے لئے محض سامان کی صورت بنا دینا کافی نہیں، دیکھ کر بھیجو کہ کھوٹا سامان نہ ہو جو وہاں نہ لیا جائے۔

فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ یعنی ان لوگوں نے اللہ کو بھلایا اور نسیان میں کیا ڈالا درحقیقت خود اپنے آپ کو اس بھول میں ڈال دیا کہ اپنے نفع نقصان کی خبر نہ رہی۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ، یہ ایک تمثیل ہے کہ اگر قرآن پہاڑوں جیسی سخت اور

دنیا کی عام مخلوقات آسمانی و زمینی خاص خاص صورتوں ہی سے پہچانی جاتی ہیں، پھر ان میں انواع و اصناف کی تقسیم اور ہر نوع و صنف کی جداگانہ ممتاز شکل و صورت اور ایک ہی نوع انسانی میں مرد و عورت کی شکل و صورت کا امتیاز پھر سب مردوں سب عورتوں کی شکلوں میں باہم ایسے امتیازات کہ اربوں کھربوں انسان دنیا میں پیدا ہوئے ایک کی صورت بالکلیہ دوسرے سے نہیں ملتی کہ بالکل ممتاز نہ ہو سکے، یہ کمال قدرت صرف ایک ہی ذات حق جل شانہٗ کا ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں جس طرح غیر اللہ کے لئے تکبر جائز نہیں کیونکہ یہ صرف اللہ جل شانہٗ کی صفت ہے، اسی طرح تصویر سازی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ **کی مخصوص صفت میں شرکت کا عملی دعویٰ ہے۔**

لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى، یعنی اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں، قرآن کریم میں ان کی تعداد متعین نہیں فرمائی گئی، حدیث میں ننانوے تعداد بتلائی ہے ترمذی کی ایک حدیث میں یہ سب یکجا مذکور ہیں اور بہت سے علماء نے اسماء حسنیٰ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، احقر کا بھی ایک مختصر رسالہ اسماء حسنیٰ کے نام سے **مناجات مقبول کے شروع میں طبع ہوا ہے۔**

سَبَّحَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ تسبیح زبان حال سے ہو تو ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات اور ان کے اندر رکھی ہوئی عجیب و غریب صنعتیں اور صورتیں زبان حال سے اپنے بنانے والے کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ حقیقی تسبیح مراد ہو، کیونکہ تحقیق یہی ہے کہ تمام اشیاء کو عالم میں اپنی اپنی حیثیت کا عقل و شعور ہے، اور عقل و شعور کا سب سے بڑا مقتضیٰ اپنے بنانے والے کو پہچاننا اور اس کا شکر گذار ہونا ہے، اس لئے ہر چیز حقیقۃً تسبیح کرتی ہو تو اس میں کوئی بُعد نہیں، اگرچہ ہم ان کی تسبیح کو کانوں سے نہ سن سکیں اسی لئے قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا ہے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ، یعنی تم ان کی تسبیح کو سنتے **سمجھتے نہیں۔**

سورۂ حشر کی آخری آیات کے فوائد و برکات: ترمذی میں حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، اور اس کے بعد ایک مرتبہ سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، سے آخر سورت تک پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتے ہیں جو شام تک اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اگر اس دن میں وہ مر گیا تو شہادت کی موت حاصل ہوگی، اور جس نے شام کو بھی کلمات تین مرتبہ پڑھ لئے تو یہی درجہ اس کو حاصل ہوگا (مظہری)

تمت

بِعَوْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى سُبْحَانَهٗ وَحَمْدِهٖ سُوْرَةُ الْحَشْرِ

لِعَاشِرِ جُمَادَى الْاُوْلٰى سَنَة ١٣٩١ھ نَحْوَ يَوْمِ الْاَحَدِ وَيَتْلُوْهَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

سُورَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

سُورَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ ممتحنہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیرہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ

اے ایمان والو نہ پکڑو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست تم ان کو

تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ

پیغام بھیجتے ہو دوستی سے اور وہ منکر ہوئے ہیں اس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دین

يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو رب ہے تمہارا ، اگر تم نکلے ہو

خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ

لڑنے کو میری راہ میں اور طلب کرنے کو میری رضامندی تم ان کو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کے

بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ

پیغام ، اور مجھ کو خوب معلوم ہے جو چھپایا تم نے اور جو ظاہر کیا تم نے اور جو کوئی کرے تم

مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١﴾ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ

میں یہ کام تو وہ بھول گیا سیدھی راہ ، اگر تم ان کے ہاتھ آجاؤ تو ہو جائیں تمہارے

أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ

دشمن اور چلائیں تم پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ اور چاہتے ہیں کسی

تَكْفُرُونَ ﴿٢﴾ لَن تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

طرح تم بھی منکر ہو جاؤ ۔ کام نہ آئیں گے تم کو ناتے والے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن

يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣﴾ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ

وہ فیصلہ کرے گا تم میں اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے ۔ تم کو چاہئے چلنی چال

أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا

اچھی ابراہیم کی اور جو اس کے ساتھ تھے ۔ جب انھوں نے کہا اپنی قوم کو ہم

بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا

الگ ہیں تم سے اور ان سے کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ

پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ

وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ

اکیلے پر مگر ایک کہنا ابراہیم کا اپنے باپ کو کہ میں مانگوں گا معافی تیرے لئے اور مالک نہیں میں

لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَ

تیرے نفع کا اللہ کے ہاتھ سے کسی چیز کا ۔ اے رب ہمارے ہم نے تجھ پر بھروسا کیا اور تیری طرف رجوع ہو کر

إِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٤﴾ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ

اور تیری طرف ہے سب کو پھر آنا ۔ اے رب ہمارے مت جانچ ہم پر کافروں کو اور ہم کو معاف کر

لَنَا رَبَّنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٥﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ

اے رب ہمارے تو ہی ہے زبردست حکمت والا ۔ البتہ تم کو بھلی چال چلنی چاہئے

أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَن يَتَوَلَّ

ان کی جو کوئی امید رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی ۔ اور جو کوئی منہ پھیرے

اور ان کے متبعین میں، تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ کے سامنے جانے کا اور قیامت کے دن کے آنے کا اعتقاد رکھتا ہو (یعنی یہ اعتقاد مقتضی ہے اس بارہ میں اتباع ابراہیمی کا) اور آگے دوسرے طرز پر وعید ہے جیسا اس سے پہلے ومن یفعلہ میں وعید آچکی ہے یعنی جو شخص اس حکم سے روگردانی کرے گا سو اسی کا ضرر ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بالکل بے نیاز اور بوجہ جامع کمالات ہونے کے سزاوار حمد ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت کا ابتدائی حصہ کفار و مشرکین سے موالات اور دوستانہ تعلقات رکھنے کی حرمت و ممانعت میں آیا ہے اور اس کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے:۔

شانِ نزول تفسیر قرطبی میں قشیری اور ثعلبی کے حوالہ سے مذکور ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد فتح مکہ سے پہلے مکہ مکرمہ کی ایک مغنیہ عورت جس کا نام سارہ تھا، پہلے مدینہ طیبہ آئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ہجرت کرکے آئی ہو؟ تو کہا کہ نہیں، آپ نے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو کر آئی ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا، آپ نے فرمایا کہ پھر یہاں کس غرض سے آئی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ مکہ مکرمہ کے اعلیٰ خاندان کے لوگ تھے، آپ ہی میں میرا گذارہ تھا، اب مکہ کے بڑے بڑے سردار تو غزوۂ بدر میں مارے گئے اور آپ لوگ یہاں چلے آئے، اب میرا گذارہ مشکل ہو گیا، میں سخت حاجت اور ضرورت میں مبتلا ہو کر آپ سے مدد لینے کے لئے یہاں آئی ہوں، آپ نے فرمایا کہ تو مکہ مکرمہ کی پیشہ ور مغنیہ ہے وہ مکہ کے نوجوان کیا ہوئے (جو تجھ پر روپیہ پیسے کی بارش کیا کرتے تھے) اس نے کہا کہ واقعہ بدر کے بعد ان کی تقریبات اور جشن طرب ختم ہو چکے ہیں، اس وقت سے کسی نے مجھے نہیں بلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالمطلب کو اس کی امداد کرنے کی ترغیب دی، انہوں نے اس کو نقد اور پوشاک وغیرہ دے کر رخصت کیا۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب صلح حدیبیہ کے معاہدہ کو کفار قریش نے توڑ دیا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرکے اس کی خفیہ تیاری شروع کر رکھی تھی اور یہ دعا بھی کی تھی کہ ہمارا راز اہل مکہ پر قبل از وقت فاش نہ ہو، ادھر مہاجرین اولین میں ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ تھے جو اصل سے یمن کے باشندے تھے، مکہ مکرمہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے وہاں ان کا کوئی کنبہ قبیلہ نہ تھا وہیں مسلمان ہو گئے، پھر ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آ گئے، ان کے اہل و عیال بھی مکہ ہی میں تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ کرام کی ہجرت کے بعد مشرکین مکہ ان مسلمانوں کو جو مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے ستاتے اور پریشان کرتے تھے جن مہاجرین کے خویش و عزیز مکہ میں موجود تھے ان کو

کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تمہاری کوئی رعایت کرے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ، اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ کفار سے خفیہ دوستی رکھیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ حرکت پوشیدہ رہ جائے گی اللہ تعالیٰ کو اُن کے چھپے اور کھلے ہر حال اور عمل کی خبر ہے جیسے کہ واقعہ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی خبردار کر کے سازش کو پکڑوا دیا۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ، ان لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ موقع پانے کے باوجود تمہارے ساتھ کوئی رواداری برتیں گے اس کا کوئی امکان نہیں، ان کو جب کبھی تم پر غلبہ حاصل ہوگا تو اُن کے ہاتھ اور زبان تمہاری بُرائی اور خرابی کے سوا کسی چیز کی طرف نہ اٹھیں گے۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ، اس میں اشارہ ہے کہ جب تم اُن سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو ان کی دوستی صرف تمہارے ایمان کی قیمت پر ہوگی، جب تک تم کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤ، وہ کبھی تم سے راضی نہ ہوں گے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، یعنی قیامت کے روز تمہارے رشتے ناتے اور تمہاری اولاد تمہارے کام نہ آئیں گے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز یہ سب تعلقات ختم کر دیں گے، اولاد ماں باپ سے اور ماں باپ اولاد سے بھاگتے پھریں گے، اس میں حضرت حاطبؓ کے عذر کی تردید ہے کہ جس اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر یہ کام کیا تھا سمجھو کہ قیامت کے دن وہ اولاد تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اور اللہ تعالیٰ سے کوئی راز اور خفیہ چیز چھپنے والی نہیں۔

اگلی آیات میں کفار سے ترک موالات کی تائید و تاکید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ اُن کا تو سارا خاندان مشرکین کا تھا، انھوں نے سب سے بیزاری و براءت ہی نہیں بلکہ عداوت کا اعلان کر دیا، اور بتلا دیا کہ جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ گے اور اپنے شرک سے باز نہ آؤ گے ہمارے تمہارے درمیان بغض و عداوت کی دیوار حائل رہے گی، قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ (تا) حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ کا یہی مطلب ہے۔

ایک شبہ کا جواب اوپر کی آیت میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ اور سنت پر چلنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے والد مشرک کے لئے استغفار کرنا ثابت ہے، جس کا ذکر سورۂ توبہ وغیرہ میں آیا ہے تو اتباع سنت ابراہیمی کے حکم سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اپنے مشرک والدین یا عزیزوں کے لئے دعاء مغفرت کرنا بھی اس میں داخل ہے، یہ جائز ہونا چاہئے، اس لئے اس اسوۂ ابراہیمی کے اتباع سے اس کو مستثنیٰ کر کے فرما دیا کہ اور سب چیزوں میں اسوۂ ابراہیمی کا اتباع لازم ہے، مگر ان کے اس فعل کی اقتداء

خلاصۂ تفسیر

(اور چونکہ ان کی عداوت سن کر مسلمانوں کو فکر ہو سکتی تھی کہ یہ قطع قرابات سے صعب رنج ہو سکتا تھا، اس لئے بطور بشارت کے آگے پیشگوئی فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (یعنی وہ جو وعدہ ہے) کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کر دے (گو بعض ہی سے سہی، یعنی ان کو مسلمان کر دے جس سے عداوت مبدل بہ صداقت ہو جاوے) اور اس کو کچھ بعید نہ سمجھو کیونکہ اللہ کو بڑی قدرت ہے (چنانچہ فتح مکہ کے روز بہت آدمی خوشی سے مسلمان ہو گئے، مطلب یہ کہ اول تو یہ قطع تعلق ہمیشہ کے لئے ہوتا تب بھی بوجہ مامور بہ ہونے کے واجب العمل تھا، پھر خاص کر جبکہ تھوڑی سی مدت کے لئے کرنا پڑے اور پھر مشارکت فی الایمان سے دوستی اور تعلق بدستور عود کر آوے تو کوئی فکر کی بات نہیں، اور (البتہ جو کسی سے اس حکم کے خلاف خطا ہو گئی ہو جس سے اب وہ تائب ہو چکا ہے تو) اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) غفور رحیم ہے (اور یہاں تک تو دوستانہ تعلقات کی نسبت حکم فرمایا تھا کہ ان کو قطع واجب کر دیا گیا آگے محسنانہ تعلقات کے حکم کی تفصیل فرماتے ہیں وہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا (مراد وہ کافر ہیں جو ذمی یا مصالح ہوں، یعنی محسنانہ برتاؤ ان سے جائز ہے، باقی رہا عدل و انصاف کا منصفانہ برتاؤ تو اس میں ذمی یا مصالح کی شرط نہیں بلکہ وہ تو ہر کافر حتیٰ کہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے، اس آیت میں عدل و انصاف سے مراد محسنانہ برتاؤ کرنا ہے، اس لئے مصالحین کے ساتھ مخصوص کیا گیا) اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں، (البتہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی (یعنی برّ و احسان) کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں (خواہ بالفعل یا بالعزم) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو (اور اگر نکالا نہ بھی ہو لیکن) تمہارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو (یعنی ان کے ساتھ شریک ہوں خواہ ان کے عمل میں شرکت کی ہو یا عزم و ارادہ اس کا رکھتے ہوں اس میں وہ سب کافر آ گئے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ صلح کا یا عقد ذمہ نہیں تھا، ان کے ساتھ برّ و احسان کا معاملہ جائز نہیں بلکہ ان سے جنگ اور مقابلہ مطلوب ہے) اور جو شخص ایسوں سے دوستی (کا برتاؤ یعنی برّ و احسان کا برتاؤ) کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار سے دوستانہ تعلق رکھنے کی سخت ممانعت و حرمت کا بیان آیا ہے اگرچہ وہ کفار رشتہ و قرابت میں کتنے ہی قریب ہوں، صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے

میں کسی قرابت داری کی پروا کرتے تھے نہ کسی خویش و عزیز کی، سب پر عمل کیا گیا جس کے نتیجہ میں گھر گھر یہ صورت پیش آئی کہ باپ مسلمان بیٹا کافر یا اس کے برعکس ہے تو دوستانہ تعلق قطع کر دیا گیا ظاہر ہے انسانی فطرت اور طبیعت پر یہ عمل آسان نہ تھا، اس لئے آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی اس مشکل کو عنقریب آسان کر دینے کی خوشخبری دی۔

بعض روایات حدیث میں ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ جب اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی کسی محبوب چیز کو چھوڑتا ہے تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسی چیز کو حلال کر کے اس تک پہونچا دیتے ہیں اور بعض اوقات اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتے ہیں۔

ان آیات میں حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ آج جو لوگ کافر ہیں اور اس کی وجہ سے وہ تمہارے دشمن ہیں تم ان کے دشمن ہو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عداوت کو دوستی سے مبدل فرما دے، مطلب یہ کہ ان کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر تم سے متعلقات باہمی کو پھر از سر نو ہموار کر دے، اس پیشنگوئی کا ظہور فتح مکہ کے وقت اس طرح ہوا کہ بجز ان کفار کے جو قتل کئے گئے اور سب مسلمان ہو گئے (مظہری)۔ قرآن کریم میں اس کا بیان یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ..... میں کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ فوج فوج بڑی تعدادوں میں اللہ کے دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور یہی ہوا۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ اُن کی والدہ بحالت کفر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہونچیں (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ غزوۂ حدیبیہ کے بعد قریش مکہ سے معاہدہ صلح ہو گیا تھا اور ان کی والدہ کا نام قُتیلہ ہے، یہ اپنی بیٹی اسماء کے لئے کچھ تحفے ہدیے لے کر مدینہ پہونچیں تو حضرت اسماءؓ نے ان کے تحفے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کر لیا) غرض حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہیں اور وہ کافر ہیں میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی والدہ کی صلہ رحمی کرو یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت اسماء کی والدہ قُتیلہ کو صدیق اکبرؓ نے زمانہ جاہلیت میں طلاق دیدی تھی حضرت اسماءؓ اس کے بطن سے تھیں اور ان کی بہن ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی دوسری بیوی ام رومان کے بطن سے تھیں، یہ مسلمان ہو گئی تھیں۔ (ابن کثیر و مظہری)

اس آیت میں ایسے کفار جنھوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ نہیں کیا، اور ان کے گھروں سے نکالنے میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا ان کے ساتھ احسان کے معاملہ اور اچھے سلوک اور عدل و انصاف کرنے کی

ہدایت دی گئی ہے، عدل و انصاف تو ہر کافر کے ساتھ ضروری ہے جس میں کافر ذمی اور مصالح اور کافر حربی و دشمن سب برابر ہیں، بلکہ اسلام میں تو عدل و انصاف جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ بار ان پر نہ ڈالے اور اُن کے چارے اور آرام کی نگہداشت رکھے، اس آیت میں اصل مقصود بر و احسان کرنے کی ہدایت ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ نفلی صدقات ذمی اور مصالح کافر کو بھی دیئے جا سکتے ہیں صرف کافر حربی کو دینا ممنوع ہے۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ (الی) اَنْ تَوَلَّوْهُمْ، اس آیت میں اُن کفار کا بیان ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ و قتال کرتے ہوں اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے میں کوئی حصہ لے رہے ہوں، اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ موالات اور دوستی سے منع فرماتا ہے، اس میں بر و احسان کا معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں، بلکہ صرف قلبی دوستی اور دوستانہ تعلقات کی ممانعت ہے، اور یہ ممانعت کچھ ان ہی پر منحصر نہیں، دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہل ذمہ اور اہل صلح کافروں کے ساتھ بھی قلبی موالات اور دوستی جائز نہیں، اس سے تفسیر مظہری میں یہ مسئلہ نکالا ہے کہ کافر ذمی ہو یا حربی اہل جنگ کفار کے ساتھ عدل و انصاف تو اسلام میں ضروری ہے ہی، اور ممانعت صرف موالات یعنی دوستی کی کی گئی ہے، بر و احسان کی ممانعت نہیں کی گئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسنانہ سلوک برسرِپیکار دشمنوں کے ساتھ بھی جائز ہے، البتہ دوسری نصوص کی بنا پر یہ شرط ہے کہ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے سے مسلمانوں کو کسی نقصان و ضرر کا خطرہ نہ ہو، جہاں یہ خطرہ ہو وہاں بر و احسان بھی جائز نہیں، ہاں عدل و انصاف ہر حال میں ہر شخص کیلئے ضروری و واجب ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ

اے ایمان والو جب آئیں تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر تو ان کو جانچ لو

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ

اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو مت پھیرو اُن کو

اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ

کافروں کی طرف نہ یہ عورتیں حلال ہیں اُن کافروں کو اور نہ وہ کافر حلال ہیں ان عورتوں کو، اور دیدو اُن کافروں کو

مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

جو اُن کا خرچ ہوا ہو اور گناہ نہیں تم کو کہ نکاح کر لو ان عورتوں سے جب اُن کو دو

أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ

کے مہر، اور نہ رکھو اپنے قبضہ میں ناموس کافر عورتوں کے، اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا، اور وہ کافر مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا، یہ

حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ وَإِن فَاتَكُمْ شَيْءٌ

اللہ کا فیصلہ ہے، تم میں فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور اگر جاتی رہیں تمہارے ہاتھ سے

مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم

کچھ عورتیں کافروں کی طرف، پھر تم ہاتھ مارو تو دے دو اُن کو جن کی عورتیں جاتی رہی ہیں اتنا

مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا

جتنا انہوں نے خرچ کیا، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم کو یقین ہے، اے نبی

النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا

جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو

وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ

اور چوری نہ کریں، اور بدکاری نہ کریں، اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں، اور طوفان نہ لائیں

يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ ۙ

باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں، اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں

فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَا أَيُّهَا

تو ان کو بیعت کر لے اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اے

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ

ایمان والو مت دوستی کرو اُن لوگوں سے کہ غصہ ہوا ہے اللہ اُن پر، وہ آس توڑ چکے ہیں پچھلے

الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ﴿١٣﴾

گھر سے جیسے آس توڑی منکروں نے قبر والوں سے

ع ۲ ۸

خلاصۂ تفسیر

سبب نزول کا واقعہ | یہ آیتیں بھی ایک خاص موقع کے متعلق ہیں اور وہ موقع صلح حدیبیہ کا ہے،

معارف ومسائل

معاہدۂ صلح حدیبیہ کی بعض شرائط کی تحقیق۔ سورۂ فتح میں حدیبیہ کا واقعہ تفصیل سے آچکا ہے، جس میں بالآخر قریش مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک معاہدۂ صلح دس سال کے لئے لکھا گیا اس معاہدہ کی بعض شرائط ایسی تھیں جن میں دب کر صلح کرنے اور مسلمانوں کی بظاہر مغلوبیت محسوس ہوتی تھی، اسی لئے صحابہ کرام میں اس پر غم وغصہ کا اظہار ہوا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشاراتِ ربانی یہ محسوس فرما رہے تھے کہ اس وقت کی چند روزہ مغلوبیت بالآخر ہمیشہ کے لئے فتح مبین کا پیش خیمہ بننے والی ہے، اس لئے قبول فرما لیا، اور پھر سب صحابہ کرام بھی مطمئن ہوگئے۔

اس صلح نامہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے کوئی آدمی مدینہ جائے گا تو آپ اس کو واپس کردیں گے، اگرچہ وہ مسلمان ہی ہو، اور اگر مدینہ طیبہ سے کوئی مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو قریش مکہ اس کو واپس نہ کریں گے، اس معاہدہ کے الفاظ عام تھے جس میں بظاہر مرد وعورت دونوں داخل تھے، یعنی کوئی مسلمان مرد یا عورت جو بھی مکہ مکرمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اس کو آپ واپس کریں گے۔

جس وقت یہ معاہدہ مکمل ہوچکا اور ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام حدیبیہ میں تشریف فرما تھے کئی ایسے واقعات پیش آئے جو مسلمانوں کے لئے بہت صبر آزما تھے، جن میں ایک واقعہ ابو جندل کا ہے، جن کو قریش مکہ نے قید میں ڈال رکھا تھا، وہ کسی طرح ان کی قید سے چھوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گئے، صحابہ کرام میں ان کو دیکھ کر سخت تشویش پیدا ہوئی کہ معاہدہ کی رُو سے اُن کو واپس کیا جانا چاہئے، اور ہم اپنے مظلوم بھائی کو پھر ظالموں کے ہاتھ میں دیدیں، یہ کیسے ہوگا؟

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ تحریر فرما چکے تھے اور اصول شریعت کی حفاظت اور اُن پر پختگی کو ایک فرد کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے تھے، اور اس کے ساتھ آپ کی چشم بصیرت عنقریب ان سب مظلوموں کی فاتحانہ نجات کو بھی گویا مشاہدہ کر رہی تھی، جس کی رنج وتکلیف تو ابو جندل کی واپسی میں آپ کو بھی یقیناً ہوگی، مگر آپ نے معاہدہ کی پابندی کی بنا پر اُن کو سمجھا بجھا کر رخصت کردیا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سعیدہ بنت الحارث الاسلمیہ جو مسلمان تھیں مگر صیفی بن الراہب کے نکاح میں تھیں جو کافر تھا، بعض روایات میں کا نام مسافر مخزومی بتلایا گیا ہے (اس وقت تک مسلمانوں اور کفار میں رشتۂ مناکحت طرفین سے حرام نہیں ہوا تھا) یہ مسلمان عورت مکہ سے بھاگ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئیں، ساتھ ہی ان کا شوہر حاضر ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ میری عورت مجھے واپس کی جائے، کیونکہ آپ نے یہ شرط قبول کرلی ہے اور ابھی تک اس معاہدہ کی مہر بھی خشک نہیں ہوئی۔

اس واقعہ پر یہ آیات مذکورہ نازل ہوئیں جن میں دراصل مسلمانوں و مشرکین کے درمیان عقد نکاح کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں یہ بھی کہ جو عورت مسلمان خواہ اس کا مسلمان ہونا پہلے سے معلوم ہو جیسے سعیدہ مذکورہ تھیں یا بوقت ہجرت اس کا مسلمان ہونا صحیح طور سے ثابت ہو جائے، وہ اگر ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ جائے اس کو کفار کے قبضہ میں واپس نہ دیا جائے، کیونکہ وہ اپنے کافر شوہر کے لئے حلال نہیں رہی (تفسیر قرطبی میں یہ واقعہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے)

غرض ان آیات کے نزول نے یہ واضح کر دیا کہ مصالحہ کی یہ شرط کہ جو بھی مسلمان آپ کے پاس پہنچے آپ واپس کریں گے اپنے لفظی عموم کے ساتھ جس میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں صحیح نہیں، یہ شرط صرف مردوں کے حق میں قبول کی جا سکتی ہے، عورتوں کے معاملہ میں یہ شرط قابل قبول نہیں، ان کے بارے میں صرف اتنا کیا جا سکتا ہے کہ جو عورت مسلمان ہو کر ہجرت کرے اس کے کافر شوہر نے جو کچھ اس پر مہر کی صورت میں خرچ کیا ہے وہ خرچ اس کو واپس کیا جائے گا، ان آیات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے مفہوم کو واضح فرما دیا، اور اس کے مطابق سعیدہ مذکورہ کو واپس نہیں کیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم بنت عقبہ ابی معیط مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچ گئیں، ان کے خاندان کے لوگوں نے واپسی کا مطالبہ بعموم شرط کی وجہ سے کیا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم عمرو بن عاص کے نکاح میں تھیں، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہ اور ان کے ساتھ ان کے دو بھائی مکہ سے بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے اور ساتھ ہی عمرو بن عاص شوہر ام کلثوم وغیرہ نے ان کی واپسی کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے شرط کے مطابق ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید کو تو واپس کر دیا، مگر ام کلثوم کو واپس نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ شرط مردوں کے لئے تھی عورتیں اس میں شامل نہیں، اس پر یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے نازل ہوئیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچنے والی دوسری عورتوں کے بھی بعض واقعات روایات میں مذکور ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ متعدد واقعات سب ہی پیش آئے ہوں۔

شرط مذکور سے عورتوں کا استثناء نقض عہد نہیں: مذکور الصدر روایت قرطبی سے تو معلوم ہوا کہ معاہدہ کی شرط بلکہ ایک شرط کی وضاحت متعلق نہیں ہے، صلح نامہ کے الفاظ اگرچہ عام تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ عورتوں کے لئے عام اور شامل نہیں تھے، اس لئے آپ نے اس کی وضاحت واقعہ حدیبیہ کے مقام پر فرما دی اور اسی کی تصدیق پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تو اس شرط کو عموم کے ساتھ قبول فرما لیا تھا

شوہر کا فرزند بھی ہے اور اس لئے صدق بھی نہیں دی، مگر شرعی حکم سے نکاح فسخ ہو چکا ہے، اس لئے دوسرے مرد سے اس کا نکاح حلال ہوگیا۔

کافر کی بیوی مسلمان ہو جائے تو نکاح فسخ ہو جانا آیت مذکورہ سے معلوم ہو چکا، لیکن دوسرے کسی مسلمان مرد سے اس کا نکاح کس وقت جائز ہوگا، اس کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ضابطہ تو یہ ہے کہ جس کافر کی عورت مسلمان ہو جائے تو حاکم اسلام اس کے شوہر کو بلا کر کہے کہ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اگر وہ اس پر بھی اسلام لانے سے انکار کرے تو اب ان دونوں میں فرقت کی تکمیل ہو گئی، اس وقت وہ کسی مسلمان سے نکاح کر سکتی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ حاکم اسلام کا شوہر کو حاضر کرنا وہیں ہو سکتا ہے جہاں حکومت اسلام کی ہو (دار الاسلام)۔ دار الحرب میں اگر یہ واقعہ پیش آئے تو شوہر سے اسلام لانے کا یا اس کے انکار کی صورت نہیں ہوگی جس سے دونوں میں تفریق کا فیصلہ کیا جا سکے، اس لئے اس صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کی تکمیل اُس وقت ہوگی جب یہ عورت ہجرت کر کے دار الاسلام میں آجائے یا مسلمانوں کے لشکر میں آجائے (دار الاسلام میں آنے کی صورت مذکورہ واقعات میں مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد ہو سکتی ہے، اور لشکر اسلام حدیبیہ میں بھی موجود تھا، اس میں پہنچنے سے بھی اس کا تحقق ہو جاتا ہے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں اختلاف دارین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جب کافر دارالحرب کی بیوی مسلمان ہو کر دونوں میں دارین کا فاصلہ ہو جائے کہ ایک دارالکفر میں اور دوسرا دارالاسلام میں تو یہ تفریق مکمل ہو کر عورت دوسرے سے نکاح کرنے کی آزاد ہو جاتی ہے (ہدایہ وغیرہ)

اور اس آیت میں جو اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ میں مہر کو بطور شرط کے فرمایا کہ تم ان سے نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ اُن کے مہر دیدو، یہ درحقیقت نکاح کی شرط نہیں، کیونکہ باتفاق امت نکاح کا انعقاد ادائیگی مہر پر موقوف اور مشروط نہیں ہے، البتہ نکاح پر مہر کی ادائیگی واجب و لازم ضرور ہے، یہاں اس کو بطور شرط کے شاید اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ابھی ایک مہر تو ان کے کافر شوہر کو واپس کیا جا چکا ہے، ایسا نہ ہو کہ اب اس سے نکاح کرنے والے مسلمان یہ سمجھ بیٹھیں کہ مہر تو دیا جا چکا، اب جدید مہر کی ضرورت نہیں، اس لئے فرما دیا کہ اس مہر کا تعلق پچھلے نکاح سے تھا، یہ دوسرا نکاح ہوگا تو اس کا جدید مہر لازم ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ، عِصَم، عِصْمَت کی جمع ہے، جس کے اصلی معنی حفاظت اور استحکام کے ہیں، مراد اس سے وہ عقد نکاح وغیرہ ہیں جن کی حفاظت کی جاتی ہے۔

کوافر جمع کافرہ کی ہے، مراد اس سے مشرک عورت ہے کیونکہ کافرہ کتابیہ سے نکاح کی اجازت قرآن کریم میں منصوص ہے، مراد آیت کی یہ ہے کہ اب تک جو مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کی اجازت تھی وہ ختم کر دی گئی، اب کسی مسلمان کا نکاح مشرک عورت سے جائز نہیں، اور جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ بھی ختم ہو چکے، اب کسی مشرک عورت کو اپنے نکاح میں روکنا حلال نہیں۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ

سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ صف مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چودہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾

حکمت والا ۔ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو ۔ اللہ چاہتا ہے ان

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾

لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے

اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ

کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں تمہارے پاس پھر جب وہ پھر گئے تو پھیر دیئے اللہ نے ان کے دل

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو ۔ اور جب کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ

اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا آیا ہوں اللہ کا تمہارے پاس یقین کرنے والا اس پر جو مجھ سے آگے ہے

مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ

توریت اور خوشخبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے احمد

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ

پھر جب آیا ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر کہنے لگے یہ جادو ہے صریح ۔ اور اس سے زیادہ بے انصاف

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ وَاللّٰهُ

کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ اور اس کو بلاتے ہیں مسلمان ہونے کو اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو ۔ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے

بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْۤ

منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی اور پڑے برا مانیں منکر ۔ وہی ہے جس نے

اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ

بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾

پڑے برا مانیں شرک کرنے والے

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں (یعنی) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (جب وہ ایسا باعظمت و شان ہوا اس کی اطاعت ہر حکم میں ضروری ہے جن میں سے ایک حکم جہاد کا ہے جو اس سورت میں مذکور ہے، جس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ

بھی تھے، یہ قول آیا ہے کہ واقعی آپ ہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اور خازن میں ترمذی سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول جو کہ علماء یہود میں سے تھے یہ ہے کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہے، اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ کے ساتھ مدفون ہوں گے، اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام تورات کے مبلغ تھے، اس لئے تورات میں اس بشارت کا ہونا نیز عیسیٰ علیہ السلام سے منقول کہا جاوے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق میں خود تورات کے موجودہ نسخوں سے متعدد بشارتیں نقل کی ہیں جلد دوم صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ قسطنطنیہ اور ان مضامین کا انجیل موجودہ میں نہ ہونا اس لئے مضر نہیں کہ حسب تحقیق علماء محققین انجیل کے نسخے محفوظ نہیں رہے، مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اس قسم کا مضمون موجود ہے، چنانچہ یوحنا کی انجیل مترجمہ عربی مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء کے چودھویں باب میں ہے کہ "تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آوے، پس اگر میں جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا"، فارقلیط ترجمہ احمد کا ہے، اہل کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد فرمایا تھا، جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو پیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد یعنی بہت سراہا گیا، بہت حمد کرنے والا، پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو فارقلیط کر دیا، اور بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک محمد موجود ہے، دیکھو بائبل کی فہرست کی یہ عبارت دیباچہ محمدی بکو عہد نامہ ایت اسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء ص ۸۱، ۸۴، ترجمہ اپولوجی گاڈ فری ہیگنس مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء اور اس فارقلیط کی نسبت اسی انجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں: "وہ تمہیں سب چیزیں سکھلائے گا،" "اس جہان کا سردار آتا ہے" "وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستی اور عدالت کے خلاف پر سزا دے گا" یہ سب وہ الفاظ ہیں جو مستقل ہونے پر دال ہیں، اور پوری بحث اس مقام کی تفسیر حقانی میں ہے، اس کا ایک تتمہ نقل کیا گیا ہے، غرض عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا، پھر جب وہ یہ تمام مضامین ارشاد فرما کر اور نبوت کے اثبات کے لئے، اور عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ ان دلائل یعنی معجزات کی نسبت کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے، اور جادو بتا کر نبوت کی تکذیب کی، کما فی المائدۃ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ الخ، اسی طرح بعد عیسیٰ علیہ السلام کے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور رسالت میں کفار موجودین نے آپ کی تکذیب کی اور مخالفت کی اور یہ ظلم عظیم ہے، پس اس ظلم کا تعدیہ مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا، اور واقعی اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہو اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیا کرتا، اللہ پر جھوٹ باندھنا یہ ہے کہ نبوت کی تکذیب کی، اثبات المنفی اور نفی المثبت یعنی جو چیز اللہ کی طرف سے نہ ہو اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اور جو اللہ کی طرف سے واقع ہو اس کی نفی کرنا، دونوں افتراء علی اللہ ہیں، اور وَهُوَ يُدْعٰى اس لئے بڑھایا کہ اس سے زیادہ تقبیح ہوگئی یعنی

خود تو متنبہ کرنے سے بھی متنبہ نہ ہوا اور نہ اللہ نے ہدایت کی، اس لئے بڑھ گیا ان کی حالت موجبہ اصلاح سے بعید ہوگئی اس لئے سزائے قتل ہی تجویز کی جانا مصلحت ہوا چنانچہ جب تک بھی اسلام کی خبر نہ پہنچی ہو اوّل اس کو دعوت اسلام کرنا چاہئے جب اس سے انکار کرے جو کہ ظاہراً علامت ناامیدی کی ہے تب جہاد مشروع ہے آگے ترغیب جہاد کیلئے وعدہ نصرت و غلبہ حق و مغلوبیت باطل ارشاد ہے کہ یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں (یعنی تدبیر عملی کے ساتھ منہ سے بھی ایذاء و اعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دین حق کو فروغ نہ ہو اور بعض اوقات قولی شبہات موثر ہو جاتے ہیں، یہ تمثیل ہے ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہ سے نور الٰہی کو بجھانا چاہتا ہے یعنی ایسے طاقتور سے بجھاوے جس میں کام نہ رہے) حالانکہ اللہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اسی اتمام نور کے لئے) اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (کہ وہ نور اللہ ہی ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کردے (یہی اتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔ (وقد مر تفسیر الاتمام والظہور فی سورۃ البراءۃ فی مثل ہذہ الآیۃ)

معارف و مسائل

شانِ نزول | ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت کیا ہے، اور حاکم نے اس کو روایت کرکے سند کو صحیح قرار دیا ہے، کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے آپس میں یہ مذاکرہ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے تو ہم اس پر عمل کریں، بغوی نے اس میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان حضرات میں سے بعض نے کچھ ایسے الفاظ بھی کہے کہ اگر ہمیں احب الاعمال عند اللہ معلوم ہو جائے تو ہم اپنی جان و مال سب اُس کے لئے قربان کردیں (مظہری)

ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد روایت کیا ہے کہ ان چند حضرات نے آپس میں جمع ہو کر یہ مذاکرہ کیا، اور چاہا کہ کوئی صاحب جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا سوال کریں، مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی ابھی یہ لوگ اسی حالت پر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب لوگوں کو نام بنام اپنے پاس بلایا (جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بذریعہ وحی ان کا اجتماع اور ان کی گفتگو معلوم ہوگئی تھی) جب یہ سب لوگ حاضر خدمت ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۃ صف پڑھ کر سنائی جو اسی وقت آپ پر نازل ہوئی تھی۔

اس سورۃ نے یہ بھی بتلا دیا کہ احب الاعمال جس کی تلاش میں یہ حضرات تھے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور ساتھ ہی ان حضرات نے جو ایسے کلمات کہے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے تو ہم اس پر عمل

کرنے میں ایسی ایسی بہادری دکھائیں وغیرہ جن میں ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں، اس پر ان حضرات کو تنبیہ کی گئی کہ کسی مومن کے لئے ایسے دعوے کرنا درست نہیں، اسے کیا معلوم ہے کہ وقت پر وہ اپنے ارادے کو پورا کر بھی سکے یا نہیں، اس کے اسباب کا جمع ہونا اور موانع کا زائل ہونا اس کے اختیار میں نہیں، بلکہ خود اس کے دست و بازو اور اعضاء و جوارح بلکہ قلب و عزم و ارادہ ان میں سے کوئی چیز بھی مکمل اس کے قبضہ میں نہیں، اسی لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کریم میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ جو کام آپ کو آئندہ کل میں کرنا ہو اگر اس کا اظہار کرنا ہے تو انشاء اللہ کی قید کے ساتھ بیان کریں کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں کل فلاں کام کروں گا، وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ، صحابہ کرام کی نیت و قصد خواہ دعوے کا نہ ہو مگر صورت دعویٰ کی تھی وہ اللہ کے نزدیک پسند نہیں کہ کوئی شخص کسی کام کے کرنے کا دعویٰ کرے بجز اس کے کہ اس کو اللہ کی مشیت کے حوالہ کرے، اور انشاء اللہ ساتھ کہے، اس تنبیہ کیلئے یہ آیات نازل ہوئیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝، مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ جو کام تمہیں کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس سے ایسے کام کے دعوے کی ممانعت تو واضح ہو گئی، جس کو کرنے کا عزم و ارادہ ہی انسان کے دل میں نہ ہو، کیونکہ یہ تو محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے نام و نمود وغیرہ کے لئے ہو سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ شان نزول کے واقعہ میں جن صحابہ نے تذکرہ کیا وہ ایسے نہ تھے کہ دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور دعویٰ کریں، اس لئے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اگرچہ دل میں عزم و ارادہ کام کرنے کا ہو پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے شان عبدیت کے خلاف ہے، اوّل تو اس کے کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے جب موقع آئے کر گذرنا چاہئے، اور کسی مصلحت سے کہنا بھی پڑے تو اس کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید کر دے تو

پھر وہ دعویٰ نہیں رہے گا۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور اس کو کرنا ہی نہ ہو یہ تو گناہ کبیرہ اور اللہ کی سخت ناراضی کا سبب ہے، کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ کا مصداق یہی ہے، اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ ارادہ کرنے کا ہو وہاں بھی اپنی قوت و قدرت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا ممنوع

و مکروہ ہے۔

دعویٰ اور دعوت میں فرق: مذکورہ تفسیر سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق دعوے سے ہے کہ جو کام آدمی کو کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، رہا معاملہ دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اس کی نصیحت دوسروں کو کرے، اور اس کی طرف دوسرے مسلمانوں کو دعوت دے وہ اس آیت کے مفہوم میں تو شامل نہیں، اس کے احکام دوسری آیات اور احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً قرآن کریم نے فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ، یعنی

تم لوگوں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو کہ خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔
اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ و نصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو، مقصد یہ ہے کہ جب دوسروں کو نصیحت کرتے ہو تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے، جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو خود بھی اس پر عمل کرو۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت و توفیق نہیں ہے اس کی طرف دوسروں کو بلانے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے، امید ہے کہ اس وعظ و نصیحت کی برکت سے کسی وقت اس کو بھی عمل کی توفیق ہو جاوے، جیسا کہ بکثرت تجربہ و مشاہدہ ہے۔ البتہ اگر وہ عمل واجب یا سنت مؤکدہ کے درجہ میں ہو تو اس کے ترک پر نقد کرکے اپنے نفس میں نادم و شرمندہ ہونے کا سلسلہ جاری رکھنا بھی واجب ہے اور اگر مستحبات کے متعلق ہے تو یہ سلسلہ ندامت بھی مستحب ہے۔

اگلی آیت میں اس اصل معاملہ کا ذکر ہے جو اس سورت کے نزول کا سبب بنا یعنی اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کونسا عمل زیادہ محبوب ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ، یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب وہ صف قتال ہے جو اللہ کے دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے قائم ہو اور مجاہدین کے عزم و ہمت کی وجہ سے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو کہ ان کے قدموں میں کوئی تزلزل نہ آنے پائے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں دشمنوں کی ایذائیں سہنے کا ذکر ہے اور اس کے بعد پھر مسلمانوں کو جہاد کی تلقین کی گئی۔ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واقعات جن کا ذکر اس جگہ آیا ہے ان میں بھی بہت سے علمی و عملی فوائد اور ہدایات ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ انہوں نے جب بنی اسرائیل کو اپنی نبوت کے ماننے اور اطاعت کرنے کی دعوت دی تو دو چیزوں کو خصوصیت سے ذکر فرمایا ایک یہ کہ وہ کوئی انوکھے رسول نہیں انوکھی باتیں لے کر نہیں آئے بلکہ وہ باتیں ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کہتے آئے ہیں، اور پہلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، اور بعد میں بھی جو آخری پیغمبر آنے والے ہیں وہ بھی اسی قسم کی ہدایات لیکر آئیں گے۔

پہلی پہلی کتابوں میں سے تورات کا خصوصیت سے ذکر شاید اس لئے کیا کہ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی قریبی کتاب وہی تھی ورنہ تصدیق انبیاء تو سب پچھلی کتابوں کو شامل اور عام ہے، نیز اس میں اشارہ اس طرف بھی ہے کہ شریعت عیسوی اگرچہ مستقل شریعت ہے مگر اس کے اکثر احکام شریعت موسوی اور تورات کے احکام ہی کے مطابق ہیں، صرف چند احکام ہیں جو بدلے گئے ہیں۔ یہ تو پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کا مضمون تھا۔ دوسری چیز یہ کہ بعد میں آنے والے رسول کی خوشخبری سنائی، اس میں بھی

اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی ہدایات بھی اس کے مطابق ہوں گی، اس لئے اس پر ایمان لانا عین تقاضائے **عقل و دیانت ہے۔**

ساتھ ہی اس آنے والے رسول کی خوش خبری عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو سنائی، اس کا نام پتہ بھی انجیل میں بتلا دیا گیا، اس میں بنی اسرائیل کو اس کی ہدایت ہے کہ جب وہ رسول تشریف لائیں، تو تمہارا فرض ہوگا کہ ان پر ایمان لاؤ، اور ان کی اطاعت کرو۔ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ، میں اسی کا بیان ہے اس میں آنے والے رسول کا نام احمد بتلایا گیا ہے، ہمارے نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد بھی تھا اور احمد بھی اور بھی متعدد نام تھے، مگر انجیل میں آپ کا نام احمد بتلانے میں شاید یہ مصلحت ہو کہ محمد نام رکھنے کا عرب میں قدیم سے دستور تھا، اس لئے اس نام کے دوسرے آدمی بھی عرب میں تھے، بخلاف احمد کے، یہ نام عرب میں معروف نہیں تھا، وہ **آپ کی ذات ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔**

انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت: یہ سب کو معلوم ہے کہ خود یہود و نصاریٰ کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ تورات و انجیل میں تحریف ہوئی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اتنی ہوئی کہ اصل کلام کا پہچاننا بھی آسان نہیں رہا، موجودہ تحریف شدہ انجیل کی بناء پر آجکل کے عیسائی قرآن کی اس خبر کو تسلیم نہیں کرتے کہ انجیل میں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد لیکر خوش خبری دی گئی ہو، اس کا مختصر جواب وہ کافی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے۔

اور مفصل جواب کے لئے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اظہار الحق کا مطالعہ کیا جائے جو مذہب عیسائیت کی حقیقت اور انجیل میں تحریفات اور باوجود تحریفات کے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں موجود ہونے کے متعلق بے نظیر کتاب ہے، خود بڑے عیسائیوں کے مقولے چھپے ہوئے ہیں کہ اگر دنیا میں یہ کتاب شائع ہوتی رہی تو عیسائیت کا کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی پھر ترکی، انگریزی میں اس کے ترجمے چھپے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مشن نے اس کتاب کو گم کر دینے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے، اس کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا تھا حال میں اس کا اردو ترجمہ دار العلوم کراچی کے مدرس مولانا اکبر علی صاحب نے اور تحقیقات جدیدہ مفیدہ موجودہ زمانے کی مطبوعہ انجیلوں سے مولانا محمد تقی صاحب استاذ دار العلوم نے لکھی ہیں جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس کی تیسری جلد میں صفحہ ۸۲ سے صفحہ ۲۶۲ تک انہی بشارتوں کی تفصیل موجودہ انجیلوں کے حوالے سے اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۰)

اے ایمان والو میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو ایک عذاب دردناک سے

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی

اَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱) يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

جان سے یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو بخشے گا وہ تمہارے گناہ

وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ

اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے

عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ

باغوں کے اندر یہ ہے بڑی مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو مدد اللہ کی طرف سے اور فتح

قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ

جلدی اور خوشی سنا دے ایمان والوں کو اے ایمان والو تم ہو جاؤ مددگار اللہ کے

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ

جیسے کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اپنے یاروں کو کون ہے کہ مدد کرے میری اللہ کی راہ میں بولے یار

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ

ہم ہیں مددگار اللہ کے پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے اور منکر ہوا ایک

طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (۱۴)

فرقہ پھر قوت دی ہم نے ان کو جو یقین لائے تھے ان کے دشمنوں پر پھر ہو رہے غالب ۔

خلاصۂ تفسیر

(آگے اول جہاد کو ثمرۂ آخرت پھر ثمرۂ دنیویہ کا وعدہ کر کے ترغیب دیتے ہیں کہ) اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو

(جب ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں بنے ہونگے یہ بڑی کامیابی ہے اور اس ثمرۂ حقیقیہ اُخرویہ کے علاوہ ایک اور ثمرہ (دنیویہ) بھی ہے کہ تم اس کو (بھی خاص طور پر) پسند کرتے ہو، یعنی اللہ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی ہے (اس کا خاص طور پر محبوب ہونا اس لئے ہے کہ انسان طبعی ثمرہ عاجلہ بھی چاہتا ہے) اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ (ان تمام امور کی) مومنین کو بشارت دیدیجئے (چنانچہ فتح و نصرت کی پیشگوئی کا ظہور اسلامی فتوحات سے ظاہر ہے، آگے اصحاب عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ یاد دلا کر نصرت دین کی ترغیب دیتے ہیں کہ) اے ایمان والو تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ (اس طریقہ سے جو تمہارے لئے مشروع ہے یعنی جہاد) جیسا کہ حواریین اپنی شریعت کے طریقے کے موافق ناصرِ دین ہوئے تھے جبکہ لوگ کثرت سے عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن اور مخالف تھے اور جبکہ) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ان) حواریین سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے، وہ حواری بولے ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں (چنانچہ ان حواریین نے دین کی یہ مدد کی کہ اس کی نشر میں کوشش کی) سو (اس کوشش کے بعد) بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ منکر رہے (پھر ان میں باہم اختلافِ مذہبی سے عداوت اور خانہ جنگیاں ہوئیں یا مذہبی گفتگو ہوئی) سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی سو وہ غالب ہوگئے (اسی طرح تم دینِ محمدی کے لئے کوشش اور جہاد کرو، اور اگر ابتداء ان خانہ جنگیوں کی کفار کی طرف سے ہو تو اس سے دین عیسوی میں جہاد کا ہونا لازم نہیں آتا)

معارف و مسائل

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

اس آیت میں ایمان اور مجاہدہ بالمال والنفس کو تجارت فرمایا ہے، کیونکہ جس طرح تجارت میں کچھ مال خرچ کرنے اور محنت کرنے کے صلہ میں منافع حاصل ہوتے ہیں ایمان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے بدلے میں اللہ کی رضا اور آخرت کی دائمی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے کہ جس نے یہ تجارت اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے گا، اور جنت میں اس کو پاکیزہ و بہترین مساکن و مکانات عطا فرما دے گا، جن میں ہر طرح کے آرام و عیش کے سامان ہونگے جیسا کہ حدیث میں مساکنِ طیبہ کی تفسیر میں اس کا بیان آیا ہے۔ آگے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ کچھ دنیا کی نعمتوں کا بھی وعدہ فرماتے ہیں:-

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ لفظ اُخریٰ نعمت کی صفت ہے معنی یہ

یہ ہیں کہ آخرت کی نعمتیں اور جنت کے مکانات تو ملیں گے ہی جیسا کہ وعدہ کیا گیا ہے، ایک نعمت نقد دنیا میں بھی ملنے والی ہے وہ ہے اللہ کی مدد اور اس کے ذریعہ فتح قریب یعنی دشمنوں کے ملک کا فتح ہونا، یہاں قریب اگر بمقابلہ آخرت کے لیا جائے تو بعد میں آنے والی اسلامی فتوحات عرب و عجم کی سب اس میں داخل ہیں اور قریب عرفی مراد لیا جائے تو اس کا پہلا مصداق فتح خیبر ہے، اور اس کے بعد فتح مکہ مکرمہ ہے، اور اس فتح قریب کے متعلق تُحِبُّوْنَهَا فرمایا یعنی یہ نقد نعمت تمہاری پسندیدہ اور محبوب ہے، کیونکہ انسان فطری طور پر عجلت پسند واقع ہوا ہے، قرآن کریم میں ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا یعنی ہے انسان جلد باز" اس کا یہ مفہوم نہیں کہ آخرت کی نعمتیں ان کو محبوب نہ تھیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں کی طلب و محبت تو ظاہر ہی ہے، مگر طبعی طور پر کچھ نقد نعمت دنیا میں بھی تمہیں مطلوب و محبوب ہے، **وہ بھی عطا کی جائے گی۔**

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ حواریین، حواری کی جمع ہے جس کے معنی مخلص دوست کے ہیں جو ہر عیب سے پاک صاف ہو (روح المعانی) سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو حواری کہا جاتا ہے، اور وہ بارہ آدمی تھے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں گذر چکا ہے اس آیت میں زمانہ عیسیٰ علیہ السلام کے ایک واقعہ کو ذکر کر کے مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کے لئے تیار رہا کریں، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دشمنوں سے تنگ آئے تو لوگوں سے کہا مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ یعنی اللہ کے دین کی اشاعت میں کون میرا مددگار ہوتا ہے؟ جس پر بارہ آدمیوں نے وفاداری کا عہد کیا اور پھر دین عیسوی کی اشاعت میں خدمات انجام دیں، تو مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اللہ کے دین کے انصار و مددگار بنیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حکم کی تعمیل ایسی کی کہ پہلی امتوں میں جس کی نظیر نہیں ملتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور دین کی خاطر سب عرب و عجم سے دشمنی خریدی، ان کی ایذائیں سہیں، اپنی جان و مال اور اولاد کو اس پر قربان کیا، اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح و نصرت سے نوازا، اور سب دشمنوں پر ان کو غالب فرمایا، ان کے ملک ان کے ہاتھ آئے اور دنیا کی فرمانروائی **بھی ان کو نصیب ہوئی۔**

فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۔

عیسائیوں کے تین فرقے

بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان میں اٹھا لیا تو عیسائیوں میں تین فرقے ہو گئے، ایک فرقہ نے کہا کہ وہ خود خدا ہی تھے آسمان میں چلے گئے، دوسرے فرقہ نے کہا کہ وہ خدا تو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے

تھے اللہ نے ان کو اٹھا لیا اور دشمنوں پر فوقیت دیدی تیسرے فرقے نے وہ بات کہی جو صحیح اور حق ہے کہ وہ نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بلکہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اللہ تعالیٰ نے ان دشمنوں سے حفاظت اور رفعتِ درجہ کے لئے اٹھا لیا، یہ لوگ صحیح مؤمن تھے تینوں فرقوں کے ساتھ کچھ عوام لگ گئے اور باہمی نزاع بڑھتے بڑھتے باہم قتال کی نوبت آگئی، اتفاق سے دونوں کافر فرقے مؤمنین پر غالب آگئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جنہوں نے اس مؤمن فرقہ کی تائید کی اس طرح انجام کار وہ مؤمن فرقہ بحیثیت حجت و دلیل کے غالب آگیا (مظہری)

اس تفسیر کے مطابق آیتِ مذکورہ میں ..... مؤمنین امتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی مراد ہوں گے جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت سے مظفر و منصور ہوں گے (مظہری) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ رفع عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں میں دو فرقے ہو گئے، ایک عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے کر مشرک ہو گیا، دوسرا صحیح دین پر قائم رہا جو ان کو اللہ کا بندہ اور رسول کہتا تھا، پھر ان مشرکین و مؤمنین میں باہم جنگ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین امتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اس امت کے کافروں پر غالب کر دیا، مگر مشہور یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں جہاد و قتال کا حکم نہیں تھا، اس لئے مؤمنین کا قتال کرنا بعید معلوم ہوتا ہے (روح المعانی) مگر اوپر خلاصۂ تفسیر میں اس کے جواب میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا امکان ہے کہ جنگ کی ابتداء کفار نصاریٰ کی طرف سے ہوئی ہو اور مؤمنین مدافعت پر مجبور ہو گئے ہوں، تو یہ جہاد و قتال کے حکم میں نہیں آتا، واللہ اعلم۔

تمت

سُوْرَۃُ الصَّفِّ بِحَمْدِ اللّٰہِ وَعَوْنِہٖ
لِاِحْدٰی وَالْعِشْرِیْنَ مِنْ جُمَادَی الْاُوْلٰی
۱۳۹۰ھ یَوْمَ الْخَمِیْسِ وَیَتْلُوْھَا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ
سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں بادشاہ پاک ذات

الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

زبردست حکمتوں والا۔ وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں کا

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ

پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور عقلمندی

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا

اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔ اور اٹھایا اس رسول کو ایک دوسرے لوگوں کیواسطے بھی

يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ

انہی میں جو ابھی ملے نہیں ان میں، اور وہی ہے زبردست حکمت والا۔ یہ بڑائی اللہ کی ہے دیتا ہے جس کو

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ

چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ مثال ان لوگوں کی جن پر لادی توریت

ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ

پھر انہوں نے اس کو نہ اٹھایا جیسے مثال گدھے کی کہ پیٹھ پر لے چلتا ہے کتابیں بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے

كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

جھٹلایا اللہ کی باتوں کو اور اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو تو کہہ اے یہودی

هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

ہونے والو اگر تم کو دعویٰ ہے کہ تم دوست ہو اللہ کے سب لوگوں کے سوائے تو تم مناؤ اپنے مرنے کو

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ

اگر تم سچے ہو اور وہ کبھی نہ منائیں گے مرنا بسبب ان کاموں کے جو آگے بھیج چکے ہیں ان کے ہاتھ

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٧﴾ قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ

اور اللہ کو خوب معلوم ہیں سب گنہگار تو کہہ موت جس سے تم بھاگتے ہو سو وہ تم سے ضرور

مُلَاقِيكُمْ ۖ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا

ملنے والی ہے پھر تم پھیرے جاؤ گے اس چھپے اور کھلے جاننے والے کے پاس پھر وہ جتلا دے گا تم کو

كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾

جو تم کرتے تھے۔

ع ۱

خلاصۂ تفسیر

سب چیزیں جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں جو کہ بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے زبردست ہے حکمت والا ہے، وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں انہی کی قوم میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے (یعنی شرک و کفر میں، اور مراد اکثر ہیں کیونکہ جاہلیت میں بھی بعضے موحد تھے، مگر تاہم کہیں بہت کے وہ بھی [illegible] تھے) اور (علاوہ ان موجودین کے) دوسروں کے لئے بھی (آپ کو مبعوث فرمایا) جو (اسلام لاکر) ان میں سے ہونے والے ہیں لیکن ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے (خواہ بوجہ اس کے کہ موجود ہیں مگر

لفظ آخَرِیْنَ کے عطف میں دو قول ہیں، بعض حضرات نے اس کو اُمیین پر عطف قرار دیا ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ بھیجا اللہ نے اپنا رسول، امیین میں اور ان لوگوں میں جو ابھی اُن سے نہیں ملے، اس پر جو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ امیین یعنی موجودین میں رسول بھیجنا تو ظاہر ہے جو لوگ ابھی آئے ہی نہیں ان میں بھیجنے کا کیا مطلب ہوگا، اس کا جواب بیان القرآن میں یہ دیا ہے کہ ان میں بھیجنے سے مراد ان کیلئے بھیجنا ہے، کیونکہ لفظ فی عربی زبان میں اس معنے کے لئے بھی آتا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آخَرِیْنَ کا عطف یُعَلِّمُهُمْ کی ضمیر منصوب پر ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم دیتے ہیں امیین کو بھی اور ان لوگوں کو بھی جو ابھی اُن کے ساتھ ملے نہیں۔ (اختارہ فی المظہری)

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ آپ پر نازل ہوئی، اور آپ نے ہمیں سنائی، جب آپ نے یہ آیت پڑھی وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہیں جن کا ذکر آخرین کے لفظ سے کیا گیا ہے، آپ نے اس وقت سکوت فرمایا، مکرر سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت سلمان فارسیؓ پر رکھ دیا (جو اس وقت مجلس میں موجود تھے) اور فرمایا کہ اگر ایمان ثریا ستارہ کی بلندی پر بھی ہوگا تو ان کی قوم کے کچھ لوگ وہاں سے بھی ایمان کو لے آئیں گے (مظہری)

اس روایت میں بھی اہل فارس کی تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ اتنا ثابت ہوا کہ یہ بھی آخرین کے مجموعہ میں داخل ہیں، اس حدیث میں اہل عجم کی بڑی فضیلت ہے (مظہری)

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ۔ اَسفار، سفر بکسر سین کی جمع ہے، بڑی کتاب کو کہا جاتا ہے، سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اُمیین میں ہونا اور آپ کی بعثت کے تین مقاصد کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے، پچھلی آسمانی کتاب تورات میں بھی آپ کا ذکر تقریباً انہی الفاظ و صفات کے ساتھ آیا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ پر ایمان لے آتے، مگر ان کو دنیا کے جاہ و مال نے تورات کے احکام سے اندھا کردیا اور باوجود تورات کا علم ہونے کے عمل کے اعتبار سے ایسے ہوگئے جیسے بالکل جاہل ناواقف ہوں، اُن لوگوں کی مذمت مذکورہ آیت میں اس طرح کی گئی کہ یہ لوگ جن پر تورات لاد دی گئی تھی، یعنی ان کو بے مانگے اللہ کی یہ نعمت دیدی گئی تھی، مگر انھوں نے اس کے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا یعنی تورات کے احکام کی پروا نہ کی، ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کی پشت پر علوم و فنون کی بڑی بڑی کتابیں لاد دی جاتی ہیں، یہ گدھا اُن کا بوجھ تو

اٹھاتا ہے مگر ان کے مضامین کی نہ اس کو کچھ خبر ہے نہ اُن سے کوئی فائدہ اس کو پہونچتا ہے، یہود کا بھی یہی حال ہے کہ دنیا سازی کے لئے تورات تو لئے پھرتے ہیں اور لوگوں میں اس کے ذریعہ جاہ اور اپنا مقدم بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

عالم بے عمل کی مثال: حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جو مثال یہود کی دی گئی ہے، یہی مثال اُس عالم دین کی ہے جو اپنے علم پر عمل نہ کرے ؎

نہ محقق بود نہ دانشمند — چارپائے برو کتابے چند

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ، یہود اپنے کفر و شرک اور ساری بداخلاقیوں کے باوجود یہ دعویٰ بھی رکھتے تھے نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ، یعنی ہم تو اللہ کی اولاد اور محبوب ہیں، اور اپنے سوا کسی کو جنت کا مستحق نہ کہتے تھے بلکہ یوں کہا کرتے تھے لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا، گویا وہ آخرت کے عذاب سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے اور جنت کی نعمتوں کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں درجے افضل و بہتر ہیں اور دنیا میں ہر وقت یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ یہاں کی زندگی رنج و غم اور تکلیفوں اور محنتوں سے خالی نہیں اور یہ راحتیں بھی آتی جاتی رہتی ہیں، اور اس کو یہ بھی یقین ہو کہ موت آتے ہی مجھے وہ عظیم اور دائمی نعمتیں ضرور مل ہی جائیں گی، تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی عقل و فہم ہے تو اس کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہو اور وہ دل سے چاہے کہ موت جلد آجائے تاکہ دنیا کی تکلیف دہ رنج و غم سے بھری ہوئی زندگی سے نکل کر خالص راحت اور آرام کی دائمی زندگی میں پہونچ جائے۔

اس لئے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ آپ یہود سے فرمائیں کہ اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ساری مخلوق میں تم ہی اللہ کے محبوب اور لاڈلے ہو اور تمہیں یہ خطرہ بالکل نہیں کہ آخرت میں تمہیں کوئی عذاب ہو سکتا ہے تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تم موت کی تمنا کرو اور اس کے مشتاق رہو۔

پھر قرآن نے خود ان کی تکذیب کر دی اور فرمایا وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ یعنی یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ اس کے کہ اُن کے ہاتھوں نے آخرت کے لئے کفر و شرک اور اعمال بد آگے بھیج رکھے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ آخرت میں ہمارے لئے عذاب جہنم کے سوا کچھ نہیں، اور یہ دعوے اللہ کے مقبول و محبوب ہونے کے بالکل جھوٹے ہیں جن کا جھوٹ ہونا خود اُن پر بھی واضح ہے، مگر دنیا کے کچھ فائدہ حاصل کرنے کے لئے ایسے دعوے کرتے ہیں، اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر موت کی تمنا ظاہر کر دی تو وہ ضرور قبول ہو جائے گی اور ہم

مر جائیں گے، اس لئے فرمایا کہ وہ ہرگز ایسی تمنا نہیں کر سکتے۔
ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس وقت ان میں کوئی موت کی تمنا کرتا تو اسی وقت مر جاتا (روح)

موت کی تمنا جائز نہیں: یہ بحث مفصل سورۂ بقرہ میں آ چکی ہے، حدیث میں موت کی تمنا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی شخص کو دنیا میں یہ یقین کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مرتے ہی جنت میں ضرور جائے گا، اور کسی قسم کے عذاب کا اس کو خطرہ نہیں تو ایسی حالت میں موت کی تمنا کرنا اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بہادری جتانے کا دعویٰ ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ، یعنی یہود جو اس دعوے کے باوجود موت کی تمنا سے گریز کرتے ہیں اس کا حاصل موت سے گریز کرنا اور بھاگنا ہے، ان کو آپ فرما دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو آ کر رہے گی، اس وقت نہیں تو کچھ بعد چند روز کے، اس لئے

موت سے فرار بالکلیہ کسی کے بس ہی میں نہیں۔

اسباب موت سے فرار کے احکام: جو چیزیں عادۃً موت کا سبب ہوتی ہیں ان سے فرار مقتضائے عقل بھی ہے، مقتضائے شرع بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جھکی ہوئی دیوار کے نیچے سے گذرے تو تیزی کے ساتھ نکل گئے، اسی طرح کہیں آگ لگ جائے وہاں سے نہ بھاگنا، عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے، مگر وہ فرار من الموت جس کی مذمت آیت مذکورہ میں وارد ہوئی ہے اس میں داخل نہیں، جبکہ عقیدہ سالم ہو اور یہ جانتا ہو کہ جس وقت موت آجائے گی تو میرا بھاگنا مجھے بچا نہ سکے گا، مگر چونکہ اس کو معلوم نہیں کہ یہ آگ یا زہر یا کوئی دوسری مہلک چیز متعین طور پر میری موت اس میں لکھدی گئی ہے، اس لئے اس سے بھاگنا فرار من الموت جو مذموم ہے اس میں داخل نہیں۔

باقی رہا طاعون یا وبا جس بستی میں آ جائے اس سے بھاگنا یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیلات کتب فقہ و حدیث میں مذکور ہیں وہاں دیکھی جا سکتی ہیں، اور تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں بھی اس پر کافی بحث کر کے مسئلہ کو منقح کر دیا ہے، یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

اے ایمان والو! جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ

اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹

کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید و فروخت یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے

معارف و مسائل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۔ یوم الجمعہ، اس دن کو یوم جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے اجتماع کا دن ہے، اور آسمان و زمین اور تمام کائنات کی تخلیق جو حق تعالیٰ نے چھ دن میں فرمائی ہے ان چھ میں آخری دن جمعہ تھا جس میں تخلیق کی تکمیل ہوئی، اسی دن میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی روز میں اُن کو جنت میں داخل کیا گیا، پھر اسی دن میں اُن کو زمین کی طرف اُتارا گیا، اسی دن میں قیامت قائم ہوگی، اور اسی دن میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ اس میں انسان جو بھی دُعاء کرے قبول ہوتی ہے، یہ سب باتیں احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے اجتماع اور عید کا ہر ہفتہ میں یہ دن جمعہ کا رکھا تھا، مگر پچھلی اُمتوں کو اس کی توفیق نہ ہوئی، یہود نے یوم سبت (سنیچر کے دن) کو اپنا یوم اجتماع بنالیا، نصاریٰ نے اتوار کو، اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو اس کی توفیق بخشی کہ انھوں نے یوم جمعہ کا انتخاب کیا، (کما رواہ البخاری ومسلم عن ابی ہریرۃؓ، ابن کثیر) زمانہ جاہلیت میں اس دن کو یوم عروبہ کہا جاتا تھا، سب سے پہلے عرب میں کعب بن لوی نے اس کا نام جمعہ رکھا، اور قریش اس دن جمع ہوتے، اور کعب بن لوی خطبہ دیتے تھے، یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانسو ساٹھ سال پہلے کا ہے

کعب بن لوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں، اُن کو حق تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت میں بھی بُت پرستی سے بچایا، اور توحید کی توفیق عطا فرمائی تھی، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خوش خبری بھی لوگوں کو سنائی تھی، قریش میں ان کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ ان کی وفات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانسو ساٹھ سال پہلے ہوئی، اسی سے اپنی تاریخ شمار کرنے لگے، عرب کی تاریخ ابتداء میں بناءِ کعبہ سے لی جاتی تھی کعب بن لوی کی وفات کے بعد اس سے تاریخ جاری ہوگئی، پھر جب واقعہ فیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال میں پیش آیا تو اس واقعہ سے عرب کی تاریخ کا سلسلہ جاری ہوگیا، خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ کا اہتمام عرب میں قبل از اسلام بھی کعب بن لوی کے زمانہ میں ہوچکا تھا، اور اس دن کا نام جمعہ رکھنا بھی انہی کی طرف منسوب ہے (مظہری)

بعض روایات میں ہے کہ انصار مدینہ نے قبل از ہجرت فرضیت جمعہ نازل ہونے سے پہلے اپنے اجتہاد سے جمعہ کے روز جمع ہونے اور عبادت کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا، (کما رواہ عبدالرزاق باسناد صحیح عن محمد بن سیرین) (از مظہری)

نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ نداء صلوۃ سے مراد اذان ہے، اور مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ بمعنی فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ ہے، فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ، سعی کے معنی دوڑنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کام کو اہتمام کے ساتھ کرنے کے بھی، اس جگہ یہی دوسرے معنی مراد ہیں کیونکہ نماز کے لئے دوڑتے ہوئے آنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب نماز کے لئے آؤ تو سکینت اور وقار کے ساتھ آؤ۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب جمعہ کے دن جمعہ کی اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو، یعنی نماز و خطبہ کے لئے مسجد کی طرف چلنے کا اہتمام کرو، جیسا دوڑنے والا کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں دیتا، اذان کے بعد تم بھی کسی اور کام کی طرف بجز نماز و خطبہ کے توجہ نہ دو (ابن کثیر) اور ذکر اللہ سے مراد نماز جمعہ بھی ہو سکتی ہے اور خطبہ جمعہ جو نماز جمعہ کے شرائط و فرائض میں داخل ہے وہ بھی، اس لئے مجموعہ دونوں کا مراد لینا یہ بہتر ہے (مظہری وغیرہ)

وَذَرُوا الْبَیْعَ، یعنی چھوڑ دو بیع، فروخت کرنے کو، صرف بیع کہنے پر اکتفا کیا گیا اور مراد بیع و شراء یعنی خرید و فروخت دونوں ہیں، وجہ اکتفاء کی یہ ہے کہ ایک کے چھوٹ جانے سے دوسرا خود بخود چھوٹ جائے گا، جب کوئی فروخت کرنے والا فروخت نہ کرے گا تو خریدنے والے کے لئے خریدنے کا راستہ ہی نہ رہے گا۔

اس میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ اذان جمعہ کے بعد جو خرید و فروخت کو اس آیت نے حرام کر دیا ہے اس پر عمل کرنا تو بیچنے والوں اور خریداروں سب پر فرض ہے، مگر اس کا عملی انتظام اس طرح کیا جائے کہ دکانیں بند کر دی جائیں تو خریداری خود بخود بند ہو جائے گی، اس میں حکمت یہ ہے کہ گاہکوں اور خریداروں کی تو کوئی حد و شمار نہیں ہوتی ان سب کے روکنے کا انتظام آسان نہیں فروخت کرنے والے دکاندار متعین اور معدود ہوتے ہیں ان کو فروخت سے روک دیا جائے تو باقی سب خریدنے سے خود رک جائیں گے، اس لئے ذَرُوا الْبَیْعَ میں صرف بیع چھوڑ دینے کے حکم پر اکتفا کیا گیا۔

فائدہ:۔ اذان جمعہ کے بعد سب ہی مشاغل کا ممنوع کرنا مقصود تھا جن میں زراعت تجارت، مزدوری سبھی داخل ہیں، مگر قرآن کریم نے صرف بیع کا ذکر فرمایا، اس سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے مخاطب شہروں اور قصبوں والے ہیں، چھوٹے دیہات اور جنگلوں میں جمعہ نہیں ہوتا، اس لئے شہروں اور قصبوں میں جو مشاغل عام لوگوں کو پیش آتے ہیں ان کی ممانعت فرمائی گئی وہ بیع و شراء کے ہوتے ہیں، بخلاف گاؤں والوں کے کہ ان کے مشاغل کاشت اور زمین سے متعلق ہوتے ہیں، اور بہ تحقیق فقہاء حضرات یہاں بیع سے مراد فقط فروخت کرنا نہیں بلکہ ہر وہ کام جو جمعہ کی طرف جانے کے اہتمام میں مخل ہو وہ سب بیع کے مفہوم میں داخل ہے اس لئے

اذانِ جمعہ کے بعد کھانا پینا، سونا، کسی سے بات کرنا یہاں تک کہ کتاب کا مطالعہ کرنا وغیرہ سب ممنوع ہیں، صرف جمعہ کی تیاری کے متعلق جو کام ہوں وہ کئے جا سکتے ہیں۔

اذانِ جمعہ شروع میں صرف ایک ہی تھی جو خطبہ کے وقت امام کے سامنے کہی جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پھر صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی طرح رہا، حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور اطراف مدینہ میں پھیل گئے، امام کے سامنے والی خطبہ کی اذان دور تک سنائی نہ دیتی تھی، تو عثمان غنیؓ نے ایک اور اذان مسجد سے باہر اپنے مکان زوراء پر شروع کر دی جس کی آواز پورے مدینہ میں پہنچنے لگی، صحابہ کرام میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا، اس لئے یہ اذان اول باجماع صحابہ مشروع ہوگئی اور اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء وغیرہ تمام مشاغل حرام ہو جانے کا حکم جو پہلے اذان خطبہ کے بعد ہوتا تھا اب پہلی اذان کے بعد سے شروع ہو گیا، کیونکہ الفاظ قرآن اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ اس پر بھی صادق ہیں، یہ تمام باتیں حدیث و تفسیر اور فقہ کی عام کتابوں میں بلا اختلاف مذکور ہیں۔

اس پر پوری امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ جمعہ کے روز ظہر کے بجائے نمازِ جمعہ فرض ہے، اور اس پر بھی اجماع و اتفاق ہے کہ نمازِ جمعہ عام پنج نمازوں کی طرح نہیں اس کے لئے کچھ مزید شرائط ہیں، پانچوں نمازیں تنہا بلا جماعت کے بھی پڑھی جا سکتی ہیں، دو آدمی کی بھی جماعت ہے اور جمعہ بغیر جماعت کے ادا نہیں ہوتا، اور جماعت کی تعداد میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، اسی طرح نماز پنجگانہ ہر جگہ دریا، پہاڑ، جنگل میں ادا ہو جاتی ہے، مگر جمعہ جنگل، صحرا میں کسی کے نزدیک ادا نہیں ہوتا، عورتوں اور بعض معذوروں، مسافروں پر جمعہ فرض نہیں، وہ جمعہ کی بجائے ظہر کی نماز پڑھیں، جمعہ کس قسم کی بستی والوں پر فرض ہے اس میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک جس بستی میں چالیس مرد آزاد، عاقل، بالغ بستے ہوں اس میں جمعہ ہو سکتا ہے اس سے کم میں نہیں، امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بستی کا ہونا ضروری ہے جس کے مکانات متصل ہوں اور اس میں بازار بھی ہو، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہو جس میں گلی کوچے اور بازار ہوں اور کوئی قاضی حاکم فیصلہ معاملات کے لئے ہو، مسئلہ اور اس کے دلائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرات علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھ کر سب کچھ واضح کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ باتفاق جمہور امت عام مخصوص البعض ہے، علی الاطلاق ہر مسلمان پر جمعہ فرض نہیں، بلکہ کچھ قیود و شرائط سب کے نزدیک ہیں، اختلاف صرف شرائط کی تعیین میں ہے، البتہ جہاں فرض ہو اُن کے لئے اس فرض کی بڑی اہمیت و تاکید ہے

پر فرمایا کہ اگر تم سب کے سب چلے جاتے تو مدینہ کی ساری وادی عذاب کی آگ سے بھر جاتی (رواہ ابو یعلی، ابن کثیر)

امام تفسیر مقاتل کا بیان ہے کہ یہ تجارتی قافلہ دحیہ بن خلیفہ کلبی کا تھا، جو ملک شام سے آیا تھا، اور تجار مدینہ میں اس کا قافلہ عموماً تمام ضروریات لے کر آیا کرتا تھا، اور جب مدینہ کے لوگوں کو اس کی آمد کی خبر ملتی تھی تو سب مرد و عورت اس کی طرف دوڑتے تھے، یہ دحیہ بن خلیفہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے بعد میں داخل اسلام ہوئے۔

اور حسن بصری اور ابو مالکؒ نے فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مدینہ میں اشیاء ضرورت کی کمی اور سخت گرانی تھی (تفسیر مظہری)، یہ اسباب تھے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بڑی جماعت تجارتی قافلہ کی آواز پر مسجد سے نکل گئی، اول تو نماز فرض ادا ہو چکی تھی، خطبہ کے متعلق یہ معلوم نہ تھا کہ جمعہ میں وہ بھی فرض کا جزء ہے، دوسرے اشیاء کی گرانی، تیسرے تجارتی قافلہ پر لوگوں کا ٹوٹ پڑنا، جس سے ہر ایک کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ دیر کروں گا تو اپنی ضروریات نہ پا سکوں گا۔

بہر حال ان اسباب کے تحت صحابہ کرام سے یہ لغزش ہوئی جس پر حدیث مذکور میں وعید کے الفاظ آئے کہ سب کے سب چلے جاتے تو اللہ کا عذاب آجاتا، اسی پر عار دلانے اور تنبیہ کرنے کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی، اذا راوا تجارۃ، اور اسی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے معاملے میں اپنا طرز بدل دیا کہ نماز جمعہ سے پہلے خطبہ دینے کا معمول بنا لیا، اور یہی اب سنت ہے (ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اُن لوگوں کو بتلا دیں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس تجارت اور ڈھول ڈھماکہ سے بہتر ہے جس میں آخرت کا ثواب تو مراد ہے ہی یہ بھی بعید نہیں کہ نماز و خطبہ کی خاطر تجارت و کسب معاش کو چھوڑنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بھی خاص برکات نازل ہوں، جیسا کہ بعض سلف صالحین سے بروایت ابن کثیر نقل کیا گیا ہے۔

تمت

الحمد للہ سورۃ الجمعۃ

یوم الخمیس ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشَرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ منافقون مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ

جب آئیں تیرے پاس منافق کہیں ہم قائل ہیں تو رسول ہے اللہ کا، اور اللہ

يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ①

جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ

انھوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، یہ لوگ برے کام

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى

ہیں جو کر رہے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہو گئے پھر مہر لگ گئی

قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ③ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ

ان کے دل پر سو وہ اب کچھ نہیں سمجھتے، اور جب تو دیکھے ان کو تو خوش لگیں تجھ کو ان کے ڈیل

وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ

اور اگر بات کہیں سنے تو ان کی بات، کیسے ہیں جیسے لکڑی لگا دی دیوار سے، جو کوئی چیخیں جانیں

ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کرے۔

اس کی مراد عزت والے سے خود اپنی جماعت اور انصار تھے، اور ذلیل سے مراد معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہ تھے، حضرت زید بن ارقمؓ نے جب اس کا یہ کلام سُنا تو فوراً بولے کہ واللہ تو ہی ذلیل و خوار اور مبغوض ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے دی ہوئی عزت اور مسلمانوں کی دلی محبت سے کامیاب ہیں۔

عبداللہ بن ابی چونکہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا اسی لئے اتنا صاف نہ بولتے تھے، اس وقت زید بن ارقمؓ کے جملہ غضب سے اس کو ہوش آیا کہ میرا کفر ظاہر ہو جائے گا، تو حضرت زیدؓ سے عذر کیا کہ میں نے تو یہ بات ہنسی میں کہدی تھی، میرا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کچھ کرنا نہیں تھا۔

حضرت زید بن ارقمؓ اس مجلس سے اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ابن ابی کا یہ سارا واقعہ کہہ سنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خبر بہت شاق ہوئی، چہرۂ مبارک پر تغیر کے آثار نظر آنے لگے، زید بن ارقمؓ کم عمر صحابی تھے، آپ نے ان سے کہا کہ لڑکے تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو، زید بن ارقمؓ نے قسم کھا کر کہا کہ نہیں میں نے اپنے کانوں سے اس کے یہ کلمات سنے ہیں، آپ نے پھر فرمایا کہ تمہیں کچھ اشتباہ تو نہیں ہو گیا، زید بن ارقمؓ نے پھر وہی جواب دیا، اور پھر ابن ابی کی یہ بات مسلمانوں کے پورے لشکر میں پھیل گئی اور آپس میں اس بات کے سوا کوئی بات ہی نہ رہی، ادھر حضرات انصار سب زید بن ارقمؓ کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے قوم کے سردار پر تہمت لگائی، اور قطع رحمی کی، زید بن ارقمؓ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی قسم پورے قبیلۂ خزرج میں مجھے ابن ابی سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ کلمات کہے تو میں اسے برداشت نہیں کر سکا اور اگر میرا باپ بھی ایسی بات کہتا تو میں اس کو بھی ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتا

دوسری طرف حضرت عمر بن خطابؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، اور بعض روایت میں ہے کہ فاروق اعظمؓ نے یہ عرض کیا کہ آپ عباد بن بشر کو حکم دیدیجئے کہ اس کو قتل کر کے آپ کے سامنے پیش کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر اس کا کیا ہو گا کہ لوگوں میں یہ شہرت دی جائیگی کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کر دیتا ہوں، اس لئے آپ نے ابن ابی کے قتل سے روک دیا، حضرت فاروق اعظمؓ کے اس کلام کی خبر عبداللہ بن ابی منافق کے بیٹے کو پہنچی ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اور یہ پکے مسلمان تھے، یہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ کا ارادہ میرے باپ کو ان کی اس گفتگو کے نتیجہ میں قتل کرنے کا ہے تو آپ مجھے حکم دیجئے میں اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں اس سے پہلے کہ آپ اپنی مجلس سے اٹھیں پیش کر دوں گا، اور عرض کیا کہ پورا قبیلۂ خزرج اس کا گواہ ہے کہ

کہ ان میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ اپنے والدین کی خدمت و اطاعت کرنے والا نہیں ہے مگر رسول کے خلاف اُن کی بھی کوئی چیز برداشت نہیں کرسکتا، اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے کسی اور کو میرے باپ کے قتل کا حکم دیا اور اس نے قتل کر دیا تو ایسا نہ ہو کہ جب میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں تو مجھ پر غیرت نسبی غالب آجائے اور میں اُسے قتل کر بیٹھوں، جو میرے لئے عذاب کا سبب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ میرا ارادہ اس کے قتل کا ہے نہ میں نے کسی کو اس کا حکم دیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عادت کے خلاف بے وقت سفر کرنے کا اعلان عام فرما دیا اور خود ناقہ قصویٰ پر سوار ہو گئے، جب صحابہ کرام بھی روانہ ہو گئے تو آپ نے عبداللہ ابن اُبی کو بلایا اور دریافت کیا کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے؟ یہ قسمیں کھانے لگا کہ میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا یہ لڑکا زید بن ارقم جھوٹا ہے، چونکہ عبداللہ بن اُبی کی اپنی قوم میں عزت تھی سب نے یہ قرار دیا کہ شاید زید بن ارقم کو کچھ مغالطہ لگ گیا ہے، ابن اُبی نے یہ نہیں کہا۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اُبی کی قسم اور عذر کو قبول کر لیا اور لوگوں میں زید بن ارقم پر غصہ اور اُن کی ملامت اور تیز ہو گئی، اور یہ اس رسوائی کے سبب لوگوں سے چھپے رہنے لگے، ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر اسلام کے ساتھ پورے دن پھر پوری رات سفر کیا، اور اگلے روز صبح کو بھی برابر سفر کرتے رہے، یہاں تک کہ دھوپ تیز ہونے لگی، اُس وقت آپ نے قافلہ کو ایک جگہ ٹھہرا دیا، پورے ایک دن ایک رات کے مسلسل سفر سے تھکے ہوئے صحابہ کرام جب اس منزل پر اُترے تو فوراً سب محو خواب ہو گئے۔

راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام سفر کرنے کی عادت کے خلاف فوری طور پر بے وقت سفر شروع کرنے اور پھر سفر کو اتنا طویل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ابن اُبی کے واقعہ کا جو چرچا تمام مسلمانوں میں پھیل گیا تھا مسلمانوں کو سفر کے اس شغل میں لگا دیں تاکہ یہ چرچا ختم ہو جائے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شروع کیا، ابھی راستے ہی میں تھے جب ابن اُبی کے بارے میں قرآن کی آیات نازل نہ ہوئی تھیں تو عبادہ بن صامت نے ابن اُبی کو نصیحت کی کہ تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اعتراف کرلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرما دیں گے، تیری نجات ہو جائے گی، ابن اُبی نے اُن کی نصیحت سن کر اپنا سر اس طرف سے پھیر لیا، حضرت عبادہ نے اسی وقت فرمایا کہ ضرور تیرے اس اعراض کے بارے میں قرآن نازل ہوگا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور زید بن ارقم بار بار آپ کے قریب آتے تھے کیونکہ ان کو اپنی جگہ یقین تھا کہ اس شخص منافق نے مجھے پوری قوم میں جھوٹا قرار دے کر رسوا کیا ہے، ضرور میری تصدیق اور اس شخص کی تکذیب میں قرآن نازل ہوگا، اچانک زید بن ارقم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو وحی کے وقت ہوتی تھی کہ سانس پھولنے لگا اور پیشانی مبارک پر پسینے بہنے لگا اور آپ کی سواری اتنی بوجھ سے دبنے لگی تو ان کو امید ہوئی کہ اب کوئی وحی اس بارے میں نازل ہوگی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت رفع ہوئی میری سواری چونکہ آپ کے قریب تھی آپ نے اپنی سواری ہی پر سے میرا کان پکڑا اور فرمایا یا غلام صَدَّقَ اللّٰہُ حَدِیْثَکَ وَنَزَلَتْ سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی ابْنِ اُبَیٍّ مِنْ اَوَّلِہَا اِلٰی اٰخِرِہَا (یعنی اے لڑکے اللہ نے تیری بات کی تصدیق کر دی اور پوری سورہ **منافقون اسی واقعہ ابن اُبی کے متعلق نازل ہوئی)**

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورۂ منافقون دوران سفر ہی میں نازل ہوگئی تھی مگر بغوی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور زید بن ارقمؓ رسوائی کے خوف سے گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے اس وقت یہ سورت نازل ہوئی، واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے قریب وادی عقیق میں پہنچے تو عبداللہ بن ابی منافق کے مؤمن صاحبزادے عبداللہ آگے بڑھے اور تمام سواریوں میں تلاش کرتے ہوئے اپنے باپ عبداللہ بن ابی کی سواری تک قریب پہنچ کر باپ کی اونٹنی کو بٹھلا دیا اور اس کے گھٹنے پر پاؤں رکھ کر باپ سے خطاب کیا کہ خدا کی قسم! تم مدینہ میں داخل نہیں ہو سکو گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں، اور جب تک تم یہ بات واضح نہ کرو کہ تم نے جو بات کہی ہے کہ عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا، اس میں عزت والا کون ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تم۔ عبداللہ بن عبداللہ ابن ابی اپنے باپ کا راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے، اور پاس سے گذرنے والے لوگ عبداللہ کو ملامت کرتے تھے کہ باپ کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے، آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ان کے قریب آئی تو معاملہ کے متعلق دریافت کیا، لوگوں نے بتلایا کہ عبداللہ مؤمن نے اپنے باپ کا راستہ اس لئے روکا ہوا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے یہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابن ابی منافق بیٹے سے مجبور ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ میں تو بچوں اور عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر صاحبزادے سے کہا کہ ان کا راستہ چھوڑ دو، مدینہ میں جانے دو، تب بیٹے نے راستہ چھوڑا۔

سورۂ منافقون کے نزول کا قصہ تو تمام ہی تھا جو اوپر لکھا گیا، قصہ کے شروع میں یہ بھی اجمالاً ذکر ہوا ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق وہی ہے جس میں ام المؤمنین حضرت جویریہؓ کا والد حارث بن ضرار ہوا تھا، بعد میں حضرت جویریہؓ کو اللہ تعالیٰ نے شرف اسلام کے ساتھ امہات المؤمنین میں داخل ہونے کا شرف عطا فرمایا اور باپ بھی مسلمان ہوگئے۔

اس کا واقعہ مسند احمد، ابوداؤد وغیرہ میں یہ منقول ہے کہ جب بنو المصطلق کو شکست ہوئی تو مالِ غنیمت کے ساتھ اُن کے کچھ قیدی بھی ہاتھ آئے، اسلامی قانون کے مطابق سب قیدی اور مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیئے گئے، قیدیوں میں حارث بن ضرار کی بیٹی جویریہ بھی تھیں، یہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصّہ میں آ گئیں، انہوں نے جویریہ کو بصورت کتابت آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ غلام یا کنیز پر کچھ رقم مقرر کر دی جائے اور اس کو محنت مزدوری یا تجارت کی اجازت دیدی جائے وہ مقررہ رقم کما کر مالک کو ادا کر دے تو آزاد ہو جائے۔

جویریہ پر جو رقم مقرر کی تھی وہ بڑی رقم تھی جس کی ادائیگی ان کے لئے آسان نہ تھی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں، شہادت دیتی ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، پھر اپنا واقعہ سُنایا کہ ثابت بن قیس جن کے حصّہ میں میں آئی ہوں انہوں نے مجھے مکاتب بنا دیا ہے، مگر رقم کتابت کی ادائیگی میرے بس میں نہیں، آپ اس میں میری کچھ مدد فرما دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ساتھ ہی ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا، جویریہ کے لئے یہ بہت بڑی نعمت تھی وہ کیسے قبول نہ کرتیں، بخوشی خاطر قبول کیا، اور یہ ازواج مطہرات میں داخل ہو گئیں، اُم المؤمنین حضرت جویریہ کا بیان ہے کہ غزوہ بنی المصطلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے تین دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یثرب کی طرف سے چاند چلا اور میری گود میں آ کر گر گیا، اس وقت تو میں نے یہ خواب کسی سے ذکر نہ کیا تھا اب اس کی تعبیر آنکھوں سے دیکھ لی۔

یہ سردارِ قوم کی بیٹی تھیں، ان کے ازواج مطہرات میں داخل ہونے سے پورے قبیلہ پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے اور ایک فائدہ اُن تمام عورتوں کو پہونچا جو اُن کے ساتھ گرفتار ہوئی تھیں اور ان کی رشتہ دار تھیں کیونکہ ان کا اُم المؤمنین ہو جانا معلوم کرنے کے بعد جن جن مسلمانوں کے پاس اُن کی رشتہ دار کوئی کنیز تھی سب نے اُن کو آزاد کر دیا کہ اُن کی عزیز کسی عورت کو کنیز بنا کر اپنے پاس رکھنا ادب کے خلاف سمجھا، اس طرح سو کنیزیں اُن کے ساتھ آزاد ہو گئیں اور پھر اُن کے والد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

واقعہ مذکورہ میں اہم ہدایات و فوائد سورۂ منافقون کے نزول کا واقعہ اس کی تفسیر کے سمجھنے میں تو معین ہے ہی، اس کے ضمن میں بہت اہم ہدایات دینیات، اخلاق، سیاست اور معاشرت کے متعلق آ گئے ہیں، اس لئے احقر نے اس واقعہ کی پوری تفصیل یہاں نقل کی ہے، وہ ہدایات یہ ہیں:۔

اسلامی سیاست کا سنگِ بنیاد وہ عالمی برادری قائم کرنا ہے جس میں رنگ، نسل، زبان اور ملکی و غیر ملکی کے سب امتیازات

غزوۂ بنی مصطلق میں پیش آنے والا ایک انصاری اور ایک مہاجر کا جھگڑا اور دونوں طرف سے انصار و مہاجرین کو اپنی اپنی مدد کے لئے پکارنا، یہ وہ جاہلیت کا بُت تھا جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑ دیا تھا، اور مسلمان کہیں کے رہنے والے ہوں کسی رنگ و زبان اور کسی نسل و قوم کے ہوں سب کو آپس میں بالکل ختم کر دیے جب وہ بھائی بھائی بنا دیا تھا، اسلام جس میں باقاعدہ مواخات کرا کر ان کی مستحکم اسلامی برادری بنا دی تھی، مگر شیطان کا یہ پرانا جال ہے جس میں لوگوں کو پھنسا کر ہمیشہ جھگڑوں کے وقت قوم و وطن اور زبان و رنگ وغیرہ کو تعاون و تناصر کی بنیاد بنا دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعاون و تناصر کا شرعی معیار حق و انصاف سب کے ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، صرف برادری اور قومیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا اصول بن جاتا ہے، اس طرح وہ مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے، اس واقعہ میں بھی کچھ ایسی ہی صورت بن رہی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً موقع پر پہنچ کر اس فتنہ کو ختم کر دیا اور تنبیہ کی کہ یہ جاہلیت و کفر کا بدبودار نعرہ ہے، اس سے بچو، اور پھر سب کو قرآنی اصول تعاون پر قائم کر دیا جس میں ارشاد ہے تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، یعنی مسلمانوں کے لئے کسی کی مدد کرنے یا مدد حاصل کرنے کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ جو شخص عدل و انصاف اور نیکی پر ہے، اس کی مدد کرو اگرچہ وہ نسب و خاندان اور زبان و وطن میں بہت دور ہو اور جو شخص کسی گناہ و ظلم پر ہو اس کی ہرگز مدد نہ کرو اگرچہ وہ تمہارا باپ اور بھائی ہی ہو، یہی وہ معقول و منصفانہ بنیاد ہے جس کو اسلام نے قائم فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قدم پر اس کی خود رعایت فرمائی، اور سب کو اس کے تابع رہنے کی تلقین فرمائی، اور اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا کہ جاہلیت کی سب رسمیں میرے قدموں کے نیچے مسل دی گئی ہیں، اب عربی عجمی کالے گورے ملکی غیر ملکی کے امتیازات کے بُت ٹوٹ چکے ہیں، باہمی تعاون و تناصر کی اسلامی بنیاد صرف حق و انصاف ہے، سب کو اس کے تابع چلنا ہے۔

اس واقعہ نے ہمیں یہ بھی سبق دیا ہے کہ دشمنانِ اسلام آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کے لئے یہی برادری اور وطنی قومیت کا حربہ استعمال کرتے ہیں، جب جس وقت موقع ملتا ہے اسی سے کام لے کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔

افسوس ہے کہ زمانہ دراز سے پھر مسلمان اپنے اس سبق کو بھول گئے، اور اغیار نے مسلمانوں کی اسلامی وحدت کے ٹکڑے کرنے میں پھر وہی شیطانی جال پھیلا دیا اور دین و اصولِ دین سے غفلت کی بنا پر عام دنیا کے مسلمان اس جال میں پھنس کر باہمی خانہ جنگیوں کے شکار ہو گئے، اور کفر و الحاد کے مقابلہ کے لئے اُن کی متحدہ قوت پاش پاش ہو گئی، صرف عربی و عجمی ہی نہیں عربوں میں مصری، شامی،

حجازی یمنی ایک دوسرے سے متحد نہ رہ سکے، ہندوستان و پاکستان میں پنجابی، بنگالی، سندھی، ہندی پٹھان اور بلوچی باہم آویزش کے شکار ہو گئے، ذلیل تر مشتعل، دشمنانِ اسلام ہماری آویزش سے کھیل رہے ہیں اس کے نتیجہ میں وہ ہر میدان میں ہم پر غالب آتے جاتے ہیں اور ہم ہر جگہ شکست خوردہ غلامانہ ذہنیت میں مبتلا انہی کی پناہ لینے پر مجبور نظر آتے ہیں کاش آج بھی مسلمان اپنے قرآنی اصول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر غور کریں غیروں کے بہکانے میں آنے کے بجائے اخوتِ اسلامی برادری کو ضابطہ بنائیں، رنگ و نسل و زبان و وطن کے بتوں کو پھر ایک دفعہ توڑ دیں تو آج بھی خدا تعالیٰ کی نصرت و امداد کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہونے لگے۔

صحابۂ کرام کی اسلامی اصول پختگی ثابت قدمی اور مقامِ بلند ۔ اس واقعہ نے یہ بھی بتلایا کہ اگرچہ وقتی طور پر شیطان نے کچھ لوگوں کو نعرۂ جاہلیت میں مبتلا کر دیا تھا مگر درحقیقت سب کے دلوں میں ایمان رچا بسا ہوا تھا، ذرا سی تنبیہ پر سب ان خیالات سے تائب ہو گئے، اور اُن کے دلوں پر اللہ اور رسول کی محبت و عظمت کا ایسا غلبہ تھا جس میں کوئی رشتہ ناطہ، برادری اور قومیت حائل نہ ہوتی، اس کی شہادت خود اسی واقعہ میں حضرت زید بن ارقمؓ کے بیان سے واضح ہوئی کہ وہ خود بھی قبیلہ خزرج کے آدمی ہیں اور ابن اُبی اس قبیلہ کا سردار تھا، اور زید بن ارقم بھی اس کی عزت و عظمت کے قائل تھے لیکن جس وقت اس کی زبان سے مومنین مہاجرین اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الفاظ سنے تو برداشت نہ کر سکے، اُسی مجلس میں ابن اُبی کو منہ توڑ جواب دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت پیش کر دی، اگر آجکل کی برادری پرستی ہوتی تو اپنی برادری کے سردار کی یہ بات وہ کبھی حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچاتے۔

اس واقعہ میں خود ابن اُبی کے صاحبزادے عبداللہ کے واقعہ نے اس کو کس قدر روشن کر دیا کہ ان کی محبت و عظمت کا اصل تعلق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے تھا، جب اپنے باپ سے اُن کے خلاف بات سُنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خود اپنے باپ کا سر قلم کرنے کی پیشکش کر دی اور اجازت طلب کی، آپ نے اس سے روک دیا، تو مدینہ کے قریب پہونچ کر باپ کی سواری کو بٹھا دیا، اور مدینہ جانے کا راستہ روک کر باپ کو مجبور کیا کہ وہ یہ اقرار کرے کہ عزت دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ خود ذلیل و خوار ہے، پھر آپؐ کی اجازت ملنے سے پہلے باپ کا راستہ نہیں کھولا، جس کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن ٭ ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اس کے علاوہ بدر و اُحد اور احزاب کی جنگوں نے تو بذریعہ تلوار اس قوم پرستی اور وطن پرستی کے بُت کے ٹکڑے اُڑا دیے ہیں، جس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی قوم و وطن اور کسی رنگ و زبان کا ہو

وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور خدا و رسول کے دشمن، وہ اگرچہ حقیقی بھائی اور باپ ہی کیوں نہ ہو وہ دشمن ہے ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　　فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

مسلمانوں کی مصالح عامہ کی رعایت اس واقعہ نے ہمیں یہ سبق بھی دیا کہ جو کام فی نفسہ جائز و درست ہو مگر دوسروں کو غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہو اس کے کرنے سے کوئی خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہوگی، یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا تو یہ کام نہ کیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن اُبی کا نفاق کھل جانے کے بعد بھی فاروق اعظمؓ کے اس مشورہ کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

مگر دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرہ سے ایسے کاموں کو چھوڑا جا سکتا ہے جو مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہوں گو مستحب اور کار ثواب ہوں، کسی مقصد شرعی کو ایسے خطرہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا بلکہ خطرہ کے ازالہ کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔

سورت کا ترجمہ اور خلاصۂ تفسیر اوپر لکھا جا چکا ہے، اب اس کے خاص خاص جملوں کی مزید توضیح دیکھئے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ الآیۃ، عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین جس کے معاملہ میں یہ سورت نازل ہوئی ہے جس میں اس کی قسموں کا جھوٹا ہونا واضح کر دیا گیا تو لوگوں نے اس کو از راہ خیر خواہی یہ کہا کہ تجھے معلوم ہے کہ تیرے بارے میں قرآن میں کیا نازل ہوا ہے، اب بھی وقت نہیں گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جا، (اور اعتراف جرم کر لے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرما دیں گے، اس نے جواب میں کہا کہ تم لوگوں نے مجھے کہا کہ ایمان لے آ میں نے ایمان اختیار کر لیا، پھر تم نے مجھے اپنے مال میں سے زکوٰۃ دینے کو کہا وہ دینے لگا، اب اس کے سوا کیا رہ گیا ہے کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سجدہ کیا کروں، اس پر آیات مذکورہ نازل ہوئیں، جن میں واضح کر دیا گیا کہ جب اُس کے دل میں ایمان ہی نہیں تو اس کے لئے کسی کا استغفار نافع نہیں ہو سکتا۔

ابن اُبی اس واقعہ کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر چند روز ہی زندہ رہا، پھر جلد ہی مر گیا (مظہری)

هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا، یہ وہی قول ہے جو جہجاہ مہاجر و سنان انصاری کے جھگڑے کے وقت ابن اُبی نے کہا تھا، جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ بیوقوف یوں سمجھ رہے ہیں کہ مہاجرین ہماری داد و دہش کے محتاج ہیں ہم ہی اُن کو دیتے ہیں، حالانکہ تمام آسمان و زمین کے خزانے تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہیں تو مہاجرین کو تمہاری کسی امداد کے بغیر سب کچھ دے سکتے ہیں، اس کا ایسا سمجھنا چونکہ بے عقلی اور بیوقوفی کی دلیل ہے اس لئے قرآن حکیم نے اس جگہ

سے (مراد اس سے مجموعہ دین ہی) غافل نہ کرنے پاویں (یعنی دنیا میں ایسے منہمک مت ہو جاؤ کہ دین میں خلل پڑنے لگے) اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں (کیونکہ نفع دنیوی تو ختم ہو جاوے گا اور آخرت کا ضرر اور خسارہ دائمی رہ جاوے گا، اور منجملہ طاعات کے ایک طاعت مالیہ کا حکم کیا جاتا ہے کہ لَا تُلْهِكُمْ کے عام مضمون میں سے ایک فرد خاص یہ بھی) ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوق واجبہ کو) اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو پھر وہ (بطور تمنا و حسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، اور اس کی یہ تمنا و حسرت اس لئے غیر مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے (ویسی ہی جزاء کے مستحق ہوگے)۔

معارف و مسائل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ، اس سورت کے پہلے رکوع میں منافقین کی جھوٹی قسموں اور ان کی سازشوں کا ذکر تھا اور سب کا خلاصہ دنیا کی محبت سے مغلوب ہونا تھا اسی وجہ سے ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی زد سے بھی بچیں اور اموال غنیمت وغیرہ کا حصہ بھی ملے، اسی وجہ سے ان کی یہ سازش تھی کہ مہاجرین صحابہ پر خرچ کرنا بند کر دو، اس دوسرے رکوع میں خطاب مومنین مخلصین کو ہے، جس میں ان کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ دنیا کی محبت میں ایسے مدہوش نہ ہو جائیں جیسے منافقین ہوگئے، دنیا کی سب سے بڑی دو چیزیں ہیں جو انسان کو اللہ سے غافل کرتی ہیں، مال اور اولاد، اس لئے ان دونوں کا نام لیا گیا، ورنہ مراد اس سے پوری متاع دنیا ہے، اور حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ مال و اولاد سے محبت ایک درجہ میں مذموم نہیں ان کے ساتھ ایک درجہ تک اشتغال صرف جائز نہیں بلکہ واجب بھی ہو جاتا ہے، مگر ہر وقت یہ حد فاصل سامنے رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔ یہاں ذکر سے مراد بعض مفسرین نے پانچ وقت کی نماز، بعض نے حج اور زکوٰۃ، بعض نے قرآن قرار دیا ہے، حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ ذکر سے مراد یہاں تمام طاعات و عبادات ہیں، اور یہی قول سب کا جامع ہے (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیوی معیشت کے سامان میں اس قدر مشغول رہنے کی تو اجازت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی طاعت سے انسان کو غافل نہ کر دے کہ اس کی محبت میں مبتلا ہو کر فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے یا حرام و مکروہات میں مبتلا ہو جائے، اور جو ایسا کرے ان کے بارے میں ارشاد وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ، یعنی یہی لوگ ہیں خسارہ میں پڑنے والے، کیونکہ انہوں نے آخرت کی عظیم اور

سُورَةُ التَّغَابُنِ

سُورَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانِيَ عَشْرَةَ آيَةً وَفِيهَا رُكُوعَانِ

سورۃ تغابن مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اسی کا راج ہے اور اسی کی تعریف ہے

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ

اور وہی ہر چیز کر سکتا ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر کوئی تم میں منکر ہے اور

مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

کوئی تم میں ایماندار اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔ بنایا آسمانوں کو اور

وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿٣﴾ يَعْلَمُ مَا فِي

زمین کو تدبیر سے اور صورت کھینچی تمہاری پھر اچھی بنائی تمہاری صورت اور اسی کی طرف سب کو پھر جانا ہے۔ جانتا ہے جو کچھ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو کھول کر کرتے ہو اور اللہ کو معلوم ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٤﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ

جیوں کی بات۔ کیا پہنچی نہیں تم کو خبر ان لوگوں کی جو منکر ہو چکے ہیں پہلے

پہلے اُن کا جنت کا وہ مقام دکھلایا جائے گا جو ایمان اور عمل صالح کی صورت میں اُن کے لئے مقرر تھا تاکہ اُن کو اور زیادہ حسرت ہو، ان روایات میں یہ بھی ہے کہ پھر جنت میں جو مقامات اہلِ جہنم کے تھے وہ بھی اہلِ جنت کو مل جائیں گے، اور جہنم میں جو مقامات اہلِ جنت کے تھے وہ بھی اہلِ جہنم کے حصہ میں آجائیں گے، یہ روایات حدیث صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں مختلف الفاظ سے مفصّل آئی ہیں، اس وقت جبکہ کفار فجار اور اشقیاء کے جنتی مقامات بھی اہلِ جنت کے قبضہ میں آئیں گے، تو ان کو اپنے غبن اور خسارے کا احساس ہوگا کہ کیا چھوڑا اور کیا پایا۔

صحیح مسلم و ترمذی وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال فرمایا کہ تم جانتے ہو مفلس کون شخص ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ جس شخص کے پاس مال متاع نہ ہو اس کو مفلس سمجھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں اپنے اعمالِ صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا ذخیرہ لے کر آئے گا مگر اس کا حال یہ ہوگا کہ دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر بہتان باندھا، کسی کو مارا یا قتل کیا، کسی کا مال ناحق لے لیا تو یہ سب جمع ہوں گے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کریں گے، کوئی اس کی نماز لے جائے گا، کوئی روزہ، کوئی زکوٰۃ، اور دوسری حسنات اور جب حسنات ختم ہو جائیں گی تو مظلوموں کے گناہ اس ظالم پر ڈال کر بدلہ چکایا جائے گا جس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کسی کا کوئی حق ہو اس کو چاہئے کہ دنیا ہی میں اس کو ادا یا معاف کرا کر سبکدوش ہو جائے، ورنہ قیامت کے دن درہم و دینار تو ہوں گے نہیں جس کا مطالبہ ہوگا اس کو اس شخص کے اعمال صالحہ سے بدلہ چکایا جائے گا، اعمال صالحہ ختم ہو جائیں گے تو بقدر اس کے حق کے مظلوم کا گناہ اس پر ڈال دیا جائے گا (مظہری)

حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے ائمہ تفسیر نے قیامت کو یوم التغابن کہنے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور بہت سے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس دن غبن اور خسارے کا احساس صرف کفار فجار اور اشقیاء ہی کو نہیں بلکہ صالحین مؤمنین کو بھی اس طرح ہوگا کہ کاش ہم عمل اور زیادہ کرتے تاکہ جنت کے مزید درجات حاصل کرتے، اس روز ہر شخص کو اپنی عمر کے اوقات پر حسرت ہوگی، جو فضول ضائع کئے، جیسا کہ حدیث میں ہے:-

مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَ عَلَيْهِ تِرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ،

"جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا اور پوری مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کیا تو یہ مجلس قیامت کے روز اس کے لئے حسرت بنے گی"

قرطبی میں ہے کہ ہر مومن بھی اس روز احسان عمل میں اپنی کوتاہی پر اپنے غبن و خسارہ کا احساس کرے گا، قیامت کا نام یوم تغابن رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ سورۂ مریم میں اس کا نام یوم الحسرۃ آیا ہے۔

شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ آخرت میں فلاح پانے والے ہیں، آگے اس کے بہت اجر اور موجب فلاح ہونے کا بیان ہے کہ اگر تم اللہ کو اچھی طرح خلوص کے ساتھ قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بڑا قدردان ہے کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے اور بڑا بردبار ہے کہ عمل معصیت پر فوراً مواخذہ نہیں فرماتا اور پوشیدہ اور ظاہر اعمال کا جاننے والا ہے اور زبردست ہے اور حکمت والا ہے (اتقوا سے حکیم تک) تمام مضامین سورت کے لئے بمنزلہ علت کے ہیں کہ سب مضامین ان پر مرتب و متفرع ہوتے ہیں۔

معارف و مسائل

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ، یعنی کسی کو کوئی مصیبت اللہ کے اذن کے بغیر نہیں پہنچتی اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ہدایت فرما دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ امر اپنی جگہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، اللہ کے اذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو نقصان و تکلیف پہنچا سکتا ہے نہ نفع اور راحت، مگر جس شخص کا اللہ پر اور اس کی تقدیر پر ایمان نہیں ہوتا مصیبت کے وقت اس کے لئے قرار و سکون کا کوئی سامان نہیں ہوتا، وہ اس مصیبت کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے، بخلاف مومن کے جس کا تقدیر الٰہی پر ایمان ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیتا ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت سے ہوا جو کچھ مصیبت مجھے پہنچی وہ پہنچنی ہی تھی اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اور جس مصیبت سے نجات ہوئی وہ نجات ہونا ہی تھی کسی کی مجال نہیں جو اس مصیبت کو مجھ پر ڈال دے، اس ایمان و اعتقاد کے نتیجہ میں اس کو آخرت کے ثواب کا وعدہ بھی سامنے ہوتا ہے جس سے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ،

"یعنی اے مسلمانو! تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں، ان کے شر سے بچتے رہو۔"

ترمذی و حاکم وغیرہ نے بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرت مدینہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل اسلام ہوئے، اور ارادہ کیا کہ ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، مگر ان کے اہل و عیال نے ان کو نہ چھوڑا کہ ہجرت کر کے چلے جائیں۔ (روح)

(اور یہ زمانہ وہ تھا کہ مکہ سے ہجرت کرنا ہر مسلمان پر فرض تھا) قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں ایسی بیوی اور اولاد کو انسان کا دشمن قرار دیا، اور ان کے شر سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی کیونکہ

اس سے بڑا دشمن انسان کا کون ہو سکتا ہے جو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب اور جہنم کی آگ میں مبتلا کر دے۔

اور حضرت عطاء بن ابی رباح کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعی کے بارے میں نازل ہوئی جن کا واقعہ یہ تھا کہ یہ مدینہ میں موجود تھے، اور جب کبھی غزوہ و جہاد کا موقع آتا تو جہاد کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تھے مگر ان کے بیوی بچے فریاد کرنے لگتے کہ ہمیں کس پر چھوڑ کر جاتے ہو، یہ اُن کی فریاد سے متاثر ہو کر رک جاتے تھے (روح، ابن کثیر)

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں ہی آیت کا سبب نزول ہو سکتے ہیں کیونکہ اللہ کے فرض خواہ ہجرت ہو یا جہاد جو بیوی اور اولاد فرض کی ادائیگی میں مانع ہوں وہ ان کی دشمن ہیں۔

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، سابقہ آیت میں جن بیوی بچوں کو دشمن قرار دیا ہے اُن کو جب اپنی غلطی پر تنبیہ ہو تو ارادہ کیا کہ آئندہ اہل و عیال کے ساتھ سختی و تشدد کا معاملہ کریں گے، اس پر آیت کے اس حصہ میں یہ ارشاد نازل ہوا کہ اگرچہ ان بیوی بچوں نے تمہارے لئے دشمن کا سا کام کیا کہ تمہیں ادائے فرض سے مانع ہوئے، مگر اس کے باوجود ان کے ساتھ تشدد اور بے رحمی کا معاملہ نہ کرو بلکہ عفو و درگذر اور معافی کو اختیار کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ کی عادت بھی مغفرت و رحمت کی ہے۔

گناہگار بیوی بچوں سے بیزاری اور بغض نہیں چاہئے

مسئلہ: علماء نے اس آیت سے استدلال کیا کہ اہل و عیال سے کوئی کام خلاف شرع بھی ہو جائے تو اُن سے بیزار ہو جانا اور اُن سے بغض رکھنا یا اُن کے لئے بددعا کرنا مناسب نہیں (روح)

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ، فتنہ کے معنی آزمائش اور امتحان کے ہیں، مراد آیت کی یہ ہے کہ مال و اولاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسان کی آزمائش کرتا ہے کہ اُن کی محبت میں مبتلا ہو کر احکام و فرائض سے غفلت کرتا ہے یا محبت کو اپنی حد میں رکھ کر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا۔

مال و اولاد انسان کے لئے بڑا فتنہ ہیں

حقیقت یہ ہے کہ مال و اولاد کی محبت انسان کے لئے بڑا فتنہ و آزمائش ہیں، انسان اکثر گناہوں میں خصوصاً حرام کمائی میں انہی کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز بعض آدمی ایسے لائے جائیں گے اُس کو دیکھ کر لوگ کہیں گے: اَكَلَ عِيَالُهٗ حَسَنَاتِهٖ یعنی اُس کی نیکیوں کو اس کے عیال نے کھا لیا (روح)۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے بارے میں فرمایا مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ یعنی یہ بخل اور جبن یعنی نامردی اور کمزوری کے اسباب ہیں، کہ ان کی محبت کی وجہ سے آدمی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رکتا ہے، انہی کی محبت کی وجہ سے جہاد میں شرکت سے رہ جاتا ہے۔ بعض سلف صالحین کا قول ہے اَلْعِيَالُ سُوْسُ الطَّاعَاتِ یعنی عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گھن ہے، جیسا گھن غلہ کو کھا جاتا ہے یہ اس کی نیکیوں کو

کہا جاتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "یعنی تقویٰ اختیار کرو مقدور بھر"، جب آیت اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ نازل ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ سے ایسا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے"، تو صحابہ کرامؓ پر بہت بھاری اور شاق ہوا، کہ اللہ کے حق کے مطابق تقویٰ کس کے بس میں ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی طاقت اور مقدور سے زیادہ تکلیف نہیں دی، تقویٰ بھی اپنی طاقت کے مطابق واجب ہے، مقصد یہ ہے کہ حصولِ تقویٰ میں اپنی پوری توانائی اور کوشش کرلے تو اس سے اللہ کا حق ادا ہو جائے گا (روح ملخصاً)

تَمَّتْ سُوْرَةُ التَّغَابُنِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

سُوْرَةُ الطَّلَاق

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثِنْتَا عَشْرَةَ آيَةً وَفِيْهَا رُكُوْعَانِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ

يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ

فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ فَاِذَا

بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا

ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ڛ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ

حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ وَالّٰۗـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ

نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰۗـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ

الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ

تو یہ ظاہر ہے کہ پہلی مثال میں اس صورت استثناء سے اس فعل کا جواز بتلانا منظور نہیں اور دوسری مثال میں ماں کی نافرمانی کا جواز ثابت کرنا نہیں بلکہ بلیغ انداز میں اس کی اور بھی زیادہ ممانعت و شناعت کا بیان ہے تو حاصل مضمون آیت اس صورت میں یہ ہوا کہ مطلقہ عورتیں اپنے شوہروں کے گھروں سے نکلیں مگر یہ کہ وہ بے حیائی ہی پر اتر آئیں اور نکل بھاگیں تو اسکا مطلب نکل بھاگنے کا جواز نہیں بلکہ اور زیادہ مذمت اور ممانعت کا اثبات ہے۔ فاحشہ مبینہ کی یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سدی، ابن السائب، نخعی وغیرہ سے منقول ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے (روح المعانی)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فاحشہ مبینہ سے مراد زنا اور بدکاری ہے اس صورت میں استثناء اپنے معنی میں ہے کہ اگر مطلقہ عورت نے زنا کیا اور جرم اُس پر ثابت ہو گیا تو اس کو حد شرعی جاری کرنے کیلئے اخانہ بیت عدت سے نکالا جائیگا۔ یہ تفسیر حضرت قتادہ، حسن بصری، شعبی، زید بن اسلم اور ضحاک وغیرہ سے منقول ہے امام ابو یوسفؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ فاحشہ مبینہ سے مراد زبان درازی اور لڑائی جھگڑا ہے تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ مطلقہ عورتوں کو انکے گھروں سے نکالنا جائز نہیں بجز اس صورت کے کہ عورت بد زبان جھگڑالو ہو اپنے شوہر اور اسکے متعلقین سے بدزبانی کے ساتھ پیش آئے تو ایسی صورت میں اس کو مکان عدت سے نکالا جا سکتا ہے۔ فاحشہ مبینہ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بروایت متعددہ منقول ہے اور آیت مذکورہ میں حضرت اُبی بن کعب اور عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت الا ان یفحشن علیکم ہے اس لفظ کے ظاہری معنی فحش کلام اور بدزبانی کے ہیں۔ اس قرأت سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے اور اس صورت میں بھی استثناء اپنی حقیقت پر رہے گا کہ بدزبانی و جھگڑا لو ہونے کی صورت میں مطلقہ کو مکان عدت سے نکالا جا سکتا ہے۔

یہاں تک طلاق سے متعلق چار احکام کا بیان آیا ہے اور آگے مزید احکام بیان ہونگے درمیان میں احکام مذکورہ کی پابندی کی تاکید اور اس کی مخالفت سے بچنے کے لئے چند وعظ و نصیحت کے جملے بیان ہوئے ہیں جو قرآن حکیم کا خاص اسلوب ہے کہ ہر حکم کے بعد خدا تعالیٰ کے خوف اور آخرت کی فکر اور یاد کر کے اس کی خلاف ورزی کو روکا گیا ہے کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ اور باہمی حقوق کی پوری ادائیگی کا انتظام کسی قانون کے ذریعہ نہیں ہو سکتا اس کے لئے خوف خدا و آخرت ہی روکنے والی چیز ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا، حُدُوْدُ اللّٰهِ سے مراد شریعت کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ یعنی جو شخص حدود اللہ میں تعدی کرے یعنی ان حدود احکام کی خلاف ورزی کرے فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ تو اس شخص نے اپنی جان پر ظلم کیا، یعنی اللہ کا یا شریعتِ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑا اپنا ہی نقصان کیا ہے اور

یہ نقصان عام ہے دینی بھی اور دنیاوی بھی، دینی نقصان تو اسی میں خلاف شرع کرنے کا گناہ اور اس کا وبال آخرت ہے اور دنیوی نقصان یہ ہے کہ جو شخص شرعی ہدایات کے بغیر طلاق دے بیٹھتا ہے وہ اکثر تین طلاقوں تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد آپس میں رجوع یا نکاح جدید بھی نہیں ہو سکتا اور آدمی اکثر طلاق دینے کے بعد پچھتاتا ہے اور مصیبت جھیلتا ہے خصوصاً جبکہ صاحب اولاد بھی ہو۔ اس لئے یہ مصیبت دنیا ہی میں اپنی جان پر پڑی اور بہت سے لوگ جو بیوی کو تکلیف دینے اور نقصان پہنچانے کی نیت سے ظالمانہ طلاق دیتے ہیں تو اس کی تکلیف عورت کو بھی کچھ پہنچ جائے لیکن اس ظالم پر ظلم اور دوہرا وبال پڑ جاتا ہے، ایک اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے کا دوسرے عورت پر ظلم کرنے کا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد ۔۔ بر گردن وے بماند و بر ما بگذشت

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا، یعنی تم نہیں جانتے شاید اللہ تعالیٰ اس غیظ و غضب کے بعد کوئی دوسری حالت پیدا فرما دیں کہ بیوی سے جو شکایتیں تھیں اور اولاد کی پرورش اور گھر کے انتظام کی جو دقتیں تھیں ان کا خیال کر کے پھر اپنی طلاق پر پچھتاوا ہو اور دوبارہ اس کو نکاح میں رکھنے کا ارادہ کرو تو دوبارہ نکاح میں رکھنے کی صورت جبھی ہو سکتی ہے جبکہ تم طلاق کے وقت حدود شرعیہ کی رعایت کرو کہ بلاوجہ طلاق کو بائن نہ کرو بلکہ رجعی رہنے دو جس میں رجعت کرنے کا شوہر کو اختیار ہوتا ہے رجعت کر لینے سے پہلا نکاح بدستور قائم رہ جاتا ہے اور یہ کہ تین طلاق تک نوبت نہ پہنچا دو جس کے بعد رجعت کا حق نہیں رہتا اور دونوں کی رضامندی کے باوجود آپس میں دوبارہ نکاح بھی شرعاً حلال نہیں ہوتا۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، اجلھن میں لفظ اجل بمعنے عدت ہے اور بلوغ اجل سے مراد عدت کا اختتام کے قریب ہونا ہے۔

طلاق کے متعلق پانچواں حکم اس آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب طلاق والی بیوی کی عدت ختم ہونے پر پہنچے تو اب نکاح سے نکل جانے کا وقت آ گیا اس وقت تک وقتی تاثرات اور غم و غصہ کی کیفیت بھی ختم ہو جانی چاہئے اس وقت پھر سنجیدگی کے ساتھ غور کر لو کہ نکاح رکھنا بہتر ہے یا اس کا بالکل منقطع کر دینا اگر نکاح میں رکھنے کی رائے ہو جائے تو اس کو روک لو جس کی مسنون صورت اگلی آیت کے اشارہ اور حدیث کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ زبان سے کہدو کہ میں نے اپنی طلاق سے رجوع کر لیا اور اس پر دو گواہ بھی بنا لو۔

اور اگر اب بھی یہی رائے قائم ہو کہ نکاح ختم کرنا ہے تو پھر اس کو خوبصورتی کے ساتھ آزاد کر دو۔ یعنی عدت ختم ہو جانے دو عدت پوری ہوتے ہی وہ آزاد خود مختار ہو جائے گی۔

تین طلاق دینا باجماع اُمت حرام وناجائز ہے۔ اور اگر کوئی شخص تین طہر میں الگ الگ تین طلاقوں تک پہنچ جائے تو اسکے ناپسندیدہ ہونے پر بھی اُمت کا اجماع اور خود قرآن کی آیات کے اشارہ سے ثابت ہے صرف اسمیں اختلاف ہے کہ یہ صورت بھی حرام وناجائز اور طلاق بدعی میں داخل ہے یا ایسا نہیں، امام مالکؒ کے نزدیک حرام ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ شافعیؒ حرام تو نہیں کہتے یعنی اس صورت کو طلاق بدعی میں شمار نہیں کرتے بلکہ طلاق سنت میں داخل سمجھتے ہیں مگر ناپسندیدہ فعل انکے نزدیک بھی ہے تفصیل اسکی سورہ بقرہ کی تفسیر **معارف القرآن جلد اول ص۵۰۲ میں مذکور ہے۔**

مگر جس طرح تین طلاق بیک وقت دینے کے حرام ہونے پر پوری اُمت کا اجماع ہے اسی طرح اسپر بھی اجماع ہے کہ حرام ہونے کے باوجود کوئی شخص ایسا کر گزرے تو تینوں طلاق واقع ہو کر آئندہ کیلئے نکاح جدید بھی حلال نہیں ہوتا۔ پوری اُمت میں بجز اہل حدیث اور اہل تشیع کے سوا تمام مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں کہ تین طلاق بیک وقت بھی دی گئی ہیں تو تینوں واقع ہو جاتی ہیں کیونکہ کسی فعل کے حرام ہونے سے اس کے آثار کا وقوع متاثر نہیں ہوا کرتا جیسے کوئی کسی کو بے گناہ قتل کرے تو یہ فعل حرام ہونے کے باوجود مقتول تو مر ہی جاتا ہے۔ اسی طرح تین طلاق بیک وقت حرام ہونے کے باوجود تینوں کا وقوع لازمی امر ہے اور مذاہب اربعہ کا یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام کا بھی اجماع حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں منقول و معروف ہے۔ اسکا پورا مکمل بیان معارف القرآن جلد اول ص[illegible] تا ص[illegible] میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے **اس کو دیکھ لیا جاوے۔**

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ یعنی گواہ بنالو اپنے مسلمانوں میں سے دو معتبر آدمیوں کو اور قائم کرو شہادت کو ٹھیک ٹھیک۔

آٹھواں حکم اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اختتام عدت کے وقت خواہ رجعت کرکے بیوی کو روکنا طے کیا جائے یا عدت پوری کرکے آزاد کرنا طے کیا جائے دونوں صورتوں میں اپنے اس فعل رجعت یا ترک رجعت پر دو معتبر گواہ بنالو۔ یہ حکم آئمہ اربعہ کے نزدیک استحبابی ہے رجعت اس پر موقوف نہیں۔ اور گواہ بنانے کی حکمت رجعت کرنے کی صورت میں تو یہ ہے کہ کہیں کل کو عورت رجعت سے انکار کرکے اپنے نکاح سے نکل جانے کا دعویٰ نہ کرنے لگے اور ترک رجعت اور انقطاع نکاح کی صورت میں اسلئے کہ کل کو خود اپنا نفس ہی کہیں شرارت یا بیوی کی محبت سے مغلوب کر کے یہ دعویٰ نہ کرنے لگے کہ عدت گزرنے سے پہلے رجعت کرلی تھی۔ ان دو گواہوں کے لئے ذَوَيْ عَدْلٍ فرما کر بتلادیا کہ شرعی اور اصطلاحی معنی میں عادل یعنی ثقہ ومعتبر ہونا گواہوں کا ضروری ہے ورنہ ان کی شہادت پر قاضی کوئی فیصلہ نہیں دیگا۔ اور اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم کسی ایسے واقعہ رجعت یا انقطاع نکاح کے گواہ ہو اور قاضی کی عدالت میں گواہی دینے کی نوبت آوے تو کسی رو رعایت یا مخالفت وعداوت کی وجہ سے سچی گواہی دینے میں

ذرا بھی فرق نہ کرو۔

ذٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، یعنی ان مذکورہ مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور آخری دن یعنی قیامت پر۔ اس میں آخرت کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا کہ زوجین کے باہمی حقوق کی ادائیگی بغیر تقویٰ اور فکر آخرت کے کسی سے نہیں کرائی جا سکتی۔

جرم و سزا کے قوانین میں قرآن حکیم کا دنیوی حکومتوں سے جدا طرز: قوانین کی تدوین اور جرائم کی سزا و تعزیر تجویز کرنا اور مرتب کرنا اصول اور ایک پرانا دستور ہے، ہر قوم و ملک میں قوانین اور تعزیرات کی کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن کریم بھی اللہ کے قانون کی کتاب ہے، مگر اس کا طرز تمام دنیا کی کتب قوانین سے نرالا اور عجیب ہے کہ ہر قانون کے آگے پیچھے خوف خدا اور فکر آخرت کو سامنے کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ انسان قانون کی پابندی کسی پولیس اور نگران کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ کے خوف سے کرے کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، خلوت ہو یا جلوت ہر صورت میں پابندی قانون کو ضروری سمجھے۔ صرف یہی سبب ہے کہ قرآن پر صحیح ایمان رکھنے والوں میں کسی سخت سے سخت قانون کی تنفیذ بھی زیادہ دشوار نہیں ہوتی اس کے لئے اسلامی حکومت کو پولیس اور اس پر اسپیشل پولیس اور اس پر نگرانی کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔

قرآن کریم کا یہ طرز بیان تو تمام ہی قوانین میں عام ہے، خصوصیت سے میاں بیوی کے تعلقات اور باہمی حقوق کے قوانین میں اس کا سب سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کیونکہ یہ تعلقات ہی ایسے ہیں کہ ان پر نہ ہر کام پر کوئی شہادت مہیا ہو سکتی ہے نہ عدالتی تحقیق زوجین کے حقوق باہمی کی کمی و کوتاہی کا صحیح اندازہ لگا سکتی ہے ان کا تمام تر مدار خود زوجین ہی کے قلوب اور ان کے اعمال و افعال پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح کے خطبہ مسنونہ میں قرآن کریم کی جو تین آیتیں پڑھنا سنت سے ثابت ہے یہ تینوں آیتیں تقویٰ کے حکم سے شروع اور اسی پر ختم ہوتی ہیں جن میں یہ اشارہ ہے کہ نکاح کرنے والوں کو ابھی سے یہ سمجھ لینا ہے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر حق تعالیٰ ہمارے کھلے اور چھپے سب اعمال سے بلکہ دلوں کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے ہم نے آپس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، ایک نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی تو عالم الاسرار کے سامنے جوابدہی کرنا ہوگی، اسی طرح سورۂ طلاق میں جبکہ طلاق کے چند احکام بیان فرمائے گئے تو پہلے ہی حکم کے بعد وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ فرما کر تقویٰ کی ہدایت فرمائی پھر چار احکام کا ذکر کرنے کے بعد یہ وعظ و نصیحت کی کہ جو شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ کسی اور پر نہیں بلکہ اپنی ذات ہی پر ظلم کرتا ہے اس کا وبال اسی کو تباہ کر دیگا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ، پھر اور چار ضمنی احکام و قوانین ذکر کرنے کے بعد دوبارہ اسی ہدایت کو دہرایا گیا ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، آگے ایک آیت میں تقویٰ کے فضائل اور اس کی دینی و دنیوی برکات کا بیان فرمایا پھر اسی آیت کے آخر میں اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنے کی برکات ارشاد فرمائی گئیں اس کے بعد پھر چند احکام عدت کے بیان فرمائے اور اس کے بعد پھر دو آیتوں

ہیں تقویٰ کے مزید برکات و ثمرات کا بیان آیا اور اسکے بعد پھر کچھ نکاح و طلاق کے متعلقات بیوی کے نفقہ اور اولاد کے دودھ پلانے وغیرہ کے احکام بتلائے گئے۔ طلاق وعدت اور عورتوں کے نفقہ اور دودھ پلانے وغیرہ کے احکام میں بار بار کہیں ذکر آخرت کہیں تقوے کی فضیلت و برکت اور کہیں توکل کے برکات اور کچھ احکام بیان کر کے پھر تقویٰ کا مکرر ذکر اور فضائل کا بیان بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر قرآن کریم کے اس طرز بیان خصوصی کی حکمت سمجھ لینے کے بعد اسکا جوڑ اور باہمی ربط بھی واضح ہوگیا۔ اب آیات مذکورہ کی تفسیر و تشریح دیکھئے

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ، یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو اللہ تعالیٰ اسکے لئے ہر مشکل و مصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیں گے اور اسکو بے گمان رزق عطا فرما دیں گے لفظ تقویٰ کے اصلی اور لغوی معنے بچنے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت و نسبت ہوتی ہے تو ترجمہ اللہ سے ڈرنے کا کر دیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے بچے اور ڈرے۔

اس آیت میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کیلئے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں۔ کس چیز سے بچنا، اسمیں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دنیا کی سب مشکلات و مصائب کے لئے بھی اور آخرت کی سب مشکلات و مصائب کے لئے بھی اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کے لئے دنیا و آخرت کی ہر مشکل و مصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں، اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اسکو خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہی ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دنیاوی ہو یا آخرت کی۔ مومن متقی کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ اس کی ہر مشکل کو بھی آسان کر دیتا ہے اور اس کی ضروریات کا بھی تکفل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اسکی ضروریات مہیا کر دیتا ہے جسکا اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا (کذا فی الروح)

مناسبت مقام کی وجہ سے بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ طلاق دینے والے شوہر اور مطلقہ بیوی دونوں یا ان میں جو بھی تقویٰ اختیار کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ اسکو طلاق اور انقطاع نکاح کے بعد پیش آنے والی ہر مشکل و تکلیف سے نجات عطا فرمائیں گے اور مرد کو اسکے مناسب بیوی اور عورت کو اسکے مناسب شوہر عطا فرمائیں گے اور ظاہر ہے کہ آیت کا اصل مفہوم جو تمام مشکلات اور ہر قسم رزق کے لئے عام اور شامل ہے اس میں زوجین کی یہ مشکلات و ضروریات بھی شامل ہیں (کذا فی روح المعانی)

آیت مذکورہ کا شان نزول حضرت عبداللہ بن عباس رض سے روایت ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے لڑکے سالم کو دشمن گرفتار

کرکے لے گئے، اس کی ماں سخت پریشان ہے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اور لڑکے کی والدہ کو حکم دیتا ہوں کہ تم کثرت کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرو۔ ان دونوں نے حکم کی تعمیل کی اور کثرت سے یہ کلمہ پڑھنے لگے اس کا یہ اثر ہوا کہ جن دشمنوں نے لڑکے کو قید کر رکھا تھا وہ کسی روز ذرا غافل ہوئے لڑکا کسی طرح اُن کی قید سے نکل گیا اور اُن کی کچھ بکریاں بھی ساتھ لیکر اپنے والد کے پاس پہنچ گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اُن کا ایک اونٹ ان کو مل گیا اس پر سوار ہوئے اور دوسرے اونٹوں کو ساتھ لگا لیا سب کو لیکر والد کے پاس پہنچ گئے اُن کے والد یہ خبر لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعض روایت میں ہے کہ یہ سوال بھی کیا کہ یہ اونٹ بکریاں جو یہ لڑکا ساتھ لے آیا ہے یہ ہمارے لئے جائز و حلال ہیں یا نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ الآیۃ۔

اور بعض روایات میں ہے کہ عوف بن مالک اشجعیؓ اور ان کی بیوی کو جب لڑکے کی مفارقت نے زیادہ بے چین کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا، اور انہیں کچھ بعید نہیں کہ تقوے کا بھی حکم دیا ہو اور کثرت لاحول ولا قوۃ پڑھنے کا بھی (یہ سب روایات روح المعانی میں ابن مردویہ سے بطریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ نقل کی گئی ہیں)

اس شانِ نزول سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ اس مقام پر یہ آیت طلاق سے تعلق رکھنے والے مرد و عورت کے متعلق آئی ہے مگر مفہوم اس کا عام ہے سب کے لئے شامل ہے۔

مسئلہ۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی مسلمان کفار کی قید میں آجائے اور وہ ان کا کچھ مال لیکر واپس آجائے تو یہ مال بحکم مالِ غنیمت حلال ہے اور مالِ غنیمت کے عام قاعدہ کے مطابق اس کا پانچواں حصہ بیت المال کو دینا بھی اس کے ذمہ نہیں جیسا کہ واقعہ حدیث میں اس مال میں سے خمس نہیں لیا گیا۔ حضرات فقہاء نے فرمایا کہ کوئی مسلمان چھپ کر بغیر امان و اجازت لئے ہوئے دار الحرب میں چلا جائے اور وہاں سے کفار کا کچھ مال چھین کر یا کسی طرح لے آئے اور دار الاسلام میں پہنچ جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن جو شخص کفار سے امان اور اجازت لیکر اُن کے ملک میں جائے جیسا آجکل ویزا لینے کا دستور ہے تو اُس کے لئے جائز نہیں کہ ان کا کوئی مال بغیر اُن کی رضامندی کے لے آئے۔ اسی طرح جو شخص قید ہو کر اُن کے ملک میں چلا جائے پھر کفار میں سے کوئی آدمی اس کے پاس کوئی امانت رکھدے تو اس امانت کا لے آنا بھی حلال نہیں، پہلی صورت میں تو اس لئے کہ امان لے کر جانے سے ایک معاہدہ اُن کے درمیان ہو گیا اب بغیر ان کی رضامندی کے اُن کے جان و مال میں کوئی تصرف کرنا عہد شکنی میں داخل ہے اور دوسری صورت میں بھی امانت رکھنے والے سے عملی معاہدہ ہوتا ہے کہ جب وہ مانگے گا امانت اس کو دیدی جائے گی، اب امانت واپس نہ کرنا

بدعہدی اور عہد شکنی ہے جو شرعاً حرام ہے (مظہری)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت سے پہلے بہت سے کفار اپنی امانتیں رکھدیتے تھے۔ ہجرت کے وقت آپکے قبضہ میں ایسی کچھ امانتیں تھیں ان کو آپ اپنے ساتھ نہیں لائے بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اسی کام کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا کہ وہ جس جس کی امانت ہے اس کو سپرد کر دیں۔

مصائب سے نجات اور مقاصد کے حصول کا مجرب نسخہ

حدیث مذکور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک کو مصیبت سے نجات اور حصول مقصد کے لئے یہ تلقین فرمائی کہ کثرت کیساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کریں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا کہ دینی اور دنیاوی ہر قسم کے مصائب اور مضرتوں سے بچنے اور منافع و مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کلمہ کی کثرت بہت مجرب عمل ہے اور اس کثرت کی مقدار حضرت مجدد نے یہ بتلائی ہے کہ روزانہ پانسو مرتبہ یہ کلمہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرے اور سو سو مرتبہ درود شریف اس کے اول و آخر میں پڑھکر اپنے مقصد کے لئے دعا کیا کرے (تفسیر مظہری)۔ اور امام احمد اور حاکم، بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک روز اس آیت وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا الآیۃ کی تلاوت بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے نیند آنے لگی پھر فرمایا کہ اے ابوذر اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کر لیں تو سب کے لئے کافی ہے (روح المعانی) کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دینی اور دنیوی مقاصد میں کامیابی کے لئے کافی ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا

یعنی جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مہمات کے لئے کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو جس طرح چاہے پورا کر کے رہتا ہے، اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے اسی کے مطابق سب کام ہوتے ہیں۔ ترمذی و ابن ماجہ نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لو انکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا

اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا کہ اس کا حق ہے تو حق تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسا پرندے جانوروں کو دیتا ہے کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس آتے ہیں

اور صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں داخل ہونگے، ان کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہونگے (مظہری)

توکل کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے اسباب و آلات کو چھوڑ دے بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب اختیاریہ کو ضرور اختیار کرے مگر بھروسہ اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر کرے کہ جبتک اُس کی مشیت و

بجائے بطور ذکر کیا گیا۔ ان کو عدت پوری ہونے تک اپنی وسعت و قدرت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم خود رہتے ہو اسی مکان کے کسی حصہ میں رکھو۔ اگر طلاق رجعی ہے تب تو باہم پردہ کی بھی ضرورت نہیں، ہاں اگر طلاق بائن دی ہے یا تین طلاق دیدی ہیں تو اب رشتہ نکاح ٹوٹ چکا ہے اسکو سابق شوہر سے پردہ کرنا چاہیے اس لئے پردہ کیساتھ اسی مکان میں رہنے کا انتظام کیا جائے۔

دسواں حکم، مطلقہ عورتوں کو وَلَا تُضَآرُّوهُنَّ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایام عدت میں جبکہ مطلقہ عورت ایام عدت میں پریشان نہ کرو | تمہارے ساتھ رہتی ہے تو اس کو تشنیع کرکے یا اس کی ضروریات میں تنگی کرکے اس کو پریشان نہ کرو کہ وہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔

وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، یعنی اگر مطلقہ عورتیں حاملہ ہوں تو ان پر اسوقت تک خرچ کرتے رہو جب تک کہ ان کا حمل پیدا نہ ہو جائے۔

گیارھواں حکم، مطلقات کا نفقہ عدت، اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مطلقہ عورتیں اگر حاملہ ہوں تو ان کا نفقہ اسوقت تک شوہر پر لازم ہے جب تک کہ حمل پیدا ہو۔ ... اسی لئے مطلقہ حاملہ کے متعلق پوری امت کا اجماع ہے کہ اسکا نفقہ اس کی عدت جو وضع حمل ہے پوری ہونے تک شوہر پر واجب ہے، باقی جو مطلقہ حاملہ نہیں اگر اس کو طلاق رجعی دی گئی ہے تو اسکا نفقہ عدت بھی شوہر پر باجماع امت واجب ہے، باقی وہ مطلقہ جس کو طلاق بائن یا تین طلاق دی گئی ہیں یا جسنے خلع وغیرہ کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرایا ہو اسکے متعلق امام شافعیؒ و احمدؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول یہ ہے کہ ان کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک انکا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہے ان کے نزدیک جس طرح حق سکنیٰ تمام مطلقات کے لئے واجب ہے اسی طرح نفقہ بھی ہر قسم کی مطلقات کے لئے واجب ہے اور دلیل یہی آیت ہے جس میں عام مطلقات کے لئے حق سکنیٰ دینے کو لازم کیا گیا ہے یعنی أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ کیونکہ اسی آیت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرات یہ ہے أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُجْدِكُمْ اور ایک قرات دوسری قرات کے لئے مفسر ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ کی مشہور قرات جس میں وانفقوا مذکور نہیں اسمیں بھی یہ لفظ محذوف ہے اور اس نے جس طرح تمام مطلقات کا حق سکنیٰ شوہروں پر لازم کیا ہے اسی طرح حق نفقہ بھی ایام عدت تک واجب کر دیا ہے اور اس کی تائید حضرت فاروق اعظمؓ اور دوسرے متعدد صحابہ کرامؓ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ انھوں نے فاطمہ بنت قیسؓ کی جن کو ان کے شوہر نے تین طلاق دیدی تھی ان کی اس روایت کو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا نفقہ ان کے شوہر پر لازم نہیں کیا یہ کہہ کر رد فرمایا کہ ہم ایک عورت کی روایت کی بنا پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے جس میں تمام مطلقات کا نفقہ عدت شوہروں پر واجب کیا گیا ہے (رواہ مسلم)

اسی طرح اگر شوہر کو دودھ پلائی کی اجرت دینے کی بوجہ افلاس کے قدرت نہیں اور کوئی دوسری عورت بلا معاوضہ یا اس معاوضہ سے کم پر دودھ پلانے کو تیار ہو جو مطلقہ ماں مانگتی ہے تو شوہر کو مجبور نہیں کیا جائیگا کہ وہ ماں کو مطالبہ کے مطابق اجرت دے اور اسی سے دودھ پلوائے بلکہ دونوں صورتوں میں دوسری عورت سے اس کو دودھ پلوایا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر دودھ پلانے والی عورت بھی اتنا ہی معاوضہ طلب کرے جتنا ماں کر رہی ہے تو شوہر کے لئے باتفاق فقہاء جائز نہیں کہ ماں کو چھوڑ کر دوسری عورت سے اسی معاوضہ پر دودھ پلوائے۔

مسئلہ۔ اگر دوسری عورت سے دودھ پلوانا طے ہوجائے تو یہ ضروری ہے کہ دودھ پلانے والی عورت اس کی ماں کے پاس رہ کر دودھ پلائے، ماں سے الگ کرکے دودھ پلوانا جائز نہیں کیونکہ حضانت یعنی تربیت اور اپنی نگرانی میں رکھنا از روئے احادیث صحیحہ ماں کا حق ہے اس سے یہ حق سلب کرنا جائز نہیں (تفسیر مظہری)۔

پندرھواں حکم۔ بیوی کے نفقہ کی مقدار میں شوہر کی حالت کا اعتبار ہوگا لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ یعنی خرچ کرے وسعت والا آدمی اپنی وسعت کے مطابق اور جس شخص پر رزق تنگ ہو وہ اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کے نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائیگا بلکہ شوہر کی حالت کے مطابق نفقہ دینا واجب ہوگا۔ اگر شوہر مالدار ہے تو امیرانہ نفقہ دینا واجب ہے اگرچہ بیوی مالدار نہ ہو بلکہ تنگدست فقیر ہو، اور اگر شوہر غریب ہے تو غریبانہ نفقہ اسکے مقدور کے مطابق واجب ہوگا اگرچہ بیوی مالدار ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہ رح کا یہی مذہب ہے۔ بعض دوسرے فقہاء کے اقوال اسکے خلاف بھی ہیں (تفسیر مظہری)۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا۔ یہ اسی بالا جملہ کی مزید تشریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اسکی وسعت و قدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا اسلئے نادار مفلس شوہر پر اسی حیثیت کا نفقہ واجب ہوگا جو حیثیت اس کی اسوقت ہے۔ آگے بیوی کو غریبانہ نفقہ پر قناعت اور اس پر صبر کی تلقین کے لئے فرمایا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا۔ یعنی کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ موجودہ حالت میں تنگی ہے تو یہ تنگی ہمیشہ رہے گی بلکہ تنگی اور فراخی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ تنگی کے بعد فراخی بھی دے سکتا ہے۔

فائدہ۔ اس آیت میں ایسے شوہروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراخی ملنے کی طرف اشارہ ہے جو مقدور بھر نفقات واجبہ پورا کرنے کی کوشش میں رہیں بیوی کو تنگ رکھنے کی عادت نہ ہو (روح المعانی) واللہ اعلم

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا

اور کتنی بستیاں کہ نکل چلیں حکم سے اپنے رب کے اور اسکے رسولوں کے پھر ہم نے حساب میں پکڑا ان کو سخت حساب میں

وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ

اور آفت ڈالی ان پر بن دیکھی آفت پھر چکھی انہوں نے سزا اپنے کام کی اور آخر کو ان کے کام

سُورَةُ التَّحْرِيْمِ

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ تحریم مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی بارہ آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ

[illegible]

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ

[illegible]

مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ② وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ

[illegible]

حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ

[illegible]

عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ

[illegible]

الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ③ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ

[illegible]

اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

[illegible]

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ④ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ

اور فرشتے اس کے پیچھے مددگار ہیں　اگر نبی چھوڑ دے تم سب کو ابھی اس کا رب بدلے میں دیدے

(یہ بیبیوں کو شاید اس لئے سنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے راز پر مطلع ہونا سُن کر آپ کے زیادہ معاتب سے اپنی تقصیر پر زیادہ شرمندہ ہوں اور توبہ کریں چنانچہ آگے خود بیبیوں کو توبہ وغیرہ کا خطاب ہے،) اے (پیغمبر کی) دونوں بیبیو اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے کیونکہ مقتضی توبہ کا موجود ہے وہ یہ کہ) تمہارے دل (اس طرف) مائل ہو رہے ہیں (کہ دوسری بیبیوں سے ہٹا کر آپ کو اپنا ہی بنا لیں اور گو یہ امر فی نفسہ اس وجہ سے کہ مقتضی اس کا حب رسول ہے قبیح نہیں ہے لیکن چونکہ اس میں دوسروں کے حقوق کا اتلاف اور دل شکنی لازم آتی ہے اور مستلزم قبیح قبیح ہوتا ہے اس اعتبار سے قبیح و موجب توبہ ہوا) اور اگر (اسی طرح) پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو (یاد رکھو) پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرئیل ہیں اور نیک مسلمان ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے (آپ کے) مددگار ہیں، (مطلب یہ کہ تمہاری ان سازشوں سے آپ کا کوئی ضرر نہیں ہے بلکہ تمہارا ہی ضرر ہے کیونکہ جس شخص کے حامی ایسے ہوں اس کے خلاف کارروائیاں کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ برا ہی ہوتا ہے اور چونکہ بعض اسباب نزول میں حضرت عائشہ وحفصہ کے علاوہ اور بیبیاں بھی شریک تھیں جیسے حضرت سودہ وصفیہ اس لئے آگے بصیغہ جمع سب کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم یہ وسوسہ دل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیبیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لئے چار ناچار ہماری سب باتیں سہی جاویں گی سو یہ سمجھ لو کہ) اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدیگا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں (بعض مصالح سے بیوہ بھی مرغوب ہوتی ہے جیسے تجربہ سلیقہ ہم عمری وغیرہ اس لئے اس کو بھی اوصاف رغبت میں شمار فرمایا)

معارف و مسائل

آیات تحریم کا واقعہ نزول: صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ وغیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے سب بیبیوں کے پاس (خبرگیری کے لئے) تشریف لاتے تھے۔ ایک روز حضرت زینب کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا اور میں نے حفصہ سے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لاویں وہ یوں کہے کہ آپ نے مغافیر نوش فرمایا ہے، مغافیر ایک خاص قسم کا گوند ہے جس میں کچھ بدبو ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا آپ نے فرمایا کہ میں نے تو شہد پیا ہے۔ ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی ہو اور اس کا رس چوسا ہو (اسی وجہ سے شہد میں بھی بدبو آنے لگی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدبو کی چیزوں سے بہت پرہیز فرماتے تھے اس لئے آپ نے قسم کھالی کہ پھر میں شہد نہ پیوں گا اور اس خیال سے کہ حضرت زینب کا جی

پُرانہ ہو اس کے اخفاء کی تاکید فرما دی مگر ان بی بی نے دوسری سے کہدیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہ شہد پلانے والی ہیں اور حضرت عائشہ و سودہ و صفیہ صاحبات مشورہ کرنے والی اور بعض روایات میں یہ قصہ دوسری طرح بھی آیا ہے ممکن ہے کئی واقعے ہوں اور ان سب کے **بعد یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں (از بیان القرآن)**

خلاصہ ان آیات کا یہ ہے کہ اس واقعہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حلال چیز یعنی شہد کو بذریعہ قسم اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یہ فعل جبکہ کسی ضرورت و مصلحت سے ہو تو جائز ہے گناہ نہیں۔ مگر اس واقعہ میں ضرورت ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے آپ خود اپنی تکلیف اٹھاویں اور ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام ازواج مطہرات کو راضی کرنے کیلئے کیا تھا، اور ایسے معاملے میں ان کا راضی کرنا آپ کے ذمہ لازم نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے از راہ شفقت و عنایت فرمایا

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اس آیت میں بھی قرآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر خطاب نہیں کیا بلکہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ کے لقب سے خطاب فرمایا جو آپ کا خصوصی اعزاز و اکرام ہے اور پھر فرمایا کہ اپنی ازواج کی رضا جوئی کے لئے آپ اپنے اوپر ایک حلال چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں یہ کلام اگرچہ ازراہ شفقت ہوا مگر صورت جواب طلبی کی تھی جس سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید آپ سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی اسلئے ساتھ ہی فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی اگر گناہ ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ مغفرت اور **معاف کرنے والے ہیں۔**

مسئلہ: کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کی تین صورتیں ہیں جن کی تفصیل ذکر سورۂ مائدہ کی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ کے تحت معارف القرآن جلد سوم [illegible] پر آچکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حلال قطعی کو عقیدۃً حرام قرار دے تو یہ کفر اور گناہ عظیم ہے اور اگر عقیدۃً تو حرام نہ سمجھے مگر بلا کسی ضرورت و حاجت کے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرلے تو یہ گناہ ہے اس قسم کو توڑنا اور کفارہ ادا کرنا اس پر واجب ہے جیسا ذکر آگے آتا ہے۔ اور کوئی ضرورت و مصلحت ہو تو جائز مگر خلاف اولیٰ ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ نہ عقیدۃً حرام سمجھے نہ قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرے مگر عملاً اس کو ہمیشہ ترک کرنے کا دل میں عزم کرلے یہ عزم اگر اس نیت سے کرے کہ اس کا دائمی ترک باعث ثواب ہے تب تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے جو شرعاً گناہ اور مذموم ہے اور اگر ترک دائمی کو ثواب سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے کسی جسمانی یا روحانی مرض کے علاج کے طور پر کرتا ہے تو بلا کراہت جائز ہے بعض صوفیائے کرام سے جو ترک لذائذ کے واقعات **منقول ہیں وہ اسی صورت پر محمول ہیں۔**

واقعہ مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھالی تھی نزول آیت کے بعد اس قسم کو توڑا،

اور کفارہ ادا فرمایا جیسا کہ درمنثور کی روایت میں ہے کہ آپ نے ایک غلام کفارۂ قسم میں آزاد کیا (از بیان القرآن)

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی صورتوں میں جہاں قسم کا توڑنا ضروری یا مستحسن ہو تمہاری قسموں سے حلال ہونے یعنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دینے کا راستہ نکال دیا ہے جس کا ذکر دوسری آیات میں مفصل ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا، یعنی جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بی بی سے ایک راز کی بات کہی۔ وہ راز کی بات صحیح اور اکثر روایات کی رو سے یہی تھی کہ آپ نے حضرت زینبؓ کے پاس جو شہد پیا اور دوسری ازواج کو بھاری معلوم ہوا آپ نے ان کو راضی کرنے کے لئے شہد پینے کی قسم کھالی مگر یہ فرمایا کہ کسی کو خبر نہ ہو تاکہ زینبؓ کو رنج نہ پہنچے مگر اس بی بی نے یہ راز دوسری پر ظاہر کر دیا جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ اس راز کی بات کے متعلق دوسری روایات میں اور بھی چند چیزیں منقول ہیں مگر اکثر اور صحیح روایات میں یہی ہے جو لکھا گیا۔

فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ، یعنی جب اس بی بی نے وہ راز کی بات دوسری بی بی کو بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر کر دی کہ اس نے آپ کا راز فاش کر دیا تو آپ نے اس بی بی سے افشاء راز کا شکوہ تو کیا مگر پوری بات نہیں کھولی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم اور حسن خلق تھا کہ پوری بات کھولنے سے ان کو زیادہ خجالت اور شرمندگی ہوتی۔ جس بی بی سے راز کی بات کہی گئی تھی وہ کون تھیں اور جس پر راز ظاہر کیا وہ کون، قرآن کریم نے اس کو بیان نہیں کیا، اکثر روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ راز کی بات حضرت حفصہؓ سے کہی گئی تھی انہوں نے حضرت عائشہؓ سے ذکر کر دیا، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے اس کا بیان آئے گا۔

بعض روایات حدیث میں ہے کہ حضرت حفصہؓ کے راز فاش کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا مگر اللہ نے جبرئیل امین کو بھیج کر ان کی طلاق سے روک دیا اور فرمایا کہ وہ بہت نماز گزار کثرت روزے رکھنے والی ہیں اور ان کا نام جنت میں آپ کی بیبیوں میں لکھا ہوا ہے (از مظہری)۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا، ازواج مطہرات میں سے جن دو کا اجمالی ذکر اوپر آیا ہے انہوں نے باہم مشورہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہد پینے پر ایسا طرز اختیار کیا جس سے آپ نے شہد پینے سے قسم کھالی اور پھر آپ نے اس کے اخفاء کے لئے فرمایا تھا وہ اخفاء نہیں کیا بلکہ ایک نے دوسری پر بات کھول دی۔ یہ دو کون ہیں ان کے متعلق صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک طویل روایت ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ عرصہ تک میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں ان دو عورتوں کے متعلق عمر بن خطابؓ سے دریافت کروں جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ، یہاں تک ایک موقع آیا کہ عمر بن خطابؓ حج کے لئے نکلے اور میں بھی شریک سفر ہو گیا۔ دوران سفر میں ایک روز عمر بن خطاب نے قضاء حاجت

تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ع ۱۹

بہانے مت بناؤ آج کے دن وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (جب رسول کی بیبیوں کو بھی عمل صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کرکے عمل صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب امت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ ہوگیا کہ اپنے اہل و عیال کی اصلاح اعمال و اخلاق میں غفلت نہ کریں اسلئے حکم دیا گیا کہ) تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (سوختہ) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود اطاعت احکام کرنا اور گھر والوں کو بچانا ان کو احکام الٰہیہ کا سکھانا اور ان پر عمل کرانے کے لئے زبان سے ہاتھ سے بقدر امکان کوشش کرنا ہے۔ آگے اس آگ کی دوسری حالت کا بیان ہے کہ) جس پر تند خو (اور) مضبوط (قوی) فرشتے (متعین) ہیں (کہ نہ وہ کسی پر رحم کریں نہ کوئی ان کا مقابلہ کرکے بچ سکے) جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجا لاتے ہیں (غرض اس دوزخ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو کافروں کو دوزخ میں داخل کرکے چھوڑیں گے اور اس وقت کافروں سے کہا جائیگا کہ) اے کافرو تم آج عذر (و معذرت) مت کرو (کہ بے سود ہے) بس تم کو تو اسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے

معارف و مسائل

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ الآیۃ، اس آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور اپنے اہل و عیال کو بھی بچائیں، جہنم کی ہولناک شدت کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ بھی فرمایا کہ جو اس جہنم کا مستحق ہوگا وہ کسی زور طاقت جتھہ یا خوشامد یا رشوت کے ذریعہ ان فرشتوں کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا جو جہنم پر مسلط ہیں جن کا نام زبانیہ ہے۔

لفظ اَهْلِيْكُمْ میں اہل و عیال سب داخل ہیں جن میں بیوی، اولاد، غلام، باندیاں سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر چاکر بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکام الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل و عیال کو ہم کس طرح جہنم سے بچائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا

تھیں گھر میں دو نیک بندوں کے ہمارے بندوں میں سے پھر انھوں نے ان سے چوری کی پھر وہ کام نہ آئے

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ﴿١٠﴾ وَضَرَبَ اللَّهُ

ان کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ اور اللہ نے بتلائی

مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ

ایک مثال ایمان والوں کے لئے عورت فرعون کی جب بولی اے رب بنا میرے واسطے اپنے پاس

بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ

ایک گھر بہشت میں اور بچا نکال مجھ کو فرعون سے اور اس کے کام سے اور بچا نکال مجھ کو ان

الظَّالِمِينَ ﴿١١﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا

لوگوں سے اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو پھر پھونک دی

فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ﴿١٢﴾

ہم نے اس میں ایک اپنی طرف سے جان اور سچا جانا اپنے رب کی باتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور وہ تھی بندگی کرنے والوں میں

وقف لازم

ع ۲۰

خلاصۂ تفسیر

(ان آیات میں دوزخ سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی اہل و عیال کو بتلا کر ان کو آگ سے بچانے کا طریقہ ہے وہ یہ ہے) اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو (یعنی دل میں ان پر کامل ندامت ہو اور آئندہ ان کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو اس میں تمام احکام دین فرائض واجبات بھی داخل ہو گئے کہ ان کا چھوڑنا گناہ ہے اور تمام محرمات و مکروہات بھی آ گئے کہ ان کا کرنا گناہ ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمہارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمہارے گناہ معاف کر دیگا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی (اور یہ اس روز ہوگا) جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور جو مسلمان (ایمان اور دین کی رو سے) اُن کے ساتھ ہیں اُن کو رسوا نہ کریگا ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا (جیسا کہ سورۂ حدید میں گذر چکا ہے اور وہ) یوں دعا کرتے ہونگے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھئے (یعنی راستہ میں گل نہ ہو جاوے) اور ہماری مغفرت فرما دیجئے آپ ہر شے پر قادر ہیں (اور اس دعا کی وجہ یہ ہوگی کہ قیامت میں ہر مؤمن کو کچھ نہ کچھ نور عطا ہوگا جس وقت پل صراط کے پاس پہنچیں گے منافقین کا نور بجھ جاوے گا جس کا ذکر سورۂ حدید میں آ چکا ہے اس وقت مؤمنین یہ دعا کریں گے کہ منافقین کی طرح کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے (کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار (سے بذریعہ تلوار) اور منافقین سے (بذریعہ زبان و بیان حجت) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس سزا کے مستحق ہوئے)

سُوْرَةُ الْمُلْك

سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ ملک مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

[illegible]

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ

[illegible]

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ

[illegible]

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ

[illegible]

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ

[illegible]

اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ

[illegible]

وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝ وَ

[illegible]

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ اِذَاۤ اُلْقُوْا

[illegible]

فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ

جائیں گے سنیں گے اس کا دھاڑنا اور وہ اچھل رہی ہوگی ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے جس وقت پڑے اس میں

فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ﴿٨﴾ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ

فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ﴿٩﴾

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوا

بِذَنْبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿١١﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ

لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١٣﴾ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾ هُوَ

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ

رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿١٥﴾ أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ

الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ

حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي

هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ﴿٢٠﴾

فوج ہے تمہاری مدد کرے تمہاری رحمٰن کے سوائے منکر پڑے ہیں بڑے دھوکے میں

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿۲۱﴾

أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۲۲﴾

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۴﴾

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۲۵﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تَدَّعُونَ ﴿۲۷﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ وَمَن مَّعِيَ أَوْ رَحِمَنَا فَمَن يُجِيرُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۸﴾

قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَن يَأْتِيكُم بِمَاءٍ مَّعِينٍ ﴿۳۰﴾

خلاصۂ تفسیر

وہ خدا بڑا عالیشان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے (حسن عمل میں موت کا تو دخل یہ ہے کہ موت کی نذر سے انسان دُنیا کو فانی اور قیامت کے اعتقاد سے آخرت کو باقی سمجھ کر وہاں کے ثواب حاصل کرنے اور وہاں کے عذاب سے بچنے کے لئے مستعد ہوتا ہے اور حیات کا دخل یہ ہے کہ اگر حیات نہ ہو تو عمل کس وقت کرے، پس حسن عمل کے لئے موت بمنزلہ شرط کے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے

دفع پر قادر ہیں وہو المراد بقولہ تعالیٰ یَنْصُرُکُمْ اور نہ ایصال منافع پر قادر ہیں وہو المراد بقولہ تعالیٰ یَرْزُقُکُمْ، پھر ان کی عبادت محض بے وقوفی ہے، یعنی جس کافر کا حال اوپر سنا ہے اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (اس کو سنا کر سوچو کہ) کیا جو شخص (بوجہ ناہموار راہ کے ٹھوکریں کھاتا ہوا اور منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ شخص (زیادہ منزل مقصود پر پہنچنے والا ہوگا) جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جارہا ہو (یہی حال ہے مومن وکافر کا کہ مومن کے چلنے کا رستہ بھی دین مستقیم اور وہ چلتا بھی ہے سیدھا ہو کر افراط و تفریط سے بچ کر اور کافر کے چلنے کا رستہ بھی زیغ وضلالت کا ہے اور چلنے میں بھی ہر وقت اوہام وخرافات میں گرتا جاتا ہے پس ایسی حالت میں کیا منزل پر پہنچے گا اور اوپر الم کی آیت متعلق آفاق کے تھے آگے تعلق انفس کے ارشاد ہے کہ) آپ (ان سے) کہئے کہ وہی (ایسا قادر منعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (اور آپ (یہ بھی) کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو روئے زمین پر پھیلایا اور تم اسی کے پاس (قیامت کے روز) اکٹھے کئے جاؤ گے اور یہ لوگ (جب قیامت کا ذکر سنتے ہیں کما فی ہذہ السورۃ من قولہ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ومن قولہ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ تو) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین مومنین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ یہ (تعیین کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو محض (علی الاجمال خبر) صاف صاف ڈرانے والا ہوں پھر جب اس (عذاب قیامت) کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے (پاس آتا ہوا دیکھنا یہ کہ اعمال کا حساب ہو کر دوزخ میں جانے کا حکم ہوگا جس سے تیقن ہو جائے گا کہ اب عذاب سر پر آیا غرض جب اس کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے) تو (مارے غم کے) کافروں کے منہ بگڑ جاویں گے (کقولہ تعالیٰ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ) اور (ان سے) کہا جاوے گا یہی ہے وہ جس کو تم مانگا کرتے تھے (کہ عذاب لاؤ، عذاب لاؤ۔ اور یہ کفار ان مضامین حقہ توحید و بعث وغیرہ کو سن کر ایسی باتیں کرتے ہیں شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ۔ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا۔ جس کا حاصل انتظار آپ کی ہلاکت کا اور آپ کو نعوذ باللہ منسوب الی الاضلال کرنا ہے آگے اس کے جواب کی تعلیم ہے جس میں عذاب کفار کی تقریر اور دوسرے مضامین سے اس کی تتمیم ہے ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ (ان سے) کہئے کہ تم یہ بتلاؤ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے ساتھ والوں کو (موافق تمہاری تمنا کے) ہلاک کر دے یا (ہماری امید اور اپنے وعدہ کے مطابق) ہم پر رحمت فرما دے تو دونوں حالت میں اپنی خیر لو اور یہ بتلاؤ کہ کافروں کو عذاب دردناک سے کون بچائے گا (یعنی ہماری تو جو حالت ہوگی دنیا میں ہوگی اور انجام اس کا ہر حال میں اچھا ہے کقولہ تعالیٰ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ الخ مگر اپنی کہو کہ تم پر جو مصیبت عظیمہ آنے والی ہے اس کو کون روکے گا اور ہمارے دنیوی حوادث سے تمہاری وہ مصیبت کیسے ٹل جاوے گی تو اپنی فکر چھوڑ کر ہمارے حوادث کا انتظار ایک فضول حرکت ہے یہ جواب ہے متربص انہ کا اور

آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے ہم اس پر (اس کے حکم کے موافق) ایمان لائے اور ہم اسی پر توکل کرتے ہیں، پس ایمان کی برکت سے تو وہ ہم کو عذاب آخرت سے محفوظ رکھے گا اور توکل کی برکت سے حوادث دنیویہ کو دفع یا سہل کر دیگا یہ بھی معترض کا تتمہ جواب ہے، سو (جب تم پر عذاب الیم آنیوالا ہے اور ہم انشاء اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے اس عذاب سے محفوظ رہنے والے ہیں تو) عنقریب تم کو معلوم ہو جاوے گا (جب اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا اور ہم کو اس سے محفوظ دیکھو گے) کہ صریح گمراہی میں کون ہے (یعنی تم ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں یا ہم جیسا تم کہتے ہو یہ جواب ہے ان کا دلیصلنا ۓ کا، آگے تقریر ہے مضمون بالا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ الخ کی یعنی اوپر جو کہا گیا ہے کہ تم کو عذاب الیم سے کوئی نہیں بچا سکتا، ان کو اگر اپنے آلہہ باطلہ کا گمان ہو کہ وہ بچا لیں گے تو اس زعم کے ابطال و ازالہ کے لئے ان سے) آپ (یہ) کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی (جو کنووں میں بڑا پینے کو آتا ہے) غائب ہی ہو جاوے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آوے (یعنی کنویں کی سوت کو بند کر دے اور اعماق ارض سے اوپر نہ آئے اور اگر کسی کو کھود لینے پر ناز ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس کو اور نیچے غائب کر دے وعلیٰ ہذا، پس جب خدا کے مقابلے میں کسی کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ معمولی طبعی واقعات میں تصرف کر سکے تو عذاب آخرت سے بچانے کی کیا قدرت ہوگی)

معارف و مسائل

فضائل سورۂ ملک اس سورت کو حدیث میں واقیہ اور منجیہ بھی فرمایا ہے۔ واقیہ کے معنے بچانے والی اور منجیہ کے معنے نجات دینے والی، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھی المانعة المنجیة تنجیه من عذاب القبر، یعنی یہ سورت عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دینے والی ہے، یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچالے گی (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب از قرطبی)

اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ سورۂ ملک ہر مومن کے دل میں ہو (ذکرہ الثعلبی) اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں ایک ایسی سورت ہے جس کی آیتیں تو صرف تیس ہیں قیامت کے روز یہ ایک شخص کی سفارش کرے گی یہاں تک کہ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گی اور وہ سورۂ تبارک ہے **(قرطبی - از ترمذی)**

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، لفظ تبارک برکت سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا جاتا ہے تو سب سے بالاو برتر ہونے کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ اکبر، بیدہ الملک۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے ملک اللہ جل شانہ کے لئے قرآن کریم میں جا بجا لفظ ید بمعنے ہاتھ استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے بالاو برتر ہے۔

اسلئے یہ لفظ متشابہات میں سے ہے جس کے حق ہونے پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی کیفیت و حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی اُس کے درپے ہونا درست نہیں۔ وہُ المُلک سے مراد آسمانوں اور زمینوں کی اور دنیا و آخرت کی حکومت ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ کے لئے چار صفات کا دعویٰ ہے۔ اول اسکا موجود ہونا، دوسرے انتہائی درجے کی صفات کمال کا مالک و رب ہونا اور بابرکت ہونا، تیسرے آسمان و زمین پر اس کی حکومت ہونا، چوتھے ہر چیز پر اس کا قادر ہونا۔ اگلی آیات میں اس دعوے کے دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتے ہیں اسلئے اگلی آیات میں تمام کائنات و مخلوقات کی مختلف انواع و اصناف سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور اس کے کمال علم و قدرت پر استدلال کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان کے اپنے وجود میں جو دلائل قدرت ہیں اُن کی طرف متوجہ فرمایا۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ میں اسکا بیان ہے، اس کے بعد کی آیتوں میں آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر سے استدلال فرمایا الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ الآیۃ، اس کے بعد زمین کی تخلیق اور اُس کے فوائد متعلقہ میں غور و فکر کا بیان ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا سے دو آیتوں میں فرمایا، پھر فضائے آسمانی میں رہنے والی مخلوق پرندوں کا ذکر فرمایا اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ۔ غرض اس پوری سورت میں اصل مضمون حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمال علم و قدرت پر کائنات عالم کے مشاہدہ سے دلائل پیش کرنا ہے۔ ضمناً دوسرے مضامین کفار کی سزا اور مؤمنین کی جزاء کے بھی آگئے ہیں۔ خود انسان کے نفس میں جو دلائل اللہ تعالیٰ کے کمال علم و قدرت کے ہیں، **اُن کی طرف دو لفظوں سے ہدایت فرمائی۔**

موت و حیات کی حقیقت، خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ، یعنی پیدا کیا اس نے موت اور حیات کو۔ احوال انسانی میں سے یہاں صرف دو چیزیں یعنی موت و حیات بیان کی گئیں کیونکہ یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے احوال و افعال پر حاوی ہیں۔ حیات کے ساتھ پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے کہ حیات ایک وجودی چیز ہے تخلیق و تکوین کا اُس سے تعلق ہونا ظاہر ہے لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا، اس کے جواب میں ائمہ تفسیر سے متعدد اقوال منقول ہیں۔ سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر سے جو یہ منقول ہے کہ موت و حیات دو مجسم مخلوق ہیں، موت ایک مینڈھے کی شکل میں اور حیات ایک گھوڑی کی شکل میں ہے۔ اس سے مراد بظاہر اس صحیح حدیث کا بیان ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ جب قیامت میں اہل جنت جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور پل صراط کے پاس اُس کو ذبح کر کے اعلان کر دیا جائے گا کہ اب جو جس

حالت میں ہے وہ دائمی اور ابدی ہے اب کسی کو موت نہیں آئے گی، مگر اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ دُنیا میں موت کوئی جسم ہو بلکہ جس طرح دُنیا کے بہت سے اقوال و اعمال قیامت میں مجسّم اور متشکل ہوجائیں گے جو بہت سی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اسی طرح موت جو انسان کو پیش آنے والی ایک حالت ہے وہ بھی قیامت میں مجسّم ہوکر مینڈھے کی شکل میں ذبح کردی جائے گی (قرطبی)

اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ موت اگرچہ عدمی چیز ہے مگر عدم محض نہیں، بلکہ ایسی چیز کا عدم ہے جس کو وجود میں کسی وقت آنا ہے اور ایسے تمام معدومات کی شکلیں عالم مثال میں قبل از وجود ناسوتی موجود ہوتی ہیں جن کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے ان اشکال کی وجہ سے ان کو قبل الوجود بھی ایک قسم کا وجود حاصل ہے اور عالم مثال کے موجود ہونے پر بہت سی روایات حدیث سے استدلال فرمایا ہے واللہ اعلم

موت و حیات کے درجات مختلفہ | تفسیر مظہری میں ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے مخلوقات و ممکنات کو مختلف اقسام میں تقسیم فرماکر ہر ایک کو حیات کی ایک قسم عطا فرمائی ہے سب سے زیادہ کامل و مکمل حیات انسان کو عطا فرمائی جس میں یہ صلاحیت بھی رکھدی کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت ایک خاص حد تک حاصل کرسکے اور یہ معرفت ہی بنائے تکلیف احکام شرعیہ اور وہ بار امانت ہے جس کے اُٹھانے سے آسمان و زمین اور پہاڑ سب ڈر گئے اور انسان نے اپنی اس خداداد صلاحیت کے سبب اُٹھالیا اس حیات کے مقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کریم کی آیت اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ میں ذکر فرمایا ہے جس میں کافر کو مُردہ اور مؤمن کو زندہ قرار دیا گیا کیونکہ کافر نے اپنی اس معرفت کو ضائع کردیا جو انسان کی مخصوص حیات تھی، اور بعض اصناف و اقسام مخلوقات میں یہ درجہ حیات کا تو نہیں مگر حس و حرکت موجود ہے اسکے مقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کریم کی آیت كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ میں آیا ہے کہ اس جگہ حیات سے مراد حس و حرکت اور موت سے مراد اسکا ختم ہوجانا ہے۔ اور بعض اقسام ممکنات میں یہ حس و حرکت بھی نہیں صرف نمو (بڑھنے کی صلاحیت) ہے جیسے عام درختوں اور نباتات میں اس کے بالمقابل وہ موت ہے جسکا ذکر قرآن کی آیت يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا میں آیا ہے۔ حیات کی یہ تین قسمیں انسان، حیوان، نبات میں منحصر ہیں ان کے علاوہ اور کسی چیز میں یہ اقسام حیات نہیں ہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کے متعلق فرمایا اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ لیکن اس کے باوجود جمادات میں بھی ایک خاص حیات موجود ہے جو وجود کیساتھ لازم ہے۔ اسی حیات کا اثر ہے جسکا ذکر قرآن کریم میں ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ اور آیت میں موت کا ذکر مقدم کرنے کی وجہ بھی اس بیان سے واضح ہوگئی کہ اصل کے اعتبار سے موت ہی مقدم ہے ہر چیز جو وجود میں آئی ہے پہلے موت کے عالم میں تھی بعد میں اس کو حیات عطا ہوئی ہے اسلئے موت کا ذکر مقدم کیا گیا۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آگے جو موت و حیات کی تخلیق کی وجہ انسان کی آزمائش و

ابتلا کو قرار دیا ہے لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ یہ آزمائش بہ نسبت حیات کے موت میں زیادہ ہے کیونکہ جس شخص کو اپنی موت کا استحضار رہوگا وہ اچھے اعمال کی پابندی زیادہ سے زیادہ کریگا، اور اگرچہ یہ آزمائش حیات میں بھی ہے کہ زندگی کے قدم قدم پر اس کو اپنا عجز اور اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونیکا استحضار ہوتا رہتا ہے جو حُسنِ عمل کا موقوف علیہ ہے لیکن موت کی فکر اصلاح عمل و حُسنِ عمل میں سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

حضرت عمار بن یاسر کی حدیث مرفوع میں ہے کفی بالموت واعظا وکفی بالیقین غنی، یعنی موت وعظ کے لئے کافی ہے اور یقین غنی کے لئے (رواہ الطبرانی) مراد یہ ہے کہ اپنے دوستوں عزیزوں کی موت کا مشاہدہ سب سے بڑا واعظ ہے جو اس سے متاثر نہیں ہوتا اسکا دوسری چیزوں سے متاثر ہونا مشکل ہے اور جس کو اللہ نے ایمان یقین کی دولت عطا فرمائی اس کے برابر کوئی غنی و بے نیاز نہیں۔ اور ربیع بن انس نے فرمایا کہ موت انسان کو دُنیا سے بیزار کرنے اور آخرت کی طرف رغبت دینے کے لئے کافی ہے۔

اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ انسان کی اس آزمائش میں جو اس کی موت و حیات سے وابستہ ہے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ کس کا عمل زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کی مقدار کا زیادہ ہونا قابل توجہ نہیں بلکہ عمل کا اچھا اور صحیح و مقبول ہونا معتبر ہے اسی لئے قیامت میں انسان کے اعمال کو گنا نہیں جائے گا بلکہ تولا جائیگا، جسمیں بعض ایک ہی عمل کا وزن ہزاروں اعمال سے بڑھ جائے گا۔

حُسنِ عمل کیا ہے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی یہاں تک کہ اَحْسَنُ عَمَلًا تک پہنچے تو فرمایا کہ (اَحْسَنُ عَمَلًا) وہ شخص ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے سب سے زیادہ پرہیز کرنے والا ہو اور اللہ کی اطاعت میں ہر وقت مستعد و تیار ہو (قرطبی)

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ، اس آیت سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا والے آسمان کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ نیلگوں فضا جو دکھائی دیتی ہے یہی آسمان ہو بلکہ ہو سکتا ہے آسمان اس سے بہت اوپر ہو اور یہ نیلگوں رنگ ہوا اور فضا کا ہو جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آسمان انسان کو نظر ہی نہ آسکے، ہو سکتا ہے کہ یہ نیلگوں فضا شفاف ہونیکے سبب اصل آسمان کو جو اس سے بہت اوپر ہے دیکھنے میں مانع نہ ہو۔ اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے آسمان کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا تو پھر اس آیت میں رویت سے مراد رویت عقلی یعنی غور و فکر ہوگا (بیان القرآن)

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ، مصابیح سے مراد ستارے اور نیچے کے آسمان کو ستاروں سے مزین کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ستارے آسمان کے اندر یا اس کے اوپر لگے ہوئے ہوں بلکہ یہ تزیین اس صورت میں بھی صادق ہے جبکہ ستارے آسمان سے بہت نیچے خلا میں ہوں جیسا کہ تحقیق جدید سے اسکا مشاہدہ ہو رہا ہے یہ اُس کے منافی نہیں۔ اور ستاروں کو شیاطین کے

دفع کرنے کے لئے انگارے بنا دینے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ ستاروں میں سے کوئی مادہ آتشیں انکی طرف چھوڑ دیا جاتا ہو ستارے اپنی جگہ رہتے ہوں، عوام کی نظر میں چونکہ یہ شعلہ ستارہ کی طرح حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اسلئے اس کو ستارہ ٹوٹنے اور عربی میں انقضاض الکوکب کہہ دیتے ہیں (قرطبی)

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیاطین جو آسمانی خبریں چرانے کے لئے چڑھتے ہیں وہ کواکب اور ستاروں سے پہلے ہی ختم کر دیئے جاتے ہیں (قرطبی) یہاں تک مختلف مخلوقات میں غور و فکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمال علم و قدرت کے دلائل بیان ہوئے آگے منکرین اور کفار کا عذاب اور پھر مومنین اور اطاعت شعار لوگوں کا ثواب بیان ہوا ہے وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ سے سات آیتوں تک یہ مضمون چلا ہے۔ آگے پھر وہی علم و قدرت کا بیان ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا، ذلول کے لفظی معنی منقاد و مطیع کے ہیں اس جانور کو ذلول کہا جاتا ہے جو سواری دینے میں شوخی نہ کرے۔ مناکب، منکب کی جمع ہے مونڈھے کو کہتے ہیں کسی بھی جانور کا مونڈھا سواری کی جگہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی کمر یا گردن ہوتی ہے جو سوار ہونے والوں کے لئے اپنے مونڈھے بھی پیش کر دے وہ بہت ہی مطیع و منقاد اور مسخر ہو سکتا ہے اسلئے فرمایا کہ زمین کو تمہارے لئے ہم نے ایسا مسخر و مطیع بنا دیا ہے کہ تم اسکے مونڈھوں پر چڑھتے پھرو۔ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام بخشا ہے کہ نہ وہ پانی کی طرح سیال اور بہنے والا ہے نہ روئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا رہنا سہنا ممکن نہ ہوتا اسی طرح زمین کو لوہے پتھر کی طرح سخت بھی نہیں بنایا اگر ایسا ہوتا تو اس میں درخت اور کھیتی نہ اگ سکتی، کنویں اور نہریں نہ کھودی جا سکتیں جسکو کھود کر اونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جا سکتی، اس قوام کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اس پر عمارتیں ٹھہر سکیں چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔

وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ، پہلے زمین کے اطراف میں چلنے پھرنے کی ہدایت فرمائی اسکے بعد فرمایا کہ اللہ کا رزق کھاؤ اسمیں اشارہ ہو سکتا ہے کہ تجارت کیلئے سفر اور مال کی درآمد برآمد اللہ کے رزق کا دروازہ ہے۔ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ میں بتلا دیا کہ زمین پر رہنے سہنے کے فوائد زمین سے حاصل کرنے کی اجازت ہے مگر موت اور آخرت سے بے فکر ہو کر انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے زمین پر رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں لگے رہو۔ اس میں تو اس بات سے ڈرایا گیا تھا کہ آخر کار قیامت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے، آگے اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زمین پر رہتے بستے کے وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے ارشاد فرمایا،

ءَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ، کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ آسمان والا تمہیں زمین کے اندر دھنسا دے اور زمین تمہیں نگل جائے یعنی اگرچہ اللہ نے زمین کو ایسا معتدل قوام دیا ہے کہ آدمی بغیر کھودے ہوئے اسکے اندر نہیں اتر سکتا، لیکن وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کو ایسا بنا دے کہ یہی زمین اپنے اوپر رہنے والوں کو نگل جائے اسکے بعد دنیا میں بسنے والوں کو ایک اور طرح کے عذاب سے ڈرایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہارے اوپر یعنی آسمان سے پتھر بھی برسا کر تمہیں ہلاک کیا جا سکتا ہے

وَّنُفُوْرٍ، یعنی یہ لوگ برابر اپنی سرکشی اور حق سے دُوری میں بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ آگے میدانِ قیامت میں کافر و مؤمن کا جو حال ہوتا ہے اسکا ذکر ہے کہ قیامت کے میدان میں کفار اس طرح حاضر کئے جاویں گے کہ پاؤں پر چلنے کے بجائے سر کے بل چلیں گے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ کفار بہرست کے بل کیسے چلیں گے، رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس ذات نے اُن کو پیروں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ اُن کو چہروں اور سروں کے بل چلا دے۔ اسی کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ یعنی کیا وہ آدمی جو اوندھا اپنے چہرہ کے بل چلے زیادہ ہدایت پانے والا ہے یا وہ جو سیدھا چلنے والا ہے۔ سیدھا چلنے والے سے مراد مؤمن ہے کہ ہدایت یافتہ وہی ہو سکتا ہے۔ آگے پھر انسانی تخلیق میں حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے چند مظاہر کا بیان ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے مگر تم لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

سمع و ابصار اور قلب کی تخصیص اس میں اعضائے انسانی میں سے اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم و ادراک اور شعور موقوف ہے۔ فلاسفہ نے علم و ادراک کے پانچ ذریعہ بیان کئے ہیں جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے یعنی سُننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا، سونگھنے کے لئے ناک اور چکھنے کے لئے زبان اور چھونے کی قوت سارے بدن میں حق تعالیٰ نے رکھی ہے۔ سُننے کے لئے کان اور دیکھنے کے لئے آنکھ بنائی ہے یہاں حق تعالیٰ نے ان پانچوں چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ، وجہ یہ ہے کہ سونگھنے چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے اسکے معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوتی ہیں۔ اُن میں سُنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں اس لئے اس جگہ حواس خمسہ میں سے صرف دو پر اکتفا کیا گیا ہے کہ بیشتر معلومات انسانی انھیں دو راہوں سے حاصل ہوتی ہیں اور تیسری چیز قلب کو بتایا ہے کہ وہ اصل بنیاد اور مرکز علم کا ہے۔ کانوں سے سُنی ہوئی اور آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کا علم بھی قلب پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ قلب کو مرکز علم قرار دیا ہے بخلاف فلاسفہ کے کہ وہ دماغ کو اسکا مرکز مانتے ہیں۔

اس کے بعد پھر کفار و منکرین کو تنبیہ اور عذاب کی وعید کا بیان ہے آخر سورت میں پھر ایک جملہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اُس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اُگانے کا کام لینے والو اس بات کو نہ بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمھاری

ذاتی جاگیر نہیں صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہے کہ اس نے پانی برسایا اور اس پانی کو برف کی شکل میں بحر منجمد بناکر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لاد دیا کہ سڑنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہے پھر اس برف کو آہستہ آہستہ پگھلاکر پہاڑوں کی عروق کے ذریعہ زمین کے اندر اتار دیا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو پھر یہ پانی جو اس نے زمین کی اوپر ہی کی سطح پر رکھدیا ہے جس کو چند فٹ یا گز زمین کھود کر نکالا جا سکتا ہے یہ مالک و خالق کا عطیہ ہے اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کے نیچے کی تہ پر اتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ، یعنی آپ ان لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اس بات پر غور کریں کہ جو پانی کنوؤں کے ذریعہ بآسانی نکال کر پی رہے ہو اگر وہ پانی زمین کی گہرائی میں اتر جائے تو تمہاری کونسی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدمی یہ آیت تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہئے اَللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اللہ رب العالمین ہی پھر اس کو لا سکتا ہے ہماری کسی کی طاقت نہیں ٭

تمت سورة الملك بحمد الله في ثالث رجب سنة ١٣٩١ يوم الخميس

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورہ قلم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باون آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ

قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ اور تیرے واسطے

لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤

بدلہ ہے بے انتہا اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر سو اب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے

بِاَيِّىكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ

کہ کون ہے تم میں جو بچل رہا ہے تیرا رب ہی خوب جانے جو بہکا اس کی راہ سے اور وہی

اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ⑦ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑧ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ

جانے راہ پانے والوں کو سو تو کہا مت مان جھٹلانے والوں کا وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو

فَيُدْهِنُوْنَ ⑨ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ⑩ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ

تو یہ بھی ڈھیلے ہوں اور کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا طعنے دینے والا چغلی کھاتا

بِنَمِيْمٍ ⑪ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ⑬

پھرنے والا بھلے کام سے روکنے والا حد سے بڑھنے والا بڑا گنہگار اجڈ اس سب کے پیچھے بدنام

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ⑭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

اس واسطے کہ رکھتا ہے مال اور بیٹے جب سنائے اس کو ہماری باتیں کہے یہ نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ⑮ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ⑯ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ

پہلوں کی اب داغ دیں گے ہم اس کو سونڈ پر ہم نے اُن کو جانچا ہے جیسے جانچا تھا

أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ

نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا

سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى

رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا

يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ

الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ

فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ

عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ

اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ

كَانُوا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا

سچے ہیں جس دن کہ کھولی جاوے پنڈلی اور وہ بلائے جاویں سجدہ کرنے کو پھر

يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ

نہ کر سکیں جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلت اور پہلے ان کو بلاتے رہے

اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ

سجدہ کرنے کو اور وہ تھے صحیح سالم اب چھوڑ دے مجھ کو اور جو کوئی جھٹلائے اس بات کو

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾

اب ہم سیڑھی سیڑھی اتاریں گے ان کو جہاں سے ان کو خبر نہیں اور ان کو ڈھیل دیتا ہوں بیشک میرا داؤ پکا ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ

کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ نیگ سو ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے کیا ان کے پاس خبر ہے غیب کی سو وہ

يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى

لکھ لاتے ہیں اب تو صبر کر منتظر رہ اپنے رب کے حکم کا اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا جب پکارا اس نے

وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ

اور وہ غصہ میں بھرا تھا اگر نہ سنبھالتا اس کو احسان تیرے رب کا تو پھینکا گیا تھا چٹیل میدان میں الزام

مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ

کھا کر پھر نوازا اس کو اس کے رب نے پھر کر دیا اس کو نیکوں میں اور منکر تو لگ ہی رہے ہیں

كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ

کہ پھسلا دیں تجھ کو اپنی نگاہوں سے جب سنتے ہیں قرآن اور کہتے ہیں وہ تو

لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾

باؤلا ہے اور یہ قرآن تو یہی نصیحت ہے سارے جہان والوں کو

وقف لازم

ع ۲ رکوع

خلاصۂ تفسیر

ن (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) قسم ہے قلم کی (جس سے مقادیر خلق لوح محفوظ پر لکھے گئے) اور قسم ہے ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتب اعمال ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے قلم اور ما یسطرون کی یہی تفسیر فرمائی ہے (در منثور) آگے جواب قسم ہے) کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرین نبوت کہتے ہیں (کذا فی الدر عن ابن جریج فی سبب النزول) مطلب یہ کہ آپ نبی برحق ہیں اور یہ قسمیں اس مدعا کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ نجماً مقدریہ کے نزول قرآن بھی ہے پس اس آیت میں

قیامت تک باقی رہنے والی ہوں (جن کا یہ مضمون ہو) کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کرتے ہو (یعنی
ثواب و جنت) ان سے پوچھئے ان میں اس کا کون ذمہ دار ہے کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک
(خدائی) ہیں (کہ انھوں نے ان کو ثواب دینے کا ذمہ لیا ہے) سو ان کو چاہئے کہ یہ اپنے ان شریکوں
کو پیش کریں اگر یہ سچے ہیں (غرض جب یہ مضمون کسی آسمانی کتاب میں نہیں جیسے بلا کتاب دوسرے طرق
وحی سے ہمارا وعدہ نہیں جو مثل قسم کے ہوتا ہے پھر ایسی حالت میں کون شخص ان میں سے یا ان کے شرکاء
میں سے ذمہ داری کر سکتا ہے ہرگز نہیں، پھر دعویٰ کس بنا پر ہے۔ آگے ان لوگوں کی قیامت کی رسوائی
کا ذکر ہے وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن کہ ساق کی تجلی فرمائی جاوے گی اور سجدہ کی طرف لوگوں کو بلایا
جاوے گا (ساق کا قصہ حدیث شیخین میں مرفوعاً اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے میدان میں اپنی ساق
ظاہر فرماوے گا۔ ساق کہتے ہیں پنڈلی کو، اور یہ کوئی ایسی صفت ہے جس کو کسی مناسبت سے ساق فرمایا
جیسا قرآن میں ہاتھ آیا ہے اور ایسے امور متشابہات میں سے ہیں اور اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلی کو دیکھ کر تمام
مومنین و مومنات سجدے میں گر پڑیں گے مگر جو شخص ریاء سے سجدہ کرتا تھا اس کی کمر تختہ کی طرح رہ جاوے گی سجدہ نہ
کر سکے گا۔ اور سجدے کی طرف بلانے سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ دار تکلیف نہیں ہے کیونکہ بلائے جانے
سے مراد امر بالسجود نہیں ہے بلکہ اس تجلی میں یہ تاثیر ہوگی کہ سب بالاضطرار سجدہ کرنا چاہیں گے جن میں مؤمن اس
بات پر قادر ہو جاویں گے اور منافق و ریاکار قادر نہ ہوں گے اور کفار کا قادر نہ ہونا اس سے بدرجہ اولیٰ مفہوم ہوتا ہے
جن کا آگے ذکر ہے یعنی کفار بھی سجدہ کرنا چاہیں گے) سو یہ (کافر لوگ سجدہ نہ) کر سکیں گے (اور) ان کی آنکھیں
(مارے شرمندگی کے) جھکی ہوئی (ہوں گی اور) ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ (دنیا میں)
سجدہ کی طرف بلائے جایا کرتے تھے (اس طرح کہ ایمان لا کر عبادت کریں) اور وہ صحیح سالم تھے (یعنی سجدہ پر قادر بھی
تھے چنانچہ ظاہر ہے کہ ایمان و عبادت فعل اختیاری ہے پس دنیا میں امتثال امر نہ کرنے سے آج ان کو یہ رسوائی
و ذلت ہوئی اور دوسری آیت میں جو سجدہ کا اور انکار کا آیا ہے وہ اس کے معارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ غلبۂ حیرت
سے ایسا ہوا ہو اور کسی غلبۂ ندامت سے ایسا ہو گا۔ آگے کفار کے اس خیال کا رد ہے کہ عذاب میں دیر
ہونے کو اپنے مقبول ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور اس کے ضمن میں آپ کی تسلی بھی ہے، یعنی جب ان کا مستحق
عذاب ہونا اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) تو مجھ کو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں ان کو (اس حال موجودہ پر)
رہنے دیجئے (یعنی عذاب کے دیر ہونے سے رنج نہ کیجئے) ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لیے جا رہے ہیں اس
طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دنیا میں ان پر عذاب نہ ڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں بیشک میری تدبیر
بڑی مضبوط ہے (آگے ان کے انکار نبوت پر تعجب ہے) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ مانگتے ہیں کہ وہ اس
تاوان سے دبے جاتے ہیں (اس لئے آپ کی اطاعت سے نفرت ہے ہٰذا قولہ تعالیٰ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا) یا ان
کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یعنی کیا ان کو احکام

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَاۗلُّوْنَ، مگر جب اس جگہ کھیت باغ کچھ نہ پایا تو اول تو یہ کہنے لگے کہ ہم جگہ کو بھول گئے ہیں اور کہیں آگئے یہاں تو کوئی باغ ہے نہ کھیت، مگر پھر قریبی مقامات اور نشانات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جگہ تو یہی ہے اور کھیت تباہ ہو چکا ہے تو کہنے لگے بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ، یعنی ہم اس نعمت سے محروم کر دیئے گئے

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ، ان میں سے جو درمیانہ آدمی تھا یعنی باپ کی طرح نیک صالح تھا اور اسی طرح پر خوش ہونے والا تھا دوسرے بھائیوں کی بات پر نہیں سخت دل نہ تھا اس نے کہا کہ کیا میں نے تمہیں پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کے نام کی تسبیح کیوں نہیں کرتے، تسبیح کے لفظی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ فقراء و مساکین سے اپنا مال بچانے کی تدبیر کا منشاء یہ ہے کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تم کو اس کے بجائے اور نہ دیگا حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے وہ خرچ کرنے والوں کو اپنے پاس سے اور زیادہ دیتا ہے (مظہری)

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ، اس بھائی کی بات اسوقت تو کسی نے نہ سنی مگر اب سب نے اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے نقص و کمی سے اور ہم ظالم تھے کہ اپنے فقراء کے حصّہ کو بھی کھا لینا چاہا۔

تنبیہ | یہ درمیانہ آدمی جس نے نصیحت کی بات کہی تھی اگرچہ دوسروں سے بہتر تھا مگر پھر بہرحال انہیں کے ساتھ ہو لیا اور انہیں کی غلط رائے پر عمل کے لئے تیار ہو گیا تھا اس لئے حشر اس کا بھی انہیں جیسا ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی گناہ سے لوگوں کو روکے اگر وہ نہ رکیں، پھر خود بھی ان کے ساتھ کام اور گناہ میں شریک ہو تو یہ بھی انہیں کے حکم میں ہوتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نہیں رکتے تو خود اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا لے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ، یعنی ان لوگوں نے اپنے جرم کا تو اعتراف کر لیا لیکن اب الزام ایک دوسرے پر ڈالنے لگے کہ تو نے ہی اول ایسی غلط رائے دی تھی جس کے نتیجہ میں یہ عذاب آیا۔ حالانکہ یہ جرم انہیں سے کسی کا تنہا نہیں تھا بلکہ سب یا اکثر اس میں شریک تھے۔

تنبیہ | آجکل اس معاملے میں ابتلاء عام ہے کہ بہت سی جماعتوں کے مجموعی عمل کی وجہ سے کوئی ناکامی یا مصیبت پیش آجائے تو اسوقت ایک دوسرا عذاب ان پر یہ ہوتا ہے کہ اس کا الزام ایک دوسرے پر ڈالنے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ، یعنی ابتداءً ایک دوسرے پر الزام ڈالنے کے بعد جب غور کیا تو پھر سب نے اقرار کر لیا کہ ہم سب ہی سرکش گناہگار ہیں یہ اعتراف ندامت کے ساتھ ان کی توبہ کے قائم مقام تھا اسی بناء پر ان کو اللہ سے یہ امید ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس باغ سے بہتر باغ عطا فرما دیں گے۔

امام بغوی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب ان سب لوگوں نے سچے دل سے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر باغ عطا فرما دیا جس کے انگوروں کے خوشے اتنے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک خچر پر لادا جاتا تھا (مظہری)

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ، اہل مکہ کے عذاب قحط کا اجمالی اور باغ والوں کے کھیت جل جانے کا تفصیلی ذکر فرمانے کے بعد عام ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اسی طرح آیا کرتا ہے، اور دنیا میں عذاب آجانے سے بھی ان کے آخرت کے عذاب کا کفارہ نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا عذاب اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

اگلی آیات میں اول متقین کے لئے جنات نعیم کا ذکر ہے اور اس کے بعد مشرکین مکہ کے ایک اور باطل دعوے کا ذکر ہے وہ یہ کہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اول تو قیامت آنے والی نہیں اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں اور مال و دولت ملے گی جیسا دنیا میں ملا ہوا ہے، اس کا جواب کئی آیتوں میں دیا گیا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبرداروں اور مجرمین کو برابر کر دیں گے یہ کیسا عجیب و غریب فیصلہ ہے، نہ کوئی سند و دلیل، نہ کسی آسمانی کتاب سے اس کا ثبوت، نہ اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ و عہد کہ **وہاں بھی تمہیں نعمت دیگا۔**

قیامت کی ایک عقلی دلیل ان آیات مذکورہ سے ثابت ہوا کہ قیامت آنا اور حساب کتاب ہونا اور نیک و بد کی جزاء و سزا بالکل مقتضائے عقل ہے کیونکہ اس کا تو دنیا میں ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں عموماً فساق فجار، بدکار چور اور ڈاکو عیش میں رہتے اور مزے اڑاتے ہیں، ایک چور اور ڈاکو ایک رات میں بعض اوقات اتنا کما لیتا ہے کہ شریف نیک آدمی عمر بھر میں بھی نہ کما سکے۔ پھر وہ نہ خوف خدا اور آخرت کو جانتا ہے نہ کسی شرم و حیا کا پابند ہے اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہے پورا کرتا ہے اور نیک شریف آدمی اول تو خدا سے ڈرتا ہے وہ بھی نہ ہو تو برادری کی شرم و حیا سے مغلوب ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے کارخانے میں تو بدکار بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق و ناحق کا صحیح انصاف ہو نیک کو اچھا بدلہ بد کو سزا ملے تو پھر اول تو کسی برائی کو برائی اور گناہ کو گناہ کہنا لغو و بے معنے ہو جاتا ہے کہ وہ ایک انسان کو بلا وجہ اس کی خواہشات سے روکنا ہے دوسرے پھر عدل و انصاف کے کوئی معنے باقی نہیں رہتے جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اس کا کیا جواب **دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا انصاف کہاں گیا۔**

رہا یہ شبہ کہ دنیا میں بسا اوقات مجرم پکڑا جاتا ہے اس کی رسوائی ہوتی ہے سزا پاتا ہے شریف آدمی کا امتیاز اس سے دنیا میں واضح ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے، یہ اس لئے غلط ہے کہ اول تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جاوے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچنا آسان نہیں جس کے ذریعہ مجرم سزا پا سکے اور جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور و زر اور رشوت و سفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے، اور اس زمانے کی حکومتی اور عدالتی جرم و سزا کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت تو سزا صرف وہ بے وقوف بے عقل یا بے سہارا آدمی پاتا ہے جو ہوشیاری سے کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے اور جس کے پاس نہ رشوت کے لئے پیسے ہوں نہ کوئی بڑا آدمی

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ، یہاں حضرت یونس علیہ السلام کو صاحب حُوت اسی مناسبت سے کہا گیا کہ وہ کچھ عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ، آیت لَيُزْلِقُوْنَكَ ازلاق سے مشتق ہے جس کے معنی لغزش دینے اور ڈگمگا دینے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفار مکہ آپ کو غضبناک اور تیز تیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنی جگہ اور مقام سے لغزش دیدیں جب یہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے۔ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ، حالانکہ یہ کلام تو تمام جہان والوں کے لئے ذکر و نصیحت اور ان کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے ایسے کلام والے کو کہیں مجنون کہا جا سکتا ہے۔ کفار کے اسی قول کا اس سورۃ کے شروع میں جواب دیا گیا تھا ختم سورۃ پر اسی کا ایک دوسرے انداز سے جواب دیدیا گیا۔

اور امام بغوی وغیرہ مفسرین نے ان آیات کا ایک خاص واقعہ نقل کیا ہے کہ انسان کی نظر بد لگ جانا اور اس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا، جیسا کہ حقیقت ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کا حق ہونا ثابت ہے، عرب میں بھی معروف و مشہور تھا اور عرب میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا اونٹوں جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ فوراً مر جاتے تھے۔ کفار مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تو تھی ہی اور ہر ممکن کوشش آپ کو قتل کرنے اور ایذاء پہنچانے کی کیا کرتے تھے ان کو یہ سوجھی کہ اس شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر لگواؤ، اور اس کو بلا لائے اس نے نظر بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کر لی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ یہ آیات اسی سلسلے میں نازل ہوئیں اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نظر بد لگانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

فائدہ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ جس شخص کو نظر بد کسی انسان کی لگ گئی ہو اس پر یہ آیات پڑھ کر دم کر دینا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے یہ آیات وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے آخر سورت تک ہیں (مظہری)

تمت سورۃ القلم بحمد اللہ یوم الاحد لست مضین من رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ حاقّہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باون آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۭ﴿۳﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ

وہ ثابت ہونے والی کیا ہے وہ ثابت ہونے والی اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہونے والی جھٹلایا ثمود اور

عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا

عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کر دیے گئے اچھل کر اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے

بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا

ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے نکلی جائے ہاتھوں سے مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن تک لگاتار

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴿۷﴾ فَهَلْ

پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ ڈھنڈ ہیں کھجور کے کھوکھلے پھر تو

تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ

دیکھتا ہے کوئی ان میں کا بچا اور آیا فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور الٹ جانے والی بستیاں

بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا

خطائیں کرتے ہوئے پھر حکم نہ مانا اپنے رب کے رسول کا پھر پکڑا ان کو پکڑنا سخت ہم نے

لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ

جس وقت پانی ابلا لاد لیا تم کو چلتی کشتی میں تاکہ رکھیں اس کو تمہاری یادگاری کے واسطے اور سنے اور رکھے

اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ

کان سن کر رکھنے والا پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا اور اٹھائی جائے

الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ﴿١٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١٥﴾

وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ

عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ﴿١٧﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ

خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا

كِتَابِيَهْ ﴿١٩﴾ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ

فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ

أُوتَ كِتَابِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَا

أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ﴿٢٩﴾ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ

الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ﴿٣١﴾ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿٣٢﴾

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾ لَّا يَأْكُلُهُ

إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿٣٧﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّهُ

لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٤٠﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَ

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ

اور نہ کہا ہوا پری والے کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو یہ اتارا ہوا ہے جہان کے رب کا اور اگر

تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ

یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر

لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهُ

کاٹ ڈالتے اس کی گردن پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچا لے اور یہ

لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ

نصیحت ہے ڈرنے والوں کو اور ہم کو معلوم ہے کہ تم میں بعضے جھٹلاتے ہیں اور وہ

لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾ ع

پچھتاوا ہے منکروں پر اور وہ یقین حق ہے اب بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو سب سے بڑا

خلاصۂ تفسیر

وہ ہونے والی چیز کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز، اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز (مقصود ان سے قیامت کی عظمت اور ہولناکی کا بیان ہے یہ استفہامات تہویل کے لئے ہیں) ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی چیز (یعنی قیامت) کی تکذیب کی سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے اور عاد جو تھے سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کر دیا تھا سو (اے مخاطب) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں (کیونکہ وہ بہت دراز قد تھے) سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے (یعنی کوئی نہیں بچا، لقولہ تعالیٰ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا) اور (اسی طرح) فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے (جن میں قوم نوح، عاد و ثمود سب آگئے) اور (قوم لوط کی) الٹی ہوئی بستیوں نے بڑے بڑے قصور کئے (یعنی کفر و شرک اور ان کے پاس رسول بھیجے گئے) سو انہوں نے اپنے رب کے رسول کا (جو ان کی طرف بھیجا گیا تھا) کہنا نہ مانا (اور کفر و شرک سے باز نہ آئے جس میں تکذیب قیامت بھی داخل ہے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سخت پکڑا (جن میں سے عاد و ثمود کا قصہ تو ابھی ہو چکا ہے اور قوم لوط اور قوم فرعون کی عقوبت بہت سی آیتوں میں پہلے آ چکی ہے اور قوم نوح کی عقوبت آگے بضمن امتنان مذکور ہے یعنی) ہم نے جب (نوح علیہ السلام کے وقت میں) پانی کو طغیانی ہوئی تم کو (یعنی تمہارے بڑوں کو جو مومن تھے اور ان کی نجات تمہارے وجود کا سبب ہوئی) کشتی میں سوار کیا (اور باقیوں کو غرق کر دیا) تاکہ ہم اس معاملہ کو تمہارے لئے ایک یادگار (اور عبرت) بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھیں،

کیونکہ یہ زندگی وبال کی ہوگی۔ آگے اس عذاب کی وجہ بتلاتے ہیں کہ) یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا (یعنی جس درجہ کا ایمان لانا حسب تعلیم انبیاء ضروری تھا وہ ایمان نہ رکھتا تھا) اور (خود تو کسی کو کیا دیتا اوروں کو بھی) غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا (حاصل یہ کہ خدا کی عظمت اور مخلوق کی شفقت جو حاصل دیانات متعلقہ حقوق اللہ و حقوق العباد ہیں یہ دونوں مفقود تھے ور مدار نجات تھا اس لئے مستحق عذاب ہوا) سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوست ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے۔ (یعنی جو ایک ایسی چیز ہے کہ کراہت و صورت میں مثل غسلین کے ہوگا جس سے زخم دھوئے گئے ہوں۔ اور یہ حصر اضافی ہے اور مقصود اس سے نفی ہے مرغوب کھانوں کی ورنہ زقوم کی غذا ہونا خود آیات سے ثابت ہے غرض ان کا طعام غسلین ہوگا) جس کو بجز بڑے گنہگاروں کے کوئی نہ کھاوے گا (آگے قرآن کی حقانیت ارشاد فرمائی جاتی ہے جس میں قیامت میں جزاء و سزا ہونے کا بیان ہے اس کی تکذیب پر تعذیب مذکور ہے) پھر (بعد بیان مضمون مجازاۃ کے) میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے (کیونکہ بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوہ آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور بعض مخلوقات بالفعل یا بالقوہ یہ صلاحیت نہیں رکھتیں، اس قسم کو مقصود سے ایک خاص مناسبت ہے کہ قرآن مجید کا لانیوالا فرشتہ نظر نہ آتا تھا اور جن پر قرآن آتا تھا وہ نظر آتے تھے، مراد یہ ہے کہ تمام مخلوق کی قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا (یعنی جس پر یہ کلام نازل ہوا وہ معزز رسول ہے) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے (جیسا کافر آپ کو شاعر کہتے تھے) تم بہت کم ایمان لاتے ہو (یہاں قلت سے مراد عدم ہے) اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے (جیسا بعض کفار آپ کو کہتے تھے مگر) تم بہت کم سمجھتے ہو (یہاں بھی قلت سے مراد عدم ہے غرض یہ نہ شعر ہے نہ کہانت ہے بلکہ) رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا (کلام) ہے اور (آگے اس کی حقانیت کی ایک دلیل عقلی ارشاد ہوتی ہے کہ) اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے (یعنی جو کلام ہمارا نہ ہوتا اس کو ہمارا کلام کہتے اور جھوٹا دعویٰ نبوت کا کرتے) تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ ڈالتے پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا (رگِ دل کاٹنے سے آدمی مرجاتا ہے مراد اس سے قتل ہے) اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے (یعنی فی نفسہ حق ہونا اس کی صفت کمالیہ ذاتیہ ہے اور موجب نصیحت ہونا اس کی صفت کمالیہ اضافیہ ہے) اور (آگے مکذبین کی وعید ہے کہ) ہم کو معلوم ہے کہ تم میں سے بعض تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے) اور (اس اعتبار سے) یہ قرآن کافروں کے حق میں موجب حسرت ہے (کیونکہ ان کے لئے وجہ تکذیب کے سبب عذاب ہوگیا) اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے سو (جس کا یہ کلام ہے) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (و تحمید) کیجئے۔

یہاں تک کہ اس آواز سے سب مرجائیں گے۔ قرآن وسنت کی نصوص سے قیامت میں صور کے دو نفخے ہونا ثابت ہے پہلے نفخہ کو نفخہ صعق کہا جاتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ یعنی اس نفخہ سے تمام آسمان والے فرشتے اور زمین پر بسنے والے جن وانس اور تمام جانور بیہوش ہوجائیں گے (پھر اسی بیہوشی میں سب کو موت آجائے گی) دوسرے نفخہ کو نفخہ بعث کہا جاتا ہے بعث کے معنے اٹھنے کے ہیں اس نفخہ کے ذریعہ سب مردے پھر زندہ ہو کھڑے ہوجائیں گے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ یعنی پھر صور دوبارہ پھونکا جائے گا جس سے اچانک سب کے سب مُردے زندہ ہو کر کھڑے ہوجاویں گے اور دیکھنے لگیں گے۔

بعض روایات میں جو ان دونوں نفخوں سے پہلے ایک تیسرے نفخہ کا ذکر ہے جس کا نام نفخہ فزع بتلایا گیا ہے۔ مجموعہ روایات ونصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا نفخہ ہی ہے اسی کو ابتداء میں نفخہ فزع کہا گیا اور انتہا میں وہی نفخہ صعق ہوجائے گا (مظہری)

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ یعنی قیامت کے روز عرش رحمن کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے بعض روایات حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ ہم چار فرشتوں کے سپرد ہے قیامت کے روز ان کے ساتھ اور چار بڑھا دیئے جاویں گے۔

رہا یہ معاملہ کہ عرش رحمن کیا چیز ہے اس کی حقیقت اور حقیقی شکل وصورت کیا ہے اور فرشتوں کا اس کو اٹھانا کس صورت سے ہے یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ نہ عقل انسانی ان کا احاطہ کرسکتی ہے نہ ان معاملات میں ان کو غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت ہے سلف صالحین صحابہ وتابعین کا مسلک ان جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ جل شانہ کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس کی حقیقت وکیفیت نامعلوم ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ یعنی اس روز سب اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے، کوئی چھپنے والا چھپ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے علم وخبر سے تو آج بھی کوئی نہیں چھپ سکتا اس روز کی خصوصیت شاید یہ ہو کہ میدان حشر میں تمام زمین ایک سطح مستوی ہوجائے گی نہ کوئی غار رہے گا نہ پہاڑ نہ کوئی تعمیر، مکان نہ کسی درخت وغیرہ کی آڑ، یہی چیزیں ہیں جن کے پیچھے دنیا میں چھپنے والے چھپا کرتے ہیں وہاں ان میں سے کوئی چیز نہ ہوگی، کسی کو چھپنے کا امکان ہی نہ رہے گا۔

هَاۗؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ لفظ هَاۗؤُمُ خذو کے معنے میں ہے جمع کے لئے بولا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ جس کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں آئے گا وہ خوشی کے مارے آس پاس کے لوگوں سے کہنے لگے گا کہ لو یہ میرا اعمال نامہ پڑھو۔

هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ، سلطان کے لفظی معنے غلبہ وتسلط کے ہیں، اسی لئے حکومت کو سلطنت اور

خود اپنے خیالات سے یا کاہنوں کی طرح شیاطین سے کچھ کلمات جمع کر لیتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب
کرتے ہیں۔ مذکورہ آیات میں حق تعالیٰ نے اُن کے اس خیالِ باطل کو ایک دوسری صورت سے بڑی شدت
کے ساتھ اس طرح رد کیا ہے کہ دیوانو، اگر یہ رسول معاذ اللہ ہماری طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے
اور ہم پر افترا پردازی کرتے تو کیا ہم یوں ہی دیکھتے رہتے اور ان کو ڈھیل دیدیتے کہ خلقِ خدا کو گمراہ کریں۔
یہ بات کوئی عقل والا باور نہیں کر سکتا اس لئے اس آیت میں بطور فرضِ محال کے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ رسول
کوئی قول بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ہماری طرف منسوب کرتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی رگِ جان کاٹ
ڈالتے اور پھر ہماری سزا سے اُن کو کوئی بھی نہ بچا سکتا یہاں یہ شدت کے الفاظ ان جاہلوں کو سنانے کے لئے
فرضِ محال کے طور پر استعمال فرمائے ہیں۔ داہنا ہاتھ پکڑنے کی تخصیص غالباً اسلئے ہے کہ جب کسی مجرم کو قتل کیا
جاتا ہے تو قتل کرنے والا اس کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے قتل کرنے والے کے بائیں ہاتھ کے مقابل مقتول کا
داہنا ہاتھ ہوتا ہے اس کو یہ قتل کرنے والا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر داہنے ہاتھ سے اس پر حملہ کرتا ہے۔

تنبیہ | اس آیت میں ایک خاص واقعہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا، اس میں
کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا۔ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے ہمیشہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے یہی
وجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اُن پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ، اس سے پہلی آیتوں میں یہ بتلایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی
طرف سے کچھ نہیں فرماتے جو کچھ ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے تذکرہ اور نصیحت ہے،
اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سب قطعی اور یقینی امور کو جانتے ہوئے تم میں بہت سے آدمی اس کی تکذیب بھی
کرتے رہیں گے جس کا نتیجہ آخرت میں اُن کی حسرت و یاس اور عذابِ دائمی ہوگا اور آخر میں فرمایا وَاِنَّهٗ لَحَقُّ
الْيَقِيْنِ یعنی یہ بات بالکل حق اور یقینی ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ سب کے آخر میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ جس میں اشارہ ہے کہ آپ ان
معاند کفار کی باتوں پر دھیان نہ دیں اور ان سے مغموم نہ ہوں بلکہ اپنے ربِ عظیم کی تسبیح و تقدیس کو اپنا
مشغلہ بنا لیں کہ یہی ان سب غموں سے نجات کا ذریعہ ہے اور یہ ایسا ہے جیسا دوسری جگہ قرآن کریم نے
فرمایا ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ
یعنی ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کفار کی بیہودہ گفتگو سے دل تنگ ہوتے ہیں اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے
رب کی حمد میں مشغول ہو جائیں اور سجدہ گزاروں میں شامل ہو جائیں اُن کی باتوں کی طرف التفات نہ کریں۔

ابوداؤد میں حضرت عقبہ ابن عامر جہنی کی روایت ہے کہ جب یہ آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ
نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنے رکوع میں رکھو اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ

رَبِّیَ الْاَعْلٰی نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کو اپنے سجدہ میں رکھو۔ اسی لئے باجماع اُمت رکوع اور سجدے میں یہ دونوں تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔ جمہور کے نزدیک ان کا پڑھنا اور تین مرتبہ تکرار کرنا سنت ہے، بعض حضرات نے واجب بھی کہا ہے۔

تمت سورة الحاقة بحمد الله تعالىٰ

سُورَةُ الْمَعَارِج

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ معارج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ

مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا منکروں کے واسطے کوئی نہیں اس کو ہٹانے والا آئے اللہ کی طرف سے

ذِى الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ

جو چڑھتے درجوں والا ہے چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور روح اس دن میں جس کا لمبان ہے

خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾

پچاس ہزار برس سو تو صبر کر بھلی طرح کا صبر کرنا وہ دیکھتے ہیں اس کو دور

وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ

اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک جس دن ہوگا آسمان جیسے تانبا پگھلا ہوا اور ہوں گے پہاڑ جیسے اون

كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ

رنگی ہوئی اور نہ پوچھے گا دوستدار دوستدار کو سب نظر آجائیں گے ان کو چاہے گا گناہگار کسی طرح

يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَ

چھڑوائی میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے بیٹوں کو اور اپنی ساتھ والی کو اور اپنے بھائی کو اور

فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُـــْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا ۭ

اپنے گھرانے کو جس میں رہتا تھا اور جتنے زمین پر ہیں سب کو پھر اپنے آپ کو بچالے ہرگز نہیں

إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ

فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾

وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ

صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ

وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُم

مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ

أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾

وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ

يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا

قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿٣٧﴾ أَيَطْمَعُ

كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا

يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿٤٠﴾

سو میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی تحقیق ہم کر سکتے ہیں

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ

اس پر کہ بدل کر لے آئیں ان سے بہتر اور ہمارے قابو سے نکل نہ جائیں گے سو چھوڑ دے ان کو

يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ

کہ باتیں بنائیں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ ملیں اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ ہے جس دن

يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾

نکل پڑیں گے قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کسی نشانی پر دوڑتے جاتے ہیں

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ

جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلت یہ ہے وہ دن جس کا

كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

ان سے وعدہ تھا

ع ۲ / ۹

خلاصۂ تفسیر

ایک مانگنے والا (براہ انکار) وہ عذاب مانگتا ہے جو کہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے (اور) جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں (اور) جو اللہ کی طرف سے واقع ہوگا جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے (جن پر ہو کر) فرشتے اور (اہل ایمان کی) روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں (اس کے پاس سے مراد ہے کہ عالم بالا میں جو موقع ان کے عروج کا منتہا مقرر کیا گیا ہے وہاں جاتی ہیں اور چونکہ اس عروج کا رستہ آسمان ہیں اس لئے ان کو معارج (یعنی سیڑھیاں) فرمادیا) اور وہ عذاب ایسے دن میں (واقع) ہوگا جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال (کی برابر) ہے (مراد قیامت کا دن ہے جو کچھ تو حقیقی مقدار سے کچھ اس کے اشتداد سے کفار کو اسقدر طول محسوس ہوگا اور چونکہ کفر و سرکشی کے مراتب کے اعتبار سے اس کی شدت اور درازی مختلف ہوگی کسی کے لئے بہت زیادہ، کسی کے لئے کچھ کم، اس لئے ایک آیت میں کالف سنۃ آیا ہے اور کافروں کی تخصیص اسلئے کی کہ حدیث میں ہے کہ مومن کو وہ دن اسقدر ہلکا معلوم ہوگا جیسے ایک فرض پڑھنے کا وقت (کذا فی الدر عن ابی سعید مرفوعاً بروایت احمد والبیہقی وغیرہم) سو (جب عذاب کا آنا ثابت ہے تو) آپ (ان کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو (یعنی انکے کفر و خلاف سے ایسے تنگ نہ ہوجئے کہ شکایت حکایت زبان پر آجاوے بلکہ یہ سمجھ کر تحمل کیجئے کہ ان کو سزا ہونے والی ہے اور اس یوم جزا کا جو ان کو انکار ہے سو) یہ لوگ اس دن کو (قیامت پر ایمان نہ ہونے کے سبب اسکے وقوع کو) بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم (کو اسکا وقوع یقینی معلوم ہے اس لئے) اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں (اور وہ عذاب اس روز واقع ہوگا) جس دن (کہ) آسمان (رنگ میں) تیل کی تلچھٹ کی طرح

ایک بار حیات پہلے آچکی ہے اس کو محال سمجھنا ان کی بے وقوفی ہے) پھر (دوسرے طور پر دفع استبعاد وقوع قیامت
کے لئے) ہم قسم کھاتے ہیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی (یعنی اس کے سورۂ صافات کے شروع میں گزرے ہیں آگے
جوابِ قسم ہے) کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ (دنیا ہی میں) ان کی بجائے ان سے بہتر لوگ لے آئیں (یعنی پیدا کر دیں) اور ہم (اس
سے) عاجز نہیں ہیں (پس جب نئی مخلوق اور وہ بھی ایسی جن میں صفت کمال زیادہ ہوں جن میں زیادہ اشیاء
پیدا کرنی پڑیں ان کو پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ پہلا استدلال خود ان منکرین کی
حالت کے اعتبار سے ہے اور دوسرا استدلال ان کے امثال و نظائر کے امکان مخلوقیت سے۔ اور جب باوجود وضوح
حق مع الدلائل کے اپنے انکار و عناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل و تفریح میں رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو
اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے جس دن یہ قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑیں گے جیسے
کسی پرستش گاہ کی طرف دوڑے جاتے ہیں (اور) ان کی آنکھیں (مارے شرمندگی کے) نیچے کو جھکی ہوں گی (اور)
ان پر ذلت چھائی ہوگی، یہ ہے ان کا وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (جو کہ اب واقع ہوگیا)

معارف و مسائل

سَاَلَ سَاۗىِٕلٌ، والسؤال کسی چیز کی تحقیق کے لئے ہوتا ہے اس کے ساتھ عربی زبان میں صلہ حرف عن کا استعمال
کیا جاتا ہے اور کبھی سوال بمعنی درخواست اور کسی چیز کی طلب کے آتا ہے یہاں ایسا ہی ہے اسی لئے اس کا صلہ یہ
بجائے عن کے حرف با آیا بعذاب، معنی یہ ہیں کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا۔ نسائی میں حضرت ابن عباس
سے روایت ہے کہ یہ مانگنے والا نضر بن حارث تھا جس نے قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں اس بات
سے کام لیا کہ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، یعنی یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر یہ قرآن حق ہے اور آپ کی طرف سے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے
یا کوئی دوسرا عذاب الیم بھیج دے (چنانچہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا (رواہ
ابن ابی حاتم) اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا جو عذاب اپنے منہ مانگا تھا آگے اس کی کچھ حقیقت کا بیان ہے کہ یہ عذاب
کافروں پر ضرور واقع ہونے والا ہے (خواہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں، اس عذاب کو دفع کرنا کسی کے بس
میں نہیں یہ عذاب اللہ کی طرف سے ہے جو درجات عالیہ والا ہے۔ یہ آخری جملہ پہلے جملے کی دلیل بھی ہے کہ جو عذاب
اللہ بالا و برتر کی طرف سے ہو اس کو دفع کرنا اور ٹالنا کسی کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

معارج، معرج کی جمع ہے عروج سے مشتق ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں اور معرج و معراج اُس
سیڑھی کو کہا جاتا ہے جس میں نیچے سے اوپر چڑھنے کے لئے درجات ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت اس آیت
میں ذی المعارج اس معنی سے ہے کہ اللہ تعالیٰ درجات عالیہ والا ہے (کذا قال سعید بن جبیر) اور یہ درجات عالیہ اوپر نیچے
سات آسمان ہیں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ذی المعارج کے معنے ہیں، ذی السمٰوٰت یعنی مالک سمٰوات۔

طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے، کیونکہ حدیث صحیح میں آیا ہے آسمان سے زمین تک پانسو سال کی مسافت ہے تو پانسو سال اوپر سے نیچے آنے کے اور پانسو واپس جانے کے یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں کہ بالفرض انسان اس مسافت کو طے کرتا تو آنے اور جانے میں ایک ہزار سال لگ جاتے اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں، تو سورۂ سجدہ کی آیت میں دنیا ہی کے دنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا اور سورۂ معارج میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو ایام دنیا سے بہت بڑا ہوگا اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا، یہاں قریب و بعید باعتبار مسافت یا زمانے کے نہیں بلکہ بعید از امکان یا بعید از وقوع مراد ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ تو قیامت کے وقوع بلکہ امکان کو بھی بعید سمجھ رہے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۚ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ، حمیم کے معنی دوست کے ہیں اور مخلص دوست کے ہیں قیامت کی شدت کا بیان ہے کہ اس روز کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا، مدد کرنا تو درکنار، آگے یہ بھی بتلا دیا کہ یہ نوبت اس لئے نہیں کہ وہ دوست سامنے نہیں ہوگا، حق تعالیٰ ان سب کو ایک دوسرے کے سامنے بھی کر دے گی، مگر ہر شخص نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا کوئی کسی دوسرے کی تکلیف و راحت کی طرف التفات نہ کرسکے گا۔

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۙ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى، ضمیر نار کی طرف راجع ہے اور لظیٰ کے معنی خالص شعلہ بغیر آمیزش کے اور شویٰ شواۃ کی جمع ہے جس کے معنی سر کی کھال کے بھی ہیں اور ہاتھوں پاؤں کی کھال کے بھی، یعنی جہنم کی آگ ایک خالص بھڑکنے والا شعلہ ہوگا جو دماغ کی یا ہاتھوں پاؤں کی کھال اتار دیگا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۙ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى، خود بلائے گی یہ آگ اس شخص کو جس نے حق سے پیٹھ موڑی اور رُخ پھیرا اور مال جمع کیا پھر اس کو روک کر رکھا۔ مراد جمع کرنے سے وہ ہے کہ خلاف شرع ناجائز طریقوں سے جمع کرے اور روکنے سے مراد یہ ہے کہ مال پر عائد ہونے والے فرائض و واجبات ادا نہ کرے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا، ہلوع کے لفظی معنی حریص بے صبر کم ہمت آدمی کے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیت میں ہلوع سے مراد وہ شخص ہے جو مال حرام کی حرص میں مبتلا ہو اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد بخیل آدمی ہے اور مقاتلؒ نے فرمایا کہ تنگدل بے صبر آدمی مراد ہے اور یہ سب معانی متقارب ہیں، ہلوع کے مفہوم میں سب داخل ہیں، اس ہلوع کی تشریح خود قرآن کے الفاظ میں آرہی ہے

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کو پیدا ہی اس حال میں کیا ہے اور یہ عیب اس کی تخلیق میں رکھ دیا تو پھر اس کا کیا قصور ہوا وہ مجرم کیوں قرار دیا گیا، وجہ یہ ہے کہ مراد اس سے انسانی فطرت اور جبلت میں رکھی ہوئی استعداد اور مادہ ہے سو اسمیں حق تعالیٰ نے ہر خیر و صلاح کا مادہ اور استعداد بھی رکھی ہے اور شر و فساد

ہر صورت و ممنوع و ناجائز قرار دیا ہے اس میں نکاح کی وہ صورتیں بھی داخل ہیں جو شرعاً حلال نہیں جیسے اُن عورتوں سے نکاح جن سے شرعاً نکاح حرام ہے اسی طرح متعہ جو شرعاً نکاح نہیں۔

اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرنا حرام ہے اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ نے استمناء بالید یعنی اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کر لینے کو بھی اس کے عموم میں داخل قرار دیکر حرام قرار دیا ہے۔ ابن جُریج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے اس کے متعلق پوچھا تو اُنھوں نے فرمایا کہ مکروہ ہے۔ میں نے سُنا ہے محشر میں کچھ ایسے لوگ آئیں گے جن کے ہاتھ حاملہ ہونگے میرا گمان یہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ سے شہوت پوری کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم پر عذاب نازل فرمایا جو اپنے ہاتھوں سے اپنی شرمگاہوں سے کھیلتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملعون من نکح یدہ یعنی جو اپنے ہاتھ سے نکاح کرے وہ ملعون ہے۔ سند اس کی ضعیف ہے (مظہری)۔

تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد امانت میں داخل ہیں وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ، اس آیت میں امانات جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جیسے دوسری جگہ بھی اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا فرمایا ہے دونوں جگہ بلفظ جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ امانت صرف وہ مال ہی نہیں جو کسی نے آپ کے پاس رکھدیا ہو بلکہ تمام حقوق واجبہ جن کا ادا کرنا آپ کے ذمہ فرض ہے وہ سب امانات ہیں ان میں کوتاہی کرنا خیانت ہے اسمیں تمام حقوق اللہ نماز روزہ حج زکوٰۃ بھی داخل ہیں اور تمام حقوق العباد جو منجانب اللہ کسی پر واجب ہیں یا اپنے خود کسی معاہدے اور معاملے کے ذریعہ اپنے پر لازم کرلئے ہیں وہ سب امانات کی فہرست میں داخل اور اُن کی ادائیگی فرض، اسمیں کوتاہی خیانت ہے (از مظہری ملخصاً)

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ، یہاں بھی لفظ شہادات کو بلفظ جمع لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے۔ اسمیں شہادت ایمان توحید رسالت بھی داخل ہے۔ ہلال رمضان اور حدود شرعیہ کی شہادت بھی اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں اُن کی شہادت بھی، کہ ان شہادتوں کا چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے انکو صحیح صحیح قائم کرنا اس آیت کی رو سے فرض ہے (از مظہری)، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمت بحمد اللہ یوم الثلثاء ۸ رجب ۱۳۹۱ھ

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ

مِدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ

لَكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿١٤﴾

أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ﴿١٥﴾ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ

فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ﴿١٨﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ﴿١٩﴾ لِتَسْلُكُوا

مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَمْ

يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوا لَا

تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَ

نَسْرًا ﴿٢٣﴾ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿٢٤﴾ مِمَّا

خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿٢٥﴾

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ

إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِي

وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

ع ۹

میں نے (ان سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ (یعنی ایمان لے آؤ تاکہ گناہ بخشے جائیں) بیشک وہ بڑا بخشنے والا ہے (اگر تم ایمان لے آؤ گے تو علاوہ اُخروی نعمت کے کہ (مغفرت ہے دنیوی نعمتیں بھی تم کو عطا کرے گا، چنانچہ) کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگا دے گا اور تمہارے لئے نہریں بہا دے گا (ان نعمتوں کے ذکر سے شاید یہ فائدہ ہو کہ اکثر طبائع میں نقد اور جلد حاصل ہونے والی چیزوں کی طلب زیادہ ہے۔ در منثور میں قتادہ کا قول ہے کہ وہ لوگ دنیا کے زیادہ حریص تھے اس لئے یہ فرمایا اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بسا اوقات یہ امور دنیویہ ایمان و استغفار پر مرتب نہیں ہوتے بات یہ ہے کہ یا تو یہ وعدہ خاص انہی لوگوں کے لئے ہوگا اور اگر عام ہو تو قاعدہ ہے کہ وعدے سے افضل کوئی چیز ملنا بھی ایفائے وعدہ ہی ہوتا ہے بلکہ وعدہ سے زیادہ، پس ایمان کامل پر روحانی مسرت و قناعت و رضا بالقضاء جو عطا ہوتا ہے جو ان اشیاء سے بھی افضل و اکمل ہے بلکہ ساری متاع دنیا اور سب اشیائے مذکورہ کا اصلی مقصد بھی تو دل کا سکون و آرام ہی ہے۔ آگے نوح علیہ السلام کا تتمہ کلام ہے یعنی میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو حالانکہ (مقتضیات اعتقاد عظمت کے موجود ہیں کہ) اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا (کہ عناصر اربعہ سے تمہاری غذا، پھر غذا سے نطفہ اور نطفہ کے بعد علقہ و مضغہ وغیرہ کی مختلف صورتوں سے گزر کر مکمل انسان بنایا یہ دلیل تو خود انسان کی ذات سے متعلق تھی، آگے دلیل آفاقی فرماتے ہیں کہ) کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور سورج کو (مثل) چراغ (روشن کے) بنایا (اور چاند گو سب آسمانوں میں نہیں ہے مگر فیہن باعتبار مجموعہ کے فرما دیا، اور اس کے متعلق کچھ سورۂ فرقان میں گذر چکا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے اور یا اس طرح کہ انسان نطفہ سے بنا اور نطفہ غذا سے اور غذا عناصر سے بنی اور عناصر میں غالب اجزاء مٹی کے ہیں) پھر تم کو (بعد مرگ) زمین ہی میں لیجاوے گا اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آوے گا اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا تاکہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو (یہ تمام وہ کلام ہے جس کی حکایت نوح علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے فرمائی اور یہ سب حکایت عرض کرکے) نوح (علیہ السلام) نے (یہ) کہا کہ اے میرے پروردگار ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخصوں کی پیروی کی کہ جن کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا (مراد ان شخصوں سے رؤسا ہیں جن کا عوام اتباع کیا کرتے ہیں اور مال اور اولاد کا ان رؤسا کو نقصان پہنچانا اس معنی سے ہے کہ مال و اولاد سرکشی کا سبب بن گئے) اور (انھوں نے جن کا اتباع کیا ہے وہ ایسے ہیں) جنھوں نے (حق کے مٹانے میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنھوں نے (اپنے تابعین سے یہ) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ (بالخصوص) وَدّ کو

اور سواع کو اور یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا (خصوصیت ان کے ذکر کی اس لئے ہے کہ یہ بت زیادہ مشہور تھے) اور ان (رئیسوں) لوگوں نے بہتوں کو (بہکا بہکا کر) گمراہ کر دیا (وہ مکر کبار یہی گمراہ کرنا ہے) اور (چونکہ مجھ کو آپ کے ارشاد لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ سے معلوم ہو گیا کہ یہ اب ایمان نہ لاویں گے اس لئے یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ) ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے (تاکہ یہ جلد مستحق ہلاکت ہو جاویں، اس سے معلوم ہوا کہ مقصود دعا کرنا زیادہ ضلال کی نہیں بلکہ استحقاق ہلاکت کی ہے اور تحقیق اس دعا کی سورۂ یونس میں قصہ موسیٰ علیہ السلام میں گزر چکی ہے۔ غرض انجام ان لوگوں کا یہ ہوا کہ) اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کئے گئے پھر (بعد غرق برزخی یا اخروی) دوزخ میں داخل کئے گئے اور خدا کے سوا ان کو کچھ حمایتی بھی میسر نہ ہوئے اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ (بلکہ سب کو ہلاک کر دے اور عموم ہلاکت و عموم بعثت کی بحث سورۂ صافات میں گزر چکی ہے آگے اس دعا کی علت ہے کیونکہ) اگر آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو (حسب ارشاد لَنْ يُّؤْمِنَ الخ) یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی (اور کافروں کے لئے بد دعا کرنے کے بعد مومنین کے لئے دعا فرمائی کہ) اے میرے رب مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو مومن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کو (یعنی اہل و عیال باستثناء زوجہ و کنعان کے) اور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دیجئے اور (چونکہ مقصود مقام میں بد دعا ہے کافروں کے لئے اور مومنین کے لئے دعا محض تقابل کی مناسبت سے ہو گئی تھی اس لئے پھر مضمون بد دعا کی طرف عود ہے اور وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا کے مقصود کی تفسیر ہے یعنی) ان ظالموں کی ہلاکت اور بڑھا دیجئے (یعنی ان کی نجات کی کوئی صورت نہ رہے جلد ہی ہلاک ہو جاویں اور یہی مقصود تھا اس دعا سے کہ ان کی گمراہی زیادہ کی جاوے اور ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے والدین مومن تھے اور اگر اس کے خلاف ثابت ہو جاوے تو والدین سے مراد آباء و امہات بعیدہ ہوں گے، اور دعا اپنے نفس کے لئے کی پھر اصول کے لئے پھر اہل و عیال کے لئے پھر عام تابعین کے لئے)۔

معارف و مسائل

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ، حرف مِنْ اکثر تبعیض یعنی جزئیت بتلانے کے لئے آتا ہے اگر یہ معنے لئے جاویں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لئے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادا کرنے کے قابل ہیں ان کو ادا کرے جیسے مالی واجبات، اور جو قابل ادائیگی نہیں جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذاء

لے آیا گیا کہ اب کوئی ایمان قبول نہ کریگا اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ کا یہی مطلب ہے
اُسوقت حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر بددعا کے کلمات آئے جیسا آگے ذکر کیا گیا جس کے نتیجہ میں
پوری قوم غرق و ہلاک ہوگئی بجز مومنین کے جن کو کشتی میں سوار کر لیا گیا تھا قوم کی فہمائش کے سلسلہ
میں نوح علیہ السلام نے ان کو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے یعنی ایمان لا کر پچھلے گناہوں کی معافی مانگنے کی
دعوت دی اور استغفار کا دنیاوی فائدہ یہ بتلایا کہ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ
اس سے اکثر علماء نے استدلال کیا ہے کہ گناہوں سے توبہ، استغفار سے اللہ تعالیٰ بارش حسب موقع برسا دیتے ہیں
قحط نہیں پڑنے دیتے اور مال و اولاد میں استغفار سے برکت ہوتی ہے کہیں کسی حکمت الٰہیہ کے تقاضے سے
اس کے خلاف بھی ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ عام لوگوں کے ساتھ یہی ہے کہ توبہ استغفار اور ترک معصیت سے دنیا
کی بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ روایات حدیث سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ
طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا، اس آیت میں دلائل توحید و قدرت کے سلسلے میں سات آسمانوں
کا طبق بر طبق ہونا اور پھر اُن میں قمر کا نور ہونا ارشاد ہوا ہے جس میں لفظ فیہن سے ظاہراً یہ سمجھا جاتا ہے
کہ چاند آسمانوں کے جرم کے اندر داخل ہے آجکل کی نئی تحقیقات و مشاہدات سے اس کے خلاف یہ معلوم
ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں سے بہت نیچے فضائے آسمانی میں ہے جس کو آجکل خلاء کہا جاتا ہے اس کی مفصل
تحقیق سورۃ فرقان کی آیت تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔
اس کو دیکھ لیا جائے۔ قوم نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا، کبار کبر کا مبالغہ ہے جس کے معنے
بہت بڑے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بہت بڑا مکر کیا وہ یہ تھا کہ خود تو تکذیب کرکے ایذائیں
پہنچاتے ہی تھے جن پر ان کا اثر تھا ان کو بھی ان کے پیچھے ڈالدیتے تھے۔ اسی سلسلہ میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا
کہ انھوں نے باہم معاہدہ کیا کہ لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ڏ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا یعنی اپنے بتوں
ود و سواع وغیرہ ان پانچ بتوں کی عبادت کو نہ چھوڑو یہ پانچ نام ہیں پانچ بتوں کے۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں درحقیقت اللہ کے نیک صالح بندے تھے جو آدم علیہ السلام اور نوح
کے درمیانی زمانے میں گذرے تھے ان کے بہت سے لوگ معتقد اور متبع تھے ان لوگوں نے ان کی وفات کے
بعد بھی ایک عرصہ دراز تک انھیں کے نقش قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔
کچھ عرصہ کے بعد شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کے تابع عبادت کرتے ہو اگر اُن کی تصویریں
بنا کر سامنے رکھ لیا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ یہ لوگ اس
فریب میں آ کے ان کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے لگے اور ان کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک
خاص کیفیت محسوس کرنے لگے یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ سب یکے بعد دیگرے مر گئے اور بالکل نئی
نسل نے ان کی جگہ لے لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود یہی بت تھے وہ

انھیں کی عبادت کیا کرتے تھے یہاں سے بت پرستی شروع ہوگئی اور ان پانچ بتوں کی عظمت ان کے دلوں میں چونکہ سب سے زیادہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے باہمی معاہدے میں ان کا نام خاص طور سے لیا گیا۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا، یعنی ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے۔ یہاں یہ شبہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی قوم کو ہدایت کرنا ہے۔ نوح علیہ السلام نے اُن کی گمراہی کی بددعا کیسے کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسکی تو خبر دیدی تھی کہ اب انمیں کوئی مسلمان نہیں ہوگا اسلئے ان کا گمراہی اور کفر پر مرنا تو یقینی تھا حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہی بڑھا دینے کی دعا اسلئے فرمائی کہ جلد ان کا پیمانہ لبریز ہوجائے اور ہلاک کر دیئے جائیں۔

مِمَّا خَطِیْٓــٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، یعنی یہ لوگ اپنی خطاؤں کی وجہ سے پانی میں غرق کئے گئے تو آگ میں داخل ہوگئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور جلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں کیونکہ اسمیں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا یہ برزخی آگ ہے جسمیں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔

عذاب قبر قرآن سے ثابت ہے: اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ یعنی قبر میں رہنے کے زمانے میں بھی لوگوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث صحیحہ متواترہ میں قبر کے اندر عذاب و ثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا اسلئے اس پر اُمت کا اجماع اور اسکا اقرار اہل سنت والجماعت کی علامت ہے

تمت سورۃ نوح بحمد اللہ لیلۃ الاربعاء ۸ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَۃُ الْجِنِّ

سُوْرَۃُ الْجِنِّ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورۂ جن مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اٹھائیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴿۱﴾

تو کہہ مجھ کو حکم آیا کہ سن گئے کتنے لوگ جنوں میں سے پھر کہنے لگے ہم نے سنا ہے ایک قرآن عجیب

یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِکَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴿۲﴾ وَّاَنَّہُ تَعٰلٰی جَدُّ

کہ سمجھاتا ہے نیک راہ سو ہم اس پر یقین لائے اور ہرگز نہ شریک بتلائیں گے ہم اپنے رب کا کسی کو اور یہ کہ اونچی ہے شان

رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا ﴿۳﴾ وَّاَنَّہُ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْھُنَا عَلَی اللّٰہِ

ہمارے رب کی نہیں رکھی اس نے جورو نہ بیٹا اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف اللہ پر بڑھا کر

شَطَطًا ﴿۴﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ﴿۵﴾ وَّاَنَّہُ

باتیں کہا کرتا تھا اور یہ کہ ہم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ بولیں گے آدمی اور جن اللہ پر جھوٹ اور یہ کہ

کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْھُمْ رَھَقًا ﴿۶﴾

تھے کتنے مرد آدمیوں میں کے پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں کے پھر تو وہ اور زیادہ سر چڑھنے لگے

وَّاَنَّھُمْ ظَنُّوْا کَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا ﴿۷﴾ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ

اور یہ کہ ان کو بھی خیال تھا جیسا تم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ اٹھائے گا اللہ کسی کو اور یہ کہ ہم نے ٹٹول دیکھا آسمان کو

فَوَجَدْنٰھَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُھُبًا ﴿۸﴾ وَّاَنَّا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْھَا مَقَاعِدَ

پھر پایا اس کو بھر رہے ہیں اس میں چوکیدار سخت اور انگارے اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں

لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَہٗ شِھَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ

سننے کے واسطے پھر جو کوئی اب سننا چاہے وہ پائے اپنے واسطے ایک انگارا گھات میں اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ برا

اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِھِمْ رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ

ارادہ ٹھہرا ہے زمین کے رہنے والوں پر یا چاہا ہے ان کے حق میں ان کے رب نے راہ پر لانا اور یہ کہ کوئی ہم میں نیک ہیں اور

مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی

الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ

یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ

مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ

فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾ وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ

مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ وَ مَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا

صَعَدًا ﴿۱۷﴾ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّ اَنَّهٗ

لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ

اَدْعُوْا رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ

لَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ﴿۲۲﴾ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ

دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِسٰلٰتِهٖ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ

رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ﴿۲۴﴾ حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا

مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۵﴾ قُلْ

اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۶﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ

سو نہیں مطلع کرتا اپنے غیب پر کسی کو مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو تو وہ چلاتا ہے

مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ(۲۷) لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ

اس کے آگے اور پیچھے چوکیدار تاکہ جانے کہ انہوں نے پہنچائے پیغام

رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۲۸)

اپنے رب کے اور قابو میں رکھا ہے جو ان کے پاس ہے اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول تفسیر آیات سے پہلے چند واقعات جاننے کے قابل ہیں جن کی ضرورت تفسیر میں پیش آوے گی۔ واقعۂ اوّل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین آسمان تک پہنچ کر فرشتوں کی باتیں سُنتے تھے، آپ کی بعثت کے بعد اُن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ اس سُننے سے روک دیا گیا اور اسی حادثہ کی تحقیق کے ضمن میں یہ جنات آپ تک پہنچے جیسا کہ سورۂ احقاف میں گذرا۔ واقعۂ دوم، زمانۂ جاہلیت میں عادت تھی کہ جب کسی جنگل یا وادی میں دوران سفر قیام کی نوبت آتی تو اس اعتقاد سے کہ جنات کے سردار ہماری حفاظت کریں گے یہ الفاظ کہا کرتے تھے اعوذ بعزیز ھذا الوادی من شر سفہاء قومہ یعنی میں اس جنگل کے سردار کی پناہ لیتا ہوں اس کی قوم کے بیوقوف شریر لوگوں سے۔ واقعۂ سوم، مکہ مکرمہ میں آپ کی بددعا سے قحط پڑا تھا اور کئی سال تک رہا۔ واقعۂ چہارم، جب آپ نے دعوت اسلام شروع کی تو کفار مخالفین کا آپ کے خلاف ہجوم اور نرغہ ہوا۔ پہلے دو واقعے تفسیر دُرِّ منثور سے اور آخری دو تفسیر ابن کثیر سے لئے گئے ہیں۔

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر (اپنی قوم میں واپس جا کر) انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے (قرآن ہونا تو اُس کے مضمون سے معلوم ہوا اور عجیب ہونا اس سے کہ مشابہ کلام بشر کے نہیں) اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے (یہ بیان ہے آمنّا بہٖ کا) اور (انہوں نے ان مضامین کا بھی باہم تذکرہ کیا جو ذیل میں آئے ہیں اور وہ مضامین یہ ہیں کہ) ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے اُس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ اولاد (کیونکہ ایسا ہونا عقلاً محال ہے۔ یہ بیان ہے لن نشرک کا) اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے (مراد اس سے کلماتِ شرک بیوی اور اولاد کا اثبات وغیرہ ہیں) اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے (کیونکہ بڑی بے باکی کی

بات ہے اس میں وجہ اپنے مشرک ہونے کی بیان کی کہ چونکہ اکثر جن و انس شرک کرتے تھے ہم سمجھے کہ خدا کی شان میں اتنے شخصوں نے جھوٹ پر اتفاق نہ کیا ہوگا، بس ہم نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیا حالانکہ محض لوگوں کا اتفاق کوئی دلیل حقانیت ہے اور نہ ہر اتفاق کا اتباع مذہب اور یہ شرک مذکور تو مشترک تھا، اور ایک شرک خاص تھا بعضے آدمیوں کے ساتھ جس سے جنات کا کفر اور بڑھ گیا تھا وہ یہ کہ) بہت سے لوگ آدمیوں میں سے ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعضے لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، سو ان آدمیوں نے ان جنات کی بد دماغی اور بڑھا دی (کہ وہ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ ہم جنات کے سردار تو پہلے سے تھے اب آدمی بھی ہم کو ایسا بڑا سمجھتے ہیں بس اس سے بد دماغی بڑھی اور کفر و عناد پر اور زیادہ مصر ہوگئے۔ یہاں تک مضمون متعلق توحید کے تھا، اور (آگے بعث یعنی قیامت کے متعلق ہے یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (لیکن یہ مضمون بھی غلط ثابت ہوا اور بعث کا حق ہونا معلوم ہوا) اور (آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) ہم نے آسمان کی خبروں کی (موافق عادت سابقہ کے) تلاشی لینی چاہا سو ہم نے اس کو سخت پہرہ (یعنی محافظ فرشتوں) اور شعلوں سے (کہ ان کے ذریعہ سے حفاظت کی جاتی ہے) بھرا ہوا پایا (یعنی اب پہرہ ہو گیا کہ کوئی حق آسمانی خبر نہ لینے پائے، اور جو جاوے شہاب ثاقب سے مارا جائے) اور (اس کے قبل) ہم آسمان (کی خبر سننے) کے موقعوں میں (خبر) سننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے (اور یہ موقع خواہ جزو آسمان ہی کے ہوں اور یا اجزاء ہوا یا کسی ملد یا غار کے ہوں جو کہ آسمان کے قریب ہوں اور جنات بہ سبب لطافت و عدم ثقل کی وجہ سے اس پر مستقر ہو سکتے ہوں جیسے بعض پرندے ہوا میں چپکے چپکے ٹھہر جاتے ہیں) سو جو کوئی اب سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے (اور تحقیق مباحث شہاب کی سورۂ حجر کے رکوع دوم میں گذری ہے، یہ مضمون رسالت کے متعلق ہے مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت دی ہے اور دفع التباس کے لئے باب کہانت بند کیا ہے اور اس بندش یعنی خبروں کی چوری کا بند ہونا ہی سبب ہوا اس جنات کے جستجو کا آپ کی خدمت میں، جیسا واقعہ اوّل میں مذکور ہے، اور (آگے مضامین مذکورہ کے متممات ہیں کہ) ہم نہیں جانتے کہ ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے سے، زمین والوں کو کوئی تکلیف دینی مقصود ہے یا ان کے رب نے ان کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے (یعنی مقصود تکوینی ارسال رسل کا معلوم نہیں کیونکہ رسول کے اتباع سے تو ہدایت ہوتی ہے اور مخالفت سے مضرت و عقوبت اور اتباع اور مخالفت آئندہ کا ہم کو علم نہیں اس لئے ہم یہ نہیں جانتے کہ ان کے بھیجنے سے قوم کو سزا دینا مقصود ہے یا ہدایت دینا، شاید یہ اس لئے کہا کہ ان کو اپنی قوم کا اندازہ تھا کہ ایمان لانے والے کم ہوں گے اور وہ سزا کے مستحق ہو جائیں گے، اور یہ نفی علم غیب سے تقویت ہے مضمون توحید کی کہ دیکھو بعضے لوگ علم غیب کو جنات کی طرف نسبت کرتے ہیں مگر ان کو اتنی بھی خبر نہیں) اور ہم میں (پہلے سے بھی) بعضے نیک (ہوتے آئے) ہیں اور بعضے اور طرح کے (ہوتے

آئے ہیں (غرض ہم مختلف طریقوں پر تھے (اسی طرح ان نبی کی خبر سُن کر اب بھی ہم میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں) اور ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین (کے کسی حصہ) میں (جاکر) اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ (دوسری کہیں) بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں (بھاگنے سے مُراد زمین کے علاوہ آسمان وغیرہ میں بھاگ جانا ہے جو فی الارض کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے فہو کقولہ تعالیٰ ما انتم بمعجزین فی الارض ولا فی السماء اس سے بھی مقصود مثل سابق کے کافروں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے اور یہ کہنا کہ مختلف طریقوں کے ہیں اس سے شاید یہ مقصود ہو کہ باوجود حق کے واضح ہوجانے کے بعض کا ایمان نہ لانا حق نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ تو پہلے سے ہوتا آیا ہے) اور ہم نے جب ہدایت کی بات سُن لی تو ہم نے تو اس کا یقین کرلیا سو ہمارا یہ حال ہے، سو جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آوے گا تو اس کو نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا (کمی یہ کہ اس کی کوئی نیکی لکھنے سے رہ جائے اور زیادتی یہ کہ کوئی گناہ زیادہ لکھ لیا جاوے شاید مقصود اس سے ترغیب ہو اور ہم میں بعضے تو وہی مضامین انذار و ترغیب کو سمجھ کر مسلمان ہوگئے) ہیں اور بعضے ہم میں بدستور سابق بے راہ ہیں سو جو شخص مسلمان ہوگیا انہوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈھ لیا (جس پر ثواب مرتب ہوگا) اور جو بے راہ ہیں وہ دوزخ کے ایندھن ہیں (یہاں تک کلام جنات کا ختم ہوگیا جو معمول ہے قُل اُوحِیَ کا اور آگے اُوحِیَ اِلیَّ کے دوسرے معمولات ہیں یعنی مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی ہے، ایک یہ کہ اگر یہ مکہ والے لوگ (سیدھے) رستے پر قائم ہوجاتے تو ہم اُن کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ اس میں ان کا امتحان کریں (کہ نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری و نافرمانی کرتے ہیں مطلب یہ کہ اگر اہل مکہ شرک نہ کرتے جس کی مذمت اوپر بضمن کلام جنات آچکی ہے تو اُن پر قحط مسلط نہ ہوتا جیسا واقعہ ثالثہ میں مذکور ہے مگر انہوں نے بجائے ایمان کے اعراض کیا اس لئے مُبتلائے قحط ہوئے) اور (عقوبت کفر میں کچھ تخصیص اہل مکہ کی نہیں بلکہ) جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان و اطاعت) سے روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہے (یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جاوے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو جیسا مشرکین کرتے تھے) سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو (اس مضمون میں بھی توحید کی تقریر ہے جس کا اوپر ذکر تھا) اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جب خدا کا خاص بندہ (مُراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو ہوجاتے ہیں (یعنی تعجب و عداوت سے ہر شخص اس طرح دیکھتا ہے جیسے اب حملہ کرنے کے لئے بھیڑ لگا چاہتی ہے یہ بھی تتمہ ہے مضمون توحید کا کیونکہ اس میں مذمت ہے مشرکین کی کہ توحید سے ان کو عداوت اور نفرت ہے آگے اس تعجب

یعنی تبلیغ احکام یعنی وحی کے وقت) محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (تاکہ وہاں شیاطین کا گذر نہ ہو کہ وحی کو فرشتے سے سن کر اور کسی سے جا کہیں یا کسی وسوسہ وغیرہ کا القاء کر سکیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے پہرہ دار فرشتے چار تھے کما فی روح المعانی اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ (اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک بحفاظت) پہنچا دیئے (اور اس میں کسی کا دخل و تصرف نہیں ہوا اور پہنچانے والا تو صرف وحی کا فرشتہ ہے لیکن معیت کی وجہ سے رصد یعنی محافظ فرشتوں کی طرف بھی اسناد فعل کی کر دی) اور اللہ تعالیٰ ان (پہرہ داروں) کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے (اس لئے پہرہ دار ایسے مقرر کئے گئے ہیں جو اس کام کے پورے اہل ہیں) اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے (پس وحی کے سب اجزاء ایک ایک کر کے اس کو معلوم ہیں۔ اور وہ سب کی پوری حفاظت کرتا ہے۔ حاصل مقام یہ کہ تعیین قیامت کا علم علوم نبوت سے نہیں، اس لئے اس کا علم نہ ہونا نبوت کے منافی نہیں البتہ علوم نبوت عطا کئے جاتے ہیں اور ان میں احتمال خطا کا نہیں ہوتا تو ایسے علوم سے تم مستفید ہو اور زوائد کی تحقیق چھوڑ دو)

معارف و مسائل

نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ لفظ نفر تین سے دس تک عدد کے لئے بولا جاتا ہے۔ جن جنات کا یہاں ذکر ہے روایت یہ ہے کہ یہ نو حضرات تھے نصیبین کے رہنے والے۔

جنات کی حقیقت | جن مخلوقات الٰہیہ میں ایک ایسی مخلوق کا نام ہے جو ذی اجسام بھی ہیں ذی روح بھی اور انسان کی طرح عقل و شعور والے بھی مگر لوگوں کی نظروں سے مخفی ہیں، اسی لئے ان کا نام جن رکھا گیا کہ جن کے لفظی معنے مخفی کے ہیں۔ ان کی تخلیق کا غالب مادہ آگ ہے جیسے انسان کی تخلیق کا غالب مادہ مٹی ہے۔ اس نوع میں بھی انسان کی طرح نر و مادہ یعنی مرد و عورت ہیں اور انسان ہی کی طرح ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ قرآن میں جن کو شیاطین کہا گیا ہے وہ بھی جنات ہی میں سے شریر لوگوں کا نام ہے۔ جنات اور فرشتوں کا وجود قرآن و سنت کی قطعی دلائل سے ثابت ہے جس کا انکار کفر ہے (تفسیر مظہری)

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ سے معلوم ہوا کہ جنات کے جس واقعہ کا یہاں ذکر ہے اس میں آپ نے قرآن سننے والے جنات کو دیکھا نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو اطلاع دی۔

واقعہ کی تفصیل | سورۂ جن کے نزول کے متعلق بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس واقعہ میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنات کو قرآن بالقصد سنایا نہیں بلکہ اُن کو دیکھا بھی نہیں، بلکہ واقعہ یہ پیش آیا کہ آپ اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بازار عکاظ کی طرف جا رہے تھے

عداس تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا کیا مذہب ہے۔ اس نے کہا میں نصرانی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو اللہ کے نیک بندے یونس بن متی علیہ السلام کی بستی کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا کہ آپ کو یونس بن متی کی کیا خبر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے میں بھی نبی ہوں۔

یہ سُن کر عداس آپ کے قدموں پر گر پڑا اور آپ کے سر مبارک اور ہاتھوں پاؤں کو بوسہ دیا۔ عتبہ اور شیبہ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس نے ہمارے غلام کو تو خراب کر دیا۔ جب عداس لوٹ کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا۔ عداس تجھے کیا ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کو بوسے دیئے تھے۔ اس نے کہا کہ میرے سردارو۔ اس وقت زمین پر اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتلائی جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ انھوں نے کہا کمبخت ایسا نہ ہو کہ یہ آدمی تجھے تیرے مذہب سے پھیر دے۔ کیونکہ تیرا دین بہرحال اس کے دین سے بہتر ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گئے جبکہ ثقیف کی بہتری سے مایوس ہو گئے۔ واپسی میں آپ نے مقام نخلہ پر قیام فرمایا اور آخر شب میں نماز تہجد پڑھنے لگے۔ تو ملک یمن نصیبین کے جنات کا یہ وفد بھی وہاں پہنچا ہوا تھا اس نے قرآن سنا اور سن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم کی طرف واپس جا کر واقعہ بتلایا جس کا ذکر اللہ تعالٰے نے آیات مذکورہ میں نازل فرمایا۔ (مظہری)

ایک صحابی جن کا واقعہ | ابن جوزی نے کتاب الصفوہ میں اپنی سند کے ساتھ حضرت سہل بن عبداللہ سے نقل کیا کہ انھوں نے ایک مقام پر ایک بوڑھے جن کو دیکھا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ رہا ہے اور اون کا جبہ پہنے ہوئے تھا جس پر بڑی رونق معلوم ہوتی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سہل کہتے ہیں کہ میں نے ان کو سلام کیا اور انھوں نے سلام کا جواب دے کر بتایا کہ تم اس جبہ کی رونق سے تعجب کر رہے ہو یہ جبہ سات سو سال سے میرے بدن پر ہے۔ اسی جبہ میں میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی پھر اسی جبہ میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ اور میں ان جنات میں سے ہوں جن کے بارہ میں سورۂ جن نازل ہوئی ہے۔ (مظہری)

اور روایات حدیث میں جو لیلۃ الجن کا واقعہ مذکور ہے جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کے ساتھ تھے اس میں آپ کا بالقصد جنات کو تبلیغ و دعوت کے لئے مکہ مکرمہ کے قریب جنگل میں جانا اور قرآن سنانا منقول ہے وہ بظاہر اس واقعہ کے بعد کا قصہ ہے جس کا ذکر سورۂ جن میں آیا ہے۔

اور علامہ خفاجیؒ نے فرمایا کہ احادیث معتبرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنات کے وفود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے ہیں اس لئے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے [illegible]

والے واقعہ میں آپؐ کو جنات کے آنے اور قرآن سننے کی خبر بھی نہ تھی جب تک بذریعہ وحی آپ کو بتلایا نہ گیا اور یہ کہ یہ واقعہ مقام نخلہ کا اور طائف سے واپسی کے وقت کا ہے۔ اور دوسری روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر مکہ کے قریب ہی کے جنگل میں آپؐ بالقصد اسی کام کے لئے تشریف لے گئے کہ جنات کو دعوتِ اسلام دیں اور قرآن سنائیں یہ اس کے بعد پیش آیا (مظہری)

وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا جد کے معنے شان کے ہیں حق تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے، تعالیٰ جدّہٗ یعنی بلند و بالا ہے اس کی شان۔ یہاں جدّہٗ کی ضمیر راجع کرنے کے بجائے لفظ ربّ مظہر رکھ دیا گیا جس میں اس علوشان کی دلیل بھی آگئی کیونکہ جو ذات مخلوق کی پروردگار ہے اس کا سب مخلوق سے عالی شان ہونا ظاہر ہے۔

اس آیت میں وَاَنَّهٗ کے عطف اور ترکیب نحوی میں مفسرین کا کلام طویل ہے عوام کو اسکی حاجت نہیں۔

وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۔ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا۔ لفظ شططا کے معنے قول بعید از عقل اور ظلم و جور کے آتے ہیں، مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک و کفر میں مبتلا رہنے کا عذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کہا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کر سکتا ہے اس لئے ان بے وقوفوں کی بات میں آکر آج تک ہم کفر و شرک میں مبتلا تھے اب قرآن سنا تو حقیقت کھلی۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا۔ اس آیت میں مومن جنات نے یہ بیان کیا ہے کہ جاہلیت کے لوگ جب کسی جنگل میں قیام کرتے تو اس جنگل کے جنات کی پناہ مانگتے تھے اس سے جنات یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو انسان سے بھی افضل ہیں کہ انسان بھی ہماری پناہ لیتے ہیں۔ اس بات نے جنات کی گمراہی میں اور اضافہ کر دیا۔

حضرت رافع بن عمیرؓ کا واقعہ تفسیر مظہری میں ہے کہ ہواتف الجن میں سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؓ سے اسی سلسلہ میں یہ نقل کیا ہے کہ رافع بن عمیر صحابیؓ نے اپنے اسلام قبول کرنے کا ایک واقعہ یہ بتلایا ہے کہ میں ایک رات ایک ریگستان میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا میں اپنی اونٹنی سے اترا اور سو گیا اور سونے سے پہلے میں نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق یہ الفاظ کہہ لئے انی اعوذ بعظیم ھذا الوادی من الجن یعنی میں پناہ لیتا ہوں اس جنگل کے جنات کے سردار کی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے اس کو وہ میری ناقہ کے سینہ پر رکھنا چاہتا ہے، میں گھبرا کر اٹھا اور دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا تو میں نے دل میں کہا کہ یہ شیطانی خیال ہے

الکھّان فیکذبون معھا مائۃ کذبۃ من عند انفسھم (مظہری) — جُڑتے ہیں اور سُن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں، وہ اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر اُن کو بتاتے ہیں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اصل آسمانوں میں پیش آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم آسمان میں جاری فرماتے ہیں تو سب فرشتے بغرض اطاعت اپنے پر مارتے ہیں اور جب کلام ختم ہو جاتا ہے تو باہم تذکرہ کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ اس تذکرہ کو آسمانی خبریں چُرانے والے شیاطین سُن لیتے ہیں اور کاہنوں کے پاس اُس میں بہت سے جھوٹ شامل کرکے پہنچاتے ہیں۔

یہ مضمون حدیث عائشہؓ مذکورہ کے منافی نہیں کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیاطین آسمانوں میں جا کر یہ خبریں چُراتے ہیں بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ خبریں درجہ بدرجہ آسمانوں میں فرشتوں کے اندر پھیلتی ہوں، پھر فرشتے عنان سما یعنی بادل تک آتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوں یہاں سے شیاطین خبروں کی چوری کرتے ہوں جیسا کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے (کذا فی المظہری)۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سُن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا۔ شیاطین بادلوں تک پہنچ کر فرشتوں سے سُن لیا کرتے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کی آسمانی وحی کی حفاظت کیلئے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان یہ خبریں سُننے کے لئے اوپر آتا تو اُس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا۔ یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی شیاطین جنات کو فکر ہوئی اور تحقیق حال کے لئے دنیا کی مشرق و مغرب میں وفود بھیجے، پھر مقام نخلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک وفد جنات کا قرآن سُن کر ایمان لانا سورۃ جن میں ذکر فرمایا گیا۔

شہاب ثاقب نزول قرآن سے پہلے بھی تھے مگر [illegible] — یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا اصطلاح میں انقضاض کوکب کہتے ہیں، یہ تو دنیا میں قدیم زمانہ سے ہوتا آیا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی تخصیص ہے۔ جواب یہ ہے کہ شہاب ثاقب کا وجود تو پہلے سے تھا خواہ اس کی حقیقت وہ ہو جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں کہ زمین سے کچھ آتشیں مادے فضا میں پہنچتے ہیں وہ کسی وقت بھڑک اُٹھتے ہیں، یا یہ ہو کہ خود کسی ستارہ اور سیارہ سے یہ آتشیں مادہ نکلتا ہو، بہرحال اس کا وجود اگرچہ ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔ اس کی پوری تفصیل سورۃ حجر کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا، یعنی جنات و شیاطین کو آسمانی خبریں سننے سے روک دینا بطور سزا کے بھی ہو سکتا ہے کہ زمین والوں کو آسمانی خبریں نہ ملا کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے یہ ہدایت کا سامان کیا ہو کہ جنات و شیاطین وحی آسمانی میں کوئی خلل نہ ڈال سکیں۔

فَمَنْ یُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا۔ بخس بفتح الباء و سکون الخاء کے معنے حق سے کم دینے اور کم کرنے کے ہیں اور رہق کے معنے ذلت و رسوائی طاری ہونا۔ مراد یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے نہ اس کی جزا میں کوئی کمی ہو سکتی ہے نہ آخرت میں اس کو کوئی ذلت و رسوائی پیش آ سکتی ہے۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ مساجد جمع مسجد ہے۔ یہاں اس کے معروف مشہور معنے بھی لئے جا سکتے ہیں یعنی وہ عبادت گاہیں جو نماز کے لئے وقف کی ہوتی ہیں وہ مسجد کہلاتی ہیں اس صورت میں معنے آیت کے یہ ہوں گے کہ جب سب مساجد صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں تو تم مسجدوں میں جا کر اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لئے نہ پکارو جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادتگاہوں میں اس شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ حاصل اس کا مساجد کو عقائد فاسدہ اور اعمال باطلہ سے پاک رکھنا ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مساجد، مسجد بفتح الجیم کی جمع ہو جو مصدر میمی بمعنے سجدہ آتا ہے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ سب سجدے صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں، اور جو شخص غیر اللہ کو اعانت کیلئے پکارتا ہے گویا وہ اس کو سجدہ کرتا ہے۔ غیر اللہ کے سجدہ سے اجتناب کرو۔

مسئلہ: باجماع امت غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اور بعض علماء کے نزدیک کفر ہے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ، ان آیتوں میں سے پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ آپ ان منکرین سے جو آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں یہ فرما دیجئے کہ قیامت کا آنا اور وہاں جزاء و سزا ہونا تو یقینی ہے لیکن اس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اور وقت کو اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتلایا اس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ روز قیامت قریب آ پہنچا ہے یا میرا رب اس کے لئے کوئی دور کی مدت مقرر کر دیگا۔ دوسری آیت میں اس کی دلیل ارشاد فرمائی۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا۔ یعنی قیامت کے وقت معین سے میری بے خبری اس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے۔ اس لئے وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی غالب و قادر نہیں بناتا۔ یہاں عالم الغیب میں الغیب کا الف لام استغراق جنس کیلئے ہے (روح المعانی عن الرضی) یعنی عالم ہر فرد غیب اور جنس غیب کا۔ اور علیٰ غیبہ میں غیب کی اضافت اللہ کی طرف کرنے سے

بھی اسی استغراق و جامعیت کا اظہار مقصود ہے یعنی ہر ہر فرد و جنس غیب کا علم جو اللہ رب العالمین کا مخصوص وصف ہے اس پر وہ کسی کو قادر و غالب نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو چاہے معلوم کرلے۔

مقصود اس آیت سے علم غیب کلی کا جس سے جہان کا کوئی ذرہ مخفی نہ ہو اس کی غیر اللہ سے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اثبات ہے۔ لیکن کسی بے وقوف کو اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بھی غیب کی چیز کی خبر نہیں تو پھر وہ رسول کیا ہوئے کیونکہ رسول کے پاس تو اللہ تعالیٰ کے ہزاروں غیب کی خبریں بذریعہ وحی بھیجتے ہیں۔ اور جس کے پاس اللہ کی وحی نہ آئے وہ نبی و رسول نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے آگے آیت میں ایک استثناء کا ذکر فرمایا۔

علم غیب اور غیب کی خبروں میں فرق

إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا۔ اس استثناء کا اس سفیہانہ شبہ کا یہ جواب ہے کہ علم غیب کلی کی نفی سے ہر غیب کی نفی مطلقاً مراد نہیں بلکہ منصب رسالت کے لئے جس قدر علم غیب کی خبروں اور غیب کی چیزوں کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ ان کو منجانب اللہ بذریعہ وحی دیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اس میں کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ اس میں اول تو لفظ رسول سے اس غیب کی نوعیت متعین کر دی گئی جس کا علم رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اور وہ ظاہر ہے علم شرائع و احکام بتمامہ اور غیب کی خبریں بقدر ضرورت وقت۔ اس کے بعد جو علم غیب رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اگلے جملے سے یوں بھی متعین کر دی کہ وہ بذریعہ فرشتوں کے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتے کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس استثناء سے جس علم غیب کا نبی و رسول کے لئے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علم غیب ہے جس کی ضرورت منصب رسالت کے لئے درپیش ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے، یعنی جس علم غیب کلی کی اصل کلام میں غیر اللہ سے نفی کی گئی تھی مستثنیٰ میں اس کا اثبات نہیں بلکہ مخصوص علوم غیبیہ کا اثبات ہے جس کو قرآن کریم میں جا بجا أَنبَاءِ الْغَيْبِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ۔

بعض ناواقف غیب اور انباء الغیب میں فرق نہیں سمجھتے اس لئے وہ انبیاء اور خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کلی ثابت کرتے ہیں اور آپ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ہر ذرہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کھلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نعوذ باللہ منہ۔ اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلا دے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں

غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا اُن کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے جب اُن کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوت و رسالت کی نفی ہو جاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں۔

آخر سورت میں فرمایا وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات خاص ہے جس کے علم میں ہر چیز کے اعداد و شمار ہیں۔ اُس کو پہاڑوں کے اندر جتنے ذرے ہیں اُن کا بھی عدد معلوم ہے، ساری دنیا کے دریاؤں میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اُس کے علم میں ہے۔ ہر بارش کے قطروں اور تمام دُنیا کے درختوں کے پتّوں کے اعداد و شمار کا اُسی کو علم ہے۔ اس میں پھر علم غیب کلّی کا ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا واضح کر دیا کہ کسی کو مذکورہ استثنار سے غلط فہمی نہ ہو جائے۔

مسئلہ علم غیب کے معنے اور اُس کے احکام سُورۂ نمل کی آیت قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ کے تحت میں پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمت

بحمد اللہ تعالیٰ سُورۃ الجن لیلۃ الجمعۃ

۱۰ رجب ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّل

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ مزمل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا

ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ

فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَاصْبِرْ

عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي

النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا

ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ

الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ

ریت کے تودے پھسلتے ۔ ہم نے بھیجی تمہاری طرف رسول بتانے والا تمہاری باتوں کا

كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَۨا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰

خلاصۂ تفسیر

اے کپڑوں میں لپٹنے والے (وجہ اس عنوان سے خطاب کرنے کی یہ ہے کہ ابتداء نبوت میں قریش نے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ کے بارہ میں مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہئے کہ اس پر سب متفق رہیں۔ کسی نے لفظ کاہن کہا، اس کو دوسروں نے رد کر دیا، کسی نے

مجنوں کہا پھر اس کو بھی سب نے غلط قرار دیا۔ پھر ساحر کہا پھر بعض نے اس کو بھی رد کر دیا لیکن
پھر یہی کہنے لگے کہ ساحر اس لئے ہیں کہ دوست کو دوست سے جدا کر دیتے ہیں۔ آپ کو یہ خبر پہنچ کر
رنج ہوا اور رنج کی حالت میں لپٹ گئے۔ اکثر سوچ اور رنج میں آدمی اس طرح کر لیتا ہے اس لئے
آپ کو خوش کرنے اور لطف کا اظہار کرنے کیلئے اس عنوان سے خطاب فرمایا جیسا کہ حدیث میں
ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب فرمایا تھا۔ غرض آپ کو خطاب ہے کہ ان باتوں کا رنج نہ کرو بلکہ
حق تعالیٰ کی طرف مداومت کے ساتھ اور زیادہ توجہ رکھو اس طرح سے کہ) رات کو (نماز میں) کھڑے
رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ اس میں آرام کرو، یا اس نصف سے کسی قدر کم کر دو
(یعنی نصف سے کم قیام کرو اور نصف سے زیادہ آرام کرو، اور اس نصف سے کم کا مصداق ایک
ثلث ہے بقرینہ قولہ تعالیٰ فیما بعد وَثُلُثَهٗ) یا نصف سے کچھ بڑھا دو (یعنی نصف سے زیادہ قیام کرو
اور نصف سے کم آرام کرو اور اس نصف سے زیادہ کا مصداق قریب دو ثلث کے ہے بقرینہ قولہ تعالیٰ
فیما بعد اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ، غرض قیام لیل تو امر وجوبی سے فرض ہوا مگر مقدار وقت قیام میں تین
صورتوں میں اختیار ہے نصف شب، دو تہائی شب، ایک تہائی شب) اور (اس قیام لیل میں)
قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (کہ ایک ایک حرف الگ الگ ہو اور یہی حکم غیر صلوٰۃ میں بھی ہے
اور تخصیص محض مقام کی وجہ سے ہے۔ آگے قیام اللیل کے حکم کی علت اور حکمت کا بیان ہے کہ) ہم تم پر
ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں (مراد قرآن مجید ہے جو نزول کے وقت بھی آپ کی حالت کو متغیر کر دیتا
تھا جیسا حدیثوں میں ہے کہ ایک بار آپ کی ران زید بن ثابت کی ران پر رکھی تھی، اس وقت وحی نازل
ہوئی تو زید بن ثابت کی ران پھٹنے لگی اور جب آپ نزول وحی کے وقت ناقہ پر سوار ہوتے تو ناقہ گردن
ڈال دیتی اور حرکت نہ کر سکتی اور شدت کے جاڑوں میں آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے۔ پھر علاوہ اس کے
اس کا محفوظ رکھنا پھر دوسروں تک پہنچانے میں کلفتیں برداشت کرنا ان اعتبارات سے ثقیل کہا گیا۔
اور مقصود یہ ہے کہ قیام لیل کو شاق نہ سمجھنا ہم تو اس سے بھی بھاری بھاری کام تم سے لینے والے ہیں
قیام اللیل کا حکم آپ کو اسی لئے دیا گیا ہے کہ آپ خوگر ہوں ریاضت کے جس سے استعداد نفس اکمل
واقوی ہو کیونکہ ہم آپ پر قول ثقیل نازل کرنے والے ہیں تو اس کے لئے اپنی استعداد کا قوی کرنا ضروری
ہے۔ آگے قیام لیل کی دوسری مصلحت ہے کہ) بے شک رات کا اٹھنا خوب مؤثر ہے (نفس کے
کچلنے میں خواہ دعا ہو یا قرأت ہو) اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے (ظاہراً تو اس طرح کہ فرصت
کا وقت ہوتا ہے اس لئے دعا و قرأت کے خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں اور باطناً اس طرح کہ
جی خوب لگتا ہے اور موافقت دل وزبان کی جو مطلوب ہے اور اس کا علت ہونا ظاہر ہے۔ آگے
ایک تیسری علت ہے جس میں تخصیص شب کی حکمت کا بیان ہے وہ یہ کہ) بے شک تم کو دن میں بہت

کام رہتا ہے دنیوی بھی جیسے تدبیر مہمات خانہ داری اور دینی بھی جیسے تبلیغ اس لئے ان کاموں کے لئے
رات تجویز کی گئی) اور (علاوہ قیام لیل کے تہلیل کا ورد رکھو دوسرے اوقات میں بھی) اپنے رب
کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع تعلق کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو (یعنی ذکر و تبتل ہر وقت
کا فرض ہے اور قطع تعلق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا تعلق مخلوق کے سب تعلقات پر غالب
ہے، آگے توحید ہے جو اس کی تاکید اور تعلیل ہے یعنی) وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے
سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اس کو اپنے کام سپرد کرنے کیلئے قرار دئیے رہو اور یہ لوگ جو باتیں
کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ (الگ ہونا یہ کہ کوئی تعلق نہ رکھو
اور خوبصورتی سے یہ کہ ان کی شکایت و انتقام کی فکر میں مت پڑو) اور (آگے ان کے عذاب کی خبر
دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے) مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو نازو نعمت میں
رہنے والوں کو (حالت موجودہ پر) چھوڑ دو (یعنی [illegible] فکر نہ کرو [illegible]
[illegible]) اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دے دو یہ کنایہ ہے صبر و انتظار سے یعنی
کچھ دن اور صبر کر لیجئے عنقریب ان کو سزا ہونے والی ہے کیونکہ ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ
ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے وھذا کقولہ یتجرعہ ولا یکاد یسیغہ اور دردناک
عذاب ہے (یعنی ان لوگوں کو ان چیزوں سے سزا دی جاوے گی اور یہ سزا اس روز ہوگی) جس روز
زمین و پہاڑ ہلنے لگیں اور پہاڑ (ریزہ ریزہ ہو کر) ریگ رواں ہو جائیں گے (پھر آگے بیچ میں سے آگے
مکذبین مذکورین کو بطور التفات کے خطاب ہے جس میں اثبات رسالت و تحقیق وعید بھی ہے یعنی)
بے شک ہم نے تمہارے پاس ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر (قیامت کے روز) گواہی دیں گے
(کہ ان لوگوں نے تبلیغ کے بعد یہ رد و کد کیا) جیسا ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا پھر
فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اس کو سخت پکڑنا پکڑا سو اگر تم (بھی بعثت رسول کے بعد
نافرمانی اور) کفر کرو گے تو (تم کو بھی ایک روز تم کو بھی مصیبت بھگتنی پڑے گی چنانچہ وہ مصیبت کا
دن آنے والا ہے سو تم) اس دن (کی مصیبت) سے کیسے بچو گے جو (اپنی شدت اور طول کی وجہ سے)
بچوں کو بوڑھا کر دے گا جس میں آسمان پھٹ جاوے گا بے شک اس کا وعدہ ضرور ہو کر رہے گا (اس کا
بھی احتمال نہیں ہے کہ وہ وقت ٹل جاوے) یہ (تمام مضمون) ایک بلیغ نصیحت ہے سو جس کا
جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف رستہ اختیار کرے (یعنی اس تک پہنچنے کے لئے دین کا رستہ قبول
کرے، آگے اس قیام لیل کی فرضیت کا نسخ ہے جو شروع سورت میں مذکور تھا یعنی) آپ کے
رب کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعضے آدمی کبھی دو تہائی رات کے
قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور رات اور دن

کیونکہ رہبانیت اصطلاح شرع میں اُس ترکِ دُنیا اور ترکِ تعلقات کا نام ہے جس میں تمام لذائذ اور حلال طیب اشیاء کو بہ نیت عبادت چھوڑ دیا جائے یعنی یہ اعتقاد ہو کہ ان حلال چیزوں کے چھوڑے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل نہیں ہو سکتی۔ یا عملاً ترکِ تعلقات اس طرح کرے کہ لوگوں کے حقوق واجبہ کی رعایت نہ کرے اُن میں خلل آئے اور یہاں جس تبتل اور ترکِ تعلق کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق پر کسی دوسری مخلوق کا تعلق غالب نہ آجائے خواہ اعتقاداً یا عملاً اور ایسا ترکِ تعلق دُنیوی تمام معاملات ازدواج و نکاح اور تعلقات رشتہ داری وغیرہ کے منافی نہیں بلکہ ان سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت خصوصاً سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی اور شمائل اس پر شاہد ہیں۔ یہاں بجائے مصدر مانوس تبتل کے تبتیل لیا گیا ہے اسی کا دوسرا عنوان سلف صالحین کی زبان میں اخلاص ہے۔ (مظہری)

فائدہ عجیبہ | ذکر اللہ کی کثرت اور تعلقاتِ دُنیا کے ترک کے معاملہ میں صوفیائے کرام سلفاً و خلفاً سب سے آگے رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم جس مسافت کو طے کرنے اور راستہ قطع کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں درحقیقت اُس کے دو قدم ہیں۔ پہلا قدم مخلوق سے انقطاع ہے اور دوسرا قدم وصول الی اللہ ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ آیت مذکورہ میں اُنہیں دو قدموں کو دو جملوں میں عطف کرکے بیان فرمایا گیا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔

یہاں ذکر اللہ سے مراد اُس پر ایسی مداومت ہے جس میں کبھی قصور و فتور نہ ہو اور کسی وقت اُس سے ذہول نہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں وُصُول الی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح پہلے جملے میں آخری قدم کا ذکر فرمایا اور دوسرے جملے میں پہلے قدم کا۔ یہ ترتیب شاید اس لئے بدل گئی کہ اگرچہ عمل میں تبتل یعنی قطع تعلقات (بالمعنے المذکور) مقدم ہے اور وصول الی اللہ اسکے بعد اُس پر مرتب ہوتا ہے مگر چونکہ مقصد سالک کا یہ دوسرا ہی قدم ہے اور یہی درحقیقت مقصود المقاصد ہے اس کی اہمیت و افضلیت بتلانے کے لئے ترتیب طبعی وقوعی کو بدل کر ذکر اللہ کو مقدم بیان فرمایا گیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے انھیں دو قدموں کو خوب بیان فرمایا ہے ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی ✽ چو پیوندہا بگسلی واصلی

ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مامور بہ ذکر و عبادت ہے | اس آیت میں ذکر اللہ کے حکم کو لفظ اسم کیساتھ مقید کر کے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا ہے وَاذْكُرْ رَبَّكَ نہیں فرمایا اسمیں اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسم رب یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مطلوب مامور بہ ہے (مظہری) بعض علماء نے جو صرف اسم ذات اللہ اللہ کے تکرار کو بدعت کہدیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسکو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا، وکیل لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو کوئی کام سپرد کیا جائے۔ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے سب کاروبار

معاملات اور حالات کو اللہ کے سپرد کردینے ہی کا نام اصطلاح میں توکل ہے۔ اس صورت میں یہ ارشاد جو
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں یہ انہیں پانچواں حکم ہے۔ امام یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ
شروع سورت سے اس آیت تک مقامات سلوک کی طرف اشارہ ہے یعنی رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت
کے لئے خلوت۔ قرآن کریم میں اشتغال۔ ذکر اللہ پر دوام۔ ماسوی اللہ سے انقطاع یعنی تبتل۔ اللہ تعالیٰ
پر توکل۔ توکل کے آخری حکم سے پہلے اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ بیان کرکے اس طرف
اشارہ کردیا کہ جو ذات پاک مشرق و مغرب یعنی سارے جہان کی پالنے والی اور ان کی تمام ضروریات ابتدا
سے انتہا تک پورا کرنے کی متکفل ہے۔ توکل اور بھروسہ کرنے کے قابل صرف وہی ذات ہوسکتی ہے اور
اس پر بھروسہ کرنے والا کبھی محروم نہیں رہ سکتا جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ
فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ پر توکل (بھروسہ) کرتا ہے اللہ اس کے (سب مہمات ومشکلات کیلئے) کافی ہوجاتا ہے۔

توکل کے معنی شرعی اللہ پر توکل اور بھروسہ کے یہ معنی نہیں کہ کسب معاش اور دفع بلا کے جو اسباب وآلات
قدرت حق نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ان کو معطل کرکے اللہ پر بھروسہ کرو، بلکہ حقیقت توکل کی یہ ہے کہ اپنے
مقاصد کے لئے اللہ کی دی ہوئی قوت وتوانائی اور جو اسباب میسر ہیں ان سب کو پورا استعمال کرو مگر اسباب مادیہ
میں غلو اور انہماک زیادہ نہ کرو اعمال اختیاریہ کو کر لینے کے بعد نتیجہ کو اللہ کے سپرد کرکے بے فکر ہوجاؤ۔

توکل کا یہ مفہوم خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ امام بغوی نے شرح السنہ میں اور بیہقی
نے شعب الایمان میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان روح القدس نفث فی روعی ان نفسا لن تموت
حتی تستکمل رزقها الا فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب (مظہری) یعنی روح القدس یعنی جبرئیل امین
نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی شخص اسوقت تک نہیں مریگا جب تک وہ اپنے مقدر میں لکھا
ہوا اللہ کا رزق پورا پورا حاصل نہیں کرلیگا، اس لئے تم خدا سے ڈرو اور اپنے مقاصد کی طلب میں اختصار
سے کام لو، زیادہ انہماک نہ ہو کہ قلب کی توجہ ساری انہیں مادی اسباب وآلات میں محصور ہو کر رہ جائے
اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ اور ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ ترک دنیا اس کا نام نہیں کہ تم اپنے اوپر اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرلو یا جو مال تمہارے پاس ہے
اسے خواہ مخواہ اڑا دو، بلکہ ترک دنیا کا نام ہے کہ تمہارا اعتماد اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس پر زیادہ ہو
بہ نسبت اسکے جو تمہارے ہاتھ میں ہے (مظہری)

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا، بقول امام کرخی یہ چھٹا حکم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو دیا گیا ہے یعنی لوگوں کی ایذاؤں اور گالیوں پر صبر جمیل۔ یہ مقامات سلوک میں سب سے اعلیٰ مقام ہے کہ دشمنوں
کی جفا وایذا پر صبر کیا جائے یعنی یہ حضرات جن لوگوں کی خیرخواہی اور ہمدردی میں اپنی ساری قوت وتوانائی اور
ساری عمر خرچ کرتے ہیں انہیں کی طرف سے اس کی جزا میں گالیاں، ایذائیں، طرح طرح کے جور وستم اٹھانا

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اسمیں آگ کے کانٹے ہونگے جو گلے میں پھنس جائیں گے (نعوذ باللہ منہ) آخر میں فرمایا وَعَذَابًا اَلِيمًا، ان متعین عذابوں کے ذکر کرنے کے بعد یہ مبہم لفظ لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا کہ اور عذاب ان سے بھی زیادہ شدید و سخت ہیں جن کا کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا (اکثرہا من مظہری)

سلف صالحین کا خوف آخرت | امام احمد، ابن ابی داؤد، ابن عدی اور بیہقی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے قرآن کی یہ آیت سنی تو خوف سے بیہوش ہوگیا، اور حضرت حسن بصریؒ ایک دن روزہ سے تھے افطار کے وقت کھانا سامنے آیا تو اس آیت کا دھیان آگیا، کھانا نہ کھا سکے اٹھوا دیا، اگلے روز بھی شام کو ایسا ہی ہوا، کھانا اٹھوا دیا، تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا تو انکے صاحبزادے حضرت ثابت بنانی اور یزید ضبی اور یحییٰ بکار کے پاس گئے اور حال سنایا، یہ تینوں حضرات آئے اور حضرت حسن کو کھانے کا بہت اصرار کرتے رہے جب مجبور ہو کر کچھ تناول فرمایا (روح المعانی)

آگے قیامت کے ہولناک واقعات کا بیان فرمایا يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ الآیۃ۔ اس کے بعد ارشاد کہ تو فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنا کر اس سے ڈرایا گیا کہ جس طرح فرعون اپنے زمانے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے گرفتار عذاب ہوا، تم بھی اس پر جمے رہے تو تمہارے اوپر بھی ایسا ہی کوئی عذاب دنیا میں آسکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر دنیا میں کوئی عذاب نہ بھی آیا تو قیامت کے اس دن کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکے گا جس کی ہولناکی اور ہول کی وجہ سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ روز قیامت کے شدید اور ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ اس میں لوگوں پر ایسا خوف اور ہول طاری ہوگا کہ اگر کوئی بچہ بھی ہو تو بوڑھا ہو جائے۔ غرض مراد اس سے ایک تمثیل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ مراد حقیقت ہے اور روز قیامت اسقدر طویل ہوگا کہ اس میں ایک بچہ بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے گا (قرطبی وروح)۔

قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی | شروع سورت میں قُمِ الَّيْلَ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں پر قیام اللیل کو فرض قرار دیا گیا تھا اور اس قیام کا طویل ہونا بھی فرض تھا، مگر اس کے طول میں اختیار دیا گیا تھا کہ آدھی رات سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور کم سے کم ایک تہائی رات ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھ صحابہ کرام کی ایک جماعت اس فرض کی ادائیگی میں اکثر عزیمت پر عمل فرماتے اور زیادہ سے زیادہ رات کا وقت اس نماز میں گزارتے تھے جو دو تہائی رات کے قریب ہوتا تھا۔ ہر رات میں یہ عمل پھر دن میں دین کی دعوت و تبلیغ اور ذاتی ضروریات خصوصاً صحابہ کرام کہ بیشتر محنت مزدوری یا تجارت کرتے تھے، اس طویل و ثقیل نماز کی پابندی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے پاؤں ورم کر آئے۔ ان کی یہ مشقت و محنت اللہ تعالیٰ کے سامنے تھی وہ اس سے بخوبی واقف تھے مگر علم الٰہی میں پہلے ہی سے متعین تھا کہ اتنی محنت کا فریضہ چند روز

ہی رکھا گیا تھا کہ آپ اور صحابہ کرام محنت و ریاضت کے خوگر ہو جائیں جس کی طرف آیات مذکورہ میں
إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپ سے یہ محنت و مشقت اسلئے لیجارہی ہے
کہ آپ کو قول ثقیل یعنی قرآن کی خدمت سپرد ہونے والی تھی جو اس مشقت سے بڑی مشقت ہے، بہرحال
علم ازلی کے مطابق جب یہ حکمت ریاضت و محنت کے خوگر بنانے کی پوری ہوگئی تو یہ فرض قیام اللیل
منسوخ کر دیا گیا۔ اور حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیات مذکورہ سے صرف
اول قیام کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو اصل نماز تہجد کا فرض بدستور رہا ہو پھر شب معراج میں پانچ نمازوں کی
فرضیت کے وقت نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی ہو، واللہ اعلم

اور ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام امت سے یہ فرض منسوخ کر دیا گیا البتہ اس کا استحباب
اور عند اللہ پسندیدہ ہونا پھر بھی باقی رہا اور اس میں بھی یہ آسانی کر دی گئی کہ وقت کی اور تلاوت قرآن کی
کوئی حد بندی نہیں رکھی گئی، ہر شخص اپنی اپنی طاقت و فرصت کے مطابق جتنے وقت میں ادا کر سکے کرلے اور
جتنا قرآن پڑھنا آسانی سے ہو سکے پڑھ لے۔

احکام شرعیہ کے منسوخ ہونے کی حقیقت، دنیا کی حکومتیں یا ادارے جو اپنے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں
اس کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ تجربہ کے بعد کوئی نئی صورت حال سامنے آتی ہے جو پہلے معلوم نہ تھی تو اس
صورت حال کے مطابق پہلے حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دیا جاتا ہے مگر احکام الٰہیہ میں اس کا کوئی
تصور و احتمال ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط ازلی اور ابدی سے کوئی چیز باہر نہیں کوئی نئی شئی
پیدا نہیں ہوتی جب لوگوں کے حالات رہیں گے کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی حق تعالیٰ کو پہلے سے معلوم ہے لیکن
باقتضائے حکمت و مصلحت کوئی حکم کچھ مدت کے لئے جاری کیا جاتا ہے پہلے ہی سے اس کا ہمیشہ کیلئے نہ ہونا مقصود
نہیں ہوتا بلکہ ایک مدت اس کے علم میں متعین ہوتی ہے کہ اس مدت تک یہ حکم جاری رہے گا مگر اس مدت کا اظہار
مخلوق پر بمصلحت نہیں کیا جاتا، الفاظ کے عموم سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم غیر موقت اور دائمی ہے، عند اللہ جو کی
مدت مقرر ہے جب وہ مدت ختم ہو کر حکم واپس لیا جاتا ہے تو مخلوق کی نظر میں وہ حکم کی منسوخی ہوتی ہے اور حقیقت
میں وہ بیان مدت ہوتا ہے یعنی اسوقت مخلوق پر ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے یہ حکم ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ
صرف اسی مدت کے لئے جاری کیا تھا اب وہ مدت ختم ہوگئی حکم باقی نہیں رہا۔

قرآن کریم میں بہت سی آیات کے منسوخ ہونے پر جو عامیانہ شبہ کیا جاتا ہے اس تقریر سے وہ شبہ رفع
ہوگیا، کیا نماز تہجد خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت کے بعد بھی فرض رہی، بعض ائمہ تفسیر نے اسی
کو اختیار کیا ہے اور ان کا استدلال سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ سے کرتے ہیں
کہ نماز تہجد کو خاص آپ کے ذمہ ایک زائد فرض کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے کیونکہ نافلہ کے لغوی معنی زائدہ کے
آتے ہیں اور مراد فریضہ زائدہ ہے مگر جمہور علما کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ فرضیت اس نماز کی امت اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے منسوخ ہو گئی البتہ بطور استحباب اس کی ادائیگی سب کے لئے باقی رہی اور آیت مذکورہ میں جو نَافِلَةً لَّكَ آیا ہے اپنے اصطلاحی معنے میں بحکم نفل ہے پھر اس کی خصوصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو آیت کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے اس کی کیا وجہ ہے یہ پوری تفصیل اور نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہونے کے بعد یہ نماز صرف نفل مستحب کے درجہ میں رہی یا سنت مؤکدہ کے درجہ میں یہ پوری تحقیق سورۂ بنی اسرائیل کی آیت مذکورہ کے تحت میں گزر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے وہاں تہجد کے خاص فضائل اور مسائل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

یہ آیت جس کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ سے شروع ہو کر فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ تک آئی ہے یہ آیت شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی جبکہ سال بھر کے بعد قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہوئی، مسند احمد، مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک سال تک اس کی پابندی کرتے رہے سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے بارہ مہینے تک آسمان میں روک رکھا سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہو کر تخفیف ہو گئی اور اسکے بعد قیام اللیل صرف نفل مستحب رہ گیا (از روح المعانی)،
پھر ان آیات میں تنسیخ حکم کی علت یہ بتلائی ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ تم اس کا احصاء نہ کر سکو گے۔ احصاء کے لفظی معنے شمار کرنے کے ہیں، مطلب آیت کا بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ قیام اللیل میں اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مقدار وقت کی پوری تعیین نہیں فرمائی بلکہ ایک تہائی رات سے دو تہائی رات تک کے درمیان کا وقت مقرر فرمایا تھا مگر صحابہ کرام جب اس نماز میں مشغول ہوتے تو اشتغال نماز کے ساتھ یہ معلوم ہونا دشوار تھا کہ رات آدھی ہوئی یا کم و بیش ہوئی، اوقات معلوم کرنے کے ایسے آلات گھڑیاں وغیرہ اُس زمانے میں موجود نہ تھیں، اور ہوتیں بھی تب بھی نماز کے ساتھ بار بار گھڑیوں کو دیکھتے رہنا اُن حضرات کے حالات اور انکے خشوع و خضوع کے ساتھ آسان نہ تھا، یہ معنے ہوئے لَنْ تُحْصُوْهُ کے اور بعض حضرات نے یہاں احصاء سے مراد عمل احصاء یعنی اس طویل وقت اور نیند کے وقت کی نماز پر مداومت نہ کر سکنا مراد لیا ہے۔ لفظ احصاء اس معنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں اسماء اللہ الحسنیٰ کے بارے میں آیا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، اس میں لفظ احصاء کا مفہوم بہت سے علماء نے عمل احصاء لیا ہے یعنی اسماء الٰہیہ کے مقتضیٰ پر پورا عمل ہونا، جیسا کہ معارف القرآن میں آیت وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا کے تحت میں اس کی تفصیل لکھی گئی (پارہ ۱۳ سورۂ ابراہیم)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ، لفظ توبہ کے اصلی معنے رجوع کے ہیں۔ گناہ سے توبہ کو بھی اسی لئے توبہ کہا جاتا ہے

کہ وہ اپنے پچھلے جرم و گناہ سے رجوع ہوتا ہے اس جگہ مراد صرف رجوع ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ حکم قیام اللیل کی فرضیت کا واپس لے لیا ؛ آخر میں فرمایا۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، یعنی نماز تہجد جو اب بجائے فرض کے مستحب یا سنت باقی رہ گئی ہے اسمیں جسقدر قرآن آسانی سے کوئی شخص پڑھ سکے وہ پڑھ لیا کرے کسی خاص مقدار کی تعیین نہیں ہے اس آیت سے بہت سے مسائل فقہیہ نکلتے ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں جمہور مفسرین کے نزدیک نماز فرض مراد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نماز فرض پانچ ہیں جو لیلۃ المعراج میں فرض ہوئی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کی فرضیت جو ایک سال تک جاری رہی تھی اسی عرصہ میں لیلۃ الاسراء کا واقعہ پیش آیا جس میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں اور اس کے بعد آیات مذکورہ کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور آخر سورت میں جو اقامتِ صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اس سے مراد پانچ نمازیں فرض ہیں (ابن کثیر۔ قرطبی۔ بحر محیط)

اسی طرح اٰتُوا الزَّكٰوةَ میں زکوٰۃ سے زکوٰۃ فرض مراد ہے مگر مشہور یہ ہے کہ زکوٰۃ بعد ہجرت دوسرے سال میں فرض ہوئی، اور یہ آیت مکی ہے ابتدائے اسلام میں نازل ہوئی ہے اس لئے بعض مفسرین نے خاص اس آیت کو مدنی کہا ہے۔ مگر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں اوائل اسلام ہی میں فرض ہوئی ہو مگر اس کے نصاب اور مقدار وجب کی تفصیلات مدینہ طیبہ میں ہجرت کے دوسرے سال میں بیان کی گئی ہوں، اس طرح آیت کے مکی ہونے کی صورت میں بھی اس کو زکوٰۃ فرض پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ روح المعانی میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کی پوری تحقیق احقر کے رسالہ نظام زکوٰۃ میں تفصیل سے آئی ہے۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو اس عنوان سے تعبیر کیا ہے کہ گویا یہ خرچ کرنے والا اللہ کو قرض دے رہا ہے اسمیں اسکے حال پر لطف و کرم کی طرف اشارہ بھی ہے اور اسکا بیان بھی کہ اللہ تعالیٰ غنی الاغنیاء ہے اُس کو دیا ہوا قرض کبھی مارا نہیں جا سکتا ضرور وصول ہوگا، اور چونکہ زکوٰۃ فرض کا حکم اس سے پہلے آچکا ہے اسلئے اَقْرِضُوا اللّٰهَ میں جس خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ذکر ہے اس کو اکثر حضرات نے صدقات نافلہ اور تبرعات پر محمول کیا ہے جیسے اپنے اقارب واعزا کو کچھ دینا یا مہمان کی مہمانی پر خرچ کرنا یا علماء و صلحاء کی خدمت کرنا وغیرہ اور بعض حضرات نے اسکا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے مالی واجبات انسان پر عائد ہوتے ہیں۔ جیسے ماں باپ، بیوی، اولاد کا نفقہ واجبہ یا دوسری واجبات شرعیہ تو اٰتُوا الزَّكٰوةَ میں ادائے زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد دوسرے واجبات کا ذکر اَقْرِضُوا اللّٰهَ سے کر دیا گیا۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ الآیۃ ، مَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک کام اپنی زندگی میں کر گزرو وہ بہتر ہے اس سے کہ مرتے وقت وصیت کرو اسمیں مالی عبادات صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور نماز روزہ وغیرہ بھی جو کسی کے ذمہ قضا ہو اپنے ہاتھ سے اپنے سامنے اللہ کی راہ میں خرچ کرے اُس سے بدرجہا بہتر ہے بعد میں تو وارثوں کے اختیار میں بات رہتی ہے وہ کریں یا نہ کریں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال کیا کہ تم میں ایسا کون ہے جو اپنے وارث کے مال سے بہ نسبت اپنے مال کے زیادہ محبت رکھتا ہو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے وارث کے مال کی محبت خود اپنے مال سے زیادہ رکھے آپ نے فرمایا سوچ سمجھ کر بات کرو صحابہ نے عرض کیا کہ ہمیں تو اس کے سوا کوئی دوسری صورت معلوم نہیں، آپ نے فرمایا (جب یہ بات تو سمجھ لو کہ) تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور جو رہ گیا وہ تمہارا مال نہیں بلکہ تمہارے وارث کا مال ہے (ذکرہ ابن کثیر باسناد ابی یعلے الموصلی ثم قال ورواہ البخاری من حدیث حفص بن غیاث الخ)

تمّت

سورۃ المزمل بحمد اللہ یوم الثلثاء ۲۲ رجب سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ المُدَّثِّر

سُوْرَةُ المُدَّثِّر مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ مدثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھپن آیتیں ہیں اور اس میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝

اے لحاف میں لپٹنے والے کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے اور اپنے رب کی بڑائی بول اور اپنے کپڑے پاک رکھ

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ فَاِذَا

اور گندگی سے دور رہ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلا بہت چاہے اور اپنے رب سے امید رکھ پھر جب

نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ

بجے وہ کھوکھلی چیز پھر وہ اس دن مشکل دن ہے منکروں پر نہیں

يَسِيْرٍ ۝ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا

آسان چھوڑ دے مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے بنایا اکیلا اور دیا میں نے اس کو مال

مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ

پھیلا کر اور بیٹے مجلس میں بیٹھنے والے اور تیاری کردی اس کے لئے خوب تیاری پھر لالچ رکھتا ہے

اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝

کہ اور بھی دوں ہرگز نہیں وہ ہے ہماری آیتوں کا مخالف اب اس سے چڑھواؤں گا بڑی چڑھائی

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝

اس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرا لیا سو مارا جائیو کیسا ٹھہرایا پھر مارا جائیو کیسا ٹھہرایا

ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ

پھر نگاہ کی پھر تیوری چڑھائی اور منہ تھوتھایا پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا پھر بولا اور

هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا

تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا

عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا يَعْلَمُ

جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾ كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَالَّيْلِ

اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيْرًا

لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿٣٧﴾ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا

كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا

اور نہ تھے کھانا کھلاتے محتاج کو اور ہم تھے باتوں میں دھنستے دھنسنے والوں کے ساتھ اور ہم تھے

والے کی کوئی چیز جلائے بے باقی رہنے دے گی اور نہ (داخل ہونے کے قبل جو کفار اس وقت باہر ہونگے انہیں
سے کسی کو بغیر اپنے اندر رکھے ہوئے) چھوڑے گی (اور) وہ (بیاکر) بدن کی حیثیت بگاڑ دے گی (اور اس پر
انیس فرشتے (بطور حکام خازن) مقرر ہیں (یہ تمام مالک سمیت مقرر رہیں گے (جو کفار کو انواع انواع عذاب
دیں گے، حاصل یہ کہ فرشتے جن کی قوت معلوم ہے باوجودیکہ انہیں کا ایک ہی تمام اہل جہنم کی تعذیب کے
لئے کافی ہے پھر انیس فرشتوں کے مقرر ہونے سے ظاہر ہے کہ عذاب کا بڑے ہی اہتمام ہوگا اور ان خاص
انیس کے عدد میں حقیقۃً حکمت تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن دوسرے حضرات نے جو ذکر کیا ہے ان سب میں اقرب
وہ ہے جو اللہ نے اس حقیر کے دل میں القاء فرمایا ہے وہ یہ کہ اصل تعذیب کفار کی عقائد حقہ کی مخالفت
پر ہے اور عقائد علمیہ و عملیات سے متعلق نہیں جیسا تفصیل رسالہ فروع الایمان کو ہیں، ایمان لانا اللہ تعالیٰ پر،
اعتقاد رکھنا کہ عالم حادث ہے، ایمان لانا فرشتوں پر، ایمان لانا اس کی سب کتابوں پر، ایمان لانا پیغمبروں
پر، ایمان لانا تقدیر پر، ایمان لانا قیامت کے دن پر، جنت کا یقین کرنا، دوزخ کا یقین کرنا، باقی
سب عقائد انہیں کے ملحقات و فروع ہیں، اور عقائد عملیہ جو عملیات کے متعلق ہیں دس ہیں پانچ مامورات
سے متعلق یعنی ان کے وجوب کا اعتقاد ضروری ہے، وہ پانچ مامورات جو شعار اسلام میں یہ ہیں، تلفظ
بالشہادتین، اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، صوم رمضان، حج بیت اللہ، اور پانچ منہیات کے متعلق
یعنی ان کی تحریم کا اعتقاد واجب ہے، وہ پانچ منہیات جو کہ آیت امتحان وغیرہ میں مذکور ہیں یہ ہیں
سرقہ، زنا، قتل، خصوصاً قتل اولاد، بہتان، عصیان فی المعروف اور غیبت و ظلم یعنی کسی کا مال
ناجائز طور پر کھانا وغیرہ سب آگیا پس یہ سب عقائد انیس ہوئے تو شاید ہر ایک عقیدہ کے مقابلے
میں ایک ایک فرشتہ معین ہو اور چونکہ ان سب میں ایک عقیدہ سب سے بڑا ہے یعنی توحید، شاید ان
فرشتوں میں بھی ایک فرشتہ سب سے بڑا مقرر ہوا ہو یعنی مالک واللہ اعلم بأسرارہ، اور (اس آیت
کا مضمون سن کر جو کفار نے تمسخر کیا جس کا بیان معارف میں آتا ہے آگے اس کا رد ہے آگے مضمون نازل
ہوا کہ) ہم نے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں (جن میں سے ایک ایک فرشتہ
میں تمام جن و انس کی برابر قوت ہے کما فی الدر ہر فرد منہم وفضہ ھکذا لہم مثل قوۃ الثقلین، اور ہم نے
ان کی تعداد (ذکر و) کتابت میں صرف ایسی رکھی ہے جو کافروں کی گمراہی کا ذریعہ ہو (اور اس
انیس کا عدد ہے) تو اس لئے (کہ یہ نتائج اس پر مرتب ہوں یعنی) تاکہ اہل کتاب (سنتے ہی) یقین
کرلیں اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے اور اہل کتاب اور مومنین شک نہ کریں اور تاکہ جن لوگوں
کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے وہ اور کافر لوگ کہنے لگیں کہ اس عجیب مضمون سے اللہ تعالیٰ کا کیا
مقصود ہے (اہل کتاب کے یقین کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کی کتاب میں بھی یہ عدد لکھا ہو
تو فوراً مان لیں گے اور اگر اب ان کی کتابوں میں یہ عدد نہ ہو تو ممکن ہے کہ کتابوں کے ضائع اور محرف

چنانچہ قمر کا اول بڑھنا پھر گھٹنا نمونہ اس عالم کے نشوونما اور پھر اضمحلال و فنا کا ہے یہاں تک کہ جیسا چاند کے محاق یعنی بے نور ہو جانے کی طرح یہ بھی فانی محض ہو جائے گا، اسی طرح اس عالم دنیا کو اس عالم آخرت کے ساتھ اختفا و انکشاف حقائق میں ایسی نسبت ہے جیسے رات کو دن کے ساتھ۔ پس اس عالم کا ختم ہو جانا مشابہ رات گذر جانے کے ہے اور اس عالم کا ظہور مشابہ اسفار صبح کے ہے۔ آگے دنیا اور اہل دنیا کے بعض احوال کا بیان ہے یعنی) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) کے بدلہ میں (دوزخ میں) محبوس ہوگا مگر داہنے والے (یعنی مومنین جن کی تفصیل سورۂ واقعہ میں گذری ہے اور چونکہ یہاں اصحاب الیمین مقابل اصحاب الشمال کے ہیں اسلئے مقربین کو بھی شامل ہے، حاصل یہ کہ مومنین اس قید سے مستثنیٰ ہیں) وہ بہشتوں میں ہونگے (اور) مجرموں (یعنی کافروں) کا حال (خود ان کافروں سے) پوچھتے ہوں گے (اور کیفیت باہمی کلام کی باوجود اس بُعد کے جو دوزخ و جنت میں ہے، سورۂ اعراف کی آیات وَنَادٰى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ الخ کی تفسیر میں گذری ہے اور یہ سوال زجر و تنبیہ کے لئے ہوگا حاصل یہ کہ جنتی کافروں سے پوچھیں گے کہ) تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور (جو لوگ دین حق کے ابطال کے شغل میں رہتے تھے ان) مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی (اس مشغلہ ابطال دین میں) رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو موت آگئی (اور ہم ان حرکات سے باز نہ آئے یعنی خاتمہ اسی نافرمانی پر ہوا سو اس وجہ سے ہم دوزخ میں آئے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار مکلف بالفروع یعنی نماز روزہ وغیرہ احکام شرعیہ کے مامور ہوں کیونکہ جہنم میں دو چیزیں ہوں گی ایک عذاب دوسرا شدت عذاب۔ پس ممکن ہے کہ مجموعہ اعمال مذکورہ سبب ہو مجموعہ عذاب اور شدت عذاب کا اس طرح کہ کفر و شرک تو سبب ہو تعذیب کا اور ترک صلوٰۃ وغیرہ سبب ہو زیادہ تعذیب کا اور کفار کے غیر مکلف بالفروع ہونے کے معنی یہ کہے جاویں گے کہ ان فروع پر نفس تعذیب نہ ہوگی اور زیادہ تعذیب اس لئے ہو سکتی ہے کہ اصول کے ضمن میں فروع بھی تبعاً آجاتے ہیں۔ اس لئے ضمناً مکلف ہونا زیادتی عذاب کا سبب ہو سکتا ہے) سو (حالات مذکورہ میں) انکو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دیگی (اور اس عدم نفع کا تحقق عدم شفاعت کے تحقق سے ہوگا یعنی کوئی ان کافروں کی شفاعت ہی نہ کرسکے گا لقولہ تعالیٰ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ۔ آگے ان کے اعراض پر تعجب ہے کہ جب کفر و اعراض کی بدولت ان کی یہ گت بننے والی ہے) تو ان کو کیا ہوا کہ اس نصیحت (قرآنی) سے روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں (اس تشبیہ میں کئی امر کی رعایت ہے اول تو گدھا بے وقوفی اور حماقت میں مشہور ہے دوسرے اسکو وحشی فرض کیا جس کو گورخر کہتے ہیں کہ وہ جو چیزیں ڈرنے کی نہیں ہوتیں ان سے بھی بلا وجہ ڈرتا اور بدک کر بھاگتا ہے تیسرے شیر سے اسکا ڈرنا فرض کیا کہ اس صورت میں ان کا بھاگنا

دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں سورۂ اقرأ کی آیات لیکر آیا تھا وہی آسمان کے نیچے فضا میں ایک معلق
کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وہی طبعی رعب وہیبت کی
کیفیت طاری ہوگئی جو غارِ حرا میں نزولِ اقرأ کے وقت ہوئی تھی سخت سردی اور کپکپی کے احساس سے
آپ گھر میں واپس تشریف لے گئے اور فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ یعنی مجھے ڈھانپو مجھے ڈھانپو۔ آپ کپڑوں
میں لپٹ کر لیٹ گئے اس پر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں کما فی حدیث الصحیحین۔ اسی لئے اس
سورت میں آپ کو خطاب یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ کے الفاظ سے کیا گیا، یہ لفظ دِثار سے مشتق ہے جو ان زائد
کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو آدمی عام لباس کے اوپر سردی وغیرہ کے دفع کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا ہے
اس لئے یہ خطاب ایک حبیبانہ مشفقانہ خطاب ہے جیسا کہ مزمل میں بیان ہو چکا ہے لفظ مزمل
کے معنے بھی اسی کے قریب ہیں۔ روح المعانی میں جابر بن زید تابعی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ
سورۂ مدثر، مزمل کے بعد نازل ہوئی ہے اور بعض حضرات نے یہ روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل
کی ہے مگر صحیحین کی جو روایت اوپر نقل کی گئی ہے اس میں اس کی تصریح ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر
نازل ہوئی (اور مراد یہ ہے کہ فترت وحی کے بعد سب سے پہلے یہ سورت نازل ہوئی) اگر مزمل کا نزول
اس سے پہلے ہوا ہوتا تو حضرت جابر ابن عبداللہؓ راوی حدیث اس کو بیان کرتے اور یہ ظاہر ہے کہ لفظ
مزمل اور مدثر دونوں تقریباً ہم معنے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی واقعہ میں ان دونوں کا نزول ہوا اور وہ
واقعہ وہی جبرئیل امین کو آسمان کے نیچے کرسی پر بیٹھے دیکھنے کا اور آپ کا گھر میں واپس ہو کر کپڑوں میں لپٹ
جانے کا ہو جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ سورۂ مزمل اور مدثر کی ابتدائی
آیتیں فترت وحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں ان دونوں میں کون مقدم اور کون موخر
اس میں روایتیں مختلف ہو گئیں اور سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات کا ان سب سے پہلے نازل ہونا تمام روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے
اور یہ دونوں سورتیں اگرچہ تقریب زمانے میں ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئی ہیں مگر فرق دونوں میں یہ ہے کہ سورۂ مزمل
کے شروع میں جو احکام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے ہیں ان میں اپنی ذاتی نفسی اصلاح سے متعلق ہیں
اور سورۂ مدثر کے شروع میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ خلق سے ہے۔

سورۂ مدثر میں سب سے پہلا حکم آپ کو یہ دیا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی کھڑے ہو جایئے اسکے معنے حقیقی قیام
کے بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ جو کپڑوں میں لپٹ کر لیٹ گئے ہیں اسکو چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے اور یہ معنی بھی ہو سکتے
ہیں کہ قیام سے مراد کام کے لئے مستعد اور تیار ہونا ہو اور مطلب یہ ہو کہ اب آپ ہمت کر کے خلقِ خدا کی اصلاح
کی خدمت سنبھالیے۔ فَاَنْذِرْ، انذار سے مشتق ہے جس کے معنے ڈرانے کے ہیں مگر ایسا ڈرانا جو شفقت ورحمت
پر مبنی ہوتا ہے جیسے باپ اپنے بچے کو سانپ بچھو اور آگ سے ڈراتا ہے انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے اسلئے
اُن کا لقب نذیر اور بشیر ہوتا ہے۔ نذیر کے معنے شفقت وہمدردی کی بنا پر مضر چیزوں سے ڈرانے والا

بھی ایک بڑا انعام ہے جو والدین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور تعب کے سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ان کی حاضری سے اپنی خدمت اور کاروبار میں امداد کا فائدہ مزید براں ہے۔ اس منحوس ترقی نے جو جدید زمانہ کر رہا ہے صرف سونے چاندی کے ٹکڑوں بلکہ ان سکوں کے اقرار ناموں (نوٹوں) کا نام عیش و آرام رکھ لیا ہے جن کے لئے والدین بڑے فخر سے اولاد کو دوسرے ملکوں میں پھینک دیتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اگرچہ سالہا سال بلکہ عمر بھر اولاد کی صورت بھی نہ دیکھیں مگر ان کی بڑی تنخواہ اور آمدنی کی خبریں کانوں تک پہنچتی ہے اور یہ اس کے ذریعہ اپنی برادری میں اپنی برتری ثابت کرتے رہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آرام و راحت کے مفہوم سے بھی بے خبر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کو بھلانے کا یہی اثر ہونا چاہئے کہ وہ خود اپنے آپ کو یعنی اپنے آرام و راحت کو بھی بھول جائے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ، امام تفسیر مقاتل نے فرمایا کہ یہ جواب ابوجہل کے کلام کا ہے اسنے جب یہ آیت سنی کہ جہنم کے خازن انیس فرشتے ہیں تو قریش کے جوانوں کو خطاب کر کے کہا کہ محمد کے ساتھی تو صرف انیس ہیں ان کے مقابلے میں کیا فکر ہوتی ہے۔ اور بیہقی نے سدی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ تو ایک شخص جو قریش میں سے ابوالاشدین کہا جاتا تھا بولا اے قوم قریش کچھ فکر نہ کرو ان انیس کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں میں اپنے داہنے بازو سے دس کو اور بائیں بازو سے نو کو دفع کر کے ان انیس کا خاتمہ کر دوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مقصود اول تو فرشتہ ایک ہی سب کے لئے کافی ہے اور انیس کا عدد جو یہاں بتلایا گیا ہے یہ ان فرشتوں کے بڑوں اور ذمہ داروں کا عدد ہے ان میں سے ہر ایک کے ماتحت خدا کی خدمات اور کفار و فجار کو عذاب دینے کے لئے اتنے فرشتے مقرر ہیں جن کا عدد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا آگے قیامت اور احوال قیامت کا ذکر ہے جس میں فرمایا اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ، اِنَّهَا کی ضمیر سقر کی طرف راجع ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں آیا ہے۔ کُبَر بضم کاف و فتح با کُبریٰ کی جمع ہے یہ صفت ہے داہیۃ یا مصیبۃ کی، معنے آیت کے یہ ہوئے کہ یہ سقر یعنی جہنم جس میں ان کو داخل کیا جائے گا بڑی بڑی آفتوں اور مصیبتوں میں سے ایک ہے اس کے علاوہ اور طرح طرح کے عذاب ہیں۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ، یہاں تقدم سے مراد تقدم الی الایمان والطاعۃ اور تاخر سے مراد ایمان وطاعت سے پیچھے ہٹنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے ڈرانا جو اوپر کی آیت میں ہے یہ ہر ایک انسان کے لئے عام ہے پھر کوئی یہ ڈر سن کر ایمان وطاعت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے کوئی بدنصیب اس کے باوجود پیچھے رہ جاتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ، رہینۃ بمعنی مرہونہ ہے اور مراد اس سے اس کا محبوس و مقید ہونا ہے جس طرح کوئی شخص قرض کے بدلے میں کوئی چیز رہن رکھدے تو وہ چیز قرض خواہ کے قبضہ میں محبوس رہتی ہے، مالک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح قیامت کے

سُورَةُ الْقِيٰمَةِ

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورہ قیامت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢ اَيَحْسَبُ

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو ملامت کرے برائی پر کیا خیال کرتا ہے

الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝٣ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ

آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیاں کیوں نہیں ہم ٹھیک کر سکتے ہیں اس کی

بَنَانَهٗ ۝٤ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝٥ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ

پوریاں بلکہ چاہتا ہے آدمی کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے پوچھتا ہے کب ہوگا دن

الْقِيٰمَةِ ۝٦ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝٧ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝٨ وَجُمِعَ الشَّمْسُ

قیامت کا پھر جب چندھیانے لگے آنکھ اور گہنا جائے چاند اور اکٹھے ہوں سورج

وَالْقَمَرُ ۝٩ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝١٠ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝١١

اور چاند کہے گا آدمی اس دن کہاں چلا جاؤں بھاگ کر کوئی نہیں کہیں نہیں ہے بچاؤ

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ۝١٢ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ

تیرے رب تک ہے اس دن جا ٹھہرنا جتلا دیں گے انسان کو اس دن جو اس نے آگے بھیجا

وَاَخَّرَ ۝١٣ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝١٤ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝١٥

اور پیچھے چھوڑا بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے اور پڑا لا ڈالے اپنے بہانے

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝١٦ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝١٧

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ
الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ
رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ
بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾
وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ
يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ﴿٣١﴾ وَلَٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٣٢﴾
ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ ﴿٣٣﴾ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٤﴾ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٥﴾
أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾
ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
وَالْأُنْثَىٰ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾

خلاصۂ تفسیر

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے (لیعنی کوئی کام
نیک کرے تو بھی نادم ہو کہ میں نے کیا کیا تھا اتنی قدر کیوں نہ کی ہوگی اور گناہ ہو جاوے تو بہت ہی نادم
ہو کذا فی الدر المنثور عن ابن عباس والحسن۔ پس اس معنی کے اعتبار سے نفس مطمئنہ کو بھی شامل ہے) اور جواب
قسم محذوف ہے یعنی تم ضرور مبعوث ہو گے، اور ان دونوں قسموں کا مناسب مقام ہونا ظاہر ہے قیامت کا تو اسلئے
کہ وہ ظرف ہے حشر و نشر کا اور نفس لوامہ کا اسلئے کہ ایسا نفس قیامت کی عملی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ آگے

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

يَفْجُرَ اَمَامَهٗ، لفظ امام بفتح الہمزہ سامنے اور مستقبل کے معنے میں ہے اسی معنے آیت کے یہ ہوئے کہ بیوقوف اور غافل انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مشاہدات میں غور نہیں کرتا کہ ماضی کے انظار پر نظر کر کے اپنے مستقبل کو درست کر لے بلکہ مستقبل میں بھی وہ یہ چاہتا رہتا ہے کہ اپنے فسق و شرک اور انکار و تکذیب پر جما رہے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے برق بفتح الباء و کسر الراء کے معنے آنکھ خیرہ ہونے کی کہ دیکھ نہ سکے۔ قیامت کے روز سب کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ نگاہ جما کر کسی چیز کو نہ دیکھ سکیں گی۔ خسف قمر خسوف سے مشتق ہے جس کے معنے روشنی ختم ہو کر تاریک ہو جانے کے ہیں۔ معنے یہ ہیں کہ چاند بے نور ہو جائے گا۔ آگے وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ میں یہ بتلایا کہ صرف چاند ہی بے نور نہیں ہوگا بلکہ آفتاب بھی بے نور ہو جائے گا جس کے متعلق دنیا کے فلاسفہ کا یہ کہنا ہے کہ اصل روشنی آفتاب میں ہے۔ چاند کی روشنی بھی آفتاب کی شعاعوں سے مستفاد ہے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ چاند اور سورج دونوں ایک ہی حال میں جمع کر دیئے جاویں گے کہ دونوں بے نور ہوں گے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چاند سورج کے جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس روز چاند اور سورج دونوں ایک ہی مطلع سے طلوع ہوں گے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے واللہ اعلم

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، یعنی اس روز انسان کو جتلا دیا جاوے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا کیا پیچھے چھوڑا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کیا وہ آگے بھیج دیا، اور جو نیک یا بد، مفید یا مضر کوئی طریقہ کوئی رسم ایسی چھوڑ گیا کہ اس کے بعد لوگ اس پر عمل کریں وہ پیچھے چھوڑا (اس کا ثواب یا عذاب اس کو ملتا رہے گا) اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ما قدم سے مراد وہ عمل صالح ہے جو اپنی زندگی میں کر گزرا اور ما اخر سے مراد وہ عمل صالح ہے جس کو کر سکتا تھا مگر نہ کیا اور وقت ضائع کر دیا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ، بصیر اور بصیرۃ کے معنے دیکھنے والے کے بھی آتے ہیں اور بصیرۃ کے معنے حجت کے بھی آتے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ، اس میں بصائر بصیرۃ کی جمع ہے اور معنے اس کے حجت کے ہیں اور معاذیر معذار بمعنے عذر کی جمع ہے۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ عدالت کے ضابطہ کی رو سے انسان کے سارے اعمال حشر میں اس کو ایک ایک کر کے بتلائے جاویں گے مگر درحقیقت اس کو اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اعمال کو خوب جانتا ہے خود اس کو معلوم ہے کہ اس نے کیا کیا کام کئے، نیز یہ کہ حشر میں تمام اپنے اعمال

نیک و بد کا مشاہدہ بھی اُس کے سامنے ہو جائے گا جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا یعنی جو عمل انھوں نے دنیا میں کیا تھا اُس کو محشر میں حاضر موجود پائیں گے اور آنکھوں سے دیکھ لیں گے یہاں جو انسان کو اپنے نفس پر بصیرہ فرمایا اسکا یہی حاصل ہے۔

اور اگر بصیرہ کے معنے حجت کے لئے جاویں تو معنے یہ ہیں کہ انسان خود اپنے نفس پر حجت و دلیل ہوگا وہ انکار بھی کرنا چاہیگا تو اسکے اعضاء اقرار کریں گے مگر انسان اپنے دل میں حقیقت کو جاننے کے باوجود عذر تراشی نہ چھوڑیگا اپنے کئے کا عذر بیان کرتا ہی رہے گا یہ معنے ہیں وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ کے۔

یہاں تک قیامت کے احوال اور اہوال کا تذکرہ تھا اور آگے بھی یہی آنے والا ہے۔ درمیان میں چار آیتوں کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ہدایت دی گئی ہے جو نزول وحی کے وقت نازل شدہ آیات کے متعلق ہے وہ یہ کہ جب جبرئیل امین قرآن کریم کی کچھ آیات لیکر نازل ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پڑھنے کے وقت ایک تو یہ فکر ہوتی تھی کہ کہیں اس کے سننے اور پھر اسکے مطابق پڑھنے میں کوئی فرق نہ آجائے۔ دوسری فکر یہ ہوتی تھی کہ کہیں ایسا کوئی حصہ کوئی کلمہ ذہن سے نکل جائے اور بھول جائیں اس لئے آپ جسوقت جبرئیل امین کوئی آیت سناتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ پڑھتے اور زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے لگتے تھے کہ بار بار پڑھ کر اس کو یاد کرلیں۔ آپ کی اس محنت و مشقت کو دور کرنے کے لئے ان چار آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے صحیح صحیح پڑھوانے پھر یاد کرا دینے اور پھر اس کو مسلمانوں کے سامنے اُسی طرح پیش کرا دینے کی ذمہ داری خود لے لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرما دیا کہ آپ اس غرض کے لئے زبان کو جلدی جلدی حرکت دینے کی زحمت نہ اُٹھائیں۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ کا یہی مطلب ہے پھر فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ یعنی ان تمام آیات کو آپ کے قلب میں جمع کر دینا پھر اُس کو اُسی طرح آپ سے پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمہ ہے اس لئے آپ اس کی فکر چھوڑ دیں اور فرمایا فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ قرآن اس جگہ بمعنے قرأت ہے معنے یہ ہیں کہ جب ہم یعنی ہماری طرف سے جبرئیل امین قرآن پڑھیں تو آپ ساتھ ساتھ نہ پڑھا کریں بلکہ ہمارے پڑھنے کے بعد پڑھا کریں اور اسوقت خاموش ہو کر سنا کریں۔ یہاں بالاتفاق اتباع قرآن سے مراد یہ ہے کہ جب جبرئیل امین پڑھیں تو آپ خاموش رہ کر سنیں۔

امام کے پیچھے مقتدی کے قرأت نہ کرنے کی ایک دلیل

حدیث صحیح میں جو یہ آیا ہے کہ امام کو اقتداء اور اتباع ہی کے لئے بنایا گیا ہے اسلئے مقتدیوں کو اسکا اتباع کرنا چاہئے جب وہ رکوع کرے تو سب مقتدی رکوع کریں جب وہ سجدہ میں جائے تو سب سجدہ میں جائیں۔ صحیح مسلم کی روایت میں اسی کیساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو اذا قرأ فانصتوا، یہ بھی اسکا بیان ہے کہ مقصود امام کا اتباع ہے رکوع سجدے میں تو اتباع امام کی صورت یہ ہے کہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ

اقوال و افعال عبادت کے ادا کئے جاویں مگر قراءت کی یہ شان نہیں کہ ساتھ ساتھ پڑھا جائے بلکہ قراءت کا ادب یہی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو، یہی استدلال ہے امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کا اس معاملے میں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قراءت نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ فکر بھی اپنے اوپر نہ رکھیں کہ نازل شدہ آیات کا صحیح مفہوم اور مراد کیا ہے اس کا بیان سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، قرآن کے سب الفاظ اور اس کی مراد کو آپ پر واضح کر دیں گے۔ ان چار آیتوں میں قرآن اور اس کی تلاوت وغیرہ کے متعلق احکام بیان کرنے کے بعد آگے پھر قیامت کے حال و مآل کا بقیہ تذکرہ آتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان چار آیتوں کا کوئی پچھلی آیتوں سے ربط و جوڑ کیا ہے۔ خلاصہ تفسیر مذکور میں اس کا ربط یہ بیان کیا گیا ہے کہ چار آیتوں سے پہلے جو قیامت کے حالات میں اس کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ ایک ایک انسان کو جس کیفیت جس شکل و صورت میں وہ پہلے تھا اُسی میں دوبارہ پیدا فرما دیں گے یہاں تک کہ اس کی انگلیوں کے پوروں کو اور ان پر بنے ہوئے امتیازی خطوط و نشانات کو بھی بالکل پہلے جیسا بنا دیں گے اُن میں سر مو فرق نہ ہوگا، یہی ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کا علم بھی بے نہایت ہے اور اس کا احصا اور محفوظ رکھنا بھی بے مثال ہے۔ اسی کی مناسبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چار آیتوں میں تسلی دی گئی کہ آپ تو بھول بھی سکتے ہیں نقل میں غلطی کا بھی امکان ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ ان سب سے بالا و برتر ہیں ان چیزوں کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے اس لئے آپ قرآن کے کلمات کو محفوظ رکھنے یا ان کے معانی سمجھنے میں غور کرنے کی زحمت چھوڑ دیں، یہ سب کام حق تعالیٰ خود انجام دیں گے۔ آگے پھر قیامت کے حالات کا بیان ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ نضرۃ بمعنے ترو تازگی، یعنی اس روز کچھ چہرے ہشاش بشاش ترو تازہ ہوں گے اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ، یعنی یہ چہرے اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آخرت میں اہل جنت کو حق تعالیٰ کا دیدار بچشم سر نصیب ہوگا اس پر اہل سنت والجماعت اور سب علماء فقہاء کا اجماع ہے، صرف معتزلہ اور خوارج منکر ہیں وجہ انکار کی فلسفیانہ شبہات ہیں کہ آنکھ سے دیکھنے کے لئے دیکھنے والے اور جس کو دیکھا جائے اور ان دونوں کے درمیان مسافت کے لئے جو شرائط ہیں خالق و مخلوق کے درمیان اُن کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کی رویت و زیارت ان سب شرائط سے بے نیاز ہوگی نہ کسی جہت اور سمت سے اس کا تعلق ہوگا نہ کسی خاص شکل و صورت اور ہیئت سے۔ روایات حدیث سے یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے ثابت ہے البتہ اس رویت و زیارت میں اہل جنت کے مختلف درجات ہوں گے بعض کو یہ زیارت ہفتہ وار جمعہ کو حاصل ہوگی بعض کو روزانہ صبح شام اور بعض کے لئے یہ ہر وقت ہر حال میں رہے گی (مظہری)۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِۨ الْمَسَاقُ ۝ سابقہ آیات میں قیامت کے حساب کتاب اور اہلِ جنت و دوزخ کا کچھ حال بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں انسان کو متوجہ کیا گیا کہ اپنی موت کو نہ بھولے موت سے پہلے پہلے ایمان اور عمل صالح کی طرف آجائے تاکہ آخرت میں نجات ملے۔ آیت مذکورہ میں موت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ غفلت شعار انسان بھول میں رہتا ہے یہاں تک کہ موت سر پر آ کھڑی ہو اور روح تراقی یعنی گلے کی ہنسلی میں آ پہنچے اور تیمار دار لوگ دوا و علاج سے عاجز ہو کر جھاڑ پھونک کرنے والوں کو تلاش کرنے لگیں اور ایک پاؤں کی پنڈلی دوسری پر لپٹنے لگے تو یہ وقت اللہ کے پاس جانے کا آگیا، اب نہ توبہ قبول ہوتی ہے نہ کوئی عمل اسلئے عقلمند پر لازم ہے کہ اس وقت سے پہلے اصلاح کی فکر کرے۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ میں لفظ ساق کے مشہور معنی پاؤں کی پنڈلی کے ہیں اور پنڈلی کے ایک دوسرے پر لپٹنے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت اضطراب اور بے چینی سے ایک پنڈلی دوسری پر مارتا ہے اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ اسوقت اگر ایک پاؤں دوسرے پر رکھا ہوا ہے اور اسکو حرکت دیکر ہٹانا چاہتا ہے تو وہ اسکی قدرت میں نہیں ہوتا (کما قال الشعبی وغیرہ)

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں دو ساقوں سے مراد دو عالم دنیا و آخرت کے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اسوقت دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن جمع ہوا ہے اسلئے دوہری مصیبت میں گرفتار ہے دنیا سے جدائی کا غم اور آخرت کے معاملے کی فکر۔ واللہ اعلم

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ لفظ اولیٰ ویل کا مقلوب ہے ویل کے معنے ہلاکت اور بربادی کے۔ یہاں اُس شخص کیلئے جس نے تکذیب ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور دنیا کے مال و دولت میں مست رہا اور اسی حال پر مر گیا اسکے لئے چار مرتبہ لفظ ہلاکت و بربادی استعمال کیا گیا کہ مرنے کے وقت پھر مرنے کے بعد قبر میں پھر حشر و نشر کے وقت پھر جہنم میں داخلے کے وقت مصیبت و بربادی تیرا حصہ ہے۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۝ یعنی کیا وہ ذاتِ حق جس کے قبضہ قدرت میں موت و حیات اور سارا جہان ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کردے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی اس آیت کی تلاوت کرے تو اس کو یہ کلمات کہنا چاہئے بلٰی وانا علی ذٰلک من الشّٰھدین یعنی بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی ہے اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلات کی اس آیت پر پہنچے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ تو اس کو اٰمنّا باللہ کہنا چاہئے

تمت سورۃ القیامۃ بحمد اللہ ۲۷ رجب سنہ ۱۳۵۹ھ

سُوْرَۃُ الدَّھْر

سُوْرَۃُ الدَّھْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِحْدٰی وَّثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورۂ دہر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکتیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾

کبھی گذرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں کہ نہ تھا وہ کوئی چیز جو زبان پر آتی

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا

ہم نے بنایا آدمی کو ایک دو رنگی بوند سے ہم پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو سننے

بَصِيْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ اِنَّآ

والا دیکھنے والا ہم نے اس کو سجھائی راہ یا حق ماننے والا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے ہم نے

اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ

تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے زنجیریں اور طوق اور آگ دہکتی البتہ نیک لوگ پیتے ہیں

مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴿۵﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ

پیالہ جس کی ملونی ہے کافور ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں بندے اللہ کے

يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۶﴾ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ

چلاتے ہیں وہ اُس کی نالیاں پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اُس دن سے کہ اس کی برائی

مُسْتَطِيْرًا ﴿۷﴾ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا

پھیل پڑے گی اور کھلاتے ہیں کھانا اُس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو

وَّاَسِيْرًا ﴿۸﴾ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ

اور قیدی کو ہم جو تم کو کھلاتے ہیں سو خالص اللہ کی خوشی چاہنے کو نہ تم سے ہم چاہیں بدلہ اور

لَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ

نہ چاہیں شکرگزاری ۔ ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک دن اُداسی والے کی سختی سے ۔ پھر بچالیا ان کو

اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا

اللہ نے بُرائی سے اُس دن کی اور ملادی ان کو تازگی اور خوش دلی ۔ اور بدلہ دیا اُن کو اُن کے صبر پر

جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا

باغ اور پوشاک ریشمی ۔ تکیہ لگائے بیٹھیں اُس میں تختوں کے اوپر ۔ نہیں دیکھتے وہاں

شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا

دھوپ اور نہ ٹھر ۔ اور جھک رہی ہیں اُن پر اُس کی چھائیں اور پست کر رکھے ہیں اُس کے گچھے

تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ

لٹکا کر ۔ اور لوگ لئے پھرتے ہیں اُن کے پاس برتن چاندی کے اور آبخورے جو ہو رہے ہیں

قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾ وَيُسْقَوْنَ

شیشے کے ۔ شیشے ہیں چاندی کے ماپ رکھا ہے اُن کا ماپ ۔ اور اُن کو وہاں

فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾

پلائے جاتے ہیں پیالے جس کی ملونی ہے سونٹھ ۔ ایک چشمہ ہے اُس میں اُس کا نام کہتے ہیں سلسبیل

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ

اور پھرتے ہیں اُن کے پاس لڑکے سدا رہنے والے ۔ جب تو اُن کو دیکھے خیال کرے

لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾

موتی ہیں بکھرے ہوئے ۔ اور جب تو دیکھے وہاں تو دیکھے نعمت اور سلطنت بڑی

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن

اُوپر کی پوشاک اُن کی کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے ۔ اور اُن کو پہنائے جائیں گے کنگن

فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً

چاندی کے اور پلائے اُن کو اُن کا رب شراب جو پاک کرے دل کو ۔ یہ ہے تمہارا بدلہ اور

وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾

ع ۲۲ ۱۹

ہوئی تمہاری کمائی ٹھکانے کی ۔ ہم نے اُتارا تجھ پر قرآن سہج سہج اُتارنا

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ

سو تو انتظار کر اپنے رب کے حکم کا اور کہنا مت مان اُن میں سے کسی گنہگار یا ناشکر کا ۔ اور لیتا رہ نام اپنے

رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾
رب کا صبح اور شام، اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اس کو اور پاکی بول اس کی بڑی رات تک

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾
یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والی کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾
ہم نے ان کو بنایا اور مضبوط کئے ان کے جوڑ بند اور جب ہم چاہیں بدل لائیں ان جیسے لوگ بدل کر

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا
یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ اور تم نہیں

تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ
چاہو گے مگر جو چاہے اللہ بیشک اللہ ہے سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا داخل کرے

مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾
جس کو چاہے اپنی رحمت میں اور جو گنہگار ہیں تیار رکھا ہے ان کے واسطے عذاب دردناک

ع ۲

خلاصۂ تفسیر

بیشک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا اور اس سے قبل غذا اور اس سے پہلے عناصر کا جزو تھا، ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے، گو کبھی وہ رحم سے خارج ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے اور مخلوط ہونے کی یہ بھی توجیہ ہو سکتی ہے کہ وہ اجزاء مختلفہ سے مرکب ہے چنانچہ ترکیب منی کی اجزاء مختلفہ سے ظاہر ہے غرض ہم نے اس کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا (اور چونکہ محاورہ میں سمیع و بصیر استعمالاً مخصوص ہے عاقل کے ساتھ اس لئے عقل دینے کی جو کہ مدار ہے مکلف ہونے کا تصریح نہیں فرمائی گئی گو مراد وہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم نے ایسی ہیئات و صفات کے ساتھ پیدا کیا کہ اس میں احکام شرعیہ کا مکلف بننے کی قابلیت ہو، اس کے بعد جب مکلف ہونے کا وقت آگیا تو) ہم نے اس کو (بھلائی برائی پر مطلع کر کے) رستہ بتلا دیا (یعنی احکام کا مخاطب بنایا پھر) یا تو وہ شکر گزار (اور مومن) ہو گیا یا ناشکر (اور کافر) ہو گیا (یعنی جس رستہ پر چلنے کو اس کو کہا تھا جو اس پر چلا وہ مومن ہو گیا جو بالکل نہ چلا کافر ہو گیا۔ آگے فریقین کی جزاء کا ذکر ہے کہ) ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے (اور) جو نیک (لوگ) ہیں وہ ایسے جام شراب سے (شرابیں) پئیں گے

جس میں کافور کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمے سے (پیویں گے) جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور
جس کو وہ (خاص بندے جہاں چاہیں گے) بہا کر لے جائیں گے (اور یہ بہشتیوں کی ایک کرامت ہوگی کہ نہرہا
جنت ان کے تابع ہونگی جیسا کہ درمنثور میں ابن شوذب سے مروی ہے کہ جنتیوں کے ہاتھ میں سونے کی
چھڑیاں ہوں گی وہ چھڑیوں سے جس طرف اشارہ کر دیں گے نہریں اُسی طرف چلنے لگیں گی۔ اور یہ کافور دُنیا کا
کافور نہیں ہے بلکہ جنت کا کافور ہے جو سپیدی اور خنکی اور تفریح و تقویت دل و دماغ میں اسکا مشارک ہے،
شراب میں خاص کیفیات حاصل کرنے کے لئے عادت ہے بعض مناسب چیزوں کے ملانے کی پس وہاں
اس جام میں کافور ملایا جاویگا اور وہ جام شراب ایسے چشمے سے بھرا جاویگا جس سے مقرب بندے پیویں گے
تو ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا سو اس سے ابرار کی بشارت میں تقویت ہوگئی اور اگر ابرار و عباداللہ
کا مصداق ایک ہو تو دو جگہ بیان کرنے سے جُدا جُدا مقصود ہے ایک جگہ اس کی آمیزش بتلانا ہے دوسری
جگہ اسکا کثیر و مسخر ہونا کہ اسباب عیش کی کثرت اور تابع طبیعت ہونا لذت عیش کو بڑھا دیتا ہے آگے
ان ابرار کی صفات مذکور ہیں کہ) وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور (ادا بھی کرتے ہیں خلوص سے کیونکہ وہ
ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی (یعنی کم و بیش سب پر اس کی سختی کا اثر ہوگا مراد قیامت کا
دن ہے الامن شاء اللہ تعالیٰ اور (وہ لوگ ایسے مخلص ہیں کہ عبادات مالیہ میں بھی جس میں غالباً اخلاص
کم ہوتا ہے کمال درجہ کا اخلاص رکھتے ہیں چنانچہ) وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور
قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (قیدی اگر مظلوم ہے کہ ظلماً قید کر لیا گیا تب تو اس کی اعانت کا مستحسن ہونا ظاہر ہے
اور اگر ظالم ہے کہ ظلم کی سزا میں قید ہوا ہے تو شدت حاجت کے وقت اسکا اطعام بھی مستحسن ہے اور
وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دل سے یوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کیلئے کھانا کھلاتے ہیں
نہ ہم تم سے (اس کا عملی) بدلہ چاہیں اور نہ (اسکا قولی) شکریہ (چاہیں اور ہم خدا کی رضامندی کے
اسواسطے تم کو کھانا کھلاتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں (تو
اُمید رکھتے ہیں کہ ان مخلصانہ اعمال کی بدولت اُس دن کی تلخی و سختی سے محفوظ رہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ
خوف آخرت سے کوئی کام کرنا اخلاص اور ابتغاء مرضاۃ اللہ کے منافی نہیں) سو اللہ تعالیٰ انکو (اس
اطاعت و اخلاص کی برکت سے) اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمادیگا
(یعنی چہروں پر تازگی اور قلوب میں خوشی دیگا) اور ان کی پختگی (یعنی استقامت فی الدین) کے بدلہ میں
اُن کو جنت اور ریشمی لباس دیگا اس حالت میں کہ وہ وہاں (جنت میں) مسہریوں پر (آرام و عزت سے) تکیہ
لگائے ہونگے (اور) نہ وہاں تپش (اور گرمی) پاویں گے اور نہ جاڑا (بلکہ فرحت بخش معتدل موسم ہوگا) اور یہ
حالت ہوگی کہ وہاں کے یعنی جنت کے، درختوں کے سائے اُن (بہشتیوں) پر جھکے ہونگے (یعنی قریب ہونگے اور
سایہ اسباب تنعم سے ہے۔ جنت میں آفتاب ماہتاب نہیں ہونگے تو پھر سایہ کا کیا مطلب ہے ہوسکتا ہے کہ

تیسری جگہ سَقٰھُمْ (رَبُّھُمْ) میں نہایت ہی تشریف و تکریم ہے پس تکرار کا شائبہ نہ رہا اور ان سب نعمتوں کو دے کر اہلِ جنت سے مسرت روحانی بڑھانے کے لئے کہا جاوے گا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو دنیا میں کیا کرتے تھے) مقبول ہوئی (آگے فریقین کی جزا کا ذکر کرنے کے بعد بطور تفریع معنوی کے آپ کو تسلی دینے کا بیان ہے۔ یعنی ان مخالفین کی سزا آپ نے سن لی، پس آپ اُن کی مخالفت سے غم نہ کیجئے اور اپنی عبادت اور دعوت و اصلاح کے کام میں لگے رہیئے کہ علاوہ طاعت ہونے کے اسمیں قلب کی بھی تو تقویت ہے اور بیان اس طاعت کا یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے (تاکہ تھوڑا تھوڑا لوگوں کو پہنچاتے رہیں اور انکو اس سے فائدہ اٹھانے میں آسانی ہو جیسا کہ سورہ اسراء کے آخر میں ہے وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ الخ) سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر (کہ اس میں تبلیغ بھی داخل ہے) مستقل رہیئے اور اُن میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے (یعنی یہ جو تبلیغ سے منع کرتے ہیں کما فی الدر المنثور من سورۃ الکافرین۔ انکی موافقت نہ کیجئے مقصود اس سے اظہار اہتمام شان، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی موافقت کرنے کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا یہ تو عبادت متعدیہ کا امر ہوا) اور (آگے عبادت لازمہ کا امر ہے یعنی) اپنے پروردگار کا صبح و شام نام لیا کیجئے اور کسی قدر رات کے حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے (یعنی نماز فرض پڑھئے) اور رات کے بڑے حصے میں اُس کی تسبیح (و تقدیس) کیا کیجئے (مراد اس سے تہجد ہے علاوہ فرائض کے اور آگے تقویت تسلی کے لئے ایک اور مضمون ہے جس میں انکار کی مذمت بھی ہے یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی اصل وجہ آپ کے ساتھ یہ ہے کہ) یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے آنیوالے ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں (پس حُبِّ دنیا نے اندھا کر رکھا ہے اسلئے حق کہنے سے بغض رکھتے ہیں اور یوم ثقیل کا ذکر سنکر چونکہ احتمال اُن کے انکار کا تھا اسلئے آگے اُس یوم ثقیل کے استبعاد کو دفع فرماتے ہیں یعنی) ہم ہی نے اُن کو پیدا کیا اور ہم ہی نے اُن کے جوڑ بند مضبوط کئے اور (نیز) جب ہم چاہیں اُن ہی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں (اور امر اول تو مشاہد ہے اور دوسرا امر ادنیٰ تنبیہ سے معلوم ہو سکتا ہے پس دونوں امروں سے قدرت الٰہیہ ظاہر ہے پھر مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے ہی میں کونسی بات زیادہ دشوار ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو، آگے اُن تمام مضامین سابقہ پر بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ) یہ (سب جو مذکور ہوا کافی) نصیحت ہے سو جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے (وقد مر فی المزمل) اور (قرآن کے تذکرہ ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جاوے کہ بعض کو اس سے ہدایت نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ قرآن فی نفسہ تذکرہ اور ہدایت کافی ہے لیکن) بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لئے خدا کے نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہوتی ہیں کیونکہ) خدا تعالیٰ بڑا علم والا اور حکمت والا ہے وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور (جسکو چاہے کفر اور ظلم میں مبتلا رکھتا ہے پھر) ظالموں کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

معارف و مسائل

سورۂ دہر کا نام سورۂ انسان اور سورۃ الابرار بھی ہے (روح) اس میں تخلیق انسانی کی ابتداء و انتہا اور اعمال پر جزاء و سزا قیامت اور جنت دوزخ کے خاص حالات نہایت بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا، حرف ھل دراصل استفہام کے لئے آتا ہے اور بعض اوقات کسی بدیہی اور کھلی ہوئی چیز کو بصورت استفہام اس لئے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس کا واضح ہونا اور مؤکد ہونا ہے کہ جس سے پوچھو گے یہی جواب دیگا، دوسرا احتمال ہی نہیں جیسے کوئی شخص نصف النہار کے وقت کسی سے کہے کہ کیا یہ دن نہیں ہے اس کی صورت تو استفہام کی ہے مگر درحقیقت اُسکے انتہائی واضح ہونے کا بیان ہے۔ اسی لئے ایسے مواقع میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ حرف ھل بمعنی قد ہے جو تحقیق واقع کے لئے بولا جاتا ہے۔ بہر دو صورت مطلب آیت کا یہ ہے کہ انسان پر ایک زمانہ دراز ایسا گزرا ہے کہ دُنیا میں کہیں اس کا نام و نشان یہاں تک کہ ذکر و تذکرہ تک نہ تھا لفظ حِيْنٌ تنوین کے ساتھ ذکر کرنے سے اس وقت اور زمانے کی درازی کی طرف اشارہ ہے اور اس آیت میں یہ زمانہ دراز انسان پر گزرنا بیان فرمایا ہے جس میں اس کا فی الجملہ کسی نہ کسی طرح کا وجود ہونا لازمی ہے عدم محض کے زمانے کو تو انسان پر گزرنا نہیں کہا جا سکتا اس لئے اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس زمانہ دراز سے جو انسان پر گزرا وہ زمانہ مراد ہے جو قرار حمل کے بعد سے پیدائش تک کا وقت ہے جو عادۃً نو مہینے ہوتے ہیں کہ اسمیں انسان کی تخلیق پر جتنے دور گزرتے ہیں نطفہ سے لیکر جسم اور اعضاء اور پھر اُس میں روح حیات آنے تک وہ سب شامل ہیں۔ اس پورے زمانے میں اگرچہ اس کا وجود ایک طرح قائم ہو چکا ہے مگر نہ کوئی جانتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی نہ کوئی اس کا نام ہے نہ کسی کو اس کی شکل و صورت معلوم ہے اس لئے اس کا کہیں ذکر و تذکرہ تک نہیں ہے۔ اور اگر اس کو وسیع تر معنے دیئے جائیں تو تخلیق انسانی کی ابتداء جس طرح نطفہ سے ہوتی ہے وہ نطفہ بھی جس غذا سے پیدا ہوا وہ غذا اور غذا سے پہلے اُس غذا کا مادہ کسی نہ کسی صورت سے دُنیا میں تھا اگر اُس زمانے کو بھی شامل کریں تو یہ زمانہ دراز ہزاروں سال کا ہو سکتا ہے بہرحال حق تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کو ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی کہ اُس میں ذرا بھی شعور ہو اور کچھ بھی غور کرے تو اُس کو اپنی حقیقت کے انکشاف کے ساتھ اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے کے وجود اور علم و قدرت پر مکمل ایمان و یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگر ایک ستر برس کا انسان اس کا مراقبہ کرے اور اس پر غور کرے کہ اب سے اکہتر سال پہلے اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور نہ اس کا کسی عنوان سے کوئی ذکر کر سکتا تھا۔ ماں باپ اور دادا دادی کے دل میں بھی اس کے مخصوص وجود کا کوئی خطرہ تک نہ تھا گو مطلق بچہ کا تصور ہو۔ اس وقت کیا چیز اُس کی ایجاد و تخلیق کی داعی ہوئی اور کس محیر العقول قدرت نے دُنیا بھر میں

پھیلے ہوئے ذرات کو اس کے وجود میں جمع کر کے اس کو ایک ہوشیار دانا بینا اور سمیع و بصیر انسان بنا دیا تو وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا ؎

نبودیم و تقاضا ما نبود ✻ لطف تو ناگفتہ ما می شنود

اس کے بعد تخلیق انسانی کی ابتداء کا بیان اس طرح فرمایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ یعنی ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے۔ امشاج، مشیج یا مشج کی جمع ہے جس کے معنے مخلوط کے آتے ہیں اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد و زن کا مخلوط نطفہ مراد ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے فرمایا ہے اور روح المعانی میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ امشاج سے مراد اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا، صفرا ہیں جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔

ہر انسان کی تخلیق میں دنیا بھر کے اجزاء ہیں اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاط اربعہ مذکورہ بھی اقسام غذا سے حاصل ہوتے ہیں اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اس میں دور دراز ملکوں اور خطوں کے اجزاء آب و ہوا وغیرہ کے ذریعہ شامل ہوتے ہیں اس طرح ایک انسان کے موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایسے اجزاء اور ذرات کا مجموعہ ہے جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں بکھرے ہوئے تھے قدرت کے نظام عجیب نے حیرت انگیز طریقہ پر اُن کو اس کے وجود میں سمو دیا ہے۔ اگر امشاج کا مطلب یہ لیا جائے تو اس جگہ لفظ امشاج کے ذکر سے منکرین قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا کیونکہ ان خدا ناشناس لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے میں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دنیا میں بکھر جاتا ہے ان کو دوبارہ جمع کرنا پھر انمیں روح ڈالنا اُن کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔

امشاج بمعنے اخلاط کی تفسیر میں اُن کے اس شبہ کا ایک واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیق انسانی میں بھی تو دُنیا بھر کے اجزاء و ذرات شامل تھے جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اُس کے لئے اسکا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو گیا اور اس تفسیر پر لفظ امشاج کا اس جگہ اضافہ بھی ایک مستقل فائدہ کیلئے ہو سکتا ہے واللہ اعلم۔

نَبْتَلِيْهِ ابتلاء سے مشتق ہے جس کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں یہ تخلیق انسانی کی غرض و حکمت کا بیان ہے کہ انسان کو اس شان کیساتھ پیدا کرنے کا مقصد اُس کی آزمائش ہے جسکا بیان اگلی آیتوں میں آیا ہے کہ ہم نے انبیاءؑ اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ اُس کو راستہ دکھلا دیا کہ یہ راستہ جنّت کی طرف اور دوسرا دوزخ کی طرف جاتا ہے اور اُسے اختیار دیدیا کہ ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے چنانچہ انمیں دو گروہ ہو گئے اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا یعنی ایک گروہ اُن لوگوں کا ہوا جنھوں نے اپنے پیدا کرنے والے اور نعمت دینے والے کو پہچان کر اسکا شکر ادا کیا اور اُس پر ایمان لایا دوسرا گروہ وہ ہوا جس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور کافر رہا۔ اس کے بعد ان دونوں گروہوں کی جزا اور انجام کا ذکر فرمایا کہ کافروں کیلئے زنجیریں اور طوق اور جہنم ہے اور ابرار یعنی ایمان و طاعت کے پابند لوگوں کے لئے بڑی بڑی نعمتیں ہیں سب سے

احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا، یعنی اہل جنت کے یہ انعامات اس سبب سے بھی ہیں کہ وہ دنیا میں مسکینوں، تیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے علٰی حُبِّهٖ میں حرف علٰی بمعنے مع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی حالت میں بھی غریبوں کو کھانا کھلاتے جبکہ وہ کھانا خود اپنے لئے بھی ان کو محبوب اور پسند ہے۔ یہی نہیں کہ اپنے سے زائد فالتو کھانا غریبوں کو دیدیں مسکین اور یتیم کو کھانا کھلانے کا عبادت و ثواب ہونا تو ظاہر ہے۔ قیدی سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اُصول شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم، مگر بہر حال اس کا کھانا کھلانا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے جو شخص اس کو کھانا کھلاتا ہے وہ گویا حکومت اور بیت المال کی اعانت کرتا ہے اسلئے قیدی چاہے کافر بھی ہو اسکو کھانا کھلانا ثواب ہوگا خصوصاً ابتدائے اسلام میں تو قیدیوں کا کھانا پینا اور انکی حفاظت عام مسلمانوں میں تقسیم کرکے انکے ذمہ کردیجاتی تھی جیسے غزوہ بدر کے قیدیوں کیساتھ معاملہ کیا گیا۔

قَوَارِیْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ، دنیا میں چاندی کا برتن کثیف ہوتا ہے آئینہ کی طرح نہیں ہو سکتا اور جو کانچ سے تیار کیا جاتا ہے وہ چاندی نہیں ہو سکتا ان دونوں میں تضاد ہے مگر یہ جنت کی خصوصیت ہے کہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جنت میں جتنی چیزیں ملیں گی اُن سب کی نظیر اور شبیہ دنیا میں بھی ملتی ہیں سوائے ان گلاسوں اور برتنوں کے جن کی ساخت چاندی سے ہے مگر آئینہ کی طرح شفاف ہیں۔

وَیُسْقَوْنَ فِیْهَا کَاْسًا کَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا، زنجبیل کے معروف معنے سونٹھ کے ہیں اور عرب لوگ شراب میں اُس کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لئے اس کو جنت میں بھی اختیار کیا گیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں اور دنیا کی چیزوں میں نام کے اشتراک کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں اس لئے وہاں کی زنجبیل کو دنیا کی زنجبیل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ، اساور سوار کی جمع ہے کنگن کو کہا جاتا جو ہاتھوں میں پہننے کا زیور ہے اس آیت میں چاندی کے کنگن کا ذکر ہے اور ایک دوسری آیت میں اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ آیا ہے یعنی کنگن سونے کے، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت چاندی کے کسی وقت سونے کے کنگن استعمال کئے جاویں یا بعض کے کنگن سونے کے ہوں بعض کے چاندی کے، مگر ایک سوال اس جگہ بہر حال ہے کہ چاندی کے کنگن ہوں یا سونے کے بہر حال یہ زیور ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لئے ہوتے ہیں مردوں کے لئے ایسے زیور پہننا عیب سمجھا جاتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا عورتوں یا مردوں کے لئے مخصوص ہونا اور ان کیلئے مستحسن یا عیب ہونا یہ چیز عرف و عادت کے تابع ہوتی ہے بعض ملکوں یا قوموں میں ایک چیز بڑی عیب اور بری سمجھی جاتی ہے دوسری قوموں میں وہ بڑا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا میں ملوک کسریٰ ہاتھوں میں

کنگن اور پہنے اور تاج میں زیورات استعمال کرتے تھے اور یہ ان کا خاص امتیاز و اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ملک کسریٰ فتح ہونے کے بعد جو خزائن کسریٰ مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے۔ جب دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کے معمولات میں جغرافیائی اور قومی تفاوت سے یہ معاملہ مختلف ہو سکتا ہے تو جنت کو دنیا پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہاں زیور مردوں کے لئے بھی مستحسن سمجھا جائے

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاۗءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا، یعنی اہل جنت کو جنت میں پہنچنے کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوگا کہ جنت کی یہ محیر العقول نعمتیں سب تمہارے اعمال کی جزا ہے جو تم نے دنیا میں کئے تھے اور تمہارے عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہوگئے۔ یہ کلمات ان کو بطور مبارکباد کے کہے جائیں گے۔ اہل حق و جنت سے پوچھئے تو جنت کی ساری نعمتیں ایک طرف اور رب العالمین کا یہ فرمانا ایک طرف سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے کہ اس میں حق تعالیٰ ان کو اپنی رضا کامل کی سند دے رہے ہیں۔ عام اہل جنت کے انعامات کا ذکر کرنے کے بعد خاص ان انعامات کا ذکر کیا گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مبذول ہوئے ان میں سب سے بڑا انعام تنزیل قرآن ہے اس انعام عظیم کا ذکر کرنے کے بعد اول تو آپ کو اس کی ہدایت کی گئی کہ مخالفین و کفار کی طرف سے جو ضد و انکار اور ان کی ایذاؤں کی تکلیف آپ کو پہنچتی ہے آپ اس پر صبر سے کام لیں۔ دوسرے اللہ کی عبادت کو دن رات کا مشغلہ بنائیں اسی سے کفار کی اذیت کا بھی ازالہ ہوگا

آخر میں معاند کفار کے کفر پر جمے رہنے کی وجہ بتلائی گئی کہ یہ جاہل دنیا کی سطحی سرسری اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہوگئے کہ انجام کو یعنی آخرت کو بھلا بیٹھے حالانکہ ہم نے دنیا میں بھی خود ان کے وجود میں ایسی چیزیں رکھی تھیں کہ انہیں غور کرتے تو اپنے خالق و مالک کو پہچان لیتے نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ یعنی ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ان کے وجود کی صنعت میں ایک خاص کمال یہ رکھا کہ ان کے جوڑ بند مضبوط و مستحکم بنائے۔

انسانی جوڑ بند میں قدرت کا کرشمہ: اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ بند پر نظر ڈالے کہ حق تعالیٰ نے حکمت و راحت انسانی جوڑ جو دیکھنے میں نرم و نازک معلوم ہوتے ہیں اور نرم پٹھوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں بظاہر تو ان کا تقاضا یہ تھا کہ سال دو سال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے خصوصاً جبکہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں مڑتے تڑتے جاتے ہیں اتنی شبانہ روز حرکت کے ساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دو سال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں یہ نرم و نازک پٹھے دیکھو کس طرح اعضاء کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں۔ انسان اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں کیسے کیسے زور اور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھس گیا ہوتا مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اسی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ تبارک اللہ احسن الخالقین ؕ

تمت سورۃ الدہر بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ المُرْسَلٰت

سُورَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

[illegible]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

[illegible]

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ

[illegible]

فَرْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۭ﴿۷﴾

[illegible]

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَاۗءُ فُرِجَتْ ۙ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴿۱۰﴾

[illegible]

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۭ﴿۱۱﴾ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۭ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۚ﴿۱۳﴾ وَمَآ

[illegible]

اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۭ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ

[illegible]

الْاَوَّلِيْنَ ۭ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾

[illegible]

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ

[illegible]

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ڰ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾

[illegible]

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٤﴾ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ﴿٢٥﴾ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا ﴿٢٦﴾

زندوں کو اور مُردوں کو

وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنَاكُم مَّاءً فُرَاتًا ﴿٢٧﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ

لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٢٨﴾ انطَلِقُوا إِلَىٰ مَا كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٩﴾ انطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ

ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ

كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٤﴾ هَٰذَا

يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ

لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٧﴾ هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنَاكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾ فَإِن كَانَ لَكُمْ

كَيْدٌ فَكِيدُونِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ

فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا

بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٤٤﴾ وَيْلٌ

يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ ﴿٤٦﴾

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿٤٨﴾

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی — پھر کس بات پر اس کے بعد یقین لائیں گے

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں پھر ان ہواؤں کی جو تیزی سے چلتی ہیں جس سے خطرات کا احتمال ہوتا ہے، اور ان ہواؤں کی جو بادلوں کو (اٹھا کر) پھیلاتی ہیں (جس کے بعد بارش ہونے لگتی ہے)، پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کر دیتی ہیں (جیسا بارش کے بعد ہوتا ہے) پھر ان ہواؤں کی جو (دل میں) اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا القا کرتی ہیں (یعنی یہ ہوائیں مذکورہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کی وجہ سے خالق کائنات کی طرف توجہ ہونے کا سبب ہوتی ہیں اور وہ توجہ دو طور سے ہوتی ہے ایک خوف سے جبکہ ان ہواؤں سے آثار خوف کے نمایاں ہوں اور دوسرا توبہ و معذرت سے اور یہ خوف و رجا کی دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں، اگر ہوائیں نفع بخش ہوں تب تو خدا کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا شکر اور اپنی تقصیرات سے عذر کرتے ہیں اور اگر وہ ہوائیں خوفناک ہوں تو خدا کے عذاب سے ڈر کر اپنے معاصی سے توبہ کرتے ہیں، آگے جواب قسم ہے) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے۔ (مراد قیامت ہے اور یہ سب قسمیں قیامت کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ نفخہ اولیٰ کے بعد تمام عالم کی فنا کا واقعہ تیز آندھیوں کے مشابہ ہے اور نفخہ ثانیہ کے بعد کے واقعات مردوں کا زندہ ہونا وغیرہ مشابہ واقعات ہوائے نافع کے ہیں جس سے بارش اور بارش سے حیات نباتی ابھرتی ہے۔ آگے اس کے وقوع پر تفریع فرماتے ہیں) سو جب ستارے بے نور ہو جاویں گے اور جب آسمان پھٹ جاوے گا اور جب پہاڑ اڑتے پھریں گے اور جب سب پیغمبر وقت معین پر جمع کئے جاویں گے (اس وقت سب کا فیصلہ ہوگا، آگے اس یوم کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ کچھ معلوم ہے) کس دن کے لئے پیغمبروں کا معاملہ ملتوی رکھا گیا ہے (آگے جواب ہے کہ) فیصلہ کے دن کے لئے (ملتوی رکھا گیا ہے، مطلب اس سوال و جواب کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جو رسولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں اور اب بھی اس امت کے کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہیں اور جب اس تکذیب پر عذاب آخرت سے ڈرائے جاتے ہیں تو آخرت کی بھی تکذیب کرتے ہیں اور یہ تکذیب فی نفسہ مقتضی اس کو ہے کہ رسولوں کا جو قصہ کفار سے پیش آرہا ہے اس کا فیصلہ ابھی ہو جاوے اور اس کی تاخیر سے کفار کو مزید انکار و تکذیب کا موقع ملتا ہے اور مسلمانوں کو طبعی طور پر اس کے جلد ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے پس اس آیت میں استعجال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض حکمتوں سے اس کو موخر کر رکھا ہے لیکن واقع ضرور ہوگا) اور (آگے اس فیصلہ کے دن کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ) آپ کو معلوم ہے کہ وہ فیصلہ کا دن کیسا کچھ ہے (یعنی بہت سخت ہے اور جو لوگ اس امر حق یعنی وقوع قیامت کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے نظائر سابقہ کے ذریعہ موجودہ لوگوں کو ڈراتا ہے) کیا ہم اگلے (کافر) لوگوں کو (عذاب سے)

جو لوگ اس امر حق یعنی اس واقعہ کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے اور واقعہ متعلق کفار ہے یعنی) یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو اجازت (عذر پیش کرنے کی) ہوگی سو عذر بھی نہ کر سکیں گے (کیونکہ واقع میں کوئی معقول عذر ہوگا ہی نہیں، اور جو لوگ اس واقعہ حقہ کو بھی جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے بھی اسی یوم کا بیان ہے کہ ان لوگوں سے کہا جاوے گا کہ) یہ ہے فیصلہ کا دن (جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے) ہم نے (آج) تم کو اور اگلوں کو (فیصلے کے لئے) جمع کر لیا سو اگر تمہارے پاس (آج کے نتیجہ اور فیصلے سے بچنے کی) کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلا لو (اور یہ کفار اس واقعہ حقہ کی بھی تکذیب کرتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے کفار کے مقابلے میں اہل ایمان کے ثواب کا بیان ہے یعنی) پرہیزگار لوگ سایوں میں اور چشموں میں اور مرغوب میووں میں ہوں گے (اور ان سے کہا جاوے گا کہ) اپنے اعمال (نیک) کے صلہ میں خوب مزے سے کھاؤ پیو ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (اور یہ کفار ہماری جنت کی بھی تکذیب کرتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (آگے پھر توبیخ و تنبیہ ہے کفار کو یعنی اے کافرو!) تم (دنیا میں) تھوڑے دن اور کھا لو اور برت لو (عنقریب کمبختی آنے والی ہے کیونکہ) تم بیشک مجرم ہو (اور مجرم کا یہی حال ہونے والا ہے اور جو لوگ سزائے مذکور کو جھٹلاتے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی اور (ان لوگوں کی سرکشی اور تکبر کی یہ حالت ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (خدا کی طرف) جھکو (یعنی ایمان اور عبدیت اختیار کرو) تو نہیں جھکتے (اس سے زیادہ کیا جرم ہوگا اور یہ لوگ اس کے جرم ہونے کو بھی جھٹلاتے ہیں سو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (اور ان تقریعات و تہدیدات قرآنیہ کا مقتضا یہ تھا کہ سنتے ہی ڈر کر ایمان لے آتے مگر جب اس پر بھی ان کو اثر نہیں) تو پھر اس (قرآن بلیغ الالفاظ والانذار) کے بعد اور کونسی بات پر ایمان لاویں گے (اسمیں کفر پر توبیخ اور ان کے ایمان سے آپ کو مایوس کرنا ہے)

معارف و مسائل

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ کے ایک غار میں تھے اچانک سورۂ مرسلات نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے جاتے تھے اور میں آپ کے مبارک منہ سے اس کو سنتا یاد کرتا جاتا تھا، آپ کا دہن مبارک اس سورت کی حلاوت سے رطب (شاداب) ہو رہا تھا اچانک ایک سانپ نے ہم پر حملہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، ہم اس کی طرف جھپٹے وہ نکل بھاگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

وہ بری طرح تمام اس کے شر سے محفوظ رہے وہ کسی قدر اس کے شر سے محفوظ ہو گیا (ابن کثیر)

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور پر آنے کا ذکر فرمایا ہے، ان چیزوں کا نام قرآن نے بیان نہیں کیا البتہ ان کی یہ پانچ صفتیں بیان فرمائی ہیں مُرسلات، عاصفات، ناشرات، فارقات، مُلقیات ذکراً۔ کسی حدیث مرفوع میں اس کی پوری تعیین نہیں آئی کہ ان صفات سے موصوفات کیا ہیں اس لئے صحابہ و تابعین کی تفسیریں اس معاملے میں مختلف ہو گئیں

بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ فرشتوں کی مختلف جماعتیں ہیں مختلف صفات کی حامل ہوں۔ بعض حضرات نے ان صفات کا موصوف ہواؤں کو قرار دیا ہے وہ بھی مختلف قسم اور نوعیت کی ہوتی ہیں اس لئے صفاتِ مختلفہ ان میں ہو سکتی ہیں۔ بعض حضرات نے ان کا موصوف حضرات انبیاء و رسل کو قرار دیا ہے۔ ابن جریر طبری نے اسی لئے اس معاملہ میں توقف اور سکوت کو احوط قرار دیا کہ احتمال دونوں ہیں ہم اپنی طرف سے کسی کو متعین نہیں کرتے۔

اور اس میں شبہ نہیں کہ جو پانچ صفات اس جگہ ذکر کی گئی ہیں ان میں سے بعض تو ملائکۃ اللہ پر زیادہ چسپاں اور ان کے مناسب ہیں ان کو ریاح کی صفت بنانے میں کھینچ تان اور تاویل کرنا پڑتی ہے، اور بعض صفات ایسی ہیں جو ریاح یعنی ہواؤں پر زیادہ چسپاں اور واضح ہیں ان کو فرشتوں کی صفت بنانے میں تو تاویل کے بغیر نہیں بنتی۔ اسلئے اس مقام میں بہتر فیصلہ ابن کثیر کا معلوم ہوتا ہے انھوں نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کی صفتیں ہیں ان تین میں ریاح اور ہواؤں کی قسم ہوئی باقی آخری دو صفتیں یہ فرشتوں کی صفات ہیں تو یہ فرشتوں کی قسم ہوئی

ریاح کی صفت قرار دینے میں آخری دو صفتوں میں جو تاویل کرنی پڑتی ہے وہ آپ خلاصہ تفسیر میں دیکھ چکے ہیں کیونکہ اس میں اسی کو اختیار کر کے تفسیر کی گئی ہے۔ اسی طرح جن حضرات نے ان سب صفات کو صفت ملائکہ قرار دیا ہے ان کو پہلی تین صفات یعنی مُرسلات عاصفات ناشرات کو فرشتوں پر چسپاں کرنے کے لئے اسی طرح کی تاویلات سے کام لینا پڑا ہے۔ ابن کثیر کے اختیار کے مطابق ان آیتوں کے یہ معنی ہو گئے کہ قسم ہے ان ہواؤں کی جو بھیجی جاتی ہیں عُرفاً، یہاں عرف کا مفہوم وہ بھی ہو سکتا ہے جو خلاصہ تفسیر میں اوپر مذکور ہوا یعنی جود و سخا اور نفع رسانی۔ جو ہوائیں بارش لیکر آتی ہیں ان کی جود و سخا اور نفع رسانی ظاہر ہے اور دوسرے معنے عرفاً کے متتابع یعنی پے در پے کے بھی آتے ہیں۔ یہ معنے لئے جاویں تو مراد وہ ہوائیں ہونگی جو بادل اور بارش کو لئے ہوئے مسلسل اور متتابع چلتی ہیں۔ اور عاصفات عصف سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں اس سے مراد وہ آندھیاں اور تیز ہوائیں ہیں جو بعض اوقات دنیا میں آیا کرتی ہیں۔ اور ناشرات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بارش ختم ہونے کے بعد بادل کو پھاڑ کر منتشر کر دیتی ہیں۔ اور فارقات، یہ صفت فرشتوں کی ہے جو وحی الٰہی نازل کر کے حق و باطل میں

فرق واضح کر دیتے ہیں اور مُلقیات ذکرًا بھی فرشتوں کی صفت ہے اور ذکر سے مراد قرآن یا مطلق وحی ہے۔
اور مطلب یہ ہے کہ قسم ہے اُن فرشتوں کی جو بذریعہ وحی حق و باطل میں فرق اور امتیاز واضح کر دیتے ہیں اور
قسم ہے اُن فرشتوں کی جو انبیاء علیہم السلام پر ذکر یعنی وحی اور قرآن کا القاء کرتے ہیں اس طرح کسی صفت
میں تاویل اور کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

رہا یہ سوال کہ اس تفسیر کی بناء پر پہلے ہواؤں کی مختلف اقسام کی قسم کھائی گئی پھر فرشتوں کی، ان دونوں
میں ربط اور جوڑ کیا ہے سو ملائکہ کی حکمتوں کا احاطہ تو کوئی کر نہیں سکتا، یہ مناسبت بھی ہو سکتی ہے کہ ہواؤں
کی دونوں قسمیں بارش والی نفع بخش اور سخت آندھیاں وغیرہ یہ سب محسوسات میں سے ہیں ہر شخص
ان کو جانتا ہے پہلے غور و فکر کے لئے انسان کے سامنے ان کو لایا گیا، اس کے بعد فرشتوں اور وحی کو پیش
کیا گیا جو محسوس نہیں مگر ذرا سے غور و فکر کرنے پر اُن کا یقین ہو سکتا ہے

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا، یہ فالملقیت ذکرا سے متعلق ہے کہ یہ ذکر اور وحی انبیاء علیہم السلام پر اسلئے نازل کی
جاتی ہے کہ وہ اہل حق مومنین کے لئے ان کی کوتاہیوں سے معذرت کا سبب بنے اور اہل باطل کفار کے لئے
نذیر اور عذاب سے ڈرانے والا ثابت ہو۔

ہواؤں یا فرشتوں یا دونوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ یعنی تم سے جس
قیامت اور حساب کتاب جزاء و سزا کا وعدہ بذریعہ انبیاء کیا جا رہا ہے وہ ضرور پورا اور واقع ہو کر رہے گا۔
آگے اس کے واقع ہونے کے وقت کے چند حالات کا ذکر ہے۔ اول یہ کہ سب ستارے بے نور ہو جائیں گے
جس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ سب بالکلیہ فنا ہی ہو جاویں، یا یہ کہ موجود رہیں مگر ان کا نور سلب
ہو جائے، اس طرح پوری دنیا ایک انتہائی سخت اندھیری میں غرق ہو جائے گی۔ دوسرا حال یہ بیان
فرمایا کہ آسمان پھٹ جائیں گے۔ تیسرا یہ کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ چوتھا حال
یہ بتلایا وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ، اُقِّتَتْ، توقیت سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تعیین وقت اور
تحدید وقت کے ہیں اور بقول زمخشری کبھی اسکے معنے کسی مقررہ وقت پر پہنچ جانے کے بھی آتے ہیں (کما
فی القرطبی) اس جگہ یہی دوسرے معنے مناسب ہیں اور معنی آیت کے یہ ہونگے کہ انبیاء و رسل کے لئے
جو میعاد اور وقت مقرر کیا گیا تھا کہ انہیں اپنی اپنی اُمتوں کے مقابلے میں شہادت کے لئے حاضر ہوں
وہ اس میعاد کو پہنچ گئے اور اُن کی حاضری کا وقت آ گیا۔ اسی لئے خلاصہ تفسیر مذکور میں اسکا ترجمہ
انبیاء کے جمع کرنے کے ساتھ کیا گیا آگے قیامت کے دن کے عظیم اور ہولناک ہونے کا بیان ہے کہ وہ
فیصلہ کا دن ہے جس میں مکذبین اور کفار کے لئے تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کے یہی معنی ہیں۔ ویل کے معنے ہلاکت و بربادی کے ہیں اور بعض
روایات حدیث میں ہے کہ ویل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس میں اہل جہنم کے زخموں کی پیپ

جمع ہوگئی یہ جملہ مستانفہ ہے جس کی قراءت رفع پر ہے، اس کے بعد موجودہ لوگوں کو پچھلی امتوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کے لئے فرمایا اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ یعنی کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ان کے کفر و شرارت کی وجہ سے ہلاک نہیں کر دیا۔ قوم عاد و ثمود اور قوم لوط قوم فرعون وغیرہ کی طرف اشارہ ہے اور ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ مشہور[1] و معروف قراءت کے مطابق بسکون عین عطف ہے نُهْلِكِ پر جس کے معنی یہ ہیں کیا ہم نے اولین کے بعد آخرین کو بھی ان کے پیچھے ہلاک نہیں کر دیا۔ اس لئے آخرین سے مراد بھی پچھلی امتوں ہی کے آخری لوگ ہوں گے جن کی ہلاکت نزول قرآن سے پہلے واقع ہو چکی ہے اور دوسری ایک قراءت میں نُتْبِعُهُمْ بضم عین بھی آیا ہے۔ اس قراءت پر یہ جملہ الگ ہے اور آخرین سے مراد امت محمدیہ کے افراد ہیں۔ پچھلی امتوں کی ہلاکت اور عذاب کی خبر دینے کے بعد موجودہ کفار اہل مکہ کو آئندہ ان پر آنے والے عذاب کی خبر دینا مقصود ہے جیسا کہ غزوہ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر عذاب ہلاکت نازل ہوا۔

فرق یہ ہے کہ پچھلی امتوں پر آسمانی عذاب آتا تھا جس سے پوری بستیاں تباہ ہو جاتی تھیں امت محمدیہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے یہ اعزاز خاص ہے کہ ان کے اوپر آسمانی عذاب نہیں آتا بلکہ ان کا عذاب مسلمانوں کی تلوار سے آتا ہے جس میں ہلاکت عام نہیں ہوتی صرف بڑے سرکش مجرم ہی مارے جاتے ہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاۗءً وَّاَمْوَاتًا، یعنی ہم نے زمین کو کفات بنایا ہے زندہ اور مُردہ انسانوں کے لئے۔ کفات، کفت سے مشتق ہے جس کے معنے ملانے اور جمع کر لینے کے ہیں کفات وہ چیز جو بہت سی چیزوں کو اپنے اندر جمع کر لے۔ زمین کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ زندہ انسان اس کی پیٹھ پر سوار ہیں اور مُردے سب اس کے پیٹ میں جمع ہیں۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ، كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ، قصر کے معنی بڑا عالیشان محل۔ اور جمالۃ جمع جمل اونٹ کو کہا جاتا ہے۔ صُفْر، اصفر کی جمع ہے جس کے معنے زرد کے ہیں۔ مراد آیت کی یہ ہے کہ اس جہنم کی آگ سے اتنے بڑے بڑے شرارے اٹھیں گے جو ایک مستقل محل عالیشان کی برابر ہوں گے پھر وہ متفرق ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوں گے وہ ٹکڑے زرد اونٹوں کی برابر ہوں گے اور بعض حضرات نے اس جگہ صُفر کا ترجمہ سیاہ کیا ہے کیونکہ زرد اونٹ کی زردی سیاہی مائل ہوتی ہے (روح)۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ، وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ، یعنی اس دن نہ تو لوگ بول سکیں گے اور نہ کسی کو اپنے کئے ہوئے عمل کا عذر پیش کرنے کی اجازت ہوگی۔ اور دوسری آیات قرآن میں جو

---

[1] اس مقام پر حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ مشہور و معروف قراءت سکون عین کی نہیں ہے ضمِ عین کی ہے، جیسا کہ کتب قراءت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ سکونِ عین کی قراءت درحقیقت شاذ ہے۔ ۱۲ محمد عبدہ

کفار کا بولنا اور عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ اس کے منافی نہیں کیونکہ محشر میں مختلف مواقف اور مقامات آئیں گے کسی مقام میں کلام اور عذر پیش کرنا ممنوع ہوگا، کسی میں اجازت ہوگی۔ (روح)

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ، یعنی کھاؤ پیو اور آرام اٹھاؤ تھوڑے دن کیونکہ تم مجرم ہو، آخر کار سخت عذاب میں جانا ہے۔ یہ مکذبین کو خطاب ہے دنیا میں، انبیاء کے ذریعہ اُن کو کہا گیا ہے کہ یہ تمہارا عیش و آرام چند روزہ ہے پھر عذاب ہی عذاب ہے (کذا فسرہ ابو حیان)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ، یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک رکوع سے مراد اسکے لغوی معنی یعنی جھکنا اور اطاعت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب دنیا میں اُن کو احکام الہیہ کی اطاعت کے لئے کہا جاتا تھا تو یہ اطاعت نہ کرتے تھے۔ اور بعض حضرات نے رکوع کے اصطلاحی معنے بھی مراد لئے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ جب ان کو نماز کی طرف بلایا جاتا تھا تو یہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ رکوع بول کر پوری نماز مراد لی گئی ہے (روح)

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ، یعنی جب یہ لوگ قرآن جیسی عجیب و غریب بلیغ اور حکمتوں سے پر واضح دلائل کی کتاب پر ایمان نہ لائے تو اس کے بعد اب کس بات پر ایمان لائیں گے مراد اُنکے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب تلاوت کرنے والا اس آیت پر پہنچے تو اسکو کہنا چاہیے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ، یعنی ہم اللہ پر ایمان لے آئے۔ نماز سے خارج میں اور نوافل میں یہ الفاظ کہنے چاہئیں مگر فرائض میں اور سنن میں اس زیادتی سے احتراز کرنا روایات حدیث سے ثابت ہے اس لئے اُس میں نہ کہا جائے۔ **واللہ اعلم**

تمت سورۃ المرسلٰت بحمد اللہ لآخر یوم من رجب ۱۳۹۰ھ وللہ

تم الجزء التاسع والعشرون من القرآن بحمد اللہ الموفق لاتمام الباقی

سُوْرَةُ النَّبَأ

سُوْرَةُ النَّبَإِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نبا مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۭ

کیا باتیں پوچھتے ہیں لوگ آپس میں بڑی خبر سے جس میں وہ کئی طرف ہو رہے ہیں

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ

ہرگز نہیں اب جان لیں گے پھر بھی ہرگز نہیں اب جان لیں گے کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّ

اور پہاڑوں کو میخیں اور تم کو بنایا جوڑے جوڑے اور بنایا نیند کو تمہاری دفع ماندگی اور

جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۠ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا

بنایا رات کو اوڑھنا اور بنایا دن کو کمائی کرنے کو اور چنے تم سے اوپر سات

شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۠ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً

چنائی مضبوط اور بنایا ایک چراغ چمکتا اور اتارا نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا

ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۭ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ

ریلا تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے بیشک دن فیصلہ کا ہے

كَانَ مِيْقَاتًا ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ وَّفُتِحَتِ

ایک وقت ٹھہرا ہوا جس دن پھونکی جائے صور پھر تم چلے آؤ جُٹ کے جُٹ اور کھولا جائے

السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۭ اِنَّ جَهَنَّمَ

آسمان تو ہو جائیں اس میں دروازے اور چلائے جائیں پہاڑ تو ہو جائیں چمکتا ریتا بیشک دوزخ ہے

اُن کا اہتمام شان ہی ظاہر کرتا ہے۔ آگے اُن کے اختلاف کا بے وجہ و باطل ہونا بیان کیا گیا ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں (کہ قیامت نہ آوے گی) ہرگز ایسا نہیں بلکہ قیامت آوے گی اور اُن کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (یعنی جب دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اُن پر عذاب شروع ہوگا تب حقیقت اور حقیت قیامت کی منکشف ہو جاوے گی اور) پھر (مکرر کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آوے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ آوے گی اور) اُن کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (اور چونکہ وہ لوگ اس کو بعید یا محال سمجھتے ہیں، آگے اس کے امکان اور وقوع کا بیان ہے کہ اس کو محال سمجھنے سے ہماری قدرت کا انکار لازم آتا ہے اور ہماری قدرت کا نفاذ نہایت عجیب ہے چنانچہ) کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا (یعنی مثل میخوں کے بنایا جیسا کسی چیز میں میخیں گاڑ دینے سے وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلتی اسی طرح زمین کو پہاڑوں سے مستقر کر دیا، اس کی تحقیق سورہ نحل میں گزر چکی ہے اور (اس کے علاوہ ہم نے اور بھی دلائل قدرت ظاہر فرمائے چنانچہ) ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد و عورت) بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا (مراد آفتاب ہے لقولہ تعالیٰ وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا) اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے بہت پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں، (اور ان سب سے ہمارا کمال قدرت ظاہر ہے پھر قیامت پر ہمارے قادر ہونے کا کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ یہ بیان تھا امکان کا آگے وقوع کا ذکر ہے کہ) بیشک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے یعنی جس دن صور پھونکا جاوے گا پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آؤ گے (یعنی ہر امت جدا جدا ہوگی، پھر مومن جدا، کافر جدا، پھر ابرار جدا، اشرار جدا، سب ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر میدان قیامت میں حاضر ہونگے) اور آسمان کھل جاوے گا پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہو جاویں گے (یعنی اسقدر بہت سا کھل جاوے گا جیسے بہت سے دروازے ملا کر بہت بڑی جگہ کھلی ہوتی ہے پس کلام مبنی ہے تشبیہ پر، اب یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ دروازے تو آسمان میں اب بھی ہیں پھر اس دن دروازے ہونے کے کیا معنی، اور یہ کھلنا نزول ملائکہ کے لئے ہوگا جیسے سورہ فرقان میں تَشَقَّقُ السَّمَاءُ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی شرح وہاں گزری ہے) اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جاویں گے سو وہ ریت کی طرح ہو جاویں گے (لقولہ تعالیٰ كَثِيبًا مَّهِيلًا) اور یہ واقعات نفخہ ثانیہ کے وقت ہوں گے البتہ تسییر جبال میں یہاں بھی اور جہاں جہاں واقع ہوا ہے دونوں احتمال ہیں یا تو نفخہ ثانیہ کے بعد کہ اس سے عالم کی سب چیزیں اپنی ہیئت پر عود کر آویں گی، جب حساب کا وقت آوے گا پہاڑوں کو زمین کے برابر کر دیا جاوے گا تاکہ زمین پر کوئی آڑ پہاڑ نہ رہے سب ایک ہی میدان میں نظر آویں، اور یا یہ نفخہ اولیٰ کا وقت ہوگا جس سے خود فنا کرنا مقصود بالذات ہوگا، پھر اس تقدیر پر یوم کو ان سب اوقات کا ظرف فرمانا اس بناء پر ہوگا کہ نفخہ اولیٰ سے نفخہ ثانیہ تک کا مجموعہ ایک یوم قرار دے لیا گیا واللہ اعلم

آگے اس یوم الفصل میں جو فیصلہ ہوگا اس کا بیان ہے یعنی) بیشک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے (یعنی عذاب کے فرشتے انتظار اور تاک میں ہیں کہ کافر آویں تو اُن کو پکڑتے ہی عذاب دینے لگیں اور وہ) سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) جس میں وہ بے انتہا زمانوں (پڑے) رہیں گے (اور) اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں گے (اس سے زمہریر یعنی ٹھنڈک سردی کی نفی نہیں ہوتی) اور نہ پینے کی چیز کا (جس سے پیاس بجھے) بجز گرم پانی اور پیپ کے یہ (ان کو) پورا بدلہ ملیگا (اور وہ اعمال جن کا یہ بدلہ ہے یہ ہیں کہ) وہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ نہ رکھتے تھے اور ہماری (اُن) آیتوں کو (جن میں حساب وغیرہ کی اور حقہ کی خبر تھی) خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (اُن کے اعمال میں سے) ہر چیز کو (انکے نامۂ اعمال میں) لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے سو (ان اعمال پر ان کو مطلع کرکے کہا جاویگا کہ اب اُن اعمال کا) مزہ چکھو کہ ہم تم کو سزا ہی بڑھاتے چلے جائینگے (یہ تو کافروں کا فیصلہ ہوا آگے اہل ایمان کا فیصلہ مذکور ہے کہ) خدا سے ڈرنے والوں کے لئے بیشک کامیابی (یعنی کھانے اور سیر کو) باغ (جن میں طرح طرح کے میوے ہونگے) اور انگور (یہ تخصیص بعد التعمیم اہتمام شان کیلئے ہے) اور (دل بہلانے کو) نوخاستہ ہم عمر عورتیں ہیں اور (پینے کو) لبالب بھرے ہوئے جام شراب (اور) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ (کیونکہ یہ باتیں وہاں مطلق معدوم ہیں) یہ (ان کو ان کی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا آپ کے رب کی طرف سے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور اُن چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں ہیں (اور جو) رحمان ہے (اور) کسی کو اس کی طرف سے (مستقل) اختیار نہ ہوگا کہ (اُس کے سامنے) معروض کر سکے جس روز تمام ذی ارواح اور فرشتے (خدا کے روبرو) صف بستہ (خشوع و خضوع کے ساتھ) کھڑے ہونگے (اُس روز) کوئی بول نہ سکے گا بجز اسکے جسکو رحمان (بولنے کی) اجازت دیدے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے (ٹھیک بات سے مراد وہ بات ہے کہ جس کی اجازت دی گئی ہے یعنی بولنا بھی محدود و مقید ہوگا یہ نہیں کہ جو چاہے بولنے لگے اور مستقل اختیار سے یہی مراد ہے، آگے اوپر کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے کہ) یہ (دن جسکا اوپر ذکر ہوا) یقینی دن ہے سو جسکا جی چاہے (اسکے حالات سنکر) اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے (یعنی نیک عمل کرے کہ وہاں نیک ٹھکانا ملے، آگے اتمام حجت ہے کہ لوگو) ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے (جو کہ ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے) جس دن ہر شخص ان اعمال کو (اپنے سامنے حاضر) دیکھ لے گا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کئے ہوں گے اور کافر (حسرت سے) کہے گا کہ کاش میں مٹی ہو جاتا (تاکہ عذاب سے بچتا، اور یہ اُس وقت کہے گا جب چوپائے جانور مٹی کردیے جاویں گے، رواہ فی الدر عن ابی ہریرۃ رض -)

معارف و مسائل

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ لفظ عمّ دو حرفوں سے مرکب ہے عن اور ما حرف ما استفہام کے لئے آتا ہے۔

دنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مالداروں اور دنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی، ان کے پاس راحت کے سامان، راحت کا مکان، ہوا اور سردی گرمی کے اعتدال کی جگہ، نرم گدے تکیے سب کچھ ہوتے ہیں جو غریبوں کو بہت کم ملتے ہیں مگر نیند کی نعمت ان کی دست گیروں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں، وہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہ راست اسی کی طرف سے ملتی ہے بعض اوقات مفلس بے سامان کو بغیر کسی بستر تکیے کے کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دیدی جاتی ہے اور بعض اوقات سازو سامان والوں کو نہیں دی جاتی ان کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام نہیں کرتیں، پھر غور کرو اس نعمت کو حق تعالیٰ نے جیسا ساری مخلوق انسان اور جانور کے لئے عام فرمایا ہے اور مفت بلا محنت سب کو دیا ہے اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ صرف مفت بلا محنت ہی نہیں بلکہ اپنی رحمت کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنادیا ہے کہ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا ہی رہے مگر رحمت حق تعالیٰ شانہ اس پر جبراً نیند مسلط کر کے اس کو سلادیتی ہے کہ دن بھر کا تکان دور ہو جائے اور اس کے قویٰ دوسرے کام کے لئے تیز ہو جائیں، آگے اسی نیند کی عظیم نعمت کا تکملہ یہ بیان فرمایا کہ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا یعنی رات کو ہم نے چھپانے کی چیز بنادیا، اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو فطرۃً نیند اس وقت آتی ہے جب روشنی زیادہ نہ ہو، ہر طرف سکون ہو، شور شغب نہ ہو، حق تعالیٰ نے رات کو لباس یعنی اوڑھنے اور چھپانے کی چیز فرما کر اشارہ کر دیا کہ قدرت نے محض صرف نیند کی کیفیت ہی عطا نہیں فرمائی بلکہ سارے عالم میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جو نیند کے لئے سازگار ہوں۔ اول رات کی تاریکی، دوسرے پورے عالم انسان اور جانور سب پر بیک وقت نیند کا مسلط ہونا کہ جب سبھی سوجائیں گے تو پورے عالم میں سکون ہوگا ورنہ دوسرے کاموں کی طرح اگر نیند کے اوقات بھی مختلف لوگوں کے مختلف ہوا کرتے تو کسی کو بھی نیند کے وقت سکون میسر نہ آتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا، وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا، انسان کی راحت و سکون کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو غذا وغیرہ کی ضروریات ملیں ورنہ وہ نیند موت ہو جائے گی۔ اگر ہمہ وقت رات ہی رہتی اور آدمی سوتا ہی رہتا تو یہ چیزیں کیسے حاصل ہوتیں، ان کے لئے جدوجہد اور محنت اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے جو روشنی میں ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ تمہاری راحت کو مکمل کرنے کے لئے ہم نے صرف رات اور اسکی تاریکی ہی نہیں بنائی بلکہ ایک روشن دن بھی دیا جس میں تم کاروبار کر کے اپنی معاشی ضروریات حاصل کر سکو، فتبارک اللہ احسن الخالقین، اس کے بعد انسان کی راحت کے اس سامان کا ذکر ہے جو آسمان سے متعلق ہیں ان میں سب سے بڑی نفع بخش چیز آفتاب کی روشنی ہے اس کا ذکر فرمایا وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا یعنی ہم نے آفتاب کو ایک روشن بھڑکنے والا چراغ بنادیا، پھر آسمان کے نیچے جو چیزیں انسان کی راحت کے لئے پیدا فرمائیں ان میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز پانی برسانے والے بادل ہیں انکا ذکر فرمایا

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا، مُعْصِرٰت، مُعْصِرَہ کی جمع ہے پانی سے بھرے ہوئے ایسے بادل کو کہا جاتا ہے جو برسنے ہی والا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے نازل ہوتی ہے اور جن آیات میں آسمان سے نازل ہونے کا ذکر ہے یا تو ان میں بھی آسمان سے مراد فضائے آسمانی ہو جیسے کہ قرآن میں بکثرت لفظ سماء اس معنی کے لئے آیا ہے اور یا یہ کہا جائے کہ کسی وقت براہ راست آسمان سے بھی بارش آسکتی ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ان تمام صنائع قدرت اور نعمات ربانی کا ذکر فرمانے کے بعد پھر اصل مضمون قیامت کی طرف رجوع ہے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا، یعنی فیصلہ کا دن جس سے مراد قیامت ہے وہ ایک مؤقت اور متعین مدت ہے جس پر دنیا ختم ہو جائے گی جبکہ صور پھونکا جائے گا اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور دو مرتبہ ہوگا، پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہو جائے گا، دوسرے نفخہ سے پھر زندہ و قائم ہو جائیگا اس دوسرے نفخہ کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے سامنے فوج در فوج حاضر ہونگے۔ حضرت ابوذر غفاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے، ایک فوج ان لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے لباس پہنے ہوئے سواریوں پر سوار میدان حشر میں آئیں گے، دوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے تیسری فوج ان لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدان حشر میں لایا جائے گا (مظہری بروایت نسائی وحاکم وبیہقی) بعض روایات میں افواج کی تشریح میں اور قسم کی افواج بھی آئی ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرین محشر کی بیشمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے ہوں گی ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا، مقصود اس سے یہ ہے کہ پہاڑ جو ثبات و قرار میں بطور مثال کے پیش کئے جاتے ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہوں کو چھوڑ کر ریزہ ریزہ ہو کر اڑتے پھرنے لگیں گے۔ سراب کے لفظی معنے ذاہب یعنی چلے جانے کے ہیں۔ جنگل کا وہ ریت جو دور سے چمکتا ہوا پانی کی صورت میں نظر آتا ہے اس کو بھی سراب اسی بنا پر کہتے ہیں کہ وہ قریب پہنچنے پر نظر سے جاتا رہتا ہے (کذا فی صحاح والراغب)

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا، مرصاد، وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کسی کی نگرانی یا انتظار کیا جائے جہنم سے مراد اس جگہ جسر جہنم یعنی پل صراط ہے۔ یہاں ثواب دینے والے اور عذاب دینے والے دونوں فرشتے انتظار کرتے ہوں گے اہل جہنم کو عذاب کے فرشتے پکڑ لیں گے اور اہل جنت کے ساتھ ثواب کے فرشتے ان کو ان کے مقام پر پہنچا دیں گے (مظہری)

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ جہنم کے پل پر فرشتوں کی چوکی ہوگی جس کے پاس جنت میں جانے کا پروانہ ہوگا اس کو گزرنے دیا جائے گا جس کے پاس نہ ہوگا اس کو روک لیا جائے گا (قرطبی)

خدا کا حکم ہوتا ہے اس کے امتثال کے لئے) تیزی کیساتھ دوڑتے ہیں پھر (ان ارواح کے متعلق ثواب کا حکم ہو یا عقاب کا) وہ ان ارواح میں سے ہر امر کی تدبیر کرتے ہیں (ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ) قیامت ضرور آویگی جس روز ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی (مراد نفخہ اولیٰ ہے) جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی چیز آجاوے گی (مراد نفخہ ثانیہ ہے) بہت سے دل اس روز دھڑک رہے ہونگے ان کی آنکھیں (مارے ندامت کے) جھک رہی ہونگی (مگر یہ لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہونگے (پہلی حالت سے مراد حیات قبل الممات یا بعد الموت پھر حیات ثانیہ ہوگی۔ مقصود استبعاد ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جاویں گے پھر (حیات کی طرف) واپس ہونگے (مقصود استعجاب ہے کہ یہ سخت دشوار ہے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو) اس صورت میں یہ واپسی (ہمارے لئے) بڑے خسارہ کی ہوگی (کیونکہ ہم نے تو اس کے لئے کچھ سامان نہیں کیا، مقصود اس سے تمسخر تھا اہل حق کے اس عقیدہ کے ساتھ، یعنی ان کے عقیدہ پر ہم بڑے خسارہ میں ہوں گے جیسے کوئی شخص کسی کو خیرخواہی سے ڈرائے کہ اس راہ مت جانا شیر ہے کھا جاوے گا اور مخاطب تکذیب کے طور پر کسی سے کہے کہ بھائی ادھر مت جانا شیر کھا جاوے گا، مطلب یہ کہ وہاں شیر ویر کچھ بھی نہیں ہے۔ آگے استبعاد و استعجاب مذکور کا رد ہے کہ یہ لوگ جو قیامت کو بعید اور مشکل کہتے ہیں تو (یہ سمجھ رکھیں کہ ہم کو کچھ مشکل نہیں بلکہ) وہ بس ایک ہی سخت آواز ہوگی جس سے سب لوگ فوراً ہی میدان میں آموجود ہونگے (آگے مکذبین کی تخویف اور تکذیب پر آپ کی تسلی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے یعنی فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ پہنچا ہے جبکہ ان کو ان کے پروردگار نے ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں (یہ اس کا نام ہے) پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے سو اس سے (جا کر) کہو کہ کیا تجھ کو اس بات کی خواہش ہے کہ تو درست ہو جاوے اور (تیری درستی کی غرض سے) میں تجھ کو تیرے رب کی طرف (ذات و صفات کی) رہنمائی کروں تو تو (ذات و صفات کو سن کر اس سے) ڈرنے لگے (اور اس ڈر سے درستی ہو جاوے، غرض یہ حکم سن کر موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس گئے اور جا کر پیغام ادا کیا) پھر (جب اس نے دلیل نبوت طلب کی تو) اس کو بڑی نشانی (نبوت کی) دکھلائی (مراد معجزہ عصا ہے یا مراد جنس مجموعہ عصا و ید بیضا) تو اس (فرعون) نے (ان کو) جھٹلایا اور (ان کا) کہنا نہ مانا پھر (موسیٰ علیہ السلام سے) جدا ہو کر (ان کے خلاف) کوشش کرنے لگا اور (لوگوں کو) جمع کیا پھر (ان کے سامنے) بآواز بلند تقریر کی اور کہا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں (اعلیٰ قید واقعی کے طور پر کہا ہے نفس مقصود اَنَا رَبُّکُمْ ہے اور اعلیٰ صفت مادحہ بڑھا دی اور احترازی نہیں ہے کہ غیر اعلیٰ دوسرے رب کا ثبوت ہو) سو اللہ تعالیٰ نے اس کو آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں پکڑا (دنیوی عذاب تو غرق ہے اور اخروی عذاب حرق یعنی جلنا ہے) بیشک اس (واقعہ) میں ایسے شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ (آگے قیامت کو بعید یا مشکل سمجھنے کا عقلی جواب ہے یعنی) بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا (اور فی نفسہ اسلئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نسبت

سے تو سب مساوی ہیں اور ظاہر ہے کہ آسمان ہی کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے، پھر جب اس کو پیدا کر دیا تو تمہارا پیدا کرنا کیا مشکل ہے، آگے آسمان کے پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ) اللہ نے اس کو بنایا (اور) اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا (کہ کہیں اس میں شقوق و فطور، پھٹا ہوا یا جوڑ پیوند تک نہیں) اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا (رات اور دن کو آسمان کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ رات اور دن آفتاب کے طلوع اور غروب سے ہوتے ہیں اور آفتاب آسمان سے متعلق ہے) اور اس کے بعد زمین کو بچھایا (اور بچھا کر) اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو (اس پر) قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے مواشی کے فائدہ پہنچانے کے لئے (اصل استدلال خلق سماء سے تھا مگر زمین کا ذکر شاید اس لئے کر دیا کہ اس کے احوال ہر وقت پیش نظر ہیں اور سماء سے بڑھ کر ہیں لیکن فی نفسہ انسان کی تخلیق سے زمین کی تخلیق بھی اشد ہے پس حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب ایسی ایسی چیزیں ہم نے بنا دیں تو تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے، آگے بعث کے بعد جو واقعات مجازات سے متعلق ہوں گے ان کی تفصیل ہے یعنی قیامت کا امکان اور صحت وقوع تو ثابت ہو گیا) سو جب وہ بڑا ہنگامہ آوے گا یعنی جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کی جاوے گی تو (اس روز یہ حالت ہوگی کہ) جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہو کر اس پر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگی اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا (کہ قیامت اور آخرت اور حساب کتاب پر اس کا ایمان کامل ہو) اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا ہوگا (یعنی اعتقاد صحیح کے ساتھ عمل صالح بھی کیا) تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا (اور عمل صالح طاق ذات ہے موقوف علیہ نہیں، چونکہ کفار بقصد انکار قیامت سے اس کا وقت پوچھا کرتے تھے آگے اس کا جواب ہے، یعنی) یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق (کیونکہ بیان کا موقوف علیہ علم ہے اور قیامت کا معین وقت ہم نے کسی کو بتلایا نہیں بلکہ) اس (کے علم) کی تعیین کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے (اور) آپ تو صرف (اخبار اجمالی سے) ایسے شخص کے ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہو (اور ڈر کر ایمان لانے والا ہو اور یہ لوگ جو جلدی مچا رہے ہیں تو گویا کہ) جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو (ان کو) ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دنیا میں) صرف ایک دن کے آخری حصہ میں یا اس کے اول حصہ میں رہے ہیں (یعنی دنیا کی مدت طویلہ قصیرہ معلوم ہوگی اور کہیں گے کہ عذاب بڑی جلدی آگیا جس کی یہ استدعا کرتے ہیں حاصل یہ کہ جلد بازی کیوں کرتے ہو وقوع کے وقت اس کو بھی یہی سمجھو گے کہ بڑی جلد ہو گیا جس دیر کو اب دیر سمجھ رہے ہو وہ دیر معلوم نہ ہوگی)

معارف و مسائل

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا، نازعات نزع سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو کھینچ کر نکالنے کے آتے ہیں، اور غرقاً اس کی تاکید ہے کیونکہ غرق اور اغراق کے معنے کسی کام میں پوری قوت شدت خرچ کرنے کے ہیں، نازعات

میں کہا جاتا ہے اغرق النازع فی القوس یعنی کمان کھینچنے والے نے اسکے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کردی اس سورۃ کے شروع میں ملائکہ کی چند صفات اور حالات بیان کرکے انکی قسم کھائی گئی ہے اور جواب قسم بدلالت حال حذف کردیا گیا، مراد اس سے قیامت اور حشر و نشر کا یقینا واقع ہونا ہے۔ فرشتوں کی قسم شاید اس مناسبت سے کھائی گئی ہے کہ اگرچہ فرشتے اس وقت بھی تمام عالم کے نظم و نسق میں دخل رکھتے اور اپنی اپنی خدمت بجا لاتے ہیں لیکن قیامت کے روز اسباب مادیہ کے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے غیر معمولی حالات و واقعات پیش آویں گے ان واقعات میں فرشتے ہی کام کریں گے

فرشتوں کی اس جگہ پانچ صفات وہ بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور نزع روح سے ہے مقصود تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے، شروع اسکا انسان کی موت سے کیا گیا کہ ہر انسان کی موت خود اسکے لئے ایک جزوی قیامت ہے اور قیامت کے اعتقاد میں اسکا بڑا دخل ہے ان پانچ صفات میں سے پہلی صفت النّٰزِعٰتِ غَرْقًا یعنی سختی کے ساتھ کھینچ کر نکالنے والے، مراد اس سے وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی روح سختی کے ساتھ نکالتے ہیں، مراد اس سختی سے روحانی سختی اور تکلیف ہے یہ ضروری نہیں کہ دیکھنے والو کو بھی اس سختی کا احساس ہو اسی لئے بسا اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کافر کی روح بظاہر آسانی سے نکلتی ہے مگر یہ آسانی ہمارے دیکھنے میں ہے جو سختی اس کی روح پر ہو رہی ہے اس کو کون دیکھ سکتا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خبر دینے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس جملے میں یہ خبر دیدی گئی ہے کہ کفار کی روح کو کھینچ کر سختی سے نکالا جاتا ہے۔

دوسری صفت ہے وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا، ناشطات نشط سے مشتق ہے جس کے معنے بندھن کھولدینے کے ہیں جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہوں اسکا بندھن کھولدینے سے وہ پانی وغیرہ آسانی کیساتھ نکل جاتا ہے انمیں مؤمن کی روح نکلنے کو اس سے تشبیہ دیکر بتلایا ہے کہ جو فرشتے مؤمن کی قبض روح پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اس کو قبض کرتے ہیں شدت نہیں کرتے، یہاں بھی آسانی روحانی مراد ہے جسمانی نہیں اس لئے کسی مسلمان بلکہ مرد صالح کو بوقت موت نزع روح میں دیر لگنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر سختی ہورہی ہے اگرچہ جسمانی طور پر سختی دیکھی جاتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو نزع روح کے وقت ہی سے برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے اسکی روح اس سے گھبرا کر بدن میں چھپنا چاہتی ہے، فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں، اور مؤمن کی روح کے سامنے عالم برزخ کا ثواب، نعمتیں اور بشارتیں آتی ہیں تو اس کی روح تیزی سے ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔

تیسری صفت فرشتوں کی وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ہے، سبح کے لغوی معنی تیرنے کے آتے ہیں، مراد اس جگہ تیزی سے چلنا ہے جیسے دریا میں کوئی آڑ پہاڑ نہیں ہوتا تیرنے والا یا کشتی وغیرہ میں چلنے والا سیدھا اپنی منزل مقصود کی طرف جاتا ہے فرشتوں کی یہ صفت کہ تیز جانے والے ہیں یہ بھی ملائکہ موت سے تعلق ہے کہ انسان کی روح قبض کرنے کے بعد اس کو تیزی سے آسمان کیطرف لیجاتے ہیں۔

چوتھی صفت وَّالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ہے مراد یہ ہے کہ پھر یہ روح جو فرشتوں کے قبضہ میں ہے اس کو اسکے اچھے یا برے ٹھکانے پر پہنچانے میں سبقت اور عجلت سے کام لیتے ہیں۔ مؤمن کی روح کو جنت کی ہواؤں اور

شیخ امام حضرت یعقوب کرخی فرماتے ہیں کہ میں اپنی ابتدائی عمر میں نجار تھا (لکڑی کا کام کرتا تھا) میں نے اپنے نفس میں سستی اور باطن میں ایک قسم کی ظلمت محسوس کی تو ارادہ کیا کہ چند روز روزے رکھوں تاکہ یہ ظلمت اور سستی دور ہو جائے۔ اتفاق سے روزے کی حالت میں ایک روز میں شیخ اجل امام بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، شیخ نے مہمانوں کے لئے کھانا منگوایا اور مجھے بھی کھانے کا حکم دیا اور فرمایا بدترین بندہ ہے جو اپنی ہوائے نفسانی کا بندہ ہو جو اسکو گمراہ کرے اور فرمایا کہ کھانا کھا لینا اس روزے سے بہتر ہے جو ہوائے نفسانی کے ساتھ ہو، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا نفس عجب و خود پسندی کا شکار ہو رہا تھا جس کو شیخ نے محسوس کیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ذکر و شغل اور نفلی عبادات میں کسی شیخ کامل کی اجازت و ہدایت درکار ہے کیونکہ وہ نفس کے شرور سے واقف ہوتا ہے، نفلی طاعت کو جس میں نفس کا دخل ہو اس سے روک دیتا ہے۔ اس وقت میں نے حضرت شیخ نقشبند قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت اگر ایسا شیخ جس کو اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے کسی کو میسر نہ ہو تو وہ کیا کرے، شیخ نے فرمایا کہ اس کو چاہئے کہ استغفار کی کثرت کرے اور ہر نماز کے بعد بیس مرتبہ استغفار پڑھنے کی پابندی کرے تاکہ پانچ وقت سو مرتبہ استغفار ہو جائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض اوقات میں اپنے قلب میں کدورت محسوس کرتا ہوں اور میں ہر روز اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار یعنی طلب مغفرت کرتا ہوں۔

تیسرا اعلیٰ درجہ مخالفت ہوائے نفسانی کا یہ ہے کہ کثرت ذکر اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ اپنے نفس کو ایسا مزکی بنا لے کہ اس میں وہ ہوائے نفسانی باقی ہی نہ رہے جو انسان کو شر کی طرف کھینچتی ہے، یہ مقام ولایت خاصہ کا مقام ہے اور اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جن کو صوفیائے کی اصطلاح میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کہا جاتا ہے، یہی لوگ قرآن کی اس آیت کے مصداق ہیں جو شیطان کو خطاب کر کے کہی گئی ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہیں چل سکے گا، اور یہی مصداق ہیں اس حدیث کے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ یعنی تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفسانی میری تعلیمات کے تابع نہ ہو جائیں (اللّٰھم ارزقناہ بفضلک و کرمک)

آخر سورت میں کفار کے اس معاندانہ سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کی معین تاریخ اور وقت بتانے پر اصرار کرتے تھے، حاصل جواب یہ ہے کہ اسکو حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے صرف اپنی ذات کیلئے مخصوص رکھا ہے اس کی اطلاع کسی فرشتہ یا رسول کو بھی نہیں دی ہے اسلئے ان کا سوال لغو ہے۔

تمت سورۃ النازعات بحمد اللہ ۲ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ دوشنبہ

سُوْرَۃُ عَبَسَ

سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ﴿۱﴾ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ﴿۳﴾ اَوْ
يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿۶﴾ وَ
مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿۹﴾ فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ
مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ
خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا
شَاۗءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى

جواب متعین ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا جواب ہو ہی نہیں سکتا، اسلئے پھر خود ہی فرمایا مِنْ نُّطْفَةٍ، یعنی انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر فرمایا خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ، یعنی یہی نہیں کہ نطفہ سے ایک جاندار کا وجود بنا دیا بلکہ اس کو ایک خاص اندازہ اور بڑی حکمت سے بنایا، اُس کے قد و قامت اور جسامت اور شکل و صورت اور اعضاء کے طول و عرض اور جوڑ بند اور آنکھ ناک کان وغیرہ کی تخلیق میں ایسا اندازہ قائم فرمایا کہ ذرا اسکے خلاف ہو جائے تو انسان کی صورت بگڑ جائے اور کام کاج مصیبت بن جائے۔

اور لفظ فَقَدَّرَهٗ سے یہاں یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ انسان جس وقت بطن مادر میں زیر تخلیق ہوتا ہے اُس وقت اللہ تعالیٰ اس کی چار چیزوں کی مقدار لکھ دیتے ہیں، وہ یہ کہ وہ کیا کیا اور کیسے کیسے عمل کرے گا، اُسکی عمر کتنی ہوگی، اس کو رزق کتنا ملے گا، اور وہ انجام کار سعید و نیک بخت ہوگا یا شقی بدبخت (کما فی حدیث ابن مسعود عند الشیخین)

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ، یعنی حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے انسان کی تخلیق بطن مادر کی تین اندھیریوں اور ایسے محفوظ مقام میں فرمائی کہ جس کے پیٹ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اسکو بھی اس تخلیق کی تفصیلات کی کچھ خبر نہیں، پھر یہ زندہ تمام اعضاء و جوارح سے مکمل انسان جس جگہ میں بنا ہے وہاں سے دنیا میں آنے کا راستہ بھی بظاہر تنگ ہے مگر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے آسان فرما دیا کہ پانچ پونڈ کا وزنی جسم صحیح سالم برآمد ہو جاتا ہے اور ماں کے وجود کو بھی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ، تخلیق انسانی کی ابتدا بیان کرنے کے بعد اس کی انتہا موت اور قبر ہے اسکا ذکر بسلسلہ انعامات فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی موت درحقیقت کوئی مصیبت نہیں نعمت ہی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحفة المؤمن الموت کہ مومن کا تحفہ موت ہے اور اس میں مجموعہ عالم کے اعتبار سے بڑی حکمتیں ہیں، اور فَاَقْبَرَهٗ کے معنی یہ ہیں کہ اس کو قبر میں داخل کیا یہ بھی ایک انعام ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے عام جانوروں کی طرح نہیں رکھا کہ مر گیا تو وہیں زمین پر سڑتا اور پھولتا پھٹتا ہے، بلکہ اُسکا اکرام یہ کیا گیا کہ اُس کو نہلا کر نئے اور پاک صاف کپڑوں میں ملبوس کر کے احترام کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

مسئلہ - اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردہ انسان کو دفن کرنا واجب ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ، اس میں تخلیق انسانی کی ابتدا و انتہا اور انہیں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انعامات کا ذکر کرنے کے بعد منکر انسان کو تنبیہ کی گئی کہ ان آیات الٰہیہ اور انعامات کا تقاضا تھا کہ انسان ان میں غور کر کے اللہ پر ایمان لاتا اور اسکے احکام کی تعمیل کرتا مگر اس بدنصیب نے ایسا نہیں کیا، آگے پھر اُن انعامات الٰہیہ کا تذکرہ ہے جو تخلیق انسانی کی ابتدا و انتہا کے درمیانی زمانے میں انسان پر مبذول ہوتے ہیں کہ انسان کا رزق کس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ آسمان سے پانی برستا ہے، بیج اور دانے جو زمین میں مدفون ہوتے بارش

اس میں ایک حیاتِ نباتی پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ ایک نحیف و ضعیف کونپل زمین کو شق کر کے اوپر نکلتی ہے اور پھر اس سے انواع و اقسام کے غلے میوے اور باغات وجود میں آتے ہیں۔ ان سب انعاماتِ الٰہیہ پر انسان کو متوجہ کر کے تنبیہ کے بعد آخر سورت میں پھر قیامت کا ذکر ہے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ، صاخہ ایسے شور و دہشت آواز کو کہتے ہیں جس سے انسان کے کان بہرے ہو جائیں مراد اس سے شورِ قیامت یعنی نفخِ صور ہے۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ، یہ حشر میں سب کے جمع ہونے کے وقت کا بیان ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے فکر میں اور نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا، دنیا میں جو رشتے ناتے ایسے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے پر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں اس عالم میں ہر شخص اپنی اپنی فکر میں ہوگا، کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا بلکہ سامنے دیکھے گا تو بھی گریز کرے گا۔ انسان اپنے بھائی سے ماں باپ سے بیوی اور اولاد سے منہ چھپاتا بھاگتا پھرے گا، دنیا میں تعاون و تناصر اور امداد باہمی بھائیوں میں ہوتی ہے اس سے زیادہ ماں باپ کی امداد و اعانت کی فکر ہوتی ہے طبعی طور پر ان سے بھی زیادہ بیوی اور اولاد سے تعلق ہوتا ہے اس میں ادنیٰ سے اعلیٰ تعلق کی طرف ترتیب سے بیان فرمایا ہے۔ آگے اس میدانِ حشر میں مومنین اور کفار کے انجام کا ذکر کر کے سورت ختم کی گئی ہے۔

تمت سورۃ عبس والحمد للہ [illegible] شعبان سنہ [illegible]

(پس) میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو (سیدھے چلتے چلتے) پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں (اور پھر پیچھے ہی کو) چلتے رہتے ہیں (اور کبھی پیچھے چلتے چلتے اپنے مطالع میں) جا چھپتے ہیں (ایسا امر پانچ ستاروں کو پیش آتا ہے کبھی سب سے چلتے ہیں کبھی پیچھے چلتے ہیں اور ان کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں، زحل، مشتری، عطارد، مریخ، زہرہ) اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے (آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کا لایا ہوا جو قوت والا ہے (کمافی النجم عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ) اور مالک عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے (اور) وہاں (یعنی آسمانوں میں) اس کا کہنا مانا جاتا ہے (یعنی فرشتے اس کا کہنا مانتے ہیں جیسا حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کہنے سے فرشتوں نے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے) اور امانتدار ہے (کہ وحی کو صحیح صحیح پہنچا دیتا ہے پس وحی لانیوالا تو ایسا ہے) اور (آگے جن پر وحی نازل ہوئی ان کی نسبت ارشاد ہے کہ) یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کا حال بخوبی تم کو معلوم ہے) مجنون نہیں ہیں (جیسا منکرین نبوت کہتے تھے) اور انھوں نے اس فرشتہ کو (اصلی صورت میں آسمان کے) صاف کنارہ پر دیکھا بھی ہے (صاف کنارہ سے مراد بلند کنارہ ہے کہ صاف نظر آتا ہے کمافی النجم وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ اور اس کا مفصل بیان سورۂ نجم میں گذر چکا ہے) اور یہ پیغمبر مخفی (بتلائی ہوئی وحی کی) باتوں پر بخل کرنیوالے بھی نہیں (جیسا کاہنوں کی عادت تھی کہ قدرے کوئی بات بتلا دیتے تھے اس سے کہانت کی بھی نفی ہو گئی اور اس کی بھی کہ آپ اپنے کام کا کسی سے معاوضہ لیں) اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کی کہی ہوئی بات نہیں ہے (اس سے نفی کہانت کی اور تاکید ہو گئی، حاصل یہ کہ نہ آپ مجنون ہیں نہ کاہن نہ صاحب غرض، اور وحی لانیوالے کو پہچانتے بھی ہیں اور وحی لانیوالا ایسا ہے پس لامحالہ یہ اللہ کا کلام اور آپ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ قسمیں مطلب مقام کے نہایت مناسب ہیں چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا اور لوٹنا اور چھپ جانا مشابہ ہے فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور عالم ملکوت میں جا چھپنے کے اور رات کا گذرنا اور صبح کا آنا مشابہ ہے قرآن کے سبب ظلمت کفر کے رفع ہو جانے اور نور ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے، جب یہ بات ثابت ہے) تو تم لوگ (اس بارہ میں) کدھر کو چلے جا رہے ہو (کہ نبوت کے منکر ہو رہے ہو) بس یہ تو (بالعموم) دنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے (اور بالخصوص) ایسے شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے (عام لوگوں کے لئے ہدایت اس معنے سے ہے کہ اُن کو سیدھا راستہ بتلایا اور مومنین متقین کے لئے اس معنے سے کہ اُن کو منزل مقصود پر پہنچا دیا) اور (بعض کے نصیحت قبول نہ کرنے سے اس کے نصیحت نامہ ہونے میں شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ) تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے ہو (یعنی فی نفسہ تو نصیحت ہے لیکن تاثیر اس کی موقوف مشیت پر ہے جو بعض لوگوں کے لئے متعلق ہوتی ہے اور بعض کے لئے کسی حکمت سے متعلق نہیں ہوتی)

معارف و مسائل

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، تکویر سے مشتق ہے اس کے معنے بے نور ہو جانے کے بھی آتے ہیں، یہی حسن بصری کی
یہی تفسیر ہے اور اس کے معنے ڈال دینے پھینک دینے کے بھی آتے ہیں۔ ربیع بن خثیمؒ نے اسی کی تفسیر کی ہے کہ مراد
اس سے یہ ہے کہ آفتاب کو سمندر میں ڈال دیا جائیگا جس کی گرمی سے سارا سمندر آگ بن جائیگا، اور ان دونوں
میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ہے کہ اول آفتاب کو بے نور کر دیا جائے پھر اس کو سمندر میں ڈالدیا جائے۔
صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شمس و قمر
قیامت کے دن دریا میں ڈال دیئے جاوینگے اور مسند بزار میں اس کیساتھ یہ بھی ہے کہ جہنم میں ڈالدیئے جاوینگے
ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ان آیات کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ شمس
و قمر اور تمام ستاروں کو سمندر میں ڈالدینگے اور پھر اس پر تیز ہوا چلے گی جس سے سارا سمندر آگ ہو جاویگا، اس طرح
یہ کہنا بھی صحیح ہوگیا کہ شمس و قمر کو دریا میں ڈالا جائے گا، اور یہ کہنا بھی درست رہا کہ جہنم میں ڈالا جائیگا
کیونکہ سارا سمندر اس وقت جہنم بن جائے گا (مستفاد من المظہری والقرطبی)

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ، انکدار سے مشتق ہے جس کے معنے سقوط و گر پڑنے کے بھی آتے ہیں یہی تفسیر منقول
اور مراد یہ ہے کہ آسمان کے سب ستارے سمندر میں گر پڑیں گے جیسا مذکورہ روایات میں اس کی تفصیل آچکی ہے

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ، یہ عرب کی عادت کے مطابق بطور مثال کے فرمایا ہے کیونکہ اس کے پہلے مخاطب عرب
لوگ تھے ان کے نزدیک دس مہینے کی گابھن اونٹنی ایک بڑی دولت سمجھی جاتی تھی۔ اُس سے دودھ اور بچہ
کا انتظار ہوتا تھا اور وہ اُس کی دم سے لگے پھرتے تھے، اس وقت اس کو آزاد چھوڑ دیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ، تسجیر سے مشتق ہے جس کے معنے آگ بھڑکانے اور بھر جانے کے بھی
آتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ یہی معنے لئے ہیں اور اس کے معنے بھر دینے کے بھی آتے ہیں اور گڈمڈ
خلط ملط کر دینے کے بھی بعض ائمہ تفسیر نے یہی معنے لئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں، پہلے
سمندر اور میٹھے دریاؤں کو ایک کر دیا جائیگا درمیان کی آڑ ختم کر دی جاویگی جس سے دریائے شور اور
شیریں دریاؤں کے پانی خلط ملط بھی ہو جائیں گے اور زیادہ بھی، پھر شمس و قمر اور ستاروں کو اس میں ڈالدیا
جائے گا پھر اس تمام پانی کو آگ بنا دیا جائیگا جو جہنم میں شامل ہو جائیگا (مظہری)

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ، یعنی جب حاضرین محشر کے جوڑے جوڑے اور جتھے بنا دیئے جاویں گے یہ
جتھے اور جماعتیں ایمان و عمل کے اعتبار سے ہونگے کہ کافر ایک جگہ مؤمن ایک جگہ، پھر کافر و مؤمنین میں بھی
اعمال و عادات کا فرق ہوتا ہے، اُس کے اعتبار سے کافروں میں بھی مختلف قسم کے گروہ ہو جائیں گے اور مسلمانوں
میں بھی یہ گروہ عقیدے اور عمل میں اشتراک کی بنا پر ہونگے جیسا کہ بیہقی نے بروایت حضرت نعمان بن بشیرؓ

حضرت عمر ابن خطابؓ سے روایت کیا ہے کہ دو لوگ ایک جیسے اعمال کرتے ہونگے وہ ایک جگہ دیئے جاویں گے اعمال سے ہوں یا برے، مثلاً اچھے معاملوں میں علم دین کی خدمت کرنیوالے علماء ایک جگہ، عبادت و زہد والے ایک جگہ جہاد کرنے والے غازی ایک جگہ، صدقہ خیرات میں خصوصیت رکھنے والے ایک جگہ۔ اسی طرح برے اعمال والوں میں چور ڈاکو ایک جگہ، زناکار فاحش ایک جگہ، دوسرے خاص خاص گناہوں میں باہم شریک ہونے والے ایک جگہ ہو جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں ہر شخص اپنی قوم کیساتھ ہوگا، مگر یہ قومیت نسبی یا وطنی نہیں بلکہ عمل و عقیدہ کے اعتبار سے ہوگی، نیک عمل کرنے والے ایک جگہ، بدعمل والے دوسری جگہ ہونگے اور اس پر آیت قرآن سے استشہاد فرمایا وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً یعنی محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہو جائیں گے جو سورۂ واقعہ کی آیت میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے کہ ایک گروہ سابقین اولین کا ہوگا، دوسرا اصحاب الیمین کا، یہ دونوں گروہ نجات پانیوالے ہونگے تیسرا گروہ اصحاب الشمال کا ہوگا جو کفار فجار پر مشتمل ہوگا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ، موءودہ وہ لڑکی جس کو زندہ دفن کر دیا گیا جیسا کہ جاہلیت عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لئے موجب عار سمجھتے تھے اور زندہ ہی اس کو دفن کر دیتے تھے، اسلام نے یہ رسم بد مٹائی، اس آیت میں قیامت و حشر کے حالات کے بیان میں ارشاد ہوا کہ جب اس لڑکی سے سوال کیا جائیگا جسکو زندہ درگور کرکے مار دیا گیا تھا، ظاہر الفاظ سے یہ ہے کہ یہ سوال خود اس لڑکی سے ہوگا، اس سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقصود اس سے سوال کرنے کا یہ ہے کہ یہ اپنی بے گناہی اور مظلومیت کی پوری فریاد بارگاہ رب العزت میں پیش کرے تاکہ اس کے قاتلوں سے انتقام لیا جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مراد یہ ہو کہ موءودہ لڑکی کے بارے میں اسکے قاتلوں سے سوال کیا جائے گا کہ اس کو تم نے کس جرم میں قتل کیا۔

فائدہ مہمہ | یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا تو نام ہی یوم الحساب، یوم الجزاء یوم الدین ہے اس میں تو ہر شخص سے اسکے سبھی اعمال کا محاسبہ اور سوال ہوگا اس جگہ خصوصی احوال اور اہوال قیامت کے سلسلہ میں خاص موءودہ لڑکی کے معاملہ میں اور اسکے متعلق سوال ہونے کو خاص اہمیت اور خصوصیت کیساتھ ذکر کیا، حکمت ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ مظلوم لڑکی جس کو خود اسکے ماں باپ نے قتل کیا ہے اسکے خون کا انتقام لینے کیلئے اس کی طرف سے کوئی دعوے کرنے والا تو ہے نہیں خصوصاً جبکہ اسکو خفیہ دفن کر دیا ہو تو کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ شہادت دے سکے محشر کے میدان میں جو عدل و انصاف کی عدالت لگی ہوگی، وہ ایسے ظلم کو بھی سامنے لائیگی جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے نہ کوئی اس مظلوم کا پرسان حال ہے۔ واللہ اعلم

چار ماہ کے بعد اسقاط حمل قتل کے حکم میں ہے | **مسئلہ**۔ بچوں کو زندہ دفن کر دینا یا قتل کر دینا سخت گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے اور چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینہ میں حمل میں

روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے اس لئے جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے تو باجماع امت مارنے والے پر اس کی دیت میں غُرّہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے اور اگر پیٹ سے باہر آ کر زندہ تھا پھر مر گیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے اور چار ماہ سے پہلے اسقاط حمل بھی بدون اضطراری حالات کے حرام ہے مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اسمیں کسی زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے (مظہری)

مسئلہ: کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پاسکے جیسے آجکل دنیا میں ضبط تولید کے نام سے اس کی ہزاروں صورتیں رائج ہو گئی ہیں اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وأد خفی فرمایا یعنی خفیہ طور سے بچہ کو زندہ درگور کر دینا (رواہ مسلم عن جذامة بنت وہب) اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر (کہ نطفہ رحم میں نہ جائے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لئے قطع نسل کی صورت نہ بنے (مظہری) آجکل ضبط تولید کے نام سے جو دوائیں یا معالجات کئے جاتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کے لئے سلسلۂ حمل و اولاد کا منقطع ہو جائے اس کی کسی حال اجازت شرعاً نہیں ہے واللہ اعلم

وَاِذَا السَّمَاۤءُ كُشِطَتْ، کشط کے لغوی معنی جانور کی کھال اتارنے کے ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یہ حال قیامت کا نفخہ اولیٰ کے وقت کا ہے جو اسی دنیا میں پیش آئیگا کہ آسمان کی زینت جن ستاروں اور شمس و قمر سے تھی وہ سب بے نور ہو کر دریا میں ڈالدیئے جاویں گے آسمان کی موجودہ ہیئت بدل جاوے گی، اس کو کشط کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے کشط کے معنے لپیٹنے کے لکھے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہونگے کہ آسمان جو چھت کیطرح سروں پر محیط ہے یہ لپیٹ دیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ، یعنی جب قیامت کے حالات مذکورہ پیش آ دیں گے اس وقت ہر انسان جان لیگا کہ وہ اپنے ساتھ کیا سامان لایا ہے سامان سے مراد اس کا نیک یا بد عمل ہے کہ وہ سب اعمال اسکے سامنے آ جاویں گے جو دنیا میں کئے تھے خواہ اس طرح کہ نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے اسکے ہاتھ میں آ جاویں یا اس طرح کہ یہ اعمال کسی خاص شکل و صورت میں اسکے سامنے آویں جیسا کہ بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ قیامت کے احوال اور ہولناک مناظر اور وہاں محاسبۂ اعمال کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے چند ستاروں کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ قرآن حق ہے اللہ کی طرف سے بڑی حفاظت کیساتھ بھیجا گیا ہے اور جس ذات پر نازل ہوا ہے وہ ذات ایک بڑی ہستی ہے وحی لانے والے فرشتے کو وہ پہلے سے جانتے پہچانتے تھے اسلئے اسکے حق ہونے میں کسی شک و شبہ کی راہ نہیں جن ستاروں کی قسم یہاں کھائی گئی وہ پانچ ستارے ہیں جن کو علم ہیئت فلکیات میں خمسہ متحیرہ کہتے ہیں اور متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پانچوں ستاروں کی حرکت دنیا میں اسطرح دیکھی جاتی ہے کہ کبھی مشرق سے مغرب کیطرف چلتے رہتے ہیں کبھی پھر پیچھے کو لوٹتے ہیں مشرق کیطرف

چلنے لگتے ہیں اس کی وجہ کیا، اور ان مختلف حرکتوں کا سبب کیا ہے، اس کے بارے میں قدیم فلسفہ یونان والوں کے مختلف اقوال ہیں اور جدید فلسفہ والوں کی تحقیق ان میں سے بعض کے مطابق ہے بعض کے خلاف اور حقیقت کا علم پیدا کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں، سب تخمینے اور اندازے ہی ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں صحیح بھی، قرآن حکیم نے امت کو اس فضول بحث میں نہیں الجھایا، جتنی بات ان کے فائدہ کی تھی وہ بتلا دی کہ وہ رب العزت جل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا اس میں مشاہدہ کریں اور ایمان لائیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ الخ، ستاروں کی قسم کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن قول ہے ایک رسول کریم کا، آگے اس رسول کریم کی صفت ایک تو یہ بیان فرمائی کہ وہ ذی قوت ہے، دوسری یہ کہ رب العرش کے یہاں وہ مطاع ہے کہ اس کے احکام عرش والے مانتے ہیں، تیسری یہ کہ وہ اللہ کے نزدیک امین ہے اس سے پیغام لانے اور پہنچانے میں کسی خیانت اور کمی بیشی کا امکان نہیں۔ اس جگہ رسول کریم سے مراد بظاہر جبریل امین ہیں کیونکہ لفظ رسول کا جیسے انبیاء پر اطلاق ہوتا ہے ایسے ہی فرشتوں کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور آگے جتنی صفات رسول کی بیان کی گئی ہیں وہ سب جبرئیل امین پر بغیر کسی تکلف و تاویل کے منطبق ہیں۔ ان کا ذی قوت ہونا تو سورۂ نجم میں صراحۃً مذکور ہے عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، اہل عرش و سماوات میں ان کا مطاع ہونا اور ان کے احکام کی پیروی کرنا لیلۃ المعراج کی حدیث سے ثابت ہے کہ جب جبرئیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر آسمان پر پہنچے اور آسمانوں کے دروازے کھلوانے کا ارادہ کیا تو دروازوں پر مقرر فرشتوں نے ان کے حکم کی اطاعت کی اور امین ہونا جبرئیل علیہ السلام کا ظاہر ہے۔ اور بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ رسول کریم سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے اور صفات مذکورہ کو کسی قدر تکلف سے آپ کی ذات پر منطبق کیا ہے، واللہ اعلم۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور کفار کے بیہودہ الزاموں کا جواب ہے وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ، یہ ان کفار کے بیہودہ اعتراض کا جواب ہے جو معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو کھلے افق پر دیکھا ہے جیسا کہ سورۂ نجم میں ہے فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، اور مقصود اس کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ وحی لانے والے فرشتے جبرئیل سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوب واقف تھے، ان کو اصلی ہیئت و صورت میں بھی دیکھ چکے تھے اس لئے اس وحی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، باقی مضمون آیات خلاصۂ تفسیر میں واضح ہو چکا ہے۔

تمت سورۃ التکویر بحمد اللہ تعالیٰ یوم الاربعاء ۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَۃُ الانفطار

سُوْرَۃُ الْاِنْفِطَارِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

سورۃ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ

جب آسمان چر جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب دریا

فُجِّرَتْ ۙ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ؕ

ابال دیئے جائیں اور جب قبریں زیر و زبر کر دی جائیں جان لے ہر ایک جی جو آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا

یٰۤاَیُّہَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ۙ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ

اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا

فَعَدَلَکَ ۙ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ؕ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ

پھر تجھ کو برابر کیا جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو

بِالدِّیْنِ ۙ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۙ یَعْلَمُوْنَ

انصاف کا ہونا اور تم پر نگہبان مقرر ہیں عزت والے عمل لکھنے والے جانتے ہیں

مَا تَفْعَلُوْنَ ۙ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۙ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۙ

جو تم کرتے ہو بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں

یَّصْلَوْنَہَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۙ وَمَا ہُمْ عَنْہَا بِغَآئِبِیْنَ ؕ وَمَاۤ اَدْرٰىکَ مَا

ڈالے جائیں گے اس میں انصاف کے دن اور نہیں اس سے جدا ہونے والے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے

یَوْمُ الدِّیْنِ ۙ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ؕ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ

دن انصاف کا پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی

جو خود اللہ کی یاد دلانے اور اُس کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھا، پھر یہ بھول اور غفلت پہ غرور اور دھوکہ کیسے لگا۔ اس جگہ رب کی صفت کریم ذکر کر کے اسکے جواب کیطرف بھی اشارہ کر دیا کہ انسان کے بھول اور دھوکہ میں پڑنے کا سبب حق تعالیٰ کا کریم ہونا ہے کہ وہ اپنے لطف و کرم سے انسان کے گناہ پر فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ اسکے رزق اور عافیت اور دنیوی آسائش میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا، یہ لطف و کرم اسکے غرور اور دھوکے کا سبب بن گیا حالانکہ ذرا عقل سے کام لیتا تو یہ لطف و کرم غرور و غفلت کا سبب بننے کے بجائے اور زیادہ اپنے رب کریم کے احسانات کا ممنون ہو کر اطاعت میں لگ جانے کا سبب ہونا چاہئے تھا۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ کمْ مِنْ مَغْرُورٍ تَحْتَ السِّتْرِ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ یعنی کتنے ہی انسان ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈالا ہوا ہے اُن کو رسوا نہیں کیا، وہ اس لطف و کرم سے اور زیادہ غرور اور دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ، اس کا تعلق اُس جملے سے ہے جو پہلے ذکر کیا یعنی عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (قیامت کے روز ہر انسان کو اپنا اپنا عمل سامنے آجائیگا، اس جملے میں اس عمل کی سزا و جزا کا ذکر ہے کہ اطاعت شعار ابرار تو اس روز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں مسرور ہونگے اور سرکش نافرمان جہنم کی آگ میں۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ، یعنی جہنمی لوگ کسی وقت جہنم سے غائب نہ ہو سکیں گے کیونکہ اُن کے لئے خلود اور دائمی عذاب کا حکم ہے لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا، یعنی کوئی شخص باختیار خود کسی دوسرے شخص کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا نہ کسی کی تکلیف کو کم کر سکے گا، اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ شفاعت کسی کی اپنے اختیار سے نہ ہوگی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کی شفاعت کی اجازت نہ دیں، اسلئے اصل حکم و مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ ہی اپنے فضل سے کسی کو شفاعت کی اجازت دیدے اور پھر شفاعت قبول فرمالے تو وہ بھی اُسی کا حکم ہے۔ واللہ اعلم

تمت سورۃ الانفطار بحمد اللہ لیلۃ الاربعاء ۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَۃُ التَّطْفِیْف

سُوْرَۃُ التَّطْفِیْفِ مَکِّیَّۃٌ وَّہِیَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً

سورۃ تطفیف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾

خرابی ہے گھٹانے والوں کی [illegible]

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ

[illegible]

مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ كَلَّا

[illegible]

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾

[illegible]

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو اور اس کو

يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ

[illegible]

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

[illegible]

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا

[illegible]

الْجَحِيمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿۱۷﴾ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ

دوزخ میں پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے ہرگز نہیں بیشک اعمال نامہ

الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿۱۸﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿۱۹﴾ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ﴿۲۰﴾

نیکوں کا علیین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین ایک دفتر ہے لکھا ہوا

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ

اس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے (فرشتے) بیشک نیک لوگ ہیں آرام میں تختوں پر بیٹھے

يَنظُرُونَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِن

دیکھتے ہیں پہچانے تو ان کے منہ پر تازگی آرام کی ان کو پلائی جاتی ہے

رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿۲۵﴾ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

شراب خالص مہر لگی ہوئی جس کی مہر جمتی ہے مشک پر اور اس پر چاہئے کہ ڈھکیں

الْمُتَنَافِسُونَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۸﴾

ڈھکنے والے اور اس کی ملونی ہے تسنیم سے وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۲۹﴾ وَإِذَا مَرُّوا

وہ لوگ جو گنہگار ہیں تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے اور جب ہو کر نکلتے

بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿۳۱﴾ وَ

ان کے پاس تو آپس میں آنکھ مارتے اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے اور

إِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ﴿۳۳﴾

جب ان کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں اور ان کو بھیجا نہیں ان پر نگہبان بنا کر

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿۳۵﴾

سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

اب بدلا پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کرتے تھے

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کر لیں تو پورا لیں
اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں (گو لوگوں سے اپنا حق پورا لینا مذموم نہیں ہے مگر اس کے ذکر
کرنے سے مقصود خود اس پر مذمت کرنا نہیں ہے بلکہ کم دینے پر مذمت کی تاکید و تقویت ہے یعنی کم دینا گرچہ

نہیں کرتا جلدی جلدی نماز ختم کر ڈالتا ہے تو اُس کو فرمایا قَدْ طَفَّفْتَ یعنی تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی، فاروقِ اعظم کے اس قول کو نقل کر کے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا لکل شیء وفاء و تطفیف یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یہانتک کہ نماز، وضو، طہارت میں بھی اور اسی طرح دوسرے حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ مزدور، ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اُس میں سے وقت چُرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سُستی کرنا بھی تطفیف ہے اس میں عام لوگوں میں یہانتک کہ اہلِ علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے۔ اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا اعاذنا اللہ منہ

حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خمس بخمس یعنی پانچ گناہوں کی سزا پانچ چیزیں ہیں۔ (۱) جو شخص عہد شکنی کرتا ہے اللہ اُس پر اُس کے دشمن کو مسلط اور غالب کر دیتا ہے (۲) جو قوم اللہ کے قانون کو چھوڑ کر دوسرے قوانین پر فیصلے کرتے ہیں ان میں فقر، احتیاج عام ہو جاتا ہے (۳) جس قوم میں بے حیائی اور زنا عام ہو جائے اُس پر اللہ تعالیٰ طاعون (اور دوسرے وبائی امراض) مسلط کر دیتا ہے (۴) اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگیں اللہ تعالیٰ اُن کو قحط میں مبتلا کر دیتا ہے (۵) جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اُن سے بارش کو روک دیتا ہے (ذکرہ القرطبی وقال اخرجہ البزار بمعناہ و مالک بن انس ایضاً من حدیث ابن عمرؓ) اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں مالِ غنیمت کی چوری رائج ہو جائے اللہ تعالیٰ انکے دلوں میں دشمن کا رعب اور ہیبت ڈالدیتے ہیں اور جس قوم میں ربوا یعنی سود خوری کا رواج ہو جائے انہیں موت کی کثرت ہو جاتی ہے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ انکا رزق قطع کر دیتے ہیں اور جو لوگ حق کے خلاف فیصلے کرتے ہیں اُن میں قتل و خون عام ہو جاتا ہے اور جو لوگ معاہدات میں غداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن پر اُن کے دشمن مسلط کر دیتا ہے (رواہ مالک موقوفاً۔ از مظہری)

فقر و فاقہ اور قحط و قطع رزق کی مختلف صورتیں حدیث میں جن لوگوں کا رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے اُس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے اور یہ صورت بھی قطع رزق ہی میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اُس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے جیسے بہت سی بیماریوں میں اسکا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں، اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود بلکہ کثیر ہونے کے باوجود اُن کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے جیسا کہ آجکل اسکا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اور حدیث میں فقر مسلط کرنے کا ارشاد ہے اسکے معنے صرف یہی نہیں کہ روپیہ پیسہ اور ضرورت کی اشیاء اسکے پاس نہ رہیں بلکہ فقر کے اصلی معنے محتاجی اور حاجتمندی کے ہیں۔ ہر شخص اپنے کاروبار اور ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کا جتنا محتاج ہو وہ اُتنا ہی فقیر ہے۔ اس زمانے کے حالات پر غور کیا جائے تو

انسان اپنے ذہن میں ہر نقل و حرکت اور اپنے ارادوں کے پورا کرنے میں ایسے ایسے قوانین میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کے لقمہ اور کلمہ تک پر پابندیاں ہیں، اپنا مال موجود ہوتے ہوئے خریداری میں آزاد نہیں کہ جہاں سے چاہے کچھ خرید لے، سفر میں آزاد نہیں کہ جب کہیں جانا چاہے چلا جائے، ایسی ایسی پابندیوں میں انسان جکڑا گیا ہے کہ ہر کام کے لئے دفتر گردی اور افسروں سے لیکر چپراسیوں تک کی خوشامد کے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہے یہ سب مصائب ہی تو ہیں بلکہ دوزخ کا نمونہ ہے۔ اس تفصیل سے وہ شبہات رفع ہوگئے جو حدیث کے ارشاد کے متعلق ظاہری حالات کے اعتبار سے ہوسکتے ہیں۔

سجین اور علیین | كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ، سجین، بکسر سین و تشدید جیم، بروزن سکین، سجن سے مشتق ہے جس کے معنی تنگ جگہ میں قید کرنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ سجین کے معنے دائمی قید کے ہیں اور احادیث و آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجین ایک مقام خاص کا نام ہے جو کفار کی ارواح کا مقام ہے اور اسی مقام میں ان کے اعمالنامے رہتے ہیں، جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمالنامے اس جگہ میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں، اور یہ بھی کہ اس جگہ کوئی ایسی کتاب جامع ہو جس میں تمام دنیا کے کفار و فجار کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہوں۔

یہ مقام کس جگہ ہے اس کے متعلق حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے طبقہ میں ہے اور علیین ساتویں آسمان میں زیر عرش ہے (اخرجہ البغوی باسنادہ وانہ احمد وغیرہ از مظہری) بعض روایات حدیث میں یہ بھی ہے کہ سجین کفار و فجار کی ارواح کا مستقر ہے، اور علیین، مومنین متقین کی ارواح کی جگہ ہے۔

جنت اور دوزخ کا مقام | بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت کیا ہے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم زمین میں، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ قیامت کے روز جہنم کو لایا جائیگا وَجِايْۤءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ اس کا مطلب کیا ہے، جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ جہنم کو ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین میں ہے وہیں سے بھڑک کر سارے سمندر اور دریا اس کی آگ میں شامل ہو جاینگے اور سب کے سامنے آجائے گی، جہنم کے لانے جانے کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح جن روایات میں یہ آیا ہے کہ سجین جہنم کے ایک مقام کا نام ہے وہ بھی اس پر منطبق ہوگئیں۔ (مظہری) واللہ اعلم

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ، مرقوم کے معنے اس جگہ مختوم کے ہیں۔ یعنی مہر لگی ہوئی۔ امام بغوی اور ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ مقام سجین کی تفسیر نہیں، بلکہ اس سے پہلے جو کتاب الفجار آیا تھا اس کا بیان ہے، معنے یہ ہیں کہ کفار و فجار کے اعمالنامے مہر لگا کر محفوظ کر دیئے جاوینگے کہ ان میں کسی کمی بیشی اور تغیر کا امکان نہ رہے گا اور ان کے محفوظ کرنے کی جگہ سجین ہے یہیں کفار کی ارواح کو جمع کر دیا جائے گا۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، ران، رین سے مشتق ہے جس کے معنے زنگ اور میل

کے نور فطرت پر انکے دلوں پر ان کے گناہوں کا زنگ لگ گیا ہے اور جس طرح زنگ لوہے کو کھا کر مٹی بنا دیتا ہے اسی طرح ان گناہوں کے زنگ نے ان کے دل کی اس صلاحیت کو ختم کر دیا جس سے بھلے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اگر اس نے توبہ کر لی اور اس پر نادم ہو کر آگے اپنے عمل کو درست کر لیا تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل اپنی اصلی حالت پر منور ہو جاتا ہے اور اگر اس نے توبہ نہ کی بلکہ اپنے گناہوں میں زیادتی کرتا چلا گیا تو یہ سیاہی اس کے سارے قلب پر چھا جاتی ہے اسی کا نام ران ہے۔ جو آیت بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ میں مذکور ہے (رواہ البغوی وکذا اخرجہ احمد والترمذی وصححہ والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم۔ از مظہری) لفظ کلّا جو آیت کے شروع میں ہے اسکو حرف ردع کہتے ہیں جس کے معنے دفع کرنے اور زجر و تنبیہ کرنے کے ہیں۔ پہلی آیتوں میں کفار کی تکذیب کا ذکر تھا کہ وہ آیات قرآن کو کہانیاں کہہ کر جھٹلاتے ہیں اس آیت میں لفظ کلّا سے اسی پر زجر و تنبیہ ہے کہ ان جاہلوں نے اپنے گناہوں کے انبار میں مبتلا ہو کر اپنے دلوں کی اس نورانیت اور صلاحیت کو ختم کر دیا ہے جس سے حق و باطل پہچانا جاتا ہے ورنہ یہ صلاحیت حق تعالیٰ ہر انسان کی جبلت اور فطرت میں رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ تکذیب کسی دلیل یا عقل و فہم کی بناء پر نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قلوب اندھے ہو چکے ہیں انھیں بھلا برا نظر ہی نہیں آتا۔

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ، یعنی قیامت کے روز یہ کفار اپنے رب کی زیارت سے محروم اور پردہ میں روک دیئے جائیں گے۔ یہ اسی عمل کی سزا ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں حق کو نہیں پہچانا تو اب اپنے رب کی زیارت کے قابل نہیں رہے۔ حضرت امام مالک و شافعیؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنین اور اولیاء اللہ کو حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی ورنہ پھر کفار کے محجوب رہنے کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا۔

فائدہ بعض اکابر علماء نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت سے حق تعالیٰ کی محبت پر مجبور ہے اسی لئے دنیا کے عام کفار و مشرکین چاہے کتنے ہی کفر و شرک میں مبتلا ہوں اور اللہ جل شانہ کی ذات و صفات کے متعلق باطل عقیدے رکھتے ہوں مگر اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت سب کے دلوں میں ہوتی ہے اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اسی کی جستجو اور رضاجوئی کے لئے عبادتیں کرتے ہیں، راستہ غلط ہوتا ہے اس لئے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتے مگر طلب اسی منزلِ حق کی ہوتی ہے۔ وجہ استدلال کی یہ ہے کہ اگر کفار میں حق تعالیٰ کی زیارت کا شوق نہ ہوتا تو ان کی سزا میں یہ نہ کہا جاتا کہ وہ زیارت سے محروم رہیں گے کیونکہ جو شخص کسی کی زیارت کا طالب ہی نہیں بلکہ متنفر ہے اس کے لئے یہ کوئی سزا نہیں کہ اس کو اس کی زیارت سے محروم کیا جائے۔

اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ، علّیین بعض حضرات کے نزدیک علو کی جمع ہے اور مراد اعلیٰ درجہ کا علو اور بلندی ہے اور فراء کے نزدیک یہ ایک مقام کا نام ہے وزن جمع پر ہے جمع نہیں، اور لفظ سجّین کی تحقیق میں اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ کی مرفوع روایت سے ثابت ہے کہ علّیین ساتویں آسمان پر زیر عرش ایک مقام ہے جس میں مومنین کی ارواح اور صحائف اعمال رکھے جاتے ہیں، اور آگے جو کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ مذکور ہے یہ بھی علّیین کی

تفسیر نہیں بلکہ ابرار کے نامہ اعمال کا بیان ہے جس کا ذکر اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ میں آیا ہے۔

یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ، یشہد شہود سے مشتق ہے جس کے معنے حاضر ہونے اور مشاہدہ کرنے کے آتے ہیں۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ ابرار وصالحین کی کتاب اعمال کو مقربین دیکھتے ہونگے اور مراد مقربین سے فرشتے ہیں اور دیکھنے سے مراد اس کی نگرانی اور حفاظت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابرار وصالحین کے صحائف اعمال مقرب فرشتوں کی نگرانی میں ہونگے (قرطبی) اور شہود سے مراد حضور کے معنے لئے جائیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر کتاب کے بجائے علیین کیطرف راجع ہوگی اور معنے آیت کے یہ ہونگے کہ مقربین بارگاہ کی ارواح اسی مقام علیین میں حاضر ہونگی کیونکہ یہی مقام ارواح کا مستقر بنایا گیا ہے جس طرح سجین کفار کی ارواح کا مستقر ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہداء کی ارواح اللہ تعالےٰ کے نزدیک سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہونگی جو جنت کے باغات اور نہروں کی سیر کرتی ہونگی اور ان کے رہنے کی جگہ قندیلیں ہونگی جو عرش کے نیچے معلق ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کی ارواح تحت العرش رہیں گی اور جنت کی سیر کرینگی اور وہ سورۂ یٰسین میں جو حبیب نجار کے متعلق آیا ہے قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ اس سے معلوم ہوا کہ حبیب نجار موت کیساتھ ہی جنت میں داخل ہوگئے اور بعض روایات حدیث سے بھی ارواح مومنین کا جنت میں ہونا معلوم ہوتا ہے ان سب کا حاصل یہ ہی ہے کہ مستقر ان ارواح کا ساتویں آسمان پر تحت العرش ہے اور یہی مقام جنت کا بھی ہے ان ارواح کو جنت کی سیر کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور یہاں اگرچہ یہ حال صرف مقربین کا ان کی خصوصیت اور فضیلت کی وجہ سے بیان کیا گیا ہے مگر درحقیقت یہی مستقر تمام مومنین کی ارواح کا بھی ہے جیسا کہ حضرت کعب بن مالکؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

انما نسمة المؤمن طائر يعلق في شجر الجنة حتى ترجع الى جسده يوم القيامة (رواہ مالک و النسائی بسند صحیح)

مومن کی روح ایک پرندہ کی شکل میں جنت کے درختوں میں معلق رہتی ہے یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ اپنے جسم میں پھر لوٹ جائے۔

اور اسی مضمون کی ایک حدیث ام ہانیؓ کی روایت سے مسند احمد اور طبرانی میں آئی ہے (مظہری)

مستقر ارواح یعنی موت کے بعد انسانی روحوں کا مقام کہاں ہے

اس معاملے میں روایات حدیث بظاہر مختلف ہیں۔ سجین اور علیین کی تفسیر میں جو روایات اوپر مذکور ہوئیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح کفار سجین میں رہتی ہیں جو ساتویں زمین میں ہے اور ارواح مومنین علیین میں رہتی ہیں جو ساتویں آسمان پر زیر عرش ہے اور مذکور الصدر روایات میں بعض سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح مومن جنت میں رہتی ہے۔ اور بعض روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومنین و کفار دونوں کی روحیں ان کی قبروں میں رہتی ہیں جیسا کہ حضرت براء بن عازبؓ کی طویل حدیث میں ہے کہ جب مومن کی روح کو آسمان میں فرشتے لیجاتے ہیں تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمالنامہ علیین میں لکھدو اور اسکو زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ اس کو میں نے زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور مرنے کے بعد

اسی میں لوٹاؤں گا اور پھر اسی زمین سے ان کو دوبارہ زندہ کرکے نکالوں گا، اس حکم پر فرشتے اس کی روح کو قبر میں لوٹا دیتے ہیں۔ اسی طرح کافر کی روح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور یہی حکم ہوگا کہ اس کو اس کی قبر میں لوٹا دو۔ امام ابن عبدالبر نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ سب کی ارواح بعد الموت قبروں میں رہتی ہیں۔ ان میں پہلی اور دوسری روایات میں جو یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض سے ارواح مومنین کا علیین میں رہنا معلوم ہوتا ہے اور بعض سے جنت میں رہنا، غور کیا جائے تو یہ کوئی اختلاف نہیں کیونکہ مقام علیین بھی ساتویں آسمان پر زیر عرش ہے اور جنت کا بھی یہی مقام خود قرآن کریم کی تصریح سے ثابت ہے یعنی عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى، اس میں تصریح ہے کہ جنت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے اور سدرہ کا ساتویں آسمان میں ہونا حدیث سے ثابت ہے اسلئے مقام ارواح جب علیین ہوا تو وہ جنت کے متصل ہے اور ان ارواح کو جنت کے باغات کی سیر نصیب ہے اسلئے ان کا مقام جنت بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کفار کی ارواح سجین میں ہیں اور وہ ساتویں زمین میں ہے اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنم بھی ساتویں زمین میں ہے اور اہل سجین کو جہنم کی تپش اور تکلیف پہنچتی رہتی ہے اسلئے ان کا مقام جہنم بھی کہدیا گیا ہے رہا البتہ اور جس روایت میں ارواح کا قبروں میں رہنا معلوم ہوتا ہے بظاہر پچھلی دونوں روایتوں سے بہت مختلف ہے اس کی تطبیق محقق زمانہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں یہ بیان کی ہے کہ یہ بات کچھ بعید نہیں کہ اصل مستقر ارواح کا علیین اور سجین ہی ہوں مگر ان ارواح کا ایک خاص رابطہ قبروں کیساتھ بھی قائم ہو اس رابطہ کی حقیقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا مگر جس طرح آفتاب ماہتاب آسمان پر ہیں اور ان کی شعاعیں زمین پر پڑکر اسکو روشن بھی کر دیتی ہیں گرم بھی۔ اسی طرح علیین و سجین کی ارواح کا کوئی رابطہ معنویہ قبروں کیساتھ ہو سکتا ہے اور ان تمام اقوال کی تطبیق میں حضرت قاضی ثناء اللہ کی تحقیق سورۂ نازعات کی تفسیر میں ابھی گزر چکی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ روح کی دو قسمیں ہیں ایک جسم لطیف ہے جو انسان کے بدن میں حلول کرتا ہے اور وہ مادی اور عنصری ہے مگر لطیف ہے نظر نہیں آتا، اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ دوسری روح جوہر مجرد ہے مادی نہیں، اور وہ روح مجردی روح اول کی حیات ہے اسلئے اسکو روح الروح کہہ سکتے ہیں، انسان کے جسم سے تعلق تو ان دونوں قسم کی روحوں کا ہے مگر پہلی قسم جسم انسانی کے اندر رہتی ہے اسکے نکلنے ہی کا نام موت ہے۔ دوسری روح کا اس پہلی روح سے تعلق قریب تو ہے مگر اس تعلق کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روح اول تو آسمانوں پر لیجائی جاتی ہے پھر قبر میں لوٹا دیجاتی ہے اس کا مستقر قبر ہی ہے اسی پر عذاب و ثواب ہوتا ہے اور روح مجرد علیین یا سجین میں رہتی ہے۔ اسطرح اقوال جمع ہوگئے مستقر ارواح کا جنت یا علیین ہے یا اسکے بالمقابل جہنم یا سجین، یہ روح مجرد کے اعتبار سے ہے اور ان کا مستقر قبر میں ہونا روح کی قسم اول یعنی نفس کے اعتبار سے ہے جو جسم لطیف ہے اور مرنے کے بعد قبر میں رہتا ہے۔ واللہ اعلم

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ تنافس کے معنے ہیں چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب و محبوب چیز کے حاصل کرنے کیلئے جھپٹنا دوڑنا، تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کرلیں۔ یہاں جنت کی

نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے غفلت شعار انسان کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ آج تم لوگ جن چیزوں کو مرغوب و مطلوب سمجھ کر اُن کے حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو یہ ناقص اور فانی نعمتیں اس قابل نہیں کہ ان کو مقصود زندگی سمجھ کر ان کے لئے مسابقت کرو بلکہ ان میں تو اگر قناعت و ایثار سے کام لیکر یہ سمجھ لو کہ یہ چند روزہ راحت کا سامان ہاتھ سے نکل بھی گیا تو کچھ بڑے صدمے کی بات نہیں ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی نہ ہو سکے، البتہ تنافس و مسابقت کرنے کی چیز یہ جنت کی نعمتیں ہیں جو ہر حیثیت سے مکمل بھی ہیں اور دائمی بھی، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا ؎

یہ کہاں کا فسانۂ سود و زیاں جو گیا سو گیا جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ، ان آیات میں حق تعالیٰ نے اہل حق کے ساتھ اہل باطل کے طرز عمل کا یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ کفار اہل باطل مومنین اہل حق پر استہزاء ہنستے اور دل لگی کرتے ہیں اور جب اہل حق ان کے سامنے آتے ہیں تو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو آنکھ کے اشارے کرتے ہیں جس سے مقصود بھی ان کی استہزاء و ایذا رسانی ہوتی ہے۔ پھر جب یہ کفار اہل باطل اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹتے ہیں تو مومنین کے ساتھ جو تمسخر اور استہزاء کیا ہے اس کا باہم تذکرہ مزے لیکر کرتے ہیں کہ ہم نے خوب ان لوگوں کو ذلیل کیا اور جب یہ کفار مومنین کو دیکھتے ہیں تو ظاہر ہمدردی کے لئے یہ کہتے ہیں اور در حقیقت تمسخر کیلئے یہ کہتے ہیں کہ یہ بیچارے بڑے سادہ لوح بے وقوف ہیں ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گمراہ کر دیا ہے۔

آجکل کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت وہ لوگ جو جدید تعلیم کی نحوست سے دین و آخرت سے بے فکر ہو چکے ہوتے ہیں خدا و رسول پر ایمان برائے نام رہ جاتا ہے وہ علماء و صلحاء کے ساتھ بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں، حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس عذاب الیم سے نجات عطا فرماویں، مومنین و صالحین کے لئے اس آیت میں تسلی کا کافی سامان ہے کہ ان کے ہنسنے کی پرواہ نہ کریں کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہنسنے والے سے جبتک ہم ڈریں گے ☆ زمانہ ہم پہ ہنستا ہی رہے گا

تمت سورۃ التطفیف و الحمد للہ لیلۃ یوم الاثنین ۲ شعبان [illegible]

سورۃ الانشقاق

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ؕ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ

اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے اے آدمی

اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ

تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر پھر اس سے ملنا ہے سو جس کو ملا اعمال نامہ اس کا

بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ

داہنے ہاتھ میں تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس

مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا

خوش ہو کر اور جس کو ملا اس کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے سو وہ پکارے گا موت

ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ

موت اور پڑے گا آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم اس نے

ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۛۚ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۛۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ

خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا کیوں نہیں اس کا رب اس کو دیکھتا تھا سو قسم کھاتا ہوں

بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ

شام کی سرخی کی اور رات کی اور جو چیزیں اس میں سمٹ آتی ہیں اور چاند کی جب پورا بھر جائے کہ تم کو چڑھنا ہے

سے کفار میں، اور پشت کیطرف سے ملنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں گی تو بایاں ہاتھ بھی پشت کیطرف ہوگا، دوسری صورت مجاہد کا قول ہے کہ اسکا بایاں ہاتھ پشت کی طرف نکال دیا جاویگا، کذا فی الدر المنثور) سو وہ موت کو پکاریگا (جیسا مصیبت میں عادت ہے موت کی تمنا کرنے کی) اور جہنم میں داخل ہوگا، یہ شخص (دُنیا میں) اپنے متعلقین (اہل و عیال و حشم و خدم) میں خوش خوش رہا کرتا تھا (یہاں تک کہ فرط خوشی میں آخرت کی تکذیب کرنے لگا تھا جیسا کہ آگے ارشاد ہے کہ) اُس نے خیال کر رکھا تھا کہ اُسکو (خدا کی طرف) لوٹنا نہیں ہے (آگے رد ہے اس گمان کا کہ لوٹنا) کیوں نہ ہوتا (آگے لوٹنے کے بعد جزا کا اثبات ہے کہ) اسکا رب اسکو خوب دیکھتا تھا (اور اسکے اعمال پر جزا دینے کے ساتھ مشیت متعلق ہو چکی تھی اسلئے جزا کا وقوع ضروری تھا) سو (اس بنا پر) میں قسم کھا کر کہتا ہوں شفق کی اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو رات سمیٹ (کر جمع کر) لیتی ہے (مراد وہ سب جاندار ہیں جو رات کو آرام کرنے کیلئے اپنے اپنے ٹھکانے میں آجاتے ہیں) اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاوے (یعنی بدر بن جاوے، ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں) کہ تم لوگوں کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے (یہ تفصیل ہے یٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ تا مُلٰقِيْهِ کی، پس وہاں جنس کو خطاب تھا یہاں جمیع افراد کو خطاب ہے وہاں لقائے عمل کا ذکر تھا فرمایا، یہاں اُس چیز کی تفصیل ہے جس سے روز محشر سے کا پالا ان سے سابقہ آوے گی اور وہ حالتیں یہ ہیں موت ہے اسکے بعد احوال برزخ اسکے بعد احوال قیامت پھر خود انمیں بھی تعدد و کثرت ہے اور ان قسموں کا مناسب مقام ہونا اس طرح ہے کہ رات کے احوال کا مختلف ہونا کہ اول شفق نمودار ہوتی پھر زیادہ رات آتی ہے تو سب سو جاتے ہیں اور پھر ایک رات کا دوسری رات سے نور قمر کی زیادت و نقصان میں مختلف ہونا، یہ سب مشابہ ہے اختلاف احوال بعد الموت کے، پس موت سے عالم آخرت شروع ہوتا ہے جیسے شفق سے رات شروع ہوتی ہے پھر عالم برزخ میں رہنا مشابہ لوگوں کے سو جانے کے ہے اور چاند کا پورا ہونا بعد محاق کے مشابہ ہے حیوۃ قیامت کے بعد فنائے عالم کے) سو (باوجود مقتضیات خوف و ایمان کے اجتماع کے) ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے اور (خود تو ایمان اور حق کی کیا طلب کرتے انکی عناد کی یہ حالت ہے کہ) جب انکے روبرو قرآن پڑھا جاتا ہے تو (اس وقت بھی خدا کیطرف) نہیں جھکتے بلکہ (بجائے جھکنے کے یہ لوگ (اور اُلٹی) تکذیب کرتے ہیں اور اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ یہ لوگ (اعمال بد کا ذخیرہ) جمع کر رہے ہیں سو (ان اعمال کفریہ کے سبب) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دیدیجئے لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے انکے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں (عمل صالح کی قید شرط کے طور پر نہیں سبب کے طریق پر ہے)۔

معارف و مسائل

اس سورت میں قیامت کے احوال اور حساب کتاب اور نیک و بد کی جزاء و سزا کا پھر غافل انسان کو خود اپنی ذات اور گرد و پیش کے حالات میں غور کرنے اور اُن سے ایمان باللہ واقرار تک پہنچنے کی ہدایت ہے۔ آئیں پہلے

کے ہیں، اور الیٰ ربک سے مراد الیٰ لقاء ربک ہے یعنی انسان کی ہر سعی و جد و جہد کی انتہا اسکے رب کی طرف ہونے والی ہے رجوع الی اللہ۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر اسکے غور و فکر کے لئے ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ اگر اس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جد و جہد کا رُخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے جو اسکو دنیا و دین میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔ پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر اپنی فطرت سے اسکا عادی ہے کہ وہ کچھ حرکت کرے اور کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اسکے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد اور محنت برداشت کرے جیسے ایک شریف نیک انسان اپنے معاش اور ضروریات زندگی کی تحصیل میں نوکری اور مزدوری کو اختیار کرتا ہے اور اس میں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے۔ بدکار بد انسان بھی اپنے مقاصد میں بے محنت بے جد و جہد کامیاب نہیں ہو سکتا چور، ڈاکو، بدمعاش، دھوکہ فریب دینے، لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو کیسی کیسی ذہنی اور جسمانی محنت برداشت کرتے ہیں تب ان کو ان کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بتلائی کہ عاقل انسان اگر غور کرے تو اسکی تمام حرکات بلکہ سکنات بھی ایک سفر کی منزلیں ہیں جن کو وہ غیر شعوری طور پر قطع کر رہا ہے جس کی انتہا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری یعنی موت ہے (الیٰ ربک) میں اسی کا بیان ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان کی ہر جد و جہد اور محنت موت پر ختم ہونا یقینی ہے۔ تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضری کے وقت اسکی تمام حرکات و اعمال اور جد و جہد کا حساب ہونا از روئے عقل و انصاف ضروری ہے تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ ظاہر ہو۔ ورنہ دنیا میں تو اسکا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک نیک آدمی ایک مہینہ محنت مزدوری کر کے اپنا رزق اور ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو ان کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی وقت حساب کا اور جزاء سزا کا نہ آئے تو دونوں برابر ہوگئے جو عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ آخر میں فرمایا فَمُلٰقِیْهِ، ملاقیہ کی ضمیر کدح کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے تو معنی یہ ہونگے کہ جو جد و جہد یہاں انسان کر رہا ہے بالآخر اپنے رب کے پاس پہنچ کر اپنی اس محنت سے ملیگا اور اسکے اچھے یا برے نتائج اسکے سامنے آجائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملاقیہ کی ضمیر رب کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ ہر انسان آخرت میں اپنے رب سے ملیگا اور رب کے سامنے اسکے ساتھ پیش ہونے والا ہے۔ آگے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے جس کی ابتداء اعمال نامہ کا داہنے یا بائیں ہاتھ میں آنا ہے داہنے والوں کو جنت کی دائمی نعمتوں کی بشارت، اور بائیں والوں کو دوزخ کے عذاب کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اس مجموعہ پر اگر انسان غور کرے کہ ضروریات زندگی بلکہ اپنے نفس کی غیر ضروری مرغوبات کو بھی حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں سطح دنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے مگر ان دونوں کے نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک کے نتیجہ میں دائمی غیر منقطع راحت ہی راحت ہے، دوسرے کے نتیجہ میں دائمی مصیبت و عذاب ہے، پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سے سوچ سمجھ کر اپنی سعی و عمل کا رُخ اس طرف پھیر دے جو دنیا میں بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی اس کو حاصل ہو۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا اِنَّهٗ کَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا

بعد اُفق مغرب میں ہوتی ہے یہ رات کی ابتدا ہے جو انسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا مقدمہ کہ روشنی جا رہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آ رہا ہے، اسکے بعد خود رات کی قسم ہے جو اس انقلاب کی تکمیل کرتی ہے، اس کے بعد اُن تمام چیزوں کی قسم ہے جن کو رات کی تاریکی اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ وسق کے اصل معنے جمع کر لینے کے ہیں، اس کے عام معنے مراد لئے جائیں تو اس میں تمام دُنیا کی کائنات داخل ہیں جو رات کی تاریکی میں چھپ جاتی ہیں اسمیں حیوانات، نباتات، جمادات، پہاڑ اور دریا سبھی شامل ہیں۔ اور جمع کر لینے کی مناسبت سے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ چیزیں جو عادۃً دن کی روشنی میں منتشر پھیلی ہوئی رہتی ہیں۔ رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہو جاتی ہیں، انسان اپنے گھر میں، حیوانات اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہو جاتے ہیں، کاروبار میں پھیلے ہوئے سامانوں کو سمیٹ کر یکجا کر دیا جاتا ہے، یہ ایک عظیم انقلاب خود انسان اور اسکے متعلقات میں ہے۔ چوتھی چیز جس کی قسم کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہے یہ بھی وسق سے مشتق ہے جسکے معنے جمع کر لینے کے ہیں قمر کے اتساق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو جمع کرے اور یہ چودھویں رات میں ہوتا ہے جبکہ چاند بالکل مکمل ہوتا ہے۔ اذا اتسق کا لفظ چاند کے مختلف اطوار اور حالات کیطرف اشارہ ہے کہ چاند ایک نہایت خفیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے پھر اس کی روشنی روز بروز بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ بدر کامل ہو جاتا ہے مسلسل اور پیہم انقلابات احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ، جو چیزیں تہ برتہ ہوتی ہیں اُن کی ایک تہ کو طبق یا طبقہ کہتے ہیں جمع طبقات آتی ہے لترکبن، رکوب بمعنے سوار ہونے سے مشتق ہے معنے یہ ہیں کہ اے بنی نوع انسان تم ہمیشہ ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ پر سوار ہوتے اور چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کے ابتداء سے انتہا تک کسی وقت ایک حال پر نہیں رہتا بلکہ اسکے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

انسانی وجود میں بیشمار انقلابات اور دائمی سفر اور اُس کی آخری منزل

نطفہ سے منجمد خون بنا پھر اُس سے ایک مضغہ گوشت بنا پھر اُسمیں ہڈیاں پیدا ہوئیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضا کی تکمیل ہوئی پھر اُس میں رُوح ڈالکر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطن مادر کے اندر رحم کا گندہ خون تھا، نو مہینے کے بعد اللہ نے اسکے دنیا میں آنیکا راستہ آسان کر دیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا۔ دُنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا، دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی، ماں کا دودھ چھوٹ کر اُس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو و لعب اسکے دن رات کا مشغلہ بنا کچھ ہوش و شعور بڑھا تو تعلیم و تربیت کے شکنجے میں کسا گیا، جوان ہوا تو پچھلے سب کام متروک ہو کر جوانی کی خواہشات نے اُن کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا۔ نکاح شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا، قویٰ میں اضمحلال اور ضعف پیدا ہوا بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہان کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں

ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض فقہائے حنفیہ نے کہا ہے کہ یہاں الْقُرْاٰنُ سے مراد پورا قرآن نہیں، بلکہ الف لام عہد کا ہو اور مراد اس سے خاص یہی آیت ہے لیکن یہ ایک قسم کی تاویل ہی ہے جو احتمال کے درجہ میں تو صحیح کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا مراد قرآن ہونا ظاہر عبارت سے بعید معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔ اسلئے صحیح بات یہ ہے کہ اس کا فیصلہ روایات حدیث اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تعامل سے ہو سکتا ہے، مگر روایات حدیث سجدہ تلاوت کے متعلق مختلف قسم کی آئی ہیں، بعض سے وجوب معلوم ہوتا ہے بعض سے رخصت۔ اسی لئے ائمہ مجتہدین کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدہ واجب ہے جیسا کہ مفصّل کی دوسری آیتوں پر واجب ہے۔ امام اعظم کا **استدلال اسکے وجوب پر مندرجہ ذیل احادیث سے ہے۔**

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو رافع نے فرمایا کہ میں نے ایک روز عشاء کی نماز حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے پڑھی، انھوں نے سورہ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کی تلاوت نماز میں کی اور اس آیت پر سجدہ کیا، میں نے ابو ہریرہ سے پوچھا کہ یہ کیسا سجدہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں اس آیت پر سجدہ کیا ہے اس لئے میں ہمیشہ اس آیت پر سجدہ کرتا رہوں گا جبتک کہ حشر میں آپ سے ملاقات ہو، اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ میں اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں سجدہ کیا ہے۔ قرطبی نے ابن عربی سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت بھی آیات سجدہ میں سے ہے اس کے پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے، مگر ابن عربی جن لوگوں میں مقیم تھے اُن میں اس آیت پر سجدہ کرنے کا رواج نہیں تھا، کیونکہ وہ ایسے امام کے مقلد ہونگے جن کے نزدیک سجدہ واجب نہیں تو ابن عربی کہتے ہیں کہ میں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب کہیں امامت کروں تو سورہ انشقاق نہیں پڑھتا کیونکہ میرے نزدیک اس پر سجدہ واجب ہے اگر سجدہ نہیں کرتا تو گنہگار ہوتا ہوں اور اگر کرتا ہوں تو پوری جماعت میرے اس فعل کو برا سمجھے گی، بلاوجہ اختلاف کیوں ڈالا جائے، **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

تمت سورۃ الانشقاق بحمد اللہ تعالیٰ ۱۶ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝۳ قُتِلَ

قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اُس کی جو اُس کے پاس حاضر ہوتا ہے مارے گئے

اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّهُمْ

کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ

عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا

وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اُن سے بدلہ لیتے تھے اسی بات کا کہ وہ یقین لائے

بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى

اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے

كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ

سامنے ہے ہر چیز تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر

لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ اِنَّ

توبہ نہ کی تو اُن کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کے لئے عذاب ہے آگ لگنے کا بیشک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ

جو لوگ یقین لائے اور کیں انہوں نے بھلائیاں اُن کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝۱۱ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ

یہ ہے بڑی مراد ملنی بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے بیشک وہی کرتا ہے پہلی دفعہ

وَيُعِيدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ
اور دوہرائے اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا مالک عرش کا بڑی شان والا کر ڈالنے والا

لِّمَا يُرِيدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿۱۸﴾ بَلِ
جو چاہے کیا پہنچی تجھ کو بات ان لشکروں کی فرعون اور ثمود کی کوئی نہیں

الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿۱۹﴾ وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ
یہ منکر جھٹلاتے ہیں اور اللہ نے ان کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے کوئی نہیں

هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴿۲۱﴾ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿۲۲﴾
یہ قرآن ہے بڑی شان کا لکھا ہوا لوح محفوظ میں

ع

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول اس سورت میں ایک قصہ کا اجمالاً ذکر ہے جو صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ کوئی کافر بادشاہ تھا اس کے پاس ایک کاہن تھا (کاہن اس کو کہا جاتا ہے جو شیاطین کے ذریعہ یا نجوم کے آثار کے ذریعہ کچھ مستقبل کی غیبی خبریں معلوم کر کے لوگوں کو بتائے) اس کاہن نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دیا جاوے تو اس کو اپنا علم سکھا دوں، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا، اس کے راستے میں ایک راہب یعنی عیسائی پادری رہتا تھا اور اس زمانے میں دین عیسوی ہی دین حق تھا اور یہ راہب اسی پر قائم عبادت گزار تھا وہ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مسلمان ہوگیا، ایک بار اس لڑکے نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور خلق خدا پریشان ہے تو اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لیکر دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جاوے اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جاوے اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو شیر کو لگا اور وہ ہلاک ہوگیا، لوگوں میں شور ہوگیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے کسی اندھے نے سنا آکر درخواست کی میری آنکھیں اچھی ہوجاویں، لڑکے نے کہا بشرطیکہ تو مسلمان ہوجاوے چنانچہ اس نے قبول کیا، لڑکے نے دعا کی وہ اچھا ہوگیا اور مسلمان ہوگیا، بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس نابینا کو گرفتار کر کے بلایا، اس نے راہب اور اعمیٰ کو تو قتل کر دیا اور لڑکے کے لئے حکم دیا کہ پہاڑ کے اوپر لیجا کر گرا دیا جاوے مگر جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہوگئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنے کا حکم دیا وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈوب گئے پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا مجھ کو بسم اللہ کہہ کر تیر مارو تو میں مر جاؤں گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا، پس اس واقعہ عجیبہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبان سے نعرہ بلند ہوا کہ ہم سب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور ارکانِ سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں آگ سے بھروا کر اشتہار دیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا اسکو آگ میں جلا دیں گے

چنانچہ بہت آدمی جلائے گئے، اس سورت میں ان پر غضب الٰہی نازل ہونے کا بیان قسم کے ساتھ فرمایا ہے) قسم ہے
برجوں والے آسمان کی (مراد برجوں سے بڑے بڑے ستارے ہیں، کذا فی الدر المنثور مرفوعاً) اور قسم ہے وعدہ کئے ہوئے
دن کی (یعنی قیامت کے دن کی) اور قسم ہے حاضر ہونے والے دن کی، اور قسم ہے اس دن کی جس میں لوگوں کی حاضری
ہوتی ہے (حدیث ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ یوم موعود قیامت کا دن ہے اور شاہد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفہ کا
دن ہے اور ایک دن کو شاہد اور دوسرے کو مشہود شاید اس لئے فرمایا کہ یوم جمعہ میں تو سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں تو گویا
وہ دن خود آتا ہے اور یوم عرفہ میں حجاج اپنے اپنے مقامات سے سفر کر کے عرفات میں اس یوم کے قصد سے جمع ہوجاتے
ہیں تو گویا وہ دن مقصود و مشہود اور دوسرے لوگ حاضری کا قصد کرنیوالے ہیں آگے جواب قسم ہے) کہ خندق والے
یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہوئے جس وقت وہ لوگ اس (آگ) کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور
وہ جو کچھ مسلمانوں کیساتھ (ظلم وستم) کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے (انکے ملعون ہونے کی خبر دینے سے تسلی مومنین کی
ظاہر ہے کہ اسی شان کے جو لوگ اس وقت مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں وہ بھی گرفتار لعنت ہونگے جس کا اثر خواہ دنیا میں بھی مرتب
ہو جیسے غزوہ بدر وغیرہ میں مقتول و مخذول ہوئے یا صرف آخرت میں جیسا عام کفار کے لئے یقینی ہے اور دشمن کے
عذاب کی خبر سے تسلی ہونا امر طبعی ہے اور ان لوگوں کا بیٹھنا اس ظلم و ستم کے انتظام اور نگرانی کے لئے تھا اور لفظ
شہود میں علاوہ نگرانی کے اشارہ ان لوگوں کی سنگدلی کیطرف بھی ہے کہ دیکھ کر بھی ترحم نہ آتا تھا اور اسکو تعالٰے کی
لعنت میں خاص دخل ہے کہ یہ سنگدلی سبب لعنت ہے) اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں اور کوئی عیب
نہیں پایا تھا بجز اسکے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور سزاوار حمد ہے ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں
اور زمین کی (یعنی ایمان لانے پر یہ معاملہ کیا اور ایمان لانا کوئی خطا نہیں، پس بے خطا ان پر ظلم کیا اسلئے وہ لوگ ملعون
ہوئے اور آگے ظالموں کے لئے عام وعید اور مظلوموں کے لئے عام وعدہ ہے) کہ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے (مظلوم
کی مظلومیت سے بھی پس انکی نصرت کریگا اور ظالم کی ظالمیت سے بھی تو اسکو سزا دیگا خواہ یہاں خواہ وہاں چنانچہ
آگے یہی مضمون ہے کہ) جنھوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی اور پھر توبہ نہیں کی تو انکے لئے جہنم کا
عذاب ہے اور (جہنم میں بالخصوص) انکے لئے جلنے کا عذاب ہے (عذاب میں ہر طرح کی تکلیف داخل ہے سانپ، بچھو، طوق
زنجیریں، حمیم، غساق وغیرہ اور سب سے بڑھ کر جلنے کا عذاب ہے اسلئے اسکو بالتخصیص فرمایا یہ تو ظالم کے حق میں فرمایا آگے
مومنین کے حق میں جنمیں مظلوم بھی آگئے ارشاد ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے انکے لئے (بہشت
کے) باغ ہیں جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی اور یہ بڑی کامیابی ہے (اور اوپر دو مضمون تھے کفار کے لئے جہنم ہونا اور مومنین
کے لئے جنت ہونا، آگے انکے مناسب اپنے بعض افعال وصفات ان مضمونوں کی تقریر کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپکے
رب کی دارو گیر بڑی سخت ہے (پس کفار پر سزائے شدید کا واقع ہونا مستبعد نہیں اور نیز) وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے
اور دوبارہ (قیامت میں بھی) پیدا کریگا (پس یہ شبہ بھی نہ رہا کہ گو بطش شدید ہے مگر قیامت ہی واقع نہ ہوگی جو کہ وقت
بطش کا ہے اس سے تقریر ہوگئی وعید کفار کی) اور آگے تقریر ہے وعدہ مومنین کی کہ) وہی بڑا بخشنے والا اور بڑی محبت

کرنے والا اور عرش کا مالک اور عظمت والا ہے (پس ایمان والوں کے گناہ معاف کر دیگا اور ان کو اپنا محبوب بنالیگا اور ذوالعرش اور مجید کو تعذیب و اثابت دونوں کیساتھ متعلق ہو سکتا ہے کہ دونوں فرع ہیں صاحب سلطنت کمال صفت کی، لیکن یہاں تعذیب کے قرینے سے ان پر اثابت کا متفرع کرنا مقصود ہے اور آگے دونوں کے اثبات کے لئے ایک عنوان ارشاد ہے کہ) وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے (آگے مومنین کی مزید تسلی اور کفار کی مزید تنبیہ کے لئے بعض خاص مغضوبین کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) کیا آپ کو ان لشکروں کا قصہ پہنچا ہے یعنی فرعون اور آل فرعون اور ثمود کا (کہ کس طرح کفر کیا اور کیونکر گرفتار عذاب ہوئے اس سے مومنین کو تسلی حاصل کرنا چاہیئے اور کفار کو ڈرنا چاہیئے مگر کفار بالکل عذاب سے نہیں ڈرتے) بلکہ یہ کافر (خود قرآن کی) تکذیب میں (لگے) ہیں (اور اس کے مضمون تعذیب کو بھی اور دیگر مضامین کو بھی جھٹلاتے ہیں) اور (انجام کار اس کا خمیازہ بھگتیں گے کیونکہ) اللہ ان کو ادھر ادھر سے گھیرے ہوئے ہے (اسکے قبضہ قدرت اور عقوبت سے نہیں بچ سکتے، اور ان کا قرآن کو جھٹلانا محض حماقت ہے کیونکہ قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے (جسمیں کوئی تغیر و تبدیل محتمل نہیں، وہاں سے نہایت حفاظت کے ساتھ صاحب وحی کے پاس پہنچایا جاتا ہے کما قال تعالیٰ فی سورۃ الجن، فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصدا، پس ایسی صورت میں تکذیب قرآن کی بالکل جہالت و موجب عقوبت ہے)۔

معارف و مسائل

وَالسَّمَاۗءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ، بروج، برج کی جمع ہے بڑے محل یا قلعہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ، یہاں بروج سے مراد محلات و قصور ہی ہیں اور اصل مادہ برج کے لغوی معنے ظہور کے ہیں۔ تبرج کے معنے بے پردہ کھلا پھرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى، اس آیت میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک حسن بصری، قتادہ، سُدی سب کا یہی قول ہے اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے اسجگہ بروج سے مراد قصور یعنی محلات لئے ہیں اور اس سے مراد وہ مکانات ہیں جو آسمان میں پہرہ داروں اور نگراں فرشتوں کے لئے مقرر ہیں۔ اور بعض متاخرین نے برج سے مراد وہ بروج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے کہ کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج کہا جاتا ہے اُن کا خیال یہ ہے کہ ثوابت ستارے انہی برجوں میں اپنی جگہ مقیم ہیں اور سیارات حرکات فلک کیساتھ متحرک ہوتے ہیں اور ان برجوں میں سیارات کا نزول ہوتا ہے، مگر یہ سراسر غلط ہے قرآن کریم سیارات کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ ہر سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیت میں ہے وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ، فلک سے مراد اسمیں آسمان نہیں بلکہ سیارے کی مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے (مظہری)۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ، خلاصہ تفسیر میں ترمذی کی مرفوع حدیث کے حوالہ سے ان

الفاظ کی تفسیر لکھ دی گئی ہے کہ یوم موعود سے مراد روز قیامت اور شاہد سے مراد روز جمعہ اور مشہود سے
مراد روز عرفہ ہے اس آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھائی، اول برجوں والے آسمان کی۔ پھر
قیامت کے روز کی پھر جمعہ و عرفہ کے دنوں کی۔ مناسبت ان چیزوں کی قسم کی جواب قسم کیساتھ یہ ہے
کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ پر اور پھر قیامت کے روز حساب کتاب اور جزا سزا پر دلیل ہیں
اور روز جمعہ و عرفہ مومنین کے لئے ذخیرہ آخرت جمع کرنے کے سبب کے دن ہیں۔ آگے جواب قسم میں ان کفار پر
لعنت آئی ہے جنہوں نے مسلمانوں (مسلمین و مسلمات) کو محض ایمان کی وجہ سے آگ میں جلایا اور پھر مومنین کے درجات کا بیان فرمایا،
واقعہ اصحاب اُخدود کی کچھ تفصیل: یہی واقعہ اس سورت کے نزول کا سبب ہے جس کا خلاصہ صحیح مسلم کی حدیث کے
حوالہ سے خلاصہ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ یہ شخص جس کو اس واقعہ میں کاہن کہا گیا بعض روایات میں کاہن
کے بجائے ساحر آیا ہے اور یہ بادشاہ جس کا ذکر اس قصہ میں ہے ملک یمن کا بادشاہ تھا جس کا نام حضرت
ابن عباسؓ کی روایت میں یوسف ذونواس تھا اس کا زمانہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت
سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا اور یہ لڑکا جس کو ساحر یا کاہن کا فن سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مامور کیا
تھا اس کا نام عبداللہ بن تامر ہے اور راہب عیسوی مذہب کا عابد و زاہد ہے اور اس زمانے میں چونکہ مذہب عیسیٰ
علیہ السلام ہی دین حق تھا اس لئے یہ راہب اس وقت کا سچا مسلمان تھا، یہ لڑکا عبداللہ بن تامر جس کو کہانت یا
سحر سیکھنے کے لئے بادشاہ نے مامور کیا تھا اور وہ راستہ میں راہب کے پاس جاتا اور اس کا کلام سنکر متاثر ہوتا اور
بالآخر مسلمان ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان بھی ایسا پختہ نصیب فرمایا کہ ایمان کیلئے طرح طرح کی ایذائیں برداشت
کرتا تھا کیونکہ جب جانے کے وقت راستہ میں راہب کے پاس بیٹھ جاتا یہاں دیر لگتی تو جب ساحر یا کاہن کے پاس
دیر سے پہنچتا تو وہ اس کو مارتا تھا اور واپسی کے وقت جب پھر راہب کے پاس بیٹھ جاتا تو گھر واپس جانے میں دیر ہوتی
اس پر گھر والے اس کو مارتے تھے مگر اس نے کسی کی پروا کئے بغیر راہب کی صحبت و مجالست نہ چھوڑی، اس کی برکت
سے اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ کرامات عطا فرمائیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس ظالم بادشاہ نے ایمان لانیوالوں
کو عذاب دینے کے لئے خندق کھدوا کر اسکو آگ کے بڑے شعلوں سے بھر دیا پھر ایمان لانیوالوں میں سے ایک
ایک کو حاضر کر کے کہا کہ یا ایمان کو چھوڑ دو ورنہ پھر اس خندق میں گرجانا پڑیگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو ایسی
استقامت بخشی کہ ان میں سے ایک بھی ایمان چھوڑنے پر راضی نہ ہوا اور آگ میں گرجانا قبول کیا، صرف ایک
عورت جس کی گود میں ایک بچہ تھا اسکو آگ میں گرنے سے ذرا جھجک ہوئی تو چھوٹا سا بچہ بولا کہ اماں جان صبر کرو،
کیونکہ آپ حق پر ہیں۔ جو لوگ اس طرح دہکتی آگ میں جلا کر اس ظالم نے قتل کئے ان کی تعداد بعض روایات میں
بارہ ہزار، بعض میں اس سے زیادہ منقول ہے۔

اور یہ لڑکا جس کی کرامتوں کا ذکر اوپر آچکا ہے اور یہ کہ اس نے خود بادشاہ کو اپنے قتل کی یہ صورت بتلادی کہ
تم میرے ترکش کا تیر لو اور اس پر باسم اللہ ربی کہکر یہ تیر مارو تو میں مرجاؤنگا، اس ترکیب کیساتھ لڑکے

نے تو جان دیدی مگر اس واقعہ کو دیکھ کر بادشاہ کی ساری قوم نے نعرہ لگایا اور اپنے مسلمان ہونیکا اعلان کر دیا، کافر ظالم کو حق تعالیٰ نے دنیا میں بھی خائب و خاسر بنا دیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا عبداللہ ابن تامر جس جگہ مدفون تھا اتفاقاً کسی ضرورت سے وہ زمین حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اپنی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا جہاں تیر لگا تھا، کسی دیکھنے والے نے اُن کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہوگیا پھر ویسے ہی رکھدیا تو بند ہوگیا، اُن کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا اللہ ربی۔ عامل یمن نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت فاروق اعظمؓ کو دی تو آپ نے جواب میں لکھا کہ اُن کو اُنکی ہیئت پر انگوٹھی سمیت اسی طرح چھپادو جیسے پہلے تھے (ابن کثیر)

فائدہ ابن کثیر نے بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دنیا میں ایک ہی نہیں بہت مختلف ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں، پھر ابن ابی حاتم نے ان واقعات میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی (جسکا واقعہ زمانہ فترت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ستر سال پہلے پیش آیا ہے) دوسری خندق شام میں، تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآن کریم میں جس خندق کا ذکر اس سورت میں ہے وہ خندق نجران ملک یمن کی خندق ہے کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ، یہ اُن ظالموں کی سزا کا بیان ہے جنھوں نے مسلمانوں کو صرف انکے ایمان کی بنا پر آگ کی خندق میں ڈال کر جلا دیا تھا، اور سزا میں دو باتیں ارشاد فرمائیں فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ یعنی انکے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے، دوسری وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ یعنی ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے، ہو سکتا ہے کہ دوسرا جملہ پہلے ہی جملے کا بیان اور تاکید ہو اور معنے یہ ہوں کہ جہنم میں جاکر اس کو ہمیشہ آگ میں جلتے رہنے کا عذاب ملے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے جملے میں ان کی اسی دنیا میں سزا کا ذکر ہو، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ان مومنین کو ان لوگوں نے آگ کی خندق میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو تو تکلیف سے اس طرح بچا دیا کہ آگ کے چھونے سے پہلے ہی اُن کی ارواح قبض کرلی گئیں آگ میں مُردہ جسم پڑے، پھر یہ آگ اتنی بھڑک اٹھی کہ خندق کے حدود سے نکل کر شہر میں پھیل گئی اور ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے اس آگ نے جلا دیا، صرف بادشاہ یوسف ذونواس بھاگ نکلا اور آگ سے بچنے کیلئے اپنے آپکو دریا میں ڈالدیا اسی میں غرق ہو کر مر گیا (مظہری)

ان لوگوں کے لئے عذاب جہنم اور عذاب حریق کی خبر کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید بھی لگا دی کہ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا، یعنی یہ عذاب اُن لوگوں پر پڑیگا جو اپنے اس فعل پر نادم ہو کر تائب نہیں ہوئے اس میں ان لوگوں کو توبہ کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس جود و کرم کو دیکھو کہ ان لوگوں نے اللہ کے اولیاء کو زندہ جلا کر ان کا تماشا دیکھا حق تعالیٰ اس پر بھی اُن کو توبہ اور مغفرت کی طرف دعوت دے رہا ہے (ابن کثیر)۔

تمت سُورۃ البروج والحمد للہ ۱۶ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الطَّارِق

سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورہ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ

قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں آنے والے کی، اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ اندھیرے میں آنے والا، وہ تارا چمکتا ہوا، کوئی جی

نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ

نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان، اب دیکھ لے آدمی کہ کاہے سے بنا ہے، بنا ہے ایک اچھلتے ہوئے

دَافِقٍ ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾

پانی سے، جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے، بیشک وہ اس کو پھیر لا سکتا ہے

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾

جس دن جانچے جائیں بھید، تو کچھ نہ ہوگا اس کو زور اور نہ کوئی مددگار، قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ

اور زمین پھٹنے والی کی، بیشک یہ بات ہے دو ٹوک، اور نہیں ہے یہ بات ہنسی کی، البتہ وہ

يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾

لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں، اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں، سو ڈھیل دے منکروں کو ڈھیل دے ان کو تھوڑے دنوں

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے اور آپ کو کچھ معلوم ہے وہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے وہ روشن ستارہ ہے (کوئی ستارہ ہو کقولہ تعالیٰ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی، آگے جواب قسم ہے کہ) کوئی شخص

ایسا نہیں کہ جس پر کوئی اعمال کا یاد رکھنے والا (فرشتہ) مقرر نہ ہو کقولہ تعالیٰ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ، مطلب یہ کہ ان کے اعمال کی حفاظت ہوتی ہے اور اس قسم کو مقصود سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ظہور ان کا خاص شب میں ہوتا ہے، اسی طرح اعمال سب نامہ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ظہور ان کا روز قیامت میں ہوگا جب یہ بات ہے، تو انسان کو قیامت کی فکر چاہیئے اور اگر اس کے استبعاد کا شبہ ہو تو اس کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینہ (یعنی تمام بدن) کے درمیان سے نکلتا ہے (مراد اس پانی سے منی ہے خواہ صرف مرد کی یا مرد و عورت دونوں کی اور عورت کی منی گو مرد کی منی کی برابر نہیں اچھلتی لیکن کچھ اندفاق ضرور ہوتا ہے اور دوسری تقدیر پر یعنی جبکہ مراد مرد و عورت دونوں کا نطفہ ہو تو لفظ ماء کا مفرد لانا اس بنا پر ہے کہ دونوں مادے مخلوط ہو کر مثل شئی واحد کے ہو جاتے ہیں اور پشت اور سینہ چونکہ بدن کے دو طرفین ہیں اس لئے کنایہ جمیع بدن سے ہو سکتا ہے، حاصل یہ ہے کہ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے اور جب یہ ابتداء اس کی قدرت سے ظاہر ہو رہا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ) وہ اسکے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے (پس وہ استبعاد قیامت کا شبہ دفع ہوگیا اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز ہوگا) جس روز سب کی قلعی کھل جاوے گی (یعنی سب مخفی باتیں عقائد باطلہ و نیات فاسدہ ظاہر ہو جاویں گی، اور دنیا میں جس طرح موقع پر جرم سے مکر جاتے ہیں اس کو چھپا لیتے ہیں یہ بات وہاں ممکن نہ ہوگی) پھر اس انسان کو نہ تو خود مدافعت کی قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی حامی ہوگا کہ عذاب کو اس سے دفع کر دے اور اگر کہا جائے کہ امکان قیامت کا گو عقلی ہے مگر وقوع نقلی ہے اور دلیل نقلی قرآن ہے اور وہ خود محتاج اثبات ہے تو اس کے متعلق سنو کہ) قسم ہے آسمان کی جس سے بارش ہوتی ہے اور زمین کی جو (تخم نکلنے کے وقت) پھٹ جاتی ہے (آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن حق و باطل میں ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور وہ کوئی لغو چیز نہیں ہے (اس سے قرآن کا کلام حق منجانب اللہ ہونا ثابت ہوگیا مگر باوجود اثبات حق کے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ لوگ (نفی حق کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی (ان کی ناکامی اور سزا کے لئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں (جس کا حاصل یہ ہے کہ میری ہی تدبیر غالب آوے گی اور جب میرا تدبیر کرنا سن لیا) تو آپ ان کافروں (کی مخالفت) سے گھبرائیے نہیں اور ان پر جلدی عذاب آنے کی خواہش نہ کیجئے بلکہ ان کو یوں ہی رہنے دیجئے (اور زیادہ دن نہیں بلکہ) تھوڑے ہی دنوں رہنے دیجئے (پھر میں ان پر عذاب نازل کر دوں گا، خواہ قبل الموت یا بعد الموت، اخیر کی قسم کو اخیر کے مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت ہوتی ہے اس کو مالامال کر دیتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے)

معارف و مسائل

اس سورت میں حق تعالیٰ نے آسمان اور ستاروں کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہر انسان پر ایک

جو اس کے آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت باری باری کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں جو اس کے ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں ان میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں، یہ فرشتے انسان سے ہر اس مصیبت کو جو اس کے لئے مقدر نہیں اس طرح دفع کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دفع کیا جاتا ہے۔ اور اگر انسان پر یہ حفاظتی پہرہ نہ ہو تو شیاطین اس کو اچک لیں (قرطبی)

خُلِقَ مِن مَّآءٍ دَافِقٍ (الآیۃ) یعنی انسان پیدا کیا گیا ہے ایک اچھلنے والے پانی سے جو نکلتا ہے پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے۔ عام طور سے حضرات مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینے سے نکلتا ہے مگر اعضاء انسانی کے ماہر اطباء کی تحقیق اور تجربہ یہ ہے کہ نطفہ درحقیقت انسان کے ہر ہر عضو سے نکلتا ہے اور بچے کا ہر عضو اس جز نطفہ سے بنتا ہے جو مرد و عورت کے اسی عضو سے نکلا ہے۔ البتہ دماغ کو اس معاملہ میں سب سے زیادہ دخل ہے اسی لئے مشاہدہ یہ ہوتا ہے کہ جماع کی کثرت کرنے والے اکثر ضعفِ دماغ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اطباء کی تحقیق یہ بھی ہے کہ نطفہ تمام اعضاء سے منفصل ہوکر نخاع کے ذریعہ خصیتین میں جمع ہوتا اور پھر وہاں سے نکلتا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو حضرات مفسرین نے جو نطفہ کا خروج مرد کی پشت اور عورت کے سینے کے متعلق قرار دیا ہے اس کی توجیہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ اس میں اطباء کا اتفاق ہے کہ نطفہ کی تولید میں سب سے بڑا دخل دماغ کو ہے اور دماغ کا خلیفہ وقائم مقام نخاع ہے جو ریڑھ کی ہڈی کے اندر دماغ سے پشت اور پھر خصیتین تک آیا ہوا ہے، اسی کی کچھ شاخیں سینے کی ہڈیوں میں آئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عورت کے نطفہ میں سینے کی ہڈیوں سے آنے والے نطفہ کا اور مرد کے نطفہ میں پشت سے آنے والے نطفہ کا دخل زیادہ ہو (ذکرہ البیضاوی)

اور اگر قرآن کریم کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اس میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں، صرف اتنا ہے کہ نطفہ پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بے تکلف ہوسکتا ہے کہ نطفہ مرد و عورت دونوں کے سارے بدن سے نکلتا ہے اور سارے بدن کی تعبیر آگے پیچھے کے اہم اعضاء سے کردی گئی سامنے کے حصہ میں سینہ اور پیچھے کے حصہ میں پشت سب سے اہم اعضاء ہیں۔ ان دونوں کے اندر سے نکلنے کا مطلب یہ لیا جائے کہ سارے بدن سے نکلتا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ۔ رجع کے معنے لوٹا دینے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ جس خالق کائنات نے اول انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے وہ اس کو دوبارہ لوٹا دینے یعنی مرنے کے بعد زندہ کردینے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ۔ تبلی کے لفظی معنے امتحان لینے اور آزمانے کے ہیں اور سرائر کے معنی ہیں مخفی امور مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز انسان کے تمام عقائد و خیالات اور نیات و عزائم جو دل میں پوشیدہ تھے دنیا میں

اُس کو کوئی نہ جانتا تھا اسی طرح وہ اعمال و افعال جو اُس نے چھپ کر کئے دُنیا میں کسی کو اُن کی خبر نہیں، محشر میں سب کا امتحان لیا جائے گا یعنی سب کو ظاہر کر دیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انسان کے ہر مخفی راز کو کھول دے گا۔ ہر اچھے بُرے عقیدے اور عمل کی علامت انسان کے چہرہ پر یا زینت ہو کر یا ظلمت و سیاہی کی صورت میں ظاہر کر دی جائے گی (قرطبی)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ، رجع کے معنے اُس بارش کے ہیں جو پے در پے ہو کہ ایک مرتبہ بارش ہو کر ختم ہو جائے اور پھر لوٹے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ، یعنی قرآن کریم ایک فیصلہ کن قول ہے جو حق و باطل میں فیصلہ کرتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قرآن کے متعلق فرمایا ہے خبر ما قبلکم وحکم ما بعدکم وھو الفصل لیس بالھزل یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں تم سے پہلی اُمتوں کے حالات و اخبار ہیں اور تمہارے بعد ہونے والوں کے احکام ہیں وہ فیصلہ کن قول ہے ہنسی مذاق نہیں۔

تمّت سُورۃ الطارق بحمد اللہ تعالیٰ ۱۷ شوال ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الْاَعْلٰى

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورہ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَ

پاکی بول اپنے رب کے نام کی جو سب سے اوپر ہے جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا اور جس نے ٹھہرا دیا پھر راہ دی اور

الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝

جس نے نکالا چارہ پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولے گا

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ

مگر جو چاہے اللہ وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے اور سہج سہج پہنچا دیں گے ہم تجھ کو آسانی تک سو تو سمجھا دے

اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝

اگر فائدہ کرے سمجھانا سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا اور سرکتا رہے گا اس سے بڑا بدبخت

الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝

وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں پھر نہ مرے گا اس میں اور نہ جیئے گا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ

بیشک بھلا ہوا اس کا جو سنورا اور لیا نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ

دنیا کے جینے کو اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں

الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝

میں صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے

آگے اس کی تفصیل ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے نصیحت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں) بامراد ہوا جو شخص (قرآن سُنکر عقائد باطلہ اور اخلاقِ رذیلہ سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا (مگر اے منکرو تم قرآن سُنکر اسکو نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے) بلکہ تم دُنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دُنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے (اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ) یہ مضمون، اگلے صحیفوں میں بھی ہے، یعنی ابراہیم و موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں (روح المعانی میں عبد بن حمید کی روایت سے حدیث مرفوع مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نزول سے پہلے دس صحیفے نازل ہوئے)

معارف و مسائل

مسئلہ - علماء نے فرمایا ہے کہ قاری جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کی تلاوت کرے تو مستحب ہے کہ یہ کہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى۔ صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیر، ابوموسیٰ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی معمول تھا کہ جب یہ سورت شروع کرتے تو سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى کہا کرتے تھے (قرطبی) یعنی نماز کے سوا جب تلاوت کریں تو ایسا کہنا مستحب ہے۔

مسئلہ - حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ سے روایت ہے کہ جب سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى نازل ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اجعلوھا فی سجودکم یعنی یہ کلمہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى اپنے سجدہ میں کہا کرو سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، تسبیح کے معنی پاک کہنے اور پاکی بیان کرنے کے ہیں۔ سبح اسم ربک کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کے نام کو پاک رکھئے۔ مراد یہ ہے کہ رب کے نام کی تعظیم و تکریم کیجئے اور جب اللہ کا نام لیں تو خشوع خضوع اور ادب کا لحاظ رکھیے، اور ہر ایسی چیز سے اُس کے نام کو پاک رکھیے جو اسکے شایاں نہیں۔ اسمیں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان ناموں سے پکاریے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو بتلائے ہیں انکے سوا کسی اور نام سے اسکو پکارنا جائز نہیں۔

مسئلہ - اسی طرح اس حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ کسی مخلوق کیلئے استعمال کرنا اس کی تنزیہ و تقدیس کے خلاف ہے اسلئے جائز نہیں (قرطبی) جیسے رحمٰن، رزّاق، غفّار، قدّوس وغیرہ آجکل اس معاملے میں غفلت برتی جارہی ہے لوگوں کو ناموں کے اختصار کا شوق ہے، عبدالرحمٰن کو رحمٰن، عبدالرزاق کو رزاق، عبدالغفار کو غفار بے تکلف کہتے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسکا کہنے والا اور سُننے والا دونوں گنہگار ہوتے ہیں، اور یہ گناہ بے لذت رات دن بلا وجہ ہوتا رہتا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ اسم سے مراد خود مسمّٰی کی ذات مراد لی ہے اور عربی زبان کے اعتبار سے اس کی گنجائش بھی ہے اور قرآن کریم میں بھی اس معنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور حدیث میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کلمہ کو نماز کے سجدے میں پڑھنے کا حکم دیا اُس کی تعمیل میں جو کلمہ اختیار کیا گیا وہ سُبْحَانَ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى نہیں بلکہ سُبْحَانَ

شامل ہے آسمان اور آسمانی مخلوقات ہوں یا زمین اور اس کی مخلوقات کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل و شعور اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دیا ہے گو وہ انسان کے عقل و شعور سے کم ہو جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت میں ارشاد ہے اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کرکے ایک وجود بخشا پھر اس کو اسکے متعلقہ کام کی ہدایت کردی اسی ہدایت کا یہ نتیجہ ہے کہ آسمان و زمین ستارے اور سیارے پہاڑ اور دریا سب کے سب جس خدمت پر ازل سے لگا دیئے گئے ہیں اس خدمت کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح بغیر کسی کوتاہی کمی کے بجا لاتے ہیں خصوصاً انسان و حیوانات جن کا عقل و شعور [illegible] ہے ان میں بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں [illegible] بھی سمجھ [illegible] کو حق تعالیٰ نے اپنی اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے اور اپنے مخالف چیزوں کو دفع کرنے کے کیسے کیسے دقیق ہنر سکھا دیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے انسان تو سب سے زیادہ عقل و شعور والا ہے جنگل کے جانوروں [illegible] پرندوں اور حشرات الارض کو دیکھو کہ ہر ایک کو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے اور بچانے اور اپنی انفرادی اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے کیسے کیسے ہنر سکھا دیئے ہیں اور یہ سب بلاواسطہ خالق کائنات کی طرف سے ہیں انہوں نے کسی اسکول کالج میں رہ کر یا کسی استاد سے یہ چیزیں نہیں سیکھیں یہ سب وہی ہدایت عامہ قدرت ربانی کے شواہد ہیں جس کا ذکر آیت اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى اور اس سورت کی قَدَّرَ فَهَدٰى میں فرمایا ہے۔

انسان کو سائنسی تعلیم بھی درحقیقت عطائے ربانی ہے | انسان چونکہ حق تعالیٰ نے عقل و شعور سب سے زیادہ مکمل عطا فرمایا اور اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے تمام زمین اور پہاڑ اور دریا اور ان میں پیدا ہونے والی اشیا انسان کی خدمت اور اسکے نفع کے لئے پیدا ہوئی ہیں مگر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کرلینا یہ بڑے علم و ہنر کو چاہتا ہے قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر یہ عقل و فہم رکھا ہے کہ پہاڑوں کو کھود کر دریاؤں میں غوطہ لگا کر زمین کی معدنی اور دریائی چیزیں حاصل کرلیتا ہے اور پھر لکڑی لوہے تانبے پیتل وغیرہ کو باہم جوڑ کر ان سے نئی نئی چیزیں اپنی ضرورت کی بنا لیتا ہے اور یہ علم و ہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، ابتداء دنیا سے ان پڑھ جاہل سب کام کرتے آئے ہیں اور یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً بخشی ہے آگے فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی اسی قدرت ربانی کا عطیہ ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیا کا استعمال سکھاتی ہے اور اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا ہے، آگے اسمیں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور انسان کی فطرت میں اسکے سمجھنے کی استعداد و صلاحیت رکھی ہے جس کے مظاہر اس سائنسی دور میں روزمرہ سامنے آرہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اس سے بھی زیادہ کیا کیا سامنے آنے کا ہو [illegible] تو یہ سب ایک لفظ قَدَّرَ فَهَدٰى کی شرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان سب کاموں کا راستہ دکھایا، اور

لیلو جو تمہاری دائمی ملکیت ہوگی تو عقلمند انسان ان دونوں میں کس کو ترجیح دیگا، اسکا مقتضا تو یہ ہے کہ آخرت کی نعمتیں اگر بالفرض ناقص اور دنیا سے کم درجہ کی بھی ہوتیں مگر انکے دائمی ہونے کی وجہ سے وہی قابل ترجیح تھیں اور جبکہ وہ نعمتیں دنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں خیر اور افضل اور اعلیٰ بھی ہیں اور دائمی بھی تو کوئی احمق بدنصیب ہی انکو **چھوڑ کر دنیا کی نعمت کو ترجیح دے سکتا ہے۔**

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى ۧ یعنی اس سورت کے سب مضامین یا آخری مضمون یعنی آخرت کا بہ نسبت دنیا کے خیر اور ابقیٰ ہونا پچھلے صحیفوں میں بھی موجود تھا جسکا بیان آگے یہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں یہ مضمون تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے پہلے کچھ صحیفے بھی دیئے گئے تھے وہ مراد ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ صحف موسیٰ سے تورات ہی مراد ہو۔

صحف ابراہیمی کے مضامین آجری نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے کیسے اور کیا تھے، آپ نے فرمایا کہ ان صحیفوں میں امثال عبرت کا بیان تھا، اُن میں سے ایک مثال میں ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے دنیا پر مسلط ہو جانے والے مغرور مبتلی میں نے تجھے حکومت اس لئے نہیں دی تھی کہ تو دنیا کا مال پر مال جمع کرتا چلا جائے بلکہ میں نے تو تجھے اقتدار اس لئے سونپا تھا کہ تو مظلوم کی بددعا مجھ تک پہنچنے دے کیونکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں مظلوم کی دعا کو رد نہیں کرتا اگرچہ وہ کافر کی زبان سے نکلی ہو۔

اور ایک مثال میں عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات کے تین حصے کرے ایک حصہ اپنے رب کی عبادت اور اُس سے مناجات کا ہو، دوسرا حصہ اپنے اعمال کے محاسبہ کا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و صنعت میں غور و فکر کا، تیسرا حصہ اپنی ضروریات معاش حاصل کرنے اور طبعی ضرورتیں پورا کرنے کا۔

اور فرمایا کہ عقلمند آدمی پر لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف رہے اور اپنے مقصود کام میں لگا رہے اپنی زبان کی حفاظت کرے، اور جو شخص اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھیگا اسکا کلام بہت کم صرف ضروری کاموں میں رہ جائیگا۔

صحف موسیٰ علیہ السلام کے مضامین حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا کہ صحف موسیٰ علیہ السلام میں کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ اُن میں سب عبرتیں ہی عبرتیں تھیں جن میں سے چند کلمات یہ ہیں :۔

مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو مرنے کا یقین ہو پھر وہ کیسے خوش رہتا ہے، اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہو وہ کیسے عاجز و درماندہ اور غمگین ہوتا ہے، اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جو دنیا اور اسکے انقلابات اور لوگوں کے عروج و نزول کو دیکھتا ہے وہ کیسے دنیا پر مطمئن ہو بیٹھتا ہے، اور مجھے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو آخرت کے حساب پر یقین ہو وہ کیسے عمل کو چھوڑ بیٹھتا ہے، حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے پھر یہ سوال کیا کہ کیا ان صحیفوں میں سے کوئی چیز آپکے پاس آنیوالی وحی میں بھی ہے آپنے فرمایا اے ابوذر یہ آیتیں پڑھو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ آخر سورۂ اعلیٰ تک (قرطبی)

تمت سورة الاعلیٰ بحمد اللہ تعالیٰ لیلۃ یوم الاحد ۱۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الغَاشِيَة

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھبیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ① وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ② عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ③ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ④ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ⑤ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ⑥ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ⑦ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ⑧ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ⑨ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑩ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ⑪ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ⑫ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ⑬ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ⑭ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ⑮ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ⑯ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ⑰ وَاِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ⑱ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ⑲ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ⑳ فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ

اور نیچے زمین اور اطراف میں پہاڑ سب کے ان علامات میں غور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا اور جب یہ لوگ باوجود قیام دلائل کے غور نہیں کرتے تو آپ بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیئے بلکہ صرف) نصیحت کر دیا کیجئے (کیونکہ) آپ تو بس صرف نصیحت کرنیوالے ہیں (اور) آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) ہاں مگر جو روگردانی اور کفر کریگا تو خدا اس کو (آخرت میں) بڑی سزا دیگا کیونکہ ہمارے ہی پاس ان کا آنا ہوگا پھر ہمارا ہی کام ان سے حساب لینا ہے (آپ زیادہ غم میں نہ پڑیئے۔)

معارف و مسائل

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ قیامت میں دو فریق مومن و کافر الگ الگ ہو جائینگے انکے چہرے الگ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اس آیت میں کافروں کے چہروں کا ایک حال یہ بتلایا ہے کہ وہ خاشعہ ہونگے، خشوع کے معنے جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں۔ نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے اور ذلت و پستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے۔ جن لوگوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع و تذلل اختیار نہیں کیا اس کی سزا ان کو قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں انکے چہروں پر ذلت اور رسوائی کے آثار نمایاں ہونگے۔

دوسرا اور تیسرا حال ان کے چہروں کا یہ بیان فرمایا کہ عاملہ، ناصبہ ہونگے، عاملہ کے لفظی معنے عمل اور محنت کرنے والے کے ہیں۔ محاورات میں عامل اور عاملہ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو مسلسل عمل اور محنت سے تھک کر ماندہ چور ہو گیا ہو اور ناصبہ نصب سے مشتق ہے اس کے معنے بھی تھکنے اور تعب و مشقت میں پڑ جانے کے ہیں۔ کفار و مجرمین کے یہ دو حال کہ عمل اور محنت سے تھکے درماندہ ہونگے ظاہر یہ ہے کہ یہ حال ان کی دنیا کا ہے کیونکہ آخرت میں تو کوئی عمل اور محنت نہیں اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اسکا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ پہلا حال یعنی چہروں پر ذلت و رسوائی یہ تو آخرت میں ہوگا اور عاملہ، ناصبہ کے دونوں حال ان لوگوں کے دنیا ہی میں ہوتے ہیں کیونکہ بہت سے کفار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں میں مجاہدہ و ریاضت دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، نصاریٰ کے راہب بہت سے ایسے بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضاجوئی کے لئے دنیا میں عبادت و ریاضت کرتے ہیں اور اسمیں محنت شاقہ برداشت کرتے ہیں مگر وہ عبادت مشرکانہ اور باطل طریقہ پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر و ثواب نہیں رکھتی تو ان لوگوں کے چہرے دنیا میں بھی عاملہ ناصبہ رہے اور آخرت میں ان پر ذلت و رسوائی کی سیاہی چھائی ہوگی حضرت حسن بصری نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ جب ملک شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب آپ کے پاس آیا، جو بوڑھا تھا اور اپنے مذہب کی عبادت و ریاضت اور مجاہدہ و محنت میں لگا ہوا تھا۔ محنت سے اسکا چہرہ بگڑا ہوا، بدن خشک لباس خستہ و بدہیئت تھا، جب فاروق اعظمؓ نے اس کو دیکھا تو آپ رو پڑے لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا تو فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ مجھے اس

بوڑھے کے حال پر رحم آیا کہ اس بیچارے نے ایک مقصد کے لئے بڑی محنت وجانفشانی کی مگر وہ اس مقصد یعنی رضائے الٰہی کو نہیں پا سکا اور اس پر حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (قرطبی)

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً، حامیہ کے لفظی معنے گرم کے ہیں اور آگ کا گرم ہونا اس کا طبعی حال ہے پھر اس کی صفت حامیہ بیان کرنا یہ بتلانے کے لئے ہے کہ اس آگ کی گرمی دنیا کی آگ کی طرح کسی وقت کم یا ختم ہونے والی نہیں بلکہ یہ حامیہ دائماً ہے

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ، یعنی اہل جہنم کو کھانے کے لئے ضریع کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ضریع دنیا میں ایک خاص قسم کی خاردار گھاس ہے جو زمین پر پھیلتی ہے کوئی جانور اس کے پاس نہیں جاتا بدبودار زہریلی کانٹوں والی ہے (کذا قال عکرمہ و مجاہد۔ قرطبی)

جہنم میں گھاس درخت کیسے | یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گھاس درخت تو آگ سے جلجانے والی چیزیں ہیں جہنم میں یہ کیسے رہیں گی کیونکہ جس خالق ومالک نے ان کو دنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ ہی بنا دے وہ آگ سے پلنے لگیں۔

ایک شبہ کا جواب | قرآن نے اہل جہنم کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا ذکر کیا ہے یہاں ضریع اُن کی غذا بتلائی ہے۔ دوسری جگہ زقوم اور تیسری جگہ غسلین، تو اس آیت میں جو حصر کیساتھ بیان کیا گیا کہ اہل جہنم کو کوئی غذا بجز ضریع کے نہ دی جائے گی، یہ حصر مقابلہ اُس غذا کے ہے جو کھانے کے لائق خوشگوار چیز یا غذائیت والی ہو اور ضریع بطور مثال کے آگیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل جہنم کو کوئی کھانے کے لائق غذا نہیں ملے گی بلکہ ضریع جیسی تکلیف دہ مضر چیزیں دی جاویں گی اسلئے ضریع میں حصر مقصود نہیں بلکہ زقوم اور غسلین بھی ضریع میں شامل ہیں اور قرطبی نے فرمایا یہ ہو سکتا ہے کہ جہنم کے مختلف درکات طبقات میں مختلف غذائیں ہوں کہیں ضریع کہیں زقوم کہیں غسلین۔

لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ، آیت سابقہ میں جب اہل جہنم کی غذا ضریع بتلائی گئی ہے بعض کفار مکہ نے جب یہ آیت سنی تو کہنے لگے ہمارے اونٹ تو ضریع کھا کر خوب فربہ ہو جاتے ہیں اُن کے جواب میں فرمایا کہ جہنم کے ضریع کو دنیا کے ضریع پر قیاس نہ کرو، وہاں کے ضریع سے نہ فربہی پیدا ہوگی اور نہ بھوک سے نجات ملے گی۔

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً، یعنی جنت میں کوئی ایسا کلام یا بات اہل جنت کے کانوں میں نہ پڑے گی جو لغو و بیہودہ اور دل خراش ہو۔ جس میں کلمات کفریہ بدرجہ اولیٰ آگئے اور دل آزار گفتگو، افتراء و بہتان، الزام تراشی اور ایسے سب کلام آگئے جن کو سن کر انسان کو ایذا پہنچتی ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے اسی کو اس طرح بیان فرمایا ہے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا یعنی اہل جنت جنت میں کوئی لغو بات یا الزام

کانے کی بات نہ سُنیں گے، اس کے علاوہ بھی کئی جگہ یہ مضمون قرآن کریم میں مذکور ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ الزام تراشی اور بے تکی بے ڈھنگی باتیں بڑی ایذا کی چیز ہے اسی لئے قرآن کریم نے اہل جنت کے حالات میں اہتمام سے اس کو بیان فرمایا کہ اہل جنت کے کانوں میں کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں پڑے گا جس سے **اُن کا دل بُرا اور میلا ہو۔**

بعض آداب معاشرت | وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۔ اکواب، کوب کی جمع ہے، پانی پینے کے برتن کو کہا جاتا ہے جیسے آبخورہ، گلاس وغیرہ، اس کی صفت میں لفظ موضوعہ لایا گیا یعنی اپنی مقررہ جگہ پر پانی کے قریب رکھے ہوئے ہوں گے۔ یہ فرما کر آداب معاشرت کے ایک اہم باب کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ پانی پینے کے برتن پانی کے قریب مقررہ جگہ پر رہنے چاہئیں وہاں سے اِدھر اُدھر ہو جائیں اور پانی پینے کے وقت تلاش کرنا پڑے یہ ایذا رسانی کی چیز ہے اسلئے ہر شخص کو اس کا اہتمام چاہئے کہ ایسی استعمالی چیزیں جو سب گھر والوں کے کام میں آتی ہیں جیسے لوٹے، گلاس، تولیہ وغیرہ اس کی جگہ مقرر رہنی چاہئے اور استعمال کرنے کے بعد اسکو وہیں رکھنا چاہئے تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے یہ اشارہ لفظ موضوعہ سے اس لئے نکلا کہ حق تعالیٰ نے اہل جنت کی راحت و آسائش کے لئے اس کے ذکر کا اہتمام فرمایا کہ ان کے پانی پینے کے برتن پانی کے قریب **رکھے ہوئے ملیں گے۔**

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۔ آیات قیامت کے احوال اور اس میں مومن و کافر کی جزاء و سزا کا بیان فرمانے کے بعد ان جاہل معاندین کی ہدایت کی طرف توجہ فرمائی جو اپنی بے وقوفی سے قیامت کا انکار اس بنا پر کرتے ہیں کہ انہیں مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بہت بعید بلکہ محال نظر آتا ہے ان کی ہدایت کے لئے حق جل شانہٗ نے اپنی قدرت کی چند نشانیوں میں غور کرنے کا ان آیتوں میں ارشاد فرمایا ہے اور اللہ کی قدرت کی نشانیاں تو آسمان و زمین میں بے شمار ہیں، یہاں اُن میں سے ایسی چار چیزوں کا ذکر فرمایا جو عرب کے بادیہ نشین لوگوں کے مناسب حال ہیں کہ وہ اونٹوں پر سوار ہو کر بڑے بڑے سفر طے کرتے ہیں اس وقت ان کے سب سے زیادہ قریب اونٹ ہوتا ہے اوپر آسمان اور نیچے زمین اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ ہوتا ہے انہیں چار چیزوں میں ان کو غور کرنے کا حکم دیا گیا کہ دوسری آیات قدرت کو بھی چھوڑو انہیں چار چیزوں میں غور کرو تو حق تعالیٰ کی ہر چیز پر **قدرت کاملہ کا مشاہدہ ہو جائے گا۔**

اور جانوروں میں اونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو خاص طور سے غور کرنے والے کیلئے حق تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں۔ اول تو عرب میں سب سے زیادہ بڑا جانور یعنی ڈیل ڈول کے اعتبار سے اونٹ ہی ہے، ہاتھی وہاں ہوتا نہیں دوسرے حق تعالیٰ نے اس عظیم الجثہ جانور کو ایسا بنا دیا کہ عرب کے بدو اور غریب مفلس آدمی بھی اس اتنے بڑے جانور کے پالنے رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں کیونکہ

اسکو چھوڑ دیجئے تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لیگا اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی یہ خود درختوں کی شاخوں سے اپنا گزارہ کر لیتا ہے، ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی طرح اس کی خوراک نہیں جو بڑی گراں پڑتی ہے۔ عرب کے جنگلوں میں پانی ایک بہت ہی کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا قدرت نے اسکے پیٹ میں ایک ریزروٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی پی کر یہ اس ٹنکی میں محفوظ کر لیتا ہے، اور تدریجی رفتار سے وہ اس کی پانی کی ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لئے سیڑھی لگانا پڑتی مگر قدرت نے اسکے پاؤں کو تین تہ میں تقسیم کر دیا یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے کہ وہ تہ کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اور اترنا آسان ہو جاتا ہے۔ محنت کش اتنا ہے کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ عرب کے میدانوں میں دن کا سفر دھوپ کی وجہ سے سخت مشکل ہے قدرت نے اس جانور کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا ہے، مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک لڑکی بچی اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لیجائے اس کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات ہیں جو انسان کو حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔ آخر سورت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے فرمایا کہ آپ کو ہم نے اس پر مسلط نہیں کیا کہ سب کو مومن ہی بنا دیں لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ بلکہ آپ کا کام تبلیغ کرنے اور نصیحت کرنے کا ہے وہ کر کے آپ بے فکر ہو جائیں، ان کا حساب کتاب اور جزاء و سزا سب ہمارا کام ہے۔

تمت سورۃ الغاشیہ بحمد اللہ لیلۃ یوم الاثنین ۱۹ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُوۡرَةُ الۡفَجۡرِ

سُوۡرَةُ الۡفَجۡرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوۡنَ اٰيَةً

سورۂ فجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیس آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالۡفَجۡرِ ۝۱ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ ۝۲ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۝۳ وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ ۝۴ هَلۡ فِىۡ

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور اس رات کی جب رات کو چلے ہے اس

ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِىۡ حِجۡرٍ ۝۵ اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶ اِرَمَ ذَاتِ

چیز میں قسم پوری عقلمند کے واسطے تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ وہ جو ارم میں تھے

الۡعِمَادِ ۝۷ الَّتِىۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِى الۡبِلَادِ ۝۸ وَثَمُوۡدَ الَّذِيۡنَ جَابُوا

بڑے ستونوں والے کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشا

الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝۹ وَفِرۡعَوۡنَ ذِى الۡاَوۡتَادِ ۝۱۰ الَّذِيۡنَ طَغَوۡا فِى

پتھروں کو وادی میں اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا یہ سب تھے جنہوں نے سر اٹھایا

الۡبِلَادِ ۝۱۱ فَاَكۡثَرُوۡا فِيۡهَا الۡفَسَادَ ۝۱۲ فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ

ملکوں میں پھر بہت ڈالی ان میں خرابی پھر پھینکا ان پر تیرے رب نے کوڑا

عَذَابٍ ۝۱۳ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ۝۱۴ فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰٮهُ

عذاب کا بیشک تیرا رب لگا ہے گھات میں سو آدمی جو ہے جب جانچے اس کو رب

رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ۝۱۵ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا

اس کا پھر اس کو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھ کو عزت دی اور وہ جس وقت اس کو

ابۡتَلٰٮهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ۝۱۶ كَلَّا بَلْ

جانچے پھر کھینچ کرے اس پر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں پر تم

لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿١٨﴾ وَ

عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھانے کی اور

تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾ كَلَّا

کھا جاتے ہو مردے کا مال سمیٹ کر سارا اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر کوئی نہیں

إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾

جب پست کر دی جائے زمین کوٹ کوٹ کر اور آئے تیرا رب اور فرشتے آئیں قطار قطار

وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ ﴿٢٣﴾

اور لائی جائے اس دن دوزخ اس دن سوچے گا آدمی اور کہاں ملے اس کو سوچنا

يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ﴿٢٥﴾

کہے گا کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیجتا اپنی زندگی میں پھر اس دن عذاب نہ دے اس کا سا کوئی

وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ﴿٢٦﴾ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي

اور نہ باندھ کر رکھے اس کا سا باندھنا کوئی اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل

إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں

ع ۱۴

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے (فجر کے وقت) کی اور (ذی الحجہ کی) دس راتوں (یعنی دس تاریخوں) کی (کہ وہ نہایت فضیلت والی ہیں کذا فسر فی الحدیث) اور جفت کی اور طاق کی (جفت سے مراد دسویں تاریخ ذی الحجہ کی اور طاق سے نویں تاریخ، کذا فی الحدیث، اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سے نماز مراد ہے کہ کسی کی طاق رکعتیں ہیں کسی کی جفت، اور پہلی حدیث کو روایۃً بھی اصح کہا گیا ہے، کذا فی الروح اور درایۃً بھی وہ ارجح ہے کیونکہ اس سورت میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی وہ سب زمانے اور اوقات کی قسم سے ہیں، درمیان میں شفع اور وتر بھی اوقات ہی کی قسم سے ہو تو تناسب واضح ہے، اور یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ شفع و وتر سے مراد عام ہو وہ جفت اور طاق ہوں جو لائق تعظیم ہیں، وقت وایام بھی اس میں داخل ہیں اور عدد رکعات نماز بھی) اور قسم ہے رات کی جب وہ چلنے لگے (یعنی گزرنے لگے، قولہ تعالیٰ واللیل اذ ادبر، آگے بطور جملہ معترضہ کے تاکید کے لئے اس قسم کا عظیم ہونا بیان فرماتے ہیں کہ) کیا ان (مذکورہ) میں عقلمند کے واسطے کافی قسم بھی ہے (استفہام تقریر و تاکید کے لئے ہے یعنی ان مذکورہ قسموں میں ہر ہر قسم تاکید کلام کے لئے کافی ہے اور گو سب قسمیں جو قرآن میں مذکور ہیں ایسی ہی ہیں مگر اہتمام کے لئے انکے کافی ہونے کی تصریح فرمادی کما مر فی قولہ تعالیٰ

جہنم و دوزخ کے متعلق بیان ہو چکا ہے، اس روز انسان کو سمجھ آوے گی اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں رہا (یعنی اب سمجھ آنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دار الجزاء ہے دار العمل نہیں۔ آگے سمجھ آنے کے بعد جو اسکا قول ہوگا اس کا بیان ہے کہ وہ) کہے گا کاش میں اس زندگی (اخروی) کے لئے کوئی (نیک عمل) آگے بھیج لیتا پس اس روز نہ تو خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا اور نہ اسکے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا (یعنی ایسی سخت سزا اور قید (زیادہ) دنیا میں بھی کسی نے کسی کو نہ اتنی سخت سزا دی ہوگی نہ ایسی سخت قید کی ہوگی یہ سزا تو اُن لوگوں کی ہوگی جو اعمال عذاب کے مرتکب ہوئے، اور جو اللہ کے فرمانبردار تھے اُن کو ارشاد ہوگا کہ اے اطمینان والی روح (یعنی جس کو امر حق میں یقین واذعان تھا اور کسی طرح کا شک و التفات نہ تھا اور تعبیر روح سے باعتبار جزء اشرف کے ہے) تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (یہ تو نعمت روحانی ہے کہ اس کے لئے احباب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں) اور میری جنت میں داخل ہو جا (لفظ مطمئنہ میں ان لوگوں کے اعمال کی طرف اشارہ ہو گیا، اعمال حسنہ کی طرف اشارہ اور اعمال عذاب کی تفصیل بیان فرمانا شاید اس لئے ہو کہ زیادہ مقصود یہاں اہل مکہ کو سنانا ہے اور اس وقت وہاں ایسے اعمال کے مرتکب زیادہ تھے)

معارف و مسائل

اس سورت میں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ میں بیان ہوا ہے یعنی اس دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر جزا و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے خواہ اسی جملے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کو جواب قسم کہا جائے یا محذوف قرار دیا جائے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے ان میں پہلی چیز فجر یعنی صبح صادق کا وقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مراد ہر روز کی صبح ہو کہ وہ عالم میں ایک انقلاب عظیم لاتی ہے اور حق تعالیٰ شانہ کی قدرت کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ الفجر کے الف لام عہد کا قرار دے کر اس سے کسی خاص دن کی فجر مراد ہو۔ مفسرین صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت ابن عباسؓ ابن زبیرؓ سے پہلے معنے یعنی عام وقت فجر کسی روز کا ہو منقول ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں اس سے مراد ماہ محرم کی پہلی تاریخ کی فجر ہے جو اسلامی قمری سال کا آغاز ہے۔ حضرت قتادہ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر کی صبح اس کی مراد قرار دی ہے۔ مجاہد و عکرمہ کا یہی قول ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے۔ وجہ اس یوم النحر کی تخصیص کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے لئے ایک رات ساتھ لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے صرف یوم النحر ایسا دن ہے کہ اسکے ساتھ کوئی رات نہیں کیونکہ یوم النحر سے

پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں بلکہ شبِ عرفہ کی رات قرار دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں نہ پہنچ سکا رات کو صبح صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ روزِ عرفہ کی دو راتیں ہیں ایک اس سے پہلے دوسری اس کے بعد اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں، اس لحاظ سے صبح یوم النحر تمام ایام دنیا میں ایک خاص شان رکھتی ہے (قرطبی)

دوسری چیز جس کی قسم ہے وہ لیالٍ عشر یعنی دس راتیں، حضرت ابن عباسؓ، قتادہ، مجاہد، سُدی، ضحاک، کلبی، ائمہ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں مراد ہیں کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبادت کرنے کے لئے اللہ کے نزدیک سب دنوں میں عشرہ ذی الحجہ سب سے افضل ہے اس کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کی برابر اور اس میں ہر رات کی عبادت شبِ قدر کی برابر ہے (رواہ الترمذی وابن ماجہ بسند ضعیف عن ابی ہریرۃ مظہری) اور ابوالزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد عشرہ ذی الحجہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آئی ہیں وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ کیونکہ یہی دس راتیں سال کے ایام میں افضل ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث مذکور سے افضل ایام ہونا عشرہ ذی الحجہ کا معلوم ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرر کی گئی تھیں

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ، شفع کے لغوی معنے جوڑ کے ہیں جس کو اردو میں جفت کہتے ہیں اور وتر کے معنے طاق اور فرد کے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ تعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے اسلئے ائمہ تفسیر کے اقوال اس میں بے شمار ہیں مگر خود حدیث مرفوع جو ابوالزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

ان الفجر ولیالٍ عشرٍ، ھو الصبح وعشر النحر والوتر یوم عرفۃ والشفع یوم النحر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والفجر ولیال عشر کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرہ نحر ہے (اور عشرہ ذی الحجہ کا یہی عشرہ ہو سکتا ہے جس میں یوم نحر شامل ہے) اور فرمایا کہ وتر سے مراد روزِ عرفہ اور شفع سے مراد یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) ہے

قرطبی نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے صحیح تر ہے بہ نسبت دوسری حدیث کے جو حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے نقل ہوئی ہے جس میں شفع و وتر نماز کا ذکر ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔ اور بعض ائمہ تفسیر ابن سیرین، مسروق، ابوصالح، قتادہ نے فرمایا کہ شفع سے مراد تمام مخلوقات...

متعلق عجیب عجیب اقوال مذکور ہیں، حضرت ابن عباس اور مقاتل سے ان کی قامت کا طول بارہ ہاتھ یعنی ۱۸ فٹ منقول ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ان کا یہ قول بھی اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے واللہ اعلم

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ارم اُس جنت کا نام ہے جو عاد کے بیٹے شداد نے بنائی تھی اور اُسی کی صفت ذات العماد ہے کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت بہت سے عمودوں پر قائم سونے چاندی اور جواہرات سے تعمیر کی تھی تاکہ لوگ آخرت کی جنت کے بدلے اس نقد جنت کو اختیار کریں، جب یہ عالیشان محلات تیار ہو گئے اور شداد نے اپنے رؤساء سلطنت کے ساتھ اس میں جانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا یہ سب ہلاک ہو گئے اور وہ عمارات بھی مسمار ہو گئے (قرطبی) اس اعتبار سے اس آیت میں قوم عاد کے ایک خاص عذاب کا ذکر ہوا جو شداد بن عاد اور اس کی بنائی ہوئی جنت پر نازل ہوا اور پہلی تفسیر جو جمہور مفسرین نے اختیار کیا ہے اس میں قوم عاد پر جتنے عذاب آئے ہیں ان سب کا بیان ہے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ، اوتاد، وتد کی جمع ہے میخ کو کہتے ہیں، فرعون کو ذی الاوتاد کہنے کی مختلف وجوہ حضرات مفسرین نے بیان فرمائی ہیں، مشہور جمہور مفسرین کے نزدیک وہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں آ چکی ہے کہ اس لفظ میں اُس کے ظلم و جور اور وحشیانہ سزاؤں کا ذکر ہے وہ جس پر خفا ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں چاروں میخوں میں باندھ کر یا خود انہی میخوں میں گاڑ کر اس کو دھوپ میں ڈال دیتا اور اس پر سانپ بچھو چھوڑ دیتا تھا، اور بعض مفسرین نے اس کی اپنی بیوی حضرت آسیہ کے متعلق یہ طویل قصہ ان کے مومن ہونے اور پھر فرعون سے اظہار ایمان کرنے اور پھر فرعون کی اسی قسم کی سزا کے ذریعہ ہلاک کر دینا ذکر کیا ہے (مظہری)

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ، قوم عاد و ثمود اور قوم فرعون کے شر و فساد کا تذکرہ فرمانے کے بعد جو عذاب اُن پر نازل ہوا اُس کو عذاب کا کوڑا برسانے کے عنوان سے تعبیر کیا ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح کوڑا مختلف اطراف بدن پر پڑتا ہے ان پر بھی مختلف قسم کے عذاب نازل کئے گئے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ، مرصاد اور مرصد، رصدگاہ اور انتظارگاہ کو کہا جاتا ہے جو کسی مقام بلند پر ہو جہاں بیٹھ کر کوئی شخص دور دور تک کے لوگوں کو دیکھ سکے اور ان کے افعال و اعمال کی نگرانی کر سکے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر انسان کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے اور سب کو اُن کی جزا و سزا دینے والا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ جملہ ان قسموں کا جواب ہے جو شروع سورت والفجر سے لیالٍ عشر میں مذکور ہوئی ہیں۔

دنیا میں رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ الآیۃ، یہاں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق ہو یہ خیال رکھتا ہے، لیکن مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو، اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے رزق میں وسعت اور مال و دولت صحت و تندرستی سے نوازے تو شیطان اسکو دو باطل خیالات میں مبتلا کرتا ہے اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت اور عقل و فہم، ورنہ علم و عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو

مجھے ملنا ہی چاہئیے میں اسکا مستحق ہوں دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے سے یہ قرار دے کہ میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں اگر مردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا۔ اسی طرح جب کبھی انسان پر رزق میں تنگی اور فقر و فاقہ آوے تو اسکو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے اور اس پر اسلئے خفا ہو کہ میں تو مستحق انعام و اکرام کا تھا مجھے بے وجہ ذلیل و حقیر کر دیا۔ ایسے خیالات کفار و مشرکین میں تو ہوتے ہی تھے اور قرآن کریم میں کئی جگہ لفظ کرکے ان خیالات کا اظہار مذکور بھی ہے افسوس ہے کہ آجکل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے انسانوں کا حال ذکر کر کے فرمایا کَلَّا یعنی تمہارا یہ خیال باطل باطل بے بنیاد ہے نہ دنیا میں وسعت رزق نیک اور مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہے اور نہ تنگی رزق اور فقر و فاقہ اللہ کے نزدیک مردود یا ذلیل ہونے کی علامت ہے بلکہ اکثر معاملہ برعکس ہوتا ہے فرعون کو دعوائے خدائی کے ساتھ کبھی درد سر تک نہ ہوا اور بعض پیغمبروں کو دشمنوں نے آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات مہاجرین میں سے جو فقیر و مفلس تھے وہ اغنیاء مہاجرین سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہونگے (رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمرؓ، مظہری) اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ سے محبت فرماتے ہیں اسکو دنیا سے ایسا پرہیز کراتے ہیں جیسے تم لوگ اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو (رواہ احمد والترمذی عن قتادۃ بن النعمان، مظہری)

یتیم پر صرف خرچ کرنا کافی نہیں اس کا اکرام بھی ضروری ہے

اس کے بعد کفار کو ان کی چند بری خصلتوں پر تنبیہ ہے اول لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ یعنی تم یتیم بچے کا اکرام نہیں کرتے۔ اصل بتلانا تو یہ ہے کہ یتیم کے حقوق ادا نہیں کرتے اس پر خرچ نہیں کرتے لیکن اس کی تعبیر اکرام کے عنوان سے کی گئی جس میں اشارہ ہے کہ عقل و انسانیت کا اور اللہ نے جو مال تمہیں دیا ہے اسکے شکر کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم یتیم کو فقط یہی نہیں کہ اسکا حق دو اور اس پر خرچ کرو بلکہ واجب ہے کہ اسکا اکرام بھی کرو اپنے بچوں کے مقابلے میں اُس کو ذلیل و حقیر نہ جانو۔ یہ الفاظ کفار کے اس قول کا جواب ہے کہ دنیا کی فراخی کو اکرام اور تنگی کو اہانت سمجھا کرتے تھے اس پر حرف بل کے ساتھ یہ ذکر فرمایا کہ اگر تمہیں کبھی تنگی رزق پیش آتی ہے تو وہ اس وجہ سے کہ تم انہی بری عادتوں میں پھنسے ہوئے ہو کہ یتیم جیسے قابل رحم بچوں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے۔ دوسری بری خصلت اُن کی یہ بتلائی وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ یعنی تم خود تو کسی مسکین غریب کو کیا دیتے دوسروں کو بھی اسکی ترغیب نہیں دیتے کہ وہ بھی یہ کام کرلیں اس عنوان میں بھی ان کفار کی بری عادت اور مذمت کے بیان کیساتھ اسطرف اشارہ ہے کہ غرباء و مساکین کا حق جیسے اغنیاء اور مالداروں پر ہے کہ اُن کو اپنے پاس سے دیں اسیطرح جو لوگ خود دینے کی قدرت نہیں رکھتے انکو بھی اتنا تو کرنا چاہیئے کہ دوسروں ہی کو اسکے لئے ترغیب دیں۔

تیسری بری خصلت یہ بیان فرمائی وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا، لَمّ کے معنے جمع کرنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تم میراث کا مال حلال و حرام سب کو جمع کرکے کھا جاتے ہو اپنے حصے کے ساتھ دوسروں کا حصہ

بھی غصب کر لیتے ہو۔ یہاں خصوصیت سے میراث کے مال کا ذکر کیا گیا حالانکہ ایک مال جس میں حلال و حرام کو جمع کیا گیا ہو ناجائز ہی ہے۔ وجہ خصوصیت کی شاید یہ ہو کہ میراث کے مال پر زیادہ نظر رکھنا اور اسکے درپے ہونا بڑی کم ہمتی اور کم حوصلہ ہونے کی دلیل ہے کہ مردار خور جانوروں کی طرح تکتے رہیں کہ کب ہمارا مورث مرے اور کب ہمیں یہ مال تقسیم ہوکر ہمارے ہاتھ آئے۔ اولوالعزم اور باہمت لوگ اپنی کمائی پر خوش ہوتے ہیں۔ *مُردوں کے مال پر ایسی حریصانہ نظر نہیں ڈالتے۔*

چوتھی بُری خصلت یہ بتلائی وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا، جم کے معنے کثیر کے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم مال کی محبت بہت کرتے ہو، بہت کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ مال کی ایک درجہ میں محبت تو انسان کا فطری تقاضا ہے وہ سبب مذمت نہیں بلکہ اس کی محبت میں حد سے بڑھنا اور انہماک ہی سبب مذمت ہے۔ کفار کی ان بُری خصلتوں کے بیان کے بعد پھر اصل مضمون کی طرف عود کیا گیا جو شروع سورت میں پانچ قسموں کیساتھ مؤکد کیا گیا ہے یعنی آخرت کی جزاء وسزا، اس سلسلہ میں اول قیامت کے آنے کا ذکر فرمایا۔

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا، لفظ دک کے لفظی معنے کسی چیز کو ضرب مار کر توڑ دینے کے ہیں مراد قیامت کا زلزلہ ہے جو پہاڑوں کو باہم ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور دکاً دکاً کو مکرر لانے سے اسطرف اشارہ کہ قیامت کا زلزلہ یکے بعد دیگرے مسلسل رہے گا۔

وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا، یعنی آئے گا آپ کا رب اور فرشتے صف بصف مراد میدان حشر میں آنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آنے کی کیا شان ہوگی اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ متشابہات میں سے ہے اور فرشتوں کا صف بصف آنا ظاہر ہے۔ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ، یعنی لایا جائیگا اس روز جہنم کو۔ جہنم کو لائے جانے کا کیا مطلب ہے اور کس طرح میدان حشر میں لائی جائے گی اس کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ظاہر یہ ہے کہ جہنم جو اب ساتویں زمین کی تہ میں ہے اُس وقت وہ بھڑک اُٹھے گی اور سمندر سب آگ ہو کر اس میں شامل ہو جائیں گے اس طرح جہنم عرصہ حشر میں سب کے سامنے آجائے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى، اس جگہ تذکر سے مراد سمجھ میں آجانا ہے یعنی کافر کو اس روز سمجھ آئے گی کہ مجھے دنیا میں کیا کرنا چاہئے تھا اور میں نے کیا کیا، مگر اس وقت یہ سمجھ میں آنا بے سود ہوگا کہ عمل اور اصلاح حال کا زمانہ گزر چکا آخرت دار العمل نہیں دار الجزاء ہے آگے اسی تذکر کا بیان ہے کہ وہ تمنا کریگا کہ کاش میں دنیا میں کچھ نیک عمل کر لیتا۔ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ، پھر اس تمنا کا باطل اور غیر مفید ہونا بتلایا کہ اب جبکہ کفر و شرک کی سزا سامنے آگئی اب اس تمنا سے کچھ فائدہ نہیں اب تو عذاب اور پکڑ کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ کی برابر کوئی پکڑ نہیں ہو سکتی۔ کفار کے عذاب بیان کرنے کے بعد آخر میں مومن کا ثواب اور ان کا جنت میں داخل کیا جانا ذکر فرمایا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ، یہاں مومن کی روح کو نفس مطمئنہ کے لقب سے خطاب کیا گیا، مطمئنہ

کے لفظی معنے ساکنہ کے ہیں۔ مراد وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اُس کی اطاعت سے سکون و قرار پاتا ہے اُسکے ترک سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور یہ وہی نفس ہو سکتا ہے جو ریاضات و مجاہدات کر کے اپنی بُری عادات اور اخلاق رذیلہ کو دُور کر چکا ہو۔ اطاعت حق اور ذکر اللہ اسکا مزاج اور شریعت اس کی طبیعت بن جاتی ہے اس کو خطاب کر کے فرمایا اِرْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ یعنی لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف، لوٹنے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مقام بھی رب کے پاس تھا اب وہیں واپس جانے کا حکم ہو رہا ہے اس سے اُس روایت کی تقویت ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ مومنین کی ارواح ان کے اعمال نامہ کے ساتھ علیین میں رہیں گی اور علیین ساتویں آسمان پر عرش رحمٰن کے سایہ میں کوئی مقام ہے ارواح انسانی کا اصلی مستقر وہیں ہے وہیں سے لا کر انسان کے بدن میں ڈالی جاتی ہے اور پھر موت کے بعد وہیں واپس جاتی ہے

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً یعنی یہ نفس اللہ تعالیٰ سے تکوینی اور تشریعی احکام پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہے کیونکہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے تقدیری احکام پر راضی ہونا ہی اس کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہوتا تو اسکو رضا بالقضا کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ یہ نفس اپنی موت کے وقت موت پر بھی راضی و خوش ہوتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ حدیث سُن کر حضرت صدیقہ عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ سے ملنا تو موت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے لیکن موت تو ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہیں، آپ نے فرمایا یہ بات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کو موت کے وقت فرشتوں کے ذریعہ اللہ کی رضا اور جنت کی بشارت دیجاتی ہے جس کو سُن کر اسکو موت زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کافر کو موت کے وقت عذاب اور سزا سامنے کر دی جاتی ہے اسلئے اسکو اُس وقت موت سے زیادہ کوئی چیز بُری اور مکروہ معلوم نہیں ہوتی (رواہ البخاری ومسلم، مظہری) خلاصہ یہ ہے کہ موت کی محبت یا کراہت اس وقت کی معتبر نہیں بلکہ نزع روح کے وقت جو نفس اللہ سے ملنے پر راضی ہو اللہ بھی اس سے راضی ہو یہی مفہوم ہے راضیۃ مرضیۃ کا۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ نفس مطمئنہ کو مخاطب کر کے یہ حکم ہوگا کہ میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ اسمیں پہلے اللہ کے صالح اور مخلص بندوں میں شامل ہونیکا حکم ہے پھر جنت میں داخل ہونیکا، اسمیں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے اللہ کے صالح مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو ان سب کے ساتھ ہی جنت میں داخلہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو دنیا میں صالحین کی صحبت و معیت اختیار کرتا ہے یہ علامت اس کی ہے کہ یہ بھی انکے ساتھ جنت میں جائے گا اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا میں فرمایا وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ، معلوم ہوا کہ صحبت صالحین وہ نعمت ہے جس کی

کرنے اور اس کے دین کو اختیار کرنے سے انکار کیا، اس کی گردن کاٹ کر سر کو ایک قریبی نہر میں ڈال دیا گیا، اُس وقت تو وہ سر پانی کی تہ میں چلا گیا، اس کے بعد پانی کی سطح پر ابھرا اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر ان کے نام لیکر آواز دی کہ فلانے فلانے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ، اس کے بعد پھر پانی میں غوطہ لگا دیا۔ یہ عجیب واقعہ سب حاضرین نے دیکھا اور سنا، اور وہاں کے نصاریٰ یہ دیکھ کر تقریباً سب مسلمان ہوگئے اور بادشاہ کا تخت ہل گیا، یہ تینوں آدمی جو مرتد ہوگئے تھے یہ سب پھر مسلمان ہوگئے اور پھر خلیفہ ابوجعفر منصور نے ہم سب کو اُن کی قید سے رہا کرایا (ابن کثیر)

الحمد للہ کہ تفسیر سورہ والفجر آج ۲۱ شعبان ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی، جبکہ اس ناکارہ گنہگار کی عمر کا چھیترواں سال ختم اور ستترواں شروع ہو رہا ہے، جس کا نصف صدی سے زیادہ حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو غفلتوں گناہوں میں برباد کرنے پر حسرت و افسوس جتنا بھی ہو کم ہے مگر قدم قدم پر حق تعالیٰ شانہ کے نعمت کی بارش اور اپنی کتاب کی اس ناچیز خدمت کو قریب الختم پہنچا دینے کا احسان عظیم عفو و کرم ہی کی امید دلا رہا ہے۔ یا من لا تضرہ الذنوب ولا تنقصہ المغفرۃ ہب لی ما لا ینقصہ واغفر لی ما لا یضرہ واجعلنی ممن تقول لہ نفسہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ وادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ـــــــ

سُورَةُ الْبَلَدِ

سُورَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ عِشْرُونَ آيَةً

سورۂ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿١﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿٢﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴿٣﴾

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی، اور تجھ پر قید نہ رہے گی اس شہر میں، اور جنے کی اور جو اس نے جنا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿٤﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴿٥﴾

تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں، کیا خیال رکھتا ہے کہ اس پر بس نہ چلے گا کسی کا

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿٦﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٧﴾ اَلَمْ

کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں، کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اس کو کسی نے، بھلا ہم نے

نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾

نہیں دیں اس کو دو آنکھیں، اور زبان اور دو ہونٹ، اور دکھلا دیں اس کو دو گھاٹیاں

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ اَوْ

سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر، اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی، چھڑانا گردن کا، یا

اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا

کھلانا بھوک کے دن میں، یتیم کو جو قرابت والا ہے، یا محتاج کو جو خاک میں

مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا

رل رہا ہے، پھر ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں

بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا

رحم کھانے کی، وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے، اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورہ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پندرہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ﴿١﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴿٢﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ﴿٣﴾ وَالَّيْلِ

قسم سورج کی اور اس کی دھوپ چڑھنے کی، اور چاند کی جب آئے اس کے پیچھے، اور دن کی جب اس کو روشن کرے، اور رات کی جب

اِذَا يَغْشٰهَا ﴿٤﴾ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ﴿٥﴾ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ﴿٦﴾ وَنَفْسٍ

اس کو ڈھانک لیوے، اور آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا، اور زمین کی اور جیسا کہ اس کو پھیلایا، اور جی کی

وَّمَا سَوّٰهَا ﴿٧﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴿٨﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ﴿٩﴾ وَ

اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا، پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی، تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوار لیا، اور

قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ﴿١٠﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ﴿١١﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ﴿١٢﴾

نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا، جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے، جب اٹھ کھڑا ہوا ان کا بڑا بدبخت،

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ

پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار ہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے، پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر وہ کاٹ ڈالی

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾

پھر الٹ مارا ان پر ان کے رب نے بسبب ان کے گناہ کے پھر برابر کر دیا سب کو، اور وہ نہیں ڈرتا اس کے پیچھا کرنے سے

ع ۱۵ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج (کے غروب) سے پیچھے آوے (یعنی طلوع ہو مراد اس سے وسط ماہ کی بعض شبوں کا چاند ہے کہ سورج کے چھپنے کے بعد طلوع ہوتا ہے اور یہ قید شاید اس لئے ہو کہ وہ

وقت کمال نور کا ہوتا ہے جیساکہ ضحٰہا کا اشارہ ہے کمال نور آفتاب کی طرف اور یہ اسوقت ذو آیۃ قدرت علی سبیل التعاقب
و اتصال ظاہر ہوتی ہیں غروب شمس و طلوع قمر، اور (قسم ہے) دن کی جب وہ اس سورج کو خوب روشن کر دے اور (قسم ہے)
رات کی جب وہ اس سورج (کو اور اس کے آثار و انوار کو بالکلیہ) چھپالے (یعنی خوب رات ہو جاوے کہ دن کی روشنی
کا کچھ اثر نہ رہے اور چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی گئی ہے ان میں جو قیدیں لگائی گئی ہیں وہ ان کے کمال کے
اعتبار سے ہیں یعنی ہر ایک کی قسم ان کی حالتِ کمال کے اعتبار سے ہے) اور قسم ہے آسمان کی اور اس (ذات) کی جس
نے اس کو بنایا (مراد اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ما طحٰہا اور ما سوّٰہا میں بھی اور مخلوق کی قسم کو خالق کی قسم پر مقدم فرمانا
اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس میں ذہن کو دلیل سے مدلول کی طرف منتقل کرنا ہے کیونکہ مصنوع دلیل ہے صانع پر تو
اس میں استدلال علی التوحید کی طرف بھی اشارہ ہو گیا) اور (قسم ہے) زمین کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بچھایا اور
(قسم ہے) انسان کی جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو ہر طرح صورت شکل اعضاء سے درست بنایا پھر
اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القا کیا (یہ اسناد باعتبار تخلیق کے ہے یعنی قلب میں جو نیکی
کا رجحان ہوتا ہے یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، گو القاء اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے
اور ثانی میں شیطان پھر وہ رجحان و میلان کبھی مرتبۂ عزم تک پہنچ جاتا ہے جو کہ انسان کے قصد و اختیار سے صادر ہوتا ہے
اسی قصد و اختیار پر عذاب و ثواب مرتب ہوتا ہے جس کے بعد صدور فعل متحقق ہوتا ہے اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا وہ معاف ہے
آگے مضمون کی تکمیل کے لئے اہل فجور و اہل تقویٰ کا مآل بتلاتے ہیں کہ) یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس جان کو پاک کر لیا
(یعنی نفس کو فجور سے روکا اور تقویٰ اختیار کر لیا) اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا (اور فجور سے مغلوب
کر دیا، اس کے بعد جواب قسم مقدر ہے یعنی اے کفار مکہ جب تم اہل فجور ہو تو ضرور مبتلائے غضب و ہلاک
ہو گے آخرت میں تو یقیناً اور دنیا میں بعض اوقات جیساکہ قوم ثمود اس فجور کی وجہ سے غضب الٰہی اور عذاب
کی مورد بنی جن کا قصہ یہ ہے کہ) قوم ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالح علیہ السلام کی) تکذیب کی (اور یہ اس
زمانہ کا قصہ ہے) جبکہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ (اونٹنی کے قتل کرنے کے لئے) اُٹھ کھڑا ہوا (یعنی
آمادہ ہو گیا اور اسکے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے) تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالح علیہ السلام) نے (جب انکو اس
عزم قتل کی اطلاع ہوئی کذا فی الخازن) فرمایا کہ اللہ کی اس اونٹنی سے اور اسکے پانی پینے سے خبردار رہنا (یعنی اسکو
قتل مت کرنا اور نہ اسکا پانی بند کرنا، چونکہ ارادہ قتل کا اصل سبب بھی پانی کی باری تھی اسلئے اسکی تصریح فرمائی۔
اور اللہ کی اونٹنی اسلئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اسکو معجزہ کے طور پر عجیب طرح سے پیدا کر کے دلیل نبوت بنا دیا اور اس کے
احترام کو واجب فرمایا) سو انھوں نے پیغمبر کو (یعنی دلیل نبوت کو جو ناقۃ اللہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی) جھٹلایا
(کیونکہ وہ ان کو نبی نہ سمجھتے تھے) پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے انکے گناہ کے سبب ان پر
ہلاکت نازل فرمائی پھر اس (ہلاکت) کو (تمام قوم کے لئے) عام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو اس ہلاکت کے اخیر میں کسی خرابی
(تکلیف) کا کسی سے اندیشہ نہیں ہوا (جیسے ملوک دنیا کو بعض اوقات کسی قوم کو سزا دینے کے بعد احتمال ہوتا ہے

سے یہی تفسیر منقول ہے۔ کشاف اور بیضاوی و قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ حرف ما کو بمعنے مَنْ لیا، اس کی مراد حق تعالیٰ کی ذات لی ہے کہ قسم ہے آسمان کی اور اسکے بنانے والے کی، اسی طرح وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا کا مفہوم یہ بیان کیا گیا کہ قسم ہے زمین اور اُس کے پھیلانے والے کی۔ مگر یہاں تک جو قسمیں اب تک مذکور ہوئیں اور جو آگے آرہی ہیں وہ سب مخلوقات کی قسمیں ہیں، درمیان میں ذات حق کی قسم آجانا نسق اور ترتیب سے بعید معلوم ہوتا ہے اور اس صورت میں جو اوپر لکھی گئی ہے یہ اشکال بھی نہیں لازم آتا کہ مخلوقات کی قسم کو ذات خالق پر مقدم کیوں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم

ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، اسمیں بھی ما کو مصدریہ لیا جائے تو معنے یہ ہیں کہ قسم ہے انسانی جان کی اور اسکے درست و متناسب کرنے کی اور اگر ما کو بمعنے مَنْ لیا جائے تو معنے یہ ہونگے کہ قسم ہے نفس کی اور اسکے برابر درست کرنیوالے کی۔ تسویہ یعنی درست اور برابر کرنے کا مفہوم اس سے پہلی سورتوں میں آچکا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، الہام کے معنے دل میں ڈالنا۔ فجور کے معنے کھلا گناہ اور تقویٰ کا مفہوم معروف و مشہور ہے۔ یہ جملہ بھی ساتویں قسم وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا کے ساتھ مربوط ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا، پھر اسکے دل میں فجور اور تقویٰ دونوں کا الہام کر دیا، مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور طاعت دونوں کے مادے اور استعداد رکھدی ہے پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار اور قدرت دیدی کہ وہ اپنے قصد و اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کرلے یا طاعت کی، جب وہ اپنے قصد و اختیار سے ان میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی قصد واختیار پر اسکو ثواب یا عذاب ملتا ہے، اس تفسیر سے وہ شبہ ختم ہوگیا کہ گناہ اور طاعت جب خود انسان کی تخلیق میں رکھدی گئی تو وہ اسکے کرنے پر مجبور ہوا، ایسی صورت میں وہ نہ کسی ثواب کا مستحق ہے نہ عذاب کا، اور یہ تفسیر ایک حدیث مرفوع سے مستفاد ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین کی روایت سے آئی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اس آیت سے مسئلہ تقدیر کے شبہ کا جواب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ الہام فجور و تقویٰ سے مراد یہ لیا جائے کہ دونوں کے مادے اور استعداد یں حق تعالیٰ نے نفس انسانی کے اندر رکھدیئے ہیں مگر اس کو ان میں سے کسی ایک پر مجبور محض نہیں کیا بلکہ اُس کو قدرت و اختیار دیا کہ ان میں سے جس کو جی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت تلاوت فرماتے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِيْ تَقْوٰىهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا وَاَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا یعنی یا اللہ میرے نفس کو تقویٰ کی توفیق عطا فرما، آپ ہی میرے نفس کے ولی اور مربی ہیں۔

ان سات قسموں کے بعد جواب قسم میں فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا، یعنی بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا۔ تزکیہ کے اصلی معنے باطنی پاکی کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کرکے اپنے ظاہر و باطن کو پاک کرلیا۔ اور محروم ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی دلدل میں دھنسا دیا

لفظ دَسّٰی، دَسٌّ سے مشتق ہے جس کے معنے زمین میں دفن کر دینے کے ہیں کما قال تعالیٰ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ اور بعض مفسرین نے یہاں زکّٰی اور دَسّٰی دونوں میں ضمیر فاعل اللہ کی طرف راجع کر کے معنے یہ کئے ہیں کہ بامراد ہوا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے پاک کر دیا، اور نامراد و محروم ہوا وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں میں دھنسا دیا اس آیت نے کُل انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا، ایک بامُراد دوسرا نامراد، آگے اس دوسری قسم کے لوگوں کا ایک واقعہ بطور مثال کے پیش کر کے اُن کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے کہ ان نامرادوں کو آخرت میں تو سخت سزا ملے ہی گی بعض اوقات دنیا میں بھی اُن کو سزا کی ایک قسط دیدی جاتی ہے جیسے قوم ثمود کو پیش آیا، ان کا واقعہ تفصیل کیساتھ سورۂ اعراف میں آچکا ہے یہاں اس کی طرف اجمالی اشارہ فرما کر انکے عذاب کا بیان فرمایا۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا، دمدمہ کا لفظ ایسے سخت عذاب کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی شخص یا قوم پر بار بار آتا رہے یہاں تک کہ ان کو بالکل فنا کر دے۔ اور فَسَوّٰىهَا کا مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب پوری قوم پر محیط ہو گیا جس میں مرد و عورت بچہ بوڑھا سب برابر ہو گئے۔ آخر میں فرمایا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا یعنی حق تعالیٰ کا عذاب اور کسی قوم کو تباہ کر دینے کے معاملے کو دنیا کے معاملات کی طرح نہ سمجھو کہ انہیں بڑے سے بڑا بادشاہ صاحب قوت و شوکت بھی جب کسی قوم کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے جس میں پوری قوم کی ہلاکت ہے تو اسکو خود بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کے بقایا یا انکے حامی لوگ ہم سے انتقام لیں اور بغاوت کرنے لگیں غرض دنیا میں دوسروں کو مارنے والا خود بھی کبھی بے خطر نہیں رہتا، جو دوسروں پر حملہ کرتا ہے اسکو اپنے پر حملہ کا خطرہ بھی لازماً برداشت کرنا پڑتا ہے بجز حق تعالیٰ جل شانہٗ کے کہ اس کو کسی وقت کسی سے کوئی خطرہ نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمت سورۃ الشمس بحمد اللہ ۲۴ شعبان ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ اللَّيْلِ

سُورَةُ اللَّيْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ إِحْدَىٰ وَعِشْرُونَ آيَةً

سورہ لیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٣﴾

قسم رات کی جب چھا جاوے اور دن کی جب روشن ہو اور اس کی جو اس نے پیدا کیے نر اور مادہ

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴿٤﴾ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾

تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا اور سچ جانا بھلی بات کو

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ

تو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے آسانی میں اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا اور جھوٹ جانا

بِالْحُسْنَىٰ ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ﴿١٠﴾ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ﴿١١﴾

بھلی بات کو سو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں اور کام نہ آئے گا اس کو مال اس کا جب گڑھے میں گرے گا

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا

ہمارا ذمہ ہے راہ سجھا دینا اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دنیا سو میں نے سنا دی تم کو خبر ایک

تَلَظَّىٰ ﴿١٤﴾ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا

بھڑکتی ہوئی آگ کی اس میں وہی پڑے گا جو بڑا بدبخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بچا دیں گے اس سے بڑے

الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ

ڈرنے والے کو جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا

تُجْزَىٰ ﴿١٩﴾ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿٢١﴾

بدلہ دے مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے اور آگے وہ راضی ہوگا

ع ۲۱ ۱۷

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے رات کی جبکہ وہ (آفتاب کو اور دن کو) چھپا لے، اور قسم ہے دن کی جبکہ وہ روشن ہو جاوے اور قسم ہے اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا (مراد اللہ تعالیٰ ہے آگے جواب قسم ہے) کہ بیشک تمہاری کوششیں (یعنی اعمال) مختلف ہیں (اور اسی طرح انکے ثمرات بھی مختلف ہیں) سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام) کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لیے سامان دیدیں گے (راحت کی چیز سے نیک عمل اور بواسطہ نیک عمل کے جنت مراد ہے کہ یُسر کا سبب اور محل ہے اسی لئے یُسریٰ کہہ دیا گیا ورنہ یُسریٰ کے معنی ہیں آسان چیز) اور جس نے (حقوق واجبہ سے) بخل کیا اور (بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (یعنی ملتِ اسلام) کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دیدیں گے (تکلیف کی چیز سے بدعمل اور بواسطہ بدعمل کے دوزخ مراد ہے کہ عُسر کا سبب اور محل ہے اسلئے اُس عمل کو عُسریٰ کہہ دیا گیا اور سامان دینے سے مراد دونوں جگہ یہ ہے کہ اچھے یا بُرے کام اُس کے لئے آسان ہو جائیں گے اور بے تکلف سرزد ہونے لگیں گے اور ویسے ہی اسباب جمع ہو جاویں گے پھر نیک اعمال کا سامان جنت ہونا اور اعمال بد کا سامانِ دوزخ ہونا ظاہر ہی ہے۔ حدیث میں ہے اما من کان من اھل السعادۃ فییسّر لعمل اھل السّعادۃ ذکرہ فی الشفق وتی) اور آگے صاحب عُسریٰ کا حال مذکور ہے کہ) اس کا مال اسکے کچھ کام نہ آویگا جب وہ برباد ہونے لگے گا (بربادی سے مراد جہنم میں جانا ہے) واقعی ہمارے ذمہ (اپنے وعدہ کے مطابق) راہ کا بتلا دینا ہے، سو وہ ہم نے پوری طور سے بتلا دیا ہے پھر کسی نے ایمان و طاعت کی راہ اختیار کرلی جسکا ذکر من اعطی الخ میں ہوا ہے، اور کسی نے کفر و معصیت کی راہ کو اختیار کرلیا جسکا ذکر من بخل میں ہوا ہے) اور (جیسی راہ کوئی شخص اختیار کریگا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے کیونکہ) ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا (یعنی دونوں میں ہماری ہی حکومت ہے اس لئے دُنیا میں ہم نے احکام مقرر کئے اور آخرت میں مخالفت اور موافقت پر سزا و جزا دیں گے جسکا بیان دونوں جگہ فَسَنُيَسِّرُهٗ میں ہوا ہے۔ آگے اسکی تفصیح اور توضیح کے ارشاد ہے کہ میں نے جو تم کو اعمال مختلفہ کی مختلف جزائیں بتلا دی ہیں) تو میں تمکو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں (جس پر جملہ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى دلالت کرتا ہے تاکہ ایمان و طاعت جن کا ذکر اعطی الخ میں ہے اختیار کرکے اس آگ سے بچو، اور کفر و معصیت جن کا ذکر بخل الخ میں ہے اختیار کرکے دوزخ میں نہ جاؤ، کیونکہ اسمیں جانے اور نہ جانے کے یہی اسباب ہیں چنانچہ آگے اس کی تصریح ہے کہ) اس میں (ہمیشہ کے لئے) وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے (دین حق کو) جھٹلایا اور (اس سے) روگردانی کی اور اس سے ایسا شخص دُور رکھا جاویگا جو بڑا پرہیزگار ہے، جو اپنا مال محض اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہو جاوے۔ (یعنی محض رضائے حق اسکا مطلوب ہے) اور بجز اپنے عالیشان پروردگار کی رضا جوئی کے (کہ یہی اس کا

مقصود ہے) اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ (اس دینے سے) اسکا بدلہ اُتارنا (مقصود) ہو (آئیں نہایت ہی مبالغہ ہے اخلاص میں کیونکہ کسی کے احسان کا بدلہ اُتارنا بھی فی نفسہٖ مستحب اور فعل موجب ثواب ہے مگر فضیلت میں احسان ابتدائی کی برابر نہیں، پس جب اس شخص کا انفاق فی سبیل اللہ اس سے بھی مبرا ہے تو ریا وغیرہ معاصی کی آمیزش سے بدرجۂ اولیٰ بری ہوگا اور یہ کمال اخلاص ہے) اور (ایسے شخص کے لئے اوپر صرف جہنم سے بچنا مذکور تھا آگے حصول نعمائے آخرت کو فرماتے ہیں کہ یہ شخص عنقریب خوش ہو جاویگا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی جن سے اس کو دائمی خوشی نصیب ہوگی)

معارف و مسائل

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى، یہ ایسا ہی مضمون ہے جیسے سورۂ انشقاق میں مذکور ہوا اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کسی نہ کسی کام کے لئے سعی و عمل اور جدوجہد کرتا ضرور ہے مگر بعض لوگ اپنی جدوجہد اور محنت سے دائمی راحت کا سامان کر لیتے ہیں اور بعض دوسرے اپنی اسی محنت سے دائمی عذاب خرید لیتے ہیں جیسے حدیث میں ہے کہ ہر انسان جب صبح کو اٹھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو تجارت پر لگا دیتا ہے کوئی تو اس تجارت میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے آپ کو عذاب آخرت سے آزاد کرا لیتا اور کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکی محنت اور سعی و عمل ہی اُس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی سعی و عمل کے انجام کو سوچے جس عمل کے انجام میں وقتی آرام و لذت ہو مگر دائمی عذاب کا سبب بنے اُس کے پاس نہ جائے۔

سعی و عمل کے اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ آگے قرآن حکیم نے سعی و عمل کے اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ بتلائے اور دونوں کے تین تین اوصاف ذکر کئے۔ پہلا گروہ کامیاب لوگوں کا ہے اُن کے تین عمل یہ ہیں فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى، یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور اللہ سے ڈر کر زندگی کے ہر شعبہ میں اُس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچتا رہا اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی۔ اچھی بات سے مراد کلمہ ایمان لا الٰہ الا اللہ ہے۔ (کما قالہ ابن عباس والضحاک وسلمی) اس کلمہ کی تصدیق سے مراد ایمان لے آنا ہے اور اگرچہ ایمان سب اعمال کی روح اور سب سے مقدم ہے اسکو یہاں مؤخر کرنے کی شاید یہ وجہ ہو کہ اس جگہ ذکر سعی و عمل اور جدوجہد کا ہے اور وہ اعمال ہی ہیں۔ ایمان تو اصالۃً قلبی چیز ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی تصدیق کرے پھر زبان سے بھی اسکا اقرار کلمہ شہادت کے ذریعہ کرلے، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی جسمانی محنت نہیں نہ کوئی اسکو اعمال کی فہرست میں شمار کرتا ہے دوسرے گروہ کے بھی تین عمل کا ذکر فرمایا وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى، یعنی جس نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے بخل کیا کہ زکوٰۃ فرض اور صدقات واجبہ بھی ادا کرنے سے گریز کیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اسکی طرف جھکنے اور اطاعت اختیار کرنے کے بجائے اُس سے بے نیازی اور بے رخی اختیار کی اور اچھی بات یعنی کلمہ ایمان

کی تکذیب کی، ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی، یُسْرٰی کے لفظی معنے
آسان اور آرام دہ چیز جس میں مشقت نہ ہو، مراد اس سے جنت ہے۔ اسی طرح اسکے بالمقابل دوسرے گروہ کے
متعلق فرمایا فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی، عُسْرٰی کے لفظی معنے مشکل و تکلیف دہ چیز کے ہیں، مراد اس سے جہنم ہے
اور معنے دونوں جملوں کے یہ ہیں کہ جو لوگ اپنی سعی و محنت پہلے تین کاموں میں لگاتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں خرچ
اور اللہ سے ڈرنا اور ایمان کی تصدیق، ان لوگوں کو ہم یُسْرٰی یعنی اعمال جنت کے لئے آسان کر دیتے ہیں اور جو لوگ
سعی و عمل دوسرے تین کاموں میں لگاتے ہیں اُن کو ہم عُسْرٰی یعنی اعمال جہنم کے لئے آسان کر دیتے ہیں، یہاں بظاہر
مقتضائے مقام یہ کہنے کا تھا کہ اُن کے لئے اعمال جنت یا اعمال دوزخ آسان کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ آسان یا مشکل ہونا
صفت اعمال ہی کی ہو سکتی ہے خود ذوات و اشخاص آسان یا مشکل نہیں، مگر قرآن کریم نے اس کی تعبیر اس طرح فرمائی کہ خود
ان لوگوں کی ذات اور وجود ان اعمال کے لئے آسان کر دیئے جاتے ہیں کہ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کی
طبیعتوں اور مزاجوں کو ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ پھر وہ گویا اعمال جنت ہی کی طبیعت بن جاتے ہیں اُن کے خلاف کرنے میں وہ
تکلیف محسوس کرنے لگیں گے، اسی طرح دوسرے گروہ کا مزاج ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ اس کو اعمال جہنم ہی پسند آئیں گے،
انھیں میں راحت ملے گی اعمال جنت سے نفرت ہوگی۔ ان دونوں گروہوں کے مزاجوں میں یہ کیفیت پیدا کر دینے کو اس
سے تعبیر فرمایا کہ یہ خود ان کاموں کے لئے آسان ہو گئے۔ ایک صحیح حدیث میں اس کی تائید اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعملوا فکل میسر لما خلق لہ اما من کان من اھل السعادۃ فییسر لعمل السعادۃ
واما من کان من اھل الشقاوۃ فییسر لعمل اھل الشقاوۃ (رواہ البخاری ومسلم عن علی) یعنی تم جو عمل
کرتے ہو وہ کرتے رہو کیونکہ ہر ایک آدمی کے لئے وہی کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا، اس لئے جو
اہل سعادت نیک بخت خوش نصیب ہیں تو اہل سعادت ہی کے اعمال اُن کی طبعی رغبت بن جاتے ہیں اور جو اہل شقاوت
بدنصیب یعنی اہل جہنم ہیں اُن کے لئے اہل شقاوت ہی کے اعمال کرنا مزاج اور طبیعت بن جاتی ہے مگر یہ دونوں چیزیں
اپنے خداداد اختیار کو استعمال کرنے کے نتیجہ میں ملتی ہیں اسلئے ان پر عذاب و ثواب کا ترتب مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔
اسکے بعد بدنصیب گروہ اہل جہنم کو تنبیہ ہے وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰی، یعنی جس مال کی خاطر یہ کمبخت حقوق
واجبہ میں بھی بخل کیا کرتا تھا یہ مال اس پر عذاب آنے کے وقت کچھ کام نہ دیگا۔ تَرَدّٰی کے لفظی معنے گڑھے میں
گر جانے اور ہلاک ہونے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ موت کے بعد قبر میں اور پھر قیامت میں جب وہ جہنم کے گڑھے میں
گرتا ہوگا تو یہ مال اُس کو کچھ نفع نہیں دیگا۔

لَا یَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی، یہ نار جہنم کے حال کا بیان ہے کہ اسمیں داخل نہیں ہوگا
مگر وہی شخص جو بدنصیب ہے جس نے اللہ و رسول کی تکذیب کی اور اُن کی طاعت سے روگردانی کی اور یہ
ظاہر ہے کہ اللہ و رسول کی تکذیب کرنیوالا صرف کافر ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مومن گناہگار
جو تکذیب کا مجرم نہیں جہنم میں نہیں جائے گا، حالانکہ قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص اس سے معارض ہوتی ہیں،

کہ مؤمن بھی جو گناہ کرتا ہے اگر اُس نے توبہ کرلی یا کسی کی شفاعت سے یا خالص رحمت سے اسکو معاف نہ کردیا گیا تو وہ بھی جہنم میں جائیگا اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے تک جہنم میں رہے گا، البتہ سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور پھر ببرکت ایمان جنت میں داخل ہوجائیگا، بظاہر اس آیت کے الفاظ اس کے خلاف ہیں اس لئے ضروری ہے کہ مراد اس آیت کی وہ ہو جو دوسری آیات قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہو، اسکی بہت آسان توجیہ تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لی گئی ہے۔ یہاں دخول جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کے لئے ہو، اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے مؤمن کوئی بھی کسی وقت بالآخر اپنے گناہ کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائیگا۔ علماء مفسرین نے اسکے سوا دوسری کچھ توجیہات بھی بیان فرمائی ہیں وہ بھی اپنی جگہ درست ہوسکتی ہیں۔ اور تفسیر مظہری میں اس کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ اس آیت میں اشقی اور اتقی سے مراد عام نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں موجود تھے، اُن موجودین میں سے کوئی مسلمان باوجود گناہ سرزد ہونے کے بھی ببرکت صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہنم میں نہیں جائے گا۔

صحابہ کرام سب کے سب جہنم سے محفوظ ہیں | وجہ یہ ہے کہ اول تو ان حضرات میں کسی سے کبھی گناہ کا صدور ہوتا ہی شاذونادر ہوا ہے اور بوجہ خوف آخرت کے اُن کے حالات سے یہ لازم معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی گناہ ہوا بھی ہے تو اُس نے توبہ کرلی ہوگی۔ پھر اسکے ایک گناہ کے مقابلے میں اُس کے اعمال حسنہ اتنے زیادہ ہیں کہ اُنکی وجہ سے بھی یہ گناہ معاف ہوسکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ، یعنی نیک اعمال بُرے اعمال کا کفارہ بنجاتے ہیں، اور خود صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسا عمل ہے جو تمام اعمال حسنہ پر غالب ہے۔ حدیث میں صلحاء اُمت کے بارے میں آیا ہے ھم قوم لا یشقی جلیسھم و لا یخیب انیسھم (صحیحین) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کیساتھ بیٹھنے والا شقی و نامراد نہیں ہوسکتا اور جو اُن سے مانوس ہو وہ محروم نہیں رہ سکتا۔ تو جو شخص سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیس اور انیس ہو وہ کیسے شقی ہوسکتا ہے۔ اسی لئے احادیث صحیحہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ صحابہ کرام سب کے سب عذاب جہنم سے بری ہیں، خود قرآن کریم میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ موجود ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى، یعنی انمیں سے ہر ایک کے لئے اللہ نے حسنیٰ یعنی جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسری آیت میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ مقدر ہوچکی ہے وہ نار جہنم سے دُور رہیں گے۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جہنم کی آگ اُس شخص کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا ہے (ترمذی عن جابرؓ)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى، یہ اہل شقاوت کے مقابل اہل سعادت تقویٰ شعار حضرات کی جزاء کا بیان ہے کہ جو آدمی اتقی یعنی مکمل اطاعت حق کا خوگر ہو اور وہ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف اسلئے خرچ کرتا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہوجائے ایسا شخص اس جہنم کی آگ سے دُور رکھا جائے گا۔ الفاظ آیت کے تو عام ہیں جو شخص بھی ایمان کیساتھ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اُس کے لئے یہ

بشارت ہے لیکن شان نزول کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مراد اس لفظ اتقیٰ سے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں ابن ابی حاتم نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے کہ سات مسلمان ایسے تھے جن کو کفار مکہ نے اپنا غلام بنایا ہوا تھا جب وہ مسلمان ہوگئے تو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا مال خرچ کرکے اُن کو کفار سے خرید کر آزاد کر دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (مظہری)

اسی کے مناسب آیت کا اگلا جملہ ہے وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ، یعنی ان غلاموں پر حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ احسان عظیم فرمایا کہ زر کثیر خرچ کرکے خرید اور آزاد کر دیا، ان کا کوئی سابقہ احسان بھی انکے ذمہ نہیں تھا جس کے بدلے میں یہ اقدام کرتے بلکہ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ، یعنی انکا مقصد اللہ تعالیٰ عالیشان کی رضاجوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔

مستدرک حاکم میں حضرت زبیرؓ سے منقول ہے کہ صدیق اکبرؓ کی یہ عادت بھی تھی کہ جس مسلمان کو کفار کے ہاتھ میں قیدی دیکھتے اُس کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے اور یہ لوگ عموماً ضعفاء ہوتے تھے، صدیق اکبرؓ کے والد حضرت ابو قحافہؓ نے ان سے فرمایا کہ جب تم غلاموں کو آزاد ہی کرتے ہو تو اتنا کام کرو کہ ایسے غلاموں کو آزاد کیا کرو جو قوی و بہادر ہیں تاکہ وہ کل تمہارے دشمنوں کا مقابلہ اور تمہاری حفاظت کر سکیں حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصد ان آزاد کردہ حضرات سے کوئی فائدہ اُٹھانا نہیں بلکہ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ان کو آزاد کرتا ہوں (مظہری)

وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ، یعنی جس شخص نے اپنا مال خرچ کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کو دیکھا اپنا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں دیکھا تو اللہ تعالیٰ بھی آخرت میں اسکو راضی ہی کر دیں گے کہ جنت کی نعمتِ عجیبہ دائمہ نصیب فرما دیں گے۔ شان نزول کے واقعہ سے ان آیات کا صدیق اکبر کی شان میں نازل ہونا ثابت ہے اس لئے یہ آخری کلمہ حضرت صدیق اکبرؓ کے لئے ایک عظیم خوشخبری اور اعزاز ہے کہ ان کو دُنیا ہی میں اللہ کی طرف سے راضی کر دیئے جانے کی خوشخبری سُنا دی۔

تمت سورۃ اللیل بحمد اللہ ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الضُّحٰی

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ ضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰى ⓵ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ⓶ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ⓷ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جاوے نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا اور البتہ پچھلی بہتر ہے

لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ⓸ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ⓹ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا

تجھ کو پہلی سے اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم

فَاٰوٰى ⓺ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ⓻ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ⓼ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ

پھر جگہ دی اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی اور پایا تجھ کو مفلس پھر بے پروا کر دیا سو جو یتیم ہو

فَلَا تَقْهَرْ ⓽ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ⓾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ⓫

اس کو مت دبا اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے (قرار پکڑنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک حقیقی یعنی اس کی ظلمت کا کامل ہو جانا کیونکہ رات میں اندھیری رفتہ رفتہ بڑھتی ہے، کچھ رات گزرنے پر مکمل ہو جاتی ہے، دوسرے مجازی یعنی جانداروں کا اس میں سو جانا اور چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آوازوں کا ساکن ہو جانا۔ آگے جواب قسم ہے) کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے بیزار ہوا (کیونکہ اول تو آپ سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ و معصوم بنایا ہے۔ پس آپ کفار کے خرافات و لغویات سے جو نزول نہ ہونے چند روز وحی کی تاخیر کے سبب یہ کہنے لگے کہ آپ کو آپ کے خدا نے چھوڑ دیا ہے، آپ پر نعمت وحی سے

ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ہو سکتا ہے کہ دونوں باتیں پیش آئی ہوں، راوی نے کبھی ایک کو بیان کیا کبھی دوسرے کو، اور یہ عورت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا اُمّ جمیل ابولہب کی بیوی تھی جیسا کہ دوسری روایت میں ہے اور تاخیرِ وحی کے واقعات متعدد مرتبہ پیش آئے ہیں ایک شروع نزولِ قرآن میں پیش آیا جسکو زمانہ فترتِ وحی کہا جاتا ہے یہ سب سے زیادہ طویل تھا۔ ایک واقعہ تاخیرِ وحی کا اُس وقت پیش آیا جبکہ مشرکین یا یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال فرمایا اور آپ نے بعد میں جواب دینے کا وعدہ فرما لیا، مگر ان شاء اللہ نہ کہنے کے سبب کچھ روز تک سلسلہ وحی کا بند رہا، اس پر مشرکین نے یہ طعنے دینا شروع کئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خدا اُن سے ناراض ہوگیا اور اُن کو چھوڑ دیا، اسی طرح کا یہ واقعہ ہے جو سورۂ ضحیٰ کے نزول کا سبب ہوا، ضروری نہیں کہ یہ سب واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے ہوں بلکہ آگے پیچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی، یہاں آخرت کو اپنے معروف معنی میں اور اسکے بالمقابل اُولیٰ کو دُنیا کے معنے میں لیا جائے تو تفسیر وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں دی گئی ہے کہ یہ کفار و مشرکین جو طعنے آپ کو دے رہے ہیں یہ دُنیا میں تو دیکھ ہی لیں گے کہ وہ سراسر لغو اور غلط تھے اور اس سے آگے آخرت کے انعامات کا بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو دنیا سے بہت زیادہ انعامات سے نوازا جائیگا اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ آخرت کو اسکے لفظی معنے میں لیا جاوے یعنی پچھلی حالت جیسا کہ لفظ اُولیٰ کے لفظی معنے پہلی حالت کے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات برابر زیادہ ہی ہوتے چلے جائیں گے کہ ہر پہلی حالت سے پچھلی حالت بہتر اور افضل ہوتی چلی جائے گی، اسمیں علوم و معارف اور قربِ الٰہی کے درجات میں ترقی بھی داخل ہے اور دُنیا کے معاشی مسائل اور سلطنت و حکومت بھی۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی، یعنی آپ کا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہو جائیں، اس میں حق تعالیٰ نے یہ متعین کرکے نہیں بتلایا کہ کیا دیں گے اسمیں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپکی ہر مرغوب چیز آپکو اتنی دیں گے کہ آپ راضی ہو جائیں۔ آپ کی مرغوب چیزوں میں دین اسلام کی ترقی، دین اسلام کا عام دُنیا میں پھیلنا پھر اُمت کی ہر ضرورت اور خود آپ کا دشمنوں پر غالب آنا، انکے ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دین حق کا پھیلانا سب داخل ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذًا لَّآ اَرْضٰی وَ وَاحِدٌ مِّنْ اُمَّتِیْ فِی النَّارِ یعنی جب یہ بات ہے تو میں اُس وقت تک راضی نہ ہونگا جبتک میری اُمت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہیگا (قرطبی) اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرما دیں گے رَضِیْتَ یَا مُحَمَّدُ، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی آپ راضی ہیں، تو میں عرض کرونگا یا رب رَضِیْتُ یعنی اے میرے پروردگار میں راضی ہوں۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رض کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جسمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کا قول ہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ، پھر آپ نے دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھائے اور گریہ وزاری شروع
کی اور بار بار فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ ، حق تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا کہ آپ سے دریافت کریں کہ آپ کیوں
روتے ہیں (اور یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ ہمیں سب معلوم ہے) جبرئیل امین آئے اور سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ میں اپنی امت
کی مغفرت چاہتا ہوں۔ حق تعالیٰ نے جبرئیل امین سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتے ہیں کہ ہم
آپ کو آپ کی امت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہ کریں گے۔

اوپر طعنۂ کفار کے جواب میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر انعامات الٰہیہ دنیا و آخرت میں فائض ہونے کا اجمالی
ذکر آیا ہے اس میں اس کی تھوڑی سی تفصیل تین خاص نعمتوں کے ذکر سے فرمائی گئی ہے، اوّل اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى
یعنی ہم نے آپ کو یتیم پایا کہ والد کا انتقال ولادت سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور انہوں نے کوئی مال و جائداد بھی نہیں چھوڑی
تھی جس سے آپ کی پرورش ہو سکے، تو ہم نے آپ کا ٹھکانا بنا دیا، یعنی آپ کے دادا عبدالمطلب اور ان کے بعد چچا ابوطالب
کے دلوں میں آپ کی ایسی محبت ڈال دی کہ سگی اولاد سے زیادہ آپ کی تربیت میں کوشش کرتے تھے۔

دوسری نعمت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ، لفظ ضال کے معنے گمراہ کے بھی آتے ہیں اور ناواقف بے خبر
کے بھی، یہاں دوسرے ہی معنے مراد ہو سکتے ہیں کہ نبوت سے پہلے آپ شریعت الٰہیہ کے احکام اور علوم سے بے خبر
تھے، آپ کو منصب نبوت پر فائز کر کے آپ کی رہنمائی فرمائی۔

تیسری نعمت وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ، عائل، عیلہ سے مشتق ہے جس کے معنے فقر و محتاج ہونے
کے ہیں، معنی آیت کے یہ ہوئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نادار اور بے زر پایا تو آپ کو غنی و مالدار کر دیا، جس کی
ابتدا حضرت خدیجہ کبریٰ کے مال میں بطور شرکت مضاربت کے تجارت کرنے سے ہوئی پھر وہ خود آپ کے
عقد نکاح میں آکر ام المؤمنین ہوئیں تو ان کا سارا مال ہی آپ کی خدمت کے لئے ہو گیا۔

ان تینوں نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد آپ کو تین چیزوں کا حکم دیا گیا، اوّل فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ، قہر
کے معنے غلبہ اور جبری تسلط کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ کسی یتیم و ضعیف اور بے وارث بچے کے اموال و حقوق پر ایسا
مسلط نہ ہوں کہ اس کا حق ضائع ہو جائے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے ساتھ شفقت کے معاملے کی تاکید
فرمائی اور اس کے ساتھ دل شکنی کا برتاؤ کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہتر گھر وہ ہے جس میں
کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ احسان و محبت کا سلوک کیا جاتا ہو، اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ
برا سلوک کیا جاتا ہو (رواہ البخاری فی الادب المفرد، وابن ماجہ والبغوی، مظہری)

دوسرا حکم وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ، نہر، نہر سے مشتق ہے جس کے معنے زجر اور جھڑکنے کے ہیں اور سائل کے
معنے سوال کرنے والا، اس میں وہ بھی داخل ہے جو کسی مال کا سوال کرے اور وہ بھی جو علمی تحقیق کا سوال کرے،
دونوں کو جھڑکنے ڈانٹنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا گیا، بہتر یہ ہے کہ سائل کو کچھ دیکر رخصت کرے
اور نہیں دے سکتا تو نرمی سے عذر کر دے اسی طرح کسی علمی مسئلہ کا سوال کرنے والے کے جواب میں بھی سختی اور بدخوئی

ممنوع ہے نرمی اور شفقت سے جواب دینا چاہئے بجز اسکے کہ سائل کسی طرح ماننے پر نہیں تو بقدر ضرورت زجر بھی جائز ہے۔

تیسرا حکم وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، حدّث، تحدیث سے مشتق ہے جس کے معنے بات کرنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا لوگوں کے سامنے ذکر کیا کریں کہ یہ بھی ایک طریقہ شکرگزاری کا ہے یہاں تک کہ آدمی جو کسی آدمی پر احسان کرے اسکا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے جو شخص لوگوں کے احسان پر اُنکا شکر نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر نہیں کریگا (رواہ احمد و رواتہ ثقات، مظہری)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم پر کوئی احسان کرے تو چاہیئے کہ آپ بھی اسکے احسان کا بدلہ دو، اور اگر مالی بدلہ دینے کی استطاعت نہیں تو یہی کرو کہ لوگوں کے سامنے اُس کی تعریف کرو کیونکہ جس نے لوگوں کے مجمع میں اس کی ثنا و تعریف کی تو اُسنے شکرگزاری کا حق ادا کر دیا (رواہ البغوی عن جابر بن عبداللہ رض، مظہری)

مسئلہ - ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے مالی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس مال میں سے کچھ اللہ کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ خرچ کرے اور نعمت بدن کا شکر یہ ہے کہ جسمانی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا کرنے میں صرف کرے اور علم و معرفت کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ دوسروں کو اُس کی تعلیم دے (مظہری)

مسئلہ - سورہ والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کیساتھ تکبیر کہنا سنت ہے اور اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ بتلائے ہیں (مظہری)

ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر اور بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے (مظہری) دونوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے سنت ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

فائدہ سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن کریم تک بیشتر سورتوں میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اسکے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابل شک و شبہ ہونے سے کیا گیا اور ختم قرآن اُس ذات کی عظمت و شان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔

تمّت سورۃ الضحیٰ ۲۸ شعبان سنہ ۱۳۹۱ھ

سُوْرَةُ الانشراح

سُوْرَةُ الانشراحِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۂ انشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ | اور اتار رکھا ہم نے تجھ سے بوجھ تیرا | جس نے جھکا دی تھی پیٹھ تیری

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ فَاِذَا

اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا | سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے | البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے | پھر جب

فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

تو فارغ ہو تو محنت کر | اور اپنے رب کی طرف دل لگا

ع

خلاصۂ تفسیر

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم و حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا (یعنی علم بھی وسیع عطا فرمایا اور تبلیغ میں جو مخالفین کی مزاحمت سے ایذا پیش آتی ہے اس میں تحمل و حلم بھی دیا، کذا قال الحسن کما فی الدر المنثور) اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی (وزر سے مراد وہ مباح اور جائز امور ہیں جو کبھی کبھی کسی حکمت و مصلحت کے پیش نظر آپ سے صادر ہوجاتے تھے اور بعد میں ان کا خلاف حکمت و خلاف اولیٰ ہونا ثابت ہوتا تھا اور آپ بوجہ علو شان و غایت قرب کے اس سے ایسے مغموم ہوتے تھے جس طرح گناہ سے کوئی مغموم ہوتا ہے، اسمیں بشارت ہے ایسے امور پر مؤاخذہ نہ ہونے کی کذا فی الدر المنثور عن مجاہد و شریح بن عبید الحضرمی بن اس بنا پر یہ بشارت آپ کو دو بار ہوئی، اول مکہ میں اس سورت کے ذریعہ، دوسری مدینہ میں سورۂ فتح میں اس کی تاکید و تکمیل اور تجدید و تفصیل کے لئے) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا (یعنی اکثر جگہ شریعت میں

اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام مبارک مقرون کیا گیا، کذا فی الدر المنثور مرفوعاً قال اللہ تعالیٰ اذا ذُکرتُ ذُکرتَ معی، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں میرا ذکر ہوگا آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ہوگا (رواہ ابن جریر وابن ابی حاتم) جیسے خطبہ میں تشہد میں نماز میں اذان میں اقامت میں، اور اللہ کے نام کی رفعت اور شہرت ظاہر ہے پس جو اس کے قرین ہوگا رفعت و شہرت میں وہ بھی ممتاز رہے گا اور چونکہ کبھی آپ اور مومنین طرح طرح کی تکالیف و شدائد میں گرفتار تھے اسلئے آگے انکے ازالہ کا الاتقیہ نبی علی سبق کے وعدہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے آپ کو روحانی راحت دی اور روحانی کلفت رفع کر دی جیسا الم نشرح الخ سے معلوم ہوا) سو اس سے دنیوی راحت و کلفت میں بھی ہمارے فضل وکرم کا امیدوار رہنا چاہئے چنانچہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ (یعنی عنقریب ہی جو کہ ساتھ ہونے کے معنی میں ہے) آسانی (ہونے والی) ہے (اور چونکہ ان مشکلات کے انواع و اعداد بھی کثیر تھے اس لئے اس وعدہ کو مکرر تاکید کے لئے فرماتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونے والی) ہے (چنانچہ وہ مشکلات ایک ایک کر کے سب رفع ہوگئیں جیسا روایات احادیث و سیر و تواریخ اس پر متفق ہیں۔ آگے ان نعمتوں پر شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو ایسی ایسی نعمتیں دی ہیں) تو آپ جب (تبلیغ احکام سے جو دوسروں کی نفع رسانی کی وجہ سے عبادت ہے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذات خاص میں) محنت کیا کیجئے (مراد کثرت عبادت و ریاضت ہے کہ آپ کی شان کے یہی مناسب ہے) اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھئے (یعنی اسی سے مانگئے اور اس میں بھی ایک حیثیت سے بشارت ہے زوال شدائد کی کہ خود درخواست کرنے کا حکم گویا درخواست پورا کرنے کا وعدہ ہے۔

معارف و مسائل

جیسا کہ سورۂ ضحیٰ کے آخر میں بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ ضحیٰ سے آخر قرآن تک بائیس سورتوں میں بیشتر ذکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر انعامات خاصہ اور آپ کی عظمتِ شان سے متعلق مضامین ہیں، صرف چند سورتیں احوال قیامت یا بعض دوسرے مضامین سے متعلق آئی ہیں۔ سورۂ الم نشرح میں بھی اُن خاص خاص نعمتوں کا ذکر ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ نے مبذول فرمائیں اور اسکے بیان میں اسی عنوان استفہام کو اختیار فرمایا ہے جو سورۂ ضحیٰ میں اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا میں اختیار فرمایا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۔ شرح کے لفظی معنے کھولنے کے ہیں اور سینہ کو کھول دینا اسکو علوم و معارف اور اخلاقِ حسنہ کے لئے وسیع کر دینے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو حق تعالیٰ نے علوم و معارف اور اخلاقِ کریمہ کے لئے ایسا وسیع بنا دیا تھا کہ آپکے علم و حکمت کو بڑے بڑے حکماء بھی نہ پا سکے اور اسی شرح صدر کا نتیجہ تھا کہ آپ کو مخلوق کیطرف توجہ کرنا حق تعالےٰ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہوتا تھا اور بعض احادیث صحیحہ

وہی ہوتا ہے جو پہلے کلمہ کا تھا اور اگر بغیر الف لام تعریف کے مکرر لایا جائے تو دونوں کے مصداق الگ الگ ہوتے ہیں اس آیت میں العسر جب مکرر آیا تو معلوم ہوا کہ اس سے وہ پہلا ہی عُسر مراد ہے کوئی نیا نہیں۔ اور لفظ یُسرًا دونوں جگہ بغیر الف لام کے لایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسرا یُسر پہلے یُسر کے علاوہ ہے تو اس آیت میں اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے تکرار سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہی عُسر و مشکل کے لئے دو آسانیوں کا وعدہ ہے، اور دو سے مراد بھی خاص دو کا عدد نہیں بلکہ متعدد ہونا مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک عُسر یعنی تنگی اور مشکل جو آپ کو پیش آئی یا آئے گی اس کیساتھ **بہت سی آسانیاں آپ کو دی جائیں گی۔**

حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو اس آیت سے بشارت سنائی اور فرمایا لَنْ یَّغْلِبَ عُسْرٌ یُّسْرَیْنِ یعنی ایک عُسر دو یُسروں پر (ایک مشکل دو آسانیوں پر) غالب نہیں آسکتی۔ چنانچہ تاریخ و سیرت کی سب کتابیں جو اپنوں اور غیروں مسلم و غیر مسلم نے لکھی ہیں وہ اس پر شاہد ہیں کہ جو کام مشکل نظر آتے تھے بلکہ لوگوں کی نظر میں ناممکن نظر آتے تھے آپ کے لئے وہ سب آسان ہوتے چلے گئے۔ روایت مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں العسر کا الف لام عہد کے لئے ہے اور مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عُسر ہے، یعنی یہ وعدہ کہ ہر مشکل کے ساتھ بہت سی آسانیاں دی جائیں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لئے ہے جس کو حق تعالیٰ نے پورا فرمایا کہ دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب اگر دنیا میں کسی شخص کو عسر کے بعد یُسر نصیب ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اُسی سے لو لگائے اور اُسی کے فضل کا اُمیدوار رہے اور کامیابی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اُس کے حق میں آسانی کر دیگا (فوائد عثمانیہ) بعض روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

تعلیم و تبلیغ کرنے والوں کو خلوت میں ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ بھی ضروری ہے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ، یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لئے تیار ہو جائیے وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ اور دعا و استغفار میں لگ جائیں۔ اکثر حضرات مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ بعض حضرات نے دوسری تفسیریں بھی لکھی ہیں مگر قریب وہی ہے جو اوپر لکھی گئی، اس کا حاصل یہ ہے کہ اعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور خلق خدا کو راستہ دکھانا اُن کی اصلاح کی فکر یہ آپ کی سب سے بڑی عبادت تھی مگر یہ عبادت بواسطہ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اس کی تدبیر کریں۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں بلکہ جب اس سے فرصت ملے تو بلاواسطہ خلوت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اُسی سے ہر کام میں کامیابی کی دعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ذکر اللہ اور عبادت بلاواسطہ ہی ہے اور شاید اسی لئے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لئے ہے اُس سے فراغت ہو سکتی ہے اور دوسرا کام

یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مومن کو کبھی نہیں ہوتی بلکہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اسی میں صرف کرنا ہے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے ہیں ان کو اس سے غفلت نہ ہونا چاہئے کہ ان کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہئے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں اس کے بغیر تعلیم و تبلیغ بھی موثر نہیں ہوتی اس میں نور و برکت نہیں ہوتی۔

فائدہ: لفظ فانصب، نصب سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تعب اور محنت کے ہیں اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذکر اللہ اس حد تک جاری رہنا چاہئے کہ کچھ مشقت اور تعب محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت و خوشی ہی پر اس کا مدار نہ رہے اور اد و وظائف اور معمولات کی پابندی خود ایک مشقت اور تعب ہے خواہ کام تھوڑا ہی ہو۔

تمت سورۃ الانشراح والحمد للہ

سُوْرَةُ التِّيْنِ

سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورہ تین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣ لَقَدْ

قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی ہم نے

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥

بنایا آدمی خوب سے انداز ے پر پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦ فَمَا

مگر جو یقین لائے اور عمل کئے اچھے سو ان کے لئے ثواب ہے بے انتہا پھر تو

يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝٧ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝٨

تجھ کو کیوں جھٹلائے اس کے پیچھے بدلہ ملنے کو کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے انجیر (کے درخت) کی اور زیتون (کے درخت) کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر (یعنی مکہ معظمہ) کی کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے پھر (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں (یعنی وہ خوبصورتی بدصورتی سے اور قوت ضعف سے بدل جاتی ہے اور بُرے سے بُرا ہو جاتا ہے مقصود اس سے بیان کرنا کمال قدرت کا ہے جس سے اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر حق تعالیٰ کی قدرت ہونا واضح ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ الخ اور مقصود اس صورت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت دوبارہ پیدا کرنے اور زندہ کرنے پر ثابت کرنا ہے جیسا فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ کے جملے سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور اس آیت کے عموم سے چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے سب کے سب قبیح اور بُرے ہو جاتے ہیں، اس ابہام کو دور کرنے کے لئے آگے آیت میں ایک استثنا بیان کیا جاتا ہے، لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (جس میں تبدیلی نہیں، یہ مومن صالح بوڑھے ضعیف ہونے کے باوجود انجام کار کے اعتبار سے اچھے ہی رہتے ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی حالت بڑھ جاتی ہے، آگے خلق اور رد دونوں پر تفریع ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تخلیق و تقلیب احوال پر قادر ہیں) تو (اے انسان) کون چیز تجھ کو قیامت کے بارے میں منکر بنا رہی ہے (یعنی وہ کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر تو ان دلائل کے ہوتے ہوئے قیامت کا منکر ہو رہا ہے) کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے (تصرفات دنیویہ میں کہ جن میں سے تخلیق انسانی اور پھر بڑھاپے میں اس میں تغیرات کا ذکر اوپر آیا ہے اور تصرفات اخرویہ میں کہ جن میں سے قیامت و مجازات بھی ہے)

معارف و مسائل

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ، اس آیت میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے جن میں دو درخت ہیں ایک تین یعنی انجیر، دوسرے زیتون اور ایک پہاڑ طور اور ایک شہر یعنی مکہ مکرمہ کی، اس تخصیص کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں درخت کثیر البرکت کثیر المنافع ہیں جس طرح طور پہاڑ اور شہر مکہ کثیر البرکات ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں تین اور زیتون کے ذکر سے مراد وہ جگہ ہو جہاں یہ درخت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ملک شام ہے جو معدن انبیاء علیہم السلام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی ملک میں مقیم تھے انکو ہجرت دے کر مکہ معظمہ لایا گیا تھا اس طرح ان قسموں میں تمام وہ مقامات مقدسہ شامل ہو گئے جہاں خاص خاص انبیاء علیہم السلام پیدا اور مبعوث ہوئے، ملک شام عام انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مسکن ہے۔ کوہ طور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام ہونے کی جگہ ہے اور سینین یا سینا اُس مقام کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے اور

بلد امین مکہ مکرمہ خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن ہے۔

ان چار چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ، تقویم کے لفظی معنے کسی چیز کے قوام اور بنیاد کو درست کرنے کے ہیں۔ احسن تقویم سے مراد یہ ہے کہ اسکی جبلت و فطرت کو بھی دوسری خلوقات کے اعتبار سے احسن بنایا گیا اور اُس کی جسمانی ہیئت اور شکل و صورت کو بھی دُنیا کے سب جانداروں سے **بہتر اور حسین بنایا گیا۔**

انسان تمام خلوقات میں سب سے زیادہ حسین ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ حسین بنایا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں کوئی انسان سے احسن نہیں کیونکہ اُس کو اللہ تعالیٰ نے حیات کیساتھ عالم، قادر، متکلم، سمیع، بصیر، مدبر اور حکیم بنایا ہے اور یہ سب صفات درحقیقت خود حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت میں آیا ہے: إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ مراد اس سے یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا کوئی درجہ اس کو بھی دیا گیا ہے ورنہ حق تعالیٰ شکل و صورت سے منزہ ہیں (قرطبی)

. . . .

. . . .

. . . .

حسن انسانی کا ایک عجیب واقعہ قرطبی نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار کے مخصوص لوگوں میں سے تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت رکھتے تھے ایک روز چاندنی رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے بول اُٹھے انتِ طالق ثلاثًا ان لم تکونی احسن من القمر یعنی تم پر تین طلاق ہیں، اگر تم چاند سے زیادہ حسین نہ ہو، یہ کہتے ہی بیوی اُٹھ کر پردہ میں چلی گئی کہ آپ نے مجھے طلاق دیدی، بات ہنسی دل لگی کی تھی مگر طلاق کا حکم یہی ہے کہ کسی طرح بھی طلاق کا صریح لفظ بیوی کو کہدیا جائے تو طلاق ہو جاتی ہے خواہ ہنسی دل لگی ہی میں کہا جائے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے رات بڑی بے چینی اور رنج و غم میں گزاری صبح کو خلیفہ وقت ابوجعفر منصور کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا قصہ سنایا اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا منصور نے شہر کے فقہاء اہل فتویٰ کو جمع کر کے سوال کیا سب نے ایک ہی جواب دیا کہ طلاق ہوگئی کیونکہ چاند سے زیادہ حسین ہونے کا کسی انسان کے لئے امکان ہی نہیں، مگر ایک عالم جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے تھے خاموش بیٹھے رہے۔ منصور نے پوچھا کہ آپ کیوں خاموش ہیں تب یہ بولے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھکر سورۂ تین تلاوت کی اور فرمایا کہ امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کا احسن تقویم میں ہونا بیان فرما دیا ہے کوئی شے اس سے زیادہ حسین نہیں۔ یہ سُن کر سب علماء فقہاء حیرت میں رہ گئے کوئی مخالفت نہیں کی اور منصور نے حکم دیدیا کہ طلاق نہیں ہوئی۔

سُوْرَةُ الْعَلَق

سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؕ اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ؕ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ؕ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۙ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۙ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩

خلاصۂ تفسیر

اقرأ سے مالم یعلم تک سب سے پہلی وحی ہے جس کے نزول سے نبوت کی ابتدا ہوئی جیسا قصہ حدیث شیخین

کو سکھایا گیا تھا، اور سب سے پہلے انھوں نے لکھنا شروع کیا (کعب احبار) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی ہیں (ضحاک) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم ربانی اللہ ہی سے ہے۔

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے حضرت قتادہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور ان کو جہل کی اندھیری سے **نورِ علم کی طرف نکالا اور علم کتابت** کی ترغیب دی کیونکہ اس میں بیشمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ تمام علوم و حکم کی تدوین اور اولین و آخرین کی تاریخ ان کے حالات و مقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں گی اگر قلم نہ ہو تو دنیا و دین کے **سارے ہی کام مختل ہو جائیں۔**

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر ان کی خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء و طلباء نے اس اہم ضرورت کو بیکار نظر انداز کر دیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریر **کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں فالی اللہ المشتکیٰ۔**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابت کی تعلیم نہ دینے کا راز حق تعالیٰ جل شانہ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو دوسروں کے کمالات سے بالاتر بنانے کے لئے آپ کی جائے پیدائش سے لیکر آپ کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش و محنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ جائے پیدائش کے لئے عرب کا صحرا تجویز ہوا جو متمدن دنیا اور علم و حکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا اور راستے اور سواریاں اتنے دشوار گذار تھے کہ شام و عراق اور مصر وغیرہ کے متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا، اسی لئے عرب سب کے سب ہی اُمیین کہلاتے ہیں، ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپ پیدا ہوئے اور پھر حق تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم و حکمت اور خط و کتابت سیکھ لیتا تھا، آپ کو اُسکے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا۔ ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم و حکمت اور اخلاق فاضلہ عالیہ کا کس کو تصور ہو سکتا ہے۔ اچانک حق تعالیٰ نے خلعت نبوت سے نوازا اور علم و حکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کی زبان مبارک پر جاری فرما دیا، فصاحت و بلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء و بلغا آپ کے سامنے عاجز ہوگئے یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اسکو دیکھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کمالات انسانی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں، خط و کتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی (ماخوذ از قرطبی)

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

سُوْرَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ اٰيٰتٍ

سورۂ قدر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

خلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے (تحقیق شب قدر میں نازل ہونے کی سورۂ دخان میں گزر چکی) اور (زیادت تشویق کے لئے فرماتے ہیں کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے (آگے جواب ہے کہ) شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی ہزار مہینہ تک عبادت کرنے کا جس قدر ثواب ہے اس سے زیادہ شب قدر میں عبادت کرنے کا ثواب ہے، کذا فی الخازن اور وہ رات ایسی ہے کہ) اس رات میں فرشتے اور روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اترتے ہیں (اور وہ شب) سراپا سلام ہے (جیسا حدیث بیہقی میں حضرت انس سے مرفوعاً مروی ہے کہ شب قدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو قیام و قعود و ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں تو اس پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں یعنی اس کے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں اور خازن نے ابن الجوزی سے اس روایت میں تسلیم کو بھی بڑھایا ہے یعنی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ اور یہ سلاموں کا غلبہ

یا اہل الجنۃ، تو اہل جنت جواب دیں گے لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ، یعنی اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اور اطاعت حکم کے لئے تیار ہیں اور سب بھلائی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے هَلْ رَضِيتُمْ یعنی تم لوگ راضی اور خوش ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ اے ہمارے پروردگار، اب بھی راضی نہ ہونے کا کیا احتمال ہے جبکہ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما دیا جو کسی مخلوق کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا میں تم کو اس سے بھی افضل اور بہتر نعمت دیدوں، پھر فرمائیں گے کہ میں نے اپنی رضا تمہارے اوپر نازل کردی اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا (رواہ البخاری ومسلم، مظہری)

اس حدیث میں بھی اہل جنت سے پوچھا گیا کہ آپ راضی بھی ہو، اور اس آیت میں خبر دی گئی کہ رَضُوا عَنْهُ یعنی اہل جنت بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے۔ یہاں بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ سے اور اس کے حکم اور ہر فعل سے راضی ہونا تو فرض بندگی اور لازمہ عبدیت ہے اس کے بغیر تو کوئی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، پھر یہاں اہل جنت کی رضامندی ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ جواب یہ ہے کہ رضا کے عام مفہوم کے اعتبار سے تو یہ صحیح ہے کہ رضا بالقضاء واجبات و فرائض عبدیت میں سے ہے لیکن رضا کا ایک درجہ اور بھی ہے جو اس سے آگے ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی ہر مراد عطا کردیں اور کوئی تمنا و آرزو باقی نہ چھوڑیں، اس جگہ رضا سے یہی مراد ہے جیسے سورہ ضحیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آیا ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى، یعنی عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو دیں گے وہ چیز جس سے آپ راضی ہوجائیں گے۔ یہاں بھی مراد تمام مرادات کا پورا کردینا ہے اسی لئے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک ایک بھی مومن جہنم میں باقی رہے گا (من المظہری)

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ، آخر سورت میں تمام کمالات دینی و نعمائے اُخروی کا جس پر مدار ہے وہ بتلا دیا یعنی خشیۃ اللہ۔ خشیت اُس خوف کو نہیں کہا جاتا جو کسی دشمن یا درندے یا موذی چیز سے طبعاً ہوتا ہے بلکہ خشیت اُس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی انتہائی عظمت و جلال کی وجہ سے پیدا ہو جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کام ہر حال میں اُس کی رضا جوئی کی فکر کرتا ہے اور ناراضی کے شبہ سے بھی بچتا ہے یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبدِ کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔

تمت سورۃ البینۃ بحمد اللہ تعالیٰ

اسلئے کوئی مؤمن کتنا ہی گناہگار ہو ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا، البتہ کافر نے اگر دنیا میں کچھ نیک عمل بھی کئے تو شرط عمل یعنی ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے کالعدم ہیں اس لئے آخرت میں اُس کی کوئی خیر نظر آتی نہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، مراد اس سے وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کرلی ہو کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن و سنت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی جو وہ چھوٹا ہو یا بڑا آخرت میں اسکا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کو خطاب کرکے فرمایا کہ دیکھو ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے (رواہ النسائی وابن ماجہ مظہری)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ محکم اور جامع آیت ہے اور حضرت انسؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو الفاذۃ الجامعۃ فرمایا ہے یعنی منفرد یکتا اور جامع۔

اور حضرت انسؓ اور ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ اذا زلزلت کو نصف القرآن اور قل ہو اللہ احد کو ثلث القرآن اور قل یا ایہا الکافرون کو ربع القرآن فرمایا ہے (رواہ الترمذی والبغوی، مظہری)

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۂ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر، پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر، پھر غارت کرنے والے صبح کو، پھر اٹھانے والے اس میں گرد، پھر گھس جانے والے اس وقت فوج میں، بیشک آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے، اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے، اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے، کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے، اور تحقیق کیا جاوے جو کچھ کہ جیوں میں ہے، بیشک ان کے رب کو ان کی اس دن سب خبر ہے

ع ۱ | ۲۵

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر (پتھر پر) ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں پھر صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں پھر اس وقت (دشمنوں کی) جماعت میں جا گھستے ہیں (مراد اس سے غازیوں کے گھوڑے ہیں جو جہاد میں دوڑتے ہیں اور چونکہ عرب شب خون اور جنگ کے عادی تھے اور گھوڑے پالتے تھے اُن کی مناسبت سے انہی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی آگے جواب قسم ہے کہ) بیشک آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے اور اُس کو خود بھی اس کی خبر ہے (کبھی ابتداءً ہی اور کبھی کچھ غور کرنے سے اپنی ناشکری کا احساس کر لیتا ہے) اور وہ مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے (یہی ناشکری کا سبب ہے آگے حب مال اور ناشکری پر وعید ہے یعنی) کیا اُس کو وہ وقت معلوم نہیں جب زندہ کئے جاویں گے جتنے مردے قبروں میں ہیں اور ظاہر ہو جاوے گا جو کچھ دلوں میں ہے بیشک اُن کا پروردگار اُن کے حال سے اُس روز پورا آگاہ ہے (اور مناسب یہ تھا کہ انسان کو اگر اس وقت کی پوری خبر ہوتی اور آخرت کا حال مستحضر ہوتا تو اپنی ناشکری اور حب مال سے باز آجاتا)

معارف و مسائل

سورۂ عادیات حضرت ابن مسعودؓ اور جابرؓ اور حسن بصری، عکرمہ، عطاء رحمہم اللہ کے نزدیک مکی اور ابن عباسؓ، انسؓ، امام مالکؒ، قتادہ کے نزدیک مدنی سورت ہے (قرطبی)۔

اس سورت میں حق تعالیٰ نے جنگی گھوڑوں کے کچھ خاص حالات و صفات کا ذکر فرمایا اور ان کی قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یہ بات تو قرآن میں بار بار معلوم ہو چکی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھا کر خاص واقعات اور احکام بیان فرماتے ہیں یہ حق تعالیٰ کی خصوصیت ہے انسان کے لئے کسی مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں ہے اور قسم کھانے کا مقصد عام قسموں کی طرح اپنی بات کو محقق اور یقینی بتلانا ہے اور یہ بات بھی پہلے آچکی ہے کہ قرآن کریم جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اُس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے اور یہ چیز گویا اس مضمون کی شہادت دیتی ہے۔ یہاں جنگی گھوڑوں کی سخت خدمات کا ذکر گویا اس کی شہادت میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔ تشریح اسکی یہ ہے کہ گھوڑوں کے اور خصوصاً جنگی گھوڑوں کے حالات پر نظر ڈالئے کہ وہ میدان جنگ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انسان کے حکم و اشارہ کے تابع انجام دیتے ہیں حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا، انکو جو گھاس دانہ انسان دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں، اسکا کام صرف اتنا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پیدا کئے رزق کو اُن تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے اب گھوڑے کو دیکھئے کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اُس کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور سخت سے سخت مشقت برداشت کرتا ہے اس کے بالمقابل انسان کو دیکھو جس کو ایک حقیر قطرہ سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اسکو مختلف کاموں کی قوت بخشی، عقل و شعور

دیا، اُن کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اُس کی تمام ضروریات کو کس قدر آسان کر کے اس تک پہنچا دیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے مگر وہ ان تمام الٰہی احسانات کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا اب الفاظ آیت کی تشریح دیکھیے عَادِیَات، عَدْو سے مشتق ہے جس کے معنی دوڑنے کے ہیں۔ ضَبْحًا، ضبح وہ خاص آواز ہے جو گھوڑے کے دوڑنے کے وقت اس کے سینے سے نکلتی ہے جس کا ترجمہ ہانپنا کیا گیا ہے۔ مُوْرِیَات، ایراء سے مشتق ہے جس کے معنی آگ نکالنے کے ہیں جیسے چقماق کو مار کر یا دیا سلائی کو رگڑ کر نکالی جاتی ہے۔ قَدْحًا، قدح کے معنے ٹاپ مارنے سے پتھریلی زمین پر جب گھوڑا تیزی سے دوڑے خصوصاً جبکہ اُس کے پاؤں میں آہنی نعل بھی ہو تو ٹکراؤ سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ مُغِیْرَات، اغارہ سے مشتق ہے جس کے معنے حملہ کرنے اور چھاپہ مارنے کے ہیں۔ صُبْحًا صبح کے وقت کی تخصیص بیان عادت کے طور پر ہے کیونکہ عرب لوگ اظہار شجاعت کے لئے رات کی اندھیری میں چھاپہ مارنا معیوب سمجھتے تھے حملہ صبح ہونے کے بعد کیا کرتے تھے۔ اَثَرْنَ، اثارت سے مشتق ہے غبار اُڑانے کے معنی میں اور نَقْع غبار کو کہا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ گھوڑے میدان میں اس تیزی سے دوڑتے ہیں کہ اُن کے سُموں سے غبار اُڑ کر چھا جاتا ہے خصوصاً صبح کے وقت میں غبار اُڑنا زیادہ سرعت اور تیزی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ وقت عادۃً غبار اُڑنے کا نہیں، کسی سخت دوڑ ہی سے اس وقت غبار اُٹھ سکتا ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا، یعنی یہ دشمن کی صفوں میں بےخوف و خطر گھس جاتے ہیں۔ کَنُوْد کے معنی میں حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ وہ شخص جو مصائب کو یاد رکھے اور نعمتوں کو بھول جائے اُس کو کنود کہا جاتا ہے ابوبکر واسطی نے فرمایا جو اللہ کی نعمتوں کو اس کی معصیتوں میں صرف کرے وہ کنود ہے۔ اور ترمذی نے فرمایا کہ جو شخص نعمت کو دیکھے اور نعمت دینے والے کو نہ دیکھے وہ کنود ہے ان سب اقوال کا حاصل نعمت کی ناشکری کرنا ہے اس لئے کنود کا ترجمہ ناشکر کا کیا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ، خیر کے لفظی معنی بھلائی کے ہیں۔ عرب میں مال کو بھی لفظ خیر سے تعبیر کرتے تھے، گویا مال بھلائی ہی بھلائی اور فائدہ ہی فائدہ ہے حالانکہ درحقیقت بعض مال انسان کو ہزاروں مصیبتوں میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں آخرت میں تو ہر مال حرام کا یہی انجام ہے کبھی کبھی دنیا میں بھی مال انسان کے لئے وبال بن جاتا ہے مگر عرب کے محاورہ کے مطابق اس آیت میں مال کو لفظ خیر سے تعبیر کر دیا ہے جیسا ایک دوسری آیت میں فرمایا اِنْ تَرَكَ خَيْرًا، یہاں بھی خیر سے مراد مال ہے۔

آیت مذکورہ میں گھوڑوں کی قسم کھا کر انسان کے متعلق دو باتیں کہی گئیں، ایک یہ کہ وہ ناشکر ہے مصیبتوں تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے یہ دونوں باتیں شرعاً و عقلاً مذموم ہیں ان سے انسان کو ان مذموم خصلتوں پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔ ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیا حالانکہ وہ انسانی ضروریات کا مدار ہے اور اُس کے کسب و اکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدر ضرورت فرض قرار دیا ہے تو مال کی محبت

کا مذموم ہونا یا تو بضعف شدت کے اعتبار سے ہے کہ مال کی محبت میں ایسا مغلوب ہو جاوے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی غافل ہو جاوے اور حلال و حرام کی پروا نہ رہے، اور یا اس سے کہ مال کا کسب اکتساب اور بقدرِ ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں بلکہ فرض ہے مگر محبت اس کی بھی مذموم ہے کیونکہ محبت کا تعلق دل سے ہے، اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مال کو بقدر ضرورت حاصل کرنا اور اس سے کام لینا تو ایک فریضہ اور محمود ہے لیکن دل میں اس کی محبت ہونا پھر بھی مذموم ہی ہے۔ جیسا انسان پیشاب پاخانے کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے اُس کا اہتمام بھی کرتا ہے مگر اس کے دل میں محبت نہیں ہوتی۔ بیماری میں دوا بھی پیتا ہے آپریشن بھی کراتا ہے مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی بلکہ بدرجۂ مجبوری کرتا ہے اسی طرح اللہ کے نزدیک مومن کا ایسا ہونا چاہیے کہ بقدرِ ضرورت مال کو حاصل بھی کرے اُس کی حفاظت بھی کرے اور مواقع ضرورت میں اس سے کام بھی لے مگر دل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو جیسا کہ مولانا رومی نے ایک بلیغ انداز میں فرمایا ہے ؎

آب اندر زیرِ کشتی پُشتی است ٭ آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

یعنی پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو کشتی کا مددگار ہے مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے ارد گرد رہے تو مفید ہے جب دل کے اندر گھس گیا تو ہلاکت ہے۔ آخر سورت میں انسان کی ان دونوں مذموم خصلتوں پر آخرت کی وعید سنائی گئی۔

اَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ الآیة، کیا اس غافل انسان کو اس کی خبر نہیں کہ قیامت کے روز جب مُردے قبروں سے زندہ کر کے اُٹھائے جاویں گے اور دلوں میں چھپی ہوئی باتیں بھی سب کھل کر سامنے آجاویں گی اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ رب العالمین ان سب کے سب حالات سے باخبر ہیں وہ اسکے مطابق جزا سزا دیں گے اسلئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ ناشکری سے باز آئے اور مال کی محبت میں ایسا مغلوب ہو کہ اچھے بُرے کی تمیز نہ رہے۔

فائدہ اس آیت میں یہ دو مذموم خصلتیں مطلق انسان کی بیان کی گئی ہیں حالانکہ انسانوں میں انبیاء و اولیاء اور بہت سے صلحاء عباد ایسے ہیں، جو ان مذموم خصلتوں سے پاک اور شکر گزار بندے ہوتے ہیں مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالنے کیلئے تیار رہتے ہیں حرام مال سے بچتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مطلق انسان کی طرف ان مذموم خصلتوں کی نسبت اس لئے کر دی گئی کہ اکثر انسان ایسے ہی ہیں اس سے سب کا ایسا ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لئے بعض حضرات نے اس آیت میں انسان سے مراد انسان کافر لیا ہے جیسا کہ اوپر خلاصہ تفسیر میں ایسا ہی ہے۔ اسکا حاصل یہ ہوگا کہ یہ دونوں مذموم خصلتیں دراصل کافر کی ہیں کسی مسلمان میں بھی خدانخواستہ پائی جائیں تو اُسے فکر کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم

تمت سورۃ العٰدیٰت بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ القَارِعَة

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۭ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۭ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۭ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۭ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۭ نَارٌ حَامِيَةٌ

خلاصۂ تفسیر

وہ کھڑکھڑانے والی چیز کیسی ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز اور آپ کو کچھ معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز (مراد قیامت ہے جو دلوں کو گھبراہٹ سے اور کانوں کو سخت آوازوں سے کھڑکھڑا دے گی اور یہ اس روز ہوگا) جس روز آدمی پریشان پروانوں کی طرح ہو جاویں گے (پروانوں سے تشبیہ چند چیزوں کی وجہ سے دی گئی، ایک کثرت سے ہونا کہ سارے اولین و آخرین انسان ایک میدان میں جمع ہو جاویں گے، دوسرے کمزور ہونا کہ سب انسان اس وقت کمزوری میں پروانے جیسے ضعیف و عاجز ہوں گے یہ دونوں وصف تو تمام

اور بکثرت انسانوں میں عام ہوں گے، تمیز سے بے تاب اور بے چینی سے ادھر ادھر پھیلنا جو پروانوں میں مشاہدہ کیا جاتا اور یہ صورت بعض مومنین میں نہیں ہوگی وہ اپنی قبروں سے مطمئن اٹھیں گے) اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جاویں گے (عہن رنگین اون کو کہا جاتا ہے پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہیں وہ سب اڑتے پھریں گے تو ان کی مثال اس اون کی ہوگی جس میں مختلف رنگ کے بال ملے ہوئے ہوں اس روز اعمال انسانی تولے جاوینگے) پھر جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی جو مومن ہوگا) وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا (یعنی نجات پاکر جنت میں جائے گا) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی کافر) اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ (ہاویہ) کیا چیز ہے (وہ) ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت میں اعمال کے وزن ہونے اور ان کے ہلکے بھاری ہونے پر دوزخ یا جنت ملنے کا ذکر ہے۔ وزن اعمال کی پوری تحقیق اور شبہات کا جواب سورۂ اعراف کے شروع میں گزر چکا ہے (معارف جلد سوم صفحہ ۵۲۶ تا ۵۳۲) وہاں دیکھ لیا جائے اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ روایات حدیث و آیات کی تطبیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن اعمال غالباً دو مرتبہ ہوگا، ایک مرتبہ کے وزن سے مومن اور کافر کا امتیاز کر دیا جائے گا کہ ہر مومن کا پلہ بھاری اور کافر کا ہلکا رہے گا، پھر مومنین میں اعمال حسنہ و سیئہ کا امتیاز کرنے کے لئے دوسرا وزن ہوگا، اس سورت میں بظاہر وہ پہلا وزن مراد ہے جس میں ہر مومن کا پلہ ایمان کی وجہ سے بھاری رہے گا خواہ اسکا عمل کیسا ہی ہو اور کافر کا پلہ ایمان نہ ہونے کے سبب ہلکا رہے گا خواہ اس نے کچھ نیک کام بھی کئے ہوں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ قرآن کریم میں عام طور پر جزا و سزا میں تقابل ہی ذکر کیا گیا کہ مومنین صالحین کیساتھ کیا معاملہ ہوگا کہ اصلی مومنین کاملین ہی ہیں، باقی رہے وہ مومنین جنہوں نے اعمال صالحہ اور سیئہ مخلوط کئے ہیں قرآن میں عام طور پر ان سے سکوت کیا گیا، اور ان آیات میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قیامت میں انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے گنے نہیں جائیں گے، اور عمل کا وزن بقدر اخلاص اور مطابقت سنت کے رہتا ہے جس شخص کے عمل میں اخلاص بھی کامل ہو اور سنت کی مطابقت بھی مکمل ہو گرچہ اسکے عمل تعداد میں کم ہوں اسکا وزن بہ نسبت اس شخص کے بڑھ جائیگا جس نے تعداد میں تو نماز روزے، صدقہ خیرات، حج عمرے بہت کئے مگر اخلاص میں کمی، یا سنت کی مطابقت میں کمی رہی۔ واللہ اعلم ؏

تمت سورۃ القارعۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُورَةُ العَصْر

سُورَةُ العَصْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ
سورۂ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

خلاصۂ تفسیر

قسم ہے زمانہ کی (جس میں رنج و خسران واقع ہوتا ہے) کہ انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک دوسرے کو حق (پر قائم رہنے) کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے (جو دوسروں کی تکمیل ہے تو جو لوگ خود بھی یہ کمال حاصل کریں اور دوسروں کی بھی تکمیل کریں یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)

معارف و مسائل

سورۂ عصر کی خاص فضیلت: حضرت عبید اللہ بن حصن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کے سامنے سورۂ والعصر نہ پڑھ لے (رواہ الطبرانی) اور امام شافعی نے فرمایا کہ اگر لوگ صرف اسی

یعنی اللہ کے بندوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو چغلخوری کرتے ہیں اور دوستوں کے درمیان فساد ڈلواتے ہیں، اور بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

تیسری خصلت جس پر عذاب کی وعید اس سورت میں آئی ہے وہ مال کی حرص اور محبت ہے اُسی کو آیت میں اس طرح سے تعبیر کیا ہے کہ حرص و محبتِ مال کی وجہ سے اُس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ چونکہ دوسری آیات و روایات اس پر شاہد ہیں کہ مطلقاً مال کا جمع رکھنا کوئی حرام و گناہ نہیں اسلئے یہاں بھی مراد وہ جمع کرنا ہے جس میں حقوق واجبہ ادا نہ کئے گئے ہوں یا فخر و تفاخر مقصود ہو یا اس کی محبت میں منہمک ہو کر دین کی ضروریات سے غفلت ہو۔

تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ، یعنی یہ جہنم کی آگ دلوں تک پہنچ جائے گی۔ یوں تو ہر آگ کا خاصہ یہی ہے کہ جو چیز اس میں پڑے اُسے بھی اور اُس کو جلا دیتی ہے انسان اُس میں ڈالا جائے گا تو اُس کے سارے اعضاء کے ساتھ دل بھی جل جائے گا، یہاں جہنم کی آگ کی یہ خصوصیت اس لئے ذکر کی گئی کہ دنیا کی آگ جب انسان کے بدن کو لگتی ہے تو اُس کے دل تک پہنچنے سے پہلے ہی موت واقع ہو جاتی ہے بخلاف جہنم کے کہ اس میں موت تو آتی نہیں تو دل تک آگ کا پہنچنا بحالتِ حیات ہوتا ہے اور دل کے جلنے کی اذیت اپنی زندگی میں انسان محسوس کرتا ہے۔

تمت سورۃ الھمزۃ بحمد اللہ تعالیٰ

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۂ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ

کیا تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ

تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ

غلط اور بھیجے ان پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں پھینکتے تھے ان پر پتھریاں

مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ ۝

کنکر کی پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھُس کھایا ہوا۔

ع ۲۴

ابرہہ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور لوٹ جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے مگر ابرہہ نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے وہ اپنے اونٹ لیکر واپس آئے تو بیت اللہ کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہوئے اور قریش کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی سب نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے قابو میں نہیں، آپ ہی اپنے بیت کی حفاظت کا انتظام فرما دیں۔ الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لیکر مختلف پہاڑوں پر پھیل گئے انکو یہ یقین تھا کہ ان کے لشکر پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اسی یقین کی بناء پر انھوں نے ابرہہ سے خود اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا، بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اسلئے پسند نہ کیا کہ خود تو اسکے مقابلے کی طاقت نہ تھی اور دوسری طرف یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُنکی بے بسی پر رحم فرما کر دشمن کی قوت اور اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی محمود نامی کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا، نفیل بن حبیب جن کو راستہ سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا اس وقت وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کر کہنے لگے تو جہاں سے آیا ہے وہیں صحیح سالم لوٹ جا کیونکہ تو اللہ کے بلد امین (محفوظ شہر) میں ہے یہ کہہ کر اس کا کان چھوڑ دیا، ہاتھی یہ سنتے ہی بیٹھ گیا، ہاتھی بانوں نے اس کو اٹھانا چلانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس کو بڑے بڑے آہنی تبروں سے مارا گیا، اس کی بھی پرواہ نہ کی، اس کی ناک میں آنکڑہ لوہے کا ڈالدیا پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا، اس وقت ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا تو فوراً کھڑا ہوگیا پھر شام کی طرف چلانا چاہا تو چلنے لگا پھر مشرق کی طرف چلایا تو چلنے لگا، ان سب اطراف میں چلانے کے بعد **پھر اس کو مکہ مکرمہ کیطرف چلانے لگے تو پھر بیٹھ گیا۔**

قدرت حق جل شانہ کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا۔ دوسری طرف دریائی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دکھائی دیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے یا مسور کی برابر تھیں ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے، جثہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے ان کے پنجے سرخ تھے، ہر پنجے میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دکھائی دیئے اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر کے اوپر چھاگئے، یہ کنکریاں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں ان کو ابرہہ کے لشکر پر گرایا، ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی کہ جس پر پڑتی اسکے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھس جاتی تھی۔ یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے، صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو اس کنکری سے ہلاک ہوا، اور لشکر کے سب آدمی اسی موقع پر ہلاک نہیں ہوئے بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے اُن سب کا یہ حال ہوا کہ راستہ میں مر مر کر گر گئے۔ ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینا تھی یہ فوراً ہلاک نہیں ہوا مگر اسکے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا کہ اس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا اسی حال میں اس کو واپس یمن لایا گیا، دارالحکومت صنعاء پہنچکر اسکا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گیا اور مر گیا ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے مگر اس طرح کہ **دونوں اندھے اور اپاہج ہوگئے**

تھے۔ محمد بن اسحاق نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے اور حضرت صدیقہ عائشہ کی بہن اسماءؓ نے فرمایا کہ میں نے دونوں اپاہج اندھوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔ اصحابِ فیل کے اسی واقعہ کے متعلق اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے،

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ، یہاں اَلَمْ تَرَ فرمایا جس کے معنے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا حالانکہ یہ واقعہ آپ کی ولادت باسعادت سے کچھ دن پہلے کا ہے آپ کے دیکھنے کا یہاں بظاہر کوئی موقع نہیں مگر جو واقعہ ایسا یقینی ہو کہ عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہو اُس کے علم کو بھی لفظ رویت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ آنکھوں دیکھی واقعہ ہے، اور ایک حد تک دیکھنا بھی ثابت ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہما نے ہاتھی بانوں کو اندھا اور اپاہج بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

طَيْرًا اَبَابِيْلَ، ابابیل لفظ جمع کا ہے مگر اسکا کوئی فرد مستعمل نہیں، معنے اس کے پرندوں کے غول کے ہیں کسی خاص جانور کا نام نہیں، اُردو زبان میں جو ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں وہ مراد نہیں جیسا کہ اوپر روایت میں گزر چکا ہے یہ پرندے کبوتر سے کسی قدر چھوٹے تھے اور کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی (کذا قال سعید بن جبیر، قرطبی)

بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ، سجیل بکسر سین سنگ گل کا معرب کیا ہوا لفظ ہے جس کے معنے ہیں ایسی کنکریں جو مٹی کو آگ میں پکانے سے بنتی ہیں اس میں اشارہ اس بات کا ہے کہ یہ کنکریں بھی خود کوئی طاقت نہ رکھتی تھیں معمولی گارے اور آگ سے بنی ہوئی تھیں مگر بقدرتِ حق تعالیٰ انھوں نے ریوالور کی گولیوں سے زیادہ کام کیا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ، عصف، بھوسہ کو کہتے ہیں اول تو خود بھوسہ ہی منتشر تنکے ہوتے ہیں، پھر جبکہ اُس کو کسی جانور نے چبا بھی لیا ہو تو وہ تنکے بھی اپنے حال پر نہیں رہتے۔ ابرہہ کے لشکر میں جس پر یہ کنکری پڑی ہے اُس کا یہی حال ہو گیا ہے۔

اصحابِ فیل کے اس عجیب و غریب واقعہ نے پورے عرب کے دلوں میں قریش کی عظمت بڑھا دی اور سب ماننے لگے کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کی طرف سے خود حق تعالیٰ جل شانہ نے اُن کے دشمن کو ہلاک کر دیا (قرطبی) اسی عظمت کا یہ اثر تھا کہ قریش مکہ مختلف ملکوں کا سفر بغرض تجارت کرتے تھے اور راستہ میں کوئی اُن کو نقصان نہ پہنچاتا حالانکہ اُس وقت دوسروں کے لئے کوئی سفر ایسے خطرات سے خالی نہیں تھا قریش کے انہی سفروں کا ذکر آگے اگلی سورت سورۂ قریش میں کر کے اُن کو شکرِ نعمت کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

تمت سورة الفيل بحمد الله تعالى

سُوْرَةُ الْقُرَيْش

سُوْرَةُ الْقُرَيْشِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيٰتٍ

سورہ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ

اس واسطے کہ مانوس کیا قریش کو | مانوس رکھنا ان کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے | تو چاہیے کہ بندگی کریں رب

هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

اس گھر کے رب کی | جس نے ان کو کھلایا بھوک میں | اور امن دیا ڈر میں

خُلاصۂ تفسیر

چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں تو (اس نعمت کے شکر میں) انکو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔

معارف و مسائل

اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے، اور شاید اسی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کر کے لکھا گیا تھا، دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی تھی مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے زمانے میں تمام مصاحف قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوا، اسی نسخۂ قرآن کو جمہور کے نزدیک امام کہا جاتا ہے اس میں ان دونوں کو دو الگ الگ سورتیں ہی لکھا ہے، دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی ہے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ، حرف لام ترکیب نحوی کے اعتبار سے اسکا مقتضی ہے کہ اسکا تعلق کسی سابق مضمون

تجارت میں منافع حاصل ہوتے تھے قریش کے امیر و غریب سب ہی تقسیم کر دیتے تھے یہاں تک کہ ان کا غریب آدمی بھی مالداروں کی برابر ہو جاتا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے ان پر مزید احسان فرمایا کہ ہر سال کے دو سفروں کی زحمت سے بھی ان کو بچا دیا کہ مکہ مکرمہ سے متصل ملک یمن تبالہ، جرش وغیرہ کو اتنا سرسبز اور زرخیز بنا دیا کہ وہاں کا غلہ اتنی ضرورت سے زائد ہونے کی بنا پر ان کو یمن کی ضرورت پڑ گئی کہ غلات وہاں سے لا کر جدہ میں فروخت کریں چنانچہ کشتیاں بھر بھر کر جدہ میں پہنچتیں اور وہ اپنے اونٹوں اور خچروں کے جانے صرف دو منزل جا کر جدہ سے سب سامان لے آتے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے مکہ والوں پر اسی احسان و انعام کا ذکر فرمایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، انعامات کا ذکر کرنے کے بعد ان کا شکر ادا کرنے کے لئے قریش کو خطاب کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کیا کرو۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رب البیت ہونے کی صفت کو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ یہی بیت کعبہ ان کے تمام فضائل اور برکات کا سرچشمہ تھا

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ، یعنی قریش مکہ نے دنیا کی ان تمام نعمتوں کو جمع فرمایا جو انسان کے خوشی سے رہنے کے لئے ضروری ہیں۔ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ میں کھانے پینے کی ضروریات داخل ہیں اور اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ میں دشمنوں ڈاکوؤں کے خوف سے مامون ہونا بھی شامل ہے اور آخرت کے عذاب سے مامون ہونا بھی۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس آیت کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا میں بھی امن اور بے خوف و خطر رہنے کا سامان فرما دیتے ہیں اور آخرت میں بھی، اور جو اس سے انحراف کرے اس سے یہ دونوں قسم کے امن سلب کر لئے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک بستی تھی جو مامون و محفوظ اور ہر خطرہ سے مطمئن تھی اس کا رزق ہر جگہ سے وافر آتا تھا، پھر اس بستی والوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کی پریشانی میں مبتلا کر دیا ان کے کرتوت کی بنا پر۔

فائدہ عظیمہ: ابو الحسن قزوینی نے فرمایا کہ جس شخص کو کسی دشمن یا اور کسی مصیبت کا خوف ہو اس کے لئے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا پڑھنا امان ہے۔ اس کو امام جزری نے نقل کر کے فرمایا کہ یہ عمل آزمودہ اور مجرب ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ مجھے میرے شیخ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے خوف و خطر کے وقت اس سورۃ کے پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر بلا و مصیبت کے دفع کرنے کے لئے اس کی قراءت مجرب ہے۔ حضرت قاضی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا ہے۔

تمت سورۃ القریش بحمد اللہ تعالیٰ

سُوْرَةُ الْمَاعُوْن

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ اٰيٰتٍ

سورۂ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا

تو نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو سو وہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں

يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ

تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر سو خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی

صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

نماز سے بے خبر ہیں وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں اور مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز

خلاصۂ تفسیر

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے سو (آپ اس کا حال سننا چاہیں تو سنیے کہ) وہ شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا دینے کی (دوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا (یعنی وہ ایسا سنگدل ہے کہ خود تو وہ کسی غریب کو کیا دیتا دوسروں کو بھی اس پر آمادہ نہیں کرتا، اور جب بندوں کا حق ضائع کرنا ایسا برا ہے تو خالق کا حق ضائع کرنا تو اور زیادہ برا ہے) سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے (کیونکہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ سب کے سامنے ظاہر کر کے دے اس لئے اس کو بالکل نہ دینے سے بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتا بخلاف نماز کے وہ جماعت کیساتھ علانیہ ادا کی جاتی ہے اس کو بالکل چھوڑ دے تو سب پر نفاق ظاہر ہو جاوے اسلئے نماز کو محض دکھلاوے کے لئے پڑھ لیتا ہے)

سُورَةُ الكَوْثَر

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّا أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ

[illegible]

هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

وہی رہ گیا پیچھا کٹا

خلاصۂ تفسیر

بیشک ہم نے آپ کو کوثر (جنت کی ایک حوض کا نام بھی ہے اور ہر خیر کثیر بھی اس میں شامل ہے) عطا فرمائی ہے (جس میں دُنیا و آخرت کی سب خیر و بھلائی شامل ہے دُنیا میں دین اسلام کی بقاء و ترقی اور آخرت میں جنت کے درجاتِ عالیہ سب داخل ہیں) سو (ان نعمتوں کے شکر میں) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھئے (کیونکہ سب سے بڑی نعمت کے شکر میں سب سے بڑی عبادت چاہئے اور وہ نماز ہے) اور (بذیل شکر کے بدنی عبادت کیساتھ مالی عبادت یعنی اُسی کے نام کی) قربانی کیجئے (جیسا دوسری آیتوں میں عموماً نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہے اس میں زکوٰۃ کے بجائے قربانی کا ذکر شاید اسلئے اختیار کیا گیا کہ قربانی میں مالی عبادت ہونے کے علاوہ مشرکین کی مشرکانہ رسوم کی مخالفت بھی ہے کیونکہ مشرکین بتوں کے نام کی قربانی کیا کرتے تھے۔ آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم کی بچپن ہی میں وفات پر بعض مشرکین نے جو یہ طعنہ دیا تھا کہ ان کی نسل نہ چلے گی اور اُن کے دین کا سلسلہ جلد ختم ہو جائے گا اس کا جواب ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بے نام و نشان نہیں ہیں بلکہ) بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے (خواہ ظاہری نسل اس دشمن کی چلے یا نہ چلے لیکن دُنیا میں اس کا ذکر خیر باقی نہیں رہتا بخلاف

آگے کہ آپ کی اُمت اور آپ کی یاد نیک نامی، محبت و اعتقاد کے ساتھ قائم رہے گی، اور یہ سب نعمتیں لفظ کوثر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگر ظاہری اولاد کی نسل نہ ہو تو کیا، جو نسل سے مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے یہاں تک کہ دُنیا سے گزر کر آخرت تک بھی، اور دشمن اس سے محروم ہے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول: ابن ابی حاتم نے سُدّی سے اور بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت محمد بن علی بن حسینؓ سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی اولادِ ذکور مر جائے اُس کو عرب ابتر کہا کرتے تھے یعنی مقطوع النسل۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم یا ابراہیم کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تو کفار نے آپ کو ابتر کہہ کر طعنہ دینے لگے، ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا تھا کہ اُن کی بات چھوڑو وہ کچھ فکر کرنے کی چیز نہیں کیونکہ وہ ابتر (مقطوع النسل) ہیں، جب اُن کا انتقال ہو جائے گا ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (روح المعانی، ابن جریر، ابن کثیر)

اور بعض روایات میں ہے کہ کعب بن اشرف یہودی ایک مرتبہ مکہ آیا تو قریش مکہ اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو کہتا ہے کہ وہ ہم سب سے (دین کے اعتبار سے) بہتر ہے حالانکہ ہم اہلِ حجابت اور بیت اللہ کی خدمت کرنے والے اور لوگوں کو پانی پلانے والے ہیں، کعب نے کہا کہ تم لوگ اس سے بہتر ہو، اس پر یہ سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (رواہ البزار باسناد صحیح عن ابن عباس، مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ کفار نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نرینہ اولاد نہ رہنے کے سبب ابتر ہونے کا طعنہ دیتے تھے یا دوسری وجوہ سے آپ کی شان میں گستاخی کرتے تھے اُن کے جواب میں سورۂ کوثر نازل ہوئی جس میں اُن کے طعنوں کا جواب بھی ہے کہ صرف اولادِ نرینہ کے نہ رہنے سے آپ کو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر کہنے والے حقیقت سے بے خبر ہیں۔ آپ کی نسل نسبی بھی ان شاء اللہ قیامت تک باقی رہے گی، اگرچہ وہ دختری اولاد سے ہو، اور نسل معنوی یعنی آپ پر ایمان لانے والے مسلمان جو درحقیقت نبی کی اولادِ معنوی ہوتے ہیں وہ تو اس کثرت سے ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کی امتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کے نزدیک مقبول اور مکرم و معظم ہونا بھی مذکور ہے جس سے کعب بن اشرف کے قول کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ سب مضمون تیسری آیت میں آیا ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ، امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے" ابن عباسؓ کے خاص شاگرد سعید بن جبیرؓ سے کسی نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے تو سعید بن جبیرؓ نے جواب دیا کہ ابن عباسؓ کا قول اس کے منافی نہیں بلکہ وہ نہر جنت جس کا نام کوثر ہے وہ بھی اس خیر کثیر میں

داخل ہے اسی لئے امام تفسیر مجاہد نے کوثر کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی خیر کثیر ہے اس میں جنت کی خاص نہر کوثر بھی داخل ہے۔

حوض کوثر بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔

بينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بين اظهرنا في المسجد اذ اغفى اغفاءةً ثم رفع رأسه متبسمًا. قلنا ما اضحكك يا رسول الله قال لقد انزلت علي آنفًا سورة فقرأ بسم الله الرحمن الرحيم انا اعطيناك الكوثر الخ ثم قال اتدرون ما الكوثر قلنا الله ورسوله اعلم قال فانه نهر وعدنيه ربي عز وجل عليه خير كثير وهو حوض ترد عليه امتي يوم القيامة آنيته عدد نجوم في السماء فيختلج العبد منهم فاقول رب انه من امتي فيقول انك لا تدري ما احدث بعدك

ایک روز جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہمارے درمیان تھے اچانک آپ پر ایک قسم کی نیند یا بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی پھر ہنستے ہوئے سر مبارک اٹھایا ہم نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے، تو فرمایا کہ مجھ پر اسی وقت ایک سورت نازل ہوئی ہے پھر آپ نے بسم اللہ کے ساتھ سورۂ کوثر پڑھی، پھر فرمایا تم جانتے ہو کوثر کیا ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور رسول ہی جانتے ہیں آپ نے فرمایا یہ ایک نہر جنت ہے جسکا میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے جس میں خیر کثیر ہے اور وہ حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز پانی پینے کے لئے آئے گی اسکے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہونگے اسوقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دینگے تو میں کہونگا کہ میرے پروردگار یہ تو میری اُمت میں ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ آپ نہیں جانتے کہ اسنے آپکے بعد کیا نیا دین اختیار کیا ہے۔

ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے مزید لکھا ہے،

وقد ورد في صفة الحوض يوم القيمة انه يشخب فيه ميزابان من السماء من نهر الكوثر وان آنيته عدد نجوم السماء

حوض کی صفت میں روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے جو نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھردیں گے اسکے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے

اس حدیث سے سورۂ کوثر کا سبب نزول بھی معلوم ہوگیا اور لفظ کوثر کی صحیح تفسیر بھی یعنی خیر کثیر، اور یہ بھی کہ اس خیر کثیر میں وہ حوض کوثر بھی شامل ہے جو قیامت میں اُمّت محمدیہ کو سیراب کریگی۔ نیز اس روایت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے اور یہ حوض کوثر میدان حشر میں ہوگی اس میں دو پرنالوں کے ذریعہ نہر کوثر کا پانی ڈالا جائیگا۔ اسی میں اُن روایات کی بھی تطبیق ہوگئی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوض کوثر پر اُمّت کا ورود دخول جنت سے پہلے ہوگا، اور اس روایت میں جو بعض لوگوں کو حوض کوثر سے ہٹا دینے کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو بعد میں اسلام سے پھر گئے یا پہلے ہی سے مسلمان نہیں تھے محض منافقانہ اظہار اسلام

تم کو تمہارا بدلہ ملیگا اور مجھ کو میرا بدلہ ملیگا (اس میں ان کے شرک پر وعید بھی سنادی گئی۔)

معارف و مسائل

سورت کے فضائل اور خواص: حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لئے دو سورتیں بہتر ہیں۔ سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص (رواہ ابن ہشام مظہری) اور تفسیر ابن کثیر میں متعدد صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں میں اور بعد مغرب کی سنتوں میں بکثرت یہ دو سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ بعض صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں کوئی دعا بتادیجئے جو ہم سونے سے پہلے پڑھا کریں۔ آپ نے قل یا ایہا الکافرون پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ شرک سے براءت ہے (رواہ الترمذی و ابوداؤد) اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب سفر میں جاؤ تو وہاں تم اپنے سب رفقاء سے زیادہ خوش حال بامراد رہو اور تمہارا سامان زیادہ ہو جائے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بیشک میں ایسا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آخر قرآن کی پانچ سورتیں سورۂ کافرون، سورۂ نصر، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھا کرو اور ہر سورت کو بسم اللہ سے شروع کرو اور بسم اللہ ہی پر ختم کرو۔ حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت میرا حال یہ تھا کہ سفر میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے بالمقابل قلیل الزاد خستہ حال ہوتا تھا۔ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم پر عمل کیا میں سب سے بہتر حال میں رہنے لگا (مظہری بحوالہ ابویعلی) اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے پانی اور نمک منگایا اور یہ پانی کاٹنے کی جگہ پر لگاتے جاتے تھے اور قل یا ایہا الکافرون، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔ (مظہری)

شانِ نزول: ابن اسحٰق کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آؤ ہم آپس میں اس پر صلح کرلیں کہ ایک سال آپ ہمارے بتوں کی عبادت کیا کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں (قرطبی) اور طبرانی کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اول تو باہمی مصالحت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ صورت پیش کی کہ ہم آپ کو اتنا مال دیتے ہیں کہ آپ سارے مکہ میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائیں اور جس عورت سے آپ چاہیں آپ کا نکاح کر دیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہا کریں اور اگر آپ یہ بھی نہیں مانتے تو ایسا کریں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں (مظہری)

اور ابوصالح کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے باہمی مصالحت کے لئے یہ صورت پیش کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں میں سے کسی بعض کو صرف ہاتھ لگا دیں تو ہم آپ کی تصدیق کرنے لگیں گے۔ اس پر جبرئیل امین سورۂ کافرون لیکر نازل ہوئے جس میں کفار کے اعمال سے براءت اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم ہے۔

کہ لفظ دین کو ابن کثیر نے بھی اعمال دین کے معنی میں لیا ہے اور پھر مقصود اس سے وہی ہوگا جو بیان القرآن میں بیان کیا گیا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کی جزا سزا خود بھگتنی پڑے گی۔

اور بعض مفسرین نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی کہ صرف ما دونوں جگہ موصولہ ہی ہے اور حال و استقبال کا بھی فرق نہیں بلکہ یہ دو جملے فی الواقع مکرر لائے گئے ہیں مگر ہر تکرار بُرا نہیں ہوتا، بہت جگہ تکرار تقاضائے بلاغت ہوتا ہے جیسے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا میں ہے۔ یہاں اس تکرار کا مقصد تاکید مضمون بھی ہے اور یہ بھی کہ کفار کی طرف سے چونکہ ایسی مصالحت کی پیشکش متعدد مرتبہ کی گئی تو متعدد جملوں سے اُس کو رد کیا گیا (نقلہ ابن جریر۔ ابن کثیر)

کفار سے معاہدہ صلح کی بعض صورتیں جائز بعض ناجائز

سورۂ کافرون میں کفار کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی چند صورتوں کو بالکلیہ رد کرکے اعلان برأت کیا گیا، مگر خود قرآن کریم میں یہ ارشاد بھی موجود ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا، یعنی کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی جھک جائیے (یعنی معاہدۂ صلح کر لیجئے) اور مدینہ طیبہ میں جب آپ ہجرت کرکے تشریف لے گئے تو یہود مدینہ سے آپکا معاہدۂ صلح مشہور و معروف ہے اسلئے بعض مفسرین نے سورۂ کافرون کو منسوخ کہا اور منسوخ کہنے کی بڑی وجہ آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کو قرار دیا ہے کیونکہ بظاہر یہ احکام جہاد کے منافی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہاں لکم دینکم کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو کفر کی اجازت یا کفر پر برقرار رکھنے کی ضمانت دیدی گئی بلکہ اس کا حاصل وہی ہے جو لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے اسلئے اصح اور صحیح جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورت منسوخ نہیں، جس قسم کی مصالحت سورۂ کافرون کے نزول کا سبب بنی وہ جیسے اسوقت حرام تھی آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت آیت مذکورہ میں آئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدۂ یہود سے عملاً ظاہر ہوئی وہ جیسے اُس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔ بات صرف موقع و محل کو سمجھنے اور شرائط صلح کو دیکھنے کی ہے جسکا فیصلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرما دیا ہے جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثنا کا ارشاد ہے وہ یہ ہے الا صلحا احل حراما او حرم حلالا، یعنی ہر صلح جائز ہے بجز اُس صلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔ اب غور کیجئے کہ کفار مکہ نے صلح کی جو صورتیں پیش کی تھیں، اُن سب میں کم از کم کفر و اسلام کی حدود میں التباس یقینی ہے اور بعض صورتوں میں تو اُصول اسلام کے خلاف شرک کا ارتکاب لازم آتا ہے، ایسی صلح سے سورۂ کافرون نے اعلان برأت کر دیا، اور دوسری جگہ جس صلح کو جائز قرار دیا اور معاہدۂ یہود سے اُس کی عملی صورت معلوم ہوئی اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں اُصول اسلام کا خلاف کیا گیا ہو یا کفر و اسلام کی حدود آپس میں ملتبس ہوئی ہوں۔ اسلام سے زیادہ کوئی مذہب رواداری، حسن سلوک، صلح و سالمیت کا داعی نہیں، مگر صلح اپنے انسانی حقوق میں ہوتی ہے، خدا کے قانون اور اُصول دین میں کسی صلح و مداہنت کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم

سُوْرَةُ النَّصْرِ

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثُ اٰيٰتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آ پہنچے اور (اس فتح کے مرتب ہونے والے آثار یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دین (اسلام) میں جوق جوق داخل ہوتا دیکھ لیں، تو (اس وقت سمجھئے کہ مقصود دنیا میں رہنے کا اور آپ کی بعثت کا جو تکمیل دین تھی وہ پورا ہوچکا اور اب سفر آخرت قریب ہے اس کے لئے تیاری کیجئے اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے (یعنی ایسے امور جو خلاف اولیٰ واقع ہوئے ان سے مغفرت مانگئے) وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ باجماع مدنی ہے اور اس کا نام سُوْرَةُ التَّوْدِيْعِ بھی ہے، تودیع کے معنی کسی کو رخصت کرنے کے ہیں اس سورۃ میں چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو سُوْرَةُ التَّوْدِيْعِ بھی کہا گیا۔

قرآن مجید کی آخری سورۃ اور آخری آیات: صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ سورۂ نصر قرآن کی آخری سورۃ ہے (قرطبی)۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کوئی مکمل سورۃ نازل نہیں ہوئی، بعض آیات کا نزول جو اس کے بعد ہونا بعض روایات میں ہے وہ اس کے منافی نہیں، جیساکہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کی سب سے پہلی سورۃ اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ مکمل سورۃ سب سے پہلے فاتحہ نازل ہوئی ہے، سورۂ اقراء اور مدثر وغیرہ کی چند آیات کا اس سے پہلے نازل ہونا اس کے منافی نہیں۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع میں نازل ہوئی اس کے بعد آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی، ان دونوں کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اسی روز رہے (اسی روز کے بعد وفات ہوگئی) ان دونوں کے بعد آیت کلالہ نازل ہوئی جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے کل پچاس دن باقی تھے، اس کے بعد آیت لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ نازل ہوئی جس کے بعد عمر شریف کے کل پینتیس روز باقی تھے، اس کے بعد آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ نازل ہوئی جس کے بعد صرف اکیس روز، اور مقاتل کی روایت میں صرف سات روز کے بعد وفات ہوئی (قرطبی)۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے، اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں، لفظ اذا جاء سے بظاہر قبل فتح نازل ہونا معلوم ہوتا ہے اور روح المعانی میں بحر محیط سے ایک روایت بھی اسکے موافق نقل کی ہے جس میں اس سورۃ کا نزول غزوہ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا، اور خیبر کی فتح فتح مکہ سے مقدم ہونا معلوم و معروف ہے اور روح المعانی میں بسند عبد بن حمید حضرت قتادہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کے نزول کے بعد دو سال زندہ رہے۔ اسکا حاصل بھی یہی ہے کہ اسکا نزول فتح مکہ سے پہلے ہو کیونکہ فتح مکہ سے وفات تک دو سال سے کم مدت ہے، فتح مکہ رمضان ۸ ہجری میں ہوئی اور وفات ربیع الاول ۱۱ ہجری میں۔ اور جن روایات میں اس کا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں ہونا بیان کیا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ پڑھی ہوگی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ مزید تحقیق اس کی بیان القرآن میں مذکور ہے۔

متعدد روایات و آثار میں ہے کہ اس سورۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آجانے کی طرف اشارہ ہے کہ اب آپ کی بعثت و دنیا میں قیام کا مقصد پورا ہو چکا اب تسبیح و استغفار میں لگ جائیے۔ مقاتل کی روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپ نے صحابہ کرام کے مجمع کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی جن میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ موجود تھے سب اس کو سنکر خوش ہوئے کہ اس میں فتح مکہ کی خوشخبری ہے مگر حضرت عباسؓ رو پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ رونے کا کیا سبب ہے تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ اس میں تو آپ کی وفات کی خبر مضمر ہے، آنحضرت

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ

سورۂ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ کسی کو جنا، نہ کسی سے جنا، اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

اُس کے جوڑ کا کوئی

خلاصۂ تفسیر

(اس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آپ سے کہا کہ اپنے رب کی صفات اور نسب بیان کیجئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ کذا فی الدر المنثور باسانید متعددہ) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات و صفات میں) ایک ہے (کمال ذات یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور کمال صفات یہ کہ علم قدرت وغیرہ اس کے قدیم اور محیط ہیں اور) اللہ بے نیاز ہے (یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں) اُس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اُس کے برابر کا ہے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول ترمذی حاکم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا نسب پوچھا تھا اُن کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ دوسری بعض روایات میں یہ سوال یہود

سُوْرَۃُ النَّاسِ

سُوْرَۃُ النَّاسِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ سِتُّ اٰیٰتٍ

سورۂ ناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنْ

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی بدی

شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ

سے اس کے جو وسوسہ ڈالے اور چھپ جائے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے

النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں

خلاصۂ تفسیر

آپ کہیے کہ میں آدمیوں کے مالک، آدمیوں کے بادشاہ، آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے (پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ کہ حدیث میں ہے کہ اللہ کا نام لینے سے شیطان ہٹ جاتا ہے) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والا) جن ہو یا آدمی (یعنی جس طرح میں شیاطین الجن سے پناہ مانگتا ہوں اسی طرح شیاطین الانس سے بھی پناہ مانگتا ہوں جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ جنات اور انسان دونوں میں شیاطین ہونے کا ذکر ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ)

معارف و مسائل

سورۂ فلق میں دنیوی آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم ہے اور اس سورت میں اخروی آفات

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ، اللہ تعالیٰ کی تین صفت ذکر کرکے اب اُس کا بیان ہے جس سے پناہ مانگنا مقصود ہے وہ ہے وسواس خناس، وسواس مصدر در اصل بمعنی وسوسہ ہے یہاں شیطان کو وسواس مبالغہ فرمادیا گویا وہ سراپا وسوسہ ہے اور وسوسہ کے معنی شیطان کا اپنی اطاعت کی طرف ایسے خفی کلام کے ذریعہ بلانا ہے جس کا مفہوم انسان کے دل میں آجائے اور کوئی آواز سنائی نہ دے (قرطبی)، خناس، خنس سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے ہٹنے کے ہیں، شیطان کو خناس اس لئے کہا گیا کہ اسکی عادت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کا نام لیتا ہے تو پیچھے بھاگ جاتا ہے پھر جب ذرا غفلت ہوئی پھر آجاتا ہے پھر وہ اللہ کا نام لیتا ہے تو پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے یہی عمل مسلسل جاری رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے قلب میں دو گھر ہیں ایک میں فرشتہ رہتا ہے دوسرے میں شیطان (فرشتہ اُس کو نیک کاموں کی رغبت دلاتا رہتا ہے اور شیطان بُرے کاموں کی) پھر جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب تک وہ ذکر اللہ میں مشغول نہیں ہوتا تو اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اسمیں برائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے (رواہ ابویعلیٰ عن انس مرفوعاً مظہری)

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ، یہ بیان ہے وسواس کا یعنی وسوسہ ڈالنے والے جنات میں سے بھی ہوتے ہیں، اور انسانوں میں سے بھی، تو حاصل استعاذہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کی تلقین فرمائی کہ اللہ سے پناہ مانگیں جنات شیاطین کے شر سے بھی اور انسانی شیاطین کے شر سے بھی۔ اگر یہ شبہ ہو کہ وسوسہ ڈالنا تو شیاطین کی طرف سے ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ مخفی طور پر انسان کے قلب میں کوئی بات ڈال دیتے ہیں، مگر انسانی شیاطین تو کھلم کھلا سامنے آکر بات کرتے ہیں اُن کا وسوسہ سے کیا تعلق ہے تو جواب یہ ہے کہ انسانی شیاطین بھی اکثر ایسی باتیں کسی کے سامنے کرتے ہیں جن سے اُس کے دل میں کسی معاملے کے متعلق ایسے شکوک شبہات پیدا ہوجاتے ہیں جن کو وہ صراحۃً نہیں کہتے۔ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب (الفوائد فی مشکلات القرآن) میں فرمایا کہ انسانی شیطان کے شر سے مراد خود اپنے نفس کا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دل میں بُرے کاموں کی طرف رغبت ڈالتا ہے اسی طرح خود انسان کا اپنا نفس بھی بُرے ہی کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنا سکھلایا ہے حدیث میں ہے اللّٰھم اعوذ بک من شر نفسی و شر الشیطان و شرکہ، یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر سے بھی اور شیطان کے شر اور شرک سے بھی۔

شیطانی وساوس سے پناہ مانگنے کی بڑی اہمیت: ابن کثیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں انسان کو اس کی تلقین فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تینوں صفتیں رب، ملک، الٰہ ذکر کرکے اس سے شیطانی وساوس اور وساوس سے پناہ مانگنا چاہیے، کیونکہ ہر انسان کے ساتھ ایک قرین یعنی ساتھی شیطان لگا ہوا ہے جو ہر قدم پر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ انسان کو تباہ و برباد کردے، اول تو اس کو گناہوں کی رغبت دیتا ہے، اور

طرح طرح سے اُس کو بہلا کر گناہوں کی طرف لیجاتا ہے، اگر اسمیں کامیاب نہ ہوا تو انسان جو طاعات و عبادت کرتا ہے اُس کو خراب اور ضائع کرنے کے لئے ریاء و نمود اور غرور و تکبر کے وسوسے دل میں ڈالتا ہے، علم والوں کے دلوں میں عقائد حقہ کے متعلق شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسکے شر سے وہی بچ سکتا ہے جس کو اللہ ہی بچائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اسکا قرین (ساتھی) شیطان مسلط نہ ہو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ، کیا آپ کے ساتھ بھی یہ قرین ہے۔ فرمایا، ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کے مقابلے میں میری اعانت فرمائی اور اُس کو ایسا کر دیا کہ وہ بھی مجھے بجز خیر کے کسی بات کو نہیں کہتا۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے ایک رات میں اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ آپ کی زیارت کے لئے مسجد میں گئیں واپسی کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہوئے، گلی میں دو انصاری صحابی سامنے آگئے تو آپؐ نے آواز دیکر فرمایا، ٹھہرو میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دونوں نے بکمال ادب عرض کیا سُبحان اللہ یا رسول اللہ (یعنی کیا آپ نے ہمارے بارے میں یہ خیال کیا کہ ہم کوئی بدگمانی کریں گے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اُس کی رگ و پے میں اثر انداز ہوتا ہے، مجھے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمھارے دلوں میں کوئی وسوسہ بدگمانی کا پیدا نہ کر دے (اس لئے میں نے بتلا دیا کہ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں)

فائدہ جیسا کہ خود بُرے کاموں سے بچنا انسان کے لئے ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کو اپنے بارے میں بدگمانی کا موقع دینا بھی درست نہیں، ایسے مواقع سے بچنا چاہیئے جس سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہو اور کوئی ایسا موقع آجائے تو بات واضح کر کے تہمت کے مواقع کو ختم کر دینا چاہیئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث نے شیطانی وسوسہ کا بڑا خطرناک ہونا ثابت کیا ہے جس سے بچنا آسان نہیں۔ بجز خدا کی پناہ کے۔

تنبیہ یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیار خود مشغول ہو، اور غیر اختیاری وسوسہ و خیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اُس پر کوئی گناہ ہے۔

لطیفہ، سورۂ فلق اور ناس کے تعوذات میں ایک فرق سورۂ فلق میں تو اللہ تعالیٰ، جس کی پناہ مانگی گئی ہے اُس کی صرف ایک صفت پر اکتفا کیا گیا یعنی رب الفلق، اور جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی وہ بہت ہیں جن کو اولاً من شر ما خلق میں اجمالاً ذکر کیا، پھر اُن میں سے خاص تین آفات کو الگ بیان فرمایا، اور سورۂ ناس میں جس چیز سے پناہ مانگی گئی ہے وہ تو صرف ایک ہی ہے یعنی وسواس اور جس کی پناہ مانگی ہے اُس کی اس جگہ تین صفات بیان کر کے پناہ کی دُعا کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا شر سب شرور و آفات سے بڑھا ہوا ہے، اوّل تو اسلئے کہ اور آفات و مصائب کا اثر تو انسان کے جسم اور دُنیاوی اُمور پر پڑتا ہے بخلاف شیطان کے کہ یہ انسان کی دُنیا و آخرت دونوں کو اور بالخصوص آخرت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے اسلئے اسکا ضرر اشد ہے دوسرے یہ کہ دُنیا کی آفات کا تو کچھ نہ کچھ علاج مادّی بھی انسان کے قبضہ میں ہے اور وہ کرتا رہتا ہے بخلاف شیطان

کیونکہ اس کے مقابلے کی کوئی مادّی تدبیر انسان کے بس کی نہیں، وہ تو انسان کو دیکھتا ہے انسان اُس کو نہیں دیکھتا وہ انسان کے باطن میں غیر معلوم طریقہ پر تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اسکا علاج صرف اللہ کا ذکر اور اسکی پناہ لینا ہے۔

انسان کے دو دشمن، انسان اور شیطان اور دونوں دشمنوں کا الگ الگ علاج

انسان کا دشمن انسان بھی ہوتا ہے اور شیطان بھی اسکا دشمن ہے حق تعالیٰ نے انسانی دشمن کو اوّل تو حسنِ خلق اور مدارات اور ترکِ انتقام و صبر کے ذریعہ رام کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور جو ان تدبیروں سے باز نہ آئے اسکے ساتھ جہاد و قتال کا حکم دیا ہے۔ بخلاف دشمنِ شیطانی کے اسکا مقابلہ صرف استعاذہ اور اللہ کی پناہ لینے سے تلقین کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں قرآن کریم کی تین آیتیں اس مضمون کی لکھی ہیں جن میں ان دونوں دشمنوں کا ذکر کر کے انسانی دشمن کا دفاع حسنِ خلق ترکِ انتقام اور اس کیساتھ احسان کا سلوک کرنا بتلایا اور اسکے مقابلے میں شیطان کا دفاع استعاذہ تلقین فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ پورے قرآن میں یہ تین ہی آیتیں اس مضمون کی آئی ہیں۔ ایک آیت سورۂ اعراف میں ہے کہ اول فرمایا خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یہ تو انسانی دشمن کے مقابلے کی تدبیر ارشاد فرمائی جسکا حاصل عفو و درگزر اور اُس کو نیک کام کی تلقین اور اسکی برائی سے چشم پوشی بتلائی۔ اسی آیت میں آگے فرمایا وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ، یہ تلقین دشمنِ شیطانی کے مقابلے میں فرمائی جسکا حاصل اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔ دوسری آیت سورۂ قد افلح المؤمنون میں اوّل دشمن انسانی کے مقابلے کے علاج میں فرمایا، اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ یعنی برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو پھر دشمن شیطانی کے مقابلے کے لئے فرمایا وَقُلْ رَّبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ، یعنی اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ اور تیسری آیت سورہ حم سجدہ کی ہے جسمیں اوّل دشمن انسانی کی مدافعت کے لئے ارشاد فرمایا اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، یعنی تم برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو اگر ایسا کرو گے تو مشاہدہ ہوگا کہ تمہارا دشمن تمہارا مخلص دوست بن جائیگا۔ اسی آیت میں دوسرا جزء دشمن شیطانی کے مقابلے میں یہ فرمایا وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، یہ تقریباً وہی الفاظ ہیں جو سورۂ اعراف میں شیطان کے مقابلے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں اور حاصل اسکا یہ ہے کہ اسکا مقابلہ بجز استعاذہ کے کچھ نہیں (ابن کثیر)

ان تینوں آیتوں میں انسانی دشمن کا علاج عفو و درگزر اور حسنِ سلوک سے بتلایا گیا ہے کیونکہ انسانی فطرت یہی ہے کہ حسنِ خلق اور احسان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور جو شریر النفس فطری انسانی صلاحیت کھو بیٹھے ہوں انکا علاج دوسری آیات میں جہاد و قتال بتلایا گیا ہے کیونکہ وہ کھلے دشمن ہیں، کھلے ساز و سامان کیساتھ سامنے آتے ہیں انکی قوت کا مقابلہ قوت سے کیا جا سکتا ہے، بخلاف شیطان لعین کے کہ وہ اپنی فطرت میں شریر ہے احسان اور عفو و درگزر اس پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالتا ہے جس سے یہ اپنی شرارت سے باز آجائے اور نہ ظاہری مقابلہ اسکا جہاد و قتال سے ہو سکتا ہے یہ دونوں قسم کی نرم و گرم تدبیریں صرف انسانی دشمن کے مقابلے میں چلتی ہیں شیطان کے مقابلے میں

نہیں چلتی اس لئے اُسکا علاج صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جانا ہے جو پورے قرآن میں تلقین کیا گیا ہے اور اسی پر قرآن کو ختم کیا گیا ہے۔

انسانی اور شیطانی دشمن کے مقابلے میں انجام کے اعتبار سے بڑا فرق

اوپر قرآنی تعلیمات میں انسانی دشمن کا دفاع اوّل احسان اور صبر جمیل سے بتلایا گیا ہے اگر اسمیں کامیابی نہ ہو تو جہاد و قتال سے اور دونوں صورتوں میں مقابلہ کرنے والا مؤمن کامیاب ہی کامیاب ہے بالکل ناکامی مؤمن کے لئے ممکن ہی نہیں کیونکہ دشمن سے مقابلہ میں یہ غالب آگیا تب تو اس کی کامیابی کھلی ہوئی ہے اور اگر شکست کھا گیا یا مقتول بھی ہوگیا تو آخرت کا اجر و ثواب اور شہادت کے فضائل اُس کو اتنے بڑے ملیں گے جو دُنیا کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہونگے۔ غرض انسانی دشمن کے مقابلے میں ہار جانا بھی مومن کے لئے کوئی مضرت نہیں، بخلاف شیطان کے کہ اس کی خوشامد اور اسکو راضی کرنا بھی گناہ ہے اور اسکے مقابلے میں ہار جانا تو آخرت کو تباہ کرلینا ہے یہی وجہ ہے جس کے لئے دشمن شیطانی کی مدافعت کے واسطے حق تعالیٰ ہی کی پناہ لینا علاج ہے اسکی پناہ کے سامنے شیطان کی ہر تدبیر ضعیف و بے اثر ہے۔

کیدِ شیطانی ضعیف ہے

مذکورہ وجوہ سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ شیطان کی طاقت بڑی ہے اسکا مقابلہ مشکل ہے اسی خیال کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا، اور سورۂ نحل میں جہاں قرآن پڑھنے کے وقت استعاذہ کا حکم دیا گیا ہے اُس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ایمان والوں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں پر یعنی اللہ کی پناہ لینے والوں پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں ہوتا ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○ یعنی جب تو قرآن پڑھنے لگے تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے۔ اسکا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اسکا زور تو انہی پر ہے جو اسکو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو شریک مانتے ہیں۔

سورۂ نحل کی تفسیر معارف القرآن جلد پنجم ص ۳۸۵ میں اس آیت کی پوری تشریح اور استعاذہ کے مسائل اور شرعی احکام کی تفصیل گزر چکی ہے اُس کو دیکھ لیا جاوے۔

قرآن کریم کے فاتحہ اور خاتمہ میں مناسبت

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جس کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اُس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دُنیا و دین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد اسکے استعمال میں ہر قدم پر شیطانِ لعین کے مکر و فریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے اس لئے اس جال کو پاش پاش کرنے کی مؤثر تدبیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔ و باختتامہٖ تمّ بحمد اللّٰہ وفضلہ وکرمہٖ وعونہٖ تفسیر القرآن الکریم وللّٰہ الحمد اوّلہٗ وآخرہٗ وظاہرہٗ وباطنہٗ فما کنّا لنھتدی الیہ لولا ان ھدانا اللّٰہ وصلی اللّٰہ تعالیٰ علٰی خیر

خلقہ وصفوۃ رسلہ وامام انبیائہ محمّد خاتم النبیّین وسیّد المرسلین علیہ وعلیہم صلوات اللہ وسلامہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم وذٰلک فی الحادی والعشرین من شعبان سنہ ۱۳۹۲؁ ضحوۃ یوم السّبت ومن غریب الاتفاق ان ھٰذا الیوم ھوالیوم الّذی ولدتّ فیہ ففی ھذا الیوم تمّت من عمر ھذا العبد الضعیف الجانی علیٰ نفسہ سبعۃ وسبعون سنۃ واخذت فی الثّامن والسبعین واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ادعو وارجوان یجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہٗ وخیر ایّامی یوم القاہ فیہ ببرکۃ کتابہ المبین ونبیّہ الامین وان یتقبل منّی جھد المقلّ الذی اتعبت فیہ نفسی فی امراضٍ وھمومٍ وضعف القویٰ وما ھوالّا بتوفیقہ وعونہ وان یغفرلی خطیئاتی وتقصیراتی فی حقوق کتابہ الکریم وان ینفع بہ المسلمین الیٰ امد بعید وان یجعلہ ذخرًا الیوم لا بیع فیہ ولا خلال ولایجدی فیہ مالٌ ولاآلٌ فسبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم

وتمّ النظر الثانی علی المجلّد الثّامن من تفسیر معارف القراٰن یوم الجمعۃ عاشر شوال سنہ ۱۳۹۲؁ بعد مااخذت فیہ لثالث رمضان سنہ ۱۳۹۲؁ وکان فی نحو اربعین یوماً وللہ الحمد